

# دروس القرآن

١

والله اعلم  
محمد الياس كهن

مركز اهل السنة والجماعة



نام کتاب ..... دُرُؤُ الْقُرْآن جلد اوّل

تالیف: ..... محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ اشاعت ..... مارچ 2020ء

بار اشاعت ..... اوّل

تعداد اشاعت ..... 1100

ناشر ..... مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ

ملنے کا پتہ

مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ، 87 جنوبی لاہور روڈ سرگودھا

0321-6353540

0335-7500510

www.ahnafmedia.com

## درس قرآن کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے انس و جن کی نظام زندگی، معاشرتی طرزِ حیات، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب، سابقہ امم کے واقعات۔ یہود و نصاریٰ اور کفار و مشرکین کے قبائح و شائع، منافقین، مفسدین، مجرمین، ظالمین اور ضالین کی عادات بد کا تذکرہ اور ان سے بچاؤ کا طریقہ۔ مومنین، انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین، اولیاء، مفلحین، متقین، راشدین، فائزین وغیرہ کی عادات خیر اور ان کو اپنانے کی ترغیب بیان فرمائی ہے یوں سمجھیے کہ ہمیشہ ہمیش کامیابی اور ابدی ناکامی کے اسباب و علل کو واضح کرتے ہوئے اپنے آخری نبی پر آخری لازوال، لاریب اور لاشک کتاب قرآن کریم نازل فرمائی۔

آج کے اس مادہ پرستی کے دور میں انسان اللہ رب العزت کے نازل کردہ دستور العمل کو چھوڑ کر دوسرے راستوں کا راہی بن چکا ہے۔ یہی وجہ ہے سارے عالم میں فرقہ وارانہ بھونچال نے اس کے نظام زندگی کو معطل کر کے رکھ دیا ہے۔ جب تک انسان بالخصوص مسلمان اپنے خالق و مالک کی معرفت اس کے اوامر، احکام، نواہی اور اس کے آخری رسول کی تعلیمات کو نہیں اپنائے گا اس وقت تک یونہی مارا مارا پھرتا رہے گا۔ اس لیے اصلاح فرد اور اصلاح معاشرہ کے لیے قرآن کریم کی تعلیمات کو عام کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ جگہ جگہ قرآن کریم کے دروس کا سلسلہ شروع کیا جائے امت مرحومہ کو انہی خطوط کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی جائے تارک گواہ ہے کہ جن لوگوں نے قرآن کی تعلیمات کو اپنایا کامیاب ہوئے اور جن لوگوں نے اس سے روگردانی کی ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اقبال مرحوم نے کہا تھا:

وہ معزز تھے زمانے میں مسلمان ہو کر  
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر

## درس قرآن کا طریقہ

اگر آپ کسی مسجد کے امام، خطیب ہیں تو اپنی مسجد کے مقتدیوں کو بلاناغہ اور باقاعدہ درس قرآن دیں۔ اس کی سب سے مؤثر اور بہترین صورت یہ ہے کہ کسی بھی نماز کے بعد [جس میں اکثر اہل محلہ کو آسانی ہو] ایک ہی مکتبہ کے مطبوعہ قرآن کریم تپائیوں پر رکھوا دیے جائیں، درس قرآن کے شرکاء ترتیب کے ساتھ بیٹھ جائیں، ترتیب یہ ہونی چاہیے:

- 1 سب پہلے الفاظ قرآن کو الگ الگ کر کے تلاوت کریں۔ ساتھ ساتھ نمازی اور شرکائے درس بھی تلاوت کریں۔
- 2 اس کے بعد ان آیات کا بالکل سادہ اور عام فہم ترجمہ کریں۔
- 3 اجمالی طور پر تلاوت شدہ آیات کا خلاصہ بیان کریں۔
- 4 اس کے بعد ان کی تفسیر کریں۔
- 5 تفسیر کرتے وقت اس بات کو بطور خاص ملحوظ رکھیں اگر ان آیات میں کوئی عقیدہ ہے تو سب سے پہلے اس کی خوب وضاحت کریں۔ پھر علی الترتیب مسائل اور واقعات وغیرہ بیان کریں۔
- 6 ایسی آیات جن کا تعلق محکمات سے ہے عوام میں صرف وہی بیان کی جائیں۔
- 7 متشابہات آیات کو عوام الناس میں بیان کرنے سے گریز کیا جائے۔
- 8 وقت کا دورانیہ بہت زیادہ طویل نہ ہو۔
- 9 شرکائے درس میں سے کوئی سوال وغیرہ کرے تو اس کو موقع دیا جائے۔
- 10 آخر میں تمام امت کے لیے گڑگڑا کر دعا کریں۔



## درس قرآن کے لیے چند مفید تفاسیر

درس قرآن دیتے وقت اس بات کا بہت زیادہ خیال کریں کہ کسی ملحد اور بدعتی کی تفسیر کو سامنے رکھ کر مطالعہ نہ کریں۔ بلکہ علمائے ربانین کی تفاسیر سے استفادہ کریں۔

### اردو زبان میں:

1. بیان القرآن از حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ
2. تفسیر عثمانی از علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ
3. معارف القرآن از مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ
4. معارف القرآن از مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ
5. معالم العرفان فی درس القرآن از صوفی عبدالحمید خان سواتی رحمہ اللہ

### عربی زبان میں:

1. الجامع لاحکام القرآن از امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ
2. روح المعانی از علامہ سید محمود آلوسی رحمہ اللہ
3. مدارک التنزیل تفسیر النسفی از امام عبد اللہ بن احمد النسفی رحمہ اللہ
4. تفسیر ابن کثیر از امام عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر رحمہ اللہ
5. احکام القرآن از حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ

### نوٹ:

ترجمہ کے لیے شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی کا آسان ترجمہ قرآن زیادہ مفید ہے۔

## تعارف

### متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن حفظہ اللہ

تحریر: مولانا محمد کلیم اللہ حنفی

الحمد للہ! بین الاقوامی سطح پر علمی و عملی میدان میں متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن کو اللہ کریم نے غیر معمولی مقبولیت و محبوبیت سے نوازا ہے، اولاً اشاعت و تحفظ دین کے لیے درکار تمام صلاحیتیں اپنے کرم سے عطا فرمائیں اور اس کے بعد ہر موڑ پر فراست ایمانی کی بدولت وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ان صلاحیتوں کے مناسب استعمال کا طریقہ بھی ودیعت کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اہل علم طبقہ میں مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں بطور خاص عقائد اسلامیہ اور فقہ حنفی کے تحفظ کے لیے مختصر عرصہ میں ان کی تجدیدی اور انقلابی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ قدرت نے آپ کو تحریکی، تربیتی، تعلیمی، تدریسی، تعمیری، تنظیمی، تحقیقی، تصنیفی، تقریری، تبلیغی اور تجدیدی ذوق جیسی لازوال نعمتوں سے خوب خوب نوازا ہے۔

اس ہمہ جہتی کے باوجود آپ سادگی اور تواضع کے پیکر ہیں۔ آپ کی مسلکی محنت، عقائد و نظریات، اساسیات اسلامیہ کا تحفظ، حرمتِ قرآن، سنت اور اس کی پاسداری، ختم نبوت، صحابہ و اہل بیت کرام رضوان علیہم اجمعین کا دفاع، فقہاء ملت خصوصاً حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی پاسبانی، اکابرین امت خصوصاً علمائے دیوبند، علم و دیانت کی پہرے داری اور مسلک اہل السنۃ والجماعۃ کے فروغ، اشاعت اور نفاذ کی کوششیں آپ کی زندگی کا مقصد اور حرزِ جان ہیں۔ اس سلسلے میں قید و قفس کی صعوبتیں، ایام اسارت کی مشکلات، قاتلانہ حملے اور اہل باطل کے منفی پروپیگنڈے سب کچھ برداشت کیا ہے۔

آپ زمانہ طالب علمی ہی سے نہایت بیدار مغز، ذہین، معاملہ فہم، باصلاحیت، ہونہار اور قائدانہ صلاحیتوں کے مالک تھے ان صلاحیتوں کی بدولت اپنے ہمعصر ساتھیوں میں امتیازی مقام رکھتے تھے۔ ایک عرصہ سے علمی، عملی اور روحانی خدمات میں مگن ہیں۔ میں اپنی معلومات کی حد تک بجا طور پر یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے 6 عشروں میں اسلامی تحریکات کے کسی بھی قائد نے اس قدر عوامی اجتماعات سے خطاب نہیں کیے ہوں گے جتنے اس عظیم انسان نے کیے۔

سفر کی صعوبتیں جھیل کر اور اغیار کے منفی پروپیگنڈے کو اپنے مضبوط اعصاب پر سہتے ہوئے بلا مبالغہ ایک ایک دن میں مختلف مقامات پر چھ چھ علمی و اصلاحی بیانات، افراد سازی، تحریکی کام کو مزید منظم اور مستحکم کرنا، وسائل کے لیے انتھک محنت، روزمرہ کے اپنے معمولات جس میں تہجد اور دیگر نوافل (اشراق، چاشت اور اوایں)، تلاوت، ذکر اذکار، تصنیف و تالیف، تقریر و وعظ، درس و اسباق وغیرہ کو سلیقہ مندی اور سنجیدگی کے ساتھ ادا کرنا۔ ہر علاقے میں وہاں کی ضرورتوں کے پیش نظر علماء کی تعیناتی کرنا الغرض اپنی زندگی کا ہر لمحہ مصروف کار کر دیا اس جہد مسلسل اور لگن کا نتیجہ ہے کہ آپ نے ایک مضبوط ٹیم تیار کی ہے جو مختلف دین کے شعبوں میں ہمہ تن مصروف عمل اور آپ کی دست بازو بنی ہوئی ہے اور آپ کے تلامذہ و فیض یافتگان کا ایک بہت بڑا طبقہ برصغیر اور بیرون ممالک میں موجود ہے جو آپ کے مشن کو سارے عالم میں پھیلانے کی تگ و دو میں پروانہ دار بڑھ رہا ہے۔

اس اجمالی خاکے کے بعد زندگی کے چند گوشے پیش خدمت ہیں۔

## ولادت:

12- اپریل 1969ء کو سرگودھا کے نواحی علاقے چک نمبر 87 جنوبی میں پیدا ہوئے۔

## خاندانی پس منظر:

آپ کے والد ماجد کا نام حافظ شیر بہادر گھسن تھا، مرحوم انتہائی نیک طبیعت کے مالک تھے، عقائد و نظریات میں حد درجہ پختگی رکھتے تھے، آپ کے خاندان کی سیاسی و سماجی حیثیت بہت اچھی ہے، آپ کے دادا چوہدری فتح محمد گھسن اپنے علاقے کے رئیس اور نمبر دار تھے۔ وہاں کے لوگوں کے مابین فیصلے فرماتے، انتظامی امور کو خود حل فرماتے۔ اس وقت جہاں آپ نے ادارہ مرکز اہل السنۃ والجماعۃ بنایا ہوا ہے یہ آپ کی وراثتی زمین ہے اور نمبر داری کا رقبہ کہلاتی ہے۔ آپ کل پانچ بھائی تھے جن میں چار ابھی حیات ہیں جبکہ سب سے بڑے بھائی محمد یوسف 1995ء میں انتقال کر گئے تھے۔ نام یہ ہیں: محمد یوسف، محمد یونس، محمد الیاس، شعیب احمد اور خبیب احمد۔

## ابتدائی زندگی:

آپ نے پرائمری تک اپنے گاؤں چک نمبر 87 جنوبی سرگودھا میں پڑھا۔ چک نمبر 88 جنوبی سے مڈل کی فراغت کے بعد آپ نے اپنے والد حافظ شیر بہادر صاحب رحمہ اللہ سے حفظ قرآن کریم شروع کیا۔ سترہ پارے والد صاحب کے پاس پڑھے اور اس کے بعد لکھڑ منڈی جامع مسجد بوہڑ والی ضلع گوجرانوالہ میں امام اہل السنۃ شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کے ہاں چلے گئے وہاں قاری محمد عبد اللہ کشمیری صاحب کے پاس مکمل قرآن کریم حفظ کیا۔ امام اہل السنۃ مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کی خوب خدمت کی یہاں تک کہ کم عمری کے باعث آپ اُن کے گھر میں بھی آیا جایا کرتے تھے۔

## تعلیم و تربیت:

درس نظامی کے ابتدائی درجات درجہ اولیٰ سے درجہ ثالثہ تک جامعہ بنوریہ سائٹ ایریا کراچی میں پڑھے اور درجہ رابعہ، خامسہ اور سادسہ جامعہ امدادیہ فیصل آباد

میں۔ درجہ موقوف علیہ کے ابتدائی دو ماہ جامعہ خیر المدارس ملتان میں جبکہ باقی سال جامعہ علوم شرعیہ ساہیوال میں مکمل کیا۔ دورہ حدیث شریف کے لیے جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد تشریف لے گئے۔

### معروف اساتذہ:

آپ کے مشہور اساتذہ میں صاحب فضل و کمال امام اہل سنت شیخ التفسیر و الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ، مولانا قاضی حمید اللہ جان رحمہ اللہ گوجرانوالہ، شیخ الحدیث مولانا زاہد الراشدی گوجرانوالہ، شیخ الحدیث مولانا محمد قاسم جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور، شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد رحمہ اللہ جامعہ اسلامیہ مفتی محمد طیب مفتی محمد زاہد امدادیہ فیصل آباد، مولانا محمد اسلم شیخوپوری رحمہ اللہ کراچی، مولانا عبد المجید رحمہ اللہ جامعہ بنوریہ کراچی، مولانا عبد المجید انور جامعہ علوم شرعیہ ساہیوال، مولانا نذیر احمد جامعہ علوم شرعیہ ساہیوال، مولانا سید نذیر شاہ جامعہ فاروق اعظم فیصل آباد اور مولانا غلام یاسین صابر قاری محمد حنیف جالندھری جامعہ خیر المدارس ملتان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

### ابتدائی محنت:

آپ نے سب سے پہلے اپنے گاؤں کا انتخاب کیا اپنے گاؤں میں ”صراط مستقیم کورس“ شروع کیا۔ اللہ رب العزت کو منظور یہی تھا کہ کام آگے بڑھے پھر امام اہل سنت حضرت مولانا شیخ سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ اور وکیل اہل سنت حضرت مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ کی مشاورت سے مدارس کے طلبہ کے لیے شعبان اور رمضان میں دورہ تفسیر کا اہتمام کیا اور تفسیر قرآن پڑھانے کے لیے حضرت مولانا منیر احمد منور شیخ الحدیث جامعہ باب العلوم کھروڑ پکا کا انتخاب کیا۔ اور اب کچھ عرصہ سے دورہ تفسیر کی بجائے دورہ تحقیق المسائل شروع کیا۔ جس میں اہم اسباق بذات خود جبکہ

باقی اسباق آپ کے شاگرد پڑھاتے ہیں۔

### پہلا دعوتی سفر:

1993ء میں آپ نے اپنا پہلا دعوتی سفر جنوبی افریقہ، کینیا، ملاوی اور زمبابوا کیا اور زمبابوا میں کچھ عرصہ تدریس کی جہاں آپ نے ہدایۃ النخو، کنزالدقائق، تفسیر جلالین اور ہدایۃ شریف وغیرہ کے اسباق پڑھائے۔ 1993ء سے 1996ء تک آپ کی ساری سرگرمیاں دعوتی رہیں۔

### گرفتاریاں اور قید و بند:

5 اگست 1996ء کو پہلی بار آپ کو بے گناہ گرفتار کیا گیا جس کی وجہ سے آپ نے دو سال تک قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ بعد میں آپ کو عدالت نے باعزت بری کیا۔ 1999ء میں دوبارہ گرفتار ہوئے تین سال قید کاٹ کر 2001ء میں اس سے بھی باعزت طور پر بری ہوئے۔ آپ کی اسارت کا کل عرصہ تقریباً سات سال بنتا ہے۔

### سفر حج و عمرہ:

1994ء میں آپ نے فریضہ حج ادا فرمایا، اس کے علاوہ بیس سے زائد مرتبہ عمرہ کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ حرمین شریفین کے تقدس کے حوالے سے آپ کے جذبات قابل قدر ہیں۔ آپ کی عادت شریفہ یہ ہے کہ آپ جب بھی عمرہ کے لیے ارض حجاز تشریف لے جاتے ہیں تو پہلے مدینہ منورہ جاتے ہیں روضہ رسول پر حاضری کے بعد مکہ مکرمہ جا کر مناسک عمرہ ادا کرتے ہیں۔

### مرکز اہل السنۃ والجماعۃ کا قیام:

دسمبر 2002ء میں نے اپنی علمی تحریکی زندگی کا آغاز کیا۔ اور ایک ادارہ مرکز اہل السنۃ والجماعۃ کے نام سے تشکیل دیا۔ جس کا مقصد پورے عالم میں قرآن،

سنت اور فقہ کی اشاعت اور تحفظ ہے۔ یہ علمی درس گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ اور روحانی تربیت گاہ بھی ہے۔ بعد ازاں فارغ التحصیل علماء کرام کے لیے ایک سالہ تخصص فی التحقیق والدعوۃ کے نام مرکز اہل السنۃ والجماعۃ میں تخصص شروع کرایا۔ آپ نے اس طرز پر علماء کرام کی فکری تربیت کی جو وقت اور حالات کے عین مطابق زمانے کی شدید ضرورت تھی، جسے دس سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔

آپ کی سرپرستی میں پورے ملک میں علماء کرام کی ایسی کھیپ تیار ہو چکی ہے جو مثبت انداز اور شائستہ زبان میں عقائد و مسائل کی اشاعت و تحفظ کے مبارک فریضے کو بڑی جوانمردی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ ریکارڈ کے مطابق ان علماء کی مجموعی تعداد 700 سے زائد ہے۔ ہر سال مدارس دینیہ کے سالانہ امتحانات کے بعد 12 دن کا شارٹ کورس دورہ تحقیق المسائل کے نام سے کراتے ہیں، ہر ماہ تین دن تحقیق المسائل کورس کے نام سے سمر کورس، صراط مستقیم کورس اور دورہ تحقیق المسائل میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے ہزاروں افراد اس میں شریک ہو چکے ہیں۔

### خواتین کی دینی تربیت کا اہتمام:

آپ نے جیسے مردوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک ادارہ قائم فرمایا اسی طرح خواتین میں دینی شعور کی بیداری کے لیے بھی الگ سے ایک ادارہ قائم کیا جس میں بچیوں کے لیے حفظ و ناظرہ، چھ سالہ درس نظامی، دو سالہ فاضلہ کورس، میٹرک تک سکول کی تعلیم، سلائی کڑھائی، صراط مستقیم کورس اور دورہ تحقیق المسائل برائے طالبات کرایا جاتا ہے۔

### عالمی تحریک کی بنیاد:

کچھ عرصہ پہلے تک اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ پاکستان میں آپ نے بطور ناظم اعلیٰ مسلکی کام کیا۔ بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر آپ نے اس جماعت سے باضابطہ

استعفادیا اور 2 مارچ 2014 کو ”عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ“ کے نام سے ایک جماعت تشکیل دی، جس کے بانی اور امیر آپ خود ہی ہیں۔ اس کی بنیاد رکھتے وقت تک آپ کے پیش نظر یہ سوچ اور فکر تھی کہ عالمگیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کے ناتے ہمارا دینی منصب بھی ”عالمی“ ہے۔ ہم تمام بے دین اور دین بیزار گروہوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے اپنی نسبت اس طبقے کی طرف کرتے ہیں جس کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نجات یافتہ قرار دیا ہے یعنی ”اہل السنۃ والجماعۃ“ اور اس کے بھی باہمی اور بین الاقوامی پلیٹ فارم پر ”اتحاد“ کے داعی ہیں۔ اس لیے جماعت کا نام ”عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ“ تجویز کیا گیا ہے۔

### جماعتی پالیسی:

آپ نے اس پلیٹ فارم پر جماعتی احباب و ذمہ داران کو جن پالیسیوں کا پابند بنایا اس سے آپ کی قائدانہ سوچ و فکر اور صلاحیتوں کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ آپ نے جماعت کی جامع پالیسی کچھ یوں مرتب کی:

- عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ؛ خالصہ علمی و تحقیقی کام کرے گی۔
- عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ؛ غیر سیاسی و غیر عسکری طرز پر کام کرے گی۔
- عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ؛ تشدد (گالی اور گولی) کی بجائے تسدد (قوت دلیل سے غلط عقائد و مسائل سے روکنا) اور تعصب (ضد و عناد) کی بجائے تصلب (دلائل کی بنیاد پر مسلک حق پر چٹنگی سے کاربند رہنے) کا راستہ اختیار کرے گی۔

- عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ؛ اہل حق کے افراد، جماعتوں اور اداروں کی مخالفت کی بجائے موافقت کرے گی۔
- عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ؛ کے ذمہ داران و کارکنان اپنی جماعتی پالیسی پر



اعتماد، دیگر پر تنقید سے اجتناب کریں گے۔

- عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ؛ سیاسی امور میں اکابر کے نقش قدم پر مواظبت کرے گی۔
- عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ؛ پاکستان کے آئین اور قانون کے دائرہ میں رہ کر کام کرے گی۔
- عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ؛ ہمہ وقت مناظرانہ کی بجائے واعظانہ طرز پر کام کرے گی۔
- عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ؛ ذاتیات کو زیر بحث لانے کی بجائے نظریات پر محنت کرے گی۔
- عالمی اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ؛ کاہر کارکن اپنی طرف سے امیر کے حکم پر جان و مال قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہے گا۔

آپ کے دست بازو بننے والے اس جماعت کے ذمہ داران و کارکنان پوری دنیا میں حسب استطاعت اپنی دینی و مسلکی فضا کو ہموار کرنے میں مسلسل مصروف عمل ہیں۔ اس محنت اور کاوش کی مختلف جہات ہیں: درس و تدریس، تعلیم و تعلم، وعظ و نصیحت، تصنیف و تالیف، سمر کورسز، بیعت و سلوک، اصلاح و ارشاد، قوتِ دلیل سے تقریر و بیان وغیرہ۔

**تبلیغی اسفار:**

چونکہ آپ ایک عالمی تحریک کے روح رواں اور بے باک لیڈر اور مدبر قائد ہیں، اس لیے وطن پاکستان میں کراچی تا چترال تمام چھوٹے بڑے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کو آپ اپنے علوم سے فیض یاب کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنے کاز، مشن اور کام کا دائرہ محدود نہیں رکھا بلکہ پورے عالم کی فکر لے کر دیوانہ وار مسلسل مصروف عمل

ہیں۔ دنیا کے اکثر خطوں میں اسلام کی ترجمانی کا فریضہ بڑی حکمت عملی جو انہر دی اور دینی بصیرت سے انجام دے رہے ہیں۔ عرب و عجم کے دور دراز ملکوں ملکوں گھومے ہیں اور آج بھی اس درد، فکر، کڑھن اور جذبہ کے ساتھ علم و عمل کا یہ شاور مستقل پایہ رکاب رہتا ہے۔ چنانچہ بیس سے زائد بیرونی ممالک [جن میں سعودی عرب، ترکی، عرب امارات، ساؤتھ افریقہ، زیمبیا، کینیا، سوازی لینڈ، موزمبیق، ملاوی، یمن، افغانستان، برما، بحرین، ہانگ کانگ، ملائیشیا، سنگاپور، عمان، تھائی لینڈ وغیرہ شامل ہیں] کے باضابطہ آپ نے اسفار کیے ہیں۔

### وطن دوستی کا مبارک جذبہ:

آپ ایک جہان دیدہ انسان ہیں۔ کئی ممالک میں اسلامی عقائد و نظریات کے سلسلے میں تشریف لے گئے۔ وہاں کے معروضی حالات کو دیکھا چنانچہ آپ خود فرمایا کرتے ہیں کہ میں نے کئی ممالک کا سفر کیا ہے لیکن پاکستان جیسا حسین و جمیل، آزاد و خود مختار ملک کہیں نہیں دیکھا۔ اہلیان پاکستان میں وطن دوستی کا جذبہ اجاگر کرنے کے لیے آپ استحکام پاکستان کے عنوان سے ہزاروں کے اجتماعات سے خطاب کرتے ہیں اور اپنے مخصوص انداز میں دہشت گردی، فرقہ واریت، تخریب کاری، قتل و قتال، مذہبی و سیاسی منافرت اور جہالت و بد امنی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔

ہر سال یوم آزادی پاکستان 14 اگست کو اپنے ادارے مرکز اہل السنۃ والجماعۃ میں استحکام پاکستان سیمینار سے خطاب کرتے ہیں، پرچم کشائی اور استحکام پاکستان کے نام پر منظم ریلی نکالتے ہیں۔ افواج پاکستان کو ملک کا محافظ سمجھتے ہوئے ان کے پر جوش حامی ہیں، جب کبھی بھی وطن دشمنوں نے ملک میں کوئی فرقہ وارانہ فساد، عسکری دہشت گردی اور تخریب کاری کی کارروائی کی تو آپ نے ایک محب وطن شہری ہونے کے ناتے اس کی بھرپور مذمت کی اور آئندہ کے لیے مستقل لائحہ عمل

تیار کرنے کا عندیہ دیا ہے آپ کے یہ بیانات ریکارڈ پر موجود ہیں جو اس بات کی کھلی شہادت ہیں کہ آپ وطن دوست انسان ہیں اور کسی صورت بھی وطن میں بد امنی گوارہ نہیں کر سکتے۔ بارہا ایسے بھی ہوا کہ جس علاقے میں آپ کا بیان ہوا اگر وہاں کی مقامی انتظامیہ اس سے روک دے تو آپ الجھتے نہیں بلکہ اس پابندی کو وطن کے وسیع تر مفاد میں دل و جان سے قبول کر لیتے ہیں۔

### رفاہی خدمات:

آپ کی زیر نگرانی ایک رفاہی ادارہ احناف ٹرسٹ رجسٹرڈ کے نام سے عوام الناس کی رفاہی خدمات میں مصروف عمل ہے، آفت زدہ علاقوں میں خلق خدا کی کثیر تعداد کو ٹرسٹ نے اپنی وسعت کے مطابق راشن، خیمے، لباس خوراک اور دیگر ضروریات مہیا کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ ذاتی طور پر غریب پروری، یتیمی و مساکین، مفلوک الحال لوگوں کی مالی اعانت کرتے ہیں۔

### تصنیفی خدمات:

آپ کے قلم سے اس وقت تک 36 کے قریب دینی، مسکلی، اصلاحی اور تحقیقی کتب نکل چکی ہیں جو عقائد اسلامیہ، قرآنی و نبوی تعلیمات، مسلک اہل السنۃ والجماعۃ، فقہ حنفی، حالات حاضرہ، اصلاح نفس، اصلاح معاشرہ و دیگر موضوعات پر اکابر علمائے دیوبند کی تشریحات، تعبیرات، ترجیحات اور تحقیقات کے عین مطابق ہیں۔ ان میں سے چند کتب یہ ہیں: عقائد اہل السنۃ والجماعۃ، دروس القرآن، دروس الحدیث، نماز اہل السنۃ، زبدۃ الشمائل، صراط مستقیم کورس، امہات المومنین، مجالس، مواعظ متکلم اسلام، رمضان المبارک فضائل و مسائل، فضائل اعمال اور اعتراضات کا علمی جائزہ اور قربانی کے فضائل و مسائل وغیرہ۔ اردو کے علاوہ عربی، انگریزی، فارسی، پشتو، گجراتی، ہندی، تامل وغیرہ کئی ایک زبانوں میں ترجمہ ہو کر آپ کی تصانیف دنیا بھر میں دین

اور تحقیق و تعلیم سے وابستہ افراد کے پاس موجود ہیں جو ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

## صحافتی خدمات:

جیسے آپ کی زبان میں قوت استدلال کا زور ہے ویسے ہی آپ کے قلم میں ادب کی حلاوت و چاشنی، تاریخ، جغرافیہ اور حالات حاضرہ کا ادراک، مسائل کا سنجیدہ حل اور اصلاح معاشرہ کا غم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ پاکستان، سعودی عرب اور انڈیا کے اخبارات و رسائل میں آپ کے ادارتی صفحات اور اسلامی ایڈیشن میں کالم اور مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

پاکستان کے بعض اخبارات کے نام یہ ہیں:

روزنامہ اسلام، روزنامہ ایکسپریس، روزنامہ دنیا، روزنامہ جنگ، روزنامہ نوائے وقت، روزنامہ نئی بات، روزنامہ جہان پاکستان، روزنامہ پاکستان، روزنامہ اوصاف، روزنامہ جناح، روزنامہ انصاف، روزنامہ امن، روزنامہ آئین، روزنامہ اساس، روزنامہ الشرق، روزنامہ تاثیر، روزنامہ اذکار، روزنامہ آفتاب، روزنامہ خبریں، روزنامہ میزان عدل، روزنامہ مشرق، روزنامہ جرات، روزنامہ سماء، روزنامہ آج، روزنامہ بولتپاکستان، روزنامہ خبریہ اور ہفت روزہ اخبار المدارس وغیرہ۔

انڈیا کے بعض اخبارات یہ ہیں:

روزنامہ متاع آخرت، روزنامہ انقلاب، روزنامہ ہمارا سماج، روزنامہ رابطہ ٹائمز، روزنامہ آج کا انقلاب، روزنامہ جدید بھارت اور روزنامہ دبنگ صحافت وغیرہ۔ سعودی عرب میں ”اردو نیوز“ اخبار کے جمعہ ایڈیشن ”روشنی میگزین“ میں آپ کے متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں۔

آپ کی زیر ادارت تین رسائل [سہ ماہی قافلہ حق، ماہنامہ فقیہ اور ماہنامہ بنات اہل السنہ] شائع ہوتے رہے ہیں۔ طویل عرصہ تک آپ نے ان کی ادارت کے

فرائض انجام دیے۔ آپ کی ادبی، لیلیٰ اور سادہ اردو میں کبھی کبھار استعارے، کنایے، محاورات، ضرب الامثال، غیر فطری تہذیب پر مزاحمتی چوٹیں اور غیر اسلامی نظریات کے حاملین کے نقطہ نظر پر آپ کے قلم کی شوخی اور جولانی و قناعت تحریر میں انگریزیاں لیتی رہتی ہے۔ آپ کا طرز تحریر نہ تو بالکل پھیکا سا ہے اور نہ ہی اتنا مشکل کہ قارئین کو دقت میں ڈالے۔ عمدہ اسلوب نگارش کی وجہ سے صحافتی دنیا میں بہت طویل سفر کیا ہے اور یہ سفر اب بھی بڑی تیزی سے طے کر رہے ہیں۔

### مشائخ طریقت:

آپ کو تصوف سے سلاسل اربعہ میں متعدد شیوخ سے اجازت حاصل ہے۔ اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

حضرت اقدس حکیم شاہ محمد اختر رحمہ اللہ

حضرت اقدس سید محمد امین شاہ رحمہ اللہ

حضرت اقدس مولانا عبد الحفیظ مکی رحمہ اللہ

حضرت پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہ

حضرت پیر عزیز الرحمن ہزاروی مدظلہ

### خانقاہ حنفیہ:

آپ فرمایا کرتے ہیں کہ محض علم بغیر ذکر اللہ کے انسان میں تکبر اور تعلی پیدا کرتا ہے اور ذکر اللہ بغیر علم کے بسا اوقات انسان کو عجب اور خود پسندی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس لیے آپ نے جہاں علماء اور عوام دونوں کو علم و ذکر کا پابند بنانے کی کوشش کی تاکہ تکبر و تعلی اور عجب و خود پسندی کا شکار ہو کر دونوں طبقات محروم نہ ہو جائیں۔ تعلق مع اللہ، اطاعت رسول، اتباع شریعت، احساس طریقت، اصلاح نفس، تزکیہ و تصفیہ باطن کے لیے اولاً عقائد اسلامیہ سے آگاہی اور غیر اسلامی نظریات و افکار

سے حفاظت، اور اس کے بعد تذکیر و موعظت کے ذریعے اخلاقی و معاشرتی اقدار کو فروغ دینا، حسن سلوک اور اعلیٰ اوصاف سے معاشرے کو مزین کرنا جہاں وقت کا اہم تقاضا ہے وہاں عوام و خواص کی اولین ضرورت بھی ہے۔

اس میدان میں آپ کا بہت مضبوط سلسلہ ہے جو ”خانقاہ حنفیہ“ کے نام سے معروف ہے۔ تادم تحریر آپ نے اس بار خلافت سے 34 افراد کو اپنا خلیفہ مجاز بیعت قرار دیا ہے۔ آپ کے خلفاء پاکستان، ہندوستان، جموں کشمیر، ملائیشیا، انگلینڈ، عرب ممالک اور سوازی لینڈ میں جبکہ مریدین اطراف عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ خانقاہ حنفیہ کے نام سے دنیا کے کی ایک ممالک میں خانقاہیں موجود ہیں جو اپنے اپنے علاقے میں لوگوں کے اصلاح و ارشاد کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔

### میڈیا کی ضرورت کا ادراک:

دور حاضر میں میڈیا ایک فکری ہتھیار ہے جو کہ بد قسمتی سے ان ہاتھوں میں ہے جو اسلام دشمن یا دین بیزار لوگ ہیں۔ اس لیے آپ نے اس ہتھیار کو دین کی اشاعت و تحفظ کے طور پر استعمال فرماتے ہوئے ایک شعبہ احناف میڈیا سروسز قائم فرمایا تاکہ اپنے پیغام کو چند سامعین کے محدود حلقے سے بڑھ کر ساری دنیا کے لوگوں تک پہنچایا جاسکے۔ احناف میڈیا سروسز کی آفیشل ویب سائٹ کا ایڈریس یہ ہے:

[www.ahnafmedia.com](http://www.ahnafmedia.com)

اس پر تلاوت قرآن، آڈیو ویڈیو نعتیں، آڈیو ویڈیو بیانات، رسائل و جرائد، کتب، آرٹیکلز، سوال و جواب اور دیگر بہت ساری علمی، اصلاحی اور تحقیقی مواد دستیاب ہے جس سے دنیا بھر کے لوگ فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف ٹی وی چینلز پر بھی اسلامی کلچر کے فروغ اور اصلاح عقائد و اعمال میں اپنا دردل پیش کرتے رہتے ہیں۔ سوشل میڈیا کے تقریباً تمام قابل ذکر پلیٹ فارمز پر آپ کے پیجز، چینلز

اور آئی ڈیزبنی ہوئی ہیں جو دن رات دینی دعوت کا پیغام پھیلانے میں مصروف ہیں۔  
 آپ جہاں ایک طرف دینی اور تحقیقی جماعت کے زیرک قائد ہیں تو وہاں  
 آپ کا اپنے اکابر سے نیاز مندانہ رویہ موجودہ دور کے قائدین کی صف میں آپ کو ممتاز  
 رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلک اہل السنۃ والجماعۃ کے تمام مشائخ، دینی اداروں،  
 تحریکوں اور جماعتوں کے ذمہ دار سربراہان اور کارکنان آپ سے قلبی محبت رکھتے  
 ہیں۔ آپ کی عالمی مسائل پر جہاں کڑی نظر رہتی ہے تو وہاں خانگی مسائل کو بھی کسی  
 اور کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتے بلکہ احسن انداز میں تمام مسائل کو حل کرنے کی  
 مومنانہ فراست آپ کے چہرے سے ٹپک رہی ہوتی ہے۔ آج ہمارے ملک اور قوم کو  
 ان جیسے علماء کی ضرورت ہے جو اسلام اور ملک دونوں کے پاسبان اور محافظ ہیں۔ اللہ  
 تعالیٰ آپ کو، آپ کی جماعت، آپ کے ادارے اور ارادے کو اپنے کرم سے مزید  
 قبولیت بخشے اور اس کا نفع عام فرمائے۔

آمین یا رب العلمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## فہرست

### 62 ----- سورة الفاتحة

62----- قوم کا مزاج اور علماء کی ذمہ داری:-----

63----- حدیث سے لگن:-----

63----- قرآن کریم کی ترتیب نزولی اور وضعی:-----

64----- ترتیب نزولی اور وضعی حکم خداوندی ہیں:-----

65----- قرآن کریم کی عظیم ترین سورۃ:-----

66----- سورۃ شفا:-----

66----- یقین محکم اور اعتمادِ کامل:-----

67----- امام اہل السنۃ کا تعویذ اور دَم:-----

67----- سورۃ فاتحہ کے مختلف نام:-----

68----- دم کرنے کا ثبوت صحیح بخاری سے:-----

69----- دَم کی اُجرت کا مسئلہ:-----

70----- حکیم الامت کا فیصلہ:-----

71----- دم کی اُجرت پر نبوی فیصلہ:-----



- 71----- صدقہ پریشانیوں کا حل ہے:
- 72----- سورۃ کے مکی، مدنی ہونے کا اصول:
- 73----- سورۃ الفاتحہ کے مکی ہونے کی دلیل:
- 73----- آیت کی علامت (O):
- 74----- سورۃ الفاتحہ کی کل آیات اور اختلاف فقہاء:
- 74----- بدعتیہ کی کاسد باب:
- 75----- امام اعظم ابو حنیفہ کا تفقہ:
- 76----- صفت رب جامع الصفات ہے:
- 76----- لفظ ”رب“ پر عجیب نکتہ:
- 77----- مخلوقات کی تعداد:
- 78----- اللہ تعالیٰ ہی رزاق ہیں:
- 79----- تفسیر روح المعانی اور علامہ آلوسی:
- 79----- خدا کے موجود ہونے پر عقلی دلیل:
- 80----- اپنے ایمان کی حفاظت کریں:
- 81----- رحمن و رحیم میں فرق:
- 82----- انسان کو ”رحمن“ نہیں کہہ سکتے، رحیم کہہ سکتے ہیں:
- 83----- عموم اور کمال میں فرق:
- 83----- اللہ تعالیٰ ہمارے مالک ہیں:
- 84----- شاہی اختیارات کا استعمال:
- 84----- سفارشی کی ضرورت:
- 85----- شفاعتِ پیغمبر کا عقیدہ:

- 85----- مدرسہ سفارشی پیدا کرتا ہے:
- 86----- اللہ کی رحمت اور بندے کا اقرار جرم:-----
- 87----- جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان مکالمہ:-----
- 88----- شرک اور توحید میں فرق:-----
- 89----- لفظ نعبہ پر عجیب نکتہ:-----
- 90----- فضائل اعمال کے معترضین سے ایک سوال:-----
- 92----- امام اہل سنت رحمہ اللہ کا جواب:-----
- 93----- صراط مستقیم کا معنی:-----
- 93----- اہل سنت کی پہچان؛ راہِ اعتدال:-----
- 94----- انعام یافتہ لوگوں کا طبقہ:-----
- 94----- بزرگوں والا راستہ:-----
- 95----- انعام یافتہ چار طبقات:-----
- 95----- ہم سنی چاروں کو مانتے ہیں:-----
- 96----- گمراہ اور مغضوب طبقہ:-----
- 97----- ضد اور جہالت سے حفاظت:-----
- 97----- امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کا مسئلہ:-----
- 97----- سننا اور چپ رہنا دو حکم ہیں:-----
- 98----- جہری اور سری نماز:-----
- 98----- آمین آہستہ کہنے کا مسئلہ:-----
- 98----- آمین؛ دعا ہے یا اللہ کا نام ہے:-----
- 99----- آمین آہستہ کہنے کا استدلال:-----

## 101 ----- سورة البقرة

- 101 ----- تمہید:
- 102 ----- عقائد و نظریات ..... اہم پہلو:
- 102 ----- سورة البقرہ کی بنیادی معلومات:
- 102 ----- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سورة البقرہ:
- 103 ----- ختم قرآن پر چندہ کی رسم:
- 103 ----- ختم قرآن کی خوشی:
- 103 ----- درس قرآن کے لیے محنت:
- 104 ----- درس قرآن کا انداز:
- 104 ----- دکھ برداشت کرنے پر نصرت خداوندی:
- 105 ----- مخالفین کے پروپیگنڈے:
- 106 ----- عقائد کی محنت جاری رہے گی:
- 106 ----- سورة البقرہ نام رکھنے کی وجہ؟:
- 106 ----- سورة الفاتحہ کے مضامین سے ربط:
- 107 ----- سورة البقرہ کے فضائل:
- 107 ----- پہلی فضیلت:
- 108 ----- تصویر اور ٹی وی کی نحوست:
- 108 ----- گناہوں سے پرہیز:
- 109 ----- گھریلو نظام زندگی اور تعدد ازواج:
- 109 ----- ہندوانہ مزاج اور دوسری شادی:
- 109 ----- نکاح عبادت ہے، عیاشی نہیں:

- 110----- رسوم و رواج کا خاتمہ... علماء کے عمل سے:۔
- 110----- بے دین لوگوں کی ناراضگی:۔
- 110----- دل جیتنے کے گر:۔
- 111----- جنات اور آسیب سے حفاظت:۔
- 111----- سورة البقرہ کی دس منتخب آیات:۔
- 112----- سورة البقرہ کے اہم واقعات:۔
- 112----- بنی اسرائیل کے ایک مقتول کا واقعہ:۔
- 112----- بے تکے سوالات اور خدائی مزاج:۔
- 113----- گائے کی تلاش اور قاتل کی پہچان:۔
- 113----- ماں کی خدمت کا صلہ:۔
- 114----- برکات کیسے حاصل ہو سکتی ہیں؟:۔
- 114----- اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے:۔
- 115----- بادشاہ طالوت کی نشانی:۔
- 116----- وسیلہ کا ثبوت اور جائز ہونا:۔
- 117----- برکت والا صندوق:۔
- 117----- جالوت سے مقابلہ اور خدائی امتحان:۔
- 118----- مان کر چلنے والے غالب رہتے ہیں:۔
- 118----- داؤد علیہ السلام کی جہاد میں شمولیت:۔
- 119----- جالوت کی شکست:۔
- 119----- مناظرے کا ثبوت:۔
- 120----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مناظرانہ گرفت:۔

- 120 ----- مخاطب کی عقل کے مطابق گفتگو:
- 121 ----- مناظرے میں بیدار مغزی:
- 122 ----- یا اللہ... یا محمد:
- 122 ----- مناظر سمجھ دار ہونا چاہیے:
- 123 ----- نمرود کی شکست اور حق کی فتح:
- 123 ----- غیر اللہ کے نام کی منت:
- 124 ----- پیراں دتہ یا اللہ دتہ؟
- 124 ----- موت کے بعد زندہ ہونا:
- 125 ----- قبر کا مفہوم کیا ہے؟
- 126 ----- توحیدی کون ہو سکتا ہے؟
- 126 ----- اللہ کیسے زندہ کریں گے؟
- 126 ----- 100 سال کی موت اور پھر زندگی:
- 127 ----- 100 سال بعد کھانے پینے کی اشیاء:
- 127 ----- مردوں کو بھی اللہ زندہ کریں گے:
- 127 ----- قوم نے عزیر علیہ السلام کی پہچان کیسے کی؟
- 128 ----- وفات کے بعد زندگی اور سننا:
- 129 ----- عدم علم کا عقلی جواب:
- 129 ----- ایک وہ جہاں ایک یہ جہاں:
- 130 ----- خلاصہ واقعات:
- 130 ----- اللہ کا قادر ہونا اور بندے کا عاجز ہونا:
- 131 ----- دفاع صحابہ پر دلیل:

- 131 ----- صحابہ امانت دار تھے:
- 132 ----- جمع قرآن اور کاتبین وحی صحابہ:
- 132 ----- کلام، کتاب اور قرآن:
- 133 ----- عقیدہ ختم نبوت پر اکابر دیوبند کی خدمات:
- 133 ----- قرآن کریم ایک معجزہ ہے:
- 134 ----- موسیٰ علیہ السلام کا پہلا معجزہ:
- 134 ----- موسیٰ علیہ السلام کا دوسرا معجزہ:
- 134 ----- عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ:
- 135 ----- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ علمی:
- 136 ----- دیگر انبیاء کے معجزے اور ہمارے نبی کا معجزہ:
- 136 ----- آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو علمی معجزہ کیوں دیا گیا؟
- 137 ----- صاحب علم کی اجرت زیادہ ہوتی ہے:
- 137 ----- دیگر انبیاء کا عمل:
- 138 ----- نبوت کا اصل کمال علم میں ہوتا ہے:
- 138 ----- امتی کا عمل کیفیت میں نبی سے نہیں بڑھ سکتا:
- 139 ----- مسئلہ تین طلاق:
- 139 ----- تین طلاقیں کو ایک کہنا کس کا مذہب ہے؟
- 139 ----- تین طلاق مناظرے کی دلچسپ روداد:
- 140 ----- زنا کو نکاح کا نام دینے کی جسارت:
- 140 ----- سوشل بائیکاٹ کرنا چاہیے:
- 141 ----- مسئلہ حیاتِ انبیاء علیہم السلام:

- 141 ----- نبوت کا مقام شہادت کے رتبے سے اعلیٰ ہے:
- 141 ----- حکیم الامت مولانا تھانوی کا مسلک:
- 142 ----- دعائے جنازہ کے الفاظ سے دھوکے کی کوشش:
- 142 ----- دھوکے کا لازمی جواب:
- 143 ----- دعائے جنازہ کے الفاظ کی حکمت:
- 143 ----- علمائے حق اور ملحدین کی سازشیں:
- 144 ----- اپنے عقائد کا پرچار کرتے رہیں:
- 144 ----- سورة البقرہ میں اختتامی بیان:
- 144 ----- غیر اختیاری وساوس کا کیا کریں؟:
- 145 ----- نبی کا غلام اور عقل کا پجاری:
- 145 ----- صدیق کا بیٹا اور ابو جہل کا بیٹا:

## 146 ----- سورة آل عمران

- 146 ----- تمہید:
- 147 ----- عقائد و نظریات کا تحفظ:
- 147 ----- انتخاب آیات کا پہلو:
- 147 ----- شان نزول اور شان ورود:
- 148 ----- سورة آل عمران کا شان نزول:
- 148 ----- اہل باطل سے گفتگو کا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟:
- 149 ----- نظریاتی اختلافات اور مہمان نوازی:
- 149 ----- نبوت کی تعلیم... مہمان کا اکرام:

- 150 ----- گفتگو کرنے میں مراتب کی پاسداری:
- 150 ----- قوت دلیل سے گفتگو سنت ہے:
- 151 ----- خطابت کا مذاق نہ اڑایا جائے:
- 151 ----- الوہیت عیسیٰ پر عقلی جواب:
- 151 ----- عیسائیوں کا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نظریہ:
- 152 ----- جواب دیئے کا انداز:
- 152 ----- الوہیت عیسیٰ کی تردید پر نقلی دلیل:
- 152 ----- مباہلے کی نوبت:
- 153 ----- مباہلہ اور اس کا طریقہ:
- 153 ----- عیسائیوں کی سمجھداری؛ مباہلہ سے انکار:
- 154 ----- ”عمران“ سے کون سا شخص مراد ہے؟:
- 154 ----- اولاد کو وقف کرنا:
- 154 ----- حضرت مریم علیہا السلام کی منت:
- 155 ----- حضرت مریم کی پریشانی پر خدائی دلاسا:
- 155 ----- حضرت مریم کی پرورش اور کفالت:
- 156 ----- اختلاف کا آسان حل قرعہ اندازی:
- 156 ----- قرعہ اندازی کا طریقہ:
- 157 ----- بچیوں کے مدارس کا ثبوت:
- 157 ----- کرامت کا ظہور:
- 157 ----- انبیاء کرام بھی اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں:
- 158 ----- دعا کی قبولیت اور بچے کا نام:



- 158 ----- فرطِ بشارت میں تعجب خیز سوال:
- 159 ----- انسانی مزاج مزید اطمینان:
- 159 ----- مناظرے میں پشتوزبان کی شرط:
- 159 ----- مذکورہ شرط توڑنے کا اصولی قاعدہ:
- 160 ----- ازالہ فکر اور بیٹے کی نشانی:
- 160 ----- عورت کو خدا نبی نہیں بناتا:
- 160 ----- فرشتہ اور جن بھی نبی نہیں ہو سکتا:
- 161 ----- عورت کی عقل اور دین ناقص کیسے ہوتا ہے؟
- 161 ----- عورت ہے تو ناقص العقل لیکن.....؟:
- 162 ----- امت کا خطرناک فتنہ..... عورت:
- 162 ----- عورت کا مساجد اور عید گاہ میں آنے کا مسئلہ:
- 162 ----- عورت کا مسجد میں اعتکاف کرنا:
- 162 ----- عورت کی بہترین عبادت گاہ:
- 163 ----- اور یہ آج کا دور..... اُف اللہ:
- 163 ----- دین کے نام پر بڑے فتنوں کا مقابلہ:
- 164 ----- حضرت حذیفہ بن یمان کی خصوصیت:
- 164 ----- فضائل اعمال کا ایک واقعہ:
- 165 ----- قیامت کو اعلان ہوگا:
- 165 ----- فسادِ عقیدہ کا جرم اور سزا:
- 166 ----- حکیم الامت تھانوی کا حکیمانہ جواب:
- 166 ----- کرامت دیکھ کر خدا سے مانگنا:

- 166 ----- کرامت کے انکار کا شرعی حکم:
- 167 ----- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش:
- 167 ----- حضرت عیسیٰ کی سب سے پہلی بات:
- 168 ----- عیسیٰ علیہ السلام کا دفاع قرآن کی زبان سے:
- 168 ----- آیات محکمات اور متشابہات کا مسئلہ:
- 169 ----- متشابہات میں بحث نہیں کرنی چاہیے:
- 170 ----- ہمارا مذہب تعارف:
- 170 ----- اہل السنۃ والجماعۃ کا معنی؟:
- 170 ----- لفظ اور معنی دونوں صحابی سے:
- 171 ----- نماز جنازہ کے بعد دعا کا مسئلہ:
- 172 ----- ڈاڑھی کا مسئلہ:
- 173 ----- فتنوں سے بچنے:
- 173 ----- حذیفی مزاج کیا ہے؟
- 174 ----- دور حاضر میں قرعہ اندازی کا مسئلہ:
- 175 ----- قرعہ اندازی میں رسول اللہ کا عمل:
- 175 ----- عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ اٹھالیا تھا:
- 176 ----- غامدی فتنے کے خدوخال:
- 177 ----- وفاتِ عیسیٰ علیہ السلام کا غامدی نظریہ:
- 178 ----- غامدی کے نظریے کی تردید:
- 178 ----- تسلی آمیز کلمات کا استعمال:
- 178 ----- پس منظر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا:

- 179 ----- عیسیٰ علیہ السلام سے متعلقہ چند عقائد:
- 179 ----- مسیح موعود کی چار علامتیں:
- 180 ----- پانچویں علامت بھی بیان کی جائے!:
- 180 ----- مگر وہ نہ سمجھیں میری بزم کے قابل نہ رہا:
- 181 ----- میں زمانے پہ چھا گیا:
- 181 ----- غلامی رسول کامیابی کا ذریعہ ہے:
- 182 ----- کفار سے تعلقات کی اقسام:
- 182 ----- موالات کا حکم:
- 183 ----- مواسات کا حکم:
- 183 ----- مدارات کا حکم:
- 183 ----- معاملات کا حکم:
- 184 ----- راہ خدا میں اپنی پسندیدہ چیز خرچ کرو!:
- 184 ----- صحابہ کا عمل بالقرآن کیسا تھا؟:
- 185 ----- صدقہ اور غریب رشتہ داروں سے صلہ رحمی:
- 185 ----- منکرین حیات النبی کی شرعی حیثیت:
- 186 ----- شہید زندہ ہوتا ہے:
- 186 ----- باجماعت نماز کی ادائیگی میں امام کا اجر بھی شامل ہے:
- 187 ----- اختیارات اور نسبت کا معاملہ:
- 188 ----- اللہ کے پاس ہونے کا استعمال عرف عام میں:
- 189 ----- اللہ تعالیٰ کے گھر کا کیا مطلب؟
- 190 ----- تین طلاق پر پشاور کا سچا واقعہ:

- 191 ----- امت کے پہلے چیف جسٹس کا فیصلہ:
- 191 ----- تین طلاق تو کجا ایک بھی نہیں ہوئی:
- 192 ----- مثالوں کا خلاصہ:
- 192 ----- نبی کی محنت اور کامیابی کا مدار:
- 193 ----- ہم جنت کیوں مانگتے ہیں؟:
- 194 ----- رہیں سلامت ان کی نسبتیں:

## 195 ----- سورة النساء

- 195 ----- اسلام اور خواتین کے حقوق:
- 196 ----- اسلام سے پہلے عورت کی حیثیت:
- 196 ----- رسول اللہ کی تین پسندیدہ چیزیں:
- 197 ----- خطبہ نکاح میں کیا پیغام ملتا ہے؟:
- 198 ----- آیت کا خلاصہ:
- 199 ----- اگر بیوی بد مزاج بھی ہو تو.....؟
- 200 ----- یتیم بچیوں سے نکاح کا مسئلہ:
- 200 ----- ایک سے زائد چار تک شادیوں کی اجازت:
- 201 ----- انصاف کی حدود:
- 201 ----- ملاپ اور قلبی میلان پر عدل نہیں:
- 202 ----- امی عائشہ سے رسول اللہ کی محبت:
- 203 ----- بیویوں کے درمیان عدل نہ کرنے پر سخت وعید:
- 204 ----- فقر و فاقہ کا علاج..... شادی:

- 204 ----- تربوز تو لا جا سکتا ہے مٹھاس نہیں:
- 205 ----- وراثت کے احکام:
- 206 ----- تقسیم وراثت اور وصیت کا واجب ہونا:
- 206 ----- بچیوں کی وراثت اور جہیز:
- 206 ----- حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جہیز یا.....؟:
- 207 ----- انبیاء کی وراثت کا مسئلہ:
- 207 ----- باغ فدک کا قضیہ:
- 208 ----- نبی کی مالی وراثت کیوں نہیں چلتی؟:
- 209 ----- نبی کی روح مبارک قلب اطہر میں سمٹ آتی ہے:
- 209 ----- حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی لا جواب دلیل:
- 209 ----- دو جلیل القدر اماموں کا دلچسپ مکالمہ:
- 211 ----- توبہ کی قبولیت کا وقت:
- 211 ----- ایمان کیا ہے؟
- 211 ----- عقیدہ حیات النبی عقلی مسئلہ نہیں:
- 212 ----- قبولیت توبہ کی شرائط:
- 212 ----- لا حول پر لا حول بھی لا حول پڑھتا ہو گا:
- 212 ----- بد نظری سے خود کو بچائیں:
- 213 ----- توبہ کی بنیادی تین شرائط:
- 213 ----- اہل دنیا کا قانون:
- 213 ----- احکم الحاکمین کا قانون:
- 214 ----- بیوی کو دیے ہوئے مال کا دوبارہ مطالبہ نہ کرو:

- 215 ----- شادی کی رسومات اور مہر فاطمی:
- 215 ----- مولوی طبقے سے ناروا سلوک:
- 216 ----- مسنون حق مہر کتنا ہے؟:
- 216 ----- بیوی کی سہیلیوں کا بھی خیال کرو:
- 217 ----- گھریلو نظام زندگی کو پرسکون بنائیں:
- 217 ----- حضرت عمر کے سامنے خاتون کی حق گوئی:
- 218 ----- خلفائے راشدین کا عمل حجت ہے:
- 218 ----- مال غنیمت اور ایک لمبا کرتا:
- 219 ----- عورت پر مرد کی فوقیت:
- 219 ----- وہبی اور کسبی صلاحیت:
- 219 ----- مرد کی فوقیت کی پہلی وجہ:
- 220 ----- مرد کی فوقیت کی دوسری وجہ:
- 220 ----- بعض خواتین مردوں سے افضل ہیں:
- 220 ----- خواتین کی سمجھداری کے چند واقعات:
- 221 ----- حضرت ام سلمہ کی دانائی:
- 222 ----- ابو حمزہ! تیرا قصور ہے یا میرا؟
- 223 ----- درِ اہلق کسے کم دیدہ موجود:
- 224 ----- اگر بیوی بات نہ مانے تو کیا کریں؟
- 225 ----- معاشرے میں خواتین کو عزت نہیں دی جاتی:
- 226 ----- مارنے کی حدود کیا ہیں؟
- 227 ----- ایک بچی کا المناک واقعہ:

- 227 ----- شرعی احکام میں تحریف یہودانہ روش ہے:
- 228 ----- کفار اور فاسق لوگوں کی مشابہت سے بچیں:
- 228 ----- محرم کے دنوں میں کالا کپڑا:
- 228 ----- اشتباہ سے بچنے کا حل قرآن کریم سے:
- 229 ----- عقیدہ حیات کے منکر پر شرعی حکم:
- 229 ----- منکرین حیات کی دھوکہ بازی:
- 230 ----- منکرین حیات سے آسان سا سوال:
- 230 ----- علیین کے نام پر دھوکہ:
- 230 ----- علیین والی حیات اعلیٰ کیسے ہے؟
- 231 ----- رحمت باری تعالیٰ سے مایوس نہیں ہونا چاہیے:
- 231 ----- حضرت وحشی کے قبول اسلام کا واقعہ:
- 231 ----- قبول اسلام کی پہلی دعوت:
- 232 ----- قبول اسلام کی دوسری دعوت:
- 232 ----- قبول اسلام کی تیسری دعوت:
- 233 ----- قبول اسلام کی چوتھی دعوت:
- 233 ----- مدعی نبوت مسلمانہ کذاب کا قتل:
- 234 ----- بیت اللہ کی تولیت:
- 234 ----- حضور علیہ السلام کے اخلاق حسنہ کا اثر:
- 235 ----- فقہاء کی بات ماننا بھی ضروری ہے:
- 236 ----- انقلاب کے دلفریب نعرے:
- 237 ----- حدیث اور فقہ کہاں چلی گئیں؟

- 237 ----- استشفاع کا عقیدہ:
- 237 ----- استشفاع کا حکم آج بھی باقی ہے:
- 238 ----- استشفاع کا پہلا واقعہ:
- 238 ----- استشفاع کا دوسرا واقعہ:
- 239 ----- عقیدہ حیات النبی کو شرک کہنے والوں سے ایک سوال:
- 240 ----- جو نبوت کا فیصلہ نہ مانے.....؟:
- 242 ----- صراطِ مستقیم کی چار علامات:
- 243 ----- اجماعِ حجت شرعیہ ہے:
- 243 ----- اجماع اور اس کے حجت ہونے کی دلیل:
- 243 ----- اجماع کے منکر کی دو سزائیں:
- 244 ----- اجماع کا سب سے پہلا منکر:
- 244 ----- منکر اجماع کی ”دلیل“:
- 245 ----- منکر اجماع سے کیا کہنا چاہیے؟:
- 245 ----- اختیاری اور اضطراری علیحدگی:
- 246 ----- عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی ناکام یہودی سازش:
- 247 ----- طیطلانس کون تھا؟:
- 247 ----- قرب قیامت اور نزول عیسیٰ علیہ السلام:
- 248 ----- عیسائی پادری اور مسلمان عالم کا مکالمہ:

## 249 ----- سورة المائدة

- 249 ----- حضرت مسیح علیہ السلام کی دعا:



- 250 ----- وجہ تسمیہ سورۃ:
- 250 ----- عوام الناس کا مزاج:
- 250 ----- دین برائے دنیا:
- 251 ----- اکابر کا مزاج:
- 251 ----- علم کی اہمیت پیدا کریں:
- 251 ----- لمحہ فکریہ!
- 252 ----- دین کی بدنامی کا سبب:
- 252 ----- امام بخاری رحمہ اللہ کی احتیاط:
- 253 ----- سورۃ کے مکی اور مدنی ہونے میں فرق:
- 253 ----- سورۃ المائدہ مدنی کیسے ہو سکتی ہے؟
- 254 ----- ایک مسئلہ..... متعدد آیات:
- 254 ----- شراب اور جوئے کی حرمت:
- 254 ----- جوئے کے تیر:
- 255 ----- شراب نقصان دہ چیز ہے:
- 255 ----- شراب نشہ آور چیز ہے:
- 256 ----- شراب قطعی حرام ہے:
- 256 ----- مسئلہ قرآن وحدیث میں موجود ہو..... پھر بھی:
- 256 ----- ترک رفع الیدین..... اختلاف روایات:
- 257 ----- صحت سند؛ صحت عمل کی دلیل نہیں:
- 257 ----- کیا ”ران“ ستر میں شامل ہے؟:
- 258 ----- فقہاء، مگر اہی سے بچاتے ہیں:

- 258 ----- امام بخاری کا فیصلہ:
- 258 ----- بخاری کی پوری بات مانیں:
- 259 ----- دھوکہ بازوں سے بچنے کا گر:
- 259 ----- ورنہ فتنہ پھیل جائے گا:
- 260 ----- اِکمالِ دین اور اِتمامِ نعمت کا فلسفہ:
- 260 ----- آیت مبارکہ کا خلاصہ:
- 260 ----- اِکمال اور اِتمام میں فرق:
- 261 ----- دین کامل ہے توفیق کہاں سے آئی؟
- 261 ----- مشکل و سوسے کا آسان جواب:
- 262 ----- جنت اور ناپینا افراد:
- 264 ----- الیوم سے مراد کون سا دن ہے؟
- 264 ----- دین کے کامل ہونے سے کیا مراد ہے؟
- 264 ----- ایک علمی نکتہ:
- 265 ----- دین نبوی اور دین صحابہ:
- 266 ----- آیت وضو اور وضو کے فرائض:
- 266 ----- نمازِ جنازہ کی نیت:
- 267 ----- نیت کہنا اور نیت کرنا:
- 267 ----- مرکزِ اہل السنۃ والجماعۃ نعمتِ خداوندی ہے:
- 268 ----- تبلیغی جماعت میں ضرور وقت لگائیں:
- 268 ----- مسئلہ نور و بشر:
- 269 ----- ذاتِ نبوت اور وصفِ نبوت:

- 269 ----- وصف نبوت کے نور ہونے کی دلیل:
- 269 ----- قائد جمعیت کا ”لاجواب“ جواب:
- 270 ----- قوم موسیٰ کی بے وفائی:
- 271 ----- بزدل قوم پر عذاب خداوندی:
- 271 ----- وجود نبوت کی برکات:
- 272 ----- اصحاب محمد رضی اللہ عنہم کی وفاداری:
- 273 ----- انصار مدینہ بھی جاٹاڑ تھے:
- 273 ----- غزوہ بدر... تاریخ اسلام کی پہلی جنگ:
- 273 ----- قوم موسیٰ نافرمان تھی کافر نہیں:
- 274 ----- نسل انسانی کی ابتدا:
- 274 ----- نکاح کا طریقہ:
- 274 ----- ہابیل و قابیل کا واقعہ:
- 275 ----- حضرت آدم علیہ السلام کی تدبیر:
- 276 ----- تاریخ آدمیت کا پہلا قتل:
- 276 ----- بعد از قتل تدفین کا مسئلہ:
- 276 ----- خیر و شر کی ابتدا اور اجر:
- 277 ----- قبر کسے کہتے ہیں؟
- 277 ----- مسائل زمینی قبر کے:
- 278 ----- وسیلہ دے کر دعا کرنا:
- 278 ----- حضرت عمر نے حضرت عباس کا وسیلہ دیا:
- 278 ----- نبی کریم کا وسیلہ دے کر دعا:

- 279 ----- دین کا کام کرنے والوں کے لیے قرآنی ہدایات:
- 280 ----- غیروں کی رکاوٹ اور اپنوں کے طعنے:
- 281 ----- صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا واقعہ:
- 281 ----- اہل حق کے خلاف منفی پروپیگنڈا:
- 282 ----- قسم کی اقسام اور احکام:
- 282 ----- یمین غموس:
- 283 ----- یمین لغو:
- 283 ----- یمین منعقدہ:
- 283 ----- یمین غموس کا حکم:
- 283 ----- یمین لغو کا حکم:
- 284 ----- یمین منعقدہ کا حکم:
- 284 ----- بلاوجہ مسائل پوچھنے کی ممانعت:
- 285 ----- لچر اور فضول میسجز:
- 285 ----- مسائل پوچھیں، پہیلیاں نہیں:
- 286 ----- منکرین فقہ کی خیانت:
- 286 ----- آیت کا موقع محل اور صحیح مطلب:
- 287 ----- ادھوری بات ادھور نتیجہ:
- 288 ----- امام ابو حنیفہ کی عبادت گزاری:
- 288 ----- امام ابو حنیفہ کا تقویٰ:
- 289 ----- امام ابو حنیفہ کی احتیاط:
- 289 ----- قیامت کا ہولناک منظر:

- 290 ----- وفات عیسیٰ اور مرزائی دجل:
- 291 ----- دونوں نبیوں کے جملوں میں بنیادی فرق:
- 291 ----- مقام عدل اور رحمت:
- 292 ----- جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں.....:
- 292 ----- مزاج صدیقی و فاروقی:
- 293 ----- جنت کے مستحق تو نہیں لیکن.....:
- 294 ----- دعا:

## 295 ----- سورة الانعام

- 295 ----- سورة کا مختصر تعارف:
- 295 ----- پیدا کرنا اور بنانا:
- 296 ----- خلق اور جعل میں فرق:
- 296 ----- فرق کی وضاحت مثال سے:
- 296 ----- سوال: سموات جمع اور ارض واحد؟:
- 297 ----- جواب:
- 297 ----- اثر ابن عباس اور سات زمینی:
- 298 ----- بعض لوگوں کا حدیث پر اعتراض:
- 299 ----- مسلسل محنت رنگ لاتی ہے:
- 299 ----- حضرت نانو توئی کا رسالہ تحذیر الناس:
- 300 ----- خاتم النبیین کون سے محمد ہیں؟:
- 300 ----- ظلمات جمع ہے اور نور واحد..... کیوں؟:

- 301 ----- ہر علاقے کی بدعت جدا ہوتی ہے:
- 301 ----- جہنم خواہشات کے پردوں میں لپٹی ہوئی ہے:
- 302 ----- خواہشات کی قربانی کا نتیجہ جنت ہے:
- 302 ----- رسول کسے کہتے ہیں؟:
- 302 ----- سید البشر مخدوم ہیں:
- 303 ----- انسان کی تخلیق مٹی سے:
- 303 ----- موت کا مقرر وقت اللہ کے علم میں:
- 303 ----- عالم اجمالی اور عالم تفصیلی:
- 304 ----- حضرت انسان..... عالم اجمالی:
- 304 ----- قیامت بڑے جہان کی موت کا نام ہے:
- 305 ----- حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے تڑپ
- 305 ----- فرمائی معجزے طلب کرنا:
- 306 ----- اللہ کی مشیت:
- 306 ----- جو دلیل نہیں مانتے:
- 307 ----- ابلیس کا تکبر اور حسد:
- 307 ----- اگر سوال کرنے والا ضدی ہو تو.....:
- 308 ----- گناہ اور مجلس گناہ دونوں سے بچیں:
- 308 ----- عدی بن زید کا قیمتی شعر:
- 309 ----- مال نیک آدمی پر خرچ کریں:
- 309 ----- مجلس نیک آدمی کی اختیار کریں:
- 309 ----- فضائل اعمال لا جواب کتاب ہے:

- 310 ----- عام آدمی اور قوم کا مقتدا:
- 310 ----- خود کشی کرنے والے کی نماز جنازہ:
- 311 ----- فتویٰ اور تقویٰ:
- 311 ----- عالم دین جہالت کا عذر ناقابل قبول:
- 311 ----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حق پر ثابت قدمی:
- 312 ----- تحمل اور برداشت کا فقدان:
- 312 ----- مشکل اوقات میں استقامت کا مظاہرہ کریں:
- 312 ----- مشکلات اہل حق اور اہل باطل دونوں کو پیش آتی ہیں:
- 313 ----- اللہ کے نام پر قربانی کا صلہ:
- 313 ----- حضرت ابراہیم کی اپنی قوم سے گفتگو:
- 313 ----- حضرت ابراہیم کے والد:
- 314 ----- مشرک باپ کا توحیدی بیٹا:
- 314 ----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت توحید:
- 314 ----- ستارہ پرستی کی تردید:
- 315 ----- حضرت تھانوی کی حکیمانہ تشریح:
- 315 ----- چاند پرستی کی تردید:
- 315 ----- سورج پرستی کی تردید:
- 316 ----- قبر کے تین سوال:
- 317 ----- نبی کو حاضر و ناظر ثابت کرنے کی مبتدعانہ کوشش:
- 317 ----- اہل بدعت کی دلیل کا جواب:
- 317 ----- قرآن کریم اور عربی گرائمر:

- 318 ----- ضابطہ در ضابطہ:
- 318 ----- ایمان اور ظلم کی آمیزش:
- 319 ----- ظلم سے کیا مراد ہے؟:
- 319 ----- قرآن سمجھنے کا اصول:
- 320 ----- کیا اللہ کو دیکھا جاسکتا ہے؟
- 320 ----- کیا رویت باری تعالیٰ کا عقیدہ حدیث کے خلاف ہے؟:
- 320 ----- اہل سنت والجماعت کا نظریہ:
- 321 ----- حدیث مبارک پر اعتراض کا جواب:
- 321 ----- حضور علیہ السلام نے اللہ کی زیارت کہاں کی؟
- 322 ----- دعوت دین کا نبوی طرز:
- 322 ----- اپنے ماں باپ کو گالی:
- 323 ----- اللہ کو نہ ماننا اور اللہ کی نہ ماننا:
- 323 ----- تبلیغی جماعت کی محنت کا دائرہ:
- 324 ----- اللہ غفور بھی ہیں اور رحیم بھی:
- 324 ----- حضرت تھانوی کا خوبصورت فرمان:

## 325 ----- سورة الاعراف

- 325 ----- تمہید:
- 326 ----- اعراف کسے کہتے ہیں؟:
- 326 ----- وجہ تسمیہ سورة:
- 327 ----- اعراف والے آخر کار جنت میں:



- 328 ----- کریم ذات کسے کہتے ہیں؟
- 328 ----- مقطعات کسے کہتے ہیں؟
- 329 ----- حروف مقطعات؛ تشابہات میں سے ہیں:
- 329 ----- اہل علم کے امتحان کے لیے:
- 330 ----- گمراہی سے بچنے کے لیے:
- 330 ----- کون کیسے گمراہ ہوتا ہے؟
- 331 ----- اہل علم کی آزمائش:
- 331 ----- عاجزی کا اعتراف:
- 331 ----- تسلی برائے حبیبِ کبریا ﷺ:
- 332 ----- نبی کا منصب حکم خدا پہنچانا ہے، منوانا نہیں:
- 332 ----- دین کے داعی دل چھوٹانہ کریں:
- 332 ----- ابلیس کی نخوت:
- 333 ----- سجدہ کا حکم ابلیس کو بھی تھا:
- 333 ----- ابلیس؛ سجدے کا انکاری:
- 333 ----- شیطانی دلائل:
- 334 ----- ابلیس کی بنیادی غلطی:
- 334 ----- ابلیس کی دلیل کا علمی رد:
- 335 ----- مٹی کی خصوصیات اور مزاج:
- 335 ----- ہر سوال کا جواب نہ دینا بھی خدائی اصول ہے:
- 336 ----- جب شیطان نے دعا مانگی:
- 336 ----- شیطان کی شیطانی:

- 337 ----- وقت معلوم کا معنی:
- 337 ----- خدا کو دھوکہ دینے کی شیطانی کوشش ناکام:
- 338 ----- جمعہ کی پہلی اذان اور کاروبار:
- 338 ----- جمعہ کے دن کی چھٹی:
- 339 ----- چھٹی برائے نماز جمعہ:
- 339 ----- اصحاب السبت کی ناجائز تاویلیں:
- 339 ----- ابلیس میں تین عین موجود تھے:
- 340 ----- چوتھا عین موجود نہیں تھا:
- 340 ----- عاشق دلیل کا مطالبہ نہیں کرتا:
- 340 ----- ابلیس کی جھوٹی قسم:
- 341 ----- احد کے میدان میں:
- 342 ----- ظاہری شکست کے اسباب:
- 342 ----- آدم علیہ السلام کو شیطان نے دھوکہ دیا:
- 343 ----- شیطانی دھوکہ..... انسانیت ننگی ہو رہی ہے:
- 343 ----- آدم علیہ السلام شیطانی دھوکے کا شکار کیوں ہوئے؟:
- 344 ----- جھوٹی قسم شیطانی خصلت اور منافق کی عادت:
- 344 ----- جنت سے زمین کی طرف کا سفر:
- 344 ----- میدان عرفات کا نام عرفات کیوں؟:
- 345 ----- آدم و حوا علیہما السلام کی دعا:
- 345 ----- منکرین وسیلہ کا استدلال:
- 345 ----- منکرین وسیلہ کو مدلل جواب:

- 346 ----- ہم قرآن وحدیث دونوں کو مانتے ہیں:
- 346 ----- درس قرآن کی آڑ میں احادیث کا انکار:
- 347 ----- نماز کا ادب:
- 347 ----- ہمارے مزاج اور فقہی مسئلہ:
- 348 ----- اچھا لباس کب پہنیں؟:
- 348 ----- قرآنی حکم:
- 348 ----- لباس کی دو بنیادی خوبیاں:
- 349 ----- مسجد کے آداب:
- 349 ----- قرآن سے ماخوذ ایک فقہی اصول:
- 349 ----- تقویٰ کا ہیضہ:
- 350 ----- شریعت کا مزاج ..... عہد فاروقی کا ایک واقعہ:
- 350 ----- بھوکا کیوں مانگتا ہے؟:
- 351 ----- اعتدال کا کیا مطلب؟:
- 351 ----- اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر موجود ہیں:
- 352 ----- جب اللہ عرش پر مستوی ہیں تو.....؟:
- 352 ----- جواب:
- 352 ----- اللہ کے ہر جگہ ہونے پر قرآنی دلائل:
- 353 ----- اللہ شہ رگ سے زیادہ قریب کیسے ہیں؟:
- 354 ----- مستوی ہونے کا مطلب:
- 355 ----- ظاہری ملکیت اور حقیقی ملکیت:
- 355 ----- فرعون کی تدبیریں ناکام ہو گئیں:

- 356 ----- جب جادو گر ایمان لے آئے:
- 356 ----- بسا اوقات وضاحتی بیان دینا ضروری ہوتا ہے:
- 357 ----- معراج جسمانی تھا محض روحانی نہیں:
- 357 ----- حیات النبی کا شفاف عقیدہ:
- 357 ----- حیات جسمانی اور حیات برزخی:
- 358 ----- اہل السنۃ والجماعت کا عقیدہ:
- 358 ----- عملی زندگی میں عقیدہ حیات النبی کی اہمیت:
- 359 ----- عرض اعمال کا عقیدہ:
- 359 ----- حضرت مدنی کا عقیدہ:
- 360 ----- سماع باری تعالیٰ اور سماع النبی:
- 360 ----- درود پڑھنے کا لطف کب آئے گا؟:
- 360 ----- روضہ پر صلوٰۃ و سلام:
- 360 ----- خوش بختوں کو جواب بھی سنائی دیتا ہے:
- 361 ----- شریعت نہ ماننے والے جانوروں سے بدتر:
- 361 ----- مزاج انسانی میں دو صفتیں:
- 361 ----- حضرت یوسف اور زلیخا:
- 362 ----- عالم الغیب صرف اللہ:
- 362 ----- ماہذا البشر اکا جملہ:
- 362 ----- جملے کا صحیح مطلب:
- 363 ----- جملے کی وضاحت ایک مثال سے:
- 363 ----- ”معزز فرشتہ“ کا مطلب:

- 364 ----- نماز میں آمین آہستہ کہیں:
- 364 ----- شوافع کا اعتراف:
- 364 ----- آمین؛ دعا ہے یا اللہ کا نام ہے:
- 365 ----- امام رازی کی دیانت:
- 365 ----- دعا؛ آہستہ یا بلند آواز سے؟
- 366 ----- مثال سے مسئلہ کی وضاحت:

## 367 ----- سورة الانفال

- 367 ----- تمہید:
- 367 ----- انفال کسے کہتے ہیں؟:
- 368 ----- مالِ غنیمت کا حلال ہونا:
- 368 ----- سابقہ شرائع اور مالِ غنیمت:
- 369 ----- ہمارے نبی کا دائرہ نبوت غیر محدود ہے:
- 369 ----- مالِ غنیمت حلال نہ ہو تو...؟
- 370 ----- مال کی تین اقسام:
- 370 ----- مال کی تقسیم کا طریقہ کار:
- 371 ----- سورۃ میں ذکر کردہ زیادہ مضامین:
- 371 ----- ہم نے مالِ غنیمت استعمال کیا:
- 371 ----- مالِ غنیمت اللہ اور رسول کا ہے:
- 372 ----- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک:
- 372 ----- صحابی رسول کا اجتہاد:

- 373 ----- اجمالی اور تفصیلی احکام:
- 373 ----- غزوہ بدر کا خلاصہ:
- 374 ----- غزوہ بدر کیوں پیش آیا؟
- 374 ----- صحابہ سے مشاورت:
- 375 ----- ابھی جنگ کا ارادہ نہیں تھا:
- 375 ----- دیہات والے صحابہ کرام سے گفتگو:
- 375 ----- جب 313 کا قافلہ چل پڑا:
- 376 ----- ابوسفیان کا خدشہ:
- 376 ----- سابقہ ادوار کی ایمر جنسی علامات:
- 376 ----- حضرت عاتکہ رضی اللہ عنہا کا خواب:
- 377 ----- ابوسفیان کے قاصد کی آمد:
- 377 ----- حضرت سعد کی مطاف میں گفتگو:
- 378 ----- امیہ کے بارے آنحضرت کی پیشین گوئی:
- 378 ----- امیہ کا تذبذب:
- 379 ----- بیوی کی یاد دہانی:
- 379 ----- ابو جہل کا لشکر روانہ ہوا:
- 380 ----- ابو جہل لاؤ لشکر سمیت میدان میں:
- 380 ----- رسول اللہ کی صحابہ سے مشاورت:
- 380 ----- صحابہ کی خواہش:
- 381 ----- مہاجرین صحابہ کرام کی رائے:
- 381 ----- انصار صحابہ کرام کی رائے:

- 381----- گھمسان کارن:
- 382----- کفار کی چالاکی:
- 382----- سکون کی نیند:
- 382----- صحابہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حفاظتی منصوبہ:
- 383----- خلافت صدیقی کے اشارے:
- 383----- بلا فصل خلافت صدیقی اس وقت کے کافروں کو تسلیم تھی:
- 384----- وعدہ نصرت خداوندی کے باوجود نبی کیوں روئے؟
- 384----- جواب:
- 385----- فتح کی بشارت:
- 385----- اللہ کی مدد آن پہنچی:
- 385----- کفر اور اسلام کی معرکہ آرائی:
- 386----- اسلام کے علمبردار اور دشمن باہم صف آرا:
- 386----- کاش ابوطالب زندہ ہوتے!
- 387----- مشرکین کی قتل گاہوں کی نشاندہی:
- 387----- امت محمدیہ کا فرعون:
- 387----- دو ننھے صحابہ؛ ابو جہل کی تلاش میں:
- 388----- تواضع نے تکبر سے زمین پاک کر ڈالی:
- 388----- ابن مسعود کا مختصر تعارف:
- 389----- ابو جہل کی فرعونیت:
- 390----- قوم موسیٰ کا فرعون:
- 390----- فتح کے بعد پیغمبر کی عادت مبارکہ:

- 391 ----- قلیب بدر کیا ہے؟
- 391 ----- ابن خطاب رضی اللہ عنہ کا اشکال:
- 391 ----- مماتوں کا استدلال:
- 392 ----- پوری بات یہ ہے:
- 393 ----- فاروقی مزاج ”مان لینا“ ہے:
- 393 ----- مشرکین میدان بدر کے کنویں میں:
- 394 ----- سیدہ امی عائشہ سماع کی منکر نہیں:
- 394 ----- ان پڑھ خواتین بھی سمجھتی ہیں:
- 395 ----- ناقصات العقل سے بھی کم عقل ”مولوی“:
- 395 ----- تضادات کا مجموعہ:
- 396 ----- متضاد باتوں کا مجموعہ:
- 396 ----- واقعات برائے واقعات نہیں:
- 396 ----- مشرکین کو شیطانی تسلی:
- 397 ----- قبیلہ بنو بکر کے حملے کا خوف:
- 397 ----- شیطان؛ سراقہ بن مالک کے روپ میں:
- 398 ----- شیطان میدان جنگ سے فرار:
- 398 ----- دو جہانوں کا دھوکے باز:
- 398 ----- قبر پر اذان کا مسئلہ:
- 399 ----- خدائی عذاب سے بچو!
- 399 ----- قصہ بنی اسرائیل کے عبادت گزار کا:
- 399 ----- مجلس گناہ سے بھی بچیں!



- 400 ----- بنو قریظہ کے یہودی صلح پر مجبور:
- 401 ----- صحابی اور نبی میں فرق:
- 402 ----- دینی تقاضوں کو مقدم رکھو:
- 402 ----- مشرکین مکہ کے گھناؤنے جرائم:
- 403 ----- اجتماعی عذاب نہ دینے کی دو وجوہات:
- 403 ----- سابقہ امتوں پر عذاب:
- 404 ----- ہمارے نبی کی نبوت کا وسیع دائرہ:
- 405 ----- چونکہ ہمارے نبی زندہ ہیں اس لیے.....:
- 406 ----- پیغمبر کے مبارک وجود کی برکت:
- 406 ----- دشمنان اسلام سے مقابلے کی تیاری کرو:
- 407 ----- توکل کا صحیح مفہوم:
- 407 ----- پیر عزیز الرحمن ہزاروی کی نصیحت:
- 407 ----- عالم دین کی جان بہت قیمتی ہے:
- 408 ----- علمائے کرام کی عزت:
- 408 ----- جمعیت علماء اسلام کا بھرپور ساتھ دیں:
- 408 ----- کارگزاری سنانی چاہیے:

## 410 ----- سورة التوبة

- 410 ----- تمہید:
- 410 ----- وجہ تسمیہ سورت:
- 411 ----- شان نزول:

- 413 ----- قبائل کی چار قسمیں:
- 414 ----- ان چاروں قسموں کا حکم:
- 416 ----- میدانِ عرفات میں برأت کا اعلان:
- 417 ----- ”بسم اللہ“ ہر سورت کا جزء ہے یا نہیں؟
- 418 ----- سورۃ التوبۃ کے شروع میں بسم اللہ نہ ہونے کی حکمت:
- 418 ----- شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کا اصلی سبب:
- 421 ----- سورۃ التوبۃ پڑھتے وقت بسم اللہ پڑھنے کا مسئلہ:
- 421 ----- مخالفتِ نظریات سے نہ کہ ذاتیات سے:
- 422 ----- مانعین زکوٰۃ اور حضرت ابو بکر صدیق:
- 424 ----- لشکرِ اسامہ کی روانگی:
- 425 ----- صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا استدلال:
- 426 ----- ترکِ جہاد کی وجوہات:
- 427 ----- مجاہدین کے خلاف بات نہ کرو!
- 429 ----- والدین کی خدمت جہاد؟ ایک مکالمہ:
- 430 ----- غزوہ حنین کا واقعہ:
- 432 ----- شیبہ بن عثمان کا واقعہ:
- 433 ----- تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟
- 434 ----- حضور علیہ السلام کی ثابت قدمی:
- 436 ----- قیدیوں کی واپسی:
- 437 ----- مالِ غنیمت کی تقسیم کا ایک واقعہ:
- 438 ----- وفائے پیغمبر:

- 438 ----- مدینہ میں دوہری برکتیں دے دے! -----
- 439 ----- روضہ اطہر کے ذرات کی فضیلت: -----
- 439 ----- فضائل اعمال پر اعتراض کا جواب: -----
- 440 ----- کعبہ مرکزِ عبادت اور روضہ مرکزِ عقیدت: -----
- 441 ----- لوگ آیت ٹھیک پڑھتے ہیں لیکن معنی غلط کرتے ہیں: -----
- 442 ----- منکرِ تقلید سے گفتگو کا طریقہ: -----
- 443 ----- غازیؒ کا واقعہ: -----
- 445 ----- صحابیتِ صدیق اکبر: -----
- 446 ----- غزوہ تبوک: -----
- 450 ----- صاف گوئی کی اہمیت: -----
- 450 ----- حصولِ تقویٰ کا طریقہ: -----
- 451 ----- ان نعمتوں کی قدر کریں! -----
- 453 ----- کارگزاری بتانی چاہیے: -----
- 454 ----- امت کے لیے پیغمبر علیہ السلام کی شفقت: -----
- 455 ----- ایک عجیب دعا: -----

## 456 ----- سورۃ یونس -----

- 456 ----- وجہ تسمیہ: -----
- 457 ----- یونس علیہ السلام کا قصہ: -----
- 459 ----- یونس علیہ السلام کا بستی سے چلے جانا: -----
- 460 ----- مچھلی کے پیٹ میں: -----

- 462 ----- بھول جانا جرم نہیں ہے:
- 463 ----- توبہ کب قبول ہوتی ہے اور کب نہیں!
- 463 ----- مودودی صاحب اور حضرت یونس علیہ السلام:
- 465 ----- قوم یونس کی توبہ قبول، فرعون کی نہیں... وجہ فرق:
- 466 ----- فرعون کی لاش؛ نشانِ عبرت:
- 467 ----- فرعون باہر پڑا ہے تو عذابِ قبر کیسے؟
- 468 ----- حضرت عمر کا استدلال کہ عذابِ جسم کو ہوا ہے:
- 469 ----- علامہ انور شاہ کشمیری کا تذکرہ:
- 471 ----- عذابِ روح اور جسم دونوں کو... شاہ صاحب کا استدلال:
- 473 ----- حروفِ مقطعات کے نزول کی حکمت:
- 473 ----- نبی کے بشر ہونے کی وجہ:
- 474 ----- آسمان وزمین چھ دن میں بنانے میں تعلیمِ امت:
- 475 ----- قمری اور شمسی نظام:
- 477 ----- ”نبی رحمت ہے تو ہر جگہ ہے“ کا جواب:
- 478 ----- جنتیوں کے تین جملے:
- 478 ----- حواریانِ بہشت کا تذکرہ:
- 479 ----- خود کو خدا کے حوالے کرو!
- 479 ----- جنت کا بازار:
- 480 ----- جنتیوں کا سلام:
- 481 ----- عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم:
- 483 ----- ذکر کرنے اور بیمار کے دعا کرنے کی ترتیب:

- 484 ----- گنجائش نکالو! کا خدائی جواب:
- 486 ----- اولیاء کو دنیا اور آخرت میں بشارت:
- 486 ----- جادو سے بچنے کے لیے وظیفہ قرآنی:
- 487 ----- آمین آہستہ کہنے کی دلیل:
- 489 ----- پیغمبر علیہ السلام کو تسلی:

## سورۃ ہود ----- 490

- 490 ----- سورت کا تعارف:
- 491 ----- قرآن اللہ کا کلام ہے... دلیل:
- 491 ----- حضور علیہ السلام کے دو معجزات:
- 492 ----- علمی اور عملی معجزات:
- 493 ----- معجزہ دینے کے متعلق اللہ کی ترتیب:
- 494 ----- قرآن مجید کے تین چیلنج:
- 495 ----- حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ اور قوم کے دو طعنے:
- 496 ----- پہلا طعنہ... کہ نبی بشر کیوں ہے؟
- 496 ----- نبی بشر ہو تو امت کا درد سمجھ سکتا ہے!
- 497 ----- نابالغ اولاد فوت ہو تو اس کا اجر:
- 499 ----- دوسرا طعنہ... کہ نبی کے متبعین چھوٹے لوگ کیوں؟
- 500 ----- نوح علیہ السلام کا جواب:
- 501 ----- نبی کو غیب کا علم نہیں:
- 502 ----- حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کا انجام:

- 503 ----- حضرت نوح علیہ السلام کی درخواست اور اللہ کا جواب:
- 504 ----- نجات کا مدار ایمان و اعمال ہیں:
- 506 ----- حضرت ہود علیہ السلام کی تبلیغ:
- 507 ----- لوط علیہ السلام کی قوم کا گناہ:
- 508 ----- ایک علمی لطیفہ:
- 508 ----- اتباع محمود اور اتباع مذموم:
- 509 ----- سورت ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا:
- 510 ----- مستشرقین کے اعتراض کا جواب:
- 511 ----- بھائی میرے لیے عافیت ہی مانگو!
- 512 ----- امتی کے دل کو مضبوط کرتے ہیں امتی کے واقعات سے:

## سورة یوسف ----- 514

- 514 ----- سورت یوسف کا شان نزول:
- 515 ----- یہودِ مدینہ کا سوال:
- 516 ----- حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ:
- 517 ----- یوسف علیہ السلام کے خلاف بھائیوں کی تدبیر:
- 518 ----- یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال دیا:
- 519 ----- قافلے والوں کا یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکالنا:
- 521 ----- یوسف بازارِ مصر میں:
- 521 ----- تین غفلت مند اور دانا لوگ:
- 522 ----- امام محمد، امام ابو حنیفہ کی مجلس میں:

- 523----- امام محمد کاسات دنوں میں قرآن حفظ کرنا:
- 523----- چھوٹا محمد ایسا ہے تو بڑا محمد کیسا ہو گا؟
- 524----- بچوں کو پہلے دین پڑھائیں پھر دوسری چیزیں!
- 525----- حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے گھر میں:
- 526----- عزیز مصر کی بیوی کا تقاضا:
- 527----- رب کی برہان کیا تھی؟
- 528----- عزیز مصر کا سامنا:
- 528----- یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کی گواہی:
- 529----- عزیز مصر کا حضرت یوسف کو اعراض کا حکم:
- 530----- اس بات کی شہرت ہوئی تو....:
- 530----- زنانِ مصر کا یوسف علیہ السلام کو دیکھنا:
- 531----- زنانِ مصر کا جملہ اور عمل:
- 531----- صفتِ ملکیت اور صفتِ بہیمیت:
- 533----- میرے محمد کو دیکھتیں تو دل کاٹ ڈالتیں!
- 533----- یوسف علیہ السلام کا جیل جانا:
- 534----- عصمتِ انبیاء علیہم السلام:
- 535----- اللہ اپنے نبی کو بچاتا ہے... مثالیں:
- 537----- یوسف علیہ السلام جیل خانہ میں:
- 538----- یوسف علیہ السلام پر پھوپھی کے گھر میں چوری کا الزام:
- 538----- ساتھی قیدیوں کا خواب اور یوسف علیہ السلام کی تعبیر:
- 540----- بادشاہ مصر کا خواب:

- 540 ----- تعبیر بتانے میں متکلم اسلام کا طرزِ عمل:
- 541 ----- بادشاہ کا خواب اور حضرت یوسف کی تعبیر:
- 541 ----- بادشاہ کے خواب کی تعبیر کی وجہ:
- 543 ----- اگر میں یوسف کی جگہ ہوتا... کا مطلب:
- 544 ----- یوسف علیہ السلام کی براءت اور تواضع:
- 545 ----- نفس کی تین اقسام:
- 546 ----- حضرت نانوتوی کا ہندو پنڈت سے مناظرہ اور تواضع:
- 548 ----- یوسف علیہ السلام کی بادشاہ کے دربار میں آمد:
- 549 ----- یوسف علیہ السلام وزیرِ خزانہ کے منصب پر:
- 550 ----- عہدہ مانگنا کب جائز اور کب ناجائز؟
- 551 ----- قحط اور یوسف علیہ السلام کی تدبیر:
- 552 ----- برادرانِ یوسف دربارِ یوسف میں:
- 552 ----- یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کے پیسے کیوں واپس کیے؟
- 553 ----- بنیامین کو لے جانے کے لیے بھائیوں کا اصرار:
- 554 ----- یعقوب علیہ السلام کی تدبیر:
- 555 ----- نظر بد کا لگ جانا برحق ہے:
- 556 ----- تدبیر اور توحید ساتھ ساتھ:
- 557 ----- بنیامین کو روکنے کی تدبیر:
- 558 ----- اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی!
- 560 ----- ہم نے یوسف کو یہ تدبیر سکھائی:
- 561 ----- یعقوب علیہ السلام کی بیٹوں کو سرزنش:



- 562 ----- جاؤ یوسف کو تلاش کرو کہنے کی وجہ:
- 564 ----- دربار یوسف میں بھائیوں کی سہ باری آمد:
- 565 ----- ہاں! میں ہی یوسف ہوں:
- 566 ----- قمیض سے پینائی کا لوٹنا:
- 567 ----- حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کا مسیلمہ کذاب کو قتل کرنا:
- 569 ----- یہ قمیض کون سی تھی؟
- 571 ----- خوشخبری دینے والے کو ہدیہ دینا:
- 571 ----- یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر:
- 573 ----- یوسف علیہ السلام کے اخلاقِ کریمانہ:
- 574 ----- حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا:
- 574 ----- حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کی وفات:

## سورة الفاتحه

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ ۱ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۲ مَلِكِ يَوْمِ  
الدِّينِ ۳ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْزُ ۴ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۵  
صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۶ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ ۷ ﴿﴾  
میں نے رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو آپ کی خدمت میں یہ  
عرض کیا تھا کہ ان شاء اللہ ماہانہ درس قرآن کا ہمارا اس دفعہ جو شوال میں پہلا درس  
قرآن ہو گا، باقاعدہ قرآن کریم کی ترتیب پر ہو گا۔ اس لیے بالترتیب سورة الفاتحه،  
سورة البقرة، سورة آل عمران، سورة النساء انہی سورتوں کا درس قرآن ان شاء اللہ چلتا  
جائے گا۔ اس میں دو سال لگیں، تین سال لگیں اللہ رب العزت بہتر جانتے ہیں۔ جب  
تک مقدر ہوا کوشش کریں گے ترتیب کے ساتھ درس قرآن کریم چلتا رہے۔

## قوم کا مزاج اور علماء کی ذمہ داری:

ہمارے ہاں درس قرآن کریم سننے والے مختلف حضرات مختلف ذوق رکھتے  
ہیں، بعضوں کا ذوق ہوتا ہے کہ اختلافی مسائل پر گفتگو ہو تو بڑی رغبت سے سنتے ہیں۔  
بعضوں کا ذوق ہوتا ہے کہ فضائل والی گفتگو ہو تو بڑے ذوق سے سنتے ہیں اور بعضوں کا  
ذوق ہوتا ہے کہ خالص درس قرآن ہو تو پھر ان کو پسند آتا ہے۔ آدمی ہر کسی کے مزاج

کی رعایت کرے یہ آدمی کے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہوتا ہے اپنی ترتیب کے مطابق کام کرتے رہیں، جن کے مزاج کی موافقت ہوگی وہ چلیں گے جن کے مزاج کے موافق نہیں ہوگا ایک وقت آئے گا اللہ ان کو موافق فرمادے گا۔

### حدیث سے لگن:

مفتی اعظم پاکستان مفتی رشید احمد لدھیانوی نور اللہ مرقدہ کے بیان میں ہم شریک تھے حضرت فرمانے لگے: حدیث مبارک میں ہے اگر دودھ پیے تو دعا یوں پڑھے: "اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيهِ وَزِدْنَا مِنْهُ"<sup>1</sup>

حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے دودھ موافق نہیں تھا، معدہ دودھ کو قبول نہیں کرتا تھا، میں دودھ پیتا رہا اور دعا کرتا رہا۔ ایک وقت آیا اللہ نے میرے معدے کو دودھ کے موافق بنا دیا۔ میں دودھ بھی پیتا رہا اور دعا بھی نہیں چھوڑی۔

اس لیے میں کہتا ہوں کہ قوم کے مزاج کا خیال کرنا اور ان کی رعایت کرنا یہ بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ایک بندہ 100 آدمیوں کی رعایت کرے، مشکل ہے۔ 100 بندے ایک کی رعایت کریں تو بہت آسان ہے۔ سورۃ فاتحہ کے مضامین کے حوالے سے آج درس قرآن ہو گا اور بالترتیب ہو گا۔ ان شاء اللہ

### قرآن کریم کی ترتیب نزولی اور وضعی:

سورۃ فاتحہ یہ قرآن کریم کی پہلی سورۃ ہے لیکن یہ نزول کے اعتبار سے پہلی نہیں۔ قرآن کریم کی دو ترتیبیں ہیں: ایک ترتیب نزولی۔ دوسری ترتیب وضعی۔ سب سے پہلے کون سی آیت نازل ہوئی، پھر کون سی نازل ہوئی، پھر کون سی نازل ہوئی۔ یہ ترتیب نزولی ہے۔

قرآن کریم میں پہلے کون سی آیت ہے، پھر کون سی آیت ہے، پھر کون سی آیت ہے۔ یہ ترتیب وضعی ہے۔

قرآن کریم کی نزول آیات کی ترتیب الگ ہے اور ان آیات کو قرآن کریم میں رکھنے کی ترتیب الگ ہے۔ آپ تمام احباب کے علم میں ہو گا کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جو سب سے پہلے آیات نازل ہوئیں سورۃ الفاتحہ کی نہیں بلکہ سورۃ العلق کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ یہ پہلی آیت ہے اور یہ بھی سب کے علم میں ہے کہ ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ یہ قرآن کے شروع میں نہیں ہے بلکہ یہ قرآن کریم کے آخری پارے تیسویں پارے میں ہے اور جو سب سے پہلے آیت نازل ہوئی وہ آخری پارے میں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے اترنے کی ترتیب الگ ہے اور قرآن کریم میں ان آیات کو کہاں کہاں رکھنا ہے؟ یعنی ترتیب وضعی بالکل الگ ہے۔

### ترتیب نزولی اور وضعی حکم خداوندی ہیں:

ترتیب نزولی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ترتیب وضعی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی کہ یہ جو آیت نازل ہوئی ہے اس کو فلاں جگہ پر رکھنا ہے۔ مثلاً جو سب سے پہلے آیت نازل ہوئی وہ ہے: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ اور جو سب سے آخر میں نازل ہوئی ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُزْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ﴾<sup>2</sup>

اب یہ آخری آیت ہے اور وہ پہلی آیت ہے اور پہلی آیت دیکھو تو تیسویں

پارے میں ہے اور آخری آیت کو دیکھو تو تیسرے پارے میں ہے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ ترتیب نزول الگ ہے اور ترتیب وضعی الگ ہے۔

تو سورۃ فاتحہ کی آیات نزول کے اعتبار سے پہلی آیات نہیں ہیں لیکن قرآن میں رکھنے کے اعتبار سے پہلی آیات یہی ہیں۔ مفسرین کرام میں یہ مستقل بحث چلی ہے کہ وہ کون سی پہلی سورۃ ہے جو مکمل نازل ہوئی ہے؟ بعض کی رائے میں سب سے پہلے مکمل نازل ہونے والی سورۃ، سورۃ الفاتحہ ہے۔

### قرآن کریم کی عظیم ترین سورۃ:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ فاتحہ کے بہت سے فضائل بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً صحیح البخاری، کتاب التفسیر میں ہے، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں مسجد میں تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا:

"أَلَا أَعْلَمُكُمْ أَكْثَرَ سُورَةٍ فِي الْقُرْآنِ قَبْلَ أَنْ أُخْرَجَ مِنَ الْمَسْجِدِ" <sup>3</sup>

مسجد سے نکلنے سے پہلے میں تجھے وہ سورۃ سکھاؤں گا جو قرآن کی سورتوں میں عظیم ترین سورۃ ہے۔ جب میں مسجد میں تھا تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ یہ سورۃ فاتحہ سب سورتوں میں عظیم ترین

سورۃ ہے اور قرآن میں اس کا نام رکھا ہے: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْ

انْقُرْآنَ الْعَظِيمِ﴾ <sup>4</sup> اس کی سات آیات ہیں جن کو بار بار پڑھا جاتا ہے اور یہ قرآن عظیم ہے۔

3- صحیح البخاری، رقم: 4703

4- الحجر 87:15

## سورۃ شفا:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: "يَا جَابِرُ! اَلَا اُخْبِرُكَ بِخَيْرِ سُورَةٍ نَزَلَتْ فِي الْقُرْآنِ؟" کہ میں تجھے وہ سورۃ نہ بتاؤں جو قرآن کریم میں سب سے بہترین سورۃ ہے؟

"قُلْتُ: بَلَى يَا رَسُولَ اللّٰهِ!" حضور! کیوں نہیں؟ مجھے وہ سورۃ بتائیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"فَاتِحَةُ الْكِتَابِ، فِيهَا شِفَاءٌ مِنْ كُلِّ دَاءٍ"<sup>5</sup>

یہ وہ سورۃ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تمام بیماریوں کی شفا رکھی ہے۔ تمام بیماریوں کی شفا اس سورۃ میں موجود ہے لیکن بندے کا یقین اور اعتماد شرط ہے بندے کو یقین نہ ہو تو شفاء کیسے مل سکتی ہے؟

## یقین محکم اور اعتماد کامل:

مجھے اس بات کا ذاتی تجربہ ہے یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں درجہ سادہ میں پڑھتا تھا۔ ”سادہ“ کہتے ہیں چھٹے درجے کو۔ میں گوجرانوالہ پڑھتا تھا، ایک مسجد ہے لانگریاں والی گلی میں، بڑی مشہور مسجد ہے اس میں جمعہ پڑھاتا تھا اور فجر کی نماز کے بعد درس قرآن بھی دیتا تھا۔ ہماری مسجد کے ایک مؤذن صاحب تھے سادہ آدمی تھے، مجھے آکر کہنے لگے ہمارے گھر میں مہمان بچی آئی ہے جس کو معمول کے مطابق ماہواری کا خون آیا اور رکائیں، مسلسل بیماری میں مبتلا ہے۔

ہم ڈاکٹروں کے پاس گئے، کوئی فرق نہیں ہے۔ حکیموں کے پاس گئے ہیں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ میں نے اسی وقت (یہ میری طالب علمی کی بات ہے میں اس وقت

بالکل نو عمر تھا) ایک کاغذ لیا اور اس پر سورۃ فاتحہ لکھی اور ان سے کہا کہ اس کو بند کر لو، پڑھنا نہیں ہے اور اس کو بچی کے پیٹ پر باندھ دو! آپ یقین کریں وہ صبح آیا اور اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ مجھے کہنے لگا کہ مبارک ہو! ہماری بچی ٹھیک ہو گئی ہے۔ آپ نے لکھا کیا تھا؟ میں نے کہا کہ ”سورۃ فاتحہ“۔ اب اس کا تعلق تو اعتماد کے ساتھ ہے۔

### امام اہل السنۃ کا تعویذ اور دَم:

امام اہل السنۃ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ سے میں نے پڑھا، علم وہاں سے شروع کیا میں ڈیرھ سال وہاں پڑھا ہوں۔ ہمارے شیخ رحمہ اللہ کی عادت تھی، کوئی بندہ تعویذ لینے آتا تو اس کو فقط یہی لکھ دیتے:

بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَهُوَ السَّبِیْعُ الْعَلِیْمُ۔<sup>6</sup>

یہی الفاظ ہر کسی کو لکھ کر دیتے۔ کوئی دَم کے لیے آتا ایک ہی دم کرتے "بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَهُوَ السَّبِیْعُ الْعَلِیْمُ" پڑھ کر اس پر پھونک مار دیتے۔ اب اس کا ترجمہ کیا ہے؟ میں اللہ تعالیٰ کے نام سے دَم کرتا ہوں اور دنیا میں بندے کو کوئی چیز تکلیف نہیں دے سکتی۔ نہ زمین میں نہ آسمان میں، اللہ تعالیٰ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے۔

### سورۃ فاتحہ کے مختلف نام:

- اس کا نام فاتحۃ الكتاب بھی ہے، یہ تو سب کہتے ہیں۔ فاتحۃ الكتاب کیوں کہتے ہیں؟ فتح کا مطلب ہوتا ہے آغاز کرنا، شروع کرنا چونکہ یہ قرآن کریم کے

- شروع میں ہے اس لیے اسے فاتحۃ الكتاب کہتے ہیں۔
- اس سورۃ کا نام سورۃ المسئلۃ بھی ہے مسئلہ کا معنی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ سے مانگنا کیونکہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ اس لیے اس سورۃ کا نام سورۃ المسئلۃ بھی ہے۔
- اس سورۃ کا نام ام الكتاب بھی ہے ام کہتے ہیں جڑ کو، بنیاد کو۔ جیسے آدمی کے جسم پر سر ہے تو کہتے ہیں ام الجسد سر آدمی کے جسم کا خلاصہ ہے، بنیاد ہے، آدمی کا دماغ کام کرے تو بندہ صحیح رہتا ہے یہ دماغ کام کرنا چھوڑ دے تو بندے کا پورا وجود کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے اس کو ام الكتاب بھی کہتے ہیں۔
- اس کا نام سورۃ الشافیۃ بھی ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی ہے اس لیے اس کو سورۃ الشافیۃ بھی کہتے ہیں۔

### دم کرنے کا ثبوت صحیح بخاری سے:

اس بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے صحیح بخاری میں ایک عجیب واقعہ ذکر فرمایا ہے: صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی جماعت ایک علاقے سے گزر رہی تھی، اس علاقے والوں سے کہا کہ ہم مسافر لوگ ہیں ہمیں مہمان بنا لو تو انہوں نے مہمان بنانے سے انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ کی شان ہے جنہوں نے انکار کیا اُس قبیلے کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا جو علاج معالجہ ان کے پاس اس دور میں تھا کیا مگر افاقہ نہ ہوا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ جن لوگوں کو ہم نے مہمان بنانے سے انکار کیا ان سے پوچھو شاید ان کے پاس کوئی علاج ہو؟

وہ لوگ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پاس آئے اور سارا معاملہ کہہ ڈالا کہ ہمارے سردار کو سانپ نے ڈس لیا ہے ہم اس لیے آئے ہیں کہ آپ لوگوں میں



سے کوئی بندہ علاج کر سکتا ہے؟ ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ جی ہاں! میرے پاس دم موجود ہے میں اس کا علاج کروں گا، وہ وہاں چلے گئے سورۃ فاتحہ پڑھی اور سردار پر پھونک ماری، اللہ تعالیٰ نے سردار کو شفا عطا فرمادی۔<sup>7</sup>

### دم کی اجرت کا مسئلہ:

اچھا اس میں ایک بات اور بھی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس حدیث کو ”کتاب الاجارۃ“ میں نقل کیا ہے۔ اجارہ کا مطلب ہوتا ہے مزدوری کرنا اور پیسے لینا۔ دم کا مسئلہ اور نقل کہاں کیا؟ کتاب الاجارہ میں۔ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ دلیل پیش کرنا چاہتے ہیں کوئی آدمی دم کرے تو اس کے پیسے لے سکتا ہے یا نہیں لے سکتا؟ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جب وہ لوگ آئے کہ ہمارے سردار کو سانپ نے ڈسا ہے جس صحابی نے دم کرنا تھا انہوں نے کہا کہ ہم اس شرط پر آئیں گے کہ اگر میں نے دم کیا اور تمہارا سردار ٹھیک ہو گیا تو تم اتنی بکریاں مجھے دو گے۔ انہوں نے کہا ہمیں منظور ہے۔ تو صحابی رسول رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دم کیا اور سردار کو شفا مل گئی انہوں نے بکریاں دے دیں۔

بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اسے اچھا نہ سمجھا کہ قرآن کریم پر اجرت نہیں لینی چاہیے تم نے اچھا کام نہیں کیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہماری طرح نہیں تھے، اگر ایک مسئلے پر الجھن آگئی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھتے تھے۔

اگر آپ لوگوں کو الجھن آجائے تو عالم سے پوچھیں آپس میں کھسک پھسک کیوں کرتے ہو؟ میرا اپنا مزاج ہے میں یہاں بیٹھا ہوں یا سفر میں ہوں، ایک مسئلہ

پوچھتا ہے دوسرا جواب دیتا ہے میں بیٹھ کر سنتا رہتا ہوں۔ بھی! جب ہم سے پوچھیں گے تو ہم جواب دیں گے۔ جب ہم سے نہیں پوچھیں گے تو خواہ مخواہ کیوں جواب دیں؟ جب تک کوئی سوال نہ کرے تو علماء کو چاہیے کہ اس مسئلہ کا جواب نہ دیں۔ یا خود پوچھے یا عقیدت مند ہو ورنہ جواب نہ دے۔

### حکیم الامت کا فیصلہ:

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ ایک سفر میں جا رہے تھے دوران سفر انہوں نے کسی کو ٹوکا! غالباً اس کی شلوار ٹخنوں کے نیچے تھی یا کوئی اور مسئلہ تھا، بھی! یہ حرام ہے۔ یوں ناکیا کرو! آگے سے اس شخص نے ایسا جملہ کہا جو کفریہ تھا۔ تو حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب شلوار ٹخنوں سے نیچے تھی تو، تو فاسق تھا، مسئلے کی توہین کر کے تو کافر ہو گیا۔ آج کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ مسئلہ تب بتاؤں گا جب میرا عقیدت مند ہو، یا مسئلہ تب بتاؤں گا جب کوئی سائل بن کر مجھ سے پوچھے گا۔ اگر ضرورت مند بن کر پوچھے بھی نہیں اور عقیدت مند بھی نہ ہو تو میں نے اس کو مسئلہ نہیں بتانا۔

اس کا بہت فائدہ ہوتا ہے۔ آپ حضرات کے ہاں میں درس کے لیے آیا ہوں، کوئی مجھے کہہ دے تو نماز پڑھاتا ہوں نہ کہے تو میں نہیں پڑھاتا۔ مجھے شوق تو نہیں تمہاری امامت کراؤں نہ ہی مجھے شوق ہے کہ 100 سو نمازیوں کا بوجھ اپنے سر لوں۔ اگر میری نماز میں خلل آگیا تو آپ کی ساری نمازیں بھی میرے سر پر ہیں۔ مجھے کیا ضرورت ہے بوجھ اور مصیبت اٹھانے کی؟ ان باتوں سے بندے کو کنارہ کش رہنا چاہیے۔ کہہ دیں تو ہم انکار نہیں کرتے اور نہ کہیں تو ہم مصلے پر سوار نہیں ہوتے۔ تو جب تک کسی کو عقیدت نہ ہو یا سائل بن کر نہ آئے عالم کو بلا وجہ مسئلہ نہیں بتانا چاہیے اس میں مسئلے کی توہین کا خطرہ ہوتا ہے اور توہین کرنے سے بندہ کافر ہو جاتا ہے۔

## دم کی اجرت پر نبوی فیصلہ:

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے دم کیا اور بکریاں لے لیں۔ اب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں مسئلہ چلا کہ دم کر کے اجرت لینا مناسب ہے؟ انہوں نے کہا کہ مدینہ میں جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں گے، آپس میں بحث کی کیا ضرورت ہے؟ مدینہ منورہ پہنچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ساری بات عرض کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دلجوئی کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قَدْ أَصَبْتُمْ أَقْسَمًا"

تم نے مسئلہ ٹھیک بتایا ہے، اب بکریوں کو تقسیم کرو!  
پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"وَاصْرِفُوا إِلَى مَعَكُمْ سَهْمًا"<sup>8</sup>

میرا حصہ بھی نکالو! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کے گوشت کو کیا کرنا تھا؟ یہ تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی دلجوئی کرنی تھی کہ تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ فرمایا کہ میرا حصہ کدھر ہے؟ میرا حصہ بھی لاؤ! امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب الاجارہ کے تحت لائے ہیں۔ بتاؤ کس قدر حماقت کی بات ہے لوگ فتوے دیتے پھرتے ہیں تعویذ حرام ہے، دم حرام ہے، ان کی اجرت لینا حرام ہے۔

## صدقہ پریشانیوں کا حل ہے:

میں ہر کسی کو تعویذ نہیں دیتا۔ آپ کے علم میں ہے ہمارے پاس ہر انگریزی ماہ کی پہلی جمعرات کو مرکز اہل السنۃ والجماعۃ 87 جنوبی سرگودھا میں اصلاحی بیان ہوتا ہے، مجلس ذکر ہوتی ہے۔ نئے لوگ مجھ سے چاروں سلاسل میں بیعت بھی ہوتے ہیں،

پرانے لوگ جو مریدین ہیں وہ سب بھی اکٹھے ہوتے ہیں۔ تو میرا ایک مرید جو خوشاب سے آگے قائد آباد ہے وہاں سے آیا، کہتا ہے: امی کہتی ہیں مولانا سے تعویذ لے کر آؤ! میں نے کہا کس بات کا؟ گائے لیتے ہیں تو دودھ نہیں دیتی، دولاکھ کی لی ہے۔ دودھ نہیں دے رہی، نقصان ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا اس کا حل یہ ہے کہ ایک گائے صدقہ کر دو تمہاری باقی ساری گائیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ کہتا ہے کہ تعویذ دیں۔ جو بات میں مناسب سمجھوں گا وہی بتاؤں گا۔ میں جو کہہ رہا ہوں ایک گائے اللہ تعالیٰ کے نام پر صدقہ کر دو باقی ساری گائیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ لیکن اس کو یہ بات سمجھ نہیں آئی، بہت سمجھایا باہر چلا گیا، پھر اندر آیا، کہتا ہے کہ امی کہتی ہیں صدقہ بھی کریں گے لیکن تعویذ بھی دیں۔

تعویذ میں ہر بندے کو نہیں دیتا، ایک بندے کو دے دو، دوبارہ مسئلہ نہیں پوچھے گا تعویذ ہی پوچھے گا۔ خوابوں کی تعبیر کیوں نہیں بتاتا؟ خواب کی تعبیر بتا دو، تو دوبارہ تعبیر ہی پوچھتے رہیں گے، مسئلہ نہیں پوچھیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ امت کے عقائد درست ہوں ان کو مسائل سمجھائے جائیں یہ تعویذوں اور خوابوں کی دنیا سے باہر نکلے۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ ہم تعویذ کو غلط سمجھتے ہیں یا ہمیں خوابوں کی تعبیر کا فن نہیں آتا نہیں بلکہ ہمیں تعویذ بھی آتے ہیں اور خوابوں کی تعبیر دینا بھی آتی ہے اور آپ کے مسائل بھی آتے ہیں۔

### سورۃ کے مکی، مدنی ہونے کا اصول:

سورۃ فاتحہ مکی ہے یا مدنی؟ آپ دیکھیں لکھا ہوتا ہے سورۃ الفاتحۃ مکیہ یہ مکی سورۃ ہے۔ مکی اور مدنی کسے کہتے ہیں؟ عام بندہ یہ سمجھتا ہے کہ جو سورۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی وہ مکی ہے اور جو سورۃ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی وہ مدنی ہے۔ یہ مکی اور مدنی کی تفسیر نہیں ہے۔ اصول یاد رکھیں: نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی

کے دواہم دور ہیں؛ ایک ہجرت سے پہلے اور ایک ہجرت کے بعد۔ وہ سورۃ یا آیات جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں وہ مکی ہیں خواہ وہ طائف میں نازل ہوئی ہوں اور جو سورۃ ہجرت کے بعد نازل ہوئی وہ مدنی ہے خواہ وہ مکہ میں نازل ہو۔

اب بات سمجھ میں آگئی؟ جب نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فاتح بن کر مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو قرآن کا نزول ہوا اس کو مدنی کہیں گے یا مکی؟ مدنی کہیں گے۔ تو جو سورۃ ہجرت سے قبل نازل ہوئیں وہ مکی ہیں خواہ مکہ سے باہر نازل ہوئی ہوں اور جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں وہ مدنی ہیں خواہ مکہ میں نازل ہوں۔

### سورۃ الفاتحہ کے مکی ہونے کی دلیل:

سورۃ فاتحہ مکی ہے، مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی اس کی دلیل کیا ہے؟ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾<sup>9</sup> ہم نے تمہیں بار بار پڑھی جانے والی سات آیات عطا کی ہیں اور یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اس کا مطلب ہے کہ سورۃ فاتحہ پہلے نازل ہو چکی تھی تبھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾

### آیت کی علامت (O):

سورۃ فاتحہ کی سات آیات ہیں۔ اس میں آپ دیکھیں گے ﴿حَرَّاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ اس کے آگے گول دائرہ (O) نہیں ہے۔ ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کے آگے گول دائرہ (O) ہے۔ ذرا نکتہ سمجھیے، میں نے تو قرآن مجید سامنے رکھا ہوا ہے تم گھر جا کے دیکھنا سورۃ فاتحہ کی سات آیات ہیں۔

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ آگے گول دائرہ ہے، ﴿الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾ آگے گول دائرہ ہے، ﴿مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ پھر گول دائرہ ہے، ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ آگے گول دائرہ، ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ آگے گول دائرہ، ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ یہاں گول دائرہ نہیں ہے حالانکہ آیت ختم ہو رہی ہے، ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ آگے گول دائرہ ہے۔ اب دیکھو! جہاں آیت ختم ہوتی ہے وہاں گول دائرہ بنا ہوا ہوتا ہے تو جب یہ سات آیات ہیں، ﴿أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ پر آیت ختم ہوتی ہے گول دائرہ کیوں نہیں ہے؟

### سورۃ الفاتحہ کی کل آیات اور اختلاف فقہاء:

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فقہی اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: سورۃ فاتحہ کی سات آیات ہیں لیکن بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا حصہ ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: سورۃ فاتحہ کی سات آیات ہیں، بسم اللہ اس کا حصہ نہیں ہے ﴿أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ پر ایک آیت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ یہاں اختلاف تھا کہ آیت ختم ہوتی ہے یا نہیں؟ اس لیے مصحف (قرآن کریم) میں یہاں دائرہ نہیں لگایا جاتا۔ لیکن اس کو عام بندہ نہیں سمجھتا کہ دائرہ یہاں پر کیوں نہیں لگا ہوا۔

### بدعتیہ کی کاسد باب:

اللہ تعالیٰ آپ کو مدینہ منورہ لے جائے اور بار بار لے جائے (آمین) آپ مدینہ منورہ مسجد نبوی میں جا کر دیکھیں، اب میں آپ کو یہاں سے کیسے سمجھاؤں؟ آپ مدینے جائیں وہ پرانی ترکی مسجد کا جو پرانا ہال ہے اس میں آپ دیکھیں تو ستونوں پر پھول بنے ہوئے ہیں ایک پھول کا رنگ اور ہے دوسرا کا ڈیزائن اور ہے اور جو ستون پر بننے والے پھولوں کے ڈیزائنوں میں فرق ہے وہ خاص واقعہ کی طرف اشارہ

ہے۔ جس کا عام بندے کو نہیں پتا ہوتا یہ پھول یوں کیوں ہے؟ اور یہ پھول یوں کیوں ہے؟ آج بھی آپ مسجد نبوی میں جائیں اور باب عبد المجید قبلہ کی مخالف جائے نماز میں داخل ہوں آپ وہاں قالین اٹھائیں نیچے تین گول دائرے بنے ہوئے ہیں کسی کو نہیں پتا کہ یہ گول دائرے کیا ہیں؟

صحابی رسول حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کے باغ میں یہاں پر چشمے تھے یہ وہ تین گول دائروں کا نشان ہے۔ عربوں نے نشانیاں رکھی ہیں لیکن وہ اظہار کیوں نہیں کرتے؟ اس قوم نے ان کو چائنا شروع کر دینا ہے۔ لیکن نشانی انہوں نے رکھی ہوئی ہے۔ اس لیے بد عقیدگی کی روک تھام کے لیے انہوں نے اس کو ظاہر نہیں کیا لیکن بالکل ختم بھی نہیں فرمایا بلکہ نشانیاں لگائی ہوئی ہیں۔

**امام اعظم ابو حنیفہ کا تفسیر:**

میں بات کر رہا تھا سورۃ فاتحہ میں سات آیات ہیں ہماری دلیل ہے سات آیات کیوں ہیں؟ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

صَلَّيْتُ خَلْفَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ فَلَمْ أَسْمَعْ أَحَدًا مِنْهُمْ يَجْهَرُ بِبِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ.<sup>10</sup>

میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی ہے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھی ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھی ہے، تو جب بھی وہ نماز پڑھتے تو بسم اللہ الرحمن الرحیم اونچی آواز میں نہیں پڑھتے تھے۔

کیوں؟ اب بات سمجھنا اگر بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا جز ہوتی تو جب سورۃ فاتحہ

جہری ہے تو بسم اللہ جہر اُہوتی بسم اللہ کو جہر اُہ پڑھنا، الحمد للہ کو جہر اُپڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا جزء نہیں ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی عقل اور دماغ کہاں تک کام کرتا ہے کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا جزء نہیں۔

### صفت رب جامع الصفات ہے:

آگے دیکھیں: ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے میں آپ کی خدمت میں بڑی مختصر مختصر تفسیر عرض کر رہا ہوں تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو رب العالمین ہے۔ قرآن کریم کا آغاز دیکھیں: ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ اور قرآن کریم کا اختتام دیکھیں ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ شروع بھی رب سے اختتام بھی رب پہ ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ﴾ اپنا نام لائے ہیں اور ”رب“ اپنی صفت لائے ہیں اور جب قرآن ختم کیا ہے ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ پھر بھی اپنی صفت ”رب“ لائے ہیں۔ وجہ یہ ہے صفت ”رب“ اللہ تعالیٰ کی وہ صفت ہے جو تمام صفات کو جامع ہے۔ رب میں خدا کی ساری صفات آجاتی ہیں، قرآن کریم کو شروع بھی ”رب“ سے کیا ہے اور ختم بھی ”رب“ پر کیا ہے۔

### لفظ ”رب“ پر عجیب نکتہ:

اچھا دوسری بات سمجھیں!

❖ جب عالم ارواح میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے سوال کیا تھا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾

❖ جب قبر میں جائیں گے تو فرشتہ سوال کیا کرے گا: ”مَنْ رَبُّكَ؟“

❖ اور اس میں درمیانی زندگی ہے، اس میں کہا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمْ



## اَلْمَلٰٓئِكَةُ ﴿۱۱﴾

پتا چلا عالم ارواح میں بھی سوال لفظ رب سے ہے۔ عالم برزخ میں بھی سوال لفظ رب سے ہے اور دنیا میں استقامت بھی رہنا کہنے پر ہے۔ یہ ”رب“ ایسی صفت ہے خدا کی کہ

- عالم ارواح میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔
  - عالم دنیا میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔
  - عالم قبر میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔
  - اور عالم برزخ میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔
- اس لیے شروع بھی رب سے کیا ہے اور ختم بھی رب پر کیا ہے۔

## مخلوقات کی تعداد:

”الخلیقین“ عالم کی جمع ہے عربی زبان میں عالم کہتے ہیں: ”مَا يَعْلَمُ بِهِ شَيْءٌ“ کو، جس سے کسی چیز کا پتا چلے اس کو عالم کہتے ہیں۔ اب عالم دنیا میں کتنے ہیں؟ عالم سے مراد مخلوق ہے، مخلوقات کی تعداد کتنی ہے؟

★ مقاتل ابن حبان رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مخلوقات کی تعداد 80 ہزار ہے 40 ہزار خشکی میں ہے 40 ہزار سمندر میں۔

★ وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ 18 ہزار تعداد ہے۔

★ صحیح قول کعب بن احبار رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے: دنیا میں کسی کو معلوم نہیں کہ

مخلوقات کی تعداد کتنی ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: ﴿وَمَا يَعْلَمُ

جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ﴿۱۲﴾ دنیا میں خدا کے لشکروں کو کوئی بھی جان ہی نہیں سکتا۔

## اللہ تعالیٰ ہی رزاق ہیں:

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی: اے اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ میں تیری ساری مخلوق کی دعوت کروں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے میرے نبی سلیمان یہ تیرے بس میں نہیں ہے۔ عرض کی کہ میرا جی چاہتا ہے مجھے اجازت عطا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں اجازت دیتا ہوں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات کو پکانے پر لگایا نانباتی بھی ان کے جن تھے جس نبی کے نانباتی جن ہوں بتاؤ اس نبی کی حکومت کتنی بڑی ہوگی؟

فرمایا پکانا شروع کرو! ایک یا دو ماہ پکانے پر لگے، دسترخوان لگ گیا، یہ ان کا معجزہ تھا کھانا پکاتے رہے، بغیر فریج میں رکھے اللہ تعالیٰ اس کھانے کو محفوظ فرماتے رہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی: مخلوق کو بھیجیے کھانا لگ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کس کو بھیجوں، سمندر والی کو یا خشکی والی کو؟ سلیمان علیہ السلام نے عرض کی اے اللہ! سمندر والی کو بھیجیں، خشکی والی تو میرے سامنے ہے مجھے سمندر والی کا علم نہیں ہے۔ پتا چلا کہ نبی کے پاس غیب کا علم نہیں ہوتا۔

حدیث مبارک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مچھلی سے کہا کہ جاؤ! میرے سلیمان کی دعوت کھاؤ! مچھلی آئی اور ایک لقمے میں سارا کھانا نگل گئی پھر منہ کھول دیا۔ سلیمان علیہ السلام نے عرض کی کہ اے اللہ یہ کیا؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں اس کو روزانہ ایسے تین لقمے دیتا ہوں۔ سلیمان تیری دعوت تو میری ایک مچھلی کو پوری نہیں

ہوئی۔ بتاؤ اب اس کا پیٹ کون بھرے گا؟ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو تو ہی رزق دے سکتا ہے نبی کے بس میں نہیں۔

کتنی مخلوقات ہیں دنیا میں کوئی نہیں جانتا۔ بتاؤ خدا کتنی طاقت والا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی طاقت پر اعتماد کی توفیق عطا فرمائے۔

### تفسیر روح المعانی اور علامہ آلوسی:

علامہ محمود آلوسی مفتی بغداد رحمہ اللہ تعالیٰ بغداد کے بہت بڑے مفتی تھے انہوں نے تفسیر روح المعانی لکھی ہے۔ رات کی چاندنی میں بیٹھ کر لکھی ہے، اتنا غریب مفتی ہے لکھنے کے لیے ان کے پاس دیا اور چراغ نہیں ہوتا تھا۔ کہتے تھے: کُنْتُ أَطَالِعُ الْكُتُبَ فِي ضَوْءِ الْقَمَرِ. میں رات کی چاندنی میں کتابوں کا مطالعہ کرتا۔ پھر تفسیر روح المعانی لکھی اور اس وقت کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کی اور بادشاہ بھی عَشْ عَشْ کر اٹھا کہ ایسے علماء بھی دنیا میں موجود ہیں چاند کی چاندنی میں بیٹھ کر مطالعہ کرتے ہیں اور تفسیر قرآن کی خدمت کرتے ہیں۔

### خدا کے موجود ہونے پر عقلی دلیل:

اس کتاب ”روح المعانی“ میں مفتی بغداد علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک دیہاتی آدمی تھا، بدو تھا، اعرابی تھا وہ جنگل سے گزر رہا تھا وہاں اونٹ کی میٹگنیاں پڑی تھیں ان کو دیکھ کر اس پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے ایک ایسا فصیح و بلیغ جملہ کہا شاید دنیا والے اتنا بڑا جملہ نہ کہہ سکیں۔ اس دیہاتی آدمی نے وہیں کھڑے ہو کر فی البدیہہ کہا:

- الْبَعْرَةُ تَدُلُّ عَلَى الْبَعِيرِ یہ میٹگنیاں بتاتی ہیں یہاں سے اونٹ گزرا ہے۔
- وَآثَرُ الْأَقْدَامِ عَلَى الْمَسِيرِ نشانات قدم بتاتے ہیں کوئی بندہ یہاں سے گزرا ہے۔

- أَفَسَمَاءُ ذَاتُ أَبْرَاجٍ آسمان کو دیکھو جو برجوں والا ہے۔
  - وَأَرْضٌ ذَاتُ بُحَايَا اور زمین کو دیکھو جو بڑے بڑے خزانوں والی ہے۔
- لَا تَدُلُّ عَلَى اللَّطِيفِ الْخَبِيرِ کیا اس سے پتا نہیں چلتا کہ دنیا میں خدا موجود ہے؟<sup>13</sup>

اس نے کہا کہ میٹکینوں سے پتا چلتا ہے کہ اونٹ گزرا ہے قدم بتاتے ہیں کہ انسان گزرا ہے۔ یہ سمندر اور زمین بتاتی کہ دنیا میں خدا موجود ہے یہ ایک دیہاتی کا استدلال ہے۔ اللہ تعالیٰ فہم اور عقل عطا فرمائے تو دیہات کے سادے کو بھی دے دے اور نہ دے تو PhD ڈاکٹر کو بھی گمراہ کر دے۔ یہ جو بڑے بڑے ڈاکٹروں نے گمراہی کا بازار گرم کیا ہے الامان والحفیظ اللہ تعالیٰ ان سے محفوظ رکھے۔

### اپنے ایمان کی حفاظت کریں:

میں یہ بات بڑی کھلی کھلی کہتا ہوں کہ پروفیسروں اور ڈاکٹروں کے درس فلاں اور درس فلاں سے خدا را خود کو بچا لو ورنہ ایمان کو برباد کر بیٹھو گے۔ ڈاکٹر کا کام ہے بھئی:

■ نبض دیکھو!

■ پیشاب چیک کرو!

■ مٹانے چیک کرو!

■ دماغ چیک کرو!

■ جسم چیک کرو!

مسائل چیک کرنا تمہارے بس میں نہیں۔ اس سے خود کو بچاؤ۔ اپنے ایمان

محفوظ کرو! ہمارے ذمہ بتانا ہے ہم بتاتے رہیں گے آپ مانیں گے تو بچ جائیں گے نہیں مانیں گے تو پھر بعد میں نہ کہنا کہ اے اللہ! ہمیں بتانے والا کوئی نہیں تھا۔ ہم نے مسئلہ آپ کے سامنے عرض کر دیا ہے۔

### رحمن و رحیم میں فرق:

﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ اللہ تعالیٰ ”رحمن“ بھی ہے، اللہ تعالیٰ ”رحیم“ بھی ہے۔ توجہ رکھنا رحمن اور رحیم میں کیا فرق ہے؟ آپ کوئی بھی ترجمہ اٹھائیں، اس میں دو لفظ لکھے ہوتے ہیں۔ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا یہ لکھا ہوتا ہے۔ بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا کبھی آپ نے غور کیا دونوں میں فرق کیا ہے؟ بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا۔ ان میں کیا فرق ہے؟ ذرا سمجھنا:

- رحمن کہتے ہیں عام الرحمة۔
- رحیم کہتے ہیں تامہ الرحمة۔
- رحمن کہتے ہیں جس کی رحمت ہر کسی کو ملے۔
- رحیم کہتے ہیں کہ جس کی رحمت مکمل ملے۔
- الرَّحْمٰن کا معنی جس کی رحمت میں عموم ہو۔
- الرَّحِیْم کا معنی جس کی رحمت میں کمال ہو۔
- اللہ تعالیٰ کی رحمت میں عموم بھی ہے۔
- اللہ تعالیٰ کی رحمت میں کمال بھی ہے۔

یہ نکتہ سمجھنا! اللہ تعالیٰ کی رحمت میں عموم بھی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت میں کمال بھی ہے۔ اس لیے یہ بات کہتا ہوں دنیا میں خدا کی رحمت میں عموم ہے اور قیامت

کے دن عموم نہیں ہو گا بلکہ قیامت کے دن خدا کی رحمت میں کمال ہو گا۔ کیا مطلب؟  
دنیا میں خدا کی رحمت کی وجہ سے

◎ مومن بھی کھاتا ہے۔

◎ کافر بھی کھاتا ہے۔

◎ انسان بھی کھاتا ہے۔

◎ جانور بھی کھاتا ہے۔

لیکن قیامت کے دن خدا کی رحمت صرف مومن کو ملے گی کافر کو نہیں مل سکتی۔ تو دنیا میں عموم ہے اور قیامت کے دن کمال ہے۔

اس لیے کہتے ہیں اللہ رحمٰن فی الدنیا ہے اللہ رحیم فی الاخرۃ ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمٰن دنیا میں اور رحیم آخرت میں خدا کی رحمت سے دنیا میں تو ہر کوئی فائدہ اٹھاتا ہے لیکن موت کے بعد خدا کی رحمت سے کافر فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اگر اٹھائے گا تو کون اٹھائے گا؟ صرف اور صرف مومن اٹھائے گا۔

**انسان کو ”رحمن“ نہیں کہہ سکتے، رحیم کہہ سکتے ہیں:**

اب ذرا نکتہ سمجھیں! رحمٰن بندے کو نہیں کہہ سکتے، رحیم انسان کو کہہ سکتے ہیں۔ ہمارے ملک کے وزیر داخلہ (2012ء میں) ان کا نام عبدالرحمن ملک ہے لوگ ان کو ”رحمن ملک“ کہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں رحمٰن؛ انسان کو کہنا جائز نہیں لیکن انسان کو رحیم کہنا جائز ہے۔

قرآن کریم میں ہے:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ

عَلَيْكُمْ بِأَنفُسِكُمْ مِثْلَ نَفْسِكُمْ ۚ ﴿١٤﴾

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے نبی کو ”رحیم“ فرمایا ہے۔ ذرا نکتہ سمجھیں انسان کو رحمن نہیں کہہ سکتے، رحیم کہہ سکتے ہیں۔ عبد الرحیم کو آپ رحیم بھی کہہ لیں کچھ گناہ نہیں، لیکن عبد الرحمن کو رحمن کہنا گناہ ہے۔ اب آپ کہیں گے رحیم کہہ سکتے ہیں تو رحمن کیوں نہیں کہہ سکتے؟

### عموم اور کمال میں فرق:

میں نے دونوں میں کیا فرق بیان کیا؟ رحمن کہتے ہیں جس کی رحمت میں عموم ہو، رحیم کہتے ہیں جس کی رحمت میں کمال ہو۔ کیا مطلب؟ ایک آدمی کے پاس جتنی محبت ہے وہ ساری ایک کو دے دے، ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا؟ ہو سکتا ہے لیکن کوئی بندہ اپنی شفقت ہر کسی کو دے، کیا یہ بھی ہو سکتا ہے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ ایک بندے کے پاس دس روپے ہوں دس کے دس ایک کو دے دے یہ تو ہو سکتا ہے۔ یہ رحیم ہے اور ایک بندہ ہر کسی کو دے، یہ تو نہیں ہو سکتا۔ تو جس بندے کے پاس جتنی دولت موجود ہے وہ ایک کو تو دے سکتا ہے۔ جس بندے کے پاس جتنی شفقت ہے وہ ایک کو دے سکتا ہے، لیکن اتنی شفقت کہ کائنات میں ہر کسی کو دے یہ بندے کی صفت نہیں ہو سکتی اس لیے بندے کو رحیم کہہ سکتے ہیں رحمن نہیں کہہ سکتے۔

### اللہ تعالیٰ ہمارے مالک ہیں:

﴿مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کا مالک ہے۔ یہاں

﴿مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ فرمایا۔ پہلے نکتہ سمجھا دوں، چونکہ بعض احباب نئے ہیں اس

لیے عرض کرتا ہوں۔ ﴿مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ فرمایا قاضی یوم الدین نہیں فرمایا، حج نہیں فرمایا۔ مالک کا کام اور ہوتا ہے، حج کا کام اور ہوتا ہے۔ حج قانون کا پابند ہوتا ہے، مالک قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اور آپ کو تسلی دی ہے قیامت کو میرے پاس آؤ تو مجھے مالک سمجھ کر آنا حج یا قاضی سمجھ کر نہ آنا۔ میں قانون کا پابند نہیں ہوں۔ قانون کہے گا سزا دو میں اپنی مالک والی شان کو استعمال کروں گا رحمت کے دروازے کھول دوں گا۔

### شاہی اختیارات کا استعمال:

میں سمجھانے کے لیے کہتا ہوں بندہ قتل ہو گیا F.I.R کٹ گئی اس کو S.H.O نے گرفتار کر لیا۔ اسپیشل کورٹ یا سیشن کورٹ میں لے کر گئے اور اس نے سزائے موت دے دی۔ آپ اس کے خلاف اپیل کریں گے ہائی کورٹ نے اس سزا کو بحال رکھا، اس کے خلاف اپیل کریں گے سپریم کورٹ میں، سپریم کورٹ نے سزائے موت کو بحال رکھا تو پھر کہاں جائیں گے؟ صدر مملکت کے پاس وہاں جا کر اس کے خلاف اپیل نہیں ہوتی۔ صدر مملکت سے کہتے ہیں ہمارے بیٹے نے قتل کیا ہے، اس کو سیشن کورٹ، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے سزائے موت دے دی ہے۔ ہم جناب کے پاس آئے ہیں ہمارے بیٹے کو معاف کر دیا جائے۔ قانون میں معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن کیونکہ آپ صدر ہیں، آپ ملک کے بادشاہ ہیں، آپ اپنے شاہی اختیارات استعمال کریں اور ہمارے بیٹے کو معاف کر دیں۔

### سفارشی کی ضرورت:

اب ذرا توجہ رکھنا جب سیشن کورٹ گئے تھے وکیل کا سہارا ہے، ہائی کورٹ میں گئے وکیل کا سہارا ہے، سپریم کورٹ میں گئے ہیں وکیل کا سہارا اور صدر مملکت کے پاس گئے ہیں اب وکیل کا سہارا نہیں ہے۔ اب سفارشی تلاش کریں گے



کوئی M.N.A، کوئی M.P.A، کوئی داماد، کوئی سسر تلاش کرو گے۔

قاضی کی عدالت میں وکیل جاتا ہے اور مالک کی عدالت میں سفارشی جاتا ہے۔ قیامت کے دن کوئی وکیل کام نہیں آئے گا، قیامت کو سفارشی کام آئیں گے اور سفارشی کون ہیں؟ نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَشْفَعُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَلَاثَةٌ: الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْعُلَمَاءُ ثُمَّ الشُّهَدَاءُ.<sup>15</sup>

کہ تین بندے شفاعت کریں گے، انبیاء بھی سفارش کریں گے، علماء سفارش کریں گے اور شہید بھی سفارش کریں گے۔ یہ وہ سفارشی ہیں جو قیامت میں کام آئیں گے۔ ایک حافظ ہے وہ 10 کو لے جائے گا، شہید 70 کو لے جائے گا اور حدیث مبارک میں ہے کہ ایک عالم اپنے تمام معتقدین کو لے کر جائے گا۔

### شفاعتِ پیغمبر کا عقیدہ:

انبیاء علیہم السلام کا تو کیا کہنا۔ حدیث مبارک میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گر کر کہیں گے: اُمِّیْیَ یَا رَبِّ اُمِّیْیَ یَا رَبِّ اُمِّیْیَ

اے اللہ! میری امت، اے اللہ! میری امت

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: "ارْفَعْ رَأْسَكَ سَلِّ نُحْطَةُ"<sup>16</sup>

میرے پیغمبر! سر اٹھا مانگنا تیرے ذمے ہے اور بخشنا ہمارے ذمے ہے۔ یہ قیامت کے دن کے سفارشی ہیں۔

### مدرسہ سفارشی پیدا کرتا ہے:

قیامت کو وکیل کام نہیں آئے گا۔ کون کام آئیں گے؟ سفارشی۔ افسوس کہ

15۔ سنن ابن ماجہ، رقم: 4313

16۔ صحیح البخاری، رقم: 4712

جن سے ہمیں آج بغض ہے، جن سے ہمیں نفرت ہے۔ میں اس لیے کہتا ہوں میں بھائی اشرف سے کہہ رہا تھا کہ یہ ابو بکر پانچویں میں ہے یہ پانچ پڑھے بس کرادو اور اس کو مدرسے میں داخل کرادو۔ میں کالج کا مخالف نہیں ہوں لیکن کالج سے وکیل پیدا ہوتے ہیں۔ میں یونیورسٹی کا مخالف نہیں ہوں لیکن وہاں ڈاکٹر پیدا ہوتے ہیں اور دینی مدرسے میں آپ کے سفارشی پیدا ہوتے ہیں۔

یہ سفارشی کب کام آتے ہیں؟ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا صاحب! دعا فرمائیں مجھے آج بھی کہہ رہے تھے ہماری اس مسجد کے صدر صاحب ہیں جن کا بیٹا ہسپتال میں داخل ہے۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ ان کو صحت عطا فرمائیں، اب ہمیں پتا ہے بندہ ہسپتال میں داخل ہے پھر ڈاکٹر کام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، جب مریض کی ڈیٹھ (فوت ہو جائے) اسی ہسپتال میں مولوی صاحب دعا فرمائیں۔ تو جب ڈاکٹر کام چھوڑتا ہے پھر مولوی صاحب کا کام شروع ہو جاتا ہے۔

آدمی جیل میں تھا وکیل کیس لڑ رہا تھا، جیل سے سپریڈنٹ کا فون آگیا بھئی تمہارے ابو جی فوت ہو گئے ہیں، اب صبح وکیل کے پاس نہیں جائیں گے سیدھا مسجد میں آئیں گے جہاں وکالت کی انتہا ہے۔ اب عالم کی ابتدا ہے وکیل کا کام ختم ہو گیا مولوی صاحب شروع ہو گئے۔ لیکن عجیب بات ہے اس مولوی کی قدر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بات سمجھنے کو توفیق عطا فرمائے۔

### اللہ کی رحمت اور بندے کا اقرار جرم:

اللہ تعالیٰ مالک یوم الدین ہے یا قاضی یوم الدین ہے بتاؤ؟ اللہ تعالیٰ مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کو جج نہیں ہوں گے۔ حدیث مبارک میں ہے اللہ تعالیٰ ایک بندے کو بلائیں گے اور کہیں گے تو نے یہ گناہ کیا! تو نے یہ گناہ کیا! وہ ڈر کے کہے گا: اے اللہ! میں نے کیا۔ اللہ میں نے کیا، کانپ رہا ہو گا میرے ساتھ کیا بنے گا؟ اللہ

تعالیٰ سارے گناہ گنوائیں گے اور پھر فرمائیں گے کہ ہم نے تیرا یہ گناہ بھی معاف کیا، تیرا یہ گناہ بھی معاف کیا۔

حدیث مبارک میں ہے جب اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کریں گے اور پھر خاموش ہوں گے تو بندہ کہے گا: اے اللہ! میرا ایک گناہ وہ تو باقی ہے۔ آپ نے تو پوچھا ہی نہیں۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "فَلَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضْحَكُ" میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ اتنا ہنسے "حَتَّى بَدَتْ نَوَاجِذُهُ" یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دند ان مبارک نظر آنے لگے۔ فرمایا ابھی ڈر رہا تھا ابھی کہہ رہا ہے اللہ میرا اور گناہ بھی باقی ہے ابھی اور گناہ بھی ہے۔<sup>17</sup>

تو اللہ تعالیٰ مالک ہیں، اللہ تعالیٰ قاضی تو نہیں ہیں۔ مالک کا معاملہ الگ ہوتا ہے، جج کا معاملہ الگ ہوتا ہے۔ مالک کو تو کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ کیوں معاف کیا؟

### جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان مکالمہ:

کتنی سفارشیں چلیں گی قیامت کے دن۔ میں صرف ایک حدیث سناتا ہوں مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ”معارف الحدیث“ میں حدیث نقل کرنے کے بعد بڑی عجیب بات فرمائی ہے کسی نیک عالم سے تعلق کتنا کام آتا ہے۔ ایک حدیث سنو! فرمایا قیامت کا دن ہو گا اہل جنت؛ اہل جہنم کے پاس سے گزریں گے، ایک جہنمی ایک جنتی سے کہے گا:

❁ ”أَمَّا تَعْرِفُنِي“ تو نے مجھے پہچانا نہیں؟

❁ ”أَنَا الَّذِي سَقَيْتُكَ شَرْبَةَ الْمَاءِ“ میں وہ شخص ہوں جس نے تجھے پانی پلایا

تھا۔

❁ ”أَمَّا تَعْرِفُنِي“ تو نے مجھے پہچانا نہیں؟

❁ ”أَنَا الَّذِي وَهَبْتُ لَكَ مَاءً تَوَضَّأْتَ بِهِ“ میں نے وضو کے لیے آپ کو پانی

دیا تھا۔<sup>18</sup>

حدیث مبارک میں ہے کہ وہ سفارش کریں گے اور اس کو ساتھ لے کر جنت میں جائیں گے۔ آج اس کی قیمت نہیں ہے کسی عالم کو پانی کا گلاس دینے سے کیا ملتا ہے؟ تم سوچو گے مولانا صاحب ترغیب دینے لگے کہ ہمیں پانی پلایا کرو نہ بابا ہم تمہارا پانی پی کر کیا کریں گے تمہارا پانی تمہیں مبارک۔ یہ تمہاری دولت تمہیں مبارک ہو اللہ تعالیٰ آپ کو زیادہ عطا فرمائے۔ اللہ کی قسم! ہم کسی کی دولت دیکھ کر جلتے نہیں بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ مسلمان کو خدا نے دولت دی ہے جلنے والے کا منہ کالا، جل کر ہم کیا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور عطا فرمائے، میں صرف بتا رہا ہوں کہ ان چھوٹی چھوٹی نیکیوں کا آخرت میں اللہ تعالیٰ اجر عطا فرمائیں گے۔

### شُرک اور توحید میں فرق:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ اللہ ہم تیری ”ہی“ عبادت کرتے

ہیں اور تجھ ”ہی“ سے مدد مانگتے ہیں شرک اور توحید میں کیا فرق ہے؟ مشرک ”بھی“ کی رٹ لگاتا ہے اور موحد ”ہی“ کی بات کرتا ہے۔ مشرک کہتا ہے ”بھی“ جبکہ موحد کہتا ہے ”ہی“ مشرک کہتا ہے کہ اللہ کو ”بھی“ مانتے ہیں، موحد کہتا ہے اللہ ”ہی“ کو مانتے ہیں۔

قرآن کریم کو اٹھائیں اللہ نے مشرک اور زانی کا مزاج بیان کیا ہے فرمایا:

﴿وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ﴾<sup>19</sup>

مشرک اور زانی ایک جیسے ہیں جس طرح مشرک ایک خدا پر بھروسہ نہیں رکھتا، قناعت نہیں کرتا۔ اسی طرح زانیہ عورت ایک مرد پر قناعت نہیں کرتی، مشرک ایک خدا پر بھروسہ نہیں کرتا۔ بدکار آدمی اپنی بیوی پر بھروسہ نہیں کرتا۔

میں کل مطالعہ کر رہا تھا ایک مفسر بڑی عجیب بات لکھتے ہیں: جو واحد ہے وہ کہتا ہے: ”اللہ ہی“ اور مشرک کہتا ہے کہ ”اللہ بھی“ اور پاک دامن عورت کہتی ہے: ”میں تیری ہی ہوں“ اور بدکار عورت کہتی ہے: ”میں تجھ سے بھی پیار کرتی ہوں“، یہ مشرک اور بدکردار کا مزاج ایک جیسا ہے۔

### لفظ نعبد پر عجیب نکتہ:

مومن کہتا ہے: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ ذرا اس پر ایک نکتہ ذہن نشین فرمائیں! ”نعبد“ اور ”نستعين“ جمع کا صیغہ ہے یا واحد کا؟ جب امام نماز پڑھاتا ہے تو کہتا ہے کہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ تب تو سمجھ آتی ہے لیکن جب اکیلے سنتیں پڑھ رہے ہوں تو کہتے ہیں: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ جب تہجد پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ اکیلے ہوتے ہیں یا جمع؟ اکیلے ہوتے ہیں، پھر ”إِيَّاكَ أَعْبُدُ“ کہنا چاہیے کہ میں تیری عبادت کرتا ہوں۔ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کیوں کہتے ہیں؟ ذرا نکتہ سمجھنا! جب ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ اکیلے کہیں تو ذہن میں تصور کیا کریں دنیا میں ایک لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب اللہ کی عبادت کرنے والا کوئی بندہ نہ ہو ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کہہ کے اپنی عبادت کو ملائکہ کے ساتھ شامل کرو اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ ملائکہ، صلحاء، نیک لوگوں کو شامل کرو۔ نتیجہ کیا نکلے گا

جب ”ہم“ کہہ کر اپنی عبادت کو صلحاء کے ساتھ شریک کریں گے، اللہ ان کی عبادت کو قبول کرے گا تو ہماری عبادت کو بھی قبول فرمائے گا۔ یہ تنہائی میں ”نَعْبُدُ“ کا فائدہ ہے۔

### فضائل اعمال کے معترضین سے ایک سوال:

اس میں ایک چھوٹا سا سوال اور کر دیتا ہوں تاکہ بات سامنے آجائے۔ آج میں ساتھیوں کو بتا رہا تھا کہ جامعہ حسینیہ شہداد پور اندرون سندھ سب سے بڑا مدرسہ ہے اور تبلیغی جماعت کا مدرسہ ہے۔ میں جب سندھ جاتا ہوں اس مدرسہ والے میرا بیان بڑے اہتمام سے کرواتے ہیں۔ میں ایک بار وہاں گیا تو مہتمم صاحب ایک حبشی کو لائے اور کہنے لگے کہ یہ لڑکا اہل حدیثوں سے بہت متاثر ہے۔ یہ لڑکا آیا تبلیغ کی وجہ سے تھا، اب فضائل اعمال پر اعتراض کرتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ فضائل اعمال سے کیوں دور ہو گئے؟ اس نے کہا کہ فضائل اعمال پر ہمارے اعتراضات ہیں، اس لیے ہم فضائل اعمال سے کٹ گئے ہیں۔

میں نے کہا میرے کچھ قرآن پر اعتراضات ہیں آپ مجھے اس کا جواب دے سکتے ہیں؟ مجھے کہتا ہے کہ کون سا اعتراض ہے؟ میں نے کہا کہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ یہ اللہ کا کلام ہے؟ کہنے لگا: جی! اللہ کلام ہے۔ میں نے کہا کہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کا کیا معنی ہے؟ کہنے لگا کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ میں نے کہا یہ تب ہو گا جب میں اور آپ قرآن پڑھیں۔ جب اللہ تعالیٰ کہے گا: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ اللہ کسے کہتا ہے میں تیری عبادت کرتا ہوں، اللہ کس سے کہتا ہے کہ میں تجھ سے مدد مانگتا ہوں؟ خدا کا کلام کیسے ہے؟ خدا بندے سے مدد مانگتے ہیں؟ خدا بندے کی عبادت کرتے ہیں؟

مجھے کہتا نہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے اس بات جواب دو! ورنہ قرآن کا انکار کرو! اس نے کہا: اعتراض تو بڑا مضبوط ہے، میں نے کہا جواب دو! اس نے کہا جواب نہیں آتا میں نے کہا تو پھر چھوڑ دو قرآن! کہتا ہے نہیں جی جواب تلاش کریں چھوڑیں کیوں؟ میں نے کہا فضائل اعمال پر اعتراض ہے جواب تلاش کر چھوڑ مت۔

### تبلیغی جماعت کا مزاج:

کہتا ہے یہ تبلیغ والے جواب نہیں دیتے میں نے کہا جواب دینا ان کا کام ہی نہیں ہے، جواب ہمارا کام ہے، ہم سے پوچھیں، دیکھو! جواب ملتا ہے یا نہیں۔ ان کے ذمے فضائل ہیں اور ہمارے ذمے دلائل ہیں، فضائل ان سے لو دلائل ہم سے لو۔

### فضائل اعمال کا علمی دفاع:

میں نے کہا لاؤ جو فضائل اعمال پر اعتراض ہے۔ میں تمہارے ایک ایک سوال کا جواب دیتا ہوں۔ مجھے ایک ساتھی نے بحرین سے فون کیا کہتا ہے کہ ایک مولوی آیا ہے فضائل اعمال میں فلاں فلاں جگہ اعتراض کرتا ہے، میں نے کہا میری اس موضوع پر دو گھنٹے کی مفصل گفتگو سی ڈی میں موجود ہے، انٹرنیٹ پر اپ لوڈ ہے، وہاں سے ڈاؤن لوڈ کر کے سی ڈی بنا کر اسے تقسیم کرو۔

اللہ کی شان ہے وہ بیان کرنے کے لیے گیا، لڑکوں نے میرے اس بیان کو ڈاؤن لوڈ کیا اس کی سی ڈی بنالیں بیان سننے والے جب باہر نکلے تو جو میری سی ڈی فضائل اعمال کے دفاع میں ہیں وہ تقسیم ہو گئیں۔ آئندہ وہ حضرت جب دوبارہ تشریف لے گئے تو تبلیغی جماعت کے خلاف بولنے کی ہمت نہیں ہوئی کیونکہ جواب تو ہم نے دے دیے تھے۔ پھر انہوں نے کہا کہ آپ خود آئیں میرا ان دنوں وہیں کا سفر ہے میں نے کہا پہلے C.D آئی تھی اب ہم آئیں گے اب سارے اعتراضات اکٹھے کرو ہم دیکھتے ہیں کہ کون سا اعتراض ہے جس کا جواب نہیں بنتا۔ میں نے کہا جب اعتراض ہے تو

چھوڑ دو قرآن کو! کہتا ہے کہ جواب تلاش کریں گے میں نے کہا فضائل اعمال پر اعتراض ہے فضائل اعمال نہ چھوڑو جواب تلاش کرو۔

### امام اہل السنۃ رحمہ اللہ کا جواب:

اب ذرا اس سوال کا جواب سمجھے سوال سمجھ گئے؟ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ یہ کلام کس کا ہے؟ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کا معنی ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ میں چھوٹا تھا وہاں حفظ کرتا تھا ہم نے اس وقت شیخ امام اہل السنۃ شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ سے جواب سنا تھا شیخ فرما رہے تھے جیسے ایک بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے اور ہیڈ ماسٹر بچے کو سمجھاتا ہے بچے جب تمہیں چھٹی چاہیے تو درخواست لکھنا:

بخدمت جناب ہیڈ ماسٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ، میرے چچا کی شادی ہے مجھے دودن کی رخصت عنایت فرمائیں۔ نیچے اپنا نام لکھ دو۔ اب کہتا ہے بخدمت جناب ہیڈ ماسٹر صاحب... لکھتا کون ہے؟ خود لکھ رہا ہے۔ استاذ فرماتے ہیں اس سے پوچھو بخدمت جناب ہیڈ ماسٹر صاحب کیوں لکھا ہے؟ یہ خود کیوں؟ چھٹی لینا چاہتا ہے؟ کیا چھٹی تو نہیں لینا چاہتا؟ پھر یہ کیوں کہہ رہا ہے بخدمت جناب ہیڈ ماسٹر صاحب میرے چچا کی شادی ہے مجھے دودن کی چھٹی چاہیے؟ کس ہیڈ ماسٹر کے چچا کی شادی ہے؟

استاذ فرمانے لگے یہ اعتراض تب تھا جب ہیڈ ماسٹر یہ درخواست اپنے لیے لکھتا، ہیڈ ماسٹر نے لکھی ہے لیکن اپنے لیے نہیں بچے کے لیے لکھی ہے۔ اسی طرح ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ پر اعتراض تب تھا جب اللہ کا کلام اللہ کے لیے ہوتا، یہ اللہ کا کلام بندے کے لیے ہے کہ جب تم پڑھو تو ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ پڑھو۔ میں نے کہا کہ بتاؤ کون سا اعتراض باقی رہ گیا؟



## صراط مستقیم کا معنی:

﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ اللہ ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔ ایک ہوتا ہے سیدھا راستہ دکھا دینا اور ایک ہوتا ہے سیدھے راستے پر چلا دینا۔ ہدایت کا ایک معنی دکھانا ہے جس کو عربی میں إِرَاقَةُ الظِّلِّیقِ کہتے ہیں راستہ دکھانا۔ ہدایت کا دوسرا معنی ایصالِ إلى المطلوب ہے یعنی سیدھے راستے پر چلا دے۔ ہم یہ نہیں کہتے اللہ ہمیں سیدھا راہ دکھا دے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ اے اللہ ہم کو سیدھے راستے پر چلا دے۔

## اہل السنۃ کی پہچان؛ راہِ اعتدال:

میں اکثر آپ کی خدمت میں اختصار کے ساتھ بات عرض کرتا ہوں کہ صراط مستقیم نام ہے راہِ اعتدال کا۔ نہ افراط، نہ تفریط، نہ تجاوز، نہ کمی۔ درمیانے راستے کا نام اعتدال ہے۔ بعض حد سے گزر جاتے ہیں بعض حد سے اتر جاتے ہیں۔ اہل السنۃ والجماعۃ حد سے گزرتے بھی نہیں اور حد سے اترتے بھی نہیں بلکہ حد پر رہتے ہیں اس کا نام صراط مستقیم ہے۔ میں دو چار مثالیں دیتا ہوں۔

◆ ایک بندہ کہتا ہے کہ خدا عرش پر ہے، ہر جگہ حاضر نہیں، ایک بندہ کہتا ہے اللہ بھی ہر جگہ پر اللہ کے نبی بھی ہر جگہ پر۔ صراط مستقیم کیا ہے اللہ ہر جگہ پر نبی مدینے میں اور نبی کا فیض ہر جگہ پر ہے۔

◆ ایک بندہ کہتا ہے کہ ننگے سر پھرو! دوسرا کہتا ہے کہ نہیں سر پر پگڑی باندھنی ہے اور سبز ہی باندھنی ہے جو انکار کرے وہ بھی غلط اور سبز کی شرط لگائے وہ بھی غلط۔ صراط مستقیم کیا ہے: پگڑی باندھو! سفید باندھ لو، سبز باندھ لو، کالی باندھ لو، جو میسر ہو وہ باندھ لو یہ صراط مستقیم ہے۔

◆ ایک بندہ کہتا ہے کہ دو ہاتھ سے مصافحہ نہ کرو ایک ہاتھ سے کرو اس نے دو ہاتھ کو چھوڑ دیا۔ ایک کہتا ہے کہ نہیں مصافحہ بھی کرو اور ساتھ گھٹنے بھی ٹیکو۔ یہ دونوں

غلط ہیں۔ صراط مستقیم کیا ہے دوہاتھ سے مصافحہ کرو مگر گھٹنے مت ٹیکو۔

♦ ایک بندہ کہتا ہے کہ تراویح 20 نہیں 8 پڑھو وہ پوری بارہ تراویح کھا گیا۔  
ایک کہتا ہے کہ نہیں 20 رکعات تراویح بھی پڑھو اور بعد میں اجتماعی دعا بھی ضرور کرو۔ ہم کہتے ہیں تراویح 20 پڑھو دعا اپنی مانگ لو یا امام کے ساتھ مانگ لو یہ آپ کی مرضی ہے۔ یہ صراط مستقیم ہے۔

♦ ایک بندہ کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے پر جاؤ اور سلام عرض کرو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تب بھی نہیں سنتے اور دوسرا کہتا ہے نہیں یہاں سے پکارو تب بھی سنتے ہیں، یہ دونوں غلط کہتے ہیں۔ صراط مستقیم کیا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے پر جاؤ تو وہ خود سنتے ہیں اور یہاں سے پڑھو تو ان کی خدمت میں فرشتے پہنچا دیتے ہیں یہ صراط مستقیم ہے۔

### انعام یافتہ لوگوں کا طبقہ:

﴿لَاهِدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ اللہ ہم کو صراط مستقیم پر چلا دے۔  
﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ اللہ نے فرمایا: یہ صراط مستقیم کن کا راستہ ہے؟  
ان لوگوں کا راستہ جن پر خدا نے انعام کیا۔ آپ حضرات پڑھے لکھے ہیں ہمیں تعجب ہے کہ لوگ اتنے ان پڑھ قرآن کے بارے میں کیوں بن جاتے ہیں؟ بتاؤ خدا نے صراط القرآن فرمایا؟ صراط الحدیث فرمایا؟ مجھے قرآن و حدیث کے راستے پر چلا۔ نہیں بلکہ فرمایا: ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ مجھے انعام یافتہ لوگوں کے راستے پر چلا۔

### بزرگوں والا راستہ:

مجھے ایک ساتھی کہنے لگا: یہ جو رائیونڈ والے (تبلیغی جماعت والے) کہتے ہیں

کہ ہم نے بزرگوں سے سنا ہے، ہمارے بزرگ یوں فرماتے ہیں، بزرگوں کے نقش قدم پر چلو۔ یہ کیا بزرگ؛ بزرگ لگا رکھا ہے یہ کہاں لکھا ہے؟ میں نے کہا کہ قرآن کریم میں لکھا ہے: کہتا ہے جی کہاں؟ میں نے کہا کہ سورۃ فاتحہ میں لکھا ہے۔ کہتا ہے جی کدھر؟ میں نے کہا: ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ آگے کیا ہے؟ ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ اے اللہ! ہمیں صراط مستقیم پر چلا۔ کیا مطلب؟ ان کے راستے پر چلا جن پر تو نے انعام فرمایا اور بزرگ اسے کہتے ہیں جس پر خدا نے انعام کیا ہو۔ بزرگوں والا راستہ تو خدا نے قرآن میں بتایا ہے۔

### انعام یافتہ چار طبقات:

اور یہ کتنے طبقات ہیں؟ چار۔

1. انبیاء کرام
2. صدیقین
3. شہداء
4. صالحین اور اولیاء

یہ چار طبقے ہیں جن پر خدا نے انعام فرمایا۔

### ہم سنی چاروں کو مانتے ہیں:

اب ذرا نکتہ سمجھنا میں کہتا ہوں ان چاروں طبقات کو ہم سنی مانتے ہیں ہم دیوبند والے مانتے ہیں۔ باقی کوئی بھی ان چاروں کو نہیں مانتا۔ کیوں؟ مرزائیوں کو دیکھو وہ انبیاء سے نکل گئے ہیں، انہوں نے اس بے ایمان کو مانا جو نبی ہی نہیں۔ جن پر خدا نے انعام کیا پہلا طبقہ کون سا ہے انبیاء کا مرزائی نکل گئے کیوں؟ وہ تو نبی کو نبی نہیں مانتے غیر نبی کے پیچھے پڑے ہیں۔

صدیقین سے رافضی نکل گئے کیونکہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نہیں مانتے وہ بھی نکل گئے۔ شہداء، اس سے اہل بدعت نکل گئے۔ شہادت سے ڈرتے ہیں۔ صالحین، اس سے وہ دوڑ گئے جو اولیاء کو نہیں مانتے۔

◎ انبیاء سے مرزائی نکل گئے۔

◎ صدیقین سے رافضی نکل گئے۔

◎ شہداء سے بدعتی نکل گئے۔

◎ اور اولیاء سے غیر مقلد نکل گئے۔

اور ہم سنی سب کو مانتے ہیں ہم دیوبند والے سب کو مانتے ہیں۔

★ انبیاء کو بھی مانتے ہیں۔

★ صحابہ کو بھی مانتے ہیں۔

★ شہداء کو بھی مانتے ہیں۔

★ اور اولیاء کو بھی مانتے ہیں۔

دیکھو سیدھا راستہ خدا نے ہمیں عطا فرمایا ہے پھر تم دل چھوٹا کیوں کرتے ہو؟  
دل چھوٹا نہ کرو دل بڑا رکھا کرو۔ خدا نے تمہیں صراطِ مستقیم پر رکھا ہے۔

**گمراہ اور مغضوب طبقہ:**

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ اے اللہ! ان کے راستے

پر چلا جن پر تو نے انعام فرمایا اللہ ان سے بچالے جن پر تیرا غضب ہے اور اللہ جو گمراہ ہوئے، ان سے بھی ہماری حفاظت فرما۔ "مغضوب" سے مراد یہودی ہیں اور "ضالین" سے مراد نصرانی عیسائی ہیں۔ کیوں؟

مغضوب اسے کہتے ہیں جس کے پاس علم ہو لیکن ضد کی وجہ سے نہ مانے۔

گمراہ اور ضال اسے کہتے ہیں جو بے چارہ جہالت کی وجہ سے نہ جانے۔

## ضد اور جہالت سے حفاظت:

یہودیوں کے پاس علم تھا لیکن ساتھ ضد شامل تھی اور نصاریٰ کے پاس علم نہیں تھا جہالت تھی۔ اللہ ہمیں مغضوب سے بھی بچائے اور ضال سے بھی۔ اللہ ہمیں ضد سے بھی محفوظ رکھے اور جہالت سے بھی محفوظ رکھے۔

## امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے کا مسئلہ:

آخر میں دو مسئلے ہیں: سورۃ فاتحہ امام کے پیچھے پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ اہل السنۃ والجماعہ کا مذہب یہ ہے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ اس پر دلیل قرآن کریم میں ہے:

﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾<sup>20</sup>

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

أَجْمَعَ النَّاسُ عَلَى أَنَّهَا نَزَلَتْ فِي الصَّلَاةِ.<sup>21</sup>

امت کا اجماع ہے یہ آیت نماز کے بارے میں اتنی کہ جب نماز کے لیے امام قرآن پڑھے تو تم قرآن سنا بھی کرو اور تم چپ بھی رہا کرو۔

## سننا اور چپ رہنا دو حکم ہیں:

سنو بھی اور چپ بھی رہو۔ اللہ نے کتنے حکم دیے؟ دو۔

❖ سننا بھی کرو۔

❖ چپ بھی رہا کرو۔

سنا کرو، چپ رہا کرو یہ دو حکم کیوں دیے ہیں؟ کیونکہ نمازیں دو قسم کی ہیں۔

20- الاعراف 204:7

21- مجموع الفتاویٰ لابن تیمیہ: ج 22 ص 150

نمبر 1: جہری      نمبر 2: سری

### جہری اور سری نماز:

جس میں امام اونچی آواز سے قرأت کرے یہ ”جہری“ نماز ہے۔ جیسے فجر، مغرب اور عشاء اور جس میں امام قرأت آہستہ کرے یہ ”سری“ نماز ہے۔ جیسے: ظہر، عصر۔

کیونکہ نمازیں دو قسم کی ہیں اللہ نے بھی دو حکم دیے۔ اب بتاؤ جو آدمی سامنے سے بولے اس کو سننے والا تو نہیں کہتے، سننے والا اسے کہتے ہیں جو چپ رہے۔ تو جب امام کی آواز آئے ﴿فَاسْتَمِعُوا لِلَّهِ﴾ سنا کرو اور ظہر، عصر میں جب آواز نہ آئے اب تم سن نہیں سکتے لیکن چپ تم نے اب بھی رہنا ہے۔ یہ سننے کا حکم جہری نمازوں کے لیے ہے ان جہری نمازوں میں چپ تو رہنا ہی ہے۔ اور چپ رہنے کا حکم سری نمازوں کے لیے ہے۔ نمازیں دو قسم کی تھیں خدا نے دونوں حکم عطا فرما دیے۔ جہری میں ﴿فَاسْتَمِعُوا﴾ اور سری نماز میں ﴿أَنْصِتُوا﴾ آواز نہیں آسکتی چپ تم نے اب بھی رہنا ہے۔ اس بارے میں ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو سورۃ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے۔

### آمین آہستہ کہنے کا مسئلہ:

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جب امام ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کہے تو مقتدی کو آمین کہنی چاہیے مقتدی اونچی آواز میں آمین نہ کہے۔

### آمین: دعا ہے یا اللہ کا نام ہے:

اس پر میں دلیل خفیوں کے عالم کی نہیں دیتا۔ امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ جو شافعی المسلک ہیں، فرماتے ہیں یہ جو آمین ہے یا تو ”اللہ کا نام“ ہے یا آمین ”دعا“ ہے،

دونوں پر دلیلیں پیش کیں ہیں۔

[1]: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"آمِينَ" اِسْمٌ مِنْ اَسْمَاءِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ" <sup>22</sup>

آمین اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

[2]: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی اور حضرت ہارون علیہ السلام نے آمین

کہی۔ قرآن کہتا ہے: ﴿قَدْ اُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا﴾ <sup>23</sup>

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو بھی دعا کہا ہے اور ہارون علیہ السلام کی

آمین کو بھی دعا کہا ہے۔ اس سے پتا چلا کہ آمین دعا ہے۔

صحیح بخاری میں امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَقَالَ عَطَاءٌ: آمِينَ دُعَاءٌ" <sup>24</sup>

امام عطاء رحمہ اللہ جلیل القدر تابعی ہیں، انہوں نے فرمایا: آمین دعا ہے۔

**آمین آہستہ کہنے کا استدلال:**

معلوم ہوا کہ آمین اللہ کا نام ہے یا دعا ہے۔ اگر اللہ کا نام ہو تو قرآن کریم میں

ہے: ﴿وَادْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرَّعًا وَخِيْفَةً﴾ <sup>25</sup> اللہ کا نام لو تو آہستہ لیا کرو۔

اگر یہ آمین دعا ہے تو قرآن کریم کہتا ہے:

22- مصنف عبد الرزاق: ج 2 ص 64 رقم الحدیث 2653

23- یونس 89:

24- صحیح البخاری: کتاب الاذان، تحت باب جہر الامام بالتأمین

25- الاعراف 205:

﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾<sup>26</sup>

اللہ سے دعا آہستہ مانگو۔

امام رازی رحمہ اللہ نے بڑی عجیب بات کہی ہے، فرماتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ میں شافعی ہوں لیکن اس مسئلے پر قرآن، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ساتھ ہے۔ اگر آمین دعا ہے تب بھی اصل آہستہ ہے، اگر آمین اللہ کا نام ہے تب بھی ذکر آہستہ ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں شافعی ہونے کے باوجود کہ اس مسئلے پر میں کہتا ہوں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا موقف بالکل درست ہے۔<sup>27</sup>

اس لیے ہم حنفی کہتے ہیں جب امام ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کہے تو مقتدی کو آمین آہستہ کہنی چاہیے، مقتدی کو آمین اونچی آواز سے نہیں کہنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو شریعت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



## سورة البقرة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْم ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۙ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ۙ الَّذِيْنَ

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ۙ﴾

تمہید:

آپ حضرات کے علم میں ہے کہ گزشتہ درس قرآن کا عنوان تھا سورۃ الفاتحہ۔ ہم اس پر مسلسل مشورہ کرتے رہے کہ درس قرآن کی ترتیب کیا بنائیں؟ اگر ایک رکوع کو لے کر چلتے ہیں تو سورۃ البقرہ میں ہی کئی سال گزر جانے ہیں اور سورۃ البقرہ نے ختم نہیں ہونا۔ اس لیے سب سے بہتر اور مناسب حل یہ تجویز کیا کہ ہم ماہانہ درس قرآن میں پوری سورۃ کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کریں۔

سورۃ الفاتحہ کی سات آیات میں نے آپ کے سامنے پیش کی تھیں۔ سورۃ البقرہ کا آج پورے اڑھائی پارے کا خلاصہ میں آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اس لیے کہ سورۃ البقرہ میں 286 آیات اور 40 رکوع ہیں۔ اب اگر ایک ایک رکوع کو بیان کریں تو 40 مہینے اس کے لیے چاہئیں۔ آپ خود اندازہ فرمائیں مزید کتنے سال لگیں گے۔ اس لیے پھر یہ مناسب سمجھا کہ پوری سورۃ کا خلاصہ اختصار کے ساتھ ایک گھنٹے میں بیان کر دیں۔

## عقائد و نظریات ..... اہم پہلو:

آپ سمجھتے ہیں میرا خاص موضوع ہے عقائد اور نظریات پر کام کرنا، میں عقائد اور نظریات کے حوالے سے جتنے مسائل ہیں اس پر عرض کروں گا باقی سارے مسائل کو بیان کرنا تو بہت مشکل ہے، ایک گھنٹے میں آدمی سورۃ البقرہ کی تلاوت کرے تو وہ پوری نہیں ہوتی، اس میں پورے مضامین کیسے بیان کیے جاسکتے ہیں؟

## سورۃ البقرہ کی بنیادی معلومات:

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے الجامع لاحکام القرآن میں ابن عربی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ سورۃ البقرہ میں:

❁ 1000 اوامر ہیں۔

❁ 1000 نواہی ہیں۔

❁ 1000 حکمتیں ہیں

❁ 1000 اخبار اور قصص ہیں۔<sup>28</sup>

## صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سورۃ البقرہ:

سورۃ البقرہ کتنی اہم سورۃ ہے؟ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سورۃ البقرہ کو بارہ سال میں حفظ کیا ہے اور ان کے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو آٹھ سال لگے۔<sup>29</sup>

وہ سورۃ البقرہ جتنی سمجھتے تھے اتنی یاد کر لیتے تھے سمجھتے بھی تھے اور یاد بھی کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سورۃ البقرہ کے حفظ سے فارغ ہوئے تو ایک

28۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج 1 ص 80

29۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج 1 ص 80

اونٹ ذبح کر کے دعوت کی تھی۔<sup>30</sup>

## ختم قرآن پر چندہ کی رسم:

مجھے بعض ساتھی کہنے لگے: ادھر آپ منع کرتے ہیں کہ قرآن مجید ختم کریں تو مٹھائی تقسیم نہ کریں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مثال بھی دیتے ہیں؟ میں نے کہا ہم منع کرتے ہیں کہ ان سے چندہ جمع نہ کریں خود تقسیم کریں تو کون منع کرتا ہے؟ یہ دس دس روپے جمع نہ کریں کہ قرآن کا ختم ہے، دس دس روپے دے کریں قرآن کی توہین، بے عزتی اور تذلیل نہ کریں۔ ہاں کسی کو اللہ توفیق عطا کرے وہ کہے جی میں قرآن ختم کرتا ہوں اور اس پر مٹھائی کھلائے کون منع کرتا ہے؟

## ختم قرآن کی خوشی:

میں الحمد للہ ہر سال قرآن مجید ختم کرتا ہوں اور کہیں سے بھی شروع کروں میرا 29 ویں رات کو ختم قرآن اپنے مرکز اہل السنۃ والجماعۃ سرگودھا میں ہوتا ہے میں اپنی جیب سے تمام آنے والے حضرات کی مٹھائی کے ساتھ خاطر تواضع کرتا ہوں، مجھے خوشی ہوتی ہے اور میں خوشی کا اظہار بھی کرتا ہوں۔ کبھی اس پر نہ ہم نے چندہ کیا ہے اور نہ ہی اپنے ختم قرآن کے لیے اللہ کبھی چندہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اپنی جیب سے لگانے کی عادت ڈالنی چاہیے، اس کا بہت فائدہ ہوتا ہے۔

## درس قرآن کے لیے محنت:

خیر میں عرض کر رہا تھا کہ سورۃ البقرہ مضامین کے حوالے سے اتنی اہم سورۃ ہے اس میں تین چار باتیں میں نے آپ لوگوں کو سمجھانی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے صحیح سمجھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں صرف توجہ دلانے کے لیے عرض کرتا ہوں اس پر

کتنی محنت کرنی پڑتی ہے؟ یقین فرمائیں آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ اس کی تیاری کے لیے میں رات چار بجے تک جاگا ہوں، چار بجے کے بعد کتنا وقت بچتا ہے؟ ڈیڑھ گھنٹا سويا، ساڑھے پانچ بجے پھراٹھ گیا، پھر آدھا گھنٹا سويا، پھر کام شروع کیا، آپ کا ایک درس ہے میں نے صبح ساڑھے نو بجے الگ بیان کیا ہے، جمعہ کا الگ بیان کیا ہے، پھر چناب نگر کانفرنس کا آخری بیان الگ کیا ہے یہ چوتھی جگہ میرا درس قرآن ہے۔

### درس قرآن کا انداز:

یہ درس قرآن میں بڑا دھیمادھیمادیتا ہوں اس لیے کہ میں نے خطابت والا درس دیا تو تمہاری مسجد کے نمازی کہیں گے یہ عید گاہ تو نہیں ہے یہ مسجد عثمانیہ ہے۔ مولانا صاحب کو سمجھاؤ! سیدھی سیدھی تقریر کرے تو اس لیے میں آپ حضرات کی بہت رعایت کرتا ہوں۔ لیکن مجھے اتنا دکھ ہوتا ہے کہ بعض حضرات اس رعایت کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بندے کو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی؟ خیر ہمیں اللہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

### دکھ برداشت کرنے پر نصرت خداوندی:

جب آدمی کو دکھ ہوتا ہے اور پھر دکھ کا جواب نہ دے تو اس پر اللہ کی مدد اور نصرت بہت زیادہ آتی ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ایک دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ کی کسی بات پر آپس میں ناخوشگوار بات ہوئی اور تکرار شروع ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے مسکرا رہے تھے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تھوڑی دیر بعد تکرار کا جواب دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑا سا ناراضگی کا اپنے چہرے مبارک سے اظہار فرمایا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ عرض کیا: حضور! پہلے آپ مسکرا رہے تھے، پھر آپ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّهُ كَانَ مَعَكَ مَلَكٌ يُؤَدُّ عَنْكَ فَلَمَّا رَدَدْتَ عَلَيْهِ بَعْضَ قَوْلِهِ وَقَعَ

الشَّيْطَانُ." 31

جب تو چپ تھا تو فرشتہ تیری بات کا جواب دے رہا تھا اور جب تو نے جواب دینا شروع کیا تو شیطان پڑ گیا۔ کیا مطلب؟ کہ اب فرشتہ چلا گیا اور اب شیطان خوش ہو رہا ہے۔

تو میں مسکرا اس لیے رہا تھا کہ تیرا دفاع فرشتہ کرتے ہیں اور تجھے اپنا دفاع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

### مخالفین کے پروپیگنڈے:

یہ اتنی انوکھی بات نہیں کہ میں تمہیں نہ بتاؤں ابھی چند دن پہلے میں گرفتار ہوا، پھر لوگوں نے احتجاج کیا تو تین دن بعد رہا ہوا۔ اب مجھے اتنا دکھ ہوا کہ بتا نہیں سکتا سرگودھا میں ایک مستقل طبقہ لگا ہوا ہے کہتا ہے کہ جی لیڈر بننے کی خاطر تین دن جیل میں رہا۔ میں نے کہا ایک دن تو بھی ادھر چلا جاتا کہ تجھے پتا چلے یہ کتنا مشکل کام ہے۔ میں نے کہا میں تو شہرت کا بھوکا تھا یہ جو روڈ پر نکلے تھے ان کو کیا ہوا تھا؟ ان کو کون سی شہرت چاہیے تھی؟

یقین کرو! بندے کو اتنا دکھ ہوتا ہے۔ تین سال قبل رات کو میں سندھ سے آ رہا تھا، فائرنگ ہوئی، میرے ڈرائیور کو گولیاں لگیں، دونوں بازوؤں سے کراس کر گئیں، اللہ نے مجھے بچا لیا میں اپنی سیٹ پر سویا ہوا تھا۔ اور پروپیگنڈا دیکھیں۔ میں جدہ گیا، مجھے وہاں کے ایک ساتھی نے کہا: لوگ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب نے ڈرائیور کو گولیاں مروائی ہیں لیڈر بننے کے لیے میں نے کہا حاشا وکلا اللہ معاف فرمائے، کوئی حد

ہوتی ہے پروپیگنڈے کی!

### عقائد کی محنت جاری رہے گی:

خیر میں صرف یہ گزارش کرتا ہوں کہ جب صحیح عقیدے پر محنت ہو تو یہ پروپیگنڈا ہوتا ہے اور اس پروپیگنڈے کو ہم نے برداشت کرنا ہے اور عقیدے کی محنت جاری رکھنی ہے ان شاء اللہ، عقیدے کی محنت ہم چھوڑ نہیں سکتے۔ خیر میں مضمون آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، اللہ ہمیں سمجھانے کی توفیق عطا فرمائے، سمجھ آئے تو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

### سورۃ البقرہ نام رکھنے کی وجہ؟:

پہلی بات یہ سمجھیں کہ سورۃ البقرۃ کا نام ”البقرۃ“ کیوں ہے؟ ”بقرۃ“ عربی زبان میں کہتے ہیں ”گائے“ کو، کیونکہ اللہ رب العزت نے اس سورۃ میں گائے کا ایک بہت اہم واقعہ بیان فرمایا ہے، اس ذکر کی وجہ سے اس سورۃ کا نام ”سورۃ البقرۃ“ ہے یعنی گائے والی سورۃ ہے۔ اب عید آ رہی ہے نا اور اس کو بعض لوگ عید الاضحیٰ بھی کہتے ہیں اور بعض بڑی عید بھی کہتے ہیں چونکہ تین دن کی ہے نا، اور بعض لوگ بقرہ عید بھی کہتے ہیں، کیونکہ گائے ذبح ہوتی ہے، تو بقرہ کا معنی گائے ہے، چونکہ اس سورۃ میں گائے کا ذکر ہے، اس لیے اس کو ”سورۃ البقرۃ“ کہتے ہیں۔

### سورۃ الفاتحہ کے مضامین سے ربط:

دوسری بات سمجھیں۔ سورۃ البقرہ کا پچھلی سورۃ سے ربط کیا ہے؟ کوئی بھی آدمی جب فصاحت کے ساتھ گفتگو کرتا ہے اس کے کلام میں ربط ہوتا ہے بے ربط گفتگو نہیں ہوتی تو اللہ کا کلام کیسے بے ربط ہو سکتا ہے؟ سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ البقرہ کیوں ہے اور ان کا آپس میں تعلق کیا ہے؟ سورۃ الفاتحہ اس پر ختم ہے ہم نے اللہ سے

دعانا کی تھی ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ اللہ ہمیں صراط مستقیم پر چلا دے، ہدایت کی دعانا کی تھی اس کا آگے جواب آیا ﴿لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ جو تم نے ہدایت کی دعانا کی تھی ہم تمہیں ہدایت کے مضمون دے دیتے ہیں ان مضامین پر عمل کرو گے تو تمہیں صراط مستقیم یعنی ہدایت مل جائے گی، ان مضامین کو چھوڑ دو گے تو تمہیں صراط مستقیم نہیں ملے گی۔ یہ سورۃ الفاتحہ کا سورۃ البقرہ کے ساتھ ربط ہے۔

### سورۃ البقرہ کے فضائل:

تیسری بات سمجھیں سورۃ البقرہ کے فضائل کیا ہیں؟ ہر سورۃ کے اپنے فضائل ہیں قرآن کریم کے فضائل تو ہیں ہی لیکن ہر سورۃ کے الگ الگ فضائل ہیں۔ اس وقت دو فضیلتیں ذہن نشین فرمائیں۔

### پہلی فضیلت:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ مَقَابِرَ."

لوگو! گھروں کو قبرستان مت بناؤ!

کیا مطلب کہ اپنے گھروں میں قرآن کی تلاوت کیا کرو! مردے قرآن کی تلاوت نہیں کرتے، تم قرآن کی تلاوت کیا کرو! اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْفِرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِي تُقْرَأُ فِيهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ."<sup>32</sup>

جس گھر میں سورۃ البقرہ کی تلاوت ہو اس گھر سے شیطان دوڑ جاتا ہے۔ اب

بتاؤ! اس سے بڑی فضیلت کیا ہو سکتی ہے؟

- ◎ خاوند اور بیوی کی لڑائی کیوں ہے؟ شیطان کی وجہ سے۔
  - ◎ داماد اور سرسر میں لڑائی کیوں ہے؟ شیطان کی وجہ سے۔
  - ◎ والدین اور اولاد میں لڑائی کیوں ہے؟ شیطان کی وجہ سے۔
  - ◎ بھائیوں کی آپس میں لڑائی کیوں ہے؟ شیطان کی وجہ سے۔
- جب شیطان گھر سے دوڑ جائے گا پھر ظاہر ہے یہ لڑائیاں ختم ہو جائیں گی۔  
اگر شیطان گھر میں رہے گا تو لڑائیاں کیسے ختم ہو سکتی ہیں؟

### تصویر اور ٹی وی کی نحوست:

لاہور میں ہمارے رشتے دار تھے، میں ان کے گھر گیا تو انہوں نے مجھے کہا الیاس! تو چیک شیک وی کر لینداں اس؟ یعنی تعویذ دھاگہ کر لیتے ہو؟ میں نے کہا: کوئی ضرورت ہو تو دیکھ لیتے ہیں۔ میرا یہ پیشہ اور مزاج نہیں ہے جیسے میں خواب کی تعبیر بتاتا ہوں لیکن مستقل یہ کام نہیں کرتا کیونکہ لوگ خوابوں کی تعبیر پوچھتے ہیں اور مسئلہ پوچھنا چھوڑ دیتے ہیں اور میں تعویذ بہت کم دیتا ہوں کیونکہ لوگ جب بھی آتے ہیں تو تعویذ ہی لیتے ہیں مسائل نہیں پوچھتے۔ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ عقیدے اور مسائل کی باتیں کریں۔ میں نے کہا چلیں ٹھیک ہے کوئی وجہ تو بتائیں؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے گھر میں کچھ اثرات ہیں، ہمیں بعض لوگوں نے بتایا۔ میں نے کہا کہ دیکھو تم نے سامنے گھر میں تصویریں لٹکا رکھی ہیں اور جس گھر میں تصویریں ہوں اس میں رحمت کا فرشتہ نہیں آئے گا تو اس میں شیطانی اثرات تو ہوں گے۔ آپ سب سے پہلے تصویریں نکالیں اور گھر سے ٹی وی کو خیر باد کہیں۔

### گناہوں سے پرہیز:

اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میٹھی چیز چھوڑنی ہی نہیں ہم نے، چینی بھی نہیں



چھوڑنی، رس گلے، گلاب جامن بھی نہیں چھوڑنے اور کہتے ہیں کہ میری شوگر کا علاج کرو۔ اب ایسے کون علاج کرے گا؟ بلکہ کہا جائے گا کہ پرہیز کرو پھر علاج ہو گا اس لیے لوگ ہم سے علاج نہیں کرواتے کہ ہمارا پرہیز بہت سخت ہوتا ہے۔ آپ سخت پرہیز کا اہتمام کریں تو اللہ پاک گھروں میں محبتیں پیدا کر دیں گے۔

### گھریلو نظام زندگی اور تعداد ازواج:

میں آپ سے کئی باتیں بڑی بے تکلفی سے کہہ دیتا ہوں کہ دیکھو آپ سے ایک بیوی نہیں سنبھلتی، میری تین ہیں اور کوئی لڑائی نہیں ہے۔ میں نے چھپ کے اور چوری نکاح نہیں کیا۔ جب بھی نکاح کیا ہے تو آپ کو مٹھائی کھلائی ہے، اب دعا کرو چوتھی ہو جائے ہم پھر آپ کو مٹھائی کھلائیں گے۔

### ہندوانہ مزاج اور دوسری شادی:

آپ مذاق سمجھتے ہیں، میں مذاق نہیں سمجھتا، میری مذاق کرنے کی عادت نہیں آپ میرے ہزاروں بیانات سنیں ان میں آپ کو کہیں لطیفے، مذاق اور بے ہودگی نہیں ملے گی۔ میں اس لیے اس پر زور دیتا ہوں کہ یہ ہندوؤں کا مزاج ہے دوسری شادی کے نام پہ چڑنا، آپ نہ کر سکیں مگر کم از کم اس کو اچھی نگاہ سے تو دیکھیں۔

### نکاح عبادت ہے، عیاشی نہیں:

کفار کے ہاں نکاح عیاشی کا نام ہے اور مسلمان کے ہاں نکاح عبادت کا نام ہے۔ کیونکہ ہم اس کو عیاشی سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ جی فلاں بندے نے دو زنانیاں رکھی ہوئی ہیں، بھائی یہ عبادت ہے عیاشی تھوڑی ہے۔ ایک آدمی تہجد پڑھتا ہے، نوافل، اشراق، اداہین بھی پڑھتا ہے آپ اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یا ذلت کی نگاہ سے؟ لیکن جو دوسرا نکاح کرے تو اس کو عیاشی کی نگاہ سے کیوں دیکھتے ہو؟

## رسوم و رواج کا خاتمہ... علماء کے عمل سے:

میں گزارش کرتا ہوں کہ وہ کام جس کو عوام عیب دار سمجھے عالم اور مقتدا کے ذمے ہے کہ وہ کام کرے اور اپنے عمل سے عیب کو توڑے یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ میں نے تیسرا نکاح کیا ہے۔ میری بیوی مجھ سے پانچ سال بڑی ہے، بیٹی اس کی شادی شدہ ہے، بچے اس کے جوان ہیں، اب بتاؤ! اپنے سے بڑی عمر والی بیوہ سے کوئی شادی کرتا ہے؟ لیکن ہم نے کی ہے۔ امت کے رسم کو عمل کے ساتھ مٹاؤ، کیوں؟ جو دین دار ہوں گے وہ خوش ہوں گے اور جو بے دین ہوں گے وہ ناراض ہوں گے۔

## بے دین لوگوں کی ناراضگی:

بے دین ناراض ہو جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے؟ کبھی بھی احوال کی پرواہ نہ کریں اور جب قوم کا مقتدا حالات کی وجہ سے شریعت پر عمل نہ کرے تو اس قوم کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اس لیے علماء کی ذمہ داری ہے عمل کے ساتھ قوم کو سمجھائیں۔

## دل جیتنے کے گر:

میں یہ بات کہہ رہا تھا یہ مسائل مشکل نہیں ہیں۔ میں ابھی یہاں کھانا کھا کر پہنچا ہوں، بھائی اشرف کے گھر سے انہوں نے کباب بنائے تھے۔ میں نے کہا: ہمیں مت کھلاؤ، اسے پیک کرو۔ کہتا ہے: کیوں؟ میں نے کہا: وہ جو خوش ہوتی ہیں نا! ان کی خوشی یہی راز ہوتا ہے وہ کہیں گی کہ ہمارا خاوند کتنا اچھا ہے؟ خود نہیں کھائے ہمارے لیے لے کر آگیا ہے۔ کچھ جملے ایسے ہوتے ہیں جو بیوی کا دل جیت لیتے ہیں اور بعض بیوی کے چھوٹے جملے خاوند کا دل جیت لیتے ہیں اور بعض جملے استاذ کا دل جیت لیتے ہیں اور بعض چھوٹے جملے شاگرد کا دل جیت لیتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے جملے بھی کہنا سیکھا کرو۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

## جنات اور آسب سے حفاظت:

چلو خیر میں بات کر رہا تھا سورۃ البقرہ کے فضائل کیا ہیں؟ ایک فضیلت میں نے عرض کی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس گھر میں سورۃ البقرہ کی تلاوت ہو اس گھر سے شیطان دوڑ جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: سورۃ البقرہ میں دس آیات ایسی ہیں اگر آدمی سوتے وقت پڑھ لے تو نہ اس گھر میں شیطان آسکتا ہے نہ اس گھر میں جن آسکتا ہے نہ اس گھر میں رات کو مصیبت آسکتی ہے۔ اگر مجنوں پر بھی یہ آیتیں پڑھ کر دم کر دی جائیں تو اللہ شفا دیتے ہیں۔ بتاؤ اس سے بڑی فضیلت کیا ہو سکتی ہے؟

## سورۃ البقرہ کی دس منتخب آیات:

لیکن افسوس کہ آج کے مسلمان کو قرآن پر اعتماد نہیں رہا، خود پڑھو اور دم کرو لیکن اعتماد کے ساتھ۔ یہ آیتیں کون سی ہیں؟ چار آیتیں بالکل شروع میں اور تین درمیان میں ہیں۔ ایک آیت الکرسی اور آیت الکرسی کے بعد والی دو آیتیں، کتنی ہو گئیں؟ چار اور تین سات، اور تین سورۃ البقرہ کی آخری آیتیں، یہ دس ہو گئیں۔

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے بعض اکابر کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ بڑا ہی بد بخت آدمی ہو گا جو سوتے وقت سورۃ البقرہ کی دس آیتوں کی تلاوت نہ کرے۔ تو آج سے اہتمام کرو جن کو زبانی یاد ہے وہ زبانی پڑھ لیا کرو اور جن کو یاد نہیں ہے وہ سوتے وقت گھر میں پڑھ لیا کرو۔ اہتمام کر لو گے؟ یاد رکھو یہ چار آیتیں شروع میں ہیں، تین آیتیں درمیان میں ہیں یعنی ایک آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں اور تین آیتیں بالکل آخر میں ہیں اس کو تلاش کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ اللہ ہمیں ان کو اہتمام کے ساتھ پڑھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ اہتمام کر کے دیکھیں پھر دیکھیں نتیجہ کیسے نکلتا ہے اللہ ضرور نتیجہ عطا فرمائیں گے۔

## سورۃ البقرہ کے اہم واقعات:

سورۃ البقرہ میں بعض واقعات اللہ نے اہمیت سے بیان فرمائے ہیں۔ میں ان میں سے صرف چار واقعات آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں تو چار واقعات کو ذہن نشین فرمائیں۔ قرآن کریم نے قصے اور واقعات ہمارا ایمان بچانے کے لیے بیان فرمائے ہیں اور عبرت کے لیے بیان فرمائے ہیں۔

## بنی اسرائیل کے ایک مقتول کا واقعہ:

بنی اسرائیل میں ایک آدمی تھا، اس کا نام تھا عامیل۔ یہ بندہ قتل ہو گیا اور اس کا قاتل نہیں ملتا تھا اور قتل کی دو وجوہ لکھی ہیں۔ ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ قاتل بھتیجا تھا اس نے اپنے چچا کو قتل کیا ہے اس کے پاس دولت تھی جھتیجہ کو دیتا نہیں تھا اس وجہ سے اس کو قتل کیا ہے۔ دولت کو لوٹنے کے لیے اپنے چچا کو قتل کیا اور بعض کہتے ہیں رشتے کا مسئلہ تھا اس کو بیٹی نہیں دی اس وجہ سے قتل کیا ہے۔

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی کہ ہم چاہتے ہیں قاتل کو تلاش کریں لیکن ہمیں قاتل ملتا نہیں ہے آپ اللہ سے پوچھ کر بتا دو تاکہ ہمیں قاتل کا پتا چلے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے گزارش کی کہ اے اللہ عامیل کے قاتل کا بتا دے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ان سے کہہ دو اگر تمہیں عامیل کا قاتل چاہیے تو ایک گائے لے لو اور اسے ذبح کرو، گائے کا ایک ٹکڑا کاٹو اور مقتول کے جسم کو لگا لو تو اللہ مقتول کو زندہ کر دے گا اور یہ خود بتائے گا کہ میرا قاتل کون ہے؟

## بے تکے سوالات اور خدائی مزاج:

اب بنی اسرائیل یہ سمجھتے تھے اگر ایسا کیا تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ وہ چاہتے تھے یہ ڈرامہ بازی چلتی رہے۔ وہ اللہ کے نبی کو دھوکہ دیتے تھے وہ لوگ کہتے تھے اللہ

سے پوچھ کر بتاؤ وہ گائے کیسی ہو؟ چھوٹی ہو، بڑی ہو، جوان ہو، کس قسم کی ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے پوچھا اللہ نے کہا وہ گائے نہ بالکل بوڑھی ہو نہ بالکل جوان ہو اس کے درمیان ہو۔ پھر کہنے لگے اللہ سے پوچھو اس کا رنگ کس قسم کا ہو؟ اگر بنی اسرائیل گائے کو ذبح کرنا چاہتے ہیں تو زر درنگ کی گائے ہو جو دلوں کو خوش کر دے، ایسی گائے تم لاؤ۔ پھر کہنے لگے ہمیں تھوڑا سا شبہ ہے کہ وہ گائے ہل چلاتی ہو یا نہ چلاتی ہو؟ وہ گائے کنویں سے پانی نکالتی ہو نہ نکالتی ہو کیسی گائے ہو؟ مزید وضاحت کریں۔

### گائے کی تلاش اور قاتل کی پہچان:

پھر اللہ کی طرف سے وحی آگئی کہ وہ گائے نہ زمین میں ہل چلاتی ہو اور نہ کھیتوں کو پانی دیتی ہو، ایسی گائے لاؤ۔ پھر گائے تلاش کی تو وہ گائے مل گئی۔ اور جس بندے کی گائے تھی اس نے کہا کہ ایک شرط یہ گائے دیتا ہوں گائے ذبح کرو اور چمڑے سے گوشت نکالو اور چمڑے کو سونے سے بھرو۔ اگر اتنا سونا مجھے دو گے تو میں گائے دوں گا ورنہ میں گائے نہیں دیتا۔ شرط لگ گئی پھر انہوں نے اس گائے کو خریدا اور اس کو ذبح کیا، اس کے چمڑے میں سونا بھر دیا، پھر اس بندے کو دیا۔ مقتول کے ساتھ ایک ٹکڑا لگایا پھر مقتول زندہ ہو گیا، اس نے کہا میرا قاتل یہ ہے اور پھر مر گیا۔

### ماں کی خدمت کا صلہ:

اس کی بعض حضرات، علامہ عثمانی رحمہ اللہ نے اور بعض مفسرین کرام رحمہ اللہ نے بڑی عجیب وجہ بیان کی ہے کہ یہ ایسے کیوں ہوا؟ یہ ایسے انہوں نے کیا نہیں تھا مگر یہ اللہ کی طرف سے کروایا جا رہا تھا۔ اصل میں ایک بہت غریب آدمی تھا جس نے اپنی ماں کی خدمت بہت کی تھی اس کی ماں نے اس کو دعا دی کہ اللہ تیرے مال میں وسعت دے اور برکتیں عطا فرمائے۔ اور وہ گائے کسی کے پاس نہیں ملتی تھی سوائے اس غریب کے جس نے ماں کی خدمت کی۔ اللہ نے اس کو ماں کی خدمت کا صلہ جو انی

اور زندگی میں دیا اور اتنی اہم گائے دی کہ ان سے سوالات ہوتے رہے اور گائے ان کی شرطوں کے مطابق یہی نکلی تو یہ اس کو ماں کی خدمت کا صلہ ملا۔

### برکات کیسے حاصل ہو سکتی ہیں؟:

میں ایک بات عرض کرتا ہوں جو یہ چاہے کہ میری دولت میں برکت ہو وہ ماں باپ کی خدمت کرے اور جو چاہے میرے علم میں برکت ہو تو وہ اپنے استاذ کی خدمت کرے۔ استاذ کی خدمت کرنے سے علوم میں برکت آتی ہے اور ماں باپ کی خدمت کرنے سے دولت میں برکت آتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ بندہ اپنے ماں باپ کو سہارا دے اور اللہ اس کو رسوا کر دے۔ اگر علم چاہتے ہیں تو استاذ کو سنبھال لیں اور اگر دولت چاہتے ہیں تو والدین کو سنبھال لیں دونوں کو چاہتے ہیں تو استاذ کو بھی سنبھال لیں اور والدین کو بھی۔ اللہ علم بھی عطا فرمادیں گے اور دولت بھی۔

میں تحدیث بالنعمة کے طور پر ایک بات عرض کرتا ہوں کہ میرے تمام اساتذہ میں سے کوئی ایک بھی استاذ ایسا نہیں ہے جو مجھ سے ناراض ہو یا ناراض ہو کر دنیا سے گیا ہو یا زندہ ہو اور اس وقت مجھ سے ناراض ہو۔ اگر کبھی طالب علمی میں کسی استاذ سے غلط فہمی تھی تو خدا گواہ ہے مسجد میں بیٹھا ہوں میں نے عالم بننے کے بعد جا کر اساتذہ کے پاؤں پکڑ پکڑ کر معافیاں مانگی ہیں کہ استاذ جی میں نے دین کا کام شروع کر دیا ہے بچپن میں کچھ غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ آپ شفقت فرمائیں اور دل سے ہمیں معاف کریں اور دعا دے کر میدان میں نکال دیں۔ آج ان اساتذہ کی دعاؤں کی برکت ہے ہم بیٹھے ہوئے دیہات میں ہیں اللہ کام پورے عالم میں پھیلا رہے ہیں۔

### اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے:

میرا بحرین کا سفر تھا آپ یقین کریں مجھے اتنا تعجب ہوا میں بتا نہیں سکتا۔ کبھی بنگلہ دیش کے علماء آرہے ہیں، کبھی انڈیا کے اور کبھی پاکستان کے آرہے ہیں۔ میں نے

کہا آپ مجھے کیسے جانتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ انٹرنیٹ پر آپ کے بیانات اور لٹریچر کو دیکھ کر اپنا عقیدہ محفوظ کر کے بیٹھے ہیں۔ آخری دن مجھے وہاں کمانڈو کا ایک انسٹرکٹر ملا تو کہنے لگا مولانا آپ میرا موبائل دیکھیں، اس موبائل میں آپ کی ویڈیو ہے۔ میرے جتنے کمانڈو شاگرد ہیں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کے پاس آپ کے بیان نہ ہوں۔ اب افسوس ہے کہ ہمیں پتا اس وقت چلا جب آپ واپس جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے کام لیتے ہیں کہ بندہ تصور بھی نہیں کر سکتا اللہ تعالیٰ آپ کے علم اور آپ کی دولت میں برکتیں عطا فرمائیں۔

ہم برکت کی بات کرتے ہیں کثرت کی بات نہیں کرتے۔ یہ نہیں کہتے کہ اللہ تمہیں دو گاڑیاں دے ہم کہتے ہیں اللہ ایک دے لیکن اچھی دے۔ برکت اور کثرت تو میں آپ کو سمجھا تا رہتا ہوں۔ ایک روٹی ہو اور دس کو پوری ہو جائے اس کو برکت کہتے ہیں۔ اور دس روٹیاں ہوں ایک کو پوری نہ ہوں اس کو کثرت کہتے ہیں۔ تو مال کثرت والا چاہیے یا برکت والا چاہیے؟ برکت والا۔

### بادشاہِ طالوت کی نشانی:

دوسرا واقعہ حضرت طالوت کا ہے یہ واقعہ بڑا اہم ہے مسئلہ کیا تھا؟ حضرت شموئیل علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔ بنی اسرائیل پر بڑا ظلم ہوا ان کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے وہ غلامی میں گئے، تو انہوں نے اپنے نبی حضرت شموئیل علیہ السلام سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہمارا کوئی ایک بادشاہ مقرر کریں ہم اس بادشاہ کے ساتھ ملیں اور جہاد کریں اور قوم سے آزادی حاصل کریں۔ حضرت شموئیل علیہ السلام نے کہا اللہ نے فیصلہ فرمایا ہے کہ بادشاہ ہم تمہیں دیتے ہیں اور بادشاہ کا نام طالوت ہو گا۔ اس کو بادشاہ بناؤ اور اس کی کمان میں آپ جہاد شروع کرو۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے طالوت غریب آدمی تھے قوم نے اس کو بادشاہ ماننے سے انکار کر دیا۔

یہ غریب آدمی ہے ہم اس کو کیسے مانیں؟ ہمیں ایسا بندہ چاہیے جس کے پاس دولت ہو وہ بڑا آدمی ہو۔ اس غریب اور فقیر کو کون مانتا ہے؟ شموئیل علیہ السلام نے فرمایا: اللہ نے اس کو علم بھی عطا فرمایا ہے اور جسمانی وجاہت بھی عطا فرمائی ہے۔ اس کا حق ہے کہ تم اس کو بادشاہ مان لو۔ وہ قوم بڑی عجیب تھی، پھر انہوں نے کہا چلو ہم اس کو بادشاہ مانتے ہیں لیکن ایسا کریں اس کی بادشاہت کی نشانی یا علامت بتا دیں دیکھو عجیب سوال ہے نبی بات کہہ رہا اور قوم کہہ رہی ہے اللہ کی طرف سے نشانی بھی دے دو۔ شموئیل علیہ السلام نے کہا کہ چلو ہم نشانی بتا دیتے ہیں۔

نشانی یہ تھی کہ گزشتہ بنی اسرائیل کے انبیاء کے تبرکات پر مشتمل ایک صندوق تھا کسی نبی کا عصا ہے، کسی نبی کی پگڑی ہے اور کسی کا کوئی اور سامان۔ جب بھی بنی اسرائیل والے اس صندوق کو لے کر جہاد میں جاتے تو اللہ اس صندوق کی برکت کی وجہ سے ان کو فتح عطا فرماتے۔

### وسیلہ کا ثبوت اور جائز ہونا:

اس صندوق کی برکت کی وجہ سے اللہ فتح عطا فرماتے مگر آج لوگ کہتے ہیں کہ ولی کا وسیلہ جائز نہیں ہے اور قرآن میں تو صندوق کا وسیلہ بھی ثابت ہے۔ لوگ کہتے ہیں ولی کا وسیلہ جائز نہیں ہے۔ ارے ان کے تبرک دیکھیے صندوق کی برکت سے اللہ ان کو فتح دیتے ہیں۔ بتائیں وسیلہ کہتے کس کو ہیں؟ ہمیں سمجھ نہیں آتی۔

میرے پاس ایک ساتھی آیا کہ بڑا اہم مسئلہ ہے مولانا! مجھے وہ کہنے لگا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نبی کا وسیلہ بھی جائز ہے، زندہ ولی کا وسیلہ بھی جائز ہے اور جو فوت ہو گیا اس کا وسیلہ جائز نہیں ہے۔ میں نے کہا آپ مجھے یہ بتائیے جو زندہ ہے اس کا وسیلہ کیوں جائز ہے؟ کہتا ہے بہت نیک آدمی ہے۔ میں نے کہا جو فوت ہو گیا وہ برا ہو گیا؟ جو زندہ ہے اس پر تو شک ہے اس کا خاتمہ ایمان پر ہو گا یا نہیں ہو گا؟ اور جس ولی



کا ایمان پر خاتمہ ہو گیا اس کا ولی ہونا تو یقینی ہے۔ جس کا ایمان پر مرنا مشکوک ہے اس کا وسیلہ جائز ہے جس کا ایمان پر مرنا یقینی تھا اس کا وسیلہ کیسے ناجائز ہے؟ میں نے کہا کہ بتاؤ کوئی مشکل بات ہے؟ تو کہنے لگا نہیں۔ میں نے کہا اتنی سی بات ہے لوگوں نے آپ کو دھوکے میں ڈالا ہوا ہے۔

### برکت والا صندوق:

خیر میں بات کر رہا تھا کہ اس وقت کا بادشاہ جو ان پر ظلم کرتا تھا اس کے پاس یہ صندوق تھا لیکن وہ بادشاہ ظالم تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ جہاں رکھتے وہاں وبا پھیلتی۔ جس بستی میں رکھتے وہاں بیماری پھیل جاتی انہوں نے وہ صندوق ایک بیل گاڑی میں رکھا اور جنگل کی طرف ہانک دیا اور بیل ان کے صندوق کو لے کر چلے گئے۔ اور جو ظالم بادشاہ تھا اس کی بستیاں وبا سے محفوظ رہیں۔ اصل میں تو اللہ نے ان کو دینی تھی۔

تو جب وہ بیل اس صندوق کو لے کر دوڑے اور حضرت طالوت کے گھر کے سامنے کھڑے ہو گئے تو اللہ کے نبی نے کہا:

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُمْ إِن كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ﴾

تم نے نشانی مانگی تھی اللہ نے یہ نشانی عطا فرمادی یہ دیکھو اس کو فرشتے اٹھا کر پھرتے ہیں اور یہ تمہارے گھر پہنچ گیا ہے۔ یہ طالوت کی نشانی ہے وہ برکت والا صندوق تمہیں اس کے پاس ملے گا وہ طالوت کے پاس ملا۔

### جالوت سے مقابلہ اور خدائی امتحان:

وہ جہاد کے لیے نکلے مقابلے کے لیے جو بادشاہ تھا اس کا نام جالوت تھا بہت

ظالم تھا اور طالوت بہت نیک تھے ان کے ساتھ اسی ہزار آدمی جہاد کے لیے نکلے۔ لیکن اللہ نے امتحان لینا تھا کہ ان میں کھرے کتنے ہیں اور کھوٹے کتنے ہیں؟ راستے میں نہر آگئی طالوت نے فرمایا دیکھو اللہ تمہارا امتحان لے گا جس آدمی نے اس نہر سے پانی پیادہ ہمارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اس کو پیاس لگے گی کمزور ہو جائے گا۔ حالانکہ پانی پینے سے پیاس بجھتی ہے لیکن تم پانی پیو گے تو پیاس بڑھ جائے گی۔ اگر چلو بھر تھوڑا بہت پی لو پھر خیر ہے، گنجائش ہے۔

### مان کر چلنے والے غالب رہتے ہیں:

اسی ہزار آدمیوں میں سے سب نے پانی پی لیا سب کو پیاس لگ گئی۔ کوئی جہاد کے قابل نہ رہا صرف تین سو تیرہ بچے طالوت اور نبی شموئیل علیہ السلام تین سو تیرہ کو لے کر چل پڑے اور ساتھ یہ اعلان کیا: ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً﴾ بِإِذْنِ اللَّهِ اللہ زیادہ کو نہیں دیکھتے اللہ ایمان کو دیکھتے ہیں ایمان والے تھوڑے بھی ہوں تو زیادہ پر غالب آجاتے ہیں۔

### داؤد علیہ السلام کی جہاد میں شمولیت:

یہ تین سو تیرہ جالوت کے مقابلے میں نکلے جالوت ظالم بھی تھا اور بہادر بھی۔ وہ ایسا آدمی تھا جو مقابلے میں اکیلا نکلا۔ اس نے کہا کہ پہلے میں اکیلا تم سب سے لڑوں گا، پھر میری فوج آئے گی۔ شموئیل علیہ السلام اللہ کے نبی تھے انہوں نے داؤد علیہ السلام کے والد سے کہا، داؤد کے والد بھی جہاد میں تھے اور داؤد علیہ السلام چھوٹے بچے تھے یہ بھی جہاد میں تھے۔ شموئیل علیہ السلام نے کہا تم اپنے بیٹے لاؤ تو داؤد علیہ السلام کے والد اپنے چھ بیٹے لائے۔ شموئیل علیہ السلام نے پوچھا کہ ساتواں بیٹا کیوں نہیں لائے؟ والد نے کہا کہ ان کی عمر ابھی تھوڑی تھی اور قد بھی چھوٹا تھا۔ انہوں نے

کہا کہ نہیں تم ساتواں بیٹا بھی لاؤ بہر حال داؤد علیہ السلام آئے۔ شموئیل علیہ السلام نے پوچھا کہ کیا تم جہاد میں جاؤ گے؟ انہوں نے کہا جی ہاں جاؤں گا شموئیل علیہ السلام نے کہا چلو تم یہ تلوار لو اور جہاد میں نکلو۔

### جالوت کی شکست:

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: جب داؤد علیہ السلام گزرے تو ابھی بچے تھے راستے میں تین پتھروں نے ان پتھروں نے بول کر کہا آپ ہمیں لے جاؤ جالوت کو ہم ماریں گے۔ اللہ نے پتھروں کو گویائی عطا فرمائی۔ داؤد علیہ السلام نے ان کو لیا اور سامنے جالوت نکلا پورا جسم لوہے میں چھپا ہوا تھا صرف اس کا ماتھا خالی تھا۔ داؤد علیہ السلام نے فلاں کو گھما کر جب پتھر مارے تو وہ اس کے ماتھے پر لگے اور پیچھے سے نکل گئے۔ جالوت گر گیا۔ خدا نے ان کو فتوحات عطا فرمائیں۔<sup>33</sup>

اللہ جب فتح دینے پر آئیں تو اللہ اسباب کا پابند نہیں ہے بغیر اسباب کے فتوحات عطا فرمادیتے ہیں۔

### مناظرے کا ثبوت:

تیسرا واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔ یہ بالکل تیسرے پارے کے شروع میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الْمَ تَرَالِيَ الَّذِي حَاجَّ اِبْرٰهٖمَ فِی رَبِّہٖ اَنْ اٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّی الَّذِیْ یُحِیْ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اَحِیُّ وَاُمِیْتُ ط قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاَنْتَ بِہَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُہِتَ الَّذِیْ کَفَرَ ط وَ اللّٰہُ لَا

## يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥١﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود سے مناظرہ ہوا۔ اس مناظرے کو اللہ پاک نے قرآن پاک میں ذکر فرمادیا۔ میں ان حضرات سے کہتا ہوں کہ جو مناظروں کی مخالفت کرتے ہیں کہ وہ قرآن کی اس آیت کو سنیں، کیا تم قرآن کی اس آیت کو قرآن سے نکال دو گے؟

### حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مناظرانہ گرفت:

ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کی گفتگو اس پر ہوئی کہ ابراہیم علیہ السلام نے کہا دیکھو میں تمہیں خدا نہیں مانتا نمرود کا مزاج یہ تھا جو بھی اس کے دربار میں آتا تو سجدہ کرتا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں تجھے سجدہ نہیں کرتا، نمرود نے پوچھا کیوں نہیں کرتے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میں تمہیں خدا مانوں تو سجدہ کروں میں نہ تمہیں خدا مانتا ہوں نہ تمہیں سجدہ کرتا ہوں۔

نمرود نے پوچھا کہ کیوں نہیں مانتے؟ تو ابراہیم علیہ السلام نے دلیل دی کہ خدا وہ ہوتا ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے تو نہ زندہ کر سکتا ہے نہ مار سکتا ہے۔ نمرود بد دماغ آدمی تھا اس نے دو قیدی لیے ایک جس کے لیے بری ہونے کا فیصلہ تھا بے قصور تھا اس کو قتل کر دیا اور جو قصور وار تھا اس کو آزاد کر دیا۔ اس نے کہا کہ دیکھو میں نے زندہ کر دیا اور مار دیا ہے نمرود بد دماغ تھا وہ موت اور حیات کا معنی نہیں سمجھتا تھا۔ اگر اس کو موت اور حیات کا معنی سمجھ آتا تو کیا وہ اس دھوکے میں پڑتا؟ ایک کو مارنا اور دوسرے کو آزاد کر دینا اس کا نام موت اور حیات نہیں ہوتا۔

### مخاطب کی عقل کے مطابق گفتگو:

عدم سے وجود اس کا نام حیات ہے اور وجود سے عدم اس کا نام موت ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دلیل نہیں بدلی بلکہ دلیل کا رخ بدل دیا کیونکہ نمرود نے

بات ایسی کی کہ جیسے آدمی عوام کے اعصاب پر چھا جائے۔ بعض لوگ ایسی بات جمع میں کہتے ہیں کہ عوام اس بات سے بہت متاثر ہوتی ہے پھر بات کو سمجھانے کے لیے مناظر کو ایسا رخ اختیار کرنا پڑتا ہے کہ لوگ اس کے دھوکے میں نہ آئیں۔ میں اس کی چھوٹی سے مثال دیتا ہوں۔

### مناظرے میں بیدار مغزی:

علامہ خالد محمود دامت برکاتہم جو مسلک دیوبند کے بہت بڑے عالم ہیں ان کا مناظرہ ہوا مرزائیوں سے اور مناظرہ ہوا لاہور میں بریلویوں کی مسجد میں جس کے ساتھ اصل مناظرہ تھا وہ مناظر موقع پر تشریف نہ لاسکے بیمار ہونگے یا کوئی اور وجہ بن گئی ہوگی۔ تو ایمر جنسی میں علامہ خالد محمود صاحب کو مناظرے کے لیے بلایا گیا اور علامہ صاحب تشریف لے آئے جب مناظرہ شروع ہوا تو علامہ خالد محمود صاحب نے مرزا غلام احمد قادیانی کی کتاب ”ازالۃ الہام“ کے حوالے دے کر مرزا کے خلاف دلیل پیش کی مرزائی مناظر بہت چالاک تھا وہ مناظر کہنے لگا کہ علامہ صاحب آپ نے شرطیں نہیں پڑھیں؟ علامہ صاحب نے شرطیں پڑھی بھی نہیں تھیں وہ تو اچانک آئے تھے۔ لیکن اگر مناظر کہہ دے کہ نہیں پڑھیں تو اس کے پلے کیا رہ جائے گا۔ وہ کہنے لگا کہ علامہ صاحب آپ نے شرطیں نہیں پڑھیں۔

اب اگر علامہ صاحب کہیں کہ میں نے پڑھی ہیں تو جھوٹ تھا اور اگر کہتے ہیں کہ میں نے نہیں پڑھیں تو وہ کہتا کہ مولوی صاحب پہلے آپ شرطیں پڑھو پھر مناظرہ کرو، پھر بے عزتی ہونی تھی۔ اس لیے علامہ صاحب نے جواب دیا کہ کون سی شرط ہے جس کی میں نے مخالفت کی ہے؟ نہ تو یہ کہا کہ میں نے نہیں پڑھی اور نہ یہ کہا کہ میں نے پڑھی ہیں۔ مرزائی مناظر کہنے لگا کہ شرائط میں لکھا ہوا ہے کہ بات قرآن و حدیث سے کریں گے اور آپ نے حوالہ ”ازالۃ الہام“ کا دیا ہے جو غلام احمد

قادیانی کی ہے نہ آپ نے قرآن پیش کیا اور نہ آپ نے حدیث پیش کی ہے، آپ نے شرط کو چھوڑ دیا ہے۔ علامہ صاحب فرمانے لگے اگر مرزائی ہے تو یہ حدیث کی کتاب ہے اور اگر یہ حدیث نہیں تو مرزائی نہیں، میں نے تو شرط کی مخالفت نہیں کی۔ مناظر چپ ہو گیا لیکن تھا تو مناظر اس سے جواب نہیں بنا خاموش تو اس نے نہیں ہونا تھا۔

**یا اللہ... یا محمد:**

اس نے پینترا بدلہ علامہ صاحب آپ ہمیں کافر کہتے ہو یہ دیکھو اوپر کیا لکھا ہوا ہے ہمیں کافر کہتے ہو اور کن کی مسجد میں ہم سے مناظرہ کرتے ہو۔ علامہ صاحب نے کہا کیا لکھا ہوا ہے کہتا ہے یا اللہ یا محمد یہ شرک نہیں؟ "مشرکوں دی مسیت وچ ساڈے نال مناظرہ کر دے او" (مشرکوں کی مسجد میں ہمارے ساتھ مناظرہ کرتے ہو؟) اب بتائیں کیسا وار تھا؟ دیوبندی بریلوی کی لڑائی شروع ہو جانی تھی جنگ مرزائی کی ہے اور اس نے بریلویوں اور دیوبندیوں والی جنگ شروع کروادی۔ علامہ صاحب نے سوچا کہ دیوبندی بریلوی کی جنگ نہیں ہونے دینی۔ علامہ صاحب فوراً فرمانے لگے تم یہ بتاؤ کہ اس مجمع میں کتنے لوگ ہیں جو حج پر گئے ہیں؟ پانچ سات آدمی کھڑے ہو گئے کہا کہ کتنے لوگ ہیں جو عمرے پر گئے ہیں اب دس بارہ اور بھی کھڑے ہو گئے۔ پوچھا کہ کیا آپ نے جدہ میں "یا اللہ یا محمد" لکھا دیکھا ہے؟ لوگوں نے کہا نہیں، آپ نے مکہ مکرمہ میں دیکھا ہے؟ لوگوں نے کہا نہیں۔ مدینہ منورہ میں دیکھا ہے؟ لوگوں نے کہا نہیں۔

**مناظر سمجھ دار ہونا چاہیے:**

علامہ صاحب فرمانے لگے اگر یہ "یا" عربی کا ہوتا تو جدہ میں لکھا ہوتا عربی کا ہوتا تو مکہ میں لکھا ہوتا عربی کا ہوتا تو مدینہ میں لکھا ہوتا، او کافر یہ "یا" عربی کا نہیں ہے پنجابی کا ہے۔ انہاں نے لکھیا اے یا اللہ نوں مندے آل یا محمد نوں مندے آل مرزا

قادیانیوں نے نہیں مندرے، اے تیرے پیوتے انہاں نے کفر دی مہر لائی اے۔ (انہوں نے لکھا ہے ہم اللہ کو مانتے ہیں یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے ہیں۔ مرزا ملعون کو نہیں مانتے۔ یہ تو انہوں نے تیرے باپ مرزا ملعون کے کفر پر مہر لگائی ہے) اب دیکھو اپنی لڑائی کو بچا لیا اور اصل لڑائی پر کھڑے ہیں۔ یہ مناظر کا کام ہوتا ہے کہ میں نے بات کیسے سمجھانی ہے؟

### نمرود کی شکست اور حق کی فتح:

ابراہیم علیہ السلام کا نمرود سے مناظرہ تھا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اللہ وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو اس نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کرتا ہوں اب دیکھو عوام پر رعب پڑ گیا؟ اب ابراہیم علیہ السلام نے دلیل نہیں بدلی بلکہ دلیل کا رخ بدلا دلیل یہ تھی کہ اللہ وہ ہوتا ہے جو عدم سے وجود میں لائے اور جو وجود کو عدم دے یہ خدا ہے اس کی مثال دی کہ میرا خدا زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے فوراً رخ بدلا اور فرمایا:

﴿فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾

خدا وہ ہے جو سورج مشرق سے لاتا ہے اگر تو خدا ہے تو مغرب سے لا! ﴿فَجَبَّهْتَ الذَّنْبَى كَفَرًا﴾ اب وہ بالکل خاموش ہو گیا اور اس دلیل کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

### غیر اللہ کے نام کی منت:

ایک بات اور سمجھیں کہ غیر اللہ کے نام کی منت ماننا ٹھیک نہیں ہے، میں کراچی پڑھتا تھا وہاں ہمارے ایک استاذ تھے مولانا عالم خان صاحب، پٹھان تھے اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ پٹھان کا علم پٹھانوں والا ہوتا ہے ہمیں سبق

پڑھا رہے تھے سبق میں کہتے ہیں: اگر تم دیکھو کوئی قبر کو پوجتا ہے، بتوں کو پوجتا ہے، اپنے بیٹے کا نام رکھتا ہے پیراں دتہ۔ پوچھو کہ پیراں دتہ نام کیوں رکھا؟ تو کہتا ہے بیس سال ہو گئے شادی کو نماز پڑھی ہے، عمرے کیے ہیں، منتیں مانی ہیں، بیٹا نہیں ملا۔ مٹھے شاہ معصوم دی منت مانی ہے تو بیٹا مل گیا ہے اس لیے میں نے نام اللہ دتہ نہیں رکھا بلکہ پیراں دتہ رکھا ہے۔

### پیراں دتہ یا اللہ دتہ؟

استاذ عالم خان صاحب عجیب بات فرمانے لگے کہ اس مشرک کو وہ دلیل دو جو ابراہیم علیہ السلام نے نمود کو دی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: دیکھو دو راستے ہیں ایک مشرق اور ایک مغرب کا خدا مشرق سے لاتا ہے اگر تو خدا ہے تو تو مغرب سے لا۔ اس مشرک سے کہو کہ دو راستے ہیں؛ ایک پاخانے کا اور ایک اولاد کا اللہ نے اولاد کا راستہ بنایا ہے۔ اگر خدا نے نہیں دیا تو پھر پیر سے کہو تو راستہ بدل کے دے۔ اگر بچہ راستہ بدل کے آئے تو پیراں دتہ، اگر اسی راستے سے آئے تو اللہ دتہ ہے۔ آپ کہیں گے کہ مولوی صاحب نے یہ کیسی دلیل دی ہے؟ لیکن ہم نے آپ کو مسئلہ سمجھانا ہے یہ وہ دلیل ہے جس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

### موت کے بعد زندہ ہونا:

ابراہیم علیہ السلام کا ایک واقعہ اللہ نے یہ بیان فرمایا۔ ایک آیت چھوڑ کر پھر دوسرا واقعہ بیان کیا ہے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اللہ سے عرض کیا اے اللہ میں جانتا ہوں آپ زندہ بھی کرتے ہیں اور مارتے بھی ہیں۔ زندگی بھی آپ دیں گے اور موت بھی آپ دیں گے۔ لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ آپ قیامت کو بندے کیسے زندہ کریں گے؟ اللہ نے پوچھا: ﴿أَوَلَمْ تَتُومِنْ﴾ تجھے یقین



نہیں؟ تو فرمایا: ﴿بَلَىٰ﴾ کیوں نہیں یقین تو ہے، ﴿وَلَكِنَّ يَظْمِنَنَّ قَلْبِي﴾ لیکن آنکھوں سے دیکھ لوں گا تو میرا دل مطمئن ہو گا کہ اللہ آپ کیسے زندہ فرمائیں گے؟ فرمایا کہ چار پرندے لے لو کبوتر، کوا، مرغ، مور یہ چار پرندے تھے ان چار پرندوں کا چمڑا اتارو سر الگ کرو دھڑ الگ کرو ٹانگیں الگ کرو ان کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دو اور یہ چار پہاڑ ہیں ایک پر ان کے سر رکھو، اور ایک پر ان کی ٹانگیں رکھو اور ایک پر ان کے پر رکھو۔ لیکن ذبح کرنے سے پہلے چند دن پرندوں کو اپنے پاس رکھنا ان کو مانوس کر لینا ابراہیم علیہ السلام نے رکھ دیا اب فرمایا ذرا درمیان میں کھڑے ہو کر پکارو پھر دیکھو کیسے آتے ہیں۔ انہوں نے ایک کو آواز دی مثلاً کبوتر کو۔ پہلے اس کا سر اٹھا پھر اس کا دھڑ اٹھا پھر اس کی ٹانگیں اٹھیں پھر اڑتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔ فرمایا کہ ہم اسی طرح قیامت کو لے آئیں گے۔

### قبر کا مفہوم کیا ہے؟

اس سے یہ بات سمجھیں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جہاں مردہ دفن ہو وہ قبر ہے۔ اچھا یہ بتائیں جو آدمی سمندر میں جائے اور جسم گل جائے اس کی قبر کون سی ہے؟ اگر کسی کو جلادیں اور جلا کر راکھ کر دیں اس کی قبر کون سی ہے؟ اگر کسی کو جانور کھالے تو اس کی قبر کون سی ہے؟ ہم نے کہا کہ قبر اس کو کہتے ہیں جہاں میت یا میت کے اجزاء ہوں یہ ساری ان کی قبر ہے۔ اب دیکھو سر، دھڑ، ٹانگیں الگ الگ پڑے تھے اللہ نے ان کو جمع کیا کہ نہیں؟ چاروں اجزاء کا آپس میں رابطہ موجود ہے۔ ایک کو آواز دی ہے تو چاروں جگہ سے جسم کے اعضاء جمع ہونا شروع ہو گئے بالکل اسی طرح جہاں آدمی کی میت کے اجزاء تحلیل ہو کر پورے پانی میں بکھر گئے ہیں یہ ساری اس کی قبر ہے۔ اللہ تمام اجزاء سے روح کا تعلق جوڑ دیتے ہیں نیک ہیں تو جنت کا مزہ دیتے ہیں اور بد کردار ہے تو جہنم کا عذاب دیتے ہیں۔ اللہ قادر ہیں یا نہیں؟ (بے شک قادر ہے)

## توحیدی کون ہو سکتا ہے؟

ایک آدمی کہنے لگا کہ اس طرح نہیں ہو سکتا تو میں نے کہا کہ تُو توحیدی کیسے ہے؟ میں نے کہا کہ توحیدی تو ہم ہیں اجزاء دنیا میں پھیل گئے ہیں ہم کہتے ہیں خدا ہر جز سے روح کا تعلق جوڑ کر عذاب، ثواب دیتا ہے۔ توحیدی ہم ہیں یا تو ہے؟ جو خدا کی قدرت نہ مانیں کیا وہ کبھی توحیدی ہو سکتا ہے؟ قدرت بھی نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ توحید۔ یہ کیسی توحید ہے؟ تم کیسی توحید لیے پھرتے ہو؟

## اللہ کیسے زندہ کریں گے؟

چوتھا واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام کا تیسرے پارے میں ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام بخت نصر بادشاہ کے دور میں تھے۔ وہ بہت ظالم بادشاہ تھا اس نے بنی اسرائیل کو قید کیا، توراۃ کو جلادیا اور عزیر علیہ السلام اس کی قید میں تھے۔ عزیر علیہ السلام اس کی قید سے رہا ہوئے اور رہا ہو کر جا رہے تھے ایک جگہ بستی سے گزرے اور پوری بستی تباہ شدہ تھی۔ عزیر علیہ السلام نے دیکھا تو پوچھا:

﴿أَنَّىٰ يَحْيٰى هٰذَا ٱللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾

اللہ یہ بستی تباہ و برباد ہے آپ اس کو زندہ کیسے کریں گے؟ یہ مسئلہ سمجھنے کے لیے اللہ سے سوال کیا۔

## 100 سال کی موت اور پھر زندگی:

حضرت عزیر علیہ السلام گدھے پر سوار تھے روٹی ان کے پاس تھی۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ خشک روٹی تھی اور اوپر انگور لیے انگور کا شیرہ ان پر نچوڑا اور اس کو کھانے لگے اس حالت میں اللہ سے سوال کیا وہیں پر اللہ نے موت دے دی۔ روٹی بھی پڑی ہے ساتھ گدھا بھی ہے اور عزیر علیہ السلام خود بھی ہیں۔

سوسال اسی طرح گزر گئے پھر اللہ نے اٹھایا، ﴿فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ﴾ اللہ نے پوچھا عزیر علیہ السلام بتاؤ کتنا عرصہ ٹھہرے؟ انہوں نے کہا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضُ يَوْمٍ﴾ اللہ ایک دن یا دن کا بعض حصہ ہے ٹھہرا ہوں اس لیے کہ جس وقت وہ فوت ہوئے تو صبح تھی اور جب اٹھے تو شام تھی۔

### 100 سال بعد کھانے پینے کی اشیاء:

اب ان کے ذہن میں تھا کہ اگر آج ہی اٹھا ہوں تو دن کا بعض حصہ ہے اگر کل سویا آج اٹھا ہوں تو پورا دن گزر گیا ہے۔ اللہ نے فرمایا: ﴿بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ آپ سوسال تک اس حالت میں ٹھہرے، ﴿فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ عزیر آپ اپنے کھانے کو دیکھو بغیر فرج کے صحیح پڑا ہوا ہے اور سوسال گزر گئے تم اپنا مشروب دیکھو اسی طرح پڑا ہے۔

### مردوں کو بھی اللہ زندہ کریں گے:

اب ذرا اپنے گدھے کو دیکھو، ﴿وَ انْظُرْ إِلَى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَ انْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا حَمًا﴾ فرمایا دیکھو اب گدھے کی ہڈی آئی ہے پھر گدھے کی ہڈی پر گوشت چڑھا پھر اس پر کھال چڑھی ہے گدھا بالکل آواز دیتا ہوا۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ گدھا ہنہناتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔ پھر فرمایا: جیسے ہم نے گدھے کو زندہ کیا ہے اسی طرح کل قیامت کے دن مردوں کو اٹھائیں گے۔

### قوم نے عزیر علیہ السلام کی پہچان کیسے کی؟

عزیر علیہ السلام اٹھے اور اپنے علاقے میں گئے تو لوگوں نے ان کو پہچانا

نہیں۔ سو سال پورا گزر گیا بابا اب کون پہچانے؟ نسل ہی بدل گئی کہا میں عزیر ہوں تمہارا آدمی ہوں تو انہوں نے کہا کیا نشانی ہے؟ کیونکہ ساری تورات کی کتابیں جلا دیں تھیں اور عزیر علیہ السلام تورات کے حافظ تھے کہا لو میں تمہیں تورات سناتا ہوں۔ جب پوری تورات زبانی سنائی تو لوگوں کو یقین آگیا کہ یہ وہی عزیر نبی ہے جو سو سال پہلے تھا تورات تو اب ہے ہی نہیں تو یہ تورات کا حافظ آخر کہاں سے آگیا؟

### وفات کے بعد زندگی اور سننا:

اس سے ایک چھوٹی سی بات ذرا سمجھیے جو لوگ بطور دلیل کے پیش کرتے ہیں۔ میں مسئلہ صاف کرتا ہوں بعض لوگ کہتے ہیں نبی قبر میں ہو اور نبی کو قبر میں آواز دو، درود سلام پڑھو تو نبی نہیں سنتا۔ دلیل کیا ہے؟ ہم کہتے ہیں اللہ کے نبی قبر میں زندہ ہیں وہ کہتے ہیں نبی قبر میں زندہ نہیں۔ توجہ رکھو وہ دلیل میں اس واقعہ کو پیش کرتے ہیں کہ عزیر علیہ السلام سو سال تک اس حالت میں رہے جب سو سال بعد اللہ نے کھڑا کیا تو اللہ نے پوچھا: ﴿كَمْ كَيْشْتُمْ﴾ کتنا عرصہ ٹھہرے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ﴿كَيْشْتُمْ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ اگر زندہ ہوتے تو ان کو پتا نہ ہوتا؟ سوال سمجھ گئے؟ زندہ ہوتے تو ان کو پتا ہوتا ان کو پتا نہ چلنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ زندہ نہیں ہیں۔ اب اس پر لوگ پریشان ہوتے ہیں کہ جی علامہ صاحب نے تو بڑی دلیل دی ہے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی موت پر۔ میں نے کہا اچھا یہ بتاؤ قرآن پاک میں اصحاب کھف کا واقعہ ہے وہ کتنے سال سوئے رہے؟ تین سو نو سال۔ کتنے سال؟ تین سو نو سال۔ جب اٹھے نا تو اللہ نے فرمایا: ﴿كَمْ كَيْشْتُمْ﴾ ہاں بھی کتنا عرصہ سوئے ہو؟ انہوں نے کہا: ﴿كَيْشْتُمْ نَارًا﴾

يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ﴿٣٤﴾

دن یا دن کا بعض حصہ وہ سوئے تھے یا مومے؟ بولونا! (سوئے)۔ قرآن کہتا

ہے: ﴿وَتَحْسَبُهُمْ آيَةً وَأَهُمْ رُقُودٌ﴾<sup>35</sup>

وہ تو سوئے پڑے تھے وہ تو مردہ نہیں تھے ان کو پتا کیوں نہیں چلا۔ سمجھیے کہتے ہیں عزیر علیہ السلام زندہ نہیں تھے اگر زندہ ہوتے پتا چل جاتا تو اصحاب کہف تو زندہ تھے نا۔ جب اٹھے تھے ان کو پتا نہ چلا اگر پتا نہ چلنا دلیل موت ہوتی تو اصحاب کہف کو سو یا نہ کہتے اصحاب کہف کو مویا کہتے۔

**عدم علم کا عقلی جواب:**

میں آپ میں سے کسی بندے سے پوچھوں اچھا آپ بتائیں درس قرآن شروع ہوئے کتنے منٹ ہوئے ہیں؟ تو آپ کو پتا نہ ہو تو کیا یہ مردہ ہونے کی دلیل ہے؟ میں ایک اور جواب دیتا ہوں سنیں، آپ کو لطف آئے گا۔ ایک یہ عالم ہے ایک وہ عالم ہے بات سمجھنا، دونوں میں فرق کیا ہے: ﴿كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ﴾<sup>36</sup>

**ایک وہ جہاں ایک یہ جہاں:**

قرآن میں ہے کہ اس عالم کا ایک دن ہو تو یہاں کے ہزار دن بنتے ہیں۔ بات سمجھیں اس عالم کا ایک دن اس عالم کے ہزار دن کے برابر ہے۔ اس جہاں کا ایک دن تو اس جہاں کے ہزار دن بنتے ہیں۔ عزیر علیہ السلام کتنا عرصہ ٹھہرے؟ 100 سال۔ کتنا بنا؟ ایک تو نہیں بنا، اللہ پوچھتا ہے: ﴿كَمْ لَبِثْتُمْ﴾ عزیر علیہ السلام کتنا عرصہ ٹھہرے

34- الکہف 18:19

35- الکہف 18:18

36- الحج 22:47

ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ اللہ! میں دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں۔ فرمایا نہیں نہیں! وہاں کی بات نہیں ہے ہم یہاں کی پوچھتے ہیں یہاں کا 100 بنتا ہے وہاں کا بعض بنتا ہے۔ نہیں سمجھے یہ جواب ٹھیک ہے یا غلط ہے؟ ﴿بَلَىٰ لَّبِثْتُ مِائَةً عَامٍ﴾ یہاں کا 100 وہاں کا بعض ہے۔ پتا کیسے نہیں چلا بتا تو دیا ہے۔ سمجھ آئی آپ کو؟ میں اس لیے کہتا ہوں کہ ان دلائل کی آپ قیمت جانا کرو پھر ان کو سنبھال کر رکھا کرو۔ یہ حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ ہے۔

### خلاصہ واقعات:

تو کتنے واقعات ہیں؟ چار

1. بقرہ کا

2. طالت علیہ السلام کا۔

3. سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا۔

4. حضرت عزیر علیہ السلام کا۔

اب میں کچھ مسائل عرض کرتا ہوں بڑے اختصار کے ساتھ

### اللہ کا قادر ہونا اور بندے کا عاجز ہونا:

بندے کا عاجز ہونا اور خدا کا قادر ہونا ہے۔ یہ کہاں پر ہے؟ ﴿الْعَمَّ﴾ میں۔ قرآن کریم کا متن سورۃ الفاتحہ ہے اور سورۃ البقرہ سے لے کر آخر سورۃ الناس تک ایک سو تیرہ سورتیں پورے قرآن کریم کی شرح ہے۔ جب شرح ہوئی ہے تو فرمایا ﴿الْعَمَّ﴾ سے شروع کرو اس کا معنی کسی کو بھی نہیں پتا سوائے اللہ کی ذات کے۔ اللہ نے بتا دیا دیکھو تمہارا علم اتنا ہے تمہیں الف کا معنی بھی نہیں آتا۔ تمہارا علم اتنا ہے تمہیں لام کا معنی بھی نہیں آتا۔ کس بات پر اکڑتے ہو؟ اور تمہیں میم کا معنی نہیں

آتا اگر قرآن سمجھنا ہے تو پہلے یہ بات مانو کہ ہم عاجز ہیں اور تو قادر ہے، پھر تمہیں دین سمجھ آئے گا۔ ﴿الْقُرْآنُ﴾ یہ قرآن کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس میں بندے کا عاجز ہونا اور خدا کا قادر ہونا سمجھایا ہے۔

### دفاع صحابہ پر دلیل:

اس میں دفاع صحابہ رضی اللہ عنہم ہے آپ بیانات سنو دفاع صحابہ پہ یہ دلیل شاید کوئی پیش کرے گا۔ ﴿ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ﴾

میں کبھی احباب سے کہتا ہوں کہ بھائی ہم سے لڑائی مول نہ لو، ہم سے دفاع صحابہ سنو، دفاع صحابہ کے دلائل ہم سے لو، پھر دیکھو صحابہ رضی اللہ عنہم کی وکالت کیسے ہوتی ہے؟ ﴿ذَلِكَ الْكِتَابُ﴾ توجہ کرو! عربی زبان میں دو لفظ ہیں ایک لفظ ہے ”هَذَا“ ایک لفظ ہے ”ذَلِكَ“ اگر کوئی چیز سامنے ہو اور قریب ہو اس کو کہتے ہیں ”هَذَا“ جس کا اردو معنی ہے ”یہ“ اگر کوئی چیز دور ہو یا غائب ہو اس کو کہتے ہیں ”ذَلِكَ“ اردو میں معنی ہے ”وہ“ اللہ فرماتے ہیں: ﴿ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ﴾ اس کتاب میں کوئی شک نہیں اس پر اعتراض ہوتا ہے یا اللہ آپ کو ”ذَلِكَ“ نہیں کہنا چاہیے ”هَذَا“ فرمانا چاہیے تھا کیونکہ قرآن تو یہ ہے قرآن وہ تو نہیں ہے قرآن تو سامنے موجود ہے۔ آپ فرماتے ”هَذَا الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ“ کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں لیکن ”هَذَا“ نہیں فرمایا بلکہ ”ذَلِكَ“ فرمایا۔ وجہ یہ ہے کہ جو قرآن جبرائیل علیہ السلام نے حضور کو دیا اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔

### صحابہ امانت دار تھے:

اور جو قرآن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیا اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ لوگ اعتراض اس پر کرتے ہیں کہ جو قرآن صحابہ نے

ہمیں دیا ہے اس میں کمی بیشی کی گئی ہے۔ اللہ نے فرمایا نہیں! نہیں! ”ذٰلِكَ“ وہ قرآن جو جبرائیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا وہ لکھا ہوا نہیں تھا وہ بھی ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ ہے جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیا وہ لکھا ہوا نہیں تھا وہ بھی ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ ہے۔

### جمع قرآن اور کاتبین وحی صحابہ:

اور یہ لکھا کب ہے؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فرمانے پر اور جمع کب ہے؟ حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے فرمانے پر۔ فرمایا جو جبرائیل علیہ السلام نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا وہ لکھا ہوا نہیں وہ بھی ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیا وہ بھی لکھا ہوا نہیں وہ بھی ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ ہے ”ذٰلِكَ“ یعنی وہ قرآن جو صدیق رضی اللہ عنہ لکھوائے گا وہ قرآن جو عمر رضی اللہ عنہ لکھوائے گا اور معاویہ رضی اللہ عنہ لکھے گا وہ ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ اس میں بھی شک نہ کرنا جس طرح وہ ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ ہے یہ بھی ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ ہے۔ اس میں بھی شک نہیں اُس میں بھی شک نہیں۔

### کلام، کتاب اور قرآن:

اس کو ”کلام“ بھی کہتے ہیں، ”کتاب“ بھی کہتے ہیں اور اسے ”قرآن“ بھی کہتے ہیں۔

✽ جب اللہ تکلم کرے تو کلام پاک ہے۔

✽ جب نبی پڑھے تو قرآن پاک ہے۔

✽ اور جب معاویہ رضی اللہ عنہ لکھے تو کتاب پاک ہے۔



یہ کتاب تو بنتی ہی تب ہے جب صحابی رضی اللہ عنہ لکھے جب نہ لکھے تو کتاب بنی کیسے؟ کیسے اس میں شک کرے گا؟ ﴿ذٰلِكَ اَنْتَ كُنْتُمْ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ اس میں دفاع صحابہ رضی اللہ عنہم ہے۔

### عقیدہ ختم نبوت پر اکابر دیوبند کی خدمات:

آگے چلیں اگلی آیت میں ختم نبوت کا بیان ہے۔ مفتی محمود رحمہ اللہ نے یہ آیت پیش کی تھی اسمبلی میں جب بعض ایم این ایز نے پوچھا تھا کہ قرآن میں کہاں لکھا ہے؟ تو مفتی محمود رحمہ اللہ نے کہا کہ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 4 کے شروع میں لکھا ہے۔ پوچھا کیسے؟ تو کہا اللہ نے فرمایا کہ ایمان والے کون ہیں؟ ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ اے میرے پیغمبر! ایمان والے وہ ہیں جو اُس کتاب پر ایمان لائیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور اس وحی پر بھی ایمان لائیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء پر آئی، اگر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی آنا ہوتا تو اللہ یوں فرماتے ایمان والے وہ ہیں جو اس کتاب پر ایمان لائیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور اُس وحی پر بھی ایمان لائیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء علیہم السلام پر آئی اور اس پر بھی ایمان لائیں جو آپ کے بعد آئی۔ خدا نے بعد کا تذکرہ نہیں کیا۔ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کیا اور پہلی وحی کا تذکرہ کیا۔ اس سے پتا چلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی بند ہے ہمارے نبی کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا ورنہ اس کو بھی ذکر فرما دیتے۔ سورۃ البقرہ کا آغاز ہے اور اللہ اس مسئلے کو بیان فرما دیا کہ ختم نبوت کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

### قرآن کریم ایک معجزہ ہے:

آگے مسئلہ ہے اعجاز قرآن کا۔ اعجاز قرآن کا معنی ہے کہ قرآن اللہ کے نبی کا

اعجاز ہے معجزہ ہے معجزہ کا معنی یہ ہے کہ جس دور میں جس فن کا چرچا تھا اللہ اپنے نبی کو اسی فن میں ایسی چیز عطا فرماتے کہ فن والے عاجز ہوتے۔

### موسیٰ علیہ السلام کا پہلا معجزہ:

موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جادو کا چرچا تھا خدا نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا یہ لاٹھی لیں اور جب وہ لاٹھیاں پھینکیں گے تو وہ سانپ بنیں گے نہیں سانپ نظر آئیں گے اور جو تو لاٹھی پھینکے گا سانپ نظر نہیں آئے گا بلکہ سانپ بنے گا ان کی لاٹھیاں سانپ بنتی نہیں تھیں، ﴿يُخَيِّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَى﴾<sup>37</sup>

محسوس ہوتا تھا سانپ بنے ہیں لیکن تم لاٹھی پھینکو گے تو سانپ بنے گا۔ اس دور میں لاٹھی کا سانپ بننا ایک جادو تھا موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کو خدا نے سانپ بنا دیا یہ معجزہ تھا جب یہ معجزہ آیا تو جادو گر عاجز ہو گئے۔

### موسیٰ علیہ السلام کا دوسرا معجزہ:

موسیٰ علیہ السلام کا دور جادو کا دور تھا۔ موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اپنے ہاتھ کو بغل کے نیچے رکھو اور نکالو وہ سورج کی طرح چمکے گا جادو گروں سے کہو کہ اس طرح تم بھی چمکا کر دکھاؤ، جادو گر تمہیں بڑے جادو دکھائیں گے مگر سمندر کو روک دیں یہ جادو گر نہیں کر سکتے۔ اے موسیٰ ذرا عصا کو مار ہم بارہ راستے دریا میں نہ بنا دیں تو پھر کہنا، پتھروں سے پانی نکالیں یہ جادو گر نہیں کر سکتے۔ پتھر پر عصا تو مار! ہم 12 چشمے جاری کر دیں گے یہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے۔

### عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ:

عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں طب اور حکمت کا چرچا تھا۔ طبیب بڑے تھے

فرمایا ان کی کون سی طب ہے؟ تو ان سے کہہ کہ ذرا کوڑھی کو ٹھیک کریں انہوں نے کہا کہ ہم تو ٹھیک نہیں کر سکتے عیسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ پھیرا تو ٹھیک ہو گیا اور مادر زاد اندھے کو ٹھیک کرنا ان کے بس میں نہیں تو ہاتھ پھیر! ہم مادر زاد اندھے کو بھی ٹھیک کر دیں گے۔ بے جان میں جان ڈالیں یہ ان کے بس میں نہیں ہے تو چڑیا مٹی کی بنا کر پھونک مار، ہم اس میں جان ڈال دیں گے۔ کوئی مرے اور دنیا میں آئے یہ حکمت کے ساتھ نہیں ہو سکتا قبر پر کھڑے ہو کر تو ”قُمْ يٰاَدْنِ اللّٰهُ“ کہہ ہم مردے کو قبر سے نکال کر لے آئیں گے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے اس دور میں طب کا چرچا تھا تو طبیب کہتے تھے کہ یہ طب نہیں ہے یہ معجزہ ہے۔ جہاں طب جواب دیتی ہے وہاں سے معجزہ کا آغاز ہوتا ہے۔

### آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ علمی:

قریشیوں میں فصاحت، بلاغت، خطابت اور اشعار کی شہرت تھی۔ اتنی شہرت تھی کہ قصیدہ لکھ کے بیت اللہ پہ لٹکا دیتے اور کہتے کہ دنیا میں کوئی ہے جو اس کا جواب دے گا۔ اللہ فرماتے ہیں: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم شعر میں تو نہیں نثر میں قرآن پیش کرتے ہیں اور قرآن پیش کیا۔ لوگ کہتے ہیں کسی کا بنایا ہوا ہے، فرمایا: ﴿قُلْ لِّسِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْاِنْجُنُّ عَلٰى اَنْ يَّاتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يٰۤاْتُوْنَۙ بِمِثْلِهٖ﴾<sup>38</sup> آپ ان سے فرمائیں کہ اگر سارے جن و انس اس بات پر جمع ہو جاؤ کہ اس قرآن جیسا بنا کر لاؤ تب بھی تم نہیں لا سکتے۔

پھر کہا چلو ایک چیلنج ہے ایسا کرو ﴿فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوْرٍ﴾<sup>39</sup>

دس سورتیں لے کر آؤ، نہیں لاسکے تو چیلنج تھوڑا سا کم ہو گیا۔

فرمایا: ﴿فَاتُّوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ﴾<sup>40</sup>

ایک سورۃ لے آؤ اور سارے جمع ہو جاؤ پھر بھی تم نہیں لاسکتے۔ تو پھر مان لو نا یہ بشر کا نہیں یہ خدا کا کلام ہے۔ اللہ نے ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطابت، فصاحت و بلاغت دے کر تمام عربوں کو عاجز کر دیا۔

**دیگر انبیاء کے معجزے اور ہمارے نبی کا معجزہ:**

اس میں ایک بات میں نے عرض کی، ذرا آپ بھی سمجھنا یہ قرآن کریم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے باقی انبیاء کو معجزے عملی دیے ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو عملی بھی دیے اور علمی بھی دیا۔ عملی معجزہ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کو عصا والا دیا اور ہمارے نبی کو عملی بھی دیا اور علمی بھی دیا۔

**آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو علمی معجزہ کیوں دیا گیا؟**

پہلے انبیاء کو علمی معجزہ نہیں دیا کیونکہ جب عامل جاتا ہے تو عمل ساتھ چلا جاتا

ہے۔

☆ مولانا صاحب نماز پڑھاتے ہیں ان کے پیچھے بابا جی نماز پڑھ رہے تھے فوت

ہو گئے نمازیں ختم، ایک اور تھے وہ چلے گئے نمازیں ختم۔

☆ ہر سال حج کرتے تھے، فوت گئے توجہ ختم۔

☆ ہر سال زکوٰۃ دیتے تھے، فوت ہو گئے زکوٰۃ ختم۔

☆ ہر سال روزے رکھتے تھے فوت ہو گئے تو روزے ختم۔

☆ عامل جب جائے عمل ساتھ جاتا ہے

- ☆ اور جب عالم جائے تو علم چھوڑ کے جاتا ہے۔
- ☆ قاری صاحب پڑھا رہے ہیں دنیا سے چلے گئے ہیں دس بچے حافظ بنے ہیں۔
- ☆ حافظ صاحب چلے گئے پچاس کو قرآن سکھا دیا۔
- ☆ شیخ الحدیث چلے گئے پچاس محدث پیدا کر دیے۔
- ☆ ایک عالم جائے تو علم چھوڑ کر جاتا ہے۔

عامل جائے تو عمل ساتھ جاتا ہے عالم چلا جائے علم کے نتیجے چھوڑ کے جاتا ہے۔ پہلے انبیاء کی نبوت محدود تھی معجزہ عملی دیا۔ نبی گیا معجزہ ساتھ چلا گیا۔ ہمارے نبی کی نبوت قیامت تک کے لیے تھی معجزہ علمی دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم چلے گئے علم اب بھی باقی ہے۔ ان کی نبوت محدود تھی اس لیے معجزہ وہ دیا جو نبی (علیہ السلام) کے ساتھ ہی ختم ہو گیا نبوت کا زمانہ جو تھوڑا تھا۔ ان کی نبوت کا زمانہ محدود تھا تو معجزہ عملی نہیں بلکہ علمی دیا۔ اللہ گواہ ہے میں صرف اس علم و عمل پر گھنٹوں دلائل دوں کہ علم و عمل میں فرق کیا ہے۔

### صاحب علم کی اجرت زیادہ ہوتی ہے:

ایک نکتہ ذہن میں رکھنا عمل بھی علم پر چلتا ہے عمل زیادہ ہوتا ہے اور اجرت کم ہوتی ہے علم میں تھوڑا کام کریں اجرت بہت زیادہ ہوتی ہے مزدور آٹھ گھنٹے کام کرتا ہے تنخواہ پانچ ہزار ہے انجینئر ایک گھنٹا دیتا ہے تنخواہ دولاکھ ہوتی ہے کیونکہ مزدور کے پاس عمل ہے انجینئر کے پاس علم ہے۔

### دیگر انبیاء کا عمل:

حضرت نوح علیہ السلام نے 950 سال تبلیغ کی ہے اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے 23 سال کی ہے مقام ان کا نہیں ان کا بڑا ہے کیونکہ اُدھر عمل اُدھر علم ہے۔ اُدھر عمل تھا اور اُدھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم کام کرتا ہے۔ عمل کا مدار

تو علم ہوتا ہے نا۔

## نبوت کا اصل کمال علم میں ہوتا ہے:

ایک اور بات ذہن میں رکھیں نبی میں اصل کمال علم ہوتا ہے نبی کا اصل کمال عمل نہیں ہوتا۔ کوئی بندہ نبی سے علم میں بڑھ جائے ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن بظاہر دیکھنے میں عمل امتی کے زیادہ ہو سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حج کیا تھا تمہاری مسجد میں ایسے کئی حاجی ہوں گے جنہوں نے تین حج کیے ہوں گے۔ بظاہر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی عمر 23 سال ہے اور 23 سال ہی نماز پڑھی ہے نا ایک آدمی کی اسی سال عمر ہے اس کی کتنی زیادہ نمازیں ہوگی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ قرآن پوری زندگی میں پڑھا کیونکہ جب مکمل ہوا تب ہی مکمل پڑھیں گے ناجب مکمل نازل ہی نہیں تھا تو مکمل پڑھیں گے کیسے؟ اور آپ کتنے قرآن پڑھتے ہیں؟ مجھ جیسا نالائق آدمی بھی رمضان میں 4 مرتبہ قرآن پڑھ لیتا ہے۔ پہلے ایک مرتبہ قرآن پڑھا، پھر اس کے بعد سنا دیا، پھر ایک مرتبہ پھیرا دیا، پھر رات کو مصلے پر پڑھا تو مجھ جیسا نکما حافظ بھی رمضان میں کم از کم چار قرآن پڑھتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری زندگی میں ایک مرتبہ پورا قرآن پڑھا ہے۔

## امتی کا عمل کیفیت میں نبی سے نہیں بڑھ سکتا:

اب دیکھیے! بظاہر امتی عمل میں آگے نکل گیا لیکن علم میں آگے نہیں نکل سکتا لیکن امتی کروڑ مرتبہ قرآن پڑھے اور نبی ایک مرتبہ ”الْحَمْدُ لِلّٰہ“ کہہ دے اس کا کروڑ مرتبہ قرآن پڑھنا نبی کی ایک مرتبہ ”الْحَمْدُ لِلّٰہ“ کہنے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس کی کئی وجوہ ہیں، پھر عرض کروں گا۔ میں عرض کر رہا تھا کہ قرآن کا اعجاز ہے اور قرآن نے چیلنج کیا پہلے کہا کہ پورا قرآن لاؤ یہ نہیں لاسکتے پھر کہا

کہ دس سورتیں لاؤ پھر آخر میں چیلنج کیا کہ ایک سورۃ لاؤ۔

### مسئلہ تین طلاق:

ایک اور مسئلہ قرآن میں ہے تین طلاق کا، ﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾<sup>41</sup>

پوری امت کا اجماع ہے، قرآن کا مسئلہ ہے، احادیث کا مسئلہ کہ اگر تین طلاق دو تو تین طلاق ہوتی ہیں تین طلاق دو تو ایک ہر گز نہیں ہوتی۔

### تین طلاقوں کو ایک کہنا کس کا مذہب ہے؟:

تین طلاقوں کو ایک طلاق کہنا یا تو مرزا یوں کا مذہب ہے یا شیعوں کا مذہب ہے اور تین طلاقوں کو تین کہنا اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب ہے۔ یہ اچھی طرح ذہن نشین فرمائیں: ﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾<sup>ط</sup>  
یہ قرآن میں ہے، سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 230 نکال لیں اور کوئی بھی تفسیر اٹھا کر دیکھ لیں وہاں یہ لکھا ہو گا کہ تین طلاقیں دینے سے تین ہوتی ہیں تین طلاقیں دینے سے ایک کبھی نہیں ہوتی۔

### تین طلاق مناظرے کی دلچسپ روداد:

میں اس پر آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ مولانا امین صفدر اوکاڑوی رحمہ اللہ کا مناظرہ تھا اور مناظرہ تین طلاق پہ تھا ادھر سے مناظرہ رکھا اور ساتھ تھانیدار کو فون کر دیا تھانیدار آگیا اور کہا کہ مولوی صاحب تمہارا مناظرہ نہیں ہو گا مولانا فرمانے لگے کہ مناظرہ کیوں نہیں ہو گا مناظرہ تو ہو گا، اس نے کہا کہ میں نہیں ہونے دوں گا مولانا

فرمانے لگے تو مناظرہ ہونے دے تو تھانیدار ہے طاقتور ہے ثالث بن جافیصلہ کر دے۔ اس نے کہا کہ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں جوتے ماروں گا اور مناظرہ نہیں ہونے دوں گا۔ مولانا اوکاڑوی رحمہ اللہ فرمانے لگے میں بڑا خوش ہوں تیری بات سن کے۔ تو ابھی جو اتار مجھے بھی مار اور اس مولوی کو بھی مار اس کو تین مار کے ایک گننا اور مجھے تین مار کے پورے تین گننا۔ مجھے تین مار اور اس کو نو مار، اس نے پوچھا کہ وہ کیوں؟ مولانا اوکاڑوی رحمہ اللہ فرمانے لگے کہ میں کہتا ہوں تین تین ہوتے ہیں اور یہ کہتا ہے تین ایک ہوتا ہے۔ یہ کہتا ہے تین طلاقیں ایک طلاق ہے اور میں کہتا ہوں کہ تین طلاقیں تین ہوتی ہیں۔ میں اس کو سمجھا رہا ہوں لیکن یہ نہیں مانتا پھر یہ تیرے جوتوں سے مسئلہ سمجھے گا میری دلیل سے اس کو مسئلہ سمجھ نہیں آئے گا۔ کیا صرف طلاق میں تین ایک ہے باقی ہر جگہ تین تین ہوتے ہیں؟

### زنا کو نکاح کا نام دینے کی جسارت:

عجیب بات ہے اللہ پاک محفوظ رکھے۔ میں تمہیں ہاتھ جوڑ کر اور دیانت داری سے کہتا ہوں کہ کوئی لڑکار ننڈی خانے سے لڑکی گھر میں لے کر آئے اور زنا کرے اتنا بڑا گناہ نہیں ہے جتنا تین طلاقوں کے بعد بیوی کو گھر میں رکھے تو گناہ ہے۔ میں بڑے اعتماد کے ساتھ بات کہتا ہوں، میں نے خدا کو جواب دینا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس نے زنا کے لیے لڑکی رکھی ہے اس کو باپ بھی کہتا ہے کہ زنا ہے ماں بھی کہتی ہے کہ زنا ہے خاندان بھی کہتا ہے کہ تو کنجڑ ہے۔ تو لڑکی لے کر آیا ہے لیکن جو تین طلاقوں کے بعد رکھتا ہے اس کو کوئی نہیں کہتا کہ یہ زنا ہے اس کے زنا کو بھی نکاح کہتے ہیں اور زنا کو نکاح سمجھ کر قبول کرنا اس میں کفر کا خطرہ ہے۔ یہ کتنا بڑا جرم ہے!

### سوشل بائیکاٹ کرنا چاہیے:

اگر تمہارے خاندان میں کوئی بندہ یہ جرم کرے تو اس سے بائیکاٹ کرو۔



اس کو خاندان سے فارغ کر دو۔ اس جرم میں کبھی شریک نہ ہونا۔ ہمارے ذمہ مسئلہ بتانا تھا ہم نے بتا دیا عمل کرو تمہارا بھلا نہ عمل کرو تو قیامت میں ہم سرخرو ہیں۔ ہم نے مسئلہ کھول کر بتایا ہے بغیر ڈر کے، بغیر جھجک کے مسئلہ کھولا ہے مانو تو آپ کی مرضی اور نہ مانو تو بھی آپ کی مرضی۔ تو تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں۔

### مسئلہ حیاتِ انبیاء علیہم السلام:

ایک بات اور سمجھیں اسی طرح قرآن میں سورۃ البقرہ میں ایک مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے فرمایا:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾

قرآن کریم کی کوئی بھی اہل السنۃ والجماعۃ کی تفسیر اٹھانا اہل بدعت کی مت اٹھانا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ مومن آدمی جو اللہ کے راستے میں قتل ہو وہ زندہ ہے اور نبی کا کلمہ پڑھا ہے تو اس کو یہ سعادت ملی ہے تو نبی اس سے بڑھ کر زندہ ہے۔

### نبوت کا مقام شہادت کے رتبے سے اعلیٰ ہے:

جب یہ شہید زندہ ہے تو نبی زندہ کیوں نہیں؟ نبوت کا مقام تو شہادت سے اوپر ہے شہادت کا مرتبہ تو نبی کے صدقے ملا ہے صدقے والا تو زندہ ہے تو نبی خود قبر میں زندہ کیوں نہیں ہوگا؟۔

### حکیم الامت مولانا تھانوی کا مسلک:

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نبی کی حیات شہید سے بڑھ کر ہوتی ہے کیوں؟ شہید کی حیات کے ساتھ جنازہ ہے اور نبی دنیا سے گئے ہیں ان کا جنازہ ایسے نہیں تھا جیسے شہید کا جنازہ ہے۔ روضے پر جاؤ درود پڑھو۔ یہ صحابہ کا جنازہ تھا

اس طرح جنازہ نہیں تھا جیسے شہید کا ہوتا ہے۔

### دعائے جنازہ کے الفاظ سے دھوکے کی کوشش:

ہمارے سرگودھا کے ایک مولوی صاحب ہیں ایک جگہ تقریر کی اور مسئلہ بیان کر رہے تھے کہ شہید زندہ نہیں ہوتا مجھے اتنا دکھ ہوا کہ بتا نہیں سکتا۔ کہتے ہیں کہ جب شہید مر جائے تو کیا دعا پڑھتے ہو؟ بندہ قتل ہو جائے تو کیا دعا پڑھتے ہو؟ "اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا۔"

مولوی صاحب تقریر کر رہے تھے کہتا ہے کیا پڑھتے ہو؟ "اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا" مولوی صاحب کہتا ہے: "مَيِّتِنَا" کیوں پڑھتے ہو؟ "حَيِّنَا وَحَيِّنَا" کیوں نہیں پڑھتے؟ پھر ماننا کہ زندہ نہیں۔ آپ سمجھ گئے؟ یہ بہت بڑی دلیل پیش کی ہے۔ شہید کو قرآن نے زندہ کہا ہے یا ہم نے کہا؟ اشکال ہم پر ہے یا قرآن پر ہے؟ پھر اللہ سے کہو کہ جب یہ زندہ ہے تو ہمیں یہ دعائیں سکھائی ہے یہ اعتراض ہمارے اوپر کیوں کرتے ہو؟ یہ تو بددماغی ہے۔

### دھوکے کا الزامی جواب:

جب میں اس علاقے میں گیا تو مجھے سب ساتھیوں نے کہا کہ تمہارے سرگودھا کے مولوی صاحب یہ دلیل دے کر گئے ہیں اور جواب بھی سرگودھا سے اچھا لگتا ہے۔ میں نے کہا جی پھر سرگودھا کا جواب سنیں میں نے کہا: "اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا۔" یہ کیوں؟ یہ سامنے ہے یا غائب ہے؟ پھر کہونا "شَاهِدِنَا وَشَاهِدِنَا" جواب آیا کہ نہیں؟ آگے "وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا" کیوں؟ یہ بچے تو نہیں ہے پھر کہونا "وَكَبِيرِنَا وَكَبِيرِنَا" میں نے کہا یہ صغیر نہیں ہے، کبیر ہے۔ آگے "وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا" کیوں؟ آپ کا باپ مرا ہے وہ عورت تو نہیں ہے نا تو پھر کہو

"وَذَكِّرْنَا وَذَكِّرْنَا"، "وَأُنْثَيْنَا" کیوں کہا؟

### دعائے جنازہ کے الفاظ کی حکمت:

میں نے کہا کہ اب جواب سمجھو! جنازہ اس کا ہے جو سامنے ہے تو کہا "وَشَهِدْنَا" اور "وَعَائِدْنَا" کہہ کر اس کو شامل کیا ہے جو غائب ہے۔ جنازہ اس کا ہے جو کبیر ہے "وَصَغِيرْنَا" کہہ کر بچوں کو دعا میں شامل کیا ہے۔ اگر جنازہ باپ کا ہے تو "وَأُنْثَيْنَا" کہہ کر عورتوں کو شامل کیا ہے۔ اگر جنازہ ماں کا ہے تو "وَذَكِّرْنَا" کہہ کر مردوں کو شامل کیا ہے۔ اگر جنازہ شہید کا ہے تو کہا "حَيِّنَا" اور "وَمَيِّتْنَا" کہہ کر مُردوں کو شامل کیا۔ اگر جنازہ غیر شہید کا ہے تو کہا "وَمَيِّتْنَا" اور "حَيِّنَا" کہہ کر شہید کو شامل کیا ہے۔

### علمائے حق اور ملحدین کی سازشیں:

اب اگلا جواب سنو! اب دوبارہ اعتراض نہیں ہو گا۔ کل میرے پاس ساتھی آئے تھے تصور کے تھے ایک اہل حدیث تھا اور کہا: مولانا! میں تو ان پڑھ ہوں مجھے تو بات کا پتا نہیں میں نے کہا پھر آئے کیوں ہو؟ اگر ان پڑھ ہو کہنے لگا ایک بات پوچھنی ہے مولانا آپ بھی عالم ہو مولوی توصیف الرحمن بھی عالم ہے میں نے کہا توصیف الرحمن مولانا طارق جمیل صاحب پر اعتراض کرتا ہے دو گھنٹے وڈیو سی ڈی بنائی ہے میں نے دو گھنٹے میں اس کا جواب دیا ہے چار سال گزر گئے آپ مولانا صاحب سے کہونا کہ جواب دو، نہیں سمجھے؟ انہیں کہو جواب دو یہ ان سے پوچھو مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟ وہ جواب دے تاکہ پتا چلے دونوں عالم ہیں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟ ایک مولوی ہے ایک جاہل ہے انہوں نے فضائل اعمال پر اعتراض کیا ہے میں نے جواب دیا ہے انہیں کہونا کہ جواب دو۔ بات سمجھ آرہی ہے؟

## اپنے عقائد کا پرچار کرتے رہیں:

میں سمجھا رہا تھا کہ مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سورۃ البقرہ میں ہے آپ مانتے ہیں کہ نہیں مانتے؟ اہل السنۃ والجماعۃ کا اجماعی عقیدہ ہے کہ اللہ کا نبی اپنی قبر میں زندہ ہے یہاں سے درود پڑھو تو فرشتے پہنچاتے ہیں اور قبر پر پڑھو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم خود سنتے ہیں۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے ہم اپنا عقیدہ اپنی مساجد میں بیان کرتے رہیں گے۔

## سورۃ البقرہ میں اختتامی بیان:

میں آخری بات عرض کرتا ہوں۔ سورۃ البقرہ کا آغاز ہے ﴿ذٰلِكَ اَنْكِتُبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ اور اختتام ہے ﴿سَمِعْنَا وَ اطَعْنَا﴾ یعنی تم نے غیب کو مانا ہے نظر آئے تو بھی مانو نہ نظر آئے تو بھی مانو، ﴿سَمِعْنَا وَ اطَعْنَا﴾ سمجھ آئے تب بھی مانو نہ سمجھ آئے تب بھی مانو۔ قرآن کی آیت اتری: ﴿وَ اِنْ تُبَدُّوْا مَآفِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تَخَفُوْهُ يُحَاسِبْکُمْ بِهٖ اللّٰهُ﴾<sup>42</sup> اگر تم اپنے اندر کی بات چھپاؤ گے یا بیان کرو گے اللہ سب جانتا ہے۔

## غیر اختیاری وساوس کا کیا کریں؟:

صحابہ رضی اللہ عنہم بہت پریشان ہو گئے یا رسول اللہ کبھی ایسے خیالات آتے ہیں جو مناسب نہیں ہوتے کیا اللہ تعالیٰ اس پر ہمارا محاسبہ کریں گے؟ غیر اختیاری وساوس آتے ہیں ہم اس میں بے بس ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ تو اختیاری پر مواخذہ ہے غیر اختیاری پر نہیں ہے۔ جواب تو یہی تھا لیکن یہ جواب

نہیں دیا بلکہ کہا کہ اے صحابہ! تم یہ کہو ﴿سَمِعْنَا وَ اطَّعْنَا﴾ اللہ نے آگے دوسری آیت اتار کر جواب دے دیا کہ غیر اختیاری پر مواخذہ نہیں ہوگا بلکہ اختیاری پر ہوگا۔ لیکن مسئلہ بعد میں سمجھایا، ﴿سَمِعْنَا وَ اطَّعْنَا﴾ پہلے سمجھایا تا کہ مزاج بن جائے کہ نظر آئے تب بھی مانیں گے اور نہ نظر آئے تب بھی مانیں گے۔ اہل السنۃ کا عقیدہ ہے کہ نبی کا فیصلہ سمجھ آئے تب بھی مانیں گے اور نہ سمجھ آئے تب بھی مانیں گے۔

### نبی کا غلام اور عقل کا پجاری:

حضور مکہ سے چلے، عرش تک گئے ہیں واپس آئے ابو جہل آیا اور کہا کہ میں نہیں مانتا کیونکہ میری عقل میں نہیں آتا اور صدیق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں تو مانتا ہوں ابو جہل نے کہا کہ جب عقل میں نہیں آتا تو پھر کیوں مانتے ہو؟ انہوں نے فرمایا عقل کا کلمہ نہیں پڑھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھا ہے۔

### صدیق کا بیٹا اور ابو جہل کا بیٹا:

میں کہتا ہوں ہاں خدا کی قسم! جو نبی کے فرمان پر عقل قربان کر دے وہ صدیق کا بیٹا ہے اور جو عقل کی وجہ سے نبی کے فرمان کو چھوڑ دے وہ ابو جہل کا بیٹا ہے۔ ہم ابو جہل والے نہیں ہیں ہم صدیق رضی اللہ عنہ والے ہیں۔ سمجھ آئے تب بھی مانتے ہیں اور نہ سمجھ آئے تب بھی مانتے ہیں، نظر آئے تب بھی مانتے ہیں نہ نظر آئے تب بھی مانتے ہیں۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرما دیا وہ برحق ہے۔ اس کے سامنے ہماری عقل کی حیثیت کیا ہے۔ اللہ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اِنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

## سورة آل عمران

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْم ۝ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۝ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ  
بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۝ مِن قَبْلُ هَٰذَا  
لِلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۝  
اللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝﴾

تمہید:

آپ تمام حضرات کے علم میں ہے کہ درس قرآن کا عنوان ”مضامین سورة آل عمران“ ہے۔ گزشتہ درس قرآن میں سورة البقرہ کے مضامین کا خلاصہ میں نے پیش کیا تھا اور آج کے درس قرآن و سنت میں سورة آل عمران کے مضامین کا خلاصہ بیان ہو گا ان شاء اللہ۔ سورة آل عمران مدنی سورة ہے۔ اس میں 200 سو آیتیں اور 20 رکوع ہیں۔ میں نے آپ سے گزارش کی تھی کہ اگر سورة آل عمران یا کسی بھی سورة کے تمام مضامین کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تو بہت زیادہ وقت لگتا ہے۔ اس لیے ہم نے یہ طے کیا کہ ہر سورة کے اہم مضامین کو اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ درس قرآن کریم کا تسلسل بھی باقی رہے اور بہت سارے اہم مسائل

بھی آپ کی خدمت میں پیش کیے جاسکیں۔

### عقائد و نظریات کا تحفظ:

میں ہر دفعہ اس کی وضاحت اس لیے کرتا ہوں تاکہ آپ حضرات کے دماغ میں بیٹھ جائے۔ بعض لوگ کہیں گے کہ فلاں مسئلہ بھی تھا، فلاں بھی تھا، مولانا صاحب نے فلاں مسئلہ بیان نہیں کیا۔ میں نے اس لیے وضاحت کی تھی کہ ہر بندہ اپنے عنوان پر کام کرتا ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد و نظریات کا تحفظ یہ بنیادی طور پر میرا مشن اور میرا کام ہے۔

### انتخاب آیات کا پہلو:

اس لیے میں سورۃ کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کوشش کرتا ہوں کہ ان آیات کا تذکرہ تفصیل سے کیا جائے جس میں ہمارے ان نظریات کا بیان ہو جس پر عموماً آج موجودہ دور میں لوگ حملہ آور ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم اس کا تذکرہ اہمیت کے ساتھ کرتے ہیں۔ باقی تذکرہ اور مضامین بھی درمیان میں آجاتے ہیں۔

### شان نزول اور شان ورود:

پہلی بات یہ سمجھیں کہ سورۃ ال عمران کا شان نزول کیا ہے؟ دو لفظ آپ نے کتابوں میں پڑھے ہیں اور علماء سے سنے ہیں۔

(1) شان نزول۔

(2) شان ورود۔

یہ دو لفظ یاد رکھیں جو واقعہ کسی آیت کے نازل ہونے کا سبب بنے اس واقعہ کو ”شان نزول“ کہتے ہیں اور جو واقعہ حدیث مبارک کے فرمانے کا سبب بنے اسے ”شان ورود“ کہتے ہیں۔ بعض واقعات وہ ہیں جو قرآن کی آیت اترنے کا سبب بنتے ہیں اور بعض واقعات وہ ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد فرمانے کا سبب ہیں۔ تو جو

واقعہ قرآن کی آیت اترنے کا سبب بنے اسے کہتے ہیں فلاں آیت یا سورۃ کا ”شان نزول“ اور جو واقعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد فرمانے کا سبب بنے اسے کہتے ہیں کہ یہ واقعہ اس حدیث کا ”شان ورود“ ہے۔ نزول کا معنی ہوتا ہے اترنا اور ورود کا معنی ہوتا ہے آنا، لغوی معنی اگر ایک بھی ہو تو لیکن اصطلاح میں ”شان نزول“ کا مطلب الگ ہے اور ”شان ورود“ کا مطلب الگ ہے۔

### سورۃ آل عمران کا شان نزول:

سورۃ ”آل عمران“ کا شان نزول کیا ہے؟ نجران کے علاقے کے عیسائیوں کا وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ اس وفد میں اور آدمی بھی تھے لیکن تین آدمی اس میں بڑے اہم تھے۔ ان میں سے ایک کا نام سید اُبَیہم تھا، یہ ان کا سردار تھا۔ دوسرے کا نام العاقب عبدالمسیح تھا، یہ مدبر اور سیاست دان تھا۔ تیسرے آدمی کا نام ابو حارثہ بن علقمہ تھا، یہ ان کا پادری اور بہت بڑا عالم تھا۔<sup>43</sup>

تو یہ وہ لوگ تھے جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے کے لیے آئے اور بڑی اہمیت کے ساتھ آئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مقام بھی دیا اور جگہ بھی دی، رہائش کا انتظام بھی کیا اور ان کے ساتھ خوب کھل کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گفتگو بھی کی۔

### اہل باطل سے گفتگو کا طریقہ کیا ہونا چاہیے؟:

جو تمہارے پاس دلائل ہیں تم پیش کرو اور جو میرے پاس ہیں وہ میں پیش کروں گا۔ تم اپنا مذہب سمجھاؤ! میں اپنا مذہب سمجھاؤں گا اور بات دلیل سے کرو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دلیل کے ساتھ ان سے بات کی اور رعایت کتنی فرمائی



ہے؟ یہ مدینہ منورہ میں ٹھہرے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم مسجد نبوی میں نماز پڑھیں گے تو منہ کعبہ کی طرف نہیں کریں گے بلکہ بیت المقدس کی طرف کریں گے جو مشرق کی جانب بنتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک ہے تم رخ ادھر کرو! مگر جب ہمارے ساتھ بات کرو تو دلائل کے ساتھ کرو۔ اس طرح بہت فائدہ ہوتا ہے۔

### نظریاتی اختلافات اور مہمان نوازی:

میرے پاس ایک دفعہ گوجرانوالہ سے بریلوی علماء کا وفد آیا، ایک خاص موضوع پر مشاورت کے لیے۔ وہ آئے بیٹھے ہم نے کھانا کھلایا بات چلتی رہی۔ جب نماز کا وقت ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ ہماری نماز کا وقت ہو گیا ہے، آپ حضرات مہمان خانے میں نماز پڑھیں۔ اس لیے کہ آپ کا اور ہمارے نظریات کا اختلاف ہے۔ آپ کی نماز ہمارے پیچھے ہوتی نہیں ہے اور ہماری آپ کی پیچھے نہیں ہوتی؟ ہم آپ کو مجبور نہیں کریں گے، مہمان خانے میں آپ نماز پڑھیں۔ آپ یقین فرمائیں کہ وہ میرے اس جملے سے بے حد خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا: مولوی صاحب! ہوتی ہے یا نہیں ہوتی یہ الگ بات ہے مگر آج ہم تیرے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ ہم نے پہلی بار ایسا مولوی دیکھا جو اپنے مدرسے میں بھی کہتا ہے کہ تم اپنی نماز پڑھو۔ کیونکہ نظریات کا اختلاف ہے، پھر انہوں نے ہمارے پیچھے نماز پڑھی۔ حالانکہ وہ اپنے مسلک کے مناظر تھے۔

### نبوت کی تعلیم... مہمان کا اکرام:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا اکرام فرمایا۔ آنے والا مہمان اگر کافر بھی ہو تو اکرام اس کا حق ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ صَیْفَهُ" <sup>44</sup>

جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ مہمان کا اکرام فرمائے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ”مسلمان“ کا اکرام فرمائے، مسلمان کا اکرام الگ چیز ہے۔ لیکن کافر اگر مہمان بن جائے تو بحیثیت مہمان اس کی میزبانی اور اکرام مسلمان کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ مہمان؛ مہمان ہوتا ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر۔

### گفتگو کرنے میں مراتب کی پاسداری:

بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے گفتگو فرمائی۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ان کو اپنی شاعری پر بہت ناز تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اپنے شاعر کو کھڑا کرو۔ ان کے شاعر نے شاعری کی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا اے حسان! اٹھو ذرا مقابلہ کرو حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے جب شعر پڑھے تو عیسائیوں کے دانت کھٹے ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا شاعر ہمارے شاعر سے بڑا ہے۔

اپنی خطابت پر بھی بڑا ناز تھا انہوں نے کہا کہ ہم بہت بڑے خطیب ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ آجاؤ۔ انہوں نے اپنا خطیب کھڑا کیا، اس نے تقریر کی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ سے فرمایا اٹھو ذرا اپنی خطابت کے جوہر دکھاؤ۔ انہوں نے کہا کہ جی آپ کا خطیب بھی ہم سے ٹکڑا ہے۔

### قوت دلیل سے گفتگو سنت ہے:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دلائل کی بات مجھ سے کرو، میں تو شاعر اور خطیب نہیں، میں تو اللہ کا نبی ہوں۔ اس لیے اگر دشمن شاعر لائے تو شاعروں

کو پیش کرنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اگر دشمن خطیب لائے تو خطیب پیش کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنت ہے۔

### خطابت کا مذاق نہ اڑایا جائے:

اس لیے خطابت کا مذاق نہ اڑایا کرو! ہاں خطابت کو پیشہ بنانا جرم ہے لیکن جب ضرورت ہو تو خطابت کا جو ہر دکھانا ایمان ہے اور خود اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا".<sup>45</sup>

بعض خطابت ایسے اثر کرتی ہے جیسے بندے پر جادو اثر کرتا ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خطابت کی ترغیب دی ہے۔

### الوہیت عیسیٰ پر عقلی جواب:

خیر! دلائل شروع ہوئے، ان کا مسئلہ چلتا رہا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دلائل کو توڑا اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دلائل دیے۔ ایک بہت بڑی دلیل یہ بیان فرمائی:

"إِنَّ عِيسَى يَأْتِي عَلَيْهِ الْفَنَاءُ".<sup>46</sup>

کہ عیسیٰ پر تو موت آئے گی، کیا خدا پر بھی موت آیا کرتی ہے؟ فرمایا کہ عیسیٰ پر موت آئے گی حالانکہ عیسائیوں کا عقیدہ بالکل الگ ہے۔

### عیسائیوں کا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نظریہ:

عیسائیوں کا عقیدہ کیا ہے؟ عیسیٰ علیہ السلام پر موت آئی ہے، سولی پر چڑھے

45- صحیح البخاری، رقم: 5146

46- تفسیر الدر المنثور للسیوطی: ج 2 ص 5

## جواب دینے کا انداز:

اللہ وہ ہے جو خود بھی زندہ ہے اور دوسروں کو بھی زندہ رکھتا ہے وہ جو خود ہی زندہ نہ رہے اسے تم نے خدا کیسے مان لیا؟ کچھ عقل سے کام لو۔ یہ عقلی دلیل دی ہے۔

## الوہیت عیسیٰ کی تردید پر نقلی دلیل:

آگے ﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ﴾ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نقلی دلیل دی ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے انجیل نازل کی ہے، تورات نازل فرمائی ہے، زبور نازل فرمائی ہے، کتابیں نازل کیں ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے کتاب نازل نہیں کی ان پر کتاب نازل ہوئی ہے۔ خدا وہ نہیں ہوتا جس پر کتاب اترے خدا وہ ہوتا ہے جو کتاب اتارے۔ تم نے کیسے ان کو خدا مان لیا؟ اب دیکھو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کیسے پیارے دلائل ہیں۔ اس کا ان سے جواب نہیں بن پڑا۔

## مہاجر ملے کی نوبت:

جب وہ دلائل میں ہار گئے، تھک گئے تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ چلو تم دلائل سے ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے تو آؤ ہم مباہلہ کر لیتے ہیں۔ پھر حضور علیہ السلام نے ان سے مباہلے پر بات کی ہے۔ آگے بات آئے گی آیت ﴿فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَابْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ﴾ کے تحت کہ اللہ کے نبی نے مباہلے پر بات کی ہے۔

### مباہلہ اور اس کا طریقہ:

مباہلہ اس وقت بھی تھا مباہلہ آج بھی ہے مباہلے کا مطلب کیا ہے؟ فریقین میں سے ہر ایک یہ دعوائے گئے کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو، اس پر اللہ کا قہر ہو اور وہ برباد ہو جائے۔

### عیسائیوں کی سمجھداری؛ مباہلہ سے انکار:

نجران کے عیسائیوں کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کرتے ہو مباہلہ؟ ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ مباہلہ کریں۔ جب اللہ کے نبی اپنے گھر سے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو لے کر نکلے اور بی بی زہرا رضی اللہ عنہا ساتھ تھیں۔ عیسائیوں کے عالم نے کہا ان کے مبارک وجود کو دیکھ لو، کبھی یہ جرم نہ کرنا اور یہ حماقت کبھی نہ کرنا ان کے ہاتھ اٹھ گئے تو پوری وادی پر آگ بر سے گی۔ بہتر ہے کہ ان سے صلح کر کے واپس ہو جاؤ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ٹھیک ہے صلح کرنا چاہو تو کر لو انہوں نے کہا کہ جی ہم کرتے ہیں۔ فرمایا کہ یوں صلح نہیں ہوگی کلمہ پڑھو یا جزیہ دو یا جاؤ جا کے جنگ کی تیاری کرو ہم آرہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جی ہم جزیہ دے کر صلح کے لیے تیار ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیہ قبول کیا اور صلح کر کے وفد واپس ہو گیا اس پر سورۃ آل عمران کی دو سو آیات نازل ہوئیں۔

## ”عمران“ سے کون سا شخص مراد ہے؟

میں بتا یہ رہا تھا کہ سورۃ کا ”شان نزول“ کیا ہے؟ اس میں لفظ ہے آل عمران۔ آل کا معنی ہوتا ہے اولاد۔ اور عمران کون ہے؟ ایک عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام ہے اور ایک عمران حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نانا کا نام ہے حضرت مریم کے جو والد تھے ان کا نام بھی عمران تھا۔ لیکن اس میں جو ”آل عمران“ ہے اس کا تعلق موسیٰ علیہ السلام کے والد کے ساتھ نہیں اس کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نانا حضرت مریم کے والد کے ساتھ ہے۔

## اولاد کو وقف کرنا:

حضرت مریم کے والد کا نام عمران تھا۔ اور یہ بیت المقدس مسجد اقصیٰ کے امام تھے۔ اس دور میں ان انبیاء میں ایک رواج چلتا تھا کہ اپنی اولاد میں سے ایک بیٹے کو دین کے لیے وقف کر دیا کرتے۔ یہ ان انبیاء علیہم السلام کی شریعت میں تھا کہ باقی بیٹے دنیا کے کام کریں اور ایک کو خالص دین کے لیے وقف کر دو یہ دین کا کام کرتا رہے۔

## حضرت مریم علیہا السلام کی منت:

ان کے دستور کے مطابق حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے اللہ سے منت مانی اے اللہ! جو میرے پیٹ میں حمل ہے اور جس امید کے ساتھ میں ہوں اے مولا کریم اگر یہ بیٹا پیدا ہو تو میں منت مانتی ہوں کہ تیری راہ میں وقف کر دوں گی میں اس کو دین کے لیے پیش کر دوں گی۔ حضرت مریم کی والدہ زندہ تھیں اور امید کے ساتھ تھیں تو والد فوت گئے۔ اب والد تو تھے نہیں۔ حضرت مریم جب پیدا ہوئیں تو ان کی والدہ نے اللہ رب العزت سے یہ کہا: ﴿رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی﴾<sup>47</sup>

## حضرت مریم کی پریشانی پر خدائی دلا سے:

اے اللہ! اگر بیٹا ہوتا تو میں تیری راہ میں وقف کر دیتی اب تو بیٹا نہیں، میں نے بیٹی کو جنا ہے اب میں کیا کروں؟ لیکن جس بیٹی کو جنا تھا اس بیٹی کو لے کر بیت المقدس پہنچ گئیں جب اس نے کہا: ﴿رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی﴾ اے اللہ میں نے بیٹی کو جنا ہے یہ حسرت کا جملہ تھا۔ اپنی بیٹی کو دین کے لیے کیسے پیش کروں؟ میں بیٹی کو کہاں لے کر جاؤں؟ اللہ نے جواب یہ دیا: ﴿وَلَیْسَ الَّذِکَرُ کَاُنْثٰی﴾

اے مریم کی ماں! جو بیٹا تو نے مانگا تھا اس بیٹی کی طرح نہیں ہے جو ہم نے دی ہے۔ تو نے بیٹا مانگا اپنی حیثیت کے مطابق اور خدا نے بیٹی دی ہے اپنی شان کے مطابق۔ اب تیری حیثیت کہاں اور خدا کی شان کہاں؟ بس تو اسی کو پیش کر دے۔ مریم کی والدہ نے مریم کو لیا، چھوٹی بچی ہے اس کو لے کر بیت المقدس میں آگئی۔

## حضرت مریم کی پرورش اور کفالت:

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ”بیان القرآن“ میں لکھا ہے ان کو دودھ پلانے کے لیے دائی کا انتظام کیا گیا یا ان کو دودھ پلانے کی نوبت ہی نہیں آئی یہ بغیر دودھ پیے بچپن میں بڑھتی چلی گئیں۔ اس لیے قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے ان کی بڑے اچھے طریقے سے پرورش کی یعنی بہت جلد جسم میں طاقت عطا فرمائی کہ اگر عام بچی کی ایک مہینے میں ایسی پرورش ہوتی ہے تو وہ ایک دن میں ایسی تھیں۔ مریم علیہا السلام کی والدہ اپنی بیٹی کو لے کر گئیں۔ بیت المقدس میں علماء تھے اور حضرت زکریا علیہ السلام بھی تھے۔ اگر مریم کے والد زندہ ہوتے جو بیت المقدس کے امام تھے اپنی بیٹی کی تربیت وہ کرتے۔ اب باپ تو تھا نہیں حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے دے دو کیونکہ حضرت زکریا کی بیوی حضرت مریم کی خالہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے

دے دو کیونکہ یہ ہماری بیٹی بھی ہے اور میری بیوی جو اس کی خالہ ہے وہ اس کی تربیت کرے گی۔

لیکن جو باقی علماء تھے انہوں نے کہا کہ نہیں ہم اس کی تربیت کریں گے۔ کیونکہ ہر بندے کی خواہش ہوتی ہے کہ بڑے خاندان کی بیٹی یا بیٹا میرا شاگرد بنے۔ بڑے خاندان سے میرا تعلق قائم ہو۔ بڑے خاندان سے مراد دولت نہیں بلکہ علم و فضل ہے۔

ان کی خواہش یہ تھی کہ اس کی تربیت ہم کریں اب فیصلہ نہ ہوا کہ تربیت کون کرے گا حضرت مریم علیہا السلام کی تربیت کرنے پر اختلاف ہوا زکریا علیہ السلام نے اپنا حق جتایا باقی علماء نے اپنا حق جتایا۔

### اختلاف کا آسان حل قرعہ اندازی:

اب اس میں طے یہ ہوا کہ یوں کرو قرعہ اندازی کرلو، جس کے نام کا قرعہ نکلے گا وہی اس کی تربیت کرے گا۔ اس آیت میں قرعہ کا مسئلہ موجود ہے۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُتْلَىٰ أُولَٰئِكَ لَهُمْ يُكْفَلُ رَوِيَّةً وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ﴾ ﴿٢٢﴾

اے میرے پیغمبر! آپ وہاں موجود نہیں تھے جب ان میں قرعہ اندازی ہو رہی تھی کہ کفالت کون کرے گا؟

### قرعہ اندازی کا طریقہ:

اب قرعہ طے کیسے ہوا؟ انہوں نے کہا جو مریم کی کفالت کے امیدوار ہیں وہ اپنا اپنا قلم دریا میں ڈالیں اور جس کا قلم ادھر جائے جدھر دریا کا پانی جاتا ہے وہ اس مریم کو نہ لے جائے اور جس کا قلم پانی کے بہاؤ کے مخالف سمت میں چلے حضرت مریم



کی کفالت وہ کرے گا۔ قلم ڈالے گئے تو حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم ادھر چل دیا جدھر سے پانی آ رہا تھا۔ نبی جوتھے۔

### بچیوں کے مدارس کا ثبوت:

پھر مریم ان کی تربیت میں آگئیں۔ پھر زکریا علیہ السلام نے مریم کی تربیت شروع فرمادی مریم بہت چھوٹی عمر میں بلوغ تک پہنچی ہیں۔ مریم علیہا السلام کی تربیت کے لیے زکریا علیہ السلام نے بچیوں کا مدرسہ بنادیا۔ لوگ کہتے ہیں بچیوں کے مدرسے کا ثبوت کہاں ہے؟ میں نے کہا قرآن کریم میں ہے۔ آدمی قرآن پڑھے تو ثبوت مل جاتا ہے اور یہ مدرسہ ہی تھا زکریا علیہ السلام کا۔

### کرامت کا ظہور:

ایک کمرہ تھا وہاں مریم کو رکھتے اور پھر دعوت و تبلیغ کے لیے چلے جاتے واپس آتے تو اس بیٹی کو کھانا پیش کر دیتے لیکن ایک بار حضرت مریم جس کمرے میں تھیں جب تالا کھولا تو سامنے تازہ بے موسے پھل نظر آئے، حضرت زکریا علیہ السلام نے تعجب سے پوچھا: ﴿يَمْرُؤُا۟ اٰتٰىكَ هٰذَا﴾ اے مریم! تالا بند ہے دروازے پہ تالا لگا ہے یہ پھل کہاں سے آتا ہے؟ حضرت مریم نے کہا: ﴿هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾

یہ اللہ کی طرف سے میرے پاس آیا ہے میں نے لفظ ”عِنْدِ اللّٰهِ“ پر آج بات کرنی ہے ان شاء اللہ۔ آپ دیکھنا عقیدہ کیسے سمجھ آتا ہے؟ اس کو یہاں چھوڑ دیں اس پہ بعد میں بات کروں گا۔

### انبیاء کرام بھی اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں:

حضرت زکریا علیہ السلام سجدے میں گر گئے، کیوں؟ اس لیے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر سو سال کے قریب ہے۔ بیوی کی عمر نوے سال کے لگ بھگ

ہے اولاد سے بالکل محروم ہیں۔ نبی کے گھر میں اولاد نہیں ہے حضرت زکریا علیہ السلام سجدے میں گر گئے اور اللہ سے دعا مانگی:

﴿رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ﴾

اے اللہ! اس مریم کو بغیر موسم کے میوے دے سکتا ہے تو مجھے بھی بغیر موسم کے اولاد دے سکتا ہے۔ اے مولا کریم! جس طرح اس کو پھل دیا ہے مجھے بھی اولاد عطا فرمادے۔

### دعا کی قبولیت اور بچے کا نام:

حضرت زکریا علیہ السلام نے جب دعا مانگی قرآن میں ہے پھر فرشتوں نے آ کر بشارت دی کہ اللہ نے تمہاری دعا قبول کر لی ہے، ﴿أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بَيْعْنِ مَصَدَقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ﴾

اللہ تمہیں خوشخبری دیتا ہے تمہارے ہاں بیٹا پیدا ہو گا اور وہ سید اور سردار بھی ہو گا وہ نبی بھی ہو گا وہ نیک بھی ہو گا۔ ﴿وَحَصُورًا﴾ اور وہ نکاح نہیں کرے گا وہ دنیا کی خواہشات سے الگ تھلگ رہیں گے اور اللہ تمہیں بیٹا عطا فرمائے گا اور جس کا نام بھی اللہ نے یحییٰ رکھ دیا ہے۔ خدا نے خود نام رکھا ہے یحییٰ۔ بتاؤ یہ کتنا عجیب بیٹا ہو گا فرمایا ”یحییٰ“ یہ اللہ نے نام رکھا ہے۔ یہ بیٹا تمہارے ہاں پیدا ہو گا۔

### فرط بشارت میں تعجب خیز سوال:

حضرت زکریا علیہ السلام کو جب بشارت ملی تو تعجب سے پوچھنے لگے میرے ہاں بیٹا کیسے پیدا ہو گا؟ ﴿رَبِّ اَنِّیْ یَکُوْنُ لِیْ عِلْمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِیْ الْکِبَرُ وَاْمْرًاۤتِیْ عَاقِرٌ﴾ میں بوڑھا ہوں میری بیوی بانجھ ہے۔ اب یہ اللہ کی قدرت سے اشکال نہیں تھا، اعتراض نہیں تھا وہ سمجھنا چاہ رہے تھے میں بوڑھا ہوں کیا میں جوان ہو جاؤں گا یا

بڑھاپے کی عمر میں خدا دے گا؟ اللہ کیسے بیٹا پیدا ہوگا؟ آپ سمجھ گئے؟ خدا کی قدرت پر اعتراض نہیں تھا وہ سمجھنا چاہ رہے تھے کہ آخر کیسے ہوگا؟

### انسانی مزاج مزید اطمینان:

کبھی آدمی کو پورا یقین ہوتا ہے۔ پھر کہتے ہیں یا رہمیں سمجھاؤ آخر یہ ہوگا کس طرح؟ اب اگر آپ کی مسجد ہے، اللہ نہ کرے اس کے اے سی میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے ہم کہیں کہ یہ ہمارے پاس چھوڑ جاؤ! ہم ٹھیک کر دیں گے۔ آپ کہتے ہیں آپ ٹھیک کر دیں گے یہ ہم جانتے ہیں مگر پھر بھی آپ تھوڑا سا سمجھائیں تو سہی۔ تو اس طرح کی باتیں آدمی اطمینان کے لیے کرتا ہے۔

### مناظرے میں پشتو زبان کی شرط:

ہمارا ایک دفعہ صوابی میں مناظرہ طے ہو گیا یہ آج سے چار پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ جب مناظرہ طے ہوا مجھے وہاں کے ذمہ دار حضرات نے فون کیا انہوں نے کہا کہ مولانا صاحب مناظرہ ہے حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان پر مگر ہمارے پاس کوئی پشتو مناظر نہیں ہے۔ تو پھر کیا کریں؟ میں نے کہا آپ مناظرہ طے کریں، پشتو والی شرط میں اڑادوں گا یہ میری ذمہ داری ہے آپ بس طے کریں اگلا کام میرے ذمے ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری شوریٰ بیٹھی ہے وہ کہتے ہیں مولانا صاحب سے پوچھو وہ یہ شرط کیسے توڑیں گے؟ میں نے کہا یہ میرا مسئلہ ہے تمہارا نہیں، تم مناظرہ طے کرو! وہ کہتے ہیں ہمیں پورا یقین ہے آپ توڑ دیں گے، لیکن یہ تو بتائیں آپ شرط توڑیں گے کیسے؟ بس ہم قلبی اطمینان کے لیے چاہتے ہیں۔

### مذکورہ شرط توڑنے کا اصولی قاعدہ:

میں نے کہا میں نے کہہ دیا توڑوں گا آپ تسلی رکھیں۔ انہوں نے کہا پھر بھی آپ ہمیں اشارہ دے دیں۔ میں نے کہا میں ان سے پوچھوں گا ایک میری جماعت ہے

ایک تمہاری جماعت ہے ان دونوں جماعتوں کا مناظرہ ہونا ہے۔ تمہاری یہ جماعت قومی ہے یا صوبائی ہے؟ اگر وہ کہیں گے صوبائی ہے تو میں کہوں گا کہ پنجاب میں گجرات کا رہنے والا تمہارا ناظم اعلیٰ کیسے ہے؟ اگر صوبائی ہے تو پنجاب کے عہدے ختم کرو اگر قومی ہے تو قومی زبان اردو ہے لہذا مناظرہ اردو میں کرو۔ یہ سن کر وہ بہت زیادہ خوش ہوئے۔

### ازالہ فکر اور بیٹے کی نشانی:

تو حضرت زکریا علیہ السلام نے پوچھا اے اللہ! یہ کیسے ہوگا؟ بیٹا تو ہونا ہے آپ نے فرمادیا، لیکن کیسے ہوگا؟ ہمیں اس بڑھاپے کے بعد جوانی ملے گی یا بڑھاپے میں آپ دیں گے؟ اللہ نے فرمایا: اسی طرح ہوگا تم فکر نہ کرو، بڑھاپا بھی رہے گا اور بیٹا بھی پیدا ہوگا، ہاں میں تمہیں ایک نشانی دیتا ہوں جب تمہاری اہلیہ امید کے ساتھ ہو جائے گی تو تم اپنی زبان سے بول نہیں سکو گے، یہ بولنا بند ہو جائے گا تم اشاروں سے بات کرو گے، تب سمجھنا کہ تمہارے ہاں امید لگ گئی ہے۔

### عورت کو خدا نبی نہیں بناتا:

اب اس میں دوسرا مطلب سمجھیں! واقعہ تو آپ نے سن لیا ہے یہ خلاصہ تھا مریم علیہ السلام کے واقعے کا۔ اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام کو بیٹا ملا۔ ایک بات درمیان میں سمجھ لیں، حضرت مریم علیہا السلام ولیہ ہیں نبی نہیں ہیں۔ خدا نے کسی بھی عورت کے سر پہ تاج نبوت نہیں رکھا۔

### فرشتہ اور جن بھی نبی نہیں ہو سکتا:

نہ کسی جن کو نبوت دی ہے، نہ ملائکہ کو نبوت دی ہے، اگر دی ہے تو بشر کو دی ہے اور بشر میں سے بشر کامل کو دی ہے بشر تو انسان ہوتا ہے نا پھر انسانوں میں کامل انسان مرد ہوتا ہے عورت نہیں ہوتی۔

## عورت کی عقل اور دین ناقص کیسے ہوتا ہے؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورت کا دین بھی ناقص ہے عورت کی عقل بھی ناقص ہے۔ پوچھا گیا کہ حضور وہ کیسے؟ فرمایا: دین ان کا اس طرح ناقص ہے کہ

☆ مرد پورا مہینا نماز پڑھتا ہے اور یہ مہینے میں کچھ دن نماز نہیں پڑھتی ہے۔

☆ مرد رمضان کا پورا مہینا روزے رکھتا ہے اور کچھ دن ان کو روزے چھوڑنے پڑتے

ہیں۔

پوچھا گیا کہ عقل کیسے ناقص ہے؟ فرمایا: اگر کسی کیس میں دو مرد ہوں تو عدالت ان کی گواہی قبول کرتی ہے دو عورتیں ہوں تو عدالت گواہی قبول نہیں کرتی۔ دو مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تو پھر گواہی قبول کی جائے گی۔ دو عورتوں کو ایک مرد کے قائم مقام رکھا گیا اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری یاد کرا دے۔<sup>48</sup>

پتا چلا کہ ان کی عقل بھی ناقص ہے۔ تو ان کی عقل بھی ناقص ہے اور دین بھی ناقص ہے۔ بتاؤ جو خود ناقص ہے وہ کامل بن کر نبی کیسے بنے گی؟ جو خود کمزور ہے وہ کامل بن کر نبی کیسے بنے گی؟

## عورت ہے تو ناقص العقل لیکن.....؟

یہ تو ایک وجہ ہے بہت سی وجوہات ہیں کہ عورت نبی کیوں نہیں بنتی؟ نبی کے کندھے پہ جو نبوت کا بوجھ ہوتا ہے اس کو اٹھانا عورت کے بس میں نہیں ہے یہ مرد ہی اٹھا سکتا ہے عورتوں کے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن ایک بات رسول اکرم صلی اللہ علیہ

و سلم نے فرمائی کہ یہ ہیں تو ناقص عقل والی لیکن بڑے بڑوں کی عقلیں اڑا کے رکھ دیتی ہیں۔ ان کی اپنی عقل تو ناقص ہے لیکن عقل والوں کی عقلیں اڑا دیتی ہے۔ اللہ فتنے سے حفاظت فرمائے۔

### امت کا خطرناک فتنہ..... عورت:

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے بعد جتنے بھی فتنے آئیں گے مردوں کے لیے سب سے خطرناک فتنہ میری امت میں عورتوں کا فتنہ ہے، یہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں۔ اس لیے ہم بار بار کہتے ہیں حدود کا خیال رکھو۔

### عورت کا مساجد اور عید گاہ میں آنے کا مسئلہ:

اب یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے کہ عورتیں عید گاہ میں لے جاؤ، یہ مستقل فتنہ ہے۔ عورتوں کو مسجد میں نمازوں کے لیے لے آؤ یہ مستقل فتنہ ہے اور آئے دن یہ فتنے بڑھ رہے ہیں۔

### عورت کا مسجد میں اعتکاف کرنا:

اب تھوڑے عرصے سے ایک نئی مصیبت شروع ہو گئی ہے کہ عورتوں کو مساجد میں اعتکاف بٹھاؤ! یہ مستقل فتنہ ہے۔ پھر اس میں جو معاشرتی مفساد اور برائیاں ہیں وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ اس کی وجہ سے کئی ایک ایسے نازیبا اور ناگفتہ بہ واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔

### عورت کی بہترین عبادت گاہ:

عورت کی بہترین عبادت گاہ گھر ہے جس میں عورتیں الگ نماز پڑھیں۔ مسجد میں مت اعتکاف بیٹھیں، گھر میں بیٹھیں۔ عورت جنازہ گاہ میں مت جائے عورت گھر میں بیٹھے۔ آپ تو مسجد عثمانیہ کے اعتکاف کی بات کرتے ہیں ”ام حمید الساعدیہ رضی

اللہ عنہا“ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیہ ہیں انہوں نے کہا یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے مسجد نبوی میں آپ کی امامت میں نماز پڑھوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب سننا فرمایا: "قَدْ عَلِمْتُ أَنَّكَ تُحِبُّينِ الصَّلَاةَ." <sup>49</sup>

مجھے پورا یقین ہے کہ تیرا جی چاہتا کہ ہے میرے پیچھے نماز پڑھے لیکن ام حمید سن! عورت کا بند کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے جب کہ برآمدے میں نماز پڑھنا صحن میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ صحن میں نماز پڑھنا اپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے اور محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا مجھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں نماز پڑھنے سے بھی افضل ہے۔

### اور یہ آج کا دور..... اُف اللہ:

یہ کس دور کی بات ہے؟ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود مسجد نبوی میں نماز پڑھا رہے تھے۔ اس دور میں بھی عورت کی گھر میں نماز مسجد میں پڑھنے سے افضل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور میں ابتدائی طور پر عورت کو اجازت دی ہے لیکن بعد میں عورتیں گھر میں نماز پڑھتی تھیں۔ مسجد میں جا کے نماز نہیں پڑھا کرتی تھیں۔

### دین کے نام پر بڑے فتنوں کا مقابلہ:

کبھی فتنے دنیا کے نام پر ہوتے ہیں اور کبھی فتنے دین کے نام پر ہوتے ہیں۔ دنیا کے نام پر فتنہ کو سمجھنا بہت آسان ہے اور مقابلہ بھی بہت آسان ہے۔ اور دین کے نام پر فتنہ کو سمجھنا بھی ذرا مشکل ہے اور اس کا مقابلہ بھی بڑا مشکل ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ عورتوں کے دین کے دشمن ہیں۔ ان بے چاریوں کی اتنی رغبت ہے اور آپ کہتے

ہیں مسجد نہ آئیں۔ اس کے بعد جو فسادات کھڑے ہوتے ہیں وہ بیان بھی نہیں کیے جا سکتے۔ آپ حضرات کا ایک محلہ ہے۔ ہمارے پاس دنیا کے لوگ مسائل پوچھتے ہیں پھر رابطے کرتے ہیں پھر بعد میں جو حالات پیش آتے ہیں ان کو اسٹیج پہ بیان کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتے۔ میں خدا کی قسم اٹھا کے کہہ رہا ہوں میرے علم میں وہ مسجدیں ہیں کہ عورت اعتکاف کے لیے آئی ہے اور اعتکاف ہی سے دوڑی ہے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں ادھر عورتیں اعتکاف میں ہیں ادھر مرد اعتکاف میں ہیں درمیان میں پتلا سا ایک کپڑا ہے۔ اب بتاؤ فتنہ پھیلے گا یا نہیں پھیلے گا؟ فتنہ پھیل جائے گا آپ کس کس فتنہ کا رونا روئیں گے؟ دین کے نام پہ آنے والے فتنے بڑے مشکل ہیں اور ان کا مقابلہ بھی بڑا مشکل ہے۔ اس پر انسان کو اپنوں کی ملا متیں سننا پڑتی ہیں کہ یہ کوئی مسئلہ بتانے والا تھا؟ یہ کوئی بات کرنے والی تھی؟ اور دنیا میں مسئلے تھوڑے ہیں؟

### حضرت حذیفہ بن یمان کی خصوصیت:

میں سمجھتا ہوں ہمارا جو مزاج ہے نایہ مزاج حذیفی ہے۔ کیا مزاج ہے؟ مزاج حذیفی (سامعین) کچھ آپ بھی سمجھ لیں مزاج حذیفی کیا ہے؟ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ بن یمان، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں اور ان کی خصوصیت کیا ہے؟ ”صَاحِبُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدان ہیں۔

### فضائل اعمال کا ایک واقعہ:

میرا جمعہ بھاگٹانوالہ<sup>50</sup> میں تھا تو تبلیغ والے ساتھی بڑی کثرت سے آتے ہیں میں نے کہا فضائل اعمال کو سمجھ لو الجھنیں ختم ہو جائیں گی اور کاز سمجھ آئے گا۔ شیخ

50۔ ”بھاگٹانوالہ“ سرگودھا میں ایک جگہ کا نام ہے۔



الحديث مولانا زکریا رحمہ اللہ نے فضائل اعمال میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ معمول تھا کہ مدینہ منورہ میں جب کسی کا جنازہ اٹھتا تو پوچھتے کہ اس جنازے میں سیدنا حذیفہ ہیں یا نہیں؟ اگر بتایا جاتا کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ موجود ہیں تو عمر رضی اللہ عنہ جنازہ پڑھتے ورنہ جنازہ نہ پڑھتے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدان ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بتایا تھا کہ مدینہ میں کون کون منافق ہیں اور منافق کا جنازہ عمر نہیں پڑھ سکتا۔

### قیامت کو اعلان ہوگا:

یہ مولانا الیاس گھسن کی دعوت نہیں ہے یہ فضائل اعمال کی دعوت ہے۔ فرق کیا ہے؟ ہم کھل کر بات کہتے ہیں اور وہ کھل کر بات نہیں کرتے مسئلہ سمجھا دیتے ہیں، اس سے عقل مند آدمی سمجھ سکتا ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ مزاج ہے تو میں اور آپ کون ہوتے ہیں کہ ہر کسی کے جنازے میں گھسیں؟ یہ کیا مصیبت پڑی ہے؟ جی ہماری مجبوری ہے، میں نے کہا کہ تمہاری مجبوری ہے ہماری کوئی مجبوری نہیں۔ کل قیامت کو جو الگ کھڑا ہونا ہے تو دنیا میں الگ ہو جاؤ۔ قیامت کو علیحدگی ضروری ہوگی۔ اختیاری علیحدگی کا اجر ملتا ہے اضطراری کا اجر نہیں ملتا۔ قیامت کے دن

اعلان ہوگا: ﴿وَأَمَّا زُورُ الْيَوْمِ أَتُهَا الْمُجْرِمُونَ﴾<sup>51</sup>

مجرم الگ ہو جائیں اور نیک الگ ہو جائیں۔

### فسادِ عقیدہ کا جرم اور سزا:

عمل کا جرم چھوٹا جرم ہوتا ہے عقیدے کا جرم بڑا جرم ہوتا ہے۔ عقیدے کے معاملے میں ہمارا کوئی سمجھوتہ نہیں ہے۔ ہم دنیا میں بھی کہتے ہیں اور قیامت میں

بھی کہ اللہ ہم کو جو ذمہ دے ہم نے گالیاں سن کر بھی اسے پورا کرنا ہے۔ آج مان لو تو کل قیامت کے دن مزے کرو گے نہیں مانو گے تو پھر بھگتنا پڑے گا۔

### حکیم الامت تھانوی کا حکیمانہ جواب:

حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہ اللہ کو ایک بندے نے خط لکھا اس نے کہا میں نے ڈاڑھی رکھی ہے لوگ ہنستے ہیں حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے کہا ”آج لوگ ہنستے ہیں کل قیامت کے دن تجھے نہیں رونا پڑے گا آج رکھ لے قیامت میں یہ روئیں گے اور تو ہنسے گا“ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق دے۔

### کرامت دیکھ کر خدا سے مانگنا:

خیر جوابات میں سنار ہا تھا وہ یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام ولی ہیں نبی نہیں اور زکریا علیہ السلام نبی ہیں۔ حضرت مریم کو جو یہ کھانا ملا جو یہ پھل ملا اور بغیر موسم کے ملایہ مریم علیہا السلام کی کرامت ہے اور اس کرامت کو قرآن نے بیان کیا ہے۔ اب جو بندہ کرامتِ اولیاء نہیں مانتا وہ ان کا انکار نہیں قرآن کا انکار کرتا ہے۔ اب قرآن بیان کرے تو کون بندہ کرامتِ اولیاء کا انکار کر سکتا ہے۔ کرامت کو ہم مانتے ہیں فرق کیا ہے؟ زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کی کرامت کو دیکھا تو مریم سے مانگا یا مریم کے خدا سے مانگا؟ مریم سے نہیں مریم کے خدا کے سے مانگا۔

### کرامت کے انکار کا شرعی حکم:

آج جھگڑا ہی یہی ہے عیسائی مریم علیہا السلام سے مانگتا ہے، اب ہم مریم علیہا السلام سے نہیں مریم علیہا السلام کے خدا سے مانگتے ہیں۔ ولی کی کرامت کو دیکھ کر ولی سے مانگنا یہ ”عیسائیت“ ہے، ولی کی کرامت کو دیکھ کر ولی کے خدا سے مانگنا یہ ”اسلام“ ہے۔ ہم کرامت مانتے ہیں لیکن ولی کے خدا سے مانگتے ہیں۔ جھگڑا یہ نہیں ہے کہ کرامت کو نہیں مانتے، کرامت کا انکار تو کفر ہے۔

بہر حال مریم علیہا السلام کی تربیت مکمل ہوئی ذکر یا علیہ السلام کے ہاں سے چلی گئیں۔ پھر مریم علیہا السلام کے ہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے مریم علیہا السلام نے پردہ کیا کہا تو کون ہے؟ انہوں نے کہا میں انسان نہیں ہوں فرشتہ ہوں۔ حضرت مریم نے کہا کیسے آئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ بیٹے کی خوشخبری دینے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ کیسا بیٹا؟ نہ تو میرے پاس کوئی بشر آیا نہ میرا نکاح ہے نہ میں ایسی کوئی گندی عورت ہوں میرے ہاں بیٹا کیسے ہو گا؟ انہوں نے کہا اسی طرح اللہ نے حکم دیا ہے میں خدا کے حکم سے آیا ہوں۔ حضرت جبرائیل امین نے مریم علیہا السلام کے گریبان میں پھونک ماری، اسی سے امید لگی، اسی سے بچہ پیدا ہوا۔

### حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش:

اب مریم علیہا السلام کے ہاں جب ولادت ہونے لگی پیٹ ظاہر ہوا تو مریم علیہا السلام نے کہا یا اللہ! کاش میں اس دن سے پہلے مرجاتی، لوگوں کو میں کیا جواب دوں گی؟ لوگوں کو میں کیا سمجھاؤں گی کہ یہ پیٹ اللہ کی طرف سے ہے، کون میری بات مانے گا؟ اللہ نے فرمایا مریم یہ تمہارے ذمے نہیں ہے بیٹا ہم نے دیا ہے تو گواہی بھی ہمارے ذمے ہے، جب بیٹا پیدا ہو جائے گا تو لوگ پوچھیں گے کہاں سے لائی ہو تو بچے کی طرف اشارہ کرنا کہ مجھ سے نہیں اس سے پوچھو۔

مریم تو نہ بول یہ خود بولے گا۔ مریم علیہا السلام کے پیٹ میں جو بیٹا تھا وہ آ گیا، گود میں ہے لوگوں نے پوچھا مریم یہ کیا؟ تو کس خاندان کی لڑکی ہے یہ کیا کیا؟ اس نے کہا جی میرا تو روزہ ہے چپ کا، چپ کا روزہ اس امت میں تھا اب نہیں ہے۔

### حضرت عیسیٰ کی سب سے پہلی بات:

انہوں نے کہا اس سے پوچھو لوگوں نے کہا اس سے پوچھیں؟ یہ بچہ ہے۔ لیکن عیسیٰ علیہ السلام بول پڑے اور فرمایا:

﴿قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ۖ آتَنِي الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۖ﴾<sup>52</sup>

میں اللہ کا بندہ ہوں، خدا کا کلمہ ہوں اللہ کے حکم سے پیدا ہوا ہوں، اللہ نے مجھے نبوت عطا فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ مجھے کتاب دے گا۔ میری ماں تو پاک دامن ہے میری ماں پر کیا الزام لگاتے ہو؟

### عیسیٰ علیہ السلام کا دفاع قرآن کی زبان سے:

دیکھو! عیسائیت سے ہم کہتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر جو الزام لگایا گیا اس کا دفاع بھی خدا کے قرآن نے کیا ہے اگر قرآن دفاع نہ کرتا تو دنیا کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کا دفاع کر سکتی ہو۔ عیسائیوں کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو دفاع کرتی۔ ہمارے قرآن نے دفاع کیا۔

میں بات یہ کہہ رہا تھا کہ آل عمران میں عمران کون ہیں؟ موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام بھی عمران تھا اور ایک حضرت مریم کے والد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نانا کا نام بھی عمران تھا اسی نسبت سے اللہ پاک نے اس سورۃ کا نام سورۃ آل عمران رکھا ہے۔ جس کی 200 آیتیں اور 20 رکوع ہیں چند ایک مسائل میں پیش کر رہا ہوں۔

### آیات محکمات اور متشابہات کا مسئلہ:

﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ

الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۚ﴾<sup>53</sup>

محکمات اور متشابہات کا مسئلہ، قرآن کریم نے خود بیان کیا ہے۔ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہیں بعض آیات محکمات اور بعض متشابہات۔ خوب سمجھ لیں

”محکمات“ ان آیات کو کہتے ہیں جن کا معنی بڑا واضح ہو اور ”متشابہات“ اسے کہتے ہیں جن کا معنی واضح نہ ہو۔ اللہ پاک فرماتے ہیں:

﴿الْعَمُّ لِلَّهِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ﴾

اس میں ہے ﴿الْعَمُّ﴾ یہ متشابہات میں سے ہے اس کا معنی کسی کو معلوم نہیں تو بعض آیات متشابہات ہیں کہ جس کا معنی کسی کو معلوم نہ ہو ”الحد“ کا معنی اللہ کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾

جن کے دل میں کجی ہے، جو گمراہ ہیں وہ محکمات نہیں متشابہات کو پیش کرتے ہیں امت کو گمراہ کرنے کے لیے۔ مگر وہ لوگ جن کا علم مضبوط ہے وہ اس کا معنی بیان نہیں کرتے، کہتے ہیں ہم ایمان لائے اس کا جو بھی معنی ہے ہم اس کو مانتے ہیں۔ اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔

### متشابہات میں بحث نہیں کرنی چاہیے:

اچھا عجیب بات ہے کہ پہلے علم والے بحث کرتے تھے اب جاہل بحث کرتے ہیں۔ اللہ پاک فرماتے ہیں علم والا وہ متشابہات سے بحث نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے جو اللہ نے فرما دیا وہ حق ہے ہم ایمان لائے ہیں اور جو جاہل ہے جس کے دل میں کجی اور گمراہی ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑتا ہے۔ اس سے پتا چلا کہ اب آپ معاشرے میں دیکھتے رہنا جو محکمات کی بات کرے وہ راخی فی العلم ہے اور جو متشابہات کی بات کرے وہ جاہل اور گمراہ آدمی ہے۔ اللہ ہم سب کو گمراہی سے محفوظ رکھے اور اللہ ہم سب کو محکمات پر عمل کرتے ہوئے ایمان کی نعمت عطا فرمائے۔ (آمین) محکمات کی بات کرنی

چاہیے اور متشابہات میں بحث نہیں کرنی چاہیے۔

### ہمارا مذہبی تعارف:

ہمارے ہاں بہت سے لوگوں نے اپنے نام رکھے ہیں کوئی کہتا ہے میرا فلاں نام ہے، کوئی کہتا ہے میرا یہ نام ہے، کوئی کہتا ہے میرا یہ نام ہے۔ ہمارا نام ہے اہل السنۃ والجماعۃ۔ کیا نام ہے؟ اہل السنۃ والجماعۃ۔ تفسیر الدر المنثور میں ہے کہ جب یہ آیت اتری: ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ﴾<sup>54</sup> کہ قیامت کے دن بعض کے چہرے سفید ہوں گے اور بعض کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! جن کے چہرے سفید ہیں وہ کون ہیں اور جن کے چہرے سیاہ ہیں وہ کون ہیں؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جن کے چہرے سفید ہیں وہ اہل السنۃ والجماعۃ ہیں اور جن کے چہرے سیاہ ہیں وہ اہل بدعت ہیں۔ اہل بدعت کا چہرہ سیاہ ہو گا اور اہل السنۃ والجماعۃ کا سفید ہو گا۔<sup>55</sup>

### اہل السنۃ والجماعۃ کا معنی؟:

اہل السنۃ والجماعۃ کا مطلب کیا ہے؟ اہل السنۃ والجماعۃ کا معنی سمجھیں۔ سنت سے مراد پیغمبر کی ذات اور الجماعت سے مراد جماعت صحابہ۔ اب اہل السنۃ والجماعۃ کا مطلب یہ ہے کہ جو حدیث پیغمبر سے لے اور حدیث کا معنی پیغمبر کے صحابی سے لے۔ یہ اہل السنۃ والجماعۃ ہے۔

### لفظ اور معنی دونوں صحابی سے:

اب جو لفظ صحابی سے لے اور معنی وہابی سے لے وہ اہل السنۃ والجماعۃ میں

54۔ آل عمران 3: 106

55۔ تفسیر الدر المنثور: ج 2 ص 111 ص 112

نہیں۔ ہم لفظ صحابی سے لیتے ہیں اور معنی بھی صحابی سے لیتے ہیں اس طرح ہم اہل سنت والجماعت ہیں۔ میں دو مثالیں دیتا ہوں تاکہ مسئلہ آپ پر کھل جائے۔

### نماز جنازہ کے بعد دعا کا مسئلہ:

ایک شخص مجھے کہنے لگا کہ جنازے کے بعد دعا مانگنی چاہیے؟ میں نے کہا کہ آپ کا کیا خیال ہے؟ کہتا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں مانگ لینی چاہیے میں نے کہا دلیل کیا ہے؟ کہتا ہے کہ حدیث موجود ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوا لَهُ الدُّعَاءَ." <sup>56</sup>

جب تم میت پر جنازہ پڑھو تو دعا اخلاص سے مانگنا۔ دیکھو! جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جنازہ پڑھو تو دعا اخلاص کے ساتھ مانگنا۔ جنازہ پہلے ہے اور دعا بعد میں ہے۔ دیکھو حدیث میں آگیا میں نے کہا بالکل آگیا۔ کہتا ہے کہ پھر کیوں نہیں مانگتے؟ میں نے کہا کہ اگلی حدیث پڑھ! حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ خود حدیث کے راوی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى عَلَى الْجَنَازَةِ قَالَ:

«اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا. اللَّهُمَّ مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الْإِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ

عَلَى الْإِسْلَامِ." <sup>57</sup>

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب میت پر جنازہ پڑھتے تو دعا مانگتے۔ میں نے

56۔ مشکوٰۃ المصابیح، رقم: 1674

57۔ مشکوٰۃ المصابیح، رقم: 1675

کہا: آپ کا کہنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جنازہ پڑھو تو دعائے مانگو، اس کا معنی بعد میں صحابی فرماتے ہیں ”جب اللہ کے نبی میت پر جنازہ پڑھتے تو دعائے مانگتے۔“ اب دعا جنازہ کے بعد ہے تو بات تیری ٹھیک اگر جنازہ میں ہے تو بات میری ٹھیک۔ ایک بات پر قائم رہو خود کیوں معنی بیان کرتے ہو؟ معنی صحابی سے لو۔ اہل السنۃ والجماعۃ کسے کہتے ہیں کہ حدیث صحابی سے لیں اور حدیث نبی کی ہو اور معنی صحابی سے۔

### ڈاڑھی کا مسئلہ:

اسی طرح ایک شخص کہنے لگا ڈاڑھی کتنی رکھتے ہو؟ میں نے کہا ایک مٹھی۔ لمبی کیوں نہیں رکھتے؟ میں نے کہا کہ تم بتا دو! آپ کبھی بھی اپنے ذمے دلیل نہ لیا کرو دلیل مخالف کے ذمے لگاؤ اور خود سوال کرو۔ آپ دلیل اپنے ذمے لیتے ہیں وہ اعتراض شروع کر دیتا ہے پھر آپ کو جواب دینا پڑتا ہے پھر ہمارا فون نمبر تلاش کرتے ہیں جب فون نہیں ملتا تو کہتے ہیں کہ اچھا عجیب بندہ ہے۔

چلیں میں مسئلہ سمجھاتا ہوں۔ میں نے کہا کہ جی آپ فرمائیں، کہتے ہیں حدیث پاک میں آیا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خَالِفُوا الْمَشْرِكِينَ وَقَرُّوا اللَّحْيَ وَأَخْفُوا الشَّوَارِبَ."<sup>58</sup>

مشرکین کی مخالفت کرو، ڈاڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں کٹاؤ!

تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ڈاڑھی بڑھاؤ! میں نے کہا کہ آگے حدیث پڑھ۔ اس میں امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا عمل یہ تھا:



"وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا حَاجَّ أَوْ اعْتَمَرَ قَبِضَ عَلَى لِحْيَتِهِ فَمَا فَضَلَ أَخَذَهُ." 59

ڈاڑھی اپنی مٹھی میں لیتے جو بڑھ جاتی تراش دیتے۔ میں نے کہا ہم نے معنی صحابی سے لیا ہے تم نے وہابی سے لیا ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا معنی سمجھ گئے؟

### فتنوں سے بچیں:

بہت سے حضرات کو میرے بعض جملوں پہ شبہ ہوتا ہے اس لیے کہ ان کے گھر میں فتنہ نہیں آیا۔ جب تمہارے گھر میں آیا تو پھر تم نے کہنا ہے مولانا گھمن صاحب کا نمبر تو دیں۔ یہ پورے ملک کا رواج ہے۔

ہم خالص دین سمجھ کر یہ بات کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کے گھر میں فتنہ ہوتا ہے تو پھر متحرک ہوتے ہیں ہم گھر میں فتنہ آنے سے پہلے پوری امت کی فکر کرتے ہیں اللہ ہمیں فتنے سے امت کو بچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

### حذیفی مزاج کیا ہے؟

ایک بات درمیان میں رہ گئی وہ کہہ دوں میں نے کہا کہ ہمارا کام کون سا ہے؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ والا، ہمارا کام کون سا ہے؟ حذیفی۔ حذیفی کا مطلب کیا ہے؟ صحیح بخاری میں روایت ہے حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"كَانَ النَّاسُ يَسْأَلُونَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخَبَرِ وَكُنْتُ أَسْأَلُهُ عَنِ الشَّرِّ فَخَافَهُ أَنْ يُدْرِكَنِي." 60

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کی باتیں پوچھتے اور میں شر کی پوچھتا۔ وہ خیر کی پوچھتے تاکہ عمل کریں میں شر کی پوچھتا تاکہ

59- صحیح البخاری: کتاب اللباس، تحت باب تقليم الاظفار

60- صحیح البخاری، رقم: 3606

امت کو بچالوں۔ یہ ہے مزاجِ حذیفی اور یہ بڑا مشکل کام ہے۔ خیر کی باتیں کہنے پر شاباش ملتی ہے اور شر سے بچانے پر اپنے بھی ملامت کرتے ہیں۔ یہ بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ لو پھر مسئلے شروع کر دیے۔ یہ مزاجِ حذیفی ہے اور ملامت کی پرواہ کیے بغیر بیان کرنا بڑے حوصلے کا کام ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو فتنوں کے خلاف کام کرے گا قربِ قیامت اللہ اسے جہاد کا اجر عطا فرمائیں گے۔

### دور حاضر میں قرعہ اندازی کا مسئلہ:

خیر جو مسئلہ میں سمجھا رہا تھا عنوان ہے ناذہن میں؟ حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت میں جو قرعہ اندازی ہوئی ہے۔ آج قرعہ اندازی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں بعض چیزوں کے اسبابِ شریعت نے مقرر کر دیے ہیں ان پر قرعہ اندازی جائز نہیں۔ جن کے اسبابِ شریعت سے مقرر نہیں کیے گئے بندے کی رائے کے سپرد ہے ان پر قرعہ اندازی جائز ہے۔

میں ذرا تفصیل سمجھاتا ہوں۔ مثلاً اب بیٹی کا حصہ ایک گنا بیٹے کا حصہ دو گنا شریعت نے مقرر کر دیا اب باپ فوت ہو گیا ایک بیٹی ہے اور ایک بیٹا ہے۔ وراثت میں دو حصے بیٹے کو اور ایک حصہ بیٹی کو ملے گا۔ بعض کہتے ہیں نہیں یا قرعہ اندازی کر لو۔ اگر قرعہ نکل آئے تو بیٹی یہ لے لے اگر نہیں تو بیٹا۔ اب قرعہ اندازی جائز نہیں ہے شریعت نے طے کر دیا کہ بیٹے کا اتنا اور بیٹی کا اتنا ہے۔ اب کوئی قرعہ اندازی نہیں۔

قرعہ اندازی کس چیز میں ہو سکتی ہے؟ اب بات سمجھنا اس میں قرعہ اندازی ہو سکتی ہے کہ باپ نے ایک ہی قیمت کے پانچ پانچ مرلے کے تین پلاٹ چھوڑے ہیں اب ان میں سے دو پلاٹ بیٹے کے ہوں گے اور ایک پلاٹ بیٹی کا۔ بیٹی کو کون سادیں؟ یہ تو شریعت نے نہیں بتایا۔ اب اس میں قرعہ اندازی کر سکتے ہیں۔ بھئی اب قرعہ ڈال لو ایک دو تین نمبر نکال لو اب نمبر طے کر لیں جس کے نام پر قرعہ نکلے وہ پلاٹ لے

لے۔ اب اس میں قرعہ اندازی جائز ہے۔ بات سمجھ آگئی۔ وراثت کے حصے مقرر ہیں اس میں قرعہ اندازی جائز نہیں لیکن کون کون سا پلاٹ لے اس پر قرعہ اندازی جائز ہے۔ اس میں اعتراض کی بات ہی نہیں ہے۔ میں بات یہ کہہ رہا تھا کہ جن چیزوں کے اسباب مقرر ہیں ان میں قرعہ اندازی جائز نہیں ہے۔ جن کے اسباب بندے کی رائے کی سپرد ہیں ان میں جائز ہیں۔ میں مثال پھر دیتا ہوں تاکہ بات آپ پر کھل جائے۔

ایک باپ کے دو بیٹے ہیں اور باپ نے کہا کہ میں دونوں کو عمرہ کرواؤں گا، ٹھیک ہے؟ اب اس میں قرعہ اندازی کی کیا ضرورت ہے کہ جس کا قرعہ نکلے وہ جائے جس کا نہ نکلے وہ نہ جائے۔ جانا تو دونوں نے ہی ہے اب قرعہ اندازی کس پر ہے؟ قرعہ اندازی اس پر ہے کہ پہلے کون جائے گا، اس پر قرعہ اندازی کر لو۔

### قرعہ اندازی میں رسول اللہ کا عمل:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات 9 ہیں۔ اب سفر میں جائیں تو کس بیوی کو لے کر جائیں۔ فرمایا کہ قرعہ اندازی کر لو جس کا نام نکلا وہ چلی جائے اور جس کا نام نہ نکلے وہ نہ جائے۔ جانا تو کسی ایک نے ہی ہے سب نے تو نہیں جانا۔ میں بتا یہ رہا تھا کہ جس کے اسباب متعین ہوں اس پر قرعہ اندازی جائز نہیں ہے۔ اور جس کے اسباب آدمی کی رائے کے سپرد ہو اس پر قرعہ اندازی جائز ہے۔

### عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ اٹھالیا تھا:

﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ يَٰعِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ﴾

یہاں ایک اور مسئلہ سمجھیں! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں

مسلمانوں کا نظریہ اور عقیدہ یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اٹھالیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب یہودی پکڑنے لگے مارنے کے لیے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہاں سے چلے گئے، ایک کمرے میں جا کر چھپ گئے، جو یہودی گرفتار کرنے کے لیے گئے تھے ان میں سے ایک کی شکل کو خدا نے عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ بنادیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا۔ اب جب یہ باہر نکلا تو کہنے لگا: عیسیٰ علیہ السلام تو اس کمرے میں نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تم خود ہی تو ہو عیسیٰ ہو اور کہتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام کمرے میں نہیں ہیں۔ کہنے لگے کہ اسے پکڑو اور سولی پہ چڑھا دو۔ چنانچہ اسے پکڑا اور سولی پر چڑھا دیا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾<sup>61</sup>

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں تھے بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ تھا۔ اللہ نے اس کی شکل عیسیٰ علیہ السلام جیسی بنادی۔ جو اللہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا سکتے ہیں کیا وہ شکل ایک جیسی نہیں بنا سکتے۔ یہ کوئی ظلم بھی نہیں ہے یہ نبی کے قاتل تھے ان کو تو ایک کو نہیں سب کو مارنا چاہیے تھا۔ یہ تو خدا کا کرم ہے کہ ایک مارا باقی سب بچ گئے یہ تو سارے لوگ نبی کو قتل کرنے کے لیے گئے تھے۔ ان کا تو اتنا بڑا جرم تھا اس میں سارے مر جاتے تو کیا فرق پڑتا؟

### غامدی فتنے کے خدو خال:

جو مسئلہ میں نے سمجھانا ہے ذرا وہ سمجھیں! ہمارے ہاں پاکستان میں ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اللہ پاک ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ پاکستان سے تو وہ چلا گیا ہے لیکن کچھ اپنی باقیات اور کچھ فتنے باقی چھوڑ گیا ہے اس شخص کا نام جاوید احمد غامدی ہے۔ غامدی

چلا گیا ہے پاکستان سے دوڑ گیا ہے ملائیشیا ڈیرہ لگا لیا ہے۔

جن دنوں حرمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مسئلہ تھا ان دنوں میں اس نے فتویٰ دیا تھا کہ توہین رسالت کا مرتکب واجب القتل نہیں ہے۔ اس پر یہ دلائل دے کر کافروں کو خوش کر رہا تھا۔ ان ہی دنوں میں یہ دوڑ گیا۔ میں نے کہا یہ سمجھتا ہو گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیوانہ مجھ تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ وہ یہاں سے چلا گیا کہ دیوانہ کوئی نہ پہنچے، مگر ملک الموت تو وہاں بھی پہنچے گا۔ آدمی موت سے بچ سکتا نہیں ہے بہتر ہے اپنے نظریات کی اصلاح کرے۔

### وفات عیسیٰ علیہ السلام کا غامدی نظریہ:

جوابات میں نے سمجھانی ہے ذرا اس کو سمجھیں۔ یہ میں نے براہ راست غامدی کانٹ پہ بیان سنا ہے۔ وہ کیا کہتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر موت آئی ہے، پھر اللہ نے آسمان پہ اٹھایا ہے۔ ہمارا عقیدہ کیا ہے؟ کہ موت نہیں آئی ہے بلکہ اللہ نے زندہ آسمان پر اٹھالیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان پر موت آئی ہے، وہ زندہ نہیں ہیں۔ دلیل کیا ہے قرآن کریم میں ہے:

﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ يٰعِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَىٰ وَمَطْعَمًا لَّكَ﴾

کہتا ہے کہ اللہ نے فرمایا: ﴿يٰعِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ﴾ عیسیٰ! میں تجھے وفات دوں گا، ﴿وَرَافِعُكَ إِلَىٰ﴾ اور تجھے آسمان پر اٹھالوں گا۔ کہتا ہے: دیکھو! خدا نے پہلے وفات کی بات کی ہے پھر اٹھانے کی بات کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا اے عیسیٰ! میں تجھے موت دے دوں گا، آسمان پہ اٹھاؤں گا، تیری لاش کی بے حرمتی کا فر نہیں کر سکے گا، ہم تیری لاش کو اٹھائیں گے اور تجھے محفوظ رکھیں گے۔ اس سے پتا چلا کہ پہلے موت بھی ہے پھر اوپر اٹھایا ہے۔ یہ ہے اس کی دلیل کا خلاصہ۔

## غامدی کے نظریے کی تردید:

میں اس کی دلیل کا جواب دینے لگا ہوں اب دیکھو! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مسئلہ کیا تھا، جب عیسیٰ علیہ السلام کے پیچھے یہودی دوڑے عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کر کے قتل کرنے کے لیے۔ عیسیٰ علیہ السلام ایک کمرے میں چھپ گئے۔ اب اللہ پاک نے عیسیٰ علیہ السلام کو تسلی دی ہے۔ اے عیسیٰ! آپ نے گھبرانا نہیں ہے، ﴿إِنِّي مُتَوَفِّيكَ﴾ موت تو میرے اختیار میں ہے یہ تجھے نہیں مار سکتے۔ موت تو میں نے دینی ہے۔ بات سمجھ آرہی ہے؟ اب عیسیٰ علیہ السلام عرض کرتے ہیں یا اللہ موت تو آپ کے اختیار میں ہے آپ ہی دیں گے میں سمجھتا ہوں لیکن یہ تو باہر آگئے ہیں۔ تو اس موقع پر ﴿إِنِّي مُتَوَفِّيكَ﴾ کہہ کر تسلی دی ہے اور ﴿وَدَافِعُكَ لَائِي﴾ کہہ کے اٹھا لیا ہے۔

## تسلی آمیز کلمات کا استعمال:

میں آپ کی مسجد میں بیان کر رہا ہوں، اللہ نہ کرے باہر پولیس آجائے اب میں آپ حضرات سے کہتا ہوں دیکھو باہر پولیس آگئی ہے، مجھے گرفتار کرنا چاہتی ہے، آپ کہیں گے مولوی صاحب تسلی رکھو ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ ہمارے دروازے پہ کھڑی ہے۔ آپ کہتے ہیں جی نہیں پکڑتی میں کہتا ہوں اچھا جی پھر آپ کیا کرو گے؟ قاری صاحب کہتے ہیں پیچھے دیکھو یہ دروازہ ہے۔ آپ یہاں سے آجاؤ اب دیکھو تسلی ہو گئی یا نہیں۔

## پس منظر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا:

حضرت عیسیٰ سے اللہ نے فرمایا: ﴿إِنِّي مُتَوَفِّيكَ﴾ عیسیٰ! وفات میں نے دینی ہے یہ یہودی تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اے اللہ یہ تو باہر کھڑے ہیں، فرمایا: ﴿وَدَافِعُكَ لَائِي﴾

رَافِعُكَ إِلَىَّ ﴿۱﴾ اچھا! تو ہم اٹھا لیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں تجھے مارتے کیسے ہیں، تو پہلے ﴿۱﴾ اب مُتَوَفِّیْكَ ﴿۲﴾ کہہ کر تسلی دی ہے اور پھر ﴿۲﴾ رَافِعُكَ إِلَىَّ ﴿۳﴾ کہہ کے اٹھا لیا ہے۔ اب بتاؤ قرآن سمجھنا کیا مشکل ہے؟ اگر یہ سارا پس منظر آدمی کے ذہن میں ہو تو معاملہ بالکل الگ ہے۔ پس منظر کو چھوڑ دو تو پہلے اور آگے معاملہ الگ ہوگا۔

### عیسیٰ علیہ السلام سے متعلقہ چند عقائد:

- ☆ ہمارا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا نے زندہ آسمان پر اٹھایا ہے۔
- ☆ قرب قیامت اللہ پاک عیسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ دنیا میں نازل فرمائیں گے۔
- ☆ وہ خلافت کا نظام قائم کریں گے۔
- ☆ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوگی۔
- ☆ مدینہ منورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارکہ میں دفن ہوں گے
- ☆ آج بھی وہاں چوتھی قبر کی جگہ خالی ہے، جہاں عیسیٰ علیہ السلام نے جانا ہے۔

### مسیح موعود کی چار علامتیں:

چنیوٹ میں ہمارا جلسہ تھا ختم نبوت کے عنوان پر۔ مجھ سے قبل ایک بہت بڑے عالم نے بیان فرمایا۔ فرمانے لگے، بھی چنیوٹ والو ایک دلیل سمجھو یہ مرزائی کہتے ہیں کہ غلام احمد قادیانی کہتا ہے میں عیسیٰ ہوں یہ جھوٹ بولتا ہے۔ ایک دلیل سمجھو کہ ایک روایت میں آتا ہے مسند ابویعلیٰ الموصلیٰ کی روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام جب آئیں گے:

- ✿ حاکم عادل بنیں گے، حکومت کریں گے۔
- ✿ خنزیر کو قتل کر کے یہودیت کو ختم کر دیں گے۔
- ✿ صلیب توڑ کے عیسائیت کا وجود ختم کر دیں گے۔

✽ مال اتنا عام ہو گا کوئی بندہ نہیں لے گا۔

یہ چار نشانیاں ہیں۔ اور مرزا کے دور میں نہ وہ حاکم عادل بنا، نہ یہودیت مٹی، نہ عیسائیت مٹی نہ مال عام ہوا تو پتا چلا کہ یہ مرزا عیسیٰ نہیں ہے۔

### پانچویں علامت بھی بیان کی جائے!:

اس کے بعد میرا بیان تھا میں نے کہا کہ قبلہ! یہ بات ہم مانتے ہیں لیکن اس حدیث میں پانچویں علامت بھی ہے وہ بھی ارشاد فرمائیں! دو بندوں کی وجہ سے کیوں چھوڑ دی ہے؟ وہ بھی بیان کریں اسی حدیث میں ہے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے حاکم عادل بن کے، یہودیت کو مٹا دیں گے، عیسائیت کو ختم کر دیں گے، مال عام ہو جائے گا اور پانچویں نشانی یہ ہے:

"ثُمَّ لَئِنْ قَامَ عَلَى قَبْرِیْ فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ! لَا حَبِیْبَتَهُ." <sup>62</sup>

پھر میری قبر پہ آئیں گے یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہیں گے اور میں جواب دوں گا۔ میں نے کہا یہ تو مدینہ گیا ہی نہیں۔ یہ پانچویں نشانی بھی بیان کرو۔

### مگر وہ نہ سمجھیں میری بزم کے قابل نہ رہا:

ہماری یہ نشانی ہے ہم چند لوگوں کی وجہ سے مسئلہ چھپاتے نہیں پورا مسئلہ بیان کرتے ہیں، اگر پورا بیان کرنا ہے تو اسٹیج پر بیٹھیں نہیں تو ہماری جان چھوڑیں۔ ہم اپنا مسئلہ کیوں چھپائیں کہ یہ ناراض ہو گا وہ ناراض ہو گا پوری دنیا ناراض ہو جائے خدا ناراض نہ ہو۔

لوگ سمجھیں مجھے محروم وقار و تمکین  
وہ نہ سمجھیں کہ مری بزم کے قابل نہ رہا



لوگوں کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے آج آپ راضی ہیں کل روٹھ جائیں تو کیا ہو گا؟ کچھ بھی نہیں ہوتا بس اپنے مولا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ناراض نہ کرو۔ دنیا کی محبت کچھ بھی نہیں ہے اللہ کی قسم اگر خدا اور حبیب خدا راضی ہیں، تو پوری دنیا تمہاری غلام ہے۔ اگر وہ ناراض ہیں تو پھر دنیا کی غلامی ہم نے کرنی ہے۔ اللہ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

### میں زمانے پہ چھا گیا:

ہمارے شیخ عارف باللہ حضرت اقدس الشاہ حکیم محمد اختر رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ جگر شاعر گزرا ہے۔ آپ نے سنا ہے؟ آپ ہم سے زیادہ شاعری پڑھتے ہیں جگر نے کہا تھا:

میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگر

وہ مجھ پہ چھا گئے ، میں زمانے پہ چھا گیا

خدا کی بات میں نے مانی ہے، زمانے نے بات میری مانی ہے۔ اس کی غلامی کرو دنیا میں شاہی کرو گے کچھ فرق نہیں پڑتا اگر لوگ ناراض ہو جائیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگ ناراض تھے مکہ سے نکالا، وہاں ناراض ہوئے مدینے والے۔ لیکن پھر ایک دور آیا مکہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ مکہ مدینہ کیا، پورا عالم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

### غلامی رسول کا میانی کا ذریعہ ہے:

بس حضور کی غلامی کرو۔ اللہ کی قسم! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کرو، پورا زمانہ آپ کا ہے۔ دوچار لوگوں کے ناراض ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ ناراض ہو بھی جائیں، دنیا میں تھوڑی سی ذلت اٹھانی بھی پڑ جائے تو کوئی بات نہیں، قیامت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیں گے یہ میرا ہے۔ بتاؤ اور کیا چاہیے؟

## کفار سے تعلقات کی اقسام:

ایک اور مسئلہ قرآن کریم میں ہے:

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾<sup>63</sup>

یہ مسئلہ قرآن کریم نے کئی مقام پر بیان کیا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ

بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾<sup>64</sup>

کفار سے تعلق رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ مسئلہ سمجھ لیں تعلقات کی چار قسمیں ہیں:

(1) موالات

(2) مواسات

(3) مدارات

(4) معاملات

★ موالات کا معنی ہوتا ہے دل سے دوستی۔

★ مواسات کا معنی ہے دل میں تو دوستی نہیں ہے مگر بوقت ضرورت غم خواری

اور فکر ہے۔

★ مدارات کا معنی کیا ہے؟ غم خواری تو نہیں ہے مگر رکھ رکھاؤ ہے۔

★ معاملات کا معنی ہے تجارت، لین دین، مزدوری نوکری، ملازمت وغیرہ۔

## موالات کا حکم:

جہاں تک تعلق ”موالات“ کا ہے یہ تو چھوٹے سے چھوٹے کافر اور بڑے

63۔ آل عمران 28:7

64۔ المائدہ 51:5

سے بڑے کافر سے بھی جائز نہیں ہے، موالات دل سے دوستی اور دل سے یارانہ۔

### مواسات کا حکم:

مواسات یہ بوقت ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کے علاقے میں ایک عیسائی ہے اس کا باپ مر گیا ہے تو کچھ ہمدردی کے بول تو بولنے چاہئیں۔ بھئی تمہارا باپ مرا ہے اس کے مرنے پر ہمیں بھی دکھ ہے۔ ہمیں بھی افسوس ہے۔ بیٹا تھوڑا سادل بڑا رکھو جو آیا اس نے جانا ہے۔ یہ غم خواری کے لفظ تو کافر کو بھی کہے جاسکتے ہیں۔

### مدارات کا حکم:

”مدارات“ کا معنی ہے خاطر تواضع، رکھ رکھاؤ اس کا مطلب کیا ہے؟ آپ بازار میں رہتے ہیں بازار میں ایک کافر ہے وہ طاقت میں آپ سے مضبوط ہے۔ اس کے شر سے بچنے کے لیے آپ جب گزریں تو کہتے ہیں کیا حال ہے شیخ صاحب؟ کیا حال ہے ملک صاحب؟ چوہدری صاحب ٹھیک ہو؟۔ اب نہ یہ محبت ہے نہ غم خواری ہے۔ یہ صرف رکھ رکھاؤ ہے اور شریعت نے اس کی اجازت دی ہے۔ وہ بھی اس کے شر سے بچنے کے لیے۔ جب شر سے بچنا ہو تو پھر گنجائش ہے ورنہ ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

### معاملات کا حکم:

معاملات اور تجارت کافر سے جائز ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ نے ”معارف القرآن“ میں لکھا ہے کہ کافر سے تجارت جائز ہے بشرطیکہ تجارت کی وجہ سے مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچے۔ مثلاً آپ کافر کو اسلحہ بیچیں، یہ ناجائز ہے کیونکہ اس سے مسلمانوں کی طاقت کمزور ہوگی۔ ایک ایسے کافر کا مال خریدیں جو اپنے مال کا کچھ فیصد کفر کی حمیت میں اسلام کے خلاف خرچ کرتا ہو جیسے مرزائی اور قادیانی ہیں، اب ان کی مصنوعات کو خریدنا بھی ناجائز ہوگا۔ تو ایسی تجارت جس سے مسلمانوں کو نقصان نہ ہو، کافر کے ساتھ بھی کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

راہ خدا میں اپنی پسندیدہ چیز خرچ کرو!

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾<sup>65</sup>

قرآن کی آیت اتری اگر تم اللہ کی محبت چاہتے، ہو اگر تم صحیح نیکیاں چاہتے ہو تو پھر وہ مال خرچ کرو جو تمہیں سب سے زیادہ پسند ہے۔ وہ سارا خرچ نہ کرو ان میں سے کچھ خرچ کرو۔

صحابہ کا عمل بالقرآن کیسا تھا؟

اب صحابہ کا ایمان دیکھو! جب یہ آیت اتری ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میری باندی پورے مال میں مجھے سب سے زیادہ پسند ہے، یہ اللہ کے نام پر آزاد ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی ہے۔ دولت قربان کرنی آسان ہوتی ہے اور عورت کی قربانی دینا بہت مشکل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورت کی قربانی دی ہے۔ تو عرض کیا کہ یہ کنیز اور باندی ہے جو مجھے بہت پسند ہے، اللہ نے آیت اتاری ہے تو میں نے اسے خدا کے نام پہ قربان کر دیا۔

حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ انصار میں سے سب سے زیادہ مال دار تھے۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ کنواں یہ جو باغ ہے مجھے بہت پسند ہے۔ جس کا تذکرہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ باب عبد الجید سے داخل ہوں تو کارپٹ کے نیچے تین گول دائرے کے نشانات بنے ہوئے ہیں۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے باغ اور تین کنوؤں کے نشانات۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت اتری تو انہوں نے کہا مجھے سب سے زیادہ یہ کنویں اور یہ باغ محبوب ہے میں یہ اللہ کے نام پر قربان کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یوں نہ کرو تم یوں

صدقہ کرنے کے بجائے اپنے قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کر دو۔ صدقے کا ثواب بھی ملے گا اور صلہ رحمی کا ثواب بھی ملے گا۔

### صدقہ اور غریب رشتہ داروں سے صلہ رحمی:

اچھا ایک واقعہ بڑا عجیب لکھا ہے مفسرین نے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے تھے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اپنا گھوڑا لے کر آئے اور کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے پورے مال میں سے یہ گھوڑا سب سے زیادہ مجھے عزیز ہے۔ اللہ کے نام پہ یہ صدقہ کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے لیا اور ان کے بیٹے اسامہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان کے حوالے کر دیا۔ والد سے لیا اور بیٹے کے حوالے کر دیا۔

انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! میرے دل میں تھوڑی سی خلیش ہے کہ میں نے مال تو دیا تھا صدقہ کرنے کے لیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی میرے بیٹے کو دے دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تمہارا صدقہ بھی ہے اور یہ صلہ رحمی بھی ہے، تمہارے ثواب میں کوئی بھی کمی نہیں آئی۔ اس سے پتا کیا چلا؟ غریبوں پر صدقہ بڑے شوق سے کرو، غریب رشتہ داروں کو ذرا مقدم رکھو۔ خاندان میں غریب رشتہ دار ہو اس کو پاؤں پہ کھڑا کرو۔ غریب کو صدقہ دینا آسان ہے اور غریب رشتہ داروں کو پاؤں پہ کھڑا کرنا بہت مشکل ہے۔ اس میں بندے کی کچھ رقابت اور کچھ رشتہ داری آڑے آتی ہے۔ پھر اس کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب فرمائی ہے۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### منکرین حیات النبی کی شرعی حیثیت:

میں نے ایک مسئلے کا وعدہ کیا تھا اب میں وہ عرض کرتا ہوں۔ آپ ذرا توجہ رکھیں! یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ جو اللہ کے نبی

کو قبر میں زندہ نہ مانے:

☼ وہ اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج ہے۔

☼ وہ بدعتی اور گمراہ ہے۔

☼ ایسے شخص کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔

☼ اگر آپ نے نمازیں پڑھی ہیں تو ان کو لوٹانا آپ کے ذمہ ہے۔

مسئلہ بتانا ہمارا فرض ہے۔ آپ لوٹائیں تو آپ کی مرضی آپ نہ لوٹائیں تو آپ کی مرضی۔ ہم کل قیامت کے دن اپنے کندھے پہ یہ جرم نہیں لے کے جائیں گے کہ اللہ ہم نے مسئلہ چھپا لیا تھا۔

**شہید زندہ ہوتا ہے:**

قرآن کریم میں یہ موجود ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ

رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ﴾<sup>66</sup>

جو اللہ کے راستے میں قتل ہو جائے ان کو مردہ گمان نہ کرو بلکہ یہ زندہ ہیں اور ان کو خدا کے ہاں سے رزق بھی ملتا ہے۔ ہمارا نظریہ ہے کہ شہید کو یہ مقام نبی کی اطاعت کی برکت سے ملا ہے۔

**باجاماعت نماز کی ادائیگی میں امام کا اجر بھی شامل ہے:**

اگر یہ زندہ ہے تو نبی بھی زندہ ہے۔ حدیث مبارک میں ہے ایک آدمی جماعت کے ساتھ نماز پڑھے 27 گنا اجر ملتا ہے۔ یہ اجر مقتدی کا بتایا ہے یا امام کا؟ (مقتدی کا) اگر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم امام کا اجر بتاتے تو مقتدی کا سمجھ میں نہیں

آنا تھا۔ لوگ کہتے وہ تو امام ہیں وہ تو قاری صاحب، مولانا صاحب ہیں نماز پڑھائی ہے تو ثواب ملا ہے۔ ہم نے تو پڑھی ہے ہمیں کیسے 27 گنا۔ مقتدی کا بتایا اور امام کا سمجھ آیا۔ اگر قرآن کہتا نبی زندہ ہے تو لوگ شہید کو زندہ نہ مانتے۔ شہید کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کیا حیثیت ہے؟ اللہ نے شہید کا مقام بتایا تو نبی کا مقام سمجھ آیا ایک شخص میرے پاس آیا عید الفطر کی بات ہے انہوں نے کہا مولانا صاحب! قرآن میں ہے شہید زندہ تو ہے لیکن ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ اللہ کے پاس زندہ ہے۔ میں نے کہا اللہ کہاں پر ہے؟ کہتا ہے اللہ تو ہر جگہ پر ہے۔ وہ تھک گیا پھر اس سے جواب نہیں بن پڑا۔ کیونکہ اتنا تو رٹا ہوا تھا طوطے کی طرح وہ رٹا بازی ختم ہو گئی۔

### اختیارات اور نسبت کا معاملہ:

میں نے کہا ذرا یہ اصول سمجھ لیں، پھر مسئلہ سمجھاتا ہوں۔ اصول یہ کہ ہے اگر کوئی چیز ایسی ہو جو بندے کے اختیار میں ہو تو نسبت بندے کی طرف ہوتی ہے اور جو بندے کے اختیار میں نہ ہو اللہ کے اختیار میں ہو تو اس کی نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ اصول سمجھ آگیا؟ میں کچھ مثالیں سے دوں گا۔ آپ کو بات سمجھ آئے گی۔

[1]: قرآن کریم میں ہے: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾<sup>67</sup>

دین اللہ کے پاس اسلام ہے تو کیا تمہارے نزدیک اسلام نہیں ہے؟ عند اللہ کا مطلب یہ ہے کہ دین میں رد و بدل کا اختیار بندے کو نہیں ہے۔ نسبت خدا کی طرف کی ہے کہ عند اللہ دین اسلام ہے۔

[2]: میں قرآن کی مثالیں دے رہا ہوں، سورۃ آل عمران میں جب اللہ نے بدر کی

بات کی ہے تو فرمایا: ﴿وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ﴾<sup>(۱۷۱)</sup>  
اللہ کی مدد آئے گی۔ مدد کس کی جانب سے ہے؟ اللہ کی جانب سے ہے۔

✽ ادھر 313 ادھر 1000

✽ ادھر 700 اونٹ اور 300 گھوڑے۔ ادھر کیا ہے؟ 2 گھوڑے 7 اونٹ 6  
تلواریں اور 8 زرہیں۔

تو یہ مدد کیسے ہو سکتی ہے؟ ﴿مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾ کیوں؟ اگر اسباب تھوڑے  
ہوں اور پھر بھی مدد ہو تو یہ بندے کے اختیار میں نہیں ہوتا خدا کی طرف سے ہوتا ہے  
اس لیے ﴿مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾ فرمایا۔

[3]: حضرت زکریا علیہ السلام آئے جب دروازہ کھولا تو آگے بے موسم کے پھل  
موجود تھے۔ پوچھا: اے مریم! ﴿أَتَىٰ لَكَ هَذَا﴾ یہ پھل کہاں سے آیا؟ فرمایا: ﴿هُوَ  
مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾<sup>68</sup> جو روزانہ زکریا علیہ السلام کھانا دیتے کیا وہ اللہ کی طرف سے نہیں  
تھا؟ لیکن مریم اسے ﴿مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾ نہیں کہتیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ جو  
زکریا علیہ السلام لاتے ہیں اگرچہ خدا کی طرف سے ہے، لیکن اس میں اختیار بندے کا  
ہے۔ لیکن جو بے موسم پھل ملتے ہیں اس میں بندے کا اختیار نہیں ہے۔ تو جس میں  
بندے کا اختیار نہ ہو اسے کہتے ہیں ﴿مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾ کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔

**اللہ کے پاس ہونے کا استعمال عرف عام میں:**

❖ آپ نے کہا جی آپ کے ابو کدھر ہیں؟

✽ کہتا ہے جی لاہور گئے ہیں۔



❖ کیوں؟

❖ ہماری دوکان میں کام تھا سامان لینے کے لیے۔

❖ دادا ابو کدھر ہیں؟

❖ اللہ میاں کے پاس۔

❖ ابو کدھر گئے؟

❖ لاہور فلاں بازار گئے، اس فلاں تاجر کے پاس بیٹھے ہیں۔

❖ دادا اللہ میاں کے پاس گئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ دادا ابو فلاں قبرستان میں ہیں، ابو فلاں تاجر کے پاس لاہور بیٹھے ہیں۔ بتاؤ خدا قبرستان میں ہے، لاہور میں نہیں؟ پھر یہ جملہ کیوں بولتے ہو کہ ابو جی فلاں تاجر کے پاس ہیں اور دادا ابو اللہ کے پاس ہیں۔

اس کا مطلب سمجھنا ابو جی مرضی سے گئے ہیں مرضی سے آئیں گے۔ دادا جی نہ مرضی سے گئے ہیں نہ مرضی سے آئیں گے۔ وہ تاجر کے پاس ہیں اور وہ اللہ کے پاس ہیں۔ "عند اللہ" کا معنی سمجھ آیا؟ میں "عند اللہ" کا معنی سمجھا رہا ہوں۔

## اللہ تعالیٰ کے گھر کا کیا مطلب؟

ایک آدمی نے ایک کنال جگہ خریدی ہے۔ اس نے پانچ مرلے کا مکان بنادیا اور 15 مرلے کی مسجد بنادی ہے۔ اب جو 15 مرلے کی مسجد ہے یہ کس کا گھر ہے؟ اللہ تعالیٰ کا اور یہ 5 مرلے کا مکان کس کا ہے عبد الرحیم بھائی کا، بشیر بھائی کا، نذیر بھائی کا۔ فرق کیا ہے؟ جگہ تو ساری اس شخص نے خریدی ایک کنال کے پیسے تو اس نے لگائے ہیں، تعمیر اس نے کی ہے فرق کیا ہے؟ یہ اس کا گھر اور وہ خدا کا گھر۔ جو پانچ مرلے اس کا گھر ہے بدلنا چاہے تو بدل سکتا ہے، بیچنا چاہے تو بیچ سکتا ہے۔ مگر جو 15 مرلے کی مسجد ہے نہ بیچ سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے، نہ ہدیہ کر سکتا ہے۔ اس پر اختیار اس کا تھا یہ مکان اس

کا تھا مگر اس پہ خدا کا اختیار ہے کیونکہ یہ خدا کا گھر ہے۔ عند اللہ کا معنی سمجھ آیا؟

خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی کا نام زبیدہ خاتون ہے۔ بیوی سے خلیفہ کی اُن بن ہو گئی۔ ایک دن خلیفہ نے اپنی بیوی سے غصے میں کہہ دیا: اگر شام کا سورج غروب ہونے سے پہلے میری حدودِ سلطنت سے نہ نکلی تو تجھے تین طلاق۔ وہ سمجھتا تھا اور عورت بھی سمجھتی تھی کہ تین طلاق جو دیں تو تین ہی ہوتی ہیں۔

### تین طلاق پر پشاور کا سچا واقعہ:

آج تین کو ایک کہنے والے عورتوں کے دماغ سے بھی چھوٹا دماغ رکھتے ہیں۔ یہ میں پشاور کا سچا واقعہ پیش کر رہا ہوں وہاں ایک عورت تھی اس کو تین طلاق ہو گئی۔ پٹھان تھا تین طلاق دے دی اب وہاں تین مولوی آگئے، تین مولوی کون تھے؟ جو تین کو ایک کہتے ہیں، جو حرام کو حلال کہتے ہیں، جو زنا کو نکاح کہتے ہیں۔ تین چار مولانا صاحب آگئے اور مسجد میں بیٹھ گئے۔ اس عورت نے کہا: مناظرہ مت کرو، ان سے میں خود سوال کرتی ہوں۔ میں مطمئن ہو گئی تو شوہر کے پاس چلی جاؤں گی نہ مطمئن ہوئی تو میں نہیں جاسکتی۔

عورت پردہ والی جگہ بیٹھی تھی۔ اس نے سوال کیا تین طلاق دو تو ایک ہوتی ہے مولوی صاحب؟ انہوں نے کہا: جی ایک ہوتی ہے۔ اس نے کہا: تم میں سے کوئی ایک مولوی اپنی بیوی کو تین طلاق دے دے پھر گھر رکھ لے، میں بھی چلی جاؤں گی۔ اس نے کہا: میرا گھر بچانے کے لیے تم میں سے ایک قربانی دے۔ جب تین طلاق ہوتی ہی ایک ہے تو ایک بار زبان سے کہہ دو، مباح ہی ہے کوئی حرام تو نہیں ہے، جب تین طلاق حرام نہیں مباح ہی ہے تم کہہ دو ایک مرتبہ، ایک بندہ اپنی بیوی کو تین طلاق دے اور پھر رکھ لے میں آج واپس چلی جاتی ہوں۔ علماء چپ، اب کوئی بھی نہ بولے، پھر اس خاتون نے کہا یہ ہم سے زنا کرو اتے ہو خود اس گناہ سے جان چھڑواتے ہو، خود

اس گناہ کے لیے تیار نہیں ہو۔

### امت کے پہلے چیف جسٹس کا فیصلہ:

خلیفہ نے کہہ دیا بعد میں تو پریشان ہو گئے خلیفہ بھی پریشان اور بیگم بھی پریشان۔ اب بیگم نے قاضی امام ابو یوسف رحمہ اللہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد، امت کے پہلے چیف جسٹس کے پاس کوئی خادم بھیجا کہ کوئی حل بتلائیں۔ میرے خاوند نے یہ بات کہہ دی ہے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرمانے لگے بیٹی مسئلے کا حل ہے لیکن تمہیں خود آنا پڑے گا اب اس نے آنا تھا، پھر پوچھا کب آؤں؟ مغرب کے قریب آنا مغرب کے قریب آگئی کہاں بیٹھوں؟ انہوں نے کہا مسجد میں تھوڑی سی جگہ بنا کر بیٹھ جاؤ وہ بیٹھ گئی۔ انہوں نے کہا جی مسئلہ نماز کے بعد بتاؤں گا۔ ملکہ نے کہا نماز سے پہلے بتادیں انہوں نے کہا جی نماز کے بعد، تم نے جانا نہیں۔

### تین طلاق تو کجا ایک بھی نہیں ہوئی:

ادھر جماعت ہوئی امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے پوچھا بیٹی کیا مسئلہ ہے؟ انہوں نے کہا جی کیا بتانا اب نہ مسئلہ نہ حل۔ انہوں نے کہا بتاؤ تو سہی تم روتی کس لیے ہو؟ اس نے کہا جی میرے خاوند خلیفہ ہارون الرشید نے کہا تھا کہ اگر سورج غروب ہونے سے پہلے میری سلطنت سے نہ نکلی تو تجھے تین طلاق۔ ملکہ نے کہا امام صاحب اب تو سورج غروب ہو گیا اب تو طلاق ہو گئی ہے۔ امام ابو یوسف فرمانے لگے بیٹی گھر چلی جا تین کجا تجھے ایک طلاق بھی نہیں ہوئی۔ اس نے کہا جی کیوں؟ فرمایا کہ تیرے خاوند نے کہا تھا اگر سورج کے غروب ہونے سے پہلے میری سلطنت کی حدود سے نہ نکلی تو طلاق۔ ہم سورج غروب ہونے سے پہلے تیرے خاوند کی سلطنت کی حدود سے نکال کے تجھے مسجد میں لے آئے ہیں۔ دیکھ مسجد پر تیرے خاوند کی سلطنت کا کوئی اختیار نہیں ہے لہذا اب تسلی سے گھر چلی جا تجھے طلاق نہیں ہوئی۔ اسے کہتے ہیں فقیہہ۔ اس لیے لوگ

فقہاء کے دشمن ہیں کہ وہ امت کے مسائل حل کرتے ہیں۔

### مثالوں کا خلاصہ:

- ★ اللہ کا گھر ہے بندے کا اختیار تو ختم ہو گیا۔
- ★ اسی طرح جو خدا کے راستے میں قتل ہو جائے اسے مردہ مت گمان کرنا کیونکہ وہ زندہ ہے مگر اس کی حیات پہ کوئی اختیار نہیں۔
- ★ اسی طرح رزق دنیا میں بھی خدا دیتا ہے۔ شہید کو بھی خدا دیتا ہے۔
- ★ دنیا میں بندے کو رزق ملتا ہے اس میں بندے کے اختیار کا دخل ہوتا ہے۔
- ★ اور جو شہادت کے بعد ملتا ہے وہ بلا قصد ملتا ہے۔
- ★ اس میں بندے کا اختیار نہیں ہوتا، اس لیے خدا نے ”عِنْدَ رَبِّهِمْ“ فرمایا۔
- ★ اسی قبر میں زندہ اسی قبر میں رزق ملتا ہے تو اللہ نے ”عِنْدَ رَبِّهِمْ“ کیوں فرمایا؟ بندے کے اختیار کا دخل نہیں ہے۔

### نبی کی محنت اور کامیابی کا مدار:

اس سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور بڑی اہم بات بیان فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَمَنْ ذُحِرَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۖ﴾<sup>69</sup>

جس شخص کو اللہ نے جہنم کی آگ سے بچا لیا اور جنت میں داخل کر دیا یہی کامیابی ہے۔ کامیابی کا مدار کیا ہے؟ جہنم سے بچ جائے جنت میں جگہ مل جائے یہی بڑی کامیابی ہے۔ اس لیے اللہ کا نبی آتا ہے یہی نبی کی محنت کا مدار ہوتا ہے کہ امت جہنم سے بچے اور جنت میں چلی جائے۔ اللہ سب کو جہنم سے بچالے۔ (آمین) اللہ ہمیں

جنت میں جانے والا بنائے اور بغیر حساب کے لے جائے۔

## ہم جنت کیوں مانگتے ہیں؟:

حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اے اللہ! تجھ سے جنت اس لیے نہیں مانگتے کہ ہم جنت کے حقدار ہیں۔ اس لیے مانگتے ہیں کہ ہم جہنم کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اللہ ہم سب کو جنت عطا فرمائے۔ (آمین)

ان شاء اللہ ہمارا ریونڈ کا اجتماع شروع ہونے والا ہے، میرا خیال ہے ہمارا پہلا اجتماع ہے مگر میرے تو دونوں اجتماع ہیں۔ میں تو دونوں میں وہاں رہتا ہوں تم سے بڑا تبلیغی تو میں ہوں۔ تم نے پہلے کے بعد واپس آ جانا ہے میں نے تو دوسرے میں بھی وہاں رہنا ہے۔ ہماری گاڑی میں خاص اسٹیکر ہوتا ہے، ہماری حویلی میں جگہ بنی ہوتی ہے جہاں آپ ترستے ہیں جانے کو۔ مولانا سعد صاحب انڈیا سے تشریف لائیں گے ان کا ناشتہ ہمارے گھر سے جانا ہے، اس سے بڑی سعادت کیا ہوتی ہے؟ لیکن مجھے کہتے ہیں جماعت میں وقت کتنا لگا گیا ہے؟ میں نے کہا حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ نے کتنا لگا گیا ہے؟ کہتے ہیں تین دن بھی نہیں میں نے کہا کہ ان کو مانتے ہو مجھے نہیں مانتے۔ بابا ہر بندے کے لیے وقت کی قید نہیں ہوتی۔

ابھی میں حرم میں تھا مجھے بہت خوشی ہوئی اتنی خوشی کہ میں بتا نہیں سکتا۔ بوڑھے بزرگ تھے تشریف لائے میں نے پوچھا کہ جی آپ کا تعارف؟ کہتے ہیں میں ریونڈ کا امام مولانا جمیل ہوں۔ مولانا تمہارا تو بہت نام سنا لیکن ملاقات نہیں ہوئی۔ مجھے بیٹے نے بتایا میں نے کہا چلو زیارت بھی کریں، باتیں بھی کریں۔ ابھی جب میں ریونڈ گیا ملاقات کے لیے تو مولانا جمیل صاحب فرمانے لگے جب ریونڈ آئیں تو میرے گھر قیام کیا کریں۔ اب بتاؤ وہاں کی دعوت پر مجھے کوئی ضرورت رہ جاتی ہے۔ اللہ ہمیں مشائخ کے ساتھ رکھے۔ (آمین)

## رہیں سلامت ان کی نسبتیں:

میں واقعے اس لیے سناتا ہوں کہ یہ ہماری سندیں ہیں، ہماری دلیلیں ہیں۔ ہماری سند کیا ہے؟ سوائے مشائخ کے۔ اپنی سند ہر بندہ بتاتا ہے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر بتاتا ہے اپنے آپ کو انجمنیئر بتاتا ہے۔ ہمارے جو بزرگ ہیں تو ہم اپنا تعارف بزرگوں سے کرائیں گے۔ جی کون ہیں آپ؟ ہم راینونڈ والے ہیں، جی ہم بزرگوں والے ہیں، ہمارا ان سے تعلق ہے۔ اللہ ہم سب کی اصلاح فرمائے۔ (آمین) آپ کا اجتماع شروع ہے۔ خصوصاً آپ اس کے لیے دعائیں فرمائیں۔

✽ اللہ گناہوں سے محفوظ فرمائے۔

✽ اللہ فتنوں سے محفوظ فرمائے۔

✽ مولا کریم ہم سب کے گناہوں کو معاف فرمادے۔

✽ گناہوں سے درگزر فرما۔

✽ بیماروں کو صحت عطا فرما۔

✽ قرض داروں کے قرض ادا فرما۔

✽ اللہ جائز حاجات کو پورا فرما۔

✽ جو تشریف لائے ان تمام کا آنا قبول فرما۔

✽ اے میرے مولا کریم راینونڈ کے اجتماع کو شر اور فتنوں سے محفوظ فرما۔

✽ پورے عالم کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنا۔

✽ قیامت کے دن ہم سب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب فرما۔

(آمین)

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة النساء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝﴾

آج کے درس قرآن کا عنوان ہے ”مضامین سورة النساء“ یعنی سورة النساء میں حق تعالیٰ شانہ نے کون کون سے مضامین ارشاد فرمائے؟

عربی زبان میں دو لفظ ہیں، ایک ”رِجَال“ اور ایک ”نِسَاء“۔ ”رِجَال“ جمع ہے ”رَجُلٌ“ کی جس کا معنی ہوتا ہے مرد اور ”نِسَاء“ جمع ہے ”إِمْرَأَةٌ“ کی لیکن لفظ سے نہیں ہے بلکہ دوسرے لفظ سے ہے اسے عربی زبان میں کہتے ہیں کہ بعض ایسی جمع ہیں کہ جن کا مفرد اس لفظ سے نہیں ہوتا بلکہ اور لفظ سے ہوتا ہے۔ اگر ایک عورت ہو تو عربی میں کہتے ہیں: ”إِمْرَأَةٌ“ اور اگر کئی عورتیں ہوں ہو تو کہتے ہیں ”نِسَاء“ تو ایک لفظ رِجَال ہے جس کا معنی ہے مرد اور ایک لفظ نِسَاء ہے جس کا معنی ہے عورتیں۔

## اسلام اور خواتین کے حقوق:

میں نکتہ عرض کرنے لگا ہوں؛ ایک سوچو وہ سورتوں میں سے ایک بھی ایسی سورة نہیں جس کا نام ”سورة الرجال“ ہو اور ایک سورة موجود ہے جس کا نام ”نساء“

ہے یہ میں نے ایک بہت بڑے اعتراض کا جواب دیا ہے۔ پوری دنیائے یورپ آج کہتی ہے کہ مسلمان ”عورت“ کے حقوق کا خیال نہیں کرتے اللہ نے قرآن کریم میں پوری سورۃ عورتوں کے نام سے اتاری ہے۔ مرد کے نام سے کوئی سورۃ نازل نہیں فرمائی اس سے زیادہ حقوق کا کیا خیال کیا جاسکتا ہے؟ پوری سورۃ نازل فرمائی ہے تقریباً ڈیڑھ پارے کی اور اس سورۃ کا نام ہی سورۃ نساء ہے یعنی سورۃ کا نام ہی عورتوں کے نام سے ہے اس میں حقوق بیان فرمائے، مسائل بیان فرمائے اور اس میں زیادہ تر مسائل وہ ہیں کہ جن کا تعلق گھریلو زندگی کے ساتھ اور معاشرتی زندگی کے ساتھ ہے۔

### اسلام سے پہلے عورت کی حیثیت:

اللہ رب العزت نے اس قدر رعایت فرمائی ہے خواتین کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قبل جاہلیت کے دور میں جب عورت کا زندہ رہنا باعثِ عار اور باعثِ شرم تھا۔

اس وقت اللہ کے پیغمبر نے عورت کے حقوق بیان کرتے ہوئے اعلان فرمایا کہ جو عورت کی، بچی کی تربیت کرے پھر جوان کرے پھر اس کا نکاح کر دے تو قیامت کے دن وہ ایسے ہوگا میرے ساتھ جیسے میری دونوں انگلیاں آپس میں ملی ہوئی ہیں، یعنی وہ پیغمبر جس نے عورت کا حق اتنا ادا کیا ہے کہ لوگ اس کو ذلت اور عار سمجھتے ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے قدموں تلے خدا نے جنت رکھی ہے۔

### رسول اللہ کی تین پسندیدہ چیزیں:

اور آپ کو حیرت ہوگی کہ دنیا میں ہر بندے کی اپنی ایک پسند ہوتی ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”إِنَّمَا حُبِّبَ إِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ، النِّسَاءُ وَالطِّيبُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي



مجھے دنیا کی تمام چیزوں سے صرف تین چیزیں سب سے زیادہ پسند ہیں:

(1) الذِّسَاءُ یعنی عورت

(2) الطَّيِّبُ یعنی خوشبو

(3) وَجُعَلْتُ قُرَّةَ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ، میری آنکھوں کی ٹھنڈک خدا نے نماز میں رکھی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی تمام چیزوں میں سے ان تین چیزوں پر اپنی پسند کا اظہار فرمایا: عورت، خوشبو اور نماز۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجود اس کے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک ہمیشہ پاکیزہ اور خوشبودار رہتا تھا اگر پیشاب مبارک نکلا ہے تو اس سے بھی خوشبو آتی، پسینہ مبارک نکلتا تو اس سے بھی خوشبو آتی اس کے باوجود بھی حضور خوشبو کا استعمال فرماتے اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشبو کتنی پسند ہوگی؟

خیر میں نے عرض کیا کہ سورۃ کا نام ہی ”سورۃ النساء“ ہے۔ میں ہر درس میں عرض کرتا ہوں کہ اگر ایک ایک موضوع پر صرف نکات بیان کریں تو ہمارا سارا وقت اسی میں پورا ہو جائے گا۔ چونکہ مضامین بیان کرنے ہوتے ہیں اسی لیے میں نکات کو چھوڑ کر اصل مضامین اور مسائل کی طرف آتا ہوں۔

**خطبہ نکاح میں کیا پیغام ملتا ہے؟:**

جب بھی کسی شخص کا نکاح ہو آپ خطبہ نکاح سنیں تو اس میں یہ آیت ہے

جو نکاح پڑھانے والے خطیب صاحب تلاوت کرتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ﴾

ہم خطبے میں یہ آیت سنتے ہیں اس وقت اتنے خوش ہوتے ہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا مولوی صاحب نے پڑھا کیا ہے، لیکن اس آیت پر کبھی غور کیا ہے کہ اللہ پاک اس آیت میں ہمیں کیا سمجھانا چاہتے ہیں؟ یعنی خطبہ نکاح میں دو آیتیں پڑھی جاتی ہیں ان میں ایک آیت سورۃ النساء کی ہے اور دوسری آیت ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۖ يُصْطَبِ

لَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ فَذَرَا

فَوْزًا عَظِيمًا﴾<sup>71</sup>

### آیت کا خلاصہ:

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ نکاح کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آیت کریمہ تلاوت فرمائی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ﴾ اے لوگو! اس خدا سے ڈرو جس نے تم تمام کو ایک ہی جان سے پیدا فرمایا ہے، یعنی یہ بتایا ہے کہ جو تمہارے نکاح میں آنے والی ہے وہ الگ نہیں ہے تمہارے ہی جد امجد آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے تم کب تک اس کو غیر سمجھتے رہو گے تمہاری نسل کی ہے تمہارے مزاج کی ہے۔ آگے فرمایا:

﴿وَخَلَقَ مِنْهَا ذَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً﴾

پہلے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا انہی سے ان کی بیوی حضرت حوا علیہا السلام کو

پیدا کیا، ان دونوں سے پھر مرد و عورت کو دنیا میں پھیلا دیا۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ﴾

فرمایا کہ اللہ کا بھی خیال کرو اور آپس میں صلہ رحمی کا بھی خیال کرو۔ کس قدر عورت کے حقوق پر قرآن کریم نے ترغیب دی ہے۔

پھر فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ ذَقِيبًا﴾ ﴿٥﴾ جملے پر غور کرنا اللہ رب العزت تمہارا نگران ہے۔

نکاح کے وقت یہ آیت کیوں پڑھتے ہیں؟ عورت کائنات کے سارے افراد کو چھوڑ دیتی ہے ایک خاوند کے لیے اس عورت کو دنیا میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ ذَقِيبًا﴾ ﴿٥﴾ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اللہ ہوں پوچھنے والا تم یہ نہ سمجھنا کہ اس مظلوم عورت کو دنیا میں کوئی پوچھنے والا نہیں، میں خدا ہوں اس لیے اس کا تم بہت زیادہ خیال کرنا۔

**اگر بیوی بد مزاج بھی ہو تو.....؟**

میرے شیخ حکیم اختر رحمہ اللہ فرماتے تھے، ہمیں تعجب ہوتا ہے اس شخص پر جو اس عورت کے منہ پر طمانچہ مارتا ہے، عورت کو پیٹتا ہے ”العیاذ باللہ“ بندے کو سن کر شرم آتی ہے، کہ کس قدر ظالم ہیں وہ لوگ جو عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہیں، جس نے سارا جہان تیرے لیے چھوڑا ظالم تو بھی اس کو پیٹے گا تو بتا دنیا میں وہ کس کو بتائے گی؟ اگر آپ کے گھر ایسی بیوی ہو جس کا مزاج اچھا نہیں، مزاج میں اکھڑ پن ہے تو یہ سوچا کرو کہ اگر آپ کی بیٹی کسی کے پاس جائے اور آپ کا داماد اس کے ساتھ یہ سلوک کرے تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی؟ بس آدمی اتنا تصور کر لے تو بیوی کے حقوق ادا کرنا بہت زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

## یتیم بچیوں سے نکاح کا مسئلہ:

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مِمَّنْهُنَّ وَتِلْكَ وَرُبَّ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَذْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ۝﴾

اس آیت میں اللہ رب العزت نے ایک مسئلہ بیان فرمایا ہے، ہوتا یہ تھا کہ پہلے زمانہ جاہلیت میں کبھی کوئی عورت یتیم ہوتی اس کا وارث کوئی نہ ہوتا تو اس سے نکاح کر لیتے، نکاح کیوں کرتے اس لیے کہ اس کا پوچھنے والا جو کوئی نہیں اس کا وارث کوئی نہیں ہے۔ جتنا چاہیں حق مہر دیں جیسے چاہیں کریں۔ تو اللہ نے فرمایا دیکھو اگر کوئی ایسی یتیم بچی ہو اور تمہیں یہ خدشہ ہو کہ میں نے اس سے نکاح کیا تو ہو سکتا ہے کہ اس کے حقوق ادا نہ کر سکوں تو بہتر ہے تم اس سے نکاح کرنے کے بجائے کسی اور آزاد عورت سے نکاح کر لو۔

## ایک سے زائد چار تک شادیوں کی اجازت:

اور تمہیں کون سی پابندی ہے؟ کہ تمہارے نکاح میں اس ایک نے ہی رہنا ہے تم چاہو تو دو کر لو، چاہو تو تین کر لو، چاہو تو چار کر لو، تو شریعت نے اجازت دی ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي النِّسَاءِ مِمَّنْهُنَّ وَتِلْكَ وَرُبَّ﴾، اگر تم نکاح کرنا چاہو دو سے آغاز کیا ہے تو دو بیویاں کرو اور تین کر لو یا تم چار کر لو۔ ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً﴾ اور اگر تمہیں خدشہ ہو کہ ہم ان کے درمیان انصاف نہیں کر سکتے تو پھر تم ایک رکھو۔

اس سے پتا چلا کہ اعلیٰ مرتبہ وہ ایک سے زائد ہے اور ادنیٰ مرتبہ ایک ہے ہمیں تعجب ہوتا ہے جو دوسری شادی کرے حالانکہ تعجب ہونا چاہیے اس پر جو ایک

کرے قرآن کا آپ انداز سمجھیں! قرآن کس طرز سے بات کہہ رہا ہے؟

### انصاف کی حدود:

اصل یہ ہے کہ تم دو کرو یا تین کرو یا چار کرو اور اگر انصاف نہیں کر سکتے ہو تو پھر اس کا حل کیا ہے؟ پھر ایک کرو، انصاف کس حد تک؟ اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھو آگے قرآن کریم نے ایک بات تو صاف فرمادی ہے:

﴿وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَبِيلُوا

كُلِّ الْمِثْلِ فَتَذَرُوهَا كَأَنْمَ عَلَقَةٍ﴾<sup>72</sup>

قرآن نے کہا کہ اگر تم انصاف کرنا چاہو تو بھی تمہارے اختیار میں نہیں ہے، بس ایسا نہ کرنا کہ ایک بالکل لٹکی ہو اور ایک سے تم ہر وقت لپٹے رہو، بس ایسا نہ کرنا! اتنا قرآن کریم نے سمجھایا کیونکہ تمہارے اختیار میں مکمل عدل نہیں۔ کیا مطلب؟ اگر ایک سے زائد عورتیں تمہارے نکاح میں ہیں:

★ مکان دونوں کا برابر ہے۔

★ لباس دونوں کا برابر ہے۔

★ خرچہ دونوں کا برابر ہے۔

★ شب باشی دونوں کے پاس برابر ہے۔

لیکن قلبی تعلق انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا، اس لیے اس میں اللہ تعالیٰ نے مساوات رکھی نہیں ہے۔

### ملاپ اور قلبی میلان پر عدل نہیں:

میں ایک مسئلہ بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرنے لگا ہوں۔ ایک ہوتا ہے

عورت کو لباس دینا، مکان دینا، خرچہ دینا اور ایک ہے عورت کے ساتھ ہمبستر ہونا۔ ہمبستر ہونے کے معاملے میں کوئی مساوات ضروری نہیں، کیوں؟ کہ اس کا تعلق انسان کے قلبی میلان سے ہے، جس قدر میلان ہو گا اسی قدر ملاپ ہو گا چونکہ میلان اس کے اختیار میں نہیں ہے ملاپ پر شریعت نے عدل رکھا ہی نہیں ہے کہ جتنا اس کے پاس جاؤ اتنا ہی اس کے پاس جاؤ۔ ہاں اگر ایک رات ایک کی ہے تو دوسری رات دوسری کی ہے اس میں مساوات بہت ضروری ہے۔

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر دنیا میں کون سی ذات انصاف کرنے والی ہے؟ اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جملہ ارشاد فرمایا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں ایک وقت میں نو بیویاں آئیں۔ حضرت خدیجہ انتقال فرما گئیں اور حضرت زینب کا انتقال ہو گیا تو دو بیویاں چلی گئیں نو بیویاں بیک وقت نکاح میں تھیں لیکن ام المومنین امی عائشہ رضی اللہ عنہا ان میں بعض خوبیاں ایسی تھیں جن کی وجہ سے نبی پاک کو باقی بیویوں کی بنسبت ان سے لگاؤ زیادہ تھا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جملہ ارشاد فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ هَذَا قَسْمِيْ فَيَا اَمْلِكُ فَلَا تَلْمِزْنِيْ فَيَا اَمْلِكُ وَلَا اَمْلِكُ."<sup>73</sup>

اے اللہ! جو ظاہری مساوات میرے اختیار میں تھیں میں نے کردی ہیں قلبی مساوات میرے اختیار میں نہیں ہے اللہ اس پر میرا مواخذہ نہ فرمانا۔ یہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ہے، بتاؤ دوسرا بندہ اس میں کیا کر سکتا ہے؟

**امی عائشہ سے رسول اللہ کی محبت:**

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آخری ایام میں روزانہ پوچھتے آج کس کی

باری ہے؟ آج کس کی باری ہے؟ ازواجِ مطہرات نے سمجھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش ہے کہ میں عائشہ کے پاس جاؤں سب ازواجِ مطہرات نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم اپنی باری عائشہ کو دیتی ہیں تو آپ وہیں قیام فرمائیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دن وہیں گزرے۔ جب انتقال ہوا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں تھا اور جاںِ جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

### بیویوں کے درمیان عدل نہ کرنے پر سخت وعید:

میں یہ بات اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ ہم بعض باتیں سمجھتے نہیں ہیں اور بلاوجہ شریعت کے مسائل پر اعتراض شروع کر دیتے ہیں۔ اگر انصاف ہو سکتا ہے تو دو نکاح کریں یا دوسے زائد نکاح کریں اگر عدل نہیں کر سکتا تو پھر شریعت نے بہت سخت بات کی ہے اگر کسی کا ایک سے زائد نکاح ہو اس نے عدل نہ کیا تو قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا دھڑ فاج زدہ ہو گا پھر یوں ہے کہ اگر عدل نہیں کر سکتے تو پھر دو شادیاں نہ کرو۔

میرے تین نکاح ہیں۔ میں سب سے کہتا ہوں کہ دوسرا نکاح مت کرو آپ کے بس میں نہیں ہے آپ اس کو سنبھال نہیں پاتے اپنی آخرت اور قبریں برباد مت کرو ضبط کرو اپنے اوپر اللہ تمہیں اسی پر اجر عطا فرمائے گا۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی چونکہ دو شادیاں تھیں۔ حضرت ”شیخ“ بھی بہت بڑے تھے اور عالم بھی بہت بڑے تھے، مزاج میں ظرافت اور لطافت بھی تھی، ایک شخص نے حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ سے ویسے ازراہ مذاق عرض کیا حضرت آپ کی دو بیویاں ہیں آپ تو جنت میں رہتے ہیں۔ حضرت نے بڑا پیارا جواب دیا فرمایا یہ وہ جنت ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے پل صراط سے گزرنا پڑتا ہے۔

ایک مرید نے کہا کہ حضرت آپ نے تو دو نکاح فرمائے۔ فرمایا میں نے اس

لیے دو کیے تاکہ تم میں سے کوئی دو نکاح نہ کر سکے انہوں نے کہا جی وہ کیسے؟ حضرت نے فرمایا کہ دیکھو جس طرح میں عدل کرتا ہوں تم کر سکتے ہو؟ کہا جی نہیں۔ کہا پھر دو نکاح ہی نہ کرو۔

### فقر و فاقہ کا علاج..... شادی:

اچھا فقر کی وجہ سے کبھی نکاح نہ چھوڑنا ہمارا ذہن ہوتا ہے کہ ایک کا خرچہ پورا نہیں ہوتا دوسری کا کہاں سے دیں گے۔ اس وجہ سے نکاح کبھی نہ چھوڑنا قرآن کا وعدہ ہے:

﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ ۚ  
 إِنَّ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِيهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝﴾<sup>74</sup>  
 اگر تم فقیر ہو تو خدا تمہیں غنی کر دے گا۔

خیر میں یہ کہہ رہا ہوں کہ عدل نہ کر سکو تو نکاح نہ کرنا اس بات سے نہ ڈرو کہ غربت کیسے جائے گی؟ اور مال تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے یہ سوچ غلط ہے۔ مال و دولت کی فراوانی وہ مالک الملک کے اختیار میں ہے شریعت سمجھ کر کام کرنا پھر دیکھو خدا کیسے فقر دور کرتا ہے۔

### تربوز تو لا جا سکتا ہے مٹھاس نہیں:

حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے ہاں ایک مرید دو تربوز لے کر آیا کہ جی یہ دونوں بیویوں کے لیے ہیں۔ حضرت نے فرمایا ان دونوں تربوزوں کو کاٹو دونوں کو کاٹا آدھا آدھا کیا تو فرمایا آدھا آدھر بھیجو آدھا آدھر بھیجو۔ دوسرا کاٹا تو فرمایا آدھا آدھر بھیجو آدھا دوسری کے پاس تو اس نے کہا کہ حضرت! ایسا کیوں کیا ہے؟ ہم تو دو تربوز



تول کر لائے تھے ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے ترازو رکھا ہوا ہے اور آپ تول تول کر دونوں بیویوں کا سامان بھجواتے ہیں ہم اس لیے تول کر لائے تھے تاکہ آپ کو تولنے کی زحمت نہ کرنی پڑے مگر آپ نے کاٹ کر دو ٹکڑے کیے پھر گھر بھجوائے ہیں۔ حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہ اللہ کا جواب سنیں فرمایا بھائی وزن میں تو آپ نے تول لیا لیکن مٹھاس تو آپ نہیں جانتے نا؟ اگر ایک بیوی کے ہاں میٹھا چلا گیا اور دوسری بیوی کے ہاں پھیکا چلا گیا تو اس کا جواب اللہ کے ہاں کون دے گا؟ اس لیے ہم نے دونوں تربوز کاٹے تاکہ دونوں پھیکے یا میٹھے ہیں تو اسی حساب سے دونوں کو ملیں یہ عدل ہے۔ تو بھائی عجب چاہتے ہیں تو نکاح فرمائیں اگر نہیں کر سکتے تو نہ فرمائیں۔ میری گزارش سمجھ رہے ہیں میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ شریعت کے معاملہ میں اپنے دماغ کو ہم بالکل صاف رکھیں تاکہ الجھن میں مبتلا نہ ہوں۔

### وراثت کے احکام:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلَّذِ كَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَتْهُ أَبَوُهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ نَعْمًا فَإِذَا مَاتَ اللَّهُ إِنْ كَانَ اللَّهُ كَانَ عَلَيْنَا حَكِيمًا ۝﴾

اس آیت میں اللہ رب العزت نے وراثت کے مسائل بیان فرمائے ہیں۔ میں وراثت اور وصیت کے مسائل پورے تو بیان نہیں کرتا کیونکہ اس میں کافی دیر لگتی ہے۔ کچھ اہم چیزیں ذہن میں رکھ لیں۔

## تقسیم وراثت اور وصیت کا واجب ہونا:

وصیت کے معاملے میں اس بات کا خیال رکھیں کہ آدمی کو اگر یہ یقین ہو کہ میری موت کے بعد میرے ورثاء شریعت کے مطابق میری وراثت کو تقسیم نہیں کریں گے اگر یہ یقین ہو تو وصیت کر کے فوت ہونا آدمی کے ذمے فرض اور واجب ہے اگر وصیت نہ کی تو پھر گناہ گار ہو گا اگر پتا ہو کہ میرے ورثاء میری وراثت کو صحیح تقسیم نہیں کریں گے تو پھر وصیت کرے کہ بھائی دیکھو وراثت تقسیم کرنا اور میرے ذمے فلاں قرض ہے وہ بھی ادا کرنا ان سب چیزوں کا خیال کرنا بہت ضروری ہے۔

ہم وصیت کے معاملے میں بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں آج کل ہمارے ہاں یہ رواج چلتا ہے کہ والد محترم اپنی وفات سے پہلے ہی اپنا مال بیٹوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور اپنی بچیوں کو محروم کر دیتے ہیں۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے عورت کو وراثت سے کبھی بھی محروم نہ کرنا۔

## بچیوں کی وراثت اور جہیز:

ہمارے ہاں رواج کیا ہے؟ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وراثت اس لیے عورت کو نہیں دیتے کہ ہم نے جہیز جو دیا ہے بھائی جہیز دینا تو آپ کے ذمے ہی نہیں تھا جو آپ کے ذمے نہیں تھا وہ تو آپ نے کر لیا اپنی ناک رکھنے کے لیے اور جو آپ کے ذمے تھا اس کو آپ نے چھوڑ دیا۔ جہیز تو آپ کے ذمے نہیں، کیوں؟ اس لیے کہ جہیز کا معنی ہوتا ہے وہ سامان جو عورت کے گھر کی ضرورتیں ہیں تو گھر کی ضرورتیں اس کے شوہر کے ذمے ہیں جس کی وہ بیوی ہے، باپ کے ذمے نہیں ہے۔ اگر باپ دیتا ہے تو یہ اس کی مروت ہے اگر نہ بھی دے تو باپ کے ذمے نہیں ہے۔

## حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جہیز یا.....؟:

لوگوں کے ذہن میں یہ دلیل آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اپنی بیٹی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو جہیز دیا تھا وہ اس کو بطور دلیل کے پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں فاطمہ الزہراء کا یہ جہیز تھا آپ مجھے بتائیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیٹیاں ہیں ایک بیٹی تو نہیں ہے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عجی چاہنے والا کون ہے؟ اگر جہیز دیا ہو تا تو حضور چاروں کو دیتے۔ یہ تو نہیں تھا کہ ایک کو جہیز دیتے اور تین کو محروم فرما دیتے جب تین کو نہیں دیا تو اس کا معنی ہے یہ جہیز نہیں تھا۔

پھر یہ کیا تھا؟ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت میں تھے بچپن سے، حضرت علی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی جو ان ہوئے، ان کو گویا بیٹے کی طرح پالا تھا اب حضرت علی جب جو ان ہوئے تو ان کے نکاح کا مسئلہ تھا اگر حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا سے نکاح نہ ہو تا کسی اور عورت سے ہو تا تو حضرت علی کو گھر کا سامان کس نے دینا تھا؟ (سامعین۔ حضور پاک نے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹا جو بنا رکھا تھا جب فاطمہ الزہراء سے نکاح کر دیا تو پھر ساتھ سامان بھی دینا تھا اگر زہرا نہ آتی کوئی اور آتی سامان تو تب بھی دینا تھا۔ حقیقت اس کی یہ تھی اور ہم سمجھتے ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زہرا کو جہیز عطا فرما دیا، اللہ پاک ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

### انبیاء کی وراثت کا مسئلہ:

یہ وراثت کا مسئلہ امت کے لیے ہے نبی کے لیے نہیں ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہم انبیاء ہیں اور نبی کا دنیا میں کوئی شخص مالی وارث نہیں ہوتا نبی کی مالی وراثت خاندان میں کبھی بھی تقسیم نہیں ہوتی۔ یہ حدیث سمجھ میں آ جائے، اس سے ایک مسئلہ باغ فدک کا حل ہو جاتا ہے۔

### باغ فدک کا قضیہ:

لوگ آج سمجھتے ہیں کہ باغ فدک حضرت فاطمہ الزہرا کا تھا ابو بکر صدیق

رضی اللہ عنہ نے غصب کر لیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کو دیا نہیں بھائی غصب کیسے کر لیا؟ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا آئیں کہ باغ فدک ہمارا ہے، ہمیں دے دیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد میرے علم میں ہے کہ نبی کا کوئی مالی وارث دنیا میں نہیں ہوتا نبی جو مال چھوڑ کر جاتے ہیں وہ صدقہ بن جاتا ہے حضرت زہرا خاموش ہو گئیں اور کبھی بھی اپنے حق کا مطالبہ نہیں کیا۔

میں نے کہا کہ وہ خاموش ہو گئیں اور آج جنگیں جاری ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے باغ فدک کیوں نہیں دیا؟ وہ تو خاموش ہو گئیں ممکن ہے کہ آپ کے ذہن میں ایک سوال آئے کہ زہرا رضی اللہ عنہا نے باغ فدک مانگا کیوں تھا؟ جب ان کا حق ہی نہیں تھا تو مانگا کیوں تھا؟ اصل وجہ یہ تھی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح خیبر کے بعد یہ ترتیب بنائی تھی کہ اپنی ازواج مطہرات کے خرچہ کے لیے ایک باغ رکھ لیا تھا اور اس سے سال بھر کا خرچہ ایک ایک بیوی کو دے دیتے وہ بھی ازواج مطہرات تھیں جتنا ملا آگے امت کے حوالے فرما دیتی تھیں، وہ سال بھر کا رکھتی ہی نہیں تھیں۔ حضرت زہرا نے سمجھا کہ حضور اس باغ سے ہماری کفالت کرتے تھے تو شاید یہ ہمارا ہی ہے، یہ غلط فہمی تھی۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مسئلہ بتایا تو امی زہرا سے غلط فہمی دور ہو گئی اور باغ فدک کا مطالبہ کرنا چھوڑ دیا۔

### نبی کی مالی وراثت کیوں نہیں چلتی؟:

بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے بڑا عجیب مسئلہ بیان فرمایا: نبی کی وراثت کیوں دنیا میں تقسیم نہیں ہوتی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وراثت اس کی ہوتی ہے جس کی مال سے ملکیت ختم ہو جائے۔ مرنے والے کی ملکیت ختم ہوگی تو اولاد کو منتقل ہوگی۔ اگر مرنے والے کی ملکیت ختم نہ ہو تو اولاد کو منتقل کیسے ہوگی؟ تو نبی

صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی صورت یہ ہوتی ہے کہ نبی کی روح مبارک پورے جسم سے قلب اطہر میں سمٹ آتی ہے، مکمل حیات کا انقطاع ہوتا ہی نہیں ہے اس لیے نبی کی وراثت امت میں تقسیم نہیں ہوتی۔

### نبی کی روح مبارک قلب اطہر میں سمٹ آتی ہے:

پیغمبر کی روح مبارک چونکہ پورے جسم سے قلب اطہر میں جمع ہو جاتی ہے تو قلب اطہر میں حیات رہتی ہے جب قلب اطہر میں حیات باقی ہے تو بتاؤ مال سے ملکیت ختم ہو گئی؟ جب ملکیت ہی ختم نہیں ہوئی ہے تو مال وراثت میں تقسیم کیسے ہو گا؟

### حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی لاجواب دلیل:

دوسری بات کہ نبی کا مال صدقہ کیوں ہو جاتا ہے؟ توجہ رکھنا! مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا نُورُثُ مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ" <sup>75</sup>

کہ جو مال نبی چھوڑ کر جائے امت میں صدقہ ہے، فرمایا: یہ بھی دلیل ہے نبی کی حیات پر، یہ نبی کی حیات پر کیوں دلیل ہے صدقہ تب بنتا ہے جب مال دینے والا زندہ ہو اگر زندہ نہ ہو تو صدقہ بنتا ہی نہیں جو حضرات فرماتے ہیں کہ بوقت موت نبی کا مال صدقہ ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بوقت موت نبی کے قلب میں حیات موجود ہوتی ہے۔ کتنا آسان سا مسئلہ ہے لوگوں نے ایسے الجھا دیا ہے اس کو۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### دو جلیل القدر اماموں کا دلچسپ مکالمہ:

مجھے اسی مسئلہ پر ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آیا حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ

کوفہ سے مکہ مکرمہ گئے امام جعفر صادق رحمہ اللہ کو سلام کیا انہوں نے سلام کا جواب دیا لیکن زیادہ خوش ہو کر نہیں دیا ایسے دیا جیسے ناراض ہوتے ہیں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے پوچھا کیا ناراضگی ہے؟ آپ نے خوش ہو کر جواب نہیں دیا۔

فرمایا: اے ابو حنیفہ! ہم نے تیرے بارے میں سنا ہے ایک طرف آیت ہوتی ہے ایک طرف حدیث ہوتی ہے تو قیاس کو لے لیتا ہے اور حدیثیں چھوڑ دیتا ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ چلیں میں آپ سے ایک دو مسئلے پوچھتا ہوں مجھے آپ جواب ارشاد فرمائیں۔ میری عقل یہ بات کہتی ہے کہ عورت کو وراثت میں دو گنا مال دینا چاہیے اور مرد کو ایک گنا دینا چاہیے کیونکہ مرد طاقور ہے اور عورت کمزور ہے مرد باہر جا کر کمالے گا اس نے تو کمانا نہیں ہے تو طاقور کو وراثت سے تھوڑا دو اور کمزور کو دو گنا دو تا کہ اس کی حوصلہ افزائی ہو میری عقل یہ بات کہتی ہے لیکن میں نے اللہ کے فرمان کی وجہ سے عقل کی بات چھوڑ دی ہے۔

امام صاحب فرمانے لگے کہ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جب عورت کے ماہواری کے دن ہوتے ہیں تو نماز بھی نہ پڑھے اور وہ روزہ بھی نہ رکھے بعد میں نماز کی قضا نہ کرے اور روزے کی کرے میری عقل کہتی ہے کہ نماز کی قضا کرے اور روزے کی قضا نہ کرے چونکہ نماز روزے کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ تو نماز کی قضا کرے اور روزے کی نہ کرے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزے کی کرے اور نماز کی نہ کرے۔ دیکھیں میں نے عقل کی بات چھوڑ دی اور آپ کے نانا جی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر عمل کیا ہے۔ امام جعفر صادق اٹھے اور امام صاحب کی پیشانی کا بوسہ لے کر فرمایا: ابو حنیفہ! ہم نے تیرے بارے میں غلط سنا تھا تو بالکل سچ کہتا ہے۔<sup>76</sup>

امام صاحب کے بارے میں لوگوں نے شبہات پیدا کیے ہیں۔ اللہ ہمیں دور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### توبہ کی قبولیت کا وقت:

﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ

مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۖ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٦﴾﴾

اس آیت میں اللہ رب العزت نے توبہ کا تذکرہ فرمایا ہے کہ توبہ اس وقت تک ہوتی ہے کہ جب تک انسان پر موت کے آثار نہ آئیں اور جب موت کے آثار آجائیں تو اس وقت آدمی پر توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اگر موت کے آثار ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ توبہ کا دروازہ کھلا ہوتا تو پھر فرعون کی توبہ بھی قبول ہو جاتی کیونکہ مرتے وقت فرعون نے بھی کہا تھا اے اللہ! میں مانتا ہوں فرمایا:

﴿أَنْتَ اَنْتَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ﴿١٦﴾﴾<sup>77</sup>

بے ایمان تو اب مانتا ہے جب تجھے نظر آگیا ہے۔

### ایمان کیا ہے؟

معلوم ہوا نظر آئے اور پھر مانے اس کا نام ایمان نہیں ہے اس کا نام مشاہدہ ہے نظر نہ آئے پھر بھی مانے اس کا نام ایمان ہے۔ سمجھ نہ آئے تو پھر مانے اس کا نام ایمان ہے سمجھ آئے اور پھر مانے اس کا نام ایمان نہیں ہے۔

### عقیدہ حیات النبی عقلی مسئلہ نہیں:

آج لوگ کہتے ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم قبر میں زندہ ہیں تو چھوٹی سی

قبر ہے سانس کیسے لیتے ہیں؟ چھوٹی سی قبر ہے کھڑے کیسے ہوتے ہیں؟ چھوٹی سی قبر ہے نماز کیسے پڑھتے ہیں؟ بھائی سمجھ آئے تب مانا اس کا نام مشاہدہ ہے نہ سمجھ آئے پھر مانا اس کا نام ایمان ہے۔

### قبولیت توبہ کی شرائط:

توبہ کی شرائط میں سے تین شرطیں بنیادی ہیں۔ یعنی جب آدمی توبہ کرے تو بوقت توبہ یہ تین کام کرے۔

- ✿ گناہ کو چھوڑ دے۔
- ✿ آئندہ نہ کرنے کا عزم کرے۔
- ✿ اپنے گناہ پر ندامت بھی ہو۔
- ✿ اگر گزشتہ گناہ نہ چھوڑے تو پھر بھی توبہ کرے۔

### لا حول پر لا حول بھی لا حول پڑھتا ہو گا:

یہ کیسی توبہ ہے؟ بازار جاتے ہیں نیم عریاں لڑکیوں کی تصاویر ہیں، کہتے ہیں: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ کتنی بے حیائی ہے، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ بھی پڑھ رہے ہو دیکھ بھی رہے ہو؟ اس لَا حَوْلَ پر تو لَا حَوْلَ بھی لَا حَوْلَ پڑھتا ہو گا۔

### بد نظری سے خود کو بچائیں:

جب سامنے تصویر ہے تو اس سے آنکھیں نیچی کرو پھر لَا حَوْلَ پڑھو! قرآن کریم کا حکم کیا ہے؟ ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوْنَ مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ﴾<sup>78</sup> کہ جب آؤ تو اپنی آنکھیں نیچی کرو تو اس کا نام ہے پردہ۔ اس سائن



بورڈ کو دیکھ بھی رہے ہیں اور کہتے ہیں: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ دیکھو! ہمارے سرگودھا میں بھی کتنی بڑی بے حیائی شروع ہو رہی ہے؟ بھائی اپنی آنکھیں نیچی کرو۔

### توبہ کی بنیادی تین شرائط:

میں گزارش کر رہا تھا کہ توبہ کے لیے تین بنیادی شرطیں ہیں:

1. گناہ کو چھوڑ دے۔
2. آئندہ نہ کرنے کا پکا عزم کرے۔
3. اپنے گناہ پر ندامت بھی ہو۔

جب آدمی اپنے گناہ پر ندامت کا اظہار کرے تو صرف یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس گناہ کو معاف کرتے ہیں بلکہ پچھلے گناہوں کو بھی اللہ نیکیوں میں بدل دیتے ہیں۔

### اہل دنیا کا قانون:

میں ایک بات کہتا ہوں اللہ کی عدالت کا معاملہ دنیا کی عدالت سے بہت مختلف ہے دنیا کی عدالتیں اگر مجرم کو معاف بھی کر دیں اس کے ریکارڈ کو ضائع نہیں کرتیں ایک آدمی چوری کے کیس میں پکڑا جائے اور دوبارہ وہ چار مہینے بھی لگالے چلے بھی لگالے اور نیک ہو جائے مگر جب بھی چوری ہوگی تھانے والے ایک مرتبہ ضرور آئیں گے پھر امیر صاحب صفائی دیں گے کہ جی اب یہ بدل گیا ہے اب اس کی جان چھوڑ دو اگلا S.H.O پھر پہنچ جائے گا کہ جناب ہمارے پاس تو اس کا ریکارڈ پڑا ہے۔ تو دنیا کا قانون کیا ہے؟ عدالت اگر مجرم کو معاف بھی کر دے مگر اس معافی کے باوجود اس کا ریکارڈ ختم نہیں کرتی۔

### احکم الحاکمین کا قانون:

خدا کا نظام یہ ہے:

"إِذَا تَابَ الْعَبْدُ أَنَسَىٰ اللَّهُ الْخَفْظَةَ ذُنُوبَهُ وَأَنَسَىٰ ذَلِكِ جَوَارِحُهُ

وَمَعَالِمُهُ مِنَ الْأَرْضِ حَتَّى يَلْقَى اللَّهَ وَلَيْسَ عَلَيْهِ شَاهِدٌ مِنَ اللَّهِ بِذَنْبٍ" 79

حدیث مبارک میں ہے: جب بندہ گناہ سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ وہ گناہ مٹا

دیتے ہیں حتیٰ کہ

◎ فرشتوں کو بھی بھلا دیتے ہیں۔

◎ اللہ تعالیٰ جسم کے اعضا کو بھی بھلا دیتے ہیں۔

◎ اللہ تعالیٰ اس زمین کو جہاں گناہ کیے ہیں اس کو بھی بھلا دیتے ہیں۔

جب قیامت میں خدا کے دربار میں جائے گا تو کوئی ایک بھی اس کے خلاف گواہ نہیں ہوگا۔ اللہ صرف گناہ معاف نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ ریکارڈ بھی ختم کر دیتے ہیں دنیا کی عدالتیں جرم تو معاف کر دیتی ہیں لیکن ریکارڈ ختم نہیں کرتیں اللہ رب العزت ریکارڈ کو بھی ختم فرما دیتے ہیں۔

**بیوی کو دیے ہوئے مال کا دوبارہ مطالبہ نہ کرو:**

﴿وَإِنْ أَرَدْتُمْ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۖ وَآتَيْتُمْ أَحْذَنَ

قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ أَتَأْخُذُونََهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا﴾ ۸۰

اس آیت میں بنیادی طور پر ایک مسئلہ بیان فرمایا اگر ایک عورت سے نکاح ہوا اور ان کا آپس میں مزاج نہیں ملتا اور طلاق کی نوبت آجاتی ہے تو پھر جو کچھ اس دوران تم نے عورت کو دیا ہے حق مہر، یا کچھ مال، تو اس مال کا واپس مطالبہ نہ کرو۔ جب طلاق ہوتی ہے تو اکثر کہتے ہیں ہم نے تو وہ بھی دیا تھا یہ بھی دیا تھا قرآن کہتا ہے یوں نہ کیا کرو دیکھو ایک مدت تم دونوں ایک ساتھ رہے ہو اکٹھے وقت گزارا ہے مروت اور غیرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اب واپسی کا تقاضا نہیں کرنا چاہیے حق مہر جو تم نے دیا

لاکھ دیا ہے یا کروڑ دیا ہے اب اس کی واپسی کا مطالبہ نہ کرو یہ مرد کے لیے جائز نہیں تو اس سے آدمی کو بچنا چاہیے۔ اس پر میں دو باتیں عرض کرتا ہوں۔

### شادی کی رسومات اور مہر فاطمی:

حق مہر کے حوالے سے ہمارے ہاں عموماً مزاج کیا ہے؟ جب مسجد میں نکاح ہو گا پہلے منگنی پر پیسے خرچ کریں گے پھر جہیز پر لڑکی والوں سے جہیز لیں گے، پندرہ بیس لاکھ کا اور دو سو بندے ان کے کھانے پر لائیں گے اس میں ان کے پانچ لاکھ خرچ کروائیں گے ان کے بیس لاکھ پچیس لاکھ خرچ کروالیں گے۔ جب پوچھا کہ نکاح میں حق مہر کتنا ہے؟ تو کہیں گے مولوی صاحب حق مہر فاطمی کتنا ہوتا ہے؟ بھائی جب تم نے جہیز مانگا تھا پھر حضرت فاطمہ یاد نہیں ہے، جب دو سو لوگوں کی بارات لے کر آئے پھر حضرت فاطمہ یاد نہیں ہے؟ جب بچی کو حق مہر دینا ہے تو پھر پوچھتے ہو مولانا صاحب بتاؤ حق مہر فاطمی کتنا ہوتا ہے؟ اب یہ کتنا سادہ مسلمان بن گیا؟ کیسائیک آدمی ہے؟ آدمی کی یہ باتیں غیرت اور مروت کے بھی خلاف ہیں یہ کس طرح کس منہ سے تقاضا کرتے ہیں، اچھا ایک جب عورت کی باری آئے تو پوچھتے ہیں مہر فاطمی کتنا ہے۔

### مولوی طبقے سے ناروا سلوک:

دوسرا جب مولوی صاحب کی باری آئے تو کہتے ہیں کہ جی مولانا صاحب کے لیے مسجد کے لیے کتنے پیسے دو گے؟ جی ہمارے ہاں تو دو سو روپے دیتے ہیں باقی آپ جیسے مناسب سمجھو بندے کو سن کر بھی شرم آتی ہے بارات دیکھو تو ٹو، ڈی گاڑیوں پر لاتے ہیں کھانا دیکھو تو دس ڈشیں پکی ہیں اور مولانا صاحب کی باری آئے تو کہتے ہیں ہمارے ہاں تو دو سو روپے دیتے ہیں باقی آپ جیسے مناسب سمجھو مناسب سمجھنے کا مطلب کہ آپ دو سو روپیہ اور بڑھادیں میں کہتا ہوں کہ آپ بارات پر پیسے خرچ نہ کرو اور اگر آپ نے خرچ کرنے ہی ہیں تو مسجد کے امام کا کیا قصور ہے 50 ہزار روپے اس

کو بھی دے دو کیا فرق پڑتا ہے؟

### مسنون حق مہر کتنا ہے؟:

میں آپ سے پیسے نہیں مانگتا ہم نے نکاح کی ترتیب یہ نہیں رکھی۔ میں اپنے گاؤں میں بھی نکاح پڑھاؤں تو نکاح کی فیس مسجد کے امام کی ہوتی ہے، میں عید پڑھاؤں تو اعلان کر کے مسجد کے امام کے لیے خود جمع کرتا ہوں، مسجد کے خادم کو بھی دو اور امام کو بھی دو۔ ایک تو میں نے عرض کرنا ہے کہ حق مہر کتنا ہوتا ہے 10 درہم چاندی اس سے کم حق مہر کی تو گنجائش ہی نہیں لیکن حق مہر ہونا کتنا چاہیے؟ اس میں دو چیزوں کی رعایت کرنا ضروری ہے اتنا کم نہ دو کہ عورت اپنی سہیلیوں کو بتاتے ہوئے شرمائے اور اتنا زیادہ بوجھ نہ ڈالو کہ لڑکا دے نہ سکے بس ان دونوں کی رعایت کرو یہ حق مہر مسنون ہے۔ اتنا کم نہ دو کہ لڑکی کو بتاتے ہوئے شرم آئے ایک لڑکی کروڑ پتی ہے باپ کی دس دکانیں ہیں اس کا حق مہر پانچ ہزار ہو تو وہ کسی کو کیسے بتائے کہ میرا حق مہر اتنا ہے، حق مہر اس کا اتنا رکھو کہ لڑکی کو سہیلیوں کو بتاتے ہوئے شرم نہ آئے۔

### بیوی کی سہیلیوں کا بھی خیال کرو:

جیسے آپ کے دوست ہیں اس کی بھی تو سہیلیاں ہیں، اپنے دوستوں کی رعایت کرتے ہو تو بیوی کی سہیلیوں کی رعایت کیوں نہیں کرتے؟ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے میں اور آپ کون ہوتے ہیں کہ نہ کریں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا وفات پا گئیں، دنیا سے چلی گئیں اندازہ کرو دنیا سے چلی گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج یہ تھا کہ جب گھر میں بکری ذبح ہوتی یا جب بھی گھر میں گوشت ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کی سہیلیوں کے گھروں میں گوشت بھجواتے۔ اپنی فوت شدہ بیوی کی سہیلیوں کا اتنا خیال فرماتے۔ اس کا بہت خیال کیا کرو یہ جو ہمارے گھروں کا نظام بگڑتا ہے نا میں کون کون

ساروناروؤں گا اس میں ہمارے بہت سارے معاملات کو دخل ہے مجھ سے کبھی بہت سے بے تکلف ساتھی پوچھتے ہیں: مولوی صاحب! آپ کے گھر میں کبھی لڑائی نہیں ہوتی میں نے کہا کبھی نہیں ہوئی کیوں نہیں ہوتی؟ میں نے کہا الحمد للہ ہم رعایت کرتے ہیں، میں اپنے دوستوں کی رعایت کرتا ہوں گھروالوں کی سہیلیوں کی بھی رعایت کرتا ہوں۔ کہ بھی تمہاری سہیلیاں ہیں جو دینا چاہو دے دو۔

### گھریلو نظام زندگی کو پرسکون بنائیں:

حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کچھ ایسا ماہانہ خرچہ اپنی بیوی کو دینا چاہیے کہ جس کا اس سے تم حساب نہ مانگا کرو! یہ حکیم الامت مولانا تھانوی رحمہ اللہ فرما رہے ہیں کچھ ایسا خرچہ دو جس کا حساب نہ مانگو۔ میں خود کہتا ہوں کہ بھی تمہاری کوئی سہیلی ہو اس کو سودو سو کا کارڈ بھیجنا چاہو تو بھیج دو۔ یہ ہدیہ کسی سہیلی کو دینا چاہو تو بے شک دے دو، مجھ سے پوچھانہ کرو، تمہاری کوئی بھی سہیلی ہو اس کی بلا کر دعوت کرو خرچہ سارا میرے ذمے ہے خوش رکھو اپنی سہیلیوں کو، کیوں؟ بھائی آپ کے پاس کروڑ روپیہ ہے آپ کے پاس دو دوکانیں ہیں تو بیوی کا امیج بھی تو بڑھنا چاہیے اس کو آپ رگڑ کے رکھتے ہیں دوستوں کو آپ باہر تکے کھلاتے ہیں تو پھر گھر میں گڑ گڑ تو ہوگی پھر لڑائی تو ہوتی ہے۔ اللہ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

### حضرت عمر کے سامنے خاتون کی حق گوئی:

مجھے اس پر ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک مرتبہ جی چاہا کہ حق مہر مقرر کر دیں تاکہ اس مقدار سے زیادہ لوگ حق مہر نہ دیں شادیاں مہنگی نہ ہوں اور امت پر بوجھ نہ پڑے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن خطبہ دیا اور خطبہ میں مسئلہ بیان فرمایا ایک مقدار مقرر کرنے کے لیے کہ بھائی اتنا حق مہر دیا کرو اور اس سے زیادہ حق مہر نہ دو تاکہ شادیاں مہنگی نہ ہوں حضرت عمر نے جوں ہی خطبہ دیا

ایک عورت کھڑی ہو گئی اسے کہتے ہیں حق گوئی، ایک عورت کھڑی ہو گئی اس نے کہا عمر تم کون ہوتے ہو حق مہر کو متعین کرنے والے؟ قرآن نے تو متعین کیا ہی نہیں قرآن کہتا ہے: ﴿وَإِنْ أَرَدْتُمْ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۖ وَآتَيْتُمْ أَحَدَهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْعًا﴾ کہ اگر تم کسی عورت کو حق مہر میں سونے کا ڈھیر بھی دے چکے ہو تو طلاق دو تو واپس نہ لو قرآن سونے کا ڈھیر دینے کی اجازت دیتا ہے عمر آپ کیسے متعین کر سکتے ہو؟ حضرت عمر فرمانے لگے: ہاں جی اگر یہ عورت نہ ہوتی تو عمر برباد ہو جاتا، اپنی رائے واپس لے لی۔ اسے کہتے ہیں حق گوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے جبری آدمی نے فرمایا میں رائے واپس لیتا ہوں واقعتاً جس آیت پر تیری نگاہ پڑی اس پر میری نگاہ نہیں تھی۔

### خلفاء راشدین کا عمل حجت ہے:

خلفاء راشدین کا عمل کیوں حجت ہے؟ اسی وجہ سے حجت ہے کہ خلیفہ راشد صحابہ کے دور کا بندہ ہے ان سے غلطی ہو تو وہ غلطی پر قائم رہ نہیں سکتا، فوراً صحابہ کی جماعت کہتی ہے: نہیں! نہیں! ایسے نہیں ہو سکتا۔

### مال غنیمت اور ایک لمبا کرتا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ نے سنا ہے غنیمت میں کپڑا آیا۔ باقی لوگوں کا ایک ایک جوڑا بنا، حضرت عمر کا قد لمبا تھا اس کپڑے سے حضرت عمر کا جوڑا بن ہی نہیں سکتا تھا۔ جمعہ کے دن خطبہ کے لیے آئے ایک شخص کھڑا ہوا۔ اعرابی تھا اس نے کہا عمر! خطبہ بعد میں دو پہلے ہمیں حساب دو جتنا تمہارا قد ہے جتنا کپڑا تقسیم ہوا اس سے تمہارا سوٹ بن ہی نہیں سکتا پہلے اس کا جواب دو پھر تقریر شروع کرنا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کا جواب میرا بیٹا عبد اللہ دے گا۔  
عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کھڑے ہوئے اور کہا: مجھے پتا تھا کہ میرے والد صاحب کا  
قد لمبا ہے، میں نے اپنے حصے کا کپڑا ان کو دیا ہے تاکہ میرے بابا کا سوٹ بن جائے۔  
حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے بہت خوش ہوئے۔ فرمایا: جب عمر کی فوج اور ماتحتی  
میں ایسے بندے موجود ہوں تو عمر کبھی بھی خراب نہیں ہو سکتا اس پر بندے کو خوش  
ہونا چاہیے اگر کوئی غلطی کی نشاندہی کرے۔

### عورت پر مرد کی فوقیت:

﴿الرِّجَالُ قَوُّمُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾<sup>80</sup>

اس آیت میں بنیادی طور پر دو مسئلے ہیں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اللہ رب  
العزت نے اس آیت میں مرد کی فوقیت کو بیان فرمایا ہے: ﴿الرِّجَالُ قَوُّمُونَ عَلَى  
النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾ دو وجوہات بیان فرمائیں یہ بڑی اہم بات  
ہے مرد کو اللہ نے عورت پر فوقیت دی ہے اور دو دلیلیں بیان فرمائیں۔

### وہی اور کسی صلاحیت:

ایک دلیل ایسی ہے جو کسی ہے اور ایک ایسی ہے جو وہی ہے۔ وہی کہتے ہیں  
جو بغیر بندے کے اختیار کے ہو۔ کسی کہتے ہیں جو بندے کے اختیار میں ہو۔

### مرد کی فوقیت کی پہلی وجہ:

اللہ پاک فرماتے ہیں کہ مرد کو عورت پر فوقیت ہے دو باتوں پر ﴿بِمَا فَضَّلَ  
اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾ پہلی وجہ یہ ہے اللہ کا نظام یہ ہے کہ اللہ نے بعض کو بعض

پر ترجیح دی ہے، یہ ہمارا فیصلہ ہے کہ مرد کو عورت پر فوقیت ہے اس نظام کو تم بدل نہیں سکتے۔ یہ مرد کی وہی صلاحیت ہے اس میں مرد کے اختیار کو دخل ہی نہیں ہے۔

### مرد کی فوقیت کی دوسری وجہ:

﴿وَبِمَا آَنَفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ دوسری وجہ یہ ہے کہ مرد خرچ کرتا ہے اور عورت خرچ کرواتی ہے خرچہ کرنے والا ہاتھ اوپر ہوتا ہے اور خرچہ لینے والا ہاتھ نیچے ہوتا ہے، اوپر والے ہاتھ کو نیچے والے ہاتھ پر فوقیت ہوتی ہے دیکھو اللہ نے کیسی عقلی بات فرمائی ہے اور دونوں باتیں سمجھائی ہیں۔

### بعض خواتین مردوں سے افضل ہیں:

اچھا یہ مسئلہ سمجھیں! یہ جو مسئلہ بیان کیا ہے ناکہ مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے یہ جنس مرد کو جنس عورت پر ہے ورنہ جزوی طور پر بعض عورتیں مردوں سے افضل ہوتی ہیں۔ میری بات سمجھ آگئی؟ یعنی عموماً کہا ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ عالم عابد سے افضل ہے لیکن اگر کوئی مولوی صاحب بھی ہو ٹیلی ویژن بھی دیکھتا ہو گناہ بھی کرتا ہو اور عابد یہ کام نہ کرتا ہو تو پھر ہم اس ٹی وی دیکھنے والے مولوی صاحب کو تو نہیں افضل کہہ سکتے۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ عمومی ضابطہ ہے کہ مرد عورت سے افضل ہے لیکن بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو بعض معاملات میں مردوں سے بہت زیادہ سمجھ دار ثابت ہوتی ہیں۔

### خواتین کی سمجھداری کے چند واقعات:

میں اس پہ اگر واقعات عرض کروں تو بہت زیادہ وقت لگے گا۔ اتنے واقعات ہیں کہ بعض معاملات میں عورتوں نے ایسے مسائل پیش فرمائے جس کا حل وقتی طور پر مرد بھی نہ پیش کر سکا۔



## حضرت ام سلمہ کی دانائی:

ایک واقعہ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی زندگی کا ہے آپ نے سنا ہو گا جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ عمرے کے لیے تشریف لے گئے اور حدیبیہ کے مقام پر روک دیا گیا، صلح کی شرطیں طے ہو گئیں معاہدہ ہو گیا، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم واپس جانے لگے کہ اگلے سال عمرے پر آئیں گے اب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ بھیجی ہم عمرہ تو نہیں کر سکتے واپس جانا ہے تو واپس جانے کے لیے یہیں احرام کھولنا پڑے گا لہذا یہاں قصر کرو، احرام کھولیں اور واپس چلیں، صحابہ بھی تو عرب تھے، مکہ کے قریشی تھے، اپنے جذبات بھی تھے۔ جب ایسا معاملہ ہوا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دنگ رہ گئے اتنا لمبا سفر کیا ہے ہم حق پر ہونے کے باوجود اتنا نرم معاہدہ کرتے ہیں اور حلق اور قصر کر کے احرام کھول کر واپس چلے جائیں یہ مدینہ والوں کو کیا جواب دیں گے؟ واپسی کس منہ سے جائیں اور اتنے دینی جذبات تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اس میں تھوڑا سا تردد ہوا کہ میں ان کو اب کیسے سمجھاؤں کہ حلق کروالو، قصر کروالو، ان کے جذبات کو میں کیسے کنٹرول کروں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اسی کیفیت میں اپنے خیمے میں تشریف لائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر کچھ غم کے آثار باقی تھے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہیں انہوں نے پوچھا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا پریشانی ہے آج آپ کے چہرے پر غم کے آثار ہیں فرمایا ام سلمہ پریشانی یہ ہے کہ اس طرح میں ان کو کہوں تو احرام کھولیں گے؟ اگر احرام نہ کھولا تو ایمان کا مسئلہ ہے اگر کھولیں گے تو بہت مشکل ہے ان کے مزاج پر بہت شاق گزرے گا میں کیسے ان سے کہوں کہ احرام کھولو؟ ام سلمہ رضی

اللہ عنہا دیکھو عورت ہیں اور ایسا بہترین حل عرض کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک بھی کھل اٹھا انہوں نے کہا یا رسول اللہ آپ ان سے کچھ بھی نہ کہیں آپ خیمے سے باہر تشریف لے جائیں اور اپنا قصر کروالیں یہ جانثار ہیں خود ہی بال کاٹ دیں گے آپ کچھ بھی نہ فرمائیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم خیمے سے باہر نکلے جوں ہی قصر کروایا سب صحابہ شروع ہو گئے چلو بھائی حلق کرو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کروادیا ہے۔ دیکھو کیسا حل پیش فرمایا حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے جو خاتون اور عورت ہیں۔

### ابو حمزہ! تیرا قصور ہے یا میرا؟

ایک اور واقعہ سنیں ایک بہت معروف آدمی تھے، ان کا تاریخ میں تذکرہ ملتا ہے ابو حمزہ ان کی کنیت مشہور تھی نام مشہور نہیں تھا اس نے نکاح کیا دو، چار، پانچ، دس، سال گزرے تو بیٹا نہیں ہو رہا بیٹی پھر بیٹی پھر بیٹی، پھر بیٹی اب انہوں نے سوچا کہ اس عورت کو طلاق دے دوں اس کے ہاں تو بیٹا ہی نہیں ہوتا جیسا آج کل ہمارے ہاں رواج ہے عورت کے ہاں دو، چار، بیٹیاں ہو جائیں تو لوگ سمجھتے ہیں یہ عورت منحوس ہے۔ اس نے سوچا کہ میں اس کو طلاق دے دوں جب طلاق دینے کا ارادہ کیا تو رات کو اپنے گھر آنا چھوڑ دیا کسی اپنے دوست کے ہاں رہنے لگے بیوی ان کی سمجھ دار تھی اس کو بھی اندازہ ہوا کہ میرا شوہر شاید مجھے طلاق دینے کا ارادہ کر چکا ہے اور وجہ یہ ہے، بیوی سمجھ دار بھی تھی اور شاعرہ بھی تھی، اس نے کاغذ پر چند اشعار لکھ کر اپنے خاوند کو بھجوا دیے اس نے لکھا۔

مَا لِأَيِّ حِمْرَةٍ لَا يَأْتِينَا غَضَبَانِ أَنْ لَا نَلِدَ الْبَنِينَ  
ابو حمزہ کو کیا ہو گیا کہ ہمارے پاس نہیں آتے، وہ اس بات پر ناراض ہیں کہ ہم بیٹا نہیں جنتیں۔

تَاللّٰهِ مَا ذَلِكْ فِيْ اَيِّدَيْنَا فَتَحْنُ كَالْاَرْضِ لِوَارِعَيْنَا

خدا کی قسم! بیٹا جننا ہمارے اختیار میں نہیں ہے، میری مثال زمین کی طرح ہے اور تمہاری مثال کسان کی طرح ہے۔

وَإِنَّمَا تَأْخُذُ مَا أُعْطِينَا وَتُنْبِئُ مَا ذَرَعُوهُ فِينَا  
زمین میں وہی بیج ہوتا ہے جو بیج کسان ڈالتا ہے اور زمین وہی پودا لگاتی ہے جو کسان نے  
بیج ڈالا ہوتا ہے۔<sup>81</sup>

بتائیں! میرا قصور ہے یا آپ کا؟ ابو حمزہ نے معافی مانگی اور گھر آگئے۔

### درِ ابلق کسے کم دیدہ موجود:

ایران کا ایک بادشاہ تھا۔ دوران گفتگو اس کی زبان سے ایک جملہ نکلا جملہ کیا تھا ”درِ ابلق کسے کم دیدہ موجود“ کہ دنیا میں ایسا موتی کسی نے نہیں دیکھا جو سفید ہو اور اس میں سیاہی ملی ہو اب جملہ زبان سے نکلا شعراء سے کہا شعر پورا کرو شعراء زور لگا رہے ہیں شعر پورا نہیں ہو رہا۔ اس نے کہا بھی یہ شعر مکمل کرو۔ اب شاعروں سے اس کا جواب تلاش نہیں ہو رہا یہ شعر ایران سے چلتا چلتا ہندوستان میں پہنچا باتیں تو اڑتی ہیں۔ یہی اڑتی ہوئی بات ہندوستان میں پہنچی۔ ہندوستان میں ایک بادشاہ عالمگیر بہت نیک تھا اس کی بیٹی تھی زیب النساء اس نے نکاح بھی نہیں کیا ایسے ہی دنیا سے رخصت ہو گئی زیب النساء اس کی بیٹی تھی بہت بڑی فاضلہ، عالمہ اور شاعرہ تھی ایک دن آئینہ کے سامنے کھڑی تھی اور اپنی آنکھوں میں سرمہ ڈالا جوں ہی سرمہ ڈالا اس سے آنسو نکلا اب دیکھو سفید آنسو ہے اس میں سرمہ ملا ہو موتی بنا کہ نہیں؟ دیکھو یہ بھی شاعرہ تھی فوراً شعر مکمل کیا عالمگیر سے کہا بادشاہ کو شعر بھیج دیں۔ اس نے کہا:

در ابلق کسے کم دیدہ موجود مگر اشکِ بتانِ سرمہ آلود

دنیا میں اہل حق کسی نے نہیں دیکھا لیکن محبوب کی آنکھ کا آنسو جس میں سرمہ ملے اسے ”دُرِ اہل حق“ کہتے ہیں۔ شاعرہ تھیں تو شاعرانہ جواب دیا اب جب شعر وہاں پہنچا تو بادشاہ تڑپ اٹھا کہ ایسا بلا کا شاعر دنیا میں کون ہے؟ ایک تو شعر پورا کیا دوسرا اس ظالم نے مصرعہ کون سا بنایا؟ شاعر تو محبت کی باتوں پہ تڑپتے ہیں۔

اب بادشاہ نے پھر ہندوستان پیغام بھیجا کہ اس شاعر کو ہمارے دربار میں بھیجا جائے۔ عالمگیر کے پاس پیغام پہنچا، عالمگیر نے زیب النساء سے کہا بادشاہ بلا رہے ہیں اب کیا کرنا چاہیے؟ بہت نیک عورت تھی اس نے کہا میرا شعر لکھو اور بادشاہ کو بھیج دو اس نے پھر شعر لکھا، بڑا عجیب اس نے کلام کیا، ایسی بلا کی شاعرہ تھی۔ اس نے کہا:

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

میں اپنے کلام میں ایسے چھپی ہوں جیسے خوشبو پھول میں چھپی ہوتی ہے بندہ پھول کو دیکھ سکتا ہے، خوشبو کو نہیں دیکھ سکتا۔ تو میرا کلام سن سکتا ہے، مجھے دیکھ نہیں سکتا۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ شاعر نہیں، شاعرہ ہے۔ یہ مرد نہیں، عورت ہے۔ بتاؤ کیسی سمجھ دار عورت تھی۔

خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ نے مردوں کو عورتوں پر فوقیت عطا فرمائی ہے لیکن اتنا بھی نہ اکڑیں۔ بعض عورتیں بہت سمجھ دار ہوتی ہیں۔ اللہ آپ سب کو سمجھ دار بیویاں، سمجھ دار بیٹیاں، سمجھ دار بہنیں اور سمجھ دار گھر کا ماحول عطا فرمائے۔ گھر کا ماحول سمجھ دار ہو تو دین کا کام کرنا بہت آسان ہوتا ہے گھر کی عورتیں سمجھ دار ہوں تو کاروبار بھی بہت اچھا چلتا ہے سمجھ دار خواتین اللہ سب کو عطا فرمائے۔ (آمین)

**اگر بیوی بات نہ مانے تو کیا کریں؟**

﴿وَالَّذِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاصْرَبُوهُنَّ

فَإِنْ أَطَعْتُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا ۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا كَبِيرًا ﴿٣٣﴾

اسی آیت میں ایک چھوٹا سا مسئلہ تھا میں اختصار سے عرض کرتا ہوں۔ اگر کبھی خاوند اور بیوی میں کچھ ناچاقی ہو جائے اور خاوند سمجھے کہ بیوی میری بات نہیں مانتی تو قرآن نے تین درجے بتائے ہیں:

### پہلا درجہ:

جس عورت سے تمہیں نافرمانی کا اندیشہ ہو یعنی تمہاری بات نہیں مانتی تو اس کو پہلے دن مارنا شروع نہ کرو بلکہ ﴿فَعِظُوهُنَّ﴾ ان کو پیار سے سمجھاؤ ان کو محبت سے سمجھاؤ۔

میں تو چھوٹا ہوں اس لیے ایسی بات نہیں کہتا۔ مفتی اعظم پاکستان مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ کا بیان میں نے سامنے بیٹھ کر سنا ہے بالکل سامنے بیٹھ کر ہم بچپن میں سنتے تھے فرماتے ہیں کہ اپنی بیوی سے کہو کہ تو میری لیلیٰ ہے مجھے تجھ سے بہت محبت ہے، میں تجھے جہنم میں جاتا برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے تجھ سے بہت پیار ہے میں تجھے بگڑتا ہوا برداشت نہیں کر سکتا، یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ ایسے الفاظ اختیار کرو وہ سمجھے کہ میرے شوہر کو مجھ سے بہت پیار ہے پھر اس کو بات سمجھانی شروع کرو پھر دیکھو کیسے بات نہیں سمجھتی، ہم پہلے ہاتھ اٹھاتے ہیں پھر ڈنڈا تجھے شرم نہیں آتی؟ تجھے نہیں پتا تو کس کے نکاح میں ہے؟ تجھے پتا نہیں تو کس خاندان سے اٹھ کر آگئی ہے؟ اللہ اکبر! آدمی کو سوچنا چاہیے آپ یقین فرمائیں اتنا دکھ ہوتا ہے۔

### معاشرے میں خواتین کو عزت نہیں دی جاتی:

میں پاکستان سے باہر ایک ملک کے دورے پر تھا۔ ایک خاتون کو فون کیا۔ میں نے اس کا نام لے کر کہہ دیا کہ بیٹا... ہم آرہے ہیں ہمارے لیے فلاں کھانا تیار کرو!

وہ روپڑی میں نے کہا کیا ہوا؟

اس نے کہا: آپ نے میرا نام لیا میں روپڑی، اس لیے کہ آپ بڑے ہیں تو آپ نے نام لیا مجھے عرصہ گزر گیا ہے اس کے نکاح میں اس ظالم نے آج تک میرا نام نہیں لیا اس ظالم نے کبھی میرا نام لے کر محبت سے نہیں پکارا۔ میں میٹرک پڑھی ہوں، باپ میرا تھا نہیں، میں باپ کے بغیر تھی، میری ماں نے اس کے نکاح میں دیا تو کہتا ہے ہم اتنے بڑے لوگ تھے تو کوڑے کے ڈھیر پر پڑی تھی، تجھے اٹھا کر سینے سے لگایا ہے آج تو باتیں کرتی ہے؟ اس نے کہا بتاؤ دنیا میں میرا اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں یہ بھی کہتا ہے کہ کوڑے کے ڈھیر پر پڑی تھی بتاؤ میرا کیجہ پھٹتا ہے میں کہاں جاؤں؟

عورت کا تعلق تو خاوند کے ساتھ ہوتا ہے، خاوند بڑے خاندان کا ہے تو چھوٹی عورت بڑی بن جاتی ہے اگر خاوند چھوٹے خاندان کا ہو تو بڑی عورت چھوٹی بن جاتی ہے فرمایا: ﴿فَعِظُوهُنَّ﴾ ان کو پہلے سمجھاؤ!

### دوسرا درجہ:

اگر پھر بھی نہ سمجھے تو ﴿وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ﴾ بستر الگ کر دو، مکان الگ نہ کرو بلکہ بستر الگ کر دو۔ ہم ناراض ہوں تو گھر میں نہیں جاتے، نہیں صرف بستر الگ کرو۔

### تیسرا درجہ:

اگر پھر بھی نہ سمجھے تو ﴿وَاصْرِبُوهُنَّ﴾ پھر اس کو مارو۔

### مارنے کی حدود کیا ہیں؟

مارنے کا مطلب بھی سمجھ لو اس کے چہرے پر تھپڑ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، جوتے سے مارنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، سوٹی سے مارنا کہ اس کے جسم پر نشان پڑیں

کوئی گنجائش نہیں ہے ہلکا سا مارو، یہ ہے مارنے کا مطلب۔ کیونکہ بڑے خاندان کی سمجھ دار عورت ہو تو اس پر ہاتھ بھی اٹھانا اس کے مرجانے کے برابر ہوتا ہے تو جوتے مارنے سے تم اس کی ساری ہجک اتار دو گے پھر دوبارہ اس نے ٹھیک کیسے ہونا ہے؟

### ایک بچی کا المناک واقعہ:

اللہ کی قسم! اتنا دکھ ہوتا ہے ہمارے ہاں ایک بچی کا نکاح ہو ا والدہ کے ساتھ آئی روپڑی کہتی ہے میں کیا بتاؤں آپ کو؟ میرا نکاح ہوا، پردے کا اہتمام میں کرتی ہوں، نمازیں میں پڑھتی ہوں، گھر کے سارے کام کرتی ہوں، خدمت ساری کرتی ہوں۔ ملک سے باہر رہتا ہے پاکستان آیا کسی رشتہ دار کے ہاں گئے، وہیں مجھے جوتے سے مارنا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں جی باہر بہت تہذیب سکھاتے ہیں! ابھی چند دن گزرے وہ عورت حمل کے ساتھ ہے پھر اس کو طلاق بھی دے دی ہے۔ میں نے کہا بتا خالم اللہ تجھے بخشے گا؟ خدا تجھے معاف کرے گا؟ کتنا بڑا ظلم تو نے ایک عورت کے ساتھ کیا۔

خیر پہلے اس کو سمجھاؤ پھر بستر الگ کرو اگر پھر بھی نہیں سمجھتی تو اتنا مارو جس سے اس کو زخم نہ پڑے اس کا خیال کرو۔

### شرعی احکام میں تحریف یہودانہ روش ہے:

﴿مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِالْأَسْنَتِ هُمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ طَوْ  
لَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمًا ۚ  
لَكِن لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٨٠﴾﴾

اس میں اللہ رب العزت نے یہود کی ایک نشانی بیان فرمائی ہے میں اب ذرا بات کو سمیٹتا ہوں یہود کی علامت کیا ہے؟ وہ اپنے مقامات سے کلمے بدل دیتے ہیں

جس موقع پر کلمہ ہوتا ہے اس پر کہتے نہیں ہیں اور ایسے کلمات جس سے اشتباہ پڑ جائے وہ بولتے ہیں۔ زبان سے کہتے ہیں ﴿سَمِعْنَا﴾ اور دل میں کہتے ہیں ہم نہیں مانتے اور کہتے ہیں: ﴿وَأَسْمَعُ غَيْرَ مُسْمِعٍ﴾ اے نبی! تو سن ایسی بات جس کی بات مانی نہ جائے۔ اللہ فرماتے ہیں بہت ظلم کیا ہے اپنی زبانیں موڑ کر کچھ جملے کہتے ہیں اللہ فرماتا ہے یوں نہیں کہنا چاہیے ان کو صاف صاف ﴿سَمِعْنَا وَآمَنَّا﴾ کہنا چاہیے۔

### کفار اور فاسق لوگوں کی مشابہت سے بچیں:

اس سے آپ کو میں نے جو بات سمجھانی ہے وہ سمجھو ایسا جملہ کہنا جس سے اشتباہ پڑے اس سے بچنا بہت ضروری ہے ایسا لباس پہننا جس سے اشتباہ پڑے اس سے بچنا بہت ضروری ہے۔

### محرم کے دنوں میں کالا کپڑا:

مجھ سے ایک ساتھی نے مسئلہ پوچھا کہ مولانا صاحب محرم کے دنوں میں کالا لباس پہننا کیسا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ کالا لباس پہننا تو جائز ہے مگر محرم کے دنوں میں نہیں پہننا چاہیے۔ محرم کے دنوں میں کالے لباس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ شیعہ ہے اس لیے ایسا لباس نہ پہنو کہ لوگ تمہیں رافضی سمجھیں۔ بس اس کی احتیاط کرو اشتباہ سے بچنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

### اشتباہ سے بچنے کا حل قرآن کریم سے:

قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آنے والے جادوگر ایمان لائے تو انہوں نے کہا: ﴿أَمَّا بِرَبِّ الْعَلَمِينَ﴾ رَبِّ مُوسَى



وَهُؤُونَ ﴿۳۳﴾<sup>82</sup> کہ ہم اس رب العالمین پر ایمان لائے ہیں جو موسیٰ و ہارون کا رب ہے۔ انہوں نے صرف یہ نہیں کہا کہ ”ہم رب العالمین پر ایمان لائے“ بلکہ ساتھ ﴿رَبِّ مُوسَىٰ وَ هَارُونَ﴾ بھی کہا۔ اگر صرف ﴿اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کہتے تو فرعون سمجھتا کہ مجھ پر ایمان لائے ہیں کیونکہ رب العالمین تو میں ہی ہوں۔ انہوں نے اس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ ”رب العالمین“ سے مراد تو نہیں ہے بلکہ رب العالمین سے مراد موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا رب ہے، ہم اس پر ایمان لائے ہیں۔ اس سے ایک بات سمجھ میں آئی کہ مکانِ اشتباہ سے بچو۔

### عقیدہ حیات کے منکر پر شرعی حکم:

میں آج کے حوالے سے ایک اہم عقیدے پر بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں جو شخص نبی کو متعلق روح قبر اطہر میں زندہ نہیں مانتا:

❁ وہ اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج ہے۔

❁ ایسے بندے کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے۔

❁ اپنی نماز اس کو لوٹانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

### منکرین حیات کی دھوکہ بازی:

میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ آج کے دور میں جو لوگ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ نہیں مانتے وہ بھی کہتے ہیں کہ ہم تو زندہ مانتے ہیں۔ آپ لوگ غلط فہمی میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ہم مانتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں: نہیں مانتے۔ اب اشتباہ تو پڑ گیا جب اشتباہ پڑ گیا۔ تو اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اشتباہ میں مت پڑو، ایسا جملہ کہو جس سے اشتباہ

پڑے ہی نا۔

### منکرین حیات سے آسان سا سوال:

ان سے آپ فوراً پوچھیں کہ آپ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا والے جسد مبارک کو زندہ مانتے ہیں؟ جو روضہ اطہر میں قبر مبارک ہے اس قبر میں زندہ مانتے ہیں؟ کہتے ہیں ہم تو اعلیٰ حیات مانتے ہیں ہم نے کہا بتاؤ کہ اس جسم کو مانتے ہو یا نہیں مانتے؟ بالکل دو ٹوک بات کرو۔

### علیین کے نام پر دھوکہ:

کہتے ہیں ہم تو اعلیٰ حیات کو مانتے ہیں۔ اعلیٰ حیات کا مطلب کیا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی روح علیین میں ہے، ہم علیین میں تو زندہ مانتے ہیں ہم نے کہا کہ نبی پاک کی روح علیین میں ہے یا جسم علیین میں ہے؟ ارے جگہ وہ اعلیٰ ہے جہاں پیغمبر کا جسد اطہر موجود ہے علیین کیسے اعلیٰ ہو گئی؟ اعلیٰ تو وہ جگہ ہے جہاں پیغمبر کا جسد اطہر موجود ہے۔

### علیین والی حیات اعلیٰ کیسے ہے؟

دیوبند کا عقیدہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے کہ جس جگہ پیغمبر کا وجود اطہر موجود ہے قبر مبارک کی وہ مٹی جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم سے لگی ہے یہ کعبہ سے بھی اعلیٰ ہے، عرش سے بھی اعلیٰ ہے اور آپ کہتے ہیں علیین اعلیٰ ہے، وہ حیات اعلیٰ کیسے؟ حیات تو یہ اعلیٰ ہے جب شبہ پڑ جائے تو کیا کریں؟ حضور پاک کے دنیاوی جسم کی حیات کا تعلق روح کے ساتھ زمینی قبر میں زندہ مانتا ہے یا نہیں مانتا؟ پھر دیکھنا حیات مانتا ہے یا نہیں مانتا۔ اشتباہ کے موقع پر عقیدے کو صاف رکھنا بہت ضروری ہے۔

رحمت باری تعالیٰ سے مایوس نہیں ہونا چاہیے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَمَنْ

يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا﴾

اس آیت کا مفہوم تو آپ سمجھتے ہیں میں نے اس کے تحت ایک واقعہ عرض کرنا ہے جو ملا علی قاری نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے اور تفسیر خازن میں بھی موجود ہے۔ واقعہ بڑا سننے والا ہے۔ اللہ رب العزت جب کسی پر نظر کرم فرماتے ہیں تو اللہ اس کی ہدایت کے لیے دروازے کیسے کھولتے ہیں؟

**حضرت وحشی کے قبول اسلام کا واقعہ:**

وحشی؛ جو بعد میں وحشی رضی اللہ عنہ بنے۔ اس وقت واقعتاً وحشی تھے بعد میں حضرت وحشی رضی اللہ عنہ بنے۔ جنگ احد میں آئے ہندہ کے غلام تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی ہندہ جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئی تھیں، ان کے غلام تھے۔ ہندہ کے بھائی کو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے میدان بدر میں قتل کیا۔ تو ہندہ نے کہا اگر تم حضرت حمزہ کو قتل کر دو میں تمہیں آزاد کر دوں گی۔ وحشی چھوٹا نیزہ چلانے کا ماہر تھا آزادی کے لالچ میں آکر وحشی نے چھپ کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو نیزہ مارا حضرت حمزہ کے پیٹ میں لگا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ ہندہ نے اس کو آزاد کر دیا۔ اب بتاؤ! کتنا بڑا جرم ہے؟

**قبول اسلام کی پہلی دعوت:**

لیکن جب اللہ کی رحمت متوجہ ہو تو کیسے متوجہ ہوتی ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ عرصے بعد فرمایا کہ جاؤ جا کے وحشی کو اسلام کی دعوت دو۔ صحابی گئے کہا کلمہ پڑھ لو بولے میں کلمہ کیسے پڑھ لوں کوئی بندہ زنا کرے، چوری کرے تو قرآن

کہتا ہے ﴿يَلْقَىٰ أَثَمًا ۖ﴾<sup>83</sup> یہ بہت بڑا گناہ ہے اس کو کئی گنا عذاب ملیں گے جو بندہ چوری کرے، زنا کرے وہ تو جہنمی ہے میں نے تو سارے گناہ کیے ہیں میں نے کلمہ پڑھ بھی لیا میں تو جہنمی ہوں جہنم میں جلوں گا کیسے کلمہ پڑھوں؟

### قبول اسلام کی دوسری دعوت:

اب یہ صحابی واپس آئے یا رسول اللہ! آپ نے ہمیں اپنا سفیر بنا کر بھیجا ہم نے دعوت دی اس نے اشکال کر دیا ہے قرآن کریم کی آیت اتر آئی: ﴿إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۖ﴾<sup>84</sup> جو بندہ ایمان لایا نیک عمل کیا اور توبہ کی خدا اس کے سارے گناہ معاف کریں گے بلکہ گناہ کی جگہ پر بھی نیکیاں لکھ دیں گے وحشی کے پاس پیغام بھیجا وحشی کہنے لگا یہ تو فرمایا جس نے توبہ کی جس نے نیک عمل کیا، "هَذَا شَرْطٌ شَدِيدٌ" کہ یہ تو بڑی سخت شرط ہے ہو سکتا ہے مجھ سے توبہ نہ ہو تو پھر میں کلمہ کیوں پڑھوں؟

### قبول اسلام کی تیسری دعوت:

یہ سفیر پھر واپس آیا، حضور! وحشی نے پھر اشکال کر دیا ہے پھر قرآن کریم کی آیت اتری: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَاءُ﴾<sup>85</sup> اللہ شرک کو معاف نہیں کرتے باقی جو گناہ وہ چاہے معاف کر دیتے ہیں وحشی سے کہا اب تو آ جاؤ وحشی نے پھر اشکال کر دیا کہ اللہ چاہے تو معاف کرتے ہیں پتا

83۔ الفرقان 25:68

84۔ الفرقان 25:70

85۔ النساء 4:48

نہیں میری معافی چاہتے ہیں یا نہیں۔ میں کیسے کلمہ پڑھوں؟

### قبول اسلام کی چوتھی دعوت:

پھر واپس آئے صحابی کہ حضور وحشی نے یہ اعتراض کیا ہے پھر قرآن کی آیت اتری: ﴿قُلْ يٰعِبَادِىَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ط﴾<sup>86</sup> خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو خدا سارے گناہ معاف کر دے گا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ وحشی کو بتاؤ وحشی کہتا ہے اب ٹھیک ہے اب مجھے کلمہ پڑھا دو اور مسلمان ہو گئے۔<sup>87</sup> دیکھو اللہ کی رحمت جب متوجہ ہوتی ہے تو کیسے بندے کو کھینچ لیتی ہے۔

### مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کا قتل:

حضرت وحشی خود کہتے ہیں کہ میں نے اتنا بڑا جرم کیا تھا کہ میرا جی چاہتا تھا کفارے میں نیکی بھی کوئی بہت بڑی کروں جتنا بڑا مسلمان قتل کیا ہے دل چاہتا ہے اتنا بڑا کافر بھی قتل کروں۔ مسیلمہ کذاب نے دعوی نبوت کیا حضرت وحشی نے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا حضرت وحشی فرمایا کرتے تھے: "قَتَلْتُ خَيْرَ النَّاسِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَشَرَّ النَّاسِ فِي الْاِسْلَامِ"<sup>88</sup> کہ میں نے جس طرح زمانہ جاہلیت میں بڑا اچھا آدمی مارا تھا تو میں نے زمانہ اسلام میں سب سے گندہ آدمی قتل کیا۔ میرا دل بڑا خوش ہے کہ میں نے جتنا بڑا جرم کیا نیکی بھی اتنی بڑی کی ہے۔ تو خیر میں بتا رہا تھا کہ اللہ کی رحمت متوجہ ہو تو اللہ یوں ہی معاملہ آسان فرما دیتے ہیں۔

86- الزمر 53:39

87- مرقاة المفاتیح: ج 5 ص 267

88- اسد الغابۃ لابن اثیر: ج 4 ص 476 ترجمۃ وحشی بن حرب

## بیت اللہ کی تولیت:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ  
النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا  
بَصِيرًا﴾

میں صرف اس آیت کا چھوٹا سا پس منظر بتانا چاہتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں تھے۔ بیت اللہ میں گئے۔ مکہ مکرمہ میں جو اس وقت بیت اللہ کا متولی تھا وہ عثمان بن طلحہ تھے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اندر جانے لگے تو اس نے کہا: میں نہیں جانے دیتا۔ اس نے ترش روئی سے کام لیا، سخت الفاظ کہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عثمان بن طلحہ! اس وقت کا انتظار کرو جس دن بیت اللہ کی چابی میرے پاس ہوگی۔ اللہ اکبر!۔ اور بیت اللہ میں وہی داخل ہوگا جس کو میں چاہوں گا۔ عثمان بن طلحہ کہتے ہیں: مجھے بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیسی بات کرتے ہیں؟ عثمان بن طلحہ نے کہا کہ پھر وہ وقت تو قریش کے لیے بہت بدتر ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، وہ وقت قریش کے لیے سب سے زیادہ عزت کا ہوگا۔

## حضور علیہ السلام کے اخلاق حسنہ کا اثر:

جب مکہ فتح ہوا تو اس وقت نبی پاک مکہ مکرمہ میں گئے بیت اللہ میں داخل ہونے لگے داخل ہوئے اور باہر نکلے، فرمایا: عثمان لاؤ چابی دو! عثمان نے ایک جملہ کہا میں بطور امانت آپ کو دیتا ہوں، حالانکہ امانت کیسی؟ متولی تو نبی ہے والی ہے وہ جسے چاہے چابی دے دے مگر اس نے کہا جی میں بطور امانت آپ کو چابی دیتا ہوں۔

حضور نے چابی لے لی اور فرمایا: عثمان وہ وقت یاد آگیا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ اس وقت کا انتظار کرو جب چابی میرے پاس ہوگی؟ میں چاہوں گا تو کوئی بیت اللہ

میں داخل ہوگا اس نے کہا حضور مجھے اچھی طرح یاد آگئی۔ اللہ کے نبی نے فرمایا: یہ لو میں تجھے چابی واپس دیتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ قیامت تک یہ چابی تمہارے خاندان میں ہی رہے گی۔ عثمان بن طلحہ نے کلمہ پڑھ لیا: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ.<sup>89</sup> اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ سے باہر تشریف لائے تو زبان پر یہ آیت جاری تھی: ﴿لَإِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ امانت والے کو امانت واپس لوٹادو۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگرچہ امانت تھی نہیں لیکن اس نے زبان سے امانت کہہ دیا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان کی بھی رعایت فرمائی اور فرمایا: تم نے امانت کہا تھا، لو ہم تمہیں واپس دیتے ہیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی رعایت فرمائی۔

**فقہاء کی بات ماننا بھی ضروری ہے:**

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ ﴿٥٩﴾

اس آیت کو دیکھ کر بعض لوگ کہتے ہیں ہم قرآن بھی مانتے ہیں حدیث بھی مانتے ہیں، فقہ کہاں سے آئی؟ اللہ بھی مانتے ہیں رسول بھی مانتے ہیں فقہاء کہاں سے آئے؟ اس آیت کے تحت مفسرین نے لکھا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ”أُولِي الْأَمْرِ“ سے مراد فقہاء ہیں۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟

- ★ اللہ کی بات بھی مانو!
- ★ پیغمبر کی بات بھی مانو!
- ★ اور فقہاء کی بات بھی مانو!
- ★ اللہ کی بات کو ”قرآن“ کہتے ہیں۔
- ★ پیغمبر کی بات کو ”حدیث“ کہتے ہیں۔
- ★ فقہاء کی بات کو ”فقہ“ کہتے ہیں۔
- ★ تو ”قرآن“ کا تذکرہ بھی قرآن میں۔
- ★ ”حدیث“ کا تذکرہ بھی قرآن میں۔
- ★ ”فقہ“ کا تذکرہ بھی قرآن میں ہے۔
- ★ ہم قرآن بھی مانتے ہیں۔
- ★ حدیث بھی مانتے ہیں۔
- ★ فقہ بھی مانتے ہیں۔
- ★ اللہ کو بھی مانتے ہیں۔
- ★ اللہ کے رسول کو بھی مانتے ہیں۔
- ★ فقہاء کو بھی مانتے ہیں۔

### انقلاب کے دلفریب نعرے:

آج بڑے بڑے سائن بورڈوں پر ایک جملہ لکھا ہوا ہے اس کو بڑی اچھی طرح تنقیدی نگاہ سے دیکھنا! آپ سائن بورڈ دیکھتے ہیں یا اس کے پاس سے گزر جاتے ہیں؟ تو نئے نئے سائن بورڈوں پر ایک جملہ لکھا جا رہا ہے ”انقلاب کے تین نشان۔ اللہ، محمد اور قرآن۔“ نہیں پڑھا؟ آپ ذرا بڑے بڑے بورڈ دیکھیں! وہ ایسی جماعت ہے جو سیاسی بھی ہے اور مذہبی بھی ہے۔ اب تو آپ کو سمجھ جانا چاہیے ایسی جماعت جو مذہبی



ہے اور اپنی سیاست؛ مذہب کے نام پر کرتی ہے۔ آپ دیکھیں! لکھا ہوا ہے؛ انقلاب کے تین نشان؛ اللہ، محمد اور قرآن۔

### حدیث اور فقہ کہاں چلی گئیں؟:

بتاؤ! حدیث گئی یا نہیں؟ سمجھو! قرآن کا نام لیا، حدیث کا نام نہیں لیا۔ آپ کہتے ہیں کہ جب محمد آگئے تو حدیث بھی آگئی۔ میں کہتا ہوں جب اللہ آگیا تو قرآن بھی آگیا پھر قرآن کا نام لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ، محمد اور قرآن۔ اس میں حدیث کا تذکرہ بھی ختم، فقہاء کا تذکرہ بھی ختم اور فقہ کا تذکرہ بھی ختم بتاؤ یہ کون سا انقلاب ہے؟ جس میں نہ پیغمبر کی حدیث ہو اور نہ پیغمبر کے وارث فقہاء ہوں۔ بتاؤ! یہ کون سا انقلاب ہو سکتا ہے؟

### استشفاع کا عقیدہ:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا﴾

اس آیت میں اللہ پاک نے یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنی جان پر ظلم کرے یعنی اگر کسی شخص سے گناہ ہو جائے تو بخشش کا طریقہ یہ ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے خود بھی گناہوں کی معافی مانگے اور حضور سے گزارش کرے کہ آپ اللہ سے فرمائیں کہ اللہ میرے گناہ معاف کر دے۔ پیغمبر اس کے لیے معافی مانگیں گے خدا اسے معاف کر دیں گے۔

### استشفاع کا حکم آج بھی باقی ہے:

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے، آپ گھر جا کر

معارف القرآن اٹھا کر دیکھو! اگر تم دیوبندی ہو تو گھر جا کر دیکھو۔ مفتی اعظم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: جس طرح یہ حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیاوی زندگی میں تھا اسی طرح یہ حکم آج بھی موجود ہے، آج بھی نبی کی قبر پر جاؤ اور وہاں جا کر کہو: اللہ! میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں اور حضور سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ بھی میرے گناہوں کی معافی مانگیں! نبی گناہوں کی معافی مانگیں گے خدا تمہارے گناہوں کو معاف کر دیں گے۔ یہ حکم آج بھی موجود ہے اور اس پر مفتی اعظم پاکستان نے واقعات بھی بیان فرمائے ہیں۔

ایک واقعہ تفسیر ابن کثیر میں ہے۔ ایک واقعہ الجامع لاحکام القرآن میں امام قرطبی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے اور یہ دونوں شافعی عالم ہیں۔ کوئی حنفی بھی نہیں ہیں۔

### استشفاع کا پہلا واقعہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تین بعد ایک اعرابی آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر پر یہ آیت پڑھی اور اسی طرح حضور سے گزارش کی۔ میں خدا سے معافی مانگتا ہوں حضور آپ بھی سفارش کریں فرماتے ہیں نبی پاک کی قبر سے آواز آئی خدا نے تیرے گناہ معاف کر دیے ہیں۔<sup>90</sup>

### استشفاع کا دوسرا واقعہ:

دوسرا واقعہ کیا ہے؟ آج بھی آپ روضہ رسول پر جائیں، اشعار درج ہیں، محمد بن عبید اللہ عتبی عاشق پیغمبر تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دیہاتی حضور پاک کے روضے پر آئے پہلے سلام پیش کیا پھر یہ آیت پڑھی اے اللہ کے پیغمبر! میں آپ کے پاس آیا ہوں خود بھی گناہوں کی معافی مانگتا ہوں اور آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ

آپ بھی اللہ سے سفارش کریں کہ وہ میرے گناہ معاف فرمادے! یہ کہا اور واپس جانے لگے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے پر یہ شعر پڑھے:

يَا حَيُّ مَنْ دُفِنْتُ بِالْقَاعِ أَعْظَمُهُ  
فَقَاتِبَ مِنْ طَيِّبِينَ الْقَاعِ وَالْأَكْمَرُ  
نَفْسِي الْفِدَاءُ لِقَبْرِ أَنْتَ سَاكِنُهُ  
فِيهِ الْعَفَافُ وَفِيهِ الْجُودُ وَالْكَرَمُ<sup>91</sup>

آج بھی یہ اشعار روضہ اقدس پر درج ہیں اس نے کہا حضور دنیا میں جتنے بھی لوگ مدفون ہیں سب سے بہتر آپ کی جگہ ہے اس روضے کی برکت سے کائنات منور ہوتی ہے اس نے جملہ کیا کہا ہے؟ ”أَنْتَ سَاكِنُهُ“ مجھے آپ بتاؤ ”ساکن“ کس کو کہتے ہیں زندہ کو یا مردہ کو؟ بتاؤ ساکن کس کو کہتے ہیں؟ مسکن کہتے ہیں مکان کو ساکن رہنے والے کو، سکنی رہنے کی جگہ کو۔ جب نکاح ہوتا ہے تو شوہر کے ذمے دو چیزیں ہیں نان و نفقہ اور سکنی نان و نفقہ کا معنی ہے کھانا پینا اور کپڑے اور سکنی کا معنی ہے اس کو مارنے کی جگہ یا اس کو زندہ رکھنے کی جگہ (سامعین، زندہ رکھنے کی جگہ) تو ساکن کا معنی کیا ہے؟ رہنے کی جگہ۔

اب یہ شاعر کیا کہتے ہیں ”نَفْسِي الْفِدَاءُ“ حضور میری جان فدا ہو اس قبر پر جس میں آپ ساکن ہیں میری جان اس قبر پر فدا ہو جائے، اس میں عفت بھی ہے اس میں جود بھی ہے اس میں سخاوت بھی ہے، یہ جملہ کہے۔

**عقیدہ حیات النبی کو شرک کہنے والوں سے ایک سوال:**

اگر عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم شرک ہے تو حضور کے روضے

پر کیوں لکھا ہوا ہے؟ ادھر آپ کہتے ہیں نبی پاک نے دعا مانگی:

"اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُّعْبَدُ"۔<sup>92</sup>

اللہ میری قبر پر کبھی شرک نہ ہو۔

حضور نے دعا کی ہے، خدا نے قبول فرمائی ہے۔

یہ عقیدہ شرک ہے تو نبی پاک کے روضے پر کیوں لکھا ہوا ہے؟ میری بات سمجھ آئی؟ ادھر آپ کہتے ہیں کہ حضور کی دعا قبول ہو گئی قبر پر کبھی شرک نہیں ہو سکتا تو پھر یہ عقیدہ شرک کیسے ہے؟

اس نے کیا کہا ”نَفْسِی الْفِدَاءُ“ میری جان بھی قربان ہو اس قبر پر جس میں حضور آپ تشریف فرما ہیں خیر یہ چلے گئے محمد بن عبید اللہ عتبی فرماتے ہیں: میں سو گیا، میں نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا حضور آئے فرمایا جاؤ اس دیہاتی بندے کو ملو، اس کو بتاؤ خدا نے اس کے گناہ معاف کر دیے ہیں۔ آج بھی جاؤ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر یوں کرو، اس مسئلے کا نام ہے ”استشفاع“ اس کا مطلب ہے شفاعت کی درخواست کرنا یہ اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے۔

**جنوبت کا فیصلہ نہ مانے.....؟:**

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (١٦)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی بات ہے۔ ایک یہودی اور ایک منافق کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا یہودی کے حق میں۔ یہ دونوں واپس آگئے تو اب منافق کا

خیال یہ تھا کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے ہیں حضرت عمر یہودیوں کے سخت دشمن ہیں تو یہ فیصلہ میرے حق میں کریں گے اور یہودی کی مخالفت کریں گے۔ منافق کسے کہتے ہیں؟ اوپر سے مسلمان اندر سے کافر یہ اوپر سے مسلمان تھا یہ گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اور منافق کہنے لگا ہمارا فیصلہ کرو یہودی کہنے لگا عمر! یہودی کو پتا تھا کہ عمر ہمارے دشمن ہیں لیکن فیصلہ غلط نہیں کر سکتے اس نے کہا اے عمر! ہمارا فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بات سماعت فرمائیں ہم دونوں پہلے حضور پاک کے پاس جا چکے ہیں، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ میرے حق میں کر چکے ہیں، اب آپ کی مرضی ہے، اب آپ جیسا چاہو فیصلہ کرو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر کیس کی سماعت کیا فرمانی تھی، فرمایا: تم تھوڑی دیر ٹھہرو، میں گھر سے ہو کر آتا ہوں۔ حضرت عمر گھر گئے اور گھر سے تلوار اٹھا کر لائے اور آکر منافق کی گردن کو کاٹ کر رکھ دیا، اور فرمایا جو نبی کے فیصلے کو نہیں مانتا اس کا فیصلہ عمر کی تلوار کرتی ہے منافق سارے اکٹھے ہو گئے کہ عمر نے زیادتی کی ہے کیس سنا نہیں ہے قتل کا فیصلہ بتا نہیں تھا حضرت عمر کے پاس تو کوئی گواہ نہیں ہے اس نے بات غلط کی ہے یا ٹھیک کی ہے کوئی گواہ نہیں تھا تو قرآن اترا۔

قرآن نے فرمایا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ میرے

پیغمبر! یہ منافق ہے مومن وہ ہوتا ہے جو آپ کے فیصلے مان لے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ نہ مانے وہ تو کافر ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کسی مسلمان کو نہیں مارا منافق کو مارا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں قرآن اترا ہے اٹھارہ آیتیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔ ایک نہیں، دو نہیں، اٹھارہ مواقع پر قرآن بولا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں۔

## صراطِ مستقیم کی چار علامات:

﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾

اس آیت کا خلاصہ کیا ہے اس آیت میں اللہ نے صراطِ مستقیم کی چار علامات بیان فرمائی ہیں: نمبر 1- نبیین 2- صدیقین 3- شہداء 4- صالحین۔

❖ انبیاء کا راستہ

❖ صحابہ کا راستہ

❖ شہداء کا راستہ

❖ اولیاء کا راستہ۔

توجہ رکھنا! یہ صراطِ مستقیم کی علامات ہیں۔

☀ مرزائی اور قادیانی... وہ نبیین سے نکل گئے کیونکہ وہ انبیاء کو نہیں مانتے، مرزا غلام احمد قادیانی کو مانتے ہیں۔

☀ صدیقین سے وہ وہ نکل گئے جو صحابہ کو نہیں مانتے۔

☀ شہداء سے اہل بدعت نکل گئے کہ ان کے پلڑے میں کوئی شہید نظر ہی نہیں آتا۔

☀ صالحین سے وہ شخص نکل گئے جو اولیاء کو نہیں مانتے۔

☀ دیوبند والے انبیاء کو بھی مانتے ہیں۔

☀ صحابہ کو بھی مانتے ہیں۔

☀ شہداء کو بھی مانتے ہیں۔

☆ اولیاء کو بھی مانتے ہیں۔

اس لیے ہمیں کوئی الجھن نہیں ہے کیونکہ ہم صراطِ مستقیم پر ہیں، اللہ ہمیں مرتے دم تک صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### اجماعِ حجت شرعیہ ہے:

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ

سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝۱۱۶﴾

توجہ رکھنا! یہ مسئلہ بڑا سمجھنے کا ہے حضرت محمد بن ادريس الشافعی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کہتے ہیں اجماعِ حجت شرعیہ ہے اس کی دلیل کیا ہے کہ اجماعِ حجت ہے؟

### اجماع اور اس کے حجت ہونے کی دلیل:

اجماع سے مراد کیا ہے؟ جس مسئلے پر سارے فقہاء جمع ہو جائیں اس مسئلے کا نام اجماع ہے۔ اجماع کے حجت ہونے کی دلیل کیا ہے امام شافعی رحمہ اللہ نے تین دن تک مسلسل قرآن کی تلاوت کی۔ دن کو قرآن کی تلاوت، رات کو قرآن کی تلاوت۔ ہر وقت تلاوت ہی تلاوت چھ دفعہ مکمل قرآن پڑھا اور پھر فرمایا کہ یہ آیت اجماع کے حجت ہونے پر دلیل ہے۔<sup>93</sup>

### اجماع کے منکر کی دوسرائیں:

اللہ نے فرمایا کہ جو شخص پیغمبر اور مسلمانوں کے راستے کو چھوڑ دے ہم ان کو دوسرائیں دیتے ہیں؛ ایک: دنیا میں ہدایت نہیں دیتے اور دوسرا: آخرت میں اس کو

جنت نہیں دیتے۔ اجماع امت دلیل شرعی ہے اور جو بندہ اجماع کا انکار کرے تو اس سے دلیلیں نہ پوچھا کریں۔

### اجماع کا سب سے پہلا منکر:

سمجھیں بات کو اس کو دلیل نہ دیا کریں اس کو نکال دیا کریں۔ دفع ہو جا! ہم سے دلیلیں پوچھتا ہے۔ میں اس پر ایک واقعہ سناتا ہوں۔ آدم علیہ السلام کے بارے میں اللہ نے فرمایا: ﴿فَقْعُوا لَهُ سَجْدِينَ﴾ ﴿٤٢﴾ میرے آدم کو سجدہ کرو! ﴿فَسَجَدَ اٰمَلَيْكَ كُلُّهُمْ اَجْمَعُونَ﴾ ﴿٤٣﴾ تمام ملائکہ نے سجدہ کیا، ﴿اَلَا اِبْلِيسَ﴾ مگر ابلیس نہیں کیا۔ کس نے نہیں کیا؟ (ابلیس نے) تمام فرشتوں نے تو سجدہ کیا صرف ابلیس نے نہیں کیا۔ اب بتاؤ! اس کائنات میں سب سے پہلے اجماع کا انکار کس نے کیا؟ (ابلیس نے، سامعین) پھر اللہ پاک نے جملے ارشاد فرمائے: ﴿اَسْتَكْبَرُ﴾ ابلیس نے تکبر کیا، ﴿وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ ﴿٤٤﴾ اور یہ کافر ہو گیا۔<sup>94</sup>

### منکر اجماع کی ”دلیل“:

پھر اللہ پاک نے پوچھا: ﴿يَا اِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيدَيَّ﴾ اے ابلیس! تو نے میرے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ اس نے دلیل یہ دی: ﴿اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ﴾ ﴿٤٥﴾ اللہ! میں تو اس سے بہتر ہوں، مجھے آگ سے بنایا، اسے مٹی سے بنایا۔ دیکھو! مٹی کو اوپر سے پھینکو نیچے آتی ہے آگ کو نیچے ڈالو پھر بھی اوپر جاتی ہے، آگ مٹی سے افضل ہوتی ہے۔ افضل



کیسے مفضول کو سجدہ کرے؟ یہ منکر اجماع کی دلیل تھی۔

### منکر اجماع سے کیا کہنا چاہیے؟:

چونکہ اہلبیس نے اجماع کا انکار کیا تھا اس لیے خدا نے اجماع کے منکر کو دلیل کا جواب نہیں دیا بلکہ فرمایا: ﴿فَاخْرُجْ﴾ نکل جا، دفع ہو جا! سمجھ گئے؟ اور آپ دلیل دینے میں لگے رہتے ہیں۔ اب خوب سمجھ لو کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی اپنی قبروں میں حیات پر امت کا اجماع ہے اور اجماع امت کے منکر کو دلیل نہیں دیتے بلکہ ”اُخْرُجْ“ کہہ کر اپنی صفوں میں سے نکال دیتے ہیں۔ او بھئی تو ہمارا نہیں ہے، نکل جا! یہاں سے۔

اوجی! ہمارے پاس قرآن ہے۔ کیا فقہاء کے پاس قرآن نہیں تھا؟ انہوں نے قرآن کے خلاف اجماع کر لیا؟ مجھے سمجھ نہیں آتی کیسی بے عقلی کی بات کرتے ہیں پھر آپ کہتے ہیں جی وہ دلیل؟ میں کہتا ہوں اجماع امت کے خلاف دلیل نہیں سنتے، ”اُخْرُجْ“ کہہ کر صفوں سے نکال دیتے ہیں۔ ان کی صفیں الگ ہیں ہماری صفیں الگ ہیں۔ اللہ ہمیں الگ الگ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### اختیاری اور اضطراری علیحدگی:

سرگودھا کے دوستو! میری بات پہ ناراض نہ ہونا میں نے بات کھل کے تمہیں سمجھا دی ہے، میں قیامت کے دن خدا کا مجرم نہیں ہوں۔ اس دن اعلان ہو گا: ﴿وَأَمَّا زُورُ الْيَوْمِ أَتْيَٰهَا الْمُجْرِمُونَ﴾<sup>96</sup> مجرم لوگ الگ الگ ہو جائیں۔ وہاں الگ ہوں گے لیکن اضطراراً الگ ہوں گے، یہاں الگ کرو اختیاراً کرو اضطراراً

الگ کرنے پر نیکی نہیں ملتی۔ جب وہاں الگ ہونا ہی ہے تو یہیں سے الگ ہو جاؤ۔ اللہ ہمیں نبی کا عاشق بنائے (آمین) اللہ ہم سب کو نبی کا غلام بنائے (آمین)

**عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی ناکام یہودی سازش:**

﴿وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾<sup>97</sup>

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ پاک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی براءت بیان فرمائی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی براءت اس طرح ہے کہ یہودی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے گئے۔ آگے کئی روایات ہیں۔ ایک روایت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ نے امام ضحاک رحمہ اللہ کے حوالے سے یہ نقل فرمائی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے حواریں کے ساتھ موجود تھے اور ابلیس نے یہودیوں کو جاکر بتایا کہ عیسیٰ علیہ السلام فلاں کمرے میں چھپے ہیں، جاؤ اور انہیں گرفتار کر کے قتل کرو۔

یہودی جمع ہو کے آگئے باہر یہودی ہیں اندر عیسیٰ علیہ السلام اپنے حواریوں کے ساتھ۔ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہودی آگئے ہیں، تم میں سے کوئی ایسا بندہ ہے جو اپنی جان قربان کر دے؟ تو وہ کل قیامت کے بعد جنت میں میرے ساتھ ہو گا۔ ایک حواری نے کہا: جی! میں تیار ہوں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اس کو اپنی مبارک پگڑی دی اور اپنی مبارک قمیص دی۔ انہوں نے پگڑی بھی سر پہ رکھ لی اور قمیص بھی پہن لی۔ اللہ نے شکل بھی عیسیٰ علیہ السلام جیسی بنادی۔

تو جب یہ باہر نکلے تو یہودیوں نے سمجھا کہ یہی عیسیٰ ہیں۔ اسی کو قرآن نے بیان کیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام سولی پہ نہیں چڑھے بلکہ ان کا جو شبیہ تھا اس کو انہوں

نے سولی پہ چڑھایا۔ وہ قتل ہو گیا اور عیسیٰ علیہ السلام بچ گئے۔

### طیطانوس کون تھا؟

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ایک آدمی تھا اس کا نام طیطانوس تھا۔ وہ یہودی تھا، جب اس کو یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے اندر بھیجا تو اس کی شکل کو اللہ نے تبدیل کر دیا۔ جب باہر نکلا تو یہود نے پوچھا جی کیا بنا؟ کہتا ہے اندر عیسیٰ نہیں ہے۔ یہودی کہنے لگے: واہ جی! خود ہی عیسیٰ ہے اور کہتا ہے کہ وہ نہیں ہے۔ اس کو پکڑا اور سولی پہ چڑھادیا۔

بہر حال جو بھی روایت ہو قرآن کا فیصلہ ہے: ﴿وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَكَانَ شُبُهًا لَهُمْ﴾ کہ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ بنادی تھی یہود ان کو نہ قتل کر سکے اور نہ صلیب پر چڑھا سکے۔ اللہ نے ان کو آسمان پہ اٹھالیا۔ دوبارہ آسمان سے عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور سارے یہود و نصاریٰ بھی ان پر ایمان لائیں گے اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک وقت آئے گا کہ دنیا میں کوئی ایک بھی کافر نہیں ہوگا۔

بہر حال ان میں سے جو بھی صورت پیش آئی ہو سب کی گنجائش ہے۔ قرآن کریم نے کسی خاص صورت کو متعین نہیں فرمایا۔ بس اتنا مذکور ہے کہ یہود کو اشتباہ ہو گیا تھا۔

### قرب قیامت اور نزول عیسیٰ علیہ السلام:

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور دوسرے آسمان پر موجود ہیں۔ قرب قیامت دنیا میں پھر تشریف لائیں گے اور دوبارہ حضور علیہ السلام کا امتی ہونے کی حیثیت سے امت کو حضور کا پیغام دیں گے۔ بہر حال ہمارا عقیدہ ہے کہ

آسمان پہ زندہ ہیں اگر ہماری زندگی میں آئے تو اللہ ہمیں ان کا ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

### عیسائی پادری اور مسلمان عالم کا مکالمہ:

میں اس پر ایک نکتہ بیان کر کے بات ختم کرتا ہوں۔ ایک عیسائی عالم نے ایک مسلمان عالم سے پوچھا کہ بھائی بتاؤ دو بندے ہیں ایک بندہ سو رہا ہے اور ایک بندہ جاگ رہا ہے تو تم راستہ کس سے پوچھو گے؟ مسلمان عالم نے بڑا پیارا جواب دیا کہ جو جاگ رہا ہے اگر وہ بھی اس انتظار میں ہو کہ سونے والا اٹھے گا تو میں اس سے راستہ پوچھوں گا تو بتاؤ کہ اب ہم کس سے راستہ پوچھیں گے؟ اس نے کہا جی اسی سونے والے سے۔ فرمایا پھر انتظار کرو اسی سونے والے سے ہی راستہ پوچھیں گے۔ اللہ پاک ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت نصیب فرمائے۔ (آمین)

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة المائدة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ  
الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرْمٌ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ مَا  
يُرِيدُ﴾

ہمارے آج کے درس قرآن کا عنوان ہے ”مضامین سورة المائدة“۔

### حضرت مسیح علیہ السلام کی دعا:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دسترخوان کا ذکر ہے جب انہوں نے اللہ رب  
العزت سے دعا مانگی تھی:

﴿اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا  
لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِنْكَ﴾<sup>98</sup>

”اے اللہ! ہمیں ایسا آسمانی دسترخوان عطا فرما جو میری امت کے لیے نشانی  
بنے اور آئندہ آنے والی انسانیت کے لیے بھی نشانی بنے۔“

## وجہ تسمیہ سورۃ:

اللہ تعالیٰ نے ان کو دسترخوان عطا فرمایا۔ چونکہ عربی میں دسترخوان کے لیے ”مائدة“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس سورۃ میں بھی ”مائدة“ کا تذکرہ ہے اس لیے اس پوری سورۃ کا نام بھی ”سورۃ المائدة“ ہے۔ اسے تفسیر کی زبان میں کہتے ہیں ”وجہ تسمیہ سورۃ“ کہ سورۃ کا یہ نام رکھنے کی وجہ کیا ہے؟

## عوام الناس کا مزاج:

ہمارے لوگوں کا ایک مزاج ہے، بہت سے لوگ کاروبار اور بزنس کرتے ہیں اور اس میں جائز اور ناجائز کا خیال بھی نہیں کرتے لیکن ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ نام اس کو شریعت والادیں یہ بڑے تعجب کی بات ہے۔ مثلاً:

ہوٹل بنائیں گے اور اس میں جائز اور ناجائز کا خیال بھی نہیں ہو گا لیکن کوشش ہو گی کہ نام اس کا ”المائدة“ رکھیں۔ کہاں ”المائدة“ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو خدا سے مانگا اور آسمان سے اترا۔ اور آپ ہوٹل میں جائز اور ناجائز کا خیال بھی نہ رکھیں اور پھر بھی اپنے ہوٹل کا نام ”المائدة“ رکھیں یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

## دین برائے دنیا:

ہمارے ایک قریبی دوست ہیں جو مجھ سے بیعت بھی ہیں، ان کے بعض دوست کراچی میں ہیں اور بعض ریاض میں ہیں، انہوں نے آپس میں مل کر یہ کوشش کی کہ ہم ”ٹریول ایجنسی“ بنائیں۔ انہوں نے کہا ہم نے 12 نام دیے ہیں اسی میں دو نام ملے ہیں ان میں سے ایک نام ہے ”تھانوی ایسوسی ایشن“ اور ایک نام اور ملا ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ تھانوی ایسوسی ایشن نام نہ رکھیں جو دوسرا نام ہے وہ

رکھ لیں! میری رائے یہ ہے کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا نام کاروبار کے لیے استعمال نہ کریں اس کو دین کے لیے ہی رہنے دیں۔

### اکابر کا مزاج:

ہمارے بعض اکابر جیسے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا مزاج یہ ہے کہ اگر آپ دکان پر جائیں سودا خریدیں تو بحیثیت عالم یہ نہ کہیں مجھ سے بھی اتنے پیسے لیں گے؟ گویا کہ آپ اپنا علم بیچ کر سودا لینا چاہتے ہیں۔ میں اپنی بات کرتا ہوں کہ دکان پر جاؤں الماری کی قیمت 12500 روپے کی ہے۔ اب میں ان سے کہوں کہ مجھ سے بھی آپ 12500 روپے لیں گے؟ اس کا مطلب ہے کہ چونکہ میں آپ کا مولوی ہوں، عالم ہوں، امام ہوں، میرے علم کی قیمت یہ ہے کہ 2000 روپے کم کر دیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنے علم کی قیمت کا احساس نہیں ہے۔

### علم کی اہمیت پیدا کریں:

امام شافعی رحمہ اللہ کا مزاج یہ تھا کہ جب وہ کسی حجام سے حجامت کروانے کے لیے تشریف لے جاتے تو عام آدمیوں سے دو تین گنا زیادہ مزدوری دیتے، مزدوری تو مثلاً دس روپے ہے آپ تیس روپے دیتے۔ ان سے پوچھا گیا کہ مزدوری دس روپے ہے آپ تیس کیوں دیتے ہیں؟ فرمایا: اس سے حجام کے دل میں علم کی قیمت پیدا ہوگی کہ علماء بہت اچھے لوگ ہیں۔

### لمحہ فکریہ!

ایک طرف مزاج یہ ہے اور ایک طرف مزاج ہمارا ہے۔ اب بتاؤ؟ امت برباد تو ہوگی نا! میں اپنی بات کرتا ہوں باقی علماء کی نہیں! اگر میں اپنے علم کو پیسوں کے لیے استعمال کروں گا تو میرے علم کی قیمت ختم ہوگی اور اس علم کو بے وقعت میں نے کیا ہے آپ نے نہیں کیا، خراب تو آپ کو میں نے کیا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ ہم سب کی

اصلاح فرمائے۔ [آمین۔ سامعین]

کاروبار میں کوشش کریں، کاروباری نام ہی رکھیں۔ اس میں دینی نام رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یا تو اس نیت سے رکھیں کہ میں نے خالص دین کا کام کرنا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔

### دین کی بدنامی کا سبب:

بسا اوقات ہماری وجہ سے دین بہت بدنام ہوتا ہے ہماری وجہ سے، چاہیے تو یہ کہ آدمی دین کا کام کرے، اگر دین کا کام نہ کر سکے تو کم از کم دین کو بدنام کرنے کا ذریعہ تو نہ بنے۔

### امام بخاری رحمہ اللہ کی احتیاط:

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کو ”امیر المؤمنین فی الحدیث“ کہتے ہیں۔ بہت بڑے محدث تھے دنیائے حدیث میں ان کا نام بہت بلند ہے۔ ان کی سوانح حیات میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ ایک دفعہ کشتی میں سفر کر رہے تھے، اس دوران کسی مسافر سے دوستی لگ گئی باتوں باتوں میں حضرت نے ان کو یہ بھی بتا دیا کہ میری جیب میں اشرفیوں کی تھیلی ہے جس میں اتنی رقم موجود ہے۔

تھوڑا سا سفر گزرا تو اسی شخص نے کہا میری ایک تھیلی چوری ہو گئی ہے جس میں اتنے سونے کے سکے موجود ہیں، اب ظاہر ہے حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے بتا تو دیا تھا جو نہی اس نے اعلان کیا تو تلاشی شروع ہو گئی، حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے چپکے سے اس تھیلی کو نکالا اور دریا میں گرا دیا۔ تلاشی لی گئی۔ اب کسی سے بھی سونا برآمد نہیں ہوا جب کنارے پر پہنچے اور جانے لگے تو اس نے الگ ہو کر امام بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا کہ صوفی صاحب! آپ کی جیب میں تو پیسے تھے آپ نے مجھے خود بتایا تھا یا آپ نے جھوٹ بولا تھا؟ آپ کے پاس نہیں تھے اگر تھے تو وہ کدھر گئے؟ حضرت امام



بخاری رحمہ اللہ نے جواب دیا اور فرمایا: پوری امت مجھ پر اعتماد کرتی ہے کہ حدیث کے معاملے میں جھوٹ نہیں بولتا، ہو سکتا ہے میں صفائی دیتا اور چوری ثابت نہ ہوتی لیکن مجھ پر چوری کا الزام تو لگ ہی جاتا، میں نے خود کو چوری کے الزام سے بھی محفوظ رکھا ہے تاکہ امت میری احادیث پر اعتماد کرے۔<sup>99</sup>

جب اس طرح آدمی دین کا کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے کام میں اس کے علوم میں بہت برکتیں عطا فرماتا ہے۔

### سورۃ کے مکی اور مدنی ہونے میں فرق:

بہر حال میں کہہ رہا تھا یہ سورۃ المائدہ ہے جس میں 16 رکوع اور 120 آیات ہیں اور سورۃ مدنی ہے۔ مدنی اور مکی میں فرق ہے۔ جو سورتیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے ہجرت فرمانے کے بعد اتریں انہیں مدنی کہتے ہیں اور جو سورتیں اس سے پہلے اتریں انہیں مکی کہتے ہیں۔

### سورۃ المائدہ مدنی کیسے ہو سکتی ہے؟

اس سورۃ کے متعلق اگرچہ بہت سے مفسرین کا خیال ہے کہ بہت ساری اس کی آیات حدیبیہ کے مقام پر اترتی ہیں، بہت ساری حجۃ الوداع کے موقع پر اترتی ہیں اور بہت ساری فتح مکہ کے موقع پر اترتی ہیں۔ فتح مکہ تو مکہ میں ہے حجۃ الوداع تو مکہ میں ہے مدینہ میں تو نہیں پھر اس کو مدنی کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ سورۃ کی اکثر آیات کا نزول رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے مدینہ ہجرت کے سفر کے بعد اترتی ہیں۔ حدیث مبارک میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الْمَائِدَةُ مِنْ آخِرِ الْقُرْآنِ تَنْزِيلًا فَأَجِلُوا حَلَالَهَا وَحَرِّمُوا

آخری سورتوں میں سے ایک سورۃ؛ سورۃ المائدہ ہے۔ جس چیز کو حلال بتادیا اس کو حلال سمجھو اور جس کو حرام بتادیا اس کو حرام سمجھو۔ تو یہ سورۃ حلال اور حرام کو بیان کرنے میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

### ایک مسئلہ..... متعدد آیات:

ایسا کیوں فرمایا؟ بعض اوقات ایک مسئلے پر ایک آیت پہلے اتری ہے اسی مسئلے پر دوسری آیت بعد میں اتری ہے۔ یہ جتنی آیات ہیں، تلاوت ہم سب آیات کی کرتے ہیں لیکن عمل ان آیات پر کرتے ہیں جو آخر میں اتری ہوں۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ سورۃ آخری سورتوں میں سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس سورۃ میں حلال فرمائیں وہ حلال ہی رہے گی اور جس کو حرام فرمائیں وہ حرام ہی رہے گی، اب اس نے منسوخ نہیں ہونا کیونکہ یہ آخری دور کی سورۃ ہے۔

### شراب اور جوئے کی حرمت:

میں اس کی چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ سورۃ المائدہ کی اس آیت میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ  
رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

یہ شراب ہے، یہ جو ہے، یہ جوئے کے تیر ہیں۔

### جوئے کے تیر:

تیروں کے ساتھ جو کیسے ہوتا تھا؟ وہ اس طرح کہ دس آدمی دس دس روپے

ڈالتے اور اسی سے کوئی چیز خرید لیتے۔ یعنی ایک اونٹ خریدا ہے، بکری خریدی ہے۔ وہ دس ہزار کی ہوتی یا کتنے کی بھی ہوتی دس آدمی برابر پیسے ڈالتے اور وہ خرید لیتے، اب اونٹ کو یا بکری کو جب تقسیم کرنا ہے تو وہ اس طرح کرتے تھے کہ سات تیر رکھ لیتے، ایک تیر پر ایک حصہ ہے ایک تیر پر دو ہیں ایک پر تین ہیں کچھ تیر خالی ہیں تو جس کا جو تیر نکلے گا اس کو وہی حصہ ملے گا جب خرید اسب نے مل کر ہے تو حصہ سب کا ہے یہ جوئے ہی کی ایک قسم تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حرام کر دیا کہ جوئے سے بچو، شراب سے بچو اور ان برے کاموں سے بچو!

### شراب نقصان دہ چیز ہے:

اب شراب کے بارے میں تو تین آیتیں نازل ہوئی ہیں پہلی آیت کون سی ہے؟ ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا﴾<sup>101</sup>

آپ سے شراب کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ فرمادیجیے: شراب میں فائدہ بھی ہے نقصان بھی ہے لیکن نقصان اس کا نفع سے زیادہ ہے۔ اب دیکھو حرام تو نہیں فرمایا۔

### شراب نشہ آور چیز ہے:

اور دوسری آیت اتری: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَرَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾<sup>102</sup>

نشے کی حالت میں ہو تو نماز نہ پڑھا کرو نشہ اتر جائے تو نماز پڑھا کرو۔ شراب کو حرام اب بھی نہیں فرمایا۔

**شراب قطعی حرام ہے:**

اور یہ تیسری آیت جب نازل ہوئی: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

اب شراب حرام ہوئی ہے اب اس کے بعد ذرہ برابر بھی شراب استعمال نہیں کی جاسکتی۔ تو مسئلہ شراب پر تو تین قسم کی آیتیں ہیں لیکن آخری یہ ہے۔

**مسئلہ قرآن و حدیث میں موجود ہو..... پھر بھی:**

اس سے ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہوا، ہمیشہ لوگ کہتے ہیں اس مسئلے پر قرآن موجود ہے، اس مسئلے پر حدیث موجود ہے۔ اس سے ہم لوگ تو جلدی متاثر ہوتے ہیں کہ فلاں مسئلہ حدیث میں ہے فلاں مسئلہ قرآن میں ہے۔ اس سے متاثر نہ ہوا کریں جب بندہ کہے فلاں مسئلہ حدیث میں ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ اس حدیث کے مد مقابل کوئی اور حدیث ہے یا نہیں۔ پھر یہ کہ دونوں حدیثوں میں سے پہلے دور کی کون سی ہے اور بعد کے دور کے کون سی ہے عمل تو تب ہو گا۔ ہم اسی سے پریشان ہو جاتے ہیں۔

**ترک رفع الیدین..... اختلاف روایات:**

اگر کوئی کہے آپ نماز میں رفع یدین کیوں نہیں کرتے حدیث میں ہے؟ آپ شروع کر دیتے ہیں۔ بھائی یہ دیکھو رفع یدین کرنے کی حدیث ہے تو آیہ نہ کرنے کی بھی حدیث موجود ہے یا نہیں اگر نہ کرنے کی حدیث بھی ہو، کرنے کی بھی ہو اب کیا دیکھیں گے بعد والی کون سی ہے۔ کرنے والی یا نہ کرنے والی اگر کرنے والی بعد کی ہے تو

کرنا چاہیے نہ کرنے والی بعد کی ہے تو پھر نہیں کرنا چاہیے۔

اب پورا مسئلہ چونکہ علم میں نہیں ہوتا ہم صرف ایک بخاری کی حدیث دیکھتے ہیں اور اس پر کہتے ہیں بخاری نے کہا۔ اب اگر کوئی بندہ کہہ دے قرآن میں ہے کہ شراب پی لو جب نشہ اتر جائے نماز پڑھ لو قرآن میں ہے تو کیا شروع کر دیں گے پینا؟ [نہیں۔ سامعین] تو صحیح بخاری میں حدیث کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

### صحتِ سند؛ صحتِ عمل کی دلیل نہیں:

اس کو علماء کی زبان میں کہتے ہیں: صحتِ سند؛ صحتِ عمل کی دلیل نہیں ہے۔ اگر حدیث کو صحیح سند سے لیا ہے اس کا معنی یہ نہیں کہ اس پر عمل کرنا بھی صحیح ہے۔ بعض اوقات سند صحیح ہوتی ہے عمل کرنا صحیح نہیں ہوتا۔

### کیا ”ران“ ستر میں شامل ہے؟:

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ ایک باب قائم کرتے ہیں: ”بَابُ مَا يُذَكَّرُ فِي الْفَحْذِ“ پہلے حدیث لائے ”الْفَحْذُ عَوْرَةٌ“<sup>103</sup> کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ران ستر ہے۔ پھر دوسری حدیث لائے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کیا اس میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنے سے میرا گھٹنا ملا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو تہبند مبارک تھا وہ تھوڑا اتر اتو میں ران کو دیکھتا رہا۔<sup>104</sup>

اب بتاؤ؟ ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ستر فرما رہے ہیں ادھر ستر دکھا رہے

103۔ صحیح البخاری: کتاب الصلوٰۃ، تحت باب ما یذکر فی الفخذ

104۔ صحیح البخاری، رقم: 371

ہیں۔ اب اگر ستر ہے تو دکھایا کیوں؟ اور ستر نہیں تو ستر فرمایا کیوں؟

**فقہاء؛ مگر ابی سے بچاتے ہیں:**

اب اس سے ایک نیا طبقہ پیدا ہوا منکرین حدیث، وہ کہتے ہیں ہم حدیث کو نہیں مانتے اور فقہاء کا کام کیا ہے؟ فقیہ کا کام ہے وہ ایسی جلدی یہ نہیں کہتا کہ ہم دونوں کو نہیں مانتے وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس میں حدیث پہلی کون سی ہے بعد کی کون سی ہے، احتیاط کس میں ہے کس میں احتیاط نہیں ہے۔

**امام بخاری کا فیصلہ:**

خود امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”حَدِيثُ أَذْنِيسَ أَسْنَدٌ“ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ران کو دیکھا تھا اس حدیث کی سند بہت مضبوط ہے۔ لیکن دوسری میں فرمایا: ”حَدِيثُ جَرَّهْدٍ أَحْوْطُ“ سند اس کی مضبوط ہے عمل کرنا اس پہ ٹھیک ہے۔ یہ امام بخاری رحمہ اللہ کا خود کا فیصلہ ہے۔

**بخاری کی پوری بات مانیں:**

میں آپ کو بتاؤں آپ یقین فرمائیں کون کون سا روایتیں اور کس کس فتنے کا تعاقب کریں۔ میں دہلی میں ایک مسجد میں بیٹھا تھا نماز پڑھنے کے بعد میں نے وہاں سے ایک کتاب اٹھائی اس کا نام تھا ”المختصر من صحيح البخاری“ صحیح بخاری کا خلاصہ۔ میں نے اسی باب کو کھولا، مجھے پتا تھا کہ یہاں اس نے گڑبڑ کرنا ہے آپ کو تو نہیں پتا! آپ یقین فرمائیں اس کا عنوان تھا بھی یہی کہ [ران ستر ہے یا نہیں] اور نیچے صرف حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ران کھل گیا اور میں اسے دیکھتا رہا اور دوسری حدیث کا ذکر بھی نہیں کیا اور امام بخاری رحمہ اللہ کے فیصلے کا ذکر بھی نہیں کیا۔

اب اگر دعائی ایئر پورٹ میں یا دعائی ساحل پر کوئی نوجوان نیکر پہن کے پھرے اور کہے جی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ میں نے دکھا دیا تو کیا حرج ہے۔ تو بتاؤ اس کو کیا جواب دو گے؟ اس نوجوان کا قصور تو نہیں ہے۔ میں اس لیے گزارش کر رہا تھا کہ یہ سورۃ آخری سورۃ ہے۔ اب اس کا مطلب کیا ہے؟ کہ اس میں جو احکام ہیں وہ منسوخ نہیں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

**دھوکہ بازوں سے بچنے کا گر:**

میں تھوڑے وقت میں اتنے چھوٹے چھوٹے اصول آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اگر آپ ان کو اپنے ذہن میں بٹھائیں تو اللہ کی قسم کھا کے کہتا ہوں کوئی بندہ آپ کو گمراہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آپ ایک مسئلے پر عمل کرتے ہیں اور اسی کے مقابلے میں کوئی آپ کے سامنے حدیث پیش کرے تو آپ کیا پوچھیں گے؟ کہ اس کے مقابلے میں کوئی حدیث ہے یا نہیں؟ وہ کہے گا، نہیں۔ تو آپ کہہ دیں مولانا صاحب سے پوچھ لیتے ہیں کہ حدیث ہے یا نہیں؟ اگر کہے اس کے مقابلے میں حدیث ہے۔ تو پھر یہ دیکھیں گے کہ وہ بات پہلے کی ہے یا بعد کی؟ آپ کہیں یا! یہ فیصلہ کر پھر تیری بات مان لیں گے، دوبارہ کبھی آپ کی دکان پر نہیں آئیں گے۔

**ورنہ فتنہ پھیل جائے گا:**

اگر آپ نے اس طرح نہ کیا بلکہ اس کی بات کو مان لیا تو پھر کیا کریں گے، ایک پمفلٹ دے گا کہ یہ اپنی بیوی کو بھی پڑھوانا۔ اب کیا ہو گا؟ پہلے ایک تھا اب دو ہیں، پھر عورتیں بعض بہت تیز ہوتی ہیں وہ پورے محلے میں بات چلاتی ہیں، پھر ہمیں بعد میں فون کریں گے مولانا صاحب ہمیں آپ کے بیان کا وقت چاہیے ہمارے محلے میں فتنہ پیدا ہو گیا ہے۔ جب ہم خود آئیں تو کہتے ہیں ضرورت کیا ہے اور جب فتنہ پیدا ہو جائے تو پھر دوڑے ہیں، پھر وقت نہیں ملتا تو ناراض بھی ہوتے ہیں۔

## اِکمالِ دین اور اِتمامِ نعمت کا فلسفہ:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ

رَضِيتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾<sup>105</sup>

یہ آیت نازل ہوئی ہے حجۃ الوداع کے موقع پر جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا آخری حج تھا اور وہ پہلا بھی تھا اور آخری بھی، آخری اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج نہیں کیا۔ اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور آیت اتنی اہم ہے کہ ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا اے امیر المومنین! یہ اتنی اہم آیت ہے اگر یہ آیت ہماری تورات میں نازل ہوتی تو جس دن یہ آیت نازل ہوتی ہم اس دن کو بطور عید مناتے۔ اتنی اہم آیت اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔

## آیت مبارکہ کا خلاصہ:

آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ آج کے دن ہم نے تمہارا دین کامل کر دیا ہے، تمہاری نعمتیں پوری کر دیں ہیں اور تمہارے دین کو بطور اسلام تمہارے لیے پسند کیا ہے کامل دین کر کے خدا نے ہمارے حوالے کر دیا۔

## اِکمال اور اِتمام میں فرق:

اس میں دو لفظ ہیں ایک ہے ”اَكْمَلْتُ“ اور ایک ہے ”اَتَمَمْتُ“۔ اِکمال اور اِتمام میں کیا فرق ہے؟ عام بندہ نہیں سمجھ سکتا۔ وہ کہتا ہے جب مکمل کر دیا جاتا ہے تو پورا بھی تو کر دیا جاتا ہے پورا اور مکمل میں کیا فرق ہے؟



اب فرق سمجھیں۔ جب کسی چیز کو مکمل کر دیں تو اسے ”اکمال“ کہتے ہیں اور جب اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہ رہے اسے ”اتمام“ کہتے ہیں۔ بندہ کہتا ہے میں نے آپ کو اتنا کچھ دے دیا ہے کہ اس کے بعد آپ کو ضرورت ہی نہیں رہی۔ یہ جو میں نے اتنا کچھ دے دیا ہے یہ ”اکمال“ ہے۔ اور اس کے مزید ضرورت ہی نہیں رہی یہ ”اتمام“ ہے۔ جو تمہیں چاہیے تھا میں نے دیا ہے اب تمہیں کسی درپہ جانے کی ضرورت نہیں رہی۔

### دین کامل ہے توفیق کہاں سے آئی؟

بعض لوگ اس آیت کا مفہوم غلط یہاں بیان کرتے ہیں اس کو عربی زبان میں کہتے ہیں: ”كَلِمَةً حَقٍّ أُرِيدَ بِهَا الْبَاطِلُ“ کہ لفظ ٹھیک ہوتا ہے اور معنی غلط ہوتا ہے۔ بعض لوگ یوں کہتے ہیں جب دین کامل ہو گیا تو کیا اس وقت فقہ تھی؟ یہ تو بعد میں آئی نا۔ جب دین کامل ہو گیا کیا اس وقت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تھے؟ یہ تو بعد میں آئے نا، یہ دیکھو دین کے کامل ہونے کے خلاف ہے اور ہمیں شک پڑ جاتا ہے کہ بات تو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

### مشکل و سوسے کا آسان جواب:

آپ پریشان نہ ہوں اس کا ایک آسان جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿الْيَوْمَ﴾ ہم نے آج کے دن دین مکمل کیا۔ ان سے پوچھو جس دن یہ آیت نازل ہوئی اس کے بعد جو کچھ آیا وہ دین میں اضافہ ہے؟ یہ آیت کب نازل ہوئی؟ وہ کہیں گے حجۃ الوداع کے موقع پر۔ پوچھو حجۃ الوداع کے موقع کے بعد نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ وسلم کتنے دن زندہ رہے؟

ایک قول ہے 85 دن، تو وہ جو 85 دن تھے وہ دین میں اضافہ ہوا نا؟ کہیں

گے وہ تو اضافہ نہیں ہے۔ کیوں نہیں ہے؟ جب ﴿الْيَوْمَ﴾ کہہ رہا ہے آج دین کامل ہو گیا ہے۔ اس کے بعد پھر آخری آیت قرآن کی یہ تو نہیں ہے۔

آخری آیت ہے: ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُزْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ

نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾<sup>106</sup>

یہ آخری آیت ہے تو پھر یہ آیت بھی دین میں اضافہ ہوا ہے، کیونکہ دین کے کامل ہونے کے بعد آئی ہے۔ پھر کہیں گے ”الْيَوْمَ“ کا مطلب یہ نہیں۔ ہم نے کہا کہ ”أَكْمَلْتُ“ کا مطلب بھی یہ نہیں۔ تو نے ”الْيَوْمَ“ کی تاویل کی ہے، ہم نے ”أَكْمَلْتُ“ کی تاویل کی ہے۔ اگر ہم ”الْيَوْمَ“ کا معنی نہیں سمجھے تو تو مکمل ہونے کا معنی نہیں سمجھا۔ تاویل کرنی پڑ گئی نا؟ [جی ہاں۔ سامعین]

### جنت اور نابینا افراد:

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے پاس ایک آدمی آیا اور تھا آنکھوں سے نابینا اور غیر مقلد بھی تھا، دل کا بھی نابینا اور آنکھوں کا بھی نابینا، دونوں نعمتوں سے محروم، بصارت بھی نہیں ہے، بصیرت بھی نہیں ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے عرض کرنے لگا میں نے آپ سے ایک مسئلے پر بحث کرنی ہے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا: کہ میں نے بحث نہیں کرنی، اس نے کہا کہ نہیں جی میں نے کرنی ہے حضرت نے فرمایا: میں نے نہیں کرنی، اس نے کہا: اجی... کیوں؟

فرمایا: اس لیے کہ تجھ سے بحث کرنے کا فائدہ ہی نہیں، اس نے پوچھا فائدہ

کیوں نہیں ہے؟ فرمایا: میں اگر بحث کروں گا تو تجھے مسئلہ سمجھ آجائے گا؟ تو اس نے کہا جی آجائے گا۔ حضرت نے فرمایا: پھر مان لو گے؟ اس نے کہا جی مان لوں گا۔

حضرت نے فرمایا: مان لو گے تو پھر کیا ہو گا؟ اس نے کہا ٹھیک ہو جاؤں گا۔ فرمایا: ٹھیک ہو جائے گا تو، تو پھر کیا ہو گا؟ اس نے کہا جنت میں جاؤں گا۔ حضرت نے فرمایا: تجھے مسئلہ سمجھ آ بھی جائے، تو مان بھی لے، تو عمل بھی کر لے، تو جنت میں پھر بھی نہیں جاسکتا۔ پھر تجھ سے بحث کا فائدہ؟ اس نے کہا: کہاں لکھا ہے؟ فرمایا: قرآن میں لکھا ہے تو جنت میں نہیں جاسکتا۔ اس نے کہا قرآن میں کہاں لکھا ہے؟ فرمایا قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا﴾<sup>107</sup>

جو دنیا میں اندھا ہے وہ قیامت میں بھی اندھا ہو گا۔ تو جنت میں اندھا تو کوئی نہیں جائے گا۔ تجھے سمجھانے کا کیا فائدہ؟ کہتا ہے: جی اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے۔ فرمایا: تاویل نہ کر جب قرآن کہہ رہا ہے جو دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا۔ تو یہاں بھی اندھا ہے تو نے وہاں بھی اندھا ہو کر ہی اٹھنا ہے۔ تو اندھا بندہ تو جنت میں نہیں جاتا۔ تجھے سمجھانے کا کیا فائدہ؟ کہتا ہے: یہ مطلب نہیں۔

فرمایا: مطلب نہ بیان کر، امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے، تو تم کہتے ہو تاویل نہیں کرنی چاہیے اور جب توں کہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے تو تیری دلیل کیسے مانیں۔؟ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرمانے لگے آیت میں تاویل نہ کریں تو تیرا جنت میں جانا ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس نے کہا: جی مجھے بات سمجھ آگئی۔

## الیوم سے مراد کون سا دن ہے؟

تو ﴿الْيَوْمَ﴾ میں آج کے دن سے مراد وہ دن نہیں ہے جب آیت نازل ہوئی ہے، بلکہ اس سے مراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں آج نوجوان بہت خراب ہو گئے ہیں۔ اس کا کیا مطلب کل ٹھیک ہو جائیں گے؟ [نہیں۔ سامعین] آج سے مراد کیا ہے؟ آج کا دور آج کا زمانہ۔ ہم نے کہا جیسے ﴿الْيَوْمَ﴾ سے مراد خاص دن نہیں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے۔

## دین کے کامل ہونے سے کیا مراد ہے؟

اسی طرح ﴿اَكْمَلْتُ﴾ سے مراد وہ نہیں جو تم نے سمجھا بلکہ ﴿اَكْمَلْتُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے دیا، دین کامل ہے، اس کی شرح یعنی حدیث، دین کامل ہے، اس قرآن نے اصول دیے، دین کامل ہیں، جو مسائل دیے وہ دین کامل ہیں، ان اصولوں سے قیامت تک آنے والے مسائل کو نکالنے کے لیے مجتہد پیدا فرمائے، وہ جو مسائل نکالیں گے وہ دین کامل ہے۔ دین کامل کا مطلب یہ ہے: تمہیں قرآن بھی دیا ہے، تمہیں حدیث بھی دی ہے، جو مسائل اس وقت چاہئے تھے وہ بھی دیے ہیں، وہ جو قیامت تک آنے والے مسائل چاہیے تھے وہ بھی دیے ہیں، اس کے لیے اصول بھی دیے ہیں اور اصولوں کی روشنی میں مسائل نکالنے والے مجتہد بھی دیے ہیں۔ سارا کچھ لوگ تو دین کامل بنے گا۔ ورنہ دین کامل بن ہی نہیں سکتا۔

## ایک علمی نکتہ:

اس میں ایک چھوٹا سا نکتہ اور بھی سمجھ لیں۔ مکہ مکرمہ میں قرآن کریم نے

اعلان فرمایا:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۝ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝ وَلَا أَنْتُمْ

عِبْدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴿۱﴾ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ ﴿۲﴾ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴿۳﴾ نَكُفُّ دِينَكُمْ وَلِي دِينِ ﴿۴﴾

اصل لفظ کیا ہے: "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ" اصل یہ ہے۔ وہ تو ایک عربی کا قاعدہ ہے نایا متکلم حذف ہو جاتی ہے اور جب وقف کرتے ہیں تو "ن" ساکن ہو جاتا ہے۔ اصل میں کیا ہے: "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ" مکہ والو، مشر کو تمہارے لیے تمہارا دین، مجھ محمد کے لیے میرا دین، اگر تم میرا دین قبول نہیں کرتے تو میں تمہارا دین قبول نہیں کر سکتا۔

### دین نبوی اور دین صحابہ:

دین کی نسبت مکہ مکرمہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف فرمائی ہے اور جب یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی فرمایا: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ یہ خطاب صحابہ کو فرمایا ہے۔ جب مکہ مکرمہ ہے تو "دینِ نبی" فرمایا اور جب مدینہ ہے تو "دینِ مکہ" فرمایا۔ جب دین مکہ میں تھا تو اسے دین محمد کہتے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دین صحابہ کے حوالے کیا تو جب نبی دنیا سے گئے ہیں انہیں دین صحابہ کہتے ہیں۔ تو پہلے "دینِ نبی" تھا اب "دینِ مکہ" ہے۔ "دینِ نبی" بنتا ہی وہ ہے جو "دینِ مکہ" ہو۔

اب اگر یہ پوچھنا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے یا نہیں تو کون بتائیں گے؟ [صحابہ۔ سامعین] صحابہ نہ بتائیں تو حضور کا دین ثابت ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مکہ میں "دینِ نبی" فرمایا اور مدینہ میں "دینِ مکہ" فرمایا۔ اس لیے ہمارا نام کیا ہے؟ [اہل السنۃ والجماعۃ۔ سامعین] سنت ہوتی ہی وہ ہے جو جماعت صحابہ دے جماعت صحابہ نہ ہو تو سنت بنتی ہی نہیں۔

## آیت وضو اور وضو کے فرائض:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾<sup>108</sup>

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: جب نماز کا ارادہ کر لو تو اس وقت اپنے چہرے کو بھی دھولو، اپنے ہاتھوں کو بھی دھولو اور سر کا مسح بھی کر لو اور اپنے پاؤں کو بھی دھولو، تو وضو کے فرض کتنے ہو گئے۔ [چار۔ سامعین] اب قرآن میں نہیں لکھا ہوا کہ وضو کے فرض چار ہیں۔

قرآن میں کیا لکھا ہے؟ جب نماز پڑھنے لگو تو چہرے کو دھولو، ہاتھ کو دھولو، سر کا مسح کرو، پاؤں کو دھولو۔ اب چار لکھا ہوا تو نہیں ہے فقہاء کے قبروں پر اللہ تعالیٰ کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے وہ آیت کا حوالہ نہیں دیتے، بس اتنا کہتے ہیں کہ وضو کے فرض چار ہیں۔ لوگ کہتے ہیں جی کتنے لکھیا وے؟ [جی کہاں لکھا ہوا ہے] قرآن میں لکھا ہے۔ کہتے ہیں قرآن میں چار تو نہیں لکھا ہوا۔ او بھائی! جو اندھا قرآن سمجھتا نہیں ہے وہ کیسے سمجھے گا کہ چار ہیں، ان کی آسانی کے لیے فقہاء نے سیدھی بات فرمادی کہ وضو کے فرض کتنے ہیں؟ [چار۔ سامعین]

## نمازِ جنازہ کی نیت:

مجھ سے ایک ساتھی کہنے لگا، وہ تھا غیر مقلد، کم عقل۔ مجھے کہتا ہے: یہ جو تمہارے ہاں جنازہ ہوتا ہے تو جنازے سے پہلے بھی کبھی کھڑے کھڑے مولانا صاحب کہتے ہیں بھئی نیت کر لو! چار تکبیر نمازِ جنازہ، ثناء واسطے اللہ تعالیٰ کے درود واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے، دعا واسطے اس میت کے، منہ قبلہ کی طرف، پیچھے اس امام کے

اللہ اکبر۔ نیت کرو کہتے ہیں۔ یہ کہاں لکھا ہے؟

میں نے کہا بخاری شریف میں۔ کہتا ہے: بخاری میں کہاں لکھا ہے؟ میں نے

کہا: پہلی حدیث میں۔ کہتا ہے: پہلی حدیث میں کہاں لکھا ہے؟ میں نے کہا:

"إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" <sup>109</sup>

اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔

### نیت کہنا اور نیت کرنا:

کہتا ہے: ہمیں اس سے اختلاف نہیں ہے، یہ جو تم زبان سے کہتے ہو یہ کہاں

لکھا ہے؟ میں نے کہا: ہم کہتے ہی نہیں ہیں۔ کہتا ہے؟ کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا: امام اعلان

کرتا ہے نیت کرو، یا کہتا ہے نیت کہو۔ کیا کہتا ہے؟ [کہتا ہے نیت کرو۔ سامعین] کہنا

زبان سے ہوتا ہے اور کرنا دل سے ہوتا ہے۔

میں نے کہا: ہم یہ تو نہیں کہتے کہ زبان سے کرو، اگر ہم کہتے زبان سے کرو تو

ہم سے پوچھتا۔ نہ ہم نے کہا ہے کرو نہ ہم سے پوچھو، انہوں نے کی ہے تو ان سے پوچھنا

چاہیے یا ہم سے؟ [ان سے۔ سامعین] اب یہ بات کوئی مشکل تو نہیں ہے نا، لیکن بلاوجہ

بات پر بات کوئی نہ کوئی ایسی بات نکالتے ہیں کہ لوگ سمجھیں یہ بہت بڑا محقق ہے۔

### مرکز اہل السنۃ والجماعۃ نعمتِ خداوندی ہے:

آپ نے عوام پر اعتراض کیا ہے۔ وہاں نہیں آتے جہاں سے جواب ملتے

ہیں، وہاں حملے کریں گے جہاں سے جواب ملتے نہیں اور فتنہ پھیلانا بہت آسان ہوتا

ہے۔ میں کبھی یہ بات کہتا ہوں کہ سرگودھا والو تم اس نعمت کی قدر کرو جب نعمت

چھن جاتی ہے تو پھر بندے کو سمجھ آتی ہے ہمارے ساتھ ہو کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام

ہے دنیا میں، دنیا بھر میں کئی سوالات ہوتے ہیں نا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جواب کے لیے لوگ سرگودھا آتے ہیں۔

ابھی 70 لڑکے تین دن سے پورے ملک سے آئے بیٹھے ہیں کہ ہم نے مسائل سیکھے ہیں، ہم نے دلائل سیکھے ہیں اور اس پر ہم اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر کریں کم ہے اللہ تعالیٰ آپ کے اس فیض کو عام فرمائے۔ اس میں سب حضرات شامل ہیں کسی ایک فرد کی محنت تو نہیں ہوئی۔

### تبلیغی جماعت میں ضرور وقت لگائیں:

خیر میں بتا رہا تھا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پہلے فرمایا وضو اور اگر وضو نہ کر سکو پھر تیمم کا طریقہ بتا دیا اگر نہ آئے تو اس کے لیے میرا آپ سے مشورہ ہے کم از کم تین دن تبلیغی جماعت کے ساتھ لگائیں اس کے لگانے سے چلو تیمم کرنا تو آجائے گا۔ ہمیں تیمم کرنا بھی نہیں آتا، اللہ کی قسم استنجا کرنا نہیں آتا، سونے کی دعائیں نہیں آتیں اور اعتراض ان پر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: اسی کوئی کافر آں؟ [ہم کوئی کافر ہیں؟] ہندوؤں کے پاس جاؤ۔ کوئی ان سے کہے اچھا فلاں دعا سناؤ۔ کہتے ہیں: دعا کوئی فرض ہے؟ اچھا پھر کریں گے کیا؟ اس لیے میں آپ سے گزارش کرتا ہوں تھوڑا تھوڑا وقت لگاتے رہا کریں اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔

### مسئلہ نور و بشر:

﴿قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ﴾

اس آیت کو اختلافی مسئلے پر آج کے دور میں بڑے شد و مد سے پیش کیا جاتا ہے آیت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تمہارے پاس نور بھی آیا ہے اور واضح کتاب بھی آئی ہے۔ پھر یہاں بحث چل پڑتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں یا بشر ہیں حالانکہ یہ بحث فضول ہے کہ نور ہیں یا بشر۔



### ذات نبوت اور وصف نبوت:

آسان بات کیا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ذات ہے اور دوسرا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو بشر کہتے ہیں اور نبی کے وصف کو نور کہتے ہیں، ذات کے اعتبار سے بشر ہیں اوصاف کے اعتبار سے نور ہیں۔ اس لیے ہم نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر بھی مانتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نور بھی مانتے ہیں۔ اب بتاؤ کوئی الجھن رہ جاتی ہے؟ [نہیں۔ سامعین] بلاوجہ اس مسئلے کو چھیڑ کر امت کو لڑانا اور پھر کفر کے فتوے جاری کرنے اور امت کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا کس قدر ظلم کی بات ہے۔

### وصف نبوت کے نور ہونے کی دلیل:

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بشر ہے اور وصف کے اعتبار سے نور ہیں اور یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبر وصف کے اعتبار سے نور کیوں ہیں؟ آگے ہے ﴿يَهْدِي بِهٖ اللّٰهُ﴾ یہ ایسا نور ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت دیتا ہے۔ تو نور ہدایت وصف کو کہتے ہیں۔ ﴿يَهْدِي بِهٖ اللّٰهُ﴾ بتا رہا ہے کہ یہ وصف ہے۔

### قائد جمعیت کا ”لاجواب“ جواب:

اسلام آباد میں قائد جمعیت مولانا فضل الرحمن صاحب دامت برکاتہم نے مجھے بلایا کسی خاص مشاورت کے لیے وہاں ایسے بات چل پڑی تو چلتے چلتے مجھے مولانا نے لطیفے کے طور پر ایک بات سنادی۔

مولانا فرمانے لگے: میں قاسم العلوم ملتان میں مدرس تھا، کتابیں پڑھاتا تھا تو میرے پاس پانچ سات لڑکے آگئے انہوں نے کہا: جی ہم نے ایک مسئلہ پوچھنا ہے۔ میں نے کہا: جی پوچھو۔ تو انہوں نے مسئلہ پوچھا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نور

ہیں یا بشر؟ مولانا فرماتے ہیں: میں نے ان سے کہا تمہارا سوال ہی غلط ہے، پہلے سوال ٹھیک کرو پھر جواب دوں گا۔

انہوں نے کہا: جی سوال کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا: نور کے مقابلے میں ظلمت آتی ہے تم پوچھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں یا ظلمت ہیں؟ تو پھر میں جواب دوں گا کہ کیا ہیں۔ نور اور بشر کا تو آپس میں ٹکراؤ ہی نہیں۔ ایک بندہ بشر بھی ہو سکتا ہے اور صفت کے اعتبار سے نور بھی ہو سکتا ہے۔ ان دونوں میں کیا ٹکراؤ ہے؟ ٹکراؤ پیدا کرو گے تو پھر ٹکراؤ بنے گا ورنہ ٹکراؤ بنتا ہی نہیں۔

### قوم موسیٰ کی بے وفائی:

﴿قَالُوا يَمُوسَى إِنَّكَ إِتَّخَذْتَ خَلْفَكَ أَبَدًا مَا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَذْنَتْ وَ

رَبُّكَ فَقَاتِلَ إِنَّا هُنَا قَاعِدُونَ ﴿٦٣﴾﴾

یہ آیت میں صرف ایک نکتہ یا صحابہ رضوان اللہ عنہم اجمعین کی شجاعت بتانے کے لیے اس آیت کو پڑھا ہے۔ اس کا لمبا واقعہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو جب اللہ تعالیٰ نے فرعون سے نجات دی، دریا سے کر اس کر گئے تو اللہ رب العزت نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی اپنی اس قوم کو لے کر چلو۔ کئی اقوال ہیں ایک قول یہ ہے کہ شام کو بیت المقدس میں اس قوم کو لیکر جاؤ، تم جہاد کرو اللہ تعالیٰ تمہیں فتح عطا فرمادے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارہ قبیلے تھے اپنی قوم کے بارہ قبیلوں کے بارہ سرداروں کو بھیجا کہ جاؤ آگے جا کر ان سے مذاکرات کرو۔ یا ان کے حالات معلوم کر کے آؤ کہ ان کی فوج کدھر کھڑی ہے۔ یہ جب گئے آگے ایک قوم کھڑی تھی قوم عمالقہ انہوں نے انہیں گرفتار کیا، گرفتار کرنے کے بعد انہوں نے کہا کہ ان بارہ کو قتل کر دو۔ بادشاہ سمجھ دار تھا اس نے کہا انہیں قتل نہ کرو بلکہ انہیں شان و شوکت اور اپنی

طاقت دکھاؤ ان کے قد بھی بڑے تھے، دولت بھی تھی اور مضبوط بھی تھے۔ ان کو اپنی طاقت دکھائی جب وہ واپس آئے تو ڈر گئے۔ پہلے موسیٰ علیہ السلام کو ملے تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا یہ بات جا کے عوام کو نہ بتانا عوام میں رعب پڑ جائے گا، تم کہو جی ہم ہو کے آگئے ہیں، بسم اللہ پڑھ کر جہاد کی تیاری کرو۔

ان میں سے دو نے بات نہیں بتائی ان میں سے ایک کا نام ”قالب“ اور دوسرے کا نام ”یوشع بن نون علیہ السلام“ انہوں نے نہیں بتائی، باقی دس نے جا کر بتادیا اور قوم میں بزدلی پھیل گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا جہاد کے لیے چلو تو قوم نے کہا: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هُنَا قَاعِدُونَ﴾

اے موسیٰ تم جاؤ اور تمہارا خدا جائے، اسی ایتھے ہی بیٹھے آں [ہم ادھر ہی بیٹھے ہیں] فتح کر کے واپس آؤ تو پھر جائیں گے، اسی نہیں جان دے [ہم نہیں جاتے] وہ یہاں بیٹھ گئے موسیٰ علیہ السلام کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی تھی۔

### بزدل قوم پر عذاب خداوندی:

اللہ نے پھر عذاب نازل کیا، ﴿قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَدْبَعَيْنَ سَنَةً يَّتِيهِمْ فِي الْاَرْضِ﴾

اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ سزا مسلط کی کہ یہ جس میدان میں تھے وہ 90 میل لمبا تھا اور 25 یا 40 میل چوڑا تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب یہ اسی میں چالیس سال تک رہیں گے، صبح سے لے کر شام تک چلتے تو پھر جب رات کو سوتے تو صبح وہی جگہ ہوتی جہاں سے چلے تھے۔

### وجود نبوت کی برکات:

چالیس سال تک وہاں ٹھہرے رہے اور اللہ تعالیٰ کا کرم دیکھو چونکہ موسیٰ

علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام یہ دونوں ان میں موجود تھے اللہ تعالیٰ نے اس کی نعمت بھی عطا فرمائی کہ ان کے بدن پہ جتنے کپڑے تھے نہ وہ پھٹتے نہ وہ میلے ہوتے، یہ دونوں کی برکت تھی۔

اسی طرح جب یہ چلتے دھوپ ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی تو ان کی دعا کی برکت سے اوپر بادل چلتا سایہ بھی دے دیا اور جب یہ ایک قسم کا کھانا کھانے سے تنگ آگئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر من و سلویٰ دو قسم کی نعمتیں عطا فرمادیں۔ بیڑ نما جانور تھا اور سلویٰ میٹھی چیز تھی، یہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نعمت عطا فرمادی۔ کھاتے بھی تھے یعنی اس قدر نافرمانی کے باوجود بھی چونکہ اللہ کے دوبرائی ان میں موجود تھے تو نبی کی برکات کا ظہور پھر بھی ہوتا تھا۔ نبی کا وجود اتنا مقدس ہوتا ہے کہ پھر بھی ان کو خیر و برکت ملتی ہے۔

### اصحاب محمد رضی اللہ عنہم کی وفاداری:

محدثین نے لکھا ہے، اصحاب سیر نے لکھا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ سے مشورہ کیا اب بتاؤ کیا کریں؟ یہ میدان بدر ہمارے سامنے آگیا کریں کیا؟ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے انہوں نے کہا یا رسول اللہ ہم موسیٰ علیہ السلام کی قوم نہیں ہیں جو آپ کو یہ کہہ دیں ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هُنَا قَاعِدُونَ﴾

اللہ کی قسم ہم سمندر میں چھلانگیں لگا دیں اگر آپ فرمادیں ہم موسیٰ علیہ السلام کی قوم نہیں ہیں جو کہیں آپ جا کر جہاد کریں بلکہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم خوشی سے کھل اٹھے۔

فرمایا: کون اٹھے گا؟ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے۔ پھر فرمایا: کون؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھے۔ پھر فرمایا: اور کون ہے؟ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جب

اٹھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے۔

### انصار مدینہ بھی جاننا تھے:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اٹھنے سے خوش کیوں نہیں ہوئے؟ یہ تو مکہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے ہیں۔ یہ تو، ہیں ہی اس کام کے لیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ مدینے کے لوگ کھڑے ہوں اور جب مدینہ کے کھڑے ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہو گئے۔

### غزوہ بدر... تاریخ اسلام کی پہلی جنگ:

کہ اب مکہ اور مدینے کے جاننا میرے ساتھ ہیں پھر 313 کو لے کر گئے ہیں، وہ جو تاریخ اسلام کی پہلی جنگ ہے جس نے پوری دنیا کے نقشے بدل کے رکھ دیے تو مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے کہا ہم موسیٰ علیہ السلام کی قوم نہیں ہیں کہ ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هُنَا قَاعِدُونَ﴾ کہہ کے آپ کا ساتھ چھوڑ دیں۔

### قوم موسیٰ نافرمان تھی کافر نہیں:

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے عجیب بات فرمائی ہے۔ فرمایا: جب یہ کہا: کہ تو جا اور تیرا خدا جائے تو بظاہر تو یہ جملہ کفر والا ہے وہ تو کافر ہو گئے تھے تو موسیٰ علیہ السلام دعائیں مانگ رہے ہیں ان کے لیے، سائبان کے لیے بادل آگئے ان پر ان کو اللہ تعالیٰ کھانے کے لیے دے۔ ان کو پانی نہیں ملتا تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر عصا مارا اس سے بارہ چشمے نکلے اور بارہ قبیلے اس سے پانی پی رہے ہیں تو یہ کافر تھے ہلاکت کی بد دعا کرنی چاہیے تھی اور ان کو پھر بھی نعمتیں مل رہی ہیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسے کافر نہیں کہتے۔ کیوں؟ نافرمانی کی لیکن کفر نہیں

ہے ان کا مطلب یہ تھا: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ﴾ اے موسیٰ! تو جا اور تیرا خدا تیری مدد کرے گا تو جہاد کر خدا کی مدد سے، فتح ہوگی تو ہم تیرے ساتھ ہیں۔ حکیم الامت تھا نوری رحمہ اللہ کی تاویل دیکھیں فرمایا کافر پھر بھی نہیں بنتے، جب جائز تاویل موجود ہو کسی کا ایمان بچانے کے لیے تو ایمان بچایا کرو کفر میں مت دھکیلا کرو۔

### نسل انسانی کی ابتدا:

﴿وَائْتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقْبِلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ ط قَالَ لَا قُعْلَنَّاكَ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ﴿٢٧﴾﴾

حضرت آدم علیہ السلام پہلے مرد ہیں، اماں حوا پہلی عورت ہے۔ اب آگے نسل انسانی نے چلنا تھا جس کی نکاح کے بغیر کوئی صورت نہیں تھی اس کی صورت یہ ہوتی آدم اور حوا اماں باپ تھے ان کے حمل سے ایک بیٹی اور ایک بیٹا پیدا ہوتا، یعنی جوڑے پیدا ہوتے اکیلا بچہ پیدا نہیں ہوتا تھا، جب بھی ہوتا جوڑا ہوتا۔

### نکاح کا طریقہ:

ان کا نکاح یوں ہوتا کہ پہلے حمل والا بیٹا اور دوسرے حمل والی بیٹی، پہلی حمل والی بیٹی اور دوسرے حمل والا بیٹا اس طرح نکاح ہوتا تھا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کو پہلا بیٹا جو پیدا ہوا اس کا نام تھا قابیل اور ساتھ اس کے بہن بھی پیدا ہوئی اور دوسرے حمل سے جو پیدا ہوئے اس لڑکے کا نام تھا ہابیل اور ساتھ بہن پیدا ہوئی۔

### ہابیل و قابیل کا واقعہ:

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں: قابیل کے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی وہ بہت خوبصورت تھی اور ہابیل کے ساتھ جو پیدا ہوئی وہ بہت بد صورت

تھی۔ اب قابیل کہنے لگا: جو میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے میں اس کے ساتھ نکاح کروں گا، حالانکہ اس کے ساتھ اس کا نکاح بنتا نہیں تھا، نکاح تو ہونا تھا دوسرے حمل والی لڑکی کے ساتھ۔ اس نے کہا: میں کروں گا۔

آدم علیہ السلام نے سمجھایا بیٹا اس کے ساتھ تیرا نکاح جائز نہیں ہے، یہ نہیں ہو سکتا۔ تو اس نے کہا: میں کروں گا۔ آدم علیہ السلام کے چونکہ علم میں تھا کہ اس سے نکاح ہو سکتا ہی نہیں ہے اور یہ بھی علم میں تھا کہ اگر یہ قربانی دیں گے تو ہابیل سچا ہے اس کی قربانی قبول ہو جائے گی۔ تو حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: چلو ایسا کرو تم دونوں قربانی دو، جس کی قربانی اللہ تعالیٰ قبول کرے گا اس کی شادی اس لڑکی سے کر دیں گے۔ آپ کے ذہن میں آئے کہ ہو سکتا ہے ہابیل کی قبول ہو جاتی، یہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ تھا ہی غلط کام قبول کیسے ہوتی۔

### حضرت آدم علیہ السلام کی تدبیر:

حضرت آدم علیہ السلام نے ایسی تدبیر اختیار کی کہ جس سے اپنے بیٹے کو سمجھانا بہت آسان ہو جائے۔ اب دونوں نے قربانی دے دی۔ اس وقت قربانی کے قبول ہونے کی علامت یہ ہوتی تھی، اگر جانور قربانی کرو تو بھی میدان میں رکھ دو اگر آپ کچھ غلہ دینے چاہتے ہیں وہ بھی رکھ دو، قربانی کو کھانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی، جو مال صدقہ کریں اس کو رکھ دیں آسمان سے آگ آتی اور آگ اس قربانی اور صدقہ کو کھا جاتی یہ اس بات کی علامت تھی کہ قربانی قبول ہو گئی اور اگر نہ کھاتی تو یہ علامت تھی کہ قربانی قبول نہیں ہوئی۔

اب قابیل اور ہابیل دونوں نے قربانی کی۔ ہابیل نے غالباً جانور ذبح کیا اور قربان کر دیا اور قابیل نے گندم وغیرہ اور جو چیزیں تھی وہ رکھیں، قابیل کی قربانی قبول نہیں ہوئی اور ہابیل کی قربانی خدا نے قبول کر لی۔

## تاریخ آدمیت کا پہلا قتل:

آدم علیہ السلام نے فرمایا: بیٹا دیکھو سیدھی سی بات ہے تیرا حق نہیں بتانا کا بتا ہے۔ قابیل حسد کی آگ میں جلا حالانکہ خوش ہونا چاہیے تھا ہابیل سے کہا میں تجھے قتل کر دوں گا۔ ہابیل نے کہا: میں کچھ نہیں کہوں گا، میں قتل ہونا تو برداشت کر لوں گا لیکن اپنے بھائی پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا، باقی میرا کیا قصور ہے بھائی خدا نے میری قربانی قبول کر لی ہے تیری قربانی قبول نہیں کی میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔

## بعد از قتل تدفین کا مسئلہ:

قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا، جب قتل کر لیا تو پریشان پھرتا تھا میں اس کو کہاں دفن کروں؟ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَبَعَثَ اللَّهُ غُرَابًا يَبْحَثُ فِي الْأَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُوَارِي سَوْءَةَ

أَخِيهِ﴾

اللہ تعالیٰ نے ایک کو ابھیجا اس نے کوئے کو دیکھا کہ ساتھ ایک کو امر اہوا تھا وہ اسے دفن کرنا چاہ رہا تھا، وہ اپنی چونچ سے مٹی کو کھودنے لگا، اس نے دیکھا تو پتا چلا مردے کو یہاں دفن کرنا ہے۔

## خیر و شر کی ابتدا اور اجر:

خیر میں صرف اتنا بتا رہا تھا اب قیامت تک جتنے قتل کے گناہ ہوں گے یہ سارے قابیل کے سر پر ہیں، چونکہ پہلا قتل اس نے کیا تھا سارے قتلوں کا گناہ اس کو ملے گا۔

حدیث مبارک میں ہے: "مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً، فَلَهُ أَجْرُهَا، وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ، مَنْ غَيَّرَ أَوْ يَنْقُصُ مِنْ أَجْوَرِهِمْ شَيْءٌ، وَمَنْ سَنَّ فِي



الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً، كَانَ عَلَيْهِ وُزْرُهَا وَوُزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ، مِنْ غَيْرِ  
أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ"۔<sup>110</sup>

جو نیک کام شروع کر لے اس کا اجر اسے بھی ملتا ہے اور بعد کے سارے نیک  
اعمال کا اجر اسے ملتا ہے، اور جو برے کام کو شروع کرے اس کا گناہ اس کو ملتا ہے اور جو  
لوگ اس برائی پر عمل کریں ان سب کا گناہ اس کے نامہ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے۔

### قبر کسے کہتے ہیں؟

رئیس المناظرین، حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا محمد امین اوکاڑوی رحمہ اللہ  
فرماتے تھے: کوئے کو پتا تھا کہ قبر کسے کہتے ہیں؟ آج کے دوستوں کو یہ نہیں پتا کہ  
قبر کسے کہتے ہیں؟ کوئے کو پتا تھا کہ یہ قبر ہے جہاں مردہ دفن کرنا ہے، ہمارے دوست  
کہتے ہیں یہ قبر نہیں ہے، قبر وہ علیین میں ہے جہاں پر روح ہوتی ہے۔

حضرت فرماتے: جب ہم ان کے لیے دعا کرتے ہیں خدا تمہیں قبر ہی نصیب  
نہ کریں تو کہتے ہیں ہمیں بد دعائیں دیتا ہے۔ بھائی! جب اس کو قبر مانتے ہی نہیں ہو تو  
تمہیں نصیب ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جو مانتا ہے اسے نصیب ہونی چاہیے۔

### مسائل زمینی قبر کے اور.....:

پھر عجیب بات یہ ہے کہ مسجد میں مسئلہ بیان کریں گے کہ قبر کو سجدہ کرنا  
حرام ہے۔ اب بتاؤ؟ وہ لوگ کبھی علیین میں گئے ہیں سجدہ کرنے کے لیے [نہیں۔  
سامعین] کسے سجدہ کرتے ہیں؟ [اس قبر کو] کس کو کہتا ہے کہ قبر ایک بالشت سے اوپر  
نہیں ہونی چاہیے، یہ کون سی قبر ہے؟ اسی مٹی والی۔ قبر کا طواف نہیں کرنا چاہیے۔ وہ  
کون سی قبر ہے؟ قبر کو پکا نہیں بنانا چاہیے۔ وہ کون سی قبر ہے؟ یہی قبر ہے۔ سارے

جب مسئلے بتائیں گے اسی قبر کے اور جب قبر کا مسئلہ آئے گا کہ قبر میں مردہ کہاں پر ہے؟ پھر کہتے ہیں: ایک قبر نہیں ہے، قبر اوتے وے یا تھلے وے [قبر اوپر بھی ہے نیچے بھی ہے] علیین میں یا سحین میں ہے۔ کوئے کو بات سمجھ آگئی تھی، ہمیں سمجھ نہیں آرہی۔

### وسیلہ دے کر دعا کرنا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وسیلہ کا ایک معنی یہ ہے کہ ایک مقام ہے میدان حشر میں جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بنایا ہے اور یہ دعا مانگنی چاہیے اللہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام وسیلہ عطا فرمائے یہ بھی ٹھیک ہے۔ اور فرمایا: وسیلہ کا ایک معنی یہ ہے کہ جس طرح نیک اعمال کے ذریعے خدا کا قرب ملتا ہے، اور نیک اعمال کا وسیلہ دے کر خدا سے مانگنا جائز ہے، اسی طرح انبیاء اور صلحاء کی قربت اور مجلس سے بھی خدا کا قرب ملتا ہے لہذا ان کا وسیلہ بھی جائز ہے۔

### حضرت عمر نے حضرت عباس کا وسیلہ دیا:

پھر حضرت نے وہاں پر دو حدیثیں نقل کی ہیں۔ ایک حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا وسیلہ دے کر خدا سے دعا مانگی اللہ تعالیٰ نے ان کو بارش عطا فرمادی۔

### نبی کریم کا وسیلہ دے کر دعا:

ایک صحابی آئے اور ان کی بینائی کا مسئلہ تھا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا یہ دعا مانگا کرو یہ دعا اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سکھائی ہے:

"اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ وَاتُوْجِّهُ اِلَیْكَ بِنَبِیِّكَ مُحَمَّدٍ نَّبِیِّ الرَّحْمَةِ." <sup>111</sup>

اے اللہ! میں تجھے تیرے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ دے کر دعا مانگتا ہوں، صحابی نے دعا مانگی تو خدا نے اس کی دعا قبول فرمائی۔ تو دیکھو قرآن کریم میں ہے اللہ تعالیٰ نے حکم کس کا دیا۔ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ اے ایمان والو! خدا سے ڈرا بھی کرو اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش بھی کیا کرو۔ تو جس طرح وسیلہ مقام کا نام ہے اسی طرح وسیلہ سے دعا کرنا ہمارا اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے۔

### دین کا کام کرنے والوں کے لیے قرآنی ہدایات:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ ۖ أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ ۖ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ ذَٰلِكُمْ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾

میں نے صرف چھوٹی سی بات سمجھانی ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر کچھ لوگ مرتد ہو جائیں تو آپ فکر نہ کریں اللہ ان کی جگہ پر ایسی قوم پیدا کرے گا جو دین کا کام کریں گے۔ خدا کو تمہاری ضرورت نہیں تمہیں خدا کے دین کی ضرورت ہے۔ اگر ہم دین کا کام کرتے ہیں تو اللہ کا ہم پر احسان ہے ہمارا خدا پر کوئی احسان نہیں۔

مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ نے اس آیت میں جو دین کا کام کرے اس کی صفات بیان کی ہیں۔

1: ﴿بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾ اللہ ان سے پیار کرتا ہے وہ اللہ سے پیار کرتے ہیں۔

2: ﴿إِذْ لَبَّى عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ مومنین کے ساتھ بہت پیار کرتے ہیں اور کافروں پر سخت ہوتے ہیں۔

3: ﴿يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں۔

4: ﴿وَلَا يَخَافُونَ تَوَمَّةً لَا يُمِرُّ﴾ یہ ملامت کی پرواہ نہیں کرتے۔

### غیروں کی رکاوٹ اور اپنوں کے طعنے:

مفتی صاحب فرماتے ہیں: یہ بات کیوں کی ہے؟ جب بھی کوئی بندہ دینی تحریک لے کر اٹھتا ہے اس کے سامنے دو رکاوٹیں ہوتی ہے۔

(1) ایک رکاوٹ غیروں کی طرف سے ہوتی ہے۔

(2) دوسری رکاوٹ اپنوں کی طرف سے ہوتی ہے۔

مفتی شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ غیروں کی رکاوٹ کا مقابلہ تو بندہ کر سکتا ہے، اپنوں کے طعنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اللہ فرماتا ہے: جس سے خدا کام لیتا ہے اللہ اس کو توفیق عطا فرماتے ہیں کہ وہ اپنوں کے طعنوں کا مقابلہ بھی کرتا ہے اور دین کے کام کو جاری رکھتا ہے۔ یہ اپنوں کا مقابلہ یعنی طعنے سہنا اور جواب نہ دینا۔ آپ نے کئی بار یہ شعر سنا ہے اور اس پر عمل کی بھی کوشش کریں۔

شہداء نے پکارا ہے تم کو فردوس کے بالاخانوں سے

ہم راہ وفا میں کٹ آئے تمہیں پیارا بھی تک جانوں سے

اس جذبہ گل بوسی میں کچھ کانٹے بھی چبھ جاتے ہیں

اپنوں کے نشتر سہہ لینا ٹکرانا فقط بیگانوں سے

ابنوں سے نہ ٹکراؤ، غیروں سے ٹکراؤ، اللہ دین کے کام کو بہت آسان فرما دیں گے۔

### صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں، ایک صحابی اور بیٹھے ہوئے تھے، کسی مسئلہ پر یوں ٹکرا رہا ہوا، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بیٹھ کے سنتے رہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کے مسکراتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پہ ناگواری کے آثار ظاہر ہو گئے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ بول رہا تھا اور میں چپ تھا تو آپ مسکرا رہے تھے۔ میں نے جواب دیا تو آپ کے چہرے پہ ناگواری کے آثار ظاہر ہو گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: جب تو خاموش تھا تو تیری طرف سے جواب دینے کے لیے اللہ نے فرشتہ مقرر کر رکھا تھا، اب جب آپ خود جواب دینے لگے تو وہ فرشتہ واپس چلا گیا۔ مجھے تو ناگواری اس بات کی ہے جو کام فرشتہ کر رہا تھا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کرنا شروع کر دیا ہے۔<sup>112</sup>

### اہل حق کے خلاف منفی پروپیگنڈا:

اس لیے ابنوں کی باتیں برداشت کریں ہر بات کا جواب نہ دیا کریں، لوگ جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں جواب نہ دیا کریں۔ ابھی پچھلے دنوں میں اسلام آباد گیا تو وہاں ایک دوست ہیں بہت اچھے، ان کے بیٹے مجھے کہنے لگے: مولانا صاحب ایک بار آپ ہمارے گھر آئے ہیں اور آپ نے درس قرآن دیا ہے۔

20 یا 25 بندے ہوں گے، کچھ مستورات ہوں گی، ان کا تو مجھے پتا نہیں۔ کہتا

ہے: آپ درس دے کر گئے ہی تھے کہ اس کے بعد بہت سارے لوگ آگئے۔ کہنے لگے: اس آدمی سے بچو، اس آدمی سے بچو۔ کہتا ہے: میں نے بہت کوشش کی صفائی دینے کی لیکن میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے کہا: آپ صفائی دیتے کیوں ہیں؟ مجھے کہتا ہے: پھر کیا کہیں؟ میں نے کہا: ان سے پوچھو کہ یہ مسئلہ ٹھیک بتاتا ہے یا غلط؟ اپنے ہیں نا، وہ کہیں گے: مسئلہ ٹھیک بتاتا ہے۔ اس سے کہو ہم صرف اس سے مسئلہ پوچھتے ہیں اور اس کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کرتے۔ بس اب اس کا جواب دینے کی تمہیں کیا ضرورت؟ جواب مت دو۔ اللہ اپنی طرف سے جواب کے لیے ملائکہ مقرر کر دے گا۔ اللہ آپ سے بھی کام لیں اللہ مجھ سے بھی کام لیں۔

### قسم کی اقسام اور احکام:

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْأَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِينٍ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعَمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۖ مَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ۚ ذَلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ ۚ وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾

اس آیت میں اللہ نے قسم کا مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ قسم کی تین قسمیں ہیں:

(1): یمین غموس

(2): یمین لغو

(3): یمین منعقدہ

### یمین غموس:

یمین غموس کسے کہتے ہیں؟ ایک کام آدمی نے نہ کیا ہو اور جھوٹ بول کر قسم

اٹھائے کہ میں نے فلاں کام کیا ہے یا ایک آدمی نے کام کیا ہو اور جھوٹ بولے میں نے نہیں کیا، یعنی گزشتہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پہ جھوٹی قسم اٹھائے اسے کہتے ہیں یمین غموس۔ غموس کا معنی ہوتا ہے ڈوب جانا یا ڈوب دینا، یہ گویا گناہ میں ڈوب گیا ہے کہ اس نے جھوٹی قسم کیوں اٹھائی ہے؟

### یمین لغو:

یمین لغو: اس کا معنی ہوتا ہے آدمی سمجھے میں نے کام کیا ہے لیکن درحقیقت نہ کیا ہو یا آدمی سمجھے کام نہیں کیا مگر درحقیقت کیا ہو اس پر قسم اٹھانے کو یمین لغو کہتے ہیں۔

### یمین منعقدہ:

یمین منعقدہ وہ قسم ہے کہ آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قسم اٹھائے اسے یمین منعقدہ کہتے ہیں۔

### یمین غموس کا حکم:

اور تینوں کا حکم کیا ہے؟ اگر کسی گزشتہ کام کے کرنے یا نہ کرنے پہ جان بوجھ کے جھوٹی قسم اٹھائی اسے یمین غموس کہتے ہیں، اس میں گناہ تو ہو گا مگر اس میں کفارہ نہیں ہے صرف گناہ ہو گا۔

### یمین لغو کا حکم:

یمین لغو: بالفرض میں ایک بات کہتا ہوں مثال کے طور پر کسی جگہ جانا تھا مگر نہیں جاسکا اور سمجھا کہ میں گیا ہوں تو کہتا ہے اللہ کی قسم میں تو گیا تھا وہ غلطی سے کہہ دیا اگر گزشتہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر بھول کر قسم اٹھائی اسے یمین لغو کہتے ہیں اس پہ کفارہ بھی نہیں اور اس پہ گناہ بھی نہیں۔

## یمین منعقدہ کا حکم:

ایک ہوتا ہے؟ آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قسم اٹھائے اگر اس قسم کو پورا نہیں کیا اس پر کفارہ ہوتا ہے۔ کفارہ کیا ہے؟ آدمی یا تو غلام آزاد کر دے، یا دس مسکینوں کو کھانا کھلا دے، یا دس کو کپڑے پہنا دے یا پھر یہ کہ تین روزے رکھے اگر روزے تین رکھے تو مسلسل رکھنے پڑیں گے یہ نہیں کہ ایک آج ایک پرسوں ایک پھر اگلے دن، بلکہ مسلسل تین روزے رکھیں یہ قسم کا کفارہ ہے۔ آدمی کو کوشش کرنی چاہیے کہ قسم نہ اٹھائے اگر قسم اٹھا بھی لے تو اس قسم کو ہر حال میں پورا کرنا چاہیے۔

## بلا وجہ مسائل پوچھنے کی ممانعت:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسْأَلُكُمْ ۖ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلَ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ ۖ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾

اس آیت میں اللہ نے بات سمجھائی ہے کہ بلا وجہ فضول مسئلے نہ پوچھا کرو، یہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حج کی آیات نازل ہوئیں، تو ایک صحابی نے پوچھا: یا رسول اللہ؟ زندگی میں ایک بار حج ہے یا ہر سال فرض ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ اس نے پھر پوچھا؟ زندگی میں ایک بار حج ہے یا ہر سال۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: اگر میں کہہ دیتا ہر سال، تو ہر سال فرض ہو جاتا تو بتاؤ تم میں سے کون کرتا؟ اس پر قرآن کریم کی یہ آیت اتری: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسْأَلُكُمْ﴾

اے ایمان والو! ایسے مسئلے نہ پوچھو اگر بتا دیئے جائیں تو بعد میں تمہیں ناگوار



گزریں۔

خلاصہ یہ ہے کہ بلا ضرورت اور بلا وجہ مسئلے نہ پوچھا کریں۔

### لچر اور فضول میسج:

عجیب بیماری چل پڑی ہے کہ میسج پہ لوگ مسئلے پوچھتے ہیں ایک، دوسرا، تیسرا، چلتے جاتے ہیں جس کا وجود ہی نہیں ہوتا اور مسئلے پوچھتے رہیں گے۔ کبھی تاریخی مسئلے، اچھا یہ بتائیں کہ نوح علیہ السلام نے جو جانور اپنی کشتی میں بٹھائے تھے سب سے پہلا جانور کون سا تھا؟ سب سے آخری جانور کون سا تھا؟ میں وہ کہہ رہا ہوں جو مجھ سے پوچھے جاتے ہیں اب بتاؤ اس کا کیا جواب دوں؟

اچھا یہ بتائیں صبح کو پھانسی ہوتی ہے۔ یہ صبح کیوں ہوتی ہے، شام کو کیوں نہیں ہوتی؟ میں نے کہا: یہ جیل والوں سے پوچھو، ہم کوئی پھانسی دیتے ہیں؟ میسج اور فون پر میں ایسے کسی بھی مسئلے کا جواب نہیں دیتا۔

مسئلہ پوچھتے ہیں امی عائشہ کا جنازہ کس نے پڑھایا تھا؟ میں نے کہا: مجھے نہیں پتا۔ کیسی بات کرتے ہیں؟ میں نے کہا: اور کیا کہوں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟

### مسائل پوچھیں، پہیلیاں نہیں:

میں نے کہا: مسئلے پوچھو، حلال کیا ہے؟ حرام کیا ہے؟ جائز کیا ہے؟ ناجائز کیا ہے؟ لوگ مسائل نہیں پوچھتے پہیلیاں پوچھتے ہیں۔ اچھا کسی نہر سے عورت کی لاش مل گئی کیسے پتا چلے گا کہ مسلمان ہے؟ تعجب ہے کہ تمہیں عورت ہی کے مسئلے سوچھے۔ نہیں میں ہنسانے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں بڑے افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ پوچھنے والا ہے جو پوچھ رہے ہیں۔ میسج چلتے چلے آرہے ہیں۔ وہ مسئلہ پوچھیں جو ضرورت کے مطابق ہو میں نے اپنا معمول بنارکھا ہے بلا ضرورت اگر کوئی مسئلہ پوچھے تو میں جواب دیتا ہی نہیں وہ مسئلہ پوچھیں جو آپ کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ ان باتوں کو چھوڑ دے جو اسے فائدہ نہیں دیتیں۔

### منکرین فقہ کی خیانت:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۖ أَوْ لَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ﴾

آیت کا خلاصہ کیا ہے؟ جب مشرکین مکہ اور گزشتہ کفار کو انبیاء علیہم السلام فرماتے کہ ہماری بات مانو، اللہ کی بات مانو۔ وہ کہتے تھے: ہم تو باپ دادا کی بات مانیں گے، تمہاری خاطر باپ دادا کو چھوڑ دیں؟ خاندان کو چھوڑ دیں؟ تمہاری خاطر ان سب کو چھوڑ دیں؟ یہ آیت اتری مشرکین اور نبی کے مابین، لیکن آج یہ آیت پیش کی جاتی ہے آپ کے خلاف اس لیے اس کا جواب اچھی طرح سمجھ لیں۔

آج کے دور میں آیت پیش کی جاتی ہے آپ کے اور میرے خلاف۔ کیا کہتے ہیں؟ یہ فقہ کو مانتے ہیں یہ بزرگوں کو مانتے ہیں بزرگوں نے کہا بزرگوں سے سنا بزرگوں کو مانتے ہیں۔ کہتے ہیں: کہ یہ مشرکین کا کام ہے جب مشرکین سے کہا جاتا: ﴿تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ﴾ مشرک کہتے: ﴿حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا﴾ ہمیں اپنا باپ دادا کافی ہے۔ تو گویا تقلید کرنا مشرکین کا کام ہے۔

### آیت کا موقع محل اور صحیح مطلب:

ہم نے کہا: آپ نے آیت تو پڑھی ہے مگر استعمال غلط کیا ہے۔ ایک آدمی تھا کسی جماعت میں گیا تو اس بے چارے نے ایک دعا سیکھ لی۔ جب ناک میں پانی ڈالیں تو کون سی دعا پڑھیں؟

"اَللّٰهُمَّ اَرِحْنِيْ رَاحِيَةَ الْجَنَّةِ وَلَا تُرَحِّنِيْ رَاحِيَةَ النَّارِ."

اے اللہ! مجھے جنت کی خوشبو سٹکھا دے اور جہنم کی بدبو سے بچالے۔

اب یہ چلا گیا اندر استنجے کے لیے وہاں ادھر سوچتا رہا کہ میں نے دعا سیکھی تھی وہ کون سی ہے؟ سوچتا رہا سوچتا رہا۔ پھر اس نے یہ دعا تھوڑی اونچی آواز سے پڑھی:

"اَللّٰهُمَّ اَرِحْنِيْ رَاحِيَةَ الْجَنَّةِ وَلَا تُرَحِّنِيْ رَاحِيَةَ النَّارِ."

اب دیکھو! دعا پڑھنی کہاں تھی اور پڑھ کہاں رہا ہے۔ اسی طرح آیت کہاں کی تھی اور فٹ ہم پر کی ہوئی ہے کہ تم امام ابو حنیفہ کو مانتے ہو، امام شافعی کو مانتے ہو۔ تو آیت مشرکین کے خلاف ہے اور پیش کس کے خلاف کر رہے ہیں؟ مؤمنین کے! آپ کو میری بات پہ تعجب تو ہوتا ہو گا لیکن اس سے زیادہ میں آپ کو سمجھانے کے لیے کیا مثال دوں۔

اگر آپ کو اشکال ہو تو میں اس اشکال کو صاف کر کے قرآن کریم کی آیت پڑھ دیتا ہوں تاکہ الجھن نہ ہو کہ مثال کیسی تھی؟ قرآن کریم نے مجھڑ مکھی کی مثال دی ہے۔ مشرکین کہتے: اللہ کا کلام اور مکھی اور مجھڑ کی مثالیں! اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٰ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَاَفَوْقَهَا﴾<sup>113</sup>

گویا اللہ تعالیٰ مکھی اور مجھڑوں کی مثالیں دے کر فرماتے ہیں کہ تمہارے کفر کی حیثیت ہی مکھی اور مجھڑ کی طرح ہے ہم اور کون سی مثالیں دیں؟ تمہیں ایسے لوگوں کی مثالیں نہ دیں تو اور کون سی مثالیں دیں؟ کیا مثال میں امام کعبہ پیش کریں؟ جواب سن لو اور جواب اسی آیت میں ہے۔

**ادھوری بات ادھورانتیجہ:**

آپ کو یاد ہو گا میں نے کئی بار ایک بات کی ہے کہ آدھا قرآن پڑھو نتیجہ اور ہے، پورا قرآن پڑھو نتیجہ اور ہے۔ ایک حدیث پڑھو نتیجہ اور ہے، دو حدیثیں پڑھو نتیجہ اور ہے۔ آگے پڑھو جواب موجود ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿أَوْ لَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ﴾

اگر باپ علم اور عمل والا نہ ہو تو پھر بھی باپ دادا کی بات مانو گے؟ چتایہ چلا اگر باپ بے علم اور بے عمل ہو اس باپ کی بات کو دین کے معاملے میں نہیں مانا جائے گا، لیکن باب علم اور عمل والا ہو تو اس کی بات کو مانا جائے گا۔

### امام ابو حنیفہ کی عبادت گزاری:

ہمارے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا علم دیکھو تو دنیا میں اس کی مثال نہیں اور اگر عمل دیکھو تو چالیس سال عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی ہے نہ علم میں مثال ہے نہ عمل میں مثال ہے۔

### امام ابو حنیفہ کا تقویٰ:

امام صاحب عمل میں اتنے بڑے آدمی تھے، دیوار کے باہر دو پہر کو دھوپ میں کھڑے ہیں۔ اس وقت کسی نے پوچھا: امام صاحب کھڑے ہیں کوئی کام ہے؟ فرمایا: جی ہاں۔ تو آپ دیوار کے سائے میں کھڑے ہو جائیں۔ فرمایا: سائے میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اب امام صاحب کا تقویٰ دیکھنا!

پوچھا کیوں؟ فرمایا: اس لیے کہ میں نے اس بندے سے پیسے لیے ہیں اور جس بندے سے پیسے لیے ہوں اس سے نفع لینا سود بنتا ہے میں دھوپ میں کھڑا ہو جاؤں گا اس کی دیوار کے سائے میں کھڑا نہیں ہوں گا کہ سود میں شامل نہ ہو جائے۔ لاؤ دنیا میں ایسے عمل والی مثال!

## امام ابو حنیفہ کی احتیاط:

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو پتا چلا کہ کوفہ میں کوئی بکری چوری ہو گئی ہے امام صاحب نے قضائی سے پوچھا فرمایا: یہ بتاؤ ایک بکری عام طور پر کتنے سال زندہ رہتی ہے؟ اس نے کہا: سات سال۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے سات سال تک بکری کا گوشت کھانا چھوڑ دیا کہ کہیں یہ چوری والی بکری کا گوشت نہ ہو۔ ایسا عمل والدین سے تلاش کر کے لاؤ۔ ہمارے امام تو علم والے بھی ہیں عمل والے بھی ہیں۔ قرآن کریم ان کی بات ماننے سے منع نہیں کرتا، بلکہ بے علم اور بے عملوں کی بات سے منع کرتا ہے۔ اللہ ہمیں علم والے اور عمل والے آباء و اجداد عطا فرمائے۔ (آمین)

## قیامت کا ہولناک منظر:

﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَا ذَا أُجِبْتُمْ ۖ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا ۖ

إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۖ﴾

قیامت کا منظر اتنا ہولناک ہوگا، اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے بھی پوچھیں گے تمہاری امت نے کیا جواب دیا؟ تو نبی بھی جواب نہیں دے گے، فرمائیں گے ﴿لَا عِلْمَ لَنَا﴾

تفصیلات کا تو ہمیں بھی نہیں پتا، جتنا آپ کو پتا ہے آپ ہی بہتر جانتے ہیں اس سے زیادہ ہمیں بھی پتا نہیں۔ نبی بھی اس ہولناکی کی وجہ سے پریشان ہوں گے اس کے اور بھی بہت سارے معانی ہیں۔ میں آخری بات کہتا ہوں۔ سورۃ المائدہ میں ہے:

﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ

الْحَكِيمُ ۝﴾

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن فرمائیں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام

سے اللہ قیامت کے دن پوچھیں گے اے عیسیٰ! تیری قوم نے مجھے چھوڑ کے تجھے خدا بنایا اور مریم کو خدا بنایا، ﴿أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَهَيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾<sup>114</sup> یہ تو نے کہا تھا؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جواب دیں گے یا اللہ! جب تک میں تمہیں نے تو کبھی نہیں کہا، بلکہ ان کی نگرانی بھی کی ہے۔

### وفات عیسیٰ اور مرزائی دجل:

﴿فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ

شَهِيدٌ﴾

اللہ جب آپ نے مجھے موت دے دی۔ یہ کب سوال ہو گا؟ [آخرت میں۔ سامعین] مرزائی کہتا ہے: دیکھو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں مجھے وفات دی، حالانکہ یہ سوال قیامت کے دن ہو گا اور قیامت سے پہلے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وفات آجائے گی۔ اس طرح باطل لوگ دھوکہ دیتے ہیں۔ اللہ ہمیں ان سے محفوظ فرمائے۔ [آمین۔ سامعین]

حضرت عیسیٰ فرمائیں گے اللہ آپ نے تو مجھے وفات دے دی میں تو آگیا تھا اب پیچھے کا معاملہ تو آپ کے علم میں ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک جملہ فرمائیں گے: ﴿إِنْ تُعَذِّبُهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ﴾ اے اللہ! تو عذاب دینا چاہے تو تیرے بندے ہیں، ﴿وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ اللہ اگر تو ان کو معاف کرنا چاہے تو، تو غالب بھی ہے حکمت والا بھی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی وہ اور تھی، کیا فرمایا:

﴿فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾<sup>115</sup>

اللہ جو میری بات مانے وہ تو میرا ہے اور جو میری نافرمانی بھی کرے تو اے اللہ تو غفور بھی ہے تو رحیم بھی ہے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیا فرما رہے ہیں؟ اللہ اگر تو عذاب دے دے تو تیرے بندے ہیں اور اگر بخش دے تو پھر ﴿فَأِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ تو عزیز بھی ہے، حکیم بھی ہے۔

### دونوں نبیوں کے جملوں میں بنیادی فرق:

دونوں نبیوں نے یہ فرق کیوں کیا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جملہ دنیا کا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جملہ آخرت کا ہے۔ آخرت میں تو کافر کے لیے معافی کا قانون ہی نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کیا عرض کر رہے ہیں۔ اے اللہ! اگر میری بات مانیں تو میرے ہیں، پھر تو آپ ان کو معاف کریں گے، اور اگر نافرمانی بھی کریں تو، تو غفور بھی ہے تو رحیم بھی ہے۔ کیا مطلب؟

### مقام عدل اور رحمت:

یعنی اگر میری نافرمانی بھی کریں پھر بھی اپنی رحمت کے صدقے ان کو تو بہ کی توفیق دے اور تو معاف کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ دنیا ہے۔ اور قیامت کے دن نہ تو بہ ہے اور نہ اس کے بعد کافر کے لیے رحمت ہے اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں اللہ اگر عذاب دے تو تیرے بندے ہیں۔ یہ مقام عدل ہے۔ اگر تو انہیں معاف کرنا چاہے یہ قانون تو نہیں ہے تو حکیم بھی ہے تو غالب بھی ہے۔

## جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں.....:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ اپنے صحابہ کے بارے میں اس وقت فرمایا جب جنگ بدر ہوئی اور ستر قیدی مسلمانوں کی قید میں آئے تو مشورہ چلا کیا کریں۔ حضرت صدیق اکبر سے پوچھا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا آپ بتاؤ کیا کریں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ عقیل حوالے کرو علی کے اور میرے رشتے دار میرے حوالے کرو، ہر کوئی اپنے اپنے رشتے دار کی گردن اڑا دے۔

حضور! یہ کفر کے سرغنہ ہیں آج ہمارے قابو میں آگئے ہیں، نہیں چھوڑنا، ان کی گردنیں اڑا دیں۔ اچھا صدیق آپ بتاؤ آپ کیا کہتے ہو؟ حضرت صدیق اکبر نے فرمایا: جیسے بھی ہیں حضور ہیں تو آپ کے ہی نا۔ حضور میرا مشورہ یہ ہے کہ ان سے فدیہ لیکر آزاد کر دو ان کو قتل نہ کریں ہو سکتا ہے کل کو مسلمان بنیں اور ہمارے معاون بنیں اور دین کا فائدہ ہو جائے۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ دینی حمیت پر بات کرتے ہیں، صدیق بھی دین کے فائدے کی بات کرتے ہیں۔

## مزاج صدیقی و فاروقی:

اس موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں صحابہ کے مزاج کا جو توازن بیان کیا ہے وہ بڑا عجیب ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: میرے صدیق کی مثال ایسے ہے جیسے ابراہیم اور عیسیٰ (علیہما السلام) ہیں اور میرے عمر کی مثال ایسے ہے جیسے موسیٰ اور نوح (علیہما السلام) ہیں۔ اگر ان کا مزاج دیکھنا چاہو تو گزشتہ انبیاء کو دیکھو۔ نوح علیہ السلام نے عرض کیا تھا:

﴿رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيًّا رَاۤىۡ ۙ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْنِيۡ ۙ



يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاَجْرًا كَفَّارًا ﴿١١٦﴾

اللہ ان کو برباد کر دے اگر یہ رہ گئے تو ان کی نسلیں پھر کافر پیدا ہوں گی ختم کر دے ان کو، اور موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانی:

﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰی اَمْوَالِهِمْ وَاَشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾<sup>117</sup>

اے اللہ ان کے مالوں کو بھی ختم فرما دے ان کے دلوں پر بھی مہر لگا دے، اللہ یہ کفر پہ مریں ان کو عذاب دے دے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہما السلام کیسے جلال میں تھے۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾<sup>118</sup>

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرما رہے ہیں:

﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَؕ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ

الْحَكِيْمُ﴾

میرے صدیق کو دیکھنا ہو تو ابراہیم اور عیسیٰ کو دیکھ لو، میرے عمر کو دیکھنا ہو تو حضرت موسیٰ اور نوح کو دیکھو۔ علیہم السلام۔ یہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی مثالیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تھیں۔

**جنت کے مستحق تو نہیں لیکن.....:**

اور روایت میں ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ رات کو اٹھے

116- نوح: 71، 26، 27

117- یونس: 88

118- ابراہیم: 36، 14

اور اس آیت کو پڑھتے رہے۔ عشاء سے لے کر فجر تک اسی ایک آیت کو پڑھتے رہے:

﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۗ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ

الْحَكِيمُ﴾

ہم بھی اللہ سے دعائیں مانگیں ہم یہ تو نہیں کہتے اے اللہ! تو عذاب دینا چاہے تو تیرے بندے ہیں۔ عدل کے تو ہم متحمل ہی نہیں ہم اللہ سے یہ ہی دعا مانگیں جو حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ مانگا کرتے تھے۔ اے اللہ! ہم اس لیے جنت تجھ سے نہیں مانگتے کہ ہم جنت کے مستحق ہیں اس لیے جنت مانگتے ہیں کہ ہم جہنم کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اللہ مجھے بھی ہدایت عطا فرمائے اللہ آپ کو بھی ہدایت عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی خدمت کے لیے قبول فرمالے، اللہ آپ کو بھی توفیق دے اور مجھے بھی توفیق دے [آمین۔ سامعین]

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

دعا:

اے اللہ! ہم سب کے گناہوں کو معاف فرمادے۔ اے اللہ! خطاؤں سے درگزر فرما۔ اے مولائے کریم! جائز حاجات کو پورا فرما۔ اے اللہ! اس درس قرآن کے تسلسل کو برقرار فرما۔ اے اللہ! جتنے بھی حضرات آئے ہیں ان کا آنا قبول فرما۔ اے اللہ! جتنے بیمار ہیں ان سب کو صحت عطا فرما۔ اے اللہ! جتنے مقروض ہیں ان کے قرضے ادا فرما۔ اے اللہ! جو اس دنیا سے جا چکے ہیں ان کی مغفرت فرما۔ آمین

## سورة الانعام

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ ۚ ثُمَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ﴾

﴿الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ﴾

**سورة کا مختصر تعارف:**

سورة الانعام اس میں 20 رکوع ہیں اور 165 آیات ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ رب العزت نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ سورة نازل فرمائی تو ستر ہزار فرشتے اس سورة کے جلو میں تشریف لائے اس قدر عظمت والی یہ سورة ہے۔ سورة کا نام ہے سورة الانعام۔ انعام عربی زبان میں چوپائے [چار ٹانگوں والے جانور] کو کہتے ہیں، چونکہ سورة مبارکہ میں انعام کا ذکر ہے اس لیے اس سورة کا نام بھی سورة انعام ہے۔

**پیدا کرنا اور بنانا:**

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ ۚ ثُمَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ﴾

﴿الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ﴾

اللہ نے اس سورت کا آغاز فرمایا الحمد اور تعریف سے، اور دو لفظ ارشاد

فرمائے ہیں۔ ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ اللہ رب العزت وہ ذات ہیں جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا، ﴿وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ﴾ اور ظلمات اور نور کو بنایا۔

اس میں دو لفظ ہیں، ان دونوں لفظوں میں فرق سمجھیں۔ سموات اور ارض کے لیے لفظ خلق اور ظلمات اور نور کے لیے لفظ جعل فرمایا۔

### خلق اور جعل میں فرق:

ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ جب آسمان اور زمین کا ذکر تھا تو ان کے لیے ”پیدا“ کا لفظ استعمال فرمایا۔ اور جب ظلمات اور نور کی بات کی تو فرمایا ظلمات اور نور کو بنایا، تو پیدا کرنے اور بنانے میں کیا فرق ہے؟ خلق اور جعل میں کیا فرق ہے؟ مفسرین نے لکھا ہے: اس لیے کہ آسمان اور زمین یہ اصل ہیں اور ظلمات اور نور یہ تابع ہیں تو اصل لفظ خلق ہے، اور تابع لفظ جعل ہے۔

### فرق کی وضاحت مثال سے:

جیسے مسجد ہے، اصل چیز تو مسجد ہے باقی اس کا رنگ ہے، روغن ہے، روشنی ہے، یہ چیزیں اس مسجد کے تابع ہیں، جب ذکر فرمایا آسمانوں کا تو فرمایا خلق پیدا کیا، اور جب آئی ظلمات اور نور کی بات تو فرمایا جعل بنایا۔ یعنی اصل آسمان اور زمین ہیں اور ظلمات اور نور اس کے تابع ہیں۔

### سوال: سموات جمع اور ارض واحد؟:

پھر یہاں اللہ رب العزت آسمان کے لیے لفظ سموات لائے ہیں جو جمع ہے، اور الارض واحد لائے ہیں، حالانکہ جس طرح سات آسمان ہیں اسی طرح سات

زمینیں ہیں۔ ﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾<sup>119</sup>

قرآن کریم میں ہے کہ جس طرح اللہ نے سات آسمان پیدا فرمائے ہیں اسی طرح سات زمینیں بھی پیدا فرمائی ہیں۔ لیکن یہاں پر آپ دیکھ لیں سموات جمع ہے والارض واحد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے آسمانوں کی تعداد زیادہ ہے اور زمینوں کی تعداد کم ہے۔

### جواب:

مفسرین نے لکھا ہے: وجہ یہ نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ آسمان اپنی ہیئت اور خصوصیات کے لحاظ سے ہر آسمان دوسرے سے الگ ہے اور سات زمینوں میں سے ہر زمین اپنی ہیئت اور عمومی خصوصیات کی وجہ سے چونکہ ایک جیسی ہے اس لیے آسمان کو جمع لائے، اور زمین کو واحد لائے۔

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ارض کی جمع غیر فصیح ہے، اس لیے واحد کا صیغہ لائے اور لفظ مِثْلَهُنَّ سے اشارہ فرمادیا کہ زمینیں بھی سات ہیں۔

### اثر ابن عباس اور سات زمینیں:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر ہے، اثر عربی زبان میں کہتے ہیں صحابی کے ارشاد کو۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اللہ رب العزت نے سات زمینیں پیدا فرمائیں، اور ہر زمین میں ایک آدم تمہارے آدم کی طرح، ایک نوح تمہارے نوح کی طرح، ایک موسیٰ تمہارے موسیٰ کی طرح، ایک عیسیٰ تمہارے عیسیٰ کی طرح اور ایک محمد تمہارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح۔ علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والتسلیم۔ یہ ہے حدیث مبارک۔

## بعض لوگوں کا حدیث پر اعتراض:

اب اس حدیث پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے؟ اعتراض یہ ہے کہ اگر ہر زمین پر ایک حضرت آدم، ایک حضرت نوح، ایک حضرت موسیٰ، ایک حضرت عیسیٰ اور ایک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور اس زمین پر بھی ہیں۔ تو ہم جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں تو پھر کون سی زمین والے محمد خاتم النبیین ہیں۔ یہ اس حدیث پر سوال ہے؟

بعض لوگوں نے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کا ہی انکار کر دیا کہ ہم مانتے ہی نہیں ہیں۔

قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ بانی دارالعلوم دیوبند انہوں نے فرمایا: ہم ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے انکار نہیں کرتے ہم معنی وہ کرتے ہیں کہ جس سے اعتراض ہی ختم ہو جائے، ہم صحابی کی بات کو رد کیوں کریں صحابی کی بات کا معنی وہ کریں کہ جس معنی پر اعتراض ہی نہ ہو۔

میں ایک جملہ عرض کرتا ہوں ہمارے ہاں بڑے حضرات ایک جملہ کہتے ہیں اور چھوٹے اس کو سمجھتے نہیں ہیں تو فتنے پیدا ہو جاتے ہیں۔ میرا یہ ایک مستقل عنوان ہے، کہ میں ایک جملہ عرض کروں کہ ہمارے بڑوں نے فلاں جملہ، فلاں جملہ، فلاں جملہ فرمایا اور چھوٹے نہ سمجھے تو اس سے فتنے پیدا ہو گئے۔

میں ایک مثال دیتا ہوں ہمارے ہاں چونکہ عموماً بہت بڑے، بڑے اجتماع ہوتے ہیں تو مجھے ایک ساتھی کہنے لگا: حاجی عبدالوہاب صاحب رائے ونڈ والے دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ بڑے بڑے جلسوں سے فتنے پیدا ہوتے ہیں اس لیے بڑے بڑے جلسے کرنے کے بجائے اپنی مسجدوں میں چھوٹے چھوٹے جوڑ رکھا کرو۔ میں نے کہا یہ بات اگر درست ہے تمہارے کہنے کے مطابق، پھر تم بتاؤ کہ رائے ونڈ سے بڑا

جلسہ تو پاکستان میں کہیں نہیں ہوتا اگر بڑے جلسے فتنے ہیں تو پھر رائے ونڈ اجتماع کو تم فتنہ کہو گے؟ وہ کہتا ہے جی نہیں۔ تو پھر کہتا ہے حاجی صاحب کے اس جملے کا مطلب؟ میں نے کہا جملے کا مطلب سمجھو اس جملے کو لے کر ہمارے جلسے کا انکار نہ کرو۔ کہتا ہے: جی مطلب کیا ہے؟ میں نے کہا: پوری بات سمجھیں مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی بڑا اجتماع کرے اور اس کے بعد سو جائے تو اجتماع فتنہ ہے اور اگر بڑا اجتماع کر کے چلتا رہے تو فتنہ نہیں ہے پھر یہ ٹھیک ہے۔ کیا مطلب ہے؟

### مسلسل محنت رنگ لاتی ہے:

مثلاً آپ سرگودھا میں ایک بہت بڑا جلسہ کریں مرزائیوں کے خلاف اور پھر سو جائیں مرزائی متحرک ہو جائیں گے اور آپ سو جائیں گے تو کیا جلسہ ان کو جگانے کے لیے کیا تھا؟ اس لیے بڑے جلسے کے بعد پھر چھوٹی چھوٹی میٹنگز مسلسل جاری رکھیں تاکہ اس جلسے کے پورے پورے فوائد حاصل ہو سکیں، آپ باطل کے خلاف جلسہ کر رہے ہیں ان کو جگالیں اور خود آپ چھوڑ دیں تو باطل متحرک ہو جائے گا آپ سو جائیں گے تو بتاؤ جلسے کا فائدہ ہوا یا نقصان [نقصان۔ سامعین]۔ اس لیے ان کا مطلب یہ ہے کہ بڑے جلسے کرو سو یا نہ کرو پھر ان ثمرات کو لوٹا کرو اور جلسے مسلسل جاری رکھا کرو، تو ہم اپنے بڑوں کے جملے سمجھتے نہیں ان کو اپنے لیے مستقل فتنہ بنا لیتے ہیں۔ اللہ ہمیں اکابر کی باتوں کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور نا بھی سمجھیں تو رد پھر بھی نہ کریں ایک وقت آتا ہے اللہ بات سمجھا ہی دیتے ہیں، لہذا اپنے بڑوں کی بات رد نہ کیا کرو۔

### حضرت نانوتوی کا رسالہ تحذیر الناس:

حضرت مولانا قاسم نانوتوی فرماتے ہیں: ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بات کا انکار نہیں کرتے اس کا معنی کرتے ہیں۔ اس پر مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی مستقل کتاب ہے، تحذیر الناس اس کتاب کا نام ہے۔ اور بڑی پڑھنے والی کتاب ہے،

دارالعلوم دیوبند کے چالیس سالہ مہتمم مولانا، قاری محمد طیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے اس کتاب کو سبقتاً پڑھا ہے تو تب مجھے سمجھ آئی ہے اب بتائیں کتنی مشکل کتاب ہوگی۔ میں نے اس کتاب کو ادھر چناب نگر میں تربیتی نشست میں بیان کیا تو مجھے وہ حضرات فرمانے لگے کہ آپ ہمیں یہ کیسٹ بھجوادیں، ہمارا جی چاہ رہا ہے کہ اس کو چھاپ دیں اتنا آسان اس کتاب کو بیان کرنا یہ بڑا مشکل ہے۔

### خاتم النبیین کون سے محمد ہیں؟

اب اشکال یہ ہے کہ اگر سات زمینوں میں سے ہر زمین پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو آخری نبی کون سے محمد ہیں۔ تو مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ دنیا کا اصول اور ضابطہ یہ ہے کہ اگر کوئی مکان سات منزلہ بنا ہو تو اس میں ہوتا ہے کہ پہلی منزل کون سی ہے اور آخری منزل کون سی ہے، جو سب سے نیچے ہو اس کو پہلی منزل کہتے ہیں اور جو سب سے اوپر ہو اس کو آخری منزل کہتے ہیں۔ تو اگر سات زمینیں بنی ہیں تو ہماری زمین کے اوپر آسمان ہے اس کے نیچے چھٹی زمین ہے، اس کے نیچے پانچویں اس کے نیچے چوتھی، اس کے نیچے تیسری، اس کے نیچے دوسری اور اس کے نیچے پہلی، تو پہلی زمین سب سے نیچے ہے اور ہماری زمین سب سے آخری ہے تو جب ہماری زمین آخری ہے تو ہماری زمین کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی آخری ہیں، اس لیے آخری نبی یہی ہیں۔ اس میں اشکال کی بات کیا ہے؟ اب دیکھو کوئی بات مشکل تو نہیں ہے نا۔

### ظلمات جمع ہے اور نور واحد..... کیوں؟

میں اس لیے اس پر نکتہ عرض کر رہا ہوں کہ اللہ نے زمین سات بنائی اور آسمان بھی سات بنائے ہیں۔ ﴿وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ﴾ اللہ پاک نے ظلمات بھی بنائے ہیں اور نور بھی بنائے ہیں، نور کو لیں گے تو روشنی ملے گی اور اگر نور کو چھوڑ دیں گے تو اندھیرا ملے گا۔ یہاں بھی اللہ پاک نے ظلمات کو جمع کر کے ذکر فرمایا اور نور کو



واحد کر کے ذکر فرمایا، نور ایک ہے اور اندھیرے کئی ہیں اور یہ بتانے کے لیے کہ حق ایک ہوتا ہے اور باطل کئی ہوتے ہیں، سنت ایک ہوتی ہے بدعتیں کئی ہوتی ہیں۔

### ہر علاقے کی بدعت جدا ہوتی ہے:

آپ پوری دنیا میں گھوم لیں آپ میں سے وہ حضرات جو کاروبار کے لیے جاتے ہیں یا جماعت کے ساتھ جاتے ہیں جماعت والوں کے اسفار تجارت والوں سے بھی زیادہ ہوتے ہیں وہ اس کا تجربہ بخوبی رکھتے ہیں پوری دنیا میں جائیں تو سنت ایک ہی ہوتی ہے لیکن ہر علاقے کی بدعت الگ الگ ہوتی ہے۔ سنت یہ نور ہے اور بدعت یہ ظلمت ہے، بدعتیں کئی ہوتی ہیں اور سنت ایک ہوتی ہے۔

اس لیے فرمایا: ﴿وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ﴾ اللہ نے ظلمات بھی بنائے اور نور بھی بنائے، ظلمات اس لیے نہیں بنائے کہ انسان اندھیروں میں چلا جائے بلکہ اس لیے بنائے کہ انسان اس سے بچے اور نور میں چلا جائے چونکہ دنیا دار الامتحان جو ہے امتحان تو بنتا ہی تب ہے جب نفع کی چیز بھی بنائے اور نقصان کی چیز بھی بنائے اور پھر بندے سے کہے یہ نقصان کی چیز ہے اور یہ نفع کی چیز ہے، بندہ نقصان کو چھوڑ کر نفع کو لے لے یہ امتحان ہے اور اگر نقصان والی چیز کو پیدا ہی نہ فرمائیں تو دنیا دار الامتحان بنے گی کیسے؟

### جہنم خواہشات کے پردوں میں لپیٹی ہوئی ہے:

جب اللہ نے جنت اور جہنم کو پیدا فرمایا تو حکم دیا ملائکہ کو ذرا اس کی سیر کریں، ملائکہ نے کہا یا اللہ دنیا میں کوئی بندہ بھی جہنم میں نہیں جائے گا سارے ہی جنت میں جائیں گے جہنم میں جاتا کون ہے۔ حدیث مبارک میں ہے اللہ نے جہنم کو خواہشات کے ساتھ ڈھانپ دیا اور جنت پر اللہ نے پردہ ڈال دیا اور کہا اب دیکھو جا کے انہوں نے کہا: اللہ اب سارے جہنم میں جانے کی کوشش کریں گے جنت میں جانے والے اب کم

ہونگے کیونکہ جہنم پر پردہ خواہشات کا ہے خواہش کی چیزوں سے ڈرو۔ یہ جہنم کا پردہ ہے جب وہاں جاؤ گے تو نیچے جہنم پڑی ہوگی۔

### خواہشات کی قربانی کا نتیجہ جنت ہے:

جنت کا معاملہ ایسا نہیں ہے جنت میں جانے کے لیے ناپسندیدہ چیزوں سے گذرنا پڑتا ہے سخت سردی ہو تو وضو کرنے کو جی نہیں چاہتا، مسجد میں جا کر نماز پڑھیں تو یہ مشکل لگتا ہے۔ بازار میں جائیں تو جی چاہتا ہے نا محرم عورتوں کو دیکھیں، بازار میں جائیں تو جی چاہتا ہے گانے سنیں یہ جی چاہنے کی باتیں ہیں یہ جو گانے والا پردہ ہے اگر یہ گانا سنے گا تو جہنم میں جائے گا اور اگر نہیں سنے گا تو بظاہر دل کو چوٹ لگے گی یہ دل کی چوٹ انسان کو جنت میں پہنچا دے گی۔

### رسول کسے کہتے ہیں؟:

ربیع الاول میں ایک بحث لمبی چھڑی ہوئی ہوتی ہے اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میرا اپنے گاؤں میں آج جمعہ پورا لفظ رسول پر تھا اور میں ان کو سمجھا رہا تھا اللہ پاک فرماتے ہیں: ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ﴾<sup>120</sup> اللہ نے فرمایا تمہارا اعزازیہ ہے تمہارے پاس وہ رسول آیا ہے جو تم میں سے ہے۔

ہمارا اعزازیہ ہے کہ اللہ نے جنس بشر میں سے نبی بنایا ہے اور ہم کہتے ہیں ہمیں اعزاز نہیں چاہیے یہ فرشتوں میں سے ہے، نوریوں میں سے ہے، اللہ کے بند و جبرائیل کو سید النور کہتے ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سید البشر کہتے ہیں۔

### سید البشر مخدوم ہیں:

سید النور خادم ہے اور سید البشر مخدوم ہے، مخدوم اعلیٰ ہوتا ہے اور خادم ادنیٰ

ہوتا ہے۔ تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مخدوموں کی فہرست میں سے نکال کر خدام کی فہرست میں نہ لاؤ۔ اس لیے ہم کہتے ہیں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بشر ہے اور نبی کے اوصاف سارے کے سارے نور ہیں۔

### انسان کی تخلیق مٹی سے:

آگے دوسری آیت میں فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا ۖ وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهُ ۚ ثُمَّ أَنْتُمْ تَمْتَرُونَ﴾

میں نے صرف ایک چھوٹا سا نکتہ بیان کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔

### موت کا مقرر وقت اللہ کے علم میں:

﴿ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا﴾ اور پیدا کرنے کے بعد تمہاری موت کا ایک وقت مقرر فرمادیا آگے پھر فرماتے ہیں: ﴿وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهُ﴾ اور ایک مقرر موت کا وقت اللہ کے پاس موجود ہے، بندہ سمجھتا ہے یہ عجیب جملہ ہے، پہلے فرمایا کہ تمہیں مٹی سے پیدا فرمایا اور موت کا وقت مقرر کر دیا پھر فرمایا: ﴿وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهُ﴾ اور ایک موت کا وقت مقرر ہے اللہ کے پاس موجود ہے۔

### عالم اجمالی اور عالم تفصیلی:

اصل وجہ یہ ہے کہ عالم دو قسم کے ہیں، ایک ہوتا ہے عالم اجمالی اور ایک ہوتا ہے عالم تفصیلی، بندے کا وجود یہ عالم اجمالی ہے اور پوری کائنات یہ عالم تفصیلی ہے ایک جہان بندے کا وجود ہے اور ایک جہان پوری کائنات ہے، بندے کا وجود ایک مستقل جہان ہے لیکن درجہ اجمال میں ہے لیکن پوری کائنات ایک مستقل جہان ہے جو

درجہ تفصیل میں ہے آپ پوری زمین کو دیکھ لیں یا کسی دیکھنے والے سے کہہ دیں جو جو چیزیں آپ کو زمین میں نظر آئیں گی ان سب کا نقشہ اللہ نے انسان کے وجود میں رکھا ہوا ہے۔

### حضرت انسان.....عالم اجمالی:

لوگ کہتے ہیں فلاں علاقے کی زمین چٹیل ہے، چٹیل کا معنی وہاں پر گھاس ہوتی ہی نہیں ہے، آدمی کے جسم میں ایسے حصے موجود ہیں جہاں بال ہوتے ہی نہیں ہیں۔ آپ تلوے کو دیکھ لیں یہاں بال اگتے ہی نہیں ہیں۔ کہتے ہیں جی فلاں ایسی زمین جہاں پر فصل اگتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے زمین بڑی شور ہے۔ بعضوں کے سر ایسے ہوتے ہیں کہ بال اگتے ہیں اور گر جاتے ہیں۔ اب دیکھو جو اقسام آپ زمین کی بتائیں گے وہ انسان کے جسم میں موجود ہیں اور جو آپ دریاؤں اور نالوں کی قسمیں بتائیں گے ناوہ انٹریوں کی شکل میں انسان کے جسم میں موجود ہیں۔ جو دنیا کے موسم ہیں ناکہیں گرم ہے کہیں سرد ہے انسان کے وجود میں بھی موجود ہیں کوئی حصہ گرم ہے کہیں سرد ہے ایسے ہے کہ نہیں؟ اچھا کہیں پانی جما ہوا ہے کہیں حرکت میں ہے۔ انسان کے وجود میں ہمہ وقت کہیں خون جما ہوا ہے جیسے انسان میں جو کبھی ہے یہ جما ہوا خون ہے کہیں حرکت والا خون ہے جتنے مناظر دنیا میں درجہ تفصیل میں موجود ہیں، وہ درجہ اجمال میں انسان کے جسم میں موجود ہیں۔

### قیامت بڑے جہان کی موت کا نام ہے:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے اور پھر موت کا وقت مقرر کر دیا ہے۔ ایک وقت موت کا میں نے جہان اجمالی کا رکھا ہے اور ﴿وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَنَا﴾ ایک وقت موت جہان تفصیلی کا رکھا ہے، جب انسان پر موت آتی

ہے تو یہ موت چھوٹے جہان کی ہے اور جب قیامت آئے گی تو موت بڑے جہان کی ہوگی، چھوٹے جہان کا نام انسان ہے اور بڑے جہان کا نام پوری کائنات ہے، موت انسان کے وجود پر بھی آتی ہے اور پوری کائنات پر بھی ہم جسے قیامت کہتے ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿ثُمَّ أَنْتُمْ تَمْتَرُونَ﴾ روزانہ تم مرتے ہوئے بندے دیکھتے ہو پھر بھی قیامت کے بارے میں شک کرتے ہو۔

### حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے تڑپ

﴿وَإِنْ كَانَ كِبَرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنْ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک وصف اللہ نے قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے: ﴿حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ﴾ میرے پیغمبر حریص ہیں تم لوگوں پر۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر طلب اور تڑپ تھی کہ میرا کوئی امتی جہنم میں نہ جائے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی طلب تھی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اتنا کڑھتے اتنا روتے اتنی محنت فرماتے اللہ رب العزت نے خود ارشاد فرمایا اے میرے پیغمبر اگر یہ ایمان قبول نہ کریں کیا ان کی فکر میں آپ اپنے آپ کو مار کے رکھ دیں گے؟

اے میرے پیغمبر آپ یوں نہ کریں، آپ اپنی صحت کا خیال فرمائیں جن کے مقدر میں ہدایت لکھی ہے وہ سیدھے رستے پر آجائیں گے اور جن کے مقدر میں ہدایت نہیں لکھی وہ نہیں آئیں گے۔

### فرمائشی معجزے طلب کرنا:

کفار آپ سے بعض فرمائشی معجزے طلب کرتے۔ ان کا ایک فرمائشی معجزہ

یہ بھی تھا اگر آپ اس فلاں پہاڑ کو سونے کا بنادیں تو ہم کلمہ پڑھ کے ایمان لے آئیں گے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش ہوتی یہ سونے کا بن جائے اور شاید یہ ایمان لے آئیں اور جنت میں چلے جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے پیغمبر تجھے بہت غم ہے اور صدمہ ہے اور تیری خواہش ہے کہ کوئی بھی فرمائشی معجزہ مل جانا چاہیے میرے پیغمبر اگر آپ کو بہت دکھ ہے نا آپ ان کے ایمان کے لیے بہت ہی حریص ہیں۔

### اللہ کی مشیت:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ﴾ اگر آپ کو اس بات سے بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے کہ یہ کیوں نہیں مانتے، ﴿فَإِنْ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلْمًا فِي السَّمَاءِ﴾ اے پیغمبر پھر آپ ایسا کریں ایک سیڑھی لے لیں اور آسمان پر چڑھ جائیں یا آپ ایک سرنگ بنائیں اور زمین میں اتر جائیں، ﴿فَتَأْتِيَهُمْ بَأْيَةٌ﴾ پھر ان کے لیے فرمائشی معجزے لے کر آجائیں۔ فرمایا نہیں میرے پیغمبر! ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَى﴾ اگر اللہ چاہتا تو یہ سارے ہدایت پر آجاتے لیکن سب کا ہدایت پر آنا اللہ کو منظور نہیں ہے اللہ نے اختیار دے دیا ہے اس اختیار سے یہ ایمان قبول کریں گے مومن بن جائیں گے نہیں قبول کریں گے تو کافر بن جائیں گے۔

### جو دلیل نہیں مانتے:

اس لیے میرے پیغمبر آپ اتنی فکر نہ کریں کہ جس سے آپ کے وجود اطہر کو خطرہ لاحق ہو جائے اللہ رب العزت نے نبی پاک کو تسلی بھی دی ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ان کے لیے فرمائشی معجزوں کی ضرورت نہیں ہے اس سے بہت بڑا اصول اور مسئلہ سمجھ آیا، مسئلہ کیا سمجھ آیا؟ بعض حضرات ضرورت سے زیادہ فکر مند ہوتے ہیں

مولوی صاحب اس لڑکے کی بات سنو۔ اچھا سن لی ہے، دلیل دی ہے نہیں مانتا پھر اور کوئی نئی دلیل دیں اچھا پھر کوئی اور خاص ٹائم اس کے لیے نکالیں۔ میں کہتا ہوں کہ دلائل سے سمجھا دیں، اللہ تعالیٰ ہدایت دیں تو بہت بہتر ورنہ اس کی فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔

### ابلیس کا تکبر اور حسد:

اللہ نے فرمایا: آدم کو سجدہ کرو۔ تمام ملائکہ نے سجدہ کیا، ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ اللہ نے فرمایا: ابلیس تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ ابلیس نے کہا: یا اللہ اس کو تو نے مٹی سے بنایا اور مجھے آگ سے بنایا میں اس سے افضل ہوں، کیونکہ مٹی اوپر پھینکو تو نیچے آتی ہے اور آگ نیچے پھینکو تب بھی اوپر جاتی ہے، میں اس سے افضل ہوں میں اس کو سجدہ کیوں کروں؟ یہ بتاؤ جو ابلیس نے دلیل دی تھی اللہ کو اس کا جواب نہیں آتا تھا؟ [آتا تھا۔ سامعین] پھر جواب دیا [نہیں۔ سامعین] کیا فرمایا: ”اُخْرِجْ“ دفع ہو جا میری جنت سے۔

### اگر سوال کرنے والا ضدی ہو تو.....:

ہر بات کا جواب نہیں دیتے یہ دیکھتے ہیں سوال کرنے والا ضدی ہے یا غلط فہمی کا شکار ہے؟ ابلیس ضدی تھا غلط فہمی کا شکار نہیں تھا جواب مل جاتا اس بے ایمان نے پھر بھی نہیں ماننا تھا۔ خدا نے فرمایا اس کو باہر نکال دو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے پیغمبر فرمائشی معجزے ان کو مت دکھائیں، یہ معجزے ماننے والے نہیں ہیں۔ میرے پیغمبر ان کا بات نہ ماننا اگر آپ کو گراں گزرتا ہے تو پھر آپ سیڑھی لیں اور آسمان پر چڑھ جائیں اور خود معجزہ لے کر آجائیں۔ اللہ نے اپنے پیغمبر کو سنایا ہے، مجھے اور آپ کو سمجھانے کے لیے بس آپ دلائل دیا کریں اور ضرورت سے زیادہ فکر مند نہ ہوا کریں آپ بلاوجہ فکر مند ہو جاتے ہیں۔

## گناہ اور مجلس گناہ دونوں سے بچیں:

﴿وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرِى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾

یہ مسئلہ ذہن میں رکھیں کہ جس طرح گناہ سے بچنا ضروری ہے اسی طرح گناہ کی مجلس سے بھی بچنا ضروری ہے، بعض لوگ خود تو گناہ نہیں کرتے لیکن گناہوں کی مجلسوں میں شرکت کر لیتے ہیں۔ اللہ رب العزت نے فرمایا: ﴿وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا﴾ جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات کے بارے میں مذاق بازی سے کام لیتے ہیں، تو پھر وہاں نہ بیٹھا کرو، ﴿فَاعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ﴾ وہاں سے اٹھ جایا کرو، وہاں مت بیٹھو ان سے الگ ہو جاؤ اس مجلس سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہیئے۔ اس سے پتا چلا جس طرح گناہ سے بچنا ضروری ہے اسی طرح گناہ کی مجلس سے بچنا بھی ضروری ہے۔

## عدی بن زید کا قیمتی شعر:

حضرت عدی بن زید کا ایک بہت قیمتی شعر ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ

عَنِ الْمَرْءِ لَا تَسْأَلُ وَالْبَصِيرُ قَرِينُهُ  
فَكُلُّ قَرِينٍ بِالْمُقَارِنِ يَفْتَدِي  
فَإِنْ كَانَ ذَا شَرٍّ فَيُجِيبُهُ سُرْعَةً  
وَإِنْ كَانَ ذَا خَيْرٍ فَقَارِنُهُ تَهْتَدِي

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ نہ دیکھا کرو کہ بندہ کیسا ہے یہ دیکھا کرو کن کے پاس بیٹھتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ بندہ ہو تو نیک اور مجلس جب بھی رکھے تو برے



لوگوں کی۔ اس کا معنی یہ ہے کہ مصنوعی تقویٰ ہے، اس میں غلاظت موجود ہے جو اس مجلس کے بغیر اس کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ تو جس طرح گناہ سے بچنا ضروری ہے اسی طرح گناہ کی مجلس سے بھی بچنا ضروری ہے۔

### مال نیک آدمی پر خرچ کریں:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیحت فرمائی ہے۔ فرمایا:

"لَا تُصَاحِبْ إِلَّا مُؤْمِنًا وَلَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ إِلَّا تَقِيًّا"<sup>121</sup>

جب بھی بیٹھو تو نیک آدمی کی مجلس میں بیٹھو، کبھی برے آدمی کی مجلس میں نہ بیٹھا کرو اور دوسری نصیحت فرمائی کہ اس بات کا اہتمام کرو کہ تمہارے مال کو کوئی ایسا آدمی نہ کھائے جو بد کردار ہو، کوشش کرو تمہارے مال کو ایسا آدمی کھائے جو نیک ہو اس کا اہتمام کرو کہ نیک آدمی کھائے۔

### مجلس نیک آدمی کی اختیار کریں:

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مثال سے کیسے سمجھایا ہے یہ بڑی سمجھنے والی مثال ہے جو فضائل اعمال میں موجود ہے۔ فضائل اعمال ہے تو فضائل اعمال لیکن کس کس چیز کے دلائل وہاں موجود ہیں، وہ کبھی فضائل اعمال پڑھنے والے عام آدمی کو خود کو بھی نہیں معلوم ہو گا کہ اس میں کون کون سی دلیل موجود ہے۔

### فضائل اعمال لا جواب کتاب ہے:

آپ حضرات کا بہت بڑا مکان ہے اور مکان کے باہر لان ہے اور ساتھ دو چار کنال جگہ بھی ہے۔ اب اس میں کئی جڑی بوٹیاں موجود ہوتی ہیں اس کا آپ کو پتا نہیں ہوتا، کبھی آپ کا مہمان آجائے اور وہ حکیم ہو تو اس کو پتا ہوتا ہے۔ فضائل اعمال والے

فضائل اعمال پڑھتے ہیں ان کو یہ پتا نہیں ہوتا اس میں کون سی دلیل ہے، ہم وہاں سے گزرتے ہیں، ہمیں اندازہ ہوتا ہے اس فضیلت میں دلیل کون سی شیخ نے لکھی ہے حضرت شیخ کا مزاج چونکہ بہت مثبت قسم کا تھا تو فضائل اعمال کے انداز میں اپنے مسلک کے دلائل شیخ نے ارشاد فرمادیے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے ایک آدمی کی دوستی خوشبو والے سے ہے اس کے پاس بیٹھے گا تو خوشبو ملے گی اگر اس کو خوشبو نہیں دے گا تو خوشبو سونگھتا تو رہے گا اور اگر کسی کی دوستی لوہار سے ہے تو اس کے جسم پر انگارے پڑیں گے اگر انگارے نہ بھی پڑ سکے تب بھی اس لوہے کی بھٹی کا دھواں اس کی ناک میں جاتا رہے گا۔ اچھی مجلس کی مثال ایسے ہے جیسے خوشبو والے کی دوستی ہے اور بری مجلس کی مثال ایسے ہے جیسے لوہے والے کی دوستی ہے یا بھٹی والے کی دوستی ہے۔ اللہ نے فرمایا جب ایسی مجلس موجود ہو تو وہاں نہ بیٹھا کرو۔

### عام آدمی اور قوم کا مقتدا:

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے فرمایا: کہ دو قسم کے لوگ ہیں اور یہ مسئلہ بڑا یاد رکھنے کا ہے۔ ایک ہے مقتدا اور ایک ہے عامی آدمی، بعض مسائل میں مقتدا کے لیے تو کوئی گنجائش نہیں ہوتی عامی آدمی کے لیے کچھ گنجائش ہوتی ہے۔ مثلاً ایک ایسی مجلس ہے جو خاندان میں ہے اگر یہ بندہ اٹھے تو اس کو یا مال کا خطرہ ہے یا جان کا خطرہ ہے یا آبرو کا خطرہ ہے اور یہ بندہ اس کا متحمل نہیں ہے کہ اپنی برادری کی اس رسم سے جان چھڑا سکے تو اس کے لیے اگر گنجائش نکل بھی آئے لیکن مذہبی رہنما کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

### خود کشی کرنے والے کی نماز جنازہ:

یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ اگر کوئی بندہ خود کشی کر کے مر جائے تو عام بندے کو

جنازہ پڑھ دینا چاہیے مگر مذہبی رہنما کو نہیں پڑھنا چاہیے۔ کیونکہ اگر مذہبی رہنماء پڑھیں گے، اس کی وجہ سے لوگ کہیں گے شاید خود کشی میں کوئی گنجائش ہے اس لیے اس کو قطعاً نہیں پڑھنا چاہیے۔ ہمیں اس کا بہت خیال رکھنا چاہیے اور یہ ضروری ہے۔

### فتویٰ اور تقویٰ:

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ امام صاحب کی چادر پر ہلکا سا دھبہ لگ گیا امام صاحب دھونے لگ گئے، ایک آدمی نے کہا: حضرت آپ تو خود فرماتے ہیں: اتنی مقدار کی گنجائش معاف ہوتی ہے اور اپنی چادر کا چھوٹا سا دھبہ بھی دھوتے ہیں۔ امام صاحب نے فرمایا: یہ مسئلہ عام آدمی کا ہے اور میں تمہارا امام ہوں۔ اس لیے مولویوں کے لیے بسا اوقات ان مسائل کی گنجائش نہیں ہوتی جس کی گنجائش آپ کے لیے ہوتی ہے۔

### عالم دین جہالت کا عذر ناقابل قبول:

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے بڑی پیاری بات لکھی ہے۔ فرمایا: اگرچہ جہالت ایک بہت بڑا جرم ہے اور عذر نہیں ہے۔ لیکن اس درجے میں عذر بن سکتا ہے کہ مجھے مسئلہ کا پتا نہیں تھا۔ بتاؤ عالم کیا عذر پیش کرے گا کہ مجھے پتا نہیں تھا۔ تو جہاں عالم کے فضائل بہت ہیں، وہاں اس کے جرائم پر سزائیں بھی سخت ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کو جرائم سے محفوظ رکھے اللہ ہمیں عافیت والی زندگی عطا فرمائے تو گناہ سے بچنا بھی ضروری ہے اور گناہ کی مجلس سے بچنا بھی ضروری ہے۔

### حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حق پر ثابت قدمی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک گفتگو اللہ رب العزت نے نقل فرمائی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں تین گفتگوئیں بڑی اہم ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک گفتگو ہے اپنے باپ سے، ایک اپنی قوم سے اور ایک ہے

بادشاہ سے۔ والد بھی مومن نہیں، قوم بھی مومن نہیں اور بادشاہ بھی مومن نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام اکیلے خدا کا نام لے کر ڈٹے ہوئے ہیں۔ یہ باتیں کہنی بہت آسان ہیں اور ان پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ بادشاہ وقت بھی مخالف ہے، ہمارے محلے کا ایس ایچ او مخالف ہو تو ہمارا پانی بند ہو جاتا ہے اور جب بادشاہ مخالف ہو تو بتاؤ کتنے بڑے حوصلے کی ضرورت ہے؟ جبکہ ابراہیم علیہ السلام ڈٹے رہے ہیں۔

### تخل اور برداشت کا فقدان:

ہم لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل چھوٹا کر لیتے ہیں میں یہ بات تمہیں کیسے سمجھاؤں دنیا کا باطل تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا میں کن لفظوں میں کس درد سے میں تمہیں یہ بات سمجھاؤں کہ کچھ نہیں بگڑتا، اپنا حوصلہ اور دل تھوڑا سا بڑا رکھا کرو۔

### مشکل اوقات میں استقامت کا مظاہرہ کریں:

مدد ہمیشہ حق والوں کے ساتھ ہے، تھوڑے سے جھٹکے لگتے ہیں۔ بیمار کو شفا ملتی ہے لیکن کچھ انجکشن لگتے ہیں۔ بیمار کو شفا مل جاتی ہے دو چار کڑوی گولیاں کھانی پڑتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کڑوی گولی بھی نہ کھائیں اور بخار اتر جائے یہ اللہ کے قانون کے خلاف ہے ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی ہو جاتا ہے لیکن قانون یہی ہے کیونکہ اللہ نے دنیا کو دارالاسباب بنایا ہے، کچھ اسباب اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ ہمارے حضرات تھوڑی سی مشقت آجائے تو بالکل پھسل جاتے ہیں تھوڑی سی مشقت ہو جائے تو فوراً ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

### مشکلات اہل حق اور اہل باطل دونوں کو پیش آتی ہیں:

اللہ رب العزت نے بڑی پیاری بات ارشاد فرمائی ہے، کبھی تم نے اس پر غور کیا ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا: اگر دین کے راستے میں کوئی مشکل آئی ہے تو مشکل تو تمہارے مخالف کو بھی آئی ہے، اگر زخم تمہیں لگے ہیں تو زخم تو ان کو بھی لگے ہیں،

اگر دودن تمہیں جانا پڑا تو دودن وہ بھی جائیں گے۔ فرق اتنا ہے کہ تم حق پر ہو اور وہ باطل والے ہیں، ان کے لیے عذاب ہو گا تمہارے لیے یہ ثواب ہے۔

### اللہ کے نام پر قربانی کا صلہ:

ابراہیم علیہ السلام کی کوئی چھوٹی محنت نہیں ہے۔ باپ مخالف، قوم مخالف اور بادشاہ بلکہ پوری کی پوری سلطنت مخالف ہے اور تنہا خدا کی زمین پر ایک بندہ ڈٹا ہوا ہے۔ جب تھوڑی سی قربانی دی ہے نا تو ہزاروں سال گزر گئے ہیں، ابراہیم علیہ السلام گزر گئے، دنیا میں کوئی کافر بھی اپنے بیٹے کا نام نمرود نہیں رکھتا لیکن مسلمان بیٹے کا نام ابراہیم رکھتے ہیں، دنیا میں کوئی کافر بھی اپنے بیٹے کا نام فرعون نہیں رکھتا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نام پر موسیٰ نام رکھتے ہیں، دنیا میں کوئی کافر بھی اپنے بیٹے کا نام ابو جہل نہیں رکھتا لیکن بلال نام رکھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا جو مقام ہے وہ دنیا کے بڑے بڑے فرعونوں کا مقام بھی نہیں ہے۔

### حضرت ابراہیم کی اپنی قوم سے گفتگو:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین گفتگوئیں ہوئی ہیں، ان میں ایک گفتگو جو اپنی قوم سے ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو یہاں ذکر فرمایا:

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبْنَيْهِ أَدْرَآكَ

اصل گفتگو آگے قوم سے جو ہے، وہ آرہی ہے یہ شروع میں باپ کا تذکرہ

ہے۔

### حضرت ابراہیم کے والد:

آزر کون تھا؟ بعض مفسرین کہتے ہیں: ابراہیم کے والد کا نام تھا تارخ، اور آزر اس کا لقب تھا۔ اور بعض مفسرین کہتے ہیں: نہیں ان کے چچا کا نام تھا آزر اور عربی

میں چچا کو باپ کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبْنَيْهِ أَرَدْتُ﴾ اپنے باپ سے کہا، اس سے مراد چچا ہے۔

### مشرک باپ کا توحیدی بیٹا:

اب ان دونوں میں سے جو بھی ہو، بہر حال اللہ نے فرمایا:

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبْنَيْهِ أَرَدْتُ أَخَذُ أَصْنَامًا إِلَهَةً إِنِّي أَرَاكَ وَ قَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾

اباجی آپ بت بناتے ہیں۔ اللہ اکبر! باپ بت بنا رہا ہے اور بیٹا دین کی دعوت دے رہا ہے، باپ مشرک بناتا ہے اور بیٹا توحیدی بناتا ہے، ﴿أَخَذُ أَصْنَامًا إِلَهَةً﴾ اور جملہ سنو! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا فرمایا: ﴿إِنِّي أَرَاكَ وَ قَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ اباجی! آپ اور آپ کی قوم دونوں گمراہی پر ہیں، میں تم کو دعوت دیتا ہوں خود کو اور ان کو کفر سے بچانے کی کوشش کرو۔

### حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت توحید:

ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو دلائل سمجھائے، اور دلائل وہ سمجھائے کہ ان کی قوم میں سے بعض وہ تھے جو بت پرست تھے، بعض لوگ ستاروں کی پوجا کرتے تھے۔ بعض لوگ چاند کی اور بعض سورج کی پوجا کرتے تھے ابراہیم علیہ السلام نے سب پر دلائل دیے۔

### ستارہ پرستی کی تردید:

جب رات ہوگئی ﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى كَوْكَبًا﴾ جب رات چھا گئی ستارہ نکل آیا فرمایا: ﴿هَٰذَا رَبِّي﴾ یہ میرا رب ہے؟ اے! قوم تم اسے خدا سمجھتے ہو؟

ابھی دیکھتے ہیں یہ ستارہ رہتا ہے یا نہیں اگر ڈوب گیا تو یہ رب نہیں ہے اور اگر چلتا رہا تو چلو تمہاری بات مانیں گے۔ ﴿فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْإِفْلِينَ﴾ جب وہ ستارہ ڈوبا تو فرمایا کہ ڈوبنے والے سے میں پیار نہیں کرتا۔

### حضرت تھانوی کی حکیمانہ تشریح:

حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ بیان القرآن میں لکھتے ہیں: یہ نہیں کہا کہ میں خدا نہیں مانتا یہ فرمایا میں محبت نہیں کرتا کیوں آدمی جسے خدا مانتا ہے اس سے محبت بھی کرتا ہے کیسے پیارے انداز میں بات کی ہے۔ یوں نہیں فرمایا میں خدا نہیں مانتا۔ فرمایا: جس سے میں محبت کرنا گوارہ نہیں کرتا اسے خدا ماننا گوارہ کر لوں گا؟ جس کو محبوب بنانا مجھے پسند نہیں ہے اس کو خالق بنانا میں پسند کر لوں گا؟ میں اس کو نہیں مانتا۔

### چاند پرستی کی تردید:

﴿فَلَمَّا رَا الْقَمَرَ بَازِعًا﴾ پھر دیکھا چاند کو وہ ستارے کی نسبت کچھ روشن تھا پھر کہا: ﴿هَذَا رَبِّي﴾ یہ میرا خدا ہے، ﴿فَلَمَّا أَفَلَ﴾ جب وہ بھی ڈوبا تو پھر فرمایا: ﴿لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ﴾ اے میری قوم! اگر خدا نے رہنمائی نہ کی تو پھر میں بھی تمہاری طرح گمراہ ہو جاؤں گا۔ خدا نے مجھے سمجھایا ہے کہ یہ چاند میرا خدا نہیں ہے۔

### سورج پرستی کی تردید:

﴿فَلَمَّا رَا الشَّمْسُ بَازِعَةً قَالَ هَذَا رَبِّي﴾ جب سورج چمک رہا تھا تو فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے یہ رب ہے؟، ﴿هَذَا أَكْبَرُ﴾ یہ تو بہت بڑا ہے، ﴿فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَقَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ﴾ جب سورج بھی ڈوب گیا تو فرمایا:

میں بری ہوں تمہارے شرک سے میں بے زار ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام دلیلیں دے دے کے اپنی قوم کو سمجھا رہے تھے کہ ڈوبنے والا کبھی خدا نہیں ہو سکتا۔

### قبر کے تین سوال:

اس سے ایک چھوٹا سا نکتہ سمجھیں!

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ جب بندہ قبر میں رکھا جاتا ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اس سے سوال کرتے ہیں: "مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟" <sup>122</sup> اس شخص یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو کیا کہتا تھا؟ یہ میں صحیح بخاری کے الفاظ پڑھ رہا ہوں، بعض کتابوں میں "مَنْ نَبِيِّكَ؟" کے الفاظ بھی آتے ہیں کہ تیرا نبی کون ہے؟

اور صحیح بخاری میں یہ الفاظ ہیں: "مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟" اس سے اہل بدعت استدلال کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حاضر اور ناظر ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ پر ہیں۔ دلیل کیا ہے؟ کہتے ہیں میت ہے سرگودھا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مدینہ میں جیسے تم اہل السنۃ والجماعۃ دیوبند والے کہتے ہو، پھر تو فرشتے کو یوں کہنا چاہیے تھا: "مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي ذَٰلِكَ الرَّجُلِ؟" عربی زبان میں دو لفظ ہیں: ایک ہے "هَذَا" اور دوسرا ہے "ذَٰلِكَ"، اگر چیز قریب ہو تو "هَذَا" کہتے ہیں اور اگر دور ہو تو "ذَٰلِكَ" کہتے ہیں۔ "هَذَا" کا معنی یہ اور "ذَٰلِكَ" کا معنی وہ۔ یہ اصول تو ٹھیک ہے نا۔ تو پھر فرشتہ کہتا ہے: "مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ" اس شخص کے بارے میں تو کیا کہتا تھا؟



## نبی کو حاضر و ناظر ثابت کرنے کی مبتدعانہ کوشش:

اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول قبر میں آتے ہیں تبھی تو ”هَذَا“ کہتا ہے، اگر قبر میں نہ آتے ہوتے اور مدینہ منورہ میں ہوتے تو کہتا: ”مَا كُنْتُ تَقُولُ فِي ذٰلِكَ الرَّجُلِ؟ ان کے بارے میں تو کیا کہتا ہے؟ لہذا فرشتے کا لفظ ”هَذَا“ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قبر میں ہیں، اور ایک وقت میں ایک بندہ فوت نہیں ہوتا، ایک وقت میں لاکھوں بندے فوت ہوتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ رسول لاکھوں قبروں میں تشریف لاتے ہیں یہی معنی تو حاضر و ناظر کا ہوا۔

## اہل بدعت کی دلیل کا جواب:

اب دلیل کا جواب سمجھنا۔ میں نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام زمین پر ہیں اور ستارہ آسمان پر ہے۔ زمین اور ستارے کے درمیان کروڑوں کلو میٹر کا فاصلہ ہے اور سرگودھا اور مدینہ منورہ کے درمیان ہزاروں کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ ﴿فَلَمَّا بَلَغَ عَلَيْهِ الثَّمَلُ قَالَ هَذَا رَبِّي﴾ جب رات چھا گئی تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿هَذَا رَبِّي﴾ یہ ہے میرا رب؟ میں نے کہا: اگر قریب والے کو ”هَذَا“ اور دور والے کو ”ذٰلِكَ“ کہتے ہیں تو ستارہ تو ابراہیم علیہ السلام سے کروڑوں کلو میٹر کے فاصلے پر تھا تو پھر ”هَذَا“ کے بجائے ”ذٰلِكَ“ کہنا چاہیے تھا لیکن قرآن نے فرمایا ”هَذَا“۔ تو پتا چلا کہ جس طرح قریب والے کو ”هَذَا“ کہتے ہیں اسی طرح دور والے کو بھی ”هَذَا“ کہتے ہیں۔

## قرآن کریم اور عربی گرائمر:

کہنے لگا: نہیں نہیں! یہ تو نحو کے خلاف ہے، گرائمر کے خلاف ہے گرائمر کا ضابطہ تو یہ ہے قریب والے کو یہ، دور والے کو وہ کہتے ہیں، قریب والے کو ”هَذَا“ اور

دور والے کو ”ذٰلِكَ“ میں نے کہا: قرآن گرا نمر کے خلاف نہیں ہے۔ اس گرا نمر کے اصول کے نیچے ایک اصول اور ہے، وہ تو نے نہیں پڑھا اس لیے تجھے الجھن پیش آئی ہے، اگر جس چیز کو دیکھا جائے اور دیکھنے والا ان دونوں کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ ہو کوئی پردہ نہ ہو، کوئی حجاب نہ ہو دور بھی ہو تب بھی ”ہٰذَا“ کہتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام زمین پر ہیں ستارہ آسمان پر ہے درمیان میں رکاوٹ کوئی نہیں ہے تو ”ہٰذَا“ فرمایا ہے میت یہاں سر گودھا میں ہے نبی مدینہ میں ہے درمیان میں پردہ نہیں ہے تو ”مَا كُنْتُ تَقُولُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ“ فرمایا ہے۔ میں نے کہا یہ نہ کہو کہ دیوبند والوں کے پاس دلیل نہیں ہے۔

### ضابطہ در ضابطہ:

تو نے ایک ضابطہ سنا ہم نے ضابطے کے نیچے ضابطہ تھا وہ بھی سنا دیا ہے، صرف ضابطہ نہیں ضابطے کی تہہ میں ایک ضابطہ ہوتا ہے ہمیں اس کا بھی علم ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یوں اپنی قوم کو سمجھایا۔

### ایمان اور ظلم کی آمیزش:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ

هُمْ مُّهُتَدُوْنَ﴾

آیت کا مطلب جو لوگ ایمان لائے اور پھر ایمان کے ساتھ ظلم کو ملایا نہیں ہے، انہیں امن بھی ملے گا ہدایت بھی ملے گی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن کو سمجھتے تھے عربی تھے نا، اور پریشان ہو جاتے، ہم نہ سمجھتے ہیں نہ پریشان ہوتے ہیں۔ قاری صاحب نے کیا پڑھا، نہ سمجھ آئی نہ پریشانی ہوئی، ہنتے ہوئے آئے ہنتے ہوئے چلے گئے۔

## ظلم سے کیا مراد ہے؟

صحابہ عربی جانتے تھے فوراً پریشان ہو جاتے۔ پریشانی کیا لگی؟ قرآن کہتا ہے:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ﴾<sup>(۱)</sup> جو ایمان لائے اور ایمان کے ساتھ ظلم کو نہ ملایا انہیں امن بھی ملے گا ہدایت بھی ملے گی۔ کہا: یا رسول اللہ! ”اَيُّنَا لَمْ يَظْلَمْ نَفْسَهُ؟“ اللہ کے نبی! ظلم کا معنی کمی کو تاہی ہے۔ ہم میں سے وہ کون سا بندہ ہے جو کمی کو تاہی نہ کرے اس کا کیا مطلب کہ ہمیں ہدایت نہیں ملے گی؟ صحابہ پریشان ہو گئے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہاں ظلم کا معنی وہ نہیں جو تم سمجھے ہو یہاں ظلم کا معنی اور ہے۔ سورہ لقمان میں ہے حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو وصیت کی ہے: ﴿يَبْنِي لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾<sup>(۲)</sup> جو ظلم کو شرک کہا۔ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔<sup>123</sup>

اب آیت کا معنی ہو گا: ”الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُشْرِكُوا بِاللَّهِ شَيْئًا“ کہ جو شخص ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ شرک کو نہ ملائے اسے امن بھی ملے گا، اسے ہدایت بھی ملے گی۔

## قرآن سمجھنے کا اصول:

اس سے ایک اصول نکلا ہے۔ توجہ رکھیں! قرآن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کو قرآن کا پس منظر معلوم ہو اور پس منظر معلوم ہوتا ہے پیغمبر کے صحابہ سے، صحابہ ہوں گے تفسیر سمجھ آئے گی صحابہ نہیں ہوں گے تفسیر سمجھ نہیں آئے گی صحابہ کو چھوڑ کر تفسیر سمجھ آہی نہیں سکتی کیونکہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بتائیں

گے کہ یہ کس موقع پر آیت نازل ہوئی ہے، اترتی دیکھی جو انہوں نے ہے ان کے علاوہ کون بتا سکتا ہے۔

### کیا اللہ کو دیکھا جاسکتا ہے؟

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾

آیت کا مطلب: کوئی آنکھ بھی خدا کو نہیں دیکھ سکتی، اللہ ساری آنکھوں کو دیکھتے ہیں اللہ لطیف بھی ہے اللہ رب العزت نے فرما دیا اور اللہ خبیر بھی ہے اور لطیف بھی ہیں۔ خبیر کا معنی تمہارے معاملات کی خبر رکھتے ہیں۔ لطیف کا معنی بڑے باریک بین ہیں کوئی ذرہ بھی خدا کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہے پہلے آیت کا ترجمہ سن لیں کوئی آنکھ بھی خدا کو نہیں دیکھ سکتی اللہ ساری آنکھوں کو دیکھتے ہیں۔

### کیا رویت باری تعالیٰ کا عقیدہ حدیث کے خلاف ہے؟

گمراہ لوگوں کا ایک نظریہ کیا ہے پہلے اصول ٹھیک بیان کریں گے اس پر مسئلے غلط چڑھائیں گے۔ پہلے اصول سمجھنا! اصول بیان کریں گے جی پہلے قرآن ہے پھر حدیث ہے، اگر حدیث قرآن کے مقابلے میں آجائے قرآن کو لیتے ہیں حدیث کو چھوڑ دیتے ہیں۔ سمجھ آگئی [جی ہاں۔ سامعین] یہ پہلے اصول بیان کریں گے پھر اگلا مسئلہ کہیں گے جی علماء دیوبند کے بعض عقیدے ہیں جو ایسی حدیث سے ثابت ہیں جو حدیث قرآن کے خلاف ہے، اب یہاں یہ دیوبند کے عقیدوں پر رگڑا لگائیں گے اور بحث شروع ہو جائے گی۔ اس آیت کی روشنی میں ایک مسئلہ اور جواب سمجھنا۔

### اہل السنۃ والجماعت کا نظریہ:

ہمارا نظریہ ہے امت مصطفیٰ کو دیکھتی ہے اور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کو دیکھتے ہیں، امت نے مصطفیٰ کو دیکھا اور مصطفیٰ نے خدا کو دیکھا۔ ایک شخص تقریر

کر رہا تھا۔ کہتا ہے: دیوبند کا عقیدہ بالکل غلط ہے۔ میں نے کہا: میرا عقیدہ حدیث سے ثابت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

إِنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ رَأَى رَبَّهُ. <sup>124</sup>

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا ہے۔

### حدیث مبارک پر اعتراض کا جواب:

کہنے لگایہ حدیث قرآن کے خلاف ہے۔ میں نے کہا: کون سی آیت ہے۔ کہتا ہے: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْبَصَارُ﴾ کہ کوئی آنکھ بھی خدا کو نہیں دیکھ سکتی، تو جب کوئی بھی آنکھ نہیں دیکھ سکتی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ میں نے کہا: اپنی بات پر قائم رہنا۔ خدا تجھے ہدایت دے اور ہدایت کے بعد جنت میں جگہ دے۔ ہم تبلیغ والے ہیں ہم بد دعائیں نہیں کرتے ہم تمہیں بھی دعائیں دیتے ہیں، ہم رائے ونڈ والے ہیں ہمارے ہاں بد دعائیں ہوتی۔

میں نے کہا: تو جنت میں جائے اور وہاں جا کے خدا کو دیکھے گا۔ کہتا ہے: جی ہاں۔ میں نے کہا: کہاں لکھا ہے۔ کہا: جی حدیث میں ہے۔ میں نے کہا: میں نہیں مانتا۔ مجھے کہتا ہے: کیوں؟ میں نے کہا: قرآن کے خلاف ہے۔ کہتا ہے: یہ قرآن کے خلاف نہیں ہے۔ میں نے کہا: کیوں نہیں ہے۔ تو کہا اس آیت کا مطلب ہے زمین پر رہتے ہوئے کوئی خدا کو نہیں دیکھ سکتا، میں زمین پر نہیں جنت میں جا کے دیکھوں گا۔

### حضور علیہ السلام نے اللہ کی زیارت کہاں کی؟

میں نے کہا: ہم نے کب کہا کہ مصطفیٰ نے زمین پر دیکھا ہے، ہم بھی کہتے ہیں مصطفیٰ نے عرش معلیٰ پر جا کے دیکھا ہے۔ [سبحان اللہ۔ سامعین] میں نے کہا: تیری

حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہے تو ہماری حدیث کیسے قرآن کے خلاف ہے۔ بس ضد ہے۔ حدیث آپ کی نہیں مانتی آپ میری مانتیں۔ ہم دونوں مانتے ہیں تیری بھی مانتے ہیں اپنی بھی مانتے ہیں۔ امتی جنت میں جائے گا وہ خدا کو دیکھے گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر گئے ہیں تو خدا کو دیکھا ہے۔

### دعوت دین کا نبوی طرز:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾<sup>125</sup>

اللہ نے ضابطہ بیان کر دیا۔ مشرکین مکہ ابو جہل اینڈ کمپنی ابوطالب کے پاس آئے اور کہا اپنے بھتیجے کو سمجھائیں، ہمیں اس کی دعوت پر اعتراض نہیں ہے، بس ہمارے معبودوں کو اور ہمیں کچھ نہ کہے۔ ابوطالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا کہا: بھتیجے یہ تیری شکایت لے کر آئے ہیں۔

فرمایا: چچا میں کہتا ہوں "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" پڑھ لو عرب و عجم تمہارے غلام بن جائیں گے۔ میرے اللہ نے قرآن کی آیت اتاری ہے میرے نبی جو تیرا طرز ہے نایہ طرز امت کو تو سمجھا دے، ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ تم معبودان باطلہ کو گالیاں دو گے وہ تمہارے سچے خدا کو گالیاں دیں گے۔ کسی کے جھوٹے خدا کو گالی مت دو تاکہ تمہارا سچا خدا گالی سے بچ جائے۔

### اپنے ماں باپ کو گالی:

ایک حدیث میں آتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے ماں

باپ کو گالیاں مت دو۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! بھلا کوئی ماں باپ کو گالیاں دے سکتا ہے؟ فرمایا: جی ہاں۔ جب تم کسی کی ماں کو گالیاں دو گے وہ تمہاری ماں کو گالیاں دے گا، کسی کے باپ کو گالی دو گے وہ تمہارے باپ کو گالی دے گا۔ اگر اپنی ماں اور اپنے باپ کو گالی سے بچنا چاہتے ہو تو دوسرے کی ماں اور باپ کو گالی مت دو۔<sup>126</sup>

**اللہ کو نہ ماننا اور اللہ کی نہ ماننا:**

﴿إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

اللہ رب العزت نے اس سورت کے اختتام پر ہمیں درس دے دیا ہے کہ بندے دو قسم کے ہیں۔ بعض اللہ کو ماننے والے اور بعض اللہ کو نہ ماننے والے، بعض اللہ کی ماننے والے اور بعض اللہ کی نہ ماننے والے، ان دو لفظوں میں غور کرنا بعض لوگ اللہ کو نہیں مانتے، بعض اللہ کی نہیں مانتے۔ کافر اللہ کو نہیں مانتا، مسلمان اللہ معاف فرمائے اللہ کی نہیں مان رہا۔ اللہ کو بھی مانو اللہ کی بھی مانو۔

**تبلیغی جماعت کی محنت کا دائرہ:**

میں اس پر ایک چھوٹی سی بات کہتا ہوں، ہمارے لوگ بھی اعتراض کرتے ہیں جماعت والوں پر، ہمیں دعوت دیتے ہو ہندوؤں کو دعوت دو، ہمیں مسلمان بناتے ہو سکھوں کو دعوت دو، ہم کہتے ہیں کہ تمہیں کیوں غلط فہمی ہے، وہ اللہ کو نہیں مانتا، تو اللہ کی نہیں مانتا، وہ رسول کو نہیں مانتا ظلم یہ ہے کہ تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں مانتا۔ انہیں کہیں گے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مانو تمہیں کہیں گے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مانو۔ ان کو اور دعوت دیں گے تجھے اور دعوت دینی ہے، ان والی دعوت اور ہے تیرے والی دعوت اور ہے۔

## اللہ غفور بھی ہیں اور رحیم بھی:

فرمایا: ﴿إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ﴾ جو آدمی نہ مانے تو خدا سخت اور تیز اور جلدی سزا دے سکتا ہے، ﴿وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ جو مان لے اور توبہ کر لے اللہ پھر معاف بھی کرتے ہیں۔ ”رَحِيمٌ“ یہ ”غَفُورٌ“ کی علت بیان کی ہے یعنی اللہ اس لیے تمہیں معاف نہیں کرتے کہ معافی تمہارا حق ہے بلکہ اس لیے معاف کرتے ہیں کہ اللہ کو رحیم کہتے ہیں۔ اب میں علماء کے لیے ایک جملہ کہنے لگا ہوں۔ قرآن کریم میں اللہ جب بھی دو صفتیں اکٹھی ذکر فرمائیں تو پہلی صفت دعویٰ ہوتی ہے اور دوسری صفت دلیل ہوتی ہے۔ ”غَفُورٌ“ دعویٰ ہے ”رَحِيمٌ“ دلیل ہے۔ اللہ تمہیں معاف کرے گا، اس لیے نہیں کہ تمہارا حق ہے اس لیے کہ اللہ رحیم ہے۔

## حضرت تھانوی کا خوبصورت فرمان:

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے ہم اللہ سے جنت مانگتے ہیں اس لیے نہیں کہ ہم جنت کے مستحق ہیں بلکہ اس لیے مانگتے ہیں کہ ہم جہنم کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اللہ ہم سب کو جہنم سے محفوظ رکھے ہمیں جنت کی نعمت عطا فرمائے۔

وَاحْزِرْ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



## سورة الاعراف

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْمَصِّ ۝ كَتَبْنَا أَنْزِلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَرَجٌ مِنْهُ  
لِتُنْذِرَ بِهِ وَذِكْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا  
تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝﴾

تمہید:

قیامت کے دن میدان حشر میں تین قسم کے لوگ ہوں گے، انسانیت تین طبقات میں تقسیم ہوگی:

1: اصحاب الجنة، 2: اصحاب النار، 3: اصحاب الاعراف۔

جنت، جہنم کا نام تو سنا ہے، اعراف کا نام بعض لوگوں نے سنا ہے اور بعض لوگوں نے نہیں سنا، قیامت کے دن تین قسم کے لوگ ہوں گے، بعض وہ کہ جن کے نیک اعمال زیادہ ہیں اور بعض وہ کہ جن کے گناہ اور اعمال بد زیادہ ہیں، اور بعض وہ کہ جن کے نیک اعمال اور برے اعمال مساوی (برابر) ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جن کے نیک اعمال زیادہ ہوں گے ان کو جنت میں بھجوا دیں گے اور وہ لوگ جن کے اعمال بد زیادہ ہوں گے ان کو جہنم میں بھجوا دیں گے۔ اور وہ لوگ جن کے نیک اعمال اور برے اعمال برابر ہوں گے ان کو اعراف میں رکھا جائے گا۔

## اعراف کسے کہتے ہیں؟:

اعراف ”عُرْف“ سے ہے، ”عُرْف“ کا معنی ہوتا ہے تعارف۔ عرف، اعراف کا مطلب جنت اور جہنم کے درمیان ایک دیوار ہے، اس دیوار کے بالائی حصہ کا نام اعراف ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں، اعراف ہے عرف سے، عرف کہتے ہیں تعارف اور معروف کو، جو چیز بلندی پر ہو وہ معروف ہوتی ہے اور پہچان لیا جاتا ہے، چونکہ قیامت کے روز بعض لوگ وہ ہوں گے جو اس بالائی دیوار پر ہوں گے، ان کے جتنے گناہ ہیں اتنے ہی نیک اعمال ہوں گے۔

نیک اعمال زیادہ تو اصحاب جنت اور گناہ زیادہ ہوں تو اصحاب النار اور اگر نیک اعمال اور گناہ برابر ہیں تو اصحاب اعراف۔ جنت میں جانے والوں کو اصحاب الجنة کہتے ہیں اور جہنم میں جانے والوں کو اصحاب النار کہتے ہیں اور اس دیوار پر رہنے والوں کو اصحاب الاعراف کہتے ہیں۔

## وجہ تسمیہ سورۃ:

تو اس سورۃ کا نام اعراف کیوں ہے؟ اس لیے کہ اس میں اعراف کا تذکرہ ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ اس میں تو اصحاب الجنة بھی ہیں اور اصحاب النار بھی ہیں، تو نام اصحاب الجنة اور اصحاب النار رکھنے کے بجائے اعراف کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اعراف درمیانی چیز ہے، جنت ایک طرف اور جہنم ایک طرف، درمیان میں اعراف ہے، تو درمیان میں اعراف ہونے کی وجہ سے اس سورۃ کا نام اعراف رکھا گیا ہے، اس میں اعراف کا مستقل تذکرہ ہے۔

اور قرآن کریم میں تینوں طبقات کا تذکرہ کیا گیا ہے: ﴿وَنَادَىٰ أَصْحَابُ

الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ أَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جنت والے جہنم والوں سے کہیں گے جو خدا نے ہم سے وعدہ کیا ہم نے اس کو سچا پایا، ﴿فَهَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا﴾

جو خدا نے تمہارے ساتھ جہنم کا وعدہ کر لیا تھا آج تم نے پایا؟ جہنم والے کہیں گے تم سچ کہتے ہو ہم دنیا میں نہ اس بات کو مانتے تھے اور نہ سمجھتے تھے، لیکن آج یہ پتا چلا ہے کہ خدا کی جنت کی بات بھی سچی ہے اور جہنم کی بات بھی سچی ہے۔

جہنم والے کہیں گے: ﴿وَنَادَىٰ أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ﴾

جہنم والے جنت والوں سے کہیں گے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں نعمتیں عطا فرمائی اور پانی جو تم کو دیا ہے اس میں سے کچھ ہمیں بھی دے دیں، جنت والے کہیں گے یہ جنت کی نعمتیں اللہ تعالیٰ نے جہنم والوں پر حرام قرار دی ہیں، یہ جنت کی نعمتیں تمہیں مل نہیں سکتیں۔

اعراف والوں کا تذکرہ ہے: ﴿وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا

يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ﴾

کہ یہ جو اعراف والے ہیں یہ جنت والوں کو بھی پہچانتے ہیں اور جہنم والوں کو بھی پہچانتے ہیں۔ جنت والوں سے کہیں گے: ﴿سَلِّمْ عَلَيْنَا﴾ ان کا دل یہ چاہے گا کہ جنت میں داخل ہوں، لیکن یہ جانیں سکیں گے۔ کیونکہ گناہ ان کے نیک اعمال کے برابر ہوں گے اور جب جہنم والوں کو دیکھیں گے اس وقت کہیں گے: ﴿أَلَا لَعْنَةُ

اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ﴾

**اعراف والے آخر کار جنت میں:**

لیکن ایک وقت آئے گا اللہ تعالیٰ اعراف والوں کو بھی جنت میں داخل

فرمادیں گے۔ یہ پھر بھی خوش قسمت ہیں کہ آخر ان کو جنت ہی میں چلے جانا ہے۔ اب دو طبقے رہ جائیں گے بعد میں، جنت والے اور جہنم والے، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو جنت والا بنائے (آمین۔ سامعین)

### کریم ذات کسے کہتے ہیں؟

ہم بے شک مجرم، نالائق اور گناہ گار ہیں، لیکن اپنے اعمال کے بجائے اللہ تعالیٰ کی رحمت پہ نظر رکھنی چاہیے کہ کریم کہتے ہی اسے ہیں جو نالائقوں کو عطا فرمائیں، جو مستحق کو دے اسے کریم نہیں کہتے، کریم اسے کہتے ہیں جو غیر مستحقین کو عطا فرمائیں، ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اے اللہ آپ کریم ہیں ہم جنت کے مستحق نہیں ہیں، آپ اپنے فضل اور کرم سے ہمیں بھی جنت میں جگہ عطا فرمائیں۔

### مقطعات کسے کہتے ہیں؟

﴿الْمَصَّ﴾ انہیں عربی زبان میں حروف مقطعات کہتے ہیں۔ مقطعات کیوں کہتے ہیں؟ حروف جمع ہے حرف کی، مقطعات جمع ہے مقطعة کی، اور مقطعة بنا ہے قطع سے، قطع کا معنی ہوتا ہے کاٹنا، چونکہ یہ وہ حروف ہیں جن کو الگ الگ کر کے پڑھا جاتا ہے، ایک کو دوسرے سے کاٹ کے پڑھا جاتا ہے، اس لیے ان کو مقطعات کہتے ہیں۔ مثلاً دیکھئے: ﴿الْمَصَّ﴾ ۱ کِتْبُ اُنْزِلَ ۲ اب ”کِتْبُ“ اس کو یوں نہیں پڑھتے کہ ک، ت، ب، الگ الگ کر کے، بلکہ اس کو ملا کر ”کِتْبُ“ پڑھتے ہیں، اسی طرح ”اُنْزِلَ“ کو الگ الگ، ا، ن، ز، ل، یوں نہیں پڑھتے بلکہ ملا کر ”اُنْزِلَ“ پڑھتے ہیں۔ لیکن ”الْمَصَّ“ کو ملا کر نہیں پڑھتے بلکہ ”الف“ کو الگ پڑھتے ہیں، ”لام“ کو الگ پڑھتے ہیں، ”میم“ کو الگ پڑھتے ہیں اور ”صاد“ کو الگ پڑھتے ہیں۔ یہ حروف جو الگ الگ پڑھے جاتے ہیں ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں۔

## حروف مقطعات؛ متشابہات میں سے ہیں:

ان کے بارے میں مفسرین علیہ الرحمہ کا فیصلہ ہے کہ یہ حروف مقطعات متشابہات میں سے ہیں۔ متشابہات قرآن کریم کی ان آیات کو کہتے ہیں کہ جن کا معنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان راز ہیں۔ اس لیے بندے کو اس راز میں دخل دینے کی ضرورت ہی نہیں۔ مقطعات، متشابہات اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہے۔ اس لیے ایک عام آدمی کو اس راز میں دخل دینا ہی نہیں چاہیے۔

بعض حضرات کے ذہن میں ایک سوال آتا ہے کہ جب ان کا معنی کوئی بندہ جانتا ہی نہیں تو ان کے نازل کرنے کا فائدہ کیا ہے؟ اس کے علماء نے کئی جوابات دیئے ہیں، آپ بنیادی طور پر دو جواب ذہن نشین فرمائیں۔

## اہل علم کے امتحان کے لیے:

پہلا جواب یہ ہے کہ ایک امتحان عالم کا ہے اور ایک امتحان غیر عالم کا ہے، غیر عالم سے کہتے ہیں پڑھو اور عالم سے کہتے ہیں کہ بس کرو، رکو۔ عالم کا امتحان کیا ہے؟ بس کرو، اور غیر عالم کا امتحان کیا ہے؟ پڑھو۔ اگر کوئی بچہ محنت نہ کرے اسے آپ کہتے ہیں بیٹا! عشاء کے بعد پڑھا کرو۔ اور کوئی بچہ بہت پڑھے اسے آپ کہتے ہیں بیٹا! تھوڑی دیر سویا بھی کرو۔

تو دونوں کو الگ الگ بات کہتے ہیں نا! نہ پڑھنے والے سے کہتے ہیں پڑھا کرو اور پڑھنے والے سے کہتے ہیں تھوڑی دیر سویا بھی کرو۔ تو غیر عالم سے کہتے ہیں دین کا علم حاصل کر لیا کرو، اور عالم سے کہتے ہیں کہ کسی جگہ رکا بھی کرو۔ تو غیر عالم کا امتحان یہ ہے کہ پڑھا کریں اور عالم کا امتحان یہ ہے کہ بعض جگہوں پہ رک جائے۔

﴿الْمَصَّ﴾ کا معنی جب اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو معلوم ہی نہیں ہے تو علماء

کو چاہیے کہ یہاں رک جائیں اور اس کے معانی بیان کرنے کی ہمت نہ کریں۔ بعض لوگ بلاوجہ اپنا علم جھاڑنے کے لیے ان کے معانی بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب سے بہترین بات یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان راز ہے، اس کا معنی ہمیں معلوم نہیں ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور مان لیتے ہیں۔ تو یہ مقطعات غیر علماء کے امتحان کے لیے نہیں ہیں بلکہ علماء کے امتحان کے لیے ہیں۔

### گمراہی سے بچنے کے لیے:

اس کا دوسرا جواب سمجھیں کہ ایک امتحان اللہ تعالیٰ یوں لیتے ہیں کہ عام آدمی کو ناز ہوتا ہے اپنی گمراہی پر، عام آدمی کو ناز ہے اپنی ادبیت پر، لوگ گمراہ کیوں ہوتے ہیں؟ بعض لوگ گمراہ ہوتے ہیں اپنی کم علمی کی وجہ سے، اور بعض لوگ گمراہ ہوتے ہیں زیادتِ علم کی وجہ سے۔ بعض لوگ گمراہ ہوتے ہیں کم علمی کی وجہ سے اور بعض لوگ گمراہ ہوتے ہیں علم کے زیادہ ہونے کی وجہ سے۔ بعضوں کا دماغ تھوڑا ہوتا ہے اور علم زیادہ ہونے کی وجہ سے ان سے سنبھلا نہیں جاتا، اس لیے وہ اپنے اکابرین کے خلاف بولنا شروع کر دیتے ہیں، علماء کے خلاف بولنا شروع کر دیتے ہیں۔

### کون کیسے گمراہ ہوتا ہے؟:

تو بعض گمراہ ہوتے ہیں علم کے نہ ہونے سے اور بعض گمراہ ہوتے ہیں علم کے زیادہ ہونے سے اور یہ علم کے زیادہ ہونے والا گمراہ کب ہوتا ہے؟ جب یہ علم مطالعے سے حاصل کر لیتا ہے، علم کسی استاذ کے سامنے دوزانو بیٹھ کر حاصل نہیں کرتا۔ اگر علم حاصل کریں کتابوں سے پھر شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں، اور جب استاذ سے علم حاصل کریں تو شکوک و شبہات ختم ہو جاتے ہیں۔ آدمی جہاں پھنس جاتا ہے استاذ سے پوچھ لیتا ہے اور اس کو کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا، اگر استاذ سے رابطہ نہ ہو شبہ پیدا ہو گا

اور اس شبہ کو پکا کر لے گا، آئندہ مزید امت کو گمراہ کرنا شروع کر دے گا۔

### اہل علم کی آزمائش:

تو یہ آیات مقطعات، تشابہات کیوں ہیں؟ ان آیات میں اللہ تعالیٰ علماء کو بتانا چاہتے ہیں کہ تم نے عربیت اور ادب پہ ناز کیا کرنا ہے تمہارا علم تو اتنا ہے کہ تمہیں ”الف“ کا معنی بھی نہیں آتا۔ تم نے کیا کرنا ہے تمہارا علم تو یہ ہے کہ تمہیں تو ”لام“ کا معنی بھی نہیں آتا، تمہیں ”میم“ کا معنی بھی نہیں آتا، اور تمہیں ”صاد“ کا معنی بھی نہیں آتا۔ تم ہمارے علم کے مقابلے میں اتنا تھوڑا علم رکھتے ہو کہ الف اور لام کا معنی بھی نہیں جانتے۔

### عاجزی کا اعتراف:

اس لیے اگر تم قرآن کریم پڑھنا اور امت کو سمجھانا چاہتے ہو تو اپنی عاجزی کا اعتراف کرو۔ اللہ تعالیٰ علم دے تو پتا چلتا ہے اگر اللہ تعالیٰ نہ دے تو الف کے معنی کا بھی پتا نہیں چلتا، بس اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں تو پورا قرآن کریم سمجھ آتا ہے اور نہ عطا فرمائیں تو الف کا معنی بھی سمجھ نہیں آتا، حروف مقطعات انسان کے امتحان کے لیے ہیں۔

### تسلی برائے حبیبِ کبریا ﷺ:

﴿كَيْتَبُ أَنْزَلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَزْبٌ مِّنْهُ لِيُنْذِرَ بِهِ وَ

ذِكْرَى لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾ ﴿٢٠﴾

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی پیغمبر کو تسلی دی ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا دکھ اور بڑا درد ہوتا کہ اے اللہ تعالیٰ میں سمجھاتا ہوں یہ سمجھتے نہیں ہے، میں منواتا ہوں یہ مانتے نہیں ہے، میں دلائل بیان کرتا ہوں قبول ہی نہیں کرتے، اللہ یہ جنت کے بجائے جہنم میں جائیں گے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بہت پریشان

ہوتے۔

## نبی کا منصب حکم خدا پہنچانا ہے، منوانا نہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے پیغمبر! ﴿كِتَبْنَا إِلَيْكَ﴾ میں نے یہ کتاب اس لیے نازل فرمائی، ﴿لَتُنذِرَ بِهِ﴾ تاکہ اس کے ذریعے آپ امت کو ڈرائیں، اور اگر یہ بات نہیں مانتے تو درمیان میں فرمایا: ﴿فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَزَجٌ مِّنْهُ﴾ ان کے نہ ماننے کی وجہ سے آپ کا دل تنگ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کے ذمے سمجھانا ہے آپ کے ذمے منوانا نہیں ہے۔

## دین کے داعی دل چھوٹانہ کریں:

ہمارے بہت سارے لوگ پریشان ہوتے ہیں کہ جی دلائل دیتے ہیں لوگ مانتے ہی نہیں ہے، میں نے سمجھایا وہ سمجھتے ہی نہیں ہے۔ میں نے کہا جو نبی کی بات نہیں مانتا وہ میری اور آپ کی نہ مانے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک بندہ رسول کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہے وہ میری اور آپ کی بات قبول نہ کرے تو بتائیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آپ مثبت انداز میں دلائل کے ساتھ بات پیش کریں اگر لوگ قبول کر لیں تو ان کا فائدہ ہے اگر قبول نہ کریں تو ان کا نقصان ہے۔ آپ اس پہ دل چھوٹانہ کیا کریں۔

## ابلیس کی نخوت:

﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ إِلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ

خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ﴿٧٢﴾﴾

ان آیات میں اللہ رب العزت نے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا اور ان کے مقابلے میں ابلیس کا تذکرہ کیا۔ یہ قصہ آپ نے کئی بار سنا ہے، میں پورا قصہ بیان نہیں کرتا میں بنیادی طور پر کچھ نکات اور نظریات بیان کرتا ہوں۔



## سجدہ کا حکم ابلیس کو بھی تھا:

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو تمام ملائکہ سے فرمایا کہ تم میرے آدم کو سجدہ کرو، حضرت آدم کو سجدہ کرنے کا حکم صرف ملائکہ کو دیا، ابلیس کا نام لے کر نہیں فرمایا تو بھی سجدہ کر لے۔ لیکن ابلیس چونکہ ان میں موجود تھا اور ابلیس کو حکم خود بخود ہے اگرچہ ابلیس فرشتہ تھا نہیں لیکن عبادت کرنے کی وجہ سے اس کا شمار ملائکہ میں ہوتا تھا۔

﴿اَسْجُدْ وَاقِلْ﴾ اگرچہ خطاب ملائکہ کو کیا ہے لیکن جو ملائکہ میں شامل تھے یہ خطاب ان سب کے لیے موجود تھا، سب ملائکہ نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، ابلیس نے کہا میں سجدہ نہیں کروں گا۔

## ابلیس؛ سجدے کا انکاری:

اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے پوچھا کہ اے ابلیس تو بتا جس آدم کو میں نے سجدے کا حکم دیا، تو نے اس کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ ﴿مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ﴾ جب میں نے حکم دیا تو تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟

## شیطانی دلائل:

ابلیس کہنے لگا:

﴿اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ﴾

اللہ آپ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا۔ آگ افضل ہوتی ہے بنسبت مٹی کے، تو افضل سجدہ کیوں کرے آدم کو جو مٹی سے بنا ہے؟ اگر آپ نے سجدہ کروانا تھا تو مجھے آپ افضل نہ بناتے، افضل مجھے بنایا اور مجھے کہتے ہیں سجدہ بھی کرو، اس لیے میں سجدہ نہیں کرتا۔

## ابلیس کی بنیادی غلطی:

آپ ذرا اس بات کو سمجھیں کہ ابلیس کو غلطی لگی کہاں سے ہے؟ اس نے خود کو اعلیٰ کیسے سمجھ لیا؟ ابلیس کا ذہن یہ تھا کہ آدم مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں، اور آگ مٹی سے اعلیٰ ہوتی ہے۔

## ابلیس کی دلیل کا علمی رد:

حالانکہ آگ اعلیٰ نہیں ہے، آگ ادنیٰ ہے اور مٹی اعلیٰ ہے۔ یہ میں ابلیس کی دلیل کا جواب دینے لگا ہوں جو آپ نے شاید نہ سنی ہو، ابلیس آگ سے بنے ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے بنے ہیں، ابلیس کی دلیل کا خلاصہ کیا تھا کہ آگ اعلیٰ ہے اور مٹی ادنیٰ ہے، اور ہم کہتے ہیں نہیں مٹی اعلیٰ اور آگ ادنیٰ ہے، اس کی وجہ کیا ہے کہ ابلیس کا ذہن یہ تھا کہ جب آگ جلاؤ تو اوپر جاتی ہے اور مٹی اوپر پھینکو تو نیچے آتی ہے، اس سے پتا چلا یہ ادنیٰ اور وہ اعلیٰ ہے۔

ہم کہتے ہیں نہیں آگ میں خَفَّت [ہلکا پن] بھی ہے، آگ میں حِدَّت بھی ہے، آگ میں طیش بھی ہے، آگ میں حرارت بھی ہے، آگ میں اکڑ بھی ہے، آگ میں علو بھی ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں مٹی کو دیکھو مٹی میں متانت بھی ہے، مٹی میں سنجیدگی بھی ہے، مٹی میں تواضع بھی ہے، مٹی میں حلم بھی ہے، اور مٹی میں تثبت بھی ہے۔ آگ کبھی اوپر اور کبھی نیچے، مٹی کو جب بھی اوپر پھینکو ایک جگہ پر ہے مٹی جم جاتی ہے۔ آگ نہیں جمتی، مٹی میں ٹھہراؤ ہے آگ میں نہیں ہے، مٹی میں تواضع ہے آگ میں کبر ہے، آگ میں اکڑ ہے مٹی میں عاجزی ہے، اور آگ میں ٹھہراؤ نہیں مٹی میں تثبت ہے، آگ میں دیکھو حلم نہیں مٹی میں دیکھو بردباری ہے، لہذا مٹی اعلیٰ ہے آگ ادنیٰ ہے۔

ابلیس سمجھتا تھا کہ نہیں آگ اعلیٰ ہے مٹی ادنیٰ ہے، میں سجدہ کیوں کروں؟

اب آپ بتائیں آگ اعلیٰ ہے یا مٹی؟ [مٹی۔ سامعین] آگ تو کچھ بھی برداشت نہیں کر سکتی، مٹی تو سارا کچھ برداشت کرتی ہے۔

### مٹی کی خصوصیات اور مزاج:

مٹی کیسے برداشت کرتی ہے؟ کہ مٹی کے سینے میں بلڈنگ بناؤ تب بھی اٹھالیتی ہے، مٹی پر پانی رکھو تب بھی اٹھالیتی ہے، مٹی پر آگ جلاؤ تب بھی اٹھالیتی ہے، مٹی پہ پاخانہ پھینک دو تب بھی اٹھالیتی ہے، مٹی پہ خوشبو گرادو تب بھی اٹھالیتی ہے۔

تو مٹی کے مزاج میں تواضع بھی ہے اور مٹی کے مزاج میں عاجزی بھی ہے، مٹی کے مزاج میں انکساری بھی ہے، مٹی کے مزاج میں حلم بھی ہے، اور اہم بات کیا ہے کہ مٹی کے مزاج میں تثبت بھی ہے۔ آگ کو دیکھو تو اس میں ٹھہراؤ نہیں اور مٹی کو دیکھو اس میں ٹھہراؤ ہے۔ اب بتاؤ اعلیٰ کون ہے؟ مٹی یا آگ۔ [مٹی۔ سامعین] ابلیس کہتا تھا کہ آگ افضل ہے۔

اب آپ لوگ ذرا مجھے یہ بتاؤ کہ مجھ جیسا بندہ سمجھ سکتا ہے کہ مٹی آگ سے افضل ہے۔ تو کیا اللہ تعالیٰ کو پتا نہیں تھا؟ پتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے جواب نہیں دیا۔ ابلیس نے کہا: ﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ﴾ اللہ میں آگ سے بنا ہوں اور میں اعلیٰ ہوں۔

### ہر سوال کا جواب نہ دینا بھی خدائی اصول ہے:

خدا نے ابلیس کو جواب نہیں دیا۔ پتا یہ چلا کہ ہر بات کا جواب نہیں دیتے۔ ہمارے لوگ پریشان ہیں کہ فلاں نے جواب کیوں نہیں دیا؟ فلاں نے جواب کیوں نہیں دیا؟ ہر بات کا جواب نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو جواب نہیں دیا فرمایا اُخْرُجْ، جواب نہیں دیا فرمایا میری جنت سے بھی نکل جا۔ جب ہم حکم دیتے ہیں آگ سے دلیلیں نہیں دیتے، پتا یہ چلا ایک طرف چھوٹا ہے اور ایک طرف بڑا ہے، اگر بڑا چھوٹے کو بات کہے اور چھوٹا دلیل دے تو بڑا دلیل کا جواب نہیں دیتا، پوچھتا ہے کہ

جب میں نے حکم دیا تو تو نے مانا کیوں نہیں ہے؟ ابلیس کو وہاں سے نکال دیا اس کا جواب نہیں دیا، اس لیے ہر بات کا جواب نہ ضروری ہوتا ہے اور نہ آپ جواب کے لیے پریشان ہو ا کریں۔

### جب شیطان نے دعا مانگی:

جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے فرمایا: ﴿فَاخْرُجْ﴾ کہ نکل جا، تو ابلیس نے کہا: ﴿أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمٍ يُبْعَثُونَ﴾ ﴿١٧﴾

اللہ میں ایک آپ سے دعا مانگتا ہوں، آپ نے نکال تو دیا ہی ہے نہ۔ لیکن آپ میری ایک دعا، میری ایک چیز ہے مجھے عطا فرما دیجئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا مانگ کیا مانگتا ہے؟

اس نے کہا: ﴿أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمٍ يُبْعَثُونَ﴾ ﴿١٧﴾ اللہ جب لوگوں کو قیامت کو دوبارہ اٹھایا جائے گا اس وقت تک کے لیے مجھے زندگی دیجئے، مجھے مہلت دیجئے، اللہ تعالیٰ سے جب ابلیس نے یہ دعا مانگی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا کہ جا تجھے اس دن تک مہلت ہے، نہیں، نہیں، فرمایا: ﴿إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ﴾ ﴿١٨﴾ کہ تجھے مہلت ہے، اور کتنی ہے؟ دوسرے مقام پر ہے کہ ﴿إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ﴾ ﴿١٧﴾ کہ ایک خاص وقت تک تجھے مہلت دیتے ہیں۔

### شیطان کی شیطانی:

ابلیس نے کہا: اللہ! مجھے مہلت دیں! قیامت تک نہیں بلکہ ﴿إِلَى يَوْمٍ يُبْعَثُونَ﴾ ﴿١٧﴾ تک۔ قیامت کے دو حصے ہیں، قیامت کو صور پھونکا جائے گا دوسرے،

ایک مرتبہ جب صور پھونکا جائے گا تو سارے لوگ مر جائیں گے، اور جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو پھر مردے اٹھ جائیں گے۔ ابلیس کتنا چالاک تھا آپ نے ابلیس کی دعا پر غور نہیں کیا، یہ نکتہ آپ نے کبھی نہیں سنا جو میں سنانے لگا ہوں، ابلیس کی چالاکی دیکھیں، صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا، جب ایک بار صور پھونکا جائے گا تو سارے مر جائیں گے، اور جب دوبارہ پھونکا جائے گا تو پھر سارے مردے اٹھائے جائیں گے۔

تو ابلیس نے کیا کہا؟ ﴿أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾ اللہ مجھے اس وقت تک زندگی دینا جب مردے اٹھائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس وقت تک زندگی دیں گے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیطان پر موت آنی ہی نہیں، جب پہلا صور پھونکا جائے گا تو سب کو مرنا ہے، تو ابلیس نے یہ نہیں کہا کہ مجھے اس وقت موت دینا جب سارے لوگ مریں گے بلکہ ابلیس نے یہ کہا کہ مجھے اس وقت تک مہلت دینا اس وقت تک مجھے موت نہیں دینا۔

### وقت معلوم کا معنی:

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: اس وقت تک مہلت دیتا ہوں بلکہ فرمایا: تجھے مہلت دیتا ہوں لیکن وقت معلوم تک، وقت معلوم کا معنی جب تک سارے نہیں مریں گے اس وقت تک تجھے بھی مہلت دیں گے۔ اور جب سارے مریں گے تو تجھ پر بھی موت آنی ہے۔

### خدا کو دھوکہ دینے کی شیطانی کوشش ناکام:

ابلیس بہت چالاک تھا، اس نے عجیب دعا مانگی ہے لیکن یہ نہیں سوچا کہ میں خدا کو دھوکا دینا چاہتا ہوں، خدا کو دھوکہ کون دے سکتا ہے؟ فرمایا: ﴿وَمَا يَخْدَعُونَ

﴿لَا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ﴾<sup>128</sup> تو اسی طرح ابلیس کو ماننے والے منافق بھی خدا کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ فرمایا کہ نہیں، نہیں، تم خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

### جمعہ کی پہلی اذان اور کاروبار:

اسی سورۃ میں ایک تذکرہ ہے اصحاب السبت کا، سبت کہتے ہفتہ کے دن کو، ہمارے لیے حکم ہے کہ جمعہ کی پہلی اذان کے بعد کاروبار کرنا جائز نہیں ہے، جمعہ کے دن کے کاروبار کرنے پر پابندی نہیں، جمعہ کی اذان کے بعد کاروبار پر پابندی ہے۔

### جمعہ کے دن کی چھٹی:

ہمارے بعض لوگ بہت عجیب ہیں، ہم کہتے ہیں جمعہ کے دن چھٹی ہو، ہم اس سے بحث نہیں کرتے کہ جمعہ یا ہفتہ اور اتوار کے دن چھٹی ہو، میں مسئلہ یہ سمجھا رہا ہوں کہ جمعہ کے دن چھٹی کرنا یہ شریعت نہیں ہے۔ جمعہ کی پہلی اذان کے بعد چھٹی ہو یہ شریعت ہے۔

جمعہ کے دن آپ کاروبار کریں جب پہلی اذان ہو جائے تو آپ کاروبار بند کریں اور جمعہ کی تیاری کریں اور جب جمعہ ہو جائے تو پھر کاروبار شروع کریں۔ قرآن کریم میں کیا ہے؟ کبھی قرآن کریم بھی پڑھا کرو:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا

إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾<sup>129</sup>

اور جب اذان ہو جائے اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف دوڑو اور کاروبار بند کرو۔ اگر دکان کھلی ہے تو بند کرو اگر ہے ہی بند، پھر بند کیا کرنا ہے؟

## چھٹی برائے نماز جمعہ:

اس لیے ہمارا مطالبہ یہ نہیں ہوتا کہ جمعہ کے دن کی چھٹی کرو، بلکہ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ جمعہ کے وقت کی چھٹی کرو، جمعہ کے دن کی کرو یا نہ کرو لیکن جمعہ کے وقت کی چھٹی کرو۔ ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ﴾ اور جب جمعہ کی نماز ہو جائے، ﴿فَإِنْ تَشِيرُوا فِي الْأَرْضِ﴾ زمین پر جاؤ، ﴿وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ اور کاروبار کرو، رزق کو تلاش کرو کون منع کرتا ہے؟

## اصحاب السبت کی ناجائز تاویلیں:

ہم پر جمعہ کی نماز کے وقت کی پابندی ہے، اور ان پر ہفتہ کے دن کی پابندی ہے کہ تم ہفتہ کے دن کام نہ کرنا، اور ہفتہ کے دن کا شکار نہ کھیلنا، انہوں نے ایک نیا حیلہ نکالا کہ دریا کے ساتھ تالاب نکالا، دریا اور تالاب کے درمیان انہوں نے ایک نالا بنا لیا، اور اس پر ایک ناک لگایا، ہفتہ کا دن آتا تو وہاں سے تختہ اٹھا لیتے، اور مچھلیاں ادھر چلی جاتی، اور وہ وہاں سے پکڑ لیتے، اور کہتے کہ ہم نے ہفتہ کے دن شکار نہیں کیا بلکہ یہ تو خود آئی ہیں۔ بھی خود کرو تو بھی گناہ ہے اور یوں کرو تو بھی گناہ ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔

ابلیس نے دھوکے دینے کے لیے دعا مانگی لیکن اللہ تعالیٰ ابلیس کی چالیں سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں تجھے اس وقت تک مہلت نہیں دوں گا، بلکہ ایک خاص وقت تک مہلت دوں گا۔

## ابلیس میں تین عین موجود تھے:

اس پر ایک بات سمجھیں، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابلیس عابد بھی تھا، آسمان کے چپے، چپے پہ سجدے کرتا تھا۔ اور سجدے

کرنے کی وجہ سے فرشتوں کے صفوں میں جا بیٹھا، ابلیس عابد بھی تھا، ابلیس عالم بھی تھا، ابلیس کو مسلوں کا بھی پتا تھا، یہ ساری باتیں تھی، ابلیس عارف بھی تھا، عارف کا مطلب اللہ تعالیٰ کے مزاج کو جانتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا سجدہ کر، ابلیس نے نہیں کیا، جب بات نہیں مانی، اللہ تعالیٰ غصے میں آئے، یہ خدا کے مزاج کو جانتا تھا۔ اللہ تعالیٰ غصے میں ہوں بندہ مانگے تب بھی دیتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں عارف، یہ مزاج کو جانتا تھا۔ اس لیے غصے کی حالت میں بھی خدا سے مانگ لیا، وہاں سے دوڑا نہیں ہے، جاتے ہوئے بھی کہا اے اللہ مجھے ایک چیز چاہئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا لے لو۔ یہ عارف تھا اللہ تعالیٰ کے مزاج کو جانتا تھا۔

### چوتھا عین موجود نہیں تھا:

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا جملہ سننا، فرمایا ابلیس عابد بھی تھا، ابلیس عالم بھی تھا، ابلیس عارف بھی تھا۔ لیکن ابلیس عاشق نہیں تھا۔

### عاشق دلیل کا مطالبہ نہیں کرتا:

ابلیس میں یہ ساری صفات تھیں لیکن ابلیس عاشق نہیں تھا کیوں؟ اس لیے کہ عاشق دلیل نہیں پوچھتا عاشق حکم پر عمل کرتا ہے۔ اس میں ساری خوبیاں موجود تھیں، لیکن ایک کوالٹی کم تھی کہ یہ عاشق نہیں تھا، اگر عاشق ہوتا نا پھر یہ نہ کہتا کہ کیوں سجدہ کروں میں تو اعلیٰ ہوں۔ خدا حکم دیتے فوراً سجدہ کر لیتا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عبادت کی توفیق بھی دیں، اللہ تعالیٰ معرفت بھی دے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو علم بھی دے اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہم سب کو اپنا عشق بھی عطا فرمائیں۔

### ابلیس کی جھوٹی قسم:

﴿قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ



## مِنَ الْخَيْرَيْنِ ﴿٣١﴾

حضرت آدم علیہ السلام سے خطا ہو گئی، آدم علیہ السلام بھول گئے، اور بھول کر خطا کر لی ہے، اور بھلوا یا کس نے؟ ابلیس نے، اور چکر اتنا سخت دیا اور اتنی سخت انہوں نے گیم کھیلی کہ حضرت آدم علیہ السلام جیسا بندہ بھی فوراً اس کی چال کو نہ سمجھ سکا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے کہا کہ اس درخت کو کھالے، آدم علیہ السلام نے فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، ابلیس نے خدا کی قسم اٹھائی، اس نے کہا میں خدا کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ جو خدا نے تمہیں منع کیا تھا، اس کا معنی یہ نہیں تھا کہ تم نے ہمیشہ نہیں کھانا۔

جب تمہیں پیدا کیا ابھی تمہارے مزاج میں ابھی تمہارے معدے میں یہ پھل کھانے کی ہمت نہیں تھی، اس لیے منع کیا تھا، اب تو تم بڑے ہو گئے ہو، اب کھالو تو کیا حرج ہے؟ اور یہ جو اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکہ دیا ہے نا، اسی طرح کا دھوکہ غزوہ احد میں اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو شیطان نے دیا ہے۔

## احد کے میدان میں:

وہ دھوکہ کس طرح تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کے میدان میں صحابہ کی تشکیل فرمائی۔ فرمایا دیکھو یہ پیچھے درہ ہے، خالی جگہ ہے، میں پچاس آدمی یہاں ٹھہرا رہا ہوں، ہمیں فتح ہو یا شکست تمہیں یہاں سے ہٹنا نہیں ہے۔ صحابہ کرام وہاں ٹھہر گئے اور جم گئے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ابھی کلمہ نہیں پڑھا اور مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ابھی تو ”رضی اللہ عنہ“ بنے نہیں تھے، حضرت خالد، مشرکین مکہ کی طرف سے لڑنے کے لیے آئے اور تھے بہت بڑے جرنیل، جب مشرکین مکہ کو شکست ہوئی وہ دوڑے، تو خالد چونکہ میدان جنگ کو سمجھتے تھے وہ جرنیل تھے اس نے

کہا میرے خیال میں دوڑنے کے بجائے ذرا پیچھے سے ہو کے اس درے سے مسلمانوں پر حملہ کریں۔

### ظاہری شکست کے اسباب:

اس درے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ٹھہرایا تھا، فرمایا تم نے یہاں سے ہلنا نہیں ہے، جب دشمن دوڑ گیا، مسلمان مال غنیمت جمع کرنے لگے، ایک صحابی نے کہا کہ چلو ہم بھی چلیں، دوسرے صحابی نے کہا نہیں، نہیں، ہم نہیں جائیں گے۔ کہا کیوں نہیں جاؤ گے؟ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا میں جب تک نہ کہوں تم کو یہاں سے جانا نہیں ہے۔

دوسرے نے کہا تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاء سمجھے نہیں ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ تھا کہ جب تک جہاد جاری ہو میں نہ بلاؤں تو تم نے نہیں آنا، اب تو جہاد ختم ہو گیا ہے، فتح ہو گئی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مقصد کے لیے ہمیں یہاں ٹھہرایا تھا اب وہ مقصد پورا ہو گیا ہے، اب چلو اور جا کر ان کا ہاتھ بٹاؤ، اور مال غنیمت جمع کرو۔ مقصد یہ تھا کہ تم اس وقت تک نہیں ہٹنا جب تک جنگ ختم نہ ہو، اب جنگ ختم ہو گئی ہٹنے میں حرج نہیں ہے۔ دشمن ادھر سے آیا ہے، اور فتح شکست میں بدل گئی ہے۔

### آدم علیہ السلام کو شیطان نے دھوکہ دیا:

ادھر بالکل اسی طرح ابلیس نے آدم علیہ السلام سے کہا خدا نے تم سے کہا تھا یہ درخت کے پھل نہ کھانا کیونکہ اس وقت تمہارے معدے میں اور تمہارے پیٹ میں اس پھل کا تحمل نہیں تھا، اب تمہارا معدہ ٹھیک ہے، اب تم بڑے ہو گئے ہو اب کھانے میں کیا حرج ہے، ابلیس نے کہا میں خدا کی قسم اٹھا کر کہہ رہا ہوں میں جھوٹ نہیں بولتا۔ جب خدا کا نام لیا چونکہ خدا کے نام سے آدم علیہ السلام کو محبت تھی تو آدم

علیہ السلام نے سوچا کہ خدا کا نام لے کر بھی بھلا کوئی جھوٹ بول سکتا ہے۔ فوراً پھل کھالیا، جوں ہی پھل کھانا تھا حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کے جسم پہ جنت کا جو لباس تھا وہ اتر گیا، اور قرآن کریم میں ہے اب دونوں نے درخت کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپنا شروع کیا۔

### شیطانی دھوکہ..... انسانیت ننگی ہو رہی ہے:

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کو شیطان نے دھوکہ دیا، ﴿فَدَلَّهُمَا بِغُرُورٍ﴾ جب دھوکہ دیا تو سب سے پہلا کام کیا کروایا، ان کو پھل کھلوا یا پھل کھانے سے ان کے کپڑے اتر گئے، اس وقت بھی شیطان نے پہلا دھوکہ دے کے کپڑے اتروائے، اب بھی جب شیطان دھوکہ دیتا ہے تو انسانیت کو ننگا کر دیتا ہے۔ پہلا حملہ شیطان کا یہ ہو گا کہ ان کے لباس چھوٹے کرو، مختصر کرو، آہستہ آہستہ ننگا کروادو، یہ شیطان کے حملوں کا حصہ ہے۔

### آدم علیہ السلام شیطانی دھوکے کا شکار کیوں ہوئے؟:

آدم علیہ السلام کے سامنے اس نے خدا کا نام لیانیک آدمی تھے فوراً نام سنا کہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر بھی کوئی جھوٹ بول سکتا ہے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

ہمارے ہاں ایک واقعہ لکھا ہے کہ بادشاہ عالمگیر رحمہ اللہ کے دور میں ملا جیون رحمہ اللہ بہت بڑے آدمی تھے، ان کی کتابیں ہمارے ہاں درس نظامی میں شامل ہیں، نیک بھی تھے، عالم بھی تھے، متقی بھی تھے، ان کے پاس ایک بندہ آیا اس نے آکر کہا کہ حضرت یہ جو سامنے دریا ہے نا اس پر جو پل ہے عالم گیر بادشاہ اس کو یہاں سے اکھاڑ کر کہیں اور لے جانا چاہتا ہے، اگر وہاں لے کر چلا گیا تو ہمارا بہت نقصان ہو گا، آپ جائیں اور عالم گیر سے سفارش کریں کہ یہاں سے پل اٹھا کر وہاں نہ لے جائے،

حضرت جانے لگے شاگردوں نے کہا بھی کدھر جا رہے ہو، شاگردوں سے کہا کہ ایک غریب آدمی آیا ہوا تھا کہ بادشاہ پل یہاں سے اکھاڑ کر وہاں لے جا رہا ہے، تو میں چاہتا ہوں کہ جا کر عالمگیر سے سفارش کروں ان بے چاروں کا نقصان نہ ہو۔

انہوں نے کہا حضرت قبلہ آپ بھی عجیب آدمی ہیں کبھی پل بھی اٹھا کر بدل سکتے ہیں؟ کہ ادھر سے اٹھائیں اور وہاں لے جائیں۔ اب حضرت ملا جیون رحمہ اللہ کا جواب سنو فرمانے لگے یہ تو ہو سکتا ہے کہ پل بدل جائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ مسلمان بدل جائے، مسلمان کیسے جھوٹ بول سکتا ہے؟ اس لیے میں جا رہا ہوں سفارش کرنے کے لیے۔ جو آدمی نیک ہوتا ہے وہ دوسروں کو نیک سمجھتا ہے۔

### جھوٹی قسم شیطانی خصلت اور منافق کی عادت:

آدم علیہ السلام بھی سمجھتے تھے کہ خدا کا نام لے کر کوئی جھوٹ نہیں بول سکتا، ابلیس نے خدا کا نام لے کر قسم کھائی تو آدم علیہ السلام نے اعتبار کر لیا، پتا چلا کہ منافق قسم کھا کر بات کریں، تو بھی اعتبار کبھی نہیں کرنا۔ اس لیے منافق کی علامت یہ ہے کہ منافق بات بات پر قسم کھاتا ہے، اور مسلمان سمجھتا ہے کہ بھی اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کون جھوٹ بول سکتا ہے۔

### جنت سے زمین کی طرف کا سفر:

اس ابلیس نے ان کو دھوکہ دیا آدم اور حوا دونوں کو جنت سے نکال دیا گیا، یہ دونوں روتے رہے چالیس سال تک روتے رہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حج پے لے جائے۔ ادھر میدان عرفات میں جاتے ہیں دعائیں مانگتے ہیں۔

### میدان عرفات کا نام عرفات کیوں؟:

میدان عرفات، عرفات یہ معرفت سے ہے، معرفت کا معنی پہچاننا ہے، حضرت آدم اور حوا اس میدان میں جمع ہوئے، ایک دوسرے کو پہچان لیا اس میدان کا

نام میدان عرفات ہے، پہچاننے کی جگہ وہاں جا کر بندہ خدا سے دعائیں مانگتا ہے۔

### آدم و حوا علیہما السلام کی دعا:

آدم اور حوا علیہما السلام نے چالیس سال تک دعائیں مانگی ہیں:

﴿قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ

مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٢٢﴾﴾

### منکرین وسیلہ کا استدلال:

بعض لوگ یہ آیت پڑھتے ہیں اور آیت پڑھ کر دھوکہ دیتے ہیں، میں اس دھوکہ کو صاف کرنے لگا ہوں، میں نے اپنے کانوں سے بیان سنا ایک مولانا بیان فرما رہے تھے کہ دیکھو آدم اور حوا علیہما السلام دونوں نے یہ دعا مانگی ہے: ﴿قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٢٢﴾﴾ کسی نبی کا وسیلہ دے کر تو دعا نہیں مانگی نا، جب آدم اور حوانے وسیلہ دے کر دعا نہیں مانگی، تو تم وسیلہ دے کر دعائیں کیوں مانگتے ہو؟

### منکرین وسیلہ کو مدلل جواب:

میں نے کہا: قبلہ! تم نے قرآن کریم تو پڑھا ہے ساتھ حدیث بھی تو پڑھ لیتے، مستدرک علی الصحیحین میں ہے، امام حاکم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: "يَا رَبِّ اَسْأَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ لِمَا غَفَرْتَ لِي" اے اللہ! میں آپ کو محمد کا واسطہ دے کر دعا مانگتا ہوں کہ میرے گناہ کو معاف کر دیں۔ اے اللہ! میں محمد کا وسیلہ دے کر دعا مانگتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے پوچھا: "وَكَيْفَ عَرَفْتَ مُحَمَّدًا وَلَمْ أَحْلُقْهُ؟" میں نے تو حضرت محمد کو پیدا نہیں کیا اے آدم آپ نے محمد کو کیسے پہچان لیا ہے؟

انہوں نے کہا: "لَا تَنْتَك لَمَّا خَلَقْتَنِي بِبَدِكَ" اے اللہ! جب آپ نے مجھے پیدا فرمایا، "وَنَفَخْتَ فِيَّ مِنْ رُوحِكَ" اے اللہ! اس وقت جب آپ نے میرے بدن میں روح کو ڈالا ہے، "رَفَعْتَ رَأْسِي" میں نے سر اٹھایا، "فَرَأَيْتُ عَلَى قَوَائِمِ الْعَرْشِ مَكْتُوبًا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ" میں نے عرش کے پاؤں میں لکھا ہوا دیکھا "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ"، مجھے اس وقت یقین آگیا "فَعَلِمْتُ أَنَّكَ لَمْ تُضِفْ إِلَى اسْمِكَ إِلَّا أَحَبَّ الْخَلْقِ إِلَيْكَ" اپنے نام کے ساتھ اسی کا نام آپ لکھتے ہیں جو آپ کو پوری کائنات میں محبوب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "صَدَقْتَ يَا آدَمُ" آدم! آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے، "إِنَّهُ لَأَحَبُّ الْخَلْقِ إِلَيَّ" پوری مخلوق میں میرا محمد مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے، "أُذْعِنِي بِحَقِّهِ فَقَدْ عَفَرْتُ لَكَ" تو نے میرے محمد کا وسیلہ دے کر مانگا ہے تو میں نے تجھے معاف کر دیا ہے۔ "وَلَوْلَا مُحَمَّدٌ مَا خَلَقْتُكَ" اگر محمد نہ ہوتے تو میں تمہیں پیدا ہی نہ کرتا۔<sup>130</sup>

### ہم قرآن و حدیث دونوں کو مانتے ہیں:

میں نے کہا ہم منکر حدیث تو نہیں کہ قرآن لے لیں اور حدیث چھوڑیں، ہم قرآن والی دعا بھی مانتے ہیں اور حدیث والی دعا بھی مانتے ہیں۔ وسیلہ دیں تو بھی ٹھیک ہے اور وسیلہ نہ دیں تو بھی ٹھیک ہے، لیکن وسیلہ کا انکار تو نہ کریں۔

### درس قرآن کی آڑ میں احادیث کا انکار:

بعض لوگ یوں قرآن پڑھ کر دھوکہ دیتے ہیں اور لوگ کیا کہتے ہیں ماشاء اللہ جی بڑا درس قرآن ہے۔ کیوں؟ حدیثوں کا انکار ہے! یہ کون سا درس قرآن

ہے جس میں حدیثوں کا انکار کر دیا جائے۔ ہم قرآن بھی مانتے ہیں اور ہم احادیث بھی مانتے ہیں، اور یاد رکھیں کوئی قرآن کا انکار کرے تب بھی ایمان ختم ہوتا ہے اور کوئی حدیث کا انکار کرے تب بھی ایمان ختم ہوتا ہے، تو ایک دعا قرآن میں ہے اور ایک دعا حدیث میں ہے، ہم قرآن والی دعا بھی مانتے ہیں اور حدیث والی دعا بھی مانتے ہیں، دونوں مانتے ہیں۔

### نماز کا ادب:

﴿يَبْنَىٰٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۗ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نماز کا ادب بیان فرمایا۔ فرمایا کہ جب تم نماز پڑھنے لگو اور نماز پڑھنے کے لیے مسجد جانے لگو تو: ﴿يَبْنَىٰٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ فرمایا: تم لباس اچھا پہنا، صرف یہ نہیں فرمایا کہ لباس پہنا، بلکہ فرمایا لباس اچھا پہنا، ﴿كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا﴾ کھایا بھی کرو اور پیا بھی کرو، ﴿وَلَا تُسْرِفُوْا﴾ لیکن اعتدال سے بڑھانہ کرو، میں دونوں لفظوں پہ بات کرتا ہوں۔

﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ﴾ جب نماز کے لیے جاؤ، ﴿عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ مسجد سے مراد ”صلوٰۃ“ ہے، جب نماز پڑھنے کے لیے جاؤ تو کپڑا کون سا پہنو؟ صرف لباس یا اچھا لباس؟ [اچھا لباس۔ سامعین] صرف لباس نہیں بلکہ اچھا لباس پہننا ہے۔

### ہمارے مزاج اور فقہی مسئلہ:

اس لیے فقہاء نے لکھا ہے اگر لباس اچھا نہ ہو اور آدمی نماز پڑھے ایسے لباس سے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ ہمارے ہاں مزاج کیا ہے، جو لباس رات کو پہن کے سوتے ہیں صبح اسی لباس کے ساتھ مسجد میں جاتے ہیں، نماز پڑھ لیتے ہیں، اور جب دفتر جاتے

ہیں تو لباس بدل لیتے ہیں، ایسے لباس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے جس لباس کو پہنتے ہوئے مجمع میں جانے سے آپ کو شرم محسوس ہو۔

### اچھا لباس کب پہنیں؟:

بڑا تعجب ہوتا ہے ہم فجر میں اٹھتے ہیں اور کپڑے بالکل تیار ہیں پھر بھی نہیں پہنتے۔ کہتے ہیں میں ذرا نماز پڑھ آؤں، نماز پڑھ لی اب ناشتہ کرنا ہے، ناشتہ کیا پھر کہے گا ذرا کپڑا لے آ، مجھے اب بازار جانا ہے۔ بھی کدھر جانا ہے؟ شادی میں، میں ذرا نماز پڑھ لوں پھر کپڑے بدلتا ہوں، کیونکہ وضو کرتے ہیں پھر خراب ہو جاتے ہیں، عجیب بات نہیں ہے!

### قرآنی حکم:

میں اس لیے کہتا ہوں کہ قرآن سمجھ لیا کریں، ﴿خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ صرف لباس نہیں پہننا بلکہ زینت والا لباس پہننا ہے۔

### لباس کی دو بنیادی خوبیاں:

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُؤَارِي سَوَاتِكُمْ وَرِيشًا﴾

کہ دیکھو اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں لباس عطا کیا ہے نا، اس میں دو خوبیاں ہیں:

نمبر 1: ﴿يُؤَارِي سَوَاتِكُمْ﴾ ستر عورت جس سے پردہ پوشی ہو۔

نمبر 2: ﴿رِيشًا﴾ لباس زینت کا ذریعہ ہو۔

پردہ پوشی بھی ہو اور زینت بھی ہو۔ نماز میں پردہ پوشی کا بھی خیال کرو اور زینت کا بھی خیال کرو۔ اللہ تعالیٰ کے دربار سے دنیا کا کون سا دربار بہتر ہے؟ اس لیے میری آپ سے گزارش ہے کہ یہ نیت کریں کہ جب مسجد میں آئیں گے تو اچھے سے



اچھا لباس پہن کر آئیں گے۔

### مسجد کے آداب:

مسجد میں آئیں تو خوشبو لگا کر آؤ خوشبو کوئی مہنگی تو نہیں ہے، بہت زیادہ مہنگی خوشبو نہیں خرید سکتے تو سستی ہی خرید لو، دو تین مہینے نکل جاتے ہیں، آدمی اچھی خوشبو کا اہتمام کرے۔

### قرآن سے ماخوذ ایک فقہی اصول:

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا﴾ کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، مفتی شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کھاؤ، اور پیو یہ نہیں فرمایا کہ کیا کھاؤ اور کیا پیو، کیوں؟ فرماتے ہیں کہ یہاں سے ایک اصول نکلا، میں گرائمر کی اور تفصیلی بات نہیں کرتا، اصول یہ نکلا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کھاؤ یہ نہیں فرمایا کیا کھاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا پیو یہ نہیں فرمایا کہ کیا پیو۔ اس سے اصول یہ نکلا کہ تمام اشیاء میں اصل اباحت ہے، تمام اشیاء میں اصل جواز ہے، تمام اشیاء ایمان والوں کے لیے حلال ہیں، حلال پر دلیل نہیں چاہیے، حرام پر دلیل چاہیے۔

### تقویٰ کا ہیضہ:

بعض لوگ متقی نہیں ہوتے بلکہ ان کو تقویٰ کا ہیضہ ہوتا ہے۔ وہ بلا وجہ بعض حلال چیزوں کو بھی حرام کہتے ہیں۔ تو حلال چیزوں کو حرام نہ کہو، تمام اشیاء میں اصل جواز، حلت، اور اباحت ہے۔ حرام پر دلیل چاہیے، حلال پر دلیل نہیں چاہیے۔

دنیا میں جتنی بھی چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں وہ سب انسانوں کے لیے حلال ہیں، اور جو جو حرام ہیں، خنزیر سے بچو حرام ہے، دم مسفوح سے بچو حرام ہے، مردار سے بچو حرام ہے۔ فلاں چیز سے بچو جو حرام ہے، تو جو جو چیزیں حرام تھیں سب بتادیں

اور ان سب کے علاوہ بقیہ حلال ہیں۔ اس لیے جب تک حرمت پہ دلیل نہ ہو تو بلاوجہ چیزوں کو حرام نہ کہا کرو۔

### شریعت کا مزاج ..... عہد فاروقی کا ایک واقعہ:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ ایک جنگل کے ساتھ گزر رہے تھے۔ جنگل میں پانی موجود نہیں تھا، ایک جگہ پر پہنچے وہاں پر پانی مل گیا، پانی کھڑا ہوا تھا، صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین کو ضرورت تھی کہ وضو کریں اور پانی پیئیں، ایک دیہاتی آدمی وہاں جنگل میں تھا ایک صحابی نے آواز لگا کر پوچھنے لگے بھائی ہماری ایک بات سنو، اس نے کہا وہ کیا؟ تو اس صحابی نے کہا ہمیں یہ بتاؤ اس پانی سے درندے پانی تو نہیں پیتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا انہیں نہ بتانا فرمایا بھی جب چیز خدا نے حلال دی ہے، تو تم بلاوجہ پوچھ کر حرام کیوں کرتے ہو؟ تمہیں پانی کی ضرورت تھی تمہیں مل گیا، اور تم نے تفتیش شروع کر دی ہے۔ پانی کا استعمال شروع کر دو اگر کوئی بندہ کہے کہ درندہ منہ ڈالتا ہے تو چھوڑ دینا، جب تک نہ کہیں استعمال کرنا۔

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سوچ ہے، یہ بات آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی اس لیے کہ آپ کو گھر میں پانی تازہ مل جاتا ہے، گھر میں نہ ملے اور ضرورت پڑے تو آپ کو باہر بازار سے پانی مل جائے گا۔ پانی نہ ملے نا تو اس وقت سمجھ آتا ہے شریعت کے اس مسئلے کی حقیقت کیا ہے۔ بسا اوقات بندہ کو مال ملتا ہے نا تو بندے کو یہ مثالیں سمجھ نہیں آتیں۔

### بھوکا کیوں مانگتا ہے؟:

کہتے ہیں کہ ایک گاڑی جارہی تھی۔ ٹریفک سگنل پر گاڑی رکی، ایک مانگنے والا آیا کہ مجھے کچھ دے دو روٹی کھانی ہے، اب بچہ اپنے باپ سے پوچھتا ہے، یہ کیا کہتا

ہے؟ اس نے کہا بیٹا یہ پیسے مانگتا ہے، بیٹے نے کہا یہ کیوں مانگتا ہے؟ کہا بیٹا اس کو بھوک لگی ہے روٹی کھانے کے لیے مانگ رہا ہے۔ تو بیٹے نے کہا ابو پھر پراٹھے کھالے مانگتا کیوں ہے؟ اس نے کہا بیٹا تو ٹھیک کہتا ہے!

جب آدمی منزل واٹر کے علاوہ کوئی پانی ہی نہ پیتا ہو اس کو یہ بات کیا سمجھ آئے گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا مت بتاؤ، پانی استعمال کرو جب کوئی کہے گا درندے منہ ڈالتے ہیں تو پھر چھوڑ دینا۔ یہ اس کو سمجھ نہیں آتی جو صبح اور شام منزل واٹر پیتا ہو۔

### اعتدال کا کیا مطلب؟:

میں کہہ رہا تھا: ﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا﴾ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اعتدال کا خیال کرو۔ اعتدال کا کیا مطلب؟ فقہائے کرام نے ایک مسئلہ لکھا ہے کہ کھانے کا ایک لقمہ جس کے بارے میں آپ کو پتا ہو کہ یہ بیماری کا سبب بنتا ہے اس ایک لقمہ کا کھانا حرام ہے۔ یہ ہے: ﴿وَلَا تُسْرِفُوا﴾ اور جب یہ خدشہ نہ ہو تو آپ جتنا کھا سکتے ہو کھاو اس پر شریعت آپ کو منع نہیں کرتی اور پابندی بھی نہیں ہے۔

### اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر موجود ہیں:

﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا ۖ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾

ہمارا اہل السنۃ والجماعۃ کا نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض ہر جگہ پر ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ پر ہے۔ یہ ہمارا نظریہ ہے۔

## جب اللہ عرش پر مستوی ہیں تو.....؟:

بعض لوگ کہتے ہیں نہیں اللہ کی ذات ہر جگہ پر نہیں، وہ سورۃ الاعراف کی آیت ﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهُ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ بطور دلیل آپ کے سامنے پیش کریں گے، بھی اگر اللہ ہر جگہ پر ہیں تو قرآن نے کیوں کہا: ﴿ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ﴾ اللہ عرش پر مستوی ہے اگر ہر جگہ پر ہے تو عرش پر مستوی کیسے ہے؟

## جواب:

ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہیں۔ تو بتاؤ جب ہر جگہ پر ہیں تو عرش پر بھی ہیں؟ [جی ہاں۔ سامعین] تو یہ آیت ہماری دلیل یا ہمارے خلاف بنے گی؟ یہ آیت ہمارے عقیدہ ہر جگہ ہونے کے خلاف ہے؟ [نہیں۔ سامعین] جب ہر جگہ ہیں تو عرش پر بھی ہیں۔ تو یہ آیت ہمارے خلاف نہیں یہ تو ہماری دلیل ہے۔ پھر ایک بندہ آپ سے کہے گا کہ جب اللہ ہر جگہ پر ہے تو اللہ تعالیٰ نے کیوں فرمایا: ﴿ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ﴾ اللہ مستوی علی العرش ہے اللہ تعالیٰ اتنا کہہ دیتے کہ اللہ ہر جگہ پر ہے؟

## اللہ کے ہر جگہ ہونے پر قرآنی دلائل:

اور دلائل قرآن کریم میں موجود ہیں کہ خدا تعالیٰ ہر جگہ پر ہیں۔

[1]: ﴿وَاللَّهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيُّمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ

وَأَسِعْ عَلَيْهِمُ ﴿١١٥﴾ <sup>131</sup>

مشرق بھی اللہ کا اور مغرب بھی اللہ کا، تم جدھر رخ پھیرو گے وہاں اللہ تعالیٰ موجود ہیں۔

[2]: قرآن کریم میں ہے: ﴿مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَاسِعُهُمْ﴾ تم تین ہو تو چوتھا اللہ ہے، ﴿وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ﴾، تم پانچ ہو تو چھٹا اللہ ہے، ﴿وَلَا آذَنِي مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْثَرُ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا﴾ <sup>132</sup> تم کم ہو یا زیادہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے۔

[3]: قرآن کریم میں ہے: ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ﴾ <sup>133</sup>

میرے پیغمبر! اگر میرے بندے پوچھیں کہ میں کہاں ہوں؟ انہیں بتاؤ خدا قریب ہیں۔ اگر پوچھیں کتنا قریب ہیں؟ تو بتانا: ﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ <sup>134</sup> تمہارے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں۔

**اللہ شہ رگ سے زیادہ قریب کیسے ہیں؟:**

ذرا اس میں ایک نکتہ سمجھنا، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ لامثال ہیں، خدا کی مثال دے نہیں سکتے، لیکن اگر میں تمہیں

131- البقرة: 2: 115

132- المجادلة: 58: 7

133- البقرة: 2: 186

134- ق: 50: 16

مثال نہ دوں تو آپ لوگ بات کو سمجھیں گے نہیں، یہ حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے لفظ ہیں۔ فرمایا مثال سمجھو!

اللہ تعالیٰ شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں اس کی مثال کیا ہے، ایک کاغذ دوسرے کاغذ سے ملا ہے، اور درمیان میں گوند لگی ہے، کاغذ کاغذ سے ملا بواسطہ گوند ہے، اور گوند کاغذ سے ملی بلاواسطہ ہے، فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں، ایک بندہ اور ایک بندہ کی شہ رگ ہیں، بندہ اور شہ رگ آپس میں ملے ہیں لیکن بواسطہ خدا ملے ہیں، اگر خدا نہ ہو تو یہ شہ رگ اور بندہ مل سکتے ہی نہیں ہے، اگر دو کاغذوں کے درمیان گوند نہ ہو دونوں کاغذ ایک دوسرے سے مل سکتے ہی نہیں ہیں، تو جس طرح گوند کاغذ سے بلاواسطہ ملتی ہے، کاغذ اور کاغذ آپس میں بواسطہ گوند ملتے ہیں، اسی طرح شہ رگ بندے سے بواسطہ خدا ملتی ہے۔ اور خدا شہ رگ سے بلاواسطہ ملتا ہے۔ ﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ ﴿۱۱﴾ اللہ تعالیٰ شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں۔

### مستوی ہونے کا مطلب:

میں سوال کا جواب دے رہا تھا کہ جب اللہ ہر جگہ پر ہیں تو مستوی علی العرش کیوں فرمایا؟ اس کا جواب سمجھنا مستوی کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پہ غالب ہے۔ یہ کیوں فرمایا، میں مثال دوں گا تو بات سمجھ آئے گی، ایک بچے کے باپ کے پاس سائیکل ہے اور دوسرے بچے کے باپ کے پاس سائیکل اور موٹر سائیکل ہیں، اور تیسرے لڑکے کے باپ کے پاس سائیکل، موٹر سائیکل اور گاڑی تینوں ہیں۔

ایک کہتا ہے میرے ابو کے پاس سائیکل ہے اور دوسرا کہتا ہے میرے ابو کے پاس اسکوٹر ہے اور تیسرا کہتا ہے میرے ابو کے پاس کار ہے۔ اب دیکھو کار تو کہتا ہے یہ سائیکل اور موٹر سائیکل کی بات نہیں کرتا، کیوں؟ بھی سائیکل اور موٹر سائیکل

تو ان کے پاس بھی ہے لیکن کار تو ان کے پاس نہیں تھی نا! اس لیے اس نے کار کا نام لیا، سائیکل اور موٹر سائیکل کا نام نہیں لیا۔

### ظاہری ملکیت اور حقیقی ملکیت:

اللہ تعالیٰ فرمائیں مکان میرا ہے، کوئی بندہ کہہ دے گا نہیں مکان میرا ہے، ظاہری ملک تو میری ہے نا! اللہ تعالیٰ فرمائیں پانی میرا ہے، کوئی بندہ کہہ دے گا ایک تالاب میرے پاس بھی تو ہے، ظاہری ملک تو اس کی ہے نا! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کائنات کا مالک میں ہوں، ایک بندہ کہتا ہے کہ پلازے کا مالک میں ہوں، کچھ تو بتائے گا! خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔ بلکہ فرمایا: ﴿ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ﴾ تم زمین کی بات کرتے ہو میرا تو عرش پر بھی غلبہ ہے۔

اور یہ صاحب یہ عقیدہ بنا کر بیٹھا ہے کہ خدا عرش پر رہتا ہے (العیاذ باللہ) اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ عرش پر ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر غالب ہیں، اللہ تعالیٰ کی عرش پر حکومت ہے۔

### فرعونی تدبیریں ناکام ہو گئیں:

﴿وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سِجْدَيْنِ﴾ قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٢٢﴾

رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿١٢٣﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعلان نبوت فرمایا، توحید کا اعلان فرمایا، فرعون اور اس کے درباری بہت پریشان ہیں کہ یہ جادو گریں۔ کیوں؟ انہوں نے معجزہ کو جب دیکھا تو اس کو جادو کہہ دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تمام جادو گروں کو جمع کرو ہم مقابلہ کر لیتے ہیں، ادھر سے ستر ہزار جادو گریں ادھر موسیٰ علیہ السلام اکیلے مقابلے میں کھڑے ہیں۔ انہوں نے رسیاں پھینکیں وہ سانپ بنے نہیں ہیں، لیکن

سانپ نظر آئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لٹھی پھینکی ہے، وہ سانپ نظر نہیں آیا ہے بلکہ سانپ بنا ہے۔ اس نے سب کچھ ہڑپ کر لیا۔

قرآن کریم میں ہے جتنے جادوگر تھے وہ سمجھتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کا جادو نہیں ہے، جادو والا سمجھتا ہے، یہ سامنے معجزہ ہے۔

### جب جادوگر ایمان لے آئے:

قرآن نے کہا: ﴿وَأَلْقَى السَّحَرَةُ سِحْرَهُنَّ﴾

وہ سارے جادوگر جو تھے سب سجدے میں گر گئے۔ سورۃ الاعراف میں ہے ان جادوگروں نے کہا: ﴿أَمَّا بِرَبِّ الْعَلَمِينَ﴾ ہم رب العلمین پر ایمان لاتے ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿رَبِّ مُوسَىٰ وَ هَارُونَ﴾ موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لائے ہیں۔ صرف اتنا کیوں نہیں کہا کہ رب العلمین پر ایمان لائے ہیں؟ یہ کیوں کہا موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لاتے ہیں؟

اگر وہ صرف کہتے کہ رب العلمین پر ایمان لائے ہیں تو فرعون کہتا رب العلمین تو میں ہوں! دیکھو مجھے یہ بھی مان گئے ہیں، کہا نہیں نہیں ہم اس رب العلمین پر ایمان لائے ہیں جو ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کا رب ہے۔ ہم تجھے نہیں مانتے اسے مانتے ہیں۔

### بسا اوقات وضاحتی بیان دینا ضروری ہوتا ہے:

جب وضاحت کرنی پڑے پھر مسئلہ کھول کے بیان کرنا اگر نہیں کھولو گے تو الجھن ہوگی، اگر وہ درباری کہتے: ﴿أَمَّا بِرَبِّ الْعَلَمِينَ﴾ رب العلمین پر ایمان لائے ہیں، فرعون کہتا یہ میرے ہیں، انہوں نے کہا نہ صرف رب العلمین نہیں بلکہ ﴿رَبِّ مُوسَىٰ وَ هَارُونَ﴾ کہہ کر بتایا ہم تیرے نہیں ہم موسیٰ اور ہارون کے ہیں۔



ہم تیرے گروپ کے نہیں فلاں گروپ کے ہیں۔

### معراج جسمانی تھا محض روحانی نہیں:

اہل السنۃ والجماعۃ کا نظریہ یہ ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہوئی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں معراج جسمانی نہیں روحانی ہوئی ہے، آپ کہیں کہ نہیں نہیں ہم صرف معراج نہیں کہتے بلکہ ہم معراج جسمانی کہتے ہیں تاکہ الجحش ختم ہو جائے کہ ہم کون ہیں۔

### حیات النبی کا شفاف عقیدہ:

الحمد للہ آج فضا بدل گئی ہے وہ لوگ بھی کہتے ہیں ہم بھی توحیات کے قائل ہیں ہم کون سے منکر ہیں؟ آپ ان سے پوچھیں کہ تم کون سی حیات کو مانتے ہو؟ حضور کا زمین والا جسم زندہ مانتے ہو یا صرف روح کو زندہ مانتے ہو؟ وہ کہے گا نہیں نہیں میں زندگی مانتا ہوں لیکن برزخی۔ آپ کہیں برزخی تو میں بھی مانتا ہوں۔ جھگڑا یہ نہیں ہے کہ برزخ میں زندہ ہیں۔ یہ بتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح زندہ ہے یا جسم زندہ ہے؟ کہے گا جی روح۔ ہم نے کہا تو ہمارا نہیں ہے، ہم کہتے ہیں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم برزخ میں زندہ ہیں صرف روح نہیں بلکہ جسد مبارک بھی زندہ ہے۔

جیسے فرعون کے دربار میں ستر ہزار جادو گروں نے یہ نہیں کہا: ﴿أَمْسَا بِرَبِّ الْعَلَمِينَ﴾ رب العالمین کہتے تو فرعون کہتا یہ میرے ہیں۔ بلکہ کہا: ﴿رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ﴾ اسی طرح ہم بھی صرف برزخی نہیں کہتے بلکہ برزخ کے ساتھ دنیا والے جسم کو بھی زندہ مانتے ہیں۔

### حیات جسمانی اور حیات برزخی:

کوئی بندہ برزخی مانے اور دنیاوی جسم کو زندہ نہ مانے وہ حیاتی نہیں ہے، وہ

حیات کا قائل نہیں ہے وہ تمہیں دھوکہ دیتا ہے، اس لیے وہ تمہیں کہے گا حیات یہ بھی مانتا ہے اور میں بھی مانتا ہوں، یہ حیات ادنیٰ مانتے ہیں ہم اعلیٰ مانتے ہیں۔

آپ متاثر نہ ہونا کہ علامہ صاحب نے بڑی دلیل دی ہے، یہ حیات ادنیٰ مانتا ہے اور ہم اعلیٰ مانتے ہیں، اعلیٰ کون سی ہے؟ کہتے ہیں ہم تو حضور کو جنت الفردوس میں زندہ مانتے ہیں، اوپر مانتے ہیں۔ ہم نے کہا حضور تو نیچے ہیں اوپر تو کیسے زندہ مانتا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اوپر ہیں یا مدینہ میں ہیں؟ [مدینہ میں ہیں۔ سامعین] تو اوپر کیسے زندہ مانتا ہے؟ دیکھو جی دھوکہ کتنا ہے؟ ہم تو اعلیٰ زندگی مانتے ہیں اور یہ ادنیٰ زندگی مانتے ہیں۔

### اہل السنۃ والجماعت کا عقیدہ:

ہم جنت الفردوس میں مانتے ہیں اور یہ روضہ میں مانتے ہیں۔ ہم نے کہا نہ جہاں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر ہے اس قبر کے مٹی کے ذرے جو حضور کے وجود سے ملے ہیں وہ جنت الفردوس سے بھی اعلیٰ ہیں۔ اعلیٰ یہ نہیں ہے کہ اوپر مان، اعلیٰ یہ ہے کہ وہاں مان جہاں حضور رہتے ہیں۔ اس دھوکے میں مت پڑو۔

﴿اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ رَبِّ مُوسٰی وَ هٰرُوْنَ ﴿﴾ انہوں نے کہا: ہم موسیٰ کے رب پر ایمان لائے ہیں۔ صرف رب العالمین نہیں کہا۔ صرف رب العالمین کہتے تو فرعون نے دھوکہ دینا تھا۔ اسی طرح اگر تم برزخی حیات کہو گے تمہیں مماتی نے دھوکہ دینا ہے۔ اس لیے کہو ہم حضور کو زندہ مانتے ہیں لیکن زمینی قبر روضہ مبارک میں زندہ مانتے ہیں۔

### عملی زندگی میں عقیدہ حیات النبی کی اہمیت:

ایک شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مولانا صاحب اگر زندہ نہ مانیں تو اس سے عملی زندگی میں کیا فرق پڑتا ہے؟ پریکٹیکل لائف میں کیا فرق پڑتا ہے؟ میں

نے کہا اگر تمہیں پتا ہو کہ تمہارے ادارے کو باس چیک کرتا ہے، اور یہ پتا ہو کہ چیک نہیں کرتا، فرق پڑتا ہے کہ نہیں؟ کسی شاپ کو ہیڈ کوارٹر کو چیک کرتا ہو تو فرق پڑتا ہے کہ نہیں پڑتا؟ یہ پتا ہو کہ اعمال پیش ہوتے ہیں اور یہ پتا نہ ہو کہ اعمال پیش ہوتے ہیں فرق پڑے گا کہ نہیں؟ فرق تو پڑتا ہے!

### عرض اعمال کا عقیدہ:

جب عقیدہ ہو کہ سوموار کو میرے اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خدمت پیش ہونے ہیں، تو حیا بھی کروں گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہ ہو۔ میں نے کہا کیوں فرق نہیں پڑتا؟ تو اپنے گھر جائیں اور آپ کے والد صاحب بہرے ہوں تب سلام کرنے کا مزہ آتا ہے یا سنتے ہوں تو مزہ آتا ہے؟

کہتا ہے سنتے ہیں تب مزہ آتا ہے۔ میں نے کہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے پہ جائے اور تیرا عقیدہ ہو کہ نہیں سنتے تجھے سلام میں لطف کیا آتا ہے؟ لطف تب آئے گا جب یہ عقیدہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سنتے بھی ہیں اور جواب بھی دیتے ہیں۔ کہنے لگا جواب دیتے ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں! کہتا ہے ہم سنتے نہیں ہیں؟ میں نے کہا بھی ہر کسی کو سنائی نہیں دیتا۔

### حضرت مدنی کا عقیدہ:

شیخ العرب والجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ گئے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے پہ اور کہتے ہیں ”السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا جَدِّي!“ روضے سے جواب آتا ہیں ”وَعَلَيْكَ السَّلَامُ يَا وَلَدِي!“ تجھے اور مجھے جواب سنائی نہ دے اس کا مطلب یہ ہے کہ سنتے ہی نہیں ہیں؟ بھی ہمیں آواز آئے تب بھی سنتے ہیں اور اگر ہمیں آواز نہ آئے تب بھی سنتے ہیں۔

## سماع باری تعالیٰ اور سماع النبی:

آپ ایک بار کہیں ”اللہ“ کیا اللہ تعالیٰ نے سنا؟ اور جواب بھی دیا؟ جب آپ کو سنائی نہیں دیا تو کہہ دیں اللہ نہیں سنتا! کیونکہ ہم نے جو نہیں سنا، ہم خدا تعالیٰ کا نام بھی لیتے ہیں اور خدا تعالیٰ جواب بھی دیتے ہیں، ہم نہیں سنتے اس کا مطلب کیا یہ ہے کہ خدا نے جواب ہی نہیں دیا؟

## درو پڑھنے کا لطف کب آئے گا؟:

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے پہ درود پڑھ اس نیت سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سنتے ہیں، پھر دیکھ پڑھنے کا مزہ کتنا آتا ہے۔ تیرے آنکھ سے آنسو نکلے جب یہ ذہن تو ہونا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روضے میں سنتے ہیں۔ میں نے کہا جب سنتے نہیں تو وہاں جاتا کیوں ہے؟

## روضہ پر صلوٰۃ و سلام:

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پہ جا کر ”الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ“ کہنا ہے۔ چلو اس کو اگر تو نہیں مانتا صرف سلام کو مانتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے پہ جا کر کہے: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ؟ کہتا ہے جی مانتا ہوں۔ میں نے کہا جب سنتے نہیں تیرے عقیدے کے مطابق تو کیوں مانتا ہے؟ تو کہتا ہے جی یہ تو دعا ہے۔ میں نے کہا پھر روضہ پہ نہ جانا، دعا ادھر سے مانگ لے ادھر منہ کر اور کہہ دے ”اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ“ لوگ پوچھیں کیوں؟ کہو جی یہ تو دعا ہی ہے وہاں کے بجائے میں نے یہاں مانگ لی ہے۔ تو کہہ پھر ہمیں پتا چلے تجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے۔

## خوش بختوں کو جواب بھی سنائی دیتا ہے:

کہنے لگا اگر سنتے ہیں تو جواب کیوں نہیں سنائی دیتا؟ تو میں نے کہا حضرت

حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر گئے ہیں، سلام کیا: ”اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا جَدِّی!“ جواب آیا: ”وَعَلَیْكَ السَّلَامُ یَا وَلَدِی!“

آپ نے اللہ اکبر کہا اللہ نے سنا؛ یا نہیں سنا؟ جواب دیا؛ یا نہیں؟ آپ نے سنا نہیں تو اس کا کیا مطلب ہے انہوں نے جواب ہی نہیں دیا؟

### شریعت نہ ماننے والے جانوروں سے بدتر:

﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلَّغْنَا هُمُ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر یہ بات نہیں مانتے یہ جانور کی طرح ہیں۔ آگے فرمایا نہیں نہیں بلکہ یہ جانور سے بھی بدتر ہیں۔ کیا اتنا کہنا کافی نہیں تھا کہ یہ جانور کی طرح ہیں بدتر کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ ہے کہ انسان کی دو خصلتیں ہیں، ملکیت اور بہیمیت۔

### مزاج انسانی میں دو صفتیں:

تو انسان کے مزاج میں اللہ نے دو صفتیں رکھی ہیں ایک مان کر چلنا اور ایک اپنی من مانی کرنا جانوروں کے مزاج میں ایک صفت ہے من مانی کرنا اور فرشتوں کے مزاج میں ایک صفت ہے مان کر چلنا اور انسان میں دونوں رکھی ہیں اور اختیار پورا دیا ہے کہ چاہے تو مان کر چلے اور چاہے تو اپنی من مانی کرے۔

### حضرت یوسف اور زلیخا:

اس کے ساتھ ایک اور بات سمجھتے جائیے حضرت یوسف علیہ السلام پر

تم نے غلام کو دیکھا نہیں ہے اگر دیکھ لیتیں تو کبھی طعنہ نہ دیتیں۔ انہوں نے کہا کہ چلو دکھا دو۔ زلیخانے دعوت کی اور دسترخوان بچھا دیا۔

### عالم الغیب صرف اللہ:

زلیخانے کہا: ﴿أُخْرِجْ عَلَيْنَهُنَّ﴾ آپ ذرا باہر تشریف لائیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام باہر آئے۔ نبی علم غیب نہیں جانتا ان کے علم میں نہیں کہ باہر کون سا تماشا لگا رکھا ہے۔ تو انہوں نے دسترخوان پر سے پھل اٹھائے ہوئے تھے چھریاں ہاتھ میں تھیں اس پر ابھی بات نہیں کرتا انہوں نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو کہا: ﴿مَا هَذَا بَشَرًا ۖ إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾ ﴿٦٦﴾ یہ یوسف بشر نہیں ہے فرشتہ ہے حضرت یوسف علیہ السلام بشر تھے کہ فرشتہ؟

### ماہذا بشر اکا جملہ:

انہوں نے کیا کہا بشر نہیں ہیں فرشتہ ہیں انہوں نے بات صحیح کہی تھی یا غلط؟ (غلط) تو اللہ کو انکی بات کی تردید کرنی چاہیے تھی اس کو بیان کیوں نہیں فرما رہے ہیں جب اس کو بیان کیا تو معلوم ہوا کہ ان کا جملہ ٹھیک تھا: ﴿مَا هَذَا بَشَرًا﴾، اگر غلط ہوتا تو اللہ تعالیٰ تردید کرتے اللہ نے تردید نہیں کی تو معلوم ہوا جملہ ٹھیک ہے۔

### جملے کا صحیح مطلب:

جملے کا مطلب کیا ہے یہ سمجھیں انسان میں دو خصلتیں ہیں فرشتہ پن و نگر پن فرشتوں کے مزاج میں ایک ہی ہے مان کر چلنا اور جانوروں میں ایک ہے من مانی کرنا اور انسان کے مزاج میں دونوں ہیں اگر یہ من مانی کرے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ جانور ہے بلکہ جانور سے بھی بدتر ہے کیونکہ جانور کے مزاج میں مان کر چلنا تھا ہی نہیں انسان کے مزاج میں مان کر چلنا رکھا تھا لیکن پھر بھی من مانی کرے۔

## جملے کی وضاحت ایک مثال سے:

مثلاً: آپ کی گاڑی ہے آپ نے پندرہ لاکھ کی لی ہے موٹر وے پر جارہے ہیں اے سی نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور آپ کے ساتھ دوسری ایک گاڑی جارہی ہے تیرہ لاکھ کی جو نان اے سی ہے تو اب آپ کہتے ہیں کہ ہماری گاڑی تو نان اے سی سے بھی بدتر ہے کیونکہ اس میں تو اے سی تھا ہی نہیں لیکن اس میں تھا لیکن کام نہیں کر رہا تو اسی طرح انسان کے مزاج میں من مانی کرنا بھی ہے اور مان کر چلنا بھی ہے اور جب یہ من مانی کرے تو جانور سے بھی بدتر ہے کیونکہ جانور کے مزاج میں مان کر چلنا تھا ہی نہیں اس کے مزاج میں تو مان کر چلنا تھا لیکن پھر بھی یہ من مانی کرتا ہے تو یہ جانور سے بھی بدتر ہے اب اس جملے پر چلیں جو ان عورتوں نے کہا تھا "ما هذا بشرًا" کہ یوسف علیہ السلام بشر نہیں بلکہ فرشتہ ہیں اور صرف فرشتہ نہیں بلکہ کریم فرشتہ ہے۔

## ”معزز فرشتہ“ کا مطلب:

عام فرشتہ نہیں بلکہ کریم فرشتہ ہے۔ کیا معنی حضرت یوسف علیہ السلام انسان ہیں اس کے مزاج میں دونوں صفتیں ہیں مان کر چلنا بھی اور من مانی کرنا بھی تو ﴿مَا هَذَا بَشَرًا﴾ کہ یہ وہ بشر نہیں ہے جو من مانی کرتا ہے بلکہ یہ وہ بشر ہے جو مان کر چلتا ہے مان کر چلے تو، ”مَدَّكَ“ ہے لیکن ملک وہ ہوتا ہے جس کے مزاج میں مان کر چلنا ہوتا ہے تو یہ انسان جب مان کر چلے تو فرشتہ اور اس کے مزاج میں من مانی ہے پھر بھی یہ مان کر چلے تو یہ ملک کریم ہے۔ اگر یہ من مانی کرے تو یہ جانور نہیں بلکہ یہ جانور سے بھی بدتر ہے کیونکہ جانور کے مزاج میں تو صرف من مانی ہے اور اس کے مزاج میں تو مان کر چلنا تھا لیکن یہ پھر بھی من مانی کرتا ہے تو یہ جانور سے بھی بدتر ہے انسان کے مزاج میں دونوں چیزیں ہیں اگر من مانی کرے تو یہ جانور سے بھی بدتر ہے اور اگر مان

کر چلے تو فرشتوں سے بھی آگے گزر جاتا ہے۔

## نماز میں آمین آہستہ کہیں:

﴿وَ اذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرَّعًا وَ خِيْفَةً وَ دُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ

بِالْعَدُوِّ وَالْاَصْحَابِ وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝۶۰﴾

ہمارے ہاں مسئلہ ہے جب امام صاحب ﴿وَلَا الضَّآئِيْنَ ۝۶۱﴾ کہے تو

مقتدی آمین کہے آہستہ یا اونچی (آہستہ) آہستہ کہنے کی دلیل کیا ہے میں دلیل دینے لگا ہوں دیکھ لینا۔

## شوافع کا اعتراف:

ہم آمین آہستہ کیوں کہتے ہیں؟ امام فخر الدین رازی، شافعی المسلک ہیں تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک بلند آواز سے آمین کہنا ہے لیکن اس کے باوجود یہ شافعی عالم لکھتے ہیں کہ جب امام ﴿وَلَا الضَّآئِيْنَ ۝۶۱﴾ کہے تو مقتدی آمین آہستہ آواز سے کہے۔ دلیل قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ ہے اور یہ امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کا ساتھ دیتی ہے۔

## آمین؛ دعا ہے یا اللہ کا نام ہے:

آمین ہے کیا؟ آمین یا تو دعا ہے یا اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔

[1]: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"آمِينَ" اِسْمٌ مِنْ اَسْمَاءِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ" <sup>135</sup>

آمین اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔



[2]: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وَقَالَ عَطَاءٌ: آمِينَ دُعَاءٌ"<sup>136</sup>

امام عطاء رحمہ اللہ جلیل القدر تابعی ہیں، انہوں نے فرمایا: آمین دعا ہے۔  
اب یہ دعا ہو یا ذکر، ہر دو صورت میں آہستہ کہیں گے۔ قرآن دعا کے  
بارے میں کہتا ہے: ﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾ اللہ سے دعا آہستہ مانگو۔  
اور اگر اللہ کا نام ہو تو قرآن کہتا ہے: ﴿وَادْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَ  
خُفْيَةً﴾<sup>137</sup> اللہ کا نام لو تو آہستہ لیا کرو۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ  
آمین آہستہ کہو کیونکہ اگر یہ دعا ہے تو بھی قرآن آہستہ کہنے کا حکم دیتا ہے اور اگر اللہ کا  
نام ہے تو ذکر کے بارے میں بھی قرآن آہستہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔

### امام رازی کی دیانت:

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ میں شافعی المسلک ہوں لیکن  
دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ اس مسئلے میں قرآن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ساتھ دیتا ہے اور  
پھر فرمایا: میں اس مسئلہ میں وہی کہتا ہوں جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا۔<sup>138</sup>

### دعا، آہستہ یا بلند آواز سے؟

میں نے ایک جگہ بیان کیا اور کہا کہ آمین دعا ہے اور آہستہ آواز سے کرنی  
چاہیے۔ ایک ساتھی کا فون آیا کہ ایک آدمی نے اپنے رسالے میں مضمون لکھا ہے اور

136۔ صحیح البخاری: کتاب الاذان، تحت باب جہر الامام بالتأمین

137۔ الاعراف 7: 205

138۔ التفسیر الکبیر للرازی: ج 14 ص 107

اعتراض کیا ہے اس کا جواب دو۔ میں نے کہا: اعتراض کیا کیا ہے؟ تو اس نے لکھا ہے کہ یہ کہتے ہیں: دعا آہستہ کرنی چاہیے تو پھر رائیونڈ والے اونچی آواز سے کیوں دعا کرتے ہیں۔ سوال تو ٹھیک ہے۔ اب اگر یہ سوال بیان کے بعد آپ سے ہو تو آپ نے پھر پھنس جانا ہے۔ رائیونڈ والے اونچی آواز سے کرتے ہیں تو دعا دو قسم کی ہے؛ ایک وہ جو اپنے لیے کرتے ہیں اور ایک وہ جو دوسروں کے لیے کرتے ہیں اور جب اپنے لیے کرے تو اس کا اور خدا کا معاملہ ہے تو یہاں آہستہ کرنی چاہیے اور رائیونڈ والے بتاتے ہیں کہ میں کیا دعا مانگ رہا ہوں تاکہ دوسروں کو بھی پتا چل جائے کہ کیا دعا ہو رہی ہے لیکن جب امام ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کہتا ہے اور یہ آمین کہتا ہے تو اس کی آمین اپنے لیے ہے اس لیے آہستہ آواز سے کرنی ہے اور اگر دوسروں کو ساتھ ملانا ہو تو جہر ہوتا ہے اب بات سمجھ آئی کہ آہستہ آواز سے کیوں کی جاتی ہے۔

### مثال سے مسئلہ کی وضاحت:

مثلاً ابھی بھائی عبدالوحید یوسف کہہ رہے تھے بچوں کے لیے اور ایک عورت بیمار ہے اس کے لیے دعا کرنی ہے تو اب میں اونچی آواز سے کروں گا کہ اللہ بیماروں کو صحت دے تو آپ کہیں گے کہ لو ابھی بیان میں کہا تھا کہ دعا آہستہ آواز میں مانگنی ہے اور اب خود ہی اونچی آواز سے دعا کر رہے ہیں تو بھائی جب میں خود دعا مانگوں گا تو آہستہ اور جب آپ ساتھ ہوں گے تو اب دعا اونچی آواز سے نہیں کر رہا بلکہ آپ کو بتا رہا ہوں کہ بیماروں کے لیے دعا کریں اب لوگ مسئلہ سنتے نہیں ہیں اعتراض کر دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

وَاجِرْ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الانفال

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ ۖ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ

أَصْلَحُوا ۖ إِذَا تَبَيَّنَ كُفْرُ أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١﴾﴾

تمہید:

سورة الانفال مدنی سورت ہے، اس میں 10 رکوع ہیں اور 75 آیتیں ہیں۔  
اس سورة کا نام ”سورة الانفال“ ہے۔ میں ہر سورة کے آغاز میں عرض کرتا رہتا ہوں کہ  
سورة کے نام رکھنے کہ وجہ یعنی ”وجہ تسمیہ“ کیا ہے؟

انفال کسے کہتے ہیں؟:

اس سورة کا نام ”سورة الانفال“ اس لیے رکھا گیا ہے کہ ”أَنْفَال“ عربی زبان  
کا لفظ ہے جو ”نَفْل“ کی جمع ہے، ”نَفْل“ کا معنی ”زائد“ بھی ہوتا ہے اور اس کا  
معنی ”فضل“ اور ”احسان“ اور ”اللہ کا کرم“ بھی ہوتا ہے۔ ”نَفْل“ کے لغوی معنی ہیں  
زائد، فضل اور انعام۔ جب ہم نماز پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس میں اتنے فرض ہیں،  
اتنی سنتیں ہیں، اتنے واجب ہیں، اتنے نفل ہیں۔

تو ”نَفْل“ کو نفل کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ نفل فرائض سے ایک زائد چیز

کا نام ہے، اس لیے نفل کہتے ہیں، یا میں نے عرض کیا کہ ”تَنْفُلٌ“ کا معنی ہوتا ہے فضل اور انعام۔ اللہ رب العزت اپنے فضل و کرم سے فرائض کی کمی کو پورا کرنے کے لیے نفل عطاء فرماتے ہیں۔ جب انسان نفل ادا کرتا ہے تو فرائض میں جو کمی کوتاہی رہ جاتی ہے نوافل کے ذریعے اس کو پورا کر دیا جاتا ہے۔ میں وجہ پیش کر رہا ہوں کہ اس سورت کو ”سورة الانفال“ کیوں کہا جاتا ہے؟

### مالِ غنیمت کا حلال ہونا:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"فُضِّلْتُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ."

اللہ رب العزت نے مجھے چھ چیزیں وہ عطا فرمائی ہیں جو گزشتہ انبیاء علیہم السلام کو عطا نہیں فرمائیں۔ ان میں سے ایک چیز "أُحِلَّتْ لِي الْغَنَائِمُ" ہے کہ اللہ نے میرے لیے میدان جنگ کے مال "مالِ غنیمت" کو حلال قرار دیا ہے۔<sup>139</sup>

### سابقہ شرائع اور مالِ غنیمت:

گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے لیے مالِ غنیمت حلال نہیں تھا یعنی ان انبیاء علیہم السلام کے لیے مالِ غنیمت کا استعمال کرنا ٹھیک نہیں تھا، جب جہاد میں نکلتے تھے اور میدان جنگ میں کفار کا مال جمع ہوتا تو اس مال کو کھلے میدان میں رکھ دیا جاتا تھا، آسمان سے آگ آتی اور اس مالِ غنیمت کو کھا جاتی۔ اگر وہ مالِ غنیمت آسمانی آگ کھا جاتی تو یہ اس بات کی علامت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد کو قبول فرمایا اور اگر آگ اس مال کو نہ کھاتی تو اس بات کی علامت ہوتی تھی کہ یہ جہاد قبول نہیں ہوا۔

لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے یہ اعزاز بخشا

ہے کہ مالِ غنیمت کو میرے لیے حلال کر دیا گیا ہے۔ اب امت جہاد کرے اور میدان جنگ میں کفار سے مال چھینے، اب آگ کے ذریعے اسے جلانے کی ضرورت نہیں، یہ اسے اپنے حلال اور پاکیزہ رزق کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں یعنی یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اعجاز ہے۔

### ہمارے نبی کا دائرہ نبوت غیر محدود ہے:

اس کی وجہ کیا ہے کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کے لیے تو مالِ غنیمت حلال نہیں تھا ہمارے پیغمبر کے لیے مالِ غنیمت حلال کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کا دائرہ نبوت محدود تھا، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دائرہ نبوت غیر محدود ہے، پہلے نبیوں نے ایک بستی میں رہنا ہے، ایک قوم میں رہنا ہے، ایک گاؤں میں رہنا ہے اور ایک خاص وقت تک اس نبی کی نبوت ہے، ہمارے نبی کی نبوت کا دائرہ محدود نہیں ہے بلکہ پوری دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت نے پوری دنیا میں جانا بھی ہے۔

### مالِ غنیمت حلال نہ ہو تو...؟

اب اگر یہاں سے چلیں اور دنیا کے کسی دوسرے کونے میں جائیں اور جاکر جہاد کریں اور مالِ غنیمت بھی ان کے لیے حلال نہ ہو تو پھر کھانے کی دو صورتیں ہیں:

(1) یا کمائیں اور کھائیں

(2) یا پھر مرکز سے مال لائیں اور کھائیں

میدان جہاد میں جاکر کمانا شروع کر دیں تو یہ جہاد نہیں کر سکیں گے اور اگر مرکز سے مال لانا چاہیں تو دور ہونے کی وجہ سے مال لا بھی نہیں سکتے۔ تو یہ امت آگے کیسے بڑھے گی؟ اس کے لیے اللہ رب العزت نے ختم نبوت کی برکت سے اعزاز دیا ہے کہ تم بڑھتے چلے جاؤ، کمانا کافر نے ہے اور کھانا تم نے ہے (سبحان اللہ۔ سامعین)

تمہیں کمانے کی ضرورت نہیں ہے، کافر کمائے گا اور تم کھاؤ گے اور یہ کھانا حلال بھی ہو گا اور طیب بھی ہو گا۔

## مال کی تین اقسام:

میدان جنگ میں جو مال ملتا ہے اس کی تین قسمیں ہیں:

1: مال غنیمت: مال غنیمت کا معنی کیا ہے؟ کہ میدان جنگ میں گئے ہیں اور کفار سے مقابلہ ہوا ہے اور مقابلے کے بعد آپ کو مال ملا ہے۔

2: مال فنی: بغیر جنگ لڑے کافر خود کو آپ کے حوالے کر دے، اس سے بھی مال ملتا ہے، اسے مال فنی کہتے ہیں۔

تو جنگ کے ذریعے مال ملے تو ”مال غنیمت“ بغیر جنگ لڑے ملے تو ”مال فنی“ ہے۔

3: انفال: ایک ہوتا ہے ”انفال“ جو نفل کی جمع ہوتی ہے، اس کو محدثین اور مفسرین نے تھوڑا عام رکھا ہے۔

## مال کی تقسیم کا طریقہ کار:

جب میدان جنگ میں جائیں اور مال غنیمت ملے تو اس مال غنیمت کے پانچ حصے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک حصہ جسے ”خمس“ کہتے ہیں یہ تو بیت المال میں جمع ہوتا ہے اور چار حصے ان مجاہدین کے درمیان تقسیم ہوتے ہیں جو جہاد میں شامل ہوتے ہیں، کبھی ان چار حصوں کو ”مال انفال“ کہتے ہیں اور کبھی میدان جنگ میں امیر لشکر کہتا ہے کہ جس شخص نے فلاں کافر کو قتل کیا تو اس کافر کا مال اس قاتل کو دیں گے تو اس مال کو بھی نفل کہتے ہیں۔ اور کبھی جو پانچواں حصہ بیت المال میں جمع ہوا ہے اسی مال میں سے امیر المجاہدین کسی مجاہد کے خاص کارنامے کی وجہ سے اس مجاہد کو بطور اکرام کے دیتا ہے اس مال کو بھی ”مال انفال“ کہتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو مال خمس

(پانچواں حصہ) بیت المال میں جمع ہوا ہے ایک شخص میدان جنگ میں تو نہیں گیا لیکن مجاہدین کی خدمت کرتا ہے، اس خدمت کرنے والے کو بھی امیر لشکر اس خمس میں سے کچھ مال دیتا ہے تو اس مال کو بھی ”مال انفال“ کہتے ہیں۔

### سورۃ میں ذکر کردہ زیادہ مضامین:

میں عرض کر رہا تھا کہ مال غنیمت ہو، مال فئی ہو یا مال انفال ہو کچھ بھی ہو اس سورۃ مبارکہ میں چونکہ زیادہ تر مسائل اور احکام جہاد کے ہیں اور اس سورۃ مبارکہ کا زیادہ تر حصہ اسلام کے پہلے غزوہ ”غزوہ بدر“ پر مشتمل ہے، غزوہ بدر میں جب صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نکلے ہیں میدان میں، مال غنیمت بھی ملا ہے اور مال غنیمت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تقسیم بھی ہوا ہے، اس مال کی وجہ سے اس سورت کا نام ”سورۃ الانفال“ رکھ دیا گیا ہے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو یہ حلال اور پاکیزہ مال عطا فرمائے۔ (آمین)

### ہم نے مال غنیمت استعمال کیا:

میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جن دنوں روس افغانستان میں آیا اور بڑا سخت قسم کا جہاد جاری تھا، اللہ رب العزت نے اس مال غنیمت میں سے وافر حصہ ہمیں بھی عطاء فرمایا تھا سبحان اللہ، ہم جتنا اللہ کا شکر ادا کریں کم ہے آپ نے مال غنیمت کا لفظ سنا ہے ہم نے مال غنیمت کو استعمال کیا ہے مال غنیمت کو حلال اور طیب سمجھ کر اسے استعمال کرنا چاہیے خدا کا کرم اور احسان سمجھنا چاہیے۔

### مال غنیمت اللہ اور رسول کا ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۖ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُولِ﴾

اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ﴾ اے میرے

پیغمبر! یہ صحابہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ مال غنیمت کا کیا کرنا ہے؟ ﴿قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَ الرَّسُولِ﴾ آپ فرمادیں یہ مال غنیمت اللہ کے حکم سے آپ کو ملا ہے اور اللہ کے حکم کے مطابق اور پیغمبر کے بتائے ہوئے طریقے سے تقسیم ہوگا، اس لیے تمہاری مرضی اور تمہاری رائے کو اس مال غنیمت کی تقسیم میں کوئی بھی دخل نہیں ہے۔

### آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارکہ:

اس کی وجہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ ایک غزوہ میں مجاہدین کے امیر بنے اور تاریخ اسلام کا سب سے پہلا واقعہ تھا حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 11 گیارہ صحابہ کرام دے کر بھیجا اور فرمایا کہ میں رقعہ دے رہا ہوں آپ نے اس کو فلاں مقام پر جا کر پڑھنا ہے اس سے پہلے پڑھنا نہیں ہے وہ رقعہ لیا اور صحابہ کو لے کر چل دیے جب وہ خاص جگہ پر پہنچے تین دن بعد وہاں رقعہ کو کھول کر دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فلاں جگہ پر فلاں تمہارا معرکہ ہوگا تم نے اس میں شرکت کرنی ہے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے صحابہ سے فرمایا یہ رقعہ ہے اور اس میں جہاد کا حکم ہے جو میرے ساتھ چل سکتا ہے چلے اور جو نہیں چل سکتا نہ چلے تمہاری مرضی ہے۔

ان گیارہ کے گیارہ نے عرض کیا کہ کیسے ممکن ہے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک کام کے لیے بھیجیں اور ہم واپس چلے جائیں اور یہ جو گئے اور ایک بڑے خاص لشکر پہ حملہ کیا اور اس حملے سے جو ان کو مال غنیمت میں کچھ مال ملا ابھی تک مال غنیمت کا حکم نازل ہوا نہیں تھا اب کرنا کیا چاہیے؟

### صحابی رسول کا اجتہاد:

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے 4 حصے مجاہدین



میں تقسیم کر دیے اور پانچواں حصہ مدینہ منورہ میں بیت المال میں جمع کروادیا ابھی حکم نازل نہیں ہوا تھا تو جب یہ مدینہ منورہ پہنچے کہا یا رسول اللہ ہمیں مال ملا ہے اور ہم نے یہ کیا اب آپ فرمائیں کیا کریں اللہ فرماتے ہیں: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ﴾ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے پوچھا ہے اور ابھی تک حکم نازل نہیں ہوا ہے لہذا میں کچھ نہیں کہہ سکتا حکم آئے گا تو بتاؤں گا۔

### اجمالی اور تفصیلی احکام:

تو جب یہ آیت اتری ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد بہت سارے احکامات بتادیے اس سورت کی پہلی آیت میں اجمال ہے اور جب دسواں پارہ شروع ہو گا ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ﴾ وہاں جا کر پوری تفصیل بیان فرمادی ہے چار حصے مجاہدین کے ہیں اور پانچواں حصہ جسے خمس کہتے ہیں بیت المال کا ہے جو امیر اپنی مرضی کے مطابق مختلف شعبہ جات میں اس مال کو تقسیم کرتا ہے اس میں مساکین بھی ہوتے ہیں فقراء بھی ہوتے ہیں اور دیگر کچھ حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

### غزوہ بدر کا خلاصہ:

اس آیت سے آگے غزوہ بدر کے تفصیلی احکام اور تفصیلی تذکرہ بڑی تفصیل سے فرمایا ہے میں بجائے اس کے کہ ایک آیت پڑھوں اور اس آیت سے غزوہ بدر کے مسائل بیان کروں اس میں تو بہت دیر لگ جائے گی میں نے عرض کیا اگر ایک ایک آیت پر بات کرتے رہیں تو پورا مہینہ مسلسل اس بیان میں لگ جائے گا، میں خلاصہ عرض کرتا ہوں جو آگے ان آیات میں اللہ رب العزت نے تذکرہ فرمایا ہے غزوہ بدر کے متعلق۔

## غزوہ بدر کیوں پیش آیا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئے اس کے بعد کفار کی مسلسل خواہش یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم کر دیا جائے ان کے اصحاب کو مٹا دیا جائے اس کے لیے کافر جو محنت کر سکتے تھے محنت کی ہے اللہ رب العزت نے ہر موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت فرمائی ہے تو کفار مکہ نے ایک مرتبہ اپنے اموال جمع کیے اور ابوسفیان (امیر معاویہ کے والد) ان کی قیادت میں شام کی طرف ایک وفد بھیجا کہ وہاں جا کر تجارت کرو اموال جمع کر کے لاؤ مکہ مکرمہ میں طاقت مضبوط کریں پھر مسلمانوں کا مقابلہ کریں ابوسفیان مکہ مکرمہ کا مال لے کر تجارت کے لیے شام پہنچے اس مال میں مکہ مکرمہ کا شاید ہی کوئی گھر ہو کہ جس گھر نے اپنا مال تجارت کے اندر نہ لگایا ہو ہر کسی نے اپنا پیسہ اس تجارت میں لگایا اس دور میں ابوسفیان جو مال تجارت لے کر آئے اس کی مالیت بنتی ہے 50 ہزار دینار ایک دینار ہوتا ہے ساڑھے 4 ماشے کا اب یہ کتنے تولہ بنتے ہیں آپ خود حساب کریں سُنار ہی حساب کر سکتے ہیں ہمارے بس میں تو حساب نہیں ہے پچاس ہزار دینار کا مال تھا اور ایک دینار ساڑھے چار ماشے کا ہوتا ہے اب ساڑھے چار ماشے کو پچاس ہزار سے ضرب دیں تو کتنے ماشے بنتے ہیں؟ کتنے تولہ بنتے ہیں؟ تو پھر آپ اندازہ کریں گے کہ کتنے کروڑ مالیت کا سامان تھا جو اس وقت شام سے مکہ مکرمہ لے کر آرہے تھے۔

## صحابہ سے مشاورت:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب پتا چلا اپنے صحابہ سے مشورہ لیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ کرتے ہیں جو مال شام جا رہا ہے اگر اس شام سے واپس آنے والے مال کو راستے میں کفار سے چھین لیا جائے یہ مال ہمارے خلاف استعمال ہونا ہے ہمارے خلاف استعمال ہونے کی بجائے مسلمانوں کے حق میں استعمال ہو میں یہ لفظ کیوں استعمال کر رہا

ہوں کہ کسی بندے کا ذہن منفی طرف نہ جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بے گناہ قافلے پر حملہ کر کے ان کا مال العیاذ باللہ لوٹنا چاہ رہے تھے یہ مقصد نہیں تھا کیونکہ اس مال نے مسلمانوں کے خلاف استعمال ہونا تھا اس لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ مال راستے سے روک لو بلاک کر دو تاکہ یہ مال مکہ نہ پہنچے جو ہمارے خلاف استعمال ہو بلکہ اس مال کو لے کر مسلمانوں کے حق میں استعمال کرنا چاہیے۔

### ابھی جنگ کا ارادہ نہیں تھا:

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ارادے سے مدینہ منورہ سے نکلے ہیں اب چونکہ جنگ کا ارادہ بھی نہیں ہے جہاد کا ارادہ بھی نہیں ہے کوئی لڑنے کا پروگرام بھی نہیں ہے اس لیے جو جانا چاہتا تھا اس کو لے گئے ہیں اور جو نہیں جانا چاہتا تھا اس کو چھوڑ دیا ہے نہ جانے والے پر کوئی عتاب بھی نہیں ہے کوئی ڈانٹ بھی نہیں کوئی ڈپٹ بھی نہیں اور فرمایا جن کے پاس سواری ہے وہ آجاؤ جن کے پاس سواری نہیں ہے رہنے دو۔

### دیہات والے صحابہ کرام سے گفتگو:

بعض صحابہ ایسے بھی تھے جو مدینہ منورہ میں رہتے تھے انہوں نے کہا یا رسول اللہ ہمارے دیہات قریب ہیں وہاں سواری موجود ہے آپ اجازت دیں ہم دوڑ کر لے آتے ہیں فرمایا نہیں رہنے دو موجود ہے تو ٹھیک ہے نہیں ہے تو تم یہیں ٹھہرو ہم چلتے ہیں۔

### جب 313 کا قافلہ چل پڑا:

یہ غالباً بارہ رمضان کا واقعہ ہے جب مدینہ سے نکلے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تین سو تیرہ کا لشکر تھا۔ جن کے پاس ستر گھوڑے ہیں دو اونٹ ہیں چھ زرہیں ہیں اور آٹھ ان کے پاس تلواریں ہیں یہ سامان لے کر نکلے ہیں ادھر سے یہ نکلے ادھر

ابوسفیان کے قاصد کو کسی نے بتا دیا العیاذ باللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے قافلے کو لوٹنے کے لیے مدینہ سے چل پڑے ہیں۔

### ابوسفیان کا خدشہ:

اس دور کا رواج یہ تھا کہ بہت قیمتی سرمایہ لے کر چلنے والا قافلہ ہوتا تو آگے کچھ لوگ دور دراز تک دیکھتے۔ جیسے ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں وہ کلیئر نس دیتے رہتے تھے کہ راستہ بالکل صاف ہے پر امن ہے خطرہ نہیں ہے اپنا سفر جاری رکھو۔ تو جو قافلے کے آگے دو چار بندے تھے انہوں نے بتایا کہ تمہارے مال کو مسلمان مدینہ والے لوٹنا چاہتے ہیں ابوسفیان نے اپنا قاصد لیا اور اس دور میں اس کو دو ہزار دینار دیے اور کہا تم یہاں سے مکہ دوڑو اور ان کو جا کر کہو کہ جتنا جلدی پہنچ سکتے ہو ہماری مدد کو پہنچو اس نے اونٹنی کو لیا اور اونٹنی کا کجاوہ الٹا کر دیا اونٹنی کی کوہان کو زخمی کر دیا اپنے کپڑے پھاڑ دیے اور اونٹنی کو لے کر چل دیا۔

### سابقہ ادوار کی ایمر جنسی علامات:

یہ اس دور میں ایمر جنسی کی علامات تھیں جیسے ہمارے ہاں کوئی ایمر جنسی گاڑی جائے اس پر ہوڑ بھی لگا ہوتا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ یہ ایمر جنسی گاڑی ہے اس کو راستہ دو اس دور میں خطرناک سفر کی علامت یہ ہوتی اونٹنی کا کجاوہ الٹا کر دو، کوہان زخمی کر دو اپنے کپڑے آگے سے پھاڑ دو پھر یہ دوڑتا جائے گا تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ کوئی بڑی ایمر جنسی خبر لے کر آرہا ہے یہ دوڑا اور مکہ مکرمہ جا رہا تھا اللہ کی شان دیکھو ابھی تک یہ مکہ میں داخل نہیں ہوا تھا۔

### حضرت عاتکہ رضی اللہ عنہا کا خواب:

اس کے مکہ مکرمہ پہنچنے سے پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی عاتکہ بنت عبدالمطلب کو خواب آیا۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص مکہ میں اونٹنی پر آرہا

ہے اور مکہ میں آکر اعلان کرتا ہے مکہ والو تین دن میں اندران جگہوں پر پہنچو جہاں تم نے قتل ہونا ہے۔ یہ اعلان کیا پھر جبل ابی قیس پر چڑھا اور پہاڑ پر سے چٹان گرائی جب چٹان پہاڑ کے دامن میں آئی تو اس کے ٹکڑے ہوئے اور کوئی نہ کوئی ٹکڑا مکہ کے ہر گھر میں داخل ہوا۔ عاتکہ بنت عبدالمطلب نے اپنے بھائی عباس سے کہا بھائی جان مجھے خواب آیا ہے لگتا ہے کہ مکہ والوں پر کوئی مشکل وقت آرہا ہے لیکن یہ خواب کسی کو بتانا نہیں۔ خواب بڑا اہم تھا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے خواب سنانا کا ایک دوست تھا ولید، اس کو بتا دیا جب ولید نے خواب سنا اس نے اپنے باپ عتبہ کو بتا دیا عتبہ نے ابو جہل کو بتا دیا ابو جہل بے ایمان تھا اور ذہین بہت تھا ابو جہل نے خواب سنا تو اس نے کہا یہ تو ہم نے سنا تھا کہ تمہارے مردوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے یہ تمہاری عورتوں نے نبوت کا دعویٰ کب سے شروع کر دیا ہے ہم یہ سنتے تھے کہ تمہارے محمد پر وحی آتی ہے یہ تمہاری عورتوں نے بھی نبوت کے دعوے شرع کر دیے؟ مطلب یہ تھا کہ کیا تم نے غلط افواہیں پھیلار کھی ہیں ابھی یہ تذکرہ چل رہا تھا۔

### ابوسفیان کے قاصد کی آمد:

غفاری جو ابوسفیان کا قاصد تھا اسی طرح مکہ مکرمہ میں داخل ہوا۔ مکہ والوں نے دیکھا تو ان کو بڑا تعجب ہوا۔ اس نے فوراً کہا جس قدر جلدی ہو سکتا ہے دوڑو اور قافلے کو بچاؤ ورنہ تمہارے قافلے کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان لوٹ لیں گے ابو جہل نے اعلان کیا، اور فوراً سب کو جمع کیا اس نے کہا جتنا جلدی ہو سکتا ہے تم نکلو۔ امیہ سردار تھا اس کا مکہ میں بڑا نام تھا۔

### حضرت سعد کی مطاف میں گفتگو:

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اس امیہ بن خلف کے دوست تھے جب

یہ مکہ آتے اس کے پاس ٹھہرتے وہ مدینہ میں جاتا تو ان کے پاس ٹھہرتا آپس میں یاری جو تھی ایک مرتبہ یہ سعد مکہ مکرمہ میں آئے اور طواف کا ارادہ تھا تو انہوں نے اپنے دوست امیہ سے کہا کہ تم مجھے طواف کراؤ لیکن ایسے وقت میں کراؤ کہ مطاف میں بندہ کوئی بھی نہ ہو میں سہولت کے ساتھ طواف کروں دوپہر کو لے کر گئے مطاف خالی ہے کہ میں تمہیں طواف کرا دیتا ہوں جب وہاں گئے ابو جہل نے ان کو دیکھ لیا یہ بڑے پر امن طریقے سے طواف کر رہے ہیں ابو جہل نے کہا امیہ یہ کیا تم نے ان بے دین لوگوں کو کھلی چھٹی دی ہے اور ساتھ ان کو پناہ بھی دی ہے اور یہ کیسے دندنا تھا تو طواف کر رہا ہے۔ ابو جہل دشمنی میں بہت آگے تھا جب اس نے یہ بات کی تو سعد رضی اللہ عنہ نے ڈانٹ کر یہ کہا ابو جہل تم اگر مکہ کے سردار ہو تو میں مدینہ کا سردار ہوں اگر میرے طواف کے رستے کی رکاوٹ بنے تو تمہاری گردن اڑا کے رکھ دوں گا خبردار کچھ کرنے کی جرات کی۔

### امیہ کے بارے آنحضرت کی پیش گوئی:

امیہ بن خلف نے کہا سعد میری اور تمہاری یاری ہے لیکن یہ ہمارا سردار ہے ایسی اونچی آواز سے بات نہ کرو حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے ایک جملہ نکلا ان سے کہو کہ تم بھی خیال سے بولو مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بتایا ہے امیہ میرے ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہو گا۔ اس نے کہا میرے بارے میں کہا؟ ہاں تمہارے بارے میں۔ اس نے کہا مکہ میں؟ فرمایا جگہ تو مجھے نہیں بتائی، لیکن یہ کہا کہ میرے ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہو گا۔ وہ کانپ گیا اور اسی وقت سے محتاط ہو گیا اور پھر کبھی مکہ سے باہر نہیں نکلا کہ میں صحابہ کے ہاتھوں قتل نہ ہو جاؤں۔

### امیہ کا تذبذب:

جب یہ معاملہ پیش آیا تو ابو جہل نے دونوں کو نکالا کہ چلو امیہ سے کہا تم بھی

چلو امیہ بن خلف کو سعد کی بات یاد آگئی وہ کہتا ہے میں تو باہر جانے کے لیے تیار نہیں ہوں ابو جہل نے کہا تم سردار ہو اگر تو نہیں گیا تو باقی لوگ کیسے جائیں گے؟ اب اس نے سرداری کی وجہ سے کہا چلو میں چلتا ہوں اور ابو جہل نے یہ بھی کہا کہ اب تم یہاں سے چلو اور میں تیز رفتار اونٹ دوں گا تمہیں کوئی راستے میں خطرہ محسوس ہو تو وہیں سے دوڑ کرواپس آجانا لیکن چلو تو سہی۔

### بیوی کی یاد دہانی:

اپنی بیوی ام سفیان سے کہا کہ کجاوہ کسو اور میرے سامان کی تیاری کرو! جب تیاری کرنے لگے تو اس کی بیوی نے کہا: وہ وقت یاد ہے جب تیرے بھائی سعد نے یہ کہا تھا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔ اس نے کہا: مجھے یاد ہے لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں ہے لیکن میں حفاظت کے ساتھ واپس آ جاؤں گا لیکن نکلنا بڑا مشکل تھا۔

### ابو جہل کا لشکر روانہ ہوا:

میں بتایہ رہا تھا یہ تھوڑا سا پس منظر خواب اور یہ مکہ والوں کے حالات بالآخر ابو جہل اپنے ایک ہزار ساتھیوں کو لے کر نکلا جب مدینہ منورہ کے قریب پہنچا تو ابو جہل کو یہ اطلاع ملی کہ ابو سفیان کا قافلہ بچ کر نکل گیا جب ان کو اطلاع ملی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہمارے مال پر حملہ کریں گے اور مال لوٹ لیں گے انہوں نے راستہ بدل لیا راستے کو بدل کر دوسرا راستہ اختیار کر لیا لیکن ابو جہل کو اپنی طاقت پہ ناز تھا بڑے بڑے سرداروں نے کہا آؤ ہم واپس چلتے ہیں۔ قافلہ بچ گیا ہے اب لڑنے کی ضرورت نہیں ہے وہ مریں گے تو قریشی ہیں ہم مریں گے تو قریشی ہیں وہ قتل ہوئے تو ہاشمی ہیں ہم قتل ہوئے تو ہاشمی ہیں اپنے ہی خاندان کو مارنا مرنا یہ کوئی عقل کی بات نہیں ہے چلو ہم واپس چلتے ہیں۔

## ابو جہل لاؤ لشکر سمیت میدان میں:

لیکن ابو جہل نے کہا میں واپس جانے کے لیے تیار نہیں ہوں بلکہ ہم جشن منائیں گے اور جشن منا کے چلیں گے۔ یہ کہہ کر قتل کے میدان میں اتر گیا ایک جماعت کے بڑے بڑے جری جوان اس کے ساتھ موجود بھی تھے ان کے پاس اونٹ بھی ہیں ان کے پاس دو سو گھوڑے بھی ہیں ان کے پاس چھ سوزر ہیں اور تلواریں بھی کافی مقدار میں ان کے پاس سامان موجود تھا۔ وہ قافلہ نکل گیا اور ابو جہل اپنے ساتھیوں کے ساتھ میدان میں اتر گیا۔

## رسول اللہ کی صحابہ سے مشاورت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا چلا کہ ابوسفیان تو چلا گیا ہے اور ادھر تو ابو جہل آگیا ہے اب صحابہ سے مشورہ لیا اب بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ابوسفیان تو ایک طرف سے نکل گیا ہے اور ابو جہل اپنی طاقت کے ساتھ میدان میں اتر گیا ہے ہمارے پاس سامان بھی نہیں ہے لیکن ایک بات طے شدہ ہے اللہ نے بتادیا ہے کہ ان دو لشکروں میں جس کے ساتھ بھی ہمارا مقابلہ ہو گا اللہ تعالیٰ اس لشکر پر ہمیں فتح عطا فرمائے گا، ابوسفیان مل گیا تو مال مل جائے گا اگر ابو جہل مل گیا تو فتح ہماری ہوگی لیکن ابو جہل کے لشکر سے مقابلہ ہو گا اور ابوسفیان کا قافلہ خالی ہے تو اس سے تو لڑائی نہیں ہوگی۔

## صحابہ کی خواہش:

صحابہ کی خواہش یہ تھی کہ ہمارا مقابلہ ابوسفیان کے قافلہ سے ہو لڑائی نہ ہو اور مال غنیمت مل جائے اللہ تعالیٰ یہ چاہتے تھے آج اسلام غالب کر کے اسلام کو فتح دے کر ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کی طاقت کا سکھ منوالیا جائے۔



## مہاجرین صحابہ کرام کی رائے:

مشورہ ہوا کہ اب کیا کرنا چاہیے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے کہا یا رسول اللہ ہم حاضر ہیں آپ جہاد کا اعلان کریں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے یا رسول اللہ ہم حاضر ہیں آپ جہاد کی بات کریں مقداد کھڑے ہوئے ہم حاضر ہیں آپ جہاد کا اعلان کریں۔

## انصار صحابہ کرام کی رائے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مشورہ دو کیا کرنا چاہیے انصار صحابہ سمجھ گئے کہ یہ مہاجر کھڑے ہو کے اعلان کرتے ہیں اللہ کے نبی پوچھنا چاہتے ہیں کہ انصار کیا کہنا چاہتے ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ انصاری کھڑے ہوئے انہوں نے کہا یا رسول اللہ ہمارا مال بھی آپ کا ہے اور ہماری جان بھی آپ کی ہے سب کچھ جو اللہ کا دیا ہوا ہے آپ کا ہے آپ بسم اللہ پڑھیں اور حکم فرمائیں آپ سمندر میں کہیں گے ہم چھلانگیں لگا دیں گے ہم پیچھے ہٹنے والے نہیں یہ موسیٰ علیہ السلام والی قوم نہیں ہے کہ جس نے اپنے نبی سے کہہ دیا تھا: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هُنَا قُعْدُوْنَ﴾ کہ اے موسیٰ! تو اور تیرا خدا لڑیں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں ہم آپ کا آخری سانس تک ساتھ دیں گے آپ بسم اللہ پڑھیں۔

## گھمسان کارن:

جب سعد رضی اللہ عنہ نے یہ تقریر کی تو آپ کا چہرہ کھکھلا اٹھا فرمایا بسم اللہ پڑھو باقی سفر کے لیے کوچ کرتے ہیں اب ادھر یہ تین سو تیرہ ہیں ادھر مقابلہ ایک ہزار کے ساتھ۔ یہ تین سو تیرہ کون سے ہیں جن کے پاس دو گھوڑے ہیں چھ تلواریں ہیں اور آٹھ زہریں ہیں اور مقابلے میں لڑنے والے ان کے دو سو گھوڑے اور ان کے

پاس چھ سوتلواں اور ان کے پاس زرہیں اور بظاہر جوڑ بھی نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب میدان میں اترے ادھر کفار ہیں ادھر مسلمان ہیں۔

### کفار کی چالاکی:

اتفاق اور اللہ کی شان دیکھو کہ جنگ کے لیے جب جگہ کا انتخاب ہونے لگا تو جو چٹیل جگہ تھی اس پر کفار نے قبضہ کر لیا جہاں پانی کے کنویں بھی ہیں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ پہ ہیں جو ریتلا علاقہ ہے، گرم جگہ ہے اگر ہوا آئے ریت اڑ جاتی ہے اس لیے کفار نے یہ سمجھا ہمیں جگہ بڑی عمدہ ملی ہے مسلمانوں کو جگہ بہت خطرناک ملی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں ٹھہرے ادھر مشرک ہیں ادھر اللہ کے نبی ہیں جب آمنے سامنے کھڑے ہوئے صف بندی ہونے لگی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجود اس کے کہ اللہ نے نصرت کا وعدہ فرما دیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تب بھی سجدے میں گر گئے اور اللہ پاک سے مانگنا شروع کر دیا پوری رات اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سامنے کھڑے اور سجدے میں اللہ سے مانگتے رہے۔

### سکون کی نیند:

مفسرین نے کہا ہے کہ ایسا وقت آیا مشرکین مقابلہ میں ہیں صحابہ کرام سوئے ہوئے ہیں حالانکہ میدان جنگ میں کس کو نیند آتی ہے اللہ نے ایسی امن کی نیند عطا فرمائی کہ سکون سے سوئے پڑے ہیں جیسے کفار سے مقابلہ نہیں ہے۔

### صحابہ کا رسول اللہ کے لیے حفاظتی منصوبہ:

اللہ کے نبی جہاں جس جگہ پہ ٹھہرے ہیں اللہ کی شان دیکھو حضرات صحابہ کرام نے کہا حضور آپ ایسے کریں ہم آگے جا کے لڑتے ہیں ہم آپ کے لیے ایک چھوٹا سا سائبان بنا دیتے ہیں چھپر سا بناتے ہیں کپڑے کا آپ اس میں آرام فرمائیں۔ حضرت سعد کہنے لگے یا رسول اللہ ہم میدان میں لڑتے ہیں اور آپ یہاں ٹھہریں اگر

اللہ نے فتح عطا فرمادی تو ہم آپ کے ساتھ ہیں اور اگر شکست ہو گئی مارے گئے آپ مدینہ میں چلیں جائیں مدینہ والے آپ کو سنبھالیں گے، ہم کفار سے لڑتے ہیں۔

### خلافت صدیقی کے اشارے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سائبان بنادیا گیا حضرت سعد رضی اللہ عنہ سائبان سے باہر کھڑے ہو گئے اور اب اس سائبان میں دو آدمی ہیں ایک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ اس کا معنی سارے صحابہ سمجھتے تھے کہ حضور کے بعد وارث صدیق ہیں جیسے نبی کو بچانا ہے ضروری ہے اسی طرح نبی کے صدیق کو بچانا بھی ضروری ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنی تلوار لے کر پہرہ دے رہے ہیں۔

### بلا فصل خلافت صدیقی اس وقت کے کافروں کو تسلیم تھی:

صحابہ بھی سمجھتے تھے حضور کے بعد وارث صدیق اکبر ہیں اور مشرکین بھی سمجھتے تھے حضور کے بعد باری صدیق اکبر کی ہے آپ کہیں گے وہ کیسے؟ اس پر قرآن تو کئی ہیں ایک دو عنوان ذہن میں رکھ لیں۔ جنگ بدر کے بعد ایک جنگ ہے وہ جنگ احد ہے، جب احد میں کفار نے مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کے لیے ایک گیم کھیلی ایک سازش تیار کی۔ سازش کیا تھی؟ یہ مشہور کردو حضور صلی اللہ علیہ وسلم قتل ہو گئے جب یہ غلط خبر اٹھے گی تو مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ جائیں گے انہوں نے یہ افواہ مشہور کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل ہو گئے اس کے بعد دوسری افواہ یہ اڑائی کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی قتل ہو گئے پھر افواہ یہ اڑائی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قتل ہو گئے ہیں اس کا مطلب؟ کافر بھی سمجھتا تھا اگر حضور شہید ہو گئے تو مسلمان حضرت ابو بکر کے پاس جائیں گے تو یہ بھی اعلان کرو کہ حضرت ابو بکر بھی قتل ہو گئے ہیں۔

حضرت ابو بکر اگر شہید ہو گئے تو لوگ حضرت عمر کے پاس جائیں گے تو یہ

بھی افواہ اڑا دو کہ حضرت عمر بھی قتل ہو گئے ہیں جب کہا کہ حضور شہید ہو گئے تو حضور خاموش رہے جب کہا حضرت ابو بکر شہید ہو گئے حضرت ابو بکر صدیق خاموش لیکن جب کہا حضرت عمر بھی شہید ہو گئے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: اوبے ایمانو میں زندہ ہوں میں بھی زندہ ہوں حضور بھی زندہ ہیں اور صدیق بھی زندہ ہیں زیادہ خوشیاں نہ مناؤ۔

### وعدہ نصرت خداوندی کے باوجود نبی کیوں روئے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل دعائیں مانگتے رہے حتیٰ کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پوری رات جاگتے رہے اور اللہ سے دعائیں مانگتے رہے۔ اس پر بعض لوگوں نے ایک اشکال کیا ہے کہ جب اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا اور وعدہ کر دیا گیا کہ آپ کو فتح ملے گی پھر اللہ کے نبی کیوں روتے ہیں؟ پھر کیوں دعا مانگتے ہیں اللہ فتح عطاء فرمادے۔ اللہ وعدہ پورا فرمادے۔ اگر یہ مٹھی بھر جماعت ختم ہو گئی تو قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں ہو گا۔

### جواب:

اس کی دو وجوہات ہیں: اللہ نے یہ بتایا کہ آپ کو فتح ملے گی لیکن یہ نہیں بتایا کہ کب ملے گی؟ اللہ کے نبی فرما رہے ہیں اللہ ابھی دے دے اور میری اس جماعت کو بچالے۔ وعدہ تھا لیکن یہ تو نہیں بتایا تھا کہ آج ہے، کل ہے، برسوں ہے یا ترسوں ہے۔ دوسری وجہ اللہ کے نبی کے سامنے اللہ کی دو شانیں ہوتی ہیں ایک شان اللہ اپنے وعدے کے پکے ہیں دوسری شان اللہ غنی اور بے نیاز ہے اللہ سے کوئی بندہ پوچھ سکتا ہے؟ اللہ نے جب وعدہ کیا اب وعدہ کب تک ہے جب تک ہم ٹھیک ہیں جب ہم بگڑ جائیں گے پھر اللہ کے فتوحات کے وعدے تو نہیں ہیں، نبی اللہ کے وعدے پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور ساتھ نبی اللہ کے غنی ہونے پر یقین بھی رکھتے ہیں۔

## فتح کی بشارت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں مانگ رہے تھے صدیق اکبر پاس ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اچانک اونگھ آئی تھوڑی سی اونگھ آئی اور فوراً آنکھ کھل گئی فرمایا: اللہ کی مدد آگئی، "هَذَا جِبْرِئِيلُ قَامَ عَلَى فَرَسِهِ" یہ جبرائیل کھڑا ہوا ہے اپنے گھوڑے کو لے کر۔ جبرائیل آگیا گھبرانے کی ضرورت نہیں آپ کو اونگھ آئی ہے اور فوراً آنکھ کھلی ہے فرمایا صحابہ اب کچھ بھی نہ پڑھو اتر جاؤ میدان میں۔

## اللہ کی مدد آن پہنچی:

ادھر اللہ نے کرم کیا فرمایا: میدان جنگ میں جانا تھا بادل آئے، بارش شروع ہو گئی اور جس جگہ کافر تھے وہ میدان صاف تھا وہاں کیچڑ ہو گیا مسلمان جہاں تھے وہ ریت تھی وہ جم گئی۔ جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ کفار کیچڑ میں پڑے ہیں اور مسلمان ریت میں جمی جگہ کے ساتھ ہیں یہاں موسم ٹھنڈا ہے وہاں کیچڑ والی جگہ یہاں تو پانی نہیں تھا اللہ نے پانی کا انتظام کر دیا اس سے وضو بھی کرو، غسل بھی کرو اس پانی کو پیو۔ اللہ نے آغاز یہاں سے فرمایا جہاں جنگ کا نقشہ بدلا ہے۔

## کفر اور اسلام کی معرکہ آرائی:

جب مقابلہ میں نکلے ہیں مقابلے میں کفار کی طرف سے سب سے پہلے تین آدمی نکلے ہیں عتبہ، شیبہ اور عتبہ کا بیٹا ولید ادھر سے مسلمانوں کی طرف سے بھی تین آدمی نکلے ہیں یہ مسلمان انصار صحابہ تھے۔ کفار اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے تھے انہوں نے انصار سے کہا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا میں فلاں انصاری ہوں میں فلاں انصاری انہوں نے کہا ہمارا تمہارا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ قریشی لاؤ جو ہماری ٹکر کے بندے۔ ہم تم سے لڑنے میں اپنی توہین سمجھتے ہیں انہوں نے واپس جا کر کہا یا رسول اللہ ہم لڑنے کے لیے گئے ہیں لیکن مکہ والے کہتے ہیں ہماری ٹکر کے بندے لاؤ! نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے قریش والوں کو بھیجو چنانچہ حضرت عبیدہ، حضرت حمزہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم میدان میں اترے۔

### اسلام کے علمبردار اور دشمن باہم صف آرا:

اُدھر عتبہ ہے مقابلے میں حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ ہیں، اُدھر شیبہ ہے مقابلے میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ہیں اور اُدھر ولید ہے مقابلے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔

ولید نے کہا: علی؟ فرمایا: ہاں علی۔ کہنے لگا: اب مزہ آئے گا لڑنے کا۔ دشمنی بھی تھی پھر کہتے ہیں مقابلے کا بندہ ہو جائے۔ اب یہ تینوں مقابلے میں آئے سامنے کون آیا عتبہ ان کے مقابلے میں عبیدہ ادھر سے انہوں نے حملہ کیا ادھر سے عتبہ نے حملہ کیا لڑ پڑے اللہ کی شان ادھر یہ دونوں لڑ پڑے اور حضرت حمزہ شیبہ سے حضرت حمزہ نے ایک وار کیا شیبہ قتل ہو گئے حضرت علی نے ایک وار کیا ولید قتل ہو گئے حضرت عبیدہ نے وار کیا تو عتبہ بچ گیا اس نے حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ پہ وار کیا ان کا پاؤں زخمی ہو گیا پنڈلی سے خون نکلنے لگا حضرت علی اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما آگے بڑھے اس بے ایمان کو بھی قتل کر دیا، تینوں کے تینوں دشمنان اسلام جہنم رسید ہو گئے۔

### کاش ابوطالب زندہ ہوتے!

حضرت عبیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے زخمی تھے کہا یا رسول اللہ! میرے بچنے کی توقع ہے؟ اللہ کے نبی نے فرمایا نہیں تو نہیں بچے گا۔ تو شہید ہو جائے گا حضرت عبیدہ کہنے لگا اے کاش آج ابوطالب زندہ ہوتے! کیوں؟ ابوطالب نے کہا تھا جب تک میں زندہ ہوں تم محمد کے قریب نہیں جاسکتے۔ میں مروں گا پھر محمد کے قریب جاؤ گے۔ عبیدہ کہتے ہیں کاش ابوطالب زندہ ہوتے ان کو پتا چلتا۔ جب تک

ہم زندہ ہیں حضور کوئی کافر آپ کے قریب نہیں آ سکتا ہم جانتے ہیں ختم نبوت کا مسئلہ ہے اس کے بعد مڈھ بھیڑ شروع ہو گئی ادھر مسلمان ادھر کافر اللہ نے کرم یہ فرمایا کہ کفار کے بڑے بڑے ستر جرنیل مارے گئے اس معرکے میں مسلمان بہت کم ہیں جنہوں نے جام شہادت نوش کیا۔

### مشرکین کی قتل گاہوں کی نشاندہی:

اب یہ سارے قتل ہو رہے تھے، بھاگ رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس جگہ پہ ابو جہل قتل ہو گا، اس جگہ عتبہ قتل ہو گا، اس جگہ شیبہ قتل ہو گا، اس جگہ ولید قتل ہو گا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مختلف جگہوں پہ نشان لگا لگا کر بتا رہے تھے یہ کس کی قتل گاہ ہے؟ یہ کس کی قتل گاہ ہے؟ 72 قتل گاہیں آپ نے بتائیں، خیر یہ سارے قتل ہو گئے۔

### امت محمدیہ کافر عون:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ابو جہل کا کیا بنا؟ چونکہ آپ نے فرمایا تھا ابو جہل کا فتنہ فرعون کے فتنے سے بڑا فتنہ ہے۔ آپ کو میں اس کی وجہ بھی عرض کرتا ہوں: بندہ سمجھتا ہے شاید فرعون بہت بڑا ظالم تھا اور ابو جہل اس سے چھوٹا تھا آپ نے یوں تو نہیں فرمایا کہ میری امت کافر عون موسیٰ کے فرعون سے بڑا فرعون ہے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ کیوں پوچھا کہ ابو جہل کا کیا بنا؟ اس کو کیوں تلاش کرتے پھر رہے تھے؟

### دونھے صحابہ؛ ابو جہل کی تلاش میں:

دو چھوٹے چھوٹے صحابی ہیں حضرت معاذ اور حضرت معوذ۔ ایک صحابی سے کہنے لگے: چچا جان یہ بتاؤ کہ ابو جہل کون ہے؟ انہوں نے پوچھا کہ تم کیا کرو گے؟ کہنے لگے ہم اس کو ماریں گے۔ وہ صحابی کہتے ہیں یہ چھوٹے بچے اس کو کیا ماریں گے، حضرت

معوذ کا اپنا کندھا کٹ گیا لٹک رہا تھا، کھینچ کر اس کو اپنے جسم سے الگ کر دیا اب ان کا ایک ہاتھ موجود ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ یہ چھوٹے ہیں ان دونوں نے باز کی طرح حملہ کیا ابو جہل سامنے تھا اس کی ٹانگ پہ حملہ کیا وہ گھوڑے سے گرا ہے۔ گرا تو دیا لیکن مارا نہیں۔ قتل نہیں کیا۔ آخر یہ بچے تھے۔

### تواضع نے تکبر سے زمین پاک کر ڈالی:

ابو جہل بے ایمان تکلیف کی وجہ سے کراہ رہا تھا، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو نبی نے بھیجا جاؤ تم اس کو قتل کر دو۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ؛ ابو جہل کی چھاتی پر چڑھے جب قتل کرنے لگے تو ابو جہل نے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا میں عبد اللہ بن مسعود ہوں۔ ابو جہل نے کہا تم بڑی مناسب جگہ پہ آئے ہو کیونکہ تم مکے کے سردار کی چھاتی پر بیٹھے ہو۔

### ابن مسعود کا مختصر تعارف:

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بکریاں چرانے والے چرواہے تھے، بعض روایات کے مطابق چھٹے نمبر پہ کلمہ پڑھ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود چھوٹے قد، گندمی رنگ، باریک پنڈلیوں، کمزور اور لطیف جسم والے تھے اس امت کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔

♦ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اِسْتَقْرِؤْا الْقُرْآنَ مِنْ اَزْبَعَةٍ مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ"۔<sup>140</sup>

کہ قرآن مجید خاص طور پر چار آدمیوں سے سیکھو! ان میں سے ایک عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔



◆ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"وَمَا حَدَّثَكُمْ ابْنُ مَسْعُودٍ فَصَدِّقُوهُ"<sup>141</sup>

جو بات تمہیں ابن مسعود فرمادیں اس کو ضرور سچا سمجھنا!

◆ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ سَرَّهَ أَنْ يَقْرَأَ الْقُرْآنَ غَضًّا كَمَا أَنْزَلَ فَلْيَقْرَأْهُ عَلَى قِرَاءَةِ ابْنِ أُمِّ عَبْدٍ"<sup>142</sup>

کہ جس شخص کو پسند ہو کہ وہ قرآن اس لہجے میں پڑھے جس لہجے میں نازل ہو تو وہ عبد اللہ بن مسعود کی قرأت کے مطابق پڑھے۔

◆ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَوْ كُنْتُ مُؤَمِّرًا أَحَدًا مِنْ غَيْرِ مَشُورَةٍ لَأَمَرْتُ ابْنَ أُمِّ عَبْدٍ"<sup>143</sup>

اگر میں کسی کو بغیر مشورہ کے امیر بناتا تو عبد اللہ بن مسعود کو بناتا۔

### ابو جہل کی فرعونیت:

بہر حال! ابو جہل کو جب قتل کرنے لگے تو ابو جہل نے کہا اگر قتل کرنا ہے میری تلوار سے قتل کرو تا کہ پتا لگے سردار؛ سردار کی تلوار سے مارا گیا ہے۔ جب تم نے مجھے قتل کرنا ہی ہے تو میرے شانوں کے قریب سے میری گردن کاٹنا تا کہ جب گردنوں کو اکٹھا کیا جائے تو پتا لگے یہ سردار کی گردن ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود

141- سنن الترمذی، رقم: 3799

142- المعجم الاوسط للطبرانی، ج 2 ص 294 رقم الحدیث 3326

143- سنن الترمذی، رقم: 3809

رضی اللہ عنہ نے اسی طرح کاٹا۔ کس وجہ سے اللہ کے نبی نے کہا کہ یہ ابو جہل موسیٰ کے فرعون سے بھی بڑا فرعون ہے۔ جب قتل ہونے لگا اس نے ایک پیغام دیا جاؤ جا کر محمد کو میرا پیغام دے دینا کہ جتنی تمہاری نفرت میرے دل میں پہلے تھی آج اس سے بھی زیادہ ہے۔

### قوم موسیٰ کا فرعون:

اب دیکھو! فرعون جب عذاب میں آیا اس نے کیا کہا تھا، میں کلمہ پڑھتا ہوں میں ایمان لاتا ہوں، موسیٰ کے رب کو مانتا ہوں۔ قوم موسیٰ کا فرعون حالت نزع میں رب موسیٰ و ہارون کو مان رہا تھا۔ لیکن مانا اس وقت جب عذاب نظر آگیا جب حالت نزع ہو تو پھر بندہ کلمہ پڑھ بھی لے تو کلمہ قبول نہیں ہوتا۔ اللہ نے کہا:

﴿اِنَّكَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ﴾<sup>144</sup>

اب ایمان لاتا ہے اب تیرا کلمہ قابل قبول نہیں ہے تو موسیٰ علیہ السلام کی امت کے فرعون نے مرتے وقت کلمہ پڑھا تھا اگرچہ قبول نہیں ہے لیکن امت محمدیہ کا فرعون ابو جہل مرتے وقت بھی کلمہ پڑھنے کے لیے تیار نہیں، یہ اس سے زیادہ سخت دل تھا اس لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو جہل میری امت کا فرعون ہے اور قوم موسیٰ کے فرعون سے بڑا فرعون ہے۔ یہ قتل ہو گیا۔

### فتح کے بعد پیغمبر کی عادت مبارکہ:

جنگ کا نقشہ بدل گیا اللہ پاک نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو فتح نصیب فرمادی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جب کسی جنگ میں فتح ہوتی تو 3 دن کے لیے وہاں قیام فرماتے۔ یہ قیام جشن والا نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ

قیام شکر انے والا ہوتا تھا اور دشمن کو بتانا تھا کہ ہم فاتح قوم ہیں لڑنے کے بعد دوڑتے نہیں ہیں بڑے علم اور تحمل کے ساتھ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پر تشریف رکھتے۔

### قلیب بدر کیا ہے؟

کفار کے جو سردار تھے ان سب کی لاشوں کو جمع کیا اور قلیب بدر ایک کنواں تھا، اس کنویں میں لاشوں کو لا کر جمع کرنا شروع کر دیا۔ کنویں میں لاشیں ڈال دی گئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کفار اور مشرکین کی لاشوں پر کھڑے ہو کر فرمایا:

"فَإِنَّا قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا"

جو اللہ نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا فتح کا ہم نے سچ پایا۔

"فَهَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا" <sup>145</sup>

اے کافرو اور مشرکوں! تم بتاؤ جو تم سے جہنم کا وعدہ کیا تم نے جہنم کو دیکھ لیا خدا

کا وعدہ پالیا ہے؟

### ابن خطاب رضی اللہ عنہ کا اشکال:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اشکال تھا۔ اشکال پیش کیا کہ یا رسول اللہ! اللہ نے قرآن میں فرمایا: ﴿إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى﴾ <sup>146</sup> آپ مردوں کو سنا نہیں سکتے۔

### مماتیوں کا استدلال:

145۔ صحیح البخاری، رقم: 3976

146۔ النمل 27: 80

منکرین حیات النبی مماتیت کا یہی استدلال ہے ﴿إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى﴾ یہ لوگ اسی آیت کو بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب تھے۔ انہوں نے ایک جگہ یہ تقریر کی اور تقریر میں یہ بات کی کہ ہم کہتے ہیں: قرآن کہتا ہے کہ مردے نہیں سنتے، ﴿إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى﴾ یہ ہماری دلیل ہے اور اس آیت سے ہم نے جو سمجھا کہ مردے نہیں سنتے، یہ صرف ہماری فہم نہیں بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی آیت سے یہی سمجھا کہ مردہ نہیں سنتا۔

جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فَهَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا؟" اے مشرکین کے سردارو! جو خدا نے تمہارے ساتھ جہنم کا وعدہ کیا تم نے پا لیا؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ اشکال تھا کہ یا رسول اللہ! قرآن کہتا ہے: ﴿إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى﴾ یہ نہیں سنتے، آپ ان کو سنارہے ہیں۔ تو مولوی صاحب کہنے لگے: ہم کہتے ہیں مردہ نہیں سنتا، دلیل ﴿إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى﴾ ہے اور اس آیت سے ہم نے استدلال نہیں کیا بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی یہی استدلال کیا تھا۔

### پوری بات یہ ہے:

میں نے کہا: تم آدمی بات کرتے ہو، پوری بات نہیں کرتے۔ پوری بات یہ ہے کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فَهَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا؟"

کہ خدا نے تم سے جو وعدہ کیا تھا کیا تم نے اسے سچا پایا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! قرآن کہتا ہے: ﴿إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى﴾ کہ یہ نہیں سنتے، آپ فرما رہے ہیں کہ یہ سنتے ہیں۔ ہم کس کی بات مانیں؟

فرمایا: عمر! اس وقت جتنا یہ سنتے ہیں تم ان سے زیادہ نہیں سن سکتے۔ حضرت

عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے۔ انہوں نے ایک سوال کیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے۔

### فاروقی مزاج ”مان لینا“ ہے:

میں ان سے کہتا ہوں [منکرین حیات و سماع سے] کہ تم بھی خاموش ہو گئے؟ کہتے ہیں کہ جی وہ حضرت عمر تھے انہوں نے تومان لیا تھا اس لیے خاموش ہو گئے تھے، ہم کیوں مانیں؟ اگر مان لیا تو پھر تو بات ہی ختم ہو گئی، ہم تومانے والے ہی نہیں، ہم کیوں مانیں؟

بھائی! جس پیغمبر پر قرآن اترا ہے وہ بات کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن یہ لوگ کہتے ہیں نہیں ہم کیوں مانیں؟ قرآن تو یہ کہتا ہے، تو اس کا معنی یہ ہے کہ قرآن آپ سمجھے ہیں، جس نبی پر قرآن اترا ہے وہ نبی اس کا معنی نہیں سمجھا۔ (العیاذ باللہ)

### مشرکین میدان بدر کے کنویں میں:

جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ اپنی کتاب ”سیرۃ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم“ میں فرماتے ہیں:

جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مشرکین کو خطاب کیا جو قلب کے بدر کے کنویں میں گرے پڑے تھے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جو دربار نبوت کے شاعر ہیں، جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات فرماتے تو حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ شعر میں اس کی تعبیر کرتے تھے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے:

يُنَادِيهِمْ رَسُولُ اللَّهِ لَمَّا قَذَفْتَاهُمْ كَبَاكِبَ فِي الْقَلْبِ

جب ہم نے ان کفار کی جماعتوں کو کنویں میں پھینکا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے خطاب فرمایا۔

أَلَمْ تَجِدُوا كَلَامِي كَانَ حَقًّا وَأَمْرُ اللَّهِ يَأْخُذُ بِالْقُلُوبِ

کیا تم نے میری بات کو حق نہیں پایا اور اللہ رب العزت بندوں کے دلوں کا مالک ہے۔

فَمَا نَطْقُوا وَلَوْ نَطْقُوا لَقَالُوا: صَدَقْتَ وَكُنْتَ ذَا رَأْيٍ مُصِيبٍ

انہوں نے کوئی بھی جواب نہ دیا، ہاں اگر یہ جواب دیتے تو یہی بات کرتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا اور آپ کی رائے بالکل درست تھی۔<sup>147</sup>

**سیدہ امی عائشہ سماع کی منکر نہیں:**

حضرت کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الجملہ میت بھی سنتی ہے۔ جمہور صحابہ و تابعین کا یہی مسلک ہے (اور یہ جو کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سماع کی منکر تھیں، یہ درست نہیں) ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سماع موتی کی منکر نہیں۔<sup>148</sup>

**اُن پڑھ خواتین بھی سمجھتی ہیں:**

آج جمعہ کی نماز سے قبل تقریباً 111 یا ساڑھے گیارہ بجے کا واقعہ ہو گا میری گھر والی آئی اور کہا کہ ایک خاتون آئی ہے اور کہتی ہے ہماری مولانا صاحب سے رشتہ داری ہے، ہم نے ملنا ہے میں نے کہا کون ہے؟ کہنے لگیں ہمیں نہیں پتا خیر وہ آئی بوڑھی عورت تھی اس نے کہا: مولانا دعا فرمائیں۔ میں نے کہا: دعا تو کریں گے جو دعا آپ نے کروانی ہے وہ بتائیں۔ پھر مجھے کہنے لگیں اچھا مجھے یہ تو بتائیں کہ مردے قبر میں زندہ ہیں یا مردہ ہیں؟

147- سیرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم: ج 2 ص 102، 103

148- سیرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم: ج 2 ص 103

میں نے کہا آپ کو اس کی کیا ضرورت پیش آئی؟ کہنے لگی: بعض لوگ کہتے ہیں کہ مردہ قبر میں زندہ ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں مرا ہوا ہوتا ہے، مجھے مولانا صاحب یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر یہ مرا ہوا ہے تو عذاب کس کو ہوتا ہے؟ ان پڑھ عورت ہے لیکن کہتی ہے کہ اگر اس میں حیات نہیں تو پھر عذاب کس کو ہوتا ہے؟ اس کو عذاب تو اس وقت ہو گا جب اس میں حیات تو ہو۔

### ناقضات العقل سے بھی کم عقل ”مولوی“:

ایک بوڑھی عورت بھی سمجھتی ہے کہ جب آپ میت کے عذاب و ثواب کے قائل ہیں تو عذاب بھی اس وقت ہو گا جب حیات ہو، جب حیات ہی نہیں ہے تو عذاب کس کو ہو گا؟ میں نے کہا اللہ جو سمجھ اس بوڑھی کو ملی ہے وہ سمجھ اس جوان کو مل جائے۔ جو اس ان پڑھ کو ملی ہے وہ اس علامہ صاحب کو مل جائے۔

### تضادات کا مجموعہ:

اسلام آباد سے ایک کتاب چھپی ہے ”آئیے عقیدہ سیکھئے“ اس میں مصنف نے سوال جواب کی صورت میں عقیدے لکھے ہیں۔ اس میں صفحہ نمبر 177 لکھا ہے:

”س: کیا مردے سنتے ہیں؟

ج: مردے نہیں سنتے، وہ مردہ ہی کیا ہوا جو سنتا ہو۔“

آگے اسی صفحہ پر لکھا ہے:

”س: کیا مردہ دفن کرنے والوں کی جوتیوں کی آواز نہیں سنتا؟

ج: اللہ تعالیٰ اس کو وہ آواز سناتا ہے۔“

اسی صفحہ پر ایک سوال و جواب یہ بھی ہے:

”س: لوگ تو کہتے ہیں مردے سنتے ہیں؟

ج: تو پھر سن کر جواب کیوں نہیں دیتے حالانکہ مردے میں نہ سننے کی طاقت

ہے نہ بولنے کی۔ اس کی یہ صلاحیت موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔“

جبکہ اسی کتاب کے صفحہ نمبر 203 پر ہے:

”س: کیا قبر والے کی چیخ و پکار انسان سنتا ہے؟

ج: مردے کی چیخ و پکار انسان اور جنوں کے علاوہ ہر چیز سنتی ہے۔“

اچھا! اب کیا یہ مردہ زندہ ہو گیا ہے؟

سوال: کیا مردہ بولتا ہے؟

جواب: وہ مردہ ہی کیا جو بول سکے۔

سوال: کیا کچھ بولتا بھی ہے؟

جواب: جب فرشتہ مارے تو چیخ لیتا ہے۔

### متضاد باتوں کا مجموعہ:

میں کہتا ہوں: عقل سے کام لویہ مردہ بول نہیں سکتا، چیخ سکتا ہے۔ سلام کرو تو نہیں سن سکتا، جوتیوں کی آواز سن لیتا ہے۔ یعنی عجیب تضاد ہے اس کتاب میں عقیدہ بھی ہے اور ساتھ میں تردید بھی ہے۔

### واقعات برائے واقعات نہیں:

میں نے جنگ بدر کا کچھ خلاصہ آپ کے سامنے پیش کیا ہماری عادت ہے ہم صرف غزوات پیش نہیں کرتے، ان غزوات کے ضمن میں جو عقائد اور نظریات ہوتے ہیں ان کو بھی پیش کرتے ہیں۔ ان آیات میں اللہ رب العزت نے غزوہ بدر کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اللہ نے بارش عطا فرمائی، فرشتے بھی بھیجے ہیں مدد کے لیے۔

### مشرکین کو شیطانی تسلی:

جس وقت مشرک اور مسلمان آمنے سامنے آئے تو شیطان نے مشرکین



سے کہا:

﴿لَا غَالِبَ لَكُمْ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌّ لَّكُمْ﴾

کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، میں تمہاری مدد بھی کروں گا، تم گھبراؤ مت  
مسلمان تمہارے اوپر غالب نہیں آسکتے۔

لیکن جب فرشتے اترے ہیں تو شیطان دوڑا، اس نے کہا:

﴿إِنِّي أَدْرِ مَا لَا تَزَوْنَ﴾<sup>149</sup>

جو میں دیکھتا ہوں وہ تم نہیں دیکھتے اور میں تمہارے ساتھ مل کر مسلمانوں کا  
مقابلہ نہیں کر سکتا۔

### قبیلہ بنو بکر کے حملے کا خوف:

اس کی وجہ کیا ہے؟ مفسرین نے لکھا ہے کہ جب مکہ والے میدان بدر میں  
آئے تو انہیں ایک چھوٹا سا خدشہ ہوا کہ یہاں بدر کی زمین کے قریب ایک قبیلہ ہے  
جس کا نام بنو بکر ہے، اس قبیلے کے ساتھ ہماری لڑائی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم مسلمانوں  
سے لڑنا شروع کر دیں اور پیچھے سے وہ قبیلہ ہم پر حملہ آور ہو جائے، انہوں نے پیچھے کچھ  
لوگ پہرے کے لیے کھڑے کر دیے تاکہ وہ قبیلہ ہم پر حملہ آور نہ ہو۔

### شیطان؛ سراقہ بن مالک کے روپ میں:

شیطان اس قبیلے کے مالک سراقہ بن مالک کی شکل میں آیا اور ساتھ کچھ  
شیاطین بھی لایا اور اس نے کہا: تم قبیلہ بنو بکر کی پرواہ نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں  
اور آج کے دن تم پر کوئی حملہ آور نہیں آسکتا، چونکہ یہ شیطان قبیلہ بنو بکر کے سردار  
کی شکل میں تھا تو مشرکین مکہ نے اس پر اعتماد کر لیا۔ ادھر سے جب جبرائیل امین علیہ

السلام فرشتوں کی فوج لے کر آئے، اس نے فرشتوں کو دیکھا تو سراقہ بن مالک دوڑا، ایک قریشی کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا، ہاتھ چھڑایا اور دوڑا، قریشی نے پوچھا: کہاں جاتے ہو؟ اس نے کہا: جو میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھتے۔

### شیطان میدان جنگ سے فرار:

یہ تو ابلیس تھا لیکن سراقہ کی شکل میں آیا تھا جب سامنے فرشتے دیکھے جو عذاب دینے کے لیے آئے تھے، ابلیس وہاں سے دوڑ گیا اور اس جگہ کو چھوڑ دیا۔

### دو جہانوں کا دھوکے باز:

اب استدلال سمجھنا! اسی طرح قرآن کریم میں ہے:

﴿وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ﴾<sup>150</sup>

جب قیامت کا دن ہو گا شیطان یہ کہے گا میں نے جو تم سے وعدہ کیا وہ جھوٹا تھا، خدا نے جو وعدہ کیا تھا وہ سچا تھا۔ میں تمہارے کام نہیں آسکتا۔ جب میدان بدر میں کفار ذلیل ہونے لگے شیطان تب بھی دوڑا ہے اور جب قیامت کے دن اس کے ماننے والوں کو عذاب ہو گا شیطان تب بھی دوڑے گا۔

### قبر پر اذان کا مسئلہ:

اس سے ایک مسئلہ سمجھ آیا آج بہت سارے لوگ جب میت کو قبر میں دفن کرتے ہیں تو دفن کے بعد اذان دیتے ہیں ان سے پوچھو اذان کیوں دی ہے؟ کہتے ہیں جہاں اذان دیں وہاں سے شیطان دوڑ جاتا ہے۔ ہم نے اذان اس لیے دی تاکہ شیطان دوڑے۔ میں نے کہا تمہارے دوڑانے کی ضرورت نہیں جب عذاب کا فرشتہ آئے تو شیطان خود ہی دوڑ جاتا ہے، وہ جب منکر نکیر کو دیکھے گا اس نے خود بخود بھاگنا ہے

شیطان اتنا بیوقوف بھی نہیں ہے کہ اس سے گناہ کرواتے اور جب مار کھانے کی باری آئے تو تمہارے ساتھ کھڑا ہو۔ وہ گناہ کرانے کے لیے آتا ہے اور جب گناہ ہو جاتا ہے تو بھاگ جاتا ہے۔

### خدائی عذاب سے بچو!

﴿وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوا

أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾

اس میں مسئلہ بیان فرمایا کہ فتنے اور عذاب سے بچو یہ صرف ظالم لوگوں پر نہیں آتا، جب خدا کا عذاب آجائے یہ عوام اور خواص دونوں پر آتا ہے۔ بعض لوگوں کو الجھن ہوتی ہے کہ جب گناہ ایک نے کیا ہے تو عذاب دوسرے پر کیوں ہے؟

### قصہ بنی اسرائیل کے عبادت گزار کا:

ایک روایت سنیں بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا اللہ نے جب عذاب کے فرشتے کو بھیجا فرشتہ گیا تو واپس آیا اس نے کہا یا اللہ اس بستی میں وہ بندہ بھی ہے جس نے آنکھ جھپکنے کے برابر بھی گناہ نہیں کیا اللہ نے فرمایا پہلے اس کو برباد کرو پھر بستی کو تباہ کرو۔ کیوں؟ اللہ نے جواب دیا فرشتے کو کہ یہ خود گناہ تو نہیں کرتا لیکن دوسرے گناہ کریں تو اس کی پیشانی پر بل نہیں آتا۔ پتا یہ چلا کہ صرف گناہوں سے بچنا ضروری نہیں ہے بلکہ گناہ کرنے والے سے دوری اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔

### مجلس گناہ سے بھی بچیں!

بعض لوگ کہتے ہیں میں گناہ میں شریک نہیں تھا، بھائی آپ نے گناہ تو نہیں کیا لیکن آپ کو گناہ کے مقامات پر بھی نہیں جانا چاہیے۔ بعض لوگ گناہ کے مقام پر چلے جاتے ہیں لیکن وہاں خود گناہ نہیں کرتے وہ مطمئن رہتے ہیں، بھائی ہم نے تو گناہ

نہیں کیا لیکن صرف گناہ نہ کرنا کافی نہیں ہے بلکہ گناہ والوں کو گناہ سے روکنا بھی ضروری ہے اور اگر ان کو روک نہ سکیں تو اس جگہ سے پھر واپس آنا ضروری ہے۔

### بنو قریظہ کے یہودی صلح پر مجبور:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمْنَكُمْ وَ

أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ ﴿٥٥﴾

اس آیت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ یہودی قبیلہ کا محاصرہ کیا 17 دن تک محاصرہ رہا یہودی تنگ آگئے انہوں نے کہا ہم صلح کرتے ہیں آپ بتائیں کس شرط پر صلح کرنی ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت سعد کو میں بھیج رہا ہوں جس شرط پر وہ صلح کریں گے وہ ہماری طرف سے صلح ہوگی۔

وہ سمجھتے تھے حضرت سعد یہود کا بڑا مخالف ہے آپ ایسا نہ کریں حضرت ابو لبابہ کو بھیج دیں اس کے ساتھ ہم شرائط صلح طے کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ ابو لبابہ کی زمین ابو لبابہ کے بال بچے ان کے علاقے میں تھے ہو سکتا ہے وہ کچھ گنجائش نکالیں گے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو لبابہ تم جاؤ اور ان سے شرائط طے کرو جب وہاں گئے تو یہودیوں کے بچے، یہودیوں کی عورتیں اور مرد جمع ہو کر آگئے اور رونے لگے انہوں نے کہا ابو لبابہ! تم جانتے ہو کہ ہمارے ساتھ کیا ہوگا؟ تم بتاؤ اگر ہم نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مان لیں جو فیصلہ سعد کرے ہمیں مان لینا چاہیے تمہارا کیا خیال ہے؟ سعد کیا فیصلہ کریں گے؟ تمہارا کیا خیال ہے؟ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کیا ہے؟

حضرت ابو لبابہ رضی اللہ عنہ صحابی تھے لیکن اولاد بھی تھی بیوی بھی تھی اور ان کی زمین بھی ان کے علاقے میں تھی کچھ نہ کچھ نرم پڑ گئے اور متاثر ہو گئے اور ان کو

اپنی گردن کی طرف اشارہ کر کے بتا دیا کہ اگر تم نے فیصلہ مان لیا تو تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ اس کا معنی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راز دان تھا اور اس نے راز فاش کر دیا ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راز فاش نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے تھا کہ جو حضور کا فیصلہ آیا تمہیں ماننا پڑے گا، ہم حضور سے بات کرتے ہیں جب اس کا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا چلا کہ ہم نے جو حضرت سعد کو بھیجنا تھا کیوں نہیں بھیجا، ہماری بات سن کر ابولبابہ نے ان کو اطلاع کر دی کہ ہم ان کو قتل کر دیں گے۔ حضرت ابولبابہ نے خود آکر عرض کیا حضور میں نے جرم کیا اور بہت بڑا جرم کیا ہے کہ آپ کی رائے قبل از وقت نہیں بتانی چاہیے تھی، لیکن صحابی تھے لغزش ہو گئی۔

### صحابی اور نبی میں فرق:

صحابی اور نبی میں کیا فرق ہے؟ نبی سے خدا گناہ ہونے نہیں دیتا، صحابی سے گناہ ہو جاتا ہے لیکن اللہ اس کے نامہ اعمال میں رہنے نہیں دیتا۔ حضرت ابولبابہ سے گناہ ہوا لیکن مدینہ منورہ مسجد نبوی میں آئے اور مسجد نبوی میں ستونوں کے ساتھ خود کو باندھ لیا اور فرمانے لگے جب تک اللہ مجھے معاف نہیں کریں گے اس وقت تک میں خود کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ گھر والوں سے کہہ دیا اپنی بیوی اور بیٹی کو جب کوئی ضرورت ہوتی بیٹی آتی ان کو بول دیتے جب ان کو قضائے حاجت کی ضرورت پیش آتی تو کھول دیتے اب کھانا بھی چھوڑ دیا، پینا بھی چھوڑ دیا۔ جب حضور کو اطلاع ہوئی تو اللہ کے نبی فرمانے لگے اس نے خود کو سزا دی ہے اور ہمارے پاس نہ آئے اگر ہمارے پاس آتے تو کچھ نہ کچھ ہوتا اب میرے اختیار میں یہ بات نہیں اس نے خود کو اللہ کے حوالے کیا اب اللہ کا اور ان کا معاملہ ہے۔ جب تک اللہ کوئی فیصلہ نہ فرمائیں میں کچھ نہیں کر سکتا۔ جب سات دن گزرے تو اللہ نے قرآن اتارا اور ان کی توبہ کا اعلان ہوا صحابہ کرام نے ان کو مبارک دی کہ مبارک ہو اللہ نے آپ کی معافی کا اعلان کر دیا۔

## دینی تقاضوں کو مقدم رکھو:

صحابہ نے کہا تمہیں مبارک ہو اللہ کے نبی نے مغفرت کا وعدہ کیا اور آیت اتر آئی، ابولبابہ فرمانے لگے: اتنے دن مشقت میں گزارے ہیں اب مجھے کوئی نہ کھولے اگر میں کھلوں گا تو نبوت کے ہاتھ نہیں اٹھیں گئے۔ اب مجھے کوئی نہ کھولے اب وہ خود ہی کھولیں گے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد تشریف لائے ابولبابہ کی رسی کو کھولا اور ان کو آزاد فرمادیا، اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا آمَوَائِكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۖ وَأَنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ

أَجْرٌ عَظِيمٌ﴾

ہم سمجھتے ہیں کہ اموال اور انسان کی اولاد یہ آزمائش کا ذریعہ ہے اپنے مال اور اولاد کی وجہ سے دین کو پس پشت تم کبھی نہ ڈالا کرو دین کے تقاضے کو مقدم رکھو اور باقی سارے تقاضے موخر رکھو۔

## مشرکین مکہ کے گھناؤنے جرائم:

﴿وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا

جَحَازَةً مِنَ السَّمَاءِ ۖ أَوْ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٢﴾ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ

فِيهِمْ ۖ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿٢٣﴾﴾

اس آیت کا خلاصہ سمجھیں! مشرکین مکہ اور ان کے جرائم اتنے گھناؤنے ہیں اللہ معاف فرمائے شیطان کو بھی شرم آئے اور ان کے دعوے کتنے عجیب ہیں کہ مشرکین مکہ کا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ ہے۔ مقابلہ کس بات کا؟ کہتے ہیں کہ جو قرآن تو ہمارے پاس لایا ہے اس جیسا قرآن لانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، ﴿لَوْ نَشَاءُ نُلْقِیْهِمْ مِثْلَ هَذَا﴾ ہم بھی تو لا سکتے ہیں۔ قرآن نے کہا: تو پھر لاؤ، تم لاتے

کیوں نہیں ہو؟ جب اس جیسا قرآن نہ لاسکے تو مشرکین مکہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں، دعا بڑی سخت ہے۔ کہنے لگے: اے اللہ اگر یہ دین سچا ہے جو محمد لے کر آیا ہے تو ﴿فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حَجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ﴾ اللہ! ہم پر پتھر برسائیں برباد کر دے، ﴿وَأُتِنَا بِعَذَابٍ آئِمٍ﴾ کوئی ہمیں دردناک عذاب دے، اللہ ہمیں تو ختم کر دے۔ اتنی سخت دعا مانگ رہے ہیں اور اللہ انہیں کیا جواب دیتے ہیں؟ فرمایا کہ میرے پیغمبر! جو انہوں نے دعائیں مانگی ہیں ان کا تقاضا تو یہی تھا کہ ان کو ختم کر دیا جاتا اور ان کو ختم کیوں نہ کرتے وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں، تمہیں تنگ کرتے ہیں۔

### اجتماعی عذاب نہ دینے کی دو وجوہات:

اصل بات تو یہ ہے کہ ان کو مٹا دیا جائے لیکن ان کو نہ مٹانے کی دو وجوہات ہیں یہ بڑی اہم بات سننے کی ہے فرمانے لگے:

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ﴾

اے میرے پیغمبر! جب تک آپ ان میں موجود ہیں اللہ ان کو عذاب نہیں دے گا، ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ اور جب تک یہ استغفار کرتے ہیں خدا تب بھی ان کو عذاب نہیں دیتا۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے تحت تفسیر معارف القرآن میں بڑی عجیب بات لکھتے ہیں: اللہ نے ان کو فرمایا کہ میرے پیغمبر جب تک آپ ان میں موجود ہیں میں ان کو عذاب نہیں دوں گا اور جب تک یہ استغفار کریں گے ہم تب بھی ان کو عذاب نہیں دیں گے۔

### سابقہ امتوں پر عذاب:

استغفار والی بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ گناہ بھی کرتے "غُفْرَانِكَ" بھی

کہتے گناہ بھی کرتے استغفر اللہ بھی کہتے ہیں، گناہ بھی کرتے ساتھ نیکیاں بھی کرتے اس سے عذاب سے بچنے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ تو جب تک اللہ کے نبی مکہ میں تھے ان پر عذاب نہیں آیا، جب نبی نے مکہ چھوڑ دیا اب تو عذاب آجانا چاہیے تھا حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے ان کو ستایا اور بہت بڑے جرم کیے لیکن جب تک لوط علیہ السلام بستی میں تھے عذاب نہیں آیا جب بستی چھوڑ دی پھر عذاب آیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے شرک کیا نبی کی بات کو نہیں مانا جب تک نوح علیہ السلام تھے عذاب نہیں آیا لیکن جب کشتی بنائی اور وہاں سے چلے گئے تو قوم پہ عذاب آیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام بستی میں ہیں عذاب نہیں آیا جب بستی چھوڑ دی، عذاب آیا ہے۔

### ہمارے نبی کی نبوت کا وسیع دائرہ:

یہ بات اچھی طرح سمجھنا! اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ط﴾

اے میرے پیغمبر! جب تک آپ ان میں موجود ہیں اللہ ان کو عذاب دے کر ہلاک نہیں کرے گا تو جب حضور مکہ چھوڑ کر مدینہ میں آئے اب تو ان پر عذاب آجانا چاہیے تھا۔

حضرت مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ عجیب بات فرماتے ہیں: ہمارے نبی اور ان نبیوں میں بہت بڑا فرق ہے کہ وہ نبی بستی چھوڑتا تو بستی والوں پر عذاب آجاتا کیونکہ وہ نبی اس بستی کا نبی تھا نبی نے بستی چھوڑ دی دائرہ نبوت سے چلے گئے جو نبوت کا دائرہ ہے وہ بستی ہے اس سے باہر چلے گئے تو ان پر عذاب آگیا۔ لیکن میرے پیغمبر کا دائرہ نبوت صرف مکہ ہی تو نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دائرہ نبوت صرف مدینہ ہی تو نہیں۔

ادھر نبی لوط علیہ السلام نے بستی کو چھوڑا دوسری بستی میں چلے گئے اب یہ



ان پر عذاب کیوں آیا نبی جس بستی کا نبی تھا نبی جس جگہ کا نبی تھا وہ بستی چھوڑ دی تو بستی والوں پر عذاب آیا ہے۔ اس امت پر عذاب تو تب آئے گا جب وہ نبی وہ جگہ چھوڑ دے جس جگہ کا وہ نبی ہے۔ یہ تو قیامت تک کرہ ارض کا نبی ہے اس امت پر قیامت تک اجتماعی عذاب آہی نہیں سکتا۔ عذاب تو تب آئے کہ جب آدمی نبوت والی جگہ سے نکل جائے تو پھر عذاب آئے گا۔

**چونکہ ہمارے نبی زندہ ہیں اس لیے.....:**

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دائرہ نبوت صرف مکہ تو نہیں صرف مدینہ تو نہیں ہے پھر مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں: کہ دو باتیں یاد رکھیں:

1: ہمارے نبی زندہ ہیں

2: قیامت تک زندہ ہیں

فرمایا کہ عذاب تو تب آئے جب نبی اپنی جگہ کو چھوڑ دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ بھی ہیں اور قیامت تک زندہ ہیں۔ نبوت قیامت تک کے لیے ہے اور پورے کرہ ارض کے لیے ہے اس لیے امت جتنا بھی بڑا گناہ کرے جب تک نبی موجود ہے امت پر اجتماعی عذاب آہی نہیں سکتا۔

باقی انبیاء بستی چھوڑتے تو بستی پر عذاب آجاتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پورے کرہ ارض کے نبی ہیں اور قیامت تک کے لیے نبی ہیں تو جب تک نبی کرہ ارض پہ ہے اور قیامت تک کے لیے ہے اس وقت تک نبی کی امت پر عذاب آسکتا ہی نہیں۔ کیوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ بھی ہیں اور قیامت تک کے لیے زندہ ہیں اب کیسے عذاب آئے گا اس امت پر؟

لوگوں کو پھر بھی شک ہوتا ہے کہ نبی زندہ ہیں یا نہیں؟ اگر حضور صلی اللہ

علیہ وسلم زندہ نہیں ہیں اور اپنی جگہ سے چلے گئے ہیں تو بتاؤ اس امت پر عذاب آجانا چاہیے تھا یا نہیں؟

### پیغمبر کے مبارک وجود کی برکت:

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کی برکت ہے کہ اس امت پر عذاب نہیں آ رہا اور کس قدر وہ شخص ظالم ہے جو اس وجود اطہر کو زندہ بھی نہیں مانتا۔ لوگ ہمیں سمجھاتے ہیں مولوی صاحب فروعی مسئلہ ہے۔ میں نے کہا مسئلہ فروعی ہے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تو اصولی ہے اگر وہ پیغمبر فروع ہے تو اصول ہو گا کیا؟ اگر نبی اصل نہیں تو پھر بتائیں اصل ہو گا کیا؟ سارے ایمان کا دار و مدار نبی کی ذات پر ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کم ہو جائے گا تو آدمی کے سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں کوشش کرنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس امت کا رشتہ ذرہ برابر بھی کم نہ ہونے پائے۔

### دشمنان اسلام سے مقابلے کی تیاری کرو:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ

بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِّنْ دُونِهِمْ﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ دشمن کے مقابلہ میں تمہیں طاقت بنانی چاہیے اور طاقت کتنی؟ ﴿مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ جتنی تم طاقت رکھ سکتے ہو اتنی طاقت اختیار کرو۔ اگر دشمن کافر کے مقابلہ میں ہم ایٹم بم بنا سکتے ہیں اور نہیں بناتے تو گناہ ہے اگر ہم اس کے مقابلہ میں اسلحہ اختیار کر سکتے ہیں اور نہیں اختیار کرتے تو گناہ ہے۔ درجہ اسباب میں قرآن کا حکم ہے اتنی تیاری کرو، ﴿تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ جس سے تمہارا دشمن بھی ڈرے اور خدا کا دشمن بھی ڈرے اس لیے مسلمانوں پر جہاد کی تیاری کرنا فرض کے

درجے میں داخل ہے۔

## توکل کا صحیح مفہوم:

کبھی ان کو ہم پر بھی تعجب ہوتا ہے کہ کیسے مولوی ہیں ان کا تو خدا پر اعتماد نہیں ہے۔ میں وہ بات کہتا ہوں جو لوگ ہمیں کہتے ہیں۔ میں نے کہا اچھا یہ بتاؤ کہ اللہ کے نبی کو اللہ پر اعتماد تھا یا نہیں تھا؟ کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو تھا۔ میں نے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہرے دار کیوں رکھے ہوئے تھے؟

آپ اللہ کو رازق مانتے ہیں یا نہیں؟ بتاؤ (مانتے ہیں) رزق اللہ دے گا یا نہیں دے گا؟ (دے گا) تو پھر آپ دوکان کیوں کھولتے ہیں؟ کیا اللہ دوکان کا محتاج ہے؟ پھر کیوں دوکان کھولتے ہو؟ آپ کہتے ہیں خدا کا حکم ہے کہ دوکان کھولیں اللہ رزق دے گا تو پھر ہمیں بھی حکم ہے اسلحہ تم رکھو جان میں بچاؤں گا۔

## پیر عزیز الرحمن ہزاروی کی نصیحت:

مولانا پیر عزیز الرحمن ہزاروی دامت برکاتہم ایک مرتبہ مجھے فرمانے لگے کہ مولانا اپنی جان کی حفاظت کرو۔ اگر تم قتل ہو گئے تو پھر آپ تو خوش ہو گئے کہ میں شہید ہو گیا ہوں ہمیں ڈر ہے کہ آپ کی پکڑ نہ ہو۔ میں نے کہا: جی وہ کیوں؟ فرمانے لگے کہ تمہارا جسم اب تمہارا نہیں ہے۔ تمہارا جسم قوم کی امانت ہے اور اس کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے۔ یہ تمہارا وجود قوم کی امانت ہے پوری دنیا کو تمہارے وجود سے فائدہ پہنچتا ہے اس جسم کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے اگر حفاظت نہ کی تو میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں خدا تمہاری پکڑ نہ کر لے تو نے اس کو بچایا کیوں نہیں؟

## عالم دین کی جان بہت قیمتی ہے:

دوکان میں دو کلو سونا ہے چوکیدار رکھتے ہیں ہمارے جسم کی دو کلو سونا کی قیمت بھی آپ کے ہاں نہیں ہے؟ جوتے کی دکان ہے اور پہرے دار رکھا ہوا ہے اور

ایک عالم کی قیمت جو توں کے برابر بھی نہیں ہے؟ یعنی جو تے کی حفاظت کرنی ہے، گندم کی حفاظت کرنی ہے، دو تولے چاندی کی حفاظت کرنی ہے اور عالم اپنے وجود کی حفاظت کرے تو لوگ کہتے ہیں کیسا مولوی ہے؟ اسے اللہ پر اعتماد ہی نہیں۔

### علمائے کرام کی عزت:

اسلام زندہ باد کا نفرنس تھی ہم نے بھی شرکت کی ہے اور بھرپور طریقے سے کی ہے ہم پر بعض لوگوں کو اشکال بھی تھا ہمیں ان کے اشکال کی پرواہ بھی نہیں اشکال کرتے ہیں تو ہزار مرتبہ کریں۔ ہمیں بہت سارے احباب نے کہا: کیوں جاتے ہو؟ ادھر مقابلے میں مختلف جماعتوں نے جلسے کیے۔ ہمارے علماء کی عزت کا مسئلہ تھا دنیا دیکھے گی کہ مولوی کیا کرتے ہیں؟ ہم دین کی عزت کی خاطر وہاں پر گئے ہیں تاکہ دنیا کو پتا چلے اگر وہاں اور لوگ آسکتے ہیں تو مسلمان اور نبی کے وارث بھی آسکتے ہیں۔

### جمعیت علماء اسلام کا بھرپور ساتھ دیں:

ایک ساتھی مجھے فرمانے لگے: مولانا صاحب جلسہ ہوا تھا؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ بولے کیا ضرورت تھی جانے کی؟ میں نے کہا: ضرورت تو تھی۔ بولے: اللہ پاک پر اعتماد نہیں؟ میں نے کہا: اسمبلی میں کس نے آنا ہے؟ اللہ پاک تو خود نہیں آئیں گے، بندے ہی آئیں گئے۔ اگر بولنے والے ہوں گے تو قانون کی حفاظت ہوگی، اگر بولنے والے نہیں ہوں گے تو قانون توڑا جائے گا۔ ہمیں اس بات کا خیال کرنا چاہیے۔ اللہ گواہ ہے پانچ سالہ دور اسمبلی میں مولانا فضل الرحمن صاحب کی محنت سے کوئی ایک دن بھی اسلام کے خلاف قانون نہیں بناسکا۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے! پورے پانچ سالہ دور اسمبلی میں ایک بل بھی خلاف اسلام نہیں چلا سکے۔

### کارگزاری سنانی چاہیے:

میں نے مولانا فضل الرحمن صاحب اور جمعیت کے قائدین سے بھی کہا:

آپ کی ایک بہت بڑی کمزوری یہ ہے کہ آپ اسمبلی کی کارگزاری باہر بتاتے نہیں ہیں، آپ بتائیں کہ میں نے اسمبلی میں یہ کہا، یہ کہا، لوگوں کے علم میں نہیں ہے۔ سارے اپنی کارگزاریاں سناتے ہیں۔ ایک چلہ کی جماعت جائے واپس رائیونڈ جائے تو کارگزاری سناتی ہے یا نہیں؟ (سناتی ہے) سال کی جماعت ہو تو پھر؟ (سناتی ہے) سہ روزہ کی جماعت ہو تو پھر؟ (سناتی ہے) اچھا اگر میں کارگزاریاں سنا دوں دیکھو مولوی اپنیاں تعریفیں کر داپھر دا اے کہ میں فلانا کم کیتا اے فلانا کم کیتا اے۔ میں نے کہا تم سہ روزہ بھی لگا کے آؤ تو کارگزاری سناتے ہو میں اپنے سفر کے تذکرے کر دوں تو اے دس دی کی لوڑ سی دبئی گیاں؟ میں نے کہا میں آپ کو کارگزاری سناؤں گا تو تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ہمارے مولانا تو ماشاء اللہ بڑا کام کر رہے ہیں بھائی کارگزاری سنائی چاہیے یا نہیں؟ (سنائی چاہیے) اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة التوبة

﴿بَرَاءَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۖ﴾

تمہید:

درس قرآن کے لیے ہمارا آج کا موضوع ہے ”مضامین سورت توبہ“۔  
سورت توبہ لمبی سورت ہے، اس میں 16 رکوع اور 129 آیات ہیں لیکن ہم نے ایک گھنٹے کے حساب سے تمام آیات کے بجائے منتخب آیات کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا ہے تاکہ سورت التوبہ کے اہم مضامین آپ کے سامنے آجائیں۔

وجہ تسمیہ سورت:

اس میں پہلی بات توبہ یاد رکھیں کہ اس سورت کا نام ”سورت توبہ“ بھی ہے اور ”سورت براءۃ“ بھی۔ میں نے کئی بار عرض کیا ہے کہ کسی سورت کا نام کیوں رکھا جاتا ہے اس کو عربی زبان میں کہتے ہیں ”وجہ تسمیہ“ یعنی اس سورت کا یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے۔ اس سورت کو ”سورت توبہ“ کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ اس سورت مبارکہ میں بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی توبہ کا تذکرہ ہے۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غزوہ تبوک میں شرکت نہ فرما سکے تو انہوں نے بغیر کوئی عذر پیش کیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی مانگی اور اللہ رب العزت نے ان کی معافی کو قبول فرمالیا، ان پر متوجہ ہوئے اور ان کی توبہ کو قبول فرمالیا۔ چنانچہ اس سورت میں

آیت ﴿لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ﴾<sup>151</sup> اور آیت ﴿وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِفُوا﴾<sup>152</sup> کے تحت تفصیل سے ان شاء اللہ یہ واقعہ آئے گا۔

اور اس سورت کو ”سورت براءة“ کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ اس سورت مبارکہ کے آغاز ہی میں اللہ رب العزت نے مشرکین سے براءت اور بیزاری کا اعلان فرمایا ہے۔ تو چونکہ اس سورت میں مشرکین سے براءت کا اعلان ہے اس لیے اس سورت کا نام ہی ”سورت براءة“ ہے۔ اس سورت مبارکہ کے اکثر مضامین کا تعلق قتال و جہاد اور غزوات کے ساتھ ہے۔

### شان نزول:

اس سورۃ کے نزول کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سن چھ ہجری کو عمرہ کی نیت سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے، حدیبیہ کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روک لیا گیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو روسائے مکہ کے ساتھ مذاکرات کے لیے بھیجا۔ بالآخر جو شرائط ہوئیں ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اس سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس چلے جائیں، آئندہ سال آئیں اور آکر عمرۃ القضاء فرمائیں۔ اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ دس سال تک مسلمان اور مشرکین و کفار آپس میں لڑیں گے نہیں یعنی نہ لڑنے کا معاہدہ تھا۔ اس معاہدہ کی ایک شق یہ بھی تھی کہ دیگر قبائل میں سے جس قبیلے کا جی چاہے مسلمانوں کا حلیف بنے اور جس کا جی چاہے وہ کفار کا حلیف بنے اور جو قبیلہ جس کا حلیف بنے گا وہ ان شرائط کا اسی طرح پابند ہوگا جس طرح مسلمان اور مشرکین اس

151۔ التوبہ: 9-117

152۔ التوبہ: 9-118

معاهدے کے پابند ہیں۔

مکہ مکرمہ میں دو قبیلے تھے؛ ایک قبیلہ بنو بکر تھا اور ایک قبیلہ بنو خزاعہ تھا۔ ان میں سے قبیلہ بنو خزاعہ نے مسلمانوں کا حلیف بننے کا عہد کر لیا اور دوسرے قبیلے نے کفار کا حلیف بننے کا عہد کر لیا۔ اب ہوا یہ کہ ابھی ایک سال ہی گزر پایا تھا کہ جس قبیلے نے مشرکین کا حلیف ہونے کا وعدہ کیا تھا انہوں نے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ پر حملہ کیا۔ اب ظاہر ہے کہ ان پر حملہ کرنا گویا مسلمانوں پر حملہ کرنا تھا اور ایک قبیلے کا دوسرے پر حملہ کرنے کا معنی یہ تھا کہ معاہدہ ٹوٹ گیا۔ اب مسلمان جب چاہیں کفار سے قتال کریں اور کفار جب چاہیں مسلمانوں سے لڑائی کریں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین مکہ کو پیغام بھیجا کہ یا تو مقتولین کی دیت ادا کریں یا حملہ آوروں سے اعلان براءت کر دیں یا معاہدہ کے ختم ہونے کا اعلان کر دیں۔ مشرکین نے معاہدہ حدیبیہ کے نسخ کو اختیار کر لیا۔ لیکن بعد میں ان کو بڑی پشیمانی ہوئی۔ تب مشرکین مکہ نے ابوسفیان کو بھیجا کہ تم مدینہ منورہ جاؤ! اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تجدید عہد کرو یعنی نیا معاہدہ کرو کہ ہم آپس میں لڑیں گے نہیں۔ ابوسفیان مدینہ منورہ پہنچے اور کئی ایک اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملے۔ انہوں نے فرمایا: ہمارے بس میں نہیں کہ ہم آپ کی سفارش کریں، ہم نے کئی معاہدے کیے اور تم لوگوں نے ان معاہدوں کو توڑا ہے، اب ہم آپ کی سفارش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں کر سکتے۔

ابوسفیان واپس مکہ پہنچا اور اس نے مکہ والوں کو بتایا تم بھی تیاری کر سکتے ہو تو کرو، مسلمان تیاری کر رہے ہیں اور اب ان کے ساتھ لڑنا شاید ہمارے بس میں نہ ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن آٹھ ہجری میں تیاری شروع کی ہے اور دس یا بارہ ہزار کالشکر لے کر مکہ مکرمہ میں فاتح بن کر داخل ہوئے ہیں۔ فتح مکہ کے عنوان سے



آپ اس کو سنتے رہتے ہیں اور اپنی جگہ پر جب یہ واقعہ آئے گا تو ان شاء اللہ تفصیل سے میں اس کا تذکرہ کروں گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار و مشرکین مکہ کے خلاف جہاد کی تیاری شروع فرمادی لیکن اس تیاری کو مخفی رکھا۔ آہستہ آہستہ یہ بات مشرکین مکہ تک پہنچی۔ ان کو شک یہاں سے ہوا کہ جب ہمارے معاہد قبیلے نے بنو خزاعہ پر حملہ کیا ہے اور ہم نے ان کا ساتھ دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حلیفوں کا بہت زیادہ خیال کرتے ہیں، اللہ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بدلہ لینے کے لیے مکہ کیوں نہیں آئے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدلہ لینے کے لیے سفر نہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ تیاری شروع فرمادی ہے۔

یہاں بتانا صرف یہ ہے کہ مشرکین نے جب اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی تیاری فرمائی اور مشرکین مکہ کو اللہ نے صاف صاف اعلان فرمادیا کہ چونکہ عہد تم نے توڑا ہے، پہل تم نے کی ہے تو اب ہماری طرف سے براءت کا اعلان ہے، تم جانو اور ہم جانیں، تم اپنی تیاری کرو ہم اپنی تیاری کریں گے۔ اس لیے اس سورت مبارکہ میں زیادہ تر وہ آیات ہیں جن کا تعلق جہاد، قتال اور غزوات کے ساتھ ہے۔

### قبائل کی چار قسمیں:

مشرکین مکہ اور گرد و نواح کے جو قبائل تھے بنیادی طور پر ان کی چار قسمیں

ہوتی ہیں:

[1]: بعض وہ تھے جنہوں نے سن چھ ہجری میں عہد کیا تھا اور بعد میں عہد توڑ دیا

تھا۔

[2]: بعض وہ تھے جنہوں نے نہ لڑنے کا عہد کیا تھا اور اپنے عہد پر برقرار رہے۔

[3]: تیسری قسم وہ لوگ تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ تو کیا لیکن معاہدے کی مدت مقرر نہیں تھی کہ ہمارا نہ لڑنے کا یہ معاہدہ کب تک ہے۔

[4]: چوتھی قسم وہ تھے جن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ لڑنے کا کوئی معاہدہ نہیں تھا۔

### ان چاروں قسموں کا حکم:

اللہ رب العزت نے ان چاروں طبقات کے لیے الگ الگ آیات نازل فرمائی ہیں۔

[1، 2]: وہ طبقہ جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں تھا یا جن کے ساتھ معاہدہ تو تھا لیکن ان کے ساتھ کوئی خاص مدت مقرر نہیں تھی ان کے لیے اعلان فرمایا:

﴿بَرَاءَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾  
 فَسَبِّحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ

ان دو طبقات کے لیے تو کھلا اعلان جنگ ہے کہ ہمارا اور تمہارا معاہدہ نہیں تھا یا معاہدہ تو تھا لیکن چونکہ کوئی وقت طے نہیں تھا اس لیے تم بھی آزاد ہو اور ہم بھی آزاد ہیں۔

[3]: وہ جنہوں نے معاہدہ تو کیا ہوا تھا لیکن معاہدے کو خود انہی نے توڑا ہے تو ان کے لیے قرآن کریم میں اعلان فرمایا کہ چار ماہ تک تیاری کرو جو کر سکتے ہو، چار ماہ کے بعد تمہارا اور ہمارا آپس میں میدان سجے گا، اور یہ چار ماہ کی بات کیوں کی ہے؟ یہ چار ماہ وہ تھے جنہیں ”اشہر حرم“ کہتے ہیں یعنی حرمت والے مہینے، ان میں چونکہ لڑنا جائز نہیں تھا اس لیے اللہ رب العزت نے فرمایا:

﴿فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ﴾

کہ جب یہ حرمت والے مہینے ختم ہو جائیں تو یہ لوگ جہاں ملیں انہیں قتل کر دو۔ یہ لوگ کلمہ پڑھیں یا یہاں سے دوڑ جائیں یا ان کو قتل کر دو۔

اور یہ آپ کے ذہن میں ہونا چاہیے کہ جزیرۃ العرب کے جو مشرکین ہیں ان کے لیے قانون عام کفار سے بالکل الگ ہے۔ عام کفار کے لیے قانون یہ ہے کہ کلمہ نہیں پڑھتے تو پھر جزیہ دیں اور اگر جزیہ نہیں دیتے تو پھر قتل کریں لیکن مشرکین مکہ اور عربوں کے لیے قانون یہ ہے کہ کلمہ یا قتل ہو گا، جزیہ دے کر وہ زندہ رہیں اس کی ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو پوری دنیا کے لیے یہی ضابطہ ہو گا، اس وقت جزیہ کا قانون ختم ہو جائے گا، یا کلمہ یا قتل ہو گا۔ اس لیے قرآن کریم کی آیات کی رو سے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو دنیا میں ایک بھی کافر زندہ نہیں رہے گا؛ یا کلمہ پڑھیں گے یا ان کو جہنم رسید کر دیا جائے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ ہو گا کہ کفار کو قتل کرنے کے لیے ان کو تلوار چلانے کی حاجت بھی پیش نہیں آئے گی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سانس لیں گے اور جہاں تک ان کے سانس کی ہوا پہنچے گی وہاں تک کافر ختم ہو جائیں گے اور یہ سانس کہاں تک جائے گا جہاں تک ان کی نگاہ کام کرے گی۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

یہ ان کا معجزہ ہو گا اور بہت تھوڑے ہی عرصے میں کفار اس دنیا سے ختم ہو جائیں گے۔ ایک وقت آئے گا کہ صرف کلمہ گو مسلمان اس دنیا میں رہ جائیں گے۔ اللہ رب العزت مجھے اور آپ سب کو فتنوں سے محفوظ رکھے۔ (آمین۔ سامعین)

[4]: جن مشرکین کے ساتھ معاہدہ تھا اور ان لوگوں نے اس معاہدے کی پابندی کی ہے ان کے بارے میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ

يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ﴾

ان کے معاہدے کو پورا کرو، جب مدت پوری ہو جائے گی تو پھر تمہارا اور ان کا اعلان جنگ ہو گا، تمہیں وعدے کی پابندی کرنی چاہیے۔

اور وہ مشرکین کہ جن کے ساتھ - جیسے پہلے میں نے عرض کیا - کہ کوئی وعدہ یا معاہدہ نہیں تھا یا معاہدہ تھا اور تعین نہیں تھی ان کے لیے فرمایا:

﴿وَإِذَا ن مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۖ وَرَسُولُهُ ۚ﴾

اے میرے پیغمبر! حج کے موقع پر اعلان کروادیا جائے کہ اللہ اور اللہ کے رسول مشرکین سے بری ہیں، اے مشرک! تم کلمہ پڑھ سکتے ہو تو پڑھو، اگر کلمہ نہیں پڑھ سکتے تو پھر تمہاری گردنیں کاٹ دی جائیں گی۔ اگر دنیا میں رہنا ہے تو کلمہ پڑھنا ہو گا اس کے علاوہ دنیا میں نہیں رہ سکتے۔

یہ میں نے چار قسم کے مشرکین کا خلاصہ بیان کیا ہے۔

### میدانِ عرفات میں برأت کا اعلان:

یہ آیات جب نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ میدانِ عرفہ میں جب لوگ جمع ہوں گے، سارے قبائل ہوں گے تو آپ نے یہ اعلان کرنا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ تمہارا اعلان تمام قبائل میں پھیل جائے گا، چنانچہ انہوں نے اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلان فرمایا۔

عجیب بات ہے کہ وہ عرفہ کا دن جمعہ کا دن تھا۔ ہمارے ہاں ایک غلط بات مشہور ہے کہ جس حج میں عرفہ جمعہ کا دن ہو تو کہتے ہیں آج کا حج؛ حج اکبر ہے حالانکہ یہ

بات صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان میں حج کو حج اکبر کہتے ہیں اور عمرہ کو حج اصغر کہتے ہیں، حج یہ بڑا حج ہے اور عمرہ یہ چھوٹا حج ہے۔

خیر اصل بات میں یہ سمجھا رہا تھا کہ سورۃ براءت میں اللہ تعالیٰ نے چونکہ مشرکین مکہ سے براءت کا اعلان فرمایا ہے اس لیے اس سورۃ کا نام سورۃ براءت بھی ہے۔

### ”بسم اللہ“ ہر سورت کا جزء ہے یا نہیں؟

ایک مسئلہ اور بھی ذہن نشین فرمائیں۔ قرآن کریم کی 114 سورتیں ہیں اور سورہ توبہ کے علاوہ ہر سورت کی ابتدا میں بسم اللہ موجود ہے لیکن ہر سورت کے شروع میں جو بسم اللہ ہے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق یہ اس سورت کا جزء نہیں ہے، جو بسم اللہ قرآن کریم کا جزء ہے وہ یہ ہے:

﴿إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾<sup>153</sup>

ہر سورت کے شروع میں جو بسم اللہ ہے وہ سورت کا جزء نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر یہ لکھی کیوں جاتی ہے؟ تو وہ اس لیے تاکہ پتا چلے کہ ایک سورت ختم ہو گئی ہے اور دوسری شروع ہو رہی ہے۔ یہ ہر دو سورتوں کے درمیان فصل اور علامت کے طور پر لکھی جاتی ہے۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بسم اللہ قرآن کا جزء ہے لیکن لا علی تعیین السورۃ کسی خاص سورت کا جزء نہیں ہے بلکہ بسم اللہ صرف قرآن کا جزء ہے۔ تو اس اعتبار سے رمضان المبارک میں ہمارے امام صاحب یا قاری صاحب یا حافظ صاحب جب الحمد سے لے کر والناس تک پورا قرآن کریم ہمیں سناتے

ہیں تو ان کو چاہیے کہ کسی ایک سورت کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم اونچی آواز سے پڑھ دیا کریں تاکہ مقتدی پورا قرآن سنیں، اس لیے کہ یہ قرآن کریم کا جزء ہے۔ اگر کسی حافظ نے پورے قرآن کی 114 سورتوں میں سے کسی ایک سورت کے شروع میں بھی بسم اللہ جہر اُنہ پڑھا تو قرآن کریم کا اجر تو مل جائے گا لیکن تراویح میں پورے قرآن کا جو اجر اونچی آواز سے پڑھنے اور سننے کا ہوتا ہے وہ ایک آیت سننے سے مقتدی محروم رہ جائیں گے۔ اگرچہ امام پڑھے گا اور مقتدی کو ثواب تو ملے گا لیکن جو اپنے کانوں سے قرآن سننے کا ثواب ہے وہ اس سے محروم رہ جائیں گے۔

### سورة التوبة کے شروع میں بسم اللہ نہ ہونے کی حکمت:

بعض حضرات نے اس کی حکمت بیان کی ہے کہ اس سورت کے شروع میں بسم اللہ کیوں نہیں ہے! حکمت اور چیز ہوتی ہے، سبب اور چیز ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس حکمت اور اس نکتہ کو اصل سبب سمجھ لیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول یہ ہے کہ چونکہ اس سورت میں براءت کا اعلان ہے اور براءت میں رحم نہیں ہوتا بلکہ براءت میں سزا اور عقاب کا پہلو غالب ہوتا ہے، بسم اللہ الرحمن الرحیم میں اللہ کا نام اور رحمن و رحیم یہ دونوں صفتیں ہیں اور ان سے رحمت اور شفقت کے پہلو نکلتے ہیں اور جب تلوار چلتی ہے تو پھر رحمت اور شفقت کے پہلو نہیں ہوتے، تو چونکہ اس سورت میں براءت کا اعلان ہے اور مشرکین کے قتل کا حکم ہے اس لیے اس سورت کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں ہے۔ یہ حکمت ضرور ہے لیکن اصلی سبب نہیں ہے۔

### شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کا اصلی سبب:

اصلی سبب وہ ہے جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا۔ ظاہر ہے کہ پورے قرآن کو جمع انہوں نے کیا ہے۔ اس سورت کے شروع میں بسم اللہ نہیں

تھی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دیکھو! یہ قرآن کریم ہے، اس میں ہماری آراء اور عقل کو دخل نہیں ہے، جبرائیل امین آتے اور ایک سورت نازل ہوتی یا ایک خاص آیت نازل ہوتی، جبرائیل امین نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی بتاتے تھے کہ یہ آیت آئی ہے اس کو فلاں سورت میں فلاں جگہ پر رکھیں اور جب سورت نازل ہوتی تو یہ بھی بتاتے کہ اس سورت کو فلاں جگہ پر رکھیں اور جب اگلی سورت شروع ہوتی یا آیت شروع ہوتی تو فرماتے کہ یہاں بسم اللہ لکھ دیں تاکہ یہ سورت الگ ہو جائے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب سورت التوبة نازل ہوئی تو اس سورت کے شروع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ لکھوائی بھی نہیں اور بتائی بھی نہیں، اب ہمیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ سورة التوبة مستقل سورت ہے یا اس سے پہلے جو سورة الانفال ہے اس کا جزء ہے! اگر یہ اس کا جزء ہو تو بسم اللہ نہیں ہونی چاہیے اور اگر اس کا جزء نہ ہو تو بسم اللہ ہونی چاہیے لیکن نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا نہیں ہے کہ اس کا جزء ہے یا اس کا جزء نہیں ہے۔ اب ہم اس کے بارے میں کیا رائے قائم کریں؟

ایک تو یہ مسئلہ پیش آیا اور دوسری الجھن کیا تھی؟۔ یہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تحقیق اور ان کا نقطہ نظر پیش کر رہا ہوں۔ کہ قرآن کریم کی 114 سورتیں ہیں، سورة الفاتحة کے علاوہ جو ﴿الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ سے قرآن کریم کا آغاز ہوتا ہے اس میں ترتیب یہ ہے کہ قرآن کریم کی بعض سورتیں ایسی ہیں جن کی آیات 100 سے زائد ہیں اور بعض سورتیں وہ ہیں جن کی آیات کی تعداد 100 سے کچھ کم ہے لیکن 100 کے قریب قریب ہے اور بعض سورتیں وہ ہیں کہ جن میں آیات اس سے بھی کم ہیں۔ تو پہلے ان سورتوں کو رکھا ہے جن کی آیات کی تعداد 100 سے زیادہ ہے اور

انہیں عربی زبان میں کہتے ہیں ”مِثْنَيْنِ“۔ مِثْنَيْنِ یہ مَآء کی جمع ہے، مَآء کہتے ہیں 100 کو اور بعد میں وہ سورتیں رکھی ہیں جن کی آیات کی تعداد 100 سے کم ہے لیکن 100 کے قریب قریب بنتی ہے، انہیں کہتے ہیں ”مثنائی“ اور بعد میں وہ سورتیں آئی ہیں جن میں آیات بہت کم ہیں، انہیں ”مفصلات“ کہتے ہیں۔

پھر مفصلات کی تین قسمیں ہیں: ایک ہے طوالِ مفصل، ایک ہے اوساطِ مفصل اور ایک ہے قصارِ مفصل۔ طوالِ مفصل؛ لمبی سورتیں ہیں، یہ ظہر اور فجر کی نماز میں پڑھتے ہیں۔ اوساطِ مفصل؛ یہ سورتیں مفصل تو ہیں لیکن درمیانی ہیں یہ عشاء اور عصر کی نماز میں پڑھتے ہیں اور قصارِ مفصل؛ یہ سورتیں مفصل تو ہیں لیکن چھوٹی ہیں یہ مغرب کی نماز میں پڑھتے ہیں۔ یہ مستقل تقسیم ہے۔

میں اصل بات جو سمجھانا چاہ رہا تھا وہ یہ ہے کہ سورۃ التوبہ کی آیات ہیں 129 اور اس سے پہلے سورۃ الانفال کی آیات کی تعداد ہے 75۔ اب بتائیں کہ اس اصول کی رو سے سورۃ الانفال کو پہلے ہونا چاہیے تھا یا سورۃ التوبہ کو پہلے ہونا چاہیے تھا؟ (سورۃ التوبہ کو۔ سامعین) تو سورۃ الانفال کو بعد میں ہونا چاہیے اور سورۃ التوبہ کو پہلے ہونا چاہیے تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ الانفال پہلے ہے اور سورۃ التوبہ بعد میں ہے، اور اب یہ بالکل قیاس کے خلاف تھا۔

اب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس میں ہم سوچتے تھے کہ سورۃ التوبہ سورۃ الانفال کا جزء ہے یا نہیں؟ جب یہ دیکھا کہ انفال کی آیات پہلے نازل ہوئی ہیں اور توبہ کی بعد میں نازل ہوئی ہیں تو پتا چلا کہ انفال پہلے ہے اور سورۃ توبہ بعد میں ہے لیکن اب سارے قیاس اور ضابطے چھوڑ دیے چونکہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ نہیں لکھوائی اس لیے ہم بھی نہیں لکھتے، البتہ اتنا کرتے ہیں کہ انفال اور توبہ کے درمیان جگہ خالی چھوڑ دی جائے یہ بتانے کے لیے کہ سورۃ انفال ختم ہو گئی



ہے اور سورۃ توبہ شروع ہو گئی ہے۔

### سورۃ التوبہ پڑھتے وقت بسم اللہ پڑھنے کا مسئلہ:

بعض لوگوں نے جہالت کی بنیاد پر عوام میں ایک نیا مسئلہ نکال دیا کہ سورت التوبہ کے شروع میں اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھتے ہیں۔ یہاں اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم نہ پڑھیں، جب سورۃ الانفال ختم کی تو بغیر بسم اللہ پڑھے سورۃ التوبہ کو شروع کر دیں لیکن اگر تلاوت ہی سورۃ التوبہ سے آپ شروع کریں تو پھر اعوذ باللہ بھی پڑھیں اور بسم اللہ بھی پڑھیں، کیونکہ اب یہ بسم اللہ سورۃ توبہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ بسم اللہ اس وجہ سے ہے کہ آپ نے قرآن کریم کی تلاوت کا آغاز کیا ہے اور جب قرآن کا آغاز کریں تو اعوذ باللہ بھی پڑھتے ہیں اور بسم اللہ بھی پڑھتے ہیں۔

خیر میں عرض کر رہا تھا کہ اس سورت کے شروع میں اللہ رب العزت نے مشرکین کی چاروں قسموں کا تذکرہ فرما دیا ہے۔

### مخالفت نظریات سے نہ کہ ذاتیات سے:

﴿فَإِنْ تَابُوا وَ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَ آتَوْا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي

الدِّينِ ۖ

دیکھو! قرآن کتنی عجیب بات فرماتا ہے۔ فرمایا کہ مشرکین کو تم قتل کرو اگر یہ کلمہ نہیں پڑھتے لیکن اگر یہ توبہ کریں، نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو اب یہ تمہارے دشمن نہیں بلکہ تمہارے بھائی ہیں۔ اب ان سے نہیں لڑنا! پتا یہ چلا کہ مسلمان کی لڑائی کسی سے ذاتیات کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ نظریات کی بنیاد پر ہوتی ہے۔

## مانعین زکوٰۃ اور حضرت ابو بکر صدیق:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں بعض لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے منع کر دیا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت سے استدلال پکڑا اور فرمانے لگے کہ اگر یہ زکوٰۃ نہیں دیں گے تو میں ان کے ساتھ قتال کروں گا، میں ان کی گردنیں اڑاؤں گا، میں ان سے جہاد کروں گا۔

یہ نکتہ سمجھنے کا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کن سے قتال کرنے کا اعلان کیا ہے! وہ منکرین زکوٰۃ نہیں تھے بلکہ مانعین زکوٰۃ تھے، انکار کا معنی اور ہوتا ہے اور منع کا معنی اور ہوتا ہے۔ انکار کا معنی ہوتا ہے کہ میں زکوٰۃ کو مانتا ہی نہیں اور منع کا معنی ہوتا ہے کہ میں مانتا تو ہوں لیکن آپ کو دیتا نہیں۔ جو بھی باطل اٹھتا ہے وہ دلیل میں قرآن پیش کرتا ہے اور معنی اپنی مرضی کا بیان کرتا ہے۔ مانعین زکوٰۃ نے کہا کہ ہمارے پاس قرآن سے دلیل ہے۔ پوچھا گیا کہ قرآن سے کیا دلیل ہے؟ انہوں نے کہا کہ قرآن کہتا ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ﴾<sup>155</sup>

اے نبی! آپ ان سے زکوٰۃ لیں اور ان کو پاک کریں۔

تو وہ کہنے لگے کہ یہ حکم اللہ کے نبی کو تھا، آپ کو کیسے حکم ہو گیا؟ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو ہم زکوٰۃ دیتے تھے، اب حضور چلے گئے ہیں اس لیے ہم آپ کو زکوٰۃ نہیں دیتے۔

اب صدیق اکبر کا جملہ سنو! حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: جو کام اللہ کے نبی نے کیا وہ صدیق ضرور کرے گا، اس لیے کہ میں اللہ کے نبی کا جانشین

ہوں:

"وَاللّٰهُ! لَوْ مَنَعُونِي عِقَالًا كَانُوا يُؤَدُّونَهُ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَاتَلْتَهُمْ عَلَى مَنَعِهِ" <sup>156</sup>

ایک رسی جو تم زکوٰۃ میں اللہ کے نبی کو دیا کرتے تھے اگر آج تم نے نہ دی تو میں صدیق تمہاری گردنیں اڑا کر رکھ دوں گا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ایسے کھڑے ہوئے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسا بندہ بھی فرمانے لگا: ابو بکر! یہاں تو بڑے بڑے فتنے ہیں، اس لیے آپ ان لوگوں کو تھوڑا سا چھوڑ دیں، ان سے بعد میں لڑ لیں گے۔

اب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا جملہ سنیں! انہوں نے فرمایا: "أَجَبًا زِي فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَخَوَارِ فِي الْإِسْلَامِ؟" عمر! جب کلمہ نہیں پڑھا تھا بہت دلیر تھے اور کلمہ پڑھنے کے بعد یہ بزدلی؟ پھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: "أَيَنْقُصُ وَأَنَا حَيٌّ؟" <sup>157</sup> دین میں کمی آجائے اور ابو بکر زندہ رہے یہ نہیں ہو سکتا۔

اور آپ یقین فرمائیں محدثین نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کے بعد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس مقام پر کھڑے تھے جس مقام پر نبی کھڑا ہوتا ہے۔ پوری امت مخالف ہو اور بندہ پھر حق بیان کرے یہ نبی کی شان ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صحابی بھی کہہ رہے ہیں کہ ابو بکر! کچھ خیال فرمائیں، کس کس سے لڑیں گے؟

آج یہ بات لوگ ہمیں سمجھاتے ہیں کہ مولانا صاحب! آپ کس کس کے

156- سنن ابی داؤد، رقم: 1556

157- جامع الاصول فی احادیث الرسول لابن اثیر الجزری: ج 6 ص 283 رقم 6426

ساتھ لڑیں گے؟ میں کہتا ہوں کہ سبحان اللہ! ہم نے تھوڑی لڑنا ہے، حق بیان کرنا ہمارے ذمے ہے اور مدد و نصرت ہمارے ذمے نہیں بلکہ اللہ کے ذمے ہے، مسلمان اپنی طاقت پر تو نہیں لڑتا، مسلمان جب بھی لڑتا ہے اللہ کے بھروسے پر لڑتا ہے۔

### لشکرِ اسامہ کی روانگی:

اور میں ایک عجیب بات عرض کرتا ہوں بات چل جو پڑی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا سے جانے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا لشکر بھیجا کہ جاؤ منکرین ختم نبوت کے خلاف جہاد کرو۔ ابھی وہ لشکر مدینے سے باہر تھا، روانہ نہیں ہوا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی جس کی وجہ سے وہ لشکر نہ جاسکا۔ بعد میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسامہ! لشکر تیار کرو اور نکلو، تم نے منکرین ختم نبوت کو مارنا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ابو بکر! آپ کیسی بات کرتے ہیں؟ اس سے بھی لڑائی، اُس سے بھی لڑائی، مدینہ تو سارا خالی ہو گیا ہے، مدینہ میں کوئی مرد نہیں رہا، اگر عیسائیوں کو اس بات کا پتا چل گیا اور انہوں نے مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا تو بتاؤ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا کیا بنے گا؟ امہات المؤمنین کا کیا بنے گا؟

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرمانے لگے:

"لَوْ جَرَّتِ الْكِلَابُ بِأَرْجُلِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا رَدَدْتُ جَيْشًا وَجَّهْتُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ."

اتنا سخت جملہ ہے یہ صدیق اکبر ہی کہہ سکتے ہیں، اللہ کی قسم میں تو ترجمہ کرنے سے ڈرتا ہوں یعنی مجھ سے ترجمہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ میں اس ترجمہ کو کیسے بیان کروں؟ یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی فرما سکتے ہیں۔ فرمایا: "لَوْ جَرَّتِ الْكِلَابُ بِأَرْجُلِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" اگر مدینہ منورہ کی حالت یہ ہو

جائے کہ کتے آجائیں اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو گھٹیٹنا شروع کر دیں تو میں یہ برداشت کر لوں گا لیکن جو قافلہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روانہ کیا ہے اس کو صدیق نہیں روک سکتا! <sup>158</sup>

آپ اندازہ کریں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کتنا ایمان ہو گا! کوئی بندہ تصور کر سکتا ہے!

محدثین لکھتے ہیں کہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس مقام پر کھڑے ہو گئے کہ مدینہ خالی ہو گیا تو اللہ رب العزت نے مشرکین، یہود اور عیسائیوں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ مسلمان عورتوں کے بارے میں بڑے غیرت مند ہوتے ہیں، اتنے افراد انہوں نے باہر بھیج دیے ہیں تو مدینے میں کتنے رکھے ہوں گے! اس لیے ان سے بچو اور مدینے پر حملے کا سوچو بھی مت۔ یوں انہوں نے مدینہ پر حملے کا خیال ہی چھوڑ دیا۔

### صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا استدلال:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسی آیت سے استدلال فرمایا تھا:

﴿فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ﴾ <sup>159</sup>

اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر یہ ایمان لائیں، توبہ کریں، زکوٰۃ دیں، نماز ادا کریں تو تمہارے بھائی ہیں۔ شخص زکوٰۃ دینے سے انکار کرتا ہے، زکوٰۃ نہیں دیتا وہ ہمارا بھائی نہیں ہے۔

اس سے اندازہ لگاؤ کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا کتنا ضروری ہے۔ میں خدا کی قسم اٹھا کر

کہتا ہوں کہ اگر مسلمان اپنی زکوٰۃ اور اپنا عشر ادا کرنا شروع کر دیں تو دنیا میں کوئی بھیک

مانگنے والا بندہ تمہیں نظر نہیں آئے گا، دنیا میں کوئی تمہیں غریب کوئی بیوہ نظر نہ آئے، کوئی یتیم تمہیں سسکیاں بھرتا نظر نہ آئے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو اپنی زکوٰۃ اور عشر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

## ترکِ جہاد کی وجوہات:

﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكِنٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾

آدمی جب بھی جہاد سے جان چھڑاتا ہے تو ان آٹھ میں سے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے، اللہ نے یہ آٹھوں وجوہات بیان فرمادی ہیں۔ کوئی جہاد میں نہیں جاتا اس لیے کہ میرے ابو موجود ہیں، میری امی جان موجود ہیں تو میں ان کو چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ کوئی نہیں جاتا کہ میرے گھر میں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، میں ان کو چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ کوئی نہیں جاتا اس لیے کہ میرے چھوٹے بھائی ہیں اور میرے ابو جی دنیا سے چلے گئے ہیں تو میں ان کو چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ کوئی کہتا ہے کہ میرا دل تو بہت کرتا ہے لیکن نئی نئی شادی ہے، اب بیوی چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ اور کوئی کہتا ہے کہ میرا دل تو بہت کرتا ہے لیکن میرا خاندان نہیں مانتا، میں کیسے جاؤں؟ اور بعض کہتے ہیں کہ ہم جانا تو چاہتے ہیں لیکن ہماری دکان کا مسئلہ ہے، نئی نئی دکان شروع کی ہے، اگر ہم جہاد پر چلے گئے تو دکان کا کیا بنے گا؟ کسی کو دولت کی فکر ہے، کسی نے نیا مکان اور نئی کوٹھی بنائی ہے۔ تو کل کتنی وجوہات بنتی ہیں؟ (آٹھ۔ سامعین)

1: والدین، 2: بیٹے، 3: اولاد، 4: بھائی، 4: بیوی، 5: خاندان، 6: مال، 7: تجارت، 8: اس

کے رہنے کی جگہیں یعنی مکانات۔

اللہ فرماتے ہیں: جو بندہ ان وجوہ کی بنیاد پر جہاد میں نہیں جاتا ﴿فَلْيَرْصُدْ﴾  
حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ﴿۱﴾ تو وہ اللہ کے عذاب کا انتظار کرے۔

### مجاہدین کے خلاف بات نہ کرو!

میں ایک چھوٹی سی بات کرتا ہوں۔ آپ جہاد میں نہیں جاسکتے یہ بات الگ ہے لیکن جہاد کے خلاف بات کر کے کبھی اپنے ایمان کو برباد نہ کرنا! بعض لوگ جاتے بھی نہیں ہیں اور مجاہدین پر اعتراض کر کے ان کے زخموں پر نمک بھی چھڑکتے ہیں، خدا کے لیے یہ جرم کبھی نہ کرنا!

میں یہاں ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں۔ بسا اوقات میرے سفر اتنے ٹف ہوتے ہیں کہ اللہ گواہ ہے شاید سوچنا بھی آپ کے بس میں نہ ہو۔

میرے ساتھ ایک تبلیغی مدرسہ کے چند لڑکے تھے۔ انہوں نے کہا کہ تین دن ہمیں چھٹیاں ہیں۔ ہم نے آپ کے ساتھ جانا ہے۔ میں نے کہا: یہ سہ روزہ تمہارے بس میں نہیں ہے۔ انہوں نے کہا: ہم نے آنا ہے۔ میں نے کہا: آپ میں سے جس کا جی کرے آجائے، میرے ساتھ سفر کرے اور دیکھے کہ میرا سفر کتنی مشقت والا ہوتا ہے۔

ابھی میرا ایک ہفتے کا کشمیر کا دورہ تھا۔ اس سفر میں میرے پاس Surf گاڑی تھی جو ابھی اسلام آباد و رکشاپ میں کھڑی ہے اس پر اڑھائی لاکھ روپے خرچہ آنا ہے تب جا کر اس نے ٹھیک ہونا ہے۔ یہ ہے ایک ہفتے کے دورے کی وجہ سے خرچ۔ آپ اندازہ کریں کہ وہ کتنا ٹف دورہ ہو گا۔ ایک ہفتے میں میں ایک ضلع سے داخل ہوا اور مظفر آباد سے جا کر نکلا۔ ایک دن میں تین تین بیان کرنا اور چھ گھنٹے پہاڑی کا سفر کرنا یہ نام لینا بہت آسان ہے لیکن سفر کرنا بہت مشکل ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میں

دنیا بھر میں اپنے میزبان سے تقریر کے پیسے بھی نہیں مانگتا۔ اگر پیسے مانگوں تو کہتے ہیں کہ مولوی پیسے مانگتے ہیں اور نہ مانگوں تو کہتے ہیں کہ ایجنسیوں کا ہے، اس کے پاس پیسہ کہاں سے آتا ہے؟ میں نے کہا: یہ سارے تاجر ایجنسیوں کے بیٹھے ہیں؟ اگر ان کے ایجنسی کے ہونے کی یہی دلیل ہے تو پھر۔ اللہ معاف کرے۔ سب ایسے ہی ہیں۔

خیر میں نے سفر کیا تو وہ طالب علم ایک رات میں ہی واپس آگئے۔ انہوں نے کہا: مولانا صاحب! یہ سفر آپ ہی کر سکتے ہیں، ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔ میں اصل جو بات سمجھا رہا تھا وہ یہ تھی کہ میں سفر میں تھا تو مجھے ایک مولانا صاحب فرمانے لگے: آپ بہت بڑا جہاد کر رہے ہیں۔ میں نے کہا: یہ جھوٹ نہ بولو، میں تقریر کرتا ہوں، میں مناظرہ کر لوں گا لیکن اس کو جہاد مت کہو! قرآن کریم نے منافقین کی علامت بیان کی ہے کہ:

﴿وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا﴾<sup>160</sup>

کہ وہ کچھ کرتے بھی نہیں ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگ ہمیں اس نام سے یاد کریں۔

میں نے ان سے کہا کہ میں جب جہاد نہیں کرتا تو مجھے مجاہد کیوں کہتے ہو؟ مجھے مولوی صاحب کہو، حافظ صاحب کہو، قاری صاحب کہو، مجاہد نہ کہو! خیر میں بات سمجھا رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر آٹھ وجوہ سے تم جہاد کرنا چھوڑ دو تو پھر تمہیں اللہ کے عذاب کا انتظار کرنا چاہیے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو عذاب سے محفوظ رکھے۔ اللہ ہمیں خالص مسئلہ بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)



میری آپ حضرات سے اتنی سی گزارش ہے کہ اگر آپ جہاد کر سکتے ہیں تو کریں، اگر نہیں کر سکتے تو خود کو مجاہد نہ کہیں اور مجاہدین کے زخموں پر نمک نہ چھڑکیں! یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ شاید کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کو اس کا جواب نہ دے سکے۔

### والدین کی خدمت جہاد؟ ایک مکالمہ:

یہ چونکہ ایک وسیع موضوع ہے اس لیے میں اس پر لمبی بات نہیں کرتا، بس صرف ایک بات کرتا ہوں۔ مجھے ایک ساتھی نے کہا: جب والدین گھر میں ہوں تو پھر تو جہاد نہیں ہوتا۔ میں نے کہا: بیوی گھر میں ہو تو پھر بھی جہاد نہیں ہوتا! مجھے وہ کہتا ہے: وہ کیسے؟ میں نے کہا: اُس کی دلیل تو دے، اس کی دلیل میں دیتا ہوں۔ کہنے لگا: ایک صحابی آئے، انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے جہاد میں جانا ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے والدین زندہ ہیں؟ اس نے کہا: جی ہاں زندہ ہیں۔ فرمایا: "فَقِيهِمَا فَيُجَاهِدْ"<sup>161</sup> ان کی خدمت کر یہی جہاد ہے۔ میں نے کہا: یہی دلیل ہے؟ اس نے کہا: جی یہی دلیل ہے۔ میں نے کہا: حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ غزوہ بدر میں جانا چاہتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہاری بیوی بیمار ہے، تم ان کی خدمت کرو یہی تمہارا جہاد ہے۔ تو بیوی کی خدمت بھی جہاد بنا! صرف والدین کی خدمت جہاد کیسے ہوئی؟ اب وہ چپ ہو گیا۔ بعد میں کہنے لگا کہ پھر کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا: مطلب تم سمجھو میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔

میں نے کہا: دیکھو ایک شخص یہاں سے جاتا ہے کہ میں چلہ پر جاؤں۔ یہاں سے مرکز جائے، بستر لے جائے، پیسے جیب میں رکھ کے جائے، کہے کہ میں تو چلے کے لیے آگیا ہوں لیکن میری امی جان سخت بیمار ہیں۔ امیر صاحب! اگر آپ اجادت دیں تو

میں گھر چلا جاؤں؟ اب امیر صاحب کہہ دیں کہ بیٹا! تو گھر چلا جا، یہی تیرا چلہ ہے۔ اب بتاؤ ثواب ملے گا یا نہیں؟ (ملے گا۔ سامعین) اور ایک بندہ گھر بیٹھ کر کہے کہ میں نے چلہ پر نہیں جانا، کیونکہ میری امی جان گھر میں ہیں، میں ان کی خدمت کروں گا، یہی میرا چلہ ہے۔ کوئی پوچھے کہ تمہارا امی کی خدمت کرنا کیسے چلہ ہوا؟ وہ کہے کہ جی اُس کا امی کی خدمت کرنا چلہ بنتا ہے تو میرا خدمت کرنا کیوں چلہ نہیں؟ ہم کہیں گے کہ وہ امیر صاحب کے پاس چلا گیا تھا اور تشکیل کروا کر واپس آ گیا تھا اور آپ تو گئے ہی نہیں۔ اسی طرح وہ صحابی آئے تھے کہ حضور! میں جانا چاہتا ہوں۔ فرمایا: والدہ کی خدمت کر یہی تیرا جہاد ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ میں جانا چاہتا ہوں۔ فرمایا: بیوی کی خدمت کر یہ تیرا جہاد ہے۔ لیکن خود فیصلہ نہ کرو بلکہ امیر فیصلہ کرے تو ٹھیک ہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم خود فیصلے شروع کر دیتے ہیں کہ میں نہیں جاتا کہ میرا فلاں عذر ہے۔

بعض لوگ ہمیں کہتے ہیں کہ اگر جہاد ضروری ہوتا تو فلاں مفتی صاحب کیوں نہیں جاتے؟ میں نے کہا: مفتی صاحب کوئی دلیل شرعی ہیں؟ ان کا اپنا کوئی عذر ہو گا۔ میرا اپنا عذر ہے، کسی کا اپنا عذر ہو گا، ہمارے عذروں کی وجہ سے مسئلے نہیں بدلا کرتے۔ مسئلہ وہی بیان کریں جو اللہ نے بیان فرما دیا ہے۔ اللہ ہمیں حق اور سچ مسئلہ بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

### غزوہ حنین کا واقعہ:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۖ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۖ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ

كَثُرْتُكُمْ﴾<sup>162</sup>

یہ بڑا اہم مسئلہ ہے جو سمجھنے کا ہے۔ ان آیات میں اللہ رب العزت نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تذکرہ فرمایا ہے اور غزوہ حنین کا تذکرہ کیا ہے۔ اللہ رب العزت نے جب مکہ مکرمہ مسلمانوں کے ہاتھ پہ فتح کرا دیا تو مکہ مکرمہ سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ایک جگہ ہے ”حنین“، یہ طائف اور مکہ کے درمیان ہے۔ وہاں پر کچھ لوگ جمع ہوئے۔ قبیلہ ہوازن جو بہت بڑا قبیلہ تھا ان کے سردار مالک بن عوف تھے جو بعد میں مسلمان ہوئے تھے۔ وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سردار جمع کر لیے اور میں نے کہا کہ - العیاذ باللہ - محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے لڑائی لڑی ہے جو اناڑی تھے، یہ ہم سے لڑیں گے تو ان کو سمجھ آ جائے گی، اس لیے تم اپنے سردار اکٹھے کرو۔

سارے لوگ اکٹھے ہو گئے تو انہوں نے کہا: اپنی عورتیں لے آؤ، بچوں کو بھی لے آؤ، سامان بھی لے آؤ تاکہ واپسی کے سارے راستے ختم ہو جائیں۔ یہ لوگ جمع ہو گئے۔ ان کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت ہے کہ چوبیس ہزار تھے اور ایک روایت میں ہے کہ چار ہزار تھے۔

مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں میں تطبیق یہ ہے کہ عورتیں، بچے اور بوڑھے سب ملاؤ تو چوبیس ہزار تھے اور صرف جنگجو شمار کرو تو پھر تعداد چار ہزار بنتی ہے۔

اور مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ دس ہزار تو وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جو مکہ مکرمہ کی فتح کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آئے تھے اور دو ہزار وہ تھے جو فتح مکہ کے موقع پر مکہ اور اطراف مکہ میں سے مسلمان ہوئے تھے تو وہ بھی ساتھ شامل ہو گئے۔

یہ چودہ ہزار کا لشکر تو مجاہدین کا تھا۔ ان کے ساتھ مکہ کے بعض وہ لوگ بھی

شامل ہو گئے جن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف پرانی نفرتیں اور کدورتیں تھیں۔ غزوہ بدر میں ان کے کچھ آدمی مارے گئے تھے، اور کسی کے غزوہ احد میں مارے گئے تھے۔ تو انہوں نے سوچا کہ ہم بھی ساتھ چلتے ہیں۔ اگر یہ طائف والے ان مسلمانوں پر غالب آ گئے تو ہم بھی اپنے ہاتھ صاف کر لیں گے اور اگر یہ مسلمان ان طائف والوں پر غالب آ گئے تو مالِ غنیمت میں ہمیں بھی مال مل جائے گا۔ تو کچھ لوگ یوں تماشائی بن کر ان کے ساتھ چلے۔

### شیبہ بن عثمان کا واقعہ:

روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص تھے جن کا نام شیبہ بن عثمان تھا، وہ اپنا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ میرا باپ حضرت حمزہ کے ہاتھ سے اور میرا چچا حضرت علی رضی اللہ عنہما کے ہاتھ سے غزوہ بدر میں قتل ہوا تھا۔ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں مسلمانوں کے ساتھ چل پڑتا ہوں اور میں کوشش کروں گا کہ مجھے موقع ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر -العیاذ باللہ- حملہ کر دوں۔ میں اس نیت سے ساتھ چلا۔ یہ بڑا عجیب درد بھر اور دلچسپ واقعہ ہے۔

شیبہ بن عثمان کہتے ہیں کہ میں موقع پا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کہ اللہ کے نبی کو قتل کر دوں لیکن دیکھا کہ دائیں جانب حضرت عباس رضی اللہ عنہ موجود تھے اور بائیں طرف حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ پھر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کی جانب سے آیا کہ پیچھے سے حملہ کر دوں۔ بس میں حملہ کرنے ہی والا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ لیا تو مجھے بلا لیا۔ میں آ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ جوں ہی میرے سینے پر ہاتھ رکھا اور دعا دی کہ یا اللہ! اس سے شیطان کو دور کر دے۔ میں نے دل میں ایسی ٹھنڈک محسوس کی جو میں بتا نہیں سکتا۔

اب جو میں نے اپنی نظر اٹھائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اپنے کان، آنکھ اور جان سے زیادہ عزیز ہو گئے تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم فرمایا کہ کفار سے جا کر لڑو! چنانچہ میں کفار سے ہمت و جرات سے لڑا۔ جب اس غزوہ سے واپس آئے تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے فرمانے لگے کہ تو اس ارادے سے آیا تھا کہ تو مجھ پر حملہ کر دے لیکن اللہ نے تجھ سے نیک کام لینے کا ارادہ کیا تھا اور وہ ہو کر رہا۔ توشیبہ بن عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں آیا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنے کے لیے اور جب واپس ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فوج کا سپاہی بنا ہوا تھا۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

### تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟

اسی غزوہ حنین کے سفر میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ایک صحابی ہیں جن کا نام تھا حضرت ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے، ایک کافر آیا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار اپنے ہاتھ میں لی، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سوئے ہوئے تھے، آپ کی آنکھ کھل گئی تو اس کافر نے کہا: "يَا مُحَمَّدُ! مَنْ يَمْنَعُكَ وِطْيً؟" اے محمد! بتاؤ تمہیں میرے ہاتھ سے اب کون بچائے گا؟ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ۔ یہ جملہ کہنا تھا کہ وہ کافر کانپ گیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار اٹھائی اور فرمایا: "مَنْ يَمْنَعُكَ وِطْيً؟" اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ حضرت ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ کہنے لگے: یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیں کہ میں اس کا کام تمام کر دوں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: میرے ساتھ میرے اللہ کا وعدہ ہے کہ جب تک میرا دین پوری دنیا میں غالب نہ ہو

جائے مجھے دنیا کا کوئی بندہ نقصان نہیں پہنچا سکتا، چھوڑ دو اس کو۔<sup>163</sup>

خیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ آگے بڑھے۔ اب ان کی تعداد ہے بارہ ہزار اور مقابلے میں کفار کی تعداد ہے چار ہزار۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے دل میں ایک بات آگئی کہ جب ہم جنگ بدر میں تین سو تیرہ تھے تو غالب آگئے تھے، اُس وقت تیر اور تلواریں تھوڑی تھیں، اب تو اسلحہ بہت زیادہ ہے اور تعداد بھی بہت زیادہ، آج تو ہم کسی سے مغلوب نہیں ہوں گے۔ یہ بات دل میں آئی ہی تھی کہ جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ ادھر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ادھر سے کفار آرہے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب آئے تو ان مشرکین نے اتنا سخت حملہ کیا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس موقع پر پاؤں اکھڑ گئے۔

قبیلہ ہوازن نے آگے سے حملہ کیا، بعض گھائیوں میں چھپ کر بیٹھے تھے انہوں نے وہاں سے حملہ کیا۔ گرد و غبار نے دن کو رات کا منظر بنا دیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: - ان کی آواز اونچی تھی۔ اے عباس! آواز لگاؤ اور انصار مدینہ سے کہو کہ تم کدھر ہو؟ تم نے حضور کے ساتھ مرنے اور جینے کا وعدہ کر لیا تھا! حدیبیہ والوں کو آواز لگاؤ کہ تم نے میرے ہاتھ پر موت کا وعدہ کیا تھا! فلاں قبیلے کو آواز لگاؤ! حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے با آواز بلند آواز لگائی۔ یہ آواز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کانوں میں پڑنی تھی کہ فوراً واپس آئے اور پھر دشمن پر حملہ کر دیا۔

### حضور علیہ السلام کی ثابت قدمی:

محدثین فرماتے ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ جب اچانک حملہ ہوا تو اس

وقت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تنہا دشمن کی طرف بڑھ رہے تھے اور فرما رہے تھے:

"أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبَ أَتَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ"<sup>164</sup>

کہ میں جھوٹا نبی نہیں ہوں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔  
فقہاء نے لکھا ہے آدمی کو اپنی قومیت کے نعرے لگانے تو جائز نہیں ہیں لیکن میدان جنگ میں قومیت کا نعرہ لگائے تو پھر جائز ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ میں عام بندہ نہیں ہوں، عبدالمطلب سردار کا بیٹا ہوں، مجھے تم جانتے ہو میں کون ہوں؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رجز پڑھ رہے ہیں اور آگے بڑھ رہے ہیں۔

جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم واپس پلٹے تو پوری جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اب دشمن قبیلہ کے بہت سارے لوگ قتل ہوئے، باقی دوڑ گئے اور قلعہ میں چھپ گئے۔ اب جب چھپے تو کئی دن گزر گئے۔ دور سے تیر مارتے تھے لیکن باہر نکل کر توڑ نہیں سکتے تھے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کیا۔ بالآخر وہ تنگ ہوئے اور ان کے بارہ سردار جمع ہو کر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ انہوں نے کہا: اے محمد! آپ رحمۃ للعلیین ہیں، کچھ کرم فرمائیں، کچھ شفقت فرمائیں، ہم پر احسان فرمائیں۔

ان کے چھ ہزار بندے قیدی بنے، چوبیس ہزار اونٹ مال غنیمت میں آئے، چالیس ہزار بکریاں مال غنیمت میں آئیں اور چالیس من چاندی مال غنیمت میں آئی۔ بتاؤ! کتنا بڑا مال غنیمت میں آیا۔

## قیدیوں کی واپسی:

اب انہوں نے کہا: اللہ کے نبی! ہم پر ترس کھائیں، رحم کریں، احسان فرمائیں، شفقت فرمائیں، ہمارے آدمی بھی دے دیں اور ہمارا سامان بھی دے دیں۔ یا رسول اللہ! اگر یہ بات ہم کسی عیسائی بادشاہ سے کہتے تو وہ بھی ہم پر رحم کھاتا، آپ تو رحمة للعالمین ہیں۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کو داد دینی چاہیے کہ کیسا بہترین فیصلہ فرمایا۔ اس لیے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو پہلو تھے:

☞ ایک پہلو یہ ہے کہ یہ مال غنیمت ہے اور میرے صحابہ کا حق ہے اور صحابہ کا حق انہیں کیسے دے دوں؟

☞ اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ یہ لوگ آگئے ہیں میرے پاس عاجز بن کر اب اگر میں نہ دوں تو وہ کہیں گے دیکھو کیسا نبی ہے! اس کو ترس ہی نہیں آتا!

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: تم ایسا کرو کہ یا تو اپنے افراد لے لو یا اپنا مال لے لو۔ انہوں نے کہا: ہمارے قیدی واپس کر دیں۔

چنانچہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے فرمایا: دیکھو! قیدی بھی تمہارا حق ہیں اور مال بھی تمہارا حق ہے لیکن مجھ سے وہ بھیک مانگنے کے لیے آئے ہیں، انہوں نے اپیل کی ہے، ان کو خالی واپس نہیں بھیجنا چاہیے تو میرا ارادہ ہے بندے ان کو دے دیں اور مال تمہیں دے دیں۔ بتاؤ! تمہاری کیا رائے ہے؟

صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: جی لیک، لیک، لیک حضور! جیسے فرمائیں ہم راضی ہیں۔ اب اللہ کے نبی کا فیصلہ دیکھنا! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہو سکتا ہے



کہ تم میری تقریر سن کر جذباتی ہو گئے ہو۔ اس لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام میں سے جو سردار تھے ان تمام کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم اپنے اپنے قبیلے کو الگ بٹھا کر یہ بات ان سے پوچھو کہ آیا یہ تمہارا جذباتی فیصلہ ہے یا نظریاتی؟ تم نے جوش میں آکر یہ بات کی ہے یا میرے فیصلے کو دل سے مانتے ہیں؟ تو سرداروں نے اپنے اپنے قبیلے سے علیحدہ علیحدہ اجازت لینے کے بعد حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ سب لوگ دل سے اپنا حق چھوڑنے کو تیار ہیں، سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو دل سے مانتے ہیں۔ تب جا کر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیلہ ہوازن کے چھ ہزار قیدی ان کو واپس کر دیے اور جتنا مال تھا وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان تقسیم کر دیا۔

### مالِ غنیمت کی تقسیم کا ایک واقعہ:

اور ایک روایت میں آتا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس موقع پر ایک بڑا عجیب معاملہ پیش آیا۔ جو لوگ مکہ سے نئے نئے مسلمان ہو کر آئے تھے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کھول کر مال دیا۔ اس کو ایک سو بکریاں دے دو، اسے دو سو بکریاں دے دو، اس کو پانچ سو دے دو، اس کو ہزار دے دو، اور جو انصارِ مدینہ تھے ان کو مال نسبتاً کم دیا۔

ایک انصاری کے دل میں بات آئی اور بات تو دل میں آ ہی جاتی ہے بشری تقاضے کی وجہ سے، انہوں نے کہا: دیکھو! جو لوگ مکہ سے آئے تھے وہ اپنے تھے اس لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو زیادہ دیا ہے اور ہمیں تھوڑا دیا ہے، یہ کوئی الزام، غیبت یا بہتان نہیں تھا یہ بشری لحاظ سے ایک بات زبان سے کہہ دی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو جمع کر دیا۔ اب حضور کا جملہ سننا! حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر فرمانے لگے: مدینے والو! تم مجھے ایک بات تو بتاؤ! تم یہ چاہتے ہو کہ میں مال ان کو دے دوں اور خود تمہارے ساتھ چلا

جاؤں یا تم چاہتے ہو کہ مال تمہیں دے کر خود ان کے ساتھ چلا جاؤں! تم کیا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! سارا مال ان کو دے دیں لیکن آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ (سبحان اللہ۔ سامعین) فرمایا: تم سمجھتے نہیں کہ میں نے مال دے کر ان کو واپس کیا ہے اور میں خود تمہارے ساتھ جا رہا ہوں، میرا مرنا اور جینا تمہارے ساتھ ہے!

### وفائے پیغمبر:

میرے پیغمبر کی وفا دیکھو! مکہ فتح ہو گیا ہے، اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو مکہ میں دفن ہو سکتے تھے لیکن اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں نہیں بلکہ جن صحابہ نے آپ سے وفا کی 2 ہے اللہ کے نبی نے ان کے ساتھ اپنی موت اور حیات کے فیصلے کیے ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس مکہ نہیں گئے بلکہ اللہ کے نبی مدینہ منورہ میں ہی رہے اور آج پوری دنیا مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ جا رہی ہے کیونکہ حضور مدینہ منورہ میں آرام فرما ہیں۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

### مدینہ میں دوہری برکتیں دے دے!

ہم اللہ کے نبی کا مدینہ بھی مانتے ہیں اور اللہ کے نبی کا مکہ بھی مانتے ہیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے کہ اے اللہ! جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی ہے اور آپ نے مکہ میں برکتیں دی ہیں، مدینہ میں دوہری برکتیں عطا فرمادیں! اور اللہ نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں قبول فرمائی ہیں۔ محدثین نے تو بہت ساری باتیں اس پر لکھی ہیں، میں ایک اور عنوان پر بات کہتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یا اللہ! آپ نے مکہ میں جو برکتیں دی ہیں مدینہ میں دوہری برکتیں عطا فرمادیں۔ اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول

فرمائی ہے۔ عام طور پر علماء تو یوں بات فرماتے ہیں کہ مکہ میں جو انعامات ہیں مدینہ میں اس سے دوہرے انعامات ہیں لیکن میں اس کو دوسرے انداز میں کہتا ہوں کہ مکہ میں تو لوگ اس لیے جاتے ہیں کہ ادھر ایک نماز پر ایک لاکھ کا اجر ملتا ہے اور مدینہ میں تو ایک نماز کا ایک لاکھ اجر نہیں ہے تو پھر یہ مکہ کے بجائے مدینہ کیوں جارہے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے نبی نے دعا مانگی ہے کہ اللہ! مدینہ کو دوہری برکتیں دے دے! ثواب اگرچہ تھوڑا ملتا ہے لیکن جاتے پھر بھی مدینہ ہیں۔ اس کا مطلب کہ لوگ ثواب کو نہیں دیکھ رہے لوگ نبی کی عقیدت کو دیکھ رہے ہیں۔

### روضہ اطہر کے ذرات کی فضیلت:

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہاں موجود ہیں؟ (مدینہ میں۔ سامعین) اور مؤمن کی شان ہے کہ وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو دیکھتا ہے۔ ہم تو مکہ بھی مانتے ہیں اور مدینہ بھی مانتے ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فضائل اعمال میں اہل السنۃ والجماعۃ احناف دیوبند کا ایک عقیدہ لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس قبر مبارک میں مدفون ہیں اس کی مٹی کے ذرے جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے ملے ہوئے ہیں یہ مکہ سے بھی اعلیٰ ہیں، کعبہ سے بھی اعلیٰ ہیں، عرش و کرسی سے بھی اعلیٰ ہیں۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

### فضائل اعمال پر اعتراض کا جواب:

ایک غیر مقلد بیان کر رہے تھے اور فضائل اعمال ہاتھ میں تھی۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی بات کی تردید کر رہے تھے طنزیہ انداز میں۔ اس نے کہا کہ تمہارے بوڑھے شیخ نے فضائل اعمال کے شروع میں لکھا ہے کہ مجھے ڈاکٹر نے کہا کہ تمہاری عقل کمزور ہے تم دماغی کام نہ کیا کرو، اس کے بعد میں نے فضائل اعمال لکھی ہے۔ تو وہ غیر مقلد کہنے لگا کہ دماغ کام کرتا نہیں تھا اور فضائل

اعمال لکھ دی ہے۔ میں نے کہا: آپ کیسی بات کہتے ہیں؟ ڈاکٹر نے تو کہا کہ آپ دماغی کام نہ کرو، یہ تو نہیں کہا کہ آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ اب دیکھو! کوئی شخص کسی بوڑھے آدمی سے کہتا ہے کہ بھائی آپ بوڑھے ہیں، کمزور ہیں، آپ دماغی کام نہ کریں تو اس کا معنی یہ ہے کہ اس کا دماغ ٹھیک نہیں؟! میں کہتا ہوں کہ ان کا دماغ تو ٹھیک تھا لیکن دماغ تیرا خراب ہو گیا ہے جو تجھے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی بات سمجھ نہیں آ رہی۔

وہ غیر مقلد کہتا ہے کہ دیکھو! حضرت شیخ زکریا فرماتے ہیں کہ مٹی کے وہ ذرے جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر سے ملے ہوئے ہیں یہ کعبہ سے بھی افضل ہیں۔ کہنے لگا کہ میں تبلیغی جماعت والوں سے کہتا ہوں کہ جب تم نماز پڑھو تو منہ کعبہ کی طرف نہ کرو، تم لوگ منہ مدینہ کی طرف کرو کیونکہ مدینہ کعبہ سے افضل ہے۔ اب لوگ پریشان ہوتے ہیں کہ بڑی وزنی دلیل دی ہے۔ میں نے کہا: آپ پریشان نہ ہوا کریں، آپ ہم سے رجوع فرمالیا کریں۔ مریض بڑے سے بڑا بھی ہو تو ڈاکٹر کے پاس لے جایا کریں، گھر میں رہیں تو پریشانی تو ہوتی ہے۔ میں نے اس کا جواب دیا۔ میں نے کہا کہ تمہارے ہاں عرش کعبہ سے افضل ہے تو جب تم نماز پڑھو تو منہ اوپر کر لیا کرو! لوگ پوچھیں کہ ایسا کیوں کر رہے ہو تو ان سے کہنا کہ عرش کعبہ سے افضل ہے۔ تم ایسا کر لیا کرو تاکہ ہمیں پتا چلے کہ جس کو تم افضل مانتے ہو اسے کعبہ بھی مانتے ہو لیکن تم نے یہ بات نہیں کرنی۔

### کعبہ مرکزِ عبادت اور روضہ مرکزِ عقیدت:

ہم ہیں حضرت شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ اور علماء دیوبند کو ماننے والے، ہم کہتے ہیں کہ ایک ہوتی ہے عبادت اور ایک ہوتی ہے عقیدت۔ ہم منہ کعبہ کی طرف کرتے ہیں کیونکہ کعبہ مرکزِ عبادت ہے اور ہمارا دل روضہ کے ساتھ دھڑکتا ہے کیوں روضہ

مرکز عقیدت ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین) اب دیکھو! ہمیں تو کوئی الجھن نہیں، ہم تو دونوں باتوں کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

**لوگ آیت ٹھیک پڑھتے ہیں لیکن معنی غلط کرتے ہیں:**

﴿اتَّخَذُوا أَحِبَّاءَهُمْ وَرُحَبَاءَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ

ابْنِ مَرْيَمَ﴾<sup>165</sup>

بعض لوگ قرآن کی آیت ٹھیک پڑھتے ہیں اور معنی و مطلب غلط بیان کرتے ہیں۔ یہ میرا مستقل ایک عنوان ہے۔ اس پر میں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں تاکہ عقیدہ سمجھ میں آئے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَّيِّتُونَ﴾<sup>166</sup>

اب لوگ آیت پڑھتے ہیں اور مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ”تم نے بھی مر جانا ہے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مر جانا ہے تو دونوں ایک جیسے ہیں۔“ ہم نے کہا: آیت تو تم نے ٹھیک پڑھی ہے لیکن مطلب غلط بیان کیا ہے۔ اگر دونوں کی موت ایک جیسی ہے تو اللہ یوں فرماتے: ”إِنَّكَ وَهُمْ مَيِّتُونَ“ بلکہ اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے میت کا لفظ الگ لائے ہیں اور امت کے لیے الگ لائے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امتی کی موت الگ ہے اور نبی کی موت الگ ہے۔

اس آیت کے متعلق اگر میں بلاغت اور معانی کی بات کروں، فن کی بات کروں تو وہ آپ کو سمجھ نہیں آئی اس لیے میں ایک مثال دیتا ہوں تاکہ آپ کو بات سمجھ میں آجائے۔ جب جلسہ ہوتا ہے تو اسٹیج پر اعلان ہوتا ہے کہ بھائیو! کھانا کھا کر جائیں،

ہم نے مہمانوں کے لیے کھانے کا انتظام کیا ہے۔ اب آپ مولانا صاحب سے کھانے کا اعلان کروائیں مسجد عثمانیہ میں اور میں دعا کروا کر وہیں نیچے بیٹھ جاؤں تو مولانا صاحب مجھے کہیں گے کہ مولانا گھسن صاحب! کیا ہوا؟ میں کہتا ہوں: آپ نے اعلان فرمایا ہے نا کہ مہمان کھانا کھا کر جائیں تو میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا ہوں۔

مولانا مجھے فرماتے ہیں کہ آپ کا کھانا ان کے ساتھ نہیں بلکہ ادھر کمرے میں ہے۔ اب بتاؤ اس کا کیا مطلب ہے؟ وہی پلاؤ جو آپ کھا رہے ہیں وہی اس کمرے میں ہے؟ کیا یہی معنی ہے؟ (نہیں۔ سامعین) یہ جو کہہ رہے ہیں تمہارا کھانا ادھر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کھانا اور ہے اور وہاں کھانا اور ہے۔ اگر ایسا نہیں تھا تو یہ کیوں کہا آپ کا کھانا ادھر ہے۔ میں کہتا ہوں: جس طرح مولانا اور خطیب کو یہ بات کہنا کہ آپ یہاں نہ کھائیں، آپ کا کھانا ادھر ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کھانا الگ ہے اور یہ کھانا الگ ہے۔

اب دیکھو! اللہ یہاں فرماتے ہیں: ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَّيِّتُونَ﴾ ﴿۱﴾ نبی کو ﴿مَیِّتٌ﴾ الگ فرمایا اور امت کو ﴿مَیِّتُونَ﴾ الگ فرمایا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ نبی کی موت الگ ہے اور امت کی موت الگ ہے۔ میں نے کہا: بعض لوگ آیت ٹھیک پڑھتے ہیں لیکن مطلب غلط بیان کرتے ہیں۔

**منکر تقلید سے گفتگو کا طریقہ:**

اب یہ آیت ﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ﴾ وہ لوگ ہمارے خلاف پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کی عادت یہ تھی کہ انہوں نے اولیاء کو اور مولویوں کو خدا بنا رکھا تھا اور انہوں نے بھی ابو حنیفہ کو خدا بنا رکھا ہے۔ اُن کے مولوی جو بات کہتے تھے وہی مانتے تھے اور ان کا امام

ابو حنیفہ جو بات کہتا ہے یہ وہی مانتے ہیں۔

میں نے کہا کچھ خدا سے ڈرو! اللہ کی بات اپنے امام سے سمجھنا یہ کوئی جرم کی بات نہیں۔ اگر کوئی بندہ تمہیں یہ بات کہے تو میں آسمان لفظوں میں آپ کو اس کی بات کا جواب دینا سکھاتا ہوں کہ پھر آپ اس سے پوچھیں کہ تم قرآن کس سے پڑھتے ہو؟ وہ کہے گا: قاری صاحب سے۔ آپ اس سے پوچھیں: قرآن کا ترجمہ کس سے پڑھتے ہو؟ وہ کہے گا: مولوی صاحب سے۔ اس سے پوچھو: قرآن ہے کس کا؟ وہ کہے گا: اللہ پاک کا۔ اب اس سے کہو: جب قرآن اللہ پاک کا ہے تو اللہ سے کیوں نہیں پڑھتے؟ مولوی صاحب سے کیوں پڑھتے ہو؟ وہ کہے گا: کلام خدا کا ہے لیکن پڑھتے مولویوں سے ہیں۔ اس پر آپ نے کہنا ہے کہ حدیث تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے لیکن سمجھتے امام ابو حنیفہ سے ہیں، تم اللہ کا قرآن مولوی سے پڑھو تو یہ تقلید شرک نہیں اور ہم اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے سمجھ لیں تو بتاؤ یہ تقلید شرک کیسے ہے؟

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ بعض لوگ آیت ٹھیک پڑھتے ہیں لیکن اس کا مطلب غلط بیان کرتے ہیں۔ اللہ ہمیں صحیح مطلب سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

**غازِ ثور کا واقعہ:**

﴿إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا<sup>167</sup>﴾

یہ واقعہ آپ نے سنا ہے۔ میں نے صرف آپ کی خدمت میں ایک دلیل

پیش کرنی ہے۔ وہ دلیل یہ ہے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی، مکہ سے مدینہ گئے، راستے میں غارِ ثور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن تک قیام فرمایا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ جب مشرکین غار کے باہر آئے اگر وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں مبارک کو دیکھتے تو دیکھ سکتے تھے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بڑا غم ہوا۔ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! میں بڑا پریشان ہوں۔ پریشانی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میرا کیا بنے گا؟ بلکہ پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ دشمن کو پتا چلا تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم گرفتار ہو جائیں گے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا“ ابو بکر! تو غمزدہ نہ ہو، خدا ہم دونوں کے ساتھ ہے، صرف یہ نہیں کہا کہ میرے ساتھ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر جا رہے تھے، آگے دریا ہے اور پیچھے فرعون کی فوجیں ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا: اب کیا کریں؟ آگے جائیں تو دریا ہے اور پیچھے جائیں تو فرعون کی فوج ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿إِنَّ مَعَ رَبِّي سَيِّدِينَ﴾<sup>168</sup>

اللہ میرے ساتھ ہے، وہ میری راہنمائی کرے گا۔

اس سے پتا چلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم پر اعتماد نہیں تھا اس لیے فرمایا: خدا میرے ساتھ ہے، میری مدد فرمائے گا۔ ساتھ میں قوم کی مدد بھی ہو جائے گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر اعتماد تھا، اس لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدیق! خدا مجھے بھی بچائے گا اور خدا تجھے



بھی بچائے گا۔

اس سے ایک نکتہ سمجھ میں آیا کہ ﴿مَعَنَا﴾ کیوں فرمایا؟ صدیق غمزدہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہیں پکڑے نہ جائیں۔ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ نقل کر دیا ﴿لَا تَخْزَنُ لَنَا اللَّهُ مَعَنَا﴾ کیونکہ مشرکین مکہ نے کہا تھا کہ جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دے۔ نعوذ باللہ۔ ان کا سر لائے یا زندہ گرفتار کر لائے تو اس کو ایک سواوٹ انعام میں دیں گے۔ ابو بکر صدیق کا سر لائے یا زندہ گرفتار کر لائے تو اس کو بھی ایک سواوٹ انعام دیں گے۔ تو جو انعام اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے طے تھا وہی انعام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے طے تھا۔ انعام دونوں کا ایک تھا تبھی تو لفظ ایک جیسا لائے ہیں ﴿لَا تَخْزَنُ لَنَا اللَّهُ مَعَنَا﴾ جو انعام میرا ہے وہ انعام تیرا ہے، تو جو خدا میرا ہے وہ خدا تیرا ہے، صدیق خدا مجھے بھی بچائے گا اور خدا تجھے بھی بچائے گا۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

اور میں کہتا ہوں کہ اگر آپ کا ذوق تازہ ہو تو نکتہ سمجھنا کتنا آسان ہے کہ جو انعام اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہی انعام صدیق اکبر کا ہے۔ پتا چلا کہ مکہ کا مشرک بھی سمجھتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مقام صدیق کا ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین) لیکن آج کا کافر بے ایمان یہ بات نہیں سمجھتا۔

### صحابیتِ صدیق اکبر:

﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَخْزَنُ لَنَا اللَّهُ مَعَنَا﴾

ہر صحابی کا اپنا اپنا اعزاز ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا اعزاز یہ ہے کہ

قرآن نے ان کو صحابی کہا ہے۔ ﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ﴾ اس لیے علماء نے لکھا ہے:

"مَنْ أَتَكَرَّ صُحْبَةً أَبِي بَكْرٍ فَقَدْ كَفَرَ لِإِنْكَارِهِ كَلَامَ اللَّهِ تَعَالَى" <sup>169</sup>

جو شخص حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا انکار کرے وہ مسلمان نہیں رہتا، کیونکہ حضرت ابو بکر صدیق کی صحابیت پر قرآن کی نص موجود ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین پیغمبر کے صحابہ نے بننا تھا اور جس کو قرآن نے صحابی کہا وہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ تو پتا چلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین اور خلیفہ بلا فصل صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔

**غزوہ تبوک:**

﴿وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خَلَفُوا طَ حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنْ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾

میں مضمون سمیٹا ہوں۔ غزوہ تبوک کا موقع تھا۔ یہ پہلا غزوہ تھا کہ جس میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرمایا کہ تبوک جانا ہے تیاری کرو، چندے دو، افراد لاؤ، بھرپور تیاری کرو۔ عموماً ایسا ہوتا تھا کہ جب بھی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی علاقے میں جہاد کے لیے جاتے تو جہاں جانا ہوتا اس جگہ کا نام نہیں لیتے تھے تاکہ منافقین ہمارا اصل مقام کسی کو بتانہ دیں۔ جب اعلان ہوا کہ اس غزوہ میں سارے مسلمان چلیں تو بعض مسلمان یہ حکم ملتے ہی فوراً تیار ہو گئے لیکن دس مسلمان ایسے تھے جو وقتی سستی کی وجہ سے نہ جاسکے۔ غزوہ تبوک کا یہ سفر پچاس دن کا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ سے واپس تشریف لائے تو ان دس مسلمانوں میں سے سات

نے اپنی توبہ وندامت کا اظہار اس طرح کیا کہ انہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں کے ساتھ باندھ دیا کہ اللہ معاف کرے گا تو ہم اپنے آپ کو کھولیں گے ورنہ ہم یونہی بندھے رہیں گے۔ ان کی توبہ قبول ہو گئی تو ان کو کھول دیا گیا۔

ان میں باقی جو تین حضرات تھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ہم صاف صاف اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہیں، ہم سے غلطی ہوئی ہے، ہم آپ کی خدمت میں آئے ہیں، اب اللہ کے لیے ہمیں معاف فرمادیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: دیکھو! تم نے میرے ساتھ کوئی دھوکے بازی نہیں کی، تم نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ہمارا عذر بھی نہیں تھا۔ کسی کی کھجوریں پکی ہیں، کسی کے گھر کا مسئلہ ہے، یہ چھوٹے چھوٹے مسائل تھے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: میں اس وقت تک معافی کا اعلان نہیں کر سکتا جب تک اللہ رب العزت آسمان سے تمہاری معافی کا اعلان نہ فرمائیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ان کے ساتھ بولنا چھوڑ دو، بات چیت بند کر دو۔

بتاؤ! یہ کتنا مشکل مسئلہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی بات نہیں فرماتے، صحابہ رضی اللہ عنہم بھی بات نہیں کرتے، سب نے ان سے بات چیت کرنی چھوڑ دی ہے۔ یہ کل تین صحابہ تھے؛ مرارہ بن ربیع العمری، ہلال بن امیہ واقفی اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہم۔ یہ پورا واقعہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے خود بیان فرمایا۔ کہتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں جاتا تھا، باقی دونوں تو بزرگ تھے، بوڑھے تھے، وہ گھر میں بیٹھ گئے، باہر نکلنے کی ہمت نہیں تھی، گھر میں بیٹھ کر ہی روتے رہتے تھے لیکن میں مسجد نبوی میں جا کر نماز پڑھتا اور میں اپنی آنکھوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا رہتا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا میرے ساتھ معاملہ کیا ہے۔

میں دیکھتا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دیکھ رہے ہیں لیکن چونکہ اللہ کا حکم تھا کہ بولنا نہیں اس لیے مجھ سے بولتے نہیں تھے۔ جب میری نگاہ پڑتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نگاہ کو بدل لیتے۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: چالیس دن اس طرح گزر گئے۔ ادھر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام بھی آیا کہ اپنی بیویوں سے بھی الگ ہو جاؤ، تم نے بیویوں کے قریب بھی نہیں جانا۔ ایک صحابی حضرت مرارہ بن ربیع العمری رضی اللہ عنہ بوڑھے بھی تھے، ان کی بیوی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئی اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میرا خاوند بوڑھا ہے، آنکھوں سے کمزور ہے، گھر کے کام کا مسئلہ ہے، ان کی خدمت کا مسئلہ ہے، مجھے اجازت دیں کہ میں ان کے پاس ٹھہروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کے پاس رہو لیکن ان کو قربت کا موقع نہ دو۔ انہوں نے کہا: حضور! وہ تو ویسے ہی بوڑھے ہیں۔ فرمایا: ان کو قربت کا موقع نہ دو، البتہ ان کے گھر میں ٹھہر سکتی ہو۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جوان تھا، جب یہ حکم ہوا تو میں نے اپنی بیوی سے کہا: تم اپنے میکے چلی جاؤ۔ میرے بعض متعلقین نے مجھے فرمایا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا تو تم کیوں اسے کہتے ہو کہ میکے چلی جائے؟ انہوں نے کہا: اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بیویوں سے الگ رہو، میں جوان آدمی ہوں، ممکن ہے مجھ سے خطا ہو جائے اس لیے میں نے اپنی بیوی کو اس کے میکے میں بھیج دیا ہے، معلوم نہیں کہ اللہ کے نبی کیا حکم جاری فرمائیں۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یقیناً جانو! زمین و سبع اور کشادہ ہونے کے باوجود تنگ ہو گئی تھی، میرے لیے جینا مشکل ہو گیا۔ اس سے بڑا ایک امتحان یہ پیش آیا کہ ایک عیسائی بادشاہ نے اپنا قاصد بھیجا اور ریشمی رومال پر پیغام لکھ کر بھیجا کہ تم کو تمہارے محمد نے چھوڑ دیا ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ہمارے پاس آ جاؤ، ہم

تمہارا اعزاز و اکرام کریں گے۔ یہ کتنا بڑا امتحان تھا۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اس ریشمی رومال کو لیا اور تندور میں ڈال دیا۔ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اس سے بڑی قربانیاں بھی دے سکتے ہیں، یہ اللہ کا حکم ہے اس لیے ہم اسے برداشت کریں گے۔

کہتے ہیں کہ پچاس دن گزر گئے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رات کے وقت وحی آئی کہ ان کو بتائیں کہ خدا نے ان کے لیے رضامندی کا اعلان کر دیا ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یا رسول اللہ! کعب بن مالک کو ابھی اس بات کی اطلاع کر دی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسا ہوا تو سب کی نیند خراب ہوگی، لوگ دوڑیں گے ان کو خوشخبری دینے کے لیے، اس لیے امت کو آرام کرنے دو۔

جب صبح ہوئی تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا۔ حضرت ابو بکر صدیق بھی دوڑے، حضرت عمر بن خطاب بھی دوڑے خوشخبری دینے کے لیے۔ ایک صحابی پہاڑی پر چڑھے اور زور سے آواز دی تاکہ ان سے کوئی سبقت نہ لے جائے۔

حضرت کعب فرماتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں داخل ہوا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ باقی صحابہ آپ کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھ کر سب سے پہلے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ میری طرف بڑھے انہوں نے کہا: بھائی! تمہیں مبارک ہو۔ پھر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک خوشی سے چمک رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دن ایسا ہے جو تمہاری زندگی میں پیدائش سے لے کر آج تک تمام دنوں میں سے سب سے زیادہ بہتر ہے، اس سے پہلے زندگی میں کبھی تم نے ایسی خوشی کا دن نہیں دیکھا ہوگا، میں تمہیں مبارک دیتا ہوں کہ اللہ نے تمہاری توبہ قبول فرمائی ہے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا آپ نے معاف فرمایا ہے یا اللہ نے معاف فرمایا ہے؟ فرمایا: اللہ نے آسمان سے تمہاری معافی کا اعلان فرمادیا ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

مفسرین فرماتے ہیں کہ پچاس دن کی حکمت بظاہر یہ سمجھ آتی ہے کہ غزوہ تبوک پچاس دن کے سفر کا تھا اس لیے ان کی توبہ پر بھی پچاس دن لگے ہیں۔

### صاف گوئی کی اہمیت:

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر انسان سے غلطی ہو جائے تو اپنے بڑوں کے سامنے حیلے اور بہانے پیش نہ کرے بلکہ صاف صاف یہ بات کہہ دے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ آپ مجھے معاف فرمادیں۔ بڑوں کے سامنے حیلے اور بہانے نہ کیا کرو! صاف صاف اپنا جرم معاف کروالیا کرو، یہ بہتر ہے، اور دوسری یہ بات ارشاد فرمائی کہ جہاد کو چھوڑنا بہت بڑا جرم ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس جرم کو جرم سمجھا ہے لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ جہاد بھی نہیں کرتے اور اس جرم کو جرم بھی نہیں سمجھتے۔ جرم سمجھیں گے تو اللہ رب العزت توبہ کی توفیق عطا فرمادیں گے اور اگر جرم نہیں سمجھیں گے تو پھر توبہ کی توفیق بھی نہیں ہوگی۔ اللہ ہم سب کو ایمان کی موت عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

### حصولِ تقویٰ کا طریقہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾

گناہوں کو چھوڑو، تقویٰ اختیار کرو! اور یہ تقویٰ حاصل کیسے ہوگا؟ فرمایا: صادقین کے ساتھ رہو، اللہ ان کی صحبت سے تمہیں تقویٰ کی نعمت عطا فرمادیں گے۔

ہمارے شیخ حضرت شاہ حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی پیاری بات فرماتے ہیں کہ اگر کسی سے کہو نا کہ تم بیعت کر لو! تو کہتے ہیں جی! اب پیر کہاں ہیں جن

کی بیعت کریں؟ فرمایا: جب پیٹ میں درد ہو تو کوئی نہیں کہتا کہ کہاں ہیں حکیم اجمل، جس سے دوائی لیں... پیٹ میں درد ہو تو فوراً دوڑتے ہیں اور جب طریقت کا مسئلہ ہو تو پھر کہتے ہیں کہ اب وہ پیر کہاں ہیں؟ پیٹ میں درد ہو تو چھوٹے چھوٹے ڈاکٹر کو قبول کر لیتے ہیں، یہ کوئی نہیں کہتا کہ حکیم اجمل نہیں رہا تو علاج نہیں کروائیں گے۔

مجھے اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ جب فوت ہو گئے تو ان کا تعزیتی جلسہ تھاشیر انوالہ باغ لاہور میں، علماء اس موقع پر بیانات فرماتے رہے کہ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ چلے گئے، اب ان جیسا کون آئے گا، حضرت بہت بڑے تھے۔ مولانا غلام غوث ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے آدمی تھے اور حضرت کا اپنا ایک مزاج عجیب تھا، بڑی کھلی طبیعت کے آدمی تھے، مولانا غلام غوث ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ اس موقع پر فرمانے لگے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی چلے گئے اب وہ نہیں آئیں گے، مولانا حسین احمد مدنی چلے گئے وہ نہیں آئیں گے، علامہ محمد انور شاہ کشمیری چلے گئے وہ نہیں آئیں گے، اب اس بوڑھے غلام غوث ہزاروی پر گزارا کرنا سیکھو! جب میں مر جاؤں گا تو میں بھی واپس نہیں آؤں گا۔

### ان نعمتوں کی قدر کریں!

میں تو یہ بات نہیں کہتا، میں تو بہت چھوٹا ہوں لیکن اتنی بات کہتا ہوں کہ ہم پر گزارا کرنا سیکھو! جب ہم مرجائیں گے تو تمہیں یہ بھی نظر نہیں آنا! یہ بات میں کس درد سے تمہیں سمجھاؤں؟ اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

امام اہل السنۃ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے مولانا عزیز الرحمن شاہد جدہ میں ہوتے ہیں، جب واپس آئے تو میرا گوجرانولہ اسٹیڈیم میں ختم نبوت کا جلسہ تھا، میں وہاں شرکت کے لیے گیا تو میں نے سوچا کہ ان سے بھی مل لیں۔ جب میں ان سے ملا تو مجھے فوراً کہنے لگے: مولانا! مجھے بہت تعجب ہوتا ہے کہ ہم

تجھے گھر کا بندہ سمجھ کر قدر نہیں کرتے لیکن میں جدہ ایئر پورٹ پر تھا تو وہاں ایک انڈین مسلمان مجھے ملا۔ مجھے کہنے لگا: آپ کہاں جا رہے ہیں؟ میں نے کہا: پاکستان۔ اس نے کہا: پاکستان کے علماء کو جانتے ہو؟ میں نے کہا: بعضوں کو جانتا ہوں۔ اس نے سب سے پہلے آپ کا نام لیا اور کہا کہ مولانا الیاس گھسن کو جانتے ہو؟ میں بہت حیران ہوا کہ لوگوں کے ہاں آپ کی کیا قیمت ہے۔

حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی صاحب دامت برکاتہم اندیا کے چودہ روزہ دورہ پر تھے۔ میں معہ الفقیر جھنگ گیا تو مدرسے کے شیخ الحدیث ہیں مولانا حبیب اللہ نقشبندی صاحب تو انہوں نے مجھے یہ بات سنائی، مجھے کہنے لگے کہ ہم چودہ روزہ دورے پر تھے تو پیر صاحب کہتے ہیں: مجھے دو باتوں پر بہت تعجب ہوا۔ ایک یہ کہ ہم دارالعلوم دیوبند گئے ہیں، سہارنپور گئے ہیں تو یہاں کے لوگ پوچھتے ہیں کہ مولانا گھسن صاحب کا کیا حال ہے؟ مولانا حبیب اللہ نقشبندی مجھے فرمانے لگے کہ ہم تو تجھے عام خطیب سمجھتے ہیں اور دارالعلوم دیوبند اور سہارنپور کے مشائخ آپ سے کتنی عقیدت رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں دوسرا مجھے اس بات پر بہت تعجب ہوا کہ وہاں مسئلہ چلا کہ ویڈیو سی ڈی کا کیا حکم ہے؟ وہ سب کہتے ہیں کہ حرام ہے ناجائز ہے، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے جواز کا فتویٰ دیا ہے تو ہم نے جواب لکھ کر دے دیا ہے۔ مولانا حبیب اللہ نقشبندی کہتے ہیں کہ ہم نے ان سے پوچھا کہ مولانا الیاس گھسن صاحب تو ویڈیو سی ڈی بناتے ہیں تو وہ حضرات کہنے لگے کہ ان کو کچھ نہ کہو۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ آپ کو اندازہ نہیں۔ ہماری ویڈیو سی ڈی نے انڈیا میں کتنا کام کیا ہے! انڈیا کا ایک مولوی ہے معراج ربانی۔ آپ ذرا اس کو سنیں کہ اس نے سعودی عرب میں کھلے عام تبلیغی جماعت کو یہود کا ایجنٹ، ڈاکو، چور، جیب کترے... جو باتیں وہ تبلیغی جماعت کے بارے میں کہہ سکتا تھا وہ اس نے کہی ہیں۔ بحمد اللہ تعالیٰ چار



سال گزر گئے ہیں جب سے ہماری سی ڈیز میں ان کو جواب ملا ہے تو ابھی تک معراج ربانی کا تبلیغی جماعت کے خلاف بیان نہیں آیا۔ آپ کو تو یہاں شب جمعہ کا مرکز مل جاتا ہے، یہ سعودیہ والوں سے پوچھو کہ جن کو انٹرنیٹ دیکھنا پڑتا ہے، ان سے پوچھو کہ ہماری ضرورت کتنی ہے؟

اٹلی کے ہمارے ایک دوست ہیں، پچھلی مرتبہ رائیونڈ اجتماع پر آئے تھے۔ وہ مجھے کہنے لگے: مولانا! بہت پریشان ہیں۔ میں نے کہا: کیا ہوا؟ کہنے لگے کہ تبلیغی جماعت کے خلاف توصیف الرحمن غیر مقلد نے سی ڈی بنائی ہے، سال سال لگائے ہوئے ہمارے بندے اہل حدیث ہوئے ہیں، چار چار ماہ والے بندے اہل حدیث ہوئے ہیں اور خدا آپ کو جزائے خیر دے، اگر آپ اس کا جواب نہ دیتے تو ہمارے لیے اٹلی میں جینا مشکل تھا۔ ان سی ڈیز نے بریکر کا کام کیا ہے، اب کوئی بھی لڑکا اہل حدیث ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں سی ڈی دیکھو! جب دلائل آتے ہیں تو لوگ واپس لوٹنا شروع ہوتے ہیں۔ اب اس کی تمہارے ہاں توقیت نہیں ہے، تم سرگودھا میں رہتے ہو، یہ باہر والوں سے پوچھو جہاں یہ مسائل پیش آتے ہیں اور پھر ان کا علاج ہوتا ہے۔ اللہ ہم سب کو قبول فرمائے، اللہ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

### کارگزاری بتانی چاہیے:

ایک شیخ صاحب ہیں، آج ہم ان کے گھر بیٹھے تھے تو بھائی زکریا کہنے لگے کہ لوگ قائد جمعیت مولانا فضل الرحمن صاحب کے بہت مخالف ہیں۔ میں نے کہا: قصور مولانا فضل الرحمن صاحب کا نہیں بلکہ قصور جمعیت علماء اسلام کا ہے۔ کہنے لگے: وہ کیسے؟ میں نے کہا: وہ یہ بات بتائیں کہ مولانا اسمبلی میں لڑائی کون سی لڑتے ہیں۔ ہم تو مولانا کے کارنامے بتاتے نہیں، اخبار تو ان کو کبھی کچھ لکھتا ہے کبھی کچھ لکھتا ہے، ہم کانوں کے کچے ہوتے ہیں تو فوراً ان باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔

تبلیغی جماعت سے لوگوں کو عقیدت کیوں ہے؟ اس لیے کہ تبلیغ والے اپنی کارگزاریاں سناتے ہیں کہ ہماری جماعت مراکش گئی، سوڈان گئی، فلاں جگہ گئی۔ میں کارگزاری سناؤں تو کہتے ہیں کہ ان کو ریاء کا بڑا شوق ہے، یہ اپنے ہی قصے سناتے ہیں۔ میں نے کہا: تبلیغ والے سناتے ہیں تو جائز ہے اور میں سناؤں تو ناجائز کیسے ہے؟ کارگزاری سناتا ہوں تو آپ کے سامنے آتا ہے کہ میرا دنیا میں کتنا کام ہے! کارگزاری نہ سنائیں تو پتا کیسے چلے گا؟ سی ڈیز آپ نے میری دیکھنی نہیں، کیٹیں میری آپ نے سنی نہیں، کتابیں آپ نے میری پڑھنی نہیں، اب میں بھی نہ بتاؤں تو تمہیں بتائے گا کون کہ ہم کون سا کام کرتے ہیں؟ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### امت کے لیے پیغمبر علیہ السلام کی شفقت:

یہ سورۃ التوبہ کی آخری آیتیں ہیں، ان میں اللہ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ

عَلَيْكُمْ بِأَنْتُمْ مِّنْ رَّءُوفٍ رَّحِيمٍ ۝۱۲۸﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْاْ فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا

هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝۱۲۹﴾

اللہ فرماتے ہیں: مؤمنو! تمہیں مبارک ہو کہ ہم نے تمہیں ایسا پیغمبر دیا ہے جو تم سے بہت محبت کرتا ہے، تمہاری مشقت پر اس کو تکلیف ہوتی ہے، وہ شفقت والا بھی ہے، رحمت والا بھی ہے، میرے محمد کو دکھ محسوس ہوتا ہے۔ یہ چھوٹی بات نہیں ہے گناہ ہم کرتے ہیں اور تکلیف حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتی ہے۔

ایک حدیث مبارک میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تَعْرَضُ عَلَيَّ أَحْمَلُكُمْ" میں دنیا چھوڑ جاؤں گا تو تمہارے اعمال قبر میں

مجھ پر پیش ہوں گے۔ اس کا فائدہ کیا ہو گا؟ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے

ہیں: "فَمَا رَأَيْتُ مِنْ خَيْرٍ حَمَدْتُ اللَّهَ عَلَيْهِ" تم نیک کام کرو گے تو میں اللہ کا شکر ادا کروں گا، "وَمَا رَأَيْتُ مِنْ شَرٍّ اسْتَغْفَرْتُ اللَّهَ لَكُمْ" تم گناہ کرو گے تو میں تمہارے لیے وہاں خدا سے مغفرت مانگوں گا۔<sup>170</sup> اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے جانے کے بعد بھی امت کے لیے غم زدہ اور پریشان ہیں۔

### ایک عجیب دعا:

میں ایک مرتبہ کتاب ”حیۃ الحیوان“ پڑھ رہا تھا۔ علامہ دِمیری نے اس میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ ایک آدمی تھے، وہ کہتے تھے کہ میں جب بیمار ہوتا تو دعا ان لفظوں سے مانگتا: ”اے اللہ! میں پریشان ہوں، بیمار ہوں اور مصیبت زدہ ہوں اور مومن کے دکھ کو دیکھ کر شیطان خوش ہوتا ہے اور مومن کے دکھ کو دیکھ کر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پریشان ہوتے ہیں، اے اللہ! میرے اس دکھ کو ختم فرما کے شیطان کو پریشان کر دے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو روضے میں خوش کر دے“ اللہ تعالیٰ میری اس دعا کو قبول فرما لیتے تھے اور میرے دکھ کو دور کر دیتے تھے۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جو آدمی یہ آیت ﴿حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾ ﴿١٦٩﴾ صبح و شام سات مرتبہ پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس آدمی کے تمام کام آسان فرما دیتے ہیں۔<sup>171</sup>

ہمیں بھی ان آیات کے پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

170۔ مند البزار: ج 5 ص 308 رقم الحدیث 1925

171۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج 1 ص 1510

## سورة یونس

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الرَّ ۚ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ ﴿۱﴾ أَكَانَ لِلنَّاسِ حُجُبًا أَنْ  
أَوْحَيْنَا إِلَى رَجُلٍ مِنْهُمْ أَنْ أَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ  
صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ قَالَ الْكَافِرُونَ إِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ مُبِينٌ ﴿۲﴾﴾

میرے نہایت واجب الاحترام بزرگو! مسلک اہل السنۃ والجماعۃ سے تعلق  
رکھنے والے بزرگو، نوجوان دوستو اور بھائیو! آپ حضرات کے علم میں ہے کہ ہمارے  
آج کے درس قرآن کا عنوان ہے ”مضامین سورۃ یونس“

وجہ تسمیہ:

سورۃ یونس کی سورت ہے۔ اس میں گیارہ رکوع ہیں اور ایک سو نو آیات  
ہیں۔ میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ قرآن کریم کی ایک سو چودہ سورتوں  
میں سے ہر ایک سورت کے نام کی ایک خاص وجہ ہے، اسے عربی زبان میں وجہ تسمیہ  
کہتے ہیں کہ اس سورت کا نام رکھنے کی وجہ یہ ہے۔ اس سورۃ کو سورۃ یونس اس لیے کہتے  
ہیں کہ اس مکمل سورت میں اللہ نے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا تذکرہ فرمایا  
ہے اور یونس علیہ السلام کا نام لے کر ذکر فرمایا ہے۔ فرمایا:

﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ﴾<sup>172</sup>

اللہ رب العزت نے ایک ضابطہ بیان فرمایا کہ جب بھی کوئی قوم ایمان لائے تو اس قوم کا ایمان اس قوم کو نفع دیتا ہے لیکن اگر ایمان نہ لائے تو خدا کے عذاب سے وہ قوم نہیں بچ سکتی ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم وہ واحد قوم ہے کہ جس نے اللہ کے عذاب کے آثار دیکھے تو گڑگڑا کر تمام مردوں، عورتوں اور بچوں نے توبہ کی، اللہ رب العزت نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور ان کی توبہ کی برکت سے ان کو عذاب سے محفوظ فرمالیا۔ اس آیت کریمہ کا پہلے صحیح مطلب سمجھیں۔ اس کے بعد بعض مفسرین نے جو غلط مطلب بیان کیا ہے میں آپ کی خدمت میں پیش کر کے اس کی تردید بھی کروں گا تاکہ صحیح بات آپ کے ذہن میں آئے۔

### یونس علیہ السلام کا قصہ:

اصل قصہ یہ ہے کہ عراق ایک ملک کا نام ہے اور موصل وہاں ایک بہت بڑے شہر کا نام ہے۔ اس کی ایک بستی ہے جس کا نام ”نینوی“ ہے۔ اس بستی کی طرف حضرت یونس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنا کر بھیجا اور اس بستی کے رہنے والوں کی تعداد ایک لاکھ یا کچھ زائد تھی۔ خود قرآن کریم نے متعین نہیں فرمائی:

﴿وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَى مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ﴾<sup>173</sup>

قرآن کریم نے فرمایا کہ ایک لاکھ یا کچھ زائد تھے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں: اللہ کے تو علم میں تھا کہ تعداد کتنی ہے تو اللہ نے یوں کیوں فرمایا کہ یہ لوگ ایک لاکھ تھے یا زائد تھے! اللہ تو صاف فرماتے کہ ایک

لاکھ تھے یا اتنے تھے۔ تو دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات اسے ہم اپنی زبان میں کسر کہتے ہیں کہ دہائیوں سے کچھ تعداد بڑھ جائے تو کبھی اس کو شمار کرتے ہیں اور کبھی اس کو شمار نہیں کرتے۔ اگر کسروں کو شمار کریں تو ایک لاکھ سے زائد تھے اور اگر شمار نہ کریں تو ایک لاکھ بنتے تھے۔ اس لیے ان کو دیکھنے والے لوگ کہتے تھے کہ ایک لاکھ کے کچھ لگ بھگ ہیں۔ اس لیے اللہ پاک نے تعداد متعین نہیں بیان فرمائی بلکہ جو بات اس وقت کے لوگ کہتے تھے اس کے مطابق گفتگو فرمائی ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو مسلسل دعوت دی لیکن آپ کی قوم نے ان کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ وحی آئی اے میرے پیغمبر! ان کو بتاؤ کہ اب تین دن کے بعد تمہارے اوپر اللہ کا عذاب آنے والا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے وحی کے مطابق اپنی قوم کو بتایا کہ تین دن کے بعد تمہارے اوپر عذاب آنے والا ہے۔ جب تین دن گزرے، آخری رات آئی تو حضرت یونس علیہ السلام بستی سے باہر چلے گئے کہ قوم پر عذاب آرہا ہے۔

ان کی قوم نے دیکھا کہ عذاب کے آثار آنے شروع ہوئے، آندھی، بادل گر جتنا شروع ہوئے تو قوم کے سمجھدار بندوں نے کہا کہ یونس علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں اور نبی کی بات کبھی غلط نہیں ہوتی، اس لیے یونس علیہ السلام کی بات کے مطابق عذاب آنا ہے۔ تو ذرا جا کر دیکھو کہ یونس علیہ السلام اس بستی میں ہیں یا نہیں؟ یہ کیوں کہا؟ اس لیے کہ جب خدا کسی بستی پر عذاب نازل فرماتے ہیں تو عذاب نازل فرمانے سے پہلے نبی کو وہاں سے نکال لیتے ہیں۔

تو یہ دیکھو کہ یونس علیہ السلام یہاں بستی میں ہیں یا نہیں؟ تو بعض لوگوں نے جا کر دیکھا تو پتا چلا کہ یونس علیہ السلام اس بستی میں نہیں ہیں، بستی کو چھوڑ چکے ہیں۔ ان کے بڑوں نے کہا: اس کا مطلب یہ ہے کہ اب طے ہوا ہے کہ خدا کا عذاب آرہا ہے،

اس لیے بستی سے نکل جاؤ اور میدان میں جمع ہو کر رو دو ہو کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو شاید اللہ اس عذاب کو ختم فرمادے۔ انہوں نے تہہ دل سے توبہ کی، دل سے ندامت اختیار کی، رونا اور گڑ گڑانا شروع کیا تو اللہ رب العزت نے ان سے عذاب کو ٹال دیا اور ختم فرمادیا۔

حضرت یونس علیہ السلام تو بستی سے دور جنگل کی طرف چلے گئے تھے۔ اب وہ عذاب کے آثار دیکھ رہے تھے لیکن عذاب نہیں آیا تو سوچا اب اگر میں واپس جاؤں گا تو میری قوم سمجھے گی کہ نبی نے جھوٹ بولا ہے اور اس قوم کا دستور یہ تھا کہ جو بندہ جھوٹ بولتا اس کو قتل کر دیتے۔ اب یونس علیہ السلام نے سوچا کہ اگر واپس گیا تو میری قوم مجھے جھوٹا سمجھے گی تو ہو سکتا ہے کہ مجھے مار دے۔

یونس علیہ السلام نے اپنی جان بچانے کے لیے یہی بہتر سمجھا کہ اس بستی کو چھوڑ کر کسی اور طرف چلا جاؤں۔ چنانچہ یونس علیہ السلام دریا کے کنارے پہنچے۔ سفر کا ارادہ فرمایا۔ آگے کشتی تیار کھڑی تھی۔ یونس علیہ السلام بیٹھے اور ملاح نے کشتی چلائی۔ کشتی چل پڑی۔ جب دریا کے درمیان میں کشتی پہنچی تو اب نہ آگے جاتی ہے اور نہ پیچھے آتی ہے۔ پوچھا: جی کشتی کیوں نہیں چل رہی؟ کشتی کے ملاح نے کہا کہ لگتا ہے ہماری کشتی میں اپنے آقا سے دوڑا ہوا کوئی غلام ہے اور جب ہماری کشتی میں کوئی ایسا بندہ ہو تو ہماری کشتی نہیں چلا کرتی۔

### یونس علیہ السلام کا بستی سے چلے جانا:

یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ تو میں ہوں۔ لوگوں نے کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ میں ہوں۔ انہوں نے کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اب اس بندے کو اس کشتی سے گراتے تو پھر کشتی نے چلنا تھا، جب تک اس کی جان کی قربانی نہ دیتے تو کشتی نے چلنا نہیں تھا۔ یونس علیہ السلام فرمانے لگے کہ

مجھے دریا میں پھینک دو، یہ قصور تو میں نے کیا ہے۔ خود قرآن کریم میں ہے:

﴿إِذْ أَتَىٰ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ﴾<sup>174</sup>

”آبق“ عربی زبان میں اس غلام کو کہتے ہیں جو اپنے مالک کی اجازت کے بغیر کہیں چلا جائے۔ اللہ رب العزت نے یونس علیہ السلام کے لیے یہ لفظ استعمال کیا ہے کہ جس طرح مالک کی اجازت کے بغیر غلام جائے اسی طرح ہمارا نبی یونس ہماری اجازت کے بغیر گیا تھا۔ کیوں؟ کہ انبیاء علیہم السلام کی سنت یہ ہے کہ وہ کسی علاقے سے ہجرت تب کرتے ہیں جب اللہ تعالیٰ صاف طور پر ہجرت کا حکم دے۔ یونس علیہ السلام ہجرت کا حکم آنے سے پہلے ہی اپنا علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔

یونس علیہ السلام کا تشریف لے جانا گناہ تو نہیں ہے کیونکہ یونس علیہ السلام کے ذہن میں تھا کہ میری قوم جھوٹا سمجھے گی اور قتل کر دے گی، میرے قتل کی وجہ سے پھر ان پر عذاب آئے گا کہ نبی کو مار دیا ہے تو بہتر یہی ہے کہ میں کسی اور طرف چلا جاؤں لیکن چونکہ وحی نہیں آئی تھی کہ آپ بستی کو چھوڑ کر چلے جائیں، بغیر وحی کے گئے تھے اور یہ گناہ تو نہیں تھا لیکن نبی کی شان کے لائق نہیں تھا کہ بغیر پوچھے یوں چلے جائیں۔ اب وہ لوگ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ ان میں قرعہ اندازی ہوئی۔ جب قرعہ نکالا تو یونس علیہ السلام کا نام تھا۔ وہ پھر بھی تیار نہ ہوئے کہ اللہ کے نبی کو ہم کیسے پھینکیں؟ دوبارہ قرعہ ڈالا تو پھر ان کے نام تھا۔ تیسری مرتبہ قرعہ ڈالا تو پھر ان کا نام تھا۔

**مچھلی کے پیٹ میں:**

قرآن کریم میں ہے:



﴿فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ﴾<sup>175</sup>

جب قرعہ اندازی کی گئی تو قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام نکلا۔ انہیں حکم دیا گیا کہ اس کو پھینک دو۔ ادھر حضرت یونس علیہ السلام کا سمندر میں گرنا تھا کہ خدا نے مچھلی کو حکم دیا کہ توجا کر کھڑی ہو جا! اور میرے یونس کو سمندر کی گہرائی میں گرنے نہیں دینا۔ مچھلی آگے تیار کھڑی ہے۔ یونس علیہ السلام نے چھلانگ لگائی اور مچھلی نے اپنے پیٹ کے اندر لے لیا۔ مچھلی کو اللہ کا حکم یہ تھا کہ یونس علیہ السلام کو نگلنا نہیں، کھانا نہیں بلکہ ان کی حفاظت کرنی ہے۔

یونس علیہ السلام کتنا عرصہ مچھلی کے پیٹ میں رہے؟ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: چالیس دن اور چالیس راتیں مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ اب اللہ نے حکم دیا کہ میرے یونس کو باہر نکالو! مچھلی نے منہ کھولا اور یونس علیہ السلام کو دریا کے کنارے پھینک دیا۔ چالیس دن مچھلی کے پیٹ میں حرارت اور گرمی کی وجہ سے ان کے بدن کے سارے بال ختم ہو گئے۔

جیسے آپ دو گھنٹے پانی میں اپنے ہاتھ رکھیں۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کا کیا حشر ہوتا ہے! وہ تو چالیس دن مچھلی کے پیٹ میں رہے ہیں۔ جسم کمزور ہو گیا، بدن لاغر ہو گیا، بال اتر گئے۔ اللہ رب العزت نے انتظام یہ فرمایا۔

﴿وَأَنْبَشْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِينٍ﴾<sup>176</sup>

”یقطين“ عربی زبان میں اس درخت کو کہتے ہیں کہ جس کا تانہ ہو جسے ہم بیل کہتے ہیں۔ اب یہ بیل کونسی تھی؟ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ کدو کی بیل تھی۔

تویونس علیہ السلام اس کدو کی بیل کے سائے میں رہتے، گرمی سے بچتے، جنگل کی ہر نی کا خدانے انتظام فرمایا کہ وہ صبح شام آکریونس علیہ السلام کو دودھ پلاتی۔ اس سے آہستہ آہستہ ان کی صحت بحال ہوئی اور پھر یونس علیہ السلام نے اپنا کام شروع فرمادیا۔  
مچھلی کے پیٹ میں گئے تو یہ دعا مانگی:

﴿لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾<sup>177</sup>

**بھول جانا جرم نہیں ہے:**

حضرت یونس علیہ السلام ظالم نہیں تھے۔ اپنے منصب اور شان کے لائق یہ ارشاد فرمایا تھا۔ جیسے میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں۔ یہ مولانا عمر صاحب ہماری مسجد کے امام ہیں، ہم مقتدی ہیں، رمضان المبارک آنے والا ہے، اگر یہ سورۃ آل عمران میں بھول جائیں تو آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ اگر سورہ بقرہ میں بھول جائیں تو بھی آپ کو تعجب نہیں ہوگا۔ ساتھی کہیں گے کہ بھائی! حافظ صاحب ہیں، بھول بھی جاتے ہیں لیکن اگر سورہ فاتحہ میں بھول جائیں تو اب آپ کو تعجب ہوگا! آپ نے کہنا ہے: مولانا صاحب کو ذہنی ٹیشن تو نہیں ہے؟ خیر تو ہے؟ سورہ فاتحہ میں بھول گئے! جس طرح ہماری مسجد کا امام سورہ فاتحہ میں بھولے تو تعجب ہوتا ہے اسی طرح جب نبی کوئی ایسی بات کہے جو نبی کی شان کے لائق نہ ہو تو نبی کہتا ہے: اللہ میں نے ظلم کیا ہے، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، آپ مجھے معاف فرمادیں۔ یہ عاجزی اس لیے تاکہ اللہ کے دربار سے معافی جلدی ملے۔

یونس علیہ السلام نے تسبیح پڑھی ہے اور اگر یونس علیہ السلام یہ تسبیح نہ پڑھتے تو قرآن کریم میں ہے:

﴿فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ ۖ لَلَّيْتُ فِي بَطْنِهِ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾

178 ﴿ۛ﴾

کہ قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے۔ تسبیح پڑھی تو اللہ پاک نے باہر نکال دیا۔

### توبہ کب قبول ہوتی ہے اور کب نہیں!

اب جو بات سمجھنے کی ہے ذرا وہ سمجھیں کہ قوم پر عذاب کیوں نہیں آیا؟ یہ جو معروف ضابطہ ہے کہ جب آدمی اللہ کے عذاب کا مشاہدہ کرے اور اس وقت توبہ کرے تو توبہ قبول نہیں ہوتی اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی پر موت کے آثار آجائیں اور آخرت کا عذاب نظر آنا شروع ہو جائے تو پھر توبہ قبول نہیں ہوتی، اسی طرح اگر دنیا کا عذاب نظر نہ آئے بلکہ دنیا کے عذاب کے اندر مبتلا ہو جائے تو پھر بھی توبہ قبول نہیں ہوتی۔

تویونس علیہ السلام کی قوم نے نہ تو آخرت کے عذاب کو دیکھا ہے نہ ان پر دنیا کا عذاب شروع ہوا ہے بلکہ دنیا کے عذاب کے آثار آئے تھے۔ انہوں نے رو دھو کر توبہ کی تو اللہ رب العزت نے انہیں معاف فرما دیا تو یوں ان کی توبہ قبول ہو گئی۔ یونس علیہ السلام کی قوم کا عذاب کیوں ملا ہے، یہ بات سمجھ میں آگئی؟ (جی ہاں۔ سامعین)

### مودودی صاحب اور حضرت یونس علیہ السلام:

میں اس بات پر بار بار کیوں زور دے رہا ہوں؟ ہمارے پاکستان کے ایک شخص ہیں جو دنیا سے جا چکے ہیں۔ ابو الاعلیٰ مودودی صاحب ان کا نام ہے، تفہیم القرآن

تفسیر کی کتاب لکھی ہے۔ اس آیت کے تحت وہ تحریر کرتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حجت پوری نہیں کر لیتا۔ پس جب نبی ادائے رسالت میں کوتاہی کر گیا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس کی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا۔“<sup>179</sup>

کتاب اِجرام ہے یہ ذہن بنانا کہ نبی سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی ہو گئی ہے۔ اگر نبی سے فریضہ رسالت میں کوتاہی ہو گئی ہے تو پھر اور کون سا گناہ ہے جو نبی سے نہیں ہو سکتا؟ حالانکہ وجہ یہ نہیں تھی۔ مودودی صاحب یہ سمجھے ہیں کہ عام قانون تو یہی ہے کہ قوم عذاب کو دیکھ لے اور پھر توبہ کرے تو توبہ قبول نہیں ہوتی لیکن یونس علیہ السلام کی قوم کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے عذاب دیکھا ہے اور توبہ کی ہے تو پھر بھی ان کی توبہ قبول ہو گئی ہے۔ یہ خیال اگرچہ بعض مفسرین نے ظاہر کیا ہے لیکن کسی نے بھی اس خصوصیت کا سبب یہ نہیں لکھا کہ العیاذ باللہ نبی سے کوتاہی ہوئی ہے اس لیے قوم کی توبہ قبول ہوئی ہے بلکہ جن مفسرین نے بھی اسے قوم یونس کی خصوصیت کہا ہے تو انہوں نے وجہ یہ لکھی ہے کہ قوم نے سچے دل سے توبہ کی تھی اس لیے توبہ قبول ہوئی۔ یا یہ کہ اللہ کے علم میں تھا کہ یہ قوم مخلص ہے اس لیے توبہ قبول کی لیکن مودودی صاحب نے جو وجہ لکھی ہے کہ قوم نے عذاب دیکھا اور توبہ کی تو توبہ تو قبول نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن ہوئی کیوں ہے کیونکہ نبی سے کوتاہی ہوئی ہے العیاذ باللہ...

حالانکہ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے، میں نے آپ کو سمجھایا ہے کہ دنیا کے

عذاب میں آدمی داخل ہو جائے تو توبہ قبول نہیں ہوتی اور آخرت کے عذاب کو دیکھ لے تو بھی توبہ قبول نہیں ہوتی، آخرت کا عذاب کب دیکھتا ہے؟ جب آدمی کی روح نکلتا شروع ہوتی ہے، جب موت کے آثار آجائیں۔ نہ ان کی روح نکلتا شروع ہوئی ہے اور نہ ان پر عذاب آیا ہے، ابھی دنیا کے عذاب کے آثار کو دیکھا ہی تھا اور دنیا کے عذاب کے آثار کو دیکھ کر کوئی توبہ کرے تو توبہ قبول ہوتی ہے۔ تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم وہ واحد قوم ہے جس پر عذاب کے آثار آئے تو انہوں نے توبہ کی ہے اس لیے ان کی توبہ قبول ہوئی ہے، اس کے علاوہ باقی قوموں نے عذاب کو آتے دیکھا تو کبھی توبہ نہیں کی اس لیے ان کی توبہ کبھی قبول بھی نہیں ہوئی۔

### قوم یونس کی توبہ قبول، فرعون کی نہیں... وجہ فرق:

آپ کے ذہن میں ایک سوال آئے گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے فرعون سے نجات دی ہے تو موسیٰ علیہ السلام دریا سے گزر گئے ہیں، بنی اسرائیل بھی گزر گئے ہیں، ان کے پیچھے فرعون اپنے لشکر کے ساتھ آیا، یہ لوگ گھوڑوں پر سوار تھے، موسیٰ علیہ السلام آگے گزرے۔ اب فرعون سمجھتا تھا کہ یہ نبی ہے اور نبی برحق ہے اور اس کا معجزہ ہے کہ دریا نے راستے دیے۔ اگر میں دریا میں گیا تو میں نے غرق ہو جانا ہے۔ وہ یہ بات سمجھ رہا تھا۔ اس لیے بعض روایات کے اندر ہے کہ فرعون آگے گئے کیوں؟ یہ چونکہ گھوڑوں پر سوار تھے تو دست قدرت سے آگے گھوڑیاں آئیں، گھوڑے ان کے پیچھے دوڑے، یہ روکنا چاہتے تھے لیکن نہیں روک سکے اور ان کے گھوڑے دریا کی طرف چلے گئے۔ جب دریا کی موجیں ملیں اور فرعون کو خدا کے عذاب نے گھیرا تو اس وقت فرعون کہنے لگا:

﴿أَمْسَتْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا الَّذِي آمَسَتْ بِهِ بَنُو إِسْرَآئِيلَ وَ أَنَا مِّنْ

## الْمُسْلِمِينَ ﴿٣٦﴾

کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں میں بھی اس پر ایمان لاتا ہوں۔  
فرعون نے عذاب دیکھا، ایمان تو یہ بھی لے آیا لیکن اس کی توبہ قبول نہیں  
ہوئی۔ اللہ نے فرمایا:

﴿الَّذِينَ وَكُفُّوا عَصِيَّةَ قَبْلُ وَكُنْتُمْ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ﴿٣٦﴾﴾

کہ اب توبہ کرتا ہے عذاب دیکھنے کے بعد! پہلے تو فساد کرتا تھا، تیرے لیے  
معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے... اور ادھر یونس علیہ السلام کی قوم نے عذاب دیکھا،  
یہ ایمان لائی، اس نے توبہ کی تو خدا نے قبول کر لی ہے۔

اب ذرا اس کا جواب سمجھیں! حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے عذاب  
کے آثار دیکھے تھے، اور فرعون عذاب میں داخل ہو گیا تھا۔ عذاب کے آثار دیکھیں  
اور توبہ کریں تو توبہ قبول ہوتی ہے اور جب عذاب شروع ہو جائے اور پھر توبہ کرے  
تو توبہ قبول نہیں ہوتی۔

## فرعون کی لاش؛ نشانِ عبرت:

یہاں ایک اور بات سمجھیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم سمندر سے گذر  
گئی اور فرعون غرق ہو گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو بتایا کہ فرعون  
غرق ہو گیا ہے، فرعون مارے گئے ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرو۔ مسلسل غلامی میں رہنے  
کے نتیجے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ فرعون  
بھی غرق ہو سکتا ہے؟ فرعون بھی برباد ہو سکتا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:  
وہ برباد ہو گیا ہے، مر گیا ہے، عذاب آگیا ہے، فرعون ختم ہو گیا ہے، دل بڑا کرو اور  
حوصلہ کرو، ابھی تک غلامی کے آثار تمہارے اندر سے جا نہیں رہے۔ اللہ رب العزت  
نے کرم فرما دیا کہ فرعون کی لاش کو اٹھایا اور سمندر سے باہر پھینک دیا کہ یہ دیکھو!

فرعون مرا پڑا ہے، اب تو یقین کر لو۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلَفَكَ آيَةً ۖ﴾<sup>180</sup>

آج ہم تیرے بدن کو محفوظ رکھیں گے تاکہ تو بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت بن جائے کہ یہ وہ شخص تھا جو سجدے کرتا تھا لیکن آج ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا ہوا ہے اور کوئی اس کو پوچھنے کے لیے تیار نہیں۔

### فرعون باہر پڑا ہے تو عذابِ قبر کیسے؟

اب اس میں ایک نکتہ سمجھیں جو میں سمجھانے لگا ہوں۔ بتائیں! فرعون کافر تھا یا نہیں؟ بہت بڑا کافر تھا، صرف کافر نہیں بلکہ کافرِ گر بھی تھا، یہ کافر بناتا تھا لیکن اس کے باوجود اب فرعون کی لاش پڑی ہے۔ آپ حضرات نے سنا ہے کہ مصر میں فرعون کی لاش کو انہوں نے مسالہ لگا کر رکھا ہوا ہے۔ یہ فرعون کون سا ہے؟ یہ وہی فرعون ہے جو موسیٰ علیہ السلام والا ہے یا کوئی اور فرعون ہے؟ اس میں دونوں رائے موجود ہیں۔ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر میں تھے، مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون کہتے تھے جیسے ہمارے بادشاہ کو صدر کہتے ہیں۔ بہر حال فرعون آج بھی پڑا ہوا ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ آدمی کے جسم کو عذاب ہوتا ہے روح کے تعلق کے ساتھ۔ وہ لوگ جو جسم کے عذاب کے قائل نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ دیکھو! فرعون کی لاش پڑی ہے، اگر اس کو عذاب ہوتا تو نظر آتا، فرعون کا جسم گرم ہوتا، کوئی آگ نظر آتی، کچھ تو پتا چلتا، اب ہم کیسے مانیں کہ فرعون کے جسم کو عذاب ہوتا ہے؟ حالانکہ قرآن کریم میں ہے:

﴿النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۖ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ ۖ﴾

أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿١٨١﴾

کہ صبح و شام ان پر آگ پیش ہوتی ہے اور جب قیامت کا دن ہوگا تو حکم ہوگا کہ فرعونوں کو جہنم میں داخل کر دو!

جہنم میں داخل نہیں کیا، بلکہ صبح و شام ان پر جہنم کی آگ پیش ہوگی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر جسم کو عذاب ہوتا ہے تو فرعون کے جسم پر عذاب تو نظر نہیں آ رہا، فرعون کا جسم تو ٹھنڈا پڑا ہوا ہے اس کے اندر تو آگ ہے ہی نہیں۔

### حضرت عمر کا استدلال کہ عذاب جسم کو ہوا ہے:

میرے اللہ کا کرم دیکھیں کہ منکرین عقیدہ اہل السنۃ نے جو اعتراضات کرنے تھے، اللہ نے ان کے جوابات پیغمبر کے صحابہ سے دلوا دیئے۔ (سبحان اللہ۔  
سامعین)

تحفہ اثنا عشریہ فارسی زبان میں ہے، اردو میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے بیٹے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے لکھی ہے اور اس میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے اور ایک یہودی آیا اس یہودی نے آکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: امیر المؤمنین! آپ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جب آدمی مر جائے اور قبر میں جائے تو جسم کو عذاب ہوتا ہے، یہ دیکھو میرے ہاتھ میں دو کھوپڑیاں ہیں۔ یہ دونوں یہودی تھے، یہودیت پر مرے ہیں۔ اگر ان کو جہنم کا عذاب ہوتا تو یہ کھوپڑیاں گرم ہوتیں۔ آپ اس پر ہاتھ لگائیں، کھوپڑی ٹھنڈی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ کا عذاب نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دماغ اور عقل مبارک پیغمبر صلی اللہ علیہ



و سلم کی صحبت سے کہاں تک پہنچی ہے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جواب سننا۔  
 وہاں دو پتھر پڑے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان پتھروں  
 کو لاؤ! وہ دو پتھر لایا۔ فرمایا کہ ان دو پتھروں پر ہاتھ رکھو! اس نے رکھے۔ پوچھا: یہ پتھر  
 ٹھنڈے ہیں یا گرم؟ اس نے کہا کہ ٹھنڈے ہیں۔ فرمایا: معلوم ہوا کہ ان پتھروں میں  
 آگ نہیں ہے تبھی تو ٹھنڈے ہیں۔ اس نے کہا: جی ہاں، آگ نہیں ہے تبھی تو  
 ٹھنڈے ہیں۔ فرمایا کہ ان کو رگڑو۔ اس نے جب دونوں پتھروں کو رگڑنا شروع کیا  
 تو پتھر گرم ہونا شروع ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بتاؤ! جب اندر  
 آگ نہیں تھی تو یہ گرم ہونا کیسے شروع ہو گئے؟ اور اگر اندر آگ تھی تو بتاؤ ٹھنڈے  
 کیوں تھے؟

اس نے کہا کہ امیر المؤمنین یہ اندر آگ تھی لیکن نظر نہیں آرہی تھی،  
 جب رگڑا تو محسوس ہوئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: جس طرح پتھر  
 وں میں آگ ہے، رگڑیں تو پتا چلتا ہے اسی طرح ان ہڈیوں میں آگ ہے نبی بتائیں تو پتا  
 چلتا ہے، پتھروں کی آگ تم نے مان لی ہے مشاہدے کی وجہ سے اور ہم ہڈی میں آگ  
 مانتے ہیں پیغمبر کے فرمانے کی وجہ سے، عقل تو دھوکہ کھا سکتی ہے لیکن پیغمبر کی بات  
 کبھی دھوکہ نہیں کھا سکتی۔

### علامہ انور شاہ کشمیری کا تذکرہ:

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ حجتہ المسلمین حضرت شیخ الہند  
 محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے مایہ ناز شاگرد اور چلتی پھرتی لائبریری تھے۔  
 علامہ انور شاہ کشمیری بہت بڑے آدمی تھے۔ خدا نے غضب کا علم دیا تھا، اتنا حافظہ دیا  
 تھا، اتنا تقویٰ دیا تھا کہ آپ تصور کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ علامہ انور شاہ کشمیری  
 رحمہ اللہ ایک مرتبہ جامع ازہر مصر میں گئے اور وہاں ایک کتاب دیکھی۔ فرمایا: یہ

کتاب مجھے دکھاؤ۔ کتاب دیکھی۔ تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ کتاب مجھے دے دو، میں ہندوستان لے جاتا ہوں اور دیوبند سے چھپوا کر یہ کتاب تمہیں واپس کر دوں گا۔ وہ لوگ کہنے لگے: نہیں، شاہ صاحب ہم کتاب نہیں دے سکتے، آپ مطالعہ کریں، نوٹ کریں، بہر حال ہم کتاب نہیں دے سکتے۔ تو حضرت علامہ انور شاہ کشمیری صاحب نے کتاب لی، مطالعہ کیا۔ ہندوستان آکر اس کو چھپوایا اور چھپوا کر اس کا نسخہ مصر، جامعہ ازہر میں بھجوا دیا۔ یہ علامہ انور شاہ کشمیری کا حافظہ تھا جو دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے۔

جب بہاولپور کی عدالت میں مرزائیوں کے خلاف پہلا کیس چلا جو ”مقدمہ بہاولپور“ کے عنوان سے چھپا ہوا ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ دیوبند سے تشریف لائے۔ عدالت میں بحث شروع ہو گئی۔ جو مرزائی مناظر تھا اس نے ہماری کتاب فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت کا حوالہ پیش کیا کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا دین متواتر ہے اور تواتر کی ہر قسم کا منکر کافر ہے تو آپ لوگ امام رازی رحمہ اللہ پر کفر کا فتویٰ لگائیں کیونکہ علامہ بحر العلوم نے ”فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت“ میں لکھا ہے کہ امام رازی نے تواتر معنوی کا انکار کیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب حج کو فرمانے لگے کہ حج صاحب! یہ شخص عبارت غلط پڑھ رہا ہے، یہ جھوٹ بولتا ہے، یہ عبارت کتاب میں موجود نہیں ہے۔ شاہ صاحب کو حج نے کہا: علامہ صاحب! آپ کے پاس تو کتاب بھی نہیں ہے، آپ کیسے فرما رہے ہیں کہ یہ عبارت غلط پڑھ رہا ہے؟ شاہ صاحب فرمانے لگے: جو بات میں کہتا ہوں اگر یہ بات غلط ہو تو میں شکست لکھ دوں گا۔

حج نے کہا کہ اتنی گارنٹی کے ساتھ کیسے فرما رہے ہیں آپ؟ حضرت شاہ صاحب فرمانے لگے کہ بتیس سال پہلے میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا اگر حوالہ غلط

ہو تو میں شکست لکھ دوں گا۔ اس کتاب میں ہے کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جو حدیث ہے ”لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِي عَلَى الضَّلَالَةِ“ یہ حدیث تو اتر معنوی کے مرتبہ کو نہیں پہنچی، تو امام رازی نے اس حدیث کے متواتر معنوی ہونے کا انکار فرمایا ہے، یہ نہیں کہ انہوں نے خود تو اتر معنوی کے حجت ہونے کا انکار کیا ہو۔ اس بندے نے عبارت میں دجل سے کام لیا ہے۔ فرمایا کہ اس سے کہیں کہ عبارت پڑھے۔ قادیانی مناظر نے جب عبارت پڑھی تو بالکل وہی بات نکلی جو حضرت شاہ صاحب نے فرمائی تھی۔<sup>182</sup>

### عذاب روح اور جسم دونوں کو... شاہ صاحب کا استدلال:

حضرت شاہ صاحب کے بارے میں ہمارے استاذ فرماتے تھے کہ جب آپ بازار میں جاتے تھے تو کان میں روئی رکھ لیتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا کہ جو بات کان میں چلی جائے وہ نکلتی نہیں ہے تو میں ڈرتا ہوں کہ گانا کان میں نہ چلا جائے اور وہ نہ نکلے تو میں اس کے عذاب کو کیسے سنبھالوں گا؟ یہ تھے ہمارے اکابر۔ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا میں نے تھوڑا سا تعارف اس لیے کروایا تاکہ جب میں حضرت کی بات سناؤں تو آپ کو سمجھ آئے کہ یہ کتنے بڑے آدمی کی بات ہے!

حضرت انور شاہ صاحب فرماتے تھے کہ جسم اور روح دونوں کو عذاب کیوں ہوتا ہے؟ مثال دینے کے لیے سمجھاتے کہ ایسے سمجھو کہ دو آدمی باغ میں گئے مالٹے چوری کرنے کے لیے۔ میں اپنے لحاظ سے مثال دوں گا نا۔ اور ان میں سے ایک بندہ اندھا ہے اور ایک لنگڑا ہے۔ لنگڑے کے پاؤں نہیں ہیں وہ چل نہیں سکتا اور اندھے کی

آنکھیں نہیں ہیں وہ دیکھ نہیں سکتا اور دونوں کا جی چاہتا ہے مالٹا کھانے کو۔ اب چوری کریں تو کیسے کریں؟ اندھے نے لنگڑے سے کہا کہ تو میرے کندھے پر بیٹھ جا اور مجھے بتاتا جا، میں چلتا جاتا ہوں۔ اب اندھا چلتا ہے اور لنگڑا بتاتا ہے تو جب وہ مالٹے کو چوری کر کے لے آئے، کھا ہی رہے تھے کہ پکڑے گئے۔ تو مالک سزا اندھے کو دے گا یا لنگڑے کو؟ دونوں کو دے گا۔ اس لیے کہ اگر لنگڑا نہ ہوتا تو راستہ کون دکھاتا اور اگر یہ اندھا نہ ہوتا تو اس کو لے کر کون جاتا؟ تو دونوں چوری میں شریک تھے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ بالکل یہی مثال انسان کے جسم اور روح کی ہے۔ جسم یوں سمجھو کہ جیسے چل سکتا ہے مگر آنکھیں نہیں اور روح ایسی ہے کہ جس میں آنکھیں ہیں مگر ٹانگیں نہیں ہیں۔ روح بغیر جسم کے کہیں جا ہی نہیں سکتی، دنیا میں جسم چلے گا تو روح ساتھ چلے گی، روح کی روشنی ہوگی تو جسم چلے گا، روح کی روشنی ہوگی تو اس کو نظر آئے گا۔ تو جس طرح اندھا اور لنگڑا یہ دونوں مل کر چوری کرتے ہیں تو سزا بھی دونوں کو ہوتی ہے، مزے جو دونوں نے لیے ہوتے ہیں اسی طرح جسم اور روح جب دونوں مل کر دنیا میں گناہ کے مزے لیتے ہیں تو قبر میں عذاب بھی دونوں کو بھگتنا پڑتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ مزے کوئی اور لے اور عذاب کسی کو ہو۔

ہمارے بعض لوگ ایسے سادہ ہیں... کہتے ہیں اس جسم کو عذاب نہیں ہوتا، اللہ اس جسم کے بجائے ایک اور جسم مثالی دیتے ہیں جو اس جسم کی فوٹو اسٹیٹ ہوتی ہے، خدا اس جسم کو عذاب دیتا ہے۔ میں نے کہا: سبحان اللہ! مزے یہ جسم لیتا ہے اور سزا کسی اور جسم کو مل رہی ہے تو پھر یہ جسم جس قدر مزے کرے کوئی فکر کی بات نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ جب اس کو عذاب ہی نہیں ہونا تو مزے سے گناہ کرتے پھر و! اللہ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کبھی یہ مسئلہ آگے مستقل آیا تو اس پر میں دلائل پیش کروں گا کہ ہم اہل السنۃ والجماعۃ کے دلائل کیا ہیں اور اس پر ہونے والے

شبہات کے جوابات کیا ہیں ان شاء اللہ۔

## حروفِ مقطعات کے نزول کی حکمت:

﴿الرَّأَيْتُ آيَاتِ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ﴾

﴿الر﴾ یہ حروفِ مقطعات ہیں۔ اس پر تفصیل سے ہم بات کر چکے ہیں۔

حروفِ مقطعات کا علم اللہ کے پاس ہے یا اللہ اور اس کے پیغمبر کا راز ہے، دنیا میں کوئی اس کو جانتا نہیں ہے۔

ایک نکتہ سمجھنے کا ہے کہ اللہ نے حروفِ مقطعات اتارے ہیں اور لوگوں کو معنی نہیں بتایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس مسئلہ کا تعلق لوگوں کے فائدے کے ساتھ ہو تو بتانا چاہیے اور جس مسئلے کا تعلق فائدے کے ساتھ نہ ہو تو اس کو چھیڑنا نہیں چاہیے۔ بعض لوگوں کا کسی مسئلے کے ساتھ دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا لیکن چسکے لینے کے لیے مسئلے پوچھتے رہتے ہیں، کوئی نہ کوئی بات چھیڑے رکھتے ہیں حالانکہ فضول بات سے بچنا چاہیے۔

## نبی کے بشر ہونے کی وجہ:

﴿أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَى رَجُلٍ مِّنْهُمْ أَنْ أَنْذِرِ النَّاسَ

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ قَالَ الْكَافِرُونَ إِنَّ

هَذَا السَّحَرُ الْمُبِينُ﴾

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب ہم نے اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر بھیجا تو مشرکین مکہ کہنے لگے: کیا بھلا نبی انسان بھی ہو سکتا ہے؟ نبی کوئی فرشتہ ہوتا تو ہم بات مانتے! ہماری طرح کھاتا ہے، ہماری طرح پیتا ہے، ہماری طرح بازار کو چلتا ہے، ہماری طرح بیویاں ہیں، ہماری طرح بچے ہیں، کیا یہ نبی

ہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کو اس بات پر تعجب ہے کہ انسان کیسے نبی ہو سکتا ہے؟ اس کا بڑا آسان جواب یہ ہے کہ نبی کے ذمے ایمان والوں کو خوشخبریاں دینا اور کافروں کو ڈرانا ہے۔ اگر یہ کام فرشتے کے ذمے ہوتا تو لوگ کہتے کہ اس کو کیا پتا روزہ کسے کہتے ہیں؟ اس کو بھوک لگے تو سمجھ آئے نا؟ ان کو کیا پتا گناہ سے بچنا کسے کہتے ہیں؟ ان میں تو گناہ کی خواہش ہی نہیں ہے، ان کو کیا پتا کہ سامنے لڑکی آئے تو دل پر کیا گزرتی ہے؟ تو اللہ فرماتے ہیں: ہم نے فرشتے کو نہیں بلکہ بشر کو نبی بنا کر بھیجا ہے اور نبی میں سارے تقاضے اللہ رب العزت رکھ دیتے ہیں لیکن ان بشری تقاضوں پر جن کا تعلق گناہ سے ہو نبی عمل نہیں کرتا، اب بتاؤ! اگر یہ فرشتہ ہوتا تو بات کیسے سمجھتا؟ کسی شخص کی ماں مر جائے اب اس کی تعزیت کرنی ہے تو جس کی ماں مر جائے اس کو تو پتا ہے کہ ماں کے مرنے کا غم کیا ہوتا ہے اور فرشتے کی ماں نہیں ہوتی تو اس کو ماں کے مرنے کا غم کیا ہو گا؟ کسی آدمی کا بچہ فوت ہو جائے تو اس کو پتا ہوتا ہے کہ بچے کے فوت ہونے پر انسان پر کیا گزرتی ہے؟ فرشتے کی اولاد ہی نہیں ہے، وہ کیا بتائے گا کہ درد کیا ہوتا ہے؟

اللہ کا نظام دیکھو! اللہ کے نبی نے امت کو مسئلہ سمجھانا تھا کہ نابالغ اولاد کے فوت ہونے پر کیا ملتا ہے تو اللہ نے نبی کی نابالغ اولاد ہی دنیا سے اٹھالی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا ہے کہ اولاد کا درد کیا ہوتا ہے! اس لیے اللہ کے نبی لوگوں کو جب سمجھاتے ہیں تو بات جلدی سمجھ میں آ جاتی ہے۔

**آسمان وزمین چھ دن میں بنانے میں تعلیم امت:**

﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ

اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۚ

اللہ تبارک و تعالیٰ نے زمین و آسمانوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا اور پھر اللہ عرش پر مستوی ہو گئے۔

جب سورج اور چاند ہی نہیں تھا تو چھ دن اور چھ رات کا مطلب کیا ہے؟ مفسرین نے فرمایا ہے کہ جس قدر چھ دن اور چھ راتوں کے وقت کی مقدار بنتی ہے تو خدا نے اتنے وقت میں آسمان اور زمین کو بنا دیا ہے، اور مفسرین یہاں ایک نکتہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ لفظ ”مُکُنْ“ فرما کر آسمان اور زمین بنا سکتے تھے یہ چھ دن اور چھ راتیں لگانے کی ضرورت کیا تھی؟ بلکہ ہم کہتے ہیں کہ اللہ لفظ ”مُکُنْ“ بھی نہ فرمائیں تو پھر بھی یہ بن سکتے تھے، کُنْ کہنے کی بھی ضرورت کیا ہے؟

اللہ پاک نے ایسا کیوں فرمایا؟ دراصل انسانیت کو یہ بات سمجھانے کے لیے ایسا کیا ہے کہ اے انسان دیکھو! خدا نے دنیا کا نظام اسباب کے ساتھ جوڑا ہے، اللہ بغیر اسباب کے پیدا فرمانا چاہیں تب بھی فرما سکتے ہیں لیکن اسباب اور تدریج کے ساتھ خدا نے معاملہ جوڑا ہے۔ پہلے بچہ ہے، پھر جوان ہے، پھر بوڑھا ہے، پھر موت ہے۔ پہلے دو روپے، پھر دس روپے، پھر سو روپے آہستہ آہستہ تمام معاملات چلتے ہیں۔ تو اس سے یہ سبق دینا مقصود ہے کہ انسان کو کبھی بھی جلد باز نہیں ہونا چاہیے، اللہ کا یہ جو نظام ہے تدریج کا اس نظام کا قائل ہو کر بندے کو تدریج کے ساتھ ہی چلنا چاہیے۔

### قمری اور شمسی نظام:

﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَرَهُ مَنَازِلَ لِّيَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٥١﴾﴾

آگے اللہ رب العزت نے چاند اور سورج کی بات کر کے ایک مسئلہ سمجھایا

ہے۔ ایک نظام شمسی ہے اور ایک نظام قمری ہے۔ میں اس پر لمبی بات کروں گا تو فلکیات کا مسئلہ چھڑ جائے گا، اس لیے میں اس پر مختصر سی بات کرتا ہوں۔ ہم نظام شمسی کو بھی مانتے ہیں اور نظام قمری کو بھی مانتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا:

اللہ وہ ہے جس نے سورج کو روشنی بنایا ہے اور چاند کو نور اور چاندنی بنایا ہے اور پھر اس کی منزلیں مقرر کی ہیں تاکہ تم ان کے ذریعے سالوں کی گنتی معلوم کر سکو اور حساب معلوم کر سکو۔ اللہ نے اس نظام کو برحق پیدا کیا ہے، اللہ یہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

سورج کی منزلیں 365 ہیں اور چاند کی 28 یا 29 ہیں۔ اس لیے سورج 365 دنوں میں اپنا دورہ مکمل کرتا ہے اور چاند ایک مہینے میں اپنا سفر طے کرتا ہے۔ ایک جگہ کا نام ”منزل“ ہے۔ چاند کے 30 یا 29 سٹاپ ہوتے ہیں لیکن چونکہ ایک رات کو نظر نہیں آتا اس لیے اس کے عموماً 28 سٹاپ شمار کیے جاتے ہیں۔ تو فرمایا کہ شمسی مہینوں کا حساب بھی ہے اور قمری کا حساب بھی ہے۔ ہمارے پاکستان میں شمسی حساب چلتا ہے لیکن شریعت کے احکام کا تعلق شمسی نظام سے نہیں ہے بلکہ قمری نظام کے ساتھ ہے۔ اگر حج کرنا ہو تو چاند کا اعتبار ہو گا، روزے رکھنے ہوں تو چاند کی تاریخ کا اعتبار ہو گا۔ اگر خدا نخواستہ عورت کو طلاق ہو یا خاوند فوت ہو جائے تو اس کی عدت میں قمری نظام کا حساب ہو گا، زکوٰۃ ادا کرنی ہے تو قمری مہینے کا حساب ہو گا۔ تو شریعت کے احکام کا تعلق قمری نظام کے ساتھ ہے لیکن اپنے کاروبار کو اگر کوئی شخص شمسی نظام سے چلانا چاہے تو شریعت اس کو منع بھی نہیں کرتی اور یہ گناہ بھی نہیں ہے لیکن نظام وہ بنائیں جو قمری ہے۔

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ چاند کی تاریخ کو یاد رکھنا یہ فرض کفایہ کے درجے میں ہے۔ اگر ایک ضلع میں کسی کو بھی پتہ نہ ہو تو یہ سارے گناہ گار ہوں گے اور



اگر دو چار کو پتا ہو تو باقی ضلع گناہ سے بچ جائے گا۔ اس لیے اہتمام کرنا چاہیے کہ شمسی کے ساتھ قمری حساب کا بھی خیال فرمائیں۔

**”نبی رحمت ہے تو ہر جگہ ہے“ کا جواب:**

ایک عقیدے کے حوالے سے اس آیت کو بطور دلیل ذہن میں رکھ لیں۔ ہمارا اہل السنۃ والجماعۃ احناف دیوبند کا عقیدہ ہے کہ اللہ رب العزت کی ذات ہر جگہ پر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مدینہ منورہ میں اپنی قبر مبارک میں ہے۔ جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ کے نبی ہر جگہ موجود ہیں ان کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾<sup>183</sup>

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے نبی کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ اب یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی رحمتہ للعالمین ہیں تو بتاؤ دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں خدا کی رحمت نہ ہو؟ اللہ کی رحمت تو ہر جگہ پر ہے۔ اللہ کے نبی خدا کی رحمت ہیں اور خدا کی رحمت ہر جگہ پر ہے تو ثابت ہوا کہ نبی بھی ہر جگہ پر ہے۔

میں اس کا جواب دینے لگا ہوں۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً﴾ کہ ہم نے سورج کو روشنی بنایا ہے۔ روشنی ہر جگہ پر ہے تو سورج ہر جگہ پر، پھر کہو کہ سورج بھی حاضر و ناظر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں، سورج تو ہر جگہ پر نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ آیت کا مطلب پھر کیا ہو گا؟ کہتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ سورج آسمان پر ہے اور اس کی روشنی ہر جگہ پر ہے۔ میں نے کہا کہ پھر اُس آیت کا معنی یہ ہے کہ نبی پاک مدینہ میں ہیں اور نبی کی رحمت ہر جگہ پر ہے۔

(سبحان اللہ۔ سامعین)

تو جو آپ کی دلیل ہے وہی ہماری دلیل ہے۔ تو جب آپ اس کا جواب دیں گے تو آپ کی اس دلیل کا جواب بھی بن جائے گا۔

**جنتیوں کے تین جملے:**

﴿دَعَوْهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۖ وَآخِرُ

دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جنتی لوگوں کے تین جملوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلے جملے سمجھیں اور پھر عقیدہ سمجھیں۔ تین جملے یہ ہیں کہ جنتی جب جنت میں جائیں گے اور اللہ کی نعمتیں دیکھیں گے تو کہیں گے: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ، سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ، سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ۔ بعض روایات میں یوں بھی آتا ہے کہ جب جنتی کوئی چیز لینا چاہیں گے، دل میں خیال آئے گا اور زبان سے الحمد للہ کہیں گے تو فرشتے وہ چیزیں ان کے سامنے پیش کر دیں گے تو جنتی سب سے پہلے کہیں گے: سبحان اللہ! مکان کیسا ہے، حوریں کیسی ہیں، فلاں چیز کیسی ہے!

**حواراں بہشت کا تذکرہ:**

حوروں کے تذکرے کیا کرو، یہ عیب کی بات نہیں ہے۔ ہم عجیب لوگ ہیں! جو شرم کی باتیں نہیں ہیں ان میں شرم آتی ہے اور جو شرم کی ہیں اس میں بے شرمی کرتے ہیں۔ لڑکیوں کی باتیں کرتے ہیں تو محسوس نہیں ہوتا، حوروں کی باتیں کریں گے تو کہیں گے کیسا مولوی ہے، شرم نہیں آتی، منبر پر بیٹھ کر حوروں کی باتیں کرتا ہے۔

اللہ نے قرآن میں حوروں کا تذکرہ اس لیے کیا ہے تاکہ اس لعنت سے بچو اور جنت کی حوروں کی طلب کرو، ہم ان کے تذکرے پر شرم محسوس کرتے ہیں اور

آپ حیران ہوں گے کہ قرآن کریم میں اللہ نے حوروں کی اٹھارہ صفتیں بیان فرمائی ہیں۔ قرآن نے جنت کی حوروں کا ایسا تذکرہ کیا ہے تاکہ مسلمان میں طلب پیدا ہو اور جنت کی حور کا مشتاق ہو جائے۔

میری عادت ہے کہ میں جب قرآن کی آیت پڑھتا ہوں اور مسئلہ سمجھتا ہوں تو محاورات کے مطابق بات کرتا ہوں تاکہ بات لوگوں کے دماغ میں اتر جائے۔ اللہ پاک نے حوروں کی ایک صفت یہ بیان فرمائی ہے:

﴿لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ﴾<sup>184</sup>

کہ یہ ان ٹچ قسم کی لڑکی ہوگی۔ اس سے بہتر میں ترجمہ کیا کر سکتا ہوں؟ اور یہ قرآن کہہ رہا ہے میں تو نہیں کہہ رہا۔ اللہ انسان کے دل میں جو جائز تقاضے رکھتے ہیں تو ان جائز تقاضوں کو پورا کرنے کی جگہ خدا نے جنت رکھی ہے۔

### خود کو خدا کے حوالے کرو!

میں خلاصہً ایک بات کہہ دیتا ہوں، اس بات کو اچھی طرح سمجھو۔ دنیا میں وہ کرو جو اللہ چاہتا ہے اور جنت میں وہ ہو گا جو تم چاہتے ہو! اس سے میں مختصر بات تو نہیں کہہ سکتا۔ یہ جو لڑکیاں تم دنیا میں چاہ رہے ہو، جنت میں اللہ ان سے بہتر دے گا اور ایک نہیں دے گا ہزاروں کی تعداد میں دے گا، میں تمہیں یہ بات کیسے سمجھاؤں؟

### جنت کا بازار:

بازار میں جاؤ تو جی چاہتا ہے کہ میرے بال ایسے ہوں، میرا لپٹا ایسا ہو، میری زلفیں ایسی ہوں، کتنی خواہشیں ہوتی ہیں اور پھر اسٹائل بنانا کرنا جو ان پھرتے ہیں۔ خدا نے جنت میں ایک بازار بنایا ہے اور اس کا نام ہے ”سوق الصور“ تصویروں کا بازار۔

پورے بازار میں تصویریں لگی ہوئی ہوں گی۔ آپ دیکھیں گے، آپ چاہیں گے کہ میں اس طرح ہو جاؤں، آپ خواہش کریں گے تو آپ اسی طرح ہو جائیں گے۔ سبحان اللہ! اب تصویر بدل گئی۔ جب گھر جائیں گے تو بیگم پہچان لے گی کہ یہ وہی ہے، یہ نہیں ہوگا کہ حور کہے کہ یہ کون آگیا؟

اب بتاؤ کہ جو ہمارے دل کے تقاضے ہیں خدا نے ان کو پورا کرنے کی جگہ کون سی رکھی ہے؟ جنت رکھی ہے۔

میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ اللہ کی قسم! اگر بندے کو سمجھ آجائے تو بندہ لعنت بھیجتا ہے دنیا پر اور گناہوں والی زندگی پر۔ پھر وہ طلب کرتا ہے کہ اللہ مجھے وہ جنت والی زندگی عطا فرمادیں۔ گناہوں کے ماحول سے بچو۔ میں کس درد سے کہوں! جو گناہ کر لیے ہیں، اللہ سے توبہ کرو! بس دل میں تھوڑے سے تصور کی ضرورت ہے، اللہ سارے گناہوں کو معاف کر دیں گے۔ بھائی! توبہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ (کر سکتے ہیں۔ سامعین) میں بھی کرتا ہوں کہ اللہ میرے سارے گناہوں کو معاف فرمائیں اور آپ بھی کہہ لیں۔ اللہ آپ کے گناہوں کو بھی معاف فرمادیں۔

### جنتیوں کا سلام:

جنت میں جائیں گے تو سب سے پہلے کیا کہیں گے؟ ﴿سُبْحَنَكَ اللَّهُمَّ﴾ بات توجہ سے سننا! اور اس کے بعد ﴿وَتَحْيَيْتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ﴾ پھر کہیں گے السلام علیکم... السلام علیکم... ایک دوسرے کو ملیں گے تو سلام کریں گے۔ آپ کسی شادی کی جگہ پر جائیں اور خوب صورت ٹینٹ لگے ہوں تو پہلے کیا کہیں گے؟ واہ جی واہ! ماشاء اللہ، سواد آگیا اور بعد میں کہتے ہیں: السلام علیکم! اچھا آپ کو بھی دعوت ہے!

جنت میں جائیں گے تو سب سے پہلے سبحان اللہ، سبحان اللہ اور پھر کہیں گے اچھا ماشاء اللہ یہ بھی آگیا، اب ایک دوسرے کو بھی سلام کریں گے اور فرشتے بھی سلام

کریں گے:

﴿سَلِّمْ قَوْلًا مِّن رَّبِّ رَحِيمٍ﴾<sup>185</sup>

اللہ بھی سلام کریں گے۔

اور جب یہ دومر حلے مکمل ہو جائیں گے تو پھر قرآن کہتا ہے:

﴿وَاحْزَنْدَعُوهُمْ إِنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾<sup>186</sup>

آخر میں کہیں گے: الحمد للہ اے اللہ! تیرا ہی کرم ہے، اللہ! تیرا ہی شکر ہے،

ہم جیسے نالائقوں پر تو نے کتنا کرم فرمادیا ہے۔

**عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم:**

یہ بات تو سمجھ آگئی ہے؟ میں یہ جملے سمجھتا رہوں تو اللہ کی قسم آپ وجد میں آئیں کہ قرآن نے کیسی عجیب بات فرمائی ہے! لیکن میں صرف ایک بات کہتا ہوں بتائیں سبحان اللہ کہنا عبادت ہے یا نہیں؟ عبادت ہے، اور سلام کہنا؟ یہ بھی عبادت ہے، اور الحمد للہ رب العالمین کہنا یہ سب عبادت ہیں۔ جنتی لوگ یہ کہاں کہیں گے؟ (جنت میں۔ سامعین) موت کے بعد یا پہلے؟ (موت کے بعد۔ سامعین) تو جب ہم یہ بات کہتے ہیں:

"الْأَنْبِيَاءُ أَحْيَاءُ فِي قُبُورِهِمْ يُصَلُّونَ".<sup>187</sup>

کہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں اور قبروں میں نماز پڑھتے ہیں، تو ہمارے خلاف لوگ آیت پڑھتے ہیں کہ قرآن کہتا ہے:

185- یسین 36:58

186- یونس 10:10

187- مسند ابی یعلیٰ الموصلی: ص 658 رقم الحدیث 3425

﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ﴾<sup>188</sup>

کہ اے نبی! موت تک عبادت کریں۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ حدیث تو قرآن کی آیت کے خلاف ہے، کیونکہ جب عبادت ہے ہی موت تک تو نبی قبر میں عبادت کیسے کرتا ہے؟ تو جب حدیث آیت کے مخالف ہو تو حدیث کو چھوڑ دیتے ہیں اور قرآن کو لے لیتے ہیں۔

یہ وہ شبہات ہیں جو یہ لوگ پیدا کرتے ہیں اور آپ سمجھتے ہیں کہ علامہ صاحب بڑے مفسر قرآن ہیں کہ حدیث کا انکار کر دیا! یہ عجیب مفسر قرآن ہے۔ جو حدیثوں کا انکار کرے وہ مفسر قرآن کیسے ہو سکتا ہے؟

اس سے پوچھو کہ اگر موت کے بعد عبادت نہیں ہے تو قرآن کیوں کہتا ہے کہ جنت میں جنتی کہیں گے: سبحان اللہ۔ جواب سمجھ میں آیا؟ (جی ہاں۔ سامعین)

دوسرا آپ ان کے مولوی صاحب سے پوچھیں کہ اب جواب دو کہ ایک آیت کہتی ہے کہ موت کے بعد عبادت نہیں ہے اور دوسری آیت کہتی ہے کہ جنت میں عبادت کریں گے۔ دونوں آیتوں کا ٹکراؤ ختم کرو! وہاں تو تمہارا کہنا تھا کہ حدیث قرآن کے خلاف ہے اور یہاں تو ایک آیت دوسری آیت کے خلاف ہو گئی۔

میں جواب دینے لگا ہوں، ذرا جواب سمجھنا! دنیا میں وہ عبادت ہے جسے آدمی کرے تو اجر ملتا ہے عبادت نہ کرے تو ثواب نہیں ملتا، اور موت کے بعد وہ عبادت ہے جس کے کرنے پر ثواب نہیں ہے بلکہ اس کے کرنے میں لذت اور مزے ہیں۔ یہ جو جنت میں سبحان اللہ کہیں گے یہ ثواب کے لیے کہیں گے؟ نہیں، یہ مزے لینے کے لیے کہیں گے اور دنیا میں ایک مرتبہ سبحان اللہ کہنے سے جنت میں درخت لگ جائے

گا۔ اب جنت میں سبحان اللہ کہنے پر درخت نہیں لگنا۔ یہ جو دنیا میں سبحان اللہ کہا ہے اس پر درخت لگا ہے۔ جب اس درخت کو دیکھے گا تو کہے گا: سبحان اللہ۔ اب یہ سبحان اللہ اس وجہ سے نہیں کہ ایک اور درخت لگے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ میں نے دنیا میں کہا تھا تو دیکھو اس سے کتنا بڑا درخت لگا ہے، اب یہ سبحان اللہ درخت لگوانے کے لیے ہے یا مزے لینے کے لیے؟ (مزے لینے کے لیے ہے۔ سامعین) ہم دنیا میں نماز پڑھتے ہیں۔ پڑھیں گے تو اجر ملے گا، نہیں پڑھیں گے تو گناہ ملے گا لیکن نبی قبر میں نماز کیوں پڑھتے ہیں؟ اس لیے کہ نماز پڑھیں گے تو مزا آئے گا۔ بات سمجھ میں آگئی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین)

میں یہ عقیدے اس لیے سمجھاتا ہوں کہ لوگ کہتے ہیں کہ ان کے عقیدے قرآن کے خلاف ہیں۔ بھائی قرآن پڑھیں تو سمجھ آئے کہ قرآن کے خلاف ہیں یا نہیں؟

اکابر علمائے دیوبند کا عقیدہ اور قرآن کے خلاف ہو! یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ہمارے اکابر قرآن کے خلاف نہیں تھے، قرآن کی خدمت کرنے والے تھے۔

**ذکر کرنے اور بیمار کے دعا کرنے کی ترتیب:**

﴿وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا بِخَتْمِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا﴾<sup>189</sup>

اللہ نے دو جگہوں پر عجیب بات فرمائی ہے۔ یہاں فرماتے ہیں کہ جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو انسان لیٹ کر بھی اللہ سے کہتا ہے: یا اللہ! میری تکلیف دور کر دے، پھر بیٹھ کر کہتا ہے: اللہ! میری تکلیف کو دور کر دے۔ پھر کھڑے ہو کر کہتا ہے: اللہ! میری تکلیف کو دور کر دے۔ ترتیب کیا رکھی ہے کہ پہلے لیٹے ہوئے، پھر بیٹھے

ہوئے اور پھر کھڑے ہوئے۔ اور جب ذکر کی باری آئی تو فرمایا:

﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَمًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ﴾<sup>190</sup>

اللہ کے ولی کھڑے ہو کر ذکر کرتے ہیں، تھک جائیں تو بیٹھ کر کرتے ہیں، پھر تھک جائیں تو لیٹ کے کرتے ہیں۔

ذکر میں قیام سے بیٹھنے کی طرف ترتیب ہے اور بیماری میں بیٹھنے سے کھڑے ہونے کی طرف ترتیب ہے۔ اللہ نے انسان کی فطرت بیان کی ہے کہ پہلے کھڑا ہوتا ہے، تھک جائے تو بیٹھ جاتا ہے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جاتا ہے، تو جب بیماری آئے تو لیٹا ہو تو بیٹھ جاتا ہے پھر کھڑا ہو کر دعا مانگتا ہے۔ تو دونوں کی ترتیب الگ الگ ہے۔ اللہ ہمیں ذکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

**گنجائش نکالو! کا خدائی جواب:**

﴿وَإِذَا تُلِيٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۖ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِيَّ أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِي ۚ إِنْ أَنَّبِعْ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۚ إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّيَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾<sup>(١٩١)</sup>

اللہ نے مشرکین کے اعتراض کا جواب دیا ہے۔ مشرکین کے سامنے جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھتے تھے تو مشرکین وہ بات کرتے تھے جو لوگ آج ہمیں کہتے ہیں۔ توجہ سے سمجھنا! ہمیں لوگ کہتے ہیں: مولانا صاحب! کوئی گنجائش نکالو! دسواں تو بدعت ہے کچھ تبدیلی کرو، ہماری مجبوری ہے۔ قل ہیں تو بدعت لیکن کچھ نہ کچھ گنجائش نکالو! جب اللہ کے نبی قرآن پڑھتے تھے تو مشرکین کہتے تھے ﴿اِئْتِ



بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا ﴿﴾ کہ یہ قرآن نہیں کوئی اور لاؤ، اچھا یہ نہیں ہو سکتا ﴿﴾ اَوْ بَدِّلْهُ ﴿﴾ یا تھوڑی سی تبدیلی کر دیں۔ اور یہی بات آج لوگ ہمیں کہتے ہیں: مولوی صاحب! ہم سمجھتے ہیں کہ بات ٹھیک نہیں ہے لیکن ہماری مجبوری ہے، کچھ گنجائش نکالیں۔ یہ بات جو مشرکین مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے آج وہی بات لوگ نبی کے ورثاء سے کہتے ہیں۔

اللہ کے نبی نے جواب دیا: ﴿مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَائِي نَفْسِي﴾ میں قرآن کو نہیں بدل سکتا، یہ میرے بس میں نہیں ﴿إِنْ أَتَيْتُمْ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ﴾ میں تو وحی کا پابند ہوں، ﴿إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ اگر میں نے وحی کو بدل دیا تو میں بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اس لیے یہ میرے بس میں نہیں ہے۔

ہم بھی امت سے یہ بات کہتے ہیں کہ ہم سے مسائل بدلنے کی توقع نہ رکھو! ہمارے بس میں نہیں ہے، عمل کر سکتے ہو تو کر لو، نہیں کر سکتے تو بدلنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔

آپ مجھے بتائیں! آپ علماء سے محبت کرتے ہیں یا نہیں؟ کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کرتے ہیں ناکہ آخرت میں ہمارے کام آئیں، اس لیے کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ہماری سفارش کریں، اس لیے ان کی بیعت کر لو، ان کے پیچھے نماز پڑھو، ان کے مدرسے میں چندہ دو! تو دنیا کے لیے یا آخرت کے لیے؟ (آخرت کے لیے۔ سامعین) لیکن یہ بتاؤ کہ آخرت میں تمہارے کام کون سے مولوی صاحب آسکتے ہیں؟ تمہاری سفارشیں کون کریں گے؟ حق گو علماء کرام! حق کو بیان کرنے والے، ملامت کی پروانہ کرنے والے اور قوم سے مفاد نہ رکھنے والے علماء یہ قیامت کے دن ہمارے سفارشی ہوں گے۔ دعا کریں کہ اللہ ہمیں ایسے علماء سے جوڑ کر رکھیں۔ (آمین)

## اولیاء کو دنیا اور آخرت میں بشارت:

اللہ رب العزت نے اولیاء کے بارے میں ایک جملہ فرمایا:

﴿لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ

اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی خوشخبری ہے اور آخرت میں بھی، اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ تو اللہ رب العزت اپنے ولی کو دنیا میں بھی بشارت دیتے ہیں اور آخرت میں بھی بشارت دیتے ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں بشارت یہ ہوتی ہے کہ وہ خود اچھا خواب دیکھتا ہے یا لوگ اس کے بارے میں اچھے خواب دیکھتے ہیں اور دوسری اس کی نشانی یہ ہے کہ بغیر مفاد کے لوگ اس سے پیار کرتے ہیں اور موت کے بعد اللہ اسے جنت کی نعمت عطا فرمادیتے ہیں۔

## جادو سے بچنے کے لیے وظیفہ قرآنی:

﴿فَلَمَّا آتَوْا قَانَ مَوْسَىٰ مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَابِغٌ لَّهُ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُصِيبُ عَمَلُ الْمُفْسِدِينَ ﴿٨٧﴾ وَ يُحَقِّقُ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ

الْمُجْرِمُونَ﴾

یاد رکھیں! میں ایک بات سمجھانے لگا ہوں۔ پوری دنیا میں آج ایک مسئلہ ہے کہ مولوی صاحب! کوئی حساب کتاب لگائیں، دکان نہیں چلتی ہے، جادو ہو گیا ہے، اثرات ہو گئے ہیں، فلاں عامل کے پاس گئے اس نے بتایا ہے۔ بھائی! جس عامل کے پاس بھی جائیں گے تو اس نے آپ کو بتانا تو ہے نا؟ وہ ایسی بات بتائیں گے کہ آپ واقعتاً پریشان ہوں تاکہ آپ ان سے علاج شروع کروادیں۔

اب بات سمجھیں: یہ دو آیتیں تین مرتبہ صبح اور تین مرتبہ شام کو پڑھیں گے تو جادو اثر نہیں کرے گا۔ اگر جادو ہو گا تو اس کی برکت سے بچاؤ ہو جائے گا۔ اس سے آسان نسخہ میں آپ کی خدمت میں کیا پیش کروں؟ لیکن آپ کو قیمت کیوں نہیں سمجھ آتی، اس لیے کہ مفت میں بتا دیا ہے۔

آپ مرکز میں تشریف لاتے، ہزار روپے خرچ کرتے، دو ہزار جیب میں ڈالتے اور میں پرچی میں لپیٹ کر دیتا تو آپ کہتے کہ مولوی صاحب نے بڑا بہترین نسخہ بتایا۔ آسان بات قوم کی سمجھ میں نہیں آتی نا!

بحمد اللہ میرا سالہا سال سے یہ معمول چلا آرہا ہے کہ میں صبح کو تین مرتبہ پڑھتا ہوں اور شام کو بھی پڑھتا ہوں اور آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بھی صبح و شام تین مرتبہ پڑھیں تو جادو اثر نہیں کرے گا۔ اگر ہو گا بھی تو اللہ اس کو اپنی قدرت سے ختم کر دیں گے۔

**آمین آہستہ کہنے کی دلیل:**

﴿قَالَ قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعَنَّ سَبِيلَ الَّذِينَ

لَا يَعْلَمُونَ﴾

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا ذکر فرمایا ہے اور میں نے اس سے ایک مسئلہ سمجھانا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی تھی: ﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾ اے اللہ! آپ نے فرعون اور اس کی قوم کو مال دیا ہے، دولت دی ہے لیکن یہ لوگ امت کو برباد کرتے ہیں، اللہ! ان کے مالوں کو مسخ کر کے رکھ دیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ ان کے جو باغات تھے وہ بھی تباہ ہو گئے، سارے

اموال کو خدا نے ختم کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یا اللہ! ان کے دلوں کو بھی سخت کر دے اب ایمان تو لائیں گے نہیں، اب ان کو عذاب دے دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا﴾ اے موسیٰ اور ہارون! ہم نے تم دونوں کی دعا قبول کر لی ہے۔ دعا مانگ رہے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اس دعا پر آمین فرما رہے ہیں حضرت ہارون علیہ السلام۔

توجہ رکھنا! امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں۔ باوجود شافعی مسلک ہونے کے۔ کہ اس آیت سے پتا چلا ہے کہ یہ جو امام نماز میں ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾ پڑھتا ہے اور ہم آمین کہتے ہیں یہ آمین دعا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا مانگتے ہیں اور حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے ہیں۔ اللہ نے دونوں سے فرمایا:

﴿قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمَا﴾ کہ ہم نے تم دونوں کی دعا قبول کر لی ہے۔ اس سے پتا چلا کہ آمین دعا ہے اور دعا کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے:

﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً﴾<sup>191</sup>

کہ جب تم دعا مانگو تو گڑ گڑا کر مانگو اور آہستہ مانگو۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ میں امام شافعی کا مقلد ہوں لیکن حق یہ ہے کہ آمین آہستہ کہنے پر قرآن امام اعظم ابو حنیفہ کا ساتھ دیتا ہے۔<sup>192</sup>

یہ چھوٹی دلیل نہیں ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے مقلد امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ جنہوں نے تیس جلدوں میں عربی میں تفسیر کبیر لکھی ہے وہ فرما رہے ہیں:

”وَنَحْنُ نَقُولُ بِهَذَا الْقَوْلِ“ کہ اس مسئلے میں ہم بھی وہی کہتے ہیں جو امام ابو حنیفہ

191۔ الاعراف 55:7

192۔ التفسیر الکبیر للرازی: ج 14 ص 107

فرماتے ہیں۔ اللہ ہمیں اپنے مسلک کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

**پیغمبر علیہ السلام کو تسلی:**

بس میں آخری آیت پر بات کر کے بات ختم کرتا ہوں:

﴿وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَخْضَمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ

الْمُحْكِمِينَ﴾

اللہ رب العزت نے اپنے پیغمبر سے فرمایا: میرے پیغمبر! آپ ان سے فرمادیں کہ اگر یہ اطاعت کریں گے تو اپنے لیے، اگر گمراہ ہوں گے تو عذاب ان پر ہوگا، اے پیغمبر! آپ وحی کی اتباع کریں اور صبر کرتے رہیں، اللہ فیصلہ فرمادیں گے اور اللہ بہترین فیصلہ فرمانے والے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے اور اس میں علماء کے لیے بھی ہدایت ہے کہ علماء کو چاہیے دلائل کے ساتھ اپنے مسلک کو بیان کرتے رہیں، اگر قوم قبول کرے تو ان کا شکریہ ادا کریں اور اگر قوم قبول نہ کرے تو زیادہ پریشان نہ ہوں۔ بس بات کہہ کر اللہ کے حوالے کر دیں۔

اللہ مجھے اور آپ سب کو اپنے مسلک کو سمجھنے کی اور عمل کرنے کی توفیق عطا

فرمائے۔ (آمین)

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة هود

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الرَّكِيبُ أَحْكَمْتُ آيَتُهُ ثُمَّ فَصَّلْتُ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ۝﴾

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ إِنِّي نَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ ﴿٢﴾﴾

### سورت کا تعارف:

آپ حضرات کے علم میں ہے کہ ترتیب کے ساتھ بحمد اللہ تعالیٰ ہمارا درس قرآن کریم شروع ہے۔ آج ہمارے درس قرآن کا عنوان ہے ”سورة هود کے مضامین“۔ یہ سورة مکی ہے۔ اس میں دس رکوع اور ایک سو تین آیات ہیں۔ سورة هود میں اللہ رب العزت نے کئی ایک انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ فرمایا ہے مثلاً حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب، حضرت ابراہیم، حضرت لوط اور حضرت موسیٰ علیہم السلام لیکن اس سورة کا نام ”سورة هود“ ہے۔ میں ہر سورت کی وجہ تسمیہ عرض کیا کرتا ہوں یعنی سورت کا نام رکھنے کی وجہ کیا ہے! اس سورة میں کئی ایک انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ تھا تو کسی ایک نبی کے نام پر اس سورة کا نام تجویز کر دیا گیا۔ یہ نام ہم خود تجویز نہیں کر سکتے اور اس میں دخل بھی نہیں دے سکتے کہ انبیاء تو کئی تھے تو فلاں نبی کے بجائے فلاں نبی کے نام پر سورة کا نام کیوں رکھا گیا ہے؟ بہر حال چونکہ اس میں حضرت ہود علیہ السلام کا مبارک تذکرہ ہے اس لیے سورة کا نام بھی سورة هود ہے۔

## قرآن اللہ کا کلام ہے... دلیل:

﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرِيَاتٍ وَّادْعُوا

مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٢﴾﴾

فرمایا: کیا یہ لوگ یہی بات کہتے ہیں کہ پیغمبر پاک نے قرآن کو خود ہی گھڑا ہے! آپ ان سے فرما دیجیے کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو تو تم بھی اس جیسی دس سورتیں بنا کر لاؤ اور اللہ کے سوا جس کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو بلا لو!

## حضور علیہ السلام کے دو معجزات:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی معجزات ہیں لیکن آپ کا سب سے معروف معجزہ قرآن کریم ہے۔ مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اپنی معروف تفسیر ”معارف القرآن“ میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو معجزے ایسے ہیں جو قیامت تک رہیں گے۔ ان میں ایک معجزہ قرآن کریم ہے اور ایک معجزہ اور ہے جو ہمارے مشاہدہ میں نہیں ہوتا۔ حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا معجزہ یہ ہے کہ جتنے لوگ حج کے لیے جاتے ہیں تو جن کا حج قبول ہو جائے تو ان کے کنکر اٹھانے نہیں پڑتے بلکہ خود بخود اٹھ جاتے ہیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو معجزات ہیں۔

اب بہت سے احباب کو تعجب ہوتا ہے کہ اب تو پتھر اٹھانے پڑتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ساروں کے حج قبول نہیں ہوتے، پہلے وہاں کنکر اٹھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا، حجاج حج کرتے کنکر پھینکتے اور جن کا حج قبول ہوتا ان کے کنکر خود بخود اٹھ جاتے لیکن اب کنکر کیوں اٹھانے پڑتے ہیں؟ جب آدمی کا کاروبار حرام کا ہو اور وہ حج کرے تو اللہ تعالیٰ سے اس حج کی قبولیت کی توقع رکھنا کتنی بڑی بیوقوفی کی بات

ہے! اس لیے انسان کو اپنے کاروبار پہ، اپنی تجارت پہ، اپنے اسباب پہ غور کرنا چاہیے اور پھر خود اندازہ لگالینا چاہیے کہ کنکر کیوں نہیں اٹھتے!

دوسرا معجزہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن کریم ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات عملی بھی ہیں اور علمی بھی ہیں، باقی انبیاء علیہم السلام کے معجزات عملی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا پھینکا تو وہ سانپ بن گیا یہ عملی معجزہ ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر عصا مارا تو بارہ چشمے نکل پڑے یہ عملی معجزہ ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب کسی نابینا کی آنکھوں پر ہاتھ لگاتے تھے تو اسے دکھائی دینے لگتا تھا یہ عملی معجزہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام تخت پر بیٹھے جہاں چاہتے وہ تخت اڑا کر لے جاتا یہ عملی معجزہ ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے جب عامل جاتا تو عمل اس کے ساتھ چلا جاتا ہے اور جب عالم جاتا تو علم کے نتائج چھوڑ کر جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل جو انبیاء علیہم السلام تھے ان کی نبوت قیامت تک نہیں تھی، ان کی نبوت کا وقت چونکہ محدود تھا اس لیے ان کے معجزے کا وقت بھی محدود تھا۔ ہمارے نبی کی نبوت چونکہ قیامت تک ہے اس لیے خدا نے معجزہ دیا تو ایسا دیا جو قیامت تک ہے۔

### علمی اور عملی معجزات:

عمل عامل کے ساتھ چلا جاتا ہے لیکن عالم اپنے علم کے اثرات کو چھوڑ کر جاتا ہے۔ ایک آدمی دنیا میں آیا، وہ نماز پڑھتا ہے، جب وہ فوت ہوتا ہے تو اس کے بعد اس کا تذکرہ ہی کر سکتے ہیں کہ یہاں فلاں نمازی تھے لیکن اب نہیں ہیں، وہ زندگی تھے اور نمازیں پڑھ رہے تھے تو نمازیں چل رہی تھیں، جب وفات پا گئے تو نمازیں بھی ختم ہو گئیں لیکن عالم جب زندہ ہوتا ہے تو تب بھی علوم ہوتے ہیں اور جب دنیا سے چلا جاتا ہے تو نتائج چھوڑ کر جاتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ فلاں عالم دنیا سے چلے گئے ہیں لیکن ماشاء



اللہ ہزاروں کی تعداد میں اپنے شاگرد دے کر گئے ہیں۔ تو باقی انبیاء علیہم السلام کے معجزات عملی ہیں اور ہمارے نبی کا معجزہ علمی ہے۔

اور اللہ رب العزت کی ترتیب اور سنت یہ ہے کہ نبی کو معجزات وہ دیتے ہیں جو اس دور میں کسی چیز کا عروج ہو، جس چیز کا لوہا دنیا مانتی ہو نبی اس کے مقابلے میں اپنا معجزہ پیش کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جادو کا چرچا تھا تو موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ وہ تھا جس نے جادو کو ختم کیا ہے، اس کے مقابلے سے جادو گر لاعاجز ہو گئے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں طب کا عروج تھا، بڑے بڑے طبیب ہوتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معجزے وہ دیے جس سے طبیب عاجز آجائیں۔ میں اس پر زیادہ بات نہیں کرتا لیکن اتنی بات کہتا ہوں کہ طبیب یہ تو کر سکتا ہے کہ دوا دے تو بخار ٹھیک ہو جائے، یہ تو کر سکتا ہے کہ دوا دے تو سر درد ٹھیک ہو جائے، یہ تو کر سکتا ہے کہ دوا دے تو بینائی لوٹ آئے لیکن مادر زاد اندھا ہو اور طبیب دوائی دے تو بینائی لوٹ آئے یہ بڑا مشکل ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام مادر زاد اندھے کا علاج فرماتے تھے یہ معجزہ تھا۔

یہ بھی ہم مان سکتے ہیں کہ مادر زاد اندھا ہو اور ڈاکٹر علاج کرے تو بینائی مل جائے لیکن آدمی دنیا چھوڑ دے اور طبیب اس میں روح ڈال دے یہ نہیں ہو سکتا، اور ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام قبر پر کھڑے ہو کر فرماتے: ”قُمْ يَا ذِي الْقُرْبَىٰ“ کہ اللہ کے حکم سے کھڑا ہو جا تو وہ مردہ زندہ ہو کر قبر سے باہر آجاتا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پرندے کی شکل بناتے اور اس پر اللہ کا نام لے کر پھونک مارتے تو وہ پرندہ جاندار بن کر اڑ جاتا، دنیا کی سائنس نے جتنی بھی ترقی کی ہو، بے جان میں جان نہیں ڈال سکتی۔

**معجزہ دینے کے متعلق اللہ کی ترتیب:**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عربی ادب کا چرچا تھا، ایک عام

عورت آتی اور سو سو اشعار پڑھ دیتی تھی، ایک آٹھ سال کا بچہ آتا اور سو سو شعر پڑھ دیتا تھا، ہزار ہزار شعروں کے قصیدے پڑھے جاتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے کچھ پہلے سات شعراء نے قصیدے لکھے اور کعبہ پر لٹکا دیے گئے، انہیں عربی زبان میں کہتے ہیں؛ سبع معلقہ۔ ”سبع“ کا معنی ہے سات اور ”معلقہ“ کا معنی ہے لٹکائے ہوئے، یہ کتاب ہمارے ہاں درس نظامی کے نصاب میں شامل ہے جس میں وہ قصیدے موجود ہیں۔ شاعر اٹھا اور اس نے قصیدہ لٹکا دیا کہ اس جیسا کلام ہے تو پڑھ کر دکھاؤ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے معجزہ وہ دیا کہ جس کے سامنے عربی کے ادیب بھی عاجز آ گئے، وہ مان گئے کہ یہ کلام بندے کا نہیں بلکہ یہ کلام بندے کے خدا کا ہے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کلام اترا تو سبع معلقہ کو اتار دیا گیا۔ اب اللہ کے پیغمبر دنیا میں تشریف لائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے معجزہ علمی بھی دیا اور ایسا معجزہ دیا کہ دنیا اس کے مقابلے سے عاجز آ گئی۔

### قرآن مجید کے تین چیلنج:

اللہ نے تدریجاً چیلنج کیا ہے۔ پہلے اللہ نے فرمایا:

﴿قُلْ لِّیْنَ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ

لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَہِیْرًا ﴿۱۹۳﴾

اے پیغمبر! آپ فرما دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جنات جمع ہو جائیں اور اس جیسا قرآن لانا چاہیں تو نہیں لاسکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کر لیں تب بھی نہیں لاسکتے!

جب اس چیلنج کو پورا کرنے سے سارے عاجز آ گئے تو اللہ تعالیٰ نے چیلنج تھوڑا

ساکم کر دیا کہ اگر یہ نہیں کر سکتے تو چلو پھر دوسرا چیلنج سنو!

﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرِيَاتٍ وَادْعُوا

مَنْ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٣٤﴾﴾<sup>194</sup>

اگر تم قرآن کو نہیں مانتے تو اس جیسی دس سورتیں تم لے آؤ، ہم مان لیں گے کہ تم قرآن کا مقابلہ کر سکتے ہو!

اس سے بھی عاجز آگئے تو اللہ نے اور تخفیف کی ہے اور فرمایا:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهِ﴾<sup>195</sup>

کہ اگر تم اس قرآن میں شک کرتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس جیسی ایک سورت ہی لے آؤ!

دنیا بھر کے عرب مل کر ایک چھوٹی سی سورت سورۃ الکوشکا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے تو پورے قرآن کا مقابلہ کیا کریں گے! اللہ رب العزت نے چیلنج دیا ہے تو پھر اس چیلنج کے سامنے کوئی نہیں بولا۔

خیر میں گزارش یہ کر رہا ہوں کہ سورۃ ہود کی ان آیات میں اللہ رب العزت نے قرآن کریم کی صداقت پر بات کی ہے۔

**حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ اور قوم کے دو طعن:**

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿١٢٥﴾﴾

حضرت نوح علیہم السلام نے جب قوم کو دعوت دی تو نوح علیہ السلام کا کلمہ پڑھنے والے بڑے بڑے لوگ نہیں تھے بلکہ غریب لوگ تھے، مسکین تھے، چھوٹے

چھوٹے کاروبار والے لوگ تھے۔ تو اس پر حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے نوح علیہ السلام کو طعنہ دیا:

**پہلا طعنہ... کہ نبی بشر کیوں ہے؟**

﴿فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَزَّلَكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا

نَزَّلَكَ إِلَّا تَتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا أَنْ يَبْذُلُوا الرَّأْيَ﴾

ان سرداروں نے پہلی بات یہ کی کہ ہم تجھے نبی کیسے مانیں؟ تو تو ہم جیسا انسان ہے، بھلا انسان بھی نبی ہو سکتا ہے؟

میں آپ کے ذوق کی تازگی کے لیے چھوٹا سا جملہ کہتا ہوں۔ ہمارے ہاں دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں جو غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے نبی کو دیکھا ہے اور ایک وہ جنہوں نے نہیں دیکھا۔ ذہن دونوں کا ایک ہی ہے۔ جنہوں نے دیکھا تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہیں بشر مانتے ہیں، نبی نہیں مانتے اور جنہوں نے نہیں دیکھا تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہیں نبی مانتے ہیں بشر نہیں مانتے۔ اس کا معنی کہ دونوں کا دماغ ایک ہی ہے کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا۔

**نبی بشر ہو تو امت کا درد سمجھ سکتا ہے!**

ہم کہتے ہیں کہ نبی ہوتا ہی بشر ہے، بشر نہ ہو تو اللہ تعالیٰ تاج نبوت اس کے سر پر رکھتے ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی قوم کا پیشوا ہوتا ہے، نبی قوم کا مقتدا ہوتا ہے اور پیشوا اور مقتدا وہی بن سکتا ہے جو قوم کے درد کو سمجھے اور قوم کا درد وہی سمجھتا ہے جس پر درد آئے، جو درد میں مبتلا نہ ہو وہ قوم کا درد سمجھے گا کیسے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں۔ نبی قوم سے کہے کہ روزہ رکھو! اب روزہ رکھنے سے بھوک بھی لگتی ہے، پیاس بھی لگتی ہے، اگر نبی ایسا ہو جسے بھوک اور پیاس لگتی ہی نہ ہو تو بتاؤ اس نبی کی بات

کون مانے گا؟ خدا نبی اس کو بناتے ہیں جس کو بھوک بھی لگے۔

آپ نے واقعہ سنا ہے اور کوئی کتاب ذہن میں نہ ہو تو فضائل اعمال تو ذہن میں ہے نا! اس میں آپ نے واقعہ پڑھا ہے کہ غزوہ خندق کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ خندق کھود رہے ہیں اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! بہت بھوک لگی ہے، کیا کریں؟ اور پیٹ سے کپڑا اٹھایا تو پتھر بندھا ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیٹ مبارک سے کپڑا اٹھایا تو دو پتھر بندھے ہوئے تھے، فرمایا: بھوک تمہیں لگی ہے تو مجھے بھی لگی ہے۔ اب اگر نبی بشر نہ ہوتے تو نہ بھوک لگتی تھی نہ صحابہ کرام کو مسئلہ سمجھ آتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹی کی تربیت کے بہت فضائل بیان فرمائے ہیں۔ اب بتاؤ! اگر کسی آدمی کی بیٹی نہ ہو اور اس کو پتا چلے کہ فلاں کی بیٹی کو طلاق ہو گئی ہے تو وہ اس درد کو کیا سمجھے گا؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیوں کو طلاق ہوئی ہے، ابو لہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیوں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما کو طلاق دی ہے۔ یہ طلاق رخصتی سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔ اب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے ہیں کہ جب بیٹی کو طلاق ہو تو باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے! اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد نہ ہوتی اور نبی فرشتہ ہوتے تو کیسے سمجھ آتا؟

### نابالغ اولاد فوت ہو تو اس کا اجر:

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد نابالغی کی حالت میں فوت ہوئی ہے۔ اب پیغمبر کو پتا ہے کہ نابالغ اولاد فوت ہو تو کیا دکھ ہوتا ہے۔

آپ کے علم میں ہے کہ ابھی ہمارے قریب ہیں مولانا ثناء اللہ صاحب ان کا چھوٹا بچہ فوت ہوا تھا تو میں تعزیت کے لیے گیا۔ وہ مجھے کہنے لگے: مولانا صاحب! مجھے

اب بات سمجھ آئی ہے کہ چھوٹا بچہ فوت ہو تو کیا تکلیف ہوتی ہے۔ پہلے کسی کے چھوٹے بچے کی وفات کا سنتے تھے تو ہم کہتے تھے کہ چھوٹا بچہ ہے، فوت ہو گیا ہے تو کیا ہوا؟ ہمیں دکھ نہیں ہوتا تھا لیکن جب اپنا بیٹا فوت ہوا ہے تو اب مجھے احساس ہوا ہے کہ چھوٹے بچے کے فوت ہونے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا: اب یہ حدیث سمجھنی کتنی آسان ہے کہ نابالغ بچہ فوت ہو اور والدین صبر کریں تو وہ جنت میں جانے کا سبب بنتا ہے! یہ بات سمجھ تب آتی ہے جب نابالغ بیٹا فوت ہو، جب فوت نہ ہو تو بات سمجھ میں نہیں آتی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اپنے گھر میں وضو کر رہا تھا، چھوٹے بچے میرے سامنے کھیل رہے تھے، غیر شعوری طور پر میرے ذہن میں بات آئی کہ نابالغ کے فوت ہونے پر اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تو اگر ہمارا بھی کوئی نابالغ فوت ہوتا... یہ بات ذہن میں آتی تو پھر میں اپنے آپ کو ایسا جھٹکا دیتا کہ یہ تو نے کیا بات سوچی ہے؟ یہ بات غیر شعوری طور پر دل میں آتی تھی جب فضائل پڑھتا تھا لیکن پھر جھٹکا دیتا کہ یہ کون سی بات ہے۔ ہمارا ایک نہیں بلکہ دو بیٹے اور ایک بیٹی؛ تین بچے نابالغی کی حالت میں فوت ہوئے ہیں۔

میں ساتھیوں سے کہتا ہوں کہ ہمیں دکھ تو ہوا ہے لیکن اب خوش ہیں، کیونکہ یہ ایک نصاب ہے جو اللہ نے ہمیں عطا فرمایا دیا ہے۔ دکھ تو ظاہر ہے کہ ہوتا ہے لیکن جب آخرت کے فضائل سامنے آتے ہیں تو بندے کو تسلی ہوتی ہے۔ میں اب بھی یہ بات بیوی کو سمجھاتا ہوں اور آپ بھی یہ بات سمجھیں! اگر بچہ نابالغ ہوا تو آپ کو پتا نہیں کہ وہ کافر ہو گا یا مؤمن ہو گا؟ پھر مؤمن ہو گا تو فاسق ہو گا یا نیک ہو گا؟ یہ ہمیں کچھ پتا نہیں۔ وہ خود جنت میں جائے گا یا باپ کو بھی گھسیٹ کر جہنم میں لے جائے گا یہ ہمیں بالکل معلوم نہیں اور اگر نابالغ فوت ہو اور وہ ہوا مسلمان کا بچہ تو اس نے کہاں

جانا ہے؟ جنت میں۔ وہ خود بھی جنت میں جائے گا اور والدین کو بھی لے کر جائے گا۔ اگر بالغ بیٹانیک ہو کر فوت ہو اور وہ جنت میں چلا بھی گیا تو اس کی جنت الگ ہوگی اور ماں باپ کی جنت الگ ہوگی! لیکن اگر نابالغ فوت ہو تو ماں باپ کے ساتھ رہے گا۔ توجو نابالغ بچوں کا لطف آتا ہے نا تو جس کے نہیں گئے وہ لطف نہیں اٹھا سکتا اور جس کے گئے ہیں وہ نابالغ بچوں کا لطف جنت میں ہمیشہ اٹھائے گا۔

اب بتاؤ! یہ اللہ کا کرم ہے یا اللہ کی طرف سے تکلیف ہے؟ (اللہ کا کرم ہے۔ سامعین) جس کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تو وہ گلہ کر گزرتے ہیں۔ اللہ کے بندے! آپ کے نابالغ بیٹے کو موت دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کو آپ سے بھی پیار ہے اور آپ کے نابالغ بیٹے سے بھی پیار ہے۔ اللہ آپ کو جنت میں ہمیشہ اکٹھا رکھنا چاہتے ہیں تو یہ پیار کی نشانی ہے یا نفرت کی نشانی ہے؟ (پیار کی نشانی ہے۔ سامعین)

اللہ نبوت کا تاج ہمیشہ بشر کے سر پر رکھتے ہیں۔ قوم کے سردار حضرت نوح علیہ السلام کو طعنہ دیتے کہ نوح! تو بھی بشر ہے اور ہم بھی بشر ہیں۔ بھلا بشر بھی نبی ہو سکتا ہے؟ وہ بھی کہتے تھے کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا اور یہ بھی کہتے ہیں کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا۔ اس دور کے مشرک اور اس دور کے مشرک کی سوچ ایک ہی ہے۔ فرق یہ تھا کہ اس دور کا مشرک بشر مانتا تھا لیکن نبی نہیں مانتا تھا اور آج کا مشرک نبی تو مانتا ہے لیکن بشر نہیں مانتا۔ موحد؛ بشر بھی مانتا ہے اور نبی بھی مانتا ہے۔ لہذا ہم دونوں چیزیں مانتے ہیں۔

**دوسرا طعنہ... کہ نبی کے متبعین چھوٹے لوگ کیوں؟**

اور دوسرا طعنہ انہوں نے یہ دیا:

﴿وَمَا نَزَّلَكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا لَنَا بَادِيَ الرَّأْيِ﴾

ہم تیری بات کیسے مانیں، ہمارے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے لوگ ہی کلمہ

پڑھتے ہیں، کوئی بڑا کلمہ پڑھتا تو پتا چلتا۔

## نوح علیہ السلام کا جواب:

جب قوم کے سردار یہ طعن دیتے تو نوح علیہ السلام فرماتے کہ دیکھو!

﴿يَقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّي وَآتَيْنِي رَحْمَةً مِّنْ

عِنْدِي فَعَمِيَّتْ عَلَيْكُمْ ۖ أَنْزَلْنَاكُمْ مِّنْهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كِرِهُونَ ﴿٢٦﴾﴾

فرمایا: یہ جو خدا نے مجھے رحمت دی ہے اگر تم نہ لو تو کیا میں تمہارے اوپر زبردستی مسلط کر دوں؟ ان کا مقصد یہ تھا کہ بڑے لوگ کلمہ پڑھیں تو ہم بھی پڑھ لیں گے، چھوٹے کلمہ پڑھیں تو ہم تیری بات کیسے مانیں؟

یہ بات یاد رکھ لیں کہ جب بھی کسی نبی نے قوم کو دعوت دی ہے تو عموماً ایسے ہوا کہ ابتدا میں پیغمبر کا کلمہ پڑھنے والے لوگ غریب ہوتے تھے اور بعد میں کلمہ پڑھنے والے امیر ہوتے تھے۔ مالدار بھی آئے ہیں جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلے کلمہ گو ہیں اور مالدار بھی ہیں، دکانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر لٹائی ہیں، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا مالدار بھی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھا ہے، دولت حضور علیہ السلام کے قدموں پر لٹائی ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ مکرمہ میں کلمہ پڑھنے والے حضرت بلال، حضرت صہیب، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین غریب اور غلام بھی تھے۔

آپ نے واقعہ پڑھا ہو گا کہ جب ابو سفیان شام کے علاقے میں گئے اور حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں وہاں اطلاعات پہنچی ہوئی تھیں تو بادشاہ نے بلا کر ابو سفیان سے کئی سوالات کیے۔ اس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ جس شخص نے دعویٰ نبوت کیا اس کے بارے میں بتاؤ کہ اس کے کلمہ گو بڑے بڑے لوگ ہیں یا غریب لوگ ہیں؟ ابو سفیان نے کہا: غریب غریب لوگوں نے کلمہ پڑھا ہے۔ اس



پربادشاہ ہر قل نے کہا: یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ سچا نبی ہے، سچے نبی کو پہلے غریب لوگ قبول کرتے ہیں، بڑے بعد میں قبول کرتے ہیں۔<sup>196</sup>

یہ ہمارا مشاہدہ اور تجربہ ہے اور عموماً ایسے ہوتا بھی ہے کہ علماء کو غریب آدمی سعادت سمجھ کر قبول کرتا ہے اور بڑا آدمی دیکھتا ہے کہ اس مولانا صاحب کی دعوت کرو جس کا حلقہ بڑا ہو، جس کا نام بڑا ہو، عام مولوی صاحب کی دعوت بڑا آدمی نہیں کرتا۔ غریب آدمی دین سمجھ کر قبول کرتا ہے اور دولت بھی پیش کرتا ہے لیکن بڑا آدمی عموماً ایسا نہیں کرتا! اللہ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

**نبی کو غیب کا علم نہیں:**

﴿وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ  
إِنِّي مَلَكٌ وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزْدَرِي أَعْيُنُكُمْ لَن يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا اللَّهُ أَعْلَمُ  
بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ إِنَّ إِيَّاذَا لِّلنَّاطِلِينَ﴾ (٢٠)

حضرت نوح علیہ السلام کو جب قوم کے سردار کہتے تھے کہ تمہارے ساتھ غریب آدمی ہیں، بڑے لوگ نہیں ہیں تو نوح علیہ السلام نے کتنا پیارا جواب دیا، فرمایا: ﴿وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ﴾ میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ میرے پاس خزانے ہیں! ﴿وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ﴾ میں کب کہتا ہوں کہ میں غیب کی خبریں جانتا ہوں! ﴿وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ﴾ میں کب کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں! ﴿وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزْدَرِي أَعْيُنُكُمْ لَن يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا﴾ میں کب کہتا ہوں کہ جو تمہاری نگاہ میں چھوٹے ہیں خدا ان کو کچھ نہیں دے گا!

لیکن جو میرے پاس آیا ہے وہ دولت کے لیے نہیں آیا، تمہارے ذہن میں آیا کہ یہ لوگ غریب ہیں اور میرے پاس پیسوں کے لیے آئے ہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ جو میرے پاس آیا ہے وہ خالص اللہ کے دین کے لیے آیا ہے، ان کے دل کی حالت خدا جانتا ہے، جو جس مقصد کے لیے آیا وہ اس کو ضرور ملے گا، نہ ہم خزانے کی بات کرتے ہیں کہ خزانے والوں سے دوستی لگائیں، نہ فرشتہ ہونے کی بات کرتے ہیں کہ اس بشر کو چھوڑ کر ملائکہ سے تعلق جوڑیں، نہ علم غیب کی بات کرتے ہیں۔ جس بات کا خدا نے حکم دیا ہے اس کا میں بھی پابند ہوں اور میرے ماننے والے بھی پابند ہیں۔ نوح علیہ السلام نے زیادہ صفائیاں نہیں دیں بلکہ صاف صاف مسئلہ اور موقف ان کے سامنے بیان فرمادیا۔

### حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کا انجام:

﴿وَأَوْحَىٰ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۖ﴾ وَأَصْنَعِ الْفُلَكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحَيْنَا وَلَا تَخَاطِبُنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۖ إِنَّهُمْ مُّعْرَقُونَ ﴿٦٢﴾﴾

حضرت نوح علیہ السلام کتنے بڑے نبی ہیں اور بیٹا کتنا بڑا کافر ہے! باپ کی صف دیکھو اور بیٹے کی صف دیکھو! باپ کا حلقہ دیکھو اور بیٹے کا حلقہ دیکھو! حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے جب شرک کی انتہا کر دی تو نوح علیہ السلام نے بھی بد دعا کی کہ اے اللہ! مجھے لگتا ہے اب یہ قوم ماننے والی نہیں ہے، آئندہ ان کی نسل بھی چلے گی تو شرک ہی کرے گی۔ اے اللہ! ان کو ختم فرما دے۔ اللہ رب العزت نے حکم دیا کہ آپ کشتی بنائیں! اب کشتی خشکی میں بن رہی ہے، ادھر قوم ان کا مذاق اڑا رہی ہے کہ کون سا پانی ہے جو آپ کشتی بنا رہے ہیں؟ حضرت نوح علیہ السلام ان کی باتیں سن بھی

رہے ہیں اور وحی کے مطابق کشتی بنا بھی رہے ہیں۔ جب کشتی مکمل ہو گئی تو اب آسمان سے پانی برسا، زمین سے پانی نکلا، اب پانی ہی پانی ہے۔ نوح علیہ السلام خود کشتی میں بیٹھے ہیں، ان کے ماننے والے بھی اسی یا بیاسی لوگ تھے وہ بھی ساتھ بیٹھے اور سب جانوروں میں سے ایک ایک جوڑا بھی ساتھ رکھ لیا۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کے بارے میں بڑے متفکر تھے۔ اپنے بیٹے کو آواز دی کہ بیٹا! اب بھی وقت ہے، اب بھی وقت ہے، بیٹے نے باپ کو جواب دیا:

﴿سَأُوتَىٰ إِلَىٰ جَنبِیْ یَعْصِمُنِی مِنَ الْمَآءِ ۖ﴾

اباجی! میں آپ کی بات نہیں مانوں گا، میں پہاڑ پر چڑھ کر بچ جاؤں گا۔  
نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے فرمایا:

﴿لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ﴾

میرے بیٹے! یہ عذاب ہے، اس سے پہاڑ نہیں بچا سکتے، اب بھی وقت ہے کشتی میں آکر بیٹھ جا۔ باپ بلا رہا ہے لیکن بیٹا بات نہیں مانتا۔ اب کیا ہوا!

﴿وَحَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ﴾

ایک موج آئی اور باپ نے بیٹے کو دیکھنا چھوڑ دیا، بیٹا اب غرق ہونے والوں میں سے ہو گیا۔ جب یہ غرق ہوا تو اللہ پاک نے زمین سے فرمایا:

﴿يَا أَرْضُ ابْلَعِی مَآءَکِ وَیَسْمَآءُ اقْلَعِی وَغِیْضَ الْمَآءِ﴾

اے زمین! اپنا پانی پی لے اور اے آسمان! تھم جا! اب یہ پانی خشک ہونا شروع ہوا۔

**حضرت نوح علیہ السلام کی درخواست اور اللہ کا جواب:**

نوح علیہ السلام اپنے بیٹے کے بارے میں فکر مند تو تھے۔ اللہ سے دعا گئی:

﴿رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ﴾

اے میرے رب! میرا بیٹا بھی تو میرے اہل والوں میں سے ہے، آپ کا وعدہ تھا کہ آپ مجھے اور میرے اہل کو نجات دیں گے، اللہ! میرے بیٹے کو نجات دے دیں۔

اللہ پاک نے فرمایا:

﴿يُنَوِّرُ إِنَّهُ لَيَسَّ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾

اے نوح! آپ نبی ہیں، آپ کا اہل وہ ہے جو کلمہ گو ہے، جو کلمہ گو نہیں ہے وہ آپ کا اہل نہیں ہو سکتا، اس کے اعمال ٹھیک نہیں ہیں، اس لیے ”فَلَا تَسْأَلْنِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ“ آپ کو اس مسئلے کا پتا نہیں ہے اس لیے ہم نے بتا دیا ہے، اب اس مسئلے کے بارے میں ہم سے بات نہ کریں۔ اس کے بعد بھی کہا تو پھر آپ کا نقصان ہو گا۔ نوح علیہ السلام نے پھر دوبارہ نہیں کہا کہ میرے اس بیٹے کو نجات دے دیں!

### نجات کا مدار ایمان و اعمال ہیں:

پتایہ چلا کہ باپ جتنا بھی بڑا ہو، باپ کی بنیاد پر اولاد کی نجات نہیں ہوتی، نجات ہوتی ہے تو ایمان اور اعمال کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی لخت جگر فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو یہ بات سمجھائی ہے:

يَا فَاطِمَةُ! أَنْقِذِي نَفْسَكَ مِنَ النَّارِ فَإِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ

شَيْئًا. <sup>197</sup>

اے میری بیٹی فاطمہ! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر کرو،

کیونکہ میں تمہیں اللہ کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا! یعنی صرف اسی بات پر ناز نہ کرنا کہ میں حضور کی بیٹی ہوں، اگر نجات ہوگی تو صرف نبوت کی بیٹی ہونے کی وجہ سے نہیں ہوگی بلکہ نجات ہوگی تو ایمان و اعمال کی بنیاد پر ہوگی۔

لیکن ایک بات ذہن نشین فرمائیں کہ اس کا تعلق صرف ایمان سے ہے کہ اگر اولاد کا ایمان نہیں تو پھر والدین کے ایمان کی بنیاد پر اولاد کی نجات نہیں ہو سکتی۔ ہاں اگر اولاد میں ایمان موجود ہو اور اعمال بھی ہوں لیکن اعمال میں کچھ کمی ہو تو والدین کی وجہ سے اولاد جنت میں جائے گی۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے یہ بات سمجھائی ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ﴾<sup>198</sup>

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کی اولاد ہے تو ہم ان لوگوں کے ایمان کی وجہ سے ان کی اولاد کو ماں باپ کے ساتھ ملا دیں گے۔ یعنی اولاد کا بھی ایمان ہے اور ماں باپ کا بھی ایمان ہے لیکن اولاد کے اعمال میں کمی تھی، ان اعمال کی بنیاد پر وہ اولاد اپنے والدین کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی، اب والدین کا جی چاہتا ہے کہ ہماری اولاد ہمارے ساتھ آئے۔ اولاد میں ایمان چونکہ موجود تھا اور والدین ان کے چونکہ جنتی ہیں اور جنتی کی خواہش اللہ پوری کرتے ہیں۔ ان کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اللہ اپنے کرم سے اس اولاد کو والدین کے ساتھ ملا دیں گے لیکن یہ ضروری ہے ان میں ایمان موجود ہو۔

خیر حضرت نوح علیہ السلام نے دعا مانگی، اللہ پاک نے بتا دیا کہ اے نوح! اگر

آپ کی اولاد کے اعمال ٹھیک نہیں ہیں تو پھر وہ آپ کے ساتھ نہیں ہے، نبی کی اولاد عمل کی بنیاد پر پیغمبر کی اہل بنتی ہے۔

آپ درود پاک پڑھتے ہیں ”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ“، بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس آل محمد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر کلمہ گواہی شامل ہے، ہر وہ شخص جو نبی کا کلمہ پڑھے وہ روحانی طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد شمار ہوتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے روحانی باپ ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہماری مائیں ہیں۔ تو جب روحانی اولاد ہیں تو پھر درود میں شامل کیوں نہیں ہوں گے؟! ایک ہے نبی کی اولاد جسمانی اور ایک ہے نبی کی اولاد روحانی۔ تو مقام؛ روحانیت کی بنیاد پر ہوتا ہے، مقام؛ جسمانیت کی بنیاد پر نہیں ہوا کرتا۔

### حضرت ہود علیہ السلام کی تبلیغ:

﴿وَالِیٰ عَادٍ اٰخَاهُمْ هُوْدًا ۙ قَالَ یَقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهِ غَیْرِہٖ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرَوْنَ ۚ﴾ یَقَوْمِ لَا اَسْأَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا ۙ اِنْ اَجْرِیْ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ۙ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾﴾

ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا۔ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا: اے میری قوم! اللہ کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں، تم لوگوں نے تو محض جھوٹی باتیں گھڑ رکھی ہیں۔ اے میری قوم! میں اس دعوت و تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو اس ذات کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کیا تم لوگ یہ بات سمجھتے نہیں ہو؟

حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا: ﴿لَا اَسْأَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا﴾ میرا مقصد مزدوری تو نہیں ہے! میرا مقصد پیسے کمانا تو نہیں ہے! مجھے میری محنت کا اجر خدا

نے دینا ہے۔ میں اکثر احباب سے کہتا ہوں کہ اللہ پاک دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے لیکن پیشہ بنانے کی توفیق عطا نہ فرمائے۔

### لوط علیہ السلام کی قوم کا گناہ:

﴿قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا لَنَا فِي بَنَاتِكُمْ مِنْ حَقٍّ وَانَّا لَنَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ﴾

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بدترین عادت یہ تھی کہ وہ مردوں کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا: ﴿يَقَوْمُ هَؤُلَاءِ بَنَاتٍ هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ﴾ کہ یہ میری بیٹیاں موجود ہیں یعنی جو نبی کی امت ہوتی ہیں وہ ساری نبی کی بیٹیاں ہوتی ہیں۔ فرمایا: میری بیٹیاں ہیں ان سے نکاح کرو، تم لوگ بدترین حرکت کیوں کرتے ہو؟ تو لوط علیہ السلام کی قوم نے جواب دیا:

﴿قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا لَنَا فِي بَنَاتِكُمْ مِنْ حَقٍّ﴾

اے لوط! تو جانتا ہے کہ ہمیں عورتوں کے ساتھ کوئی غرض نہیں ہے، ہماری غرض اور ہے۔ پھر حضرت لوط علیہ السلام نے بد دعا کی تو خدا نے عذاب نازل کیا، بستی کو الٹ پلٹ دیا، برباد کر دیا۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی اس قوم کے ساتھ ہلاک ہوئی۔ ان کے ہاں جب کوئی مہمان آتا تو قوم کے یہ شیطان لوگ اسے بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس فرشتے خوبصورت بے ریش لڑکوں کی شکل میں آئے۔ وہ لوگ وہاں پر پہنچ گئے۔

بیوی نے ان لوگوں کو اطلاع کر دی کہ آج لوط علیہ السلام کے ہاں جو تم چاہتے ہو وہ موجود ہیں۔ قوم آئی۔ حضرت لوط علیہ السلام نے کہا: خدا سے ڈرو، ہماری قوم کی بیٹیوں سے نکاح کرو، یہ ظلم میرے ساتھ نہ کرو، مہمانوں میں مجھے رسوا نہ کرو! فرشتوں نے کہا: آپ گھبراہٹ میں مت، ہم انسان نہیں ہیں ہم چاہتے ہیں کہ اس قوم پر

حجت پوری ہو جائے، پھر دیکھیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟! آپ ان کو چھوڑیں اور صبح سے پہلے ان کی بربادی کا منظر دیکھیں۔ یہ اس آیت کا پس منظر تھا۔

### ایک علمی لطیفہ:

یہاں ایک علمی لطیفہ بھی سن لیں۔ علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اس پر ایک لطیفہ لکھا ہے کہ ایک طفیلی آدمی تھا۔ اس کے محلہ میں شادی ہوئی اور اس کا جی چاہا کہ میں بھی کھانے میں پہنچ جاؤں۔ دعوت اس کو تھی نہیں تو وہ پیچھے سے دیوار پھلانگ کر چھت پر چڑھا اور جہاں زنانہ خانہ تھا وہاں پہنچ گیا۔ تو شادی والوں نے کہا: اوئے ادھر تو عورتیں ہیں! اس نے کہا ”لَقَدْ عَلِمْتُ مَا لَنَا فِي بَنَتِكَ مِنْ حَقِّ“ تم جانتے ہو کہ مجھے عورتوں سے کوئی غرض نہیں ہے، یعنی میرا مقصد کوئی اور تھا، وہاں دوسری طرف چونکہ مرد ہیں اور وہ کھانا نہیں دیں گے اس لیے میں ادھر گھسا ہوں۔ ہمارے بعض علماء بہت سے علمی لطائف لکھتے ہیں تاکہ لوگوں کو بات سمجھ میں آجائے۔

### اتباع محمود اور اتباع مذموم:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٢١﴾ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاتَّبَعُوْهُ أَمْرٌ فِرْعَوْنَ ۖ وَمَا أَمْرٌ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ ﴿٢٢﴾﴾

ہم موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس اپنی آیات اور واضح دلائل دے کر بھیجا لیکن انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی بات ماننے کے بجائے فرعون کی بات مانی، حالانکہ فرعون کی بات درست نہیں تھی۔

یہاں ایک بات سمجھیں کہ جب ہم کہتے ہیں کہ علماء اور فقہاء کی بات مانو تو غیر مقلد کہتے ہیں کہ اتباع کرو لیکن تقلید نہ کرو، وہ کہتے ہیں کہ نبی کی بات مانو تو اتباع ہوتی ہے اور اگر امام کی بات مانو تو تقلید ہوتی ہے، تقلید باطل ہے اور اتباع ٹھیک ہے۔



ہم انہیں کہتے ہیں کہ تم نے قرآن کو پڑھا نہیں ہے، اگر پڑھا ہے تو پھر سمجھا نہیں ہے۔ قرآن کریم میں کئی مقامات پر ”اتباع“ لفظ آیا ہے۔ ہمیشہ نبی کی بات ماننے کو اتباع نہیں کہتے بلکہ اگر غلط بات کو مانیں تو اس کو بھی اتباع کہا گیا ہے۔ یعنی نیک بات مانیں تو وہ بھی اتباع ہے اور بری بات مانیں تو وہ بھی اتباع ہے۔

فرق صرف یہ ہے کہ نیک کی مانیں تو اتباع محمود ہے اور برے کی مانیں تو اتباع مذموم ہے۔ قرآن کریم کو نیک کی اتباع کرنا پسند اور برے کی اتباع کرنا پسند نہیں ہے۔ اب اسی آیت میں دیکھیں کہ فرعون کی بات ماننے کے لیے لفظ ”اتباع“ استعمال کیا، فرمایا: ﴿فَاتَّبَعُوا أَمْرَ فِرْعَوْنَ﴾ کہ ان لوگوں نے فرعون کے حکم کی اتباع کی۔ اس لیے ہم نے کہا کہ ہمیشہ نبی کی بات ماننے کو اتباع نہیں کہتے، فرعون کی بات مانیں تو اسے بھی اتباع کہتے ہیں۔ ہاں فرق یہ ہے کہ اچھی اتباع ہو تو ٹھیک ہے اور بری اتباع ہو تو غلط ہے۔

### سورت ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا:

﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ

بَصِيرٌ﴾

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈاڑھی میں تقریباً بیس بال مبارک سفید ہو گئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ کو کس چیز نے بوڑھا کر دیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

”شَيَّبَتْنِي هُودٌ وَأَخَوَاهُ“

کہ مجھے سورت ہود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! سورت ہود کی کس آیت نے؟ فرمایا: اس آیت نے:

## ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ﴾

کہ تم ڈٹ جاؤ! اس آیت کے غم نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔<sup>199</sup>

آپ کہیں گے کہ اس میں تعجب والی کون سی بات ہے؟ ساٹھ سال کے بندے کے بال تو سفید ہو ہی جاتے ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ ساٹھ سال کا امتی نہیں ہے بلکہ یہ نبی ہے، نبی میں کتنی طاقت ہوتی ہے؟ یہ بات سمجھنا! دو روایتیں ہیں۔ اللہ ایک نبی کو جنت کے چالیس مردوں کی طاقت دیتے ہیں اور ایک جنتی مرد کی طاقت دنیا کے سو مردوں کے برابر ہوتی ہے۔ اس حساب سے ایک نبی میں کتنے مردوں کی طاقت ہوئی؟ چار ہزار۔ اب بتاؤ! ہمارے جیسا بندہ ہو اور ساٹھ سال کی عمر میں بال سفید ہوں تو تعجب کی کوئی بات نہیں اور جس میں چار ہزار مردوں کے برابر طاقت ہو تو اس کی ڈاڑھی میں چند بال سفید ہوں تو یہ تعجب کی بات ہے۔

میں نے پورا مسئلہ اس لیے کھولا ہے کیونکہ منکرین حدیث اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ روایت ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ساٹھ یا باسٹھ سال ہے اور اس عمر کا بندہ تو بوڑھا ہوتا ہی ہے، اس کے بال تو سفید ہو ہی جاتے ہیں، پھر صحابہ کے تعجب کی کون سی بات ہے؟ اس لیے میں نے وضاحت کر دی ہے۔

### مستشرقین کے اعتراض کا جواب:

اچھا! اس سے آپ ایک اور مسئلہ سمجھیں۔ مستشرقین اور کفار نے اعتراض کیا، العیاذ باللہ، العیاذ باللہ، نقل کفر کفر نباشد۔ اللہ ہمیں محفوظ فرمائیں، سچی بات ہے ایسی باتیں نقل کرتے ہوئے بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے لیکن بات سمجھانے کے لیے میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مستشرقین، ملحدین اور کفار نے

اعتراضات کیے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گیارہ نکاح کیے اور بیک وقت نو نکاح کیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ، العیاذ باللہ، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم میں جنسیت کا بڑا غلبہ تھا، عام آدمی کے لیے ایک نکاح مشکل ہوتا ہے اور حضور نے گیارہ کیے۔

ہم نے کہا: کم عقلو! تم بات سمجھتے نہیں ہو۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ تعالیٰ نے چار ہزار مردوں کے برابر طاقت رکھی ہے اور آپ کی بیویاں گیارہ ہیں۔ اب بتاؤ! پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے خواہشات کو دبایا ہے یا ان پر عمل کیا؟ دبایا ہے۔ تو یہ تعریف کی چیز تھی اور تم نے اعتراض کر دیا۔ حیرت کی بات ہے!

**بھائی میرے لیے عافیت ہی مانگو!**

اور میں کئی بار یہ عرض کر چکا ہوں کہ جب کوئی مجھے استقامت کی دعا دیتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ استقامت کی دعا نہ دو بلکہ عافیت کی دعا دو۔ کئی بار ایسے ہو اہے کہ میں جلسے سے فارغ ہوا ہوں اور کوئی دھڑلے دار بیان ہوا ہو تو لوگ فوراً کہتے ہیں کہ ماشاء اللہ! اللہ آپ کو استقامت دے۔ میں انہیں کہتا ہوں کہ استقامت کا معنی یہ ہے کہ ابھی جو میں نے بیان کیا ہے اس کے خلاف ایف آئی آر درج ہو، پھر میں تھانے جاؤں، پھر جیل کاٹوں اور پھر آکر وہی تقریر کروں جو پہلے کی ہے یہ استقامت ہے، اور عافیت یہ ہے تقریر بھی کریں، شاباش بھی ملے، کھانا بھی اچھا ملے، پیسے بھی اچھے ملیں، پھر دوبارہ وہی بیان کریں یہ عافیت ہے۔

اب بتاؤ! استقامت ٹھیک ہے یا عافیت ٹھیک ہے؟ (عافیت ٹھیک ہے۔  
 سامعین) اس لیے آپ میرے لیے عافیت کی دعا کریں۔ اللہ ہمیں عافیت کے ساتھ  
 دین کا کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

بعض حضرات نے استقامت کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ کوئی مشکل ہی نہ

آئے، بندہ مشکلات کے بغیر ہی سیدھی راہ پر چلتا رہے۔ اس معنی کو دیکھا جائے تو پھر درست ہے۔

### امتی کے دل کو مضبوط کرتے ہیں امتی کے واقعات سے:

﴿وَكَلَّا نَقْصُ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُنْثِيَتْ بِهِ فُؤَادَكَ﴾<sup>200</sup>

اے میرے پیغمبر! ہم آپ کے سامنے گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے کچھ واقعات بیان کرتے ہیں تاکہ آپ کا دل پختہ ہو، آپ کا دل مضبوط ہو۔

اس سے ایک مسئلہ ذہن میں رکھیں! نبی کے دل کو مضبوط رکھنے کے لیے انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان ہوتے ہیں۔ ہم امتی ہیں اور امتی کے دل کو مضبوط رکھنے کے لیے امتیوں کے واقعات بیان ہوتے ہیں۔ اس لیے اکابر اور بزرگوں کا تذکرہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ (کرنا چاہیے۔ سامعین)

آج ایک نئی وبا ہمارے ہاں پھیلانی جا رہی ہے کہ جب ہم بزرگوں کے واقعات بیان کرتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ بزرگوں کے واقعات کیوں بیان کرتے ہو؟ انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کرو!

ہم کہتے ہیں کہ اگر مخاطب نبی ہے تو نبی کے دل کو پختہ رکھنے کے لیے نبیوں کے واقعات بیان فرمائے جاتے ہیں۔ نبی سے فرمایا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو دیکھو! انہیں تخت ملا ہے تب بھی اپنی بات پر قائم رہے ہیں، ایوب علیہ السلام کو دیکھو! کتنے بیمار ہیں تب بھی حق بیان کیا ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کو دیکھو! بادشاہ بنے ہیں تب بھی حق بیان کیا ہے، یحییٰ علیہ السلام کو دیکھو! ٹکڑے ہوئے ہیں تب بھی حق بیان کیا ہے تو اے پیغمبر! آپ نے بھی ثابت قدم رہنا ہے جس طرح یہ انبیاء علیہم

السلام ثابت قدم رہے۔

میں نے کہا: اگر ہم یہ واقعات بیان کریں تو لوگ فوراً کہہ دیں گے کہ مولانا صاحب! وہ تو نبی تھے اس لیے حق پر قائم رہے اور ہم تو نبی نہیں ہیں، ہم تو امتی ہیں، ہم کیسے حق پر قائم رہیں؟ اس لیے ہم ان لوگوں کے سامنے پھر بزرگوں کے حالات پیش کرتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ حضرت شیخ زکریا کو دیکھو! حضرت مولانا الیاس دہلوی کو دیکھو! مولانا تھانوی کو دیکھو! مولانا شیخ الہند کو دیکھو! مولانا قاسم نانوتوی کو دیکھو! رحمہم اللہ تعالیٰ۔

نبی کے دل کو مضبوط کرنے کے لیے نبی کو پیش کرتے ہیں، امتی کے دل کو مضبوط کرنے کے لیے امتی کو پیش کرتے ہیں۔ اس لیے ہم انبیاء علیہم السلام کے واقعات بھی مانتے ہیں، اکابر اور مشائخ کے واقعات بھی مانتے ہیں۔ اللہ ہم سب کو اپنے اکابر کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

## سورة یوسف

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الَّذِي تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ۝ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝﴾

ترتیب درس قرآن کے حوالے سے ہماری آج کی اس سورت کا نام ”سورة یوسف“ ہے۔ اس سورت کے بارہ رکوع اور ایک سو گیارہ آیات ہیں۔

### سورت یوسف کا شان نزول:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چرچا مکہ سے مدینہ منورہ پہنچا تو مدینہ منورہ کے یہودی حسد کی آگ میں جلنے لگے۔ وہ اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ اس نبی کا دائرہ نبوت وسیع ہے اور آپ نے مکہ کے بعد مدینہ منورہ آنا ہے۔ تو انہوں نے طرح طرح کی شرارتیں شروع کیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کیے۔ ان کی شرارت کا طرز مشرکین مکہ سے الگ تھا۔ مشرکین مکہ جاہل تھے اور یہود مدینہ علم والے تھے۔ جہلا کی شرارتیں اپنی ہوتی ہیں اور علماء کی شرارتیں اپنی ہوتی ہیں۔ جاہل اپنے انداز سے محنت کرتا ہے اور علم والا اپنے طرز سے حملہ کرتا ہے۔ جاہل علمی بات تو کہہ نہیں سکتا البتہ وہ راستہ روکنے کے لیے طاقت کا استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح جاہل علمی بات نہیں

کہہ سکتا بلکہ وہ الزامات لگاتا ہے۔ تو مکے والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر الزامات لگائے کہ آپ معاذ اللہ جادوگر ہیں، کاہن ہیں، شاعر ہیں۔

مدینہ میں چونکہ یہود تھے۔ ان کا طرز مخالفت یہ تھا کہ مختلف قسم کے علمی شبہات ڈالتے۔ ان کا ذہن یہ ہوتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی ہیں، جواب نہیں دے سکیں گے۔ تو ہم کہہ دیں گے کہ کیسا نبی ہے جس کو مسائل کا پتا ہی نہیں ہے! اور اعتراضات بھی ان کے ایسے ہوتے تھے کہ جن کا تعلق بھی بظاہر نبوت کے ساتھ نہیں ہے۔

### یہودِ مدینہ کا سوال:

یہودِ مدینہ نے مشرکین مکہ کے ذریعے آپ سے سوال کیا کہ بتائیں! وہ کون سا نبی ہے جس کا بیٹا شام سے مصر پہنچا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آگئی اور پوری سورت یوسف نازل ہو گئی۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری سورت سنادی۔ انہوں نے چھوٹا سوال کیا ہے اور جواب کتنا لمبا دیا گیا۔

اس سورت میں اللہ رب العزت نے فرمایا:

﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾

قصے تو ہم نے اور بھی بیان کیے ہیں لیکن یوسف علیہ السلام کا قصہ سب سے اچھے انداز میں بیان ہوا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ میں زیادہ وجوہ پر بات نہیں کرتا۔

میں کئی مرتبہ آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں کہ میں آپ کے وقت کا بہت خیال کرتا ہوں۔ اگر میں نے بیان اڑھائی تین گھنٹے کا کر دیا تو آئندہ درس میں آپ نے سوچنا ہے کہ مولانا کے درس میں جائیں یا نہ جائیں؟ درس کے بعد چائے نہیں، چاول بھی نہیں، کھانا بھی نہیں ہے تو اتنا لمبا بیان کون سنے؟ اس لیے میں آپ کی رعایت کرتے ہوئے بیان تھوڑا کرتا ہوں، صرف ضروری ضروری باتیں کرتا ہوں،

لمبی باتیں چھوڑ دیتا ہوں۔

تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ باقی انبیاء علیہم السلام کے قصے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیان فرمائے ہیں اور یکجا کسی نبی کا قصہ بیان نہیں فرمایا، کہیں تھوڑا سا کہیں پھر تھوڑا سا، تو جتنی ضرورت ہو اتنا بیان کر دیا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کا پورا قصہ اللہ نے بالترتیب ایک جگہ بیان کیا ہے اور آغاز کہاں سے کیا ہے؟ یوسف علیہ السلام کے خواب سے۔

### حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ:

یوسف علیہ السلام کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں۔ ایک بیوی سے دس بچے ہیں اور دوسری بیوی سے صرف دو ہی بیٹے ہیں۔ ایک کا نام حضرت یوسف اور دوسرے کا نام بنیامین ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بچپن میں خواب دیکھا:

﴿إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ زَايَتْهُمْ لِي سَجْدِينَ ﴿٢٥﴾﴾

﴿النَّعَرَ زَايَتْهُمْ لِي سَجْدِينَ ﴿٢٥﴾﴾

کہ مجھے گیارہ ستاروں، ایک چاند اور ایک سورج نے سجدہ کیا ہے۔ اپنے والد کے سامنے اپنا خواب بیان کر دیا۔ تو والد نے بتایا کہ اس خواب کا تذکرہ دوسرے بھائیوں سے نہ کرنا، ممکن ہے وہ تمہیں نقصان پہنچائیں۔ ظاہر ہے کہ والد سمجھتا ہے اپنے بیٹوں کے باہمی تعلقات کو۔ جب بھائیوں کو پتا چلا تو بھائی اس وقت سے آپ علیہ السلام کے مخالف ہو گئے۔

چونکہ نبی کی اولاد تھی، آدمی عالم کا بیٹا ہو، عالم نہ بھی ہو تو علم کی شان اس میں کچھ نہ کچھ ہوتی ہے۔ ایک آدمی بڑے خاندان کا ہو اور حرکتیں چھوٹوں والی کرے پھر بھی بڑے خاندان کا ہونے کی وجہ سے اس میں خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔



وہ نبی کے بیٹے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ اس خواب کی جو تعبیر ہے وہ بڑی اہم ہے۔ ممکن ہے آئندہ چل کر حضرت یوسف کو بڑا مقام ملے، اس لیے انہوں نے حضرت یوسف کے بارے میں سازشیں شروع کیں تاکہ ہم ابھی اسے ختم کر دیں۔ ہمارا باپ اس سے پیار زیادہ کرتا ہے، ہم سے کم کرتا ہے۔ کل اس کا مقام بھی نظر آتا ہے تو کیوں نہ اس کو ختم کر دیں!

### یوسف علیہ السلام کے خلاف بھائیوں کی تدبیر:

انہوں نے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہا: ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں، ہم نوجوان بھائی ہیں، اکٹھے بکریاں چرائیں گے، سیر کریں گے، کھائیں گے، پیئیں گے، خوشی منائیں گے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: مجھے ڈر ہے کہ تم کھیل کود میں مصروف رہو اور یوسف کو کہیں بھیڑیانا کھا جائے۔ مجھے یہ خدشہ ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ کیوں فرمایا کہ مجھے خدشہ ہے کہ اس کو بھیڑیانا کھا جائے؟

مفسرین نے اس کی کئی وجوہات لکھی ہیں: اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جس علاقے میں حضرت یعقوب علیہ السلام رہتے تھے اس علاقے میں بھیڑیے کثرت کے ساتھ تھے، اس لیے یہ بات فرمائی۔ بعض نے یہ لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو خواب آیا تھا کہ میرے اس بیٹے پر کچھ بھیڑیوں نے حملہ کر دیا ہے تو اسے ایک بھیڑیے نے بچا لیا ہے اور پھر میرا بیٹا ایک کنویں میں چھپ گیا ہے۔ اس سے ان کو خدشہ پڑا کہ شاید میرا بیٹا ان بھیڑیوں سے نقصان نہ اٹھائے۔

وہ سمجھدار تو بہت تھے۔ انہوں نے اسی جملے کو پکڑ لیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو لے گئے۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کر دیں، حضرت یوسف کے بڑے بھائی کا نام یہودا تھا۔

بعض کہتے ہیں: اس کی نسل سے جو لوگ ہیں انہیں یہودی کہتے ہیں۔ تو وہ ذرا رحم دل تھا اور ترس کھاتا تھا۔ اس نے کہا کہ دیکھو! یہ ہمارا بھائی ہے، باپ ہمارا ایک ہے اگرچہ ماں الگ الگ ہے، ہمیں اس بھائی کو مارنا نہیں چاہیے اور باپ کو دکھ نہیں دینا چاہیے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے بھائیوں نے یہود کو دھمکی دی کہ اگر تو باز نہیں آیا تو تجھے بھی قتل کر دیں گے۔ اس نے کہا: پھر بچنے کا راستہ یہی ہے کہ کوئی ایسی تدبیر کروں کہ بھائی بچ بھی جائے اور یہ بھی مطمئن ہو جائیں۔ اس نے کہا کہ اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے اس بچے کو باپ سے جدا کرنے کا تو قتل نہ کرو بلکہ اس کو کسی گمنام کنویں میں ڈال دو! یا تو کوئی بچھو اس کو ڈسے گا اور یہ مر جائے گا یا کوئی قافلے والے اسے اٹھا کر لے جائیں گے، تمہاری مراد بھی پوری ہو جائے گی کہ باپ سے الگ ہو گا اور ہمارے معصوم بھائی کی جان بھی بچ جائے گی۔ انہوں نے اس رائے کو بالآخر پسند کیا۔ گمنام سا ایک کنواں تھا۔ حضرت یوسف چھوٹے بچے تھے۔ آپ بتاؤ چھ یا سات سال کا بچہ کتنا ہوتا ہے؟ چھوٹا سا بچہ ہے، ان کو پکڑ کر کنویں کے ڈول میں رکھنے لگے تو یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ انہوں نے قمیص اتار دی اور ہاتھ باندھ کر ڈول میں ڈال دیا۔

### یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال دیا:

بعض روایات میں ہے کہ جب آدھا ڈول نیچے گیا تو رسی کاٹی اور بعض روایات میں ہے کہ خدا کا کرنا یہ تھا کہ اسی کنویں میں ایک چٹان تھوڑی سی آگے کی طرف بڑھی ہوئی تھی۔ جب ڈول نیچے گیا تو یوسف علیہ السلام اس سے نیچے اتر گئے۔ ڈول سے نکلے اور اس چٹان پر بیٹھ گئے اور بعض روایات میں ہے کہ جبرائیل امین علیہ السلام آئے۔ انہوں نے وہاں سے اٹھادیا اور چٹان پر بٹھا دیا۔ تین دن اور تین رات

تک یوسف علیہ السلام پو نہی ٹھہرے رہے۔ ان کا بھائی یہود آتا تھا اور کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے دے کر چلا جاتا تھا۔ اس کے دل میں ترس تھا لیکن بھائیوں کے سامنے وہ بھی بے بس تھا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس گئے تو انہوں نے پوچھا: یوسف کا کیا بنا؟ انہوں نے کہا: بس ابو! آپ سچ ہی کہتے تھے، ہم سے تھوڑی سی غفلت ہو گئی، ہم کھیل کود میں لگے تھے، آگے گئے تو یوسف کے پاس بھیڑیا آیا اور اسے کھا گیا۔ ان کی قمیص کو لیا اور اس قمیص کے ساتھ انہوں نے ایک دنبے یا بکرے کا خون لگایا اور کہا دیکھو! یہ خون موجود ہے۔

بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت یعقوب فرمانے لگے: بھڑیا اتنا سمجھدار ہے کہ بیٹے کی قمیص کو کچھ نہیں کہا اور اسے چیر پھاڑ بھی دیا ہے، تم مجھے بیوقوف بناتے ہو؟ حضرت یعقوب علیہ السلام سمجھ گئے کہ اللہ کی طرف سے ابتلا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: میں تمہیں تو کچھ نہیں کہتا، ﴿بَنَی سَوَّلَتْ لَکُمۡ اَنۡفُسُکُمۡ اَمۡرًا﴾ تم جھوٹ بولتے ہو، یہ تمہاری کوئی خفیہ تدبیر ہے، ﴿فَصَبِّرۡ جَمِیۡلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوۡنَ﴾ میں اس معاملے کو اللہ کے حوالے کرتا ہوں، اللہ ہی میرے معاملے کا حل نکالے گا۔

### قافلے والوں کا یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکالنا:

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے غم میں ہیں اور یوسف علیہ السلام کے بھائی اپنی خوشی میں ہیں۔ یہود اخیر گیری کرتا ہے۔ ایک قافلہ جس کا راستہ یہ نہیں تھا نہ ہی وہ کنواں کسی خاص راستے پر تھا، وہ قافلہ بھٹک کر اس راستے کی طرف آیا۔

مفسرین فرماتے ہیں: وہ قافلہ بھٹکا نہیں تھا بلکہ اللہ اس قافلے کو بھٹکا کر ادھر

لائے تھے کہ ہم نے یہاں سے یوسف کو نکالنا ہے۔ قافلے والوں نے ایک بندے کو بھیجا کہ اس کنویں سے پانی نکالو! اس نے جب ڈول نکالا تو بجائے پانی کے ایک خوب صورت اور چمکتا ہوا بچہ باہر آیا۔ اس نکالنے والے کا نام ملک تھا۔ اس نے کہا: ﴿يَبْسُرْ هَذَا غُلَامٌ﴾ کہ تمہیں مبارک ہو! ہم پانی تلاش کر رہے تھے تو اللہ نے کتنا پیارا بچہ عطا کیا ہے۔ یہوداد دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے بھائیوں کو بتایا۔ بھائی دوڑے آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ قافلے والوں نے یوسف علیہ السلام کو تو کنویں سے نکال لیا ہے۔ اب ان کے ذہن میں تھا کہ یہ اس کو چھوڑیں گے نہیں اور یہ بھی ذہن میں تھا کہ ہو سکتا ہے چھوڑ دیں اور یہ بھی ذہن میں تھا کہ ہو سکتا ہے اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔ اب بھائیوں نے ایک نئی ترکیب چلائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے انہوں نے کہا: یہ ہمارا غلام ہے، تم نے چوری کیا ہے، قافلہ والوں نے کہا: ہم نے چوری کہاں کیا ہے؟ یہ تو کنویں سے نکلا ہے۔ انہوں نے کہا: ہمارا غلام دوڑا ہوا تھا، اگر تم خریدنا چاہتے ہو تو ہم تمہیں بیچنے کے لیے تیار ہیں۔ قافلہ والوں نے کہا: ہم خرید لیتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: انہوں نے بیس درہم میں ان کو بیچ دیا اور دس بھائیوں نے دودو درہم تقسیم کر لیے اور ایسا کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ تھی ﴿وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ﴾ وہ بے رغبت تھے، ان کو ضرورت نہیں تھی، وہ تو جان چھڑانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایسے طریقے سے یوسف جائے کہ وہاں سے واپس نہ آئے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے اس غلام کو لے لو اور باندھ کر رکھنا! اس کی عادت دوڑ جانے کی ہے۔ اگر تم نے کوتاہی کی تو یہ بھاگ جائے گا۔ مقصد یہ تھا کہ قافلے والے یوسف کو چھوڑیں نا۔ انہوں نے یوسف علیہ السلام کو باندھا اور مصر کے بازار میں لے گئے۔

حضرت یوسف سات سال کے بچے ہیں۔ حسن و جمال کے پیکر ہیں۔ اتنا جمال اللہ نے ان کو عطا فرمایا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے سفر میں حضرت یوسف کا چہرہ دیکھا تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کا آدھا حسن اللہ نے تنہا یوسف علیہ السلام کو دیا ہے اور آدھا حسن خدا نے دنیا میں تقسیم کیا ہے۔ بتاؤ خدا نے کتنا جمال عطا کیا ہوگا؟

### یوسف بازارِ مصر میں:

یہ سب تکوینی نظام چل رہا تھا، اس بچے نے بادشاہ کے دربار میں پہنچنا تھا۔ اب لوگ خریدنے کے لیے آگئے۔ بچہ قیمتی تھا۔ قیمت لگنا شروع ہوئی۔ کسی نے کہا: میں اس کے بدلے میں چاندی دیتا ہوں۔ کسی نے کہا: میں اس کے بدلے میں سونا دیتا ہوں۔ اس کی قیمت بڑھتی چلی گئی اور قیمت اتنی بڑھ گئی کہ عام بندہ اس کو خرید ہی نہیں سکتا تھا۔

یوں کہنا چاہیے کہ یوسف علیہ السلام کی قیمت اللہ نے اتنی لگوا دی کہ عام بندہ اس کو لے ہی نہیں سکا۔ اللہ نے بتا دیا کہ میرا یوسف کتنا قیمتی ہے! بالآخر عزیز مصر کے حصے میں آئے اور اس نے بھاری رقم دے کے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا۔ وہ جب گھر گیا تو اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کو دیکھا، ان کی بول چال دیکھی، وہ سمجھا کہ یہ کل بہت بڑا آدمی بنے گا۔

### تین عقلمند اور دانالوگ:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں تین لوگ ایسے گزرے ہیں کہ جنہوں نے شکلوں اور چہروں سے پہچانا ہے کہ یہ بندہ کتنا بڑا ہوگا! ان میں سے ایک عزیز مصر تھا جس نے حضرت یوسف کو بچپن میں دیکھ کر پہچانا ہے کہ بہت بڑا آدمی بنے گا اور اپنی بیوی سے کہا کہ اس کا خیال رکھنا! ایک حضرت

شعیب علیہ السلام کی بیٹی ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو اپنے والد سے کہا کہ ان کو ملازم رکھ لیں، یہ طاقت ور بھی ہیں اور امانت دار بھی اور ایک حضرت ابو بکر صدیق ہیں جنہوں نے حضرت عمر کے چہرے سے پہچاننا کہ بہت بڑا آدمی بنے گا۔ عزیز مصر نے یوسف علیہ السلام کو گھر میں جگہ دی ہے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مصلیٰ پر جگہ دی ہے۔

بعض لوگ ہوتے ہیں کہ جو پہچان لیتے ہیں کہ اس نے بہت بڑا آدمی بننا ہے۔ اور ایسے ہوتا ہے، بچپن میں بعض علامات ایسی ہوتی ہیں جو انسان کے بڑا ہونے کی دلیل بنتی ہیں۔

### امام محمد: امام ابو حنیفہ کی مجلس میں:

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مجلس میں تشریف فرما تھے۔ ایک بچہ آیا اور امام صاحب سے مسئلہ پوچھا کہ اگر کوئی بندہ عشاء کی نماز پڑھ کر سو جائے اور پھر اس کو غسل کی حاجت ہو جائے تو عشاء کی نماز دوبارہ پڑھے یا نہ پڑھے؟ امام اعظم ابو حنیفہ نے فرمایا: عشاء کی نماز دوبارہ پڑھے۔ شاگردوں کو بڑا تعجب ہوا کہ امام صاحب نے کیسا مسئلہ بتایا ہے کہ جب کوئی آدمی عشاء کی نماز پڑھ کر سوئے، غسل کی حاجت ہو جائے تو دوبارہ تو نماز نہیں پڑھی جاتی۔ حضرت امام ابو حنیفہ فرمانے لگے: یہ بچہ نہایت ذکی اور سمجھدار تھا، اس بچے نے مسئلہ عام بندے کے بارے میں نہیں پوچھا اس نے اپنے بارے میں پوچھا ہے لیکن شرمیلا اتنا ہے کہ بتا نہیں سکتا کہ مجھے رات غسل واجب ہوا تھا، یہ پوچھنا چاہ رہا ہے کہ جب میں نے عشاء کی نماز پڑھی تو میں نابالغ تھا اور رات سو یا تو مجھے غسل کی ضرورت پیش آگئی، اب میں بالغ ہوا ہوں تو میں عشاء کی نماز پڑھوں یا نہ پڑھوں؟ امام صاحب نے فرمایا: جب عشاء کی نماز پڑھی یہ نابالغ تھا، اس پر نماز فرض ہی نہیں تھی تو جب فجر کی نماز سے پہلے بالغ ہوا تو اب عشاء کی نماز اس پر فرض ہو گئی ہے، تو

عشاء دوبارہ پڑھے گا۔ امام صاحب نے فرمایا: ”قَدْ يُفْتَحِي لِهَذَا الصَّبِيَّ“ کہ یہ لڑکا بہت بڑا آدمی بنے گا۔

### امام محمد کاسات دنوں میں قرآن حفظ کرنا:

کچھ دن گزرے اسی لڑکے کا باپ اسے لے کر درس گاہ میں آیا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے اس نے عرض کی: حضرت! یہ میرا بچہ ہے آپ اس کو درس گاہ میں بیٹھالیں۔ امام صاحب نے پوچھا: قرآن کا حافظ ہے؟ کہا: نہیں، فرمایا: میری ایک شرط ہے کہ لڑکا جب تک قرآن کا حافظ نہ ہو میں اپنی درس گاہ میں نہیں بٹھاتا۔

مجھے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ قرآن وحدیث کی بات کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ کا رد کرتے ہیں، امام صاحب تو اس شخص کو درس گاہ میں ہی نہیں بٹھاتے جو قرآن کا حافظ نہ ہو، اس سے بڑھ کر قرآن کون جانتا ہے؟ امام ابو حنیفہ کا جنازہ جہاں سے اٹھا ہے وہاں پر امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے آٹھ ہزار مرتبہ قرآن ختم کیا ہے، اب یہ بندہ قرآن نہیں سمجھتا! عجیب بات ہے۔

خیر انہوں نے کہا: میرا لڑکا قرآن کا حافظ تو نہیں ہے۔ فرمایا پھر اس کو لے جاؤ۔ اب وہ ہفتے بعد پھر آئے۔ کہا کہ اس بچے کو داخل فرمالیں۔ امام صاحب نے فرمایا: میں نے پچھلے ہفتے بھی کہا تھا کہ بچہ قرآن کا حافظ ہونا چاہیے، یہ قرآن کا حافظ نہیں آپ دوبارہ لے آئے! باپ نے کہا: آپ امتحان لے لیں، یہ ایک ہفتے میں مکمل قرآن حفظ کر کے آیا ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

یہ بچہ ہے اور امام صاحب نے پہچان لیا کہ اس نے کل کو بہت بڑا آدمی بننا ہے۔ یہ بچہ کون ہے؟ امام اعظم ابو حنیفہ کا شاگرد ہے۔

### چھوٹا محمد ایسا ہے تو بڑا محمد کیسا ہوگا؟

اہل کتاب کے ایک دانشور نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”المبسوط“ کا

مطالعہ کیا تو مسلمان ہو گیا۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ مسلمان کیوں ہوئے؟ اس نے کہا:

”هَذَا كِتَابُ مُحَمَّدٍ كُمْ الْأَصْغَرِ فَكَيْفَ كِتَابُ مُحَمَّدٍ كُمْ الْأَكْبَرِ“

کہ مسلمانوں کے چھوٹے محمد کی کتاب ایسی ہے تو بڑے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کی کتاب کا کیا عالم ہو گا؟! اس بات نے مجھے اسلام قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔<sup>201</sup>

### بچوں کو پہلے دین پڑھائیں پھر دوسری چیزیں!

بعض لوگ بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور کل کو جا کر بہت بڑے بنتے ہیں۔ بعض صفات اللہ نے بچوں میں رکھی ہوتی ہیں ہم صفات کا استعمال غلط کرتے ہیں۔ مثلاً ہمارا بیٹا ذہین ہوتا ہے تو ہم قرآن کے بجائے اسے انگلش لینگویج میں لگا دیتے ہیں، صلاحیتیں اس کی بدل جاتی ہیں اب وہ عالم بنے گا تو کیسے بنے گا؟ ہمارا بیٹا ذہین ہوتا ہے اور اب ہم نے اس کو کمپیوٹر انڈرڈ زندگی دے دی ہے تو بتاؤ وہ قرآن پر کیسے آئے گا؟ ہم کمپیوٹر کے مخالف نہیں ہیں لیکن ہم کہتے ہیں پہلے قرآن پڑھائیں پھر کمپیوٹر سکھائیں، پہلے قرآن سکھائیں پھر انگلش زبان پر لائیں۔ ہم نے کب انگریزی کا انکار کیا ہے! لیکن دین پہلے ہے اور دنیاوی علم بعد میں ہے۔ اللہ نے بچوں میں صلاحیتیں بہت رکھی ہوتی ہیں لیکن ہم کبھی ان صلاحیتوں ابھارتے نہیں۔

چلیں بات چل پڑی ہے تو میں ایک چھوٹی سی بات کہتا ہوں۔ عید الفطر کے موقع پر مدارس میں چھٹیاں تھیں اور میرا گجرات میں علماء کنونشن میں بیان تھا۔ میرا ایک چھوٹا بچہ ہے دس یا گیارہ سال کا ہو گا وہ مدرسے سے گھر آیا تو میری بیوی نے کہا: اس کو بھی ساتھ لے جائیں۔ میں نے کہا: اس کو بھی ساتھ لے جاتا ہوں۔ ہم نے صبح ناشتہ نہیں کیا جلدی چلے گئے۔ راستے میں میں نے اس سے پوچھا کہ کوئی چیز کھانی ہے؟



بچہ تھا، اس نے کہا: کھانی ہے۔ میں نے کہا: کیا کھانا ہے؟ اس نے کہا کہ جوس دے دیں اور ساتھ چپس بھی ہوں۔ میں نے کہا: تجھے بھوک لگی ہے؟ کہتا ہے: جی ہاں۔ میں نے کہا: بھوکے آدمی کو تو نیند نہیں آتی اور تو تو گاڑی میں سو رہا ہے؟ تجھے کیسی بھوک لگی ہے؟ میں تو بیٹے سے مذاق کر رہا تھا۔

دیکھیں ذہن کیسے کام کرتا ہے! صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ مجھے فوراً کہنے لگا، کہا: ہم فضائل اعمال کی تعلیم میں بیٹھتے تھے مدرسے میں تعلیم ہوتی ہے، اس میں ہم نے ایک واقعہ سنا کہ ایک صاحب گھر آئے اور ان کے گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا اور بیوی نے ہانڈی آگ پر رکھ دی اور اس میں پتھر ڈال کر اسے ہلاتی رہی اور بچے سو گئے کہ کھانا پک رہا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر بھوکے کو نیند نہیں آتی تو فضائل اعمال کا واقعہ غلط ہے؟ یہ گیارہ سال کا بچہ ہے اور آپ استدلال دیکھیں، یہ چھوٹی بات نہیں ہے، میں جب یہ صلاحیتیں دیکھتا ہوں تو میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور ہم پوری کوشش کریں گے کہ ان کو دین پر لائیں، باقی اللہ کی مرضی ہے اللہ کیا کام لینا چاہتے ہیں، ہمیں تو اندازہ نہیں۔

### حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے گھر میں:

خیر میں اپنے عنوان پر واپس آتا ہوں۔ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ عزیز مصر نے اپنے بیوی سے کہا: ہم نے اس کو خریدا ہے یہ ہمارے کام بھی آئے گا اور اس کو بیٹا بھی بنا سکتے ہیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ عزیز مصر کا بیٹا نہیں تھا، صاحب اولاد نہیں تھا تو اس نے کہا چلو بیٹا بنا لیتے ہیں۔ حضرت یوسف اس کے گھر میں پلے اور جوان ہوئے۔ عزیز مصر کے بیوی کا نام زلیخا ہے۔ وہ حضرت یوسف پر فریفتہ ہو گئی۔ اس نے نیا جال بچھانا شروع کر دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن سے متاثر ہوئی اور اس نے حضرت یوسف سے اپنی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔ اپنے محل

اور کمرے کے دروازے کو تالا لگایا، اگلے میں پھر اگلے میں، یوں کئی تالے بند کر کے وہ ان کو اپنے کمرے میں لے گئی اور وہاں جا کر اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن کی تعریفیں شروع کر دیں۔ یوسف علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ مجھ سے گناہ کا تقاضا کرتی ہے۔ یوسف علیہ السلام گناہ کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوئے۔

### عزیز مصر کی بیوی کا تقاضا:

اب جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ زلیخا نے ارادہ کیا حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنی بری خواہش کو پورا کرنے کا۔ یوسف علیہ السلام تیار کیوں نہیں ہوئے؟ اس کی وجوہات تو کئی ہیں جو مفسرین نے لکھی ہیں، میں ایک آپ کے سامنے پیش کرنے لگا ہوں۔ قرآن کریم میں تو صرف اتنا ہے ﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ﴾ کہ اس عورت نے گناہ کا پختہ ارادہ کر لیا، ﴿وَهَمَّ بِهَا﴾ حضرت یوسف علیہ السلام نے ارادہ نہیں کیا، ﴿هَمَّ﴾ عربی زبان کا لفظ ہے، پختہ ارادہ کے معنی میں بھی آتا ہے اور طبعی میلان کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ جس طرح آدمی نے گرمی کا روزہ رکھا ہو اور سامنے ٹھنڈا شربت آجائے تو پینے کو جی تو چاہتا ہے لیکن آدمی روزہ توڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر خلوت میں نا محرم عورت آجائے تو گناہ کا طبعی تقاضا پیدا ہوتا ہے لیکن اس طبعی تقاضے پر عمل کرنے کا نبی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ﴾ اس زلیخا نے تو پختہ ارادہ کر لیا تھا لیکن یوسف علیہ السلام نے ارادہ پختہ نہیں کیا، ہاں ﴿وَهَمَّ بِهَا﴾ غیر اختیاری طور پر طبعی خیال آیا لیکن یوسف علیہ السلام کے پاس چونکہ دلیل موجود تھی اور وہ دلیل علم شریعت تھا کہ زنا اور یہ گناہ کرنا حرام ہے، اس لیے یوسف علیہ السلام نے اپنے علم کے مطابق عمل کیا اور اس کے قریب جانے کا سوچا ہی نہیں ہے۔

## رب کی برہان کیا تھی؟

میں بتایہ رہا تھا کہ بسا اوقات انسان بات سمجھتا نہیں ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے ﴿تَوَلَّوْا أَنْ دَاوُودَ هَانَ رَبِّهِ﴾ اگر یوسف علیہ السلام کے پاس دلیل نہ ہوتی، اللہ کی دلیل نہ دیکھ لیتے تو ممکن ہے کچھ ارادہ کر لیتے، اگرچہ ارادے پر عمل نہ کرتے۔ وہ دلیل کیا تھی جس نے حضرت یوسف کو گناہ سے دور رکھا ہے؟ یہ بات سمجھنے کی ہے۔

مفسرین نے کئی واقعات نقل کیے ہیں خلاصہ سب کا ایک ہے۔ بعض نے کہا کہ زلیخا بند کمرے میں اپنا بت جس کو سجدے کرتی تھی اس پر اپنا دوپٹہ اتار کر ڈالنے لگی۔ یوسف علیہ السلام نے پوچھا یہ کیا کرتی ہو؟ اس نے کہا: میرا خدا ہے، مجھے اس سے شرم آتی ہے۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا: اس سے شرم آتی ہے جو دیکھ نہیں سکتا اور جو خدا دیکھتا ہے اس سے شرم نہیں آتی۔ بعض نے کہا کہ دلیل یہ دیکھی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا جسم اطہر ان کے سامنے آیا، جنہوں نے اپنے دانت کے نیچے انگلی رکھی ہوئی تھی، یہ بتانے کے لیے کہ بیٹا یہ جرم کبھی نہیں کرتے۔

بعض نے اس طرح کے اور واقعات لکھے ہیں لیکن مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سب کا خلاصہ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کو خدا نے بچانا تھا، دلیل نبوت بھی ہے، علم شریعت بھی ہے اور طبع سلیم بھی دی تھی۔ یوسف علیہ السلام گناہ کے قریب بھی نہیں گئے، حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کو سمجھایا تو کتنی عجیب عورت ہے! ایک شخص نے مجھ پر احسانات کیے ہیں، مجھے گھر میں ٹھکانا دیا ہے، میری بچپن میں پرورش کی ہے، میں اس گھر میں بھلا خیانت کر سکتا ہوں؟ تو کیسی بات سوچتی ہے؟ لیکن اس وقت یوسف علیہ السلام جب یہ سمجھے کہ یہ عورت مجھے چھوڑنے والی نہیں ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام دوڑے اس دروازے کی طرف جس کو تالا لگا ہوا تھا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام دوڑے تو

خدا کے حکم سے تالے ٹوٹتے چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ اپنی ہمت کے مطابق کام کرنا انسان کے ذمہ ہے، کامیابیاں عطا فرمانا یہ اللہ کے ذمے ہے۔ آدمی اپنا کام کرے، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھے۔

### عزیز مصر کا سامنا:

﴿وَأَسْتَبَقُوا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَالْفَيْسَا سَيِّدَهَا لَكَا الْبَابُ قَالَتْ

مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝﴾

دروازے پر پہنچے۔ جو نہی باہر نکلے تو اب نیا مسئلہ پیش آیا۔ آگے عزیز مصر سامنے کھڑا تھا۔ وہ تو ہکا بکا رہ گیا۔ کمرے سے یوسف علیہ السلام بھی آرہے ہیں اور کمرے سے زلیخا بھی آرہی ہے۔ زلیخا پیچھے دوڑ رہی ہے اور یوسف علیہ السلام آگے تھے۔ زلیخانے۔ جیسے عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔ فوراً وار کیا اور عزیز مصر سے کہنے لگی: ﴿مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ عزیز مصر! بتاؤ کہ اگر کوئی تمہاری بیوی کے ساتھ گناہ کا ارادہ کرے تو اس کی کیا سزا ہے؟ یا تو اس کو دردناک قسم کا عذاب دو یا اسے جیل میں ڈال دو۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے عجیب صورت حال بن گئی۔ اب چونکہ موقع ایسا تھا کہ صفائی پیش کرنا ضروری تھا، حضرت یوسف علیہ السلام نے صفائی تو اس کو دینی تھی لیکن یوسف علیہ السلام کے بولنے سے قبل اللہ نے وکیل صفائی کا انتظام خود فرمایا۔

### یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کی گواہی:

﴿وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا ۝﴾

مفسرین فرماتے ہیں کہ وہاں ان کے محل میں چھوٹا سا بچہ موجود تھا۔ جب عورت نے عزیز مصر کے ساتھ بات کی تو فوراً اس چھوٹے بچے کو جو بول نہیں سکتا تھا خدا

نے اسے ایسی قوت گویائی عطا کی کہ اس نے کہا:

﴿إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدًّا مِنْ قَبْلِ فَصَدَقْتُ وَهُوَ مِنَ الْكَذَّابِينَ ۝۲۶﴾

﴿إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدًّا مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبْتُ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝۲۷﴾

اے عزیز مصر! اگر حضرت یوسف کی قمیص آگے سے بھٹی ہے تو یہ عورت سچ بولتی ہے اور حضرت یوسف سچے نہیں ہیں اور اگر حضرت یوسف کی قمیص پیچھے سے بھٹی ہے تو پھر عورت جھوٹ بولتی ہے اور وہ سچے ہیں۔

جب دیکھا تو حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص پیچھے سے بھٹی ہوئی تھی، یوسف علیہ السلام دوڑ رہے تھے وہ پکڑ رہی تھی تو اس چھینا جھٹی میں ان کی قمیص پیچھے سے پھٹ گئی۔ عزیز مصر نے کہا: جھوٹ تو بولتی ہے اور الزام یوسف پر لگاتی ہے۔

مفسرین نے عجیب بات لکھی ہے کہ اگر وہاں یہ چھوٹا بچہ بول کراتی بات ہی کہہ دیتا کہ یوسف سچا ہے اور زلیخا جھوٹی ہے تو بات تو پھر بھی سمجھ آسکتی تھی کہ چھوٹا سا بچہ جو بول نہیں سکتا اس نے صفائی دی ہے لیکن یوں نہیں ہوا بلکہ اللہ نے اس کو بلوایا اور ساتھ دانائی کی بات بلو کر بلوایا، دلیل کے ساتھ بلوایا۔

اس بچے نے جملہ ایسا کہا کہ عام بندہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ بات ٹھیک کہتا ہے، صرف یہ نہیں کہا کہ زلیخا جھوٹی ہے اور یہ سچے ہیں، تیری بیوی جھوٹ بولتی ہے اور تمہارا غلام سچ بولتا ہے۔ اس نے کہا کہ عقل کی بات ہے تم دیکھ لو! اگر دامن آگے سے پھٹا ہے تو قصور ان کا ہے لیکن اگر دامن پیچھے سے پھٹا ہے قصور تمہاری بیگم کا ہے۔

**عزیز مصر کا حضرت یوسف کو اعراض کا حکم:**

اب جب دیکھا تو ایسا ہی تھا ﴿فَلَمَّا رَأَىٰ قَمِيصَهُ قُدًّا مِنْ دُبُرٍ﴾ اب کیا کرتے! جرم تو پکڑا گیا۔ عزیز مصر نے دیکھ لیا کہ زلیخا میری بیوی جھوٹ بولتی ہے اور

یوسف علیہ السلام سچ بولتے ہیں تو عزیز مصر نے کہا: ﴿يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا﴾ اے یوسف! آپ جانے دیں۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ عجیب بات یہ ہے کہ ایسے موقع پر عزیز مصر کو طیش آنا چاہیے تھا لیکن اسے طیش نہیں آیا۔ یا تو اس میں غیرت کی کمی تھی یا پھر یہ اللہ کی طرف سے انتظام ہونا تھا اس لیے اسے طیش نہیں آیا۔ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا: آپ جانے دیں اور اپنی بیوی سے کہا: تیرا قصور ہے، تو اپنے قصور پر معافی مانگ، یہ بات اچھی نہیں اور ساتھ عزیز مصر نے ایک جملہ بھی کہا: ﴿إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ﴾ ان کے کیدوں سے ہے۔ یہ تمہارا ہی مکر ہے اور تمہارے مکر بہت بڑے ہوتے ہیں۔

یہ جملہ ہر عورت کے بارے میں کبھی نہ کہنا اور ہر عورت پر فٹ نہ کرنا! نیک عورتوں کو کبھی نہ کہنا کہ عورتیں مکار ہوتی ہیں اور ان کے مکر بہت بڑے ہوتے ہیں۔ یہ ان عورتوں کے بارے میں ہے جو فاحشہ، بد کردار اور غلط قسم کی ہوں۔

### اس بات کی شہرت ہوئی تو....:

خیر معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن یہ بات عزیز مصر کے محل میں پھیل گئی۔ اب یہ گھر کا مسئلہ تھا لیکن عورتوں تک بات جا پہنچی، چلتے چلتے محل سے باہر شہر میں چرچا ہو گیا۔ یہ چرچا اس بات کا تھا کہ زلیخا اپنے غلام پر عاشق ہو گئی ہے۔ مصر کی عورتوں نے زلیخا سے کہا: زلیخا تجھے کچھ حیا کرنا چاہیے تھی، تو عزیز مصر کی بیوی ہے اور غلام پر عاشق ہو گئی ہے! اس وقت زلیخا نے کہا: تم نے اس غلام کو دیکھا نہیں، اگر دیکھ لیتیں تو مجھے کبھی بھی طعنہ نہ دیتیں۔ انہوں نے کہا: اچھا ہمیں بھی دکھا دو۔ اب ان کا وہ بھی دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

زنانِ مصر کا یوسف علیہ السلام کو دیکھنا:

حضرت یوسف علیہ السلام اندر ہیں اور زلیخا باہر ہے۔ عورتوں کی دعوت کر دی گئی اور اس دعوت میں اس نے خاص اہتمام کیا۔ دسترخوان بچھایا گیا اور پھل اور چھریاں رکھ دی گئیں۔ تکیے سجا دیے گئے۔ پھر اس نے یوسف علیہ السلام سے کہا: ﴿اُخْرِجْ عَلَيَّهِنَّ﴾ آپ ذرا باہر تشریف لائیں۔ جب یوسف علیہ السلام باہر آئے تو ﴿فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ﴾ انہوں نے کہا کہ زلیخا تو ٹھیک کہتی ہے، یہ تو بلا کا حسین و جمیل ہے۔ زلیخا کو طعنہ دینے والی عورتیں ہکا بکارہ گئیں۔ انہوں نے ایک جملہ کہا اور ایک عمل کیا۔

### زنانِ مصر کا جملہ اور عمل:

رات میں نے بیان میں بھی نقل کیا تھا، جو ساتھی تھے انہوں نے سنا ہوگا، جملہ یہ کہا ﴿حَاشَ لِلَّهِ مَا هَذَا بَشَرًا اِنْ هَذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ یہ انسان نہیں ہے، یہ تو فرشتہ ہے۔ ساتھ انہوں نے ایک کام کیا ﴿وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ﴾ انہوں نے اپنی انگلیاں کاٹ ڈالیں۔ اتنے حسن و جمال کے نظارے میں مست ہو کر رہ گئیں، ان کو پتا ہی نہیں چلا کہ ہم اپنی انگلیاں کاٹ رہی ہیں یا پھل کاٹ رہی ہیں۔

آپ بتائیں! کس درجے کا حسن ہوگا؟ آپ تصور کر سکتے ہیں؟ ان دونوں جملوں کی مختصر شرح سمجھ لیں۔ میں نے رات بیان میں بھی عرض کیا تھا کہ اللہ نے انسان میں دو قسم کی صفتیں رکھی ہیں:

### صفتِ ملکیت اور صفتِ بہیمیت:

1: صفتِ ملکیت

2: صفتِ بہیمیت

ملکیت کا معنی ہے فرشتہ پن اور بہیمیت کا معنی ہے ڈنگر پن۔ فرشتہ پن کا معنی

مان کر چلنا اور ڈنگرپن کا معنی من مانی کر کے چلنا۔ جانور میں ایک ہی صفت ہے من مانی کرنا اور فرشتوں میں ایک ہی صفت ہے مان کر چلنا اور انسان میں اللہ نے دونوں صفتیں رکھی ہیں اور پھر یہ دیکھنا ہے کہ انسان من مانی کرتا ہے یا مان کر چلتا ہے؟ اگر یہ من مانی کی صفت نہ ہو اور پھر انسان مان کر چلے تو یہ انسان کا کوئی امتحان نہیں ہے، امتحان تو تبھی ہو گا کہ من مانی کرنے کا مادہ موجود ہو اور پھر بھی مان کر چلے۔ اگر انسان من مانی کرے اور مان کر نہ چلے تو قرآن کہتا ہے:

﴿أُولَٰئِكَ كَانُوا لِنِعْمِ رَبِّهِمْ أَصْلًا﴾<sup>202</sup>

یہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ جانور سے بھی بدتر ہیں۔ جانور سے بدتر کیوں ہیں؟ اس لیے کہ جانور وہ ہے جو من مانی کرے، اس نے من مانی کی ہے تو جانور کی طرح بنا ہے، جانور میں تو مان کر چلنے کا وصف بھی نہیں تھا لیکن اس میں مان کر چلنے کا وصف تھا پھر بھی من مانی کی ہے تو جانور سے بھی بدتر ہوا۔

انہوں نے کہا: ”إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ“ کہ یہ تو فرشتہ ہے، کیونکہ اس انسان میں من مانی کا وصف موجود ہے اور پھر بھی مان کر چلتا ہے، یہ فرشتوں کا کام ہے جانور کا کام نہیں ہے۔ ان عورتوں نے کہا: یہ کیسا انسان ہے کہ من مانی کرتا ہی نہیں، یہ تو مان کر چلتا ہے ”إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ“ یہ تو فرشتہ ہے۔ پھر صرف ”مَلَكٌ“ نہیں کہا بلکہ ”مَلَكٌ كَرِيمٌ“ کہا۔ فرشتہ وہ ہوتا ہے جس میں مان کر چلنے کی ہی صفت ہو اور مان کر چلے اور جس میں من مانی کی صفت ہو اور پھر مان کر چلے تو یہ ”مَلَكٌ“ نہیں بلکہ ”مَلَكٌ كَرِيمٌ“ ہوتا ہے، یہ تو فرشتہ صفت ہے۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں کہا تو زلیخا فوراً بول اٹھی



”فَذِكْرُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ“ یہی ہے وہ جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں، اب دیکھ لیا تم نے؟ اب بتاؤ میں بے بس تھی یا نہیں؟

**میرے محمد کو دیکھتیں تو دل کاٹ ڈالتیں!**

ام المؤمنین امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

لَوَاجِي زَلِيخًا لَّوْ رَأَيْتَ جَمِيْنَهُ

لَا تَزْنَ بِالْقَطْعِ الْقُلُوبَ عَلَى الْاَيْدِي <sup>203</sup>

جن عورتوں نے زلیخا کو طعنہ دیا تھا انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو اپنی انگلیاں کاٹ ڈالیں، اگر میرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیتیں تو دل کاٹ ڈالتیں۔

یہ جملہ کیوں کہا؟ وجہ یہ ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی الانبیاء ہیں اور حضرت یوسف نبی ہیں۔ نبی الانبیاء وہ ہوتا ہے جس سے اوصاف نکلتے ہیں اور نبی وہ ہوتا ہے جسے اوصاف ملتے ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسن نکلا ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کو ملا ہے، ہمارے نبی مرکزِ حسن ہیں حضرت یوسف شاخِ حسن ہیں۔ ہمارے جسم میں دل مرکزِ بدن ہے اور ہمارا ہاتھ شاخِ بدن ہے۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انہوں نے شاخِ بدن کو دیکھا تو شاخِ بدن کو کاٹا، مرکزِ حسن کو دیکھ لیتیں تو مرکزِ بدن کو کاٹ لیتیں۔ جنہوں نے یوسف کو دیکھا اور ہاتھ کاٹے ہیں اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیتیں تو دل کاٹ لیتیں۔

**یوسف علیہ السلام کا جیل جانا:**

زلیخانے کوشش کی کہ اس کی بات مانیں لیکن حضرت یوسف اگر بات نہ

مانیں تو ان کو جیل جانا پڑے گا۔ ادھر یوسف علیہ السلام نے کہا: ﴿رَبِّ السِّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ﴾ اے اللہ! جس گناہ کی یہ مجھے دعوت دیتی ہے، میں جیل میں تو جاسکتا ہوں گناہ نہیں کر سکتا۔

حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر رحمہ اللہ جو میرے پیر و مرشد ہیں، ایک بہت پیارا جملہ فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: ﴿رَبِّ السِّجْنِ أَحَبُّ﴾ عربی زبان کے دو لفظ ہیں؛ ایک لفظ حبیب ہوتا ہے اور ایک لفظ احب ہوتا ہے۔ حبیب کا معنی ہوتا ہے ”پیارا“ اور احب کا معنی ہوتا ہے ”سب سے پیارا“، جیسے گرانر میں کہتے ہیں کہ احب یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ تو حضرت فرماتے تھے کہ اللہ کی کیسی تقدیر ہے اور خدا کی قدرت کا عالم دیکھیں کہ ﴿رَبِّ السِّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ﴾ یوسف علیہ السلام کہتے ہیں کہ اللہ! گناہ کے بجائے مجھے ان کی جیل احب ہے، محبوب نہیں کہا بلکہ احب کیا۔ حضرت فرماتے ہیں: اللہ کی محبت کا جیل خانہ احب ہے تو بتاؤ اللہ کے گلزار کا عالم کیا ہو گا؟ جس کی جیل محبوب ترین ہو اس کی جنت کا عالم کیا ہو گا؟

**عصمتِ انبیاء علیہم السلام:**

آگے جملہ سنو، فرمایا:

﴿وَالَّا تَصْرِفُ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْبَهِلِينَ﴾

اے اللہ! اگر آپ مجھ سے گناہ کو الگ نہ کرتے، اگر آپ میری مدد نہ فرماتے تو ہو سکتا ہے میں گناہ میں مبتلا ہو جاتا۔

یہاں دو لفظوں پر غور کرنا! حضرت یوسف گناہ سے بچے ہیں اللہ رب العزت نے فرمایا: ﴿كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ﴾ کہ ہم نے یوسف

سے گناہ کو دور رکھا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے یوسف کو گناہ سے دور رکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں اور آپ وہ ہیں کہ جو گناہ سے الگ ہوتے ہیں، نبی وہ ہوتا ہے جس سے خدا گناہ کو الگ کرتا ہے۔ ہم تو گناہ سے بچتے ہیں لیکن اللہ نبی سے گناہ کو الگ کر دیتے ہیں۔

اور دوسری بات کہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ﴾ ہم نے یوسف سے گناہ کو الگ کیا ہے اور خود یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ﴾ کہ اے اللہ! اگر آپ مجھ سے ان کے مکر کو دور نہ کرتے.... معلوم ہوا کہ ان عورتوں کا مکر بھی خدا نے دور کیا ہے اور گناہ بھی خدا نے دور کیا ہے۔

اس سے ایک مسئلہ سمجھ میں آیا کہ نبی معصوم ہے۔ معصوم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نبی گناہ نہیں کرتا بلکہ معصوم ہونے کا معنی یہ ہے کہ اللہ اپنے نبی سے گناہ ہونے ہی نہیں دیتا۔ معصوم ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ نبی اپنی حفاظت خود کرتا ہے بلکہ معصوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے نبی کی حفاظت کرتا ہے۔ کیونکہ نبی نبوت کا اعلان خود نہیں کرتا بلکہ خدا نبی سے اعلان نبوت کرتا ہے، وہ خدا نبی کو گناہوں سے بچاتا ہے۔ اگر نبی سے گناہ ہو جائے تو الزام نبی پر نہیں لگے گا بلکہ الزام خدا پر لگے گا کہ نبوت کے لیے کیسا بندہ منتخب کیا ہے جو گناہ کرتا ہے!

**اللہ اپنے نبی کو بچاتا ہے... مثالیں:**

[1]: میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں۔ اگر سخت گرمی میں بارہ بجے دن کو اڑھائی سال یا تین سال کا بچہ سڑک پر آجائے تو لوگ اس کو نہیں کہتے کہ تُو اڑھائی سال یا تین سال کا بچہ ہے تُو سڑک پر کیوں آیا ہے؟ سردی میں رات گیارہ بجے تین سال کا بچہ باہر آ

جائے اور اسے سردی لگے تو کوئی اس بچے کو نہیں کہتا کہ تو ننگے پاؤں، ننگے جسم باہر کیوں نکلا ہے؟ لوگ اس کی ماں سے کہتے ہیں کہ آپ کو جننے کا شوق ہے، ان بچوں کی حفاظت نہیں کر سکتیں؟ یہ آج ہم عورت سے کہتے ہیں۔ اگر اڑھائی تین سال کا بچہ گرمی سردی سے نہ بچے تو الزام بچے پر نہیں لگتا، الزام بچے کی ماں پر لگتا ہے، کیونکہ یہ بچہ دنیا میں خود نہیں آیا، ماں نے بچے کو جنا ہے، اگر بچہ خود آتا تو سردی گرمی سے بچنا خود بچے کے ذمہ ہوتا، وہ خود نہیں آیا بلکہ اسے ماں نے جنا ہے، تو جس ماں نے جنا ہے اس ماں نے بچے کو بچانا بھی ہے۔

اسی طرح نبی اپنی نبوت کا اعلان خود نہیں کرتا، اگر خود کرتا تو گناہ سے بچنا خود نبی کے ذمے ہوتا، خدا نبی کے سر پر تاج نبوت سجاتا ہے، تبھی تو خدا اپنے نبی کو گناہوں سے بچاتا ہے۔ اگر بچہ نہ بچے تو الزام ماں پر لگتا ہے، اگر نبی نہ بچے تو الزام خدا پر لگتا ہے کیونکہ نبی انتخاب خدا ہوتا ہے۔

[2]: میں ایک مثال دیا کرتا ہوں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَا تَزَوَّجْتُ شَيْئًا مِنْ نِسَائِي وَلَا زَوَّجْتُ شَيْئًا مِنْ بَنَاتِي إِلَّا يَأْذِنُ جَاءَنِي بِهِ جِبْرِيلُ عَنِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ" <sup>204</sup>

میں نے جب بھی کسی کی بیٹی لی ہے تو خدا کی وحی سے لی ہے، میں نے جب بھی اپنی بیٹی کسی کو دی ہے تو خدا کی وحی سے دی ہے۔

میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گیارہ نکاح فرمائے ہیں۔ الزام ایک عائشہ پر لگا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دفاع نہیں کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم دفاع تب کرتے جب عائشہ رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہوتے، حضور چپ

رہے ہیں، صفائی خود خدا نے دی ہے۔ کیونکہ عائشہ انتخابِ مصطفیٰ نہیں ہے، عائشہ انتخابِ خدا ہے۔ اگر انتخابِ مصطفیٰ ہوتی تو دفاعِ نبی کے ذمے تھا، انتخابِ خدا ہے تو دفاعِ خدا کے ذمے ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نبی ہیں۔ انتخابِ خدا کا ہے یا اپنا؟ (خدا کا۔ سامعین) تو دفاعِ کس نے کرنا تھا؟ (خدا نے۔ سامعین) فرمایا: ﴿كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ﴾ کہ ہم نے گناہ کو اس سے دور کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اگر یوسف علیہ السلام کو ہم نہ بچاتے تو مبتلا ہو جاتے لیکن ہمارے نبی ہیں تو ہم نے ان کو بچایا ہے۔

### یوسف علیہ السلام جیل خانہ میں:

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں تدبیریں ہوئیں۔ عزیز مصر نے سمجھا کہ الزام لگا ہے لیکن یوسف ہے تو سچا، ادھر میرے گھر کا مسئلہ ہے۔ آخر یہ طے کیا کہ یوسف کو جیل میں ڈال دو۔ یوسف علیہ السلام جیل میں چلے گئے۔ کچھ عرصہ گزرا تو دوسرے قیدیوں سے دوستیاں ہو گئیں۔

مفسرین نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے کچھ قیدیوں نے کہا: ہمیں آپ سے بڑا پیار ہے تو حضرت یوسف نے فرمایا: مجھ سے پیار نہ کرو، کہنے لگے: کیوں؟ فرمایا: جب بھی مجھ سے پیار ہوا تو تکلیف مجھے آئی ہے، لہذا تم مجھ سے پیار مت کرو، میری پھوپھی نے مجھ سے پیار کیا تھا تو چوری کا الزام مجھ پر لگا تھا، میرے باپ نے پیار کیا تھا تو مجھے کنویں کی قید اور غلامی اور جلا وطنی ملی ہے، زلیخا نے پیار کیا ہے تو مجھے جیل ملی، تم پیار کرو گے تو پتا نہیں کیا ملے گا؟ اس لیے مجھ سے پیار کے دعوے نہ کرو، پیار تم نے کرنا ہے اور سزا مجھے ملنی ہے۔

اللہ والوں کے ساتھ بھی عجیب معاملات ہوتے ہیں!

## یوسف علیہ السلام پر پھوپھی کے گھر میں چوری کا الزام:

یوسف علیہ السلام سے پیار پھوپھی نے کیا تو الزام چوری کا لگا۔ یہ چوری کا الزام کیسے لگا تھا؟ اصل میں حضرت یوسف علیہ السلام بالکل چھوٹے بچے تھے، والدہ کا انتقال ہو گیا تھا تو پھوپھی نے ان کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔ پھوپھی کو ان سے پیار بہت زیادہ تھا۔ جب آپ کچھ بڑے ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: میرا بیٹا واپس کر دو، میں اسے لے جاتا ہوں۔ پھوپھی کا دل نہیں کرتا تھا واپس کرنے کو۔ اس نے واپس تو کر دیا لیکن ایک تدبیر کی کہ اپنا دوپٹہ لیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی کمر سے باندھ کر قمیص پہنا کر حضرت یعقوب کے حوالے کر دیا۔

جب جانے لگے تو انہوں نے کہا کہ میں دوپٹہ تلاش کر رہی ہوں نہیں مل رہا، نوکر کے پاس دیکھا تو نہیں مل رہا، کسی اور کے پاس دیکھا تو نہیں ملا۔ بالآخر تلاشی لینی شروع کی تو یوسف کی کمر سے بندھا ہوا ملا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت یہ تھی کہ جو شخص چوری کرے تو چوری کے بدلے میں وہ خود غلام بنے۔ لہذا ان کی پھوپھی نے کہا: یہ میرا چور ہے، مجھے دو۔ یوں اس طریقے سے پھوپھی نے لے لیا۔ پھوپھی کا انتقال ہوا تو یوسف علیہ السلام واپس گھر آئے۔

آپ نے ان قیدیوں سے فرمایا: پھوپھی نے پیار کیا تو چوری کا الزام لگا، باپ نے پیار کیا تو غلامی ملی، زلیخانے پیار کیا تو جیل ملی اور تم پیار کرو گے تو پتا نہیں پھر کیا ملے گا؟! اس لیے ہم سے پیار کے دعوے مت کرو۔ یہ ظرافت کی باتیں تھیں جو یوسف علیہ السلام ان سے فرما رہے تھے۔

## ساتھی قیدیوں کا خواب اور یوسف علیہ السلام کی تعبیر:

خیر حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں قیدی تھے۔ انہوں نے یوسف علیہ السلام سے کہا کہ ہم نے خواب دیکھا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے

خواب کی تعبیر بتائیں۔ اس پوری سورت میں چار خوابوں کا ذکر ہے، یوسف علیہ السلام نے کہا: کیا خواب ہے؟ ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ میرے سر پر روٹیوں کا ایک ٹوکرا ہے اور اس میں سے کچھ پرندے اٹھا کر لے جا رہے ہیں اور دوسرے قیدی نے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں انگور سے شراب نچوڑ کر بادشاہ کو پلا رہا ہوں۔

یوسف علیہ السلام تعبیر کے امام تھے، تعبیر ایک فن ہے جو اللہ تعالیٰ ہر کسی کو نہیں دیتے اور ہر کسی کے سامنے اپنے خواب کا تذکرہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔

بہر حال یوسف علیہ السلام نے سمجھا کہ تبلیغ کا موقع بڑا اچھا ہے، یوسف علیہ السلام نے پہلے ان کو بات سمجھائی کہ ہم جیل میں آئے ہیں جیل سے تو نکل ہی جانا ہے، یہ جو تم نے بت بنا رکھے ہیں چھوڑو ان کو، اللہ کی عبادت کرو، مجھے خدا نے علم دیا ہے، خدا نے تعبیر بتائی ہے۔ اس طرح ان کی ذہن سازی شروع کی۔ فرمایا: ایک خدا بہتر ہے یا ہزاروں خدا بہتر ہیں؟ یوں ان کو پوری بات سمجھائی اور توحید کی دعوت دی۔

اب یوسف علیہ السلام نے ان کو خواب کی تعبیر بتائی۔ فرمایا کہ تم میں سے ایک شخص وہ ہے جو بادشاہ کا ساتی بنے گا اور ایک وہ ہے جس کو سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔ تعین کر کے یہ نہیں کہا کہ تیری تعبیر یہ ہے اور تیری تعبیر یہ ہے۔ نبی دل رکھتا ہے اور دل رکھنے کے لیے فرمایا۔ یہ بھی تو بتا سکتے تھے کہ جس نے کہا کہ میں انگور نچوڑ کر شراب پلا رہا ہوں یہ بادشاہ کا ساتی بنے گا اور جس کے سر سے پرندے روٹیاں اٹھا کر لے جا رہے تھے اس کو سزائے موت ہوگی۔ جس کے بارے میں خیال تھا کہ یہ بچ جائے گا اس سے فرمایا: جب تم بادشاہ کے ساتی بنو گے تو بادشاہ کے سامنے میرا ذکر بھی کرنا کہ ایک بے گناہ قیدی جیل میں ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿فَأَنسَلَهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ ۖ﴾

اس نے کہا کہ یہ میرے ذمے ہو گیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو بھول گیا۔ اس کو یاد

ہی نہیں رہا کہ میرے ساتھ جیل میں کوئی قیدی تھا جس نے مجھے کہا تھا کہ بادشاہ کے سامنے میرا تذکرہ کرنا۔ ”بِضْعَ سِنِينَ“ کا اطلاق تین سال سے لے کر سات سال تک ہوتا ہے۔

### بادشاہ مصر کا خواب:

تو بعض کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد سات سال تک یوسف علیہ السلام جیل میں رہے۔ ایک دن بادشاہ نے خواب دیکھا تو اپنے درباریوں سے کہا:

﴿إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ جِجَافٌ وَسَبْعَ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَبْسُوتٌ﴾

میں نے دیکھا ہے کہ سات موٹی گائے ہیں اور سات دلی پتلی گائے ہیں، دلی گائیوں نے موٹی گائیوں کو کھالیا ہے اور میں نے دیکھا کہ سات ہری بھری بالیاں ہیں اور سات خشک ہیں، ﴿يَأْيِيهَا الْمَلَأُ أَفْتُونٍ فِي رُعْيَايَ إِنَّ كُنْتُمْ لِلرُّعْيَا تَعْبُرُونَ﴾ اس نے کہا مجھے بتاؤ اس خواب کی تعبیر کیا ہے؟ اب درباری خواب کی تعبیر تو جانتے نہیں تھے۔ انہوں نے کہا: ”أَضْعَاثُ أَحْلَامٍ“ بادشاہ! یہ بے تکی خیالات ہیں اور ہم خیالات کی تعبیر نہیں جانتے، ہم تو صحیح خوابوں کی تعبیر بتائیں گے۔ اب پہلے صحیح خواب بتا پھر ہم تعبیر بتائیں گے۔ اب دیکھو! کیسے چکر دیا بادشاہ کو، یہ نہیں کہا کہ ہمیں پتا نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ کہتے تو انہیں پتا تھا کہ دربار سے خارج کر دیے جائیں گے۔

### تعبیر بتانے میں متکلم اسلام کا طرزِ عمل:

خواب کی تعبیر ایک فن ہے۔ خواب ہر کسی کو نہ بتایا کرو، جو شخص تعبیر کا ماہر ہو اسے خواب بتایا کرو۔ میں نے آپ سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ میں خواب کی تعبیر دیتا



ہوں لیکن دیتا صرف ان کو ہوں جو میرا پکا مرید ہو۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ مرید بنانے کا شوق ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ مجھے مرید بنانے کا شوق نہیں، مرید بنا کر تو بندہ خود پھنس جاتا ہے کہ ان کو مرید بنا کر تربیت کون کرے گا؟ تربیت نہیں کرے گا تو قیامت کو مواخذہ ہے، ہم شرط لگاتے ہیں وگرنہ لوگ کہتے ہیں کہ تعویذ دے دو، خواب کی تعبیر دے دو، پھر پورا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے... ہم کہتے ہیں کہ ہم سے مسائل پوچھو، تعویذ تو بڑا آسان کام ہے، خواب کی تعبیر تو بہت آسان کام ہے۔ مسائل تم نہیں پوچھتے اور تعبیر ہم نہیں بتاتے، اپنے اپنے کام پر ڈٹے رہیں! اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### بادشاہ کا خواب اور حضرت یوسف کی تعبیر:

جب بادشاہ کے دربار میں بات چلی تو اس بندے کو یاد آیا کہ یوسف نے مجھ سے کہا تھا کہ بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا۔ اس نے کہا: بادشاہ سلامت! اگر اجازت ہو تو میرے ساتھ ایک صاحب جیل میں تھے، نیک بھی تھے اور خوابوں کی تعبیر بھی بتاتے تھے، ان سے جا کر پوچھوں؟ بادشاہ نے کہا: پوچھو! تو یہ جب وہاں پہنچا تو اس نے جو جملہ کہا وہ بڑا پیارا ہے، اس نے کہا: ﴿يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ﴾ میرے دوست خواب کی تعبیر تو بتا! بادشاہ نے خواب دیکھا ہے کہ سات دہلی پتلی گائے ہیں وہ سات موٹی گائیوں کو کھا رہی ہیں اور سات بالیاں ہیں جو بالکل سوکھی ہیں اور سات ہری بھری ہیں۔ جب خواب کی تعبیر پوچھی تو یوسف علیہ السلام نے فوراً کہا کہ بادشاہ کو جا کر بتاؤ کہ سات سال فصل بہت اگے گی، اگلے سات سال میں قحط پڑے گا تو جو تم نے سات سال میں جمع کیا ہو گا یہ سات سالہ قحط کھا جائے گا۔

### بادشاہ کے خواب کی تعبیر کی وجہ:

یہ تعبیر کیوں نکالی ہے؟ ذرا اس کی وجہ سمجھیں! زمین سے فصلیں اگتی ہیں،

جب بیل کنویں کو چلائیں تو پانی نکلتا ہے، وہ فصل کو لگتا ہے تو اچھی گائے یہ اشارہ ہے اچھی فصل کی طرف اور یہ جو تھادلی پتلی گائے تو یہ اشارہ ہے قحط سالی کی طرف، کہا کہ پہلے سات سال ہری بھری فصلیں ہوں گی، پھر سات سال میں قحط پڑے گا۔ قحط سے اگر بچنا ہے تو کسانوں سے کہو کہ جتنا ان کے پاس غلہ ہے ان کو بالیوں میں ہی رہنے دیں، ضرورت سے زائد نہ نکالیں۔ ہر سال پانچواں حصہ رکھتے جائیں، جب قحط شروع ہو گا تو جمع شدہ غلہ تمہارے کام آئے گا۔

جو سرکار ہے وہ دیہاتوں سے غلہ خریدے، بقدر ضرورت خرچ کرنا، باقی سارا خزانے میں جمع کر لینا، اگلے سال تمہارے کام آئے گا۔ تو جب سات سال کا قحط ختم ہو گا تو اگلا تم نے خواب نہیں دیکھا۔ میں ایک چیز اور بتاتا ہوں کہ اس کے ایک سال بعد پھر بارشیں خوب ہوں گی، فصل بہت ہوگی۔ یوں پچھلی قحط سالی کا جتنا تمہارا نقصان ہو گا وہ ایک سال میں سارا پورا ہو جائے گا۔ یہ اللہ کے نبی ہیں جنہوں نے خواب کی تعبیر بھی بتائی اور اضافی بشارت بھی سنائی ہے۔

اب بات سمجھنا! بادشاہ نے کہا: یہ تو بڑا نیک آدمی ہے، اس کو جیل سے نکال لاؤ تا کہ ہم اپنے کانوں سے ذرا خواب کی تعبیر سنیں۔ جب لینے کے لیے بادشاہ کا قاصد پہنچا تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ﴾ بادشاہ کے پاس واپس جاؤ، اس سے پوچھو: ﴿مَا بَأْسُ النَّسْوَةِ الَّتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ﴾ کہ ان عورتوں نے ہاتھ کیوں کاٹے؟ پہلے یہ تحقیق کرو، پھر میں باہر نکلتا ہوں۔ دیکھیں! اللہ کے نبی کیسے کھڑے ہیں! یہ قیدی وہ ہے جو جیل کاٹ رہا ہے، قیدی بھی نیک تھا لیکن بدنام ہو کر گیا تھا۔ اب باہر آنا ہے تو صفائی کے بغیر باہر نہیں آنا۔ حضرت یوسف فرمانے لگے: ﴿إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِيهِمْ عَلِيمٌ﴾ کہ میرا رب تو جانتا ہی ہے، لیکن ذرا تحقیق کرو۔

بادشاہ سے یہ نہیں کہا کہ عزیز مصر کی بیوی نے مجھ پر الزام لگایا ہے، مجھے

ناحق جیل میں رکھا ہے، نہیں بلکہ اس کی بیوی کا نام ہی نہیں لیا۔ فرمایا کہ جن عورتوں نے ہاتھ کاٹے ہیں ان سے پوچھو کہ ہاتھ کیوں کاٹے ہیں؟ عزیز مصر کا پھر بھی خیال کیا ہے، پھر بھی اس کی ستر پوشی کی ہے۔

بادشاہ نے ان عورتوں کو بلایا اور کہا: ﴿مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُنَّ يُوسُفَ عَنْ نَفْسِهِ﴾ تمہارا کیا قصہ ہے جب تم نے یوسف کو ورغلانے کی کوشش کی تھی؟ تم نے کیوں ایسا ڈرامہ رچایا؟ ان سب نے کہا: ﴿حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ﴾ اللہ کی پناہ! یوسف تو نیک آدمی ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں تھا۔ عزیز مصر کی بیوی نے کہا: ﴿الَّتِي حَصَّصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ﴾ اب تو حق واضح ہو گیا، میں کہتی ہوں کہ قصور میرا ہے وہ سچا ہے۔

اب یوسف علیہ السلام باہر آئے، بتاؤ! کتنے پروٹوکول اور اعزاز سے آئے ہوں گے!

مفسرین کہتے ہیں: عجیب بات یہ ہے کہ خود بندے سے کہا کہ جاؤ بادشاہ سے تذکرہ کرو، وہ بندہ بھول گیا، کیوں بھولا؟ اس کی وجہ سمجھیں: اللہ اپنے نبی کو کسی کا ممنون نہیں بناتے، اللہ اپنے نبی کو کسی کا زیرِ احسان نہیں ہونے دیتے، اگر وہ تذکرہ کر دیتا تو بادشاہ رحم کر کے نیک سمجھ کر چھوڑ دیتا، الزام تو رہتا لیکن خدا نے اسے بھلا دیا۔ ایسا سبب پیدا کیا کہ نبی اپنی ترتیب سے باہر آیا ہے۔

**اگر میں یوسف کی جگہ ہوتا... کا مطلب:**

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑا بیاراجملہ ارشاد فرمایا کہ اگر اس موقع پر میں ہوتا ”لَمَّا أَحْبَبَتْهُمْ حَتَّى اشْتَرَطَ أَنْ يُخْرِجُونِي“ تو میں شرط لگاتا کہ تعبیر بعد میں بتاؤں گا پہلے مجھے جیل سے نکالو! اور دوسرا ”وَلَوْ كُنْتُ مَكَانَهُ

لَبَّادَزُّهُمْ الْبَابَ“ کہ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو میں فوراً جیل سے نکل جاتا۔<sup>205</sup>

اب اس پر بندہ کے ذہن میں ایک سوال آتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ صبر والے ہیں؟

مفسرین نے اس کا بڑا پیارا جواب دیا ہے، فرماتے ہیں: اصل میں اللہ کے نبی یہ نہیں کہنا چاہتے کہ میں کرتا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کو ترتیب بتانا چاہتے ہیں کہ یہ یوسف علیہ السلام کا جگر تھا جو ڈٹ گئے، جب تمہارے ساتھ یہ معاملہ ہو تو شرطیں نہ لگانا، بلکہ رہائی کے اسباب تلاش کرنا، بادشاہوں کے موڈ کا پتا نہیں چلتا اور یوسف علیہ السلام تو نبی تھے، ان کا مقام بہت بڑا تھا اور یوسف علیہ السلام نبی تھے تو ممکن ہے کہ بذریعہ وحی خدا نے انہیں بتا دیا ہو کہ اب صفائی کا موقع ہے، صفائی کے ساتھ باہر آنا ہے تو اس لیے یوسف علیہ السلام صفائی کے بعد جیل سے باہر نکلے ہیں۔

**یوسف علیہ السلام کی براءت اور تواضع:**

﴿وَمَا أَتَّبِعْ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي إِنَّ

رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾

یوسف علیہ السلام نے جیل سے نکلنے سے پہلے اپنی براءت کا اظہار زیادہ ضروری سمجھا، شاہ مصر نے ان عورتوں کو جمع کیا، ان سے ساری بات پوچھی۔ اسے پتا چلا کہ یوسف علیہ السلام تو بالکل بے گناہ ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ادھر قاصد کو پیغام دیا اور ساتھ یہ فرمایا:

﴿وَمَا أَتَّبِعْ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي﴾

اب اس میں پاکدامنی کا دعویٰ بھی تو تھا کہ یوسف علیہ السلام نے خود کو پاک

دامن فرمایا ہے تو ساتھ ہی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ پاکدامنی کے ساتھ تواضع کا اظہار بھی کر دیا۔ فرمانے لگے کہ اگرچہ میں اس معاملے میں بے گناہ ہوں لیکن میرا یہ بے گناہ ہونا میرا کمال نہیں ہے، یہ میرے اللہ کا فضل ہے۔ کیونکہ ہر انسان کا نفس گناہ کا حکم دیتا ہے مگر اللہ کرم فرمائے تو انسان گناہوں سے نجات جاتا ہے۔

### نفس کی تین اقسام:

علماء نے لکھا ہے کہ نفس انسانی اپنی ذات کے اعتبار سے ہمیشہ گناہوں کا حکم دیتا ہے، اس کو کہتے ہیں؛ نفس امارہ بالسوء کہ گناہ کا حکم دینے والا، لیکن جب انسان اپنے نفس کے گناہوں کے تقاضے پر عمل نہ کرے تو یہی نفس؛ امارہ سے نکل کر نفس لوامۃ بنتا ہے یعنی برے کاموں پر ملامت کرنے والا اور اس کے تقاضے پورے نہ کرنے والا اور قرآن کریم نے نفس لوامۃ کو اعزازیہ بخشا کہ اللہ نے نفس لوامۃ کی قسم اٹھائی ہے۔ فرمایا:

﴿لَا أَقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَمَةِ ۖ وَلَا أَقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَامَةِ ۖ﴾<sup>206</sup>

اور جب انسان گناہوں کے تقاضے مسلسل دبائے اور گناہوں کے تقاضے پر بالکل عمل نہ کرے تو یہی نفس؛ لوامہ سے نکل کر نفس مطمئنہ بنتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿يَأْتِيَهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ اَرْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مَُّرْضِيَةً ۖ﴾<sup>207</sup>

تو پہلے نفس امارہ یعنی گناہوں کا حکم دینے والا، پھر نفس لوامہ یعنی گناہوں پر ملامت کرنے والا اور پھر نفس مطمئنہ۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں بڑا عجیب نکتہ لکھا ہے، فرماتے ہیں کہ عام آدمی کا نفس امارہ ہوتا ہے، صالحین کا نفس لواہ ہوتا ہے اور مسلسل محنت کے بعد جب نفس میں برے کاموں کا تقاضا ہی نہ رہے تو یہ نفس مطمئنہ بن جاتا ہے۔ صلحائے امت کا نفس مطمئنہ بنتا ہے لیکن مسلسل مجاہدات اور ریاضات کے بعد، مگر نبی کو یہ مقام بغیر کسی محنت اور مشقت کے محض اللہ کے فضل و کرم سے حاصل ہو جاتا ہے۔ تو گویا عام آدمی کے نفس کا آخری درجہ ہے نفس مطمئنہ لیکن نبی کے نفس کا آغاز ہی نفس مطمئنہ سے ہوتا ہے۔ آپ بتائیں کہ نبی کس مقام پر فائز ہوتا ہے؟ انسان سوچ بھی نہیں سکتا!

تو یوسف علیہ السلام نے صفائی بھی دی ہے اور ساتھ تواضع کا اظہار بھی فرمایا ہے اور یہ طریقہ ہمارے اکابر علماء دیوبند کا بھی ہے۔

### حضرت نانوتوی کا ہندو پنڈت سے مناظرہ اور تواضع:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ دارالعلوم دیوبند کے بانی ہیں۔ حضرت کا ایک ہندو سے مناظرہ تھا۔ مناظرے کے لیے اعلان کیا گیا۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تشریف لے آئے تو حضرت نے ہندو مناظر پنڈت سے کہا: پہلے گفتگو آپ کریں۔ ہندو نے کہا کہ پہلے گفتگو آپ کریں، آپ بڑے ہیں، آپ بزرگ ہیں۔ مولانا فرمانے لگے کہ بہتر ہے کہ آپ کر لیں۔ اس نے کہا: حضرت! آپ فرمائیں، ہم آپ کو اعزاز دینا چاہتے ہیں۔ مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ فرمانے لگے کہ اس نبی کا امتی ہوں جو خاتم النبیین ہیں، تو میرا موقع بعد میں ہے مجھے بعد میں کرنی چاہیے۔ انہوں نے کہا حضرت! آپ شفقت فرمائیں، آپ پہلے کر لیں۔

مولانا فرمانے لگے: چلو! میں تمہاری مان کر کچھ پہلے کرتا ہوں اور کچھ بعد میں کروں گا، کیونکہ میں اس نبی کا امتی ہو جو نبی اول بھی ہیں اور نبی آخر بھی ہیں، اس لیے

میری باری پہلے بھی ہے اور بعد میں بھی ہے۔ اس ہندو پنڈت نے کہا کہ حضرت! ہم دلائل کی بات نہیں کرتے آپ کی منت کرتے ہیں، آپ بڑے ہیں، آپ پہلے گفتگو فرمائیں۔ مولانا نانوتوی فرمانے لگے: اگر میں نے گفتگو کی تو میرے بعد تم گفتگو کر نہیں سکو گے، میری گفتگو اول بھی ہوگی اور آخر بھی ہوگی، اس لیے میں موقع دیتا ہوں کہ گفتگو پہلے کر لو۔ انہوں نے پھر اصرار کیا تو مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے تین گھنٹے کی گفتگو کی اور اللہ کے وجود کو ثابت کر کے ان کے معبودوں کی نفی کی۔

مولانا کے بیان کے بعد ثالث نے اعلان کیا تو کوئی ہندو پنڈت بیان کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوا۔ جو انہوں نے شبہات پیدا کرنے تھے مولانا نے ان تمام شبہات کا جواب پہلے دے دیا تھا، ان کی کوئی دلیل بچی ہی نہیں تھی۔ تو ہندو پنڈت جو ثالث تھا اس نے فیصلہ دیا، اس نے کہا کہ آج قاسم نانوتوی انسان نہیں بول رہا تھا بلکہ لگتا تھا کہ انسان کی زبان پر الہام کا فرشتہ بول رہا ہے۔ مولانا قاسم نانوتوی جیت گئے۔

جو میں واقعہ اصل میں سنانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک شخص مولانا قاسم نانوتوی کے پاس آیا، اس نے ایک عجیب حملہ کیا، اس نے کہا: مولانا قاسم نانوتوی! مسلمان آپ کی قدر نہیں کرتے، اگر آپ ہندوؤں میں ہوتے تو دہلی کے ایک ایک چوک پر آپ کا بت بنا کر پوجا جاتا۔ آپ بتائیں! کتنا بڑا حملہ تھا؟ اگر ہم ہوتے تو ہم نے فوراً کہنا تھا بالکل بات ٹھیک ہے، سرگودھا کے لوگ میری قدر نہیں کرتے، مجھے سمجھ ہی نہیں سکے۔

مولانا قاسم نانوتوی کہنے لگے: بالکل ٹھیک کہتے ہو، اگر میں تمہارے اندر ہوتا تو تم بت بنا کر پوجتے کیونکہ تمہاری مجبوری ہے کہ تمہارے اندر قاسم ہوتا جو کوئی نہیں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے مسلمانوں میں اتنے قاسم ہیں کہ یہ کس کس کی پوجا کریں گے؟! اب دیکھو اتنا بڑا آدمی تھا اور تواضع میں ساری بات کو ختم

کر دیا۔

### یوسف علیہ السلام کی بادشاہ کے دربار میں آمد:

حضرت یوسف علیہ السلام پاکدامن بھی ہیں اور ساتھ تو اضع فرما کر عاجزی کا اظہار بھی کر دیا تاکہ اس پر نفس خوش نہ ہو کہ اپنی پاکدامنی کے دعوے کیے جا رہے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا معاملہ صاف ہوا تو بادشاہ نے کہا کہ ان کو میرے پاس لے آؤ، ہم ان کو اپنا خاص بندہ بنا کر رکھتے ہیں۔

روایات میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ بادشاہ مصر جس زبان میں بات کرتا آپ اسی زبان میں جواب دیتے۔ جتنی زبانیں وہ جانتا تھا وہ بات کرتا رہا اور آپ جواب دیتے رہے۔ یوسف علیہ السلام نے دو زبانیں اضافی استعمال کیں، عربی زبان میں اس کو سلام کیا اور عبرانی زبان میں اس کو دعائیں دیں تو یہ بادشاہ کے سامنے ان کی فوقیت کا معاملہ تھا کہ آپ دو زبانیں وہ جانتے ہیں جو بادشاہ بھی نہیں جانتا۔ تو بادشاہ کے ذہن میں آیا کہ یہ صرف نیک ہی نہیں بلکہ عالم بھی ہے، صرف پاکدامن ہی نہیں بلکہ بہت بڑا عالم بھی ہے۔ تو بادشاہ بڑا متاثر ہوا۔ اس نے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے اور میری خواہش ہے کہ اس کی تعبیر آپ بتائیں، میں اپنے کانوں سے سنوں۔

تو باد نے کہا: میرا جی چاہتا ہے کہ میں خود سنوں۔ یوسف علیہ السلام نے کہا کہ آپ کے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ سات سال خوب پیداوار ہوگی اور پھر سات سال خوب قحط ہوگا، آپ ایسا کریں کہ اپنی رعایا کو حکم دیں کہ خوب محنت کریں اور پیداوار خوب لگائیں، جتنی پیداوار ہو اس کے چار حصے استعمال کریں اور پانچواں حصہ اپنے پاس رکھ لیں اور وہ جو پانچواں حصہ ہے وہ گندم کے خوشے میں ہی رہنے دیں، اس سے گندم خراب نہیں ہوتی اور سات سال کے بعد جب قحط شروع ہو گا تو آپ کے خزانے



میں تو ویسے ہی گندم جمع ہوگی اور عوام کے پاس بھی ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ عوام کو حکومت سے گندم لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

اب جو حکومت کے پاس گندم اور غلہ ہوگا، باہر کے جو تاجر اور مساکین آئیں گے یہ ان کو مل جائے گا۔ حکومت کا کام بھی چلے گا اور عوام پہلے سے خوشحال ہوگی۔ عوام حکومت کی محتاج نہیں ہوگی اور باہر سے لوگ جب آپ سے گندم لینے کے لیے آئیں گے، غلہ آپ ان کو بیچیں گے تو حکومت کے خزانے میں اتنے پیسے جمع ہوں گے جتنے پہلے کبھی بھی جمع نہیں ہوئے ہوں گے۔ بادشاہ حیران ہو گیا کہ اس بندے نے خواب کی تعبیر بھی بتائی ہے اور تعبیر کے ساتھ تدبیر بھی بتائی ہے۔ نبی کا معاملہ بہت بلند ہوتا ہے۔ جتنا شفیق نبی ہوتا ہے امت کے ساتھ اتنی شفقت تو ماں بھی نہیں سوچ سکتی اپنی اولاد کے ساتھ۔

### یوسف علیہ السلام وزیر خزانہ کے منصب پر:

بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کو اپنا خاص بندہ بنالیا اور ایک سال تک ان کو اپنا شاہی مہمان بنا کر رکھا اور ایک سال کے بعد ان کو وزیر خزانہ بنایا۔ ایک سال تک شاہی مہمان کیوں بنایا؟ مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا خیال یہ تھا یہ عالم بھی بہت بڑا ہے اور نیک بھی بہت زیادہ ہے لیکن ابھی شاہی آداب سے واقف نہیں ہے، اس کو ذرا حکومت کے معاملات میں دخیل بھی کر دیں اور میں قریب رہ کر ان کو سال میں دیکھ بھی لوں تاکہ آئندہ منصب دوں تو مجھے دھوکہ نہ لگے۔

حضرت یوسف علیہ السلام سے جب بادشاہ نے مشورہ کیا کہ ساری بات مجھے سمجھ آگئی ہے۔ اب ہمیں کرنا کیا چاہیے، آپ اس کا حل بتائیں، اس کے لیے انتظام کیسے کریں؟ تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

﴿اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾

آپ مجھے وزیر خزانہ بنادیں، یہ کام میں سنبھال لوں گا۔ آج کے دور کا میں ترجمہ کر رہا ہوں کہ مجھے وزیر خزانہ بنادیں، کیوں؟ اس لیے کہ وزیر خزانہ میں دو صفتیں ضروری ہوتی ہیں:

1: وہ امانت دار ہو، بددیانت نہ ہو۔

2: وہ یہ جانتا ہو کہ کہاں خرچ کرنا ہے اور کہاں خرچ نہیں کرنا اور کتنا کرنا ہے اور کتنا نہیں کرنا۔ فرمایا: ﴿إِنِّي حَفِیْظٌ عَلَیْہِمْ﴾ کہ میں حفیظ بھی ہوں اور علیم بھی ہوں، میں حفاظت بھی کرنا جانتا ہوں اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ کہاں خرچ کرنا ہے!

### عہدہ مانگنا کب جائز اور کب ناجائز؟

وزیر کی ساری صفات یوسف علیہ السلام نے دو لفظوں میں سمیٹ دی ہیں۔ اس پر بظاہر ایک اشکال ہے۔ کوئی بندہ یہ سمجھے گا کہ یوسف علیہ السلام العیاذ باللہ خود وزارت مانگ رہے ہیں حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لَنْ نَسْتَعْمِلَ عَلَى عَمَلِنَا مَنْ أَرَادَ." 208

کہ جو بندہ ہم سے کوئی عہدہ مانگے تو ہم اس کو نہیں دیتے۔

تو حدیث سے ثابت ہوا کہ عہدہ مانگنا اچھا کام نہیں ہے، نہیں مانگنا چاہیے لیکن یوسف علیہ السلام تو مانگ رہے ہیں۔ مفسرین نے اس کی وجہ بتائی ہے کہ یوسف علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اور نبی امت پر بہت شفیق ہوتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام دیکھ رہے تھے کہ قحط آنا ہے، غریب نے پریشان ہونا ہے، بادشاہ بھی کافر ہے، عملہ بھی کافر ہے، ان کے دل میں امت کا دکھ اور درد نہیں ہے۔ اگر اس موقع پر آگے بڑھ کر میں نے یہ کام نہ سنبھالا تو ان لوگوں سے کام سنبھالے گا نہیں، اس لیے اپنے کندھوں پر

بوجھ اٹھالیا تاکہ غریب کی پریشانی ختم ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایسے موقع پر اگر کوئی عالم سیاست میں آجائے تو اس کو آنا چاہیے، پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔ آپ کہیں گے کہ شاید مولانا صاحب اپنے لیے فضا ہموار کر رہے ہیں! ارے بھائی! فضا ساز گار کوئی دس بندوں میں تو نہیں کرتا، دس ہزار بندوں میں کرتا ہے، میں تو مسئلہ اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ جب بندہ خود کو اہل سمجھے اور اس کا خیال ہو کہ میں کنٹرول کر سکتا ہوں تو اس کو اللہ کا نام لے کر میدان میں نکل آنا چاہیے، پھر لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔

### قط اور یوسف علیہ السلام کی تدبیر:

سارا نظام حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالے کر دیا گیا۔ قرآن کا اسلوب ہے کہ پورا واقعہ بیان نہیں کرتا بلکہ جس واقعہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کو بیان کرتا ہے۔ اب وزیر خزانہ بنا دیا گیا۔ پیداوار آگ گئی بعد میں قحط شروع ہو گیا۔ یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی اس لیے اب قرآن کریم نے سیدھا واقعہ بیان کیا ہے کہ قحط مصر سے نکلا اور باہر تک چلا گیا۔ اب حضرت یوسف علیہ السلام کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو بھیجا کہ تم بھی مصر جاؤ اور جا کر سامان لے آؤ۔ اس دور میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اصول یہ بنایا تھا کہ جو آدمی آئے گا اس کے پاس جو سواری ہوگی اس کے حصے کا غلہ اس کو لا کر دیں گے، دوسرے بندے کے حصے کا غلہ اس کو نہیں دیں گے۔ ایک بندے کو ایک کا سامان دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ لوگ تھوڑا تھوڑا لے کر جائیں گے، زیادہ نہیں لے کر جائیں گے، جب ختم ہو جائے پھر آؤ، پھر ختم ہو جائے تو پھر آؤ، اب جو شخص اتنا لمبا سفر کر کے آئے گا اور غلہ تھوڑا ملے گا تو وہ حساب کے ساتھ خرچ کرے گا کہ دوبارہ جانا بڑا مشکل ہے اور اگر ایک ایک بندے کو دس دس بندوں کا غلہ دے دیں گے تو لوگ جا کر ضائع کرنا شروع

کر دیں گے۔

### برادرانِ یوسف دربارِ یوسف میں:

تو یوسف علیہ السلام کے بھائی بھی آئے اور ان کے بھائیوں نے آکر بھی اپنا اپنا حصہ وصول کیا۔ یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا کہ میرے بھائی ہیں لیکن وہ نہیں پہچان سکے کیونکہ جب یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکا تھا تو ان کی عمر سات سال تھی اور اب اس واقعے کو چالیس سال ہو گئے ہیں۔ ان کی عمر سینتالیس سال ہے تو وہ کیسے پہچانتے؟ جب یہ بھائی واپس جانے لگے تو یوسف علیہ السلام نے ان کے بھائیوں کا جتنا پیسہ تھا وہ سارا ایک بوری میں ڈال کر واپس کر دیا اور ان سے پوچھا کہ تمہارے بھائی کتنے ہیں؟ انہوں نے کہا: جی ہمارے اتنے بھائی ہیں، ایک ہمارا چھوٹا بھائی ہے جو ہمارے والد کے پاس ہے۔ تو یوسف علیہ السلام نے کہا کہ آئندہ آؤ تو اس کو بھی لے کر آنا، اگر تم نہیں لے کر آئے تو میں تمہیں تمہارے حصے کا مال نہیں دوں گا۔

یہ شرط کیوں لگائی؟ اس لیے کہ وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارا ایک بھائی ہے۔ اب آئندہ اگر اس بھائی کو نہیں لاتے تو اس کا مطلب کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اب ان کو مجبوراً اپنا بھائی ساتھ لانا پڑے گا یہ بتانے کے لیے کہ ہمارا ایک بھائی تھا جس کو ہم ساتھ لے کر آگئے ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے ان کے سامان میں ان کے سارے پیسے بھی رکھ دیے۔ جب یہ واپس گئے تو انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو سارا واقعہ سنایا کہ انہوں نے ہم سے پوچھا تھا تو ہم نے ایک بھائی اور بھی بتایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آئندہ اس بھائی کو لاؤ گے تو ہم غلہ دیں گے ورنہ غلہ نہیں دیں گے۔

### یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کے پیسے کیوں واپس کیے؟

﴿وَلَمَّا فَخَّخُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ﴾

جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو اندر ان کے پیسے سارے موجود تھے۔

انہوں نے کہا: ابا جی! ہمیں اناج بھی دیا گیا ہے اور پیسے بھی سارے آگئے۔ اور ہمیں کیا چاہیے؟

یوسف علیہ السلام نے یہ پیسے ان کے سامان میں کیوں رکھے تھے؟ مفسرین نے اس کی کئی وجوہات لکھی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ لکھی ہے کہ وہ ان کے بھائی تھے اور یوسف علیہ السلام کی مروت نے گوارا نہ کیا کہ اپنے بھائیوں سے پیسے لے کر ان کو سامان دیا جائے۔ اگرچہ بھائیوں نے ظلم کیا تھا لیکن پھر بھی بھائی ہی تھے۔ تو یوسف علیہ السلام کی غیرت نے گوارا نہیں کیا۔ اس لیے آپ علیہ السلام نے ان کو پیسے واپس کر دیے اور عین ممکن ہے کہ آپ نے اتنے پیسے خزانے میں جمع کروا دیے ہوں۔

دوسری وجہ مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے پیسے واپس کر دیے اس لیے کہ ان کے ذہن میں تھا کہ یہ لوگ غریب ہیں، جب ان کے پاس پیسے نہیں ہوں گے تو یہ دوبارہ کیسے آئیں گے؟ اس لیے پیسے رکھ دیے تاکہ یہ دوبارہ آئیں۔

اور تیسری وجہ یہ لکھی ہے کہ یوسف علیہ السلام سمجھتے تھے کہ میرے والد حضرت یعقوب نبی ہیں۔ جب یہ پیسے دیکھیں گے تو کہیں گے کہ جاؤ! یہ پیسے واپس کر کے آؤ، وہ ان کو رہنے نہیں دیں گے، ان کو ضرور بھیجیں گے۔ اس لیے یوسف علیہ السلام نے پیسے سامان میں رکھ دیے۔

### بنیامین کو لے جانے کے لیے بھائیوں کا اصرار:

جب بیٹوں نے باپ کے سامنے ساری بات رکھ دی اور کہا کہ اس بھائی بنیامین کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دیں تو والد نے کہا: بیٹا! مجھے بتاؤ!

﴿هَلْ أَمْنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمْنُتُكُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ مِن قَبْلُ﴾

پہلے میں نے یوسف کے بارے میں تم پر اعتماد کیا تو اس کو کھو بیٹھا، اب یہ

چھوٹا بھی تمہیں دے کر اسے بھی ضائع کر بیٹھوں؟ میں کیسے تمہارے ساتھ بھیج سکتا ہوں؟ مجھے بتاؤ! یہ ان کی باتیں چل رہی تھیں بعد میں سامان کھولا تو اس میں سے پیسے بھی نکلے۔ تو انہوں نے والد کو ترغیب دی کہ ابا جان! سامان تھوڑا ہے، گزارہ نہیں ہوگا۔ ہم دوبارہ جا کر اور لے کر آئیں، سال گزارنا مشکل ہوگا۔ والد نے کہا کہ چلو میں بھیج دیتا ہوں لیکن ایک شرط ہے:

﴿لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّى تُؤْتُوا مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي بِهِ إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ﴾

تم قسم کھا کر وعدہ کرو کہ تم اس کو واپس لے کر آؤ گے، اللہ کی طرف سے کوئی مصیبت آجائے تو الگ بات ہے لیکن تم وعدہ کرو کہ تم کو تباہی نہیں کرو گے۔ اب ظاہر ہے والد کے دل میں پہلے یوسف علیہ السلام کا صدمہ موجود ہے، اب چھوٹا بیٹا بھیجنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ جب انہوں نے قسم اٹھا کر وعدہ کر لیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے سارے بیٹے بھجوا دیے۔ جب بیٹے جانے لگے تو ایک مشورہ دیا اور ایک تدبیر دی۔ فرمانے لگے: میرے بیٹو!

**یعقوب علیہ السلام کی تدبیر:**

﴿يَسِّرُنِي لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ﴾

تم مصر کے ایک ہی دروازے سے سارے اکٹھے نہ داخل ہو جانا بلکہ تم الگ الگ دروازے سے شہر میں داخل ہونا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ بات کیوں فرمائی ہے؟ وجہ اس کی یہ تھی کہ جب یہ پہلی مرتبہ گئے تو اجنبی تھے، ان کو کوئی پہچانتا نہیں تھا، وہاں شاہی مہمان خانے میں ان کو ٹھہرایا گیا تھا، ان کو عزت بھی دی گئی تھی، اب

جب واپس آئے ہیں تو ان کا سامان بھی واپس ہو گیا ہے، اب جب دوبارہ جارہے ہیں اور بادشاہ کے کہنے پر جارہے ہیں تو اب لوگ تو ان کو جانتے ہیں کہ یہ بندے خاص ہیں، اب بندے خاص بھی ہوں اور نوجوان بھی ہوں اور تعداد بھی کافی ہے، سارے بھائی ہیں تو ہر بندے کی نظر پڑتی ہیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام سمجھتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ لوگ ان کو دیکھ لیں اور نظر لگ جائے۔ اس لیے فرمایا کہ اکٹھے نہ جانا، الگ الگ دروازے سے داخل ہونا۔

### نظر بد کا لگ جانا برحق ہے:

اس آیت کے تحت مفسرین نے لکھا ہے کہ نظر لگ جاتی ہے اور نظر کا لگ جانا برحق ہے، اس لیے انسان کو اس کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔ اس کے تحت ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک صحابی تھے سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ۔ ایک بات کپڑے اتارے اور غسل کرنے لگے۔ جسم کا اوپر کا حصہ نظر آرہا تھا تو عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ صحابی نے دیکھا تو ان کا جسم بہت خوبصورت اور سفید تھا، فرمایا: کتنا خوب صورت جسم ہے، میں نے زندگی میں اتنا خوب صورت جسم کبھی دیکھا ہی نہیں ہے۔ یہ کہنا تھا کہ حضرت سہل کو بہت سخت بخار ہو گیا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ نے عامر بن ربیعہ سے بڑا عجیب جملہ فرمایا:

عَلَاہَ یَقْتُلُ أَحَدُكُمُ أَحَاہُ ۖ أَلَا بَرَّکْتَ إِنَّ الْعَيْنَ حَقٌّ.

تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو قتل کیوں کرتا ہے؟ تو نے بارک اللہ کیوں نہیں کہا، مبارک کیوں نہیں کہا، ماشاء اللہ کیوں نہیں کہا؟ اللہ کے نبی نے فرمایا: نظر لگ جاتی ہے، نظر حق ہے۔ پھر حضرت عامر بن ربیعہ سے فرمایا کہ تم وضو کرو۔ انہوں نے وضو کیا، وضو کا سارا پانی جمع کیا، وہ جمع شدہ پانی حضرت سہل بن حنیف پر پھینکا تو نظر اتر گئی

اور بخار ٹھیک ہو گیا۔<sup>209</sup>

اس لیے نظر سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ایسے آدمی کو دیکھیں کہ جو بہت خوبصورت ہے تو کہیں ماشاء اللہ! کسی کا بچہ دیکھیں تو کہیں: ماشاء اللہ، مبارک ہو، اس سے پھر نظر نہیں لگتی ہے۔

### تدبیر اور توحید ساتھ ساتھ:

تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ ایک دروازے سے داخل نہیں ہونا الگ الگ دروازے سے جانا ہے اور ساتھ ایک جملہ فرمایا:

﴿وَمَا أَعْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۖ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ﴾

یہ ایک تدبیر ہے جو میں نے بتادی ہے، باقی اگر اللہ نے کسی مصیبت کا فیصلہ کر دیا ہے تو اس کو میری تدبیر بھی نہیں ٹال سکتی۔

نبی تدبیر بھی بتا رہے ہیں اور توحید بھی بتا رہے ہیں۔ بعض لوگ موحد بننے ہیں تو تدبیر چھوڑ دیتے ہیں اور بعض لوگ تدبیریں اختیار کرتے ہیں تو اللہ کی توحید کو بھول جاتے ہیں۔ نبی موحد بھی ہوتا ہے اور مدبر بھی ہوتا ہے۔ اس لیے توحید بھی نہ چھوڑیں اور تدبیر بھی نہ چھوڑیں۔ بچہ بیمار ہو جائے تو ڈاکٹر کے پاس بھی لے جائیں اور اللہ سے دعا بھی مانگیں۔ اللہ سے دعا مانگیں اور ڈاکٹر کے پاس نہ لے کر جائیں تو یہ بچے کے ساتھ زیادتی ہے۔ ڈاکٹر سے علاج کروائیں اور اللہ سے دعا نہ مانگیں تو بھی یہ زیادتی ہے۔ اس لیے دعا بھی مانگیں اور دوا بھی کریں۔ اللہ چاہیں گے تو شفا دیں گے، اللہ نہیں چاہیں گے تو شفا نہیں عطا فرمائیں گے۔



## بنیامین کو روکنے کی تدبیر:

خیر جیسے باپ نے کہا تھا اسی طرح برادرانِ یوسف داخل ہوئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کا اہتمام کیا کہ دو دو بندوں کو ایک ایک کمرے میں ٹھہرا دیا۔ اب ٹوٹل بھائی گیارہ تھے۔ دو دو ایک ایک کمرے میں اور حضرت بنیامین اکیلے رہ گئے۔ تو بنیامین کو یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ میرے کمرے میں ٹھہریں گے۔ یوسف علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ دیکھو میں تمہارا بھائی ہوں، تم پریشان نہ ہونا۔ سارا واقعہ ان کو بتادیا۔ اب ظاہر ہے کہ بھائی تو مچل اٹھا کہ میں اپنے سگے بھائی کے پاس کمرے میں آرام کر رہا ہوں۔ بنیامین نے کہا اللہ کے لیے مجھے واپس نہ بھیجو! میں ان کے ساتھ رہنے پر خوش نہیں ہوں۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا: اس کی ایک صورت یہ ہے کہ میں تمہارے سامان میں کچھ رکھ دوں اور چوری کا الزام لگا دوں، تمہیں روک لوں، اس کے علاوہ تو کوئی صورت موجود نہیں ہے۔ بنیامین نے کہا کہ مجھے یہ الزام برداشت ہے لیکن مجھے واپس نہ بھیجو! صبح سب کا سامان بنادیا گیا۔ ہر ایک کا اونٹ لاد دیا گیا تو بنیامین کا سامان تھا اس میں بادشاہ کا چاندی یا جو اہرات کا پیالہ رکھ دیا گیا۔ جب یہ قافلہ چلنے لگا تو ایک آدمی نے زور سے آواز دی، اس نے کہا:

﴿أَيْتُهَا الْعِيزُ أَنْكُمْ لَسِرِقُونَ﴾

اے قافلے والو! تم چور ہو، ٹھہر جاؤ۔ سارے رک گئے۔ انہوں نے کہا کہ تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے؟ خدا کی قسم! ہم نے تو چوری نہیں کی، تم کیسی بات کرتے ہو؟ انہوں نے کہا: بادشاہ کا پیالہ گم ہو گیا ہے اور اعلان کرنے والے نے کہا کہ جو بندہ بادشاہ کا پیالہ لے کر آئے گا میں اس بات کا ضامن ہوں کہ بادشاہ اسے ایک اونٹ کے برابر غلہ اور دے گا۔ بادشاہ تلاش کر رہا ہے۔ اب جیسے تدبیر طے تھی تو اسی طرح اس اعلان کرنے والے نے اعلان کیا۔ انہوں نے کہا:

﴿تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ﴾ (٤٤)

اللہ کی قسم! تمہیں پتا ہے کہ ہم فساد کی تو نہیں ہیں، چور بھی نہیں ہیں! پھر قاصد نے کہا: جو آدمی چور ثابت ہو اس کی سزا کیا ہوگی؟ انہوں نے کہا:

﴿جَزَاءُ ذَٰلِكَ مَنْ وَجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاءُ ذَٰلِكَ﴾

جس کے سامان سے چوری کا پیالہ نکل آیا تو آپ اس کو اپنے قبضے میں رکھ لیں، یہی اس کی سزا ہے۔ انہوں نے کہا: چلو ٹھیک ہے۔ اب انہوں نے پہلے دوسرے بھائیوں سے شروع کیا، ان کے سامان میں پیالہ تو نہیں تھا، آخر میں جب بنیامین کا سامان کھولا تو اندر پیالہ موجود تھا۔ انہوں نے کہا: تم کہتے ہو کہ ہم نے چوری نہیں کی، یہ دیکھو! پیالہ تو نکل آیا۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ﴾

میں اس کا مطلب بعد میں سمجھاتا ہوں۔ اب جب ان کے بھائی کے پاس سامان نکالا تو یہ بھائی فوراً کہنے لگے:

**اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی!**

﴿اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اٰخَرُ لَهُ مِنْ قَبْلُ﴾

اگر اس نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی۔ یوسف اور بنیامین ایک ماں سے تھے اور باقی بھائی دوسری ماں سے تھے۔ یہ بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح چور ہے۔ وہ چوری کون سی تھی؟ میں نے بتایا تھا کہ یوسف علیہ السلام کی والدہ بچپن میں فوت ہو گئی تھیں۔ تو ان کی پھوپھی نے پالنے کے لیے انہیں اپنے پاس رکھا تھا۔

جب یوسف علیہ السلام کچھ بڑے ہوئے چھ یا سات سال کی عمر کے تو

حضرت یعقوب علیہ السلام کہنے لگے کہ یوسف ہمیں واپس دے دو۔ تو پھوپھی نے ایک دوپٹہ لیا اور یوسف علیہ السلام کی کمر میں قمیص کے نیچے باندھ دیا۔ جب جانے لگے تو پھوپھی نے کہا کہ میرا ایک دوپٹہ گم ہو گیا ہے، مل نہیں رہا۔ ادھر ادھر دیکھا ادھر دیکھا، بالآخر تلاشی لینی شروع کی تو حضرت یوسف علیہ السلام کی کمر کے ساتھ بندھا ہوا ملا۔ تو یعقوب علیہ السلام کو چھوڑنا پڑا۔ پھر جب تک پھوپھی زندہ رہیں حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پھوپھی کے پاس رہے، ان کی وفات کے بعد یعقوب علیہ السلام کے پاس آ گئے۔

تو انہوں نے یہ کہا کہ اگر چھوٹے بھائی نے چوری کی ہے تو پہلے بڑے بھائی نے بھی چوری کی تھی حالانکہ یوسف علیہ السلام نے چوری بالکل نہیں کی تھی اور یہ سارا واقعہ ان کو پتا تھا کہ چوری نہیں کی بلکہ ہماری پھوپھی نے حیلہ کیا تھا بھتیجے کو اپنے پاس رکھنے کے لیے، لیکن یہ ایسے عجیب لوگ تھے کہ تھوڑا سا الزام لگا تو پچھلی باتیں جو غلط تھیں انہوں نے کھولنی شروع کیں۔ یوسف علیہ السلام نے دل میں فرمایا:

﴿أَنْتُمْ شَرُّ مَمَكَاثِنَ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ﴾

کہ تم بڑے ہی گندے لوگ ہو، اللہ وہ ساری باتیں جانتا ہے جو تم اپنی زبان سے بیان کر رہے ہو۔

اب جو بات میں سمجھانا چاہتا ہوں اسے سمجھیں! آدمی کو کتنا تعجب ہوتا ہے اس واقعے پر کہ یہ کیسا واقعہ ہے۔ یوسف علیہ السلام نے بنیامین بھائی کو رکھنا تھا تو ویسے ہی رکھ لیتے کہ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے تم گندم لے کر جاؤ اور یعقوب علیہ السلام کو لے آؤ اور انہیں جا کر بتانا کہ تمہارا بیٹا ہوں میں، زندہ ہوں، بالکل صحیح سالم ہوں، کتنا آسان کام تھا لیکن ایسا نہیں کیا۔ پہلے ان پر چوری کا الزام لگایا۔ پھر وہ پورے مجمع میں بدنام ہوئے ہیں۔ پھر وہاں سے چوری برآمد ہوئی تو ذلت بھی ہے۔ تو اس پر یہ اشکال ہے کہ

یہ کام نبی کی شان کے لائق نہیں ہے کہ ایسا کرے۔ اس کا جواب اللہ نے خود قرآن میں دیا ہے:

**ہم نے یوسف کو یہ تدبیر سکھائی:**

﴿كَذَلِكَ كِدْنَا يُوسُفَ﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تدبیر یوسف علیہ السلام کی نہیں تھی، یہ تدبیر ہماری تھی۔ کیونکہ ﴿مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾ ان کے بادشاہ کے پاس کوئی ایسا قانون نہیں تھا جس قانون کے تحت یوسف علیہ السلام بنیامین کو روک سکتے، اس لیے اس کا حل یہی تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت کے مطابق فیصلہ ہو، پھر یہ روک سکتے تھے۔

یعقوب علیہ السلام کی شریعت کا قانون یہ تھا کہ جو بندہ چوری کرے اور چوری برآمد ہو جائے تو چور اس سامان والے شخص کا غلام بن جاتا۔ یہ ایسا کیوں ہوا؟ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ خضر اور موسیٰ علیہم السلام جب گئے تھے تو خضر علیہ السلام نے بچے کو قتل کر دیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ آپ نے بچے کو کیوں مارا ہے؟ کشتی کو توڑا تو کہا کہ آپ نے کشتی کیوں توڑی ہے؟ یہ سارا واقعہ آگے آئے گا اپنے موقع پر تو ہم اس کی تفصیل بیان کریں گے۔ اب بظاہر چھوٹے بچے کو قتل کرنا کتنا بڑا جرم ہے! لیکن خضر علیہ السلام کر رہے ہیں۔ تو مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ بعض معاملات بندے کے ہاں جرم شمار ہوتے ہیں لیکن جب اللہ تکوینی امر کے تحت فرمائیں تو پھر خدا کو کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ یہ آپ نے کیوں کیا ہے اور یہ کیوں نہیں کیا؟ اصل میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے امتحانات تھے اور امتحان در امتحان در امتحان سے اللہ اپنے نبی حضرت یعقوب کو گزار رہے ہیں۔ اس لیے یہ تدبیر اللہ کی طرف سے تھی۔ لہذا یوسف علیہ السلام پر کوئی الزام نہیں۔

خیر بنیامین کو انہوں نے روک لیا۔ اب یہ بھائی کہنے لگے:

﴿إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ﴾

اس کا بوڑھا باپ ہے، وہ بہت پریشان ہو گا۔ آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو روک لیں۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم اسی کو روکیں گے، ہم نے کسی اور کو روکا تو یہ ظلم ہو گا اور ہم ظلم نہیں کر سکتے۔ اب یہ سارے بھائی واپس جانے لگے تو ان کے جوڑے بھائی یہود اٹھے وہ بیٹھ گئے، وہ کہنے لگے: ہم نے پہلے بھی باپ کو دکھ دیا تھا اب دوسرا دکھ دیا تو میں واپس نہیں جاسکتا۔ تم سارے جاؤ اور ابو کو ساری بات بتادو لیکن میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یا تو میری موت یہاں پر آئے گی یا میرے والد مجھے اجازت دے دیں۔

جب یہ لوگ واپس گئے تو انہوں نے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہا کہ آپ کا بیٹا بنیامین چوری میں پکڑا گیا ہے۔ ہم بہت افسردہ ہیں۔ اس کو چھوڑ کر آگئے ہیں۔ اگر ہم پر آپ کو یقین نہیں آتا تو آپ ان لوگوں سے پوچھ لیں جہاں پر یہ سارا واقعہ پیش آیا اور ان لوگوں سے پوچھ لیں جو ہمارے ساتھ تھے، اب شاید آپ کو ہم پر یقین آجائے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

**یعقوب علیہ السلام کی بیٹوں کو سرزنش:**

﴿بَنِی سَوَّلَتْ لَکُمْ أَنْفُسُکُمْ أَمْراً﴾

تم جھوٹ بولتے ہو! یہ تم نے اپنی طرف سے واقعہ گھڑا ہے۔

یہ واقعہ تو بالکل سچا تھا لیکن یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں سے کہہ رہے ہیں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو! حالانکہ نبی تو خلاف واقعہ بات کبھی نہیں کہہ سکتے تو پھر بیٹوں کو ایسا کیوں کہا؟ اس کی وجہ سمجھنا!

ایک اجتہاد ہوتا ہے نبی کا اور ایک اجتہاد ہوتا ہے امتی کا۔ اب حضرت

یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو روکا یا نہیں روکا... اس کی دلیل یعقوب علیہ السلام کے پاس کوئی نہیں ہے، یہ جو انہوں نے اپنے بیٹوں سے فرمایا: ”بَلَّ سَوَّكَتَ نَكْمُ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا“ کہ تم نے اپنی طرف سے واقعہ گھڑا ہے، یہ ان کا اجتہاد تھا کیونکہ بیٹوں نے پہلے بھی دھوکہ دیا تھا تو حضرت یعقوب نے سوچا کہ جس طرح انہوں نے پہلے کیا ہے تو اب پھر دھوکہ دے رہے ہیں۔ تو یہ نبی کا اجتہاد ہے۔ اور ایک اجتہاد ہوتا ہے امتی کا۔ نبی اور امتی کے اجتہاد میں فرق یہ ہے کہ اگر نبی کا اجتہاد خلاف واقعہ ہو تو اللہ وحی اتار کر اس خطا کو درست فرما دیتے ہیں اور اگر امتی سے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو اس کی خطا قیامت تک بھی رہ سکتی ہے، لیکن مجتہد اگر خطا کر بھی جائے تو اس کی خطا پر بھی اللہ اسے جنت دیتے ہیں، جہنم اس پر پھر بھی نہیں ہے۔

### جاؤ یوسف کو تلاش کرو کہنے کی وجہ:

خیر حضرت یعقوب علیہ السلام بہت پریشان ہوئے، اتنے غمزدہ تھے، اتنے غمزدہ تھے کہ رورو کر جیسے بندے کی آنکھیں چلی جاتی ہیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں چلی گئیں۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَابْيَضَّتْ عَيْنُهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ﴾

حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں سفید ہو گئیں، بینائی چلی گئی۔ ”كَظِيمٌ“ اس بندے کو کہتے ہیں جو بدلہ لے سکتا ہو اور پھر بھی نہ لے، اندر سے گھٹتا رہے، یعقوب علیہ السلام اندر سے گھٹتے تھے اور زبان سے اظہار نہیں کرتے تھے، روتے جاتے تھے۔ ان کے بیٹوں نے کہا:

﴿تَاللّٰهِ تَفْتَنُوا تَذَكُّرُ يُّوسُفَ حَتَّى تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنَ

الْهٰلِكِيْنَ﴾

ابا! خدا کی قسم آپ یوسف کو یاد کرنا نہیں چھوڑیں گے، یا تو بہت بیمار ہو جائیں گے یا اپنے آپ کو ہلاک کر دیں گے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام فرمانے لگے:

﴿إِنَّمَا أَشْكُوا بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (٢١)

میں اپنے غم کو اللہ کے سامنے رکھتا ہوں، تمہارے سامنے نہیں رکھتا اور اللہ سے دعا مانگتا ہوں ایک وقت آئے گا اللہ مجھے دے گا۔ جو علم میرے پاس ہے بیٹو! وہ تمہارے پاس نہیں ہے۔

﴿يَبْنَئِي أَدْهُبُوا فَاتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلَا تَأَيَّسُوا مِنْ رَّوْحِ

اللَّهِ إِنَّهُ لَا يَأَيَّسُ مِنْ رَّوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ﴾ (٢٢)

میرے بیٹو! جاؤ، یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو، اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، اللہ کی رحمت سے کافر ہی مایوس ہوتے ہیں!

مفسرین نے لکھا ہے کہ اب یوسف علیہ السلام کے ملنے کا وقت قریب آگیا ہے تبھی تو فرمایا کہ تلاش کرو۔ اب بتاؤ! جب بیٹے یوسف علیہ السلام کو لے کر گئے تھے اور کنویں میں ڈالا تھا اور باپ سے کہا تھا کہ بھیڑیے نے کھا لیا ہے تو باپ نے اس وقت کہا تھا کہ تم جھوٹ بولتے ہو! تو یعقوب علیہ السلام تلاش کرنے کے لیے نکلے؟ (نہیں۔ سامعین) جب پتا ہے کہ جھوٹ بول رہے ہیں تو تلاش تو کرنا چاہیے تھا لیکن اس وقت تلاش نہیں کیا، اس کی وجہ کہ اللہ نے چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا امتحان لینا تھا تو تلاش کی طرف ذہن ہی نہیں جانے دیا، آپ گھر بیٹھ کر رو رہے ہیں لیکن بچے کو تلاش نہیں کر رہے اور آج چالیس سال بعد کیا کہہ رہے ہیں کہ جاؤ اور یوسف کو تلاش کرو! چالیس سال تک روتے رہے ہیں، تلاش نہیں کر رہے لیکن جب ملنے کا وقت قریب آیا تو اب بیٹوں سے کہہ رہے ہیں کہ تلاش کرو۔

## دربار یوسف میں بھائیوں کی سہ باری آمد:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اب بھی مطمئن تھے کہ میرا بیٹا زندہ ہے لیکن مل نہیں رہا، جاؤ اور اسے تلاش کرو اور تلاش کرنے کدھر جاؤ؟ پھر مصر کی طرف۔ اب بیٹا گم کہاں پر ہوا ہے اور بھیج ان کو مصر کی طرف رہے ہیں۔ یہ بیٹے پھر چل پڑے۔ عزیز مصر حضرت یوسف کے پاس پہنچے تو جا کر انہوں نے کہا:

﴿يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرَّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ

فَاَوْفِنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ﴿١١﴾﴾

اے عزیز مصر! ہمیں پھر تنگدستی نے گھیر لیا ہے، ہمارے پاس جو ٹوٹے پھوٹے پیسے تھے ہم لے کر آئے ہیں، اس کے بدلے میں آپ ہمیں غلہ دے دیں۔ مفسرین کہتے ہیں کہ دو باتیں تھیں یا تو ان کے پاس سکے کھوٹے تھے یا گھر کا سامان تھا وہ لے کر چلے گئے تھے جس کی قیمت بنتی نہیں تھی اور بازار میں بکتا نہیں تھا، اس کے بدلے میں ہمیں غلہ دے دو۔

یوسف علیہ السلام نے جب یہ منظر دیکھا تو دل بھر آیا۔ اتنا عرصہ گزرا۔ باپ کی جدائی کو، بیٹوں نے ظلم کی انتہا کر دی ہے اور آج کس طرح محتاج ہو کر میرے پاس آئے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کا دل تو بھر آنا ہی تھا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے نام ایک خط لکھا تھا، اس کا عنوان یہ تھا کہ میں یعقوب ہوں، میرے باپ کا نام اسحاق ہے، ان کے باپ کا نام ابراہیم ہے، ہم تینوں نبی ہیں اور ہمارے خاندان کو اللہ نے ہمیشہ آزمایا ہے، میرے دادا ابراہیم کو آزمایا تھا، میرے باپ اسحاق کو آزمایا تھا اور مجھے آزمایا ہے۔ پہلے آزمایا تھا یوسف کی وجہ سے اور اب آزمایا ہے بنیامین کی وجہ سے۔ اے بادشاہ مصر! نبی ہونے کی حیثیت سے گواہی



دیتا ہوں کہ ہم انبیاء ہیں، ہم کبھی چوری نہیں کیا کرتے، ہمارا بیٹا واپس کر دو!

اب یوسف علیہ السلام نے خط پڑھا تو دل کی کیفیت کیا ہو گی کہ باپ کو پتا ہی نہیں کہ بیٹے کو خط لکھ رہا ہوں۔ اللہ نے کیسے نبی سے معاملہ چھپا کر رکھا اور اتنا عرصہ یعقوب علیہ السلام کا امتحان لیتے رہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا بھی امتحان ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کا بھی امتحان ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا امتحان اس طرح ہے کہ آپ نے بھی حضرت یعقوب کو بتانا نہیں ہے، بس معاملات چلاتے رہیں! جب یہ سارا معاملہ ہوا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے فرمایا:

**ہاں! میں ہی یوسف ہوں:**

﴿هَلْ عَلِمْتُمْ مَآ فَعَلْتُمْ يٰيُوسُفُ وَآخِيهِ﴾

تمہیں یاد ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا معاملہ کیا تھا؟

اب بھائیوں نے نظریں بھر کے دیکھا تو انہوں نے کہا:

﴿إِنَّكَ لَا تَذَكَّرُ يٰيُوسُفُ﴾

کیا تو یوسف ہے؟ اب بتاؤ کتنا عجیب معاملہ ہے! فرمایا:

﴿أَنَا يُّوسُفُ وَهٰذَا أَخِي﴾

ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔

اب اندازہ کرو! یوسف علیہ السلام کے حوصلے کا، فرمایا:

﴿قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا ۖ إِنَّهُ مَن يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ

الْمُحْسِنِينَ ﴿١٦﴾﴾

یہ نہیں کہا کہ تم نے میرے ساتھ زیادتی کی تھی بلکہ فرمایا کہ اللہ نے میرے اوپر احسان کیا، ان کے گناہ بتانے کے بجائے اللہ کے احسان کا تذکرہ فرماتے ہیں اور

فرماتے ہیں کہ یہ میرا کمال نہیں، جو آدمی بھی مصیبت پر صبر کرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کا ساتھ دیا کرتے ہیں، اللہ اس کی نیکی کو ضائع نہیں کرتے، اللہ آزماتے ہیں، پھر کچھ وقت گزرتا ہے تو بالآخر اللہ مدد کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا:

﴿قَالَ اللَّهُ لَقَدْ آتَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخَطِئِينَ﴾

اے یوسف! اللہ نے آپ کو ہم پر بڑی فضیلت دی ہے اور ہم مانتے ہیں کہ ہم نے خطا کی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

﴿لَا تَتْرِبْ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يُغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ﴾

اگر تم نے مان لیا ہے تو ہم نے تم کو معاف کیا، اور میں اللہ سے تمہارے لیے دعا مانگتا ہوں کہ اللہ بھی تمہیں معاف کر دے، اللہ بہت رحم کرنے والا ہے۔

**قمیص سے بینائی کا لوٹنا:**

﴿إِذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَذَا فَالْقُوهُ عَلَىٰ وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا﴾

فرمایا: یہ میری قمیص لو اور میرے باپ کی آنکھوں پر ڈال دو ان کی بینائی واپس آجائے گی۔

مفسرین نے لکھا ہے: جب جانے لگے تو یہود انے کہا: قمیص مجھے دے دو، اپنے باپ کو میں دوں گا، کیونکہ جب انہوں نے حضرت یوسف کو کنوئیں میں ڈالا تھا تو یوسف کی جس قمیص پر بکرے کا جھوٹا خون لگا کر حضرت یعقوب علیہ السلام کو پیش کیا تھا تو وہ یہود انے پیش کیا تھا۔ تو اب یہود انے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ جتنا بڑا گناہ ہوتا تھا کفارہ ہونا چاہیے۔ وہ جھوٹا کام بھی میں نے کیا تھا تو میرا جی چاہتا ہے کہ سچا کام بھی میں کروں تو باپ خوش ہوگا۔ تو جس طرح میں نے باپ کو یوسف کی قمیص دے کر دکھ دیا

تھاب میرا جی چاہتا ہے کہ اب یوسف کی قمیص دے کر باپ کا دل خوش کروں۔

### حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کا مسیلہ کذاب کو قتل کرنا:

میں اس پر صرف ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ جنگِ احد میں ہندہ نے شرط لگائی تھی اپنے غلام وحشی سے کہ تم حضرت حمزہ کو قتل کر دو تو میں تمہیں آزاد کر دوں گی چونکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ہندہ کے بھائی کو قتل کیا تھا میدانِ بدر میں۔ ہندہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں، ابھی مسلمان نہیں ہوئی تھیں۔ وحشی بڑا زبردست نیزہ باز تھا۔ اس نے برچھی نما چھوٹا نیزہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے تاک کر مارا جو حضرت حمزہ کے پیٹ میں لگا۔ حضرت حمزہ شہید ہو گئے۔ اب وحشی وہاں سے دوڑ گیا۔ اللہ پاک نے کرم فرمایا اور وحشی کے اسلام قبول کرنے کا وقت قریب آ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحشی کے پاس صحابی کو بھیجا کہ جاؤ وحشی کو اسلام کی دعوت دو۔ جب وہ صحابی وحشی کے پاس چلے گئے تو وحشی نے کہا کہ میں مشرک ہوں، میں نے کلمہ پڑھ لیا تو میرے گناہوں کا کیا بنے گا؟ قرآن کی آیت اتری:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾<sup>210</sup>

کہ اللہ مشرک کو معاف نہیں کرتا، باقی جن کو چاہے معاف کر دیتے ہیں۔ تو شرک سے توبہ کر لے۔ اس نے کہا کہ میں شرک سے توبہ کر لوں گا لیکن میری معافی کا وعدہ تو نہیں ہے، اللہ فرماتے ہیں کہ جن کو چاہوں معاف کروں، اب پتا نہیں کہ مجھے چاہیں گے یا نہیں چاہیں گے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صحابی آ گیا تو پھر قرآن کی دوسری آیت اتر آئی:

﴿إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ

کہ جس آدمی نے کفر کو چھوڑ دیا اور توبہ کر لی اور نیک اعمال کیے تو اللہ ان کے گناہوں کو بھی نیکی سے بدل دیں گے۔

وحشی کے پاس پیغام بھیجا تو اس نے کہا: میں اب بھی تیار نہیں ہوں، اس میں ہے کہ توبہ کر لے جبکہ میں تو فلاں گناہ نہیں چھوڑ سکتا، فلاں گناہ نہیں چھوڑ سکتا تو میری معافی کیسے ہوگی؟ اب دیکھو! اللہ کی رحمت جب متوجہ ہوتی ہے تو بہانے کیسے تلاش کرتی ہے اور کتنا بڑا قاتل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کو قتل کیا ہے۔ اب تیسری آیت نازل ہوئی کہ جا کر کہو:

﴿قُلْ يُعْبَادِي الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا﴾<sup>212</sup>

مایوس نہ ہو، اللہ سارے گناہ معاف کر دیں گے۔

جب وحشی کے پاس یہ پیغام بھیجا تو اس نے کہا: اب ٹھیک ہے۔ وحشی آیا اور کلمہ پڑھ لیا اور خیر سے مسلمان ہو گیا۔<sup>213</sup>

اب مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا تو جو مسلمانوں کا قافلہ مسیلمہ کے خلاف جہاد کے لیے گیا وحشی بھی اس میں تھا۔ اب پہلے وحشی تھے اور اب حضرت وحشی رضی اللہ عنہ ہیں۔ تو وحشی کہنے لگے: میرے دل میں تھا کہ میں نے جتنا بڑا گناہ کیا ہے اتنی بڑی نیکی کروں! حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو میں نے قتل کیا تھا اب مجھے چاہیے

211۔ الفرقان 25:70

212۔ الزمر 39:53

213۔ مرقاة المفاتیح ج 5 ص 267

کہ اس مسئلہ کو ماروں۔ انہوں نے تاک کر مارا تو مسئلہ کو قتل کر دیا۔ اب حضرت وحشی رضی اللہ عنہ بڑے خوش تھے۔ فرمایا کہ جب میں کافر تھا تو میں نے بہت اچھے آدمی کو قتل کیا تھا تو جب میں نے کلمہ پڑھا ہے تو میں نے نہایت برے کو قتل کیا ہے۔ تو میں خوش ہوں کہ میں نے جتنا گناہ کیا تھا میں نے اتنی نیکی بھی کر لی۔

تو یہود کا خیال تھا کہ میں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص دے کر باپ کو دکھ دیا تھا تو اب مجھے یہ قمیص پیش کرنے دو تاکہ میں باپ کو خوش کروں اور اس خوشی میں وہ مجھے معاف کر دیں۔ جب یہ قمیص لے کر گئے۔ آپ اندازہ فرمائیں کہ حضرت یعقوب علیہ کنعان میں رہتے تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں رہتے تھے۔ یہاں سے اڑھائی سو میل فاصلہ ہے۔ کہاں کنعان کے قریب کنویں میں ہیں تو بیٹے کا پتا نہیں ہے اور ادھر سے قمیص چلی ہے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کہہ رہے ہیں:

﴿إِنِّي لَآجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَن تَفْتَدُونِ﴾

مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔ اللہ کا عجیب معاملہ ہے۔ اسے کہتے ہیں؛ وحی! بیٹا قریب ہی کنعان کے کنویں میں ہے تو ان کا پتا نہیں ہے اور اڑھائی سو میل دور سے قمیص چلی ہے تو اب اللہ نے بتا دیا تھا۔ میں نے بتایا تھا نا کہ ان کے ملنے کا وقت قریب آگیا ہے اس لیے اب سارے اسباب جمع ہونا شروع ہوئے ہیں۔ فرمایا: مجھے خطرہ ہے تم نے کہنا ہے کہ یہ بہک گیا ہے ورنہ سچی بات یہی ہے کہ مجھے یوسف کی خوشبو آنا شروع ہو گئی ہے۔

**یہ قمیص کون سی تھی؟**

یہ قمیص کون سی تھی؟ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ قمیص وہ تھی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود نے آگ میں ڈالا تھا تو حضرت ابراہیم کو جنت سے

قمیص لا کر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پہنادی۔ یہ قمیص ان کے بیٹے اسحاق کے پاس تھی۔ پھر ان کے بیٹے یعقوب علیہ السلام کے پاس۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسی قمیص کو نلکی کی طرح بند کر کے اپنے بیٹے یوسف کے گلے میں ڈالا ہوا تھا۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں ڈالا اور قمیص ان کی اتار لی اور اس پر بکری یا بھیڑ کا خون لگا کر باپ کو پیش کی تو جو ان کے گلے میں تھی تعویذ کی شکل میں نلکی کی طرح، جبرائیل علیہ السلام آئے اور وہ نلکی کھول کر حضرت یوسف علیہ السلام کو قمیص پہنادی۔ یہ قمیص یوسف کے پاس تھی۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قمیص تھی جو اب ان کے پوتے یعقوب علیہ السلام کے پاس ہے تو نبی کی قمیص کی خاصیت یہ تھی کہ جب یعقوب علیہ السلام نے اس کو آنکھوں سے لگایا تو خدا نے فوراً بینائی کو لوٹایا۔ یہ بعض مفسرین کی تحقیق ہے۔

حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق بڑی عجیب ہے۔ شیخ مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ یوسف کا وجود گویا کہ جنت کا وجود تھا اور جنت کے وجود سے لگنے والی قمیص کی برکت یہ تھی کہ جس کی آنکھ پر لگتی اللہ اس کی بینائی لوٹا دیتے، یہ جنتی وجود کی برکت تھی کہ حضرت یعقوب کے علاوہ کسی بھی نابینا کو لگا دیں تو اللہ بینائی عطا فرما دیں گے۔

خیر ان کی بینائی لوٹ آئی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کہنے لگے:

﴿أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (٢١)

میں تمہیں کہتا نہیں تھا کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے، میں نبی ہوں میں تمہیں کہہ رہا تھا کہ یوسف زندہ ہے، تلاش کرو لیکن تم کہتے تھے کہ زندہ نہیں ہے، خیر انہوں نے کہا:

﴿يَا بَنَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ﴾ (٢٢)

ابا! ہم مانتے ہیں کہ ہم نے گناہ کیا تھا، آپ ہمارے لیے اللہ سے معافی مانگیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

﴿سَوْفَ أَسْتَغْفِرُكَ كُمْرِي إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾

ابھی نہیں، میں عنقریب تمہارے لیے اللہ سے دعا کروں گا۔ اللہ معاف کرنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔

مفسرین نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ان کی خواہش یہ تھی کہ میں تہجد کے وقت تمہارے لیے دعا کروں گا، بوقت تہجد جو قبولیت کا وقت ہوتا ہے عام وقتوں میں نہیں ہوتا، اس لیے فرمایا کہ میں عنقریب تمہارے لیے معافی مانگوں گا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس یہ قمیص لے کر پہنچے، یہود اٹھایا کوئی بھی تھا تو انہوں نے کہا کہ میں آپ کو خوشخبری دیتا ہوں لیکن آپ سے ایک چیز چاہتا ہوں۔ یعقوب علیہ السلام نے کہا: کیا چاہتے ہو؟ تو اس نے کہا کہ دعا کریں کہ اللہ ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمادیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ دعا مانگی۔

### خوشخبری دینے والے کو ہدیہ دینا:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہی: اس سے ثابت ہوا کہ جب کوئی شخص خوشخبری دے تو خوشخبری دینے والے کو گفٹ دینا یہ بھی سنت ہے، کوئی اچھی خبر دے تو اس کو خوش کرنا بھی سنت ہے۔

### یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر:

مفسرین لکھتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے دو سو اونٹوں پر سامان لاد کر دیا اور فرمایا کہ پورے خاندان کو لے کر آؤ۔ یوسف علیہ السلام کے والد، بھابھیاں، بچے سارے آئے تو یہ تقریباً بہتر یا تہتر افراد بنتے ہیں جو مصر میں شاہی مہمان بن کر داخل

ہوئے اور جا کر یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا، یوسف علیہ السلام نے خواب دیکھا تھا نا:

﴿إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَايَهُمْ لِي سَاجِدِينَ ۝﴾

کہ میں نے گیارہ ستارے دیکھے ہیں اور اس کے ساتھ چاند اور سورج بھی دیکھا ہے جو مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

سورج حضرت یعقوب اور چاند ان کی اہلیہ ہیں۔ یہ اہلیہ کون سی تھیں؟ یا تو حضرت یوسف کی حقیقی والدہ ہیں اور اگر حقیقی والدہ فوت ہو گئی ہیں تو خالہ ہیں، پھر بھی ماں ہیں۔

پہلی امتوں میں سجدہ عبادت تو حرام تھا لیکن سجدہ تعظیمی حرام نہیں تھا۔ اب اس امت میں سجدہ تعظیمی بھی حرام ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔ حضرت قیس بن سعد سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں ”حِزْرہ“ میں گیا۔ یہ کوفہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ وہاں دیکھا کہ لوگ اپنے کمانڈر کو سجدہ کر رہے ہیں۔ جب میں وہاں سے واپس آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تو ہم نے آپ سے عرض کیا کہ ہماری خواہش ہے ہم آپ کو سجدہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا، ”لَوْ كُنْتُ أَمِيرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِأَحَدٍ لَأَمَرْتُ النِّسَاءَ أَنْ يَسْجُدْنَ لِأَزْوَاجِهِنَّ“ اللہ کے غیر کو سجدے کی گنجائش ہوتی تو پھر میں یہ حکم دیتا کہ بیوی اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔<sup>214</sup>

خیر اس موقع پر جب حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر پوری ہو گئی تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

﴿يَأْتِ بِهَذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا ۝﴾



ابو جی! میں نے بچپن میں خواب دیکھا تھا اور آپ نے تعبیر بتائی تھی اب اس کا وقت آگیا ہے، اب دیکھیں! میرا خواب کیسے سچا ہو گیا ہے۔

### یوسف علیہ السلام کے اخلاقِ کریمانہ:

یہاں میں ایک بات کہہ کے اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

﴿وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي﴾

اب ذرا نبی کے اخلاق دیکھنا! کہتے ہیں کہ اللہ نے کرم کیا کہ میرے خاندان کو دیہات سے شہر کی طرف لے آیا، پہلے شیطان نے ہمارے اور بھائیوں کے درمیان پھوٹ ڈالی تھی، اب خدا نے ہمیں اکٹھا کر دیا ہے۔

اب بتاؤ! یوسف علیہ السلام کنویں سے نکلے اور بادشاہ بنے لیکن کنویں کا ذکر نہیں کیا کہ اس سے بھائیوں کو تکلیف ہوگی، جیل کا ذکر کیا ہے کنویں کا ذکر نہیں کیا۔ جب بھائیوں نے معافی مانگ لی تو بات ختم ہو گئی۔ اب اگر پھر بات شروع کر دیتے کہ دیکھو! تم نے مجھے کنویں میں ڈالا تھا، تم نے میرے ساتھ کیا کیا تھا، بادشاہ نے میرے ساتھ کیا معاملہ کیا تھا، کنویں کی بات کا تذکرہ نہیں کیا، بھائیوں کے ظلم کی طرف اشارہ ہی نہیں کیا۔ فرمایا کہ اللہ کا کرم ہے کہ خدا نے مجھے جیل سے نکالا اور خدا کا تم پر کرم ہے کہ خدا تم کو دیہات سے شہر کی طرف لایا۔ کتنے سال الگ رہنے کے بعد خدا نے ہمیں اکٹھا کر دیا۔

میں یہ بات اس لیے کہتا ہوں کہ جب آپس میں مل بیٹھنا ہو تو پھر پچھلی باتیں بیان کرنا چھوڑ دیا کرو۔ اس سے نقصان ہوتا ہے۔

## حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا:

پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے دعا مانگی ہے۔ فرمایا:

﴿رَبِّ قَدْ أَتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ  
فَاطْرَسُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ اَنْتَ وَلِيّٰ فِي الدُّنْيَا وَالْآٰخِرَةِ ۖ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَّ  
اَحْيِنِي بِالصّٰلِحِيْنَ﴾ ﴿١١١﴾

اے اللہ! آپ نے مجھے بادشاہت عطا کی، آپ نے مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم دیا، یا اللہ! آپ زمین و آسمان کو پیدا کرنے والے ہیں، آپ دنیا میں میرے دوست ہیں اور آخرت میں بھی میرے کارساز ہیں۔ اے اللہ! میں آپ سے دعا کرتا ہوں کہ جب موت دینا ہو تو اسلام کے ساتھ دینا اور مجھے پھر نیک لوگوں کے ساتھ شامل کرنا۔

ہم بھی دعا کریں کہ اللہ ہمارا خاتمہ بھی ایمان پر فرمائیں، اللہ قیامت کے دن نیک لوگوں میں سے اٹھائیں۔ (آمین)

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے پورے خاندان کو مصر بلایا تو بہتر آدمی تھے یا ترانوے تھے۔ آگے ان کی نسل چلی ہے جنہیں ”بنی اسرائیل“ کہتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے۔ ایک یوسف خود ہیں اور گیارہ اور ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام جب مصر میں گئے ہیں اپنے بیٹے یوسف علیہ السلام کے پاس تو یہ کل بہتر یا ترانوے آدمی تھے اور جب فرعون سے نجات ملی اور موسیٰ علیہ السلام نے ان کو نکالا تو اس وقت بنی اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ سے بھی زائد تھی۔ جب آئے ہیں تو تعداد بہتر ہے اور جب نکلے ہیں تو لاکھوں سے بھی زائد ہیں۔

## حضرت یعقوب و یوسف علیہما السلام کی وفات:

یعقوب علیہ السلام نے وہیں وفات پائی اور یہ وصیت کی کہ مجھے شام میں دفن

کرنا میرے والد اسحاق علیہ السلام کے پاس۔ اس لیے ان کو بیت المقدس میں دفن کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عام یہودیوں میں یہ رسم چل پڑی ہے کہ وہ اپنے مردوں کو دور دور سے لے جا کر بیت المقدس میں دفن کرتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا مصر میں انتقال ہوا۔ جب موسیٰ علیہ السلام مصر سے بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو تابوت میں یوسف علیہ السلام کا جسم اطہر موجود تھا، ان کا تابوت بھی وہاں سے اٹھایا اور ان کو بھی شام میں جا کر دفن کیا تھا۔ اب مصر میں موجود نہیں، وہاں سے منتقل کر دیا تھا۔ یہ خلاصہ تھا جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔

اللہ پاک اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ

اَجْمَعُوْا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝۱۰۲﴾

اے میرے پیغمبر! غیب کی خبریں ہم آپ کو بتاتے ہیں، جب یوسف علیہ السلام کے بھائی مکر کر رہے تھے تو آپ ان کے پاس موجود نہیں تھے۔ یہ آپ کے نبی ہونے کی دلیل ہے کہ آپ نے کسی سے پڑھا بھی نہیں ہے اور ہم سے پوچھ کر آپ نے خبریں بتا دی ہیں۔

﴿وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰۳﴾

اللہ پاک نے عجیب بات فرمائی ہے۔ یہودیوں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ ہمیں واقعہ سنائیں! آپ نے واقعہ سنا دیا لیکن یہ ایمان پھر بھی نہیں لائیں گے۔ اگر آپ چاہیں تو یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے لیکن اے نبی! آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے۔

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۴﴾

یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جو جہان والوں کے لیے ہیں۔ اے پیغمبر! آپ اپنا کام کریں اور یہ لوگ اپنا کام کریں۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ علماء کو اپنا کام کرنا چاہیے اور عوام کو اپنا کام کرنا چاہیے۔ عوام کے ذمے ہے کہ علماء کی بات مانیں اور علماء کے ذمے ہے کہ عوام کو بات سمجھائیں! اگر علماء نہیں بتائیں گے تو قیامت کو یہ مجرم ہوں گے اور عوام نہیں مانے گی تو قیامت کو یہ مجرم ہوگی۔ اگر اس وجہ سے بیان کرنا چھوڑ دیں کہ لوگ تو مانتے نہیں ہیں تو یہ نبوت کی شان کے بھی خلاف ہے اور نبی کے وارث علماء کی شان کے بھی خلاف ہے۔ اللہ ہم سب کو شریعت کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(آمین)

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

# دروس القرآن

٢

والله اعلم  
محمد الياس كهن

مركز اهل السنة والجماعة



نام کتاب ..... دُرُوقُ الْقُرْآنِ جلد دوم

تالیف: ..... محمد الیاس <sup>مظفر ملتان</sup> رحمانی

تاریخ اشاعت ..... مارچ 2020ء

بار اشاعت ..... اوّل

تعداد اشاعت ..... 1100

ناشر ..... مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ

ملنے کا پتہ

مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ، 87 جنوبی لاهور روڈ سرگودھا

0321-6353540

0335-7500510

[www.ahnafmedia.com](http://www.ahnafmedia.com)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## فہرست

### سورة الرعد ----- 27

27 ----- تمہیدی گفتگو:

28 ----- ”استویٰ علی العرش“ کا معنی:

29 ----- عرش کا ذکر کرنے کی وجہ:

30 ----- سورج اور چاند کا مسخر ہونا:

30 ----- اللہ ہر جگہ پر ہے:

31 ----- غیر مقلدین کی چال:

32 ----- کفار کا بعث بعد الموت کا انکار:

33 ----- حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ:

34 ----- یہ عین ایمان ہے:

34 ----- حضرت عزیر کے واقعہ سے بعض لوگوں کے استدلال کا جواب:

35 ----- عقائد پر کمپرومازنہ کریں!

35 ----- اشکال کی وضاحت:

36 ----- ہمارا جواب:

- 36 ----- اصحابِ کہف کا واقعہ:
- 36 ----- ایک عجیب نکتہ:
- 37 ----- قدرتِ خداوندی کی دلیل:
- 38 ----- اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے... واقعہ:
- 39 ----- حکیم الامت کی تحقیق:
- 39 ----- حضرت متکلم اسلام کے زمانہ طالب علمی کا واقعہ:
- 40 ----- آج کے دور کا گمراہ فرقہ اور مشرکین مکہ:
- 41 ----- چھپکلی کی مثال:
- 41 ----- عذاب اور ثواب اسی قبر میں ہے:
- 43 ----- ثواب و عذاب قبر پر اشکال کا جواب:
- 44 ----- انسان کی حفاظت کا انتظام:
- 45 ----- حق اور باطل کی مثال:
- 45 ----- ہدایت ملنے کی دو صورتیں:
- 48 ----- اللہ سے مانگنے میں بخل نہیں کرنا چاہیے:
- 48 ----- منکرین رسالت کی تردید:

## 50 ----- سورۃ ابراہیم

- 50 ----- سورت کا تعارف:
- 51 ----- متشابہات کی اقسام:
- 54 ----- کتاب کے نازل کرنے کا مقصد:
- 54 ----- سنت اور بدعت کی مثال:



- 56 ----- نبی کی وحی اپنی قوم کی زبان میں ہوتی ہے:
- 56 ----- نبی سارے جہاں کے ہیں تو ایک زبان میں وحی کیوں؟
- 59 ----- حضور علیہ السلام پوری کائنات کے نبی ہیں:
- 59 ----- احمد سعید ملتانی کے اعتراض کا جواب:
- 63 ----- گزشتہ اقوام کے دو اعتراض اور انبیاء کے جواب:
- 64 ----- انبیاء کا بشر ہونا ہمارے لیے اعزاز ہے:
- 65 ----- شیطان کا اظہار برأت کرنا:
- 66 ----- کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی مثالیں:
- 67 ----- عذاب قبر کا ثبوت:
- 68 ----- تشہد میں ﴿رَبِّ اجْعَلْنِي﴾ پڑھنے پر اعتراض کا جواب:
- 69 ----- جنازے پر سورۃ فاتحہ کو واجب کہنے والوں سے سوالات:

## 71 ----- سورۃ الحجر

- 71 ----- تمہیدی باتیں:
- 71 ----- قرآن؛ کامل و واضح کتاب:
- 72 ----- کفار کی حسرت کہ کاش ہم مسلمان ہوتے!
- 72 ----- مسلمان؛ کافر سے بہتر ہے:
- 73 ----- ایمان کی قدر کیجیے!
- 74 ----- بے نمازی مسلمانوں کے متعلق حضرت تھانوی کا نظریہ:
- 74 ----- حفاظت قرآن:
- 76 ----- نعمت باری تعالیٰ کا بیان:

- 77 ----- تخلیق آدم اور سجدہ ملائکہ:
- 78 ----- بشریت کمال کا نام ہے:
- 78 ----- مولانا فضل الرحمن کا جواب:
- 80 ----- تخلیق آدم کے مراحل:
- 82 ----- ابلیس کو سجدے کا حکم نہیں تو اس پر عتاب کیوں؟
- 83 ----- ابلیس کی دلیل کا خدائی جواب:
- 84 ----- سب سے پہلا اجماع اور پہلا منکر اجماع:
- 85 ----- ”روضہ جنت ہے“ پر اشکال کا جواب:
- 87 ----- ابلیس عاشق نہیں تھا:
- 89 ----- تذکرہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ:
- 90 ----- کبھی کبھی عاشقانہ جواب بھی دیا کریں!
- 91 ----- ابلیس کی تمنا:
- 92 ----- ایک صحابی کا قصہ:
- 93 ----- ایک ولی کا قصہ:
- 94 ----- گمراہوں ٹھکانہ جہنم ہے:
- 95 ----- ابراہیم علیہ السلام کے مہمان:
- 97 ----- فرشتوں کی لوط علیہ السلام کے پاس آمد:
- 98 ----- قوم لوط کی بد بختی:
- 99 ----- قوم لوط پر عذاب:
- 99 ----- اصحاب حجر والوں کا انجام:
- 100 ----- سورۃ الفاتحہ کو ”قرآن عظیم“ کہنے کی وجہ:

102 ----- پیغمبر پاک علیہ السلام کو تسلی:

103 ----- عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اشکال کا جواب:

104 ----- عبادتِ تکلفی اور عبادتِ تلذذی:

## 106 ----- سورة النحل

106 ----- تمہیدی باتیں:

107 ----- شہد کی مکھی:

108 ----- شہد کا چھتا؛ عظیم کاریگری کا نمونہ:

109 ----- شہد کی مکھی کو پیغام:

110 ----- تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے:

110 ----- شہد کی مکھی کے بارے میں حدیث:

111 ----- دنیا کی حقیقت:

112 ----- جانوروں کی پیدائش:

113 ----- گھوڑے کا گوشت نہ کھائیں:

114 ----- سمندر کے فائدے:

114 ----- تازہ گوشت سے مراد مچھلی ہے:

115 ----- منکرین حیات الانبیاء کے استدلال کا جواب:

116 ----- منکر حیات سے گفتگو:

118 ----- میت کی دو قسمیں:

121 ----- تقلید کا ثبوت:

121 ----- عالم با عمل سے مسئلہ پوچھیں:

- 122 ----- حدیث حجت ہے:
- 122 ----- بچی کی پیدائش اور مشرکین مکہ کی حالت:
- 124 ----- قصور تیرا ہے یا میرا!
- 126 ----- تلاوت سے پہلے تعوذ کا حکم:
- 126 ----- جان اور ایمان کے دشمن سے بچاؤ کا طریقہ:
- 127 ----- دل میں ایمان ہو تو کلمہ کفر کہنے کا حکم:
- 128 ----- جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہنے کی شرائط:
- 128 ----- دو قسم کے اعمال کے نفاذ و عدم نفاذ کا مسئلہ:
- 130 ----- ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ:
- 130 ----- ملت اور امت میں فرق:
- 131 ----- دعوت دین کے طریقے:
- 131 ----- ایمان و عمل پہ لانا اور بچانا:
- 132 ----- رائیونڈ مرکز اور سرگودھا مرکز:
- 133 ----- فضائل نماز اور نماز اہل السنۃ والجماعۃ:
- 134 ----- توڑ نہیں، جوڑ پیدا کریں!
- 134 ----- ایمان و تقویٰ:

## 135 ----- سورة بنی اسرائیل

- 135 ----- تمہیدی گفتگو:
- 135 ----- معراج کیوں ہوا؟
- 136 ----- پیغمبر علیہ السلام کی تکالیف:

- 138 ----- سفرِ معراج کے دو حصے:
- 138 ----- معراج جسمانی ہوئی ہے:
- 139 ----- معراج جسمانی پر دلائل:
- 141 ----- صفتِ عبد تمام صفات میں افضل ہے:
- 142 ----- اس امت کے متواضع کے ہاتھوں امت کے متکبر کا قتل:
- 144 ----- ام ہانی کے گھر سے سفر کی ابتدا:
- 146 ----- حطیم کعبہ سے سفر کی ابتدا کی وجہ:
- 146 ----- زمزم کے پانی سے قلبِ اطہر دھونے میں حکمت:
- 147 ----- براق کی رفتار:
- 147 ----- ایمان و حکمت سے قلب کو بھرنا:
- 148 ----- زمینی سفر کے پانچ مقامات پر ٹھہراؤ!
- 149 ----- دورِ رکعت سے کم کوئی نماز نہیں:
- 149 ----- ایک رکعت و تڑپڑھنے والوں سے سوال:
- 150 ----- امام کے پیچھے قرأت نہ کی جائے:
- 151 ----- نماز انبیاء علیہ السلام کے اجسام نے پڑھی ہے:
- 151 ----- انبیاء جب قبروں میں ہیں تو بیت المقدس میں کیسے؟
- 152 ----- آدم برسرِ مطلب:
- 152 ----- مذکورہ اشکال کا جواب:
- 153 ----- توضیح بالمثال:
- 153 ----- بیت المقدس سے عرشِ معلیٰ کا سفر:
- 154 ----- تین پیالے ان سے مراد:

- 154 ----- آسمانوں پر انبیاء علیہ السلام سے ملاقاتیں:
- 154 ----- اس ملاقات میں حکمتیں:
- 156 ----- سدرۃ المنتہیٰ پر آمد:
- 156 ----- متکلم اسلام کا خواب اور امام اہل السنۃ کی تعبیر:
- 158 ----- معراج کی رات دیدارِ باری تعالیٰ:
- 159 ----- دیدارِ باری تعالیٰ پر اعتراض کے جوابات:
- 160 ----- حضرت عائشہ کا موقف ہمارے خلاف نہیں:
- 161 ----- توضیح بالمثال:
- 162 ----- تین عبادات کے بدلے تین انعامات:
- 163 ----- تشہد کے جملوں کا باہمی ربط:
- 164 ----- ایک واؤ کے ساتھ یا دو واؤ کے ساتھ؟
- 166 ----- معراج کے تحفے:
- 166 ----- نمازیں؛ پچاس سے پانچ رہ گئیں:
- 167 ----- مقام ناز اور مقام نیاز:
- 167 ----- تعارف و وجہ تسمیہ سورت:
- 168 ----- قبولیت اعمال کی شرائط:
- 169 ----- شیطان کی پہلی محنت اور اس کا توڑ:
- 170 ----- شیطان کی دوسری محنت اور اس کا توڑ:
- 172 ----- اخلاصِ نیت ضروری ہے:
- 173 ----- تصحیح نیت کا اجر:
- 174 ----- عمل کی قبولیت کی شرائط:

- 174 ----- اجر اور قدر میں فرق:
- 175 ----- شاہ کی قدر دانی یہ ہے تو شہنشاہ کا عالم کیا ہوگا؟
- 176 ----- اللہ کی شان بے نیازی و شانِ سرفرازی:
- 177 ----- عبادت خدا کی اور ادب والدین کا:
- 178 ----- آیت میں ذکر خدا ہے تو ذکر مصطفیٰ کہاں ہے؟
- 179 ----- مولانا صاحب! میرے والد کے لیے دعا کریں:
- 180 ----- مقتدی کا اجر بتایا امام کا اجر سمجھ میں آیا:
- 181 ----- سینک، بال، کھر کا اجر بتایا تو گوشت کا خود بخود سمجھ میں آیا:
- 181 ----- شہید کی حیات بتائی تو نبی کی حیات میں آئی:
- 182 ----- پیغمبر علیہ السلام کے ادب کے تقاضے:
- 183 ----- میانہ روی کی تعلیم:
- 184 ----- اولاد کو قتل نہ کرو!
- 184 ----- پہلے دور اور آج کے دور کے کافر میں فرق:
- 185 ----- انسان اشرف المخلوقات ہے:
- 186 ----- انسان اور فرشتوں میں افضل کون ہے؟
- 186 ----- انسان کی فضیلت کی وجوہات:
- 187 ----- تو چاند سے زیادہ خوبصورت نہ ہوئی تو تجھے تین طلاق!
- 188 ----- چور پکڑا گیا اور طلاق بھی نہیں ہوئی:
- 190 ----- امام اعظم نے امام اعمش کی مشکل حل کر دی:
- 191 ----- انسان؛ سیرت اور صورت میں اعلیٰ مخلوق:
- 193 ----- فضیلتِ انسان کی وجوہات:

- 195 ----- جو یہاں اندھا وہاں بھی اندھا (ایک واقعہ):
- 196 ----- ”اللہ کہاں ہے؟“ کے عنوان پر مکالمہ:
- 198 ----- عصمتِ انبیاء علیہم السلام:
- 199 ----- صدیقِ عکس جمالِ پیغمبر:
- 201 ----- نماز پنجگانہ کا تذکرہ:
- 202 ----- فقہتِ امامِ اعظم ابو حنیفہ:
- 202 ----- نماز تہجد کا اہتمام کیجیے!
- 203 ----- ترکِ تہجد پر وعید کیوں؟
- 204 ----- ”روح کیا چیز ہے؟“ کا جواب:
- 206 ----- ”روح کیا ہے؟“ کا جواب اجمالی دینے کی وجہ:
- 207 ----- قرآن کے تین چیلنجز:
- 208 ----- کفار کے بے جا سوالات کے معقول جوابات:
- 209 ----- نبی کے بشر ہونے کی حکمت:
- 210 ----- باری تعالیٰ کے دو نام؛ اللہ اور رحمن:
- 211 ----- قرأت میں میانہ روی کا حکم:
- 212 ----- اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک ذات ہے:

## 213 ----- سورة الکہف

- 213 ----- تعارف، وجہ تسمیہ اور فضائلِ سورت:
- 214 ----- خود عمل کریں تو دعوت دینا آسان ہوتا ہے:
- 215 ----- جمعہ کے دن ان معمولات کا اہتمام کیجیے:



- 217 -----سورت کاشانِ نزول:
- 219 -----اصحابِ کہف کا تفصیلی واقعہ:
- 219 -----مشرک بادشاہ کے احوال:
- 220 -----غار میں کتنا عرصہ رہے؟
- 221 -----موحد بادشاہ کی خدائی امداد:
- 222 -----قرآن کی دعوتِ راہِ اعتدال:
- 223 -----افراط، تفریط اور صراطِ مستقیم:
- 224 -----کسی کو راہِ راست پر لانے کے لیے گناہ کرنا جائز نہیں:
- 225 -----اصحابِ کہف اور الرقیم:
- 226 -----غار کا محل وقوع:
- 227 -----اصحابِ کہف کے سونے کی کیفیت:
- 228 -----قبر سونے کی جگہ ہے:
- 229 -----اصحابِ کہف کا کتا:
- 229 -----ان کے ساتھ بیٹھنے والا محروم نہیں ہوتا:
- 231 -----کتا صاحبِ کمال ہو گیا پر اعتراض کا جواب:
- 232 -----جزل کا مقابلہ جزل سے کریں!
- 233 -----جانوروں کے سجدہ کرنے کا ذکر:
- 234 -----منکرینِ حیات کے اعتراض کا جواب:
- 236 -----ایک عجیب نکتہ:
- 237 -----قرآن کریم کا نصف حصہ:
- 237 -----نرمی سے پیش آنا ذریعہ نجات ہے:

- 238 ----- اصحابِ کہف کی یاد میں مسجد بنانے میں حکمت:
- 238 ----- حضرت امیر شریعت کا جملہ:
- 238 ----- اصحابِ کہف کی تعداد:
- 239 ----- اصحابِ کہف سات تھے... دلیل:
- 240 ----- حضرت ابن عباس کو حضور علیہ السلام کی دعا:
- 241 ----- ہر نیک کام سے پہلے ان شاء اللہ کہنے کی تاکید:
- 241 ----- ایک حکایت:
- 242 ----- دو آدمیوں کا قصہ:
- 243 ----- ہر وقت اللہ کا شکر ادا کیا جائے:
- 243 ----- دنیا کی بے ثباتی کی مثال:
- 244 ----- قیامت کے دن ایک جھگڑالو شخص کا حال:
- 246 ----- حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ:
- 247 ----- مقام ناز اور مقام نیاز:
- 248 ----- مجمع البحرین میں خضر علیہ السلام سے ملاقات:
- 249 ----- خادم کو بتانا چاہیے کہ کہاں جانا ہے!
- 250 ----- مردہ مچھلی زندہ ہو کر پانی میں چلی گئی:
- 251 ----- لیلیۃ التعریس کا واقعہ:
- 252 ----- عالم اور غیر عالم میں فرق:
- 253 ----- ملاقات ہو گئی:
- 254 ----- حضرت خضر کی شرط اور حضرت موسیٰ کا عہد:
- 255 ----- بستی والوں کی دیوار ٹھیک کرنا:

- 256 ----- تین کاموں کی توضیح:
- 256 ----- کشتی کا تختہ توڑنے کی وجہ:
- 257 ----- بچے کو قتل کرنے کا سبب:
- 258 ----- دیوار کو سیدھا کرنے کا مقصد:
- 258 ----- بڑے کی بھول پر ڈانٹ کی وجہ:
- 260 ----- چالیس سال تک تکبیرِ اولیٰ فوت نہیں ہوئی:
- 261 ----- استاذ چھوٹا بھی ہو تب بھی اس کا ادب کیا جائے:
- 262 ----- علم تشریعی اور علم تکوینی:
- 263 ----- آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟
- 263 ----- کشتی توڑنے پر اشکال کی وجہ:
- 264 ----- ”حضرت خضر نے بچے کو کیوں مارا؟“ کا جواب
- 265 ----- ایک سوال کا جواب:
- 266 ----- یتیم بچوں کا خزانہ کیا تھا؟
- 267 ----- باپ کی نیکی کا اثر کئی پشتوں تک ہوتا ہے:
- 268 ----- حضرت خضر علیہ السلام کے تین جملوں کی تشریح:
- 269 ----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ادب:
- 270 ----- خضر علیہ السلام نبی تھے:
- 271 ----- کیا خضر علیہ السلام زندہ ہیں؟
- 271 ----- حیاتِ خضر علیہ السلام کے دلائل:
- 272 ----- وفاتِ خضر علیہ السلام کے دلائل:
- 274 ----- فیصلہ کن رائے:

- 275 ----- ذوالقرنین کا تذکرہ:
- 276 ----- پوری دنیا پر حکومت کرنے والے چار اشخاص:
- 277 ----- ”ذوالقرنین“ کہنے کی وجہ:
- 277 ----- جواب بقدر سوال ہونا چاہیے:
- 278 ----- ذوالقرنین کو تمام ضروری اسباب دیے گئے:
- 279 ----- ذوالقرنین نبی تھے یا نہیں؟
- 281 ----- مشرک قوم کے متعلق ذوالقرنین کا موقف:
- 281 ----- طلوع آفتاب کی جگہ پر پہنچنا:
- 282 ----- یاجوج ماجوج کو روکنے کے لیے دیوار کی تعمیر:
- 284 ----- دیوار کی مضبوطی اور شکرِ خداوندی:
- 284 ----- دیوار کب ٹوٹے گی؟
- 284 ----- سکندر کا کچھ تعارف:
- 285 ----- یاجوج ماجوج کون ہیں؟
- 285 ----- دیوار ذوالقرنین:
- 286 ----- یاجوج ماجوج کب نکلیں گے؟
- 287 ----- دجال کا خروج اور اس کی فتنہ انگیزی:
- 287 ----- یاجوج ماجوج کے کچھ احوال:
- 289 ----- سورۃ الکہف کے واقعات میں مناسبت:
- 290 ----- دیوار ذوالقرنین میں سوراخ ہو چکا ہے:
- 291 ----- یاجوج ماجوج کی تعداد:
- 291 ----- متکلم اسلام کی نصیحت:

## سورۃ مریم ----- 292

- 292 ----- حضرت مریم کے ذکر سے پہلے یحییٰ اور حضرت زکریا کا تذکرہ کیوں؟
- 293 ----- حضرت مریم کی والدہ کا نذر ماننا:
- 295 ----- حضرت مریم کی کفالت کے لیے قرعہ اندازی:
- 296 ----- بے موسم کے پھلوں کی آمد:
- 296 ----- ”عند اللہ“ قرآنی اصطلاح ہے:
- 297 ----- یہ گھر اللہ رحمن کا اور یہ عبد الرحمن کا:
- 298 ----- حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا:
- 298 ----- ولی کی کرامت دیکھ کر ولی کے خدا سے مانگیں!
- 299 ----- حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا:
- 300 ----- حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کی جامعیت:
- 301 ----- انبیاء کے مال میں وراثت نہیں چلتی:
- 302 ----- نبی کے مال میں وراثت نہ چلنے کی وجہ؟
- 304 ----- حضرت نانوتوی کی توجیہ:
- 304 ----- نبی کے قلب میں حیات ہوتی ہے:
- 305 ----- ہمارے پاس دلائل موجود ہیں:
- 306 ----- وراثت سے مراد وراثت علمی ہے، قرآنی دلیل:
- 307 ----- حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کی قبولیت:
- 307 ----- حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا ایک قصہ:
- 308 ----- حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات:
- 309 ----- میرے ہاں بیٹا کیسے ہو گا؟

- 310 ----- مزید اطمینان کے لیے سوال کرنا قابل اشکال نہیں:
- 311 ----- بچے کی امید لگنے کی نشانی:
- 312 ----- قوم کو اشاروں سے تسبیح کی تلقین:
- 312 ----- حضرت یحییٰ علیہ السلام کو خطاب:
- 313 ----- حضرت یحییٰ علیہ السلام کو عطا کردہ چیزیں
- 314 ----- حضرت مریم کا تذکرہ کیجیے:
- 315 ----- حضرت جبریل کی حضرت مریم کے پاس آمد:
- 316 ----- متکلم اسلام کی ایک بدعتی سے گفتگو:
- 318 ----- حضرت مریم علیہا السلام کا استعاذہ:
- 319 ----- اللہ ہی بیٹا دینے والا ہے:
- 319 ----- حضرت مریم علیہ السلام کی پریشان حالی:
- 320 ----- بیت اللحم میں آمد:
- 321 ----- موت کی تمنا کب جائز ہے؟
- 323 ----- انسان کو شش کرے، نتیجہ اللہ دیتے ہیں:
- 323 ----- کھانا پہلے یا پینا پہلے؟
- 324 ----- دسترخوان لگانے کا طریقہ:
- 324 ----- دسترخوان کے متعلق چند واقعات:
- 326 ----- نذر نہیں مانی تھی تو یہ کیوں کہا کہ نذر مانی ہے؟
- 327 ----- حضرت مریم کو ہارون کی بہن کہنے کی وجہ:
- 327 ----- یقینی خبر کو ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں:
- 328 ----- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گود میں گفتگو کرنا:

- 329 ----- کتاب ابھی ملی نہیں تو یہ کیوں فرمایا کہ کتاب ملی ہے؟
- 329 ----- آپ کی تعبیرات کے کیا کہنے!
- 330 ----- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نماز کوہ کا حکم:
- 330 ----- منکرین حیات النبی کے استدلال کا جواب:
- 331 ----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ:
- 332 ----- بیان ریکارڈ کرنے کی اہمیت:
- 333 ----- آپ واقعی نرم آدمی ہیں!
- 335 ----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والد کو دعوت:
- 336 ----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی قوم کو دعوت:
- 337 ----- ابراہیم علیہ السلام کے دلائل توحید:
- 338 ----- اسلوب کی تبدیلی کی وجہ:
- 339 ----- بیماری کی نسبت اپنی طرف اور شفا کی نسبت اللہ کی طرف:
- 340 ----- شہد میں شفا؛ لیکن کیسے؟
- 340 ----- ہر روز گوشت نہ کھائیں:
- 341 ----- رات کو دودھ پییں لیکن بکری کا:
- 342 ----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ادب:
- 342 ----- معصوم ہیں تو مغفرت کے یقین کے بجائے امید کیوں فرمایا؟
- 343 ----- ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے:
- 343 ----- ابراہیم علیہ السلام کی ایک اور دلیل:
- 347 ----- کیا بتوں کو بڑے بت نے مارتھا؟
- 347 ----- حضرت ابراہیم کی نمرود کو دعوت:

- 348 ----- عذاب قبر پر اشکالات کے جوابات:
- 349 ----- برزخ کسے کہتے ہیں؟
- 350 ----- لاش کو جانور کھالے تو عذاب کیسے ہوگا؟
- 351 ----- نمرود سے مناظرہ:
- 352 ----- ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت:
- 354 ----- کیا حضرت ہاجرہ باندی تھیں؟
- 355 ----- حضرت ابراہیم پر اشکال کا جواب (ثلاث کذبات):
- 356 ----- یہ شخص مجھے راستہ دکھا رہا ہے:
- 357 ----- حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ:
- 358 ----- نبی اور رسول میں فرق:
- 360 ----- رسول کا لغوی معنی:
- 361 ----- نبی نمائندہ خدا اور صحابی نمائندہ مصطفیٰ:
- 362 ----- جتنے نمائندے میرے اتنے نمائندے آپ کے:
- 363 ----- موسیٰ علیہ السلام سے خطاب خداوندی:
- 364 ----- منصور حلاج کے نعرۃ انا الحق کی توجیہ:
- 365 ----- بیعت کی ضرورت و اہمیت:
- 366 ----- فساد کی وجہ:
- 366 ----- بیعت کی تین اقسام:
- 367 ----- حضرت ادریس علیہ السلام کا تذکرہ:
- 368 ----- انبیاء علیہم السلام اور خشیتِ الہیہ:
- 369 ----- نالائق جانشین کی بیماریاں:



- 369 ----- ”خَلْفَ“ اور ”خَلْفَ“ میں فرق:
- 370 ----- توبہ کا دروازہ کھلا ہے:
- 370 ----- اللہ کے نام اور صفات جیسا کوئی نہیں!
- 371 ----- بعث بعد الموت برحق ہے:
- 372 ----- پل صراط سے گزرنے والوں کی تین اقسام:
- 373 ----- ایمان کی قدر کیجیے!
- 374 ----- مسلمان اور کافر کے جہنم میں جانے میں فرق:
- 374 ----- شرک کی قباحت:
- 375 ----- اہل ایمان کے لیے محبوبیت عامہ:
- 376 ----- آیت پر ایک شبہ اور اس کا جواب:

### 377 ----- سورۃ طہ

- 377 ----- حروفِ مقطعات:
- 379 ----- آیات کا شانِ نزول:
- 380 ----- حضور علیہ السلام کی رات کی عبادت:
- 381 ----- جو میرے طریقے سے روگردانی کرے وہ مجھ سے نہیں:
- 382 ----- اصل زندگی راہِ اعتدال ہے:
- 382 ----- آسمان و زمین کی اشیاء کا علم اللہ ہی کے پاس ہے:
- 384 ----- برّ اور انخی میں فرق:
- 384 ----- استواء علی العرش متشابہات میں سے ہے:
- 385 ----- اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف:

- 386 ----- ”اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے“ کی وضاحت:
- 387 ----- اللہ تعالیٰ کے ہر جگہ ہونے کے دلائل:
- 389 ----- اللہ کو صرف عرش پر ماننے والوں کی پہلی دلیل:
- 389 ----- اس دلیل کا جواب:
- 391 ----- اللہ کو صرف عرش پر ماننے والوں کی دوسری دلیل:
- 392 ----- اس دلیل کا جواب:
- 392 ----- انسان مکلف بقدر عقل:
- 394 ----- حضرت تھانوی کی پیش کردہ مثال:
- 394 ----- حدیث جاریہ کا مطلب از حضرت تھانوی:
- 395 ----- اللہ تعالیٰ کو صرف عرش پر ماننے والوں کا ایک شبہ:
- 395 ----- اس شبہ کا جواب:
- 396 ----- اتحاد اور حلول میں فرق:
- 397 ----- اجمالاً ادب، تفصیلاً بے ادبی:
- 398 ----- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نمونہ ادب:
- 398 ----- منی، مذی اور ودی کی تعریف:
- 400 ----- دعائیں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھانے کی وجہ:
- 401 ----- فریق مخالف سے چند سوالات:
- 402 ----- اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنی:
- 403 ----- اسمائے حسنی کے متعلق چند باتیں:
- 404 ----- ذات باری تعالیٰ کے لیے لفظ ”خدا“ کا استعمال:
- 405 ----- ایک شخص کی متکلم اسلام سے گفتگو:

- 406 ----- تفسیر تو پاک کر دی مفسر کا کیا ہو گا؟
- 407 ----- اتحاد امت کے لیے چار نکاتی ایجنڈا:
- 409 ----- اسمائے حسنیٰ کے ذریعے دعائے مستجاب کا مجرب طریقہ:
- 410 ----- اللہ تعالیٰ تکلفات سے محفوظ رکھے:
- 411 ----- موسیٰ علیہ السلام کو عطاءے نبوت:
- 412 ----- درخت سے آواز آنا:
- 413 ----- مقدس مقامات میں جوتے اتارنا ادب ہے:
- 414 ----- نماز ایک اہم عبادت ہے:
- 415 ----- قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے:
- 415 ----- بری صحبت سے بچنا ضروری ہے:
- 416 ----- موسیٰ علیہ السلام کے معجزات:
- 416 ----- [1]: عصائے موسیٰ
- 418 ----- [2]: ید بیضاء
- 418 ----- داعی کی ضرورت تین چیزیں:
- 420 ----- عبادات میں ماحول کو دخل ہے:
- 421 ----- ام موسیٰ کو پیغام خداوندی:
- 423 ----- قبلی کا قتل:
- 423 ----- موسیٰ علیہ السلام پر آزمائشوں کی تفصیل:
- 425 ----- موسیٰ علیہ السلام کی محبوبیت:
- 426 ----- موسیٰ علیہ السلام کا اپنی ماں کا دودھ پینا:
- 427 ----- فرعون کی ڈاڑھی پکڑنا:

- 428 ----- قبیل اور بنی اسرائیل کی لڑائی: -----
- 429 ----- مدین کا سفر: -----
- 430 ----- مدین سے واپسی: -----
- 431 ----- نرمی اور سختی کہاں کی جائے؟ -----
- 432 ----- فرعون کو دعوت اور اس کا جواب: -----
- 433 ----- پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا: -----
- 434 ----- جادو گروں سے مقابلہ: -----
- 434 ----- جادو گروں کا قبولِ حق: -----
- 439 ----- فرعون کی حق سے روگردانی: -----
- 439 ----- بنی اسرائیل کی آزادی: -----
- 441 ----- فرعون نمونہ عبرت بنا: -----
- 441 ----- موسیٰ علیہ السلام کی اللہ سے ہمکلامی: -----
- 442 ----- بنی اسرائیل کا بچھڑے کی عبادت کرنا: -----
- 443 ----- امانت کی پاسداری: -----
- 443 ----- بچھڑے کی عبادت اور تین گروہ: -----
- 444 ----- بنی اسرائیل کی توبہ: -----
- 445 ----- سامری کا تعارف: -----
- 446 ----- انبیاء علیہم السلام کا اجتہادی اختلاف: -----
- 447 ----- مشاجرت صحابہ اور ہمارا موقف: -----
- 448 ----- قصہ حضرت آدم علیہ السلام: -----
- 450 ----- مسئلہ بتائیں تو پوری بات سمجھائیں! -----

- 451 ----- تبلیغی بھائی کی عالمہ سے شادی کا دلچسپ واقعہ:
- 452 ----- عصمت انبیاء علیہم السلام پر اعتراض کا جواب:
- 454 ----- یہاں اندھا تو وہاں بھی اندھا:
- 455 ----- حضرت تھانوی اور ایک غیر مقلد کا دلچسپ مکالمہ:
- 456 ----- تکالیف ملیں تو دو کام کریں:
- 456 ----- پانچوں نمازوں کے اوقات کا ثبوت:
- 457 ----- دنیا سے بے رغبتی اختیار کریں!

## 458 ----- سورة الانبياء

- 458 ----- ”بشر“ کا معنی:
- 459 ----- قرآن شعر نہیں اور نبی شاعر نہیں:
- 460 ----- تقلید کا ثبوت:
- 461 ----- محال عقلی، محال شرعی اور عادی:
- 462 ----- تقلید مطلق اور تقلید شخصی:
- 462 ----- انبیاء بشر ہیں، خدا نہیں!
- 463 ----- قادیانیوں کے استدلال کا جواب:
- 464 ----- قادیانیوں سے گفتگو کا طریقہ:
- 464 ----- ”تو نمبر دار نہیں بن سکتا!“
- 465 ----- توحید باری تعالیٰ پر دلیل:
- 466 ----- ترک رفیع دین اور نکتہ اختلاف کی تنقیح:
- 467 ----- بڑھیا کا چرخہ:

- 468 ----- اللہ تعالیٰ کو خدا کہنا جائز ہے:
- 469 ----- موت برحق ہے:
- 469 ----- وقوع موت اور خبر موت میں فرق کرنا ضروری ہے:
- 469 ----- منکرین حیات الانبیاء سے گفتگو:
- 472 ----- خیر و شر کے ذریعے آزمائش:
- 472 ----- عجلت اور سرعت میں فرق:
- 474 ----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قوم سے مکالمہ:
- 478 ----- حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا اجتہادی اختلاف:
- 481 ----- قضاء اور دیانت کا مفہوم:
- 483 ----- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کا معنی:
- 485 ----- حضرت ایوب علیہ السلام کا ابتلاء:
- 486 ----- فضائل حج کی حکایت پر اعتراض کا جواب:
- 488 ----- حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ:
- 492 ----- جاہل عاملوں کے استدلال کا رد:
- 493 ----- قبولیت عمل کے لیے شرط؛ صحت عقیدہ:
- 493 ----- خروج یا جوج ماجوج:
- 495 ----- زمین کے وارث نیک بندے ہوں گے:
- 496 ----- کیا پیغمبر علیہ السلام ہر جگہ پر ہیں؟

## سورة الرعد

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ الْحَقُّ وَ

لَكِنَّ أَكْثَرَالنَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ﴾

تمہیدی گفتگو:

سورة الرعد مدنی سورة ہے۔ اس میں چھ رکوع اور تینتالیس آیات ہیں۔ اس سورة کا نام سورة الرعد کیوں ہے؟ اس لیے کہ اس کی تیرھویں آیت ﴿وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَكُوتُ مِنْ خَيْفَتِهِ﴾ میں رعد کا ذکر ہے۔ عربی زبان میں بادلوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے سے جو کڑک دار آواز پیدا ہوتی ہے اسے ”رعد“ کہتے ہیں لیکن یہاں یہ مراد نہیں۔ یہاں ”رعد“ سے مراد ایک فرشتہ ہے جس کا نام رعد ہے، اس کو اللہ رب العزت نے بارشوں کے برسانے پر مقرر فرمایا ہے۔

یہ رعد فرشتہ خود بھی اللہ کی حمد کی تسبیحات پڑھتا ہے اور دوسرے فرشتے بھی اللہ کے خوف سے اللہ کی تسبیحات پڑھتے ہیں۔ چونکہ اس سورة میں لفظ رعد سے مراد فرشتہ ہے تو فرشتے کے تذکرہ کی وجہ سے اس سورة کا نام ”سورة الرعد“ رکھا گیا ہے۔ اسے عربی اصطلاح میں ”تَسْبِيحَةُ الْكُلِّ بِاسْمِ الْجُزْءِ“ کہتے ہیں یعنی جزء کی وجہ سے

کل کا نام رکھنا۔

﴿اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمُوتَ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَبَوَّاهَا ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ﴾

اللہ رب العزت نے اپنی قدرت کو بیان فرمایا ہے کہ اے میرے پیغمبر! کتاب میں نے دی ہے اور یہ لوگ مانتے نہیں ہیں اور ان کو یہ احساس نہیں ہے کہ میری قدرت کتنی بڑی ہے! کئی آسمان میں نے کھڑے کر دیے ہیں جن کے نیچے ایک ستون بھی نہیں ہے، دیکھو میری کتنی طاقت ہے! ان منکرین کی میرے سامنے کیا حیثیت ہے؟! لیکن پھر بھی میں ان کو کچھ بھی نہیں کہتا، میں نے ان کو ڈھیل دے رکھی ہے اور یہ ڈھیل کا معنی سمجھتے ہیں کہ میں ان کی گرفت نہیں کر سکتا! یہ لوگ میری طاقت کو نہیں دیکھتے۔ ہم نے کتنی بڑی بلڈنگ کھڑی کی ہے اور اس کے نیچے کوئی ستون نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی تعمیر کرنے والا مستری اور انجینئر آپ پیش کر سکتے ہیں جو بلڈنگ کھڑی کرے اور نیچے کوئی ستون نہ ہو؟ (نہیں۔ سامعین) اللہ کو دیکھیں کہ کتنی بڑی بلڈنگ کھڑی کی ہے!

”استویٰ علی العرش“ کا معنی:

اس کے بعد فرمایا: ﴿ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ﴾

پھر اللہ عرش پر مستوی ہوئے۔

اس کا معنی بعض لوگوں نے غلط سمجھا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ عرش پر رہتے ہیں، حالانکہ اس کا یہ معنی نہیں کہ اللہ عرش پر رہتے ہیں بلکہ اس کا یہ معنی ہے کہ اللہ کا عرش پر غلبہ ہے، اللہ کا عرش پر قبضہ ہے، اللہ کا عرش پر حکم چلتا

ہے۔



## عرش کا ذکر کرنے کی وجہ:

کسی بندے کے ذہن میں سوال آتا ہے کہ آسمان پر بھی تو خدا کا غلبہ ہے، زمین پر بھی خدا کا غلبہ ہے تو اس میں اہم بات کون سی تھی جو ﴿ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ﴾ فرمادیا؟

اس بات کا جواب سمجھانے کے لیے میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک لڑکے کے والد کے پاس سائیکل ہے۔ دوسرے کے والد کے پاس سائیکل بھی ہے اور موٹر سائیکل بھی ہے۔ تیسرے کے والد کے پاس سائیکل بھی ہے، موٹر سائیکل بھی ہے اور کار بھی ہے۔ ان تینوں کی آپس میں اگر بحث ہو جائے تو ایک کہتا ہے کہ میرے باپ کے پاس سائیکل ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرے باپ کے پاس موٹر سائیکل ہے۔ تیسرا کہتا ہے کہ میرے ابو کے پاس کار ہے۔ اب بتاؤ! جس کے پاس کار ہے کیا اس کے پاس سائیکل یا موٹر سائیکل نہیں ہے؟ سائیکل بھی ہے اور موٹر سائیکل بھی ہے لیکن وہ کہہ رہا ہے کہ میرے ابو کے پاس کار ہے، یہ سائیکل اور موٹر سائیکل کی بات نہیں کر رہا بلکہ یہ کار کی بات کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایسی چیز بتا رہا ہے جو دوسرے کے باپ کے پاس نہیں ہے۔

یہاں اللہ رب العزت سمجھا رہے ہیں کہ زمین کا مالک بھی میں ہوں لیکن ظاہری طور پر انسان کو ملک میں دے رکھی ہے، زمین کی حیثیت کیا ہے آسمان کی حیثیت کیا ہے؟ زمین تمہیں نظر آرہی ہے اور آسمان تک تم جا نہیں سکتے لیکن آسمان نظر آرہے ہیں۔ میں وہ خدا ہوں جس کا غلبہ اس عرش پر بھی ہے جس تک تمہاری رسائی کا تصور بھی نہیں! میری طاقت کے سامنے تم ٹھہر سکتے ہو؟ لیکن پھر بھی تم میرا تحمل دیکھو، میرا حلم دیکھو کہ میں تمہیں کچھ نہیں کہتا۔

## سورج اور چاند کا مسخر ہونا:

﴿وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط﴾

اللہ نے سورج اور چاند کو مسخر فرمایا ہے۔ یہ اپنے وقت پر نکلتے ہیں اور اپنے وقت پر ڈوبتے ہیں۔ محال ہے کہ یہ ہلکا سادائیں بائیں ہو جائیں! بتاؤ اللہ کتنی قدرت اور طاقت والے ہیں۔

## اللہ ہر جگہ پر ہے:

﴿ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ﴾

”پھر اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا“ اس کا معنی ضرور سمجھیں۔ میں یہ بات اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ بسا اوقات بعض لوگ اس کے معنی کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ہمارا اہل السنۃ والجماعۃ کا نظریہ ہے کہ اللہ کی ذات ہر جگہ موجود ہے، غیر مقلدین کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات عرش پر موجود ہے اور ہر جگہ پر موجود نہیں ہے۔

میں اس دفعہ رمضان المبارک میں دو دن کے لیے ملک بحرین گیا تو ایک ساتھی ملاقات کے لیے آیا جو پہلے ہمارا تھا لیکن اب مسلک بدل چکا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اللہ کی ذات کہاں پر ہے؟ میں نے کہا: ہر جگہ پر ہے۔ مجھے کہنے لگا: ہماری دکان میں بھی ہے؟ العیاذ باللہ، میں نے کہا: رمضان کہاں پر ہے؟ کہنے لگا: ہر جگہ۔ میں نے کہا: تمہاری دکان میں بھی ہے؟ تو چیپ ہو گیا۔ میں نے کہا: بتاؤ! اب جواب نہیں آ رہا۔ میں نے کہا: جس طرح رمضان بابرکت ہے خواہ بازار میں بھی ہو لیکن نظر نہیں آتا، اللہ ہر جگہ پر ہے لیکن نظر نہیں آتا۔ رمضان مبارک ہے اور جسم سے پاک ہے اسی طرح اللہ مبارک ہے اور جسم سے پاک ہے۔ اس کا جسم سے تعلق ہی کیا ہے؟ مجھے کہنے

لگا: اللہ ہر جگہ پر ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ اس نے کہا: اس کی دلیل کیا ہے؟ میں نے کہا: قرآن کریم میں پہلے پارے میں ہے:

﴿وَاللَّهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيُّمَا تَوَلَّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ

وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾<sup>1</sup>

مشرق بھی اللہ کا اور مغرب بھی اللہ کا، جدھر تم رخ کرو گے ادھر اللہ کی ذات موجود ہے۔

مجھے کہنے لگا: اس سے مراد اللہ کا علم ہے، اللہ کی قدرت ہے، اللہ کی ذات مراد نہیں ہے۔ میں نے کہا: یہ جو تمہاری دکان میں قرآن کا ترجمہ اور تفسیر ہے یہ میرے عالم کا ہے یا تمہارے عالم کا ہے؟ کہا: جی، ہمارے عالم کا ہے۔ اس تفسیر کا نام ”احسن البیان“ ہے جس کا ترجمہ محمد جو ناگرٹھی غیر مقلد نے کیا ہے۔ میں نے کہا: اس کو اٹھاؤ اور دیکھو یہ کیا ترجمہ کرتا ہے؟ اب اس نے ترجمہ کیا ہے:

”اور مشرق اور مغرب کا مالک اللہ ہی ہے۔ تم جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ کا منہ ہے۔“<sup>2</sup>

میں نے کہا: علم کا بھی منہ ہوتا ہے؟ قدرت کا بھی منہ ہوتا ہے؟ کہنے لگا: نہیں۔ میں نے کہا: منہ کس کا ہوتا ہے؟ کہتا ہے: ذات کا۔ میں نے کہا: یہی بات تو میں کہتا ہوں کہ جدھر رخ کرو گے وہاں اللہ کی ذات موجود ہے۔

**غیر مقلدین کی چال:**

جب یہ پھنستے ہیں تو پھر علماء کی بات کرتے ہیں اور جب نہیں پھنستے تو پھر

1- البقرة: 115:2

2- تفسیر احسن البیان: ص 95

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کرتے ہیں۔ وہ مجھے کہنے لگا: میں اپنے شیخ سے پوچھوں گا۔ میں نے کہا: شیخ سے نہ پوچھو، اللہ سے پوچھو! مجھے کہتا ہے: کیوں؟ میں نے کہا: بندہ؛ عالم سے پوچھے تو مشرک ہوتا ہے تو موحد ہے تو خدا سے پوچھا کر! ہم امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے پوچھیں تو شرک ہے اور تم کسی مولوی سے پوچھو تو شرک نہیں ہے! مجھے کہتا ہے: اللہ کی بات ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ اس پر میں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ قرآن اللہ کا ہے اور پڑھتے قاری سے ہیں، قرآن اللہ کا ہے اور سمجھتے مولوی سے ہیں، حدیث نبی کی ہے اور سمجھتے امام سے ہیں۔ میں نے کہا: اس میں شرک والی کون سی بات ہے؟

خیر میں سمجھا رہا تھا کہ اللہ کی ذات ہر جگہ موجود ہے۔

### کفار کا بعث بعد الموت کا انکار:

﴿وَإِنْ تَعَجَّبَ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءِذَا كُنَّا تُرَابًا ءِ إِنَّا لَنَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ﴾

اے میرے پیغمبر! اگر آپ کو اس پر تعجب ہے کہ یہ لوگ آپ کی بات نہیں مانتے، آپ کے کھلے ہوئے معجزات دیکھنے کے باوجود انکار کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ تعجب ان کی اس بات پر ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم مٹی بن جائیں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کیے جائیں گے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

ان لوگوں کی بات اتنی عجیب کیوں ہے؟ اس لیے کہ جب یہ کچھ بھی نہیں تھے تو خدا نے پیدا کر دیا، اب ان کا ڈیزائن موجود ہے تو اب ان کو پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟ بھائی ایک بلڈنگ کا میٹرل بھی نہ ہو، بلڈنگ کا نقشہ بھی نہ ہو، بلڈنگ کا کچھ بھی نہ ہو وہ بلڈنگ بنانا آسان ہے اور پھر اس بلڈنگ کو گرا کر دوبارہ بنانا یہ تو اس سے بھی زیادہ آسان ہے! تو اللہ فرماتے ہیں کہ کتنا تعجب ہے ان پر کہ یہ کہتے ہیں کہ بوسیدہ ہڈیوں کو

کون پیدا کرے گا؟ اللہ نے ایک مقام پر اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

﴿قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ﴾<sup>3</sup>

اے پیغمبر! آپ ان کو بتائیں کہ جس خدا نے پہلے پیدا کیا تھا وہی خدا ان کو دوبارہ پیدا کریں گے۔

### حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ:

حضرت عزیر علیہ السلام نے ایک بار کہا تھا۔ قرآن کریم میں یہ واقعہ موجود ہے:

﴿أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّى يُحْيِي هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ﴾<sup>4</sup>

عزیر علیہ السلام کا نام تو قرآن میں نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔ آپ ایک بستی سے گزرے جو خدا کے عذاب کا شکار تھی یا معمول کے مطابق اس کی مدت گزر گئی اور وہ بستی گری پڑی تھی۔ عزیر علیہ السلام نے تعجب سے اللہ پاک سے عرض کیا: یا اللہ! یہ بستی ختم ہو گئی ہے، اب اس کو دوبارہ کیسے کھڑا کریں گے؟ عزیر علیہ السلام کے پاس روٹی تھی، انگور تھے، روٹی کے ٹکڑے لیے اور انگور کا سرکہ لیا اور اس کو بنایا جیسے سالن بناتے ہیں، یہ ان کے ہاتھ میں تھا، ﴿فَأَمَّا تِلْكَ الْأُمَّةُ عَاوِمٌ﴾ خدا نے وہیں موت دے دی۔ اب روٹی پاس پڑی ہے اور عزیر علیہ السلام فوت ہو گئے۔ ﴿فَأَمَّا تِلْكَ الْأُمَّةُ عَاوِمٌ ثُمَّ بَعَثَهُ﴾ سو سال کے بعد اللہ تعالیٰ عزیر علیہ السلام کو دنیا میں لائے۔ پوچھا: ﴿مَهْمَا لَبِثْتَ﴾ اے

عزیر! آپ کتنا عرصہ ٹھہرے ہیں؟ کہا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ کہ یا اللہ! دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں۔ فرمایا: ﴿بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ نہیں، بلکہ آپ سو سال رہ کر آئے ہیں، آپ کو اندازہ نہیں۔

### یہ عین ایمان ہے:

ساتھ ساتھ اس چیز کی بھی وضاحت کر دوں تاکہ کسی کو دھوکہ نہ لگے۔ وہ یہ کہ حضرت عزیر علیہ السلام کے تعجب کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر یقین نہیں تھا، ان کو یقین تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے عین الیقین۔ عین الیقین کا معنی ہوتا ہے کہ آدمی دیکھے اور یقین آئے اور ایک ہوتا ہے ”بن دیکھے“۔ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کی بات پر یقین رکھتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ میں آنکھوں سے بھی دیکھوں اور یہ ایمان کے خلاف نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا تھا کہ اے اللہ! میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ کو دیکھوں! اب بتاؤ کہ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ پر یقین نہیں تھا؟ (یقین تھا۔ سامعین) لیکن آپ فرما رہے تھے کہ اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ میں تجھے دیکھوں! تو یہ ایمان کے خلاف نہیں ہے۔

### حضرت عزیر کے واقعہ سے بعض لوگوں کے استدلال کا جواب:

اس واقعہ سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام موت کے بعد زندہ نہیں ہوتے۔ ہمارا اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام موت کے بعد اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

میں آپ سے ایک بات عرض کرتا ہوں کہ عقائد کے معاملہ میں جھجکا نہ کریں، سینہ تان کر بات کیا کریں، دلیری سے بات کیا کریں، ہم ہیں نا! پھر آپ کو کیا

پریشانی ہے؟ پوری دنیا مطمئن ہو کر سوئی ہے کہ ہم موجود ہیں، الحمد للہ، اور یہ بات میں مذاق میں نہیں کہہ رہا، آپ دنیا کے کسی ملک میں جائیں گے یا جن کا سوشل میڈیا سے تعلق ہو تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ ہم مسلک پر مطمئن ہیں، کیوں کہ ہمارا یہ خادم [مولانا محمد الیاس گھمن صاحب] زندہ ہے۔ تمہیں ہماری محنت کا اندازہ نہیں ہے، اس لیے میں کبھی کبھی احساس دلانے کے لیے یہ بات کہتا ہوں۔ اللہ پاک ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### عقائد پر کپڑا مارتے کریں!

ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ عقائد پر کوئی کپڑا مارتے نہیں۔ جو کپڑا مارتے کرتا ہے وہ ہمارے ساتھ نہ چلے، وہ کسی اور عالم کو تلاش کرے جس نے عقائد میں خلط ملط کرنا ہے، وہ کوئی اور پیر تلاش کرے، وہ ہمیں معاف کرے۔ ہمارے ساتھ وہ چلے جس نے خالص عقیدہ رکھنا ہے۔ خالص عقیدے پر خالص مدد آتی ہے، خالص دین پر خالص مدد آتی ہے، خالص عقیدے پر اللہ خالص جنت عطا فرماتے ہیں۔ تو خالص مال لینا ہے یا ملاوٹ والا؟ (خالص۔ سامعین) باطل الگ ہے اور ہم حق والے الگ ہیں۔ ہم اس دنیا میں باطل سے الگ ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ قیامت میں اللہ کریم ہمیں اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رکھیں۔ (آمین)

### اشکال کی وضاحت:

اب وہ لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ عزیر علیہ السلام سو سال تک رہے۔ جب اللہ پوچھتے ہیں کہ آپ کتنا عرصہ رہے؟ تو جواب دیا:

﴿لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾

کہ میں ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ رہا۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر عزیر علیہ السلام زندہ ہوتے تو انہیں پتا چل جاتا کہ کتنا عرصہ ٹھہرا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ زندہ نہیں تھی تو پتانہ چلا۔

### ہمارا جواب:

میں نے کہا کہ میں پہلے آپ کے اس نظریے کی تردید قرآن سے کرتا ہوں۔ دیکھو! اصحابِ کھف سوئے تھے یا فوت ہو گئے تھے؟ (سوئے تھے۔ سامعین) فوت تو نہیں ہوئے تھے؟ (نہیں۔ سامعین) بتاؤ سویا ہوا زندہ ہوتا ہے یا مردہ؟ (زندہ ہوتا ہے۔ سامعین)

### اصحابِ کھف کا واقعہ:

اصحابِ کھف کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ جب اٹھے تو ان میں سے ایک نے پوچھا: ﴿كَمْ لَيْسَتْ﴾ کہ تم لوگ کتنا عرصہ ٹھہرے ہو؟ تو انہوں نے جواب میں کہا تھا: ﴿لَيْسْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضُ يَوْمٍ﴾ کہ ہم ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں۔

حضرت عزیر علیہ السلام نے فرمایا تھا ﴿لَيْسَتْ يَوْمًا أَوْ بَعْضُ يَوْمٍ﴾ اور وہی جملہ اصحابِ کھف نے فرمایا کہ ﴿لَيْسْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضُ يَوْمٍ﴾ کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اب بتاؤ! کیا اصحابِ کھف زندہ نہیں تھے؟ (زندہ تھے۔ سامعین) پتا تو ان کو بھی نہیں چلا کہ کتنا عرصہ ٹھہرے رہے تو پھر ان کے متعلق بھی کہو کہ یہ زندہ نہیں تھے۔ معلوم ہوا کہ پتانہ چلنا اس بات کی دلیل نہیں کہ زندہ نہیں۔ بسا اوقات بندہ زندہ ہوتا ہے لیکن پتا نہیں چلتا۔

### ایک عجیب نکتہ:

ایک اور عجیب نکتہ میں آپ کو پیش کرنے لگا ہوں جو آپ کے لیے سمجھنا



آسان ہو گا اور بہت کم ہی یہ نکتہ آپ نے سنا ہو یا شاید کبھی بھی آپ نے نہ سنا ہو۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ﴾<sup>5</sup>

کہ قیامت کا ایک دن دنیا کے ہزار سال کے برابر ہے۔

اور یہاں کے سو سال ہوں تو پھر وہاں کا کچھ حصہ بنے گا۔ اللہ رب العزت نے عزیر علیہ السلام سے پوچھا: ﴿كَمْ لَيْسَتْ﴾ آپ کتنا عرصہ ٹھہرے ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: ﴿لَيْسَتْ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ کہ ایک دن یا دن کا بعض حصہ۔ عزیر علیہ السلام کہاں سے آئے تھے؟ (وہاں سے۔ سامعین) اور اللہ پاک وہاں کا پوچھ رہے تھے یا یہاں کا؟ (یہاں کا۔ سامعین) اللہ یہاں کا پوچھ رہے ہیں اور حضرت عزیر علیہ السلام وہاں کا بتا رہے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ ٹھہرے جو وہاں تھے تو بتایا بھی اسی جگہ کا۔ اللہ نے فرمایا کہ میں وہاں کا نہیں بلکہ یہاں کا پوچھ رہا ہوں۔ وہاں کا بعض یوم ہے اور یہاں کا مائة عام ہے، وہاں کا کچھ ہے اور یہاں کا سو سال ہے۔ اب بتاؤ! کوئی اختلاف ہے اس میں؟ (نہیں۔ سامعین) کتنی آسان سی بات ہے۔

### قدرتِ خداوندی کی دلیل:

میں بات یہ سمجھا رہا تھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام کے قصے میں اللہ نے بتایا ہے کہ بندہ اگر اس دنیا سے چلا جائے تو میں اس کو اس دنیا میں واپس بھی لا سکتا ہوں اور حضرت عزیر علیہ السلام سے اللہ نے فرمایا کہ ذرا ہماری قدرت دیکھو! ﴿فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ کہ اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو! سو سال گزرنے

کے باوجود بالکل تازہ ہے، گلاسٹرا نہیں۔ ﴿وَ أَنْظُرْ إِلَى حِمَارِكَ﴾ ذرا اپنے گدھے کو دیکھو جس پر سوار ہو کر آئے تھے۔ وہ گدھا بالکل گل سڑ گیا تھا۔ تو فرمایا: ﴿وَ أَنْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِرُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا﴾ دیکھو! ہم اس کی ہڈیاں کیسے جمع کرتے ہیں پھر اس پر کیسے گوشت چڑھاتے ہیں۔ تو یوں اللہ رب العزت نے اسے زندہ کر کے کھڑا کر دیا۔ فرمایا کہ اگر ہم چاہیں سو سال میں کھانا سالم رکھ لیں اور چاہیں تو گدھے کو ہڈیاں بنا کر پھر ان پر گوشت چڑھا کر یوں زندہ کریں۔ عزیر علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے۔

تو اللہ اس سورت میں بھی فرما رہے ہیں کہ ﴿وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ؕ اِذَا كُنَّا تُرَابًا اِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ﴾ اے میرے پیغمبر! آپ کو اس بات پر تعجب ہے کہ یہ مانتے نہیں لیکن اس سے زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ جب ہم مٹی بن جائیں گے تو اللہ ہمیں دوبارہ کیسے زندہ کرے گا؟

**اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے... واقعہ:**

صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آدمی کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنی اولاد سے کہا:

”فَاِنِّیْ لَمْ اَحْمَلْ خَبِيْرًا قَطُّ“ میں نے کبھی کوئی نیک کام نہیں کیا، ”فَاِذَا مُتُّ فَاُخْرِ قُوْنِیْ“ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا، میرے جسم کی ہڈیوں کو کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کرنا اور جس دن آندھی چلے تو میرے اس جسم کے ذروں کو بکھیر دینا، میں ڈرتا ہوں کہ مجھے عذاب نہ ہو۔ اس کی اولاد نے باپ کی وصیت پر عمل کیا، لاش کو جلایا اور اس کے جسم کے ذروں کو ہوا میں بکھیر دیا۔ حدیث میں ہے کہ ”فَجَمَعَهُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ“ اللہ عزوجل نے اسے جمع کیا، پوچھا: ”مَا حَمَلَكَ؟“ تم نے ایسے کیوں کیا؟ اس

نے جواب دیا: ”مَحَافِظُكَ“ اللہ! میں نے یہ کام تیرے ڈر کی وجہ سے کیا۔ اللہ نے فرمایا: چلو میں نے تجھے معاف کر دیا۔<sup>6</sup>

### حکیم الامت کی تحقیق:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عجیب بات فرمائی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ علماء نے اس حدیث پر بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں کہ جب وہ اس کا قائل نہیں تھا تو مسلمان نہیں ہوا، جب مسلمان نہیں ہوا تو مغفرت کیسے ہوئی؟ حضرت نے فرمایا کہ وجہ یہ نہیں کہ قائل نہیں تھا بلکہ وہ قائل تھا لیکن جتنی انسان کی عقل ہو بندہ اتنا ہی مکلف ہوتا ہے، اس کا خیال یہ تھا کہ جسم ہو تو خدا عذاب دیتا ہے اور جب جسم نہ ہو تو خدا عذاب نہیں دیتا، اس لیے اس نے کہا کہ اللہ! میں نے تیرے ڈر کی وجہ سے ایسے کیا۔ چونکہ اس کی نیت ٹھیک تھی اس لیے اللہ نے فرمایا کہ جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا۔

### حضرت متکلم اسلام کے زمانہ طالب علمی کا واقعہ:

مجھے اچھی طرح یاد ہے، یہ زمانہ طالب علمی کی بات ہے، میں چوتھے سال میں جامعہ امدادیہ فیصل آباد میں پڑھتا تھا تو میں ایک بار 87 جنوبی سرگودھا اپنے گھر آیا۔ چوتھے سال میں آدمی کی کیا عمر ہوتی ہے! ہمارے ایک رشتہ دار تھے جو جرمنی سے آئے تھے، وہ کسی کے ہاتھ چڑھ گئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے سوالات کیے۔ مجھے کہنے لگے: آپ کہتے ہیں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آدمی قبر میں جائے گا تو مٹی میں مل جائے گا، پھر دوبارہ زندہ ہو گا اور اس کو عذاب ہو گا۔ یہ بات تو اللہ کی شانِ عدل کے خلاف ہے۔ میں نے کہا: کیوں؟ کہنے لگے کہ گناہ تو اس جسم نے کیے ہیں اور یہ مٹی ہو گیا ہے۔

اللہ دوبارہ جو جسم بنائیں گے وہ تو اور ہوگا، تو گناہ اس جسم نے کیے ہیں اور عذاب دوسرے جسم کو مل رہا ہے یہ تو عدل کے خلاف ہے۔

میں نے کہا: اس طرح نہیں ہے، آپ بات سمجھ نہیں ہیں، یہ تب ہوگا جب پہلے والا جسم الگ ہو اور بعد والا جسم الگ ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ پہلے والا جسم جس کو اللہ نے مٹی میں ملایا ہے وہی دوبارہ درست ہوگا، اللہ اسی کو دوبارہ پیدا فرمائیں گے اور عذاب بھی اسی جسم کو ہوگا۔ لہذا یہ عدل کے خلاف نہیں ہے۔

### آج کے دور کا گمراہ فرقہ اور مشرکین مکہ:

میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں۔ ایک لڑائی مسلمانوں کی مشرکین مکہ سے تھی اور ایک لڑائی ہماری آج کے لوگوں سے ہے۔ ہم فتویٰ تو نہیں لگاتے نہ شرک کا نہ کفر کا لیکن اتنی بات ضرور کہتے ہیں کہ یہ ضلالت اور گمراہی سے خالی نہیں ہیں۔ مشرک کہتے تھے: ﴿مَنْ يُحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ﴾<sup>7</sup>

کہ بوسیدہ ہڈیاں دوبارہ کون زندہ کرے گا؟

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جب ایک آدمی کو جانور نے کھالیا اور وہ جانور کے پیٹ سے نکل گیا تو اس کو عذاب کیسے ہوگا؟ ایک آدمی دریا میں گرا اور اس کا وجود پانی میں تحلیل ہو گیا تو اس کو عذاب کیسے ہوگا؟ ایک آدمی کو آگ میں جلایا گیا اور اس کا جسم راکھ ہو کر بکھر گیا تو اس کو عذاب کیسے ہوگا؟

آج یہ اشکال وہ لوگ کرتے ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا اس قبر میں عذاب و ثواب ہوگا؟

ہم نے کہا: خدا تمہیں عقل عطا فرمائے۔ مشرک بھی یہی کہتا تھا کہ جب یہ

ہڈی بوسیدہ ہو گئی تو خدا اسے پیدا کیسے کرے گا؟ اور تم بھی یہی کہتے ہو کہ جب یہ جسم مٹی بن گیا تو خدا اس کو عذاب کیسے دے گا؟ پانی میں گل گیا تو عذاب کیسے دے گا؟ یا ہوا میں بکھر گیا تو خدا اس کو عذاب کیسے دے گا؟ جانور نے کھا لیا تو خدا عذاب کیسے دے گا؟ ہم نے کہا: بھائی! عذاب ہم نے نہیں دینا، عذاب خدا نے دینا ہے۔ وہ صمد بھی ہے اور قدیر بھی ہے۔ اب بتاؤ! کون ان لوگوں کو سمجھائے؟ آپ پھر بھی کہتے ہیں کہ وہ ہمارے ہیں۔ پتا نہیں آپ کیسے ”اپنا“ کہہ لیتے ہیں یا یہ بات ہمیں نہیں سمجھ آرہی یا آپ کو زیادہ سمجھ آگئی ہے۔

اسی قبر میں مردے کو عذاب و ثواب ہوتا ہے جہاں آپ اسے دفن کرتے ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ جو نیک ہے اس کی روح علین میں ہے اور جو کافر ہے اس کی روح سجن میں ہے لیکن عذاب اسی جسم کو ہوتا ہے۔ آپ لوگ یہ بتائیں کہ عذاب اللہ نے دینا ہے یا ہم نے دینا ہے؟ (اللہ نے دینا ہے۔ سامعین) تو کیا اللہ عذاب دینے میں سارے جسم کے محتاج ہیں کہ سارا جسم سالم ہو تو پھر دے سکتے ہیں اور اگر جسم ذروں میں بکھر جائے تو عذاب نہیں دے سکتے؟ آپ کیسی بات کرتے ہیں؟ جسم کے ذرے الگ الگ ہوں تو اللہ پھر بھی عذاب دے سکتے ہیں۔

### چھپکلی کی مثال:

ہم نے دنیا میں چھپکلی کو تڑپتے دیکھا ہے، اس کی دُم کہیں ہوتی ہے اور دھڑ کہیں اور ہوتا ہے، کچھ وقت وہ دُم بھی تڑپتی رہتی ہے یا نہیں؟ (تڑپتی ہے۔ سامعین) کچھ وقت تڑپنا تو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے یہ کیسی باتیں تم کہہ دیتے ہو کہ اللہ عذاب کیسے دے گا؟ اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### عذاب اور ثواب اسی قبر میں ہے:

اسی قبر میں عذاب ہے جہاں مردے کو دفن کیا ہے، اسی قبر میں ثواب ہے

جہاں مردے کو دفن کیا ہے۔ ہاں روح وہاں پر ہے اور جسم یہاں پر ہے، روح اور جسم کے تعلق سے ثواب اور عذاب ہوتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ جس طرح آدمی سویا ہوا ہو، آپ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہوں اور اچانک وہ ہل جائے آپ اسے کہتے ہیں کہ بھائی! کیا ہوا تجھے؟ وہ کہے کہ مجھے خواب آیا ہے کہ مجھے فلاں شخص نے ڈنڈا مارا ہے۔ آپ اس سے کہیں کہ تو جھوٹ بولتا ہے، تو ہمارے پاس سویا ہوا ہے، کس نے تجھے ڈنڈا مارا ہے؟ اب بتاؤ! یہ سونے والا سچ کہہ رہا ہے یا نہیں؟ (سچ کہہ رہا ہے۔ سامعین) کیوں؟ اس لیے کہ یہ ڈنڈا اس کی روح کو لگا ہے اور جسم محسوس کر رہا ہے، ہمیں نظر نہیں آ رہا۔ تو جس طرح سونے والے کو لگ رہا ہے لیکن ہمیں نظر نہیں آ رہا اسی طرح قبر والے کو بھی لگ رہا ہے لیکن ہمیں یہ بھی نظر نہیں آ رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"فَيَصْبِيحُ صَبِيحَةً يَسْبَعُهُ الْخَلْقُ غَيْرَ الثَّقَلَيْنِ."<sup>8</sup>

اس قبر میں جو عذاب ہوتا ہے اسے جن وانس کے علاوہ ہر مخلوق سنتی ہے۔

دوسری روایت میں ہے:

"لَوْلَا أَن لَّا تَدْفَنُوا لَدَعَوْتُ اللَّهَ أَنْ يُسَبِّحَكُمْ عَذَابُ الْقَبْرِ."<sup>9</sup>

کہ میں اس لیے تمہیں عذاب قبر دکھائے جانے کی دعا نہیں کرتا کہ اگر تمہیں نظر آ گیا تو تم اپنے مردے کو دفن کرنا چھوڑ دو گے۔

اور ایک حدیث مبارک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نجر پر سوار ہو کر جا رہے تھے تو نجر بدکا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہاں کچھ قبریں

8۔ مسند احمد: ج 11 ص 183 رقم الحدیث 13381

9۔ مسند احمد: ج 10 ص 496 رقم الحدیث 12491

ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کسی کو معلوم ہے کہ یہ کس کی قبریں ہیں؟ ایک بندے نے عرض کیا: جی ہاں! میں ان جانتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: یہ لوگ کب مرے تھے؟ اس آدمی نے عرض کیا: یہ لوگ زمانہ جاہلیت میں مرے تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان لوگوں کو ان قبروں میں عذاب ہو رہا ہے۔<sup>10</sup>

اب سوال یہ ہے کہ یہ خچر بدکا تھا تو کیا علین و سحین سے گزر رہا تھا یا اسی قبرستان سے گزر رہا تھا؟ (اسی قبرستان سے۔ سامعین) اگر عذاب وہاں ہو رہا تھا تو خچر یہاں سے کیسے بدکا؟ اتنی دور سے خچر نے کیسے سن لیا؟ یہ بات سمجھ میں آرہی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین) معلوم ہوا کہ عذاب اصل تو سحین میں روح کو ہو رہا تھا لیکن روح کے تعلق سے اسی قبر میں پڑے جسم کو بھی ہو رہا تھا جس کو خچر سن کر بدکا تھا۔

### ثواب و عذاب قبر پر اشکال کا جواب:

بعض اشکال ایسے ہوتے ہیں جو بڑے وزنی معلوم ہوتے ہیں، اس لیے ان کو حل کرنا چاہیے۔ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ ہمارے پاس قبرستان میں کتنی قبریں ایسی ہیں کہ وہاں سے ہمارے جانور گزرتے رہتے ہیں لیکن وہ تو کبھی نہیں بدکے۔ اگر اسی قبر میں عذاب ہوتا ہے تو جانور آج کیوں نہیں بدکتے؟

میں جواب کو سمجھانے کے لیے دو مثالیں دیتا ہوں۔

[1]: میں نے کہا: ہمارا گھوڑا جس نے ریل گاڑی کو نہیں دیکھا اور اچانک دیکھے تو بدکتا ہے کہ نہیں؟ (بدکتا ہے۔ سامعین) اور جن کے گھوڑے ریل گاڑی کی پٹری کی ساتھ رہتے ہیں کبھی وہ بھی بدکے ہیں؟ (نہیں۔ سامعین)

[2]: ہم اچانک کبھی ایسی جگہ پر جا کر سوئیں جہاں سے ریل گزرتی ہے تو بتاؤ کہ وہاں نیند آتی ہے؟ (نہیں۔ سامعین) اور جن کے گھر ریل کی پٹری کے ساتھ ہیں ان کی آنکھ ہی نہیں کھلتی۔ میں نے کہا: بھائی! یہ گدھے اور خچر تو روزانہ ان قبرستانوں میں عذاب دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں تو یہ کیسے بدکیں گے؟ کبھی کبھار ہو تو بدکیں، یہ روزانہ دیکھیں تو بدکیں گے کیسے؟

### انسان کی حفاظت کا انتظام:

﴿لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ﴾

اللہ رب العزت اپنی شانِ کبریٰ بیان فرما رہے ہیں۔ فرمایا: ہم نے انسان کے آگے اور پیچھے ایسے فرشتے متعین کر دیے ہیں جو ہر وقت انسان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ خدا کی کتنی شانِ کبریٰ ہے اور ہمیں نظر ہی نہیں آرہی۔

روح المعانی میں علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ آدمی کے دائیں اور بائیں ہر وقت فرشتے متعین ہیں جو گڑھے میں نہیں گرنے دیتے، حادثات نہیں ہونے دیتے اور جب اللہ کسی بندے کو تکلیف دینے کا فیصلہ فرماتے ہیں تو پھر فرشتے ہٹا لیے جاتے ہیں اور بندے پر تکلیف آجاتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس سے بھی عجیب بات فرماتے ہیں کہ فرشتے انسان پر متعین ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں حتیٰ کہ گناہوں سے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اگر یہ گناہ کر بھی لیتا ہے تو پھر کچھ دیر کے لیے نہیں لکھتے تاکہ یہ توبہ کر کے اسے ختم کر لے اور جب یہ توبہ کر کے بھی معاف نہیں کروا تا تو پھر آخر ان کو گناہ لکھنا پڑتا ہے تو لکھ دیتے ہیں۔

حضرت کعب احبار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ رب العزت نے انسان



کی حفاظت کے لیے فرشتے متعین نہ کیے ہوتے تو جنات انسان کا جینا مشکل کر دیتے۔

## حق اور باطل کی مثال:

﴿أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ

زَبَدًا زَابِيًا﴾

اللہ تعالیٰ نے اس میں حق اور باطل کی مثال بیان فرمائی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ حق اور باطل کی مثال ایسی ہے جیسے بارش برستی ہے تو وادیاں بہہ پڑتی ہیں، اس میں ناکارہ چیز یعنی کچرا بھی ہوتا ہے اور اس میں کام کی چیز یعنی پانی بھی ہوتا ہے، کچرا اور جھاگ اوپر ہوتا ہے تو بندہ سمجھتا ہے کہ جھاگ بہت زیادہ ہے لیکن کچھ دیر کے بعد جب پانی تھمتا ہے تو جھاگ ختم ہو جاتی ہے اور پانی جس سے سبزہ اگنا ہوتا ہے وہ نیچے رہ جاتا ہے۔ ایسے ہی باطل کا طوفان آتا ہے تو جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے، پھر حق نیچے سے ابھر آتا ہے۔

## ہدایت ملنے کی دو صورتیں:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ

الْقُلُوبُ﴾

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں اللہ کی ہدایت کا نظام ایسا ہے کہ کبھی بندہ محنت کرتا ہے تو اسے ہدایت مل جاتی ہے اور کبھی بندہ محنت نہیں کرتا بلکہ اللہ اسے ویسے ہی چن لیتے ہیں۔ کبھی نمازیں پڑھ رہا ہے، روزے رکھ رہا ہے تو اللہ مغفرت فرما دیتے ہیں اور کبھی اللہ اس کی مغفرت کا ایسا بہانہ تلاش کرتے ہیں کہ بندے کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ اللہ معافی کا انتظام فرما لیتے ہیں۔

میں اس پر کئی واقعات پیش کر سکتا ہوں لیکن ابھی صرف دو واقعے آپ کی

خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ ایک گزشتہ امت کا اور ایک اس امت کا۔

گزشتہ امت میں بنی اسرائیل کی ایک بدکردار عورت تھی۔ راستے میں ایک کنویں سے اس کا گزر ہوا۔ کنویں کے قریب ایک کتا پانی نہ ملنے کی وجہ سے پیاس سے سسک رہا تھا۔ عورت زانیہ ہے، عورت فاحشہ ہے، عورت بدکردار ہے۔ اس عورت نے دوپٹے کو پھاڑا، اس سے ڈول کی رسی بنا کر کنویں میں اتارا اور اس سے پانی نکال کر اس کتے کو پلایا۔ اس عمل کی وجہ سے اللہ نے اس عورت کی بخشش فرمادی۔<sup>11</sup>

فضائل درود شریف حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ہے۔ میں ان حضرات سے کہتا ہوں جو تبلیغی جماعت سے وابستہ ہیں کہ اس فضائل اعمال کی تعلیم کرائیں جس میں فضائل درود شریف موجود ہے۔ بعض ناثروں نے فضائل درود شریف کو الگ کر دیا ہے اور باقی فضائل اعمال کو اکٹھا چھاپ دیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ فضائل درود شریف ٹھیک تھا تو الگ کیوں کیا ہے؟

میں نے کہا: حضرت شیخ نے لکھا ہے لیکن دکانداروں نے الگ کیا ہے۔ فضائل نماز حضرت شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی، فضائل قرآن حضرت شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی، فضائل رمضان حضرت شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی، فضائل درود بھی حضرت شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے ہی لکھی۔ یہ سارے رسالے حضرت شیخ کے ہیں۔ آپ نے صرف ایک ہی رسالے کو الگ کر دیا اور باقیوں کو اکٹھے کر دیا، یہ کیوں کیا؟

خیر میں جو واقعہ سن رہا تھا وہ فضائل درود شریف میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک خاتون حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت

میں حاضر ہوئی۔ کہنے لگی کہ میری بیٹی کا انتقال ہو گیا ہے اور میری یہ خواہش ہے کہ میں اس کو خواب میں دیکھوں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایسا کرو کہ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد چار رکعت نفل نماز پڑھنا اور ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ کے بعد الھکمہ التکاثر پڑھنا اور اس کے بعد لیٹ جانا۔ سونے تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتی رہنا۔

اس عورت نے یہی کام کیا۔ خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ اس کی بیٹی نہایت سخت عذاب میں مبتلا ہے۔ تار کول کا لباس پہنا ہوا ہے۔ دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ پاؤں میں آگ کی زنجیر ہے۔ وہ عورت صبح اٹھی تو بہت پریشان تھی۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور خواب کا یہ ماجرا انہیں سنایا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بیٹی کی طرف سے صدقہ کرو، شاید اللہ رب العزت تیرے صدقے کی وجہ سے تیری بیٹی کو معاف فرمادے گا۔

اگلے دن حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے خود خواب دیکھا کہ جنت کا ایک حسین باغ ہے جس میں ایک اونچے تخت پر ایک نہایت خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس لڑکی نے حسن بصری سے کہا کیا آپ نے مجھے پہچانا؟ حسن بصری فرمانے لگے کہ میں نے تو تمہیں نہیں پہچانا۔ وہ لڑکی کہنے لگی کہ میں وہی لڑکی ہوں جس کی ماں کو آپ نے درود شریف پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تمہاری ماں میرے پاس آئی تھی اس نے تو بتایا تھا کہ تمہارا حال خراب ہے۔

لڑکی کہنے لگی کہ میری حالت وہی تھی جو میری ماں نے آپ کو بتائی تھی۔ پوچھا کہ تمہاری حالت درست کیسے ہوئی؟ کہنے لگی کہ ہم ستر ہزار آدمی اسی عذاب میں مبتلا تھے کہ ایک نیک صالح بزرگ کا گزر ہمارے قبرستان پر ہوا، انہوں نے ایک دفعہ درود شریف پڑھ کر اس کا ثواب ہم سب کو پہنچا دیا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور وہ درود شریف

ایسا قبول ہوا کہ اللہ نے اس کی برکت سے ہم سب کو اس عذاب سے آزاد کر دیا۔<sup>12</sup>

یہ درود پاک کی فضیلت ہے۔ ایک مرتبہ آپ بھی درود پاک پڑھ لیں:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰی اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰی  
اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مُّجِيْدٌ۔ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ  
عَلٰی اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مُّجِيْدٌ۔

ہم بھی دعا کرتے ہیں یا اللہ جو درود پاک پڑھا ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر  
قیامت تک آنے والے جتنے مسلمان ہیں، اللہ اس کا ثواب ان سب کو عطا فرما۔

**اللہ سے مانگنے میں بخل نہیں کرنا چاہیے:**

ہم مانگنے میں کیوں بخل کرتے ہیں! دینا اللہ نے ہے، ہم نے تھوڑی دینا ہے،  
آپ اللہ کی شان کے مطابق مانگا کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ چھوٹا سا درود ہے اس کا ثواب  
کس کس کو دیں گے؟ یہ ہمارا کام تھوڑی ہے، یہ اللہ کا خزانہ ہے، اللہ کی شان کے مطابق  
مانگا کرو! ہمارے درود کی وجہ سے ہمارا دشمن بھی بخشتا جائے تو ہمیں کوئی تکلیف ہے؟  
(سامعین۔ نہیں) ہمیں خوش ہونا چاہیے۔ ہمیں گالیاں دینے والا بخشتا جائے ہمیں  
خوش ہونا چاہیے، ہماری غیبت کرنے والا بخشتا جائے ہمیں خوش ہونا چاہیے، ہمارے  
راستے میں روڑے اٹکانے والا بخشتا جائے ہمیں خوش ہونا چاہیے۔ کسی کے جہنم میں  
جانے سے ہمارا کیا فائدہ ہے؟ اللہ پاک ہر مسلمان کو جنت کی نعمت عطا فرمائے اور جو  
کفار زندہ ہیں اللہ ان کو ہدایت کی دولت عطا فرمائے۔ (آمین)

**منکرین رسالت کی تردید:**

﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۖ قُلْ كَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَ

بَيِّنْكُمْ ۖ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمٌ انْكِتَبْ ﴿٢٣﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ اتنے دلائل کے باوجود کافر اب بھی کہتے ہیں کہ تو پیغمبر نہیں ہے۔ اے میرے پیغمبر! آپ ان سے زیادہ بحث نہ کریں، بس چھوٹی سی بات ان سے کہہ دیں۔ وہ بات کیا ہے؟ ﴿قُلْ كَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمٌ انْكِتَبْ﴾

آپ فرمادیا کریں کہ میری نبوت پر دو قسم کی دلیلیں ہیں؛ دلائل نقلیہ اور دلائل عقلیہ۔ دلائل عقلیہ معجزات ہیں اور دلائل نقلیہ آسمانی کتابیں ہیں۔ میری نبوت پر یقین نہیں ہے تو بتاؤ! میرے اشارے سے چاند کیسے ٹوٹا تھا؟ میری نبوت پر یقین نہیں ہے تو بتاؤ زہر تم نے کھلایا میں کیسے بچا ہوں؟ تین سو تیرہ کو فتح کیسے ملی ہے؟ یہ میری نبوت پر دلائل ہیں اور اگر پھر بھی تم نہیں مانتے تو جاؤ تورات پڑھ لو، جاؤ انجیل پڑھ لو، جاؤ زبور پڑھ لو، آسمانی کتابوں کے علماء سے پوچھو! تمہیں وہ بتائیں گے کہ میری نبوت برحق ہے یا نہیں؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلائل عقلیہ بھی ہیں اور دلائل نقلیہ بھی ہیں۔ وہ نہیں مانتا جس کے پاس عقل نہیں ہے یا وہ نہیں مانتا جس کے پاس کتاب نہیں ہے۔ اللہ کا کرم ہے کہ اللہ نے مسلمان کو عقل بھی دی ہے اور اللہ نے مسلمان کو آسمانی کتب کا علم بھی دیا ہے۔ اللہ ہم سب کو اس نعمت کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاجِرْ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

## سورة ابراہیم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الَّذِينَ كُتِبَ لَهُمُ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ

بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ﴾

### سورت کا تعارف:

سورة ابراہیم مکی سورة ہے، اس میں سات رکوع اور بانوے آیات ہیں۔ سورة ابراہیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ ہے اور ان کی دعاؤں کا ذکر ہے اس لیے اس مناسبت سے اس سورة کا نام ”ابراہیم“ رکھا گیا ہے۔

مکہ مکرمہ میں زیادہ محنت عقائد پر ہوئی ہے اور مدینہ میں زیادہ تراحم نازل ہوئے ہیں اور عقائد میں سے سب سے اہم پہلا عقیدہ توحید ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی دعوتِ توحید میں گزری ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ توحید کا تذکرہ ہو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر نہ ہو۔ جب سورة میں توحید کے مضامین بکثرت ہوں گے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے بھی ضرور ہوں گے۔

﴿الْمَاءِ﴾... اس سورة کو الف، لام، را سے شروع کیا ہے اور الف، لام، را

حروفِ مقطعات میں سے ہیں۔ مقطعات یہ مقطعات کی جمع ہے، مقطعات یہ قطع سے بنا ہے اور قطع کا معنی ہوتا ”کاٹنا“ چونکہ ان حروف کو کاٹ کاٹ کر پڑھتے ہیں الف... لام...

را... اس وجہ سے ان کو مقطعات کہا گیا ہے۔ ان حروف کا معنی اللہ کی ذات کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اگر اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے سامنے بیان نہیں فرمایا۔ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتایا تو ہمیں بھی حق نہیں ہے کہ ہم اس کی کھود کرید کریں، اس لیے کہتے ہیں کہ الف، لام، را حروف متشابہات میں سے ہیں اور متشابہات جمع ہے متشابہ کی۔ متشابہ یہ اشتباہ سے بنا ہے، اشتباہ کا مطلب کہ جس کا معنی مشتبہ ہو، جس کا معنی معلوم نہ ہو، اس کو متشابہات کہتے ہیں۔

### متشابہات کی اقسام:

متشابہات کی دو قسمیں ہیں:

- 1: جس کا معنی معلوم ہو اور مراد معلوم نہ ہو۔
  - 2: جس کا معنی بھی معلوم نہ ہو اور مراد بھی معلوم نہ ہو۔
- ♦ جس کا معنی معلوم ہو لیکن مراد غیر معلوم ہو جیسے حدیث مبارک میں ہے:

"يَدُ اللَّهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ".<sup>13</sup>

اللہ کا ”ید“ جماعت پر ہے۔

اب ”ید“ کا معنی تو معلوم ہے کہ عربی میں اس کا معنی ہاتھ ہے لیکن یہاں ”ید“ سے مراد کیا ہے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔

♦ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمایا:

﴿وَاصْنَعِ الْفُلَكَ بِأَعْيُنِنَا﴾<sup>14</sup>

”اعین“ جمع ہے عین کی۔ عین کا معنی عربی زبان میں آنکھ ہے لیکن یہاں عین سے مراد کیا ہے یہ اللہ ہی جانتے ہیں۔ اس کو کہتے ہیں کہ معنی معلوم ہو اور مراد غیر معلوم ہو۔

◆ قرآن کریم میں ہے:

﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾<sup>15</sup>

جب قیامت کے دن ساق سے پردہ ہٹا دیا جائے گا۔  
اب ”ساق“ کا معنی پنڈلی یہ تو ہمیں معلوم ہے لیکن جب اللہ کے لیے لفظ ”ساق“ آئے تو اس وقت معنی کیا ہوتا ہے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اسے معلوم المعنی اور غیر معلوم المراد کہتے ہیں۔

بالکل اسی طرح ”الْعَرْشُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی“<sup>16</sup> ہے۔ ”استوی“ کا معنی بھی معلوم ہے۔ ”علی“ کا معنی بھی معلوم ہے اور ”عرش“ کا معنی بھی معلوم ہے لیکن جب یہ اللہ کے لیے کہا جائے تو اس وقت اس کا معنی کیا ہوتا ہے یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اسے معلوم المعنی اور غیر معلوم المراد کہتے ہیں۔

اور متشابہ کی ایک قسم غیر معلوم المعنی غیر معلوم المراد بھی ہے کہ ان کا لغوی معنی بھی معلوم نہیں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی کیا مراد ہے! جیسے ﴿الْاٰلُف... لام... را...﴾ کا معنی اور مراد دونوں معلوم نہیں۔ اس لیے اس کے معنی کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے۔ بعض حضرات کو یہ عادت ہوتی ہے کہ ایسی باریک باتیں پیش کرتے رہتے ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ جی فلاں تو بہت بڑا محقق ہے، دیکھو کیسے کیسے معنی



بیان کیے ہیں! تو جس معنی کے بیان کرنے کی اللہ رب العزت اجازت نہیں دیتے آپ اس کو کیوں بیان کرتے ہیں؟ قرآن کریم میں ہے:

﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ﴾

وہ اللہ ہی ہے جس نے قرآن مجید کو آپ پر نازل کیا ہے، اس میں بعض آیات محکمات ہیں جو کہ ام الکتاب ہیں یعنی اصل اصول یہی آیات ہیں جن کے معانی اور مفہوم میں کسی قسم کا اشتباہ یا التباس نہیں ہوتا، اور بعض آیات متشابہات ہیں۔

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾

جن لوگوں کے دل میں کجی اور ٹیڑھ پن ہے وہ فتنہ پھیلانے کے لیے ان متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کی تاویلات کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾<sup>17</sup>

حالانکہ ان آیات کا صحیح مطلب اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اور جو لوگ راسخ فی العلم ہیں وہ کہتے ہیں ”آمنّا بہ“ کہ ہم ان پر ایمان لے آئے ہیں، یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نصیحت صرف عقلمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔

اس لیے یہاں پر اپنی گردن کو جھکا دینا چاہیے۔ اللہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ

تمہارے علم کی طاقت اتنی ہے کہ تم ایک الف کا معنی نہیں جانتے تو پورے قرآن کا معنی تم کیا سمجھو گے! اپنی اوقات دیکھو الف، لام، را کا معنی تمہیں نہیں آتا اور بحث کبھی میرے نبی سے ہے اور کبھی میرے قرآن سے ہے۔

### کتاب کے نازل کرنے کا مقصد:

﴿كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾

اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف قرآن کو نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف نکالیں۔

”ظلمات“ سے مراد کفر، شرک اور بدعات کے اندھیرے ہیں اور ”نور“ سے مراد توحید کی، سنت کی اور اعمالِ حسنہ کی روشنی ہے۔ آپ یہاں ایک نکتہ سمجھیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کفر اور شرک کے لیے لفظ ”ظلمات“ جمع لائے ہیں اور توحید و سنت کے لیے لفظ ”نور“ مفرد لائے ہیں یہ سمجھانے کے لیے کہ کفر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اس لیے ظلمات کو جمع لائے اور نور کا لفظ مفرد لائے یہ بتانے کے لیے کہ ایمان ایک ہی ہوتا ہے، بدعات کی کئی قسمیں ہوتی ہیں لیکن سنت کی قسمیں نہیں ہوتیں سنت ہر علاقہ میں ایک ہی ہوتی ہے۔ مثلاً سونے کا جو سنت طریقہ ہے وہی سرگودھا پاکستان میں ہے، وہی سونے کا طریقہ امریکہ میں ہے، وہی سعودی عرب میں ہے جبکہ بدعات کی کئی قسمیں ہیں، ہر علاقہ کی بدعت الگ ہوتی ہے۔

### سنت اور بدعت کی مثال:

گندم کی بھی فصل ہوتی ہے اور چاول کی بھی فصل ہوتی ہے، ہم گندم بھی کاشت کرتے ہیں اور چاول بھی کاشت کرتے ہیں، ان فصلوں کے ساتھ ساتھ جڑی بوٹیاں بھی ہوتی ہیں جو گندم اور چاول کی فصل کو خراب کرتی ہیں، اب کھیت میں جڑی بوٹیوں کی تو کئی قسمیں ہوتی ہیں لیکن گندم اور چاول کی کئی قسمیں نہیں ہوتیں، تو

بدعات کی کئی قسمیں ہوتی ہیں لیکن سنت کی کئی قسمیں نہیں ہوتیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ کفر اور شرک کو ختم کرنے کے لیے توحید اور سنت کی روشنی کو لانا ہوگا، اسی طرح بدعات کو ختم کرنے کے لیے سنت کی پیروی کرنی ہوگی۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے بہت بڑے خلیفہ ہیں مولانا عبد الغنی پھولپوری رحمہ اللہ، ایک شخص ان کا مرید ہوا جو پہلے بدعتی تھا۔ ہمارے ہاں بیعت کو خشک طبقہ قبول نہیں کرتا، وہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ بدعتیوں کا کام ہے حالانکہ بیعت لینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور بیعت کرنا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ ہے تو جو کام اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو تو وہ بدعت کیسے ہو سکتا ہے؟

کبھی بیعت علی الایمان ہوتی کہ کوئی کافر کلمہ پڑھتا اور مسلمان ہو جاتا، کبھی بیعت علی ارکان الاسلام ہوتی کہ بندہ مؤمن ہے تو وہ بیعت کرتا کہ میں ارکان کی پابندی کروں گا، کبھی بیعت علی الموت ہوتی کہ ایک مسلمان ہے وہ اس بات پر بیعت کرے کہ میں مر تو سکتا ہوں لیکن حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ ان تینوں قسموں کی بیعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہوتی تھی اور ان تینوں قسموں کی بیعت آج بھی ہے۔

حضرت مولانا عبد الغنی پھولپوری رحمہ اللہ سے اس بدعتی نے بیعت ہونے کے بعد پوچھا: حضرت! کیا میں درود تاج اور درود ماہی پڑھ سکتا ہوں؟ تو حضرت فرمانے لگے: بھائی! ایک درود وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا ہے اور ایک درود وہ ہے جو مولویوں نے بنایا ہے، آپ بتاؤ! کون سا درود بہتر ہے؟ اس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والا۔ فرمایا: ”اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ“ والا درود یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور یہ جو درود ہیں یہ بعد کے مولویوں کے ہیں، تجھے جس

سے زیادہ پیار ہے تو وہ پڑھ لیا کر۔ تو اس کو بات سمجھ آگئی۔

## نبی کی وحی اپنی قوم کی زبان میں ہوتی ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۖ﴾

اللہ رب العزت نے یہاں ایک ضابطہ بیان فرمایا کہ ہم نے جب بھی کوئی نبی بھیجا ہے تو اس پیغمبر کو وہی زبان دے کر بھیجا ہے جو زبان اس کی قوم کی تھی۔

اللہ نے یہ نہیں فرمایا ”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ أُمَّتِهِ“ کہ ہم نبی کو اس کی امت کی زبان دے کر بھیجتے ہیں بلکہ فرمایا: ﴿إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ﴾ کہ ہم نبی کو اس کی قوم کی زبان دے کر بھیجتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتے کہ ہم نبی کو اس امت کی زبان دے کر بھیجتے ہیں تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عربی میں بھی بات کرتے، اردو، انگلش اور فارسی میں بھی بات کرتے، اللہ نے ”أُمَّتِهِ“ کے بجائے ”قَوْمِهِ“ فرمایا ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قریش تھی اور ان کی زبان عربی تھی، اس لیے اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عربی زبان دے کر بھیجا ہے۔

## نبی سارے جہاں کے ہیں تو ایک زبان میں وحی کیوں؟

اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سارے جہاں کے نبی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قوم کی زبان دے کر کیوں بھیجا گیا ہے؟ اس کی کئی وجوہات ہیں:

[۱]: پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قوم عرب میں اگرچہ بڑے بڑے گناہ تھے لیکن ان میں بعض صفات ایسی تھیں جس میں وہ لوگ بے مثال اور کیتا تھے۔ وہ صفات کسی اور قوم میں نہیں تھیں۔ مثلاً سخاوت اس قوم کا مزاج تھا، یہ لوگ بڑے سخی تھے اور شجاعت اس قوم کا مزاج تھا، یہ بڑے ہی بہادر لوگ تھے اور وفان لوگوں کا مزاج تھا اور شاید

کہ ان جیسی وفاباتی قوموں میں ہو! اور مہمان نوازی ان لوگوں کا مزاج تھا، جنگ کرنا ان لوگوں کا مزاج تھا... تو یہ اوصاف ایسے تھے جو دین کی اشاعت کے لیے کافی تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عربی زبان دے کر بھیجا تا کہ دین کی اشاعت ہو۔

یہ بات واضح ہے کہ دین کی اشاعت کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ پیسا اشاعت دین کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ پیسا ہو گا تو دین کی اشاعت ہوگی۔ عرب قوم میں سخاوت تھی، جب ان میں نبی آیا اور اس نے ان کو زکوٰۃ دینے کا کہا تو ان لوگوں نے اپنا پیسا بہا دیا۔ ان لوگوں میں شجاعت تھی کہ یہ لوگ بڑے بہادر تھے۔ جب ان کو جہاد کرنے کا حکم دیا گیا تو بڑی دلیری کے ساتھ انہوں نے جہاد کیا۔ ان لوگوں نے اپنے گھر کو چھوڑا، اپنے وطن کو چھوڑا اور جہاد کرنے کے لیے نکل پڑے۔

یہ اوصاف ان لوگوں میں تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال دیکھیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ان اوصاف کو نہیں بدلا بلکہ ان کے اوصاف کا رخ بدلا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت ہی غصے والے آدمی تھے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس غصے کو بزدلی میں نہیں بدلا بلکہ غصے کا رخ بدلا ہے، غصہ کا ازالہ نہیں کیا بلکہ امالہ کیا اور فرمایا: اے عمر! کافروں کو مارنا ہے، اپنوں کو نہیں مارنا! تو بعض اوصاف اللہ نے عربوں کو ایسے دیے ہیں جو کسی اور میں نہیں ہیں۔

[۲]: اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آسمان کی دفتری زبان عربی ہے۔ ملائکہ کی زبان عربی ہے، جنت اور جہنم والوں کی زبان عربی ہے اور مرنے کے بعد قبر میں بھی عربی زبان ہے چاہے کوئی انگریز ہو، پختون ہو، پنجابی ہو کسی بھی زبان والا ہو تو فرشتے نے پوچھنا ہے: ”مَنْ رَبُّكَ“ اس وجہ سے اللہ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عربی زبان دی ہے۔

[۳]: اور تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ

علیہ السلام تک جتنے انبیاء علیہم السلام ہیں وہ دائرہ نبوت ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مرکزِ دائرہ نبوت ہیں اور جو مرکز ہوتا ہے وہ بالکل درمیان میں ہوتا ہے۔ مکہ مکرمہ کو دیکھا جائے تو وہ زمین کے درمیان میں ہے، اسی وجہ سے اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین کے درمیان میں بھیجا ہے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ نبی ہم سے دور ہیں اور فلاں سے قریب ہیں بلکہ اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین کے مرکز میں بھیج کر سب کو راضی کر دیا اور مرکزِ زمین والوں کی زبان عربی تھی، اس لیے قرآن بھی عربی زبان میں دیا اور اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زبان بھی عربی دی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”أَجِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ“ کہ تین وجوہات کی بنا پر عرب کے ساتھ پیار کیا کرو؛ ”لِأَنَّ عَرَبِيٌّ“ کیونکہ میں عربی ہوں، ”وَالْقُرْآنُ عَرَبِيٌّ“ اور قرآن بھی عربی ہے ”وَكَلَامُ أَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ“ اور اہل جنت کی زبان بھی عربی ہو گی۔<sup>18</sup>

اسی لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید کے لیے ایک زبان کا انتخاب فرمایا ہے اور باقی زبانوں کے ترجمے کا انتظام فرما دیا ہے۔ اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اقوامِ عالم کا نبی بنایا ہے۔ اگر قرآن ہر قوم کی زبان میں ہوتا تو قرآن کو محفوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہو جاتا، اس وجہ سے اللہ نے ایک زبان کا انتخاب کیا ہے اور وہ عربی زبان ہے۔

[۴]: اور چوتھی وجہ قرآن کو عربی زبان میں نازل کرنے کی یہ ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پوری کائنات کے نبی ہیں اور قرآن کو ایسی زبان میں ہونا چاہیے تھا

جس میں جامعیت ہو۔ اور یہ جامعیت باقی تمام زبانوں میں نہیں بلکہ عربی زبان میں تھی۔ اس وجہ سے قرآن مجید کو عربی زبان میں نازل کیا ہے۔

### حضور علیہ السلام پوری کائنات کے نبی ہیں:

اور آگے اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَىٰ

النُّورِ﴾

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی دلائل دے کر بھیجا تا کہ وہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف نکالیں۔

یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فرمایا گیا ہے ﴿يُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَىٰ النُّورِ﴾ کہ آپ لوگوں کو نکالیں ظلمات سے نور کی طرف اور موسیٰ علیہ السلام کے لیے فرمایا گیا ہے ﴿أَنْ أَخْرِجَ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَىٰ النُّورِ﴾ کہ آپ اپنی قوم کو نکالیں ظلمات سے نور کی طرف۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری کائنات کے نبی ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پورے لوگوں کے نبی نہیں بلکہ ایک قوم کے نبی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نبی القوم ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی الناس ہیں۔

### احمد سعید ملتانی کے اعتراض کا جواب:

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنْجَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ وَيَدْعُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَ يُسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَ فِي ذِكْرِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ﴾

اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ بات کہی تھی

کہ اس نعمت کو یاد کرو جو اللہ نے تم پر کی ہے، وہ نعمت یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں فرعون کے لوگوں سے نجات دی ہے، وہ لوگ تمہیں تکلیف دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے، اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارا بڑا امتحان تھا۔

ہم واقعات کی تفصیل میں نہیں جاتے، ہم عقائد پر بات کرتے ہیں، نظریات پر بات کرتے ہیں کہ انسان کا نظریہ ٹھیک ہونا چاہیے۔ ہمارے پاکستان کا ایک آدمی تھا جس نے کتاب لکھی ”قرآن مقدس اور بخاری محدث“ اس کتاب میں اس نے بخاری شریف کی ایسی باون حدیثیں پیش کی ہیں جو اس کے ذہن کے مطابق قرآن کے خلاف ہیں۔ کہتا ہے کہ فلاں حدیث صحیح نہیں ہے، فلاں حدیث صحیح نہیں ہے، کیوں صحیح نہیں؟ اس لیے کہ قرآن کے خلاف ہے۔ اس کا نام ہے احمد سعید ملتانی، اس نے یہ کتاب لکھی۔ یہ خود تو اب فوت ہو گیا ہے لیکن اس کی کتاب موجود ہے۔ اس کتاب میں اس نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نکاح کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنً وَثُلَّةً وَرُبْعً﴾<sup>19</sup>

کہ ”نساء“ کے ساتھ نکاح کرو، دو کے ساتھ یا تین یا چار کے ساتھ۔

تو اللہ نے لفظ ”نساء“ بولا ہے۔ احمد سعید کہتا ہے کہ ”نساء“ کا لفظ عاقلہ بالغہ پر بولا جاتا ہے اور امام بخاری نے حدیث ذکر کی ہے کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امی عائشہ کے ساتھ نکاح ہوا تو اس وقت امی عائشہ کی عمر 6 سال تھی اور رخصتی کے وقت ان کی عمر 9 سال تھی۔ کہتا ہے کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے کیوں کہ قرآن



کہتا ہے کہ نساء سے نکاح کرو اور نساء بالغہ عورت کو کہتے ہیں جبکہ حدیث میں اس کے برعکس ہے، کیونکہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر چھ سال تھی تو چھ سالہ بچی ہوتی ہے عورت نہیں ہوتی! اب اگر ہم اس حدیث کو صحیح مانیں تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے خلاف کام کیا ہے اور اگر قرآن کو صحیح مانیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے جھوٹ بولا ہے۔ تو اس نے یہ اعتراض کیا ہے بخاری شریف پر۔

ہمارے ہاں مزاج یہ ہے کہ جو آدمی اٹھے اور اکابر کی تحقیقات پر پانی پھیر دے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ بہت بڑا آدمی ہے۔ میں نے کہا: اگر یہی بات ہے تو سب سے بڑا آدمی تو پھر ابلیس کو کہنا چاہیے کیوں کہ وہ خدا کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا جب اللہ نے حکم دیا تھا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو! تو ابلیس نے تکبر کی وجہ سے انکار کر کے اپنے اعلیٰ ہونے پر دلیل دی کہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، آگ اوپر ہوتی ہے اور مٹی نیچے ہوتی ہے، لہذا افضل؛ مفضل کو سجدہ نہیں کرتا۔ تو پھر ابلیس کو بھی ”علامہ“ کہنا چاہیے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے جواب دیا ”فَاخْرِجْ“ دفع ہو جا! تو ہم سے بحث کرتا ہے!

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”بدائع الفوائد“ میں مٹی کے آگ سے افضل ہونے پر سترہ دلائل پیش کیے ہیں۔<sup>20</sup> تو اللہ کو ان دلائل کا علم نہیں تھا؟ بالکل تھا لیکن اللہ نے اسے جواب نہیں دیا بلکہ فرمایا: نکل جا!

تو میں سمجھا رہا تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں بہت بڑا آدمی ہے، فلاں بڑا علامہ ہے، کیوں؟ اس لیے کہ اس نے فلاں کے خلاف لکھا ہے، فلاں کے خلاف لکھا

ہے حالانکہ یہ بڑے پن کی نشانی نہیں ہے، یہ چھوٹے پن کی نشانی ہے، اکابرین کے خلاف لکھنے سے آدمی بڑا نہیں بنتا۔

میں احمد سعید کا جواب دینے لگا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اذْكُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنجَاكُمْ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ﴾

وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ اللہ کی نعمت کو یاد رکھو جب اللہ نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دی، وہ تمہیں تکلیف دیتے تھے، تمہارے بچوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بچیوں کو زندہ رکھتے تھے۔

اللہ نے بچوں کے لیے ”ابناء“ کا لفظ بولا ہے اور ابناء کے مقابلے میں بچیوں کے لیے ”نساء“ کا لفظ بولا ہے۔ جس طرح ابناء سے مراد بچے ہیں اسی طرح نساء سے مراد بچیاں ہیں۔ میں نے کہا کہ بخاری شریف کی روایت قرآن کے خلاف تب ثابت ہوگی جب نساء کا معنی صرف بالغ عورت ہو اور لیکن قرآن نابالغ کو بھی نساء کہہ رہا ہے تو پھر بخاری کی یہ حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہے۔

اب امام بخاری رحمہ اللہ نے بات غلط کی یا ان علامہ صاحب نے بات غلط کی ہے؟ ان علامہ صاحب نے بات غلط کی ہے۔ ہم نے تو دلیل سے بات کی ہے، ہم نے اس پر فتویٰ نہیں لگایا۔ اب تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ لوگ اس جواب دینے کو بھی سختی کہتے ہیں، ہمیں یہ بات سمجھ نہیں آتی۔ بھائی! میں مسئلہ سمجھا رہا ہوں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے درست بات کی ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے غلطی نہیں کی، جو اعتراض کرتا ہے اس کو تو جواب دینا چاہیے۔ اب جواب دینا کون سی سختی ہے؟

فضائل اعمال پر اعتراض کیا گیا تو ہم نے اس کا جواب دیا۔ میں آپ سے یہ

پوچھنا چاہتا ہوں کہ بتاؤ! اعتراض کرنا جرم ہے یا اس کا جواب دینا جرم ہے؟ اعتراض کرنا جرم ہے لیکن جواب دینا جرم نہیں ہے۔ جو شخص اکابر پر اعتراض کرے آپ اس کو فرقہ واریت نہیں کہتے اور جو اکابر کا دفاع کرے آپ اس کو فرقہ واریت کہتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے! لیکن ہم اس کی پروا نہیں کرتے، ہم اپنے اکابر کا دفاع کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے ان شاء اللہ۔

### گزشتہ اقوام کے دو اعتراض اور انبیاء کے جواب:

﴿جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ۚ قَالَتْ رُسُلُهُم أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يُدْعُوكُمْ لِيُغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُخَوِّجَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ قَالُوا إِنَّ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ۝﴾

پہلی قوموں کے پاس جب ان کے رسول واضح دلائل لے کر آئے اور انہوں نے اپنی قوم کو دعوت دی تو قوم نے دو اعتراضات کیے:

[1]: پہلا اعتراض انبیاء علیہم السلام کی توحید اور ایمان کی دعوت پر تھا۔ قوم کے لوگوں نے کہا: ﴿إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ﴾ کہ جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو یعنی توحید پر یقین رکھنے اور ایمان لانے کی طرف تو ہم اس کے منکر ہیں اور ہمیں تمہاری اس دعوت میں شک ہے۔

[2]: اور دوسرا اعتراض ان کا یہ تھا: ﴿إِنَّ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ کہ تم ہماری طرح بشر ہو۔

قوم نے یہ اعتراضات کیے تو انبیاء علیہم السلام نے ان کے جوابات دیے۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ دیا کہ ﴿أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَأَطِرِ السَّنُوتِ وَالْأَذْهِ﴾ کہ کیا تم لوگوں کو اللہ کے بارے میں شک ہے؟ اس کی توحید میں شک ہے؟ حالانکہ اللہ کی ذات تو وہ ذات ہے کہ جس نے آسمان وزمین کو بنایا ہے۔ تو آسمان وزمین کو بنانا خود اللہ کی وحدانیت کی دلیل ہے! لہذا جب آسمان وزمین کی تخلیق جیسی عظیم دلیل موجود ہے تو تمہارا شک کرنا نہایت تعجب کی بات ہے!

اور جب انہوں نے دوسرا اعتراض کیا کہ نبی ہماری طرح بشر نہیں ہو سکتا تو انبیاء علیہم السلام نے ان کو جواب میں فرمایا: ﴿إِن نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾ کہ تمہاری یہ بات ٹھیک ہے کہ آپ بھی بشر ہیں اور ہم بھی بشر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس پر چاہتے ہیں اپنا خصوصی احسان کرتے ہیں۔ تو اللہ نے ہم پر بھی احسان کیا کہ ہمیں نبی بنایا۔ بشریت؛ نبوت کے منافی نہیں ہے۔

### انبیاء کا بشر ہونا ہمارے لیے اعزاز ہے:

ایک اعتراض اس وقت تھا اور ایک اعتراض آج کے اس دور میں کیا جاتا ہے۔ اُن لوگوں نے اعتراض یہ تھا کہ نبوت اور بشریت اکٹھی نہیں ہو سکتیں اور آج کے بعض لوگوں نے بھی یہی کہا ہے کہ نبوت اور بشریت اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ بس دونوں میں فرق اتنا ہے کہ انہوں نے بشر مانا لیکن نبی نہیں مانا اور انہوں نے نبی تو مانا لیکن بشر نہیں مانا، انہوں نے نبی کو دیکھا تھا اور انہوں نے نبی کو دیکھا نہیں ہے۔

اور ہم اہل السنۃ والجماعۃ نبی بھی مانتے ہیں اور بشر بھی مانتے ہیں، نبی ہوتا ہی بشر ہے اور جو بشر نہ ہو وہ نبی کیسے بن سکتا ہے؟ یہ تو ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ اللہ نے نبی کا انتخاب انسانوں میں سے کیا ہے۔ اللہ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ﴾<sup>21</sup>

اللہ نے مومنین پر احسان کیا ہے کہ انہی میں سے نبی کو پیدا فرمایا ہے۔ یہ ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ نبی ہم میں سے ہے، اور کتنی کم عقلی کی بات ہے جو اپنے اعزاز کو چھوڑتا ہے۔ ہم نبی کو بشر بھی مانتے ہیں اور نور بھی مانتے ہیں اور اہل بدعت نبی کو بشر نہیں مانتے بلکہ نور مانتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب عرش پر گئے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے جانے والا کون ہے؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام جو نوریوں کا سردار ہے، نوریوں کا سردار خادم ہے اور بشر کا سردار کا مخدوم ہے اور مخدوم خادم سے اعلیٰ ہوتا ہے۔

**شیطان کا اظہارِ براءت کرنا:**

﴿وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَن دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنفُسَكُمْ﴾

جب ہر بات کا فیصلہ ہو جائے گا یعنی قیامت والے دن جب جنتی جنت میں چلے جائیں گے اور جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے تو اس وقت شیطان ان لوگوں سے کہے گا جو شیطان کی بات مانتے تھے، شیطان کہے گا کہ اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا تو اللہ نے اپنے اس وعدے کو پورا کر دیا۔ میرا تمہارے اوپر کوئی جبر نہیں تھا، صرف اتنی بات تھی کہ میں نے تمہیں دعوت دی تھی اور تم نے میری دعوت کو قبول کر لیا تھا، اس لیے تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو!

## کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی مثالیں:

﴿الَمْ تَرَ كَيْفَ صَرَّبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (٢٢) تُؤْتِي أُكْلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا ۖ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (٢٣) وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (٢٤)﴾

یہاں اللہ تعالیٰ نے مثالیں دے کر بات سمجھائی ہے۔ ایک مثال کلمہ طیبہ کی ہے اور ایک مثال کلمہ خبیثہ کی ہے۔ کلمہ طیبہ سے مراد کلمہ ایمان اور توحید ہے۔ کلمہ خبیثہ سے مراد کفر اور شرک کا کلمہ ہے۔ فرمایا: کلمہ طیبہ اس پاک درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور اس کی شاخیں آسمان کی طرف بلند ہوں اور کلمہ خبیثہ اس درخت کی طرح ہے جو زمین کے اوپر سے ہی اکھاڑ لیا جاتا ہے، اس درخت کو زمین میں کوئی استحکام اور جماؤ نہیں ہوتا یعنی اسے اکھاڑیں تو فوراً اکھڑ آتا ہے۔

وہ درخت جس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں، مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کھجور کا درخت ہے اور وہ درخت جس کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں اس سے مراد حنظل ہے جو ہلکے سے جھٹکے سے اکھڑ آتا ہے۔ اسی طرح جس نے کلمہ کفر کہا تو وہ ہلکے سے جھٹکے سے ختم ہو جائے گا جس نے کلمہ ایمان کہا تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں بھی ثابت قدم رکھیں گے اور آخرت میں بھی ثابت قدم رکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

﴿يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْآخِرَةِ﴾<sup>22</sup> کہ کلمہ تم پڑھو، میں تمہیں دنیا میں بھی ثابت قدم رکھوں گا اور موت

کے بعد بھی ثابت قدم رکھوں گا۔

### عذاب قبر کا ثبوت:

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ دس آیات قرآنی اور ستر کے قریب احادیث سے ثابت ہے کہ جس قبر میں میت کو دفن کیا جاتا ہے اس ہی قبر میں اگر میت نیک ہو تو اس کو ثواب ملتا ہے اور اگر میت گناہ گار ہو تو اس کو عذاب ہوتا ہے اس میت کی روح کو اس کی طرف لوٹا کر۔ اس پر محدثین نے کئی احادیث لکھی ہیں، میں آپ کے سامنے ایک حدیث بیان کرتا ہوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب بندے کو قبر میں اتارا جاتا ہے، ملائکہ آتے ہیں، اسے بٹھاتے ہیں، پھر تین سوال کرتے ہیں: ”مَنْ رَبُّكَ؟ وَمَا دِينُكَ؟ وَمَنْ نَبِيُّكَ؟“ بندہ ان تین سوالوں کا جواب دے دیتا ہے تو ایک فرشتہ آسمان سے اعلان کرتا ہے کہ اللہ فرما رہے ہیں: ”أَنَّ قَدْ صَدَقَ عَبْدِي“ کہ میرے بندے نے سوالوں کا صحیح جواب دیا ہے، ”فَأَفْرِشُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ“ اس کو جنت کا بچھونا دو! ”وَالْبِسُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ“ اس کو جنت کا لباس دے دو! ”وافتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى الْجَنَّةِ“ جنت کی طرف سے دروازہ کھول دو! ”فَيَأْتِيهِ مِنْ رَوْحِهَا وَطِيْبِهَا“ جنت کی ہوائیں اور جنت کی خوشبو اس قبر میں پہنچ جاتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ”فَذَلِكَ قَوْلُ اللَّهِ تَعَالَى ﴿يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِأَقْوَالِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾ کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ”يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِأَقْوَالِ الثَّابِتِ“ کا یہی مطلب ہے۔<sup>23</sup>

اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ہمارے جو عزیز، رشتہ دار اس دنیا سے جا چکے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی قبروں میں وسعتیں عطا فرمائے، اللہ ان کی قبر کی تنگیاں ختم فرمائے۔ (آمین)

**تشہد میں ﴿رَبِّ اجْعَلْنِي﴾ پڑھنے پر اعتراض کا جواب:**

﴿رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ﴾

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ﴿٢٠﴾

یہاں اس سورت کے آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کئی دعائیں ذکر کی گئی ہیں۔ میں صرف ایک دعا پڑھتا ہوں جو میں نے مسئلہ سمجھا ہے۔ جب ہم تشہد میں بیٹھے ہیں تو یہ دعا پڑھتے ہیں: ﴿رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ﴿٢٠﴾

ہمارا مسلک یہ ہے کہ امام کے پیچھے ہم قرأت نہیں کرتے اور امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے پر لوگ ہم پر بہت سارے اعتراضات کرتے ہیں، ان اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ بھی کرتے ہیں کہ تم تو کہتے ہو کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیے اور خود امام کے پیچھے تشہد میں جو دعا پڑھتے ہو ﴿رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ﴾ یہ بھی تو قرآن ہے۔ تو تم امام کے پیچھے یہ قرآن کیوں پڑھتے ہو؟

ہم ان کو جواب دیتے ہیں کہ تشہد میں یہ ضروری نہیں کہ ﴿رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ﴾ ہی پڑھیں، اس کے علاوہ بھی آپ اور دعائیں بھی پڑھ سکتے ہیں، اس میں آپ کو اختیار ہے اور ہم جو تشہد میں امام کے پیچھے ﴿رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ﴾ پڑھتے ہیں تو یہ بطور قرأت نہیں بلکہ بطور دعا کے پڑھتے ہیں، قرأت سمجھ



کر پڑھیں تو حکم اور ہے اور دعا سمجھ کر پڑھیں تو حکم اور ہے، اور قرآن تو نماز میں قیام کی حالت میں پڑھتے ہیں قعود کی حالت میں نہیں پڑھتے، قعود کی حالت میں دعائیں پڑھی جاتی ہیں قرآن نہیں اور جو ہم نے دعا پڑھی ہے قعود میں تو اگرچہ یہ قرآن میں ہے لیکن ہم قرآن سمجھ کر نہیں بلکہ دعا سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ میں اس کی مثال دیتا ہوں۔ قرآن میں ”فرعون“ کا لفظ ہے، اگر اس کو قرآن سمجھ کر پڑھو تو 50 نیکیاں ملتی ہیں اور اگر اس کو قرآن سمجھ کر نہ پڑھو تو کوئی نیکی نہیں۔

اسی طرح نماز جنازہ میں پہلی تکبیر کے بعد ثناء پڑھی جاتی ہے اور دوسری تکبیر کے بعد درود شریف پڑھا جاتا ہے اور تیسری تکبیر کے بعد دعا پڑھی جاتی ہے اور چوتھی تکبیر کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے۔ بعض لوگ پہلی تکبیر کے بعد سورۃ فاتحہ پڑھتے ہیں، اگر ان سے پوچھا جائے کہ تم سورۃ فاتحہ کیوں پڑھتے ہو؟ تو وہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے پڑھی ہے اس لیے ہم پڑھتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کو بطور دعا پڑھنا تو ٹھیک ہے لیکن بطور قرأت پڑھنا جائز نہیں ہے اور ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ جس کو نماز جنازہ کی دعا نہیں آتی وہ ”زَبْنًا غُفْلًا“ پڑھ لے یا اور کوئی دعا پڑھ لے، اور سورۃ فاتحہ دعا ہے یا نہیں؟ (دعا ہے۔ سامعین) اگر کوئی بندہ سورۃ فاتحہ کو قرآن سمجھ کر نہیں بلکہ دعا سمجھ کر پڑھتا ہے تو اب حکم اور ہے اور اگر قرآن سمجھ کر پڑھے تو حکم اور ہے! دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اس کو بطور دعا پڑھیں تو حکم اور ہے اور اگر اس کو بطور قرآن پڑھیں تو حکم اور ہے۔

**جنازے پر سورۃ فاتحہ کو واجب کہنے والوں سے سوالات:**

جو لوگ جنازے پر سورۃ فاتحہ پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں:

"لَا صَلَوةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ".<sup>24</sup>

کہ جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی، اور نماز جنازہ بھی نماز ہے اس لیے یہ بھی بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی۔

جب وہ یہ دلیل دیتے ہیں تو آپ نے ان سے کہنا ہے کہ اگر یہی بات ہے کہ نماز جنازہ بھی نماز ہے تو نماز تو رکوع کے بغیر بھی نہیں ہوتی، نماز جنازہ بھی نماز ہے تو نماز تو سجدہ کے بغیر بھی نہیں ہوتی، نماز جنازہ بھی نماز ہے تو نماز تو تشہد کے بغیر بھی نہیں ہوتی۔ تو اس میں رکوع، سجدہ بھی کرو! تشہد بھی کرو! یہ تم کیوں نہیں کرتے؟

اگر وہ کہیں کہ اس نماز سے مراد اور نماز ہے تو آپ نے کہنا ہے کہ اُس نماز سے مراد بھی اور نماز ہے۔ اگر تم سورۃ فاتحہ کو قرأت سمجھ کر پڑھتے ہو تو اس میں رکوع اور سجدہ بھی کرو! اگر وہ کہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۃ فاتحہ کیوں پڑھی؟ تو آپ نے کہنا ہے کہ اگر سورۃ فاتحہ فرض ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہیں پڑھی اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے کیوں نہ پڑھی؟ اگر سورۃ فاتحہ پڑھنی فرض ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی صحابہ پڑھتے۔

خیر میں بتا رہا تھا کہ اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی تو پھر تشہد میں ﴿رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ﴾ کیوں پڑھتے ہو؟ تو آپ نے کہنا ہے کہ ہم قرأت سمجھ کر نہیں پڑھتے بلکہ دعا سمجھ کر پڑھتے ہیں۔

اللہ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)  
وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الحجر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الَّذِي تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٍ مُبِينٍ ﴿١﴾﴾

تمہیدی باتیں:

سورة الحجر کی سورت ہے۔ اس میں چھ رکوع اور ننانوے آیات ہیں۔ اس سورت کو سورة الحجر اس لیے کہتے ہیں کہ اس سورت میں اللہ رب العزت نے اصحاب الحجر کا ذکر کیا ہے۔ ”حجر“ ایک وادی کا نام ہے جو حجاز اور شام کے درمیان واقع ہے۔ اس میں قوم ثمود آباد تھی۔ قوم ثمود کی طرف اللہ رب العزت نے حضرت صالح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا۔ ان کا تذکرہ آگے آئے گا۔ چونکہ اس سورت میں خاص اس جگہ کا تذکرہ کیا گیا ہے اس لیے اسی مناسبت سے اس سورت کا نام سورة الحجر رکھا گیا ہے۔

قرآن؛ کامل و واضح کتاب:

﴿الَّذِي تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٍ مُبِينٍ ﴿١﴾﴾

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قرآن مجید کے لیے دو لفظ ارشاد فرمائے ہیں:

1: کتاب 2: قرآن مبین

”الکتاب“ سے مراد یہ ہے کہ قرآن ایسی کتاب ہے کہ جو کامل اور مکمل ہے

اور ساتھ ہی فرمایا ”قرآن مبین“ کہ یہ مکمل بھی ہے اور واضح بھی ہے۔ اس کتاب کے بعد مزید کسی آسمانی کتاب کی ضرورت بھی نہیں اور وضاحت اتنی مضبوط ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت بھی نہیں۔

قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ دنیا کے نصابوں سے بالکل مختلف ہے۔ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ جو وقت آپ نے اس کو دینا ہے اسی وقت میں قرآن یاد بھی ہو جاتا ہے اور تھوڑے سے وقت میں قرآن سمجھ میں بھی آ جاتا ہے۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ قرآن کامل اور مکمل کتاب بھی ہے اور واضح بھی، اس کے بعد مزید کسی آسمانی کتاب کی ضرورت نہیں رہتی۔

**کفار کی حسرت کہ کاش ہم مسلمان ہوتے!**

﴿رَبِّمَا يَوْذُ الَّذِينَ كَفَرُوا تَوَكَّأُوا مُسْلِمِينَ﴾

دنیا میں بسا اوقات جہالت علمی کی وجہ سے مسلمان کافروں کو دیکھ کر رشک کرتا ہے کہ اے کاش! ہم بھی ان جیسے ہوتے۔ لیکن یہ دنیا بہت عارضی ہے، موت اور حشر کے بعد جب مسلمان کو جنت میں مقامات ملیں گے اور کافر کو جہنم میں عذاب ملے گا اور ہر آئے دن اس کے کسی خاص کفر کی وجہ سے عذاب میں ترقی ہوگی تو پھر ہر موقع پر کافر یہ تمنا کرے گا ﴿تَوَكَّأُوا مُسْلِمِينَ﴾ کہ اے کاش! ہم بھی مسلمان ہوتے۔

**مسلمان؛ کافر سے بہتر ہے:**

عجیب بات ہے کہ معاملہ تو انجام پر ہے، معاملہ تو دار الجزاء پر ہے، معاملہ تو نتائج پر ہے، آج تک کسی آیت میں، کسی حدیث مبارک میں ہم نے نہیں پڑھا اور نہ کسی سے آپ نے سنا ہو گا کہ موت کے بعد کسی انسان کی تمنا ہو کہ کاش کہ میں کافر ہوتا لیکن ہر کافر کی تمنا ہوگی کہ کاش میں مسلمان ہوتا! تو آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ

مسلمان جتنا بھی نالائق ہو بہر حال مسلمان ہے اور کافر جتنا بھی اچھا ہو بہر حال وہ کافر ہے۔ مسلمان گندے سے گندا ہو لیکن اچھے سے اچھے کافر سے پھر بھی اچھا ہے۔ اس لیے کافر جتنا بھی اچھا ہو وہ کافر ہی ہے اور مسلمان بظاہر جتنا بھی گندا ہو بہر حال وہ مسلمان ہی ہے۔ اللہ ہمیں اس نعمت کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ہم چونکہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوئے ہیں، اسلام کی ہمیں محنت کرنی نہیں پڑی، بغیر محنت کے ہمیں کلمہ اور ایمان ملا ہے اس لیے عموماً آج ہمیں اس کلمہ کی قدر نہیں ہے، اس کلمہ کے الفاظ کی قدر اس وقت ہوگی کہ جب قبر میں منکر نکیر پوچھیں گے: "مَنْ رَبُّكَ؟ مَنْ نَبِيُّكَ؟ مِمَّا دِيْنُكَ؟" کہ بتا تیرا رب کون ہے؟ تیرا نبی کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟ اس وقت احساس ہو گا کہ اس کلمہ کی اہمیت کیا ہے! دنیا بہت تھوڑی ہے اور آخرت بہت لمبی ہے۔

### ایمان کی قدر کیجیے!

میں صرف گزارش یہ کر رہا ہوں کہ دنیا میں کوئی ایسا مسلمان نہیں اور نہ آپ ثابت کر سکتے ہیں، نہ آپ نے کہیں سنا ہے کہ جس کی یہ تمنا ہو کہ کاش میں کافر ہوتا اور کوئی ایسا کافر نہیں کہ جس کی یہ تمنا نہ ہو کہ اے کاش میں مسلمان ہوتا! تو بالآخر نتیجہ اللہ پاک نے اسلام کا رکھا ہے۔ اس لیے مسلمان ایمان پر اللہ کا جس قدر شکر ادا کریں وہ کم ہے۔ اللہ ہمیں اس کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

یابعض حضرات نے یوں لکھا ہے کہ جب جہنم میں کافر بھی ہو گا اور اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے مسلمان بھی اگر جہنم میں چلا گیا تو اس مسلمان کو کافر جب یہ طعنہ دے گا کہ تم کلمہ پڑھ کر جہنم میں اور ہم بغیر کلمہ پڑھے جہنم میں، تو بتاؤ! تم میں اور ہم میں فرق کیا ہوا؟ جب یہ طعنہ دے گا تو اللہ کی رحمت جوش میں آئے گی، اللہ تعالیٰ حکم دیں گے کہ ہر وہ شخص جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان موجود ہے اس کو جہنم سے نکالو

اور جنت میں بھیج دو۔

اب کافروں کو حسرت ہوگی ﴿تَوَكَّنُوا مُسْلِمِينَ﴾ اے کاش! کہ ہم مسلمان ہوتے۔ تو یہ نام کے مسلمان کو بھی معمولی مسلمان نہ سمجھیں۔ ہمارے اکابر کا عام اور نام نہاد مسلمانوں کے بارے میں عجیب نظریہ ہے۔

### بے نمازی مسلمانوں کے متعلق حضرت تھانوی کا نظریہ:

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک جگہ پر بہت عجیب بات ارشاد فرماتے ہیں کہ جو مسلمان نماز نہیں پڑھتا یہ اچھا کام نہیں کرتا، اور کہتے ہیں کہ اگر تم کسی بے نمازی مسلمان سے بات کرو گے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کا نماز نہ پڑھنا یہ اللہ پر ناز کی وجہ سے ہے۔ جب اس سے پوچھو کہ نماز کیوں نہیں پڑھتا؟ اگر اس کا تھوڑا سا بھی اللہ سے تعلق ہو تو وہ کہتا ہے کہ جنت تیری نہیں ہے، جنت اللہ کی ہے، اللہ نے ہمیں بخش ہی دینا ہے اور ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں، ہم نے جنت میں چلے ہی جانا ہے۔ اگر یہ شخص نماز نہیں بھی پڑھتا تو بھی اس کو اللہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ناز ہے۔

اور یہ ناز ایسی چیز ہوتی ہے کہ اللہ اس کی بڑی قدر کرتے ہیں لیکن ناز دل کے ساتھ ہو، یہ بھی دیکھے کہ میری زبان اور دل ایک ساتھ ہیں یا میری زبان اور دل ایک ساتھ نہیں۔ اللہ رب العزت ہمیں اس کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

### حفاظتِ قرآن:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَنَحْفَظُونَهُ﴾

اللہ رب العزت نے فرمایا کہ قرآن مجید ہم نے ہی نازل کیا ہے اور اس قرآن کریم کی حفاظت بھی ہم ہی کریں گے۔ اس لیے اگر کوئی مسلمان قرآن شریف

کی حفاظت کے لیے محنت یا کوشش کرتا ہے تو یہ سمجھو کہ اللہ نے جو وعدہ فرمایا ہے اس وعدے میں اسباب کے درجے میں اللہ نے کسی مسلمان کو استعمال کرنا ہے۔ خوش قسمت وہ شخص ہے کہ جس کا قلب قرآن کریم کے محفوظ کرنے کے لیے استعمال ہو، جس کا سینہ اس کی حفاظت کے لیے استعمال ہو، یہ اس مسلمان کی سعادت اور خوش بختی ہے۔

جہاں تک تورات اور انجیل کا معاملہ ہے تو اللہ رب العزت نے ان کی حفاظت کا ذمہ خود نہیں لیا بلکہ علمائے تورات اور انجیل کے ذمے تھا کہ حفاظت تم نے کرنی ہے اور قرآن کے بارے میں اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس کی حفاظت تم نے کرنی ہے بلکہ فرمایا کہ نازل بھی ہم نے کیا ہے اور حفاظت بھی ہم نے کرنی ہے۔ قرآن کریم قیامت تک کے لیے محفوظ ہو گا۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے تحت تفسیر معارف القرآن میں ایک بڑی عجیب بات لکھی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ یہ جو قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ قرآن نازل بھی ہم نے کیا ہے اور قرآن کی حفاظت بھی ہم کریں گے، اس وعدے میں صرف قرآن شامل نہیں ہے بلکہ اس میں احادیث بھی شامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہیں قرآن کے الفاظ اور ایک ہے قرآن کا معنی، قرآن کے الفاظ نے بھی قیامت تک رہنا ہے اور قرآن کے معنی نے بھی قیامت تک رہنا ہے۔ قرآن کے الفاظ تو ہمیں نظر آتے ہیں اور اس کا معنی وہ ہے جسے احادیث کہتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن کریم کے نازل کرنے سے مقصد صرف قرآن مجید کے الفاظ کی تلاوت نہیں بلکہ قرآن مجید پر عمل بھی کرنا ہے، عمل تب کریں گے جب قرآن کا معنی آئے گا۔ اس لیے قرآن کے الفاظ نے بھی رہنا ہے اور معانی نے بھی رہنا ہے۔ قرآن بھی قیامت تک محفوظ رہے گا اور احادیث بھی، قرآن

کو محفوظ کرنے والے بھی سینے ہوں گے اور احادیث کو محفوظ کرنے والے بھی قیامت تک سینے ہی رہیں گے۔

### نعمت باری تعالیٰ کا بیان:

﴿وَالْأَرْضُ مَدَدُهَا وَالْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْزُونٍ ۝ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَاشٍ وَمَنْ نَسْتُمْ لَهُ بِرِزْقَيْنَ ۝ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنْزِلُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ ۝﴾

اللہ رب العزت نے فرمایا: زمین کو ہم نے پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ بنا کر رکھ دیے اور زمین میں ہر قسم کی چیزیں توازن کے ساتھ پیدا کر دی ہیں۔ زمین میں ہم نے تمہارے لیے رزق کا سامان پیدا کر دیا ہے اور ان مخلوقات کا رزق بھی پیدا کر دیا ہے جنہیں تم روزی نہیں دیتے۔ ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہم انہیں مناسب مقدار میں اتارتے رہتے ہیں۔

توازن کے ساتھ پیدا کرنے کا معنی یہ ہے کہ جس قدر چیزیں زمین میں موجود ہیں ہم ایک دم ساری چیزیں نہیں اگا دیتے بلکہ جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنی اگا دیتے ہیں۔ مثلاً زمین کی تہ میں جتنی گندم موجود ہے ساری گندم نہیں نکال لیتے بلکہ انسانوں کی ضرورت کے مطابق نکالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اگر زمین کی تہہ میں موجود سارا اناج ایک بار نکالیں اور انسان اسے سنبھالنا چاہے تب بھی نہیں سنبھال سکے گا، اس لیے اللہ کرم یہ کرتے ہیں کہ ﴿وَمَا نُنْزِلُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ﴾ جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنی نکالتے رہتے ہیں۔

اور آسمان کے بارے میں یہ بات فرمائی کہ: ﴿وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ ۝﴾ ہم ہوائیں



بھی چلاتے ہیں جو بادلوں کو پانی سے بھر دیتی ہیں اور آسمان سے بارشیں بھی ہم برساتے ہیں، پھر اس پانی سے تمہیں سیراب بھی ہم کرتے ہیں اور جس قدر ہمارے خزانہ میں پانی ہے ہم آسمان سے سارا پانی بیک وقت گرا دیں تو تم اس سارے پانی کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

پھر اللہ رب العزت نے نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ سمندر موجود ہیں، سمندر میں پانی ہے، وہاں سے آبی بخارات اوپر اٹھتے ہیں، پھر ہوائیں چلتی ہیں، بادل کی شکل بنتی ہے اور جہاں جتنی ضرورت ہوتی ہے تو اللہ وہاں آسمان سے بارش برسا دیتے ہیں، اکٹھی برف آتی ہے تو بڑے بڑے گلیشیرز کی صورت میں جم جاتی ہے اور جتنی ضرورت ہوتی ہے پگھلتی رہتی ہے اور زمینوں کو سیراب کرتی رہتی ہے۔

اب دیکھیں اللہ رب العزت نے ایسا نظام بنایا ہے کہ ساری دنیا والے مل کر بھی ایسا نظام نہیں بنا سکتے۔ یہ اللہ رب العزت کا نظام ہے۔

### تخلیق آدم اور سجدہ ملائکہ:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ

مَسْنُونٍ ۖ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِينَ ۝﴾

ان آیات میں اللہ رب العزت نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ بیان کیا ہے، پھر حضرت آدم علیہ السلام کے سجدے کا، پھر ابلیس کے انکار کرنے کا، پھر ابلیس کے مہلت مانگنے کا اور اللہ تعالیٰ کے مہلت دینے کا کسی قدر اللہ نے ذکر فرمایا ہے۔ شروع میں آپ نے پڑھا تھا کہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ﴾<sup>25</sup>

اے فرشتو! میں زمین میں اپنا خلیفہ پیدا کر رہا ہوں۔

اور یہاں فرمایا:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلٰصٰلٍ مِّنْ حَمَآءٍ

مَسْنُوٰنٍ ۝۱۸﴾

کہ میں مٹی کا بشر پیدا کر رہا ہوں۔

وہاں فرمایا تھا کہ خلیفہ پیدا کر رہا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو خلیفہ ہے وہی بشر ہے اور جو بشر ہے وہی اللہ کا خلیفہ ہے۔ اللہ نے اپنی خلافت کی نعمت بشر کو دی ہے، اپنی خلافت نور کو نہیں دی ہے، اس لیے اس دنیا میں نور ہونا کمال نہیں ہے بلکہ بشر ہونا کمال ہے۔

**بشریت کمال کا نام ہے:**

اب بتاؤ! یہ بات سمجھ آئے تو انسان ذہن بنا لیتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں کیونکہ اللہ نے فرشتوں کو خلیفہ نہیں کہا بلکہ بشر کے بارے میں فرمایا کہ میں نے اس کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ تو ہمارا اعزاز اس میں ہے کہ ہم انہیں بشر مانیں لیکن صفات کے اعتبار سے نبی کو نور بھی مانیں۔ ہم پیغمبر کو ذات کے اعتبار سے بشر مانتے ہیں اور صفات کے اعتبار سے نور بھی مانتے ہیں۔

**مولانا فضل الرحمن کا جواب:**

مجھے یاد ہے کہ ہم ایک مرتبہ اسلام آباد میں مولانا فضل الرحمن صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ میں بڑی عزت کے ساتھ مولانا صاحب کا نام لیتا ہوں، آپ میں سے بہت سے حضرات مولانا صاحب کے خلاف بھی ہوں گے، میں آپ کو اختلاف کرنے سے منع نہیں کرتا لیکن عموماً اختلافات ان لوگوں کو ہوتے ہیں جنہوں نے مولانا

صاحب کو قریب سے نہیں دیکھا بلکہ صرف مولانا صاحب کے بارے میں سنا ہے، جو قریب سے دیکھتا ہے وہ سارے اختلافات بھول جاتا ہے۔

ایک بندے کی سیاست میں پوری زندگی گزر جائے، والد اس کا سیاست میں رہا ہو، نہ اس میں اخلاقیات کا مسئلہ ہے نہ اس میں مالیات کا مسئلہ ہے، تمہیں دنیا میں تلاش کرنے سے ایسا سیاست دان نہیں ملے گا۔ ایک ہوتا ہے کہ اخبار میں کوئی کالم آئے، کالم تو مخالفت میں لکھے جاتے ہیں لیکن کبھی کوئی شخص ان کے بارے میں اخلاقیات اور مالیات کے بارے میں ثبوت نہیں دے سکتا، اس ڈاڑھی کے ساتھ اسمبلی میں رہنا، اس پگڑی کے ساتھ اسمبلی میں رہنا، اس مسنون لباس میں رہ کر فرعون وقت کو لکارنا یہ ہر بندے کے بس کی بات نہیں، بڑوں بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ یہ مولانا صاحب ہیں کہ اس ماحول میں رہ کر بھی دین کی بات کرتے ہیں، مولانا جب کام آتے ہیں تب ہمیں احساس ہوتا ہے۔

اب دیکھیں! حکومت نے کتنی بڑی تعداد میں فارم تقسیم کیے مدارس کے لیے، مدارس کا تھوڑا سا مسئلہ بنا تو اب بھی مولانا صاحب کا بیان آگیا کہ ہم ڈٹ کر مقابلہ کریں گے اور مدارس کا تحفظ کریں گے، اب سب کو احساس ہو گیا کہ مولانا کتنے قیمتی آدمی ہیں۔ اللہ ہمیں ان کی قدر کی توفیق عطا فرمائے۔

خیر ہم وہاں بیٹھے تھے تو مولانا فضل الرحمن صاحب فرمانے لگے کہ میں قاسم العلوم ملتان میں کتابیں پڑھاتا تھا، مدرس تھا تو اس وقت میرے پاس چند ایک نوجوان آئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا ہے۔ میں نے کہا: پوچھیں۔ تو انہوں نے کہا کہ یہ بتائیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں یا بشر ہیں؟ مولانا صاحب نے کہا کہ میں نے انہیں کہا کہ آپ کا سوال ٹھیک نہیں ہے، پہلے سوال ٹھیک ہو تو پھر جواب ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ سوال کیوں ٹھیک نہیں؟ مولانا صاحب نے

فرمایا کہ آپ سوال کرتے کہ نور ہیں یا ظلمت؟ پھر میں جواب دیتا کہ نور ہیں کیونکہ نور اور ظلمت میں ٹکراؤ ہے، نور اور بشر میں تو کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ذات کے اعتبار سے بشر ہیں اور اوصاف کے اعتبار سے نور بھی ہیں، اس میں تو ٹکراؤ ہے ہی نہیں تو آپ نے ٹکراؤ کیسے پیدا کیا ہے!

### تخلیق آدم کے مراحل:

میں صرف گزارش یہ کر رہا تھا کہ اللہ نے اس آیت میں فرمایا:

﴿إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ﴾

پہلے اللہ رب العزت نے مٹی پیدا فرمائی، پھر اس مٹی کو اپنی قدرت سے گوندھنے کا انتظام فرمایا، پھر اس مٹی کا خمیر پیدا فرمایا اور ایک عرصہ تک مٹی رہ جائے تو جیسے بو آنا شروع ہو جائے تو وہ ایسے سڑی ہوئی مٹی بن گئی، پھر اس کو خشک کیا اور خشک کرنے کے بعد پھر حضرت آدم علیہ السلام کو وجود بخشا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نرم مٹی سے بنانا آسان ہے، نرم مٹی کو خشک کیا پھر بنایا تو جو مشکل کام تھا خدا کی قدرت نے وہ ظاہر فرمایا۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کا پہلے وجود بنالیا۔

﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي﴾

پھر اللہ نے اس میں روح کو ڈالا۔ اب یہاں جو لفظ ہے ذرا وہ سمجھیں۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ﴿وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي﴾ کہ میں نے آدم میں اپنی روح کو ڈالا۔ اب اس کا معنی یہ تو نہیں ہے کہ اللہ کی روح ہے اور وہ ڈالی ہے۔ تو یہ روح کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کیوں کی ہے؟ اصل میں ہمارے ہاں ایک ہوتا ہے مضاف اور ایک ہوتا ہے مضاف الیہ۔ جیسے گرانمر کی زبان میں کہتے ہیں کہ یہ میری مسجد

ہے... یہ میرا کھانا ہے... یہ میری گاڑی ہے... اسے اضافت کہتے ہیں۔ اللہ رب العزت بعض چیزوں کو اعزاز دینے کے لیے نسبت اپنی طرف کرتے ہیں۔ اسے اضافت تشریفہ کہتے ہیں جیسے سارے انسان اللہ کے بندے ہیں لیکن جن کو اللہ اعزاز دیتے ہیں تو انہیں خطاب کرتے ہیں:

﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۖ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي﴾<sup>26</sup>

اللہ تعالیٰ نیک لوگوں سے فرماتے ہیں کہ یہ میرے بندے ہیں حالانکہ بندے تو سارے اللہ کے ہیں لیکن جن کو اللہ اعزاز دینا چاہتے ہیں ان کی نسبت اللہ اپنی ذات کی طرف فرماتے ہیں۔ یہاں بھی حضرت آدم علیہ السلام کی روح کو خدا نے اعزاز بخشا ہے اس لیے فرمایا کہ میں نے اپنی روح کو ڈالا۔ یعنی ہر کسی کی روح تو میں نے پیدا کی ہے لیکن اعزاز دینے کے لیے اللہ نے نسبت اپنی طرف کی ہے۔

﴿فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ﴾

تمام فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا۔

یہاں پورا واقعہ تو نہیں ہے۔ سورۃ البقرہ میں ہے کہ جب اللہ رب العزت نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرما دیا تو فرشتوں سے فرمایا: ﴿اسْجُدُوا لِآدَمَ﴾<sup>27</sup> کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سب مل کر سجدہ کرو۔ یہاں اس سورت میں ہے: ﴿فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ﴾ تمام فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا، ﴿إِلَّا

ابلیس کو سجدے کا حکم نہیں تو اس پر عتاب کیوں؟

اس کا جواب سمجھیں کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا، الگ سے ابلیس کو حکم کیوں نہیں دیا اس لیے کہ ابلیس انبی ملائکہ میں رہتا تھا اس لیے مستقل فرد کو حکم دینے کی ضرورت نہیں تھی، جو ملائکہ میں رہتا تھا اس کو بھی یہی حکم تھا جو ملائکہ کو تھا۔ اس لیے فرمایا کہ تم سارے سجدہ کرو اور ابلیس سمجھتا تھا کہ مجھے سجدہ کا حکم ہے۔ اسی وجہ سے ابلیس نے یہ نہیں کہا کہ اللہ مجھے تو حکم ہی نہیں ہے تو میں سجدہ کیوں کروں؟ اس کو پتا تھا کہ مجھے حکم ہے اس لیے ابلیس نے جب سجدے سے انکار کیا۔ تو اللہ نے فرمایا کہ تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ اور یہاں عجیب بات یہ ہے:

﴿إِلَّا ابْلِيسَ ط أَبَى أَنْ يَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ﴾ ﴿٦٦﴾

اصل میں تو مزہ انہی کو آتا ہے جو کچھ عربی بلاغت سمجھتے ہوں، ان کو قرآن کے الفاظ کا مزہ آتا ہے۔ یہاں فرمایا: ﴿اَبٰی اَنْ يُّكُوْنَ مَعَ السَّجِدِيْنَ﴾ ﴿۱۶﴾ یہ نہیں فرمایا ”اَبٰی اَنْ يُّسَجَّدَ“ کہ ابلیس نے انکار کیا کہ میں سجدہ نہیں کرتا بلکہ فرمایا کہ ابلیس نے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جائے، انکار کیا سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہونے سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل حکم ملائکہ کو تھا لیکن ابلیس چونکہ ان میں سے تھا اس لیے ضمنی حکم اس کو بھی تھا۔

میں بسا اوقات یہ نکات پیش کر دیتا ہوں۔ ہر آدمی کو سمجھ نہ بھی آئے تو جن کو بلاغت سے تعلق ہے ان کو ضرور سمجھ آئے گا کہ میں نے جو نکتہ بیان کیا اس نکتے کی

حیثیت کیا ہے؟

## ابلیس کی دلیل کا خدائی جواب:

خیر اس نے انکار کر دیا۔ اللہ نے پوچھا:

﴿يَا بَلِيسُ مَا لَكَ أَلاَّ تَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ﴾ ﴿٢٢﴾

اے ابلیس! تو سجدہ کرنے والوں میں سے کیوں نہیں ہوا؟

ابلیس نے جواب دیا:

﴿لَمَ أَكُنْ لِّسَجْدَ بَشِيرٍ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ﴾ ﴿٢٣﴾

میں سجدہ اس مٹی کے وجود کو نہیں کر سکتا۔

دوسرے مقام پر ہے کہ ابلیس نے کہا تھا:

﴿خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ﴾ ﴿٢٤﴾<sup>28</sup>

کہ مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو آپ نے مٹی سے پیدا کیا۔ تو مٹی کو آگ کیسے سجدہ کرے؟ آگ تو شعلے والی ہے اور اوپر جاتی ہے، مٹی کو اوپر پھینکو تو نیچے آتی ہے، مٹی میں عاجزی ہے اور میرے اندر بلندی ہے۔ تو بلند؛ پست کو بھلا سجدہ کر سکتا ہے؟

یہ ابلیس نے عقلی دلیل پیش کی ہے۔ اس دلیل کو توڑا جاسکتا تھا لیکن اللہ نے توڑا نہیں ہے، اللہ نے فرمایا کہ تو یہاں سے نکل جا! یہ میرا حکم تھا اور تو اس میں اعتراض کرتا ہے۔ خدا کے حکم کے سامنے عقل کی بات نہیں کرتے بلکہ خدا کے حکم کو مالک کا حکم سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے، اس لیے تمہیں اعتراض نہیں کرنا چاہیے تھا۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے سترہ دلائل اس بات پر پیش فرمائے ہیں کہ

مٹی؛ آگ سے افضل ہے۔<sup>29</sup> تو کیا یہ دلائل خدا کے علم میں نہیں تھے؟ جس خدا نے ابن القیم کو دلائل دیے ہیں تو خدا کے علم میں وہ دلائل ہیں لیکن اللہ نے دلیل نہیں دی۔ معلوم ہوا کہ ہر موقع پر دلیل نہیں دیتے بلکہ بعض اوقات بغیر دلیل دیے اسے نکال دیتے ہیں۔ ہر موقع دلیل کا نہیں ہوتا۔

### سب سے پہلا اجماع اور پہلا منکر اجماع:

اور اس سے ایک بات اور ذہن میں رکھ لیں۔ یہ ہمارا استدلال نہیں ہے ہمارے مشائخ کا ہے۔ جس کا استدلال ہو میں نام لے کر بتاتا ہوں۔ ہمارے جھگ کے ایک بزرگ ہیں حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی صاحب دامت برکاتہم، ہمارے مسلک دیوبند کے بہت بڑے شیخ ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس تاریخ انسانی میں جس مسئلے پر سارے جمع ہوئے ہیں وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا ہے اور جس نے اس اتفاق کا سب سے پہلے انکار کیا اس کا نام ابلیس ہے۔ معلوم ہوا کہ ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے سجدے پر اتفاق کر لیا اور ابلیس نے انکار کر دیا۔ تو سب سے پہلے دنیا میں اجماع کا انکار کرنے والا ابلیس ہے۔ جو اجماع کو مانے گا وہ جنت میں ملائکہ کے مقام کو پہنچ جائے گا اور جو اجماع کا انکار کرے گا وہ ابلیس کے مقام تک پہنچ جائے گا یعنی جہنم میں۔

آپ اندازہ فرمائیں کہ اجماع کی اہمیت کتنی زیادہ ہے! یہ سب سے پہلا اجماع ہے جس کی شیطان نے مخالفت کی ہے اور اجماع کس کا ہے؟ ملائکہ اور فرشتوں کا اور جس نے انکار کیا وہ ابلیس ہے۔ تو جو ملائکہ کی صفت کو اختیار کرے گا تو وہ جنتی ہے اور جو ابلیس کی صفت اختیار کرے گا تو وہ جنت کے بجائے جہنم میں ہو گا۔



ابلیس نے انکار کیا تو اللہ نے فرمایا: ﴿فَاخْرِجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ﴾ ﴿۲۳﴾

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ میں پہلے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں، یہ ہمارا عقیدہ ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ اطہر، قبر مبارک یہ جنت کا ٹکڑا ہے، یہ بھی ہمارا نظریہ ہے۔

### ”روضہ جنت ہے“ پر اشکال کا جواب:

ایک صاحب کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ یہ جنت نہیں ہے اور کہنے والے بھی آپ کے شہر سرگودھا کے ہیں اور جنت نہ ہونے کی دلیل انہوں نے یہ دی کہ صحیح بخاری میں حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مسجد نبوی والی جگہ کو کھدوا یا مسجد نبوی کو تعمیر کرنے کے لیے تو وہاں چند ایک ہڈیاں نکلیں جو مشرکین کی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو باہر پھینکوا دیا اور وہاں مسجد نبوی تعمیر کی۔ اب وہ دلیل دینے لگے کہ اگر یہ جنت ہے تو جنت میں تو مشرک کی ہڈی نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنت نہیں ہے۔

ہم نے کہا کہ اس کا آسان سا جواب تو قرآن کریم میں ہے کہ جب اللہ پاک نے حکم دیا تھا فرشتوں کو کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ ابلیس کہاں رہتا تھا؟ جنت میں، آپ تو کہتے ہیں کہ مشرک کی ہڈی نہیں ہو سکتی اور یہاں تو پورا ابلیس جنت میں ہے۔

اب وہ کہنے لگے کہ آگے بھی پڑھیں، اللہ نے آگے فرمایا ہے: ﴿فَاخْرِجْ﴾

کہ اللہ نے اسے وہاں سے نکال دیا۔ تو میں نے کہا کہ بخاری میں بھی آگے پڑھیں، اس میں ہے کہ مشرک کی ہڈی تھی لیکن اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نکال دی۔ اس جنت سے مشرکین کی ہڈی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکالی ہے اور اُس جنت سے

ابلیس کو خدا نے نکالا ہے، یہ بھی جنت ہے اور وہ بھی جنت ہے۔

اچھا عجیب بات یہ ہے کہ پھر یہی لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں قرآن بہت آتا ہے۔ اس بات پر آپ نے قرآن کو چھوڑ کر احادیث کو لے لیا ہے اور ہم نے احادیث کو بھی نہیں چھوڑا، ہم نے قرآن کو بھی نہیں چھوڑا کیونکہ ہمارے اکابر کو قرآن بھی آتا ہے اور ہمارے اکابر کو احادیث بھی آتی ہیں، قرآن بھی ہمارا ساتھ دے رہا ہے اور حدیث بھی ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔

مجھے ایک شخص کہنے لگا کہ آپ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ جنت ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ کہنے لگا: حدیث کون سی ہے؟ میں نے کہا کہ صحیح بخاری میں ہے:

مَا بَيْنَ بَيْتِي وَمَنْبَرِي رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ.<sup>30</sup>

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرا منبر اور جو میرا حجرہ ہے اس کے درمیان کی جگہ جنت ہے۔

بعض دلائل ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں تھوڑی سی توجہ دینی پڑتی ہے پھر وہ سمجھ میں آجاتے ہیں۔ بسا اوقات میں ایک دلیل بار بار اس لیے دیتا ہوں کہ اگر پہلے درس میں نہ بھی سمجھ آئے تو جب کوئی شخص اس کو آپ کے خلاف استعمال کرے گا تو خدا نخواستہ اس کا جواب آپ کو نہ بھی آئے لیکن یہ تو ذہن میں ہو گا کہ اس کا جواب ہے۔ اگر وہ کہے کہ کون سا جواب ہے؟ تو کہو گے کہ میرے ذہن میں نہیں آ رہا لیکن میں نے اس کا جواب سنا تھا، مجھے یاد نہیں رہا، یہ تو نہیں ہو گا کہ جواب ہے ہی نہیں۔

خیر جب میں نے اسے صحیح بخاری کی روایت پیش کی تو اس نے کہا کہ جو

درمیان والی جگہ جنت ہے تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر تو شامل نہیں ہے۔ میں نے اسے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے:

"مَا بَيْنَ بَيْتِي وَمَنْبَرِي رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ."

کہ میرے گھر اور منبر کے درمیان جو جگہ ہے وہ جنت کا ٹکڑا ہے۔

آپ مجھے بتائیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو منبر ہے وہ کہاں پر ہے؟ کہا کہ ریاض الجنۃ میں ہے۔ میں نے کہا: وہ جنت میں ہے یا نہیں؟ کہا کہ ہے۔ میں نے کہا: پھر یہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر ہے یہ باہر کیسے ہے؟ میں نے کہا کہ دیکھیں! اگر گھر اور منبر کے درمیان والی جگہ جنت ہے اور گھر اور منبر اس میں شامل نہیں ہے تو منبر تو آج بھی ریاض الجنۃ میں ہے۔ آپ مسجد نبوی میں جا کر دیکھ لیں۔ میں نے کہا کہ منبر کو نکال دو پھر ریاض الجنۃ سے۔ کہنے لگا کہ منبر تو نہیں نکال سکتے۔ تو میں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمرے کو پھر کیوں نکال رہے ہو؟

اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر بھی جنت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا روضۃ بھی جنت ہے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

**ابلیس عاشق نہیں تھا:**

خیر اللہ رب العزت نے اسے فرمایا کہ یہاں سے نکل جا! تو اس نے فوراً کہا: ﴿رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾ کہ اللہ! مجھے قیامت تک کے لیے مہلت دے دے۔ توجہ رکھنا! جب اللہ نے حکم دیا کہ سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ پھر اللہ نے اس پر لعنت بھیجی ہے۔ تو اللہ رب العزت لعنت کس پر بھیجتے ہیں؟ جس سے پیار کریں یا جس پر غصہ ہوں؟ (جس پر غصہ ہوں۔ سامعین)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ حالت غضب میں ہیں اور فرما رہے ہیں کہ اس ابلیس پر میری لعنت ہو اور اس وقت یہ ابلیس کیا کہہ رہا ہے کہ ﴿رَبِّ فَأَنْظِرْنِي﴾ وہ

دعا مانگ رہا ہے اور اللہ حالت غضب میں ہیں۔ بتاؤ! اگر باپ غصے میں ہو اور اپنے بیٹے سے کہے کہ نکل جاؤ تو وہ کہے ابو جی! مجھے پیسے تو دو۔ بندہ کہے گا کہ عجیب بات ہے کہ باپ نے گھر سے نکالا ہے اور یہ کرایہ مانگ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ابلیس پر ناراض ہو رہے ہیں کہ نکل جا، تو ملعون ہے اور وہ کہہ رہا ہے: ﴿رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾ اے اللہ! مجھے قیامت تک کی مہلت دے دو۔ اللہ نے فرمایا: ﴿فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ﴾ اِیَّ یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿۲۸﴾ کہ جاؤ! وقت مقرر تک ہم نے تمہیں مہلت دے دی ہے۔

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوا کہ شیطان عالم بھی تھا، عارف بھی تھا اور عابد بھی تھا، عالم کا پتا ایسے چلا کہ اللہ اسے فرما رہے ہیں کہ تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ تو وہ جواب میں دلیل دے رہا تھا تو دلیل دینا عالم کا کام ہے۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ عالم بھی بہت بڑا تھا، اتنا بڑا عالم تھا کہ خدا کے سامنے بحث کر رہا ہے اور فرمایا: عارف بھی تھا جو اللہ کے مزاج کو سمجھتا ہو۔ معرفتِ خداوندی بھی اس کو تھی۔ عارف اس لیے تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ اللہ جتنے بھی غصے میں ہوں اللہ غصے سے مغلوب نہیں ہوتے اس حال میں بھی مانگیں تو دے دیتے ہیں۔ عابد بھی تھا کہ عبادت کرتے کرتے ملائکہ کی صف میں بیٹھا ہوا ہے، عابد اتنا ہے ملائکہ میں اس کا شمار ہے لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں ایک چیز کی کمی تھی کہ یہ عاشق نہیں تھا۔ اگر عاشق ہوتا تو اللہ کے سامنے دلائل سے بات نہ کرتا بلکہ بات مان لیتا۔ کیوں کہ جب آدمی کو کسی سے عشق ہوتا ہے تو اس کے دل کو دکھایا نہیں کرتا، دلیلوں سے بات نہیں کرتا بلکہ بات سمجھ نہ بھی آئے تب بھی مان لیتا ہے۔

## تذکرہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ:

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عابد بھی تھے، عالم بھی تھے، عارف بھی تھے اور عاشق بھی تھے۔ اس لیے انہوں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ مجھے بات سمجھ میں آرہی ہے یا سمجھ میں نہیں آرہی، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس قدر عشق پیغمبر میں فنا ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بیت اللہ میں ہیں، مشرکین نے انہیں اتنا مارا اتنا مارا کہ صدیق کو پہچانا مشکل ہو گیا تھا، اٹھا کر گھر لائے گئے۔ جب تھوڑی سی ہوش آگئی تو پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ ماں نے کہا کہ اب بھی تو حضور کی بات کرتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ماں! میں نے قسم اٹھا رکھی ہے کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ نہ دیکھوں گا میں ایک گھونٹ بھی پانی نہیں پیوں گا، پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ دکھاؤ کہ حضور ٹھیک ہیں یا نہیں؟ ٹھیک ہیں تو پھر پانی پیوں گا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو افسوس یہ تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بچ جاؤں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہوں۔ پہلے دیکھ لوں پھر پانی پی لوں گا۔ اس لیے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے تو صدیق نے دنیا میں رہ کر کیا کرنا ہے!

اب دیکھیں! صدیق اکبر عاشق پیغمبر ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خبر ملی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے عرش پر گئے ہیں اور واپس آئے ہیں۔ ابو جہل نے کہا تھا کہ میں نہیں مانتا کیوں کہ وہ عقلیات کی بات کر رہا تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چونکہ عارف بھی تھے، عابد بھی تھے، حضور کے عاشق بھی تھے جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ یہ بتائیں کہ اگر کوئی بندہ یہ بات کہے کہ میں ایک رات میں عرش پر گیا اور واپس آیا ہوں تو ابو بکر آپ مان لیں گے؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ ابو جہل بہت بے ایمان ہے خیر کی اس سے توقع نہیں ہے۔ صدیق

اکبر نے پہلا سوال یہ کیا کہ ابو جہل! پہلے یہ بتا کہ اس بات کا کہنے والا کون ہے؟ اگلی بات پھر کریں گے کہ ماننی ہے یا نہیں ماننی! ابو جہل نے کہا کہ آپ کے دوست نے کہا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر ہوا ہے، پھر نہ پوچھنا کہ ہوا ہے یا نہیں ہوا۔

اللہ ہمیں عالم بھی بنائے، اللہ ہمیں عارف بھی بنائے، اللہ ہمیں عابد بھی بنائے اور اللہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا عاشق بھی بنائے۔ تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ عالم بھی تھا، یہ عارف بھی تھا اور یہ عابد بھی تھا، کمی یہ تھی یہ عاشق نہیں تھا اس لیے یہ مار کھا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عشق پیغمبر کو بھی پیدا کریں، جب تک یہ باتیں پیدا نہ ہوں تو شریعت پر عمل کرنا بڑا ہی مشکل ہوتا ہے اور دلائل کا جواب دینا تو بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔

**کبھی کبھی عاشقانہ جواب بھی دیا کریں!**

حضرت مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی رحمہ اللہ کا میں نے ایک بیان سنا۔ حضرت فرمانے لگے کہ میرا ایک مرتبہ شاہدرہ میں عیسائی پادری کے ساتھ مناظرہ ہوا۔ عیسائی پادری نے مجھ سے سوال یہ کیا کہ تم مسلمان خنزیر نہیں کھاتے، تم بکر ا کھا لیتے ہو اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت فرمانے لگے: میں نے اسے عقلی دلیل پیش کی کہ دیکھو! خنزیر اور بکرے میں فرق یہ ہے کہ خنزیر حلال اور حرام میں امتیاز نہیں کرتا۔ اس نے کہا کہ یہ تو کوئی بنیاد نہیں ہے، اگر حلال حرام میں تمیز نہ کرنے کی بات ہے تو وہ تو بکرا بھی نہیں کرتا۔ اس نے کہا کہ ایک بکر اپیدا ہو اس کو یہاں باندھ لو اور ایک بکری اس کے ساتھ ہی پیدا ہوئی ہو تو اس کو بھی یہیں باندھ لو تو اس بکرے کو تو نہیں پتا کہ یہ میری بہن ہے۔ تو بکرا بھی حلال حرام کا خیال نہیں کرتا اور خنزیر بھی نہیں کرتا۔ تو دونوں برابر ہوئے نا!

حضرت اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ میرا خیال تھا کہ میں نے اس کو بڑی اچھی دلیل دی ہے، جب دلیل ٹوٹی تو میرے دل میں فوراً وہ بات آئی جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہر موقع پر عالمانہ بات نہ کرو اس موقع پر عاشقانہ بات کرو۔ حضرت اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہمیں خدا نے حکم دیا ہے کہ بکرا کھالو اور حکم دیا ہے کہ خنزیر نہ کھاؤ! ہم حکم الہی کے پابند ہیں، ہم یہ نہیں دیکھتے کہ حکم کیوں دیا ہے؟ ہاں اس پر ہم سے بات کر لو کہ یہ اللہ کا حکم ہے یا اللہ کا حکم نہیں ہے؟ ہم ثابت کریں تو ٹھیک اور اگر ثابت نہ کریں تو ہماری کمزوری ہے۔

### ابلیس کی تمنا:

خیر میں یہ بات سمجھا رہا تھا کہ ابلیس نے اللہ سے دعا کی تو اللہ نے قبول فرما لی۔ جب واپس جانے لگا تو اس نے کہا:

﴿رَبِّ بِمَا آغْوَيْتَنِي لِأُذِينَ لَّهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَا غُورِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ﴾

کیونکہ اس کو خدا کے وعدے پر یقین تھا، اس کو پتا تھا کہ اب خدا نے وعدہ کر لیا ہے، میں کچھ بھی کہتا رہوں تو مجھے اللہ نے قیامت سے پہلے ہلاک نہیں کرنا ہے۔ تو اس نے کہا کہ یا اللہ! چونکہ آپ نے مجھے یہاں سے رد کر دیا اس لیے میں بھی زمین میں انسانوں کی نظروں میں گناہوں کو محبوب بنا دوں گا اور میں سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا اور خود اس نے کہا: ﴿إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ﴾ ہاں اللہ! یہ بات ٹھیک ہے کہ میں سب کو گمراہ کر لوں گا لیکن جو تیرے مخلص بندے ہیں ان کو گمراہ کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔

اب آپ کے ذہن میں ایک سوال آئے گا اور یہ سوال آنا بھی چاہیے کہ اگر شیطان کا کسی مخلص بندے پر زور نہیں چلتا تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی نیک بندے سے گناہ نہ ہو حالانکہ نیک سے نیک بندہ ہو گناہ اس سے بھی ہو جاتا ہے تو پھر اس کا کیا

مطلب ہے کہ اللہ کے نیک بندوں پر اس کا بس نہیں چلے گا؟ اس آیت سے کچھ آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَإِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَنٌ إِلَّا مَنْ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَايِبِينَ﴾

تو جس کو چاہے گمراہ کر لیکن میرے جو بندے ہوں گے ان پر تیرا زور نہیں چل سکتا۔

اللہ رب العزت نے بھی فرما دیا اور شیطان بھی کہہ رہا ہے کہ میرا زور مخلص بندوں پر نہیں چل سکتا اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ نیک سے نیک بندہ بھی گناہ کر گزرتا ہے۔ پھر آخر ان آیات کا مطلب کیا ہو گا؟

حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا آسان سا مطلب یہ ہے ایسا زور چلنا کہ موت تک گناہ کریں اور جہنم میں چلے جائیں ایسا زور اللہ کے نیک بندوں پر نہیں چل سکتا۔ ابلیس کی تمنا یہ ہے کہ میں ایسا زور لگاؤں گا کہ اپنے ساتھ جہنم میں لے جاؤں گا، خدا کا جو نیک بندہ ہے اگر اس سے گناہ ہو بھی گیا تو بعد میں وہ توبہ کرے گا۔

### ایک صحابی کا قصہ:

جیسے ایک صحابی اور ایک ولی کا واقعہ ہے۔ صحابی کا واقعہ یہ ہے کہ ان سے زنا ہو گیا۔ وہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور اعتراف کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعراض فرمایا۔ انہوں نے پھر اعتراف کیا، پھر اعتراف کیا، پھر اعتراف کیا۔ جب چار مرتبہ اعتراف کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو سنگسار کر دو! جب انہیں سنگسار کرنے لگے تو پتھر لگتے ہی وہ دوڑے۔ جب ان کی موت واقع ہو گئی تو کسی نے ان کے بارے میں سخت بات کہہ دی تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے:



"قَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ تَابَهَا أُمَّةٌ مِّنَ الْأُمَمِ لَقَبِلَ مِنْهُمْ" <sup>31</sup>

اب اس کے بارے میں کوئی جملہ نہ کہنا! اس نے اتنی مقبول توبہ کی ہے کہ اگر امتوں میں سے کوئی امت اس طرح توبہ کرتی تو یہ توبہ پوری امت کی طرف سے کفایت کر جاتی۔

اب دیکھیں! شیطان نے کوشش کی تھی کہ میں بدکاری کرا کر جہنم میں لے جاؤں گا، ان سے بدکاری بھی ہوئی ہے لیکن توبہ اتنی بڑی سطح پر چلی گئی ہے کہ بدکاری کرنے کی باوجود بھی بندہ جنت میں جا رہا ہے، اس لیے فرمایا کہ ابلیس کا ایسا زور نہیں چلے گا کہ بندہ جہنم میں چلا جائے۔

### ایک ولی کا قصہ:

اسی طرح ایک ولی کا قصہ ہے۔ ہمارے استاذ صاحب فرماتے تھے کہ ایک ولی تھے، عالم تھے اور وہ تہجد کی بڑی پابندی فرماتے تھے۔ ایک روز معمول کے مطابق ان کا ارادہ ہوا کہ تہجد پڑھوں لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے کوئی ان کے پاؤں کو دبا کر سلا رہا ہے۔ خیر غفلت ہو گئی اور وہ تہجد نہیں پڑھ سکے۔ تہجد فرض نہیں ہے سنت ہے لیکن وہ اپنی اس تہجد کو برقرار رکھنے کے لیے جب اٹھے تو فجر کی سنتیں پڑھیں، نماز پڑھی، پھر ذکر میں مشغول رہے اور اشراق کی نماز پڑھی اور عشاء کے بعد جو رات کی تہجد تھی وہ بھی پڑھ لی۔

تہجد کی قضا تو ان کے ذمے نہیں تھی لیکن کمی کو پورا کرنے کے لیے پڑھی اور پھر رونا شروع کر دیا کہ اے اللہ! میں کتنے عرصے سے تہجد پڑھ رہا تھا، آج میری تہجد قضا ہو گئی ہے، میں تہجد نہیں پڑھ سکا، اے اللہ! تو مجھے معاف فرما دے، میرے معمول

میں کی آئی ہے۔ یہ رونا تھا کہ دوسرے دن وہ شخص آیا جس نے پاؤں دبا کر سلا دیا تھا۔ اس نے اٹھایا کہ اٹھیں اور تہجد پڑھ لیں۔ اس ولی نے اس شخص کو پکڑ لیا کہ خلوت خانے میں یہ کون ہے؟ یہاں تو کوئی بندہ آہی نہیں سکتا۔

اس نے کہا کہ بس آپ اٹھیں اور تہجد پڑھیں۔ مجھے نہ پوچھیں کہ میں کون ہوں؟ انہوں نے پھر اصرار سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میں شیطان ہوں۔ انہوں نے پوچھا کہ تو شیطان ہے اور تہجد کے لیے اٹھا رہا ہے! شیطان نے کہا کہ کل جو سلا دیا تھا اور آپ روئے ہیں تو وہ عمل تہجد سے بھی آگے نکل گیا ہے، اس لیے میں نے اٹھایا کہ اٹھ کر تہجد ہی پڑھ لیں۔

تو جو اللہ کے نیک بندے ہیں ان کے ساتھ شیطان چھیڑ چھاڑ تو کرتا ہے لیکن اس کے بدلے میں جو توبہ کرتے ہیں تو پھر شیطان کو بھی افسوس ہوتا ہے کہ میں یہ چھیڑ چھاڑ نہ کرتا تو بہتر تھا۔

**گمراہوں ٹھکانہ جہنم ہے:**

﴿وَأَنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو تیری بات مانے گا وہ جہنم میں جائے گا۔

اس کے بعد فرمایا:

﴿لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ﴾

کہ جہنم کے سات دروازے ہیں۔ اللہ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔

جہنم کے سات دروازے ہیں اور جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ بعض

حضرات فرماتے ہیں کہ ”سبعة ابواب“ سے جہنم کے سات طبقات مراد ہیں۔ ان

سات طبقات کے نام جہنم، لظی، حطمة، سعیر، سقر، جحیم اور ہادیہ ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ کھلی ایک جہنم ہے اسی کے سات دروازے مراد ہیں جس

طرح عام دروازے ہوتے ہیں۔

یہاں میں ایک بات عرض کرتا ہوں کہ جہنم کے دروازے سات ہیں اور جنت کے دروازے آٹھ ہیں۔ یہ آٹھواں دروازہ کیوں ہے؟ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں لکھا ہے۔ معارف القرآن دو الگ الگ تفسیریں ہیں، ایک مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اور دوسری مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔

حضرت کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جہنم کے سات دروازے مخصوص اعمال والوں کے لیے جہنم میں جانے کے ہیں اور جنت کے سات دروازے مخصوص اعمال والوں کے لیے جنت میں جانے کے ہیں لیکن جنت کا ایک دروازہ اضافی رکھا ہے کہ جس سے اہل توحید بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ تو جنت کا ایک دروازہ بغیر حساب والوں کے لیے ہو گا کہ جن کے لیے اعمال کا مسئلہ ہی نہیں ہو گا، ان کے لیے اعلان ہو گا کہ تمہارا دروازہ یہ ہے۔

**ابراہیم علیہ السلام کے مہمان:**

﴿وَبَيَّنَّاهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ۖ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا

قَالُوا إِنَّا مِنْكُمْ وَجَلُونَ ۖ قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ۝﴾

اس سورت مبارکہ میں اللہ رب العزت نے ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بالکل اختصار سے بیان فرمایا ہے۔ لوط علیہ السلام کا بھی ذکر کیا ہے اور حضرت شعیب علیہ السلام کا بھی کچھ ذکر فرمایا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں صرف اتنی بات فرمائی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تشریف فرماتے تو کچھ فرشتے انسانی شکل میں ان کے پاس آئے۔ ابراہیم علیہ السلام بہت مہمان نواز تھے۔ بغیر پوچھے ان کے لیے بچھراؤ کیا اور کھانا

پکا کر ان کے پاس لے آئے۔ جب بچھڑا سامنے رکھ دیا تو انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ ابراہیم علیہ السلام کو تھوڑا سا خوف محسوس ہوا کہ یہ کیسے مہمان ہیں جو کھانا نہیں کھاتے؟ کہیں یہ میرے لیے نقصان کا سبب نہ ہوں۔ اس وقت ملائکہ نے کہا کہ اے ابراہیم! آپ ہم سے ڈریں مت، ہم آپ کے پاس کھانا کھانے کے لیے نہیں آئے، ﴿اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ﴾ ﴿۵۲﴾ ہم تو آپ کو ایک بہت بڑے علم والے بیٹے کی خوشخبری دینے کے لیے آئے ہیں، اس لیے آپ ڈر محسوس نہ کریں۔ آپ علیہ السلام نے انہیں فرمایا:

﴿اَبَشِّرْ تُمُوْنٰی عَلٰی اَنْ مَّسِّنٰی الذَّكَرَ فَمِنْ تَبَشِّرُوْنَ﴾ ﴿۵۳﴾

میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں، بڑھاپے میں آپ مجھے بچے کی بشارت دیتے ہو! انہوں نے کہا: ﴿بَشِّرْكَ بِاٰلِ حَقٍّ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْقٰنِطِيْنَ﴾ ﴿۵۴﴾ ہم نے آپ کو سچی خوشخبری دی ہے، آپ اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّقْنُطْ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ﴾ ﴿۵۵﴾ کہ اللہ کی رحمت سے ناامید تو گمراہ آدمی ہی ہوتا ہے، میں ناامید تو نہیں بس ویسے میں نے تعجب میں کہا ہے کہ میں بوڑھا ہوں اور تم مجھے بشارت دے رہے ہو۔

پھر ابراہیم علیہ السلام نے ان ملائکہ سے محسوس کیا کہ یہ صرف بچے کی بشارت دینے کے لیے نہیں آئے ہیں، لگتا ہے کہ کوئی کام اور بھی ہے۔ فرمایا کہ تم نے بیٹے کی تو مجھے بشارت دی ہے، کوئی اور مقصد ہو تو وہ بھی بتا دو! حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی تھے تو محسوس ہوا کہ ان فرشتوں کا کوئی اور مقصد بھی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کی طرف تو نہیں آئے آپ کو تو صرف بشارت دینی تھی، اللہ نے ہمیں لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف عذاب دینے کے لیے بھیجا ہے۔

## فرشتوں کی لوط علیہ السلام کے پاس آمد:

جب وہاں پر پہنچے تو لوط علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُونَ﴾ کہ تم اجنبی لوگ لگتے ہو اور مجھے بہت دکھ ہے کہ تم میرے مہمان بنو گے۔ میری بد بخت قسم کی قوم ہے، یہ مردوں پر جنس پرستی کی وجہ سے ہاتھ ڈالتے ہیں، میں تمہاری حفاظت اپنی قوم سے کیسے کروں گا؟ یہ جنس پرستی کا جو مرض ہے یہ لوط علیہ السلام کی قوم سے چلا ہے، اس سے پہلے جنس پرستی کا کوئی تصور بھی نہیں تھا، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ قرآن کریم میں ہے کہ فرشتوں نے لوط علیہ السلام سے کہا:

﴿فَاسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ وَامْضُوا حَيْثُ تُؤْمَرُونَ﴾

کہ آپ فکر نہ کریں، آپ تیاری کریں اور رات کو کسی وقت اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکلیں اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلیں۔ آپ میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے بلکہ جہاں تک جانے کا حکم ہے وہیں تک چلتے رہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام نے تیاری کی۔ ادھر قوم کو پتا چلا کہ لوط علیہ السلام کے پاس مہمان آئے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَجَاءَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ﴾

یہ لوگ ایک دوسرے کو خوش خبری دیتے ہوئے لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ اندازہ کریں کہ لوط علیہ السلام کس قدر غم زدہ ہو کر یہ بات فرماتے ہوں گے کہ:

﴿إِنَّ هَؤُلَاءِ ضَيْفِي فَلَا تَفْضَحُونِ﴾ ﴿١٦﴾ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تَخْزُونِ﴾

کہ یہ میرے مہمان ہیں، اللہ کے لیے مجھے رسوا نہ کرو! خدا سے ڈرو اور مجھے غمگین نہ کرو!

## قوم لوط کی بد بختی:

لیکن قوم ایسی بد بخت تھی کہ اس نے کہا: ﴿أَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ  
الْعَلَمِينَ﴾ کہ اے لوط! ہم نے تمہیں کئی بار منع نہیں کیا کہ اپنے گھر میں دنیا  
جہان کے لوگوں کو مہمان نہ بنایا کرو۔

لوط علیہ السلام فرمانے لگے: ﴿هَؤُلَاءِ بَنَاتِي إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ﴾

تمہاری بیویاں جو میری روحانی بیٹیاں ہیں وہ تمہارے گھروں میں موجود ہیں  
اس لیے تم کیوں اس جرم کا ارتکاب کرتے ہو؟ لوط علیہ السلام مسافر تھے۔ اپنا علاقہ  
نہیں تھا، عراق کے علاقے سے چلے تھے شام میں ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ گئے،  
وہاں سے حکم ہوا تو ہجرت کر کے بستی سدوم میں گئے۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ نبی ہیں  
اور اجنبی علاقے میں رہتے ہیں اور اللہ کے حکم کی وجہ سے وہاں پہنچے ہیں تو کس قدر ان  
کو شرمندگی ہوگی جب ان کے مہمانوں پر قوم ہاتھ ڈالتی ہوگی۔ سوائے جزع فزع کے  
لوط علیہ السلام اور کیا کر سکتے تھے؟ لوط علیہ السلام نے بس ایک حسرت کا جملہ کہا تھا جو  
یہاں نہیں ہے ایک دوسرے مقام پر ہے، فرمایا:

﴿لَوْ أَنَّ بَيْنَكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِيَ إِلَىٰ دُونِ شَدِيدٍ﴾ 32

کاش آج میری طاقت ہوتی یا میرا مضبوط قبیلہ ہوتا تو تم یہ حرکت کبھی نہ  
کرتے۔ خیر لوط علیہ السلام کو فرشتوں نے کہا کہ آپ ہماری پرواہ نہ کریں، ہم ان کو  
ہلاک کرنے کے لیے ہی آئے ہیں۔ اللہ رب العزت نے اس جگہ پر رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم کی ذات کی قسم کھا کر فرمایا:

﴿لَعَنَّاكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ (٤٢)

کہ ہم آپ کی ذات کی قسم اٹھا کر کہہ رہے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام کی یہ قوم مدہوشی اور بے حیائی میں اتنی مست تھی کہ ان کو احساس ہی نہیں ہوا کہ پیغمبر ہمیں کس عذاب سے ڈرا رہا ہے اور ہمیں کس گناہ سے روکتا ہے؟! وہ لوگ بے حیائی پر ڈٹے رہے۔ بالآخر لوط علیہ السلام رات کو نکلے اور یہ پیچھے رہ گئے۔ لوط علیہ السلام کی اہلیہ وہ زانیہ نہیں تھی، کافرہ ضرور تھی۔

نبی کے گھر میں کافرہ عورت تو آسکتی ہے لیکن نبی کے گھر میں زانیہ عورت کبھی نہیں آسکتی۔ اس لیے کہ ہمارے معاشرے میں جس قدر عیب زنا کو سمجھا جاتا ہے اس قدر عیب کفر کو نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے اللہ اپنے نبی کے گھر میں کبھی بھی فاحشہ عورت کو نہیں آنے دیتے۔ ہاں کافرہ عورت آسکتی ہے۔ اس عذاب میں ان کی بیوی بھی رہ گئی اور باقی لوگ بھی رہ گئے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اتنا سخت عذاب تھا کہ:

**قوم لوط پر عذاب:**

﴿فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ سِجِّيلٍ﴾ (٤٣)

پہلے اللہ نے اس بستی کو پہلے اوپر لے جا کر نیچے کی طرف پلٹا اور پھر اوپر سے ان پر پتھر برسائے۔ آج بھی وہ بستی اس طرح تباہ شدہ ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ بحر میت انہی بستیوں کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک نہ اس پانی میں کوئی مچھلی رہ سکی ہے نہ اس پانی میں کوئی اور جانور رہ سکا ہے۔ اللہ ہم سب کی ان عذابوں سے حفاظت فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

**اصحاب حجر والوں کا انجام:**

﴿وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحَجَرِ الْمُرْسَلِينَ﴾ (٤٤)

حجروالوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ وادی حجر میں قوم ثمود آباد تھی۔ ان کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ انہوں نے اپنی قوم کو دعوت دی لیکن قوم نے آپ کو جھٹلایا جس کے نتیجے میں اللہ نے اس قوم کو ایک ہیبت ناک آواز کے ذریعے ہلاک کر دیا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قوم ثمود کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا اور انہوں نے آپ کو جھٹلایا تھا تو پھر یہاں جمع کا صیغہ کیوں لائے؟ یعنی یہ کیوں کہا ﴿وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ﴾ کہ حجر والوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا حالانکہ جھٹلایا تو ایک نبی کو تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت مشترک ہوتی ہے اس لیے ایک نبی کو جھٹلانا گویا تمام انبیاء کی دعوت کا انکار کرنا ہے۔ اس لیے یہاں جمع کا لفظ لائے یعنی حجر والوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا۔

### سورة الفاتحة کو ”قرآن عظیم“ کہنے کی وجہ:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾

اللہ رب العزت نے ان قوموں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اے میرے پیغمبر! آپ کی قوم اگر آپ کی بات نہ مانے تو آپ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کو دیکھیں۔ وہ بھی اپنی قوموں کو دعوت دیتے رہے ہیں اس لیے آپ بھی قوم کو دعوت دیتے رہیں۔ اگر یہ نہ مانیں تو آپ درگزر فرمائیں، آپ سختی نہ فرمائیں، جو دلائل آپ کے پاس ہیں آپ ان کو دے دیں اور دعا بھی مانگیں۔ اے پیغمبر! آپ کا اعزاز یہ ہے کہ ہم نے آپ کو وہ سورت دی ہے جو بار بار پڑھی جاتی ہے اور اس سورت کو اللہ نے قرآن عظیم بھی فرمایا ہے۔ مراد اس سے سورة الفاتحة ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو



اللہ نے خاص طور پر عطا فرمائی تھی۔

یہاں پر دو باتیں سمجھ لیں:

[۱]: پہلی بات جو مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے کہ یہاں پر قرآن عظیم سے مراد ”فاتحہ“ ہے۔ اللہ نے سورۃ فاتحہ کو قرآن عظیم کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے چھ مضامین بیان فرمائے ہیں:

توحید، رسالت، قیامت، احکام، ماننے والے، نہ ماننے والے

یہ چھ مضامین اللہ نے سورۃ الفاتحہ میں اختصار سے بیان فرمادیے ہیں:

[1]: ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ میں توحید۔

[2]: ﴿مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ میں قیامت

[3]: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ میں احکام

[5,4]: ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں رسالت اور ماننے والے

[6]: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ میں نہ ماننے والے

اس لیے فاتحہ کو قرآن عظیم کہا کہ اس میں الفاظ تھوڑے ہیں اور پورے قرآن کا خلاصہ موجود ہے اور نماز کی جتنی بھی رکعتیں ہیں باقی سورت ہو یا باقی سورت نہ ہو لیکن فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ جیسے عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ بھی ہے اور دوسری سورت بھی ہے اور آخری دو رکعتوں میں فاتحہ تو ہے لیکن اور کوئی سورت نہیں ہے۔ مغرب کی پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ بھی ہے اور دوسری سورت بھی ہے اور آخری یعنی تیسری رکعت میں سورۃ الفاتحہ تو ہے لیکن دوسری کوئی سورت نہیں ہے۔

آپ کو تعجب ہو گا کہ ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ

ہے کہ اللہ چاہتے ہیں کہ بندہ میرے سامنے کھڑا ہے، بندہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے تو میرا کلام پڑھے، پورا قرآن ہر رکعت میں بندہ اللہ کے سامنے نہیں پڑھ سکتا تو اللہ نے فرمایا کہ فاتحہ پڑھو گویا کہ تم نے سارا قرآن پڑھ لیا ہے۔ ایک تو یہ ذہن میں رکھ لیں۔

[۲]: اور دوسری بات کہ آپ یہ دو کتابیں اپنے پاس رکھ لیں؛ ایک مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کی کتاب ”سیرت المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم“ اور دوسری ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمہ اللہ کی کتاب ”اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم“۔

ان دونوں کتابوں کا اہتمام فرمائیں۔ یہ دو کتابیں ہر شخص کے پاس ضرور ہونی چاہئیں۔ ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کے حالات آپ کے سامنے موجود ہوں گے۔ ”اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم“ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے خلیفہ مجاز ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمہ اللہ نے لکھی ہے، ایک جلد میں ہے اور سارے معمولات جمع کیے ہیں کہ کھانا کیسے ہے، پینا کیسے ہے، پگڑی کیسے باندھنی ہے، ٹوپی کیسے پہننی ہے، سونا کیسے ہے؟ یہ سب معمولات جمع کر دیے ہیں۔

### پیغمبر پاک علیہ السلام کو تسلی:

جب اللہ رب العزت نے یہ ساری باتیں ارشاد فرمائیں تو آخر میں ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ﴾ ۹۷ ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ﴾ ۹۸

اے پیغمبر! ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ جو باتیں بناتے ہیں ان کی وجہ سے آپ کا سینہ تنگ ہوتا ہے۔ ہمیں اس بات کا پتا ہے۔ اب اس کا حل یہ ہے ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ

رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ﴿۹۸﴾ کہ آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہیے اور سجدہ کرنے والوں میں شامل رہیے!

اس آیت کے تحت مفسرین نے لکھا ہے خصوصاً مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہ اللہ نے اپنے نبی کو تسلی دی ہے کہ آپ دعوت دیتے ہیں اور یہ قبول نہیں کرتے تو آپ کا دل تنگ ہو تو اس کا حل یہ ہے کہ آپ اللہ کی تعریف بھی کریں، اللہ کو سجدے بھی کریں۔ معلوم ہوا کہ دکھ پر خدا کو یاد کرنے سے خدا دکھ کو ختم فرما دیتے ہیں اور آپ کو تسلی مل جائے گی۔

**عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اشکال کا جواب:**

﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ﴾ ﴿۹۹﴾

پیغمبر! آپ اللہ کو یاد کیا کریں۔ یہ کفار آپ کی بات نہ بھی مانیں تو بھی آپ وفات تک اللہ کی عبادت میں لگے رہیں۔ آپ سے آپ کی عبادت کے بارے میں سوال ہوگا، ان کی عبادت کے بارے میں سوال نہیں ہوگا۔

اس آیت سے یہ مسئلہ ذہن نشین فرمالیں کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں نماز نہیں پڑھتے وہ اس آیت کو ہمارے خلاف بطور دلیل کے پیش کرتے ہیں اور یہ دلیل کیسے ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ﴾ کہ اے پیغمبر! آپ موت آنے تک عبادت کریں! یہ نہیں کہ موت کے بعد بھی عبادت کریں اور تم جو حدیث پیش کرتے ہو کہ:

"الْأَنْبِيَاءُ أَحْيَاءُ فِي قُبُورِهِمْ يُصَلُّونَ" <sup>33</sup>

انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں، جبکہ قرآن کہتا ہے کہ موت تک نماز ہے اور حدیث کہتی ہے کہ قبروں میں بھی نماز ہے۔ تو یہ حدیث قرآن کے خلاف ہو گئی۔ ان کی دلیل سمجھ میں آگئی؟ (جی ہاں۔ سامعین)

اب بندہ سمجھتا ہے کہ یہ بہت بڑا علامہ ہے، بہت بڑا شیخ القرآن ہے کہ حدیثیں بھی قرآن کے خلاف ثابت کرتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو قرآن کے خلاف ثابت کر دیا یہ کتنا بڑا عالم ہے! لوگ اس کا نام ”علامہ“ رکھتے ہیں جو نبی کی حدیثوں کو قرآن کے خلاف ثابت کرتے ہیں۔

بابا! یہ عالم نہیں ہے، اس سے بڑا جاہل کون ہو سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قرآن سے ٹکراتا ہے!

### عبادتِ تکلیفی اور عبادتِ تلذذی:

حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا بہت پیارا جواب دیا ہے۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ عبادت کی دو قسمیں ہیں:

ایک عبادتِ تکلیفی ہے اور ایک عبادتِ تلذذی ہے۔ عبادتِ تکلیفی اسے کہتے ہیں کہ نماز پڑھیں تو ثواب ملے اور عبادت نہ کریں تو گناہ ملے۔ اب فجر کی نماز پڑھیں گے تو ثواب ملے گا اور نہیں پڑھیں گے تو گناہ ملے گا۔ انسان نماز پڑھنے کا مکلف ہے، اور عبادتِ تلذذی کا معنی یہ ہے کہ عبادت کریں گے تو مزا آئے گا اور عبادت نہیں کریں گے تو مزا نہیں آئے گا۔ اس کا گناہ اور ثواب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے مثال دے کر یہ بات سمجھائی تھی کہ رمضان میں آپ اگر افطاری کریں تو ثواب ملے گا اور اگر چیزیں موجود ہوں اور افطاری پھر بھی نہ کریں تو ثواب ملے گا یا گناہ ہو گا؟ (گناہ ہو گا۔ سامعین) اب افطاری کے وقت یہ جو آپ کو لڈ ڈرنک استعمال کرتے ہیں، شربت استعمال کرتے ہیں، جو س استعمال کرتے ہیں اس کے استعمال کرنے پر ثواب ہے اور نہ استعمال کرنے پر گناہ ہے تو افطاری کے وقت جو کھانا پینا ہے یہ تکلیفی ہے، اور جب تراویح کے بعد آپ کہتے ہیں کہ ہم نے تراویح پڑھ لی ہے، اب آئیں کریم ہونی چاہیے، اب اگر آئیں کریم نہ کھائیں تو پھر گناہ نہیں ہو گا، کھائیں گے تو مزا آئے گا۔ تو یہ تراویح والی جو آئیں کریم ہے یہ تلذذی ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ جو دنیا میں عبادت ہے یہ عبادت تکلیفی ہے، ہمارے پیغمبر! موت تک آپ نے عبادت تکلیفی کرنی ہے، اور جو قبر میں نماز ہے وہ تکلیفی نہیں ہے وہ تلذذی ہے۔ تو آیت میں عبادت اور ہے اور حدیث میں عبادت اور ہے۔ اب بتائیں ٹکراؤ کیسے ہے؟ قرآن اور بات کہہ رہا ہے، حدیث اور بات کہہ رہی ہے۔ اللہ پاک ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جب جنتی جنت میں جائیں گے تو جنت میں اللہ کی نعمتوں کو کھائیں گے تو کہیں گے: ”الحمد لله!“ تو یہ عبادت نہیں ہے؟ (عبادت ہے۔ سامعین) تو جب قرآن میں ہے کہ موت کے بعد عبادت نہیں ہے تو یہ جنت میں کیسے عبادت کریں گے؟ ہم کہتے ہیں کہ یہ عبادت تلذذی ہو گی۔ اللہ ہم سب کو جنت عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

## سورة النحل

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿آتَىٰ أَمْرَ اللَّهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوهُ ۖ سُبْحَنَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿١﴾﴾

تمہیدی باتیں:

آج ہمارے درس قرآن کا عنوان ہے ”سورة النحل کے مضامین“۔ اس سورت کا ایک نام سورة النحل ہے اور ایک نام سورة النعم بھی ہے۔ نِعَم کا معنی ہے نعمتیں۔ تو اس سورت میں اللہ پاک نے بہت سارے انعامات کا تذکرہ فرمایا ہے جو اللہ نے انسان کو عطا فرمائے ہیں۔ مثلاً اس میں ایک بہت بڑی نعمت یہ ہے کہ انسان کو دودھ کے لیے بھینس عطا فرمائی۔ بھینس گھاس کھاتی ہے تو اس کا ایک حصہ گوبر بن جاتا ہے اور ایک حصہ دودھ بنتا ہے۔ گوبر اور خون کے درمیان میں سے اللہ پاک خالص دودھ عطا فرماتے ہیں، یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان اور اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔

اللہ نے اس قسم کی بہت سی نعمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے اس لیے اس سورت کا نام ”سورة النعم“ بھی ہے کیوں کہ اس میں خاص نعمتوں کا تذکرہ ہے لیکن سورت کا معروف نام سورة النحل ہے۔ عربی زبان میں ”نحل“ کہتے ہیں شہد کی مکھی کو۔ کیونکہ اس سورت مبارکہ میں شہد کی مکھی اور شہد کا بطور خاص ذکر فرمایا اس لیے اس سورت کا نام بھی سورة النحل رکھ دیا گیا۔

اس سورت کے 16 رکوع ہیں اور 128 آیات ہیں۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ساری آیات کی تفصیل ذکر نہیں کی جاتی چند آیات کی تفصیل اور پھر پوری سورت کا خلاصہ آپ کی خدمت میں ذکر کر دیا جاتا ہے۔

### شہد کی مکھی:

اس سورت کی آیت نمبر 68 میں اللہ نے شہد کی مکھی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اللہ رب العزت شہد کی مکھی کے دل میں کئی طرح کے پیغام بھیجتے ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے:

﴿إِنَّا نَتَّخِذُ مِنْ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ﴾

شہد کی مکھی کو حکم یہ ہے کہ شہد کا وہ چھتا جس پر وہ شہد بناتی ہے اسے پہاڑ پر لگائے یا کسی درخت پر لگائے یا کسی اونچی منزل پر بنائے یعنی شہد کا مخصوص چھتا جس پر شہد بننا ہو اس کو زمین پر نہیں لگانا! اس چھتے کو بطور خاص غلاظت سے پاک صاف رکھنا ہوتا ہے اس لیے اللہ اس کو بلند جگہ رکھنے کا حکم فرماتے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ شہد کو اللہ پاک نے صاف رکھنا ہے تو بلند جگہ پر بھی رکھوایا، پھر شہد کے چھتے کو اللہ پاک نے فرمایا: ”بُيُوتًا“ یہ جمع ہے ”بیت“ کی، بیت کہتے ہیں مکان کو۔ عام طور پر جو مکان انسان کے رہنے کے لیے ہوتے ہیں عربی زبان میں ان کو بیت کہتے ہیں۔ اللہ پاک نے شہد کی مکھی کی جگہ کے لیے بھی وہی لفظ استعمال کیا ہے جو انسان کے مکان کے لیے ہے یعنی بیت۔ تو جس طرح انسان کے گھر کو بیت کہتے ہیں تو شہد کی مکھی کے گھر کو بھی بیت کہتے ہیں۔ اللہ پاک انسان کے گھر کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور شہد کی مکھی کے گھر کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔

جس طرح انسانی سوسائٹی میں ایک بڑا ہوتا ہے اور باقی اس کے ماتحت ہوتے ہیں بالکل اسی طرح شہد کی مکھیوں میں بھی ایک بڑا ہوتا ہے اور باقی اس کے ماتحت

ہوتے ہیں۔ شہد کی مکھی کے بڑے کو ”ملکہ“ کہتے ہیں۔ ان کا جسم اور قد بھی عام مکھیوں سے قدرے بڑا ہوتا ہے۔ یہ ملکہ باقی سب مکھیوں کی ڈیوٹیاں لگا دیتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اس ملکہ کو اتنی طاقت عطا فرما دیتے ہیں کہ یہ سیزن میں یومیہ ایک ہزار سے زیادہ انڈے دیتی ہے جس سے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ خاص قسم کی گھنگھناٹ پیدا کرنے کے لیے شہد کی مکھی ایک منٹ میں گیارہ ہزار مرتبہ اپنے پروں کو حرکت دیتی ہے اور اس سے ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ شہد کی مکھی جب پھولوں کا رس چوسنے کے لیے سفر کرتی ہے تو آدھا کلو شہد تیار کرنے کے لیے اسے مجموعی طور پر 55 ہزار کلو میٹر کا سفر طے کرنا پڑتا ہے اور ایک سفر میں ایک مکھی پچاس سے لے کر سو تک پھولوں سے رس چوستی ہے اور اس سے شہد تیار ہوتا ہے جو کہ چھوٹی محنت نہیں ہے۔

شہد کی مکھی اتنی محنت کرتی ہے۔ بارہ کلو میٹر فی گھنٹا کی رفتار سے سفر کرتی ہے اور پچپن ہزار کلو میٹر کا سفر طے کرتی ہے۔ اگر کوئی شہد کی مکھی راستے میں کسی گندگی پر بیٹھ جائے اور پھر شہد کے چھتے میں آئے تو مکھیوں کی جو ملکہ ہوتی ہے اس نے باقاعدہ پولیس رکھی ہوئی ہوتی ہے، یہ پولیس یا گارڈ باہر پہرہ دیتے ہیں، جب ایسی مکھی آئے تو اس کو چھتے سے باہر ہی روک لیتے ہیں اور اسے قتل کر دیتے ہیں کہ تم صاف چیزوں کے بجائے گندگی لے کر کیوں آئی ہو؟

### شہد کا چھتا؛ عظیم کارِ یگیری کا نمونہ:

اللہ پاک نے جو شہد ہمارے لیے پیدا فرمایا ہے اس کا اتنا انتظام فرماتے ہیں۔ اور آپ حیران ہوں گے کہ خورد بین جس سے چھوٹی چھوٹی چیزیں دیکھا کرتے ہیں اس خورد بین میں ایک عکسہ اور شیشہ ہوتا ہے، شہد کی مکھی کی آنکھیں بھی خورد بین کی طرح کام کرتی ہیں۔ اب انسان اس کو سوچنا چاہے تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ شہد کی مکھی جس مکان میں شہد بناتی ہے پہلے اس مکان میں مخصوص چھتا بنتا ہے۔ وہ چھتا خاص قسم کے



مواد سے تیار ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی جو چھتا بناتی ہے اس کے خانے نہ مثلث ہیں نہ مربع ہیں نہ محسّس ہیں بلکہ مسدس ہیں یعنی تین بھی نہیں، چار بھی نہیں، پانچ بھی نہیں ہے بلکہ چھ کونوں والے خانے ہیں۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ چھ کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس خانے کے تین کونے ہوں اسے آپ جب بھی صاف کریں گے تو کچھ نہ کچھ اس میں ذرے رہ جائیں گے، چار ہوں گے تب بھی رہ جائیں گے، پانچ ہوں گے تب بھی رہ جائیں گے اور اگر آپ مسدس یعنی چھ کونے والا ایک خانہ بنائیں تو اس کے ہر کونے کے درمیان میں بالکل بھی فاصلہ نہیں ہوتا اس لیے مکھی مسدس شکل کو اختیار کرتی ہے۔ یہ مکان میں چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جیسے ہمارے مکان میں کمرے ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک ایک کمرہ مسدس بنتا ہے۔ دنیا میں آپ کو کوئی انجینئر اتنا اچھا کام کرنے والا نہیں ملے گا جو اللہ مکھی کے ذریعے لیتے ہیں۔

**شہد کی مکھی کو پیغام:**

﴿وَاَوْسِیْ رَبِّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾

جس طرح نبی پر اللہ اپنا کلام اتاریں اسے ”وحی“ کہتے ہیں، مکھی پر وحی تو نہیں ہوتی لیکن اللہ نے لفظ وحی والا استعمال کر کے اس کو براہِ راست یہ حکم دیا کہ پہاڑوں درختوں اور اونچی جگہوں پر اپنا گھر بنا۔

﴿فَاَسْأَلُكَ سُبُلَ رَبِّكَ ذُلًّا ط﴾

اور مکھی کے لیے اللہ رب العزت راستے بہت آسان بنا دیتے ہیں۔ یہ گزشتہ دور میں سمجھنا مشکل تھا لیکن آج کے دور میں سمجھنا بہت آسان ہے۔ اب دیکھیں! ہمارے لیے ایک راستہ زمین پر ہے اور ایک راستہ فضا میں جہازوں کے لیے ہے، ہم جیسا بندہ جو ان چیزوں کے علم کو نہیں جانتا وہ نہیں سمجھ سکتا کہ فضا میں ایئر لائن کا راستہ

کیسے ہوتا ہے؟ گویا یہ راستہ پہلے مکھیوں کے لیے تھا اور آج جہازوں کے لیے بنا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے فضائی راستے موجود ہیں جو آج انسان جہازوں کے لیے استعمال کرتا ہے اور ہزاروں لاکھوں سال سے ان کو شہد کی مکھی استعمال کر رہی ہے۔

### تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے:

﴿يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ ط﴾

فرمایا مکھی کے پیٹ سے پینے کی ایسی چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہیں، اس میں انسان کی بیماری کے لیے اللہ نے شفا رکھی ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کرنے لگا کہ میرا بھائی بیمار ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے شہد پلاؤ! اس نے شہد پلایا۔ آکر پھر کہنے لگا کہ بیماری ابھی ویسے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی مشورہ دیا۔ اس نے جا کر پلایا لیکن بیماری ابھی بھی ویسے تھی۔ تیسری بار پھر آیا اور آکر کہا کہ اب بھی کوئی فرق نہیں۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "صَدَقَ اللَّهُ وَكَذَبَ بَطْنُ أَخِيكَ" اللہ کا قرآن سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، "إِسْقِهِ عَسَلًا" اس کو پھر جا کر شہد پلاؤ! اس نے جا کر پھر پلایا تو مریض ٹھیک ہو

گیا۔<sup>34</sup>

### شہد کی مکھی کے بارے میں حدیث:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الذُّبَابُ كُلُّهَا فِي النَّارِ يَجْعَلُهَا عَذَابًا لِأَهْلِ النَّارِ إِلَّا النَّحْلَ" <sup>35</sup>

یعنی دوسرے تکلیف دینے والے جانداروں کی طرح مکھیوں کی بھی تمام قسمیں جہنم میں جائیں گی مگر شہد کی مکھی جہنم میں نہیں جائے گی۔

تو اللہ تعالیٰ مکھیوں کی تمام اقسام کو عذاب دینے کے لیے جہنم میں نہیں ڈالیں گے بلکہ اس لیے ڈالیں گے کہ یہ مکھیاں جہنمیوں کو عذاب دیں، ان کو کاٹیں اور انہیں تکلیف دیں لیکن شہد کی مکھی وہ واحد جانور ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ جہنم میں عذاب دینے کے لیے تو درکنار جہنمیوں کو عذاب دینے کے لیے بھی نہیں بھیجیں گے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عام حالات میں شہد کی مکھیوں کو مارنے سے منع بھی کیا ہے کہ ان کو قتل نہ کرو۔ <sup>36</sup>

ہاں اگر وہ آپ کو تکلیف دینا چاہ رہی ہو اور آپ نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کوئی تدبیر کی اور وہ مر گئی تو یہ بات الگ ہے لیکن کوشش کیا کریں کہ اس کو قتل نہ کریں۔

### دنیا کی حقیقت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں دو چیزیں انسان کے لیے بڑی اہم ہیں؛ انسان کا لباس اور انسان کی خوراک۔ دنیا میں سب سے بہترین اور قیمتی اور نرم لباس ریشم کا ہے اور دنیا میں سب سے بہترین مشروب شہد کا ہے۔ "أَشْرَفُ لِبَاسِ ابْنِ آدَمَ فِيهَا لَعَابُ دُودَةٍ" دنیا میں انسان کا سب سے قیمتی لباس ریشم کے کیڑے کا لعاب ہے، "وَأَشْرَفُ شَرَابِهِ رَجِيْعُ مَخْلَةٍ" اور اس کا نفیس لذت بخش

35۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج 2 ص 1781

36۔ سنن ابی داؤد، رقم: 5267

مشروب شہد کی مکھی کا فضلہ ہے۔<sup>37</sup>

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دنیا کی حقارت بیان فرمائی ہے کہ سب سے قیمتی لباس بھی ایک جانور کا تھوک ہے اور سب سے قیمتی مشروب بھی ایک جانور کا فضلہ ہے۔

اللہ ہمیں یہ ساری باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### جانوروں کی پیدائش:

﴿وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا نَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ﴾

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کچھ نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے اور جانوروں کا بطور خاص ذکر فرمایا ہے۔ فرمایا کہ چوپایوں کو اللہ ہی نے تمہارے لیے بنایا ہے، ان میں تمہارے لیے سردی سے بچنے کا سامان ہے یعنی جانوروں کی اون سے تم گرم لباس بنا کر سردی سے اپنا بچاؤ کرتے ہو۔ مزید فرمایا کہ ان میں تمہارے لیے اور بھی منافع ہیں اور ایک نفع یہ بھی ہے کہ تم ان کا گوشت کھاتے ہو۔

آگے فرمایا کہ ان جانوروں پر تم بوجھ لادتے ہو جو تم اٹھا کر نہیں لے جاسکتے تھے، یہ جانور تمہارا بوجھ بھی اٹھاتے ہیں۔

﴿وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً﴾

یہاں تین قسم کے جانوروں کا ذکر کیا: گھوڑا، خچر اور گدھا۔ ان کو کیوں پیدا کیا؟ تو یہاں یہ فائدے ارشاد فرمائے:

1: ﴿لِتَرْكَبُوهَا﴾ کہ تم ان پر سواری کرو۔

2: ﴿وَزِينَةً﴾ تاکہ تمہاری زینت کا سبب بنیں۔

### گھوڑے کا گوشت نہ کھائیں:

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ کی دور نظری دیکھیں! امام صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ گھوڑے کا گوشت نہیں کھانا چاہیے۔ کیوں کہ اللہ نے پہلے ذکر فرمایا: ﴿وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا﴾ کہ اللہ ہی نے جانور پیدا فرمائے، پید اس لیے فرمائے کہ ﴿تَكُمُ فِيهَا دِفْءٌ﴾ اس کے اون کا لباس استعمال کر کے سردی سے بچو، ﴿وَمَنْفَعٌ﴾ اس سے نفع حاصل کرو، ﴿وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ﴾ اور ان کو کھاؤ، لیکن جب گھوڑے کی باری آئی تو فرمایا: ﴿يَتَذَكَّبُوهَا وَزِينَةً﴾ کہ گھوڑے کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ اسے کھاؤ بلکہ اس اس لیے پیدا کیا کہ اس پر سواری کرو اور اس سے زینت کا کام لو۔

حضرت امام صاحب کا دماغ دیکھیں! قرآن کی آیت سے استدلال فرمایا کہ گھوڑے کو کھانا جائز نہیں ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اللہ نے گھوڑے، خچر اور گدھے کا اکٹھا ذکر فرمایا اور فرمایا: ﴿يَتَذَكَّبُوهَا وَزِينَةً﴾ پہلے اور جانوروں کا ذکر کر دیا اور بعد میں ان تین کا اکٹھا ذکر کر دیا۔ معلوم ہوا کہ جس طرح گدھے کو نہیں کھانا چاہیے، جس طرح خچر کو نہیں کھانا چاہیے اسی طرح گھوڑے کو بھی نہیں کھانا چاہیے۔ گھوڑے کے کھانے سے بچنا چاہیے۔

فقہاء نے اس کی وجوہات اور بھی لکھی ہیں۔ مثلاً صاحب ہدایہ نے ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ گھوڑا چونکہ جہاد کا آلہ ہے اس لیے گھوڑے کا گوشت نہ کھانے میں گھوڑے کا احترام ہے اور اس لیے گھوڑے کو نہیں کھانا چاہیے کہ اگر آلات جہاد کو کھانا شروع کر دیں تو آلات جہاد کم ہو جائیں گے اور شریعت نے آلات جہاد بڑھانے کا حکم

دیا ہے، کم کرنے کا حکم نہیں دیا ہے۔

بہر حال میں نے صرف یہ عرض کیا ہے کہ گھوڑے کو کھانا نہیں۔ آپ ایمان داری کے ساتھ بتائیں کہ جس جانور کو عام حالات میں کھانا مکروہ ہے اس جانور کی قربانی کرنا کیسے جائز ہو گا؟ اور آج لوگوں نے نیا مسئلہ نکال رکھا ہے، پہلے گھوڑے کی قربانی پر فتوے دیتے تھے اور اب گھوڑے کی قربانی شروع بھی کر دی ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو زندہ کیا جا رہا ہے! اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک کام کو نہ فرمائیں تو وہ سنت کیسے ہو سکتی ہے؟

**سمندر کے فائدے:**

﴿وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا﴾

وہی ذات ہے جس نے سمندر تمہارے لیے مسخر کر دیے ہیں یعنی تمہارے کام پر لگا دیے ہیں تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس میں سے زیورات نکالو جنہیں تم پہنتے ہو!

**تازہ گوشت سے مراد مچھلی ہے:**

مفسرین نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ یہ جو اللہ رب العزت نے فرمایا ہے کہ ہم نے سمندر کو تمہارے کے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ، اس سے مراد مچھلی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مچھلی ایسا جانور ہے اگر زندہ ہو تب بھی تازہ ہے اور اگر تم اسے مار دو تب بھی تازہ ہے۔ اس آیت سے پتا چلا کہ مچھلی کو ذبح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ نے ان کے گوشت کو تازہ قرار دیا ہے، لہذا ذبح کیے بغیر استعمال کی جاتی ہے۔

## منکرین حیات الانبیاء کے استدلال کا جواب:

﴿وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ۖ﴾

﴿أَمْوَآتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ ۖ وَمَا يَشْعُرُونَ ۖ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ۖ﴾

ان آیات کو بطور خاص سمجھیں!

اللہ رب العزت نے ان آیات میں مشرکین مکہ کی یا ان سے پہلے کے مشرکین جو بتوں کی عبادت کرتے تھے، ان کی تردید کی ہے، فرمایا:

یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جن چیزوں کی پوجا کرتے ہیں وہ کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ ﴿وَهُمْ يُخْلَقُونَ﴾ بلکہ یہ تو خود پیدا ہوتے ہیں یعنی یہ خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں، ﴿أَمْوَآتٌ﴾ یہ مردہ ہیں، ﴿غَيْرُ أَحْيَاءٍ﴾ ان میں زندگی نہیں ہے، ﴿وَمَا يَشْعُرُونَ ۖ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ﴾ اور ان کو خود پتا نہیں کہ کب اٹھیں گے۔ لہذا ایسے آدمی کو معبود نہ مانو، ایسے آدمی کی عبادت نہ کرو اور اس کو خدا نہ سمجھو۔

یہ آیت خدا نے بتوں کے بارے میں نازل کی ہے۔ بہت سے حضرات اس آیت سے دلیل یہ پکڑتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام بھی وفات کے بعد مردہ ہیں، انبیاء علیہم السلام بھی اپنے قبروں میں زندہ نہیں ہیں، دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾

کہ جن کو وہ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ بت بھی ہیں، اللہ کے علاوہ جن بھی ہیں، اللہ کے علاوہ فرشتے بھی ہیں، اللہ کے علاوہ انسانوں میں نبی بھی ہیں، ﴿مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ عام ہے، اللہ کے علاوہ جو بھی ہیں وہ سارے اس آیت میں شامل ہو جائیں گے۔ دلیل سمجھ میں آگئی ان کی؟ (جی ہاں۔ سامعین)

کہ اللہ کے علاوہ جس کی بھی یہ پوجا کریں یہ سارے کے سارے ﴿أَمْوَاتٌ﴾ ہیں یعنی مردہ ہیں، ﴿غَيْرُ أَحْيَاءٍ﴾ اور یہ زندہ نہیں ہیں۔ اس میں نبی بھی شامل ہیں اور غیر نبی بھی شامل ہیں۔ قرآن نے سب کو مردہ کہہ دیا ہے۔

اور ﴿وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ﴾

ان کو پتا ہی نہیں ہے کہ کب اٹھائے جائیں گے؟ اگر یہ زندہ ہوتے تو ان کو پتا ہوتا، جب ان کو پتا ہی نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زندہ نہیں ہیں۔ اس سے پتا چلا کہ نبی زندہ بھی نہیں ہے اور نبی قبر میں سنتا بھی نہیں ہے۔

### منکر حیات سے گفتگو:

گزشتہ سے پیوستہ عید الفطر کی بات ہے، میں وہاں 87 جنوبی اپنے مرکز میں بیٹھا ہوا تھا۔ منڈی بہاؤ الدین کے ایک عالم مجھ سے بیعت ہیں وہ مجھے ملنے کے لیے آئے۔ ان کے ساتھ دو ساتھی اور بھی تھے۔ تو ان کے ساتھ جو آدمی آئے تھے انہوں نے مجھ سے اسی آیت پر بات کی کہ مولانا صاحب! آپ تو کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ مردہ ہیں، زندہ نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ دلیل کیا ہے؟ انہوں نے کہا: قرآن میں ہے: ﴿وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ کہ جن کو یہ مشرکین پوجتے ہیں اللہ کے علاوہ، ﴿أَمْوَاتٌ﴾ وہ سارے کے سارے اموات ہیں۔ ﴿مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ میں تو نبی بھی شامل ہے۔ اس سے پتا چلا کہ نبی بھی اموات ہیں اور ﴿وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ﴾ ان کو پتا ہی نہیں ہے کہ کب اٹھائے جائیں گے؟ جب انہیں پتا ہی نہیں تو یہ زندہ بھی نہیں ہیں۔

میں نے ان سے کہا کہ آپ کی دلیل کی بنیاد دو چیزیں ہیں:

1: اللہ نے ﴿أَمْوَاتٌ﴾ کہا کہ یہ مردے ہیں۔



2: ﴿وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ﴾ کہ ان کو پتا نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے؟

میں نے کہا کہ اگر اس آیت کو آپ بطور دلیل پیش کرتے ہیں تو آپ سے دو سوال ہیں:

(1): اللہ نے فرمایا: ﴿أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ﴾۔ یہاں صرف ﴿أَمْوَاتٌ﴾ فرمایا ﴿غَيْرُ أَحْيَاءٍ﴾ بھی فرمایا؟ کہا کہ ﴿غَيْرُ أَحْيَاءٍ﴾ بھی فرمایا۔ میں نے کہا کہ اموات کا معنی تو ہے کہ مردے ہیں، غیر احیاء کا کیا معنی ہے؟ کہنے لگے کہ ”زندہ نہیں ہیں۔“ تو میں نے کہا کہ جب ”اموات“ فرما دیا تھا تو اب بتاؤ ”غیر احیاء“ کہنے کا کیا مطلب تھا؟

مثلاً میں کہتا ہوں کہ مجھے بھوک لگی ہے۔ اس کا کیا معنی ہے کہ میں نے کھانا کھایا ہے یا نہیں؟ (نہیں کھایا، سامعین) اب میں آپ سے کہوں کہ ”مجھے بھوک لگی ہے، میں نے کھانا نہیں کھایا۔“ تو آپ کہیں گے کہ مولانا صاحب! آپ کو بھوک لگی ہے اس سے ہمیں سمجھ آگیا ہے کہ آپ نے کھانا نہیں کھایا ہے، اس لیے آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ”میں نے کھانا نہیں کھایا۔“

میں نے کہا کہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿أَمْوَاتٌ﴾ اور آگے فرمایا: ﴿غَيْرُ أَحْيَاءٍ﴾ تو جب ”اموات“ کا معنی بھی زندہ نہیں ہیں تو پھر ”غیر احیاء“ کہنے کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے کہا کہ ایک تو آپ یہ بتائیں!

(2): دوسرا میں نے ان سے کہا کہ قرآن میں ہے: ﴿وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ﴾ کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے یہ انہیں پتا ہی نہیں ہے۔

آپ نے کہا تھا کہ چونکہ انہیں پتا نہیں ہے لہذا زندہ بھی نہیں ہیں۔ مجھے

بتائیں! آپ یہاں سے کب اٹھیں گے؟ وہ کہنے لگے: ہمیں پتا نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ زندہ ہیں یا مردہ؟ کہنے لگے: زندہ۔ میں نے کہا کہ ہمیں تو سمجھ نہیں آرہی کہ آپ زندہ ہیں یا مردہ؟ بات سمجھ آگئی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین)

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ میں کب اٹھوں گا؟ (نہیں۔ سامعین) اس سے معلوم ہوا کہ آپ زندہ نہیں ہیں کیونکہ آپ کو پتا ہی نہیں۔ میں نے کہا: اگر پتا نہ چلنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ زندہ نہیں ہیں تو آپ لوگوں کو بھی پتا نہیں ہے، اب بتاؤ میں آپ کو زندہ مانوں یا مردہ مانوں؟ کہنے لگے کہ زندہ مانیں! میں نے کہا کہ جب آپ کو پتا نہیں تو زندہ کیسے؟ اگر آپ کو پتا نہیں تو آپ زندہ اور اگر ان کو پتا نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے تو وہ بھی زندہ!

میں نے ان سے کہا کہ اچھا یہ بتائیں کہ ہماری موت کب آئے گی؟ کہا کہ پتا نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ زندہ ہیں یا مردہ؟ کہا کہ زندہ۔ میں نے کہا: جس طرح اس جہان میں پتا نہیں کہ موت کب آتی ہے؟ اسی طرح قبر کے بعد پتا نہیں کہ کب اٹھنا ہے۔ تو یہاں بھی زندہ اور وہاں بھی زندہ۔ یہاں مرنے کا پتا نہیں اور وہاں دوبارہ اٹھنے کا پتا نہیں۔ یہ تو اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ مردہ ہیں۔ آپ کوئی دلیل پیش کریں!

### میت کی دو قسمیں:

باقی یہ جو آپ نے نقل کیا: ﴿أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ﴾ اللہ نے یہاں پہلے فرمایا: ﴿أَمْوَاتٌ﴾ اور پھر فرمایا: ﴿غَيْرُ أَحْيَاءٍ﴾۔ پہلے اموات کہا اور پھر غیر احیاء کہا، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں ایک مقام پر ہے:

﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَّيِّتُونَ﴾<sup>38</sup>

یہاں صرف ”میت“ کہا، ساتھ ”غیر احیاء“ نہیں کہا۔ پتا یہ چلا کہ دنیا کی میت دو قسم کی ہیں: ایک میت وہ ہے کہ جس میں روح آئی اور نکل گئی یہ بھی میت ہے، اور ایک میت وہ ہے کہ جس میں سرے سے روح آئی ہی نہیں۔ بات سمجھ میں آگئی؟

انسان پر موت آئے تو یہ ”میت“ ہے لیکن یہ ایسا میت ہے کہ جس میں پہلے روح تھی اور نکل گئی اور ایک میت یہ ہے جیسے میرے سامنے یہ موبائل ہے، یہ مردہ ہے یا زندہ؟ (مردہ۔ سامعین) اس میں کبھی روح آئی ہے؟ (نہیں۔ سامعین) اب یہ ایسا میت ہے کہ جس میں روح آئی ہی نہیں ہے۔ جس میں روح آئے اور نکل جائے اس کو ”مَیِّتٌ غَیْبٌ حَیٌّ“ کہتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے یہاں صرف ﴿أَمْوَاتٌ﴾ نہیں فرمایا بلکہ ﴿أَمْوَاتٌ غَیْبٌ أَحْیَاءٌ﴾ فرمایا ہے کہ اے مشرک! خدا کو چھوڑ کر جن کی تم پوجا کرتے ہو یہ ایسے مردے ہیں کہ جن میں کبھی روح آئی ہی نہیں ہے۔ تو ان سے مراد نبی نہیں بلکہ یہاں مراد بت ہیں، نبی میں روح آئی اور نکلی اور اس بت میں روح آئی ہی نہیں۔ جس میں روح آئے اور نکل جائے وہ ”میت“ ہوتا ہے اور جس میں روح آئے ہی نہیں اسے ”مَیِّتٌ غَیْبٌ حَیٌّ“ کہتے ہیں۔ تو یہ آیت بتوں کے بارے میں ہے، یہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں نہیں ہے۔

اور یہ جو آپ کہتے ہیں کہ ﴿مِنْ دُونِ اللّٰهِ﴾ میں اللہ کے ماسوا انسان، نبی، فرشتہ اور جن سب شامل ہیں تو میں نے کہا کہ کچھ غور کریں کہ ﴿مِنْ دُونِ اللّٰهِ﴾ کا کبھاڑ کس پر چلا رہے ہیں؟ ﴿مِنْ دُونِ اللّٰهِ﴾ کو اتنا عام نہ کریں ورنہ نقصان ہو گا۔ کہنے لگے کہ وہ کیسے؟ میں نے کہا: قرآن کریم میں ہے:

﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصْبُ جَهَنَّمَ﴾<sup>39</sup>

اے مشرک! تم بھی اور اللہ کے علاوہ جس کو تم پکارتے ہو وہ سارے جہنم کا ایندھن ہو۔

اگر ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ میں نبی مراد ہے العیاذ باللہ تو نبی کو جہنم کا ایندھن کہہ سکتے ہو؟ اگر ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ میں مراد فرشتے ہوں تو فرشتوں کو جہنم والا کہہ سکتے ہو؟ میں نے کہا کہ ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ سے مراد نبی نہیں بلکہ مراد بت ہیں کہ یہ مشرکین خود بھی جہنم میں جائیں گے اور جن بتوں کی وہ پوجا کرتے ہیں وہ بت بھی جہنم میں جائیں گے۔

میں نے ان سے کہا کہ اپنے عقیدے کی بہت اصلاح فرمایا کریں۔ مجھے کہنے لگے: اچھا! اگر اس سے مراد بت ہوں تو پھر یہ جو اللہ نے فرمایا ہے کہ ان کو پتا نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے؟ کیا بت بھی اٹھائے جائیں گے؟ میں نے کہا: اٹھائے جائیں گے۔ کہنے لگے کہ کہاں لکھا ہے؟ میں نے کہا: قرآن میں ہے:

﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصْبُ جَهَنَّمَ﴾

کہ اے مشرک! تم بھی اور خدا کے علاوہ جن کی تم پوجا کرتے ہو تم سب جہنم کا ایندھن ہو!

بت پہلے سے تو جہنم میں نہیں جائے گا، البتہ یہاں سے اٹھے گا تو جہنم میں جائے گا۔ تو مشرک نے بھی وہیں جانا ہے اور اس کے بت نے بھی وہیں جانا ہے۔

میں بار بار عقائد پر اس لیے بات کرتا ہوں کہ عقائد کے معاملے میں آپ دل بڑا رکھا کریں، ہمارے عقائد قرآن و سنت کے بالکل موافق ہیں۔

## تقلید کا ثبوت:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رَجَالًا نُوحِيَ إِلَيْهِمْ فَسَئَلُوا أَهْلَ

الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾

توجہ رکھنا! ہم تقلید کو مانتے ہیں، اس پر دلیل یہی آیت ہے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ سے پہلے بھی انسانوں ہی کو نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اگر تمہارے پاس علم نہیں ہے تو اہل علم سے پوچھ لو۔

آدمی کے پاس دلیل نہ ہو تو اہل علم سے پوچھنا اسی کا نام ”تقلید“ ہے۔ ایک شخص مجھ سے کہنے لگا کہ اگر تقلید کا حکم قرآن میں ہے تو تقلید کا لفظ قرآن میں دکھاؤ؟ میں نے کہا کہ تم اللہ کو ایک مانتے ہو؟ کہا: جی ہاں، ایک مانتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اللہ کو ایک ماننے کو کیا کہتے ہیں؟ کہتا ہے: ”توحید“۔ میں نے کہا کہ پورے قرآن میں مجھے توحید کا لفظ دکھا دیں؟ اس نے کہا: نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ پھر توحید کو ماننا چھوڑ دے! کہتا ہے کہ توحید کا لفظ نہیں ہے لیکن توحید کا معنی تو موجود ہے۔ میں نے کہا کہ تقلید کا لفظ تو نہیں ہے لیکن تقلید کا معنی تو موجود ہے۔ ہم تقلید کرتے ہیں اور تقلید کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

## عالم با عمل سے مسئلہ پوچھیں:

اس پر ایک چھوٹا سا نکتہ ذہن نشین فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَسَئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾

اگر تمہارے پاس علم نہیں ہے تو ﴿فَسَئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ﴾ اہل ذکر سے پوچھ لو، یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اہل علم سے پوچھ لو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر اہل علم سے نہیں پوچھنا بلکہ ایسے اہل علم سے پوچھو

جو اہل علم بھی ہو اور اہل ذکر بھی ہو۔ کیا مطلب کہ علم بھی ہو اور علم یاد بھی ہو۔ جس کو علم یاد ہو وہ گناہ نہیں کرتا۔ علماء فرماتے ہیں کہ اس کے پاس علم بھی ہو اور عمل بھی ہو۔ جو خود نہیں بچتا وہ قوم کو کیسے بچائے گا؟ اگر میں خود نماز نہیں پڑھتا تو تمہیں کیسے سمجھاؤں گا؟ میری اپنی شلواری ٹخنوں سے نیچے ہے تو تمہاری کیسے اوپر کراؤں گا؟ میری اپنی ڈاڑھی پوری نہیں ہے تو تمہاری کیسے رکھواؤں گا؟ میرے گھر میں ٹی وی ہے تو تمہاری جان ٹی وی سے کیسے چھڑاؤں گا؟ میری اپنی بیوی پردہ نہیں کرتی تو تمہیں کیسے پردہ سمجھاؤں گا؟ میں خود سود کھاؤں گا تو تمہیں کیسے بتاؤں گا کہ سود حرام ہے؟ اس لیے فرمایا کہ علم اس سے پوچھو جس کے پاس علم بھی ہو اور عمل بھی ہو۔

**حدیث حجت ہے:**

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ

يَتَفَكَّرُونَ﴾

اے میرے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف قرآن اتارا تاکہ آپ ان کو معنی سمجھائیں! معلوم ہوتا ہے کہ معنی وہ ہے جو نبی کا فرمان ہو۔

ہم قرآن بھی مانتے ہیں اور حدیث بھی مانتے ہیں۔ اسے علماء کی زبان میں ”حجت حدیث“ کہتے ہیں۔ ہم قرآن کو بھی دلیل مانتے ہیں اور حدیث کو بھی دلیل مانتے ہیں۔

**بچی کی پیدائش اور مشرکین مکہ کی حالت:**

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ﴾

ان آیات میں مشرکین مکہ کی بری عادت کو بیان کیا ہے کہ ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا تو بڑے خوش ہوتے اور اگر لڑکی پیدا ہوتی تو ان کا چہرہ سیاہ ہو جاتا اور وہ دل ہی

دل میں کڑھتے رہتے، ﴿يَتَوَادَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءٍ مَا بُشِّرَبِهِ﴾ اس خوشخبری کو برا سمجھ کر لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ کسی کو پتا نہ چلے کہ ان کے ہاں بچی پیدا ہوئی ہے، اور پریشان ہوتے کس بات پر ہیں؟ ﴿أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ﴾ اس بات پر کہ ذلت برداشت کر کے اس بچی کو رکھ لوں یا اس کو زندہ درگور کر دوں؟

اللہ نے ان کی مذمت بیان کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آج بھی بچے کی پیدائش پر خوش ہونا اور بچی کی پیدائش پر غمگین ہونا یہ مؤمن کا کام نہیں ہے، یہ مشرک کا کام ہے۔

اور آپ حیران ہوں گے کہ مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ”معارف القرآن“ میں ایک عجیب نکتہ لکھا ہے بلکہ انہوں نے تو حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک حدیث میں ہے کہ ایسی عورت جس کے ہاں پہلی بچی پیدا ہو تو یہ عورت برکت والی ہے۔ کیوں کہ جب اللہ نے قرآن مجید میں بچی کی پیدائش کی بات کی ہے تو بیٹیوں اور بیٹیوں کی اللہ نے ترتیب یہ بیان کی ہے:

﴿يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذَّكَوْرَ﴾ (۲۹)

ذُكْرًا وَإِنَاثًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَشَاءُ عَقِيمًا إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ﴿۴۰﴾

ترتیب یہ بتائی کہ اللہ جسے چاہیں بیٹیاں دیں، جسے چاہیں بیٹے دیں، جسے چاہیں بیٹیاں اور بیٹے دونوں دیں اور جسے چاہے بانجھ کر دیں۔

اللہ تعالیٰ نے بات بیٹی سے شروع کی ہے۔ جس عورت کے ہاں پہلی بیٹی پیدا ہو وہ زیادہ سعادت مند ہے اور ہم ہیں کہ بیٹی کی پیدائش پر پریشان ہیں، بیٹے کی پیدائش

پر خوش ہیں۔ بیٹے کی پیدائش پر خوش ہونا اور بیٹی کی پیدائش پر پریشان ہونا یہ مومن کا کام نہیں ہے، یہ مشرک کا کام ہے۔ ہم پریشان اس وجہ سے ہیں کہ ہم نے نکاح کو اتنا مہنگا کر دیا ہے کہ اب بیٹی کی پیدائش پر پریشان ہوتے ہیں کہ بارات سنبھالنا پڑے گی، جہیز دینا پڑے گا.... تو دو بیٹیوں کے نکاح کیسے کروں گا؟ لیکن اگر سنت عمل پر آجاتے نہ بارات نہ جہیز بلکہ سادہ سادہ نکاح کرتے تو اللہ کی قسم بیٹی کے حوالے سے گھر رحمت کا گہوارہ بن جاتا رحمت کا گھر کبھی نہ بنتا۔ مشکل ہم نے خود پیدا کی ہے، شریعت کا قصور تو نہیں ہے۔

میں ایک بات عرض کرتا ہوں آپ ذہن میں رکھ لیں! ہمارے ہاں عموماً مزاج یہ ہے کہ جس عورت کے ہاں ایک دو تین چار بیٹیاں پیدا ہوں تو ہم اس عورت کو منحوس سمجھتے ہیں اور اس پر مشورے شروع کر دیتے ہیں کہ اس کو طلاق دے دیں، کیوں کہ اس کے ہاں بیٹا پیدا نہیں ہوا، اس کی بیٹیاں ہی پیدا ہوتی ہیں حالانکہ اگر عورت کے ہاں بیٹا پیدا نہ ہو تو اس میں عورت کا قصور تو نہیں ہے، اگر مقدر میں بیٹا ہو گا تو بیٹا پیدا ہو گا، مقدر میں بیٹی ہو گی تو پھر بیٹی پیدا ہو گی۔

### قصور تیرا ہے یا میرا!

شاید آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے اس پر آپ کی خدمت میں ایک واقعہ پیش کیا تھا کہ ایک آدمی ابو حمزہ تھا، اس کی بیوی کے ہاں پہلی بیٹی، دوسری بیٹی، تیسری بیٹی، چوتھی بیٹی پیدا ہوئی۔ اس نے ارادہ کیا کہ میں بیوی کو فارغ کر دوں۔ اس لیے اس نے گھر میں آنا چھوڑ دیا۔ بیوی اس کی سمجھدار تھی اور بلا کی شاعرہ تھی، اس بیوی نے اپنے شوہر کے نام پر ایک خط لکھا:

مَا لِإِنِّي حَمْرَةٌ لَا يَأْتِيَنِي غَضْبَانٌ أَنْ لَا نَلِدَ الْبَنِينَ

ہمارے شوہر ابو حمزہ کو کیا ہو گیا کہ ہمارے پاس نہیں آتے، وہ ناراض ہو گئے



کہ ہمارے ہاں بیٹا نہیں ہوتا۔

ثَالِثُهُ مَا ذَلِكْ فِيْ اَيِّدِيْنَا فَتَنْحُنْ كَالْاَرَضِ لِوَارِعِيْنَا  
اللہ کی قسم! یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے، ہماری مثال زمین کی ہے اور  
تمہاری مثال کسان کی ہے۔

وَإِنَّمَا نَأْخُذُ مَا أُعْطِيَْنَا وَنُنْبِئُ مَا كَزَعُوْهُ فِیْنَا  
زمین اسی بیج کو لیتی ہے جو بیج کسان ڈالتا ہے اور زمین وہی پودا اگاتی ہے جو  
کسان نے بیج ڈالا ہوتا ہے۔

ابو حمزہ! اب بتا کہ یہ میرا قصور ہے یا تیرا قصور ہے؟<sup>41</sup>

یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب ہیں وہ آج ہمارے ہاں جمعہ میں آئے  
اور کہہ رہے تھے کہ ہم نے دنیا ٹی وی پر آپ کے درس میں آپ سے یہ اشعار سنے  
تھے، وہ شعر آپ مجھے لکھ کر دے دیں۔

اور مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ایک عالم ہیں، مجھ سے بیعت ہیں اور ضلع اوکاڑہ میں  
ہوتے ہیں۔ وہ مجھے کہہ رہے تھے کہ ہم نے آپ کا دنیا ٹی وی والا درس ڈاؤن لوڈ کیا ہے  
اور میں نے کچھ خواتین کو دیا سکول میں اور میں نے کہا کہ ہمارے مولانا کا یہ کلپ سکول  
میں عورتوں کو سناؤ! اس نے کہا کہ جی یہ کلپ اس لیے مقبول نہیں کہ یہ ایک عالم کا  
ہے۔ اگر یہ کسی اسکول ٹیچر، پروفیسر یا ڈاکٹر کا ہوتا تو لوگ کہتے کہ دیکھو! کتنا بڑا آدمی  
ہے یہ، کتنی نکتے کی بات کی ہے! لیکن اب یہ نکتہ نکتہ کیوں نہیں بن رہا اس لیے کہ یہ  
پروفیسر کا نہیں بلکہ مولوی کا کلپ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ عورتوں نے کہا: اگر یہ کوئی  
کالج کا پروفیسر ہوتا تو لوگ کہتے کہ یہ عورتوں کے حقوق کے بارے میں بات کرتا ہے۔

## تلاوت سے پہلے تعوذ کا حکم:

﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگو تو ”أَعُوذُ بِاللّٰهِ

مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ پڑھ لیا کرو۔

## جان اور ایمان کے دشمن سے بچاؤ کا طریقہ:

قرآن پڑھنے سے پہلے ”أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ پڑھنے کی بات

کیوں کی ہے؟ اس لیے کہ انسان کے دشمن دو ہیں:

1: انسان

2: شیطان

چونکہ دشمن دو ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اپنے ان دونوں دشمنوں سے بچو! جو کافر انسان؛ مسلمان کا دشمن ہے اس سے بچنے کے لیے اللہ نے مسلمان کو جہاد کی نعمت عطا کی ہے اور جو شیطان ہمارا دشمن ہے اس سے بچنے کے لیے اللہ نے تعوذ کی نعمت ہمیں عطا فرمائی ہے۔ جہاد کریں گے تو کافر دشمن سے بچ جائیں گے جو انسان ہے اور اعوذ باللہ پڑھیں گے تو شیطان سے بچ جائیں گے جو بے ایمان ہے۔ اللہ چاہتے ہیں کہ انسان کی جان کی بھی حفاظت ہو اور انسان کے ایمان کی بھی حفاظت ہو۔ لہذا جہاد بھی ضروری ہے اور تعوذ بھی ضروری ہے۔

کافر انسان چونکہ نظر آتا ہے اس کو آدمی طاقت سے روک سکتا ہے اور شیطان ایسا کافر ہے جو نظر نہیں آتا اس لیے اس کو اعوذ باللہ پڑھ کر اللہ کی غیبی طاقت سے روکا جائے گا۔ شیطان کو روکنے کے لیے غیبی طاقت چاہیے کیونکہ جب شیطان نظر نہیں آ رہا تو غیبی طاقت کی ضرورت ہے۔

## دل میں ایمان ہو تو کلمہ کفر کہنے کا حکم:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا مِنْۢ اُكْرِهٖ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ  
بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنۢ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ  
عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾

حضرت عمار رضی اللہ عنہ؛ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور  
حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ میں تھیں،  
غلامی کی زندگی تھی، جب مسلمان ہو گئیں تو کافروں نے سزائیں دینا شروع کیں۔  
حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیہ اور مسلمان عورت ہیں۔  
جب دشمن نے سزا دی تو ایک ٹانگ ایک اونٹ سے باندھی اور دوسری ٹانگ دوسرے  
اونٹ سے باندھی اور اونٹوں کو مخالف سمت میں چلایا تو حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے  
جسم کے دو ٹکڑے ہو گئے لیکن اس شہیدہ نے اپنی زبان سے کلمہ کفر نہیں کہا۔

ہمارے اسلام کا سب سے پہلا شہید مرد نہیں بلکہ عورت ہے، ان کے شوہر  
حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو دشمن نے اتنا مارا کہ انہوں نے جان دے دی لیکن اپنی  
زبان سے کلمہ کفر نہیں کہا۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ ان کے بیٹے تھے۔ جب انہیں مارا  
اور جان سے مارنے کی دھمکی دی تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے اپنی زبان سے ایسے  
کلمات کہہ دیے جو ایمان والے نہیں تھے، جان بچ گئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خد  
مت میں آئے اور عرض کی: یا رسول اللہ! ابو شہید ہو گئے، اماں بھی شہید ہو گئی اور میں  
بچ گیا ہوں، میں نے کچھ کلمات زبان سے کہہ دیے ہیں جو مجھے نہیں کہنے چاہیے تھے تو  
میرے لیے کیا حکم ہے؟ اللہ نے ان کی تسلی کے لیے قرآن اتارا ہے، فرمایا:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا مِنْۢ اُكْرِهٖ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ

## بِالْإِيمَانِ ﴿۱۰﴾

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: عمار! تمہارے دل میں ایمان تھا؟ کہا: حضور! دل میں ایمان تھا، میں نے بچنے کے لیے زبان سے کہا تھا۔ تو اللہ نے صفائی میں قرآن کی آیت نازل کر دی، فرمایا اس سے کہہ دو کہ تمہارا ایمان بالکل ٹھیک ہے۔

## جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہنے کی شرائط:

یہاں اچھی طرح مسئلہ ذہن نشین فرمالیں! ایک مسئلہ ہے ایمان کا، ایک مسئلہ ہے اعمال کا۔ اگر آدمی کو یہ خطرہ ہو کہ اگر میں نے زبان سے کلمہ کفر نہ کہا تو میری جان چلی جائے گی یا میرا کوئی عضو ختم ہو جائے گا تو اگر اس نے اپنی جان بچانے کے لیے زبان سے کلمہ کفر کہہ دیا بشرطیکہ اس کے دل میں ایمان ہو تو شریعت نے اس کی اجازت دی ہے۔ اجازت کا معنی یہ نہیں کہ ضرور کریں لیکن اگر ایمان پر جان دے اور شہید ہو جائے تو یہ عزیمت اور بڑا مرتبہ ہے۔ اگر جان بچالی اور کلمہ کفر کہہ دیا تو یہ رخصت کا مرتبہ ہے۔ رخصت کی شریعت میں گنجائش موجود ہے۔

لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ جس آدمی نے دھمکی دی ہے وہ واقعی جان سے مارنے پر قادر بھی ہو، اس کے پاس طاقت بھی ہو اور آپ کو پورا یقین بھی ہو کہ مار دے گا، ایسے نہیں کہ کوئی ہلکی سی دھمکی دے دے اور آپ زبان سے کلمہ کفر شروع کر دیں۔

## دو قسم کے اعمال کے نفاذ و عدم نفاذ کا مسئلہ:

ایمان کے علاوہ جو ہمارے مسائل ہیں وہ دو قسم کے ہیں: بعض کلمات وہ ہیں کہ زبان سے کہنے سے بندے کو کچھ نہیں ہوتا جب تک آدمی دل سے راضی نہ ہو مثلاً خرید و فروخت کا معاملہ ہے۔ خرید و فروخت مکمل تب ہوتی ہے جب انسان دل سے کرے، صدقہ تب ہوتا ہے جب انسان دل سے کرے،

زکوٰۃ تب ادا ہوتی ہے جب انسان دل سے دے وگرنہ ادائیگی نہیں ہوتی لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں کہ دل سے راضی نہ بھی ہو محض زبان سے کہہ دے تب بھی ہو جاتی ہیں۔ حدیث مبارک میں تین چیزیں بیان فرمائی گئی ہیں:

"ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزُلُهُنَّ جِدٌّ النِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ."<sup>42</sup>

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر حقیقت میں ہوں تب بھی ہو جاتی ہیں اور اگر مذاق میں ہوں تب بھی ہو جاتی ہیں اور وہ تین چیزیں: نکاح، طلاق اور رجوع ہیں۔

نکاح کے حوالے سے یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ اگر ایک مرد اور ایک عورت اور دو گواہ موجود ہوں اور یہ مذاق مذاق میں ایجاب و قبول کر لیں اور خاوند بیوی بن جائیں تو حقیقتاً نکاح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مذاق مذاق میں بیوی سے کہہ دے کہ تجھے طلاق ہے تو بیوی کو طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ ایک شخص کی بیوی عدت میں تھی اور اس نے مذاق میں رجوع کیا تو رجوع ہو جائے گا۔

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ میں تجھے مار دوں گا ورنہ زکوٰۃ مجھے دے دے اور یہ شخص زکوٰۃ ادا بھی کر دے گا تو شرعاً زکوٰۃ ادا نہیں ہو گی کیونکہ زکوٰۃ تب ادا ہو گی جب آدمی دل سے دے اور یہ دل سے نہیں دے رہا اس لیے ادائیگی شمار نہیں ہو گی۔ اگر کوئی شخص کہے کہ یہ مکان مجھے بیچ دے ورنہ میں تجھے مار دوں گا، اگر وہ مجبور ہو کر بیچ بھی دے تو جب تک دل سے نہیں بیچے گا یہ مکان اس آدمی کی ملک میں نہیں آئے گا لیکن اگر کوئی آدمی کسی بندے کے سر پر بندوق رکھے کہ میں تجھے گولی مار دوں گا وگرنہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور یہ مجبور ہو کر طلاق

دے دے تو بھی طلاق ہو جائے گی کیوں کہ طلاق کا تعلق دل کے ساتھ نہیں بلکہ اس کا تعلق زبان کے ساتھ ہے۔ اس لیے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طلاق مکروہ یعنی جبر کے ساتھ دی جانے والی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

### ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ:

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا ۖ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۚ﴾  
 ﴿شَاكِرًا لِأَنْعَمِهِ ۚ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۚ﴾ وَآتَيْنَاهُ فِي  
 الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۲۲﴾

ان آیات میں اللہ رب العزت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام ایک آدمی تھے لیکن پوری جماعت والا کام کیا، خدا نے انہیں فرد نہیں فرمایا بلکہ ابراہیم علیہ السلام کو امت کہا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اللہ کے فرمانبردار تھے، مشرکین میں سے نہ تھے، اللہ کی نعمتوں کی شکر ادا کرتے تھے، اللہ نے ان کو چن لیا تھا اور انہیں سیدھا راستہ دکھایا تھا۔ ہم نے ان کو دنیا میں بھی نعمتیں دیں اور آخرت میں بھی ان کا شمار ہمارے نیک صالح بندوں میں ہو گا۔

### ملت اور امت میں فرق:

اللہ اپنے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں:

﴿أَنْ أَتَّبِعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ﴾

میرا ابراہیم اس مقام پر ہے کہ اے پیغمبر! آپ بھی ان کی ملت کی اتباع فرمائیں۔

ملت اور چیز ہے اور امت اور چیز ہے۔ دونوں میں فرق سمجھیں۔ اصولوں

کے مل جانے سے اور اصولوں کے ایک ہونے سے ملت بنتی ہے امت نہیں بنتی اور اصول و مسائل ایک ہوں تو پھر ملت نہیں بلکہ امت بنتی ہے۔ ہم ملت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہیں اور امت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں۔ اصول وہی ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہیں اور اصول و مسائل دونوں وہی ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔

### دعوتِ دین کے طریقے:

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾

اس آیت میں اللہ پاک نے دعوت کی ترتیب بتائی ہے کہ جب آپ نے دعوت دینی ہے تو تین طریقے استعمال کریں:

[1]: ﴿بِالْحُكْمَةِ﴾ دلیل سے بات کرو۔

[2]: ﴿الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ فضائل اور ترغیب سے بات کرو۔

[3]: ﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ اور اگر شبہات پیش کیے جائیں تو ان کو اچھے انداز سے رد بھی کرو۔

### ایمان و عمل پہ لانا اور بچانا:

ان تین طریقوں کو میں اپنی زبان میں سمجھانے کے لیے دو جملے کہتا ہوں کہ ہمارے ذمے دو کام ہیں:

1: امت کو ایمان و اعمال پر لانا۔

2: امت کے ایمان و اعمال کو بچانا۔

امت ایمان و اعمال پر آتی ہے فضائل سے اور امت کا ایمان و اعمال بچتا ہے

دلائل سے، تبلیغ والوں کے ذمے لانا ہے اور ہمارے ذمے بچانا ہے۔

حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے جو کام شروع کیا وہ اعمال پر لانے والا ہے اور ہم نے جو کام شروع کیا وہ بچانے والا ہے، لانے والی محنت کرنے والے کا نام حضرت مولانا الیاس دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہے اور بچانے والی محنت کرنے والے کا نام بھی حضرت تو نہیں لیکن مولوی محمد الیاس گھمن ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

میں رانیونڈ اجتماع پر تھا۔ جیسے علماء میں پیار محبت کی باتیں چلتی ہیں تو مجھے ایک ساتھی نے کہا کہ مولانا صاحب! یہ کام جو آپ کرتے ہو کہ اس عقیدے پر یہ اعتراض ہے اور یہ جواب ہے، یہ اعتراض ہے اور یہ جواب ہے، یہ کہاں لکھا ہے؟ میں نے کہا: جو کام آپ کر رہے ہو وہ کہاں لکھا ہے؟ مجھے کہنے لگے کہ یہ تو قرآن میں ہے۔ میں نے کہا کہ آیت پڑھیں تو انہوں نے یہی آیت پڑھی:

﴿ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾

میں نے کہا کہ آیت پوری ہو گئی ہے یا کچھ باقی ہے؟ کہنے لگے: آدھی ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ پوری پڑھیں! آگے ہے: ﴿وَجَادِلْهُمْ بَالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ میں نے کہا کہ ﴿ادْعُ﴾ والا کام آپ کا ہے اور ﴿جَادِلْهُمْ﴾ والا کام میرا ہے، ﴿ادْعُ﴾ کا معنی لانا ہے اور ﴿جَادِلْهُمْ﴾ کا معنی بچانا ہے۔ آپ بڑے ہیں آپ کا ذکر پہلے ہے، ہم چھوٹے ہیں ہمارا ذکر بعد میں ہے۔

**رانیونڈ مرکز اور سرگودھا مرکز:**

میں نے کہا کہ ہم نے لانا بھی ہے اور بچانا بھی ہے۔ ایک مرکز رانیونڈ بنا ہے اور ایک مرکز آپ کے سرگودھا چک 87 جنوبی لاہور روڈ پر مرکز اہل السنۃ والجماعۃ بنا ہے۔ آپ آج مان لیں تب بھی آپ نے ماننا ہے اور پچاس سال بعد مان لیں تب بھی



آپ نے ماننا ہے۔ ماننا تو ہے ہی، کوئی جلدی ماننا ہے اور کوئی دیر سے ماننا ہے۔ رائیونڈ مرکز کا کام ہے لانا اور ہمارے مرکز کا کام ہے بچانا، لانا بھی ہم نے ہے اور بچانا بھی ہم نے ہے، بتاؤ تبلیغ والے لارہے ہیں یا نہیں؟ (لارہے ہیں۔ سامعین) اور ہم بچارہے ہیں یا نہیں؟ (بچارہے ہیں۔ سامعین) آپ کے پاس ثبوت ہے کہ نہیں ہے آپ پوری دنیا میں جا کر دیکھ لیں۔ دنیا کے جس کونے میں آپ جائیں گے ان شاء اللہ آپ کو وہاں ہماری محنت نظر آئے گی کہ ہم نے امت کو بچا کیسے ہے۔

### فضائل نماز اور نماز اہل السنۃ والجماعۃ:

میں سمجھانے کے لیے کہتا ہوں کہ اگر آپ نے نمازی بنانا ہو تو فضائل نماز پڑھیں اور جب نمازی کو بچانا تو پھر تو پھر دلائل نماز پڑھیں۔ حضرت شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب فضائل نماز ہے اور میری کتاب دلائل نماز ہے، آپ فضائل نماز پڑھیں تو امت نماز پر آجائے گی اور جب غیر مقلد کھسر پھسر کریں تو ہماری کتاب ”نماز اہل السنۃ والجماعۃ“ پیش کریں ان شاء اللہ آپ کے نمازی بچ جائیں گے۔

رائیونڈ جائیں سہ روزہ لگائیں اور کوئی دلیل پوچھے تو آپ کو نہیں آتی۔ یہ میں مذاق نہیں کر رہا، مسجد میں بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ ماہانہ سہ روزہ کی دلیل تمہیں رائیونڈ مرکز نہیں دے گا، دلائل آپ کو سرگودھا مرکز دے گا۔ نہ یقین آئے تو یہاں بیٹھا ہوا کوئی ایک شخص پیش کر دو جو یہ کہے کہ میں سہ روزہ لگاتا ہوں اور اس کی یہ دلیل ہے۔ ہاں وہ یہ تو کہے گا کہ ہمارے بزرگوں کی ترتیب ہے لیکن دلیل اس کے پاس نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں کی ترتیب ہے اور اس ترتیب پر دلیل یہ ہے! میں اپنے ساتھیوں سے کہتا ہوں کہ ہمارے حضرات جو فرماتے ہیں کہ بزرگوں نے فرمایا.... بزرگوں سے سنا.... تو مخالف اعتراض کرتے ہیں کہ ہم قرآن پیش کرتے

ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ بزرگوں نے فرمایا۔ میں نے کہا کہ ہم قرآن سے ثابت کریں گے کہ بزرگوں کی باتیں بھی مانی ہیں۔

**توڑ نہیں، جوڑ پیدا کریں!**

توہم نے لانا بھی ہے اور ساتھ بچانا بھی ہے۔ صبح سے لے کر شام تک آپ کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر مال جمع کرتے ہیں اور جب جمع ہو جائے تو کاؤنٹر پر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں؟ (نہیں۔ سامعین) اس جمع کیے ہوئے مال کو اپنے لاک میں رکھتے ہیں، بینک میں رکھتے ہیں، گھر لے کر آتے ہیں۔ تو کمانے کا طریقہ اور ہوتا ہے اور جمع کیے ہوئے مال کو محفوظ کرنے کا طریقہ اور ہوتا ہے۔ لانے والا طریقہ دعوت والا ہے اور بچانے والا طریقہ دلائل والا ہے۔ ہم دونوں کام کرتے ہیں یا ایک کام کرتے ہیں؟ (دونوں کام کرتے ہیں۔ سامعین)

میں ایک جگہ جلسہ پر تھا۔ تو رائیونڈ کا اجتماع ہوتا ہے 6 دن کا اور ہمارا 87 مرکز کا اجتماع ہوتا ہے 6 گھنٹوں کا۔ میں نے کہا کہ آپ 6 دن والا مانتے ہیں اور 6 گھنٹے والا نہیں مانتے! بھائی جب ہم نے چھ دن والا مانا ہے تو آپ چھ گھنٹے والا تو مانیں! اس لیے کہ ہم نے امت کو لے کر چلنا ہے، امت میں توڑ پیدا نہیں کرنا۔ اللہ ہمیں جوڑ کی توفیق عطا فرمائے۔

**ایمان و تقویٰ:**

﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ﴾

اس آیت میں اللہ نے یہ بات سمجھائی ہے کہ اللہ کی مدد ان کے ساتھ ہے جو ایمان بھی لائیں اور تقویٰ بھی اختیار کریں۔ دعا کریں کہ اللہ ہمیں ایمان پر ثابت قدمی بھی عطا فرمائے اور تقویٰ کی نعمت بھی عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاجْزِ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة بنی اسرائیل

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿سُبْحَنَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ

الْأَقْصَا الَّذِي بَرَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنَ الْيَتْنَا ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿١﴾﴾

**تمہیدی گفتگو:**

میں نے سورت بنی اسرائیل کی پہلی آیت تلاوت کی ہے۔ اس سورت میں اللہ نے واقعہ معراج کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اب مہینہ بھی رجب کا شروع ہے۔ اس لیے اس مناسبت سے معراج کا واقعہ قدرے تفصیل سے پیش کرتا ہوں۔

اس بات میں مؤرخین کا اختلاف ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج کس سال، کس مہینے اور کس تاریخ کو ہوا۔ رائج اور زیادہ قوی رائے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے گیارہویں سال معراج کے لیے تشریف لے گئے اور گیارہویں سال بھی رجب کا مہینا تھا اور ستائیس تاریخ تھی۔ چونکہ اقوال اس میں کئی ہیں اور ائمہ کا اختلاف بھی ہے اس لیے میں نے آپ کی خدمت میں صرف ایک قول پیش کیا ہے جو رائج اور سب سے بہتر ہے۔

**معراج کیوں ہوا؟**

پہلی بات تو یہ سمجھیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ رب العزت

نے معراج کیوں کروایا ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ اصل میں اللہ رب العزت کا نظام یہ ہے کہ جب کوئی انسان اللہ کے دین کے لیے مشقت برداشت کرتا ہے تو جس قدر مشقت برداشت کرے اللہ اس سے زیادہ اس کو عزتیں دیتا ہے۔ کچھ دیر تو انسان کو مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے لیکن نتیجہ مشقت نہیں بلکہ نتیجہ عزت ہی ہوتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کفار مکہ نے ہر قسم کے دکھ کے دروازے کھولے اور راحت کے دروازے بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خیال کے مطابق وہ جس قدر تکالیف دے سکتے تھے انہوں نے دی ہیں۔ سب سے زیادہ زیادتی کا آخری مرحلہ کسی معزز آدمی کے ساتھ اس کا بایکٹ ہوتا ہے۔ اہل مکہ نے تین سال تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بایکٹ کیا اور شعب ابی طالب میں تین سال تک بند رکھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شعب ابی طالب سے نکلے۔ آج کی زبان میں اسے جیل کہہ دیں جو بغیر چار دیواری کے تھی۔ اسی سال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غنحوار بیوی ام المؤمنین حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔

### پیغمبر علیہ السلام کی تکالیف:

اب دیکھیں! بناتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم؛ رقیہ، ام کلثوم، اور فاطمہ رضی اللہ عنہن چھوٹی چھوٹی چچیاں گھر میں ہیں اور دنیا مخالف ہے، پورے عالم کی فکر ہے، دن رات ایک بندہ کام میں لگا ہوا اور ایک غنحوار بیوی گھر میں ہو اور وہ بھی فوت ہو جائے تو انسان کے دل پر کیا گزرتی ہے! اس لیے اس سال کو ”عام الحزن“ یعنی غم کا سال کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف کی طرف تشریف لے گئے۔ اہل مکہ بات بھی نہیں سنتے اور دکھ بھی دیتے تھے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا شاید

طائف والے میری بات سمجھ لیں۔ طائف والوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات قبول کرنے کے بجائے مزید ظلم یہ کیا کہ طائف کے اوباش بد معاش لڑکوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیا۔ وہ تالیاں بھی پیٹتے تھے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق بھی اڑاتے تھے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھر بھی مارتے تھے جس کی وجہ سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں مبارک خون کی وجہ سے رنگین بھی ہوئے۔

جب نبی کا خون کسی زمین پر گر جائے تو اللہ اس وقت اس زمین والوں کو زندہ نہیں رہنے دیتے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خون گرا ہے اس کے لیے اللہ نے فرشتے بھیجے، فرشتوں نے آکر عرض کیا کہ حضور! آپ اجازت دیں تو ہم ان کو ان دو پہاڑوں کے درمیان پیس کر کے رکھ دیں گے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ اگر یہ طائف والے مسلمان نہیں ہوئے تو اللہ ان کی اولاد میں ایسے لوگ پیدا فرمادے گا جو اللہ کی عبادت کریں گے۔<sup>43</sup>

اس حالت میں بھی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے لیے بد دعا نہیں فرما رہے بلکہ اللہ سے امید لگائے ہوئے ہیں کہ اللہ ان کی اولاد کو اسلام کی توفیق دے گا۔ اس لیے میں ان کے حق میں بد دعا نہیں کرتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں مکہ واپس تشریف لائے تو جب مکہ والوں نے تکلیف دینے کی انتہا کر دی تو اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اے میرے محبوب! اب میں تمہیں عزت دینے کی انتہا کرتا ہوں۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ نام و نشان مٹا دیں گے لیکن ہم فرش پر نہیں بلکہ عرش پر تیرے چرچے کرتے ہیں، یہاں

فرش پر عداوت ہے آپ عرش پر اپنی عزت دیکھیں! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے لیے جو مشقت برداشت کی ہے اس کے بدلے میں خدا نے یہ اعزاز معراج کی صورت میں بخشا ہے۔

### سفر معراج کے دو حصے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا سفر دو حصوں کا ہے؛ ایک مکہ سے بیت المقدس اور ایک بیت المقدس سے عرش معلیٰ تک۔ مکہ مکرمہ سے بیت المقدس کے اس سفر کو ”اسراء“ کہتے ہیں جو سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اور پھر وہاں سے عرش معلیٰ تک کے سفر کو ”معراج“ کہتے ہیں جس کا ذکر سورۃ النجم کی پہلی اٹھارہ آیات میں ہے۔

تو یہاں ”اسراء“ کا ذکر بھی ہے اور معراج کا ذکر بھی ہے لیکن عام طور پر چونکہ مکہ سے بیت المقدس کا سفر زمینی ہے اگرچہ عجیب تر تھا لیکن عجیب شمار نہیں ہوتا اور بیت المقدس سے عرش معلیٰ تک کا سفر عجیب تر ہے اس لیے اس پورے سفر کو اسراء کے بجائے ”معراج“ ہی کہہ دیتے ہیں۔

### معراج جسمانی ہوئی ہے:

بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج جسمانی کا انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ معراج روحانی ہوئی ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اطہر نہیں گیا بلکہ فقط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک گئی ہے۔

جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف روحانی معراج نہیں بلکہ جسمانی معراج ہوئی ہے، اس لیے کہ روحانی معراج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال نہیں ہے۔ کوئی بندہ یہاں سویا ہوا ہوا اور دیکھے کہ میں آسمان پر گیا ہوں، میں عرش پر گیا ہوں، میں مکہ گیا ہوں، میں مدینہ گیا ہوں تو یہ کوئی

کمال نہیں ہے کیوں کہ صرف روح تو عام بندے کی بھی جاسکتی ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز اور اعجاز یہ ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف روح نہیں بلکہ جسم بھی ساتھ جائے۔ اس لیے ہمارے علماء کہتے ہیں کہ آج کے دور میں جب کوئی کہے کہ ہم معراج مانتے ہیں تو ان سے یہ پوچھیں کہ معراج مانتے ہو یا معراج جسمانی مانتے ہو؟ کیوں کہ وہ کہے گا معراج اور نیت کرے گا روحانی کی، جبکہ روحانی پر اختلاف نہیں ہے، اختلاف تو معراج جسمانی پر ہے۔

بالکل اسی طرح جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موت کے بعد قبر مبارک میں زندہ ہیں۔ اگر کوئی بندہ کہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ مانتے ہیں تو آپ نے پوچھنا ہے کہ حیات روحانی مانتے ہو یا جسمانی مانتے ہو؟ وگرنہ لوگ دھوکہ دیں گے حیات کہہ کر اور روحانی مان کر ڈنڈی مار جائیں گے۔ معراج کہیں گے اور روحانی مان کر ڈنڈی مار لیں گے۔ ہم وفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات بھی جسمانی مانتے ہیں اور مکہ سے عرش تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج بھی جسمانی مانتے ہیں۔

### معراج جسمانی پر دلائل:

معراج جسمانی پر تو دلائل کئی ہیں، آپ موٹے موٹے دلائل ذہن میں رکھ لیں:

#### دلیل نمبر 1:

اللہ رب العزت اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کو ذکر کرتے ہوئے لفظ ﴿سُبْحَنَ﴾ کو لائے ہیں۔ لفظ ”سبحان“ عربی زبان میں وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کوئی عجیب واقعہ ہو۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کا معراج پر جانا عجیب نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کا جانا یہ عجیب تر ہے۔ خدا نے لفظ ”سبحان“ کہہ کر بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم گیا ہے،

روح تو ساتھ ہے ہی۔

## دلیل نمبر 2:

اللہ نے فرمایا: ﴿أَمَرْتُ بِعَبْدِهِ﴾ کہ اللہ نے معراج کرایا ہے اپنے عبد کو۔  
 ”عبد“ صرف روح کا نام نہیں ہے، عبد اس جسم کا نام ہے جس کے اندر روح ہو۔ تو  
 معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کو خدا نے معراج کروایا ہے۔  
 یہ دو دلیلیں تو میں نے قرآن سے پیش کی ہیں۔ اب دو دلیلیں احادیث سے  
 ذہن میں رکھ لیں:

## دلیل نمبر 3:

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے واپس تشریف لائے تو حضرت ام  
 ہانی رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کے  
 والوں میں اپنے سفر کا تذکرہ نہ کیجیے گا، یہ لوگ پہلے آپ کی مخالفت کرتے ہیں ان کو اور  
 موقع ہاتھ میں آجائے گا۔<sup>44</sup>

اگر صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح گئی تھی تو پھر حضرت ام ہانی کو یہ  
 بات کہنے کی ضرورت کیا تھی؟ اس کا معنی یہ ہے کہ جسم گیا ہے اور اس کو خلافِ عادت  
 سمجھ کر مکہ و لوں نے انکار کرنا ہے۔

## دلیل نمبر 4:

اور دوسری بات سمجھیں کہ مکہ مکرمہ میں ایک شخص بڑا عقل مند تھا اور اس  
 عقل مند کو ابو الحکم کہتے تھے لیکن بعد میں ابو الحکم کا نام ”ابو جہل“ پڑا اور ایک شخص  
 جسے ابو بکر کہتے تھے اس واقعے کے بعد یہ ابو بکر سے آگے ”صدیق“ بنا ہے۔ یہ صدیق



کیوں بنا ہے اور وہ ابوالحکم کے بجائے ابو جہل کیوں بنا رہا؟ اس لیے کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے اور فرمایا کہ میں معراج کر کے آیا ہوں، دیدارِ خدا کر کے آیا ہوں تو ابو جہل نے کہا کہ میری عقل نہیں مانتی، تو جسے ابوالحکم یعنی حکمت والا کہتے تھے اس کا لقب ”ابو جہل“ یعنی جہالت والا ہونا چاہیے اور بعد میں ایسا ہی ہوا؛ وہ اپنی عقل سے پرکھ رہا تھا جبکہ نبوت کے معاملات عقل سے نہیں بلکہ خدا کی وحی سے ہوتے ہیں، نبی کا تو کمال یہ ہے کہ جہاں عقل جواب دے دے وہاں سے وحی اپنا کام شروع کرتی ہے۔ ابو جہل نے حضرت ابو بکر سے کہا کہ اگر کوئی شخص یہ بات کہے کہ میں ایک رات میں عرش پر گیا اور واپس آیا ہوں تو کیا آپ مان لیں گے؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یہ بتاؤ یہ بات کہی کس نے ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کے یار نے کہا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یار نے کہا ہے تو پھر سچ ہے، پھر وہ واقعی ہو کر آئے ہیں۔

اگر روحانی معراج تھی تو پھر جھگڑا کیوں تھا؟ یہ جھگڑا تو اس پر تھا کہ جسمانی معراج ہوئی ہے۔ اگر میں آپ سے کہہ دوں کہ رات کو میں سویا تھا، خواب میں میں نے وہ جگہ دیکھی ہے جہاں سے سورج نکلتا ہے، پھر میں مدینہ میں گیا، پھر میں مکہ میں گیا۔ آپ کو کوئی بھی تعجب نہیں ہونا لیکن اگر میں کہوں کہ صبح جہاں سے سورج نکلتا ہے میں وہاں گیا، جہاں ڈوبا تھا وہاں گیا، پھر فلاں جگہ گیا، پھر فلاں جگہ گیا، ایک دن میں اتنا لمبا سفر کیا ہے تو اب آپ کو یقیناً تعجب ہو گا کہ یار مولانا صاحب کیسی بات کر رہے ہیں؟ تعجب تبھی ہوتا ہے کہ جب نبی کا معراج جسمانی مانیں، روحانی مانیں تو پھر تعجب کی بات ہی نہیں ہے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج جسمانی ہے۔

**صفتِ عبد تمام صفات میں افضل ہے:**

تیسری بات سمجھیں! اللہ رب العزت نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو

معراج کرایا ہے۔ پیغمبر میں ایک صفت نہیں ہے کئی ان گنت اوصاف ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک کمال نہیں ہے بلکہ بے شمار کمالات موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیت نہیں ہے بلکہ رسالت کے کئی خصائص ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں سے سب سے بہتر وصف کا تذکرہ کیا۔ فرمایا: ﴿سُبْحَنَ الَّذِي آمَنَّا بِعَبْدِهِ﴾ یہاں ”بِعَبْدِهِ“ فرمایا ہے، ”بِنَسَبِهِ“ نہیں فرمایا۔ کیوں کہ اللہ نے اپنے نبی کے سب اوصاف میں سب سے بہتر وصف ”عبودیت“ کو ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں جتنی صفیں آتی ہیں ان تمام صفات میں بہتر صفت عبودیت یعنی عاجزی اور تواضع ہے۔ اب اس کو حدیث مبارک کی روشنی میں سمجھیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ تَوَاضَعَ لِلدَّوْرَةِ فَفَعَهُ اللَّهُ"<sup>45</sup>

کہ جب انسان عاجزی اختیار کرتا ہے تو اللہ اتنی ہی بلندیاں عطا فرماتے ہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر دنیا میں متواضع کوئی نہیں اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر خدا نے دنیا میں بلندی بھی کسی کو عطا نہیں فرمائی ہے۔ انسان میں جس قدر تواضع بڑھتی جائے گی اللہ اسی قدر لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام بھی بڑھاتے جائیں گے اور بندہ جس قدر تکبر کرتا چلا جائے گا تو اللہ اسی قدر اس کو فنا کرتے چلے جائیں گے۔

**اس امت کے متواضع کے ہاتھوں امت کے متکبر کا قتل:**

اس سے آپ ایک چھوٹی سی بات سمجھیں! اس امت کا فرعون ابو جہل ہے۔ ابو جہل میں کبر اور تکبر کی انتہا ہے۔ دنیا میں اگر کسی نے اکڑ والے لوگ دیکھے ہوں تو

شاید ابو جہل سے زیادہ اکر نے والا کوئی نظر نہ آئے۔ یہ بے ایمان فرعون سے بھی زیادہ متکبر تھا۔ جب فرشتے فرعون کی موت کا پیغام لے کر آئے، فرعون جب مرنے اور پانی میں بہنے لگا تو اس نے بھی کہا تھا: ﴿أَمْسَتْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا الَّذِي آمَسَتْ بِهِ بَنُوآ إِسْرَآئِيلَ﴾ کہ میں اب ایمان لاتا ہوں۔ اللہ نے فرمایا: ﴿آتَنَّا وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ﴾<sup>46</sup> کہ اب کلمہ پڑھتا ہے، عذاب کو دیکھ کر کلمہ پڑھتا ہے، پہلے کلمہ کیوں نہیں پڑھا؟ فرعون متکبر تھا لیکن عذاب کو دیکھ کر وہ بھی کلمہ پڑھنے لگا لیکن ابو جہل کی گردن کاٹی جا رہی ہے، عذاب میں مبتلا ہے، جہنم میں داخل ہونے لگا ہے لیکن اس بے ایمان نے اس وقت بھی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا: او چرواہے! تو میرے سینے پر چڑھ کر بیٹھا ہے، دنیا میں اس سے بڑھ کر تیرے لیے اعزاز کیا ہے کہ تو چرواہا ہو کر سردار کے سینے پر بیٹھا ہے۔ تو اپنی تلوار سے مجھے نہ مارنا! لوگ طعنہ دیں گے کہ چرواہے کی تلوار سے کٹا ہے، یہ میری تلوار پکڑ اور اس سے مجھے قتل کر!

آپ اندازہ کریں کہ ابو جہل نے متکبرانہ انداز میں کہا کہ میری تلوار سے مجھے قتل کر تا کہ لوگ طعنہ نہ دیں کہ چرواہے کی تلوار سے سردار کا قتل ہوا تھا۔ پھر ابو جہل نے کہا کہ گلہ ادھر اوپر سے نہیں بلکہ ذرا نیچے سے کاٹنا تا کہ پتا چلے کہ سردار کا سر پڑا ہے اور کہا کہ عبد اللہ! جا کر اپنے ساتھی (رحمت کائنات صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہنا کہ جتنی مجھے تجھ سے دنیا میں نفرت تھی آج اس سے بھی زیادہ ہے العیاذ باللہ۔<sup>47</sup>

اللہ کی شان دیکھیں! ابو جہل سے زیادہ متکبر کوئی نہیں اور عبد اللہ بن مسعود

رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں کہ جن کے بارے میں روایات میں ہے کہ اگر ایسے شخص کو دیکھنا ہو کہ جس کے دل میں کبر کا نام و نشان تک نہ ہو تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو دیکھ لو! جو آدمی عبودیت کے اعلیٰ مقام پر تھا خدا نے اس سے اس شخص کو قتل کروایا ہے جو تکبر کے آخری مقام پر تھا۔ اللہ کا نظام یہ ہے کہ جب انسان اکڑتا ہے اللہ اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ دعا کریں اللہ رب العزت ہمیں کبر سے محفوظ فرمائے، اللہ ہمیں عاجزی عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

تو میں کہہ رہا تھا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں سے صفت عبد کو خدا نے ذکر فرمایا کہ میں نے اپنے محبوب کو معراج کرایا ہے، یہ میرا محبوب بھی ہے اور عبد بھی ہے۔

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کھانے کے لیے بیٹھے تو ایسے بیٹھے جیسے غلام بیٹھتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"أَكُلُ كَمَا يَأْكُلُ الْعَبْدُ."<sup>48</sup>

کہ میں ایسے کھاتا ہوں جیسے غلام کھاتا ہے۔

### ام ہانی کے گھر سے سفر کی ابتدا:

چوتھی بات سمجھیں! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج پر تشریف لے جانے لگے تو حضرت ام ہانی کے گھر سوئے ہیں، جبرائیل امین چھت چھاڑ کر آئے ہیں دروازے سے نہیں آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھایا اور کعبہ لے گئے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم حطیم کعبہ میں سو گئے۔ وہاں سے ان کو جگایا اور زم زم کے کنویں کے پاس لے گئے۔ وہاں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک سینہ کو شق کیا

اور قلبِ اطہر کو نکال کر زم زم کے پانی سے دھویا اور سونے کا طشت جنت سے لائے تھے، اس میں ایمان اور حکمت بھرا ہوا تھا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر میں ڈالا، پھر سینہ مبارک کو بند کیا، پھر براق سواری پر بٹھایا۔ حضرت جبرائیل نے لگام پکڑی ہے اور حضرت میکائیل نے رکاب تھامی ہے۔ اس اعزاز کے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ ایک طرف جبرائیل اور ایک طرف میکائیل ہے۔

حضرت ام ہانی کے گھر جب جبرائیل آئے تو دروازے سے نہیں آئے چھت پھاڑ کر آئے ہیں یہ بتانے کے لیے کہ آج کے سارے معاملات عادت سے ہٹ کر ہیں، یہ روٹین کی زندگی نہیں ہے، یہ روٹین سے بالکل مختلف ہے۔ حضور! آپ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم حطیم کعبہ کے بجائے حضرت ام ہانی کے گھر سے بھی جاسکتے تھے لیکن اللہ نے حضرت ام ہانی کے گھر کے بجائے کعبہ سے معراج کا آغاز کروا کر یہ بتایا کہ جس مقام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا آغاز ہوا ہے اس کا نام کعبہ ہے اور جہاں پر اختتام ہوا ہے اس کا نام عرشِ معلیٰ ہے۔

”کعبہ“ مکانِ اول کا نام ہے اور ”عرش“ مکانِ آخر کا نام ہے۔ یہ بتانے کے لیے کہ جس طرح کعبہ سے مکانات کی ابتدا ہے اور عرش پر مکانات کی انتہا ہے اسی طرح میرے محبوب سے مقامات کی ابتدا ہے اور میرے محبوب پر مقامات کی انتہا ہے، عرش سے اوپر مکان نہیں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کا مقام نہیں ہے، عرش پر مکانات کی انتہا ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مقامات کی انتہا ہے۔

محدثین نے لکھا ہے کہ اس سے یہ بھی پتا چلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ کیوں کہ اگر اس کے بعد کوئی اور مقام ہوتا تو اللہ وہاں تک بھی لے کر جاتے، مقامات سارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر دیے۔ فرمایا کہ نبیوں کو

مقامات دیے ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سارے مقامات ختم کر کے بتا دیا کہ اس کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا و نہ اس کے بعد کوئی مقام ہے اور نہ ہی کوئی مکان ہے۔

### حطیم کعبہ سے سفر کی ابتدا کی وجہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے لیے گئے ہیں تو کعبہ کے دو حصے ہیں؛ ایک جو تعمیر شدہ ہے اور ایک حطیم کعبہ ہے جو تعمیر شدہ نہیں ہے، ثواب میں دونوں برابر ہیں لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک کمرہ بنا ہوا ہے اور ایک کی دیوار پانچ فٹ کے قریب ہے۔ اس پر تین فانوس بھی لگے ہوئے ہیں۔ ایک راستہ آنے کا اور ایک راستہ جانے کا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ وہاں سے لے جاسکتے تھے جو حصہ تعمیر شدہ ہوا ہے لیکن وہاں سے لے گئے جو تعمیر شدہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے ہم غریبوں اور مسکینوں پر کرم فرمایا ہے کہ اگر کعبہ کے چھتے ہوئے حصے سے جاتے تو میں اور آپ چاہتے کہ وہ جگہ دیکھیں جہاں سے حضور گئے تھے، وہاں کے منتظمین نے کہنا تھا کہ یہ دروازہ صدر اور وزیر کے لیے کھلتا ہے ہر بندے کے لیے نہیں کھلتا، اللہ نے اس جگہ کے بجائے اس مقام سے معراج کرایا ہے جو غریبوں کی جگہ ہے، نہ آنے پر پابندی ہے نہ جانے پر پابندی ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

اللہ رب العزت نے مساکین کا کتنا خیال فرمایا ہے!

### زمزم کے پانی سے قلبِ اطہر دھونے میں حکمت:

پھر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا شوق صدر ہوا۔ زم زم کے پانی سے اللہ کے رسول کے قلبِ اطہر کو دھویا گیا۔ یہاں محدثین نے مستقل بحث چھیڑی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کو دھونے کے لیے وہاں سے آب کوثر کا پانی آسکتا تھا، آب کوثر کے بجائے زم زم کے پانی کا استعمال کیوں ہوا؟ حکیم الامت

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ زم زم کا پانی آب کوثر سے بھی افضل ہے اس لیے آب کوثر کے بجائے زم زم کے پانی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کو دھویا۔

### براق کی رفتار:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری براق کے بارے میں آیا ہے کہ اتنی تیز رفتار تھی کہ جہاں نگاہ پڑتی وہیں اس کا قدم پڑتا تھا۔ کوئی شخص کہے کہ اتنی تیز رفتار تھی؟ ہم نے کہا کہ نام دیکھ کے تو سمجھ آ جانی چاہیے کہ اتنی تیز رفتار کیوں ہے؟ ”براق“ بَرَق سے ہے، برق کا معنی بجلی ہے، دنیا کی بجلی میں رفتار کتنی ہے! آپ بتائیں کہ پشاور میں آپ بٹن آن کریں تو کراچی میں لائٹ جل جاتی ہے، یہ تو دنیا کی بجلی ہے جو ایک سینکڑں میں ہزاروں کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے اور یہ تو جنت کی تھی۔ اگر وہ ایک سینکڑں میں کروڑوں کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لے تو یہ عقل کے خلاف نہیں ہے۔

### ایمان و حکمت سے قلب کو بھرنا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سونے کا طشت لایا گیا تھا جس میں ایمان اور حکمت تھی۔ اس کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر میں ڈال دیا گیا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اپنی کتاب ”نشر الطیب بذکر النبی الجبیب صلی اللہ علیہ وسلم“ میں لکھتے ہیں کہ کسی بندے کے ذہن میں سوال آتا ہے کہ سونے کے برتن کو استعمال کرنا تو جائز ہی نہیں ہے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کا استعمال کیسے ہوا؟

حضرت فرماتے ہیں کہ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ مکہ میں استعمال ہوا اور سونے کے برتن کے استعمال پر پابندی مدینہ منورہ میں ہوئی۔

اور دوسرا جواب یہ دیا کہ سونے کا برتن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال نہیں فرمایا بلکہ ملائکہ نے استعمال کیا ہے۔ یہ حکم انسانوں کے لیے ہے ملائکہ کے لیے نہیں ہے۔

اور تیسرا جواب یہ دیا ہے کہ یہ سارے معاملات معراج کے لیے تھے جو امورِ آخرت سے تعلق رکھتے تھے اگرچہ اس عالم میں تھے لیکن تھے اگلے عالم کے، اور جب ہم اگلے عالم میں جائیں گے تو وہاں سونے کا استعمال مرد بھی کریں گے اور عورتیں بھی کریں گی، نبوت نے کر لیا تو خلافِ عادت اور خلافِ شرع نہیں ہے۔

### زمینی سفر کے پانچ مقامات پر ٹھہراؤ!

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے چلے تو راستے میں جبرائیل امین علیہ السلام نے کہا کہ یہاں اتریں دو رکعات پڑھیں، یہ ”یثرب“ ہے آپ کی ہجرت کی جگہ۔ پھر سوار ہوئے آگے چلے۔ جبرائیل امین نے پھر کہا: یہاں بھی دو رکعات نماز پڑھیں، یہ ”مدین“ ہے حضرت شعیب علیہ السلام کا علاقہ۔ پھر وہاں سے چلے۔ جبرائیل امین نے پھر کہا کہ یہاں بھی دو رکعات نفل پڑھیں۔ یہ ”طورِ سیناء“ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خدا سے ہم کلام ہونے کی جگہ۔ پھر وہاں سے آگے چلے، دو رکعات نفل پڑھیے یہ ”بیت اللحم“ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے۔ وہاں سے آگے چلے تو ”بیت المقدس“ آگیا۔ اس میں بھی دو رکعات نماز پڑھی۔ یہ بہت سارے انبیاء علیہم السلام کی مسجد اور قبلہ ہے۔ چونکہ آپ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لیے آپ کو باقی انبیاء علیہم السلام کے خاص خاص مقامات دکھائے جارہے ہیں۔

ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ اقصیٰ ہی میں تھے کہ ایک مؤذن نے اذان دی اور اقامت کہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہم صف باندھ کر کھڑے ہوئے، انتظار کر رہے تھے کہ امامت کون کرے گا؟ تو جبرائیل امین نے



میرا ہاتھ پکڑا اور مصلے پر کھڑا کر دیا تو میں نے سب کو نماز پڑھائی۔ نماز پڑھانے سے جب میں فارغ ہوا تو جبریل امین نے مجھ سے کہا: کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے کن لوگوں کو نماز پڑھائی ہے؟ میں نے کہا: مجھے معلوم نہیں۔ عرض کیا کہ آپ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو نماز پڑھائی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امام بنے ہیں اور باقی انبیاء علیہم السلام مقتدی بنے ہیں۔

### دور رکعت سے کم کوئی نماز نہیں:

اب یہاں پر دو مسئلے سمجھنا!

[۱]: دنیا میں اتنا لمبا سفر اور اتنے تھوڑے وقت میں کبھی کسی نے طے نہیں کیا۔ اس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ آپ بتائیں! جب سفر بہت لمبا ہو اور وقت بہت تھوڑا ہو تو نماز چھوٹی سے چھوٹی پڑھتے ہیں یا بڑی سے بڑی پڑھتے ہیں؟ (چھوٹی پڑھتے ہیں۔ سامعین) اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یثرب یعنی مدینہ میں دو رکعات پڑھیں، مدین میں دو رکعات پڑھیں، طور سینا میں دو رکعات پڑھیں، بیت اللحم میں دو رکعات پڑھیں اور بیت المقدس میں دو رکعات پڑھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ مقامات پر نماز پڑھی ہے اور اس لمبے سفر میں تھوڑے وقت میں چھوٹی سے چھوٹی نماز دو رکعات پڑھی ہے۔ اس سے پتا چلا کہ دو رکعات سے کم نماز کا شریعت میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اگر ایک رکعت کا جواز ہوتا تو کسی جگہ پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت تو پڑھ لیتے نا! اس لیے کم از کم دو رکعات ہیں، ایک رکعت وتر کی کوئی ہم سے بات نہ کرے۔

### ایک رکعت وتر پڑھنے والوں سے سوال:

اور میں آپ سے کہا کرتا ہوں کہ جو بندہ آپ سے ایک رکعت وتر کا کہے تو اگر آپ زیادہ دلائل نہ دے سکتے ہوں تو ایک دلیل ذہن میں رکھ لیں۔ آپ اسے کہنا

کہ ہم وتر کی تین رکعتیں پڑھتے ہیں۔ پہلی رکعت میں ﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ اور دوسری میں ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ﴾ اور تیسری میں ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ پڑھتے ہیں۔ یہ ہم نے حدیث کی روشنی میں تین رکعتیں اور تین سورتیں بتائی ہیں۔

اگر آپ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وتر ایک رکعت پڑھتے تھے تو ایک حدیث آپ بھی بتادیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت پڑھتے تھے اور یہ سورت پڑھتے تھے۔ اگر نہیں ملتی تو مان لیں کہ وتر ایک نہیں بلکہ تین رکعات ہیں۔

### امام کے پیچھے قرأت نہ کی جائے:

[۲]: دوسرا مسئلہ یہ سمجھیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم امام بنے اور باقی انبیاء علیہم السلام مقتدی بنے ہیں۔ نمازیوں کی تین قسمیں ہیں:

1: امام بھی امتی اور مقتدی بھی امتی۔

2: امام نبی اور مقتدی صحابہ۔

3: امام بھی نبی اور مقتدی بھی نبی۔

توجہ رکھنا! ہمارے ہاں جامع مسجد عثمانیہ سرگودھا میں جو جماعت ہو رہی ہے امام مولانا محمد عمر صاحب بھی امتی ہیں اور ہم بھی امتی ہیں، مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم امام تھے اور نبی تھے، صحابہ مقتدی تھے اور امتی تھے اور بیت المقدس میں امام بھی نبی ہے اور مقتدی بھی نبی ہیں۔

آپ بتائیں کہ کون سی نماز سب سے افضل ہو سکتی ہے؟ (جس میں امام بھی نبی ہو اور مقتدی بھی نبی ہوں۔ سامعین) اب آپ سب سے افضل نماز دیکھ لیں اس میں امام نے سورۃ الفاتحہ پڑھی ہے اور کسی آیت یا کسی حدیث یا کسی تاریخ کی کتاب میں نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھی ہے۔ معلوم ہوا کہ بہترین نماز وہ ہے کہ جب امام فاتحہ پڑھے تو مقتدی فاتحہ نہ پڑھیں۔ قیامت کے دن اللہ

فرمائیں کہ جن لوگوں نے امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی تھی وہ کھڑے ہو جاؤ ہم نے ان کو اُن کے پیچھے لے کر جانا ہے جنہوں نے فاتحہ نہیں پڑھی تھی، ہم کھڑے ہوں گے اور انبیاء علیہم السلام کے پیچھے چل پڑیں گے۔

انبیاء علیہم السلام کی نماز قابل قبول ہے اور ہماری نماز قابل قبول نہیں ہے؟ اس فتویٰ لگانے والے کو کچھ شرم اور عقل کرنی چاہیے کہ میں فتویٰ کیا لگا رہا ہوں کہ جس نے امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوگی! اس کا معنی کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام کی نماز نہیں ہوئی ہے، یہ فتویٰ ہم پر نہیں ہے یہ براہ راست اللہ کے انبیاء علیہم السلام پر فتویٰ لگ رہا ہے۔ اس لیے یہ فتوے اتنے جلدی نہ لگایا کرو۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

### نماز انبیاء علیہ السلام کے اجسام نے پڑھی ہے:

ایک مسئلہ اور سمجھیں۔ انبیاء علیہم السلام نے بھی نماز پڑھی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پڑھی ہے۔ باقی انبیاء علیہم السلام مقتدی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے امام بنے ہیں۔ اب یہاں بحث چلی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام مثالی تھے یا اجساد مثالی نہیں تھے بلکہ جسد غضری کے ساتھ تھے؟ ہمارا موقف یہ ہے کہ جس طرح نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم دنیا والے جسم کے ساتھ تھے باقی انبیاء علیہم السلام بھی دنیا والے جسم کے ساتھ تھے۔ اعزاز تو تب ہی بنے گا نا کہ آگے دنیا والا جسم ہو اور پیچھے بھی دنیا والے جسم ہوں اور اگر آگے دنیا والا جسم ہو اور پیچھے روحیں ہوں تو اعزاز کیسے ہوگا؟

### انبیاء جب قبروں میں ہیں تو بیت المقدس میں کیسے؟

ایک شخص نے مجھے اٹک سے فون کیا اور کہنے لگے کہ مولانا صاحب! اگر یہ بات مان لی جائے جو آپ لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں

زندہ ہیں، اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں جب انبیاء علیہم السلام قبروں میں نماز پڑھتے ہیں تو بیت المقدس میں نماز پڑھنے والے کون تھے؟ اور اگر بیت المقدس میں نماز پڑھنے والے انبیاء ہیں تو بتائیں پھر قبروں میں کون تھے؟ وہ ثابت یہ کرنا چاہتا تھا کہ قبروں میں تو انبیاء علیہم السلام ہیں دنیا والے جسم کے ساتھ اور یہاں معراج کے موقع پر بیت المقدس میں انبیاء علیہم السلام کی رو حیں آئی ہیں تاکہ اعتراض نہ ہو۔

میں نے کہا کہ ہم دیوبند والے ہیں، ہم اپنے عقیدے کا تحفظ کرنا جانتے ہیں اور ہم بڑے شرح صدر سے عقیدہ بیان کرتے ہیں، ہم اس طرح نہیں کرتے کہ ہمارے پاس دلیل نہ ہو۔ میں اکثر حضرات سے کہتا ہوں کہ ہمارے اکابر نے یہ فرمایا ہے... میں صرف یوں نہیں کہتا کہ ”ہمارے اکابر نے یہ فرمایا ہے“ بلکہ میں کہتا ہوں کہ ”ہمارے اکابر نے فرمایا اور ہمارے اکابر کے فرمانے کی یہ وجہ ہے...“ ہم اپنے اکابر کے مسئلے کو دلیل سے بیان کرتے ہیں، بغیر دلیل کے بیان نہیں کرتے۔

### آدم بر سر مطلب:

جو بندہ آپ سے کہے کہ ”امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھیں تو نماز نہیں ہوتی“ آپ اس سے پوچھنا کہ یہ فتویٰ جامع مسجد عثمانیہ والوں پر ہے یا بیت المقدس کے انبیاء علیہم السلام پر ہے؟ یہ فتویٰ کس پر لگا رہے ہو؟ حنفیوں پر لگا رہے ہو یا بیت المقدس کے انبیاء علیہم السلام پر لگا رہے ہو؟ اگر ان کی ہو جاتی ہے تو پھر ہماری کیوں نہیں ہوتی؟

### مذکورہ اشکال کا جواب:

میں نے اس سے کہا: آپ کہاں سے ہیں؟ مجھے کہتا ہے کہ جی میں اٹک کا ہوں۔ کہاں پڑھتے ہو؟ کہتا ہے: راولپنڈی میں۔ میں نے کہا کہ کیوں جھوٹ بولتے ہو؟ اس نے کہا کہ جھوٹ نہیں ہے، میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو! اس نے کہا: کیسے؟ میں نے کہا کہ اٹک میں رہتے ہو تو راولپنڈی کیسے پڑھتے ہو؟ مجھے تمہاری

بات سمجھ نہیں آرہی! کہتا ہے کہ مولانا صاحب! میں رہتا اٹک میں ہوں لیکن پڑھنے کے لیے پنڈی آتا ہوں۔ میں نے کہا کہ انبیاء علیہم السلام رہتے قبروں میں ہیں لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے بیت المقدس آئے ہیں، جس طرح تو رہتا اٹک میں ہے اور پڑھنے کے لیے پنڈی آیا ہے، وہ رہتے قبروں میں ہیں لیکن حضور کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے بیت المقدس آئے ہیں۔ ان کا بیت المقدس میں آنا قبروں میں رہنے کے خلاف نہیں ہے۔

### توضیح بالمثال:

مجھ سے آپ پوچھیں کہ مولانا صاحب! آپ کہاں رہتے ہیں؟ میں کہوں کہ 87 جنوبی میں۔ آپ کہیں کہ آپ تو عثمانیہ مسجد سرگودھا میں ہیں! میں کہوں گا کہ یار میں رہتا 87 میں ہوں لیکن یہاں درس دینے کے لیے آیا ہوں۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام رہتے قبروں میں ہیں اور بیت المقدس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے آئے تھے۔

### بیت المقدس سے عرش معلیٰ کا سفر:

بیت المقدس تک کا سفر براق پر ہوا ہے۔ اب اگلا سفر معراج کا شروع ہونے والا ہے۔ ”معراج“ سیڑھی کو کہتے ہیں۔ سیڑھی کیسی ہے؟ اس کی شان اللہ ہی جانتا ہے۔ نبی بھی بے مثال ہے، اللہ بھی بے مثال ہے، معراج کی پوری رات بھی بے مثال ہے، وہاں کی سیڑھیاں بھی بے مثال ہیں۔ ہم بتا تو سکتے ہیں شاید سمجھانہ سکیں۔

اور دنیا میں آج بھی مختلف قسم کی سیڑھیاں ہیں۔ پہلے سیڑھیاں لکڑی کی ہوتی تھیں، اب فولڈنگ والی سیڑھیاں اور لوہے والی سیڑھیاں ہیں۔ اب لفٹ کی صورت میں سیڑھیاں آئی ہیں۔ ہمارے دور کی سیڑھیاں بدل رہی ہے تو اللہ نے کون سی سیڑھی دی یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔

## تین پیالے ان سے مراد:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں جانے لگے۔ حدیث پاک میں ہے کہ فرشتے نے آپ کے سامنے تین پیالے پیش کیے؛ ایک پیالہ پانی کا، ایک دودھ کا اور ایک شراب کا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا پیالہ استعمال فرمایا۔ جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ پانی کا پیالہ پی لیتے تو آپ کی امت سیلاب میں غرق ہو جاتی، اگر آپ شراب کا پیالہ پی لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی، آپ نے فطرت کا خیال کیا ہے اور آپ نے دودھ کا استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہدایت بھی رہے گی اور اس امت میں علم بھی رہے گا ان شاء اللہ۔ گمراہ کرنے والے آئیں گے لیکن نہیں کر سکیں گے، خدا تعالیٰ قیامت تک ایسے علم والے حضرات رکھیں گے جو امت کی صحیح رہنمائی کرتے رہیں گے۔ اللہ ہمیں ان کے ساتھ رکھیں جو صحیح رہنمائی کرنے والے ہیں۔

## آسمانوں پر انبیاء علیہ السلام سے ملاقاتیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس سے چلے۔ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام سے ملاقات ہوئی، تیسرے آسمان پر حضرت یوسف سے، چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے، پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام سے، چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔

## اس ملاقات میں حکمتیں:

علماء نے نکتہ لکھا ہے کہ....

پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات کیوں ہوئی؟ کیونکہ وہ



حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ ہیں، پوری انسانیت کے والد ہیں، ان کا حق یہ تھا کہ پہلے ان سے ملاقات ہو۔

☆ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کیوں ہوئی؟ اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر گئے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ آسمان پر گئے ہیں، دونوں زندہ جانے والوں کو خدا نے ملا دیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام ان کے کزن تھے اس لیے ساتھ ان کی ملاقات بھی کرائی ہے۔

☆ اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کیوں ہوئی؟ کیونکہ یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے دکھ دیا تھا، تو ان سے ملاقات میں حضور علیہ السلام کو بتانا مقصود ہے کہ جس طرح یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے ستایا تھا اسی طرح آپ کو بھی رشتہ داروں نے ستایا ہے، ایک وقت آیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب فاتح بنے تو ﴿لَا تَتْرِبْ عَلَیْكُمْ الْیَوْمَ﴾<sup>49</sup> کہا تھا۔ میرے محمد! ایک دور آئے گا کہ آپ بھی یوسف علیہ السلام کی طرح مخالفین کی خطائیں معاف کریں گے، جن مراحل سے وہ گزرے ہیں آپ بھی ان مراحل سے گزریں گے۔

☆ اس کے بعد حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات کیوں ہوئی؟ اس لیے کہ ادریس علیہ السلام انبیاء علیہم السلام میں سے وہ نبی ہیں جنہوں نے ملوک یعنی بادشاہوں کو خط لکھے ہیں۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بادشاہوں کو خطوط لکھے ہیں اس لیے خدا نے دونوں کی ملاقات کرائی ہے۔

☆ حضرت ہارون سے ملاقات کیوں ہوئی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر گئے تو پیچھے قوم نے شرک کیا تھا تو مشرکین کو قتل کیا ہے۔ اللہ نے ملاقات کروا

کر بتایا کہ آپ کی قوم کے مشرکین کو بھی قتل کیا جائے گا، تو بدر میں بھی قتل ہوئے، احد میں بھی قتل ہوئے، فتح مکہ کے موقع پر بھی عنادی افراد قتل ہوئے۔

☞ موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کیوں ہوئی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی شام میں جہاد کیا ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی شام کے جہاد کے لیے تبوک تک تشریف لائے ہیں، شام، موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے جانشین حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے ہاتھوں فتح ہوا ہے تو اشارہ فرمایا کہ شام آپ کے ہاتھوں نہیں لیکن آپ کے جانشین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہو گا۔

☞ سب سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کیوں ہوئی؟ کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اس کعبہ کے محافظ ہیں اور ابراہیم علیہ السلام اس کعبہ کے بانی ہیں۔ فرمایا کہ محافظ؛ بانی کو بھی دیکھ لے۔

بیت المعمور جو بالکل کعبہ کے وسط پر ہے وہاں ابراہیم علیہ السلام ٹیک لگا کر بیٹھے ہیں، ستر ہزار فرشتے روزانہ اس بیت کا طواف کرتے ہیں، جو فرشتہ ایک بار آیا دوبارہ اس کی باری قیامت تک نہیں آئے گی۔

### سدرۃ المنتہیٰ پر آمد:

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے اوپر چلے گئے اور سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے۔ ”سدرۃ“ بیری کا نام ہے۔ بیری یوں نہ سمجھیں جیسے ہمارے ہاں کی بیری ہوتی ہے۔ وہ بیری کیسی ہے یہ خدا ہی جانتا ہے!

### متکلم اسلام کا خواب اور امام اہل السنۃ کی تعبیر:

سدرۃ پر مجھے ایک بات یاد آئی۔ میں ایسی باتوں کا عموماً تذکرہ کرتا نہیں ہوں لیکن میرے پاس یہ تحریریں لکھی ہوئی موجود ہیں۔ ہمارے اساتذہ کو پتا ہے کہ ایسی تحریروں کا پورا ایک رجسٹر ہے۔ میں اساتذہ سے کہتا ہوں کہ اس کو میرے مرنے کے



بعد چھاپیں، اس کو میری زندگی میں شائع نہ کریں، بعض وہ خواب ہیں جو لوگوں نے ہمارے بارے میں دیکھے ہیں اور بعض وہ ہیں جو میرے اپنے خواب ہیں۔

مجھے اڈیالہ جیل میں 302 کے جھوٹے کیس میں 25 سال کی قید تھی۔ تو میں نے اس وقت ایک خواب دیکھا۔ وہ خواب میں نے لکھ کر امام اہل السنۃ والجماعۃ شیخ التفسیر والحديث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ کو بھیجا۔ وہ خواب یہ تھی کہ میں نے بیری کا ایک درخت دیکھا جس پر موٹے موٹے بیر لگے ہیں۔ میں اور مجھ سے جو دو چھوٹے بھائی ہیں وہ اس سے بیر توڑ رہے ہیں اور اپنی جھولیوں میں ڈال رہے ہیں۔ اچانک میری آنکھ کھلی اور میری زبان پر یہ آیت جاری تھی:

﴿فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ۖ وَطَلْحٍ مَّنْضُودٍ ۖ﴾

”سدر“ بیری کو کہتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ حضرت شیخ مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ عجیب معبر تھے۔ انہوں نے مجھے جواب لکھا کہ تم اور تمہارے بھائیوں کے مال اور اولاد میں اللہ بہت برکت دے گا۔ میں نے جب وہ تعبیر دیکھی تو جو میرے ساتھ جیل میں ساتھی تھے شام کو میں نے ان سے کہا کہ میری رہائی آگئی ہے۔ انہوں نے مذاق میں کہا کہ تم نے بہت چالاکی کی ہے! ان کا خیال یہ تھا کہ اندر اندر سے اس نے ہائی کورٹ میں رٹ کی اور ہمیں بتایا ہی نہیں ہے اور آج کسی سپاہی نے بتایا ہو گا کہ تمہاری رہائی ہو گئی ہے اور تم جانے والے ہو۔ انہوں نے تعجب سے کہا کہ ہمیں کیوں نہیں بتایا؟ میں نے کہا کہ میرے وکیل نے کیس نہیں لڑا، وہ تو لڑے گا ان شاء اللہ لیکن میں نے امام اہل السنۃ کو خواب لکھ بھیجا تھا تو انہوں نے مجھے تعبیر دی ہے۔ پھر میں نے مذاق کے طور پر کہا کہ جیل میں رہ کر مال میں برکت ہوتی ہے لیکن اولاد کی برکت کے لیے تو مجھے باہر جانا پڑے گا نا! یعنی جیل میں رہ کر مال تو بڑھ سکتا ہے اولاد کیسے بڑھی گی؟

آج ہماری ایک بیوی نہیں بلکہ تین بیویاں ہیں تو برکت ہوئی ہے یا نہیں؟ (ہوئی ہے۔ سامعین) ایک وقت وہ تھا کہ میرے پاس سائیکل تک نہیں تھی اور اب میری ستر لاکھ کی گاڑی ہے۔ اب بتاؤ! یہ برکت ہے یا نہیں؟ میں پیسے کماتا تھوڑی ہوں۔ آپ تو میرے شہر کے ہیں، اس لیے آپ کو اس کی قیمت محسوس نہیں ہوتی اور باہر کے لوگ جب کبھی دیکھتے ہیں ناکبھی ٹیلی فون پر بات ہو جائے، کبھی مصافحہ ہو جائے تو اس کی قیمت ان کو سمجھ آتی ہے، آپ کو تو پتا ہے کہ درس ہونا ہی ہونا ہے... خیر یہ تو میں ویسے مذاق کر رہا تھا۔ اللہ میرے اور آپ کے سارے اعمال کا بدلہ آخرت میں عطا فرمائے۔ یہ تو ویسے بات چلی ہے تو میں نے کہہ دیا ہے۔

آج کی زبان میں ”سدرۃ المنتہی“ کو اس طرح سمجھیں کہ یہ اوپر سے نیچے آنے والے احکامات اور نیچے سے اوپر جانے والے اعمال کا جنکشن ہے۔ نیچے سے جو اعمال جاتے ہیں وہاں رک جاتے ہیں پھر اوپر جاتے ہیں، اوپر والے احکام وہاں رکتے ہیں پھر نیچے آتے ہیں۔ تو ”سدرۃ المنتہی“ جنکشن ہے۔ یہاں جبرائیل امین رک گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے بھی اوپر گئے ہیں۔ جبرائیل امین نے کہا کہ حضور! ہماری پرواز یہاں تک ہے، اس سے آگے جانے کی ہمیں اجازت نہیں ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پھر وہاں سے اوپر گئے ہیں، پھر آگے ”صریف الاقلام“ تک گئے ہیں۔ ”صریف الاقلام“ کا معنی کہ تقدیر کے قلم کے چلنے کی آواز آرہی ہے۔ یہ تقدیر کے قلم خدا کے حکم سے چلتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے اوپر گئے۔ اب اللہ کے نبی مکان سے لامکان تک پہنچے ہیں۔ اللہ کے نبی نے اللہ رب العزت کی بات کو براہِ راست سنا ہے اور اللہ کی ذات کو براہِ راست دیکھا ہے۔

**معراج کی رات دیدارِ باری تعالیٰ:**

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا:

"رَأَيْتُ رَبِّيَّ عَزَّ وَجَلَّ." <sup>50</sup>

میں نے اللہ رب العزت کو دیکھا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"رَأَيْتُ النُّورَ الْأَعْظَمَ." <sup>51</sup>

میں نے نور اعظم کو دیکھا ہے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے بلا واسطہ گفتگو بھی کی ہے اور خدا کا دیدار بھی بلا واسطہ کیا ہے۔

### دیدارِ باری تعالیٰ پر اعتراض کے جوابات:

میں اس پر بیانات کرتا رہتا ہوں، آپ سنتے رہتے ہیں، میں نے بتایا تھا کہ ایک مولوی صاحب نے ہمارے دیوبند کے اس عقیدے پر اعتراض کیا۔ کہنے لگا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کو نہیں دیکھ سکتے۔ کیوں کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ <sup>52</sup>

کہ کوئی آنکھ بھی خدا کو نہیں دیکھ سکتی اور جس حدیث میں ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے۔ لہذا ہم اس حدیث کو

50۔ الخصائص الکبریٰ للسیوطی: ج 1 ص 268

51۔ الخصائص الکبریٰ للسیوطی: ج 1 ص 262

52۔ الانعام 6: 103

نہیں مانتے جو قرآن کے خلاف ہو۔

میں نے کہا کہ دیوبند والے حدیث بھی مانتے ہیں اور قرآن بھی مانتے ہیں۔  
میں نے کہا: قبلہ! اللہ آپ کو ہدایت عطا فرمائے۔ ہم تو تبلیغی، خانقاہی، دیوبندی لوگ  
ہیں، ہم بد دعائیں نہیں دیتے ہم تو دعائیں دیتے ہیں کہ اللہ تمہیں ہدایت عطا فرمائے اور  
ہدایت کے بعد جنت میں جگہ عطا فرمائے۔ تو بتاؤ کہ آپ جنت میں اللہ کا دیدار کرو  
گے؟ اس نے کہا کہ جی ہاں۔ میں نے کہا کہ کہاں لکھا ہے؟ کہا کہ حدیث میں لکھا ہے کہ  
اہل جنت؛ جنت میں خدا کا دیدار کریں گے۔ میں نے کہا کہ میں اس حدیث کو نہیں  
مانتا؟ مجھے کہتا ہے: کیوں؟ میں نے کہا کہ یہ حدیث قرآن کی اس آیت کے خلاف ہے:

﴿لَا تَدْرِيكَ إِلَّا بَصَارٌ﴾

کہ کوئی آنکھ بھی خدا کو نہیں دیکھ سکتی۔

تو آپ کیسے دیکھیں گے؟ کہتا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر  
کوئی بندہ خدا کو نہیں دیکھ سکتا، میں تو جنت میں خدا کو دیکھوں گا۔ میں نے کہا کہ ہم کب  
کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو فرش پر دیکھا ہے، ہم بھی تو کہتے ہیں کہ  
عرش پر جا کر دیکھا ہے، تم جنت میں جا کر دیکھ لو تو قرآن کے خلاف نہیں ہے اور حضور  
صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر جا کر دیکھیں تو یہ قرآن کے خلاف کیسے ہے؟

**حضرت عائشہ کا موقف ہمارے خلاف نہیں:**

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھیں تاکہ آپ کو کوئی بندہ دھوکہ نہ دے  
سکے۔ اگر کوئی کہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت صحیح بخاری  
میں موجود ہے کہ امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم  
نے خدا کا دیدار نہیں کیا! جو کہتا ہے کہ دیدار کیا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے۔

اگر کوئی آپ سے یہ بات کہے تو پھر آپ نے کہنا ہے کہ بخاری کی حدیث

ہمارے بالکل خلاف نہیں ہے۔ اچھی طرح سے یہ بات سمجھیں کہ یہ ہمارے خلاف کیوں نہیں ہے؟

اصل میں امی عائشہ رضی اللہ عنہا سمجھا رہی ہیں کہ انہی آنکھوں سے زمینی ماحول میں کوئی شخص خدا کا دیدار نہیں کر سکتا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمین پر دیدار نہیں کیا بلکہ عرش پہ جا کے کیا ہے، جب عالم بدل گیا ہے تو پھر خدا کا دیدار کیا ہے۔ اب امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت ہمارے خلاف نہیں ہے۔

### توضیح بالمثال:

اور دوسرا جواب یہ ذہن میں رکھیں! میں اسے سمجھانے کے لیے ایک مثال دیا کرتا ہوں۔ میں آپ حضرات کی عثمانیہ مسجد میں درس قرآن دینے کے لیے آیا ہوں۔ اب میرے جانے کے بعد ایک نوجوان کہتا ہے کہ مولانا الیاس گھمن صاحب نے اقبال کالونی کو نہیں دیکھا۔ دوسرا کہتا ہے کہ دیکھا ہے۔ اب دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ قاری صاحب نے دونوں کو بلا لیا کہ بیٹا کیوں لڑ رہے ہو؟

ایک نے کہا کہ میں کہتا ہوں کہ مولانا الیاس گھمن صاحب نے اقبال کالونی نہیں دیکھی اور یہ کہتا ہے کہ دیکھی ہے۔ تو قاری صاحب نے پوچھا: تو کہتا ہے کہ دیکھی ہے تو تیری دلیل کیا ہے؟ اس نے کہا کہ جی عثمانیہ مسجد اقبال کالونی میں ہی ہے، مولانا صاحب کی آنکھیں ہیں، جب یہاں آئے ہیں تو بھائی اشرف کے گھر بیٹھے ہیں، وضو کیا ہے، وہاں سے مسجد آئے ہیں تو اقبال کالونی دیکھی ہے نا۔

اب دوسرے سے پوچھا کہ تو کہتا ہے کہ اقبال کالونی کو نہیں دیکھا تو تمہاری دلیل کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: جی میرا مطلب یہ ہے کہ اقبال کالونی کے سارے گھروں کو نہیں دیکھا، چیدہ چیدہ دیکھا ہے۔ قاری صاحب نے کہا کہ بات تو دونوں کی ٹھیک ہے اس کے لیے لڑنے کی کیا ضرورت ہے؟

اب یہاں بھی یہی بات سمجھیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کو دیکھا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اجمال کے درجے میں دیکھا ہے اور امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نہیں دیکھا تو مراد یہ ہے کہ تفصیل کے درجے میں نہیں دیکھا۔ تو اجمالاً دیکھا ہے تفصیلاً نہیں دیکھا۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی بات بھی ٹھیک ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بات بھی ٹھیک ہے۔

ہم دیوبند والے تمہیں آپس میں نہیں لڑاتے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپس میں لڑائیں گے؟ ہم لڑانے والی بات نہیں کرتے ہم تو جوڑنے والی بات کرتے ہیں۔

### تین عبادات کے بدلے تین انعامات:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا دیدار کیا ہے۔ وہاں اللہ رب العزت نے پوچھا: میرے محبوب! میرے پاس آئے ہو، کیا لائے ہو؟ جناب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا:

"التَّحِيَّاتُ لِلَّهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ"

☆ "التَّحِيَّاتُ لِلَّهِ" اے اللہ! میری زبانی عبادتیں آپ کے لیے ہیں۔

☆ "وَالصَّلَوَاتُ" اے اللہ! میری بدنی عبادتیں آپ کے لیے ہیں۔

☆ "وَالطَّيِّبَاتُ" اے اللہ! میری مالی عبادتیں آپ کے لیے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں عبادتیں اللہ کی خدمت میں پیش کی ہیں؛ زبان بھی آپ کے لیے، بدن بھی آپ کے لیے اور مال بھی اللہ کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کے بدلے میں تین انعامات عطا فرمائے ہیں:

1: "التَّحِيَّاتُ لِلَّهِ" کے بدلے: "السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ"

2: "وَالصَّلَوَاتُ" اس کے بدلے: "وَرَحْمَةُ اللَّهِ"

3: "وَالطَّيِّبَاتُ" اس کے بدلے: "وَبَرَكَاتُهُ"

کیا معنی کہ میرے محبوب! تیری زبانی عبادت میرے لیے تو میرا زبانی سلام تیرے لیے، تیری بدنی عبادت میرے لیے تو میری رحمت تیرے لیے، تیرا مال میرے لیے تو اس مال کی برکتیں تیرے لیے۔ تین چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی ہیں، اللہ رب العزت نے تین چیزیں بطور انعام کے دی ہیں۔

**تشہد کے جملوں کا باہمی ربط:**

ہم تشہد پڑھتے تو ہیں لیکن سمجھتے نہیں کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں اور ان دونوں کا آپس میں جوڑ کیا ہے؟ جب ہم مسجد میں آئیں تو دعا مانگتے ہیں:

"اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ."

اے اللہ! میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا تھا: "اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلٰوَاتُ" کہ اللہ میں نماز تیرے لیے پڑھتا ہوں۔ تو اللہ نے جواب میں فرمایا تھا: "وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" کہ میرے نبی! میری رحمتیں تیرے لیے ہیں۔ جب ہم مسجد میں آئیں تو کہتے ہیں کہ یا اللہ! عرش پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا نماز میں پڑھتا ہوں اور آپ نے فرمایا تھا کہ رحمتیں میں بھیجتا ہوں۔ یا اللہ! نماز ہم پڑھتے ہیں، اب رحمت کے دروازے آپ کھول دیں۔

اور جب ہم مسجد نے جانے لگتے ہیں تو یہ دعا پڑھتے ہیں:

"اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ."<sup>53</sup>

اے اللہ! میں آپ سے آپ کا فضل مانگتا ہوں۔

قرآن کریم میں ہے:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾<sup>54</sup>

کہ جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو زمین میں پھیل جاؤ اور رزق تلاش کرو! تو ہم مسجد سے باہر نکلتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! آپ نے قرآن میں اعلان فرمایا ہے کہ ﴿وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھو اور باہر جا کر اللہ کا فضل تلاش کرو۔ تو ہم اب مسجد سے باہر جانے لگے ہیں اور آپ سے مانگ کر جا رہے ہیں۔ مانگنا ہمارے ذمے ہے اور عطا کرنا آپ کے ذمے ہے۔ تو یہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سوال ہے اور یہ اللہ کا جواب ہے۔

### ایک واؤ کے ساتھ یاد دواؤ کے ساتھ؟

اس پر ایک علمی لطیفہ یاد آیا۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما ہیں۔ ایک بدو آدمی دیہات سے آیا اور اس نے امام اعظم ابو حنیفہ سے سوال کیا:

أَيُّوَاوُيَوَاوَيْنِ؟ کہ ایک واؤ کے ساتھ یاد دواؤ کے ساتھ؟

امام صاحب نے فرمایا:

يَوَاوَيْنِ. کہ دو واؤ کے ساتھ۔

اس نے دعا دی:

"بَارَكَ اللَّهُ فِيكَ كَمَا بَارَكَ فِي لَوْلَا!"

اللہ آپ میں ایسی برکتیں دے جیسے ”لا“ اور ”لا“ میں ہیں۔

امام صاحب نے فرمایا: آمین۔



وہ شخص دعائے کرچلا گیا۔ شاگروں نے پوچھا: استاذ جی نہ ہمیں سوال سمجھ میں آیا نہ جواب سمجھ میں آیا، نہ ہمیں دعا سمجھ میں آئی اور نہ آمین سمجھ میں آئی۔

امام صاحب نے فرمایا کہ اس نے مجھ سے پوچھا کہ حدیث میں التحیات دو قسم کی منقول ہیں، ایک التحیات وہ ہے جس میں ”واؤ“ دو ہیں: ”التَّحِيَّاتُ لِلَّهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ“ اور دوسری التحیات وہ ہے جس میں واء ایک ہے: ”التَّحِيَّاتُ لِلَّهِ الطَّيِّبَاتُ وَالصَّلَوَاتُ لِلَّهِ“ تو اس بدو نے مجھ سے پوچھا ہے کہ ہم التحیات کون سا پڑھا کریں؟ ایک واء والا یا دو واء والا؟ میں نے اسے کہا کہ دو واء والا پڑھا کرو۔ پھر اس نے مجھے بہت پیاری دعادی۔ اللہ نے جب اپنے نور کی مثال بیان فرمائی تو ارشاد فرمایا:

﴿مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكُوهٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ ۚ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ ۚ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ ۗ﴾<sup>55</sup>

اللہ نے زیتون کے درخت کی بات کی ہے۔ فرمایا کہ زیتون کا درخت ایسا ہے کہ اس جیسا درخت نہ مشرق میں ہے نہ مغرب میں ہے۔ خدا نے دوبار ”لا“ استعمال کیا ہے زیتون کے درخت کے لیے۔ تو مجھے اس دیہاتی نے کہا:

"بَارَكَ اللَّهُ فِيكَ كَمَا بَارَكَ فِي لَوْلَا!"

اللہ آپ کی علم میں اس طرح برکتیں دے جس طرح زیتون کے درخت میں برکت دی ہے، اس جیسا مشرق اور مغرب میں درخت نہیں ہے آپ جیسا امام مشرق اور مغرب میں کوئی نہ ہو!

اس بدو نے کیسی پیاری بات کی اور حضرت امام صاحب کے دماغ کا اندازہ

فرمائیں! بندہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا دشمن وہ شخص ہے جو علم کا دشمن ہے، جس کو علم سے پیار ہے وہ امام صاحب کا کبھی مخالف نہیں ہو سکتا۔

### معراج کے تحفے:

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے ملاقات کی اور واپس تشریف لے آئے۔ اللہ پاک نے تین چیزیں بطور خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی ہیں:

- 1: سورۃ البقرۃ کی آخری آیتیں دی ہیں۔
- 2: یہ تحفہ دیا کہ جو شخص شرک نہ کرے اگرچہ کبیرہ گناہ بھی کرے تو ایک وقت آئے گا کہ اللہ اس کو معاف فرمادیں گے۔
- 3: پچاس نمازیں عطا کی ہیں۔

### نمازیں؛ پچاس سے پانچ رہ گئیں:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے۔ راستے میں موسیٰ علیہ السلام ملے تو انہوں نے پوچھا کہ کیا ملا ہے؟ فرمایا: پچاس نمازیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ نہیں پڑھیں گے، میں نے آزمایا ہے، اللہ سے کم کروالیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے گئے۔ اللہ نے پانچ کم کر دیں، باقی پینتالیس رہ گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ پینتالیس بھی نہیں پڑھیں گے، کم کروالیں۔ پھر واپس گئے تو چالیس رہ گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ چالیس بھی نہیں پڑھیں گے۔ یوں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نو مرتبہ گئے، پینتالیس معاف ہو گئیں، اب پانچ باقی رہ گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ پانچ بھی نہیں پڑھیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اے موسیٰ! اب تو مجھے اللہ سے یہ کم کراتے ہوئے حیا آتی ہے۔

ادھر سے وحی آگئی کہ اے میرے محبوب! ہم اپنے قانون کو نہیں بدلتے،

یہ پڑھیں گے پانچ لیکن ہم اجر پچاس کا دیں گے۔ جاؤ! انہیں بشارت دے دو، ہم نے پینتالیس پڑھنے میں کم کی ہیں لیکن ثواب ہم نے پورا دینا ہے۔ خدا کا کتنا کر م ہے!

### مقام ناز اور مقام نیاز:

حضرات مفسرین نے ایک عجیب جملہ کہا ہے کہ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے توبات شروع کر دی لیکن ابراہیم علیہ السلام نے کوئی بات نہ کی۔ علماء نے اس کی بڑی پیاری وجہ لکھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مقام ناز پر تھے اور ابراہیم علیہ السلام مقام نیاز پر تھے۔ مقام نیاز والا نہیں بولتا بلکہ مانتا ہی جاتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام مقام ناز پر تھے اور جس کو ناز ہو وہ بول بھی پڑتا ہے۔ ابراہیم؛ خلیل اللہ ہیں اور حضرت موسیٰ؛ کلیم اللہ ہیں، حضرت ابراہیم مقام خلّت پر تھے اور حضرت موسیٰ مقام کلام میں تھے۔ انہوں نے تکلم کیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خاموشی اختیار کی ہے۔

یہ تین انعام جو بطور خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اللہ ہمیں ان کو ماننے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

### تعارف و وجہ تسمیہ سورت:

سورت بنی اسرائیل مکی سورت ہے۔ اس میں 12 رکوع اور 111 آیات ہیں۔ اس سورت کا نام سورت بنی اسرائیل کیوں ہے؟ اس لیے کہ اس سورت کی ابتدا ہی میں اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل کا تذکرہ کیا ہے۔

میں اس سے قبل یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ”اسرائیل“ کہتے ہیں۔ ”اسرا“ کا معنی عبد ہے اور ”ئیل“ کا معنی اللہ ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام یعقوب تھا اور ان کا لقب تھا اسرائیل یعنی عبد اللہ، اللہ کا بندہ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے اور ہر بیٹے سے آگے مستقل ایک قبیلہ بنا۔

اس نسبت سے ان کے بارہ قبائل بنے اور ان بارہ قبائل کو ”بنی اسرائیل“ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کہا جاتا ہے۔ انہی بنی اسرائیل ہی میں سے یہودی ہیں اور انہی میں سے عیسائی ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد اور یہود کی اولاد آگے چلی۔ یہود کی جو اولاد ہے انہی کا نام ”یہودی“ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی انہی کی اولاد میں سے ہیں۔ قیامت کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور یہودیت کو قتل کریں گے۔

عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر بھی میں ان شاء اللہ کبھی آئندہ بحث کروں گا کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کی حکمتیں کیا ہیں؟ عیسیٰ علیہ السلام کیوں تشریف لائیں گے؟ بہر حال جب عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو یہودیت اور عیسائیت ختم ہو جائے گی۔ تو اس سورت کا نام ”سورت بنی اسرائیل“ ہے۔

### قبولیت اعمال کی شرائط:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ جَعَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا ۝۱۱ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ۝۱۲ كَلَّا نُبَدِّلُ هَؤُلَاءِ وَ هَؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۖ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ۝۱۳﴾

ان تین آیات میں اللہ رب العزت نے قبولیتِ اعمال کی تین شرطیں بیان فرمائی ہیں۔ شیطان کی ایک محنت یہ ہے کہ کوئی آدمی نیک عمل نہ کرے اور اس کی دوسری محنت یہ ہے کہ اگر کوئی نیک عمل کرے تو اس طرح کرے کہ اس کا نیک عمل قبول نہ ہو۔ مثلاً مسجد میں اگر آجائے تو نماز ٹھیک طرح ادا نہ ہو اور قبول نہ ہو۔ اس کی پہلی محنت کہ کوئی شخص رمضان کا روزہ نہ رکھے اور دوسری محنت کہ اگر روزہ رکھ لے تو

اس سے روزے میں اعمال ایسے کروائے کہ اس کا روزہ قبول نہ ہو۔ اس کی پہلی محنت کہ انسان حج نہ کرے اور دوسری محنت کہ اگر حج کرے تو دورانِ حج اس سے ایسے اعمال سرزد کروائے کہ اس کا حج قبول نہ ہو۔ شیطان کی دونوں محنتیں ہیں۔

### شیطان کی پہلی محنت اور اس کا توڑ:

شیطان کی جو پہلی محنت تھی انسان نیک عمل ہی نہ کرے یہاں اس محنت کا توڑ بیان کیا گیا ہے۔ توڑ یہ ہے کہ آدمی نیک عمل کرے۔ اس کے لیے دو چیزیں ہیں:

[1]: بوقتِ عمل انسان مستحکم ارادہ اور عزم کرے، ہمت سے کام لے۔

[2]: اپنی زبان سے کہے: ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ“

اللہ ایسے بندے کو نیک اعمال کی توفیق عطا فرمادیتے ہیں۔ آپ اس کی ایک مثال سمجھ لیں۔ جب مؤذن اذان دیتا ہے تو ہم مؤذن کی اذان کے ساتھ ساتھ جواب دیتے ہیں: ”اللّٰهُ أَكْبَرُ اللّٰهُ أَكْبَرُ“ کے جواب میں ”اللّٰهُ أَكْبَرُ اللّٰهُ أَكْبَرُ“، ”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ“ کے جواب میں ”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ“، ”أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ“ کے جواب میں ”أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ“، اور ”حَسْبِيَ عَلَى الصَّلَاةِ“ کے جواب میں ”حَسْبِيَ عَلَى الصَّلَاةِ“ نہیں اور ”حَسْبِيَ عَلَى الْفَلَاحِ“ کے جواب میں ”حَسْبِيَ عَلَى الْفَلَاحِ“ نہیں، پھر ”اللّٰهُ أَكْبَرُ اللّٰهُ أَكْبَرُ“ کے جواب میں ”اللّٰهُ أَكْبَرُ اللّٰهُ أَكْبَرُ“ اور ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ“ کے جواب میں ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ“۔

تو سوال یہ ہے کہ پوری اذان میں جو کلمات مؤذن کہتا ہے ہم بھی وہی کلمات کہتے ہیں لیکن جب مؤذن ”حَسْبِيَ عَلَى الصَّلَاةِ“ کہتا ہے تو نہ ہم جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ”حَسْبِيَ عَلَى الصَّلَاةِ“ اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جی ہاں! ہم نماز کے لیے آرہے ہیں بلکہ ہم کہتے ہیں کہ ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ“ یہ تبدیلی کیوں؟ اس لیے کہ زبان سے کہنا

کہ اللہ بہت بڑا ہے یہ آسان ہے اور عمل سے ثابت کرنا یہ مشکل ہے۔

زبان سے کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں یہ آسان ہے اور جب برادری ایک طرف ہو اور نبی کا حکم دوسری طرف، تو عمل سے ثابت کرنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں یہ بڑا مشکل ہے۔ اس لیے اللہ پاک نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے یہ حکم دیا کہ جب ”سُحِّي عَلَى الصَّلَاةِ“ کی باری آئے تو کہنا کہ ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ“ کہ اے اللہ! ہم نے زبان سے آپ کو بڑا مان لیا ہے اب عمل کی باری ہے تو یہ ہے مشکل کام لیکن اگر آپ طاقت دے دیں تو پھر مشکل نہیں ہے۔ اس لیے آدمی ہمت کرے، دکاندار ہے تو دکان چھوڑ دے، اذان شروع ہو تو گاہک کو روک دے اور ساتھ ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ“ کہے۔ اللہ اس بندے کو نماز کی توفیق ضرور عطا فرمائیں گے، آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔

### شیطان کی دوسری محنت اور اس کا توڑ:

اور جہاں تک دوسری محنت ہے کہ انسان عمل کرے اور قبول نہ ہو تو اس پر شیطان تین محنتیں کرتا ہے:

[1]: پہلے محنت کرے گا کہ آدمی کا عقیدہ ٹھیک نہ ہو، جب عقیدہ ٹھیک نہیں ہو گا تو عمل قبول نہیں ہو گا۔

اللہ رب العزت نے قرآن میں ارشاد فرمایا:

﴿لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾<sup>56</sup>

اللہ نے امت کو سمجھانے کے لیے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا ہے۔ لیکن اس کو سمجھانے سے پہلے میں یہاں ایک مثال دوں گا تاکہ آپ کے لیے اس

آیت کو سمجھنا ذرا آسان ہو جائے۔ مدینہ منورہ میں ایک عورت نے چوری کی۔ اس عورت کا نام فاطمہ ہے اور قبیلہ بنی مخزوم ہے۔ جب اس فاطمہ مخزومیہ کی چوری ثابت ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دو، یہی سزا ہے چور کی۔ اب ان کی سفارشیں آنا شروع ہو گئیں کہ حضور! یہ بڑے خاندان کی عورت ہے، اس کا ہاتھ نہیں کاٹنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا" <sup>57</sup>

اگر فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چوری کرے گی تو محمد تب بھی اس کا ہاتھ کاٹ دے گا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا چوری کریں، ایسا بالکل نہیں ہو سکتا لیکن اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کیوں فرمائی ہے؟ یہ امت کو سمجھانے کے لیے فرمایا ہے کہ میں نبی حدود میں امیر غیر، چھوٹے بڑے کافرق نہیں کر سکتا۔ اب سمجھیں کہ یہ جو اللہ نے فرمایا:

﴿لَيْسَ أَشْرُكَتَ لِيْخَبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ <sup>(12)</sup>

اے پیغمبر! اگر آپ نے بھی شرک کیا تو آپ کے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

نبی کے بارے میں شرک کا تصور کرنا بھی جرم ہے لیکن خطاب اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے اور یہ امت کو سمجھانے کے لیے ہے۔

شیطان کی پہلی محنت یہ ہے کہ بندے کے عقائد خراب کروں اور ہماری [مولانا محمد الیاس گھمن صاحب کی] پہلی محنت یہ ہے کہ بندے کے عقائد کو درست

کریں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ میری محنت پوری دنیا میں یہ ہے کہ بندے کے عقائد ٹھیک کروں... عقائد ٹھیک کروں... کیونکہ اعمال کے قبول ہونے کی بنیاد عقیدہ ہے۔  
[2]: شیطان کی محنت ہوتی ہے کہ اگر اس کا عقیدہ ٹھیک ہے تو نیت خراب کروں تاکہ یہ اللہ کے لیے کام نہ کرے، لوگوں کے لیے کام کرے، جب لوگوں کے لیے کام کرے گا تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ عمل قبول نہیں ہوگا۔

### اخلاص نیت ضروری ہے:

ایک حدیث مبارک میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ پہلے شہید کو اٹھائیں گے اور پوچھیں گے کہ تو نے میرے لیے کیا کیا ہے؟ وہ کہے گا:  
قَاتَلْتُ فِي سَبِيلِكَ حَتَّى اسْتُشْهِدْتُ.

اے اللہ! میں نے تیرے نام پر جان دی اور شہید ہو گیا۔

اللہ فرمائیں گے: تو جھوٹ بولتا ہے۔

إِنَّمَا أَرَدْتُ أَنْ يُقَالَ: فَلَانٌ جَرِيءٌ.

یہ تو نے اس لیے کیا تھا کہ لوگ کہیں کہ بڑا دلیر آدمی ہے، وہ لوگوں نے کہہ دیا ہے، اب اس کو جہنم میں ڈال دو!

اللہ پھر عالم کو کھڑا کر کے پوچھیں گے کہ تو نے میرے لیے کیا کیا؟  
وہ کہے گا:

"تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَقَرَأْتُ الْقُرْآنَ وَعَلَّمْتُهُ فِينِكَ.

اے اللہ! میں نے علم سیکھا اور قرآن پڑھا اور آپ کی رضا کے لیے پڑھایا۔

اللہ فرمائیں گے کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔

"إِنَّمَا أَرَدْتُ أَنْ يُقَالَ: فَلَانٌ عَالِمٌ وَفُلَانٌ قَارِئٌ.

تو قرآن اس لیے پڑھاتا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ یہ بہت بڑا مولوی ہے، بہت



بڑا قاری ہے، زبردست خطیب ہے، وہ تو لوگوں نے کہہ دیا ہے، اب اس کو الٹے منہ جہنم میں ڈال دو!

پھر اللہ سخی سے پوچھیں گے تو نے کیا کیا؟  
وہ کہے گا:

"مَا تَرَكْتُ مِنْ شَيْءٍ تُحِبُّ أَنْ أَنْفِقَ فِيهِ إِلَّا أَنْفَقْتُ فِيهِ لَكَ."

اے اللہ! جتنا تو نے مجھے مال دیا میں نے سارا تیرے نام پر لگا دیا۔

اللہ فرمائیں گے کہ تو بھی جھوٹ بولتا ہے۔

"إِنَّمَا أَرَدْتُ أَنْ يُقَالَ: فَلَانٌ جَوَادٌ."

یہ تو نے اس لیے کیا تھا کہ لوگ کہیں کہ یہ تو بڑا سخی ہے، وہ لوگوں نے کہہ

دیا ہے، اب اسے جہنم میں ڈال دو!<sup>58</sup>

اب بتاؤ! عالم ہونا کتنا بڑا اعزاز ہے! شہید ہونا کتنا بڑا اعزاز ہے اور سخی ہونا کتنا

بڑا اعزاز ہے! لیکن یہ تینوں جہنم میں کب جائیں گے جب ان کی نیت ٹھیک نہیں ہوگی

اور اگر نیت ٹھیک ہوگئی تو کیا ہی کہنے۔

### تصحیح نیت کا اجر:

ایک واقعہ عرض کرتا ہوں، اس کو ذہن نشین فرمائیں! بنی اسرائیل کے

لوگوں میں سے ایک شخص قیامت کے دن اللہ کے دربار میں آئے گا، اللہ رب العزت

اس کے نامہ اعمال میں ایک ریت کے ٹیلے کے برابر گندم اور آٹے کا صدقہ لکھ دیں

گے۔ وہ کہے گا: اللہ! میں تو غریب تھا، اتنی گندم تو میں نے زندگی میں دیکھی بھی نہیں

ہے یہ میرے نامہ اعمال میں کہاں سے آگئی؟

اللہ رب العزت فرمائیں گے کہ فلاں بستی سے تو گزرا اور اس بستی میں فقر اور قحط تھا۔ تو نے وہاں کہا تھا: اگر اس ٹیلے کے برابر آج میرے پاس آتا ہوتا میں غریبوں پر صدقہ کرتا، نیت تو نے کی ہے اور لکھ ہم نے لیا ہے۔

اب نیت خراب ہو تو مولوی صاحب بھی پھنسے پڑے ہیں اور نیت ٹھیک ہو تو تاجر بھی نکل گیا ہے۔ اس لیے شیطان کی محنت ہوتی ہے کہ نیت خراب ہو۔

[3]: اگر عقیدہ بھی ٹھیک ہو اور نیت بھی ٹھیک ہو تو شیطان کی محنت ہوتی ہے کہ عمل سنت کے مطابق نہ کرے۔ شیطان یہ محنت کرے گا اور عمل سنت کے مطابق نہیں کرنے دے گا۔

آج دنیا میں جتنی بدعات ہو رہی ہیں یہ کس بنیاد پر ہیں؟ لوگ بڑے اخلاص کے ساتھ اپنے باپ کو بخشوانے کے لیے ایسے اعمال کرتے ہیں جن سے باپ کی بخشش تو کجا خود اولاد گناہ گار ہو جاتی ہے۔

### عمل کی قبولیت کی شرائط:

اللہ نے ان آیات میں تین شرطیں بیان فرمائیں جن کی وجہ سے انسان کا عمل قبول ہوتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾

عقیدہ بھی ٹھیک ہو، نیت بھی ٹھیک ہو اور عمل بھی سنت کے مطابق ہو۔

﴿فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُورًا﴾

پھر یہ نہیں کہ ہم اجر دیتے ہیں بلکہ ہم اس کے عمل کی قدر بھی کرتے ہیں۔

### اجر اور قدر میں فرق:

اجر اور ہوتا ہے اور قدر اور ہوتی ہے۔ ہم اجر کے پیچھے دوڑتے ہیں اور اللہ

نے اجر کی بات نہیں فرمائی، اللہ نے قدر کی بات فرمائی ہے۔ اجر اور چیز ہے قدر اور چیز ہے۔ اجر کا معنی ہے ”مزدوری“ اور قدر کا معنی ہے ”پروٹوکول“۔ مزدوری الگ چیز ہے اور پروٹوکول الگ چیز ہے۔

اگر آپ وزیر اعلیٰ پنجاب کی تنخواہ جا کر پوچھیں تو کسی فیکٹری کے جی ایم کی تنخواہ بھی اس سے زیادہ ہوگی۔ جب وزیر اعلیٰ کے اجر کو دیکھیں گے تو اجر اس کا کم ہے اور جی ایم کا زیادہ ہے اور جب پروٹوکول کو دیکھیں گے تو وزیر اعلیٰ نے جب لاہور سے چلنا ہے تو یہ حکم جاری ہو جاتا ہے کہ سرگودھا تک راستے میں کوئی جی ایم کھڑے نہیں ہونے دینا! روڈ خالی کر دو! کیوں کہ وزیر اعلیٰ صاحب آرہے ہیں۔ اجر اور ہوتا ہے اور قدر اور چیز ہوتی ہے۔

اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اجر دوں گا، فرمایا: عقیدہ ٹھیک ہو، نیت ٹھیک ہوئی اور عمل سنت کے مطابق ہو تو پھر میں تمہارے عمل کی قدر کروں گا۔ جب شاہ قدر کرتا ہے تو اپنی حیثیت کے مطابق دیتا ہے اور جب شہنشاہ قدر کرتا ہے تو اپنی شان کے مطابق نوازتا ہے۔

### شاہ کی قدر دانی یہ ہے تو شہنشاہ کا عالم کیا ہوگا؟

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ بغداد میں قحط پڑ گیا۔ ایک آدمی نے جو ہڑ سے پانی کا ایک مٹکا بھرا اور بادشاہ کے پاس پہنچا۔ بادشاہ نے پوچھا: کیسے آئے ہو؟ اس نے کہا کہ بغداد میں قحط تھا تو میں نے سوچا کہ بادشاہ سلامت پیاسے ہوں گے، ان کی خدمت میں پانی پیش کر دوں۔ بادشاہ نے سمجھا کہ یہ شخص سادہ ہے لیکن ہے مخلص، یہ سمجھتا نہیں ہے کہ بادشاہ کے پاس مال کون سا ہوتا ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے کہا کہ یہ مٹکا لے لو اور اس کے مٹکے کو ہیرے، جواہرات اور سونے سے بھر کر دے دو!

وہ بڑا خوش ہوا کہ میں نے مشکل وقت میں بادشاہ کو پانی دیا ہے تو بادشاہ نے خوش ہو کر مجھے بدلے میں سونا دیا ہے۔ بادشاہ نے اپنے وزیر سے کہا کہ یہ جس راہ سے آیا ہے اس راہ سے واپس نہ جائے، اس کو واپسی پر ہمارے باغات اور چشموں سے گزانا تاکہ اس کو پتا چلے کہ ہمیں تیرے پانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب اس نے سر پر مٹکا اٹھایا ہوا ہے اور بادشاہ کے باغات سے گزر رہا ہے۔ یہ بیچارہ پسینہ پسینہ ہو گیا کہ یہ بادشاہ اگر ان پھلوں کے جوس پیتا رہے تو اس کے پاس جوس ختم نہ ہو، میں نے پانی دے کر کون سا کمال کیا ہے!

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں: جب شاہ قدر کرتا ہے تو جو ہڑ کے پانی کے بدلے میں جو اہرات دیتا ہے اور جب شہشاہ قدر کرتا ہے تو ایسی نعمتیں دیتا ہے جن کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا! تو شاہ کی قدر اور ہوتی ہے اور شہنشاہ کی قدر اور ہوتی ہے۔

### اللہ کی شان بے نیازی و شان سرفرازی:

ہم جو نیک اعمال کرتے ہیں تو اللہ کو ہمارے نیک عمل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے سبحان اللہ کہا تو اللہ ہمیں جنت دے دیں گے۔ یہ اللہ کو ضرورت نہیں ہے کہ اللہ ہمارے سبحان اللہ کا محتاج ہے، وہ تو ہے ہی سبحان اس کو ہمارے سبحان کی ضرورت کیا ہے؟ یہ سبحان کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کو ہمارے سبحان کی ضرورت نہیں ہے۔

تو جب آدمی عمل کرے بشرطیکہ اس کا عقیدہ بھی ٹھیک ہو اور اس کی نیت بھی ٹھیک ہو اور عمل بھی سنت کے مطابق ہو تو اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُورًا ۝﴾

ہم اسے صرف اجر نہیں دیتے بلکہ اس کی قدر کرتے ہیں۔

## عبادت خدا کی اور ادب والدین کا:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِنَّمَا يُبَلِّغَنَّ  
عِنْدَكَ الْكَبِيرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ  
لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۝٢٣ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ  
ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْنِي صَغِيرًا ۝٢٤﴾

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے توحید کے بعد والدین کا ادب بیان کیا ہے۔ فرمایا  
کہ تم نے سجدہ خدا کو کرنا ہے اور ادب تم نے والدین کا کرنا ہے۔ آگے اللہ نے والدین  
کے لیے پانچ چیزیں فرمائی ہیں:

[1]: ﴿فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ﴾ ان کو ”اف“ بھی نہیں کہنا۔ ماں باپ سے بڑے  
سے بڑا نقصان ہو جائے تو اس زندگی والے اس نقصان پر آپ نے یہ نہیں کہنا: اباجی! یہ  
کیا کیا ہے؟

[2]: ﴿وَلَا تَنْهَرْهُمَا﴾ اور ماں باپ کو ڈانٹنا بھی نہیں ہے۔

[3]: ﴿وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا﴾ ان کے ساتھ شرافت سے بات کرنی ہے

[4]: ﴿وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ والدین کے لیے ہمیشہ

اپنے بازوؤں کو بچھا کر رکھنا ہے، جی جی کرتے رہنا ہے!

[5]: ﴿وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْنِي صَغِيرًا﴾ اور ساتھ اللہ سے

دعائیں بھی مانگنی ہیں کہ اے اللہ! میرے اباجی اور امی جی پر رحم فرما! میں تو خدمت  
کرتا ہوں، آپ بھی رحم فرمادیں!

تو اللہ نے والدین کے بارے میں یہ بات فرمائی ہے۔

## آیت میں ذکر خدا ہے تو ذکر مصطفیٰ کہاں ہے؟

اب یہاں ایک بات سمجھیں! ایک معاملہ والدین کا ہے اور ایک معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ عموماً آپ نے سنا کہ جب بھی اللہ کا نام ہو اس کے بعد اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہوتا ہے۔ جب خدا کا ذکر ہو تو بعد میں مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ یہاں ذکر خدا تو ہے لیکن ذکر مصطفیٰ نہیں ہے بلکہ اللہ کے ذکر کے بعد والدین کا ذکر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ذکر خدا کے بعد ذکر مصطفیٰ کیوں نہیں ہے؟ یہ مضمون تو بہت لمبا ہے لیکن میں ساری باتیں اختصار سے کہہ رہا ہوں۔ یہاں ذکر مصطفیٰ موجود ہے لیکن اسے دیکھنے والی آنکھ ہر بندے کے پاس نہیں ہے۔ اگر آنکھ موجود ہو تو نظر آئے گا کہ یہاں ذکر مصطفیٰ کیسے ہے۔

یہ بات سمجھیں! عبادت ہر حال میں خدا کی ہے اور ادب ہر حال میں والدین کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی کے پاس صحت ہو تب بھی سجدہ خدا کو، اگر بیماری ہو تب بھی سجدہ خدا کو، دولت ہو تب بھی سجدہ خدا کو، فقر ہو تب بھی سجدہ خدا کو، اللہ اولاد دیں تب بھی سجدہ خدا کو، اولاد دے کر واپس بلا لیں تب بھی سجدہ خدا کو! پتا چلا کہ جس طرح سجدہ ہر حال میں خدا کو ہے اسی طرح ادب ہر حال میں والدین کا ہے، والدین مسلمان ہوں یا والدین کافر ہوں، والدہ رات مصلیٰ پر گزارے یا والدہ رات سینما میں گزارے ہر حال میں ماں کا ادب اولاد کے ذمہ ہے۔

کوئی بیٹا یہ نہیں کہہ سکتا کہ تو تہجد نہیں پڑھتی، رات بازار میں گزرتی ہے، میں تیری خدمت نہیں کروں گا، ماں گندی سے گندی ہو لیکن بیٹے کی جنت اسی ماں کے قدموں میں ہے۔ یہ ماں اور خدا کا معاملہ ہے۔ باپ سود کھائے یا باپ تجارت کرے یہ باپ اور خدا کا معاملہ ہے، بیٹا اس بنیاد پر باپ کو رد نہیں کر سکتا کہ تو سود خور

ہے۔ بیٹے کے لیے جنت کا دروازہ یہی باپ ہے۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین فرمائیں! کبھی جو تھوڑا سا تقویٰ آجائے، آدمی ڈاڑھی رکھ لے، نماز پڑھ لے اور نیک بن جائے تو اپنے سود خور باپ کے خلاف بکنا شروع ہو جاتا ہے، بے نماز باپ کی بے ادبی کرتا ہے اور باپ غلط ہو تو باپ کے خلاف زبان درازی کرتا ہے۔ یاد رکھو! باپ جیسا بھی ہو وہ باپ ہے۔ کبھی بھی انسان باپ کے خلاف نہ بد زبانی کرے، نہ باپ کے خلاف بد گمانی کرے۔ ہاں اگر باپ کی باتیں شریعت کے خلاف ہوں تو اپنے باپ کے لیے دعائیں ضرور کرتا رہے۔

### مولانا صاحب! میرے والد کے لیے دعا کریں:

مجھ سے کراچی کے ایک ساتھی بیعت ہیں اور ان کے گھر والے بھی مجھ سے بیعت ہیں۔ ان کے والد صاحب کا بڑا مسئلہ ہے کہ انہوں نے سود کے لیے بینک میں پیسہ جمع کر ادیا ہے اور گھر میں ٹی وی رکھا ہوا ہے، ہر وقت وہی دیکھتے رہتے ہیں۔ میں بڑا حیران ہوتا ہوں۔ وہ بیعت والا ساتھی جب بھی آتا ہے تو کہتا ہے کہ مولانا صاحب! دعا فرمائیں اللہ ہمارے والد صاحب کو ہدایت عطا فرمائے اور میں کوشش کر رہا ہوں کہ امی اور ابو دونوں کو عمرے پر لے جاؤں اور حرم میں لے جا کر کہہ دوں کہ اللہ! جو میرے بس میں تھا میں نے کر دیا، میں نے سود کی جگہ زم زم پلا دیا ہے، اب اندر تو صاف فرما دے! تو والدین کے ساتھ معاملہ ایسا ہونا چاہیے۔

خیر میں مختصر کہہ رہا ہوں تاکہ بات لمبی نہ ہو۔ یہاں یہ بات سمجھیں کہ سجدہ خدا کو کیوں اور ادب والدین کا کیوں؟ اللہ کو سجدہ اس لیے ہے کہ اللہ پاک کے کلمہ ”کن“ سے ہم پیدا ہوئے ہیں اور ماں باپ کا ادب اس لیے ہے کہ ماں باپ ہماری پیدائش کا سبب ہیں۔ سبب حقیقی اللہ کی ذات ہے اور سبب ظاہری ماں باپ کی ذات ہے۔

اب حقیقت پر غور کریں گے تو نظر آئے گا کہ میری پیدائش کا سبب میرے ماں باپ ہیں، ان کی پیدائش کا سبب ان کے ماں باپ ہیں، ان کی پیدائش کا سبب ان کے ماں باپ، اسی طرح اگر اوپر چلتے جائیں تو ہم سب کی پیدائش کا سبب ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حدیث مبارک میں ہے کہ اللہ رب العزت نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا تھا:

"وَلَوْلَا مُحَمَّدٌ مَّا خَلَقْتُكَ"<sup>59</sup>

اے آدم! اگر ہم نے محمد مصطفیٰ کو پیدا نہ کرنا ہوتا تو میں تجھے وجود ہی نہ دیتا! اب پتا چلا کہ ہم سب کی پیدائش کا سبب آدم علیہ السلام ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا سبب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اب بتاؤ کہ جن کی وجہ سے تنہا مجھے وجود ملا ہے اگر ان کا ادب کرنا ضروری ہے تو جن کی وجہ سے پوری کائنات کے سارے انسانوں کو وجود ملا ہے تو ان کا ادب والدین سے بڑھ کر ضروری ہے!

اس لیے میں کہہ رہا تھا کہ والدین کے ساتھ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر موجود ہے لیکن اس کو دیکھنے کے لیے آنکھ ہونی چاہیے، آنکھ ہو تو پھر نظر آتا ہے۔ اور اس بات کو سمجھانے کے لیے میں آپ کو کئی ایک مثالیں دے چکا ہوں اگر آپ کو یاد ہو، میں ایک دو مثالیں ابھی بھی دے دیتا ہوں:

**مقتدی کا اجر بتایا امام کا اجر سمجھ میں آیا:**

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب آدمی باجماعت نماز پڑھے تو



ایک نماز پر ستائیس نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔<sup>60</sup>

اب یہ اجر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی کے لیے بتایا ہے یا امام کے لیے بتایا ہے؟ (مقتدی کے لیے۔ سامعین) اور اگر مصلیٰ پر امام نہ ہو تو مقتدی کو یہ اجر ملے گا؟ (نہیں۔ سامعین) مقتدی کا اجر بتایا ہے تو امام کا اجر سمجھ میں آیا ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم امام کا اجر بتا دیتے تو مقتدی کا اجر سمجھ میں نہیں آتا تھا، اس لیے مقتدی کا اجر بتایا تو امام کا اجر سمجھ میں آگیا۔

**سینگ، بال، کھر کا اجر بتایا تو گوشت کا خود بخود سمجھ میں آیا:**

حدیث پاک میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:  
 "بِكُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةً."<sup>61</sup> جب آدمی قربانی کرتا ہے تو ایک ایک بال کے بدلے میں اللہ اسے نیکی عطا فرماتے ہیں۔

اب بتاؤ! بال کھاتے ہیں یا گوشت کھاتے ہیں؟ (گوشت کھاتے ہیں۔ سامعین) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ ایک ایک بوٹی کے بدلے میں نیکی ملتی ہے بلکہ فرمایا کہ "بِكُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةً" کہ ایک ایک بال کے بدلے میں نیکی ملتی ہے۔ اگر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بوٹیوں کا اجر بتا دیتے تو بال کا اجر سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لوگ کہتے کہ بال تو ہم پھینک دیتے ہیں۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بال کا اجر بتایا ہے تو بوٹی کا اجر خود بخود سمجھ میں آیا ہے۔

**شہید کی حیات بتائی تو نبی کی حیات میں آئی:**

یہ بات سمجھتے جانا! ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ

60۔ صحیح البخاری، رقم: 645

61۔ سنن ابن ماجہ، رقم: 3127

ہیں لیکن قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ

لَا تَشْعُرُونَ﴾<sup>62</sup>

کہ شہید زندہ ہے۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ نبی زندہ ہے۔ یہاں شہید کی زندگی بتائی ہے۔ علماء نے لکھا کہ جب شہید؛ نبی کا امتی ہو کر زندہ ہے تو نبی پھر بڑھ کر زندہ ہے، اب اللہ نے شہید کی زندگی بتائی ہے نبی کی نہیں بتائی، کیوں کہ اگر اللہ قرآن میں بتا دیتے کہ نبی زندہ ہے تو شہید کو زندہ کون مانتا؟ لوگوں نے کہنا تھا کہ ہم اس لڑکے کو جانتے ہیں، یہ ہماری مسجد کے قریب رہتا تھا، ہم نے کبھی اس کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا، اس کے تو چہرے پہ ڈاڑھی بھی نہیں تھی، یہ شہید ہو گیا ہے تو ہم اسے زندہ کیسے مان لیں؟ اب اگر اللہ؛ نبی کی حیات بتا دیتے تو شہید کی حیات سمجھ میں نہیں آتی تھی، شہید کی حیات بتائی ہے تو نبی کی حیات سمجھ میں آئی ہے۔

**پیغمبر علیہ السلام کے ادب کے تقاضے:**

اس طرح اگر اللہ یہاں فرمادیتے کہ ”وَقُضِيَ رُبُّكَ إِلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِمُحَمَّدٍ إِحْسَانًا“ سجدہ تم خدا کو کرو اور ادب مصطفیٰ کا کرو تو والدین کا ادب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اللہ نے ﴿وَبِأَنۡوَٰلِٰدِیۡنِیۡنِیۡمَ إِحۡسَٰنًا﴾ فرمایا ہے ”وَبِمُحَمَّدٍ إِحْسَانًا“ سمجھ میں آیا ہے۔

اب ذرا بات سمجھیں! کہ جب سجدہ خدا کو کرنا ہے اور ادب کائنات میں سب سے بڑھ کر مصطفیٰ کا کرنا ہے تو پھر اگلے جو پانچ احکام ہیں ان کا مطلب کیا ہو گا؟ اس کا مطلب ذوق سے سمجھ میں آتا ہے، بغیر ذوق کے سمجھ میں نہیں آتا۔

[1]: ﴿فَلَا تَقُلْ لَهُمَا آفٌ﴾ والدین کا ادب کرنا فرض ہے، ان کو ”اف“ کہنا گناہ ہے تو نبی کا ادب کرنا ایمان ہے اور ”اف“ کہنا کفر ہے۔

[2]: ﴿وَلَا تَنْهَهِمَا﴾ والدین کا ادب کرنا فرض ہے اور ان کو ڈانٹنا جرم ہے، نبی کا ادب کرنا ایمان ہے اور نبی کے سامنے اونچا بولنا بھی کفر ہے۔

[3]: ﴿وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا﴾ والدین کا ادب کرنا فرض ہے اور والدین کے سامنے بے ہودہ بات کرنا جرم ہے۔ نبی کا ادب کرنا ایمان ہے اور نبی کے سامنے ایسا جملہ کہنا جس سے توہین کا پہلو نکلتا ہو ایسا جملہ کہنا بھی کفر ہے۔

[4]: ﴿وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذِّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ والدین کا ادب کرنا فرض ہے تو والدین کے سامنے نظروں کو جھکانا اور بازو بچھانا فرض ہے۔ نبی کا ادب کرنا ایمان ہے اور نبی کے نام پر گردن کٹانا بھی ایمان ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ کسی آدمی میں علمی ذوق نہ ہو تو اس کو میری تقریر کا مزہ نہیں آئے گا، ہماری گفتگو کے لیے علمی ذوق ہونا بہت ضروری ہے۔ میں ایک جملہ کہنے لگا ہوں۔

[5]: ﴿وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْنِي صَغِيرًا﴾ یہ والدین کے لیے دعا ہے کہ اے اللہ! ان پر رحم فرما اور ان پر ایسا کرم فرما جیسے میں بچہ تھا تو مجھ پر یہ شفقت کرتے تھے، آج یہ بوڑھے ہیں تو ان پر آپ شفقت فرمائیں۔

**میانہ روی کی تعلیم:**

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ

فَتَقْعَدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾

اللہ پاک نے کیسا پیارا اصول بیان فرما دیا کہ جب پیسہ خرچ کرنے پر آؤ تو اتنا

بھی خرچ نہیں کرنا کہ خود فقیر ہو جاؤ اور اتنا بھی نہ روکنا کہ خود بخیل ہو جاؤ! نہ تم نے بخیل ہونا ہے اور نہ تم نے فقیر ہونا ہے، درمیانہ راستہ اختیار کرو، اللہ کے راستے میں خرچ بھی کرتے رہو اور اپنی ضرورت کے لیے پیسے رکھتے بھی رہو!

**اولاد کو قتل نہ کرو!**

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَزَرُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ

إِنْ قَتَلْتُمْ كَانَ خِطَاً كَبِيراً﴾ ﴿٢٠﴾

اس وقت کے مشرک اور آج کے دور کے نام نہاد مسلمانوں کے دماغ ایک جیسے ہیں۔ وہ بھی کہتے تھے کہ اولاد کو قتل کرو، اگر یہ زندہ رہے تو انہیں کہاں سے کھلائیں گے؟ اور آج بھی لوگ یہی کہتے ہیں کہ بچے دو ہی اچھے! اگر زیادہ ہوں گے تو ہم انہیں کہاں سے کھلائیں گے۔

**پہلے دور اور آج کے دور کے کافر میں فرق:**

میں بار بار عرض کرتا ہوں کہ وقت کم ہوتا ہے، ایک ایک جملے پر بولنے کو جی چاہتا ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ مولانا علی میاں فرماتے تھے کہ پہلے کے کافر کو سمجھنا بہت آسان تھا اور آج کے کافر کو سمجھنا بڑا مشکل ہے، کیوں کہ پہلے جب آدمی نظریہ بدلتا تھا تو اپنا نام بھی بدلتا تھا۔ کہتا تھا کہ میں مسلمان نہیں ہوں میں عیسائی ہوں، مسلمان نہیں ہوں میں فلاں فرقے کا ہوں اور آج کا مسلمان نظریہ بدلتا ہے اور نام نہیں بدلتا، نام مسلمانوں والا ہوتا ہے اور اندر عقیدہ مسلمانوں والا نہیں ہوتا، اس لیے آج کا کافر سمجھنا بہت مشکل ہے اور آج کے کفر کی اطلاع بھی بڑی مشکل ہے۔

مشرکین کا نظریہ یہ تھا کہ اگر یہ اولاد باقی رہی تو ہم کھلائیں گے کہاں سے؟

لہذا ان کو مار دو اور آج کے مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اگر اولاد زیادہ ہو گئی تو سنبھالیں گے کیسے؟ لہذا گولیاں استعمال کرنی شروع کر دو! دونوں کے نظریہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ میں بات تمہیں ہنسانے کے لیے نہیں کہہ رہا، آپ کو پتا ہے کہ لطیفہ سنانا میرا مزاج نہیں ہے، میں کوئی لطیفہ بھی سناؤں تو خالص عقیدے کی اصلاح کے لیے سنا تا ہوں۔

ہاں البتہ ضرورت کی وجہ سے وقفہ کرنا پڑے تو اس کی شریعت میں گنجائش ہے۔ مثلاً کسی کی اہلیہ کے ہاں بڑا آپریشن ہوا، بچہ پیدا ہو گیا، اب آئندہ اگر بچہ نو ماہ میں ہو گیا تو پھر اس کو بڑے آپریشن کی ضرورت ہوگی تو اس کے لیے سنبھالنا بڑا مشکل ہو گا، اگر اس طرح کا کوئی عذر ہو اور وقفہ کریں تو یہ مسئلہ الگ ہے۔ لہذا اس دماغ کی اصلاح کرنا بہت ضروری ہے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### انسان اشرف المخلوقات ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا﴾

اس آیت میں اللہ رب العزت نے بنی آدم کی فضیلت کا تذکرہ فرمایا ہے کہ ہم نے بنی آدم کو فضیلت بھی دی ہے، ان کو دریا اور خشکی میں سواریاں بھی دی ہیں، ہم نے ان کو پاکیزہ رزق بھی دیا ہے اور اپنی مخلوقات میں سے بہت بڑی مخلوق پر فضیلت اور ترجیح بھی دی ہے۔

فضیلت والی مخلوقات دو ہیں:

1: انسان 2: فرشتے

فرشتے اس لیے فضیلت والے ہیں کہ وہ خالص نورانی مخلوق ہیں۔

﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾<sup>63</sup>

فرشتوں میں اللہ نے گناہ کا مادہ ہی نہیں رکھا۔

اور انسان میں گناہ کا مادہ رکھا ہے اور پھر بھی انسان نیک کام کرتا ہے تو ملائکہ سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

### انسان اور فرشتوں میں افضل کون ہے؟

اللہ نے انسان کو تمام مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اس ضمن میں ایک بات ذہن نشین فرمائیں! انبیاء علیہم السلام کی جماعت مقدسہ تمام فرشتوں حتیٰ کہ بڑے بڑے چار فرشتوں؛ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت علیہم السلام سے بھی افضل ہے۔ پھر یہ چار فرشتے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ عام انسانوں سے افضل ہیں اور عام انسانوں میں سے جو اولیاء، اتقیا اور صالحین ہیں یہ عام ملائکہ سے افضل ہیں اور عام ملائکہ عام انسانوں سے افضل ہیں۔

یہی ترتیب مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں بیان فرمائی ہے اور یہی تفصیل مفتی شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر عثمانی میں ارشاد فرمائی ہے۔

### انسان کی فضیلت کی وجوہات:

انسان فرشتوں سے بھی اعلیٰ کیوں ہے؟ مفسرین نے اس کی کئی وجوہات لکھی ہیں۔ میں اتنی بات کہتا ہوں کہ انسان صورتاً بھی اعلیٰ ہے اور انسان سیرۃً بھی اعلیٰ ہے۔ اللہ نے انسان کی جو ظاہری صورت قرآن کریم میں بیان کی ہے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾

کہ جتنی بھی مخلوقات موجود ہیں سب سے خوب صورت شکل اللہ نے انسان کو عطا فرمائی ہے۔

### تو چاند سے زیادہ خوبصورت نہ ہوئی تو تجھے تین طلاق!

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے سورۃ التین میں اسی آیت کے تحت ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ عیسیٰ بن موسیٰ ہاشمی جو خلیفہ ابو جعفر منصور کے دربار کے مخصوص لوگوں میں سے تھے اور اپنی بیوی سے بہت محبت رکھتے تھے ایک روز چاندنی رات میں بیوی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تو بول اٹھے:

أَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا إِنْ لَمْ تَكُونِي أَحْسَنُ مِنَ الْقَمَرِ!

کہ اگر تو چاند سے زیادہ خوبصورت نہیں تو تجھے تین طلاق۔

میں نے کہا کہ چلو یہاں ایک بات تو سمجھ آگئی کہ یہ جو ذکر نائیک بیچارہ بار بار کہتا ہے کہ تین طلاق ایک ہوتی ہے کیوں کہ وہ غصے میں طلاق دے دیتے ہیں تو میں نے کہا کہ اس نے تو غصے میں نہیں دی، اس نے تو گود میں رکھ کر طلاق دی ہے، اس نے تو پیار کے ساتھ طلاق دی ہے۔

تو عیسیٰ بن موسیٰ ہاشمی کا یہ جملہ کہنا تھا کہ عورت اٹھ کر پردے میں چلی گئی کیوں کہ ایک طلاق ہو تو رجوع ہو سکتا ہے اور جب تین طلاق دیں تو رجوع بھی نہیں سکتا تھا۔

اس سے پتا چلا کہ اس زمانے میں مرد حضرات کو تو چھوڑیں عورتیں بھی سمجھتی تھیں کہ تین طلاق دیں تو تین ہی ہوتی ہیں۔ اب وہ پریشانی کے عالم میں خلیفہ ابو جعفر منصور کے دربار میں گیا تو بادشاہ نے علماء کو بلا کر مسئلہ دریافت کیا کہ بتائیں! طلاق ہوئی یا نہیں ہوئی؟ سب علماء نے کہا کہ جی تین طلاقیں ہو گئی ہیں۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کے ایک شاگرد وہاں موجود تھے جو بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ فقیہ کی

عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم کو جلدی ظاہر نہیں کرتا، اس سے کوئی پوچھے گا تو پھر بولے گا، عالم کو بولنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے بلکہ طلب کو دیکھ کر فتویٰ دینا چاہیے۔

خلیفہ نے ان سے پوچھا کہ آپ بتائیں! انہوں نے فرمایا کہ میں تو یہی عرض کروں گا کہ ایک طلاق بھی نہیں ہوئی۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیوں؟ انہوں نے کہا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾

اللہ نے انسان کو ساری مخلوقات سے خوب صورت بنایا ہے۔ تو چاند بھی ایک مخلوق ہے، جب اللہ فرمائیں کہ سب سے خوب صورت انسان ہے تو قرآن سے ان کی بیوی کا چاند سے زیادہ خوب صورت ہونا ثابت ہو گیا، لہذا ایک طلاق بھی نہیں ہوئی۔<sup>64</sup> یہ امام صاحب کے شاگرد کا علم تھا، بتائیں کہ امام صاحب کا علم کتنا وسیع ہو گا؟

### چور پکڑا گیا اور طلاق بھی نہیں ہوئی:

اس پر بات چل پڑی ہے تو میں ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دور میں کچھ چور آئے اور ایک محلہ میں انہوں نے چوری کی اور گھر کا سارا سامان چوری کر کے لے گئے۔

مالک مکان نے انہیں دیکھ لیا اور پہچان لیا کہ یہ کون ہیں۔ چوروں نے سوچا کہ یہ صبح تھانیدار کو بتادے گا تو ہم پکڑیں جائیں گے، اب کیا کریں؟ ایک نے کہا کہ اس کو قتل کر دو۔ دوسرے نے کہا کہ قتل نہیں چھپتا، یہ معاملہ بڑا مشکل ہے کچھ اور کرو!



ان چوروں نے کہا کہ اس سے طلاق کی قسم لے لو! چنانچہ مالک مکان سے کہا کہ ہم تجھے مار دیں گے، اگر جان بچانا چاہتے ہو تو یہ قسم کھا لو کہ اگر تم نے کسی کو ہمارے بارے میں بتایا کہ یہ چور ہیں تو تیری بیوی کو تین طلاق۔ اس نے جان کے خوف سے قسم کھالی۔ چور تسلی سے چلے گئے۔ اس سے پتا چلا کہ اس وقت کے چور بھی سمجھتے تھے کہ تین طلاق دیں تو تین ہوتی ہیں۔ بادشاہ، وزیر اور عورتوں کا کیا کہنا چوروں کو بھی علم تھا کہ تین طلاق دو تو تین ہوتی ہیں۔

خیر صبح ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہی چور اس کا سامان بازار میں فروخت کر رہے ہیں۔ اب یہ بیچارہ بتا بھی نہیں سکتا کیونکہ اگر بتاتا ہے تو اس کی بیوی کو تین طلاق پڑتی ہے۔ یہ شخص حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گیا اور کہا کہ امام صاحب! میرے گھر میں رات کو چوری ہو گئی ہے اور چور محلے کے ہیں، میری کچھ مدد فرمائیں! امام صاحب نے کہا کہ تم مجھے بتاؤ میں گرفتار کرا دیتا ہوں۔ اس نے کہا کہ بتاؤں گا تو بیوی نہیں رہے گی، اگر نہیں بتاتا تو مال نہیں رہے گا، اب میں تو پھنس گیا ہوں۔ امام صاحب نے پوچھا کہ مسئلہ کیا ہے؟ اس نے ساری بات بتائی۔ امام صاحب نے فرمایا کہ تو فکر نہ کر!

امام صاحب نے تھانیدار سے کہا کہ محلے کے سارے لڑکوں کو جمع کر دو اور اس مالک مکان سے کہا کہ تو مسجد کے دروازے پر کھڑا ہو جا! تھانیدار سے کہا کہ ایک ایک لڑکے کو بلاؤ اور اس سے پوچھو کہ کیا اس لڑکے نے چوری کی ہے؟ مالک مکان سے کہا کہ اگر وہ چور نہ ہو تو کہہ دینا کہ اس نے چوری نہیں کی، اور جب چور آئے تو تو نے چپ کر جانا ہے، تو نے بولنا نہیں ہے۔ اب تھانیدار نے ایک لڑکے کو بلایا اور اس مالک مکان سے پوچھا: اس نے چوری کی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ پھر پوچھا: یہ چور ہے؟ کہا: نہیں۔ یہ چور ہے؟ کہا: نہیں۔ جب چور آیا اور اس سے پوچھا کہ یہ چور ہے؟ تو اب وہ

خاموش ہو گیا۔ تو امام صاحب نے فرمایا کہ اس کو پکڑ لو، یہی چور ہے۔  
 اب دیکھو چور بھی پکڑا گیا اور بیوی کو طلاق بھی نہیں ہوئی، طلاق تو تب ہوتی  
 جب وہ یہ بتاتا کہ یہ چور ہے۔ اسی لیے آج لوگ امام صاحب کے مخالف ہیں کہ امام  
 صاحب چوروں کو پکڑ لیتے تھے۔ تو لوگ امام صاحب سے ناراض ہوتے ہیں کہ امام  
 صاحب چوروں کو پکڑتے کیوں تھے؟ اس لیے آپ حضرات پریشان نہ ہوا کریں۔  
 حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے آدمی تھے۔

### امام اعظم نے امام اعمش کی مشکل حل کر دی:

تین طلاق پر ایک واقعہ میں اور پیش کر دوں۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ  
 علیہ کے ایک استاذ امام اعمش تھے جن کی آنکھیں چند دھپائی ہوئی تھیں جنہیں عربی  
 زبان میں ”اعمش“ کہتے ہیں۔ وہ خوب صورت نہیں تھے لیکن ان کی بیوی خوب  
 صورت تھی۔ اس لیے ان کے گھر میں ان بن رہتی تھی۔ کبھی کوئی بات، کبھی کوئی  
 بات... ایک مرتبہ رات گھر میں کوئی بات بڑھ گئی تو امام اعمش نے غصے میں آکر اپنی  
 بیوی کو کچھ کہہ دیا تو بیوی چپ ہو گئی، ناراض ہو گئی اور خاموش ہو کر بیٹھ گئی اور ان سے  
 بات کرنا بند کر دی۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے غصے میں آکر کہا: اگر تو نے صبح کی اذان تک  
 مجھ سے بات نہ کی تو تجھے تین طلاق! امام اعمش نے غصے میں آکر کہہ تو دیا لیکن وہ تو اور  
 پکی ہو گئی اور نہ بولی۔ وہ تو جان پہلے سے چھڑانا چاہتی تھی، وہ بہانے تلاش کر رہی تھی۔  
 اب امام اعمش رحمہ اللہ پریشان ہوئے کہ اس نے تو بولنا نہیں ہے۔ وہ اسی  
 وقت رات کو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دروازے پر گئے اور دستک دی۔ کہا:  
 ابو حنیفہ! میں پریشان ہوں، اس مسئلہ کا حل تو بتائیں۔ مسئلہ بتایا تو امام صاحب فرمانے  
 لگے کہ اپنی مسجد کے مؤذن سے کہیں کہ آج فجر کی اذان آپ کے کہنے پر نہیں بلکہ آج  
 میرے کہنے پر دے! جس وقت میں اسے کہہ دوں تو وہ اس وقت اذان دے۔ انہوں

نے کہا کہ پھر؟ امام صاحب نے کہا کہ آپ سکون کے ساتھ آرام فرمائیں، اگلا کام میرا ہے۔ امام اعمش جا کر سوئے لیکن اب نیند نہ آئے۔ ان کو پتا تھا کہ بیوی نے بولنا نہیں ہے اور اذان ہو جاتی ہے۔ اب پریشانی ہے۔

امام صاحب فجر کی اذان شروع ہونے سے مثلاً ایک گھنٹہ پہلے ان کی مسجد میں گئے اور مؤذن سے کہا کہ اذان دو! اس نے کہا کہ ابھی تو وقت شروع نہیں ہوا۔ فرمایا کہ تمہیں امام اعمش نے کچھ کہا تھا؟ جی کہا تھا کہ آج صبح کی اذان ابو حنیفہ کے کہنے پر دینا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ پھر اذان دے دیں۔ مؤذن اٹھا اور اس نے اذان دے دی۔ جب اذان کی آواز امام اعمش کے گھر پہنچی تو امام اعمش کی بیوی بول پڑی کہ اب خوش ہے؟ یعنی میں نہیں بولی اور طلاق ہو گئی ہے۔

حضرت امام اعمش پھر امام صاحب کے دروازے پر گئے کہ ابو حنیفہ! آپ کہتے تھے کہ طلاق نہیں ہوگی وہ تو ہو گئی۔ امام صاحب نے فرمایا! آپ آرام فرمائیں، یہ میرا کام ہے۔ انہوں نے کہا کہ ابو حنیفہ! میں اپنی بیوی کا مزاج سمجھتا ہوں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ میں شریعت کا مزاج میں سمجھتا ہوں، آپ آرام فرمائیں۔ امام اعمش گھر گئے لیکن نیند کیسے آئے۔ ایک گھنٹے کے بعد مؤذن نے اعلان کیا کہ آج اذان وقت سے پہلے دی تھی، اب میں وقت پر اذان دینے لگا ہوں۔ امام اعمش نے بیوی سے کہا کہ اب خوش ہے؟ بیوی نے کہا: لگتا ہے کہ تو ابو حنیفہ سے مل کر آیا ہے۔

### انسان؛ سیرت اور صورت میں اعلیٰ مخلوق:

تو خیر میں عرض کر رہا تھا کہ اللہ نے انسان کو تمام مخلوقات پر فوقیت دی ہے صورت میں بھی اور سیرت میں بھی۔

انسان کی صورت بھی تمام مخلوقات سے بہتر ہے اور صورت کا بہتر ہونا تو ہر بندہ مشاہدہ کر رہا ہے کہ جس قدر حسن صورت اللہ نے انسان کو دیا ہے اس کی دنیا میں

کوئی مثال نہیں ملتی۔ دنیا میں سوائے انسان کے کوئی ایک جاندار بھی ایسا نہیں جو انسان کی طرح ہاتھ سے کھاتا ہو، جو بھی کھائیں گے یا تو اپنے منہ سے کھائیں گے یا پاؤں اور منہ کا اکٹھا استعمال کریں گے، صرف ہاتھ کے ذریعے منہ میں لقمہ ڈالتا ہو یہ انسان کا خاصہ ہے، دوسری کوئی مخلوق نقل کر کے چند لقمے تو انسان کی طرح کھائے گی لیکن مستقل ہاتھ سے کھانا یہ انسان کا خاصہ ہے۔

پھر دنیا میں جس قدر مخلوقات غذائیں کھا رہی ہیں تو ان غذاؤں کی بھی دو قسمیں ہیں:

1: مفرد غذا 2: مرکب غذا

کوئی آدمی صرف گڑ کھالے تو یہ مفرد غذا ہے، صرف چینی کھالے تو یہ بھی مفرد ہے، صرف پھل کھالے یہ بھی مفرد ہے، صرف گنا چوس لے یہ بھی مفرد ہے، اب کئی کو جمع کر کے نئی غذا تیار کرنا یہ انسان کا خاصہ ہے، انسان کے علاوہ جتنی مخلوقات ہیں ان کی غذا مفرد ہے اور انسان کی غذا مفرد بھی ہے اور مرکب بھی ہے۔ آپ دیکھ لیں! گوشت اور سبزی ملا کر کھا رہا ہے جبکہ کسی مخلوق کو دیکھیں تو وہ صرف سیب کھا رہا ہے، کسی کو دیکھیں تو وہ صرف کیلا کھا رہا ہے، ایک ایک چیز ہی کھانی ہے اور انسان کو دیکھ لیں کہ سیب بھی ہے، کیلا بھی ہے، اور فروٹ بھی ہیں اور سب کو ملا کر فروٹ چاٹ بنا کر کھا رہا ہے۔

تو دنیا میں جتنے بھی حیوانات کی قسمیں ہیں ان سب کی غذا مفرد ہے اور مرکب غذا صرف انسان کا خاصہ ہے۔

اس کی وجہ انسان کی حسن صورت بھی ہے اور حسن عقل بھی ہے۔ جس قدر دنیا میں مخلوقات موجود ہیں اس قدر عقل کسی کے پاس نہیں جس قدر اللہ رب العزت نے انسان کو عطا فرمائی ہے۔ انسان کی صورت، انسان کی عقل، انسان کا کردار، انسان

کی سیرت یہ ایسی ہیں جن کی بنیاد پر اللہ نے انسان کو تمام مخلوقات پر فوقیت عطا فرمائی ہے۔

### فضیلتِ انسان کی وجوہات:

میں یہاں دو باتیں بڑی اہمیت سے پیش کرنا چاہتا ہوں، آپ اُن پر توجہ دیں:

[1]: جو علم انسان کے پاس موجود ہے وہ علم انسان کے علاوہ کسی کے پاس موجود نہیں۔ آپ کہیں گے کہ وہ کیسے؟ انسان کے پاس وہ علم ہے جسے ”علم الہی“ کہتے ہیں، علم الہی پہلے نبی کو ملتا ہے پھر نبی کی وساطت سے آگے امت کو ملتا ہے۔ تورات، زبور، انجیل اور قرآن کو اللہ نے فرشتوں کو نہیں دیا، اللہ نے اپنا یہ کلام جنوں کو نہیں دیا، اللہ نے یہ کلام انسانوں کو دیا ہے، تو انسان کے پاس وہ علم ہے جسے ”علم الہی“ کہتے ہیں۔

[2]: جو بات میں سمجھانے لگا تھا وہ یہ کہ انسان اور باقی مخلوقات میں کیا فرق ہے؟ بعض مخلوقات میں عقل ہے لیکن خواہشات نہیں اور بعض مخلوقات میں شہوات ہیں لیکن عقل نہیں ہے، انسان ایسی مخلوق ہے کہ جس میں عقل بھی ہے اور شہوت بھی ہے۔ تو جن میں صرف شہوات ہیں وہ حیوان ہیں اور جن میں محض عقل ہے شہوات نہیں وہ ملائکہ ہیں۔ انسان میں شہوات بھی ہیں اور عقل بھی ہے۔ اگر انسان عقل کو چھوڑ کر شہوات اختیار کرے تو ﴿أُولَٰئِكَ كَانُوا لِنَعَامٍ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۖ﴾<sup>65</sup> یہ جانوروں سے بھی بدتر ہے اور اگر یہ شہوات کو چھوڑ کر عقل اختیار کرے تو یہ فرشتوں سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ تو یہ انسان کے وہ کمالات ہیں جو کسی اور مخلوق میں نہیں ہیں۔ اسی لیے اللہ رب العزت نے اپنا نائب انسان کو بنایا ہے۔ جبرئیل علیہ السلام جیسے مقدس فرشتے کو بھی نہیں بنایا۔ فرمایا:

﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ﴾<sup>66</sup>

کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں تمہاری کیا رائے ہے؟ فرشتوں کی رائے معلوم کرنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اللہ مشورہ کر رہے تھے۔ اللہ رب العزت امت کو درس دینا چاہتے تھے کہ جب تم کوئی کام کرو تو مشورہ کر لیا کرو۔ یہ ہمیں راستہ دکھایا ہے ورنہ اللہ کو مشورہ کی ضرورت نہیں۔ اس کے جواب میں فرشتوں نے کہا:

﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ﴾

اے اللہ! آپ ایسے انسان کو پیدا کریں گے جو زمین میں فساد کرے گا، خون بہائے گا؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾<sup>(۲۰)</sup>

جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔

میں صرف ایک بات عرض کرتا ہوں کیونکہ مجھے پوری سورت کو بیان کرنا ہوتا ہے، میں مختصر مختصر باتیں کرتا جاتا ہوں۔ آپ حضرات نے ابھی رمضان المبارک میں بھی احادیث مبارکہ سنی ہوں گی کہ عید کے دن اللہ رب العزت ملائکہ سے پوچھتے ہیں کہ اے ملائکہ تم مجھے بتاؤ!

"مَا جَزَاءُ الْآجِرِ إِذَا عَمِلَ عَمَلَهُ؟ فَتَقُولُ الْمَلَائِكَةُ: إِلَهَنَا وَسَيِّدُنَا!

جَزَاؤُهُ أَنْ تُؤْفِيَهُ أَجْرُهُ"<sup>67</sup>

جو مزدور اپنی مزدوری پوری کرے اس کی اجر ت اور جزا کیا ہے؟ فرشتے

66۔ البقرة: 2:30

67۔ شعب الایمان للبیہقی: ج 3 ص 336 رقم الحدیث 3695

کہتے ہیں: اللہ! اس کی جزا یہ ہے کہ اس کی مزدوری پوری دے دی جائے۔ پھر جب انسان عید گاہ سے واپس لوٹتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اے فرشتو! گواہ بن جاؤ، میں نے اپنے بندوں کو معاف کر دیا ہے۔

آپ نے کئی ایسی احادیث سنی ہوں گی کہ جن میں ہوتا ہے کہ اللہ فرماتے ہیں کہ فرشتو! گواہ بن جاؤ، فرشتو! گواہ بن جاؤ۔ ان پر سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ ملائکہ کو گواہ کیوں بناتے ہیں؟

محدثین نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ جب اللہ نے انسان کو پیدا کیا تو اللہ نے پوچھا تھا: ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ کہ میں زمین میں انسان کو اپنا خلیفہ بنانے لگا ہوں، تمہاری رائے کیا ہے؟ انہوں نے کہا تھا کہ یہ فساد کرے گا اور خون بہائے گا تو اب اللہ تعالیٰ ان فرشتوں کو وہ ماضی یاد دلاتے ہیں کہ تم نے کہا تھا کہ انسان فساد کریں گے، اب تمہی گواہ بنو کہ میں نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ اب تم گواہ رہو کہ یہ جولائی کی گرمی کے روزے رکھتا ہے، تم گواہ رہو کہ یہ رات کو تراویح پڑھتا ہے، تم بھی گواہ رہو کہ یہ رات کو تہجد پڑھتا ہے، تم گواہ رہو کہ حق پر ہونے کے باوجود حق کو معاف کر دیتا ہے۔ تو تمہی نے کہا تھا کہ یہ خون بہاتا ہے۔ اب یہ دیکھو کہ میں کیسے معاف کرتا ہوں! اس لیے فرشتوں کو گواہ بنا کر ایسی باتیں ارشاد فرماتے ہیں۔

اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

**جو یہاں اندھا وہاں بھی اندھا (ایک واقعہ):**

﴿وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا﴾

جو شخص دنیا میں دین سے آنکھیں بند کر کے اندھا ہو جائے تو قیامت کے دن اس کی آنکھیں بند ہوں گی، وہ جنت میں نہیں جاسکتا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک

غیر مقلد آگیا۔ آنکھ کا بھی اندھا ہے اور دل کا بھی اندھا ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت! میں نے آپ سے امام ابو حنیفہ کے چند مسائل پر بات کرنی ہے کیوں کہ امام ابو حنیفہ تاویلیں بہت کرتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تو نے بات کرنی ہے پر میں نے تم سے نہیں کرنی۔ اس نے کہا: کیوں؟ حضرت تھانوی فرمانے لگے کہ اگر میں نے تجھے قائل کر بھی لیا تو فائدہ کوئی نہیں۔ اس نے کہا: فائدہ کیوں نہیں؟ اگر آپ نے مجھے قائل کر لیا تو میں مان لوں گا۔ حضرت نے فرمایا: اگر تو نے مان لیا تو پھر؟ اس نے کہا کہ آپ کے مذہب کے مطابق ہدایت پر آؤں گا۔ فرمایا: پھر؟ اس نے کہا کہ ہدایت پر آؤں گا تو جنت میں جاؤں گا۔ فرمایا: اگر تم ہدایت پر آؤ گے تو جنت میں پھر بھی نہیں جاسکتے۔ اس نے کہا: جی وجہ؟ فرمایا: قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَى فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَى وَأَضَلُّ سَبِيلًا﴾

کہ جو دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا۔ تو اندھا بندہ جنت میں نہیں جاسکتا تو تجھ سے بحث کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟ وہ کہنے لگا کہ نہیں نہیں اس آیت کا مطلب یہ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ تاویل نہیں کرنی، تاویل نہیں کرنی، اس نے کہا کہ آیت کا مطلب یہ ہے۔ فرمایا: نہیں، مطلب کیا ہوتا ہے؟ جب امام اعظم ابو حنیفہ فرمائیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے تو تم کہتے ہو کہ تاویل کی ہے اور اب تو خود تاویل کیوں کرتا ہے؟ اس نے کہا کہ تاویل نہ کریں تو قرآن حل نہیں ہوتا۔ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ یہی بات امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ تم تاویل کرو تو ٹھیک ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تاویل کریں تو غلط ہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔

**”اللہ کہاں ہے؟“ کے عنوان پر مکالمہ:**

میں ایک مرتبہ بحرین میں تھا، رمضان المبارک میں ایک غیر مقلد مجھے ملا تو کہا کہ اللہ کہاں پر ہے؟ میں نے کہا کہ ہر جگہ پر ہے۔ اس نے کہا کہ ہر جگہ پر ہے تو



دلیل پیش کریں۔ میں نے کہا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَآيَةً مَّا تُؤْتُوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾<sup>68</sup>

مشرق بھی اللہ کا مغرب بھی اللہ کا، جدھر رخ کرو گے ادھر اللہ موجود ہے۔ مجھے کہتا ہے کہ یہاں اللہ کی ذات نہیں بلکہ اس سے مراد ہے کہ اللہ کی صفت علم موجود ہے۔ اس کے دفتر میں غیر مقلد عالم محمد جو ناگڑھی کا ترجمہ قرآن موجود تھا۔ میں نے کہا کہ یہ ترجمہ تمہارے عالم کا ہے؟ کہتا ہے: جی ہاں۔ میں نے کہا کہ اس آیت کا ترجمہ پڑھ کیا لکھا ہے؟ اب محمد جو ناگڑھی صاحب نے ترجمہ لکھا ہے:

”اور مشرق اور مغرب کا مالک اللہ ہی ہے۔ تم جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی

اللہ کا منہ ہے۔“<sup>69</sup>

میں نے کہا کہ منہ علم کا ہوتا ہے یا ذات کا ہوتا ہے؟ منہ قدرت کا ہوتا ہے یا ذات کا ہوتا ہے؟ میں نے کہا کہ اس سے پتا چلا کہ اللہ کی ذات ادھر ہے جدھر تم منہ کرو گے۔ جب پھنس گیا تو مجھے کہتا ہے کہ میں اس کا جواب اپنے شیخ صاحب سے لا کر دوں گا۔ میں نے کہا کہ شیخ صاحب سے نہیں تو اس کا جواب اللہ پاک سے لے! مجھے کہتا ہے کہ اللہ سے کیوں لیں؟ میں نے کہا کہ جب ہم آیت امام ابو حنیفہ سے سمجھیں تو تم کہتے ہو کہ مشرک ہو اور جب تو آیت اپنے شیخ سے سمجھے گا تو تو مؤمن ہو گا؟ کہتا ہے کہ جی اللہ سے تو نہیں سمجھ سکتے۔ تو میں نے کہا کہ پھر اپنے شیخ کے بجائے امام اعظم ابو حنیفہ سے سمجھ جو صحابہ رضی اللہ عنہم کا شاگرد ہے۔ آج کے دور کے بندے کو تو تم مانتے ہو اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور کے بندے کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہو! اللہ ہمیں یہ

68۔ البقرة: 115

69۔ تفسیر احسن البیان: ص 95

بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

**عصمتِ انبیاء علیہم السلام:**

مضمون تو لمبا ہے میں اختصار سے بات کرنے لگا ہوں، ہم اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ نبی معصوم ہیں اللہ رب العزت نبی کو گناہوں سے محفوظ رکھتے ہیں نبی سے گناہ نہیں ہونے دیتے، اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُوكَ عَنِ الذِّمِّيِّ أَوْ حِينَئِذَا إِلَيْكَ لِيَفْتَرِي عَلَيْنَا غَيْرَهُ ۖ وَإِذَا لَاتَخَذُوكَ حَلِيلًا ۖ وَلَوْ لَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدَّتْ تَزْكُنَ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۖ﴾

اب جس کو عربی گرائمر آتی ہو تو مزہ اس کو آتا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں: میرے پیغمبر! آپ جو ان کی بات نہیں مانتے اور ہدایت پر رہتے ہیں ہم آپ کی حفاظت کرتے ہیں اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو نتیجہ یہ نکلتا کہ آپ تھوڑا سا مائل ہونے کے ہلکا سا قریب ہو جاتے۔

یہاں لفظ دیکھیں: ﴿وَلَوْ لَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ﴾ اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے، تو ﴿لَقَدْ﴾ عربی میں قریب کے معنی کے لیے آتا ہے، پھر فرمایا: ﴿كِدَّتْ﴾ اس کا معنی ہے قریب، پھر ﴿تَزْكُنَ﴾ فرمایا، اس کا معنی ہے مائل ہونا، ﴿شَيْئًا﴾ کا معنی ہے تھوڑا سا اور ﴿قَلِيلًا﴾ کا معنی ہے بہت تھوڑا۔

اب آپ آیت سمجھیں! اس آیت میں اللہ نے اپنے نبی کی فطرت بیان فرمائی ہے کہ نبی کی فطرت اتنا عمدہ ہوتی ہے کہ اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ آپ مائل ہو جاتے تھوڑا سا بہت تھوڑا سا۔ اب یہ ”بہت تھوڑا“ میرے اور آپ کے اعتبار سے نہیں ہے یہ اللہ کے اعتبار سے ہے۔ جب اللہ کسی چیز کو ”بہت

تھوڑا“ فرمادیں تو بتاؤ وہ کتنا تھوڑا ہو گا؟ اس سے اندازہ کریں کہ نبی کی طبیعت کتنی صاف ہوتی ہے! اللہ فرماتے ہیں: میرے پیغمبر! ہم نے ثابت قدم رکھا اور آپ ان کی بات نہیں ماننے، اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو بالکل معمولی سا آپ کسی درجے میں ان کی طرف مائل ہونے کے ہلکا سا قریب ہو جاتے یعنی اللہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت بیان فرماتے ہیں کہ جو باطل کو قبول کرتی ہی نہیں ہے چہ جائیکہ اللہ کی حفاظت کا پردہ اس پر موجود ہو تو پھر پیغمبر باطل کی طرف کیسے جاسکتے ہیں؟ نبی کا مزاج ایسا ہے کہ نبی باطل کے قریب ہی نہیں جاتا۔

### صدیق عکس جمال پیغمبر؛

اگر کسی شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عکس دیکھا ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج کو سمجھا ہو تو اس کی دنیا میں سب سے بہترین مثال پیغمبر کا صدیق ہوتا ہے، وہ صدیق کو دیکھ لے تو پیغمبر کا مزاج سمجھ آ جائے گا۔ اس لیے کہ صدیق وہ ہوتا ہے جو پیغمبر کا عکس ہو، پیغمبر کے مزاج کو سمجھتا ہو اسے صدیق کہتے ہیں اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس حیثیت سے صدیق اور صدیق اکبر ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

بانی دارالعلوم دیوبند قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صدیق وہ ہوتا ہے جو باطل کو اس طرح پھینک دیتا ہے جس طرح معدہ مکھی کو پھینک دیتا ہے، جس طرح معدہ مکھی کو قبول نہیں کرتا اسی طرح صدیق وہ ہے جو کذب کو قبول ہی نہیں کرتا۔ کبھی آپ نے سنا ہے کہ کسی کے معدہ میں مکھی چلی گئی ہو؟ مکھی اگر معدہ کی طرف جائے بھی تو انسان خود بخود ڈکار لینا شروع کر دیتا ہے اور اس کو باہر پھینکتا ہے، اور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ معدہ جس طرح مٹھاس قبول کرتا ہے اس طرح صدیق وہ ہے جو صداقت کو قبول کرتا ہے۔

دنیا میں معدہ کا نظام ہضم بہترین بنانے کی سب سے مضبوط چیز میٹھا ہے۔ عموماً لوگ کھانے کے بعد میٹھا کھاتے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ معدہ کی خاصیت یہ ہے کہ اس کو معدہ بہت جلد قبول کرتا ہے۔ اگر کسی کے معدہ میں مرچیں بھی موجود ہوں تو اس کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں مٹھاس ڈال دیں، جس طرح معدہ مٹھاس قبول کرتا ہے، صدیق اسی طرح حق کو قبول کرتا ہے۔

مجھے ایک بات پر بہت تعجب تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بہت ساری باتیں ایسی ہیں جو انسان کو بہت دیر کے بعد سمجھ میں آتی ہیں۔ یہ سن 1994 کی بات ہے، میں اس وقت کینیا گیا اور کینیا سے آگے زیمبا کے ایک شہر دسا کا اور چپاٹا میں گیا، یہ میری زندگی کا پہلا سفر تھا، اس وقت میری عمر 24 سال ہو گی۔ تو مجھے کہا گیا کہ وہاں راستے میں فلاں شہر میں ایک پاکستانی مولانا صاحب ہیں وہ آپ کے میزبان ہیں اور آپ کو وہ کھانا کھلا کر چپاٹا چھوڑ کر آئیں گے۔ پہلی بار ہم وہاں گئے ہیں تو ہندوستان کے گجراتی لوگ کھانا پکانے میں بہت مشہور ہیں، ان کے ہاں ہماری دعوت تھی۔ تو میں نے دیکھا کہ کھانا بعد میں آیا اور میٹھا پہلے آگیا۔ مجھے بڑا تعجب ہو گیا کہ ہم تو میٹھا بعد میں کھاتے ہیں یہ پہلے کیوں لائے؟ تو جو پہلے مولانا صاحب بیٹھے تھے انہوں نے کہا کہ گجراتیوں کا مزاج ہے کہ یہ میٹھا پہلے کھاتے ہیں، تو میں نے بھی کھالیا اور کھانا بھی کھالیا۔

اب جو بات میرے لیے ناقابلِ فہم تھی وہ یہ تھی کہ عموماً کھانے کے بعد میٹھا کھایا جاتا ہے اور یہ کھانے سے پہلے میٹھا لے آیا۔ چلتے چلتے یہ بات مجھے سال 2013 میں یعنی انیس سال بعد سمجھ آئی، تو حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کا یہ جملہ پڑھا کہ صدیق صداقت کو ایسے قبول کرتا ہے کہ جیسے معدہ مٹھاس کو قبول کرتا ہے۔ مجھے اب سمجھ میں بات آئی کہ وہ لوگ پہلے کیوں کھاتے ہیں! جس نے کھانا تھوڑا کھانا ہو اور بعد میں کھانا ہضم کرنا ہو تو وہ کھانے کے بعد میٹھا کھائے تاکہ جو کچھ کھایا وہ ہضم ہو

جائے اور جس نے کھانا خوب کھانا ہو وہ کھانے سے پہلے میٹھا کھاتا ہے تاکہ پہلی خوراک کو معدہ ہضم کر دے اور اوپر کھانا خوب کھائیں! مجھے اس وقت سمجھ میں آئی کہ وہ لوگ میٹھا پہلے کیوں کھاتے ہیں!

میں نے کہا: اگر اللہ مجھے اب وہاں لے گئے تو میں ان کو بتاؤں گا کہ آپ لوگ میٹھا پہلے کیوں کھاتے ہیں۔ مجھے انیس سال بعد یہ بات سمجھ میں آئی۔ میں نے اللہ کا کتنا شکر ادا کیا میں بتا نہیں سکتا۔ آدمی کا دلی ذوق ہو تو پھر کتنی خوشی ہوتی ہے کہ یار کتنے عرصے سے میرے ذہن میں ایک نکتہ تھا، تو اللہ کا شکر ہے کہ آج وہ حل ہو گیا۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### نماز پانچگانہ کا تذکرہ:

﴿اقِمِ الصَّلَاةَ لِذُلُوْكَ الشَّمْسِ اِلَى غَسَقِ الْاَيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ

قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾

اس آیت میں اللہ رب العزت نے پانچوں نمازوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اس میں فرمایا: اے پیغمبر! آپ نماز قائم کریں ﴿لِذُلُوْكَ الشَّمْسِ﴾ سورج کے مائل ہونے کے بعد سورج کے چھپ جانے تک، رات کے چھا جانے تک۔

سورج مائل اس وقت ہوتا ہے جسے حدیث میں ”زوال“ کہتے ہیں۔ تو اب زوالِ شمس کے بعد ہے ”ظہر“ اس کے بعد ہے ”عصر“، اس کے بعد ہے ”مغرب“ اور اس کے بعد ہے ”عشاء“۔ کب تک؟ ﴿اِلَى غَسَقِ الْاَيْلِ﴾ رات کے چھا جانے تک۔ تو سورج کے زائل ہونے کے بعد سے رات کے چھا جانے تک چار نمازوں کا بیان ہے۔

آگے فرمایا: ﴿وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾ یہاں ”قرآن“ سے مراد صلوٰۃ ہے یعنی نماز فجر مراد ہے۔ اللہ نے یہاں صلوٰۃ کے بجائے قرآن فرمایا، کیوں کہ فجر کی نماز میں عام

نمازوں کی بنسبت قرآن اتنا زیادہ پڑھا جاتا ہے کہ خدا نے نماز کا نام ہی قرآن رکھ دیا ہے۔ تو اس آیت میں پانچوں نمازیں آگئی ہیں۔

### فقاہتِ امام اعظم ابو حنیفہ:

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ دیکھیں! عربی زبان میں دو لفظ ہیں؛ ایک ہے ”شفق احمر“ اور ایک ہے ”شفق ابیض“۔ شفق کہتے ہیں کہ جب سورج غروب ہوتا ہے تو اس کے بعد ایک سرخی ہوتی ہے اور ایک سفیدی۔ اب جب سورج غروب ہو گا تو پہلے مشرق کی جانب سرخی ہوگی، پھر سرخی ختم ہوتی جائے گی اس کے بعد سفیدی آئے گی۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سورج غروب ہونے کے بعد تھوڑی سی سرخی رہ جاتی ہے اسے کہتے ہیں ”شفق احمر“۔ اس سرخی کے ختم ہونے کے بعد ایک سفیدی آتی ہے اسے کہتے ہیں ”شفق ابیض“۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عشاء کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب شفق احمر اور شفق ابیض ختم ہو جائیں، کیوں کہ قرآن کہتا ہے: ﴿إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ﴾ پانچوں نمازیں کب ہیں؟ سورج کے مائل ہونے کے بعد رات کے چھا جانے تک، اور رات کا چھا جانا تب شمار ہوتا ہے جب سفیدی اور سرخی دونوں ختم ہو جائیں۔ آپ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی فقاہت دیکھیں! اللہ ہمیں اتنے عظیم فقیہ کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

### نماز تہجد کا اہتمام کیجیے!

﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ ۚ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا

مَحْمُودًا﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے پیغمبر! آپ تہجد کی نماز پڑھیں۔

”تہجد“ عربی زبان کا لفظ ہے اور عجیب بات ہے کہ اس لفظ کے متضاد معنی ہیں۔ عربی زبان میں جاگنے کو بھی ”هَجْدٌ“ کہتے ہیں اور عربی زبان میں سونے کو بھی ”هَجْدٌ“ کہتے ہیں۔ اب تہجد کا معنی بعض لوگ کہتے ہیں کہ آدمی عشاء کی نماز پڑھے پھر سو جائے اور پھر اٹھ کر تہجد پڑھے، یہ سونا ضروری نہیں ہے اس لیے کہ ﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ﴾ کا معنی یہ ہے کہ آپ نیند کم کریں، رات کا کچھ حصہ جاگیں! اگر آدمی سویا اور سو کر پھر اٹھا تو اس نے نیند کچھ کم کی ہے اور اگر عشاء کی نماز پڑھی اور سویا نہیں اور پھر تہجد پڑھی، پھر تہجد پڑھنے کے بعد سویا تو اس نے بھی نیند کچھ کم کی ہے۔ تو اگر پہلے پڑھ لے تو اس نے بھی نیند کم کی ہے اور صبح اٹھ کر پڑھ لے تو اس نے بھی نیند کم کی ہے۔ دونوں صورتوں میں نیند کا کم کرنا یہ لفظ دونوں کو شامل ہے۔

اس لیے تہجد کے نوافل کا افضل وقت یہ ہے کہ آدمی سو جائے اور صبح اٹھ کر آٹھ رکعات پڑھے اور اگر کسی کو اندیشہ ہو کہ صبح نہیں اٹھ سکتا تو وہ عشاء کی نماز کے بعد تہجد کی نیت سے آٹھ رکعات پڑھ کر سو جائے۔ اللہ رب العزت اس کو آٹھ رکعات تہجد کا مکمل اجر و ثواب عطا فرمائیں گے۔

پہلے امت پر تہجد فرض تھی جس کا ذکر سورۃ مزمل میں موجود ہے، بعد میں تہجد کا حکم ختم ہو گیا، اس کے بجائے پانچ نمازیں آگئیں اور اب تہجد سنت غیر مؤکدہ ہے۔ اگر کوئی پڑھے گا تو اجر ملے گا اور اگر نہیں پڑھے گا تو کوئی گناہ نہیں۔

### ترکِ تہجد پر وعید کیوں؟

آپ کے ذہن میں اس پر ایک سوال ضرور آئے گا کہ جب یہ سنت مؤکدہ نہیں ہے تو بعض احادیث میں تہجد کے ترک کرنے پر وعید کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وعید اس وقت ہے جب آدمی تہجد کی عادت بنا لے پھر تہجد چھوڑ دے، تو یہ مناسب نہیں ہے۔ نفل نماز ضروری تو نہیں ہے لیکن اگر نفل نماز کی عادت بنا لے اور

پھر چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ ناراضگی کا اظہار فرماتے ہیں۔

تہجد امت کے لیے بھی سنت ہے اور پیغمبر کے لیے بھی سنت ہے۔ یہ جو بعض حالات میں مشہور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تہجد فرض تھی، یہ بعض حضرات کی رائے ہے، ترجیح اس بات کو ہے کہ تہجد آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض نہیں تھی، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ اگر کسی وجہ سے تہجد نہیں پڑھ سکے تو سورج نکلنے کے بعد آٹھ رکعات پڑھ لیا کرتے تھے تاکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معمول ختم نہ ہو۔

**”روح کیا چیز ہے؟“ کا جواب:**

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ

الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝﴾

اہل مکہ کو الجھن یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نیک ہیں، صادق ہیں، امین ہیں لیکن نبوت کا دعویٰ کر لیا، شاید یہ حکومت کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے مدینہ کے یہودی علماء سے رابطہ کیا کہ تم کوئی سوال بتاؤ کہ ہم وہ سوال کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا جواب نہ دے سکیں۔

یہ اہل باطل کا طریقہ ہے کہ اہل حق کو خاموش کرانے کے لیے اہل باطل سے رابطہ کریں گے کہ کوئی ایسا سوال بتاؤ جس کا جواب مولوی نہ دے سکیں۔

تو مکہ والوں نے یہودیوں کے پاس وفد بھیجا۔ یہود نے تین سوال بتائے کہ اگر تینوں کا جواب دیں تو پھر بھی نبی نہیں اور اگر تینوں کا جواب نہ دیں تو پھر بھی نبی نہیں اور اگر دو کا جواب دیں اور ایک کا جواب نہ دیں تو پھر بھی نبی نہیں۔ انہوں نے تین سوال یہ بتائے:

(1): ان سے پوچھنا کہ وہ نوجوان کون تھے جو غار میں چھپ گئے تھے؟ آگے



اصحابِ کہف کا واقعہ آرہا ہے۔

(2): وہ کون سے بادشاہ ہیں جنہوں نے پوری دنیا پر حکومت کی؟

(3): روح کے بارے میں ان سے پوچھیں کہ روح کیا ہے؟

چنانچہ یہ لوگ یہود سے سوال پوچھ کر مدینہ منورہ سے مکہ واپس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان لوگوں نے یہ تین سوالات کیے۔ آگے سورۃ کہف میں اس کی تفصیل آئے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس کا جواب کل دوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان شاء اللہ کہنا بھول گئے۔ وہ لوگ کل پھر آئے۔ فرمایا: کل جواب دوں گا۔ کل پھر آئے۔ فرمایا: کل دوں گا۔ یوں سترہ یا انیس دن تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نہیں آئی۔ اس کے بعد جب انہوں نے شور و غل مچا دیا تو پھر اللہ پاک نے وحی نازل فرمائی:

﴿وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا﴾<sup>70</sup>

اے میرے پیغمبر! یہ بات کبھی نہ کہنا کہ میں یہ کام کل کروں گا بلکہ ان شاء اللہ کہہ کر بات کرنا!

ان شاء اللہ نہ کہنے کی وجہ سے سترہ دن وحی بند رہی پھر یہ آیت اتری۔ آگے اصحابِ کہف کا اور سکندر ذو القرنین کا واقعہ ان شاء اللہ تفصیل سے آئے گا۔ فرمایا انہیں بتاؤ کہ جو لوگ ایک عرصہ غار میں رہے وہ اصحابِ کہف تھے اور جس آدمی نے پوری دنیا میں حکومت کرنے کے لیے پوری دنیا کا چکر کاٹا اس کا نام ذو القرنین ہے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سوالوں کے جواب دے دیے اور تیسرے کے جواب میں اللہ نے یہ آیت نازل کی:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي﴾

اے پیغمبر! ان کو یہ نہیں بتانا کہ روح کیا چیز ہے، انہیں یہ بتانا کہ روح امر ربی ہے، اس کی تفصیل مجھے معلوم نہیں۔

**”روح کیا ہے؟“ کا جواب اجمالی دینے کی وجہ:**

یہاں پر علماء نے دو باتیں بہت اہم لکھی ہیں:

[1]: روح کی تفصیل انہیں اس لیے نہیں بتائی کہ ان کا دماغ اتنا نہیں تھا کہ وہ روح کو سمجھ سکیں۔ جیسے قرآن کریم میں ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۝ لَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝﴾

﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝﴾

لوگوں نے سوال کیا کہ آپ یہ بتائیں کہ اللہ کیا ہے؟ اب جواب میں یہ نہیں بتایا کہ اللہ کیا ہے۔ فرمایا انہیں بتائیں اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، اللہ کسی کا بیٹا نہیں، اللہ کا کوئی باپ نہیں اور اللہ کا ہمسر بھی کوئی نہیں۔

انہوں نے یہ تو نہیں پوچھا کہ اللہ کون ہے؟ انہوں نے پوچھا تھا کہ اللہ کیا ہے؟ لیکن جواب یہ دیا گیا کہ اللہ کون ہیں! اسی طرح قرآن کریم میں ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْآهْلِ ۖ قُلِ الْآهْلُ مِنَ النَّاسِ ۚ يَمْلِكُ النَّاسُ وَاعْتَدِ لِلنَّاسِ وَاعْتَدِ لِلنَّاسِ ۚ﴾<sup>71</sup>

انہوں نے پوچھا کہ چاند کیا ہے؟ جواب دیا: ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ ۚ﴾

﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ ۚ﴾ کہ چاند کیوں ہے؟

اب دیکھیں! سوال کیا ہے اور جواب کیا ہے! تو انہوں نے پوچھا تھا کہ روح

کیا ہے؟ جواب دیا کہ ﴿قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي﴾

[2]: اللہ رب العزت نے تعلیم دی ہے کہ عوام کے سامنے اتنی ہی بات کرو جتنی وہ سمجھ سکیں اور جو نہ سمجھ سکیں وہ مسئلے عوام میں لانے ہی نہیں چاہئیں۔

### قرآن کے تین چیلنجز:

﴿قُلْ لِّیْنَ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا﴾<sup>72</sup>

یہ بات آپ جانتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے منکرین قرآن کو تین مرتبہ چیلنج دیا ہے۔ پہلا چیلنج یہاں پر ہے:

[۱]: ﴿قُلْ لِّیْنَ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا﴾

تم کہتے ہو کہ قرآن اصلی نہیں ہے تو جن وانس سارے جمع ہو جاؤ اور اس جیسا کوئی قرآن لاسکتے ہو تو لاؤ!

جب سارے عاجز ہو گئے پھر ان کو چیلنج دیا کہ تم کہتے ہو کہ یہ قرآن اصلی نہیں ہے تو....

[۲]: ﴿قُلْ فَاتَّوْا بِعَشْرِ سُوْرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرِیٰتٍ وَّادْعُوْا مَنْ اَسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾<sup>73</sup>

کہ تم اس طرح کی دس سورتیں بنا لاؤ!

72۔ بنی اسرائیل 88:

73۔ ہود 11:

جب دس سورتوں سے بھی عاجز آگئے تو پھر اللہ نے چیلنج دیا:

[۳]: ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّمَّنْ

مِثْلِهِ ۚ﴾<sup>74</sup>

کہ ایک سورت تو لاؤ، اب تم ایک سورت بھی قیامت تک نہیں لا سکتے اب تم جہنم کا ایندھن ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ!

تو تدربچا چیلنج کیا ہے۔ پہلے پورے قرآن کا، پھر دس سورتوں کا اور پھر ایک سورت کا اور آج پندرہ سو سال گزر گئے یہ چیلنج آج تک موجود ہے، دنیا کے سارے کافر مل کر ایک سورت بھی نہیں لا سکے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

**کفار کے بے جاسوات کے معقول جوابات:**

﴿وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّىٰ تُفَجِّرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا ۙ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّحِيلٍ ۚ وَعَنْبٌ فَتَفْجِرَ الْأَنْهَارَ حِلْطَهَا تَفْجِيرًا ۙ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسْفًا أَوْ تَأْتِي بِنَا إِلَٰهٍ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۚ﴾<sup>75</sup>

میرے پیغمبر! ان کے بہت سارے بے جاسم کے مطالبے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک مطالبہ یہ تھا ہم آپ پر ایمان لائیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ آپ زمین سے پانی کے چشمے نکالیں اور کھجوروں اور انگوروں کے باغات لائیں۔ ہم آپ پر ایمان لائیں گے لیکن ہماری شرط یہ ہے کہ آپ آسمان پر چڑھیں اور وہاں سے سنہری ٹکڑے لائیں۔ ہم آپ پر ایمان لائیں گے ہماری شرط یہ ہے کہ آپ آسمان سے کتاب لے کر آئیں اور بتائیں

کہ یہ کتاب لایا ہوں۔

اللہ پاک نے فرمایا: اے پیغمبر! آپ ان کو بتائیں ﴿سُبْحَانَ رَبِّي﴾ میرا اللہ پاک ہے، یہ کام میرے بس میں نہیں ہے، ﴿هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلُكُمْ﴾ میں انسان بھی ہوں اور رسول بھی ہوں، مجھ سے مطالبہ وہ کرو جو انسان کے بس میں ہو، وہ مطالبات مجھ سے نہ کرو جو انسان کے بس میں نہیں ہیں۔ ہاں! اگر دنیا میں انسان نہ ہوتے بلکہ فرشتے رہتے تو اللہ فرشتے کو نبی بنا کر بھیج دیتا، وہ آسمان سے جا کر کتابیں لے آتا۔

### نبی کے بشر ہونے کی حکمت:

اب دیکھو! کتنی وضاحت سے اللہ پاک نے ارشاد فرمایا اور ہمیں تعجب ہوتا ہے اب بھی بعض لوگ پیغمبر کی بشریت کا انکار کرتے ہیں!

اس کے بارے میں اصول ذہن نشین فرمائیں۔ اگر کوئی بندہ آپ سے پوچھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں یا نور ہیں؟ جواب آپ نے یہ دینا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ذات کے اعتبار سے بشر ہیں اور وصف کے اعتبار سے نور ہیں، ہم اللہ کے نبی کو بشر بھی مانتے ہیں ذات کے اعتبار سے اور نور بھی مانتے ہیں وصف کے اعتبار سے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نور ہدایت بھی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر بھی ہیں۔ بشر بنانا اس لیے ضروری تھا کہ اللہ کے نبی بشروں کی طرف جارہے تھے، اگر اللہ کے نبی بشر نہ ہوتے اور بشری تقاضے نہ سمجھتے تو آپ بتائیں بشریت کی ضرورتوں کا ان کو احساس کیسے ہوتا؟

میں یہ بات سمجھا چکا ہوں کہ اگر اللہ کے نبی کا نابالغ بچہ نہ ہوتا اور نابالغ بچہ فوت نہ ہوتا تو نابالغ بچے کی موت پر دکھ کتنا ہوتا ہے یہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے پتا چلتا؟ بعض باتیں علم سے نہیں بلکہ تجربات کی بنیاد پر سمجھ میں آتی ہیں کہ اس

میں دکھ اور درد کتنا ہوتا ہے! اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیمی نہ دیکھی ہوتی تو یتیم کی کیفیت کیا ہوتی ہے یہ اللہ کے نبی کیسے معلوم کرتے؟ اگر پیغمبر کے ساتھ پیٹ نہ ہوتا، بھوک سے نہ گزرتے تو کیسے پتا چلتا کہ غریب کی ضرورت کیا ہے؟ پیغمبر کی بیٹیوں کو طلاق نہ ہوتی تو پیغمبر کیسے سمجھتے کہ بیٹی کی طلاق کا درد کیا ہوتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان تھے۔ ہجرت کے لیے مجبور نہ کیا جاتا تو مکان کے چھوڑنے پر دکھ کتنا ہوتا ہے یہ تو وہی محسوس کر سکتا ہے جس کا مکان ہو اور مکان سے نکالا جائے۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام کو بشروں کی طرف بھیجا گیا تھا اس لیے اللہ اپنے نبی کو بشر بنا کر بھیجتے ہیں تاکہ بشری ضرورتیں پیغمبر کے علم میں ہوں اور پیغمبران کو محسوس بھی فرمائیں۔

**باری تعالیٰ کے دو نام؛ اللہ اور رحمن:**

﴿قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوْ ادْعُوا الرَّحْمَنَ ۖ أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ وَلَا تَجْهَرُوا بِصَلَاتِكُمْ وَلَا تَخَافُوهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا ۝ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُن لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُن لَّهُ وَلِيٌّ مِّنَ الدُّنْيَا وَكَبِيرٌ ۝﴾

ان آیات کا خلاصہ تین باتیں ہیں، ان کو ذہن نشین فرمائیں:

[1]: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگ رہے تھے: یا اللہ! یا رحمن! تو مشرکین کہنے لگے کہ ہمیں تو آپ کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور خود دو خداؤں کو پکار رہے ہیں؟ اس کے جواب میں اللہ پاک نے فرمایا: ﴿قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوْ ادْعُوا الرَّحْمَنَ ۖ أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ﴾ کہ رحمن بھی اللہ کا نام ہے، اللہ بھی اسی کا نام ہے، چاہو تو اللہ کہہ کر پکارو اور چاہو تو رحمن کہہ کر پکارو۔ اللہ ان کا ذاتی نام ہے اور رحمن ان کا صفاتی نام ہے۔ ذات کے اعتبار سے اللہ ایک ہے اور صفاتیں اس کی کئی ہیں۔ تو یا اللہ

کہنا بھی ٹھیک ہے اور یارِ حُسن کہنا بھی ٹھیک ہے۔

### قرأت میں میانہ روی کا حکم:

[2]: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح تہجد کے لیے اٹھتے اور قرأت اونچی آواز سے فرماتے تو مشرکین آکر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو روکتے۔ مشرکین کو تکلیف ہوتی تھی قرآن کیوں پڑھتے ہیں! عجیب بات یہ کہ انہیں قرآن سننے میں مزا بھی آتا تھا، چھپ چھپ کر سنتے بھی تھے لیکن دوسروں کو منع بھی کرتے تھے کہ تم ان کے قریب نہ جانا۔ تو اللہ رب العزت نے فرمایا:

﴿وَلَا تَجْهَرُ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتُ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا﴾

میرے پیغمبر! آپ درمیانی راستہ اختیار کریں۔ اگر قرأت اونچی آواز سے کریں گے تو یہ بد کہیں گے اور قرآن بہت آہستہ پڑھیں گے اور مغرب یا فجر یا عشاء کی نماز ہے تو مقتدی سن نہیں سکیں گے، اس لیے آپ درمیانہ راستہ اختیار کریں تاکہ مشرکین روکنے پر مجبور بھی نہ ہوں اور مقتدی آرام سے سن بھی سکیں۔

حدیث مبارک میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نماز میں بہت آہستہ تلاوت فرما رہے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ بہت اونچا قرآن پڑھ رہے ہیں۔ جب وہ دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ قرآن آہستہ کیوں پڑھتے ہیں؟ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! ”قَدْ أَسْمَعْتُ مَنْ تَأْجِيئُ“ آہستہ اس لیے پڑھتا ہوں کہ جس ذات کو سنار ہوں وہ تو سن رہی ہے! اے عمر! آپ اونچا کیوں پڑھتے ہیں؟ انہوں نے کہا: حضور! ”أَوْقُظُ الْوَسْطَانِ وَأَظْهَرُ الشَّيْطَانَ“ اپنے آپ سے نیند اور شیطان کو بھگانے کے لیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدیق! آپ تھوڑا اونچا پڑھ لیا کریں، فاروق! آپ

تھوڑا آہستہ پڑھ لیا کریں۔<sup>75</sup>

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا خیال فرمایا۔

**اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک ذات ہے:**

[3]: مشرکین تین قسم کے تھے؛ بعض مشرک وہ تھے جو بتوں کو خدا بناتے ہیں، یہود وہ تھے جو حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بناتے تھے اور عیسائی وہ تھے جو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بناتے تھے۔ تو کسی نے خدا کا بیٹا بنادیا اور کسی نے خدا کے مقابلے میں بتوں کو مان لیا۔

اللہ رب العزت نے فرمایا: دنیا میں مددگار تین قسم کے ہیں، یا وہ چھوٹا ہو یا برابر کا ہو یا بڑا ہو۔ اگر چھوٹا ہو تو اسے ”اولاد“ کہتے ہیں اور برابر ہو تو اسے ”شریک“ کہتے ہیں اور بڑا ہو اسے ”مددگار“ کہتے ہیں۔ تو اللہ رب العزت کے نہ کوئی برابر، نہ چھوٹا ہے اور نہ بڑا ہے، اللہ ہر قسم کے شریکوں سے پاک ہیں۔ فرمایا:

﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَ

لَمْ يَكُنْ لَهُ وِثٌّ مِنَ الذَّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا﴾

میرے پیغمبر! آپ ان سے کہیں کہ اللہ کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ کوئی اللہ کے برابر بھی نہیں ہے اور کوئی بھی اللہ کا حمایتی اور مددگار نہیں ہے۔ اللہ ہی بڑا ہے، اللہ ہی کی بڑائی بیان کرو۔

دعا کریں کہ اللہ رب العزت ہم سب کو ہر قسم کے شرک سے محفوظ رکھے، اللہ خالص سنت اور اتباع توحید کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاجْرِدْ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



## سورة الکہف

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ

عِوَجًا ۖ قَدْ

تعارف، وجہ تسمیہ اور فضائل سورت:

سورة الکہف کئی سورت ہے۔ اس میں دس رکوع اور ایک سو دس آیات ہیں۔  
سورة الکہف کو سورة الکہف اس لیے کہتے ہیں کہ اس سورت میں چونکہ اصحاب کہف کا تذکرہ ہے اس لیے اس کا نام بھی سورة الکہف رکھا گیا ہے۔

اس سورت کے فضائل احادیث مبارکہ میں بہت زیادہ منقول ہوئے ہیں۔  
ایک حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ سورت الکہف وہ واحد سورت ہے جو لمبی ہونے کے باوجود اکٹھی نازل ہوئی ہے اور جب سورة الکہف نازل ہوئی تو ستر ہزار فرشتے اس کو لے کر آئے۔<sup>76</sup> (سبحان اللہ۔ سامعین)

ایک حدیث مبارکہ میں ہے جو انسان جمعہ کے دن سورة الکہف کی تلاوت

کرے اس کے پاؤں سے لے کر آسمان تک ساری جگہ اللہ نور سے بھر دیتے ہیں۔<sup>77</sup>  
 اور اس کا اندازہ دنیا میں نہیں بلکہ قیامت کو ہو گا کہ سورۃ الکہف سے مجھے کیا ملا ہے؟ اس روشنی میں انسان قیامت کے دن اپنے سفر کو طے کرے گا۔

ایک حدیث مبارک میں ہے کہ جو انسان جمعہ کے دن سورۃ الکہف کو پڑھتا ہے تو اس جمعہ سے لے کر گزشتہ جمعہ تک کے جتنے گناہ ہیں اللہ سارے معاف فرما دیتے ہیں۔<sup>78</sup>

اور ایک حدیث مبارک میں ہے کہ جو انسان سورۃ الکہف جمعہ کے دن پڑھے اس جمعہ سے لے کر آئندہ جمعہ تک پورا ہفتہ اس آدمی کو اللہ تمام قسم کے فتنوں سے محفوظ رکھتے ہیں حتیٰ کہ اس دوران یعنی اس جمعہ سے لے کر آئندہ جمعہ تک دجال کا فتنہ بھی آگیا تو اللہ اس شخص کو دجال کے فتنے سے بھی بچالیں گے۔<sup>79</sup>

### خود عمل کریں تو دعوت دینا آسان ہوتا ہے:

یہ سورت اس قدر مؤثر ہے! اس لیے اس سورت کو بہت زیادہ پڑھنے کا اہتمام کریں۔ مجھے بھی آج چونکہ مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے مطالعہ میں دقت پیش آتی ہے، آج بھی مصروفیت کی وجہ سے الجھن تھی کہ صبح سورۃ الکہف نہیں پڑھ سکا تو پھر میں نے آج عصر کے بعد جو تھوڑا سا وقت ہوتا ہے اس کی قصداً تلاوت کی۔ میں نے کہا باقی جمعوں میں اگر چھوٹ بھی جائے تو شاید فرق نہ پڑے لیکن آج رات تو میں نے سورۃ الکہف کی فضیلت کو بیان کرنا ہے، آدمی بیان کرے اور خود نہ پڑھے تو آدمی کو

77۔ الترغیب والترہیب: ج 1 ص 298

78۔ تفسیر ابن کثیر: ج 4 ص 194

79۔ تفسیر ابن کثیر: ج 4 ص 194

بیان کرتے ہوئے خود شرم محسوس ہوتی ہے۔

اس پر میں ایک چھوٹا سا واقعہ پیش کرتا ہوں۔ ایک صاحب نسبت ولی اللہ تھے۔ ان کے پاس ایک خاتون اپنے بچے کو لے کر آئی نصیحت کروانے کے لیے کہ یہ گڑ بہت کھاتا ہے، اس کو سمجھا دیں۔ بزرگ نے فرمایا: اس کو کل لے کر آنا۔ وہ اگلے دن آئی تو انہوں نے بچے کو سمجھا دیا۔ عورت کہنے لگی: حضرت! آپ کل ہی سمجھا دیتے، یہ مجھے ایک دن کا انتظار آپ نے کیوں کروایا ہے؟ وہ فرمانے لگے: اے خاتون! کل میں نے خود گڑ کھایا تھا اس لیے مجھے نصیحت کرتے ہوئے خود شرم آرہی تھی، بے شک تھوڑا کھایا تھا لیکن کھایا تو تھا، جب میں نے خود کھایا تھا تو اب کیسے نصیحت کروں؟ اس لیے چوبیس گھنٹے انتظار کرنے کی آپ کو تکلیف دی تھی۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ میں سے ہر بندہ یہ نیت کرے کہ ان شاء اللہ آئندہ ہر جمعہ کے دن سورۃ الکہف کی تلاوت کرے گا۔ ان شاء اللہ اللہ عمل کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

### جمعہ کے دن ان معمولات کا اہتمام کیجیے:

جمعہ کے دن کے معمولات میں سے تین معمولات کا بہت زیادہ اہتمام کیا

کریں:

[۱]: ایک یہ ہے کہ ہر جمعہ سورۃ الکہف کی تلاوت فرمایا کریں۔

[۲]: دوسرا یہ کہ جہاں آپ نے عصر کی نماز پڑھی ہے اسی جگہ پر بیٹھے بیٹھے 80

مرتبہ یہ درود پاک پڑھیں:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَسَلِّمْ تَسْلِيْمًا.

جو شخص 80 بار جمعہ کے دن عصر کی نماز پڑھنے کے بعد اسی جگہ پر بیٹھ کر یہی

درود پاک پڑھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ ہے اللہ رب العزت اس کے

80 سال کے گناہ معاف فرماتے ہیں اور 80 سال کی عبادات کا اجر بھی عطا فرماتے ہیں۔<sup>80</sup>

یہ کتنا آسان سانسخہ ہے اور ہم کتنے نالائق ہیں کہ اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اللہ کا بڑا شکر ہے کہ ہمارے اور آپ کے مدرسے مرکز اہل السنۃ والجماعۃ میں ہر جمعہ کے دن عصر کے بعد اساتذہ اور تمام طلبہ بیٹھ کر یہ درود پاک پڑھتے ہیں۔ یہ ہلکی سی کارگزاریاں میں اس لیے سناتا ہوں کہ ایسے مدرسے پر اگر کسی کا ایک روپیہ بھی لگا ہو تو وہ ذہن میں رکھے کہ 80 مرتبہ درود پاک کا اجر اللہ مجھے ضرور عطا فرما دیتے ہیں۔

[۳]: تیسرا یہ کہ جمعہ کے دن امام ایک خطبہ دے کر بیٹھے تو دوسرے خطبے اور پہلے خطبے کے درمیان میں جو ایک آدھ منٹ کا وقفہ ہے اس میں دعا کا اہتمام کیا کریں۔ یہ قبولیت دعا کا وقت ہے لیکن یہ خیال کریں کہ اس وقت دعا زبان سے نہیں کرنی بلکہ اپنے دل میں کرنی ہے۔ اللہ پاک زبان کی بات بھی سنتے ہیں اور اللہ پاک دلوں کی بات بھی جانتے ہیں۔ وہ علیم بذات الصدور ہے۔ چونکہ امام خطبے کے لیے جب منبر پر آ جائے تو سنتوں اور نوافل کی گنجائش بھی نہیں ہے اور اس وقت دعائیں مانگنے اور بات کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

اب بتاؤ! آدھا منٹ کیا وقت ہوتا ہے؟ ایک منٹ کیا وقت ہوتا ہے؟ بس اپنی گردن کو جھکائیں اور دل ہی دل میں کہہ دیں کہ اللہ! میرے والد صاحب بیمار ہیں انہیں شفا عطا فرما دے! میری بیٹی ہے رشتے کا انتظام فرما دے، میرا بیٹا ہے اس کی ملازمت کا انتظام فرما دے، میرا کاروبار ہے اللہ اس کے معاملات کو ٹھیک فرما دے،

میں نے فلاں گناہ کیا ہے اپنے کرم سے اسے معاف فرمادے۔ میں اپنی ضرورتوں کو جانتا ہوں اور آپ اپنی ضرورتوں کو جانتے ہیں، اس لیے آپ یہ تین اہتمام ضرور فرمائیں۔ میں نے تو تدریجاً تین باتیں کی ہیں۔ آپ کم از کم ایک بات کا اہتمام فرما لیں۔ کتنا خوش قسمت ہے وہ شخص جس کو یہ تینوں چیزیں نصیب ہوں۔ دعا فرمائیں کہ اللہ پاک ہم کو ان تینوں چیزوں کا اہتمام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### سورت کا شانِ نزول:

حدیث پاک میں ہے کہ مشرکین مکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے سامنے ہمیشہ کی طرح جب اس بار بھی لا جواب ہوئے تو مشرکین مکہ کے بعض رؤسا اور سرداروں نے مشورہ کیا کہ ہم چونکہ ان پڑھ ہیں، یہودی اور عیسائی صاحب علم لوگ ہیں، تورات اور انجیل کے عالم ہیں۔ تو ہم اپنے دو تین بندے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ بھیجیں جو وہاں جا کر ان یہودیوں سے پوچھیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو مشرکین مکہ نے نذر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط ان دو بندوں کو مشورے کے ساتھ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ بھیجا اور یہودیوں سے کہا کہ آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ یہودیوں نے کہا: ان سے جا کر تین سوال کرو۔

- 1: وہ نوجوان کون تھے جو غار میں جا کر چھپے اور کئی سو سال تک سوتے رہے؟
- 2: ان سے پوچھو کہ ذوالقرنین کون تھا جس نے پوری زمین پر فتح حاصل کرنے کے لیے مشرق اور مغرب کا سفر کیا اور اس کا کیا واقعہ ہے؟
- 3: روح کے متعلق پوچھو کہ روح کیا چیز ہے؟

یہ تین سوال جا کر ان سے پوچھو۔ اگر انہوں نے صحیح جواب دے دیے تو سمجھ لینا کہ وہ سچے نبی ہیں۔ اگر جواب نہ دے سکیں تو سمجھ لینا کہ وہ اپنے دعوائے نبوت

میں خدا نخواستہ سچے نہیں ہیں۔

مشرکین واپس آئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تینوں سوال کیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ان کا جواب تمہیں کل دوں گا۔ مشرکین مکہ کل آئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات معمول کے مطابق فرمائی کہ وحی آجائے گی اور میں جواب دے دوں گا لیکن وحی نہیں آئی۔ وہ کل آئے اور پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں کل جواب دوں گا۔ وہ کل پھر آ گئے یعنی پرسوں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہیں دیا۔ یوں تقریباً سترہ دن تک وحی منقطع رہی۔ وہ روزانہ آتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل کی بات فرما دیتے۔ اس پر قرآن کریم کی یہ آیت اتری جس پر بات آگے چل کر ہوگی کہ:

﴿وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ۚ ۝١٢١ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ

اللَّهُ ۚ﴾

اے میرے پیغمبر! آپ ان شاء اللہ کے بغیر کوئی بات نہ فرمایا کریں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھول کر ان شاء اللہ نہیں فرمایا تو سترہ دن تک وحی بند ہو گئی۔ بالآخر وحی آئی تو سورۃ الکہف اس وحی میں نازل ہوئی جس میں ان کے دو سوالات کے جوابات تفصیلاً موجود ہیں اور تیسرا سوال کہ روح کیا ہے اس پر بات سورۃ بنی اسرائیل کی آیت:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۚ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ

مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝١٥١﴾

کے تحت ہو چکی ہے۔ اصحاب کہف کون تھے؟ اس پر بھی قرآن نے بات کی ہے اور ذوالقرنین کون تھا؟ اس پر بھی قرآن کریم نے بات کی ہے۔

## اصحابِ کہف کا تفصیلی واقعہ:

پہلی بات یہ سمجھیں کہ کہف اور غار کا معنی کیا ہے؟ عربی زبان میں ”غار“ کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے اور ”کہف“ کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ پہاڑ میں جو مختصر غار ہو اس کو غار کہتے ہیں اور جو لمبی اور وسیع غار ہو اسے عربی زبان میں ”کہف“ کہتے ہیں۔ لہذا اصحابِ کہف کا معنی یہ ہے کہ یہ نوجوان اس غار میں تھے جو قدرے لمبی تھی۔

اصحابِ کہف کا واقعہ 250ء کا ہے۔ پھر تین سو سال تک یہ لوگ سوتے رہے تو مجموعہ 550ء ہو گیا اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت 570ء میں ہوئی۔ اس حساب سے اصحابِ کہف کے بیدار ہونے کا یہ واقعہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے 20 سال پہلے پیش آیا تھا۔

## مشرک بادشاہ کے احوال:

بادشاہ ظالم تھا، مشرک تھا اور شرک پر اپنی قوم کو مجبور کیا کرتا تھا۔ ایک دن ان کا ایک خاص میلہ تھا جہاں بتوں کی عبادت ہوتی تھی۔ اس میں چند نوجوان جو کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اللہ رب العزت نے ان میں سے ہر ایک کے دل میں یہ بات ڈالی کہ مجھے بتوں کی عبادت کرنے کے بجائے اللہ کی عبادت کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک نوجوان اس مجمع سے کھسکا اور باہر جا کر درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ایک اور آیا وہ بھی وہیں بیٹھ گیا۔ تیسرا آیا تو وہ بھی وہیں بیٹھ گیا۔ تو یہ حضرات تقریباً سات کے لگ بھگ تھے وہاں الگ الگ بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کو بتا بھی نہیں رہے تھے۔ ڈر رہے تھے کہ کوئی جاسوس نہ ہو اور بادشاہ کو نہ بتادے اور ہمیں قتل نہ کروادے۔

آخر ایک نے پوچھ لیا کہ آپ کیوں آئے ہیں تو باری باری سب نے یہی کہا کہ ہم اس شرک سے تنگ ہیں۔ جب سب کی بات ایک ہو گئی تو سب نے اتفاق کیا اور ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھ گئے۔ اب مشورہ کیا کہ نکل تو آئے ہیں، اب کیا کریں؟ یہ بات

آہستہ آہستہ شہر میں پھیلی شروع ہوئی کہ چند نوجوان بیٹھے ہیں جو کھاتے پیتے ہیں اور اس شہر سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارے بتوں کی عبادت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کی یہ شکایت بادشاہ تک پہنچ گئی۔

بادشاہ نے ان کو بلا لیا اور بلا کر پوچھا تو انہوں نے ببانگ دہل بادشاہ کے سامنے کہا کہ ہم جان تو دے سکتے ہیں لیکن ہم شرک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بادشاہ نے ان کے شاہی لباس اتروا دیے اور ان سے کہا: میں تمہیں کچھ دن مہلت دیتا ہوں، تم مشورہ کر لو، اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ یہ حضرات وہاں سے نکلے اور آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا کریں؟ طے یہ پایا کہ یہاں سے نکل کر دور چلے جائیں اور اپنے ایمان کی حفاظت کریں۔ تو یہ ایک غار تک پہنچے اور وہاں جا کر سو گئے۔

### غار میں کتنا عرصہ رہے؟

قرآن میں ہے:

﴿وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا﴾

یہ تین سو سال تک سوتے رہے اور نو سال اوپر۔

تین سو سال بھی ہیں اور تین سو نو سال بھی ہیں۔ یہ کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ شمسی حساب کریں تو تین سو سال بنتے ہیں اور قمری حساب کریں تو تین سو نو سال بنتے ہیں اور قمری حساب میں ہر سو سال پر تین سال بڑھ جاتے ہیں، اس لیے تین سو سال شمسی پر قمری حساب سے نو سال مزید ہو گئے۔ اس لیے اللہ نے ﴿ثَلَاثَ مِائَةٍ﴾ بھی فرمایا اور ﴿وَازْدَادُوا تِسْعًا﴾ بھی فرمایا۔ تین سو سال کو الگ ذکر کیا اور نو سال کو الگ ذکر کیا تاکہ شمسی حساب بھی آجائے اور قمری حساب بھی آجائے۔ یہ قرآن



کریم کی بلاغت ہے۔

یہ نوجوان تین سو سال کے بعد اٹھے۔ آنکھ کھلی تو بھوک لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا: ایک آدمی کو بھیجو جو کھانا لے کر آئے لیکن محتاط سفر کرے، کسی کو پتہ نہ چل جائے، اگر پتا چلا تو بادشاہ ہم سب کو سنگسار کر دے گا۔ تو بچتا بچتا ایک نوجوان دکان پر پہنچا۔ جب اس نے سکے دیے روٹی اور سالن لینے کے لیے تو دکاندار نے کہا: سکے تم نے کہاں سے لیے ہیں؟ اس نے کہا: میرے اپنے ہیں۔ دکاندار نے کہا: چوری کیسے ہیں؟ اس نے کہا: نہیں، یہ میرے اپنے ہیں، چوری کہاں سے کیسے ہیں۔

دکاندار نے کہا: یہ تین سو سال پرانے ہیں یہ تمہارے کہاں سے آئے؟ دکاندار کو شک پڑا کہ کہیں خزانہ دفن تھا جو اس نے کھولا اور چوری کر کے لایا ہے۔ دکاندار کو شک پڑا اور اس نے پولیس کے حوالے کیا کہ ہم نے ایک بندہ پکڑا ہے اور ہمیں لگتا ہے کہ یہ چور ہے۔ پولیس نے پکڑا اور بادشاہ تک لے گئے اور اب جو بادشاہ تین سو سال کے بعد تھا یہ توحید پرست اور موحد تھا، اور جو پہلا تھا وہ مشرک تھا۔

### موحد بادشاہ کی خدائی امداد:

اس بادشاہ کا مسئلہ یہ تھا کہ اس کی قوم حشر کو نہیں مانتی تھی۔ قوم کا کہنا تھا کہ اللہ دوبارہ کیسے زندہ کریں گے؟ اس بادشاہ نے ایک دن رات ریت پر بیٹھ کر ننگے پاؤں اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ اے اللہ! میری قوم آخرت کو نہیں مانتی، میری قوم حشر کو نہیں مانتی، یا اللہ! کوئی ایسی دلیل مجھے عطا فرما دے کہ ان کو میں سمجھا سکوں کہ اللہ دوبارہ کیسے پیدا کریں گے؟ تو بادشاہ نے سمجھا کہ جو میں دعائیں مانگتا تھا شاید اللہ نے وہ قبول کر لی ہیں۔ بادشاہ نے اس نوجوان سے کہا: تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟ تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟ پھر پتا چلا کہ اس نام کا بندہ دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

پھر بادشاہ نے تفتیش کرائی تو پتا چلا کہ وہ جو تین سو سال پہلے بادشاہ جس کا نام

دقیانوس تھا وہ جب مرا تو مرتے وقت ایک تختی لکھ کر رکھ گیا تھا کہ فلاں فلاں نام کے اتنے بندے ہیں، یہ میرے باغی ہیں اور جب بھی میرے بعد والے کسی بادشاہ کو ملیں تو ان کو وہ سنگسار کر دے یا سزائے موت دے دے۔ بادشاہ نے دیکھا تو یہ وہی لوگ ہیں۔ پھر جب ساری بات بادشاہ نے سنی تو انہوں نے بتایا کہ ہمارا بادشاہ شرک والا تھا اور شرک پر مجبور کرتا تھا، ہم نے غار میں پناہ لی تھی، ہم سوئے رہے اور آج اٹھے تو میں کھانا لینے کے لیے آیا ہوں، اس وقت ان سکوں کو دیکھا تو پتا چلا کہ یہ تین سو سال پرانے آدمی تھے۔

بادشاہ نے کہا: مجھے غار تک لے جاؤ تاکہ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھوں، بادشاہ نے غار دیکھی اور ان کی زیارت بھی کی۔ بعض روایات میں ہے کہ بادشاہ ان کی زیارت نہ کر سکا اور وہ وفات پا گئے اور یہ ایک زندہ تھا۔

خیر بادشاہ نے پھر اپنی قوم کو سمجھایا کہ دیکھو! تم کہتے ہو کہ جو مر جائے گا وہ دوبارہ کیسے اٹھے گا؟ یہ دیکھو! تین سو سال سے سوئے ہوئے ہیں، ان کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ تو جو اللہ تین سو سال تک سلا کر دوبارہ اٹھا سکتا ہے تو وہ وفات کے بعد حیات بھی دے سکتا ہے۔ یوں اس بادشاہ کی دعا اللہ نے قبول فرمائی اور دلیل کے طور پر ان کے سامنے نمونہ ظاہر ہو گیا۔ یہ تھے اصحاب کہف جو ولی اللہ تھے۔

## قرآن کی دعوت راہ اعتدال:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ

عِوَجًا ۚ

اللہ فرماتے ہیں: قرآن میں ٹیڑھا پن نہیں ہے بلکہ قرآن درست، معتدل اور درمیانے راستے کی بات کرتا ہے۔

یہ بات سمجھ لیں کہ قرآن حد سے تجاوز بھی نہیں کرتا اور حد سے نیچے بھی نہیں آتا بلکہ حد پر رہتا ہے۔ حد سے تجاوز کریں تو افراط ہے، حد سے اتر جائیں تو تفریط ہے اور حد پر رہیں تو اعتدال اور صراطِ مستقیم ہے۔ اگر حدود کراس کریں تو الحاد ہے اور حدود سے نیچے اتر آئیں تو بدعات ہیں اور حدود پر رہیں تو پھر اہل السنۃ والجماعہ ہیں۔ قرآن کریم حدود پر رہنے کی بات کرتا ہے۔ حد سے تجاوز کرنے کی ہر گز بات نہیں کرتا۔

### افراط، تفریط اور صراطِ مستقیم:

میں اس کی بہت سی مثالیں دیا کرتا ہوں۔ آپ ایک مثال ذہن نشین فرمائیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر صلوٰۃ و سلام پڑھیں تو بھی نہیں سنتے اور دوسرا کہتا ہے کہ جہاں سے بھی پڑھو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ سے سنتے ہیں۔ تو جو کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر پر پڑھا ہو صلوٰۃ و سلام بھی نہیں سنتے یہ الحاد والا ہے اور جو کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے بھی سنتے ہیں یہ بدعات والا ہے اور جو کہے کہ ادھر سر گودھامیں پڑھیں تو اللہ پہنچا دیتے ہیں اور قبر پر پڑھیں تو اللہ سنا دیتے ہیں یہ اہل السنۃ والجماعہ والا ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا

الْحَدِيثِ آسَفًا﴾ ﴿١﴾

اے میرے پیغمبر! آپ کو ان کے ایمان لانے کی فکر ہے اور کرنی چاہیے لیکن ان کے ایمان کی اتنی فکر نہ کریں کہ اپنی جان گنوا بیٹھیں، کیوں کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے، اس میں مؤمن بھی رہتے ہیں اور کافر بھی رہتے ہیں، نہ سارے مؤمن بننے ہیں نہ سارے کافر بننے ہیں، کچھ ماننے والے ہوں گے جو جنت میں جائیں گے اور

کچھ انکار کرنے والے ہوں گے جو جہنم میں جائیں گے، آپ کے ذمے محنت کرنا ہے، آپ کے ذمے ان کو جنت میں لے جانا نہیں ہے۔ اس لیے اتنی محنت نہ کریں کہ اپنی جان گنوا بیٹھیں، اتنی محنت کریں جتنا شریعت نے حکم دیا ہے۔

**کسی کو راہِ راست پر لانے کے لیے گناہ کرنا جائز نہیں:**

اس سے ایک مسئلہ سمجھ لیں۔ بعض لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مجھ سے ایک آدمی نے مسئلہ پوچھا، وہ جماعت میں چل رہا تھا اور جماعت میں سارے علماء تھے۔ کہا: جی ہم فلاں طبقے کی مسجد میں ہیں اور ان کے پیچھے نماز پڑھیں تو نماز ہو جاتی ہے یا نہیں ہوتی؟ میں نے کہا: نماز نہیں ہوتی۔ مجھے کہنے لگا: جب ہم ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھیں گے تو وہ ہماری بات نہیں سنیں گے، ہم نماز اس لیے پڑھتے ہیں تاکہ وہ ہماری بات سن لیں۔

میں نے کہا: مولانا صاحب! مجھے آپ بتائیں کہ اگر کوئی لڑکی جو زنا کی عادی ہو، اس کو گناہ سے بچانے کے لیے اس کے ساتھ منہ کالا کر لیں تو کیا اس کی گنجائش ہے؟ مجھے کہتا ہے: نہیں۔ تو میں نے کہا: اس کو بھی تو جنت میں لے کر جانا ہے، تو اگر اس کے ساتھ دوستی نہیں لگاؤ گے تو تمہاری بات نہیں سنے گی تو کیا بات سنانے کے لیے دوستی لگانا جائز ہے؟ مجھے کہتا ہے: نہیں! میں نے کہا: پھر کسی کی نماز کو ٹھیک کرنے کے لیے اپنی نماز خراب کرنا کیسے جائز ہے؟ پھر کہنے لگا: مجھے بات سمجھ میں آگئی ہے۔

دوسرے کا ایمان بچانے کے لیے اپنا ایمان خراب نہ کریں۔ دوسرے کی نماز بچانے کے لیے اپنی نماز خراب نہ کریں۔ چونکہ تبلیغی جماعت میں آپ حضرات بھی جاتے رہتے ہیں اس لیے اچھی طرح مسئلہ سمجھ لیں۔

وہ کہنے لگا: پھر ان کی مسجد میں ہم نہ جائیں؟ میں نے کہا: جایا کرو۔ کیا نماز نہ پڑھیں؟ میں نے کہا: پڑھا کرو۔ اس نے کہا: ادھر آپ کہتے ہیں کہ نہیں ہوتی اور ادھر

آپ کہتے ہیں کہ پڑھا کرو! میں نے کہا: جب مسئلہ ہم بتاتے ہیں تو حل نکالنا بھی ہمارے ذمے ہے۔ مجھے کہتا ہے: جی حل کیا ہے؟ میں نے کہا: دو حل ہیں:

ایک حل یہ ہے کہ پیچھے کھڑے ہو کر پڑھ لیں اور بعد میں قضا کر لیں۔ جب آپ نے قضا کی تو نماز بھی ہو گئی اور دعوت بھی ہو گئی۔

اور دوسرا حل یہ ہے کہ آپ ان کے پیچھے نماز پڑھیں اور اقتداء صوری کریں۔ اقتداء صوری کا معنی یہ ہے امام نے اللہ اکبر کہا تو آپ بھی اللہ اکبر کہیں، امام ثناء پڑھے تو آپ بھی ثناء پڑھیں، امام اعوذ باللہ پڑھے تو آپ بھی پڑھیں، امام بسم اللہ پڑھے تو آپ بھی پڑھیں، وہ فاتحہ پڑھے تو آپ بھی پڑھیں، وہ سورۃ پڑھے تو آپ بھی پڑھیں۔ دیکھنے میں آپ اس کے پیچھے ہوں لیکن درحقیقت نماز آپ کی اپنی ہو! میں نے کہا: نماز بھی ہو گئی ہے اور آپ کی دعوت بھی ہو گئی ہے۔

ہم آپ کو مسئلہ بتا کر ضائع نہیں کرتے۔ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ہم دعوت کا اہتمام بھی کرتے ہیں اور مسئلہ بھی ٹھیک بتاتے ہیں۔

### اصحابِ کہف اور الرقیم:

﴿أَمْرٌ حَسِبْتُ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا ۝﴾

فرمایا: تمہیں تعجب ہے کہ اصحابِ کہف کا واقعہ عجیب ہے۔ اصحابِ کہف کا واقعہ اتنا عجیب نہیں ہے اس سے بھی عجیب تر واقعات قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اصحابِ کہف تو سوئے رہے اور جاگ گئے۔ حضرت عزیر علیہ السلام پر تو وفات آگئی اور وہ زندہ ہو گئے۔ سو کر جاگنا اتنا عجیب نہیں ہے جتنا وفات پا کر زندہ ہو جانا عجیب ہے۔ اس لیے اس کو اتنا عجیب نہ سمجھو بلکہ اس سے بھی عجیب واقعات اللہ نے اور بھی تمہیں دکھائے ہیں۔

ان کو اصحابِ کہف بھی کہا اور اصحابِ رقیم بھی کہا۔ کہف تو غار کو کہتے ہیں

اور رقیم کیا ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ ”الرقیم“ اس وادی کا نام ہے جہاں پر وہ پہاڑ ہے جس میں غار تھی۔ بعض کہتے ہیں: ”الرقیم“ اس پہاڑی کا نام ہے جس میں غار تھی اور بعض کہتے ہیں: ”الرقیم“ کا معنی مرقوم ہے یعنی لکھی ہوئی، یہ جس غار میں بعد میں وفات پا گئے تھے تو مسلمان بادشاہ نے باہر تختی لکھ کر لگا دی تھی کہ فلاں فلاں ولی وفات پا گئے تھے جو اس غار میں موجود ہیں۔ اس لیے ان کو ”اصحاب رقیم“ بھی کہتے ہیں۔

### غار کا محل وقوع:

﴿وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزُورُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ﴾<sup>ط</sup>  
 اس آیت میں اللہ نے غار کا بڑا عجیب نقشہ کھینچا ہے۔ اس کو ذرا سمجھنا! اللہ فرماتے ہیں کہ وہ غار ایسی ہے کہ جب سورج نکلتا ہے تو دھوپ دائیں جانب ہوتی ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو بائیں جانب ہوتی ہے یعنی غار کا نقشہ اس طرح ہے کہ براہ راست دھوپ ان پر نہیں پڑتی، غار کھلی ہے، ہوا آتی جاتی ہے لیکن براہ راست ان کے جسم پر دھوپ نہیں پڑتی۔ اللہ ان کے جسم کو دھوپ سے بچا بھی لیتے ہیں تاکہ اٹھیں نا اور ہوا کا سلسلہ بھی رہتا ہے تاکہ سانس نہ گھٹے۔

اب یہ غار کیسی تھی؟ مفسرین فرماتے ہیں: یہ جو فرمایا کہ سورج جب نکلتا ہے تو دائیں طرف سے گزرتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو بائیں طرف سے، یہ دایاں اور بایاں کس کا ہاتھ ہے؟ یا تو دایاں ہاتھ مراد ہے جب آدمی غار میں داخل ہو یا دایاں ہاتھ مراد ہے جب آدمی غار سے نکلے۔ اگر غار میں داخل ہونا مراد ہو تو اس کا معنی ہے اس غار کا منہ شمال کی جانب تھا اور اگر مراد ہو داخل ہونے والا تو پھر یہ کہیں گے کہ اس کا منہ جنوب کی جانب تھا۔

لیکن بعض مفسرین فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چونکہ ولی تھے اور

ان کی یہ کرامت تھی کہ باوجود اس کے کہ دھوپ اندر جاسکتی تھی لیکن پھر بھی اللہ رب العزت نہیں جانے دیتے تھے۔ کیونکہ قرآن میں ہے:

﴿ذٰلِكَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ ط﴾

یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور نشانی تب ہی ہوتی ہے کہ جب عادت کے مطابق نہ ہو بلکہ عادت کے خلاف ہو۔

### اصحاب کہف کے سونے کی کیفیت:

﴿وَتَحْسَبُهُمْ اَيَّاقًا وَّهُمْ رُقُودٌ ط﴾

اللہ رب العزت فرماتے ہیں: تم دیکھو گے تو ایسے لگے گا جیسے وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ جاگ نہیں رہے تھے بلکہ سوئے ہوئے تھے۔

کیا معنی؟ کہ جب آدمی جاگتا ہے تو آنکھ کھلی ہوتی ہے وہ ایسے سوئے ہوئے تھے کہ آنکھ بھی کھلی ہوئی ہے اور سوئے ہوئے بھی ہیں اور جاگتے ایسے تھے کہ جسم ڈھیلا نہیں تھا۔ جب آدمی دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ جاگتے ہیں حالانکہ وہ جاگتے نہیں تھے، درحقیقت سوئے ہوئے تھے۔

قرآن کریم فرماتا ہے: ﴿وَتَحْسَبُهُمْ اَيَّاقًا وَّهُمْ رُقُودٌ ط﴾ تمہارا خیال

ہے کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں، تو ”رُقُود“ کا معنی ہے سونا۔

سورۃ لیس آپ میں سے تقریباً ہر آدمی کو آتی ہے اور بعض وہ ہیں جو اہتمام سے فجر کے بعد پڑھتے بھی ہوں گے۔ سورۃ لیس کی تلاوت فجر کے بعد کیا کریں۔

حدیث مبارک میں ہے: جو آدمی لیس کی تلاوت صبح کے وقت کرتا ہے اللہ اس کے دن بھر کی حاجات پوری فرمادیتے ہیں۔ جب اللہ اپنے ذمے کام لے لیں تو ہم اعتماد نہیں کرتے اور کوئی بندہ جب اپنے ذمے لے لے تو ہم فوراً اعتماد کر لیتے ہیں۔ یہ

انسانی طبیعت ہے۔ تو فجر کے بعد سورۃ یٰس کا اہتمام فرمایا کریں۔

## قبر سونے کی جگہ ہے:

اب مسئلہ سمجھیں! سورۃ یٰس میں ہے:

﴿قَالُوا يَوْمَئِذٍ لَّيْسَ مِنَّا وَمَنْ مَّرْقَدِنَا﴾<sup>81</sup>

قیامت کے دن کا فراٹھ کر کہیں گے کہ ہمیں سونے کی جگہ سے کس نے اٹھا دیا ہے؟ یہ قبر سونے کی جگہ ہے یا مرنے کی جگہ ہے؟ (سامعین کی۔ سامعین) میت پڑی ہے اور قرآن کریم میں ہے کہ وہ کہیں گے کہ ہمیں سونے کی جگہ سے کس نے اٹھا دیا ہے؟

آپ قبرستان میں گئے ہوں گے تو وہاں کتبے لکھے ہوتے ہیں۔ وہاں ”مرقد“ لکھا ہوتا ہے۔ تو ”مرقد“ کا معنی ہے سونے کی جگہ۔ تو یہ سونے کی جگہ ہے یا مرنے کی جگہ ہے؟ (مرنے کی جگہ ہے۔ سامعین) تو مرقد کیوں لکھتے ہیں؟ قرآن کریم میں ﴿مَنْ مَّرْقَدِنَا﴾ ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی موت ایسے ہے جیسے سونے والے کی موت ہوتی ہے اور سونے والی کی موت یہ ہے کہ روح اندر نہیں ہوتی لیکن روح کا تعلق موجود ہوتا ہے، اس کی روح بھی اندر موجود نہیں لیکن روح کا تعلق موجود ہے۔

فرق یہ ہے کہ سونے والے کو زندہ مانتے ہیں آنکھ سے نظر آنے کی وجہ سے اور مرنے والے کو زندہ مانتے ہیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کی وجہ سے۔ حیات اُس میں بھی ہے اور حیات اس میں بھی ہے، یہ نظر نہیں آرہی کہ ﴿يَوْمَئِذٍ لَّيْسَ مِنَّا وَمَنْ مَّرْقَدِنَا﴾ ہے اور یہ سونے والے کی نظر آرہی ہے۔ مشاہدے والی چیز



کو ایمان نہیں کہتے، بن دیکھے نبی کے فرمانے کی وجہ سے مانیں تو اس کو ایمان کہتے ہیں۔

### اصحابِ کہف کا کتا:

﴿وَكَلَبُھُمْ بِأَسِطُّ ذَرَّاعِیْہِ بِالْوَصِیْدِ﴾

اصحابِ کہف جب چلے تو اصحابِ کہف کے ساتھ ان کا کتا بھی تھا اور وہ بھی غار کے باہر پڑا ہوا تھا۔ اصحابِ کہف کا کتا ان کے ساتھ کیوں تھا؟ مفسرین کہتے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ چونکہ کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ تھے تو رکھوالی والا کتا بھی رکھا تھا اور جب یہ گئے تو کتا بھی پیچھے چلا گیا اور ان کی صحبت میں رہا لیکن اتنی بات طے ہے کہ ان ولیوں کی صحبت میں رہنے والے کتے کا تذکرہ بھی اللہ پاک نے قرآن میں فرما دیا ہے۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ اگر ولی کی صحبت میں کتا آجائے تو اس کے تذکرے اچھے ہوتے ہیں اور جب ولی کی صحبت میں انسان آجائے تو بتائیں اس کے تذکرے کتنے اچھے ہوتے ہوں گے!

### ان کے ساتھ بیٹھنے والا محروم نہیں ہوتا:

صحیح بخاری میں ایک روایت موجود ہے کہ کچھ فرشتے ایسے بھی ہیں جو ذکر کرنے والوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں۔ جب وہ ایسی مجلس کو پالیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوں تو یہ فرشتے ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں کہ ادھر آ جاؤ! جو چیز تم تلاش کر رہے تھے وہ یہاں ہے۔ پھر وہ فرشتے ان ذاکرین کو آسمان دنیا تک اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ جب یہ مجلس ختم ہو جاتی ہے اور ذکر کرنے والے واپس چلے جاتے ہیں تو یہ فرشتے بھی آسمان کی طرف چڑھ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو اس محفل کا علم ہے لیکن اللہ پھر بھی ان فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ میرے بندے کیا کہہ رہے تھے؟ فرشتے کہتے ہیں یا اللہ! وہ لوگ آپ کی تسبیح بیان

کر رہے تھے، آپ کی بڑائی بیان کر رہے تھے۔ اللہ پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: انہوں نے آپ کو نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتے ہیں: اگر وہ مجھے دیکھ لیں تو کیا کریں گے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ یا اللہ! اگر وہ آپ کو دیکھ لیتے تو آپ کی عبادت زیادہ کرتے، آپ کا ذکر اور زیادہ کرتے۔

اللہ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ مجھ سے کیا چیز مانگ رہے تھے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ وہ آپ سے جنت مانگ رہے تھے۔ اللہ پوچھتے ہیں: کیا انہوں نے میری جنت کو دیکھا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتے ہیں: اگر وہ جنت کو دیکھ لیتے تو ان کی کیفیت کیسی ہوتی؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اگر وہ دیکھ لیتے تو ان کی طلب اور زیادہ بڑھ جاتی۔ اللہ فرماتے ہیں: اچھا! یہ بتاؤ کہ وہ کس چیز سے پناہ مانگ رہے تھے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: وہ جہنم کی آگ سے پناہ مانگ رہے تھے۔ اللہ پوچھتے ہیں: کیا انہوں نے جہنم کو دیکھا ہے؟ یا اللہ! انہوں نے جہنم کو نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتے ہیں: اگر وہ جہنم کو دیکھ لیتے تو ان کی کیفیت کیا ہوتی؟ یا اللہ! اگر وہ جہنم کو دیکھ لیتے تو اس سے زیادہ پناہ مانگتے اور اس سے زیادہ خوف کھاتے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اے فرشتو! گواہ رہنا، میں نے انہیں بخش دیا ہے۔ ان میں سے ایک فرشتہ عرض کرتا ہے کہ ان میں فلاں بندہ بھی تھا جو ان کے ساتھ ذکر کرنے کے لیے وہاں نہیں بیٹھا تھا بلکہ اپنے کسی کام سے وہاں آ گیا تھا۔ تو اللہ فرماتے ہیں:

"هُمُ الْجَلَسَاءُ لَا يَشْفَعِي جَلِيسُهُمْ."<sup>82</sup>

یہ ذکر کرنے والے اتنے بابرکت ہیں ان میں اپنے کام کے لیے بیٹھنے والا بھی محروم نہیں رہتا۔

جب ایک کتا اللہ کے ولی کی صحبت میں آجائے تو اللہ اس کو محروم نہیں کرتے، انسان ولی کی صحبت میں آجائے تو وہ محروم کیسے ہو سکتا ہے؟

**کتا صاحب کمال ہو گیا پر اعتراض کا جواب:**

یہاں پر ایک بات سمجھیں! خیبر پختونخواہ ضلع ہری پور میں میرا بیان تھا۔ بیان سے جب فارغ ہوا تو چند ایک نوجوان آئے۔ ان کے پاس دو تین کتابیں تھیں۔ مجھ سے انہوں نے کہا: ہم نے بات کرنی ہے۔ میں نے کہا: کیا بات کرنی ہے؟ بندہ مولوی ہو تو بات کرنے کو بھی جی چاہتا ہے، اب ان سے کیا بات کریں؟

میں نے کہا: چلو آپ کا شوق بھی پورا کر لیں۔ کہنے لگے: ہمارے ہاتھ میں ”امداد المشتاق“ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے، آپ مانتے ہیں؟ میں نے کہا: میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی مانتا ہوں اور ان کی ساری کتابوں کو بھی مانتا ہوں۔ آپ بسم اللہ پڑھیں، جو اعتراض ہے آپ شوق پورا کر لیں۔ کہتے ہیں: ”امداد المشتاق“ میں حضرت تھانوی صاحب نے حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کی کا ایک ملفوظ لکھا ہے کہ حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادی بیٹھے تھے۔ ایک کتا سامنے سے گزرا۔ جنید بغدادی کی نگاہ اس کتے پر پڑ گئی تو وہ کتا اتنا صاحب کمال ہو گیا کہ شہر کے کتے اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ وہ کتا ایک جگہ بیٹھا تو باقی کتے اس کے ارد گرد حلقہ بنا کر بیٹھے اور مراقبہ کیا۔<sup>83</sup>

تو وہ کہنے لگے کہ دیکھو! کتنی غلط بات لکھی ہے۔

میں نے کہا: کیا غلط بات ہے اس میں؟ کہنے لگے: پہلی بات تو اس میں غلط یہ ہے کہ کتا کامل ہو گیا، کیا کبھی کتا بھی کامل ہو سکتا ہے؟ اور دوسری غلط بات یہ ہے کہ

کتوں نے مراقبہ کیا، کیا کبھی کتے بھی مراقبہ کرتے ہیں؟

میں نے کہا: چلو قرآن سے پوچھ لیتے ہیں دونوں باتیں کہ حضرت تھانوی نے غلط بات کی ہے یا ٹھیک؟ کہنے لگا: قرآن سے پوچھتے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں قرآن سے پوچھتے ہیں، جب قرآن پر اعتراض ہو تو دفاع اللہ کا قرآن خود کرتا ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

میں نے کہا: ہمارے اکابرین جھوٹے نہیں تھے۔ اب سنو قرآن کیا کہتا ہے۔ اصحاب کھف جو تھے وہ اس امت کے ولی ہیں یا گزشتہ امت کے؟ کہنے لگے کہ گزشتہ امت کے۔ میں نے کہا: ان کے ساتھ جو کتا ملا تھا اللہ نے قرآن میں جس کا ذکر کیا ہے تو یہ اس کا ذکر کیوں کیا ہے، اس کو اچھا سمجھ کر یا برا سمجھ کر؟ کہا: اچھائی تھی تبھی تو ذکر کیا۔ میں نے کہا: اُس امت کے ولی کی صحبت میں کتا آجائے تو بدل سکتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ولی کی صحبت میں آجائے تو کیوں نہیں بدلتا؟ قرآن کہتا ہے کہ وہ بدل گیا ہے اور تم ماننے کے لیے تیار نہیں ہو۔

پھر وہ مجھے کہنے لگا: جی کامل کیسے ہوا؟ میں نے کہا: تمہیں شک اس لیے پڑا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ انسان کامل ہے اور کتنا ناقص ہے تو ناقص کو کامل کیسے کہہ دیا؟ کتے کو کامل کہنا یہ انسان کے مقابلے میں نہیں ہے، اس کتے کو کامل کہنا دوسرے کتوں کے مقابلے میں ہے، انسان کا مقابلہ انسان سے ہوتا ہے اور کتے کا مقابلہ کتے سے ہوتا ہے۔

### جنرل کا مقابلہ جنرل سے کریں!

اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ جامعہ امدادیہ فیصل آباد کے مہتمم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا ندیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے استاذ ہیں۔ صدر ضیاء الحق کا جب حادثہ پیش آیا تو استاذ جی نے طلبہ کو جمع کر لیا اور فرمانے لگے کہ آج بہت بڑا ولی دنیا سے چلا گیا ہے۔ اب استاذ صاحب فرمانے لگے کہ تمہیں تعجب ہو گا کہ میں نے اسے

کیسے ولی کہہ دیا ہے؟ وہ ڈاڑھی منڈاتا تھا تو ڈاڑھی منڈا ولی کیسے بن گیا؟ فرمایا: مجھے بتا ہے کہ تمہارے ذہن میں سوال آتا ہے۔ استاذ جی نے فرمایا کہ یہ شک تمہیں اس لیے پڑ رہا ہے کہ تم نے اس کا مقابلہ کیا ہے علماء سے اور شیخ الحدیث صاحب سے، جب اس کا مقابلہ علماء سے کریں گے تو پھر ولی نہیں ہو گا، آپ صدر کا مقابلہ دیگر صدور سے کریں پھر پتا چلے گا کہ وہ ولی تھا یا نہیں تھا؟

تاجر کا مقابلہ تاجر سے ہوتا ہے، افسر کا مقابلہ افسر سے ہوتا ہے، مولوی کا مقابلہ مولوی سے ہوتا ہے، انسان کا مقابلہ انسان سے ہوتا ہے اور کتے کا مقابلہ کتے سے ہوتا ہے۔ اگر مولوی ہو اور ڈاڑھی منڈاتا ہو کہو نیک آدمی ہے تو کیا کوئی مان لے گا؟ (نہیں۔ سامعین) اور افسر ڈاڑھی منڈاتا ہو لیکن رشوت نہ کھاتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور ماتحتوں کا خیال کرتا ہو تو کیا کہتے ہیں؟ جی بڑا نیک آدمی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اس کو نیک کیوں کہتے ہو؟ بھائی مصلے کے امام کی نیکی اور ہوتی ہے، افسر کی نیکی اور ہوتی ہے۔ بات سمجھ آرہی ہے؟ (جی۔ سامعین)

کتوں کا کمال اور ہوتا ہے اور انسانوں کا کمال اور ہوتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ کتا بڑا سمجھدار ہے۔ اب اس کا یہ معنی تو نہیں کہ مسجد کے امام سے بھی بڑا سمجھدار ہے۔ سمجھداری کا معنی یہ ہے کہ دشمن کو بھی سمجھتا ہے اور مالک کو بھی سمجھتا ہے۔

### جانوروں کے سجدہ کرنے کا ذکر:

دوسری بات وہ مجھے کہنے لگا: کتا مراقبہ میں چلا گیا، یہ قرآن کے خلاف ہے۔ میں نے کہا: کتے سجدے کرتے ہیں اور تو کہتا ہے کہ مراقبہ بھی نہیں کرتے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ عَذَابَ اللَّهِ يَسْجُدُونَ لَهُ مِنَ السَّمَوَاتِ وَمِنَ الْأَرْضِ وَالشَّجَرُ

وَالنُّجُومَ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَاللَّهُوَابُ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ﴿٨٤﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ چوپائے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ جانور سجدے کرتے ہیں اور تو کہتا ہے کہ مراقبہ نہیں کرتے۔ مراقبہ کا معنی گردن جھکا لینا ہے اور سجدے کا معنی گردن کو زمین سے لگا دینا ہے، گردن کو زمین سے لگائے تو سجدہ ہو جاتا ہے اور گردن جھکائے تو مراقبہ کیوں نہیں ہوتا؟

میں نے کہا: حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کو سمجھنے کے لیے دیوبند کا دماغ چاہیے۔ آپ کا دماغ کام نہیں کرتا، اس کے لیے خوشبودار دماغ چاہیے، بدبودار دماغ سے کبھی بھی خوشبو سمجھ میں نہیں آتی۔

**منکرین حیات کے اعتراض کا جواب:**

﴿وَكَذَلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ ۖ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۖ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۖ﴾

اصحاب کہف جب بیدار ہوئے تو ان میں سے ایک نے پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتُمْ﴾ تم کتنا عرصہ سوئے ہو؟ دوسرے کہنے لگے: ﴿لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔ کچھ کہنے لگے: ﴿رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ﴾ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تم کتنا عرصہ سوئے ہو!

مجھے بتاؤ! یہ زندہ تھے یا مردہ تھے؟ (زندہ تھے۔ سامعین) کیا ان کو پتا چلا کہ یہ کتنا عرصہ سوئے ہیں؟ (سامعین۔ نہیں) نہیں پتا چلا نا! اب ذرا ایک دلیل کا جواب

آپ نے خود سمجھنا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں: انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ نہیں ہیں۔ وہ ہمارے خلاف اپنی دلیل میں قرآن کی آیت پیش کرتے ہیں:

﴿أَوَكَلِّدُنِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّى يُحْيِي هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾<sup>85</sup>

حضرت عزیر علیہ السلام گزر رہے تھے، ایک تباہ شدہ بستی کو دیکھا، پوچھا: اللہ اسے کیسے زندہ کرے گا؟ ﴿فَأَمَّا تِلْكَ الْأُمَّةَ مَائَةِ عَامٍ ثُمَّ بَعَثْنَا﴾ اللہ نے سو سال کے لیے ان کو موت دے دی۔ پھر اللہ نے زندہ کیا تو پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتَ﴾ اے عزیر! کتنا عرصہ وہاں ٹھہرے ہو؟ انہوں نے فرمایا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ اللہ! دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں۔ اللہ نے فرمایا: ﴿بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ نہیں بلکہ آپ سو سال تک ٹھہرے ہیں۔

اب منکرین حیات کہتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام زندہ نہیں تھے۔ کیوں کہ اگر زندہ ہوتے تو انہیں پتا چل جاتا! میں نے پوچھا: بتاؤ! اصحابِ کھف زندہ تھے یا نہیں؟ کہا: زندہ تھے۔ میں نے کہا: پھر پتا کیوں نہیں چلا؟ آپ تو کہتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو پتا نہیں چلا لہذا مردہ ہیں تو بتاؤ! اگر کوئی یہ کہے کہ اصحابِ کھف کو پتا نہیں چلا لہذا مردہ تھے تو مان لو گے؟ کہا جی نہیں۔ تو میں نے کہا کہ پتا نہ چلنا یہ مردہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

آپ یہاں بیٹھے ہیں، آپ کو پتا ہے کہ میں نے کتنے منٹ تقریر کی ہے؟

(متکلم اسلام نے دو چار سامعین سے مخاطب ہو کر پوچھا تو جواب ملا کہ نہیں) اب آپ مردہ ہو گئے؟ (نہیں۔ سامعین) بھائی کسی چیز کا معلوم نہ ہونا یہ مردہ ہونے کی دلیل تھوڑی ہے۔ اللہ پاک دلوں کو زندہ فرمائے تو پھر یہ باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔

### ایک عجیب نکتہ:

ایک اور عجیب نکتہ سنیں اور اس کو سمجھیں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ﴾<sup>86</sup>

اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن وہاں کا یہاں کے ہزار سال بنتے ہیں۔

اُس جہان کا ایک دن یہاں کے؟ (ہزار سال۔ سامعین) اور یہاں کے سو

سال ہوں تو پھر وہاں کا کچھ حصہ بنے گا۔ تو عزیر علیہ السلام سے پوچھا:

﴿كَمْ لَيْسَتْ﴾

آپ کتنا ٹھہرے ہیں؟

انہوں نے فرمایا: ﴿لَيْسَتْ يَوْمًا أَوْ بَعْضُ يَوْمٍ﴾

ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں۔

عزیر علیہ السلام کہاں سے آئے تھے؟ (وہاں سے۔ سامعین) تو اللہ پاک

وہاں کا پوچھ رہے تھے یا یہاں کا؟ (یہاں کا۔ سامعین) اللہ یہاں کا پوچھ رہے ہیں اور

حضرت عزیر علیہ السلام وہاں کا بتا رہے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ ٹھہرے وہاں تھے تو

بتایا بھی اسی جگہ کا ہے۔ اللہ نے فرمایا: میں وہاں کا نہیں بلکہ یہاں کا پوچھ رہا ہوں۔ تو

وہاں کا ”بعض یوم“ ہے اور یہاں کا ”مئة عام“ ہے، وہاں کا کچھ ہے اور یہاں کا سو سال

ہے۔ کوئی اختلاف ہے اس میں؟ (نہیں۔ سامعین) کتنی آسان سی بات ہے۔ قرآن



سمجھ میں اپنی نہیں آتا اور اعتراض دوسروں پر کرتے ہیں۔ اللہ پاک قرآن سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

### قرآن کریم کا نصف حصہ:

﴿وَلْيَتَلَطَّفْ﴾

یہ لفظ قرآن کریم کا نصف ہے۔ یہاں آدھا قرآن مکمل ہو گیا۔ اس لفظ میں جو ”ت“ ہے وہ پہلے نصف میں ہے اور ”ل“ دوسرے نصف میں ہے۔ اور آپ تعجب کریں گے کہ جہاں قرآن کا بالکل درمیان ہے اللہ لفظ کیسے لائے ہیں ﴿وَلْيَتَلَطَّفْ﴾ یہ لطف سے ہے۔ جب شروع ہے تو ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ اور جب ختم ہے تو ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ شان ربوبیت کو بیان کیا اور جب درمیان میں ہے تو لفظ لطف کو لائے ہیں ﴿وَلْيَتَلَطَّفْ﴾۔

### نرمی سے پیش آنا ذریعہ نجات ہے:

اصحابِ کھف نے ایک بندے سے کہا: تم پیسے لے جاؤ اور پاک مال لے کر آنا اور ذرا نرمی سے معاملہ طے کرنا، تھوڑی سی بھی سختی کی تو پکڑے جاؤ گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سختی سے بندہ پکڑا جاتا ہے اور نرمی سے نکل جاتا ہے۔ اللہ کو سختیاں پسند نہیں ہیں اللہ کو نرمیاں پسند ہیں۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ سختی اور ہوتی اور مضبوطی اور ہوتی ہے۔ میں نے سختی کا انکار کیا ہے یہ نہ ہو کہ آپ مضبوطی کا انکار کر دیں۔ ایک لوہے کی زنجیر ہوتی ہے اور ایک ریشم کا رسا ہوتا ہے۔ لوہے کی زنجیر سخت ہوتی ہے اور ریشم کا رسا مضبوط ہوتا ہے۔ مسلمان کو لوہے کی زنجیر نہیں بننا چاہیے، ریشم کا رسا بننا چاہیے، اپنے عقیدے پر مضبوط رہو، سختی نہ کرو۔

تو اللہ رب العزت اس لفظ کو درمیان میں لائے ہیں۔

### اصحابِ کہف کی یاد میں مسجد بنانے میں حکمت:

﴿قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا ۖ﴾

جب اصحابِ کہف وفات پا گئے غار میں تو اب مشورہ ہوا کہ ان کی یاد گار کے طور پر کوئی عمارت بنائیں۔ بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ یہاں بطور یاد گار کے مسجد بنالیں۔ مفسرین نے عجیب نکتہ لکھا ہے کہ ان کی یاد میں مسجد بنانے کا فیصلہ کیوں ہوا؟ کہا اس لیے کہ اس وقت چرچا ہو رہا تھا شرک اور توحید کا اور لڑائی ہو رہی تھی کہ اللہ دوبارہ زندہ کریں گے یا نہیں؟ تو چونکہ یہ زندہ مثال ان لوگوں کے لیے تھی کہ دیکھو! تین سو سال بعد اللہ نے ان کو زندہ کیا، اللہ مردے کو بھی زندہ کر سکتے ہیں۔ اگر یہاں پر مسجد نہ بناتے کوئی اور تعمیر کر لیتے تو ممکن تھا کہ لوگ ان کو سجدے کرنا شروع کر دیتے۔ مسجد بنائی یہ بتانے کے لیے کہ تم نے بھی سجدہ اس کو کرنا ہے جس کو سجدہ انہوں نے کیا تھا۔

### حضرت امیر شریعت کا جملہ:

امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب میں حضور کے رخسار دیکھتا ہوں تو جی کرتا ہے کہ سجدہ کر لوں، نبی کی زلفیں دیکھوں تو جی چاہتا ہے کہ جھک جاؤں لیکن جنگِ بدر میں انہی زلفوں کو زمین پر ٹیک کر نبی کو خدا سے مانگتے دیکھتا ہوں تو میں کہتا ہوں: عطاء اللہ! سجدہ اسے کر جسے یہ رخسار والا کر رہا ہے۔ مجھے پیغمبر کے سجدے نے اللہ کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

### اصحابِ کہف کی تعداد:

﴿سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةً رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُولُونَ خَمْسَةً سَادِسُهُمْ

كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُولُونَ سَبْعَةً وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ﴾

اصحابِ کہف کی تعداد کتنی تھی؟ قرآن کریم نے تین قول نقل کیے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا، بعض کہتے ہیں: پانچ تھے اور چھٹا کتا تھا اور بعض کہتے ہیں: سات تھے اور آٹھواں کتا تھا۔

**اصحابِ کہف سات تھے... دلیل:**

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآن میں ہے کہ میرے پیغمبر! آپ کہہ دیں: ﴿رَبِّيَ عَلَّمَ بِعَدَّتِهِمْ﴾ صحیح تعداد ان کی اللہ ہی جانتا ہے، ﴿مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا الْقَلِيلُ﴾ دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو ان کی تعداد کو جانتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”اَنَا مِنَ الْقَلِيلِ“ میں بھی ان چند لوگوں میں سے ہوں اور جانتا ہوں کہ کتنے تھے؟ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما دلیل یہ دیتے ہیں کہ جب اللہ نے پہلا اور دوسرا قول نقل کیا یعنی بعض کہتے ہیں: تین تھے اور چوتھا کتا تھا اور بعض کہتے ہیں: پانچ تھے اور چھٹا کتا تھا تو اللہ نے فرمایا: ﴿رَجْمًا بِالْغَيْبِ﴾ یہ اٹکل پچو والی باتیں ہیں اور جب تیسرا قول نقل کیا کہ وہ سات تھے اور آٹھواں کتا تھا تو اس کو اٹکل کی باتیں نہیں فرمایا۔ اس کو اٹکل کے جملے کے بعد فرمایا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دو قول ٹھیک نہیں ہیں، تیسرا قول ٹھیک ہے۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ فرمایا: جب یہ سوئے ہوئے تھے اور اٹھے تو ﴿قَائِلٍ مِنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ﴾ ان میں سے ایک بندے نے کہا: تم کتنا عرصہ ٹھہرے ہو؟ کتنے بندوں نے کہا؟ (ایک نے) سامعین، پھر ﴿قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ

يَوْمٍ ﴿﴾ یہاں ”قَالُوا“ یہ جمع ہے، انہوں نے کہا: ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں۔ جمع کے کم از کم تین فرد ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا: ﴿قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَيْسَ لَكُمْ﴾ دوسروں نے کہا: اللہ بہتر جانتا ہے کہ تم کتنا عرصہ ٹھہرے ہو! اب یہ تین جملے ہو گئے۔ ایک نے کہا: کتنا عرصہ ٹھہرے ہو؟ بعض نے کہا: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ اور بعض نے کہا: اللہ بہتر جانتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: پہلا قائل تو ایک تھا، دوسرا بھی جمع ہے اور تیسرا بھی جمع ہے اور جمع کے کم از کم تین فرد ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ تین جمع تین چھ، جمع ایک؛ گل سات ہوئے۔

### حضرت ابن عباس کو حضور علیہ السلام کی دعا:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ تفسیر کیوں فرماتے ہیں؟ یہ بھی سمجھ لیں! میں نے آپ کو سنایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ تھیں۔ ان کی والدہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کبھی بھیج دیتیں کہ جاؤ بیٹا! وہاں سو بھی جانا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے رات کے اعمال بھی دیکھنا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اٹھے، قضائے حاجت کے لیے گئے، واپس تشریف لائے تو ابن عباس بچے تھے، انہوں نے لوٹا پانی کا بھر کر رکھ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: یہ پانی کس نے بھرا ہے؟ حضرت ابن عباس نے عرض کیا: میں نے بھرا ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دعائیں مانگیں:

"اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّينِ وَعَلِّمَهُ التَّوَاتُلَ"

اے اللہ! اس کو دین کا فقیہ بنا اور قرآن کا مفسر بنا!  
جس کے لیے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہو تو اگر اس پر بھی  
قرآن نہیں کھلنا تو بتاؤ قرآن کس پر کھلنا ہے؟

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دعا کرائی نہیں تھی بلکہ  
دعا لی تھی، ہم دعائیں کراتے ہیں دعائیں لیتے نہیں ہیں، دعائیں کرانے کے بجائے  
دعائیں لینا سیکھ لو! دعا لینے کا مزہ اپنا ہوتا ہے اور دعا کرانے کا مزہ اپنا ہوتا ہے۔ اللہ ہمیں  
بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### ہر نیک کام سے پہلے ان شاء اللہ کہنے کی تاکید:

﴿وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ۚ﴾ (٣١) ﴿إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾

اللہ نے فرمایا: اے میرے محمد! جب بھی آپ نے کوئی کام کرنا ہو تو یہ کہا  
کریں ”ان شاء اللہ“ اور ان شاء اللہ کہے بغیر کوئی کام نہ کیا کریں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شاء اللہ نہیں کہا تو سترہ دن وحی بند ہو  
گئی۔ یہ ناراضگی نہیں تھی بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھانا مقصود تھا۔ جتنا کسی کا  
مقام ہوتا ہے سمجھانا اسی طرز کا ہوتا ہے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔  
(آمین)

جب کوئی کام کرنا ہو تو ان شاء اللہ کہا کرو اور جب کوئی کام کر لو تو پھر ماشاء اللہ  
کہا کرو۔ ہمارے بعض لوگ ماشاء اللہ اور ان شاء اللہ میں فرق نہیں کرتے۔

### ایک حکایت:

کہتے ہیں کہ ایک بندے کے پاس پیسے تھے۔ کسی نے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟  
کہا: منڈی جا رہا ہوں گھوڑا خریدنے کے لیے۔ تو اس نے کہا: بھائی! ان شاء اللہ کہا کرو!  
اس نے کہا: پیسے جیب میں ہیں، اب کیا ان شاء اللہ کہنا ہے۔ خیر وہ منڈی چلا گیا تو جیب

کٹ گئی۔ جب شام کو واپس آیا تو لوگوں نے پوچھا: گھوڑا خریدا؟ اس نے کہا: ان شاء اللہ جب میں بازار گیا تو ان شاء اللہ میں جب وہاں پہنچا تو ان شاء اللہ میری جیب کٹ گئی۔ لوگوں نے کہا: جیب کٹ گئی اب ان شاء اللہ کہنے سے کچھ بھی نہیں ہو گا، جب جیب میں مال ہو تو بندہ ان شاء اللہ نہیں کہتا اور جب جیب کٹ جائے تو پھر ان شاء اللہ ان شاء اللہ کہتا ہے۔ (مسکراہٹ از سامعین) اللہ ہم سب کو جب کام اچھا کریں تو ان شاء اللہ کہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

براکام کرنا نہیں چاہیے اور کبھی کریں تو پھر ان شاء اللہ نہ کہیں، گندے کام پر وعدوں کی ضرورت نہیں ہے، اچھے کاموں پر وعدوں کی ضرورت ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو قرآن کریم سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### دو آدمیوں کا قصہ:

﴿وَاَصْرَبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زُرْعًا ۝﴾

اللہ رب العزت نے ان آیات میں دو آدمیوں کا واقعہ بیان فرمایا ہے ہمیں سمجھانے کے لیے۔ ان میں ایک شخص وہ تھا جس کے پاس زمین بھی ہے، باغات بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ساری نعمتیں موجود ہیں لیکن وہ ان نعمتوں کی قدر کرنے کے بجائے کفریہ کلمات کہتا اور ان انعامات کو اللہ کی جانب سے سمجھنے کے بجائے اپنی محنت کی بنیاد سمجھتا اور اس کا خیال یہ تھا کہ میرے پاس جو دولت موجود ہے شاید اس پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔

مقابل اہل حق اور نیک آدمی تھا، اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ دیکھ! اللہ نے تجھے ایک نطفہ سے پیدا فرمایا، اللہ نے تجھے مرد بنایا، اللہ نے تجھے دولت عطا فرمائی، اس پر تجھے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور جب تو اللہ کی دی ہوئی نعمت اور

باغات کو دیکھے تو تجھے ”ماشاء اللہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ“ کہنا چاہیے اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے دماغ میں یہ تھا کہ میرے پاس دولت موجود ہے اور یہ ہمیشہ رہے گی لیکن اس کا احساس اس کو اس وقت ہوا جب اللہ رب العزت نے ان نعمتوں کو چھین لیا، باغات کو ختم کر دیا اور یہ خالی ہاتھ رہ گیا اور اس وقت یہ کہہ رہا تھا:

﴿يَلَيْتَنِی لَمْ أَشْرِكْ بِرَبِّیْ أَحَدًا ۝﴾

اے کاش! میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا، اے کاش! میں اللہ کی نعمت کی قدر کر لیتا، لیکن اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَلَمْ تَكُنْ لَهُ فِئَةً يَنْصُرُوْنَهُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِرًا ۝﴾

جب اللہ کی گرفت آجائے پھر اللہ سے چھڑانے والا کوئی نہیں ہوتا۔

### ہر وقت اللہ کا شکر ادا کیا جائے:

جب اللہ نعمتیں عطا فرمائے اس وقت انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرے، جب نعمتیں چھن گئیں اب رونے سے کیا بنے گا؟ اس میں ہمیں یہ بات سمجھانی ہے کہ اللہ کی عطا کردہ نعمت کو اللہ کی طرف سے سمجھیں، اللہ کی ان نعمتوں میں جو خدا نے ہمارے ذمے حق لگائے ہیں ان حقوق کو ادا کریں، جس طرح ہم مال کے آنے پر خوش ہوتے ہیں اسی طرح اللہ کے حکم پر مال دینے میں بھی خوش ہونا چاہیے۔

### دنیا کی بے ثباتی کی مثال:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّیْحُ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝﴾

اللہ رب العزت نے مثال دے کر دنیا و آخرت کو سمجھایا ہے۔ فرمایا: ان

لوگوں کے سامنے دنیا کی یہ مثال پیش کرو کہ دنیا کی مثال بالکل ایسے ہے جیسے ہم نے آسمان سے بارش برسائی تو اس سے زمین ہری بھری ہو گئی لیکن ایک وقت آتا ہے کہ وہ ہریالی سب ختم ہو جاتی ہے اور وہ سبزہ ایسا ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے کہ ہوائیں چلتی ہیں تو اسے اڑالے جاتی ہیں۔

اللہ نے آپ کو مال بھی دیا ہے، اللہ نے دولت بھی دی ہے، یہ دنیوی زندگی کی رونق ہے، اس نے ختم ہو جانا ہے اور باقی کیا رہے گا؟ فرمایا:

﴿وَالْبَقِيَّةُ الصَّالِحَةُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا﴾

اولاد بھی چلی جائے گی اور دولت بھی چلی جائے گی لیکن جو نیک عمل اللہ کے پاس بھیجا ہے وہ عمل باقی رہ جائے گا۔ اس لیے اولاد سے محبت کرنی چاہیے، مال سے محبت کرنا کوئی جرم نہیں ہے لیکن مال کا غلط استعمال کرنا جرم ہے۔

﴿وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ﴾

فرمایا: جب قیامت کے دن اعمال نامے کھولے جائیں گے تو مجرم اپنے اعمال نامہ کو دیکھ کر ڈر جائے گا اور کہے گا:

﴿يَوَيْلَتَنَا مَا لَ هَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا﴾

ہائے ہماری بربادی! میرے نامہ اعمال میں تو ہر قسم کا عمل لکھ دیا گیا ہے۔

﴿وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۚ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا﴾

جتنے اعمال انہوں نے کیے ہوں گے وہ سارے اعمال اپنے سامنے رکھے ہوئے پائیں گے اور اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرے گا۔

**قیامت کے دن ایک جھگڑالو شخص کا حال:**

حدیث پاک میں ہے کہ قیامت کے دن بھی بعض لوگ ایسے جھگڑالو ہوں



گے کہ اللہ رب العزت جب انہیں فرمائیں گے: تم نے کیا کیا؟ تو وہ کہے گا: میں تیری توحید پر ایمان لایا، تیرے نبیوں کو میں نے مانا ہے، میں نے نیک اعمال کیے ہیں۔ اللہ نامہ اعمال کھول کر رکھیں گے کہ تیرے نامہ اعمال میں توحید بھی نہیں ہے، میرے پیغمبر پر ایمان لانا بھی نہیں ہے، میرے نبی کی اطاعت کرنا بھی نہیں ہے، تیرے نامہ اعمال میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ کہے گا کہ نامہ اعمال کا مجھے نہیں پتا، میں نے کبھی نہیں دیکھا لیکن جو بات میں کہتا ہوں بالکل سچی ہے۔

اللہ رب العزت فرمائیں گے: فرشتو! تم گواہی دو۔ فرشتے کہیں گے کہ یہ شخص جھوٹ بولتا ہے، نہ اس کے پاس توحید تھی نہ نبی پر ایمان تھا اور نہ ہی یہ نیک اعمال کرتا تھا۔ وہ کہے گا: فرشتوں کو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں، اللہ! یہ کہاں سے آپ گواہ لے کر آئے؟ اللہ لوح محفوظ رکھ دیں گے کہ یہ دیکھ اس میں سارا کچھ لکھا ہوا ہے۔ وہ کہے گا کہ اللہ آپ کا تو وعدہ ہے کہ آپ کبھی بندے پر ظلم نہیں کرتے تو جو چیزیں میں نے دیکھی نہیں وہ میرے خلاف گواہ کیسے بن گئی ہیں؟ تو یہ شخص قیامت کو بھی جھگڑے گا۔

پھر حدیث پاک ہے میں کہ اللہ اس کی زبان پر مہر لگا دیں گے۔ اب اس کے ہاتھ بولیں گے کہ گناہ کیا تھا؟ اللہ فرمائیں گے کہ اب ان کو جھٹلا! انسان کے جسم کے اعضاء بولیں گے کہ اللہ! اس نے ہم سے گناہ کیا تھا۔ اللہ فرمائیں گے: اب اس کو جھٹلا! لیکن یہ شخص ان گواہوں کو جھٹلا نہیں سکے گا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ بد اعمالیوں اور بد کرداری کی وجہ سے اس کے اپنے اعضاء کی گواہی کے بعد اللہ پاک اس کو جہنم میں ڈال دیں گے اور اس کے مد مقابل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِذَا تَابَ الْعَبْدُ أَنْسَى اللَّهُ الْحَفَظَةَ ذُنُوبَهُ وَأَنْسَى ذَلِكَ جَوَارِحَهُ

وَمَعَالِمُهُ مِنَ الْأَرْضِ حَتَّى يَلْقَى اللَّهَ وَلَيْسَ عَلَيْهِ شَاهِدٌ مِنَ اللَّهِ بِذَنْبٍ" <sup>88</sup>

جب بندہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو اللہ فرشتوں کو اس کے گناہ بھلا دیتے ہیں، جسم کے گناہ کو بھلا دیتے ہیں، اللہ زمین کو گناہ بھلا دیتے ہیں، قیامت کے دن یہ بندہ اس حال میں خدا کے پاس جائے گا کہ کوئی اس کے خلاف گواہی دینے والا نہیں ہو گا۔ اللہ ساری گواہی ختم کر دیں گے۔ اللہ ہم سب کو گناہوں سے بچنے اور توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

### حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ:

اب یہاں آیت نمبر 60 سے آیت نمبر 82 تک حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ اللہ رب العزت نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام بھی سنا ہے، حضرت خضر علیہ السلام کا نام بھی سنا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں آپ نے بہت ساری بے جا باتیں بھی سنی ہیں۔ میں ان کا بھی تذکرہ کروں گا بلکہ آپ کو حیرانی ہوگی کہ بسا اوقات لوگ مصافحہ کرتے وقت انکو ٹھادباتے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں: کیوں دبایا؟ کہتے ہیں: چیک کرتے ہیں کہ خضر تو نہیں ہے۔ میں نے کہا: انکو ٹھوں سے خضر تھوڑی بنتے ہیں! پھر تو جن کے انکو ٹھے کٹے ہوتے ہیں وہ سارے خضر بن جائیں گے۔ یہ بالکل غلط مشہور کر رکھا ہے کہ خضر علیہ السلام کا انکو ٹھا نہیں ہو گا یا انکو ٹھے کی ہڈی نہیں ہوگی۔ بھائی! آپ مجھے جانتے ہیں کہ میں کہاں کا ہوں، میرے انکو ٹھے پر آپ کیسے فیصلہ کریں گے؟ میں آپ کو جانتا ہوں کہ آپ کون ہیں، انکو ٹھے پر فیصلہ کیسے ہو گا؟ ہماری قوم بھی عجیب ہے۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

پورے واقعہ کا پہلے خلاصہ سن لیں، پھر میں آپ کی خدمت میں قرآن کریم کی آیات پیش کرتا ہوں:

صحیح بخاری میں حدیث موجود ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام بنی اسرائیل کو بیان ووعظ فرما رہے تھے، دین کی دعوت دے رہے تھے، ان میں سے ایک شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ سے بڑا عالم بھی کوئی ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ سے بڑا عالم کوئی نہیں ہے اور یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی بجائے تھی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نبی و رسول ہیں، کلیم اللہ ہیں، تورات ان پر نازل ہوئی ہے، بات بالکل بجائے تھی لیکن موسیٰ علیہ السلام کا اس طرح بات کہنا اللہ کو پسند نہیں آیا۔

کیوں؟ اس لیے کہ یہ دعویٰ یوں نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ موسیٰ علیہ السلام یوں فرماتے: میرے علم کے مطابق میرے خیال میں تو مجھ سے بڑا عالم نہیں ہے یا فرما دیتے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام نے جس انداز میں فرمایا کہ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں اللہ رب العزت کو یہ ادا پسند نہیں آئی۔ اس ادا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عملاً تربیت کا فیصلہ فرمایا۔ انسان جتنا بڑا ہوتا ہے اس کی تربیت بھی اتنی ہی سخت ہوتی ہے۔

### مقام ناز اور مقام نیاز:

موسیٰ علیہ السلام اللہ کے محبوب بھی ہیں، اللہ کے لاڈلے بھی ہیں، کلیم اللہ بھی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام اللہ کے ناز والے پیغمبر ہیں۔ ایک ہوتے ہیں نیاز والے اور ایک ہوتے ہیں ناز والے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام مقام نیاز پر تھے، نیاز والا ہر بات کو قبول کرتا ہے اور بولتا نہیں ہے اور مقام ناز والا ہر بات پر بول کے پوچھتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام مقام نیاز پر تھے۔ میں نے ایک بات عرض کی تھی شاید

آپ کو یاد ہو کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج سے واپس تشریف آئے تو ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کو پچاس نمازوں کے بارے میں بتایا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کوئی بات نہیں کی لیکن موسیٰ علیہ السلام بول پڑے کہ یہ قوم پچاس نمازیں نہیں پڑھے گی، اللہ سے کم کروالیں۔ یہاں موسیٰ علیہ السلام کیوں بولے؟ اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مقام ناز پر تھے تو ناز والے بولا کرتے ہیں، ناز والے سوالات کیا کرتے ہیں۔

آپ کسی شیخ کے مرید دیکھ لیں، کسی عالم کے عقیدت مند دیکھ لیں، کسی باپ کے بیٹے دیکھ لیں! ہر مرید ایک جیسا نہیں ہے۔ بعض مرید ہر بات پر جی جی کہتے ہیں اور بولتے نہیں ہیں اور بعض مرید تھوڑے سے بے جھجک ہو کر بات کر لیتے ہیں۔ تو دونوں کے قسم کے مرید ہوتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے پیغمبر بھی دونوں قسم کے ہیں۔

### مجمع البحرين میں خضر علیہ السلام سے ملاقات:

موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے۔ اللہ نے فرمایا: اچھا! تم سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے تو تم اس جگہ پر جاؤ جو دو سمندروں کے ملنے کی جگہ ہے، ﴿مَجْمَعُ الْبَحْرَيْنِ﴾ دو سمندروں کے ملنے کی جگہ ہے۔

مفسرین کے اس پر کئی اقوال ہیں کہ کون سی جگہ ہے؟ لیکن ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ کون سی جگہ ہے۔ فرمایا کہ اس جگہ پر جاؤ اور اس کی علامت یہ ہے تمہارے پاس جو مچھلی موجود ہوگی یہ تمہارے پاس سے نکلے گی اور سرنگ بنا کر دریا میں داخل ہو جائے گی۔ جس جگہ پر مچھلی جائے وہاں تمہیں ہمارا ایک بندہ ملے گا اور وہ تم سے بھی بڑا عالم ہوگا، ان کے پاس وہ علم ہوگا جو تمہارے پاس بھی نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھ اپنے خادم یوشع بن نون بن افرایم بن یوسف کو لیا۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پڑپوتے ہیں۔ بعض روایات میں ہے

کہ حضرت یوسف علیہ السلام نہیں بلکہ بھانجے تھے۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کی خدمت پر مامور تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ چلو! چلنا ہے۔ کہاں جانا ہے؟ جہاں دو دریاؤں کی ملنے کی جگہ ہے۔ کیوں جانا ہے؟ یہ ہمارا مقصد ہے۔

### خادم کو بتانا چاہیے کہ کہاں جانا ہے!

مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے بڑی عجیب بات لکھی ہے۔ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم کو بتا دیا کہ کہاں جانا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تواضع اور ادب دیکھیں کہ خادم کو بتایا۔ فرمایا: آج اگر خادم پوچھے کہ کہاں جانا ہے؟ تو کہتے ہیں کہ تو کون ہوتا ہے پوچھنے والا؟ تو کون ہوتا ہے بک بک کرنے والا؟ بس تو گاڑی چلا جو تیرے ذمے کام ہے۔

ہم موسیٰ علیہ السلام سے تو بڑے مخدوم نہیں ہیں، انہوں نے اپنے خادم کو بتا دیا کہ میں نے فلاں جگہ جانا ہے۔ اس لیے خادم کو بتانا یہ ادب کے خلاف نہیں ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی کا سبب ہے کہ میں نے فلاں جگہ جانا ہے۔ اسی حساب سے گاڑی سیٹ کرے گا، اسی حساب سے خدام تیاری کریں گے ورنہ وہ تیاری نہیں کریں گے۔ پھر آپ غصے بھی ان پر ہوں گے، ہاں اگر کوئی خفیہ سفر ہو تو پھر بتانا ضروری نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے بھی فرمایا کہ آپ مدینہ منورہ میں ہیں۔ مزاج مبارک یہ تھا کہ جب آپ نے جنگی سفر کرنا ہوتا تو صحابہ کے درمیان میں بیٹھ کر مشورہ کرتے، مشرق کی طرف کا راستہ کتنا ہے، سفر کتنا ہے، راستہ میں مقامات کیسے ہیں؟ کیوں کہ اندر جو منافق موجود ہیں، وہ دشمن کو اطلاع نہ کریں کہ تمہارے اوپر حملہ ہے۔ مشورہ مشرق کا ہوتا لیکن صبح جب سواری پر سوار ہوتے تو سفر مغرب کا ہوتا، یہ عمومی مشورہ ہوتا تھا لیکن دو چار جو خاص لوگ ہوتے تھے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ یہ روزانہ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کے شوریٰ کے

آدمی تھے، روزانہ ان کے ساتھ مشورہ سارے امور پر چلتا تھا ورنہ عموماً آپ مشورہ ایسے فرماتے تھے۔

### مردہ مچھلی زندہ ہو کر پانی میں چلی گئی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت یوشع علیہ السلام سے فرمایا: چلو! انہوں نے تیاری کی، ایک مچھلی ساتھ لے لی، اس مچھلی کو تیار کر لیا کہ سفر میں کھائیں گے۔ اللہ رب العزت نے یہ تو فرمایا تھا کہ دو دریاؤں کی ملنے کی جگہ ہے اور یہ علامت بھی بتا دی تھی کہ مچھلی ہوگی وہ دریا میں چلی جائے گی لیکن یہ نہیں بتایا کہ بطور متعین کون سا وقت ہوگا، کون سی خاص جگہ ہوگی؟

یہ چلتے رہے۔ راستہ میں ایک جگہ پر موسیٰ علیہ السلام نے آرام کیا اور خادم صاحت جاگتے رہے۔ اچانک ان کے سامان والے تھیلے سے مردہ مچھلی زندہ ہوئی اور دریا میں سرنگ بنا کر اندر چلی گئی۔ اب بتاؤ! دریا میں تو کبھی سرنگ نہیں ہوتی، سرنگ تو پہاڑوں میں ہوتی ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام نبی تھے اور یہ سارے واقعات خرقِ عادت پیش آرہے تھے۔ اس خادم نے دیکھا اور بتانا بھول گیا۔ موسیٰ علیہ السلام اٹھے اور چل دیے۔

حدیث پاک میں ہے کہ ایک دن اور ایک رات کا سفر طے کیا تو موسیٰ علیہ السلام پر تھکاوٹ کے آثار ہوئے، پہلے لمبا سفر کیا تو تھکاوٹ کے آثار بھی نہیں ہیں، بھوک اور پیاس نے بھی نہیں ستایا اور اب منزل سے آگے بڑھے تو تھکاوٹ ہو گئی۔ اپنے خادم سے فرمانے لگے کہ ہمارا ناشتہ لاؤ، کھانا لاؤ! اس نے کہا: اوہو میں تو بتانا ہی بھول گیا، وہ تو کل کی بات ہے کہ مچھلی دریا میں چلی گئی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے ڈانٹا نہیں بلکہ فرمایا کہ چلو! فوراً سفر واپس کرو، اسی جگہ کی تلاش میں تو ہم نکلے تھے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ اگر وہ بھولے تھے تو موسیٰ علیہ السلام بھی تو بھول

گئے تھے، وہ مچھلی بتانا بھولا لیکن موسیٰ علیہ السلام نے بھی تو نہیں پوچھا کہ ہم جا رہے ہیں مچھلی تمہارے پاس نہیں ہے، وہ سامان کدھر ہے؟ ان کو بھی خیال نہیں آیا تو یہ بھول گئے اور وہ بھی بھول گئے۔ موسیٰ علیہ السلام مچھلی کا پوچھنا بھول گئے اور وہ مچھلی کا سمندر میں جانا بھول گئے۔

### لیلۃ التعریس کا واقعہ:

یہ بالکل ایسے ہے جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر پر جا رہے تھے، راستہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا، رات کا آخری پہر تھا، اب صبح صادق میں کچھ وقت باقی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آرام کرو اور ایک جا کر بیٹھے اور ہمارا پہرہ دے۔ جب اذان ہو جائے تو وہ اٹھائے۔ کون پہرہ دے گا؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور! میں جگاؤں گا۔ فرمایا: ٹھیک ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی سو گئے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی سو گئے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنا کجاوہ لیا اور کجاوہ سے ٹیک لگالی اور مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی سو گئے۔ ادھر سورج نکلا تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھلی۔ فرمایا کہ بلال! کیا ہوا؟ تم تو بیٹھے تھے ہمیں اٹھانے کے لیے اور تم بھی سو گئے؟ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! جس اللہ نے آپ کو سلایا اس اللہ نے مجھے بھی سلا دیا، آپ بھی سو گئے، ہم بھی سو گئے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اذان دو! اذان دی۔ فرمایا: سنتیں پڑھو! سنتیں پڑھیں۔ اقامت کہو، اقامت کہہ دی گئی۔ فرمایا: اب فجر کی نماز ادا کرو۔<sup>89</sup>

علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے وقت بھولنا سمجھ نہیں آتا لیکن اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھولے نہیں ہیں خدا نے بھلایا ہے۔ عملاً امت کو سمجھانے کے لیے کہ اگر کسی موقع پر پوری جماعت کی نیند نہ کھلے اور پوری جماعت کی نماز قضاء ہو جائے تو اب ان کو نماز کیسے پڑھنی چاہیے؟ اللہ کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات صرف زبان مبارک سے نہیں بلکہ عمل سے بات سمجھائی ہے۔ بہت سارے کام اللہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً یوں کرواتے ہیں تاکہ امت کو مسائل سمجھ میں آجائیں اور اس سے پیغمبر کو اجر ملتا ہے جب نبی عمل سے ایک بات کو سمجھاتے ہیں۔

بیٹھ کر نفل پڑھیں تو آدھا ثواب ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر نفل پڑھیں تو پورا ثواب ہے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ علماء نے وجہ لکھی ہے کہ ایک ہے بیٹھ کر نفل پڑھنے کا اجر اور دوسرا ہے امت کو تعلیم دینے کا اجر۔ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا اجر ڈبل ہو جاتا ہے اور امتی کا اجر سنگل رہتا ہے۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ عوام جتنا بھی نیک عمل کر لے کبھی بھی عالم کے برابر ان کے اعمال نہیں پہنچ سکتے۔ یہ بات ذہین نشین فرمائیں! اگر عالم جمعہ کے دن صبح تین گھنٹے سو بھی جائے تو آپ کے نوافل اس کے برابر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ عالم سوئے گا، پھر غسل کرے گا، مطالعہ کرے گا اور تازہ دم ہو کر ان کو درس قرآن دے گا، مسائل سمجھائے گا۔ اب یہ جو مسجد میں پانچ سو بندہ آیا ہے تو عالم تازہ دم ہو کر مسئلے بتا رہا ہے، اس کا سونا اپنے لیے نہیں تھا اس کا سونا بھی آپ کے لیے تھا۔ عالم کی عبادت کا آپ تصور نہیں کر سکتے کہ اس کی عبادت کا اللہ نے کیا اجر عطا فرمایا ہے! اللہ تعالیٰ یہ باتیں ہمیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

**عالم اور غیر عالم میں فرق:**



عام بندہ اس بات کو نہیں سمجھتا! بالکل اس کا وہی مزاج بنتا ہے جو مشرکین کا مزاج تھا۔ مشرکین کا مزاج یہ تھا کہ ہم میں اور نبی میں کیا فرق ہے؟ ہم سوتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سوتے ہیں، ہم کھاتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی کھاتے ہیں، ہم نکاح کرتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی نکاح کرتے ہیں، ہم بازار جاتے ہیں نبی بھی بازار جاتے ہیں، ہم نے کام کیا نبی نے بھی کام کیا۔

جو دھوکا اس مشرک کو تھا یہی دھوکا آج عوام کو بھی لگتا ہے۔ ہم میں اور مولانا صاحب میں کیا فرق ہے؟ یہ نماز پڑھاتا ہے اور تنخواہ لیتا ہے ہم دکان پر جاتے ہیں تو تنخواہ لیتے ہیں۔ دونوں ہی تنخواہ لیتے ہیں، جو دھوکا ان کو تھا وہی دھوکا ان کو ہے۔ ان کو دھوکا لگا تو وہ نبوت کی صحبت سے محروم ہو گئے اور آج دھوکا لگے گا تو عالم کے علم سے محروم ہوں گے۔ اس عالم کے علم میں کیا فرق پڑے گا؟ لیکن ہلکی سی بے ادبی سے اللہ علم سے محروم کر دیتا ہے۔ اللہ ہمیں علم بھی عطا فرمائے، اللہ ہمیں ادب بھی عطا فرمائے۔ (آمین)

### ملاقات ہو گئی:

موسیٰ علیہ السلام واپس تشریف لائے۔ یوشع بن نون ان کے ساتھ تھے۔ وہاں دیکھا کہ ایک بندہ پاؤں سے لے کر سر تک چادر اوپر لے کر سویا ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جاکر کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! انہوں نے سلام کا جواب دیا اور تعجب کیا کہ اس ویرانے میں کون ہے جس نے مجھے سلام کیا۔ پوچھا کون ہو؟ انہوں نے کہا: میں موسیٰ ہوں۔ انہوں نے کہا: کون سے موسیٰ؟ جواب دیا: بنی اسرائیل کا نبی۔ انہوں نے پوچھا: ہمارے پاس کیسے آنا ہوا؟ انہوں نے کہا: کچھ علم آپ کے پاس ہے جو ہمارے پاس نہیں، ہمیں اللہ نے بھیجا ہے وہ علم آپ سے سیکھنا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فوراً فرمایا: اے موسیٰ! جو علم میرے پاس ہے

میں آپ کو سکھاؤں گا لیکن اس کو سہنے کی طاقت آپ کو نہیں ہے، بہتر ہے کہ آپ مجھ سے نہ سیکھیں! موسیٰ علیہ السلام فرمانے لگے کہ میں آپ کی اتباع کروں گا، آپ کی بات مانوں گا، میں ضبط اور صبر سے کام لوں گا۔

### حضرت خضر کی شرط اور حضرت موسیٰ کا عہد:

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم میرے ساتھ چلو اور میں جو کرتا جاؤں گا تم نے دیکھتے جانا ہے لیکن تم نے مجھ سے سوالات نہیں کرنے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں آپ کے ساتھ چلوں گا اور جو کام آپ کریں گے میں دیکھوں گا لیکن ان شاء اللہ میں پوچھوں گا نہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: چلیے! حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام یہ دونوں چلے ہیں۔ دریا کے کنارے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر سفر کرنے کے بعد دریا کے کنارے کشتی آگئی اور یہ دونوں کشتی میں بیٹھ گئے۔ کشتی والوں نے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کو نیک آدمی سمجھ کر کرایہ نہیں لیا، بغیر کرایہ کے کشتی میں سوار کر لیا۔ حضرت خضر علیہ السلام کشتی میں بیٹھے اور کشتی میں بیٹھے ہی کشتی کا ایک تختہ توڑ کر پھینک دیا۔ موسیٰ علیہ السلام فوراً بول اٹھے کہ آپ نے کشتی کیوں توڑی ہے؟ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: میں نے کہا تھا کہ آپ نے سوال نہیں کرنا! آپ تو پہلی ہی بات پر بول پڑے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فوراً کہا:

﴿لَا تَوَاخِذُنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُزْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عَسَىٰ أُنَاقِلَ﴾

میرے معاملے میں تنگی پیدا نہ کریں! میں بھول گیا ہوں، آئندہ میں خیال کروں گا۔ فرمایا: ٹھیک ہے اب چلو۔ اب وہاں کشتی سے نیچے اترے۔ پھر آگے ایک کنارے پر بستی آباد تھی۔ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام وہاں گئے تو دیکھا کہ بچے کھیل رہے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک نابالغ بچے کو پکڑا اور اسے

قتل کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام فوراً پوچھنے لگے:

﴿أَفَتُلْتَفِتْنَ أَنْفُسًا ذِكِّيْتُمْ بِغَيْرِ نَفْسٍ لَّقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا نُّكْرًا ۝﴾

یہ آپ نے کیا کیا؟ بے گناہ بندے کو قتل کر دیا؟ حضرت خضر علیہ السلام فرمانے لگے:

﴿أَلَمْ أَقُلْ لَّكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝﴾

میں کہتا تھا کہ تم میرے ساتھ نہیں چل سکتے! اے موسیٰ! جو علم میرے پاس ہے تیرے بس میں نہیں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام فرمانے لگے: بس یہ آخری بار ہے۔

﴿إِنْ سَأَلْتَهُ عَن شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَحِّبْنِي ۝﴾

اب اگر سوال کروں تو پھر مجھے اپنے پاس نہ رکھنا! بس ایک موقع مجھے اور دے دیں۔

### بستی والوں کی دیوار ٹھیک کرنا:

یہ دونوں حضرات پھر چل پڑے۔ دورانِ سفر حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام ایک بستی سے گزرے تو ان بستی والوں سے انہوں نے کہا: ہمیں اپنا مہمان بنالو، ہم مسافر لوگ ہیں۔ بستی والوں نے مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ اسی بستی میں ایک دیوار تھی جو کہ ٹیڑھی تھی اور گرنے کے قریب تھی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے دیوار کو ٹھیک کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام جلالی آدمی تھے۔ پھر بول پڑے، فرمایا: یہ ہمیں مہمان بنانے کے لیے تیار نہیں، ایک وقت کا دو بندوں کو کھانا نہیں کھلاتے اور آپ مفت میں ان کی دیواریں کھڑی کر رہے ہیں! آپ ان سے کہتے کہ میں دیوار کھڑی کرتا ہوں لیکن اس کے پیسے لوں گا، وہ پیسے ان سے لیتے اور بیٹھ کر کھانا کھا لیتے۔ حضرت خضر علیہ السلام فرمانے لگے:

## ﴿هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ﴾

بس موسیٰ! بس ہو گئی ہے، اب میں اور آپ اکٹھے نہیں چل سکتے، تمہارا راستہ جدا ہے اور میرا راستہ جدا ہے۔

## تین کاموں کی توضیح:

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام جب یہاں سے الگ ہونے لگے تو حضرت خضر علیہ السلام نے اب ان تینوں واقعات کی توضیح فرمائی کہ میں نے کشتی کا تختہ کیوں توڑا، میں نے اس نابالغ بچے کو قتل کیوں کیا اور میں نے بغیر پیسوں کے دیوار کو سیدھا کیوں کیا ہے۔ فرمانے لگے:

## کشتی کا تختہ توڑنے کی وجہ:

[۱]: ﴿أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ﴾

یہ کشتی مساکین کی تھی۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک باپ کے دس بیٹے تھے، ان میں سے پانچ معذور تھے اور پانچ صحت مند تھے۔ پانچ صحت مند مزدوری کرتے اور اسی میں سے پانچ معذورین کو کھلاتے تھے اور معذوروں سے پیسے نہیں لیتے تھے۔ یہ کشتی ان کی تھی جس میں سوار ہوئے۔ ان لوگوں نے مفت میں سوار کیا تو حضرت خضر علیہ السلام نے انہیں یہ صلہ دیا کہ دریا کے پار ایک ظالم بادشاہ تھا اور وہ کشتیاں چھین لیتا تھا۔ چھینتا صحیح کشتی کو تھا۔ یہ بات حضرت خضر علیہ السلام کے علم میں تھی اور کشتی والوں کے علم میں نہیں ہو گا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی میں بیٹھتے ہی ایک تختے کو توڑ دیا۔ جب اس کنارے پر جائیں تو ظالم بادشاہ کے کارندے اس کشتی کو صحیح سالم نہیں عیب دار کشتی سمجھ کر چھوڑ دیں گے اور مساکین کی یہ کشتی بچ جائے گی۔ انہوں نے کرایہ نہیں لیا اور حضرت خضر علیہ السلام نے انہیں صلہ یہ دیا کہ ان کی

کشتی بادشاہ سے محفوظ ہو گئی۔

باقی خضر علیہ السلام نے جو کشتی توڑی تھی تو بعض مفسرین فرماتے ہیں: تختہ نکال دیا تھا اور بعد میں اس میں آئینہ جوڑ لیا تھا۔ اگر آئینہ نہیں جوڑا تو پھٹا نکالنے کے باوجود پانی کیوں نہیں آیا؟ خضر علیہ السلام؛ اللہ کے نبی تھے۔ آگے بات آئے گی اور یہ خضر علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ تختہ ٹوٹنے کے باوجود بھی کشتی میں پانی نہیں آیا۔ اب حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو عیب دار کیا اور ظالم بادشاہ سے ان کو بچا لیا، معذورین کا جو رزق لگا ہوا تھا اس کی حفاظت ہو گئی۔

**بچے کو قتل کرنے کا سبب:**

[۲]: حضرت خضر علیہ السلام فرمانے لگے:

﴿وَأَمَّا الْعُلَمَاءُ فَكَانَ أَبَوْهُ مُؤْمِنِينَ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَ

كُفْرًا ۝۸۰﴾

جو بچے میں نے قتل کیا ہے اس کے والدین ایمان والے اور نیک ہیں۔ یہ اگر بڑا ہو جاتا تو ہمیں خدشہ تھا کہ یہ سرکشی کرتا اور کفر کرتا۔ ﴿فَارَدْنَاهُ أَنْ يُجِدِلَهُمَا

رَبُّهُمَا خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا ۝۸۱﴾

تو ہم نے چاہا کہ اس بچے کو ختم کریں اور اس بچے کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ان کو اچھا بیٹا دیں۔ یہ جو ﴿فَارَدْنَاهُ﴾ فرما رہے ہیں تو یہ حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا پھر اللہ سے دعا مانگی اور اللہ نے بدلے میں دیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ جن والدین کے بچے کو قتل کیا تھا اس کے بدلے میں اللہ نے ان کو بیٹی دی اور اس بیٹی سے خدا کے دینی پیدا ہوئے۔ فوت شدہ بچے کو تو آدمی ویسے بھول جاتا ہے۔ اب دیکھیں! اگر والدین سے بیٹا لیا ہے تو بدلے میں جو دیا ہے وہ بہتر ہے کیونکہ اس کے بطن سے نبی پیدا ہوئے

ہیں اور ان کی آگے امت بھی چلی ہے۔

**دیوار کو سیدھا کرنے کا مقصد:**

[۳]: ﴿وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ

لَهُمَا﴾

فرمایا: ہم نے دیوار اس لیے کھڑی کی ہے کہ یہ دیوار جن بچوں کی ہے وہ یتیم ہیں اور شہر میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے ایک خزانہ موجود ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ بچے اس خزانہ کو لے لیں۔

﴿وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا﴾

اور ان کا والد بہت نیک آدمی تھا، دنیا سے چلا گیا، خزانہ دفن کر گیا۔ اگر یہ دیوار گر جاتی تو خزانہ نیچے سے باہر آ جاتا، لوگ خزانہ لے لیتے اور یتیم بچے محروم رہ جاتے۔ ہم نے دیوار سیدھی کھڑی کر دی تاکہ بچے جب کل بڑے ہوں گے تو دیوار کے نیچے سے اپنے باپ کا خزانہ خود لے لیں گے۔ تو ہم نے یتیم بچوں کا کام کیا ہے، ہم نے بستی والوں پر احسان نہیں کیا۔ ہماری مہمان نوازی سے انکار بستی والوں نے کیا ہے اور ہم نے نیکی یتیم بچوں پر کی ہے۔

یہ تو مختصر قصہ تھا حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام کا جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔

**بڑے کی بھول پر ڈانٹ کی وجہ:**

اب چند ایک باتیں سمجھ لیں۔ بعض سوالات جو آپ کے ذہن میں آئے ہوں گے اگر نہیں آئے تو آنے چاہئیں۔ اگر انسان کا دماغ کام کرے تو پھر سوال دماغ میں ضرور آنے چاہئیں۔ میں بات بالکل صاف کرتا ہوں تاکہ مسئلے میں الجھن نہ

رہے۔

پہلی بات تو یہ سمجھیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بیان فرما رہے تھے اور ایک بندے نے پوچھا: آپ سے بڑا کوئی عالم ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ یہ جملہ اگرچہ ٹھیک تھا لیکن اس جملے کا انداز وہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ یوں فرماتے کہ میرے علم کے مطابق تو کوئی نہیں۔ اگر اور کوئی بڑا عالم موجود ہو تو شاید اللہ کے علم میں ہو۔

موسیٰ علیہ السلام چونکہ بہت بڑے آدمی تھے اور بڑے کی چھوٹی بات جو خلاف اولیٰ ہو اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ فرمادیتے ہیں تاکہ آئندہ امت کو تعلیم ہو جائے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو خدا نے حکم دیا:

﴿وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ﴾<sup>90</sup>

کہ آپ نے اس درخت کے قریب نہیں جانا!

حضرت آدم و حواء علیہما السلام دونوں بھول گئے۔ بھول جانا کوئی جرم نہیں تھا لیکن اللہ نے بھولنے پر بھی ڈانٹ دیا: آدم! تمہاری شان کے لائق یہ بھولنا نہیں تھا۔ یہاں بھی یہی بات ہے کہ اے موسیٰ! تمہاری شان کے لائق یہ جملہ ٹھیک نہیں تھا۔ تو جتنا آدمی بڑا ہو اسی طرح اس کو محتاط بھی زیادہ رہنا چاہیے۔

میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں، آپ بات ذہن میں رکھیں! ہمارے امام مسجد صاحب نماز میں سورۃ البقرۃ تلاوت کریں یا سورۃ الکہف تلاوت کریں اور اس میں بھول جائیں تو آپ کو تعجب نہیں ہو گا کہ ہمارے امام صاحب سورۃ الکہف میں بھول گئے ہیں لیکن امام صاحب اگر سورۃ الفاتحہ میں بھول جائیں تو آپ کو تعجب تو ہو گا کہ امام

صاحب سورۃ الفاتحہ میں بھی بھول گئے حالانکہ بھولنا انسان کے بس میں نہیں ہے، سورۃ الفاتحہ میں بھی بھول سکتا ہے، سورۃ الکہف میں بھی بھول سکتا ہے لیکن سورۃ الکہف میں بھول جائے تو تعجب نہیں ہوتا اور فاتحہ میں بھول جائے تو تعجب ہوتا ہے۔

اگر آپ کے امام صاحب چھٹی پر ہوں اور ایک نیک آدمی ہے، چہرے پر ڈاڑھی ہے، قاری اور حافظ بھی نہیں ہے اس نے گیارہ سورتیں جماعت میں سہ روزہ کے دوران یاد کی ہیں وہ مصلیٰ پر پہلی بار کھڑا ہوا اور وہ سورۃ الفاتحہ میں بھول جائے اور ٹانگیں بھی کانپ جائیں تو کسی کو بھی تعجب نہیں ہو گا کیوں کہ یہ پہلی بار مصلے پر آیا ہے اور سورۃ الفاتحہ عام آدمی بھولے تو تعجب نہیں ہوتا اور امام بھول جائے تو تعجب ہے۔

ایسے جملے اگر عام آدمی کی زبان سے نکلیں تو ڈانٹ نہیں پڑتی اور اگر اللہ کے نبی کی زبان سے نکلیں تو اللہ ڈانٹ دیتے ہیں کہ آپ کو یہ جملے نہیں کہنے چاہئیں تھے یہ آپ کی شان کے لائق نہیں ہیں۔

میں اس لیے سمجھتا ہوں کہ آپ اعتراض نہ کر گزریں کہ پھر موسیٰ علیہ السلام نے ایسا جملہ کیسے کہہ دیا جو اللہ کو پسند نہیں تھا۔

آدم علیہ السلام بھولے تو خدا نے ڈانٹ دیا کہ اے آدم! آپ کو نہیں بھولنا چاہیے تھا۔ کوئی اور بھول جائے تو الگ بات ہے۔ چالیس سال آدم علیہ السلام روئے ہیں کہ اے اللہ! میری اس خطا کو معاف فرمادے۔ تو جیسی ڈانٹ ہے تو اس کے مطابق آدم علیہ السلام روئے ہیں۔

### چالیس سال تک تکبیرِ اولیٰ فوت نہیں ہوئی:

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے امام اہل السنۃ والجماعۃ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ سے یہ جملہ اپنے کانوں سے سنے۔ اب نئی نسل تو ان سے واقف نہیں ہے اور پرانی نسل جو مذہب نہیں جانتی وہ بھی واقف نہیں ہے۔ لگھڑ



منڈی ضلع گوجرانوالہ حضرت کی مسجد میں میں نے قرآن مجید حفظ کیا ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا کہ حضرت فرما رہے تھے: میں دارالعلوم دیوبند میں پڑھتا تھا اور ایک دن فجر کی نماز کے لیے میری آنکھ نہیں کھلی اور پہلی رکعت چلی گئی۔ میں دوسری رکعت میں نماز میں آیا۔ میرے استاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے مجھے بلایا اور پوچھا: اے بیٹے سرفراز! تیری ایک رکعت آج قضاء کیوں ہوئی ہے؟ فرمایا: چالیس سال گزر گئے میں نے تکبیر اولیٰ نہیں جانے دی، چالیس سال گزر گئے تکبیر اولیٰ نہیں جانے دی۔ تو بڑے لوگوں کی جب ڈانٹ پڑے تو پھر بڑے یوں ہوتے ہیں۔

### استاذ چھوٹا بھی ہو تب بھی اس کا ادب کیا جائے:

موسیٰ علیہ السلام کو ہلکی سی ڈانٹ پڑی ہے۔ دیکھو! کتنا لمبا سفر کیا ہے تاکہ اللہ پاک جس طرح خوش ہوں میں نے اپنے اللہ کو مناکر دکھانا ہے۔ اللہ تو راضی تھے، ناراض ہونے والی تو بات ہی نہیں تھی لیکن ہلکی سی تنبیہ پر نبی کس طرح میدان میں نکلے ہیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حضرت خضر علیہ السلام کے پاس آئے ہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے فرمایا:

﴿سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا﴾

میں آپ کی بات مانوں گا، ضبط سے کام لوں گا اور جو آپ فرمائیں گے میں اتباع کروں گا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے ہیں اور حضرت خضر علیہ السلام چھوٹے ہیں لیکن اب موسیٰ علیہ السلام سیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام استاذ بنے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام شاگرد بنے ہیں۔ اگر استاذ چھوٹا بھی ہو تو پھر بھی استاذ کا ادب شاگرد کے ذمہ ہے۔

آدمی کی عمر پچاس سال ہو جائے اور قرآن کریم نہ پڑھا ہو اور اب دل میں آئے کہ مجھے قرآن پڑھ لینا چاہیے تو وہ پندرہ سال کے بچے سے قرآن پڑھنا شروع کرے تو اب اسے یہ ذہن بنالینا چاہیے کہ یہ میرا استاد ہے، عمر کا چھوٹا ہے تب بھی اس کا ادب میرے ذمہ ہے۔

### علم تشریعی اور علم تکوینی:

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں ان شاء اللہ آپ کی مکمل بات مانوں گا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کر دیا کہ جب آپ چلیں گے تو کچھ باتیں ایسی ہوں گی جو آپ کے بس میں نہیں ہوں گی، آپ کو صبر کرنا پڑے گا۔ یہ بات حضرت خضر علیہ السلام نے کیوں فرمائی؟ یہ بات اچھی طرح سمجھیں! حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس علم شریعت ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کے پاس علم تکوین ہے۔ علم تکوین الگ ہے اور علم تشریع الگ ہے۔ علم تشریع کا معنی ہے کہ نماز پڑھو، روزے رکھو، زکوٰۃ دو، گناہ سے بچو، نیک کام کرو، حلال اختیار کرو، حرام سے بچو، ماں باپ کا ادب کرو، باپ کا حق یہ ہے، اولاد کا یہ ہے.... تو یہ شریعت کا علم ہے اور تکوین کا علم یہ ہے بارش کب ہوگی؟ ہوا کب چلے گی؟ فصل کب نکلے گی؟ کوئی بندہ کب مرے گا؟ کوئی بندہ کب پیدا ہوگا؟ کوئی کب ٹھیک ہوگا؟ کب صحت مند ہوگا؟ رزق کتنا ملے گا.... یہ سب تکوینی چیزیں ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذمے شریعت ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کے ذمے تکوین ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور علم ملا ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کو اور علم ملا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: میں جو کام کروں گا چونکہ آپ کا علم ان کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا اس لیے آپ نے یقیناً اعتراض کرنا ہے۔ آپ اعتراض تو نہیں کریں گے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

نہیں، میں اعتراض نہیں کروں گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ کیوں فرماتے ہیں کہ میں اعتراض نہیں کروں گا؟ اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس شریعت کا علم ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی نبی ہے، یہ شریعت کے خلاف تو کام نہیں کرے گا اس لیے مجھے اعتراض کرنے کی ضرورت کیا ہے!

### آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟

بعض لوگ میرے پاس آتے ہیں اور مجھے کہتے ہیں: مولانا صاحب! ایک بات پوچھنی ہے، آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟ میں کہتا ہوں: جی ناراض ہونے والی بات ہوگی تو ناراض ہوں گے، نہیں ہوگی تو نہیں ہوں گے، میں خواہ مخواہ ایڈوانس کہہ دوں کہ نہیں ناراض ہوں گا! یہ غلط بات ہے۔ ناراض ہونے والی بات پر ناراضگی ہونی چاہیے، غصہ والی بات پر غصہ ہونا چاہیے۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس آدمی کو غصے والی بات پر غصہ نہ آئے وہ انسان نہیں بلکہ گدھا ہے۔ اگلا جملہ... پھر معافی مانگنے پر معاف نہ کرے تو وہ انسان نہیں بلکہ شیطان ہے۔ اب بعض لوگ غصے نہیں ہوتے اور بعض لوگ معاف بھی نہیں کرتے۔ یہ دونوں ہٹ دھرم قسم کے لوگ ہیں۔

### کشتی توڑنے پر اشکال کی وجہ:

میں بات سمجھا رہا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں ان شاء اللہ آپ کی بات مانوں گا۔ اب حضرت خضر علیہ السلام نے پہلا کام یہ کیا کہ جنہوں نے کشتی میں سوار کیا ان کی کشتی کا تختہ توڑ دیا۔ اب بتاؤ! کسی بندے کا نقصان کرنا یہ شریعت کے خلاف ہے یا نہیں؟ (خلاف ہے۔ سامعین) تو جب موسیٰ علیہ السلام شریعت کے خلاف کام دیکھیں گے تو کیسے برداشت کریں گے؟ انہوں نے تو کہنا ہے کہ آپ نے

تختہ کیوں توڑا ہے؟ مساکین کی کشتی آپ نے خراب کیوں کی ہے؟ اور حضرت خضر علیہ السلام کے ذمہ شریعت تھی یا تکوین تھی؟ (تکوین تھی۔ سامعین) تو اللہ کی طرف سے ان کے ذمہ تھا کہ آپ نے کشتی کو سنبھالنا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام شریعت کی وجہ سے اعتراض کر رہے تھے۔

### ”حضرت خضر نے بچے کو کیوں مارا؟“ کا جواب

اب آگے گئے تو بچے کو قتل کر دیا۔ توجہ رکھنا! آپ کے ذہن میں بھی آئے گا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے نابالغ بچے کو بغیر جرم کے قتل کیا۔ یہ تو بہت بڑا گناہ ہے اور نبی نے اتنا بڑا گناہ کیسے کر دیا؟ اب بتاؤ! جس فرشتے کے ذمے ہے کہ فلاں کی جان لینی ہے وہ فرشتہ جان لینے کا پابند ہے کہ نہیں؟ (پابند ہے۔ سامعین) یہ ظلم ہے؟ (نہیں۔ سامعین) کسی فرشتے کے ذمے ہے کہ یہ مکان فلاں گھر والوں پر گرا دو! فرشتہ گرائے گا یا نہیں؟ (گرائے گا۔ سامعین) بتاؤ! یہ ظلم ہے؟ (نہیں۔ سامعین)

تو حضرت خضر علیہ السلام کے ذمہ شریعت نہیں تھی، حضرت خضر علیہ السلام کے ذمے تکوین تھی۔ آپ نے فلاں کو مارنا ہے، مارنا چاہیے تھا کہ نہیں؟ (مارنا چاہیے تھا۔ سامعین) بتاؤ بھائی! یہ تکوینی امور اللہ فرشتوں کو دیتے ہیں اور وہی تکوینی امور فرشتے کے بجائے اللہ کسی انسان کو دیں تو بندہ اعتراض کر سکتا ہے؟ (نہیں۔ سامعین) بس بات صرف اتنی ہے۔

کتنے بندے یہاں سے لاہور جاتے ہیں اور ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے اور وہ فوت ہو جاتے ہیں۔ یہ ایکسیڈنٹ خود ہوتا ہے یا فرشتہ کرواتا ہے؟ خود بخود تو گاڑی نہیں لگتی۔ یہ فرشتے کے ذمے ہے کہ گاڑی کا ایکسیڈنٹ کروانا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس بندے کی موت یوں ہوگی تو فرشتہ اسی طرح موت دینے کا پابند ہے۔ اس بچے کی موت یوں ہوگی تو حضرت خضر علیہ السلام پابند ہیں کہ آپ نے موت

یوں دینی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام شریعت والے تھے تو انہوں نے کہا: یہ ناحق قتل کیوں کیا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام بھی ٹھیک تھے، خضر علیہ السلام بھی ٹھیک تھے۔

### ایک سوال کا جواب:

اگلی بات سمجھیں! حضرت خضر علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ اگر یہ بچہ بالغ ہو جاتا تو اس نے کافر ہونا تھا اور والدین کی ذلت کا سبب بننا تھا۔ توجہ رکھنا! یہ سوال بڑا اہم ہے۔ یہ بچہ بالغ ہو جاتا تو یہ کافر ہو جاتا یہ اللہ کے علم میں تھا، ہم نے بالغ ہونے سے پہلے قتل کر دیا تاکہ یہ نہ بالغ ہو اور نہ ہی کافر ہو اور اس کے بدلے میں ان کو نیک اولاد مل گئی جس کے پیٹ سے اللہ نے نبی پیدا کیا اور آگے ان کی امت چلی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب کسی آدمی کے مقدر میں لکھا ہے کہ اس نے بڑا ہو کر کافر ہونا ہے تو یہ اللہ کے علم میں ہے کہ یہ بالغ ہو اتو کافر ہو گا۔ توجہ یہ نابالغ ہو کر قتل ہو گیا تو پھر یہ اللہ کے علم کے خلاف نہیں ہے؟ پتا نہیں آپ کے ذہن میں سوال بھی ہے کہ نہیں! میں نے خوا مخواہ ایک سوال چھیڑ دیا ہے۔ کبھی آپ کے ذہن میں سوال ہوتا نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ذہن میں سوال آیا ہو گا تو میں سوال کر کے پھنس جاتا ہوں کہ ان کے تو ذہن میں نہیں تھا، ہم نے کون سی بحث چھیڑ دی ہے۔ آپ کے ذہن میں سوال آگیا؟ (جی۔ سامعین)

مفسرین نے اس کا بڑا پیارا جواب دیا ہے کہ وجہ یہ ہے ایک ہوتی ہے تقدیر مبرم، ایک ہوتی ہے تقدیر معلق۔ تقدیر مبرم کا معنی کہ بہر حال یوں ہونا ہے اور تقدیر معلق کا معنی کہ اگر یوں ہو اتو یوں ہونا ہے، اگر یوں ہو اتو یوں ہونا ہے۔ اگر یہ بالغ ہو اتو کافر ہونا ہے اور بالغ نہ ہو اتو کافر نہیں ہونا۔ اس کی تقدیر مبرم نہیں تھی بلکہ تقدیر معلق تھی۔ اگر بالغ ہو اتو کافر ہونا ہے، بالغ نہ ہو اتو کافر نہیں ہونا۔ بالغ ہو اتو کافر ہو تا اور بالغ نہیں تھا اور بلوغ سے پہلے قتل ہو گیا تو کفر بھی نہیں۔ یہ تقدیر معلق ہے، تقدیر مبرم

نہیں تھی۔

## یتیم بچوں کا خزانہ کیا تھا؟

اس کے بعد یہ جو دیوار کا معاملہ تھا اس کو بھی ذہن میں رکھیں! دیوار کے مسئلے پر حضرت خضر علیہ السلام فرماتے ہیں: یہ دو یتیم بچوں کی دیوار ہے، ان کا والد نیک تھا، دیوار کے نیچے خزانہ موجود تھا، خزانہ کی ہم نے حفاظت کی ہے۔

پہلی بات سمجھیں کہ وہ خزانہ کیا تھا؟ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ سونا اور چاندی دفن تھا، جب یہ بچے بڑے ہوئے تو والد کا خزانہ ان کو ملا ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خزانہ سے مراد ایک سونے کی تختی تھی۔ تختی بھی ہے اور سونے کی بھی ہے یعنی ظاہری بھی خزانہ اور باطنی بھی خزانہ اور اس تختی پر لکھا ہوا کیا تھا؟ اس میں پہلا جملہ لکھا ہوا تھا:

[1]: بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

[2]: دوسرا جملہ لکھا تھا: "عَجَبْتُ لِمَنْ يُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ كَيْفَ يَحْزَنُ"

کہ تعجب اس آدمی پر ہے جو تقدیر کو مانتا بھی ہے پھر غمگین بھی رہتا ہے۔ تقدیر کے ماننے والے کو غمگین نہیں ہونا چاہیے، تقدیر کے ماننے والے کو خوش ہونا چاہیے کہ میرے مقدر میں جو لکھا تھا مجھے خدا نے عطا فرما دیا ہے۔

[3]: تیسرا جملہ "وَعَجَبْتُ لِمَنْ يُؤْمِنُ بِالرِّزْقِ كَيْفَ يَتَعَبُ"

کہ تعجب اس آدمی پر ہے جو ایمان بھی رکھتا ہے کہ میرا رزق میرے مقدر کا ضرور ملنا ہے تو پھر ضرورت سے زیادہ جاگ جاگ کر محنت کیوں کرتا ہے؟ اتنی محنت کرے جتنی اس کے لیے کافی ہو جائے، ضرورت سے زیادہ مال کمانے میں پریشان کیوں ہوتا ہے۔

[4]: اور چوتھا جملہ "وَعَجَبْتُ لِمَنْ يُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ كَيْفَ يَفْرَحُ"

آدمی کا ایمان بھی ہے کہ میں مرنا ہے پھر ہر وقت گناہوں میں خوش بھی رہتا ہے، موت پر ایمان رکھنے والا کبھی گناہوں پر خوش نہیں ہوتا بلکہ غمگین رہتا ہے۔

[5]: پانچواں جملہ "وَعَجَبْتُ لِمَنْ يُؤْمِنُ بِالْحِسَابِ كَيْفَ يَغْفُلُ"

آدمی کو یقین ہے کہ میرا حساب ہو گا پھر بھی اعمال سے غافل ہے۔

[6]: چھٹا جملہ "وَعَجَبْتُ لِمَنْ يَعْرِفُ الدُّنْيَا وَتَقَلُّبُهَا بِأَهْلِهَا كَيْفَ يَظْمَأُنُّ

إِلَيْهَا"

بندے کو یقین بھی ہے کہ اس دنیا نے بدلنا ہے، پھر بھی دنیا پر مطمئن ہے اور آخرت کو چھوڑا ہوا ہے۔

[7]: اور ساتواں جملہ لکھا ہوا تھا: "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ"

یہ سونے کی تختی ہے، ظاہری نعمتیں بھی ہیں اور باطنی نعمتیں بھی ہیں۔<sup>91</sup>

**باپ کی نیکی کا اثر کئی پشتوں تک ہوتا ہے:**

اور قرآن کریم میں ہے:

﴿وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا﴾

ان بچوں کا باپ بہت نیک تھا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ اوپر کی نسل میں سے ساتواں باپ تھا اور ایک مفسر فرماتے ہیں کہ اوپر کی نسل میں یہ دو سو اباں باپ تھا۔ مفسرین نے بڑا عجیب نکتہ لکھا ہے: اگر ماں باپ نیک ہوں تو نیک باپ کا اثر ساتویں اور دسویں پشت تک کم از کم چلتا ہے، والد نیک ہو تو ساتویں پشت تک اللہ ان کو رزق اس باپ کی وجہ سے عطا فرماتے ہیں۔

یہاں مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر والدین عالم یا نیک ہوں اور ان کی

اولاد اگر نیک نہ بھی ہو اور آپ کو تنگ نہ کرے تو نیک والدین کی اولاد کا احترام پھر بھی کرنا چاہیے۔

### حضرت خضر علیہ السلام کے تین جملوں کی تشریح:

حضرت خضر علیہ السلام کے جو تین لفظ فرمائے تھے ان لفظوں پر ذرا غور

کرنا!

[۱]: جب کشتی کے باری آئی تو خضر علیہ السلام نے فرمایا:

﴿فَارَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا﴾

کہ میں نے چاہا کہ کشتی کو عیب دار کر دوں تاکہ بادشاہ اس کو چھین نہ سکے۔

[۲]: اور جب بچے کی باری آئی تو فرمایا:

﴿فَارَدْنَا أَنْ يُبَدِّلَهُمَا رُبُّهُمَا خَيْرًا مِنْهُ ذِكْوَةً وَأَقْرَبَ رَحْمًا﴾

ہم نے چاہا کہ اس نالائق اور نافرمان بچے کے بجائے اللہ ان کو نیک بچہ دے

دیں۔ یہاں کہتے ہیں ”ہم نے چاہا کہ اللہ ان کو نیک اولاد دے“

[۳]: اور جب آگے دیوار کی باری آئی تو فرمایا:

﴿فَارَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا﴾

تمہارے رب نے چاہا کہ جب یہ بچے بڑے ہو جائیں تو زمین کے نیچے سے ان

کو خزانہ مل جائے۔

اب بتاؤ! حضرت خضر علیہ السلام نے یہ جو تینوں کام کیے ہیں یہ اپنی مرضی

سے کیے یا اللہ کے حکم سے؟ (اللہ کے حکم سے کیے۔ سامعین) تو جب کشتی کو توڑا تو پھر

یوں کیوں کہا کہ ”میں نے چاہا کہ اس کشتی کو عیب دار کر دوں“ اور جب بچے کو قتل کیا تو

اپنا اور رب دونوں کا ذکر کیا کہ ”ہم نے چاہا“ اور جب دیوار ٹھیک کی ہے تو فرمایا کہ



”تمہارے رب نے چاہا“

مفسرین نے لکھا ہے کہ شر اور خیر کے خالق اللہ ہیں، بیماری اور صحت کے خالق اللہ ہیں لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے جب اچھی چیز ہو تو نسبت خدا کی طرف کرنی چاہیے اور جب اچھی نہ ہو تو نسبت اپنی طرف سے کرنی چاہیے۔

✽ اب جو کشتی کا تختہ توڑا ہے تو بظاہر یہ اچھا کام نہیں تھا تو فرمایا: ﴿فَآرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا﴾ کہ میں نے چاہا کہ تختہ توڑ دوں اور نسبت اللہ کی طرف نہیں کی، نسبت اپنی طرف کی ہے۔

✽ اور جب نابالغ بچے کو قتل کیا تو فرمایا: ﴿فَآرَدْتُ أَنْ﴾ ہم نے چاہا۔ اب دیکھنا اس نابالغ نے قتل ہونا ہے تو بدلے میں ان کو ایک نئی بیٹی ملنی ہے۔ تو دو کام ہو گئے۔ ایک بچے کا قتل ہونا اور ایک ایسی بچی کا پیدا ہونا جس کا بیٹا بنی ہو۔ تو بچے کا قتل کرنا یہ بظاہر اچھا کام نہیں تھا اور بیٹی کا پیدا ہونا اور اس سے نبی کا پیدا ہونا یہ اچھا کام تھا۔ اب اس کی نسبت دونوں طرف سے کی ہے کہ ”ہم نے چاہا“ یعنی میں نے بچہ قتل کر دیا، خدا نے بدلے میں بیٹی دے دی۔

✽ جب دیوار کی باری آئی، اس کو کھڑا کیا تو یہ کام اچھا اور سراپا خیر تھا۔ اب نسبت صرف اللہ کی طرف کی ہے۔ فرمایا: ﴿فَآرَادَ رَبُّكَ﴾ تمہارا رب چاہتا تھا۔ تو جو سراپا خیر تھا اس کی نسبت اللہ کی طرف کر دی ہے۔

**حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ادب:**

حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِي﴾<sup>92</sup>

میرا اللہ مجھے پلاتا بھی ہے، مجھے کھلاتا بھی ہے۔ آگے فرمایا:

﴿وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِي﴾<sup>93</sup>

یہ نہیں فرمایا کہ اللہ مجھے بیمار بھی کرتا ہے اور مجھے صحت بھی دیتا ہے بلکہ فرمایا کہ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو اللہ مجھے صحت دے دیتا ہے، حالانکہ صحت بھی اللہ دیتے ہیں اور بیماری بھی اللہ دیتے ہیں لیکن ابراہیم علیہ السلام بیماری کی نسبت اپنی طرف کرتے ہیں اور صحت کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں۔ ادب کا تقاضا ہے کہ جو چیز اچھی نہ ہو اس کی نسبت انسان اللہ کی طرف نہ کرے۔ حالات جیسے بھی ہوں خدا کی طرف سے ہیں لیکن جب نعمت ملے تو یہ کہا کریں کہ میرے اللہ نے دی ہے اور جب فاقہ ملے تو کہیں کہ میرے گناہوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ جب اللہ اچھی ہو انیں چلا دے تو اللہ کی طرف سے ہیں، جب سیلاب اور دیگر آفات آجائیں تو پھر کہیں کہ ہمارے اعمال کی وجہ سے ہیں۔ یہ ادب کا تقاضا ہے۔

### خضر علیہ السلام نبی تھے:

صحیح بات تو یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی ہیں، ان کے نبی ہونے کی سب سے بڑی دلیل کو ذہن میں رکھیں۔ خضر علیہ السلام کام وہ کرتے ہیں جو بظاہر شریعت کے خلاف ہیں، شریعت کے خلاف کام ولی تو کر نہیں سکتا۔ اب جو بظاہر شریعت کے خلاف ہے تو یہ وحی کی وجہ سے ہو گا کشف کی وجہ نہیں ہو گا اور جس پر وحی آئے وہ نبی ہوتا ہے، ولی نہیں ہوتا۔ لہذا حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے۔

92۔ الشعراء 26: 79

93۔ الشعراء 26: 80

## کیا خضر علیہ السلام زندہ ہیں؟

دوسری بحث جس کا تذکرہ کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ چلتی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا چکے ہیں؟ بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام زندہ ہیں اور بہت سارے کہتے ہیں کہ وفات پا چکے ہیں۔ آپ فیصلہ کن بات ذہن نشین فرمائیں! علماء میں سے جو کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام زندہ ہیں، ان کے دلائل سماعت فرمائیں:

## حیاتِ خضر علیہ السلام کے دلائل:

◆ پہلی دلیل یہ ہے کہ مستدرک حاکم میں روایت موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب وفات پا گئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا مجمع موجود تھا۔ ایک شخص آیا۔ اس کی کچھ ڈاڑھی سیاہ تھی اور کچھ ڈاڑھی سفید تھی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ مجمع چیرتا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا۔ وہاں پر کچھ کلمات کہے اور واپس چلا گیا۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اس شخص کو کوئی جانتا ہے؟ تو حضرت ابو بکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جی ہاں!

هَذَا أَخُو رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْخَضِرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ. <sup>94</sup>

یہ جو بندہ آیا ہے یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا بھائی حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔

◆ دوسری دلیل صحیح مسلم میں روایت موجود ہے کہ جب دجال حملہ کرتا ہوا مدینہ منورہ کے قریب پہنچے گا تو ایک شخص مدینہ منورہ سے آئے گا جو اس وقت کے

لوگوں میں سے سب سے بہتر ہوگا اور وہ دجال کا مقابلہ کرے گا۔<sup>95</sup>  
تفسیر قرطبی میں ہے کہ ابواسحاق فرماتے ہیں کہ یہ آدمی حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے۔<sup>96</sup>

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں۔  
♦ تیسری دلیل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ میری حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی ہے اور انہوں نے مجھے یہ دعائیٰ ہے کہ فرض نماز کے بعد یہ دعا مانگا کریں۔<sup>97</sup>

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں۔

### وفاتِ خضر علیہ السلام کے دلائل:

اور جو علماء کہتے ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام وفات پا چکے ہیں ان کے بھی دلائل ہیں۔  
☆ پہلی دلیل ان کی یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور منہ مقتدیوں کی طرف کیا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو ایک جملہ ارشاد فرمایا:

"أَرَأَيْتُمْ كَيْفَ لَيْلَتُكُمْ هَذِهِ؟"

آج کی رات کو دیکھ لیا ہے؟ یعنی اسے ذہن میں رکھو! پھر فرمایا:  
فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقَىٰ مِنْهُ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ.<sup>98</sup>

95- صحیح مسلم، رقم: 2938

96- الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج 2 ص 1932

97- الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج 2 ص 1932

98- صحیح البخاری، رقم: 116

آج جو لوگ زندہ ہیں تو آج کے سو سال کے بعد ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں ہو گا۔

تو یہ علماء کہتے ہیں کہ اگر حضرت خضر علیہ السلام اس وقت زندہ بھی تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا۔ اس لیے وہ بھی اس رات کے سو سال بعد دنیا سے چلے گئے۔

☆ دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات پڑھ رہے تھے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ تورات پڑھ رہے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کی طرف دیکھ نہیں رہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو عرض کرنے لگے:

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَغَضَبِ رَسُولِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
رَضِينَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا.

میں اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ ہم اللہ کے پروردگار ہونے پر، اسلام کے دین حق ہونے پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر ایمان رکھتے ہیں!

اس پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ بَدَأَ لَكُمْ مُوسَى فَاتَّبَعْتُمُوهُ وَتَرَكْتُمُونِي  
لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ وَلَوْ كَانَ حَيًّا وَأَذْرَكَ بُبُوتِي لَا تَبْعَنِي.<sup>99</sup>

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں مجھ محمد کی جان ہے، اب اگر

موسیٰ علیہ السلام تمہارے سامنے آجائیں اور تم ان کی پیروی کرو اور مجھے چھوڑ دو تو تم سیدھے راستے سے بھٹک جاؤ گے اور اگر آج موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پالیتے تو وہ بھی میری اتباع کرتے۔

اب یہ حضرات کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام زندہ نہیں۔ اگر زندہ ہوتے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق بات کرتے۔

### فیصلہ کن رائے:

دونوں پہلوؤں کے جوابات موجود ہیں۔ میں مکمل بحث نہیں کر رہا۔ میں نے صرف ایک اصولی بات کی ہے۔ بہترین بات یہ ہے کہ حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ جو بہت بڑے جید عالم تھے، اپنی تفسیر تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ حضرت سید احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے حالت کشف میں حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی اور ان سے سوال کیا کہ آپ زندہ ہیں یا وفات پاچکے ہیں؟ تو حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اور حضرت الیاس علیہ السلام دونوں دنیا سے وفات پاچکے ہیں لیکن اللہ نے ہم دونوں کو یہ قدرت اور طاقت عطا کی ہے کہ ہم کسی بھی انسان کی شکل میں آکر کسی بھی انسان کی مدد کر سکتے ہیں۔<sup>100</sup>

یہ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کا مکاشفہ ہے اور یہ اللہ کا نظام ہے جس میں بندہ دخل نہیں دے سکتا۔ اب جنہوں نے دیکھا ہے وہ بھی ٹھیک ہیں اور جو کہتے ہیں کہ وفات پاگئے ہیں وہ بھی ٹھیک ہیں۔ اب اس سے ثابت ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی بھی ہیں اور زندہ بھی نہیں ہیں، وفات پاچکے ہیں۔ ہاں اللہ نے ان کو طاقت عطا فرمائی

ہے کہ اگر وہ کسی انسان کی شکل میں متشکل ہو کر آ بھی جائیں اور کوئی بندہ دعویٰ کر بھی دے تو آپ بہت جلدی اس پہ فتویٰ بھی فٹ نہ کریں! ہاں علماء سے ضرور سے پوچھیں کہ یہ بندہ ایسے کہتا ہے، سچ بولتا ہے یا جھوٹ بولتا ہے؟ کیوں؟ اس لیے کہ کوئی بندہ دعویٰ نہ کر دے کہ آج رات مجھے خضر علیہ السلام ملے تھے اور مجھے کہا تھا کہ فلاں کو مار دو اس لیے میں نے اس لیے مار دیا۔ اس پر 302 کا مقدمہ چلے گا، عدالت میں سزائے موت ہوگی اور اس دعویٰ پر اس کی جان نہیں چھوٹے گی۔ ہمارے فتوے اس کے خلاف یہی ہوں گے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو شریعت کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### ذوالقرنین کا تذکرہ:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُوا عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ۚ﴾

مشرکین مکہ نے یہود مدینہ سے پوچھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سوال کیے تھے۔ ان میں ایک سوال یہ تھا کہ وہ کون سا شخص ہے جس نے پوری دنیا پر حکومت کی ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ نے وحی کے ذریعے مشرکین مکہ کے سوالات کے جواب نازل کیے۔

اللہ رب العزت کا انعام ہے کہ اللہ رب العزت دنیا میں بعض ایسے افراد کو بھیجتے ہیں کہ جو انسان ہونے کے باوجود فرشتہ صفت ہوتے ہیں۔ بعض انسان حضرت آدم کی اولاد میں سے ہی ہوتے ہیں لیکن ان میں صفات فرشتوں والی ہوتی ہیں اور اللہ رب العزت ان کے تقویٰ اور عمل کی وجہ سے انہیں بعض ایسی چیزیں عطا فرمادیتے ہیں جسے ہم مافوق الاسباب یا خرق عادت کہتے ہیں۔

اگر پیغمبر سے صادر ہو تو اس کا نام ”معجزہ“ ہے اور غیر پیغمبر یعنی کسی ولی سے صادر ہو تو اسے ”کرامت“ کہتے ہیں۔

## پوری دنیا پر حکومت کرنے والے چار اشخاص:

حضرت سکندر ذوالقرنین انہی اشخاص میں سے ایک شخص ہیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ بعض روایات میں آتا ہے چار ایسے آدمی گزرے ہیں جنہوں نے پوری دنیا پر حکومت کی ہے۔ ان میں سے دو کافر ہیں اور دو مسلمان ہیں۔ مسلمانوں میں سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں اور دوسرے حضرت سکندر ذوالقرنین ہیں اور کافروں میں سے نمرود اور بخت نصر۔ اور ایک شخص ایسا آئے گا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ہو گا اور وہ پوری دنیا پر حکومت کرے گا، وہ حضرت مہدی ہیں۔

تو حضرت ذوالقرنین ان اشخاص میں سے ہیں جنہوں نے پوری دنیا پر حکومت کی ہے۔ جس طرح اللہ رب العزت نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے ہوا کو مسخر کر دیا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام دور دراز کے سفر ہوا پر کرتے تھے تو حضرت سکندر ذوالقرنین کے لیے اللہ نے ابر اور بادل کو مسخر کر دیا تھا۔ یہ لمبے سفر بادل پر کرتے تھے۔ یہ اللہ کا نظام ہے۔ اللہ چاہیں تو ہوا کو مسخر کر دیں یا بادل کو اور آج کے دور میں بات سمجھ نہیں آتی کہ پوری دنیا کا سفر کیسے کیا! اللہ رب العزت نے انہیں سب راستے بتائے تھے کہ کون سا راستہ کس ملک کو جاتا ہے اور کون سا راستہ کس ملک کو جاتا ہے۔ جو اللہ شہد کی مکھی کو علم دے سکتا ہے وہ انسان کو نہیں دے سکتا؟

حضرت ذوالقرنین کو دنیا میں سفر اور فتوحات کے لیے جو اسباب درکار تھے اللہ رب العزت نے وہ سارے اسباب بھی ان کو عطا فرمائے تھے۔ ان کے بارے میں مشرکین نے پوچھا تھا کہ ذوالقرنین کون ہے؟ حضرت ذوالقرنین نے سب سے پہلے سفر کیا ہے مغرب کا اور وہاں تک گئے ہیں جہاں سے سورج غروب ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد سفر کیا مشرق کا اور وہاں پر گئے ہیں جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے اور اس کے بعد سفر کیا ہے شمال کا اور وہاں تک گئے ہیں جہاں سے آگے آبادی نہیں ہے۔



اللہ رب العزت نے انہیں رعب اور طاقت اتنی عطا فرمائی کہ جن کو بھی دعوت دیتے وہ ان کے تابع ہوتے گئے۔ کسی میں بھی ان کی مخالفت کا دم نہیں تھا۔

### ”ذوالقرنین“ کہنے کی وجہ:

اب ذوالقرنین سے مراد کیا ہے؟ ایک قول ہے علمائے شریعت کا اور ایک قول ہے علمائے طریقت کا۔ شریعت اور طریقت میں تضاد نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو علماء ظاہری مسائل کا علم رکھتے ہوں انہیں علمائے شریعت کہتے ہیں اور جو علماء مسائل باطنہ کے ماہر ہوں انہیں علمائے طریقت کہتے ہیں۔ تو شریعت بھی دین ہے اور طریقت بھی دین ہے۔ علمائے شریعت کہتے ہیں کہ ”قرن“ کا معنی ہے کنارہ، چونکہ یہ مشرق اور مغرب تک گئے تھے اس لیے انہیں ”ذوالقرنین“ کہتے ہیں کہ دو کناروں والا اور علمائے طریقت کہتے ہیں کہ ان کو اللہ نے ظاہر کا علم بھی دیا تھا اور باطن کا علم بھی دیا تھا۔ اس لیے اس کو دو کناروں والا کہتے ہیں۔ ایک کنارہ ظاہری علوم کا ہے اور ایک کنارہ باطنی علوم کا ہے۔

اس سے پہلے والی آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفر کا واقعہ ہے اور ان آیات میں سکندر ذوالقرنین کے سفر کا قصہ ہے۔ اللہ نے دونوں کو جوڑا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا سفر کیوں تھا؟ علم کی طلب میں اور سکندر ذوالقرنین کا سفر کیوں ہے؟ اعمال شریعت کے نفاذ کی طلب میں۔ تو ایک علوم ہیں اور ایک ان کا نفاذ ہے۔ علوم کا سفر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے اور نفاذ کا سفر سکندر ذوالقرنین کا ہے۔ معلوم ہوا کہ علم شریعت بھی ضروری ہے اور اس کا نفاذ بھی ضروری ہے۔ تو اللہ نے دونوں واقعات کو اکٹھے ذکر فرما دیا ہے۔

### جواب بقدر سوال ہونا چاہیے:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال پوچھا گیا تھا کہ ذوالقرنین کون ہے؟

قرآن کریم میں ہے کہ میرے پیغمبر آپ انہیں بتائیں:

﴿سَأْتِلُّوْا عَلَیْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝۳۷﴾

یہاں یہ نہیں فرمایا ﴿سَأْتِلُّوْا عَلَیْكُمْ ذِكْرًا﴾ کہ میں اس کا ذکر کرتا ہوں، اس کی باتیں بتاتا ہوں بلکہ ﴿مِّنْهُ ذِكْرًا﴾ فرمایا۔ ”ذِكْرًا“ اور ”مِّنْهُ ذِكْرًا“ میں فرق ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں ”مِنْ“ آتا ہے تبعیض اور بعض کے لیے۔ ایک ہوتا ہے کہ میں نے کھانا کھالیا اور ایک ہوتا ہے کہ میں نے کھانے میں سے کھالیا۔ یہ ”میں سے“ کا معنی ہے ”کچھ“۔ تو اللہ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اے محمد! ان کو بتاؤ کہ میں آپ کو ذوالقرنین کی باتیں بتاتا ہوں بلکہ فرمایا: ﴿سَأْتِلُّوْا عَلَیْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا﴾ میں ان کی ساری باتیں نہیں بتاتا بلکہ ان کی کچھ باتیں بتاتا ہوں یعنی وہ باتیں جو تمہارے متعلق ہیں اور جو تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے وہ میں ہر گز نہیں بتاتا۔ یہ بات آپ ذہن نشین فرمائیں۔

**ذوالقرنین کو تمام ضروری اسباب دیے گئے:**

﴿اِنَّا مَكْنٰلَهٗ فِی الْاَرْضِ وَاتَّيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا ۝۳۸﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہم نے ذوالقرنین کو زمین میں اقتدار عطا فرمایا تھا اور انہیں ہر کام کے لیے ضروری اسباب بھی دیے تھے۔

اللہ کے عطا کردہ اسباب و وسائل کو استعمال کرتے ہوئے ذوالقرنین مغرب کی طرف نکلے تھے، اتنا آگے گئے کہ ﴿حَتّٰی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِی عَیْنٍ حَمِیْمَةٍ﴾ کہ ان کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کالے کیچڑ والی جگہ پر سورج غروب ہو رہا ہے حالانکہ وہ سورج غروب نہیں ہو رہا تھا بلکہ محسوس ایسے ہوتا تھا اور یہ آخری کنارہ تھا۔

اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا قُلْنَا يَذَاقُ الْقُرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ

تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا﴾

وہاں پر ایک قوم تھی جو کافر تھی۔ اللہ نے اجازت دی کہ آپ چاہیں تو ان کو کفر کی سزا کے طور پر قتل کر دیں اور آپ چاہیں تو قتل کرنے کے بجائے ان کو دعوت دے دیں۔ حضرت سکندر ذوالقرنین نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کو دعوت دیں گے، جو دین ابراہیمی کو قبول کرے گا ہم اس کو معاف کریں گے اور جو دین ابراہیمی کو قبول نہیں کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے۔

**ذوالقرنین نبی تھے یا نہیں؟**

یہاں ایک بات سمجھیں! اس مقام پر ہے:

﴿قُلْنَا يَذَاقُ الْقُرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے کہا اے ذوالقرنین! تم چاہو تو ان کو سزا دے دو اور تم چاہو تو ان سے نرمی والا معاملہ فرما دو۔

علماء کے درمیان بحث چلی ہے کہ ذوالقرنین نبی تھے یا ولی؟ اب دیکھیں! علماء کتنی دور کی بات سوچتے ہیں کہ نبی تھے یا ولی تھے؟ بعض علماء کہتے ہیں کہ ولی تھے دلیل یہ ہے کہ اللہ فرماتے ہیں: ”اے ذوالقرنین! چاہو تو ان کو سزا دے دو اور اگر چاہو تو ان کو معاف کر دو!“ اور یہ خطاب نبی کو ہوتا ہے، غیر نبی کو نہیں ہوتا۔ تو اللہ نے خطاب اس لیے کیا کہ ذوالقرنین نبی تھے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ ذوالقرنین نبی تو نہیں تھے البتہ ولی تھے۔ ابراہیم علیہ السلام کے دور میں انہوں نے مکہ مکرمہ جا کر حج کیا ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے

دعائیں دی ہیں۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کے صحابی بنے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے بعد انہوں نے دنیا کا سفر شروع کیا ہے اور ان کی دعا کے بعد خدا نے یہ سارے معاملات ان کے سپرد کر دیے ہیں۔<sup>101</sup>

باقی رہی یہ بات کہ اگر نبی نہیں تھے تو پھر اللہ نے خطاب کیسے کیا؟ اس کا علماء نے جواب یہ دیا ہے کہ یہ خطاب ایسے تھا کہ جیسے یوسف علیہ السلام ابھی چھوٹے تھے اور کنوئیں میں تھے تو اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَذَا﴾<sup>102</sup> کہ ہم نے یوسف پر وحی بھیجی تھی کہ ایک وقت آئے گا کہ تم ان کو بتاؤ گے کہ انہوں نے یہ کام کیا تھا۔ تو یوسف علیہ السلام کے دل میں اللہ نے ایک القاء فرمایا تھا اور اس کا نام اللہ نے وحی رکھ دیا۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ جب پریشان تھیں کہ فرعونی سپاہی اسرائیلی بچوں کو قتل کر رہے ہیں تو میرے بیٹے کا کیا بنے گا؟ تو اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ ۖ فَإِذَا خَفَتْ عَلَيْهِ فَأَلْقَيْهِ

فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِ وَلَا تَحْزَنِي ۗ﴾<sup>103</sup>

ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں یہ الہام کر دیا کہ تم اپنے بچے کو دودھ پلاتی رہو، جب تمہیں خوف ہو کہ اس کی جان کو خطرہ ہے تو اس کو صندوق میں ڈال کر سمندر میں ڈال دینا اور ڈرنا نہیں! اب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی تو نہیں ہیں لیکن لفظ ”وحی“ کا آیا ہے۔

101۔ البدایہ والنہایہ: ج 2 ص 123

102۔ یوسف 12: 15

103۔ القصص 7: 28

اسی طرح شہد کی مکھی کے بارے میں قرآن کریم میں ہے:

﴿وَأَوْحِي رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ ۝۱۰۴﴾

خدا نے شہد کی مکھی کے دل میں خیال ڈالا۔

اب یہاں پر بھی لفظ ”وحی“ استعمال ہوا ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ یہاں پر وہ خطاب نہیں ہے جو نبیوں کو ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ نبی ان سے خطاب کیا کہ ہماری طرف سے ذوالقرنین کو یہ پیغام دے دو کہ تم کافروں کو قتل کرو یا ان کو قید میں ڈال دو، ہم نے تمہیں اختیار دیا ہے۔

**مشرک قوم کے متعلق ذوالقرنین کا موقف:**

سکندر ذوالقرنین نے دوسری بات کو اختیار کیا اور اعلان فرمایا کہ:

﴿أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُكَرًا ۝۱۰۵﴾

اے اللہ! ان میں سے جس شخص نے ظلم کیا تو ہم اسے سخت سزا دیں گے، پھر اسے اپنے رب کے پاس پہنچا دیا جائے گا اور اللہ اس سے بھی سخت دردناک عذاب دے گا۔

﴿وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءٌ الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ

أَمْرٍ نَّاسِرًا ۝۱۰۶﴾

اور جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرے تو اس کو اچھا بدلہ ملے گا یعنی اس کا دنیا میں بھی اجر ہے اور آخرت میں بھی بدلہ ہے۔

**طلوع آفتاب کی جگہ پر پہنچنا:**

حضرت ذوالقرنین اب مغرب سے واپس ہوئے۔ مشرق کی طرف چلے

گئے۔ لمبا سفر کیا اور اتنے دور پہنچے کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَهُمُ

مِّنْ دُونِهَا سَبْتًا ۝۱۰﴾

حضرت سکندر ذوالقرنین نے دیکھا اور یوں محسوس ہوا کہ سورج یہاں سے طلوع ہو رہا ہے اور ایسی قوم پر سورج طلوع ہو رہا تھا کہ جو بالکل بے پردہ قوم تھی، نہ انہوں نے مکان بنائے تھے نہ انہوں نے کپڑے پہنے تھے، جنگل میں بغیر مکان کے برہنہ رہتے تھے۔ انہوں نے زمین میں اپنے ٹھکانے بنائے ہوئے تھے۔ رات کو ان کے اندر چلے جاتے تھے۔ دن کو کام کرتے تھے۔ بالکل جانوروں کی طرح زندگی گزارتے تھے۔

**یاجوج ماجوج کو روکنے کے لیے دیوار کی تعمیر:**

جب اس سفر سے فارغ ہوئے تو حضرت سکندر ذوالقرنین نے شمال کی جانب لمبا سفر کیا۔ اب یہاں قرآن کریم نے جو بات کی ہے وہ یہ ہے:

﴿حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْمًا ۚ لَا يَكَادُونَ

يَفْقَهُونَ قَوْلًا ۝۱۱﴾

کہ ایسی قوم کے پاس پہنچے جو حضرت سکندر ذوالقرنین کی بات کو نہیں سمجھتی تھی، اُن کی زبان اور تھی، اِن کی زبان اور تھی۔ ان سے بات کیسے کریں؟ خیر ترجمان سے یا اشاروں سے بات ہوئی۔ اس قوم نے سکندر ذوالقرنین سے کہا: ہمارا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، اس مسئلے کو حل کریں۔ پوچھا: مسئلہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہاں ایک قوم ہے جنہیں ”یاجوج ماجوج“ کہتے ہیں، یہ ہمیں بہت تنگ کرتے ہیں، مال کھاتے ہیں، مویشی کھاتے ہیں، ہمیں نقصان پہنچاتے ہیں، ہمیں ان سے بچائیں۔

اب سکندر ذوالقرنین نے کسی طرح ان کو بات سمجھائی کہ ایک یہ پہاڑ ہے اور ایک ادھر پہاڑ ہے، درمیان میں لمباراستہ ہے، وہ ادھر سے آپ کے پاس آتے ہیں تو میں یہاں آپ اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیتا ہوں جو بہت لمبی اور چوڑی ہو تاکہ تم بچ جاؤ! انہوں نے کہا کہ آپ بنا دیں، ہم چندہ جمع کر کے آپ کو پیسے دیتے ہیں جتنا ہمارے بس میں ہے۔ حضرت سکندر ذوالقرنین نے فرمایا کہ میں پیسے تم سے نہیں لیتا، ﴿مَا مَكْنِي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ﴾ تم افراد مجھے دو، سامان میرے پاس موجود ہے۔

حضرت سکندر ذوالقرنین نے دیوار کھڑی کی۔ تقریباً تمام مفسرین نے لکھا ہے کہ بطور کرامت اتنی بڑی لمبی دیوار حضرت سکندر ذوالقرنین نے کھڑی کی۔ دیوار کیسے کھڑی کی؟ انہوں نے کہا کہ تم لوہے کے تختے لاؤ، جتنا لوہا تم لا سکتے ہو لاؤ! دونوں پہاڑوں کے درمیان لوہے پر لوہا رکھتے گئے اور ایک لمبی دیوار بنائی۔ اب ادھر بھی لوہا ادھر بھی لوہا اور درمیان میں خالی جگہ۔ اب فرمایا کہ اس میں لکڑی ڈال دو اور اتنی آگ جلاؤ کہ یہ لوہا سخت گرم ہو جائے۔ جب یہ لوہا گرم ہوا تو اس پر پگھلتا ہوا تانبا ڈال دیا۔ اب وہ دیواریں ٹھنڈی ہو گئیں اور ان کی درزیں بند ہو گئیں تو دیوار بہت اونچی، لمبی اور مضبوط بن گئی۔

یہ حضرت سکندر ذوالقرنین کی کرامت ہے۔ کرامت کیوں تھی؟ مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ کرامت اس لیے کہتے ہیں کہ جب اتنی اونچی دیوار آدمی کھڑی کرے اور جب پہاڑیوں کے دو کونوں کے درمیان لوہے کے تختوں کو برابر کر کے رکھ لے اور پھر آگ جلائے تو آپ بتاؤ! جلتی ہوئی آگ کے قریب کوئی نہیں جاسکتا تو اس کو ہلاتے کیسے ہوں گے؟ پھر اتنا تانبا بے کو اندر ڈالا کیسے ہو گا؟ تو کرامت کے علاوہ اسباب کے تحت یہ کام ممکن نہیں تھا۔

## دیوار کی مضبوطی اور شکرِ خداوندی:

آگے قرآن مجید میں ہے:

﴿فَمَا اسْطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا﴾

دیوار اتنی بڑی بنادی کہ یا جوج ماجوج چڑھ بھی نہیں سکتے تھے اور اتنی مضبوط بنادی کہ وہ سوراخ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

جب یہ دیوار مکمل ہو گئی تو حضرت سکندر ذو القرنین نے فرمایا: ﴿هَذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَبِّي﴾ یہ میرا کمال نہیں ہے، میرا اللہ کا کرم ہے۔ یہ نیک آدمی کی نشانی ہوتی ہے کہ اتنا بڑا کام ہونے کے باوجود بھی نسبت اپنی طرف نہیں کرتا بلکہ نسبت اپنے خدا کی طرف کرتا ہے۔

## دیوار کب ٹوٹے گی؟

جب یہ دیوار بنادی تو اب یہ دیوار ان سے ٹوٹے گی نہیں۔ یہ کب ٹوٹے گی؟ فرمایا: ﴿فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ﴾ جب قیامت قریب آئے گی تو پھر یہ دیوار پھٹ جائے گی۔ ﴿وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا﴾ فرمایا کہ میرے اللہ کا وعدہ ہو کر رہنا ہے۔

قیامت کے قریب یہ دیوار پھٹے گی۔ پھر یا جوج ماجوج وہاں سے نکلیں گے اور زمین میں پھیل جائیں گے۔ بہت تباہی پھیلانیں گے، بعد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ تعالیٰ ان سے اہل زمین کو نجات عطا فرمائیں گے۔ یہ مختصر سا واقعہ میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا۔

## سکندر کا کچھ تعارف:

اب آپ دو تین باتیں سمجھیں:



[1]: ہماری تاریخ میں کئی ایک سکندر گزرے ہیں۔ یہ سکندر جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے یہ نیک آدمی تھے، نمرود کے دور کے تھے، ابراہیم علیہ السلام کی زیارت کی ہے اور مکہ مکرمہ میں جا کر حج کیا ہے، مشرق اور مغرب کا سفر کیا ہے، شریعت اسلامیہ کا نفاذ کیا ہے، یاجوج ماجوج کے سامنے دیوار کھڑی کی ہے اور کفر کو طاقت کے ساتھ مسلمان کیا ہے، جو مسلمان نہیں تھے ان کو سزا دی ہے۔ یہ وہ باتیں تھیں جو ان کے بارے میں قرآن کریم میں آئی ہیں یا روایات میں آئی ہیں۔ یونان کا مشہور سکندر جسے لوگ سکندر اعظم بھی کہتے ہیں وہ اور تھا۔

### یاجوج ماجوج کون ہیں؟

[2]: یاجوج ماجوج کون ہیں؟ میں تفاسیر اور احادیث کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر جب سیلاب کا عذاب آیا تھا تو پوری دنیا سے انسان ختم ہو گئے۔ اس کے بعد دوبارہ جو نسل چلی ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام کی نسل میں سے ہے اور یاجوج ماجوج؛ نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہیں۔ تو یاجوج ماجوج یہ انسان ہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ اجساد کے لحاظ سے جانور اور درندوں کی طرح ہیں اور اپنی صفات کے اعتبار سے جنات کی طرح ہیں۔ جیسے جن میں طاقت بہت ہوتی ہے اسی طرح ان میں طاقت بہت ہوتی ہے لیکن یہ ہیں انسانوں میں سے، یہ کوئی الگ مخلوق نہیں ہے۔

### دیوار ذوالقرنین:

تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں پانچ بڑی بڑی دیواروں کا تذکرہ ہے اور مصنفین نے اپنے خیال اور تخمینہ سے دیوار ذوالقرنین کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن دلیل کسی کے پاس نہیں ہے۔ وہ پانچ دیواریں کون سی ہیں؟

☆ ایک دیوارِ چین ہے جس کی لمبائی کا اندازہ بارہ سو میل سے پندرہ سو میل تک کیا گیا ہے۔

☆ ایک دیوارِ آذربائیجان ہے یہ بہت بڑی دیوار ہے۔

☆ ایک دیوارِ سرِ قند ہے۔

☆ ایک دیوار؛ دیوارِ تبت ہے

☆ اور پانچویں دیوارِ بحیرہ روم کے مشرقی کنارہ پر ایشیائے کوچک کے جزائر میں سے کسی جزیرہ میں واقع ہے۔

لیکن سکندر ذوالقرنین نے جو دیوار بنائی اور جس کا تذکرہ قرآن کریم میں ہے وہ مذکورہ پانچوں دیواروں میں سے کوئی نہیں ہے۔

حضرت مولانا ادیس کاندھلوی رحمہ اللہ تفسیر معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ نہ ہم اس جگہ کی تعین کر سکتے ہیں اور نہ اس جگہ کا تعین کرنا ہماری شرعی ضرورت ہے۔ دیوار بنائی ہے اور یا جوج ماجوج وہاں بند ہیں اور قیامت کے قریب آکر وہ دیوار کھلے گی اور اللہ ان کو باہر نکالیں گے۔

### یا جوج ماجوج کب نکلیں گے؟

حضرت مہدی مدینہ منورہ میں پیدا ہوں گے۔ مکہ مکرمہ میں جا کر اعلان کریں گے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے اور عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال تک اس دنیا میں رہیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں دجال کا ظہور ہو گا اور پھر یہ دنیا میں چالیس دن تک رہے گا لیکن دنوں کی ترتیب یوں ہو گی کہ پہلا دن ایک سال کے برابر، دوسرا دن ایک ماہ کے برابر اور تیسرا دن ایک ہفتے کے برابر اور باقی دن معمول کے دنوں کے برابر ہوں گے اور ان دنوں میں وہ شمال و جنوب، مشرق و مغرب پوری کی پوری دنیا پر پھیل جائے گا۔

## دجال کا خروج اور اس کی فتنہ انگیزی:

اور دجال کو اللہ ایسی قوت عطا کریں گے کہ یہ ایک علاقے میں جائے گا اور کہے گا کہ میرا کلمہ پڑھو! ہر کسی سے کہے گا کہ مجھے خدا مانو! جو نہیں مانیں گے وہ جادو کی طاقت سے انہیں ختم کر دے گا۔ گھاس ختم ہو جائے گی، پانی خشک ہو جائے گا اور جو لوگ اس کو مانیں گے وہاں زمین سے خزانے نکلیں گے۔

حدیث میں آتا ہے کہ دجال کے پیچھے خزانے ایسے جائیں گے جیسے شہد کی مکھی اپنے مالک کے پیچھے چلتی ہے۔ اب دیکھیں! کتنا مشکل ہو جائے گا ایسی حالت میں ایمان کی حفاظت کرنا! اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیت المقدس کے قریب ایک جگہ ہے اس کا نام ہے ”باب لد“ وہاں دجال کو قتل کر دیں گے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جہاں تک نگاہ جائے گی وہاں تک ان کا سانس جائے گا اور جہاں تک ان کا سانس جائے گا وہاں تک کافر مر جائیں گے۔ یعنی جس کافر کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سانس لگے گی وہ مر جائے گا۔ اس طرح سارے کافر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں ختم ہو جائیں گے اور دجال بھی قتل ہو جائے گا۔ جو نبی دجال ختم ہو جائے گا تو اس کے متصل بعد ہی یاجوج ماجوج کا خروج ہو گا۔

## یاجوج ماجوج کے کچھ احوال:

بعض احادیث میں آتا ہے کہ یاجوج ماجوج روزانہ اس دیوار کو چاٹتے ہیں اور جب اتنی باریک ہو جاتی ہے کہ دوسری جانب نظر آنا شروع ہو جاتا ہے تو پھر کہتے ہیں کہ کل آکر اس کو چاٹیں گے اور جب دوسرے دن آتے ہیں تو دیوار پھر مکمل ہو جاتی ہے، اس طرح یہ روزانہ کرتے رہتے ہیں۔

حدیث پاک میں ہے کہ یہ خالص اللہ کی طرف سے ہے ورنہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یاجوج ماجوج جو محنت کرتے ہیں چوبیس گھنٹے کام کریں، اس طرح کہ سارے

آدمی کام نہ کریں کچھ سوئیں اور کچھ کام کریں۔ کچھ کام کریں اور کچھ سوئیں۔ اچھا! اگر یہ بھی نہ کریں تو پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب خدا نے ان کو اتنی بڑی طاقت دی ہے تو بندے پر بندہ بیٹھ کر وہ دیوار کو پھلانگنے کی ترتیب بنائیں۔ کون سا کام ہے جو نہیں ہو سکتا لیکن ان کا دماغ کام ہی نہیں کر رہا۔

جب اس دیوار میں سوراخ ہونا ہو گا تو حدیث پاک میں ہے کہ جب وہ سونے لگیں گے تو کہیں گے کہ ان شاء اللہ کل آئیں گے۔ اگرچہ یہ مسلمان نہیں بلکہ کافر ہوں گے لیکن ان شاء اللہ کی برکت سے جتنی دیوار چھوڑ کر جائیں گے اگلے دن اتنی باقی ہوگی اور کچھ دیر میں دیوار ختم ہو جائے گی۔ یہ پوری دنیا میں پھیل جائیں گے۔ پھر فوج در فوج یوں ہوں گے کہ جیسے ہر اونچی جگہ سے وہی نکلتے ہیں اور اتنے زیادہ ہوں گے کہ دریا سے گزریں گے تو سارا پانی ختم کر دیں گے۔

یا جوج ماجوج کا فتنہ اتنا بڑا ہو گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کو لے کر کوہ طور پر چلے جائیں گے۔ اس فتنے سے بچاؤ بڑا مشکل ہو گا۔ بالآخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا سے دعا مانگیں گے: یا اللہ! مسلمانوں کی حفاظت فرما، ان سے ہماری جان بچا! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا کی برکت سے جتنے بھی یا جوج ماجوج ہوں گے ان کی گردن میں ایک دانہ نکلے گا جس کی وجہ سے سارے مر جائیں گے اور پوری زمین میں بدبو پھیل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کچھ بھاری بھر کم پرندوں کو بھیجیں گے جن کی گردنیں اونٹ کی گردن کی طرح ہوں گی۔ وہ یا جوج ماجوج کی لاشوں کو اٹھائیں گے اور جہاں اللہ کا حکم ہو گا وہاں گر ادیں گے۔

اس کے بعد بارش ہوگی اور پوری زمین کو اس بدبو سے پاک کیا جائے گا۔ اب پھر بہار اسلام شروع ہوگی۔ دنیا میں اس قدر فراوانی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ زمین کو حکم فرمائیں گے کہ خزانے کو باہر نکالو! برکتیں ظاہر کر دو! تو برکتیں یوں ظاہر ہوں گی کہ

ایک گائے کا دودھ پورے خاندان کے لیے کافی ہو گا، ایک انار کاٹیں گے تو کھانے کے لیے آدھا کافی ہو جائے گا اور دوسرے آدھے سے چھتری بنائیں گے۔ آخر کار حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا سے چلے جائیں گے۔

آپ علیہ السلام کی وفات کے کافی عرصے بعد آہستہ آہستہ کفر پھیلنے لگے گا۔ جب کفر بہت زیادہ پھیل جائے گا تو حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک ٹھنڈی سی ہوا چلے گی اور اس وقت کے جو مسلمان ہیں اس ہوا سے سارے فوت ہو جائیں گے۔ پھر دنیا میں صرف کفر رہ جائے گا۔ کفر پر خدا نے قیامت برپا کرنی ہے۔ جب ایک انسان بھی اس دنیا پر اللہ اللہ کہنے والا ہو گا تو اس دنیا پر قیامت نہیں آئے گی۔ پھر صور پھونکا جائے گا۔ کب سے فرشتہ کھڑا ہے کہ خدا کا حکم ہو اور میں صور پھونکوں! نہ وہ تھکتا ہے اور نہ وہ اونگھتا ہے۔ جب وہ صور پھونکے گا تو دنیا تباہ ہو جائے گی۔ چالیس سال اسی طرح گزریں گے۔ چالیس سال کے بعد پھر صور پھونکا جائے گا۔ پھر قبروں سے نکالا جائے گا۔ اللہ پاک ہم سب کو یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### سورة الکہف کے واقعات میں مناسبت:

سورة الکہف میں پہلے واقعہ اصحاب کہف کا تھا، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اور پھر حضرت سکندر ذو القرنین کا۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے بڑی عجیب بات لکھی ہے، فرمایا کہ یہ سکندر ذو القرنین اگرچہ بادشاہ تھا لیکن اصحاب کہف سے زیادہ ولی تھا۔ مشرق اور مغرب کا بادشاہ ہو اس کے باوجود اس میں غرور نہ آئے تو اصل بندہ تو یہ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ولی تو اصحاب کہف بھی تھے لیکن بڑا ولی یہ تھا۔ کیوں کہ وہ ولی وہ تھے جو جابر بادشاہ سے چھپے اور غار میں عبادت کی اور یہ ولی وہ تھا جو جابر بادشاہ سے ٹکرایا اور کفر کے خلاف واضح کام کیا ہے۔ تو دونوں نے اپنے ایمان کو بچایا لیکن انہوں نے ایمان کو بچانے کے لیے غار کا رخ کیا اور انہوں نے ایمان کو بچانے

اور دنیا میں دین پھیلانے کے لیے سمندوں کا رخ کیا ہے۔ اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

### دیوارِ ذوالقرنین میں سوراخ ہو چکا ہے:

آخر میں آپ سے ایک بات عرض کرتا ہوں۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سوئے ہوئے تھے۔ اچانک رات کو اٹھے اور فرمایا:

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَنِلُّ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرِّ قَدِ اقْتَرَبَ

کہ ہلاکت ہو عرب کے لیے ایک ایسے شر سے جو قریب آچکا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مِثْلُ هَذِهِ.

یا جوج ماجوج والی جو دیوار ہے اس سے اتنا سوراخ ہو گیا ہے۔

اب یہ کتنا ہے؟ اس حدیث کے جو راوی ہیں حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے دس کے عدد کی شکل بنا کر دکھائی۔<sup>105</sup>

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی جو روایت ہے کہ "فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مِثْلُ هَذِهِ" کہ یا جوج ماجوج والی جو دیوار ہے اس سے اتنا

سوراخ ہو گیا ہے۔ اس روایت کے راوی وہیب ہیں، انہوں نے انگلیوں کے اشاروں سے نوے کے عدد کی شکل بنائی۔ "وَعَقَدَ وَهَيْبٌ بِيَدَيْهِ تِسْعِينَ"<sup>106</sup>

جس بندے کو عدد معلوم نہیں وہ کہے گا کہ دونوں احادیث میں تعارض ہے اور جس بندہ کو عدد معلوم ہو گا وہ کہے گا کہ تعارض نہیں ہے۔

105- صحیح مسلم، رقم: 2880

106- صحیح مسلم، رقم: 2881

میں نے اس پر مستقل ایک فائل تیار کی ہے جس میں انگلیوں کی مدد سے گنتی گننے کا طریقہ لکھا ہے۔ اس طریقے کو ”عقد انامل“ کہتے ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو وہ فائل مرکز اہل السنۃ والجماعۃ سے منگوا لیں۔ آپ یقین فرمائیں کہ ان دس انگلیوں کی مدد سے انسان دس ہزار تک آسانی کے ساتھ گنتی گن سکتا ہے۔

### یا جوج ماجوج کی تعداد:

یا جوج ماجوج دنیا میں کتنے ہوں گے؟ حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ رب العزت حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ آپ اپنی اولاد میں سے ان لوگوں کو اٹھائیے جو جہنمی ہیں۔ وہ عرض کریں گے: یا اللہ! جہنمی کون لوگ ہیں؟ اللہ فرمائیں گے ہر ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے جہنمی ہیں اور صرف ایک جنتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ بات سنی تو ڈر گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! ہم میں سے وہ ایک جنتی کون سا ہو گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پریشان نہ ہو کیونکہ یہ نو سو ننانوے جہنمی تم میں سے ایک اور یا جوج ماجوج میں سے ایک ہزار کی نسبت سے ہوں گے۔<sup>107</sup>

اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

### متکلم اسلام کی نصیحت:

دو باتیں ذہن میں رکھ لیں: اللہ کے ذکر اور قرآن کریم کی تلاوت کا اہتمام کریں۔ اور اہل الذکر اور علماء کے ساتھ تعلق رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ذکر کی بھی توفیق عطا فرمائے اور اہل الذکر کے ساتھ تعلق کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة مریم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿كَهَيْعَصَ ۚ ذِكْرَ حَمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكْرِيًا ۚ﴾ (۱) اِذْ نَادَى رَبَّهُ نِدَاءً

خَفِيًّا ۚ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاسْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَلَمْ اَكُنْ

بِدُعَاؤِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۚ﴾ (۲)

ہمارے آج کے درس قرآن کا عنوان ہے مضامین سورت مریم۔ سورت مریم کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کا ذکر فرمایا ہے۔ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کا ذکر ایک تو پارہ نمبر سولہ سورت مریم میں ہے اور ایک پارہ نمبر تین سورت آل عمران میں ہے۔ ان دو جگہوں پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اجمال و اختصار کے ساتھ دو اور مقامات پر بھی ذکر فرمایا ہے۔

**حضرت مریم کے ذکر سے پہلے یحییٰ اور حضرت زکریا کا تذکرہ کیوں؟**

حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہما السلام کا ذکر حضرت مریم علیہا السلام کے ذکر سے پہلے کیا ہے، بظاہر آدمی کے ذہن میں آتا ہے کہ سورت کا نام ”سورت مریم“ ہے تو اس میں حضرت مریم کا ذکر ہونا چاہیے تھا۔ اس کی ایک دو وجوہات ذہن نشین فرمائیں:



پہلی وجہ یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام کے خالو ہیں، حضرت مریم کی والدہ کا نام حنہ تھا اور حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی کا نام ایشاع یا الیشع تھا۔ یہ دونوں آپس میں بہنیں تھیں۔ تو حضرت مریم کے ذکر سے پہلے حضرت زکریا کا ذکر کیا جائے تو یہ خاندان ہی کا ذکر ہے کسی اور کا ذکر تو نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کا بچپن حضرت زکریا علیہ السلام کی تربیت میں گزرا ہے۔ حضرت زکریا نے پرورش کی ہے حضرت مریم علیہا السلام کی۔ جب حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر آئے گا تو میں اس میں تفصیل سے عرض کروں گا۔

### حضرت مریم کی والدہ کا نذرماننا:

یہ آپ کے علم میں ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ امید سے تھیں، انہوں نے منت مانی تھی:

﴿رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي﴾<sup>108</sup>

اے میرے رب! میں نے نذرمانی ہے کہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے میں اس کو ہر کام سے آزاد کر کے تیرے لیے وقف کروں گی۔

میں اس کو تیرا دین سیکھنے کے لیے وقف کر دوں گی لیکن جب ان کے ہاں پیدائش ہوئی تو وہ بیٹا نہیں بلکہ بیٹی تھی تو حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے بڑی حسرت کے ساتھ کہا: ﴿إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَى﴾ کہ میرا خیال تھا کہ بیٹا ہوتا تا کہ تیرے دین کے لیے وقف کرتی، یہ دین کو پڑھتا اور دین کا کام کرتا لیکن میرے ہاں تو بیٹی کی پیدائش ہوئی ہے۔ اللہ رب العزت نے جو ان کو جواب دیا وہ بڑا پیارا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَيْسَ الذَّكَوٰى كَالْذَّنٰى﴾ اس آیت کا مطلب سمجھیں، فرمایا کہ جو لڑکا تو نے مانگا تھا وہ کمالات اور برکات میں اس لڑکی کی طرح نہیں ہے جو ہم نے تمہیں دی ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے لڑکا اپنی حیثیت کے مطابق مانگا تھا اور اللہ نے لڑکی اپنی شان کے مطابق دی ہے۔ اب ان کی سوچ اپنی ہے اور اللہ رب العزت کے فیصلے اپنے ہیں۔

پھر حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر قرآن کریم میں اللہ نے کئی بار فرمایا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کس قدر عظیم خاتون ہیں کہ جن کے بطن سے اللہ نے بغیر شوہر کے بیٹا عطا فرمایا اور بیٹا بھی نبی ہے اور وہ بھی مادر زاد نبی۔ آپ یہ تو سنتے ہیں کہ فلاں بندہ مادر زاد ولی ہے لیکن یہ بھی سنیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مادر زاد نبی ہیں۔ عام طور پر اللہ کسی بھی بندے کے لیے نبی ہونے کا فیصلہ فرماتے ہیں تو اس کی عمر کے چالیس سال کے بعد اس سے اعلان نبوت کرواتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بتیس سال کی عمر میں زمین سے آسمان پر بھی چلے گئے تھے تو یہ پیدا نشی نبی ہیں، بتاؤ! کس قدر اللہ کا انعام ہے۔

اور تاریخ میں کئی ایسے بچے گزرے ہیں جنہوں نے اس عمر میں گفتگو کی جس میں بچے بول نہیں سکتا لیکن جس کا تذکرہ اللہ نے قرآن میں کیا ہے اس کا نام حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہے۔ انہوں نے بچپن میں ماں کی گود میں کلام کیا ہے اور بڑے ہو کر بھی کریں گے اور نزول کے بعد جب زمین پر تشریف لائیں گے تو پھر دوبارہ گفتگو فرمائیں گے ان شاء اللہ۔ اگر ہماری زندگی میں اللہ انہیں لے آئے تو دعا کریں کہ اللہ ہمیں ان کا سپاہی بننے کی توفیق عطا فرمائے اور اگر ہماری زندگی میں نہ آئیں تو اپنی اولاد کو یہ وصیت کر کے جائیں کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت مہدی آئیں تو بیٹا! آپ نے ان کا ساتھ دینا ہے۔

تو حضرت مریم علیہا السلام کے ذکر سے پہلے حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر اس لیے کیا کہ حضرت مریم حضرت زکریا کی تربیت میں رہی ہیں۔

### حضرت مریم کی کفالت کے لیے قرعہ اندازی:

حضرت مریم علیہا السلام پیدا ہوئیں، چلنے کے قابل ہوئیں، سن شعور کو پہنچیں تو آپ کی والدہ نے آپ کو لیا اور بیت المقدس جو اس وقت کا مدرسہ تھا، وہاں لے گئیں اور بیت المقدس میں اس زمانے میں تورات پڑھائی جاتی تھی، اس وقت آسمانی کتاب تورات تھی، تورات کو لوگ پڑھتے اور لکھتے تھے، حضرت مریم علیہا السلام کا خاندان دینی و علمی اور معاشرتی شرافت کا حامل خاندان تھا۔ تو حضرت مریم علیہا السلام کو ان کی والدہ لے کر گئیں۔ تو وہاں جو علماء تھے تورات کو سمجھنے والے اور تورات کو جاننے والے ان میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ حضرت مریم علیہا السلام اس کی پرورش میں رہیں، اچھے شریف خاندان کی بیٹی ہے، اس بیٹی کی تربیت ہم کریں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ﴾<sup>109</sup>

اے پیغمبر! آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ لوگ قرعہ اندازی کے طور پر اپنی قلمیں ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے؟ فیصلہ یہ ہوا کہ قرعہ اندازی کریں اور قرعہ اندازی کا طریقہ بڑا عجیب تھا، طریقہ یہ تھا کہ وہاں قریب ایک دریا گزرتا تھا تو جن قلموں سے تورات کو لکھتے تھے ہر عالم اپنے اپنے قلم کو اس دریا میں ڈالے تو جس کا قلم پانی کی مخالف سمت چل پڑے گا تو وہ مریم کی کفالت کرے گا۔ انہوں نے اپنا اپنا قلم ڈالا تو حضرت مریم کی کفالت کے

لیے حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم اس طرف چلا جہاں سے پانی آرہا تھا یعنی مخالف سمت پر۔ تو حضرت مریم حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت میں آگئیں۔

### بے موسم کے پھلوں کی آمد:

حضرت زکریا علیہ السلام چونکہ اللہ کے نبی تھے، دعوت دینے کے لیے اور امت کو دین سمجھانے کے لیے جایا کرتے تھے۔ بیت المقدس کے محراب میں جو کمرہ تھا وہاں حضرت مریم کو چھوڑ کر دروازہ بند کر کے چلے جاتے تھے اور واپس آکر ان کو سبق پڑھانا ہوتا تھا۔ جب واپس تشریف لاتے تو آپ نے کئی مرتبہ دیکھا کہ حضرت مریم کے پاس بے موسم کے پھل موجود ہیں، موسم نہیں ہے پھل کا لیکن پھل موجود ہے۔ اس کا تذکرہ اللہ نے سورت آل عمران میں کیا ہے:

﴿كَلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِذْقًا قَالَ يَمْرِئُؤُا۟نِىٰ لَکَۢ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِۙ﴾<sup>110</sup>

وہاں بغیر موسم کے پھل دیکھا تو حضرت مریم علیہا السلام سے کہا کہ اے مریم! یہ پھل کہاں سے آئے؟ انہوں نے جواب دیا: ﴿هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ یہ اللہ کی طرف سے ہیں۔

### ”عند اللہ“ قرآنی اصطلاح ہے:

یہاں یہ ضابطہ سمجھ لیں۔ اصل میں اس ”عند اللہ“ کے لفظ پر کئی گھٹنے چاہئیں تاکہ میں آپ کو کئی عقائد سمجھاؤں۔ اس ایک لفظ کے سمجھنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کے کئی عقائد حل ہوتے ہیں۔ صرف ایک لفظ سمجھ لیں۔ حضرت مریم علیہا

السلام نے کہا:

﴿هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ﴾

یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

آپ بتائیں! جو کھانا حضرت زکریا علیہ السلام روزانہ دیتے تھے تو وہ کھانا کس کی طرف سے تھا؟ (اللہ کی طرف سے۔ سامعین) تو پھر یہ کیوں کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے لیکن ضابطہ یہ ہے کہ جب اللہ کسی چیز میں ظاہری ملکیت انسان کی رکھ دیں تو اس میں نسبت انسان کی طرف ہوتی ہے، اللہ کی طرف نہیں ہوتی، مثال سمجھیں:

**یہ گھر اللہ رحمن کا اور یہ عبد الرحمن کا:**

ایک آدمی نے ایک کنال زمین خریدی۔ اس نے اس کنال میں سے پانچ مرلے میں مسجد بنا کر وقف کر دی اور باقی پندرہ مرلے میں اپنا مکان بنالیا۔ جب یہ دونوں مکان بن جاتے ہیں تو پوچھا جائے کہ یہ مکان کس کا ہے؟ وہ کہے گا: یہ اللہ کا گھر ہے، اور یہ پندرہ مرلے والا مکان کس کا ہے؟ یہ بھائی عبد الرحمن کا گھر ہے۔ تو یہ نام بدل کیوں گیا ہے؟ اس لیے کہ یہ جو بھائی عبد الرحمن کا گھر ہے اس پر ظاہری ملکیت بھی اس کی ہے جبکہ حقیقی مالک تو اللہ ہیں اور مسجد کے معاملے میں حقیقی مالک بھی اللہ اور ظاہری ملکیت بھی اللہ کی ہے۔ تو جہاں بندے کے اختیارات ختم ہو جاتے ہیں وہاں قرآن کریم میں نسبت آتی ہے ”هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ“۔ اگر آپ حضرات کو یاد ہو تو میں کچھ گفتگو اس پر پہلے دوسرے پارے میں کر چکا ہوں۔

تو حضرت مریم علیہا السلام فرمانے لگیں: ﴿هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ

يَزِدُّكَ مِنْ شَاءٍ بَغَيْرِ حِسَابٍ﴾ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اللہ جس کو چاہے بغیر

حساب کے رزق دیتا ہے۔

### حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا:

﴿هٰذَاكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾

إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿١١١﴾

حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر بعض روایات کے مطابق ننانوے سال یا اس سے بھی زیادہ تھی اور حضرت زکریا کی بیوی جوانی ہی میں بانجھ تھیں، ان کے ہاں اولاد کی صلاحیت ہی نہیں تھی اور اب تو تھیں ہی بوڑھی۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کے پاس بے موسم کے پھل کو دیکھا تو سجدے میں گرے اور اللہ سے دعا مانگی: ﴿رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ اے اللہ! تو اپنی طرف سے مجھے نیک اور پاکیزہ اولاد عطا فرما دے جس طرح بغیر موسم کے آپ مریم کو پھل دے سکتے ہیں تو بغیر موسم کے اللہ مجھے بھی اولاد والا پھل عطا فرما دے۔

### ولی کی کرامت دیکھ کر ولی کے خدا سے مانگیں!

اب یہاں ایک بات سمجھیں! حضرت مریم نبی نہیں ہیں بلکہ اللہ کی ولی ہیں، ہم نبی سے معجزہ اور ولی سے کرامت کے قائل ہیں۔ نبی کی نبوت بھی مانتے ہیں اور معجزہ بھی مانتے ہیں، ولی کی ولایت بھی مانتے ہیں اور ولی کی کرامت بھی مانتے ہیں، نہ نبی کا معجزہ نبی کے اختیار میں ہوتا ہے اور نہ ولی کی کرامت ولی کے اختیار میں ہوتی ہے۔ اللہ چاہیں تو نبی کے ہاتھ پر معجزہ ظاہر فرمادیں، چاہیں تو ظاہر نہ فرمائیں، ولی کے ہاتھ پر چاہیں تو کرامت ظاہر فرمادیں اور چاہیں تو کرامت ظاہر نہ کریں۔ حضرت مریم ولی

ہیں، نبی نہیں ہیں۔ بے موسم کے پھل ملنا ان کی کرامت ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کی کرامت کو دیکھا تو کرامت کا انکار نہیں کیا بلکہ کرامت کو مان لیا لیکن مریم کی کرامت کو دیکھ کر مریم سے نہیں مانگا بلکہ مریم کے خدا سے مانگا ہے۔ اب اس سے ہمیں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ بعض لوگ دنیا میں ولی کی کرامت کو مانتے ہیں اور ولی سے مانگتے ہیں، عیسائی حضرت مریم سے مانگتے ہیں، آپ چرچ میں جا کر دیکھ لیں وہ بی بی مریم سے مانگتے ہیں اور بعض لوگ ولی کی کرامت کو مانتے ہیں اور پھر ولی کے خدا سے مانگتے ہیں، ولی کی کرامت کو مان کر ولی سے مانگنا یہ عیسائیت ہے اور ولی کی کرامت کو مان کر ولی کے خدا سے مانگنا یہ اسلام ہے۔

### حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا:

حضرت زکریا علیہ السلام نے ولی کی کرامت کو مانا اور مانگا اللہ سے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی ہے، ایک دعا سورت آل عمران میں صرف اتنی ہے: ﴿رَبِّ هَبْ لِي مِنْ دُونِكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ کہ اے اللہ! تو مجھے نیک اولاد عطا فرما دے۔ میں پہلے ان کی دعا پر بات کر لوں، دعا کی قبولیت پر بات بعد میں ہوگی۔ پہلے ذرا دعا سمجھ لیں، اور جو دعا سورت مریم میں مانگی ہے اس میں حضرت زکریا علیہ السلام کی تمہید ہے، پہلے انہوں نے اللہ سے باتیں کی ہیں:

﴿إِذْ نَادَى رَبَّهُ نِدَاءً خَفِيًّا﴾

جب انہوں نے اپنے رب کو چپکے سے پکارا۔

اللہ سے دعا مانگی ہے تو اونچی آواز سے نہیں مانگی بلکہ آہستہ آہستہ دعا کی ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ بعض دعائیں ایسی ہوتی ہیں کہ اس کو مانگتے ہوئے انسان کو جھک محسوس ہوتی ہے، اب زکریا علیہ السلام بوڑھے ہیں، بیوی بانجھ ہے تو دعا بھی مانگ رہے ہیں اور ساتھ چونکہ خود بھی تعجب ہے کہ یہ میں کیسی دعا مانگ رہا ہوں تو دعائیں یہ فرما

رہے ہیں:

﴿رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاسْتَعَلَ الرَّاسُ شَیْبًا﴾

اے اللہ! میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور میرے سر میں سفیدی چھا گئی ہے،  
بڑھاپا آ گیا ہے۔

﴿وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَاۤیْكَ رَبِّ شَقِیًّا﴾

اور اے اللہ! میں نے جب بھی آپ سے مانگا تو آپ نے میری دعا کو قبول  
فرمایا، اب بظاہر جو دعائیں مانگنے لگا ہوں کوئی آثار نہیں ہیں کہ مجھے ایسی چیز ملنی چاہیے  
لیکن آپ نے ہمیشہ مجھے نوازا ہے۔ میں یہ دعا اس لیے مانگ رہا ہوں کہ:

﴿وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ﴾

میرے جو رشتہ دار ہیں یہ دینی معاملات میں میرا ساتھ نہیں دیتے، مجھے ڈر  
ہے کہ میرے جانے کے بعد میری اس دعوت کو اور میرے علم کو میرے رشتہ دار چلا  
نہیں سکیں گے، مجھے موت کے بعد اس کے ضائع ہونے کا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔

﴿وَكَانَتْ اِمْرَاۤتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۝ یَّرِثُنِیْ وَ یَرِثْ مِنْ

اِلَیْ یَعْقُوْبَ﴾

میری بیوی بانجھ ہے۔ اے اللہ! مجھے کوئی ایسا وارث عطا فرمادیں جو میرا بھی  
وارث بنے اور یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا بھی وارث بنے۔

**حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کی جامعیت:**

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے  
تفسیر بیان القرآن میں بہت پیاری بات لکھی ہے کہ یہ کیوں فرمایا کہ میرا بھی وارث ہو  
اور آل یعقوب کا بھی وارث ہو۔ فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو دعا مانگنا چاہتے ہیں



کہ اللہ ایک تو جو میرا مخصوص علم ہے یہ بھی اس کے پاس ہوں اور جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی آل کے پاس علم ہے وہ بھی اس کے پاس ہو، اس کو دونوں قسم کے علوم عطا فرمادے۔ تو ایسا کہنا جامعیت کی وجہ سے تھا کہ دونوں علوم کا جامع ہو۔

### انبیاء کے مال میں وراثت نہیں چلتی:

اب یہاں پر ایک مسئلہ سمجھ لیں! ہمارا مسلک یہ ہے کہ نبی کے رشتہ دار اور نبی کے خاندان کے لوگ نبی کی وفات کے بعد نبی کے مال کے وارث نہیں ہوتے اور بعض لوگوں کی رائے یہ ہے۔ جن کا ہم سے تعلق نہیں ہے۔ کہ پیغمبر کے جانے کے بعد پیغمبر کی اولاد وارث ہوتی ہے۔ دلیل ان کی یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا مانگی ہے کہ اے اللہ! مجھے بیٹا دے جو میرا وارث ہو۔ اگر نبی کا وارث نہیں ہوتا تو زکریا علیہ السلام نے دعا کیوں مانگی ہے؟ تو وہ کہتے ہیں اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کا وارث ہوتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ نبی کا مالی وارث کوئی نہیں ہوتا اس پر تو بہت سے دلائل موجود ہیں۔ یہاں ایک دو دلیلیں سن لیں کہ وارث کیوں نہیں ہوتا؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ دلیل ارشاد فرمائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کے بعد یہ بحث چلی کہ پیغمبر کا جو باغ فدک تھا خیر والا اس کا کیا بنے گا؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گھر کے اخراجات کے لیے جو باغات تھے ان کا وارث کون بنے گا؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے:

"إِنَّا مَعْشَرَ النَّبِيِّاءِ لَا نُورَثُ مَا تَرَ كُنَّا فَهُوَ صَدَقَةٌ."<sup>112</sup>

فرمایا کہ ہم نبیوں کے گروہ ہیں، ہمارے مال میں کوئی وارث نہیں ہوتا، جو مال نبی چھوڑ کر جائے وہ امت کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔

اور ایک روایت ہے جو صحیح بخاری میں موجود ہے، اگر کوئی شخص آپ کے خلاف پیش کرے تو آپ اس کا جواب بھی ذہن نشین فرمائیں۔ روایت یہ ہے کہ حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں کہ باغ فدک اور خیبر کی زمینوں میں ہمارا حصہ ہے، آپ ہمیں دے دیجئے! حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ فاطمہ! اللہ کے نبی تمہارے والد کا ارشاد ہے کہ ”لَا نُورِثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةً“ کہ نبی کا کوئی وارث کوئی نہیں ہوتا، نبی جو مال چھوڑ کر جاتا ہے وہ امت کے لیے صدقہ ہوتا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت فاطمہ الزہرا خاموش ہو گئیں حتیٰ کہ ان کا انتقال ہو گیا۔<sup>113</sup>

اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا؛ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چھ ماہ زندہ رہیں اور دوبارہ انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے وراثت کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ مسئلہ ان کو سمجھ آ گیا۔  
تو جن کا تقاضا تھا انہوں نے چھوڑ دیا کیونکہ مسئلہ ان کو سمجھ میں آ گیا تھا اور جن کا تقاضا نہیں ہے وہ چودہ سو سال ہو گئے ابھی تک لڑ رہے ہیں کہ ابو بکر صدیق نے -العیاذ باللہ- وراثت پر قبضہ کر لیا ہے۔

### نبی کے مال میں وراثت نہ چلنے کی وجہ؟

توپینغیر کا وارث کوئی نہیں ہوتا، یہ بڑی اہم اور نکتہ کی بات ہے۔ اتنی تو آپ نے حدیث سن لی کہ نبی کا وارث کوئی نہیں ہوتا کیونکہ اللہ کے نبی نے خود فرمایا ہے کہ

ہم نبی ہیں اور ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا ہے لیکن ہوتا کیوں نہیں؟ اس کا بہترین جواب وہی ہے جو قاسم العلوم والخیرات بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ نے اپنی کتاب ”تخذیر الناس“ میں دیا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ پیغمبر کا وارث نہ بننے کی بنیادی وجہ یہ ہے۔ یہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں لیکن اب صرف یاد دہانی کے لیے دوبارہ عرض کر رہا ہوں۔ کہ موت امتی پر بھی آتی ہے اور موت نبی پر بھی آتی ہے لیکن دونوں کی موت میں فرق ہے۔ موت کا معنی ہوتا ہے ”قبض روح“۔ میں درس قرآن سبق کے انداز میں دیتا ہوں تاکہ آپ دلائل کو اچھی طرح سمجھیں اور یاد کریں۔ اور ”قبض“ کے دو معنی ہو سکتے ہیں:

1: قبض کا ایک معنی ہے سمٹ جانا اور ایک معنی ہے نکل جانا۔ میں سمجھانے کے لیے کہتا ہوں دیکھیں اس وقت میرے ہاتھ میں کنگھا ہے اور میں نے ہاتھ پھیلا یا ہوا ہے، عربی میں کہیں گے: ”بَسَطْتُ يَدِي“ کہ میں نے ہاتھ پھیلا دیا۔ اب میں نے ہاتھ سمیٹ لیا ہے تو عربی میں کہیں گے: ”قَبَضْتُ يَدِي“ کہ میں نے ہاتھ سمیٹ لیا ہے۔ اب یہ قبض؛ بسط کے مقابلے میں ہے، قبض کا معنی ہے سمٹ جانا اور بسط کا معنی ہے پھیل جانا۔

2: اور قبض کا ایک معنی ہوتا ہے؛ لے لینا۔ [متکلم اسلام حفظہ اللہ سامعین میں سے ایک شخص کو اپنے پاس بلا کر اس کے سر سے ٹوپی ہاتھ میں لے کر فرماتے ہیں] مثلاً یہ ٹوپی پہلے ان کے پاس تھی اور اب میرے پاس ہے۔ آپ کہیں گے کہ پہلے ٹوپی ان کے پاس تھی اور اب ان سے نکل کر مولانا کے پاس آگئی ہے۔ اب قبض کا معنی ہے کہ ایک چیز کا ایک شخص سے نکل کر دوسرے کے پاس چلے جانا، پہلے قبضہ ان کا تھا اور اب قبضہ میرا ہے۔ تو یہاں قبض کا معنی ہے خروج۔

تو قبض کا ایک معنی ہے؛ جس یعنی سمٹ جانا اور ایک معنی ہے؛ خروج یعنی

### حضرت نانوتوی کی توجیہ:

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب امتی پر موت آتی ہے تو اب قبض روح کا معنی ہے؛ روح کا نکل جانا، گویا امتی کے وجود سے روح نکل جاتی ہے اور جب نبی پر موت آتی ہے تو اب قبض روح کا معنی ہے؛ روح کا سمٹ جانا یعنی نبی کے سر مبارک کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخن مبارک تک تمام جسم سے روح سمٹی ہوئی قلب اطہر میں جمع ہو جاتی ہے۔ تو امت کے لیے قبض بمعنی خروج ہوتا ہے اور نبی کے لیے قبض بمعنی جس ہے۔

اگلی بات سمجھیں کہ نبی کی وراثت کیوں نہیں چلتی! مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وراثت تو تب چلے گی جب جس کا مال ہو اس کی ملکیت سے نکل جائے، جب اس کی ملکیت سے مال نکلے گا ہی نہیں تو دوسرا شخص اس کا مالک کس طرح بن سکتا ہے؟ تو حضرت فرماتے ہیں کہ مال ملکیت سے اس وقت نکلتا ہے جب موت آجائے اور موت ایسے آئے کہ تمام اجزاء سے روح نکل جائے، نبی کی موت ایسی نہیں ہے کیونکہ یہاں روح جسم کے دیگر اجزاء سے نکلی ہے اور قلب اطہر میں سمٹ گئی ہے، جب پیغمبر کا مال ان کی ملکیت سے نکلا ہی نہیں ہے تو پیغمبر کے ورثاء مال کے مالک کیسے بنیں گے؟ اور ملکیت سے مال نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ تمام اجزاء سے روح نکل جائے، یہاں تمام اجزاء سے روح نکلی نہیں ہے بلکہ قلب اطہر میں جمع ہو گئی ہے۔ اس لیے نبی کا مال نہ ملکیت سے نکلتا ہے اور نہ ہی رشتہ دار کو ملتا ہے۔

### نبی کے قلب میں حیات ہوتی ہے:

اگلی بات آپ ذہن میں رکھیں۔ اس حدیث میں پہلا لفظ ہے ”لَا نُورَتْ“ ہمارا کوئی وارث نہیں بننا اور دوسرا لفظ ہے ”مَا تَرَ كُنَّا صَدَقَةً“ جو مال ہم چھوڑ کر جاتے

ہیں وہ امت میں صدقہ بن جاتا ہے۔ بھائی! صدقہ تو تب بنے گا جب مال کا کوئی مالک ہو۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بڑی عجیب بات فرماتے ہیں کہ صدقے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ جس وقت مال صدقہ ہوتا ہے اس وقت صدقہ کرنے والا زندہ ہو، صدقہ کرنے والا زندہ ہو گا تو مال صدقہ ہو گا نا! اگر وہ زندہ نہیں ہو گا تو صدقہ کیسے ہو گا؟ اس لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نبی پر موت آتی ہے تو مال اس کی ملک سے نکلتا نہیں ہے کہ کوئی رشتہ دار وارث بنے، ہاں خود نبی کا مال اللہ کے نبی کے فرمان کے مطابق صدقہ بنتا ہے، تو صدقہ بن جانا اس بات کی دلیل ہے کہ موت آ بھی جاتی ہے اور نبی کے قلب اطہر میں حیات بھی ہوتی ہے۔

اگر آپ قلب کی حیات نہیں مانیں گے تو مال صدقہ کیسے ہو گا؟ اس لیے نبی کا مال وراثت میں تبدیل نہیں ہوتا البتہ نبی کا مال صدقہ بن جاتا ہے۔

### ہمارے پاس دلائل موجود ہیں:

میں اپنے حضرات سے ایک بات کہتا ہوں کہ آدمی دلائل سنتا رہے اور دلائل سمجھ نہ بھی آئیں لیکن اپنے عقیدے سے پھر تا نہیں ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ ہمارے پاس دلائل ہیں لیکن میں سمجھا نہیں سکتا۔ میں یہ بات اس لیے کہتا ہوں کہ مجھے ایک ساتھی نے ایک مرتبہ ایک جلسے میں یہ چٹ دی کہ مولانا صاحب! آپ اپنے بیان میں بسا اوقات اتنے مشکل دلائل دیتے ہیں کہ لوگ سمجھتے نہیں۔ میں نے کہا: میں بھی سمجھ رہا ہوں کہ یہ دلیل نہیں سمجھ رہے لیکن میں دلیل پھر بھی دیتا ہوں کیونکہ انہیں دلیل سمجھ تو نہیں آئے گی لیکن یہ تو پتا چل جائے گا کہ ہمارے پاس دلائل موجود ہیں۔

آپ نے بینک میں اکاؤنٹ کھلوایا ہے اور اس اکاؤنٹ میں کتنے پیسے ہیں آپ بیٹے کو بتاتے نہیں ہیں اور آپ کے پاس چیک بک پڑی ہے۔ اب بیٹے کو یہ تو پتا ہے کہ باپ کے اکاؤنٹ میں پیسے ہیں لیکن یہ پتا نہیں کہ کتنے ہیں، پیسے ہوں تو بیٹا خوش ہوتا ہے

اگر نہ ہوں تو پریشان ہوتا ہے۔ آپ کہتے ہیں: بیٹا! عید آرہی ہے ہم ان شاء اللہ اس پر اونٹ ذبح کریں گے۔ ابو! پیسے کہاں ہیں؟ میرے اکاؤنٹ میں ہیں۔ کتنے ہیں یہ نہیں بتاتے لیکن بیٹا مطمئن رہتا ہے۔ تو آپ کو پتا ہے کہ آپ کے اکاؤنٹ میں دلائل ہیں تو آپ بھی مطمئن رہتے ہیں۔ اس لیے دلائل دیتے رہنا چاہیے اور آہستہ آہستہ آدمی سنتا رہے... سنتا رہے... ایک وقت آتا ہے کہ دلائل سمجھ میں بھی آجاتے ہیں۔

میرے علم میں - بحمد اللہ تعالیٰ - دنیا کے غیر علماء کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے جو مسلسل دلائل سننے کی وجہ سے اپنے عقائد پر دلائل سے گفتگو فرماتے ہیں اور تھوڑی بہت تعداد نہیں ہے چونکہ ہمارے پاس تو ایک نعمت موجود ہے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم انٹرنیٹ استعمال کریں، سامنے بیٹھ کر دلائل سنتے ہیں، وہ جو انٹرنیٹ پر مسائل دیکھتے ہیں الحمد للہ ان کو بے حد نفع ہوتا ہے۔ اللہ ہمیں بھی ان دلائل کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

### وراثت سے مراد وراثت علمی ہے، قرآنی دلیل:

اب ان کی دلیل کا جواب ذہن نشین فرمائیں کہ جو کہتے ہیں حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا کی تھی اور کہا تھا کہ اے اللہ! مجھے بیٹا دے جو میرا وارث بنے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وراثت چلتی ہے۔

ہم نے کہا: جب قرآن آدھا پڑھیں تو مسئلہ آدھا ہوتا ہے اور جب قرآن پورا پڑھیں تو مسئلہ بھی پورا ہوتا ہے۔ زکریا علیہ السلام نے صرف یہ نہیں کہا کہ میرا وارث بنے، انہوں نے کہا کہ اے اللہ! میرا وارث بھی بنے اور آل یعقوب کا وارث بھی بنے۔ اگر وراثت سے مراد مال والی وراثت ہو تو بتائیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد تو ان کی رشتہ دار نہیں ہے، ان کا وارث کیسے بنے گا؟ معلوم ہوا کہ اس وراثت سے مالی وراثت مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد علمی اور دینی وراثت ہے۔

## حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کی قبولیت:

زکریا علیہ السلام کی دعا اللہ رب العزت نے قبول فرمائی۔ میں پہلے بتا رہا تھا کہ سورت آل عمران میں ہے کہ زکریا علیہ السلام نے دعا مانگی تھی۔ جب دعا مانگی تو:

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلَكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ

بِغُلَامٍ مُّصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿٦٦﴾﴾

جب وہ محراب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے تو فرشتوں نے انہیں آواز دی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتے ہیں، یحییٰ اللہ کے ایک کلمے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کریں گے، ایک امت کے پیشوا ہوں گے، اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے مکمل طور پر روکے ہوئے ہوں گے اور نیک صالح نبی ہوں گے۔

زکریا علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے فرشتوں نے آکر یہ خوشخبری دی کہ اس بیٹے کا نام یحییٰ ہوگا، وہ اللہ کے کلمہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرے گا، سردار اور پیشوا بھی ہوگا، ”حَصُورًا“ وہ عورتوں سے بالکل الگ تھلگ ہوگا۔

## حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا ایک قصہ:

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے شادی نہیں کی۔ میں آج پڑھ رہا تھا کہ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام دونوں باہر نکلے چہل قدمی کے لیے۔ چونکہ دونوں رشتہ دار تھے اور بعض روایات کے مطابق دونوں کی عمروں میں صرف چھ ماہ کا فرق ہے، یحییٰ علیہ السلام چھ ماہ بڑے ہیں۔ اور بھی روایات ہیں۔ تو دونوں چل رہے تھے۔ اچانک حضرت یحییٰ علیہ السلام کا کسی گزرتی ہوئی خاتون سے ٹکراؤ سا ہو گیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت یحییٰ علیہ السلام سے فرمانے لگے۔ وہ دونوں نبی ہیں، دونوں

دوست ہیں، رشتہ دار ہیں، آپس میں باتیں کر رہے ہیں، وہ کہہ سکتے ہیں لیکن ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ انہوں نے کہا کہ یچی! آج تو نے ایسا گناہ کیا کہ تیرا گناہ کبھی بھی معاف نہیں ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے کون سا گناہ کیا؟ حضرت عیسیٰ نے کہا کہ تیرا عورت سے ٹکراؤ ہو گیا۔ حضرت یچی علیہ السلام نے کہا کہ اللہ کی قسم! اگر جبرائیل بھی آجائیں تو میرا اللہ کے عرش سے ہر وقت ایسا تعلق رہتا ہے کہ میرا دل اُدھر بھی نہیں ہٹتا، تو اُدھر کیسے ہٹ جائے گا؟ مجھے تو پتا ہی نہیں ہے کہ کسی عورت کے ساتھ میرا ٹکراؤ ہوا ہے تو میرا گناہ کیسے ہے؟ تو حضرت یچی علیہ السلام اس طرح عورت سے الگ تھلگ تھے کہ چوبیس گھنٹے ان کا قلب اطہر اللہ کے ساتھ تعلق میں لگا رہتا تھا۔

### حضرت یچی علیہ السلام کی صفات:

حضرت زکریا علیہ السلام کو خوشخبری دی جا رہی ہے حضرت یچی علیہ السلام کی۔ یہ میں سورت آل عمران سے پڑھ رہا تھا۔ یہاں سورت مریم میں ہے:

﴿يٰۤزَكَرِيَّا اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اِسْمُهُ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لّٰهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّاۙ﴾

اے زکریا! ہم تمہیں ایسے لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یچی ہو گا۔ ہم نے ان کا نام بھی ان سے پہلے پیدا نہیں کیا۔

اور ان صفات والا بندہ بھی پہلے پیدا نہیں کیا۔ یہ نام بھی ان کا یکتا ہے اور صفات بھی یکتا ہیں۔ بعض ایسی صفات اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کی تھیں جو ان سے پہلے کسی کو نہیں دی تھیں۔ جب یہ دعا قبول ہو گئی تو اب زکریا علیہ السلام اللہ سے پوچھنے لگے:

﴿رَبِّ اِنِّىۤ يَكُوْنُ لِىْ عِلْمٌ وَّكَانَتْ اِمْرَاَتِىْ عَاقِرًا وَّاقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ



اے اللہ! میرے ہاں بیٹا ہو گا کیسے؟ میری بیوی تو بانجھ ہے اور میں انتہائی بوڑھا ہو چکا ہوں کہ میرا جسم سوکھ چکا ہے۔

اب دیکھیں! جب مانگا ہے تو تعجب نہیں ہوا اور جب دعا قبول ہوئی ہے تو اب تعجب ہو رہا ہے کہ کیسے ہو گا؟ اور یہ ذہن میں رکھنا کہ زکریا علیہ السلام کو شک نہیں تھا، شبہ نہیں تھا۔ تو سوال ہوتا ہے کہ پھر یہ کیوں پوچھا کہ کیسے ہو گا؟ اس کی وجہ آگے آرہی ہے۔ اللہ نے فرشتہ بھیجا، اس نے کہا:

﴿كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلٰیٰ هٰٓئِیْنٍ وَّ قَدْ خَلَقْتٰكَ مِنْ قَبْلُ وَاَنْتَ تَكُ

شَیْئًا۝۶﴾

اسی حالت میں ہو گا۔ تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ یہ تو میرے لیے آسان ہے، میں نے اس سے پہلے تمہیں پیدا کیا تھا حالانکہ تم اس وقت کچھ بھی نہیں تھے۔

**میرے ہاں بیٹا کیسے ہو گا؟**

اے زکریا! پہلے آپ کا وجود ہی نہیں تھا، ہم نے آپ کو پیدا کر دیا اور آپ سے بیٹا پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟ آپ کچھ نہیں تھے تو ہم نے آپ کو وجود دیا تو آپ سے وجود دینا کیا مشکل ہے؟ تو اللہ نے فرمایا کہ اسی طرح ہو گا۔

﴿كَذٰلِكَ﴾ ”اسی طرح ہو گا“ اس کا معنی کیا ہے؟ اصل میں زکریا علیہ السلام

کے ذہن میں تین کیفیتیں، تین صورتیں تھیں:

[1]: یا اللہ! جو بیٹا مجھے ملے گا تو کیا میں پھر جو ان ہو جاؤں گا اور میری بانجھ بیوی ٹھیک ہو جائے گی تب ملے گا؟

[2]: یا مجھے جو بیٹا ملے گا میری بیوی تو بانجھ ہے، کیا میں کوئی اور شادی کروں گا پھر ملے گا؟

[3]: میں بوڑھا ہوں، میری بیوی بانجھ ہے۔ کیا ہمیں بیٹا اسی حالت میں ملے گا؟

### مزید اطمینان کے لیے سوال کرنا قابل اشکال نہیں:

اب سمجھیں! کہ یہ کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا تھا کہ اے اللہ! آپ مجھے دکھادیں کہ آپ مردے کو زندہ کیسے کرتے ہیں؟ اللہ نے پوچھا: ﴿أَوَلَمْ تَتُومِنْ﴾ کیا تجھے یقین نہیں ہے؟ کہا: ﴿بَلٰی﴾ کیوں نہیں، مجھے تو یقین ہے، ﴿وَلَكِنَّ يَّطْبِئِنَ قَلْبِی﴾ لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرا دل مزید مطمئن ہو جائے۔

آپ سوچیں گے کہ مزید مطمئن ہونے کا معنی کیا ہے؟ میں اس کو سمجھانے کے لیے ایک مثال دیتا ہوں۔ میرا بچھلے ہفتے کراچی میں درس تھا، وہاں پر ابراہیم علیہ السلام کی یہ بات بھی آگئی تو میں نے ان کو ایک مثال دی تھی کہ میرا گھر سرگودھا ہے اور آپ کراچی کے ہیں۔ آپ نے مجھ سے تاریخ پوچھی ہے تو میں نے آپ کو تاریخ دی ہے۔ اب آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مولانا صاحب! آپ کراچی کیسے آئیں گے؟ میں کہتا ہوں کہ میں نے وقت دے دیا ہے، میں آ جاؤں گا۔ آپ کہیں گے: پھر بھی آپ کیسے آئیں گے؟ آپ بس پر آئیں گے، آپ جہاز پر آئیں گے، ٹرین کے ذریعے آئیں گے، کیسے آئیں گے؟ تو آپ کو یہ تو یقین ہے کہ میں آؤں گا لیکن کیفیت کا پتا نہیں ہے کہ کیسے آؤں گا؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یقین ہے کہ اللہ مردوں کو زندہ کریں گے لیکن چونکہ مردہ کو زندہ کرنے کی کئی کیفیتیں ہو سکتی ہیں اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام پوچھتے ہیں کہ اے اللہ! اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ بس میں یہ چاہتا ہوں۔ اب بات سمجھ میں آگئی؟

اب حضرت زکریا علیہ السلام جو سوال کرتے ہیں کہ اے اللہ! میں بوڑھا ہوں میری بیوی بانجھ ہے تو میرے ہاں بیٹا کیسے ہوگا؟ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کو

کوئی شک تھا بلکہ ان کے سامنے تین کیفیات تھیں؛ ایک... کہ آپ مجھے جوانی دے دیں گے اور میری بانجھ بیوی ٹھیک ہو جائے گی تب ملے گا، دوسری... کہ میں نیا نکاح کروں گا تب ملے گا، تیسری... کہ اسی حالت میں رہیں گے تب ملے گا۔ تو اللہ نے فرمایا: ”مَذِلَّكَ“ دونوں اسی حالت میں رہو گے اور میں تمہیں بیٹا عطا کروں گا۔

### بچے کی امید لگنے کی نشانی:

اب حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی:

﴿رَبِّ اجْعَلْ لِّي آيَةً﴾

اے میرے رب! پھر کوئی نشانی بتا دیں۔

دیکھیں! اللہ سے کتنی پیار و محبت کی باتیں ہو رہی ہیں، اب یہ جلدی ہے کہ اللہ کوئی نشانی بتا دیں۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ مثلاً آپ کسی بندے سے کہیں کہ اس سال ہمارا ارادہ ہے حج پر جانے کا، آپ سفارش کریں کہ آپ کے اچھے تعلقات ہیں، ویزہ لگوا دیں۔ وہ بندہ کہتا ہے کہ لگوا دیں گے۔ کل آپ پوچھتے ہیں کہ لگ جائے گا نا؟ تو وہ کہتا ہے: میں جو کہہ دیا ہے نا کہ لگ جائے گا۔ آپ پھر اس سے پوچھتے ہیں: بھائی! کچی بات ہے نا؟ وہ کہتا ہے یار! کچی بات ہے لگ جائے گا۔ آپ پھر کہتے ہیں: اچھا یہ بتاؤ کب تک لگے گا؟ وہ کہتا ہے کہ بھائی آپ حج سے پہلے پہنچ جائیں گے، آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ اب دیکھیں! آپ کو پورا یقین ہے لیکن پھر بھی کہہ رہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اسی طرح زکریا علیہ السلام کا شوق ابھر رہا تھا تو فرمانے لگے کہ اللہ! کوئی نشانی بتا دیں۔ اللہ رب العزت نے فرمایا کہ اس کی نشانی یہ ہے:

﴿قَالَ آيَتُكَ إِلَّا تَكَلَّمَ النَّاسُ ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ بالکل ٹھیک ہیں لیکن آپ تین دن تین راتیں

زبان سے بات نہیں کر سکیں گے، ذکر کرتے رہیں گے، نماز پڑھتے رہیں گے، تورات کی تلاوت کرتے رہیں گے۔ جب آپ پر یہ حالت طاری ہو جائے تو آپ سمجھنا کہ آپ کی بیوی امید سے ہو گئی ہے، بس یہ اس کی علامت ہے۔

### قوم کو اشاروں سے تسبیح کی تلقین:

﴿فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوا بُكْرَةً وَّ

عَشِيًّا ۝۱۱﴾

اب ذکر یا علیہ السلام محراب سے نکلے اور لوگوں کو اشارے سے کہا کہ تم صبح شام تسبیح کیا کرو۔ تم بھی ذکر کرو، میں بھی ذکر کرتا ہوں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ ان کی بیوی امید سے ہیں۔

### حضرت یحییٰ علیہ السلام کو خطاب:

جب حضرت یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور سن شعور کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام سے فرمایا:

﴿يَا يَحْيَىٰ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ ۖ

اے یحییٰ! تورات کو مضبوطی سے پکڑو۔ اس پر عمل کرو اور امت کو عمل کی دعوت دو! یحییٰ علیہ السلام نبی تھے۔ آپ کی دعوت میں پانچ بنیادی باتیں تھیں:

1: اللہ کی عبادت کرو، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

2: نماز توجہ سے پڑھو، دائیں بائیں دھیان نہ کرو۔

3: روزے کا بہت زیادہ خیال کرو۔

4: صدقات کا بہت اہتمام کرو۔

5: ہر وقت اللہ کا ذکر کرو۔

## حضرت یحییٰ علیہ السلام کو عطا کردہ چیزیں

﴿وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۚ﴾ ۱۷ ﴿وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكَاةً ۚ وَكَانَ تَقِيًّا ۝۱۸﴾  
 ﴿وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝۱۹﴾ وَسَلَّمُ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ  
 يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝۲۰﴾

حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اللہ نے کئی چیزیں عطا فرمائیں:

پہلی چیز: ... فرمایا کہ ﴿وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا﴾ ہم نے بچپن میں ان کو دانائی اور فہم عطا فرمایا۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں کہ جن کو بچپن میں اللہ دانائی عطا فرمائیں، فہم و فراست عطا فرمائیں۔

دوسری چیز: .... ﴿وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا﴾ کہ ہم نے دل کی نرمی ان کو عطا کی تھی، یہ ہر وقت بہت روتے تھے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام گھر میں نہیں تھے، تین دن گھر سے باہر رہے، حضرت زکریا علیہ السلام پریشان ہو کر نکلے کہ میرا بیٹا کدھر ہے؟ ایک جگہ پر گئے تو دیکھا کہ حضرت یحییٰ نے قبر کھودی ہوئی ہے اور اس میں لیٹ کر رو رہے ہیں۔ حضرت زکریا نے پوچھا: بیٹا! یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ابو آپ خود ہی کہتے تھے کہ جہنم کا معاملہ بڑا سخت ہے اور قبر کی گھاٹی سے گزر کر جانا ہے، جو یہاں سے پاس ہو گیا تو وہ آگے بھی پاس ہے، اور یہ راستہ آنسو بہائے بغیر طے نہیں ہو سکتا اس لیے تو میں روتا ہوں۔ تو زکریا علیہ السلام بھی رونے لگ گئے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام بہت زیادہ روتے تھے۔ اللہ نے رقت عطا فرمائی تھی۔

تیسری چیز: ... ﴿وَزَكَاةً﴾ اللہ نے اخلاق بڑے صاف ستھرے عطا فرمائے۔

چوتھی چیز: ... ﴿وَكَانَ تَقِيًّا﴾ خدا نے تقویٰ بھی عطا فرمایا تھا۔

پانچویں چیز: ... ﴿وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ﴾ والدین کے فرماں بردار بہت تھے۔  
 چھٹی چیز: ... ﴿وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا﴾ نہ مخلوق کو تنگ کرتے اور نہ اللہ کی نافرمانی کرتے تھے۔

### حضرت مریم کا تذکرہ کیجیے:

﴿وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ اتَّخَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا  
 ١١ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا  
 سَوِيًّا ١٢ قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ١٣﴾

حضرت مریم علیہا السلام کی عمر تیرہ سال یا پندرہ سال تھی، دونوں قول ملتے ہیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام خوبصورت مرد کی شکل میں آئے۔ فرشتہ جب بھی انسان کی شکل میں آتا ہے تو ہمیشہ خوبصورت مرد کی شکل میں آتا ہے۔ تو حضرت مریم نے ان کو دیکھا تو پر دے کا اہتمام کیا۔ انہوں نے بتایا کہ میں جبرائیل امین ہوں، اللہ کی طرف سے بچے کی بشارت لے کر آیا ہوں۔ حضرت مریم کے گریبان میں پھونک ماری اس سے ان کو حمل ٹھہر گیا۔

ولادت کے دن جب قریب آئے تو ان کو بتایا گیا کہ فلاں جگہ پر تشریف لے جائیں، وہ ٹیلے کی طرف گئیں تو وہاں پر بغیر موسم کے اللہ نے کھجور پر پھل لگا دیا اور پانی کا چشمہ بھی جاری فرما دیا۔ بچے کی ولادت کے بعد آپ وہیں پر کھجور کھاتیں اور چشمہ کا پانی پیتیں۔ چالیس دن تک یا جتنے دن نفاس کے تھے وہیں ٹھہری رہیں۔

اس کے بعد واپس اپنے خاندان میں آئیں تو خاندان والوں نے کہا: یہ بچہ کہاں سے آگیا ہے؟ تمہارا تو نکاح ہی نہیں ہے۔ تو حضرت مریم کو حکم تھا کہ آپ اس بچے کی طرف اشارہ کریں، پھر عیسیٰ علیہ السلام نے صفائی دی کہ میں اللہ کا بندہ ہوں،

مجھے اللہ رب العزت نبی بنائیں گے، مجھے کتاب دیں گے۔ اس طرح ان لوگوں کا سارا بہتان ختم ہو گیا۔

﴿وَإِذْ كُنَّا فِي الْمَكَّةِ مُرْسِمِينَ﴾ اس کتاب میں مریم علیہا السلام کا بھی ذکر فرمائیں، ﴿إِذْ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرِيفًا﴾ اس وقت کا ذکر کریں جب وہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر مشرق کی طرف واقع ایک جگہ پہ چلی گئیں تھیں، ﴿فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا﴾ پھر انہوں نے اپنے اور لوگوں کے درمیان ایک پردہ لٹکا لیا۔ جس محراب میں آپ عبادت کیا کرتی تھیں اس سے مشرقی جانب آپ تشریف لے گئیں۔ اس لیے عیسائی آج بھی بیت المقدس کی مشرقی جانب کو اپنا قبلہ بنا کر عبادت کیا کرتے ہیں۔

### حضرت جبرائیل کی حضرت مریم کے پاس آمد:

﴿فَإَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾

اس وقت ہم نے ان کے پاس اپنی روح یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا جو ان کے سامنے ایک مکمل انسان کی شکل و صورت میں ظاہر ہوا۔  
حضرت جبرائیل علیہ السلام کی ذات نور تھی اور شکل اور ڈھانچا بشر کا تھا۔  
آج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور اور بشر ہونے پر اہل بدعت یہی بحث چلاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس طرح جبرائیل امین آئے تھے کہ ذات نور تھی اور شکل و صورت بشر کی تھی اسی طرح اللہ کے نبی ذات کے اعتبار سے نور ہیں اور آپ شکل و صورت کے اعتبار سے بشر ہیں، یہ ان کا عقیدہ ہے۔

جبکہ ہمارا اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذات کے اعتبار سے بشر ہیں اور آپ وصف کے اعتبار سے نور ہیں۔ جہاں آپ کی اور صفیتیں ہیں

مثلاً سر اجا منیرا ہیں، بشیر ہیں، نذیر ہیں، رحمت ہیں وہاں آپ کی ایک صفت نور بھی ہے۔

### متکلم اسلام کی ایک بدعتی سے گفتگو:

فیصل آباد جامعہ اسلامیہ امدادیہ؛ جلالین والے سال ہم پڑھتے تھے اور عمارت کی چھت پر ہمارا تکرار ہوتا تھا، تو ظاہر ہے کہ تیسری منزل پر چھت ہے، اس پاس کی آوازیں بھی زیادہ آتی ہیں، ہمارے مدرسے کے قریب ایک اہل بدعت کی مسجد تھی تو وہاں مولانا سعید اسد صاحب آئے، وہ جو معروف سعید اسد ہیں وہ نہیں بلکہ کوئی اور تھا۔ اعلان ہوا تو میں تکرار کر رہا تھا، طلبہ نے کہا چلیں، تو میں نے طلبہ سے کہا: بھائی! آپ کو پتا ہے کہ جامعہ امدادیہ میں کس طرح سختی ہوتی ہے۔ خیر انہوں نے کہا: لازمی جانا چاہیے۔ جب سب کا مشورہ ہو گیا تو میں بھی تیار ہو گیا۔ پھر جب وہاں گئے تو ہم پانچ سات لڑکے ساتھ تھے، تو میں نے پہلے ایک ترتیب بنالی کہ ان کا بیان توجہ سے سنیں۔ جب بیان ختم ہو جائے تو پھر گفتگو کرتے ہیں۔ یہ ہم نے آپس میں مشورہ کر لیا۔ خیر بیان ختم ہوا۔ ان کے مولانا محراب میں بیٹھے۔ ہم قریب ہو گئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ جو کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں تو آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں کہ آپ کی ذات نور ہے اور آپ لبادہ بشریت میں آئے ہیں یا آپ کی ذات بشر ہے اور آپ صفت کے اعتبار سے نور ہیں؟ آپ کا عقیدہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ذات اور ماہیت دونوں کے اعتبار سے نور ہیں اور لبادہ بشریت میں آئے ہیں جس طرح جبرائیل امین آئے تھے۔

میں نے کہا: آپ اس پر کوئی دلیل پیش فرمائیں، تو انہوں نے دلیل پڑھی:



﴿قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ﴾<sup>114</sup>

کہنے لگے: فلاں فلاں مفسر نے لکھا ہے کہ یہاں نور سے مراد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی ذات ہے۔ میں نے کہا کہ عقیدہ میں کون سی نص پیش کرتے ہیں؟ نص کی تو چار قسمیں ہیں:

1: قطعی الثبوت قطعی الدلالت

2: ظنی الثبوت ظنی الدلالت

3: قطعی الثبوت ظنی الدلالت

4: ظنی الثبوت قطعی الدلالت

”دلالت“ کہتے ہیں معنی کو اور ”ثبوت“ کہتے ہیں اس کے ثابت ہونے کو یعنی الفاظ اللہ کے نبی سے ہم تک قطعیت کے ساتھ پہنچے ہوں اور اس کا معنی متعین ہو کہ یہی معنی ہے، اس کے علاوہ کوئی اور معنی نہیں ہے، یہ ہے قطعی الدلالت، اور اگر معنی میں کئی احتمالات ہوں کہ یہ بھی ہے... یہ بھی ہے... اسے کہتے ہیں کہ ظنی الدلالت ہے۔

آپ یہ بات یاد رکھ لیں جو عقیدہ قطعی ہو اور اس کا منکر کافر تو ایسے عقیدہ میں نص وہ پیش کرتے ہیں جو قطعی الثبوت بھی ہو، قطعی الدلالت بھی ہو۔ جب عقیدہ ظنی ہو، اس کا منکر کافر نہ ہو تو پھر دلیل میں قطعیت کی ضرورت نہیں ہوتی، ظنیت سے بھی کام چل جاتا ہے۔

میں نے ان صاحب سے کہا: یہ جو آپ نے آیت پڑھی ہے یہ قطعی الثبوت تو ہے لیکن قطعیت الدلالت نہیں ہے۔ چونکہ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے روح

المعانی میں تین احتمالات لکھے ہیں کہ یہاں نور سے مراد کیا ہے! اور ضابطہ ہے کہ ”إِذَا جَاءَ الْإِحْتِمَالُ بَطَلَ الْإِسْتِدْلَالُ“ تو یہ آیت قطعی الثبوت تو ہے لیکن قطعی الدلالت نہیں۔ آپ ایسی نص پیش کریں جو قطعی الثبوت بھی ہو اور قطعی الدلالت بھی ہو۔ اب ان مولانا صاحب کو احساس ہوا کہ ہم نے چیلنج تو بہت کیے ہیں لیکن اب سامنے بھی طالب علم تگڑا ہے۔ بندے کو محسوس ہو جاتا ہے۔ وہ تھوڑا سا گھبراہٹا۔ مجھے کہنے لگا کہ مولوی اشرف علی تھانوی نے نشر الطیب میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضور کو پیدا کیا ہے اور اس میں لفظ نور آیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے نشر الطیب پڑھی ہے؟ میں نشر الطیب بھی پڑھی ہے اور اس کا حاشیہ بھی پڑھا ہے، حضرت نے لکھا ہے کہ یہاں نور سے مراد روح محمد ہے، ذات محمد مراد ہی نہیں۔ آپ لوگ نشر الطیب کا تو بتاتے ہیں لیکن حاشیہ میں جو تشریح حضرت خود کرتے ہیں وہ کیوں نہیں بتاتے؟ وہ مولانا اٹھ کے کھڑے ہو گئے کہ شرطیں طے کرو، باضابطہ مناظرہ کریں گے۔ میں نے کہا: باضابطہ کیا ہوتا ہے، اب تو بات شروع ہو گئی ہے، آپ شروع کرنے سے پہلے کہتے کہ شرطیں طے کرو، جب بات چل پڑی تب آپ کو یاد آیا.... خیر وہ بات ختم ہو گئی اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔

میں آپ سے بھی کہتا ہوں کہ پہلے اپنی تیاری مکمل کرو، پھر بات کرنے کا مزہ آتا ہے، فضول باتیں نہ کرو، فتویٰ بازی نہ کرو، پھڈانہ ڈالو لیکن تیاری آپ کی مکمل ہونی چاہیے۔

**حضرت مریم علیہا السلام کا استعاذہ:**

﴿قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا﴾

حضرت مریم علیہا السلام نے جبرائیل امین کو انسانی شکل میں دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم اللہ سے ڈرنے والے ہو، متقی ہو تو میں رحمن کی پناہ میں آتی ہوں،

میں تم سے بچتی ہوں۔ اب اس جملے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ متقی نہ ہو تو پھر نہ بچیں، متقی ہو تو پھر بچیں، ”إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا“ یہ استعاذہ کی شرط ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ یہ جو شرط ہے ”إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا“ یہ استعاذہ کے مؤثر ہونے کی شرط برائے ترغیب ہے، مطلب یہ کہ تم متقی آدمی ہو، تمہیں تو یہ کام نہیں کرنا چاہیے، تمہیں تو خیال کرنا چاہیے۔ جیسے ہم ایک طالب علم سے کہتے ہیں کہ اگر تم طالب علم ہو تو پھر تمہیں تہجد پڑھنی چاہیے، کیا اس کا یہ معنی ہے کہ اگر طالب العلم نہ ہو تو نہیں پڑھنی چاہیے؟ ہر گز یہ معنی نہیں۔ تو یہ جملہ ترغیب کے لیے ہے کہ اگر تم متقی ہو تو تمہیں خیال کرنا چاہیے، میں اللہ کی پناہ میں آتی ہوں، اور یہ بطور مبالغہ کے ہے کہ اگر عام آدمی ہو تو گناہ اس کو بھی نہیں کرنا چاہیے لیکن تم متقی ہو اور یہ گناہ کرتے ہو، تم بھی نامحرم عورت کے سامنے آتے ہو!

**اللہ ہی بیٹا دینے والا ہے:**

﴿قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكَ غُلَامًا زَكِيًّا ۝﴾

انہوں نے کہا: میں اللہ کی طرف سے رسول ہوں، فرشتہ ہوں، میں تو تمہیں پاکیزہ بیٹا دینے کے لیے آیا ہوں۔ اس پر اشکال یہ ہے کہ جب حضرت جبرائیل بیٹا دے سکتے ہیں تو نبی کیوں نہیں دے سکتا؟ فرشتہ دے سکتا ہے تو پیر کیوں نہیں دے سکتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام خود فرما رہے ہیں ”أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ“ کہ میں تمہارے رب کا نمائندہ ہوں، یعنی اللہ نے مجھے بھیجا ہے کہ میں تمہیں بیٹا دوں، وہ اپنی طرف سے تو نہیں دے رہے بلکہ اللہ نے بھیجا ہے۔

**حضرت مریم علیہ السلام کی پریشان حالی:**

﴿قَالَتْ أَنَّى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ۝﴾ قَالَ

كَذَلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىٰ هَيْئٍ ۖ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ  
أَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢٢﴾

حضرت مریم بولیں: میں نے نہ تو نکاح کیا کہ جائز طریقے پر کوئی مرد میرے قریب آیا ہو اور نہ ہی میں بدکردار ہوں تو بچہ کیسے پیدا ہو گا؟ تو انہوں نے کہا: ”كَذَلِكَ“ اسی طرح ہو گا یعنی بغیر مرد کے ہو گا۔ اللہ فرماتے ہیں یہ تو میرے لیے بہت آسان ہے۔

بچہ کے پیدا ہونے کے چار طریقے ہیں: کبھی مرد اور عورت ملتے ہیں تو بچہ ہوتا ہے جیسا کہ عام طریقہ ہے، کبھی نہ مرد ہوتا ہے نہ عورت لیکن اللہ تعالیٰ پیدا فرما دیتے ہیں جیسے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، کبھی صرف مرد سے پیدا فرماتے ہیں جیسے حضرت حوا کو حضرت آدم سے پیدا کیا اور کبھی صرف عورت سے پیدا فرماتے ہیں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت مریم سے پیدا کیا۔

﴿وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا﴾

یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو ہو کر رہنا ہے۔

**بیت اللحم میں آمد:**

﴿فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٣﴾ فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ

جَذْعِ النَّخْلَةِ ۖ

حضرت مریم امید کے ساتھ ہو گئیں تو لوگوں سے الگ ایک دور کے مقام پر چلی گئیں۔ اس مقام کا نام بیت اللحم ہے اور یہ بیت المقدس سے آٹھ میل دور ہے، یہ تقریباً تیرہ کلو میٹر بنتے ہیں، آپ وہاں چلی گئیں اور وہاں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔

﴿قَالَتْ يَلَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَذَا وَكُنْتُ نَسِيًّا مَّنْسِيًّا﴾ (٣٢)

حضرت مریم علیہا السلام فرمانے لگیں: کاش! میں اس سے پہلے مر جاتی اور میں بھولی بسر ہو جاتی، کسی کو پتا بھی نہ ہوتا کہ مریم نام کی کوئی عورت دنیا میں آئی تھی۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے بشارتیں دی ہیں جیسا کہ دوسرے مقام پر ہے کہ آپ کا بیٹا ان ان صفات کا حامل ہو گا، کتاب و حکمت جانتا ہو گا، تورات و انجیل کا علم رکھتا ہو گا، اسے معجزات عطا ہوں گے وغیرہ وغیرہ لیکن اس کے باوجود بھی جب درد نے بہت زیادہ تکلیف دی اور بدنامی کا خوف سوار ہوا تو وہ بشارتیں بھی بھول گئیں اور کہا کہ کاش میں مر جاتی۔

### موت کی تمنا کب جائز ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ موت کی تمنا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ حدیث پاک میں ہے کہ تم اللہ سے موت نہ مانگا کرو، اگر موت مانگنی ہی پڑے تو یوں مانگا کرو کہ:

اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مَا كَانَتْ الْحَيٰۤاةُ خَيْرًا لِّيْ وَتَوَفَّنِيْ اِذَا كَانَتْ الْوَفَاۗةُ خَيْرًا لِّيْ

بی. 115

اے اللہ! اگر زندگی میرے حق میں بہتر ہے تو مجھے زندگی دے اور اگر موت میرے حق میں بہتر ہے تو مجھے موت دے دے۔

تو سوال یہ ہے کہ حضرت مریم نے موت کیوں مانگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بسا اوقات آدمی اپنے حالات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور جب مغلوب الحال ہو جائے تو وہ من کل الوجوه مکلف نہیں رہتا، کچھ احکام اس سے

ساقط ہو جاتے ہیں، پھر اگر وہ مغلوب الحال ہو کر کوئی ایسی بات کرتا ہے تو اس کو بطور اعتراض پیش نہیں کرتے۔ دیکھیں! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر کے موقع پر فرمایا:

اللَّهُمَّ إِنَّ فِيْهِكَ هَذِهِ الْعَصَابَةُ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ فَلَا تُعْبِدْ فِي الْأَرْضِ

أَبَدًا. <sup>116</sup>

اے اللہ! یہ میری مٹھی بھر جماعت اگر ہلاک ہو گئی تو قیامت تک کوئی تیری عبادت نہیں کرے گا۔

تو کیا اللہ کی عبادت تین سو تیرہ اصحابِ بدر پر موقوف ہے؟ یہ ختم ہو جائیں تو عبادت بھی کوئی نہیں کرے گا؟ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلبہ حال میں یہ بات ارشاد فرمائی تھی کہ میری پونجی تو یہی ہے، مجھے آپ نے نبی بنا کر بھیجا، میرے ساتھ یہی ہیں، میں بھی ختم ہو گیا اور یہ بھی ختم ہو گئے تو آپ کی عبادت کون کرے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسباب اور حالات کو دیکھ کر یہ بات ارشاد فرمائی۔

تو حضرت مریم علیہا السلام نے بھی غلبہ حال میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ کاش! میں مرجاتی، باقی چیزوں کی طرف ان کی توجہ نہیں گئی۔ یا اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مریم علیہا السلام نے یہ سوچ کر فرمایا کہ جب میرا خاوند نہیں ہے، میرے ہاں بچے کی پیدائش ہو اور لوگ طعنہ دیں، مجھے بدنام کریں تو اس وقت انسان کو صبر سے کام لینا چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بدننامی کے ڈر سے بے صبری ہو جاؤں اور بے صبر ہونا بہت بڑا گناہ ہے اور گناہ سے تو بہتر ہے کہ بندہ مر ہی جائے۔ تو گناہ کے خوف سے موت مانگنا یہ تو کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔

﴿فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَّا تَحْزَنِي قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝ وَ

هُزِّي إِلَيْكِ بِجُذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقُ عَلَيْكِ وَطَبَا جُنُيًّا ۝﴾

اور نیچے سے آواز آئی۔ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ٹیلہ پر تھیں۔ تو فرشتے نے آواز دی کہ غم نہ کرو، دیکھو! تمہارے نیچے چشمہ بھی ہے۔ کھجور کے تنے کو ہلاؤ تو تمہارے پاس تر کھجوریں بھی آئیں گی۔ یوں اس نے بشارت دی۔

یہاں دو چیزوں؛ پانی اور کھجور کا ذکر فرمایا۔ ایک تو اللہ تعالیٰ نے خرقِ عادت وہاں چشمہ جاری فرمادیا کیونکہ وہاں پانی نہیں تھا اور دوسرا وہاں کھجوروں پر پھل نہیں تھا، یہ بھی خرقِ عادت تھا۔ یہ دونوں چیزیں بطور کرامت کے تھیں۔

**انسان کو شش کرے، نتیجہ اللہ دیتے ہیں:**

اب یہاں سوال یہ ہے اللہ تعالیٰ پانی دینا چاہتے تو چشمہ کے بغیر ویسے دے دیتے، پھل دینا تھا تو یہ کیوں فرمایا کہ تنے کو حرکت دے دو تو کھجور اترے گی! دراصل یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ حرکت انسان کرتا ہے اور دیتے اللہ ہیں، جس حد تک ممکن ہو اس حد تک محنت کرو، حضرت مریم کیا کر سکتی تھیں! اب جب موسم نہیں ہے تو کھجوریں پیدا تو نہیں کر سکتی تھیں اس لیے فرمایا کہ تم تنے کو ہلاؤ، اللہ تعالیٰ تمہیں کھجوریں دیں گے۔ انسان کو اپنی ہمت کے مطابق اسباب اختیار کرنے چاہیں۔

**کھانا پہلے یا پینا پہلے؟**

﴿فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا ۝﴾

کھاؤ اور پیو اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرو!

اب یہاں ایک نکتہ سمجھیں! جب فرشتے نے بشارت دی تو پانی کا ذکر پہلے ہے اور کھجور کا بعد میں ہے اور جب کھانے کا حکم دیا تو فرمایا کہ کھاؤ اور پیو! یہاں کھانے کا

حکم پہلے ہے اور پینے کا حکم بعد میں ہے۔ یہ ترتیب کیوں بدلی ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کھانے کا انتظام کرنا ہو تو دسترخوان پر پانی پہلے رکھتے ہیں، کھانا بعد میں رکھتے ہیں اور خصوصاً اگر کھانا ایسا ہو کہ جس کے بعد پیاس لگے تو کھانے سے پہلے پانی کا انتظام کرتے ہیں۔ اللہ نے انہیں کھجوریں دی تھیں تو کھجور کھانے کے بعد پانی کی طلب بڑھ جاتی ہے، اس لیے پانی کا انتظام پہلے کیا ہے۔

### دسترخوان لگانے کا طریقہ:

اس لیے میں اپنے طلبہ کو خدمت کرنے کا طریقہ سمجھاتا ہوں کہ جب بھی کھانے کی خدمت ہو تو پہلے دسترخوان لگاؤ، اس کے بعد برتن رکھو، اس کے بعد پانی رکھو اور اس کے بعد کھانا رکھو، پھر روٹیاں رکھو اور چاول اس کے بعد لاؤ کیونکہ چاول جلدی ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ تو جس چیز نے جلدی ٹھنڈا ہونا ہے اس کو بعد میں لاؤ، جس چیز نے دیر تک رہنا ہے اس کو پہلے لاؤ۔ اگر سلاد ہو، رائتہ ہو، دہی ہو تو یہ چیزیں بھی پہلے رکھو۔

### دسترخوان کے متعلق چند واقعات:

[۱]: کل صبح ہم ایک جگہ پر تھے۔ جن کے ہاں تھے ماشاء اللہ ان کا ادارہ بہت اچھا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم چائے پییں گے۔ چائے بن گئی۔ تو میں نے کہا کہ بغیر چینی والی دو! انہوں نے کہا کہ جی چائے تو چینی والی ہے۔ میں نے کہا: جب مہمان مانگے تو یہ نہیں کہتے کہ چینی والی ہے بلکہ اس سے پوچھے بغیر چینی والی بنا کر لاتے ہیں، یہ ادب کا تقاضا ہوتا ہے، آپ نے چینی والی بنالی اور ہمیں بغیر چینی والی چاہیے تو یہ نہ کہیں کہ یہ تو چینی والی بنی ہے، چاہیے تھا کہ کچھ چائے پھینکی بھی لاتے، اگر نہیں ہے تو دوبارہ بنالیں، جب یہ کہیں گے کہ چینی والی ہے تو مہمان کہے گا کہ بس رہنے دو! تو آپ لوگ ادب بھی سیکھیں، آپ شہر میں رہتے ہیں۔



میرے ساتھ کچھ ساتھی بیٹھے تھے۔ میں نے کہا: چلیں چینی والی چائے ہے تو ان کو بلا دیں۔ ان سے پوچھا کہ آپ میں سے کوئی بغیر چینی کے پیے گا؟ انہوں نے کہا جی ہاں، میں بیٹھی پیتے ہیں۔ میں نے کہا: چلو یہ ان کو بلا دو۔ تو اس وقت میزبان نے کہا: جی میں نے آپ کے لیے ایک کپ بغیر چینی کے بھی بنائی ہوئی ہے۔ میں نے کہا: پھر پوری بات پہلے کر دو، پوری بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ پھر بسکٹ لینے کے لیے لڑکا گیا ہوا تھا اور چائے پہلے آگئی۔ جب ہم نے چائے پی لی تو بسکٹ بعد میں آئے۔ بھائی خدمت کرنا سیکھو! میں اس لیے سمجھاتا ہوں، طریقہ بتاتا ہوں کہ خدمت کیسے کی جاتی ہے؟ آپ یقین کریں! بسا اوقات دسترخوان کی ترتیب مہمان کو کھینچ لیتی ہے، کھانے کی چیزیں بہت مہنگی نہ ہوں لیکن دسترخوان صاف ہو، برتن صاف ہوں، دال رکھی ہو، اچار رکھا ہو، سلاد رکھا ہو، دہی رکھا ہو، اچھے چچ رکھے ہوں اور ساتھ پانی رکھا ہو تو دیکھو دسترخوان میں حسن کتنا آتا ہے! انسان کی رغبت بڑھ جاتی ہے کھانے میں۔

[۲]: آج صبح ہمارے اساتذہ کا اجلاس تھا۔ دس بج کر بیس منٹ پر چھٹی ہوئی۔ ہمارا اجلاس دس بج کر بیس منٹ پر شروع ہوا اور دس بج کر تیس منٹ پر ختم ہو گیا اور پینتیس منٹ پر کھانا شروع ہوا تو پچاس پر ختم۔ یعنی تیس منٹ میں اجلاس بھی ہے اور کھانا بھی ہے۔ آپ کسی کو بتائیں گے تو کوئی نہیں مانے گا۔ ہم نے اتنے سے وقت میں اجلاس بھی کیا اور کھانا بھی کھایا۔ اب کھانا باہر کا نہیں تھا، یہی لنگر کی دال تھی، میں نے کہا کہ دال کو تڑکا لگا دو اور دو کلو دہی لاؤ اور اس کی لسی بناؤ، ساتھ سلاد رکھ دو، آپ کھانے کے لیے آئیں گے تو آپ کا جی چاہے گا کہ کھائیں۔ دسترخوان کو دیکھ کر بھوک لگ جاتی ہے۔

ہمارے ہاں کچھ دن پہلے کراچی سے مہمان آئے تھے۔ میں نے ان کو بتایا کہ ہمارے ہاں اجلاس ہوتا ہے دس بجے، تو دس کا معنی دس ہوتا ہے، ہمارے تمام اساتذہ

دس بجے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان کو میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ فرما رہے تھے کہ وقت کی پابندی میں آپ کو تو راحت ہوتی ہوگی لیکن باقیوں کو تو تکلیف ہوتی ہوگی۔ میں نے کہا: نہیں، ان کو مجھ سے بھی زیادہ راحت ہوتی ہے کیونکہ مزاج بن گیا ہے۔

### نذر نہیں مانی تھی تو یہ کیوں کہا کہ نذر مانی ہے؟

﴿فَمَا تَزِيدُنِي مِنَ الْبَشِيرِ أَحَدًا ۖ فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا﴾ يَا خُتْلُوْنَ مَا كَانَ أَبُوكَ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكَ بَغِيًّا

فرمایا: جب تم کسی آدمی کو آتا دیکھو تو تم کہنا کہ میں نے اللہ کے لیے روزے کی منت مانی ہے، میں آج کسی سے بات نہیں کروں گی۔ جب حضرت مریم واپس آئیں تو لوگوں نے کہا: اے ہارون کی بہن! تیرا باپ بھی اچھا تھا اور تمہاری ماں بھی بدکردار نہیں تھی، تو ماں باپ نیک ہوں اور پھر اولاد جرم کرے تو لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ نیک باپ کی بیٹی، نیک بھائی کی بہن، اور یہ تو نے کیا کیا؟

حضرت مریم نے کہا: میں نے تو چپ رہنے کی منت مانی ہے، اشارہ کیا کہ میں نہیں بولوں گی، بچے کی طرف اشارہ کیا، پھر وہ بچہ بولا۔

اس پر سوال یہ ہے کہ انہوں نے تو منت مانی نہیں تھی لیکن اللہ فرما رہے ہیں کہ تم کہنا ”إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَنِ صَوْمًا“ اس کا جواب یہ ہے کہ نذر مانی تھی اسی حکم میں خود بخود آگیا ہے یعنی جب وہ پوچھیں گے تو تم نے کہنا ہے کہ میں نذر مانی تھی یعنی نذر مان لینا اور کہہ دینا کہ میں نے نذر مانی ہوئی ہے۔

پہلی شریعت میں چپ کا روزہ چلتا تھا، اس شریعت میں چپ کا روزہ نہیں ہے بلکہ چپ کو ثواب سمجھنا گناہ ہے۔ ہاں اگر بندہ اس وجہ سے خاموش رہے کہ میں بولوں

گا تو غیبت ہوگی تو بہتر ہے کہ میں چپ رہوں تو پھر کوئی حرج نہیں، پھر خاموش رہنا چاہیے، ”مَنْ صَمَتَ نَجَا“<sup>117</sup> حدیث میں بھی ہے کہ جو خاموش رہتا ہے وہ نجات پاتا ہے۔

### حضرت مریم کو ہارون کی بہن کہنے کی وجہ:

حضرت مریم کو ہارون کی بہن کیوں کہا گیا؟ اس کی دو وجوہات ہیں:

- (1): یا ان کا بھائی تھا جس کا نام ہارون تھا۔
- (2): یا آپ حضرت ہارون علیہ السلام کے خاندان میں سے تھیں اور یہ ان میں یہ رواج تھا۔ جیسے عرب کا آدمی ہو تو اس کو ”ابو العرب“ کہتے ہیں، تمیم کے خاندان کا ہو تو اخو التمیم کہتے ہیں، اسی طرح ”اخت ہارون“ کہا کہ یہ ہارون علیہ السلام کے خاندان کی عورت ہے۔

### یقینی خبر کو ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں:

﴿قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْأَمْهِدِ صَبِيًّا﴾

انہوں نے کہا کہ اس بچے سے کیسے بات کریں جو گود میں ہے؟  
اب بظاہر یہ سوال ہوتا ہے کہ ”كَانَ“ فعل ماضی ہے اور ماضی بعید ہوتا ہے  
تو انہوں نے کیسے کہا کہ ہم اس بچے سے کیسے بات کریں جو بچہ گود میں تھا؟  
اس کا جواب یہ ہے کہ ”كَانَ“ ہمیشہ ماضی بعید کے لیے نہیں آتا بلکہ کبھی کبھی حال کے لیے بھی آتا ہے۔  
قرآن کریم میں ہے:

﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾<sup>118</sup>

اس میں اس شخص کے لیے نصیحت کا سامان ہے جو صاحبِ دل ہو اور متوجہ ہو کر سنتا بھی ہو اور حاضر بھی ہو۔

ایک اور جگہ ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الرِّثَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا﴾<sup>119</sup>

زنا کے قریب نہ جاؤ کیونکہ یہ بے حیائی کا کام ہے اور بہت برا راستہ ہے۔  
تو یہاں تینوں آیات میں ”كَانَ“ حال کے معنی میں ہے۔ تو ”كَانَ“ ہمیشہ ماضی کے لیے نہیں آتا۔

**حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گود میں گفتگو کرنا:**

﴿قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ۖ آتَنِي الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۖ وَجَعَلَنِي مُبْرَكًا آيَنَ مَا كُنْتُ ۖ وَأَوْصَنِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۖ وَبَرًّا بِوَالِدَتِي ۖ وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا﴾<sup>120</sup>

تو انہوں نے فرمایا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے اللہ تعالیٰ کتاب عطا فرمائیں گے، مجھے نبی بنائیں گے اور میں جہاں بھی ہوں گا اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے نماز کا، حکم دیا ہے زکوٰۃ کا، میں جب تک زندہ رہوں مجھے اپنی ماں کا فرمانبردار بنایا ہے اور مجھے سختی والا نہیں بنایا۔

﴿وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا﴾<sup>121</sup> ذَلِكَ

عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿٣٣﴾

اور مجھ پر اللہ کی طرف سے سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوا، جس دن مروں گا اور جس دن میں دوبارہ اٹھایا جاؤں گا۔ یہ عیسیٰ بن مریم تھے جنہوں نے بالکل سچی بات کی ہے، یہی وہ حق بات ہے جس کے بارے میں لوگ شک کرتے ہیں۔

### کتاب ابھی ملی نہیں تو یہ کیوں فرمایا کہ کتاب ملی ہے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی ہے حالانکہ ابھی کتاب دی نہیں تھی بلکہ کتاب تو ابھی ملنی تھی تو ماضی سے کیوں تعبیر فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ ”ماضی تحقیق کے لیے ہے“ کیا مطلب کہ جس کام کا مستقبل میں ہونا یقینی ہو اس کو ماضی کے لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

اس کی مثال سمجھیں! آپ میرے پاس آتے ہیں کہ استاذ جی! سردی بہت ہے، ہمارا جی چاہتا ہے کہ کل حلوہ پکے۔ میں کہتا ہوں: پک گیا اور بتاؤ؟ استاذ جی! ہمارا دل چاہتا ہے کہ کل چھٹی ہو۔ میں نے کہا: ہو گئی، اور بتاؤ؟ اب میں یہاں ماضی کا لفظ بول رہا ہوں لیکن یہ عرف ہوتا ہے اور مراد یہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں اس کام کا ہونا یقینی ہے۔ یہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ”اَتَيْنِي الْكِتَابُ“ لفظ ماضی کا استعمال کیا ہے لیکن مراد مستقبل ہے کہ مجھے اللہ کتاب دیں گے۔

### آپ کی تعبیرات کے کیا کہنے!

میں کل ایک جگہ لاہور میں تھا۔ بعض علماء مجھے ملے تو انہوں نے مجھے کہا: مولانا! ہم نے تفاسیر بہت پڑھی ہیں لیکن یہ جو آپ دروس القرآن میں تفسیر کرتے ہیں مثال کے ساتھ بس یہ مثال آپ کے پاس ہے، اس سے بات ایسے کھلتی ہے کہ قرآن کو سمجھنے میں الجھن نہیں ہوتی۔ تو آپ کا درس قرآن کب مکمل ہو گا؟ ایک جلد کے بعد

اتنے تقاضے دنیا سے ہو رہے ہیں کہ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے! میں نے ان سے کہا کہ ان شاء اللہ جلد مکمل ہو جائے گا۔

### حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نماز و زکوٰۃ کا حکم:

فرمایا: ﴿وَأَوْصَيْنِي بِالصَّلَاةِ وَ الزَّكَاةِ﴾ مجھے اللہ نے حکم دیا ہے کہ میں نماز پڑھوں اور زکوٰۃ دوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس زندگی بھر میں کبھی اتنا پیسہ جمع نہیں ہوا کہ وہ زکوٰۃ دیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی برتن نہیں رکھے بلکہ آپ چلو سے پانی پیتے رہے، کبھی آپ نے مکان بھی نہیں بنایا، بس جہاں رات آئی تو وہاں سو جاتے تھے۔ تو انہیں زکوٰۃ کا حکم کیسے دیا؟ اصل بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کا حکم ہونا الگ ہے کہ اللہ نے ہم پر زکوٰۃ کو فرض قرار دیا لیکن دیں گے تب جب پیسہ ہو گا۔ اللہ نے حج فرض قرار دیا ہے لیکن کب؟ جب استطاعت ہو گی۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں نماز بھی پڑھوں اور زکوٰۃ بھی دوں، کیا مطلب کہ اگر میرے پاس پیسہ ہو تو زکوٰۃ دوں! یہ ایسا معنی ہے کہ اس میں تاویلات نہیں کرنی پڑتیں۔

﴿وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ﴾ میں اپنی والدہ کا فریادار ہوں گا۔ ظاہر ہے کہ والد تو تھے نہیں اس لیے صرف والدہ کا ذکر فرمایا۔

### منکرین حیات النبی کے استدلال کا جواب:

﴿وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا﴾

بعض لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ نہیں ہیں۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ مجھ پر سلامتی ہو جس دن میں پیدا ہوا، جس دن مجھ پر موت آئی اور جس دن میں زندہ

کیا جاؤں گا۔ موت کے بعد حشر کو میں زندہ کیا جاؤں گا۔ یہاں درمیان میں قبر والی حیات کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی قبر میں زندہ نہیں ہیں۔

جبکہ ہم اہل السنۃ والجماعۃ احتناف دیوبند کا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ ہم نے کہا: یہ بات وہ کرتا ہے جس کو نحو نہیں آتی، نحو آتی تو اتنی حماقت و غلطی کبھی نہ کرتا۔ نحو کا ضابطہ ہے کہ حال اور ذوالحال کا زمانہ ایک ہوتا ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں کہ ہمارے استاذ جی آئے ہیں اور آپ کو ملنا چاہتے ہیں۔ کب آئے ہیں؟ آپ کہتے ہیں: اٹھ بجے۔ کس چیز پر آئے ہیں؟ جی اپنی گاڑی پر آئے ہیں۔ آپ کہتے ہیں: ”جَاءَنِي أَسْتَاذِي رَاكِبًا عَلَى سَيَّارَتِهِ“ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آئے ہیں تو گاڑی پر سوار تھے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ گھر سے چلے تھے تو پیدل تھے اور جب گیٹ سے داخل ہوئے تو گاڑی پر بیٹھ گئے بلکہ جب آئے ہیں تو گاڑی پر سوار تھے، اس سے پہلے گاڑی پر تھے یا نہیں تو وہ ہمارے عرف سے ثابت ہوتا ہے کہ گاڑی پر ہی سوار تھے، لغت اس پر خاموش ہو جاتی ہے۔

تو اس سے تو اتنا ثابت ہو رہا ہے کہ جب میں کھڑا ہوں گا تو زندہ ہوں گا۔ یہ نہیں کہ کھڑا ہونے سے پہلے میں مردہ ہوں گا۔ بعثت اور حیات اکٹھی ہوں گی، تو اس سے تو قبر کی حیات کا ثبوت مل رہا ہے۔

﴿وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَأَعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ٢٢﴾

اللہ تعالیٰ میرا اور تم سب کا رب ہے، اسی کی عبادت کرو، یہی صراط مستقیم

ہے۔

**حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ:**

﴿وَادْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ ۖ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا ١٢٤﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور

دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔ آپ کی ایک بیوی کا نام سارہ ہے اور دوسری بیوی کا نام ہاجرہ ہے۔ تو ہماری گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات تک رہے گی، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام کا تذکرہ ان شاء اللہ آئندہ ہو گا۔ ویسے تو جب آدمی قرآنی آیات پر گفتگو کرے تو ایک ایک آیت پر کتنی تفصیل سے گفتگو کی جاسکتی ہے آپ سنتے ہیں آپ کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ ہم خلاصہ بیان کرتے ہوئے تھوڑا تھوڑا کر کے درس آگے چلا رہے ہیں تاکہ خلاصہ اور ضروری مضامین آپ کے سامنے آجائیں۔ اس سے پھر بات مکمل ہوتی ہے۔

میرا پچھلے مبینہ عرب امارات، کینیا، ملائیشیا کا سفر تھا۔ گفتگو ہوئی تو ان حضرات کو احساس ہوا کہ ایک ایک آیت، ایک حدیث اور ایک عقیدہ کو سمجھنے کے لیے کتنا وقت درکار ہوتا ہے۔ ہمارا ایک جگہ سبق تھا صبح نو سے بارہ بجے تک اور پھر ظہر سے عصر اور پھر مغرب سے عشاء۔ تو انہوں نے ایک مجلس میں مجھے کہا کہ مولانا صاحب! ہماری خواہش ہے کہ کسی عقیدہ پر کوئی ایک دلیل پیش فرمادیں۔ تو میں نے عشاء کے بعد ایک حدیث ”الْأَنْبِيَاءُ أَحْيَاءُ فِي قُبُورِهِمْ يُصَلُّونَ“<sup>120</sup> پر جب بات شروع کی تو رات کے ساڑھے دس بج گئے۔ میں نے کہا کہ آگے شروع کریں یا بس کریں؟ کہنے لگ: بس کریں، باقی اگلے سفر میں۔ تو ایک حدیث پر دو گھنٹے لگے ہیں۔

میں تھوڑے تھوڑے اشارے کرتا ہوں وگرنہ بہت تفصیل سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ ہم آپ کے وقت کا بھی خیال کرتے ہیں اور اس بات کا بھی خیال کرتے ہیں کہ ضروری ضروری مضامین بھی ہمارے سامنے آتے رہیں۔

**بیان ریکارڈ کرنے کی اہمیت:**



آج چونکہ رائیونڈ کا اجتماع بھی شروع ہے۔ اللہ اس کو مبارک فرمائے، اس کو امت کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنائے، شرور اور فتن سے محفوظ فرمائے۔ ہمارے بہت سارے ساتھی وہاں پر تشریف لے گئے ہیں اور ہم نے بھی کل جانا ہے ان شاء اللہ، دعا کے بعد واپس آئیں گے تو بعض حضرات کا خیال تھا کہ شاید یہ درس مؤخر ہو۔ میں نے کہا کہ بھائی درس مؤخر نہیں ہوگا، سارے ساتھی تو اجتماع پر بھی نہیں جاتے، کچھ رہ بھی جاتے ہیں اور جو جاتے ہیں اگر وہ واقعتاً درس سننے کا شوق رکھتے ہوں تو ہمارا درس ریکارڈ ہوتا ہے تو وہ سن لیں گے اور وہ ریکارڈنگ نہ مانگیں تو آپ سمجھیں کہ وقت پورا کرتے ہیں، سننے کا شوق نہیں رکھتے، جن کو سننے کا شوق ہو تو ہمارا تو ہر درس ریکارڈ ہوتا ہے، وہ بعد میں سن لیا کریں۔

میں اس سفر میں عجیب باتیں دیکھتا رہا، شاید آپ کو میری بات پر کسی حد تک یقین آئے۔ میں نے اس دفعہ باہر کے سفروں میں بعض ایسے حضرات کو دیکھا ہے کہ میرے خیال میں میری نجی مجلس کی گفتگو جو میں نے کی ہے اور اس کی آڈیو ریکارڈنگ ہوئی ہے اور وہ نیٹ پر بھی گئی ہے تو شاید کوئی بھی ایسی گفتگو نہیں ہے جو انہوں نے نہ سنی ہو، بیانات تو بہت دور کی بات ہیں، اور بعضوں نے تو ایک ایک بیان کو سو سو بار سنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا صاحب! ہم خلوت میں آپ کے بیانات سنتے رہتے ہیں اور پھر کیسٹ بند کر کے روتے ہیں، پھر سنتے ہیں پھر روتے ہیں اور ہم پاکستان والوں پر حیران ہوتے ہیں کہ آپ جیسا بندہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حوالے کیا ہوا ہے!

**آپ واقعی نرم آدمی ہیں!**

ہمارے ہاں جیسے بہت مشہور ہے کہ مولانا گھمن صاحب بہت سخت ہیں، لہجہ بڑا سخت ہے، مجھے اس سفر میں شافعی المسلک اور ملائیشیاء کے دو علماء اکٹھے ملے۔ ایک عجیب بات کی۔ دنیا میں جو قومیں نرم شمار ہوتی ہیں ان میں شاید ملائیشیاء والے ایک نمبر

پر ہوں، یہ بہت نرم لوگ ہیں، مزاج نرم ہے، آپ لوگ چائے گرم پیتے ہیں اور وہ چائے ٹھنڈی پیتے ہیں، اتنی ٹھنڈی پیتے ہیں کہ بسا اوقات تو برف ڈال دیتے ہیں، ہوٹل سے چائے لیں گے اور پلاسٹک میں بند کریں گے، موٹر سائیکل پر رکھیں گے اور گھر جا کر پئیں گے۔ اب بتاؤ! وہ کیسی چائے ہوگی؟! ہر دسترخوان پر جیسے کھانے کے لیے پلیٹ رکھتے ہیں اس طرح وہ چائے بھی رکھتے ہیں، تو جو قوم اتنی ٹھنڈی چائے پیتی ہو وہ کتنی نرم مزاج ہوگی؟

مجھے ان علما نے کہا کہ ہمیں ایک بات پر تعجب ہے کہ مشہور یہ ہے کہ آپ بہت سخت ہیں اور آپ کے میزبان ملائیشیا کے لوگ ہیں جن سے زیادہ نرم ہی کوئی نہیں۔ تو اس دعویٰ کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ ملائیشیا کے لوگ آپ کو شوق سے سنتے ہیں حالانکہ یہ سخت بندے کو بالکل نہیں سنتے۔ ملائیشیا میں ایک ٹی وی ہے IKIM، انہوں نے مجھے بلایا اور جو بیان آپ نہیں سن سکتے انہوں نے کہا کہ جی مولانا صاحب! ہمارے ٹی وی پر عقیدہ اہل السنۃ کے نام سے بیان کریں! ہم اہل حدیث اور اہل قرآن نہیں بلکہ خود کو اہل السنۃ والجماعۃ کہتے ہیں، آپ اس پر دلائل دیں اور لائیو بیان دنیا میں نشر ہوا اور لوگ اس کو سن رہے ہیں اور ساتھ ملائیشین زبان میں اس کا ترجمہ بھی چل رہا ہے۔

تو خیر مجھے ایک بات کا احساس ہوا باہر کے سفروں میں کہ یہ جو آپ کی مسجد کا درس ہے دنیا کا بہت بڑا طبقہ ہے جو اس درس کو بڑے اہتمام سے سنتا ہے، جب یہ ریکارڈ ہو کر نیٹ پر جاتا ہے تو لوگ اس کو شوق سے سنتے ہیں۔ لوگ ”دروس القرآن“ کو شوق سے خریدتے ہیں اور ابھی دروس القرآن کی ایک ہی جلد چھپی ہے اور چھپ کے دنیا میں جا رہی ہے اور لوگ بار بار کہہ رہے ہیں کہ مولانا صاحب! دوسری جلد کب آئے گی؟ میں نے کہا: بھائی! ہمارے اس درس کا چھ سات دفعہ ناغہ ہوا ہے کچھ مجبوریوں کی

وجہ سے، ان شاء اللہ ہم کوشش کریں گے کہ دسمبر میں اگر نہیں تو جنوری میں دوسری جلد بھی آجائے گی تو پھر آپ کو اندازہ ہو گا کہ جامع مسجد عثمانیہ کے دروس القرآن کا فیض دنیا میں کتنا پھیلا ہے۔ اللہ ہمیں اس کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے دو تین باتیں ذہن میں رکھ لیں! حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا جو سلسلہ ہے وہ اپنے گھر سے ہی شروع ہوا۔ سب سے پہلے اپنے والد کو دعوت دی۔ جو میں نے آیت تلاوت کی ہے:

﴿وَإِذْ كُنَّا فِي الْكُتُبِ إِبْرَاهِيمَ ۖ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا ۝﴾

فرمایا: اس کتاب قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی باتیں بھی کیا کرو! وہ سچے نبی ہیں۔

### حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والد کو دعوت:

﴿إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا ۚ يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَنِ عَصِيًّا ۝﴾

جب انہوں نے اپنے والد سے کہا: اے اباجی! آپ ان بتوں کی عبادت کیوں کرتے ہیں جو سنتے بھی نہیں اور دیکھتے بھی نہیں، آپ کے کسی کام کے نہیں اور میرے پاس وحی کا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ میرے پاس وہ علم ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے تو آپ میری بات مان لیں اور شیطان کی بات نہ مانیں، شیطان اللہ کا نافرمان ہے اور دشمن ہے، یہ آپ کو پریشان کرے گا اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ پر اللہ کا عذاب نہ آجائے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے کہہ رہے ہیں۔

والد نے کہا: ﴿أَرَاغِبُ أَنْتَ عَنِ إِلَهَتِي يَا اِبْرَاهِيمُ﴾ اے ابراہیم! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ تیری اس دعوت کی وجہ سے میں بتوں کی عبادت چھوڑ دوں؟ کان کھول کر سن لے ﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَا رَجْمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا﴾ اگر تو اس دعوت سے باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے اللہ کی توحید کا مسئلہ بھی ہے اور والد کے ادب کا مسئلہ بھی ہے، اللہ کی توحید بھی نہیں چھوڑتے اور والد کا ادب بھی نہیں چھوڑ رہے، اپنے والد سے کہتے ہیں ”سَلِّمْ عَلَيَّكَ“ اچھا اباجی! اللہ کے حوالے، میں آپ کو اللہ کے حوالے کرتا ہوں، جتنا میں آپ کو سمجھا سکتا تھا اس حد تک تو میں نے آپ کو سمجھایا ہے۔

﴿سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا﴾

میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہوں لیکن میں آپ سے الگ ہو کر بھی اللہ سے آپ کے لیے معافی مانگتا ہوں گا کہ اے اللہ! میرے اباجی کو معاف فرما، اللہ! میرے اباجی کو سمجھ عطا فرما، میں آپ کے بتوں کو چھوڑتا ہوں اور مجھے اپنے رب سے امید ہے کہ اللہ مجھے محروم نہیں کرے گا۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دعوت ہے جو آپ نے اپنے والد کو دی ہے اور والد نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا۔

**حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی قوم کو دعوت:**

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے گھر سے نکلے اور اپنی قوم کو سمجھانا شروع کیا۔ نبی کا دل دیکھیں! کتنا بڑا ظرف ہوتا ہے۔ اکیلے ہیں، گھر کا ماحول مخالف ہے، خاندان مخالف ہے اور اپنی قوم سے دلائل کے ساتھ بات کی ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ۖ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ

﴿٤١﴾ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عِظْفِينَ ۖ﴾

اے میرے پیغمبر! ان کو ابراہیم کا واقعہ سناؤ جب انہوں نے اپنی قوم سے اور اپنے والد سے بھی کہا تھا کہ تم کس کی عبادت کرتے ہو؟ اللہ کو چھوڑ کر سجدے کسے کرتے ہو؟ تو قوم نے کہا تھا: ہم ہمیشہ ان بتوں کی پوجا کریں گے جن کی ہم ہمیشہ سے پوجا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا:

﴿قَالَ هَلْ يَسْعَوْنَ كُمُ إِذْ تَدْعُونَ ۖ﴾ ﴿٤٢﴾ أَوْ يَنْفَعُونَكُمُ أَوْ يَضُرُّونَ ۖ﴾<sup>121</sup>

جب تم ان کو بلاتے ہو تو کیا یہ تمہاری بات کو سنتے ہیں؟ اور اگر تم کہیں پھنس جاؤ تو تمہیں نفع دیتے ہیں؟ تمہیں خوشی ملے تو تمہیں تکلیف دے سکتے ہیں؟

انہوں نے کہا: اے ابراہیم! یہ ساری باتیں چھوڑو، ﴿بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ﴾ ہمارے باپ دادا ایسے کرتے تھے تو ہم نے بھی ایسے ہی کرنا ہے، بس یہ نہ پوچھو کہ یہ نفع دیتے ہیں یا نقصان دیتے ہیں؟ سنتے ہیں یا نہیں؟ ہمارے آباء واجداد اسی طرح کرتے تھے تو ہم بھی اسی طرح کریں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام فرمانے لگے: پھر یہ بات سن لو کہ تم اور تمہارے آباء واجداد جو مشرک ہوں ﴿فَاتَّهَمُوا عَدُوِّيَ ۖ لَا رَبَّ الْعَالَمِينَ﴾ ﴿٤٣﴾ رب العالمین کے علاوہ ہر مشرک میرا دشمن ہے، میں نہ تمہیں مانتا ہوں اور نہ تمہارے آباء واجداد کو مانتا ہوں۔

ابراہیم علیہ السلام کے دلائل توحید:

پھر ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو ایک اللہ کو ماننے پر دلائل دینا شروع کیے۔ فرمایا:

﴿الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ﴾ (۷۱)

میرا اللہ وہ ہے جس نے مجھے پیدا بھی کیا ہے اور پھر وہ ہر موقع پر میری رہنمائی بھی فرماتا ہے۔ یہ کیسی عجیب گفتگو ہے! بچہ چھوٹا سا ہوتا ہے، اس کو یہ پتا نہیں ہوتا کہ میری خوراک کہاں ہے؟ اللہ اس کے دل میں ڈالتے ہیں کہ تیری خوراک تیری ماں کا دودھ ہے، اللہ اس کے دل میں ڈالتے ہیں تو یہ دائیں بائیں نہیں جاتا بلکہ سیدھا اپنی ماں کے دودھ پر جاتا ہے۔ تو اللہ یوں رہنمائی فرماتے ہیں۔

﴿وَالَّذِي هُوَ يُطْعَمُنِي وَيَسْقِينِ﴾ (۷۲)

میرا رب وہ ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور مجھے پلاتا ہے۔

﴿وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ﴾ (۷۳) وَالَّذِي يُمَيِّتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ﴾ (۷۴)

جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا بھی دیتا ہے۔ موت بھی وہی دیتا ہے اور زندگی بھی وہی دیتا ہے۔

﴿وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ﴾ (۷۵)

اور مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے قیامت کے دن معاف بھی فرمائے گا۔

### اسلوب کی تبدیلی کی وجہ:

ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ ساری باتیں فرمائی ہیں تو دو مقامات پر طرز بالکل بدل دیا ہے۔ پہلے فرمایا: اللہ نے مجھے پیدا بھی کیا ہے، اللہ میری رہنمائی بھی فرماتے ہیں، اللہ مجھے کھلاتے بھی ہیں، اللہ مجھے پلاتے بھی ہیں... آگے ایک جملہ چھوڑ کر فرمایا کہ اللہ مجھے موت بھی دیں گے، اللہ مجھے زندگی بھی دیں گے۔ اب اس سے پہلے

ایک بات فرمائی:

[۱]: ﴿وَإِذَا مَرَضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ﴾

جب میں بیمار ہوتا ہوں تو شفا بھی دیتے ہیں۔

اور اس سے آگے ایک بات فرمائی:

[۲]: ﴿وَاللّٰهُ اَطْمَعُ اَنْ يَّعْفِرَ لِيْ خَطِيْئَتِيْ يَوْمَ الدِّينِ﴾

فرمایا اور مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن مجھے معاف بھی فرمائیں گے۔

اب یہ دو جملے آپ سمجھیں۔ جب پیدائش کی باری آئی تو فرمایا: اللہ پیدا بھی کرتے ہیں، اللہ ہدایت بھی دیتے ہیں، کھلاتے بھی ہیں، پلاتے بھی ہیں، موت بھی دیں گے، زندہ بھی کریں گے... اور جب بیماری کی باری آئی تو ابراہیم علیہ السلام نے لفظ بدل دیے ہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ اللہ بیماری بھی دیتا ہے اور اللہ شفا بھی دیتا ہے۔

**بیماری کی نسبت اپنی طرف اور شفا کی نسبت اللہ کی طرف:**

جیسے ہم کسی کے پاس جائیں تو یہی لفظ کہتے ہیں کہ بھائی! گھبراؤ نہیں، جس خدا نے بیماری دی ہے تو وہی خدا صحت بھی دے گا! یہی بات ہم لوگ کہتے ہیں جبکہ ابراہیم علیہ السلام کہہ رہے ہیں ﴿وَإِذَا مَرَضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ﴾ کہ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو شفا اللہ دیتا ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ جو اللہ بیماری دیتا ہے وہی صحت بھی دیتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے بیماری کی نسبت اپنی طرف کی ہے، اللہ کی طرف نہیں کی اور صحت اور شفا کی نسبت اللہ کی طرف کی۔ یہ جملے کہہ کر ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات سمجھائی ہے کہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ بیماری کی نسبت اللہ کی طرف نہ کریں، صحت کی نسبت اللہ کی طرف کریں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً بندے جب بیمار ہوتے ہیں تو ان میں سے ننانوے

فیصد وہ ہوتے ہیں جن کی بیماری میں ان کی بد پرہیزی کا دخل ہوتا ہے۔ ایک فیصد ایسے ہوتے ہیں جو بالکل ترتیب سے چل رہے ہوں اور پھر بھی بیماری آئے۔ جیسے اب مجھے بھی گلے میں ہلکی سی خراش محسوس ہو رہی ہے زکام کی وجہ سے، چونکہ موسم بدل رہا ہے۔ اب بدلتے موسم میں ہم موسم کا خیال نہیں کرتے۔ ابھی کھانا کھایا اور میزبان نے پوچھا: مولانا صاحب! بوتل پیئیں گے؟ اب دل تو نہیں کر رہا لیکن چونکہ آگئی ہے تھوڑی سی پی بھی لیتے ہیں۔ میں بھی ایسے کرتا ہوں اور آپ بھی ایسے کرتے ہیں۔ اب بتاؤ اس موسم میں بوتل پینے کا کوئی جواز بنتا ہے؟ لیکن بس پی لی۔ اب جب انسان نے بد پرہیزی کی ہے تو بتاؤ کہ بیماری آتی ہے یا نہیں؟ کیونکہ اللہ پاک نے ہر چیز میں تاثیر رکھی ہے۔ تو اس تاثیر نے اس کے مطابق عمل بھی کرنا ہے۔

### شہد میں شفا؛ لیکن کیسے؟

ہم بہت ساری باتیں نہیں سمجھتے تو غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شہد میں اللہ نے شفا رکھی ہے اس میں کوئی اشکال نہیں لیکن شفا کیسے رکھی ہے اور اس کو کھانا کیسے ہے؟ یہ طبیب کو پتا ہے۔ اب گرمی میں شہد پانی میں ملا کر پیئیں تو شہد کی تاثیر ٹھنڈی ہو جائے گی تو گرمی میں شفا ہو گی۔ سردی میں شہد کو ویسے چاٹ لیں بغیر پانی ملائے تو اب اس میں شفا ہے۔

کوئی شخص کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پانی میں شہد ملا کر پیتے تھے تو یہ دسمبر میں صبح کو اٹھے اور ایک جگہ شہد کا پانی بنا کر پی لے اور پھر بیمار ہو اور کہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے تو بندہ بیمار نہیں ہوتا، یہ کیسے ہوا؟ بھائی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہد پیتے تو تھے لیکن کب پیتے تھے یہ بھی تو سمجھنا ضروری ہے۔

### ہر روز گوشت نہ کھائیں:

میں ایک بار لاہور گیا۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ ہمارے ایک قاری صاحب



دوست تھے تو وہ مجھے فرمانے لگے: مولانا صاحب! کیا پسند کرتے ہیں، کیا کھائیں گے؟ میں نے جیسے دوست سے کہتے ہیں انہیں کہا کہ بکرا کھائیں گے۔ مجھے وہ کہنے لگے: سبزی ہو جائے؟ میں نے کہا: جو بھی ہو جائے، میں نے تو اپنی پسند بتادی ہے۔ وہ مجھے کہنے لگے کہ اس پسند کی کوئی خاص وجہ ہے؟ میں نے کہا کہ بکرے کا گوشت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا، اس لیے ہمیں بھی پسند ہے۔ مجھے انہوں نے کہا: مولانا صاحب! پسند تو تھا لیکن اس کا یہ معنی تو نہیں کہ ہر روز کھائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی کھائیں، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز کھاتے تھے؟ تو یہ حضور پاک صلی اللہ کی سنت ہے لیکن یہ بھی دیکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم استعمال کب فرماتے تھے۔

### رات کو دودھ پیئیں لیکن بکری کا:

ملتان میں ہمارے ایک حکیم صاحب ہیں، مجھے جسم میں کوئی تکلیف ہوئی تو میں نے علاج ان سے کروایا۔ مجھے انہوں نے میری بیماری نہیں بتائی بس علاج کرتے رہے۔ جب علاج ہو گیا تو پھر انہوں نے بتایا کہ آپ کی بیماری یہ تھی۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں پہلے بتاتا تو آپ پریشان ہو جاتے، دراصل آپ کا خون اور پیپ آپس میں ملنا شروع ہو گیا تھا، اس وجہ سے جسم میں خارش شروع ہو گئی تھی، علاج کرتا رہا اب ٹھیک ہو گیا تو اب آپ کو بتا دیا کہ بیماری یہ تھی۔ تو وہ حکیم صاحب مجھے کہنے لگے کہ جب تک آپ دوا کھاتے ہیں یا تو آپ دودھ نہ پیئیں، اگر پینا بھی ہے تو صبح صبح گرم پیئیں، رات کو سوتے وقت نہ پیئیں۔ اب چونکہ میں مولوی تھا اور مولوی دلیل بھی دیتے ہیں تو میں نے انہیں کہا کہ سوتے وقت دودھ پینا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، حکیم صاحب! سنت سے بیماری کیسے پھیل سکتی ہے؟ سنت میں تو شفا ہی شفا ہے۔ تو حکیم صاحب فرمانے لگے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کو جو دودھ پیتے تھے وہ بکری کا ہوتا

تھا اور آپ کے ہاں تو بھینس کا ہوتا ہے، بکری کا ملے تو آپ بھی پی لیں، کچھ نہیں ہوگا، بھینس کا ہو تو پھر نہیں پینا!

اب جس کے سامنے یہ پوری بات نہیں ہے وہ کیا سمجھے گا کہ سوتے وقت دودھ پینا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور حکیم کہتا ہے کہ نہ پو! لہذا حکیم پاگل ہے، اس کو پتا ہی نہیں ہے شریعت کا، یہ اسلام کو جانتا ہی نہیں ہے، اس پر بس حکمت چڑھی ہوئی ہے۔ اب حکیم کو برا کہیں گے حالانکہ حکیم تو بات ٹھیک کہہ رہا ہے۔

**حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ادب:**

ابراہیم علیہ السلام کی بات کو اس تناظر میں سمجھیں ﴿وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ﴾ کہ جب بیمار میں ہوتا ہوں تو اللہ ایسے کریم ہیں کہ مجھے شفا دیتے ہیں۔ تو مرض کی نسبت اپنی طرف کی ہے اور شفا کی نسبت اللہ کی طرف کی ہے۔ یہ ادب ہے اور ہمیں ادب سمجھانا نہیں آتا تو پھر امت تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتی ہے۔ ادب بڑی بنیادی چیز ہے۔

### معصوم ہیں تو مغفرت کے یقین کے بجائے امید کیوں فرمایا؟

اب دوسری بات سمجھیں کہ نبی تو معصوم ہے، نبی سے اللہ گناہ نہیں ہونے دیتے، جب گناہ نہیں ہوتا تو یقیناً نبی بخشا ہوا ہے لیکن ابراہیم علیہ السلام فرما رہے ہیں:

﴿وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ﴾

کہ مجھے امید ہے کہ قیامت کو اللہ مجھے معاف بھی فرمادیں گے۔ امید نہیں بلکہ پورا یقین ہے تو پھر یقین کو امید سے کیوں تعبیر کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پر یقین ہونے کے باوجود پھر بھی اللہ سے ڈرتے ہیں کہ میں ایسی بات کیسے کہہ دوں۔ یہ ابراہیم علیہ السلام جیسے نبی کا معاملہ ہے۔

## ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے:

اس لیے علماء کہتے ہیں: ”الْإِيمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ“ کہ ایمان امید اور خوف کے درمیان ہوتا ہے، کیا مطلب کہ اللہ سے ڈرتے بھی رہیں اور امید بھی رہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر قیامت کے دن اعلان ہو جائے کہ سارے لوگ جہنم میں جائیں گے اور ایک بندہ جنت میں جائے گا تو مجھے امید ہے کہ وہ میں ہوں گا اور اگر قیامت کو اعلان ہو جائے کہ سارے جنت میں جائیں گے اور صرف ایک جہنم میں جائے گا تو میں ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں میں ہی نہ ہوں۔<sup>122</sup>

اب دیکھیں! امید بھی کتنی ہے اور خوف بھی کتنا ہے؟! آدمی ڈرتا بھی رہے اور اللہ سے امید بھی ہو تو اس کو ایمان کہتے ہیں۔ آدمی کبھی بھی بے خوف نہ ہو۔

اب ابراہیم علیہ السلام کے ایک ایک لفظ سے کیسا خوف نکل رہا ہے آپ کو خود اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ تو اپنی قوم کو وہ دلیل دی ہے جو عام سنجیدہ طبقہ سمجھتا ہے۔

## ابراہیم علیہ السلام کی ایک اور دلیل:

اب ایک اور دلیل ابراہیم علیہ السلام نے قوم کو دی کہ تم جو اللہ کے علاوہ بتوں کی عبادت کرتے ہو، اللہ کے علاوہ اور بڑی بڑی چیزیں کیا ہو سکتی ہیں؟ آسمان پر ستارہ ہو سکتا ہے، چاند ہو سکتا ہے، سورج ہو سکتا ہے، یہ بھی اللہ کی بڑی مخلوق ہیں، تو بتوں کی تو حیثیت ہی کوئی نہیں، یہ تو چل بھی نہیں سکتے، اندھیرے میں روشنی نہیں دے سکتے تو ان پر کیا توقع رکھیں؟

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا﴾<sup>123</sup>

جب رات چھا گئی، ستارہ طلوع ہوا تو ابراہیم علیہ السلام فرمانے لگے: ﴿هَذَا رَبِّي﴾ کہ یہ میرا رب ہے؟ اس کو رب مانوں؟ ﴿فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْإِفْلَينَ﴾ جب ستارہ غروب ہو گیا تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میں غروب ہونے والے سے پیار نہیں کرتا۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو ڈوبتا ہے میں اس کو خدا نہیں مانتا بلکہ فرمایا کہ جو ڈوبتا ہے میں اس سے پیار نہیں کرتا، اس سے محبت نہیں کرتا، عبادت تو دور کی بات ہے میں ڈوبنے والوں سے پیار بھی نہیں کرتا۔ اس کی وجہ بھی ہے، قرآن کریم میں ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾<sup>124</sup>

جو ایمان والے ہیں ان سے زیادہ اللہ سے کوئی پیار نہیں کرتا۔  
تو حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو ڈوبے اس سے محبت نہیں ہوتی، جب اس سے محبت نہیں تو وہ خدا کیسے بنے گا؟

﴿فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِعًا قَالَ هَذَا رَبِّي﴾

جب چمکتا ہوا چاند دیکھا تو فرمایا: یہ میرا رب ہے؟ اور ایک وقت آیا کہ چاند بھی ڈوب گیا تو فرمانے لگے:

﴿لَيْنَ لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ﴾

کہ اگر خدا نے میری راہنمائی نہ کی تو تمہاری طرح میں بھی گمراہ ہو جاؤں گا،

اس چاند کو بھی میں خدا نہیں مان سکتا۔

پھر اس کے بعد سورج اس سے بھی زیادہ روشن ہو گیا، ﴿فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسُ  
بَارِزَةً قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا أَكْبَرُ﴾ فرمایا: یہ رب ہے؟ یہ جو بڑا ہے اس کو خدا مان  
لوں؟ ﴿فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَقَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ﴾ جب وہ بھی ڈوب گیا  
تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمہارے شرک سے بری ہوں۔ یہ سب نفع نہیں  
دے سکتے، نقصان نہیں دے سکتے، سن نہیں سکتے، بات نہیں کر سکتے تو میں ان کو خدا  
کیسے مانوں؟ ابراہیم علیہ السلام کتنی محنت کے ساتھ اپنی قوم کو آہستہ آہستہ سمجھاتے  
رہے۔ جب یہ سارے راستے پورے ہو گئے اور آپ نے سمجھا کہ قوم کو دلیل سے بات  
سمجھ نہیں آرہی، اب ان کے ساتھ کوئی اور ہاتھ کرنا چاہیے۔ حضرت ابراہیم علیہ  
السلام فرمانے لگے:

﴿وَتَاللَّهِ لَا كَيْدَنَّ أَصْنَامُكُمْ بَعْدَ أَنْ تُوَلُّوا مُدْبِرِينَ﴾<sup>125</sup>

مجھے لگتا ہے کہ تمہیں تب سمجھ آئی ہے جب میں نے تمہارے خداؤں سے  
دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے یہ جملہ کہہ دیا۔ اب یہ قوم ایک میلہ لگتا تھا  
اس پر جانے لگی۔ ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ تم بھی چلو! قرآن کریم میں ہے:

﴿فَنظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ﴾<sup>126</sup> فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ ﴿۸۹﴾

ستاروں کو دیکھا اور فرمایا: میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں نہیں جاسکتا۔  
قوم نے سمجھا کہ ابراہیم علیہ السلام اب کچھ ٹھیک ہو گئے ہیں، انہوں نے بھی ستاروں  
کے اثر کو ماننا شروع کر دیا ہے جبکہ ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ میں تمہارے

شرک سے بیزار ہوں، تمہارے شرک کو دیکھ کر مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔

قوم میلے پر چلی گئی۔ ابراہیم علیہ السلام ان کے جانے کے بعد بت خانے میں داخل ہوئے، کسی بت کا ناک کاٹ دیا، کسی کا کان کاٹ دیا، کسی کا ہاتھ کاٹ دیا، کسی کا پاؤں کاٹ دیا اور کلہاڑا بڑے بت کے کندھے پر رکھ دیا۔ جب وہ میلے سے واپس آئے تو دیکھا کہ کوئی بت لنگڑا ہے، کوئی سر کٹا ہے، سارے بت یوں پڑے تھے۔ اب انہوں نے کہا کہ یہ کام کس نے کیا ہے؟ تلاش کرو اسے! بعض لوگ کہنے لگے: ﴿سَمِعْنَا قَتِي يَذْكُرُهُمْ يَقَالُ لَهُ اِبْرَاهِيْمُ﴾ ہم نے ابراہیم کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ہمارے بتوں کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کرتا تھا، کہنے لگے: ﴿فَاتُّوْا بِهٖ عَلٰی اَعْيُنِ النَّاسِ نَعْلَهُمْ يَشْهَدُوْنَ﴾ لاؤ ان کو سب کے سامنے تاکہ ہم ان سے پوچھیں۔

جب ان کو لایا گیا تو قوم نے پوچھا: ﴿ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِالْهَيْتٰنَا يٰاِبْرَاهِيْمُ﴾ اے ابراہیم! ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کام آپ نے کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: یہ میں نے نہیں کیا، ﴿بَلْ فَعَلَهُ كَيْبِرُهُمْ هٰذَا﴾ یہ جو بڑا ہے نا اس نے کیا ہے۔ تو وہ فوراً کہنے لگے: ابراہیم! آپ بھی عجیب ہیں، یہ بات نہیں کر سکتا، چل نہیں سکتا تو یہ کلہاڑا مارے گا؟ ابراہیم علیہ السلام فرمانے لگے: یہی بات تو میں تمہیں کہتا ہوں، ﴿اَفِیْ تٰکُمْ وَلِیْمًا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ تف ہے تمہاری عبادت پر، تم اتنی موٹی سی بات کو بھی نہیں سمجھ سکتے، یہی بات تو میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں، تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔ ﴿ثُمَّ نَكِیْسُوْا عَلٰی رُءُوسِهِمْ نَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا هٰؤُلَآءِ یَنْطِفُوْنَ﴾ پھر وہ شرمندہ ہو کر کہنے لگے کہ تجھے پتا ہے کہ یہ باتیں نہیں کر سکتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرمانے لگے کہ مجھے پتا ہے تبھی تو تمہیں کہتا ہوں کہ ان کی عبادت نہ کرو۔

## کیا بتوں کو بڑے بت نے مارتا تھا؟

یہاں ایک چھوٹا سا سوال سمجھیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

﴿بَلْ فَعَلَهُ كَيْدُؤْهُمْ هَذَا﴾

بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو کہا ہے کہ بڑے بتوں نے یہ کیا ہے، یہ بظاہر سچ اور درست نہیں کہا۔ اس کا جواب سمجھیں؛ بسا اوقات گفتگو میں اپنے مخالف کے مسلمات کو لے کر گفتگو کی جاتی ہے۔ مسلمات کا معنی کہ جس بات کو مخالف بھی مانتا ہو اس کو فرض کر لیتے ہیں کہ تم ٹھیک کہتے ہو، اب بتاؤ اب کیا کریں؟ نتیجہ پھر اس کے خلاف نکلتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ جب تم یہ کہتے ہو کہ یہ ہمارے مددگار ہیں، نفع دیتے ہیں، نقصان دیتے ہیں، چلو مان لیتے ہیں، اس لیے تو میں کہتا ہوں کہ اس بڑے بت نے کیا ہے۔ اب انہوں نے کہا: یہ تو نہیں کر سکتے۔ فرمایا: یہی بات تو میں بھی کہتا ہوں۔ یہ مقصد تھا اس بات کے کہنے کا، ایسا نہیں تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی بات میں جھوٹ تھا العیاذ باللہ۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

## حضرت ابراہیم کی نمرود کو دعوت:

جب قوم کی بس ہو گئی تو ابراہیم علیہ السلام نے براہ راست نمرود کو دعوت دی۔ جب نمرود کو پتا چلا کہ ہمارے ملک میں کوئی نوجوان لڑکا ہے جو دعوت دیتا ہے، ہماری عبادت کے خلاف بولتا ہے اور ہمیں بھی خدا نہیں مانتا تو اس نے کہا کہ جاؤ! ان کو بلا کر لاؤ۔ ابراہیم علیہ السلام اب نمرود کے دربار میں آئے۔ نمرود نے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا: تو ہمیں خدا نہیں مانتا؟ فرمایا: نہیں۔ پوچھا کہ ان بتوں کو خدا نہیں مانتا؟ آپ نے فرمایا کہ ان کو بھی نہیں مانتا۔ اس نے پوچھا: پھر کس کو مانتا ہے؟

فرمایا: میں خدا اس کو مانتا ہوں ﴿ذَیِّ الَّذِیْ یُحْیِ وَ یُمِیْتُ﴾ جو زندہ بھی کرتا ہے اور موت بھی دیتا ہے۔ اس نے کہا: یہ کون سی بڑی بات ہے؟ سزائے موت کے ایک قیدی کو لیا اور کہا: چلو تم بری ہو اور کہنے لگا کہ میں نے اسے زندہ کیا اور ایک اس قیدی کو لیا جس کے لیے فیصلہ تھا بری ہونے کا، کہا کہ اس کو سزائے موت دے دو، اسے سولی پر لٹکا دو! کہنے لگا کہ ہم نے اس کو مار دیا۔ تو دیکھو! ہم نے زندہ بھی کیا اور ہم نے مار بھی دیا، تم کہتے تھے کہ اللہ مارتا ہے اور اللہ ہی زندہ کرتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ نمرود موت و حیات کا معنی نہیں سمجھتا۔

اس پر میں بات کروں گا تو بات لمبی ہو جائے گی۔ بعض باتیں جلدی سمجھ میں نہیں آتیں، ان پر تھوڑی سی بات کرنی پڑتی ہے پھر جا کر بات سمجھ آتی ہے۔ اگر میں نے بات شروع کی تو آپ کو میری بات پر تعجب ہو گا اور آپ لوگ کہیں گے کہ مولانا صاحب! اس مسئلہ کی کیا ضرورت ہے؟

میں ملائیشیا گیا، وہاں لوگوں نے یہ حیات ممات کا مسئلہ چھیڑا ہوا ہے۔ تو مجھے شافعی المذہب لوگوں نے کہا جو ہماری اردو زبان بھی نہیں سمجھتے کہ مولانا صاحب! حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسئلہ سمجھائیں! اور یہ کہنے والے بھی تبلیغی جماعت کے لوگ ہیں کہ ہمارے بچوں کو ان لوگوں نے خراب کرنا شروع کر دیا ہے، ہمیں مسئلہ سمجھائیں! تو میں نے کہا: بھائی اس کے لیے وقت زیادہ چاہیے، انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

### عذاب قبر پر اشکالات کے جوابات:

میں صرف یہ بتا رہا تھا کہ بسا اوقات مسئلہ سمجھانے کے لیے لمبی بات سمجھانی پڑتی ہے تو مجھے صرف موت کا معنی سمجھانے کے لیے پانچ گھنٹے سبق پڑھانا پڑھا، صرف یہ سمجھانے کے لیے کہ موت کیا ہے! جب ان کو بات سمجھ میں آگئی تو میں نے کہا کہ



اب تمہیں سمجھ آئے گا کہ برزخ کیا ہے۔ مجھے اچھا خاصا وقت لگانا پڑا کہ برزخ کسے کہتے ہیں؟ اب اگر برزخ کا مسئلہ نہ سمجھائیں تو بہت سارے اعتراضات ہوتے ہیں۔

مثلاً یہ لوگ کہتے ہیں کہ فرعون جو مصر میں ہے وہ قبر میں نہیں پڑا ہوا بلکہ قبر سے باہر پڑا ہوا ہے اور آپ لوگ کہتے ہیں کہ عذاب قبر ہوتا ہے۔ جب فرعون قبر میں ہے ہی نہیں تو اس کو عذاب قبر کیسے ہوگا؟ اس طرح ایک شبہ یہ بھی کرتے ہیں کہ ایک آدمی کو جانور کھا گیا ہے، وہ تو دفن ہوا ہی نہیں تو اس کو عذاب قبر کہاں ہوگا؟ ایک کافر ہے اس کو شیر نے کھا لیا ہے، اگر اس کو عذاب ہو رہا ہے تو اس سے شیر کو بھی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ تو بتاؤ اس جانور کو کس بات کی سزا ہے؟ اس بنا پر یہ لوگ کہتے ہیں کہ جسم کو عذاب ہی نہیں ہوتا۔ ایسے شبہات وہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اس لیے لوگوں کے لیے سمجھنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے پھر سمجھانا پڑتا ہے کہ برزخ کیا ہے!

جب میں نے سارے سوالات چھیڑے تو ان کو بڑا تعجب ہوا کہ سارے سوالات تو یہی ہیں۔ پھر میں نے مسئلہ سمجھانا تھا، بتاؤ پانچ گھنٹے لگنے ہیں یا نہیں؟ ایک ایک اعتراض میں نقل کرتا رہا اور ان کو سمجھاتا رہا۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ایک بات کو سمجھانے میں کافی دیر چاہیے تب جا کے بات سمجھ آتی ہے۔

### برزخ کسے کہتے ہیں؟

چھوٹی سی بات آپ بھی سمجھ لیں، میں لمبی بات نہیں کرتا۔ آپ یہ بات ذہن میں رکھ لیں کہ برزخ کسے کہتے ہیں؟ برزخ دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے:

1: زمان 2: مکان

زمان: وقت کو کہتے ہیں اور مکان: جگہ کو کہتے ہیں۔ برزخ کا زمان یہ ہے کہ موت سے لے کر حشر تک یہ سارا وقت زمان ہے اور سبچین سے لے کر علیین تک یہ سارا

مکانِ برزخ ہے۔ سچین ساتوں زمینوں سے نیچے ایک جگہ ہے اور علیین آسمان پر ایک جگہ ہے، یہ سارا برزخ ہے۔

اب آپ بات سمجھ سکتے ہیں کہ ایک آدمی فوت ہو جاتا ہے اور اس کی لاش باہر پڑی ہوتی ہے لیکن وہ پھر بھی برزخ میں ہے۔ کوئی بندہ کہے گا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ لاش برزخ میں ہے اور ہم برزخ میں نہیں ہیں، جبکہ ہیں تو دونوں عثمانیہ مسجد میں! تو آپ اسے سمجھائیں گے کہ برزخ دو چیزوں کا نام ہے؛ سچین سے علیین تک مکان اور موت سے لے کر حشر تک زمان، اس میت کو دونوں چیزیں مل رہی ہیں، اس کو مکان بھی مل گیا اور زمان بھی اور ہمیں مکان تو مل گیا کہ سچین اور علیین کے درمیان ہیں لیکن ہمیں زمان نہیں ملا۔ یہ بات کب سمجھ میں آئے گی جب آپ کو برزخ کا معنی سمجھ میں آئے گا اور جب برزخ کا معنی سمجھ میں نہیں آئے گا تو سوالات پیدا ہوتے رہیں گے۔

### لاش کو جانور کھالے تو عذاب کیسے ہوگا؟

یہ جو اعتراض تھا کہ بندہ شیر کے پیٹ میں ہے اس کو تکلیف ہوتی ہے تو شیر کو تکلیف کیوں نہیں ہوتی؟ میں نے کہا: یہ تو بہت آسان ہے، انگلی میں ہڈی کو تکلیف ہو تو چمڑے کو بھی تکلیف ہوتی ہے؟ (نہیں ہوتی۔ سامعین) کبھی نہیں ہوتی۔ ہڈی کی حیثیت الگ ہے اور چمڑے کی حیثیت الگ ہے۔ سر میں درد ہو تو اوپر بھی تکلیف ہوتی ہے؟ اوپر تو نہیں ہوتی۔ پیٹ میں معدے میں درد ہو تو چمڑے کو بھی تکلیف ہوتی ہے؟ چمڑے کو تو نہیں ہوتی۔ تو کافر کو تکلیف ہوتی ہے لیکن شیر کو نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے پیٹ میں کیڑے پڑ جائیں، اس کو دوا کھلائی تو اندر کیڑے مر رہے ہیں اور آدمی کو کچھ بھی نہیں ہو رہا، وہ چیز جو کیڑے نے کھائی ہے اس کو تکلیف ہوئی ہے کہ نہیں؟ ہوئی ہے۔ اب دیکھو! باقی معدے کو تکلیف نہیں ہو رہی، جسم میں

معدہ ہے اور معدے میں کیڑا ہے، وہ کیڑا مر جاتا ہے، کیڑے کو تو تکلیف ہوتی ہے لیکن معدے کو تکلیف نہیں ہوتی۔

اس لیے اگر کافر کسی شیر کی غذا بن جائے اور اس کی غذا کو تکلیف ہو اور شیر کو تکلیف نہ ہو یہ تو عقل میں آنے والی بات ہے۔ جب ہم نے یہ مسئلہ چھیڑا تو انہوں نے کہا: مولانا صاحب! ہم پر ایک اور احسان کریں۔ میں نے کہا: وہ کیا؟ کہا کہ آپ دوبارہ دس دن آئیں، اس دفعہ آپ نے سفر کیا ہے کبھی صوبہ گلڈا، کبھی صوبہ پنگی، کبھی صوبہ کلتنن وغیرہ جب آپ دوبارہ آئیں گے تو ملائیشیاء کے علماء ایک جگہ جمع ہوں گے، اُس بار آپ سفر نہیں کریں گے بلکہ ہم سفر کریں گے، ہمیں پتا نہیں تھا کہ ہمارے ملک میں کون ہے۔ اب ہمیں پتا چلا ہے۔ آئندہ آپ ایک جگہ بیٹھیں گے اور ہم آپ کے پاس آئیں گے۔ تو اب ان کو احساس ہوا کہ دلائل کسے کہتے ہیں اور دلیل کی طاقت کتنی ہوتی ہے۔

اس لیے میں کبھی سرگودھا والوں سے کہتا ہوں کہ مزے کی نیند سو جاؤ! ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہے ان شاء اللہ۔ بس یہ شرط ہے کہ تم تھوڑا سا اعتماد تو کرو! تم یہاں سے لاہور جاتے ہو تمہیں تکلیف نہیں ہوتی اور تمہیں 87 جاتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے، اب اس کا علاج تو ہمارے پاس نہیں ہے۔

### نمود سے مناظرہ:

تو خیر میں عرض کر رہا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام نے نمود کو سمجھایا۔ اب وہ موت و حیات سمجھتا نہیں تھا، وہ بد دماغ آدمی تھا، اس کو اب کیسے سمجھائیں؟ اس کے لیے وقت چاہیے تھا۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے فوراً رخ بدل کر کہا کہ میرا اللہ وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، اگر تو خدا ہے تو سورج کو مغرب سے نکال کر دکھا!

﴿فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ﴾

نمرود چپ ہو گیا، اس کی بس ہو گئی۔ بادشاہوں اور حکومتوں کا مزاج ہوتا ہے کہ وہ دلیل سے بات نہیں کرتے، طاقت سے بات کرتے ہیں۔ جب یہ سارے حربے ناکام ہو گئے تو نمرود نے کہا:

﴿حَٰزِقُوْهُ وَاَنْصُرُوْا اِلَٰهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فَعٰلِیْنَ﴾<sup>127</sup>

کہ اپنے خداؤں کی مدد کرو اور ابراہیم کو آگ میں ڈالو۔

آگ جلادی۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ مجھے کوئی ڈر نہیں، پھینک دو، اللہ میری مدد کرے گا۔ انہوں نے جلتی آگ میں ڈالا، آگ ایسی تھی کہ اوپر سے پرندہ گزرتا تو جل جاتا۔ جب ابراہیم علیہ السلام آگ میں گئے تو اللہ رب العزت نے فرشتے کو بھیجا کہ جاؤ آگ کو میری طرف سے کہہ دو!

﴿یٰۤاِنۡسَارُوْا کُوۡفِیۡۡۤا بَزۡدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤی اٰۤبَرٰہِیۡمَ﴾<sup>128</sup>

اے آگ! ٹھنڈی ہو جا لیکن زیادہ ٹھنڈی نہیں کہ ہمارے ابراہیم کو تکلیف ہو، بلکہ ایسے ہو جا کہ گل و گلزار میں پڑے ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام وہاں سے بھی فارغ ہوئے۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔

### ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت:

جب یہ سارے مرحلے ختم ہوئے تو ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ اب بہتر یہ ہے کہ میں اس شہر کو چھوڑ دوں۔ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ، لوط علیہ السلام اور ان کی بیوی کو ساتھ لیا اور وہاں سے چل پڑے۔ پہلے فرات پہنچے، وہاں سے فلسطین، وہاں سے مصر پہنچے تو وہاں ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی۔ مصر کا

بادشاہ تھا فرعون۔

یہ وہ فرعون نہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آیا تھا بلکہ جیسے ہمارے ہاں صدر ہوتا ہے، وزیر اعظم ہوتا ہے، ہمارے ہاں بادشاہ صدر ہے اور اس دور کا مزاج یہ تھا کہ مصر کا جو بھی بادشاہ تھا اس کو فرعون کہتے تھے، فرعون نام نہیں ہے یہ فرعون وہاں کا ایک خاص لقب تھا، اس دور کا جو فرعون تھا اس کا ایک عجیب گندہ مزاج تھا کہ اگر کوئی شخص وہاں سے گزرتا تھا اور اس کے ساتھ اس کی عورت بھی ہوتی اور خوب صورت ہوتی تو بادشاہ اس کے خاوند کو قتل کر دیتا تھا اور اس کی بیوی کو رکھ لیتا اور اگر شوہر ساتھ نہ ہوتا کوئی اور ہوتا بھائی وغیرہ تو پھر وہ کچھ نہیں کہتا تھا۔

ابراہیم علیہ السلام وہاں سے گزرے۔ اس مصیبت کا ان کو بھی سامنا کرنا پڑا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ سارہ کو اللہ نے ظاہری حسن بہت عطا کیا ہوا تھا۔ تو سرکاری کارندے آگئے پکڑنے کے لیے۔ ابراہیم علیہ السلام نے بیوی سے کہا کہ جب وہ تجھ سے کہے کہ یہ کون ہے؟ تو کہنا کہ یہ بھائی میرے ساتھ ہے اور میں تیرا مذہبی بھائی ہوں۔ مسلمان سارے بہن بھائی ہیں۔ اسلامی رشتے کے لحاظ سے بہن تھی۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت سارہ؛ ابراہیم علیہ السلام کی چچا زاد بہن تھی تو فرمایا کہ میں تیرا چچا زاد اور اسلامی بھائی ہوں۔

حضرت سارہ جب فرعون کے پاس پہنچیں تو اس نے پوچھا: ساتھ کون ہے؟ کہا کہ بھائی ہے۔ وہ بد بخت پھر بھی باز نہ آیا۔ ہاتھ بڑھانا چاہا تو خدا نے اس کا ہاتھ شل کر دیا۔ اس نے سمجھا کہ یہ کوئی نیک عورت ہے۔ کہا کہ دعا کرو، اللہ مجھے ٹھیک کر دیں، میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔ حضرت سارہ نے دعا کی تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ پھر ہاتھ ڈالا تو پھر شل ہو گیا۔ اس نے پھر کہا کہ دعا کرو کہ اللہ مجھے ٹھیک کر دیں، میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔ تیسری بار ٹھیک ہوا تو پھر ہاتھ ڈالا، پھر شل ہوا، پھر اس نے کہا کہ آخری بار تجھ سے

کہتا ہوں، مجھے معاف کر دو۔ حضرت سارہ نے دعا مانگی تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ پھر اس فرعون نے اپنی بیٹی ہاجرہ حضرت سارہ کو دی کہ یہ تیری خدمت گزار ہے تم اس کو بھی ساتھ لے جاؤ۔

### کیا حضرت ہاجرہ باندی تھیں؟

ابراہیم علیہ السلام مصر میں داخل ہوئے تو ایک بیوی ہے اور نکلے تو دو بیویاں ہیں۔ اس نے امتحان لینا چاہا خدا نے ساتھ بیوی دے دی۔ اس ہاجرہ سے پھر عرب کی نسل چلی ہے۔ اب آپ کے ذہن میں ایک سوال آئے گا اور عموماً مشہور ہے کہ ہاجرہ فرعون مصر کی لونڈی اور خادمہ تھی، وہی اس نے حضرت سارہ کو دی تھی اور وہ حضرت ابراہیم کی خادمہ تھی تو ان کی نسل سے جو لوگ چلے ہیں ان میں سے قریش بھی ہیں اور قریش سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں تو کیا پیغمبر کے خاندان میں کوئی ایسی عورت بھی ہے جو باندی ہو؟

اس کا بہترین جواب جو علماء نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ جب ایک آدمی ایک شادی کے بعد دوسری شادی کرتا تو دوسری شادی کے لیے یہ شرط تھی کہ وہ پہلی بیوی کے لیے خادمہ بن کر رہتی۔ جب فرعون مصر نے اپنی بیٹی دی تو کسی نے کہا کہ آپ تو شہزادی کو خادمہ بنوا رہے ہیں تو نمرو دے کہ سارہ اتنی نیک عورت ہے کہ میری بیٹی میرے پاس شہزادی بن کر رہے اس سے بہتر ہے کہ سارہ کی نوکرانی بن کر رہے۔ تو خادمہ نہیں تھی شہزادی تھی وہ اس نے دی تھی۔ اس سے پھر اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ آگے جو اسماعیل علیہ السلام کا واقعہ چلتا ہے تو میں نے صرف خلاصہ عرض کیا ہے۔

تو ابراہیم علیہ السلام جدا مجد ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ان کی ملت کی اتباع کرنے کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے اور یہاں سے پھر آگے وہ سلسلہ چلا

ہے۔

### حضرت ابراہیم پر اشکال کا جواب (ثلاث کذبات):

اس میں صرف ایک بات یاد رکھ لیں۔ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے اور بڑا مشہور اعتراض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَمْ يَكْذِبْ اِبْرَاهِيْمُ اِلَّا ثَلَاثَ كَذَبَاتٍ." <sup>129</sup>

ابراہیم علیہ السلام نے زندگی میں صرف تین جھوٹ بولے ہیں۔ اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ یہ روایت ٹھیک نہیں ہے۔ جو لوگ صحیح بخاری پر اعتراض کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ اعتراض کیا ہے؟ کہ یہ حدیث آیت کے خلاف ہے، قرآن کریم میں ہے: ﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِبْرَاهِيْمَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا﴾ قرآن ابراہیم علیہ السلام کو صدیق کہتا ہے اور بخاری کہتا ہے کہ انہوں نے تین جھوٹ بولے تھے۔

علماء نے لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس کو کذب اور جھوٹ کہا ہے تو دراصل یہ جھوٹ نہیں تھا، یہ ایسے الفاظ تھے جو دیکھنے میں جھوٹ لگ رہے تھے، درحقیقت سچ تھے، اس کو بلاغت اور علم المعانی کی زبان میں ”توریہ“ کہتے ہیں۔ توریہ کا معنی یہ ہے کہ مخاطب معنی کوئی اور سمجھے اور بولنے والا مراد کوئی اور معنی لے۔

یہ تین واقعات ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ پیش آئے ہیں جو میں نے ابھی درس کے دوران بیان کر دیے ہیں لیکن صرف سمجھانے کے لیے میں کہہ رہا ہوں۔ ایک واقعہ یہی ہے کہ بیوی سے فرمایا کہ جب فرعون آپ سے پوچھے کہ یہ شخص کون ہے؟ تو آپ نے کہنا ہے کہ یہ میرا بھائی ہے، وہ کچھ اور سمجھا اور ابراہیم علیہ السلام کا

مقصد تھا کہ اسلامی بھائی ہوں۔ یہ جھوٹ تو نہیں ہے۔ دوسرا واقعہ جب بتوں کو مارا تو کلہاڑا بڑے کے کندھے پر رکھا اور کہا: ﴿بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا﴾ کہ یہ کام ان کے بڑے نے کیا ہے حالانکہ بڑے نے تو نہیں کیا تھا تو چونکہ وہ کہتے تھے کہ بت سب کچھ کرتے ہیں تو ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات ان کے دعوے کے مطابق کہی تھی کہ اس نے کیا ہے، حالانکہ مراد ان کی یہ نہیں تھی۔ ﴿بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا﴾

اور بعض نے اور جواب دیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ﴿بَلْ فَعَلَهُ﴾ کو الگ کہا، پھر ﴿كَبِيرُهُمْ هَذَا﴾ کو الگ کہا۔ سانس توڑ کر دو جملے بولے ہیں۔ قوم نے کہا: ابراہیم! تو نے یہ کیا ہے؟ فرمایا: نہیں، ﴿بَلْ فَعَلَهُ﴾ اس کو اُس نے کیا ہے، ﴿كَبِيرُهُمْ هَذَا﴾ بڑا یہ ہے۔ اب یہ کام کس نے کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے اس کے متعلق کچھ نہیں فرمایا۔ تو دیکھو بات بالکل الگ فرمائی ہے۔

تیسرا واقعہ کہ جب ستاروں کو دیکھا تو کہا کہ ﴿هَذَا زَيْتِي﴾ یہ میرا رب ہے؟ اب تو بالکل عنوان ہی بالکل بدل گیا، یہ تو استفہام ہو رہا ہے۔ اس لیے اس میں اعتراض کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام کا طرز یہ تھا کہ سننے والا اور سمجھے اور کہنے والے کی مراد کچھ اور ہو۔

**یہ شخص مجھے راستہ دکھا رہا ہے:**

اس کو سمجھنا ہو تو آخر میں ایک مثال سمجھو! حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کی تنہائی میں مکہ سے مدینہ لے جا رہے تھے تو راستے میں ایک کافر ملا۔ اس نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پہچان لیا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہچانا۔ تو اس نے پوچھا کہ یہ ساتھ کون ہے؟ اب صدیق اکبر پریشان ہو گئے کہ اگر بتاتا ہوں تو یہ ظالم ہمیں چھوڑے گا نہیں، مخبری کر دے گا اور



اگر جھوٹ بولوں گا تو صدیق نہیں رہوں گا۔ اب میں کیا کروں؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"هَذَا الرَّجُلُ يَهْدِيَنِ السَّبِيلَ".<sup>130</sup>

یہ میرے ساتھ بندہ ہے جو مجھے راستہ دکھا رہا ہے۔

وہ کافر سمجھا کہ جہاں جانا ہے تو راستے کا پتا نہیں ہے یہ شخص وہ راستہ دکھا رہا ہے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے کہ یہ مجھے جنت کا راستہ دکھا رہے ہیں۔ وہ کچھ اور سمجھا اور انہوں نے کچھ اور فرمایا۔ یہ بڑی عقل کی باتیں ہیں اور جب انسان خود کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے تو اللہ ایسی باتیں انسان کو سمجھا دیتے ہیں۔ اللہ مجھے اور آپ سب کو توفیق عطا فرمائیں کہ ہم بھی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیں۔

**حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ:**

﴿وَإِذْ كُنَّا فِي الْمَدْيَنَ مُصَلِّينَ إِذْ دَخَلْنَا فِي الْوَادِعِ وَكُنَّا وَقُوفًا وَرُؤُسُنَا سَمِيفًا ۚ﴾

اس آیت کریمہ میں دو لفظ ہیں جو ہم نے سمجھنے ہیں۔ اپنی زبان پر ہم اس کو لاتے بھی ہیں لیکن عموماً اس کے مضمون کو ہم سمجھ نہیں پاتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا" موسیٰ علیہ السلام رسول بھی تھے اور نبی بھی تھے۔ ہم عموماً کہتے ہیں کہ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم... ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم... تو کیا نبی اور رسول کا معنی ایک ہے یا الگ الگ ہے؟ ذرا اس بات کو سمجھیں۔

کئی بار آپ نے سنا ہو گا کہ سو الاکھ کم و بیش انبیاء علیہم السلام اللہ نے مبعوث فرمائے ہیں اور تین سو تیرہ ان میں رسول ہیں، تو رسولوں کی تعداد کم ہے اور نبیوں کی

تعداد زیادہ ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ نبی اور رسول میں فرق ہے۔

### نبی اور رسول میں فرق:

رسول اسے کہتے ہیں جو نئی اور مستقل شریعت لے کر آئے اور اس کی دو صورتیں ہیں؛ ایک صورت یہ ہے کہ رسول اپنی قوم کے پاس اپنی مستقل شریعت لے کر آئے جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کی طرف سے تورات دی، یہ مستقل شریعت ہے، عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو انجیل دی، یہ مستقل شریعت ہے، داؤد علیہ السلام نے زبور دی یہ مستقل شریعت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے تھے یہ مستقل شریعت ہے، حضرت ادریس علیہ السلام کے تیس صحیفے تھے یہ مستقل شریعت ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایک نبی جس قوم کی طرف مبعوث ہے تو وہ گزشتہ نبی کی شریعت اس قوم کو دے۔ تو وہ شریعت تو نئی نہیں ہے لیکن اس قوم کے لیے وہ نئی شریعت ہے۔ اس کی مثال سمجھیں! حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے ہیں؛ ایک حضرت اسحاق اور ایک حضرت اسماعیل علیہما السلام۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسحاق تھے، ان کے بیٹے یعقوب تھے، ان کے بیٹے یوسف... علیہم السلام۔ یہ انبیاء کی لڑی ہے، اور حضرت اسماعیل؛ ابراہیم علیہ السلام کے وہ بیٹے ہیں کہ جن کی نسل سے ایک ہی نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

تو حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل سے بہت سارے انبیاء آئے ہیں جبکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے صرف حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ آپ نے کئی بار سنا ہے کہ حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو بنو اسرائیل کہتے ہیں۔ ”اسرائیل“ یہ دو لفظ ہیں؛ ایک ”اسرا“ اور دوسرا ”ئیل“۔ اسرا کا معنی ہوتا ہے عبد اور ”ئیل“ کا معنی ہوتا ہے اللہ۔ تو اسرائیل کا معنی ہے عبد اللہ، یہ

حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا۔ نام آپ کا یعقوب تھا اور لقب آپ کا اسرائیل تھا یعنی عبد اللہ۔ ان کے پھر بارہ بیٹے تھے جن میں بڑے کا نام یہودا اور سب سے چھوٹے کا نام بنیامین تھا۔ دو بیویاں تھیں۔ ایک سے دس بیٹے تھے اور دوسری سے بنیامین اور یوسف علیہ السلام دو بیٹے تھے۔

اب حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد تھی ان کا لقب تھا ”بنو اسرائیل“ اسرائیل کا معنی تو ہے عبد اللہ اور ابن کی عربی میں جمع ”بنون“ آتی ہے۔ تو بنو اسرائیل کا معنی ہے یعقوب علیہ السلام کی اولاد۔ تو یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے بہت سے نبی آئے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام قوم جرہم کے نبی تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ گئے تو اپنی بیوی ہاجرہ اور بیٹے اسماعیل کو وہاں چھوڑا۔ وہاں پر کھانے کا انتظام بھی نہیں تھا۔ تو جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی برکت سے اللہ نے زم زم کا چشمہ جاری کیا تو پانی کا انتظام بھی ہو گیا جس کی وجہ سے آبادی شروع ہو گئی اور قافلے آنا شروع ہو گئے۔ جہاں پانی ہو وہاں آبادیاں ہوتی ہیں۔ آبادیوں کے لیے پانی شرط ہے ورنہ آبادی ہوتی ہی نہیں ہے۔ وہ قبیلہ جو آباد ہوا وہ قبیلہ جرہم تھا۔ اسماعیل علیہ السلام اس قبیلے کے نبی تھے۔

اسماعیل علیہ السلام کی شریعت حضرت ابراہیم علیہ السلام والی تھی۔ اب ابراہیم علیہ السلام قبیلہ جرہم کے نبی نہیں ہیں لیکن شریعت حضرت ابراہیم علیہ السلام والی تھی۔ اب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جو شریعت ہے وہ نئی شریعت نہیں بلکہ پرانی شریعت ہے لیکن جس قوم کے لیے یہ آئی اس کے پاس ابراہیم علیہ السلام کی شریعت نہیں آئی۔ تو اگرچہ شریعت پرانی تھی مگر ان لوگوں کے لیے نئی تھی۔ اس لیے اسماعیل علیہ السلام بھی رسول ہیں۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ رسول اسے کہتے ہیں جو نئی شریعت لے کر آئے

اور نبی اسے کہتے ہیں جو خواہ نئی شریعت لے کر آئے یا پرانی شریعت کے مطابق چلے۔ اب ہم یہ کہیں گے کہ ایک نبی ہے اور ایک رسول ہے، نبی عام ہوتا ہے اور رسول خاص ہوتا ہے، نبی ہر صاحبِ وحی کو کہتے ہیں اور رسول ہر صاحبِ وحی کو نہیں کہتے، رسول اسے کہتے ہیں جس پر وحی بھی آئے اور مستقل نئی شریعت بھی آئے۔

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی بھی تھے اور رسول بھی تھے۔ نبی تھے کہ ان کے پاس اللہ کی وحی آتی تھی اور رسول بھی تھے کہ ان پر اللہ نے تورات کو نازل کیا تھا۔ میں نے صرف یہ بات سمجھائی ہے کہ نبی اور رسول کا معنی کیا ہے۔

### رسول کا لغوی معنی:

اس سے ایک چھوٹی سی بات اور سمجھیں۔ میں چھوٹی چھوٹی باتیں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ اگر وہ آپ کو سمجھ آجائیں تو اس سے عقائد درست ہوتے ہیں، نظریات ٹھیک ہوتے ہیں، کل کو الجھن اور پریشانی نہیں ہوتی۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ نبی اور رسول کا یہ معنی ہے یہ شریعت کی مخصوص اصطلاح ہے ورنہ عربی لغت میں رسول کا معنی صرف ”قاصد“ ہے، نبی بھی رسول ہے اور غیر نبی بھی رسول ہے۔ عربی زبان میں معنی یہ ہے کہ میں کسی کو کوئی پیغام دے کر کسی کے پاس بھیجتا ہوں تو یہ میرے رسول ہیں، ہم اسے قاصد کہتے ہیں اور عربی میں اسی قاصد کو ”رسول“ کہتے ہیں۔ نبی اللہ کا رسول ہے، اللہ کا قاصد ہے، اللہ کا نمائندہ ہے، اللہ کا سفیر ہے۔

میں یہ بات سمجھا رہا ہوں کہ جہاں بھی قرآن میں لفظ رسول آئے تو اس رسول کا معنی یہ نہ سمجھنا کہ اس پر وحی آرہی ہے، کبھی قرآن رسول کا لفظ اصطلاحی معنی میں استعمال کرتا ہے جسے ہم پیغمبر کہتے ہیں اور کبھی قرآن رسول کا لفظ اصطلاحی معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ عربی زبان کا معنی استعمال کرتا ہے جس کا معنی صرف پیغام لانے والا اور نمائندہ ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ﴾<sup>131</sup>

اللہ پاک فرشتوں میں سے بھی رسول بناتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی بناتے ہیں۔

بتاؤ! کبھی کوئی فرشتہ نبی ہوا ہے؟ (نہیں۔ سامعین) تو جب فرشتہ نبی نہیں ہے تو رسول کیسے ہو گا؟ لیکن قرآن کہہ رہا ہے کہ ہم رسول بناتے ہیں فرشتوں میں سے بھی اور انسانوں میں سے بھی۔ اب جب آپ یہ بات سمجھ لیں گے کہ ”رسول“ کا معنی عربی لغت میں قاصد ہے تو کوئی بندہ آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ تو ایک ہے رسول کا شریعت کی اصطلاح میں معنی جسے ہم پیغمبر کہتے ہیں وہ رسول صرف انسان ہوتا ہے اور ایک ہے رسول کا عربی زبان میں معنی جس کا معنی قاصد ہے وہ انسان بھی ہوتا ہے اور وہ اللہ کا فرشتہ بھی ہوتا ہے۔ تو رسول کے دو معنی الگ الگ ذہن میں رکھ لیں۔

### نبی نمائندہ خدا اور صحابی نمائندہ مصطفیٰ

اللہ نے قرآن کریم میں فرشتے کو بھی رسول کہا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو بھی رسول کہا ہے۔ صحابہ کے لیے بھی لفظ رسول آیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے چلے عمرہ ادا کرنے کے لیے تو کفار مکہ نے حدیبیہ کے مقام پر روک لیا۔ وہ واقعہ آپ نے سنا ہو گا صلح حدیبیہ والا، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مذاکرات کے لیے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ بھیجا۔ کفار مکہ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر لیا اور مشہور کر دیا کہ ہم نے ان کو قتل کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بیعت لی کہ ہم

عثمان کا بدلہ لیں گے، بدلہ لیے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ اب اس کے لیے جو لفظ جامع ترمذی میں آیا ہے وہ ہے:

"كَانَ عُمَانُ بْنُ عَفَّانَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى أَهْلِ مَكَّةَ."<sup>132</sup>

یہاں لفظ ”رسول“ دوبار آیا ہے، موٹی موٹی عربی تو سب سمجھتے ہیں نا؟ یہاں لفظ ”رسول اللہ“ سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور پہلے لفظ رسول سے مراد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان مکہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول تھے، حضور پاک رسول خدا ہیں اور حضرت عثمان رسول مصطفیٰ ہیں۔ تو یہاں رسول کا معنی ہے قاصد اور نمائندہ۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ نبی نمائندہ خدا ہوتا ہے اور صحابی نمائندہ مصطفیٰ ہوتا ہے۔

### جتنے نمائندے میرے اتنے نمائندے آپ کے:

ایک بات آپ نے سنی ہوئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ دونوں کی تعداد سو لاکھ کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی؛ نمائندہ خدا ہوتا ہے اور صحابی؛ نمائندہ مصطفیٰ ہوتا ہے۔ اللہ نے اپنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ میرے محمد! یہ آپ کا اعزاز ہے کہ جتنے نمائندے میرے ہیں اتنے نمائندے آپ کے ہیں، میری بات جن سے سمجھ آتی ہے وہ نمائندہ خدا ہیں اور جن سے آپ کی بات سمجھ آتی ہے وہ نمائندہ مصطفیٰ ہیں، ان پہ نمائندگی میری ختم ان پہ نمائندگی آپ کی

ختم، آپ کے بعد اگر کوئی نمائندہ خدا ہونے کا دعویٰ کرے وہ بھی بے ایمان ہے اور اُن کے بعد کوئی نمائندہ مصطفیٰ ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ بھی بے ایمان ہے، حضور آئے ہیں نبوت ختم ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم گئے ہیں صحابیت ختم ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

تو میں نبی اور رسول کا معنی سمجھا رہا تھا کہ رسول مستقل شریعت والا ہوتا ہے اور نبی صاحب وحی ہوتا ہے خواہ مستقل شریعت ہو یا پچھلے رسول کی شریعت کو لے کر چلے۔ تو موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں چونکہ اللہ نے دونوں لفظ استعمال فرمائے ہیں اس لیے میں نے دونوں لفظوں کا معنی بتا دیا ہے۔

**موسیٰ علیہ السلام سے خطاب خداوندی:**

﴿وَنَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا ۖ﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے دائیں جانب کوہ طور تھا وہاں سے ہم نے انہیں آواز دی۔

یہ دائیں جانب کس کی ہے، بس اس بات کو سمجھیں۔ میں وہ باتیں بتاتا رہتا ہوں جو آپ نے سنی ہوں گی لیکن آپ کے ذہن میں نہیں ہوتیں۔ میں وہ آپ کو سمجھا دیتا ہوں تاکہ الجھنیں پیدا نہ ہوں۔ پہاڑ کی نہ دائیں جانب ہوتی ہے نہ بائیں جانب ہوتی ہے، پہاڑ تو برابر ہوتا ہے تو یہ دائیں جانب کس کی ہے؟ علامہ نسفی نے تفسیر مدارک میں لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب مدین سے چلے اور مصر جا رہے تھے تو راستے میں پہاڑ طور سینا ہے اور یہ موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب ہے۔ تو طور سینا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب تھا اور وہاں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ کے ہم کلام ہونے کا تفصیلی واقعہ آگے ہم عرض کریں گے ان شاء اللہ۔

## منصور حلاج کے نعرۂ انا الحق کی توجیہ:

آج صرف ایک بات سمجھ لیں۔ ہماری تاریخ میں ایک بزرگ گزرے ہیں جنہیں منصور حلاج کہتے ہیں اور وہ کہتے تھے ”انا الحق... انا الحق... انا الحق...“ اس وقت علماء نے فتویٰ دیا کہ ان کو قتل کرو، ”حق“ اللہ کی ذات ہے... لیکن ہمارے مشائخ کہتے ہیں کہ وہ ولی تھے، ہم ان کے بارے میں یہ کلمہ نہیں کہتے ہیں کہ وہ کافر تھے۔ جن کو اشکال تھا وہ اس بات پر تھا کہ ”حق“ تو اللہ کی ذات ہے اور یہ کہتے ہیں ”انا الحق“ تو گویا یہ کفر کہہ رہے ہیں، خود کو العیاذ باللہ اللہ کہہ رہے ہیں۔

جو حضرات کہتے ہیں کہ یہ کفر نہیں تھا یہ اسلام تھا ان کی دلیل یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو آواز آئی اللہ کی طرف سے وہ یوں آئی کہ طور سینا پر درخت تھا اور درخت کے پتے سے آواز آئی: ﴿إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي﴾<sup>133</sup> کہ میں خدا ہوں، میرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، میری عبادت کرو۔

ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ تجلیاتِ الہی کو ہر طور کے درخت پر پڑیں تو پتا بولا، ادھر منصور کی ذات پر پڑیں تو منصور کی ذات بولی اور یہ الفاظ استعمال ہوئے۔ منصور کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ میں حق ہوں۔ ان کی زبان سے الہی آواز تھی کہ میں حق ہوں۔ یہ اب کفر تو نہیں رہتا لیکن اتنی باریکی سمجھنا ہر بندے کے بس کی بات نہیں ہے اور جب یہ باریکی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں تو پھر ہم فتویٰ بہت زیادہ دیتے ہیں حالانکہ فتویٰ کی زیادہ ضرورت نہیں ہے بلکہ امت کو سمجھانے کی زیادہ ضرورت ہے۔

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمہ اللہ کے مرید تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی



بہت بڑے آدمی ہیں۔ حکیم الامت اشرف علی تھانوی فرماتے تھے: اگر میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کا مرید نہ ہوتا تو میں فتوے باز مولوی بنتا، میں بچا اس لیے ہوں کہ میری لگام کسی پیر کے ہاتھ میں تھی۔

### بیعت کی ضرورت واہمیت:

میں اس لیے کہتا ہوں کہ عالم جتنا بڑا ہو اس کے لیے مرید بننا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا بڑا ڈاکٹر ہو اس کے لیے مرید ہونا اتنا ہی زیادہ ضروری ہے، تبلیغ میں جتنا زیادہ وقت لگاتا ہو اس کے لیے پیر کا ہونا بھی اتنا ہی زیادہ ضروری ہے۔ میں یہ باتیں کھل کر اس لیے کہتا ہوں کہ ہمارے ہاں جو آدمی ڈاڑھی منڈاتا ہو، نماز نہ پڑھتا ہو تو لوگ اسے کہتے ہیں کہ کسی پیر صاحب سے بیعت کر لے تو نیک ہو جائے گا اور نیک کو کوئی نہیں کہے گا کہ تو بیعت ہو جا۔ میں کہتا ہوں کہ بے نمازی کے لیے مرید بننا اتنا ضروری نہیں ہے جتنا نمازی کے لیے ضروری ہے۔

شاید آپ کو میری بات اتنی جلدی سمجھ میں نہ آئے، میں اس لیے کہتا ہوں کہ اس بات کو اچھی طرح سمجھیں۔ نیک آدمی کا مرید ہونا زیادہ ضروری ہے، جس آدمی میں شریعت کا شوق نہیں ہے تو اس میں بلاشبہ شوق پیدا کرنے کی ضرورت ہے لیکن جس میں شریعت کا شوق موجود ہے تو ضرورت ہے کہ اس کو شریعت سمجھاؤ! بسا اوقات آدمی شریعت سمجھا ہوا نہیں ہوتا اور کبھی سمجھتا ہے لیکن عمل نہیں کرتا۔ تو دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

میں اس کی ایک مثال دے کر بات سمجھاتا ہوں۔ اگر گھوڑا طاقت ور ہو خوراک اس کی اچھی ہو تو گھوڑا جتنا طاقت ور ہو اتنا ہی اس کا کوچوان اچھا ہونا چاہیے۔ گھوڑا مضبوط ہو اور اس کی لگام کسی کے ہاتھ میں نہ ہو وہ خود بھی مرتا ہے اور ساری سواریوں کو بھی مارتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ جب گھوڑا طاقت ور ہے تو اب لگام کی کیا

ضرورت ہے؟ مجھے آپ بتائیں! گھوڑا کمزور ہو اور لگام کسی کمزور کے ہاتھ میں ہو تو کام چل جاتا ہے اور اگر گھوڑا مضبوط ہو اور لگام کسی کمزور بندے کے ہاتھ میں ہو تو برباد ہوتا ہے کہ نہیں؟ (برباد ہوتا ہے۔ سامعین) تو آدمی جتنا زیادہ دین پر عمل کرے تو یہ مضبوط گھوڑا ہے، اس کی لگام کسی مضبوط آدمی کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ میں بعض باتیں کہتا ہوں لیکن اتنی جلدی وہ لوگوں کو سمجھ نہیں آتیں، تھوڑی دیر لگتی ہے۔

### فساد کی وجہ:

میں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ ہماری مساجد میں زیادہ تر فساد بے نمازیوں کی وجہ سے نہیں ہوتے بلکہ مسجد میں نماز پڑھنے والوں کی وجہ سے ہوتے ہیں، بے نمازی آکر لڑتے ہیں یا نمازی لڑتے ہیں؟ (نمازی لڑتے ہیں۔ سامعین) امام کے خلاف فساد نمازی کرتے ہیں یا بے نمازی کرتے ہیں؟ (بے نمازی۔ سامعین) تو اصلاح کس کی زیادہ ضروری ہے؟ (نمازیوں کی۔ سامعین) لیکن پھر آپ کہتے ہیں کہ مولانا صاحب! بے نمازیوں کو بیعت کرو، فساد آپ کرتے ہیں اور بیعت بے نمازیوں کی کرواتے ہیں۔ ہم دین دار ہیں، ہم ٹھیک ہیں تو لوگ مزید جلدی ٹھیک ہو سکتے ہیں، میں ٹھیک نہ ہوا تو میرا گاؤں جلدی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ میرا ٹھیک ہونا میری عوام کے ٹھیک ہونے سے زیادہ ضروری ہے، میرے عقیدے کا ٹھیک ہونا میرے مقتدی کے عقیدے کے ٹھیک ہونے سے زیادہ ضروری ہے، میرے عمل کا ٹھیک ہونا میرے مقتدیوں کے عمل کے ٹھیک ہونے سے زیادہ ضروری ہے۔

### بیعت کی تین اقسام:

حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تین طرح کی بیعت ہوتی تھی؛ ایک بیعت علی الایمان کہ بندہ پہلے کافر تھا، بیعت کرتا اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا۔ دوسری بیعت علی الموت اور

بیعت علی الجہاد تھی جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر حدیبیہ کے مقام پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیعت کی تھی کہ حضور! ہم مرجائیں گے لیکن عثمان غنی کا انتقام لیے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ تیسری بیعت تھی علی ارکان الاسلام کہ اللہ کے نبی! ہم شریعت پر عمل کریں گے۔

اب بات سمجھنا! یہ بیعت علی ارکان الاسلام کون کر رہے ہیں، جو پہلے ایمان لا چکے تھے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے، انہیں صحابہ کہتے ہیں رضی اللہ عنہم، اب یہ مزید بیعت کر رہے ہیں کہ ہم شریعت پر عمل کریں گے، صحابی سے زیادہ کوئی نیک ہو سکتا ہے؟ نہیں، تو صحابی بھی سمجھتا ہے کہ بیعت کی ضرورت ہے۔ تو آپ کو ضرورت کیوں نہیں ہے؟ آپ کہتے ہیں مجھے ضرورت نہیں ہے کیونکہ میرے چہرے پر تو ڈاڑھی پہلے سے ہے، میں تو نماز پہلے سے پڑھتا ہوں۔

اس لیے ہمارا تو معمول ہے کہ ہم تو اپنا ہاتھ شیخ کے ہاتھ میں دیتے ہیں، جہاں پھنتے ہیں وہاں پوچھتے ہیں، اصلاحی خط بھی لکھتے ہیں، اپنے گناہ کی اصلاح کے لیے شیخ سے پوچھتے بھی ہیں۔ اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں۔

میں نے آپ سے کہا تھا کہ ایک ایک لفظ پر اگر ایسے نکتے بیان کرتے جائیں تو آپ اندازہ فرمائیں کہ کتنے سالوں میں قرآن ختم ہو گا۔

**حضرت ادریس علیہ السلام کا تذکرہ:**

﴿وَإِذْ كُنَّا فِي الْكَتِّبِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا﴾

ایک نبی حضرت ادریس علیہ السلام ہیں، ان کا تذکرہ آگے قرآن کریم میں تفصیل کے ساتھ شاید نہ ہو سکے تو خلاصہ ذہن میں رکھ لیں۔ حضرت ادریس علیہ السلام کی بعض خصوصیات ہیں جو مفسرین حضرات نے ذکر کی ہیں۔ ان کے بارے میں

ہے ”وَهُوَ أَوَّلُ مَنْ خَطَّ بِالْقَلَمِ“ کہ آپ پہلا وہ شخص ہیں جنہوں نے قلم سے لکھنا شروع کیا، ”وَأَوَّلُ مَنْ خَاطَ الثِّيَابَ وَلَبَسَ الْمَخِيطَ“ آپ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے کپڑا اسی کر لباس پہنا ہے، آپ سے پہلے لوگ جانوروں کے چمڑے کا لباس پہنتے تھے، ”وَهُوَ أَوَّلُ مَنْ اتَّخَذَ السِّلَاحَ وَقَاتَلَ الْكُفَّارَ“ آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلحہ بنایا اور کفار سے جہاد کیا، ”وَأَوَّلُ مَنْ نَظَرَ فِي عِلْمِ الْحِسَابِ“ آپ ہی پہلے شخص ہیں کہ جو حساب کتاب میں ماہر تھے۔ یہ ادريس عليه السلام ہیں۔<sup>134</sup>

اب یوں سمجھو کہ آج دنیا جتنی بھی ترقی کر رہی ہے اس ترقی کے بانی حضرت ادريس عليه السلام ہیں، یہ مسلمان ہیں اور کوئی نہیں ہے۔ ہم نے چھوڑ دیا تو کسی اور نے لے لیا۔ وراثت ہماری ہے لیکن اوروں نے لے لی ہے۔ اس لیے مادیات میں ترقی کرنا شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ ہاں ترقی کرتے ہوئے شریعت کو چھوڑ دینا یہ شریعت کے خلاف ہے۔ دائرہ شریعت میں رہ کر ترقی کریں تو کون ہے جو مسلمان کا مقابلہ کر سکے، کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ اللہ ہمیں یہ میراث حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

### انبیاء علیہم السلام اور خشیتِ الہیہ:

میں بات سمیٹا ہوں۔ اللہ رب العزت نے سورت کے شروع میں حضرت زکریا علیہ السلام کا تذکرہ کیا، حضرت یحییٰ علیہ السلام کا تذکرہ کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ کیا، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کیا، حضرت ادريس عليه السلام کا تذکرہ کیا، پھر حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ کیا۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ یہ سب لوگ وہ تھے کہ جب ان کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی تھیں تو یہ سجدہ بھی کرتے تھے، روتے بھی تھے اور گر گڑ گڑاتے بھی تھے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا معمول تھا۔

## نالائق جانشین کی بیماریاں:

﴿خَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَةَ

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غِيًّا﴾

انبیاء علیہم السلام تو بڑے تھے ان کی اولاد بھی نیک تھی لیکن ایک وقت آیا کہ ان کے بعد نالائق قسم کے جانشین پیدا ہوئے، انہوں نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ نمازیں برباد کیں اور دوسرا کام شہوات اور خواہشات کے اندر پڑے۔ معلوم ہوا کہ جو نالائق قسم کے جانشین ہوتے ہیں ان کی دو بیماریاں ہیں:

1: نماز میں کوتاہی کرتے ہیں۔

2: ناجائز خواہشات کو پورا کرتے ہیں۔

جائز خواہش پر عمل کرنا گناہ نہیں ہے البتہ ناجائز خواہش پر عمل کرنا گناہ ہے اور جائز خواہش میں اتنا مبتلا ہونا کہ آدمی اگلے جائز کے بھی قابل نہ رہے تو پھر جائز خواہشات کو کنٹرول کرنا چاہیے کہ آدمی اتنا آگے نہ نکل جائے۔

## ”خَلَف“ اور ”خَلْف“ میں فرق:

یہاں عربی زبان کے دو لفظ سمجھ لیں۔ ایک لفظ ”خَلَف“ ہے اور ایک لفظ ”خَلْف“ ہے۔ عربی کتنی عجیب زبان ہے۔ اگر خَلَف پڑھیں لام کے زبر کے ساتھ تو اس کا معنی ہے لائق جانشین اور اگر خَلْف پڑھیں لام کے سکون کے ساتھ تو اس کا معنی ہے نالائق جانشین۔ لفظ کی حرکت کے بدلنے سے معنی بدل جاتا ہے۔

یہاں قرآن کہتا ہے ”خَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ“ لام کے سکون کے ساتھ ہے، اللہ فرماتے ہیں کہ جانشین نالائق ہو گئے تھے، انہوں نے نمازیں بھی برباد کیں اور خود خواہشات میں بھی پڑ گئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی ترتیب ہے کہ پہلے لائق کا ذکر کرتے ہیں، پھر نالائق کا ذکر کرتے ہیں، نیک کام کا ذکر کرتے ہیں پھر برے کام کا ذکر کرتے ہیں، جنت کا کرتے ہیں پھر جہنم کا کرتے ہیں۔

**توبہ کا دروازہ کھلا ہے:**

﴿إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ۖ﴾ جَنَّتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدَ الرَّحْمَنُ عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًا ﴿١٦﴾

یہاں اللہ نے جنت کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ نالائق جانشین ہیں اور اللہ کا نظام دیکھیں۔ فرمایا: بندہ نالائق ہو، مجرم ہو، گناہ گار ہو میں اللہ پھر بھی دروازے کھلے رکھتا ہوں اور وہ کھلا دروازہ یہ ہے کہ یہ نالائق توبہ کریں، نیک عمل کریں تو میں انہیں پھر جنت میں بھیج دوں گا۔

اللہ رب العزت ہم نالائقوں کے لیے بھی راستے رکھتے ہیں، ہمارے لیے ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔

**اللہ کے نام اور صفات جیسا کوئی نہیں!**

﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَ اصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ ۚ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ۚ﴾ ﴿١٧﴾

آگے عام بندوں کو خطاب کیا ہے کہ اللہ آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے ان سب کا رب ہے، اللہ کی عبادت میں جبرے رہو۔

ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا: ”هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا“ اللہ کو چھوڑ کر تم اوروں کی عبادت کرتے ہو! کیا تم نے خدا جیسا کوئی دنیا میں سنا ہے یا دیکھا ہے؟

یہاں ”سَمِیًّا“ کے دو معنی ہیں:

[۱]: ایک معنی یہ ہے کہ جو صفت اللہ کی ہو وہ صفت کسی اور کی ہو۔ یعنی صفات

میں اللہ جیسا تم نے کسی کو دیکھا ہے یا سنا ہے؟

[۲]: اور ایک معنی یہ ہے کہ جس طرح اللہ کا نام ہے اسی طرح کسی معبود باطل کا

نام اللہ ہو ایسا نہیں۔ بعض علماء نے عجیب بات یہ لکھی ہے یہ ”سَمِیًّا“ اسم سے ہے اور

اسم کا معنی نام ہوتا ہے۔ اللہ پاک کا نظام عجیب دیکھیں کہ دنیا میں لوگوں نے جتنے غلط،

ناجائز اور باطل خدا بنائے ہوئے تھے ہر خدا کا کوئی نام بھی رکھا لیکن آج تک کسی باطل

کا نام ”اللہ“ نہیں رکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِیًّا“ کہ کیا تم نے

کبھی سنا ہے کہ معبود باطل بھی ہو اور نام اللہ بھی ہو؟ نہیں سنا۔ تو یہ دنیا میں ایک ہی ہے

جس کا نام اللہ ہے۔ نہ کوئی اللہ کے نام جیسا ہے، نہ کوئی اللہ کی صفات جیسا ہے، اللہ پاک

کا نام بھی جدا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات بھی جدا ہیں۔

**بعث بعد الموت برحق ہے:**

﴿وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ إِذَا مَا مِثُّ لَسَوْفَ أُخْرِجُ حَيًّا ۝۱۶﴾

الْإِنْسَانُ أَنَا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكْ شَيْئًا ۝۱۷﴾

اگلی بات اللہ پاک نے یہ بھی فرمائی ہے کہ تعجب اس بات پر ہے کہ بندہ پھر

بھی کہتا ہے کہ اگر میں مر گیا تو کیا میں دوبارہ زندہ ہوں گا؟ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھول

گیا ہے کہ ہم نے اس کو پیدا کیا جب یہ کچھ بھی نہیں تھا، جب کچھ ہے تو پھر دوبارہ پیدا

کرنا کیا مشکل ہے؟ اللہ تو ”بدیع السماوات والارض“ ذات ہے۔ بدیع کہتے ہیں کہ جس

کے پاس کوئی ماڈل نہ ہو پھر بنائے۔ اگر کوئی ماڈل پہلے سے موجود ہو تو پھر بنانا آسان ہوتا

ہے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ تم کچھ نہ تھے ہم نے پھر بنادیا، اب ان کو تعجب ہوتا ہے کہ اللہ

ہمیں دوبارہ کیسے بنائے گا؟

﴿فَوَدَّ بَكَ لَخَشَرْتَهُمْ وَالشَّيْطَانِ ثُمَّ لَنُخْصِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا﴾

فرمایا: تم سن لو کہ ہم تمہیں بھی اٹھائیں گے اور شیطان کو بھی اٹھائیں گے۔ قیامت کے دن وہ بھی آئے گا، قیامت کے دن تم بھی آؤ گے، سارے انسان چاہے وہ نیک ہیں یا برے ہیں یہ سب کے سب قیامت کے دن آئیں گے، اور یہاں اللہ نے اپنا فیصلہ فرمادیا ہے کہ تم یاد رکھ لو، براہو یا اچھا ﴿وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا﴾ اللہ کا وعدہ ہے کہ ہر بندے نے جہنم کے اوپر سے گزرنا ہے، میدانِ محشر اور جنت کے درمیان جہنم ہے، ہاں فرق اتنا ہو گا کہ کوئی ایسے گزرے گا جس طرح ابراہیم علیہ السلام نمرود کی آگ سے گزرے اور کوئی اس میں گرے گا اپنے گناہوں کی سزا بھگتے گا اور پھر جنت میں جائے گا اور کوئی ایسے گزرے گا کہ گرے گا پھر وہیں رہ جائے گا اور جنت میں جانے کی اس کو توفیق نہیں ہوگی۔

### پلی صراط سے گزرنے والوں کی تین اقسام:

اب یوں سمجھو کہ تین قسم کے لوگ ہوں گے:

[۱]: بعض لوگ ایسے ہوں گے کہ جنہوں نے جہنم سے گزرنا ہے اپنے اعمال کے حساب سے۔ کوئی بہت زیادہ رفتار سے، کوئی آہستہ، لیکن گزرنا ضرور ہے۔ لیکن جو صلحاء ہوں گے وہ جہنم کے اوپر سے گزر رہے ہوں گے تو ٹھنڈک محسوس کریں گے اور جہنم کی گرمی انہیں محسوس تک نہیں ہوگی۔ صرف جہنم کا مشاہدہ کر کے جانا ہے۔

[۲]: اور جو مسلمان ہیں اور فاسق ہیں وہ جہنم میں جائیں گے، وہاں کچھ عرصہ رہیں گے اور نکل جائیں گے۔ اللہ ہمیں کچھ عرصے کے لیے جانے سے بھی محفوظ فرمائے۔

[۳]: کافر جہنم میں جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے جائیں گے اور پھر کبھی بھی اس



جہنم سے نکل نہیں سکیں گے۔

### ایمان کی قدر کیجیے!

اللہ کی قسم ایمان جیسا بھی ہو بہت بڑی نعمت ہے، مسلمان جیسا بھی ہو دنیا کے اربوں کافروں سے اچھا ہے، کبھی بھی کافر کو مسلمان سے اچھا نہ کہنا! قیامت کے دن جب کافر جہنم میں جائیں گے تو ایک وقت آئے گا کہ مسلمان فاسق بھی جہنم میں اور کافر بھی جہنم میں ہوں گے۔ کافر مسلمانوں کو یہ طعنہ دیں گے کہ تم ہمیں کہتے تھے کہ تم کافر ہو اس لیے جہنم میں جلو گے لیکن یہاں جہنم میں تو تم بھی پڑے ہو، تمہارے کلمہ کا تمہیں کیا فائدہ ہوا؟ اس وقت اللہ کی غیرت کو جوش آئے گا، اللہ فرشتے کو حکم دیں گے کہ جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان موجود ہو گا اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں لے آؤ۔ قرآن کہتا ہے: ﴿رُبَّمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ﴾<sup>135</sup>

اس وقت کافر کہیں گے کہ اے کاش! ہم بھی دنیا میں مسلمان ہوتے، لیکن آج کاش کہنے سے کچھ نہیں بنے گا۔ دنیا میں انسان کلمہ پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے اور جو شخص مسلمان ہو۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں۔ کہ اس کی حوصلہ شکنی نہ کیا کرو، اس کی حوصلہ افزائی کرو، مسلمان جیسا بھی ہو اس کو سینے سے لگاؤ، اس کو دور نہ کرو، مسلمانوں کی کمزوریوں پر پردہ ڈالو، کمزوریوں کو ظاہر نہ کرو، کوئی عیب نظر آ جائے تو اس کو چھپانے کی کوشش کرو اور اپنے بارے میں ذہن بناؤ کہ اس کا ایک عیب مجھے پتا چلا ہے لیکن میرے دس ہیں جو اللہ نے چھپا کر رکھے ہیں۔ اگر میرے عیب کھل گئے تو بتاؤ میرا کیا بنے گا؟ یہ بات ہمیں ضرور سوچنی چاہیے۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

## مسلمان اور کافر کے جہنم میں جانے میں فرق:

ایک چھوٹی سی بات سمجھ لیں کہ جہنم میں کافر بھی جائے گا اور اگر مسلمان فاسق ہو تو وہ بھی جائے گا۔ تو دونوں میں کیا فرق ہے؟ فرق یہ ہے کہ کافر کو اللہ جہنم کا میں بھیجیں گے ذلیل کرنے کے لیے اور مسلمان کو اللہ بھیجیں گے لیکن پاک کرنے کے لیے۔ ذلیل کرنا اور ہے اور پاک کرنا اور ہے۔ یہ جو اس پر گناہوں کی نجاست تھی یہ توبہ کر کے اس کو پاک نہیں کر سکا تو اس کے لیے خدا نے جہنم کی آگ رکھی ہے کہ اس سے پاک کر کے پھر جنت میں بھیج دیں گے۔ لیکن کفر کی نجاست ایسی ہے کہ وہ جہنم کی آگ سے بھی پاک نہیں ہوگی۔

تو میں سمجھا یہ رہا تھا کہ جہنم میں تو فاسق مؤمن بھی جائے گا لیکن وہ پاک ہو گا تو نکل جائے گا اور کافر نے جو منہ سے کفر کی نجاست نکالی ہے یہ اتنی گندی نجاست ہے کہ اس کو پوری جہنم بھی پاک نہیں کر سکتی۔ عام طور پر اگر نجاست آگ میں گرے تو آگ نجاست کو ختم کر دیتی ہے لیکن کفر اور شرک ایسی نجاست ہے کہ اس کو جہنم کی آگ بھی پاک نہیں کر سکتی۔ یہ ناپاک اسی میں پڑا رہے گا۔ مسلمان جیسا بھی ہے یہ پھر بھی مسلمان ہے، اس نے ان شاء اللہ جنت میں جانا ہے۔ اللہ ہم سب کو جنت میں لے جائیں۔

## شرک کی قباحت:

آگے اللہ رب العزت نے فرمایا کہ بعض لوگ شرک کرتے ہیں اور شرک اتنا بڑا جرم ہے کہ ﴿تَكَادُ السَّمُوتُ يَتَفَطَّرُونَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا﴾ ۱؎ اَنْ دَعَوِ الْذِّكْرَ حَنِیْ وَلَکَآ ۱؎ ﴿﴾ جب یہ مشرک اپنی زبان سے خدا کے لیے بیٹا کہتا ہے، خدا کی بیٹیاں کہتا ہے، خدا کے ساتھ شرک کرتا ہے تو آسمان پھٹنے

لگتا ہے، زمین ٹوٹے لگتی ہے، پہاڑ گرنے لگتے ہیں میں اللہ ان کو تھام لیتا ہوں۔

اور کمال یہ ہے کہ مشرک ایک مرتبہ کہتا ہے کہ اللہ! میری توبہ، میں اب شرک نہیں کروں گا تو اللہ سب صاف فرمادیتے ہیں۔ جرم اتنا بڑا ہے اور عنایت اتنی بڑی ہے تو بندہ سوچ سکتا ہے! بس ہمارے آنے کی دیر ہے، اللہ کے ہاں معافی میں کوئی دیر نہیں ہے۔

### اہل ایمان کے لیے محبوبیت عامہ:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا ۝﴾

جو آدمی ایمان لائے، عقیدہ اس کا ٹھیک ہو، اعمال سنت کے مطابق ہوں تو اللہ اس کے لیے محبت کی ہوائیں چلا دیتے ہیں۔ میں اس سے آسان اور عام فہم ترجمہ نہیں کر سکتا۔ حدیث پاک میں ہے کہ جب اللہ اس سے پیار کرتے ہیں تو جبرائیل امین علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ فلاں بندے سے مجھے بہت پیار ہے، جبرائیل فرشتوں سے کہتے ہیں کہ اللہ کو اس بندے سے بہت پیار ہے۔ فرشتے آگے اعلان کرتے ہیں۔ وہ اعلان چلتے چلتے زمین والوں تک آتا ہے۔ پھر اس نیک بندے سے سارے زمین والے پیار کرتے ہیں۔

اور حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا بھی مانگی ہے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم بھی اس دعا کو مانگا کریں، عربی یاد نہ ہو سکے تو اردو ترجمہ سے مانگیں، اردو میں بھی نہ ہو سکے تو پنجابی میں مانگ لیا کریں، وہ دعا یہ ہے:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ شَكُوْرًا وَّاجْعَلْنِيْ صَبُوْرًا وَّاجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَّفِيْ اَعْيُنِ

النَّاسِ كَبِيْرًا"۔<sup>136</sup>

اے اللہ! مجھے اپنی نعمتوں پر شکر کرنے والا بنادے، اے اللہ! مجھے صبر کرنے والا بنادے، مجھے میری آنکھ میں چھوٹا کر دے اور لوگوں کی آنکھ میں بڑا کر دے۔ بندہ خود کو بڑا سمجھے تو یہ جرم ہے اور خود کو چھوٹا سمجھے اور دوسرے اس کو بڑا سمجھیں تو یہ اللہ کی نعمت ہے۔ اللہ ہم سب کو ایسا ہی بنادیں، یہ اللہ کی نعمت ہے۔

### آیت پر ایک شبہ اور اس کا جواب:

میں آخری بات سنا کر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔ یہ جو ہم نے آیت پڑھی ہے کہ جس کا عقیدہ ٹھیک ہو اور اعمال بھی اس کے سنت کے مطابق ہوں تو اللہ لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت پیدا فرمادیتے ہیں۔ بعض کو اس آیت پر شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے کتنے لوگ دیکھے ہیں کہ ان کا عقیدہ بھی ٹھیک ہے، عمل بھی سنت کے مطابق ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ ان سے پیار نہیں کرتے، تو کیا یہ آیت غلط ہے؟

جواب یہ ہے کہ آیت تو ٹھیک ہے لیکن ہمیں سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ اس کا ایک معنی علامہ نسفی رحمہ اللہ نے تفسیر مدارک میں لکھا ہے کہ ایسا ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت مؤمن کے لیے ترتیب یوں بنادیتے ہیں کہ مؤمن کی نیک لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا فرمادیتے ہیں تو وہ اس سے پیار کرتے ہیں اور جو فجار اور نیک نہیں ہوتے ان کے دلوں میں محبت نہیں ہوتی بلکہ اس نیک آدمی کا رعب بٹھا دیتے ہیں، وہ اس کو چھیڑتے نہیں ہیں۔ اگر چھیڑیں تو بھی ڈرتے ہیں، ان کو پتا ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ کچھ ہونا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کافر چھیڑتے تھے لیکن کافروں کو پتا تھا کہ اس چھیڑ کا کچھ نتیجہ نکلتا ہے۔ اللہ ہم سب کو ایسا بنادیں، اللہ ہم سب کو نیک بنادیں، اللہ ہمارے عقائد کو درست بنادیں اور اللہ ہم سب کو قرآن کریم کی خدمت کے لیے قبول فرمائیں۔ (آمین)

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة طہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿طه﴾ مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ ﴿١﴾ إِلَّا تَذِكْرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ ﴿٢﴾ تَنْزِيلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمُوتِ الْعُلَىٰ ﴿٣﴾ الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ ﴿٤﴾ لَهُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرَىٰ ﴿٥﴾ وَإِنْ تَجَهَّزْ بِالنُّقُولِ فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَىٰ ﴿٦﴾ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ﴿٧﴾

### حروف مقطعات:

﴿طه﴾ حروف مقطعات میں سے ہے۔ حروف؛ حرف کی جمع ہے، مقطعات؛ قطع سے بنا ہے۔ حروف مقطعات کا معنی ہے وہ حروف جن کو کاٹ کر الگ الگ پڑھا جائے جیسے ﴿السم﴾ کو الف... لام... میم... الگ پڑھتے ہیں، ﴿طه﴾ کو بھی طا... ہا... الگ الگ پڑھتے ہیں اس لیے ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں۔ ان حروف کا معنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ اگر اللہ رب العزت نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ کا معنی بتایا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو نہیں بتایا۔ قرآن مجید کے جن حروف کا معنی اللہ اور اس کے رسول صلی

اللہ علیہ وسلم نہ بتائیں ان کی کھود کرید میں نہیں پڑنا چاہیے۔

میں مختصر آگہتا ہوں کہ بہت سارے مفسرین حضرات یہ بات فرماتے ہیں کہ طاسے مراد یہ ہے اور ہاسے مراد یہ ہے اور بالآخر وہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ اس کا معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہے۔ جب اصل معنی ہی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں تو بہت سارے معانی آپ حضرات کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جب ﴿طٰه﴾ اور ان جیسے حروفِ مقطعات کے معنی معلوم نہیں تو پھر ان کو قرآن مجید میں ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ تو یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ افراد دو قسم کے ہیں: ایک قسم اہل علم کی ہے اور ایک قسم غیر اہل علم کی ہے۔ علماء کا امتحان الگ ہوتا ہے اور غیر علماء کا امتحان الگ ہوتا ہے۔ ہر آدمی کا امتحان اس کی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ غیر عالم کا امتحان اور ابتلاء یہ ہے کہ تم پڑھو! اس کی پڑھنے سے جان جاتی ہے، یہ مشکل ہے اس کے لیے اور علماء جو پڑھنے سے خوش ہوتے ہیں تو ان کی اس سے جان جاتی ہے کہ تم فلاں چیز نہ پڑھو! تو اللہ تعالیٰ نے غیر عالم کا امتحان اس میں رکھا ہے کہ یہ قرآن کے معنی سیکھتے ہیں یا نہیں اور عالم کا امتحان اس میں ہے کہ جن الفاظ کے معنی میں نے نہیں بتائے تو یہ ان کی تلاش میں پڑتے ہیں یا نہیں؟ اس لیے فرمایا: ﴿طٰه﴾ کہ عالم رک جائے، یہی اس کی شان ہے کہ جن آیات کے معانی غیر واضح ہیں اور انسانی عقل وہاں تک نہیں پہنچ سکتی ان آیات میں کھود کرید کیے بغیر ان کا معنی اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔

قرآن مجید میں ہے کہ آیات دو قسم کی ہیں: ایک محکمات اور دوسری متشابہات۔ متشابہات کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ

اَفْتِنَتْهٖ وَابْتِغَاءَ تَاْوِيلِهٖ ۚ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَ الرَّسُوْلُوْنَ فِي الْعِلْمِ  
يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلُّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُو الْاَلْبَابِ ﴿١٣٧﴾

کہ جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ پن ہے وہ فتنہ پھیلانے کے لیے ان  
متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کی تاویلات کرنے میں لگے رہتے ہیں  
حالانکہ ان آیتوں کا صحیح صحیح مطلب اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور جو پختہ کار اہل علم  
ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لاتے ہیں۔

تو ہم بھی ایمان لاتے ہیں کہ ﴿طہ﴾ کا معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم  
نہیں۔ لہذا ہم اس میں کوئی بحث و کرید نہیں کرتے۔

## آیات کا شان نزول:

﴿مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقٰی﴾

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں جب قرآن مجید کا نزول شروع ہوا تو  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تہجد میں قرآن مجید کی تلاوت اتنی فرماتے کہ بسا اوقات  
مسلسل قیام کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پر ورم آجاتا۔ حدیث  
مبارک میں ہے:

حَتّٰی تَوَرَّمَتْ قَدَمَاۤءُ. 138

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پر ورم آجاتا اور سوج جاتے۔  
مشرکین نے اس پر جملے کسنا شروع کر دیے۔ انہوں نے کہا کہ ان پر قرآن  
کیا اترا پوری مصیبت آگئی، اچھا خاصا رات کو سوتے تھے اب پوری رات جاگتے ہیں۔ تو

اللہ نے فرمایا:

﴿مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ ۖ إِلَّا تَذَكُّرًا لِّمَن يَخْشَىٰ ۖ﴾

اے میرے پیغمبر! ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ آپ مشقت میں مبتلا ہو جائیں اور مشقت میں پڑ جائیں۔ تمام رات بیدار رہنے اور تلاوت میں مشغول رہنے کی ضرورت نہیں۔ اور ان کو کیا پتا کہ مشقت کیا ہوتی ہے، یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری مشقت کو دیکھتے ہیں کہ آپ آنسو بہا رہے ہیں، آپ کے پاؤں مبارک سوچ رہے ہیں، پوری پوری رات آپ قیام کر رہے ہیں لیکن جو راحت ہم آپ کے قلب کو دیتے ہیں اس راحت کا انہیں اندازہ ہی نہیں اور ان کو پتا ہی نہیں کہ اس میں کیا مزہ آ رہا ہے!

میں آپ کو آسان مثال دیتا ہوں کہ گرمی کا موسم ہے، حاجی نے صرف دو چادریں پہنی ہوئی ہیں، اس کے علاوہ کوئی دوسرا کپڑا نہیں ہے، نہ تیل لگا سکتا ہے اور نہ خوشبو لگا سکتا ہے، جسم میں جویں پڑیں تو ان کو باہر نہیں نکال سکتا اور کھلے میدان میں پڑا ہوا ہو تو لوگ دیکھ کر تو یہی سمجھیں گے کہ یہ شخص کتنی مشقت میں ہے لیکن اس حاجی سے پوچھو کہ اس کو مزہ کتنا آ رہا ہے، اس کو کیا لطف آ رہا ہے۔ تو قرآن کریم رات کو پڑھنے میں کیا مزہ آتا ہے یہ تو اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی جانتے ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِلَّا تَذَكُّرًا لِّمَن يَخْشَىٰ﴾ یہ قرآن کریم تو نصیحت ہے ان کے لیے جو اللہ سے ڈریں، یہ مشرکین نہ تو اللہ سے ڈرتے ہیں اور نہ قرآن کریم کے قریب آتے ہیں تو ان کو کیسے سمجھ میں آئے گا کہ قرآن کریم میں کیا ہے۔

**حضور علیہ السلام کی رات کی عبادت:**

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابتدا میں بڑا لمبا قیام فرماتے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی آیت نازل فرمائی:



139 قَلِيلًا

جو میرے طریقے سے روگردانی کرے وہ مجھ سے نہیں:

139- المنزل مل 73:1 تا 3

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بات سنی تو ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں تمہاری بنسبت اللہ سے زیادہ ڈرتا ہوں لیکن میری حالت یہ ہے کہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں اور شادی بھی کرتا ہوں۔ لہذا جو شخص میرے اس طریقے سے روگردانی کرے تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔<sup>140</sup>

### اصل زندگی راہِ اعتدال ہے:

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ بات سمجھائی کہ اس کا معنی یہ نہیں کہ جو چھوٹا ہے وہ مسلسل روزے رکھے، بلکہ فرمایا کہ اعتدال کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرو، نفل بھی پڑھو اور آرام بھی کرو، روزے بھی رکھو اور افطار بھی کرو، جو انسان اعتدال کی زندگی گزارتا ہے تو وہ کبھی پریشان نہیں ہوتا اور ٹینشن کا شکار بھی نہیں ہوتا۔ اگر کبھی پریشان ہو بھی جائے تو کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہو، کسی کو مستقل اپنا شیخ بنایا ہو اور اس سے رابطہ بھی رکھا ہو تو ان کو بتائے کہ میرے گھر میں یہ مسئلہ ہے، وہ اس کو کوئی آیت بتائے یا ترتیب بتائے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور اگر اس سے مسئلہ حل نہ بھی ہو تب بھی آدمی کو ذہنی سکون ہوتا ہے کہ اللہ کا شکر ہے کہ میں اپنے کام میں لگا ہوا ہوں، ورنہ آدمی پریشانیوں کا شکار رہتا ہے۔

خیر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے قرآن مجید مشقت کے لیے نازل نہیں کیا، نصیحت کے لیے نازل کیا ہے۔

### آسمان و زمین کی اشیاء کا علم اللہ ہی کے پاس ہے:

﴿تَذَرِلَّا مِمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمُوتِ الْعُلَى﴾

یہ قرآن مجید اس ذات کی طرف سے نازل کردہ ہے جس نے زمین اور بلند و بالا آسمان پیدا کیے۔

﴿الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى ۝﴾

اور رحمن عرش پر مستوی ہے۔ اس مسئلہ پر میں بعد میں بات کروں گا۔

﴿لَهُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرَى ۝﴾

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور جو کچھ زمین کی تہہ کے نیچے ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کا ہے۔ لوگ نہ آسمانوں کی بلندی کو معلوم کر سکتے ہیں اور نہ زمین کے نیچے کے حالات کو معلوم کر سکتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں لکھا ہے کہ لوگوں نے تحقیقات کی ہیں کہ زمین کے نیچے کیا ہے، انہوں نے نیچے جانے کی کوشش کی ہے، چھ میل تک گئے ہیں اس سے آگے ان کے آلات کام نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے نیچے مستقل چٹان ہے جو ٹوٹی نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کے نیچے کیا ہے وہ تم نہیں جانتے، میں جانتا ہوں، میرے علم کا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔

جامع الترمذی کی روایت میں ہے۔ میں ان شاء اللہ آگے چل کر اسے دلیل کے طور پر بھی پیش کروں گا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَوْ أَنَّكُمْ دَلَّيْتُمْ بِحَبْلِ إِلَى الْأَرْضِ السُّفْلَى لَهَبَطَ عَلَى اللَّهِ.<sup>141</sup>

اگر تم ایک ڈول رسی سے باندھ کر نیچے لٹکاؤ اور وہ رسی نیچلی زمین یعنی تحت الثریٰ تک جائے تو وہ بھی ایسے ہوگی جیسے اللہ کے بالکل پاس پڑی ہو، اللہ سے وہ رسی

بھی دور نہ ہوگی جو ساتویں زمین تک چلی گئی ہے۔

## سِرّ اور اخفی میں فرق:

﴿وَإِنْ تَجْهَرُوا بِالْقَوْلِ فَيَنْتَهُ يَغْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى﴾

اللہ کو بہت اونچا پکارنے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تو آہستہ بات بھی سنتے ہیں اور مزید آہستہ بھی سنتے ہیں۔ یہاں دو لفظ استعمال فرمائے ہیں ایک ہے لفظ ”سِرّ“ اور دوسرا ہے لفظ ”أَخْفَى“۔ سِرّ کا معنی ہے خفی، پوشیدہ اور اخفی کا معنی ہے بہت زیادہ پوشیدہ۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ ”سِرّ“ اس پوشیدہ کو کہتے ہیں جو بندے کے دل میں ہو اور ”أَخْفَى“ اس پوشیدہ کو کہتے ہیں جو بندے کے دل میں آنا ہے لیکن ابھی تک نہیں آیا۔ ایک تو ہمارے دل میں ہے نامثلاً جب ہم درس قرآن سے فارغ ہوں گے تو میں نے کہاں جانا ہے، آپ نے کہاں جانا ہے یہ ہمارے دماغ و سوچ میں ہے، اس کو سر کہتے ہیں اور اخفی کہتے ہیں کہ کل ہم نے مزید دل میں کیا سوچنا ہے یہ ہمیں پتہ نہیں، تو آج جو تمہارے دل میں ہے اللہ تعالیٰ اس راز کو بھی جانتے ہیں اور آئندہ تمہارے دل نے جو راز سوچنا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتے ہیں۔

﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى﴾

اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور اللہ کے لیے بہت اچھے اچھے، پیارے پیارے نام ہیں۔

## استواء علی العرش متشابہات میں سے ہے:

میں ان آیات میں سے آج آپ کی خدمت میں دو آیتیں پیش کروں گا۔ یہ دو اہم آیتیں ہیں اور ان کا تعلق عقائد سے ہے۔ پہلی آیت ہے:

﴿الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى﴾

اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک اور مذہب یہ ہے کہ یہ آیت متشابہات میں سے ہے۔ متشابہات کی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم یہ ہے کہ جو لفظ قرآن میں استعمال ہوا ہے اس کا معنی بھی معلوم نہ ہو اور مراد بھی معلوم نہ ہو۔ جیسے لفظ ”طا“۔ اب حرف ”طا“ کا عربی میں کوئی معنی نہیں اور حرف ”ھا“ کا بھی کوئی معنی نہیں۔ جب حروف کو آپس میں جوڑا جاتا ہے تب ان کا معنی بنتا ہے۔ آپ کہتے ہیں: الف... ب... ت... ث...۔ الف کا کوئی معنی نہیں لیکن جب الف کو لام اور ہ سے جوڑیں گے تو لفظ ”اللہ“ بنے گا۔ اب اس کا معنی بھی ہو گا۔ تو ”طا“ کا معنی بھی معلوم نہیں اور مراد بھی معلوم نہیں۔

متشابہات کی دوسری قسم یہ ہے کہ اس لفظ کا عربی میں معنی تو معلوم ہے لیکن قرآن میں اس کا مطلب کیا ہے یہ معلوم نہیں، جیسے ﴿الرَّحْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ ہے کہ رحمن عرش پر مستوی ہے۔ اب رحمن کا معنی ہے بڑا مہربان، ”علی“ کا معنی ہے پر، عرش کا معنی ہے ”تخت“، استوی کا معنی ہے مستقر بنانا، لیکن یہاں قرآن مجید میں ﴿الرَّحْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ کی مراد معلوم نہیں ہے۔ تو پھر ان آیات کا مطلب کیا ہے؟

### اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف:

اس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات موجود بلا مکان ہے، اب موجود بلا مکان کو سمجھانے کے لیے ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ ”اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے“۔ اللہ تعالیٰ جگہ سے پاک بھی ہیں اور ہر جگہ پر بھی ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ چھ جہات سے پاک بھی ہیں اور چھ جہات کو محیط بھی ہیں۔ کیا معنی؟ ایک اوپر کی جہت ہے فوق، ایک نیچے کی جہت ہے تحت، آگے کی جہت ہے قدام، پیچھے کی

جہت ہے خُلف، دائیں کی ہے جہت یمن اور بائیں کی جہت ہے شَمال۔ اللہ تعالیٰ ان چھ جہات سے پاک بھی ہیں اور ان جہات کو محیط بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عجیب شان ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق بعض باتیں ایسی ہیں کہ اگر میں وہ آپ کے سامنے ذکر بھی کروں گا تو آپ سمجھ نہیں پائیں گے، ان کو سمجھنا آپ کے بس میں نہیں ہے۔ وہ اتنی اوپر کی باتیں ہوتی ہیں کہ عام عالم نہیں سمجھ سکتا تو عوام ان کو کیسے سمجھیں گے۔ بڑا مشکل کام ہے۔ میں ان موضوعات کو نہیں چھیڑتا۔ میں موٹی موٹی باتیں عرض کرتا ہوں۔

### ”اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے“ کی وضاحت:

ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے اور ہر جگہ سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ جگہ سے پاک ہیں، موجود بلا مکان ہیں، اللہ تعالیٰ کو اپنے وجود کے لیے کسی جگہ کو اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ دیکھتے ہیں ہم بھی دیکھتے ہیں لیکن ہم میں سے کوئی ایسا بندہ ہے جس کی آنکھ نہ ہو پھر بھی دیکھے؟ کوئی ایسا بندہ نہیں ہے۔ اللہ پاک دیکھتے ہیں لیکن آنکھ سے پاک ہیں، اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے لیے آنکھ کی ضرورت نہیں ہے، ہم پکڑتے ہیں لیکن پکڑیں گے تب جب ہاتھ ہو گا، ہاتھ نہیں ہو گا تو کیسے پکڑیں گے؟ اللہ تعالیٰ بندے کو پکڑتے ہیں: ﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ﴾ لیکن اللہ تعالیٰ ہاتھ سے پاک ہے، اللہ کی پکڑ بہت سخت ہے۔ ہم سنتے ہیں کان سے، کسی بندے کے کان ہی نہ ہوں پھر سننے ایسا نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ سننے میں کان کے محتاج نہیں ہیں۔ ہم بولتے ہیں جب زبان ہو، کسی کی زبان کاٹ کر پھینک دو تو وہ بول نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ بولنے میں زبان کے محتاج نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ صد اور بے نیاز ذات ہے۔ صد کہتے ہیں:

”الَّذِي لَا يَحْتَاجُ إِلَى أَحَدٍ وَلَا يَحْتَأُجُ إِلَيْهِ كُلُّ أَحَدٍ“

کہ کائنات میں وہ کسی چیز کا محتاج نہ ہو اور کائنات کا ہر ذرہ اس کا محتاج ہو۔ صد

کا آسان ترجمہ ”بے نیاز“ کر دیا جاتا ہے تاکہ لوگ سمجھ جائیں، لمبا ترجمہ عام بندہ سنبھال نہیں سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ موجود ہے، یہ ہمارا عقیدہ ہے۔

بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر نہیں بلکہ عرش پر ہیں اور ان کی دلیل یہی آیت ﴿الْمَرْحَمُنْ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى﴾ اور اس جیسی دیگر آیات ہیں۔ تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو جی! اللہ تعالیٰ کہہ رہے ہیں کہ میں عرش پر مستوی ہوں اور آپ کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ عرش پر نہیں ہے؟

### اللہ تعالیٰ کے ہر جگہ ہونے کے دلائل:

ہمارا اصل السنۃ والجماعۃ کا مسلک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے۔ پہلے اس کے دلائل ذہن نشین فرمائیں:

[1]: قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَآیْنَ مَا تَوَلَّوْا فَجْهَ اللّٰهِ ۚ﴾<sup>142</sup>

مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی اللہ کا ہے، تم جدھر بھی رخ کرو گے ادھر اللہ کی ذات ہے۔

تو اللہ کی ذات ہر طرف ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آگیا ہے۔

[2]: سورۃ المجادلۃ میں ہے:

﴿مَا يَكُونُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلَاثَةٍ اِلَّا هُوَ رَاٰهُمْ وَاَبْعَهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰی مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرُ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَ مَا كَانُوا﴾<sup>143</sup>

اگر تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہوتی ہے تو چوتھا اللہ ہوتا ہے، پانچ

آدمیوں میں ہو تو چھٹا اللہ ہوتا ہے، اور سرگوشی کرنے والے اس سے کم ہوں یا زیادہ ہوں، وہ جہاں کہیں بھی ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔

[3]: ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ﴾<sup>144</sup>

اگر آپ سے میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں کہ اللہ کہاں ہے؟ تو آپ نے کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ قریب ہے، اور کتنا قریب ہے؟ فرمایا:

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾<sup>145</sup>

ہم بندے کی شہ رگ سے زیادہ اس کے قریب ہیں۔

اس آیت کو سمجھانے کے لیے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ جب کاغذ کاغذ کے ساتھ جڑتا ہے تو بیچ میں گوند کا واسطہ ہوتا ہے لیکن گوند کاغذ کے ساتھ جڑی ہے تو اس میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اسی طرح انسان اور اس کی شہ رگ اللہ تعالیٰ کے واسطے سے ملتے ہیں۔ بندہ اور اس کی شہ رگ کے درمیان واسطہ اللہ کی ذات کا ہے۔ تو گویا انسان اور اس کی شہ رگ واسطے سے ملے ہیں اور اللہ تعالیٰ انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے کیونکہ درمیان میں کسی چیز کا واسطہ نہیں۔<sup>146</sup>

[4]: ﴿عَاَمِنْتُمْ مِّنَ السَّمَاءِ﴾<sup>147</sup>

کیا تم اس اللہ سے نہیں ڈرتے جو آسمانوں میں ہے۔

144۔ البقرة: 2: 186

145۔ ق: 50: 16

146۔ خطبات حکیم الامت: ج 17 ص 431 عنوان: اقریبیت کا مفہوم

147۔ الملک: 67: 16



[5]: ﴿وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ﴾<sup>148</sup>

اور وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی ہے۔

تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے۔

میں نے آپ کے سامنے پانچ آیتیں پیش کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ مشرق میں بھی ہے، مغرب میں بھی ہے، اللہ تعالیٰ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی ہے یعنی ہر جگہ پر ہے۔

**اللہ کو صرف عرش پر ماننے والوں کی پہلی دلیل:**

جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر نہیں، صرف عرش پر ہے وہ دلیل میں آیت ﴿اَللّٰهُ حَمْدٌ عَلٰی اَنْعَرَشِ اَسْتَوٰی﴾ پیش کرتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے۔

**اس دلیل کا جواب:**

ہم کہتے ہیں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے تو یہ ہمارے خلاف نہیں ہے، اس لیے کہ ہم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے، عرش پر بھی ہے فرش پر بھی ہے۔ آپ کی پیش کردہ دلیل سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے لیکن یہ تو ثابت نہیں ہوا کہ اس کے علاوہ کہیں اور نہیں ہے۔ جب آپ ساری آیتیں ملائیں گے کہ اللہ تعالیٰ مشرق و مغرب میں بھی ہے، آسمانوں اور زمین میں بھی ہے، شہ رگ سے زیادہ قریب بھی ہے اور عرش پر بھی ہے تو یہ ہمارے حق میں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ آپ کے عقیدے کے خلاف کئی آیتیں موجود ہیں جس میں

ہے کہ اللہ آسمان میں ہے، زمین میں ہے، اللہ تعالیٰ شہ رگ سے زیادہ قریب بھی ہے، مشرق میں ہے، مغرب میں ہے وغیرہ لیکن ہمارے عقیدے کے خلاف پورے قرآن مجید میں کوئی آیت موجود نہیں ہے۔ میں اس لیے آپ سے عرض کرتا ہوں کہ آپ دل بڑا رکھائیں، ہمارے مسلک کے خلاف قرآن مجید میں کوئی آیت بھی نہیں ہے، ہمارے مسلک کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث مبارک نہیں ہے، اس لیے آپ گھبراہٹ نہ کریں۔

اب یہ جو آیت ہے: ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ ہم کہتے ہیں کہ اس کا معنی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے، اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ اللہ عرش پر ہے۔ اور اگر اس آیت کا معنی وہ کر بھی دیں جو یہ لوگ کرتے ہیں کہ ”خدا عرش پر ہے“ تو ہمارے خلاف پھر بھی نہیں ہوگی۔ اس لیے ہم یہ بات عرض کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ موجود ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صرف عرش پر ہے تو وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾، آپ اس کا جواب سمجھ گئے ہیں؟ (جی ہاں، سامعین) دیکھیں! اگر اس آیت کا معنی یہ کریں کہ ”اللہ تعالیٰ صرف عرش پر ہے“ تو پھر اس معنی کے خلاف دوسری آیتیں بھی ہیں مثلاً اللہ مشرق میں بھی ہے، مغرب میں بھی ہے، آسمانوں میں بھی ہے، تمہارے ساتھ بھی ہے، شہ رگ سے زیادہ قریب بھی ہے۔ تو یہ ساری آیات اس آیت ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ کے خلاف ہو جائیں گی نا؟ حالانکہ قرآن میں اختلاف نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَوْ كَانَ

149 ﴿۱۴۹﴾ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اِخْتِلَافًا کَثِیْرًا﴾

کہ اگر قرآن کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں کئی اختلاف ہوتے۔  
یعنی اگر قرآن میں اختلاف آجائے تو سمجھو کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف  
سے نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، دلیل اس کی یہ  
ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اس لیے آپ ساری آیتیں ملائیں گے تو نتیجہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر  
جگہ پر ہے۔ اس لیے اس آیت کا یہ معنی کرنا کہ صرف عرش پر ہے، بالکل غلط ہے۔  
اگر معنی ”عرش پر“ کر لیں تو پھر شاید کوئی بات بنے لیکن ”صرف عرش پر“ معنی کرنا تو  
بالکل غلط ہے۔

### اللہ کو صرف عرش پر ماننے والوں کی دوسری دلیل:

ان لوگوں کی دوسری دلیل مسلم شریف کی حدیث ہے۔ اس کا نام حدیث  
جاریہ ہے۔ ”جاریہ“ باندی کو کہتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک صحابی حضرت معاویہ بن الحکم  
السلمی رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ  
یا رسول اللہ! میری ایک باندی تھی جو احد اور جوانیہ کی طرف میری بکریاں چرایا کرتی  
تھی، ایک دن میں اس جگہ گیا اور دیکھا کہ ایک بھیڑیا آگیا اور ایک بکری کو اٹھا کر لے  
گیا۔ میں بھی انسان ہوں، مجھے بھی غصہ آتا ہے۔ تو میں نے بہت زور سے اس کو تھپڑ  
مارا۔ صحابی خود فرماتے ہیں کہ جب یہ بات میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی تو آپ  
کو بہت زیادہ ناگوار گزری۔ میں نے محسوس کیا تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس  
کو آزاد کر دوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو لے آؤ۔ میں اس کو آپ  
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دو سوال  
کیے:

پہلا سوال یہ کیا: ”أَتَيْتَ اللَّهَ؟“ کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہیں؟ تو اس نے جواب دیا:

”فِي السَّمَاءِ“ کہ وہ آسمان میں ہیں۔

دوسرا سوال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا: ”مَنْ أَنَا؟“ کہ میں کون ہوں؟ تو اس نے جواب دیا: ”أَنْتَ رَسُولُ اللَّهِ“ آپ اللہ کے رسول ہیں۔  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَعْتَقَهَا فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ کہ اس کو آزاد کر دو، یہ مؤمنہ ہے۔<sup>150</sup>

تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ہر جگہ پر نہیں کیونکہ اس باندی نے یہ نہیں کہا کہ اللہ ہر جگہ پر ہے بلکہ اس نے کہا کہ اللہ آسمان میں ہے۔

### اس دلیل کا جواب:

پہلی بات یہ ہے کہ یہ آپ کی دلیل نہیں بنتی کیونکہ یہ آپ کے دعویٰ کے مطابق نہیں، آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے اور باندی نے کہا کہ اللہ آسمان میں ہے، تو آسمان بہت نیچے ہے، پھر اس کے اوپر سدرۃ المنتہی ہے، پھر کرسی ہے، پھر سمندر ہے، پھر عرش ہے۔ تو تمہارے دعوے کے مطابق یہ دلیل کیسے ہوئی؟ یہ دلیل تو ہماری بنتی ہے، کیوں کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے اور ہر جگہ میں آسمان بھی ہے۔ تو یہ ہماری دلیل ہے، تمہاری نہیں۔

### انسان مکلف بقدر عقل:

دوسری بات یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہے اس کو ہر بندہ سمجھ نہیں سکتا اور نہ ہر بندہ سمجھا سکتا ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ انسان مکلف بقدر عقل ہوتا ہے، جتنی اس کی عقل ہوتی ہے اللہ اتنا اس کو پابند کرتے ہیں، اس سے زیادہ اس کو پابند نہیں کرتے۔ اس پر حضرت تھانوی رحمۃ

اللہ علیہ نے دو مثالیں دی ہیں:

ایک مثال بنی اسرائیل کی دی ہے اور ایک مثال اب کے دور کی دی ہے اور دونوں مثالیں بڑی عجیب ہیں۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک شخص کے مرنے کا وقت قریب آگیا۔ جب اس کو اندازہ ہوا کہ اب میں زندہ نہیں رہ سکتا تو اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو بہت سی لکڑیاں جمع کر کے آگ جلاؤ اور مجھے اس میں ڈال دینا، میری لاش جلانے کے بعد ہڈیوں کو پیس لینا اور اس راکھ کو کسی گرم یا کسی تیز ہوا چلنے والے دن میں پانی میں بہا دینا۔ جب وہ فوت ہو گیا تو اس کے گھر والوں نے اس کی وصیت کے مطابق یہ کام کیا اور اس کی راکھ کو پانی میں بہا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بندے کے اعضاء کو جمع کیا اور اس سے پوچھا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس بندے نے کہا:

مِنْ خَشْيَتِكَ اے اللہ! تیرے ڈر کی وجہ سے ایسا کیا۔ تو خدا نے اس کو بخش

دیا۔<sup>151</sup>

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تو کفر ہے کہ کوئی بندہ یہ کہے کہ میرا جسم ہو گا تو اللہ عذاب دے گا اور اگر جسم نہیں ہو گا تو اللہ عذاب ہی نہیں دے گا۔ کیا اللہ عذاب دینے میں جسم کے پابند ہیں کہ جسم سالم ہے تو عذاب ہو گا، اگر جسم سالم نہیں ہے تو اللہ عذاب نہیں دے سکتا؟! اب یہ جو اس بندے نے کہا کہ مِنْ خَشْيَتِكَ اے اللہ! تیرے ڈر کی وجہ سے ایسا کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس شخص میں عقل ہی اتنی تھی، وہ سمجھتا تھا کہ جسم ہو تو اللہ عذاب دیتے ہیں، نہ ہو تو دیتے ہی نہیں اس

لیے اس کو ختم کر دو تا کہ اللہ مجھے عذاب ہی نہ دیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی عقل کے مطابق فیصلہ فرمایا اور فرمایا کہ میں نے تجھے بخش دیا۔

### حضرت تھانوی کی پیش کردہ مثال:

دوسری مثال حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عجیب دی۔ فرمایا کہ ایک مولوی صاحب نے ایک دیہات میں تقریر کی۔ اس نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بھی نہیں ہے، اللہ کی آنکھ بھی نہیں ہے، اللہ کا ناک بھی نہیں ہے، اللہ کا کان بھی نہیں ہے۔ اصل یہ ہوتا ہے کہ کس موقع پر جملہ کہنا کیسا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اللہ دیکھتا ہے لیکن بغیر آنکھ کے، اللہ آنکھ سے پاک ہے۔ اللہ سنتا ہے لیکن بغیر کان کے، اللہ کان سے پاک ہے۔ ان جملوں کا مفہوم بالکل الگ ہوتا ہے لیکن وہاں عوام بھی دیہات کی تھی اور مولوی صاحب بھی دیہات کا تھا۔ تو اس نے تقریر کی اور یہ جملے کہے کہ اللہ کا ہاتھ بھی نہیں ہے، اللہ کی آنکھ بھی نہیں ہے، اللہ کا ناک بھی نہیں ہے، اللہ کا کان بھی نہیں ہے تو ایک دیہاتی اس کی تقریر سن رہا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ اللہ ہے یا کوئی تریوزے۔ العیاذ باللہ۔ کہ نہ آنکھ ہے، نہ ناک ہے، نہ کان ہے کچھ بھی نہیں ہے، کیا یہ اللہ ہے؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس دیہاتی بندے کو کافر نہیں کہنا، کیوں کہ اس بچارے کی عقل ہی اتنی تھی۔ تو جتنی عقل ہو بندہ اتنا مکلف ہوتا ہے۔

### حدیث جاریہ کا مطلب از حضرت تھانوی:

اب حدیث جاریہ کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس باندی سے پوچھا ”أَيُّنَ اللّٰهُ؟“ کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہیں؟ اور اس نے جواب دیا: ”فِي السَّمَاءِ“ کہ اللہ آسمان میں ہیں۔ باندی کا یہ جواب واقع کے مطابق درست نہیں تھا لیکن وہ چونکہ باندی ہے، بدو عورت ہے، وہ اتنی بات کیسے سمجھائے کہ اللہ ہر جگہ پر ہے، اس پر وہ دلیل کہاں سے لائے؟ تو اس نے

اپنی عقل کے مطابق کہا کہ اللہ آسمان میں ہے، کیوں کہ جب ہر جگہ پر ہے تو آسمان میں بھی تو ہو گا نا!۔ یہ ایسے ہے جیسے آپ ایک چھوٹے بچے سے پوچھیں کہ اللہ تعالیٰ کدھر ہیں؟ وہ اوپر اشارہ کرتا ہے، کیونکہ بے چارہ سمجھ ہی اتنی رکھتا ہے۔ میں اس پر بھی ان شاء اللہ بات کروں گا کہ اوپر اشارہ کیوں کیے جاتے ہیں؟ تو اس باندی کا جواب اگرچہ واقع کے مطابق نہ تھا لیکن چونکہ اس کی عقل کے بقدر تھا اس لیے اس کا ایماندار ہونا تسلیم کر لیا گیا۔

یہ ان لوگوں کی دوسری دلیل تھی، ان کے پاس زیادہ دلائل نہیں ہیں۔

### اللہ تعالیٰ کو صرف عرش پر ماننے والوں کا ایک شبہ:

ان کے علاوہ یہ لوگ عقلی دلیلیں پیش کرتے ہیں، عقل سے ثابت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر نہیں ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ ہر جگہ پر ہے۔ اس نے کہا کہ یہ بتائیے کہ اللہ تعالیٰ بیت الخلاء میں بھی ہے؟ - العیاذ باللہ - اب اگر میں اس سے کہتا کہ اللہ تعالیٰ وہاں نہیں ہے پھر تو اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر نہ ہوئے، ہر جگہ ہونے کا دعویٰ ٹوٹ گیا اور اگر میں کہتا کہ - العیاذ باللہ - ہے تو یہ تو گستاخی ہے، ایک مسلمان کیسے کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بیت الخلاء میں ہے؟!

تو یہ لوگ ایسے سوال بناتے ہیں پھنسانے کے لیے تاکہ لوگ پھنس جائیں۔

### اس شبہ کا جواب:

میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کو کچھ قرآن بھی یاد ہے؟ اس نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے میں پورے قرآن کا حافظ ہوں۔ میں نے کہا: اب بات سمجھانی بہت آسان ہو گئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے سینے میں قرآن موجود ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ میں نے کہا کہ تیرے سینے میں قرآن محفوظ ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ میں نے کہا: عقل مند

آدمی! جب تیرے سینے میں قرآن مجید موجود نہیں ہے تو محفوظ کیسے ہوا؟ میں نے سمجھانے کے لیے اسے کہا کہ میں کہتا ہوں کہ میری جیب میں پیسے موجود نہیں ہیں بلکہ محفوظ ہیں تو کیا یہ صحیح ہو گا؟ کہنے لگا: نہیں، کیونکہ موجود ہوں گے تو محفوظ ہوں گے۔ تو میں نے کہا: اب بتاؤ! تمہارے سینے میں قرآن موجود ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں موجود ہے۔ میں نے کہا: اب دوسرا مسئلہ بتاؤ کہ کوئی آدمی قرآن مجید کو بیت الخلاء میں لے کر جاسکتا ہے؟ کہنے لگا: نہیں۔ میں نے کہا کہ تیسری بات بتاؤ کہ کوئی آدمی قرآن پاک بیت الخلاء میں نہیں لے کر جاسکتا تو جب تو بیت الخلاء جاتا ہے تو اپنے سینے کو پھاڑ کر قرآن پاک کو باہر نکال کر جاتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر قرآن پاک کی بے ادبی کرتا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے سینے میں قرآن موجود ہے لیکن جسم سے پاک ہے، تو میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ بھی ہر جگہ موجود ہے لیکن جسم سے پاک ہے۔

یہ جو قرآن ہمارے سامنے موجود ہے اس کو بیت الخلاء میں لے کر جانا بے ادبی ہے لیکن جو سینے میں ہے اس کو لے کر جانا بے ادبی نہیں ہے کیونکہ یہ جسم والا ہے اور وہ جسم سے پاک ہے۔ جس طرح سینے میں قرآن پاک بلا جسم ہے، بیت الخلاء میں جائیں تو اشکال نہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی بلا جسم ہے، ہر جگہ موجود ہے، اب کوئی اشکال نہیں۔

### اتحاد اور حلول میں فرق:

مجھے ایک آدمی کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے؟۔ میں پوری دنیا میں جاتا ہوں، مجھے ہر قسم کے لوگ ملتے ہیں۔ میں نے اسے کہا: جی ہاں۔ تو اس نے کہا کہ دنیا میں جب بھی دو چیزیں ہر جگہ موجود ہوتی ہیں تو ان دونوں میں یا اتحاد ہوتا ہے یا حلول ہوتا ہے؟ تو اب آپ بتائیے کہ اللہ تعالیٰ جس جگہ موجود ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا اس جگہ کے ساتھ اتحاد ہوتا ہے یا حلول ہوتا ہے؟



اتحاد اور حلول کا معنی یہ ہے کہ چار پانچ چیزیں آپ اکٹھی کر لیں اور ان میں سے ہر ایک کا اپنا وجود قائم رہے تو اسے ”اتحاد“ کہتے ہیں، جیسے ہم ناشتے میں آملیٹ کھاتے ہیں، اس میں کیا ہوتا ہے؟ انڈہ، گھی، ٹماٹر، ہری مرچ اور کالی مرچ۔ تو ہر چیز الگ الگ نظر آتی ہے، یہ اتحاد ہے، اور حلول کی مثال چائے ہے، اس میں دودھ، پتی، چینی اور پانی ہوتا ہے لیکن جب چائے تیار ہو جاتی ہے تو ہر چیز کا وجود فنا ہو جاتا ہے کسی چیز کا وجود الگ الگ نہیں رہتا۔ یہ حلول ہے۔

اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا دوسری چیزوں میں اتحاد ہے یا حلول ہے؟ میں نے کہا کہ نہ اتحاد ہے اور نہ حلول ہے، اس نے کہا: اتحاد بھی نہیں حلول بھی نہیں تو پھر اللہ کیسے موجود ہیں؟ میں نے کہا کہ اتحاد اور حلول ان کا ہوتا ہے جن کا جسم ہو، اللہ جسم سے پاک ہے اور ہر جگہ موجود بھی ہے اس لیے اتحاد بھی نہیں اور حلول بھی نہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ صرف عرش پر ہے وہ اس قسم کی دلیلیں پیش کرتے ہیں لوگوں کو پھنسانے کے لیے۔

### اجمالاً ادب، تفصیلاً بے ادبی:

ایک اور علمی جواب ذہن میں رکھیں۔ یہ جو اس بندے نے کہا کہ کیا اللہ بیت الخلاء میں بھی ہے؟ تو اس کے جواب میں ایک اہم بات یہ سمجھیں کہ بعض چیزیں دنیا میں ایسی ہیں کہ آدمی ان کو تفصیلاً بیان کرے تو بے ادبی ہے اور اجمالاً بیان کرے تو ادب ہے۔ میں اس کی دو مثالیں بیان کرتا ہوں:

1: آپ کسی شخص سے کہو کہ تیرا بال اللہ نے بنایا، ماتھا اللہ نے بنایا، تیری آنکھ اللہ نے بنائی، تیرا منہ اللہ نے بنایا، تیرا سینہ اللہ نے بنایا، اب پاؤں تک گنتے جاؤ تو ہر عضو کا نام لے کر کہہ سکتے ہو کہ اللہ نے بنایا؟ (نہیں۔ سامعین) اگر میں سر سے لے کر پاؤں تک ہر عضو کا نام لے کر کہوں کہ یہ یہ عضو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے تو آپ کہو گے کہ

کیسا عجیب آدمی ہے، یہ بات بھلا کہنے کی تھی؟ لیکن اگر یوں کہوں کہ سر سے لے کر پاؤں تک پورا جسم اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے تو آپ کہو گے: سبحان اللہ۔

2: اگر کوئی شخص اپنی بیٹی کا نکاح کر کے کسی کو دے دے تو داماد کو یہ تو کہہ سکے گا کہ میری بیٹی کا خیال رکھنا، اس کے سارے حقوق ادا کرنا، میں نے بڑی محبت اور پیار سے پالی ہے، لیکن کیا وہ شخص سارے حقوق کا نام لے کر کہہ بھی سکتا ہے کہ فلاں فلاں حق کا خیال رکھنا؟ (نہیں۔ سامعین) اجمالاً کہے گا تو ادب ہے، تفصیلاً کہے گا تو یہ بے ادبی ہے۔ لوگ بھی کہیں گے کہ کیسا باپ ہے! شرم نہیں آتی کہ داماد سے ایسی باتیں کرتا ہے۔

### صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نمونہ ادب:

اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک صحابی سے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مسئلہ پوچھو، میں نہیں پوچھ سکتا کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی میرے نکاح میں ہے۔ انہوں نے کہا: مسئلہ یہ ہے کہ "إِنِّي رَجُلٌ مَذَّاءٌ" مجھے مذی بہت آتی ہے۔<sup>152</sup>

### منی، مذی اور ودی کی تعریف:

انسان کے عضو خاص سے پیشاب کے علاوہ تین قسم کا پانی نکلتا ہے: منی، مذی اور ودی۔

جب آدمی پیشاب کے لیے بیٹھتا ہے تو کبھی کبھی ایک سفید سا پانی نکلتا ہے، بسا اوقات وزن اٹھانے سے بھی نکلتا ہے، اس کو ودی کہتے ہیں۔ یہ بیماری کی وجہ سے نکلتا

ہے، اور جب کوئی انسان اپنی بیوی سے گپ شپ کرتا ہے تو اس وقت جو سفید ساپانی نکلتا ہے اسے مذی کہتے ہیں، اور جب انسان اپنی بیگم سے جماع کرتا ہے تو اس وقت جو مادہ نکلتا ہے اسے منی کہتے ہیں۔ مذی اور ودی کے نکلنے سے وضو ٹوٹتا ہے اور منی کے نکلنے سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "إِنِّي رَجُلٌ مَذَّاءٌ" مجھے مذی بہت آتی ہے لیکن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا داماد ہوں، میں حضور سے یہ مسئلہ نہیں پوچھ سکتا، اس لیے تم پوچھ کر بتاؤ۔

اب بتائیں! میرا اور آپ کا داماد اور سرکار شہ تو نہیں ہے، میں بیان کرتے ہوئے جھجک رہا ہوں اور آپ کو سنتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی ہے۔ تو اس صحابی نے جا کر پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! ایسی صورت ہو تو غسل کرنا چاہیے یا وضو؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ كُلَّ فَحْلٍ مُّجَذَّبٍ فَإِذَا كَانَ الْمَيْتُ فَفِيهِ الْغُسْلُ وَإِذَا كَانَ الْمَيِّتُ فَفِيهِ الْوُضُوءُ." <sup>153</sup>

ہر مرد کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا ہے، اس لیے اگر منی ہو تو غسل واجب ہوتا ہے اور اگر مذی ہو تو اس پر وضو ہوتا ہے، غسل نہیں ہوتا۔

تو بعض مسئلے آدمی اجمالاً تو پوچھ سکتا ہے، تفصیلاً نہیں پوچھ سکتا۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے۔ کہاں کہاں پر ہے؟ اس کو تفصیل سے بتائیں گے تو بے ادبی ہو گی اور وہ چونکہ پرلے درجے کے بے ادب ہیں اس لیے گستاخ سوال ہی ایسا کرتے ہیں کہ اللہ بیت الخلاء میں ہے؟۔ العیاذ باللہ۔ کم از کم اس

شخص کو سوچنا چاہیے کہ میں کیا بات کہہ رہا ہوں؟! ہمارے ہاں ادب بہت زیادہ ہے۔  
اللہ ہم سب کو با ادب رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

### دعا میں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھانے کی وجہ:

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس قسم کے ان کے دلائل ہیں جن سے یہ لوگ  
اشکالات پیدا کرتے ہیں۔ ایک بات اور بھی سمجھیں کہ جب ہم دعا مانگتے ہیں تو ہاتھ  
اوپر کی طرف اٹھاتے ہیں۔ اس پر یہ لوگ کہتے ہیں دعا میں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھانے  
سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اوپر ہے، اگر اللہ تعالیٰ اوپر نہ ہوتے تو آپ ہمیشہ اوپر ہاتھ نہ  
اٹھاتے۔

یہ بات یاد رکھنا! میں شروع میں بتا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ چھ جہتوں سے پاک  
ہے؛ آگے، پیچھے، اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، اور چھ جہتوں کو محیط بھی ہے۔ ان چھ جہتوں  
میں سے عقل کے اعتبار سے جہت فوق یعنی اوپر کی جانب کو عظمت حاصل ہے۔  
ہمارے معاشرے میں اوپر کی جہت کو عظمت حاصل ہے۔ آپ کسی کو عزت دیتے ہیں  
تو اوپر بٹھاتے ہیں یا نیچے؟ (اوپر۔ سامعین) اس لیے ہم دعا کرتے وقت ہاتھ اوپر  
اٹھاتے ہیں کہ جہت فوق کو ہمارے معاشرے میں عظمت حاصل ہے، اس کا معنی یہ  
نہیں کہ خدا اوپر ہے۔

دیکھو! میں بیان کر رہا ہوں، میری آواز چاروں طرف جارہی ہے اور جو بندہ  
پیچھے بیٹھا ہوا ہے اس کو ہم کہیں گے کہ ایسے نہیں بیٹھتے، آگے بیٹھ جاؤ اور بیان سنو! وہ  
کہتا ہے کہ مجھے آواز آرہی ہے۔ آپ سب کہیں گے کہ اس نے اچھی بات نہیں کہی،  
کیوں کہ اگرچہ آواز چاروں طرف جارہی ہے لیکن جب کسی کے سبق میں یا بیان میں  
بیٹھو تو ادب کا تقاضا یہ ہے کہ سامنے بیٹھو۔ اب کوئی یہ کہے کہ آواز تو پیچھے بھی جارہی  
ہے، آگے کیوں بٹھاتے ہو؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ ادب کا تقاضا ہے۔ اللہ ہر طرف ہے تو

دعا مانگتے ہوئے ہاتھ اوپر کیوں اٹھاتے ہو؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ ادب کا تقاضا ہے۔

میں نے اس پر بڑی مختصر سی بات کی ہے کہ ﴿الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ رحمن عرش پر مستوی ہے سے کبھی اس دھوکے میں نہ آنا کہ اللہ تعالیٰ صرف عرش پر ہے۔

### فریق مخالف سے چند سوالات:

انہوں نے تو عقلی شہادت پیش کیے اور ہم نے جوابات دیے اور ہم عقلی دلائل پیش کریں گے تو ان کا جواب ان کے پاس نہیں ہے اور واقعتاً نہیں ہے، میں کئی سالوں سے سوال کر رہا ہوں ابھی تک ہمارے سوالات کا جواب نہ کسی نے سوشل میڈیا پر دیا ہے اور نہ پرنٹ میڈیا پر دیا ہے۔

1: میں عقلی دلیل پیش کرتا ہوں۔ اس کو یاد رکھنا۔ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے، تو اس سے پوچھو کہ اگر اللہ عرش پر ہے تو پھر عرش مکان ہوا اور اللہ تعالیٰ مکین ہوئے۔ مکین کہتے ہیں رہنے والے کو اور مکان کہتے ہیں رہنے کی جگہ کو، مکان مکین سے بڑا ہوتا ہے، دنیا میں مجھے ایک بندے کا نام بتادیں کہ رہنے والا بڑا ہو اور رہنے کی جگہ چھوٹی ہو، دنیا میں کوئی ایک مثال دے سکتے ہو؟ (نہیں۔ سامعین)

اگر اللہ تعالیٰ عرش پر رہتا ہے تو اللہ مکین اور عرش مکان ہوا، اور ضابطہ ہے کہ مکان؛ مکین سے بڑا ہوتا ہے تو ”اللہ اکبر“ کا معنی کیا ہو گا؟ جب مکان؛ مکین سے بڑا ہو گا تو اللہ اکبر کا عقیدہ ٹوٹ جائے گا۔ میں نے کہا: اس کا جواب تم دے دو لیکن ابھی تک جواب نہیں آیا اور آئے گا بھی نہیں، ان شاء اللہ۔

2: اگر اللہ عرش پر ہے تو عرش مخلوق ہے اور اللہ خالق ہے، خالق ہمیشہ سے ہے مخلوق ہمیشہ سے نہیں ہے۔ اگر اللہ عرش پر ہے تو جب عرش نہیں تھا پھر اس وقت اللہ کہاں پر تھے؟

ہم پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہیں، جب عرش نہیں تھا تب بھی تھے اور جب عرش ہے تب بھی ہیں لیکن وہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے تو اب ہمارا سوال بنتا ہے کہ جب عرش نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ کہاں تھے؟

3: ہمارا تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر اللہ عرش پر ہے تو اللہ خالق اور عرش مخلوق، اللہ محدود ہے یا غیر محدود؟ (غیر محدود۔ سامعین) عرش جتنا بھی بڑا ہو محدود ہی ہوگا! اللہ خالق غیر محدود ہے اور عرش مخلوق محدود ہے، اب بتاؤ غیر محدود؛ محدود پر کیسے آ سکتا ہے؟

یہ ہمارے تین سوالات آپ یاد رکھ لیں، اگر تین نہیں تو ایک بھی یاد رکھ لیں گے تو ان شاء اللہ ان سے یہ ایک بھی نہیں ٹوٹے گا، آپ آزما کر دیکھ لیں۔

میں بار بار کیوں کہتا ہوں کہ اس درس قرآن کی قدر کرو، اس درس میں لوگوں کو لاؤ کہ وہ اس کو سنیں۔ یہ ہماری عقیدے کی جنگ ہے پوری دنیا میں اور یقین کریں میں تو جانتا ہوں الحمد للہ بڑے بڑے اکابر کہتے ہیں کہ مولانا صاحب! ہم سمجھتے ہیں کہ تیرا وجود اللہ کی نعمت ہے، ہر دور میں اللہ کسی ایسے بندے کو پیدا فرماتے ہیں اور اس سے اپنے دین کا دفاع کرواتے ہیں۔ دیکھو! ہم پوری دنیا میں دفاع کر رہے ہیں، کوئی ٹینشن نہیں ہے، کوئی پریشانی نہیں ہے، اللہ کریم کا شکر ہے، ہمیں کوئی لالچ نہیں ہے، کتنے بے لوث طریقے سے لگے ہوئے ہیں۔ اللہ آپ کو بھی قبول فرمائے اور اللہ ہمیں بھی قبول فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

**اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنی:**

﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى﴾

اسمائے حسنی پر تھوڑی سی بات کر لیتے ہیں۔ حدیث پاک ہے، نبی کریم صلی

اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”إِنَّ لِلَّهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اسْمًا مِائَةً إِلَّا وَاحِدًا مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ.“<sup>154</sup>

کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، جو شخص ان کو یاد کر لے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

ہمارے ہاں مرکز اہل السنۃ والجماعۃ میں تخصص کے لیے جو طلبہ آتے ہیں ہم ان کو یہ نام یاد کرواتے ہیں۔

### اسمائے حسنیٰ کے متعلق چند باتیں:

اور اس کے متعلق دو تین باتیں یاد رکھیں!

[1]: پہلی بات... یہ جو حدیث میں ہے کہ جو شخص اللہ کے ننانوے نام یاد کرے اس کو جنت ملے گی، اس کا معنی ہر گز یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے صرف یہی ننانوے نام ہیں بلکہ ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے نام اور بھی ہیں۔ یہ فضیلت ننانوے ناموں کی ہے کہ جو ان کو یاد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں جگہ عطا فرمائے گا۔

[2]: اسمائے حسنیٰ کو دو طرح پڑھنا جائز ہے:

پہلا طریقہ... ”هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ“

دوسرا طریقہ... ”يَا هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يَا رَحْمَنُ يَا رَحِيمُ يَا مَلِكُ يَا قُدُّوسُ يَا سَلَامُ يَا مُؤْمِنُ“

یاء حرفِ ندا کے ساتھ بھی پڑھ سکتے ہیں اور بغیر یاء کے بھی پڑھ سکتے ہیں،

جب بغیر یاء کے پڑھیں گے تو الف لام کے ساتھ پڑھیں گے جیسے ”الْوَحْمَنُ“ اور جب یاء کے ساتھ پڑھیں گے تو الف لام کے بغیر پڑھیں گے جیسے ”يَا وَحْمَنُ“۔

[3]: اللہ تعالیٰ کے وہ نام جو قرآن کریم یا احادیث مبارکہ سے ثابت ہیں ان ناموں سے اللہ تعالیٰ کو پکارنا بالکل جائز ہے اور جو نام قرآن کریم یا احادیث مبارکہ میں نہیں ہیں بلکہ بہت سارے لوگ اپنی اپنی زبان میں اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں تو اب اس لفظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اگر وہ لفظ ایسا ہے جو ان لوگوں کے ہاں اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے متعین ہے، اس لفظ کو بول کر اس سے صرف اللہ کی ذات مراد ہوتی ہے اگرچہ وہ عجمی زبان کا لفظ ہو تو بھی اللہ کے لیے استعمال کرنا جائز ہے۔

### ذات باری تعالیٰ کے لیے لفظ ”خدا“ کا استعمال:

جیسے ہمارے ہاں لوگ لفظ ”خدا“ کو اللہ کی ذات کے لیے استعمال کرتے ہیں، جب ہم کہتے ہیں ”خدائے پاک“ تو اس سے مراد کیا ہوتا ہے؟ (اللہ۔ سامعین) اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہوتی ہے۔ یہ متعین ہے۔ لہذا ہماری زبان میں خدائے پاک کہنا جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور جو ہمارے بعض علماء فرماتے ہیں کہ ایسا کہنا ٹھیک نہیں ہے، تو میں آپ کی خدمت میں بار بار عرض کرتا ہوں کہ میں ان کا نام نہیں لیتا اور میرے سامنے نام لے کر تردید نہ کروایا کرو، یہ مناسب نہیں ہے، ہمارے بعض حضرات بڑے عالم ہوتے ہیں، مبلغ بڑے ہوتے ہیں، واعظ بڑے ہوتے ہیں لیکن ان کا تحقیقی مزاج نہیں ہوتا اس لیے وہ ایسی باتیں فرمادیتے ہیں جو ان کی شان کے مناسب نہیں ہوتیں۔ ہر بندے کو اپنے دائرے میں رہ کر کام کرنا چاہیے، اس کا فائدہ بہت زیادہ ہوتا ہے، قاری صاحب کو صرف قرآن پڑھ کر سنانا چاہیے، اس کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے، تبلیغ والوں کو دیکھو وہ



جب چھ نمبر بیان کریں تو کہتے ہیں کہ ”حدیث پاک میں ہے جس کا مفہوم یہ ہے...“ اور یہ کہنا بھی چاہیے بہت اچھی بات ہے۔ آپ اس سے پوچھیں کہ ایسے کیوں کہتے ہو؟ تو جواب دے گا کہ بھائی! میں عالم تو ہوں نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کا ترجمہ مجھ سے صحیح نہ ہو سکے اور میں قیامت کے دن پکڑا جاؤں۔ اب ہر بندہ سمجھتا ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نہیں بیان کر رہا بلکہ مفہوم بیان کر رہا ہے، اب اس پر اعتراض کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے، اور یہ ہمارے اکابرین نے بہت اچھا رخ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس لیے ”خدا“ کا لفظ استعمال کرنا ناجائز نہیں ہے، میں آپ کو بتا چکا ہوں، آج دوبارہ بتا دیتا ہوں تاکہ آپ اچھی طرح سمجھیں۔

### ایک شخص کی متکلم اسلام سے گفتگو:

مجھے ایک شخص کہنے لگا کہ ”خدا“ کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے کہا: کیوں؟ کہنے لگا: خدا کی جمع خدا یاں آتی ہے اور اللہ تعالیٰ ایک ہے، اللہ کئی نہیں ہو سکتے۔ میں نے کہا کہ اگر یہ مان لیا جائے تو پھر اللہ کو ”رحیم“ بھی نہیں کہنا چاہیے اس کی جمع قرآن میں ”رَحْمَاءُ“ آئی ہے، پھر اللہ تعالیٰ کو ”رب“ بھی نہیں کہنا چاہیے کیونکہ قرآن میں اس کی جمع ”أَرْبَابُ“ آئی ہے، پھر اللہ تعالیٰ کو ”إِلَہ“ بھی نہیں کہنا چاہیے کیونکہ اس کی جمع ”إِلَہَاتُ“ آئی ہے، اس طرح تو پھر کچھ بھی نہیں کہنا چاہیے۔

وہ کہنے لگا: ہماری دلیل ایک اور بھی ہے۔ میں نے کہا: وہ بھی سنا دو۔ کہنے لگا: دین عربی میں ہے اور ”خدا“ عجمی لفظ ہے۔ تو میں نے اسے کہا کہ یہ بتاؤ کہ روزانہ کتنی نمازیں فرض ہیں؟ کہنے لگا: پانچ۔ میں نے کہا کہ سال میں کتنے روزے فرض ہیں؟ کہنے لگا: ایک ماہ۔ میں نے کہا آپ ”الصَّلَوَاتُ الْخَمْسَةُ فَرَضٌ“ اور ”صِيَامُ شَهْرِ رَجَبٍ“

کہا کرو، یوں نہ کہو کہ پانچ نمازیں فرض ہیں، ایک ماہ کے روزے فرض ہیں۔ وہ کہنے لگا: کیوں؟ میں نے کہا کہ دین عربی میں ہے، روزہ کیوں کہتے ہو؟ دین عربی میں ہے، نماز کیوں کہتے ہو؟ کہنے لگا کہ جب عربی میں بات کریں گے تو صوم و صلوٰۃ کہیں گے اور جب اردو میں کریں گے تو نماز روزہ کہیں گے، تو میں نے کہا کہ جب عربی میں بات کریں گے تو اللہ، محمد کہتے ہیں اور جب اردو میں بات کریں گے تو خدا اور پیغمبر کہیں گے، تم جو بات کرو تو ٹھیک ہے ہم کریں تو ٹھیک کیوں نہیں؟ میں نے کہا: کوئی اور دلیل ہے تو پیش کر سکتے ہو، لیکن اب خاموش ہو گیا۔

### تفسیر تو پاک کردی مفسر کا کیا ہو گا؟

ایک تفسیر ہے اس کا نام ہے ”احسن البیان“، مصنف کا نام ہے محمد جونا گڑھی۔ آج کل سعودیہ سے تقسیم ہوتی ہے اور چل رہی ہے۔ اس کے مقدمے میں صلاح الدین یوسف نے لکھا ہے کہ اس پوری تفسیر میں جہاں جہاں لفظ ”خدا“ لکھا تھا ہم نے اس کو کاٹ دیا ہے اور وہاں لفظ ”اللہ“ لکھ دیا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ لفظ ”خدا“ سے شرک کی بو آتی ہے، ہم نے اس کو مٹا کر لفظ ”اللہ“ لکھ دیا ہے تاکہ اس سے شرک کی بو نہ آئے۔ محمد جونا گڑھی فوت ہو چکا ہے، میں نے کہا کہ لفظ ”خدا“ کو کاٹ کر تفسیر کو تو توحیدی بنادیا اور مصنف تو آپ کے گمان کے مطابق مشرک مر گیا، کیوں کہ مصنف لفظ ”خدا“ لکھتا رہا اور آپ نے لفظ خدا کاٹ کر لفظ اللہ لکھ دیا، تو وہ خدا خدا لکھ کر مر گیا بعد والے اللہ اللہ پڑھیں گے تو پڑھنے والے توحیدی ہو جائیں گے اور لکھنے والا شرک میں فوت ہوا، میں نے کہا کہ تفسیر تو تم نے پاک کردی اب اس کے مفسر کا کیا کرو گے؟

ہم کہتے ہیں کہ اللہ کہنا بھی ٹھیک ہے اور خدا کہنا بھی ٹھیک ہے۔ تو جب ہماری بات مانو گے تو مصنف موحد ہو گا اور ان کی بات مانو گے تو مشرک ہو گا۔ اس لیے

ایسی باتیں چھوڑو جس سے امت کا نقصان ہو، امت ٹوٹتی ہو، ایسے فتوؤں کی زد میں پھر اپنے اکابر آجاتے ہیں۔

### اتحاد امت کے لیے چار نکاتی ایجنڈا:

امت میں اتحاد کے حوالے سے میں آپ کے سامنے چار باتیں پیش کرتا ہوں، باقی دیوبندی، بریلیوی اور اہل حدیث اختلاف تو ختم ہو گا نہیں، کیوں کہ کسی نے اپنا مسلک تو چھوڑنا نہیں، اپنی مسجد چھوڑ کر آپ کی مسجد میں آنا نہیں، اس لیے چار کام کریں:

- 1: ایک دوسرے کو کافر نہ کہیں۔
- 2: ایک دوسرے کے اکابر کی پگڑیاں نہ اچھالیں۔
- 3: اپنی مسجد میں اپنا مسلک اور مسئلہ بیان کریں اور دوسرے کا نام لے کر تردید نہ کریں۔
- 4: کبھی قومی اور بین الاقوامی ایشوز پر اور کسی بڑے فورم پر اکٹھے ہونے کی ضرورت پڑے تو پھر سارے اکٹھے ہو جائیں۔

مثلاً ختم نبوت کا مسئلہ آئے تو سارے اکٹھے ہو جائیں، آئین کا مسئلہ آئے تو سارے اکٹھے ہو جائیں، پاکستان کے دفاع کا مسئلہ آئے تو سارے اکٹھے ہو جائیں، پاکستان کو بچانے کا مسئلہ آئے سارے اکٹھے ہو جائیں، دہشتگردی پر لعنت بھیجی ہے تو سارے اکٹھے ہو جائیں، فرقہ واریت کو ختم کرنا ہے تو سارے اکٹھے ہو جائیں۔ اب بتاؤ! میں اتحاد کا درس دے رہا ہوں یا اختلاف کا درس دے رہا ہوں؟ (اتحاد کا۔ سامعین) کتنا آسان سانسخہ ہے اور میں لڑائی ختم کر رہا ہوں، لڑائی بڑھا نہیں رہا۔

تو خیر میں نے اسمائے حسنی کے حوالے سے بات کی ہے۔ ایسا لفظ جو عربی زبان کا نہ ہو اور یہ بھی پتا نہ ہو کہ اس کو کس معنی میں استعمال کیا جاتا ہے تو ایسے لفظ کا

استعمال اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ناجائز ہے۔

[4]: اسمائے حسنی کے حوالے سے جو تھی بات ذہن نشین فرمائیں۔ یہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ نام جو قرآن کریم یا احادیث مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور کے لیے استعمال ہوا ہے تو اس لفظ کو اللہ کے غیر کے لیے استعمال کر سکتے ہیں اور جو لفظ اللہ تعالیٰ کے غیر کے لیے استعمال نہیں ہوا تو اس کو اللہ کے غیر کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔ میں اس کی مثال دیتا ہوں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِأَنْفُسِكُمْ لَا تَرَوُفٌ رَّحِيمٌ﴾<sup>155</sup>

اے لوگو! تمہارے پاس تمہی میں سے ایک رسول آیا ہے، جسے تمہاری تکلیف بہت گراں گزرتی ہے، اس نبی کو تو ہمیشہ تمہاری بھلائی کی فکر لگی رہتی ہے اور یہ نبی مؤمنوں کے لیے انتہائی شفیق اور بہت مہربان ہے۔

اس آیت میں ”رؤف“ اور ”رحیم“ صفات ہیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حالانکہ رؤف اور رحیم؛ اللہ تعالیٰ کے نام بھی ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ رؤف اور رحیم کا لفظ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ تو آپ کسی بندے کو جس کا نام عبد الرؤف ہو ”رؤف“ کہنا چاہیں اور عبد الرحیم نامی بندے کو ”رحیم“ کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں لیکن پورے قرآن میں اور احادیث مبارکہ میں ”الرحمن“ کا نام اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے لیے استعمال نہیں ہوا، اس لیے عبد الرحمن کو ”رحمن بھائی“ نہیں کہہ سکتے۔ ”علی“ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام بھی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ

نہیں فرمایا کہ اس نام کو ختم کر دو۔ معلوم ہوا کہ اس نام کو رکھ سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿الَيْسَ مِنْكُمْ دَجُلٌ زَّشِيدٌ﴾<sup>156</sup>

”رشید“ عام آدمی کے لیے استعمال ہوا ہے اس لیے آپ عبدالرشید کو ”رشید بھائی“ کہہ سکتے ہیں۔

### اسمائِ حسنیٰ کے ذریعے دعائے مستجاب کا مجرب طریقہ:

اور آخر میں ایک بات عرض کر دیتا ہوں۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ بھائی ہم دعا مانگتے ہیں لیکن ہماری دعا قبول نہیں ہوتی، ہمیں دعا کرنے کا کوئی طریقہ بتا دو۔ تو دعا کرنے کا طریقہ یاد رکھیں! پہلے گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھیں، پھر سورہ حشر کے آخری رکوع ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَتَتَنظَرُوا نَفْسَ مَا قَدَّمْتُمْ لِغَدٍ وَ اتَّقُوا اللَّهَ﴾ کی تلاوت شروع کریں اور جب ﴿لَوْ أَنزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَّرَأَيْنَاهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾ تک پہنچیں تو تلاوت روک دیں۔ اس وقت یہ دعا کریں کہ اے اللہ! میری یہ ضرورت، میری یہ مصیبت، میری یہ تکلیف میرے لیے پہاڑ کی طرح ہے، آپ کی قدرت و طاقت کے سامنے اس کی کیا حیثیت ہے؟! اے اللہ! میری اس حاجت کو پورا فرمادیں۔ اس کے بعد پھر آگے تلاوت شروع کر دیں۔ پھر جب ﴿لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى﴾ پر پہنچیں تو اللہ تعالیٰ کے ان ننانوے اسمائِ حسنیٰ کو پڑھ لیں، اسمائِ حسنیٰ پڑھتے ہوئے دل میں اپنی مراد کا تصور کریں اور رکوع کے اختتام پر گیارہ بار درود شریف پڑھ لیں اور آخر میں اپنی مراد مانگیں۔ اس

طرح دعا مانگیں تو ان شاء اللہ دعائیں قبول ہوں گی۔

### اللہ تعالیٰ تکلفات سے محفوظ رکھے:

میں اکثر یہ بات مزاح میں کہتا ہوں کہ آپ قبول اس لیے نہیں فرماتے کہ میں پیروں کے روپ میں آکر نسخہ نہیں بتاتا۔ ہمارے ہاں بہت عجیب سا مسئلہ ہے کہ جب تک آپ مخصوص اسٹائل اختیار نہ کریں لوگ آپ کو بزرگ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ وہ اسٹائل یہ ہیں: قاری صاحب! نماز پانچ منٹ لیٹ کرو حضرت تشریف لارہے ہیں۔ اب آپ سمجھیں گے کہ مولانا گھمن بہت بڑے آدمی ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے نماز لیٹ ہو گئی اور آپ کو انتظار کرنا پڑ گیا۔ اچھا! نماز پڑھ لی اور میں کہتا ہوں کہ آپ ذرا تھوڑی دیر بیٹھیں، میں تازہ وضو کر کے آتا ہوں، آپ سب کہیں گے کہ جی بہت بڑا آدمی ہے۔ درس ہو گیا، اعلان ہو گا کہ بھائی! آپ ابھی مصافحہ نہ کریں حضرت نے چائے پینی ہے، اور چائے بھی آپ خود ڈال کر دیں، بسکٹ بھی آپ دیں، چینی بھی آپ ڈال کر دیں تو سب سمجھیں گے کہ بڑا آدمی ہے۔ اور ہماری ترتیب یہ نہیں ہے بلکہ ہم تو وقت پر آتے ہیں اور وقت پر جاتے ہیں، ہم چائے میں چینی بھی خود ڈالتے ہیں اور خود اٹھا کر پی لیتے ہیں اس لیے ہمیں کوئی ولی نہیں سمجھتا۔

اللہ گواہ ہے مجھے لوگ کہتے ہیں کہ مولانا صاحب! اگر آپ پیر بننا چاہتے ہیں تو ہم آپ کو طریقہ بتا دیتے ہیں۔ میں کراچی گیا۔ آپ یقین فرمائیں۔ مجھے کراچی کے لوگوں نے کہا: اگر آپ نے بڑے لوگوں کے ہاں مقبول ہونا ہے تو سب سے پہلا کام یہ کریں کہ آپ کراچی والوں کا فون سننا چھوڑ دیں، کسی لڑکے کو فون دیں اور وہ کہے کہ حضرت مصروف ہیں، دو گھنٹے کے بعد فون کرنا، وہ پھر فون کریں تو لڑکا کہے کہ حضرت سبق میں ہیں، پھر فون کرے تو کہے کہ حضرت آرام میں ہیں، فلاں کام میں مصروف ہیں تو اب لوگ کہیں گے کہ مولانا صاحب بہت بڑے آدمی ہیں اور آپ تو بذات خود

فون اٹھاتے ہیں کہ مولانا الیاس گھمن بات کر رہا ہوں تو اس طرح آپ کو کون بڑا سمجھے گا؟ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان تکلفات سے محفوظ رکھے، اللہ کے ہاں بندے کی قیمت بن جائے بہت بڑی بات ہے۔

### موسیٰ علیہ السلام کو عطائے نبوت:

﴿وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَى ۖ إِذْ رَأَيْنَا أَفْقَالَ لِّأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي

أَنْسَتْ نَارَ آلْعِزَّىٰ أَتَيْكُمْ مِنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجْدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۖ﴾

کیا آپ کے پاس موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ پہنچا ہے، جب انہوں نے آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں سے کہا کہ یہیں ٹھہرو، میں نے آگ دیکھی ہے، شاید میں اس آگ میں سے کوئی شعلہ تمہارے پاس لے آؤں یا آگ کے پاس جا کر مجھے راستے کا پتہ چل جائے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے واپس تشریف لائے تو ان کے گھر والے بھی ساتھ تھے، گھر والے امید سے تھے۔ اس سفر میں کچھ بکریاں بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ آپ راستہ بھول گئے۔ آپ کے گھر والوں کو ولادت کی تکلیف شروع ہو گئی، سردی بہت تھی، انتظامات نہیں تھے، آپ کے پاس چقماق تھا کہ پتھر کو پتھر پر مارتے تو آگ نکلتی لیکن کوشش کے باوجود اس سے آگ نہ نکلی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دور سے ایک درخت کو جلتا ہوا دیکھا تو اپنے گھر والوں سے کہا کہ یہاں ٹھہرو، میں وہاں سے آگ لے کر آتا ہوں۔ آپ جب اس درخت کے قریب پہنچے تو عجیب منظر دیکھا کہ اس درخت کی کوئی شاخ یا پتا جلتا نہیں ہے بلکہ آگ نے درخت کے حسن اور خوبصورتی کو مزید بڑھا دیا ہے۔ یہ منظر کچھ دیر تو دیکھتے رہے اور انتظار میں رہے کہ شاید کوئی آگ کی چنگاری زمین پر گرے، کوئی ٹہنی نیچے گرے تو میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔ جب کافی دیر تک ایسا نہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے کچھ گھاس یا سوکھی

لکڑی لی کہ درخت کے قریب کرتا ہوں تاکہ اسے آگ لگ جائے۔ جب آپ وہ گھاس یا سوکھی لکڑی آگ کے قریب کرتے تو آگ پیچھے ہٹ جاتی اور جب آپ پیچھے ہٹ جاتے تو آگ آپ کی طرف آ جاتی۔ اس سے موسیٰ علیہ السلام کو بہت تعجب ہوا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟

### درخت سے آواز آنا:

اسی دوران اس درخت سے موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آواز آئی:

﴿إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾

اے موسیٰ! میں تمہارا رب ہوں، اپنے جوتے اتار دو کیونکہ تم اس وقت طوی کی مقدس وادی میں ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب ”یُوسُی“ کے لفظ سے پکارا گیا تو آپ نے لبیک کہا اور عرض کیا کہ نے کہا کہ یہ تو میں پہچان گیا ہوں کہ یہ میرے اللہ کی آواز ہے لیکن آواز کس طرف سے آرہی ہے اور اللہ کس طرف ہیں؟ یہ مجھے سمجھ نہیں آرہی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہارے اوپر، سامنے، پیچھے اور تمہارے ساتھ ہوں، میں ہر طرف ہوں۔ یہ وضاحت روایات میں موجود ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہاں پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کی بشارت دی اور آپ سے فرمایا:

﴿وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ﴾ (۱۳) ﴿إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا

فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾

میں نے تمہیں نبوت دینے کے لیے منتخب کر لیا ہے اس لیے جو وحی تم پر



بھیجی جا رہی ہے اسے غور سے سنو۔ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اس لیے میری عبادت کرو اور مجھے یاد رکھنے کے لیے نماز قائم کرو!

حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے۔ اپنی اہلیہ کو بتایا کہ مجھے نبوت ملی ہے۔ تو اس کا تذکرہ اللہ نے ان آیات میں کیا ہے۔

### مقدس مقامات میں جوتے اتارنا ادب ہے:

﴿يُمُوسَىٰ ١١٠ إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ١١١﴾

آپ جب وہاں پہنچے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں تمہارا رب ہوں، اپنے جوتے اتار دو کیونکہ تم اس وقت طوی کی مقدس وادی میں ہق۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جوتے کیوں اتراوے گئے؟ بعض مفسرین فرماتے ہیں تاکہ پاؤں براہ راست اس وادی کے ساتھ لگ جائیں اور برکت حاصل ہو جائے یا وجہ یہ تھی کہ وہ جگہ پاک تھی اور موسیٰ علیہ السلام کے جوتے مردار کی کھال کے بنے ہوئے تھے۔ خیر جو بھی وجہ تھی فرمایا کہ جوتے اتار دو۔

اس آیت کے تحت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشیر بن خصاصیہ رضی اللہ عنہ کو قبروں کے درمیان جو تا پہن کر چلتے ہوئے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِذَا كُنْتَ فِي مَثَلِ هَذَا الْمَكَانِ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ"

کہ جب تم اس جیسی جگہ پر چل رہے ہو تو اپنے جوتے اتار لیا کرو۔<sup>157</sup>

اس سے معلوم ہوا کہ اکابرین کی قبور کے پاس جو جوتے اتارے جاتے ہیں وہ ناجائز نہیں ہے۔ اس لیے میں گزارش کرتا ہوں کہ اپنے اکابر کا کوئی واقعہ بظاہر خلاف

شریعت نظر آرہا ہو تو اس میں جلد بازی سے کام نہ لیا کریں بلکہ اپنے علم کی کوتاہی کا اعتراف کریں اور اس کے متعلق دلائل تلاش کرتے رہیں۔

میں بھی جب اپنے مشائخ کی قبور پر جاتا اور بعض لوگوں کو دیکھتا کہ وہ جوتے باہر اتارتے اور ننگے پاؤں اندر جاتے تو میں بسا اوقات جوتے اتار دیتا اور جہاں چٹائی وغیرہ نہ ہوتی تو جوتے پہن کر جاتا مگر تردد میں رہتا کہ قبروں کے درمیان چلتے ہوئے لوگ جوتے کیوں اتار دیتے ہیں؟ لیکن میں نے کبھی اعتراض نہیں کیا، نہ ہی ساتھ والوں کے سامنے کسی اعتراض کا اظہار کیا، کیونکہ جب مجھے اضطراب ہے تو ساتھ والے بھی ظاہری بات ہے پریشان ہوں گے اور جواب ہمارے پاس ہے نہیں تو خاموشی بہتر ہے۔ جب درس قرآن کے لیے ان آیات کا میں نے مطالعہ کیا اور معارف القرآن کو دیکھا تو اشکال ختم ہو گیا۔ اس سے میرے اوپر اپنی جہالت کھلی کہ ہمارا علم کتنا تھوڑا سا ہوتا ہے اور کتنی جلدی اعتراض شروع کر دیتے ہیں۔ اس لیے اپنے علم اور اپنی کوتاہی کو دیکھنا چاہیے اور اعتراض میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔

### نماز ایک اہم عبادت ہے:

﴿إِنِّى أَنَا اللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِىْ ۚ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ ۖ﴾

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اس لیے میری عبادت کرو اور مجھے یاد رکھنے کے لیے نماز قائم کرو!

﴿فَاعْبُدْنِىْ﴾ میں تمام عبادات حتیٰ کہ نماز بھی آگئی ہے، پھر دوبارہ نماز کا

ذکر اس لیے فرمایا کہ نماز عام عبادات کی بنسبت بہت اہم ہے، تو بطور خاص پھر نماز کا ذکر فرمایا۔

## قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے:

﴿إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِيَجْزِيَ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَى ۝﴾

قیامت آنے والی ہے، میں اس کے علم کو مخفی رکھنا چاہتا ہوں۔  
اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقت کو مخفی رکھا ہے، کسی کو اس کا علم نہیں ہے، نہ فرشتوں کو نہ ہی انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کو علم ہے کہ قیامت کب آئے گی۔  
قیامت کے دن ہر آدمی کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔

## بری صحبت سے بچنا ضروری ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نصیحت کی جا رہی ہے ہمیں سمجھانے کے لیے کہ  
بری صحبت سے بچیں۔ فرمایا:

﴿فَلَا يَصُدُّكَ عَنْهَا مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَزِدْهُ﴾

تمہیں قیامت کے معاملے میں ایسا شخص غافل نہ کرنے پائے جو قیامت پر  
ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہوا ہے، ورنہ آپ ہلاکت میں پڑ جائیں  
گے۔

تو یہ ان کو بتایا جا رہا ہے ہمیں سمجھانے کے لیے کہ ایسے لوگوں کی صحبت سے  
بچنا ضروری ہے جن کے عقائد اور اعمال خراب ہوں، ان کی صحبت کی وجہ سے انسان  
خود تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الْكَلْجُلُ عَلَى دِينٍ خَلِيلِهِ فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُخَالِلُ" <sup>158</sup>

آدمی اپنے دوست کے دین پر چلتا ہے، اس لیے تم میں سے ہر کسی کو دیکھنا  
چاہیے کہ میری دوستی کس کے ساتھ ہے۔

سبعہ معلقہ میں ایک شعر ہے:

عَنِ الْمَرْءِ لَا تَسْأَلْ وَسَلَّ عَنْ قَرِينِهِ  
فَإِنَّ الْقَرِينَ بِالْمُقَارِنِ يَفْتَدِي

کسی کے بارے میں دیکھنا ہو کہ بندہ کیسا ہے تو اس بندے کو نہ دیکھو بلکہ اس کے دوستوں کو دیکھو، ہم نشینوں کو دیکھو، اگر یہ اچھا ہو گا تو اچھے لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہو گا اور گندوں کے ساتھ بیٹھنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بندہ ٹھیک نہیں ہے۔

### موسیٰ علیہ السلام کے معجزات:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں عصا تھا تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا:

﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَمْوَسَّىٰ﴾

اے موسیٰ! یہ آپ کے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟

### [1]: عصائے موسیٰ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا:

﴿هِيَ عَصَائِيْ ۚ اَتَوَكَّلُ عَلَیْهَا وَ اَهْبُشُ بِهَا عَلٰی غَنَمِیْ وَلِیْ فِیْهَا

مَا رِبْ اُخْرِیٰ﴾

فرمایا کہ یہ میری لاٹھی ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں اور ان کاموں کے علاوہ اس لاٹھی سے اور بھی کام لیتا ہوں۔

موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ آئندہ چل کر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی اس لاٹھی کو اڑدھا اور سانپ بنانا تھا اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلے متنبہ کر دیا کہ تسلی کر لیں اور

قلبی اطمینان کر لیں کہ یہ لکڑی کی لاٹھی ہے۔ جب انہوں نے دیکھ لیا کہ یہ لاٹھی ہے تب اللہ تعالیٰ نے اس کو سانپ بنانے کا معجزہ ظاہر کیا اور نہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید میں رات کے اندھیرے میں لاٹھی کی جگہ سانپ کو پکڑ کر لایا ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے فرمایا تاکہ جب یہ لاٹھی پھینکیں اور وہ سانپ بن جائے تو پہلے سے موسیٰ علیہ السلام ذہن میں ہو کہ یہ لاٹھی ہی ہے جو میرے ہاتھ میں تھی اور وہی سانپ بنی ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ تو سمجھانے کے لیے پوچھا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟

یہاں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے جو باتیں فرمائی ہیں وہ مانوس کرنے کے لیے ہیں کیونکہ پہلے اچانک آگ کو دیکھا، پھر آواز کو سنا تو حیرانی ہوئی۔ اس لیے اب مانوس کرنے کے لیے اللہ نے آپ سے یہ باتیں ارشاد فرمائیں۔

بعض حضرات مفسرین یہ بات فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام سے جب پوچھا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ تو آپ نے جواب میں تین باتیں کیوں فرمائیں؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت تھی تو جس سے محبت ہوتی ہے آدمی بہانے تلاش کرتا ہے کہ میں اس سے زیادہ سے زیادہ بات کروں۔

﴿قَالَ اَلْقَهَا يٰمُوسٰى ۝۱۶﴾ فَالْقَهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝۱۷﴾ قَالَ

خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۚ سَنُعِيْدُهَا سَيِّرَتَهَا الْاُولٰٓئِ ۝۱۸﴾

اے موسیٰ! اس لاٹھی کو پھینکو۔ آپ نے پھینکا تو وہ ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کو پکڑو اور خوف محسوس نہ کرو، ہم اس کو دوبارہ اس طرح کا عصا بنادیں گے۔

ایک بات یہ سمجھیں کہ قرآن کریم میں یہاں لفظ ”حَيَّةٌ“ ہے، ایک اور مقام پر ”ثُعْبَانٌ“ ہے۔ ثعبان کہتے ہیں بڑے اژدہا کو اور حية کہتے ہیں باریک سانپ کو۔

تو دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ جب شروع میں تھا تو یہ سانپ باریک تھا آہستہ آہستہ بڑا ہوتے ہوئے اڑدبا بن گیا اور یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تھا تو بہت بڑا اڑدبا لیکن رفتار میں ایسا دوڑتا تھا جیسے باریک سانپ دوڑتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض لوگ بدن میں بہت موٹے ہوتے ہیں لیکن ان کے بدن میں چستی اتنی ہوتی ہے کہ دبلے پتلے لوگوں سے بھی زیادہ تیز دوڑتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب عصا کو پھینکا اور وہ سانپ بنا تو موسیٰ علیہ السلام دوڑے اور دوسرے مقام پر ہے کہ واپس دوڑے تو اللہ نے فرمایا کہ ڈرو مت! ہم دوبارہ اس کو عصا بنا دیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام کا ڈرنا یہ طبعی خوف تھا، بشری تقاضا تھا، یہ نہ نبوت کے خلاف ہے اور نہ ہی ایمان کے خلاف ہے، اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، طبعی خوف ہوتا ہے۔

## [2]: یٰدِیُّضَاءُ

﴿وَاَضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجَ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً

اُخْرٰی﴾

دوسرا معجزہ یہ تھا کہ اپنے ہاتھ کو اپنی بغل کے نیچے ڈال دو، جب باہر نکالا تو چمکتا تھا، اس میں بے عیب سفیدی تھی۔ یہ دونشانیاں آپ کو دی ہیں۔ اب فرعون کے پاس جاؤ، اس کو دین کی دعوت دو۔ آگے آئے گا کہ کیا باتیں کرنی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے جب نبوت عطا فرمائی تو دو معجزے عطا فرمائے۔

## داعی کی ضرورت تین چیزیں:

فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے تین باتیں

دعائیں مانگیں اور تینوں چیزیں وہ ہیں جو ایک داعی اور مبلغ کی ضرورت ہوتی ہیں:

- [1]: ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي﴾ اے اللہ! جو بات میں سمجھانا چاہتا ہوں میرے اوپر کھول دے، بات مجھے اچھی طرح سمجھ آئے تاکہ مجھے سمجھانے میں دقت نہ ہو۔  
 داعی کی ضرورت یہ ہے کہ جو بات دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہے وہ خود اچھی طرح سمجھے، آپ عقیدہ سمجھانا چاہتے ہیں تو پہلے خود سمجھیں، درس قرآن دینا چاہتے ہیں تو پہلے خود سمجھیں، پھر آدمی کو سمجھانے کا لطف آتا ہے۔
- [2]: ﴿وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي﴾ اے اللہ! مجھے اسباب عطا فرما دے۔

داعی کی دوسری ضرورت اسباب ہیں۔ اسباب ہوں تو کام کرنا بہت آسان ہوتا ہے، اسباب نہ ہوں تو کام کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اسباب میں بنیادی اسباب دو ہیں:  
 پہلا افراد اور دوسرا اموال۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو مانگا اور بطور وزیر مانگا کہ مجھے یہ دے دیں تو مجھے کام میں آسانی ہوگی۔

[3]: ﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي﴾ اے اللہ! مجھے فصیح زبان عطا فرما دیں، زبان کی لکنت ختم ہو جائے تاکہ میں بات کھل کر بتا سکوں۔ تو داعی کی یہ تین ضرورتیں ہیں۔

اور یہ بات میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ فصیح زبان کا مطلب لفاظی نہیں ہے، فصیح زبان کا مطلب یہ ہے کہ اتنی عام فہم اور سادہ سی بات ہو کہ مخاطب کے دماغ میں اتر جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ تین چیزیں کیوں مانگی ہیں؟ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی: ﴿يَفْقَهُوا قَوْلِي﴾ تاکہ وہ میری بات سمجھ جائیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا نہیں مانگی کہ وہ میری بات کو مان لیں بلکہ فرمایا کہ وہ میری بات کو سمجھ جائیں۔  
 داعی کے ذمہ بات منوانا نہیں ہے، بات سمجھانا ہے۔ آج ہمارے ہاں لڑائی

اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ ہم بات سمجھانے کے بجائے منوانے کی کوشش کرتے ہیں، ہمارے ذمہ سمجھانا ہے۔ آپ سمجھادیں، مخاطب مانتا ہے تو ٹھیک اور اگر نہیں مانتا تو نہ سہی، اس کی مرضی۔ اس طرح کام کریں تو پھر لڑائی اور جھگڑے نہیں ہوتے۔

آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دعا الگ مانگی:

﴿وَجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۖ هٰؤُنْ اٰخِي ۖ اَشْدُّ بِيْ  
اَذْرِي ۖ وَاَشْرِكُهُ فِىْ اَمْرِى ۝﴾

یہ ﴿وَاَشْرِكُهُ فِىْ اَمْرِى﴾ کی تفسیر ہے کہ یا اللہ! میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا معاون بنادے۔ اس کے ذریعے میری کمر مضبوط فرمادے، اس کو میرے کام میں شامل فرمادے۔

”وزیر“ کہتے ہیں بوجھ اٹھانے والے کو۔ چونکہ وزراء سلطنت کے بادشاہوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں اس لیے انہیں ”وزیر“ کہتے ہیں۔

**عبادات میں ماحول کو دخل ہے:**

﴿كَى نَسْبَحَكَ كَثِيْرًا ۖ وَ نَذْكُوكَ كَثِيْرًا ۝﴾

تاکہ ہم آپ کی تسبیح کریں اور ہم آپ کا ذکر زیادہ کریں۔

جب بھی آدمی اللہ کا ذکر کرنا چاہے تو ذکر کا ماحول ضروری ہے، ماحول سے ذکر کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ جب میرا بھائی میرے ساتھ ہو گا تو ذکر کرنے میں مجھے آسانی ہوگی، ماحول پیدا ہو جائے گا۔ عبادات میں عبادات کے ماحول کا بہت دخل ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۖ الَّذِىْ اَطَعْتَهُمْ مِّنْ جُوعٍ ۚ وَ

اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝﴾



قریش کو چاہیے کہ اس گھر یعنی بیت اللہ کے رب کی عبادت کریں جس نے بھوک کی حالت میں ان کو کھانے کو دیا اور خوف کی حالت میں ان کو امن دیا۔ معلوم ہوا کہ عبادات میں مزا آتا ہے جب عبادات کا ماحول ہو، ماحول اچھا ہو تو عبادت کرنی بہت آسان ہے۔ اور عبادات کے ماحول میں دو چیزوں کو بہت دخل ہے:

- 1: آدمی کو معاش کی پریشانی نہ ہو۔
- 2: آدمی کو خوف کی پریشانی نہ ہو بلکہ امن میسر ہو تو عبادات کا بہت لطف آتا ہے۔ صبح آپ نے اٹھنا ہے تہجد پڑھنی ہے، اب اگر پانی گرم مل جائے، مسجد میں ہیٹر لگا ہو، نیچے قالین بچھا ہو تو کتنی راحت سے عبادت ہوتی ہے۔ اگر پانی ٹھنڈا ہو، سرد ہو اچھل رہی ہو، مسجد کا فرش ٹھنڈا ہو عبادت کتنی مشکل ہے؟! ماحول اچھا ہو یہ چیز اللہ تعالیٰ سے مانگی بھی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اچھا ماحول عطا فرمائیں اور اگر اچھا ماحول ملے تو اس کی قدر بھی کرنی چاہیے۔

﴿قَالَ قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يٰمُوسٰى﴾

اچھا موسیٰ! جو آپ نے دعا کی تھی ہم نے قبول کر لی ہے۔

﴿وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْكَ مَرَّةً اٰخَرٰی﴾

اور ہم نے تم پر ایک اور مرتبہ بھی احسان کیا تھا۔ ایک احسان تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمکلامی کا شرف بخشا، آپ کو نبوت دی، آپ کو معجزات عطا کیے، اس کے علاوہ آپ پر پہلے بھی بہت سے احسانات کیے۔ یہاں ”اٰخَرٰی“ کا معنی ”بعد“ نہیں ہے بلکہ اٰخَرٰی کا معنی ”اور“ ہے۔ ان احسانات کی اللہ تعالیٰ نے اب تفصیل شروع فرمائی:

ام موسیٰ کو پیغام خداوندی:

﴿اِذْ اَوْحٰیْنَا اِلٰی اُمِّكَ مَا یُوحٰی﴾

جب ہم نے آپ کی ماں کے پاس پیغام بھیجا تھا جواب وحی کے ذریعے آپ کو بتا رہے ہیں۔

فرعون اور اس کے درباریوں میں ایک بات چلی کہ بنی اسرائیل کے لوگ اس بات پر خوش ہیں کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ ان میں کوئی نبی اور رسول پیدا ہوگا۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے تھے اسماعیل علیہ السلام اور ایک بیٹے تھے اسحاق علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے تھے حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے جن کے آگے بارہ خاندان تھے۔ انہیں بنو اسرائیل کہتے ہیں۔ ”اسرا“ کا معنی عبد ہے اور ”یسر“ کا معنی اللہ ہے۔ اسرائیل لقب تھا حضرت یعقوب علیہ السلام کا، تو بنو اسرائیل کا معنی ہے ”یعقوب کے بیٹے“ یعنی بارہ۔ ان بارہ بیٹوں کے آگے بارہ خاندان تھے اور ان کی آبادی آگے لاکھوں کی تعداد میں تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر جب مصر سے گئے اس وقت بنی اسرائیل ساڑھے چھ لاکھ کے لگ بھگ تھے۔

فرعون کو خواب آیا اور درباریوں نے تعبیر بتائی کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جو تمہاری حکومت کو ختم کر دے گا تو فرعون نے کہا کہ اس کا حل کیا ہے؟ درباریوں نے کہا کہ حل یہی ہے کہ ان کے بچوں کو قتل کریں تاکہ نہ بچہ رہے اور نہ نبی بنے۔ اس پر مشورہ ہوا اور طے یہ ہوا کہ ان کے بچوں کو ذبح کرو اور بچیاں زندہ رکھو، بچے ذبح کرتے رہے۔ جب اچھی خاصی تعداد ذبح ہونا شروع ہو گئی تو انہوں نے پھر آپس میں مشورہ کیا کہ اگر بچے یوں ذبح ہوتے رہے تو ہمارے کام تو یہی بنی اسرائیل ہی کرتے ہیں، ان کی پرانی نسل ختم ہو جائے گی اور نئی نسل مردوں کی نہیں ہوگی تو ہمارے کام کون کرے گا؟ اب انہوں نے مشورہ کیا کہ ایک سال جو بچے پیدا ہوں ان

کو ذبح کرتے رہو اور جو اگلے سال پیدا ہوں ان کو زندہ رکھا جائے۔

حضرت ہارون علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جو بچوں کو ذبح کرنے کا نہیں تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اگلے سال پیدا ہوئے جو بچوں کو ذبح کرنے کا تھا۔ تو حضرت ہارون علیہ السلام کے بارے میں تو والدہ کو کوئی پریشانی نہیں تھی، پریشانی بنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت والے سال۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں پریشان نہ ہوں، جب یہ بچہ پیدا ہو تو اس کو تابوت میں بند کرو اور دریا میں ڈال دو، ہم اس بچے کو تمہارے پاس ہی لائیں گے، اس کی تربیت تمہارے پاس ہی ہوگی، تم غمزدہ نہ ہو۔

**قبطی کا قتل:**

﴿وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَاكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا﴾

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ ایک بندہ آپ سے قتل ہوا، پھر ہم نے آپ کو اس گھٹن اور پریشانی سے نجات دی اور بھی کئی آزمائشیں آپ پر آئی ہیں۔

آپ کئی سال مَدِیْن میں رہے ہیں، پھر بھی آپ کے مقدر میں تھا اس لیے آپ واپس آئے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ پر کئی آزمائشیں بنتی ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے ان کے گھر پر آئی ہیں۔ ان آزمائشوں کی تفصیل ایک لمبی حدیث مبارک میں ملتی ہے۔

**موسیٰ علیہ السلام پر آزمائشوں کی تفصیل:**

”حدیث الفتون“ کے نام سے سنن النسائی میں بڑی تفصیل کے ساتھ یہ حدیث موجود ہے کہ معروف تابعی حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا﴾ کہ اے موسیٰ! ہم نے تمہیں کئی آزمائشوں سے گزارا، اس میں اس ”فتن“ اور آزمائشوں سے کیا مراد ہے؟

تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کو بتایا کہ جب وہ سال تھا اوپر جو واقعہ میں نے ذکر کیا ہے کہ فرعون اور اس کے درباریوں میں جو مشورہ ہوا کہ ایک سال کے بچوں کو زندہ رکھو اور دوسرے سال کے بچوں کو ذبح کرو تو جس سال زندہ رکھنا تھا اس سال ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے اور آئندہ سال حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی ماں بہت پریشان ہوئی کہ میرے بچے کا کیا بنے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈالا کہ اس بچے کو لکڑی کے صندوق میں ڈالو اور دریا کے حوالے کر دو۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ ان آزمائشوں میں سے سب سے پہلی آزمائش تھی۔

باوجود اس کے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں اللہ نے یہ بات ڈالی، بشارت بھی دی اور وعدہ بھی کیا لیکن پھر بھی طبعی خوف غالب تھا۔ انہوں نے بچے کو صندوق میں ڈال کر دریا کے حوالے کر دیا۔ دریائے نیل کا ایک حصہ فرعون کے محل کے طرف سے ہو کر گزرتا تھا تو یہ صندوق اس طرف چلا گیا۔ آگے چٹان تھی جہاں فرعون کی کنیزیں نہاتی تھیں، کپڑے دھوتی تھیں، سارے کام کرتی تھیں تو اللہ نے اس صندوق کو ان کے قریب کر دیا۔ وہاں کنیزوں نے صندوق کو اٹھایا، سوچا کہ اس کو کھولیں۔ پھر کہا کہ اگر کھولتی ہیں تو اندر سے مال نکلے گا، فرعون کی بیوی کو بتائیں گے تو وہ کہے گی کہ اس میں سے کچھ مال تم نے رکھ لیا ہو گا تو بہتر ہے کہ اس کو کھولے بغیر ہی فرعون کی بیوی کے پاس لے جائیں۔ فرعون کی بیوی آسیہ کے پاس لے گئیں۔ اس نے کھولا تو اندر بچہ تھا۔

## موسیٰ علیہ السلام کی محبوبیت:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَأَلَقَيْنَا عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِنِّي﴾

ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بہت محبوب بنایا تھا۔ فرعون کی بیوی نے جب دیکھا تو دیکھتے ہی دل میں اس بچے کی محبت اتر گئی۔ فرعون کی اولاد تو تھی نہیں تو اس نے کہا کہ اس کی میں تربیت کرتی ہوں۔ جب یہ بات تھوڑی سی پھیل گئی تو جو اہلکار فرعون کی طرف سے مقرر تھے کہ جب بچہ پیدا ہو تو ذبح کر دینا ہے وہ یہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا کہ اس بچے کو ہمارے حوالے کر دو، ہم نے اس کو ذبح کرنا ہے۔ فرعون کی بیوی نے کہا کہ میں فرعون سے بات کر لیتی ہوں، اگر اجازت مل گئی تو ٹھیک ہے ورنہ تم اس کو ذبح کر دینا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اس واقعہ کو ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دوسری آزمائش تھی۔

خیر اس نے فرعون کے پاس جا کر بات کی کہ یہ بچہ ہے اور میں چاہتی ہوں کہ ہم اس کو پالیں، ہمارا بیٹا نہیں ہے، یہ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا۔ فرعون نے کہا کہ یہ تیری آنکھوں کی ٹھنڈک تو ہو سکتا ہے لیکن میری آنکھوں کی ٹھنڈک نہیں ہو سکتا۔

بعض روایات میں ہے کہ اگر فرعون یہ کہہ دیتا کہ یہ بچہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا جس طرح اس کی بیوی نے کہا تھا تو اللہ تعالیٰ دونوں کو ہدایت عطا فرما دیتے۔

خیر بیوی کے کہنے پر فرعون نے اس بچے کو قتل سے آزاد کر دیا۔ اب اس کا مسئلہ تھا دودھ پلانے کا، تو دودھ پلانے کے لیے دایہ مزگائی لیکن بچے نے دودھ نہیں پیا۔ اب یہ بڑا مسئلہ تھا کیونکہ اگر بچہ دودھ نہیں پیتا تو زندہ کیسے رہے گا؟ فرعون کی بیوی نے

اپنی کنیزیں بھیجیں کہ دایہ تلاش کرو، وہ بازار میں پھر کر دایہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ ادھر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اپنی بیٹی سے کہا کہ باہر جاؤ اور لوگوں سے پتا کرو کہ اس تابوت اور بچے کا کیا بنا؟ موسیٰ علیہ السلام کی بہن باہر گئی تو دیکھا کہ کنیزیں بچے کو لے کر دودھ پلانے کے لیے دایہ کو تلاش کر رہی ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا کہ میں ایک گھر کا پتا دیتی ہوں، وہ دودھ بھی پلائے گی اور اس کا خیال بھی رکھے گی۔ ان کنیزوں کو شک پڑا کہ کہیں یہ عورت اس بچے کی ماں یا کوئی خاص رشتہ دار ہے جو اتنے یقین سے کہہ رہی ہے کہ وہ گھر والے اس بچے کا خیال رکھیں گے۔ تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی بہن کو اس شک میں پکڑ لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ تیسری آزمائش کا ہے۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا کہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر اس گھر کا دودھ اس بچے نے پی لیا تو ان گھر والوں کو فرعون کے دربار تک رسائی مل جائے گی، پیسے زیادہ ملیں گے اور جب اتنا کچھ بادشاہ کے گھر سے ملے گا تو وہ اس کا خیال کیوں نہیں رکھیں گے؟! ان کنیزوں کو اس بات سے تھوڑی سی تسلی ہو گئی تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی بہن کو چھوڑ دیا۔

### موسیٰ علیہ السلام کا اپنی ماں کا دودھ پینا:

موسیٰ علیہ السلام کی بہن فوراً گھر پہنچی اور یہ سارا قصہ والدہ کو بتایا۔ دونوں اس جگہ آئیں جہاں کنیزیں کھڑی تھیں۔ کنیزوں کے کہنے پر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے بھی بچے کو گود میں لیا تو فوراً بچے نے ان کا دودھ پینا شروع کر دیا اور پیٹ بھر کر پیا۔ یہ بات فرعون کی بیوی کے پاس پہنچی تو بہت خوش ہوئی۔ چنانچہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بلایا۔ اس نے کہا کہ تم یہاں ٹھہرو اور بچے کو دودھ پلاؤ، تمہارا خرچہ ہم دیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے کہا کہ پہلے میرے پاس ایک بچہ گھر میں ہے، میں اس کو پالتی ہوں، میں اس کو گھر میں کیسے چھوڑوں؟! اگر اس کو دودھ پلانا ہے تو

میرے پاس بھیج دو، میں اپنے گھر میں اس کو دودھ پلاؤں گی، اگر نہیں تو یہاں رہ کر پلانا میرے بس میں نہیں ہے، صاف انکار کیا اور خود داری سے کام لیا۔

خیر انہوں نے بچہ اس کے حوالے کر دیا۔ تو جو اللہ نے وعدہ فرمایا تھا کہ ہم اس کو آپ کے پاس واپس لوٹائیں گے وہ وعدہ پورا ہو گیا۔ اب خرچہ فرعون کا ہے اور دودھ اپنے بچے کو پلاتی ہے۔ یوں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کے پاس رہ کر دودھ پیتے رہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص صنعت و حرفت کا کام کرے، چیزیں تیار کرے۔ جیسے فیکٹریاں ہوتی ہیں، کارخانے ہوتے ہیں۔ اور دیانت سے کام کرے تو یہ ایسے ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہے، یعنی بچہ بھی اپنا ہے اور اس بچے کو دودھ پلانے پر خرچہ بھی مل رہا ہے حالانکہ اپنے بچے کو دودھ پلانے پر تو خرچہ نہیں ملتا تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ بندہ صنعت و حرفت کا کام کرے اچھی نیت سے کرے تو کام بھی اپنا کرے گا اور ثواب بھی ملے گا۔

### فرعون کی ڈاڑھی پکڑنا:

خیر کچھ دنوں کے بعد فرعون کی بیوی نے بلایا کہ لے آؤ بیٹے کو میں نے دیکھنا ہے۔ اس دوران فرعون کی بیوی نے اپنے سب درباریوں کو حکم دیا کہ جب وہ دایہ بچے کو لے کر آئے تو تم سب ہدایا دو۔ تو جس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کے ساتھ گھر سے نکلے اس وقت سے لے کر محل پہنچنے تک لوگوں نے خوب ہدیے دیے۔ جب سارے ہدیے جمع ہو گئے تو اس نے یہ سارے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے حوالے کر دیے کہ یہ بھی تمہارا مال ہے، تم اس کو لے جاؤ۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ میں اب اس کو فرعون کے پاس لے جاتی ہوں وہ بھی اس کو ہدیے تحفے دے گا۔ جب فرعون

کے دربار میں لے کر گئی، فرعون نے ان کو اپنی گود میں بٹھالیا تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کی ڈاڑھی کو پکڑا اور اپنی طرف جھٹکا مار کر کھینچا۔

اس سے فرعون کو شک پڑا کہ یہ وہی بچہ نہ ہو اور درباریوں نے کہا کہ یہی وہ بچہ ہے جو تیری سلطنت کے ختم ہونے کا ذریعہ بنے گا، اس کو سنبھالو۔ تو فرعون نے کہا کہ اس کو لے جاؤ اور ذبح کر دو۔ فرعون کی بیوی نے کہا کہ یہ بچہ ہے، اس کو کچھ پتا نہیں ہے، تم اس کو آزمالو، ایسا کرو کہ تم آگ کے انگارے رکھو اور موتی بھی رکھو۔ اگر یہ سمجھدار ہو تو یاقوت کی طرف جائے گا اور اگر بچہ ہو تو آگ زیادہ چمکتی ہے ادھر دوڑے گا۔ انہوں نے یہ دونوں چیزیں رکھ دیں تو موسیٰ علیہ السلام نے انگارے اٹھا لیے۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام موتیوں کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہتے تھے کہ جبرائیل امین آئے اور ان کا ہاتھ انگاروں کی طرف پھیر دیا، موسیٰ علیہ السلام نے آگ کا انگارہ ہاتھ میں پکڑا اور فوراً منہ میں ڈال دیا۔ فرعون نے فوراً انگارے کھینچ کر باہر نکالا، اس سے موسیٰ علیہ السلام کی کچھ زبان جل گئی۔ تو فرعون کی بیوی نے کہا کہ دیکھو! یہ تو بچہ ہے، اس کو تو پتا ہی نہیں ہے کہ آگ کیا ہوتی ہے اور یاقوت کیا ہوتا ہے؟! خیر اس سے اس کو تسلی ہو گئی اور اس نے بچے کو چھوڑ دیا۔

اس طرح موسیٰ علیہ السلام ان کے گھر میں پلے جو ان ہوئے، ایک وقت آیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی سب لوگ عزت کرتے تھے، احترام کرتے تھے۔

### قبطی اور بنی اسرائیلی کی لڑائی:

ایک دن موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک اسرائیلی اور ایک فرعونی آپس میں لڑ رہے ہیں، موسیٰ علیہ السلام کو یقین ہوا کہ فرعون کا قصور ہے تو آپ نے چھڑانے کے لیے اس کو مکارا تو فرعونی قتل ہو گیا۔ اب پتا نہیں چل رہا تھا کہ قتل کس نے کیا



ہے؟ یا اسرائیلی کو پتا ہے یا موسیٰ علیہ السلام کو، تیسرے بندے کو اس کی خبر نہ تھی۔ فرعون نے بندے لگائے کہ قاتل کو تلاش کرو تا کہ ہم اس کو سزا دیں لیکن قاتل مل نہیں رہا تھا۔ دوسرے دن پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام جارہے تھے، دیکھا کہ وہی اسرائیلی ایک اور فرعون سے لڑ رہا تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ آج اسرائیلی کا قصور ہے تو آپ نے اس کو سمجھایا کہ تو روزانہ لڑتا ہے اور باز کیوں نہیں آتا؟ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو تھوڑا سا ڈانٹا تو وہ سمجھا کہ اب مجھے ماریں گے، اس نے کہا کہ موسیٰ! کل تم نے ایک فرعون کو مارا تھا اور آج تم مجھے مارنا چاہتے ہو۔

اتنی بات کی اور بات ختم ہو گئی۔ اس فرعون نے بات سنی۔ اس نے فرعون کے دربار میں یہ بات پہنچادی کہ کل جو قتل ہوا تھا وہ موسیٰ نے کیا تھا۔ فرعون نے پولیس والے دوڑائے کہ جاؤ گرفتار کرو، پولیس والے تو بائی روڈ جاتے ہیں آدمی کو پکڑنے کے لیے، وہاں پر ایک درباری تھا جس نے بات سن لی تو وہ مختصر راستے سے گیا اور موسیٰ علیہ السلام سے کہا موسیٰ! اپنی خیر مناؤ، وہ تجھے مارنا چاہتے ہیں۔

### مدین کا سفر:

موسیٰ علیہ السلام پھر وہیں سے رات کے اندھیرے میں نکلے اور مدین کا رخ کیا۔ اجنبی آدمی تھے راستے کا پتہ نہیں تھا۔ آگے سارا واقعہ آپ نے سنا ہوا ہے کہ راستے پر ایک کنواں تھا، لوگ وہاں پانی بھرتے تھے، دو بچیاں ایک طرف کھڑی تھیں، موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ تم کیوں کھڑی ہو؟ کہا کہ لوگ جانیں گے تو ہم اپنی بکریوں کو پانی پلائیں گی۔ موسیٰ علیہ السلام نے ڈول نکالا اور بکریوں کو پانی پلادیا تو وہ جلدی گھر پہنچ گئیں۔ وہ دونوں حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیاں تھیں۔ پوچھا کہ آج تم جلدی آگئی ہو؟ بیٹیوں نے جواب دیا کہ وہاں پر کوئی مسافر تھا، انہوں نے ہماری بکریوں کو پانی پلایا ہے۔ کہا کہ اس کو بلا کر لاؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں گئے، حضرت شعیب علیہ

السلام نے ان کے سارے حالات سنے تو فرمایا کہ تم پریشان مت ہو، فرعون کی جو سلطنت تھی تم وہاں سے نکل آئے ہو۔ میں اپنی ایک بیٹی سے تمہارا نکاح کر دوں گا، میری شرط یہ ہے کہ آٹھ سال بکریاں چراؤ اور اگر دس سال چراؤ گے تو تمہاری مرضی ہے۔ موسیٰ علیہ نے شرط قبول کر لی۔

یہ حضرت شعیب علیہ السلام نے تدبیر اختیار فرمائی کہ ویسے رکھوں گا تو یہ غیرت مند نوجوان ہے، ٹھہرے گا نہیں اور اگر مزدوری پر رکھوں گا تو رک جائے گا اور یہ بات شعیب علیہ السلام کی بیٹی نے کہی کہ آپ اس کو مزدوری پر رکھیں، یہ قوی بھی ہے اور امین بھی ہے۔ تو شعیب علیہ السلام نے پوچھا کہ تمہیں کیسے پتا چلا؟ اس نے کہا کہ ایک تو ہم نے ان کو پانی نکالتے ہوئے دیکھا، اس سے ہمیں اس کی طاقت کا پتا چلا اور جب میں بلانے کے لیے گئی تو انہوں نے آنکھیں نیچے کر کے میری پوری بات کو سنا، پھر مجھے کہا کہ میں آگے چلتا ہوں اور تم میرے پیچھے چلو، جس طرف مڑنا ہے تم اس طرف پتھر پھینکنا، میں سمجھوں گا کہ راستہ اس طرف ہے۔ تو ان دو باتوں کی وجہ سے شعیب علیہ السلام نے ان کو اپنا داماد بنایا۔

### مدین سے واپسی:

پھر جب موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس سے واپس آ رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ حکم دیا کہ جاؤ اور فرعون کو دعوت دو۔

﴿إِذْ هَبَ آتَتْ وَ آخُوكَ بِأَيْتِي وَلَا تَتَّبِعَانِي فِي ذِكْرِي﴾ (٢٠) إِذْ هَبَا إِلَىٰ

فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ﴿٢١﴾ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيْسًا تَعْلَهُ يَتَذَكَّرْ أَوْ يَخْشَىٰ ﴿٢٢﴾

تم اور تمہارا بھائی میری یہ نشانیاں لے کر جاؤ اور میرے ذکر میں سستی نہ کرنا، فرعون کے پاس جاؤ، وہ حد سے نکل چکا ہے، اس کے پاس جا کر نرمی سے بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا اللہ سے ڈر جائے۔

تو اللہ تعالیٰ نے بات کرنے کا سلیقہ بتایا ہے۔ آج جتنا بھی بڑا داعی ہو وہ موسیٰ علیہ السلام سے بڑا نہیں ہو سکتا اور جس کو دعوت دینی ہو وہ جتنا بھی گندہ ہو فرعون سے گندہ نہیں ہو سکتا تو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں کو حکم ہے کہ بات نرم کہنا، لہجہ کا بہت دخل ہے بندے کو سمجھانے میں، اس لیے بات اچھی ہو لیکن لہجہ نرم ہونا چاہئے۔

### نرمی اور سختی کہاں کی جائے؟

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے فرمایا: ﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ کہ فرعون سے نرم لہجہ میں بات کرنا۔ اب سوال یہ ہے کہ آج ہمارے ہاں احتجاج ہوتا ہے حکمرانوں کے خلاف، ہماری تقاریر ہوتی ہیں فرق باطلہ کے خلاف اور بہت سخت ہوتی ہیں جس کا لہجہ نرم نہیں ہوتا تو کیا یہ قرآن کریم کی اس آیت کے خلاف ہے؟

بات سمجھیں کہ یہ جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو نرم بات کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہ ابتداء تھا کہ جب آپ پہلی بار جاؤ تو اس کو نرمی سے بات سمجھاؤ، ابتدا میں سختی نہ کرو بلکہ پیار سے سمجھاؤ اور جب حجت تام ہو جائے اور پھر بھی نہ مانے تو پھر ﴿قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ نہیں ہے بلکہ پھر حکم یہ ہوتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾<sup>159</sup>

اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو!

پھر جہاد بھی ہے اور سختی بھی ہے، ابتدائی طور پر دلائل، پیار اور نرمی سے بات سمجھاؤ، جب بار بار سمجھانے کے باوجود نہ سمجھے تو پھر تنبیہ بھی جائز ہے، لاکارنا بھی جائز ہے اور جب نوبت قتال تک پہنچ جائے تو پھر جہاد اور قتال بھی جائز ہے۔ یہ مراحل

اخیر کے ہیں اور ہمارے حضرات جو حکمرانوں کو لتاڑتے ہیں وہ پہلے دن نہیں ہوتا، بڑے عرصہ کے بعد ہوتا ہے۔ تو دونوں میں فرق کرنا چاہیے۔

﴿قَالَ رَبَّنَا إِنَّا نَخَافُ أَنْ يُفْرِطَ عَلَيْنَا أَوْ أَنْ يَطْغَى ۖ﴾ قَالَ لَا

تَخَافَا إِنِّي مَعَكُمْ أَسْمَعُ وَأَرَى ﴿٢٠﴾

ان دونوں نے کہا کہ یا اللہ! ہمیں ڈر ہے ﴿اَنْ يُّفْرِطَ عَلَيْنَا﴾ کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کرے کہ دعوت دینے سے پہلے ہی ہمیں ختم کر دے اور ہمارے اوپر حملہ کرے، ﴿اَوْ اَنْ يُّطْغٰی﴾ یا ہم اسے دعوت دیں تو مزید سرکش ہو جائے، یہ ہمیں خدشہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ڈرو مت، میں تمہارے ساتھ ہوں، سن بھی رہا ہوں اور دیکھ بھی رہا ہوں۔

### فرعون کو دعوت اور اس کا جواب:

﴿فَاتَّيَبَهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَءِيلَ ۖ وَلَا

تُعَذِّبْهُمْ ۚ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّنْ رَبِّكَ ۖ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۖ﴾

تم اس کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم دونوں تمہارے رب کے پیغمبر ہیں، اس لیے بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو اور انہیں تکلیفیں مت دو۔

تو دو باتیں ہیں؛ ایک اس کو توحید کی دعوت دو اور دوسرا اس سے اپنی قوم کی آزادی کی بات کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اس کے پاس پہنچے اور اس کو دعوت دی تو اس نے پوچھا کہ تم کس بات کی دعوت دیتے ہو؟ کہا کہ اللہ کے دین کی دعوت دیتے ہیں، پھر کہا: تمہارا رب ہے کون؟ فرمایا:

﴿رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ حَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰى ۖ﴾

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب پیدا کیا ہے اور اس کی

رہنمائی بھی فرمائی، اس کو راستے بھی دکھائے۔

﴿قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ﴾ قَالَ عَلِمْتُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَا

يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى ﴿٥٤﴾

فرعون نے کہا کہ اچھا! یہ بتاؤ کہ بقول تمہارے پہلے بھی نبی گزرے ہیں تو جن لوگوں نے ان کی بات نہیں مانی ان کا کیا انجام ہوا؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کا کیا انجام ہوا، یہ بات اللہ کے علم میں ہے۔ فرعون کا مقصد یہ تھا کہ جب میں یہ سوال کروں گا تو موسیٰ علیہ السلام کہیں گے کہ وہ جہنمی تھے، عذاب آیا تھا اور تباہ ہو گئے تھے تو میں اپنی قوم کو بطور مذاق کہوں گا کہ انہیں دیکھو! یہ اپنے علاوہ سب کو گمراہ سمجھتے ہیں، بس یہی نیک ہے اور کوئی نیک نہیں ہے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے تدبیر سے بات فرمائی کہ ﴿عَلِمْتُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ﴾ اس کا علم میرے رب کے پاس ہے اور میرے رب کو نہ غلطی لگتی ہے اور نہ ہی وہ بھولتا ہے۔

**پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا:**

﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ﴾ ﴿٥٥﴾

اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے، اسی زمین میں ہم تمہیں واپس لے جائیں گے اور اسی زمین سے تمہیں ایک مرتبہ دوبارہ نکالیں گے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ضابطہ بیان فرمایا کہ مٹی سے تم کو پیدا کیا، مٹی میں لوٹائیں گے اور اسی مٹی سے اٹھائیں گے۔ بعض روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ جو انسان بھی پیدا ہوتا ہے تو رحم مادر میں ایک تو باپ کا نطفہ ہوتا ہے اور دوسرا جس مٹی میں اس انسان نے دفن ہونا ہوتا ہے اس مٹی کا کچھ حصہ اللہ تعالیٰ فرشتے کے ذریعے ماں کے رحم میں ڈال دیتے ہیں۔ تو جس مٹی میں اس نے دفن ہونا ہوتا ہے وہ مٹی اس میں شامل

ہوتی ہے۔ اب اس کی نوعیت کیا ہوتی ہے وہ تو اللہ ہی جانتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ پہنچی وہاں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"خُلِقْتُ أَنَا وَابْنُ بَكْرٍ وَعُمَرُ مِنْ طِينَةٍ وَاحِدَةٍ" <sup>160</sup>

کہ میں، ابو بکر اور عمر ایک ہی مٹی سے بنے ہیں۔

اس لیے دفن بھی ایک جگہ ہوئے اور قیامت کے دن اٹھیں گے بھی اسی جگہ سے۔

### جادو گروں سے مقابلہ:

﴿قَالَ أَجِئْتَنَا لِنُخْرِجَنَّا مِنْ أَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يَمُوسَى﴾

فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ! تم اس لیے آئے ہو تاکہ اپنے جادو سے ہمیں اپنی زمین سے نکال دو۔ ہم تمہارا مقابلہ کریں گے۔ اب مقابلہ کیسے کریں گے؟ اس کے لیے عید کا دن طے ہوا اور دوپہر کا وقت جس میں سب امیر غریب جمع ہوں۔ گراؤنڈ ایسا ہے جو اسرائیلیوں اور فرعونیوں کے درمیان میں ہے تو دونوں کے آنے میں زیادہ دیر نہ لگے اور وقت پر پہنچیں۔ فرعونی بھی آگئے، اسرائیلی بھی آگئے، ان کے ستر ہزار جادو گر بھی آئے۔ وہ موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ پہلے تم اپنا کرشمہ دکھاؤ گے یا ہم دکھائیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ پہلے تم دکھاؤ، اس کے بعد میں معجزہ دکھاؤں گا۔ ان ستر ہزار جادو گروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینکیں۔

### جادو گروں کا قبولِ حق:

﴿فَإِذَا جَاءَهُمْ وَعَصِيَهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَى﴾

فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَى ﴿٢٤﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَى ﴿٢٥﴾ وَالْقَىٰ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفُ مَا صَنَعُوا ۖ إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدٌ سَیْرٌ ۖ وَلَا يُفْعِلُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ﴿٢٦﴾ فَالْقَى السَّحْرَةَ سُجَّدًا قَالُوا أَمَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ ﴿٢٧﴾

جو نبی انہوں نے رسیاں پھینکیں تو ان کے جادو کے اثر سے موسیٰ علیہ السلام کو ایسے محسوس ہونے لگا کہ یہ سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں۔ اس سے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا۔ خوف اس وجہ سے تھا کہ ان لوگوں نے لاٹھیاں پھینکیں اور سانپ بن گئے، میں لاٹھی پھینکوں گا تو وہ بھی سانپ بن جائے گی تو قوم فیصلہ کیسے کرے گی کہ یہ جادو ہے یا معجزہ؟ لوگ ایمان کیسے لائیں گے؟۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَى﴾ کہ اے موسیٰ! تم مت ڈرو، تم ہی غالب آؤ گے۔ آج پتہ چل جائے گا کہ معجزہ کیا ہوتا ہے اور جادو کیا ہوتا ہے!

جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی پھینکی تو اثر دہا بن گیا، اس نے سارے سانپوں کو نگل لیا۔ جادو گر وہیں سجدے میں گر گئے اور انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کے پروردگار پر۔ تو فرعون نے ان سے کہا کہ تم نے ملی بھگت کی ہے، تم موسیٰ علیہ السلام سے ملے ہوئے ہو، اس لیے تم نے ایسا کرتب کیا۔ میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ آج تمہارا دایاں ہاتھ بائیں پاؤں اور دایاں پاؤں بائیں ہاتھ کاٹ کے رکھ دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ فرعون! تو نے جو کرنا ہے آج کر لے، ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، ہم بدلنے والے نہیں ہیں چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

**جادو کا اثر (احمد سعید کے اعتراض کا جواب)**

یہاں یہ بات سمجھیں کہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَلَا يُفْعِلُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ﴿٢٦﴾﴾

کہ جادو گر کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اب مسئلہ جادو کا ہے۔ یہاں بعض لوگوں نے جادو کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ جادو کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ہمارے قریب دور میں ایک مماتی تھا احمد سعید چتر وڑی، اب فوت ہو گیا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر والی حیات کا منکر تھا، اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج تھا، اس نے ایک مستقل کتاب لکھی تھی ”قرآن مقدس اور بخاری محدث“، اس نے اپنی اس کتاب میں صحیح بخاری کی 53 احادیث ایسی نقل کی ہیں کہ جن کو قرآن کریم کے خلاف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے ایک حدیث صحیح بخاری کتاب الطب میں ہے کہ:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ سَخَّرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ مِنْ بَنِي زُرَيْقٍ يُقَالُ لَهُ لَبِيدُ بْنُ الْأَعْصَمِ حَتَّى كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُخَيِّلُ إِلَيْهِ أَنَّهُ كَانَ يَفْعَلُ الشَّيْءَ وَمَا فَعَلَهُ.<sup>161</sup>

کہ امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لبید بن اعصم نے جادو کیا تھا اور اس جادو کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بسا اوقات خیال آتا کہ میں نے یہ کام کیا ہے حالانکہ وہ کام کیا نہیں ہوتا تھا اور بسا اوقات یہ خیال آتا کہ میں نے یہ کام نہیں کیا حالانکہ آپ نے وہ کام کیا ہوتا تھا، تو یہ جادو کا اثر تھا۔

اور احمد سعید نے کہا کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَلَا يُفْعِلُ الْإِنْسَانُ حَيْثُ

آتَى ۝۱۶﴾ کہ جادو گر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور ادھر امی عائشہ کہتی ہے کہ لبید بن اعصم کامیاب ہوا تھا۔ تو یہ حدیث قرآن کریم کے خلاف ہے۔ لہذا جادو کی کوئی حقیقت



نہیں ہے۔

حالانکہ احمد سعید کی یہ بات بالکل ہی غلط ہے اور قرآن کریم کو نہ سمجھنے کی علامت ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ذَهَبَ أَهْلُ السُّنَّةِ إِلَى أَنَّ السِّحْرَ ثَابِتٌ وَلَهُ حَقِيقَةٌ.<sup>162</sup>

کہ اہل السنۃ کا موقف یہ ہے کہ جادو کی حقیقت بھی ہے اور یہ ثابت بھی ہے۔

قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ<sup>163</sup> فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ﴾

کہ یہ بنی اسرائیلی لوگ اس چیز یعنی جادو کے پیچھے لگ گئے جو دو فرشتوں؛ ہاروت وماروت کو دی گئی تھی۔ یہ دو فرشتے لوگوں کو اس وقت تک جادو نہیں سکھاتے تھے جب تک ان کو یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم بطور امتحان کے بھیجے گئے ہیں، اس لیے تم لوگ جادو کے پیچھے پڑ کر کفر اختیار نہ کرنا۔ پھر بھی لوگ ان سے جادو سیکھتے تھے جس کے ذریعے میاں اور بیوی کے درمیان جدائی ہو جائے۔

تو جادو کی حقیقت تو قرآن سے ثابت ہے۔ یہ کہنا کہ قرآن سے ثابت نہیں ہے یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تو اس نے کہا کہ یہ حدیث قرآن کریم کے خلاف ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ قرآن کریم نہ سمجھنے کی وجہ سے اشکال پیش آیا۔ ﴿وَلَا يُفِيهِ السَّاحِرُ حَيْثُ

162۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج 1 ص 246

163۔ البقرة: 2: 102

آتی ﴿﴾ کا معنی یہ ہے کہ جادو گر جس مقصد کے لیے جادو کرتا ہے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اب دیکھو! ان لوگوں نے اپنی لائٹھیاں پھینکیں، اپنی رسیاں پھینکیں تو نتیجہ کیا نکلا کہ وہ سانپ دوڑتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ جادو تو انہوں نے کیا، جادو کا اثر بھی ہو گیا لیکن ان کے جادو سے مقصد تھا موسیٰ علیہ السلام کو شکست دینا لیکن وہ موسیٰ علیہ السلام کو شکست نہیں دے سکے، یہ ہے ﴿وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَى﴾ کا معنی۔

لبید بن اعصم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تاکہ آپ دین کی دعوت نہ دے سکیں، اس کے جادو کے باوجود آپ دین کی دعوت دیتے رہے تو جادو گر اپنے جادو میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

میں ایک مثال سے سمجھاتا ہوں کہ کامیاب ہونے کا مطلب یہ ہے مثلاً کچھ لوگ کسی عالم پر قاتلانہ حملہ کرتے ہیں، مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کو قتل کریں، وہ حملہ کر دیتے ہیں، عالم کو دو گولیاں لگ جاتی ہیں جس سے وہ زخمی ہوتے ہیں اور کچھ دنوں کے علاج کے بعد وہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ وہ حملہ کر نہیں سکے اور ان کے حملہ کا اثر نہیں ہوا بلکہ ہم کہیں گے کہ حملہ کیا ہے، حملہ کا اثر بھی ہوا ہے لیکن حملہ کرنے والے اپنے حملے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

تو قرآن کریم میں یہ تو ہے جادو گر اپنے جادو میں کامیاب نہیں ہو سکتے، قرآن میں یہ نہیں ہے کہ جادو کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ جادو کا اثر ہونا اور ہے اور جادو گر کا اپنے مقصد میں کامیاب ہونا اور ہے۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

دوسری بات... اگر غور کیا جائے تو جو بات قرآن کریم میں ہے وہی بات بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال میں آتا کہ میں نے یہ کام کیا ہے حالانکہ آپ نے کیا نہیں ہوتا تھا۔ ادھر قرآن کریم میں ہے:

﴿فَإِذَا جِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَى﴾

تو جو لفظ بخاری کے ہیں وہی لفظ قرآن کریم کے ہیں۔ وہاں بھی "يُحْيِي" اِلَيْهِ" اور یہاں بھی "يُحْيِي" اِلَيْهِ"۔ یعنی وہ رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بنے نہیں تھے لیکن دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ سانپ بن گئے ہیں، اسی طرح اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال میں آتا کہ میں نے یہ کام کیا ہے حالانکہ کیا ہوا نہیں تھا۔ تو بخاری اور قرآن کے الفاظ تو ایک جیسے ہیں پھر یہ بخاری؛ قرآن کے خلاف کیسے ہے؟

### فرعون کی حق سے روگردانی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعوت دی، اصلاح کی کوشش کی لیکن فرعون باز نہیں آیا، موسیٰ علیہ السلام نے معجزات دکھائے لیکن وہ پھر بھی نہیں مانا، موسیٰ علیہ السلام نے مقابلہ کیا اور فاتح ہو گئے لیکن فرعون پھر بھی نہیں مانا۔ فرعونوں پر پھر عذاب آیا کہ جب بھی وہ کھانا کھانے لگتے تو مینڈک ہی مینڈک ہوتے برتنوں میں، کھانے میں، انہوں نے کہا کہ موسیٰ! دعا کرو۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو عذاب ٹل گیا۔ لیکن انہوں نے پھر سرکشی کی تو پھر ان پر عذاب آیا کہ ٹڈیاں ہی ٹڈیاں ہیں۔ پھر کہا کہ جی دعا کرو! دعا کی تو یہ عذاب بھی ٹل گیا لیکن وہ لوگ پھر بھی شرارت سے باز نہیں آئے، پھر خدا کا عذاب آیا کہ جو چیز کھانے لگتے وہ خون بن جاتی۔ کہا کہ جی دعا کرو، اگر یہ عذاب دور ہو گیا تو ہم ٹھیک ہو جائیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی، عذاب ٹلا لیکن یہ پھر بھی ٹھیک نہیں ہوئے۔ پھر ان کے کپڑوں میں جویں ہی جویں پڑ گئیں۔ پھر کہا کہ جی دعا کرو، یہ عذاب دور ہو گیا تو ہم ٹھیک ہو جائیں گے۔ دعا سے عذاب ٹلا لیکن وہ پھر بھی ٹھیک نہ ہوئے۔ اس طرح مختلف قسم کے ان پر عذاب آئے لیکن وہ پھر بھی ٹھیک نہ ہوئے۔

### بنی اسرائیل کی آزادی:

﴿وَلَقَدْ آوَحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ ۖ أَنْ أَسْرِ بِعَبَادِي فَاصْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا

فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَا تَخَفُ دَرَكًا وَلَا تَخْشَى ﴿٦٦﴾

ہم نے موسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ میرے بندوں کو لے کر راتوں رات یہاں سے روانہ ہو جاؤ! پھر ان کے لیے سمندر میں ایک خشک راستہ نکال لینا جس سے تمہیں یہ خطرہ بھی نہ ہو گا کہ دشمن پکڑ لے گا اور کوئی خوف بھی نہ ہو گا۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ ہمیں اچانک نکلنا ہے فرعونوں کو پتہ نہ چلے۔ اسرائیلیوں نے فرعونوں سے کہا کہ بھائی! ہماری اپنی عید ہے، ہم وہ منانے کے لیے مصر سے باہر جا رہے ہیں اور چونکہ موقع ہماری خوشی کا ہے اس لیے ہمیں عاریۃً کچھ زیور چاہئیں۔ اس بہانے سے انہوں نے کچھ زیورات مانگ لیے۔ بنی اسرائیل چھ لاکھ سے کچھ زائد افراد تھے، رات کی تاریکی میں نکلے۔ فرعون کو اس کی اطلاع ملی تو فرعون اپنا لشکر لے کر نکلا، سات لاکھ تو صرف گھڑ سوار تھے، باقی لشکر اس کے علاوہ تھا۔

موسیٰ علیہ السلام جب سمندر پر پہنچے تو منظر یہ تھا کہ آگے دریا ہے اور پیچھے فرعونی۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا: ﴿إِنَّا كُنتُمْ مُؤْمِنُونَ﴾<sup>164</sup> کہ ہم تو پکڑے گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے، ضرور رہنمائی فرمائے گا۔ خیر! موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا مارا تو سمندر میں بارہ راستے بن گئے اور پانی ایسا کھڑا تھا ﴿كَالْعُودِ الْعَظِيمِ﴾<sup>165</sup> کہ جیسے ایک بڑا پہاڑ ہو۔ بنی اسرائیل وہاں سے گزرے، ادھر فرعون بھی آگئے۔ فرعون سمندر دیکھ کر ڈرنے لگے تو فرعون نے اپنا گھوڑا پہلے ڈالا، باقی اس کے پیچھے آئے۔ جب ان کے لشکر کا پہلا گھوڑا آخری کنارے پر تھا اور

164۔ الشعراء 61:26

165۔ الشعراء 63:26

آخری گھوڑا پہلے کنارے پر یعنی جب سب دریا میں چلے گئے اللہ کی طرف سے حکم آگیا کہ اب ان کو تباہ کر دو، پانی آپس میں مل گیا اور یہ سب بہہ گئے۔

### فرعون نمونہ عبرت بنا:

اللہ تعالیٰ نے فرعون کی لاش کو محفوظ رکھا تاکہ بعد والے عبرت حاصل کریں۔ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی دریا سے نکل کر آگے گئے تو ایک قوم پر گزر ہو ا جو بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ اے موسیٰ! ہمیں بھی کوئی خدا بنادو تاکہ ہم اس کی پوجا کریں تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم یہاں ٹھہرو، میں اللہ کے پاس جاتا ہوں، اللہ سے دعا کرتا ہوں، کوئی کتاب لاتا ہوں عمل کرنے کے لیے۔ آپ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون کو سمجھایا کہ ذرا ان کا خیال رکھنا اور میرے آنے تک ان کی نگرانی کرنا۔ میں ان شاء اللہ تیس دن کے بعد آتا ہوں۔

### موسیٰ علیہ السلام کی اللہ سے ہمکلامی:

وحی آگئی کہ آپ آئیں، تیس دن روزے رکھیں، پھر ہم آپ کو کتاب دیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے تیس دن روزے رکھے، روزہ رکھنے سے منہ میں ایک بو پیدا ہوتی ہے تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کے خیال سے مسواک کی جس سے بو زائل ہو گئی۔ جب اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ اے موسیٰ! آپ نے افطار کیوں کر لیا؟ موسیٰ علیہ السلام نے کچھ کھایا یا نہیں تھا لیکن چونکہ پیغمبر تھے اس لیے محض مسواک کرنے کو بھی اللہ تعالیٰ نے افطار کرنے سے تعبیر کیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس حقیقت کو سمجھ گئے تو عرض کیا کہ یا اللہ! تیس دن روزے رکھنے کی وجہ سے ایک بو تھی میں نے آپ سے بات کرنی تھی تو میں نے مسواک کر کے بو کو ختم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہمیں تو وہی بو پسند ہے اور یہ بو ہمارے ہاں مشک سے زیادہ پسندیدہ ہوتی ہے۔ لہذا آپ دس روزے مزید رکھو، پھر ہمارے پاس آنا۔

## بنی اسرائیل کا بچھڑے کی عبادت کرنا:

ادھر موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام نے تیس دن کا وعدہ کیا تھا، وہ تو پورے ہو گئے لیکن موسیٰ علیہ السلام کہاں گئے؟ بعض روایات میں آتا ہے کہ سامری نے ان کو مشورہ دیا یا ہارون علیہ السلام نے اپنی مرضی سے فرمایا وہ جو تمہارے پاس زیورات اور عاریت کا سامان ہے وہ تمہارا نہیں ہے، یہ تمہارے پاس بطور امانت کے تھا، فرعون جی جو اس سامان کے مالک ہیں وہ ہلاک ہو چکے ہیں اس لیے تم اس کو استعمال نہیں کر سکتے، یہ تمہاری ملکیت نہیں ہے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے وہ سارا سامان اور زیورات جمع کر کے ایک گڑھے میں پھینکوا دیا اور کہا کہ اس کو آگ لگا کر ختم کرو۔ ان سارے زیورات اور سامان کو آگ لگا دی گئی۔ سامری آیا تو اس نے مٹھی بند کی ہوئی تھی، حضرت ہارون علیہ السلام سمجھے کہ اس کے ہاتھ میں بھی کوئی زیور ہے، اس لیے اس کو بھی کہا کہ تم بھی اپنی مٹھی کا سامان اس آگ میں ڈالو۔ اس نے کہا: میں ڈالتا ہوں لیکن ہارون! تم ایک دعا کرو کہ جو میں چاہتا ہوں اللہ کرے وہ ہو جائے۔ یہ شخص منافق تھا۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے اس کو مسلمان سمجھ کر دعا کی کہ یا اللہ! جو یہ چاہتا ہے وہ ہو جائے۔

اس نے مٹھی میں موجود چیز کو آگ میں پھینکا۔ اس کے ذہن میں تھا کہ میں سارا سونا اکٹھا کر کے ایک بچھڑا بناؤں، اس میں مٹی ڈالوں اور پھر قوم سے کہوں کہ تم اس کی عبادت کرو۔ جب وہ چیز ڈالی تو چونکہ ہارون علیہ السلام دعا کر چکے تھے اس لیے اس دعا کی وجہ سے وہ سارا سونا، چاندی، لوہا، پیتل جو کچھ اس گڑھے میں ڈالا گیا تھا سب مل کر بچھڑا بن گیا۔ اب بچھڑے سے آواز آئی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ وہ بچھڑے کی آواز نہیں تھی بلکہ بچھڑا ایسا بنایا تھا کہ اس میں سے سوراخ تھا، جب پیچھے کی طرف سے ہوا تیزی سے اندر جاتی اور منہ سے نکلتی تو اس سے

آواز پیدا ہوتی تھی۔ اس سامری نے کہا کہ دیکھو! تیس دن ہو گئے، موسیٰ علیہ السلام بھول گئے ہیں، دراصل خدایہ ہے اور پتا نہیں کہ وہ کہاں سے خدا کو تلاش کر رہے ہیں!

### امانت کی پاسداری:

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو جب ساتھ لے کر گئے تو بنی اسرائیل نے فرعونیوں سے عاریتاً زیورات لے کر ساتھ رکھے ہوئے تھے، باوجود اس کے کہ فرعونی ان کے مخالف تھے، ان کے بچے قتل کیے تھے اور ایک عرصہ دراز تک ان پر ظلم کیے رکھا تھا۔ اگر بدلے میں ان زیورات کو استعمال کرتے تو کر سکتے تھے لیکن حضرت ہارون علیہ السلام نے فرمایا کہ اس زیور کو استعمال نہیں کرنا، مخالف اگرچہ غرق ہو گئے ہیں اور اب یہ مال ان کو واپس نہیں کیا جاسکتا لیکن چونکہ مال ان کا ہے اس لیے میں یہ حلال نہیں سمجھتا کہ تم اسے استعمال کرو! اس لیے حکم دیا کہ یہ زیورات گرٹھا کھود کے اس میں ڈال دو اور اسے آگ لگا دو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرہ سال تک مکہ والوں نے ستایا ہے، کون سا ظلم ہے جو آپ پر نہیں کیا، بیٹیوں کو طلاق تک کی نوبت آئی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو چھپ کر ہجرت فرما رہے ہیں تو مکہ والوں کا جو مال تھا وہ حضرت علی کے پاس رکھ دیا کہ علی! یہ مکہ والوں کی امانتیں ہیں، ان کے حوالے کر دینا۔ یہ ہے اسلام اور شریعت کہ کسی بندے سے ہماری کتنی مخالفت کیوں نہ ہو لیکن شرعی حدود سے تجاوز نہیں کرنا، بس اپنے جذبات کو مسلط نہیں کرنا، ہم نے موت کو سامنے رکھنا ہے، اتنا کرنا ہے جتنا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔

### پچھڑے کی عبادت اور تین گروہ:

خیر جب پچھڑا بن گیا تو بنی اسرائیل کے کئی گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ نے اسے سچ مچ خدا سمجھ کر پوجنا شروع کر دیا کہ موسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو وہ بھی اسی کو

پوچھیں گے۔ ایک گروہ نے انکار کر دیا کہ بھائی! یہ شرک ہے، ہم اس کے قریب بھی نہیں آتے۔ ایک گروہ وہ تھا جو کہتا تھا کہ چلو پوجتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام جب آئیں گے تو اگر کہا کہ چھوڑ دو تو ہم چھوڑ دیں گے۔ یہ مترد قسم کے لوگ تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام تورات لے کر جب واپس آئے تو آگے معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ آپ نے اپنے بھائی سے کہا کہ یہ کیا ہوا؟ اور اپنے بھائی کو ڈاڑھی اور بالوں سے پکڑ کر کھینچنا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم نے میرے جانے کے بعد ان کو سنبھالا نہیں ہے، انہوں نے کہا کہ مجھے ڈر تھا کہ آپ کہیں گے کہ تم نے بنی اسرائیل کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا، اس لیے میں نے ان کو سمجھایا، یہ باز نہیں آئے لیکن میں ان کو قتل تو نہیں کر سکتا تھا۔ اب آپ ان کو سمجھائیں۔

### بنی اسرائیل کی توبہ:

موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ آپ نے بہت غلط کیا۔ اب ہمیں توبہ کرنی چاہیے۔ توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ ان میں سے جو نیک ستر آدمی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے پاس جائیں اور اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑی چھان بین اور تحقیق و تفتیش سے کام لے کر ستر آدمیوں کو چنا تھا۔ یہ ستر نیک آدمی اللہ تعالیٰ کے پاس گئے۔ چھان بین کے باوجود ان ستر میں بعض وہ افراد بھی شامل ہو گئے جو متردین تھے جنہوں نے کہا تھا کہ بچھڑے کو پوج لیتے ہیں لیکن اگر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ چھوڑ دو تو ہم چھوڑ دیں گے۔ جب کوہ طور پر پہنچے تو زمین کو زلزلہ آیا اور وہ ستر کے ستر ہلاک ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ! اگر آپ نے ان کو مارنا ہی تھا تو ان کو یہاں وفد میں آنے سے پہلے ہی ہلاک کر دیتے۔ پہلے بنی اسرائیل ہمارے خلاف باتیں کرتے ہیں پھر کہیں گے کہ تو نے ہمارے بندے مروا دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان ستر کو زندگی عطا فرمائی اور موسیٰ علیہ السلام پر وحی آگئی کہ ان



میں سے جو لوگ اس شرک میں ملوث نہیں ہوئے تھے وہ شرک کرنے والوں کو قتل کریں اور قتل کی یہ صورت مقرر ہوئی کہ جو شخص رشتہ میں جس سے زیادہ قریب ہو وہ اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے یعنی باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو اور بھائی بھائی کو۔ چنانچہ اس طرح ان کی ایک بڑی تعداد قتل ہوئی۔ جب انہوں نے اس حکم پر عمل کیا تو اللہ نے ان سب کی توبہ قبول فرمائی اور قاتل اور مقتول دونوں کی خطا معاف کر دی۔

### سامری کا تعارف:

﴿وَاضْلَهُمُ السَّامِرِيُّ﴾

یہ سامری بد بخت تھا جس نے ان کو گمراہ اور تباہ کیا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ سامری کا نام بھی موسیٰ تھا اور یہ بھی اسی سال پیدا ہوا تھا جس سال فرعون نے آرڈر جاری کیا تھا کہ جو لڑکا پیدا ہو اس کو ذبح کر دو اور اس کی ماں بھی اس کو ایک غار میں چھوڑ کر آگئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے یہ بندوبست فرمایا تھا کہ جبرائیل امین کو بھیجتے، وہ ایک انگلی پر شہد اور دوسری پر مکھن لگا کر اس کے منہ میں دیتے اور ساتھ اس کو دودھ پلاتے تھے، اس طرح یہ جوان ہوا۔

تو ایک موسیٰ جس کی فرعون نے تربیت کی وہ موسیٰ پیغمبر بنا اور ایک موسیٰ جس کی جبرائیل امین تربیت کرتے تھے وہ کافر اور بد بخت ہوا۔ آپ نے سنا ہے کہ بڑا مشہور شعر ہے:

إِذِ الْمَرْءُ لَمْ يُخْلَقْ سَعِيدًا تَحَيَّرَتْ  
عُقُولُ مُرَبِّيهٖ وَخَابَ الْمُؤْمِلُ  
فَمُوسَى الَّذِي رَبَّاهُ جَبْرِيلُ كَافِرٌ  
وَمُوسَى الَّذِي رَبَّاهُ فِرْعَوْنُ مُرْسَلٌ

کہ اگر آدمی کے مقدر میں نیک بنی نہ ہو تو اس کی تربیت کرنے والوں کی

عقلیں حیران ہو جاتی ہیں اور اس سے آس اور امیدیں لگانے والے مایوس ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ایک وہ موسیٰ ہے کہ جس کی تربیت جبرائیل کرتے ہیں تو وہ کافر بنتا ہے اور ایک وہ موسیٰ ہے کہ جس کی تربیت فرعون کر رہا ہے تو وہ نبی بنتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے پوچھا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا کہ ﴿بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ﴾ کہ میں نے وہ کچھ دیکھا ہے جو انہوں نے نہیں دیکھا۔ تو نے کیا دیکھا ہے؟ کہا کہ جبرائیل امین جب گزرتے تھے تو جہاں پاؤں رکھتے تھے تو وہاں سبزہ اگتا تھا، تو میں سمجھا کہ اس مٹی میں خاص تاثیر ہے کہ جس چیز پر اس کو ڈالا جائے گا اس میں حیات کے آثار پیدا ہو جائیں گے، میں نے وہاں سے مٹی اٹھائی اور یہ جو مچھڑا بنا تھا اس میں پھینکی تو اس نے آواز نکالنا شروع کی۔

موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ چلو انہوں نے تو توبہ کر لی ہے، اب تیری سزا یہ ہے ﴿فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَوةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ﴾ کہ تو زندگی بھر یہ کہتا پھرے کہ میرے قریب نہ آنا... میرے قریب نہ آنا... اب جو اس کو ہاتھ لگاتا اس کو بھی بخار چڑھ جاتا اور ہاتھ لگانے والے کو بھی بخار چڑھ جاتا، اس طرح یہ ذلت اور خواری کے ساتھ مرا۔

### انبیاء علیہم السلام کا اجتہادی اختلاف:

﴿قَالَ يَبْنَؤُمْ لَا تَأْخُذْ بِالْحَيَاتِي وَلَا بِرَأْسِي إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ

فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَآءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا: اے میری ماں کے بیٹے! میری ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو مت پکڑو، میں تو اس بات سے ڈرتا تھا کہ تم یہ نہ کہو کہ بنی اسرائیل کے تم نے ٹکڑے کر دیے، میں نے تمہاری وجہ سے ان کا خیال

کیا اور نہ مجھے ان سے کیا ہمدردی تھی؟

یہاں جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں کا اجتہاد تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اجتہاد یہ تھا کہ جب ان لوگوں نے شرک کیا تھا تو ان کو قتل کرنا چاہیے تھا، حضرت ہارون علیہ السلام کا اجتہاد یہ تھا کہ مجھے موسیٰ علیہ السلام کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے اور معاملہ نرمی کا ہونا چاہیے۔ تو ایک کا اجتہاد ہے مصالحت اور ایک اجتہاد ہے مقاتلت، دونوں کا اجتہاد ہے۔ تو جب تک وحی نہ آئے اور دونوں میں اختلاف ہو تو دونوں کے اس اختلاف میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ایک حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا واقعہ ہے اور ایک حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا واقعہ ہے۔

### مشاجرت صحابہ اور ہمارا موقف:

یہاں ساتھ 84 چک ہے تو مجھے وہاں ایک شخص ملا۔ اس نے سوال کیا کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما یہ دونوں آپس میں لڑے ہیں، تو ان میں حق پر کون تھا اور باطل پر کون تھا؟ میں نے کہا کہ جب دو لڑیں ایک حق پر اور دوسرا باطل پر ہو یہ ضروری نہیں، ہو سکتا ہے کہ دونوں حق پر ہوں۔ وہ کہنے لگا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام میں اختلاف ہوا ہے تو بتاؤ ان میں حق پر کون تھا اور باطل پر کون تھا؟ کہا کہ دونوں حق پر تھے۔ تو میں نے کہا کہ دونوں کے درمیان اختلاف ہو اور بات ہاتھ پائی تک پہنچ جائے اور دونوں حق پر ہیں تو دو صحابیوں میں اختلاف ہو اور بات قتل تک پہنچ جائے تو دونوں حق پر کیوں نہیں ہیں؟ کہا کہ جی وہاں تو غلط فہمی تھی، جب غلط فہمی دور ہو گئی تو اختلاف ختم ہو گیا۔ میں نے کہا کہ وہاں چونکہ وحی آتی تھی وہ غلط فہمی وحی دور کر دیتی تھی اور یہاں وحی نہیں آتی تھی اس لیے غلط فہمی باقی رہ گئی اور اختلاف بھی باقی رہ گیا۔

تو اس سے تو ہمارا موقف ثابت ہو گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی کا دروازہ بند ہے، نہ وحی آئی نہ غلط فہمی دور ہوئی اور آخر دم تک غلط فہمی باقی رہی۔ اب اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

### قصہ حضرت آدم علیہ السلام:

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ۙ اَبٰی ۖ فَكُلْنَا مِنْۢ بَیۡۤاَمُرٍ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِرِجۡلِكَ فَلَا یُخْرِجَنَّکُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی ۝۱۱۴﴾

اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ حضرت آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا تھا لیکن ابلیس نے انکار کیا تھا۔ اس وقت ہم نے کہا تھا کہ اے آدم! یہ ابلیس تمہارا اور تمہاری بیوی دونوں کا دشمن ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو جنت سے نکلوا دے اور تم مشقت میں پڑ جاؤ۔

آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا۔ پھر ان کی پہلی سے حضرت حوا کو پیدا فرمایا اور حکم دیا کہ اس خاص درخت کے قریب نہ جانا، باقی جو مرضی کھاؤ۔ آدم علیہ السلام بھول گئے اور اس خاص درخت کو کھالیا۔ اس وجہ سے اللہ کی طرف سے عتاب آیا۔

جو بات سمجھنے کی ہے ذرا وہ سمجھنا۔ یہاں فرمایا:

﴿فَكُلْنَا مِنْۢ بَیۡۤاَمُرٍ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِرِجۡلِكَ فَلَا یُخْرِجَنَّکُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی ۝۱۱۴﴾

﴿الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی ۝۱۱۴﴾

کہ یہ شیطان تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ایسی شرارت کرے کہ آپ کا ذہن اس طرف نہ جائے اور یہ آپ کو جنت سے نکال دے، ﴿فَتَشْقٰی﴾ اور تمہیں مشقت اٹھانی پڑے۔ یہ ”شقاوت“ آخرت کی شقاوت نہیں

ہے بلکہ یہ دنیا کی مشقت ہے۔ آدم علیہ السلام جنت کے کھانے کھاتے تھے اور بغیر کسی مشقت اور محنت کے کھاتے تھے، جب دنیا میں آئے تو حکم ہوا کہ کاشت کرو اور اسے کاٹو اور کھاؤ، تو کھایا لیکن مشقت کے ساتھ۔

اب دیکھو! جب نکالنے کی بات کی تو دونوں کی کی ہے ﴿فَلَا يَخْرُجَنَّكُمَا﴾ کہ کہیں یہ شیطان تم دونوں کو نہ نکال دے اور جب مشقت کی بات کی تو ﴿فَتَشْقَى﴾ فرمایا جس کا خطاب صرف آدم علیہ السلام کو ہے۔ یعنی جنت سے تم دونوں کو نکالے گا اور اے آدم! مشقت پھر تمہیں اٹھانی پڑے گی۔ تو جب دونوں نکلیں گے تو مشقت تو دونوں کو اٹھانی ہوگی، پھر اکیلے آدم کی بات کیوں کی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مشقت والے کام ہوتے ہی مرد کے ذمہ ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا:

﴿إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۖ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا

تَصْحَىٰ﴾

دیکھو آدم! جنت میں تمہیں بھوک کا مسئلہ نہیں ہے، پھل ہے کھانا ہے مل جاتا ہے، جنت میں لباس کا مسئلہ نہیں ہے لباس بنا بنایا ہے، تمہیں خود تیار نہیں کرنا پڑتا، جنت میں تمہیں پیاس کا مسئلہ نہیں ہے، پانی اور پینے کا سامان موجود ہے، جنت میں دھوپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ یعنی یہاں اسباب سارے موجود ہیں۔ لیکن اگر تم نے شیطان کی بات مان لی تو یہ تم دونوں کو جنت سے نکلوا دے گا۔ آدم! پھر تم مشقت میں پڑو گے، تمہیں کھانے کا انتظام کرنا پڑے گا، لباس کا انتظام کرنا پڑے گا، پینے کا انتظام کرنا پڑے گا، رہنے کے لیے مکان کا انتظام کرنا پڑے گا۔

تو یہاں خطاب آدم اور حوا دونوں کو اس لیے نہیں ہے کہ یہ چیزیں مہیا کرنا شوہر کے ذمہ ہوتا ہے، کھانا شوہر کے ذمہ ہے، پلانا شوہر کے ذمہ ہے، مکان شوہر کے ذمہ ہے اور لباس شوہر کے ذمہ ہے۔ اس لیے فرمایا کہ آدم! اگر تم نے پھل کھالیا اور

اس نے تمہیں جنت سے نکال دیا تو مشقت میں آپ نے پڑنا ہے اور یہ بنیادی ضرورتیں ہیں جو ہر شوہر کے ذمہ ہیں، اس سے زائد چیزیں شوہر کے ذمہ نہیں ہیں۔

### مسئلہ بتائیں تو پوری بات سمجھائیں!

لیکن یہ بات ہمیشہ سمجھنا کہ مسائل بتاتے وقت بات پوری کرنا ورنہ نتیجہ کیا نکلے گا؟! ابھی ملائیشیا کے سفر پر مجھے براہ راست ایک آدمی نے بتایا کہ رمضان میں ہمارے پاکستان کے ایک بہت معروف عالم ہیں انہوں نے ٹی وی پر بیان دیا کہ بیوی کے ذمے شوہر کے کپڑے دھونا نہیں ہے، بیوی کے ذمے شوہر کے والدین کی خدمت کرنا نہیں ہے، بیوی کے ذمے شوہر کی بہن کی خدمت نہیں ہے، بیوی کے ذمے شوہر کے کسی رشتہ دار کی کوئی خدمت نہیں ہے، صرف شوہر کی حد تک ہے۔

اس آدمی نے کہا کہ مولانا! میرے گھر میں مسئلہ پیدا ہو گیا، میری بیوی نے کہا کہ میں اب تمہارے ماں باپ کی خدمت نہیں کروں گی کیونکہ میرے ذمہ نہیں ہے، دیکھو! فلاں مولانا صاحب نے کہا ہے۔ تو مجھے کہنے لگے کہ مولانا صاحب! یہ بتائیں کہ شوہر کے ذمے بیوی کا نان و نفقہ اور سکُن ہے، کیا علاج بھی ہے؟

تو مولانا صاحب کو بتانا چاہیے تھا کہ جس طرح بیوی پر شوہر کے والدین کی خدمت نہیں ہے اسی طرح شوہر پر بیوی کے علاج کا ذمہ بھی نہیں ہے، جب اس کی ساس گھر آئے تو شوہر کے ذمے کھانا کھانا نہیں ہے،، بیوی کہے کہ میں نے ابو سے ملنے کے لیے جانا ہے تو پھر شوہر کے ذمے نہیں ہے کہ اس کے ابو کے لیے تحفے بھیجے۔ جب یہ ماں باپ کے ہاں جاتی ہے تو مال لے کر جاتی ہے، اس کے بہن بھائی آتے ہیں تو پیسہ خرچ کرتی ہے کہ میرا بھائی آیا ہے، میری بہن آئی ہے، پھر ہم بھی اکڑ جائیں کہ ہمارے ذمے نہیں ہے۔ یہ مولانا نے آدھی بات کر کے ہمارے گھر کا ماحول تباہ کیا ہے۔

اس لیے ہمیشہ یہ خیال رکھنا! عوام میں بیان کرتے وقت اعتدال کا پورا خیال رکھنا، جب یہ بتاؤ تو ساتھ دوسرے معاملات بھی بتاؤ پھر فوراً دماغ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

### تبلیغی بھائی کی عالمہ سے شادی کا دلچسپ واقعہ:

ایک آدمی نے تبلیغ میں کچھ وقت لگایا، دین سے محبت ہو گئی تو ان کی خواہش ہو گئی کہ میں اپنا نکاح عالمہ سے کروں تاکہ ہمارے گھر کا ماحول بہت اچھا ہو۔ اس نے عالمہ سے شادی کر لی۔ سال چھ مہینے گزر گئے تو عالمہ نے تقاضا کر لیا کہ مجھے الگ مکان بنا کر دو، میں تمہارے امی ابو اور بھائیوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی، یہ میرا شرعاً حق ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے تو اس لیے شادی کی تھی کہ تم گھر میں ہو گی تو میری امی ابو اور بھائیوں کے لیے کچھ دین کا ماحول بنے گا، الگ مکان میں رہنا ہے تو میرے گھر میں دین کا ماحول کیسے بنے گا؟ اس نے کہا کہ بہر حال یہ میرا حق ہے آپ کسی دارالافتاء سے پوچھیں، میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔

وہ آدمی مولانا صاحب کے پاس گیا کہ آپ نے میرا نکاح کر لیا تھا عالمہ کے ساتھ، میں نے سوچا تھا کہ میرے گھر کا ماحول دینی بنے گا لیکن وہ تو اور بگڑ گیا۔ مولانا صاحب نے کہا کہ اس میں حرج کی بات کون سی ہے؟ اس کا حل تو موجود ہے۔ گھر جاؤ اور بیوی سے کہو کہ میں تمہیں الگ مکان بنا کر دیتا ہوں اور ایک اور لڑکی سے نکاح کرتا ہوں جو میرے ماں باپ کے ساتھ رہے گی۔ اس نے جا کر عالمہ سے کہا کہ میں تمہیں الگ مکان بنا کر دیتا ہوں اور میں ایک اور نکاح کرتا ہوں جو ہمارے گھر کے ماحول کو دین کے مطابق رکھے۔ عالمہ نے کہا کہ کیوں؟ کہا کہ دوسری شادی میرا حق ہے، تم اپنا حق مکان والا لے لو، میں اپنا حق دوسری شادی والا لے لیتا ہوں تو پھر اس نے فوراً کہا کہ اگر میں یہاں ٹھہر جاؤں پھر دوسری شادی کرو گے؟ کہا کہ نہیں کروں گا۔ اس نے کہا کہ چلو میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔

اب دیکھو! دوسرا رخ بتایا تو دماغ ٹھیک ہو گیا۔ یہ رخ نہ بتاتے تو کتنے مسائل پیدا ہو جاتے۔ تو اگر بیوی کے ذمے شوہر کے ماں باپ کی خدمت نہیں ہے تو شوہر بیوی کو ماں باپ کے پاس جاتے ہوئے کتنے ہدیے دیتے ہیں کہ یہ ہدیہ تمہاری امی کا ہے، یہ تمہارے ابو کا ہے تو اس عورت کو بھی تو سوچنا چاہیے کہ کیا یہ ہدیے میرے شوہر کے ذمے ہیں؟ اور جب اس کی اپنی باری آتی ہے تو کہتی ہے کہ یہ میرے ذمے نہیں ہے۔۔۔ یہ میرے ذمے نہیں ہے۔۔۔ خاوند اور بیوی کے معاملات آپس میں اعتدال سے، پیار سے، نرمی سے چلتے ہیں، دونوں کو ایک دوسرے کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

### عصمت انبیاء علیہم السلام پر اعتراض کا جواب:

﴿وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ﴾

آدم علیہ السلام نے وہ کام کر لیا جو کرنے کا ارادہ نہیں تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ آدم علیہ السلام مشقت میں پڑ گئے۔

﴿ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ﴾

اللہ تعالیٰ نے ان پر کرم فرمایا، انہوں نے توبہ کی اور اللہ نے قبول فرمائی۔ یہاں بات سمجھو! ہم اہل السنۃ والجماعۃ احناف دیوبند کا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام چھوٹے اور بڑے گناہوں سے معصوم ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرماتے ہیں۔ جو لوگ نبی کو معصوم نہیں مانتے وہ اس آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں ﴿وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ﴾ اور ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے نافرمانی کی۔ العیاذ باللہ۔ یہ اشکال ان کو ہوتا ہے جو لفظ کا ایک معنی سمجھتے ہیں، جب ایک لفظ کے دو معنی ہوں اور بندے کو دونوں آتے ہوں تو پھر اشکال نہیں ہوتا۔

لفظ ”عَصَىٰ“ معصیت سے ہے اور معصیت کا ایک معنی ہے نافرمانی کرنا اور



دوسرا معنی ہے کہ وہ کام کرنا جس کا ارادہ نہ ہو۔ آدمی بعض کام بلا ارادی طور پر کر لیتا ہے، کرنا کچھ چاہتا ہے اور ہو کچھ جاتا ہے، اس کو بھی معصیت کہتے ہیں اور یہاں معصیت کا یہی معنی ہے کہ آدم علیہ السلام کا قطعاً یہ مقصد نہیں تھا کہ جس درخت سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے میں وہ درخت کھاؤں، اللہ نے فرمایا تھا کہ اس درخت سے نہیں کھانا تو وہ سمجھے کہ ایک خاص درخت سے منع فرمایا ہے، جس درخت سے منع نہیں فرمایا۔ تو وہ کرنا کچھ چاہتے تھے اور صادر کچھ اور ہو گیا، تو اس معصیت کا معنی نافرمانی نہیں ہے۔

اسی طرح ”غَوٰی“ کا لفظ یہ غواہیت سے مشتق ہے، اس کا ایک معنی ہے دنیاوی معاملات میں انسان کا مشقت میں پڑ جانا، راحت کا ختم ہو جانا، تکلیف میں آ جانا، اور ایک اس کا معنی ہے؛ گمراہ ہو جانا۔ تو جن کو ”غَوٰی“ کا ایک ہی معنی آتا ہے وہ اعتراض کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام گمراہ ہو گئے۔ العیاذ باللہ۔ اور جن کو ”غَوٰی“ کے دونوں معنی آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہاں ”غَوٰی“ کا معنی گمراہ ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا معنی زندگی کا تنگ ہونا اور عیش کا ختم ہونا ہے اور تنگ ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ قلبی تنگی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مشقت پیدا ہو گئی ہے۔

ایک دفعہ میں کراچی گیا تو میں نے مستقل اسی موضوع پر بیان کیا کہ لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں اور جو لوگ صرف ایک معنی سمجھتے ہیں انہیں اشکال ہوتا ہے مثلاً لفظ تقلید یہ قلاہ سے مشتق ہے، غیر مقلدین جو تقلید کے دشمن ہیں کیونکہ ان کو قلاہ کا صرف ایک ہی معنی آتا ہے؛ پٹہ اور ہم تقلید سے محبت کرتے ہیں کیوں کہ ہمیں قلاہ کے دو معنی آتے ہیں پٹہ بھی اور ہار بھی۔

ممانی ہمیشہ پیغمبر کی موت کے بارے میں اشکال میں رہتے ہیں، کیوں کہ ان کو موت کا ایک ہی معنی آتا ہے یعنی خروج روح اور ہمیں موت کے دو معنی آتے ہیں؛

ایک خروجِ روح اور دوسرا جس روح۔

اسی طرح دودھ پلانے کی مدت کے بارے میں غیر مقلدین کا اشکال امام صاحب پر ہے کیوں کہ ان لوگوں کو ”حمل“ کا ایک ہی معنی آتا ہے یعنی بچے کا ماں کی گود میں ہونا اور ہمیں اشکال نہیں ہوتا کیونکہ ہمیں حمل کے دو معنی آتے ہیں؛ ایک بچے کا ماں کی گود میں ہونا اور دوسرا بچے کا ماں کے پیٹ میں ہونا۔

اسی طرح ”عَصَى“ اور ”غَوَى“ کے بھی دو دو معنی آتے ہیں جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے۔

**یہاں اندھا تو وہاں بھی اندھا:**

﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمَى﴾

**الْقِيَمَةِ أَعْمَى ﴿١١٣﴾**

جو شخص میری یاد سے غافل ہوتا ہے تو اس کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔ یا تو قبر کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے یا دنیا کی زندگی۔ دنیا کی زندگی کے تنگ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی حرص بڑھ جاتی ہے، بہت کچھ ہونے کے باوجود انسان کا قلبی سکون تباہ ہو جاتا ہے اور جب اس شخص کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اٹھائیں گے تو اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ یہ اللہ سے کہے گا:

﴿قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰی وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿١١٤﴾ قَالَ كَذٰلِكَ

اَتَّكَ اٰیْتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰی ﴿١١٥﴾﴾

کہ یا اللہ! میری تو آنکھیں تھیں آج تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ فرمایا: ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں اور تو نے انہیں بھلا دیا تو آج کے دن تجھے بھی بھلا دیا جائے گا۔ بھلا دینے کا یہ معنی نہیں ہے کہ اللہ بھول جائیں گے بلکہ اس کا معنی یہ ہے

کہ جس طرح اس شخص نے اللہ کی آیات کا خیال نہ رکھا آج اس کا بھی خیال نہیں رکھا جائے گا۔ اس کو ”تُنْذِی“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

### حضرت تھانوی اور ایک غیر مقلد کا دلچسپ مکالمہ:

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک اندھا غیر مقلد آیا۔ دل کا بھی اندھا آنکھوں کا بھی اندھا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ میں نے آپ سے گفتگو کرنی ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ میں نے آپ سے گفتگو نہیں کرنی۔ اس نے کہا کہ کیوں؟ فرمایا کہ گفتگو کا فائدہ نہیں ہے، اس نے کہا کہ کیوں فائدہ نہیں ہے؟ فرمایا: اس لیے نہیں ہے کہ اگر میں تمہیں سمجھاؤں گا اور تمہیں بات سمجھ آ بھی جائے تو پھر کیا ہو گا؟ اس نے کہا کہ میں مان جاؤں گا۔ فرمایا کہ مان جاؤ گے تو پھر کیا ہو گا؟ اس نے کہا: پھر آپ کے مسلک کے مطابق مجھے ہدایت مل جائے گی۔ فرمایا کہ پھر؟ کہا کہ ہدایت ملے گی تو میں جنت میں جاؤں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ تمہیں ہدایت مل بھی جائے تب بھی توجنت میں نہیں جاسکتا، لہذا تجھے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس نے کہا: میں کیوں جنت نہیں جاسکتا؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ﴾<sup>166</sup>

جو دنیا میں اندھا ہے وہ قیامت کو بھی اندھا ہو گا۔

تو نے تو قیامت کو ویسے ہی اندھا ہونا ہے اور اندھا جنت میں نہیں جاسکتا تو کیا فائدہ تجھے سمجھانے کا؟ اس نے کہا: حضرت! اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے فرمایا: تاویل نہ کرو، سیدھی سیدھی بات کرو، اس نے کہا کہ جی

تاویل کے بغیر تو آیت حل ہی نہیں ہو سکتی۔ حضرت نے فرمایا کہ یہی بات امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کریں تو تم کہتے ہو کہ تاویلیں کرتا ہے اور جب تیرا مسئلہ آیا تو تو کہتا ہے کہ تاویل کے بغیر آیت حل ہی نہیں ہوتی۔ اس نے کہا: مجھے بات سمجھ آگئی ہے۔

### تکالیف ملیں تو دو کام کریں:

﴿فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾

میرے پیغمبر! یہ لوگ آپ کی بات نہیں مانتے، آپ کو تنگ کرتے ہیں، الزامات لگاتے ہیں، راستے میں رکاوٹ ڈالتے ہیں تو آپ دو کام کریں:

1: ﴿فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ﴾ ایک تو صبر کریں۔

2: ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾ ذکر کریں، اللہ کو یاد کریں۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھیں کہ جب بھی کوئی بندہ دین کا کام کرے لوگ اس کو ستائیں، رکاوٹیں ڈالیں تو اس کا حل صرف دو چیزیں ہیں:

☆ ان کی تکالیف پر صبر اور برداشت کریں۔

☆ اللہ... اللہ... اللہ... کا ذکر ہر وقت اللہ کی یاد میں رہیں اور بس۔ ان دو

کاموں میں لگ جائیں تو اللہ مسائل حل فرمادیتے ہیں۔ یہ قرآنی نسخہ ہے۔

### پانچوں نمازوں کے اوقات کا ثبوت:

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا وَمِنْ

أَنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ﴾

آپ اپنے رب کی تسبیح اور حمد بیان کرتے رہیں سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کریں اور دن کے کناروں

میں بھی تاکہ آپ خوش ہو جائیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ اس آیت میں پانچوں نمازوں کا ثبوت ملتا ہے۔  
 چنانچہ ﴿قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ﴾ (سورج نکلنے سے پہلے) سے مراد فجر کی نماز ہے، ﴿وَقَبْلَ غُرُوبِهَا﴾ (غروب ہونے سے پہلے) سے ظہر اور عصر کی نماز مراد ہے، ﴿وَمِنْ أَوَّامٍ الْبَلِّ﴾ (رات کے اوقات میں) اس میں مغرب اور عشاء آگئی ہے۔ ﴿وَأَطْرَافِ النَّهَارِ﴾ (دن کے کناروں میں) اس سے فجر اور مغرب کی تاکید مراد ہے۔  
 ﴿لَعَلَّكَ تَرْضَى﴾ تاکہ تم خوش ہو جاؤ یعنی صبر کرو اور نمازیں پڑھو، ذکر کرو، اس سے یہ مصیبتیں ٹل جائیں گی اور آفات ختم ہو جائیں گی۔

**دنیا سے بے رغبتی اختیار کریں!**

﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾

یہاں بھی نبی کو خطاب کر کے یہ بات ہمیں سمجھائی ہے کہ اے نبی! جو مال ہم نے ان کفار کو دیا ہے آپ کی نگاہ اس پر نہ اٹھے، یہ سب دنیا کا مال ہے، آزمائش کے لیے ہے، اللہ کا دیا ہوا رزق بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے، بس آپ خود بھی نماز پڑھیں اور گھروالوں کو بھی نماز کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
 وَاجْزُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الانبياء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ﴿١﴾ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرِ مِنْ رَبِّهِمْ مُحَدَّثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿٢﴾ لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ ۚ وَاسْرُوا النَّجْوَى ۚ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۗ هَلْ هَذَا اِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ ۚ اَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ﴿٣﴾﴾

مشرک لوگ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو رد کرتے اور بنیادیہ بناتے کہ تم بشر ہو اور ہم بھی بشر ہیں، بشر نبی نہیں ہو سکتا۔

”بشر“ کا معنی:

بشر کی تعریف یہ ہے کہ ذو عقل ہو اور محسوس ہو۔ ملائکہ اور جنات بشر نہیں ہیں، اس لیے کہ ذو عقل تو ہیں لیکن محسوس نہیں۔ حیوانات، اشجار اور اجار بھی بشر نہیں اس لیے کہ محسوس تو ہیں لیکن ذو عقل نہیں جبکہ بشر میں یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں؛ ایک یہ کہ اس میں عقل ہو اور دوسرا وہ محسوس ہو۔ محسوس ہونے کا معنی کہ آپ اس کو ہاتھ لگانا چاہیں تو لگا سکیں، پکڑنا چاہیں تو پکڑ سکیں، دیکھنا چاہیں تو دیکھ سکیں۔

تو وہ لوگ بشر کا معنی نہیں سمجھتے تھے اس لیے انہیں الجھنیں ہوتی تھیں، آج کے مشرک اور نبی کے دور کے مشرک دونوں کی فکر ایک جیسی ہے۔ اُن کی فکر اور سوچ یہ تھی کہ نبوت اور بشریت جمع نہیں ہو سکتی اور ان کی بھی یہی سوچ ہے کہ نبوت و بشریت جمع نہیں ہو سکتی۔ فرق یہ تھا کہ انہوں نے دیکھا تو بشر مانا لیکن نبی نہیں مانا اور انہوں نے نبی تو مانا لیکن بشر نہیں مانا۔ حالانکہ نبی ہوتا ہی ہمیشہ بشر ہے، بشریت کے علاوہ اللہ نے کسی کو نبوت کے لیے منتخب کیا ہی نہیں ہے۔ اللہ رب العزت کا فیصلہ ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ﴾ ہم نے جب بھی کسی کو نبی بنایا تو مرد اور بشر ہی کو بنایا۔

### قرآن شعر نہیں اور نبی شاعر نہیں:

﴿بَلْ قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ بَلِ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۖ فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ﴾<sup>167</sup>

مشرکین کا ایک الزام، اعتراض اور بہتان یہ بھی تھا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم - معاذ اللہ - شاعر ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام، قرآن پاک بشر کا کلام ہے، قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ﴾<sup>167</sup>

کہ ہم نے نبی کو شعر کا علم دیا ہی نہیں اور شاعری آپ کے لائق ہی نہیں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اشعار پڑھنا ثابت ہی نہیں ہے۔ کبھی بکھارا اگر آپ نے کوئی ایک آدھ شعر فرما دیا ہو تو الگ بات ہے یا کسی کا کوئی شعر بطورِ استشہاد و

استدلال کے نقل فرمادیا ہو تو الگ بات ہے لیکن مستقل شعر پڑھنا اور کہنا آپ کا مزاج ہی نہیں تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اشعار پڑھتے ہی نہیں تھے تو مشرکین نے کیسے الزام لگایا کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شاعر ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک شعر کا معنی وہ ہے جو ہمارے عرف میں ہے اور ایک شعر کا معنی وہ ہے جو لغت عرب میں ہے۔ ہمارے ہاں کلام دو قسم کا ہے: ایک وہ کلام ہے جو مُسَجَّع اور مُقَفَّع ہو، اسے کلام شعری کہتے ہیں اور ایک کلام وہ ہے جو مُسَجَّع اور مُقَفَّع نہ ہو، اسے کلام نثر کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں شاعر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کلام قافیہ بندی کے ساتھ پڑھتا ہے، اسے کہتے ہیں کہ یہ شاعری کرتا ہے اور اگر بغیر قافیہ بندی کے پڑھے تو ہم کہتے ہیں کہ نثر پڑھ رہا ہے جبکہ عرب میں شعر خیالات اور فرضی چیزوں کو کہتے ہیں، اس لیے منطق میں جب کوئی فرضی قضیہ یا خیالی قضیہ پیش کرنا ہو تو اسے قضیہ شعریہ کہتے ہیں۔ تو مشرکین جو کہتے تھے کہ یہ شاعر ہے اس کا معنی یہ نہیں تھا کہ وہ کلام مُسَجَّع اور مُقَفَّع ہے بلکہ اس کا معنی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ یہ خیالی اور فرضی باتیں بیان کرتا ہے، کبھی کوئی قصہ بیان کر دیتا ہے، کبھی کوئی واقعہ بیان کر دیتا ہے، اس کا حقیقت سے کیا تعلق ہے۔ تو یہ معنی ہے ان کے اس قول ﴿بَلْ هُوَ شَاعِرٌ﴾ کا۔

### تقلید کا ثبوت:

﴿فَسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾

اگر تمہیں معلوم نہیں تو اہل علم سے پوچھ لو۔

اس سے پتا چلا کہ آدمی دو قسم کے ہیں؛ بعض وہ ہیں جن کے پاس علم ہے اور بعض وہ ہیں جن کے پاس علم نہیں ہے۔ جن کے پاس علم نہیں ہے وہ ان سے پوچھیں جن کے پاس علم ہے اور پوچھنا تبھی ہوتا ہے جب عمل کرنا ہو ورنہ پوچھنے کا کوئی فائدہ



نہیں ہوتا۔ اس سے تقلید ثابت ہوتی ہے کہ غیر اہل علم؛ اہل علم سے پوچھیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں نہ آئے کہ اس آیت سے تو ان کے لیے تقلید ثابت ہوتی ہے جو اہل علم نہیں ہیں تو پھر علماء تقلید کیوں کرتے ہیں؟

اس کا جواب ذہن میں رکھ لیں کہ ایک تقلید ہوتی ہے عوام کی اور ایک تقلید ہوتی ہے خواص کی، عوام کی تقلید فروع اور اصول دونوں میں ہوتی ہے اور خواص کی تقلید فروع میں نہیں بلکہ اصول میں ہوتی ہے۔ اب چاروں ائمہ رحمہم اللہ کے بعد جتنے بھی مجتہد ہوں گے ان میں مجتہد مطلق کوئی نہیں ہو گا، اگر ہو گا تو مجتہد فی المذہب ہو گا۔ یعنی ائمہ اربعہ کے بعد کسی مجتہد کے اصول بھی اپنے ہوں اور فروع بھی اپنے ہوں ایسے مجتہد نہیں ہوں گے، بلکہ اصول اس کے مجتہد مطلق والے ہوں گے اور انہی اصولوں کی روشنی میں اجتہاد یہ خود کرے گا۔ اسے ”مجتہد فی المذہب“ کہتے ہیں اور ہم جو یہ کہتے ہیں کہ مجتہد مطلق اب نہیں ہو گا اس کا معنی یہ نہیں کہ اس کا آنا اب محال شرعی ہے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ ایسے مجتہد کا پیدا ہونا اب تقریباً ناممکن ہے۔

### محال عقلی، محال شرعی اور عادی:

محال کی تین قسمیں ہیں:

1: ایک ہوتا ہے محال عقلی مثلاً ایک چیز آگ بھی ہو اور پانی بھی ہو، ایک چیز روشنی بھی ہو اور اندھیرا بھی ہو، ایسا ہونا محال ہے اور یہ محال عقلی ہے یعنی عقل کی رو سے یہ جمع نہیں ہو سکتے، عقل ان کے جمع ہونے کو تسلیم نہیں کرتی۔

2: اور ایک ہوتا ہے محال شرعی یعنی شرعاً ایسا ہونا محال ہو، مثلاً دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا یہ شرعاً محال ہے یعنی شریعت اس کو تسلیم نہیں کر سکتی۔

3: اور ایک ہوتا ہے محال عادی یعنی محال عقلی بھی نہ ہو اور محال شرعی بھی نہ لیکن عام طور پر لوگوں کی عادت میں ایسا نہ ہوتا ہو جیسے ایک آدمی اتنا دوڑے کہ دو سو

کلو میٹر فی گھنٹا اس کی رفتار ہو، اب کسی بندے کے لیے دو سو کلو میٹر فی گھنٹا دوڑنا نہ شرعاً محال ہے اور نہ ہی عقلاً محال ہے لیکن عادتاً محال ہے کیونکہ عام طور پر کسی بندے میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ دو سو کلو میٹر فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑے، اسے ”محالِ عادی“ کہتے ہیں۔

تو ہم جو کہتے ہیں کہ مجتہد مطلق اب نہیں ہو سکتا، اس کا ہونا محال ہے تو اس سے مراد محالِ عادی ہے، عقلاً اور شرعاً محال نہیں ہے، اور مجتہد مطلق کے اب محال ہونے کی وجہ ہے کہ ہمارے بندوں میں اتنی صلاحیتیں نہیں ہیں کہ بندہ قرآن کا بھی حافظ ہو، دس لاکھ احادیث کا بھی حافظ ہو، پھر موضوع اور صحیح کو الگ بھی کر سکتا ہو، سارے علوم بھی اس کے پاس ہوں اور اصول بھی اپنے نکالے اور اپنے اصولوں سے فروع بھی اپنے نکالے تو یہ صلاحیتیں اب نہیں ہیں، اس لیے مجتہد کا اب پیدا ہونا یہ محالِ عادی ہے۔

### تقلید مطلق اور تقلید شخصی:

تقلید کی دو قسمیں ہیں: ایک ہے تقلید شخصی اور ایک ہے تقلید غیر شخصی جسے تقلید مطلق بھی کہتے ہیں۔ تقلید شخصی ان لوگوں کے لیے ہے جو اصحاب التریج نہیں ہیں، جو اصحاب التریج ہیں ان کے لیے تقلید شخصی نہیں ہے۔ اصحاب التریج وہ حضرات ہیں جن کے پاس دلائل کو پرکھنے کی صلاحیت ہو اور دلائل کی بنیاد پر کسی ایک موقف کو ترجیح دے سکتے ہوں، یہ حضرات دو فقہاء کے موقف اور ان کے دلائل کو لیتے ہیں اور ایک فقیہ کے دلائل کو دیکھتے ہوئے اس کے موقف کو ترجیح دے سکتے ہیں، اور جن کے پاس اتنی صلاحیت نہ ہو تو وہ تقلید شخصی کریں۔

انبیاء بشر ہیں، خدا نہیں!

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے جو نبی بنائے ایک تو وہ ایسے جسد نہیں تھے جو کھاتے نہ ہوں یعنی یہ بشر تھے فرشتے نہیں تھے، نبی انسان ہوتا ہے فرشتہ نہیں ہوتا۔ فرشتہ نہیں کھاتا اور یہ کھاتے تھے۔ لہذا یہ انسان تھے، اور دوسری بات کہ ﴿وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ﴾ یہ ہمیشہ رہنے والے بھی نہیں تھے بلکہ فوت ہونے والے تھے اور اللہ وہ ہے جو ہمیشہ رہتا ہے فوت نہیں ہوتا۔ تو یہاں اس بات کی نفی کرنی مقصود ہے کہ نبی بشر ہوتا ہے، نہ ہی فرشتہ ہوتا ہے اور نہ ہی خدا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ”خالد“ اللہ کی صفت ہے اور یہ تو ”خالدین“ نہیں تھے، لہذا یہ نہ فرشتے ہیں اور نہ ہی خدا ہیں۔

### قادیانیوں کے استدلال کا جواب:

اس آیت سے قادیانی استدلال کرتے ہیں کہ جب سارے انبیاء فوت ہو گئے ہیں تو ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں، لہذا وہ بھی فوت ہو گئے ہیں۔ تو تم کیسے کہتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اس بات سے بحث نہیں ہے کہ کوئی زندہ ہے یا نہیں، فوت ہوا ہے یا نہیں بلکہ اس آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ نبی بشر ہوتا ہے، بشر کھاتا بھی ہے اور ہمیشہ رہتا بھی نہیں ہے، اس آیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام فوت ہو گئے ہیں۔ تو اس آیت میں اتنا بتانا مقصود ہے کہ بشر پر خلود نہیں ہے بلکہ فنا ہے، باقی قادیانیوں کا یہ کہنا کہ ”سارے انبیاء فوت ہو گئے ہیں“ تو اس بات کا اس آیت میں تذکرہ نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو زندگی دی ہے وہ عام قانون سے ہٹ کر دی ہے، یہ معجزہ ہے۔

## قادیانیوں سے گفتگو کا طریقہ:

قادیانیوں سے جب بھی گفتگو کرنی ہو تو ان کے ساتھ بنیادی گفتگو کے موضوعات تین ہیں:

1: حیاتِ عیسیٰ اور وفاتِ عیسیٰ علیہ السلام

2: اجرائے نبوت اور ختم نبوت

3: صدقِ مرزا و کذبِ مرزا

قادیانیوں سے جب بھی بات کرنی پڑے تو ”صدقِ مرزا و کذبِ مرزا“ پر کریں اور وہ جب بھی بات کریں گے تو ”وفاتِ عیسیٰ اور حیاتِ عیسیٰ“ پر کریں گے لیکن آپ نے اس پر بات نہیں کرنی۔ اگر وہ اس موضوع کو چھیڑ بھی دیں تو آپ انہیں کہیں کہ چلیں! ہم ایک منٹ کے لیے مان لیتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں تو بتاؤ پھر کیا ہوا؟ ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی آسکتے ہیں یا نہیں؟“ چلیں ہم ایک منٹ کے لیے مان لیتے ہیں کہ آسکتے ہیں تو بتاؤ پھر کیا ہوا؟ دیکھو! جھگڑا تو اس بات پر ہے کہ مرزا نبی ہے کہ نہیں؟ جس کو تم نبی مانتے ہو اس کو ثابت تو کرو! حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو جائیں تو کیا اس سے مرزا نبی بن جائے گا؟ مسئلہ تو مرزا کی نبوت کا ہے۔

## تو نمبر دار نہیں بن سکتا!

مشہور ہے کہ گاؤں میں ایک میراثی رہتا تھا۔ اس کے بیٹے نے ماں سے پوچھا کہ اگر نمبر دار مر جائے تو نمبر دار کون ہو گا؟ ماں نے کہا: اس کا بیٹا۔ اس نے کہا کہ اگر وہ بھی مر جائے تو...؟ ماں نے کہا کہ اس کا بیٹا، پوچھا کہ اگر وہ بھی مر جائے تو...؟ ماں نے کہا کہ اس کا بیٹا۔ ماں نے جب بیٹے کے سوالات پہ سوالات سنے تو اس نے کہا: بیٹا! 100 نمبر دار بھی باری باری مر جائیں تو نے پھر بھی میراثی ہی رہنا ہے، تو نمبر دار نہیں بن سکتا۔

ہم کہتے ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام بشمول حضرت ادریس اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی موت مان بھی لیں تب بھی اس خبیث مرزا غلام احمد قادیانی نے میراثی ہی رہنا ہے، یہ نبی نہیں بن سکتا۔

### توحید باری تعالیٰ پر دلیل:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا

يَصِفُونَ ﴿٢٢﴾﴾

اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ زمین و آسمان میں ایک خدا ہے، کئی خدا نہیں ہیں۔ تو یہاں تعددِ الہ کی نفی کی ہے اور تعددِ الہ کی نفی پر جو دلیل پیش فرمائی ہے وہ یہ آیت ہے: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾ کہ اگر آسمان و زمین میں ایک سے زائد خدا ہوں تو آسمان و زمین میں فساد ہو جائے گا۔ تو جب آسمان و زمین میں فساد نہیں ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ ایک سے زائد خدا بھی نہیں ہیں۔ اب سمجھیں کہ یہ دلیل بنتی کیسے ہے؟

ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ آسمان و زمین میں ایک ہی خدا ہے۔ مشرکین کا دعویٰ ہے کہ دو ہیں۔ تو اب ہمارا ان سے یہ سوال ہے کہ دنیا میں جو بھی کام ہو وہ دونوں کے اتفاق سے ہو گا یا اختلاف سے ہو گا؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ دونوں کے اتفاق سے ہو گا تو سوال یہ ہے کہ کیا ایک کی طاقت کافی نہیں تھی کہ دوسرے کی ضرورت پڑی ہے؟! اگر ایک کافی تھا تو دوسرا خدا کیسے ہوا؟ اور اگر ایک کافی نہیں تھا تو پھر یہ خدا کیسے ہوا؟ اور اگر آپ کہتے ہیں کہ دنیا کے کام دونوں کے اختلاف سے ہوتے ہیں تو اب الجھن یہ ہو گی کہ جب اختلاف ہو تو ایک کی بات چلتی ہے ایک کی نہیں چلتی تو جس کی نہیں چلتی وہ عاجز ہوا اور عاجز تو خدا نہیں ہوتا تو پھر خدا کسے کہو گے؟

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ دنیا میں خدا ایک ہی ہے، ایک سے زائد نہیں۔ ”لَا إِلَهَ“ سے باقی اللہ کی نفی کر دو اور ”إِلَّا اللَّهُ“ سے ایک کو مان لو تو یہ توحید ہے۔ ایک خدا کو ماننے کا نام توحید نہیں بلکہ ایک خدا کو مانیں اور ایک سے زائد خدا کی نفی بھی کریں تو یہ توحید ہے۔

### ترکِ رفعِ یدین اور نکتہ اختلاف کی تنقیح:

یہی بات ہم غیر مقلدین سے کہتے ہیں جب ان کی اور ہماری بات رفع الیدین پر ہوتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ چار رکعت والی نماز میں ہم لوگ ایک مقام پر رفع الیدین کرتے ہیں اور ستائیس مقامات پر نہیں کرتے اور تم لوگ دس مقامات پر کرتے ہو اور اٹھارہ مقامات پر نہیں کرتے۔ تو تمہارا اور ہمارا اختلاف پورا ہونا چاہیے۔

چار رکعت والی نماز میں عقلی طور پر اٹھائیس مقامات بنتے ہیں جہاں پر رفع الیدین ہو سکتا ہے۔ چار رکعت والی نماز میں چار قیام ہیں ہر رکعت کے شروع میں ایک رفع یدین ہو تو یہ چار رفع یدین ہو گئے، رکوع میں جاتے ہوئے رفع یدین اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے رفع یدین ہو تو یہ کل بارہ ہو گئے۔ آٹھ سجدے ہیں اور سجدے میں جاتے ہوئے اور سجدے سے اٹھتے ہوئے رفع یدین ہو تو یہ سولہ رفع یدین ہو گئے۔ بارہ اور سولہ کو ملائیں تو کل اٹھائیس ہو گئے۔ ہم احناف شروع میں ایک بار رفع یدین کرتے ہیں اور باقی ستائیس مقامات پر نہیں کرتے اور غیر مقلدین شروع نماز میں، رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے اور تیسری رکعت کے شروع میں کرتے ہیں تو یہ ٹوٹل دس مقامات ہوئے اور اٹھارہ مقامات پر یہ لوگ رفع یدین نہیں کرتے۔ تو ہم ان سے کہتے ہیں کہ جس طرح عقیدہ توحید پر ہماری دلیل ہے ﴿فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ

﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾<sup>168</sup> ہے کہ ایک خدا کا اثبات اور باقی سب کی نفی ہے اسی طرح ترک رفع یدین کے مسئلہ میں بھی ہماری دلیل میں ایک مرتبہ رفع یدین کا اثبات اور باقی مقامات کی نفی ہے۔ ترک رفع الیدین پر ہماری دلیل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِصَلَاةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَقَامَ فَرَفَعَ يَدَيْهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ ثُمَّ لَمْ يُعِدَّ<sup>169</sup>

کیا میں تم لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے بارے میں نہ بتاؤں؟ لوگوں نے کہا کہ بتائیں تو آپ نے نماز پڑھ کر دکھائی اور شروع میں رفع یدین کیا، پھر کہیں بھی نہیں کیا۔

ہم ان لوگوں سے کہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح ایک حدیث پیش کرو۔ خواہ وہ حدیث صحیح ہو، خواہ ضعیف ہو۔ کہ جس میں چار رکعت والی نماز میں دس مقامات پر رفع یدین کیا ہو اور اٹھارہ مقامات پر نہ کیا ہو۔ ایسی حدیث پوری ذخیرہ احادیث میں ایک بھی موجود نہیں ہے۔

### بڑھیا کا چرخہ:

میں سنایا کرتا ہوں کہ ایک عورت جنگل میں چرخہ چلایا کرتی تھی۔ کسی نے پوچھا: اسکول گئی ہو؟ کہا: نہیں، کبھی مدرسہ گئی ہو؟ نہیں، اچھا! یہ بتاؤ کہ اللہ موجود ہے؟ کہا: جی موجود ہے۔ دلیل کیا ہے؟ اس بوڑھی نے کہا: یہ چرخہ دلیل ہے۔ یہ کیسے دلیل ہے؟ اس نے کہا: جب میں چلاتی ہوں تو چلتا ہے اور جب نہ چلاؤں تو نہیں چلتا،

168۔ محمد 19:47

169۔ سنن النسائي، رقم: 1026

اس سے پتا چلا کہ سورج کو کوئی نکالنے والا موجود ہے، کائنات کو چلانے والا کوئی موجود ہے تبھی تو چل رہی ہے۔ تو پتا چلا کہ کائنات کو چلانے والی ذات موجود ہے اور وہ اللہ ہے۔ پھر پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ خدا کتنے ہیں؟ اس نے کہا: ایک ہے۔ دلیل کیا ہے؟ کہا: یہ چرخہ دلیل ہے۔ وہ کیسے؟ اس نے کہا: میں جب جوان تھی تو میری ماں نے میری شادی کر دی تھی اور جہیز میں مجھے یہ چرخہ دیا تھا۔ اب میں بوڑھی ہو گئی ہوں اور چرخہ اب بھی ٹھیک چل رہا ہے کیونکہ چلانے والی ایک ہے، اگر چلانے والی دو ہوتیں تو میں کہتی کہ ادھر چلاؤ دوسری کہتی الٹا چلاؤ تو اس سے چرخہ ٹوٹ جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ ایک ہے، اگر دو ہوتے تو ایک کہتا سورج مشرق سے نکالنا ہے اور دوسرا کہتا کہ مغرب سے نکالنا ہے تو سورج ٹوٹ جاتا لیکن سورج ابھی تک ٹھیک چل رہا ہے تو یہ دلیل ہے کہ چلانے والا خدا ایک ہی ہے۔

### اللہ تعالیٰ کو خدا کہنا جائز ہے:

ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ”اللہ“ بھی کہہ سکتے ہیں اور ”خدا“ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی مقام پر علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر عثمانی میں لکھا ہے: ”اور کامل تذلل صرف اسی ذات کے سامنے اختیار کیا جاسکتا ہے جو اپنی ذات و صفات میں ہر طرح کامل ہو، اسی کو ہم ”اللہ“ یا ”خدا“ کہتے ہیں۔“<sup>170</sup>

اس لیے میں یہ بات بار بار کہتا ہوں کہ ہماری پوری محنت یہ ہے کہ امت اکابرین کے ساتھ رہے، اکابرین سے ہٹ کر کوئی رائے قائم نہ کرے۔ یعنی میں اس بات پر جھگڑتا ہوں کہ لوگ اپنی رائے قائم نہ کریں بلکہ اکابرین والی رائے پر عمل پیرا ہوں اور میرے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ امت کو توڑ رہا ہے اور جو لوگ اکابر کو چھوڑ کر



اپنی رائے دیتے ہیں ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ امت کو جوڑ رہے ہیں۔ بھائی! الگ رائے دینے سے امت جڑتی ہے یا اکابرین کی رائے پر رہ کر امت جڑتی ہے؟ (اکابرین کی رائے پر رہ کر۔ سامعین) تو اس بات کا خوب اہتمام کریں کہ اکابرین کی رائے کو لیا جائے اور اپنی رائے دینے سے بچا جائے۔

### موت برحق ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبَلُّوْكُمْ بِالْخَيْرِ فِتْنَةً ۖ وَآلَيْنَا تُزْجَعُونَ﴾

ہر جاندار نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ہم تمہیں اچھی اور بری حالتوں میں مبتلا کر کے آزماتے ہیں اور تمہیں ہماری طرف لوٹ کر ہی آنا ہے۔

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ میں صرف اتنی بات ہے کہ ہر نفس پر موت آئی ہے، اس کا معنی یہ نہیں کہ ہر ایک پر موت آئی ہے۔ اس دونوں میں فرق سمجھنا بہت ضروری ہے۔

### وقوع موت اور خبر موت میں فرق کرنا ضروری ہے:

جب ہم کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ حضور تو زندہ نہیں ہیں، ان کی دلیل یہی آیت ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ بات سمجھو! ایک ہے وقوع موت اور ایک ہے خبر موت، قرآن اور حدیث نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی خبر دی ہے، آپ کی موت کا وقوع بیان نہیں کیا۔

### منکرین حیات الانبیاء سے گفتگو:

ہماری تو بات چلتی رہتی ہے۔ میں نے ایک ساتھی سے پوچھا کہ حضور پاک

صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں؟ اس نے کہا کہ جی ہاں! میں نے کہا: دلیل کیا ہے؟ اس نے کہا: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ میں نے کہا: تم بھی نفس ہو؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ میں نے کہا: تم مر گئے ہو؟ کہنے لگا: نہیں! میں نے کہا: قرآن تو کہہ رہا ہے کہ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ اور تم بھی نفس ہو لہذا تم کو بھی فوت شدہ ہونا چاہیے۔ اس نے کہا: کیا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر موت نہیں آئی؟ میں نے کہا: میں تو آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ اگر موت آئی ہے تو آپ دلیل پیش کرو! اس نے کہا: ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ﴾<sup>171</sup> میں نے کہا: جب یہ آیت اتری تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت زندہ تھے؟ اس نے کہا: جی ہاں زندہ تھے۔ میں نے کہا: زندہ کو قرآن نے ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ﴾ کیسے کہہ دیا؟ اس آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آئے گی، آپ وقوع موت پر آیت پڑھو۔ اب اس نے یہ آیت پڑھی: ﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا﴾<sup>172</sup> میں نے کہا: اس کا کیا مطلب ہے کہ موت سب پر آگئی ہے؟ اس نے کہا کہ اگر موت نہیں آئی تھی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے دفن کیسے کیا تھا؟ میں نے کہا: صحابہ رضی اللہ عنہم نے دفن کیا تھا یہ کون سے پارے کی آیت ہے؟ وہ کہنے لگا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر موت نہیں آئی تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ کیسے بنے؟ میں نے کہا: یہ کس پارے کی آیت ہے؟ آپ لوگ قرآن مجید سے کوئی ایک آیت پیش کرو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ میں سے ایک حدیث پیش کرو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آئی ہے۔

اب اس نے کہا: بخاری شریف میں خطبہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہے:

"مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ." 173

کہ جو شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا وہ یہ جان لے کہ آپ وفات پا چکے ہیں۔

میں نے کہا: یہ کس پارے کی آیت ہے؟ یہ تو قرآن میں نہیں ہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آئی ہے اس کا ذکر نہ ہی قرآن میں ہے اور نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آئی ہے یہ خطبہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔ ہم یہ بات مان لیتے ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فرمان سے موت ثابت ہو رہی ہے لیکن آپ لوگوں پر تعجب ہے کہ آپ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فرمانے پر موت مان لی ہے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جو وصیت فرما رہے ہیں کہ میری موت ہو جائے تو غسل، کفن، جنازہ کے بعد میری چارپائی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ کے باہر رکھ دینا، اگر اجازت ملے تو دفن کرنا... تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس جملہ سے آپ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں نہیں مانتے؟ تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فرمانے پر موت تو آپ نے مان لی ہے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فرمانے سے آپ حیات کیوں نہیں مانتے؟!

میں بارہا کہتا ہوں کہ آپ عقائد سمجھا بھی کریں اور آگے سمجھایا بھی کریں، بعض مرتبہ کسی کو خود سمجھ میں نہیں آتے اور بعض مرتبہ کوئی آگے سمجھا نہیں سکتا۔

## خیر و شر کے ذریعے آزمائش:

﴿وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم شر اور خیر کے ذریعے آزماتے ہیں۔ کبھی ایسی چیز دیتے ہیں جو بندے کو اچھی لگتی ہے اور کبھی ایسی دیتے ہیں جو بندے کو اچھی نہیں لگتی۔ جو چیز طبیعت کے موافق ہو وہ بندے کو اچھی لگتی ہے تو اسے ”خیر“ کہہ دیتے ہیں اور جو چیز طبیعت کے موافق نہ ہو وہ بندے کو اچھی نہیں لگتی تو اسے ”شر“ کہہ دیتے ہیں۔ تو اس چیز کو ”شر“ صرف اس لیے کہہ دیتے ہیں کہ وہ بندے کی طبیعت کے موافق نہیں ہوتی ورنہ اللہ کی طرف سے جو چیز بھی ملتی ہے وہ خیر ہی خیر ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم تمہیں آزماتے ہیں اور آزمانے کا معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کے احوال کا پتا نہیں، دراصل ہوتا یوں ہے کہ مثلاً اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو کوئی مقام دیتا ہے تو اسے آزماتا ہے تاکہ دوسرے بندوں کو بھی پتا چل جائے کہ یہ بندہ آزمائش میں پورا اترتا ہے اس لیے یہ اس مقام کا اہل تھا جو خدا نے اس کو دیا ہے۔

## عجلت اور سرعت میں فرق:

﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾

انسان کو جلد باز پیدا کیا گیا ہے یعنی انسان کی طبیعت میں جلد بازی ہے۔ ایک لفظ ہے ”عجلت“ اور ایک لفظ ہے ”سرعت“، عجلت کہتے ہیں جلد بازی کو اور سرعت کہتے ہیں تیزی کو۔ جلد بازی اور چیز ہے اور سرعت اور چیز ہے۔ عجلت مذموم اور ناپسندیدہ ہے اور سرعت محبوب اور پسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں:

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾<sup>174</sup>

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾

اپنے رب کی مغفرت کی طرف تیزی سے چلو۔  
ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

﴿وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ﴾<sup>175</sup>

بعض اہل کتاب نیک کاموں کی طرف دوڑ لگاتے ہیں اور تیزی سے سرانجام دیتے ہیں۔

سورۃ آل عمران کی اس آیت کے تحت امام فخر الدین ابو عبد اللہ محمد بن عمر بن حسین رازی الشافعی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ”تفسیر کبیر“ میں سرعت اور عجلت کے درمیان فرق لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

السُّرْعَةُ مَخْصُوصَةٌ بِأَنْ يُقَدَّمَ مَا يَنْبَغِي تَقْدِيمُهُ، وَالْعَجَلَةُ مَخْصُوصَةٌ بِأَنْ يُقَدَّمَ مَا لَا يَنْبَغِي تَقْدِيمُهُ.<sup>176</sup>

سرعت کا معنی ہے کہ اس کام کو جلدی کرنا جس کو جلدی کرنا چاہیے اور عجلت کہتے ہیں کہ اس کام کو جلدی کرنا جس کو جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ عمومی قاعدہ ہے اگرچہ کبھی کبھی عجلت کا لفظ سرعت پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی تھی:

174۔ آل عمران 3:133

175۔ آل عمران 3:114

176۔ التفسیر الکبیر للرازی: ج 8 ص 203

﴿وَجِئْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَى﴾<sup>177</sup>

اے اللہ! میں جلدی جلدی آیاتا کہ آپ خوش ہو جائیں۔

حدیث پاک میں ہے:

"أَلَا كَأَنَّكَ مِنَ اللَّهِ وَالْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ".<sup>178</sup>

میانہ روی اللہ کی طرف سے اور عجلت شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔

تو سرعت کو پسند کیا ہے اور عجلت کو ناپسند کیا گیا ہے۔

**حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قوم سے مکالمہ:**

﴿قَالُوا ءَأَنْتَ فَعَلْتَ هَذَا بِالْهَيْتِنَا يَا ابْنِ هِمْ﴾<sup>179</sup> قَالَ بَلْ فَعَلَهُ<sup>180</sup>

كِبِيرُهُمْ هَذَا فَسَلُّوهُمْ إِنْ كَانُوا يَنْطُقُونَ﴾<sup>181</sup>

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم میلے پر جانے لگی۔ ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ آپ بھی چلیں، آپ کو بھی میلہ دکھاتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی طرف دیکھا اور فرمایا: ﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾<sup>179</sup> کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ قوم نے سمجھا کہ شاید پیٹ یا سر میں درد ہو گا جبکہ ابراہیم علیہ السلام فرمانا چاہتے تھے کہ میں تمہارے اس کفر کی بیماری سے بہت تنگ ہوتا ہوں، مجھے اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام میلے پر نہیں گئے۔ جب یہ سارے لوگ میلے پر چلے گئے تو ابراہیم علیہ السلام نے کلباڑا لیا جو بھی سامان ملا اس سے بتوں کو توڑا اور جو بڑا بت تھا اس کو کچھ نہیں کہا بلکہ وہ جو کلباڑا تھا اس کے کندھے پر رکھ کر چھوڑ دیا۔ جب یہ مشرک لوگ

177- لہ: 20: 84

178- سنن الترمذی، رقم: 2012

179- الصافات 89: 37

واپس آئے اپنے چھوٹے چھوٹے خداؤں کو دیکھا کہ وہ مرے پڑے ہیں اور اپنے بڑے خدا کو دیکھا کہ وہ کھڑا الے کر کھڑا ہوا ہے تو انہوں نے کہا: یہ کیا ہوا؟ ہمارے خداؤں کو کس نے مارا ہے؟ انہوں نے کہا:

﴿سَمِعْنَا فَتَى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ إِبْرَاهِيمُ ۝﴾

ہم نے سنا ہے کہ ایک نوجوان ہے جو ان کے بارے میں بڑی باتیں کرتا رہتا ہے، اچھے لفظوں میں ان کا تذکرہ نہیں کرتا، اس کا نام ابراہیم ہے۔ کہنے لگے کہ بلاؤ ان کو اور لوگوں کے سامنے ان سے پوچھو۔ وہ سب کے سامنے آجائے تاکہ اس کو سزا ملے تو کسی کو اعتراض کا موقع نہ ملے۔ جب ابراہیم علیہ السلام کو سب کے سامنے لایا گیا اور ان سے پوچھا گیا کہ اے ابراہیم! کیا ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کام آپ نے کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

﴿بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِنْ كَانُوا يَنْطِقُونَ ۝﴾

نہیں، یہ حرکت ان کے اس بڑے سردار نے کی ہے، انہی بتوں سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہیں تو! مجھ سے کیا پوچھتے ہو! انہی سے پوچھو۔ تو انہوں نے کہا:

﴿لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا هَؤُلَاءِ يَنْطِقُونَ ۝﴾

اے ابراہیم! تو جانتا ہے کہ یہ تو بات بھی نہیں کر سکتے، ان سے کیا پوچھیں؟ اب وہ لوگ بڑے شرمندہ ہوئے تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

﴿أَفَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ ۝﴾

﴿أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝﴾

کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کر رہے ہو جو تمہیں نہ نفع پہنچاتی ہیں اور نہ نقصان پہنچاتی ہیں، تف ہے تم پر بھی اور تمہارے ان خداؤں پر بھی جن کی

تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، کیا تم میں اتنی بھی سمجھ نہیں۔

## ”بل فعلہ کبیر ہم“ کی توضیح بالمثال:

اب سوال یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا﴾ کہ یہ کام ان بتوں کے اس بڑے سردار نے کیا ہے، بظاہر یہ جھوٹ ہے کیونکہ بڑے بت نے تو یہ کام نہیں کیا تھا بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود مارا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام تو صدیق ہیں، نبی ہیں بلکہ نبی الانبیاء اور عام نبی بھی جھوٹ نہیں بولتا تو ابراہیم علیہ السلام کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں؟! ابراہیم علیہ السلام نے کیا بولا تھا اس کو پہلے مثال سے سمجھیں۔ اور میں یہ بات ہمیشہ کہتا ہوں کہ بات کے موافق مثال دینا سیکھو! مثال سے بات کھلتی ہے اور مثال بیان کرنا قرآن کریم کا طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضَرْبٌ مِّثْلُ ۖ فَاسْتَبِعُوا آلَهُ ۖ﴾<sup>180</sup>

اے لوگو! ایک مثال بیان کی جا رہی ہے، اسے غور سے سنو!

اللہ تعالیٰ مثال دے کر سمجھا رہے ہیں کہ جن کو تم پوجتے ہو اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارتے ہو یہ اتنے کمزور ہیں کہ ایک مکھی کو پیدا بھی نہیں کر سکتے اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو یہ اتنے کمزور لوگ ہیں کہ اس سے واپس بھی نہیں چھڑا سکتے۔ تو مثال بیان کر کے سمجھانا یہ اللہ رب العزت کا طریقہ ہے۔

خیر میں مثال بیان کر رہا تھا کہ مثلاً ایک ادارہ میں ایک آدمی ہے جو کہ قابل ہے، شریف ہے، اس کی عزت بھی بہت ہے۔ اسی ادارہ میں کچھ پیسے چوری ہوتے ہیں... ایک بار، دوبار، تین بار... اور اس آدمی کا جو مخالف اور حاسد ہے وہ ادارے



والوں سے کہتا ہے کہ پیسے اسی شخص نے چوری کیے ہیں، ادارے والے اس شریف آدمی کو بلا کر پوچھتے ہیں کہ بتائیں! پیسے آپ نے چوری کیے ہیں؟ اس نے کہا: بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ میں پیسے چوری کروں؟ ادارے والوں نے کہا: ہمیں آپ پر شک ہے۔ اب وہ شخص روتا ہے کہ تم نے کیسی بات کہہ دی کہ میں نے چوری کیے ہیں؟ بھلا میں بھی چوری کر سکتا ہوں! وہ اپنی صفائی دے رہا ہے اور اس کو حد درجہ کا افسوس ہے کہ میرے اوپر الزام لگا ہے چوری کا۔

اب ہو ایوں کہ وہی چوری کے پیسے کسی دوسرے آدمی کی الماری سے مل گئے اور کسی نے دیکھ بھی لیے۔ اب پیسے دیکھنے والا بندہ اس ادارے کے سربراہ اور بڑے کو لا کر دکھاتا ہے کہ فلاں جگہ پیسے رکھے ہوئے ہیں۔ وہ آکر پیسے برآمد کر لیتا ہے، پولیس کے ذریعے اس بندے کو گرفتار کر والیتے ہیں جس سے پیسے برآمد ہوئے ہیں اور پولیس اسے تھانے لے جاتی ہے۔ اب جس شریف آدمی پر پہلے الزام لگ رہا تھا وہ تھانہ میں آتا ہے اور ایس ایچ او سے کہتا ہے کہ سر! چوری تو میں نے کی ہے، آپ نے اس کو شخص کیوں پکڑا؟ ایس، ایچ، او کہتا ہے کہ ہم معذرت کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ آپ پر الزام لگا اور ادارے کا سربراہ بھی کہتا ہے کہ ہم سے غلطی ہو گئی تھی۔

اب یہ شخص جو کہہ رہا ہے کہ چوری میں نے کی ہے اس کا کیا مطلب ہے کہ واقعی اسی نے چوری کی ہے؟ (نہیں۔ سامعین) اب جس طرح یہ کہہ رہا ہے کہ چوری تو میں نے کی ہے تم نے اس کو کیوں پکڑا ہوا ہے؟! یہ شخص ان ادارے والوں کی جہالت، حماقت، غنڈہ گردی اور ان کے بہتان کو کھولنے کے لیے چوری کی نسبت اپنی طرف کر رہا ہے حالانکہ چوری اس نے کی نہیں ہے۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿بَلْ فَعَلَهُ كَيْدُ هُمْ هَذَا﴾ کہ اس بڑے نے مارا ہے یعنی تم لوگ دن رات یہی رٹ لگاتے ہو کہ سب کچھ یہی کرتے ہیں، یہی خدا ہیں، بگڑی بناتے ہیں، جس کو

چاہیں تباہ کر دیتے ہیں تو اسی نے مارا ہے پوچھو انہی سے! اب بات سمجھ میں آگئی؟ (جی ہاں۔ سامعین) یہ ایسی تعبیر ہے کہ جس پر تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ قرآن کریم کی تعبیرات کو اپنے عرف کے ماحول کے مطابق بیان کرو تو پھر قرآن ایسے کھلتا ہے کہ سارے اشکال ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان لوگوں کی تجہیل، حماقت اور کوڑھ مغزی کو بیان کرنے کے لیے کہا کہ ان سے پوچھو کہ یہ سب کس نے کیا ہے؟ کیونکہ تم خود ہی کہتے ہو کہ یہ بگڑی بناتے ہیں، اولاد دیتے ہیں، یہی نفع و نقصان کے مالک ہوتے ہیں، تو جب تمہارا عقیدہ یہی ہے کہ نقصان دینا انہی کے ہاتھ میں ہے تو یہ بڑا بت کھڑا ہے لہذا اسی نے یہ کام کیا ہے کہ باقی سب بتوں کو توڑ کے رکھ دیا ہے۔

اب دیکھو! کتنی آسان سی تعبیر ہے اور ہم اتنی لمبی تفسیر کرتے ہیں کہ خود کو بھی سمجھ میں نہیں آتی، سامع کا سمجھنا تو دور کی بات ہے!

### حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا اجتہادی اختلاف:

﴿وَدَاوُدَ وَ سُلَيْمَنَ إِذْ يَخُكِّمَنِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَسَتْ فِيهِ غَمٌّ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا جَحْشِيَهُمْ شَاهِدِينَ﴾

حضرت داؤد علیہ السلام والد تھے اور سلیمان علیہ السلام بیٹے تھے۔ دونوں نبی تھے۔ ایک آدمی کی بکریاں دوسرے کے کھیت میں چلی گئیں اور اس کے کھیت کو کھالیا۔ اب وہ دونوں کیس لے کر حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا: بکریوں نے جو کھیت کھایا ہے اس کی قیمت کا اندازہ لگاؤ کہ کتنی قیمت بنتی ہے؟ قیمت لگائی گئی تو بکریوں اور کھیت کی قیمت برابر تھی۔ فرمایا کہ بکریاں اس کھیت والے کو دے دو۔

وہ دونوں حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس گئے تو حضرت سلیمان علیہ

السلام نے فرمایا: یوں نہ کرو بلکہ جس کی بکریاں ہیں وہ اس کے کھیت میں کام کرے اور کھیت والا بکریاں لے کر چرائے اور بکریوں کا دودھ پیے۔ جس وقت بکریوں نے کھیت کھایا تھا جب دوبارہ اتنا ہو جائے تو بکریاں بکریوں والے کو دے دو اور کھیت والا اپنا کھیت سنبھال لے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَفَهَّمْنَهَا سُلَيْمَنَ ۖ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا﴾

کہ ہم نے حکمت، علم اور دانائی تو دونوں کو دی تھی، ﴿فَفَهَّمْنَهَا سُلَيْمَنَ﴾ مگر سلیمان علیہ السلام کے کیا کہنے! سلیمان علیہ السلام کو اس مسئلہ میں بنسبت داؤد علیہ السلام کے سمجھ زیادہ دی تھی۔ اب فیصلہ تو دونوں کا ٹھیک تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب نص نہ ہو تو دونوں کے اجتہاد میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ تو جہاں نص نہ ہو تو وہاں امتیوں کے اجتہاد میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔

**آپ کی بات تو آپ کا بیٹا بھی نہیں مانتا ہم کیوں مانیں؟!**

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بڑے ہیں اور استاذ ہیں، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ چھوٹے ہیں اور شاگرد ہیں۔ جب امام ابو یوسف اور امام محمد اپنے استاذ سے اختلاف کرتے ہیں تو غیر مقلدین کھپ ڈالتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کو ہم کیسے مانیں؟ ان کی بات تو ان کے شاگرد بھی نہیں مانتے۔ میں کہتا ہوں کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ یہ لوگ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے دور میں نہیں تھے وگرنہ یہ لوگ حضرت داؤد علیہ السلام سے کہتے کہ ہم آپ کی بات کیسے مانیں؟ آپ کی بات تو آپ کا بیٹا بھی نہیں مانتا۔

تو سلیمان علیہ السلام چھوٹے نبی ہو کر بڑے نبی حضرت داؤد علیہ السلام سے اختلاف کر سکتے ہیں تو چھوٹے مجتہد امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ اپنے سے بڑے

مجتہد امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے اختلاف کیوں نہیں کر سکتے؟!

اور یہ بات الگ ہے کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر، امام حسن بن زیاد وغیرہ قسم کھا کر یہ بات بیان کرتے تھے کہ جب بھی ہم امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف کرتے ہیں تو وہ ہمارا اپنا قول نہیں ہوتا بلکہ کسی مسئلہ پر امام ابو حنیفہ کی دورائے ہوتی ہیں، انہی میں سے ایک رائے کو ہم ترجیح دیتے ہیں اور معروف یوں ہو جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مسئلہ یہ ہے اور ان کے مقابلے میں امام محمد کا مسئلہ یہ ہے، حالانکہ امام محمد کا مسئلہ اپنا نہیں ہوتا بلکہ امام ابو حنیفہ کے دو فتووں میں سے ایک کو ترجیح دی ہوتی ہے۔<sup>181</sup>

### مسئلہ تین طلاق (ایک خاص صورت)

ابھی چند دن قبل ایک مسئلہ آیا تھا کینیڈا سے، ایک آدمی نے اپنی بیوی کو واٹس ایپ پہ واٹس میسج میں طلاق دیتے ہوئے یوں کہا کہ ”میں تجھے ایک طلاق دیتا ہوں، میں تجھے ایک طلاق دیتا ہوں، میں تجھے ایک طلاق دیتا ہوں“ یہ تین مرتبہ اس نے کہا۔ پھر بعد میں نیچے میسج میں لکھا کہ میں تجھے ایک طلاق دے رہا ہوں۔

تو استفتاء ہمارے پاس آیا۔ یہاں سے ہم نے جواب دیا کہ اس کو تین طلاق ہو گئی ہیں۔ پھر انہوں نے پاکستان کا ایک بہت بڑا جامعہ ہے وہاں یہ مسئلہ بھیجا تو انہوں نے کہا کہ ایک طلاق ہوئی ہے۔

تو وہ پاکستان آئے اور کہا کہ ہم ملنے کے لیے آرہے ہیں، میں نے کہا: آجائیں۔ تو میں نے ان سے کہا کہ فتویٰ تو وہی ہے جو تین طلاق والا ہے باقی آپ کہتے ہیں کہ میری نیت یہ تھی تو آپ کے پاس دو چیزیں ہیں؛ ایک آپ کی نیت ہے اور ایک

اُس جامعہ کا فتویٰ ہے، ہم بہت چھوٹے ہیں اور وہ جامعہ بہت بڑا ہے۔ اب وہ کہنے لگا کہ ہم عوام کیا کریں جب آپ علماء میں سے ایک کی رائے تین کی ہے اور ایک کی رائے ایک کی ہے؟ میں نے کہا کہ داؤد علیہ السلام کی رائے اور تھی اور سلیمان علیہ السلام کی رائے اور تھی لیکن ہم نے تو اللہ سے نہیں کہا کہ یا اللہ! دونیوں کی رائے میں اختلاف ہو گیا ہے اب ہم کیا کریں، بھائی! ایک مسئلہ پر دو نبیوں کی رائے کا اختلاف ہو تو الجھن نہیں ہوتی، ایک مسئلہ پر دو صحابہ کی رائے الگ الگ ہو جائے تو الجھن نہیں ہوتی اور ایک مسئلہ ہم دو مولویوں کی رائے مختلف ہو جائے تو کیا الجھن ہے؟

تو وہ دو آدمی تھے، ان میں سے ایک کی بیوی مجھ سے بیعت ہے وہ کہنے لگا کہ ہمیں تو کبھی بھی الجھن نہیں ہوتی اس لیے کہ ہماری گھر والی مولانا گھمن صاحب سے بیعت ہے تو جب بھی کوئی مسئلہ ہوتا ہے ہم انہی سے پوچھتے ہیں، ہم کسی اور سے پوچھتے ہی نہیں ہیں، الجھن تو تمہیں ہے کہ کبھی اس سے پوچھتے ہو اور کبھی اس سے پوچھتے ہو۔ خیر میں یہ سمجھا رہا تھا کہ دونیوں میں اختلاف ہوا ہے۔ اگر دو امتیوں میں اختلاف ہو جائے تو پھر اس میں کون سی الجھن ہے؟

آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ اُس جامعہ والوں کو اشکال کہاں سے ہوا؟! دراصل فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص طلاق کا لفظ تین بار کہے اور کہے کہ میری نیت دوسرے اور تیسرے لفظ سے تاکید کی تھی تو دیانۃً ہم یہ کہیں گے کہ ایک طلاق ہی ہوئی ہے اور قضاءً یہ کہیں گے کہ تین طلاق ہوئی ہیں۔ تو ان جامعہ والوں نے اسی وجہ سے ایک کا فتویٰ دے دیا۔ اُن کو دیانۃً اور قضاءً کے فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ مغالطہ لگا۔

### قضاء اور دیانت کا مفہوم:

دیانت اور قضاء کیا ہوتی ہے؟ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ جب کوئی بندہ

اپنی بیوی سے کہے کہ تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے اور یہ الفاظ بیوی نے خود سنے ہوں یا یہ معاملہ قاضی، پنچایت اور عدالت کے سامنے پہنچ جائے تو اب اگر شوہر کہتا ہے کہ میری نیت ان الفاظ سے تاکید کی تھی یعنی میں ایک طلاق دینا چاہتا تھا اور دوسرے اور تیسرے لفظ سے میں پہلی طلاق ہی کی تاکید کر رہا تھا میری نیت دوسری اور تیسری طلاق دینے کی نہیں تھی تو اس صورت میں اس کی اس نیت کا کوئی اعتبار نہیں ہو گا بلکہ یہ تین طلاقیں شمار ہوں گی کیونکہ معاملہ اب قضاء میں آچکا ہے۔ بیوی کو بھی اس معاملہ میں قاضی کا درجہ دیا جا چکا ہے ”الْمَرْأَةُ كَالْقَاضِي“ کہ جب وہ الفاظ خود سن لے یا کسی معتبر ذریعے سے اس کے پاس پہنچ جائیں تو ایسے ہی حکم ہو گا کہ گویا قاضی نے سن لیے، اب خاوند کی نیت کا اعتبار نہیں ہو گا۔ یہ مطلب ہے کہ قضاء تین واقع ہوں گی۔

اور اگر یہ الفاظ بیوی نے نہ سنے ہوں اور نہ ہی یہ معاملہ قاضی، پنچایت اور عدالت میں پہنچا ہو مثلاً خاوند نے غائبانہ طور پر اپنی بیوی سے کہا ہو کہ طلاق، طلاق، طلاق۔ پھر حلفاً کہے کہ میری نیت صرف ایک کی تھی، دوسری اور تیسری بار میں نے محض تاکید کے طور پر کہا تھا تو اب اس کی تصدیق کی جائے گی اور وہ بیوی سے رجوع کرتا ہے تو اس کی رجعت کو بھی ٹھیک قرار دیا جائے گا۔ یہ معنی ہے دیانتاً ایک طلاق کے واقع ہونے کا۔

تو جب بیوی خود سن لے کہ اس کے خاوند نے تین مرتبہ کہا ہے اور اب خاوند یہ کہتا ہو کہ میری نیت ایک کی تھی اور دو تاکید تھیں تو اب اس قاعدہ ”الْمَرْأَةُ كَالْقَاضِي“ کی رو سے بیوی کے سامنے تین مرتبہ کہنا یا بیوی کا ان تین مرتبہ کو سن لینا ایسے ہی ہے جیسے قاضی نے تین مرتبہ طلاق کا لفظ سنا ہو، تو اس صورت میں تین ہوتی ہیں، ایک نہیں ہوتی۔

اور دارالعلوم دیوبند نے ”الفاظ طلاق کے تکرار سے تین طلاق واقع ہونے پر بعض شبہات کا جواب“ کے نام سے بیس صفحات کا ایک فتویٰ اسی نوعیت کا دیا ہے کہ ایسی طلاقیں تین شمار ہوں گی، ایک نہیں ہوگی۔

### حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کا معنی:

یہی وہ بات تھی جو اس حدیث مبارک میں ہے:

كَانَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَيُّ بَكْرٍ وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق کے بجائے ایک ہوتی تھی، لہذا ایک ہی شمار ہوتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو لوگوں نے تین طلاقیں دینا شروع کر دیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"إِنَّ النَّاسَ قَدْ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرٍ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أَكَاثَةٌ فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ".<sup>182</sup>

کہ لوگوں کو جس کام میں سہولت تھی انہوں نے اس میں جلد بازی شروع کر دی ہے یعنی جب ایک دینی تھی تو ان کو ایک دینی چاہیے تھی، جب انہوں نے تین دی ہیں تو اب تین ہی ہوں گی۔

اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے امام ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ پہلے کوئی شخص اپنی بیوی کو انت

طالق، انت طالق، انت طالق کہہ کر طلاق دیتا تو چونکہ دوسری اور تیسری طلاق سے عام طور پر لوگ نئی طلاق کا ارادہ نہیں کرتے تھے اس لیے لوگوں کی غالب اور عام عادت کو دیکھتے ہوئے ان الفاظ سے محض تاکید مراد لی جاتی تھی اور اس بندے کی نیت کا اعتبار کر لیا جاتا تھا کہ اس نے دوسری اور تیسری طلاق سے محض تاکید مراد لی ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور لوگوں نے تین طلاقیں پے در پے دینا شروع کر دیں اور ان لوگوں کی نیت بھی عموماً طلاق کے دوسرے اور تیسرے لفظ سے استیناف یعنی نئی طلاق دینے ہی کی ہوتی تھی اس لیے جب کوئی شخص تین طلاقیں والا جملہ بولتا تو اس دور کے عرف کی بناء پر تین طلاقیں کا حکم لگایا جاتا تھا۔<sup>183</sup>

چونکہ اب زمانے میں فساد آگیا تھا اس لیے جو الفاظ کہہ دیے بس انہی کا اعتبار ہوتا، نیت کا اعتبار نہیں ہوتا تھا۔

خیر میں طلاق دینے والے شخص کی بات سن رہا تھا۔ مجھے وہ شخص کہنے لگا کہ حضرت! میری تو تین طلاق دینے کی نیت نہیں تھی بلکہ صرف ایک طلاق دینے کی نیت تھی۔ میں نے اسے کہا کہ آپ دو آدمی میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ ہم نے آپ کو فتویٰ دیا تھا جس کی وضاحت کے لیے آپ اتنا لمبا سفر کر کے یہاں آگئے۔ اب میں مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ میں بات کرتے کرتے غصہ میں آکر اس میز پر ہاتھ مارتا ہوں، آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ کے نیچے آتا ہے اور آپ کی گھڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ آپ کہتے ہیں مولانا صاحب! ہم تو آئے تھے مسئلہ سمجھنے کے لیے اور یہاں آکر اپنی گھڑی تڑوا بیٹھے اور میں کہوں کہ اللہ کی قسم! میری نیت گھڑی توڑنے کی ہرگز نہیں تھی۔ تو بتائیں کیا میری نیت گھڑی توڑنے کی نہ بھی ہو تو کیا گھڑی نہیں ٹوٹے گی؟! اب اس کو کچھ دھچکا سا



لگا کہ واقعی اگر نیت نہ بھی ہو پھر بھی کچھ ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں آپ سے بار بار یہ کہتا ہوں کہ شریعت سمجھو! شریعت سمجھو!

### حضرت ایوب علیہ السلام کا ابتلاء:

﴿وَاَيُّوبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهُٗ اَنِّىۡ مَسَّنٰى الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّحِيْمِيْنَ﴾

فَاَسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَاَتَيْنَاهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً  
مِّنْ عِنْدِنَا وَاذْكُرْ لِّلْعٰبِدِيْنَ ﴿۳۷﴾

حضرت ایوب علیہ السلام نے بہت زیادہ تکلیف برداشت کی، سات سال بیماری کاٹی، اولاد فوت ہو گئی، سامان ختم ہو گیا اور جسم میں بیماری کی وجہ سے چھالے پڑ گئے۔ آپ کی نیک بیوی برابر آپ کی خدمت کرتی رہی۔ ایک دن شیطان طبیب کی شکل میں آیا ایوب علیہ السلام کی بیوی کے پاس، اس نے کہا کہ میں ان کا علاج کرتا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔ پوچھا کہ کیا شرط ہے؟ شیطان کہنے لگا کہ جب ان کو شفا ہو جائے تو تم یہ کہنا کہ تو نے ان کو شفا دی ہے، میں اس کے علاوہ کوئی نذرانہ نہیں لوں گا۔ انہوں نے اس بات کا ذکر حضرت ایوب علیہ السلام سے کیا۔

حضرت ایوب علیہ السلام تو نبی تھے۔ آپ نے بیوی سے فرمایا کہ بھلی مانس! وہ طبیب نہیں تھا بلکہ وہ تو شیطان تھا۔ آپ کو اس بات کا بہت دکھ ہوا کہ میری بیماری کی وجہ سے شیطان کا حوصلہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہ میری بیوی سے یہ کلمات کہلوانا چاہتا ہے۔ تو حضرت ایوب علیہ السلام نے قسم کھا کر اپنی بیوی فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے شفا دے دے اور میں ٹھیک ہو جاؤں تو تجھے سو قمچیاں ماروں گا۔ جب آپ ٹھیک ہو گئے اور بیوی نے خدمت بھی بہت کی تھی تو اللہ نے فرمایا کہ سو تینکے لے کر اکٹھے مار دیں، آپ کی قسم پوری ہو جائے گی۔ تو یوں ان کی قسم پوری ہو گئی۔

بیماری کی حالت میں حضرت ایوب علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تھی:

﴿أَنِّي مَسْنِي الضُّرِّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾

اے اللہ! مجھے یہ تکلیف لگ گئی ہے، آپ کی ذات تو رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والی ہے۔ آپ مجھ پر رحم فرمائیں!

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کی دعا کو قبول کیا، ان کی بیماری کو بھی دور کر دیا، ان کو ان کے گھر والے بھی دے دیے اور اتنے لوگ اور بھی دیے۔ تو اللہ پاک نے ان کی کیسی مدد فرمائی۔

### فضائل حج کی حکایت پر اعتراض کا جواب:

میں جنوبی پنجاب کے سفر پر تھا۔ مبارک پور ایک جگہ ہے وہاں میرے پاس دو غیر مقلد آئے۔ فضائل اعمال اور فضائل صدقات لے کر۔ کہنے لگے کہ پہلے ہم دیوبندی تھے، پھر اہل حدیث ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ تم جو بھی ہو جاؤ مجھے کیا تکلیف ہے، یہ کہانیاں مجھے کیوں سناتے ہو؟ لیکن جس وجہ سے تم ہوئے ہو وہ وجہ مجھے بتادو۔ انہوں نے کہا: ہم نے فضائل حج پڑھی ہے، اس میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے ایک واقعہ لکھا کہ ایک آدمی حج پر جا رہا تھا، راستہ میں بیمار ہو گیا، اس نے اللہ سے دعا مانگی۔ دعا قبول ہو گئی۔ اب ایک آدمی وہاں آگیا تو اس مسافر نے اس سے کہا کہ یہ تو سارا جنگل ہے، تم یہاں کہاں سے آئے ہو؟ اس بندے نے کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں اور میں فوت ہو گیا تھا، تم نے دعا مانگی تو اللہ مجھے زندہ کیا اور تیرے علاج کے لیے بھیجا۔

تو وہ دونوں غیر مقلد مجھے کہنے لگے کہ یہ کفریہ عقیدہ ہے۔ تو ”فضائل حج“ میں کفر تھا اس لیے ہم نے فضائل حج کو چھوڑا اور اہل حدیث ہو گئے۔ میں نے کہا: میں قرآن پاک کی آیات پڑھتا ہوں، اگر ان میں یہی بات ہو جس کو تم کفر کہہ رہے ہو تو کیا

اسلام کو چھوڑ کر سیکھ ہو جاؤ گے؟ کہنے لگے: قرآن میں ہے؟ میں نے کہا: میں بتاتا ہوں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَرَأْتُمُ فِيهَا﴾<sup>184</sup>

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں ایک بندہ قتل ہو گیا۔ پتا نہیں چل رہا تھا کہ قاتل کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وحی آئی ہے کہ گائے ذبح کرو، ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا﴾ اس کے گوشت کا ٹکڑا مقتول کے ساتھ لگاؤ وہ زندہ ہو کر بتائے گا کہ میرا قاتل کون ہے! جب گوشت لگایا تو وہ زندہ ہوا اور بتایا کہ میرا قاتل کون ہے۔ میں نے کہا کہ یہ واقعہ پہلے پارہ میں ہے، اگر دنیا میں کسی بندے کا زندہ ہونا تمہارے نزدیک کفر ہے تو پہلا پارہ چھوڑ دو کیونکہ تمہارے مطابق اس میں کفر آگیا ہے۔ - معاذ اللہ! -

میں نے کہا: دوسرے پارے میں ہے:

﴿الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ﴾<sup>س</sup>

فَقَالُوا لَهُمْ اللَّهُ مَوْتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ<sup>185</sup>

کیا آپ کو ان لوگوں کا حال معلوم نہیں جو موت سے بچنے کے لیے اپنے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل پڑے۔ اللہ نے انہیں فرمایا کہ مر جاؤ، پھر انہیں زندہ کیا۔ اب دیکھو! حضرت شیخ زکریا رحمہ اللہ نے تو ایک شخص کا واقعہ لکھا ہے اور یہاں اللہ تعالیٰ ہزاروں کی بات فرماتے ہیں، لہذا تم چھوڑ دو دوسرے پارے کو بھی۔ آگے تیسرے پارے میں ہے:

﴿أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّى يُحْيِي

هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ﴾<sup>186</sup>

حضرت عزیر علیہ السلام تھے یا کوئی اور نیک آدمی تھے، ان کا گزر ایک بستی پر ہوا جو چھتوں کے بل گری پڑی تھی، انہوں نے اس بستی کے بارے میں کہا کہ اللہ اس کو کیسے زندہ کریں گے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سو سال تک موت دی، پھر اٹھایا۔ میں نے کہا: لو تمہارے نظریے کے مطابق ایک اور کفر آگیا، اب تیسرے پارے کو چھوڑ دو۔ آگے ساتویں پارے میں ہے:

﴿وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ يَٰذَا الَّذِي إِيَّاكَ اللَّهُ﴾<sup>187</sup>

حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو اللہ کے حکم سے زندہ کرتے تھے۔

اب ساتویں پارے کا بھی انکار کر دو!

تو وہ شخص کہنے لگا کہ یہ تو معجزات ہیں۔ میں نے کہا کہ شیخ زکریا صاحب رحمہ اللہ نے جو بیان کیا وہ ولی کی کرامت تھی۔ جس طرح معجزہ خلاف شریعت نہیں ہوتا اسی طرح کرامت بھی خلاف شریعت نہیں ہوتی۔ میں نے کہا: اہل حدیث ہونے کی وجہ تو یہی تھی نا! اب کوئی اور وجہ ہو تو وہ بتاؤ! اس پر وہ لاجواب ہو گیا۔

**حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ:**

﴿وَذَا النُّونِ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَىٰ فِي

الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ ۖ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾<sup>188</sup>

حضرت یونس علیہ السلام کی قوم شرک کیا کرتی تھی، آپ نے انہیں بہت سمجھایا لیکن وہ باز نہیں آئی تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر تم باز نہیں آؤ گے تو تین دن بعد تم پر عذاب آئے گا۔ جب تین دن گزرے، آخری رات آئی تو حضرت یونس علیہ السلام بستی سے باہر چلے گئے کہ قوم پر عذاب آرہا ہے۔

قوم پیچھے سے گڑ گڑائی، معافیاں مانگیں... بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول کیا اور عذاب کو ختم فرمادیا۔

اب اللہ نے عذاب کو ختم کیوں فرمادیا؟ اس کی ایک وجہ تو میں نے سورۃ یونس میں بیان کی تھی کہ جب آدمی پر موت کے آثار آجائیں اور آخرت کا عذاب نظر آنا شروع ہو جائے تو پھر توبہ قبول نہیں ہوتی، اسی طرح اگر دنیا کا عذاب نظر نہ آئے بلکہ دنیا کے عذاب کے اندر آدمی مبتلا ہو جائے تو پھر بھی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ یونس علیہ السلام کی قوم کا معاملہ یہ تھا کہ اس نے نہ تو آخرت کے عذاب کو دیکھا اور نہ ہی اس پر دنیا کا عذاب شروع ہوا بلکہ اس قوم نے جب دنیا کے عذاب کے آثار دیکھے تو رو دھو کر توبہ کی تو اللہ رب العزت نے انہیں معاف فرمادیا۔ یوں ان کی توبہ قبول ہو گئی۔

بعض مفسرین نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ عذاب کو ختم فرمانا یہ عام معمول سے ہٹ کر تھا، عام معمول میں جب آثارِ عذاب آجائیں تو اللہ تعالیٰ توبہ کو قبول نہیں فرماتے لیکن اس قوم کے بارے میں قرآن کریم میں ان لفظوں میں ارشاد فرمایا:

﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ أَمَنَتْ فَنَقَعَهَا إِيْمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ ۖ لَمَّا

أَمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ

کہ جب بھی کوئی بستی عذاب کو دیکھ کر ایمان لائے تو ایمان لانا ان کو نفع نہیں دیتا سوائے یونس علیہ السلام کی قوم کے۔

توجہ جو بھی ہو خیر یونس علیہ السلام بستی چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ نے وحی آنے کا انتظار نہیں کیا بلکہ اپنے اجتہاد کی بنا پر پہلے چلے گئے اور یہ بات قابلِ گرفت بھی نہیں تھی کیونکہ آپ نے یہ سمجھا تھا کہ سرکش اور نافرمان قوم پر عذاب آئے تو ان سے ملتا نہیں ہے۔ جب تین دن کی مہلت ان کو دی گئی ہے اور انہوں نے توبہ نہیں کی تو بس اب ان پر عذاب کا آنا یقینی ہے، اس لیے وحی کا انتظار کے بغیر آپ بستی سے چلے گئے۔

جب قوم نے توبہ کر لی جس کی وجہ سے ان پر عذاب نہیں آیا تو یونس علیہ السلام نے سوچا کہ اگر میں واپس اپنی قوم میں چلا گیا تو وہ شاید مجھے جھوٹا سمجھیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ قوم میں یہ رسم جاری تھی کہ جس کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے اس کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام کو اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں قوم بھی مجھے جھوٹا کہہ کر قتل نہ کر دے کیونکہ میں نے تو کہا تھا کہ تین دنوں میں عذاب آجائے گا لیکن عذاب تو آیا نہیں۔ اس لیے آپ چلے گئے۔

اور آپ علیہ السلام یہ سمجھتے تھے کہ میں نے یہ جو عمل کیا ہے اللہ تعالیٰ مجھے اس پر سزا نہیں دیں گے لیکن چونکہ آپ ایک جلیل القدر پیغمبر تھے اس لیے آپ کا بغیر حکم الہی اپنے اجتہاد کی بنا پر بستی سے چلے جانا اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا تو آپ پر عتاب ہوا۔

چنانچہ ایسا ہوا کہ آپ دریا کے کنارے گئے، دیکھا کہ وہاں ایک کشتی کھڑی ہے جو لوگوں سے بھری ہوئی ہے، آپ اس میں جا کر بیٹھ گئے۔ جب کشتی آگے چلی تو ایک بھنور میں پھنس گئی۔ کشتی کے ملاح نے کہا کہ لگتا ہے ہماری کشتی میں اپنے آقا سے دوڑا ہوا کوئی غلام ہے اور جب ہماری کشتی میں کوئی ایسا بندہ ہو تو ہماری کشتی نہیں چلا کرتی۔

یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ تو میں ہوں۔ انہوں نے کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا کہ میں ہوں۔ اب اس بندے کو اس کشتی سے گراتے تو پھر کشتی نے چلنا تھا، جب تک اس کی جان کی قربانی نہ دیتے تو کشتی نے چلنا نہیں تھا۔ یونس علیہ السلام فرمانے لگے کہ مجھے دریا میں پھینک دو!

چنانچہ ان میں قرعہ اندازی ہوئی۔ قرعہ اندازی میں تینوں بار یونس علیہ السلام کا نام نکلا۔ انہوں نے یونس علیہ السلام کو پانی میں ڈال دیا۔ اللہ کے حکم سے ایک بڑی مچھلی نے آپ کو نگل لیا۔ یونس علیہ السلام چالیس دن تک مچھلی کے پیٹ میں رہے اور یہ دعا مانگتے رہے:

﴿لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾

یونس علیہ السلام توبہ کرتے رہے اور جو کام آپ نے کیا تھا اسے خطا سمجھتے رہے حالانکہ یہ خطا نہیں تھی بلکہ یہ تو آپ کا اجتہاد تھا کہ نافرمان قوم پر تین دنوں میں عذاب کا آنا یقینی ہے، لہذا میں ان میں کیوں ٹھہروں؟ مجھے چلے جانا چاہیے۔

اس کی مثال ایسے ہے کہ جیسے غزوہ احد کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر کمان والے دستے سے فرمایا تھا کہ جب تک میں نہ کہوں تم نے پہاڑی سے نہیں ہلنا، جب فتح ہو گئی تو ان تیر کمان والے صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ اب تو ضرورت پوری ہو گئی ہے، اب ہم بھی جائیں اور جا کر مالِ غنیمت جمع کریں۔ جب یہ پہاڑی سے

نیچے اترے تو پہاڑی کے پیچھے سے کفار نے حملہ کیا جس سے کافی صحابہ شہید ہو گئے، فتح بظاہر شکست میں تبدیل ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہ تھا کہ جب تک میں نہ کہوں تم نے یہاں سے نہیں ہٹنا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ دستہ وہاں سے اس لیے ہٹا کہ انہوں نے سمجھا کہ اب فتح ہو گئی ہے، اب یہاں رہنے کی ضرورت نہیں رہی۔ تو ان کا ہٹنا اجتہاد کی بنا پر تھا۔ معاذ اللہ۔ یہ کوئی نافرمانی یا کوئی گناہ نہیں تھا۔

### ﴿فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ﴾ کا معنی:

اس مقام پر جو الفاظ ہیں: ﴿فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ﴾ اس کا معنی اچھی طرح سمجھ لیں۔

یہاں لفظ ”نَقْدِرَ“ قدرت سے مشتق نہیں بلکہ یا تو یہ لفظ ”تقدير“ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے فیصلہ کرنا۔ اب آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ حضرت یونس علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ اللہ میرے بارے میں سزا کا فیصلہ نہیں فرمائیں گے۔

یا یہ لفظ ”قَدَّرَ“ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے ”تنگی کرنا“، اب آیت کا مطلب ہو گا کہ حضرت یونس علیہ السلام نے یہ خیال کیا اور یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر تنگی نہیں فرمائیں گے۔

### جاہل عاملوں کے استدلال کا رد:

﴿وَالَّذِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا

ابْنَهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ﴾

حضرت مریم علیہا السلام کے پاس حضرت جبرائیل امین آئے، ان کے گریبان میں پھونک ماری جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ کچھ جاہل عاملوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ عورتوں کے ننگے جسم پر



علاج کے لیے ہاتھ پھیرنا جائز ہے معاذ اللہ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ کے نمائندے تھے اور جنسیت اور خواہشاتِ نفسانی سے بالکل پاک تھے اور دوسرا یہ کہ انہوں نے صرف پھونک ماری تھی لیکن آج کے عامل تو ہاتھ پھرتے ہیں لہذا ان لوگوں کے لیے اس آیت کو دلیل بنانا جائز نہیں ہے۔

### قبولیتِ عمل کے لیے شرط؛ صحتِ عقیدہ

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ ۖ وَإِنَّا

لَهُ كَاتِبُونَ﴾ (۹۳)

جو شخص نیک اعمال کرے بشرطیکہ وہ مومن ہو تو اس کی کوشش کی ناقدری نہیں کی جائے گی، ہم اس بندے کے اعمال کو لکھتے جاتے ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے عمل کے قبول ہونے کی شرط لگا دی ہے کہ جب عقیدہ ٹھیک ہو گا تو عمل قبول ہو گا۔ اگر عقیدہ ٹھیک نہ ہو تو اعمال قبول نہیں ہوتے۔

### خروج یا جوج ماجوج:

﴿حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ﴾ (۹۶)

علاماتِ قیامت میں سے ایک علامت یہ ہے کہ جو سد سکندری ہے اس کے پار یا جوج ماجوج ہیں، وہ دیوار کو توڑیں گے اور وہاں سے نکلیں گے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد کی بات ہے۔ یہ لوگ اس طرح پوری دنیا میں پھیل جائیں گے کہ جیسے ہر بلند جگہ سے پھسلتے ہوئے آرہے ہوں۔ کوئی ٹیلہ سے گر رہا ہو گا، کوئی پہاڑی آرہا ہو گا اور ہر شے کو ہڑپ کر جائیں گے، پانی پینیں گے تو دریا کو خشک کر کے رکھ دیں گے۔

صحیح مسلم کی کتاب الفتن میں ایک روایت موجود ہے۔ حضرت زینب بنت

جس رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوئے ہوئے تھے، نیند سے بیدار ہوئے اور فرمایا:

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرِّ قَدْ اقْتَرَبَ، فُتِّحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مِثْلُ هَذِهِ.

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تباہی ہو عرب کے لیے ایک شر سے جو بہت قریب آگیا ہے۔ وہ شر کیا ہے؟ اس کی وضاحت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی، فرمایا کہ یا جوج اور ما جوج کی جو دیوار ہے اس میں اتنا سا سوراخ ہو گیا ہے۔

وہ سوراخ کتنا سا تھا؟ ”وَعَقَدَ سُفْيَانُ بَيْدَهُ عَشْرَةً“ حدیث کے راوی حضرت سفیان نے ہاتھ سے دس کا اشارہ کر کے بتا دیا کہ اتنا سوراخ ہوا ہے۔<sup>189</sup>

دوسری روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں:

فُتِّحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مِثْلُ هَذِهِ وَعَقَدَ وَهَيْبٌ بَيْدَهُ

تِسْعِينَ.<sup>190</sup>

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج یا جوج و ما جوج کی دیوار سے اتنا سا سوراخ کھل گیا ہے۔ اس میں ہے کہ حدیث کے راوی وہیب نے نوے کا اشارہ کر کے بتایا کہ اتنا سوراخ مراد ہے۔

اب دونوں روایتوں کو دیکھیں تو ایک کا راوی کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دس کا اشارہ کیا اور دوسری کا راوی کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نوے کا اشارہ کیا ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کے ساتھ بتایا ہے کہ اتنا

189- صحیح مسلم، رقم: 2880

190- صحیح مسلم، رقم: 2881

سورخ ہو گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو ایک نے سمجھا کہ دس کا اشارہ ہے اور ایک نے سمجھا کہ نوے کا اشارہ ہے۔

بہر حال یہ دونوں احادیث وہی سمجھے گا جس کو عقد الانامل کا طریقہ آتا ہو، جس کو یہ طریقہ نہیں آتا وہ یہ ان حدیثوں کو خود کیسے سمجھے گا اور دوسروں کو کیسے سمجھائے گا؟! یہ حدیثیں تو وہی سمجھے گا جس کو یہ طریقہ آتا ہو۔ جو طریقہ نہیں جانتا وہ تو احادیث پر اعتراض کر دے گا کہ ایک راوی کہتا ہے کہ نوے کا اشارہ ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ دس کا اشارہ ہے، تو دونوں حدیثیں کیسے ٹھیک ہو سکتی ہیں؟ اس معترض سے پوچھو کہ نوے کا اشارہ ہو تو انگلی کہاں رکھتے ہیں اور دس کا اشارہ ہو تو انگلی کہاں رکھتے ہیں؟ جب تمہیں اس کا پتا ہی نہیں تو تم اعتراض کیسے کرتے ہو؟!

”عقد الانامل“ کا طریقہ ایسا ہے کہ بندے کی دونوں ہاتھ کی دس انگلیوں پر دس ہزار کی گنتی ہو جاتی ہے۔ یہ کیسے کرتے ہیں ہم نے اس پر پوری فائل بنائی ہے اور ویڈیوز بھی بنی ہوئی ہیں۔ ان شاء اللہ آپ کو پڑھائیں گے اور آپ دیکھیں گے کہ اس طریقے کو سیکھنے میں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ لگتے ہیں۔ اللہ ہمیں سیکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

**زمین کے وارث نیک بندے ہوں گے:**

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ

الصَّالِحُونَ﴾ (١٠٥)

ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ اس زمین کے وارث میرے نیک بندے بنیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ نیک بندے ہمیشہ غالب رہیں گے۔ آج ہمیں جو حکومت نہیں ملتی تو اس کی ایک وجہ تو ہے کہ ہم نیک نہیں ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم اس کے لیے کوشش بھی نہیں کرتے۔ انسان نیک ہو اور حصول کے

لیے کوشش بھی کرے تو اللہ تعالیٰ بندے کو نواز دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کئی جگہ اس بات کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً سورۃ النور میں فرمایا:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾<sup>191</sup>

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ہیں ان سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں ضرور زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا۔

اسی طرح سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾<sup>192</sup>

کہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنادیتا ہے اور آخری انجام پرہیزگاروں کے حق میں ہوتا ہے۔ یہاں بھی انجام کے پرہیزگاروں کے حق میں ہونے کا مطلب یہی ہے کہ زمین کے وارث یہی قرار پاتے ہیں۔

**کیا پیغمبر علیہ السلام ہر جگہ پر ہیں؟**

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾<sup>193</sup>

اے پیغمبر! ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اس آیت سے اہل بدعت استدلال کرتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ پر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمتِ خدا ہیں اور رحمتِ خدا ہر جگہ پر ہے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر جگہ پر ہیں۔ ہم نے کہا کہ سورج ہر جگہ پر ہے کیا یہ بات مان لو گے؟ کہتے ہیں کہ جی نہیں۔ ہم نے کہا: دلیل تو قرآن کریم میں بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا﴾<sup>193</sup>

کہ اللہ وہی ہے جس نے سورج کو سراپا روشنی بنایا اور چاند کو سراپا نور بنایا۔ روشنی ہر جگہ پر ہے تو کیا اس بات کو مان لو گے کہ سورج بھی ہر جگہ پر ہے؟ کہتے ہیں کہ جی اس آیت کا معنی یہ ہے کہ سورج تو آسمان پر اس کی روشنی ہر جگہ پر ہے۔ تو ہم نے کہا کہ اُس آیت کا معنی بھی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ہیں اور آپ کی رحمت ہر جگہ پر ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

اللہ تعالیٰ ہمیں حق بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

# دروس القرآن

۳

والله اعلم  
محمد الياس كهن

مركز اهل السنة والجماعة



نام کتاب ..... دُرُوسُ الْقُرْآنِ جلد سوم

تالیف: ..... محمد الیاس عظیمی

تاریخ اشاعت ..... مارچ 2020ء

بار اشاعت ..... اوّل

تعداد اشاعت ..... 1100

ناشر ..... مکتبہ اہل السنۃ و الجماعۃ

ملنے کا پتہ

مکتبہ اہل السنۃ و الجماعۃ، 87 جنوبی لاهور ڈسٹرکٹ

0321-6353540

0335-7500510

www.ahnafmedia.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## فہرست

25	سورة الحج
25	بعث بعد الموت کی دلیل؛ تخلیق انسانی
26	سن ہجری کو رواج دیں!
27	عمر انسانی کے مراحل اور احوال:
28	سفید بالوں سے حیا:
29	سیاہ خضاب کے علاوہ کاجواز:
30	پیغمبر پاک کے مخالف کا غیظ و غضب میں جلنا:
31	حق ہمیشہ غالب رہتا ہے:
31	تمام مخلوق خدا کو سجدہ کرتی ہے:
31	کتنا صاحب کمال ہو گیا پر اعتراض کا جواب:
33	جزل کا مقابلہ جزل سے کریں!
34	جنتی مردوں کا کنگن پہننا:
36	کنگن پہننا شاہی اعزاز ہے:
37	دین کی فہم بہت بڑی نعمت ہے:



- 38 ----- حورانِ جنت کا تذکرہ:
- 39 ----- حرم؛ امن و سلامتی کی جگہ
- 39 ----- حضرت ابراہیم کا کعبہ تعمیر کرنا:
- 40 ----- حضرت ابراہیم کا اعلانِ حج:
- 41 ----- مرکز کی بنیاد اور مشکلات کا سامنا:
- 42 ----- اللہ اس سے بھی بڑی گاڑی دے:
- 43 ----- قربانی کے صرف تین دن ہیں:
- 45 ----- صحابہ کرام کو جہاد کی اجازت:
- 46 ----- کیا جہاد کے لیے ایمان مضبوط ہونا شرط ہے:
- 47 ----- دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!
- 48 ----- حضرت بشیر بن خصاصیہ اور بیعت علی الجہاد:
- 49 ----- مشر و عیت جہاد کی وجہ:
- 51 ----- حکومت اسلامی کے بنیادی کام:
- 51 ----- خلفائے راشدین کا سنہری دور:
- 53 ----- صحیح بندے کا انتخاب ہماری ذمہ داری:
- 54 ----- خلفائے راشدین چار ہیں:
- 56 ----- ترتیبِ خلافت کی وجہ:
- 57 ----- کام کرنے والے کا دل بڑا ہونا چاہیے!
- 58 ----- محبت سب سے لیکن اتباع اپنے شیخ کی:
- 59 ----- قیامت کے دن کی مقدار:
- 61 ----- نزولِ وحی کے وقت شیطان کا لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالنا:

- 61 ----- دو موتیں اور دو حیاتیں:-----
- 65 ----- معبودانِ باطلہ کے باطل ہونے کی مثال:-----
- 66 ----- مناقبِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ:-----
- 67 ----- تمہارا خواب میری نبوت کی دلیل ہے:-----
- 68 ----- سورۃ حج کے آخر میں سجدہ تلاوت نہ ہونے کی دلیل:-----
- 69 ----- دین میں حرج نہ ہونے کا مطلب:-----
- 70 ----- ملت اور امت کا معنی:-----
- 70 ----- امت دعوت اور امت اجابت:-----
- 71 ----- ”مسلمان یا حنفی؟“ کا آسان جواب:-----
- 72 ----- دین ایک اور مذہب کئی:-----
- 73 ----- اجتہادی اختلاف کی مثالیں:-----
- 75 ----- چاروں برحق اور مسئلہ ایک کا ٹھیک:-----

## 77 ----- سورۃ المؤمنون

- 77 ----- سورت کے فضائل و خصوصیات:-----
- 78 ----- مومنین کی سات صفات:-----
- 79 ----- امام محمد کا ایک ہفتے میں حفظ قرآن:-----
- 80 ----- خود کو گناہوں سے بچائیے!-----
- 81 ----- مسائل میں جھجک سے کام نہ لیں:-----
- 82 ----- نماز میں رفع یدین نہ کرنے کی دلیل:-----
- 84 ----- عیدین میں رفع یدین کیوں؟-----

- 86 ----- تخلیق انسانی کے سات مراحل:
- 87 ----- حیات فی القبر کا ثبوت:
- 89 ----- قوم کسے کہتے ہیں؟
- 91 ----- ربوہ کا معنی اور قادیانی دھوکہ:
- 92 ----- انسان بقدر وسعت مکلف ہوتا ہے:
- 93 ----- صاحب حیثیت بندوں پر عذاب کا معنی:
- 94 ----- مشرکین کی عادت:
- 95 ----- مشرکین مکہ کی ہٹ دھرمی:
- 96 ----- توحید و قیامت دو اہم عقیدے:
- 97 ----- بعث بعد الموت:
- 98 ----- عذاب قبر برحق ہے:
- 100 ----- انسان بقدر عقل مکلف ہے:
- 100 ----- مرکز اہل السنۃ والجماعۃ مرکز اعتدال:
- 101 ----- ہم نرم لوگ ہیں!
- 102 ----- سارے اختیارات کا مالک اللہ ہے:
- 103 ----- اللہ کا کوئی شریک نہیں:
- 103 ----- بڑھیا کا چرخا:
- 105 ----- کفار و مشرکین کو عذاب کی وعید:
- 106 ----- دائرۂ نبوت:
- 107 ----- شیطان سے حفاظت کی دعا:
- 109 ----- انسانی فطرت:

- 110 ----- عالم برزخ:
- 111 ----- امی عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ اقدس میں پردہ:
- 113 ----- خاندان نبوت کی نسبت کی اہمیت:
- 114 ----- قیامت کے دن وزنِ اعمال:
- 115 ----- زبدۃ الشمائل شرح شمائل ترمذی:
- 117 ----- علماء کی قدر کیجیے!
- 118 ----- جہنمیوں کی آہ کہ ہمیں یہاں سے نکالیں!
- 119 ----- نیوکار لوگوں کا بدلہ:
- 119 ----- منکرین حیات الانبیاء کے ایک شبہ کا جواب:
- 121 ----- انسان بے کار پیدا نہیں کیا گیا:
- 121 ----- پیغمبر پاک کو دعا کی ترغیب:
- 122 ----- امراض سے بچاؤ کا دم:
- 123 ----- سورت کی ابتدا اور انتہا کا ربط:
- 123 ----- زبدۃ الشمائل اور نماز اہل السنۃ والجماعۃ کی اہمیت:

## 125 ----- سورۃ النور

- 125 ----- زنا، انسانی معاشرے کا ایک سنگین جرم:
- 126 ----- زنا کے متعلق پہلا حکم:
- 126 ----- زنا کی سزا کے تدریجی احکامات:
- 128 ----- ثبوتِ زنا کی شرائط سخت ہیں:
- 128 ----- زنا کے ثبوت کے طریقے:

- 130 ----- عورت کا ذکر مرد سے پہلے کیوں؟
- 131 ----- زنا کے متعلق دوسرا حکم:
- 133 ----- ترکیب کے اعتبار سے دو معانی کا بیان:
- 134 ----- زنا کے متعلق تیسرا حکم:
- 135 ----- لعان کا مسئلہ:
- 137 ----- واقعہ اُفک:
- 143 ----- حضرت عائشہ کی سات خصوصیات:
- 144 ----- اہل فضل چاہیے کہ دوسروں کو نوازیں!
- 145 ----- پارسا لوگوں اور گندے لوگوں کی فطرت:
- 145 ----- چار قسم کے مکانات کا حکم:
- 148 ----- آنکھ اور عصمت کی حفاظت کا حکم:
- 149 ----- عورت کے پردے کا ایک حکم:
- 152 ----- بے نکاحوں کے نکاح کرانے کی ترغیب:
- 155 ----- عفت و پاکدامنی اختیار کرنے کا حکم:
- 156 ----- اللہ آسمان و زمین کا نور ہے:
- 158 ----- مساجد میں ذکر اللہ کی ترغیب:
- 159 ----- کفار کے اعمال سراب کی مانند ہیں:
- 161 ----- کامیابی کی بنیاد چار باتیں:
- 162 ----- آیت استخلاف:
- 162 ----- خلفائے راشدین چار ہیں:
- 163 ----- نعروں کا جواب کیسے دیا جائے؟

- 165 ----- ایک اشکال کا جواب:
- 167 ----- تین اوقات میں اجازت لے کر جاؤ!
- 168 ----- معذورین کے کھانے کا مسئلہ:
- 169 ----- جن کے گھروں کی چابیاں ہوں وہاں سے کھانے کا حکم:
- 170 ----- پیغمبر کو ایسے نہ پکارو!
- 171 ----- کوئی جانے کی اجازت مانے تو دے دیں!
- 172 ----- اجازت دینے کے بعد استغفار کا حکم کیوں؟
- 172 ----- منافقین کی حرکتیں:

## 174 ----- سورة الفرقان

- 174 ----- برکت مطلوب نہ کہ کثرت:
- 176 ----- حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب:
- 176 ----- دلیل ختم نبوت:
- 177 ----- مشرکین کے ایک اعتراض کا جواب:
- 177 ----- قرآن مجید کا چیلنج:
- 178 ----- مشرکین کے دوسرے اعتراض کا جواب:
- 179 ----- امام صاحب قاضی القضاۃ نہیں بنے تو شاگرد کیوں بنا؟
- 180 ----- متکلم اسلام کا تعجب:
- 183 ----- عذاب کی خبر دینا خوش خبری کیسے ہے؟
- 184 ----- کاش میں فلاں کو دوست نہ بناتا!
- 185 ----- تقدیر، علم الہی اور امر الہی دونوں کا مجموعہ ہے:

- 186 ----- خواہشات کو خدا بنانے کا معنی:
- 186 ----- صفتِ ملکیت صفتِ بہیمیت:
- 188 ----- زنانِ مصر کے جملے کی وضاحت:
- 189 ----- سائے کا کم زیادہ ہونا:
- 191 ----- نعمت الہیہ:
- 191 ----- قرآن کے ذریعے جہاد کرنے کا معنی:
- 192 ----- نسبی و سرسالی رشتے:
- 192 ----- پیغمبر کی صفات کا خلاصہ:
- 193 ----- دینی امور پر اجرت کا جواز:
- 196 ----- عباد الرحمن کی صفات:
- 200 ----- منکرین کو تنبیہ:

## 201 ----- سورة الشعراء

- 201 ----- حروفِ مقطعات:
- 201 ----- متشابہ اور مشتبہ میں فرق:
- 202 ----- پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی فکرِ امت:
- 203 ----- ہدایت پر لانے کے لیے گناہ کا ارتکاب جائز نہیں:
- 205 ----- حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم تبلیغ:
- 207 ----- نبی معصوم ہوتا ہے:
- 207 ----- طبعی اور عقلی خوف:
- 208 ----- فرعون کا احسان جتلا نا:

- 209 ----- مکالمہ فرعون:
- 210 ----- حکیم کا جواب سائل کی ضرورت کے پیش نظر ہوتا ہے:
- 212 ----- متکلم اسلام اور ایک ٹیلیفونک کال:
- 213 ----- جادو گروں سے مقابلہ:
- 214 ----- جہاں ضرورت ہو وضاحت کر دینی چاہیے:
- 214 ----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ:
- 215 ----- ادب کا تقاضا:
- 216 ----- اچھے تذکرے کی خواہش:
- 218 ----- حضرت مولانا ابراہیم الحق ہر دوئی کی مرید کو نصیحت:
- 218 ----- حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ:
- 219 ----- حضرت ہود علیہ السلام کی تبلیغ:
- 219 ----- حضرت صالح علیہ السلام کی تبلیغ:
- 220 ----- حضرت لوط علیہ السلام کی تبلیغ:
- 220 ----- غیر فطری عمل حرام ہے:
- 221 ----- وحی کا نزول قلب اطہر پر:
- 221 ----- ایک علمی نکتہ:
- 222 ----- عرب کے ہاں شعر کا مفہوم:
- 225 ----- حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا قصیدہ:
- 228 ----- فتح خیبر کے موقع پر اشعار کا تبادلہ:
- 230 ----- در سخن مخفی منم:



- 233 ----- حروفِ مقطعات:
- 233 ----- تذکرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام:
- 234 ----- درخت سے آواز آئی:
- 236 ----- مسئلہ وحدۃ الوجود:
- 237 ----- عطاءئے معجزہ کے وقت موسیٰ علیہ السلام کو تسلی:
- 238 ----- نو نشانوں کا بیان:
- 240 ----- ضد؛ قبول حق میں سخت رکاوٹ ہے:
- 240 ----- نبی کی وراثت علمی ہوتی ہے:
- 241 ----- باغ فدک کا مسئلہ:
- 242 ----- حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مطالبے کی وجہ:
- 243 ----- حیات الانبیاء علیہم السلام کی دلیل بطرزِ نانوتوی:
- 244 ----- حضرت نانوتوی کے علوم:
- 245 ----- پرندوں کی بولیاں:
- 246 ----- اہل بدعت کے استدلال کا جواب:
- 247 ----- چیونٹی کی گفتگو سننا:
- 248 ----- پرندوں کی حاضری اور ہد کی غیر حاضری:
- 249 ----- حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعے سے مستنبط چند مسائل:
- 251 ----- کسی کی نجی زندگی میں مداخلت نہ کریں!
- 251 ----- حضرت سلیمان کا خط ملکہ بلقیس کے نام:
- 252 ----- خط لکھنے کا طریقہ:
- 253 ----- ملکہ بلقیس کا فیصلہ:

- 255 ----- ملکہ بلقیس کی دربار سلیمانی میں حاضری:
- 256 ----- اس کا تخت کون لائے گا؟
- 257 ----- تخت لانے والا کون تھا؟
- 258 ----- ملکہ بلقیس کی عقلمندی:
- 259 ----- شیشے کے محل میں داخلہ:
- 259 ----- حضرت سلیمان اور ملکہ بلقیس کا نکاح ہوا یا نہیں؟
- 260 ----- عورتوں کی عقل کی چند مثالیں:
- 261 ----- قصور تیرا ہے یا میرا!
- 263 ----- منکرین سماع موتی کے استدلال کا جواب:
- 266 ----- منکرین حیات کو الزامی جواب:
- 266 ----- ”آپ اندھوں کو ہدایت نہیں دے سکتے!“ کا معنی:
- 269 ----- علامت قیامت؛ دابة الارض کا نکلنا
- 269 ----- قیامت کی دس علامات:

## 271 ----- سورة القصص

- 271 ----- حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ:
- 271 ----- حدیث الفتون:
- 273 ----- ام موسیٰ کی طرف پیغام اور قادیانی استدلال:
- 274 ----- وحی الہام اور وحی نبوت:
- 275 ----- ام موسیٰ کی پریشانی:
- 276 ----- صندوق دریا میں ڈال دیا:

- 277 ----- ولی سے محبت کی وجہ:
- 277 ----- موسیٰ علیہ السلام کی محبوبیت:
- 278 ----- موسیٰ علیہ السلام کا اپنی ماں کا دودھ پینا:
- 280 ----- موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کی ڈاڑھی پکڑنا:
- 282 ----- قبطی کا قتل:
- 283 ----- شہری افضل یاد بیہاتی، ایک دلچسپ مکالمہ
- 286 ----- خانقاہ اور درس گاہ کے ماحول میں فرق:
- 286 ----- بیویاں بھی اور مرید نیاں بھی!
- 287 ----- پیغمبر کی بیوی اور عام امتی میں فرق:
- 287 ----- موسیٰ علیہ السلام کا سفر مدین:
- 288 ----- حضرت شعیب علیہ السلام سے ملاقات:
- 289 ----- ملازمت اور عہدے کے لیے چار اہم صفات:
- 290 ----- حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی سے نکاح:
- 291 ----- بکریاں چرانے کو حق مہربنانا کیسا ہے؟
- 292 ----- موسیٰ علیہ السلام کی مصرواپسی اور عطاءِ نبوت:
- 293 ----- مقدس مقامات میں جوتے اتارنا:
- 294 ----- حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی دربارِ فرعون میں آمد:
- 294 ----- فرعون کے ساتھ مکالمہ:
- 295 ----- جادو گروں سے مقابلہ:
- 296 ----- بنی اسرائیل کی آزادی:
- 297 ----- لشکرِ فرعون کی غرقابی:

- 297 ----- بنی اسرائیل کی عجیب فرمائش:
- 298 ----- بچھڑے کی پوجا کا قصہ:
- 300 ----- پاس کر یا برداشت کر!
- 301 ----- بنی اسرائیل کی توبہ:
- 301 ----- قوم جبارین کے خوف سے بنی اسرائیل کا پیچھے ہٹنا:
- 302 ----- نبی سے گناہ نہیں ہوتا:
- 303 ----- حضرت ہارون علیہ السلام کی معاونت:
- 303 ----- اعمال دنیا کی آخرت میں صورتِ مثالیہ:
- 306 ----- دو مرتبہ اجر کا معنی:
- 308 ----- ہدایت دینا اللہ کے اختیار میں ہے:
- 308 ----- قارون کا تذکرہ:
- 309 ----- گناہ کا پختہ ارادہ بھی باعثِ پکڑ ہے:
- 310 ----- نیکی اور برائی کا بدلہ:
- 310 ----- آپ علیہ السلام کے ساتھ مکہ واپسی کا وعدہ:
- 311 ----- مصیبت آئے تو مسئلہ نہ بدلیں:
- 312 ----- پیغمبر پاک کو نصیحت:
- 313 ----- بڑا سمجھائے تو فوراً صفائی پیش نہ کریں!
- 313 ----- حق پر عمل پیرا رہیں اور اسی کی دعوت دیتے رہیں!

## 315 ----- سورة العنكبوت

- 315 ----- اہل ایمان کے لیے آزمائش لازمی ہے:

- 316 ----- مصیبت آئے تو حق کا ساتھ نہ چھوڑیں!
- 318 ----- مشقت آنا قابلِ تعجب نہیں:
- 319 ----- ”اللہ جاننا چاہتے ہیں“ پر شبہ کا جواب:
- 320 ----- اصطلاحاتِ شرع میں تبدیلی نہ کرو!
- 320 ----- مزجِ انسانی:
- 322 ----- گناہ کا بوجھ کون اٹھائے گا؟ (ایک تعارض کا حل)
- 323 ----- حقوق العباد کی پامالی سے بچیں!
- 324 ----- افضل ہونے کی بنیاد علم ہے:
- 325 ----- کمالِ علمی اصل کمال ہے:
- 328 ----- سجدہ نبوی؛ سجود امت سے افضل ہے:
- 330 ----- حضرت نانوتوی کے علوم:
- 331 ----- قومِ لوط کے جرائم:
- 331 ----- چار قسم کا عذاب:
- 332 ----- داعی کے لیے دو چیزوں کا اہتمام:
- 333 ----- نماز گناہ سے روکتی ہے تو نمازی گناہگار کیوں؟
- 334 ----- ہجرت کا حکم:
- 335 ----- رابطہ رکھ کر کام کریں!
- 336 ----- امیر اور پیر ایک ہونا چاہیے:
- 337 ----- ہجرت کرنے والوں کو تسلی:
- 338 ----- مشرکین کا مصیبت کے وقت اللہ کو پکارنا:
- 339 ----- تین کام چار طریقے:

## سورة الروم 342

- 342 ----- روم و فارس کی جنگ اور نزولِ سورت کا قصہ:
- 343 ----- صدیق اکبر کا شرط لگانا:
- 345 ----- پانچ نمازوں کا اشارہ:
- 346 ----- ایک عجیب نکتہ:
- 347 ----- قدرتِ حق کی نشانیاں:
- 347 ----- محبت اور مودت:
- 348 ----- فطرت سے کیا مراد ہے؟
- 349 ----- انسانی اعمال کا اثر:
- 350 ----- نیکو کار لوگوں پر تکلیف کی وجہ:
- 352 ----- مصائبِ آفت ہیں یا آزمائش؟ پر کھنے کا طریقہ:
- 354 ----- روزِ قیامت مجرموں کا جھوٹ بولنا:

## سورة لقمن 356

- 356 ----- ابتدائی آیات کا شانِ نزول:
- 357 ----- جائز اور ناجائز کھیل:
- 357 ----- جائز کھیلوں کا احادیث سے ثبوت:
- 359 ----- آسمانوں کے ستونوں کی تحقیق:
- 360 ----- حضرت لقمان نبی تھے یا ولی؟ راجح قول:
- 361 ----- اکابر کے کلام سے تواضع:
- 362 ----- حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحتیں:

- 363 ----- اللہ تعالیٰ کے کلمات لامتناہی ہیں:
- 364 ----- والد اپنی اولاد کے کام آئے گا یا نہیں؟ (تعارض کا حل)
- 366 ----- ادنیٰ کی نفی سے اعلیٰ کی نفی:
- 367 ----- پانچ چیزوں کا علم:
- 367 ----- تبدیلی اسلوب سے معافی پر اثر:
- 370 ----- علم غیب کی تعریف اور اشکالات کے جوابات:
- 371 ----- احکام غیبیہ اور انہوں نے غیبیہ میں فرق:

### 373 ----- سورة السجدة

- 373 ----- نماز کی تلاوت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول:
- 374 ----- استاذ یا شیخ آئے تو امامت اس سے کروائیں!
- 375 ----- متکلم اسلام کا واقعہ امامت سفر:
- 378 ----- استواء علی العرش منشا بہت میں سے ہے:
- 378 ----- قیامت کے دن کی مقدار، تعارض کا حل
- 379 ----- منکرین حیات الانبیاء کے ایک شبہ کا جواب:
- 382 ----- ملک الموت اور ان کی جماعت:
- 383 ----- حدود شریعت کا لحاظ کیجیے!
- 384 ----- ”اللہ بھلا دیں گے“ کا معنی:
- 385 ----- سفر معراج میں موسیٰ اور حضور علیہما السلام کی ملاقات:
- 386 ----- موسیٰ علیہ السلام کا قبر میں نماز پڑھنا:
- 388 ----- نماز پڑھنا جسم کا کام ہے:

- 390 ----- مقتدا کے لیے دو شرطیں:
- 391 ----- صبر کی تین اقسام:
- 392 ----- متکلم اسلام کی طلبہ کو نصیحت:
- 392 ----- مشکلات کے بعد راحتوں کا دور ہے:
- 393 ----- پانی کا نظام قدرت کا کرشمہ:

### 395 ----- سورة الاحزاب

- 395 ----- غزوہ احزاب کا واقعہ:
- 396 ----- کفر کے لشکر کی تعداد:
- 397 ----- مسلمانوں کی تیاری:
- 398 ----- ایک عظیم معجزہ:
- 399 ----- بنو قریظہ کی عہد شکنی:
- 400 ----- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابہ کرام پر شفقت:
- 401 ----- حضرت سعد بن معاذ کا جذبہ ایمانی:
- 402 ----- حضرت نعیم بن مسعود کا ایمان اور جنگی تدبیر:
- 404 ----- حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا دشمن کی خبر لانا:
- 406 ----- غزوہ بنو قریظہ:
- 408 ----- احسان کا بدلہ احسان:
- 409 ----- ایک کافر کی قومی حمیت:
- 409 ----- کفار و منافقین کی بات نہ مانیں!
- 411 ----- نام لے کر خدا نے پکارا نہیں:



- 411 ----- تین باطل خیالات و رسوم کی تردید:
- 412 ----- رسمِ ظہار:
- 413 ----- شاہ اسماعیل شہید پر اعتراض کا جواب:
- 416 ----- منہ بولا بیٹا بنانے کی تردید:
- 417 ----- حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا قصہ:
- 418 ----- کسی کو بیٹا یا بیٹی بنانے کا حکم:
- 418 ----- رسول خدا عزیز از جان:
- 419 ----- نبی کی بیوی سے نکاح کی حرمت منصوص:
- 421 ----- انبیاء علیہم السلام سے عہد:
- 422 ----- نبی؛ روح مع الجسد کا نام ہے:
- 425 ----- کرے غلط تفسیر اور کہلائے شیخ القرآن!
- 426 ----- امہات المؤمنین کا مطالبہ اور خدائی تنبیہ:
- 428 ----- امہات المؤمنین کا مقام:
- 429 ----- ازواجِ مطہرات کو پانچ ہدایات:
- 430 ----- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اشکال کا جواب:
- 433 ----- اہل بیت کا مصداق کون؟
- 435 ----- تطہیر تکوینی اور تطہیر تشریعی:
- 436 ----- مؤمنات کی صفات:
- 437 ----- کثرتِ ذکر اللہ کا معمول بنائیے!
- 438 ----- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سر تسلیم خم:
- 440 ----- کفو کی تین اقسام:

- 441 ----- حضرت زید کا نکاح اور طلاق:
- 442 ----- پیغمبر تبلیغ دین میں خوف نہیں کھاتے:
- 443 ----- حضرت زینب کا نکاح کس نے کرایا؟
- 444 ----- حضرت زید بن حارثہ کا اعزاز:
- 445 ----- متنبی کی مطلقہ سے نکاح کی حکمت:
- 445 ----- عقیدہ ختم نبوت:
- 446 ----- حضور علیہ السلام کی ابوت روحانی:
- 447 ----- روحانی بیٹے قیامت تک ہوں گے:
- 448 ----- عقیدہ ختم نبوت اور حضرت نانوتوی کی تعبیر:
- 450 ----- ایمان اصل اور ایمان نسل:
- 451 ----- ختم نبوت ذاتی اور ختم نبوت زمانی:
- 453 ----- علم پورا تو عقیدہ پورا:
- 454 ----- آپ ٹینشن دیتے ہیں، لیتے نہیں!
- 454 ----- طلبہ کو نصیحت:
- 455 ----- کثرت ذکر کا اہتمام کیجیے!
- 455 ----- حضور علیہ السلام کی پانچ صفات کا تذکرہ:
- 456 ----- عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم:
- 457 ----- رخصتی سے قبل طلاق کا حکم:
- 458 ----- پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی چند خصوصیات:
- 458 ----- 1: چار سے زائد بیویاں
- 458 ----- 2: مال فنی میں اعزاز

- 460 ----- 3: خاندان کی عورتوں سے نکاح
- 461 ----- 4: بغیر مہر کے نکاح
- 462 ----- حضور علیہ السلام پر باری مقرر کرنا واجب نہیں:
- 463 ----- ازواجِ مطہرات کی خوشی:
- 464 ----- نکاح کے متعلق ایک اور حکم:
- 465 ----- کھانے کی دعوت کے آداب:
- 467 ----- حضور علیہ السلام کو تکلیف دینا جائز نہیں:
- 467 ----- پردے کا حکم:
- 468 ----- آیتِ مباہلہ کا صحیح مفہوم:
- 470 ----- ستر عورت اور حجابِ نساء میں فرق:
- 471 ----- مقتدا کی شرائط؛ عقل اور ہدایت
- 472 ----- بنی اسرائیل کا الزام اور موسیٰ علیہ السلام کی براءت:
- 473 ----- قولِ سدید اور قولِ صواب میں فرق:
- 474 ----- انسان؛ بارِ امانت کا حامل
- 476 ----- ایمان اور کفر کا انجام:

## 477 ----- سورۃ سبا

- 477 ----- تسبیحِ داؤدی میں پرندوں اور پہاڑوں کی شرکت:
- 478 ----- اپنے بارے میں لوگوں کی آراء معلوم کرنا:
- 480 ----- حضرت داؤد علیہ السلام کی کاریگری:
- 481 ----- حضرت سلیمان علیہ السلام کے اعزازات:

- 482 ----- شاہانہ زندگی تقویٰ کے خلاف نہیں!
- 483 ----- سفید لباس کا اہتمام:
- 483 ----- تانے کا چشمہ:
- 484 ----- تسخیر جن کا مسئلہ:
- 485 ----- سرکش جنات کی سزا:
- 486 ----- جنات کی ڈیوٹیاں:
- 486 ----- محراب کسے کہتے ہیں؟
- 487 ----- حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں تصویر سازی:
- 487 ----- موجود دور میں تصویر کا حکم:
- 488 ----- حرمتِ تصویر کی وجوہات:
- 489 ----- تصویر کے بارے میں رائے:
- 489 ----- مسئلہ عمومی بیان کریں لیکن فتویٰ نہ لگائیں:
- 490 ----- جنوں کی کاریگری بڑی بڑی دیگیں:
- 490 ----- حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات:
- 491 ----- حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعائیں:
- 492 ----- منکرینِ حیات الانبیاء کے ایک شبہ کا جواب:
- 494 ----- قوم سبا کا قصہ:
- 495 ----- رزق کی فراوانی قدرت کا انعام ہے:
- 497 ----- مال خرچ کرنے کی عادت ڈالیں!

## 498 ----- سورۃ فاطر

- 498 ----- ملائکہ اللہ کے قاصد ہیں:
- 498 ----- حضرت عمر کے قبولِ اسلام کی دعا:
- 499 ----- عزتوں کا مالک اللہ ہے:
- 500 ----- کلمات طیبات کا مصداق اور ان کی اہمیت:
- 501 ----- ہر شخص کی عمر متعین ہے:
- 502 ----- عمر متعین ہے تو صلہ رحمی سے بڑھے گی کیسے؟
- 503 ----- میٹھا اور کڑوا پانی:
- 504 ----- منکرینِ حیات کی جہالت:
- 508 ----- نعمتِ باری تعالیٰ کا بیان:
- 509 ----- خشیتِ الہیہ عالم کی خصوصیت:
- 510 ----- امت کے تین قسم کے افراد:
- 511 ----- ظالم، معتدل اور سابق بالخیرات کی تعریف:
- 512 ----- جنتی مردوں کا نگن پہننا:
- 512 ----- کافر کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی:
- 513 ----- کافر اور مؤمن کی سزائیں فرق:
- 515 ----- بری تدبیر کا نتیجہ خود پر کوٹتا ہے:
- 516 ----- کافر کے عذاب کے ساتھ جانوروں کی ہلاکت کیوں؟

## سورة الحج

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ﴿١﴾﴾

بعث بعد الموت کی دلیل؛ تخلیق انسانی

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّن

تُرَابٍ ثُمَّ مِّنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِّنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِّنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُّخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ

لَكُمْ ﴿٢﴾﴾

اللہ رب العزت نے قیامت کا ذکر فرمایا اور دوبارہ اٹھائے جانے پر بطور دلیل کے انسان کی تخلیق کو بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں کیسے بنایا ہے کہ تمہاری غذا کا بنیادی عنصر مٹی ہے، مٹی سے پھر غذائیں نکلتی ہیں، انسان وہ غذائیں کھاتا ہے تو ان غذاؤں سے پھر نطفہ بنتا ہے، وہ باپ کی پیٹھ سے ہو کر ماں کے رحم میں جاتا ہے، اس کے بعد پھر خون بنتا ہے اور جم کر ایک لو تھڑے کی شکل اختیار کر جاتا ہے، پھر بوٹی بنتی ہے، پھر ان میں ہڈی آتی ہے، پھر اس سے بعض مرتبہ بچے کے اعضاء پورے بن جاتے ہیں اور بعض اوقات پورے نہیں بن پاتے۔ پھر بعض مرتبہ عورت جو بچہ جنتی ہے وہ صحیح سالم اعضاء کے ساتھ جنتی ہے اور بعض مرتبہ اسے انہی ناقص اعضاء کے ساتھ اسقاط

ہو جاتا ہے اور بعض مرتبہ بچہ پیدا ہوتا ہے اور ناقص اعضاء کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ تو اس ترتیب کے ساتھ اور ان مراحل سے گزر کر بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے۔

جب کوئی نمونہ سامنے نہ ہو تو بنانا مشکل ہوتا ہے اور جب نقشے سامنے آجائیں تو پھر بنانا بہت آسان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ابتدائی تخلیق کی تو دوبارہ اسے بنانا کیا مشکل ہے؟! انسان کی پیدائش اللہ تعالیٰ آناً فاناً فرما سکتے تھے کہ ارادہ فرمائیں اور انسان بن جائے لیکن ایسا نہیں کیا بلکہ تدریجاً نو ماہ میں انسان کو پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھائی ہے کہ دنیا میں کام اچانک نہیں ہوتے تدریجاً ہوتے ہیں اس لیے جلد بازی کا مزاج مناسب نہیں ہے، بندے کو اپنی باری اور اپنے وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔ پہلے بچپن پھر جوانی پھر بڑھاپا بعض بچپن دیکھتے ہیں تو جوانی نہیں دیکھ پاتے اور بعض جوانی دیکھتے ہیں تو بڑھاپا نصیب نہیں ہوتا لیکن عام معمول یہی ہے۔

پھر اس امت محمدیہ کی اوسطاً عمر 60 اور 70 سال کے درمیان ہے۔ تو ہر انسان کو اپنا بچپن اور جوانی ذہن میں رکھنی چاہیے۔ ہر آنے والا دن انسان کی عمر کو گھٹاتا ہے، گھٹی ہوئی عمر پر انسان کو خوش نہیں ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے مختصر زندگی دی ہے آخرت کی تیاری کے لیے اس لیے ہمیں اس میں آخرت کی فکر اور آخرت کی تیاری کرنی چاہیے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

### سن ہجری کو رواج دیں!

آج یکم جنوری 2019ء ہے۔ دنیا بھر میں سارے لگے ہوئے ہیں علماء بھی اور غیر علماء بھی اور ہر کوئی معافیاں مانگتا پھر رہا ہے کہ پچھلے سال کے گناہ معاف کر دیں۔ معافی مانگنا تو ٹھیک ہے، اپنے اعمال کا احتساب کرنا بھی ٹھیک ہے، غور بھی کرنا چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سارا زور یکم جنوری پر کیوں ہوتا ہے! یکم محرم پر کیوں نہیں ہوتا! یکم محرم کے موقع پر بھی سال ختم ہو رہا ہے اور نیا سال شروع ہو رہا ہے۔ تو دیکھو! اتنی

محنت کی ہے اغیار نے سن عیسوی کو عام کرنے کی اور ہمارے مسلمانوں کا جو اصل حساب ہے وہ سن ہجری پر ہی ہے، ہجری شمسی بھی ہوتا ہے اور ہجری قمری بھی ہوتا ہے۔ اس وقت افغانستان میں جو سن کی ترتیب ہے وہ ہجری شمسی ہے اور شریعت میں اصل ہجری قمری ہے۔ تو ہجری شمسی بھی دنیا میں چل رہے ہیں لیکن اصل ہجری قمری ہے جس پر احکام شریعت کا مدار ہے۔ تو ہمیں اپنے سال ہجری کو ہی رواج دینا چاہیے اس کا تذکرہ کرنا چاہیے اور اغیار سے بالکل متاثر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے، متاثر وہ ہوتا ہے جس نے اپنی فکر آئندہ نسلوں کو نہ دینی ہو اور جب اپنی فکر آئندہ نسلوں میں منتقل کرنی ہو تو پھر بندہ کسی سے متاثر نہیں ہوتا۔ ہم نے اپنے اکابر کی میراث محفوظ کرنی ہے اور اسے اگلی نسلوں یعنی اصاغر میں منتقل کرنا ہے، ہم اکابر اور اصاغر کے درمیان میں ہیں، بعد والوں کے لیے اکابر بن جائیں گے اور پہلے والوں کے اصاغر بن جائیں گے، خود کو چھوٹا سمجھتے رہیں گے تو کل والوں کے لیے اللہ بڑا بنادیں گے اور اگر خود کو بڑا سمجھتے رہیں گے تو کل والے بڑا سمجھنا تو بہت دور کی بات ہے آپ کو چھوٹا سمجھنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں گے۔

### عمر انسانی کے مراحل اور احوال:

یہ جو انسان کی عمر کے مختلف مراحل ہیں ان کے بارے میں ایک روایت میں آتا ہے کہ جب بچہ نابالغ ہوتا ہے اور کوئی نیک کام کرتا ہے تو اس کا ثواب اس کے والد یا والدین کے نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے اور اگر وہ بچہ کوئی گناہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ یہ گناہ نہ اس بچے کے نامہ اعمال میں لکھتے ہیں اور نہ ہی اس کے والدین کے نامہ اعمال میں لکھتے ہیں۔ جب یہ بچہ بالغ ہو جاتا ہے تو حساب کا قلم اس کے لیے جاری ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ دو فرشتوں کو مقرر کر دیا جاتا ہے اور انہیں کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کی حفاظت کرو اور اعمال کرنے میں اس کو قوت اور طاقت پہنچاؤ۔ جب یہ چالیس سال کی عمر کو پہنچ



جائے اور ایمان کی حالت میں گزارے تو اللہ تعالیٰ اس کو تین امراض سے محفوظ رکھتے ہیں: جنون، جذام اور برص سے۔

پچاس سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے حساب کو ذرا ہلکا فرمادیتے ہیں۔ جب ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ پھر اس کو اپنی طرف محبت کی توفیق دے دیتے ہیں، ساٹھ سے اوپر ستر سال تک پہنچ جائے تو سب آسمان والے اس کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں، جب یہ اسی سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کے نیک اعمال لکھے جاتے ہیں اور گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں اور جب یہ نوے سال کی عمر تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے سارے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں اور اس کو یہ حق دے دیا جاتا ہے کہ اپنے گھر والوں کی شفاعت کرے۔ اللہ رب العزت اب اس بندے کو ”امین اللہ“ اور ”اسیر اللہ“ کا لقب دیتے ہیں اور جب اگلی عمر کو پہنچ جاتا ہے جسے ”ازدُل“ عمر“ کہتے ہیں تو اس کے وہ اعمال جو وہ جوانی میں کیا کرتا تھا وہ اب برابر اس کے نامہ اعمال میں لکھے جاتے ہیں البتہ جوانی میں جو گناہ کرتا تھا وہ گناہ نہیں لکھے جاتے۔ یہ حالت ایمان میں بڑھاپے کی برکت ہے۔

یہ روایت حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ذکر فرمائی ہے۔ روایت اگرچہ ضعیف ہے لیکن امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں اس روایت کو مرفوع اور موقوف دونوں طرح سے نقل کیا ہے۔

### سفید بالوں سے حیا:

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ جب انسان اسلام کی حالت میں بوڑھا ہو جاتا ہے، اس کے بال سفید ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کا حیا کرتے ہیں اور اسے

عذاب نہیں دیں گے۔<sup>1</sup>

مجھے ایک ساتھی نے کہا کہ بندہ اگر سفید بالوں کے ساتھ فوت ہو جائے تو اللہ رب العزت اس کا حیا کرتے ہیں اور اسے عذاب نہیں دیتے لیکن اگر کوئی شخص سفید بالوں پر کلر لگا لے تو کیا اللہ تعالیٰ پھر بھی اس کا حیا کرتے ہیں؟

میں نے کہا کہ جب بندے کو حدیث سمجھ میں آجائے تو پھر کوئی اشکال نہیں ہوتا، سمجھ میں نہ آئے تو پھر اشکال ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے یہ سمجھا کہ یہاں بال کا سفید ہونا رنگ مراد ہے حالانکہ اس سے انسان کے بڑھاپے کی عمر مراد ہے۔ اب اگر کوئی آدمی بوڑھا ہو جائے اور اس کے بال سفید ہی نہ ہوں تو پھر اس کو یہ فضیلت تو ملنی ہی نہیں چاہیے حالانکہ ایسا نہیں۔ تو سفید بالوں سے یہاں بڑھاپے کی حالت مراد ہے۔ اور ایسا ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ بندہ بڑی عمر کا ہوتا ہے لیکن بال سفید نہیں ہوتے بلکہ سیاہ رہتے ہیں۔ حضرت مولانا خالد محمود سومر و شہید رحمۃ اللہ علیہ سندھ والے مجھ سے عمر میں بڑے تھے، ان کے پوتے اور نواسے ہیں لیکن آپ دیکھیں تو ان کے سارے بال سیاہ تھے۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟ انہوں نے فرمایا تھا کہ بس میرے بال ہیں ہی سیاہ!

سیاہ خضاب کے علاوہ کا جواز:

اصل چیز ہوتی ہے حدیث پاک کو سمجھنا۔ کل بھی ہندوستان سے ایک عالم نے مجھ سے رابطہ کیا کہ حدیث پاک میں بال کالے کرنے کی ممانعت آئی ہے اور آپ بال کالے کرتے ہیں، اس پر کوئی ایسا جواب دیں کہ ہم مطمئن ہو جائیں۔ میں نے کہا: مطمئن ہونا تو بہت آسان ہے اگر مطمئن ہونا چاہیں تو! سورۃ الرحمن میں جنت کے

باغات کی صفت بیان کی گئی ہے: ﴿مُذْهَبًا مَّتَنِّ (۱۶)﴾... پودے کا کالا ہونا کمال نہیں ہے بلکہ سبز ہونا یہ کمال ہے۔ تو وہ باغات اتنے گہرے سبز ہوں گے کہ سبز ہونے کے باوجود سیاہ نظر آئیں گے، یہ کمال ہے۔ تو میں نے ان سے کہا کہ میں بال کالے نہیں کرتا بلکہ براؤن کلر لگاتا ہوں، یہ براؤن کلر اتنا ڈارک اور گہرا ہوتا ہے کہ دیکھنے میں میرے بال کالے لگتے ہیں۔ تو کالا ہونا اور ہے اور کالا لگنا اور ہے۔ اب میں نے کہا کہ دلیل تو میں نے دے دی ہے، مطمئن ہوں آپ کی مرضی، مطمئن نہ ہوں آپ کی مرضی۔

### پیغمبر پاک کے مخالف کا غیظ و غضب میں جلنا:

﴿مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنْ لَّنْ يَنْصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدَهُ مَا يَغِيظُ (۱۷)﴾

اللہ تعالیٰ جب کسی کو نبوت عطا فرماتے ہیں تو اس نبی کی مدد بھی فرماتے ہیں۔ اس نبی کی مدد کو دیکھ کر پیغمبر کا مخالف حسد کی آگ میں مزید جلتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ سمجھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اپنے نبی کی مدد نہیں کرے گا تو اسے چاہیے کہ وہ ایک رسی لے آسمان پر چڑھ جائے اور وہاں جا کر آنے والی وحی اور رابطے کو کاٹ ڈالے تاکہ نبوت کو ملنے والی اللہ کی مدد آنا ختم ہو جائے اور اگر یہ شخص ایسا نہیں کر سکتا تو پھر اپنے گلے میں رسی ڈال لے اور خود کشی کر کے مر جائے لیکن خدا کی مدد ختم نہیں ہوگی۔ میں نے آیت کی وہ تفسیر کی ہے جس میں ساری روایات جمع ہو جاتی ہیں کیونکہ بعض مفسرین نے یہ رائے قائم فرمائی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حاسد رسی لے کر آسمان پر چڑھے اور اوپر جا کر اللہ کی آنے والی مدد کو ختم کرے یا وحی کو ختم کرے تاکہ نہ نبی ہو اور نہ مدد آئے اور بعض نے کہا کہ چھت

سے رسی لٹکائے اور گلے میں ڈال لے اور غیظ و غضب میں آکر خود کشی کر کے مر جائے۔ تو میں نے خلاصہ عرض کر دیا ہے۔

### حق ہمیشہ غالب رہتا ہے:

یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ حق ہمیشہ غالب ہو کر رہے گا اور حق اپنے راستے خود بناتا ہے۔ میں ابھی کراچی میں تھا اور وہاں ہماری خانقاہ کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ اندرون سندھ کے دورے پر میرے ساتھ مفتی محمد حسنین صاحب تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کام کے لیے پیسا نہیں بلکہ کام کے لیے بندے کا کام کا ہونا ضروری ہے۔ جب انسان کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اسباب پیدا فرماتے ہیں اور کبھی کبھار آزمائش بھی آتی ہے تو اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ اسباب بھی عطا فرماتے ہیں۔

### تمام مخلوق خدا کو سجدہ کرتی ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾  
کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کو وہ ساری مخلوق سجدہ کرتی ہے جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ نیز سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور بہت سارے انسان بھی۔

### کتا صاحبِ کمال ہو گیا پر اعتراض کا جواب:

اس آیت کو بطور جواب کے میں نے کئی جگہوں پر پیش کیا ہے۔ ”امداد المشتاق الی اشرف الاخلاق“ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے۔ میں ایک بار ہری پور میں تھا۔ بیان کے بعد دونوں جوان آئے۔ ان کے پاس دو تین کتا

میں تھیں۔ ان میں سے ایک امداد المشتاق بھی تھی۔ تو وہ کہنے لگے کہ امداد المشتاق میں کچھ واقعات ایسے ہیں جو صریح قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ میں نے کہا: کوئی بیان کریں۔ انہوں نے کہا کہ حضرت تھانوی صاحب نے حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کی کا ایک ملفوظ لکھا ہے کہ حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادی بیٹھے تھے۔ ایک کتا سامنے سے گزرا۔ جنید بغدادی کی نگاہ اس کتے پر پڑ گئی تو وہ کتا اتنا صاحب کمال ہو گیا کہ شہر کے کتے اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ وہ کتا ایک جگہ بیٹھا تو باقی کتے اس کے ارد گرد حلقہ بنا کر بیٹھے اور مراقبہ کیا۔<sup>2</sup>

تو وہ نوجوان مجھے کہنے لگے کہ کتے کا کامل ہونا اور کتوں کا مراقبہ کرنا یہ صریح قرآن کریم کے خلاف ہے۔

میں نے کہا: جہاں تک کتے کے کامل ہونے کی بات ہے تو اس کا ذکر تو خود قرآن میں ہے۔ اصحاب کہف تھے اور ان کے ساتھ ایک کتا بھی تھا۔ قرآن کریم نے مقام مدح میں اصحاب کہف کے کتے کا ذکر کیا:

﴿وَكَلَبُہُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْہِ بِالنَّوَصِیْدِ﴾<sup>3</sup>

کہ اصحاب کہف کا کتا دہلیز پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے بیٹھا تھا۔ تو اچھا ذکر کرنا یہ کمال کی وجہ سے ہوتا ہے۔ باقی آپ کو شبہ اس لیے پڑا کہ آپ نے کتے کا مقابلہ انسان سے کر دیا۔ جب کتا بمقابلہ انسان ہو گا تو کتا واقعی ناقص ہو گا اور جب کتا بمقابلہ کتا ہو گا تو کوئی کتا کامل ہو گا اور کوئی کتا ناقص ہو گا۔

باقی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ نے جو فرمایا تو اس کا معنی یہ

نہیں کہ وہ کتا؛ انسانوں سے کامل ہو گیا بلکہ وہ کتاباکی کتوں سے کامل ہو گیا۔ تو کسی بھی چیز کا مقابلہ کرنا ہو تو اس کا مقابلہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کا مقابلہ کرنا کس سے ہے؟

### جزل کا مقابلہ جزل سے کریں!

ہم جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد میں پڑھتے تھے۔ ان دنوں جزل ضیاء الحق کا حادثہ ہوا اور وہ شہید ہو گئے۔ ہمیں استاذ جی شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جمع کیا اور فرمایا کہ آج ایک بہت بڑے ولی کا جنازہ اٹھ گیا ہے۔ پھر فرمانے لگے کہ میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے ذہن میں آئے گا کہ جزل ضیاء الحق ولی کیسے تھا؟ وہ تو ڈاڑھی منڈا تھا، صاحب حکومت ہونے کے باوجود بھی اسلام نافذ نہیں کیا تو وہ ولی کیسے؟ پھر خود ہی جواب ارشاد فرمایا کہ آپ کو وہ ولی اس لیے نہیں لگتا کہ آپ اس کا مقابلہ اپنے اساتذہ اور شیوخ سے کرتے ہیں۔ جب اس کا مقابلہ دوسرے صدور سے کریں کہ جو اس سے پہلے پاکستان کے صدر تھے، انہیں بھی دیکھ لیں اور پھر جزل ضیاء الحق کو بھی دیکھ لیں تو آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ وہ ولی تھا یا نہیں؟

آپ کے علاقہ میں ایک ایس ایچ او آجائے، وہ ڈاڑھی بھی منڈاتا ہو اور شراب بھی پیتا ہو۔ آپ جلسے کی منظوری لینے کے لیے اس کے پاس جائیں اور وہ کہے کہ مولانا صاحب! بیٹھیں اور چائے پیئیں۔ پھر وہ پوچھے کہ آپ کیسے آئے؟ آپ کہیں جی جلسہ ہے، اجازت لینے آئے ہیں، آپ اجازت دے دیں۔ ایس ایچ او کہے کہ مولانا صاحب! آپ جلسہ کریں، اجازت کی بالکل پروانہ کریں، یہ ہماری ذمہ داری ہے، ہم حفاظت کریں گے۔ آپ بتائیں کہ جب آپ واپس آئیں گے تو آکر کیا کہیں گے؟ ایس ایچ او بہت گندہ ہے یا اچھا ہے؟ (اچھا ہے۔ سامعین) آپ نے کہنا ہے کہ بہت اچھا ہے۔ حالانکہ وہ تو شراب پیتا ہے تو پھر اچھا کیسے ہو گیا؟ اب آپ نے خود کہنا ہے کہ ہم جو اچھا کہہ رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایس ایچ او دین کے راستے میں رکاوٹ

نہیں اور اس سے پہلے جو ایس ایچ او تھا وہ بہت خراب کرتا تھا، یہ اس کے مقابلہ میں بہت اچھا ہے۔

اسی طرح کتے کا کامل ہونا یہ انسان کے مقابلہ میں نہیں بلکہ کتے کے مقابلہ میں ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ کتا مراقبہ کرتا ہے۔ تو میں نے کہا کہ ایک ہے مراقبہ اور ایک ہے سجدہ۔ سجدے کا معنی ہوتا ہے پیشانی زمین پر رکھنا اور مراقبہ کا معنی ہوتا ہے کہ پیشانی کو جھکا دینا۔ قرآن تو کتے کے سجدے کی بات کرتا ہے اور تم کہتے ہو کہ مراقبہ قرآن کے خلاف ہے؟ اس نوجوان نے کہا: قرآن میں کہاں پر ہے کہ یہ چوپایہ بھی سجدہ کرتا ہے؟ میں نے کہا کہ سورۃ الحج میں ہے:

﴿الَّذِينَ يَسْجُدُونَ لِلَّهِ يَسْجُدُونَ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ  
وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالْذَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾<sup>4</sup>

کہ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کو وہ ساری مخلوق سجدہ کرتی ہے جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ نیز سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور بہت سارے انسان بھی۔

تو قرآن ﴿وَالَّذِينَ يَسْجُدُونَ لِلَّهِ يَسْجُدُونَ لَهُ﴾ کہتا ہے کہ چوپائے بھی خدا کو سجدہ کرتے ہیں اور تم کہتے ہو کہ یہ مراقبہ بھی نہیں کرتے۔ اب بتاؤ کہ امداد المشتاق قرآن کے خلاف کیسے ہوئی؟ اس پر وہ نوجوان لاجواب ہو گئے۔ ماننا نہ ماننا الگ بات ہے۔

**جنتی مردوں کا کنگن پہننا:**

﴿إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ

تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُجَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا

حَرِيرٌ ﴿٢٦﴾

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اللہ تعالیٰ انہیں ایسے باغات میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ وہاں انہیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور موتیوں کے۔ ان باغات میں ان کا لباس ریشم ہو گا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کو اللہ تعالیٰ جنت میں سونے کے کنگن پہنائیں گے اور موتیوں کے کنگن پہنائیں گے اور سورۃ الدھر میں ہے:

﴿وَحُلُّوْا أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ﴾<sup>5</sup>

کہ ان کو چاندی کے کنگن پہنائیں گے۔

تو تین قسم کے کنگن اہل جنت مردوں کو پہنائیں جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کنگن تو زیور ہے اور زیورات عورتیں پہنتی ہیں۔ یہاں جنتی مردوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہیں کنگن پہنائے جائیں گے حالانکہ مردوں کا زیورات پہننا معیوب ہوتا ہے تو ان کو کیوں پہنائے جائے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے عام لوگوں کا لباس اور ایک ہوتا ہے بادشاہوں کا لباس۔ عام لوگ تاج نہیں پہنتے لیکن بادشاہ تاج پہنتے ہیں کیونکہ یہ شاہی اعزاز ہوتا ہے، دنیا میں عام لوگ کنگن نہیں پہنتے لیکن بادشاہ پہنتے ہیں کیونکہ یہ بھی شاہی اعزاز ہوتا ہے، تو جنتی مردوں کو بھی جنت میں جو کنگن پہنائے جائیں گے تو یہ شاہی اعزاز کی وجہ سے ہو گا اور شاہی اعزاز کی وجہ سے کنگن پہننا معیوب نہیں بلکہ عزت کی بات ہے۔



## کنگن پہننا شاہی اعزاز ہے:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے مدینہ ہجرت کر کے جا رہے تھے۔ ابو جہل اور اس کے ساتھیوں نے اعلان کیا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سر کی قیمت سو سواونٹ ہیں۔ انہیں کوئی زندہ لائے یا ان کا سر لائے تو اسے سواونٹ ملیں گے۔ توجو انعام اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر رکھا وہی انعام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر رکھا۔ دشمن بھی جانتا تھا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اہمیت کتنی ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کی قیمت کا لگ جانا یہ عیب نہیں ہے بلکہ یہ پیغمبر کی سنت سے ثابت ہے، ہم اس کو اعزاز نہیں سمجھتے اس لیے اس پر بہت پریشان ہوتے ہیں۔ تو کئی لوگ ان کی تلاش میں نکلے۔ سراقہ بن مالک بھی نکلے۔ اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ان کا گھوڑا بحکم خداوندی گھٹنوں سمیت زمین میں دھنس گیا۔ انہوں نے یہ معاملہ دیکھ کر توبہ کی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے گھوڑا نکل آیا۔ اس وقت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ بشارت دی کہ سراقہ ایک وقت آئے گا کہ فارس کے بادشاہ کسریٰ کے کنگن مالِ غنیمت میں مسلمانوں کے پاس آئیں گے جو تمہیں ملیں گے۔

سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ دنیا سے تشریف لے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا۔ فارس فتح ہو گیا اور کسریٰ کا مال غنیمت کے طور پر مسلمانوں کے پاس آیا تو سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ آئے اور کہا کہ بادشاہ کے کنگن مجھے دے دیں کیونکہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ وہ کنگن تمہیں ملیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مالِ غنیمت جمع کرو، جمع کیا تو اس میں کنگن نہیں تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کنگن لاؤ، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اس لیے اس میں کنگن ضرور ہوں گے۔ جب کچھ یورپوں

کو جھاڑا گیا تو ان میں سے کنگن نکل آئے۔ چنانچہ وہ کنگن حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کو دے دیے گئے۔

اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ بادشاہ کنگن پہنتے تھے۔ تو جنت کا ماحول بھی بادشاہوں کی طرح ہو گا۔ ہر آدمی کی اپنی جنت ہو گی اور وہ اس کا بادشاہ ہو گا۔ ایسا بادشاہ کہ ﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ﴾<sup>6</sup> یعنی بندہ جس چیز کی خواہش کرے گا اور جو مانگے گا اسے وہی ملے گا۔ تو بادشاہ تاج بھی پہنتے ہیں اور کنگن بھی پہنتے ہیں اس لیے جنت میں کنگن پہننا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

### دین کی فہم بہت بڑی نعمت ہے:

یہ بات میں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں کہ دین کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ یہ جو آواز لگتی ہے کہ دل تھوڑا سا بڑا رکھو! کسی اور کو بھی جنت میں جانے دو! اللہ کی جنت بہت بڑی ہے! صرف تم نے ہی جنت میں جانا ہے؟ کیا اتنی بڑی جنت کا خدا نے اچار ڈالنا ہے؟! - العیاذ باللہ - یہ نا سمجھی کی بات ہے۔ سب سے آخری شخص جو جنت میں جائے گا اس کی جنت دنیا سے دس گنا بڑی ہو گی لیکن اس دس گنا بڑی جنت میں بندہ ایک ہی ہو گا، دو نہیں ہوں گے۔ کوئی فرشتہ یہ نہیں کہے گا کہ یا اللہ! دنیا سے دس گنا بڑی جنت ہے، اس میں دو چار اور بندے بھی اس میں بھیج دیں! ایسا نہیں ہو گا بلکہ اس میں صرف ایک ہی بندہ ہو گا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ شاید جنت کمروں کا نام ہے کہ ایک جنت ہے جس میں ہزاروں کمرے ہیں، تم نے جانا ہے تو چلو دو چار بندے اور بھی ساتھ ہو جائیں تو کیا فرق

پڑتا ہے؟! ایک کمرے میں اکیلا بندہ نہ ہو بلکہ دو بندے سو جائیں۔ یاد رکھو! جنت رہنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ عیش کی جگہ ہے، رہنے کی جگہوں پر گزارا کرنا ہوتا ہے اور عیش کی جگہوں پر گزارا نہیں ہوتا بلکہ وہاں من مانی کی زندگی ہوتی ہے۔

یہ بات یاد رکھ لیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص دنیا میں سونے اور چاندی کے برتن میں پیے گا اللہ اس کو آخرت میں برتن نہیں دے گا، جو شخص دنیا میں ریشم استعمال کرے گا اللہ اسے آخرت میں ریشم نہیں دے گا، جو شخص دنیا میں شراب پیے گا اللہ اسے آخرت میں شراب نہیں دے گا۔<sup>7</sup>

تو جنت کے احوال الگ ہیں اور دنیا کے احوال الگ ہیں۔ وہاں اگر مرد کنگن پہنیں گے تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ وہ جہان ہی الگ ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ دل بڑا رکھو! کسی اور کو بھی جنت میں جانے دو! تو یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ جنت میں آدمی ایسے رہے گا جیسے سلطنت کا بادشاہ اور سلطنت کا بادشاہ ایک ہوتا ہے یا دس ہوتے ہیں؟ (ایک ہوتا ہے۔ سامعین) آپ کسی دنیا کے بادشاہ سے کہیں ناکہ دل بڑا رکھو! بادشاہ اپنی سلطنت میں کسی اور کو برداشت نہیں کرتا، ہاں مہمان بن کر آؤ تو ٹھیک ہے تو جنتی ایک دوسرے سے ملیں گے، آئیں جائیں گے، بتاؤ یہ آنا جانا رہنے کے لیے ہو گا یا مہمان نوازی کے لیے؟ (مہمان نوازی کے لیے۔ سامعین) مہمان بن کر آؤ تو ٹھیک ہے۔ یہ میں نے دفع دخل مقدر کیا ہے تاکہ اشکال سارے ختم ہو جائیں۔

### حوران جنت کا تذکرہ:

دنیا کے بادشاہوں کی کنیزیں ہوتی ہیں اور جنتی جنت میں بادشاہ ہوں گے جن کی کئی باندیاں ہوں گی یعنی جنت کی حوریں۔ کتنی راحت، سکون اور آرام کی جگہ ہو

گی جنت! بس دنیا میں تھوڑا سا ضبط کر لو تو آگے مزے ہی مزے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ نے حور کی اٹھارہ صفات بیان فرمائی ہیں اور حدیث مبارک میں تو جماع اور جماع کی کیفیات تک کو بیان کیا ہے کہ جنتی حور کے پاس کیسے جائے گا! اللہ نے حوروں کا حسن بیان کیا ہے، دنیا والی بیوی کا حسن بیان نہیں کیا، یہ تو وہاں جنت میں حوروں کی ملکہ ہو گی، اس کے حسن کو بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ خیر جنت میں سونے کے کنگن ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عطا فرمائے۔ (آمین)

### حرم؛ امن و سلامتی کی جگہ

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ  
الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ﴾

مسجد حرام وہ جگہ ہے جو باہر سے آنے والے اور وہاں کے رہنے والے سب کے لیے برابر ہے۔ مسجد حرام اور حرم کی وہ جگہ جس کا تعلق افعالِ حج کے ساتھ ہے دنیا میں کسی کی ملکیت نہیں ہے جیسے صفا و مروہ کے درمیان کی جگہ، طواف کرنے کی جگہ مطاف، مزدلفہ کا میدان، منی کا میدان، عرفات کا میدان وغیرہ۔

### حضرت ابراہیم کا کعبہ تعمیر کرنا:

﴿وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ  
لِلطَّائِفِينَ وَالنَّكَاسِ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے وہ جگہ بتادی جہاں احاطہ کعبہ تھا یعنی خانہ کعبہ کی جگہ بتائی کہ اس کو تعمیر کرو۔ اس کی پہلی تعمیر تو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں ہوئی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب طوفان آیا تھا تو کعبہ کی تعمیر اٹھالی گئی تھی البتہ اس کی بنیادیں اور وہ جگہ متعین تھی۔ یہ حکم ﴿وَطَهِّرْ بَيْتِيَ﴾

لِبَطَّافِينَ وَانْقَائِيْنَ وَالرَّكَّعِ السُّجُودِ ﴿۶﴾ کہ میرے گھر بیت اللہ کو طواف کرنے والوں، عبادت کے لیے کھڑے ہونے والوں اور رکوع سجدے کرنے والوں کے لیے پاک رکھیے! یہ نام اس وقت دیا گیا تھا جب بیت اللہ کی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیت اللہ درودیوار کا نام نہیں بلکہ اس جگہ اور زمینی ٹکڑے کا نام ہے جس پر بیت اللہ کی تعمیر ہوئی ہے۔ ظاہر ہے وہ جگہ اس وقت بھی موجود تھی جب یہ حکم ہوا تھا۔

### حضرت ابراہیم کا اعلان حج:

﴿وَإِذْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ

كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴿۷﴾﴾

اور پھر فرمایا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کرو کہ وہ تمہارے پاس پیدل آئیں اور دور کے راستوں سے ان سوار یوں پر سوار ہو کر آئیں جو لمبے سفر کی وجہ سے دہلی پتلی ہو گئی ہوں۔

روایات میں ہے ابراہیم علیہ السلام مقام ابراہیم پر پتھر پر کھڑے ہوئے اور اللہ نے پتھر کو بہت اونچا کر دیا کہ اب آواز لگاؤ! بعض روایات میں ہے جبل ابو قیس پر کھڑے ہو کر آواز لگاؤ۔ دونوں روایتیں جمع ہو سکتی ہیں کہ آپ پہلے مقام ابراہیم پر پتھر پر کھڑے ہوئے اور وہ پتھر جبل ابو قیس پر چلا گیا ہو۔ تو اللہ نے فرمایا کہ اعلان کرو! عرض کیا: یا اللہ! یہاں تو ویرانہ ہے، کون سنے گا اور جہاں آبادی ہے وہاں میری آواز کیسے پہنچے گی؟ اللہ نے فرمایا: آواز لگانا آپ کے ذمہ ہے اور آپ کی آواز کو ساری دنیا میں پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے مشرق، مغرب، شمال، جنوب چاروں طرف منہ کر کے آواز لگائی کہ خانہ کعبہ بن گیا ہے، حج کرنے کے لیے آؤ! یہ

آواز اللہ نے۔ بعض روایات میں ہے کہ۔ عالم ارواح میں جو روحیں تھیں ان کے کانوں تک بھی پہنچائی۔ جس جس کے مقدر میں حج کرنا لکھا تھا اس نے جواب دیا۔

### مرکز کی بنیاد اور مشکلات کا سامنا:

جب ہم نے یہاں مرکز اہل السنۃ والجماعۃ کا کام شروع کیا تو چھوٹی سی جگہ تھی۔ میں نے کہا کہ دو بیت الخلاء بناؤ! میرے ساتھ مجھ سے چھوٹے بھائی شعیب اور ان سے چھوٹے بھائی خبیب تھے۔ ہم تازہ تازہ جیلوں سے نکلے ہوئے تھے، ستم رسیدہ تھے، غمزدہ تھے، کوئی پرسان حال بھی نہیں تھا، کوئی ہمارے سر پر ہاتھ رکھنے کے لیے تیار بھی نہیں تھا۔ تو میں نے کہا کہ یہاں دو بیت الخلاء بناؤ۔ مجھ سے چھوٹے بھائی شعیب نے کہا کہ دو بنا کے کیا کرنا ہے؟ تو بھائی خبیب نے بھائی شعیب سے کہا کہ پیسے تو بھائی جان نے لگانے ہیں، تمہیں کیا ضرورت ہے انکار کرنے کی؟ تم بنا دو۔ بھائی جان نے پہلے دنیا کا بہت ظلم سہا ہوا ہے، ہمارا بھائی ہے، جو کہتا ہے وہی کر دو، اس ایک کو تو خوش رکھو، نہ ہمارے پاس باپ ہے نہ ہمارے پاس خاندان ہے نہ جماعت ہے نہ پیسا ہے، کچھ بھی نہیں ہے، ایک بھائی بچتا ہے ہمارے پاس... خیر میں بتا رہا تھا کہ وہ دو بیت الخلاء بنانے کے لیے تیار نہیں تھے کہ یہاں آئے گا کون؟ لیکن آپ آج مرکز کا نظام دیکھو اور لوگوں کا رجوع دیکھو! اب حالت یہ ہے کہ بیت الخلاء بہت ہیں لیکن پھر بھی کم پڑ جاتے ہیں۔

ہم نے یہاں کام شروع کیا۔ میں دنیا کے نقشے بنا کر بیٹھتا تھا۔ میرے ساتھ کام کرنے والے میرا مذاق اڑاتے اور کہتے کہ جیل میں رہ رہ کر مار کھا کھا کر اس کا دماغ بل گیا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں نے پوری دنیا میں کام کرنا ہے۔ میں ان کی باتوں پر پھر یہ آیت پڑھتا تھا ﴿وَإِذْ فِي النَّاسِ بِالْحَبَشَةِ﴾ میں نے ان سے کہا کہ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ لوگوں میں آواز لگاؤ۔ میں بھی آج کام کی آواز لگاتا ہوں،

اگر اللہ کو منظور ہوا تو ہماری یہ آواز دنیا کے کچے پکے گھر تک پہنچے گی اور پھر ہم نے آواز لگائی۔

جب ہم نے کام شروع کیا تھا تو میں بس پر سفر نہیں کرتا تھا، میں ہمیشہ رینٹ کی کار لے کر جاتا، کبھی کسی سے کرایہ کا مطالبہ بھی نہیں کرتا تھا، میں نے کہا: یا اللہ! بس والی خطابت ہم سے نہیں ہوتی، ہماری فکر دشمن سے ہے، اللہ تو اپنے کرم سے اسباب عطا فرما۔ ہمارے ساتھ ڈرائیور میاں مشتاق ہے، یہ بدعتی تھا، اب الحمد للہ بہت بدل گیا ہے، اس کی گاڑی تھی میں ہفتہ ہفتہ اس کو ساتھ رکھتا تھا، اب اللہ نے اس کو دو اپنی گاڑیاں دے دیں۔ ہمارے ساتھ جو بھی ملا ہے اللہ نے اس کو بہت نوازا ہے۔ میں آپ کو بھی گارنٹی کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں لیکن چلیں اخلاص سے، تو تھوڑی دیر لگے گی، آپ دیکھنا کہ اللہ نواز تا کیسے ہے!

ہم یہاں سے چلے مظفر آباد کشمیر، ایک ہفتہ کا دورہ تھا، اس کی بیوی کافون آتا کہ کب واپس آرہے ہیں تو یہ مذاق میں بیوی سے کہتا کہ ہم دین پھیلا رہے ہیں، بس ایک پہاڑ رہ گیا ہے اس کے پار دین پہنچا کرو واپس آجائیں گے اور مجھے مذاق میں کہتا کہ مولوی صاحب! بس پوری دنیا میں آپ ہی نے دین پھیلا نا ہے اور کوئی نہیں ہے دین پھیلانے والا؟ میں اسی رینٹ کی گاڑی پر سندھ تک جایا کرتا تھا اور کرایہ کسی سے نہیں مانگتا تھا، بس چلتے رہے۔

**اللہ اس سے بھی بڑی گاڑی دے:**

میں ایک مرتبہ جنوبی پنجاب دورہ پر تھا۔ مولانا زبیر صاحب شجاع آبادی جنوبی پنجاب وفاق کے مسئول ہیں، میں نے پوچھا کہ کہاں پر ہیں؟ کہا: ملتان وفاق المدارس کے دفتر میں ہوں۔ میں نے کہا: میں بھی ملتان میں ہوں اور آگے سفر پر جارہا ہوں۔ میں اور مولانا ایک ہی مدرسے میں پڑھتے رہے ہیں، وہ مجھ سے آگے تھے

اور میں پیچھے تھا، وہ مجھ سے بڑے ہیں اور میں چھوٹا ہوں۔ تو میں نے ان سے کہا کہ میں ایک جلسے پر لو دھراں جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا: میں نے بھی اس جلسہ میں جانا ہے۔ میں نے کہا کہ میری گاڑی میں آجائیں، گپ شپ لگائیں گے، آپ کی گاڑی پیچھے آ جائے گی۔ تو باتوں باتوں میں میں نے تذکرہ کیا کہ میں نے آج تک کسی جلسہ والے سے پیسہ نہیں مانگا، دیں... نہ دیں... تھوڑا دیں... زیادہ دیں... ان کی مرضی۔ مولانا مجھ سے فرمانے لگے کہ نہ مانگنے کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کے پاس وہ گاڑی ہے جو مانگنے والے خطیبوں کے پاس بھی نہیں ہے، اور ہماری خواہش ہے کہ اللہ اس سے بھی بڑی گاڑی دے۔

### قربانی کے صرف تین دن ہیں:

﴿وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَةٍ عَلَىٰ مَآرَدِ قُلُوبِهِمْ مِّنْ بَّهِيمَةٍ

الْأَنْعَامِ﴾

متعین دنوں میں ان مخصوص چوپائیوں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔ یہ مخصوص دن دس، گیارہ اور بارہ ذوالحجہ ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"قَالَ لَمَعْلُومَاتُ يَوْمِ النَّحْرِ وَيَوْمَانِ بَعْدَهُ."<sup>8</sup>

کہ ایام معلومات سے مراد یوم نحر یعنی دس ذوالحجہ اور اس کے بعد دو دن ہیں یعنی گیارہ اور بارہ ذوالحجہ۔ یوں قربانی کے کل دن تین بنتے ہیں۔

﴿لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ﴾

اللہ تعالیٰ کے ہاں قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ اللہ کے ہاں تمہارا



تقویٰ اور اخلاص پہنچتا ہے۔

یہ بات ذہن نشین فرمائیں کہ ہم جو قربانی کرتے ہیں اس سے مقصود جانور کو ذبح کرنا ہے۔ جانور کا گوشت مقصود نہیں ہے۔ لہذا قربانی کرنے والا شخص اگر جانور کا سارا گوشت خود کھالے، جانور کی کھال کا مصلیٰ بنالے تو قربانی کے اجر میں معمولی سا فرق بھی نہیں آئے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ جو اجر قربانی کے گوشت کو تقسیم کرنے پر ہے وہ نہیں ملے گا اور غریبوں کی ہمدردی کا عنوان ختم ہو جائے گا، مروت کے خلاف ہو گا اور مزاج شریعت کے بھی خلاف ہو گا لیکن اگر کوئی شخص سارا گوشت استعمال کرنا چاہے تو کر سکتا ہے کیونکہ مقصد جانور کو ذبح کرنا ہے، مقصد جانور کا گوشت تقسیم کرنا نہیں ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آجائے تو پھر یہ اشکال خود بخود ختم ہو جائے گا جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ قربانی کے دن جانور ذبح کرنے کے بجائے اگر ہم جانور کی قیمت کو صدقہ کر دیں تو غریبوں کا فائدہ زیادہ ہو گا! کروڑوں جانور ایک دن میں ذبح ہوتے ہیں۔ اگر ہم ان کروڑوں جانوروں کے پیسوں سے جو اربوں کی مقدار میں بنتے ہیں یتیم خانہ بنادیں، اسکول بنادیں، شفاخانہ بنادیں، فلاحی سینٹر بنادیں، مدرسہ بنادیں، غریب بچیوں کے نکاح کرادیں تو کتنا کام ہو سکتا ہے اور ہم جانور ذبح کر کے اس مال کو ختم کر دیتے ہیں۔

اس کا جواب ہے: ﴿لَنْ يَنَالَ اللَّهُ خُومَهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْكُمْ﴾ کہ گوشت تو مقصود ہی نہیں ہے، اللہ تو صرف چاہتے ہیں کہ جانور کو ذبح کرو اور بس! یہی مقصود ہے۔ باقی دیگر ضروریات کے لیے شریعت کا ایک مستقل نظام ہے۔ ایک حکم زکوٰۃ کا ہے۔ اب ہر آدمی جو صاحب نصاب ہے اگر مکمل زکوٰۃ ادا کر دے تو لوگوں کی ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔ اس کے بعد پھر عشر ہے، وہ ادا کیا جائے۔ پھر صدقۃ الفطر ہے وہ ادا کریں۔ پھر صدقات نافلہ ہیں وہ ادا کیے جائیں۔

یہ سارے صدقات صحیح طریقے سے ادا ہو جائیں تو لوگوں کی تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں گی اور کوئی اشکال پیدا ہی نہ ہو گا۔

اللہ رب العزت چاہتے ہیں کہ بندہ مالی قربانی بھی دے یعنی اگر سونا چاندی اور مال تجارت ہے تو زکوٰۃ دے، اگر زمین ہے تو پیداوار سے عشر دے اور اگر جانور ہیں جن پر زکوٰۃ آتی ہے تو ان میں سے زکوٰۃ ادا کر دے اور اس کے علاوہ بھی اللہ کے نام پر دے۔ تو اللہ رب العزت ہر قسم کی قربانی ہم سے مانگتے ہیں۔

### صحابہ کرام کو جہاد کی اجازت:

﴿إِذْ لِلَّذِينَ يُقَتِّلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا ۖ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ﴾<sup>۹</sup>  
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آنے کے بعد سب سے پہلی آیت جو جہاد اور قتال کے بارے میں نازل ہوئی وہ یہی آیت ہے: ﴿إِذْ لِلَّذِينَ يُقَتِّلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا﴾، مکہ مکرمہ میں مشرکین مکہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر حد سے زیادہ ظلم کیا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ حکم تھا کہ ﴿كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ﴾<sup>۹</sup> اپنے ہاتھ روک رکھو، تم نے ابھی قتال نہیں کرنا، جہاد نہیں کرنا بلکہ تم نے صبر کرنا ہے۔ تو مکہ مکرمہ میں تیرہ سال تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجماعاً سختیاں برداشت کرتے رہے، مصائب جھیلنے رہے اور مقابلہ نہیں کیا۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ہمیں اجازت ملے کہ ہم مشرکین کو جواب دیں۔ تو مدینہ منورہ آنے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی کہ وہ لوگ جن پر ظلم کیا گیا ان کو اجازت ہے کہ وہ قتال کریں اور یہ یقین کریں کہ اللہ رب العزت ان کی مدد کرنے پر قادر ہیں۔ وہ یہ نہ دیکھیں کہ ہم

تعداد میں تھوڑے ہیں، ہمارے پاس اسباب کم ہیں بلکہ اللہ کے بھروسے پر میدان میں نکلیں۔

اس لیے تاریخ اسلام میں سب سے پہلی باضابطہ جنگ جو کفر اور اسلام کے درمیان ہوئی وہ جنگ بدر ہے۔ مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی اور کفار کی تعداد ایک ہزار تھی۔ ان کی افرادی طاقت بھی زیادہ تھی اور اسلحہ بھی زیادہ تھا۔ اس کے باوجود اللہ رب العزت نے مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ اس موقع پر ستر بڑے بڑے کافر قتل ہو گئے اور مشرکین مکہ کی کمر ٹوٹ گئی۔

### کیا جہاد کے لیے ایمان مضبوط ہونا شرط ہے:

یہاں ایک مسئلہ بھی اچھی طرح سمجھیں۔ بعض لوگ جہاد کے فرض ہونے کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ جہاد فرض تب ہو گا جب ایمان بہت مضبوط ہو اور اس کی دلیل یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں تیرہ سال تک ایمان بنانے کی کوشش ہوئی اور اس کے بعد مدینہ منورہ میں جہاد فرض ہوا۔

اگر مان لیا جائے کہ یہ دلیل ٹھیک ہے تو اس سے شریعت کے تقریباً نوے فیصد سے زیادہ احکام ختم ہو جائیں گے کیونکہ احکام مکہ مکرمہ میں نازل نہیں ہوئے تھے بلکہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں صرف نماز فرض ہوئی ہے باقی نماز کی تفصیلات، پانچ وقت جماعت کا اہتمام وغیرہ یہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئے۔ حج فرض ہو رہا ہے سن 8 ہجری میں۔ تو اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ تیرہ سال مکہ میں گزارنے کے بعد مدینہ میں جہاد فرض ہوا اس لیے فرضیت جہاد کے لیے ایمان مضبوط ہونا ضروری ہے تو پھر یہ بھی کہنا پڑے گا کہ حج ہجرت کے آٹھ سال بعد فرض ہوا، تیرہ سال مکہ والے اور آٹھ سال مدینہ والے یہ کل ملا کر اکیس سال ہوئے تو پھر جہاد کی فرضیت کے لیے ایمان تھوڑا چاہیے اور حج کی فرضیت کے لیے ایمان زیادہ چاہیے کیونکہ حج تو اس

کے بھی بعد فرض ہوا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کب فرض ہوئی... پردہ کب فرض ہوا... شراب کب حرام ہوئی... تو بہت سی چیزیں ہیں جن کا حکم مدینہ میں آیا۔ تو پھر ان سب کو ماننے کے لیے ایمان کی مضبوطی کی شرط لگانا ہوگی۔ اس لیے یہ دلیل انتہائی غلط ہے۔

### دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین فرمائیں کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾<sup>10</sup>

اے ایمان والو! دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!

جب کلمہ پڑھا ہے تو آپ کو پورے اسلام میں داخل ہونا پڑے گا۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اب یہ فرض ہے یہ فرض نہیں ہے، ہمارا کرنا یا نہ کرنا الگ مسئلہ ہے اور جہاد کا فرض ہونا یا نہ ہونا الگ مسئلہ ہے۔ اب اگر کسی شخص سے آپ کہیں کہ حج کرو! وہ کہتا ہے کہ میں حج نہیں کرتا۔ آپ اس سے پوچھیں کہ حج کیوں نہیں کرتے؟ وہ کہتا ہے کہ حج کب فرض ہوا؟ آپ کہتے ہیں کہ 8 ہجری میں۔ وہ کہتا ہے کہ پہلے ایمان کی محنت ہے، میرا ایمان ابھی تک اس حالت پر نہیں کہ حج فرض ہو جائے۔ تو جہاد پہلے فرض ہوا ہے اور حج بعد میں فرض ہوا ہے، ہر سال لاکھوں بندے حج پر چلے جاتے ہیں تو کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ حج پر جانے کے لیے پہلے تیرہ سال کی محنت چاہیے تو جہاد کا کیا قصور ہے کہ اس کے لیے ایسی باتیں کی جائیں۔ اس لیے یہ دلیل پیش نہ کریں۔ بس سیدھی سی بات کریں کہ جہاد فرض ہے۔ ہم جہاد نہیں کرتے تو اپنا فسق بیان کریں کہ ہم نہیں کرتے، اپنے فسق کو چھپانے کے لیے اور اپنا جھوٹا تقویٰ بیان کرنے کے لیے احکامات شریعت کو تبدیل نہ کریں۔

## حضرت بشیر بن خصاصیہ اور بیعت علی الجہاد:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جی ہم کمزور ہیں۔ حضرت جی مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ”حیات الصحابہ رضی اللہ عنہم“ کتاب لکھی ہے۔ اس میں ایک عنوان قائم کیا ہے: ”اعمال اسلام پر بیعت ہونا“

ایک ہوتی ہے ”بیعت اسلام“ کہ کافر بیعت کریں اور مسلمان ہو جائیں اور ایک ہوتی ہے ”بیعت جہاد“ کہ مسلمان بیعت کریں کہ ہم مرجائیں گے لیکن ساتھ نہیں چھوڑیں گے اور ایک بیعت ہوتی ہے ”بیعت علی ارکان الاسلام“ کہ ہم بیعت کرتے ہیں کہ شریعت کے احکام پر عمل کریں گے۔ یہ بیعت آج بھی ہوتی ہے۔

تو حضرت جی مولانا محمد یوسف کاندھلوی ”اعمال اسلام پر بیعت ہونا“ کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں کہ بشیر بن خصاصیہ رضی اللہ عنہ صحابی تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا کہ میں نے بیعت کرنی ہے، آپ مجھے کن چیزوں پر بیعت کریں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت میں چھ چیزیں گنائیں:

اس بات کی گواہی دو اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں، پانچوں نمازیں وقت پر ادا کرو۔ فرض زکوٰۃ ادا کرو۔ رمضان کے روزے رکھو۔ بیت اللہ کا حج کرو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔

حضرت بشیر بن خصاصیہ نے کہا: یا رسول اللہ! میں باقی کام تو کر لوں گا لیکن جہاد اور زکوٰۃ میرے لیے مشکل ہیں، میں یہ دو کام نہیں کر سکتا۔ ایک تو زکوٰۃ ادا نہیں کر سکتا کیونکہ میرے پاس دس اونٹنیاں ہیں، ان کے دودھ پر ہی ہمارا گزارا ہوتا ہے اور یہی ہماری سواری کے کام بھی آتے ہیں اور دوسرا جہاد نہیں کر سکتا کیونکہ میں بزدل آدمی ہوں، لوگوں سے سنا ہے کہ جو میدان جہاد سے پشت پھیرے گا تو وہ اللہ کے غضب کا مستحق قرار پائے گا، مجھے خوف ہے کہ اگر میں دشمن سے لڑتے لڑتے میدان

جنگ سے بھاگ گیا تو کہیں اللہ کے عذاب کا مستحق نہ بن جاؤں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور فرمایا: اے بشیر! جب تم زکوٰۃ بھی نہیں دو گے اور جہاد بھی نہیں کرو گے تو جنت میں کیسے جاؤ گے؟ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بیعت نہیں فرمایا۔ حضرت بشیر بن خصاصیہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ اپنا ہاتھ بڑھائیں، میں آپ سے بیعت ہوتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو حضرت بشیر بن خصاصیہ نے ان تمام چھ کی چھ باتوں پر بیعت کی۔<sup>11</sup>

### مشروعیت جہاد کی وجہ:

مکہ مکرمہ میں جہاد فرض نہیں تھا مدینہ منورہ میں فرض ہوا اور اس کی وجہ اللہ رب العزت نے یہ بیان کی ہے:

1: ﴿اِذْ لِلَّذِينَ يُقَتِّلُونَ بِآثَمِهِمْ ظَلَمُوا﴾

جہاد کی اجازت ہے اس لیے دی ہے کہ تم مظلوم ہو۔

2: ﴿الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبَّنَا اللّٰهُ﴾

نیز یہ اجازت اس لیے ہے کیونکہ تم کو کفار نے مکہ سے نکال دیا ہے، تمہارے گھروں سے نکال دیا گیا ہے، تمہیں ہجرت پر مجبور کیا گیا ہے، اب تم بھی بدلہ لے لو۔

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهَدَمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ

وَصَلَوٰتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا﴾

دنیا میں چار قسم کی جگہیں ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نام لیا ہے:

- 1: ”صَوَامِعُ“ یہ صَوْمَع کی جمع ہے۔ عیسائیوں کے ان راہبوں کی مخصوص عبادت گاہ کا نام ہے جو دنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ یہ راہب ان خلوت خانوں میں قیام پذیر ہو کر اپنی عبادت میں مشغول رہتے تھے۔
  - 2: ”وَبَيْعُ“ یہ بیعۃ کی جمع ہے، عیسائیوں کی عام عبادت گاہ کو بیعۃ کہتے ہیں۔ اسے کنیسہ اور گر جا بھی کہتے ہیں۔
  - 3: ”صَلَوْتُ“ اس جگہ کو کہتے ہیں کہ جہاں یہودی عبادت کرتے ہیں۔
  - 4: ”مَسْجِدُ“ یہ مسجد کی جمع ہے، وہ جگہ جہاں مسلمان عبادت کرتے ہیں۔
- تو اللہ رب العزت نے فرمایا کہ ان عبادات گاہوں کا تحفظ تب ہو گا جب مسلمان جہاد کریں گے، جہاد نہیں کریں گے تو عبادت گاہوں کا تحفظ نہیں ہو گا۔ آج بھی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جو ہم سب کا ماویٰ اور مِلّٰہ ہے لوگ اس پر میزائل گرانے کا سوچ رہے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ حرمین کو ختم کریں مگر ان شاء اللہ حرمین ختم نہیں ہو گا، مکہ بھی رہے گا اور مدینہ بھی رہے گا، ان شاء اللہ ان کے ماننے والے بھی رہیں گے۔ یہ سب ان لوگوں کی حماقتیں ہیں.. جہالتیں ہیں.. غفلتیں ہیں.. اپنی دنیا و آخرت تباہ کرنے والی باتیں ہیں۔ قرآن کریم نے کعبہ کو ﴿قِيَمًا لِلنَّاسِ﴾<sup>12</sup> کہا ہے کہ لوگوں کی دنیا میں رہنے کی وجہ یہ کعبہ ہے۔ جب کعبہ ختم ہو جائے گا اللہ تعالیٰ کائنات کا نظام ہی ختم کر دیں گے۔ تو جب تک کعبہ ہے ہم بھی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کعبہ کی حفاظت فرمائیں اور ہم اس حفاظت کے لیے استعمال ہو جائیں تو یہ اللہ کا ہمارے اوپر بہت بڑا احسان ہے۔ اس لیے فرمایا کہ جب تک یہ جہاد ہو گا عبادت گاہوں کا تحفظ ہو گا اور جب جہاد نہیں ہو گا تو عبادت گاہوں کا تحفظ بھی نہیں ہو گا۔

## حکومت اسلامی کے بنیادی کام:

﴿الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾

اب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہم نے جہاد کی اجازت دی ہے کیونکہ ان پہ ظلم ہوا تھا اور ان کو گھر سے نکالا گیا تھا تو جب یہ جہاد کریں گے اور ان کو حکومت ملے گی تو یہ لوگ چند کام کریں گے:

1: ﴿أَقَامُوا الصَّلَاةَ﴾ لوگوں سے نماز کی پابندی کروائیں گے۔

2: ﴿آتَوُا الزَّكَاةَ﴾ زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے۔

3: ﴿آمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ﴾ نیکی کا حکم دیں گے۔

4: ﴿نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ گناہوں سے روک دیں گے۔

معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت کے بنیادی طور پر چار کام ہیں؛ لوگوں سے نمازوں کا اہتمام کروائیں، لوگوں سے زکوٰۃ کا اہتمام کروائیں۔ ان سے نیک کام کروائیں اور انہیں گناہوں سے روک دیں۔

## خلفائے راشدین کا سنہری دور:

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں بعض لوگوں نے خلیفہ وقت کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے زکوٰۃ کا انکار نہیں کیا بلکہ خلیفہ وقت کو زکوٰۃ دینے سے انکار کیا ہے۔ انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہم زکوٰۃ خود ادا کریں گے، آپ کو نہیں دیں گے کیونکہ ہم لوگ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں انہی کو دیتے تھے، حضور دنیا سے چلے گئے تو اب آپ کو کیوں دیں؟ ان کے جواب میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:



لَوْ مَتَّعُونِي عَقَالًا كَانُوا يُؤَدُّونَهُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
لَقَاتَلْتُهُمْ عَلَى مَنَعِهِ. <sup>13</sup>

اللہ کے نبی کے دور میں جو لوگ زکوٰۃ میں ایک رسی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے اگر وہ مجھے نہیں دیں گے تو میں ایک رسی پر بھی ان سے جہاد کروں گا۔ زکوٰۃ کا معاملہ اتنا اہم ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے غمائل اور گورنروں کو خط لکھتے تھے۔ فرماتے کہ نماز کا بہت اہتمام کیا کرو۔ اگر کسی گورنر اور عامل کی نماز ٹھیک ہے تو باقی سب معاملات ٹھیک ہیں، نماز ہی ٹھیک نہیں تو باقی چیزیں ہم نہیں دیکھتے اور قیامت کے دن بھی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے نامہ اعمال میں نماز کو دیکھیں گے تو حاکم وقت کی ذمہ داری ہے کہ نیکی پر لوگوں کو مجبور کر دیں اور گناہوں سے جبراً روک دیں۔

ایک ہے میرا اور آپ کا کام... ہم جبر نہ کریں بلکہ ہم منت سماجت کریں، فضائل سنائیں جیسے ہم تبلیغ کرتے ہیں لیکن حاکم وقت امر بالمعروف کرتا اور نہی عن المنکر کرتا ہے۔ دو باتوں میں فرق اچھی طرح سمجھ لیں۔

فضائل، دلائل اور ترغیب سے کسی کو دین پر لانا یہ امر بالمعروف نہیں ہے، اسی طرح فضائل، دلائل اور ترغیب سے کسی کو گناہ سے روکنا یہ نہی عن المنکر نہیں ہے بلکہ یہ وعظ و نصیحت ہے، دعوت ہے، تبلیغ ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کسے کہتے ہیں؟ امر کہتے ہیں: ”قَوْلُ الْقَائِلِ لِغَيْرِهِ عَلَى سَبِيلِ الْإِسْتِعْلَاءِ افْعَلْ“ کہ بندہ طاقت کے ساتھ یہ کہے کہ تم نے یہ کام کرنا ہے، اسے ”امر“ کہتے ہیں یعنی سامنے والا بندہ آپ کے سامنے انکار نہ کر سکے اور نہی کہتے ہیں: ”قَوْلُ الْقَائِلِ لِغَيْرِهِ عَلَى“

سَبِيلِ الْإِسْتِعْلَاءِ؛ لَا تَفْعَلْ“ کہ طاقت کے ساتھ کسی کو یہ کہنا کہ تم نے یہ کام نہیں کرنا اور وہ اس کا انکار بھی نہ کر سکے۔ اسے کہتے ہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ طاقت کے بغیر نہیں ہوتا اور طاقت یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔

اس لیے حدیث پاک میں ہے: ”مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيَعِزِّزْهُ بِبَيْدَةٍ“ جو شخص گناہ کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روک دے۔ اگر اس کی طاقت نہیں رکھتا تو ”فَبِلِسَانِهِ“ اپنی زبان سے روک دے۔ زبان سے بھی نہیں روک سکتا تو ”فَبِقَلْبِهِ“ پھر دل سے برا سمجھے، ”وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ“ فرمایا کہ یہ ایمان کا کمزور اور آخری درجہ ہے۔<sup>14</sup>

### صحیح بندے کا انتخاب ہماری ذمہ داری:

خیر میں عرض یہ کر رہا ہوں کہ نماز کی پابندی کروانا، زکوٰۃ ادا کروانا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ حکومت کی ذمہ داری ہے اور ایسے بندے منتخب کر کے اسمبلی میں بھجوانا کہ وہ یہ کام سرانجام دیں یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر ہم ایسا بندہ منتخب نہیں کرتے اور سامنے ایسا بندہ موجود بھی ہو جو یہ کام کر سکتا ہو لیکن ہم دوسرے بندے کو وٹ دیں تو عند اللہ ہم مجرم ہوں گے، قیامت کے دن ہم سے مواخذہ ہو گا کہ ہم نے غلط بندے کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ ووٹ ایک شرعی امانت ہے، اس کو معمولی بات نہ سمجھا کریں کہ جس کو دل چاہا دے دیا، جس کو دل نہ چاہا نہ دیا اور ہمیں امانت میں خیانت اور بددیانتی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

خیر میں عرض یہ کر رہا تھا کہ یہ جو مظلومین ہیں ان کو جب حکومت ملے گی تو

یہ نمازوں کا اہتمام بھی کروائیں گے، زکوٰۃ کا اہتمام بھی کروائیں گے، امر بالمعروف بھی کریں گے اور نہی عن المنکر بھی کریں گے۔ یہ جو ہم کرتے ہیں یہ التماس ہے، گزارش ہے، وعظ ہے لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں ہے۔

میں یہ گزارش اس لیے کرتا ہوں کہ التماس اور گزارشات کو امر بالمعروف کا نام نہ دینا، احکام اور شریعت کی اصطلاحات کو کبھی نہ بدلنا، یہ جرم کبھی نہ کرنا و گرنہ لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا معنی بدل دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### خلفائے راشدین چار ہیں:

یہاں ایک اہم مسئلہ سمجھیں۔ ہمارے ہاں ”خلافت راشدہ“ چار افراد پر بند ہے۔ خلفائے راشدین چار ہیں؛ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ خلفائے راشدین سات ہیں؛ چار مذکورہ اور حضرت حسن، حضرت معاویہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم۔

ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح یہ چار حضرات خلفاء بنے ہیں اسی طرح باقی تین بھی خلیفہ بنے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جانے کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ چھ ماہ تک جانشین بنے ہیں، پھر حضرت حسن نے بھی حضرت امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور خود دستبردار ہوئے ہیں لیکن چھ ماہ تک خلیفہ تو رہے ہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت حسن کے بعد خلیفہ بنے ہیں۔ پھر جب یزید نے حکومت کی ہے تو عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس سے بغاوت کی اور مکہ پر حکومت کی ہے۔ تو یہ تین حضرات حضرت حسن، حضرت معاویہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم صحابہ بھی ہیں اور خلفاء بھی ہیں اور صحابہ کے بارے میں اللہ نے قرآن

میں فرمایا ہے: ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ﴾<sup>15</sup> کہ یہ صحابہ سارے راشد ہیں۔ تو یہ تین بھی خلفاء راشدین ہوئے۔

اس کا جواب سمجھیں کہ ہم جب ”خلافت راشدہ“ کہتے ہیں تو اس کا معنی ہوتا ہے ”خلافت راشدہ موعودہ فی القرآن“ یعنی ایسی خلافت جس کا وعدہ قرآن میں ہے۔ جب ہم کہتے ہیں خلفائے راشدین تو اس سے مراد وہ خلفاء ہیں کہ جن کی خلافت کا اللہ نے قرآن میں وعدہ فرمایا ہے اور وہ چار ہیں، سات نہیں۔ دلیل سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان صحابہ کو جہاد کی اجازت دی ہے جن میں دو باتیں ہیں:

◆ ایک ﴿بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا﴾ کہ جن پر ظلم ہوا ہے،

◆ اور دوسری ﴿الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ کہ جن کو مکہ سے نکال کر ہجرت پر مجبور کر دیا گیا۔

یہی وہ لوگ ہیں کہ ﴿الَّذِينَ إِنَّ مَكْنَئَهُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ کہ جن کو ہم خلافت دیں گے۔ تو خلافت اور حکومت کا وعدہ ان لوگوں سے ہوا ہے کہ جن پر ظلم ہوا ہے اور جن کو مکہ مکرمہ سے نکالا گیا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکر پر ظلم بھی ہوا ہے اور انہوں نے ہجرت بھی کی ہے، حضرت عمر پر ظلم بھی ہوا ہے اور ہجرت بھی کی ہے، حضرت عثمان پر ظلم بھی ہوا ہے ہجرت بھی ہے اور حضرت علی پر ظلم بھی ہوا ہے اور ہجرت بھی ہے۔ رضی اللہ عنہم۔ تو ان چار پر ظلم بھی ہوا اور انہوں نے ہجرت بھی کی ہے کہ ان کو گھر سے نکال دیا گیا ہے۔

اب ہم باقی تین کو دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

نے اسلام قبول کیا ہے فتح مکہ کے موقع پر یا فتح مکہ سے ایک سال پہلے سن سات ہجری میں عمرۃ القضا کے موقع پر، تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی ہی نہیں تو اس آیت کا مصداق کیسے بنیں گے؟! اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ تو پیدا ہی مدینہ منورہ میں ہوئے ہیں، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح بھی مکہ مکرمہ میں ہوا ہے تو انہوں نے ہجرت کیسے کی ہے؟ اسی طرح حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما وہ صحابی ہیں جو مسلمانوں کی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد سب سے پہلے پیدا ہوئے۔ تو یہ تین حضرات وہ ہیں جن کو ہجرت کا موقع ہی نہیں ملا۔ لہذا خلافت کا یہ وعدہ ان کے ساتھ ہے جنہوں نے ہجرت کی ہے اور وہ صرف چار ہیں۔

ہم تو نہ نعرہ لگوارہے ہیں، نہ جھگڑا کر رہے ہیں بلکہ دلیل سے اپنا موقف عوام کو سمجھا رہے ہیں اور اپنی عوام کو دلیل سے اپنا عقیدہ سمجھانا چاہیے۔ اس لیے میں نے کہا کہ خلفائے راشدین چار ہیں۔

### ترتیب خلافت کی وجہ:

اور میں ایک بات بتایا کرتا ہوں کہ خلفائے راشدین چار ہیں اور ان چار میں ترتیب بھی یہی ہے؛ پہلے حضرت ابو بکر، پھر حضرت عمر، پھر حضرت عثمان اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہم اور ان کی خلافت کی یہ ترتیب اس لیے ہے کہ ان میں جو پہلے دو ہیں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرسریں اور باقی دو حضرت عثمان اور حضرت علی یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ہیں۔ سرسریں باپ کی جگہ ہے جو کہ پہلے ہوتا ہے اور داماد بیٹے جگہ ہے جو بعد میں ہوتا ہے۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سرسریں اور بڑے ہیں اور حضرت عمر سرسریں اور چھوٹے ہیں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلام پہلے قبول کیا ہے اور حضرت عمر

رضی اللہ عنہ نے بعد میں قبول کیا ہے، تو حضرت ابو بکر کا نمبر پہلا ہے اور حضرت عمر کا نمبر دوسرا ہے۔ پھر حضرت عثمان داماد ہیں اور دوہرے ہیں، حضرت علی داماد ہیں اور اکہرے ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے حضرت رقیہ کا نکاح پہلے ہوا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت فاطمہ کا نکاح بعد میں ہوا ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دوہرے داماد ہیں اور یہ اکہرے داماد ہیں، عثمان حضور کے داماد پہلے بنے ہیں، علی بعد میں بنے ہیں تو حضرت عثمان کا نمبر تیسرا ہے اور حضرت علی کا نمبر چوتھا ہے۔ رضی اللہ عنہم (سبحان اللہ۔ سامعین)

ہم ترتیب کے ساتھ قائل ہیں اور دلیل کے ساتھ قائل ہیں اور بغیر دلیل کے محض ہٹ دھرمی سے بات نہیں کرتے۔

**کام کرنے والے کا دل بڑا ہونا چاہیے!**

﴿وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَثَمُودٌ﴾

قَوْمُ إِبْرَاهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ ﴿٢٦﴾

اے پیغمبر! یہ آپ کی بات نہیں مانتے اور آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ اس پر دل چھوٹانہ کریں۔ اگر یہ آپ کی تمکذیب کرتے ہیں، آپ کو جھٹلاتے ہیں تو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی حضرت نوح کو جھٹلایا تھا، قوم عاد نے اپنے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کو جھٹلایا تھا، قوم ثمود نے اپنے نبی حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا، حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کی اقوام نے بھی اپنے نبی کو جھٹلایا تھا، تو یہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے، لہذا آپ اپنے کام کو جاری رکھیں۔

اس سے یہ بات بڑی اچھی طرح سمجھ آتی ہے کہ علماء کرام: انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں تو جس طرح انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا گیا اور ہمارے نبی سے فرمایا گیا کہ آپ نے دل چھوٹا نہیں کرنا بلکہ اپنا کام جاری رکھنا ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے

وارث علماء کو جھٹلایا جائے اور عالم کو اپنے موقف کی حقانیت پر پورا یقین ہو تو اس عالم کو بھی دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے کام کو جاری رکھنا چاہیے، اس سے اللہ تعالیٰ کام کے نتائج بہت جلد عطا فرماتے ہیں۔

آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے عثمانیہ مسجد والوں کو ایک بات کئی بار کہی ہے جو ہمارے تبلیغ والے دوست کہتے ہیں کہ برف کو نہ بستی ہے اور ٹھنڈی ہوائیں کراچی چلتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ درس قرآن عثمانیہ مسجد میں ہوتا ہے اور پڑھنے والے باہر کی دنیا سے ہوتے ہیں۔ درس یہاں پر ہوتا ہے، چھپتا کراچی سے ہے اور تقسیم پوری دنیا میں ہوتا ہے اور تمہیں پتا بھی نہیں ہوتا کہ تمہارا درس قرآن کہاں کہاں پر جا رہا ہے۔ ہم سے لوگ پوچھتے ہیں کہ مولانا صاحب! درس قرآن کی تیسری جلد کب آرہی ہے؟ آپ ایسے بڑے لوگ ہیں کہ آپ کے پاس پہلی دو جلدیں بھی نہیں ہیں، کبھی آپ کو احساس بھی نہیں ہوا کہ ہمارے ہاں درس ہوتا ہے تو درس قرآن کی کتاب ہمارے پاس بھی تو ہونی چاہیے، کبھی ہم بھی پوچھیں کہ مولانا صاحب! دو جلدیں کہاں سے ملتی ہیں، ہم ان کا مطالعہ تو کر لیں۔

میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ پڑھے ہوئے درس کو آپ گھر میں دیکھ لیں تو پھر آپ کو اس کی اہمیت کا احساس ہو گا، سنتے ہوئے بندے کو محسوس نہیں ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے؟! جب چیز لکھی ہوئی سامنے آتی ہے پھر احساس ہوتا ہے کہ درس قرآن میں کتنے عقائد بیان ہوئے ہیں!

تو کام کرنے والے بندے کو دل بہت بڑا رکھنا چاہیے تب جا کے کام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

**محبت سب سے لیکن اتباع اپنے شیخ کی:**

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سورۃ البقرۃ کے

پہلے رکوع میں ﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ہم تمام انبیاء علیہم السلام کا اعتقاد رکھتے ہیں لیکن اتباع اپنے نبی کی کرتے ہیں، فرمایا کہ اس سے ثابت ہوا کہ مشائخ اور علماء جتنے ہیں اعتقاد سب کے ساتھ رکھنا چاہیے لیکن اتباع اپنے شیخ اور عالم کی کرنی چاہیے۔ اس سے بات سمجھنی اور سمجھانی بہت آسان ہو جاتی ہے۔

### قیامت کے دن کی مقدار:

آگے مشرکین اور کفار کو یہ بات سمجھائی ہے کہ ذرا یہ بھی سوچا کرو کہ ایک دن آنے والا ہے ﴿وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ﴾ ﴿۲۴﴾ وہ ایک دن دنیا کے ہزار سالوں کے برابر ہو گا۔ یہاں جو تم نے پیغمبر کی مخالفتیں کی ہیں تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ یہاں کے دن چھوٹے ہیں اور قیامت کا دن بہت بڑا دن ہے، وہاں کا ایک دن دنیا کے ہزار سالوں جتنا۔

یہاں ایک بات سمجھ لیں۔ قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ہے:

﴿تَعْرِجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ

سَنَةٍ﴾ ﴿۲۵﴾<sup>16</sup>

کہ وہاں کا ایک دن پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ قرآن کریم کا خاصہ یہ ہے کہ قرآن میں اختلاف نہیں ہوتا، قرآن کی آیتوں میں ٹکراؤ اور تعارض نہیں ہوتا۔ اب اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ قیامت کا ایک دن دنیا کے ایک ہزار سالوں کے برابر ہے اور دوسری آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ ایک دن پچاس ہزار



سال کے برابر ہے۔ تو بظاہر ٹکراؤ معلوم ہو رہا ہے حالانکہ ٹکراؤ نہیں ہے۔

اس کا ایک جواب تو ایسا ہے کہ ہر بندہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور ایک جواب ایسا ہے کہ اسے سمجھنا ہر بندے کے بس کی بات نہیں ہے۔ جو جواب ہر بندہ سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ دن ایک ہی ہے، اپنے حالات کے مطابق کسی کے لیے وہ ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے اور کسی کے لیے پچاس ہزار سال کے برابر۔ جس طرح بندہ اگر راحت میں ہو تو پتا ہی نہیں چلتا گھنٹوں گزر جاتے ہیں اور آدمی جب تکلیف میں ہو تو ایک گھنٹا ایک سال کے برابر ہو جاتا ہے۔ تو جن کے اعمال بہت اچھے ہیں تو ان کے لیے تو ایک ہزار سال بھی نہیں ہو گا اور جن کے اعمال گندے ہیں تو ان کے لیے ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہو جائے گا اور جن کے بہت ہی گندے ہوں گے تو ان کے لیے وہ مرحلہ اتنا مشقت کا ہو گا کہ ان کو ایسے لگے گا جیسے پچاس ہزار سال گزرے ہوں۔ تو یہ آدمی کے احوال کے مطابق ہے۔ اس کو حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لفظ اشتداد سے تعبیر فرماتے ہیں یعنی کسی کے لیے شدت کم ہوگی اور کسی کے لیے زیادہ ہوگی۔

اور دوسرا جواب نظام فلکیات کی روشنی میں سمجھیں اور اس کا سمجھنا ہر بندہ کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس کو آسان لفظوں میں سماعت فرمائیں۔ ہمارے ہاں سورج ہمارے سر سے گزرتا ہے۔ جہاں سے سورج گزرتا ہے اسے ”خط استواء“ کہتے ہیں۔ تو زمین کے وہ حصے جو خط استواء پر ہیں یعنی جب سورج نکلتا ہے تو اس کے نیچے آنے والی جو زمین ہے وہاں پر دن اور رات چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے اور جو لوگ سورج سے قطب شمالی پر ہیں وہاں ایک دن اور ایک رات ایک سال کا ہوتا ہے۔ تو ہمارے لیے ایک دن اور ایک رات چوبیس گھنٹے کا اور قطب شمالی والوں کے لیے ایک دن اور ایک رات ایک سال کا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بالکل اسی طرح قیامت کے

دن ہو گا کہ جہاں سورج آہستہ آہستہ گزرے گا وہاں پچاس ہزار سال کا ایک دن ہو گا اور جہاں سے تیزی سے گزرے گا وہاں کا دن ایک ہزار سال کے برابر ہو گا۔

**نزولِ وحی کے وقت شیطان کا لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالنا:**

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَتِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾

میں جو جو آیات پڑھتا جاتا ہوں اور ان کی تفسیر کرتا جاتا ہوں بطور خاص طلبہ اور علماء سے عرض کرتا ہوں کہ آپ جب تفاسیر دیکھیں گے اور ان آیات کو پڑھیں گے تو پھر اندازہ ہو گا کہ میں کتنے آسان انداز میں سمجھا رہا ہوں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب کسی نبی یا کسی رسول پر وحی آتی ہے تو ایک طرف نبی پر وحی اتر رہی ہوتی ہے اور وہ لوگوں کے سامنے بیان کر رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف شیطان کفار کے دل میں اس وحی کے بارے میں شکالات پیدا کر رہا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان شکالات کا جواب دیتے ہیں، چنانچہ ان جوابات کو قبول نہ کرنے والوں کا مرض بڑھ جاتا ہے اور قبول کرنے والوں کا ایمان اور پختہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

**دوموتیں اور دو حیاتیں:**

﴿وَهُوَ الَّذِي أَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ﴾

اللہ رب العزت نے تمہیں حیات دی، پھر اللہ تمہیں موت دیں گے، پھر اللہ تمہیں زندہ کریں گے۔ اس آیت میں ایک حیات، پھر موت اور پھر حیات دینے کا

ذکر ہے۔ تو اس میں دو حیاتوں اور ایک موت کا ذکر ہے اور قرآن کریم میں دوسری جگہ پر ہے:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ

ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿١٧﴾

تم اللہ تعالیٰ کو کیسے جھٹلاتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تمہیں زندگی دی، پھر وہی تمہیں موت دے گا پھر وہی تمہیں زندہ کرے گا اور پھر تم اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے۔

اس آیت میں دو موتیں اور دو حیاتیں مذکور ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ موتیں اور حیاتیں کتنی ہیں؟ ہمارا اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف یہ ہے کہ ظاہری اور کھلی دو موتیں اور دو حیاتیں ہیں اور ایک موت اور حیات ایسی ہے جو کھلی ہوئی نہیں ہے بلکہ مخفی ہے، وہ آنکھوں سے نظر نہیں آتی بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھانے سے سمجھ میں آتی ہے۔ پہلے بچہ عدم میں ہوتا ہے اور ماں کے پیٹ میں آجاتا ہے، جب تک روح نہیں آتی تو مردہ ہوتا ہے، یہ مردہ ہونا ایسا ہے جو ماں کو بھی محسوس ہو رہا ہوتا ہے، اس کے بعد جب اس میں روح آتی ہے تو بیٹا ماں کے پیٹ میں زندہ ہوتا ہے اور ماں اس کو محسوس بھی کرتی ہے، اس کے بعد یہی بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو اس میں حیات ہوتی ہے اور یہ حیات ہر کسی کو نظر آرہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد بندے پر موت آتی ہے، ہر کسی کو پتا چل جاتا ہے کہ موت آگئی ہے، اس کے بعد قیامت کے دن جو حیات ہوگی وہ حیات ہر کسی کو نظر آجائے گی۔

اس کے درمیان کا جو وقت ہے یعنی موت کے بعد اور قیامت کے دن اٹھنے

سے پہلے تک اب اس میں جو حیات ملتی ہے اعادہ روح کے ساتھ تو یہ ایسی حیات ہے کہ جو بندے کو نظر نہیں آتی اور اس کے نظر نہ آنے کی وجہ قرآن کریم نے بیان کی ہے:

﴿وَمِنْ وَدَّ آيِهِمْ بَرَزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾<sup>18</sup>

یہ اس لیے نظر نہیں آتی کہ اس حیات پر پردہ ہے اور جو چیز پردے میں ہو وہ موجود تو ہوتی ہے لیکن نظر نہیں آتی۔ تو بعض لوگ پردہ کے نیچے والی چیز کا انکار کر دیتے ہیں، وجہ کہ وہ نظر نہیں آرہی ہے اس لیے نہیں مانتے، حالانکہ وہ ہوتی ہے اگرچہ نظر نہیں آتی۔ تو قبر والی حیات کھلی حیات نہیں ہوتی، قبر والی حیات مخفی حیات ہوتی ہے، اسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر ماننا پڑتا ہے اور وہ حیات کیسی ہے؟ میں صرف اس پر ایک حدیث سناتا ہوں۔

حدیث پاک میں ہے کہ جب انسان کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں۔ ایک کا نام منکر اور دوسرے کا نام نکیر ہے۔ وہ اس میت سے سوال کرتے ہیں۔ ایک سوال یہ کرتے ہیں: ”مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ؟“ تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تمہارا کیا نظریہ ہے؟ بندہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور رسول تھے۔ یہ ٹھیک جواب دے دیتا ہے تو قبر اس کے لیے وسیع کر دی جاتی ہے اور نور سے بھر دی جاتی ہے۔ فرشتے اسے کہتے ہیں: ”كَمْ كُنْتُمْ مَوْتًا الْعَرُوسِ“ سو جا جس طرح پہلی رات کی دلہن سوتی ہے۔<sup>19</sup>

اب اس کو جو موت ملی ہے یہ موت ایسی ہے جو بصورت نیند ہے لیکن وہ نیند

18۔ المؤمنون 100:23

19۔ سنن الترمذی، رقم: 1071

عالم دنیا کی نہیں ہے بلکہ عالم برزخ کی ہے، عالم دنیا کی نیند نظر آتی ہے اور عالم برزخ کی نیند نظر نہیں آتی، صرف پیغمبر کے فرمانے پر مانی جاتی ہے۔ اس لیے قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ

لَا تَشْعُرُونَ﴾<sup>20</sup>

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ کہو! بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں ہے۔

یہ حیات کسی خاص شہید کے لیے ہے یا ہر شہید کے لیے؟ اگر خاص شہید کے لیے ہوتی تو ہم کہتے کہ یہ خرق عادت ہے، یہ اس شہید کی کرامت ہے بلکہ یہ حیات ہر شہید کے لیے ہے کہ اللہ اسے موت کے بعد حیات دیتے ہیں۔ اب یہ حیات قیامت کے بعد والی نہیں ہے بلکہ قیامت سے پہلے قبر والی حیات ہے لیکن یہ حیات کیسی ہے؟ فرمایا: ﴿لَا تَشْعُرُونَ﴾ تم اس حیات کو اپنے آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے، تم اس کو محسوس نہیں کر سکتے۔ معلوم ہوا کہ قبر والی جو حیات ہے یہ مخفی حیات ہے یہ کھلی حیات نہیں ہے، کھلی حیات کو مشاہدے والی حیات کہتے ہیں اور مخفی حیات کو غیب والی حیات کہتے ہیں۔ اس لیے دنیا والی حیات کا کوئی انکار کر بھی دے تو اسے کہیں گے کہ تو اندھا ہے تجھے نظر نہیں آ رہا لیکن قبر والی حیات کا کوئی انکار کر دے تو اسے یہ نہیں کہتے کہ تو اندھا ہے تجھے نظر نہیں آ رہا ہے بلکہ اسے یہ کہتے ہیں کہ تو بے ایمان ہے، پیغمبر کی بات پر یقین نہیں کر رہا۔ اس لیے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر یقین کرتے ہیں اور قبر والی حیات جو مخفی ہے اسے مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سارے عقائد سمجھنے

کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

## معبودانِ باطلہ کے باطل ہونے کی مثال:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاستَمِعُوا لَهُ ۖ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ ۖ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ﴾ ﴿٤٦﴾

اے لوگو! ایک مثال بیان کی جا رہی ہے اسے غور سے سنو! تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے اگرچہ سارے اس کام کے لیے اکٹھے بھی ہو جائیں تب بھی نہیں کر سکتے اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو یہ اسے واپس بھی نہیں لاسکتے۔ تو جو لوگ پکار رہے ہیں اور جن کو پکارا جا رہا ہے یہ دونوں کتنے کمزور ہیں!

یہاں ایک مثال دی ہے کہ یہ مشرک جن جھوٹے اور پتھر کے بنائے ہوئے بتوں کی پوجا کرتے ہیں ان کو یہ ذہن بنالینا چاہیے کہ یہ سارے معبود مل کر بھی ایک مکھی کو پیدا نہیں کر سکتے۔ مکھی کو پیدا کرنا تو دور کی بات ہے اگر مکھی ان سے کوئی چیز اچک کر لے جائے تو سارے مل کر مکھی سے وہ چیز واپس بھی نہیں لے سکتے۔ ان میں سے کسی بت کی آنکھ پر مکھی بیٹھ جائے تو یہ اڑا بھی نہیں سکتے۔ ان کے منہ سے کوئی چیز لے جائے تو یہ واپس لے بھی نہیں سکتے۔ ان کی حالت یہ ہے ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ﴾ کہ مانگنے والا بھی کمزور ہے یعنی مشرک اور جن سے مانگ رہے ہیں یعنی بت وہ بھی کمزور ہیں۔ تو کمزوروں سے نہیں مانگا جاتا بلکہ قوی اور طاقت ور سے مانگا جاتا ہے، اسی لیے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ کہ اللہ طاقت والا بھی ہے اور غالب بھی ہے، تو کمزوروں کو چھوڑو اور طاقت والے کی طرف رجوع کرو۔

## مناقب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ:

یہاں پر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ ذہن میں رکھ لیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ کے والد حضرت ابو قحافہ ان کو بت خانے میں لے گئے اور وہاں جا کر حضرت ابو بکر سے کہا کہ ان بتوں کی عبادت کرو! یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے پہلے کی بات ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں جنہوں نے زمانہ جاہلیت میں بھی کبھی شرک نہیں کیا۔ آپ ایسے سلیم الفطرت انسان تھے۔ باپ نے کہا کہ بتوں کی عبادت کرو۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس بات سے فرمانے لگے: مجھے بھوک لگی ہے، کھانا دو! مجھے پیاس لگی ہے، پانی دو! حضرت ابو بکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے والد نے یہ معاملہ دیکھ کر انہیں تھپڑ مارا اور کہنے لگے: یہ سن سکتے ہیں؟ یہ تمہیں کھانا دے سکتے ہیں؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابا جان! اگر یہ کھانا نہیں دے سکتے تو میں ان کو سجدہ کیسے کروں؟ جب یہ بات صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی والدہ کو پتا چلی تو انہوں نے اپنے خاوند حضرت ابو قحافہ سے کہا: اس بیٹے کو مارا نہ کرو کیونکہ جب یہ پیدا ہوا تھا تو بوقتِ پیدائش میرے کان میں غیب سے ایک آواز آئی تھی:

يَا أَمَّةَ اللَّهِ عَلَى التَّحْقِيقِ! أَبَشِّرْ حَى بِالْوَلَدِ الْعَتِيقِ! ائْمَةُ فِي السَّمَاءِ  
الصِّدِّيقِ، لِمُحَمَّدٍ صَاحِبٍ وَرَفِيقٍ.<sup>21</sup>

اے اللہ کی بندی! تجھے ایسے بچے کی بشارت ہو جو جہنم کی آگ سے آزاد ہے، اس کا نام آسمان میں صدیق لکھ دیا گیا، یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دوست ہو گا اور ان کا صحابی ہو گا۔

## تمہارا خواب میری نبوت کی دلیل ہے:

ابھی اعلانِ نبوت بھی نہیں ہوا کہ صدیق اکبر کے لیے بشارت آرہی ہے۔ بات چل پڑی ہے تو میں اس پر ایک واقعہ اور سنا دیتا ہوں۔ ”الخصائص الکبریٰ“ میں امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی جوانی میں اعلانِ نبوت سے قبل تجارت کے لیے شام میں گئے۔ وہاں ایک خواب دیکھا اور عیسائی راہب سے اس خواب کی تعبیر پوچھی۔ اس عیسائی راہب نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس کی تعبیر یہ ہے:

يَبْعَثُ نَبِيٌّ مِنْ قَوْمِكَ تَكُونُ وَزِيرًا فِي حَيَاتِهِ وَخَلِيفَةً بَعْدَ مَوْتِهِ.

کہ تمہاری قوم میں سے ایک نبی مبعوث ہوگا، تم زندگی میں اس کے نائب اور اس کی وفات کے بعد اس کے خلیفہ ہو گے۔

یہ تعبیر تھی سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس خواب کی۔ آپ نے تعبیر کو سنا۔ آگے لکھا ہے:

فَأَمَرَهَا أَبُو بَكْرٍ حَتَّى بُعِثَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

اس تعبیر کو چھپا لیا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، تو ابو بکر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

يَا مُحَمَّدُ! مَا الدَّلِيلُ عَلَى مَا تَدَّعِي؟

آپ کے اس دعویٰ نبوت پر کیا دلیل ہے؟ کیونکہ ابھی تک کلمہ نہیں پڑھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الرُّؤْيَا النَّبِيَّ رَأَيْتُ بِالشَّامِ.

میری نبوت پر دلیل تیرا وہ خواب ہے جو تو نے شام میں دیکھا ہے۔ صدیق اکبر نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔ اس روایت میں ہے: فَعَانَقَهُ وَقَبَّلَ مَا بَيْنَ



عَيْنِيَّہ۔ کہ سینے سے لگ گئے اور پیشانی کا بوسہ لیا۔<sup>22</sup>

محدثین نے لکھا ہے صدیق اکبر کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ پہلے صحابی ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حالت ایمان میں پہلی بار ملے ہیں تب بھی پیشانی چومی ہے اور جب آخری بار ملے ہیں تب بھی پیشانی چومی ہے، چوم کے آیا ہے اور چوم کے رخصت کیا ہے۔

آپ بتائیں! صدیق نے نبی کی پیشانی چومی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین) آج کسی عالم کی پیشانی کو بوسہ دینا بدعت کیسے ہوا؟ تو لوگ ان چیزوں پر پتا نہیں بدعات کے فتوے کس طرح لگا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### سورۃ حج کے آخر میں سجدہ تلاوت نہ ہونے کی دلیل:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا  
الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

اس آیت پر امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں سجدہ تلاوت ہے۔ ہمارے ہاں سجدہ تلاوت نہیں ہے۔ آپ حاشیہ میں دیکھیں گے یہاں لکھا ہوگا ”السجدة عند الشافعي“ امام شافعی اس پر سجدہ کرتے ہیں، امام ابو حنیفہ کے ہاں اس پر سجدہ نہیں ہے۔ ہماری امام شافعی سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔ ہم اس بارے میں اپنی دلیل پیش کرتے ہیں۔ ہمارے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت پر سجدہ اس لیے نہیں کہ اس میں ہے: ﴿ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا﴾ تو رکوع اور سجدہ دونوں کا حکم ہے اور

جہاں رکوع اور سجدہ دونوں کا حکم ہو تو وہ سجدہ تلاوت نہیں ہوتا بلکہ سجدہ نماز ہوتا ہے۔  
لہذا اس کا تعلق سجدہ تلاوت سے نہیں بلکہ اس کا تعلق سجدہ نماز سے ہے۔

### دین میں حرج نہ ہونے کا مطلب:

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ

فِي الدِّينِ مِنْ حَرْجٍ﴾

اللہ رب العزت نے فرمایا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کا حق ہے، اس کے لیے اللہ نے تمہارا انتخاب کیا ہے اور اللہ نے دین میں حرج نہیں رکھا۔  
دین میں بہت آسانی ہے لیکن آسانی کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ جہاں تھوڑی سی سختی آئے تو شریعت کا حکم بدل ڈالو! دین میں حرج نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا حکم اپنے بندے کو نہیں دیتے جس پر عمل کرنا بندے کے بس میں نہ ہو۔ ایک ہوتا ہے مشکل نہ ہو اور ایک ہوتا ہے بندے کے بس میں نہ ہو... تو مشکل ہونا اور ہوتا ہے اور بس میں نہ ہونا اور ہوتا ہے، اور جہاں بس میں نہیں ہوتا وہاں اللہ تعالیٰ تخفیف کا فیصلہ فرما کر سہولت اور رعایت بھی عطا فرماتے ہیں۔

تو حرج کا معنی یہ نہیں ہے کہ کسی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اور کہتا ہے کہ دین میں تو حرج نہیں لہذا اس کو ایک شمار کرو! کسی نے بندے کو قتل کر دیا اور اب کہتا ہے کہ مجھے قصاص میں نہ مارو کیونکہ شریعت میں حرج نہیں ہے۔ یاد رکھو! اس طرح سے ”حرج نہ ہونے“ کی تشریح کر کے احکام شریعت کو تبدیل کر دینا ہمارے بس میں نہیں ہے، ہم کیسے احکام کو بدلیں؟! حرج نہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ شریعت کے کہنے پر صرف ایک طلاق دو اس میں آسانی ہے اور اس میں حرج اور تنگی نہیں ہے۔  
اب تم نے تین اکٹھی دی ہیں تو شریعت نے جو آسانی رکھی تھی اس کو تم نے خود ہی ختم کر دیا ہے تو اس میں شریعت کا کیا قصور! حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہی بات فرماتے تھے:

إِنَّ النَّاسَ قَدْ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرِ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أَثَاةٌ. <sup>23</sup>

لوگوں کو جس کام میں آسانی تھی انہوں نے اس میں جلد بازی سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔

### ملت اور امت کا معنی:

﴿مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ﴾

دوسری بات یہ فرمائی کہ تم ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہو۔ اس پر میں پہلی بات کر چکا ہوں کہ ہم امت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں اور ملت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہیں۔ ”ملت“ اسے کہتے ہیں کہ ان کے اصولوں میں اشتراک ہو اور ”امت“ اسے کہتے ہیں کہ ان کے اصول اور فروع دونوں میں اتفاق ہو۔ اصولوں میں ہمارا اشتراک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہے لیکن اصول اور فروع دونوں میں اشتراک اللہ کے نبی کے ساتھ ہے۔ تو ہم ملت ابراہیمی ہیں اور امت محمدی ہیں۔

### امت دعوت اور امت اجابت:

مزید ایک بات سمجھیں کہ ایک امت دعوت ہوتی ہے اور ایک امت اجابت۔ جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کریں انہیں امتِ اجابت کہتے ہیں اور جو حضور کا کلمہ نہ پڑھے اسے امت دعوت کہتے ہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں آواز لگ رہی ہے کہ ”بھائیو! سارے امتی بن کر جیو!“ تو میں بھی کہتا ہوں کہ بن کر جیو لیکن امتِ اجابت بن کر جیو، امت دعوت بن کر نہ جیو! امتِ اجابت اور ہوتی ہے اور امت دعوت اور ہوتی ہے۔ دونوں امت ایک کیسے ہو سکتی ہیں؟! بتاؤ کہ کافر اور مسلمان ایک ہو جائیں یہ کیسے ممکن ہے؟ کافر امت دعوت ہیں اور ہم امتِ اجابت ہیں۔ قیامت کے

دن جنت میں صرف اسی نے جانا ہے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو قبول کیا ہو گا۔

## ”مسلمان یا حنفی؟“ کا آسان جواب:

﴿هُوَ سَمُّكُمْ الْمُسْلِمِينَ﴾

ابراہیم علیہ السلام نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ ہم بھی اپنا نام مسلمان رکھتے ہیں لیکن ہمارا نام مسلمان ہونے کے باوجود ہم اپنے آپ کو ”حنفی“ بھی کہتے ہیں۔ اس پر لوگ کہتے ہیں کہ حنفی نہ رکھو، یہ قرآن کے خلاف ہے۔

اب اگر کوئی بندہ آپ سے پوچھے کہ آپ کی قومیت کیا ہے؟ سرگودھایا پاکستان؟ تو آپ اپنے آپ کو سرگودھا کا کہتے ہو؟ (نہیں بلکہ پاکستانی کہتے ہیں۔ سامعین) آپ کی کوئی جماعت رائے ونڈ جائے اور وہاں حضرات پوچھیں کہ تم کہاں سے آئے ہو تو آپ کہتے ہو کہ سرگودھا سے لیکن جب آپ پاکستان سے باہر حج پر گئے ہوں اور اب کوئی شخص آپ سے پوچھے کہ کہاں سے آئے ہو؟ تو آپ کیا جواب دیں گے؟ (پاکستان سے۔ سامعین) اور اگر دو پاکستانی اکٹھے ہو جائیں اور وہ پوچھیں تو اب کیا جواب دیں گے؟ (سرگودھا۔ سامعین)

اسی طرح جب آپ سے کوئی پوچھے کہ آپ مسلمان ہو یا کافر؟ تو جواب ہو گا مسلمان! تو یہ جو فرمایا: ﴿هُوَ سَمُّكُمْ الْمُسْلِمِينَ﴾ یہ کافروں کے مقابلے میں فرمایا ہے اور کفار کے مقابلے میں ہم مسلمان ہیں۔

اب مسلمانوں میں چار امام ہیں: امام اعظم ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ۔ تو آپ سے کوئی پوچھے کہ کس امام کے مقلد ہو؟ اور آپ جواب دیں کہ امام اعظم ابو حنیفہ کے تو آپ کا اپنے آپ کو حنفی کہنا یہ ﴿هُوَ سَمُّكُمْ

اَلْمُسْلِمِيْنَ ﴿﴾ کے خلاف نہیں ہو گا۔

## دین ایک اور مذہب کئی:

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی کر دوں۔ یاد رکھیں کہ دین اور مذہب میں فرق ہے۔ دین کہتے ہیں ان مسائل کو جو منصوصات ہیں، منصوصات کا معنی کہ جو صاف صاف قرآن اور حدیث میں ہیں، اور مذہب کہتے ہیں اجتہادات کو۔ تو دین ایک ہے اور مذہب چار ہیں۔ اب میں آپ کو یہ بات سمجھاؤں تو بات لمبی ہو جائے گی کہ دین ایک ہو تو مذہب چار کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس کے لیے مختصراً آپ ایک حدیث ذہن میں رکھ لیں۔ سنن نسائی میں روایت موجود ہے۔ دو صحابی سفر پہ تھے۔ نماز کا وقت ہو گیا تو ان دونوں نے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی کیونکہ پانی نہیں تھا۔ ابھی نماز کا وقت باقی تھا کہ پانی مل گیا۔ اب کیا کریں؟ پہلی نماز کافی ہے یا اب دوبارہ پڑھیں۔ ان میں سے ایک صحابی نے وضو کیا اور نماز کا اعادہ کیا اور دوسرے صحابی نے وضو نہیں کیا بلکہ پہلی نماز کو کافی سمجھا۔ اب ان کی دلیل کیا تھی؟ میں سمجھانے کے لیے کہتا ہوں کہ جن صحابی نے وضو نہیں کیا اور پہلی نماز کو کافی سمجھا ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾<sup>24</sup> کہ جب پانی نہ ملے تو تیمم کر لو، میں نے تیمم کر لیا اور نماز بھی پڑھ لی تو حکم پورا ہو گیا، اب پانی مل بھی جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دوسرے صحابی نے دوبارہ وضو کر کے نماز پڑھی تو ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ کہ پانی نہیں ملا تب تیمم کرو، میں نے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی لیکن اب وقت میں اندر چونکہ پانی مل گیا ہے تو

اب وضو کر کے دوبارہ نماز پڑھنی پڑے گی۔

### اجتہادی اختلاف کی مثالیں:

اب دیکھو! دین ایک ہی ہے، آیت ایک ہی ہے لیکن مذہب دو ہو گئے۔ ایک نے ایک مسئلہ نکالا اور دوسرے نے دوسرا مسئلہ نکالا، اجتہاد دونوں نے کیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم لڑنے والے نہیں تھے۔ انہیں الجھن پیش آئی تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حل پوچھ لیا۔ خیر جب یہ دونوں مدینہ منورہ آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمارے ساتھ یہ مسئلہ پیش آیا تھا، میں نے تو نماز دوبارہ لوٹائی تھی وضو کر کے اور اس نے نہیں لوٹائی۔ حدیث پاک میں ہے کہ جس آدمی نے نماز دوبارہ نہیں پڑھی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا:

"أَصَبَّتِ السُّنَّةُ."<sup>25</sup>

کہ اصل مسئلہ تیرا ہے۔ یہ اصل مسئلہ ہے کہ دوبارہ نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں تھی اور فرمایا کہ جس نے دوبارہ نماز پڑھ لی مسئلہ نکالنے میں تو اس سے خطا ہو گئی لیکن چونکہ اس نے اجتہاد کیا ہے اس لیے اللہ اسے دو نمازوں کا ثواب دے گا۔

اب مذہب ایک ہو گیا یا دو ہو گئے؟ (دو ہو گئے۔ سامعین) اگر امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کے دو مذہب ہو جائیں تو لوگ کہتے ہیں کہ دین تو ایک ہے اور مذہب دو کیسے ہو گئے؟

صحیح بخاری میں روایت موجود ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ خندق سے فارغ ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنو قریظہ پر حملہ کرنا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

"لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدُ الْعَصْرِ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ."

عصر کی نماز تم نے بنی قریظہ میں پڑھنی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم راستے میں تھے کہ سورج غروب ہونے کا وقت قریب ہو گیا۔ بعض صحابہ نے کہا کہ ہم تو ابھی نماز پڑھیں گے، نماز قضا نہیں کریں گے۔ دوسروں نے کہا کہ نماز قضا ہوتی ہے تو ہونے دو ہم تو بنی قریظہ کے محلے میں جا کے ہی پڑھیں گے۔ اب یہ اختلاف کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تم نے عصر کی نماز بنو قریظہ کے محلے میں پڑھنی ہے تو ہم کون ہوتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بدلنے والے! نماز قضا بھی ہو جائے تب بھی ہم نے تو وہیں جا کر پڑھنی ہے۔ تو انہوں نے حدیث کا مطلب یہ سمجھا اور دوسرے صحابہ کہنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ جلدی جلدی جاؤ تاکہ عصر تک وہاں پہنچ جاؤ، اب چونکہ ہمیں دیر ہو گئی ہے تو نماز کو تو قضا نہیں کرنا، اس لیے ہم نے تو نماز پڑھنی ہے۔ جب واپسی ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو آپ علیہ السلام نے کسی کی بھی سرزنش نہیں کی بلکہ دونوں کو ٹھیک قرار دیا۔<sup>26</sup>

یہاں بھی حدیث ایک ہے لیکن مذہب کتنے ہو گئے؟ (دو۔ سامعین)

اس پر قرآن کریم سے بھی مثال سن لیں تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ ان کے پاس قرآن نہیں ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے دور میں ایک آدمی کی بکریوں نے کسی کا کھیت چر لیا تھا۔ اب یہ لوگ اپنا قضیہ لے کر حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس گئے تو داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ کھیت کی قیمت لگاؤ اور بکریوں کی قیمت لگاؤ۔ قیمت لگی تو بکریوں کی قیمت کھیت کے برابر تھی۔ فرمایا کہ کھیت والے کو بکریاں دے دو۔ پھر یہ

فیصلہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس لے جایا گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام چھوٹے ہیں اور بیٹے ہیں۔ انہوں نے فیصلہ یہ کیا کہ جس آدمی کی یہ بکریاں ہیں اس کو کھیت دے دو اور جس کا کھیت ہے اس کو یہ بکریاں دے دو۔ کھیت والا بکریاں چراتا رہے اور دودھ پیتا رہے اور بکریوں والا کھیت پر محنت کرے۔ جب کھیت اپنی اصلی حالت پر آجائے تو کھیت کو مالک کے حوالے کر کے اپنی بکریاں لے لے۔

اب دیکھو! ایک اجتہاد حضرت داؤد علیہ السلام کا ہے اور ایک اجتہاد حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اس وقت یہ مخلوق نہیں تھیں ورنہ انہوں نے تو یہ کہنا تھا کہ ایک ہی سچا ہے، دونوں سچے نہیں ہو سکتے۔ معاذ اللہ۔

آج لوگ کہتے ہیں کہ یا تو امام ابو حنیفہ ٹھیک ہیں یا امام شافعی ٹھیک ہیں، دونوں ٹھیک کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ جب دونوں نبی ٹھیک ہو سکتے ہیں اور دونوں صحابی ٹھیک ہو سکتے ہیں تو چاروں امام بھی ٹھیک ہو سکتے ہیں!

### چاروں برحق اور مسئلہ ایک کا ٹھیک:

آج کے دور کی ایک مثال سمجھو۔ بارہ آدمی تبلیغی جماعت میں نکلے ہیں یا دین پڑھنے کے لیے نکلے ہیں یا کسی خانقاہ میں اپنے شیخ سے ملنے کے لیے نکلے ہیں۔ راستے میں ایسی جگہ سے گزر رہے ہیں جہاں آبادی نہیں ہے۔ نماز کا وقت ہو گیا اور مطلع ابر آلود ہے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا کہ قبلہ کس طرف ہے؟! اب ان میں اختلاف ہو گیا کہ قبلہ کدھر ہے۔ نہ تو ان کے پاس کمپاس ہے، نہ شمال کا پتا ہے اور نہ کوئی بتانے والا ہے۔ ان میں سے تین بندے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے بہت غور کیا ہے کہ قبلہ اس طرف ہے تو انہوں نے اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لی۔ دوسرے تین کہنے لگے کہ ہمارا دل مانتا ہے کہ قبلہ اس طرف ہے تو انہوں نے اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ تیسرے تین



کہتے ہیں کہ ہمارا دل کہتا ہے کہ اس طرف ہے تو انہوں نے اسی طرف رخ کیا۔ باقی جو تین بچ گئے تھے وہ کہنے لگے کہ ہمارا دل مانتا ہے کہ قبلہ اس جانب ہے تو انہوں نے اسی رخ کو لیا۔ اب آپ بتائیں کہ نماز کس کی ہوئی؟ (چاروں کی۔ سامعین) قبلہ کس کا ٹھیک ہے؟ (ایک کا۔ سامعین) اور یہ کون جانتا ہے؟ (اللہ جانتا ہے۔ سامعین)

تو ہم ان چاروں کو ٹھیک کہیں گے کہ ان چاروں کی نماز صحیح ہے، ہم کسی کے خلاف فتویٰ نہیں دیں گے لیکن حقیقت میں مسئلہ کس کا ٹھیک ہے یہ ہم نہیں جانتے بلکہ یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ اسے علماء کی زبان میں کہتے ہیں کہ چاروں میں سے عند اللہ ایک امام ٹھیک ہے اور عند الناس چاروں برحق ہیں یعنی ہم سب کو برحق کہیں گے لیکن جس سے خطا ہو گئی اجر اسے بھی ملے گا جیسے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مسئلہ تو اس کا ٹھیک ہے جس نے تیمم کر کے نماز ادا کرنے کے بعد دوبارہ ادا نہیں کی لیکن جس نے وضو کر کے دوبارہ ادا کی ہے اسے دو نمازوں کا ثواب ملے گا۔

اللہ ہم سب کو شریعت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة المؤمنون

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١﴾ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ﴿٢﴾﴾

### سورت کے فضائل و خصوصیات:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی آتی تھی تو عام طور پر ایسی آواز ہوتی جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں، ان کے اڑنے سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے، جب وہ آواز ختم ہوتی تو ہم سمجھ جاتے کہ آپ پر وحی آچکی ہے۔ ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے آواز آنا شروع ہوئی تو ہم بھی قریب ہو گئے تاکہ دیکھیں کہ نئی وحی کیا آئی ہے۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ رخ ہو کر یہ دعا مانگی:

"اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَآكِرِمْنَا وَلَا تُيْهِنَّا وَاعْظِمْنَا وَلَا تَحْزِمْنَا

وَآثِرْنَا وَلَا تُؤَيِّرْنَا عَلَيْنَا وَارْضِنَا وَارْضَ عَنَّا." <sup>27</sup>

کہ اے اللہ! ہمیں زیادہ عطا فرما، کمی نہ فرما، ہمیں عزت عطا فرما ہمیں ذلت سے محفوظ فرما، ہمیں بخشش عطا فرما ہمیں محروم نہ فرما، ہمیں دوسروں پر ترجیح دے دوسروں

کو ہم پر ترجیح دے، ہم سے راضی ہو جا اور ہمیں بھی اپنی رضا سے راضی کر دے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابھی مجھ پر دس آیات ایسی نازل ہوئی ہیں کہ جو شخص ان پر پورا پورا عمل کرے وہ سیدھا جنت میں جائے گا۔<sup>28</sup>

### مومنین کی سات صفات:

سورة المؤمنون کی پہلی دس آیات میں ایمان والوں کی سات خاص صفات ذکر کی گئی ہیں:

[1]: ﴿الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾

کہ نماز عاجزی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

[2]: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ﴾

کہ فضول کاموں اور فضول باتوں سے بچتے ہیں۔ یہ بات خود حدیث مبارک میں بھی ہے کہ ”إِنَّ مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ“<sup>29</sup> کہ یہ آدمی کے اسلام کی خوبی ہے کہ فضولیات سے بچتا ہے۔

[3]: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ﴾

کہ وہ لوگ زکوٰۃ پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

[4]: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ﴾

کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شرمگاہ کی حفاظت پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ ایک حدیث مبارک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

28- تفسیر ابن کثیر: ج 4 ص 463

29- سنن الترمذی، رقم: 2318

"مَنْ يَصْنَعْ لِي مَآبَيْنَ لِحَيِّهِ وَمَآبَيْنَ رِجْلَيْهِ أَصْمَنَ لَهُ الْجَنَّةُ".<sup>30</sup>

کہ جو شخص مجھے اپنی زبان اور اپنی شرمگاہ کی ضمانت دے تو میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

گناہ شروع ہوتا ہے دیکھنے سے، آنکھ دیکھتی ہے اور ہاتھ پکڑتا ہے پھر شرمگاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے اور انجام بہت برا ہوتا ہے۔ اس لیے جو بد کرداری سے بچنا چاہے اس کا سب سے پہلا حل یہ ہے نا محرموں سے بچے، اپنی نگاہ کی حفاظت کرے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

ہمارے مشائخ نے بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا اور فرمایا ہے کہ جب تک بچے کے چہرے پر ڈاڑھی نہ آئے بلا وجہ اس کے چہرے پر نگاہ نہیں ڈالنی چاہیے، اس سے بچنا چاہیے۔ جب تک چہرے پر ڈاڑھی نہ ہو ایسے بچے کو امر دیکھتے ہیں۔ اس سے بچنا ضروری ہے، خلوت میں اس کے ساتھ کبھی نہ بیٹھیں۔ اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔

### امام محمد کا ایک ہفتے میں حفظ قرآن:

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ اس بارے میں معروف ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ بہت خوبصورت تھے اور بچپن میں پڑھنے کے لیے حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے پاس آئے۔ امام اعظم دوران سبق ان کو سامنے نہیں بٹھاتے تھے بلکہ پشت کے پیچھے بٹھاتے تھے۔ یہ کون ہیں! امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت۔

اور امام محمد کون ہیں؟ ذرا ان کی قابلیت کو دیکھنا کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے والد اپنے بیٹے امام محمد کو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے پاس لائے کہ ان کو درس گاہ میں بٹھائیں اور پڑھائیں۔ فرمایا: کیا یہ قرآن کا حافظ ہے؟ عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا: میری

درسگاہ میں بیٹھنے کی شرط یہ ہے کہ طالب علم قرآن کا حافظ ہو۔ امام محمد کے والد ایک ہفتے کے بعد پھر اپنے بیٹے کو لائے کہ میرے بیٹے کو کلاس میں بٹھالیں! فرمایا تم پچھلے ہفتے بھی لائے تھے تو میں نے بتایا تھا میری شرط ہے کہ طالب علم قرآن کا حافظ ہو، اس لیے پہلے اس کو حفظ کراؤ! تو امام محمد کے والد نے کہا، ”جی میرا بیٹا قرآن حفظ کر کے آگیا ہے۔“ یہ تھے امام محمد۔ ایک ہفتے میں مکمل قرآن حفظ کرنے والا آدمی لیکن امام صاحب نے اپنے سامنے نہیں بٹھایا بلکہ پشت کے پیچھے بٹھایا۔ اس لیے جب انسان بے احتیاطی کرتا ہے تو گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو ان گناہوں سے بچاؤ! یہ گناہ ایسے ہیں کہ دنیا میں بھی ذلت اور آخرت میں بھی ذلت اٹھانی پڑتی ہے اور ایمان تباہ ہو جاتا ہے، اعمال تباہ ہو جاتے ہیں، حافظہ کمزور ہو جاتا ہے، پڑھائی سے دل اچاٹ ہو جاتا ہے اور یہ ایسا عجیب گناہ ہے کہ جب لگ جائے پھر انسان کی جان نہیں چھوڑتا۔

### خود کو گناہوں سے بچائیے!

ہمارے حضرت عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جو شخص زمانہ طالب علمی میں اس گناہ میں مبتلا ہو جائے وہ مہتمم اور شیخ الحدیث بھی بن جائے تب بھی اس گناہ سے جان نہیں چھوڑتی، اس لیے زمانہ طالب علمی سے ہی احتیاط کرو اور جبر کے ساتھ خود کو سنبھالو۔

﴿إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ﴾

ایمان والے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرتے ہیں، ہاں اپنی بیوی ہو یا اپنی باندی ہو تو پھر جائز ہے۔ آپ اندازہ فرمائیں کہ شرمگاہ کا استعمال ان دو کے علاوہ کرنا حرام ہے، زنا ہو تب بھی حرام ہے، مشت زنی ہو تب بھی حرام ہے، لواطت ہو تب بھی حرام ہے، بیوی کا پچھلا حصہ استعمال کرو تب بھی حرام ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَلْعُونٌ مِّنْ أَتَىٰ أَمْرًا أَكَّفَىٰ ذُبْرَهَا." <sup>31</sup>

کہ جو شخص عورت کا پیچھے والا حصہ استعمال کرے تو وہ ملعون ہے۔

اپنی ہی بیوی ہو اور حالت حیض اور حالت نفاس میں ہمبستری کرے تب ہی حرام ہے۔ تو دیکھو! شریعت نے کس حد تک منع کیا ہے۔ اس لیے یہ ساری صورتیں اس میں شامل ہیں۔ نامحرم عورت سے زنا کرنا بھی شامل ہے، لواطت بھی شامل ہے، اپنی عورت کا پچھلا حصہ استعمال کرنا بھی شامل ہے، حالت حیض اور نفاس میں اگلا حصہ استعمال کرنا بھی شامل ہے۔ اس لیے ان تمام قسم کے گناہوں سے بچنا ضروری ہے۔

### مسائل میں جھک سے کام نہ لیں:

اور مسائل بیان کرتے وقت جھک سے کام نہیں لینا چاہیے۔ مسائل کھل کر بیان کرنے چاہئیں۔ ہمارے حضرت حکیم محمد اختر رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔ میں نے اپنے کانوں سے حضرت کی مجالس میں سنا ہے۔ فرمایا کہ تم شلواریں اتارتے ہو اور تمہیں شرم نہیں آتی اور جب میں کہتا ہوں کہ شلواریں اتارو تو کہتے ہو کہ اختر کیسی باتیں کرتا ہے! تم بلیویرنٹ اور ننگی فلمیں بند کمرے میں دیکھتے ہو تمہیں شرم نہیں آتی اور جب میں کہتا ہوں یہ کام نہ کرو تو تم کہتے ہو کہ اختر کیسی باتیں کرتا ہے! تم دوسروں کے بچوں کو گندی نگاہ سے تاڑتے ہو تمہیں شرم نہیں آتی اور جب میں کہتا ہوں کہ مت تاڑو! تو کہتے ہو کہ اختر کیسی بات کرتا ہے! اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

[6:5]: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْنَتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ دُعُونَ﴾

ایمان والے امانات کا خیال کرتے ہیں اور معاہدات کا خیال کرتے ہیں۔

[7]: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾

اور نماز کی پابندی کرتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے یہ سات اوصاف بیان کیے ہیں۔ شروع بھی نماز سے کیا ہے اور ختم بھی نماز پر کیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ فرمائیں کہ نماز کتنی اہم چیز ہے۔ جو لوگ نوافل کا اہتمام کرتے ہیں وہ سنن اور واجبات کا بھی اہتمام کرتے ہیں اور جو سنن اور واجبات کا اہتمام کرتے ہیں وہ فرائض کا بھی اہتمام کرتے ہیں، فرض کی حفاظت کے لیے نوافل کا اہتمام بہت ضروری ہے، نوافل کا اہتمام نہ کریں تو فرض کا اہتمام نہیں ہوتا۔

### نماز میں رفع یدین نہ کرنے کی دلیل:

﴿الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَشِعُونَ﴾

جہاں خشوع کی اور تفسیریں ہیں ان میں سے ایک تفسیر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ بھی مروی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں:

خُشِعُونَ مُتَوَاضِعُونَ لَا يَلْتَفِتُونَ يَمِينًا وَلَا شِمَالًا وَلَا يَزْفَعُونَ  
أَيْدِيَهُمْ فِي الصَّلَاةِ. <sup>32</sup>

کہ خشوع و خضوع والے وہ لوگ ہیں جو نماز میں عاجزی اور انکساری کرتے ہیں اور دائیں بائیں نہیں دیکھتے اور نماز میں رفع الیدین نہیں کرتے۔

تو ہم کہتے ہیں کہ ہم اہل السنۃ والجماعۃ احناف دیوبند نماز پڑھتے ہیں اور نماز میں رفع الیدین نہیں کرتے۔ ہماری دلیل قرآن کریم کی یہی آیت ہے: ﴿الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَشِعُونَ﴾ جو لوگ رکوع جاتے، رکوع سے اٹھتے اور تیسری رکعت سے اٹھ کر رفع یدین کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہماری دلیل بھی قرآن کریم میں ہے:

﴿خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾<sup>33</sup>

یہاں ”مسجد“ سے مراد ہے ”صلوٰۃ“ یعنی ”عند کل صلوٰۃ“ کہ نماز کے وقت زینت کا خیال کیا کرو اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہاں زینت سے مراد رفع الیدین ہے یعنی نماز میں رفع الیدین کا اہتمام کرو۔ تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ایک صحابی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ایک آیت کی تفسیر کریں جس کا معنی ہو کہ نماز میں رفع الیدین نہ کرو تو احناف کہتے ہیں کہ رفع الیدین نہ کرنا قرآن سے ثابت ہو گیا اور اگر ایک صحابی عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب رفع الیدین کرنے کی تفسیر کرتے ہیں تو رفع الیدین کرنا بھی تو قرآن سے ثابت ہو گیا۔

ہم کہتے ہیں کہ بات سمجھو! دو لفظ الگ الگ ہیں؛ ایک ہے لفظ ”فی“ اور ایک ہے لفظ ”عِنْدَ“ ہے۔ لفظ ”فی“ کا معنی ہوتا ہے میں اور اندر، اور لفظ ”عِنْدَ“ کا معنی ہوتا ہے پاس۔ تو نماز میں دو قسم کے رفع یدین ہیں؛ ایک رفع یدین ہے تکبیر تحریمہ کے وقت، یہ ہے ”عند“ اور ایک ہے رکوع کرتے وقت، یہ ہے ”فی“۔ یعنی ایک ہے رفع یدین نماز میں کرنا اور ایک ہے رفع یدین نماز کے پاس کرنا۔ تو عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

وَلَا يَرْفَعُونَ أَيْدِيَهُمْ فِي الصَّلَاةِ.

خشوع والے نماز میں رفع یدین نہیں کرتے۔ یہ جو رکوع والا رفع الیدین ہے یہ نماز میں والا رفع یدین ہے لہذا اسے نہ کیا جائے اور ﴿خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ میں مسجد سے مراد نماز ہے اور بقول آپ کے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق نماز کے پاس رفع الیدین کرو تو یہ نماز کے پاس والا رفع یدین وہ ہوتا



ہے جو نماز کے شروع میں ہو یعنی تکبیر تحریمہ والا رفع یدین۔ اب اس کا معنی یہ ہے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رفع یدین کرو یعنی تکبیر تحریمہ والا رفع یدین اور ادھر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نہ کرو یعنی رکوع والا رفع یدین۔ تو تمہارا ایک رفع یدین بھی قرآن سے ثابت نہیں ہے، جو کرنا ثابت ہے وہ بھی ہمارے والا ہے اور جو نہ کرنا ثابت ہے وہ بھی ہمارے والا ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

میں نے کل بھی کہا تھا کہ بات سمجھنا سیکھو! اپنی زبان میں فصاحت پیدا کرو، فصاحت اور بلاغت کا معنی لفاظی نہیں ہے، فصاحت اور بلاغت کا معنی ہے کہ اس طرح گفتگو کرو کہ سامع اور مخاطب کے دل و دماغ میں بات اتر جائے، یوں بات کیا کرو!

### عیدین میں رفع یدین کیوں؟

پھر وہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اچھا! احناف نماز میں رفع الیدین کے قائل نہیں لیکن جب تم عیدین کی نماز پڑھتے ہو تو چھ مرتبہ رفع الیدین نماز میں کرتے ہو ہر تکبیر کے ساتھ اور جب وتر پڑھتے ہو تو تیسری رکعت میں دعائے قنوت کے وقت جب اللہ اکبر کہتے ہو تو رفع الیدین کرتے ہو تو یہ رفع یدین بھی تو نماز میں ہوا، پھر یہ عمل بھی تو تمہارے مسلک کے خلاف ہوا۔

ہم نے کہا: نماز نام ہے اذکار اور افعال کا لیکن اصل نام ہے اذکار کا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں، پھر دوسروں کو سمجھائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾<sup>34</sup> کہ نماز پڑھو تاکہ تم میرا ذکر کرو۔ نماز کا مقصد ہے اللہ کا ذکر کرنا۔ میں بارہا کہتا ہوں کہ ترجمہ کرنا سیکھو۔ اس آیت کا ترجمہ یوں کرو! ”نماز پڑھو تاکہ تم نماز کے ذریعے میرا ذکر کرو!“ لام تعلیل کا ہے۔ معلوم ہوا کہ نماز سے مقصود

اللہ کا ذکر ہے۔ اب نماز میں کچھ اقوال ہوتے ہیں، ان کو ذکر کہنا اور سمجھنا بہت آسان ہے۔ مثلاً ”سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ“ یہ ذکر ہے، ”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ یہ ذکر ہے، ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى“ یہ ذکر ہے، ”الَّتَحِيَّاتُ لِلَّهِ“ یہ ذکر ہے لیکن جو افعال ہیں وہ کیسے ذکر بنیں؟ ہم کہتے ہیں کہ نماز کے وہ افعال جو مقرون بذکر اللہ ہیں وہ ذکر ہی ہیں۔ جیسے ہم نے ہاتھ اٹھائے اور کہا اللہ اکبر، یہ ہاتھ اٹھانا ذکر ہو گیا کیونکہ ہم نے اس کے ساتھ اللہ اکبر کہہ دیا ہے۔ ہم ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوئے اور ”سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ“ پڑھا تو یہ قیام بھی ذکر ہو گیا کیونکہ اس کے ساتھ اللہ کا ذکر مل گیا ہے۔ پھر ہم نے کہا ”سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“ اور کھڑے ہوئے اور ساتھ اللہ کا نام بھی لیا تو گویا کہ کھڑا ہونا بھی ذکر ہو گیا۔ پھر ہم رکوع میں گئے تو کہا اللہ اکبر، ہم سجدے میں گئے تو کہا اللہ اکبر۔ اب جو افعال کے ساتھ ذکر ہے تو اس ذکر کی وجہ سے وہ افعال بھی ذکر ہو گئے۔

اسی طرح جب ہم تکبیراتِ عیدین کہتے ہیں تو ہاتھ اٹھاتے وقت ساتھ کہہ دیتے ہیں اللہ اکبر۔ یہ ہاتھ اٹھانا ایک فعل ہے لیکن ساتھ اللہ کا نام لیا تو یہ بھی ذکر بن گیا۔ وتر کی تیسری رکعت میں ہاتھ اٹھاتے ہیں اور ساتھ کہتے ہیں اللہ اکبر، تو یہ فعل کے ساتھ اللہ کا نام لیا تو یہ بھی ذکر بن گیا۔ تو تکبیراتِ عیدین کے وقت اور وتر کی تیسری رکعت میں دعائے قنوت کے وقت جب ہم ہاتھ اٹھاتے ہیں، رفع الیدین کرتے ہیں تو ساتھ اللہ کا نام بھی لیتے ہیں۔ لہذا یہ حرکات اور افعال بھی اللہ کا ذکر بن جاتے ہیں، اور غیر مقلدین جب رکوع میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں اللہ اکبر، انہوں نے یہاں پر دو کام کیے ہیں؛ ایک رکوع میں گئے اور دوسرا ہاتھ اٹھائے۔ اب یہ اللہ اکبر کس کے لیے ہے؟ رکوع میں جانے کے لیے ہے یا رفع الیدین کے لیے ہے؟ تو یہاں پر ذکر ایک ہے اور افعال دو ہیں تو یہ ذکر کس فعل کے لیے ہے؟ اب ان افعال میں سے ایک ہے رکوع جانا اور ایک ہے ہاتھ اٹھانا۔ رکوع جانا تو فرض ہے اگر رکوع نہ کریں تو نماز نہیں ہوتی

اور ہاتھ اٹھانا یعنی رفع الیدین کرنا یہ تمہارے ہاں بھی فرض نہیں ہے تو اس اللہ اکبر والے ذکر کو کس فعل کے لیے شمار کرو گے؟ رکوع کے لیے شمار کرو گے تو ٹھیک ہے اس سے رکوع اللہ کا ذکر بن جائے گا اور نماز کا حصہ بن جائے گا۔ اگر آپ کہتے ہیں کہ اللہ اکبر کہنا رفع الیدین کے لیے ہے تو پھر ہاتھ اٹھانا تو اللہ کا ذکر بن جائے گا لیکن رکوع کرنا اللہ کا ذکر نہ بنے گا تو جب اللہ کا ذکر نہ بنا تو نماز کا حصہ نہ ہوا اور رکوع نماز کا حصہ نہیں ہو گا تو نماز ادا نہیں ہو گی۔ اگر اللہ اکبر کہنے کو رکوع کا حصہ بنالیں اور رفع الیدین کا نہ بنائیں تو رفع الیدین نماز کا حصہ نہ بنے گا تو نماز تمہارے ہاں پھر بھی ہو جائے گی۔ اس لیے آپ جو رفع الیدین کرتے ہیں اس کے ساتھ اللہ کا ذکر موجود نہیں ہوتا، جب اس رفع الیدین کے ساتھ اللہ کا نام نہیں لیا گیا تو یہ ذکر اللہ نہ بنا اور قرآن کہتا ہے: ﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾ کہ نماز پڑھو تاکہ تم میرا ذکر کرو۔ اس لیے ہمارے والا جو رفع الیدین ہے وہ تو نماز کا حصہ بن جاتا ہے اس پر تو کوئی اشکال ہی نہیں اور تمہارے والے رفع الیدین نماز کا حصہ نہیں بنتے اس لیے اشکال اس پر رہتا ہے، ہمارے رفع الیدین پر اشکال بالکل نہیں ہوتا۔

### تخلیق انسانی کے سات مراحل:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ۖ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً ۚ فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۚ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا فَكَسَوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا ۖ ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۖ فَتَبَرَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾

اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے سات مراحل بنائے۔ پہلا مرحلہ ﴿مِّنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ﴾ ہے کہ انسان کی تخلیق کا پہلا مرحلہ مٹی کا خلاصہ ہے۔ پوری مٹی

سے تو بندہ پیدا نہیں ہوتا البتہ مٹی کے خلاصے سے پیدا فرمایا۔ دوسرا مرحلہ ﴿ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ﴾ اس کے بعد مٹی کے خلاصے سے نطفہ یعنی پانی کا قطرہ بنا۔ تیسرا مرحلہ ﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً﴾ کہ اس پانی کے نطفے کو علقہ یعنی جما ہوا خون بنادیا۔ چوتھا مرحلہ ﴿فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً﴾ کہ اس جمے ہوئے خون کا لو تھڑا بنایا۔ پانچواں مرحلہ ﴿فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظًا﴾ پھر اس لو تھڑے کو ہڈیوں میں تبدیل کر دیا۔ چھٹا مرحلہ ﴿فَكَسَوْنَا الْعِظَ لَحْمًا﴾ پھر ہڈیوں کے اوپر گوشت چڑھا دیا۔ ساتواں مرحلہ ﴿ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ﴾ کہ پھر مکمل انسان بنادیا۔ یہ جو ساتواں مرحلہ ہے یہ انسان کے بدن میں روح ڈالنا ہے۔

روح دو قسم کی ہے: ایک ہے روح حیوانی اور ایک ہے روح حقیقی۔ روح حقیقی تو اللہ نے عالم ارواح میں ہر کسی کی پیدا فرمادی ہے، ایک ہے ہر عضو میں روح تو یہ روح حیوانی ہوتی ہے۔ عالم ارواح اور روح حقیقی کا تعلق جیسے ہی جڑ جاتا ہے تو بندے میں حیات پیدا ہوتی ہے۔ جب اس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے تو انسان پر موت آ جاتی ہے۔

### حیات فی القبر کا ثبوت:

﴿ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ﴾ ﴿ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ تَبْعَثُونَ﴾ ﴿١٦﴾

اللہ نے تمہیں ان سات مراحل سے گزار کر زندگی دی، پھر تمہیں موت دیں گے اور پھر قیامت کے دن تمہیں دوبارہ کھڑا کریں گے۔

اب بعض لوگوں کا اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ قبر میں حیات نہیں ہے بہت بڑی حماقت اور نادانی کی بات ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے موت دیں گے، پھر قیامت کے دن اٹھائیں گے۔ اگر قبر میں حیات ہوتی تو اس کا بھی ذکر ہوتا، معلوم ہوا کہ قبر میں حیات نہیں ہے۔

اس کا جواب اچھی طرح سمجھ لیں کہ ایک ہے حیاتِ ظاہری اور ایک ہے حیاتِ باطنی اور حیاتِ مخفی۔ ایک وہ حیات ہے جو نظر آرہی ہوتی ہے اور ایک وہ حیات ہے جو نظر نہیں آتی۔ موت کے بعد قبر میں جو حیات ملتی ہے وہ حیاتِ ظاہری نہیں ہوتی بلکہ یہ حیاتِ مخفی ہوتی ہے، اسی لیے فرمایا کہ ﴿لَا تَشْعُرُونَ﴾<sup>35</sup> کہ یہ حیات ایسی ہے کہ تمہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن دوبارہ کھڑا کریں گے تو وہ حیات ایسی ہوگی جو مخفی نہیں ہوگی بلکہ ظاہری اور واضح ہوگی۔ اب آیت کا مطلب اور تفسیر یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ بندے کو پہلے موت دیں گے، اس کے بعد قبر میں حیات دیں گے لیکن یہ حیات مخفی ہوگی ظاہری اور آنکھوں سے نظر آنے والی نہیں ہوگی، پھر جب قیامت قائم ہوگی تو اسی مخفی حیات کو ظاہری حیات بنا کر بندے کو کھڑا کر دیں گے۔ اسی لیے قرآن کریم میں موت کے بعد اٹھنے کے لیے کبھی لفظ ”بعث“ استعمال ہوا ہے اور کبھی لفظ ”حیات“ استعمال ہوا ہے۔ لفظ ”بعث“ کا معنی ہوتا ہے کہ بندے میں حیات تو تھی لیکن نظر نہیں آرہی تھی، مخفی تھی اور جب بندے کو کھڑا کر دیا تو جو حیات پہلے سے ہے اب وہ نظر آنے لگی ہے۔

اس کو مثال سے یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک آدمی سویا ہوا ہے لیکن زندہ، اب کوئی کہے: اس کو اٹھاؤ۔ تو اٹھانے کا معنی کیا ہے کہ اس کو زندہ کرو یا نیند سے بیدار کرو؟ (نیند سے بیدار کرو۔ سامعین) لیکن وہ نیند سے اٹھتے ہی کہتا ہے: ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ“ کہ تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں موت کے بعد زندہ کیا اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اب دیکھیں کہ ہم نے تو کہا تھا کہ اس سوئے ہوئے کو بیدار کرو اور وہ سویا ہوا شخص اٹھ کر

کہتا ہے کہ میں زندہ ہو گیا۔ حالانکہ اسے کہنا چاہیے کہ میں بیدار ہو گیا ہوں لیکن وہ کہتا ہے کہ میں زندہ ہو گیا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جو نیند میں حیات ہے یہ بیداری کی نسبت کم ہے اس لیے اس کو نیند بھی کہہ دیتے ہیں اور موت بھی کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح قبر میں جو حیات ہے یہ حیات ایسی ہے جو دنیا والی حیات کی نسبت کم ہے اور اتنی حیات ہے کہ ”قَدْ مَاتَ يَتَلَذُّ وَيَتَأَلَّمُ“ جس سے بدن راحت کو محسوس کرے اور خدا خواستہ اگر کافر ہے تو دکھ کو محسوس کرے کیونکہ حیات بہت کم درجے کی ہے۔ اس لیے اس حیات کو موت کی طرح سمجھ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بندے کو دوبارہ زندہ کر دیا گیا ہے۔

تو کبھی لفظ بعث آتا ہے اور کبھی لفظ احياء۔ احياء کا معنی کہ پہلے اس کی حیات مخفی تھی اب اس کو حیات ظاہری مل گئی ہے تو کہہ دیا گیا کہ اس کو زندہ کر دیا اور بعث کا معنی کہ حیات پہلے سے تھی لیکن اس کے اجزاء منتشر تھے، اب اکٹھے کیے اور اس کو کھڑا کر دیا۔ اس لیے یہ استدلال کرنا کہ اس آیت سے قبر کی حیات کی نفی ہوتی ہے بالکل غلط ہے۔ قبر کی حیات کی نفی کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں بارہا کہتا ہوں کہ بندے پر مسئلہ کھل جائے تو پھر الجھن نہیں رہتی، جب تک مسئلہ نہ کھلے تو پھر الجھنیں ہی رہتی ہیں۔

### قوم کسے کہتے ہیں؟

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا نَكُومُ

مِنْ إِلَهِ غَيْرُهُ ۖ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٢٢﴾﴾

ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ انہوں نے جاکر کہا کہ اے میری قوم! اللہ کی عبات کرو جس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

ایک ہے لفظ ”امت“ اور ایک ہے لفظ ”قوم“۔ قوم کا مفہوم الگ ہے اور

امت کا مفہوم الگ ہے۔ پیغمبر کو جس کی طرف بھیجا جاتا ہے وہ پیغمبر کی امت ہوتی ہے اور پیغمبر جس میں پیدا ہوتا ہے وہ پیغمبر کی قوم ہوتی ہے۔ پیغمبر کی امت میں تو کئی قومیں ہوتی ہیں لیکن پیغمبر کی اپنی قوم ایک ہوتی ہے کئی قومیں نہیں ہوتیں۔  
اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ﴾<sup>36</sup>

ہم نبی کو وحی کی وہ زبان دیتے ہیں جو نبی کی قوم کی زبان ہوتی ہے۔  
اگر ہم دنیا کے سارے مسلمان ایک قوم ہوتے تو ہم سب کی زبان عربی ہوتی حالانکہ ہم سب کی زبان عربی نہیں ہے۔ پتا چلا کہ ہم مسلمان کئی قومیں ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اس کی قوم کی زبان میں وحی دیتا ہے تاکہ نبی اپنی قوم کو اسی کی زبان میں اللہ کے احکام سمجھا سکے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قریش تھی جس کی زبان عربی تھی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عربی زبان میں وحی دی گئی ہے۔

میں عوام کو سمجھانے کے لیے یہ بات کہا کرتا ہوں آپ مرزائیوں سے پوچھیں کہ تم لوگ مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی مانتے ہو، یہ بتاؤ کہ اس پر وحی آتی تھی؟ وہ کہیں گے کہ جی آتی تھی۔ اس کی وحی کس زبان میں آتی تھی؟ آپ جب اس کی نام نہاد وحی کی زبانیں گنیں وہ سات یا نو بنتی ہیں، کبھی عربی میں وحی، کبھی فارسی میں وحی، کبھی انگریزی میں وحی، کبھی سنسکرت میں وحی، کبھی کسی اور زبان میں وحی حالانکہ نبی کی وحی کی زبان نبی کی قوم کی زبان ہوتی ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ مرزا قادیانی کی قومیں سات تھیں نو تھیں یا ایک تھی؟ کہتے ہیں: جی ایک تھی۔ تو جب قوم اس کی ایک ہے تو

وحی کی زبان بھی ایک ہونی چاہیے، جب اس کی وحی کی زبانیں کئی ہیں تو اس کی قومیں بھی کئی ہونی چاہئیں نا! اور جس آدمی کی قومیں کئی ہوتی ہیں وہ حلال زادہ نہیں ہوتا بلکہ وہ حرام زادہ ہوتا ہے۔ حرام زادے آدمی کو شریف انسان ماننا مشکل ہے ہم اس کو نبی کیسے مان لیں؟! بات سمجھ میں آگئی؟ (جی ہاں۔ سامعین)

**ربوہ کا معنی اور قادیانی دھوکہ:**

﴿وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَهُمَا إِلَىٰ رِبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَ

مَعِينٍ﴾

حضرت مریم علیہا السلام جبرائیل امین علیہ السلام کے پھونکنے سے امید سے ہو گئیں۔ جب بچہ جننے کا وقت آیا تو اپنی بستی سے نکل گئیں اور ایک اونچی جگہ پر ٹھہریں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَنَادَاهُمَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَا تَحْزَنِينَ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۖ وَ

هُدًى إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسْقِطُ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۚ﴾<sup>37</sup>

کہ فرشتے نے ان کے نیچے ایک جگہ سے انہیں آواز دی کہ آپ غم نہ کریں۔ آپ نے رب نے آپ کے نیچے ایک چشمہ پیدا کر دیا ہے۔ ایک کھجور کا درخت ہے۔ اس کے تنے کو اپنی طرف ہلائیں تو پکی ہوئی تازہ کھجوریں گریں گی۔ انہیں کھاتی پیتی رہیں۔ کھجوریں کھانے اور چشمے کا پانی پینے سے معلوم ہوتا ہے کھجور نہایت طاقتور چیز ہے۔ ولادت کے بعد عورت کو بہت طاقت والی خوراک دیتے ہیں تاکہ کمزوری دور ہو جائے۔ تو مریم علیہا السلام نے اس مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جنما۔



”زبوة“ عربی زبان میں اونچی جگہ کو کہتے ہیں۔ اس آیت سے قادیانی دھوکہ دیتے ہیں، ربوہ کا معنی ربوہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے شہر کا ذکر قرآن میں ہے۔ دیکھو کفر کتنی محنت کرتا ہے۔ ان لوگوں نے ایسی جگہ کو تلاش کیا جو عام زمینوں سے اونچی ہے۔ یہ چناب نگر میں اونچی جگہ پر ہے۔ پہاڑ ہیں اور ساتھ میں دریا کا چو پانی بہہ رہا تھا اس کو انہوں نے چشمہ بنادیا کہ قرآن کریم میں ہے۔ اب دنیا کے کافر جن کو انہوں نے مرزائی بنا کر ایک کفر سے دوسرے کفر میں لانا ہے ان کو یہ سمجھانے کے لیے کہ مرزا قادیانی نبی ہے اور اس کا ذکر قرآن میں ہے۔

ہمارے اکابر کو اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق اجر عطا فرمائے۔ حضرت مولانا منظور احمد چینیوٹی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات پہ محنت شروع کی کہ اس شہر کا نام تبدیل کرانا ہے۔ مولانا چینیوٹی بہت محنتی آدمی تھے۔ بس جس کام میں لگ جاتے اس کو چھوڑتے نہیں تھے جب تک منزل تک نہ پہنچا دیتے۔ ربوہ کا نام تبدیل کروا کر ”چناب نگر“ بنانے میں مولانا منظور احمد چینیوٹی رحمۃ اللہ علیہ کو تیس سال لگ گئے۔ اس لیے بیانات میں جب بھی ذکر کریں تو ”چناب نگر“ ہی کہیں تاکہ ان کے دماغ سے ربوہ نکل جائے اور چناب نگر معروف ہو جائے۔ تیس سال کی محنت کے بعد ربوہ سے چناب نگر تبدیل کیا گیا۔ اب اگر باہر سے کوئی کافر آئے گا اور یہاں چناب نگر لکھا ہو گا تو وہ مرزائیوں سے کہے گا کہ تم تو کہتے ہو کہ قرآن میں جس ربوہ کا ذکر ہے وہ یہی شہر ہے لیکن یہاں تو چناب نگر لکھا ہوا ہے، یہ ربوہ تو نہیں ہے۔

**انسان بقدر وسعت مکلف ہوتا ہے:**

﴿وَلَا تُكَلِّفْ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا مَكْتَبٌ بِمَا تَحِقُّ وَهُمْ لَا

يُظْلَمُونَ ﴿١٦﴾﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم جب بھی کسی چیز کا حکم دیتے ہیں تو آدمی کی

وسعت اور طاقت کے مطابق دیتے ہیں۔ اس لیے یہ بات ذہن نشین کر لیں قرآن کریم اور شریعت کا حکم بندے کے لیے مشکل تو ہو سکتا ہے لیکن ناممکن نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ ایسا حکم دیتے ہی نہیں جس کا کرنا بندے کے اختیار اور بس میں نہ ہو۔

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ کوئی مرد زنا کرنے کے لیے عورت کے جسم پر بیٹھا ہو تو اسے حکم ہے کہ پیچھے ہٹ جاؤ! اگر پیچھے ہٹنا ممکن نہ ہو تا تو اللہ رب العزت پیچھے ہٹنے کا حکم ہی نہ دیتے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ایسی حالت میں بھی زنا سے بچنا انسان کے اختیار میں ہے۔

اور ہمارے حضرت عارف باللہ مولانا شاہ حکیم محمد اختر رحمۃ اللہ علیہ اس کی مثال دے کر یوں سمجھاتے تھے کہ یہ کیسے اختیار میں ہے! فرماتے تھے کہ آدمی زنا کے لیے عورت کے جسم پر بیٹھا ہو اور اچانک دروازہ کھلے تو ساری شہوت ختم ہو جاتی ہے، کوئی بندہ اوپر سے آجائے تو شہوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ فرماتے کہ اتنی سی بات ہے تو یہ بندہ کیسے کہتا ہے کہ میرے بس میں نہیں ہے، معمولی تصور سے کہ مجھے کوئی دیکھ نہ لے آدمی کی خواہش اور شہوت ختم ہو جاتی ہے تو جب یہ تصور کریں کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے تو شہوت کیسے ختم نہیں ہوگی؟!

### صاحب حیثیت بندوں پر عذاب کا معنی:

﴿بَلْ قُلُوبُهُمْ فِي غَمْرَةٍ مِّنْ هَٰذَا وَلَهُمْ أَعْمَالٌ مِّنْ دُونِ ذَٰلِكَ هُمْ لَهَا

عَمِلُونَ ﴿٣٦﴾ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذْنَا مُتْرَفِيهِمْ بِالْعَذَابِ إِذَا هُمْ يَجْعَرُونَ ﴿٣٧﴾﴾

ان مشرکین کے دل اس دین اسلام کے معاملہ میں بالکل غافل ہوئے پڑے ہیں اور اس کے علاوہ ان لوگوں کے اور بھی کئی برے کام ہیں جو یہ لوگ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ہم ان میں سے دولت مند اور امیر لوگوں کو عذاب دیتے ہیں تو یہ لوگ چیخ اٹھتے ہیں۔

## مشرکین کی عادت:

مُسْتَكْبِرِينَ<sup>ص</sup> بِهِ سِرًّا تَهْجُرُونَ ﴿٦٢﴾

اس آیت کے تحت مفسرین نے لکھا ہے کہ رات کو قصے سنانا کہانیاں سنانا یہ مناسب نہیں ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب عشاء کے بعد کسی کو قصے کہانیوں اور فضول گپوں میں مشغول دیکھتے تو سخت تنبیہ فرماتے اور بعض لوگوں کو تو باقاعدہ سزا دیتے تھے، فرماتے کہ عشاء کے بعد جلدی سو جاؤ شاید صبح تہجد کی توفیق مل

جائے۔

## مشرکین مکہ کی ہٹ دھرمی:

﴿وَلَقَدْ أَخَذْنَاهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے لیے بددعا کی جس کی وجہ سے ان پر سخت قحط آیا۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے، مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ عالمین کے لیے رحمت بن کر آئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واقعی میں رحمت بن کر آیا ہوں۔ ابوسفیان کہنے لگے کہ ہمارے کچھ بندے آپ نے بدر میں مار دیے اور جو باقی بچے ہیں ان کو قحط سالی میں مارنا چاہتے ہیں؟ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ یہ قحط ختم ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تو قحط ختم ہو گیا۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کو عذاب میں مبتلا کیا تھا اور پھر اس سے نجات بھی دی لیکن یہ لوگ ایسے ہیں کہ پھر بھی اپنے رب کے سامنے نہیں جھکے۔ اور یہ عذاب سے نجات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے ملی لیکن یہ لوگ پھر بھی اپنے کفر اور شرک پر جمے رہے حالانکہ حق تھا کہ یہ لوگ راہِ راست پر آجاتے۔

﴿حَتَّىٰ إِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيدٍ إِذَا هُمْ فِيهِ

مُبْلِسُونَ﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ہم ان پر سخت عذاب نازل کریں تو یہ لوگ ایک دم مایوس اور حیرت زدہ ہو جائیں گے۔

نافرمان لوگوں پر یہ عذاب یا تو دنیا میں ہی کسی وقت آسکتا ہے یا پھر موت

کے بعد یہ لوگ اس عذاب کا مزہ چکھیں گے۔ اللہ پاک ہمیں ہر حال میں اپنی اطاعت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

**توحید و قیامت دو اہم عقیدے:**

﴿وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ قَلِيلًا مَّا

تَشْكُرُونَ﴾

اللہ رب العزت نے ان دور کو ع میں اہمیت کے ساتھ دو مسئلے بیان کیے ہیں:

1: توحید 2: قیامت

پھر توحید پر اللہ نے بہت سارے دلائل ارشاد فرمائے۔ اس لیے ان آیات میں بہت ساری باتیں ایسی ہیں جو بہت اہم ہیں اور سمجھنے والی ہیں۔ فرمایا کہ اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہیں سننے کے لیے کان دیے ہیں، دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں اور سمجھنے کے لیے دل دیا ہے، ﴿قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ﴾ پھر بھی تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو، چاہیے تو یہ تھا کہ جب اللہ نے بغیر مانگے آنکھ دی ہے تو اس سے وہ کچھ دیکھتے جو اللہ چاہتے ہیں، کان دیے ہیں تو اس سے وہ سنتے جو اللہ چاہتے ہیں، اللہ نے دل دیا تو اس سے وہ سوچتے جو اللہ چاہتے ہیں، کان آنکھ اور دل اللہ نے دیے ہیں اور استعمال تم اپنی مرضی کے مطابق کرتے ہو، یہ بات مناسب نہیں ہے۔

اللہ کے شکر کی ایک صورت یہ ہے کہ بندہ زبان سے کہے کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے، یا اللہ! تیرا بڑا شکر ہے... یہ بھی ٹھیک ہے لیکن اصل شکر یہ ہے کہ انسان اعضاء سے وہ کام کرے جو اللہ چاہتے ہیں۔ کوئی شخص اپنے والد سے کہے کہ آپ میرے والد ہیں، بڑے ہیں، بزرگ ہیں میں آپ کو مانتا ہوں۔ والد صاحب کہے کہ بیٹا! مجھے پیاس لگی ہے میں نے پانی پینا ہے جاؤ پانی لاؤ! اب بیٹا کہتا ہے کہ ابو جان آپ کے پاس سے

اٹھنے کو میرا دل نہیں کرتا۔ ایک بندہ کہتا ہے کہ ابو! میں آپ کا بہت ادب کرتا ہوں۔ والد صاحب کہتا ہے کہ مجھے بھوک لگی ہے، میں نے کھانا کھانا ہے جاؤ کھانا لاؤ! کہتا ہے ابو جی میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے پاس ہی بیٹھوں۔ اب بیٹے کی یہ باتیں اپنی جگہ پر تو ٹھیک ہیں لیکن اس موقع پر یہ مناسب نہیں ہیں۔ اس موقع پر تو یہ دیکھیں کہ والد صاحب کی ضرورت کیا ہے؟ جو ضرورت ہوتی ہے وہ پوری کریں اور والد صاحب کا حکم مانیں۔ اللہ رب العزت کا معاملہ یہ ہے کہ بندوں سے اس کو کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اللہ ہم سے کوئی چیز مانگتے ہیں، ہاں اللہ رب العزت ہمیں جو احکام دیتے ہیں وہ ہمارے فائدے کے لیے دیتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ ان تمام اعضاء کو اللہ کے حکم کے مطابق استعمال کرو اور یہی اصل اللہ کا شکر ہے۔

### بعث بعد الموت:

﴿وَهُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝۹﴾ وَهُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝۱۰ بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالِ الْأَوَّلُونَ ۝۱۱ قَالُوا إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا إِنَّنَا لَسَبْعُونَ ۝۱۲ لَقَدْ وَعَدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا هَذَا مِنْ قَبْلُ إِنْ هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝۱۳﴾

کہ تمہیں خدا ہی نے زمین میں پھیلایا اور پھر تم نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ ہی زندہ کرتا ہے اور اللہ ہی موت دیتا ہے، دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن اللہ ہی لاتے ہیں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے، اتنی موٹی موٹی باتیں بھی نہیں سمجھتے! اب دیکھو قرآن نے کتنے اچھے انداز میں یہ بات سمجھائی ہے، اور فرمایا کہ اے پیغمبر! آپ تو ان کو باتیں سمجھا رہے ہیں لیکن یہ لوگ سمجھنے کے بجائے ویسی ہی باتیں کرتے ہیں جیسی باتیں پچھلے لوگوں نے کہی تھیں، تو جو پہلے نبیوں کو جواب ملتا تھا وہی

جواب آپ کو بھی ملنا ہے۔ پہلے لوگ کیا کہتے تھے؟ پہلے لوگ کہتے تھے کہ جب ہم فوت ہو جائیں گے، مٹی ہو جائیں گے، ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم واقعی دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ یہ جو وعدے ہمارے ساتھ کیے جا رہے ہیں یہ ہمارے آباؤ اجداد کے ساتھ پہلے والے انبیاء علیہم السلام بھی کیا کرتے تھے، ان وعدوں کی کوئی حقیقت نہیں، نہ ہمارے آباء و اجداد اٹھے تھے اور نہ ہم اٹھیں گے، یہ نہیں ہو سکتا، یہ باتیں سب پرانے قصے اور کہانیاں ہیں۔

اب یہاں جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ مشرکین اور کفار جو قیامت کے دن کا انکار کرتے ہیں انہیں ایک اشکال اور دماغی تعجب تھا۔ ان کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ کیسے اٹھائے جائیں گے؟

ان کا جواب تو قرآن مجید نے دیا ہے اپنے مقام پر کہ دیکھو! جب تم نہیں تھے تو ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا، تو جب ایک بار پیدا کیا تو دوبارہ پیدا کرنا تو بہت آسان ہے، اب کیا مشکل ہے؟ مثلاً ایک عمارت موجود نہیں ہے، اس کو پہلی مرتبہ بنانا مشکل ہے لیکن جب عمارت تیار ہو جائے تو اس کو دوبارہ بنانا کیا مشکل ہے؟!

### عذابِ قبر برحق ہے:

اب کتنے لوگ ایسے ہیں کہ جو اسلام کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور پھر ذہن یہ ہوتا ہے کہ جب انسان فوت ہو جاتا ہے، قبر میں چلا جاتا ہے، مٹی میں ختم ہو جاتا ہے تو اس کے جسم کو عذاب نہیں ہوتا کیونکہ جسم تو ختم ہو گیا۔ لہذا عذاب صرف روح کو ہو گا۔ کتنے تعجب کی بات ہے۔ دیکھو! اس جسم کو ثواب اور عذاب ہم نے نہیں دینا، یہ اللہ تعالیٰ نے دینا ہے، کوئی چیز نظر نہ آرہی ہو اور اس کو مارنا اور عذاب دینا ہو تو یہ ہمارے لیے مشکل ہے اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے، اللہ کی قدرت کا انکار تو نہ کرو، دعویٰ توحید کا ہے اور انکار قبر کے عذاب کا کیا جا رہا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے! بڑے

تعجب کی بات ہے۔

اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ اچھی طرح سمجھو کہ قبر کہتے ہیں اس جگہ کو جہاں میت اور میت کے اجزاء ہوں۔ قبر کا معنی یاد رکھیں! اگر ایک بندے کو جانور نے کھالیا، اس انسان کے اعضاء کے اجزاء جانور کے معدہ میں پہنچے ہیں، پھر تبدیل ہو کر زمین میں گئے ہیں اور ذروں کی صورت میں زمین میں تقسیم ہو گئے ہیں لیکن وہ اجزاء گئے تو ہیں، جہاں جہاں منتشر اجزاء ہیں وہ ساری جگہ اس کے لیے قبر ہے۔ کوئی آدمی دریا میں یا سمندر میں گرا، پھر وہ وہیں گل گیا اور اس کے اجزاء پانی میں تحلیل ہو گئے، یہ ہمیں نہیں پتا لیکن اللہ کو تو پتا ہے، اس بندے کے اجزاء جہاں جہاں ہیں وہ ساری کی ساری اس بندے کی قبر ہے۔ اگر کسی شخص کو جلادیا ہے، پھر اس کی راکھ کو پانی میں بہا دیا ہے تو یہ سارے اجزاء جہاں جہاں گئے ہیں یہی اس کی قبر ہے۔ تو قبر صرف وہ جگہ نہیں جہاں میت کو دفن کرتے ہیں بلکہ وہ بھی قبر ہے جہاں میت اور میت کے اجزاء ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان اجزاء سے روح کا تعلق جوڑتے ہیں اور تعلق جوڑ کر اگر بندہ نیک ہو تو اچھا بدلہ دیتے ہیں اور اگر کافر ہو تو اس کو سزا دیتے ہیں، اس لیے اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

صحیح بخاری میں ایک روایت موجود ہے۔ ایک شخص تھا، اس نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو بہت سی لکڑیاں جمع کر کے آگ جلانا اور مجھے اس میں ڈال دینا، میری لاش جلانے کے بعد ہڈیوں کو پیس لینا اور اس راکھ کو کسی گرم یا کسی تیز ہوا چلنے والے دن میں پانی میں بہا دینا۔ جب وہ فوت ہو گیا تو اس کے گھر والوں نے اس کی وصیت کے مطابق یہ کام کیا اور اس کی راکھ کو پانی میں بہا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بندے کے اعضاء کو جمع کیا اور اس سے پوچھا: ”لِمَ فَعَلْتَ؟“ کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ مطلب یہ تھا کہ تو نے ایسی وصیت کیوں کی؟ اس نے کہا: مِنْ خَشْيَتِكَ، اے اللہ!



تیرے ڈر کی وجہ سے ایسا کیا۔ تو خدا نے اس کو معاف کر دیا۔<sup>38</sup>

### انسان بقدر عقل مکلف ہے:

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ یہ عقیدہ کفریہ ہے کہ کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ میرا جسم ہو گا تو اللہ عذاب دے گا اور اگر جسم نہیں ہو گا تو اللہ عذاب ہی نہیں دے گا لیکن اللہ نے اس بندے کو پھر بھی معاف کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی عقل کے مطابق مکلف ہوتا ہے، جتنی عقل ہو گی اتنا ہی مکلف ہو گا۔ اس کا ذہن یہ نہیں تھا کہ عذاب نہیں ہو گا۔ اس کا ذہن تھا کہ جسم ہو گا تو عذاب ہو گا، جب جسم ہی نہیں ہو گا تو عذاب ہی نہیں ہو گا۔ تو اس کا دماغ ہی اتنا تھا۔ وہ خدا کی قدرت کا انکار نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے اللہ نے اسے معاف کر دیا تھا۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ اگر میں عالم ہونے کے باوجود حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت نہ ہوتا تو میں فتویٰ باز مولوی ہوتا اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے میں احتیاط سے فتویٰ دیتا ہوں۔

### مرکز اہل السنۃ والجماعۃ مرکز اہل السنۃ والجماعۃ:

اس لیے ہم اپنے مرکز اہل السنۃ والجماعۃ 87 جنوبی سرگودھا میں علماء کو مناظرہ بھی پڑھاتے ہیں، فرق باطلہ کا رد بھی سکھاتے ہیں، بولنے کا سلیقہ بھی سکھاتے ہیں اور لکھنا بھی سکھاتے ہیں۔ میرے کالم پاکستان کے کئی اخبارات میں ہر ہفتے چھپتے ہیں اور آج کے اخبارات میں بھی چھپے ہیں۔ آپ آج بھی دیکھ لیں۔ سارے کام

بحمد اللہ ہم کرتے ہیں اور ہمارے مرکز و خانقاہ حنفیہ میں ایک سبق صبح نماز فجر سے پہلے ہوتا ہے، طلبہ اور اساتذہ اٹھ کر تہجد پڑھتے ہیں اس کے بعد سبق پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، پھر فجر کی نماز پڑھتے ہیں، پھر سورت یسین پڑھتے ہیں، پھر ذکر کرتے ہیں، پھر اشراق تک تلاوت کرتے ہیں، پھر اشراق پڑھ کر ناشتہ کرتے ہیں۔ ہم اس طرح اپنے طلبہ کو سنبھالتے ہیں کہ یہ فتوے باز اور لڑاکے مولوی نہ بنیں بلکہ اعتدال کے ساتھ مسائل کو سمجھانے والے علماء بنیں۔ اس کے باوجود میرے بارے میں مشہور ہے کہ یہ بڑا سخت ہے۔ میں حیران ہوں کہ سختی کا نام و نشان بھی نہیں ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ بہت سخت ہے۔

### ہم نرم لوگ ہیں!

میں ملائیشیا میں تھا تو وہاں میرے میزبان شافعی علماء تھے۔ وہ خانقاہوں میں پیر بھی ہیں اور تبلیغی مرکز راینونڈ کے فاضل بھی ہیں۔ ان میں سے ایک مولانا جمال صاحب ہیں جو مجھے بڑی محبت سے استاذ جی کہہ کر پکارتے ہیں، وہ مجھے کہنے لگے: استاذ جی لوگ کہتے ہیں کہ آپ بہت سخت ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ آپ بہت نرم ہیں اور آپ کے نرم ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ملائیشیا والے آپ کو قبول کرتے ہیں۔ ملائیشیا کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ملائی سے ہے یعنی اتنا نرم ہے۔ میں نے ملائیشیا کے چار سفر کیے ہیں۔ ان میں لڑائی، گالی گلوچ کا تصور ہی نہیں ہے۔

خیر میں یہ بات سمجھا رہا تھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بندہ ایمان کا اتنا مکلف ہوتا ہے جتنی اس کے پاس عقل ہو۔ اس کی حضرت تھانوی نے ایک بڑی عجیب مثال دی ہے۔ فرمایا کہ ایک دیہات میں ایک عالم نے بیان کیا کہ اللہ آنکھ سے بھی پاک ہے، ناک سے بھی پاک ہے، کان سے بھی پاک ہے، اللہ دیکھتے ہیں بغیر آنکھ کے، سنتے ہیں بغیر کان کے اور بولتے ہیں بغیر زبان کے، اللہ سب چیزوں سے

پاک ہیں۔ تو ایک دیہاتی اٹھا۔ اُن پڑھ تھا۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب! یہ خدا ہے یا تر بوز ہے۔ العیاذ باللہ۔ کہ نہ آنکھ ہے، نہ ناک ہے، نہ کان ہے کچھ بھی نہیں ہے، کیا یہ خدا ہے؟ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ اس کو کافر نہیں کہنا کیونکہ اس کی عقل اتنی ہے۔ اس کی سوچ یہ ہے کہ بندہ ہو اور آنکھ نہ ہو تو کتنا عجیب لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہو اور اللہ کی آنکھ نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟! یہ بات اس کی عقل میں آ ہی نہیں سکتی، اس کی عقل ہی اتنی ہے اس لیے اس دیہاتی بندے کو کافر نہیں کہنا۔

اس لیے جس میں عقل کم ہو اس کے ساتھ نرمی اور شفقت کا معاملہ کیا جاتا ہے، اس کو مارا اور ڈانٹا نہیں جاتا۔

**سارے اختیارات کا مالک اللہ ہے:**

﴿قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (۸۲) سَيَقُولُونَ  
لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۸۳﴾ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَوَاتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ  
الْعَظِيمِ ﴿۸۴﴾ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ  
شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۸۶﴾ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ فَأَنَّى  
تُسْحَرُونَ ﴿۸۷﴾ ﴿۸۸﴾

پھر اللہ پاک نے فرمایا کہ اے پیغمبر! آپ ان سے پوچھیں کہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے یہ کس کا ہے؟ یہ لوگ کہیں گے کہ اللہ کا ہے۔ آپ ان سے فرمائیں کہ کیا پھر بھی تم اس سے سبق نہیں لیتے، سمجھتے نہیں؟ پھر فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ سات آسمانوں اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے؟ تو وہ کہیں گے کہ وہ بھی اللہ ہے۔ آپ ان سے فرمائیں کہ جب یہ مانتے ہو تو اللہ سے ڈرتے کیوں نہیں ہو؟ اگر ان سے پوچھیں کہ وہ کون ہے جس کے پاس سارے اختیارات ہیں؟ جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے

میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا! اگر تمہیں پتا ہے تو ذرا بتاؤ! تو کہیں گے کہ یہ سارے اختیارات اللہ کے پاس ہیں۔ تو ان سے کہو کہ پھر کہاں سے تم پر یہ جادو ہوا ہے کہ یہ سب چیزیں مانتے ہو لیکن اللہ کو نہیں مانتے! تو یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ نے دلائل کے طور پر بیان فرمائی ہیں۔

﴿مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَكِيدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنَ إِلَهٍ إِذَا تَذَهَبَ كُلُّ إِلَهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَّ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ سُبْحَنَ اللَّهُ عَمَّا يُصِفُونَ﴾

نہ تو اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی شریک ہے، کیونکہ اگر اللہ کے ساتھ کوئی خدا ہو تا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور پھر وہ دونوں خدا ایک دوسرے سے لڑائی شروع کرتے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی بنائی ہوئی باتوں سے پاک ہے۔

### اللہ کا کوئی شریک نہیں:

خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اب دیکھیں کہ دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں کہ جو اللہ کو مانتے ہیں اور ساتھ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بھی مانتے ہیں، کتنے ایسے ہیں کہ جو خدا کو مانتے ہیں اور ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بھی مانتے ہیں اور کتنے ہیں کہ جو اللہ کو مانتے ہیں اور ساتھ حضرت مریم کو اللہ کی بیوی مانتے ہیں، کوئی حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔ تو یہ جو پوری دنیا کا نظام چل رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ اس کی کوئی بیوی ہے، وہ اکیلا اس نظام کو چلا رہا ہے۔

### بڑھیا کا چرخا:

آپ کو شاید یاد ہو کہ میں نے آپ کو سنایا تھا کہ ایک بڑھیا جنگل میں چرخا

کات رہی تھی۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا کیا عقیدہ ہے؟ اللہ کو مانتی ہو؟ کہا بیٹا مانتی ہوں۔ اس سے پوچھا کہ اللہ کو ماننے پر تمہارے پاس دلیل کیا ہے؟ اس نے کہا: دلیل یہ چر خاہے۔ کہا کہ چرنے سے تمہیں کیسے سمجھ میں آیا کہ خدا ہے؟ کہا کہ مجھے یہ سمجھ میں آیا کہ میں چرنے کو چلاتی ہوں تو چلتا ہے اور جب چھوڑ دیتی ہوں تو رک جاتا ہے، اگر چرنے کو چلانے والی بوڑھی اماں نہ ہو تو چر خانہ میں چلتا۔ تو میں دیکھتی ہوں کہ اگر کوئی نکالنے والا نہ ہو تو سورج کیسے نکل سکتا ہے؟ برسانے والا نہ ہو تو بادل کیسے برس سکتا ہے؟ چلانے والا نہ ہو تو ہوائیں کیسے چل سکتی ہیں؟ اچھا یہ بتاؤ کہ اللہ کتنے ہیں؟ بڑھیا کہنے لگی کہ ایک ہے۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ کہا کہ اس کی دلیل بھی یہی چر خاہے۔

کہا کہ چرنے سے کیسے پتا چلا؟ اس نے کہا: میری ماں نے مجھے جہیز میں چر خا دیا تھا، میرے بال کالے تھے اور آج بالوں میں سفیدی آگئی ہے لیکن چر خانہ میں ٹوٹا، کیوں نہیں ٹوٹا اس لیے کہ اس کو چلانے والی میں ایک ہوں۔ اگر اس کو چلانے والی دو عورتیں ہوتیں، ایک وہاں بیٹھتی اور ایک یہاں بیٹھتی، ایک کہتے کہ چر خا یوں چلا دوسری کہتی کہ یوں چلا، ایک سیدھا چلاتی اور دوسری الٹا چلاتی تو چر خا کب سے ٹوٹ گیا ہوتا! ایک کہتی کہ یہ میرا ہے اور دوسری کہتی کہ میرا ہے، ایک نے کہنا تھا کہ میں نے چلانا ہے اور دوسری کہتی کہ میں نے چلانا ہے۔ تو اب تک چرنے کا نہ ٹوٹنا اس وجہ سے ہے کہ میں اکیلی مالک اور چلانے والی ہوں۔ تو سورج روزانہ وقت پر طلوع ہوتا ہے اور وقت پر غروب ہوتا ہے، یہ آسمان اور زمین، یہ دن رات کا نظام تباہ نہیں ہو رہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ چلانے والا ایک ہے۔

اب دیکھیں بات سمجھ میں آئی تو ایک چرنے سے بھی سمجھ میں آئی اور جن کو سمجھ میں نہیں آتی وہ سائنس پڑھ کر بھی گمراہ ہوتے ہیں، ٹیکنالوجی پڑھ کر بھی گمراہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سمجھ عطا فرمائیں۔ (آمین)

## کفار و مشرکین کو عذاب کی وعید:

﴿قُلْ رَبِّ اِمَّا تُرِيِّي مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿٣٢﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِي فِي الْقَوْمِ

الظَّالِمِيْنَ ﴿٣٣﴾﴾

اللہ تعالیٰ نے کئی آیات میں یہ فرمایا ہے کہ ہم کافروں اور مشرکوں کو عذاب دیں گے، جو لوگ آپ کی بات نہیں مانتے ان کو سزا دیں گے۔ اب یہ عذاب قیامت کے دن ہو گا یہ بات تو یقینی ہے لیکن اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اسی دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آئے اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بعد آئے اور یہ ضابطہ ہے کہ جب کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو صرف ظالموں پر نہیں آتا بلکہ ظالموں کے ساتھ ساتھ نیک لوگوں پر بھی آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نیک لوگوں پر عذاب آتا تو ہے لیکن آخرت میں ان کو کوئی عذاب نہیں ہو گا اور دنیا میں جو تکلیف اور پریشانی ان کو ملی ہے اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کا اجر دیں گے۔ تو جب یہ بات ممکن تھی کہ حضور علیہ السلام کی زندگی میں ان مشرکین پر عذاب آتا تو اب حضور علیہ السلام کو تلقین کی جا رہی ہے کہ آپ اپنے رب سے یہ دعا مانگیں کہ اے اللہ! اگر آپ نے ان لوگوں کو میرے سامنے ہی عذاب دینا ہے تو مجھے اس سے محفوظ رکھنا اور ان لوگوں میں شامل نہ فرمانا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم عذاب سے بالکل محفوظ ہیں لیکن پھر بھی آپ کو یہ دعا سکھائی گئی تاکہ آپ ہر حال میں اپنے رب کو یاد رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَإِنَّا عَلَىٰ اَنْ تُرِيَاكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقَدِيرُونَ ﴿٣٤﴾﴾

کہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ آپ کے سامنے ہی ان مشرکین پر عذاب نازل کر دیں۔

عذاب دو قسم کا ہوتا ہے؛ ایک ہے خاص عذاب جو مخصوص لوگوں پر آتا ہے اور ایک ہے عام عذاب جو سب لوگوں پر آتا ہے۔ اس امت میں خاص خاص لوگوں پر خاص خاص عذاب آتے رہے ہیں، اللہ نہ کرے۔ شاید آئندہ بھی آجائے لیکن اس امت پر عمومی عذاب کہ جس سے امت کے سارے مجرم تباہ ہو جائیں، یہ نہ آیا ہے اور نہ آئے گا۔

### دائرہ نبوت:

اس کی وجہ قرآن کریم نے یہ بتائی ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ﴾<sup>39</sup>

میرے محبوب! آپ جب تک ان میں ہیں تو ہم ان کو عمومی عذاب دے کر ہلاک نہیں کریں گے۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور پوری کائنات کے نبی ہیں۔ یہ کیسے ثابت ہوا؟ وہ اس طرح کہ اللہ رب العزت کا ضابطہ ہے کہ اللہ جب کسی مجرم کو عذاب دینے کا فیصلہ فرماتے ہیں تو جو نبی کا دائرہ نبوت ہوتا ہے اللہ نبی کو اس دائرے سے نکال لیتے ہیں اور مجرم قوم کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر جب عذاب آیا تو ان کو دائرہ نبوت سے نکالا، جو دی پہاڑ پر لے گئے اور قوم کو ہلاک کر دیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو مدین سے نکال کر ان کی قوم کو ہلاک کر دیا کیونکہ مدین ان کا دائرہ نبوت تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر جب عذاب آیا تو ان کی بستی سدوم ان کا دائرہ نبوت تھا، ان کو وہاں سے نکالا اور ان کی مجرم قوم کو ہلاک کیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجرم قوم کو اللہ تعالیٰ ہلاک کیوں نہیں فرماتے؟ اس لیے کہ ”وَأَنْتَ

فِيهِمْ“ اس لیے کہ نبی ان میں موجود ہے۔ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ گئے پھر تو عذاب آجانا چاہیے تھا؟ ہم کہتے ہیں کہ حضور اب بھی دنیا میں ہیں۔ اچھا! جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر چلے گئے پھر تو عذاب آجانا چاہیے تھا؟ ہم کہتے ہیں کہ حضور اب بھی دنیا میں ہیں۔ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وفات آگئی اور آپ قبر میں چلے گئے، اب تو دنیا میں نہیں ہیں اب تو عذاب آجانا چاہیے!

ہم کہتے ہیں کہ بات سمجھو! مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر اجتماعی عذاب کیوں نہیں آتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام عذاب تب آتا ہے جب نبی کا جو دائرہ نبوت ہے اللہ اپنے نبی کو اس دائرہ نبوت سے نکال لیں، تو پھر مجرم قوم پر عذاب آتا ہے۔ ہمارے نبی کا دائرہ نبوت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے نبی ہیں، مدینہ کے نبی ہیں، طائف کے نبی ہیں، تبوک کے نبی ہیں، فرش کے نبی ہیں، عرش کے نبی ہیں، اس جہان کے نبی ہیں، اُس جہان کے نبی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دائرہ نبوت اتنا وسیع ہے کہ نہ آپ نے دائرہ نبوت سے باہر جانا ہے اور نہ ہی مجرم قوم پر عمومی عذاب آنا ہے۔ تو عام عذاب نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت میں موجود ہیں۔

### شیطان سے حفاظت کی دعا:

﴿وَقُلْ رَبِّ اعْزُذْ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيْطَانِ﴾

اب دیکھو! اللہ کے نبی کو حکم ہے کہ آپ یہ دعا مانگا کریں کہ اے اللہ! شیطان کی چھیڑ چھاڑ سے میں آپ کی پناہ میں آتا ہوں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں لکھا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے کہ جب ان پر اللہ عذاب بھیج رہے اور یہ آپ کو



تکلیف دیتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ شیطان آپ کے دل میں ڈال دے کہ آپ بھی ان کو تکلیف دیں۔ اس لیے فرمایا کہ آپ دعا مانگیں کہ اے اللہ! شیطان کے ان وسوسوں سے مجھے بچا کر رکھنا، شیطان کی اس چھیڑ چھاڑ سے بچا کر رکھنا۔

کوئی شخص بغیر کسی وجہ کے آپ کو گالی دیتا ہے تو دل میں آتا ہے کہ میں بھی اس کو گالی دوں۔ یہ جو دل میں آتا ہے کہ میں بھی گالی دوں تو یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے کہ تم بھی اس کو گالی دو۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اس موقع پر یہ آیات پڑھا کرو:

﴿وَقُلْ رَبِّ اَعُوذُ بِكَ مِنْ هَزَاتِ الشَّيْطَانِ﴾ ۴۰ وَ اَعُوذُ بِكَ رَبِّ اَنْ

يَغْضُرُونِ ﴿۴۱﴾

یہ دعا پڑھیں گے تو اللہ پاک محفوظ فرمائیں گے۔ گالی کا جواب گالی نہیں ہوتا۔ اللہ ہم سب کو محفوظ فرمائیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کورات کو نیند نہیں آتی تھی تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے رات کو نیند نہیں آتی، میں کیا کروں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم یہ دعا پڑھ لیا کرو:

اَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ الثَّمَاثَةِ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ وَشَرِّ عِبَادِهِ وَمِنْ هَمْزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَاَنْ يَّغْضُرُوْنَ. 40

میں اللہ کے بے عیب کلمات کی برکت سے اللہ کی ناراضگی، اللہ کے عذاب اور اس کے بندوں کے شر اور شیطان کی چھیڑ چھاڑ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور اس بات سے بھی اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ شیاطین مجھ پر تسلط کریں اور میرے پاس آئیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دعا مانگی تو سکون کی نیند سوتے تھے۔

اس سے ایک مسئلہ یہ ثابت ہوا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اللہ کے نبی! مجھے نیند نہیں آتی تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا بتائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر اللہ کے کسی نیک بندے کے پاس جائیں کہ میرے سر میں درد ہے، میرے پیٹ میں درد ہے، میرے بیٹے کو تکلیف ہے اور وہ کہے کہ یہ دعا پڑھ لو تو اس دعا اور ورد کا پڑھنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہو گیا کہ یہ جائز ہے۔ یہ نہیں کہنا کہ غلط اور بالکل ناجائز ہے، ایسے فتوے جلدی نہ لگایا کرو۔

### انسانی فطرت:

﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ﴾ (۱۶) لَعَلِّي أَعْمَلُ

صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ﴿﴾

فرمایا کہ اے میرے پیغمبر! ابھی تو یہ بات نہیں مانتے ہیں لیکن ایک وقت آئے گا جب ان کو موت کے آثار نظر آئیں گے اور آخرت کی منزلیں نظر آنے لگیں گی تو یہ کہیں گے اے رب! مجھے واپس لوٹا دیں، میں دنیا میں جو دین کے کام نہیں کر سکا اب جا کر کروں گا، فلاں گناہ کیا تھا لیکن اب واپس جا کر نہیں کروں گا، فلاں نیک عمل نہیں کیا تھا اب جا کر کروں گا۔ فرمایا اے پیغمبر! ﴿كَلَّا﴾ ہر گز نہیں، اگر ہم ان کو بھیج بھی دیں تو یہ پھر بھی نہیں کریں گے، ﴿إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا﴾ بس یہ ان لوگوں کی زبان سے کہنے کی باتیں ہیں، یہ واپس جا کر بھی یہ کام نہیں کریں گے۔

جیسے خدا نخواستہ کسی کا ایک سیڈنٹ ہونے والا ہو، کوئی حادثہ پیش ہونے والا ہو تو کہتے ہیں کہ اللہ ایک بار بچالے، بس ایک بار بچالے، ایک بار خیریت سے گھر پہنچ جائیں تو اب گناہ نہیں کریں گے، جب گھر پہنچ جاتے ہیں تو پھر شروع ہو جاتے ہیں، پھر

باز نہیں آتے۔ تو فرمایا ان کی فطرت ہے کہ یہ باز نہیں آئیں گے۔

## عالم برزخ:

﴿وَمِنْ وَدَّآيِهِمْ بَرَزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾

اے میرے پیغمبر! اب ان کے پیچھے ایک پردہ ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔  
یہاں چند ایک باتیں سمجھیں تاکہ آپ کو قبر، حیات، نبوت اور صلوٰۃ و سلام  
یہ سارے مسائل سمجھ میں آئیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ عالم چار ہیں:

1: عالم ارواح

2: عالم دنیا

3: عالم برزخ

4: عالم آخرت

عالم ارواح یہ انتظار کی جگہ ہے اور عالم دنیا یہ کام کی جگہ ہے اور عالم برزخ یہ  
آرام کی جگہ ہے اور عالم آخرت یہ انعام کی جگہ ہے۔

کل رات ہمارے مرکز اہل السنۃ والجماعۃ میں خانقاہی اجتماع ہے۔ ترغیب تو  
میں بہت دیتا ہوں کہ آپ ہمارے خانقاہی اجتماع میں آیا کریں، بیان میں شرکت کیا  
کریں، مجلس ذکر میں بیٹھا کریں تو وہاں پر آدمی کھل کے بات کرتا ہے، تفصیل سے  
بات ہوتی ہے، لوگ بھی زیادہ ہوتے ہیں، لوگ دور دور سے سننے کے لیے آتے ہیں اور  
جب طلب ہوتی ہے تو پھر مضمون نکلتا ہے، جب طلب نہ ہو تو مضمون نہیں نکلتا۔ بچے  
میں طلب ہو اور روئے تو ماں کی چھاتی میں دودھ اتر آتا ہے اور جب عوام میں طلب ہو  
تو عالم کی زبان سے علم نکلتا ہے، جب طلب نہیں ہوتی تو کوشش کرنے کے باوجود بھی  
بیان کھل کر نہیں ہو پاتا۔ یہ اللہ کا عجیب نظام ہے۔

خیر میں عرض کر رہا تھا کہ عالم ارواح انتظار کی جگہ ہے، عالم دنیا یہ کام کی جگہ ہے، عالم برزخ یہ آرام کی جگہ ہے اور عالم آخرت یہ انعام کی جگہ ہے۔ دنیا میں کام کرنا ہے آرام نہیں کرنا، ہاں اتنا آرام کریں جس سے کام کے لیے تیار ہو جائیں اور بس، باقی آرام قبر میں ہو گا اور دنیا میں اعمال کی جزانہ مانگیں، اعمال کی جزا کی جگہ آخرت ہے۔

برزخ کے بارے میں دوسری بات سمجھیں! برزخ کا معنی ہے ”پردہ“ آپ والدہ کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں دو لینا چاہتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر مرد ہے اور والدہ نے پردہ کیا ہوا ہے تو والدہ کا پردہ آگے ہوتا ہے یا پیچھے؟ (آگے۔ سامعین) اور یہاں پر ہے ﴿مِنْ وَدَّآبِهِمْ﴾ کہ ان کے پیچھے پردہ ہو گا۔ تو دنیا میں پردہ آگے ہوتا ہے اور جب انسان مر جائے تو اس کا پردہ پیچھے ہوتا ہے۔ تو والدہ پردے میں ہے ڈاکٹر تو پردے میں نہیں ہے۔ اب جو پردے میں ہے وہ باہر والے کو دیکھ لے تو یہ پردے کے خلاف نہیں ہے اور باہر والا اگر پردے میں دیکھ لے تو یہ پردے کے خلاف ہے۔

اس سے پتا چلا کہ پردے کے باہر سے پردے میں والے کے حالات معلوم نہیں ہوتے، ہاں پردے میں والے کو پردے کے باہر والے کے حالات کا پتا چل جاتا ہے۔ تو جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے تو یہ میت پردے میں ہے یا ہم پردے میں ہیں؟ یہ میت پردے میں ہے، ہم پردے میں نہیں ہیں۔ اس کا معنی یہ کہ اگر ہم میت کی قبر پر جائیں اور میت کو دیکھ لیں تو یہ پردے کے خلاف ہے اور اگر میت ہم کو دیکھ لے تو یہ پردے کے خلاف نہیں ہے۔

### امی عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ اقدس میں پردہ:

ایک بندہ کہتا ہے کہ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ میت پردے میں ہوتی ہے تو پردے والا باہر والے کو کیسے پہچان سکتا ہے؟ میں نے کہا: یہ روایت قرآن کے خلاف کیسے ہے؟ قرآن تو کہتا ہے کہ

میت پردے میں ہے تو جو پردے میں ہو وہ پردے سے باہر والے کو دیکھ لے تو پردے کے خلاف نہیں ہے، پردے کے مطابق ہے۔

مستدرک الحاکم میں روایت موجود ہے، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے کمرے میں دفن کر دیا گیا تو میں جاتی تھی اور پردے کا اہتمام نہیں کرتی تھی۔ پھر میرے والد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دفن کیا گیا میں پھر بھی جاتی تھی اور پردے کا اہتمام نہیں کرتی تھی، کیونکہ ایک میرا والد ہے اور ایک میرا شوہر ہے، دونوں سے پردہ نہیں ہے۔ ”فَلَبَّا دُفِنَ عُمَرُ مَعَهُمْ“ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ دفن کر دیا گیا، فرماتی ہیں ”فَوَاللّٰهِ مَا دَخَلْتُ إِلَّا وَأَنَا مَشْدُودَةٌ عَلَى ثِيَابِي“ پھر خدا کی قسم! میں اس وقت تک نہیں جاتی تھی جب تک میں اچھی طرح پردہ نہ کر لیتی تھی۔ اس کی وجہ خود بیان کرتی ہیں کہ ”حَيَاءٌ مِنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ“ کیونکہ مجھے عمر رضی اللہ عنہ سے حیا آتی تھی۔<sup>41</sup>

اب لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیسے دیکھ رہے تھے وہ تو برزخ میں تھے؟ بھائی! حضرت عمر رضی اللہ عنہ پردے میں تھے یا امی عائشہ رضی اللہ عنہا پردے میں تھیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پردے میں تھے۔ اگر پردے میں والا پردے کے باہر دیکھ لے تو یہ پردے کے خلاف نہیں ہے۔ جب عمر رضی اللہ عنہ روضہ میں دفن ہوئے تو امی عائشہ رضی اللہ عنہا نے پردہ کر لیا۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہیں دیکھ سکتے تھے تو امی عائشہ رضی اللہ عنہا نے پردہ کیوں کیا؟ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ جب قرآن سمجھ میں آجائے تو پھر بات بنے گی۔

ہر حدیث کو قرآن کے خلاف کہہ کر رد نہ کرو، اللہ کے پیغمبر پر اترنے والا قرآن بھی مانو اور اللہ کے رسول کے ارشادات بھی مانو۔ میں پوری دنیا میں یہ محنت کر رہا ہوں کہ قرآن بھی مانو اور حدیث بھی مانو، حدیث کو رد نہ کیا کرو کہ یہ قرآن کے خلاف ہے بلکہ سمجھنے والے سے سمجھ لیا کرو۔ ہماری سمجھ کم ہے اور امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی سمجھ بہت زیادہ ہے۔ حکیم الاسلام قاری محمد طیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک صحابی کو نبوت کی صحبت کی برکت سے خدا تعالیٰ عقل عطا فرماتا ہے کہ اگر صحابی کی عقل کی زکوٰۃ تقسیم کی جائے تو قیامت تک کے لیے کوئی انسان پاگل نہیں رہے گا اور یہ تو عام صحابی نہیں بلکہ ام المؤمنین امی عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی فہم کو دیکھو! اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ تو میں نے برزخ کے حوالے سے یہ مختصر سی بات کی ہے۔

### خاندان نبوت کی نسبت کی اہمیت:

﴿فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ﴾ (٦٦)

قیامت کے دن دو مرتبہ صور پھونکا جائے گا؛ پہلی مرتبہ اسرافیل علیہ السلام جب صور پھونکیں گے تو سارے لوگ مرجائیں گے، پھر جب دوبارہ پھونکیں گے تو مرے ہوئے لوگ زندہ ہو جائیں گے۔ قیامت کے دن اعمال کام آئیں گے، نسب کام نہیں آئے گا کہ یہ فلاں کا بیٹا ہے، فلاں کا باپ ہے، فلاں کا چچا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"كُلُّ نَسَبٍ وَصِهْرٍ مُنْقَطِعٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا نَسَبِي وَصِهْرِي." <sup>42</sup>

قیامت کے دن کسی کا نسب کام نہیں آئے گا، اس دن صرف میرا نسب اور

دامادی تعلق ہی کام آئے گا۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت کے تحت یہاں لکھا ہے کہ ”اسی حدیث کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ام کلثوم بنت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے نکاح کیا اور چالیس ہزار درہم مہرباندھا۔“<sup>43</sup>

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا داماد بن جاؤں تاکہ قیامت کے دن اس خاندانِ نبوت کی نسبت کام آجائے۔ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت ام کلثوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دی۔

### قیامت کے دن وزنِ اعمال:

﴿مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (١٠٦) وَمَنْ خَفَّتْ

مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ﴿١٠٧﴾

اللہ رب العزت نے قیامت کے حوالے سے بات فرمائی ہے کہ قیامت والے دن جس بندے کا نیک عمل والا پلڑا بھاری ہو گا تو وہی کامیاب ہو گا اور اگر نیک اعمال والا پلڑا ہلکا ہو گیا تو اب خسار اور نقصان ہو گا، ایسا بندہ جہنمی ہے۔ دعا کریں کہ اللہ ہمارے نیک اعمال والا پلڑا وزنی فرمادیں۔

یہاں جو بات کی جارہی ہے یہ کفر اور ایمان کی ہے کہ ایک بندہ کافر ہے اور ایک مؤمن ہے، کافر کا میزان ہلکا ہو گا اور مؤمن کا میزان بھاری ہو گا۔ قیامت کے دن وزن کس چیز کا کیا جائے گا اس بارے میں کئی قسم کی روایات ملتی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ خود انسان مؤمن و کافر کو تولّا جائے گا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے نامہ اعمال کو تولّا جائے گا اور بعض روایات میں ہے کہ انسان کے اعمال کو تولّا

جائے گا۔ تینوں قسم کی روایات موجود ہیں۔ دعا کریں کہ قیامت کے دن اللہ ہم سب کا ایمان والا پلڑا بھاری فرمادیں۔

میں آج اسی مقام پر دو حدیثیں پڑھ رہا تھا۔ جمعہ کے بعد میں گھر میں تھا اور گھر والے پاس بیٹھے تھے۔ جب میں نے ان روایتوں کو پڑھا تو بہت خوش ہوا۔ گھر والے مجھے کہتے ہیں کہ کیا ہوا؟ میں نے کہا کہ ڈر تو بہت لگتا ہے کیونکہ اعمال بہت کمزور ہیں اور بہت تھوڑے ہیں، کبھی کبھی ایسی احادیث سامنے آتی ہیں تو پھر ہمت بڑھ جاتی ہے۔ اب یہاں اس مقام پر مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز شہیدوں کا خون اور علماء کی روشنائی جس سے انہوں نے علم دین کی کتابیں لکھی تھیں باہم تولے جائیں گے تو علماء کی روشنائی کا وزن شہیدوں کے خون سے زیادہ نکلے گا۔“<sup>44</sup>

اب بندے کو تسلی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں کتاب ہے شامل ترمذی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں شامل ترمذی سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے، اس کتاب میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، تیل، سرمہ، آپ کے کپڑے، نعلین، ہنسنا وغیرہ یہ پوری زندگی جمع کی ہے۔

### زبدۃ الشمائل شرح شامل ترمذی:

میں نے سن 2000 میں اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کی شرح لکھی ”زبدۃ الشمائل“ کے نام سے اور یہ کتاب میں نے تیرہ دنوں میں لکھی ہے۔ آپ پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ ہو گا۔ جب میں نے کتاب علماء کو پیش کی تو مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر دامت فیوضہم مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی



نے اس پر تقریظ لکھی اور جب میں نے یہ کتاب دارالعلوم دیوبند میں بھیجی تو شیخ الحدیث حضرت مولانا سعید احمد پالنپوری حفظہ اللہ نے بھی اس پر تقریظ لکھی۔ حضرت مولانا محمد اکرم طوفانی صاحب دامت برکاتہم نے بھی اس پر تقریظ لکھی ہے۔ باباجی سے ہمیں پیار ہے، آپ کو اختلاف ہو تو میں کچھ نہیں کہتا، مجھے پیار ہے اور میری عادت ہے کہ جو بندہ کام کرے میں اس کے پاؤں چومتا ہوں، اس بوڑھے آدمی نے بہت کام کیا ہے، سرگودھا والوں پر اتنے احسانات ہیں کہ مرتے دم تک ان کے احسانات کو نہیں اتار سکتے۔ مجھے تعجب ہے ان بندوں پر جو باباجی کی بعض باتوں پر ناراض ہو جاتے ہیں، آدمی جب زندگی بھر کام کرے اور اس کی آخری عمر ہو تو اب اس سے ناراض نہیں بلکہ خوش ہونا چاہیے۔ طوفانی صاحب اسی سال کی عمر کے بوڑھے آدمی ہیں، انہوں نے خاتم النبیین ہسپتال بنا کر آپ پر احسان کیا ہے، آپ لوگ زندگی بھر اس کی قیمت نہیں چکا سکتے، یہ جھوٹی سی بات ہے کہ آپ کا سستا علاج بھی ہو رہا ہے اور ایمان بھی بچ رہا ہے اور مرزائیت کفر ہے آپ ان کے ہسپتال میں پیسے بھی دیتے تھے اور وہ ایمان بھی چھین لیتے تھے۔ الحمد للہ! آج لوگوں کا ایمان بچ گیا ہے، اللہ نے حجت کو تام کر دیا ہے، قیامت کے دن کوئی بندہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں کے پاس دل کا ہسپتال نہیں تھا۔ اس لیے میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ باباجی کی قدر کریں، میں نے اسپیشل ان سے تقریظ لی ہے اپنی اس کتاب پر۔ خانقاہ سر اجیہ کے صاحبزادہ عزیز احمد صاحب سے بھی تقریظ لکھوائی ہے، آپ لوگ ذرا حضرت کے جملے پڑھیں حضرت نے لکھا ہے کہ ”مولانا محمد الیاس گھسن زید مجددہ اہلسنت کا سرمایہ ہیں“ آپ ذرا علماء کی تصدیقات کو پڑھیں کہ علماء نے کیا کیا لکھا ہے۔

خیر میں کہہ رہا تھا کہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ حدیث پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور دوسری حدیث حضرت مفتی شفیع صاحب نے یہ نقل کی ہے

کہ قیامت کے دن ایک شخص کے اعمال تو لے جائیں گے تو وہ کچھ کم ہوں گے جس سے اس کے اعمال کا پلڑا ہلکا رہ جائے گا، پھر ایک ایسی چیز لائی جائے گی جو بادل کی طرح ہو گی۔ جب اسے اس بنے کے نیکیوں والے پلڑے میں رکھا جائے گا تو وہ پلڑا بہت بھاری ہو جائے گا۔ وہ شخص پوچھے گا یا اللہ! یہ کیا چیز ہے؟ اللہ فرمائیں گے کہ یہ تیرا علم ہے جو تو لوگوں کو سکھاتا تھا۔ (سبحان اللہ۔ سامعین) میں یہ حدیث پڑھ کر بہت خوش ہوا، یقین کریں کہ میں بہت کمزور ہوں لیکن بعض حدیثیں ایسی آجاتی ہیں کہ دل خوش ہو جاتا ہے اور کچھ امیدیں ہمیں بھی لگ جاتی ہے۔ اللہ ہمیں نجات کا راستہ عطا فرمائیں، اللہ ہمیں قدر کی توفیق عطا فرمائیں۔

### علماء کی قدر کیجیے!

اس لیے میں علماء کے خلاف باتیں کرنے سے منع کرتا ہوں، عالم کمزور بھی ہو تو انسان ہے، کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں لیکن علماء کے خلاف بات نہ کیا کرو، عالم عالم ہی ہوتا ہے، نبی کا وارث یہی ہوتا ہے، جیسا بھی ہو یہی پیغمبر کا وارث ہے۔ اس لیے علماء کی قدر کیا کرو! اب دیکھو! فوت ہونے والا باپ آنکھوں کا اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہے اور اس کا بیٹا نابینا ہے، اگر باپ فوت ہو جائے تو اس کا وارث کون ہو گا؟ بیٹا ہو گا۔ کوئی کہے کہ اس کا بیٹا تو نابینا ہے لہذا کوئی ڈاکٹر تلاش کرو جس کو اس کا وارث بنائیں تو سب کہیں گے کہ وارث یہی بیٹا ہو گا اگرچہ نابینا ہے۔ باپ پہلوان ہے اور بیٹا پاؤں سے لنگڑا ہے، اب باپ فوت ہو گیا تو وارث اسی لنگڑے بیٹے ہی بننا ہے، یہ نہیں کہ کوئی پہلوان تلاش کرو جو اس کا وارث بنے۔ عالم ہی نبی کا وارث ہے چاہے جیسا بھی ہو، آپ چوبیس گھنٹے عبادت کریں رات کو تہجد پڑھیں روزانہ قرآن ختم کریں لیکن آپ کو کوئی نہیں کہے گا کہ آپ نبی کے وارث ہیں، کیونکہ آپ مولانا صاحب نہیں ہیں جبکہ وارث عالم ہی بنتا ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ علماء کے خلاف کبھی بات نہ کیا کرو، کچھ کوتاہی ہو تو

برداشت کرو یہ سوچ کر کہ یہ نبی کا وارث ہے، اس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں علماء سے محبت اور قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جس بکری کا دودھ تم پیتے ہو اس بکری کی میٹھی بھی تم نے اٹھانی ہے، یہ نہیں کہ دودھ تم پیو اور میٹھیاں ہمسایہ اٹھائے۔ اسی طرح جس عالم کے علم سے نفع آپ اٹھاتے ہو اگر اس میں کچھ کمزوریاں ہیں تو برداشت بھی آپ نے کرنی ہیں، یہ تو نہیں کہ علمی نفع آپ اٹھائیں اور کمزوریاں مخالف برداشت کرے، یہ کیسے ہو سکتا ہے!

**جہنمیوں کی آہ کہ ہمیں یہاں سے نکالیں!**

﴿تَلْفَحُ وُجُوهُهُمْ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ ۝۳۰﴾ أَلَمْ تَكُنْ آيَتِي تُتْلَىٰ  
عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ۝۳۱﴾ قَالُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا  
قَوْمًا ضَالِّينَ ۝۳۲﴾ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ ۝۳۳﴾ قَالَ  
اخْسُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ۝۳۴﴾

قیامت کا دن ہو گا، کافر جہنم میں ہوں گے، ان کے چہرے جھلس رہے ہوں گے اور وہاں وہ اللہ کو پکار رہے ہوں گے کہ اے اللہ! ہمیں یہاں سے نکال دیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی تھیں اور تمہیں ڈرایا جاتا تھا لیکن تم ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے۔ وہ کہیں گے کہ یا اللہ! ہماری بد بختی ہم پر غالب آگئی ہم گمراہ ہو گئے، اللہ! ہمیں یہاں سے نکال دیں اب ہم نافرمانی نہیں کریں گے۔ اللہ فرمائیں گے:

﴿اِخْسُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ﴾ کہ ذلیل ہو کر یہیں جہنم میں پڑے رہو

اب تم نے ہم سے بات نہیں کرنی۔ پھر یہ اہل جہنم کسی سے بات نہ کر سکیں گے۔

## نیکو کار لوگوں کا بدلہ:

﴿إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْ عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ۝ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سَخِرِيًّا حَتَّى أَنْسَوْكُمُ ذِكْرِي وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُونَ ۝ إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا إِنَّهُمْ هُمُ الْفَاقِرُونَ ۝﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے نیک بندوں کی ایک جماعت دنیا میں یہ دعا مانگا کرتی تھی: ”فَاغْفِرْ لَنَا“ اللہ! ہم سے گناہ ہوئے ہیں تو ہمیں معاف فرما، ”وَارْحَمْنَا“ اور ہم پر رحم فرما، اے اللہ! تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔ اللہ جہنمیوں سے فرمائیں گے کہ تم میرے ان نیک بندوں کا مذاق اڑاتے تھے، ان کے ساتھ ٹھٹھا اور مذاق کی وجہ سے تم میری یاد سے بھی غافل رہے، آج میں نے ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت عطا کی ہے، آپ وہ کامیاب و کامران ہیں۔

﴿قُلْ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ۝ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَادِيْنَ ۝ قُلْ إِنْ لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا لَّوْ أَنْكُم كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝﴾

پھر اللہ ان جہنمیوں سے پوچھیں گے کہ بتاؤ تم کتنا عرصہ دنیا میں رہے ہو؟ یہ لوگ کہیں گے کہ دن یا دن کا کچھ حصہ ہم زمین میں ٹھہرے ہیں، ہمیں صحیح یاد نہیں یا اللہ! آپ ان لوگوں سے پوچھیے جنہوں نے گنتی کی ہے! اللہ فرمائیں گے کہ تم تھوڑی مدت سے زیادہ نہیں رہے ہو۔

## منکرین حیات الانبیاء کے ایک شبہ کا جواب:

یہاں ایک مسئلہ ذہن میں رکھیں۔ حضرت عزیر علیہ السلام ایک بستی سے گزرے۔ وہ بستی تباہ شدہ تھی۔ حضرت عزیر نے اللہ سے سوال کیا:

﴿أَنِّي يُحْيِي هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾<sup>45</sup>

اللہ! آپ اس بستی کو کیسے زندہ کریں گے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک سو سال تک موت دے دی۔ سو سال کے بعد اٹھایا اور فرمایا: ﴿كَمْ لَبِثْتُمْ﴾ آپ کتنا عرصہ اس حالت میں رہے ہو؟ حضرت عزیر علیہ السلام نے کہا کہ ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ اے اللہ! میں ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ اس حالت میں رہا۔

جو لوگ پیغمبر کی قبر والی حیات کا انکار کرتے ہیں وہ قرآن کی اس آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ نے سو سال موت دی، پھر اللہ نے ان کو زندہ کیا، پھر پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتُمْ﴾ کتنا عرصہ ٹھہرے ہو؟ حضرت عزیر نے کہا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ کہ اللہ! ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ، تو اس سے پتا چلا کہ نبی قبر میں زندہ نہیں ہوتا، اگر زندہ ہوتا تو ان کو پتا ہوتا کہ میں کتنی مدت ٹھہرا ہوں۔

اس دلیل کا جواب یاد رکھ لیں کہ اللہ جب کفار سے قیامت کے دن پوچھیں گے کہ ﴿كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ تم دنیا میں کتنا عرصہ ٹھہرے رہے؟ تو کافر کہیں گے: ﴿لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ کہ ہم ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ زمین میں رہے، اب بتاؤ کہ کافر دنیا میں زندہ تھے تو ان کو پتا کیوں نہیں ہے؟ اگر پتا نہ ہونا موت کی دلیل ہے تو پھر دنیا میں سارے کافر مرے ہوئے ہیں کیونکہ ان کو قیامت کے دن یہ پتا نہیں چلے گا کہ دنیا میں کتنے دن ٹھہرے تھے۔

میں کسی بندے سے پوچھوں کہ بیان شروع ہوئے کو کتنے منٹ ہوئے ہیں؟

تو آپ منٹ کو گن کر نہیں بتا سکتے جب تک کہ آپ گھڑی نہیں دیکھیں گے، تو کیا آپ مرے ہوئے ہیں؟ بھائی! پتانا چلنا یہ موت کی دلیل کیسے ہو سکتی ہے؟ دیکھو! اصحاب کہف غار میں گئے اور تین سو نو سال تک سوتے رہے اور جب اٹھے تو پوچھا کہ کتنا عرصہ ٹھہرے؟ کہا کہ ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ۔ اب وہ سوئے ہوئے تھے یا مرے ہوئے تھے؟ (سوئے ہوئے تھے۔ سامعین) تو کیا پتانا چلنا دلیل ہے کہ وہ زندہ نہیں تھے؟

اور ان منکرین حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ہم قرآن بیان کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن پڑھ کر عقیدہ غلط بتاتے ہیں۔ اللہ پاک ہمیں ایسے کام سے محفوظ رکھے۔

**انسان بے کار پیدا نہیں کیا گیا:**

﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ﴾

فَتَعَلَى اللَّهِ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ﴿١٦٦﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ کیا تمہارا خیال یہ تھا کہ ہم نے تمہیں یونہی فضول پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہمارے پاس نہیں آؤ گے؟ اللہ رب العزت اونچی شان کا مالک ہے، حقیقی بادشاہ ہے، اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، اللہ عزت والے عرش کا مالک ہے۔ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہراتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، ان کا حساب تو اللہ کے ذمہ ہے، قیامت کو کافر کامیاب نہیں ہوں گے۔

**پیغمبر پاک کو دعا کی ترغیب:**

﴿وَقُلْ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ﴾

آخر میں فرمایا کہ اے میرے پیغمبر! آپ یہ دعا مانگا کریں: ﴿رَبِّ اغْفِرْ وَ

اِذْ حَمَّوْا اَنْتَ خَيْرُ الرَّحِمِيْنَ ﴿۱﴾ یہ دعا آپ لوگ یاد کریں۔ یہ قرآنی دعا ہے۔ آپ کو یاد نہیں ہے تو ایک مرتبہ میرے ساتھ پڑھ لیں:

﴿رَبِّ اغْفِرْ وَاِذْ حَمَّوْا اَنْتَ خَيْرُ الرَّحِمِيْنَ ﴿۱﴾﴾

### امراض سے بچاؤ کا دم:

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا گزر ایک بندے پر ہوا جو کئی امراض میں مبتلا تھا۔ آپ نے سورۃ المؤمنون کی آخری آیات ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنْمَّا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا﴾ سے آخر تک اس کے کان میں پڑھ دیں وہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبداللہ! تو نے اس کے کان میں کیا پڑھا؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضور! میں نے یہ آخری آیتیں پڑھی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: اگر کوئی مومن مکمل یقین کے ساتھ یہ آیتیں پڑھے تو پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے۔

اس لیے سورۃ المؤمنون کی آخری چار آیات ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنْمَّا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا﴾ سے لے کر ﴿وَ اَنْتَ خَيْرُ الرَّحِمِيْنَ﴾ تک یاد رکھ لیں، زبانی یاد نہیں ہوتیں تو قرآن کھول کر پڑھ لیا کریں، اگر گھر میں کوئی بیمار ہے تو یہ چار آیتیں اس کے کان میں دم کر دیا کریں، اگر سرد رہے یا کوئی اور تکلیف ہے تو ان کو پڑھ لیا کریں، میں ان کے پڑھنے کی اجازت دیتا ہوں۔

کئی لوگ کہتے ہیں کہ جی ہمیں وظیفے کی اجازت دیں۔ ہماری اجازت بڑی کھلی ہوتی ہے تاکہ نفع عام ہو، ہم اس کو روک روک کر نہیں رکھتے، ہماری ساری چیزیں نیٹ پر موجود ہوتی ہیں، بغیر پیسے کے کلک کریں تو ہمارا سامان باہر آجاتا ہے۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

## سورت کی ابتدا اور انتہا کا ربط:

جب اس سورت کا آغاز ہوا تو فرمایا کہ ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ﴾ کہ ایمان والے کامیاب ہیں اور جب سورت ختم ہو رہی ہے تو فرمایا: ﴿إِنَّهُ لَا يُفْهِمُ الْكَافِرُونَ﴾ کہ کافر ناکام ہو گیا۔ پتا چلا کہ کامیابی و کامرانی یہ صرف ایمان والوں کا حصہ ہے، کافر لوگ اس سے محروم ہیں۔ اللہ ہمیں ایمان پر ثابت قدم رکھے۔ (آمین)

## زبدۃ الشمائل اور نماز اہل السنۃ والجماعۃ کی اہمیت:

میں نے کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ میری کچھ کتابیں ایسی ہیں جو ہر کسی کے لیے مفید ہوتی ہیں تو میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہر بندے کے پاس ہوں جیسے نماز اہل السنۃ والجماعۃ یہ ہر گھر میں ہو اور ہر مسجد میں ہو، اس میں ہماری نماز پر پورے دلائل موجود ہیں، ایک کتاب زبدۃ الشمائل ہے یہ بھی ہر گھر میں ہو اور میں نے یہ کتاب چھپنے کے بعد سب سے پہلے اپنے گھر والوں کو ہدیہ کی ہے۔ آپ اس کو ایک بار پڑھ لو اور میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اگر ممکن ہو تو آپ اپنے گھر میں گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر اس کی تھوڑی سی تعلیم کراؤ۔ میں نے تین دن پہلے گھر والوں سے کہا کہ سرمہ لاؤ۔ وہ مجھے سرمہ لگانے لگیں تو میں نے کہا کہ پہلے زبدۃ الشمائل میں دیکھو کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سرمہ کیسے لگاتے تھے اور کون سا سرمہ لگاتے تھے اور کب لگاتے تھے؟ یہ پڑھو اور پھر لگاؤ۔ سرمہ تو لگانا ہوتا ہے، تیل لگانا ہوتا ہے، کنکھی استعمال کرنی ہوتی ہے، بستر بچھانا ہوتا ہے لیکن اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کو سامنے رکھ کر ہم یہ کام کریں تو کتنی برکت ہوگی کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ ساری سنتیں اس کتاب میں موجود ہیں اور یہ کتاب اتنی آسان ہے کہ عامی بندہ بھی جب پڑھے گا تو اس کو بھی سمجھ میں آجائے گی اور جن حضرات نے اس کتاب پر



تقریظات لکھی ہیں تقریباً تمام علماء نے یہ بات لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا گھسن صاحب کو ایک فن دیا ہے کہ مشکل سے مشکل الفاظ کو آسان تعبیرات کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور انہوں نے اس کتاب میں اس فن کو خوب استعمال کیا ہے۔

تو ہماری خواہش ہے کہ آپ زبدۃ الشمائل اور نماز اہل السنۃ والجماعۃ کو خریدیں اور یہ الاتحاد ڈائری ہے جو ہر سال چھپتی ہے، جو حضرات ڈائریاں استعمال کرتے ہیں وہ اس کو بھی ساتھ رکھیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی زندگی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

## سورة النور

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿سُورَةٌ أَنْزَلْنَاهَا وَفَرَضْنَاهَا وَأَنْزَلْنَا فِيهَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ١﴾ الْفَاحِشَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةً جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَيَشْهَدَ عَذَابُهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ٢﴾

### زنا؛ انسانی معاشرے کا ایک سنگین جرم

وہ اعمال جو شریعت میں نہایت ناپسندیدہ اور گھناؤنے جرم قرار دیے گئے ہیں ان میں ایک زنا بھی ہے۔ زنا کو شریعت میں نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام دو ایسے نبی ہیں کہ جن کے نکاح میں آنے والی بیوی کافرہ ہے لیکن وہ فاحشہ اور زانیہ نہیں تھیں کیونکہ زنا انسانی سوسائٹی میں بہت بڑا عیب ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ایسے عیوب سے پاک رکھتے ہیں جو انسانی سوسائٹی میں جرم شمار ہوتے ہوں۔

ایک معاشرہ وہ ہوتا ہے جسے ہم اسلامی معاشرہ اور اسلامک سوسائٹی کہتے ہیں اور ایک ہوتا ہے صرف انسانی معاشرہ۔ انسانی سوسائٹی میں اور بحیثیت انسان کفر اختیار

کرنا معاشرے میں جرم شمار نہیں ہوتا لیکن بحیثیت انسان زنا کرنا یہ معاشرے میں عیب شمار ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ اپنے نبی کو ان عیوب سے محفوظ رکھتے ہیں۔ تو سورت نور کے پہلے رکوع میں اور پھر دوسرے رکوع میں بھی زنا کے متعلق کچھ احکام بیان فرمائے ہیں۔

### زنا کے متعلق پہلا حکم:

سب سے متعلق پہلا حکم یہ ہے کہ زنا کرنے والے مرد یا عورت کو دیکھیں کہ کنوارہ ہے یا شادی شدہ ہے؟ کنوارے کو کہتے ہیں بکر، باکر، باکرہ اور شادی شدہ کو مُحصَن، ثیب، ثیبہ کہتے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں نکاح کے عنوان میں اور زنا کی سزا کے عنوان میں محسن اور محسنہ ایسے مرد اور عورت کو کہتے ہیں جن میں یہ شرطیں ہوں:

1: آزاد ہو

2: عاقل ہو

3: بالغ ہو

4: نکاح کر کے ہمبستری کی ہو یا خلوتِ صحیحہ کی ہو۔ خلوتِ صحیحہ کا معنی یہ ہے کہ شوہر اور بیوی ایسے مکان میں ہوں کہ اگر وہ ہمبستری کرنا چاہیں تو کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

ان شرائط کے حامل کو شریعت کی اصطلاح میں محسن کہتے ہیں۔ محسن کا حکم اور ہے اور کنوارے کا حکم اور ہے۔ محسن کا حکم یہ ہے کہ اسے رجم اور سنگسار کر دیا جائے اور کنوارے کا حکم یہ ہے کہ اسے سو کوڑے لگائے جائیں۔

### زنا کی سزا کے تدریجی احکامات:

زنا کی سزا کے احکامات تدریجاً نازل ہوئے ہیں۔ پہلے یہ آیت نازل ہوئی ہے:

﴿وَالَّذِي يَأْتِيَنَّ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ

أَذْبَعَةً مِّنْكُمۡ فَإِنۡ شَهِدُوا۟ فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّهِنَّ الْمَوْتُ  
أَوْ يُجْعَلَ لِلَّهِ لِهِنَّ سَبِيلًا ﴿١٥﴾ وَالَّذِينَ يَأْتِيْنَهَا مِنْكُمۡ فَأَذُوهُمَا <sup>46</sup>

کہ تمہاری عورتوں میں سے جب کوئی عورت زنا کا ارتکاب کرے تو اس پر چار گواہ بنا لو، اگر یہ گواہ ان عورتوں کے خلاف گواہی دیں تو ان عورتوں کی سزا یہ ہے کہ ان کو گھر میں روک کر رکھو یہاں تک کہ ان کو موت آجائے یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راستہ پیدا کر دے اور اس کے علاوہ قاضی اپنی صواب دید سے اگر کچھ تنبیہ کرنا چاہے تو کرے۔

اس پہلے حکم میں سزا یہ تھی کہ عورت کو گھر میں قید کیا جائے اور اس جرم کے مرتکب مرد و عورت کو قاضی یا امیر اپنی صواب دید کے مطابق کچھ سزا دے۔ اس کے بعد پھر سورۃ النور کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد کو سو سو کوڑے مارو!

جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورۃ النساء میں جو وعدہ کیا گیا تھا ﴿أَوْ يُجْعَلَ لِلَّهِ لِهِنَّ سَبِيلًا﴾ کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی اور راستہ پیدا کر دے گا تو اللہ نے سورۃ النور میں وہ راستہ بتا دیا ہے یعنی زانی عورت اور زانی مرد کو سو سو کوڑوں کی سزا دی جائے۔ ساتھ ہی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بات بھی فرمادی کہ اس آیت میں سو کوڑے مارنے کا جو ذکر ہے یہ غیر شادی شدہ مرد اور غیر شادی شدہ عورت کے ساتھ خاص ہے۔

پھر زنا کی سزا کا تیسرا درجہ وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان

فرمایا کہ زانی مرد اور عورت اگر غیر شادی شدہ ہوں تو ان کی سزا سو سو کوڑے ہے اور شادی شدہ ہوں تو ان کی سزا فقط رجم اور سنگسار کرنا ہے۔

### ثبوتِ زنا کی شرائط سخت ہیں:

زانی بندہ اگر شادی شدہ ہو تو شریعت نے اس کی سزا بہت سخت رکھی ہے کہ اس کو پتھروں کے ساتھ مار کر ہلاک کر دو اور شریعت نے زنا کے ثبوت کے لیے شرائط بھی بہت سخت رکھی ہیں کہ چار مرد ہوں جو مرد اور عورت کو زنا کرتا دیکھیں اور اس طرح دیکھیں کہ جیسے سلائی سرمہ دانی میں داخل ہے، صرف مرد کو عورت پر سوار نہ دیکھیں بلکہ گواہی دیں کہ عضو خاص عضو خاص میں ایسے داخل تھا جیسے سلائی سرمہ دانی میں داخل ہوتی ہے۔ چونکہ زنا کی سزا بہت سخت ہے اس لیے اس کے ثبوت کے لیے شرائط بھی بہت سخت اور کڑی رکھی گئی ہیں۔

### زنا کے ثبوت کے طریقے:

اس لیے زنا جب بھی ثابت ہوتا ہے تو اس کے لیے تین طریقے ہیں:

- 1: چار مرد گواہ ہوں۔
- 2: زانی یا زانیہ خود اعتراف کرے کہ میں نے زنا کیا ہے۔
- 3: کنواری عورت کا حمل ظاہر ہو جائے۔ اب ظاہر ہے کہ اس سے فرار تو اختیار نہیں کر سکتی کہ حمل کس کا ہے؟ پھر وہ بتائے گی کہ یہ فلاں بندے کا ہے۔ اب وہ بندہ اقرار کرے گا تو اسے سزا ملے گی اور اگر اقرار نہیں کرے گا تو عورت کو سزا ملے گی اور مرد کو سزا نہیں ملے گی۔

کسی کے ذہن میں یہ سوال ضرور آ سکتا ہے کہ جب ثبوتِ زنا کے لیے اتنی سخت شرائط ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زنا کا معاملہ شریعت میں نرم ہے، اتنی شرائط لگانے سے نہ زنا ثابت ہو گا اور نہ سزا ہو گی، پھر اس سے تو زنا کے دروازے کھل جائیں

گے! تو یہ بات ذہن نشین فرمائیں کہ زنا کے ثابت ہونے کے بعد بہت سخت سزائیں ہیں لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ زنا کی اجازت مل گئی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے بارے میں کہتا ہے کہ میں نے فلاں کو فلاں کے ساتھ زنا کرتے دیکھا ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ اپنے ساتھ تین گواہ مزید پیش کرو! اگر گواہ نہیں ہیں تو زنا ثابت نہیں ہو گا لیکن اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ کھلی چھٹی دی ہے۔ کوئی آدمی عدالت میں قاضی کو یہ کہے کہ میں نے فلاں مرد کو فلاں عورت کے ساتھ خلوت میں دیکھا ہے تو قاضی تعزیر لگائے گا۔ کوئی کہے کہ میں نے ان دونوں کو اکٹھے ننگے بدن کے ساتھ دیکھا ہے تو قاضی تعزیر لگائے گا۔ تو شریعت نے مرد اور عورت کو ملنے کی چھٹی نہیں دی! ہاں اگر زنا کرتے دیکھا ہے تو اس کی شرائط سخت ہیں لیکن وہ زنا کی شکایت نہ لگائے بلکہ وہ کہے کہ میں نے ان کو پیار کرتے دیکھا ہے، بوس و کنار کرتے دیکھا ہے، دونوں کو ننگی حالت میں لیٹے دیکھا ہے تو اب اس پر چار گواہ نہیں چاہئیں بلکہ اب اس پر تو دو گواہ ہی کافی ہیں جیسے دوسرے معاملات میں دو گواہ کافی ہو جاتے ہیں۔ تو اتنی سخت سزا کا معنی یہ نہیں ہے کہ زنا کا دروازہ کھولا ہے، اتنی سخت سزا کا مطلب یہ ہے کہ زنا جرم بہت بڑا ہے۔ کسی بندے کے بارے میں یہ بات کہنا کہ اس نے بدکاری کی ہے تو یہ اس بندے کا معاشرہ میں ستیاناس کرنے والی بات ہے۔ تو شریعت یہ چاہتی ہے کہ عزت کی حفاظت ہو، یہ نہیں ہے کہ زنا کی اجازت دی ہے۔

یہاں اس آیت میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ غیر شادی شدہ زانی ہو یا زانیہ ہو تو ان کو سو سو کوڑے سزا دو اور ان کے معاملے میں تمہیں ترس نہیں کھانا چاہیے اور سزا بھی علی الاعلان دو، چھپ کر نہ دو، ﴿وَيُكَلِّفُ عَذَابَهُمَا طَائِفَةً مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ کہ جب ان کو سزا ملے تو مسلمانوں کا ایک مجمع ان کو دیکھے۔ عذاب کہتے ہیں ”إِلَّا لَهُمُ الْحَيِّ عَلَى سَبِيلِ الْهَوَانِ“ زندہ آدمی کو رسوا کرنے کے لیے تکلیف دینا یہ

ہے عذاب۔ یہ جو کوڑے مارے جاتے ہیں ان کوڑوں کا بنیادی مقصد تکلیف دینا نہیں ہے بلکہ بنیادی مقصد رسوا کرنا ہے تاکہ آئندہ اس گناہ کی کوئی ہمت اور جرأت نہ کرے، ان سے تکلیف دینا مقصود ہوتا تو ان کو بند کمرے میں ہی سزا دے دیتے جہاں کوئی بھی نہ دیکھتا۔ اسی لیے فرمایا کہ ان کی سزا کو مسلمانوں کا ایک مجمع دیکھے۔

سزا دینے کے وقت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت موجود ہو، اس کا مقصد صرف تکلیف دینا اور تنبیہ کرنا نہیں بلکہ رسوا کرنا بھی ہے۔ اگر مارنا ہی مقصود ہوتا تو پھر کوڑا سخت ہوتا، حالانکہ حکم دیا گیا کہ کوڑا اتنا سخت نہ ہو، لفظ ﴿فَاجْلِدُوا﴾ جلد سے ہے، جلد کہتے ہیں چڑے کو، عام طور پر جو سزا دینے کے لیے کوڑا مارا جاتا ہے وہ لکڑی کا نہیں ہوتا بلکہ چڑے کا بنا ہوتا ہے اور لکڑی کا بھی ہو تو اتنا سخت نہ مارو کہ جس سے چڑا ادھر جائے اور ہڈی تک اس کا اثر پہنچ جائے۔ آپ کسی آدمی کو بند کمرے میں دس جوتے مارو وہ برداشت کر لے گا لیکن سو بندوں میں کھڑا کر کے اس کی بے عزتی کرو تو برداشت نہیں کرے گا۔ تو شریف لوگ اس کو اپنے لیے بڑی توہین سمجھتے ہیں۔ بہر حال یہ شریعت نے حکم دیا ہے۔ تو شریعت میں شادی شدہ کے لیے رجم کی سزا ہے اور غیر شادی شدہ کے لیے کوڑے مارنے کی سزا ہے۔

### عورت کا ذکر مرد سے پہلے کیوں؟

یہاں جب زنا کا مسئلہ اور سزا بیان کی تو پہلے عورت کا ذکر کیا یعنی ﴿الزَّانِيَةُ﴾ وَ الزَّانِي ﴿﴾ کہا۔ زنا تب ہوتا ہے جب عورت بھی چاہے اور مرد بھی چاہے ورنہ زنا کیسے ہو سکتا ہے! بدکاری بہت مشکل ہے، جبر کے ساتھ کسی عورت کی عزت لوٹنا بہت مشکل ہے لیکن یہ بات یاد رکھنا کہ عورت کتنی بھی کمزور کیوں نہ ہو جب تک اس کی خواہش نہ ہو مرد عورت کے قریب جانے کی ہمت نہیں کرتا، ہمت تب کرے گا جب عورت کی

طرف سے مرد کو کوئی گنجائش نظر آئے ورنہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کوئی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ اس لیے شریعت نے عورت کو باہر نکلنے سے منع کیا ہے اور پردہ کا حکم دیا ہے، شوہر کے علاوہ کسی کے سامنے زیب و زینت کرنے سے منع کیا ہے۔ محرم کے سامنے اجازت ہے لیکن ترغیب نہیں ہے اور عورت کی آواز کو بھی ستر قرار دیا ہے اور عورت کے لباس تک کا خیال کیا ہے۔ اگر یہ زیور پہن کر جائے تو یوں نہ چلے کہ اس کی چھکار آئے، اتنا مخفی اس لیے رکھا ہے کہ اس کی وجہ سے زنا کی ترغیب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت میں عورت کا ذکر پہلے کیا ہے اور مرد کا بعد میں کیا ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

### زنا کے متعلق دوسرا حکم:

﴿الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا

زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذَلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾

زانی مرد جب نکاح کرتا ہے تو زانیہ عورت سے کرتا ہے یا مشرک عورت سے کرتا ہے اور زانیہ عورت سے بھی نکاح یا تو زانی مرد کرتا ہے یا مشرک مرد کرتا ہے، اور یہ بات ایمان والوں پر حرام کر دی گئی ہے کہ وہ بدکار مرد یا بدکار عورت کو نکاح کے لیے پسند کریں۔

ایک بات تو یہ سمجھ لیں کہ یہاں جب نکاح کی بات کی ہے تو نکاح کی نسبت مرد کی طرف کی ہے ﴿الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً﴾ کہ زانی مرد نکاح کرتا ہے تو زانیہ عورت سے کرتا ہے یا مشرک عورت سے کرتا ہے اور جب زانیہ عورت کا معاملہ آیا تو یہ نہیں فرمایا کہ زانیہ عورت نکاح کرتی ہے زانی مرد سے یا مشرک مرد سے بلکہ وہاں انداز یہ اختیار فرمایا ﴿وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ﴾ کہ



زانیہ عورت سے نکاح کرتا ہے زانی مرد یا مشرک مرد۔ یعنی دونوں کے نکاح کے بارے میں نسبت مرد کی طرف کیوں کی ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ نکاح کی نسبت مرد کی طرف ہوتی ہے کیونکہ نکاح میں مرد حاکم ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ نابالغ لڑکی کے لیے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہے اور اگر بالغ ہو تو نکاح خود نہ کرے بلکہ اس کا ولی نکاح کروائے کیونکہ اس میں عورت کی عفت بھی ہے، حفاظت بھی ہے اور بہتر بھی یہی ہے کیونکہ اس کی عقل کم ہے اور وہ اپنے لیے مسائل پیدا کرے گی۔

دوسری بات یہ سمجھیں کہ اس آیت کا معنی یہ نہیں ہے کہ زانی مرد اگر پاک دامن عورت سے نکاح کرے تو اس کا نکاح نہیں ہوتا بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کی فطرت اور طبیعت بیان کی ہے کہ زانی مرد کو پاک دامن عورت اچھی نہیں لگتی، اس کا میلان بدکار عورت کی طرف ہی ہوتا ہے اور بدکار عورت کو پاک دامن مرد اچھا نہیں لگتا، اس کا رجحان بھی بدکار مرد کی طرف ہی ہوتا ہے۔

ایک بات یہ بھی سمجھیں کہ یہاں زانی مرد اور زانیہ عورت کے ساتھ مشرک مرد اور مشرک عورت کا ذکر کیوں کیا ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح زنا کرنے والا مرد ایک عورت پر راضی نہیں ہوتا بلکہ اور عورتوں کی طرف بھی دیکھتا ہے اسی طرح مشرک؛ ایک خدا پر راضی نہیں ہوتا بلکہ اور دروازوں کو بھی دیکھتا ہے، جس طرح زانیہ عورت ایک شوہر پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اور مردوں کی طرف بھی نگاہ اٹھاتی ہے اسی طرح مشرک عورت بھی ایک اللہ کے در پر راضی نہیں ہوتی اور مردوں پر بھی جاتی ہے، تو زانی اور مشرک ان دونوں کا مزاج چونکہ ایک جیسا ہے اس لیے دونوں کو اکٹھا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔

## ترکیب کے اعتبار سے دو معانی کا بیان:

﴿وَحُرْمَ ذَلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾

یہ ایمان والوں پر حرام ہے۔

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ”زنا ایمان والوں پر حرام ہے“۔ ”حُرْمَ“ میں جو ہوضمیر ہے وہ زنا کی طرف لوٹتی ہے، پھر تو صاف سی بات ہے کہ زنا حرام ہے، کوئی تاویل کرنے یا مزید بات سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر ”حُرْمَ“ کی ہو ضمیر سے مراد نکاحِ زانی و زانیہ اور نکاحِ مشرک و مشرکہ ہو تو اب مطلب ہو گا کہ پاکدامن آدمی کا زانیہ عورت سے اور پاکدامن عورت کا زانی مرد سے نکاح حرام ہے، اسی طرح مسلمان مرد کا مشرکہ عورت سے اور مسلمان عورت کا مشرک مرد سے نکاح حرام ہے۔ ان کو حرام کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ سمجھ لیں۔ جہاں تک مسئلہ ہے کہ مسلمان مرد کا نکاح مشرکہ عورت سے اور مسلمان عورت کا نکاح مشرک مرد سے تو اس کا حرام ہونا تو بالکل واضح ہے، مسلمان اور کافر کا نکاح آپس میں نہیں ہوتا، یہ بات بڑے آرام سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔

جہاں تک دوسرا مسئلہ ہے کہ پاکدامن آدمی کا زانیہ عورت سے اور پاکدامن عورت کا زانی مرد سے نکاح حرام ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں! اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک پاکدامن اور عفت والا آدمی کسی زانیہ سے نکاح کرے اور نکاح کے بعد اس کو زنا سے نہ روکے بلکہ اس عورت کی زنا کاری پر راضی رہے تو اس بندے کا یہ فعل حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ اسی طرح اگر کوئی پاکدامن اور صاحبِ عفت عورت زانی مرد سے نکاح کرے اور نکاح کے بعد اس کو اس فعلِ حرام سے نہ روکے اور اس پر راضی رہے تو اس عورت کا راضی رہنا فعلِ حرام اور ناجائز ہے۔

تو یہاں حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا فعل حرام ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا نکاح بھی حرام ہو، ان کا نکاح ٹھیک ہے، اس پر نکاح کے ثمرات مرتب ہوں گے، حق مہر بھی ہوگا، نفقہ بھی ہوگا، جو اولاد پیدا ہوگی اس کا نسب ان کے ساتھ ثابت ہو جائے گا، ان میں کوئی مر جائے تو میراث بھی ہوگی لیکن ان کا یہ فعل حرام رہے گا۔

میں اس کی مثال دوں تو پھر بات سمجھنی آسان ہوگی۔ کوئی شخص کسی عورت کو اغوا کرے اور پھر اس کو زنا پر مجبور کرے اور عورت کہتی ہے کہ میں اس طرح تو آپ کے ساتھ نہیں کر سکتی۔ مرد نے کہا: چلو پھر نکاح کر لو۔ عورت راضی ہو گئی اور انہوں نے دو گواہ بنا کر نکاح کر لیا۔ اب اس نکاح کی وجہ سے ہمبستری حلال ہو گئی ہے لیکن کیا مرد کا اس طرح کرنا جائز ہے؟ (نہیں۔ سامعین) اس طرح نکاح کرنا حرام ہے لیکن چونکہ یہ عورت اس کے نکاح میں آگئی ہے اس لیے ہمبستری حلال ہوگی، عورت کا نان و نفقہ اس مرد کے ذمے ہوگا، ان میں سے کوئی ایک مر جائے تو دوسرا اس کا وارث بھی ہوگا لیکن یہ طریقہ حرام ہے۔

### زنا کے متعلق تیسرا حکم:

﴿وَالَّذِينَ يَزْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَدْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾

اب یہ تیسرا حکم آگیا ہے زنا کے بارے میں کہ عورت پاکدامن ہو، نیک ہو اور کوئی بندہ اس پر زنا کی تہمت لگاتا ہے تو اس شخص کو چاہیے کہ چار گواہ پیش کرے۔ اگر چار گواہ پیش نہیں کر سکتا تو اس تہمت لگانے والے پر حد قذف لگائی جائے گی اور وہ

مردود الشہادت ہو جائے گا، آئندہ کسی کیس میں اس کی شہادت قبول نہیں ہوگی۔ ہاں اگر یہ توبہ کر لیتا ہے تو اس کو آخرت میں سزا نہیں ملے گی لیکن دنیا کی سزا باقی رہے گی یعنی اس کو کوڑے بھی لگیں گے اور آئندہ گواہی بھی قبول نہیں ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ کوئی آدمی کسی پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگائے اور چار گواہ نہ پیش کر سکے تو اس کے بارے میں تین حکم ہیں:

1: اسی کوڑے مارے جائیں گے۔

2: آئندہ کسی مقدمے میں یہ گواہ بن کر آئے تو اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔

3: اس شخص کو آخرت میں سزا ہوگی۔ ہاں اگر اس نے توبہ کر لی تو توبہ کرنے سے آخرت والی جو سزا ہے وہ ختم ہو جائے گی لیکن مردود الشہادۃ پھر بھی رہے گا اور کوڑے بھی لگیں گے۔

حد زنا اور حد قذف میں ایک فرق ہے۔ زنا اگر شہادتوں سے ثابت ہو جائے تو پھر کوئی مطالبہ کرے یا نہ کرے زانی اور زانیہ پر حد زنا ہوگی لیکن اگر کوئی شخص کسی پر تہمت لگائے اور چار گواہ پیش نہ کر سکے اور اگر مقذوف سزا کا مطالبہ کرے تو تہمت لگانے والے کو اسی کوڑے مارے جائیں گے۔ اگر مقذوف سزا کا مطالبہ نہ کرے تو صرف تہمت لگانے پر اسی کوڑے نہیں ہوں گے۔ اس لیے کہ یہ حق العبد ہے اور حق العبد کا تعلق مطالبے کے ساتھ ہوتا ہے۔

**لعان کا مسئلہ:**

﴿وَالَّذِينَ يَزْمُونَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ شُهَدَاءُ اِلَّا اَنْفُسُهُمْ

فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعٌ شَهَدَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهُ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۱﴾

یہ معاملہ خاوند اور بیوی کے درمیان ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر زنا کا

الزام لگائے اور چار گواہ بھی پیش کرے تو اس کی بیوی پر حد زنا لگ جائے گی۔ اگر گواہ نہ ہوں تو لعان ہو گا۔ لعان کا طریقہ یہ ہے کہ یہ مرد چار مرتبہ قسمیں کھائے کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اس بات میں سچا ہوں کہ میں نے اسی طرح اس کو دیکھا ہے۔ پانچویں مرتبہ قسم یوں اٹھائے کہ اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ اب بیوی سے کہا جائے گا کہ وہ بھی چار مرتبہ قسمیں کھائے کہ یہ جھوٹ بولتا ہے اور پانچویں مرتبہ یوں قسم کھائے کہ اگر یہ سچا ہے تو پھر مجھ پر خدا کا غضب نازل ہو۔

یہاں شوہر کی پانچوں قسموں میں نسبت شوہر کی طرف ہے اور بیوی کی پانچوں قسموں میں بھی نسبت شوہر کی طرف ہے حالانکہ انکار تو بیوی بھی کر رہی ہے۔ تو چونکہ الزام شوہر نے لگایا ہے اس لیے نسبت بھی اسی کی طرف کر دی ہے۔ اسے شریعت میں ”لعان“ کہتے ہیں۔

حدیث پاک میں ہے کہ یہ دونوں کبھی بھی آپس میں جمع نہیں ہو سکتے، یہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے لیکن طلاق نہیں ہو گی۔ طلاق تب ہو گی جب شوہر اس کو طلاق دے گا اور اس کو طلاق دینی چاہیے۔ اگر شوہر طلاق نہیں دیتا تو پھر قاضی ان دونوں کے درمیان قضاء تفریق کرائے اور پھر وہ تفریق طلاق شمار ہو گی۔

اگر کوئی بندہ اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت پر زنا کا الزام لگائے تو حکم الگ ہے اور اگر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے تو حکم الگ ہے۔

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ حَكِيمٌ﴾

دیکھو! یہ اللہ کا فضل اور رحمت ہے کہ تمہیں حکم لعان دیا ہے۔

کیونکہ اگر کسی نے اپنی بیوی کو کسی کے ساتھ دیکھا تو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ اگر قاضی کو جا کر کہے کہ میں نے بیوی کو زنا کرتے دیکھا ہے تو قاضی حد کیسے لگائے گا؟ اس کے پاس چار گواہ نہیں ہیں اور کسی کو نہ بتائے تو چونکہ اپنی آنکھوں سے

دیکھا ہے اس لیے برداشت کیسے کرے گا؟ اب اس کو گولی مار دے تو مارنا جائز نہیں ہے، اب یہ کیا کرے؟ اور اگر اپنے خاندان کو جمع کر کے کہے کہ میں نے اس کو طلاق دینی ہے، میں نے فلاں کے ساتھ دیکھا ہے تو ثبوت پیش کرو! اب کہاں سے ثبوت لائے گا؟ اس لیے حکم لعان اللہ کا فضل اور رحمت ہے۔

اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان یہ بہت عجیب معاملہ تھا۔ جب یہ حکم نازل ہوا کہ اگر کسی کو زنا کرتے دیکھو تو چار گواہ پیش کرو تو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے کہا کہ یا رسول اللہ! کوئی بندہ اپنی بیوی کے ساتھ کسی کو دیکھے تو پھر گواہ لینے کے لیے جائے گا اور وہ واپس آئے گا تو وہ کام کر کے جاچکا ہو گا۔ تو ہم کیا کریں؟

دوسرا دن ہوا تو انصار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک کے ساتھ یہ واقعہ پیش آگیا۔ اس نے کہا: جی میرے گھریہ واقعہ ہو گیا ہے۔ تو انصار صحابہ کہتے ہیں کہ جس کام کو ہم نے غیرت کا مسئلہ سمجھا تھا ہمارے گھر ہی وہ معاملہ ہو گیا۔ تو پھر یہ آیات نازل ہوئیں کہ اب لعان کرو۔

### واقعہ افک:

﴿إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ بَلْ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سن 6ھ کو غزوہ بنو المصطلق میں تشریف لے گئے۔ واپس آرہے تھے تو حضرت ام المؤمنین امی عائشہ رضی اللہ عنہا قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئیں۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر بھی تھوڑی تھی اور وزن

بھی کم تھا اور ہودج-جوانٹ کے اوپر کجاوا ہوتا تھا۔ جس میں بیٹھتی تھیں اس کا پردہ بھی لٹکا ہوا تھا تو اٹھانے والے صحابہ نے یہ سمجھا کہ شاید امی عائشہ رضی اللہ عنہا اس میں موجود ہیں۔ چونکہ عمر تھوڑی ہے اور وزن کم ہے اس لیے محسوس نہیں کیا۔ ہودج اٹھا کر اونٹ کے اوپر رکھا اور قافلہ روانہ ہو گیا۔

امی عائشہ رضی اللہ عنہا جب واپس تشریف لائیں تو قافلہ جا چکا تھا۔ آپ نے نہایت عقل مندی سے فیصلہ فرمایا کہ جب اگلی منزل پر اتریں گے اور میں ہودج میں نہیں ہوں گی تو ظاہر ہے کہ مجھے تلاش کرنے کے لیے واپس آئیں گے، اس لیے بجائے اس کے کہ میں قافلے کے پیچھے جاؤں اور راستہ بھٹکوں تو میں ادھر ہی ٹھہر جاتی ہوں۔ حضرت امی عائشہ رضی اللہ عنہا نے چادر اپنے اوپر لی اور وہیں لیٹ گئیں۔ حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کے ذمہ تھا کہ جب قافلہ چلے تو وہ پیچھے پیچھے آیا کریں اور وہ جگہ دیکھا کریں جہاں قافلہ رکا تھا، کسی کی کوئی چیز گر جاتی ہے تو ایسی چیزیں اکٹھی کر لیا کریں۔

حضرت صفوان رضی اللہ عنہ آئے تو دیکھا کہ ایک خاتون لیٹی ہوئی ہیں۔ نگاہ پڑی تو امی عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ انہوں نے فوراً کہا: ”إِنَّا لِلّٰهِ وَإِإِآِئِیْہِ رَاجِعُونَ“ امی عائشہ رضی اللہ عنہا نے آواز کو سنا تو اٹھ گئیں اور فوراً پردہ فرمالیا۔ پردے کے احکام کے نازل ہونے سے پہلے امی عائشہ رضی اللہ عنہا کو چونکہ حضرت صفوان نے دیکھا ہوا تھا اس لیے دیکھنے سے پہچان گئے۔ اونٹ کو بٹھایا۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا اس پر سوار ہو گئیں اور آپ ساتھ ساتھ چلے اور جب اگلی منزل پر پہنچے تو منافقین نے دیکھتے ہی ان پر الزام لگا دیا۔ یہ کیفیت تقریباً ایک مہینہ تک مدینہ منورہ میں رہی۔ سب سے بڑا شیطان عبد اللہ بن ابی تھا۔ اس نے اس واقعہ کو اڑایا۔ اس نے طریقہ یہ اختیار کیا کہ خود سامنے نہ آتا اور باقی لوگ بات کرتے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ باتیں سنتے رہے اور آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔ آپ گھر تشریف لے جاتے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھتے کہ کیا حال ہے؟ ٹھیک ہو؟ کوئی چیز چاہیے؟ اور پھر واپس تشریف لاتے، اس سے زیادہ گھر رکتے نہیں تھے۔ حضرت امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے بہت تکلیف ہوتی لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مجھ سے پہلے معاملہ فرماتے تھے اب اتنی شفقت اور توجہ کیوں نہیں ہے۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کو بہت تکلیف ہوئی اور بیمار ہو گئیں۔

ایک رات قضائے حاجت کے لیے باہر تشریف لے گئیں۔ حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کی والدہ ام مسطح رضی اللہ عنہا آپ کے ساتھ تھیں۔ ام مسطح کا پاؤں ان کی چادر میں الجھا تو وہ گر پڑیں اور ان کی زبان سے نکلا: مسطح ہلاک ہو جائے!

امی عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ وہ تو بدری صحابی ہے، اتنا نیک اور شریف آپ کا بیٹا ہے اور آپ بد دعائیں دیتی ہیں! تو انہوں نے کہا: عائشہ! تجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ پورا مہینا ہو گیا ہے۔ عبد اللہ بن ابی منافقین کے سردار نے جو تمہارے اوپر الزام لگایا ہے اس میں تو میرا بیٹا بھی شامل ہو گیا ہے۔ جب بتایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اب سمجھ میں بات آئی کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے اوپر توجہ کیوں نہیں دیتے تھے۔ پھر ظاہر ہے جو ان پر گزرنی تھی وہ انہی پر گزری ہوگی۔

اس کو عام بندہ کیسے سوچ سکتا ہے! پاکدامن بھی ہو، نبی کی بیوی بھی ہو، ام المؤمنین ہو اور اس پر الزام لگے تو آپ سوچیں ذرا کیا کیفیت ہوگی؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گھر آئیں تو حضرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لی کہ آپ اگر مجھے اجازت دیں تو میں اپنی امی ابو کے ہاں چلی جاؤں۔ فرمایا: چلی



جاؤ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی والدہ کے ہاں آ گئیں تو اپنی والدہ سے پوچھا کہ امی یہ کیا معاملہ ہے؟ ان کی والدہ نے کہا: دیکھو بیٹی! ایسے ہوتا ہے کہ جو بیوی خاوند کی منظورِ نظر ہو لوگ اس پر باتیں کرتے ہیں، اللہ کرم کرے گا، تم تسلی رکھو! خیر امی عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا تسلی رکھنی تھی۔ بیمار پڑ گئیں۔ بستر پر لیٹ گئیں۔ رورو کے اپنے آنسو ختم کر لیے۔

اسی دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس خبر کے پھیلنے کی وجہ سے بہت غمگین تھے۔ حضرت علی اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما یہ ان کے گھر کے بچے شمار ہوتے تھے۔ آپ نے دونوں کو بلا کر بطورِ خاص مشورہ کیا کہ اسامہ اور علی! تم بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے، میں کیا کروں؟ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے حضور! مشورہ کیا کرنا ہے، وہ بہت نیک ہیں، پاکدامن ہیں، اتنی شریف ہیں تو آپ کیوں ایسی بات سوچتے ہیں، آپ ان افواہوں کی پروا مت کیجیے! حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ حضور! اگر افواہوں کی وجہ سے آپ کی طبیعت میں عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کچھ تکدر آ گیا ہے تو آپ حکم فرمائیں اور رشتہ لے آتے ہیں! کیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راحت کا خیال ہو رہا ہے۔ یہ ہوتا ہے چھوٹوں کا بڑوں کے ساتھ معاملہ۔

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی بیوی نے گھر میں بات کی کہ ہم کیا سن رہے ہیں عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں! حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سے فرمایا کہ تم یہ کام کر سکتی ہو؟ کہا کہ نہیں! تو انہوں نے کہا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کیسے سوچتی ہو؟ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی کے بارے میں یہ کیسے سوچ لیا ہے؟ کہا کہ لوگ باتیں کر رہے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب سنا تو فوراً یہی کہا: "هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ"

کہ یہ بہت بڑا بہتان ہے، ایسا نہیں ہو سکتا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اپنے والدین کے گھر تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! مجھے تمہارے بارے میں یہ باتیں پہنچی ہیں۔ اگر تم بری ہو تو اللہ ضرور تمہیں بری کر دیں گے اور اگر تم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو توبہ کر لو، بندہ جب اللہ کے حضور توبہ کرتا ہے تو اللہ ضرور اس کی توبہ قبول فرما لیتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے اپنے ابو سے کہا: آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دیں۔ انہوں نے کہا: میں کیا جواب دوں؟ پھر میں نے امی سے کہا کہ امی! آپ جواب دیں۔ امی نے کہا کہ بیٹا! اب ہم کیا بات کریں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ہمت کر کے پھر میں نے بات کی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک عجیب فاضلانہ گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں بری ہوں اللہ جانتا ہے لیکن اگر میں کہہ دوں کہ میں ٹھیک ہوں تو شاید آپ کو یقین نہ آئے اور اگر میں کہہ دوں کہ آپ نے ٹھیک سنا ہے تو شاید آپ کو یقین آجائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ لوگوں کی باتوں سے اتنا متاثر ہیں کہ اب آپ میری ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بس میں اس کو اللہ کے حوالے کرتی ہوں۔ یہ کہا اور الگ بستر پر جا کر لیٹ گئیں۔

اب ظاہر ہے کہ ان کو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی؟ آپ ذرا سوچیں! خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہیں پر تھے۔ ابھی گھر سے نکلے نہیں تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے آثار شروع ہو گئے۔ وحی آئی۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور فرمایا: ”أَبَشِّرْ مَیْ یَا عَائِشَةُ“ خوشخبری ہو عائشہ! اللہ نے تجھے بری قرار دیا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ نے کہا: عائشہ! اٹھو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو۔ آپ نے کہا: میں اٹھوں گی بھی نہیں اور شکریہ بھی ادا نہیں کروں گی، یہ تو میرے اللہ نے مجھ پر کرم کیا ہے۔ اب ظاہر ہے وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لاڈلی بیوی تھیں۔

خیر اس پر پھر یہ دور کو ع نازل ہوئے اور اللہ رب العزت نے امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت کا اعلان فرمایا۔

﴿إِنَّ الدِّينَ جَاءُؤُ بِآلِفِكَ عُصْبَةً مِّنْكُمْ﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ تم میں سے ہی کچھ لوگ ہیں جو اس میں شریک ہو گئے ہیں۔

حضرت مسطح اور حضرت حسان رضی اللہ عنہما بھی اس پروپیگنڈے میں شریک ہو گئے تھے اور ان دونوں صحابہ کو اسی کوڑے لگے ہیں لیکن یہ بدری صحابہ ہیں۔ ان کے بارے میں ہمارے دل میں رتی برابر بھی میل نہیں ہے۔ اللہ ہمیں شریعت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

﴿لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا

وَقَالُوا هَذَا أَفْكٌ مُّبِينٌ ۚ لَوْلَا جَاءُؤُ عَلَيْهِ بِآرَبَعَةٍ شُهَدَاءَ ۖ فَاذْلَمَ يَأْتُوا

بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمُ الْكَذِبُونَ ۝﴾

اللہ فرماتے ہیں: جب تم نے یہ بات سنی تھی تو تم اچھا گمان رکھتے اور تم کہتے کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے۔ یہ بہتان لگانے والے اپنی اس بات پر چار گواہ کیوں نہیں لائے؟ جب یہ گواہ نہیں لائے تو یہی لوگ اللہ کے ہاں جھوٹے ہیں۔

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَمَسَّكُمْ

فِي مَا أَفْضَلُكُمْ فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٣٧﴾

اگر تم پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو جو کام تم لوگوں نے کیا ہے اس کی وجہ سے تم پر سخت عذاب نازل ہوتا!

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک یہ تھا کہ اپنی بیویوں میں سے جن کے گھر رات گزارتے تو اس گھر میں جو ہدیہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتا وہ اسی بیوی کا ہوتا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خواہش ہوتی تھی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ہوں تب ہدیہ دیں تاکہ حضرت عائشہ کو ہدیہ ملے اور باقی ازواج کو یہ بات پسند نہیں تھی۔

تو ایک مرتبہ بعض ازواج نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ آپ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کریں کہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہیں کہ اتنا عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال نہ کریں کہ جب ان کے گھر ہوں تب ہی ہدیہ دیں۔ ہمارا بھی خیال کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سفارش کی تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فاطمہ!

"أَلَا تُحِبِّينَ مَا أَحَبُّ؟"<sup>47</sup>

جو بات تمہارے ابو پسند کرتے ہیں کیا تم وہ پسند نہیں کرتیں؟

### حضرت عائشہ کی سات خصوصیات:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سات ایسی خصوصیات ہیں جن میں ان کا کوئی شریک نہیں ہے:

1: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں۔ کسی بڑے کی اولاد ہونا یہ

بہت بڑی خصوصیت ہے اور بہت بڑا اعزاز ہے۔

2: حضرت جبریل امین کپڑے پر یا اپنی ہتھیلی پر ان کی تصویر لے کر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا کہ یہ آپ کی بیوی ہوں گی۔

3: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باقی دس ازواج ایسی ہیں جو مطلقہ یا بیوہ ہیں اور یہ واحد ہیں جو کنواری ہیں۔

4: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایک بستر میں لیٹے ہوتے تھے تو وحی آجاتی تھی، کسی اور بیوی کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔

5: جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں رکھا ہوا تھا۔

6: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا جو حجرہ ہے وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا مدفن بنا ہے۔

7: ان کی برأت کا اعلان خود قرآن کریم نے کیا ہے۔

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کتنی بڑی خصوصیات تھیں! اللہ پاک ہم سب کو قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

**اہل فضل چاہیے کہ دوسروں کو نوازیں!**

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَ

الْمَسْكِينِ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کا جو ان کے رشتہ دار بھی تھے، صحابی بھی تھے اور غریب بھی تھے، ان کا خرچہ بند کر دیا کہ تم نے یہ کیوں کہا؟ جب یہ آیات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حق میں اتریں تو اللہ نے فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ رشتہ دار بھی ہے، مسکین بھی ہے، مہاجر بھی ہے۔ تو جو تم دیتے

تھے دیتے رہو! صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی قسم کو توڑا، کفارہ ادا کیا اور حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کو پھر خرچہ دینا شروع فرمادیا۔

### پارسا لوگوں اور گندے لوگوں کی فطرت:

﴿الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ أُولَئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾

یہاں مزاج بتایا ہے کہ گندی باتیں گندے مرد ہی کرتے ہیں اور گندے مرد گندی باتوں کے مناسب ہیں، اچھی باتیں اچھے مرد کرتے ہیں اور اچھے مرد اچھی باتوں کے مناسب ہیں یا اس کا مطلب یہ ہے کہ گند؛ گند کی طرف مائل ہوتا ہے اور طہارت؛ طہارت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پاک دامن ہیں، ان کے نکاح میں پاک دامن ہی آتی ہیں۔ پاک دامن لوگ پاک دامن بیویاں پسند کرتے ہیں اور پاک دامن عورتیں پاک دامن مرد پسند کرتی ہیں۔

تو یہ مزاج بتایا ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ نیک آدمی کے نکاح میں زانیہ نہیں آسکتی اور نیک عورت کا شوہر زنا نہیں کر سکتا! اس کا یہ معنی نہیں ہے۔

### چار قسم کے مکانات کا حکم:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذِكُّكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾

مکانات عموماً چار قسم کے ہوتے ہیں:

- 1: وہ مکان جس میں آدمی خود اکیلا رہتا ہے۔
- 2: وہ مکان جس میں اور لوگ بھی رہتے ہوں، رشتے دار ہوں یا اجنبی ہوں۔

3: وہ مکان جس میں کسی کا رہائش پذیر ہونا معلوم نہ ہو کہ کوئی اس میں رہتا بھی ہے یا نہیں!

4: وہ مکان جو رہائش کے لیے نہیں ہیں جیسے مسجد، خانقاہ اور مدرسہ وغیرہ۔  
 ✽ تو جو مکان رہنے کے لیے ہے اس میں اجازت کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور سلام اس نیت سے کر لیا جائے کہ اس میں فرشتے ہوں گے۔

✽ اور وہ مکان جس میں کچھ لوگ رہتے ہوں تو وہاں دو کام کرنے ہیں؛ ایک تو ان کو سلام کرنا ہے اور دوسرا ان سے اجازت لینی ہے اپنے تعارف کے ساتھ کہ میں کون ہوں۔ مثلاً میں پہلے سلام کرتا ہوں کہ ”السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!“ اندر سے آواز آئے کہ کون؟ ”میں مولانا محمد الیاس گھمن سرگودھا سے“ صرف ”میں“ کہنا کافی نہیں ہے۔

امام علی بن عاصم واسطی بہت بڑے محدث گزرے ہیں۔ ایک بار وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے گھر ان سے ملنے کے لیے گئے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کون؟ انہوں نے کہا: ”اکا“ میں ہوں۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے دوستوں میں سے ”انا“ نام کا کوئی نہیں ہے۔ پھر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ان کو ایک حدیث سنائی کہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، دروازے پر دستک دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ”ہمن؟“ کون ہو؟ انہوں نے کہا: ”اکا“ میں ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ”انا انا!“ یعنی انا انا کیا ہوتا ہے، اپنا نام بتاؤ! 48

اس لیے جب دروازے پر دستک دیں اور گھر والے پوچھیں کہ کون ہیں؟ تو اپنا پورا تعارف بتائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا:

اَلسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ اَیَّدْخُلْ عَمْرٌ؟<sup>49</sup>

اللہ کے نبی پر سلام ہو، حضور! کیا عمر اندر آسکتا ہے؟

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملنے کے لیے گئے۔ فرمایا: ”اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ! هَذَا أَبُوْ مُوسٰی، اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ! هَذَا الْاَشْعَرِیُّ“ یعنی پورا تعارف کروایا۔<sup>50</sup>

اس میں جھجکنا نہیں چاہیے۔ بعض لوگ صرف نام بتاتے ہیں اور ساتھ مولانا نہیں کہتے اور جو شہرت ہے وہ بھی نہیں بتاتے تو اس طرح بندے کو تعارف نہیں ہوتا۔ میں اپنی بات کرتا ہوں کہ میں جب کسی کو فون کرتا ہوں تو میں ”مولانا محمد الیاس گھمن“ کہتا ہوں۔

بعض لوگ ہمیں فون کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ کون ہیں؟ میں کہتا ہوں: آپ نے کس کو فون کیا ہے؟ حالانکہ پہلے اپنا نام بتانا چاہیے تھا، پھر یوں پوچھنا چاہیے تھا کہ آپ فلاں مولانا صاحب ہیں؟ تو تہذیب کے دائرے میں رہ کر فون کرنا بہت ضروری ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا﴾

49۔ سنن ابی داؤد، رقم: 5201

50۔ صحیح مسلم، رقم: 2154



یہ دوسرے مکان کا حکم ہے جہاں پر لوگ رہتے ہیں کہ ان کو سلام کرو، ان سے اجازت لو! ”تَسْتَأْنِسُوا“ کا معنی ہے کہ جب بندہ اجازت لیتا ہے تو مانوس ہو جاتا ہے۔

﴿فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ قِيلَ لَكُمْ اذْجِعُوا فَاذْجِعُوا هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ ۗ﴾

یہ وہ مکان ہے جس میں بندے نہ ہوں اور یہ ہو سکتا ہے کہ ہوں تو ان سے اجازت مانگو! ملتی ہے تو ٹھیک ہے اور نہیں ملتی تو اندر نہ جاؤ! اگر اندر لوگ موجود ہیں اور کہتے ہیں کہ واپس جاؤ تو اس میں ہتک عزت محسوس نہ کرو! بسا اوقات کوئی مجبوری ہوتی ہے، کوئی ضرورت ہوتی ہے۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَسْكُونَةٍ فِيهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۗ﴾

یہ وہ مکان ہے جو رہائش کا نہیں ہے ویسے کوئی خانقاہ ہے یا مدرسہ ہے اس میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں تمہارا سامان موجود ہے اور اپنی ضرورتیں پوری کرو۔

**آنکھ اور عصمت کی حفاظت کا حکم:**

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّونَ أَبْصَارَهُمْ وَيَحْفَظُونَ فُرُوجَهُمْ ۚ ذَٰلِكَ

أَزْكَىٰ لَهُمْ ۗ﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایمان والوں کو چاہیے کہ اپنی نگاہ نیچے رکھیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ زیادہ صفائی کا سبب ہے۔

﴿وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ ۗ﴾

ایمان والی عورتوں کو بھی چاہیے کہ اپنی نگاہیں نیچے رکھیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کریں۔

ایک ہے مرد کا نامحرم عورت کو دیکھنا اور ایک ہے عورت کا نامحرم مرد کو دیکھنا۔ اگر عورت کے لیے نامحرم مرد کو دیکھنے کی اجازت ہوتی تو اللہ کبھی نہ فرماتے ﴿يَعْصِبْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ﴾ معلوم ہوتا ہے کہ مرد کے ذمہ ایک کام ہے عورت کو نہ دیکھنا اور عورت کے ذمہ دو کام ہیں: نمبر ایک... مرد کو نہ دیکھنا اور نمبر دو... اپنے چہروں کو چھپا کر رکھنا! مرد پر پردہ نہیں ہے، عورت پر پردہ ہے۔

### عورت کے پردے کا ایک حکم:

﴿وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾

عورت اپنی زینت کو ظاہر نہ کرے۔

ایک ہے زینت اور ایک ہے زینت کی جگہ۔ مثلاً زینت کی چیز سرمہ ہے اور زینت کی جگہ آنکھ ہے، ایک زینت کی چیز چوڑی ہے اور زینت کہ جگہ بازو ہے، زینت کی چیز انگوٹھی ہے اور زینت کی جگہ انگلی ہے۔ دونوں اس میں شامل ہیں یعنی اپنی زینت کی جگہیں اور مواقع ظاہر نہ کرو۔

﴿إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾

مگر جسم کے وہ حصے جو خود بخود کھل جاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس سے مراد دو قسم کی چیزیں ہیں؛ ایک زینت کی چیزیں ہیں مثلاً کپڑا اور ایک اس کو چھپانے کے لیے ہے جیسے برقعہ، اس کو تو نہیں چھپا سکتے کہ یہ ان کی مجبوری ہے۔ تو ﴿مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ میں برقعہ اور چادر شامل ہیں۔

اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ مواقعِ زینت کو ظاہر نہ کرو لیکن زینت کے مقامات جو خود بخود کھلتے ہیں ضرورت کی وجہ سے جس میں چہرہ ہے اور ہاتھ ہیں اس کا ذکر تو احادیث میں ہے اور پاؤں کو قیاس کیا ہے چہرہ وغیرہ پر کہ عموماً عورت کام کے لیے باہر جاتی ہے، لہذا اس کی اجازت ہے۔

اور اجازت کے دو مطلب ہیں؛ ایک یہ ہے کہ عورت پر ان اعضاءِ مذکورہ کا پردہ نہیں ہے اور ایک معنی ہے کہ ان کو دیکھنا جائز ہے۔ یہ دو چیزیں الگ ہیں؛ عورت کو ان چیزوں کی اجازت دی ہے ضرورت کی وجہ سے لیکن اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ مرد؛ عورت کے چہرے کو دیکھے۔

﴿إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنَى إِخْوَانِهِنَّ أَوْ خَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّبِيعِينَ غَيْرِ أُولَى الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَى عَوْرَتِ النِّسَاءِ﴾

یہاں سے بارہ قسم کے افراد بتائے ہیں کہ جن سے عورت پر پردہ نہیں ہے۔ اس سے مراد چہرہ نہیں ہے بلکہ مواقعِ زینت مراد ہیں یعنی سینہ، گردن، سر کے بال، پنڈلی کہنی تک بازو ہیں۔ وہ بارہ افراد کون کون سے ہیں:

(1) عورت کا شوہر

(2) اپنا والد

(3) سر

(4) عورت کے اپنے بیٹے

(5) شوہر کا بیٹا جو کسی اور بیوی سے ہے

(6) عورت کے اپنے بھائی

(7) عورت کے بھائی کے بیٹے

(8) عورت کی بہن کے بیٹے

(9) مسلمان عورتیں

(10) باندیاں۔ اس میں غلام شامل نہیں ہیں، غلاموں سے پردہ فرض ہے

(11) ایسے لوگ جو گھر میں رہتے ہیں کھانے پینے کے لیے اور ان میں عقل اتنی نہیں

ہوتی کہ عورتوں اور مردوں کے معاملات سمجھتے ہوں

(12) ایسے چھوٹے بچے جو مرد اور عورت کے معاملات سے واقف نہیں ہیں۔

تو ان مذکورہ بارہ قسم کے افراد کے سامنے عورت بوقت ضرورت بازو، پنڈلی،

سر کے بال وغیرہ کھول سکتی ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ ان اعضاء کا کھولنا ضروری

ہے۔

﴿وَلَا يَغْضِبُنَّ بَآدِ جُلُوسِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ﴾

عورت اپنے پاؤں کی آواز کو بھی مخفی رکھے تاکہ اس کی جوزینت ہے وہ کھل

نہ جائے۔

بعض عورتیں اپنے پاؤں میں زیور پہنتی ہیں کہ چلنے سے جن کی آواز آتی

ہے۔ تو کوشش کریں کہ ان کی آواز بھی نہ آئے۔

عورت کی آواز بھی ستر ہے۔ بغیر ضرورت کے عورت کو اپنی آواز بھی نا

محرم سے مخفی رکھنی چاہیے۔ ہاں ضرورت ہو تو الگ بات ہے۔ جیسے پردہ کی آیات نازل

ہونے کے بعد بھی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پردہ میں ازواجِ مطہرات رضی

اللہ عنہن سے مسائل پوچھتے تھے، وہ جواب عنایت فرماتی تھیں۔

عورت کے جسم کا وہ حصہ جس کا نماز میں چھپانا فرض ہے یہ عورت کا ستر ہے

جس کا نا محرم سے چھپانا فرض ہے اور نماز پڑھتے وقت عورت کی ہتھیلیاں، چہرہ، پاؤں

ننگے ہوں تو نماز ہو جاتی ہے۔

## بے نکاحوں کے نکاح کرانے کی ترغیب:

﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ﴾

جو مرد اور عورتیں بغیر نکاح کے ہیں ان کا بھی نکاح کراؤ!

بغیر نکاح کے ہونے سے مراد یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص کی بیوی تھی فوت ہو گئی ہے، یا کسی عورت کا شوہر تھا فوت ہو گیا ہے یا ایسا ہے کہ انہوں نے نکاح کیا ہی نہیں ہے تو ان کا نکاح کرانے کا حکم دیا گیا ہے۔

یہاں ﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ﴾ میں نکاح کی نسبت مردوں کی طرف کی ہے کہ ان کا نکاح تم خود کراؤ! اس سے معلوم ہوا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کا از خود شادیاں کرنا ٹھیک نہیں ہے، بڑوں کو چاہیے کہ رشتے کروائیں کیونکہ بڑوں کے رشتوں میں خیر ہی خیر ہے۔

﴿وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ﴾

اور جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہیں تمہارے غلاموں اور باندیوں میں سے تو ان کے نکاح کراؤ!

﴿إِنْ يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾

اگر ان کے پاس پیسے نہیں ہیں تو اللہ اپنے فضل سے دے دیں گے۔

یہاں ترغیب دینا مقصود ہے کہ اگر ان میں صلاحیت ہو، حقوق ادا کرنے کی طاقت بھی ہو تو نکاح کراؤ! میں ذاتی طور پر اپنے تجربات کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ اللہ رب العزت نکاح کی وجہ سے غربت نہیں دیتے بلکہ نکاح کی وجہ سے اللہ دولت دیتے ہیں۔ یہ شرط ہے کہ نکاح نیک نیتی سے کیا جائے، محض اپنی شہوت اور شہرت کے لیے نہ کیا

جائے۔ بعض شہوت کے لیے کرتے ہیں اور بعض شہرت کے لیے کرتے ہیں کہ میری دو بیویاں، تین بیویاں ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس سے تو جو نقصانات ہونے ہیں وہ تو ہونے ہیں۔

ابھی کچھ دن قبل کی بات ہے میں نے اپنی چھوٹی دونوں بیویوں کے اکاؤنٹ میں دس ہزار مہینا کے اعتبار سے چھ ماہ کے اکٹھے پیسے جمع کروادیے تاکہ بعد میں ان کے کام آتے رہیں۔ مجھے شارحہ سے فون آگیا کہ استاذ جی! اکاؤنٹ نمبر بھیج دیں، میں نے ہدیہ دینا ہے۔ میرا اکاؤنٹ نمبر تو نہیں ہے اس لیے میں نے کسی اور کا دے دیا۔ تو اس نے ایک لاکھ روپے بھیج دیے۔ تو جتنا خرچ کیا تھا اللہ نے اتنا دے دیا۔

ایک مرتبہ غالباً عید کا موقع تھا، گھر والوں نے کہا: پیسے چاہئیں، کپڑے وغیرہ لینے ہیں۔ میں نے پوچھا: کتنے؟ کہا: تیس ہزار روپے۔ میرے پاس استطاعت نہیں تھی پھر بھی میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں دے دیے اس نیت سے کہ اللہ اور دے دیں گے۔ تو میرا ایک دوست آیا اس نے کہا: یہ آپ کے لیے ایک ہزار ریال ہدیہ ہے۔ تو جتنے خرچ ہوئے تھے اللہ نے اتنے دے دیے۔ اب میرا یقین ہو گیا ہے کہ اللہ رب العزت بیوی اور بچوں پر خرچ کرنے کی وجہ سے مال میں تنگی نہیں فرماتے۔

میں نے جب دوسری شادی کی تو میرا مکان نہیں تھا اور پیسے بھی نہیں تھے لیکن میں نے شادی اس نیت سے کی کہ بیوی عالمہ ہوگی تو بنات کا مدرسہ بن جائے گا اور بچیوں کے لیے تعلیم کا انتظام ہو جائے گا۔ میں نے شادی کر لی۔ میری بیوی ایک سال تک اسی میرے کمرے جو کہ میری بیٹھک ہے، اس میں رہی۔ ہمارے چچا امریکہ میں تھے، وہیں فوت ہو گئے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ مدرسہ کے لیے جگہ دیں تو بنات کے مدرسے کی یہ جگہ انہوں نے دے دی، کہا کہ مدرسہ بنا لو! میں نے کہا: ٹھیک ہے۔ ہم نے نقشہ بنایا کہ ساتھ گھر بھی ہو گا۔ میں نے بھائی خبیب سے پوچھا: کتنے پیسے لگیں

گے؟ انہوں نے کہا: دس لاکھ کا خرچہ ہے۔ تو میں نے ایک دوست سے کہا کہ دس لاکھ روپے قرض دے دو! اس نے دے دیے۔ جب کام شروع کیا تو بنیادوں تک پہنچے پہنچتے دس لاکھ پورا ہو گیا۔ میں نے دوبارہ انہیں فون کیا کہ دس لاکھ اور دے دیں اور اپنا اکاؤنٹ نمبر بھی دیں، میں رمضان کے بعد تھوڑا تھوڑا دیتا رہا ہوں گا۔ اس نے کہا: پہلا دس لاکھ آپ کا ہدیہ اور دوسرا دس کل بھجوا دیتا ہوں۔ جب چھت تک پہنچے تو وہ دس بھی ختم ہو گئے۔ میں نے پھر اس کو فون کیا کہ دس اور دے دیں، میں تھوڑے تھوڑے کر کے دے دوں گا۔ اس نے کہا: دوسرا دس وہ بھی ہدیہ اور یہ تیسرا دس لاکھ بھیج رہا ہوں یہ بھی ہدیہ ہے۔ تو کل تیس لاکھ ہیں۔ یہ مدرسہ میرے ذاتی پیسوں سے بنا ہوا ہے۔ دس لاکھ ہم نے اور لگائے تو مدرسہ اور مکان دونوں بن گئے۔ مجھے اس پر بہت خوشی ہوتی ہے کہ مدرسہ کے پیسوں سے میرا مکان نہیں بنا بلکہ میرے پیسوں سے مدرسہ بنا ہے۔ لہذا مجھے شرح صدر ہوتا ہے کہ میں مکانات کو اپنے ذاتی استعمال میں لاتا رہوں تو مجھے شرعاً کوئی الجھن نہیں ہوتی۔

اگر اللہ مجھے وسائل دے تو دنیا اس مرکز کو دیکھنے آئے، نقشہ، تعمیرات، ڈسپلن وغیرہ۔ ہمیں تو فقر و فاقہ ہے، ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں لیکن وسائل کی وجہ سے بڑھ نہیں سکتے۔

خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ بیوی اور اولاد کے بارے میں حسن نیت بہت ضروری ہے اور بندہ ان پر خرچ کرے تو اللہ محروم نہیں کرتے۔

میں کل ایک جگہ بیان پر گیا۔ تقریباً نو ہزار کا پٹرول ڈلوایا۔ میزبان نے ایک روپیہ بھی نہیں دیا اور نہ ہی میں نے ان سے تقاضا کیا ہے۔ ایک جگہ ناشتہ کیا تو میزبان نے پانچ ہزار دیے، دوسری جگہ سے ایک اور نے پانچ ہزار دیے اور تیسرے نے دو ہزار دیے۔ یوں دائیں بائیں سے لوگ ہدیے دیتے رہے اور اللہ نے پورے کر دیے۔

آج صبح میں مطالعہ کر رہا تھا۔ گھنٹی بجائی تو مولانا ذکر اللہ آئے۔ میں نے ان سے کہا: دودھ میں پتی اور جو شانہ ڈال کر لے آؤ! میں بتا نہیں سکتا کہ میرے دل پر شکر کی کیفیت کیا تھی؟ میں ایسے مست ہوتا ہوں کہ جیسے کوئی اپنی سلطنت میں مست ہوتا ہے کہ ایک منٹ میں بیٹھے بیٹھے دودھ پتی چائے پہنچ گئی۔ میں بارہا کہا کرتا ہوں آپ سے بھی اور اپنے اساتذہ سے بھی کہتا رہتا ہوں کہ اللہ کے انعامات پر بہت زیادہ شکر ادا کیا کرو، کبھی کفر ان نعمت نہ کیا کرو۔

﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾<sup>51</sup>

انسان اللہ کا جتنا شکر ادا کرتا ہے اللہ انعامات میں اضافہ فرماتے ہیں۔

﴿مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ﴾<sup>52</sup>

انسان کا عقیدہ ٹھیک ہو اور شکر ہو تو اللہ فرماتے ہیں کہ میں اس کو عذاب کیوں دوں؟

باقی خواہشات تو بادشاہوں کی بھی پوری نہیں ہوتیں اور ضرورتیں فقیروں کی بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ ہم لاہور سے آرہے تھے تو مزدور سڑک پر کھڑے ہیں، پتا نہیں کہ کوئی لینے آئے گا بھی یا نہیں؟ پتا نہیں کھانا بھی ملنا ہے یا نہیں؟ اور ہمیں روزانہ تروتازہ کھانا ملتا ہے بغیر کسی انتظار اور مشقت کے، یہ اللہ کا کتنا بڑا فضل ہے! ہماری کتنی پرسکون زندگی ہے اور آخرت میں اللہ کی رضا اور جنت تو ملنی ہے ان شاء اللہ۔

**عفت و پاکدامنی اختیار کرنے کا حکم:**

﴿وَلْيَسْتَغْفِرِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾



اور جس کے پاس نکاح کرنے کے اسباب نہ ہوں تو وہ پاک دامنی کی زندگی گزاریں، جب اللہ اپنے فضل سے انہیں ہمت دیں اور اسباب مہیا فرمادیں تو وہ پھر نکاح کر لیں۔

﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتِيَّتَكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾

زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ لوگ باندیاں رکھتے اور ان سے زنا کرواتے اور پیسے کھاتے۔ عبد اللہ بن ابی بے ایمان منافق یہ کرتوت کرتا تھا اور ان کی کمائی کھاتا تھا۔ بعض باندیاں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئیں وہ نہیں چاہتی تھیں لیکن یہ پھر بھی کراتا تھا۔ تو قرآن نے سمجھایا کہ ایسا کرنا تو جائز ہی نہیں ہے خصوصاً وہ باندی جو پاکدامن ہو اسے زنا پر مجبور کرنا یہ تو اور بھی گناہ ہے۔ باندیوں کو سمجھایا کہ تم یہ کام نہ کرو اگر آقا مجبور کر کے یہ کام کراتا ہے تو پھر تم پر کوئی گناہ نہیں ہے، اللہ تمہیں معاف کر دے گا۔

**اللہ آسمان وزمین کا نور ہے:**

﴿اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مِثْلُ نُورٍ مُّثَوِّدٍ كَمِشْكُوتٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ﴾

اس آیت میں اللہ نے اپنے نور؛ نورِ ہدایت کی مثال دی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں: اللہ نور ہے تو اس سے مراد ہوتا ہے ”مُثَوِّدٌ“ یعنی روشن کرنے والا۔

”نور“ کا حقیقی معنی ہے: ”الظَّاهِرُ بِنَفْسِهِ وَالْمُظْهِرُ لِغَيْرِهِ“ خود ظاہر ہو اور دوسرے کو ظاہر کرے۔ نور کا یہ حقیقی معنی اللہ پر صادق نہیں آتا کیونکہ اللہ ظاہر نہیں ہیں تو یہاں نور کا مجازی معنی ہے۔ نور سے مراد ہے ”مُثَوِّدٌ“ کہ اللہ رب العزت روشن کرتے ہیں آسمانوں کو اور زمین کو۔ اس سے مراد ہے ”مَافِي السَّمَوَاتِ“ ہے یعنی ان کو

جو آسمانوں میں ہیں اور ”وَالْأَرْضُ“ کا معنی ہے ”وَمَا فِي الْأَرْضِ“ جو زمین میں ہیں۔  
مراد صرف آسمان اور زمین کی مخلوق نہیں ہے بلکہ تمام مخلوقات ہیں، تمام مخلوق کا کنایہ  
آسمان اور زمین سے ہے کیونکہ ہمارے سامنے یا زمین ہے یا آسمان ہے، اس میں تمام  
مخلوقات آتی ہیں۔

اللہ رب العزت کیسے روشن کرتے ہیں؟ تو اس کی مثال دی ہے کہ جیسے ایک  
طاقچہ ہو۔ طاقچہ سے مراد جیسے دیوار ہے اور دیوار میں روشن دان سا بنا ہو جو پیچھے سے بند  
ہو۔ پھر اس طاقچہ میں چراغ ہو اور چراغ ایک قندیل میں ہو اور چراغ کو جس تیل سے  
جلایا جا رہا ہے وہ زیتون کا تیل ہے، ﴿لَا شَرْقِيَّةَ وَلَا غَرْبِيَّةَ﴾ اور زیتون بھی ایسا کہ  
جس کی مشرق کی جانب کسی درخت یا پہاڑ کی کوئی آڑ نہ ہو اور مغرب کی جانب بھی کسی  
درخت یا پہاڑ کی آڑ نہ ہو۔ اگر مشرق کی جانب سے کوئی آڑ نہ ہو تو شروع دن سے ہی  
اس پر دھوپ پڑتی رہتی ہے اور اگر مغرب کی جانب سے کوئی آڑ نہ ہو تو آخر دن تک  
اس پر دھوپ پڑتی رہتی ہے۔ تو یہ ایسا زیتون کا درخت ہے کہ جس پر پورا دن سورج کی  
روشنی پڑتی رہتی ہے اسی وجہ سے اس کا تیل نہایت صاف اور عمدہ ہوتا ہے۔

اب مثال دی ہے کہ طاقچہ ہو وہ بھی شیشے کا ہے، اس میں قندیل ہے وہ بھی  
شیشے کا ہے اور قندیل میں ایک چراغ ہے، چراغ زیتون کے تیل سے جلنا ہے اور زیتون  
بھی ایسا کہ نہایت لطیف اور عمدہ ہے کہ بہت جلد جلتا ہے اور دھواں بہت کم دیتا ہے۔  
فرمایا کہ اللہ اسی طرح روشن کرتے ہیں۔

اور اس سے مراد مؤمن کا دل ہے کہ مؤمن کے دل میں طبعی ایمان کے  
قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے، پھر اوپر سے وحی الہی جب آتی ہے تو بہت جلد اسے  
عمل کی توفیق مل جاتی ہے۔

﴿يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ﴾

اللہ رب العزت رہنمائی فرماتے ہیں اپنے نور کے ذریعہ جس کو چاہتے ہیں اور لوگوں کو سمجھانے کے لیے مثالیں بھی دیتے ہیں۔

### مساجد میں ذکر اللہ کی ترغیب:

﴿فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ﴾

﴿فِي بُيُوتٍ﴾ کا تعلق پچھلے جملے میں موجود لفظ ﴿يَهْدِي﴾ کے ساتھ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نور کے ذریعہ جو رہنمائی فرماتے ہیں تو اس نور ہدایت کے ملنے کی جگہ ایسے گھر ہیں کہ جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کو بلند کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام لے کر ذکر کیا جائے۔

یہاں بلند کرنے سے مراد ظاہراً بلند کرنا نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کی عظمت کا خیال کیا جائے۔ اور یہاں گھروں سے مراد مساجد ہیں۔

﴿يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْأَغْدَا وَالْأَصَالِ ۚ رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ ۚ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ﴾

ان گھروں میں صبح و شام اللہ کی تسبیح وہ لوگ بیان کرتے ہیں جنہیں کوئی تجارت یا کوئی خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے روکتی نہیں ہے، نماز قائم کرنے سے نہیں روکتی، زکوٰۃ ادا کرنے سے نہیں روکتی اور یہ لوگ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں کہ جس دن دل تڑپتے تڑپتے رہ جائیں گے اور آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔

﴿لِيَجْزِيَ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَيَزِيدَهُمْ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَاللَّهُ يَزِدُّكَ

مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾

اللہ رب العزت ان لوگوں کو ان کے اعمال کا بہترین بدلہ دیں گے اور اپنے

کرم سے مزید بھی عطا فرمائیں گے اور اللہ جس کو چاہتے ہیں بغیر حساب کے رزق عطا فرما دیتے ہیں۔

### کفار کے اعمال سراب کی مانند ہیں:

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ ۗ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾

ان دو آیتوں میں اللہ نے دو قسم کے کافروں کی مثال دی ہے۔

[1]: دنیا میں ایک قسم ان کفار کی ہے جو قیامت کے قائل ہیں، جنت اور جہنم کے قائل ہیں لیکن عقائد کفریہ ہیں جیسے آج کے دور میں قادیانی ہیں، یہ جنت اور جہنم کو مانتے ہیں لیکن عقیدہ مسلمان نہیں ہیں۔

[2]: اور بعض کافر وہ ہیں جو قیامت کے دن کے منکر ہیں۔ جیسے دہریے ہیں، یہ کافر ہیں اور قیامت کے دن کے منکر ہیں۔

تو کفار کی دو قسمیں ہیں؛ بعض قیامت کو مانتے ہیں لیکن کسی اور عقیدے کی وجہ سے کافر ہیں اور بعض قیامت کو بھی نہیں مانتے۔ تو جو قیامت کو مانتے ہیں وہ کچھ نہ کچھ نیک عمل بھی کرتے ہیں اور اس کو امید بھی ہوتی ہے کہ نیک عمل قبول ہو گا اور توقع بھی ہوتی ہے کہ اس کو اجر بھی ملے گا لیکن چونکہ شرط ایمان مفقود ہے یعنی ایمانیات کے سارے عقائد موجود نہیں ہیں اس لیے ان کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ تو ان کو نور و وہم کے درجے میں حاصل ہے۔

تو پہلے ان کافروں کی مثال دی ہے جو قیامت کو مانتے ہیں کہ ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے سراب ہو۔ ”سراب“ کہتے ہیں کہ جب سخت دھوپ میں بندہ ریت

پر کھڑا ہو تو اسے دور سے ایسے معلوم ہو گا جیسے پانی چل رہا ہو حالانکہ یہ دھوکہ ہے، یہ پانی نہیں ہوتا۔ تو یہی سا شخص سراب کو دور سے پانی سمجھتا ہے اور جب قریب جاتا ہے تو پانی موجود نہیں ہوتا۔ اب سوائے ندامت و شرمندگی اور حسرت کے اس کو کچھ نہیں ملتا۔ اس طرح یہ قیامت کو مانتے تھے تو نیک عمل کیا، ان کا وہم یہ تھا کہ نیک عمل کا اجر قیامت کے دن ملے گا اور جب قیامت کا دن آئے گا تو نیک عمل کا جو بدلہ ان کو اچھا نظر آ رہا تھا وہ اچھا نہیں ہو گا، کیونکہ ایمان کی شرط مفقود ہو گئی ہے۔ حسرت کی وجہ سے ان کا مرنے کو دل چاہے گا لیکن پھر بھی نہیں مریں گے۔

﴿أَوْ كَظُلُمٍ فِي بَجْرِ لَيْلٍ يَخْشَى مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ  
سَحَابٌ ظَلُمْتُ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكِدْ يَرِبْهَا وَمَنْ لَّمْ  
يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَالَهُ مِن نُّورٍ﴾

اور دوسرا وہ کافر ہے جو قیامت کو مانتا ہی نہیں ہے، وہ چونکہ قیامت کو مانتا نہیں ہے تو وہم کے درجے میں بھی اس کو نور حاصل نہیں ہے۔ اس کا تو کفر در کفر ہے، عمل اس کے پاس ہے ہی نہیں۔

آپ کے ذہن میں آئے گا کہ بعض کافر ایسے ہیں جو دہریے ہیں، قیامت کو نہیں مانتے لیکن نیک اعمال پھر بھی کرتے ہیں، ہسپتال بناتے ہیں، یتیم خانے بناتے ہیں، نیکی کے کام کرتے ہیں۔ تو وہ نیکی کے کام آخرت کے لیے نہیں کرتے ہیں وہ نیکی کے کام دنیا کے لیے کرتے ہیں، ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کاموں سے نیک نامی ہوگی، اجر کی وجہ سے وہ ہر گز ایسے کام نہیں کرتے۔ ان کفار کی مثال ایسی ہے جیسے بہت گہرا سمندر ہو اور اس میں اندھیرے ہوں، اس کے اوپر پھر ایک موج ہے پانی کی، پھر اس کے اوپر ایک موج ہے، پھر اس کے اوپر بادل ہیں۔ اب اتنا اندھیرا موجود ہو تو آدمی کو اور اعضاء تو درکنار اپنا ہاتھ بھی نظر نہیں آتا۔

ہاتھ کی مثال کیوں دی ہے؟ اس لیے کہ آدمی کے اعضاء میں سے آنکھ کے سب سے قریب ترین عضو ہاتھ ہوتا ہے، چہرہ قریب تو ہے لیکن نظر نہیں آتا، پیشانی قریب ہے لیکن نظر نہیں آتی، باقی جتنے بھی اعضاء ہیں دیکھنے کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب ترین عضو ہاتھ ہے اور ہاتھ ایک ایسا عضو ہے کہ آدمی آنکھ کے جتنا قریب کرنا چاہے کر سکتا ہے، باقی اعضا میں سے کوئی اتنا قریب کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ تو جب ہاتھ تک نظر نہیں آتا تو باقی اعضاء کیسے نظر آئیں گے؟ فرمایا کہ ان کفار کی مثال ایسے ہے کہ یہ قیامت کے دن کے قائل نہیں ہیں، نیک عمل بھی یہ کوئی نہیں کرتے تو یہ لوگ اندھیرے در اندھیرے میں ہیں، ان کو وہاں کچھ بھی نہیں ملے گا۔

تو دونوں میں فرق یہ ہے کہ جو قیامت کے دن کے قائل ہیں ان کے پاس نور ہے اگرچہ وہم کے درجے میں ہے اور جو قیامت کے دن کے قائل نہیں ہیں ان کے پاس وہم کے درجے میں بھی نور نہیں ہے۔

### کامیابی کی بنیاد چار باتیں:

﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾

یہ آیت نہایت جامع ترین آیت ہے۔ مسجد نبوی میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ موجود تھے کہ ایک شخص آیا۔ وہ کافر تھا، کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تیرا کلمہ پڑھنے کا خاص سبب؟ اس نے کہا کہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے، میں نے تورات اور انجیل کو پڑھا ہے اور ایسی جامع آیت مجھے دنیا میں کہیں نہیں ملی، میں حقانیت قرآن کا قائل ہو کر کلمہ پڑھتا ہوں۔ فرمایا کہ وہ آیت کون سی ہے؟ اس شخص نے کہا: یہ آیت ہے؛

﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾

اس نے کہا: اس کے شروع میں ہے ﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ﴾ کہ اللہ رب العزت کی اطاعت کریں، اس کا تعلق فرائض کے ساتھ ہے کہ فرائض الہیہ کو مانیں، ﴿وَرَسُولَهُ﴾ اور پیغمبر کی سنت کو مانیں، ﴿وَيَخْشَ اللَّهَ﴾ خدا سے ڈریں یعنی ماضی میں خدا سے ڈرتا رہا ہو، ﴿وَيَتَّقِهِ﴾ اور خدا کی مخالفت کبھی نہ کریں یعنی مستقبل میں۔ توجہ شخص فرائض کا خیال بھی رکھے اور سنت کا خیال بھی رکھے، پھر اللہ سے بھی ڈرے اور خدا کی مخالفت بھی نہ کرے۔ تو ﴿فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾ اس کے کامیاب ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟

### آیت استخلاف:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ﴾

اس آیت کو “آیت استخلاف” کہتے ہیں۔ یہ بہت اہم مسئلہ ہے، تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر سبق ہو گا ان شاء اللہ لیکن ابھی اس کا خلاصہ سمجھیں!

قرآن کریم میں اللہ پاک نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کن کن صحابہ کو خلافت دینے کا وعدہ فرمایا ہے؟ جسے ہم کہتے ہیں کہ صحابہ کرام میں سے خلفائے راشدین کون ہیں جن کی خلافت کا وعدہ اس آیت میں ہے؟

### خلفائے راشدین چار ہیں:

اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک یہ ہے حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم۔ خلافت راشدہ حق چار یار ہیں، تو خلافت راشدہ کا مصداق چار خلفائے راشدین ہیں۔

دلیل یہ آیتِ استخلاف ہے: ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ﴾ اللہ نے وعدہ کیا ان ایمان والوں سے جو تم میں سے ہیں۔ یہ ﴿مِنْكُمْ﴾ کا خطاب جب ہوا تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس وقت کلمہ پڑھ کر مسلمان نہیں ہوئے تھے، لہذا وہ ﴿آمَنُوا مِنْكُمْ﴾ میں شامل نہیں ہیں۔ حسنین کریمین ابھی نابالغ بچے تھے تو وہ بھی ﴿آمَنُوا مِنْكُمْ﴾ میں داخل نہیں تھے۔ اس لیے یہ صرف چار خلفاء کے ساتھ خاص ہے۔ تو اللہ رب العزت اس آیت میں فرماتے ہیں:

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ہیں ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا اور ان کے لیے اس دین کو ضرور اقتدار بخشے گا جسے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ان کو جو خوف لاحق رہا ہے اس کے بدلے انہیں ضرور امن عطا کرے گا۔ وہ میری عبادت کریں، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور جو لوگ اس کے بعد بھی ناشکری کریں گے تو ایسے لوگ نافرمان شمار ہوں گے۔

تو جب یہ نعرہ لگے ”خلافتِ راشدہ“ تو جواب کیا دیتے ہیں؟ حق چار یار! خلافتِ راشدہ... حق چار یار! نعرہ لگانا سیکھو اور جب مسئلہ سمجھانا ہو تو مسئلہ سمجھانا سیکھو!

### نعروں کا جواب کیسے دیا جائے؟

بعض مواقع پر نعرے لگتے ہیں تو میں فوراً تردید نہیں کرتا بلکہ میں سمجھایا کرتا ہوں۔ مثلاً نعرہٴ تکبیر... اللہ اکبر لگتا ہے، اسی طرح ”نعرہٴ رسالت“ لگتا ہے تو بعض نئے نئے لوگ ہوتے ہیں وہ ”یارِ رسول اللہ!“ کہہ دیتے ہیں، میں فوراً تردید نہیں کرتا، بلکہ میں بات سمجھاتا ہوں، میں کہتا ہوں کہ بھائی! نعرہ کا جواب صحیح وہ دیتا ہے جو نعرے کو سمجھے، جو نعرے کو نہ سمجھے وہ صحیح جواب نہیں دیتا۔ اب ”نعرہٴ تکبیر“ کا جواب ”اللہ



اکبر، ”نعرۂ رسالت“ کا جواب بعض کہتے ہیں ”محمد رسول اللہ“ اور بعض کہتے ہیں ”یار رسول اللہ“ اور جب ”خلافتِ راشدہ“ کا نعرہ لگے تو بعض کہتے ہیں ”حق چاریار“ اور بعض کہتے ہیں کہ ”حق سارے یار“۔ یہ دو قسم کے جواب چلتے ہیں۔ اب نعرہ سمجھیں گے تو جواب صحیح دیں گے، نعرہ صحیح نہیں سمجھیں گے تو جواب کیسے صحیح دیں گے؟

جب ایک شخص کہتا ہے کہ ”نعرۂ تکبیر“ تو وہ آپ سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ! سب سے بڑا کون ہے؟ تو جواب کیا دیں گے؟ ”اللہ اکبر“۔ پھر وہ کہتا ہے کہ ”نعرۂ رسالت“ تو پہلے سوچو کہ نعرے والا پوچھتا کیا ہے؟ ”نعرۂ رسالت“ والا پوچھتا ہے کہ تمہارا رسول کون ہے؟ تو جس کا رسول ”محمد“ ہے، صلی اللہ علیہ وسلم، وہ کہتا ہے کہ ”محمد رسول اللہ“ اور جس کا رسول ”یا“ ہے وہ کہتے ہیں ”یار رسول اللہ“۔ اب آپ کے رسول کون ہیں؟ (محمد رسول اللہ۔ سامعین) تو پھر ”نعرۂ رسالت“ کا جواب کیا ہونا چاہیے؟ (محمد رسول اللہ۔ سامعین)

اب دیکھیں! اہل بدعت پر رد ہو رہا ہے لیکن رد اس طرح نہیں ہو رہا کہ بھڑک اٹھیں، کفر کا فتویٰ دے کر ان کو مقابلے میں کھڑا کر دیں۔ پھر ہم نے کہا کہ جب ”خلافتِ راشدہ“ لگتا ہے تو جواب میں کوئی کہتا ہے کہ ”حق چاریار“، کوئی کہتا ہے کہ ”حق سارے یار“۔

جو شخص کہتا ہے کہ ”خلافتِ راشدہ“ تو وہ آپ سے پوچھتا ہے کہ وہ صحابہ بتاؤ جن کی خلافت کا وعدہ اللہ نے قرآن میں کیا ہے! اگر سب سے کیا ہے تو جواب ”سارے یار“ ہے، اگر چار سے کیا ہے تو جواب ”چار یار“ ہیں۔ تو جب کہیں کہ ”خلافتِ راشدہ“ تو جواب کیا دیں گے؟ (حق چاریار۔ سامعین) ”نعرۂ تکبیر“ کا جواب کیا دیں گے؟ اللہ اکبر، ”نعرۂ رسالت“ کا جواب کیا دیں گے؟ (محمد رسول اللہ۔ سامعین)

## ایک اشکال کا جواب:

لوگ دھوکہ بڑا سخت دیتے ہیں اور دلیل اتنی عجیب دیتے ہیں کہ عام بندہ بالکل بے بس ہو جاتا ہے۔ دلیل ان کی کیا ہے؟ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن چھ ماہ کے لیے خلیفہ بنے تھے تو وہ بھی تو خلیفہ تھے! حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی خلیفہ ہیں اور ان کے دور میں حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کچھ وقت کے لیے مکہ مکرمہ کے خلیفہ بنے ہیں۔ حضرت ابو بکر بھی خلیفہ، حضرت عمر بھی خلیفہ، حضرت عثمان بھی خلیفہ، حضرت علی بھی خلیفہ، حضرت حسن بھی خلیفہ، حضرت امیر معاویہ بھی خلیفہ اور حضرت عبد اللہ بن زبیر بھی خلیفہ، تو یہ خلفاء چار تو نہیں، خلفاء سات ہیں، اور اگر قرآن سے پوچھو تو قرآن کہتا ہے: ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاٰثِدُونَ﴾<sup>53</sup> کہ وہ سارے راشد بھی ہیں۔ تو ان سات صحابہ میں سے ساتوں خلفاء بھی ہیں اور راشد بھی ہیں، اس لیے ہم ان سات کو ”خلیفہ راشد“ کہتے ہیں۔

اب دیکھو! بظاہر کتنی مضبوط دلیل ہے! بندہ اسے فوراً قبول کرتا ہے۔ ہم نے کہا کہ بات یوں نہیں ہے۔ یہ خلفاء بھی ہیں اور یہ راشدین بھی ہیں، اس پر اعتراض نہیں ہے، اصل بات یہ ہے کہ ”خلافت راشدہ“ یہ شریعت کی خاص اصطلاح ہے، جس کا خاص معنی ہے اور اس میں الجھن نہیں ہے۔ مثلاً ”عشرہ مبشرہ بالجنۃ“ یہ کتنے ہیں؟ دس ہیں یا سارے؟ (دس۔ سامعین) آپ کہتے ہیں کہ صحابہ میں سے دس ہیں کہ جن کو جنت کی بشارت دی ہے، دوسرا کہتا ہے کہ جھوٹ ہے، کیونکہ

قرآن کریم میں ہے: ﴿وَكَلَّمَ اللَّهُ الْحُسَيْنِيَّ ۖ﴾<sup>54</sup> اللہ نے سب کو جنت کی بشارت دی ہے تو آپ عشرہ مبشرہ کیوں کہتے ہو؟ اس لیے یہ نہ کہا کرو کہ یہ دس مبشرہ ہیں بلکہ کہو کہ سارے مبشرہ ہیں۔ تو دس کو جنت کی بشارت دی ہے یا سب کو دی ہے؟ (سب کو دی ہے۔ سامعین) تو آپ ”عشرہ مبشرہ“ کیوں کہتے ہیں؟ تو جس طرح آپ نے یہ کہا کہ خلفاء بھی ہیں اور راشد بھی ہیں، لہذا سات خلفائے راشدین ہیں، آپ چار کیوں کہتے ہیں؟ تو آپ سے بھی کوئی بندہ کہے گا کہ سب کو جنت کی بشارت دی ہے تم ”عشرہ مبشرہ بالجنتہ“ کیوں کہتے ہو؟

ہم نے کہا کہ تمام صحابہ کرام جنتی ہیں لیکن جب ہم ”عشرہ مبشرہ بالجنتہ“ کہتے ہیں تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے ایسے صحابہ کہ جن کا نام ایک مجلس میں لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی فرمایا وہ دس ہیں۔ ویسے تو جنتی سارے ہیں۔ اب یہ سات خلفاء بھی ہیں اور ساتوں راشد بھی ہیں لیکن ”خلفائے راشدین“ سے مراد صحابہ کرام میں وہ صحابہ ہیں کہ جن کے بارے میں آیتِ استخلاف میں اللہ نے خلافت کا وعدہ کیا اور وہ سات نہیں بلکہ وہ چار ہیں۔

اب اس کے ساتھ تھوڑا سا اور اضافہ کر لو کہ جب ہم کہتے ہیں ”خلافتِ راشدہ“ تو اس سے مراد ہوتا ہے ”خلافتِ راشدہ موعودہ فی القرآن“ یعنی ایسی خلافت جس کا وعدہ قرآن میں کیا گیا ہے وہ چار کے ساتھ ہے، وہ سب کے ساتھ نہیں ہے ورنہ تو آیتِ استخلاف قیامت تک آنے والے ہر خلیفہ کو شامل ہو جائے گی، اللہ نے کسی کا نام تو نہیں لیا نا؟ جو بھی امام ہے اعمالِ صالحہ کرتا ہے اور شریعت کے مطابق حکومت کرتا ہے تو وہ خلیفہ ہو گا۔

تو ”خلفائے راشدین“ شریعت کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد چار ہیں، باقی سات کو ہم خلیفہ بھی کہہ دیں گے، راشد بھی کہہ دیں گے لیکن اصطلاحی خلافت راشدہ نہیں ہے، اس لیے ہم دونوں میں فرق کرتے ہیں کہ چار خلفاء کی خلافت ”خلافت راشدہ“ ہے اور باقی تین کی خلافت؛ خلافت عادلہ ہے۔ یہ فرق کر لیتے ہیں تاکہ الجھن نہ ہو۔

### تین اوقات میں اجازت لے کر جاؤ!

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنَكُمْ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِنْ قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهْرِ وَمِنْ بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ﴾

پہلے حکم یہ تھا کہ جب کسی کے گھر میں داخل ہو تو سلام کرو اور اجازت لو، اب حکم ہے ان لوگوں کے لیے جن کا گھر میں آنا جانا رہتا ہے کہ وہ کس وقت اجازت لیں اور کس وقت بغیر اجازت کے آئیں؟ فرمایا کہ صبح فجر سے پہلے کا وقت اور دوپہر کو سونے کا وقت اور عشاء کے بعد گھر میں آرام کا وقت ہے۔ عام طور پر جب ان تین وقتوں میں بندہ سوتا ہے تو بدن کے زائد کپڑے اتار دیتا ہے، عام حالات میں کبھی کبھی بندہ سونے کے لیے جائے تو قمیص اتارتا ہے اور لنگی پہنتا ہے تو شلواری بھی اتار دیتا ہے، زائد کپڑے اترے ہوئے ہوتے ہیں، اس وقت بندہ نامناسب حالت میں ہوتا ہے، اس لیے ایسے وقت حکم دیا کہ جب جاؤ تو یہ تمہارے ستر کے اوقات ہیں، ڈھانپنے کے وقت ہیں ایسے وقت میں اجازت کے بغیر نہ جایا کرو، بلکہ اجازت لے کر جایا کرو۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ﴾

ان اوقات کے علاوہ آنا جانا ہو تو کوئی حرج نہیں ہے اور یہ حکم محارم کے لیے

بیان ہو رہا ہے، اجنبی کے لیے نہیں ہے۔ اجنبی کے لیے تو ویسے جانا جائز ہی نہیں ہے۔

﴿طَوُّفُونَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ ۖ﴾

ان کا ہر وقت تمہارے گھروں میں آنا جانا رہتا ہے، تم اتنی بار اجازت کیسے لو گے؟ لیکن ان وقتوں میں ذرا خیال کیا کرو!

﴿وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا اسْتَأْذَنَ

الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ اور جب نابالغ بچے بالغ ہو جائیں تو ان وقتوں میں وہ بھی اجازت لیں جیسے دوسرے بڑے لوگ اجازت لیتے ہیں۔

﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ الَّتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ

جُنَاحٌ أَنْ يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ ۖ﴾

اور ایسی بوڑھی عورت کہ جو نکاح کی امید نہیں رکھتی یعنی ایسی حالت میں ہے کہ نکاح کی رغبت ان میں ختم ہو گئی ہے تو ان پر کوئی حرج نہیں ہے کہ اپنے زائد کپڑے اتار دیں۔ ”زائد“ کی قید ذہن میں رکھنا! ایسی بوڑھی عورت زائد کپڑے اتاریں، ﴿غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ﴾ اس کا مقصد پھر بھی زینت کا دکھانا مقصود نہ ہو۔ زائد کپڑے سے مراد یہ ہے کہ جو اپنے چہرے کا کپڑا ہے اس کو اتار دیں تو کوئی حرج نہیں ہے، زینت پھر بھی مقصود نہ ہو۔ بعض نے ان میں سے ہتھیلی اور پاؤں کو بھی خارج کیا ہے کہ اس حالت میں رہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے حق میں اجنبی، محارم کی طرح ہوتا ہے۔ جس طرح محرم دیکھ سکتا ہے اجنبی بھی دیکھ سکتا ہے۔ اب اندر کی شہوت اس کا اللہ اور بندے کے درمیان کا معاملہ ہے۔

**معذورین کے کھانے کا مسئلہ:**

﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ

حَرْجٌ وَلَا عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَنْ تَأْكُلُوا مِنْ بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ ﴿١٠﴾

بعض حضرات کی خواہش ہوتی ہے کہ ایک نابینا ہے اس کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلائیں، لنگڑا ہے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلائیں، کوئی اور بیمار ہے تو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلائیں لیکن الجھن پیش ہوتی کہ جب اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھائیں گے تو نابینا نے کا خیال ہوتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ مجھے کھانے کی تمیز نہیں، میں زیادہ کھالوں، ہو سکتا ہے کہ میں اچھی چیز کھالوں اور دوسری چھوڑ دوں۔ اور جو لنگڑا اور مریض ہوتا ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ مریض کے ساتھ لوگ بیٹھ کر کھانا پسند نہیں کرتے، مجھے مروّت میں شاید ساتھ تو بٹھادیں لیکن ہو سکتا ہے کہ دل سے نہ چاہتے ہوں۔ یہ خلیجان تھے۔ اللہ نے سارے خلیجان ختم فرمادیے۔

فرمایا کہ کوئی معذور ہو، لنگڑا ہو، نابینا ہو تو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاؤ تب بھی حرج نہیں ہے، اپنے والد کے گھر سے کھلاؤ تب بھی حرج نہیں ہے، امی کی گھر سے کھلاؤ تب بھی حرج نہیں ہے، بھائی کے گھر سے کھلاؤ تب بھی حرج نہیں ہے، بہن کے گھر سے کھلاؤ تب بھی حرج نہیں ہے، اپنے چچا اور ماموں اور پھوپھی کے گھر سے کھلاؤ تب بھی حرج نہیں ہے، یا اپنے قریبی بے تکلف دوست کے دسترخوان سے کھلاؤ تب بھی حرج نہیں ہے۔ یہ ورہشتے ہیں جو عام طور پر کھانا کھانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے اور دل میں گھٹن محسوس نہیں کرتے تو ایسی جگہ پر خود کھاؤ یا ان کو ساتھ بٹھاؤ اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

**جن کے گھروں کی چابیاں ہوں وہاں سے کھانے کا حکم:**

﴿أَوْ مَا مَلَكَتُمْ مَفَاتِحَهُ﴾

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول تھا کہ جب جہاد پر جاتے تھے تو اپنے گھر کی چابیاں کسی معذور کو دیتے کہ تم اس کا خیال رکھو اور جو کھانا چاہو تو وہ کھا بھی

سکتے ہو لیکن وہ کبھی کھاتے نہیں تھے کہ ہو سکتا ہے کہ مروت میں کہا ہو کہ میں کھاؤں! تو وہ کھانا نہیں کھایا کرتے تھے۔ اللہ رب العزت نے فرمایا: ﴿أَوْ مَا مَلَكَكُمْ مَفَاحِجَةً﴾ کہ جن کے گھر کی چابیاں تمہارے پاس ہیں وہ تمہیں دے کر گئے تو تم کھانا چاہو تو کھا سکتے ہو۔

**پیغمبر کو ایسے نہ پکارو!**

﴿لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ يَسْتَلْثُونَ مِنْكُمْ لَوْ اِذَا فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

یہ آیات خاص طور پر غزوہ خندق کے موقع پر نازل ہوئی ہیں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے ساتھ ملایا تھا اور سب نے مل کر خندق کھودی تھی۔

اللہ پاک نے فرمایا کہ ان سب کو بلائیں اور صحابہ کرام سے فرمایا کہ نبی کے بلانے کو اپنے بلانے کی طرح نہ سمجھنا کہ کسی نے بلایا اور دل چاہے تو جائے اور دل نہ چاہے تو نہ جائے، بلکہ پیغمبر نے بلایا ہے تو پھر ضرور جانا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آپ ان کو بلائیں اور اپنے ساتھ کام پر لگائیں! اور نبی کو ہدایت دی ہے کہ اگر ان میں سے کسی کو ضرورت ہو اور وہ جانا چاہے تو اس کو اجازت دے دیجیے!

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ پیغمبر بلائیں تو ضرور جانا اور پیغمبر سے فرمایا کہ اگر کوئی اجازت مانگے تو اجازت دے دینا! یوں دونوں کی رعایت فرمائی ہے۔

پہلے تو ان کو سمجھایا کہ ﴿لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ﴾ کہ نبی کے بلانے کو اپنی طرح نہ سمجھنا اور بعض نے معنی کیا کہ ﴿لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ﴾

كَذَّعَاءٍ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ﴿١٦﴾ کہ پیغمبر کو ایسے نہ بلانا جیسے ایک دوسرے کو بلاتے ہو! اگر ﴿دُعَاءَ الرَّسُولِ﴾ سے مراد ہو پیغمبر کو بلانا تو یہ ”دعا“ مصدر ہے جس کی نسبت فاعل کی طرف ہوگی یعنی پیغمبر کا بلانا، اور اگر مراد یہ ہو کہ نبی کو نہ بلاؤ جیسے آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو پھر ”دعا“ مصدر ہوگا جس کی نسبت مفعول کی طرف ہے۔ دونوں احتمال اس میں موجود ہیں۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنے استاد، اپنے شیخ، اپنے بڑے اور اپنے گھر کے بزرگ آدمی ان کو نام لے کر ایسے نہ بلاؤ جیسے اپنے دوستوں کے نام لے کر بلاتے ہو، ادب کے ساتھ انہیں پکارا کرو۔

**کوئی جانے کی اجازت مانے تو دے دیں!**

﴿فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأَذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ جب آپ سے اجازت مانگیں تو آپ ان کو اجازت دے دیا کریں! اب اس میں شبہ تھا کہ ایک طرف پیغمبر نے بلایا ہے اور ایک طرف ان کی اپنی حاجت ہے تو اپنی حاجت کو پیغمبر کے بلانے پر قربان کیوں نہیں کرتے؟ فرمایا یہ بات ایمان کے خلاف نہیں ہے۔ بسا اوقات انسان کی حاجات ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کو جانا پڑتا ہے۔ تو آپ سے اجازت لیں تو آپ ان کو اجازت دے دیا کریں۔

لیکن اتنی بات ارشاد فرمائی کہ ﴿فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأَذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ﴾ آپ اجازت دیں جس کو چاہیں اور جس کو نہ چاہیں تو آپ اجازت نہ دیں۔ آپ اجازت دینے کے پابند نہیں ہیں۔



## اجازت دینے کے بعد استغفار کا حکم کیوں؟

﴿وَأَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اللَّهُ﴾

آپ اجازت بھی دیں اور پھر اللہ سے معافی بھی مانگیں! اجازت دے کر اللہ سے معافی مانگے کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف پیغمبر نے بلایا ہے اپنے کام کے لیے اور ایک طرف گھر کی ضرورت کے لیے ان کو جانا پڑتا ہے۔ اب بظاہر یہ ہے کہ پیغمبر کے بلانے کے بعد گھر کے کام کے لیے نہیں جانا چاہیے لیکن بشری تقاضے ہیں، ان کی ضرورتیں ہیں تو آپ اجازت بھی دے دیا کریں اور ان کے لیے اللہ سے معافی بھی مانگا کریں۔

بسا اوقات انسان سمجھتا ہے کہ میرا گھر جانا بہت ضروری ہے اور یہ اس کی اجتہادی خطا ہوتی ہے۔ اگر وہ نہ بھی جائے تو کام چل سکتا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ میں نہ جاؤں تو کام نہیں ہو گا۔ فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے اجتہاد میں خطا ہو تو آپ ان کے لیے معافی بھی مانگیں تاکہ ان کی اجتہادی خطا پر بھی گرفت نہ ہو۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ اللہ تو معاف فرماتے ہیں۔

## منافقین کی حرکتیں:

﴿قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنْكُمْ لِوَاذًا﴾

یہ منافقین کے بارے میں ہے۔ غزوہ خندق کے موقع پر بلایا گیا۔ مؤمنین سارے جمع ہو جاتے لیکن منافقین کھسک جاتے تھے۔

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرٍ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ

يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

یہ جو پیغمبر کی بات نہیں مانتے اور چھپ چھپ کر کھسکتے ہیں، ان کو بچنا چاہیے

فتنہ میں مبتلا ہونے سے اور ان کو بچنا چاہیے اللہ کے عذاب سے۔

﴿إِلَّا إِنْ يَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قَدْ يَعْلَمُ مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ ۝

يَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۝ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾

جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے سب کچھ اللہ کا ہے، اللہ جانتے ہیں جس حالت میں تم ہو اور اللہ جانتے ہیں جس حالت میں تمہیں لوٹایا جائے گا اور اللہ پھر ان کو ان کے اعمال کی خبر دے گا۔ اللہ ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔

بس دعا کریں کہ اللہ ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم والاذوق اور جذبہ عطا فرمائے اور منافقین کے طرزِ عمل سے ہم سب کو محفوظ فرمائے۔ آمین  
وَاجْزُ دَعُوْا اَنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

## سورة الفرقان

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿تَبٰرَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُوْنُ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝۱﴾

**برکت مطلوب نہ کہ کثرت:**

”تَبٰرَكَ“ یہ برکت سے مشتق ہے۔ عربی زبان میں دو لفظ استعمال ہوتے

ہیں: ایک برکت اور دوسرا کثرت۔

”برکت“ کا معنی ہوتا ہے کہ چیز کی مقدار کم ہو اور فوائد زیادہ ہوں،

”کثرت“ کا معنی ہوتا ہے کہ مقدار زیادہ ہو اور فوائد کم ہوں۔ شریعت میں کثرت

مطلوب نہیں، برکت مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ ۝۵۵﴾

کتنی ایسی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی

ہیں۔

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۝۱۰۰ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۝۱۰۱ اِذْ اَعْجَبَكُمْ

كَثُرْتُكُمْ ﴿٥٦﴾

اللہ نے کئی مقامات پر تمہاری مدد کی ہے اور جنگ حنین میں بھی اس نے تمہاری مدد کی ہے جب تمہیں تمہاری کثرت پر ناز تھا۔  
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری دنوں میں خطبہ دیا۔  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ أَظْلَلَكُمْ شَهْرٌ عَظِيمٌ شَهْرٌ مُبَارَكٌ. <sup>57</sup>

کہ ایک ایسا مہینا آ رہا ہے جو ایک عظیم مہینا ہے اور برکت والا مہینا ہے۔  
یہاں بھی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہینے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے برکت کی بات کی ہے۔ ”شَهْرٌ مُبَارَكٌ“ کہ یہ بابرکت مہینا ہے۔  
اس پر میرا پورے ایک گھنٹے کا ایک بیان ہے، آپ اسے سن لیں۔ یہ متن ہے آگے اس کی شرح ہے۔

اگرچہ ”کثرت“ بعض مقامات پر اللہ کی بہت بڑی نعمت بھی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَإِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَثَرْتُكُمْ﴾ <sup>58</sup>

تم اس وقت کو یاد کرو جس وقت تم تھوڑے تھے تو اللہ نے تمہیں زیادہ کر دیا۔

دشمن کے مقابلے میں تعداد زیادہ ہو جانا یہ اللہ کی نعمت ہے۔ آدمی کے ماننے

56۔ التوبة: 9: 25

57۔ صحیح ابن خزيمة: ج 2 ص 911 باب فضائل شهر رمضان

58۔ الاعراف: 7: 86

والے تھوڑے ہوں اور اللہ زیادہ بنادیں تو یہ اللہ کی نعمت ہے لیکن عام طور پر کثرت مطلوب نہیں ہوتی بلکہ برکت مطلوب ہوتی ہے۔

تو جب بھی کسی شخص کو عادیں تو زندگی میں کثرت کی دعا نہ دیں، برکت کی عادیں کریں۔ برکت اور کثرت میں فرق ہمیشہ ذہن میں رکھیں۔

## حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب:

﴿نَزَّلَ الْفُرْقَانَ﴾

کتاب اللہ کا ایک نام جس طرح قرآن ہے اسی طرح ایک نام ”فرقان“ بھی ہے اور فرقان کہتے ہیں کہ جو حق اور باطل میں قوتِ دلیل کے ساتھ فرق کرے۔ قرآن کریم دلائل کی قوت سے باطل کو حق سے الگ کرتا ہے اس لیے اس کو فرقان کہتے ہیں۔

## دلیل ختم نبوت:

﴿يَسْأَلُونَ لِّلْعَلَمِينَ نَذِيرًا﴾

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ”لِّلْعَالَمِينَ نَذِيرًا“ نہیں فرمایا بلکہ ”لِّلْعَلَمِينَ نَذِيرًا“ فرمایا اس بات کو سمجھانے کے لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک عالم کے لیے پیغمبر نہیں ہیں بلکہ عالمین کے لیے پیغمبر ہیں۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت اور عظمت نبوت پر دلیل ہے کہ باقی انبیاء علیہم السلام ایک عالم کے یا ایک قوم کے نبی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم عالمین کے نبی ہیں۔ تو اس کے بعد کسی اور نبی کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

نبوت ایک بستی سے شروع ہوتی... ایک شہر، ایک ملک، ایک عالم، پھر عالمین۔ کوئی نبی ایک بستی کا ہے، کوئی ایک شہر کا ہے، کوئی ایک ملک کا ہو گا اور حضور

صلی اللہ علیہ وسلم عالمین کے نبی اور رسول ہیں۔ تو آپ کی نبوت میں وسعت اتنی زیادہ ہے کہ اس کے بعد مزید نبوت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ جب نبوت اپنے تمام تر کمالات اور درجات کو پہنچ جائے تو اس کے بعد مزید نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ تو اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر بھی دلیل ہے۔

### مشرکین کے ایک اعتراض کا جواب:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا فُكٌّ أَفْتَرَاهُ وَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَزُورًا﴾

مشرکین کا ایک اعتراض یہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو قرآن اتر رہا ہے یہ آپ خود گھڑتے ہیں۔ مشرکین کہتے تھے: ﴿أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾ اکتتبہا فہی ثملی علیہ بکرة و اصیلا ﴿۱﴾ کہ یہ تو پہلے لوگوں کی باتیں ہیں جو آپ نے صحابہ کو لکھوائی ہیں اور صبح و شام وہی آپ کے سامنے پڑھ پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں۔

اس کا اللہ رب العزت نے جواب دیا ہے:

﴿قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾

کہ اے میرے پیغمبر! آپ فرما دیجیے کہ قرآن میری طرف سے نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

### قرآن مجید کا چیلنج:

اور اللہ کی طرف سے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ پاک نے چیلنج دیا ہے:

﴿قُلْ لِّبَنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ﴾

لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ﴿٥٩﴾

اگر تم کہتے ہو کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے نہیں ہے تو جن وانس سارے جمع ہو جاؤ اور اس جیسی کتاب لاسکتے ہو تو لاؤ!

یہ چیلنج کیسے دیا ہے؟ یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ دنیا میں بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جس جیسی چیز انسان بنا سکتے ہیں اور بعض ایسی ہیں کہ جس جیسی چیزیں انسان نہیں بنا سکتے۔ اب دیکھیں! میرے سر پر ٹوپی ہے، اس جیسی کروڑوں ٹوپیاں انسان بنا سکتے ہیں لیکن اس ٹوپی کے نیچے بال ہیں، کروڑوں انسان مل کر بھی ان جیسا ایک بال بھی نہیں بنا سکتے یعنی ایسا بال جو انسانی بدن میں ہو اور خود بخود بڑھے۔ ہمارے ہاتھ میں گھڑی ہے۔ اس جیسی کروڑوں گھڑیاں انسان بنا سکتے ہیں لیکن جس ہاتھ پر ہے اس ہاتھ جیسا ایک ہاتھ کروڑوں بندے مل کر بھی نہیں بنا سکتے۔

تو جس جیسی چیز انسان بنا سکے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو بھی انسان نے بنایا ہے اور جس جیسی چیز انسان نہ بنا سکے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو بھی انسان نے نہیں بنایا بلکہ اللہ نے بنایا ہے۔ اس لیے اللہ پاک نے فرمایا کہ اگر تمہارا دعویٰ یہی ہے کہ قرآن کریم میری کتاب نہیں تو تم اس جیسی بنا کر دکھاؤ! تو اس جیسی کتاب نہ بنا سکتا اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن بھی اللہ کی کتاب ہے، کسی بندے کی نہیں ہے۔

**مشرکین کے دوسرے اعتراض کا جواب:**

﴿وَقَالُوا مَا لِيَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونُ مَعَهُ نَذِيرًا ﴿٦٠﴾﴾

اس میں دوسرے اعتراض کا جواب ہے۔ ان کا ایک اعتراض یہ تھا کہ یہ کیسا

نبی ہے جو کھاتا بھی ہے، پیتا بھی ہے، بازاروں میں چلتا بھی ہے، فرشتہ بھی نہیں اور اس کے پاس خزانہ بھی نہیں؟ اگر نبی ہوتا تو اس کے ساتھ ملائکہ ہوتے، پیغمبر ہوتا تو یہ نہ کھاتا نہ پیتا۔ اللہ رب العزت نے اس اعتراض کا پہلے اجمالی جواب دیا:

﴿اَنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُوْنَ سَبِيْلًا ۝۱﴾

دیکھو! یہ کیسے نکمی مثالیں پیش کرتے ہیں کہ نبی ہوتا تو اس کے ساتھ فرشتہ ساتھ ہوتا۔ لیکن اگر پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ فرشتہ ہوتا تو پھر یہی لوگ کہتے کہ اس کے فرشتہ ہونے پر کیا دلیل ہے؟ اگر نبی ہوتا اور نہ کھاتا تو یہ کہتے کہ ہم کھاتے ہیں تو ہمارا نبی تو وہ ہونا چاہیے کہ جو کھانے والا ہو! یہ کیسی باتیں کرتے ہیں؟ تو یہ اجمالی جواب دیا ہے۔

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ اِنْ شَاءَ جَعَلَ لَكَ خَیْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنَّتْ تَجْرِیْ مِنْ

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَیَجْعَلُ لَّكَ قُصُوْرًا ۝۲﴾

یہاں سے پھر تفصیلاً جواب دیا ہے کہ اللہ چاہتے تو باغات جاری کر دیتے، اللہ چاہتے تو خزانے نازل فرما دیتے، اللہ کے لیے مشکل نہیں تھا لیکن یہ دنیا دار الابتلاء ہے، دار الامتحان ہے۔ اگر پیغمبر کے ساتھ خزانے ہوں پھر لوگ کلمہ پڑھیں گے تو خزانے دیکھ کر پڑھیں گے، ایمان بالغیب کبھی نہیں لائیں گے۔ تو اللہ فرماتے ہیں کہ ہم یہ کر سکتے ہیں لیکن ہم نے کیا نہیں ہے۔

**امام صاحب قاضی القضاۃ نہیں بنے تو شاگرد کیوں بنا؟**

پہلے میں ایک سوال کا جواب دیتا ہوں، اس پر پھر بات سمجھ آئے گی۔  
میں جدہ میں تھا تو مجھے ایک شخص نے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو خلیفہ وقت نے چیف جسٹس۔ قاضی القضاۃ۔ بننے کے لیے منصب



پیش کیا تو امام صاحب نے قبول نہیں کیا۔ اس نے امام صاحب رحمہ اللہ کو کوڑے مارے پھر بھی قبول نہیں کیا۔ حضرت امام صاحب کو جیل میں ڈالا پھر بھی قبول نہیں کیا۔ زہر دے کر امام صاحب کو شہید کر دیا، امام صاحب نے آخر وقت تک اس عہدہ کو قبول نہیں کیا۔ آپ بتاؤ کہ جس امام کے ہم مقلد ہیں اس امام کا جنازہ جیل سے اٹھا ہے یا کسی مسجد سے اٹھا ہے؟ (جیل سے۔ سامعین) اب اگر کوئی عالم جیل میں جائے تو اس کا ساتھ دینا چاہیے یا اس کو چھوڑ دینا چاہیے؟ (ساتھ دینا چاہیے۔ سامعین) لیکن ہم ایسا نہیں کرتے۔ مجھے دو مہینے جیل ہو جائے تو آپ میں سے پیچھے دس پندرہ رہ جائیں گے اور اگر داخلے سے پہلے جیل ہو جائے تو داخلہ کم ہو جائے گا، جو تعاون کرتے ہیں جب جیل آجائے تو وہ تعاون چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ مولوی صاحب تو جیل جاتے ہیں۔

### متکلم اسلام کا تعجب:

میری ایک کتاب پر کام چل رہا ہے ان شاء اللہ چھپ کر منظر عام پر آجائے گی، اس کا نام ہے ”تعجبات“۔ تو میرے تعجبات ہیں۔ ان میں سے ایک بہت بڑا تعجب یہ ہے کہ جب ہم اسٹیج پر اپنے اکابر علمائے دیوبند کی مدح کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایسے تھے کہ کچھ ریل میں اور کچھ جیل میں، لوگ پوچھتے کہ شاہ جی! کیا حال ہے؟ تو شاہ جی فرماتے: کیا پوچھنا! آدھی جیل میں کاٹی اور آدھی ریل میں کاٹی۔ تو اس کو فخر کے طور پر بیان کرتے ہیں اور جب ماننے کی بات آتی ہے تو اس کو ماننے میں جو ہمیشہ ریل میں ہو، اس کو نہیں ماننے جو کبھی ریل میں ہو کبھی جیل میں۔ بھائی! یا تو ”جیل جانا اکابر کی شان ہے“ ایسے بیان مت کرو اور اگر یہ اکابر کی شان ہے تو پھر ان کو مانو جو جیل جاتے ہیں، پھر ان کا ساتھ دو! مجھے تعجب ہے کہ کہتے کچھ اور ہیں کرتے کچھ اور ہیں۔

تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو شہید کر دیا گیا لیکن آپ نے قاضی القضاۃ کا

عہدہ قبول نہیں کیا۔ حضرت امام صاحب کی دلیل بہت عجیب تھی۔ حاکم وقت نے کہا کہ آپ چیف جسٹس کا عہدہ قبول کریں۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ اس نے کہا کہ نہیں، آپ کو کرنا پڑے گا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ یہ جو میرا جملہ ہے کہ میں قاضی القضاۃ کے عہدے کا اہل نہیں ہوں میں یہ سچ بول رہا ہوں یا جھوٹ بول رہا ہوں؟ اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں تو جھوٹے آدمی کو قاضی نہیں بنانا چاہیے اور اگر میں سچ بول رہا ہوں تو نااہل کو عہدہ نہیں دینا چاہیے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ کیسی عجیب دلیل ہے! خیر امام صاحب قاضی نہیں بنے۔

اس امت کے پہلے قاضی القضاۃ - چیف جسٹس - قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ ہیں۔ تو مجھ سے اس بندے نے سوال کیا کہ اگر قاضی القضاۃ بننا برا تھا تو امام ابو یوسف کیوں بنے؟ اگر بننا اچھا تھا امام ابو حنیفہ کیوں نہیں بنے؟

میں ایک اصول پیش کرتا ہوں اور اس پر بہت سارے عقائد اور مسائل چھیڑا کرتا ہوں۔ اصول یہ ہے کہ جب معصوم پر اعتراض ہو تو محفوظ کو پیش کرتے ہیں اور جب ماجر پر اعتراض ہو تو محفوظ کو پیش کرتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم پر اعتراض ہو تو اس کا جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے مل جاتا ہے اور جب مجتہد پر اعتراض ہو تو اس کا جواب صحابی کی زندگی سے مل جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ صحابہ نے تو نبی کو دیکھا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کام کریں گے اور جو مجتہد ہے اس نے یا تو صحابہ کو دیکھا ہے یا بعد والے کو دیکھا ہے، تو ان کی زندگی پر جو اعتراض ہو وہ صحابہ کی زندگی سے ملے گا۔

تو میں نے ان سے کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں حکومت بھی دی، مدینہ منورہ میں آپ کو دولت بھی دی اور مدینہ منورہ میں اللہ نے آپ کو طاقت بھی دی۔ سوال یہ ہے کہ یہ تین چیزیں اللہ نے مکہ میں کیوں نہیں دیں؟

طاقت، دولت اور حکومت! اگر کوئی شخص پوچھے کہ یہ چیزیں بہتر تھیں تو مکہ میں کیوں نہیں دیں اور اگر بہتر نہیں تھیں تو مدینہ میں کیوں دی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا حق تھا کہ آپ کو دولت بھی ملتی، آپ کو حکومت بھی ملتی اور آپ کو طاقت بھی ملتی لیکن اگر مکہ میں مل جاتی تو صحابہ پر اعتراض ہوتا کہ انہوں نے کلمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں نہیں پڑھا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت کی وجہ سے پڑھا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طاقت کی وجہ سے پڑھا ہے۔ چونکہ یہ الزام ان پر لگ سکتا تھا اس لیے اللہ نے یہ تینوں چیزیں مکہ میں نہیں دیں۔ اب جو صحابہ کلمہ پڑھ رہے تھے تو خالص محبت پیغمبر میں پڑھ رہے تھے، کوئی حاکم تھا تو حکومت چھوڑ کر خدمت میں آ رہا ہے، جو طاقت والا تھا وہ حضور پر نثار ہو رہا ہے، جو مالدار تھا وہ مال کو لٹا کر آ رہا ہے تو صحابہ نے کلمہ مال اور حکومت کی وجہ سے نہیں پڑھا بلکہ اللہ کے نبی کی محبت میں پڑھا ہے۔ لیکن جب مدینہ میں آئے ہیں تو حق چونکہ انہی کا تھا اس لیے خدا نے حکومت بھی دی ہے، طاقت بھی ہے اور پھر دولت بھی دی ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ قاضی القضاۃ بن جاتے تو آج دنیا میں جو لوگ مسلمان ہیں کم از کم ساٹھ ستر فیصد ان میں حنفی ہیں اتنی اکثریت کے ساتھ احناف ہوتے تو لوگ کہتے کہ حنفیت کے پھیلنے کی وجہ یہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہ چیف جسٹس تھا، طاقت تھی، قلم تھا اور علم تھا اس وجہ سے حنفی مذہب پھیل گیا۔ تو ان کا جنازہ جیل سے اٹھا اور شاگرد قاضی القضاۃ بنا ہے یہ بتانے کے لیے کہ حنفیت کے پھیلنے کی وجہ قاضی القضاۃ کا عہدہ نہیں ہے لیکن چونکہ حق انہی کا تھا اس لیے ان کے شاگردوں کو دیا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم دے سکتے تھے پیغمبر کو لیکن ہم نے دیا کیوں

نہیں؟ اس لیے کہ یہ دنیا دار الالبلاء اور دار الامتحان ہے، اس لیے ہم ان کو نہیں دیتے۔

## عذاب کی خبر دینا خوش خبری کیسے ہے؟

﴿يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلَائِكَةَ لَا بُشْرَىٰ يَوْمَئِذٍ لِلْمُجْرِمِينَ وَيَقُولُونَ حَجْرًا

مُحْجَرًا ۝﴾

قیامت کے دن جب ملائکہ کو دیکھ لیں گے تو اس دن ان مجرمین کے لیے کوئی خوش خبری نہیں ہوگی یعنی خوش خبری نہیں ملے گی۔

بظاہر اعتراض ہوتا ہے کہ سورۃ آل عمران میں تو ہے: ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ

آلِيمٍ ۝﴾ کہ ان کفار کو عذاب کی بشارت دو اور یہاں فرماتے ہیں کہ قیامت کو ان کے لیے کوئی خوشخبری نہیں ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جو فرمایا جا رہا ہے کہ قیامت کے دن ان کے لیے کوئی خوشخبری نہیں ہوگی اس کا معنی یہ ہے کہ جن چیزوں سے بندہ خوش ہوتا ہے وہ قیامت کے دن ان کو نصیب نہیں ہوں گی، بندہ راحت سے اور عزت سے خوش ہوتا ہے۔ نہ ان کو راحت ملے گی نہ عزت ملے گی۔

اور ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ آلِيمٍ﴾ میں عذاب کا معنی خوش خبری نہیں ہے،

بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ جب ان کو بار بار سمجھایا جا رہا ہے کہ تم یہ کام نہ کرو وگرنہ عذاب ہو گا تو وہ کہتے کہ ہم عذاب بھگت لیں گے لیکن تمہاری بات نہیں مان سکتے۔ تو فرمایا کہ یہ خود عذاب پر خوش ہیں نا! تو ان کو عذاب کی خوش خبری دے دو۔

جیسے دنیا میں کوئی شخص کہتا ہے کہ دیکھو بیٹا! باہر نہ جانا ورنہ پکڑے جاؤ گے۔

وہ باہر چلا گیا اور پکڑا گیا۔ پھر بندہ تھانے جا کر اس سے ملتا ہے کہ اب خوش ہے نا؟ میں تجھے کہتا تھا نا کہ باہر نہ جاؤ! تو وہ خوش نہیں ہوتا لیکن اصل میں تنبیہ کرنا مقصود ہوتا

ہے۔

## کاش میں فلاں کو دوست نہ بناتا!

﴿يُوَيِّدُنِي لَيْتَنِي لَمْ أَخَذْ فَلَانًا خَلِيلًا﴾

مکہ کے مشرکین میں عقبہ بن ابی معیط ایک مشرک سردار تھا۔ اس کی عادت یہ تھی جب سفر سے واپس آتا تو معزز لوگوں کی دعوت کرتا۔ اس نے دعوت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بلایا تو حضور بھی تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تو اللہ کی وحدانیت اور میری رسالت کی گواہی دے تو میں تیرا کھانا کھاؤں گا ورنہ نہیں کھاؤں گا۔ اس نے کلمہ پڑھ لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا کھالیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے گئے۔

عقبہ بن ابی معیط کا ایک گہرا دوست تھا ابی بن خلف۔ اس کو پتا چلا کہ عقبہ مسلمان ہو چکا ہے تو وہ سخت غصہ ہوا۔ وہ عقبہ کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ عقبہ! میں نے سنا ہے کہ تم نے کلمہ پڑھ لیا ہے؟ اس نے کہا کہ پڑھا تو ہے لیکن میری مجبوری تھی کہ مکہ کے معزز مہمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے ہوئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ تو کلمہ نہیں پڑھے گا تو میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اگر میں نہ پڑھتا تو وہ کھانے سے اٹھ جاتے تو سارے لوگ اٹھ جاتے، یوں میری بہت بے عزتی ہو جاتی۔ تو میں نے اپنی عزت رکھنے کے لیے کلمہ پڑھ لیا تھا۔

ابی بن خلف نے کہا کہ توجب تک ان کے چہرے پر نعوذ باللہ تھو کے گا نہیں میں تیری باتوں کو قبول نہیں کر سکتا اور ہماری دوستی نہیں چل سکتی، اب جا اور یہ کام کر! تو عقبہ گیا اور ابی بن خلف کے کہنے پر العیاذ باللہ یہ کام کر گزرا۔ پھر یہ دونوں بدر میں قتل ہوئے۔

تو فرمایا کہ یہی عقبہ قیامت کو یہی باتیں کرے گا: ﴿يُوَيِّدُنِي لَيْتَنِي لَمْ

أَتَخَذُ فَلَانًا حَلِيلًا ﴿٢٨﴾ اے کاش! میں ابی بن خلف کو اپنا دوست نہ بناتا اور آج یہ جہنم اور ذلت کی سزا مجھے نہ بھگتنی پڑتی!

یہ واقعہ تو خاص ہے لیکن آپ یہ تو سمجھتے ہیں کہ اصول تفسیر کا ایک مسلمہ ضابطہ ہے: ”الْعِبْرَةُ بِعُمُومِ اللَّفْظِ لَا بِخُصُوصِ السَّبَبِ“ آیات اپنے مورد کے ساتھ خاص نہیں ہوتی وہاں عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے اور شان نزول کے باہر بھی آپ اس کو بیان فرما سکتے ہیں۔ آج بھی جب انسان گناہ کرتا ہے تو اس گناہ کی بہت بڑی وجہ دوستی ہوتی ہے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

**تقدیر؛ علم الہی اور امر الہی دونوں کا مجموعہ ہے:**

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ وَكَفَى بِرَبِّكَ هَادِيًا

وَنَصِيرًا ﴿٢٩﴾﴾

اللہ نے اپنے پیغمبر کو تسلی دی ہے کہ یہ جو آپ کے سامنے باتیں کرتے ہیں، الزام لگاتے ہیں، آپ کی بات نہیں مانتے تو آپ حوصلہ رکھیں! یہ معاملہ آپ کے ساتھ نہیں ہے بلکہ ہر نبی کے ساتھ ان کے دور میں ایسا ہوتا تھا۔

یہاں ایک سوال سمجھیں: ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ﴾ سے معلوم ہوتا

ہے کہ اللہ ہر دور میں ہر نبی کے لیے دشمن خود بناتے ہیں تو پھر دشمن کا کیا قصور ہے؟

اس سوال کا جواب سمجھنے سے پہلے تقدیر کا معنی سمجھیں! عام بندے سمجھتے

ہیں کہ تقدیر صرف امر الہی کا نام ہے حالانکہ تقدیر صرف امر الہی کا نام نہیں ہے بلکہ علم

الہی اور امر الہی دونوں کے مجموعے کا نام تقدیر ہے۔ اللہ کے علم میں تھا کہ میں فلاں

بندے کو اختیار دوں گا تو وہ بندہ اپنے اختیار سے یہ کام کرے گا۔ یہ ”علم الہی“ ہوا، اور

اللہ نے اس کو لکھ دیا کہ فلاں بندہ یہ کام کرے گا تو یہ ”امر الہی“ ہوا۔ اب علم الہی؛ امر

الہی کے خلاف ہو یا امر الہی؛ علم الہی کے خلاف ہو ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو تقدیر صرف ”علم الہی“ کا نام نہیں بلکہ تقدیر علم الہی اور امر الہی کے مجموعے کا نام ہے۔ اور بندہ مجبور محض ہو ایسا بھی نہیں کیونکہ ہونا بندے کے اختیار کے ساتھ تھا۔ یہ ہے تقدیر کا معنی!

اب اشکال کا جواب سمجھیں کہ ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا﴾ کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے علم میں تھا کہ میں نبی بھیجوں گا، پھر لوگوں کو اختیارات دوں گا تو کچھ اختیار سے مانیں گے اور کچھ اختیار سے دشمن بنیں گے۔ تو خدا نے لکھ دیا کہ ہر نبی کے ساتھ دشمن ہوں گے۔ اس لیے نہیں کہ خدا نے لکھ دیا ہے تو دشمن ہو گئے بلکہ خدا کے علم میں تھا کہ ہوں گے تو لکھ دیا اور کوئی کام خدا کے علم کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ کی تقدیر کے خلاف کچھ بھی نہیں ہوتا۔

### خواہشات کو خدا بنانے کا معنی:

﴿أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ ۚ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا﴾

یہاں اللہ رب العزت نے فرمایا کہ بہت سارے لوگ ہیں جو اپنی خواہش کو خدا بنا لیتے ہیں۔ اپنی خواہش کو خدا بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ کی بات چھوڑے اور اپنی خواہش کے مطابق کام کرے۔

### صفت ملکیت صفت بہیمیت:

﴿أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا

كَآلَ نَعَامٍ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا﴾

یہاں کفار کے بارے میں فرمایا کہ یہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ جانور سے بھی بدتر ہیں۔

اس کی دو وجوہات ذہن نشین فرمائیں! ایک وجہ تو میں عام طور پر پیش کرتا

ہوں۔ اللہ رب العزت نے انسان کی فطرت میں گناہ کرنے کا مادہ بھی رکھا ہے اور اس گناہ کو کنٹرول کرنے کی قوت بھی رکھی ہے۔ ہم اس کو سمجھانے کے لیے یوں کہتے ہیں کہ اللہ نے ہر بندے کی جبلت میں دو چیزیں رکھی ہیں:

1: ملکیت 2: بہیمیت

”ملکیت“ کا معنی ہے فرشتہ پن اور بہیمیت کا معنی ہے ڈنگر پن۔ فرشتہ پن کا معنی مان کر چلنا اور ڈنگر پن کا معنی من مانی کرنا۔ تو جب انسان کے مزاج میں من مانی ہے اور جانور کے مزاج میں من مانی ہے تو جب یہ من مانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿كَأَلَا نَعْلَمُ﴾ کہ یہ جانور کی طرح ہو گیا ہے کہ جانور کا کام من مانی کرنا تھا اور یہ بھی من مانی کر رہا ہے۔ مزید یہ کہ جانور کی فطرت میں مان کر چلنا نہیں تھا اور اس کی فطرت میں مان کر چلنا بھی تھا لیکن پھر بھی من مانی کر رہا ہے تو فرمایا ﴿بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا﴾ یہ جانور سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔

میں اس کی مثال دیتا ہوں۔ یہاں سرگودھا سے اسلام آباد ایک کوچ نان اے سی چلتی ہے اور ایک اے سی والی چلتی ہے۔ اے سی والی کوچ کا کرایہ زیادہ ہے۔ آپ اے سی کوچ میں پانچ سو روپے دے کر بیٹھتے ہیں۔ راستے میں اے سی کوچ کا ایئر کنڈیشن خراب ہو گیا۔ اب نان اے سی کی کھڑکیاں کھلی ہیں اور ہوا چل رہی ہے لیکن اے سی کوچ میں جس ہے۔ کرایہ بھی زیادہ لیا۔ اب راستے میں آپ اے سی کوچ کو کیا کہتے ہیں کہ ”یہ نان اے سی کی طرح ہے“ یا ”نان اے سی سے بھی بدتر ہے“ نان اے سی سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ نان اے سی میں اے سی تھا بھی نہیں اور کام کرتا بھی نہیں تھا اور اس میں اے سی ہے اور پھر بھی کام نہیں کرتا تو یہ نان اے سی سے بدتر ہے۔

فرمایا: ﴿إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ﴾ کہ یہ جانوروں کی طرح ہیں ﴿بَلْ هُمْ



أَصْلُ سَبِيلًا ﴿۱۰﴾ یہ جانور کی طرح تو ہے کہ جانور من مانی کرتا ہے اور یہ بھی من مانی کرتا ہے لیکن جانور کے مزاج میں مان کر چلنا نہیں تھا اس لیے من مانی کرتا ہے اور اس کے مزاج میں مان کر چلنا تھا پھر بھی من مانی کرتا ہے تو یہ اس سے بھی بدتر ہے۔

### زنانِ مصر کے جملے کی وضاحت:

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ آپ کے ذہن میں ہو گا۔ زلیخا کو جب مصر کی عورتوں نے طعنہ دیا تو زلیخا نے کہا کہ تم نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا ہے؟ کہا کہ نہیں دیکھا۔ اس نے کہا: تم نے اس غلام کو دیکھا نہیں، اگر دیکھ لیتی تو مجھے کبھی بھی طعنہ نہ دیتی۔ خیر اس نے دکھانے کے لیے دسترخوان لگایا۔ پھل رکھے چھریاں رکھیں۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَأَتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سَبِيلًا﴾ اس نے ہر عورت کو چھری دے دی اور پھل رکھ دیے۔ یوسف علیہ السلام سے کہا: ﴿اخْرِجْ عَلَيْنَهُنَّ﴾ آپ تشریف لائیں! یوسف علیہ السلام جب باہر آئے۔ نبی تھے، علم غیب نہیں ہے، کیا پتا کہ باہر کیا تماشا ہے۔ جب ان عورتوں نے دیکھا ﴿وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ﴾ تو اپنی انگلیاں کاٹیں اور زبان سے جملہ کہا: ﴿مَا هَذَا بَشَرًا﴾ یہ بشر نہیں ہے۔ اب دیکھو! یوسف علیہ السلام بشر تھے اور یہ کہتی ہیں کہ بشر نہیں ہے اور پورے قرآن میں اللہ نے ان کے جملے کی تردید نہیں کی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جملہ ٹھیک ہے۔

اب بظاہر یہ ہمارے اہل السنۃ والجماعۃ احناف دیوبند کے عقیدے کے خلاف ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نبی ہیں اور ہم نبی کو بشر مانتے ہیں۔ وہ عورتیں ان کو بشر نہیں کہتیں اور قرآن تردید نہیں کر رہا تو جب قرآن کوئی بات ذکر کرے اور تردید نہ کرے تو وہ ہماری شریعت ہوتی ہے۔ تو جب تردید نہیں کی تو بظاہر پتا چلتا ہے کہ وہ جملہ ٹھیک تھا۔

ہم کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام بشر یعنی انسان ہیں اور انسان کی فطرت میں تقاضا گناہ بھی ہوتا ہے اور تقاضائے گناہ کے کنٹرول کرنے کی طاقت بھی ہوتی ہے۔ تقاضائے گناہ کو ”بہیمیت“ کہتے ہیں اور تقاضائے گناہ کے کنٹرول کرنے کی طاقت کو ”ملکیت“ کہتے ہیں۔ تو جوان عورتوں نے کہا تھا: ﴿مَا هَذَا بَشَرًا﴾ تو اس میں بشریت کی نفی نہیں ہے بلکہ بشریت کی ضمن میں بہیمیت کی نفی ہے۔ مطلب یہ کہ یہ وہ بشر نہیں ہے جو گناہ کرتا ہو، دلیل یہ ہے کہ ﴿إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾ یہ وہ بشر نہیں ہے جو گناہ کرے، یہ وہ بشر ہے جو گناہ نہ کرے، اور جو گناہ نہ کرے اسے ”مَلَكٌ“ کہتے ہیں، پھر صرف ”مَلَكٌ“ نہیں کہا بلکہ ”مَلَكٌ كَرِيمٌ“ کہا۔ کیونکہ جس ذات کی طبیعت میں گناہ کا تقاضا نہ ہو اور وہ گناہ نہ کرے اسے ”مَلَكٌ“ کہتے ہیں اور جس ذات کی طبیعت میں گناہ کا تقاضا ہو اور پھر بھی گناہ نہ کرے تو اسے ”مَلَكٌ كَرِيمٌ“ کہتے ہیں۔

ہم اہل بدعت سے کہتے ہیں کہ اگر یہ تمہاری دلیل ہے تو تمہارے دعویٰ کے مطابق تو نہیں ہے۔ کیونکہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ ”نبی بشر نہیں ہوتا“ لیکن تمہارا یہ دعویٰ تو نہیں کہ ”نبی فرشتہ ہوتا ہے“۔ یہ تمہاری دلیل تب بنتی جب تمہارا دعویٰ ہوتا کہ نبی بشر نہیں ہوتا بلکہ فرشتہ ہوتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ ”نبی فرشتہ نہیں ہوتا“ اور وہ عورتیں کہہ رہی ہیں کہ ”یہ فرشتہ ہے“... تو تردید جس طرح ﴿مَا هَذَا بَشَرًا﴾ کی نہیں ہے اسی طرح تردید ﴿إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾ کی بھی نہیں ہے تو بتاؤ! یہ تمہاری دلیل کیسے بنی؟

سائے کا کم زیادہ ہونا:

﴿الَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ

﴿جَعَلْنَا الشَّمْسُ عَلَيَّهِ ذَلِيلًا ۝﴾

اللہ رب العزت نے اپنی قدرت بتائی ہے کہ دیکھو! اللہ سائے کو کیسے پھیلا دیتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو سائے کو ایک ہی جگہ ٹھہرا کر رکھتا۔ پھر اللہ نے سورج کو اس پر دلیل بنا دیا ہے۔

جب سورج نکلتا ہے تو سایہ مغرب کی طرف بڑھتا ہے۔ جب سورج زوال کے وقت اوپر آتا ہے تو سایہ سمت جاتا ہے یا کالعدم ہو جاتا ہے۔ جب سورج مغرب کی طرف جاتا ہے تو سایہ مشرق کی طرف جاتا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿ثُمَّ قَبْضُنْهُ إِلَىٰ نَا قَبْضًا يَّسِيرًا ۝﴾

پھر ہم آہستہ آہستہ اس سائے کو اپنی طرف سمیٹتے رہتے ہیں۔ سورج مغرب کی طرف جارہا ہے تو سایہ سمت رہا ہے، جب شام ہوتی ہے تو سایہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں ﴿ثُمَّ قَبْضُنْهُ إِلَىٰ نَا﴾ سے کیا مراد ہے کہ ہم سائے کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں! آپ کو یاد ہو گا، میں نے عرض کیا تھا کہ ﴿بَن دَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ﴾<sup>60</sup> والی آیت کے تحت علامہ فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الْمُرَادُ الرَّفْعُ إِلَىٰ مَوْضِعٍ لَا يَجْرِي فِيهِ حُكْمُ غَيْرِ اللّٰهِ.<sup>61</sup>

کہ جہاں ظاہری حکم بھی اللہ کا ہو اور حقیقی حکم بھی اللہ کا ہو تو وہاں نسبت اللہ اپنی طرف کرتے ہیں۔ یہاں اس آیت ﴿ثُمَّ قَبْضُنْهُ إِلَىٰ نَا﴾ میں سائے کے سمت جانے کا ذکر ہے تو اس میں ظاہری اختیار بھی اللہ کا ہے اور حقیقی اختیار بھی اللہ کا ہے۔ اس لیے اس کو اللہ اپنی طرف منسوب کرتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ جہت سے پاک ہیں،

60۔ النساء:4:158

61۔ التفسیر الکبیر للرازی: ج 11 ص 104

جسم سے پاک ہیں اور مکان سے پاک ہیں۔

### نعت الہیہ:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَ النَّوْمَ سُبَاتًا وَ جَعَلَ

النَّهَارَ نَشُورًا﴾

اللہ نے اپنی قدرتیں بیان کی ہے۔ اللہ نے رات کو لباس بنایا۔ جس طرح لباس اپنے پورے جسم کو ڈھانپ لیتا ہے اسی طرح رات پوری انسانیت کو ڈھانپ لیتی ہے۔ ﴿وَالنَّوْمَ سُبَاتًا﴾ نیند کو راحت کا ذریعہ بنایا۔ ”سَبَتٌ“ کا معنی ”کاٹنا“ ہوتا ہے اور نیند بھی چونکہ تھکاؤ کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے اس لیے اس کو ”سُبَاتًا“ فرمایا۔

﴿وَ جَعَلَ النَّهَارَ نَشُورًا﴾

اور دن کو زندگی بنایا ہے۔ یعنی دن میں بندہ اٹھ کر چلتا ہے اس لیے اس کو فرمایا ہے کہ ہم نے دن کو زندگی بنا دیا ہے۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ رات آتی ہے تو سب کو نیند آتی ہے، دن ہوتا ہے تو سارے جاگتے ہیں۔ اگر اللہ یوں نہ فرماتے تو کسی کے دل میں رات کو سونا ہوتا، کسی کے دل میں دن کو سونا ہوتا تو پوری دنیا کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ خدا نے پوری انسانیت کا مزاج ایک جیسا بنا دیا ہے کہ رات کو سونا ہے اور دن کو جاگنا ہے۔ اس لیے اصل کام کا وقت دن اور سونے کا وقت رات ہے۔

### قرآن کے ذریعے جہاد کرنے کا معنی:

﴿فَلَا تُطِيعُوا الْكُفْرِينَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾

کفار کی بات مت مانیں اور قرآن کریم کو لے کر کفار کا مقابلہ کریں۔

یہاں ”جہاد“ کا معنی جہاد نہیں کرنا، جہاد کا معنی مقابلہ کرنا ہے۔ پھر اشکالات ختم ہو جائیں گے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین فرمائیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جہاد ہر اس کام کو کہتے ہیں جس میں مشقت ہو۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ نے دعوت بالقرآن کو جہاد فرمایا، لہذا جہاد کا معنی قتال نہیں کرنا چاہیے۔ جب کوئی یہ بات کرے تو آپ ان سے پہلا سوال یہ کریں کہ جہاد فرض مکہ میں ہوا یا مدینہ میں؟ وہ کہیں گے: مدینہ میں۔ آپ کہیں کہ یہ آیت تو مکی ہے، تو جب جہاد مدینہ میں فرض ہوا تو مکہ میں اللہ کس کو جہاد فرما رہے ہیں؟ معلوم ہوا کہ یہ بات غلط ہے جو آپ نے کی ہے۔

ہاں بسا اوقات قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ لغوی معنی کو لے کر جہاد کا لفظ استعمال فرماتے ہیں۔ اس کا معنی ہر گز یہ نہیں ہوتا کہ اس سے قتال کی نفی ہو رہی ہے۔ لغوی معنی استعمال ہو رہا ہے اور لغت مشکل کام کو جہاد کہا جائے تو ہم بھی اس کے مخالف نہیں لیکن شرعاً، اصطلاحاً اور عرفاً جہاد کا معنی صرف قتال ہے۔

### نسبی و سسرالی رشتے:

﴿وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا﴾

وہی ذات ہے جس نے پانی کے قطرے سے انسان بنایا ہے، پھر اس کو نسبی تعلقات بھی دیے اور سسرالی تعلقات بھی دیے۔

”نَسَبًا“ کہتے ہیں جو ماں اور باپ کی طرف سے رشتہ ہو اور ”صِهْرًا“ کہتے ہیں جو بیوی کی طرف سے رشتہ ہو۔ ایک گندہ قطرہ پانی تھا اور خدا نے کتنے تعلقات اس کے ساتھ جوڑ دیے ہیں۔

### پیغمبر کی صفات کا خلاصہ:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾

پیغمبر کی جتنی صفات ہیں ان کا خلاصہ دو صفتیں ہیں: مبشر اور نذیر۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دین خلاصتاً دو چیزوں کا نام ہے، ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ اور امر اور نواہی۔

اللہ فرماتے ہیں: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ﴿۶۲﴾

اس لیے خیر کو لینا ہے اور شر سے بچنا ہے۔ اور امر پر عمل کرنا ہے اور نواہی سے بچنا ہے۔ اور موت کے بعد ابدی اور دائمی ٹھکانے دو ہی ہیں: جنت یا جہنم۔ ”بَشِيرًا“ کا معنی کہ جنت کی طرف بلاتا ہے اور ”نَذِيرًا“ کا معنی کہ جہنم سے بچاتا ہے۔ تو ہمارے ذمے کام ہے کہ پیغمبر کے وصف بشیر کو بھی اختیار کریں اور نبی کی صفت نذیر کو بھی اختیار کریں۔

جو یہ کہتے ہیں کہ صفت بشیر ہی کو لیں تو وہ آدھے دین کی بات کرتے ہیں، ہم مرکز سے آدھے دین کی نہیں بلکہ پورے دین کی بات کرتے ہیں۔ اگر اللہ قرآن میں کہتے ہیں کہ نکاح کرو تو ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ زنا نہ کرو! اور یہ کہا ہے کہ حلال پانی پیو تو یہ بھی کہا ہے کہ شراب نہ پیو! اگر یہ کہا ہے کہ حلال جانور کھاؤ تو یہ بھی کہا ہے کہ خنزیر مت کھاؤ! اگر یہ کہا ہے کہ توحید اختیار کرو تو یہ بھی کہا ہے کہ شرک سے بچو! اگر حکم ہے کہ سنت پر چلو تو یہ بھی حکم ہے کہ بدعت سے بچو! اس لیے نبی کا صحیح وارث وہ ہے جو امت کو دونوں باتیں بتائے کہ آپ نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا!

**دینی امور پر اجرت کا جواز:**

﴿قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ﴾

اے پیغمبر! آپ فرمادیجیے کہ میں تمہیں دین کی بات بتاتا ہوں لیکن اس پر میں تم سے اجر نہیں مانگتا۔

اس آیت کو سمجھیں گے تو اشکال ختم ہو جائے گا۔

یہاں مسئلہ چلتا ہے کہ اجرت علی تعلیم الدین جائز ہے یا نہیں؟ دین کا کام کریں تو اس پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟ یاد رکھنا! ایک ہے کہ آدمی دین کا کام کرے اور اجرت کے لیے کرے یہ سوال ہے، ایک ہے کہ دین کا کام کرے اور اجرت کے لیے نہ کرے یہ اجرت علی تعلیم الدین نہیں ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تجارت فرماتے تھے لیکن جب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کا کام شروع کیا تو تجارت آپ نے چھوڑ دی، پھر آپ کا گزر بسر کہاں سے ہوتا تھا؟ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال تھا، حضرت خدیجہ اپنے شوہر کو مال دے رہی تھیں یا نبی کو دے رہی تھیں؟ (نبی کو دے رہی تھیں۔ سامعین) شوہر کے ذمہ بیوی کا خرچہ ہے یا بیوی کے ذمہ شوہر کا خرچہ ہے؟ (شوہر کے ذمہ بیوی کا خرچہ ہے۔ سامعین) اب حضرت خدیجہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مال دے رہی ہیں تو یہ نبی کو دے رہی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں تجارت نہیں کی، صحابہ رضی اللہ عنہم ہدایا دیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایہ ملتے تو تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ میں تم سے مانگتا نہیں ہوں۔ اس سے ایک بات تو یہ سمجھیں کہ دین کا کام پیسوں کے لیے کرنا یہ حرام ہے، دین کا کام کریں اور ضرورت کے تحت پیسے آپ کو ملیں اور آپ لے لیں تو یہ جائز ہے۔

اور دوسری بات اچھی طرح سمجھیں! یہ جو اللہ کے نبی نے فرمایا تھا:

﴿مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ﴾

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا تھا یا کفار سے فرمایا تھا؟ (کفار کو۔ سامعین) کفار مخالف تھے یا معتقد تھے؟ (مخالف تھے۔ سامعین) اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مخالف! میں تم سے پیسے نہیں مانگتا، اللہ کے لیے دین بیان کرتا ہوں۔

اور آج کے دور میں اجرت کس سے لی جاتی ہے، مخالف سے یا موافق سے؟ (موافق سے۔ سامعین) ہمارا مسئلہ تو موافقین کا ہے اور لوگ دلیل مخالفین کی دیتے ہیں۔ تو یہ تو دیکھو کہ دلیل دعویٰ کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟

بھائی! آپ اپنے معتقد کے پاس جائیں، وہاں بیان کریں اور کہیں کہ میں کھانا بھی آپ کے ہاں کھاؤں گا تو بتاؤ کہ وہ آپ کا معتقد اس کو برا سمجھتا ہے؟ (نہیں۔ سامعین) اور آپ جائیں مشرک کو بات سمجھانے کے لیے اور اس سے کہیں کہ جی! ہم دودھ بھی پیئیں گے، کیا آپ ایسے کہتے ہیں؟ (نہیں۔ سامعین) جب مخالف سے دین کی بات ہو تو آپ مخالف کو سمجھائیں تو کہتے ہیں کہ میرا کوئی ذاتی نفع نہیں ہے، میں اپنی گاڑی پر آیا ہوں، اپنا خرچ کرتا ہوں، میں آپ سے اجرت لیے بغیر آپ کی خیر خواہی کے لیے آیا ہوں۔

تو موافق کی بات الگ ہوتی ہے اور مخالف کی بات الگ ہوتی ہے۔ قرآن تو سمجھو! اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو فرما رہے ہیں ﴿مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ﴾ تو یہ بات مشرکین سے فرما رہے ہیں، یہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے نہیں فرما رہے تھے۔

اور مسجد کا امام جو تنخواہ لیتا ہے یہ کسی مشرک اور کافر سے نہیں لیتا، یہ اپنے معتقد سے لیتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی سمجھیں کہ جو مخالفین ہیں وہ نہیں سمجھے تو انہوں نے اعتراض کیا ہے اور ہم نہیں سمجھے تو ہم جواب نہیں دے پائے۔



اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

## عباد الرحمن کی صفات:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ

الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾

ان آیات میں اللہ رب العزت نے عباد الرحمن کی صفات بیان فرمائی ہیں کہ عباد الرحمن کون ہوتے ہیں؟ ہم سب کو چاہیے کہ عباد الرحمن بنیں اور ان صفات کو اپنانے کی کوشش کریں۔ اللہ کے بندے کون ہیں؟ فرمایا:

1: ﴿الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾

اکڑ کر نہیں چلتے بلکہ عاجزی سے چلتے ہیں۔

2: ﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾

جب جاہل ان سے بات کریں تو وہ ان کو سلام کہہ دیتے ہیں۔

یہاں جاہل سے مراد غیر عالم نہیں ہے۔ یہاں جاہل سے مراد جہالت والا

ہے۔ بے شک عالم ہو لیکن جاہلوں کی طرح چلے۔ جس طرح حدیث پاک میں ہے:

"مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَبِّدًا فَقَدْ كَفَرَ"<sup>63</sup>

یہاں کفر کا معنی یہ نہیں کہ کافر ہو گیا بلکہ یہاں کفر کا معنی ہے کہ اس نے

کافروں والا کام کیا ہے۔

تو یہاں جاہل سے مراد یہ نہیں کہ عالم نہ ہو، یہاں جاہل سے مراد ہے کہ جو

جاہلوں کی طرح چلے، بعض لوگوں کے پاس علم بھی ہو گا لیکن وہ ضدی ایسے ہوتے ہیں

جیسے جاہل ہوتے ہیں۔ ان کو سلام کہنے کا معنی یہ نہیں کہ السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا جائے بلکہ سلام کا معنی یہ ہے کہ ان سے جان چھڑاؤ!

3: ﴿وَالَّذِينَ يَسْتَشْعِرُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا﴾

یہ رات گزارتے ہیں سجدے اور قیام کی حالت میں یعنی یہ تہجد کا اہتمام کرتے ہیں۔

4: ﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ إِنَّ عَذَابَهَا

كَانَ غَرَامًا﴾

اپنی زبان سے کہتے ہیں: اے اللہ! ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا دے، جہنم کا عذاب بہت سخت ہے۔

5: ﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ

قَوَامًا﴾

میانہ روی کرتے ہیں، نہ تو فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ ہی بخل سے کام لیتے ہیں، ﴿وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾ بلکہ یہ اعتدال کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

6: ﴿وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ﴾

اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہیں پکارتے یعنی یہ شرک نہیں کرتے۔

7: ﴿وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ﴾

ناحق کسی کو قتل نہیں کرتے۔

8: ﴿وَلَا يَزْنُونَ﴾

یہ زنا نہیں کرتے۔ زنا کا معنی صرف یہ نہیں کہ آدمی بد فعلی کرے۔ حدیث پاک میں ہے کہ ہاتھ کا زنا پکڑنا ہے، آنکھ کا زنا دیکھنا ہے۔ تو یہ سب زنا کی قسمیں ہیں۔

﴿وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ۖ يُضْعَفُ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَ

يَخْلُدُ فِيهِ مُهَانًا ۖ﴾

جو شخص بھی یہ کام کرے گا تو اپنے کیے کی سزا بھگتے گا، قیامت کے دن اس کو دگنا عذاب بھی ہو گا اور ذلیل ہو کر ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو اللہ فرما رہے ہیں ﴿وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا﴾ تو یہ کفر کا عذاب بیان فرما رہے ہیں یعنی ﴿لَا يَدْعُونَ﴾ کی ضد ہو گی ”يَدْعُونَ“۔ اگر اللہ کے ساتھ کسی الہ کو پکارے یعنی کفر کرے اور ساتھ قتل بھی کرے تو اس کا عذاب کیا ہو گا؟ دوام ہو گا کیونکہ کفر ہے اور ذلیل بھی ہو گا۔ اس کی وجہ میں بتا چکا ہوں کہ مؤمن فاسق اگر جہنم میں جائے گا تو اس کو ذلیل نہیں کیا جائے گا بلکہ گناہوں سے پاک کیا جائے گا۔ مؤمن کا جہنم میں جانا ذلت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ گناہوں سے پاک ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس لیے مؤمن کو جہنم میں جو عذاب ہو گا اس کو حقیقتاً عذاب نہیں کہتے، ہاں صورت عذاب کی ہوتی ہے درحقیقت تزکیہ ہوتا ہے۔ عذاب اور ہے اور تزکیہ اور ہے۔

﴿إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ

حَسَنَاتٍ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۖ﴾

جو توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو اللہ اس کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتے ہیں۔ اللہ غفور ہیں کہ گناہوں کو معاف کر دیتے ہیں اور اللہ رحیم ہیں کہ پھر بدل کر نیکیاں عطا فرما دیتے ہیں۔

جب اللہ دو صفتیں اکٹھی ذکر فرمائیں تو عام طور پر پہلی صفت دعویٰ ہوتی ہے اور دوسری دلیل ہوتی ہے۔ اللہ رب العزت ”غفور“ ہیں کیوں؟ اس لیے کہ تم مستحق

رحمت ہو اور اس لیے بھی کہ وہ ”رحیم“ بھی ہے۔

9: ﴿وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّوْرَ﴾

فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

10: ﴿وَإِذَا مَرُّوا بِاللُّغُومِ مَرُّوا كِرَامًا﴾

اور جب گناہ کی جگہ سے گزریں تو گزر جاتے ہیں، وہاں کھڑے نہیں ہوتے۔

11: ﴿وَالَّذِينَ إِذَا دُكِرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا﴾

جب قرآن کریم کی آیات پڑھیں تو اندھے اور بہرے ہو کر مشرکین کی طرح گرتے نہیں ہیں بلکہ قرآن کو سمجھتے ہیں، اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور عمل کرتے ہیں۔

12: ﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ

وَجَعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا﴾

اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ! ہماری گھر والیوں اور ہماری اولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ بنا اور ہمیں متقین کا امام بنا!

اب دیکھو! اس سے کیا بات ثابت ہو رہا ہے؟ کہ متقین کا پیشوا بننا یہ بری چیز نہیں ہے۔ دعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں متقین کا پیشوا بنادے! کیا معنی کہ ہم نیکی کا ایسا کام کریں کہ لوگ ہمیں دیکھ کر نیکیاں کریں، وہ نیکیاں کریں گے تو ان کا ثواب ہمیں بھی ملے گا۔

﴿أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَ

سَلَامًا﴾ خَلِيدِينَ فِيهَا حَسَنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ﴿۱۳﴾

اللہ ان کو صبر کی وجہ سے جنت کے بالا خانے دیں گے، وہاں ان کا استقبال دعاؤں اور سلام کے ساتھ کیا جائے گا۔ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بہترین ٹھکانہ ہے۔

**منکرین کو تنبیہ:**

﴿قُلْ مَا يَعْبَوُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ

لِرِئَا مَا ۝﴾

اے پیغمبر! آپ فرمادیجیے کہ اگر تم اللہ کو نہیں پکارتے تو اللہ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب جبکہ تم نے جھٹلایا دیا ہے تو اب اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تمہیں عذاب ضرور ملے گا۔

اللہ ہم سب کو شریعت سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ .

## سورة الشعراء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿طسّم﴾ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ﴿٢﴾

حروف مقطعات:

﴿طسّم﴾

یہ تینوں حروف مقطعات میں سے ہیں۔ ”مقطعات“ قطع سے ہے، قطع کا معنی ہے کاٹنا۔ چونکہ ان کو اکٹھا نہیں پڑھتے بلکہ کاٹ کاٹ کر الگ الگ پڑھتے ہیں جیسے طا... سین... میم... اس لیے ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں اور قرآن کریم میں حروف مقطعات جہاں پر بھی ہیں یہ متشابہات میں سے ہیں۔ متشابہات ان کو کہتے ہیں جن کا معنی اللہ کے علاوہ کسی کو معلوم نہ ہو۔

بعض لوگوں نے ان دنوں میں ایک نیا نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات پہلے متشابہات تھیں اب وہ آیات متشابہات نہیں ہیں، کیونکہ اب لغت عام ہو رہی ہے، تحقیقات ہو رہی ہیں اور الفاظ کے معانی اب کھل کر سامنے آرہے ہیں، اس لیے یہ الفاظ متشابہات نہیں رہے۔

متشابہ اور مشتبه میں فرق:

یہ بات یاد رکھیں کہ متشابہ الگ چیز ہے اور مشتبه الگ چیز ہے، بعض

لوگوں نے متشابہ کو مشتبہ سمجھا اور کہا کہ یہ آیات مشتبہ ہیں یعنی ان کا معنی مشتبہ ہے، ان کے معنی پر پہلے شبہات تھے، اب تحقیق ہو گئی ہے تو شبہات ختم ہو گئے۔“ میں عرض کرتا ہوں کہ متشابہات کا معنی مشتبہ ہونا نہیں ہے، مشتبہ ہونا اور ہوتا ہے اور متشابہ ہونا اور بات ہے۔ مثلاً قرآن کریم کی یہ آیت ”الْحَمْدُ“ متشابہ ہے کہ اس کا معنی اللہ ہی کو معلوم ہے، اللہ کے علاوہ کوئی اس کا معنی نہیں جانتا، یہ آیت مشتبہ نہیں ہے کہ اس پر پہلے شبہات تھے اور تحقیق سے ختم ہو گئے۔ ان دونوں میں فرق اچھی طرح سمجھ لیں۔ ہاں اگر بعض آیات بعضوں کے لیے مشتبہ ہوں کہ ان کا معنی نہ کھلے اور تحقیق کریں تو معنی کھل جائے تو یہ بات اور ہے۔ تو ہم یہ نہیں کہتے کہ قرآن کریم کی بعض آیات محکمت ہیں اور بعض مشتبہات ہیں بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ بعض آیات محکمت ہیں اور بعض متشابہات ہیں۔ متشابہات اور چیز ہیں اور مشتبہات اور چیز ہیں۔

### پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر امت:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی بے حد فکر تھی کہ لوگ کلمہ پڑھیں، دین پر آئیں اور جنت میں جائیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کڑھتے بھی بہت تھے، محنت بھی فرماتے تھے، لوگوں کی باتیں برداشت بھی بہت فرماتے تھے تو اللہ رب العزت نے یہ بات سمجھائی کہ اگر یہ لوگ آپ کی بات نہ مانیں تو کیا آپ اپنے آپ کو ختم کر دیں گے؟ ”بَاخِعٌ“ کا لفظ ”بَخَعَ“ سے نکلا ہے، ”بَخَعَ“ کہتے ہیں جانور کو ذبح کرتے کرتے اس کی گردن کی خاص رگ تک پہنچ جانے کو، اس رگ کو ”بَخَاعٌ“ کہتے ہیں۔ تو اس کا معنی یہ ہے کہ کیا آپ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے اپنے

آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے؟ آپ خود کو مار دیں گے؟ اگر یہ لوگ بات مانتے ہیں تو ان کا اپنا نفع ہے، نہیں مانتے تو ان کا اپنا نقصان ہے، آپ کا کوئی نقصان نہیں بلکہ ایک مقام پر ہے:

﴿لَا يَضُرُّكُمْ مَن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾<sup>64</sup>

اگر آپ ہدایت پر ہیں تو گمراہ لوگ آپ کو کچھ نقصان نہیں دے سکتے۔ آپ کے ذمے سمجھانا ہے، آپ سمجھا دیں اور زیادہ فکر نہ کریں۔ اس سے یہ مسئلہ کھل کر سامنے آتا ہے کہ کسی بندے کو نیکی پر لانے کے لیے خود گناہ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ کسی بندے کو سنت پر لانے کے لیے بدعت کا ارتکاب درست نہیں ہے کیونکہ دوسرے بندے کا سنت پر آنا یہ متوقع ہے اور ہمارا بدعت کر کے گناہ کبیرہ کرنا متیقن ہے اور متوقع نیکی کے لیے یقینی گناہ کرنا جائز نہیں ہے۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے: اگر کوئی شخص جہنم میں جانا چاہتا ہے تو شوق سے جائے، ہم اپنے کندھے پر بٹھا کر جہنم میں نہیں چھوڑ سکتے۔

**ہدایت پر لانے کے لیے گناہ کا ارتکاب جائز نہیں:**

میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ ایک مرتبہ تبلیغ کے لیے کچھ علماء چل رہے تھے۔ ایک عالم نے مجھے فون کیا کہ لاہور میں فلاں مسجد میں ہماری جماعت ہے تو اس امام کا یہ عقیدہ ہے، اب ہم اس کے پیچھے نماز پڑھیں؟ میں نے کہا کہ بالکل نہ پڑھیں۔ اس نے کہا کہ اگر نہیں پڑھیں گے تو یہ لوگ دعوت میں جڑیں گے نہیں تو اس سے ان کی مسجد میں کام نہیں ہوگا! میں نے کہا کہ اس مسجد میں مرد ہوتے



ہیں لیکن عورتیں نہیں ہوتیں۔ جس طرح مردوں کے لیے جنت جانے کا مسئلہ ہے اسی طرح خواتین کے لیے بھی ہے۔ اگر لاہور میں کچھ اہل بدعت مرد ہیں اور آپ ان کو اہل السنۃ بنا کر جنت میں لے جانا چاہتے ہیں تو لاہور میں ایسے گناہ کے اڈے بھی ہیں جہاں عورتیں زنا کرتی ہیں تو ان کو بھی زنا سے نکال کر جنت میں لے جانا چاہیے۔ اب ان کو زنا سے نکالنے کے لیے یہ حل اختیار کرنا کہ ان سے دوستی لگاؤ، زنا کرو اور جب دوستی لگ جائے پھر ان کو دین پر لے آؤ، کیا یہ جائز ہے؟ کہا: جی یہ تو جائز نہیں ہے۔

میں نے کہا کہ ایک زانیہ عورت سے زنا کر کے نکاح کی طرف لانا جائز نہیں ہے تو مبتدع آدمی کو سنت پر لانے کے لیے بدعات کر کے اپنی نماز خراب کرنا کیسے جائز ہو گا؟ فرق یہ ہے کہ زنا کی قباحت ہمارے ذہن میں ہے اور بدعت کی قباحت ہمارے ذہن میں نہیں ہے، زنا کے خلاف گفتگو ہوتی ہے تو ذہن بنا ہے کہ یہ بہت گندہ کام ہے اور بدعات کے خلاف گفتگو نہیں ہوتی تو ہمارا ذہن نہیں بنا کہ یہ بھی بہت گندہ کام ہے۔ اس لیے آپ سوشل میڈیا پر بہت سارے لوگوں کو دیکھو گے کہ وہ گندے اور فاسد العقیدہ لوگوں میں گھسے ہوتے ہیں، پوچھیں کہ کیوں؟ تو کہتے ہیں کہ جی یہ لوگ دین پر آجائیں گے۔ بات سمجھو کہ ان کو دین پر لانے کے لیے ان کے پاس جانا گناہ نہیں ہے لیکن ایسے امور کا ارتکاب کرنا کہ جس سے اپنے کمزور عقیدے والے لوگ ان اہل بدعت اور اہل کفر کو ٹھیک سمجھنا شروع کر دیں تو یہ بڑی غلطی ہے۔

میں آپ کو یہاں بتاتا ہوں کہ دیکھو فلاں اہل بدعت ہے ٹھیک نہیں ہے، فلاں ملحد ہے ٹھیک نہیں ہے، پھر وہ ہمارے ادارے میں آئے، ہم اس کو کھانا بھی کھلائیں، اس کو سونے کی جگہ بھی دیں تو آپ ہم سے پوچھیں گے کہ مولانا! آپ ہمیں کہتے تھے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے لیکن وہ آپ کے پاس آیا تو آپ نے اس کے ساتھ یہ معاملہ کیوں کیا؟ تو ہم آپ کو سمجھائیں گے کہ یہ ہمارے مہمان تھے اور مہمان کا تو حق

ہوتا ہے خواہ کافر ہی کیوں نہ ہو، اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ ہم ان کو ٹھیک سمجھتے ہیں، مہمان ہونے کی وجہ سے ہم نے ان کی عزت کی ہے۔ اب جب ہم یہ وضاحت کر دیں گے تو آپ کا ذہن کبھی الجھن کا شکار نہیں ہوگا۔

اس لیے آپ یہ بات اچھی طرح ذہن میں رکھ لیں۔ آپ نے کل مقدمہ اپنا ہے، اللہ تعالیٰ آپ سے خوب کام لے، جب آپ اہل کفر یا اہل بدعت سے کسی خاص مسئلے پر اکٹھے بیٹھیں تو اپنے ورکر کو ضرور بتائیں کہ یہ بندہ ٹھیک نہیں لیکن ہم ضرورت کے تحت اس کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ اگر یہ طریقہ اپنائیں گے تو اس سے ورکر ٹوٹا اور کٹتا نہیں ہے۔

### حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم تبلیغ:

﴿وَإِذْ نَادَىٰ رَبُّكَ مُوسَىٰ إِنِ أَنْتَ الْغَوَّامُ الظَّالِمِينَ ۖ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۖ أَلَا يَتَّقُونَ ۚ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ ۚ وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَٰرُونَ ۚ وَلَهُمْ عَلَىٰ ذُنُوبٍ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ۚ﴾

اللہ رب العزت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ فرعون کی قوم کے پاس جاؤ، ان کو دعوت دو اور اللہ سے ڈرنے کی بات کرو! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ! میں ڈر محسوس کرتا ہوں کہ وہ کہیں مجھے جھٹلا نہ دیں۔ دوسری بات یہ کہ میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے اور میری زبان بھی نہیں چلتی اور مجھ سے ایک ایسا کام ہوا تھا کہ جس کو یہ لوگ گناہ سمجھتے ہیں، ان کی نگاہوں میں ایک جرم میرے اوپر ہے۔ وہ کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام شہر میں نکلے تو ایک قبطی اور ایک اسرائیلی کو دیکھا کہ دونوں آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قبطی کو سمجھایا لیکن وہ نہیں سمجھا ﴿فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ﴾ تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کو مکا

مارا، ﴿فَقَضَىٰ عَلَيْهِ﴾ وہ جلالی مکا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تھا، لگا اور بندہ مر گیا۔

دوسرے دن پھر ایسے ہوا کہ وہی اسرائیلی کسی اور سے جھگڑ رہا تھا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے سمجھایا لیکن وہ نہیں سمجھا تو اس کو سمجھانے کے لیے مکا اٹھایا تو اس اسرائیلی نے سمجھا کہ مجھے ماریں گے۔ اس نے کہا کہ موسیٰ! کل اس کو مارا تھا اور آج مجھے مار رہے ہیں۔ تو اس اسرائیلی کے بولنے کی وجہ سے چھپا ہوا قتل کا معاملہ کھل گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جان بوجھ کر تو قتل نہیں کیا تھا یعنی یہ قتل عمد نہیں تھا بلکہ قتل خطا تھا جس کا گناہ نہیں ہوتا۔ موسیٰ علیہ السلام وہاں سے مدین چلے گئے۔ پھر آگے لمبا قصہ ہے کہ وہاں شعیب علیہ السلام کی بیٹی سے نکاح ہوا۔ واپسی راستے میں نبوت ملی۔ واپس تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری سوچی تو آپ علیہ السلام عرض کرنے لگے کہ اے اللہ! مجھے ایک تو یہ ڈر ہے کہ یہ مجھے جھٹلائیں گے، میں اکیلا ہوں اور یہ سارے ایک طرف ہیں تو میرا دل تنگ ہو گا، آپ میرے ساتھ میرے بھائی ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت دے دیں تاکہ کوئی میری تائید کرنے والا ہو، اور میری زبان زیادہ کھل کر نہیں چل سکتی، اگر میں کہیں انکوں تو میرا بھائی بات شروع کر دے، اللہ رب العزت نے موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کو قبول فرمایا اور حضرت ہارون علیہ السلام کو نبوت عطا کر کے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھیج دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ جو فرمایا: ﴿وَلَهُمْ عَلَىٰ ذَنْبٍ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ﴾ کہ مجھے یہ خدشہ ہے کہ وہ مجھے مار ہی نہ ڈالیں کہ تو تو ہماری قوم کے ایک فرد کا قاتل ہے۔ اے اللہ! اس کا کیا ہو گا؟ تو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس بات کے جواب میں فرمایا: ﴿كَلَّا﴾ کہ یہ تمہیں نہیں مار سکتے، ﴿فَاذْهَبَا بِأَيْتِنَا إِنَّا مَعَكُمْ مُسْتَعِينُونَ﴾ تم ہمارے دلائل لے کر جاؤ، ہم تمہارے ساتھ ہیں، تمہاری

گفتگو سنیں گے۔ آگے پھر پوری گفتگو ہے۔

### نبی معصوم ہوتا ہے:

میں صرف ﴿وَلَهُمْ عَلَى ذَنْبٍ﴾ پر بات کرتا ہوں کہ اس کا معنی کبھی یہ نہ کرنا کہ موسیٰ علیہ السلام جرم کا اعتراف کر رہے ہیں۔ معاذ اللہ۔ بلکہ جس کام کو قطعی لوگ گناہ سمجھتے تھے موسیٰ علیہ السلام نے اس کو ذکر کیا کہ ان کی نگاہ میں ان کے بندے کا قتل یہ جرم ہے، تو ان کی نگاہ میں ان کا مجرم ہوں تو وہ کہیں مجھے مار نہ دیں۔ لہذا ﴿وَلَهُمْ عَلَى ذَنْبٍ﴾ سے کوئی بندہ یہ استدلال نہ کرے کہ نبی معصوم نہیں ہوتا۔

### طبعی اور عقلی خوف:

اور یہ جو موسیٰ علیہ السلام خوف کی بات کرتے ہیں تو سمجھ لیں کہ ایک ہوتا ہے عقلی خوف اور ایک ہوتا ہے طبعی خوف، ﴿فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ﴾ میں جس خوف کا ذکر کیا ہے یہ طبعی خوف تھا عقلی خوف نہیں تھا۔ طبعی اور عقلی خوف میں فرق یہ ہے کہ مثلاً ہمیں عقلاً محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے والدین اور بچوں اور بیوی سے زیادہ ہے لیکن طبعاً جو محبت ہے وہ کھانے سے زیادہ ہے، گھر والوں سے زیادہ ہے، ماں باپ سے زیادہ ہے۔ عقل اور طبیعت میں فرق کا پتا اس وقت چلتا ہے جب عقلی اور طبعی محبت میں تقابل ہو جائے تو پھر پتا چلتا ہے کہ ایمان کیا ہے۔

یعنی اگر کوئی بندہ یہ کہے کہ میں تمہاری والدہ کو گالی دوں یا تمہارے نبی کو؟ تو ہم کہیں گے کہ اگر آپ نے ضرور گالی دینی ہے تو ہماری ماں کو دے دو، ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نہ کہنا۔ اب دیکھو! عقلی محبت طبعی محبت پر غالب آگئی، اسی کا نام ایمان ہے۔ عام طور پر عقلی محبت مغلوب رہتی ہے اور طبعی محبت غالب رہتی ہے لیکن

جب دونوں کا تقابل ہوتا ہے تو پھر عقلی محبت غالب ہو جاتی ہے اور طبعی محبت مغلوب ہو جاتی ہے۔ بندہ بسا اوقات الجھن میں پڑ جاتا ہے کہ میں تو مؤمن نہیں ہوں کیونکہ مجھے حضور سے زیادہ اپنے گھر سے پیار ہے۔ تو میں بتا رہا ہوں کہ یہ طبعی پیار ہوتا ہے عقلی نہیں ہوتا۔

تو موسیٰ علیہ السلام کا خوف یہ طبعی تھا عقلی نہیں تھا، عقلاً ہر مؤمن سمجھتا ہے کہ اللہ سے ڈرنا چاہیے۔

### فرعون کا احسان جتلانا:

﴿قَالَ أَلَمْ نُنْزِ بِكَ فِيْنَا وَلِيْنًا وَّ لَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمْرِكَ سِنِيْنًا ۚ﴾

فَعَلْتَ فَعَلْتَكَ الْبِئْسَ فَعْلًا وَّ أَنْتَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ ﴿١٦﴾

جب فرعون سے بات چلی تو فرعون نے کہا کہ ہم نے تیری پرورش کی، تجھے پالا اور تو نے اپنی عمر کے بہت سارے سال ہم میں گزارے، اور یہاں رہ کر تو نے ایک کام بھی کر ڈالا تھا، یہ اشارہ کر رہا تھا فرعون اس قتل کی طرف، پھر کہنے لگا کہ آج تو ناشکر ہو کر ہم سے باتیں کرتا ہے! موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہارا بندہ قتل ہوا تھا تو ﴿فَعَلْتُهَا إِذًا وَّ أَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ﴾ مجھ سے یہ کام ہوا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا، بے خبری میں مارا گیا تھا، میرا قتل کا ارادہ نہیں تھا بس غلطی سے ہو گیا تھا۔ لیکن جب مجھے خوف ہوا کہ تم مجھے قتل کر دو گے تو میں یہاں سے چلا گیا۔ پھر اللہ نے مجھے نبوت دی ہے۔ باقی جو تم میرے اوپر احسان جتلالتے ہو تو اس احسان کی وجہ یہ تھی کہ تم نے میری قوم کو غلام بنارکھا تھا۔

اب دیکھو! موسیٰ علیہ السلام نے کتنی پیاری بات فرمائی جب اس نے کہا کہ ہم نے تمہیں بیٹا بنا کر رکھا اور آج تم یہ باتیں کرتے ہو؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَىٰ أَنْ عَبَّدَتْ بَنِي إِسْرَآءِيلَ﴾ کہ یہ جو تم احسان جتلا رہے ہو کہ مجھے پالا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر رکھا ہوا تھا۔ تم نے خواب دیکھا تھا کہ تمہاری حکومت چھنے گی تو تم نے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنا شروع کیا، اگر تم انہیں مارنا شروع نہ کرتے تو میں تمہارے گھر میں کبھی نہ پلتا، اللہ نے تمہارے گھر میں مجھے پالا، یہ جو تمہارے گھر میں پلا ہوں تو اس کی وجہ بھی تم خود ہو، اگر بنی اسرائیل کے بچوں کا قتل نہ ہوتا تو میری ماں کیوں مجھے دریا کے حوالے کرتی۔ تو اب سوچو کہ میری پرورش کرنے میں تمہارا کیا احسان تھا جو تم آج جتلا رہے ہو؟!

**مکالمہ فرعون:**

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ ۲۱ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ اِنْ كُنْتُمْ مُّوَقِّنِينَ ۚ ۲۲ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۚ ۲۳ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَائِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۚ ۲۴ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمْ الَّذِیْ اٰذٰی اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۚ ۲۵

اب فرعون کہتا ہے: ﴿وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ رب العالمین کیا ہے؟ اس نے یہ نہیں کہا: ﴿وَمَنْ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ کہ رب العالمین کون ہے بلکہ کہا کہ رب العالمین کیا ہے؟ تو اس کا سوال اللہ کی حقیقت اور ماہیت کے متعلق تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا﴾ اللہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے سب کا رب ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا تعارف صفات کے ذریعے کروایا کیونکہ اللہ کی حقیقت اور ماہیت سمجھنا بندے کے بس میں نہیں ہے تو جس چیز کو بندہ سمجھ نہیں سکتا وہ آپ سمجھاتے کیوں؟ تو اس نے سوال اور کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے جواب اور دیا۔

فرعون نے اپنے ارد گرد کے لوگوں سے کہا کہ سن بھی رہے ہو کہ موسیٰ کیا کہہ رہا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ﴾ کہ وہ تمہارا بھی خدا ہے اور تمہارے پچھلے باپ دادوں کا بھی خدا ہے۔ فرعون نے کہا کہ تمہارا نبی تو دیوانہ لگتا ہے۔ معاذ اللہ۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کی بات کی پرواہ نہ کی بلکہ بات جاری رکھی اور فرمایا: ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا﴾ کہ اللہ تو مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب کا رب ہے۔ اب فرعون کو غصہ آیا اور اس نے کہا کہ اگر تو نے میرے علاوہ کسی اور کو معبود بنایا تو میں تجھے قید کر لوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اگر میں کوئی معجزہ پیش کروں تو پھر بھی ایسا کرو گے؟ اس نے کہا: اگر سچے ہو تو پھر لاؤ معجزہ! موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کو زمین پر مارا تو اژدھا بن گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے دوسرا معجزہ دکھایا کہ اپنا ہاتھ بغل میں ڈالا اور باہر نکالا تو وہ سورج کی طرح چمکنے لگا۔

### حکیم کا جواب سائل کی ضرورت کے پیش نظر ہوتا ہے:

یہاں سے ایک بات یہ سمجھ میں آئی کہ سائل کا سوال کے مطابق جواب دینا ضروری نہیں ہے، عجیب کو یہ بات دیکھنی چاہیے کہ میں نے جواب کیا دینا ہے؟ یہ بڑی الجھن کی بات ہوتی ہے کہ کوئی بندہ جب سوال کرتا ہے تو ہم اسی سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں اور ہمیں اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ اگر ہم نے وہ جواب نہ دیا تو لوگ کیا کہیں گے؟! ہم اس کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ دیکھیں کہ جو سوال اس نے کیا ہے اگر اسی کا جواب دینا مناسب ہے تو دیں ورنہ جو مناسب ہو وہ جواب دیں اور یہ طریقہ کار اور اسلوب قرآن کریم میں کئی مقامات پر ہے۔

1: مثلاً مشرکین مکہ نے جب پوچھا تھا کہ اللہ کس چیز کا بنا ہوا ہے؟ تو اللہ نے نبی

صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا تھا کہ آپ فرمائیں ﴿هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ کہ اللہ ایک ہے۔

2: ایک اور مقام پر ہے ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْآهْلِ﴾<sup>65</sup> صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے سوال کیا کہ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی وجہ کیا ہے؟ جواب دیا: ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾<sup>ط</sup> تم یہ نہ پوچھو کہ چاند بڑا چھوٹا کیوں ہوتا ہے بلکہ تم یہ پوچھو کہ چاند کے فوائد کیا ہیں؟ تو چند فوائد بتا دیے کہ اس سے تم عبادات اور معاملات کے اوقات طے کرتے ہو، اس سے تم مہینے متعین کر کے حج کرتے ہو۔ اسی طرح اس سے دن متعین کر کے تم رمضان کے روزے رکھتے ہو، اگر عورت کو طلاق ہو جائے تو اس کے ذریعے سے وہ عدت پوری کرتی ہے۔ تو ان کے سوال کے جواب میں اس چیز کو بیان کیا جو ان کے لیے فائدہ مند تھی اور وہ اس کو سمجھ بھی سکتے تھے۔

3: قرآن کریم میں ہے: ﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ﴾<sup>66</sup> کہ وہ

آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ فرمایا: ﴿قُلْ مَا أَنفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ﴾ آپ فرما دیں یہ نہ پوچھو کہ کیا خرچ کریں بلکہ یہ پوچھو کہاں خرچ کریں؟ تو بتا دیا کہ والدین، عزیز و اقارب، یتیم، مسکین اور مسافروں پر خرچ کرو! تو یہاں بھی سوال کسی اور چیز کے بارے میں ہے، جواب اور دیا گیا۔

اس سے ایک اصول یہ سمجھ میں آیا کہ ہمیشہ ہر بندے کے سوال کے مطابق جواب نہیں دیتے بلکہ عالم کو دیکھنا چاہیے کہ یہاں کون سا جواب دینا مناسب ہے اس



کے مطابق بات کہنی چاہیے۔

### متکلم اسلام اور ایک ٹیلیفونک کال:

آج رات میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، مجھے ایک شخص نے فون کیا کہ مولانا صاحب! میں حنفی ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ کہانی مت ڈالو کہ تم کون ہو تم سوال کرو! کہنے لگا کہ یہ میں نے کتاب میں پڑھا ہے کہ جب عورت کو تین طلاق ہو جائے تو یہ جو حلالہ کرتے ہیں... میں نے کہا کہ دنیا میں کوئی بھی حلالہ نہیں کرتا، تم جھوٹ بولتے ہو۔ اب میں نے اس کے سوالات کے دروازے بند کیے۔ میں نے کہا کہ کون حلالہ کرتا ہے؟ کہنے لگا کہ میں نے سنا ہے کہ دیوبند والے مستقل حلالہ کرتے ہیں، ان کے پاس انتظام ہوتا ہے، دفتر ہوتا ہے... میں نے کہا کہ کوئی نہیں کرتا، نہ کوئی انتظام ہوتا ہے اور نہ کوئی ایسا دفتر ہوتا ہے، یہ تم لوگ جھوٹ بولتے ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر تم اپنی بیوی کو تین طلاق دے دو تو تمہاری غیرت اس بات کو گوارا کرے گی کہ اس کو ایک رات کے لیے میرے پاس بھیج دو؟ کہا کہ نہیں۔ تو میں نے کہا کہ اور کس کی غیرت گوارا کرتی ہے؟ اللہ کے نبی نے اس پر لعنت بھیجی ہے، اس لیے تم لوگوں نے کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ خیر وہ اس سے تھوڑا سنبھل گیا۔ چونکہ وہ بڑی عجیب طرز سے سوال کرتے ہیں کہ یہ کہے گا کہ طلاق ہو جائے تو پھر کسی اور مرد سے نکاح کریں، پھر وہاں سے طلاق لیں اور پہلے کے پاس آجائے۔ یہ لوگ اس کی پھر ریکارڈنگ کرتے ہیں اور وہ ریکارڈنگ سنا کر کہتے ہیں کہ جی مولانا گھمن صاحب بھی کہہ رہے ہیں کہ حلالہ ہے۔

پھر اس نے کہا کہ اچھا یہ بتائیں کہ ماموں فوت ہو جائے تو ممانی سے نکاح کرنا جائز ہے؟ میں نے کہا: ممانی اور چچی سے ماموں اور چاچو کے فوت ہو جانے کے بعد یا ان کے طلاق دے دینے کے بعد نکاح جائز ہے لیکن معاشرے میں اس نکاح کو معیوب

سمجھا جاتا ہے۔ اب اگر میں صرف اتنا کہتا کہ نکاح جائز ہے تو اس نے کئی جابلوں کو دھوکہ دینا تھا کہ مولانا گھسن صاحب کہتے ہیں کہ ممائی سے نکاح جائز ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ چوتھے پارے کا آخری رکوع پڑھ لو اور اس کی تفسیر دیکھ لو، تمہیں خود سمجھ میں آجائے گا کہ نکاح کر سکتے ہیں یا نہیں؟ میرے گھر والے اس وقت ساتھ بیٹھے تھے تو مجھے کہنے لگے کہ آپ سیدھا بتا دیتے کہ نکاح کر سکتے ہیں! میں نے کہا: یہ اتنی سیدھی بات نہیں جتنا تم سمجھتی ہو، آپ کو معلوم نہیں کہ کیا جواب دینا ہوتا ہے، یہ میرا فن ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کیا جواب دینا ہے۔ تو سوال کرنے والا کیا سوال کرتا ہے اس کو آپ نہیں سمجھتے۔

تو میں صرف اتنی بات عرض کر رہا ہوں کہ سائل جو سوال کیا کرتا ہے اس کو نہ دیکھیں بلکہ آپ یہ دیکھیں کہ آپ نے جواب کیا دینا ہے؟  
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات پہلے بیان ہو چکے ہیں آپ کے علم میں ہیں، اس لیے میں ان واقعات کی تفصیل نہیں بیان کر رہا بلکہ میں خاص خاص آیات پر بات کر رہا ہوں۔

### جادو گروں سے مقابلہ:

﴿قَالَ لَهُمْ مُوسَىٰ اَلْقُوا مَا اَنْتُمْ مُلْقُونَ ۚ﴾ ۲۳ ﴿فَالْقُوا جِبَالَهُمْ وَ  
عَصِيَّهُمْ وَ قَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَعْنُ الْعٰلِبِيْنَ ۚ﴾ ۲۴ ﴿فَاَلْقٰى مُوسٰى عَصَاهُ  
فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُوْنَ ۚ﴾ ۲۵ ﴿

فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے اپنے جادوگر جمع کر لیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادو گروں سے فرمایا کہ پھینکو جو کچھ تم نے پھینکنا ہے۔ انہوں نے رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں، وہ سانپ نظر آئے۔ جب

موسیٰ علیہ السلام نے عصا پھینکا تو اس نے ساری رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل لیا، ان جادو گروں کا سارا جادو ختم ہو گیا۔ جب جادو ختم ہو گیا تو ﴿فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سِجْدًا﴾ جادو گر سجدے میں گرادیے گئے۔ انہوں نے سجدہ کیا نہیں بلکہ ان کو سجدے میں گرا دیا گیا۔ ﴿فَأُلْقِيَ﴾ مجہول کا صیغہ ہے یعنی ان کو سجدے میں ڈال دیا گیا اور انہوں نے کہا ﴿أَمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ رَبِّ مُوسَى وَهَارُونَ ﴿۱۶﴾ کہ ہم رب العالمین پر ایمان لاتے ہیں جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے، انہوں نے صرف ﴿أَمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ کہنے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ساتھ ﴿رَبِّ مُوسَى وَهَارُونَ﴾ کی وضاحت بھی کی ہے۔

### جہاں ضرورت ہو وضاحت کر دینی چاہیے:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں وضاحت ضروری ہو وہاں وضاحت ضرور کرو، مجمل بات کبھی نہ کرو! اگر وہ لوگ یہ بات کہتے کہ ہم رب العالمین پر ایمان لائے تو فرعون کہتا کہ رب العالمین تو میں ہوں، یہ تو مجھ پر ایمان لائے ہیں، اس لیے انہوں نے وضاحت سے کہا: ﴿رَبِّ مُوسَى وَهَارُونَ﴾ کہ ہم اس رب العالمین پر ایمان لائے ہیں جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا رب ہے۔ انہوں نے وضاحت کر دی تاکہ الجھن ہی ختم ہو جائے۔ تو جہاں وضاحت کی ضرورت ہو تو وہاں نام لے کر فتنے کی وضاحت کرو، اگر ضرورت نہ ہو تو بلا وجہ مصائب اور مسائل کو اپنے گلے میں مت ڈالو۔

### حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ:

﴿وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِم نَبَأَ آبَائِهِمْ﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ﴿۱۷﴾

یہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا جا رہا ہے۔ میں سارے واقعات پیش بھی نہیں کر رہا اور ان پر پوری تفصیل سے بات بھی نہیں کر رہا، میں نے

آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ دروس ہیں، ان میں کسی آیت سے کوئی مسئلہ نکلتا ہو کوئی عقیدہ حل ہوتا ہو تو ہم صرف ان آیات پر بات کرتے ہیں۔

جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت دی اور یہ کہا کہ تم کس کی پوجا کرتے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا یہ بت تمہاری باتیں سن سکتے ہیں؟ کیا یہ تمہیں نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ﴿بَلَىٰ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ﴾ کہ ہمارے باپ دادا ایسا کرتے تھے تو ہم بھی یہی کریں گے۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيَّ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ یہ سب ہمارے دشمن ہیں سوائے اللہ کی ذات کے۔ دشمن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی وجہ سے بندے جہنم میں جائیں گے۔

### ادب کا تقاضا:

﴿اَلَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْٓنِ ۙ﴾ ۱۱۱ ﴿وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۙ﴾ ۱۱۲  
 اِذَا مَرَضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۙ﴾ ۱۱۳ ﴿وَالَّذِيْ يُمَيِّتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۙ﴾ ۱۱۴  
 ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی صفات کو بیان فرمایا کہ اللہ وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، وہ میری رہنمائی فرماتا ہے، وہ مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے، اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا بھی دیتا ہے اور اللہ مجھے موت بھی دے گا اور زندگی بھی دے گا اور مجھے امید ہے وہ قیامت کے دن مجھے معاف بھی فرمائے گا۔

یہاں ﴿وَ اِذَا مَرَضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ﴾ پر ادب کا تقاضا سمجھیں۔ مرض بھی من جانب اللہ ہوتا ہے اور شفا بھی من جانب اللہ ہوتی ہے لیکن بیماری عموماً آدمی کی بد پرہیزی کی وجہ سے ہوتی ہے، دنیا میں جو بیماری آتی ہے تو ننانوے فیصد امراض ایسے

ہیں کہ اسبابِ مرض ہم بندے اختیار کرتے ہیں پھر بیماری آ جاتی ہے مثلاً ناموافق غذا کھائی تو بیمار ہو گئے، سفر لمبا کیا تو بیمار ہو گئے اور موسم میں کپڑوں کا خیال نہیں کیا تو بیمار ہو گئے کیونکہ اللہ نے ان چیزوں میں یہ سبب رکھا ہوتا ہے کہ اس کھانے سے یہ تکلیف ہوگی، اس کھانے سے یہ تکلیف ہوگی، اس سے یہ ہو گا اور جب اللہ سے شفا مانگیں تو اللہ یوں نہیں فرماتے کہ جب میں ایک چیز سے منع کرتا ہوں تو تم کیوں کرتے ہو، جب میں کہتا ہوں کہ ان چیزوں میں احتیاط کرو تو تم کیوں نہیں کرتے؟ یوں نہیں ہوتا بلکہ ہم مرض کے اسباب اختیار کرتے ہیں اس کے باوجود اللہ تعالیٰ شفا دیتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام مرض کی نسبت اپنی طرف کرتے ہیں اور شفا کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں، جب ہم نے ناموافق غذا کھائی تو بیمار ہو گئے اور موافق دوا کھائی تو شفا مل گئی۔ دونوں کام ہم نے کیے ہیں لیکن مرض کی نسبت اپنی طرف ہے اور شفا کی نسبت اللہ کی طرف ہے کیونکہ مرض اچھی چیز نہیں ہے اس کی نسبت اللہ کی طرف کرنا یہ ادب کے خلاف تھا، اس لیے فرمایا کہ اسبابِ مرض اختیار کر کے بیمار ہو جاتا ہوں اور اللہ کا کریم یہ ہے اللہ پھر بھی شفاء عطا فرما دیتے ہیں۔

**اچھے تذکرے کی خواہش:**

﴿وَأَجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ﴾

ابراہیم علیہ السلام نے جہاں اور دعائیں مانگی ہیں وہاں ایک دعا یہ بھی مانگی کہ اے اللہ! میرا اچھا تذکرہ بعد والوں کی زبان پر جاری فرما دے۔ اس سے بظاہر عام بندے کو شبہ ہوتا ہے کہ یہ ریا ہے، حالانکہ یہ ریا نہیں ہے یعنی لوگ میرا اچھا تذکرہ کریں، مجھے اچھے لفظوں سے یاد کریں اس میں ریا اور دکھلاوا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ایسا کام کر جاؤں جو صدقہ جاریہ بن جائے اور لوگ اس کام کی وجہ سے جنت میں جائیں تو جب نیک کام کی بنیاد میں رکھوں گا تو لوگ مجھے اچھے لفظوں سے یاد

کریں گے۔ آدمی کے دل میں یہ خواہش ہو کہ لوگ مجھے اچھے لفظوں سے یاد کریں یہ جائز ہے بشرطیکہ اس آدمی کی خواہش حب جاہ اور حب دنیا کی نہ ہو کہ جب لوگ مجھے اچھا سمجھیں گے تو میری عزت کریں گے، مجھے پیسے دیں گے اور مجھے لیڈر بھی مانیں گے، اور دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی ایسے عمل کی وجہ سے یہ خواہش نہ رکھے جو اس نے کیا نہ ہو مثلاً اس کی خواہش ہو کہ میں جب کمرے میں چلا جاؤں اور دروازہ بند کر لوں اور میں نوافل بھی نہ پڑھوں اور لوگ سمجھیں کہ یہ اندر جا کے نوافل پڑھتا ہے تو یہ جائز نہیں ہے، اور تیسری شرط یہ ہے کہ آدمی اس خواہش کے لیے کہ لوگ مجھے اچھا سمجھیں کوئی غلط کام کرے تو یہ بھی جائز نہیں ہے جیسے آج ہمارے ہاں بیماری چل پڑی ہے کہ اہل باطل کو بھی ساتھ ملاؤ تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ بڑا امت کو جوڑنے والا ہے تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔

ہاں اگر مقصود یہ ہو کہ لوگ مجھے اچھا سمجھیں گے تو میری بات سنیں گے، اچھا سمجھیں گے تو میری بات قبول کریں گے، اچھا سمجھیں گے تو دینی امور میں میرا ساتھ دیں گے تو یہ جائز ہے، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا خود مانگی ہے:

اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي شَكُورًا وَاجْعَلْنِي صَبُورًا وَاجْعَلْنِي فِي عَيْنِي صَغِيرًا وَفِي

أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيرًا.<sup>67</sup>

اے اللہ! مجھے شکر کرنے والا بندہ بنادے، مصیبت آئے تو اس پر صبر کرنے والا بنادے، مجھے میری اپنی نگاہوں میں چھوٹا کر دے اور دوسروں کی نگاہوں میں بڑا کر دے۔

لوگ بڑا سمجھیں گے تب آپ کی بات مانیں گے، جب بڑا نہیں سمجھیں گے

تو آپ کی بات کیسے مانیں گے؟! ہمارے شیخ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”وَفِي أَعْيُنِ النَّاسِ كِبِيرًا“ بننے کے لیے ”فِي عَيْنِي صَغِيرًا“ ہونا ضروری ہے، جب بندہ اپنی نگاہ میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے تو پھر لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل بن جاتا ہے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو لوگوں کی نگاہ میں بڑا کرے تاکہ لوگ ہم سے فائدہ اٹھائیں، اور یہ بات اچھی طرح یاد رکھنا! ایسے اسباب اختیار کرنا کہ جس سے لوگ ہماری بات کو سنیں یہ جائز ہے اور یہ بھی ایک سبب ہے کہ لوگ ہمیں اچھا سمجھیں۔

### حضرت مولانا ابرار الحق ہر دوئی کی مرید کو نصیحت:

حضرت مولانا ابرار الحق ہر دوئی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے ایک مرید نے خط لکھا کہ حضرت! میں دکان پر ہوتا ہوں، کبھی وقت بھی مل جاتا ہے تو اس میں باتیں بہت ہوتی ہیں تو میں کیا کروں؟! فرمایا کہ تسبیح ساتھ رکھ لو اور ذکر کیا کرو۔ اس نے پھر خط لکھا: حضرت ہاتھ میں تسبیح رکھ کر ذکر کرتا ہوں تو دل میں خیال آتا ہے کہ لوگ مجھے نیک سمجھتے ہیں۔ حضرت فرمانے لگے کہ تم کیا چاہتے ہو کہ لوگ تمہیں برا سمجھیں پھر ٹھیک ہے؟ بھائی آپ کی خواہش نہیں ہے کہ لوگ آپ کو اچھا سمجھیں لیکن آپ کے عمل سے پھر بھی وہ اچھا سمجھتے ہیں تو اس کو خدا کی نعمت اور کرم سمجھیں۔

### حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ:

﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ۖ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا

تَتَّقُونَ ۖ﴾

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا جب ان سے ان کے بھائی حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں ہو؟ نوح علیہ السلام اللہ کے

نبی ہیں اور قوم کافر ہے پھر بھی نوح علیہ السلام کو ان کا بھائی کہا جا رہا ہے تو یہ دینی بھائی نہیں بلکہ یہ قومی بھائی ہیں۔ ان کی قوم شرک کرتی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے محنت کی لیکن قوم نہیں مانی اور آپ علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی ہے اور آخر کار بد دعا کی کہ اللہ! اس قوم کو ہلاک فرمادیں۔

### حضرت ہود علیہ السلام کی تبلیغ:

﴿كَذَّبَتْ عَادُ انْمُرْسِلِينَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اٰخُوهُمْ هُوْدًا اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝﴾

قوم عاد نے بھی رسولوں کو جھٹلایا جب ان سے ان کے بھائی حضرت ہود علیہ السلام نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں ہو؟

حضرت ہود علیہ السلام ان کے قومی بھائی تھے۔ ان کی قوم چونکہ ظالم بھی تھی اور بڑی بڑی عمارتیں بھی بناتی تھی تو فرمایا کہ تم ایسے کام نہ کیا کرو، فضول عمارتیں نہ بنایا کرو۔ آپ حضرات ایک بات یاد رکھیں کہ بڑے سے بڑا مکان بنانا شرعاً جائز ہے جب اس کی ضرورت ہو اور ضرورت نہ ہو بلکہ صرف نام و نمود کے لیے بڑا مکان کیا چھوٹا سا مکان بھی بنانا جائز نہیں ہے۔

### حضرت صالح علیہ السلام کی تبلیغ:

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ انْمُرْسِلِينَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اٰخُوهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝﴾

قوم ثمود نے بھی رسولوں کی تکذیب کی جب ان سے ان کے بھائی حضرت صالح علیہ السلام نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں ہو؟

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو بہت سمجھایا مگر قوم نہیں مانی۔ بالآخر قوم کے مانگنے پر ایک معجزہ یعنی اونٹنی ایک چٹان سے نکلی۔ طے ہوا کہ ایک دن یہ اونٹنی پانی پیے گی اور ایک دن قوم کے جانور پانی پئیں گے۔ اس قوم نے صالح علیہ السلام کی



اونٹنی کو مار ڈالا تو ان پر خدا کا عذاب آیا اور وہ لوگ برباد ہو گئے۔

## حضرت لوط علیہ السلام کی تبلیغ:

﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ۖ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطُ أَلَا

تَتَّقُونَ ۖ﴾

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا جب ان سے ان کے بھائی حضرت لوط علیہ السلام نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں ہو؟ حضرت لوط علیہ السلام اہل سدوم کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپ کی قوم عمل بد کرتی تھی، وہ لوگ لڑکوں کے ساتھ غیر فطری فعل کرتے۔ اس گناہ پر ان کی پوری قوم کو تباہ کر دیا گیا۔

## غیر فطری عمل حرام ہے:

یہاں اس آیت ﴿وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ بَكُم رُبُّكُمْ مِنْ أَرْوَاحِكُمْ﴾ پر

ایک نکتہ سمجھ لیں۔ یہاں ”مِنْ أَرْوَاحِكُمْ“ میں مِنْ بیان یہ ہے یا تبعیضیہ ہے۔ اگر مِنْ بیان یہ ہو تو اس کا معنی یہ ہو گا کہ تم نے چھوڑ دیا اس کو جو خدا نے تمہارے لیے بنایا ہے یعنی تمہاری بیویاں، ان کو چھوڑ کر تم مردوں سے اپنی حاجت پوری کرتے ہو! اور اگر مِنْ تبعیضیہ ہو تو پھر معنی ہو گا کہ تم نے بعض وہ چھوڑ دیا جو خدا نے تمہاری بیویوں میں سے تمہارے لیے بنایا تھا یعنی تم اپنی بیویوں کا قبل چھوڑ کر ذر استعمال کرتے ہو۔

تو اگر مِنْ تبعیضیہ ہو تو اس آیت سے یہ بھی ثابت ہو گا کہ جس طرح مرد سے لواط حرام ہے اسی طرح اپنی منکوحہ سے بھی حرام ہے، اگرچہ اس کی حرمت پر مستقل حدیث موجود ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا:

"مَلْعُونٌ مِّنْ أَتَىٰ أَمْرًا أَنَّهُ فِي دُبُرِهَا." 68

وہ شخص ملعون ہے جو اپنی عورت کے ساتھ غیر فطری عمل کرے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

### وحی کا نزول قلب اطہر پر:

﴿وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَلَمِينَ ﴿١٩٢﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾ عَلَىٰ

قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿١٩٤﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿١٩٥﴾﴾

یہ قرآن مجید رب العالمین کا نازل کیا ہوا ہے، اسے فرشتہ روح الامین لے کر اتر ہے، یہ قرآن مجید آپ کے دل پر اتارا ہے تاکہ آپ پیغمبروں میں شامل ہو جائیں جو لوگوں کو ڈراتے ہیں اور یہ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کے پیغام کو واضح کرنے والی ہے۔

اس آیت میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ”الروح الامین“ فرمایا گیا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر وحی لاتے تھے۔ میں کئی بار یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ جب امتی سو جائے تو اس کا دل اور آنکھ دونوں سو جاتے ہیں اور جب پیغمبر سو جائے تو نبی کی آنکھ سوتی ہے اور نبی کا دل جاگتا ہے اور وحی پیغمبر کی آنکھ اور کان پر نہیں بلکہ دل پر آتی ہے اس لیے پیغمبر جاگتے ہوں اور جبرائیل علیہ السلام آئیں تب بھی وحی ہے اور پیغمبر سو جائیں اور خواب دیکھیں تو تب بھی وحی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وحی کا تعلق پیغمبر کے قلب اطہر سے ہے اور جب حضور جاگ رہے ہوں دل تب بھی جاگتا ہے اور اگر نبی سو رہے ہوں دل تب بھی جاگتا ہے۔

ایک علمی نکتہ:

”الرُّؤُوسُ الْأَمِينُ“ سے مجھے یاد آیا کہ میں نے آپ کی خدمت میں آیت ﴿مَا هَذَا بَشَرًا ۖ إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾ پیش کی تھی اور بتایا تھا کہ جس میں تقاضائے معصیت نہ ہو اور پھر معصیت نہ کرے اس کو ”مَلَكٌ“ کہتے ہیں اور اگر تقاضائے معصیت ہو اور اس کو کٹر ول کرے اس کو ﴿مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾ کہتے ہیں۔ اس پر کل عصر کے بعد ایک طالب علم نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ اللہ نے قرآن کریم میں جبرائیل امین کو ”رسول“ بھی کہا اور ”کریم“ بھی کہا، فرمایا: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾۔ میں نے کہا کہ جبرائیل کو ﴿رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾ کہا یا ﴿مَلَكٌ كَرِيمٍ﴾ کہا؟ جواب دیا کہ ﴿رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾ کہا، میں نے کہا کہ ملک کریم الگ ہوتا ہے رسول کریم الگ ہوتا ہے، دونوں میں فرق سمجھ آجائے تو جواب سمجھ میں آگیا، اور دوسری بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ ایک لفظ جب دو جگہ پر آئے تو ہر مرتبہ اس کا ایک ہی معنی نہیں ہوتا۔ کبھی ایک لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں، خود لفظ ”کریم“ کے علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ معنی لکھے ہیں۔

### عرب کے ہاں شعر کا مفہوم:

﴿وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۚ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۚ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۚ﴾

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے شعراء کی مذمت بیان فرمائی ہے کہ شعراء کے پیچھے گمراہ لوگ چلتے ہیں اور شاعر ہر قسم کی وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں اور ایسی بات کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔ اس لیے ان سے بچنا چاہیے۔

ہمارے ہاں شعر کا معنی اور ہے، جس کو ہم شعر کہتے ہیں یہ شعر عربی اور شعر اصطلاحی ہے ورنہ لغت عرب میں شعر کا معنی مسجع اور مقفی کلام نہیں ہوتا بلکہ

لغتِ عرب میں شعر کا معنی ہوتا ہے ایسی بات جو فرضی ہو اور غیر تحقیقی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو شعر نہیں پڑھتے تھے، اگر شاعر کا معنی ہو مسجع اور مقفیٰ کلام کہنے والا تو پھر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ شاعر کیوں کہتے تھے حالانکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم تو شعر نہیں پڑھتے تھے؟ اور اللہ بھی فرماتے ہیں: ﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشُّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ﴾ کہ ہم نے نبی کو شعر نہیں سکھایا اور شعر نبی کے لائق ہی نہیں ہے۔

عرب جن کی فطرت میں شاعری تھی، وہاں دس دس سال کی بچی سو سو اشعار کے قصیدے پڑھتی تھی تو وہ جانتے تھے کہ شعر کا معنی کیا ہے اور حضور پاک شعر نہیں پڑھتے تھے لیکن وہ پھر بھی کہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شاعر ہیں۔

تو عرب کے اس ماحول میں شاعر کا معنی یہ ہے کہ یہ خیالی باتیں کرتا ہے، فرضی باتیں کرتا ہے۔ العیاذ باللہ۔ من گھڑت باتیں کرتا ہے جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے اہل منطق ادلہ فرضیہ کو اور غیر تحقیقی بات کو ”ادلہ شعریہ“ کہتے ہیں۔ کبھی آپ منطق میں پڑھیں گے کہ یہ دلیل شعری ہے۔ اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ یہ غلط دلیل ہے، غیر تحقیقی بات ہے، فضول سی بات ہے۔ یہ بات سمجھ میں آگئی؟ (سامعین) اسی وجہ سے عرب کہتے تھے کہ یہ شاعر کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی تردید فرماتے ہیں کہ یہ شاعر کا کلام نہیں ہے۔

البتہ عرف اور اصطلاح میں شاعر اسے کہتے ہیں جو مقفیٰ اور مسجع کلام کرے اور یہاں ﴿وَالشُّعْرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنُ﴾ میں شعراء سے مراد مسجع اور مقفیٰ کلام کہنے والے شعراء ہیں، ان کی عادت یہ ہوتی ہے کہ یہ عموماً ایسی باتیں کرتے ہیں جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے فرمایا کہ ان کے پیچھے وہی لوگ چلتے ہیں جو گمراہ ہیں اور خود یہ شاعر لوگ بھی بھٹکتے رہتے ہیں، کبھی ادھر جاتے ہیں اور کبھی ادھر جاتے ہیں۔ ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَانْتَصَرُوا﴾

مِنْ بَعْدِ مَا ظَلِمُوا ﴿٦٨﴾ ہاں! جو ایمان لائیں، نیک عمل کریں، اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کریں اور اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد اس کا بدلہ لیں تو ان کے لیے شعر کہنا جائز ہے۔ معلوم ہوا کہ جن اشعار میں خیالی باتیں ہوں تو وہ ٹھیک نہیں ہیں لیکن اگر شعر و شاعری اللہ کے دین کے لیے ہو اور دین پر ہونے والے ظلم کے انتقام کے لیے ہو، نبوت کی شان میں مدح کے لیے ہو تو پھر کہنا جائز ہے بلکہ بعض مقامات پر مستحب ہے اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ مِنَ الشَّعْرِ لِحِكْمَةً." <sup>69</sup>

کہ اشعار میں دانائی اور حکمت ہوتی ہے۔ شعر میں آدمی چھوٹے سے جملے میں بہت بڑی بات کہہ دیتا ہے جو کہ نثر میں نہیں کہہ پاتا۔ غالب شاعر تھا، وہ کہا کرتا تھا:

عشق نے غالب نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

مولانا محمد احمد صاحب بہت بڑے عالم اور بزرگ تھے، وہ فرماتے تھے:

عشق نے احمد ہے کما کر دیا

ورنہ ہم تو آدمی تھے نام کے

غالب کے ہاں عشق اور تھا اور ان کے ہاں عشق اور تھا، وہ عشق مجازی کا رونا روتا تھا اور یہ عشق حقیقی کی باتیں کرتے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج مبارک تھا کہ مسجد نبوی کے منبر پر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بٹھاتے اور فرماتے: حسان! ہماری مدح میں

شاعری کرو اور جب وہ شعر پڑھتے تو اللہ کے نبی دعائیں دیتے:

اَللّٰهُمَّ اَيِّدْهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ. <sup>70</sup>

اے اللہ! جبرائیل امین کے ذریعے حسان کی مدد فرما! حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے شاعری میں حضور صلی اللہ علیہ کی مدح کا حق ادا فرمایا ہے۔

### حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا قصیدہ:

صحیح مسلم میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ابوسفیان نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو اور مذمت میں کلام کہا۔ اس وقت تک ابوسفیان مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حسان کو بلاؤ! آپ نے حضرت حسان سے فرمایا: ابوسفیان کو جواب دو لیکن یہ یاد رکھنا کہ میرا اور ابوسفیان کا نسب اوپر ایک ہے، کہیں ہمارا نسب بھی مجروح نہ ہو جائے، اس لیے تم پہلے ابو بکر صدیق کے پاس جا کر نسب سمجھ لو کیونکہ وہ علم الانساب کے ماہر ہیں۔ پھر حضرت حسان حضرت ابو بکر صدیق کے پاس گئے، وہاں سے واپس لوٹ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! ابو بکر صدیق نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب مجھے بتا دیا ہے، اس ذات کی قسم جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش میں سے ایسے نکال لوں گا جیسے گوندھے ہوئے آٹے میں سے بال کو نکال لیا جاتا ہے۔ ام المؤمنین امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ روح القدس ہمیشہ تیری مدد کرتے رہیں گے جب تک تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مخالفین کو جواب دیتا رہے گا۔ پھر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قصیدہ پڑھا

اور ابوسفیان کو فی البدیہہ جواب دیا۔ فرمایا:

هَجَوْتُ مُحَمَّدًا فَأَجَبْتُ عَنْهُ وَعِنْدَ اللَّهِ فِي ذَلِكَ الْجَزَاءُ

تو نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو اور برائی کی ہے تو میں نے حضور کی طرف سے اس کا جواب دیا اور اس کا اصل بدلہ اللہ تعالیٰ ہی دے گا۔

هَجَوْتُ مُحَمَّدًا بَرًّا تَقِيًّا رَسُولَ اللَّهِ شَيْمَتُهُ الْوَفَاءُ

تو نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو اور برائی کی ہے جو نیک اور پرہیزگار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور آپ کی خصلت وفا کرنا ہے۔

فَإِنَّ أُنَىٰ وَوَالِدَيْ وَعِزِّي لِعِزِّضِ مُحَمَّدٍ مِنْكُمْ وَقَاءُ

میرے ماں باپ اور میری عزت و آبرو؛ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و آبرو بچانے کے لیے قربان ہیں۔

ثَلَكْتُ بُنْيَتِي إِنْ لَمْ تَرَوْهَا تُثَبِّرُ النَّقْعَ مِنْ كَنَفِي كَدَاءُ

اگر تم گھوڑوں کو مقام کداء کے دونوں جانب سے گردوغبار اڑاتا ہوا نہ دیکھو تو میں خود پرگریہ اور آہ وزاری کروں گا۔ مطلب یہ کہ تم پر ہم نے حملہ نہ کیا تو سمجھو میں ختم ہو گیا۔

يُبَارِيَنِ الْأَعِنَّةَ مُضْعِدَاتٍ عَلَى أَكْتَافِهَا الْأَسْلُ الْظِّمَاءُ

ایسے گھوڑے جو تمہاری طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے، ان کے کندھوں پر ہم نے ایسے نیزے رکھے ہوئے ہیں جو تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔

تَكُلُّ جِيَادُنَا مَتَمَطِّرَاتٍ تَلْظِمُهُنَّ بِالْخُمُرِ النِّسَاءُ

ہمارے گھوڑے تمہاری طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے اور ان گھوڑوں کے چہروں کو ہماری عورتیں اپنے دوپٹوں سے صاف کرتی ہیں۔

فَإِنْ أَعْرَضْتُمْ عَنَّا اعْتَمَرْنَا وَكَانَ الْفَتْحُ وَانْكَشَفَ الْعِطَاءُ

اگر تم ہم سے نہ بولو تو ہم عمرہ کر لیں گے اور فتح ہمارا مقدر ہوگی اور حقائق سے پردہ اٹھ جائے گا۔

وَاللَّا فَاصِیْبُوا لِضِرَابِ یَوْمٍ یُعِزُّ اللّٰهُ فِیْهِ مَنْ یَّشَاءُ

ورنہ اس دن کا انتظار کرو جس دن اللہ تعالیٰ عزت والوں کو عزت دے گا۔

وَقَالَ اللّٰهُ قَدْ اَرْسَلْتُ عَبْدًا یَقُولُ الْحَقَّ لَیْسَ بِہِ خَفَاءُ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے ایک بندے کو رسول بنا کر بھیجا ہے جو حق سچ بات کہتا ہے اور اس کی بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

وَقَالَ اللّٰهُ قَدْ اَرْسَلْتُ جُنْدًا هُمُ الْاَنْصَارُ عَزَمَتْهَا اللَّقَاءُ

اور اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ میں نے ایک لشکر بھیجا ہے جو انصار ہیں اور ان کا مقصد صرف دشمن کا مقابلہ کرنا ہے، اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد اور غرض نہیں ہے۔

لَنَا فِیْ كُلِّ یَوْمٍ مِنْ مَّعَدٍّ سَبَابٌ اَوْ قِتَالٌ اَوْ هِجَاءٌ

ہم تو ہر روز ایک نہ ایک چیز کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں، کبھی کافروں کی بری عادات اور غلط کاموں پر ان کی مذمت کرنے میں لگے ہوئے ہیں، کبھی کافروں سے جنگ کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور کبھی ان کافروں کی ہجو کرنے میں لگے ہیں۔

فَمَنْ یَّهْجُوْ رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنْکُمْ وَیَمْدَحْہُ وَیَنْصُرْہُ سَوَاءٌ

تم میں سے جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرے اور ان کی تعریف کرے یا ان کی مدد کرے، سب برابر ہے۔ یعنی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وَجِبْرِیْلُ رَسُوْلُ اللّٰهِ فِیْنَا وَرُوْحُ الْقُدِّیْسِ لَیْسَ لَہُ کِفَاءٌ

اور جبریل امین کو ہمارے پاس خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے اور روح القدس کا کوئی بھی مد مقابل نہیں ہے۔ یعنی جب اللہ کا اتنا عظیم اور مقرب فرشتہ ہم



میں ہے تو تم کس طرح ہم سے مقابلہ کرو گے؟! <sup>71</sup>

اب دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم شاباش دے رہے ہیں۔ تو حضور کی مدح میں ایسے قصیدے پڑھنا جائز ہیں، اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ میں محفل حمد و نعت کے حق میں ہوں، جو لوگ مخالفت کرتے ہیں وہ ٹھیک نہیں کرتے۔ بھائی! اگر نعت کا طرز اچھا نہیں ہے تو نعت کہنے کو برانہ کہو بلکہ کوشش کرو کہ طرز اچھا ہو جائے! اگر نعت خواں کوئی بدعت شروع کر دے تو بدعت کو ختم کرنے کی کوشش کرو لیکن نعت خوانی کو برانہ کہو! تو ان بنیادوں پر ان محفلوں کی مخالفت کبھی نہیں کرنی چاہیے۔

### فتح خیبر کے موقع پر اشعار کا تبادلہ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی طرف گئے ہیں۔ خیبر میں یہود کا معروف و مشہور پہلوان مرحب ہے، اس کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ وہ یہ اشعار پڑھتا ہوا مقابلے کے لیے نکلا:

قَدْ عَلِمْتُ حَيَبْرُؤَ أَيْ مَرْحَبُ شَاكِي السِّلَاحِ بَطْلُ مُجَرَّبُ

پورا خیبر جانتا ہے کہ میرا نام مرحب ہے، میں اسلحہ اٹھائے ہوئے ہوں، بہت بہادر پہلوان ہوں اور تجربہ کار آدمی ہوں۔

أَطْعَنُ أَحْيَانًا وَ حِينًا أَصْرِبُ إِذَا الْحُرُوبُ أَقْبَلَتْ تَلَهَّبُ

جب جنگ شروع ہوتی ہے اور شعلے مارتی ہے تو اس وقت میں کبھی نیزے کا وار کرتا ہوں اور کبھی تلوار سے حملہ کرتا ہوں۔

مرحب کی یہ بات سن کر حضرت عامر رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے، فرمایا:

قَدْ عَلِمْتُ حَيَبْرُؤَ أَيْ عَامِرُ شَاكِي السِّلَاحِ بَطْلُ مُعَامِرُ

اگر خیر تجھے جانتا ہے کہ تو مر حب ہے تو خیر مجھے بھی جانتا ہے کہ میرا نام عامر ہے، میں بھی اسلحہ سے لیس ہوں، بہادر پہلوان ہوں اور جب لڑتا ہوں تو موت کی پرواہ نہیں کرتا۔ اب میدان ہمارا فیصلہ کرے گا۔

حضرت عامر آگے بڑھے اور مر حب پر وار کیا، آپ کی تلوار چھوٹی تھی، وار کیا تو مر حب پیچھے ہٹ گیا اور تلوار اپنے گھٹنے کو لگی، حضرت عامر شہید ہو گئے۔ بعضوں نے کہا کہ ان کے اعمال ختم ہو گئے کیونکہ اپنی تلوار سے فوت ہوئے ہیں؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: عامر کو اللہ دوہرا اجر دے گا۔ محدثین فرماتے ہیں کہ ایک اجر شہید ہونے کا اور ایک اجر اپنوں کی باتیں سننے کا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عامر کی جگہ پر آگے بڑھے اور یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

أَنَا الَّذِي سَمَّيْتَنِي أُحْمَى حَيْدَرَهُ  
كَلَيْتَ غَابَاتٍ كَرِيهِ الْمَنْظَرَهُ  
أَوْفِيَهُم بِالصَّاعِ كَيْلَ السَّنْدَرَهُ

میں وہ شخص ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر یعنی شیر رکھا ہے، میں جنگل کے شیر کی طرح ہوں کہ میری ہیبت دیکھ کر مجھ سے دنیا ڈرتی ہے، آج تجھے ناپ ناپ کر دوں گا۔

آپ رضی اللہ عنہ نے ایک وار کیا، مر حب کے سر کے دو ٹکڑے کر دیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہو رہے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض نہیں ہو رہے۔ لیکن ہم اپنے آپ کو دیکھیں کہ ہم کیسے صوفی ہیں! ہم کیسے متقی ہیں! ہم کیسے داعی اور مبلغ ہیں کہ ہم ان باتوں پر ناراض ہوتے ہیں۔ میں بار بار کہتا ہوں کہ اپنے ایمان کی فکر کرو! اگر کوئی ضدی کافر ہو اور مر جائے تو اس کے مرنے پر افسوس نہیں ہے بلکہ اس کافر کے مرنے پر خوشی ہے۔ آپ نے وہ واقعہ پڑھا ہو گا کہ ایک جنگ کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اعلان فرما رہے ہیں:

مَنْ قَتَلَ قَتِيلًا فَلَهُ سَلْبُهُ.<sup>72</sup>

کہ جو شخص کسی کافر کو قتل کرے گا تو اس کافر کا سامان اس مجاہد کے لیے انعام ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ترغیب دے رہے ہیں۔

میں اس لیے عرض کرتا ہوں کہ دعوت کا معنی ہر گز یہ نہیں ہے کہ ہم شرعی حدود کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیں۔ میں نے کتنی بار آپ کو سمجھایا ہے کہ مرکز کی یہ خوبی ہے کہ ہم غلط بات نہیں کہتے اور میں اپنے فضلاء کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ اگر حق بات نہیں کہہ سکتے تو خاموش ہو جانا لیکن غلط بات کبھی نہ کہنا، آپ جہاد کا صحیح معنی نہیں بیان کر سکتے تو خاموش ہو جانا لیکن غلط معنی کبھی بیان نہیں کرنا! آپ کسی کا ساتھ نہیں دیتے تو چپ ہو جانا لیکن ان کے زخموں پر نمک مت چھڑکنا! جہنم کے دروازے اپنے لیے مت کھولنا! اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

### در سخن مخفی منم:

خیر میں عرض یہ کر رہا تھا کہ آدمی مؤمن ہو اور نیک اعمال کرے اور اللہ کو یاد کرے اور اس پر ظلم ہو تو بد لے کے لیے شعر کہے تو شریعت نے اس کی اجازت دی ہے، اس لیے ہر شعر برا نہیں ہوتا۔ میں اس پر اکثر یہ واقعہ سنایا کرتا ہوں کہ ایک بار ایران کے بادشاہ کے منہ سے ایک جملہ نکل گیا:

در ابلق کسے کم دیدہ موجود

”ابلق“ وہ موتی ہوتا ہے جو سفید ہو اور اس میں سیاہی کی آمیزش ہو۔ اس نے کہا کہ ایسا موتی دنیا میں کسی نے نہیں دیکھا۔ یہ ”کم“ بمعنی عدم ہے۔ اب اس نے اپنے سرکاری شعراء سے کہا کہ اس شعر کو پورا کرو۔ انہوں نے بہت کوشش کی لیکن

شعر پورا نہیں ہوا۔ یہ مصرعہ چلتے چلتے ہندوستان پہنچا۔ عالمگیر بادشاہ کی بیٹی زیب النساء آئینہ کے سامنے کھڑی آنکھوں میں سرمہ ڈال رہی تھی۔ جب اس نے آنکھوں میں سرمہ ڈالا تو آنکھ سے ایک آنسو نکلا جس کے اندر سیاہ سرمہ ملا ہوا تھا۔ اس نے فوراً شعر تیار کر لیا۔ یہ خاتون نیک بہت تھی اور شاعرہ بھی تھی۔ اس نے کہا:

در ابلق کسے کم دیدہ موجود مگر اشک بتان سرمہ آلود  
کہ دنیا میں ابلق موتی یعنی وہ موتی جس میں سفیدی اور سیاہی ملی ہوتی ہے کسی  
نے نہیں دیکھا لیکن محبوب کی آنکھ کا آنسو کہ جب اس میں سرمہ مل جائے تو وہ ابلق  
موتی بن جاتا ہے۔

کیسا اس خاتون نے کلام کیا۔ اب عالمگیر نے کہا کہ یہ لو شعر اور ایران کے  
بادشاہ کو بھیج دو۔ بادشاہ کو جب یہ مکمل شعر ملا تو بادشاہ عیش و عشرت کر اٹھا کہ یہ کیسا شاعر  
ہے جس نے شعر مکمل کیا ہے! اور شاعر کا ذوق دیکھو کہ اس نے کتنی بلند بات کی ہے!  
شعر و شاعری میں تو یہی باتیں ہوتی ہیں نا جس پر سبھی مرتے ہیں۔ اب بادشاہ نے کہا کہ  
اس شاعر کو ہمارے دربار میں لاؤ ہم اس کی زیارت کرنا چاہتے ہیں، ہم اسے انعام دیں  
گے۔ یہ پیغام عالمگیر کے پاس آیا تو عالمگیر پریشان ہوا کہ بیٹی کو ایرانی بادشاہ کے دربار  
میں کیسے بھیجوں! بیٹی نے جب اپنے والد کی پریشانی دیکھی تو کہا بادشاہ کو ہمارا یہ شعر بھیج  
دیکھیے۔ وہ شعر یہ تھا:

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

میں اپنے کلام میں اس طرح چھپی ہوئی ہوں جس طرح پھول میں اس کی  
خوشبو چھپی ہوتی ہے۔ جو شخص مجھے ملنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ میرا کلام دیکھ لے،  
کلام دیکھنے سے ہی ملاقات ہو جائے گی۔ جس طرح آپ خوشبو کو نہیں دیکھ سکتے البتہ

پھول کے ذریعے اسے محسوس کر سکتے ہیں اسی طرح ہمیں بھی نہیں دیکھ سکتے البتہ کلام کے ذریعے محسوس کر سکتے ہیں! بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ شاعر مرد نہیں ہے بلکہ عورت ہے اور یہ عورت ہمارے دربار میں آنے والی نہیں ہے۔ تو دیکھو شاعری سے بندہ کیسی بات کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاجِرُ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة النمل

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿طس﴾ تِلْكَ آيَاتُ الْقُرْآنِ وَكِتَابٍ مُبِينٍ ﴿١﴾ هُدًى وَبُشْرَى  
لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٢﴾ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ  
يُوقِنُونَ ﴿٣﴾

حروف مقطعات:

﴿طس﴾

اس پر کل بات ہوئی تھی کہ یہ ”طس“ اور اس جیسے کلمات یہ حروف  
مقطعات میں سے ہیں اور منتشابہات میں سے ہیں جن کا معنی اللہ رب العزت کی ذات  
کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

تذکرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام:

﴿إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا ۖ سَاتِيكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ  
آتِيكُمْ بِشَهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ﴿١٠﴾﴾

ان آیات میں حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ فرمایا ہے۔  
حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے مدین تشریف لے گئے اور شعیب علیہ السلام کی بیٹی

سے آپ کا نکاح ہوا۔ ان کے ساتھ آپ واپس تشریف لارہے تھے تو راستے میں بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی گھر والی امید سے تھیں۔ چونکہ سردی تھی اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قریب میں آگ نہیں تھی۔ انہوں نے دیکھا تو دور کوہ طور پر انہیں آگ جلتی ہوئی محسوس ہوئی تو گھر والوں سے کہا ﴿إِنِّي أَنَسْتُ نَارًا﴾ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ وہاں آگ ہے، میں وہاں جاتا ہوں اور آگ لے کر آتا ہوں یا ممکن ہے کہ وہاں کوئی بندہ مل جائے جس سے راستے کا پتا چل جائے گا۔ موسیٰ علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے تو ﴿فَوَدَّىٰ أَنْ بُورِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ وہاں آپ نے یہ آواز سنی کہ بابرکت ہے وہ جو آگ میں ہے اور بابرکت ہے وہ جو آگ کے قریب ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ ﴿مَنْ فِي النَّارِ﴾ سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی ذات ہے۔ موسیٰ علیہ السلام ایسی جگہ پر تھے جہاں یہ محسوس کر رہے تھے کہ میرے چاروں طرف آگ ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام بھی برکت والے ہیں اور ان کے آس پاس جو ملائکہ ہیں وہ بھی برکت والے ہیں۔ ﴿وَسُبْحَنَ اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ اللہ رب العزت جہات سے پاک ہیں، یہ جو خاص جہت میں آپ نے آگ دیکھی ہے یہ خدا نہیں ہے، اللہ جہات سے پاک ہیں۔

**درخت سے آواز آئی:**

﴿يُمُوسَىٰ إِنَّهُ أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾

یہاں سے آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں اللہ ہوں، غالب ہوں اور حکمت والا ہوں، اور قرآن کریم کی بعض آیات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو آواز اس درخت

میں سے آئی تھی ﴿إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي﴾ باتیں دونوں ٹھیک ہیں یعنی وہ درخت تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس درخت کو آگ لگی ہوئی ہے اور اس میں سے آواز آئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آواز سنی۔ یہ اللہ رب العزت کی آواز تھی جو بالکل بے کیف تھی اور ان کو بتایا گیا کہ یہ آواز اللہ رب العزت کی ہے۔ اب اس درخت سے آواز کا آنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ درخت بولتا ہے بلکہ اصل بات یہ تھی کہ اس درخت پر تجلی الہی پڑی اور درخت نے اللہ کی آواز کو آگے نقل کر دیا۔

اب یہاں منصور حلاج کا واقعہ سمجھیں کہ جو کہتے تھے ”انا الحق، انا الحق، انا الحق“۔ فقہاء نے ان کے قتل کا فتویٰ دیا اور صوفیاء کہتے ہیں کہ وہ بالکل ٹھیک تھے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ فقیہ کا معاملہ مسائل کا ہے، وہ امت کو اشتباہ سے بچاتا ہے اور صوفیاء کا معاملہ بالکل جدا ہے۔ صوفیاء کہتے ہیں کہ وہ جو ”انا الحق“ فرماتے تھے وہ اپنے بارے میں ”انا الحق“ نہیں کہہ رہے تھے بلکہ اللہ رب العزت کا ”انا الحق“ کہنا نقل فرما رہے تھے۔ تو یہ حکایت ہو رہی تھی اور یہ کفر نہیں ہوتا۔

اسی طرح بعض بزرگوں کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا ”سُبْحَانِي مَا أَعْظَمَ شَأْنِي“، تو لوگوں نے کہا کہ یہ کافر ہے۔ جب ہم اللہ کے بارے میں کہیں تو ہم یوں کہیں گے: ”سُبْحَانَهُ مَا أَعْظَمَ شَأْنُهُ“ اور وہ بزرگ جو کہہ رہے تھے ”سُبْحَانِي مَا أَعْظَمَ شَأْنِي“ تو وہ اپنے بارے میں نہیں کہہ رہے تھے بلکہ اللہ کے کلام کو نقل فرما رہے تھے۔ تو اللہ رب العزت کی جو تجلیات ہیں اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ تجلی منصور حلاج کی زبان پر ہو اور ”أَنَا الْحَقُّ“ کی آواز وہاں سے نکلے، اللہ چاہے تو وہ تجلیات کسی درخت پر پڑیں اور اس سے ﴿إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي﴾ کی آواز آئے، تو جس طرح وہ درخت سے نکلنے والی آواز درخت کی اپنی نہیں تھی اسی طرح



منصور حلاج کی زبان سے نکلنے والی آواز ان کی اپنی نہیں ہے بلکہ وہ حکایت کو نقل فرما رہے ہیں۔

### مسئلہ وحدۃ الوجود:

یہاں بعض حضرات نے مختصر طور پر وحدۃ الوجود کا مسئلہ بیان کیا ہے۔ میں اس مسئلہ پر مستقل ایک دن تخصص کی درس گاہ میں بات کروں گا کہ وحدت الوجود کیا ہے اور وحدت الشہود کیا ہے؟

وحدت الوجود کا معنی عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز ہے وہ خدا ہی ہے اور صوفیاء کے بارے میں عام لوگوں کا ذہن یہ ہے کہ صوفیاء ہر چیز کو خدا سمجھتے ہیں حالانکہ معاملہ یہ نہیں ہے۔ وحدت الوجود کا معنی ہوتا ہے کہ حقیقی وجود اللہ تعالیٰ کا ہے اور باقی وجود کا عدم ہے، گویا کہ فنا ہیں۔ ایک تو دنیا میں اللہ کی ذات کے علاوہ کسی چیز کا وجود اپنا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ کی ذات کے علاوہ دنیا میں کسی وجود کو بقاء حاصل نہیں ہے بلکہ تمام وجود فانی ہیں۔ تو ایسا وجود جو از خود ہو اور بغیر کسی کے پیدا کرنے کے ہو اور فانی بھی نہ ہو بلکہ باقی ہو تو وہ صرف اللہ کا وجود ہے، اسے وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔

تو خدا کی ذات پر صوفیاء کی نظر اتنی ہوتی ہے کہ باقی اشیاء ان کی نظر میں کا عدم ہوتی ہیں، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں صرف ایک ہی وجود ہے، باقی کوئی وجود نہیں ہے۔ اگر یہ بات دیکھیں تو غلط بھی نہیں ہے بالکل ٹھیک ہے۔ حقیقی وجود دنیا میں صرف ایک ہے، باقی وجود فنا کے درجے میں ہیں، اللہ رب العزت کی ذات گرامی کے مقابلے میں ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ تو یہ وحدت الوجود کا معنی ہے۔

اور وحدت الشہود کا معنی یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں ایک اللہ کا وجود ان کو نظر آتا ہے اور خدا کی ذات پر اتنی گہری نظر ہوتی ہے کہ باقی چیزوں کے وجود انہیں نظر

نہیں آتے۔ اس کی مثال ایسے سمجھیں جیسے سورج نکل آئے تو ستارے ختم نہیں ہوتے، ستارے موجود تو ہوتے ہیں لیکن سورج اتنی تیز روشنی کے ساتھ آتا ہے کہ ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اور نظر نہیں آتے۔ تو جس طرح سورج کے ہوتے ہوئے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اور نظر نہیں آتے بالکل اسی طرح صوفیاء کی اللہ کی ذات پر اتنی گہری نگاہ ہوتی ہے کہ باقی چیزوں کا وجود انہیں نظر نہیں آتا۔ تو اس میں بھی حرج کی کوئی بات نہیں ہے۔

یہ بات سمجھیں کہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود عقائد کا نہیں بلکہ تصوف کا مسئلہ ہے اور تصوف کے مسائل کو تصوف کی عبارات اور تصوف کی اصطلاحات سے سمجھنا چاہیے، یہ عقائد کی اصطلاحات سے سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ باقی وحدۃ الوجود پر مستقل بات کرنے کی ضرورت ہے جس میں اس مسئلہ پر ہونے والے اشکالات کا رد ہو کیونکہ اس کی بنیاد پر بہت سارے لوگ آج کل اہل حق پر کفر کے فتوے لگا رہے ہیں کہ تم وحدۃ الوجود کے قائل ہو۔ تو اس مسئلہ کو مستقل سمجھنے کی ضرورت ہے۔

**عطائے معجزہ کے وقت موسیٰ علیہ السلام کو تسلی:**

﴿وَأَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّى مُدْبِرًا وَلَمْ

يُعَقِّبُ يُمُوسَى لَا تَخَفْ إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيْ الْمُرْسَلِينَ﴾

موسیٰ علیہ السلام کو اللہ رب العزت نے فرمایا کہ اپنی لاٹھی پھینکو! آپ نے پھینکی تو وہ اڑ دھا بن گیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس اڑدھے سے خوف محسوس کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ڈرنے کی بات نہیں ہے! ایسے مقامات پر پیغمبر ڈرتے نہیں ہیں، ڈرتا تو وہ ہے جس نے ظلم کیا ہو۔ یہ استثناء منقطع ہے۔ اور وہ بھی اگر توبہ کر لے تو اسے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور آپ سے تو کوئی گناہ بھی نہیں ہوا۔

یہ بات کہہ کر موسیٰ علیہ السلام کی ایک الجھن کو دور کیا ہے کہ جو آپ نے

قبطی کو قتل کیا تھا وہ قتل کرنا گناہ تو نہیں تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام اپنے اوپر بوجھ محسوس کر رہے تھے کہ میرے ہاتھ سے ایک بندہ قتل ہو گیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوءٍ فَإِنِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ اگر کوئی بندہ واقعتاً ظلم کر لے، پھر توبہ کر لے تو ہم اس کو بھی معاف کر دیتے ہیں اور آپ نے تو کوئی ظلم نہیں کیا، آپ کا کوئی گناہ بھی نہیں تھا پھر بھی آپ اس الجھن میں ہیں، آپ اس الجھن کو چھوڑیں اور کھل کر دین کا کام کریں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات سمجھائی جا رہی ہے۔

یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے شاگرد کسی علاقے میں کام کرے اور وہ بعض الجھنیں اپنے استاد کو بتاتا ہے کہ استاد جی! جب میں پڑھتا تھا تو مجھ سے یہ غلطی ہوئی تھی۔ استاد کہتا ہے کہ یہ تو غلطی تھی ہی نہیں، ہم نے تو اس کا اختیار دیا ہوا تھا، تم اس الجھن کو چھوڑو اور بس کام کرو! تو استاد کی طرف سے تسلی دی جا رہی ہوتی ہے۔ تو اللہ رب العزت نے موسیٰ علیہ السلام کی الجھن کو دور کر کے تسلی عطا فرمائی۔ اس موقع پر ﴿مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوءٍ﴾ کا معنی اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔

### نوشانیوں کا بیان:

﴿وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجَ بَيْضًا مِّنْ غَيْرِ سُوءٍ﴾ فِي تَسْعِ آيَةٍ

إِلَى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِقِينَ ﴿٧٧﴾

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ اپنی بغل میں ہاتھ ڈالیں، جیب کٹی ہوئی چیز کو کہتے ہیں، بعض اسے گریبان کہتے ہیں اور بعض بغل کہتے ہیں، جب بغل میں ہاتھ ڈالیں گے تو ہاتھ چمکتا ہوا باہر نکلے گا، بالکل صاف و شفاف ہو گا، اس میں کوئی عیب نہیں ہو گا۔ ﴿فِي تَسْعِ آيَةٍ﴾ یہ دونوں چیزیں - عصا کا سانپ بننا اور ہاتھ کا چمکتے ہوئے بغل سے نکلنا - ان نوشانیوں میں سے ہیں جو ہم آپ کو دے رہے ہیں، آپ ان کو لے کر فرعون

اور اس کی قوم کی طرف جائیں۔ وہ نو نشانیاں یہ تھیں:

- 1: ید بیضا... چمکتا ہوا ہاتھ۔
  - 2: عصا... جب موسیٰ علیہ السلام لاٹھی پھینکتے تو وہ اڑدھا بن جاتی، کبھی لاٹھی پھینکی تو بارہ چشمے نکل آئے، کبھی لاٹھی پھینکی تو سمندر میں بارہ راستے بن گئے۔
  - 3: نقص ثمرات... ایک وقت ایسا آیا کہ فرعونوں کے پھلوں میں کمی آگئی۔
  - 4: سنین... یعنی قحط سالی۔ فرعونی قحط میں مبتلا ہوئے، کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا، فرعونوں نے موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کی۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی۔ جب قحط ختم ہو گیا تو فرعونی پھر اپنی سرکشی میں مبتلا ہو گئے۔
  - 5: طوفان... اس طوفان سے گھبرا کر فرعون کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کی کہ یہ عذاب ہم سے دور ہو جائے۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ طوفان دور ہوا۔
  - 6: ٹڈی دل... ایک عذاب ٹڈیوں کا ان پر مسلط کر دیا گیا۔ ٹڈی دل نے ان کے سارے کھیتوں اور باغوں کو کھالیا۔
  - 7: قمل... یعنی جوئیں، کپڑوں میں جوئیں، بالوں میں جوئیں، ہر چیز میں جوئیں پڑ گئیں تو ان کے لیے کھانا مشکل ہو گیا، موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ دعا کریں۔ آپ نے دعا کی جو وہوں کا عذاب ختم ہو گیا لیکن یہ لوگ پھر نڈر ہو گئے۔
  - 8: ضفادع... مینڈک، ہر چیز میں مینڈک کھانے میں، پینے میں۔
  - 9: دم... خون، جو کھاتے پیتے وہ خون بن جاتا۔
- آپ اندازہ کریں کس قدر ضدی قوم تھی کہ اس قدر تباہیوں کے باوجود یہ پھر بھی ٹھیک نہیں ہوتے تھے۔ اللہ رب العزت ہمیں سمجھ عطا فرمائیں کہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح امتی بنیں، اسی میں خیر ہے۔ (آمین)

## ضد؛ قبول حق میں سخت رکاوٹ ہے:

﴿وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا فَانظُرْ كَيْفَ

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ﴾

ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھے اور انہیں موسیٰ علیہ السلام کی سچائی اور حقانیت کا یقین ہو چکا تھا پھر بھی ظلم اور تکبر کی وجہ سے انکار کرتے رہے۔ یہاں ﴿وَاسْتَيْقَنَتْهَا﴾ کا جملہ یہ حالیہ جملہ ہے، ترجمہ یوں کریں گے: حالانکہ ان کا دل یقین کرتا تھا کہ بات بالکل ٹھیک ہے لیکن پھر بھی انکار کرتے تھے۔

دنیا میں ایسے ہوتا ہے کہ آدمی ضد اور حسد کی وجہ سے کسی بات کو قبول نہیں کرتا، دل مانتا ہے کہ یہ بات ٹھیک ہے پھر بھی قبول نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ضد اور حسد کی آگ سے محفوظ فرمائے۔ (آمین)

## نبی کی وراثت علمی ہوتی ہے:

﴿وَوَرِثَ سُلَيْمَنُ دَاوُدَ﴾

حضرت داؤد علیہ السلام والد تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام ان کے بیٹے تھے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث بنے۔ نبی کی وراثت مالی نہیں ہوتی۔ پیغمبر کے مال کا دنیا میں کوئی وارث نہیں بنتا اور پیغمبر اپنے کسی رشتہ دار کا دنیاوی امور میں وارث نہیں بنتا۔ تو پیغمبر نہ وارث ہوتا ہے نہ موروث ہوتا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث بنے اور یہ وراثت مالی نہیں بلکہ علمی اور روحانی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے علم، فکر اور روحانیت کے وارث حضرت سلیمان علیہ السلام بنے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک بیٹا تو نہیں تھا بلکہ انیس بیٹے تھے

لیکن وارث صرف ایک بیٹا حضرت سلیمان بنا۔ تو اگر یہ وراثت مالی ہوتی تو ایک بیٹے کو نہیں بلکہ تمام بیٹوں کو مساوات کے ساتھ ملتی کیونکہ مساوات کے بغیر تقسیم پیغمبر کی شان کے لائق نہیں ہے۔ اس لیے حضرت سلیمان علیہ السلام جو حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث بنے ہیں تو یہ وراثت مالی نہیں بلکہ یہ وراثت علمی ہے۔

اور مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ایک روایت ذکر کی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث بنے تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام کے وارث ہوئے۔<sup>73</sup>

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے چودہ سو سال بعد تشریف لارہے ہیں، درمیان میں لوگ وارث نہیں بنے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وارث بن رہے ہیں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ یہ وراثت مالی نہیں بلکہ وراثت علمی تھی۔

### باغ فدک کا مسئلہ:

اس سے یہ مسئلہ بڑے آرام سے سمجھ آ جاتا ہے کہ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئیں اور ان سے فرمایا کہ خیر میرے ابو جی کا مال ہے اور میں ان کی وارث ہوں، تو خیر کا جو باغ ہے باغ فدک؛ وہ مجھے وراثت میں دے دیں!

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے خود آپ کے والد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ:

"إِنَّا مَعْتَصِرُ الْكَتُبِیَّاءِ لَا نُؤَرِّثُ مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ".<sup>74</sup>

فرمایا کہ ہم نبیوں کے گروہ ہیں، ہمارے مال میں کوئی وارث نہیں ہوتا، جو مال نبی چھوڑ کر جائے وہ امت کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔

حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو بات سمجھ میں آگئی، سیدہ رضی اللہ عنہا چھ ماہ تک زندہ رہیں لیکن انہوں نے پھر کبھی بھی باغ فدک کا مطالبہ نہیں کیا، جبکہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا ناراض تھیں اس لیے بات نہیں کی۔ ہم کہتے ہیں کہ سیدہ رضی اللہ عنہا ناراض نہیں تھیں بلکہ انہوں نے جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اپنے بابا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنی تو انہیں مسئلہ سمجھ میں آگیا، اسی لیے انہوں نے تادم حیات پھر کبھی بھی مطالبہ نہیں کیا۔ یہ بات غلط ہے کہ وہ ناراض تھیں، اور ہمیں بہت سی باتوں پر تعجب ہوتا ہے اب آپ کو بھی تعجب ہو گا۔ ہمیں تعجب کیا ہے کہ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا جن کا وراثت کا دعویٰ تھا ان کو مسئلہ سمجھ میں آگیا اس لیے انہوں نے وراثت پر پھر کبھی بات نہیں کی لیکن تیرہ چودہ سو سال گزر گئے اور آج لوگ لڑ رہے ہیں کہ جی! صدیق نے حضرت زہراء کو وراثت کیوں نہیں دی؟! ہے نا تعجب کی بات کہ جن کا تعلق بھی نہیں ہے وہ ابھی تک لڑ رہے ہیں کہ جی! باغ فدک تھا کس کا اور لے کون گیا! حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کو کیوں نہیں ملا؟

### حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مطالبے کی وجہ:

یہاں ایک بات سمجھ لیں کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو شبہ کیوں ہوا کہ یہ ہمارا مال ہے؟ دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کے فتح ہونے کے بعد اپنی

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو پورے سال کا خرچ اس فذک کے باغ سے دیتے تھے لیکن ازواج مطہرات اس مال میں سے ضرورت کا رکھتیں اور باقی خرچ کر دیتی تھیں۔ تو حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو شبہ یہ ہوا کہ اگر یہ مال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مال سے سال کا خرچہ گھر والوں کو کیوں دیتے تھے؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا تھا اور ان کے جانے کے بعد ہم اولاد وارث ہیں لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب یہ مسئلہ سمجھایا تو حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کو مسئلہ سمجھ میں آگیا۔

### حیات الانبیاء علیہم السلام کی دلیل بطر زنا توئی:

اسی حدیث کے ضمن میں میں یہ بات کہتا ہوں کہ قاسم العلوم والخیرات بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ اسی حدیث ”إِنَّا مَعَشَرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُورُثُ مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ“ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نبی اپنی قبر میں زندہ ہوتا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص زندہ ہو، روح اور جسم کا تعلق ہو تو مال کا مالک وہ بندہ خود ہوتا ہے، دوسرے بندے کا اس مال سے حق وابستہ نہیں ہوتا لیکن جب اس شخص کی روح اور جسم کا تعلق ختم ہو جائے، اس پر موت آجائے تو اس کے وارث اس کے مال کے مالک بن جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مال کا کوئی وارث کیوں نہیں بنا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب پیغمبر پر موت آتی ہے تو ظاہر پر موت آجاتی ہے لیکن قلبِ اطہر میں حیات رہتی ہے تو جب حضور کی روح کا جسم سے تعلق باقی ہے تو آپ کا مال آپ کی ملک سے نکلا نہیں ہے، اس لیے اس مال کا کوئی وارث بنا بھی نہیں ہے۔

تو پیغمبر کے مال کا رشتہ داروں کی ملک نہ بننا اس بات کی دلیل ہے کہ روح کا جسدِ اطہر کے ساتھ ایسا تعلق موجود ہے کہ پیغمبر کا مال اس کی ملک سے نہیں نکلتا اور پھر



فرمایا ”مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ“ کہ جو مال ہم چھوڑیں وہ ہمارے رشتہ داروں کا نہیں بلکہ امت کے لیے صدقہ ہے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ حدیث پاک کا جزء بھی دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں کیونکہ کسی شخص کا مال صدقہ تب بنتا ہے جب صدقہ کرنے والا صدقہ کرتے وقت زندہ ہو، اگر صدقہ کرنے والا صدقہ کرتے وقت زندہ نہ ہو تو مال صدقہ کیسے بنے گا؟ پیغمبر پر موت آ بھی رہی ہے اور مال امت کے لیے صدقہ بن بھی رہا ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ بوقت موت پیغمبر میں اب بھی حیات موجود ہے تبھی تو مال صدقہ بنا ہے! صدقہ بننے کے لیے متصدق کا زندہ ہونا ضروری ہے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر پر موت ہے لیکن قلبِ اطہر میں حیات ہے، اب بطور وراثت کے مال نبوت کا تقسیم نہ ہونا یہ بھی دلیل حیات ہے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ساری بحث اپنی کتاب ”آب حیات“ میں لکھی ہے۔

### حضرت نانوتوی کے علوم:

حضرت سہارنپوری المہند علی المفند میں لکھتے ہیں کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے آب حیات میں وہ تحقیق بیان فرمائی ہے کہ جو آپ سے پہلے کسی نے نہیں فرمائی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اس کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ پٹرول میں حرارت ہوتی ہے اگرچہ بظاہر ٹھنڈک ہی کیوں نہ ہو۔ اگر آپ ٹھنڈے پٹرول کو جلتی آگ پر ڈال دیں تو آگ بھڑک اٹھتی ہے حالانکہ پٹرول ٹھنڈا ہے، اس کے ظاہر میں برودت ہے لیکن پٹرول میں حرارت ہے جس کی وجہ سے آگ بھڑک اٹھی ہے، اور اگر آپ جلتی آگ پر گرم پانی ڈال دیں تو آگ پھر بھی بجھ جاتی ہے، کیونکہ اگرچہ پانی اوپر سے گرم ہے لیکن پانی میں خاصہ برودت کا ہے جو آگ کو بجھا رہا ہے۔ اسی طرح پیغمبر کے ظاہر پر موت بھی ہو تو پیغمبر کے قلبِ اطہر میں حیات ہوتی ہے اس لیے مولانا

نانو تو ہی فرماتے ہیں کہ پیغمبر کی جو موت ہے وہ مزیل حیات نہیں ہوتی بلکہ سائر حیات ہوتی ہے یعنی حیات کو چھپا لیتی ہے جبکہ امتی کی موت مزیل حیات ہوتی ہے کہ حیات کو ختم کر دیتی ہے۔ جیسے ایک دیا جل رہا ہو، آپ اس کے اوپر الٹا پیالہ رکھیں تو اس پیالے کی وجہ سے دیا بجھتا نہیں ہے بلکہ چھپ جاتا ہے تو پیغمبر کے قلب اطہر میں جو حیات کا دیا جلتا ہے اس کے اوپر موت کا پیالہ آ جائے تو حیات کا دیا بجھتا نہیں ہے، وہ چھپ جاتا ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

اگر حضرت نانو تو ہی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم بندے کو سمجھ آ جائیں تو لطف آتا ہے، جب سمجھ میں نہیں آتے تو ”وَالنَّاسُ أَغْدَاءٌ لِّمَا جَهِلُوا“ پھر لوگ اس کی مخالفت مول لیتے ہیں کہ بندہ ٹھیک نہیں کہتا۔ اللہ رب العزت ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### پرندوں کی بولیاں:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ عَلِمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَأَوْتَيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۖ﴾

اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ضرورت کی ہر چیز دی گئی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی بولیوں کے ساتھ دیگر جانوروں کی بولیاں بھی سکھائی تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سے اور جانوروں نے بھی بات کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کو جواب دیا ہے۔ لیکن یہاں بطور خاص سلیمان علیہ السلام ”مَنْطِقَ الطَّيْرِ“ فرما کر پرندوں کی بولی کی بات کر رہے ہیں لیکن باقی جانوروں کی بولیوں کی بات نہیں کر رہے حالانکہ سلیمان علیہ السلام چوہو نی کی بات بھی سمجھتے ہیں جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ جب چوہو نی نے کہا ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ﴾

اَدْخُلُوا مَسْكِنَكُمْ ﴿۱﴾ کہ اے چوٹیو! اپنی اپنی بلوں میں گھس جاؤ! سلیمان علیہ السلام نے چوٹی کی آواز کو سنا اور سمجھ بھی گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف پرندوں کی بولیاں نہیں بلکہ سلیمان علیہ السلام دوسرے جانوروں کی بولیاں بھی سمجھتے تھے۔ یہاں بطور خاص ”مَنْطِقُ الطَّيْرِ“ پرندوں کی بولیوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ آگے جو گفتگو آرہی ہے اس کا تعلق پرندے کے ساتھ ہے اسی لیے فرمایا کہ ہمیں پرندوں کی بولیاں بھی سکھائی گئی ہیں۔

### اہل بدعت کے استدلال کا جواب:

﴿وَأُوتِينَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ حضرت سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہمیں ہر چیز دی ہے۔ ﴿كُلِّ شَيْءٍ﴾ کے بارے میں ایک بات یاد رکھ لیں، اہل بدعت عموماً دھوکہ دیتے ہیں۔ اہل بدعت کہتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا: ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ کہ دیکھو! آدم علیہ السلام کو اللہ نے تمام چیزوں کا علم دیا۔ یہاں ”کل“ کا لفظ ہے اور کل عموم کے لیے آتا ہے۔ جب آدم علیہ السلام کے پاس ہے تو حضور ان سے افضل ہیں تو حضور کے پاس تو بطریق اولیٰ ہوگا۔ اس سے اہل بدعت علم غیب ثابت کرتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھیں کہ ”کل“ کا لفظ ہمیشہ عموم کلی کے لیے نہیں آتا بلکہ بعض اوقات لفظ ”کل“ لایا جاتا ہے لیکن اس سے ایک خاص حد تک عموم مراد ہوتا ہے بالکلیہ عموم مراد نہیں ہوتا۔ جیسے یہاں فرمایا کہ ﴿وَأُوتِينَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ ہمیں ہر چیز دی گئی تو اب یہاں یہ معنی نہیں کہ دنیا بھر کی تمام چیزیں سلیمان علیہ السلام کو دی گئی تھیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ سلطنت میں جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کو وہ دی گئی تھیں جیسے فوج، طاقت، افراد، وزیر، مشیر وغیرہ۔ اگر

لفظ ”کل“ کا عموم کلی والا معنی مراد لیا جائے کہ دنیا جہاں اور تمام عالم کی ہر ہر چیز دی گئی تو یہ معنی درست نہیں بنتا کیونکہ آگے جو قصہ آرہا ہے ملکہ سباء کا تو اس کے پاس جو تخت تھا وہ تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس نہیں تھا تو پھر عموم کلی والا معنی کیسے ٹھیک ہوگا؟ تو یہاں لفظ ”کل“ کا یہی مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں حکومت دی ہے اور حکومت کے متعلقہ جتنے امور ضروری ہوتے ہیں خدا نے مجھے سارے عطا فرمادیے ہیں، اور یہاں ”کل“ سے عموم کلی مراد نہیں اس پر ایک اور دلیل خود آگے قرآن کریم کی یہ آیت ہے: ﴿إِنِّي وَجَدْتُ أُمْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ﴾ ہد ہد نے کہا کہ میں نے ایک ایسی عورت کو دیکھا ہے جو لوگوں پر حکومت کرتی ہے اور اس کو ہر چیز ملی ہے اور اس کا ایک تخت بھی ہے۔ اب اس عورت کو ہر چیز کہاں ملی ہے! اس کو تو شوہر نہیں ملا تھا اور ہر چیز کیا اس کو ملنی ہے! ملکہ بلقیس تو سلیمان علیہ السلام کے پاس آنے سے پہلے کنواری تھی، اس لیے اہل بدعت کا ”مِنْ كُلِّ شَيْءٍ“ کا معنی یہ کرنا کہ سلیمان علیہ السلام کو ہر ہر چیز ملی ہے، بالکل غلط ہے۔

### چیونٹی کی گفتگو سننا:

﴿حَتَّىٰ إِذَا أَتَوْا عَلَىٰ وَادِ النَّسْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يَا أَيُّهَا النَّسْلُ ادْخُلُوا مَسْكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمُنُ وَجُنُودُهُ ۖ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ﴾<sup>(۱۷)</sup>

اس سورت کا نام سورۃ النمل ہے، اس لیے کہ سورت کے درمیانی حصہ میں میں چیونٹیوں کا ذکر آیا ہے۔ سلیمان علیہ السلام کا لشکر جارہا تھا، راستے میں چیونٹیوں کی بستی تھی تو ایک چیونٹی نے آواز دے کر باقی چیونٹیوں سے کہا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّسْلُ ادْخُلُوا مَسْكِنَكُمْ﴾ کہ اے چیونٹیو! اپنی اپنی بلوں میں گھس جاؤ! ﴿لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمُنُ وَجُنُودُهُ ۖ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ﴾ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان علیہ

السلام کا لشکر تمہیں روند ڈالے گا اور انہیں پتا بھی نہ چلے کہ ہمارے پاؤں کے نیچے کچھ آیا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے جب جیونٹی کی یہ بات سنی تو ﴿فَتَبَسَّ مَضَاجِکًا مِّنْ قَوْلِهَا﴾ آپ علیہ السلام مسکرا پڑے اور کہا: اے اللہ! آپ نے جو نعمت مجھے دی ہے اور میرے والدین کو دی ہے مجھے اس کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما اور مجھے توفیق دے کہ میں نیک اعمال کروں جو تجھے پسند ہوں اور اپنی رحمت کے ساتھ مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما! تو سلیمان علیہ السلام کے پاس سب نعمتیں موجود ہیں اس پر اللہ کا شکر ادا فرما رہے ہیں۔

### پرندوں کی حاضری اور ہدہ کی غیر حاضری:

﴿وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهَدْهَدَ ۚ أَمَرَ كَانٌ مِّنَ

الْعَالَمِينَ﴾

سلیمان علیہ السلام چونکہ بادشاہ تھے اور بادشاہ کے ذمہ ہے اپنی رعایا کی نگرانی کرنا تو سلیمان علیہ السلام بھی نگرانی کرتے تھے اور پوچھتے تھے کہ فلاں کدھر ہے؟ فلاں کدھر ہے؟ آپ سفر میں ہیں تو آپ نے سفر میں پوچھا کہ ہدہ کدھر ہے؟ یہ کیوں پوچھا؟ اس لیے کہ ہدہ کی خاصیت یہ ہے کہ زمین کے نیچے اس کو پانی نظر آتا ہے، پانی کتنا گہرا ہے اس کو پتا چلتا ہے۔ تو سلیمان علیہ السلام اپنے لشکر کے ساتھ ہدہ رکھتے تھے، جہاں پڑا ہوتا تو اس سے پوچھتے کہ پانی کہاں پر ہے؟ ہدہ بتاتا کہ نیچے پانی ہے، آپ علیہ السلام جنات سے فرماتے کہ پانی نکالو۔ وہ نکالتے تو بس تھوڑی دیر بعد وہاں پر تالاب بن جاتا تھا اور لشکر وہاں سے پانی پیتا تھا۔ دنیا میں اللہ نے سلیمان علیہ السلام کو کیا حکومت عطا فرمائی تھی! سبحان اللہ۔

چونکہ ہدہ نہیں تھا اس لیے حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ﴿مَا لِيَ لَا

أَزَىٰ الْهَذَا ۖ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَافِلِينَ ﴿۱﴾ مجھے کیا ہو گیا ہے کہ مجھے ہد ہد نظر نہیں آ رہا یا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے؟! حضرت سلیمان علیہ السلام نے پہلے اپنی بات کی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے کہ مجھے ہد ہد نظر نہیں آ رہا۔ پہلے نسبت اپنی طرف کی امت کو یہ بات سمجھانے کے لیے کہ میرے ذمہ ہے کہ میں ان کی نگرانی کروں، مجھے خدشہ ہے کہ وہ چھوٹا سا پرندہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس کی نگرانی نہیں کر سکا اور وہ کہیں بھٹک گیا ہو اور اس کو کچھ ہونہ گیا ہو! یہ میری وجہ سے تو کہیں بھٹک نہیں گیا؟! لیکن جب پورا یقین ہو گیا کہ یہ میری وجہ سے نہیں بھٹکا بلکہ وجہ کوئی اور ہو گی تو فرمایا: ﴿۲﴾ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَافِلِينَ ﴿۲﴾ یہاں ”اَمْ“ کا لفظ ”بَل“ کے معنی میں ہے، مطلب کہ میری وجہ سے نہیں بلکہ وہ خود کہیں ادھر ادھر ہو گیا ہے۔ اچھا! تلاش کرو کہ وہ کہاں ہے؟ آگے فرمایا کہ اس کو لاؤ ﴿۳﴾ لَا عَذَابَ لَّكَ عَذَابًا شَدِيدًا ﴿۳﴾ یا تو میں اس کو اچھی خاصی تنبیہ کروں گا اگر معمولی غلطی ہوئی تو اور ﴿۴﴾ لَا أَذْبَحُكَ ﴿۴﴾ اگر بہت بڑی غلطی ہوئی تو ذبح کر دوں گا، ﴿۵﴾ أَوْ لِيَأْتِيَنَّيَ سُلْطٰنٌ مُّبِينٌ ﴿۵﴾ یا اگر معقول عذر ہو تو میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔

### حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعے سے مستنبط چند مسائل:

اس واقعے سے مفسرین نے چند مسائل بیان فرمائے ہیں:

**نمبر 1:** ایک مسئلہ یہ بیان فرمایا ہے کہ بڑوں کی ذمہ داری ہے اپنے ماتحتوں کی نگرانی کرنا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرماتے تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا پوچھتے تھے، جب کوئی نماز میں نہیں ہوتا تو آپ پوچھتے کہ فلاں شخص نماز کے لیے کیوں نہیں آیا؟ جی! بیمار ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جا کر اس کی بیمار پرسی فرماتے۔ فلاں کیوں نہیں آیا؟ جی! اس کی شادی ہے۔ فلاں کیوں نہیں آیا؟ جی! اس کا یہ عذر ہے۔ تو یہ پیغمبر علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

**نمبر 2:** ماتحت آدمی اگر کوئی جرم کرے تو اس کو سزا دینی چاہیے۔ دیکھو! یہ پرندہ ہے انسان نہیں ہے اور سلیمان علیہ السلام اس کو بھی سزا دینے کی بات کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ جانور جو پالتو ہوں اور کوتاہی کریں تو ان کو اس درجے میں سزا دینا جو قابل برداشت ہو یہ قرآن کریم سے ثابت ہے۔ آپ کا پالتو گدھا ہے، پالتو گھوڑا ہے، پالتو بھینس ہے، وہ نافرمانی کریں کوتاہی کریں تو تھوڑی سی سزا دے سکتے ہیں۔

**نمبر 3:** اگر انسان ہو اور انسان کے ماتحت ہو اور وہ خرابی پیدا کرے تو اس کو تو سزا دینے کی بطریق اولیٰ گنجائش موجود ہے۔

خیر! وہ ہد آگیا تو ہد ہد نے آکر بتایا کہ میں نے ایک عورت کو دیکھا ہے جس کی بہت بڑی سلطنت ہے، ﴿وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ﴾ اس کا بہت بڑا تخت ہے۔ بطور خاص اس کے تخت کا ذکر کیا ہے باقی چیزوں کا ذکر نہیں کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا تخت شاہی قیمتی بہت تھا اور اس کی پوری سلطنت میں بے بہا قیمت والا اور ایک عجبہ سے کم نہیں تھا۔ بلقیس نے سات محل بنائے اور ساتوں محلات کے وسط میں اس نے اپنا محل بنایا ہوا تھا یعنی اس کے محل تک پہنچنے کے لیے سات محل کر اس کرنے پڑتے تھے۔ ایک بڑا محل، اس میں چھوٹا محل، اس میں پھر چھوٹا، پھر چھوٹا، پھر چھوٹا۔ اس کا تخت اسی ہاتھ لمبا، چالیس ہاتھ چوڑا اور تیس ہاتھ اونچا تھا اور اس پر جواہرات، سونے اور چاندی جو کچھ اس کے بس میں تھا اس نے لگا دیا تھا۔ تو ہد ہد نے کہا کہ وہ لوگ مشرک ہیں، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سورج کی پوجا کرتے ہیں شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال مزین کر رکھے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ چلو ہم دیکھتے ہیں کہ تم سچ بولتے ہو یا جھوٹ بولتے ہو! تو سلیمان علیہ السلام نے اس کو ایک خط دیا اور فرمایا: جا کر ان تک پہنچاؤ، پھر ایک طرف بیٹھ جانا اور دیکھنا کہ وہ کیا کہتے ہیں! اس خط کو ہد ہد نے لیا، یا تو

مجلس میں جا کر رکھا یا بلقیس اکیلی تھی اس کے پاس جا کر چھوڑا۔

**کسی کی نجی زندگی میں مداخلت نہ کریں!**

﴿ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَأَنْظَرُوا مَاذَا يَرِجْعُونَ﴾

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہد ہد سے فرمایا تھا کہ جب خط پہنچا دینا تو ذرا ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو جانا، پھر دیکھنا کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔

اس سے مفسرین نے ایک مسئلہ بیان کیا ہے کہ جب کسی کا پیغام لے کر جائیں تو پیغام پہنچا کر اس پر مسلط نہ ہوا کریں بلکہ ایک طرف ہو جائیں، پھر انتظار کریں کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ اس سے کتنی آسانی سے باتیں سمجھ آرہی ہیں کہ کسی کی چیز کو دیکھو مت! کسی کی چیز کو پڑھو مت! کسی کا میسج نہ پڑھو! کسی کا خط نہ دیکھو! کسی کی نجی زندگی میں مداخلت نہ کرو!

**حضرت سلیمان کا خط ملکہ بلقیس کے نام:**

خیر! ہد ہد نے خط پیش کر دیا۔ اب ملکہ نے اپنے وزراء اور خواص کو جمع کیا اور اس نے کہا ”يَا أَيُّهَا الْمَلَأُوا إِلَيَّ أَنْفِي إِلَيَّ كِتَابٌ كَرِيمٌ“ اے سرداران قوم! ایک زبردست اور عظیم الشان خط میرے پاس آیا ہے جو سلیمان کی طرف سے ہے اور خط کا مضمون یہ ہے:

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾ أَلَا تَعْلَمُونَ عَلَىٰ وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ ﴿٦٦﴾

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ میرے مقابلے میں بغاوت اور سرکشی نہ کرو بلکہ فرمانبردار بن کر میرے پاس پہنچو!

پوری تاریخ میں سلیمان علیہ السلام کے خط سے جاندار خط آج تک کبھی کسی



طاقت سے لکھ رہا ہے۔

خط کے بارے میں ہمیشہ یاد رکھیں کہ شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنی چاہیے اور بسم اللہ لکھنے کے بعد اپنے نام سے خط کا آغاز کرنا چاہیے مثلاً ”مَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ إِلَى فُلَانٍ“ یہ خط عبد الرحمن کی طرف سے فلاں کے نام پر ہے، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بھی یہی ہے۔ اگر کوئی شخص خط کے شروع میں اپنا نام لکھنے کے بجائے خط کے آخر میں لکھے تو جائز یہ بھی ہے لیکن اگر شروع میں اپنا نام لکھنا چاہیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بسم اللہ لکھیں، پھر اپنا نام لکھیں اور پھر خط لکھیں۔

### خط لکھنے کا طریقہ:

قرآن کریم میں جو خط موجود ہے اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ہے، بعد میں بسم اللہ ہے اور اس کے بعد خط ہے۔ اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خط لکھنے والا اگر اپنا نام پہلے لکھے، پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھے، پھر خط لکھے تو یہ بھی جائز ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں ایسا نہیں ہے بلکہ سلیمان علیہ السلام کا خط تو یہ تھا:

”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ مِنْ سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوُدَ إِلَى بَلْقَيْسِ ابْنَةِ دَجَاجِ شَرَحَ وَقَوْمَهَا أَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ وَأَتُونِي مُسْلِمِينَ“ بلقیس نے جب خط اپنی قوم کو پڑھ کر سنایا تو قوم کو آگاہ کرنے اور یہ بتانے کے لیے کہ یہ کس کا خط ہے سلیمان علیہ السلام کا اسم گرامی پہلے ذکر کر دیا اور کہا ”إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ“ تو جو جملہ اس نے کہا تھا قرآن نے اسی کو نقل کر دیا، اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اپنا نام بسم اللہ سے پہلے لکھا تھا۔ تو ان مفسرین کا موقف یہ ہے کہ بسم اللہ پہلے لکھی ہوئی تھی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام بعد میں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک طریقہ یہ تھا:

مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ.<sup>75</sup>

کہ شروع میں اپنا نام لکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کے پاس خط جاتا ہے وہ دیکھتے ہی جان لیتا ہے کہ یہ خط کس کا ہے، پھر آگے خط پڑھنے میں دلچسپی ہوتی ہے اور اگر خط کے بالکل آخر میں نام ہو تو دلچسپی کم ہوتی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خط لکھتے تو سنت نبوی کی اتباع کرتے ہوئے پہلے اپنا نام لکھتے اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لکھتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

مَا كَانَ أَحَدٌ أَعْظَمَ حُرْمَةً مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ أَصْحَابُهُ إِذَا كَتَبُوا إِلَيْهِ كِتَابًا بَدَأُوا بِأَنْفُسِهِمْ.<sup>76</sup>

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی آدمی قابل تعظیم نہیں لیکن آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم جب آپ کو خط لکھتے تو اپنے نام سے شروع کرتے۔

اس پر دلیل سنن ابی داؤد کی روایت ہے کہ حضرت علاء حضرمی رضی اللہ عنہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خط لکھتے تھے تو اپنا نام شروع میں لکھتے تھے۔<sup>77</sup>

### ملکہ بلقیس کا فیصلہ:

خیر! ملکہ بلقیس نے اپنے وزراء کو بلا کر مشورہ کیا کہ بتاؤ کیا کریں؟ میں تمہارے مشورہ کے بغیر حتمی فیصلہ نہیں کرتی۔ وہ لوگ بڑے سمجھدار تھے، کہا کہ

75- صحیح البخاری، رقم: 7

76- روح المعانی: ج 10 ص 196

77- سنن ابی داؤد، رقم: 5134

﴿نَحْنُ أَوْلُوا قُوَّةً وَأَوْلُوا بِأَسِ شَدِيدٍ﴾ ہمارے پاس طاقت بھی ہے اور ہم جنگجو بھی ہیں، اس لیے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، باقی تو ہماری بادشاہ ہے جو فیصلہ کرے ہم تیرے ساتھ ہیں لیکن تو نے گھبرا کر فیصلہ نہیں کرنا! یہ بہت سمجھدار عورت تھی اس نے کہا کہ بات سمجھو کہ ﴿إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا﴾ کہ جب بادشاہ کسی شہر میں داخل ہوں تو تباہی مچا دیتے ہیں، ﴿وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً﴾ اور عزت والے لوگوں کو ذلیل کر کے رکھ دیتے ہیں، اس لیے جذباتی فیصلے نہ کرو بلکہ سمجھداری سے کام لو۔ میں ان کی طرف ہدیہ بھیجتی ہوں اس سے پتا چل جائے گا کہ وہ بادشاہ ہے جس کی خواہش ہوتی ہے کہ میں کسی اور حکومت پر قبضہ کروں اور میری بادشاہی بڑھ جائے یا وہ اللہ کا نبی ہے جو چاہتا ہے کہ اور ملکوں میں اللہ کی شریعت نافذ ہو۔ تو اگر تمہارا مال انہوں نے قبول کر لیا تو اس کا معنی ہے کہ وہ دنیا چاہتے ہیں اور اگر مال قبول نہ کیا تو سمجھنا نبی ہیں، پھر ہمیں ان سے جھگڑنا نہیں چاہیے۔ خیر اس نے ہدیہ بھیجا۔ ہدیہ میں کچھ سونے کی اینٹیں بھیجیں، جو اہرات اس کے علاوہ تھے، سو غلام بھیجے اور سو باندیاں بھی۔ باندیوں کو غلاموں والے کپڑے پہنا دیے اور غلاموں کو باندیوں والے کپڑے پہنا دیے تاکہ پتا تو چلے کہ یہ پہچان بھی سکتے ہیں یا نہیں! پھر کچھ سوالات بھی کیے۔ سلیمان علیہ السلام کو بذریعہ وحی پتا چل گیا کہ بلقیس نے یہ ہدیہ بھیجا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کے آنے سے پہلے راستے میں جنات کے ذریعے سونے کی اینٹوں کی سڑک بنوا دی اور سڑک کے دونوں طرف عجیب الخلق جانور بندھوا دیے، جانوروں کا گوہر اور پیشاب سونے کی اینٹوں پر پڑتا تھا اور راستے میں دونوں طرف جنات کھڑے کیے۔ تخت شاہی سجایا اور اس پر چار چار ہزار سونے کی کرسیاں لگوائیں، ایک طرف علماء بیٹھے اور ایک طرف وزرائے سلطنت بیٹھے۔ جب وہ آئے تو بعض روایات میں آتا ہے کہ جب انہوں نے سونے کی اینٹوں پر جانوروں کو

پیشاب اور گوبر کرتے دیکھا تو سونے کی اینٹیں وہیں پھینک دیں کہ ہم سوائنٹ گفٹ دینا چاہتے ہیں اور یہاں دیکھو کہ جانور سونے پر پیشاب کر رہے ہیں اور جنات ان کے ماتحت ہیں۔

خیر اس کے باوجود بھی حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کا بہت اکرام کیا، بہت عزت کی جیسے مہمان کی عزت کرتے ہیں، نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ وہ لوگ آئے تو سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ﴿أَتُمِدُّوْنَ بِمَالِ فِتْنَةٍ أَمْ لَكُمْ خَيْرٌ مِّمَّا أَتاكمُ﴾ کہ تم ہمیں مال دینا چاہتے ہو؟ جو مال اللہ نے ہمیں دیا ہے وہ تمہارے اس مال سے بہت بہتر ہے جو تمہیں دیا ہے، ﴿بَلْ أَنْتُمْ بِهَدْيَتِكُمْ تَفْرَحُونَ﴾ بلکہ اپنے ہدیہ پر تم خود خوش رہو! ﴿إِذْ جَعَلْنَاهُمْ﴾ ان کے پاس واپس لوٹ جاؤ اور ان کو جاکر بتاؤ کہ ﴿فَلَنَأْتِيَنَّهُمْ جُذُودٌ لَّا قَبْلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَا آذِلَّةً وَهُمْ صُغُرُونَ﴾ کہ ہم اب تمہارے پاس ایسا لشکر لائیں گے جس کے مقابلے کی تمہارے پاس ہمت نہیں ہوگی اور پھر ہم تم لوگوں کو ذلیل کر کے وہاں سے نکال دیں گے۔

### ملکہ بلقیس کی دربار سلیمانی میں حاضری:

جب یہ لوگ واپس پہنچے تو جاکر ملکہ بلقیس کو بتایا کہ وہ بہت بڑے لوگ ہیں، ان کے لیے مال و دولت تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ملکہ بلقیس سمجھ گئی کہ یہ لوگ کون ہیں! وہ کہنے لگی کہ چلو ہم خود چلتے ہیں اور چل کر اسلام قبول کرتے ہیں، ان کی اطاعت کر لیتے ہیں۔ جب ملکہ بلقیس چلی تو اس نے بارہ ہزار سردار ساتھ لیے اور ہر سردار کی ماتحتی میں ایک لاکھ فوج رکھی۔ اتنا بڑا لشکر اور طاقت لے کر وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچی۔ اور یہ طاقت دکھانے کے لیے نہیں لا رہی تھی چونکہ بادشاہ تھی اس

لیے شاہانہ طرز سے آرہی تھی، باقی آس لیے رہی تھی تاکہ اسلام قبول کرے۔  
 حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ نے بیت اتنی عطا کی تھی کہ کوئی بندہ آپ  
 کے سامنے بات نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن آپ علیہ السلام نے خود دیکھا کہ دو گر و غبار  
 اڑ رہا ہے تو آپ نے دربار والوں سے پوچھا کہ یہ غبار کیسا ہے؟ آپ کو جواب دیا گیا کہ  
 ملکہ بلقیس اپنے لوگوں کو لے کر خدمت میں حاضر ہو رہی ہے۔ بعض روایات میں ہے  
 کہ وہ ابھی تین میل کے فاصلے پر تھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کی اطلاع  
 ہوئی۔

### اس کا تخت کون لائے گا؟

سلیمان علیہ السلام نے اپنے مصاحب جمع کیے کہ وہ آرہی ہے اور پوچھا کہ  
 ﴿أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بَعْرُهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ﴾ اس کی سلطنت میں  
 سب سے اہم چیز اس کا تخت ہے، بتاؤ اس کے تابعدار بن کر آنے سے پہلے میرے پاس  
 اس کا تخت کون لائے گا؟ ﴿قَالَ عِفْرِيتٌ مِّنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ  
 مِن مَّقَامِكَ﴾ ایک طاقت ور اور مضبوط جسم والے جن نے کہا کہ جی میں لاتا ہوں اور  
 مجلس برخواست ہونے سے پہلے پہلے لاؤں گا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ  
 اس سے بھی پہلے لاؤ تو ﴿قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ  
 أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ﴾ بعض کہتے ہیں کہ آصف بن برخیا جو حضرت سلیمان علیہ  
 السلام کا وزیر تھا یا آپ کا خالہ زاد بھائی تھا اس کے پاس کتاب کا علم تھا، اس نے کہا کہ  
 جی! مجھے اجازت دو میں لاتا ہوں اور اتنی دیر میں لاؤں گا کہ آپ آنکھ بند کر کے کھولیں  
 گے تو تخت آپ کے سامنے ہو گا حضرت سلیمان علیہ السلام نے آنکھ بند کی اور کھولی تو  
 تخت ان کے سامنے آگیا تھا۔

## تخت لانے والا کون تھا؟

اور مفسرین میں سے بہت سارے حضرات کی رائے یہ ہے کہ ﴿الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ﴾ سے مراد حضرت سلیمان علیہ السلام خود ہیں اور کتاب اللہ کا علم آپ علیہ السلام کے پاس تھا۔ اب مطلب یہ ہے کہ آپ نے عفریت جن سے فرمایا کہ تم تو اس کو اتنی دیر میں لاؤ گے اور میں تیری پلک جھپکنے سے پہلے اس کو لے آتا ہوں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس سے مراد سلیمان علیہ السلام نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے پاس خود علم تھا تو آپ نے کسی اور سے کیوں کہا کہ تخت کون لائے گا؟ مفسرین کہتے ہیں کہ آپ نے یہ سوال یہ بات بتانے کے لیے کیا کہ پیغمبر کا امتی ولی ہے، خدا نے اس کو علم الکتاب کی بنیاد پر یہ کرامت دی ہے کہ یہ لا سکتا ہے اور میں تو نبی ہوں تو اس سے اندازہ کر لو کہ نبی کے معجزے کی طاقت کتنی بڑی ہوگی؟! اس لیے خود نہیں لائے بلکہ اپنے ماتحت سے کہا کہ تم لے کر آؤ۔

اور یہ عرش کیسے لائے تھے؟ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے تصرف کیا تھا۔ تصرف کہتے ہیں قلبی توجہ اور خیالی طاقت استعمال کرنے کو، وہ اس تخت کو اپنی خیالی طاقت سے لائے تھے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مستقل ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہی ”التصرف“ ہے اور اس میں پوری بحث کی ہے کہ خیالی اور قلبی توجہ کی حیثیت کیا ہے؟ دیکھو! ہمارے اکابر نے کوئی پہلو چھوڑا نہیں ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ یہ خیالی طاقت نہیں تھی بلکہ یہ اس کی کرامت تھی۔ اچھا جب کرامت تھی تو کرامت تو غیر اختیاری ہوتی ہے تو اس نے کیسے کہا کہ میں پلک جھپکنے سے پہلے لاؤں گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح یہ اس کی کرامت تھی اسی

طریقے سے یہ ان کا بھی کشف تھا اللہ کی طرف سے کہ تم یہ کہہ دو! جتنی جلدی تم کہو گے اتنی جلدی ہم لائیں گے، اگر ولی کی کرامت برحق ہے تو ولی کا کشف بھی تو برحق ہے، تو اس میں الجھن کی کون سی بات ہے؟

یہ بات کہنا اس لیے ضروری ہے کہ ایسے موقع پر ایسی تاویل کریں جو نصوص شرعیہ کے خلاف نہ ہو۔ اگر یہ کہیں گے کہ ولی کو اختیار ہے تو یہ نصوص کے خلاف ہے۔ تو جب کوئی ایک نص دیگر نصوص کے خلاف نظر آرہی ہو تو وہاں مقام کے مناسب تاویل کرنی پڑتی ہے تاکہ نصوص کا باہمی تعارض نہ ہو۔

### ملکہ بلقیس کی عقلمندی:

خیر! جب وہ تخت لے کر آگئے تو سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ تخت کی ہیئت اور شکل و صورت تبدیل کر دو۔ جب ملکہ بلقیس وہاں پہنچی تو سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ﴿أَهْكَذَا عَرْشُكَ﴾ بلقیس! تیرا تخت بھی ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا: ﴿كَأَنَّهُ هُوَ﴾ کہ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ ویسا ہی ہے۔ پھر اس نے خود کہا ﴿وَأَوْتَيْنَا الْعِلْمَ مِنَ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ﴾ ﴿٢٧﴾ اے سلیمان! ہمیں پہلے پتا چل گیا تھا کہ خدا نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے اور ہم آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری پہلے ہی قبول کر چکے ہیں۔

اب قرآن کریم نے آگے اس عورت کی تعریف کی ہے، فرمایا: ﴿وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَعْبُدُ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كَافِرِينَ﴾ ﴿٢٨﴾ کہ اس عورت کو اللہ پر ایمان لانے سے اس بات نے روک رکھا تھا کہ وہ خدا کے علاوہ کسی اور کی عبادت کرتی تھی اور ایسی قوم سے تعلق رکھتی تھی جو کافر قوم تھی۔ ظاہر بات ہے کہ جب سارا ماحول کافروں کا ہو ایمان کی طرف توجہ نہیں ہوتی لیکن جب اسے اسلام کی طرف بلایا گیا تو فوراً ایمان لائی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ سمجھدار عورت تھی ضدی

نہیں تھی۔ ہاں بعض احوال ایسے تھے کہ جس نے اسے شرک کی طرف مائل کیا ہوا تھا لیکن جب تھوڑی سی دلیل سامنے آئی تو وہ شرک چھوڑ کر توحید کی طرف آگئی۔

### شیشے کے محل میں داخلہ:

﴿قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۖ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً ۖ وَكَشَفَتْ عَنْ

سَاقِيهَا﴾

سلیمان علیہ السلام نے ان کے آنے پر جنات سے شیشے کا ایک محل بنوایا اور اس محل تک پہنچنے کے لیے درمیان میں ایک تالاب بنایا اور تالاب کے اوپر ایسا شیشہ فٹ کیا کہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اوپر کچھ بھی نہیں ہے بس پانی ہی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ آؤ! میں تمہیں ایک محل دکھاؤں! اب ظاہر ہے کہ وہ بادشاہ تھی تو اسی کے مطابق اس کا استقبال ہونا ہے۔ جب آگئی تو قرآن پاک میں ہے ﴿وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقِيهَا﴾ اس نے سمجھا کہ یہ تو پانی میں جانے لگی ہوں تو اس نے فوراً تھوڑے سے پائچے اوپر کر لیے تاکہ پانی سے گیلے نہ ہوں۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ شیشہ ہے آپ آئیں۔ ﴿قَالَتْ رَبِّ اِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اس نے کہا کہ اے میرے رب! میں نے آج تک اپنی جان پر ظلم کیا ہے، میں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اسلام قبول کرتی ہوں۔ فوراً کلمہ پڑھا۔ یہ خدا کا کتنا بڑا کرم ہوتا ہے کہ اللہ اتنی بڑی طاقت عطا فرمائے اور پھر بھی بندہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے۔

### حضرت سلیمان اور ملکہ بلقیس کا نکاح ہوا یا نہیں؟

اس کے بعد ملکہ بلقیس کا سلیمان علیہ السلام کے ساتھ نکاح ہوا یا نہیں ہوا؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ آپ علیہ السلام نے اسے اپنے نکاح میں لے لیا تھا اور بعض



کہتے ہیں کہ نہیں لیا تھا اور بعض مفسرین کی رائے بہت پیاری ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس کا معاملہ ﴿وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَنِ بْنِ رَبِّ الْغُلَامَيْنِ﴾ پر ختم ہو گیا۔ مطلب یہ کہ قرآن نے جہاں بات ختم کر دی وہاں تم بھی ختم کر دو۔ اس کے نکاح ہونے نہ ہونے سے تفسیر کا کیا تعلق ہے؟ اور بات صرف اتنی ہے کہ یہ معجزہ ہے یہ کرامت ہے یہ ولی ہے یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی ہے اور ملکہ بلقیس نے کلمہ پڑھ لیا بات ختم ہو گئی۔ البتہ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ نکاح ہوا تھا، سلیمان علیہ السلام نے نکاح کیا تھا اور اسے اپنے ملک پر برقرار رکھا تھا اور ایک مہینے میں تین دن حضرت سلیمان علیہ السلام ان کے ہاں جا کر ٹھہرتے تھے اور اس کو تین ایسے محل بنا کر دیے کہ جس کی مثال اس کی سلطنت میں نہیں تھی۔ سلیمان علیہ السلام کے لیے جانا کیا مشکل تھا؟! تخت پر بیٹھے، وہ اڑا کر لے جاتا، پانچ سو کرسیاں تخت پر رکھی ہوئی ہوتی تھیں اور جہاں حکم ہوتا تخت اتر جاتا۔

### عورتوں کی عقل کی چند مثالیں:

ملکہ بلقیس بہت سمجھدار تھی۔ یہ بات ذرا سمجھیں کہ ہمیشہ عورت مرد کی نسبت کم سمجھدار ہو ایسا نہیں ہوتا، یہ جو ہے کہ عورت ناقص العقل ہوتی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ جنس عورت جنس مرد کے مقابلے میں ناقص العقل ہے لیکن ہر عورت ہر مرد کی نسبت ناقص العقل ہو یہ معنی اس کا ہر گز نہیں ہے۔ بعض عورتیں ایسی ہیں کہ مرد سے کئی گنا زیادہ عقلمند ہوتی ہیں اور بعض الجھنیں ایسی ہوتی ہیں جسے خاتون ہی حل کر سکتی ہے عام مردوں کے بس میں نہیں ہوتا۔

مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے مقام پر ہیں۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا آپ کے ساتھ ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خیمے میں ہیں اور آپ کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ کیا پریشانی

ہے؟ فرمایا کہ میرے ساتھ صحابہ ہیں، عربوں کا خون ہے، ہم مدینہ سے یہاں تک پہنچے ہیں، آگے مکے والے کہتے ہیں کہ ہم عمرہ نہیں کرنے دیں گے، میں نے صلح کر لی ہے، اب میں نے واپس جانا ہے اور میں انہیں کہوں کہ حلق یا قصر کرو اگر احرام کھول دو! بہت مشکل ہے، یہ بات کیسے مانیں گے کیونکہ ان کے جذبات اتنے سخت ہیں کہ میں سوچ رہا ہوں کہ کون سی بات کروں کہ یہ فوراً مان لیں! حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر اجازت ہو تو میں عرض کروں؟ فرمایا: جی ہاں۔ یہ باتیں میں سمجھانے کے لیے اپنے الفاظ میں بتا رہا ہوں۔ فرمایا کہو! حضور! میری رائے یہ ہے کہ آپ انہیں کچھ بھی نہ کہیں، آپ خیمے سے باہر تشریف لائیں اور اپنا قصر کروادیں، یہ آپ کے جانثار ہیں، آپ کو دیکھیں گے تو سارے خود بخود شروع ہو جائیں گے اور آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیمے سے باہر نکلے، بالوں کا قصر یا حلق کروایا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیکھا تو سارے شروع ہو گئے۔ اب دیکھیں! ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا مشورہ کتنا عمدہ اور اچھا تھا۔ اس لیے ہر عورت ہر مرد کے مقابلے میں ناقص العقل ہو ایسا نہیں ہوتا بلکہ جنس عورت جنس مرد کے مقابلے میں ناقص العقل ہوتی ہے۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### قصور تیرا ہے یا میرا!

اس موقع پر میں کئی بار یہ واقعہ سنایا کرتا ہوں کہ ابو حمزہ ایک شخص تھا۔ اس کے ہاں چار پانچ بچیاں پیدا ہوئیں، کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ تو ہمارے ہاں بھی یہی ہے اور ابو حمزہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ عورت منحوس ہے، اس کے ہاں بیٹا پیدا نہیں ہوتا لہذا دوسری شادی کر لو تا کہ بیٹا پیدا ہو جائے۔ تو ابو حمزہ کا بھی یہی ارادہ بنا اور اس نے گھر آنا چھوڑ دیا، اپنی بیوی سے قدرے نالاں تھے کہ اس کے ہاں بیٹا کیوں پیدا نہیں ہوتا؟ اس کی بیوی سمجھدار بھی تھی اور بلا کی شاعرہ بھی تھی۔ اس نے ابو حمزہ کے نام ایک خط لکھا

جس میں کچھ اشعار لکھے:

مَا لِأَيِّ حَمْرَةٍ لَا يَأْتِيَنَا غَضَبَانِ أَنْ لَا نَلِدَ الْبَنِينَ

ابو حمزہ کو کیا ہو گیا کہ ہمارے پاس نہیں آتے، وہ اس بات پر ناراض ہیں کہ ہم بیٹا نہیں جنتیں۔

تَاللّٰهِ مَا ذَلِكْ فِيْ اَيِّدِيْنَا فَتَحْنُ كَالْأَرْضِ لِزَارِعِيْنَا

خدا کی قسم! بیٹا جتنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے، میری مثال زمین کی طرح ہے اور تمہاری مثال کسان کی طرح ہے۔

وَاِنَّمَا نَأْخُذُ مَا أُعْطِيَْنَا وَنُنْبِتُ مَا ذَرَعُوْهُ فَيَنَّا

زمین میں وہی بیج ہوتا ہے جو بیج کسان ڈالتا ہے اور زمین وہی پودا لگاتی ہے جو کسان نے بیج ڈالا ہوتا ہے۔<sup>78</sup>

ابو حمزہ! اب بتائیں کہ قصور میرا ہے یا آپ کا؟ ابو حمزہ نے معذرت کی اور واپس آکر ہنسنا اور بسنا شروع کر دیا۔ اب بتاؤ! کیسی اس نے سمجھداری کی بات کی ہے۔

میں نے جب پاکستان میں مسلک کا کام شروع کیا تو میں بڑی بھڑکتی خطابت، جذباتی اور بڑی رفتار سے بیان کرتا تھا، میں نے ٹھنڈے انداز سے کام شروع نہیں کیا کیونکہ قوم کو اٹھانا تھا تو قوم اٹھ گئی۔ میرے ایک دوست نے مجھے لاہور سے فون کیا کہ ہمارے گھر آپ کے بیان کی کیسٹ چل رہی تھی تو ہمارے محلے کی ایک خاتون نے کہا کہ یہ بیان مجھے بھی دو۔ اس نے بیان اپنے گھر لگا دیا۔ اس نے کہا کہ اللہ کی شان! اس کی نو بیٹیاں تھیں اور بیٹا کوئی نہیں تھا اور گھر میں ان بن رہتی تھی۔ جب عورت نے اس بیان کو سنا، رات شوہر آیا تو کہتی ہے کہ مولانا صاحب کی تقریر سنو! جب یہی واقعہ اس

نے گھر میں سنا تو اس کے شوہر نے معذرت کی کہ تیرا قصور نہیں ہے یہ میرا قصور ہے۔  
اب دیکھو! عورت کتنی سمجھدار ہے۔ ناقص العقل ہے لیکن جنس مرد کے مقابلے میں۔

### منکرین سماعِ موتی کے استدلال کا جواب:

﴿إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تَسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ۖ وَمَا أَنْتَ بِهَادِي الْعُمَىٰ عَنْ ضَلَلَتِهِمْ ۖ إِنَّ تَسْمِعَ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ﴾

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلسل دعوت سے کفار نہ مانتے تو آپ غمزدہ ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو تسلی دی ہے کہ اے پیغمبر! ان کو سنانا آپ کے ذمے ہے، آپ سنا سکتے ہیں لیکن منوانا آپ کے بس میں نہیں ہے، اس لیے ان کے نہ ماننے پر آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوا کریں۔ جس طرح قبر پر آپ کسی مردے کو سنا دیں اور وہ بات قبول نہ کرے اسی طرح اگر یہ بات سنیں اور قبول نہ کریں تو یہ مردوں کی طرح ہیں۔ اس لیے یہ قلباً مردے ہیں، آپ زیادہ پریشان نہ ہوا کریں، آپ کے ذمے کفار کو سمجھانا ہے، کافر نہ سمجھیں تو آپ پریشان نہ ہوں، بس بات سنا کر اور سمجھا کر ختم کر دیں۔

ان آیات کے تحت بعض مفسرین سماعِ موتی کی بحث شروع کر دیتے ہیں اور بعض لوگ ان آیات کے تحت بلا وجہ اس بحث کو چھیڑ دیتے ہیں حالانکہ ان آیات کا سماعِ موتی کے مسئلے کے ساتھ دور کا بھی کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے۔ اللہ نے اپنے نبی کو سمجھانا ہے اور انہیں تسلی دینی ہے تو اس کے لیے اللہ رب العزت نے یہ تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ اب اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مردے سنتے نہیں ہیں یہ بالکل فضول سی بحث ہے۔ جو لوگ سماعِ موتی کے منکر ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ حضور مردوں کو سنا

نہیں سکتے لہذا مردے سن بھی نہیں سکتے، کیوں؟ ﴿إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ﴾ کہ اللہ نے موتی کو تشبیہ دی ہے بہرے کے ساتھ اور یہ تشبیہ تب ہی صحیح ہوگی جب مردہ نہ سنے۔ اگر مردہ سن لے تو بہرے کے ساتھ تشبیہ کیسے درست ہوگی؟ تو یہ ”صم“ کا لفظ بتا رہا ہے کہ مردہ نہیں سنتا۔ آپ اندازہ فرمائیں کہ کتنی بڑی بد دیانتی اور دھوکہ دیا جا رہا ہے!

ہم کہتے ہیں کہ پہلی بات یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اسماع کی نفی کی ہے اور اسماع کی نفی سے سماع کی نفی نہیں ہوتی۔ یہ فرمایا ہے کہ آپ مردوں کو سنا نہیں سکتے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مردے سنتے بھی نہیں۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ﴾ اے پیغمبر! آپ جسے چاہیں اسے آپ ہدایت نہیں دے سکتے۔ اب اس کا معنی کوئی بندہ یہ کرے کہ ”کسی کو ہدایت مل بھی نہیں سکتی“ تو یہ معنی ہرگز درست نہیں ہے کیونکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت نہیں دے سکتے، ہدایت دینے کی نفی تو ہے لیکن کیا اس کی بھی نفی ہے کہ کسی کو ہدایت مل بھی نہیں سکتی؟ اس کی نفی نہیں ہے۔ تو نفی اسماع سے نفی سماع نہیں ہوتا۔

اور یہ جوان لوگوں کا استدلال ہے ﴿وَلَا تَسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ﴾ سے کہ موتی کو بہرے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اگر یہ سن لیں تو بہرے کے ساتھ تشبیہ کیسے ہوئی؟ تو ہم کہتے ہیں کہ قرآن کریم کے آغاز میں سورت بقرہ کا دوسرا رکوع ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿صُمُّ بِكُمْ عُمًى فَهُمْ لَا يَزِجُجُونَ﴾ کہ یہ کفار بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، بہرے ہیں تو اب یہ حق کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ تو یہاں فرمایا ”صم“ یہ کفار بہرے ہیں۔ تو کفار سنتے ہیں یا نہیں؟ کفار تو سنتے ہیں لیکن اللہ

فرماتے ہیں کہ یہ بہرے ہیں۔ فرمایا ”بُكُمْ“ یہ کفار گونگے ہیں۔ ابو جہل اور اس کے ساتھی بولتے تو تھے تو پھر اللہ انہیں ”بُكُمْ“ کیوں کہتے ہیں؟ ”عُمی“ یہ اندھے ہیں حالانکہ وہ دیکھتے تھے پھر ”عُمی“ کیوں فرمایا؟ تو ﴿وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ﴾ میں تو موتی کو صرف ”الصُّمَّ“ فرمایا تو تمہیں اشکال ہو رہا ہے اور سورۃ البقرۃ میں کفار کو ”صُمَّ“ بھی کہا، ”بُكُمْ“ بھی کہا، ”عُمی“ بھی کہا حالانکہ یہ سنتے بھی تھے بولتے بھی تھے دیکھتے بھی تھے۔ اب اس کا کیا مطلب ہے؟ ذرا توجہ رکھنا! اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کفار سنتے ہیں لیکن قبول نہیں کرتے، یہ بولتے ہیں لیکن حق نہیں بولتے، یہ دیکھتے ہیں لیکن صحیح بات نہیں دیکھتے کہ دیکھ کر قبول کر لیں۔ تو ان کی حالت اس بہرے کی طرح ہے جو سنتا ہی نہیں ہے، اس گونگے کی طرح ہے جو بولتا ہی نہیں ہے، اس اندھے کی طرح ہے جو دیکھتا ہی نہیں ہے، اب دونوں برابر ہیں کیونکہ وہ سنتا نہیں اور یہ سنتے ہیں لیکن قبول نہیں کرتے، وہ دیکھتا نہیں اور یہ دیکھتے ہیں لیکن قبول نہیں کرتے، وہ بولتا نہیں اور یہ بولتے ہیں لیکن حق نہیں بولتے، تو ان کے دیکھنے، بولنے اور سننے کیا فائدہ ہے؟

بالکل اسی طرح اس آیت ﴿إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ﴾ میں موتی کو تشبیہ دی ہے ”صُمَّ“ کے ساتھ جس طرح وہاں کفار کو تشبیہ دی ہے ”صُمَّ“ کے ساتھ، تو جو معنی کفار کو ”صُمَّ“ کے ساتھ تشبیہ دینے کا وہاں ہو گا وہی معنی موتی کو ”صُمَّ“ کے ساتھ تشبیہ دینے کا یہاں ہو گا۔ وہاں معنی یہ ہے کہ کافر بات سن بھی لے تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہے اس لیے کافر بہرے کی طرح ہے اور یہاں معنی یہ ہے کہ مردہ سن بھی لے تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہے اس لیے مردہ بہرے کی طرح ہے۔

## منکرین حیات کو الزامی جواب:

ہم ایک اور بات کہتے ہیں کہ اگر تشبیہ دیکھنی ہے تو پھر تو قرآن کریم سے یہ تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ سنتے نہیں ہیں لیکن ساتھ یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ مردے دوڑتے بھی ہیں کیونکہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَلَا تَسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ﴾ کہ جب ایک شخص بہرا ہو اور واپس دوڑے تو وہ نہیں سنتا۔ تو کیا مردے دوڑتے ہیں؟ (نہیں۔ سامعین) تو اللہ نے مردے کو کس بہرے سے تشبیہ دی ہے؟ بہر یا دوڑنے والا بہرا؟ (دوڑنے والا بہرا) تو پھر کیا مردے دوڑتے بھی ہیں؟ اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھیں کہ ایک چیز ہوتی ہے مقید اور ایک ہوتی ہے مطلق۔ وہاں صُمٌّ، بُكْمٌ، عُمًی مطلق ہیں مقید نہیں ہیں اور یہاں ”صُمٌّ“ مقید ہے ﴿إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ﴾ کی قید کے ساتھ کہ یہاں اس بہرے سے تشبیہ ہے جو دوڑتا بھی ہو، اس کا معنی کہ یہ مردہ اس بہرے کی طرح ہے جو دوڑتا تو ہے لیکن سنتا نہیں ہے۔ تو اس سے تو پھر مردے کا دوڑنا ثابت ہو گا۔ منکرین حیات کہتے ہیں کہ ہم تو نہیں مانتے! میں نے کہا اب کیوں نہیں مانتے؟! جب قرآن کہہ رہا ہے تو پھر آپ کیوں نہیں مانتے؟ آپ نے آدھی بات مان لی اور آدھی بات چھوڑ دی۔ بھائی! جب مقید کے ساتھ تشبیہ دی ہے مشبہ بہ مقید ہے تو مشبہ بھی مقید ہو گا نا! مشبہ بہ مطلق ہے تو مشبہ بھی مطلق ہو گا! تو جو وجہ تشبیہ ہے وہ قید کے ساتھ ہے اطلاق کے ساتھ نہیں ہے، آپ نے بات مانتی ہے تو پھر پوری بات مانو۔

”آپ اندھوں کو ہدایت نہیں دے سکتے!“ کا معنی:

﴿وَمَا أَنْتَ بِهَدِيٍّ الْعُمَىٰ عَنْ ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِنَّ تَسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ

بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ﴾

آپ اندھوں کو گمراہی سے بچا کر ہدایت کا راستہ نہیں دکھا سکتے۔ اب یہاں ”عُمیٰ“ کسے کہا جا رہا ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ مردے کو کہا جا رہا ہے۔ قرآن کریم نے زندہ کفار کو ”عُمیٰ“ کہا ہے کہ جو راہِ حق نہیں دیکھنا چاہتے تو تم انہیں کیسے دکھا سکتے ہو؟ ﴿إِنْ تَسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا﴾ آپ اس کا ترجمہ کیا کریں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایمان والوں کو سناسکتے ہیں، آپ کافروں کو نہیں سناسکتے؟ ﴿إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى﴾ کا معنی آپ لوگوں نے یہ کیا کہ آپ مردوں کو نہیں سناسکتے اور اس کا نتیجہ یہ نکالا کہ مردہ سنتا نہیں ہے تو پھر ﴿إِنْ تَسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا﴾ کے بارے میں کہیں کہ آپ کافر کو نہیں سناسکتے لہذا کافر سنتا بھی نہیں ہے! کہتے ہیں جی! کافر تو سنتا ہے۔

میں نے کہا کہ آیتیں دونوں ایک طرح کی ہیں۔ تو آپ دونوں کو الگ الگ کیوں بیان کرتے ہیں؟ اس لیے اس کا صحیح معنی یہ ہے کہ یہاں اسماع کی نفی ہو رہی ہے سماع کی نفی نہیں ہو رہی اور یہ جو اسماع کی نفی ہو رہی ہے تو اس سے بھی اسماع نافع اور قبول کی نفی ہو رہی ہے کہ آپ ان کو ایسا نہیں سناسکتے کہ وہ قبول بھی کر لیں جیسے مردہ سن بھی لے تو قبول نہیں کرتا۔ تو اس آیت کا سماع موتی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، خواہ مخواہ لوگ اس کو چھیڑ دیتے ہیں اور جب وہ بیان کریں گے تو ہم تردید بھی کریں گے۔ بعض لوگ انبیاء علیہم السلام کے سماع کا انکار کرتے ہیں اور دلیل میں سورۃ فاطر کی آیت ﴿إِنَّ اللَّهَ يَسْمِعُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ﴾ پیش کرتے ہیں، میں ان شاء اللہ سورۃ فاطر کی تشریح میں اس کا ذکر کروں گا اور صحیح تشریح آپ کے سامنے رکھوں گا۔

اب آپ میرا ایک تعجب سننا! میرا تعجب یہ ہے کہ لوگ ان آیات کی روشنی



میں سماعِ موتی کی نفی عوام میں بیان کرتے ہیں اور جب ہم ان آیات کا صحیح معنی بیان کر کے عوام میں ان کا رد کرتے ہیں تو لوگ ہمیں کہتے ہیں کہ یہ عوام والا مسئلہ نہیں ہے، یہ تو علمی مسئلہ تھا عوام میں بیان نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے کہا کہ یہ مسئلہ ہم نے عوام میں بیان کیا ہے؟ بیان انہوں نے کیا تھا ہم نے تو رد کیا ہے، جو بیان کرنے والا ہے اس کو تو آپ کچھ نہیں کہتے اور جو رد کرنے والا ہے آپ اسے کہتے ہیں کہ تم نے علمی مسائل عوام میں شروع کر دیے۔ تو میں نے کہا کہ عوام میں پھر علمی مسائل بیان نہ کیا کریں تو کیا جہالت والے مسائل بیان کیا کریں؟! یعنی مسائل کی دو قسمیں ہیں؛ بعض علمی اور بعض جاہلانہ، درس گاہ میں علمی مسائل بیان ہونے چاہئیں اور عوام میں جاہلانہ باتیں ہونی چاہئیں، اس کا تو پھر یہی معنی ہو گا نا؟ بھائی فتنہ جب عوام میں ہو گا تو اس کا رد بھی تو عوام میں ہو گا!

میں نے آپ سے کئی بار کہا کہ آپ لوگ ہمیں اور ان کو برابر کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ آپ بازار میں تھے آپ کے پاس موبائل تھا، ایک شخص آپ سے موبائل چھینتا ہے اور آپ اس سے موبائل واپس لے لیتے ہیں، پولیس دونوں کو پکڑے گی؟ (نہیں۔ سامعین) بھائی! ہمارا موبائل ہے وہ چھین رہا تھا، میں تو موبائل کو واپس لے رہا ہوں۔ یہ لوگ عوام میں صحیح عقیدہ کی تردید کر رہے ہیں اور ہم ان کی نفی کرتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ تم دونوں فتنہ باز ہو! بھائی دونوں ایک جیسے کیسے ہو گئے ہیں؟

اور سماعِ موتی کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے آپ حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ ”تکمیل الہجور بسماع اہل القبور“ ہے اس کا مطالعہ فرمائیں، بڑے آرام سے مسئلہ سمجھ میں آ جائے گا۔ اللہ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

## علامت قیامت؛ دابة الارض کا نکلنا

﴿وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ﴾

اور جب ہماری بات پوری ہونے کا وقت ان لوگوں کے پاس آ پہنچے گا یعنی قیامت قریب ہوگی تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے باتیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ یہ جانور اس لیے نکالیں گے کہ لوگ اللہ کی آیتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

## قیامت کی دس علامات:

حضرت حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک دس علامات ظاہر نہ ہو جائیں۔

1: ”ظُلُوعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا“ سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہوگا۔

2: ”وَحُزُّوْجُ الدَّابَّةِ“ دابة الارض کا نکلنا۔ صفا پہاڑی جو حرم کے بالکل اندر ہے اور مطاف کے بالکل ساتھ ہے وہ پہاڑی پھٹے گی اور اس کے اندر سے ایک جانور نکلے گا مٹی جھاڑتا ہوا، مقام ابراہیم پر پہنچے گا تو کچھ لوگ وہاں سے دوڑ جائیں گے اور کچھ رہ جائیں گے، یہ ان کے چہرے کو نور سے منور کر دے گا اور یہ دنیا میں ہر کافر تک پہنچے گا، اب یہ کیسے پہنچے گا اس کا حال اللہ کو معلوم ہے، روایات میں بس اتنا ہی آیا ہے اور یہ لوگوں سے باتیں کرے گا کہ تم اللہ کی نشانیوں کو نہیں مانتے تھے، اب قیامت آگئی، بار بار یہی کہے گا کہ تم نہیں مانتے تھے، تم نہیں مانتے تھے، تم نہیں مانتے تھے۔ اس کے

آنے کے بعد اگر کوئی کافر کلمہ پڑھنا چاہے گا تو نہیں پڑھ سکے گا چونکہ اب ایسی علامت آگئی ہے کہ کلمہ پڑھنے کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

3: ”وُخْرِجُوا بِأَجُوجٍ وَمَأْجُوجٍ“ یا جوج ماجوج کا نکلنا۔

4، 5، 6: ”وَالَّذِجَالُ وَعِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَالْذُّخَانُ“ دجال کا نکلنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نازل ہونا اور دھوئیں کا نکلنا۔

7، 8، 9: ”وَتِلْكَ أَسُوفٍ خُسُوفٍ بِالْمَغْرِبِ وَخُسُوفٍ بِالْمَشْرِقِ وَخُسُوفٍ بِجَزِيرَةِ الْعَرَبِ“ تین خسوف ہوں گے یعنی لوگ زمین میں دھنسا شروع ہو جائیں گے، ایک خسوف مغرب میں، ایک مشرق میں اور ایک جزیرۃ العرب میں۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ یہ قیامت کے بالکل قریب قریب کی علامات ہیں۔

10: ”وَآخِرُ ذَلِكَ تَخْرُجُ نَارٌ مِنَ الْيَمِينِ مِنْ قَعْرِ عَدَنَ تَسْوِقُ النَّاسَ إِلَى الْمَحْشَرِ“ اور آخری علامت یہ ہوگی کہ وسط عدن سے ملک یمن میں ایک آگ نکلے گی جو پوری انسانیت کو گھیرنا شروع کر دے گی، لوگ جہاں سونا چاہیں گے وہاں آگ رک جائے گی، جہاں کھائیں گے رک جائے گی، یہ آگ لوگوں کو میدانِ محشر سر زمینِ شام کی طرف لائے گی۔ اور اس کے بعد پھر قیامت شروع ہو جائے گی۔<sup>79</sup>

اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔ (آمین)  
وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة القصص

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿طَسَمَ ۝ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ۝ نَتْلُو عَلَيْكَ مِنْ نَبَأِ

مُوسَىٰ وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝﴾

### حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ:

اس سورت میں تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو نقل فرمایا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر ہے، سورت طہ میں، اس سورة القصص میں، سورة الاعراف میں اور بھی کئی سورتوں میں ہے۔

### حدیث الفتون:

موسیٰ علیہ السلام کا پورا واقعہ سنن النسائی کتاب التفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ یہی واقعہ آپ دیکھنا چاہیں تو ﴿وَفَتَّنَكَ فُتُونًا﴾ سورة طہ کے تحت تفسیر ابن کثیر میں دیکھ لیں، وہاں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اول تا آخر واقعہ موجود ہے اور یہ حدیث پاک ”حدیث الفتون“ کے نام سے معروف ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس حدیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے قبل فرعون مصر پر حاکم تھا۔ فرعون اور اس کے درباریوں میں یہ بات معروف تھی کہ بنی اسرائیل کے لوگ اس بات پر خوش ہیں کہ ان کی قوم میں بادشاہ بھی ہوں گے، ان کی قوم میں نبی بھی ہوں گے اور یہ بشارت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی ہے۔ پہلے ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ نبی یوسف بن یعقوب ہیں، وہ فوت ہو گئے تو پھر ان کا خیال ہوا کہ کوئی اور نبی آنا ہے جو ہماری عزت کا باعث بنے گا، ہمیں غلامی سے نکالے گا۔ تو فرعون کی جو شوریٰ تھی انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ ایسا کریں کہ ان کے بچے قتل کریں اور خدمت کے لیے ان کی بچیاں زندہ رکھیں، نہ ان میں کوئی لڑکا ہو گا اور نہ بادشاہ بنے گا۔ اس کے لیے انہوں نے ایک پولیس متعین کر دی کہ جس گھر سے اطلاع ملے کہ یہاں بچے کی پیدائش ہوئی ہے اس کو لے کر ذبح کر دو۔ کچھ عرصہ جب بچوں کی اچھی خاصی تعداد ذبح کر لی تو اب ان کے ہاں اہم مسئلہ پیدا ہوا کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہماری خدمت کرتے ہیں، جب ان کے بچے ذبح ہو جائیں گے تو ہماری خدمت کون کرے گا؟ اب انہوں نے دوبارہ اپنی اسمبلی کا اجلاس بلوایا۔ پھر مشورہ میں یہ طے ہوا کہ ایک سال بچوں کو ذبح کریں اور ایک سال بچوں کو زندہ رکھیں کیونکہ جو تھوڑے زندہ رہیں گے ان کی تعداد اتنی کم ہوگی کہ ہمارے اوپر حکومت نہیں کر سکیں گے۔ اب انہوں نے یہ طے کر لیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے ہاں حضرت ہارون علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس سال بچوں کو ذبح نہیں کرنا تھا اس لیے حضرت ہارون علیہ السلام کی پیدائش پر ان کی والدہ کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ آئندہ وہ سال تھا کہ جس سال بچوں کو ذبح کرنا تھا اس سال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ امید کے ساتھ تھیں تو

ان کو یہ پریشانی بہت زیادہ تھی کہ اگر اس سال میرے ہاں بچہ پیدا ہوا تو یہ لوگ اسے مار دیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ﴿وَفَتَّتَكَ فَتُونًا﴾ کہ یہ آزمائش ان آزمائشوں میں سے سب سے پہلی آزمائش تھی جو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لیے تھی اور اس مرحلے سے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ گزری ہیں۔

### ام موسیٰ کی طرف پیغام اور قادیانی استدلال:

﴿وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفَتْ عَلَيْهِ فَلَاٰخِيَهٗ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَاٰدُوْهُ اِلَيْكَ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ جب امید کے ساتھ تھیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ جب تمہارا بچہ پیدا ہو جائے تو اسے دودھ پلاتی رہنا، جب کوئی خطرہ محسوس ہو تو اس بچے کو دریا میں ڈال دینا اور ڈرنا مت نہ ہی غمگین ہونا۔ ہم اس بچے کو تمہارے پاس ضرور بالضرور پہنچائیں گے اور اسے رسول بنائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تسلی دی موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو۔ یہ اشارہ تھا کہ آپ کا بچہ آپ کی گود میں پلے گا، اس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی، یہ قتل نہیں ہوگا اور یہ بڑا بھی ہوگا۔

یہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر وحی آئی اس کے لیے قرآن کریم میں یہ الفاظ ہیں ﴿وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوسٰى﴾ اس سے مرزا قادیانی اور اس کی جماعت استدلال کرتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی نہیں تھیں پھر بھی ان پر وحی آئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وحی ختم نہیں ہوئی بلکہ وحی کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کی طرف بھی وحی فرمائی ہے ﴿وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلٰى

## وحی الہام اور وحی نبوت:

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ وحی کی دو قسمیں ہیں:

ایک ہوتی ہے وحی الہام اور ایک ہوتی ہے وحی نبوت۔ ان اقسام کو وحی تشریعی اور وحی غیر تشریعی بھی کہتے ہیں۔ وحی الہام وہ ہوتی ہے کہ جس پر وحی ہو اس کا تعلق اس کی ذات کے ساتھ ہو اور وحی نبوت وہ ہوتی ہے کہ جس پر وحی نازل ہو اس وحی کا تعلق اس کی ذات کے ساتھ نہ ہو بلکہ دوسرے افراد کے ساتھ ہو۔ پیغمبر پر جو وحی آتی ہے اس کا تعلق اس پیغمبر کی ذات سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق پیغمبر کی دعوت، پیغمبر کی تبلیغ اور پیغمبر کی شریعت کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ جو مکھی پر وحی آئی ہے اس کا تعلق دوسروں سے نہیں ہے بلکہ مکھی کی ذاتی زندگی سے ہے، اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر وحی آئی ہے تو اس وحی کا تعلق ان کی ذاتی زندگی سے ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بسا اوقات ہم ”وحی“ کے لفظ سے پریشان ہو جاتے ہیں اور ہمارا عام طور پر جواب یہ ہوتا ہے کہ ایک ہے وحی لغوی اور ایک ہے وحی اصطلاحی، اور ﴿وَاَوْحِیْ رَبُّكَ اِلَی النُّحْلِ﴾ میں وحی لغوی مراد ہے۔ اس لیے اچھی طرح سمجھ لیں کہ وحی الہام اور وحی نبوت الگ الگ چیز ہیں، وحی نبوت یہ پیغمبر کے ساتھ خاص ہے اور وحی الہام یہ پیغمبر کے ساتھ خاص نہیں ہے، کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنا کوئی پیغام کسی کے دل میں ڈالتے ہیں تو یہ وحی الہام ہے۔

پھر بسا اوقات ہم وحی لغوی اور وحی اصطلاحی کے الفاظ کہتے ہیں تو یہ اصطلاحی وحی نبی کے ساتھ خاص ہے اور لغوی وحی بمعنی پیغام یہ غیر نبی کے ساتھ بھی

ہو سکتا ہے۔

## ام موسیٰ کی پریشانی:

خیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو تسلی مل گئی۔ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ انہوں نے بچے کو صندوق میں ڈال کر دریا کے حوالے کر دیا۔ جب انہوں نے بچے کو دریا میں ڈالنا تھا تو اس وقت شیطان نے وسوسہ ڈالا، اس نے کہا کہ دیکھو! بچے کو اپنے پاس رکھو، دریا کی موجوں میں جائے گا تب بھی مر جائے گا اور اگر کوئی اس کو اٹھالے گا اور ذبح ہو جائے گا تو تمہارے سامنے تو قتل ہو گا، اس کو خود کفن دو گی، دفن کرو گی، اپنے بیٹے کو دیکھ تو لو گی اور اگر ایسی جگہ چلا گیا تو تمہیں دیکھنا بھی نصیب نہیں ہو گا۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو جو اللہ کی طرف سے الہام تھا وہ اس موقع پر بھول گیا کہ خدا نے مجھے تسلی دی کہ ایسا نہیں ہو گا، اس لیے انہیں تھوڑی سی پریشانی بھی ہوئی۔ یہ عام طور پر بندے کو بات سمجھ نہیں آتی کہ جب اللہ کی طرف سے الہام تھا تو بھول کیسے گیا؟ اب دیکھو! قرآن کریم اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے نازل فرمایا اور قرآن کریم کے حافظ کو آیات یاد بھی ہوتی ہیں اور وہ ان کو سمجھتا بھی ہے لیکن جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کبھی صبر کا دامن چھوڑ بھی دیتا ہے۔ جب کوئی اسے یاد کرائے کہ قرآن میں ہے: ﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾<sup>81</sup> کہ صبر اور نماز کے ذریعے اللہ سے مدد مانگو! اب اس حافظ کو یاد آ جاتا ہے اور پھر اس کو صبر کی توفیق مل جاتی ہے۔ تو دیکھو کہ اس کے پاس اللہ کا پیغام ہوتا ہے لیکن پھر بھی بھول جاتا ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے پاس پیغام موجود تھا لیکن وہ بھول گئیں۔ یہ میں نے اس لیے عرض کیا کہ بسا اوقات بندے کو الجھن ہوتی ہے کہ



اللہ کا پیغام کیسے بھول گئی؟ دیکھیں! حضرت آدم علیہ السلام جنت میں تھے، اللہ نے فرمایا تھا: ﴿وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ﴾<sup>82</sup> اس درخت کے قریب نہ جانا لیکن آدم علیہ السلام بھول گئے۔ اب آدمی کو تعجب ہوتا ہے کہ جب اللہ کا حکم تھا تو بھولے کیسے؟! شیطان نے کیسے بھلا دیا؟ تو اس سوال کے جواب کی میں نے آسان سی صورت بتائی ہے کہ قرآن کے حافظ کو قرآن یاد ہوتا ہے، عالم کو کسی مسئلے پر آیات یاد ہوتی ہیں لیکن موقع پر بھول جاتا ہے اور بعد میں اس کو یاد آ جاتی ہیں۔

### صندوق دریا میں ڈال دیا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے موسیٰ علیہ السلام کو ایک صندوق میں ڈالا اور دریائے نیل کے حوالے کر دیا۔ دریائے نیل کا ایک حصہ فرعون کے محل کے طرف سے ہو کر گزرتا تھا تو یہ صندوق اس طرف چلا گیا۔ آگے چٹان تھی جہاں فرعون کی کنیزیں نہاتی تھیں، کپڑے دھوتی تھیں، سارے کام کرتی تھیں تو اللہ نے اس صندوق کو ان کے قریب کر دیا۔ انہوں نے صندوق دیکھا تو کہا کہ اگر اس کو کھولیں تو ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی مال ہو اور جب سامان فرعون کی بیوی کو دیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ شک کرے کہ تم نے کچھ مال تم نے رکھ لیا ہو گا تو بہتر ہے کہ اسی کے پاس جا کر صندوق کھولیں۔ جب فرعون کی بیوی آسیہ اس نے صندوق کو کھولا، دیکھا تو پہلی نظر میں اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کی محبت اس کے دل میں ڈال دی، ﴿وَالْقَيِّمُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي﴾ اللہ فرماتے ہیں کہ اے موسیٰ! ہم نے خاص طور پر آپ پر اپنی محبت ڈالی ہے کہ جو آپ کو دیکھتا ہے آپ اس کے محبوب بن جاتے ہیں۔

## ولی سے محبت کی وجہ:

بعض علماء نے اس سے استدلال کیا ہے کہ جس طرح اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر محبت ڈال دی تھی تو جو اللہ کا ولی ہوتا ہے اللہ اس کو بھی شانِ محبوبیت عطا فرما دیتے ہیں کہ لوگ اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس پر بھی آپ کو شبہ ہو گا کہ کتنے ولی ہیں کہ لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ محبت کیسے ڈالتے ہیں؟ یہ بات یاد رکھنا! محبوبیت کا معنی ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ سے پیار کرتے ہیں وہ اس ولی سے بھی پیار کرتے ہیں اور جو اللہ سے پیار نہیں کرتے وہ اللہ کے اس ولی سے کیسے پیار کریں گے؟ محبت تو ولی اور اللہ سے تعلق کی وجہ سے ہے، اللہ سے محبت ہو گی تو اللہ کے ولیوں سے محبت بھی ہو گی۔ اب دیکھو! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کائنات کی محبوب ترین شخصیت ہیں اور ابو جہل جب قتل ہونے لگا تو اس نے اس وقت کہا تھا کہ محمد - صلی اللہ علیہ وسلم - کو میرا پیغام دینا کہ جتنی نفرت میں آپ سے پہلے کرتا تھا آج اس سے زیادہ کرتا ہوں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ جب اس کو اللہ سے پیار نہیں تو اللہ کے محبوب سے کیسے پیار ہو گا؟!

اس کو میں عام مثال میں یوں سمجھتا ہوں کہ مثلاً ہمارا ادارہ مرکز اہل السنۃ والجماعۃ ہے، جو آدمی اس سے پیار کرتا ہے تو وہ یہاں پڑھنے والے طالب علم سے بھی پیار کرتا ہے اور جو مرکز سے نفرت کرتا ہے وہ طالب علم سے بھی پیار نہیں کرے گا۔

## موسیٰ علیہ السلام کی محبوبیت:

خیر اس کے دل میں محبت ڈالی۔ اس نے کہا کہ اس کو سنبھال کے رکھتے ہیں۔ اس کو مارتے نہیں ہیں۔ اس کو بچہ پیار الگا۔ جو نہی گھر میں یہ خبر پھیلی تو وہ جو فرعون نے سپاہی چھوڑے تھے بچوں کو قتل کرنے کے لیے وہ فوراً پہنچ گئے، یہ بچہ ہمیں دے دو ہم نے اس کو ذبح کرنا ہے۔ فرعون کی بیوی نے کہا کہ میں فرعون سے بات کر لیتی ہوں،

اگر اجازت مل گئی تو ٹھنڈک ہے ورنہ تم اس کو ذبح کر دینا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس واقعہ کو ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ ﴿وَفَتَحْنَاكَ فَتُتَوَّنَا﴾ کی آزمائشوں میں سے یہ دوسری آزمائش تھی۔

وہ فرعون کے پاس گئی تو اس نے فرعون کو بچہ دکھایا اور کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ ہم اس کو پالیں، اس کو مارنا نہیں ہے، یہ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا۔ فرعون نے کہا کہ یہ تیری آنکھوں کی ٹھنڈک تو ہو سکتا ہے لیکن میری آنکھوں کی ٹھنڈک نہیں ہو سکتا۔ فرعون نے کہا کہ اس کو ذبح کر دو! بیوی نے کہا کہ ذبح مت کرو، ایک بچے کے زندہ رہنے سے کون سی حکومت آتی ہے؟! ہر سال تم ذبح کرتے ہو، اگر ایک زندہ رہ گیا تو کون سی بادشاہت ان کی وجہ سے آتی ہے؟ فرعون نے کہا کہ تیرے کہنے پر میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔

بعض روایات میں ہے کہ جب فرعون نے یہ کہا کہ یہ تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے مجھے اس کی حاجت نہیں ہے، اگر وہ یہ جملہ کہہ دیتا کہ یہ تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو گا تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک بھی ہو گا تو اللہ اس کو ایمان کی توفیق عطا فرما دیتے۔ اس کی بیوی کو ایمان کی توفیق ملی ہے کیونکہ اس نے کہا تھا کہ یہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

### موسیٰ علیہ السلام کا اپنی ماں کا دودھ پینا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلانے لگے تو آپ کسی کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ دایہ تلاش کیں لیکن آپ کسی کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ آسیہ نے موسیٰ علیہ السلام کو کنیزوں کے حوالے کیا کہ اس کو شہر میں لے جاؤ اور کوئی ایسی عورت تلاش کرو جس کا دودھ یہ پی لیں۔ کنیزیں بازار میں پھر کر دایہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ ادھر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اپنی بیٹی سے کہا کہ باہر جاؤ اور لوگوں سے پتا کرو کہ اس

تابوت اور بچے کا کیا بنا؟ موسیٰ علیہ السلام کی بہن باہر گئی تو دیکھا کہ کنیزیں بچے کو لے کر دودھ پلانے کے لیے دایہ کو تلاش کر رہی ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے ان سے کہا کہ میں تمہیں ایک عورت بتاتی ہوں وہ دودھ بھی پلائے گی اور اس کا خیال بھی رکھے گی اور اس کی خیر خواہ بھی ہوگی۔ ان کنیزوں کو شک پڑا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ عورت اس بچے کوئی خاص رشتہ دار نہ ہو جو اتنے یقین سے کہہ رہی ہے کہ اس گھر والے اس بچے کا خیال رکھیں گے۔ تو انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب کہ تم جانتی ہو بچہ کس کا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿وَفَتَنَكَ فَتُونًا﴾ کی آزمائشوں میں سے یہ تیسری آزمائش ہے۔

اس نے کہا کہ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں اس کی ماں کو جانتی ہوں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اس گھر کا دودھ اس بچے نے پی لیا تو اس عورت کو فرعون کے دربار میں ایک مقام مل جائے گا، اس کو پیسے ملیں گے تو وہ بچے کے ساتھ ضرور خیر خواہی کرے گی، میں تو یہ کہنا چاہتی ہوں۔ ان کنیزوں کو اس بات سے تھوڑی سی تسلی ہو گئی تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی بہن کو چھوڑ دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن فوراً گھر پہنچی اور یہ سارا قصہ والدہ کو بتایا۔ دونوں اس جگہ آئیں جہاں کنیزیں کھڑی تھیں۔ کنیزوں نے بچہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے حوالے کیا، انہوں نے دودھ پلانا شروع کر دیا تو فوراً بچے نے ان کا دودھ پینا شروع کر دیا اور پیٹ بھر کر پیا۔

فرعون کی بیوی نے یہ بات سنی کہ بچے نے دودھ پینا شروع کر دیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو اپنے پاس بلایا۔ وہ چلی گئیں۔ اس نے کہا کہ تم یہاں ٹھہرو اور بچے کو دودھ پلاؤ، تمہارا خرچہ ہمارے ذمے ہو گا۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے شان بے نیازی کا مظاہرہ کیا تا کہ پتہ نہ چلے کہ یہ اسی بچے کی ماں ہے، کہا کہ پہلے میرے پاس ایک بچہ گھر میں ہے، میں اس کو پالتی ہوں، میں اس

کو گھر میں کیسے چھوڑوں؟! یہ حضرات ہارون تھے جو ایک سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ اگر اس کو دودھ پلانا ہے تو میرے پاس بھیج دو، میں اپنے گھر میں اس کو دودھ پلاؤں گی اور میں تمہیں ضمانت دیتی ہوں کہ اس بچے کا خیال بھی رکھوں گی۔ فرعون کی بیوی نے کہا کہ مجھے اس سے پیار بہت ہے، میں اس سے جدا نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے کہا کہ بہر حال میں آپ کے محل میں نہیں رہ سکتی۔ تو اس نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ماں کے حوالے کر دیا۔

### موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کی ڈاڑھی پکڑنا:

جب موسیٰ علیہ السلام کچھ تھوڑے سے بڑے ہوئے چلنے کے قابل ہوئے تو فرعون کی بیوی نے پیغام بھیجا کہ بچہ ہمیں دکھانے کے لیے لاؤ، میں اس کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام کو لایا گیا۔ فرعون کی بیوی نے شاہی حکم جاری کیا کہ جب وہ دایہ بچے کو لے کر آئے تو تم سب ہدایا دو۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کے ساتھ گھر سے نکلے تو ان کی والدہ کو ہدیے ملنا شروع ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ شاہی حکم تھا۔ جب دربار میں پہنچے تو بہت سارے ہدیے جمع ہو گئے، اس نے یہ سارے ہدیے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے حوالے کر دیے کہ یہ بھی تمہارا مال ہے، تم اس کو لے جاؤ۔

اس کے بعد فرعون کی بیوی نے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ اس کو فرعون سے بھی کچھ ہدیہ مل جائے۔ تو وہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے دربار میں لے گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی گود میں تھے۔ آپ نے فرعون کی ڈاڑھی کو پکڑ کر ایسے کھینچا کہ فرعون زمین کی طرف جھک گیا۔ اسی وقت اس کی شورلی نے کہا کہ یہ وہی بچہ ہے جو تمہاری حکومت ختم کرے گا، اس کو ذبح کر دو ورنہ تمہارے لیے مسئلہ پیدا ہو گا۔ اسی وقت فرعون نے آرڈر جاری کیا کہ اس کو ذبح کر دو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ چوتھا موقع تھا آزمائش کا۔ یہ موسیٰ علیہ السلام پر ایک اور

امتحان تھا۔

فرعون کی بیوی کھڑی ہوئی۔ اس نے کہا: یہ ظلم نہ کرو، دیکھو! تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، اپنے وعدے کی لاج رکھو! اگر تمہیں شبہ ہے تو یہ شبہ دور کر لیتے ہیں۔ میں ایک طرف دو موتی رکھ دیتی ہوں اور ایک طرف آگ کے دو انگارے رکھ دیتی ہوں۔ اگر یہ موتی کی طرف جائے تو سمجھو کہ یہ سمجھ دار ہے اور اس نے جان بوجھ کر تمہیں جھٹکا دیا ہے اور اگر انگاروں کی طرف جائے تو سمجھو کہ بچہ ہے، بس جان بوجھ کر نہیں کیا غفلت میں کیا ہے جیسے بچے بڑوں کے ساتھ کر دیتے ہیں۔ فرعون مان گیا تو دو موتی اور دو آگ کے انگارے موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رکھ دیے گئے۔

بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جانے لگے موتی کی طرف تو جبرئیل علیہ السلام نے ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف کیا اور بعض روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام خود گئے اور آگ کے انگارے کو لیا۔ اب ظاہر ہے کہ بچہ آگ کے انگارے کو لے تو بچہ پھینکتا نہیں ہے، وہ پریشان ہو جاتا ہے کہ میں اس کے ساتھ کیا کروں؟ یہ میں شبہ کا جواب دے رہا ہوں کہ انہوں نے آگ کا انگارہ رکھا کیسے؟ گرم تھا تو فوراً پھینک دیتے، چھوڑ دیتے، ہاتھ میں کیسے رکھ لیا؟ آپ کسی بچے کے ہاتھ میں برف دو وہ ٹھنڈی ہوتی ہے وہ بچہ روتا ہے لیکن پھینکتا نہیں ہے، اس کو سمجھ نہیں آتی کہ میں اس کے ساتھ کروں کیا! تو موسیٰ علیہ السلام نے آگ کا انگارہ اٹھایا اور پھر فرعون نے آگے بڑھ کر آگ کا انگارہ نیچے کیا۔ فرعون کی بیوی نے کہا کہ میں تمہیں کہتی تھی کہ یہ بچہ ہے، تم خواہ مخواہ پریشان ہو گئے ہو۔ اس وقت واپس لے آئی اور موسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ کے حوالے کر دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پرورش پاتے رہے، جوان ہوئے۔ ان کو دربارِ شاہی کا قرب ملا۔ اس لیے ان کا ایک خاص مقام تھا۔ کوئی چھیڑ خانی نہیں کرتا تھا کہ یہ

فرعون کے دربار کے خاص آدمی ہیں۔ یہ اپنی قوم بنی اسرائیل کا خیال بھی رکھتے تھے، کسی کو زیادتی نہیں کرنے دیتے تھے اور کسی کو ڈانٹ بھی دیتے تو کوئی بولتا بھی نہیں تھا کہ یہ فرعون کے خاص آدمی ہیں۔

### قبطی کا قتل:

اسی دوران موسیٰ علیہ السلام جب گھر سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک قبطی یعنی فرعون کے قبیلے کا آدمی ایک اسرائیلی یعنی موسیٰ علیہ السلام کے قبیلے والے آدمی سے جھگڑا کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو سمجھایا کہ تم کیوں ظلم کرتے ہو؟ کیوں زیادتی کرتے ہو؟ موسیٰ علیہ السلام سمجھے کہ زیادتی قبطی کی ہے تو آپ نے چھڑانے کے لیے اور تھوڑی سی تنبیہ کرنے کے لیے اس کو مکارا تو وہ مر گیا۔ موسیٰ علیہ السلام بھی چلے گئے اور اسرائیلی بھی چلا گیا۔ اب بات مشہور ہو گئی کہ کسی اسرائیلی نے اس کو قتل کر دیا ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ قتل تو ہو گیا لیکن قاتل کون ہے؟ قاتل تلاش کر رہے تھے اور قاتل ملتا نہیں تھا۔

موسیٰ علیہ السلام اس پر پریشان تھے کہ میرا پتا چل گیا تو فرعون مجھے قصاص میں مار دے گا۔ یہ چھپ رہے تھے کہ میرا پتا نہ چلے۔ دوسرے دن موسیٰ علیہ السلام آئے تو وہی اسرائیلی آدمی کسی اور قبطی سے جھگڑا کر رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے۔ آپ نے پہلے تو اس قبطی کو سمجھایا پھر اس اسرائیلی کو تنبیہ کی۔ کہا کہ تو بھی جھگڑا ہے تیری عادت ہے جھگڑا کرنا، تو کل بھی جھگڑا کر رہا تھا اور آج بھی جھگڑا کر رہا ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام اس پر غصہ ہوئے اور تھوڑا سا آگے بڑھے تو اس کو شک پڑا کہ آج میری باری ہے، یہ اسرائیلی فوراً بول پڑا کہ کل بھی آپ نے ایک بندے کو قتل کیا تھا اور آج مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں! اتنی بات ہوئی۔ خیر جھگڑا ختم ہو گیا

اور وہ قبلی چپ چاپ وہاں سے چلا گیا اس نے جا کر دربار میں شکایت کی کہ قاتل موسیٰ علیہ السلام ہیں اور دلیل کے طور پر یہ واقعہ پیش کیا۔ فرعون نے بندے بھیجے کہ جاؤ اور موسیٰ کو قتل کر دو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ پانچواں موقع ہے آزمائش کا۔

فرعون کے آدمی موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے نکل پڑے۔ یہ لوگ شہر کی بڑی سڑک کے ذریعے موسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں نکلے بائی روڈ جیسے سرکاری گاڑیاں چلتی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کی حمایت والا ایک شخص تھا جسے پتا چل گیا کہ سپاہی موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے نکل پڑے ہیں، وہ گلی کو چوں سے ہوتا ہوا موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا اور آکر موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ موسیٰ! دوڑو تمہارے قتل کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام وہاں سے نکلے اور پھر مدین کی طرف چل پڑے۔

### شہری افضل دیہاتی، ایک دلچسپ مکالمہ

﴿وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ﴾

اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ میں درجہ اولیٰ جامعہ بنوریہ کراچی میں تھا تو ہمارے ایک استاد تھے جامعہ بنوریہ میں انہوں نے درجہ ثالثہ میں بات شروع کر دی کہ شہری دیہاتی سے افضل ہوتا ہے۔ جب چھٹی ہوئی تو لڑکے ملے تو انہوں نے مجھے بھی کہا کہ آج ہمارے ہاں یہ بات چلی ہے۔ میرا چونکہ شروع سے ہی گفتگو کا مزاج تھا تو میں نے طلبہ سے کہا کہ دعا کرو استاد جی ہماری کلاس میں یہ بات شروع کریں۔ خیر انہوں نے اگلے دن ہماری کلاس میں یہ بات شروع کر دی کہ شہری دیہاتی سے افضل ہوتا ہے اور وہ تھے تو پکے تبلیغی لیکن مزاج ان کا گفتگو والا تھا۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ کوئی خارجی وجہ نہ ہو تو بالذات شہری دیہاتی سے



افضل ہوتا ہے، دیہاتی سخت دل ہوتے ہیں، بات نہیں سمجھتے، تعلیم نہیں ہوتی یہ باتیں اپنی جگہ پر ہیں لیکن چونکہ ہم نے تھوڑی سی بات کرنی تھی اس لیے میں نے کہا: استاد جی! شہری دیہاتی سے افضل ہوتا ہے یہ بات دلیل کے ساتھ ہے یا بغیر دلیل کے ہے؟ فرمانے لگے: بہت سے دلائل ہیں۔ میں نے کہا کہ ہمیں بھی کوئی دلیل دے دیں۔ استاد جی فرمانے لگے: قرآن کریم میں ہے: ﴿وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ يَسْعَى﴾ کہ ایک شہری آدمی تھا جس نے موسیٰ علیہ السلام کی جان چھڑائی تھی۔ میں نے کہا: استاد جی! یہ بندہ شہری نہیں تھا دیہاتی تھا، ”أَقْصَا“ اقصى مضاف ہے اور ”الْمَدِينَةِ“ مضاف الیہ ہے اور مضاف مضاف الیہ میں اصل تغایر ہوتا ہے، وہ شہر سے نہیں تھا بلکہ شہر سے باہر دیہات سے آیا تھا، وہ ہمارا بندہ تھا آپ کا نہیں تھا۔ آپ کوئی اور دلیل پیش فرمائیں۔

استاد جی فرمانے لگے کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَ نِفَاقًا﴾ کہ دیہاتی کفر اور نفاق میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اسی قرآن کریم میں ہے: ﴿وَمِنَ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ﴾ کہ مدینہ یعنی شہر کے لوگوں میں بھی کچھ لوگ نفاق میں ماہر ہو گئے ہیں، اور قرآن نے دیہاتیوں کی تعریف بھی کی ہے: ﴿وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ کہ دیہاتیوں میں سے کئی لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ تنبیہ بھی فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا قُزْبَةٌ لَهُمْ﴾ کہ انہی دیہاتیوں کے لیے فضیلت بھی ہے۔ استاذ جی! آپ نے ایک حصہ تو پیش کیا اور دوسرے آپ نے چھوڑ دیے، اب یہ دلیل بھی ٹوٹ گئی۔

مجھے کہتے ہیں کہ جو دیہاتی تہ بند پہنتے ہیں اس سے کبھی کبھی بندے کا ستر کھل

جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارا تو کبھی کبھی کھلتا ہے اور شہریوں کا تو روزانہ کھلتا ہے۔ حدیث پاک میں علاماتِ قیامت میں ایک علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ ایسی عورتیں ہوں گی کہ کپڑے پہنے ہوں گی لیکن پھر بھی ننگی ہوں گی تو شہری تو کپڑے پہن کر بھی ننگے ہوتے ہیں اور ہمارا تو کبھی کبھی ستر کھلتا ہے۔ میں نے کہا کہ استاد جی! ہمارا تہبند کبھی کبھی کھلتا ہے تو آپ کو نظر آگیا ہے اور شہریوں کا ہر وقت پیٹ پہن کر بھی کھلا ہوتا ہے ہم نے تو کبھی اعتراض نہیں کیا۔

میں نے کہا کوئی اور دلیل؟ مزاح میں فرمانے لگے: تم مان لو! میں نے کہا: استاذ جی ہم تو نہیں مانتے کیونکہ میں نے تو پہلے آپ سے کہا تھا کہ دلیل کے ساتھ یا بلا دلیل؟ تو آپ نے فرمایا تھا دلیل کے ساتھ، آپ شروع میں فرماتے کہ بلا دلیل مان لو تو ہم مان لیتے، اب تو استاذ جی دلیل سے بات چلے گی۔ بس گاڑی رک گئی پھر آگے نہیں چلی۔ اگرچہ بالذات شہری، دیہاتی سے افضل ہوتا ہے لیکن میں نے محبت میں استاذ جی سے تھوڑی سی گفتگو کر لی۔

اور طالب علمی میں میری عادت تھی شاید آپ کو یقین نہ آئے، بسا اوقات درس گاہ میں ہماری تین تین دن بات چلتی رہتی تھی، سبق رک جاتے تھے، لگے رہتے تھے استاد بھی اور ہم بھی، اور الحمد للہ مجھے یاد نہیں ہے کہ کبھی بھی کسی گفتگو میں نتیجہ یہ نکلا ہو کہ ہم پیچھے ہٹ گئے ہوں! کبھی صرف پر بحث ہو جاتی، کبھی حیات پر بات ہو جاتی، کبھی کسی اور مسئلے پر شروع ہو جاتے۔ جب کبھی درس گاہ میں استاذ جی حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ممانیت کے خلاف دلائل دیتے تو میں ممانیت کی طرف سے شروع ہو جاتا کہ استاذ جی یہ آیت بھی ہے، یہ آیت بھی ہے، استاذ جی کہتے: اچھا! کچھ دانے ایسے بھی ہیں! ان کو شک پڑتا کہ شاید یہ ممانی ہے لیکن حاشا وکلا کبھی بھی کسی استاذ کی رتی برابر بھی دل میں حقارت نہ آئی اور نہ آنی چاہیے۔ یہ درس گاہ کا ماحول ہوتا

ہے۔ خانقاہ کا ماحول الگ ہوتا ہے اور درس گاہ کا ماحول الگ ہوتا ہے۔

### خانقاہ اور درس گاہ کے ماحول میں فرق:

ایک خاتون ہیں اور مجھ سے بیعت ہیں۔ انہوں نے مسئلہ پوچھا، میں نے بتایا۔ اس نے کہا: ایسا کیوں؟ میں نے کہا کہ آپ میری شاگرد نہیں ہیں، مجھ سے بیعت ہیں، جب شاگرد ہو اور درس گاہ میں ہو تو پھر کیوں کیوں کر نا اور جب بیعت ہوں تو پھر کیوں کیوں نہیں کرتے، پھر بات مانتے ہیں۔ درس گاہ کا مزاج قیل و قال والا ہے اور خانقاہ کا مزاج حال والا ہے، شیخ کے سامنے بات نہیں کرتے، بات سمجھ میں نہ آئے تب بھی خاموش ہو جائیں اور درس گاہ میں ہوں اور بات سمجھ میں نہ آئے تو کھل کر دلیل مانگتے ہیں اور دلیل سے بات کرتے ہیں۔

### بیویاں بھی اور مرید نیاں بھی!

الحمد للہ میری بیویاں بھی ہیں اور مجھ سے بیعت بھی ہیں، اس لیے ہم کبھی شوہر بن کر بات کرتے ہیں اور کبھی پیر بن کر بات کرتے ہیں، جب شوہر بن کر بات کریں تو ان کو حق ہوتا ہے کہ آگے سے بات کریں۔ بیوی میں دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک محبوب ہوتی ہے اور دوسری محکوم ہوتی ہے، چونکہ محکوم ہے تو اس کا حق ہے کہ بات مانے اور چونکہ محبوب ہے تو اس کا حق ہے کہ کچھ بات منوائے۔ کچھ لوگ محکومیت دیکھتے ہیں تو محبوبیت نہیں دیکھتے اس لیے وہ ہر وقت حاکم بنتے ہیں اور کچھ شانِ محبوبیت دیکھتے ہیں اور شانِ محکومیت نہیں دیکھتے اس لیے وہ ہر بات مانتے ہیں۔ اس لیے ہر بات نہ مانیں کہ وہ آپ کی محکوم بھی ہے اور ہمیشہ ڈانٹ ڈپٹ نہ کریں کہ وہ آپ کی محبوب بھی ہے، یہ دو چیزیں سامنے رکھیں گے تو آپ کے مزاج میں اعتدال آئے گا۔

یہ جو میں آپ سے ہنستے ہنستے باتیں کہتا ہوں یہ زندگی کے اصول ہیں۔ اگر آپ ان کو سمجھ جائیں تو گھروں میں جھگڑے نہیں ہوں گے۔ اس لیے ہمیشہ ذہن میں

دونوں باتیں یاد رکھنا! محکوم بھی اور محبوب بھی تو پھر جھگڑا کبھی نہیں ہو گا۔ تو میں نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری چاروں بیویاں بھی ہیں اور مرید بھی ہیں، کبھی شوہر بن جاتے ہیں اور کبھی پیر صاحب بن جاتے ہیں۔

### پیغمبر کی بیوی اور عام امتی میں فرق:

قرآن کریم میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾<sup>83</sup>

اے ایمان والو! تم اپنی آواز نبی کی آواز سے اونچی نہ کیا کرو! نبی کے سامنے اونچی آواز سے بولیں تو سارے عمل تباہ اور ایمان ختم ہو جائے گا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اس سے مستثنیٰ ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہن، وہ صرف امتی نہیں ہیں بلکہ پیغمبر کی بیویاں بھی ہیں، ان کو وہ حق حاصل ہے جو کسی اور کو نہیں ہے، امتی نبی سے ناراض ہو تو امتی کا ایمان ختم ہو جاتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم امی عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرماتے ہیں کہ جب تو ناراض ہوتی ہے تو مجھے پتا چل جاتا ہے۔ کب؟ فرمایا کہ جب تو خوش ہو تو کہتی ہے رب محمد کی قسم! اور جب تو کہے کہ رب ابراہیم کی قسم! تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ آج عائشہ مجھ سے خوش نہیں ہے۔<sup>84</sup>

یہ بیوی کی شان ہے۔ یہ ہمیشہ ذہن میں رکھیں گے تو پھر لڑائی جھگڑے اور فسادات ختم ہو جاتے ہیں۔

### موسیٰ علیہ السلام کا سفر مدین:

خیر! موسیٰ علیہ السلام وہاں سے نکلے اور مدین کی طرف چل پڑے۔ مدین

کے قریب تھے کہ ایک کنواں نظر آیا۔ دیکھا کہ لوگ وہاں اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے اور دو نوجوان بچیاں پیچھے ہٹ کر کھڑی ہیں، اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے پردے کے ساتھ نظریں جھکا کر ان سے پوچھا کہ تمہارا کیا مسئلہ ہے، تم کیوں کھڑی ہو؟ ان عورتوں نے جواب دیا کہ ہم اس وقت تک اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلاتیں جب تک یہ لوگ یہاں سے چلے نہ جائیں! موسیٰ علیہ السلام کو ان عورتوں پر ترس آیا، آپ خود کنویں پر تشریف لے گئے اور کنویں میں سے پانی کھینچا اور ان عورتوں کی بکریوں کو پلا دیا۔ وہ عورتیں وہاں سے چلی گئیں۔ بعض روایات میں ہے کہ لوگ وہاں اپنے جانوروں کو پانی پلاتے اور جب فارغ ہوتے تو کنویں پر ایک بھاری پتھر رکھ کر اس کو بند کر دیتے تاکہ اس میں کوئی گندگی نہ پڑے اور یہ عورتیں چونکہ پتھر ہٹا نہیں سکتی تھیں اس لیے لوگوں کی بکریوں کے بچے ہوئے پانی پر اکتفا کرتیں اور اپنی بکریوں کو پلاتیں۔ اور یہ پتھر ایسا بھاری تھا کہ دس بندے مل کر اس کو اٹھاتے تھے لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اکیلے اس پتھر کو اٹھایا اور کنویں سے پانی نکال کر بکریوں کو پانی پلا دیا۔

### حضرت شعیب علیہ السلام سے ملاقات:

حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں سے فارغ ہوئے تو ایک درخت کے سائے کے نیچے بیٹھ گئے اور یہ دعا کی: ﴿رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ﴾ ﴿٣٧﴾ اے اللہ! میں محتاج ہوں، مجھے آپ کا فضل و کرم چاہیے۔ ان دونوں لڑکیوں نے جا کر اپنے والد حضرت شعیب علیہ السلام سے سارا واقعہ بیان کیا۔ آپ نے ایک بیٹی کو بھیجا کہ جاؤ ان کو بلا کر لاؤ! وہ بلائے کے لیے آئی تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں آگے چلتا ہوں اور تم میرے پیچھے پیچھے چلو، پیچھے سے مجھے بتانا کہ دائیں جانا ہے یا بائیں جانا ہے۔ جب گھر پہنچ گئے تو موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کو پورا واقعہ سنایا۔ جب

واقعہ سن لیا تو حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں تسلی دی اور فرمایا: ﴿لَا تَخَفْ ۖ نَحْنُ نَحْمِلُ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ کہ یہاں پریشان نہ ہونا! یہ مصر اور فرعون کی شاہی کا علاقہ نہیں ہے نہ ہی اس کی یہاں تک دسترس ہے اور نہ اس کا حکم یہاں تک چلتا ہے، آپ اس حوالے سے مطمئن ہو جائیں!

حضرت شعیب علیہ السلام کی ایک بیٹی نے ان سے کہا کہ ابو جان! آپ ان کو ملازمت پر رکھ لیں اس لیے کہ یہ قوی بھی ہیں اور امین بھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی سے پوچھا: تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ قوی بھی ہے اور امین بھی ہے؟ اس نے کہا کہ قوت تو ہم نے اس بات سے دیکھی ہے کہ انہوں نے خود پتھر اٹھایا اور ڈول کھینچ کر بکریوں کو پانی پلایا، اور امین کیسے؟ کہا کہ اباجی! اس نے آنکھ بھر کر ہمیں نہیں دیکھا، اپنی آستین سے چہرہ چھپا کر ہم سے بات کرتے تھے اور ہمیں فرمایا کہ تم پیچھے چلو میں تمہارے آگے چلتا ہوں، اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ یہ امین بھی ہیں۔ چنانچہ شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ ان دو بیٹیوں میں سے ایک کے ساتھ آپ کا نکاح کر دوں لیکن ہماری شرط ہے کہ آٹھ سال آپ بکریاں چرائیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے یہ شرط منظور ہے۔ اس کے بعد شعیب علیہ السلام نے ان کو ملازم رکھا۔

### ملازمت اور عہدے کے لیے چار اہم صفات:

دیکھیں! کسی شخص کو آپ نے عہدہ دینا ہو یا ملازمت دینی ہو تو دو چیزیں تو یہ ہیں اور دو ان کے علاوہ ہیں، ان چار کا خیال کرنا چاہیے:

1: وہ قوی و باصلاحیت ہو، آپ کا کام کر سکتا ہو اور قوی سے مراد طاقت و نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جو کام آپ اس سے لینا چاہتے ہیں اس میں قوی ہو۔

2: امانت دار ہو۔

اس کے علاوہ جو دو چیزیں ہیں ان کا ذکر سورت یوسف میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہ مصر سے فرمایا تھا: ﴿اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾<sup>85</sup> کہ آپ مجھے خزانوں کے انتظامات سپرد کر دیں! اس کے لیے آپ نے دو چیزیں بیان فرمائی ہیں: ایک یہ کہ مجھے حفاظت کرنے کا سلیقہ بھی آتا ہے اور دوسرا یہ کہ میرے پاس اس فن کا علم بھی ہے۔ اس لیے قوت اور امانت داری کے علاوہ دو اور چیزیں بھی ہونی چاہئیں:

3: حفیظ ہو، نگرانی اس کا مزاج ہو، اشیاء کی حفاظت کرے۔

4: علیم ہو، اس کے پاس اس فن اور معاملہ کا علم بھی ہو۔

یہ چار چیزیں بالکل الگ تھلگ ہیں۔ ایک بندے کے پاس علم ہوتا ہے لیکن کمزور ہے کہ کام نہیں کر سکتا، لکھنا کیسے ہے اس کو پتا ہے لیکن اس کا ہاتھ کام نہیں کرتا یعنی خطا نہیں ہے، اب یہ علیم تو ہو گا لیکن قوی نہیں ہو گا، اس لیے اس کو لکھنا بھی آتا ہو اور لکھ سکتا بھی ہو۔ تو جو کر سکتا ہو وہ قوی ہے اور جو جانتا ہو وہ علیم ہے۔ پھر یہ حفیظ بھی ہو۔ حفیظ کا معنی کہ ایک بندہ جانتا بھی ہے کام کر بھی سکتا ہے لیکن اپنے کیے ہوئے کام کو سنبھالتا نہیں ہے، حفاظت نہیں کرتا۔ اب اس کو آپ کیا کریں گے؟! تو بندہ قوی بھی ہو، امین بھی ہو، حفیظ بھی ہو اور علیم بھی ہو۔ یہ چار صفتیں ہوں پھر آپ بندہ رکھیں۔

### حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی سے نکاح:

خیر حضرت شعیب علیہ السلام سے معاملہ طے ہو گیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جو حق مہر رکھا تھا وہ بظاہر مال نہیں تھا بلکہ ان کا کام تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ

ہمارے اس دور میں ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

تو اس کے لیے پہلی بات تو یہ سمجھیں کہ ہمارے ہاں حق مہر میں مال ہونا شرط ہے، بکریاں چرانا یہ مال نہیں ہے۔ ہاں یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی شریعت کا معاملہ تھا اور ان کی شریعت میں جائز تھا۔ دوسری بات یہ جو حضرت شعیب علیہ السلام نے حق مہر رکھا تھا ہو سکتا ہے کہ وہ حق مہر بھی مال ہو۔ مال اس طرح ہو گا کہ آپ آٹھ سال کام کریں گے اور ہر مہینے آپ کو اتنی تنخواہ ملے گی اور وہ تنخواہ آپ کا حق مہر ہو گا۔ آج بھی اگر کوئی بندہ اپنی بیٹی کسی کو نکاح میں دیتا ہے اور حق مہر کی یہ صورت بنالے کہ آپ ہمارے پاس ایک سال کام کریں گے۔ جو ایک سال کام کریں گے اس کے جتنے پیسے ملیں گے وہ پیسے حق مہر ہوں گے، ہم مہر کے پیسے نہیں لیں گے بلکہ اتنے پیسوں کا کام لیں گے تو یہ کام پیسوں کے بدلے میں ہوا؟ اس لیے یہ مال ہی ہے اور اس کو حق مہر بنانا جائز ہے۔

### بکریاں چرانے کو حق مہر بنانا کیسا ہے؟

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ نکاح حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کا ہو رہا ہے اور حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملازم رکھ رہے ہیں اپنا! تو حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کو حق مہر کیا ملا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ بکریاں حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی کی ہوں اور یہی بکریاں موسیٰ علیہ السلام چراتے ہوں اور حضرت شعیب علیہ السلام نے ملازمت کی محض نسبت اپنی طرف کی ہو۔ تو جب بکریاں بیٹی کی ہیں تو ملازمت بھی انہی کی کر رہے ہیں تو جو مزدوری بیٹی نے دینی تھی اس کے پیسے نہیں دیے بلکہ پیسے کے بدلے میں کام کر لیا۔

آج بھی اگر کوئی شخص نکاح کرے اور حق مہر کے طور پر پیسے نہ رکھے بلکہ حق مہر کے طور پر کوئی کام رکھ لے تو فقہاء کہتے ہیں کہ جائز ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ



وہ کام عورت کی ذات سے تعلق نہ رکھتا ہو، گھر سے باہر تعلق رکھتا ہو کیونکہ شوہر بن کر بیوی کی خدمت کرے تو یہ شوہر کے لیے عیب ہے، اس میں شوہر کی خفت ہے، ایسی چیز حق مہر نہ رکھو مثلاً کوئی کہے کہ ہم بیٹی دیتے ہیں اور حق مہر یہ ہے کہ آپ نے اس کے سر کی مالش کرنی ہے تو یہ حق مہر صحیح نہیں۔ ہاں اگر یہ کہے کہ نکاح کر کے دیتے ہیں اس کا جو بزنس ہے وہ تم سنبھالو گے اور اس پر جو بندہ ہم نے رکھا ہے اس کی بیس ہزار تنخواہ ہے وہ آپ کو نہیں دیں گے بلکہ وہ تمہارا حق مہر ہو گا تو یہ بات ٹھیک ہے، اس کی گنجائش موجود ہے۔

### موسیٰ علیہ السلام کی مصر واپسی اور عطاءِ نبوت:

خیر! حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں ٹھہرے۔ آٹھ سال کی پیشکش اُن کی طرف سے تھی اور دو سال انہوں نے اپنی طرف سے پورے کیے کیونکہ شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ آٹھ سال شرط ہے اور دس سال پورے کرو تو تمہاری مرضی ہے۔ تو دس سال پورے کیے۔ نکاح ہوا اور بیوی کو لے کر واپس آرہے تھے۔ رات سرد اور اندھیری تھی اور موسیٰ علیہ السلام کی بیوی امید سے تھیں۔ ان کو دردِ ذہ شروع ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام کے پاس چقماق تھا کہ پتھر کو پتھر پر مارتے تو آگ نکلتی لیکن کوشش کے باوجود اس سے آگ نہ نکلی۔ آپ نے دور سے دیکھا کہ ایک جگہ آگ ہے تو بیوی کو چھوڑ کر آگ لینے کے لیے چلے گئے۔ جب وہاں پہنچے تو وہ آگ نہیں تھی بلکہ وہ تو تجلی الہی تھی، جس سے درخت چمک رہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا:

﴿يُوسَىٰ ۖ إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ

کہ اے موسیٰ! میں تمہارا رب ہوں، آپ اپنے جوتے اتار دیں کیونکہ آپ اس وقت طوی کی مقدس وادی میں ہیں۔

جوتے اتار کر موسیٰ علیہ السلام آئے اور اللہ کا کلام سنا۔ واقعہ تو آپ کے ذہن میں ہے نا! وہاں سے موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی یا اللہ! آپ نے مجھے نبی بنایا لیکن میری زبان میں لکنت ہے اور مجھ سے ان کا بندہ قتل ہوا ہے، ان کی نظر میں میں ان کا مجرم ہوں تو آپ میرے ساتھ میرے بھائی ہارون کو وحی دے دیں۔ اللہ تعالیٰ نے دعا کو قبول فرمایا۔ حضرت ہارون علیہ السلام کو نبی بنادیا۔ حضرت ہارون کو حکم دیا کہ موسیٰ علیہ السلام آرہے ہیں، مصر سے باہر نکل کر موسیٰ علیہ السلام کا استقبال کرو۔

### مقدس مقامات میں جوتے اتارنا:

یہاں ایک مسئلہ یاد رکھنا! یہ جو موسیٰ علیہ السلام مقدس وادی میں گئے اپنے جوتے اتار دیے، یہ اب بھی مسئلہ ہے کہ جب بھی کسی مقدس اور ایسے مقام پر جائیں جس کا آپ کی نظروں میں احترام ہے تو وہاں جوتے اتار دینے چاہئیں۔

ایک حدیث پاک میں ہے کہ حضرت بشیر بن خصاصیہ رضی اللہ عنہ کو قبروں کے درمیان جو تاپہن کر چل رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو فرمایا:

"إِذَا كُنْتَ فِي مِثْلِ هَذَا الْمَكَانِ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ."<sup>87</sup>

کہ جب ایسی جگہوں پر ہو تو اپنے جوتے اتار دیا کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اکابرین اور اولیاء اللہ کی قبور کے پاس جو جوتے

اتارے جاتے ہیں وہ ناجائز نہیں ہے بلکہ یہ حدیث پاک سے ثابت ہے۔

### حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی دربارِ فرعون میں آمد:

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں فرعون کے دربار میں گئے کہ ہمیں اللہ نے حکم دیا ہے کہ تمہیں دعوت دیں، تم کلمہ پڑھو اور شاہی چھوڑو اور خدا کی عبادت کرو اور بنی اسرائیل کو آزاد کرو۔ اس نے کہا کہ کون ہے رب؟ کہا:

﴿رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ حَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى﴾<sup>88</sup>

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب پیدا کیا ہے اور اس کی رہنمائی بھی فرمائی، اس کو راستے بھی دکھائے۔

### فرعون کے ساتھ مکالمہ:

یہ بات پیچھے گزر چکی ہے۔ خیر مکالمہ چلتا رہا۔ فرعون نے کہا کہ تمہیں یاد ہے کہ ہم نے تمہاری تربیت کی اور آج ہمیں سناتے ہو؟! موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ جو تم مجھے پالا ہے دودھ پلایا ہے کون سا احسان کیا ہے؟ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر رکھا، بچے تم ذبح کرتے تھے، اگر تم یہ کام نہ کرتے تو میں تمہاری تربیت میں کبھی نہ آتا، یہ جو تم نے میری پرورش کی ہے، بچپن میں پالا ہے تو یہ میرے اوپر احسان نہیں کیا۔ فرعون نے پوچھا کہ کوئی دلیل بھی ہے تمہارے پاس تو پیش کرو! موسیٰ علیہ السلام نے عصا پھینکا تو وہ اژدھا بن گیا، فرعون دوڑا اور تخت کے نیچے چھپ گیا اور موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اس سانپ کو سنبھالو! موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ رکھا تو وہ پھر عصا بن گیا۔

یہ عصا استنبول ترکی میں آج بھی موجود ہے اور میں نے خود اپنی آنکھوں

سے دیکھا ہے، بالکل سادہ سا عصا ہے۔ یوسف علیہ السلام کا عمامہ بھی استنبول میں موجود ہے اور بھی بہت سی نادر چیزیں وہاں پر موجود ہیں۔ چونکہ وہاں خلافت عثمانیہ تھی تو دور دور سے وہاں چیزیں لے کر آئے تھے۔ پانچ سو سال سے ایک سیکنڈ بھی ایسا نہیں گزرا کہ وہاں چوبیس گھنٹے قرآن کریم کی تلاوت نہ ہوتی ہو! وہاں قاری حضرات متعین ہیں اور بہت عجیب منظر ہے، انسان پر بہت عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ پھر دوسرا معجزہ آپ نے ید بیضاء دکھایا۔ فرعون اس سے بہت پریشان ہوا۔

### جادو گروں سے مقابلہ:

جب موسیٰ علیہ السلام چلے گئے تو اس نے اپنے درباریوں کو جمع کیا، مشورہ ہوا تو کہا کہ یہ جادو ہے۔ جادو گر بلاؤ۔ اس کے لیے عید کا دن طے ہوا اور یہ عید کا دن دس محرم کا دن تھا اور آج بھی جب آپ سبق پڑھ رہے ہیں تو آج بھی دس محرم ہے، یہ بھی عجیب اتفاق ہے۔ تو ستر ہزار جادو گر آئے۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ پھینکیں گے لاٹھی یا ہم پھینکیں؟ فرمایا: تم پھینکو! انہوں نے لاٹھیاں پھینکیں:

﴿فَإِذَا جِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَى﴾<sup>89</sup>

جو نہی انہوں نے رسیاں پھینکیں تو ان کے جادو کے اثر سے موسیٰ علیہ السلام کو ایسے محسوس ہونے لگا جیسے سانپ دوڑ رہے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی پھینکی تو اس نے سارے سانپوں کو ہڑپ کر لیا۔ جادو گروں نے اسی وقت کلمہ پڑھا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ جادو نہیں ہے، یہ معجزہ ہے اور وہ موسیٰ علیہ السلام کے صحابی بن گئے۔ اب حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام ایک طرف ہیں اور فرعون دوسری طرف ہے۔ دعوت چلتی رہی، فرعون نہیں مانتا تھا، عذاب آتا تو کہتا کہ دعا کرو! موسیٰ علیہ

السلام دعا کرتے اور عذاب ٹل جاتا تو فرعون پھر سرکش ہو جاتا، پھر عذاب آتا، یہ گڑ گڑاتا، موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے اور عذاب ٹل جاتا۔ واقعات آپ سارے سن چکے ہیں، کبھی جوئیں، کبھی مینڈک، کبھی خون، کبھی ٹڈی کا عذاب آتا لیکن فرعون ضدی اور سرکش تھا، نہیں مانا۔

### بنی اسرائیل کی آزادی:

خیر ایک وقت آیا کہ اللہ پاک نے حکم دیا موسیٰ علیہ السلام کو کہ آپ رات کے وقت نکلیں! دن کے وقت اسرائیلیوں نے فرعونوں سے کہا کہ بھائی! ہماری اپنی عید ہے، ہم وہ منانے کے لیے مصر سے باہر جا رہے ہیں اور چونکہ موقع ہماری خوشی کا ہے اس لیے ہمیں عاریۃً کچھ زیور چاہئیں۔ اس بہانے سے انہوں نے کچھ زیورات مانگ لیے۔ رات کے وقت موسیٰ علیہ السلام نے خود کو، اپنے بھائی کو اور اسرائیلیوں کو ساتھ لیا اور نکل گئے۔ فرعون کو اطلاع ملی تو فرعون اپنا لشکر لے کر نکلا، سات لاکھ صرف فرعون کے گھوڑ سوار تھے، باقی لشکر اس کے علاوہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام جب دریا پر پہنچے تو منظر یہ تھا کہ آگے دریا ہے اور پیچھے فرعون۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم جب دریا پر پہنچی تو انہوں نے کہا: ﴿إِنَّا لَمُدْرَكُونَ﴾<sup>90</sup> کہ ہم تو مارے گئے، اب ہمارا کیا بنے گا، سامنے دریا ہے اور پیچھے فرعون ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿إِنَّ مَعَ رَبِّ سَيِّدِينَ﴾<sup>91</sup> اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ اپنا عصا مارو! عصا مارا تو بارہ راستے بن گئے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ ہر قبیلہ ایک ایک راستے سے گزر گیا۔

یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا۔ ”اسرا“ کا معنی ہے عبد اور ”ئیل“ کا

معنی ہے اللہ، اسرائیل کا معنی اللہ کا بندہ اور بنی اسرائیل کا معنی ہے اسرائیل کے بیٹے۔ ان کے بارہ بیٹے تھے، سب سے بڑا بیٹا یہودا تھا اور سب سے چھوٹا بنیامین تھا اور بارہ بیٹوں سے آگے بارہ قبیلے چلے ہیں جو ”بنی اسرائیل“ کہلاتے ہیں اور ان کی آبادی آگے لاکھوں کی تعداد میں تھی۔ شریعت نے آج بھی معاشرت میں قبائل کی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ تو وہاں بھی ایک راستہ نہیں بنا بلکہ بارہ راستے بنے ہیں، ہر قبیلہ اپنے راستے سے گزرا، جب ان کو وادی تیار میں پانی کی ضرورت پڑی تھی تو چار کونوں والا پتھر تھا اور ہر کونے سے تین چشمے نکلے یوں بارہ قبیلے اور بارہ چشمے بنے، وہاں بھی قبائل کو تسلیم کیا اور اس کا بڑا خیال رکھا ہے۔

### لشکرِ فرعون کی غرقابی:

خیر بنی اسرائیل آگے تھے اور فرعون اور اس کا لشکر پیچھے تھا، موسیٰ علیہ السلام کا آخری بندہ سمندر سے گزر رہا تھا اور فرعون کا آخری بندہ سمندر میں داخل ہو رہا تھا تو حکم ہوا اور پانی آپس میں مل گیا۔ اب فرعون غرق ہو گئے۔ جب بنی اسرائیلی دریا پار کر گئے تو چونکہ یہ غلامی میں رہے تھے اور غلام کے دل سے اپنے حاکم کا خوف کبھی نہیں جاتا۔ تو انہوں نے کہا کہ فرعون کا کیا بنا؟ فرمایا کہ وہ تباہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ زندہ ہو اور آجائے۔ اللہ تعالیٰ نے دریا کو حکم دیا کہ فرعون کو باہر نکال کر پھینک دو۔ دریائے فرعون کی لاش کو باہر پھینک دیا۔ یہ اس لیے باہر پھینکا تھا کہ بنی اسرائیلی اس کو دیکھ لیں، ان کو پھر تسلی ہوئی کہ فرعون مر گیا ہے، ایک تو ان کو تسلی ہو گئی اور دوسرا بعد والوں کے لیے عبرت کا نشان بنا دیا۔ فرعون آج بھی وہاں پر ہے اس کو عذاب ہو رہا ہے۔

### بنی اسرائیل کی عجیب فرمائش:

بنی اسرائیلی آگے ایک جگہ پر پہنچے تو انہوں نے کچھ بت دیکھے تو موسیٰ علیہ

السلام سے کہا: ﴿يُمُوسَى اجْعَلْ لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ﴾<sup>1</sup> کہ اے موسیٰ! جیسے ان لوگوں کے بت ہیں تو ہمیں بھی ایسے بنا کر دیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تم کیسے عجیب لوگ ہو، جاہلوں والی باتیں کرتے ہو! پھر فرمایا: ابھی تم یہیں ٹھہرو! میں کوہ طور پر جاتا ہوں، اللہ سے دعا کرتا ہوں، کوئی کتاب لاتا ہوں عمل کرنے کے لیے۔ موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر گئے تورات کو لینے کے لیے، آپ نے تیس روزے رکھے۔ تیس روزے رکھنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے مسواک کے ساتھ اچھی طرح اپنا منہ صاف کیا۔ جب کوہ طور پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: موسیٰ! آج تمہارا روزہ نہیں ہے؟ یہ سمجھانے کے لیے کہا۔ جی! روزے تو پورے ہو گئے ہیں۔ کہا کہ تمہارے منہ سے خوشبو کیوں آرہی ہے، بو ختم ہو گئی؟! کہا: جی وہ تو میں نے مسواک کر لی ہے۔ فرمایا مسواک کیوں کی؟ عرض کیا کہ آپ کے دربار میں آ رہا تھا تو میری خواہش تھی کہ میرے منہ سے خوشبو آئے۔ فرمایا: روزے دار کے منہ کی جو بو ہے وہ مجھے مشک سے زیادہ پسند ہے، جاؤ دس روزے اور رکھو اور روزے والی خوشبو کو باقی رہنے دو۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر دس روزے رکھے۔ اب یہاں آپ کو ہو گئے چالیس دن۔ پیچھے قوم نے کہا کہ ہم سے وعدہ کیا تھا کہ تیس دن بعد آؤں گا اور تیس دن بعد نہیں آئے، کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ سامری نے کہا کہ وہ بھول گیا ہے، وہ خدا کو تلاش کر رہا ہے جبکہ خدا ہمارے پاس ہے۔

### پچھڑے کی پوجا کا قصہ:

حضرت ہارون علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ وہ جو تمہارے پاس زیورات اور عاریت کا سامان ہے وہ تمہارا نہیں ہے، یہ تمہارے پاس بطور امانت کے

تھا، فرعونؑ جو اس سامان کے مالک ہیں وہ ہلاک ہو چکے ہیں اس لیے تم اس کو استعمال نہیں کر سکتے، ان کے زیور اپنے پاس رکھنا جائز نہیں ہے۔ آپ علیہ السلام نے وہ سب زیور ایک گڑھے میں پھینکو کر آگ لگوا دی اور یہ جو سامری تھا آیا، اس کے ہاتھ میں مٹی تھی، حضرت ہارونؑ یہ سمجھے کہ اس کے ہاتھ میں کوئی زیور ہے جو اس نے چھپایا ہوا ہے۔ کہا کہ تم نے کیا چھپایا ہوا ہے؟ تم بھی پھینکو! اس نے کہا کہ میرے پاس زیور نہیں ہیں مٹی ہے، جب حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور ہمارے لشکر کے آگے آگے تھے تو جس گھوڑے پر وہ سوار تھے جہاں ان کا گھوڑا پاؤں رکھتا وہاں سبزہ اگتا تھا تو میں سمجھا کہ اس مٹی میں حیات ہے، میں نے وہ مٹی سنبھال کر رکھی ہے۔ میں اسے ایک شرط پر اس آگ میں پھینکوں گا کہ آپ دعا کریں کہ جو میں چاہتا ہوں اللہ کرے وہ ہو جائے۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ! جو یہ چاہتا ہے وہ ہو جائے۔ سامری نے وہاں مٹی پھینکی اور دعا مانگی کہ میں چاہتا ہوں کہ مٹی پورا بچھڑا بن جائے۔ اب ہارون علیہ السلام اللہ سے دعا مانگ چکے تھے، دعا قبول ہو گئی اور جب مٹی پھینکی تو وہ ساری مٹی اکٹھی ہوئی اور وہ ایک بچھڑا بن گیا اور اس بچھڑے سے آواز نکلتا شروع ہو گئی۔ آواز نکلنے کی وجہ یہ تھی کہ بچھڑا اندر سے خالی تھا، منہ کا بھی سوراخ تھا، پیچھے بھی سوراخ تھا، جب ہوا پیچھے سے ہو کر تیزی سے منہ کے ذریعے گزرتی تو آواز آتی۔ سامری نے کہا کہ خدا تو یہ ہے اور موسیٰ علیہ السلام بھول گئے ہیں، اس لیے اس کی پوجا کرو۔

اب بنی اسرائیل کے تین قسم کے گروہ ہو گئے تھے۔ بعضوں نے پوجنا شروع کر دیا۔ بعضوں نے کہا کہ ہم اس کے قریب بھی نہیں جائیں گے، یہ تو شرک ہے۔ بعضوں نے کہا کہ چلو پوجتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام جب آئیں گے تو اگر کہا کہ چھوڑ دو تو ہم چھوڑ دیں گے۔ یہ متردلوگ تھے۔



## پاس کریا برداشت کر!

مظفر گڑھ میں میرا ایک جگہ پر بیان تھا تقلید کے عنوان پر تو ایک آدمی نے چٹ لکھ کر دی کہ کوئی آسان سی مثال دے کر تقلید کا مسہ سمجھا دیں! میں نے کہا: ہمارے ہاں ٹریکٹر ٹرائی چلتی ہے اور اس کے پیچھے لکھا ہوتا ہے:

1: ہارن دوراستہ لو

2: پاس کریا برداشت کر

3: نہ چھیڑ ملنگاں نوں

پہلی قسم ”ہارن دوراستہ لو“... یہ مجتہد ہے، اپنی محنت سے آگے بڑھتا ہے، دوسری قسم ”پاس کریا برداشت کر“... اس میں ”پاس کر“ یہ مجتہد ہے اور ”برداشت کر“ یہ مقلد ہے اور جو پاس بھی نہ کر سکے اور برداشت بھی نہ کرے اور اندر ہی اندر سے جلتا رہے یہ ہے غیر مقلد، بس گاڑی دوڑا رہا ہے نہ آگے جاسکتا ہے اور نہ ہی برداشت کر سکتا ہے۔ تیسری قسم ”نہ چھیڑ ملنگاں نوں“... انہیں کوئی غرض نہیں دنیا میں کیا ہو رہا ہے! کبھی تیجہ، کبھی ساتواں، کبھی عرس، کبھی برسی بس خوراک پر خوراک ہے، یہ ہیں ”نہ چھیڑ ملنگاں نوں“۔

موسیٰ علیہ السلام جب واپس آئے تو دیکھ کر بہت غصے ہوئے۔ آپ نے تورات کی تختیاں ڈالیں اور حضرت ہارون علیہ السلام کو پکڑا سر کے بالوں اور ڈاڑھی سے اور کھینچا کہ یہ تو نے کیا کیا؟ تم نے میرے جانے کے بعد ان کو سنبھالا نہیں ہے؟ حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا کہ جی! میں سمجھتا تھا کہ اگر میں نے ان کو مارا تو یہ دو فرقوں میں تقسیم ہو جائیں گے تو آپ کہیں گے کہ امت کو تقسیم کر دیا ہے، میں تو آپ کی وجہ سے خاموش تھا کہ آپ آئیں اور جو فیصلہ فرمائیں وہ کر لیں گے، موسیٰ علیہ السلام کا غصہ پھر ختم ہو گیا۔ اب ان کا کیا کریں کہ انہوں نے اتنا بڑا جرم کیا ہے؟!

## بنی اسرائیل کی توبہ:

موسیٰ علیہ السلام نے کہا اب ہمیں توبہ کرنی چاہیے۔ توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ ان میں سے جو نیک ستر آدمی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے پاس جائیں اور اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کریں۔ ستر آدمیوں کو لے کر آپ دعا کے لیے کوہ طور پر گئے۔ اصل حکم تو یہ تھا کہ وہ لوگ جائیں جو نیک اور ولی ہیں لیکن ان میں بعض وہ لوگ بھی چلے گئے جو متردین تھے جنہوں نے کہا تھا کہ بچھڑے کو پوج لیتے ہیں لیکن اگر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ چھوڑ دو تو ہم چھوڑ دیں گے۔ کوہ طور پر گئے تو ان متردد لوگوں کی وجہ سے زلزلہ آیا اور وہ ستر کے ستر ہلاک ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے عرض کیا کہ یا اللہ! ان کی حرکتوں کی وجہ سے آپ ہمیں عذاب دیں گے؟ بنی اسرائیل کہیں گے کہ تو نے ہمارے بندے مروا دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان ستر کو زندگی عطا فرمائی اور موسیٰ علیہ السلام پر وحی آگئی کہ ان کی توبہ یہی ہے کہ ان میں سے جو لوگ اس شرک میں ملوث نہیں ہوئے تھے وہ شرک کرنے والوں کو قتل کریں، جو شخص رشتہ میں جس سے زیادہ قریب ہو وہ اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے یعنی باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو اور بھائی بھائی کو، اب یہ بہت مشکل مرحلہ تھا لیکن انہوں نے اس حکم پر عمل کیا، بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

## قوم جبارین کے خوف سے بنی اسرائیل کا پیچھے ہٹنا:

اب وہاں سے آگے نکلے، حکم تھا کہ آپ ملک شام جائیں! جب ملک شام کے ایک شہر پہنچے جس پر جبارین کا قبضہ تھا، یہ بیہت ناک قوم تھی، شکل بھی ان کی عجیب و غریب تھی اور قد بھی ان کے لمبے لمبے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام اس شہر میں داخل ہونا چاہتے تھے لیکن قوم نے کہا:

﴿يُمُوسَىٰ إِنَّا لَنَنذِرُكَ لَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ

فَقَاتِلَا إِنَّا هُنَا قَاعِدُونَ ﴿٩٢﴾

اے موسیٰ! جب تک یہ قوم اس شہر میں موجود ہے ہم اس میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے، آپ اور آپ کا رب جا کے لڑو، ہم تو یہیں بیٹھیں گے، ہم نہیں لڑیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام ان کے اس رویے سے نہایت غمگین ہوئے اور ان کے لیے بد دعا کی۔ اس بد دعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ چالیس سال تک اس وادی میں رہے۔ صبح سے لے کر شام تک چلتے اور شام کو رک جاتے، جب صبح اٹھتے تو پھر وہی جگہ ہوتی۔ بس اتنا تھا کہ ان کو کپڑے دے دیے گئے جو میلے بھی نہیں ہوتے تھے اور کھانے کے لیے بٹیر اور ترنجبین ملے تو یہ لوگ اس سے بھی تنگ آئے۔ تو چالیس سال تک یہ لوگ اسی وادی میں رہے اور موسیٰ علیہ السلام کا انتقال بھی یہیں ہوا۔ اس کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کے خلیفہ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام شام گئے اور پھر شام کے اس شہر کو فتح کیا۔ تو یہ میں نے پورا واقعہ مختصر آپ کو سنایا جو مختلف سورتوں میں مختلف مواقع پر تھوڑا تھوڑا بیان کیا گیا ہے۔

اب بعض آیات کے متعلق کچھ باتیں سن لیں:

**نبی سے گناہ نہیں ہوتا:**

﴿قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ

الرَّحِيمُ ﴿٩٣﴾﴾

اس پر ایک سوال ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کا گناہ نہیں تھا تو موسیٰ علیہ

السلام نے ﴿رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي﴾ کیوں فرمایا؟

اس کا جواب سمجھیں کہ موسیٰ علیہ السلام سے جو قتل ہوا تھا یہ قتل عمد نہیں تھا بلکہ قتل خطا تھا جو گناہ نہیں ہے اور معصیت بھی نہیں ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام چونکہ نبی تھے اور نبی اپنی شان کے مطابق بات کرتا ہے کہ یا اللہ! مجھے خطا بھی نہیں مارنا چاہیے تھا، آپ مجھے معاف فرمادیں۔

### حضرت ہارون علیہ السلام کی معاونت:

﴿وَإِخْوِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسَلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي﴾

﴿إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ﴾ (۳۳)

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یا اللہ! میری زبان بھی لکنت والی ہے اور مجھ سے ان کا ایک بندہ بھی قتل ہو گیا ہے تو آپ ہارون علیہ السلام کو میرے ساتھ بھیج دیں، ان کی زبان مجھ سے زیادہ صاف ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ داعی کو اسبابِ ضروریہ اختیار کرنے چاہئیں اور اسباب کا اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں ہوتا۔ کسی بھی علاقے میں آپ کام کرنے کے لیے جائیں تو وہاں کوشش کریں کہ آپ کے ہمنوا ہوں، اس کے لیے اللہ سے دعا بھی کریں اور محنت کے ساتھ افراد بھی پیدا کریں تو یہ دعوت کے خلاف نہیں ہے۔

### اعمالِ دنیا کی آخرت میں صورتِ مثالیہ:

﴿وَجَعَلْنَاهُمْ آيَةً يُدْعَوْنَ إِلَى الثَّارِ وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ لَا يُنصَرُونَ﴾ (۳۴)

ہم نے ان کو ایسے مقتدا بنایا تھا جو لوگوں کو آگ کی طرف بلاتے تھے اور جب قیامت کا دن ہو گا تو ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے مقتدا کو ”امام“ کہا ہے۔ فرعون کے درباری یہ اپنی قوم کے امام

اور مقتدا تھے اور یہ ائمہ جہنم تھے، اسی لیے کہا ﴿أَيُّمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ﴾ کہ یہ لوگ ائمہ ضلالت تھے اور یہ جہنم کی طرف بلاتے ہیں۔ جس طرح ضلالت کے ائمہ ہوتے ہیں اسی طرح ہدایت کے ائمہ بھی ہوتے ہیں، ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ آيَةً يَهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا﴾<sup>93</sup> ائمہ ہدایت لوگوں کو جنت کی طرف بلاتے ہیں۔

اب دیکھو! بظاہر شبہ ہے کہ ﴿يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ﴾ یہ لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں حالانکہ یہ آگ کی طرف تو نہیں بلاتے تھے، پھر یہ کیوں کہا کہ یہ آگ کی طرف بلاتے ہیں؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ ایسے اعمال کی دعوت دیتے تھے جو اعمال جہنم کی طرف پہنچاتے تھے تو گویا یہ جہنم کی طرف بلاتے تھے۔

دوسرا جواب... علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ دنیا میں جتنے اعمال ہیں ان اعمال کی عالم مثال میں ایک صورت ہوتی ہے، دنیا میں جو گناہ ہے اس کی عالم مثال میں جو صورت ہے وہ نار ہے، یہ بلاتے تو ”گناہ“ کی طرف ہیں لیکن اس گناہ کی مثالی صورت ”نار“ ہے، تو یہاں جو کہا کہ یہ ”النَّارِ“ کی طرف بلاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عالم مثال میں اعمالِ سیئہ کی جو صورتِ مثالیہ ہے اس کی طرف بلارہے ہیں۔ اس لیے اب اس پر کوئی اشکال ہی نہیں ہوتا۔

اس کو سمجھ لیا ہو تو اس کے ذریعے ایک چھوٹا سا اشکال دور کر لیں۔ ہم کہتے ہیں کہ قبر میں ثواب و عذاب جسدِ اصلی و عنصری کو ہوتا ہے اور مماتی کہتے ہیں کہ قبر میں ثواب و عذاب جسدِ مثالی کو ہوتا ہے اور وہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ”اشرف الجواب“ آپ کے سامنے پیش کریں گے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ

اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صوفیا کا عقیدہ یہ ہے کہ قبر میں ثواب و عذاب جسد مثالی کو ہوتا ہے، تو مماتی کہتے ہیں کہ اکابر ہمارے ساتھ ہیں، تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔ اب یہ ایسا اشکال ہے کہ بسا اوقات اچھا خاصا بندہ اس کا جواب نہیں دے پاتا۔

اب جواب سمجھیں اور یہ جواب ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ﴾<sup>94</sup> کے تحت تفسیر عثمانی میں دیکھنا، علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بدن سے جو روح نکلتی ہے اس روح کی شکل وہی ہوتی ہے جو جسم کی ہوتی ہے تو روح متشکل بشکل الجسد الاصلی ہوتی ہے، یہ جو روح کی شکل جسد اصلی والی ہے تو یہ جسد غضری کی طرح ہے یا نہیں؟ (ہے۔ سامعین) تو جسد مثالی ہوا۔ تو علامہ کشمیری فرماتے ہیں کہ صوفیاء جسد مثالی اس روح کو کہتے ہیں جو جسد غضری کی طرح ہوتی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ ثواب و عذاب ہوتا ہے جسد غضری کو جس کا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے اور صوفیاء کہتے ہیں کہ ثواب و عذاب ہوتا ہے روح کو جو جسد مثالی ہے تو صوفیاء روح کے ثواب و عذاب کے قائل ہیں اور ہم بھی اصلاً روح کے ثواب و عذاب کے قائل ہیں، روح کے واسطے سے جسد کے قائل ہیں تو صوفیاء کی اور ہماری رائے ایک ہے، اسے نزاع لفظی کہتے ہیں۔ جسے ہم روح کہتے ہیں صوفیاء اسے ہی جسد مثالی کہتے ہیں اور مماتی کہتے ہیں کہ نہ جسد غضری کو عذاب ہوتا ہے، نہ روح کو بلکہ ان سے الگ ایک اور جسم ہے اس جسم کی طرح تو وہ جسم مثالی ہے اس کو عذاب ہوتا ہے۔ اب آپ بتائیں! اکابر کا ذوق ہمارا ہے یا ان کا ہے؟ (ہمارا۔ سامعین)

بات اس لیے کہتا ہوں کہ تعبیرات سمجھو، اپنے اکابر کے علوم کو سمجھو گے تو الجھن نہیں ہوگی اور یہ جواب تم نے سن لیا تو کبھی ٹینشن نہیں ہوگی، جب یہ بات ذہن

میں نہیں ہوگی تو پھر تم بھی کہو گے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بات تو ان والی کرتے ہیں ہماری تو نہیں کرتے۔

### دو مرتبہ اجر کا معنی:

﴿أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَ يَذَرُؤْنَ بِالْحَسَنَةِ  
السَّيِّئَةِ وَ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ﴾

اہل کتاب میں سے جو یہود ہیں یہ پہلے تورات پر ایمان لائے پھر قرآن کریم پر ایمان لائے، پہلے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، نصاریٰ پہلے پھر انجیل پر ایمان لائے پھر قرآن کریم پر ایمان لائے، پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، قرآن کہتا ہے کہ ان کو دوہرا اجر ملے گا۔ سوال یہ ہے کہ ان کو دوہرا اجر کیوں ملے گا؟

بعض حضرات جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہلے تورات پر ایمان لائے، پھر قرآن پر لائے تو دوہرا اجر ملے گا، پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تو دوہرا اجر، پہلے انجیل پر ایمان لائے پھر قرآن پر لائے تو دوہرا اجر، پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تو دوہرا اجر۔ تو دوہرا اجر ملنے کی یہ وجہ ہے۔

اسی طرح ایک حدیث پاک بھی ہے کہ ایک شخص اپنی باندی کی تعلیم و تربیت اچھی کرے اور اس کو آزاد کرنے کے بعد اس سے بھی نکاح کرے تو اللہ اس کو دوہرا اجر دیں گے۔<sup>95</sup> ایک اجر آزاد کرنے کا اور ایک اجر نکاح کرنے کا۔

ایک اور حدیث پاک میں ہے کہ جو غلام اپنے آقا کی خدمت بھی کرے اور

اللہ کی عبادت بھی کرے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔<sup>96</sup>

اس لیے کہ ایک تو یہ مالک کی بات مانتا ہے اور دوسرا ایک اللہ کی مانتا ہے۔  
ہم کہتے ہیں کہ یہ جواب ٹھیک نہیں کہ پہلے ایمان تورات اور انجیل پر تھا اور  
اب قرآن پر ہے، جب عمل دوہیں تو اجر بھی دوہرا ہے، کیوں ٹھیک نہیں اس لیے کہ  
دو عملوں پر دوہرا اجر تو ہر بندے کو ملتا ہے پھر ان اہل کتاب کی کیا خصوصیت ہے؟!  
اور اس جواب کی تائید قرآن نہیں کرتا کیونکہ قرآن کریم یہ نہیں کہتا  
”يُؤْتُونَ أَجْرَيْنِ“ بلکہ کہتا ہے ﴿يُؤْتُونَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ﴾ دو اجر کا ملنا الگ ہے اور  
”مرتين“ الگ ہے، اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ ان کو دو اجر ملیں گے بلکہ فرمایا کہ ان کو دو  
مرتبہ اجر ملے گا، دو مرتبہ اجر اور ہوتا ہے اور دوہرا اجر اور ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی  
نے روزہ بھی رکھا اور نفل نماز بھی پڑھی تو اس کو دو اجر ملیں گے، ایک آدمی نے روزہ  
بھی رکھا اور گرمی میں رکھا ہے اس کو دو اجر نہیں بلکہ دوہرا اجر ملے گا۔ تو دوہرا اور ہوتا  
ہے اور دو اور ہوتے ہیں، دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

تو اس سوال کا اصل جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی عطا ہے کہ اللہ کس  
عمل پر کتنا ثواب دیتے ہیں، بعض اعمال قرآن کریم اور احادیث میں ایسے آئے ہیں کہ  
جس میں ایک عمل پر خدا نے دوہرے اجر کا وعدہ کیا ہے، وہ اللہ کی مرضی کہ اللہ کیوں  
کرتے ہیں اس پر بندہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن  
کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿نُؤْتِيهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ﴾<sup>97</sup> ازواجِ مطہرات کو ہر عمل  
پر دوہرا اجر ملتا ہے۔ اہل کتاب جو پہلے اپنے نبی پر ایمان لائے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ

96۔ صحیح البخاری، رقم: 2546

97۔ الاحزاب: 31



و سلم پر ایمان لائے ان کو بھی دوہرا اجر ملتا ہے یہ ان کی خصوصیت ہے۔

### ہدایت دینا اللہ کے اختیار میں ہے:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ

أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ﴾ (١٦)

آپ جس کو ہدایت دینا چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے اسے ہدایت عطا فرماتا ہے اور اللہ ہدایت قبول کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔

میں اس کو بطور دلیل کے پہلے پیش کر چکا ہوں کہ بعض لوگ کہتے ہیں:

﴿إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى﴾ کا مطلب ہے آپ مردوں کو سنا نہیں سکتے لہذا امر دے سنتے

بھی نہیں ہیں۔ تو میں نے کہا کہ کوئی بندہ یہ کہہ دے کہ ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ

أَحْبَبْتَ﴾ کا مطلب ہے کہ جس کو آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے تو اس کا معنی یہ

ہے کہ ہدایت ملتی بھی نہیں ہے، تو کیا یہ معنی درست ہو گا؟!

صحیح مطلب یہ ہے کہ ہدایت دینا آپ کے اختیار میں نہیں ہے اسی طرح

مردوں کو سنانا بھی آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔

### قارون کا تذکرہ:

﴿إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَى فَبَغَى عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنْ

الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ ۚ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا

تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ﴾ (٢٦)

قارون بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ موسیٰ علیہ

السلام کے چچا کا بیٹا تھا۔ اس کے پاس مال اتنا زیادہ تھا کہ اس کے خزانے کی چابیاں اونٹ

اٹھاتے تھے، یہ فرعون کا خاص آدمی تھا اور بنی اسرائیل پر فرعون کی طرف سے نگران

مقرر تھا۔ جب بنی اسرائیل فرعون کے تسلط سے نکل آئے تھے تو یہ بھی بنی اسرائیل کے ساتھ آیا تھا۔ اسے اپنے سامان اور مال و جائیداد پر بہت ناز تھا۔ یہ اونٹوں پر مال لاد کر نکلتا اور فخر و تکبر کرتا تھا۔ اس وقت جو نیک لوگ تھے وہ اس کو سمجھاتے تھے کہ ایسا کام نہ کر! یہ کہتا کہ یہ مال اللہ نے مجھے نہیں دیا بلکہ میں نے اپنے فن سے کمایا ہے، جو لوگ دنیا کے طالب تھے وہ تمنا کرتے کہ کاش ہمیں بھی ایسا مال مل جاتا۔ ایک وقت آیا کہ اللہ نے زمین میں اس کو مال کے ساتھ دھنسا دیا۔ جب یہ زمین میں دھنسا یا گیا تو جن لوگوں نے قارون کے مال کی خواہش کی تھی وہ کہنے لگے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے ہمیں ان نیک لوگوں کے ساتھ ہی رکھا، اگر ہم اس کے ساتھ ہوتے تو ہم بھی تباہ و برباد ہو جاتے۔ قارون اپنے مال پر اترتا تھا تو خدا نے مال سمیت اس کو دفن کر دیا۔

**گناہ کا پختہ ارادہ بھی باعث پکڑ ہے:**

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْأَخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (آء)

آخرت والا گھر تو ہم نے ان لوگوں کے لیے بنایا ہے جو زمین میں بڑائی کا ارادہ بھی نہیں کرتے اور فساد مچانے کا ارادہ بھی نہیں کرتے اور اچھا انجام تو متقین کے لیے ہے۔

یہاں یہ بات سمجھیں کہ یہاں یہ نہیں فرمایا: ”نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ“ کہ وہ لوگ فساد نہیں مچاتے بلکہ فرمایا: ﴿نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا﴾ کہ فساد مچانے کا ارادہ نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سرکشی اور فساد جس طرح جرم ہے اسی طرح سرکشی اور فساد کا پختہ ارادہ کرنا بھی جرم ہے۔ گناہ کا مصمم ارادہ کرنا بھی گناہ ہوتا ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ارادہ گناہ؛ گناہ نہیں

ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ دل میں گناہ کا خیال آجائے اور آدمی گناہ نہ کرے تو یہ گناہ نہیں ہے اور اگر بندہ یہ ارادہ کر لے کہ میں نے یہ گناہ کرنا ہے، اس کے پورے اسباب بھی جمع کر لے لیکن پھر گناہ نہ کر سکے تو جو گناہ کرنا تھا اور نہ کر سکا اس کی تو سزا نہیں ملے گی لیکن اس نے جو پختہ ارادہ کیا ہے اس پر اس کو سزا ضرور ملے گی۔

### نیکی اور برائی کا بدلہ:

﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا

يُجْزَى الَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾

جو شخص نیک عمل کرے گا تو اللہ اس شخص کو اس نیک عمل سے بڑھ کر بہتر بدلہ عطا فرمائیں گے۔ ”خیر“ کا لفظ فرمایا، ”خیر“ اسم تفضیل کا صیغہ ہے لیکن یہاں یہ متعین نہیں ہے کہ کتنا دیں گے۔ اس کا ادنیٰ درجہ ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾ ہے کہ نیکی کا بدلہ کم از کم دس گنا ہو گا اور زیادہ کتنا ہو گا یہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔

اور جو گناہ کرے گا تو گناہ کے بدلے میں اللہ صرف ایک ہی گناہ دیں گے۔ اس میں یہ نہیں ہو گا کہ گناہ ایک کرے تو بدلے میں اللہ دس گنا عذاب دے بلکہ ایک گناہ کا بدلہ صرف ایک ہو گا۔

### آپ علیہ السلام کے ساتھ مکہ واپسی کا وعدہ:

﴿إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ قُلْ رَبِّي أَعْلَمُ مَنْ

جَاءَ بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے مدینہ ہجرت فرما کر چلے۔ جب مقام جحفہ پر پہنچے جو مدینہ کے راستے کی مشہور منزل رابغ کے قریب ہے تو اس وقت

مکہ مکرمہ کے راستہ پر نظر پڑی تو بیت اللہ اور وطن یاد آیا، اسی وقت جبرائیل امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے ﴿إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَأْدٌ إِلَىٰ مَعَادٍ﴾ اللہ کے نبی! جس اللہ نے آپ پر قرآن نازل کیا ہے وہ اللہ آپ کو مکہ دوبارہ لائے گا۔  
اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے اور ایک وقت آیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پھر دوبارہ مکہ مکرمہ تشریف لائے۔

### مصیبت آئے تو مسئلہ نہ بدلیں:

میں اس لیے یہ بات سمجھاتا ہوں کہ یہ طے شدہ ہے کہ اہل حق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد ہے، درمیان میں ابتلا، امتحان اور کچھ آزمائشیں آتی ہیں، اس وقت دنیا میں پوری امت کا ذہن بن گیا ہے کہ مسئلہ بدل دو، مسئلہ چھوڑ دو تا کہ مشقت نہ آئے۔ کیس، پرچہ، جیل نہیں ہونی چاہیے ایسی پالیسیاں اختیار کرو!

لیکن ہمارا موقف یہ ہے کہ دین کا مسئلہ ٹھیک بیان کرو، حق کو صحیح بیان کرو اور پوری پالیسی ایسی رکھو کہ جیل اور یہ تکلیفیں نہ آئیں لیکن اس کے باوجود بھی اگر جیل اور تکلیف آجائے تو پھر مسائل نہ بدلنا، پھر حق کو نہ چھوڑنا، پھر بھی آتی ہیں تو آنے دو، پھر اللہ کے لیے برداشت کرو، ہمیشہ کے لیے دنیا میں نہیں رہنا، دکھ اور سکھ دنیا کا حصہ ہیں، موت کے بعد کے معاملات اصل ہوتے ہیں۔ ہمیشہ یہ فکر کرنا کہ کبھی تکلیف نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَحْسِبَ النَّاسَ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ﴾<sup>98</sup>

بندہ ایمان والا ہو اور اس پر آزمائش نہ آئے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟! اگر کوئی

شخص ایمان والا ہو اور زندگی بھر کوئی آزمائش نہیں آئی تو اس کو اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے کہ میں کیسا مؤمن ہوں؟ اس لیے میں بسا اوقات علماء سے عرض کرتا ہوں کہ جب ہم تذکرہ کرتے ہیں کہ ہمارے اکابر وہ تھے جنہوں نے جیل کاٹی... ہمارے اکابر وہ تھے جنہوں نے مار کھائی... ہمارے اکابر وہ تھے جنہوں نے ظلم سہے لیکن دین کا ساتھ نہیں چھوڑا، تو تقریریں یوں کریں گے اور جب ماننے کی باری آئے گی تو مانیں گے ان کو جن کے پاس صرف ریل ہے، جن کے ہاں جیل کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ بھائی! جب ان اکابر کا تذکرہ کرتے ہو کہ جن کے پاس ریل اور جیل دونوں تھے تو پھر چلو بھی ان کے ساتھ جن کے پاس ریل اور جیل دونوں ہیں، تذکرہ ان کا جن کے پاس جیل ہے اور ماننا ان کو جو جیل کا نام سن کر حق کو بدل دیں۔ یا للعجب! اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔ (آمین)

میں کہتا ہوں کہ شریعت کا خیال کریں، قانون کے دائرے میں رہ کر کام کریں، قانون کو مت توڑیں لیکن اگر کبھی ایسا مسئلہ پیش آجائے کہ دین کو چھوڑنے میں راحت ملتی ہو اور دین کو لینے میں تکلیف آتی ہو تو پھر تکلیف کو راحت پر ترجیح دیں، ایک وقت آئے گا کہ اللہ تکلیف ختم فرما کر راحت عطا فرمائیں گے۔ (آمین)

**پیغمبر پاک کو نصیحت:**

﴿وَمَا كُنْتَ تَرْجُو أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِن رَّبِّكَ

فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ﴾

کبھی آپ نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ پر وحی آئے گی لیکن یہ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر رحمت ہے، آپ پہلے بھی کفار کے معاون نہیں تھے آپ آئندہ بھی نہ ہونا۔

## بڑا سمجھائے تو فوراً صفائی پیش نہ کریں!

اس سے یہ بات سمجھ آئی کہ جب استاد شاگرد کو، شیخ اپنے مرید کو اور بڑا اپنے چھوٹے کو سمجھائے کہ بیٹا! گھر جاؤ تو نمازوں کا خیال کرنا! آگے سے یہ نہ کہیں کہ جی! میں تو خیال کرتا ہوں بلکہ خاموشی سے سنو اور کہو کہ ان شاء اللہ، استاد جی ایسا ہو گا۔ میرے پیغمبر! آپ کافروں کے معاون پہلے بھی نہیں تھے لیکن آئندہ بھی نہ ہونا! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تھوڑا کہا تھا کہ یا اللہ! میں پہلے بھی نہیں تھا تو اب کیسے ہوں گا!

اور یہ نصیحت یاد رکھ لیں کہ جب کوئی بڑا کسی چھوٹے کو نصیحت کرے تو اس وقت چھوٹا اپنی صفائی نہ دے، وہ صفائی دے گا تو بڑے کے دل میں ایسا تکدر آئے گا کہ آئندہ وہ نصیحت کرنے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔

اگر کسی بڑے کو چھوٹے کے بارے میں غلط اطلاع ہو اور اس پر وہ بڑا اس چھوٹے کو ڈانٹ لے تو اس وقت چھوٹا سنتا رہے، اس وقت صفائی نہ دے بلکہ کسی مناسب موقع کا انتظار کرے کہ میں نے ایک بات کرنی ہے، یا لکھ کر دے دے کہ آپ کو جو میرے متعلق فلاں نے اطلاع دی ہے وہ غلط دی ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہے، اصل معاملہ اور تھا لیکن آپ کو غلط بتایا گیا تھا، اس سے اس کو زیادہ خوشی ہوتی ہے اور موقع پر بولنا یہ تکلیف کا باعث ہوتا ہے، اس وقت خاموش رہنا چاہیے، بڑے نے تھوڑا سا ڈانٹ لیا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی ہے؟!

## حق پر عمل پیرا رہیں اور اسی کی دعوت دیتے رہیں!

﴿وَلَا يَصُدُّكَ عَنْ آيَةِ اللَّهِ بَعْدَ إِذْ أَنْزَلْتُ إِلَيْكَ وَادْعُ إِلَى رَبِّكَ وَلَا

تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾

دیکھو! کیسے خطاب ہو رہا ہے! فرمایا: جب آپ پر اللہ کی آیات نازل ہو جائیں تو یہ لوگ آپ کو ان پر عمل کرنے سے روک نہ سکیں، آپ کو چاہیے کہ آپ اپنے رب کی طرف بلاتے رہیں اور آپ نے خود مشرکین میں سے نہیں ہونا!

﴿وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾

اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکارو! اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ہر چیز تباہ ہو جائے گی لیکن اللہ کی ذات باقی رہ جائے گی۔ حکومت تو اللہ ہی کی ہے اور تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں اس آیت کے تحت لکھا ہے: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اس لیے کہ سوائے ذات خداوندی کے ہر چیز اپنی ذات سے فانی اور معدوم ہے۔

حضرت نے یہاں لکھا ہے کہ ”کسی شے کا وجود ذاتی اور خود بخود نہیں، خدا کو خدا اس لیے کہتے ہیں کہ وہ خود بخود ہے اور اس کا وجود ذاتی ہے، اس کے سوا جو چیز بھی موجود کہلاتی ہے تو اس کا وجود خدائے واجب الوجود کے سہارے سے ہے۔“<sup>99</sup>

اللہ ہم سب کو قرآن کریم سمجھنے اور سمجھانے کی اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة العنكبوت

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْم ۝ أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا

يُفْتَنُونَ ۝﴾

اہل ایمان کے لیے آزمائش لازمی ہے:

﴿الْم﴾ پر کئی بار بات ہو چکی ہے کہ اس کا معنی اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔

﴿أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝﴾

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ انہیں صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیا جائے

گا کہ ”ہم ایمان لائے“ اور انہیں آزمایا نہ جائے!

جو شخص دین کا کام کرے اور اس پر مشقت اور مشکل پیش آئے یہ بالکل

برحق ہے اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن آدمی دین کا کام کرے اور اس پر

مشکل نہ آئے تو اس پر تعجب کرنا چاہیے۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي

كَبَدٍ ۝﴾<sup>100</sup> کہ ہم نے بندے کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی بندہ آپ سے کہے



کہ اللہ کا شکر ہے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے تو اس پر تعجب کرنا چاہیے کہ تکلیف کیوں نہیں ہے اور اگر کوئی بندہ کہے کہ مجھے تکلیف ہے تو یہ تعجب کی بات نہیں۔ حدیث پاک میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً: الْأَنْبِيَاءُ، ثُمَّ الصَّالِحُونَ، ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَلَا أَمْثَلُ.

101

دنیا میں سب سے زیادہ سختی اور آزمائش انبیاء پر آتی ہے، پھر نیک صالح لوگوں پر، پھر جو ان کے زیادہ قریب ہو اس پر آتی ہے۔

### مصیبت آئے تو حق کا ساتھ نہ چھوڑیں!

ہمارے ہاں اس وقت جو سب سے بڑا مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اس کو بہت بڑی سمجھداری سمجھتے ہیں کہ دین کا کام کیا ہے اور کوئی مشکل نہیں آئی۔ اس کے لیے عقائد تبدیل کر کے بتاتے ہیں، مسائل غلط بتاتے ہیں، غلط مسائل کی تائید کرتے ہیں تاکہ جیل سے بچ جائیں، مصیبت سے بچ جائیں لیکن یہ یاد رکھیں کہ تھوڑے دنوں کے لیے تو بچ جائیں گے لیکن موت کے بعد پھر جیل ہے، کچھ دنوں کے لیے تو بچ جائیں گے لیکن موت کے بعد پھر عذاب ہے، جان تو چھوٹ نہیں سکتی، تو بجائے اس کے کہ آدمی قیامت کا بڑا عذاب لے لے بہتر ہے کہ دنیا کی تھوڑی سی مشقت لے اور آخرت کے عذاب سے بچ جائیں۔

ہمارے ہاں جو بندہ کام کرے اور اس قسم کے مراحل سے گزرے تو لوگ اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور اس قسم کے مراحل میں مشکلات نہ آئیں تو لوگ اس کے ساتھ چلتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ جس امام کے ہم مقلد ہیں امام اعظم ابو حنیفہ

نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ؛ حضرت امام صاحب نے زندگی کے آخری چار سال جیل میں گزارے ہیں، ایک دو دن نہیں زندگی کے آخری چار سال! جب امام صاحب نے کام شروع کیا تھا تو اس وقت جیل میں جاتے تو بندہ کہہ سکتا تھا کہ سفارش کوئی نہیں تھی، پیسہ کوئی نہیں تھا، چھڑانے والا کوئی نہیں تھا، تعلقات نہیں تھے لیکن حضرت امام صاحب کی زندگی کے آخری چار سال جیل میں ہیں، کتنا بڑا شخص ہے! کتنے بڑے تعلقات ہیں! اللہ نے وسائل کتنے دیے تھے! لیکن پھر بھی قید میں رہے۔

اموی خاندان کے آخری خلیفہ نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بات کی کہ آپ قاضی القضاۃ، چیف جسٹس بنیں، امام صاحب نے انکار فرمایا۔ انکار کی دلیل جو بھی دی لیکن انکار کی بنیاد یہ تھی کہ میں ان کی غلط باتوں کی تائید نہیں کروں گا۔ اگر تائید نہیں کروں گا تو پھر جھگڑا ہو گا اور اگر تائید کروں گا تو نتیجہ جہنم ہو گا اور یہ جہنم میں نہیں لے سکتا۔ حضرت امام صاحب نے انکار کر دیا۔ اس وقت کوفہ کا گورنر تھا یزید بن ہبیرہ اس کے ذریعے امام صاحب کو روزانہ دس کوڑے لگوائے جاتے، ایک سو بیس کوڑے امام صاحب کو لگے ہیں۔

اموی خاندان کے بعد خلیفہ ابو جعفر منصور نے بھی پیش کش کی تو امام صاحب نے قبول نہیں فرمائی۔ پھر اس نے بھی تیس کوڑے لگوائے تو حضرت امام صاحب نے ایک سو پچاس کوڑے کھائے ہیں۔ اب چونکہ امام صاحب کو جیل تو پہلے آپکی تھی، اب اگر آپ کو جیل سے رہا کرتے تو امام صاحب کے کئی متوسلین تھے، شاگرد تھے، دنیا میں ایک حلقہ تھا، اگر امام صاحب کوئی جملہ فرمادیں تو حکومت کے لیے مسئلہ نہ پیدا ہو تو خلیفہ نے یہی مناسب سمجھا کہ امام صاحب زندہ جیل سے باہر نہ نکلیں، جنازہ جیل سے نکلے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو بالآخر زہر دینے کا فیصلہ ہوا۔

جیل کا ایک ملازم جو چھوٹے درجے کا تھا اس نے امام صاحب سے عرض کیا

کہ میں چھوٹا آدمی ہوں، میں کچھ کر نہیں سکتا لیکن آپ کو اطلاع دے رہا ہوں کہ آپ کو زہر پلا دیا جائے گا، آپ جو کر سکتے ہیں کر لیں۔ امام صاحب کے پاس جیل والے دودھ کا پیالہ لائے اور پیش کیا۔ امام صاحب نے پینے سے انکار کیا، فرمایا ”إِنِّي لَأَعْلَمُ مَا فِيهِ“ میں جانتا ہوں اس میں کیا ہے؟ بتا دیا تھا نا کہ زہر ہے تو نہیں پیا۔ امام صاحب نے کہا کہ میں اس کو پیوں گا تو خود کشی ہوگی اور خود کشی کرنا جائز نہیں، اپنی مرضی سے میں نہیں پی سکتا۔ پھر امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو زمین پر لٹایا گیا اور ان کے منہ میں پیالہ اندھا لایا گیا، کچھ منہ میں چلا گیا اور کچھ ڈاڑھی پر لگ گیا۔

امام صاحب اٹھے اور دو رکعت نماز کی نیت باندھ لی۔ جب سجدے میں گئے تو روح پرواز کر گئی، لیکن امام صاحب نے غلط مسئلہ بیان نہیں کیا۔ میں اس لیے گزارش کرتا ہوں اور میں بار بار عرض کرتا ہوں کہ غلط مسئلہ کبھی نہ بتانا، آپ جیل یا مشقت کے ڈر سے صحیح مسئلہ نہیں بتا سکتے تو خاموش ہو جائیں لیکن غلط مسئلہ کبھی نہیں بتانا۔ اصل تو آدمی کے لیے عزیمت ہے کہ مسئلہ بیان کرنا چاہیے، زندگی میں کچھ احوال آتے ہیں تو انہیں برداشت کرنا چاہیے۔

### مشقت آنا قابلِ تعجب نہیں:

﴿أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ﴾

لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان بھی لائیں، جنت بھی ملے اور پھر امتحان بھی نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ امتحانات تو زندگی کا حصہ ہیں۔ اس سے بندے کو متاثر نہیں ہونا چاہیے اور بندے کو بزدلی کا شکار بھی نہیں ہونا چاہیے بلکہ تسلسل سے اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے۔ میں اکثر یہ بات آپ کی خدمت میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمارا ہر اٹھنے والا قدم قبر کی طرف جارہا ہے، ہر قدم موت کی طرف ہے، آج مر جائیں کل مر جائیں جانا تو ہے ہی، مشقت میں ہوں یا راحت میں ہوں دنیا تو چھوڑ کر جانی ہے، اس لیے

مسائل میں کبھی انسان غلطی نہ کرے۔

خیر میں یہ بات سمجھا رہا تھا کہ دین کے کام پر مشقت آنایہ تعجب کی بات نہیں ہے اور مشقت نہ آنایہ تعجب کی بات ہے! ہمارے ہاں بگاڑ کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے جیل نہیں جانا، اس کے لیے خود کو بدلنا پڑے، نظریات بدلنے پڑیں، پالیسیاں بدلنی پڑیں، کچھ بھی ہو جائے بس جیل نہیں جانا! یہ جو خوف ہے اس کو اتارنا بہت ضروری ہے! بھائی جیل چلے بھی گئے تو کیا ہوگا؟ جیل بھری پڑی ہے ڈاکوؤں، چوروں، زانیوں اور شرابیوں سے، اگر دو اہل علم چلے جائیں گے تو کون سی قیامت آن پڑے گی؟ اس سے کیا ہوتا ہے! کچھ بھی نہیں ہوتا!

اور میں پرسوں یہاں اساتذہ سے کہہ رہا تھا کہ ہمیں ایجنسی والے اٹھائیں اور سڑک پر لٹائیں تو کہتے ہیں کہ ہماری تذلیل ہوگئی، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو لٹا کر زہر کا پیالہ دیا جا رہا ہے لیکن انہوں نے تو نہیں کہا کہ میری تذلیل ہوگئی، وہ تو اس کو اپنی عزت سمجھتے تھے، اس لیے دین کے معاملے میں کوئی مشقت آجائے تو اللہ کے لیے برداشت کریں اور ڈریں اور دوڑیں مت!

**”اللہ جاننا چاہتے ہیں“ پر شبہ کا جواب:**

﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَ

لَيَعْلَمَنَّ الْكَافِرِينَ﴾

اللہ رب العزت نے تسلی دی ہے کہ یہ معاملہ صرف تمہارے ساتھ نہیں بلکہ تم سے پہلے لوگوں کے ساتھ بھی تھا، ہم نے ہر کسی کا امتحان لیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ سچے کون ہیں اور کاذب کون ہیں۔ بظاہر شبہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت امتحان لیتے ہیں تو بندے کا پتا چلتا ہے اور نہیں لیتے تو پتا نہیں چلتا، ﴿لَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ

صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَذِبِينَ ﴿۱﴾ اللہ جاننا چاہتا ہے کہ سچا کون ہے اور اللہ جاننا چاہتا ہے کہ جھوٹا کون ہے۔ حالانکہ اللہ کو تو پہلے سے پتا ہے، پھر اللہ امتحان کے ذریعے کیوں معلوم کر رہے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے علم میں سب چیزیں ہیں لیکن لوگوں کو نہیں پتا کہ ان میں صادق کون ہیں اور کاذب کون ہیں؟ تو اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ ہم ایسا امتحان لیتے ہیں کہ جس سے سب کو پتا چل جائے کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے؟ یعنی ہم ظاہری طور پر سچے اور جھوٹے کو الگ الگ کرتے ہیں تاکہ تمہارے علم کے اندر بھی یہ بات آجائے۔ اس لیے تفسیر جلالین والے ایسے موقع پر ایسے لفظ کہہ دیتے ہیں ”فَلَيَعْلَمَنَّ أُمِّيٰ عَلِمَ ظُهُورٌ“ یعنی ایسی بات کہ جو سب کے سامنے آجائے۔

### اصطلاحات شرع میں تبدیلی نہ کرو!

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَآ لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾

ہم نے انسان کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے، اگر والدین تمہیں اس بات پر مجبور کریں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ جس کے متعلق تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اس معاملے میں والدین کی بات مت مانو!

### مزج انسانی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةً لِلنَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ ۖ وَلَئِن جَاءَ نَصْرٌ مِّن رَّبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ﴾

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب ان کو

اللہ کے راستے میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو لوگوں کی طرف سے ملنے والی تکلیف کو ایسے سمجھنے لگتے ہیں جیسے ان پر اللہ کا عذاب آچکا ہو! اور اگر ان مسلمانوں کو اللہ کی طرف سے کوئی مدد ملے تو یہ منافق قسم کے لوگ کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔

اللہ رب العزت بعض منافق مزاج کے لوگوں کی عادت کو بیان فرما رہے ہیں کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ زبان سے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، ہم مومن ہیں لیکن جب ان پر کوئی تکلیف آئے تو یوں چلاتے ہیں جیسے ان پر خدا کا عذاب آگیا ہو اور جب اہل ایمان کو راحت ملے تو پھر کہتے ہیں ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ منافقین کا کام ہے کہ راحت میں ساتھ دینا اور مشکل میں دوڑ جانا، اس کو اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر سمجھایا ہے۔

ایک مقام پر ہے: ﴿يُنَادُوهُمْ أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ﴾<sup>102</sup> کہ منافق لوگ جب مومنین کو راحت میں دیکھیں گے تو پکاریں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟! لہذا اپنی کامیابی اور راحت میں ہمیں بھی شریک کر لو اور اپنے نور سے ہمیں بھی مستفید ہونے دو!

قرآن کریم میں ہے: ﴿قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَا تَبْعُنَكُمُ﴾<sup>103</sup> منافقین نے کہا کہ اگر ہم غزوہ احد کو جہاد سمجھتے تو ہم آپ کا ساتھ ضرور دیتے، یہ کون سا جہاد ہے؟ یہ تو خود کشی ہے! اور کبھی کہتے: ﴿لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا﴾ کہ یہ صحابہ اگر ہماری بات مان لیتے تو جہاد میں شہید نہ ہوتے بلکہ بچ جاتے۔

اللہ فرماتے ہیں: ﴿فَادْرَءُوا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾<sup>104</sup> کہ اے پیغمبر آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم سچے ہو تو تم اپنی ذات سے موت ہٹا کر دکھاؤ! موت سے کوئی بندہ بچ نہیں سکتا تو پھر یہ تاویلیں کرنے کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔

**گناہ کا بوجھ کون اٹھائے گا؟ (ایک تعارض کا حل)**

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطِيئَتَكُمْ وَمَاهُمْ بِحَمِيلِينَ مِنْ خَطِيئِهِمْ مِنْ شَيْءٍ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ﴾<sup>۱۱۷</sup>

جب پیغمبر علیہ السلام دعوت دیتے اور لوگ ان کی دعوت کو قبول کرتے تو کفار ان کو نبی کی دعوت سے روکتے تھے۔ لوگ کہتے کہ اگر ہم پیغمبر کی دعوت قبول نہیں کریں گے تو نبی تو فرما رہے ہیں کہ عذاب ہو گا، جہنم میں جائیں گے تو ہمارا کیا بنے گا؟ کفار کہتے کہ تم فکر نہ کرو! تمہارے بوجھ ہم اٹھائیں گے، جہنم کا عذاب ہمارے ذمہ ہے، بس تم انکار کرو۔

یہاں دو آیتوں میں بظاہر تعارض اور ٹکراؤ ہے۔ اس طرح کہ یہاں آیت سے جو بات سمجھ میں آرہی ہے وہ یہ ہے ﴿وَمَا هُمْ بِحَمِيلِينَ مِنْ خَطِيئِهِمْ مِنْ شَيْءٍ﴾ کہ کافر لوگ مومنین کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے لیکن اگلی آیت میں ہے: ﴿وَلِيَحْمِلَنَّ أَثْقَالَهُمْ وَاتَّقَالًا مَعَ أَثْقَالِهِمْ﴾ کہ یہ لوگ اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ اور لوگوں کے گناہوں کے بوجھ کو بھی اٹھائیں گے۔ تو بظاہر ان دو آیتوں میں تعارض ہے، لیکن حقیقت میں تعارض نہیں ہے اس لیے کہ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ کافر لوگ مومنین سے کہتے

تھے کہ تم ہماری بات مانو اور ہم تمہارا بوجھ اس طرح اٹھائیں گے کہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، سب مشقت ہمارے ذمے ہے اور دوسری آیت کا معنی یہ ہے کہ جو آدمی گناہ کرتا ہے اپنے گناہ کو وہ بھی اٹھائے گا اور جس کی وجہ سے وہ گناہ کرتا ہے وہ شخص بھی اس کے گناہ کا بوجھ اٹھائے گا۔ اب دونوں میں تعارض ختم ہو گیا۔

حدیث پاک میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کوئی نیک کام ایسا شروع کرتا ہے کہ جس پر لوگ عمل کرتے ہیں تو اس نیک عمل کا اجر بھی اس کو ملے گا اور جو لوگ نیک عمل کریں گے ان سب کا اجر بھی اس کو ملے گا اور اگر کوئی شخص گناہ کا ایسا کام کرتا ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ گناہ کرتے ہیں تو ان کے گناہوں کا وبال قیامت کے دن اس کو بھی ہو گا۔<sup>105</sup>

### حقوق العباد کی پامالی سے بچیں!

میں طلبہ سے اکثر یہ بات عرض کرتا ہوں کہ گناہ سے تو ہمیشہ بچنا چاہیے لیکن کچھ گناہ ایسے ہیں کہ وہ تو کبھی نہ کریں! ایک تو حقوق العباد کی پامالی... یہ کبھی نہ کریں اور یہ بات ذہن میں رکھ لیں کہ کسی کا جو تاچوری کرنا یہ حق العبد ہے اور بعض ایسے گناہ جن کو شاید ہم گناہ نہیں سمجھتے۔ مثلاً پانی کی ٹینکی ہے اس پر گلاس رکھے ہوئے ہیں، میں نے پانی پی لیا اور گلاس اٹھا کر لے گیا تو یہ جو میں نے گلاس اٹھایا ہے یہ حق العبد پر ڈاکہ مارا ہے، اس میں سب طلبہ کا حق تھا اور میں نے لیا ہے، قیامت کے دن مجھے ان سب کو اس گلاس کا جواب دینا پڑے گا۔ اب بتاؤ! میں قیامت کے دن کہاں سے دوں گا؟ ہم سمجھتے نہیں ہیں کہ ہم نے کتنا بڑا جرم کیا ہے؟

میں یہ اس لیے عرض کرتا ہوں کہ ہم طلبہ اگر اس چیز کا خیال نہیں کریں



گے تو لوگ کیسے خیال کریں گے؟ ایک تو ایسا حق کبھی نہ کھائیں جس کے ساتھ حق العبد کا تعلق ہو۔ دوسرا ایسا گناہ کبھی نہ کریں جو گناہ متعدی ہو! ایک گناہ لازمی ہے جو انسان کی ذات تک ہے، اس کا کسی اور سے تعلق نہیں مثلاً خدا نہ کرے کوئی بندہ حرام کھا لیتا ہے تو اس کا تعلق اس کی ذات کے ساتھ ہے، کسی نے زنا کیا اس کا تعلق اس کی ذات کے ساتھ ہے لیکن ایک گناہ ایسا ہے جو دوسرے گناہ کا عادی بناتا ہے، مثلاً خود فلم دیکھتا تھا تو یہ بھی جرم تھا، اب اس نے دوستی لگائی اور ایک دوست کو فلم پر لگا دیا۔ اب یہ تو توبہ کر لے گا لیکن جس کو فلم پر لگایا ہے اس کی فلمیں کس کے کھاتے میں جائیں گی؟! یہ متعدی گناہ کبھی نہ کریں۔ ہم بھی اگر نہیں بدلیں گے تو بتاؤ دنیا میں کون سی جگہ ہے جہاں تبدیلی آئے؟ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

**افضل ہونے کی بنیاد علم ہے:**

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا فَأَخَذَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظَالِمُونَ﴾ (۱۲)

قرآن کریم کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال اپنی قوم کو دعوت دی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے بعد تین سو سال اپنی قوم کو دعوت دی ہے۔ اب دیکھو! ساڑھے نو سو سال کا زمانہ بہت بڑا ہے اور نوح علیہ السلام کی دعوت میں مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی مشکلات سے بھری پڑی ہے لیکن مدنی زندگی میں غزوات کی مشکلات بھی ہیں اور ریاست، مرکز، صحابہ کرام اور اپنے متعلقین اور معتقدین کی وجہ سے راحت بھی ہے لیکن نوح علیہ السلام کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔

اس صورتحال کے پیش نظر ایک اشکال ہے کہ نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سال کی محنت اور مشقت کا تقاضا یہ ہے کہ نوح علیہ السلام مقام اور مرتبہ میں افضل

ہونے چاہئیں کیونکہ مشقت بہت ہے۔ قرآن کریم اور شریعت کی رو سے ہمارے ہاں افضل اور ادنیٰ کا مدار تو دین کی مشقت اور دین کی محنت ہے اور جو شخص دین کا کام زیادہ کرتا ہے اس کا اجر بھی زیادہ ہے اور جو کم کرتا ہے اس کا اجر بھی کم ہے اور جس کا اجر زیادہ ہے تو اللہ کے ہاں افضل بھی وہی ہو گا۔ تو بظاہر حضرت نوح علیہ السلام کو افضل ہونا چاہیے!

لیکن یہ بات ذہن نشین فرمائیں کہ یہ اشکال اس وقت ہے کہ

نمبر 1: جب انسان یہ نہیں سمجھتا کہ نبوت کا اصل منصب کیا ہے۔

نمبر 2: جب یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نبوت کی خاصیت کیا ہے اور نبوت کے حوالے سے اس بات کو جب تک آدمی نہیں سمجھتا کہ نبوت کا کمال کیا ہے۔

### کمال علمی اصل کمال ہے:

یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ جو کسی چیز کا کمال ہوتا ہے وہ کمال تب ہوتا ہے جب وہ دوسرے میں نہ ہو۔ اگر وہ بات دوسرے میں بھی ہو تو اس بندے کا کمال نہیں رہتا۔ تو کمال نبوت؛ عمل نہیں ہے بلکہ کمال نبوت؛ علم ہے۔ لہذا جس پیغمبر کا علم جتنا زیادہ ہو گا اسی قدر یہ پیغمبر دوسرے پیغمبروں سے اعلیٰ اور افضل ہو گا۔ تو چونکہ کمالات نبوت میں سے کمال اصلی؛ علم ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو علم ہے یہ تمام انبیاء علیہم السلام سے اعلیٰ ہے۔ ایک تو قرآن کریم میں ہے:

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ

جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّمَّنْ لَكُمْ تَوْهَدُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيكُمْ فَلَا تَوَّعَدُوهُ وَلَا تَنْصُرُوهُ ۚ﴾<sup>106</sup>

جب اللہ نے اپنے پیغمبروں سے یہ عہد لیا تھا کہ اگر میں تمہیں کتاب اور

حکمت دوں، پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو تمہارے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرے تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور اس کی تصدیق بھی کرو گے!

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تصدیق فرمائیں گے ان علوم کی جو انبیاء علیہم السلام کے پاس ہیں اور آدمی تصدیق تب ہی کرتا ہے جب اس کا علم ہو، اگر علم نہ ہو تو تصدیق کیسے کرے گا؟! تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر تورات کے مصدق ہیں تو اس کا معنی یہ ہے کہ تورات کے عالم بھی ہیں، اگر آپ انجیل کی تصدیق فرماتے ہیں تو اس کا معنی کہ آپ کے پاس انجیل کا علم بھی ہے، زبور کی تصدیق فرماتے ہیں تو زبور کا علم بھی ہے۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس تورات کا علم ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس انجیل کا علم ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس زبور کا علم ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان تینوں کا علم ہے اور ساتھ قرآن کریم کا علم بھی ہے۔ تو چونکہ آپ کا علم سب سے اعلیٰ ہے اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام بھی سب سے اعلیٰ ہے۔ یہ بات سمجھ میں آئی؟ (جی ہاں۔ سامعین)

اسی طرح یہ بات بھی دیکھ لیں کہ امت میں ایک ہے علم اور ایک ہے عمل، علم ایسا جس پر عمل ہو لیکن عمل فرائض کی حد تک ہو، واجبات کی حد تک ہو۔ امت میں اگر کوئی شخص صاحب علم ہو اور فرائض، واجبات اور سنن مؤکدہ کو بجالاتا ہو اور حرام اور مکروہات سے بچتا ہو اور نوافل اس کے نامہ اعمال میں نہ ہوں اور اس کے مد مقابل ایک امتی ہو جس کے نامہ اعمال میں فرائض، واجبات، سنن مؤکدہ، غیر مؤکدہ اور نوافل اتنے زیادہ ہوں کہ جس کا عالم کے نامہ اعمال میں تصور بھی نہ ہو سکتا ہو تو پھر بھی وہ عالم اس عابد سے اعلیٰ اور افضل ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک فیکٹری میں کام کرنے والے ہزار مزدور ہوتے ہیں اور اس فیکٹری میں کام کرنے والا ایک انجنیئر ہوتا ہے، مزدور آٹھ گھنٹے دھوپ میں مشقت اٹھاتا ہے اور اس کی تنخواہ پندرہ ہزار

روپے ہوگی اور یہ انجینئر کنڈیشن میں بیٹھتا ہے اور روزانہ ایک گھنٹا دیتا ہے لیکن اس کی تنخواہ پندرہ لاکھ روپے ہوگی۔ ایک شخص کہتا ہے کہ یہ اے سی میں بیٹھتا ہے، ایک گھنٹا دیتا ہے، صرف کاغذ دیکھتا ہے اور چلا جاتا ہے لیکن اس کی تنخواہ پندرہ لاکھ روپے ہے اور ایک مزدور صبح سے لے کر شام تک مشقت اور گرمی میں اینٹیں اٹھاتا ہے اور اس کی تنخواہ صرف پندرہ ہزار روپے ہے! ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ یہ جو مزدور ہے یہ عامل ہے اور یہ انجینئر جو ہے یہ عالم ہے۔

جو نسبت عامل اور عالم کے درمیان ہوتی ہے یہی نسبت شریعت میں بھی ملحوظ ہوتی ہے عالم اور عابد میں۔ انبیاء علیہم السلام کا جو اصل کمال ہے وہ ہے علم، جس نبی میں علم زیادہ ہو گا وہ نبی دوسرے سے اعلیٰ ہو گا۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم تمام انبیاء علیہم السلام سے اعلیٰ ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام بھی سب سے اعلیٰ ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اولین و آخرین سب کا علم دیا گیا ہے<sup>107</sup>۔ اس کی مثال ایسے سمجھو جیسے ایک دماغ ہے اور ایک آنکھ ہے۔ آنکھ تب دیکھتی ہے جب دماغ کام کرتا ہو، دماغ کام نہ کرے تو آنکھ کام نہیں کرتی، کان تب سنتا ہے جب دماغ کام کرے، دماغ کام نہ کرے تو کان کام نہیں کرتا۔ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ایک دماغ کی ہے اور باقی انبیاء علیہم السلام کی مثال کان، ناک کی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال مجموعہ نبوت میں دماغ کی طرح ہے، اب جو دماغ اور آنکھ کا فرق ہے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ اب دیکھو! آنکھ اٹھ گھٹنے دیکھ رہی ہے، کان دس گھٹنے سن رہا ہے لیکن کسی سے پوچھو کہ مقام دماغ کا زیادہ ہے یا کان اور آنکھ کا؟ ہر بندہ کہے گا کہ دماغ کا! تو اگر کسی نبی کی عملی

محنت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بھی ہو تب بھی اس کا مقام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم والا نہیں ہو سکتا۔

یہ جو گفتگو میں کر رہا ہوں یہ ساری گفتگو قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ حضرت نانوتوی کے عجیب علوم تھے۔ اللہ پاک ہم سب کو ان کے علوم پڑھنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### سجدہ نبوی؛ سجود امت سے افضل ہے:

اور اسی سے یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین فرمائیں کہ ہمارا جو یہ عقیدہ ہے کہ پیغمبر کا ایک سجدہ ہو تو امت کے اربوں سجدوں سے اعلیٰ ہے، نبی کا ایک مرتبہ سبحان اللہ کہنا یہ امت کے اربوں سبحان اللہ کہنے سے اعلیٰ ہے، پیغمبر بظاہر عمل کم ہونے کے باوجود امت سے آگے نکل جاتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اللہ کے ہاں جو عبادت کا وزن اور اجر ہوتا ہے وہ عبادت کی کمیت کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ عبادت کی کیفیت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اگر اخلاص کم ہو اور سو بار پہلا کلمہ پڑھیں اور اخلاص زیادہ ہو اور ایک بار پڑھیں تو ایک بار اخلاص کے ساتھ پڑھا جانے والا کلمہ سو بار بغیر اخلاص کے ساتھ پڑھے جانے والے کلمے سے آگے نکل جاتا ہے، اگر اخلاص ہو اور تعداد کم ہو پھر بھی آگے نکل جائے گا۔

کسی عمل میں اخلاص کا زیادہ ہونا، کسی عمل میں خشوع کا زیادہ ہونا اس کی بنیاد ہوتی ہے تو واضح پر۔ جو بندہ جس قدر زیادہ متواضع ہوتا ہے اسی قدر اس کی عبادات میں خشوع بھی زیادہ ہوتا ہے، اور تو واضح کی بنیاد ہمیشہ معرفت پر ہوتی ہے، جس قدر بندہ کسی کو پہچانتا ہے تو اسی قدر بندہ متواضع اختیار کرتا ہے اور معرفت کی بنیاد ہوتی ہے علم، جس قدر جس بندے کی معلومات ہوتی ہیں اسی قدر اس بندے کو معرفت ہوتی ہے۔ اب دیکھو! اعمال کے وزن کی بنیاد کیفیت اور کیفیت کی بنیاد تواضع اور تواضع کی بنیاد

معرفت اور معرفت کی بنیاد علم ہے۔

آپ نے کئی بار دیکھا ہو گا کہ ہم کرسی پر بیٹھے ہوتے ہیں، بیان ختم ہو گیا، مصافحہ کرنا ہے، اب بعض آتے ہیں مصافحہ بھی کرتے ہیں اور ہاتھ بھی چوم رہے ہوتے ہیں، بعض آتے ہیں مصافحہ کرتے ہیں اور ہاتھ نہیں چومتے اور بعض بچے ایسے آتے ہیں کہ مصافحہ کریں گے اور مجھے نہیں بلکہ مجمع کو دیکھتے ہوئے کرتے ہیں، کیونکہ وہ روٹین وائز مصافحہ کر رہے ہیں، ان کے دل میں عظمت نہیں ہے، جب عظمت نہیں ہوگی تو تواضع بھی نہیں ہوگی۔

تو کیفیت کی بنیاد ہوتی ہے عظمت اور عظمت کی بنیاد تواضع اور تواضع کی بنیاد معرفت ہے۔ آپ کسی بندے کے سامنے متواضع تب ہوں گے جب اس کو پہچانتے تو ہوں نا کہ بندہ کون ہے؟ آپ سڑک سے گزریں، ایک سفید ریش بزرگ کھڑے ہیں، آپ سلام کر کے گزر جاتے ہیں، ایک اور بندہ آتا ہے، وہ ان بزرگ سے پوچھتا ہے کہ استاد جی! آپ نے کہیں جانا ہے؟ وہ سمجھتا ہے کہ ہماری مسجد کے امام صاحب ہیں، وہ ان کی عزت تھوڑی سی زیادہ کرتا ہے، ایک تیسرا بندہ آتا ہے اور کہتا ہے میری گاڑی میں بیٹھیں میں آپ کو شہر چھوڑ کر آتا ہوں، تو یہ تیسرا آنے والا ان کا شاگرد ہے جس نے ان کے پاس پڑھا تھا تو تینوں میں فرق ہو گیا۔ اس لیے کہ جتنی معرفت ہوگی اتنی تواضع ہوگی اور معرفت کی بنیاد علم اور معلومات ہیں۔

اب بات سمجھنا! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا اللہ کی ذات اور صفات کے بارے میں اتنا علم ہے کہ سارے انسانوں کا علم بھی جمع کریں تو حضور کے علم سے کم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اللہ کی جتنی عظمت ہے ساری کائنات کی عظمت کو جمع کریں تو وہ اس سے کم بنتی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اللہ کی عظمت ہے۔ وجہ؟ علم کی وجہ سے معرفت ہے،

معرفت کی وجہ سے عظمت ہو رہی ہے اور جب عظمت دل میں ہوگی تو اس مطلب یہ ہو گا کہ جس قدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اللہ کی تواضع، عظمت، خشیت اور خشوع ہے تو سارے انسانوں کا خشوع جمع کر لیں تو آپ کا خشوع زیادہ ہے، کیوں؟ اس لیے کہ خشوع کی بنیاد عظمت ہے، اس کی بنیاد معرفت ہے، اس کی بنیاد علم ہے تو جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خشوع پوری کائنات کے انسانوں سے زیادہ ہے اور عمل کی کیفیت کی بنیاد خشوع ہوتا ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی جو کیفیت ہے یہ پوری کائنات کے انسانوں کی کیفیات سے زیادہ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سجدہ کریں تو اس کی کیفیت اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اگر قیامت تک آنے والے سارے انسانوں کی سجدوں کی کیفیات ملا بھی لیں تب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سجدے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تو پھر پیغمبر کا ایک سجدہ پورے انسانوں کے سجدے سے اعلیٰ ہو گا۔ (سبحان اللہ۔ سامعین) بات سمجھ آگئی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین)

### حضرت نانوتوی کے علوم:

مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تحذیر الناس میں یہی بات فرماتے ہیں کہ بظاہر امتی اعمال میں نبی سے بڑھ جاتا ہے حقیقت میں نہیں بڑھتا۔ یہ ”بظاہر“ کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک تریٹھ سال ہے، امتی کی عمر ساٹھ سال ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کام چالیس سال کے بعد شروع کیا ہے اور امتی پندرہ سال کے بعد بالغ ہوتے ہی نمازیں شروع کر دے گا۔ تو بظاہر تو نمازیں اس کی زیادہ ہیں لیکن اللہ کے ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازوں کا جو وزن ہے وہ اس امتی کی نمازوں کا نہیں ہے۔ تو بظاہر امتی نبی سے بڑھتا ہے لیکن حقیقت میں نہیں بڑھ سکتا۔ حضرت نانوتوی کی اسی عبارت پر بریلوی حضرات اعتراض کرتے ہیں۔

## قوم لوط کے جرائم:

﴿إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُونَ السَّبِيلَ ۚ وَ تَأْتُونَ فِي  
نَادِيَكُمُ الْمُنْكَرَ﴾

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے بنیادی طور پر تین جرم تھے جو قرآن کریم نے بیان کیے ہیں؛ پہلا جرم یہ تھا کہ وہ لڑکوں سے بد فعلی کرتے تھے۔

اور دوسرا جرم اس قوم کا یہ تھا کہ وہ ڈاکے ڈالتے تھے اور تیسرا جرم یہ تھا کہ بے حیائی کا کام مجلس میں کرتے تھے۔ بعض نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ یہ بد فعلی بھی کرتے اور مجلس میں ہی کرتے تو یہ ان کا دوہرا جرم تھا، یا اس کا مطلب یہ ہے کہ بد فعلی تو مجلس میں نہیں کرتے تھے لیکن بعض دیگر نامناسب کام مجلس میں کرتے ہوئے شرماتے نہیں تھے، اور یہ بات معاشرے میں دیکھ لیں کہ بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے مزاج میں بے حیائی ہوتی ہے اور وہ سمجھتے نہیں کہ مجلس میں یہ بات کرنی چاہیے، یہ کام اس مجلس کے مناسب ہے یا نہیں! وہ یہ کام کریں گے اور اس کے اس کام پر دس بندے ہنسیں گے تو اسے فخر ہو گا کہ میرے اس کام پر دس بندے ہنس پڑے ہیں۔

## چار قسم کا عذاب:

﴿فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهِ ۖ فَمِنْهُمْ مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّبِيحَةُ ۖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ ۖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ أَغْرَقْنَا ۖ﴾

اللہ تعالیٰ نے یہاں چار قسم کے عذاب کا تذکرہ فرمایا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم، حضرت لوط علیہ السلام کی قوم اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی قوموں کا



تذکرہ فرمایا کہ ان میں سے نافرمان لوگوں کو ہم نے ان کو یہ عذاب دیے:

﴿فِيْنَهُمْ مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا﴾ بعضوں پر سخت تیز ہوا بھیجی جس میں پتھر تھے، ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ﴾ اور بعضوں کو چیخ نے ہلاک کر دیا، ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ حَسَفْنَا بِهٖ الْاَرْضَ﴾ اور بعضوں کو زمین میں دھنسا دیا، ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا﴾ اور بعضوں کو پانی میں غرق کر دیا۔ ان چار عذابوں کا معنی یہ نہیں ہے کہ عذاب ان چار میں منحصر ہے بلکہ عذاب اس کے علاوہ بھی ہیں، ان چار کا ذکر اس لیے کیا کہ خاص خاص لوگوں پر یہ خاص چار عذاب آئے تھے۔

### داعی کے لیے دو چیزوں کا اہتمام:

﴿اٰتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿٢٥﴾﴾

یہاں اللہ رب العزت نے دین کی دعوت دینے والے داعی اور واعظ کو نصیحت کی ہے کہ اس کو دو چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے:

نمبر 1: ﴿اٰتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ قرآن کریم کی تلاوت کرنا

نمبر 2: ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ﴾ نماز کی پابندی اور اہتمام کرنا

داعی اور واعظ کو یہ دو چیزیں اختیار کرنی چاہئیں، یہ داعی کے لیے بنیادی چیزیں ہیں، نماز پڑھنا کافی نہیں ہے بلکہ نماز کا اہتمام ضروری ہے، ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ کیونکہ نماز انسان کو فحشاء اور منکر سے روک دیتی ہے۔ فحشاء اور منکر کا معنی کیا ہے؟

”منکر“ ایسے گناہ کو کہتے ہیں جس کے حرام ہونے پر دلیل شرعی ہو، اور

”فحشاء“ اس گناہ کو کہتے ہیں جس کو ہر عقل مند شخص برا اور نامناسب سمجھے چاہے وہ مومن ہو یا کافر ہو، مثلاً زنا ہے... دنیا میں جو کفار ہیں وہ بھی زنا کو اچھا نہیں سمجھتے، ڈاکہ... دنیا میں کوئی کافر بھی اس کو اچھا نہیں سمجھتا، کسی کا حق مارنا... کوئی کافر بھی اس کو اچھا نہیں سمجھتا۔ تو فرمایا کہ تم نماز کی پابندی کرو اس لیے کہ نماز فحشاء اور منکر ہر قسم کے گناہوں سے روک دیتی ہے۔

### نماز گناہ سے روکتی ہے تو نمازی گناہگار کیوں؟

اس پر سوال یہ ہے کہ بسا اوقات بندہ نماز پڑھتا ہے اور پھر بھی گناہ نہیں چھوڑتا! اس کے دو جواب ہیں؛

ایک یہ کہ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ نماز بندے سے اس کے گناہ چھڑو ادیتی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ نماز گناہوں سے روکتی ہے، روکنا اور ہے اور چھڑوانا اور ہے۔ قرآن کریم زنا سے روکتا ہے لیکن لوگ پھر بھی کرتے ہیں، قرآن شراب سے روکتا ہے لیکن لوگ پھر بھی پیتے ہیں، اس لیے نماز گناہوں سے روکتی ہے کا معنی یہ نہیں ہے کہ نماز گناہ نہیں کرے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جب نماز پورے آداب کے ساتھ ہو تو پھر گناہوں سے روکتی ہے اور آدمی کو توفیق مل جاتی ہے کہ گناہوں سے بچ جاتا ہے لیکن اگر کسی کو یہ توفیق نہ ملے تو اسے غور کرنا چاہیے کہ اس کی نماز بغیر آداب کی رعایت کے ہے، اس لیے بندے کو پورے آداب کے ساتھ نماز کا اہتمام کرنا چاہیے، اور ایک حدیث پاک میں ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”مَنْ لَمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ فَلَا صَلَاقَ لَهُ.“<sup>108</sup>

کہ وہ نماز جو انسان کو گناہوں سے نہ روکے تو وہ نماز کہلانے کے لائق ہی نہیں۔

لیکن اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ اگر نماز پڑھیں اور گناہ نہ چھوٹیں تو بندہ نماز ہی چھوڑ دے بلکہ نماز پڑھتا رہے، ایک وقت آئے گا کہ اللہ اس کو توبہ کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

اور قرآن کریم کی تلاوت انسان کو راہ راست پر لاتی ہے اور نیک اعمال کی توفیق ملتی ہے، بندہ گناہوں سے بچتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بندہ قرآن کا مخاطب خود کو سمجھے، ایسا نہ ہو کہ درس قرآن مسجد میں دیں اور قرآن کا مخاطب مقتدی کو سمجھیں اور خود کو نہ سمجھیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کئی بار فرماتے کہ میں اپنے اندر جو عیب دیکھتا ہوں اسی پر میں بیان کرتا ہوں اور خود کو مخاطب کرتا ہوں۔ یہ بہت اہم چیز ہے کہ قرآن کریم کے مخاطب خود کو سمجھیں گے تو توبہ کی توفیق ملے گی اور اگر درس قرآن دیں گے اور عوام کے لیے دیں گے تو پھر خود کو توبہ کی توفیق نہیں ملتی۔

### ہجرت کا حکم:

﴿يَعْبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِيَّ وَأَسْعَتِي فَايْتَايَ فَاَعْبُدُونِ ۝۳۱﴾

یہاں پر ان حضرات کو بات سمجھائی ہے کہ جو لوگ دین پر عمل نہیں کر سکتے یا دین کا کام نہیں کرتے اور ان کا عذر ان کا معاشرہ ہوتا ہے کہ اس ماحول میں ہم کام نہیں کر سکتے تو اللہ رب العزت نے فرمایا کہ میری زمین بہت وسیع ہے، اگر ایک زمین میں رہتے ہوئے دین کا کام نہیں کر سکتے تو اس علاقے سے ہجرت کر کے کسی اور جگہ چلے جاؤ۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّيْنَاهُمُ الْغُلَامَ ظَالِمٍ أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا

كُنَّا مُسْتَضْعِفِينَ فِي الْأَرْضِ ۖ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ﴿١٠٩﴾

کہ جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اور اسی حالت میں فرشتے جب ان کی جان نکالنے آئے تو فرشتوں نے پوچھا کہ تم کس حالت میں تھے؟ تو ان ظالم لوگوں نے کہا کہ ہم مجبور تھے، فرشتوں نے کہا: ﴿اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاَسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيْهَا﴾ کہ خدا کی زمین تو بڑی وسیع اور کشادہ ہے، تم ہجرت کر جاتے! اپنا علاقہ چھوڑ کر کسی اور علاقے میں چلے جاتے۔

### رابطہ رکھ کر کام کریں!

میں طلبہ سے یہ درخواست کیا کرتا ہوں کہ جب آپ ہمارے ہاں تخصص کر لیں تو کام کے لیے اپنے علاقے کو ترجیح دیں۔ باقی یہ بات کہ اپنے علاقے میں کیسے کام کرنا ہے تو اس کے لیے ہم سے رابطہ رکھیں، وہاں کے حالات بتائیں، پھر یہاں سے ہدایات لیں، کچھ وقت لگے گا، پھر علاقے میں کام شروع ہو جائے گا ان شاء اللہ۔

ہمارے ہاں طلبہ اپنے علاقے میں جاتے ہیں، کام شروع کرتے ہیں، احوال نامناسب ہوتے ہیں، یہ سہہ نہیں سکتے تو ہمیں بتائے بغیر علاقہ چھوڑ دیتے ہیں۔ جب کبھی ملاقات ہوتی ہے اور میں حالات اور کام کا پوچھتا ہوں تو کہتے ہیں کہ استاد جی! میں فلاں علاقے کا ہوں۔ وہ علاقہ کیوں چھوڑا؟ جی! حالات ٹھیک نہیں تھے۔ تو میں کہتا ہوں کہ ہمیں تو بتاتے کہ حالات ٹھیک نہیں تھے، مشورہ تو کر لیتے، اس کے بعد آپ آگے چلتے۔ جی استاذ جی! میں نے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ اس سے آپ کو تکلیف

ہوگی۔ میں نے کہا کہ آپ جو علاقہ چھوڑ کر چلے گئے ہیں تو کیا اس سے مجھے خوشی ہوگی؟ بعض لوگوں کا دماغ بہت عجیب ہوتا ہے۔ ایک طالب علم پڑھتا ہے۔ دو چار مسئلے بنیں گے تو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ عین جانے کے وقت آتا ہے اور کہتا ہے: استاد جی! میں جانے لگا ہوں! کیوں جارہے ہو؟ مجھے فلاں استاد نے ڈانٹا ہے! مجھے فلاں نے مارا ہے! فلاں نے میری بے عزتی کی ہے! میں نے کہا کہ مجھے بتایا کیوں نہیں؟ جی! میں نے سوچا کہ استاذ جی آپ کو تکلیف ہوگی۔ میں نے کہا کہ ابھی جو تم جارہے ہو تو کیا میں مٹھائی تقسیم کروں گا؟ ابھی خوشی ہوگی؟ بھائی یہ تم پہلے دن بتاتے تو اس کا حل نکل آتا، اب چھوڑ کر جارہے ہو تو اب اس کا کیا حل نکل سکتا ہے؟! تو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔

### امیر اور پیر ایک ہونا چاہیے:

اگر تم ایک علاقے میں کام نہیں کر سکتے تو علاقہ بدل لو لیکن اپنی رائے سے نہ بدلو بلکہ کسی بندے سے مشورہ کر کے بدلو، اور میں ایک بات کہتا ہوں وہ شاید آپ کو ابھی سمجھ میں نہ آئے، جب آپ میری سیٹ پر ہوں گے تو پھر آپ کو سمجھ میں آئے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اپنا امیر اور اپنا پیر ایک رکھو۔ ہمارے ہاں پیر الگ ہوتا ہے اور امیر الگ ہوتا ہے، امیر کی فکر الگ ہے اور پیر کی الگ ہے، جب پیر اور امیر کی رائے الگ الگ ہو تو مرید اور کارکن پریشان ہوتا ہے کہ میں کدھر جاؤں؟! اور اگر پیر اور امیر ایک ہو تو پھر کبھی الجھن نہیں ہوگی۔ میری گزارش سمجھ آئی؟ (جی ہاں۔ سامعین) اس کا ہمیشہ خیال فرمائیں۔

میں یہ بات سمجھاتا ہوں کہ ہمیشہ استخارہ اور استشارہ کرنے کے بعد بات طے کرو کہ میں نے کرنا کیا ہے؟ استخارہ کہ اللہ سے خیر طلب کرو دو رکعات پڑھ کر اور استشارہ کہ اپنے با اعتماد دوستوں سے مشورہ کرو اور جو تم سے محبت کرتے ہیں ان سے

کرو۔ پھر یہ طے کر لو کہ نے زندگی میں کیا کرنا ہے؟ ہدف طے کرو! جب یہ ہو گیا تو اب اس ہدف تک پہنچنے کے لیے کون سا شخص مناسب ہے؟ استخارہ اور استشارة سے اس بندے کا انتخاب کرو! جب یہ دو چیزیں طے ہو گئیں تو اب دائیں بائیں نہیں دیکھنا، بس اب چلتے رہو! اللہ تمہیں نتائج عطا فرمائیں گے۔ الجھن تب ہوتی ہے کہ جب ہم ہدف طے نہیں کرتے کہ ہم نے کرنا کیا ہے۔ کبھی ادھر کبھی ادھر، کبھی یہ کبھی وہ اور جب ہدف طے ہو جاتا ہے تو اس ہدف تک پہنچنا کیسے ہے۔ اس کا طریقہ متعین نہیں ہو پاتا تو پھر آدمی الجھن کا شکار رہتا ہے۔

### ہجرت کرنے والوں کو تسلی:

تو فرمایا: ﴿يَعْبَادِي الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةً فَإِيَّايَ فَاعْبُدُونِ﴾ کہ اے میرے مومن بندو! میری زمین بہت کشادہ اور وسیع ہے، لہذا خالص میری ہی عبادت کرو! یہاں بات سمجھیں کہ جب آدمی اپنا علاقہ چھوڑ کر دوسرے علاقے میں مستقل چلا جاتا ہے تو بندے کو دو پریشانیاں ہوتی ہیں؛ پہلی پریشانی کہ خوف ہوتا ہے کہ میری جان کا کیا بنے گا، کہیں میں مرنہ جاؤں۔ تو اللہ نے فرمایا ”كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ“ کہ موت تو آئی ہے ادھر بھی آئی ہے ادھر بھی آئی ہے، اس خدشے چھوڑو اور اپنا کام شروع کرو، اور دوسری پریشانی یہ ہوتی ہے کہ اپنے علاقے میں رشتہ دار ہیں، گھر بار ہے، ہجرت کر کے دوسرے علاقے میں جاؤں گا تو معاش کا کیا بنے گا؟ تو فرمایا:

﴿وَكَايِنٍ مِّنْ دَابَّةٍ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۗ اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ ۗ وَ

هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾

کہ کتنے جانور ایسے ہیں جو اپنا رزق روزی اٹھا کر نہیں پھرتے، اللہ انہیں بھی

رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی رزق دیتا ہے، اللہ تمہاری باتیں سنتا بھی ہے اور تمہاری نیتوں کو جانتا بھی ہے اس لیے رزق کی فکر نہ کرو۔ یہ دو کام ہم حل کریں گے بس تم اپنا سفر شروع کرو۔

### مشرکین کا مصیبت کے وقت اللہ کو پکارنا:

﴿فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلِكِ دَعَوْا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا خَجَلُ

إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ۝﴾

مشرکین کی عادت تھی کہ جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے اور پھنس جاتے تو اس وقت اللہ کو پکارتے اور اخلاص کے ساتھ پکارتے۔ مشرک بھی سمجھتے تھے کہ اس مشکل سے اللہ کے علاوہ کوئی بھی نہیں نکال سکتا تو چونکہ دعا اخلاص سے ہوتی تھی تو اللہ ان کے اخلاص کو قبول فرما لیتے تھے۔ یہ ہے اخلاص کا معنی! اخلاص کا معنی یہ نہیں تھا کہ وہ مؤمن ہو جاتے تھے، وہ نیک ہو جاتے تھے بلکہ اس گھڑی میں ان کا عقیدہ یہ ہوتا تھا کہ اس مشکل سے خدا کے علاوہ ہمیں کوئی نہیں نکال سکتا، تو اللہ بچا دیتے اور یہ پھر شرک شروع کر دیتے۔

اب دیکھو! اس آیت اور دیگر اس قسم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کی دعائیں اللہ قبول فرماتے ہیں اور قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝﴾<sup>110</sup>

کہ کافر کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ تو بظاہر دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔

جواب یہ ہے کہ ان میں تعارض نہیں ہے اس لیے کہ مقام بدل گیا ہے۔ یہ جو ہے کہ ان کی دعا قبول ہو گئی تھی اس کا تعلق دنیا کے ساتھ ہے اور یہ جو کہا گیا کہ ان

کی دعا قبول نہیں ہوگی اس کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے، اب تعارض و تناقض نہیں رہتا۔ آپ تو منطقی لوگ ہیں۔ علم منطق میں پڑھتے رہتے ہیں کہ:

در تناقض ہشت وحدت شرط داں

وحدت موضوع و محمول و مکاں

وحدت شرط و اضافت جزء و کل

قوت و فعل است در آخر زماں

**تین کام چار طریقے:**

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ

الْمُحْسِنِينَ﴾

کہ جو شخص ہمارے دین کے راستے میں مشقت برداشت کرے اور محنت کرے تو ہم اس کے لیے اپنے راستے کھول دیتے ہیں، یقیناً اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ آ رہی ہے کہ ”سبل“ یہ ”سبیل“ کی جمع ہے، اللہ تک پہنچنے کا ایک راستہ نہیں ہے، اللہ تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں۔ تو دین کو ایک خاص ہیئت میں محدود کرنا یہ بہت بڑا ظلم ہوگا۔ اس لیے میں یہ بات اکثر سمجھایا کرتا ہوں کہ مجموعہ نبوت نے تین کام کیے ہیں:

نمبر 1: اشاعت دین      نمبر 2: دفاع دین      نمبر 3: نفاذ دین

اور اس کام کے لیے چار طریقے اختیار کیے ہیں:

1: تقریر      2: تحریر      3: مناظرہ      4: جہاد

اب یہ جو تین کام اور چار طریقے ہیں کوئی بندہ کہے کہ میں نے ایک ہی کام کرنا ہے، نفاذ اسلام تو جرم ہے۔ میں نے ایک ہی کرنا ہے، دفاع اسلام تو جرم ہے۔ میں



ایک ہی کروں گا، اشاعت اسلام تو جرم ہے۔

اشاعتِ دین فضائل سے ہوتی ہے، ترغیب سے ہوتی ہے۔ دفاعِ دین دلائل سے ہوتا ہے اور نفاذِ دین طاقت سے ہوتا ہے۔ اس لیے یہ تینوں کام ہمارے ہیں، فضائل والا بھی، دلائل والا بھی اور طاقت والا بھی۔ اگر فضائل والا دلائل نہیں دے سکتا تو دلائل والوں کی مخالفت نہ کرے اور دلائل والا اگر طاقت نہیں رکھتا تو طاقت والوں کی مخالفت نہ کرے۔ ہمارے اس دور میں تبلیغ والے یہ فضائل والے ہیں اور تبلیغ سے مراد خاص تبلیغی جماعت نہیں بلکہ علماء، خطباء اور واعظین بھی اس کا حصہ ہیں، اور دلائل یہ ہمارا کام ہے اور ہماری طرح جو لوگ دنیا میں کام کرتے ہیں کہ شریعت پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دلائل سے دیتے ہیں، یہ دفاعِ دین ہے، اور نفاذِ دین یہ طاقت سے ہوتا ہے جو کہ مجاہدین کا کام ہے۔

یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ ہم فضائل والا کام نہیں کرتے، ہم طاقت والا کام نہیں کرتے لیکن ہم ان دونوں کو برا بھی نہیں کہتے، ایک کام ہم نہیں کر سکتے تو وہ کام دوسرے کریں گے۔ میں نے کئی بار کہا ہے کہ مجھے بہت سارے تعجبات ہوتے ہیں، ایک تعجب مجھے اس بات پر ہوتا ہے کہ ہم فضائل اور طاقت والوں کو برا نہیں کہتے، تنقید بھی نہیں کرتے، اعتراض بھی نہیں کرتے اور ہمارے اوپر ہر دوسرا بندہ اعتراض کرتا ہے تم یہ کیوں کرتے ہو؟ یہ کیوں کرتے ہو؟ میں نے کہا کہ کبھی ہم نے بھی اعتراض کیا ہے؟! تم لوگ ہم پر اعتراض بھی کرتے ہو اور معتدل بھی ہو اور ہم اعتراض سنتے ہیں اور اس کا جواب بھی نہیں دیتے تو ہم متشدد دھڑے اور میڈیا پر آکر تم ہمارے خلاف باتیں بھی کرتے ہو اس کے باوجود تم معتدل ہو اور ہم جو خاموش رہتے ہیں ہم متشدد ہیں۔ اس پر مجھے بہت تعجب ہوتا ہے۔

تین کام ہیں: اشاعتِ دین، دفاعِ دین اور نفاذِ دین۔ اس کے لیے چار طریقے

ہیں: پہلا تقریر، دوسرا تحریر، تیسرا مناظرہ اور چوتھا جہاد۔ میں ان شاء اللہ اس عنوان کو اپنے اجتماع ”دورہ تربیۃ العلماء“ میں پیش کروں گا، پھر تفصیل سے بات کریں گے تاکہ آپ اس کو سمجھیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی موضوعات ہم نے طے کیے ہیں۔

تو یہاں اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ یہاں ”سبل“ فرمایا، ”سبیل“ نہیں فرمایا۔ ”سبل“ کہہ کر ہم جیسے فقیروں کے لیے بھی راستے کھولے ہیں۔ ہمیں بھی کچھ تسلی ہوتی ہے کہ ہمارا کام دین کا کام ہے۔ اللہ ہم سب کو دین کا کام اخلاص کے ساتھ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الروم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْم ۝ غُلِبَتِ الرُّومُ ۝ فِي آدْنَى الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ

سَيَغْلِبُونَ﴾

### روم و فارس کی جنگ اور نزولِ سورت کا قصہ:

مکہ مکرمہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اعلانِ نبوت فرمایا تو اس وقت عرب سے باہر دو بہت بڑی طاقتیں تھیں؛ ایک روم اور دوسری ایران۔ روم میں عیسائیوں کی حکومت تھی اور ایران میں آتش پرستوں، مجوسیوں اور آگ کے پجاریوں کی حکومت تھی۔ مسلمان چونکہ اسلامی تعلیم اور آسمانی کتاب کو مانتے تھے اور عیسائی آسمانی کتاب؛ انجیل کو مانتے تھے اس لیے مسلمانوں کی کسی قدر نزدیکی اور قرب عیسائیوں سے تھا۔

عیسائی بھی اللہ کو مانتے ہیں مسلمان بھی مانتے ہیں، عیسائی قیامت کو مانتے ہیں مسلمان بھی مانتے ہیں، عیسائی رسالت کو مانتے ہیں مسلمان بھی مانتے ہیں اور مشرکین؛ اللہ کے ساتھ بتوں کو بھی معبود مانتے تھے جس کو عیسائی نہیں مانتے تھے، مشرکین قیامت کا انکار کرتے تھے عیسائی اقرار کرتے تھے، مشرکین رسالت کو نہیں مانتے تھے اور عیسائی مانتے تھے، اس لیے مسلمانوں کی ذہنی ہم آہنگی اہل روم کے ساتھ تھی۔ اگر

ان میں جنگ ہو اور رومی غالب ہوں تو مسلمانوں کو خوشی ہوتی تھی اور اگر ایرانی غالب ہوں تو مشرکین کو خوشی ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ جنگ ہوئی جس میں ایرانی غالب آگئے تو مشرکین خوش ہوئے۔ اس کے بعد قرآن کریم کی یہ آیتیں نازل ہوئیں: ﴿غَلِبَتِ الرُّومُ﴾ روم مغلوب ہو گیا، ﴿فِي آخِذِي الْأَرْضِ﴾ قریب کی زمین میں۔ اس سے مراد ملک شام کے علاقے اذرعات اور بصریٰ ہیں جو رومی سلطنت کا حصہ تھے اور بنسبت ایران مکہ سے قریب تھے۔ یعنی رومیوں کی زمین میں جنگ ہوئی اور ایرانی غالب آئے۔ ﴿وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلِبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ﴾ ایک وقت آئے گا کہ پھر روم والے عیسائی ایرانیوں پر غالب آئیں گے۔ کب؟ ﴿فِي بَضْعِ سِنِينَ﴾ چند سالوں میں۔ ”بَضْعُ“ عربی میں کہتے ہیں تین سے لے کر نو تک نو، یعنی تین سے زائد اور نو سے کم ہوں، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو کو بضع کہتے ہیں۔

﴿يَلَهُ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ﴾ جب رومی مغلوب تھے تب بھی اللہ کا حکم چلتا تھا اور جب یہ غالب ہوں گے بھی اللہ کا حکم چلے گا۔ ﴿وَيَوْمَئِذٍ يُفْرِغُ الْمَوْءُنُونَ﴾ بِنَصْرِ اللَّهِ اور جب رومی غالب آئیں گے تو مومنین خوش ہوں گے اللہ کی مدد کی وجہ سے۔ اللہ کی مدد کا معنی کہ رومی بھی کافر ہیں اور ایرانی بھی کافر ہیں۔ اب کسی ایک کے ساتھ اللہ کی مدد یہ اسلام اور کفر والی نہیں ہے بلکہ اللہ کی مدد کا معنی یہ ہے کہ روم کو اللہ غالب کر کے مسلمانوں کو خوشی دیں گے اور یہ مسلمانوں کی خوشی اللہ کی مدد کی وجہ سے ہے۔

**صدیق اکبر کا شرط لگانا:**

جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ابی بن خلف سے یہ

شرط لگائی کہ تین سال میں رومی غالب آئیں گے میں یہ قسم کھاتا ہوں۔ اس نے کہا کہ نہیں آئیں گے۔ شرط لگ گئی دس دس اونٹوں کی کہ اگر روم غالب آگیا تو ابی بن خلف دس اونٹ دے گا اور اگر ایران غالب آگیا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دس اونٹ دیں گے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آکر خبر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کریم میں تو ﴿بِضْعِ سِنِينَ﴾ کہا ہے اور ”بِضْع“ تو تین سے لے کر نو تک کو کہتے ہیں۔ لہذا اگر شرط تبدیل کرو۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آئے تو ابی بن خلف سے کہا کہ تین نہیں نو سال میں اندر غالب ہوں گے اور شرط ہم دس اونٹ کے بجائے سو اونٹ کی لگا لیتے ہیں۔ ہم مدت بھی بڑھا دیتے ہیں اور شرط میں اونٹ بھی بڑھا دیتے ہیں۔ ابی بن خلف نے کہا کہ مجھے منظور ہے۔ اس کو یہ اندیشہ ہوا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کہیں مکہ چھوڑ کر ہجرت نہ کر جائیں تو اس نے کہا کہ اپنا کوئی ضامن دو۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا ضامن اپنے بیٹے عبدالرحمن بن ابی بکر کو بنایا کہ میرا یہ ضامن ہے۔

ایک وقت آیا کہ جنگ بدر ہوئی اس میں ابی بن خلف مارا گیا۔ اس کے ایک سال بعد روم والے غالب آگئے۔ اب ابی بن خلف تو موجود نہیں تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کے ورثاء سے مطالبہ کیا شرط کا تو اس کے بیٹے نے سو اونٹ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ سو اونٹ لے کر مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”هَذَا السُّحْتُ تَصَدَّقْ بِهِ“ کہ یہ تو ناپسندیدہ مال ہے، ہم اس کو نہیں لے سکتے اس لیے تم اس کو صدقہ کر دو۔

”سُحْتُ“ کے کئی معانی آتے ہیں، معروف معنی اس کا ”گناہ“ ہوتا ہے، اس کے علاوہ ناپسندیدہ چیز کو بھی ”سُحْتُ“ کہتے ہیں۔ یہ مال حرام نہیں تھا کیونکہ جس وقت

انہوں نے ان کے ساتھ شرط لگائی تھی تو شرط حرام نہیں تھی تو پھر مال حرام کیسے ہوا؟ اس لیے میں اس کا جواب عرض کر رہا ہوں کہ ”نُحْت“ کا متعارف معنی اگرچہ حرام ہے لیکن عام معنوں میں ”نُحْت“ ہر اس مال کو بھی کہتے ہیں جو ناپسندیدہ ہو اگرچہ حلال ہو۔ تو مال حلال ہونے کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا بلکہ اس سارے مال کو آپ نے صدقہ فرمادیا۔ یاد رکھیں کہ اب دو طرفہ شرط حرام ہے۔

### پانچ نمازوں کا اشارہ:

﴿فَسُبْحَنَّ اللَّهَ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ ﴿٧٤﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ ﴿٧٥﴾﴾

اللہ رب العزت کی پاکی بیان کیا کرو جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو، آسمانوں اور زمین میں اللہ ہی کی حمد بیان ہوتی ہے، اور پچھلے پہر بھی اللہ کی پاکی بیان کیا کرو اور ظہر کے وقت بھی۔

”عَشِيًّا“ کا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کرتے ہیں ”آخری وقت“ اور شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں ”سہ پہر“۔ شاہ عبد القادر فرماتے ہیں کہ پچھلے پہر سے مراد عصر کی نماز ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا معنی ”بعد زوال“ فرمایا۔ ”عَشِيًّا“ زوال کے بعد ہی ہوتا ہے خواہ کتنی ہی دیر بعد ہو۔ تو یہاں فرمایا شام، صبح، عصر اور ظہر۔ یہ آیت چونکہ مکی ہے تو بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد خاص چار اوقات ہیں:

شام کا وقت      صبح کا وقت      عصر کا وقت      ظہر کا وقت

آیت مکی ہے اور مراد عام تسبیحات ہیں اس سے مراد نمازیں نہیں ہیں۔

بعض حضرات نے اس سے مراد نمازیں لی ہیں کہ اس آیت میں پانچ نمازوں

کا اشارہ نکلتا ہے۔ ﴿حِينَ تُمْسُونَ﴾ میں مغرب اور عشاء دونوں شامل ہیں، ﴿حِينَ تَصْبِحُونَ﴾ میں فجر کی نماز ہے، ﴿عَشِيًّا﴾ میں عصر کی نماز ہے اور ﴿حِينَ تَظْهَرُونَ﴾ میں ظہر کی نماز ہے۔

اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿حِينَ تُمْسُونَ﴾ میں مغرب ہے، ﴿حِينَ تَصْبِحُونَ﴾ میں صبح ہے، ﴿عَشِيًّا﴾ میں عصر ہے اور ﴿حِينَ تَظْهَرُونَ﴾ میں ظہر ہے۔ باقی نماز عشاء رہ جاتی ہے تو اس کے لیے قرآن کریم میں ایک مقام پر ہے ﴿ثَلَاثُ عَوْدَاتٍ لَّكُمْ﴾ کہ تین مقامات ایسے ہیں جس میں تمہیں بطور خاص پردے کا خیال رکھنا چاہیے، ان میں ایک وقت ﴿مِنْ بَعْدِ صَلَوةِ الْعِشَاءِ﴾<sup>111</sup> ہے، اس میں عشاء کی نماز کا صراحتاً تذکرہ موجود ہے۔ اس لیے چار نمازوں کا تذکرہ یہاں پر ہے اور پانچویں نماز کا ذکر وہاں پر ہے۔ اس طرح یہ پانچ نمازیں بنتی ہیں۔

### ایک عجیب نکتہ:

ہاں ایک بات یہ سمجھیں کہ ﴿تُمْسُونَ﴾ کو ﴿تَصْبِحُونَ﴾ پر مقدم کیا ہے یعنی شام کا ذکر پہلے کیا ہے اور صبح کا ذکر بعد میں کیا ہے حالانکہ عام طور پر صبح پہلے ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کا آغاز شام سے ہوتا ہے صبح سے نہیں ہوتا، اسلامی تاریخ کی یکم غروب شمس کے بعد ہوتی ہے طلوع صبح کے بعد نہیں ہوتی، اس لیے شام پہلے ہے اور صبح بعد میں۔ اسی طرح ﴿وَعَشِيًّا وَحِينَ تَظْهَرُونَ﴾ میں

یہاں عصر کا وقت پہلے ذکر کیا اور ظہر کا بعد میں، اس کی وجہ یہ ہے کہ عصر کا وقت تجارت کے لیے بنسبت ظہر کے زیادہ مشغولیت و مصروفیت کا ہوتا ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا ذکر پہلے کیا ہے۔

### قدرت حق کی نشانیاں:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْتَفِرُونَ﴾ (۲۶)

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی پانچ نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔ ان میں دوسری نشانی یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے تمہاری بیویاں پیدا فرمائی ہیں۔ ”تم میں سے“ سے مراد یہ ہے کہ تمہاری جنس انسان ہی سے پیدا فرمائی ہیں۔ اللہ کی کمال قدرت ہے کہ خوراک ایک ہے، مٹی ایک ہے، مادہ ایک ہے لیکن پیدا ہونے والے بچوں میں یہ دونوں قسمیں پیدا فرمادی ہیں۔ پھر اللہ رب العزت نے دونوں کے جسم اور اعضاء الگ الگ پیدا فرمادیے ہیں، دونوں کے تقاضے الگ بنادیے ہیں۔ یہ اللہ کی قدرت کی نشانی ہے۔ ایک ہی پانی سے مرد پیدا ہو رہا ہے اور اسی سے عورت پیدا ہو رہی ہے۔ مرد کے جسم کے تقاضے بالکل الگ رکھے ہیں اور عورت کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ ﴿لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا﴾ تاکہ مرد کو اس سے راحت ملے۔ ﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾ اور اللہ رب العزت نے تم دونوں کے درمیان مودت یعنی پیار کو رکھا ہے، اور رحمت یعنی شفقت کو رکھا ہے۔

### محبت اور مودت:

﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾



اب دیکھیں کہ دو بندے ایک کمرے میں رہتے ہوں، ان دونوں کے درمیان قلبی محبت نہ ہو، وہ ایک دوسرے کا کام بھی کریں گے لیکن سکون پھر بھی نہیں ہو گا۔ اب ان دونوں میں سکون کیسے ہو گا؟ تو فرمایا کہ ہم نے خاوند اور بیوی میں باہمی سکون پیدا کرنے کے لیے ان میں محبت پیدا فرمائی ہے۔ اور ﴿مَوَدَّةً﴾ کو پہلے ذکر کیا اور ﴿رَحْمَةً﴾ کو بعد میں ذکر کیا۔ مودت کہتے ہیں محبت کو اور رحمت کہتے ہیں ہمدردی اور شفقت کو۔ اس لیے کہ مودت کا تعلق جوانی کے ساتھ ہے اور رحمت کا تعلق بڑھاپے کے ساتھ ہے، جب انسان عالم شباب میں ہو تو اس کے مزاج میں محبت اور پیار غالب ہوتا ہے اور جب انسان عالم شباب سے بڑھاپے کی طرف جائے تو پھر محبت کے جذبات کم ہو جاتے ہیں پھر شفقت اور ہمدردی کے جذبات زیادہ ہو جاتے ہیں، اس لیے جوانی میں ایک دوسرے سے پیار کریں گے اور بڑھاپے میں ایک دوسرے کا بطور ہمدردی اور شفقت کے خیال رکھیں گے۔ اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

### فطرت سے کیا مراد ہے؟

﴿فَطَرَتِ اللّٰهُ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾

یہاں ”اَتَّبِعْ“ فعل محذوف ہے یعنی ”اَتَّبِعْ فَطَرَتِ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا“ کہ اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر انسان کو پیدا فرمایا ہے اس کی اتباع کرو اور اللہ نے جو فیصلہ فرمایا جو فطرت پیدا کی ہے اس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ یہاں ”فطرت“ سے کیا مراد ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ فطرت سے مراد فطرتِ اسلام ہے۔ یہ معنی لیں تو اس پر کئی اعتراضات ہیں۔ ایک اعتراض یہ ہے کہ اگر فطرت سے مراد فطرتِ اسلام ہے تو یہ تو بدلتی ہے کہ بندہ کبھی کافر بھی ہو جاتا ہے حالانکہ ﴿لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾ اللہ جس فطرت پر پیدا فرمائیں تو اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

اس پر اور بھی بہت سارے سوالات ہوتے ہیں لیکن میں نے پہلے آپ سے گزارش کی ہے کہ میں دروس القرآن میں لمبی باتیں کرنے کے بجائے فیصلہ کن بات کرتا ہوں، کئی اقوال نقل کرنے کے بجائے قول رائج پیش کرتا ہوں اور لمبی بحثوں کے بجائے صرف وہ بات کرتا ہوں جس کا تعلق قرآن کریم کی تفسیر سے ہو۔

اس لیے رائج قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت سے مراد ہے کہ اللہ نے ہر بندے میں حق قبول کرنے کی استعداد اور صلاحیت رکھی ہے اور اس کو دنیا کا کوئی شخص تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ تو ہے کہ بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہو ”قَابُوَاهُ يَهُودًا اَوْ يُنَصِّرًا اِنَّهُ“<sup>112</sup> اور اس کے والدین اس کو یہودی بنادیں یا عیسائی بنادیں لیکن حق کو قبول کرنے کی استعداد پھر بھی ختم نہیں ہوتی وہ تو موت تک رہتی ہے۔ تو اللہ رب العزت نے انسان کی طبیعت میں یہ استعداد پیدا فرمائی ہے۔ اگر موانع اور رکاوٹیں اسلام لانے کے راستے میں نہ ہوں تو ہر بندہ مؤمن بن جائے گا، ماحول انسان کو اسلام لانے سے روک دیتا ہے، والدین روک دیتے ہیں، بسا اوقات ذاتی اغراض روک دیتی ہیں لیکن اللہ رب العزت نے انسان کی طبیعت میں جو قبول اسلام کی استعداد رکھی ہے وہ استعداد کبھی بھی ختم نہیں ہوتی۔

### انسانی اعمال کا اثر:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ

لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾

انسانوں نے جو اعمال کیے جو اپنے ہاتھوں کمایا اس کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے کیے ہوئے کاموں کا کچھ مزہ چکھائے،

شاید یہ لوگ باز آجائیں اور خدا کی طرف رجوع کریں۔

### نیکوکار لوگوں پر تکلیف کی وجہ:

بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ دنیا میں جو بھی تکلیف جو بھی مصیبت اور جو بھی طوفان آتا ہے اگر اس کی وجہ انسانی اعمال ہیں تو پیغمبر پر تکلیف آتی ہے، ولی پر تکلیف آتی ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی آفتیں پہنچتی ہیں تو کیا۔ العیاذ باللہ۔ ان کو بھی تکلیفیں ان کے اعمال کی وجہ سے پہنچتی ہیں؟ تو بظاہر اس آیت پر یہ اشکال ہوتا ہے۔

اب اس کا جواب سمجھیں۔ ایک ہے فساد کی علتِ تامہ اور ایک ہے فساد کا سبب۔ علتِ تامہ کا مطلب یہ ہے کہ صرف اور صرف یہی وجہ ہے اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں اسے علتِ تامہ کہتے ہیں۔ تو اس دنیا میں مصائب کی علتِ تامہ یہ انسان کے اعمال نہیں ہیں کہ دنیا میں جو بھی مصیبت آتی ہے انسان کے عمل کی وجہ سے آتی ہے، جو بھی خوشی ہوتی ہے تو نیک عمل کی وجہ سے ہوتی ہے، چنانچہ ”يَمَّا كَسَبَتْ اَيُّدِي النَّاسِ“ میں ”ب“ علت کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ ”ب“ سببیت کے لیے ہے یعنی دنیا میں انسان پر جو مصیبت اور تکلیف آتی ہے اس کا ایک سبب انسان کا عمل ہوتا ہے۔ تو یہ ہو سکتا ہے کہ تکلیف آئے اور اس کا سبب انسان کا اپنا عمل نہ ہو بلکہ اس کا سبب کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ انسان برا عمل کرے اور اس کے بدلے میں اس پر تکلیف نہ آئے۔ تو دونوں چیزیں ممکن ہیں۔

اب دنیا میں جو آفات آتی ہیں ان کا ایک ہوتا ہے سببِ ظاہری اور ایک ہوتا ہے سببِ باطنی۔ ظاہری اسباب کو اسبابِ طبعیہ اور اسبابِ مادیہ بھی کہتے ہیں۔ مثلاً آگ ہے اس کی طبیعت میں ہے کہ یہ جلاتی ہے، پانی ہے اس کی طبیعت میں ہے کہ یہ غرق کرتا ہے، ہوا ہے اس کی طبیعت میں ہے کہ یہ دھکیلتی ہے، یہ سببِ طبعی اور مادی اسباب ہیں، اور بعض اسباب باطنی ہوتے ہیں یعنی اس کا تعلق انسان کے عقائد اور اعمال سے

ہوتا ہے۔ کبھی دونوں سبب جمع ہوتے ہیں تو نتیجہ اس کے مطابق نکلتا ہے، کبھی ایک سبب ہوتا ہے اور دوسرا نہیں ہوتا تو نتیجہ کبھی سبب طبعی کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی سبب باطنی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

مثال سمجھیں کہ ایک شخص بس پر جا رہا ہے اور آگے دوسری بس آئی اور ایکسڈنٹ ہو گیا اور یہ جانے والا شخص کافر ہے یا علانیہ فاسق ہے۔ جب بس بس سے ٹکرائے گی تو تباہی ہوگی تو یہ طبعیت ہے اور یہ شخص ہے بھی مجرم۔ اب یہاں پر سبب طبعی و مادی بھی موجود ہے اور سبب باطنی بھی موجود ہے تو تباہی ہو گئی ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک سبب ہوتا ہے اور دوسرا نہیں ہوتا یا دونوں نہیں ہوتے۔ مثلاً ایک شخص بس پر لاہور سے سرگودھا آ رہا ہے۔ بس بس سے ٹکرائی بھی نہیں اور یہ بندہ بھی نیک ہے۔ تو جب نہ ٹکرائے تو تباہ بھی نہیں ہونا چاہیے اور نیکی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مصیبت نہ آئے۔ اب یہاں دونوں سبب اچھے موجود ہیں تو نتیجہ اچھا ہے اور وہاں دونوں سبب برے تھے تو نتیجہ بھی برا تھا۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گاڑی گاڑی سے ٹکراتی ہے اور بندہ نیک ہوتا ہے۔ اب یہاں پر سبب طبعی موجود ہے تباہی کا لیکن سبب باطنی یعنی بد عملی موجود نہیں ہے، اب اگر گاڑی تباہ ہو جاتی ہے تو یہ سبب طبعی کی وجہ سے ہوئی ہے، سبب باطنی موجود نہیں ہے اور کبھی گاڑی گاڑی سے ٹکراتی ہے گاڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور بندہ پھر بھی ٹھیک ہوتا ہے، اب اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی نیک تھا، نیکی کی وجہ سے خدا نے اس کو بچا لیا ہے، اب اس کا سبب باطنی کام آ گیا ہے۔ اس طرح اسباب میں تفاوت بھی ہوتا ہے اور کبھی سبب جمع بھی ہوتا ہے کہ دونوں چیزیں اکٹھی ہوتی ہیں۔

تو میں عرض یہ کر رہا ہوں کہ کبھی کوئی پریشانی اور مصیبت آتی ہے تو اس کی وجہ صرف اعمالِ بد نہیں ہوتے بلکہ کبھی اعمالِ بد سبب بنتے ہیں اور کبھی نہیں بنتے۔

﴿بِمَا كَسَبَتْ آيْدِي النَّاسِ﴾ میں یہ جو کسبِ اعمال ہے یہ سبب ہے، یہ علتِ تامہ نہیں ہے۔ اس لیے جب بھی کسی شخص پر کوئی مصیبت دیکھیں تو یہ فتویٰ نہ لگایا کریں کہ اس نے کوئی گناہ کیا ہو گا! آپ کسی مدرسے کے شیخ الحدیث کو دیکھیں۔ اس کی موت کا وقت ہے اور شدید تکلیف میں ہے تو آپ کبھی فتویٰ نہ لگائیں کہ یہ حرام مال کھاتا ہو گا! موت میں کسی کا ایکسیڈنٹ ہو جائے تو کبھی نہ کہنا کہ یہ طلبہ پر ظلم کرتا ہو گا تبھی تو اس کے ساتھ ایسا ہوا ہے!

جب یہ ساری بات سامنے ہو گی تو آپ کبھی بھی کسی بندے پر فتویٰ نہیں لگائیں گے۔ میری گزارش سمجھ آرہی ہے نا؟ (جی ہاں۔ سامعین) میں بار بار ایک بات کہتا ہوں کہ دین کو سمجھیں! دین کو سمجھیں! حدیثِ پاک میں ہے:

مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ. <sup>113</sup>

کہ اللہ پاک جب کسی کے ساتھ بھلائی کا فیصلہ فرمائیں تو اس کو دین کی سمجھ عطا فرمادیتے ہیں۔ تو اگر دنیا میں آفت کی علتِ تامہ؛ اعمالِ بد ہوتے تو پھر یہ بات ٹھیک تھی جبکہ دنیا میں آفت کی علتِ تامہ یہ انسان کے اعمال نہیں ہیں بلکہ یہ سبب ہیں، کبھی تکلیف برے عمل کی وجہ سے ہوتی ہے اور کبھی تکلیف اور آفت تو ہوتی ہے لیکن اس کی وجہ برا عمل نہیں ہوتا۔

### مصائبِ آفت ہیں یا آزمائش؟ پرکھنے کا طریقہ:

اب یہ جو دنیا میں آفت اور تکلیف آتی ہے اس کی علامت کیا ہے کہ یہ اعمالِ بد کی وجہ سے ہے یا اعمالِ بد کی وجہ سے نہیں ہے؟ اس کی علامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھی ہے کہ اگر بندے کے ظاہر پر آفت اور تکلیف

آجائے اور اس کا دل مطمئن ہو کہ میرے اللہ کی طرف سے ہے، میرا اللہ اسی پر راضی ہے، اللہ اس سے میرے گناہ معاف کر دے گا تو سمجھو کہ یہ بد اعمالی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ بندے کا امتحان ہے، اللہ اس کے درجات بلند فرمانا چاہتے ہیں، اس کو اپنا قرب دینا چاہتے ہیں اور اگر کسی بندے پر تکلیف اور آفت آئے اور بندہ ایسے پریشان ہو جیسے عذاب آگیا تو سمجھ لو کہ یہ اس کے اعمالِ بد کی وجہ سے ہے، یہ امتحان اور ابتلاء نہیں ہے۔ آپ نیکی کا کام کریں ہو سکتا ہے کہ پرچہ کٹ جائے، آپ دین کا کام کریں ہو سکتا ہے کہ جیل آجائے۔ اگر آپ اس پر رو رہے ہیں، چیخ رہے ہیں جیسے عذاب آگیا ہے تو سمجھ لیں کہ عملِ بد کی وجہ سے پرچہ کٹا ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ایک علامت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر بندے پر آفت اور تکلیف آئے اور اس کی وجہ سے رجوع الی اللہ نصیب ہو جائے تو سمجھو یہ امتحان ہے اور اگر آفت اور تکلیف آئے اور رجوع الی اللہ نصیب نہ ہو اور بندہ مزید گناہ کرے تو سمجھو کہ یہ اعمالِ بد کی وجہ سے دنیا میں عذاب آگیا ہے، اور آج کے دور میں اس کو پرکھنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ اللہ نہ کرے ایک بندہ ہے اس کو دنیا میں تکلیف آتی ہے، ہسپتال میں داخل ہوتا ہے لیکن وہاں نرسوں کو تاڑتا ہے، ہسپتال میں داخل ہوا ہے اور موبائل پر فلمیں دیکھ رہا ہے اپنی بیماری کا وقت گزارنے کے لیے تو اب اس کا معنی یہ ہے کہ یہ بندہ خدا کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اب میں بھی سمجھ سکتا ہوں اور آپ بھی سمجھ سکتے ہیں مثلاً ہم میں سے کسی کو بخار ہو جائے، میں پڑھاتا ہوں تو میں چھٹی کر لوں، آپ پڑھتے ہیں تو آپ چھٹی کر لیں لیکن جب موقع ملے تو فلمیں دیکھیں، ڈرامے دیکھیں، گانے سنیں تو مجھے بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مجھ پر خدا کا عذاب ہے اور آپ کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ آپ پر خدا کا عذاب ہے، یہ کوئی امتحان نہیں ہے۔ اگر سنا ہی تھا تو تلاوت لگا دیتے، نعت لگا دیتے، کوئی بیان سن لیتے!

اللہ ہم سب کو یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

﴿فَإِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تَسْمِعُ النُّصْمَ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ۚ﴾

اس کی تفسیر اور مضامین سورت النمل میں تفصیل کے ساتھ گزر چکے ہیں، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

### روزِ قیامت مجرموں کا جھوٹ بولنا:

﴿وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ ۚ مَا لَبِثُوا غَيْرَ

سَاعَةٍ كَذَلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ ۚ﴾

جب قیامت کا دن ہو گا تو مجرم لوگ قسمیں کھا کر کہیں گے ہم تو دنیا میں بہت تھوڑی دیر ٹھہرے تھے یا یہ کہیں گے کہ ہم لوگ قبر میں بہت تھوڑا سا ٹھہر کر آئے ہیں۔

اب بظاہر معلوم ہو رہا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں اور قیامت کے دن تو کوئی شخص جھوٹ نہیں بول سکے گا تو پھر یہ جھوٹ کیسے بول رہے ہیں؟ بات سمجھیں کہ یہ لوگ جو جھوٹ بولیں گے تو یہ شروع شروع میں ہو گا۔ اللہ کی عدالت قائم ہو گی تو ہر ایک کو آزادی ہو گی کہ جو چاہے بیان کرے کیونکہ اللہ کو تو حقیقتِ حال معلوم ہو گی نا! اب مشرک لوگ یہ کہیں گے: ﴿مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ﴾<sup>14</sup> کہ ہم تو شرک کرتے ہی نہیں تھے۔ ابتداءً ہی بندے کو اختیار ہو گا کہ جو چاہے بولے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں سب کچھ ہے، اللہ تعالیٰ کو کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جب یہ لوگ زبان سے جھوٹ بولیں گے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ﴾<sup>115</sup>

کہ آج کے دن ہم ان کی زبان پر مہر لگا دیں گے، ان کی زبان چپ ہو جائے گی اور ان کے بدن کے دیگر اعضاء ہاتھ، پاؤں وغیرہ بول پڑیں گے۔ تو بندہ شرمندہ ہو گا اور اس کا جھوٹ کھل کر سامنے آجائے گا۔ تو یہ جو ہے کہ قیامت کے دن کوئی شخص جھوٹ نہیں بول سکے گا اس کا تعلق ابتدا سے نہیں بلکہ اس کا تعلق انتہا کے ساتھ ہے، ان کے خلاف گواہی ان کے اعضاء دیں گے تو پھر یہ جھوٹ کیسے بولیں گے؟ لہذا ان میں تناقض نہیں ہے۔ تناقض کے لیے آٹھ شرطیں ہوتی ہیں اور یہاں زمانہ بدل گیا ہے اس لیے تناقض نہیں رہے گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.



## سورة لقمن

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْقَمْرُ ۝ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ ۝ هُدًى وَرَحْمَةً لِلْمُحْسِنِينَ ۝﴾

ابتدائی آیات کا شان نزول:

﴿الْقَمْرُ﴾ یہ حروف مقطعات میں سے ہے، اس پر بات پہلے ہو چکی ہے۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ

بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝﴾

نضر بن حارث یہ مشرک تھا اور تجارت کے لیے مختلف ملکوں کا سفر کیا کرتا تھا۔ ایک بار یہ ایران گیا کسریٰ کے ہاں تو وہاں سے پرانے بادشاہ جو ایران کے گزرے ہیں ان کے قصوں اور کہانیوں پر مشتمل کتابیں خرید کر لایا۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ وہاں سے ایک گانا گانے والی کنیز بھی خرید کر لایا۔ اس نے مکہ مکرمہ میں آکر اہل مکہ کو جمع کیا اور کہا کہ محمد - صلی اللہ علیہ وسلم - تمہیں پرانے وقت کی کہانیاں سناتا ہے، عاد اور ثمود کے قصے سناتا ہے تو میں تمہیں اس سے بھی زیادہ مزید کہانیاں سناتا ہوں، تم ان کی نہ باتیں سنو بلکہ میری سنو اور کہتا کہ محمد - صلی اللہ علیہ وسلم - تمہیں قرآن سناتے ہیں اور نماز پڑھنے کا کہتے ہیں، روزے رکھنے کا کہتے ہیں، مشقت کی بات کرتے ہیں، ادھر آؤ اور اس کنیز کا گانا سنو! قرآن سننے میں تمہیں تکلیف ہی تکلیف ہو گی اور

گانا سنو گے تو مزے ہی مزے ہیں، اس لیے تمہیں قرآن سننے کی کیا ضرورت ہے؟! تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا﴾ کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو خدا سے غافل کرنے والی باتوں کو خرید لیتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے لوگوں کو خدا کے راستے سے بھٹکا دیں اور اس کا مذاق اڑائیں، ﴿أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾ جو لوگ بھی یہ کھیل تماشے کی چیزیں خریدتے ہیں امت کو گمراہ کرنے کے لیے تو ان کے لیے درد ناک عذاب ہے۔

### جائز اور ناجائز کھیل:

ہمارے ہاں جو کھیل کود ہوتے ہیں یہاں ان کے بارے میں ایک بات سمجھ لیں کہ ایسا کھیل جس میں دین کا نفع ہو یا ایسا کھیل جس میں دنیا کا نفع ہو مثلاً بدن کو مضبوط کرنا ہو، چاک و چوبند رہنا ہو، اپنی طاقت کو برقرار رکھنا ہو، صحت کو ٹھیک رکھنا ہو تو ایسے کھیل کو شریعت جائز کہتی ہے۔ لیکن ایسا کھیل جس میں دین کا نفع بھی نہ ہو اور دنیا کا نفع بھی نہ ہو تو اس کو شریعت بسا اوقات مکروہ کہتی ہے، بسا اوقات ناجائز کہتی ہے اور بسا اوقات حرام بھی کہتی ہے۔ اس لیے ہر کھیل جائز بھی نہیں ہے اور ہر کھیل ناجائز بھی نہیں ہے۔ بعض کھیل ایسے ہیں جیسے شطرنج تو اس کے بارے میں حدیث میں صراحتاً ممانعت آگئی ہے تو اب یہ دنیا کے لیے ہو یا کسی اور کام کے لیے ہو اسے ناجائز ہی کہنا ہے، اس کے جائز ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

### جائز کھیلوں کا احادیث سے ثبوت:

احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ترغیب دی ہے کہ بندے کو کھیلنا چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تھے اور حبشی لوگ مسجد

نبوی کے صحن میں نیزہ بازی کر رہے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔  
ام المؤمنین امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پیچھے تھیں تو آپ رضی اللہ عنہا نے اپنا سر  
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے مبارک پر رکھا اور کھیل دیکھتی رہیں۔<sup>116</sup>

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”إِلَهُوَا الْعَبُّوَا“ کہ کھیل کود کرتے رہو!

”فَإِنِّي أَكْرَهُ أَنْ يُرْمَى فِي دِينِكُمْ غُلْظَةٌ“<sup>117</sup>

کہ مجھے تمہارے دین میں شدت اور خشکی پسند نہیں ہے، اتنی سختی پیدا نہ کرو  
کہ بندہ کھیلنا بھی چھوڑ دے بلکہ اپنے کھیل کود کو جاری رکھو!

اور ایک حدیث پاک میں ہے:

”رَوْحُوا الْقُلُوبَ سَاعَةً بِسَاعَةٍ“<sup>118</sup>

کہ اپنے دل کو کبھی کبھی خوش کر لیا کرو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں احادیث میں ہے کہ بسا اوقات  
قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کے مشاغل اور ان میں مسلسل غور و فکر کرنے سے  
جب تھک جاتے تو اپنی تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے زمانہ جاہلیت کے شعر سنا کرتے  
تھے۔ تو یہ شعر و شاعری گناہ نہیں ہے، یہ غلط نہیں ہے، مقصد اس کا ٹھیک ہو تو اس میں  
کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ شرط یہ ہے کہ آواز عورت کی نہ ہو، موسیقی اور ساز نہ ہو،  
اور ایسا بے ریش لڑکا بھی نہ ہو کہ جس کو دیکھ کر بندے کو عورت کی طرح کے خیالات

116۔ صحیح مسلم، رقم: 892

117۔ شعب الایمان: ج 5 ص 247 رقم الحدیث 6542

118۔ مسند الشہاب: ج 1 ص 393 رقم الحدیث 672

پیدا ہوں اور مضمون بھی گندانہ ہو جو بندے میں شہوت پیدا کرے۔ تو ان شرائط کے ساتھ آپ شاعری سنا چاہیں تو سننے پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن ایسا کچھ نہ سنیں کہ جس سے دین کا نقصان ہو اور تباہی ہو۔

خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہر کھیل کو شریعت نہ منع کرتی ہے اور نہ ہی ہر کھیل کی اجازت دیتی ہے۔ ایک حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَيْسَ مِنَ اللَّهِوِ ثَلَاثٌ.

یہ روایت اکثر کتب احادیث میں کتاب الجہاد کے تحت موجود ہے کہ لہو و لعب کے کھیلوں سے یہ تین کھیل مستثنیٰ ہیں، ان تین کھیلوں کی اجازت ہے:

نمبر 1: ”تَأْدِيبُ الرَّجُلِ فَرَسَهُ“ آدمی اپنے گھوڑے کو سدھائے۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ جہاد کے لیے یہ گھوڑا تیار وہ جائے گا۔

نمبر 2: ”وَمُلَاعَبَتُهُ أَهْلَهُ“ آدمی اپنی بیوی سے کھیلے۔ اس میں مقصد تو والد و تناسل کی تکمیل ہے۔

نمبر 3: ”وَرَمْيُهُ بِقَوْسِهِ وَنَبْلِهِ“ آدمی تیر اندازی کرے۔ یہ بھی جہاد کی تیار میں داخل ہے۔<sup>119</sup>

تو ہر کھیل کو ناجائز بھی نہیں کہہ سکتے اور ہر کھیل کو جائز بھی نہیں کہہ سکتے۔

**آسمانوں کے ستونوں کی تحقیق:**

﴿خَلَقَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ أَلْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ

تَمِيدَ بِكُمْ وَ بَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ط﴾

نحوی لحاظ سے اس آیت کی دو ترکیبیں ہو سکتی ہیں:

ایک تو یہ کہ ”تَرَوْنَهَا“ یہ ”عَمَدٍ“ کی صفت ہے اور ”ہا“ ضمیر کا مرجع ”عَمَدٍ“ ہے۔ اب اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو پیدا فرمایا ہے ایسے ستونوں کے بغیر جو تمہیں نظر آسکیں۔ یعنی اگر ستون ہوتے تو تمہیں نظر آجاتے جب تمہیں نظر نہیں آتے تو معلوم ہوا کہ ستون نہیں ہیں اور یہ آسمان بغیر ستون کے محض اللہ کی قدرت کے سہارے قائم ہیں۔

دوسری ترکیب یہ ہے کہ ”تَرَوْنَهَا“ کی ضمیر کا مرجع ”السَّمَوَاتِ“ ہیں۔ اب اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے پیدا فرمایا ہے جیسا کہ تم انہیں دیکھ رہے ہو، مطلب یہ کہ آسمان بغیر ستون کے بنایا گیا ہے۔ بعض حضرات نے پہلی ترکیب کے مطابق کہ ”تَرَوْنَهَا“ کو ”عَمَدٍ“ کی صفت بنایا جائے اس کا ایک معنی یہ بھی کیا ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو پیدا فرمایا ہے ایسے ستونوں کے بغیر جن کو تم دیکھتے ہو یعنی آسمانوں کے ستون تو ہیں لیکن تمہیں نظر نہیں آتے۔

بہر حال یہ دونوں معانی درست ہیں کہ آسمان کے ستون ہیں یا یہ کہ آسمان بغیر ستون کے بنا ہوا ہے۔

### حضرت لقمان نبی تھے یا ولی؟ رائج قول:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنْ اشْكُرْ لِلَّهِ ۚ وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا

يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿١٧﴾﴾

حضرت لقمان علیہ السلام نبی تھے یا ولی تھے؟ رائج قول یہ ہے کہ حضرت لقمان ولی تھے نبی نہیں تھے اور بعض روایات میں ہے کہ لقمان علیہ السلام کو اللہ پاک نے اختیار دیا تھا کہ تم چاہو تو نبوت لے لو اور چاہو تو حکمت لے لو۔ انہوں نے کہا کہ

اے اللہ! نبوت بڑی ذمہ داری ہے، آپ مجھے حکمت دے دیں۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے حکمت کو نبوت پر ترجیح کیوں دی؟ عجیب جواب دیا، فرمایا کہ اگر اللہ مجھ سے پوچھے بغیر مجھے نبوت دے دیتے تو یہ انتخاب خدا ہوتا تو اللہ خود حفاظت فرماتے اور جب اللہ نے مجھے اختیار دیا ہے، اب نبوت ملتی تو اللہ کا انتخاب نہ ہوتا بلکہ خود میرا ہوتا تو میرے لیے سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا، اس لیے میں نے حکمت کو نبوت پر ترجیح دی۔

### اکابر کے کلام سے توافق:

میں نے آپ سے کہا تھا کہ میری عادت ہے کہ میں بہت ساری باتیں اصول کے درجے میں کہتا ہوں اور وہ اصول میں نے کہیں پڑھا نہیں ہوتا ہے لیکن جو مجھے سمجھ آتا ہے کہہ دیتا ہوں۔ پھر جب مجھے اپنے اکابر کی کتابوں سے اس کے حوالے ملنا شروع ہو جاتے ہیں تو خلوت میں میری خوشی کو میں ہی جانتا ہوں اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔

عصمت نبوت پر میں نے کئی بار یہ بات کی۔ آپ کو یاد ہے۔ کہ نبی معصوم ہے، اللہ نبی کو گناہ سے بچاتا ہے، یعنی اللہ نبی کو نبوت عطا فرماتا ہے اور گناہوں سے بچاتا ہے، وجہ کہ یہ نبوت انتخاب نبی نہیں ہوتا بلکہ انتخاب خدا ہوتا ہے، اس لیے پیغمبر پر اعتراض ہو تو پیغمبر دفاع نہیں کرتے بلکہ اللہ خود دفاع کرتے ہیں، جیسے امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی میں نے مثال دی تھی۔ اب اس بات سے مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ حضرت لقمان حکیم نے یہی بات فرمائی جب سوال ہوا کہ آپ نے حکمت کو نبوت پر ترجیح کیوں دی ہے؟ فرمایا کہ اگر اللہ مجھے بغیر میرے اختیار کے خود نبوت دے دیتے تو انتخاب اللہ کا ہوتا اور اللہ خود حفاظت فرماتے چونکہ مجھے انتخاب دیا کہ نبوت لوں یا حکمت لوں تو اگر میں کہتا کہ میں نبوت لیتا ہوں تو اس کا مطلب کہ نبوت انتخاب میرا ہے تو مجھے خود اپنی حفاظت کرنی پڑتی اور یہ بہت مشکل تھا، اس لیے میں نے حکمت کو نبوت پر ترجیح

دی ہے۔ جب ایسے تائیدی جملے ملتے ہیں تو بندے کو بے حد خوشی ہوتی ہے۔

### حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحتیں:

لقمان علیہ السلام اللہ کے ولی تھے۔ آپ نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں فرمائی ہیں وہ سن لیں:

نمبر 1: ﴿يَبْنَى لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ﴾ کہ بیٹا! شرک نہیں کرنا شرک بہت بڑا گناہ ہے۔ اس نصیحت کا تعلق عقیدے سے ہے۔

نمبر 2: ﴿يَبْنَى اِنَّ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ حَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يٰٓاْتِ بِهَا اللّٰهُ﴾

اے میری بیٹے! اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر بھی ہو، کسی چٹان میں چھپی ہو، آسمانوں میں ہو یا زمین میں کسی جگہ ہو تو اللہ کی ذات ایسی ہے کہ اسے حاضر کر دے گی۔ اس لیے اللہ کے علم کا قائل ہو جانا کہ کوئی چیز بھی اللہ کے علم سے مخفی نہیں ہے۔ اس نصیحت کا تعلق بھی عقیدے سے ہے۔

نمبر 3: ﴿يَبْنَى اَقِمِ الصَّلٰوةَ﴾ بیٹا! نماز کی پابندی کرنا۔ اس کا تعلق اصلاحِ عمل سے ہے۔

نمبر 4: ﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَاَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ بیٹے! نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ اس کا تعلق اصلاحِ خلق سے ہے۔

نمبر 5: ﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ﴾ سے آخر تک جو نصیحتیں ہیں ان کا تعلق آدابِ معاشرت سے ہے۔ اور یہ کل چار نصیحتیں ہیں:

پہلی: ... ﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ﴾ لوگوں کے ساتھ ترش روئی کے ساتھ پیش نہ آنا!

دوسری: ... ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ زمین میں اکڑ کر نہ چلنا۔

تیسری: ... ﴿وَأَقْصِدْ فِي مَشْيِكَ﴾ میانہ روی کے ساتھ چلنا۔

چوتھی: ... ﴿وَاعْظُضْ مِنْ صَوْتِكَ﴾ اپنی آواز کو پست رکھنا۔ پست کا معنی کہ اتنی آہستہ آواز بھی نہ ہو کہ لوگ سن نہ سکیں اور بہت اونچی بھی نہ ہو بلکہ درمیانی آواز ہو۔ بلند آواز اس لیے نہ ہو کہ ﴿إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ﴾ سب سے ناپسندیدہ آواز گدھے کی آواز ہے۔ اس لیے چیخ چلا کر بولنا یہ مناسب نہیں ہے۔

### اللہ تعالیٰ کے کلماتِ لامتناہی ہیں:

﴿وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ

سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ﴾

زمین میں جتنے درخت ہیں ان کی قلمیں بن جائیں اور جو سمندر ہے اس کے ساتھ سات سمندر اور بھی مل جائیں اور اللہ کے کلمات لکھنا شروع کر دیں تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے۔

زمین میں جتنے درخت ہیں ان کی قلمیں بنا دی جائیں کا معنی یہ نہیں ہے کہ ایک درخت کی ایک قلم ہو بلکہ معنی یہ ہے کہ اس کی شاخوں کی قلمیں بنائی جائیں اور سات سمندروں کو سیاہی بنایا جائے اور پھر کوئی بندہ اللہ کی صفات لکھنا چاہے تو بھی اس کے اختیار اور بس میں نہیں ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے علماء کے ایک سوال کے جواب میں نازل ہوئی۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَمَا أَوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا



قَلِيلًا ﴿١٢٠﴾ کہ تمہیں بہت تھوڑا علم ملا ہے۔ علمائے یہود نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اس آیت کا مصداق آپ کی قوم ہے یا ہم بھی ہیں؟ فرمایا کہ سب اس کا مصداق ہیں۔ یہودی علماء نے کہا کہ ہم اس کا مصداق نہیں ہو سکتے، کیونکہ "أَتَيْنَا التَّوْرَةَ، وَفِيهَا تَبْيَانٌ كُلِّ شَيْءٍ" ہمارے پاس تورات ہے اور تورات میں ہر چیز ہے، تو ہمارے پاس بہت زیادہ علم ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پہلی بات یہ ہے کہ خود تورات تھوڑا سا علم ہے سارا نہیں ہے اور پھر تورات کا بھی تمہارے پاس سارا علم نہیں بلکہ بہت تھوڑا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ آبْحُرٍ مَا نَفَدَتْ كَلِمَتُ اللَّهِ﴾ کہ اللہ کی صفات کوئی شخص لکھنا چاہے تو سات سمندر بھی نہیں لکھ سکتے تو تمہارے پاس اس کے مقابلے میں کیا علم ہے؟! بہت تھوڑا سا علم ہے! اس لیے اس پر تمہیں اکڑنا نہیں چاہیے۔<sup>121</sup>

### والد اپنی اولاد کے کام آئے گا یا نہیں؟ (تعارض کا حل)

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ وَاحْشَوْا يَوْمًا لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا﴾  
اے لوگو! اپنے رب سے ڈرتے رہو اور اس دن سے ڈرو جس دن باپ اپنی اولاد کے کام نہیں آئے گا اور نہ اولاد اپنے باپ کے کام آئے گی۔ مراد اس سے قیامت کا دن ہے۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے یہ ہو کر رہے گا۔

یہاں بظاہر اشتباہ یہ پیدا ہو رہا ہے کہ سورۃ الطور میں ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ﴾<sup>122</sup>

کہ جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد ان کے نقش قدم پر چلی ایمان کے ساتھ یعنی اولاد بھی مؤمن ہوئی تو ہم ان کی اولاد کو ان کی وجہ سے ان کے مقامات کے ساتھ ملا دیں گے اور ہم والدین کے اعمال میں کمی بھی نہیں کریں گے۔

تو سورۃ الطور سے معلوم ہوتا ہے کہ والد بھی مؤمن ہو اور اولاد بھی مؤمن ہو تو اللہ اولاد کو والدین کے اونچے مقام تک پہنچا دیں گے۔ تو والد تو کام آئے گا۔ اسی طرح سورۃ الرعد میں ہے:

﴿جَحْتُ عَذْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّتِهِمْ﴾<sup>123</sup>

ہمیشہ رہنے والے باغات میں یہ لوگ خود بھی داخل ہوں گے اور جو ان کے نیک آباء و اجداد ہیں وہ بھی ان میں آئیں گے اور جو بیویاں نیک ہیں وہ بھی آجائیں گی اور جو نیک اولاد ہیں وہ بھی آئیں گی۔ نیکی کی وجہ سے ان کو بھی یہ محل ملیں گے۔ تو اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن یہ رشتے کام آئیں گے۔

جبکہ یہاں سورۃ لقمن کی اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ والد کام نہیں آئے گا۔

اب یہاں جواب سمجھیں! قرآن کریم میں یہاں جو ہے کہ باپ بیٹے کے کام

نہیں آئے گا اس سے مراد کافر ہے کہ اگر بیٹا کافر ہو تو باپ اس کے کام نہیں آئے گا، باپ کافر ہو تو بیٹا اس کے کام نہیں آئے گا اور اگر کافر نہ ہو بلکہ مؤمن ہو تو پھر ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔ لہذا ان ساری آیتوں میں تعارض نہیں ہے۔

### ادنیٰ کی نفی سے اعلیٰ کی نفی:

یہاں ﴿وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَاۓزٌ عَنِ الْوَالِدِ شَيْئًا﴾ پر دوسری بات سمجھیں کہ ”ولد“ اور ”مولود“ میں کیا فرق ہے؟ مولود کہتے ہیں براہ راست بیٹے کو اور ولد بیٹے کو بھی کہتے ہیں اور بیٹے کے بیٹے یعنی پوتے کو بھی کہتے ہیں، اسی طرح اس کے بیٹے یعنی پڑپوتے کو بھی کہتے ہیں۔ تو یہاں اللہ نے ﴿وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَاۓزٌ﴾ فرمایا ہے، ”وَلَا وَلَدٌ هُوَ جَاۓزٌ“ نہیں فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی بیٹا جس کو باپ سے گہرا تعلق ہے جب یہ باپ کے کام نہیں آئے گا تو پوتا اور پڑپوتا جن کا باپ سے تعلق کم ہوتا ہے وہ تو بدرجہ اولیٰ اس کے کام نہیں آئیں گے۔ تو ﴿وَلَا مَوْلُودٌ﴾ کہہ کر ”ولد“ کی نفی کر دی ہے۔ اگر ولد کی نفی کرتے تو مولود کی نفی سمجھ میں نہیں آتی تھی کیونکہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ پوتا قیامت کے دن دادا کے کام نہیں آئے گا ہو سکتا ہے کہ بیٹا کام آجائے، اسی طرح پڑپوتا کام نہ آئے تو ممکن ہے کہ بیٹا کام آجائے۔ تو بیٹے کی نفی کرنے سے پوتے اور پڑپوتے کی نفی خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔

میں نے کہا تھا کہ میں ایک اصول پر چلتا ہوں اور میں یہ اصول اکثر بیان کرتا ہوں اور آج جب میں نے اس آیت کی تفسیر دیکھی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے کئی بار کہا تھا اعلیٰ کی نفی سے ادنیٰ کی نفی نہیں ہوتی اور ادنیٰ کی نفی سے اعلیٰ کی نفی ہو جاتی ہے۔ ایک حکم ادنیٰ کے لیے ثابت ہو تو وہ اعلیٰ کے لیے بطریق اولیٰ ثابت ہو گا اور اگر اعلیٰ کے لیے حکم ثابت ہو تو وہ ادنیٰ کے لیے ثابت نہیں ہو گا۔

قرآن کریم نے پیغمبر کی حیات کی بات صراحتاً نہیں فرمائی بلکہ شہید کی حیات کی بات کی ہے، کیونکہ اگر نبی کی حیات بتاتے تو شہید کی حیات سمجھ میں نہیں آنی تھی، شہید کی حیات بتائی ہے تو پیغمبر کی حیات سمجھ میں آئی ہے۔

### پانچ چیزوں کا علم:

﴿إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾

یہ جو پانچ چیزیں ہیں ان پانچ چیزوں کے علم کو ”مفتاح الغیب“ کہتے ہیں۔ یہ غیب کی پانچ کنجیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہی پانچ کو ذکر کیوں کیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ ان پانچ چیزوں کے بارے میں ہی بات کرتے ہیں، نجومیوں سے انہی کے بارے میں پوچھتے ہیں، اندازے انہی کے بارے میں لگاتے ہیں تو اس لیے اللہ نے انہی پانچ کو ذکر فرمایا۔ وہ پانچ چیزیں کون سی ہیں؟

- 1: قیامت کا علم اللہ کے پاس ہے۔
- 2: بارش کب ہوگی؟ اس کا علم بھی اللہ کے پاس ہے۔
- 3: مادوں کے پیٹ میں کیا ہے؟ اس کا علم بھی اللہ کے پاس ہے۔
- 4: انسان کیا کمائے گا؟ اس کا علم بھی اللہ کے پاس ہے۔
- 5: انسان کہاں مرے گا؟ اس کا علم بھی اللہ کے پاس ہے۔

### تبدیلی اسلوب سے معانی پر اثر:

اب ذرا دیکھیں کہ ﴿إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾ ان تینوں کو الگ الگ انداز میں بیان کیا ہے۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ

عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴿۱﴾ یہ جملہ اسمیہ لائے ہیں، ﴿وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ﴾ ﴿۲﴾ یہ جملہ فعلیہ لائے ہیں اور ﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَدْحَامِ﴾ ﴿۳﴾ یہ بھی جملہ فعلیہ ہے۔ تو پہلا جملہ اسمیہ اور باقی دو جملے فعلیہ ہیں۔ جملہ اسمیہ کیوں لائے! اس لیے کہ قیامت کا دن متعین ہے، قیامت بار بار نہیں آئی، اس میں تجدد نہیں ہے اور بارش بار بار ہونی ہے اور ماں کے پیٹ میں اولاد نے بار بار پیدا ہونا ہے، بارش میں اور ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچے میں تجدد ہے اس لیے یہاں جملہ فعلیہ لائے اور جملہ فعلیہ میں تجدد ہوتا ہے۔

اچھا پھر دیکھیں کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ ﴿۴﴾ میں علم کی بات کی ہے، ﴿وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ﴾ ﴿۵﴾ میں علم کی بات نہیں کی بلکہ فرمایا کہ اللہ بارش برساتے ہیں۔ اس پر سوال یہ ہے کہ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ اللہ بارش برساتا ہے بلکہ وہ تو سب جانتے ہیں اللہ برساتا ہے، مسئلہ یہ تھا کہ بارش کب ہوگی اس کا علم کسی کے پاس ہے یا نہیں؟ تو جو مسئلہ زیر بحث تھا وہ ذکر نہیں کیا اور جو زیر بحث نہیں تھا وہ ذکر کر دیا۔ جواب یہ ہے کہ اللہ نے یہ طرز اختیار کیا یہ بات سمجھانے کے لیے کہ ایک ہے بارش کا برسانا اور ایک ہے بارش کا علم، تو جس نے برسانا ہے علم اسی کے پاس ہو گا جس نے برسانا نہیں ہے اس کے پاس علم کہاں سے ہو گا؟! آگے فرمایا: ﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَدْحَامِ﴾ ﴿۶﴾ یہاں پر پھر علم کی بات کی ہے کہ اللہ پاک جانتے ہیں جو کچھ رحم میں ہے۔ اب بظاہر اس پر آج کے دور میں اشکال ہوتا ہے کہ عورت کے پیٹ میں بچہ ہوتا ہے تو الٹرا سائونڈ کے ذریعہ پتا چل جاتا ہے کہ بیٹا ہے یا بیٹی؟ ہم کہتے ہیں کہ اس کا تعلق صرف بچے کے جسم بننے کے ساتھ نہیں ہے بلکہ جب بچہ ماں کے پیٹ میں بطور نطفہ آیا تھا اس کو بھی ﴿مَا فِي الْاَدْحَامِ﴾ ﴿۷﴾ کہتے ہیں اور وہ کیا ہو گا؟ یہ اللہ ہی جانتا ہے اس کو کوئی الٹرا سائونڈ مشین نہیں بتا سکتی۔

﴿وَمَا تَذَرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾ دیکھیں! پہلے تین جملوں میں اللہ کے علم کا دعویٰ کیا ہے بقیہ کے علم کی نفی نہیں کی اور آخری دو میں بقیہ کے علم کی نفی بھی کر دی ہے، ﴿وَمَا تَذَرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾ یہ کل کیا کمائے گا اس کو کچھ پتا نہیں ہے، ﴿وَمَا تَذَرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ﴾ کہاں مرے گا اس کو کچھ پتا نہیں۔ تو پہلے تین میں بقیہ کے علم کی نفی نہیں کی اور آخری دو میں بقیہ کے علم کی نفی کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کل کیا کمانا ہے اس کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے، انسان نے کہاں مرنا ہے اس کا تعلق انسان کی اپنی ذات کے ساتھ ہے اور پہلی تین چیزیں کہ قیامت کب آئی ہے؟ اس کا تعلق کسی ذات کے ساتھ نہیں ہے، بارش کب برسائی ہے؟ اس کا تعلق انسان کی ذات کے ساتھ نہیں ہے، کسی عورت کے پیٹ میں کیا ہے؟ اس کا تعلق انسان کی ذات سے نہیں۔ اللہ پاک بات سمجھا رہے ہیں کہ وہ دو چیزیں جس کا تعلق انسان کی ذات سے ہے جب انسان ان کو نہیں جانتا تو جن چیزوں کا تعلق اس کی ذات سے نہ ہو ان کو کیسے جانتا ہو گا؟

میں نے عرض کیا نا کہ وہ جو میں اصول بیان کرتا ہوں مجھے آج دو مثالیں تفسیر میں اور ملی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان دو کی نفی کرنے سے پہلی تین کی نفی خود ہی ہو گئی کیونکہ یہ ادنیٰ ہیں اور پہلی تین اعلیٰ ہیں۔ ادنیٰ کی نفی سے اعلیٰ کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے۔ جب انسان اپنی ذات کے متعلق بات نہیں جانتا تو قیامت کو کیسے جانے گا؟ اپنی ذات کے متعلق نہیں جانتا کہ کل کیا کمائے گا تو بارش کو کیسے جانے گا؟ اپنی ذات کے متعلق یہ نہیں جانتا کہ کس جگہ پر مرنا ہے تو کسی اور کے بارے میں کیا جانے گا؟

اچھا یہاں ایک بات اور سمجھیں! ایک ہے مکانِ موت اور ایک ہے زمانِ موت۔ یہاں مکانِ موت کی نفی کی ہے زمانِ موت کی نفی نہیں کی۔ انسان کہاں

مرے گا اس کو نہیں پتا یہ مکانِ موت کی نفی ہے اور کس وقت مرے گا اس کا یہاں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکانِ موت کا آدمی کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہوتا ہے لیکن زمانِ موت کا آدمی کو اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک آدمی نے مکان بنایا ہے کہ اب بوڑھا ہو گیا ہوں، بچے اپنے اپنے کام میں لگ گئے ہیں، بس اچھا سا مکان بنالیا ہے تاکہ راحت کے ساتھ زندگی گزاریں۔ اب اس آدمی نے کیا سوچنا ہے کہ میں نے کہاں مرنا ہے؟ نہیں کیونکہ اس کو کچھ اندازہ ہے کہ اسی مکان میں مروں گا تو مکانِ موت کا بندے کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہوتا ہے لیکن کب مرنا ہے! اس کا ذرا بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ جب انسان کو مکانِ موت کا پتا نہیں تو زمانِ موت کا کیسے پتا چلے گا؟ زمانِ موت کی نفی کر دیتے تو مکانِ موت کی نفی نہیں ہونی تھی اور مکانِ موت کے علم کی نفی سے زمانِ موت کے علم کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے۔

### علمِ غیب کی تعریف اور اشکالات کے جوابات:

یہاں ایک اشکال اور اس کا جواب سمجھیں۔ اشکال یہ ہے کہ یہاں فرمایا کہ ان پانچ چیزوں کا علم اللہ کے پاس ہے، اس سے تو معلوم ہوا کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے پاس ان کا علم نہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر معجزۂ بتا دیتے ہیں تو ان میں سے بعض چیزوں کا علم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی ہوتا ہے، کبھی ان کا علم بذریعہ الہام ولی کے پاس بھی ہوتا ہے اور بسا اوقات ایک بات نجومی کہتا ہے اور کبھی اس کی بات ٹھیک ہوتی ہے اور کبھی وہ غلط ہوتی ہے اور بارش کے بارے میں ماہرین موسمیات بتا دیتے ہیں کہ فلان دن بارش ہوگی اور وہ اسی وقت ہوتی بھی ہے۔ اس سے تو پتا چلا کہ اللہ کے علاوہ ان کے پاس بھی بعض چیزوں کا علم ہوتا ہے۔

یہ اشکالات تب ہوتے ہیں کہ جب بندے کو علمِ غیب کی تعریف اور مفہوم کا پتا نہ ہو، جب علمِ غیب کا معنی سمجھ میں آجائے تو پھر کبھی بھی اشکالات نہیں ہوں

گے۔ علم الغیب کی تعریف کیا ہے:

فَإِنَّ الْغَيْبَ الْمُطْلَقَ فِي الْإِطْلَاقَاتِ الشَّرْعِيَّةِ مَا لَمْ يَقُمْ عَلَيْهِ دَلِيلٌ  
وَلَا إِلَى ذِكْرِهِ وَسِيلَةٌ وَسَبِيلٌ<sup>124</sup>.

اصطلاح شریعت میں غیب اسے کہتے ہیں کہ جس پر کوئی دلیل بھی نہ ہو اور جس تک پہنچنے کا کوئی واسطہ اور وسیلہ بھی نہ ہو۔ جس تک آپ پہنچے ہیں وہ غیب رہا ہی نہیں، اس لیے علم الغیب الگ ہوتا ہے اور انباء الغیب الگ ہوتا ہے۔ علم الغیب اللہ کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہوتا، عالم الغیب صرف اللہ کی ذات ہے اور انباء الغیب؛ اللہ نبیوں کو بذریعہ وحی دیتے ہیں اور ولیوں کو بذریعہ الہام دیتے ہیں اور بسا اوقات کل ہو نے والی چیز کو بذریعہ اوزار و آلات کے ماہرین موسمیات معلوم کر لیتے ہیں تو اسے علم الغیب نہیں کہتے ہیں، علم نام ہے یقینیات کا اور آلات کے ذریعہ جو معلوم ہو وہ غنایات ہیں اور ظنی چیز کو علم کبھی نہیں کہتے۔ اس لیے یہ چیزیں ایک تو علم نہیں ہیں اور اگر علم ہوں بھی تو علم الغیب نہیں ہے کیونکہ غیب وہ ہے جس پر کوئی دلیل اور پہنچنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ بلا واسطہ علم ہی علم الغیب ہوتا ہے اور نبی کے پاس علم بلا واسطہ نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے ہوتا ہے، اظہار غیب الگ ہے اور اطلاع علی الغیب الگ ہے اور انباء الغیب الگ ہے اور علم الغیب الگ ہے۔ پورے قرآن کریم اور تمام احادیث میں اللہ کی ذات کے علاوہ عالم الغیب اور علم الغیب کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا! یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں۔

### احکام غیبیہ اور ان کو ان غیبیہ میں فرق:

اور دوسری بات یہ سمجھ لیں جو غیب سے متعلقہ چیزیں ہیں وہ دو قسم کی ہیں:



نمبر 1: احکام غیبیہ

نمبر 2: اُکوان غیبیہ

احکام غیبیہ سے مراد وہ علوم ہیں جن کا تعلق احکام شریعت کے ساتھ ہو جس میں عقائد، مسائل، اخلاق سب شامل ہیں اور اُکوان غیبیہ سے مراد آنے والے حالات کی خبریں ہیں احوال، اخبار وغیرہ۔ جہاں تک تعلق ہے احکام غیبیہ کا وہ تو اللہ اپنے پیغمبر کو دیتے ہیں چونکہ پیغمبر کا منصب ہے کہ اس نے شریعت بتانی ہے اور اُکوان غیبیہ کا تعلق نبی اور ولی کے ساتھ نہیں ہے، یہ خاصہ خداوندی ہے، اللہ جس قدر جتنے حالات بتانا چاہیں بتا دیتے ہیں اور نہ بتانا چاہیں تو نہیں بتاتے۔ اس لیے کلی طور پر اگر احکام غیبیہ یہ کسی نبی کو مل جائیں تو ممکن ہے لیکن اُکوان غیبیہ اللہ نہ کسی نبی کو دیتے ہیں اور نہ کسی ولی کو دیتے ہیں۔ اگر ﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ﴾<sup>125</sup> کا معنی کوئی یہ کرے کہ نبی کو سارے احکام غیبیہ ملے ہیں تب بھی نبی عالم الغیب نہیں ہوتا کیونکہ اُکوان غیبیہ تو اب بھی اللہ کے پاس ہیں تو آپ نبی کو عالم الغیب کیسے کہیں گے؟ اس لیے کوئی نبی عالم الغیب نہیں ہوتا بلکہ عالم الغیب اللہ کی ذات ہے جس کے پاس احکام غیبیہ بھی ہیں اور اُکوان غیبیہ بھی ہیں۔ اللہ ہم سب کو صحیح عقائد و نظریات پر کاربند فرمائے۔

وَاجْزُ دَعُوا أَنَا الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة السجدة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْم ۝ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ يُنذِرُ قَوْمًا مَّا أَتَهُمْ مِنْ نَذِيرٍ ۚ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ۝﴾

### نماز کی تلاوت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پانچ وقت جماعت کا خود اہتمام فرماتے اور یہ سنت ہے۔ کسی ادارے کا سربراہ ہو، کسی جماعت کا سربراہ ہو تو اس کو نماز کی امامت خود کرنی چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک اور سنت طریقہ یہی ہے۔ پھر کون سی نماز میں کون سی تلاوت کرے یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ عام طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک یہ تھا کہ آپ فجر اور ظہر کی نماز میں سورة الحجرات سے لے کر سورة البروج تک کی سورتوں میں سے کوئی دو سورتیں، عصر اور عشاء کی نماز میں سورة الطارق سے لے کر سورة البینہ تک کی سورتوں میں سے کوئی دو اور مغرب میں سورة الزلزال سے لے کر سورة الناس تک کوئی دو سورتیں تلاوت فرماتے تھے۔ سورة الحجرات سے لے کر سورة البروج تک کی سورتوں کو طویل مفصل کہتے ہیں اور سورة الطارق سے سورة البینہ تک اوساط مفصل اور سورة الزلزال سے

سورة الناس تک کی سورتوں کو قصار مفصل کہتے ہیں۔ کئی مرتبہ اس کے علاوہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے مثلاً مغرب کی نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورت المرسلات پڑھی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز پڑھائی تو دونوں رکعتوں میں ایک ہی سورت ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾ پڑھی۔ تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اپنے مقتدیوں میں بعض کی رعایت فرماتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز مختصر فرمادیتے جس طرح فجر کی نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا رہے تھے تو بچے کے رونے کی آواز آئی۔ بعض صحابیات نماز میں شریک تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں تلاوت مختصر فرمادی۔ پہلی رکعت میں ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ اور دوسری میں ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ تلاوت فرمادی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چونکہ بچہ رو رہا تھا اور عورت کی توجہ اس طرف تھی اس لیے میں نے نماز کو مختصر کر دیا۔

جمعہ کے دن فجر کی نماز کی پہلی رکعت میں سورة السجدة اور دوسری رکعت میں سورة الدھر کا پڑھنا سنت ہے۔ اس کا آپ لوگ بھی اہتمام فرمائیں! مدرسے میں ماحول ہوتا ہے لیکن عام مساجد میں اس کا ماحول نہیں ہوتا۔ اس لیے عام مساجد میں پھر ترغیب دو کہ جمعہ کے دن فجر میں یہ دونوں سورتیں پڑھنا سنت ہے، پھر ایک دوبار اس کی تلاوت کر لیں تو لوگوں کو بات سمجھ آ جائے گی۔

**استاذ یا شیخ آئے تو امامت اس سے کروائیں!**

آپ کبھی کسی علاقے میں امام مقرر ہوں اور آپ کی مسجد میں کوئی استاذ یا کوئی بڑا آجائے تو کوشش کریں کہ جماعت وہ کرائے اور اپنے مقتدیوں کو مسئلہ سمجھائیں کہ جب امام مسافر ہو اور مقتدی مقیم ہوں تو امام دور کعات کے بعد سلام پھیر دے گا اور مقتدی اپنی بقیہ نماز کھڑے ہو کر پوری کریں گے اور ان دور کعات میں نہ تو

سورۃ فاتحہ پڑھنی ہے اور نہ ہی کوئی دوسری سورۃ، یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے امام کے پیچھے ہی کھڑے ہیں، اس کو ”لاحق“ کہتے ہیں۔ مقتدی کی تین قسمیں ہوتی ہیں؛ مُدْرِك، مسبوق اور لاحق۔ اس طرح مسئلہ سمجھائیں گے تو کبھی کوئی الجھن نہیں ہوگی، اگر مسئلہ سمجھائے بغیر کسی کو مصلے پر کھڑا کریں گے تو لوگ اعتراض کریں گے اور پھر اپنے مقتدیوں کو یہ سمجھائیں کہ بھائی! ہماری خوش قسمتی ہے، ہماری نیک بختی ہے کہ آج ہماری مسجد میں ہمارے بڑے تشریف لائے ہیں اس لیے آج نماز وہ پڑھائیں گے۔ پھر جب آپ کے وہ استاذ یا شیخ چلے جائیں تو جانے کے بعد اگلے دن یہ بات پھر سمجھائیں، اس کا ماحول بنائیں کہ کل ہمارے استاد ہمارے پاس آئے تھے، ان کا احسان ہے کہ ہمارے پاس آئے ہیں، بڑا کرم فرمایا، بڑی شفقت فرمائی، ہمیں چاہیے تھا کہ ہم ان کے پاس جاتے ہم نہیں جاسکے تو وہ خود آگئے۔ آپ ایسی باتیں کریں گے تو آپ کے مقتدیوں کے ذہن بن جائیں گے اور آئندہ آپ کی مسجد میں کوئی بڑا آدمی آئے گا اور آپ اس کو مصلے پر کھڑا کریں گے تو کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ ہمارے ہاں چونکہ ماحول نہیں بنا ہوتا اس لیے ہم چاہتے بھی ہوں کہ اپنے بڑے کو مصلے پر کھڑا کریں لیکن پھر بھی کھڑا نہیں کر سکتے۔

### متکلم اسلام کا واقعہ امامتِ سفر:

یہ کافی پرانی بات ہے، اس وقت سرگودھا شہر میں بھی میری کوئی زیادہ شہرت نہیں تھی۔ میں ایک بار گھر والوں کے ساتھ میانوالی گیا، واپس سرگودھا شہر میں ایک جگہ رکا کسی کو ملنے کے لیے، نماز ظہر کا وقت تھا تو نماز پڑھنے کے لیے محلہ کی مسجد میں چلا گیا۔ مجھے خیال نہ رہا کہ میں مسافر ہوں، چونکہ شہر میں تھا اس لیے میں نے سمجھا کہ مقیم ہوں۔ اس مسجد کے امام صاحب میرے جاننے والے تھے اور انہوں نے بھی یہی سمجھا کہ یہ یہیں 87 جنوبی ہی سے آئے ہیں یہ کون سا مسافر ہیں! انہوں نے مجھے

مصلے پر کھڑا کر دیا۔

جب میں نے نماز پڑھانی شروع کر دی تو پھر مجھے خیال آیا کہ میں تو مسافر ہوں۔ اب جب دو رکعات پوری کیں تو میں نے سوچا کہ یا تو میں چار رکعات پوری کروں تاکہ ان کی گالیوں سے بچ جاؤں اور قیامت کے دن عذاب بھگتوں اور یا دو رکعات کے بعد سلام پھیر دوں اور قیامت کو اجر ملے اور ابھی آفت اپنے سر لے لوں، تو میں نے اسی کو ترجیح دی کہ دنیا میں ان مقتدیوں کی طرف سے اذیت برداشت کروں اور آخرت کی ذلت سے بچوں۔ ظہر کے دو رکعات کے بعد میں نے سلام پھیرا اور جوں ہی میں نے سلام پھیرا تو لوگوں نے بھی سلام پھیر دیا اور لوگ لعن طعن کرنا شروع ہو گئے۔

اب مسئلہ بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں تھا، دو چار مقتدیوں کو پتا تھا تو انہوں نے کھڑے ہو کر باقی نماز پوری کی اور باقی سب نے سلام پھیر دیا اور شروع ہو گئے، امام صاحب پر بھی برسے اور مجھ پر بھی برسے، وہ بولتے رہے اور میں خاموش چپ چاپ سنتا رہا، جتنی ان کے پاس باتیں تھیں جب وہ ختم ہو گئیں تو پھر میں نے بولنا شروع کیا۔ ایسے موقع پر بولنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے صبر سے کام لو، ان کو اندر کا ابال باہر نکالنے دو۔ جب وہ لوگ خاموش ہو گئے تو میں نے کہا کہ اب میری بات سنیں! میرا گاؤں 87 چک ہے، میں وہاں سے میانوالی گیا تھا اور میانوالی سے واپسی پر یہاں رکا ہوں تو میں مسافر ہوں، آپ کے امام صاحب کا خیال یہ تھا کہ مولانا صاحب 87 چک سے آئے ہیں چونکہ میں تو ان سے ملنے کے لیے نہیں آیا تھا میں تو اس محلے کے فلاں بندے کو ملنے کے لیے آیا ہوں، نماز کے لیے آیا تو انہوں نے مصلے پر کھڑا کر دیا ان کو تو پتا نہیں ہے کہ میں مسافر ہوں یا نہیں ہوں اور آپ ان کو ڈانٹ رہے ہیں۔

اور میں چونکہ سرگودھا شہر میں ہوں اور عام طور پر شہر میں کسی کے ذہن

میں نہیں ہوتا کہ میں مسافر ہوں تو میرے خیال میں بھی نہیں تھا کہ میں مسافر ہوں۔  
 تو میں بھی اپنے آپ کو مقیم سمجھ کر کھڑا ہو گیا، میں بھول گیا، بھولنے پر تو اللہ بھی معاف  
 کر دیتا ہے لیکن آپ لوگ معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور دوسری بات میں  
 نے یہ کہی کہ یہ مسئلہ ہے کہ جب امام مقیم ہو تو چار رکعات پڑھائے اور امام مسافر ہو تو  
 چار رکعات والی نماز میں دو کے بعد سلام پھیر دے اور مقتدی اپنی باقی دو رکعات ایسے  
 پڑھیں! مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ آپ جھگڑتے کیوں ہیں، پریشان کیوں ہیں؟ امام  
 مقیم ہو نماز آپ کی پھر بھی ہوتی ہے، امام مسافر ہو نماز آپ کی پھر بھی ہوتی ہے، مجھے  
 افسوس اس وجہ سے ہے کہ تم اتنے جاہل لوگ ہو تمہاری ڈاڑھیاں سفید ہو گئیں اور  
 تمہیں مسئلے کا پتا نہیں ہے اور تم کو تے ہو مولانا صاحب کو! جرم تمہارا ہے اور ڈانٹتے  
 ہمیں ہو۔

پھر میں نے بھرپور طریقے سے ان کی کلاس لی تو کہنے لگے کہ جی غلطی ہو گئی  
 ہے، معذرت معذرت! میں اس لیے کہتا ہوں کہ ایسے کبھی ہوتا ہے لیکن بولنے میں  
 جلدی نہ کرو، پہلے ان کو اپنا ابال نکالنے دو پھر اس کے بعد مسئلہ بیان کرو! جب ان کو  
 احساس ہو کہ ہم غلطی پر ہیں پھر ان کو ڈانٹ پلاؤ! اس کے بعد ان کو احساس ہوتا ہے کہ  
 ہم نے جرم کیا ہے۔

نمازوں میں مسنون قرأت کا اہتمام کیا کریں لیکن اگلی بات میں بارہا کہتا  
 ہوں کہ آپ نے مسئلہ پڑھ لیا اور مسئلہ آپ کو یاد ہو گیا لیکن جس مسجد میں آپ نماز  
 پڑھتے ہیں اس مسجد کا امام اس طرز پر تلاوت نہیں کرتا جو میں نے بتائی ہے تو اس کے  
 بارے میں دل میں نفرت کے خیالات ہرگز نہ لائیں کہ اس کو مسئلے کا پتا نہیں، یہ  
 مسنون قرأت نہیں کر رہا کیونکہ یہ اس سے بھی بڑا گناہ ہے، اس لیے بہت جلد کسی کے  
 بارے میں ایسا ذہن نہ بنایا کریں! اس سے نفرت کی فضا پھیلتی ہے، اس کو نقصان کچھ

نہیں ہوتا اور بندہ اپنی آخرت تباہ کر بیٹھتا ہے۔

### استواء علی العرش متشابہات میں سے ہے:

﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلٰى الْعَرْشِ﴾

اللہ رب العزت نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے چھ دنوں میں پیدا کیا۔ چھ دنوں سے مراد چھ دنوں کی مقدار ہے کیونکہ اس وقت تو دن رات ہوتے ہی نہیں تھے۔ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلٰى الْعَرْشِ﴾ پھر اللہ عرش پر مستوی ہوئے۔ یہ متشابہات میں سے ہے اور استواء علی العرش کا معنی ہم نہیں جانتے بلکہ اس کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔ اس پر میں پہلے تفصیل سے بات کر چکا ہوں۔

### قیامت کے دن کی مقدار: تعارض کا حل

﴿يَذْكُرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يُعْرِجُ اِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ

مِقْدَارُهُ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعْدُوْنَ ۝۳﴾

اللہ رب العزت آسمان سے لے کر زمین تک جتنے معاملات ہیں ان سب کی تدبیر اور انتظام خود فرماتے ہیں اور پھر ہر امر؛ اللہ کی طرف لوٹتا ہے ایک ایسے دن میں جو تمہارے ایک ہزار سال کے برابر ہے یعنی قیامت کے دن۔

بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۝۱۲۶﴾

کہ وہاں کا ایک دن دنیا کے پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے اور اس

سورت میں فرمایا کہ وہاں کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے لیکن اس میں کوئی تعارض نہیں ہے کہ یہ فرق مختلف اشخاص کی مختلف کیفیات کے اعتبار سے ہے۔ بعض بندوں کو وہاں کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر لگے گا اور بعضوں کو وہاں کا ایک دن دنیا کے پچاس ہزار سال کے برابر لگے گا اور صحیح اور رائج بات یہ ہے کہ نہ ہمیں ایک ہزار سال کے برابر ہونے کی کیفیت کا پتا ہے اور نہ ہمیں پچاس ہزار سال کے برابر ہونے کی کیفیت کا پتا ہے، ہم اس پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اس پر بھی ایمان لاتے ہیں، اس کا حقیقی معنی قیامت کے دن خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ دنیا میں اس طرح ہوتا ہے کہ مثلاً ایک شخص صحت مند ہو، خوراک اس کی اچھی ہو، راحت کے اسباب موجود ہوں، عشاء پڑھ کر سوتا ہے اور جب فجر ہوتی ہے تو اس کو پتا نہیں چلتا یوں لگتا ہے کہ جیسے ابھی سویا تھا اور ایک شخص تکلیف میں ہو، اس کو رات کو نیند نہ آتی ہو تو اس کو ایک رات یوں لگتی ہے کہ جیسے مہینا گزر گیا ہو۔ ایک وقت ایک شخص کے لیے لمبا ہو جاتا ہے اور وہی وقت دوسرے کے لیے بہت چھوٹا ہو جاتا ہے، دنیا میں ہم اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

### منکرین حیات الانبیاء کے ایک شبہ کا جواب:

یہ بات سمجھ آ جائے تو اس سے ایک اور عقیدہ سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام ایک بستی سے گزرے، ﴿أَوَ كَآلِذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَھِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوشِہَا﴾<sup>127</sup> وہ بستی تباہ شدہ تھی تو انہوں نے کہا کہ اللہ رب العزت اس کو کیسے زندہ کریں گے؟ ﴿فَآمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَتَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَہُ﴾ اللہ نے انہیں سو



سالوں کے لیے موت دے دی پھر ان کو زندہ کیا۔ پھر پوچھا ﴿كَمْ لَبِثْتَ﴾ آپ کتنا ٹھہرے ہیں؟ عرض کیا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ کہ میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں۔ فرمایا: ﴿بَلْ لَبِثْتَ مِائَةً عَامٍ﴾ کہ آپ سو سال تک ٹھہرے ہیں۔

اب اس سے وہ لوگ دلیل پکڑتے ہیں جو قبور میں انبیاء علیہم السلام کے اجساد کی حیات کی نفی اور انکار کرتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ دیکھو! اللہ نے پوچھا کہ کتنا ٹھہرے ہو؟ انہوں نے کہا: دن یا دن کا بعض حصہ۔ اللہ رب العزت نے فرمایا کہ نہیں بلکہ تم سو سال ٹھہرے ہو! اگر حضرت عزیز زندہ ہوتے تو ان کو پتا چل جاتا کہ میں کتنا عرصہ ٹھہرا ہوں، ان کو پتا نہیں چلا۔ لہذا معلوم ہوا کہ وہ زندہ نہیں ہیں۔ یعنی منکرین حیات نے ان کے عدم علم کو عدم حیات پر دلیل بنادیا۔

پہلی بات تو یہ سمجھیں کہ عدم علم کو عدم حیات پر دلیل بنانا ہی غلط ہے۔ مثال کے طور پر آپ یہاں بیٹھے ہیں اور میں پوچھوں کہ میرے سبق کو شروع ہوئے کتنے سیکنڈ ہوئے ہیں؟ آپ جواب دیں کہ پتا نہیں۔ اب اس کا معنی کیا ہے کہ آپ مردے ہیں؟ اب عدم علم کو عدم حیات پر دلیل کیسے بنا؟ قرآن کریم میں ہے:

﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَأُجِبْتُمْ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا﴾<sup>128</sup>

کہ قیامت کے دن اللہ تمام رسولوں کو جمع فرمائے گا اور ان سے کہے گا کہ میں نے تمہیں ان لوگوں کے پاس بھیجا تھا ان کی طرف سے تمہیں کیا جواب ملا؟ نبی کہیں گے کہ ہمیں تو کچھ پتا نہیں۔ تو کیا نبی دنیا میں زندہ نہیں ہوتے؟! اگر عدم علم؛ عدم حیات پر دلیل ہے تو پھر تو دنیا میں کوئی نبی زندہ نہیں ہو گا حالانکہ ایسا نہیں ہے!

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جہنمیوں سے پوچھیں گے:

﴿كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ﴾ ﴿١١٢﴾

کہ تم زمین میں کتنے سال ٹھہرے رہے؟ وہ کہیں گے:

﴿لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ <sup>129</sup>

کہ دن یا دن کا کچھ حصہ ہم ٹھہرے ہیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو دن کا کچھ حصہ تھوڑا ٹھہرے ہیں بلکہ کوئی ساٹھ سال جیا ہے، کوئی سو سال جیا ہے تو کیا یہ سارے لوگ مردے ہیں؟ اس لیے عدم علم کو عدم حیات پر دلیل نہیں بنا سکتے۔

اور دوسری بات یہ سمجھیں کہ عزیر علیہ السلام دنیا میں نہیں تھے ان کی حیات عالم برزخ یعنی دوسرے جہان کی حیات تھی، اس عالم اور دوسرے عالم میں فرق یہ ہے کہ اس عالم کا ایک ہزار سال ہو تو اگلے عالم کا ایک دن بنتا ہے۔ تو اللہ رب العزت نے پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتُ﴾ کہ تم کتنا عرصہ ٹھہرے ہو؟ عرض کیا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ کہ میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں۔ تو بات تو ٹھیک تھی کیونکہ جب اللہ نے پوچھا تو عزیر علیہ السلام یہ سمجھے کہ شاید مجھ سے وہاں کے بارے میں سوال کیا جا رہا ہے، فرمایا: نہیں! ہم وہاں کا نہیں بلکہ ہم یہاں کا پوچھ رہے ہیں، اور یہاں کا کتنا بنتا ہے؟ فرمایا: ﴿بَلْ لَبِثْتَ مِائَةً عَامٍ﴾ بلکہ تم ایک سو سال ٹھہرے ہو! اب یہاں کا ایک سو سال اور وہاں کا دن یا دن کا بعض حصہ ہو تو یہ تو موافقت ہے، یہ مخالفت کیسے ہے؟! اور اگر عدم علم کو عدم حیات کی دلیل بنائیں تو بھی ٹھیک نہیں ہے اور اگر آپ کہتے ہیں کہ ان کو علم نہیں تھا یہ بھی ٹھیک نہیں ہے بلکہ ان کو تو علم بھی تھا۔ اس لیے اس آیت کو عدم حیات پر دلیل نہیں بنا سکتے۔

## ملک الموت اور ان کی جماعت:

﴿قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ

تَرْجَعُونَ﴾

آپ ان سے فرمائیں کہ ملک الموت تمہاری روح کو قبض کرتا ہے جو تم پر مقرر کیا گیا ہے، پھر تمہیں واپس تمہارے رب کی طرف لے جایا جائے گا۔  
اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک الموت روح کو قبض کرتا ہے اور دوسرے مقام سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ روح قبض کرتے ہیں۔ فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُم الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ﴾<sup>130</sup>

کہ جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، جب فرشتے ان کی روح قبض کرنے آئے تو پوچھنے لگے کہ تم کس حالت میں تھے؟ جواب یہ ہے کہ یہاں ”ملک“ وہاں ”ملائکہ“ میں کوئی تعارض نہیں ہے، روح قبض کرنے پر کئی فرشتے متعین ہیں جن کے سربراہ ملک الموت ہیں جن کا نام عزرائیل علیہ السلام ہے۔

یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بعض لوگ بڑی شدت سے رد کرتے ہیں کہ ملک الموت کا نام عزرائیل کہیں بھی نہیں آیا۔ میں نے کہا کہ مفسرین نے ملک الموت کا نام عزرائیل لکھا ہے اس لیے ہر بات کا شدت سے رد نہ کیا کریں۔ بعض لوگ معروف بات کے رد کرنے کو بڑا عالم ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں کہ یہ بہت بڑا مولوی ہے کیونکہ معروف بات کا رد کیا ہے یہ بعض لوگوں کا مزاج ہے۔ جب مفسرین نے ملک الموت کا نام عزرائیل رکھا ہے تو آپ کو شدت سے رد کرنے کی ضرورت کیا ہے! بس خاموشی اختیار کر لیں۔

عزرائیل علیہ السلام کے بارے میں کئی ایک روایات ہیں کہ عزرائیل علیہ السلام کو جب ارواح قبض کرنے کی ڈیوٹی پر متعین کیا تو انہوں نے خود اللہ سے درخواست کی کہ اے اللہ! میرے ذمے جو آپ نے کام لگایا ہے میں کروں گا لیکن اس کی بدنامی بہت ہوگی، ہر بندہ مجھے برا کہے گا کہ یہ ہمارے باپ کی روح لے گیا، ماں کی روح لے گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ارواح تم قبض کرو گے لیکن ہم اس کے ظاہری اسباب کچھ ایسے پیدا کریں گے کہ لوگ آپ کا تذکرہ بھی نہیں کریں گے۔ تو کوئی ایکسڈنٹ میں جا رہا ہے، کوئی بیماری میں جا رہا ہے، کوئی آدمی بالکل صحت مند ہو اور موت آئے ایسا بہت کم ہوتا ہے جب بھی کسی پر موت آتی ہے تو اس کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ بن جاتا ہے۔ کبھی بوڑھا ہو گیا، کبھی بیمار ہو گیا اور کبھی اتنا بوڑھا ہو جاتا ہے کہ لوگ خود ہی کہتے ہیں کہ مر ہی جائے تو اچھا ہے، اب عزرائیل علیہ السلام کو بددعائیں کیا دینی ہیں، اب تو دعائیں دیں گے کہ اچھا ہے کہ اس کی روح تو لے گیا۔

یہ معاملہ تو انسانوں کا ہے کہ عزرائیل علیہ السلام اور ان کی جماعت ارواح قبض کرتی ہے لیکن انسان کے علاوہ جو حیوانات ہیں ان کے بارے میں دونوں قسم کی روایات ملتی ہیں کہ ان کی روح ملک الموت قبض کرتے ہیں یا یہ کہ ان کی روح براہ راست اللہ تعالیٰ خود قبض فرمالیتے ہیں۔ دونوں قسم کے اقوال ملتے ہیں۔

**حدودِ شریعت کا لحاظ کیجیے!**

﴿وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدًىهَا وَلَكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي

لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ (١٧)

یہاں یہ مسئلہ ذہن نشین فرمائیں کہ ہم دعوت کے پابند ہیں، ہم تبلیغ کے پابند ہیں، لوگوں کو ہدایت کی طرف لانے پر پابند ہیں لیکن حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے، حدودِ شریعت سے نکل کر ہم دعوت کبھی نہ دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ

تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر ہم چاہتے تو ہر کسی کو ہدایت عطا فرما دیتے لیکن ہمارا فیصلہ ہے کہ جہنم کو ہم نے لوگوں اور جنات سے بھرنا ہے۔ تو جب ہر بندے نے جنت میں نہیں جانا بہت ساروں نے جہنم میں بھی جانا ہے تو پھر آپ حدودِ شریعت کو توڑ کر دین کی دعوت کیوں ہیں؟ حدودِ شریعت میں رہ کر دین کی دعوت دیں، کسی کے مقدر میں ہو گا تو دعوت قبول کرے گا، مقدر میں نہیں ہو گا تو نہیں قبول کرے گا۔

**”اللہ بھلا دیں گے“ کا معنی:**

﴿فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا إِنَّا نَسِينُكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (۳۳)

قیامت کے دن اللہ خود فرمائیں گے یا بذریعہ ملائکہ فرمائیں گے کہ آج تم چکھو اس عذاب کو، تم نے قیامت کے دن کو بھلا دیا تھا تو آج ہم نے تمہیں بھلا دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ کسی بندے کو بھلا تو نہیں سکتے تو کیسے فرما دیا کہ آج ہم نے تمہیں بھلا دیا ہے؟ اس کا معنی یہ ہے کہ بھلایا نہیں بلکہ اس کے ساتھ معاملہ ایسا ہو گا جیسے بھلا دیا ہے۔ جیسے بسا اوقات حکمران کسی بندے کو پکڑتے ہیں اور جیل میں ڈالتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکمران تو ایسے ہیں کہ جیسے جیل میں ڈال کر بھلا دیا ہے حالانکہ بھلایا نہیں ہوتا بلکہ پتا ہوتا ہے لیکن چونکہ رہا نہیں کرتے تو گویا یہ معاملہ ایسے ہے جیسے بھول گیا ہو۔

﴿وَلَنَذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (۲۲)

اللہ رب العزت کبھی دنیا میں انسان کو مصیبت اور تکلیف دیتے ہیں آخرت کے عذاب سے پہلے تاکہ یہ بندہ لوٹ آئے اور کفر سے باز آجائے اور اگر کسی بندے کو

دنیا میں تکلیف پہنچے اور اس کی وجہ سے توبہ کر کے گناہ چھوٹ جائے تو یہ تکلیف تکلیف نہیں بلکہ یہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ ظاہری طور پر اگرچہ عذاب ہے لیکن درحقیقت خدا کی بہت بڑی نعمت ہے اور آپ یقین فرمائیں میں کس درد کے ساتھ آپ کو یہ بات سمجھاؤں کہ بسا اوقات اللہ کی طرف سے آنے والی تکالیف یہ انسان کے لیے اتنی مفید ہوتی ہیں کہ اگر یہ تکالیف نہ ہوتیں تو شاید بندے کو اتنا فائدہ نہ ہوتا اور بسا اوقات فتوحات ملتی ہیں، نعمتیں ملتی ہیں، صحت ملتی ہے، مسلسل عزت ملتی ہے تو انسان غرور اور گھمنڈ کا شکار ہو جاتا ہے لیکن جب اللہ اس بندے کو تھوڑی سی تنبیہ فرماتے ہیں تو پھر بندہ رجوع الی اللہ کر کے توبہ کرتا ہے۔ تو یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے، خدا کا کتنا بڑا اکرم ہے۔ اس لیے اللہ کی طرف سے آنے والی تکلیف کو اللہ کی محبت سمجھا کریں کہ اللہ کو مجھ سے پیار ہے تبھی تو اللہ نے مجھے تنبیہ فرمائی ہے، اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

### سفر معراج میں موسیٰ اور حضور علیہما السلام کی ملاقات:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهِ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَءِيلَ﴾

اس کا ایک معنی یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی ہے اور آپ کو ہم نے قرآن کریم دیا ہے ﴿فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهِ﴾ یہ قرآن ہماری طرف سے ہے اس قرآن میں آپ نے شک نہیں کرنا! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے قرآن ہونے میں کوئی شک نہیں تھا لیکن بسا اوقات اس پر مزید پختہ رہنے کے لیے اللہ پاک ایسی بات ارشاد فرماتے ہیں۔

اور دوسرا معنی اس آیت کا بعض مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ ہم نے موسیٰ

علیہ السلام کو تورات دی اور آپ کی موسیٰ علیہ السلام سے اس دنیا میں ملاقات ہوگی اس ملاقات میں آپ شک نہ کرنا، یقین کرنا کہ آپ کی ملاقات موسیٰ علیہ السلام ہی سے ہوئی ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ملاقات کہاں پر ہوئی ہے؟ تو یہ ملاقات معراج کی رات آسمانوں پر ہوئی ہے۔

☞ اللہ کے نبی پہلے آسمان پر گئے ہیں ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے ہے

☞ دوسرے آسمان پر ملاقات حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہے

☞ تیسرے آسمان پر ملاقات حضرت یوسف علیہ السلام سے ہے

☞ چوتھے آسمان پر ملاقات حضرت ادریس علیہ السلام سے ہے

☞ پانچویں آسمان پر ملاقات حضرت ہارون علیہ السلام سے ہے

☞ چھٹے آسمان پر ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہے

☞ ساتویں آسمان پر ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ کس نبی سے کس آسمان پر ملاقات ہوئی اس کو یاد رکھنے کے لیے جو مخفف ہے وہ ہے ”أَعْيَا هُمَا“ اس میں پہلے الف ہے مراد آدم، پھر عین ہے مراد عیسیٰ، پھر یا ہے مراد یوسف، پھر الف ہے مراد ادریس، پھر آگے ہا ہے مراد ہارون، پھر میم ہے مراد موسیٰ، پھر الف ہے مراد ابراہیم۔ یہ سات حروف ذہن میں رکھیں گے تو یاد کرنا بہت آسان ہوگا کہ کس آسمان پر کس نبی سے ملاقات ہوئی تھی۔

تو چھٹے آسمان پر ملاقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی اور یہ لمبا واقعہ ہے، اس وقت میں اس پر بات نہیں کرتا۔

**موسیٰ علیہ السلام کا قبر میں نماز پڑھنا:**

اسی طرح صحیح مسلم کی جو روایت ہے کہ کثیب احمد سرخ ٹیلے سے آپ

صلی اللہ علیہ وسلم گزرے تو موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔  
حدیث کے الفاظ ہیں:

مَرَرْتُ عَلَى مُوسَى لَيْلَةً أُسْرِي بِي عِنْدَ الْكُثَيْبِ الْأَحْمَرِ وَهُوَ قَائِمٌ  
يُصَلِّي فِي قَبْرِهِ. <sup>131</sup>

معراج والی رات میرا گزر موسیٰ علیہ السلام پر ہوا تو وہ سرخ ٹیلہ کے پاس اپنی  
قبر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔

اب جو نہیں مانتے وہ آسان سا اعتراض کر دیتے ہیں کہ یہ حضور اقدس صلی  
اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا۔ ہم نے کہا کہ دو باتیں الگ ہیں؛ ایک ہے موسیٰ علیہ السلام کا  
قبر میں نماز پڑھنا اور ایک ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا باہر سے دیکھ لینا! تو معجزہ اُن کا  
نماز پڑھنا نہیں ہے بلکہ معجزہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھ لینا ہے۔ بحث دیکھنے پر نہیں  
ہو رہی، بحث نماز پڑھنے پر ہو رہی ہے۔

کبھی اعتراض کر دیتے ہیں کہ جی نماز تو روحیں پڑھتی تھیں، جسم نہیں  
پڑھتے تھے۔ میں نے کہا کہ جس کو قبر میں دفن کیا ہے نماز وہی پڑھے گا نا؟ اگر اس قبر  
میں روح ہے تو پھر روح پڑھے گی اور اگر اس قبر میں جسم ہے تو پھر جسم پڑھے گا۔ جب  
اس قبر میں نماز پڑھی جا رہی ہے تو اس قبر میں روح کیسے نماز پڑھے گی؟ تمہارا تو عقیدہ  
یہ ہے کہ روح کا جسم کے ساتھ تعلق بھی نہیں ہے اور روح ہوتی بھی علیین میں ہے، یہ  
تو ہمارا عقیدہ ہے کہ روح اور جسم کا تعلق ہے، تمہارے عقیدے پر تو نہ یہاں روح ہے  
اور نہ اس کا تعلق ہے تو خالص جسم نماز پڑھ رہا ہے نا! ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقاۃ  
شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں:



فَإِنَّ حَقِيقَةَ الصَّلَاةِ وَهِيَ الْإِثْيَانُ بِالْأَفْعَالِ الْمُخْتَلِفَةِ إِمَّا تَكُونُ  
لِلْأَشْبَاحِ لَا لِلْأَرْوَاحِ.<sup>132</sup>

کہ اصل نماز تو وہی ہوتی ہے جو جسم پڑھتا ہے، وہ نماز نہیں ہوتی جو روح پڑھتی ہے۔

**نماز پڑھنا جسم کا کام ہے:**

اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ نماز کا تعلق روح سے نہیں ہے بلکہ جسم سے ہے۔ حدیث جبرائیل مفصل حدیث ہے۔ اس میں ہے کہ جبرائیل امین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلا سوال کیا ”أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ“ حضور! فرمائیے کہ اسلام کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَتُقِيمَ  
الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنْ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا  
کہ اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے  
لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کیا کر،  
رمضان کا روزہ رکھا کر اور اگر طاقت ہو تو بیت اللہ کا حج ادا کر۔

پھر پوچھا: ”فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ“ کہ ایمان کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزیں فرمائی ہیں:

أَنْ تُوْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ  
بِالْقَدْرِ خَيْرٌ وَشَرٌّ.

کہ اللہ کو ماننا، اللہ کے فرشتوں کو ماننا، خدا کی آسمانی کتابوں کو ماننا، اللہ کے

رسولوں کو ماننا، آخرت کے دن کو ماننا اور اچھی یا بری تقدیر کو ماننا۔ یہ ایمان ہے۔

پھر پوچھا: ”فَأُخْبِرَنِي عَنِ الْإِحْسَانِ“ احسان کیا ہے؟ فرمایا:

أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَمَا نَأْتِكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ.

کہ اللہ کی عبادت یوں کر کر کہ گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے، اگر یوں نہ کر سکے تو پھر عبادت یوں کر کر کہ گویا خدا تجھے دیکھ رہا ہے۔

پھر پوچھا: ”فَأُخْبِرَنِي عَنِ السَّاعَةِ“ قیامت کے بارے میں بتائیے! فرمایا:

مَّا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ.

فرمایا: اس سوال کا جواب تجھے بھی نہیں آتا، اس سوال کا جواب مجھے بھی نہیں آتا۔

پھر پوچھا: ”فَأُخْبِرَنِي عَنْ أَمَارَاتِهَا“ کہ اچھا قیامت کی کچھ نشانیاں ہی بتا

دیجیے! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَنَّ تِلْدَ الْأُمَّةِ رَبَّتْهَا وَأَنَّ تَرَى الْخُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ

يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبُنْيَانِ.<sup>133</sup>

فرمایا: جب وہ دور آجائے کہ باندی اپنی مالکہ کو جنے یعنی بیٹی کی حیثیت مالکہ کی

بن جائے اور ماں کی حیثیت باندی کی بن جائے تو سمجھ لینا قیامت آنے لگی ہے اور فرمایا

کہ جب دیکھو کہ ایک آدمی جس کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں ہیں، اس کے جسم پر

کپڑا بھی نہیں ہے، پیٹ میں روٹی بھی نہیں ہے اور بکریاں چرانے والا ہے جب ایسے

آدمی بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کریں تو سمجھ لینا کہ قیامت آرہی ہے۔

اب دیکھو! پہلا سوال اسلام، دوسرا ایمان اور تیسرا احسان کے بارے میں کیا

ہے۔ اسلام کا تعلق جسم سے ہے، ایمان کا تعلق دل سے ہے اور احسان کا تعلق دل میں چھپی ہوئی کیفیت سے ہے۔ تو اسلام میں جو پانچ چیزیں ہیں ان میں سے دوسری چیز نماز ہے۔ تو نماز جسم کا کام ہے یا روح کا؟ (جسم کا۔ سامعین) یہ تو کام ہی جسم کا ہے۔ تو پھر روح کیسے پڑھ رہی ہے؟! اس لیے ہم کہہ رہے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے جو نماز پڑھی ہے وہ جسم نے پڑھی ہے، یہ مت کہو کہ روح نے پڑھی ہے۔

**مقتدا کے لیے دو شرطیں:**

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ آيَةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا﴾ وَكَانُوا

بِأَيِّتِنَا يُوقِنُونَ ﴿٣٢﴾

اور ہم نے ان میں سے کچھ لوگوں کو جنہوں نے صبر سے کام لیا پیشوا بنادیا وہ ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے اور ہماری آیات پر یقین بھی رکھتے تھے۔ اللہ رب العزت جس کو ہدایت کا مقتدا بناتے ہیں اور امام الہدیٰ بناتے ہیں تو اس کے لیے دو شرطیں ہیں:

1: کمال علمی 2: کمال عملی

علم اور عمل میں کمال ہو تو اللہ اس بندے کو مقتدیٰ بناتے ہیں۔

﴿لَمَّا صَبَرُوا﴾ یہ کمال عملی ہے۔ صبر کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ”الصَّبْرُ

عَلَى الطَّاعَاتِ“ کہ نیکی پر دل نہیں کرتا پھر بھی کرتا ہے، ”الصَّبْرُ عَنِ الْمَعَاصِي“ کہ گناہ کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن پھر بھی نہیں کرتا، ”الصَّبْرُ عَلَى الْمَصَائِبِ“ کہ مصیبت آئے تو اس پر صبر کرے اور برداشت کرے۔ تو یہ تین قسم کے صبر اس میں شامل ہیں۔ طاعات پر بھی صبر کرتا ہے، گناہوں سے رکنے پر بھی صبر کرتا ہے، مشقت آئے تو اس کو بھی برداشت کرتا ہے تو کمال عملی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا؟ اس سے

بڑا کمال اور کیا ہو سکتا ہے؟

﴿وَكَاْنُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُوْنَ﴾ کہ ہماری آیات پر یقین رکھتے ہیں۔ تو یقین وہی کرے گا جس کے پاس علم ہوگا، علم بھی آگیا فہم بھی آگیا تو یہ کمالِ علمی اس میں آگیا۔

تو جس شخص میں کمالِ علمی بھی ہو اور کمالِ عملی بھی ہو تو مقتدا بننا اس کا حق ہے۔ جب اللہ بندے کو یہ دو چیزیں دے اور پھر اس کو اقتداء بھی ملے تو اس بندے کو قبول کرنا چاہیے، اس کے خلاف پلان نہ بناؤ! تمہارا کچھ بھی فائدہ نہیں ہونا اور اس کا کچھ بھی نہیں بگڑنا، انسان اپنی دنیا اور آخرت تباہ کر بیٹھتا ہے۔

### صبر کی تین اقسام:

صبر کی تین قسمیں ہیں؛ صبر علی الطاعات، صبر عن المعاصی اور صبر علی المصائب۔ تو یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ عوام کو الجھن ہو تو تعجب نہیں ہونا چاہیے لیکن اگر علماء کو الجھن ہو تو تعجب ہوتا ہے کہ نماز میں دل نہیں لگتا، مطالعہ میں دل نہیں لگتا، تکرار کو دل نہیں کرتا۔ مجھے بعض طلبہ کہتے ہیں کہ استاذ جی دعا کریں! میں نے کہا: اس کا تعلق دعا سے نہیں ہے اس کا تعلق چستی سے ہے، میں بھی کبھی تھکا ہوا ہوتا ہوں میرا بھی دل نہیں کرتا کہ مطالعہ کروں، میرا بھی جی چاہتا ہے کہ سبق کی چھٹی کروں لیکن جی چاہنے کا نام تو عبادت نہیں ہے، اگر دل کیا اور آپ نے پڑھ لیا تو کون سا ثواب کمایا؟ دل کیا اور تلاوت کر لی تو کون سی عبادت کی؟ عبادت تو اس چیز کا نام ہے کہ دل نہ کرے پھر بھی انسان اسے کرے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کتنے بڑے آدمی تھے! حضرت کے ایک مرید نے خط لکھا کہ حضرت میں عبادت کرتا ہوں لیکن مزا نہیں آتا۔ حضرت تھانوی نے جواب لکھا کہ مزا؛ مذی میں ہے عبادت میں نہیں ہے، اس کو اللہ کا حکم سمجھ کر کرو! اب دیکھو بظاہر ہنسانے والی بات ہے لیکن حکیم

الامت نے کتنی بڑی بات فرمائی! کیسے امت کے نبض کو سمجھتے تھے!

### متکلم اسلام کی طلبہ کو نصیحت:

میں اس لیے کہتا ہوں کہ بس ایک فیصلہ کرو! مزدوں کو چھوڑو! مزا آتا ہے یا نہیں آتا، جی چاہتا ہے یا نہیں کرتا لیکن یہ کام کرنا ہی کرنا ہے، کچھ وقت گزرے گا تو مزا بھی آنا شروع ہو جائے گا اور وہ طبیعت بن جائے گی، اطاعت کے بغیر بندے کو لطف ہی نہیں آئے گا لیکن اس پر تھوڑی سی محنت کرنی پڑتی ہے۔ محنت سے مطالعہ کا ذوق بنا لو پھر دیکھنا کہ مطالعہ میں کتنا مزا آتا ہے، پھر نکات سننے کو دل کتنا کرتا ہے، ایک نکتہ ملے تو بندہ باغ باغ ہو جاتا ہے کہ ایک نکتہ میرے سامنے آگیا۔ اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین فرمائیں کہ جب انسان مطالعہ میں آگے بڑھتا ہے اور علوم میں وسعت آتی ہے تو انسان میں تواضع آتی ہے، کبر نہیں آتا، کیونکہ مطالعے کی وسعت سے اپنی جہالت بندے پر کھلتی ہے تو جہالت کھلنے سے تواضع آتی ہے کہ مجھے ان ان چیزوں کا پتا نہیں تھا۔ اب آپ تفسیر پڑھ رہے ہیں تو آپ کو کتنی باتیں معلوم ہو رہی ہیں جن کا آپ کو پتا نہیں تھا۔ تو جب چیزوں کا پتا چل رہا ہے تو آپ کے اوپر اپنی جہالت کھل رہی ہے یا نہیں؟ کھل رہی ہے تو اس سے بندے میں عاجزی آنی چاہیے، جب آپ اپنا یہ رخ بنا لیں تو پھر اللہ کے شکر کی توفیق ملتی ہے۔

### مشکلات کے بعد راحتوں کا دور ہے:

آپ یقین فرمائیں کہ میں آپ کو اپنے دل کی کیفیت نہیں بتا سکتا بس! میں جب کبھی گھر میں بیٹھا ہوتا ہوں تو ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ جیسے بندے کے آنسو آنے لگتے ہیں، میں ایک ایک چیز دیکھتا ہوں تو خدا کا بہت شکر ادا کرتا ہوں کہ آج سے کچھ سال پہلے میری حالت یہ تھی کہ مجھ سے کوئی بندہ سلام لینے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس سے ملیں گے تو مصیبت، اس سے ملیں گے تو تکلیف، اس سے تعلق بنے گا تو پتا نہیں

کیا ہو گا؟! اتنی مشکلات سے میں گزرا ہوں کہ میرا نام لینے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ اب اللہ کا شکر ہے۔ کبھی لوگ ملنے کے لیے تیار نہیں تھے اور ابھی میں کسی علاقے میں جاؤں تو جانے سے پہلے فون شروع ہو جاتے ہیں کہ ہمارا گھر راستے میں ہے ہماری دکان روڈ کے اوپر ہے ہمارا مدرسہ سامنے ہے بس ایک منٹ کے لیے رک جائیں! خدا گواہ ہے کہ میرے دل میں اس پر اکڑ نہیں آتی بلکہ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ایک وقت تھا کہ کوئی پوچھنے کے لیے تیار نہیں تھا اور آج فون کر رہے ہیں، کل گھاس نہیں ڈالتے تھے اور آج دیسی مرغ کھانے کے لیے تیار ہیں، ایسی چیزیں آنے سے خدا کا شکر ادا کیا کریں۔

میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ آج دنیا میں مسلمانوں پر اتنے شدید حالات ہیں کہ آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے اور یہاں آپ کو تو کوئی ٹینشن ہی نہیں، قالین پر بیٹھے ہیں، پنکھے لگے ہوئے ہیں، صبح و شام وقت پر پکا پکایا کھانا مل رہا ہے اور آپ سبق پڑھ رہے ہیں۔ دیکھو خدا کے کتنے انعامات ہیں! تو ان انعامات کا کیا معنی ہے کہ ہم اپنی زندگیاں گناہوں میں گزار دیں؟ بلکہ ہمیں شکر اور اللہ کی عبادت کے ساتھ زندگی گزارنی چاہیے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

### پانی کا نظام قدرت کا کرشمہ:

﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا

تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ أَفَلَا يُبْصِرُونَ﴾<sup>(النبأ: ۲۷)</sup>

کیا ان لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو کھینچ کر خشک زمین کی طرف لے جاتے ہیں، پھر اس سے کھیتی پیدا کرتے ہیں جسے ان کے جانور بھی کھاتے ہیں اور یہ لوگ خود بھی کھاتے ہیں۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں!

یہاں اللہ پاک نے نظام آب پاشی کو بیان کیا ہے اور قرآن کریم نے دونوں

نظاموں کو بیان فرمایا ہے۔ بعض ایسے علاقے ہیں کہ اللہ پاک فرشتوں کو حکم دیتے ہیں وہ وہاں بارش برساتے ہیں اور زمین تازہ ہو جاتی ہے، سبزے اگتے ہیں اور بعض زمینیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو زیادہ بارشوں کی متحمل نہیں ہوتیں، پھر اس علاقے میں بارشیں نہیں ہوتیں، بارشیں وہاں ہوتی ہیں جہاں زمینیں بارشوں کی متحمل ہوتی ہیں تو وہاں سے پانی چلتا ہے اور بذریعہ نہر ان علاقوں میں آتا ہے جہاں کی زمین بارش کی متحمل نہیں ہوتی۔ یہ ہماری زمینیں ہیں، یہاں دس دن بارشیں ہو جائیں تو سیلاب آجائے اور چلنا مشکل ہو جائے۔ اللہ پانی پہاڑوں پر برساتے ہیں وہاں سے ندیاں نکلتی ہیں نہریں بنتی ہیں اور آگے ہماری زمینیں سیراب ہوتی ہیں۔ یہاں پر اس کا ذکر فرمایا کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہم برساتے کہاں پر ہیں اور وہاں سے پانی کو چلا کر کہاں لے جاتے ہیں جس سے تمہاری زمینیں سرسبز ہو جاتی ہیں۔ اللہ رب العزت ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الاحزاب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝﴾

### غزوہ احزاب کا واقعہ:

جنگ بدر مدینہ منورہ میں پہنچنے کے بعد سن 2 ہجری میں ہوئی۔ اس کے بعد غزوہ احد سن 3 ہجری میں ہوا۔ پھر غزوہ احزاب سن 4 ہجری میں پیش آیا اور بعض کہتے ہیں کہ 5 ہجری میں پیش آیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ احد سے فارغ ہوئے۔ ادھر مدینہ منورہ سے یہود کے قبیلہ بنو نضیر اور بنو نائل سے تقریباً بیس آدمی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے سخت نفرت اور عداوت رکھتے تھے مکہ گئے اور ابوسفیان اور دیگر سرداران مکہ کو جا کر ملے اور کہا کہ ہم تمہارے ساتھ تعاون کرتے ہیں تم جا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ کرو اور ان کو ان کے ساتھیوں سمیت ختم کر دو۔

قریش مکہ نے کہا کہ وہ تو ہمیں کافر سمجھتے ہیں، ہمارا اور ان کا دین و مذہب کا سخت اختلاف ہے اور تم یہودی ہو اہل کتاب ہو تو تم بتاؤ کہ تمہارے نزدیک ہم سچے ہیں



یا وہ سچے ہیں؟ قریش مکہ نے سوچا کہ اگر ان کے ساتھ بات چلی کر لیں اور یہ بھی ہمیں غلط سمجھتے ہوں تو پھر ان کے ساتھ مل کر لڑنے کی ضرورت کیا ہے؟ یہودیوں نے جھوٹ بولا اور کہا کہ ہم ان کو غلط سمجھتے ہیں اور تمہیں درست سمجھتے ہیں۔

قریشیوں نے کہا کہ چلو پھر مسجد حرام میں جا کر معاہدہ کرتے ہیں۔ بیس آدمی ان یہودیوں کے تھے اور پچاس آدمی ان قریش مکہ کے تھے۔ مسجد حرام میں جا کر خانہ کعبہ کی دیواروں سے چمٹ کر معاہدہ کر رہے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم کرنے کے لیے اور اللہ کا حکم دیکھو کہ اللہ پھر بھی ان کو برداشت کر رہے ہیں۔ خیر ان کا معاہدہ ہو گیا۔

ان یہودیوں نے جب قریش مکہ سے معاہدہ کیا تو واپسی پر ایک جنگجو قبیلہ غطفان کے پاس گئے، انہیں اپنے اور قریش کے معاہدے کا بتایا اور ان کو بھی اس بات پر ابھارا کہ تم بھی ہمارا ساتھ دو اور اس نئے دین کو ختم کرنے میں مدد کرو تو ہم تمہیں خیبر کی ایک سال کی کھجوروں کی آمدن دیں گے۔ بعض روایات میں ہے کہ آدھی آمدن دیں گے۔ اس رشوت کی شرط پر قبیلہ غطفان کے سردار عیینہ بن حصن نے آمادگی ظاہر کی کہ ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔

### کفر کے لشکر کی تعداد:

جب یہ معاہدے ہو گئے تو قریش مکہ کا قافلہ مکہ سے نکلا۔ انہوں نے چار ہزار بندے ساتھ لیے اور ساتھ تین سو گھوڑے اور ایک ہزار اونٹ لیے۔ ان پر سامان لادا اور مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ پھر راستے میں ایک جگہ ”مرز ظہران“ میں پڑاؤ ڈالا۔ یہاں اس لشکر میں کئی قبیلے شامل ہو گئے، قبیلہ اسلم، قبیلہ اشجع اور بنو مرہ، اسی طرح بنو کنانہ، بنو فزارہ اور غطفان کے سارے قبیلے جن کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا یہ سارے کے سارے اس لشکر میں شامل ہوتے گئے تو یہ لشکر بارہ ہزار افراد تک جا پہنچا۔ یہ سارا لشکر اب

مدینہ منورہ کی طرف چلا۔

### مسلمانوں کی تیاری:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع مل گئی کہ یہ لوگ حملے کے لیے آ رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مشورہ یہ تھا کہ یا رسول اللہ! ہمارے ہاں عجم میں جب کوئی دشمن باہر سے حملہ کرے تو ہم خندق کھود کر اپنے شہروں کا دفاع کرتے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ رائے ٹھیک ہے۔ چنانچہ ان کے مشورے پر عمل کیا گیا اور تقریباً ساڑھے تین میل لمبی خندق کھودنے کا فیصلہ ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کو دس دس ساتھیوں میں تقسیم کیا اور ان دس کو حکم دیا کہ وہ چالیس گز خندق کھودیں۔ اس جہاد کے لیے انصار کا جھنڈا حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو دے دیا اور مہاجرین کا جھنڈا حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔

### سَلَمَانٌ مِّنْ أَهْلِ الْبَيْتِ:

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ انصار کے ساتھ ہوں یا مہاجرین کے ساتھ؟! اب انصار کہتے کہ یہ ہمارے ہیں اور مہاجرین کہتے کہ ہمارے ہیں۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نزاع کو ختم فرمایا، فرمایا: نہ تمہارے ہیں نہ ان کے ہیں ”سَلَمَانٌ مِّنْ أَهْلِ الْبَيْتِ“ بلکہ یہ ہمارے ہیں۔ اب لڑائی ختم ہو گئی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ کچھ انصاری صحابہ ملائے کچھ مہاجر صحابہ ملائے، دس بندے ان کو بھی دے دیے کہ یہ تمہارا حصہ ہے تم کھودو! اندازہ کریں ساڑھے تین میل لمبی خندق صرف چھ دن میں کھودی گئی۔ اس خندق کی چوڑائی اور گہرائی اتنی تھی جس سے گھوڑا پھلانگ نہ سکے اور دشمن اس کو کراس نہ کر سکے۔

## ایک عظیم معجزہ:

خندق کھود رہے تھے کہ اس میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ظاہر ہوا۔ خندق کھودنے کا مشورہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دیا تھا، آپ اس فن کے ماہر بھی تھے لیکن اللہ کی شان کہ حضرت سلمان ہی کے حصے میں جو جگہ آئی وہیں ایک بڑی چٹان آگئی جو ان سے نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ اب یہ ماہر بھی ہیں اور رکاوٹ بھی وہیں پیدا ہو گئی۔ دیکھو اللہ پاک کیسے تربیت فرماتے ہیں! ان کے ساتھ والے بعض صحابہ نے کہا کہ ہم سیدھی خندق کھودنے کے بجائے تھوڑا سا راستے کو موڑ لیں اور پھر اصل خندق کے ساتھ ملا لیں گے لیکن اس کا خط چونکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کھینچا ہے کہ خندق یہاں سے کھودنی ہے اس لیے جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں گے نہیں یہ تھوڑی سی جگہ بھی موڑنی نہیں ہے۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے جا کر عرض کیا تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی خندق کھود رہے تھے اور اتنی مٹی آپ کے جسم پر گری ہوئی تھی کہ آپ کا پیٹ اور پیٹھ نظر نہیں آرہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لائے، پوچھا کون سا حصہ ہے؟ عرض کیا: یہ چٹان ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کدال لی اور ایک ضرب لگائی اور یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا﴾<sup>134</sup> اس سے اس چٹان کا تیسرا حصہ ٹوٹ گیا اور ایک روشنی بھی اس چٹان سے نکلی۔ دوسری ضرب لگائی اور یہی آیت یوں پڑھی: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا﴾ تو اس کا دوتہائی حصہ ٹوٹ گیا اور ساتھ ہی ایک روشنی بھی نکلی اور جب تیسری

ضرب لگائی اور یہی آیت پھر پوری پڑھی: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَتِهِ﴾ تو پوری چٹان ٹوٹ گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم خندق سے باہر تشریف لائے اور ایک جگہ بیٹھ گئے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور! میں نے ہر ضرب پر پتھر سے ایک روشنی نکلتے دیکھی ہے۔ فرمایا کہ کیا واقعی تم نے روشنی دیکھی ہے؟ عرض کیا جی حضور! حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو پہلی روشنی تھی اس میں خدا نے مجھے یمن اور کسریٰ کے محلات دکھائے اور جبرئیل امین نے مجھے کہا کہ آپ کی امت ان کو فتح کرے گی اور پھر جو دوسری مرتبہ روشنی نکلی ہے اس میں میں نے روم کے سرخ محلات کو دیکھا اور جبرئیل امین نے مجھے کہا کہ آپ کی امت ان شہروں کو بھی فتح کرے گی۔

منافقین مذاق اڑاتے تھے کہ کھانے کے لیے روٹی نہیں ہے، بچنے کے لیے خندقیں کھودی جا رہی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ روم اور کسریٰ فتح کریں گے کتنے تعجب کی بات ہے! لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم کو پورا یقین تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ فتوحات ہوں گی۔

### بنو قریظہ کی عہد شکنی:

یہ محاصرہ ایک مہینے تک چلا۔ اب بتاؤ! یہ جنگ کتنی سخت تھی بندہ اندازہ نہیں کر سکتا۔ سردی کا مہینا، سخت تیز ہوا جو خیموں تک کو اکھاڑ دے اور سارے یہودی بھی قریش کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا بنو قریظہ جو مدینہ میں تھا ان کا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ تھا کہ کسی لڑائی میں ایک دوسرے کے خلاف دشمن کی مدد نہیں کریں گے۔ انہوں پہلے تو قریش کا ساتھ نہیں دیا لیکن قبیلہ بنو نضیر کا سردار حیی بن اخطب ان کے پاس آیا۔ اس نے بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد سے کہا کہ تم ہمارے ساتھ ملو اور مسلمانوں کا خاتمہ کریں۔ بار بار یہی بات کرتا

رہا۔ کعب بن اسد اپنے قلعے میں سے جواب دیتا رہا کہ ہمارا معاہدہ ہے، ہم توڑ نہیں سکتے لیکن جی بن اخطب نے دلائل دے کر اس کو قائل کر لیا اور اپنے ساتھ ملا لیا۔ جب یہ اطلاع ملی تو اس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پریشانی ہوئی کہ یہ کیا ہوا؟ باہر سے احزاب ہیں اور مدینہ میں اس قبیلہ بنو قریظہ کی بغاوت۔

### آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابہ کرام پر شفقت:

اب محاصرہ لمبا ہو گیا۔ کھانے کا سامان کم ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مشقت بھی دیکھ رہے تھے تو صحابہ کی مشقت کے پیش نظر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں ایک تدبیر آئی کہ قبیلہ غطفان کے سردار عیینہ بن حصن نے یہودیوں کے کہنے پر ان مشرکین کا ساتھ اس لالچ میں دیا ہے کہ اسے خیبر کی کھجوریں ملیں گی، تو غطفان کے دو سرداروں کے پاس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قاصد بھیجا کہ تم ہمارے ساتھ معاہدہ کرو کہ تم ان مشرکین سے الگ ہو کر واپس چلے جاؤ گے تو ہم تمہیں مدینے کی کھجوروں کا ایک تہائی حصہ دیں گے۔

یہ گفتگو ابھی چل رہی تھی، اس قبیلہ کے سردار بھی راضی ہو چکے تھے لیکن ابھی معاہدہ پر دستخط نہیں ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو قبیلہ اوس کے سردار تھے اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ جو قبیلہ خزرج کے سردار تھے ان کو بلایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے یہ صورتحال رکھی اور مشورہ لیا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ نہیں فرمایا بلکہ معاملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے پر چھوڑ دیا۔

جب ان سے کہا تو حضرت سعد بن معاذ نے کہا: یا رسول اللہ! جب ہم نے کلمہ نہیں پڑھا تھا ہم نے انہیں ایک کھجور کبھی نہیں دی الا یہ کہ وہ ہمارے مہمان بن کر

آئیں تو ہم کھلاتے تھے یا یہ کہ وہ ہم سے خرید لیتے تھے، اب ہم نے کلمہ بھی پڑھا ہے اور سچے بھی ہیں اس لیے اب مصالحت کے لیے ان کو مدینے کی کھجور کا ایک تہائی حصہ دیں ہمیں اس مصالحت کی کوئی ضرورت نہیں، ہم اب ان کو اپنی تلواریں دیں گے! حضور! اگر آپ پر یہ وحی آئی ہے تو سر آنکھوں پر ہمیں قبول ہے، اگر آپ کی ذاتی رائے اور طبیعت کا فیصلہ ہے تب بھی قبول ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وحی بھی نہیں آئی اور طبیعت میری بھی قبول نہیں کرتی لیکن میں تمہاری مشقت دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا چاہ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ حضور! ہماری مشقت کو چھوڑ دیں ہم آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کو کھجور کا دانہ بھی نہیں دیں گے۔ چونکہ ابھی معاہدہ فائنل نہیں ہوا تھا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ختم فرمادیا۔

### حضرت سعد بن معاذ کا جذبہ ایمانی:

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ قبیلہ اوس کے سردار تھے۔ بنو حارثہ کا قلعہ تھا جہاں پر مستورات کو محفوظ کیا ہوا تھا۔ حضرت سعد بن معاذ وہاں اپنی والدہ کے پاس گئے۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا بھی وہاں پر تھیں۔ ابھی پردے کا حکم نازل نہیں تھا امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ان کی ذرہ چھوٹی سی تھی تو میں نے ان کی والدہ سے کہا کہ ان کو ذرہ بڑی دو تاکہ ان کو زخم نہ لگے۔ ان کی والدہ کہنے لگیں کہ کوئی مسئلہ نہیں، جو اللہ کو منظور ہو وہ ہو کر رہتا ہے۔ خیر حضرت سعد بن معاذ جب لشکر میں آئے تو ان کو بازو میں تیر لگا جس سے خون بہنے لگا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ یا اللہ! میری دو خواہشیں ہیں؛ ایک تو یہ ہے کہ اگر آئندہ قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی حملہ کرنا ہے تو اس وقت تک مجھے زندہ رکھ تاکہ میں ان کا مقابلہ کروں جنہوں نے حضور کو ستایا ہے، آپ کو ہجرت پر مجبور کیا ہے، آپ کو تکلیفیں دی ہیں، ایذائیں پہنچائی ہیں اور اگر آئندہ کوئی

ایسا سلسلہ نہ ہو تو مجھے شہادت کی موت عطا فرما اور میری دوسری خواہش یہ ہے کہ قبیلہ بنو قریظہ نے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بد عہدی کی ہے تو میں جب تک ان کا انجام نہ دیکھ لوں مجھ پر موت نہ آئے، یہ دوسری خواہشیں ہیں۔ اللہ نے ان کی دونوں دعاؤں کو قبول فرمالیا۔

### حضرت نعیم بن مسعود کا ایمان اور جنگی تدبیر:

اب ہوا یوں کہ قبیلہ غطفان جو احزاب میں ایک بڑی طاقت کا حامل قبیلہ تھا اس قبیلہ کے ایک فرد نعیم بن مسعود مسلمان ہوئے اور مدینہ منورہ آگئے، انہوں نے کہا کہ حضور! میں نے کلمہ پڑھا ہے میرے ذمہ آپ خدمت لگائیں میں کیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم تنہا کیا کر سکتے ہو! واپس جاؤ اور جتنا ممکن ہو سکے اسلام سے مدافعت کا کام کرو! اب اس صحابی کا ذوق دیکھو! انہوں نے کہا کہ حضور! آپ مجھے اجازت دیں کہ اگر میں وہاں جا کر جو مصلحت دیکھوں اس کے مطابق کچھ کرنا چاہوں تو کر سکوں! فرمایا: کرو تمہیں اجازت ہے۔

یہ سیدھا بنو قریظہ کے پاس گئے۔ ان کو جا کر کہا کہ تم مجھے جانتے ہو کہ میں تمہارا پرانا دوست ہوں! کہا کہ جی جانتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ قریش تو مکہ چلے جائیں گے، ہم قبیلہ غطفان والے بھی چلے جائیں گے، یہودیوں کے دوسرے قبائل بھی شکست ہوئی تو اپنے اپنے وطن واپس لوٹ جائیں گے اور تم تو مدینہ میں رہتے ہو، تمہارا مال اور تمہاری عورتیں تو یہیں مدینہ میں ہیں، اگر فتح مسلمانوں کو مل گئی تو تمہارا کیا بنے گا؟ بنو قریظہ نے کہا کہ بات تو ٹھیک ہے۔ انہوں نے کہا کہ پھر میں تمہیں خیر خواہانہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم قبیلہ غطفان سے اور قریش سے معاہدہ کرو کہ وہ اپنے پچاس سردار تمہارے پاس بطور گروی رکھیں کہ اگر تمہیں شکست ہوئی اور انہوں نے تمہارا ساتھ دیا ہو گا تو تم ان کے سردار ان کو واپس کر دو گے اور اگر ساتھ نہ دیا تو تم ان کے

سرداروں کو قتل کرو گے۔ انہوں نے کہا کہ بات تمہاری بہت اچھی ہے، ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔

وہ صحابی ان سے بات کرنے کے بعد سیدھے ابوسفیان کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ اے ابوسفیان! جس بنو قریظہ پر تم نے اعتماد کیا ہے وہ تمہارے نہیں ہیں، انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں ہیں؟! کہا کہ وہ تم سے معاہدہ کرنے کے بعد اپنے فیصلے پر بڑے نادم ہیں اور پریشان ہیں، انہوں نے اندرون خانہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشکش کی ہے کہ ہم قریش اور غطفان کے چند سردار تمہارے حوالے کریں گے تم ان کو قتل کر دینا۔ پھر ہم آپ کے ساتھ مل کر ان سب سے جنگ کریں گے۔ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس شرط کو قبول کر لیا ہے۔ اب آپ قریش جو فیصلہ کریں سوچ سمجھ کر کریں۔

پھر یہ صحابی اپنے قبیلہ غطفان کے پاس گئے، ان کو جا کر کہا کہ قبیلہ بنو قریظہ تمہارے ساتھ نہیں ہے، تم تو باہر سے آئے ہو اور وہ مدینہ شہر میں رہتے ہیں، جن پر تم نے اعتماد کیا ہے کہ مشکل وقت میں ساتھ دیں گے وہ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے، انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کیا ہے تمہارے پیچاس سردار لیں گے، ان کے حوالے کریں گے اور وہ انہیں قتل کریں گے، اس طرح تم دوڑ جاؤ گے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا مسلمانوں سے معاہدہ ہے، بنو قریظہ اوپر سے تو تمہارے ساتھ ہیں لیکن اندر سے مسلمانوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بات تو تمہاری ٹھیک لگتی ہے۔

ابوسفیان نے کہا: اب دیکھیں کہ نعیم بن مسعود کی بات غلط ہے یا ٹھیک ہے؟ تو ابوسفیان نے دو آدمی بنو قریظہ کے پاس بھیجے، قریش کی طرف سے عکرمہ بن ابی جہل کو اور بنو غطفان کی طرف سے ورقہ بن غطفان کو اور یہ پیغام دیا کہ کافی دن گزر گئے ہیں ہمارے پاس خوراک کم ہو گئی ہے، ہمیں تمہاری خوراک کی ضرورت ہے، کافی دن ہو



گئے ہیں تیر اندازی دونوں طرف سے ہو رہی ہے اسلحہ کم ہے ہمیں تمہارے اسلحہ کی ضرورت ہے، تم نے ہمارے ساتھ معاہدہ کیا تھا لہذا اسلحہ بھیجو اور جنگ میں شرکت کرو ہمارا ساتھ دو۔

جب انہوں نے بندے بھیجے تو بنو قریظہ نے کہا کہ ہم جنگ میں شرکت کریں گے لیکن ہماری ایک شرط ہے کہ تم پچاس سردار ہمارے پاس گروی رکھو ہم پھر تمہارے ساتھ چلیں گے، اگر تم چلے گئے تو ہمارا کیا بنے گا؟ اگر مسلمانوں کو فتح ہوئی تو تم ہمارا ساتھ دو گے اس لیے پچاس سردار بطور گروی ہمارے پاس رکھو۔ ابوسفیان نے کہا کہ نعیم بن مسعود ٹھیک کہتا تھا، ہم نے ان پر بھروسہ کیا لیکن یہ ہمارے مخالف ہو گئے۔ اس سے ان کا دل ٹوٹ گیا کہ اب اندر کے لوگ بھی مخالف ہو گئے ہیں۔ ابوسفیان نے بھی پیغام بھیجو دیا کہ تم نے ساتھ دینا ہے تو دو لیکن ہم اپنے سردار تمہارے پاس گروی نہیں رکھیں گے۔ اس سے بنو قریظہ نے بھی کہا کہ واقعی نعیم بن مسعود نے ہم سے ٹھیک بات کہی تھی۔

### حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا دشمن کی خبر لانا:

اندازہ کرنا کہ یہ کس قدر مشقت کا معاملہ تھا! ادھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت نماز پڑھی اور فرمایا کہ تم میں سے کون ہے جو ابوسفیان کے قافلے میں جائے اور آکر مجھے حالات بتائے۔ ایک شخص بھی کھڑا نہیں ہوا۔ حالات کی کتنی سختی ہوگی! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر نماز شروع کر دی، دو رکعات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر پوچھا کہ تم میں سے کون ہے جو اس لشکر کی خبر لائے گا۔ ایک بھی کھڑا نہیں ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر نماز شروع کر دی۔ پھر سلام پھیرا اور پوچھا کہ کون خبر لائے گا؟ صحابہ پھر خاموش ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم جاؤ! حضرت حذیفہ کھڑے ہو

گئے کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا۔

سردی بہت سخت تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے کچھ دعا فرمائی، اپنا ہاتھ مبارک ان کے سر اور چہرے پر پھیرا اور ان کو رخصت کیا تو فرمایا کہ تم نے یہاں سے لے کر وہاں جانے تک پھر واپس میرے پاس آنے تک کام کچھ نہیں کرنا صرف تم نے مجھے خبر لا کر دینی ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں وہاں سے اٹھا تو میں اس طرح چل رہا تھا کہ جیسے کوئی بندہ گرم حمام میں چل رہا ہو، آج کے دور میں ایسے سمجھو جیسے ہیڑ لگا لیا جائے تو گرمائش محسوس ہوتی ہے۔ ایسے بدن گرم ہو گیا کہ ٹھنڈک اور سردی کا احساس ہی ختم ہو گیا۔ دل سے خوف بھی ختم ہو گیا اور دشمن کا رعب بھی ختم ہو گیا۔ حضرت حذیفہ رات کو جہاں مشرکین کے خیمے تھے وہاں چلے گئے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابوسفیان میرے نشانے پر تھا، میں تیرا تاتو وہ قتل ہو جاتا لیکن مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات یاد آگئی کہ تو نے کرنا کچھ نہیں ہے بس مجھے آکر اطلاع دینی ہے، اس لیے میں نے اپنے تیر کو روک دیا۔ کہتے ہیں کہ وہاں سب آگ سینک رہے تھے تو میں بھی جا کر وہاں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ حالات چونکہ سخت تھے کہ ہوا سے خیمے اکھڑ گئے تھے، ان کی ہانڈیاں الٹ گئی تھیں تو ابوسفیان چاہتا تھا کہ واپسی کا اعلان کریں اس لیے اس نے خاص ذمہ داروں سے بات کرنا چاہی۔

سب بیٹھے تھے تو انہوں نے کہا کہ ہمارا راز کہیں فاش نہ ہو جائے اس لیے جو بندے بیٹھے ہیں ہر بندہ ساتھ والے سے پوچھے کہ تو کون ہے؟ حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ میں بہت پریشان ہو گیا کہ مجھ سے پوچھا تو میں تعارف کیا کر اؤں گا؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے ذہن میں ایک بات آئی کہ جو میرے ساتھ بیٹھا

ہوا تھا میں نے پہل کی اور اس سے پوچھ لیا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا میں فلاں بن فلاں ہوں۔ قبیلہ ہوازن کا کوئی آدمی تھا۔ جب اس نے بتایا تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، مجھے اب تسلی ہے کہ بندے اپنے ہی ہیں۔ اس نے ان سے پوچھا ہی نہیں۔

اب ابوسفیان نے کہا کہ حالات بہت خراب ہیں، ہمارے پاس کمک بھی نہیں ہے، بنو قریظہ نے ہمارے ساتھ غداری کی ہے، لہذا بہتر یہی ہے کہ یہاں سے نکلو! یوں پورے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اور سب جانے کی تیاری کرنے لگے۔ حضرت حذیفہ رات ہی کو واپس آئے اور آکر خبر دی کہ یا رسول اللہ! وہ جارہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنے مسکرائے کہ حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ رات کی تاریکی میں مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دانت مبارک نظر آنے لگے۔ جب انہوں نے خبر دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”الْآنَ نَغْزُوهُمْ وَلَا يَغْزُونَنَا نَحْنُ نَسِيرُ إِلَيْهِمْ“<sup>135</sup> اب مشرکین ہم پر حملہ نہیں کریں گے، جب بھی ہو گا ہم ہی حملہ کریں گے اور ان کے ملک پر چڑھائی کریں گے۔ یعنی یہ آخری معرکہ تھا جو ختم ہو گیا، اس کے بعد ہمارے اوپر کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔

### غزوہ بنو قریظہ:

خیر مشرکین چلے گئے، مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ ابھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام مدینہ پہنچے ہی تھے کہ جبرائیل امین حضرت وحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں تشریف لائے، انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! آپ لوگوں نے ہتھیار اتار دیے ہیں لیکن ہم فرشتوں نے نہیں اتارے، ابھی بنو قریظہ کی طرف چلیں اور ان کی خبر لیں۔ جبرائیل امین نے کہا کہ میں آپ سے پہلے جا رہا ہوں آپ بھی آجائیں اور

ہتھیار لے کر آئیں۔ جب مسلمان وہاں پہنچے تو بنو قریظہ نے خود کو قلعہ میں بند کر لیا۔ مسلمانوں نے اس قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ بنو قریظہ کا سردار تھا کعب بن اسد، اس نے اپنے قبیلہ والوں سے کہا کہ تین باتوں میں تم کو اختیار ہے:

نمبر 1: تم سب کو معلوم ہے کہ مسلمان سچے ہیں قرآن سچا ہے اس لیے کلمہ پڑھ لو اور حضور کی غلامی میں آ جاؤ! دنیا میں مال، اولاد بچا لو گے اور آخرت میں عذاب سے بچ جاؤ گے۔

نمبر 2: اپنے بچوں اور عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرو اور پھر ان سے لڑو ورنہ تمہارے بعد ان کا حشر بہت برا ہو گا۔

نمبر 3: یوم السبت یعنی ہفتے کے دن مسلمانوں پر حملہ کر دو کیونکہ مسلمان سمجھتے ہیں کہ یہ دن ہمارے نزدیک بڑا مقدس دن ہے اور ہم اس دن مسلمانوں پر حملہ نہیں کریں گے۔ اس دن یہ لوگ بے خبر ہوں گے تو تم اسی دن بے خبری میں ان پر حملہ کر دو اور مسلمانوں پر فتح حاصل کر لو۔

اس کی قوم نے کہا کہ کلمہ تو ہم کبھی نہیں پڑھیں گے، تورات تو ہم چھوڑ نہیں سکتے۔ بچے اور عورتیں ذبح کرنا یہ ہمارے بس میں نہیں ہے اور ہفتے والے دن ان پر حملہ کریں تو یہ ہماری شریعت کے خلاف ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے تمہیں تین آپشن دیے ہیں باقی تمہاری مرضی ہے۔ بالآخر سب اس پر متفق ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں، جو فیصلہ حضور کریں گے وہی قبول ہو گا۔

انصار صحابہ میں سے جو اوس قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے ان کا بنو قریظہ کے ساتھ کسی زمانے میں معاہدہ رہا تھا تو ان انصار صحابہ نے کہا کہ بنو قریظہ کا معاملہ ہمارے حوالے کر دیں۔ بنو قریظہ کا بھی خیال تھا کہ اوس سے ہمارے پرانے تعلقات ہیں وہ ہمارے حق میں کوئی نرم فیصلہ کریں گے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

میں اس کا فیصلہ تمہارے ہی ایک سردار کے سپرد کر دوں تو کیا تم راضی ہو؟ ان صحابہ نے کہا جی ہاں ہم راضی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔ اس بات پر سب راضی ہو گئے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ قبیلہ اوس کے سردار تھے، زخمی تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے مسجد نبوی میں خیمہ لگوا دیا تھا تاکہ لوگ وہاں آ کر ان کی تیمارداری کریں۔ فیصلہ ان کے سپرد ہوا تو حضرت سعد نے عجیب فیصلہ کیا۔ فرمایا کہ ان کے جو مرد لڑنے کے قابل ہیں سارے ذبح کر دیے جائیں، ان کی عورتوں اور بچوں کو باندیاں اور غلام بنالیا جائے اور ان کا سارا مال بطور غنیمت کے مسلمانوں کے حوالے کیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب تو سعد کا فیصلہ ہے، اسی پر عمل ہوا کہ بچے اور عورتیں باندیاں اور غلام بن گئے اور جو ان سارے ذبح ہو گئے اور جتنا مال تھا وہ مسلمانوں کے حوالے ہو گیا جس طرح مال غنیمت جمع ہوتا ہے۔

### احسان کا بدلہ احسان:

ایک صحابی تھے حضرت ثابت بن شماس بن قیس رضی اللہ عنہ۔ زمانہ جاہلیت میں ایک جنگ ہوئی تھی جنگ بعاث اس میں حضرت ثابت بن شماس قید ہو کر بنو قریظہ کے ایک آدمی زبیر بن باطا کے قبضے میں آ گئے تھے۔ زبیر بن باطا نے ان کا سر مونڈ کر ان کو چھوڑ دیا، آزاد کر دیا اور قتل نہیں کیا۔ اب ان کا جی چاہا کہ میں اس کے احسان کا بدلہ دوں! چنانچہ انہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں فلاں جنگ میں قیدی بنا تھا اس نے میرا سر مونڈ کر مجھے چھوڑ دیا تھا، مجھے قتل نہیں کیا تھا تو میرا جی چاہتا ہے کہ آپ اس کو آزاد فرمادیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آزاد فرما دیا۔ حضرت ثابت بن شماس نے اسے کہا کہ دیکھو تم نے مجھ پر احسان کیا تھا تو میں نے اس احسان کا بدلہ تمہیں دے دیا ہے۔ زبیر بن باطا نے کہا کہ اس زندگی کا

کیا فائدہ جس میں بیوی اور بچے میرے ساتھ نہ ہوں۔ وہ صحابی پھر گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی بیوی اور بچے آزاد کرنے کی درخواست کی۔ فرمایا کہ اس کی بیوی اور بچے بھی آزاد ہیں۔ اس نے کہا کہ میں نے وہاں کیا جینا ہے جہاں میرا مال بھی میرے پاس نہ ہو۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے، فرمایا کہ اس کا مال بھی اس کو دے دو۔ یوں اس شخص کو اس کے احسان کا پورا پورا بدلہ دیا گیا۔

### ایک کافر کی قومی حمیت:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ایک مسلمان کی شرافت اور احسان شناسی ہے کہ احسان کا بدلہ احسان سے دیا۔ اب اس کافر کی غیرت کو بھی دیکھو! اس کافر نے کہا کہ ہمارے یہودیوں کے سردار ابن ابی الحقیق کہاں ہیں؟ بتایا گیا کہ وہ قتل ہو گیا ہے۔ اس نے پوچھا کہ بنو قریظہ کے سردار کعب بن قریظہ اور عمرو بن قریظہ کا کیا بنا؟ کہا کہ وہ بھی قتل ہو گئے ہیں۔ پھر اس نے دو جماعتوں کے متعلق پوچھا تو ان کے بارے میں بھی یہی بتایا گیا کہ وہ بھی قتل ہو گئے ہیں۔ یہ سن کر زبیر بن باطانے کہا کہ جب سارے قتل ہو گئے ہیں تو میرے زندہ رہنے کا کیا فائدہ! مجھے بھی قتل کرو! حضرت ثابت بن شماس نے کہا کہ میں تو تمہیں اپنے ہاتھ سے نہیں مار سکتا۔ کہتا ہے کہ تم نہیں مار سکتے تو کسی اور سے کہو کہ مجھے قتل کرے، میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ تو کسی اور صحابی نے اس کو قتل کر دیا۔ اب دیکھو! یہ اس کافر کی غیرت تھی جس نے اپنوں کے ساتھ مرنا تو گوارا کیا لیکن غیر کے پاس زندہ رہنا گوارا نہیں کیا۔

اللہ ہم سب کو دین اور مذہب کی غیرت عطا فرمائے۔ بہر حال یہ غزوہ احزاب کا پورا خلاصہ تھا جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔

### کفار و منافقین کی بات نہ مانیں!

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنَّ اللَّهَ

كَانَ عَلَيْنَا حَكِيمًا ﴿٢٠﴾ وَأَتَّبِعْ مَا يُوْحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿٢١﴾

ہجرت مدینہ کے بعد مکہ مکرمہ کے کچھ مشرکین ولید بن مغیرہ اور شیبہ بن ربیعہ مدینہ منورہ آئے اور انہوں نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ کپڑے و ماٹریاں لے کر، آپ نے جو دعویٰ کیا ہے اس دعوے سے دستبردار ہو جائیں تو ہم قریش اپنی آدھی دولت آپ کو دیں گے۔ ادھر مدینہ کے یہود نے بھی کہا کہ اگر آپ اپنے دعوے اور اسلام کی دعوت سے باز نہ آئے تو ہم آپ کو قتل کر دیں گے۔ تو اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

بعض روایات میں ہے کہ جب حدیبیہ والا واقعہ ہو چکا تھا، مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ اب ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہیں کریں گے۔ اس زمانے میں مکہ مکرمہ سے ابوسفیان، عکرمہ بن ابی جہل اور ابو العور سلمیٰ یہ مدینہ منورہ آئے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ایک تو آپ ہمارے معبودوں کی برائی کرنا چھوڑ دیں اور دوسرا آپ صرف یہ کہہ دیں کہ یہ بھی نفع پہنچاتے ہیں شفاعت کرتے ہیں، بس اتنا کر لیں تو ہم آپ کو بھی کچھ نہیں کہیں گے اور آپ کے رب کو بھی چھوڑ دیں گے! ان کی یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو بہت بری لگی تو بعض صحابہ کرام کا ذہن بنا کہ ان کو قتل کر دینا چاہیے کہ انہیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ بات کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ لیکن چونکہ حدیبیہ میں معاہدہ ہو چکا تھا اس معاہدے کی وجہ سے قتل نہیں کر سکتے تھے تو قرآن کریم نے کہا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ ۚ إِنَّ اللَّهَ

كَانَ عَلَيْنَا حَكِيمًا ﴿٢٢﴾

یہاں خطاب اگرچہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن سنایا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو جا رہا ہے۔ اے نبی! اللہ سے ڈرو۔ کیا مطلب کہ یہ جو تم نے ان کو مارنے کا ارادہ کیا ہے اس کو ختم کرو۔ ﴿وَلَا تُطِيعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ﴾ کفار اور منافقین کی بات کبھی نہ مانو! کفار جو مکہ سے آئے تھے یا مدینہ کے یہودی تھے اور آپ کو پیشکش کر رہے تھے تو ان کی بات ہرگز نہ مانیں اور بعض لوگ جو مدینہ کے ہیں اور اوپر سے مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں لیکن اندر سے کافر ہیں یعنی منافق لوگ تو ان کی بات بھی نہ مانیں، ﴿إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والے حکمت والے ہیں۔

اور اگر یہ خطاب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو اور سنایا بھی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو تو پھر اس کا معنی یہ ہے اللہ کے نبی! اللہ سے ڈرتے تو آپ پہلے بھی ہیں اور کفار کی اطاعت تو پہلے بھی نہیں کرتے تھے لیکن اس پر چٹنگی سے کاربند رہیں کہ گناہ بھی نہیں کرنا اور کفار کی بات کو ماننا بھی نہیں ہے۔

### نام لے کر خدا نے پکارا نہیں:

قرآن کریم میں یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اعزاز ہے کہ ان کا نام لے کر اللہ نے خطاب نہیں فرمایا، جب بھی خطاب کیا ہے تو کسی وصف سے کیا ہے، ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ﴾، ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ﴾، ﴿يَا أَيُّهَا الْمَرْمَلُ﴾، ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ جبکہ باقی انبیاء علیہم السلام کا نام لے کر خطاب فرمایا ہے۔

### تین باطل خیالات و رسوم کی تردید:

﴿مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ ۚ وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمُ الْاِثْنَى تَطْهَرُونَ مِنْهُنَّ امْهَتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاءَكُمْ اَبْنَاءَكُمْ ۚ ذِكُّكُمْ



قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ﴿٢٠﴾

عرب میں تین قباحتیں رائج تھیں اور ان میں تین غلط باتیں معروف تھیں۔ ان میں ایک یہ کہ جو سمجھ دار آدمی ہوتا اور بات کی تہہ تک پہنچتا تو لوگ اس کے بارے میں کہتے کہ اس کے دودل ہیں۔ تو اللہ نے فرمایا: ﴿مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ﴾ کہ اللہ نے کسی آدمی کے پیٹ میں دودل پیدا نہیں فرمائے، آدمی ایک ہوتا ہے تو اس کا دل بھی ایک ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں لوگ یہ تو نہیں کہتے کہ دل دو ہوتے ہیں لیکن باتیں ایسی کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دودل کا کہہ رہے ہیں جیسے میرا ایک دل کرتا ہے کہ آج پڑھ لوں اور ایک دل کرتا ہے کہ آج نہ پڑھوں! اس جملے سے ایسے لگتا ہے کہ اس کے دودل ہیں حالانکہ دل تو ایک ہی ہوتا ہے، اس لیے اگر اس کے بجائے یہ کہہ دیا کریں کہ میرا ایک خیال ہے کہ پڑھ لوں اور ایک خیال آتا ہے کہ نہ پڑھوں، اب بات بالکل قرآن کریم کے مطابق ہو جائے گی۔

### رسم ظہار:

قرآن نے ایک تو اس رسم کی تردید کی ہے اور دوسری رسم جس کی تردید کی ہے وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنی ماں کی پیٹھ کے ساتھ تشبیہ دے دیتا یا اپنے ماں کے کسی اور عضو کے ساتھ تشبیہ دے دیتا یعنی تو میرے لیے ایسے ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ، میری ماں کا پیٹ تو لوگ اس کو ہمیشہ کے لیے حقیقی ماں کی طرح حرام سمجھتے تھے۔ شریعت نے اس کی تردید کی ہے کہ ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے، اس کو وہ بھی ”ظہار“ کہتے تھے اور شریعت بھی ”ظہار“ کہتی ہے۔ ظہار؛ ظہر سے ہے، ظہر پیٹھ کو کہتے ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا کہ تیری پیٹھ میرے لیے ایسے ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ۔ شریعت نے اس رسم کو ختم کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسا کہنے سے بیوی حرام تو ہو جاتی ہے

لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ کچھ وقت کے لیے۔ اٹھائیسویں پارے کے شروع میں یہ مسئلہ بیان فرما دیا ہے، اس موقع پر تفصیل کے ساتھ آئے گا کہ اس کا کفارہ ادا کر دو، کفارہ ادا کرنے کے بعد بیوی اپنے شوہر کے لیے پھر حلال ہو جاتی ہے۔

یہاں ایک بات سمجھیں۔ محرم یہ بہت قابل احترام رشتہ ہے۔ اگر اس کے عضو کے ساتھ بیوی کو تشبیہ دی ہے تو بیوی حرام ہوئی ہے۔ اب بیوی کے حرام ہونے کی وجہ سے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ جو ہماری ماں ہے اس کا احترام کم ہو گیا ہے، اس سے ماں کا احترام بڑھا ہے کم نہیں ہوا، اس سے بہن کا احترام بڑھا ہے کم نہیں ہوا یعنی ماں، بہن، بیٹی، پھوپھی اتنی احترام والی ہیں کہ اگر بیوی کو ماں یا بہن یا بیٹی یا پھوپھی کہہ دیا تو بیوی حرام ہو جائے گی جب تک کفارہ ادا نہیں کریں گے اس کے پاس جانا حرام ہے۔ تو اس سے ماں اور بہن کی عزت بڑھی ہے یا کم ہوئی ہے؟ یقیناً بڑھی ہے۔

### شاہ اسماعیل شہید پر اعتراض کا جواب:

اب اس سے اچھی طرح یہ بات سمجھیں کہ اہل بدعت نے اہل السنۃ و الجماعۃ احناف دیوبند پر جو اعتراضات کیے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور دورانِ نماز گدھے کا خیال آجائے تو نماز نہیں ٹوٹی اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آجائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ اعتراض یوں کرتے ہیں لوگوں کو دیوبند سے نفرت دلانے کے لیے کہ دیکھو یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخ ہیں کہ گدھے کے خیال سے نماز نہیں ٹوٹی اور حضور کا خیال آجائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

یہ عبارت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی نہیں ہے، یہ عبارت تو سید احمد شہید کی ہے جس کو نقل شاہ محمد اسماعیل شہید نے فرمایا ہے۔ شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید رحمہما اللہ یہ بزرگ دارالعلوم دیوبند بننے سے پہلے کے ہیں بعد کے نہیں ہے۔ اس

لیے یہ کہنا کہ دیوبندی بزرگوں نے لکھا ہے یہ بات بھی غلط ہے اور بعض لوگ نہیں سمجھتے تو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا نام لے کر کہتے ہیں کہ حضرت تھانوی نے لکھا ہے... حالانکہ عبارت حضرت تھانوی کی بھی نہیں ہے۔

اور تیسری بات یہ سمجھیں کہ یہ جو عبارت بیان کی جاتی ہے عبارت یوں نہیں ہے کہ اگر کسی کو دورانِ نماز گدھے کا خیال آگیا تو نماز نہیں ٹوٹی اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آگیا تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ عبارت نقل بھی غلط ہوتی ہے۔

چوتھی بات... اس کی اصل عبارت سن لیں کہ عبارت وہاں پر کیا ہے کہ عبادتِ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے، اس لیے ہر ایسے عمل سے بچنا چاہیے جہاں اللہ کے بجائے غیر اللہ کی عبادت کا شبہ ہو۔ اگر نماز کے دوران حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آجائے تو حضور اتنے عظمت والے ہیں کہ بندے کا دل نہیں کرتا کہ خیال وہاں سے ہٹے، بندہ خیال کو جما دیتا ہے، اب ظاہر ہے کہ نماز تو اللہ کے لیے ہے اللہ کے نبی کے لیے تو نہیں ہے، اس لیے وہاں خیال کو جما نہیں دینا چاہیے بلکہ ہٹا دینا چاہیے تاکہ نماز خالص اللہ پاک کے لیے ہو جائے۔

اب آپ نماز پڑھ رہے ہیں، نماز کے دوران خیال آ جاتا ہے مدینہ کا، روضہ کا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا، مدینہ کی گلیوں میں چلنے کا تو بندے کا ذہن وہاں متوجہ ہوتا ہے، ادبِ محبت عقیدت اتنی ہوتی ہے کہ دل نہیں کرتا کہ خیال وہاں سے بدلے حالانکہ خیال نہیں آنا چاہیے، نماز خالص اللہ کے لیے ہے اور اگر نماز کے دوران گدھے کا خیال آجائے تو گدھا اتنا کمزور اور ناپسند ہے کہ اس کی طرف بندے کا ذہن جائے بھی تو ذہن جھٹک کر واپس آ جاتا ہے۔ اب نماز کے دوران گدھے کے خیال آ جانے سے آدمی کا ذہن کسی اور یعنی مخلوق کی طرف نہیں جاتا لیکن اگر دورانِ نماز اللہ کے نبی کا خیال آجائے تو آدمی جھٹک کر ادھر سے ذہن کو کھینچتا نہیں ہے بلکہ

ادھر ذہن رکھتا ہے۔ تو اب غیر اللہ؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق ہیں خالق تو نہیں ہیں تو نماز میں ذہن ان کی طرف منتقل ہونا یہ مناسب نہیں ہے۔

سید احمد شہید نے یہ بات سمجھائی ہے کہ دورانِ نماز اگر گدھے کا خیال آ جائے تو ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا اور منتقل کرنے کو دل بھی نہیں کرتا، اس لیے بندہ فوراً ذہن بدل کے اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو یہ نقصان دہ کم ہے اور اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آ جائے تو بندہ ذہن ادھر سے جھٹکتا نہیں ہے بلکہ ادھر متوجہ رکھتا ہے اور یہ اللہ کی عبادت میں زیادہ مغل ہوتا ہے، اس لیے گدھے کا خیال آنا اتنا مغل نہیں ہے جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال کا آجانا نقصان دہ ہے۔ اس کی وجہ صرف عبادت ہے اور کوئی نہیں ہے۔

اب اس پر جو بندہ اعتراض کرتا ہے اس کو ایک تو ہم نے علمی انداز میں سمجھایا ہے اور ایک طرزیوں سمجھیں۔ جب کسی بندے کو تحقیقی انداز میں بات سمجھ نہ آئے تو اس کو الزامی طور پر بات سمجھاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اب ان اہل بدعت سے پوچھو کہ اگر تمہارے گھر میں کوئی جانور آ جائے کبھی تو آپ نے کہا کہ اماں جی! پردہ کرو جانور آگیا؟ نہیں کہتے۔ باجی! پردہ کرو جانور آگیا! نہیں کہتے اور اگر گھر میں تمہارا کوئی بزرگ آ جائے تو کہتے ہو جی! پردہ کرو بزرگ آگئے۔ اب کوئی بندہ یہ کہے کہ کیا یہ بزرگ جانور سے بھی بدتر ہوا کہ اس کے آنے سے تو پردہ نہیں ٹوٹا لیکن اس کے آنے سے پردہ ٹوٹ گیا۔

وجہ یہ ہے کہ جانور کے آنے سے پردے کے احترام میں فرق نہیں پڑتا اور انسان اتنا معزز اور محترم ہے کہ اس کے آنے سے پردے کے احترام میں فرق پڑتا ہے۔ اب جانور کے آنے سے پردے کے احترام میں فرق نہ پڑنا یہ جانور کے اعلیٰ ہونے کی نہیں بلکہ گھٹیا ہونے کی دلیل ہے اور انسان کے آنے پر فرق پڑنا یہ انسان کے

گھٹیا نہیں اعلیٰ ہونے کی دلیل ہے۔ اسی طرح نماز میں گدھے کا خیال آئے تو یہ گدھے کے گھٹیا ہونے کی دلیل ہے کہ اس سے نماز میں فرق نہیں پڑتا اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال آنے سے نماز میں فرق پڑتا ہے یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ ہونے کی دلیل ہے۔

اب میں کفارہ ظہار کے حوالے سے مثال سمجھانے لگا ہوں کہ دیکھو! کوئی آدمی اپنی بیوی سے کہہ دے کہ تیری پیٹھ میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے تو بیوی حرام ہو گئی۔ اگر اس نے کہا کہ تیری پیٹھ گدھے کی پیٹھ کی طرح ہے تو حرام نہیں ہوئی۔ اس کا مطلب کہ ماں گدھے سے بھی گندی ہو گئی؟ (نہیں۔ سامعین) اس لیے کہ ماں کی وجہ سے تو بیوی حرام ہوتی ہے لیکن گدھے کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ اب اس کا مطلب کہ ماں گدھے سے بھی گئی گزری ہے؟! ہم کہتے ہیں کہ گئی گزری نہیں ہے، بیوی کو گدھی کہنے سے بیوی حرام نہیں ہوتی کیونکہ گدھی کسی کھاتے میں نہیں ہے اور بیوی کو ماں کہنے کی وجہ سے بیوی حرام ہوتی ہے کیونکہ ماں بہت بڑی عظمت والی چیز ہے۔ بات سمجھ آئی آپ کو؟ (جی ہاں۔ سامعین)

**منہ بولا بیٹا بنانے کی تردید:**

﴿وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ﴾  
تیسری رسم ان میں یہ تھی کہ جب کسی کو متبنیٰ یعنی منہ بولا بیٹا بنا لیتے تھے تو اسے حقیقی بیٹے کی طرح سمجھتے تھے، وہ وراثت میں بھی شریک ہوتا جس طرح حقیقی بیٹا وارث بنتا ہے، اس متبنیٰ کی وفات کے بعد اس کی بیوہ سے اس کا باپ نکاح نہیں کر سکتا تھا اور اگر وہ متبنیٰ اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا تو اس کے بعد بھی اس کا باپ نکاح نہیں کر سکتا تھا اس لیے کہ وہ اس کی حقیقی بہو کی طرح شمار ہوتی تھی۔ تمام معاملات حقیقی بیٹوں کی طرح تھے۔ شریعت نے اس رسم کی تردید کی ہے۔

## حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا قصہ:

لوگ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو زید بن محمد کہتے تھے حالانکہ وہ زید بن محمد نہیں تھے بلکہ زید بن حارثہ تھے، تو اس آیت کے اترنے کے بعد حضرت زید کو زید بن محمد کے بجائے زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔ حضرت زید کو کافروں نے ڈاکہ مار کر چرایا اور مکہ میں لا کر فروخت کر دیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے انہیں خریدا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ہدیہ پیش کر دیا۔ ان کے رشتے دار تلاش کرتے ہوئے مکہ پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا کہ یہ ہمارا بیٹا ہے، اس کی والدہ پریشان ہے، ہم اس کو لے جانا چاہتے ہیں، لہذا آپ جتنا پیسہ لینا چاہتے ہیں لے لیں اور ہمارا بیٹا واپس کر دیں۔ تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بغیر پیسوں کے بھیج دوں گا لیکن آپ خود زید سے پوچھ لیں۔

حضرت زید سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تو یہاں رہے گا تو غلامی اختیار کرے گا۔ حضرت زید نے کہا: میں آزادی سے اس غلامی کو ترجیح دیتا ہوں، میں نہیں جاؤں گا، مجھے اس غلامی پر فخر ہے۔ تو اس کے بعد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد فرما دیا اور منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ چونکہ حضرت زید نے اپنے حقیقی باپ کو چھوڑا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر پر باپ والا ہاتھ رکھا تھا۔ اب مکہ میں ”زید بن محمد“ مشہور ہو گیا۔ تو ان آیات کے نزول کے بعد انہیں زید بن محمد کے بجائے زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بھی افسوس تھا کہ کہاں ”زید بن محمد“ اور کہاں ”زید بن حارثہ“ تو اللہ رب العزت نے ان کے اس دکھ کا ازالہ قرآن کریم میں ان کا نام ”زید“ لے کر فرمایا: ﴿فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا﴾ حضرت زید کا ذکر ان کے نام سے قرآن میں کیا۔ اس کی ایک وجہ مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ جو ان کو دکھ ہوا تھا

تو اس کا ازالہ اس سے کر دیا گیا۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابہ کرام میں سے بڑے سے بڑے صحابی کا نام قرآن میں نہیں ہے اور حضرت زید کا نام قرآن کریم میں ہے۔ بطور قرآن ان کا نام لیں تو تین نیکیاں ملتی ہیں۔ رضی اللہ عنہ، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہمیشہ بہت اعزاز بخشا ہے۔ ام المؤمنین امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت زید کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی کسی جہاد کے قافلے پر بھیجا ہے تو امیر بنا کر بھیجا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک اعزاز تھا، مامور بنا کر آپ ان کو کبھی نہیں بھیجتے تھے۔

**کسی کو بیٹا یا بیٹی بنانے کا حکم:**

﴿ادْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ﴾

متبنی کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اس کو اس کے باپ کے نام سے پکارو! اب یہ مسئلہ ذہن نشین فرمائیں۔ ہمارے ہاں کسی لڑکے کو یا لڑکی کو بیٹا یا بیٹی بنالیں تو جب ان کا نام لکھتے ہیں تو جو حقیقی باپ ہے اس کا نام نہیں لکھتے حالانکہ حقیقی باپ کا نام لکھنا یونین کو نسل میں ضروری ہے، نکاح نامہ میں جب کو انف لکھتے ہیں تو اس میں بیٹی کا حقیقی باپ نہیں لکھتے بلکہ جس نے بیٹی بنایا ہے اس کا نام لکھتے ہیں حالانکہ حقیقی باپ کا نام لکھنا ضروری ہے۔ اور وراثت، پردہ وغیرہ تمام احکام میں بھی حقیقی ماں باپ کا اعتبار ہوگا، جنہوں نے لے کر پالا ہے ان کا نہیں۔

**رسول خدا عزیز از جان:**

﴿النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ ۖ وَأُولَئِذَا دُعُوا إِلَىٰ بَعْضِهِمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۚ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُمْ مَّعْرُوفًا كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ

## مَسْطُورًا ﴿١﴾

یہ فرمایا کہ پیغمبر کی ذات مؤمنین کو ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ محبوب ہے اور پیغمبر کی بیویاں مؤمنین کی مائیں ہیں۔

یہ مسئلہ اچھے طریقے سے سمجھیں کہ پیغمبر مؤمنین کے لیے مؤمنین کی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ پیغمبر کی بیویاں مؤمنین کی مائیں ہیں تو اس سے یہ مسئلہ خود بخود سمجھ میں آ گیا کہ پیغمبر امت کے باپ ہیں۔ اس سے ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں امت کی مائیں ہیں تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم امت کے باپ ہوئے۔ اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ امتی سارے آپس میں بہن بھائیوں کی طرح ہیں، تو پھر نکاح کا مسئلہ کیا ہو گا؟ پھر ان کی وراثت کا مسئلہ کیا ہو گا؟ تو اس شبہ کو ﴿وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ﴾ سے دور کیا کہ پیغمبر اور امت کا یہ رشتہ جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہے، جو تمہارے جسمانی رشتہ دار ہیں وراثت میں وہ تمہارے حق دار زیادہ ہیں ان کو وراثت دو! یعنی ایک بھائی روحانی بھائی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہونے کی وجہ سے اور ایک آپ کا حقیقی بھائی ہے آپ کے ماں اور باپ شریک ہونے کی وجہ سے، اب یہ جو روحانی بھائی ہے مالی معاملات میں زیادہ حق اس کا نہیں ہے بلکہ مالی معاملات میں زیادہ حق اس کا ہے جو آپ کا جسمانی اور خونی بھائی ہے۔ اس شبہ کو اس سے دور کر دیا۔

## نبی کی بیوی سے نکاح کی حرمت منصوص:

یہاں ایک بات اور سمجھیں! یہ جو فرمایا: ﴿وَأَزْوَاجَهُمْ﴾ کہ پیغمبر کی بیویاں یہ امت کی مائیں ہیں۔ پیغمبر کی بیوی کے ساتھ امتی کے نکاح کا حرام ہونا اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے



ساتھ امتی کا نکاح حرام ہے اس حرمت کی دلیل قرآن کریم کی دوسری آیت میں صراحتاً موجود ہے ﴿وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تُنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا﴾ کہ پیغمبر کی بیوی سے امتی کبھی بھی نکاح نہیں کر سکتا۔ یہ مسئلہ ذرا سمجھ لینا! پیغمبر کی بیوی سے امتی کا نکاح حرام ہے اور اس آیت ﴿وَأَزْوَاجَهُ أُمَّهَاتُهُمْ﴾ کو نبی کی بیوی کے ساتھ امتی کے نکاح کے حرام ہونے پر بطور دلیل کے کبھی بھی پیش نہ کرنا۔

”پیغمبر کی بیوی سے امتی کا نکاح کیوں حرام ہے؟“ ہم نے کہا کہ خود اللہ نے حرام قرار دیا ہے ﴿وَلَا أَنْ تُنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا﴾ اس لیے حرام ہے۔ اب دیکھو! ماں سے نکاح کیوں حرام ہے؟ پھوپھی سے نکاح کیوں حرام ہے؟ بہن سے نکاح کیوں حرام ہے؟ بیٹی سے نکاح کیوں حرام ہے؟ اس لیے کہ اللہ نے جو محرمات بتا دیے ہیں بس وہ محرمات ہیں۔ اسی طرح اللہ نے بتا دیا ہے کہ پیغمبر کی بیوی امت کے لیے حرام ہے تو بس حرام ہے۔ نکاح حرام ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ﴿وَأَزْوَاجَهُ أُمَّهَاتُهُمْ﴾ کہ پیغمبر کی بیویاں امت کی مائیں ہیں، کیونکہ اگر پیغمبر کی بیوی امت کی ماں ہے اور اس وجہ سے نکاح جائز نہیں تو خود پیغمبر امت کے باپ ہیں تو پھر نبی کا نکاح بھی کسی امتی کی لڑکی کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے لیکن پیغمبر باپ ہونے کے باوجود امتی لڑکی سے نکاح کر رہے ہیں تو پھر پیغمبر کی بیوی ماں ہو اور امت کا نکاح نہ ہو... حرمت کی یہ وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اس لیے جب مسئلہ حیات اپنی جگہ پر آئے گا تو وہاں پر میں یہ بات سمجھاؤں گا اور یہ دلیل آپ کے ذہن میں ہوگی تو بات سمجھنی بہت آسان ہوگی۔ اب دیکھو! استاد کی بیوی شاگرد کی روحانی ماں ہے لیکن شاگرد نکاح کر سکتا ہے استاد کے فوت

ہونے پر استاد کے طلاق دینے پر، مرشد کی بیوی یہ مرید کی ماں ہے لیکن روحانی ہے اس کے فوت ہونے پر طلاق ہونے پر مرید نکاح کر سکتا ہے۔ پیغمبر کی بیوی روحانی ماں ہے لیکن پیغمبر کی وفات کے بعد بھی امتی نکاح نہیں کر سکتا تو معلوم ہوا کہ اس کی وجہ روحانی ماں ہونا نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ اللہ نے اس سے نکاح حرام قرار دے دیا ہے اور بس۔

### انبیاء علیہم السلام سے عہد:

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَ مِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ ۚ وَأَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا﴾

عام مفسرین کی رائے ہے کہ یہ میثاق؛ عالم ارواح میں لیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے تمام انبیاء سے عہد لیا تھا اور اے حضور! آپ سے بھی عہد لیا، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہم السلام سے بھی لیا اور ہم نے ان سے مضبوط عہد لیا کہ دنیا میں جاؤ گے اور تبلیغ احکام کرو گے۔

﴿لَيَسْئَلَنَّ الصِّدِّيقِينَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۖ وَأَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا أَلِيمًا﴾

تاکہ اللہ سچوں سے ان کی سچائی کے بارے میں پوچھے اور ہم نے کافروں کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ہم نے آپ سے وعدہ لیا تھا کہ آپ نے کام کرنا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کام کیا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پوچھیں گے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہیں گے کہ جی ہاں اے اللہ! جو میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا میں نے اس کے مطابق تبلیغ کی ہے۔

یہاں فرمایا: ﴿مِنَ النَّبِيِّينَ﴾ کہ ہم نے تمام انبیاء سے عہد لیا اور ان پانچ کا بطور خاص اللہ نے الگ ذکر فرمایا؛ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم،

حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام ان کے اعزاز اور اکرام کی بنیاد پر کہ یہ حضرات تمام انبیاء میں سب سے زیادہ اولوالعزم اور مرتبے والے انبیاء ہیں۔

### نبی؛ روح مع الحمد کا نام ہے:

یہاں دیکھیں! عالم ارواح میں وعدہ ہے اور عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء کی روحوں کو نبی فرمایا یعنی روحوں کو ﴿مِنَ النَّبِيِّينَ﴾ کہا۔

وہ لوگ جو قبور میں انبیاء کی حیات کے منکر ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم انکار نہیں کرتے ہم بھی کہتے ہیں کہ نبی زندہ ہے لیکن فرق کیا ہے؟ تم کہتے ہو کہ نبی کا جسم زندہ ہے اور ہم کہتے ہیں کہ نبی کی روح زندہ ہے اور وصفِ نبوت یہ روح کی صفت ہے، وصفِ رسالت یہ روح کی صفت ہے جسم کی نہیں ہے۔ دلیل یہ ہے ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ﴾ عالم ارواح تھا وہاں اجسام نہیں تھے صرف ارواح تھیں اور اللہ نے ارواح انبیاء کو ”النبيين“ فرمایا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی؛ روح ہوتی ہے، نبی؛ جسم نہیں ہوتا۔ تو جب وفات آئی ہے تو ہم نے وفات کے بعد بھی روح کو زندہ مانا ہے تو ہم تو وفات کے بعد نبی کو زندہ مانتے ہیں لیکن اس قبر میں جسم ہے روح نہیں ہے، روح اعلیٰ علیین میں ہے۔ لہذا نبی زندہ ہے اور اعلیٰ علیین میں زندہ ہے۔

اب دیکھیں! بظاہر کتنا عجیب شبہ ہے، بندہ سمجھتا ہے کہ بڑی مضبوط بات ہے۔ اس طرح یہ لوگ کہتے ہیں کہ حدیث پاک میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُنْتُ نَبِيًّا وَآدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالْطِّينِ.<sup>136</sup>

حضرت آدم علیہ السلام کا جسم ابھی مٹی اور گارے کے درمیان تھا میں تب

بھی نبی تھا۔ اس وقت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم نہیں بناتھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیسے نبی تھے؟ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو اللہ نے نبی فرمایا۔ تو یہ وصفِ نبوت روح کے لیے ہے، وصفِ رسالت روح کے لیے ہے، جسم کے لیے نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ نبی؛ روح اور جسم کے مجموعے کو کہتے ہیں، اس پر دلیل ﴿النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾ ہے، پیغمبر کی ذات مؤمنین کے لیے ان کی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ تو مؤمنین نے جس پیغمبر کی ذات کو اپنی جانوں سے عزیز مانا وہ پیغمبر پاک کا جسم بھی تھا یا صرف روح تھی؟ جسم مع الروح تھا۔ آگے ہے ﴿وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ﴾ یہ ”ہ“ ضمیر کا مرجع ﴿النَّبِيُّ﴾ ہے یعنی اس نبی کی بیویاں امت کی مائیں ہیں۔ تو یہ جو بیویاں تھیں یہ جسم کی تھیں یا روح کی تھیں؟ جسم کی تھیں۔ تو قرآن تو خود بتا رہا ہے کہ وصفِ نبوت یہ پیغمبر کے جسم کے لیے ہے لیکن جسم بھی کون سا؟ جس میں روح ہو، وہ جسم نہیں جس میں روح نہیں ہے۔

توجہ سے بات سمجھنا! جب ہم کہتے ہیں کہ قبر میں جسم کو دفن کر دیا گیا تو یہ جسم نبی ہے۔ کیونکہ جسم کی نبوت تو قرآن سے ثابت ہو گئی نا ﴿النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾ مؤمنین اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں نبی کو، وہ نبی کی روح تھی یا جسم تھا؟ (جسم تھا۔ سامعین) جس کے لیے جانیں دی جا رہی ہیں، صحابہ کٹ رہے ہیں، سب کچھ قربان ہو رہا ہے، جس کو بچانے کے لیے طلحہ رضی اللہ عنہ خود تیر کو برداشت کر رہے ہیں تو وہ نبی کا جسم تھا نا! جس کی بیویاں امت کی مائیں ہیں، ”ہ“ ضمیر کا مرجع ﴿النَّبِيُّ﴾ ہے تو یہ بیویاں جسم کی تھیں یا روح کی تھیں؟ روح کی تو نہیں تھیں نا! تو نبی جسم ہوا ہے لیکن جسم کون سا؟ مع الروح والا۔

اب منکرین حیات الانبیاء کہتے ہیں کہ وفات کے بعد نبی زندہ ہے تو سوال یہ ہے کہ وفات کس پر آئی ہے جسم پر یا روح پر؟ روح تو مرتی نہیں ہے تو وفات تب ہی ہو گی جب نبی کے جسم کو نبی مانیں گے! اگر نبی کے جسم کو نبی نہیں مانیں گے تو نبی پر وفات کیسے ہوئی؟ اگر صرف روح نبی ہے تو اس پر وفات آتی نہیں ہے، موت تو تب ہی مانیں گے جب وصفِ نبوت آپ جسم کے لیے ثابت کریں۔ پھر اس کے بعد کہتے ہیں کہ نبی زندہ ہے تو جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ وصفِ نبوت جسم کے لیے ہے تو زندہ کون ہو گا؟ جسم، اور جسم بھی کون سا کہ جس میں روح ہو۔ تو یہ ماننا پڑے گا نا کہ وفات کے بعد جسم زندہ ہے اور وہ جسم زندہ ہے جس کے ساتھ روح کا تعلق موجود ہے، ایسا جسم نبی نہیں ہے کہ جس کے ساتھ روح کا تعلق نہ ہو بلکہ ایسا جسم نبی ہے جس کے ساتھ روح کا تعلق ہو۔

تو قرآن کریم سے ثابت ہو رہا ہے کہ وصفِ نبوت پیغمبر کے جسم کے لیے ہے اور وصفِ رسالت بھی پیغمبر کے جسم کے لیے ہے یہ بھی قرآن سے ثابت ہو رہا ہے، آگے بانیسویں پارے میں آرہا ہے کہ:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ

النَّبِيِّينَ﴾

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں لیکن رسول اللہ ہیں۔ اب دیکھو! جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں وہی محمد اللہ کے رسول ہیں اور جس محمد سے بالغ مردوں کی نفی کی جا رہی ہے وہ محمد کی روح نہیں ہے وہ محمد کا جسم ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ تو جس جسم سے بالغ مردوں کی نفی کی جا رہی ہے اسی جسم کے لیے رسالت کو ثابت کیا جا رہا ہے، کیونکہ ”لَکِن“ عربی زبان میں استدراک کے لیے آتا ہے، استدراک کا معنی ہے کہ کلام سابق میں جو شبہ پیدا ہوا

”لَکِنْ“ کے بعد والا کلام اس شبہ کو دور کرتا ہے۔ ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ دِّجَائِلِكُمْ﴾ حضور بالغ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، اس میں شبہ یہ تھا کہ جب امت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی ابوت سے محروم ہوگئی جسمانی شفقت سے محروم ہوگئی تو کیا اللہ کے نبی کی روحانی ابوت اور روحانی شفقت سے بھی امت محروم ہوئی یا نہیں؟ فرمایا: ﴿وَلَكِنَّ دَسْوَةَ اللَّهِ﴾ کہ امت اگرچہ اللہ کے نبی کی جسمانی ابوت سے محروم ہوگئی ہے لیکن روحانی ابوت باقی ہے اور جب روحانی ابوت باقی ہے تو روحانی شفقت بھی باقی ہے، ﴿وَلَكِنَّ دَسْوَةَ اللَّهِ﴾ اس لیے تمہیں یہ ٹینشن نہیں لینی چاہیے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں تو امت شفقت سے محروم ہوگئی، فرمایا: نہیں، روحانی باپ اب بھی ہیں، اب بتاؤ! کون روحانی باپ ہیں؟ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، وہ جسم جس میں روح موجود ہے۔ تو قرآن کریم سے وصف نبوت بھی جسم کے لیے ثابت ہو رہی ہے اور وصف رسالت بھی جسم کے لیے ثابت ہو رہی ہے۔

### کرے غلط تفسیر اور کہلائے شیخ القرآن!

اب بتاؤ! قرآن کتنی واضح بات کر رہا ہے۔ لوگ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ جی ماشاء اللہ انہیں بہت قرآن آتا ہے۔ میں نے کہا: عجیب بات ہے کہ یہ غلط قرآن پڑھے تو شیخ القرآن بنتا ہے اور غلط تفسیر کرے تو شیخ التفسیر بنتا ہے، یعنی جتنا زیادہ قرآن غلط پڑھے اتنا زیادہ شیخ القرآن بنتا ہے، ارے بابا! غلط قرآن پڑھنے سے بندہ شیخ القرآن تھوڑا بنتا ہے؟! میں ایک بات کہتا ہوں کہ ہمارے ہاں اہل باطل نے اس قدر محنت کی ہے کہ اپنے بارے میں مشہور کر دیا ہے کہ جی یہ قرآن بہت جانتے ہیں اور ایک آپ لوگ ہیں کہ آپ یہاں سے جائیں گے صحیح عقیدہ اور صحیح تفسیر پڑھ کر جائیں گے لیکن

مجال ہے کہ آپ واپس جا کر یہ کہیں کہ ہمارے استاد جی کو قرآن بہت زیادہ آتا ہے! تفسیر کرتے ہیں تو بہت مزا آتا ہے! یہ آپ کبھی نہیں کہیں گے اور وہ پوری دنیا میں پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ جی ہمارے ہاں دورہ ہوتا ہے، قرآن وہاں پہ کھلتا ہے، قرآن کی خدمت بہت ہو رہی ہے۔ اب اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ کہ ہمارے اہل حق بزرگ بھی اپنی زبانوں سے کہہ دیتے ہیں کہ جی عقیدے میں ان سے اختلاف ہے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ قرآن کی خدمت اس نے کی ہے۔ میں نے کہا یہ جو ہم نماز فجر سے پہلے تفسیر پڑھ رہے ہیں یہ قرآن کی خدمت نہیں ہے؟ (خدمت ہے۔ سامعین) فرق صرف یہ ہے کہ ہم خدمت میں شبہات کو رفع کرتے ہیں اور ان کی خدمت یہ ہے کہ قرآن میں شبہات کو پیدا کر رہے ہیں، شر جلدی پھیلتا ہے اور خیر دیر سے پھیلتی ہے، یہ امت کا مزاج ہے۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ قرآن مجید کو سمجھو! اب دیکھو بات کیسے کھل رہی ہے! بندے کا ضمیر کہتا ہے کہ وصفِ نبوت یہ جسم کے لیے ہے۔ راولپنڈی کے ایک عالم تھے، انہوں نے مجھ سے بات کی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ لوگ جنہوں نے اُن کے پاس قرآن پڑھا ہے انہیں کہنا کہ کبھی ہمارے استاذ کے پاس بھی پڑھنا! پھر آپ دیکھنا کہ شبہات ختم کیسے ہوتے ہیں؟! اب دیکھو بندے کا دل مانتا ہے، ضمیر مانتا ہے کہ قرآن کیا کہتا ہے! اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

**امہات المؤمنین کا مطالبہ اور خدائی تنبیہ:**

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَ

زَيَّنَّهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۖ﴾

غزوہٗ احزاب کے بعد بنو نضیر اس کے بعد بنو قریظہ کی فتوحات کے دروازے کھلے تو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! قیصر اور کسریٰ بادشاہ

ہیں ان کی بیگمات سونے سے لدی ہوئی ہیں، ان کی خدمت پر کنیزیں مامور ہیں، ہم اتنا تو نہیں مانگتیں لیکن اب جو وسعت پیدا ہو گئی ہے تو ہمارے خرچے میں بھی وسعت ہونی چاہیے، ہم ان کی طرح نہیں مانگتیں لیکن آپ بھی وسعت فرمادیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کا یہ مطالبہ سنا تو آپ کو بہت رنج ہوا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بلایا، حضرت عائشہ سے پیار بھی سب سے زیادہ تھا۔ فرمایا کہ عائشہ! میں ایک بات کہنے لگا ہوں لیکن اس کا جواب جلدی نہ دینا، ماں باپ سے مشورہ کر کے دینا۔ عرض کیا: حضور فرمائیں! فرمایا کہ دیکھو! اگر تم دنیا چاہتی ہو تو میں طلاق دیتا ہوں اور ساتھ تمہیں دنیا دے کر رخصت کر دیتا ہوں اور اگر مجھے چاہتی ہو تو پھر دنیا کی وسعت نہیں ملے گی اسی فقر کے ساتھ رہنا پڑے گا۔

حضرت عائشہ نے کہا کہ حضور! اس پر بھی کوئی والدین کے ساتھ مشورہ کرنے کی ضرورت ہے؟ اس پر بھی میں ماں باپ سے مشورہ کروں گی؟ میں سب کچھ قربان کرتی ہوں آپ کی ذات پر، آپ کی ذات مل جائے تو ہمیں اور کیا چاہیے؟ یہی بات جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری ازواج مطہرات سے کی تو سب نے یہی جواب دیا لیکن امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے فخر اس بات پر ہے کہ سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ مجھ سے کیا۔ اسے تخییر طلاق کا مسئلہ کہتے ہیں۔ تخییر طلاق دو طرح سے ہوتی ہے:

نمبر 1: خاوند اپنی بیوی سے کہے کہ اگر تم یہ چیز چاہتی ہو، تم اس چیز کو پسند کرتی ہو تو میں تجھے طلاق دے کر یہ چیز دے دیتا ہوں۔

نمبر 2: اگر تم یہ چاہتی ہو کہ تمہیں یہ چیز ملے تو میری طرف سے تمہیں اختیار ہے کہ خود کو طلاق دینا چاہو تو دے لو۔



دونوں صورتیں ٹھیک ہیں۔ پہلی یہ کہ تم یہ چیز لینا چاہتی ہو تو کہو میں تمہیں یہ چیز بھی دے دوں اور تمہیں طلاق بھی دے دوں! وہ کہتی ہے کہ مجھے منظور ہے۔ اب شوہر طلاق دے دیتا ہے اور دوسری صورت یہ کہ بیوی خود اپنے آپ کو طلاق دینا چاہے تو بھی ٹھیک ہے کیونکہ خاوند نے اختیار دیا ہے کہ اگر چاہو تو اپنے آپ کو طلاق دے لو تمہیں طلاق کا اختیار ہے اور یہ چیز بھی لے لو اور بیوی کہتی ہے میں خود کو طلاق دیتی ہوں تو اسے طلاق ہو جائے گی۔

### امہات المؤمنین کا مقام:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ مَنْ يَّاتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيَّنَةٍ يُضَعَّفْ لَهَا

الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾

اے پیغمبر کی بیویو! اگر تم نے گناہ کیا تو تمہیں دو گنا عذاب ملے گا۔

یہاں بات سمجھنا! ”فاحشہ“ سے مراد زنا نہیں ہے، اس کی وجہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی نبی کے نکاح میں ایسی عورت نہیں آئی جس میں زنا کا عیب موجود ہو۔ ہاں ایسی بیوی آئی ہے کہ جس میں کفر ہو لیکن ایسی نہیں آئی جس میں زنا کا عیب ہو۔ آپ کو تعجب تو ہو گا کہ کفر برداشت کیا ہے لیکن زنا کو برداشت کیوں نہیں کیا؟ ایک ہوتا ہے عیب شرعی اور ایک ہوتا ہے عیب عرفی۔ شرعی عیب تو مسلمانوں میں عیب شمار ہو گا اور عرفی عیب مسلمان اور کافر دونوں میں عیب شمار ہو گا۔ کفر؛ یہ انسان میں عیب ہے لیکن یہ عیب شرعی ہے، عیب عرفی نہیں ہے۔ بات سمجھ آرہی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین) معاشرے میں کسی بندے کا کافر ہونا یہ عیب نہیں ہوتا، انسان ہے اس کی مرضی ہے مسلمان ہو اس کی مرضی ہے کافر ہو، شریعت نے اسے پورا اختیار دیا ہے کہ جو چاہے اختیار کرے لیکن زنا یہ عرفی عیب ہے، معاشرے میں اس کو گندا سمجھا جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی بیوی میں وہ

عیب نہیں رکھتے جس کو معاشرے میں گندا سمجھا جاتا ہو۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ یہاں فرمایا ﴿بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ﴾ یعنی کھلی ہوئی بے حیائی۔ یہ جو زنا ہوتا ہے یہ علانیہ نہیں ہوتا، یہ چھپ کر ہوتا ہے اور ”فاحشہ“ کو ”مبینہ“ فرمایا گیا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں زنا مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد عام گناہ ہے۔ بس پیغمبر کی بیوی اگر گناہ کرے گی تو عذاب ڈبل ہو گا اور اگر نیکی کرے گی تو اس کو اجر بھی دوہرا دیا جائے گا جس کا ذکر ”مَوْتَتَيْنِ“ میں آگے آ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ یہ پیغمبر کی بیوی ہے۔

اس سے بعض علما نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ یہی حال عالم کا ہے جو نبی کا وارث ہے، یہ نیک عمل کرے گا تو اس کے عمل پر دوہرا اجر ملے گا اور اگر یہ گناہ کرے گا تو اس کے گناہ پر عذاب بھی دوہرا ہو گا کیونکہ یہ نبی پاک کا وارث ہے، اس کو یہ کام نہیں کرنا چاہیے تھا۔

آگے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے لیے فرمایا: ﴿تَوْتَاهَا أَجْرَهَا مَوْتَتَيْنِ﴾ اس پر پہلے بات ہو چکی ہے کہ انہیں ان کے نیک اعمال پر دوہرا اجر ملے گا، یہ نہیں کہ دو عملوں پر دو اجر ملیں گے۔

### ازواج مطہرات کو پانچ ہدایات:

﴿يُنْسَاءُ النَّبِيُّ نِسَاءً كَاحِدٍ مِنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ  
بِالنُّقُولِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا﴾

اس آیت میں اللہ پاک نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کی عظمت بیان فرمائی ہے کہ دنیا جہاں کی عورتوں سے یہ افضل ہیں اور ان کے افضل ہونے کی وجہ ان کے اعمال نہیں، افضل ہونے کی وجہ نبی کی بیوی ہونا ہے، پیغمبر کی بیوی ہونا اتنا بڑا شرف

ہے جو کسی اور عورت کو نہیں ملتا۔ لہذا ان سے کوئی عورت افضل نہیں ہے۔ یہاں ازواجِ مطہرات کو اللہ نے پانچ ہدایات دی ہیں:

**ہدایت نمبر 1:** اگر کوئی بندہ آئے، کوئی مسئلہ پوچھے، کوئی جائز بات کرے تو بات کرنے کی تو گنجائش ہے لیکن ﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ﴾ عورت کی فطرت میں جو نزاکت ہے اس فطری نزاکت کو تم نے استعمال نہیں کرنا، تم نے تکلف کر کے اس فطری نزاکت کو ختم کر کے تھوڑی سی ترش بات کہنی ہے۔ ﴿فَيَطْمَعَ الذَّيْ فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ﴾ عورت کی فطری نزاکت والی بات کرو گی تو وہ شخص جس کے دل میں مرض ہے اس کے دل میں طمع پیدا ہو گا، تم اس طمع کے دروازے کو بھی بند کر دو۔ ﴿وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا﴾ اور جو عفت کا تقاضا ہے اس کے مطابق بات کیا کرو۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت پیاری بات لکھی ہے، ﴿وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا﴾ کا ترجمہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”اور قاعدہ کے موافق بات کرو!“ لفظ قاعدہ کے بعد تو سین میں لفظ ”عفت“ بڑھا دیا ہے، قاعدہ عفت کے موافق بات کرو یعنی پاکدامن عورتیں جس طرح بات کرتی ہیں اس طرح بات کرو۔<sup>137</sup>

### حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اشکال کا جواب:

آگے فرمایا: ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ بلا ضرورت گھر سے باہر نہ نکلو بلکہ گھر ہی ٹھہرا کرو۔ ام المؤمنین امی عائشہ رضی اللہ عنہا مکہ سے بصرہ گئی ہیں۔ اس پر روافض بہت چیختے ہیں کہ یہ ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ کے خلاف ہے کہ اللہ کا حکم ہے نبی کی بیویاں گھر میں ٹھہریں اور حضرت عائشہ مکہ سے بصرہ چلی گئی ہیں تو قرآن کے حکم کی

خلاف ورزی کی ہے، حالانکہ یہ خلاف ورزی نہیں ہے، ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ کا حکم عام حالات میں ہے اور اگر خاص ضرورت ہو تو نکلنا جائز ہے۔ حضرت امی عائشہ رضی اللہ عنہا مدینہ سے مکہ گئی ہیں اس پر اعتراض کیوں نہیں کیا؟ یہ بھی تو ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ کے خلاف ہے؟! امی عائشہ جب گھر سے نکلی ہیں تو مدینہ سے مکہ پھر مکہ سے بصرہ گئی ہیں، اگر گھر سے نکلنا ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ کے خلاف ہوتا تو اعتراض پھر مدینہ سے مکہ جانے پر بھی ہونا چاہیے تھا۔

کہتے ہیں: نہیں جی! مدینہ سے مکہ جانا ٹھیک تھا چونکہ حج مقصود تھا اور مکہ سے بصرہ کیوں گئی ہیں وہاں مقصود کیا تھا؟ ہم کہتے ہیں کہ وہاں بھی تو شرعی تقاضا مقصود تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں شہید کر دیا گیا تھا تو حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت نعمان بن بشیر، حضرت کعب بن حجرہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین مدینہ سے مکہ پہنچے اور وہاں آکر امی عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ حضرت عثمان تو شہید ہو گئے ہیں اور قاتلان عثمان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حلقے میں ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مجبوری ہے کہ ان سے قصاص نہیں لے سکتے اور اگر ہم مدینہ جائیں گے تو آپ ہمیں بتائیں کہ ہم کیا کریں؟ ہمیں خدشہ ہے کہ لوگ ہمیں بھی مار دیں گے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ دیا کہ تم فی الحال مدینہ نہ جاؤ تم مکہ سے بصرہ چلے جاؤ، وہاں مسلمانوں کی مستحکم حکومت ہے اور تمہیں تحفظ ملے گا، کچھ نہیں ہو گا، جب حالات سازگار ہو جائیں گے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا باغیوں پر کنٹرول ہو جائے گا، مزید قتل و غارت کی ان کو ہمت نہیں ہو گی تو مدینہ چلے آنا! انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ آپ ہماری والدہ ہیں، آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ اب یہ کون ہیں؟ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کے رشتہ دار ہیں، عام آدمی

نہیں ہیں، حضرت عبداللہ بن زبیر یہ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے ہیں اور امی عائشہ ان کی خالہ ہیں، یہ آپ کے محرم ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ بھی چلیں تو اپنے بھانجے کے ساتھ گئی ہیں، محرم کے ساتھ سفر کرنا گناہ بھی نہیں ہے، پھر ہودج پر پردے لٹکائے ہیں، پردے کے ساتھ گئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ بھی کچھ عرصہ وہاں ٹھہریں، ماحول سازگار ہو گا تو آپ بھی تشریف لے آئیں۔ تو جس طرح ان کا شرعی تقاضا مدینہ سے مکہ جانے کا تھا ایسا ہی شرعی تقاضا مکہ سے بصرہ جانے کا بھی تھا۔ اس لیے اعتراض بالکل فضول ہے۔

### ہدایت نمبر 2: ﴿وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى﴾

اور قدیم جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھر! جاہلیت اولیٰ سے مراد وہ جاہلیت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانہ کی عورتیں بے حیائی اور بے شرمی کے ساتھ بلا جھک بازاروں، میلوں، گلی کوچوں میں بے پردہ ہو کر پھر ا کرتی تھی۔ جب باہر نکلتیں تو بن ٹھن کر نکلتیں۔ اپنے پرائے کا امتیاز تھا نہ غیر محرموں سے بچنے کی فکر، اور ایک ہوتی ہے جاہلیت اُخریٰ یعنی اسلام لانے کے بعد آدمی اگر شریعت پر عمل نہ کرے اس کو بھی جاہلیت کہتے ہیں لیکن یہ اُخریٰ ہوتی ہے۔ تو فرمایا کہ جس طرح زمانہ جاہلیت میں عورتیں بغیر پردے کے نکلتی تھیں تم ایسا کبھی نہیں کرنا۔

### ہدایت نمبر 3: ﴿وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ﴾ نماز کی پابندی کیا کرو۔

### ہدایت نمبر 4: ﴿وَاتَيْنَ الزَّكَاةَ﴾ زکوٰۃ ادا کیا کرو۔

### ہدایت نمبر 5: ﴿وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کیا

کرو۔

یہ پانچ ہدایات ازواج مطہرات کو دی ہیں لیکن اس کا خطاب تمام عورتوں کے لیے ہے، سب اس کے اندر شامل ہیں۔

### اہل بیت کا مصداق کون؟

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ

تَطْهِيرًا﴾

اے اہل بیت! اللہ رب العزت چاہتے ہیں کہ تم سے گندگی کو دور کریں اور تمہیں پاک صاف رکھیں۔

یہاں ایک مسئلہ تو یہ سمجھیں کہ اہل بیت کا مصداق کون ہے؟ اہل السنۃ والجماعۃ کا اجماعی عقیدہ ہے کہ اہل بیت میں پہلے پیغمبر کی بیویاں، پھر پیغمبر کی اولاد، پھر اولاد کی اولاد اور پھر داماد شامل ہیں۔ اہل بیت کا اولین مصداق ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن ہیں۔ یہ جو آیت کریمہ ہے یہ ازواج مطہرات کے حق میں نازل ہوئی۔ آپ اس کے پیچھے دیکھیں ﴿يُنْسَاءَ النَّبِيِّ مَن يَأْتِ مِنْكُنَّ﴾ خطاب نبی کی بیویوں کو ہے، اس کے بعد آپ دیکھیں ﴿يُنْسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ﴾ یہاں بھی خطاب نبی کی بیویوں کو ہے، پھر اسی آیت کے آگے دیکھیں ﴿وَإِذْ كُنَّ مَائِيثِلَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ یہاں بھی خطاب نبی کی بیویوں کو ہے۔ تو اس آیت سے پہلے اور بعد میں ازواج مطہرات کا تذکرہ ہے اور انہی کو خطاب ہو رہا ہے، لہذا درمیانی آیت سے مراد بھی ازواج مطہرات ہی ہیں۔ اس لیے اہل بیت کا مصداق ازواج مطہرات ہیں۔

اہل بیت کا آپ لغوی مفہوم دیکھیں تب بھی پیغمبر کی بیویاں ہی ہیں۔ لفظ ”اہل بیت“ میں ”بیت“ کسے کہتے ہیں؟ یہ لفظ ”بَاتَ، يَبِيتُ، بَيْتًا“ سے ہے بمعنی رات گزارنا، ”الْبَيْتُ“ اس کمرے کو کہتے ہیں جہاں آدمی رات گزارے اور اہل بیت

اسے کہتے ہیں کہ جو رات کمرے میں آپ کے ساتھ رہے۔ آدمی کی بیوی رات کو آدمی کے ساتھ کمرے میں ہوتی ہے۔ بیٹا اور بیٹی ایک وقت تک تو ہوتے ہیں لیکن اس کے بعد ان کے سونے کی جگہ الگ ہو جاتی ہے، جو ہمیشہ کے لیے خاوند کے ساتھ کمرے میں آرام کرے یہ بیوی ہوتی ہے، اس لیے اہل بیت سے مراد پیغمبر کی بیویاں ہیں۔

ہمارے عرف میں بھی جب ”گھر والے“ کہا جائے تو گھر والوں سے مراد بیویاں ہوتی ہیں اولاد وغیرہ بعد میں ہے۔ آپ اپنے شاگرد کے پاس جانا چاہتے ہیں اور وہ کہے کہ استاد جی! جب آپ آئیں تو گھر والوں کو بھی ساتھ لائیں۔ اب استاد جائے تو ساتھ بیٹی ہو، ساتھ داماد ہو تو شاگرد پوچھے گا کہ گھر والے آئے ہیں؟ آپ کہتے ہیں کہ نہیں، گھر والے بیمار تھے نہیں آسکتے البتہ بیٹی میرے ساتھ آئی ہے۔ اب ہر بندہ سمجھتا ہے کہ بیٹی اہل بیت نہیں ہے، داماد اہل بیت نہیں ہے، بندہ یہ کہتا ہے کہ گھر والے تو نہیں آسکے البتہ میں بچے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ تو عرف میں بھی اہل بیت سے مراد بیوی ہوتی ہے۔

روافض کہتے ہیں کہ اہل بیت سے مراد ازواجِ مطہرات نہیں ہیں۔ ان کی ایک دلیل یہ ہے ﴿يُذْهِبْ عَنْكُمْ﴾ کہ دیکھو! اللہ رب العزت نے ”کُھ“ ضمیر کا استعمال کیا ہے، ازواجِ مطہرات تو ساری عورتیں ہیں، چلو کچھ عورتیں اور کچھ مرد ہوں تو ”کُھ“ کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو مذکر کی ضمیر ہے مؤنث کی تو نہیں ہے، اس میں تو حضرت علی، حسن، حسین رضی اللہ عنہم ہیں، پھر حضرت فاطمہ ہیں۔ تو ان کے ساتھ تین مرد ہیں اور ایک عورت ہے تو ”کُھ“ لائے ہیں تغلیباً جو ایک عورت کو بھی شامل ہے۔ اگر ازواجِ مطہرات ہی اہل بیت کا اصل مصداق ہیں تو پھر ”کُھ“ کیوں فرمایا؟

ہم کہتے ہیں کہ اس کا جواب تو خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں فرشتے آئے اور ان کی بوڑھی بیوی کو بچے کی بشارت دی تو

ان کو بڑا تعجب ہوا۔ فرشتوں نے کہا:

﴿اَتَعْجَبِينَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحِمْتُ اللّٰهَ وَبَرَكَتُهُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ﴾<sup>138</sup>

کیا آپ اللہ کے حکم پر تعجب کا اظہار کر رہی ہیں؟! اے اہل بیت تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں!

اب دیکھو! یہاں تنہا ابراہیم علیہ السلام کی بیوی ہے تو فرشتوں نے ان کے لیے ”کُمّہ“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تو ”کُمّہ“ کی اصل وضع تو مردوں کے لیے ہے لیکن جب ایسے صیغے ہوں سلام وغیرہ کے تو اس قسم کے صیغوں میں ”کُمّہ“ کا لفظ عورتوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اب دیکھو! یہاں تو صرف ایک بیوی پر ”کُمّہ“ کا اطلاق ہو رہا ہے تو یہاں نو بیویوں کے لیے ”کُمّہ“ کا استعمال کیوں نہیں ہو سکتا؟

اور دوسرا یہ سمجھیں کہ جب ہم کہتے ہیں کہ اہل بیت کا اولین مصداق پیغمبر کی بیویاں ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم پیغمبر علیہ السلام کے داماد اور نواسوں کو اس سے خارج کرتے ہیں بلکہ ان کو بھی اہل بیت میں شامل مانتے ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد اور نواسے شامل ہوں گے تو پھر ”کُمّہ“ کے لفظ پر کوئی اعتراض ہی نہیں رہتا، وہ بھی اہل بیت ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں بھی اہل بیت ہیں۔

**تطہیر تکوینی اور تطہیر تشریعی:**

ہاں البتہ اس سے روافض یہ استدلال کرتے ہیں کہ پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی، داماد اور حسنین کریمین اہل بیت بھی ہیں اور معصوم بھی ہیں۔ معصوم ہونے کی دلیل ﴿يُذْهِبْ عَنْكُمْ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ﴾ ہے کہ دیکھو! اللہ فرما



رہے ہیں کہ ہم ”رجس“ کو آپ کے قریب بھی نہیں آنے دیں گے اور ”رجس“ سے مراد گناہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اللہ نے ان سے دور کر دیے ہیں۔ لہذا وہ معصوم ہو گئے۔

یہ بات یاد رکھنا! ایک ہے تطہیر تکوینی اور ایک ہے تطہیر تشریعی، تطہیر تشریعی کا معنی ہے کہ کوئی بندہ گناہ نہ کرے یہ شرعاً پاک ہے اور تطہیر تکوینی کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بندے کا مقدر ایسا فرمادیں کہ وہ گناہ کرے گا ہی نہیں۔ انبیاء اور ملائکہ کی تطہیر تکوینی ہے۔ اب اس کا معنی یہ نہیں کہ کسی اور بندے کی تطہیر ہو ہی نہیں سکتی، ہو سکتی ہے لیکن وہ تشریعی ہوگی تکوینی نہیں ہوگی اور تکوینی ہونے پر مستقل دلیل چاہیے۔

اب اس کو دوسرے لفظوں میں سمجھنا! ہم کہتے ہیں کہ نبی ہو گا اور معصوم ضرور ہو گا، فرشتہ ہو گا اور معصوم ضرور ہو گا۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ فرشتے کی طبیعت میں گناہ کا میلان رکھا ہی نہیں ہے اس لیے وہ معصوم ہے اور پیغمبر چونکہ انسان ہے گناہ کا میلان ہو گا لیکن پیغمبر کو تکویناً گناہ سے ہمیشہ خدا بچائیں گے۔ تو فرشتے اور انبیاء کی تطہیر تکوینی ہے کہ ان سے کبھی گناہ ہو گا ہی نہیں! اور انبیاء کے علاوہ جو امت ہے ان میں کسی کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں ہے کہ یہ گناہ کرے گا نہیں! ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ امت کا ایسا فرد ہو جو گناہ نہ کرے۔ معصوم کا معنی یہ نہیں کہ بندہ گناہ نہ کرے بلکہ معصوم کا معنی یہ ہے کہ اللہ اس کو تمام گناہوں سے پاک رکھیں گے، لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی امتی بندہ ہو اور گناہ کبھی نہ کرے تو یہ عصمتِ نبوت کے خلاف نہیں ہے۔ لہذا تکوینی تطہیر الگ ہے اور تشریعی تطہیر الگ ہے۔

**مؤمنات کی صفات:**

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَ

الْقَنِيَّتَيْنِ وَالْقَنِيَّتِ وَالصَّادِقَيْنِ وَالصَّادِقَتِ وَالصَّبِيرَيْنِ وَالصَّبِيرَتِ وَالْخُشْعَيْنِ وَالْخُشْعَتِ وَالْمُتَصَدِّقَيْنِ وَالْمُتَصَدِّقَتِ وَالصَّابِرَيْنِ وَالصَّابِرَتِ وَالْحَفِظَيْنِ فُرُوجَهُمْ وَالْحَفِظَتِ وَالذَّكِرَيْنِ اللَّهُ كَثِيرًا وَالذَّكِرَتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ﴿٥٠﴾

بے شک فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں، عبادت گزار مرد اور عبادت گزار عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، دل سے عاجزی کرنے والے مرد اور دل سے عاجزی کرنے والی عورتیں، صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں، ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور عظیم الشان اجر تیار کر رکھا ہے۔

قرآن کریم میں اکثر مقامات پر جب خطاب کیا ہے تو مردوں کو کیا ہے جبکہ شریعت کی مکلف خواتین بھی ہیں، اس بنا پر بعض صحابیات رضی اللہ عنہن نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمیں تو ڈر لگتا ہے کہ ہماری عبادات اللہ کے ہاں قبول بھی ہیں یا نہیں۔ کیونکہ ہمیں اللہ نے قرآن میں کبھی خطاب نہیں کیا اور نہ براہ راست ہمیں کوئی حکم دیا ہے۔ تو اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ ان میں جس طرح مردوں کو خطاب ہے اسی طرح خواتین کو بھی ہے۔

**کثرتِ ذکر اللہ کا معمول بنائیے!**

﴿وَالذَّكِرَيْنِ اللَّهُ كَثِيرًا وَالذَّكِرَتِ﴾

میں نے جمعرات خانقاہی اجتماع میں بھی عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ہم سے صرف ذکر کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ کثرتِ ذکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہاں ﴿وَالذِّكْرُ مِنَ اللَّهِ كَثِيرًا وَالذِّكْرُ﴾ میں بھی کثرتِ ذکر کی بات کی ہے۔ اس لیے میں اس پر بہت زیادہ زور دیتا ہوں کہ علماء اور طلبہ کو کثرت سے ذکر کرنا چاہیے۔ عموماً ہم ذکر میں بہت کوتاہی سے کام لیتے ہیں اور عام طور پر علماء کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ ہم مطالعہ کریں، پڑھیں، بیان کریں، سبق پڑھائیں لیکن ذکر پر توجہ نہیں دیتے حالانکہ ذکر کرنے کے ساتھ کام میں برکت ہوتی ہے، جو کام آپ کا دو سال میں ہونا ہے وہ ایک سال میں ہو گا، جو کام کم بڑھنا ہے ذکر کی وجہ سے زیادہ بڑھے گا، تو ذکر ایندھن ہے عالم کے کام کے لیے، اس لیے اس پر بہت زیادہ توجہ دینی چاہیے خصوصاً قرآن کریم کی تلاوت اور اللہ کے نام کا ذکر جس حد تک ممکن ہو کریں۔ ہمارے اکابر اس کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا کرتے تھے۔

### حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سر تسلیم خم:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ غلام تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آزاد فرمایا اور اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ لوگ بھی ان کو زید بن محمد کہہ کر پکارتے تھے۔ جب یہ آیات نازل ہوئیں کہ منہ بولے بیٹے کو اس شخص کا بیٹا کہہ کر نہ پکارا جائے بلکہ ان کو ان کے اصلی باپ کی نسبت سے پکارا جائے تو ان کو زید بن محمد کے بجائے اصلی باپ کی طرف منسوب کر کے پکارا جانے لگا۔ واقعہ پہلے میں نے بیان کر دیا ہے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جب جوان ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کی پھوپھی کی بیٹی تھیں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا، قریشی تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کا نکاح ان سے کرنا چاہا۔ زینب بنت جحش کو حضرت زید کے نکاح کا پیغام بھیجا۔ حضرت زینب بنت جحش اور ان کے بھائی عبد اللہ بن جحش اس نکاح پر آمادہ نہیں ہوئے، کیونکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ میں ایک عرفی عیب تھا، عرفی عیب کا مطلب کہ جو شریعت میں عیب شمار نہیں ہوتا اور معاشرے میں عیب شمار ہوتا ہے، ان کا عرفی عیب یہ تھا کہ وہ غلام تھے پھر آزاد ہوئے اور قریش بڑا خاندان ہے اس بنیاد پر وہ نکاح تیار نہیں ہوئے۔ تو قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی کہ جب اللہ اور اللہ کا رسول کوئی فیصلہ کر دے تو پھر مؤمن مرد اور مؤمن عورت کا اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت زینت بنت جحش رضی اللہ عنہا کا کمال ایمان دیکھیں کہ آپ فوراً نکاح کے لیے راضی ہو گئیں اور ان کے بھائی بھی راضی ہو گئے۔ تو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کا نکاح منعقد ہو گیا۔ شریعت نے کفو کا خیال بھی کیا ہے لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھیں کہ اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے کی بنیاد کفو نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ایمان اور تقویٰ ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَ

قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ﴾<sup>139</sup>

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے افضل وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو!

تو افضلیت کی بنیاد تو ایمان اور اعمال ہیں ہاں البتہ معاشرے میں شریعت نے

کفو اور برابری کا خیال کیا ہے، خاندانوں کا خیال کیا ہے، معاشرت میں اس چیز کا خیال کیا ہے۔

### کفو کی تین اقسام:

اور کفو تین قسم کی ہوتی ہے؛ ایک کفو شرعی ہے، ایک کفو نسبی ہے اور ایک کفو مالی ہے۔ تو شریعت نے ان تینوں کا خیال رکھا ہے۔

**نمبر 1:** کفو شرعی کا معنی کہ مسلمان؛ کافر سے اعلیٰ ہے برابر نہیں ہے، اسلام اور کفر میں برابری نہیں ہے، اس لیے مسلمان لڑکی کا نکاح کافر لڑکے سے نہیں ہو سکتا کیونکہ عورت اعلیٰ ہے اور یہ مرد ادنیٰ ہے۔ شریعت نے یہ تو کہا ہے کہ مرد مسلمان ہو اور عورت کتابی ہو تو اس کی گنجائش ہے لیکن عورت مسلمان ہو اور مرد کتابی ہو اس کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ شرعی کفو ہے۔ اس میں کسی مسلمان کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ دخل اندازی کرے۔

**نمبر 2:** کفو نسبی یعنی خاندان کی جو برابری ہے یہ لڑکی کا بھی حق ہے اور خاندان کا بھی حق ہے۔ لہذا لڑکی اپنی مرضی سے اپنے سے ادنیٰ خاندان میں نکاح کرنا چاہے تو والدین کو حق حاصل ہے کہ وہ نکاح کو روکوا دیں باوجود اس کے کہ بالغ لڑکی اپنے اختیار سے نکاح کر سکتی ہے لیکن یہ کفو؛ خاندان کا بھی حق ہے اور لڑکی کا بھی حق ہے۔

**نمبر 3:** مالی کفو یعنی مال میں برابر ہونا، یہ لڑکی کا حق ہے خاندان کا نہیں ہے یعنی اگر کفو نسبی میں برابری ہے اور لڑکا مال کے اعتبار سے کمزور ہے اور بالغ لڑکی نکاح کرنا چاہے تو اب والدین اور خاندان لڑکی کو روک نہیں سکتے کہ کفو میں برابر نہیں ہے۔

آپ نے اس کا حال اپنے علاقے میں، اپنے گاؤں میں دیکھا ہو گا کہ بعض لوگ کم مالدار ہوتے ہیں لیکن خاندانی لوگ ہوتے ہیں اور بعضوں کے پاس مال بہت ہوتا ہے لیکن خاندان کے اعتبار سے وہ چھوٹے لوگ ہوتے ہیں، اس لیے اگر مال تھوڑا

ہو اور خاندان میں برابر ہو تو یہ مالی کفو لڑکی کا حق ہے، یہ اپنا حق چھوڑنا چاہیے تو اس کو شریعت نے اجازت دی ہے۔ کفو میں تینوں چیزوں کا خیال رکھیں۔

### حضرت زید کا نکاح اور طلاق:

﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَهُ﴾

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا نکاح ہو گیا لیکن یہ نکاح زیادہ عرصہ تک چلا نہیں۔ نکاح تو قبول کر لیا لیکن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا مزاج کچھ تیز تھا، پھر خاندان بھی بڑا تھا اور حضرت زید آزاد کردہ غلام تھے، اس لیے ان کے دل میں ان کی وہ اہمیت نہ آسکی جو شوہر اور بیوی کے درمیان ہونی چاہیے۔ بالآخر نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات وحی کے ذریعے بتادی گئی کہ زید انہیں طلاق دے دیں گے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں گی۔ اب ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت زید نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ یا رسول اللہ! ہمارا نباہ نہیں ہوتا، میں آزاد کردہ غلام ہوں اور وہ قریش کی لڑکی ہے، اس کے مزاج میں کچھ تیزی ہے جو مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اس سے رکو! اللہ سے ڈرو کا معنی کہ اگرچہ طلاق دینا مباح ہے لیکن ”اَبْغَضُ الْمُبَاحَاتِ“ ہے کہ جائز چیزوں میں سے سب سے زیادہ اللہ کو ناپسندیدہ ہے، اللہ سے ڈرو اور اس کا ارتکاب نہ کرو۔

اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر انہوں نے طلاق دے دی اور میں نکاح کرتا ہوں تو لوگ اس کو معیوب سمجھیں گے کہ دیکھو

اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا اور عرب منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹے کا درجہ دیتے تھے، اس کی بیوی کے ساتھ باپ کبھی بھی نکاح نہیں کرتا تھا تو لوگ تو طعنے دیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ خوف محسوس کرتے تھے اس لیے آپ ان سے فرماتے تھے کہ انہیں طلاق نہ دو! لیکن حضرت زید رضی اللہ عنہ کا نباہ نہیں ہوا۔ بالآخر انہوں نے طلاق دے دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت زینب بنت جحش سے ہو گیا۔

### پنجمبر تبلیغ دین میں خوف نہیں کھاتے:

یہاں ایک بات تو یہ سمجھیں کہ قرآن کریم میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ﴾

انبیاء اور رسل وہ لوگ ہیں جو اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچاتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے۔

اور یہاں اللہ پاک فرماتے ہیں:

﴿وَتَخْفَىٰ فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ

تَخْشَهُ﴾

کہ آپ دل میں ایک بات چھپا رہے تھے، اس کا اظہار نہیں کر رہے اور اللہ اس بات کو ظاہر کرنے والا تھا، آپ کے دل میں تھا کہ زید طلاق دے گا تو بحکم خداوندی نکاح آپ کریں گے تو آپ اس کا اظہار کیوں نہیں کر رہے تھے اور حضرت زید کو طلاق نہ دینے کی نصیحت کیوں فرما رہے تھے، آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں کہ لوگ تہمت لگائیں گے، لوگ الزام لگائیں گے، لوگ برا کہیں گے حالانکہ آپ کو اللہ

سے ڈرنا چاہیے!

تو قرآن کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نہیں ڈرتے اور ایک سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ڈرتے ہیں۔ دونوں میں فرق کیا ہے؟ یہ بات اچھی طرح سمجھیں کہ جہاں فرمایا کہ نہیں ڈرتے تو اس کا معنی یہ ہے انبیاء اور رسل عوام سے نہیں ڈرتے تبلیغ، دعوت اور شریعت کے معاملے میں کہ جب اللہ فرمائیں کہ یہ حکم شریعت ہے اسے بیان کرو تو پھر وہ نہیں ڈرتے کہ لوگ کیا کہیں گے! کیا الزام لگائیں گے! کیا بہتان لگائیں گے! بلکہ انبیاء علیہم السلام فریضہ نبوت کو ادا کرتے ہیں، اور یہاں جو فرمایا کہ آپ لوگوں سے ڈرتے تھے تو اس کا معنی یہ ہے کہ یہ نکاح بظاہر ایک دنیاوی معاملہ ہے، بظاہر تبلیغ و رسالت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے کہ فلاں سے نکاح کرو! بظاہر یہ دنیاوی معاملہ تھا، اس لیے آپ کو خوف محسوس ہوا کہ اہل دنیا اس پر اعتراض کریں گے۔ تو وہاں خوف نہیں کرتے دینی اور شرعی امور کے بیان کرنے میں اور یہاں خوف کیا ہے دنیوی امور میں، تو اس کی وجہ اور ہے اور اس کی وجہ اور ہے۔ لہذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

لیکن جب آپ کو یہ بات بتادی گئی کہ متنبی کی بیوی سے والد نکاح کر سکتا ہے اور آپ نے نکاح کرنا ہے۔ ایک ہے زبان سے مسئلہ بتانا اور ایک ہے عمل سے مسئلہ بتانا، یہ شریعت کا وہ حکم ہے جو آپ نے عمل سے بتانا ہے اور زبان سے بتانے سے وہ اثر نہیں ہو گا جو آپ کے عمل سے ہو گا، تو جب یہ وحی آگئی اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوف محسوس نہیں کیا بلکہ حضرت زینب سے نکاح فرمایا ہے۔

**حضرت زینب کا نکاح کس نے کرایا؟**

﴿فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدًا مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاهَا﴾

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح کس نے کیا؟ اب قرآن مجید میں تو ہے



﴿ذَوَّجْنَاهَا﴾ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ کا نکاح زینب کے ساتھ کیا ہے۔ اس بنیاد پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا یہ بات فرمایا کرتی تھیں کہ تمام ازواجِ مطہرات میں سے یہ مجھے شرف حاصل ہے کہ میرا نکاح کسی انسان نے نہیں اللہ نے خود پڑھایا ہے اور بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا ہے لیکن چونکہ اللہ کے حکم سے تھا اس لیے اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے کیا ہے لیکن زیادہ بہتر رائے یہ ہے کہ حضرت زینب کا نکاح دنیا میں کسی نے نہیں پڑھا اللہ نے خود پڑھایا ہے، یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بہت بڑا اعزاز تھا۔

### حضرت زید بن حارثہ کا اعزاز:

حضرت زینب اور حضرت زید کے درمیان جدائی ہو گئی۔ اس جدائی کا حضرت زینب کو نقصان نہیں ہوا، کیونکہ حضرت زید کے نکاح سے نکلیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں چلی گئیں، حضرت زینب کا تو طلاق کے بعد اعزاز بڑھ گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آ گئی ہیں۔ اب حضرت زید کا کیا ہو گا! یہ بات بڑی سمجھنے کی ہے کہ حضرت زید جو قریشی خاندان کے داماد تھے جب ان کا نکاح ختم ہو گیا تو قریشی خاندان کی دامادی ختم ہو گئی تو ان کا مقام بظاہر بڑھا نہیں بلکہ کم ہوا۔ تو اللہ رب العزت نے حضرت زید کو یہ اعزاز دیا ﴿فَلَمَّا قَضَىٰ ذَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا ذَوَّجْنَاهَا﴾ کہ حضرت زینب کو طلاق کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح دے دیا اور حضرت زید طلاق کے بعد قرآن کریم کے اندر آ گئے اور یہ ایسا اعزاز ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد کسی صحابی کو یہ اعزاز نہیں ملا، تنہا حضرت زید کا اعزاز ہے کہ جن کا نام اللہ نے قرآن میں لیا ہے۔ اب ظاہر ہے اس طلاق کے بعد حضرت زید کا دل تو ٹوٹنا تھا اور دل ٹوٹنے کا خدا نے ازالہ کیسے کیا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا ذکر قرآن

میں کر دیا، اب اگر یہ کہا جائے گا کہ حضرت زینب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہیں تو یہ بھی کہا جائے گا کہ حضرت زید کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔

**متنبی کی مطلقہ سے نکاح کی حکمت:**

﴿يَكُنْ لَا يَكُونُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجٍ أَدْعِيَآ بِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا﴾

ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عملاً فیصلہ اس لیے کروایا تا کہ آئندہ ایمان والوں پر حرج نہ ہو اور مسئلہ کھل جائے کہ اگر کوئی شخص اپنے متنبی کی بیوی سے نکاح کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

﴿مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۖ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ آپ کے ساتھ نہیں ہے بلکہ آپ سے گزشتہ انبیاء علیہم السلام کو بھی جو ہم نے حکم دیا اس پر انہوں نے عمل فرمایا ہے، اور جو اللہ کا فیصلہ ہوتا ہے اس نے ہو کر رہنا ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نے جو حکم دیا آپ نے عمل کیا اسی طرح پہلے انبیاء علیہم السلام بھی عمل فرماتے رہے ہیں۔

**عقیدہ ختم نبوت:**

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا﴾

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔

یہ بات یہاں پر کیوں ذکر فرمائی؟ اس لیے کہ جب حضرت زید نے حضرت

زینب کو طلاق دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمایا تو اعتراض ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کیا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ﴾ کہ حضور تم میں سے کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں، جب زید حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا ہی نہیں تو تم کیسے کہتے ہو کہ زید حضور کا بیٹا ہے؟ وہ بیٹا جو خونی رشتے سے ہو اس کے بیٹے کی مطلقہ سے تو نکاح جائز نہیں ہوتا، یہ زید بن محمد نہیں ہے یہ زید بن حارثہ ہے، اس لیے تمہیں یہ اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ ”مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْكُمْ“ بلکہ ”مِنْ رِّجَالِكُمْ“ فرمایا، اگر ”مِنْكُمْ“ فرماتے تو یہ اشکال رہتا کہ حضور کے تو تین بیٹے تھے، حضور کی چار بیٹیاں بھی ہیں، پھر یہ کیسے فرمادیا! تو ”مِنْ رِّجَالِكُمْ“ کہہ کر فرمایا کہ حضور باپ تو ہیں لیکن رجال کے باپ نہیں۔ ”رجل“ کہتے ہیں جو زینہ بھی ہو اور بالغ بھی ہو۔ تو حضور کسی رجل کے باپ نہیں ہیں، نہ زید حضور کے سگے بیٹے ہیں اس لیے ان کی طلاق یافتہ سے نکاح کرنے پر حضور پر اعتراض کرنا غلط ہے۔

### حضور علیہ السلام کی ابوت روحانی:

جب یہ بات فرمائی ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ﴾ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی بالغ مرد کے باپ نہیں ہیں۔ اب اس پر ایک شبہ پیدا ہوا۔ وہ شبہ یہ ہے کہ یہ امت پیغمبر کی ابوت؛ باپ والی شفقت سے تو ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی تو کیا جو روحانی شفقت تھی وہ بھی ختم ہو گئی؟ ”ابوت“ کی نفی تو ہو گئی ہے لیکن کیا نبوت کی نفی بھی ہے؟ فرمایا ﴿وَلَكِنَّ رَسُولَ اللَّهِ﴾ کہ ہم نے ابوت کی نفی کی ہے نبوت کی نفی نہیں کی، تو پیغمبر جو ابوت کی وجہ سے جسمانی باپ تھا اس شفقت سے تم محروم ہو لیکن نبوت کی وجہ سے جو روحانی باپ ہے وہ شفقت اب بھی باقی ہے۔

”لَکِنْ“ عربی میں استدراک کے لیے آتا ہے، استدراک کا معنی ہوتا ہے کہ ”لَکِنْ“ سے پہلے والی عبارت میں جو شبہ پیدا ہوا ”لَکِنْ“ کا بعد اس شبہ کو ختم کر دیتا ہے۔ ﴿وَلَکِنْ رَّسُولَ اللَّهِ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور صرف رسول ہی نہیں، فرمایا: ﴿وَحَاطَمَ النَّبِیِّنَ﴾ یہ آخری نبی ہیں، ایسا نہیں کہ آج تو امت کو روحانی شفقت ملی ہے لیکن جو تمہارے بعد آئیں گے ان کے لیے کوئی اور نبی آئے گا، فرمایا نہیں نہیں! ان کے لیے بھی یہی نبی ہوں گے اور ان کو باپ والی روحانی شفقت بھی نہیں سے ملے گی۔ ﴿وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا﴾ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔

### روحانی بیٹے قیامت تک ہوں گے:

یہاں پر جس طرح ایک رسم بدکار دہوا ہے اسی طرح مشرکین مکہ کے ایک اعتراض کا جواب بھی ہوا ہے۔ اعتراض کیا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے حضرت قاسم جب فوت ہوئے تو مشرکین مکہ نے اس بات پر کہ ان کی زینہ اولاد فوت ہو گئی ہے خوشیاں منائیں تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ﴾ کہ تمہاری یہ بات تو ٹھیک ہے کہ میرے محمد کی زینہ اولاد فوت ہو گئی ہے لیکن تمہیں خوش نہیں ہونا چاہیے۔

مشرکین مکہ کی خوشی یہ تھی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کے بعد ہم سے لڑائی ان کی اولاد نے کرنی ہے، جب ان کی اولاد ختم ہو گئی تو ان کا مشن ختم ہو گا، اب ہم سے لڑائی کون لڑے گا؟! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَکِنْ رَّسُولَ اللَّهِ﴾ کہ تمہاری لڑائی محمد بن عبد اللہ سے نہیں محمد بن عبد اللہ رسول اللہ سے ہے، اگر صرف محمد بن عبد اللہ سے ہوتی اور رسالت کی حیثیت نہ ہوتی تو ان کے جانے کے بعد ان کے

بیٹے لڑائی لڑتے لیکن ان کا مسئلہ محمد بن عبد اللہ کا نہیں ہے محمد رسول اللہ کا ہے، لہذا ان کے جانے کے بعد ان کے جسمانی بیٹے نہیں لیکن ان کے روحانی بیٹے جنگ لڑیں گے اور وہ موجود ہیں اور وہ تھوڑے سے نہیں ہیں بلکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں۔

اب ان مشرکین کے ذہن میں پھر ایک خوشی آسکتی تھی کہ چلو ایک لاکھ چوبیس ہزار بھی فوت ہو جائیں گے تو پھر بھی ان کا مشن مٹ جائے گا، فرمایا کہ یہ صرف رسول اللہ نہیں ہیں بلکہ یہ خاتم النبیین بھی ہے۔ اگر صرف اللہ کے رسول ہوتے تو جو ان کے کلمہ گو تھے ایک لاکھ چوبیس ہزار وہی لڑتے، یہ رسول بھی ہیں اور آخری بھی ہیں اس لیے ان کے بعد قیامت تک آنے والی امت ان کی روحانی اولاد ہے، تمہاری جسمانی اولاد ہوگی یا نہیں لیکن ان کی روحانی اولاد قیامت تک چلتی رہے گی، اس لیے حضور کی اولاد بھی رہے گی اور حضور کا مشن بھی رہے گا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

### عقیدہ ختم نبوت اور حضرت نانوتوی کی تعبیر:

اور ایک اس سے بھی اہم نکتہ سمجھیں۔ حجۃ الاسلام بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: خاتمیت ایک جنس ہے جس کی دو نوعیں ہیں؛ ایک ہے خاتمیتِ زمانیہ اور ایک ہے خاتمیتِ ذاتیہ۔ خاتمیتِ زمانیہ کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تمام نبیوں سے آخر کا ہے۔ فرمایا: ہم یہ بھی مانتے ہیں لیکن یہ حضور کا کوئی زیادہ اعزاز نہیں ہے کیونکہ تقدیم اور تاخیر بالذات میں کوئی وجہ فضیلت نہیں ہے یعنی کسی کا اول ہونا یا آخر ہونا اس میں ذاتی طور پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ حضرت ابو بکر خلیفہ اول ہیں، حضرت علی خلیفہ آخر ہیں لیکن حضرت ابو بکر افضل ہیں، حضرت علی افضل نہیں ہیں۔ اگر صرف آخری ہونا فضیلت کی دلیل ہوتی تو آخری خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ

عنه سے اعلیٰ ہوتے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ہمارے چاروں ائمہ میں سے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اول ہیں اور امام احمد بن حنبل چوتھے نمبر پہ ہیں۔ اب امام احمد بن حنبل آخر ہونے کی وجہ سے امام ابو حنیفہ سے افضل تو نہیں ہیں۔ باجماعت نماز ہوتی ہے، ایک صف اول ہے اور ایک صف آخر ہے، اب صف آخر یہ صف اول سے افضل تو نہیں ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ عجیب تشریح فرماتے ہیں، فرمایا کہ تقدیم اور تاخر بالذات میں کوئی وجہ فضیلت نہیں ہے تو خاتم النبیین ہونا یہ افضلیت کی دلیل کیسے ہے؟ تو حضرت فرماتے ہیں کہ ایک ہے خاتمیتِ زمانیہ اور ایک ہے خاتمیتِ ذاتیہ، خاتمیتِ ذاتیہ کا معنی یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز اسی سے شروع ہے اور اسی پر ختم ہے، اسے کہتے ہیں خاتمیتِ ذاتیہ یعنی یہ چیز اس کو بالذات ملی ہے اور دوسروں کو اس کے واسطے سے ملی ہے، اور اس کا ضابطہ یہ ہے کہ ایک چیز کسی کو بلا واسطہ ملے تو اسے کہتے ہیں ”بالذات“ اور اگر وہی چیز دوسرے کو بلا واسطہ ملے تو اسے کہتے ہیں ”بالعرض“۔

جیسے سورج جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی روشنی دیوار پر پڑتی ہے، سورج کی روشنی بلا واسطہ ہے اور دیوار کی روشنی سورج کے واسطے سے ہے، سورج ہو گا تو یہ روشنی ہو گی سورج نہیں ہو گا تو یہ روشنی بھی نہیں ہو گی لیکن جب سورج غروب ہوتا ہے تو یہ روشنی کہاں جاتی ہے؟ یہ واپس سورج میں چلی جاتی ہے۔ جیسے آپ ٹارچ چلائیں تو روشنی سامنے دیوار پر چلی جاتی ہے، جب بند کریں تو روشنی دوبارہ ٹارچ میں آ جاتی ہے۔ تو فرمایا کہ سورج کی روشنی ”بالذات“ ہے اور دیوار کی روشنی ”بالعرض“ ہے۔ اسے کہتے ہیں ختم نبوت ذاتی یعنی اللہ کے نبی کی جو ختم نبوت ہے یہ ذاتی ہے، کیا معنی کہ اسی سے نبوت شروع ہو گی اور اسی پر نبوت ختم ہو گی۔ خاتمیتِ ذاتیہ کا مقصد ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بالذات ہے؛ شروع بھی یہاں سے ہے اور ختم بھی

یہاں پر ہے۔ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں جس کا معنی یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو نبوت بالعرض ملی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت بالذات ملی ہے۔

### ایمان اصل اور ایمان نسل:

اب اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ بات توجہ سے سمجھنا! جب اللہ نے قرآن کریم میں ﴿وَأَزَٰوَاجَهُمْ أَتَمَّهُتْهُمْ﴾ فرمایا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں مؤمنین کی مائیں ہیں، اس کا معنی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مؤمنین کے باپ ہیں، حضور باپ ہوں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں مائیں بنیں گی۔ اگر یہ باپ نہیں ہوں گے تو ان کی بیویاں مائیں کیسے بنیں گی؟ اب یہ پیغمبر باپ کیوں ہیں؟ اس لیے کہ ایک وہ شخص ہے جو ایمان لاتا ہے اور ایک وہ شخص ہے جس پر ایمان لایا جاتا ہے، تو جو ایمان لایا یہ بھی ایمان والا ہے اور جس پر ایمان لایا وہ بھی ایمان والا ہے، دونوں کے ایمانوں میں فرق کیا ہے کہ جس پر ایمان لایا جائے اس کا ایمان ”اصل“ ہوتا ہے اور جو ایمان لاتا ہے اس کا ایمان ”نسل“ ہوتا ہے، اصل کو باپ کہتے ہیں اور نسل کو اولاد کہتے ہیں۔ تو پیغمبر کا ایمان دیگر کے ایمان کے لیے مثل باپ کے ہے اور دیگر کا ایمان نبی کے ایمان کی نسبت مثل اولاد کے ہے۔ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم؛ صاحب ایمان اصل ہے اور باقی سارے صاحب ایمان نسل ہیں، تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم باپ ہیں اور باقی اولاد ہیں۔

اب توجہ فرمائیں! حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہم السلام تک یہ تمام انبیاء علیہم السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں ﴿تَشَوُّوْنَ مِنْ بَدِهِ﴾، تو حضور کا ایمان اصل ہوا اور ان سب کا ایمان نسل ہوا، نسل ایمان والا بیٹا ہے اور اصل ایمان والا باپ ہوتا ہے۔ مولانا نونو تو ہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مشرکین مکہ خوش ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد چلی گئی، فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسے صاحب

اولاد ہیں کہ جب دنیا میں نہیں تھے ان کی اولاد تب بھی تھی اور جب دنیا میں نہیں ہوں گے ان کی اولاد تب بھی ہوگی۔ (سبحان اللہ۔ سامعین) ایسا باپ دنیا میں کوئی ہوگا کہ جب نہیں تھے اولاد تب بھی تھی اور جب نہیں ہوں گے اولاد تب بھی ہوگی۔ اس لیے تم اس پیغمبر کی ذات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

اب دیکھو! ایسی عمدہ تعبیر اور تشریح ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو ہم پڑھتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں اور جب سمجھتے نہیں تو کہتے ہیں کہ یہ ان کا تفرد ہے! ان کی بات ٹھیک نہیں ہے! میں کہتا ہوں کہ بھائی! تفرد کا معنی یہ ہے کہ کسی نص کے خلاف تو ہو، جب کسی نص کے خلاف نہیں ہے تو آپ نے تفرد کیسے کہہ دیا؟!

### ختم نبوت ذاتی اور ختم نبوت زمانی:

اس لیے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک ہے حضور کی ختم نبوت ذاتی اور ایک ہے ختم نبوت زمانی، ہم زمانی بھی مانتے ہیں لیکن وجہ فضیلت زمانی نہیں بلکہ وجہ فضیلت ذاتی ہے۔ توجہ رکھنا! اب حضرت فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، ان کے بعد کوئی اور نبی آ بھی جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر فرق پھر بھی نہیں پڑتا! یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت ذاتی پر فرق نہیں پڑتا! یہ تحذیر الناس کی دوسری عبارت ہے جس پر اہل بدعت نے اعتراض کیا ہے کہ مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے نبوت کا دروازہ کھولا ہے اور مرزا قادیانی اس دروازے سے نبی بن کر آ گیا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا قاسم نانوتوی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، اگر آپ کے بعد کوئی نبی آ بھی جائے تو ختم نبوت پر فرق نہیں پڑتا، یہ قضیہ شرطیہ ہے ”کَو“ والا اور ”کَو“ استعمال ہوتا ہے انتقائے ثانی کے لیے بوجہ انتقائے اول کے۔ جیسے قرآن میں ہے:



﴿تَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ لَا يَكُنْ لَكَ إِلهٌ غَيْرُ اللَّهِ لَا تَتَوَكَّلْ عَلَى الْبَشَرِ﴾<sup>140</sup>

اگر زمین و آسمان میں کئی خدا ہوتے تو زمین و آسمان میں فساد آجاتا۔

لیکن فساد نہیں آیا کیونکہ کئی خدا نہیں ہیں۔ تو ﴿لَفَسَدَتَا﴾ ثانی ہے اور

﴿كَانَ فِيهِمَا﴾ اول ہے، تو ”کو“ آتا ہے انتقائے ثانی کے لیے بوجہ انتقائے اول

کے۔ اب اعتراض سمجھنا! یہ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا قاسم نانوتوی فرماتے ہیں کہ حضور

خاتم النبیین ہیں، ”اگر آپ کے بعد کوئی نبی آجائے“ یہ اول ہے، ”تو بھی ختم نبوت پر

فرق نہیں پڑتا“ یہ ثانی ہے۔ اب دیکھو! ”اگر آپ کے بعد کوئی نبی آجائے“ اس کا انتقاء

ہے ”اگر آپ کے بعد کوئی نبی نہ آئے“ اور ”ختم نبوت پر فرق نہیں پڑتا“ اس کا انتقاء

ہے ”تو ختم نبوت پر فرق پڑتا ہے“ اب وہ کہتے ہیں کہ حضرت نانوتوی کی عبارت کا

مطلب یہ ہوا کہ حضور کے بعد نبی کا آنا ضروری ہے، تو مرزا کہتا ہے کہ لو میں آگیا

ہوں، تو یہ دروازہ مولانا قاسم نانوتوی نے کھولا تھا، مرزا اس سے نکل کر آگیا۔

اب جواب سمجھیں! ہم کہتے ہیں کہ ”کو“ ہمیشہ انتقائے ثانی کے لیے بوجہ

انتقائے اول کے نہیں آتا۔ شرح جامی میں ہے: ”وَلَهَا اسْتِعْمَالٌ ثَالِثٌ“ کہ ”کو“ کا

ایک استعمال اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ”کو“ آتا ہے تاکید ثانی کے لیے بوجہ انتقائے

اول کے، جب پہلے کی نفی ہوگی تو دوسرا جملہ مزید مضبوط ہوگا۔ مثلاً میں کہتا ہوں ”کو“

أَهْنَتَنِي لَا تُحَرِّمْتُكَ کہ اگر تو میری توہین کرے گا تو میں تب بھی تیری عزت کروں

گا! اب اس کی نفی یہ ہے کہ اگر تو مجھے گالی نہیں دے گا پھر تو بطریق اولیٰ میں تیری

عزت کروں گا۔ اب حضرت کی عبارت کا معنی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم

النبیین ہیں اگر آپ کے بعد کوئی نبی آجائے تو ختم نبوت پر فرق نہیں پڑتا اور اگر نہ

آئے تو پھر یقیناً ختم نبوت پر فرق نہیں پڑتا۔ اب دیکھو! مولانا نانو تو ی رحمة اللہ علیہ کی نحو کتنی مضبوط ہے۔ میں اس لیے کہتا ہوں کہ تمہیں نحو آدھی آتی ہے اور حضرت نانو تو ی کو پوری آتی ہے۔

### علم پورا تو عقیدہ پورا:

میرا کراچی کا ایک سفر تھا تو میں نے وہاں ایک مدرسے میں پورے دو گھنٹے طلبہ میں اسی موضوع پر بیان کیا کہ جب علم ادھورا ہو تو عقیدہ ادھورا ہوتا ہے اور اگر علم پورا ہو تو عقیدہ پورا ہوتا ہے۔

آج بھی اٹک سے چند طلبہ ملنے کے لیے آئے تھے میرے شاگرد سے فون کروا کے، تو ہم نے انہیں پکوڑے کھلائے، حلوا کھلایا، مٹھائی کھلائی، بسکٹ کھلائے، انڈے کھلائے اور چائے پلائی۔ میں نے ان سے پوچھا آپ کیوں آئے ہیں؟ کہا کہ ہم کراچی میں پڑھتے ہیں، وہاں ہمارے ساتھ مماتی لڑکے پڑھتے ہیں، وہ ہمیں بہت تنگ کرتے ہیں کہ مولانا الیاس گھمن صاحب سے کہو کہ چیلیج لکھ کر دیں ہمارے فلاں مناظر نے مناظرہ کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ صدقہ جاؤں! یہ تو اس طرح ہے کہ میں کہوں کہ میں نے تم سے کُشتی کرنی ہے اور چیلیج لکھ کر تم دو! بہت عجیب بات ہے، بھائی! جس کو کُشتی کا شوق ہے چیلیج لکھ کر بھی وہی دے گا نا! آپ نے اتنا لمبا سفر کیا ہے وہ مناظر چیلیج لکھ کر دے دیتا کہ جی میں مناظرہ کرنا چاہتا ہوں، پھر آپ مجھے کہتے کہ جی آپ بھی کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ مناظرہ اس نے کرنا ہے اور چیلیج لکھ کر میں دوں؟ میں نے کہا کہ بیٹا یہ ترتیب تو غلط ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ نہ میں آپ کا باپ جانتا ہوں، نہ خاندان جانتا ہوں، نہ میں آپ کا گھر جانتا ہوں تو آپ کے نام پر میں لیٹر پیڈ پر مناظرہ لکھ دوں گا؟ کم از کم یہ بات تو سوچو! کہا: جی وہ ہمیں بہت تنگ کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ تمہیں اس لیے تنگ کرتے ہیں کہ تم ہمارے پاس نہیں پڑھتے، ہمارے

پاس پڑھو پھر تمہیں کوئی تنگ نہیں کرے گا، میں یہ تو نہیں کہتا کہ تم تنگ کرو گے لیکن تمہیں تنگ کوئی نہیں کرے گا!

### آپ ٹینشن دیتے ہیں، لیتے نہیں!

میں ایک دفعہ جامعۃ الرشید کراچی میں تھا تو مفتی عبد الرحیم صاحب جو جامعہ کے مہتمم ہیں اور میرے استاذ ہیں، میں نے ثالثہ والے سال ان سے پہلے تین پاروں کی ترکیب پڑھی ہے، مجھے استاد جی فرمانے لگے کہ تمہاری تین بیویاں ہیں تو تمہیں پریشانی نہیں ہوتی؟ میں نے کہا کہ استاذ جی! پریشانی اس کو بنتی ہے جس کو ٹینشن ہو، میں ٹینشن فری آدمی ہوں مجھے کوئی بھی پریشانی نہیں ہوتی۔ تو استاد جی فرمانے لگے: یہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ مسئلہ اور ہے۔ میں نے کہا: وہ کیا؟ فرمایا: ایک بندہ ہوتا ہے جو ٹینشن نہ لے اور ایک ہوتا ہے جو ٹینشن دے، تو تمہاری عادت ہے کہ تم دوسروں کو ٹینشن دیتے ہو اور پھر خود سکون سے سوتے ہو، یہ نہیں کہ تم ٹینشن لیتے نہیں ہو بلکہ تم نے پوری دنیا کو ٹینشن دی ہوئی ہے، لوگ پریشان ہیں اور تم سکون سے سوتے ہو، پھر تمہیں پریشانی کہاں سے ہونی ہے؟

### طلبہ کو نصیحت:

اور یہی وجہ ہے۔ آپ یقین کریں۔ کہ ہمیں کوئی ٹینشن نہیں ہے الحمد للہ، بڑے سکون سے سوتے ہیں، یہ اللہ کا خاص کرم ہے، اللہ یہ سکون اور اطمینان آپ کو بھی نصیب فرمائے۔ (آمین۔ سامعین) گناہ چھوڑ دیں، تعلق مع اللہ مضبوط کریں، ذکر والی زندگی بنائیں اور کسی کے معاملات میں دخل اندازی نہ کریں، پھر دیکھیں کہ کیسے ٹینشن فری زندگی آپ کو ملتی ہے! آپ کے ساتھ ایک ساتھی بیٹھا ہے، اس کا میسج آئے تو اسے پڑھنے دو، وہ غلط ہے یا ٹھیک ہے تمہارا اس سے تعلق نہیں ہے، اگر ایک مرتبہ شک پڑا کہ غلط میسج ہے تو پھر پیچھے پڑ جائیں گے، چھوڑو ان باتوں کو اور اپنے کام

سے کام رکھو! بدگمانی کر کے خواہ گناہ اپنے ذمہ ضرور لینا ہے؟! میں اس لیے کہتا ہوں کہ گناہ چھوڑو! تعلق مع اللہ بناؤ اور اپنے کام سے کام رکھو! آپ کو کبھی تکلیف نہیں ہوگی۔ دنیا جہاں کی تکلیفیں آپ اپنے سر لے کر پھرتے ہیں اور اپنی فکر نہیں ہوتی۔ یہ کس درد کے ساتھ یہ بات میں آپ کو سمجھاؤں! بطور خاص تخصص والوں سے کہتا ہوں کہ یہاں تمہارے اب بہت تھوڑے دن باقی ہیں، صرف اپنے کام سے کام رکھو، اپنے قریبی ساتھی کو بھی بھول جاؤ تم زندگی بھر مجھے دعائیں دو گے اور اگر یہ چار مہینے تم نے دوستی میں اور کھانے پینے اور گپ شپ میں گزار دیے تو زندگی بھر تم پچھتاؤ گے لیکن اس وقت پچھتانے کا کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔ لہذا وقت کو قیمتی بناتے ہوئے حدیثیں یاد کرو، عقائد یاد رکھو، مسائل یاد کرو اور ہر روز نمازوں کے بعد جو بیان کرتے ہو اس کی سخت پابندی کرو، جمعرات کو خطابت کی پابندی کرو، بیانات اپنی زبان پر بار بار کہو اپنی زبان پر جاری کرو، پھر ان شاء اللہ ثم ان شاء اللہ جب موقع آئے گا پھر تمہیں اندازہ ہو گا کہ ہم نے کتنا اچھا کام کیا ہے۔

**کثرت ذکر کا اہتمام کیجیے!**

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ۝﴾

اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کرو۔ اللہ تعالیٰ بار بار ذکر کا نہیں بلکہ کثرت ذکر کا حکم فرما رہے ہیں۔ ہماری اس طرح کی آیات کی طرف توجہ نہیں ہوتی، تو ذکر کی طرف ذہن نہیں جاتا اس لیے علماء اور طلبہ کو ذکر کا خوب اہتمام کرنا چاہیے۔

**حضور علیہ السلام کی پانچ صفات کا تذکرہ:**

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝﴾ وَدَاعِيًا

إِلَى اللَّهِ بِآذِنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۝﴾

یہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ صفتیں بیان فرمائی ہیں:

1: ﴿شَهِيدًا﴾.... آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن اپنی امت یا دیگر انبیاء علیہم السلام کی امتوں پر گواہی دیں گے جب گزشتہ امتیں اپنے نبیوں کی تکذیب کریں گی کہ انہوں نے ہمیں دین کی دعوت نہیں دی، ان کے خلاف امت محمدیہ گواہی دے گی کہ اللہ! یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں، ان کے پیغمبر نے ان کو دعوت دی تھی، اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ تمہیں کیسے پتا ہے؟ تم تو اس وقت نہیں تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم گواہی دیں گے کہ میری امت بالکل ٹھیک کہتی ہے، ان کو میں نے بتایا تھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بطور سرکاری گواہ کے قیامت کے دن پیش ہوں گے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بین القوسین میں ”شَهِيدًا“ کا معنی سرکاری گواہ کیا ہے۔

یہاں شاہد کا معنی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر روزانہ یا ہفتے میں دو مرتبہ امت کے اعمال اجمالاً پیش ہوتے ہیں، ان اعمال کے پیش ہونے کی وجہ سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کل قیامت کے دن امت کے حق میں گواہی دیں گے۔

2: ﴿وَمُبَشِّرًا﴾.... بشارت دینے والے۔

3: ﴿وَنَذِيرًا﴾.... اور ڈرانے والے۔

4: ﴿وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِآذِينِهِ﴾.... اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف بلانے والے۔

5: ﴿وَسِرَاجًا مُنِيرًا﴾ اور ایسے چراغ ہیں جو امت کو روشنی دیتے ہیں۔

### عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

آپ حیران ہوں گے کہ بظاہر اس آیت کا عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت

کے تحت بھی عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم بیان کیا ہے کہ ”تمام انبیاء خصوصاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے گزرنے کے بعد بھی اپنی قبروں میں زندہ ہیں“<sup>141</sup>

اور بعض حضرات کا تو کہنا یہ ہے جیسا کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس طرح دنیا میں سورج کی روشنی سے پوری انسانیت منور ہوتی ہے اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کی روشنی سے تمام اہل ایمان کے قلوب معطر اور منور ہوتے ہیں۔ اس لیے جتنا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق گہرا ہو گا اتنا انسان اپنے دل میں نورانیت کو محسوس کرے گا۔

### رخصتی سے قبل طلاق کا حکم:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُونَهَا فَمِنْ تَعْتُوهُنَّ وَسَرَّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا﴾

یہاں اس عورت کا مسئلہ بیان کیا جس کا نکاح ہوا ہو اور بغیر خلوت صحیحہ کے اس کو طلاق ہو جائے، خلوت صحیحہ کی ایک صورت جماع ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ ایسی جگہ میسر ہو جائے جہاں شوہر ہم بستری پر قادر ہو تو اس کو بھی جماع کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔ فرماتے ہیں کہ اس عورت کی کوئی عدت نہیں ہے۔ طلاق کے فوراً بعد کہیں نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے، ﴿فَمِنْ تَعْتُوهُنَّ﴾ اس کو کچھ نفع دو، بہترین ساجوڑا تحفہ میں دو۔ شلوار، قمیص، دوپٹہ اور اوپر چادر بھی ہو، ﴿سَرَّحُوهُنَّ﴾ اور عزت کے

ساتھ انہیں رخصت کرو۔

## پنجمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی چند خصوصیات:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الَّتِي أَتَيْتَ أَجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمَّكَ وَبَنَاتِ عَمَّتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ الَّتِي هَاجَزْنَ مَعَكَ وَأُمَّرَاءَ مُؤْمِنَةً إِنْ وَهَبْتَ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ﴾

یہاں پر اللہ رب العزت نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کچھ اعزاز بیان فرمائے ہیں:

### 1: چار سے زائد بیویاں

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الَّتِي أَتَيْتَ أَجُورَهُنَّ﴾  
اے پنجمبر! ہم نے آپ کے لیے وہ بیویاں بھی حلال کیں جن کا آپ نے حق مہر ادا کر دیا ہے۔ اس پر سوال یہ ہے کہ حق مہر پنجمبر ادا کریں تو بیوی حلال ہو جاتی ہے اور جب حق مہر امتی ادا کرے تو اس کے لیے بھی تو حلال ہو جاتی ہے، پھر یہ پنجمبر کی خصوصیت کیسے ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت اس طرح ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ کے نکاح میں چار سے زائد بیویاں تھیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ چار سے زائد بیویاں جن کا آپ نے حق مہر ادا کر دیا ہے وہ آپ کے لیے حلال ہیں اور باقی امت کے لیے چار سے زائد حلال نہیں ہیں۔

### 2: مالِ فئی میں اعزاز

﴿وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ﴾

جو مالِ فنی اللہ نے آپ کو دیا ہے اس میں سے جو باندی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں آچکی ہے وہ بھی آپ کے لیے حلال ہے۔

ایک ہوتا ہے مالِ غنیمت اور ایک ہوتا ہے مالِ فنی۔ کفر سے جنگ ہو اور مال ملے یہ مالِ غنیمت ہے، بغیر جنگ کے فتح ہو اور مال ملے تو یہ مالِ فنی ہے لیکن عام طور پر مالِ غنیمت اور مالِ فنی دونوں کو مالِ فنی کہا جاتا ہے، اس لیے یہاں پر دونوں شامل ہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی باندی آئے اور اس کو خرید اجائے تو وہ بھی اس میں شامل ہے۔ مقصود صرف باندی ہے۔ تو فرمایا: اور جو آپ کی باندیاں ہیں وہ بھی آپ کے لیے حلال ہیں۔ اب اس پر بھی وہی سوال ہے کہ باندی تو امتی کے لیے بھی حلال ہے تو یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز اور خصوصیت کیسے ہے؟ اس کا جواب سمجھیں کہ اس معاملے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز تین طرح سے ہے:

(۱): ایک اعزاز تو یہ ہے کہ جو باندی میدانِ جنگ میں آئے وہ تقسیم ہونے سے پہلے سپہ سالار یا امیر نہیں لے سکتا جبکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق حاصل تھا کہ مالِ غنیمت تقسیم ہونے سے پہلے آپ جو چاہیں لے لیں، آپ کسی باندی کا انتخاب کریں تو آپ کے لیے جائز ہے جس طرح حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو آپ نے اپنے لیے مخصوص فرمایا تھا، یہ نبی کا اعزاز ہے۔

(۲): اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم بادشاہ کسی مسلمان امیر المؤمنین کو ہدیہ بھیجے تو وہ امیر المؤمنین کا ذاتی مال نہیں ہوتا بلکہ وہ بیت المال میں جمع ہوتا ہے لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز یہ تھا کہ اگر آپ کو غیر مسلم بادشاہ براہ راست کوئی ہدیہ بھیجے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق حاصل تھا کہ خود لیں اور مالِ بیت المال میں جمع نہ کریں جس طرح مقوقس بادشاہ نے حضور کی خدمت میں حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا بھیجی ہیں اور آپ نے ان کو اپنے حرم میں رکھا ہے تو یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا



اعزاز ہے۔

(۳): اور تیسرا آپ کا اعزاز اس طرح ہے کہ امتی کی باندی ہو اور امتی کی وفات ہو جائے یا وہ طلاق دے دے تو اس کے بعد اس باندی سے نکاح کرنا جائز ہوتا ہے لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی باندی کا معاملہ اس طرح نہیں ہے، جس طرح پیغمبر کی وفات کے بعد ان کی بیوی سے امتی کا نکاح نہیں ہوتا اسی طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیغمبر کی باندی سے بھی کسی امتی کا نکاح نہیں ہوتا۔ تو یہ تین اعزاز ﴿وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ﴾ میں شامل ہیں۔

### 3: خاندان کی عورتوں سے نکاح

﴿وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ الْاُخْرٰى﴾

هَاجَرُونَ مَعَكَ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چچا کی بیٹیاں، پھوپھی کی بیٹیاں، ماموں کی بیٹیاں اور خالہ کی بیٹیاں حلال کر دی گئیں لیکن ان کے لیے ایک شرط ہے ﴿الَّتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ﴾ کہ انہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو۔ اب اس پر بھی سوال ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز کیسے ہے؟ چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ کی بیٹیاں تو ہر مسلمان صحابی کے لیے حلال تھیں؟

یاد رکھنا! یہاں پر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز یہ ہے کہ عام مسلمان کے لیے ان رشتہ داروں سے نکاح کرنا جائز تھا چاہے انہوں نے ہجرت کی ہو یا نہ کی ہو لیکن حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کی جو عورتیں تھیں ان کے ساتھ نکاح کرنا تب حلال تھا جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئیں۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا آپ کے چچا ابوطالب کی بیٹی خود فرماتی ہیں کہ میرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے

نکاح کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس لیے کہ میں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت نہیں کی اور طَلَقًا میں شامل ہوں، طَلَقًا وہ لوگ ہیں کہ جب فتح مکہ ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نہ قتل کیا نہ غلام بنایا بلکہ ویسے چھوڑ دیا۔ تو یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز ہے۔

#### 4: بغیر مہر کے نکاح

﴿وَأَمْرًا مُّؤْمِنَةً إِنْ وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا﴾

ایمان والی عورت جو اپنے آپ کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہدیہ کرے بغیر حق مہر کے اور پیغمبر پاک اس سے نکاح کرنا چاہیں تو نکاح ہو سکتا ہے۔ اب یہ اعزاز تو بڑا واضح ہے کہ امتی کے نکاح میں حق مہر شرط ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز یہ ہے کہ بغیر حق مہر کے آپ کسی سے نکاح کرنا چاہیں تو آپ کو اجازت ہے۔ ہاں ﴿وَأَمْرًا مُّؤْمِنَةً﴾ یہ مؤمنہ کی قید اللہ کے نبی کے لیے ہے، کتابیہ عورت سے امتی کا نکاح ہو سکتا ہے لیکن کتابیہ عورت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح جائز نہیں ہے۔ ﴿خَالِصَةً لِّكَ مِنَ الدُّوْنِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ یہ اعزازات اور خصوصیات خالص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہیں، دوسرے ایمان والوں کے لیے نہیں ہیں۔

﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ﴾ ہم نے ایمان والوں کے لیے جو احکامات ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں ان پر مقرر کیے ہیں وہ ہمارے علم میں ہیں، لیکن آپ کو عام مسلمانوں کے ان احکامات سے مستثنیٰ قرار دیا ہے کیوں؟ ﴿يَكَيْلًا يَكُونُ عَلَيْكَ حَرْجٌ﴾ یہ سب اس لیے ہے تاکہ اس میں پیغمبر کے لیے حرج نہ ہو بلکہ پیغمبر کے لیے راحت ہی راحت

ہو جائے۔

### حضور علیہ السلام پر باری مقرر کرنا واجب نہیں:

﴿تُزَجَّىٰ مِنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤَيَّ إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ وَمِنْ ابْتِغَايَاتِ  
مَنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ذَلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ تَقَرَّ أَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَ  
وَيَرْضَيْنَ بِمَا آتَيْنَهُنَّ كُلَّهُنَّ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا  
حَلِيمًا﴾ (۱)

یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر باری  
مقرر کرنے کی پابندی نہیں ہے، آپ جس بیوی کے پاس رات گزارنا چاہیں آپ کی  
مرضی، نہ گزارنا چاہیں آپ کی مرضی۔

لیکن رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد  
اور اس اجازت کے ملنے کے باوجود بھی ازواج مطہرات میں ہمیشہ برابری قائم رکھی  
ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں:

اللَّهُمَّ هَذَا قَسْمِي قِيمًا أَمْلِكُ فَلَا تُلْهِئِي قِيمًا تَمْلِكُ وَلَا أَمْلِكُ.<sup>142</sup>

اے اللہ! جس چیز میں میرا اختیار ہے اس میں تو میں نے تمام بیویوں میں  
برابری سے کام لیا ہے، دل تیرے اختیار میں ہے، یہ میرے اختیار میں نہیں ہے، اللہ!  
اس پر میرا مواخذہ نہ فرمانا! دل کی محبت کسی سے کم ہو کسی سے زیادہ ہو تو اس پر مواخذہ  
نہ فرمانا!

ہاں امتی کے لیے باری مقرر کرنا واجب ہے۔ ایک بات یاد رکھنا! اگر ایک

سے زائد نکاح ہوں تو مرد کے ذمہ باری مقرر کرنا تو ہے کہ ایک رات ایک کے پاس، دوسری رات دوسری کے پاس گزارے لیکن ہمبستری میں باری ضروری نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مباشرت کا تعلق بندے کے قلبی میلان کے ساتھ ہوتا ہے اور دل کا میلان ہر ایک کی طرف نہیں ہوتا۔ اس لیے اس میں برابری نہیں ہوتی۔

اچھا اسی طرح باری مقرر کرنا حضر میں تو شرط ہے لیکن سفر میں شرط نہیں ہے۔ ہر دفعہ شوہر ایک ہی بیوی کو سفر میں لے کر جائے اور دوسری کو نہ لے کر جائے تو اس کی بھی اجازت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سفر میں بنیادی چیز ہے راحت، اس راحت کی وجہ سے روزہ بھی معاف ہے کہ بعد میں رکھ لو، نماز مکمل نہیں بلکہ قصر ہے، اس کی بنیادی وجہ راحت ہے تو جس بیوی سے آدمی کا مزاج نہیں ملتا، اگر اس کو سفر میں رکھے گا تو راحت کے بجائے مشقت ہوگی۔ تو شریعت نے سفر میں باری کی پابندی ہی ختم فرمادی۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ لوگ یہ تو کہتے ہیں کہ عدل بہت مشکل ہے، عدل بہت مشکل ہے لیکن جو سہولتیں شریعت نے دی ہیں ان کی طرف کسی کی نظر نہیں جاتی، دیکھو! ہمبستری بھی شرط نہیں ہے، سفر میں باری بھی شرط نہیں ہے، باقی رہا کھانا پینا وہ تو آپ نے برابر دینا ہی ہے، رات گزارنے میں برابری تو آپ نے کرنی ہی ہے، اب بتاؤ اس میں عدل کرنا کون سا مشکل کام ہے؟

﴿وَمَنْ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ﴾

آپ نے کسی بیوی کو الگ کیا ہوا ہو، اس سے اجتناب کا ارادہ کر لیا ہو اور پھر واپس بلانا چاہیں تو بلا سکتے ہیں، آپ پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

**ازواجِ مطہرات کی خوشی:**

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰی اَنْ تَقْرَآ عَیْنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَ وَيَرْضَيْنَ بِمَا اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ایسی چیز ہے کہ جس سے ازواجِ مطہرات کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی، وہ غمزہ نہیں ہوں گی اور جو کچھ آپ دیں گے اس پر خوش ہو جائیں گی۔

اب یہاں ایک بات سمجھیں! آپ جس کو چاہیں باری دیں جس کو چاہیں باری نہ دیں اس سے اُن کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے اللہ رب العزت نے اپنے نبی کو اختیار دیا ہے کہ آپ کسی بیوی کو رات دیں یا نہ دیں آپ کی مرضی، تو جب ان باری اُن کا حق ہی نہیں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی ہے، چاہیں تو باری دیں چاہیں تو نہ دیں۔ دکھ تو تب ہوتا ہے جب استحقاق ہو اور نہ ملے جبکہ یہاں تو استحقاق والا معاملہ ہی نہیں۔ دونوں صورتوں میں ازواجِ مطہرات کی آنکھیں ٹھنڈی ہی ٹھنڈی ہیں۔

### نکاح کے متعلق ایک اور حکم:

﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَجَبَكَ حُسْنُهُنَّ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ ۖ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ رَقِيبًا ۝﴾

اس آیت کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کو بلایا اور فرمایا کہ اگر تم دنیا چاہتی ہو تو میں تمہیں دنیا دے کر رخصت کر دیتا ہوں اور اگر دنیا چھوڑ کر میرے پاس رہنا چاہتی ہو تو میرے نکاح میں رہو! انہوں نے کہا کہ حضور! ہم آپ کے پاس رہنے کے لیے تیار ہیں۔ جب ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے یہ قربانی دی تو اللہ نے ان کو پھر اعزازیہ بخشا کہ اپنے نبی سے فرمایا: ﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ﴾ اے پیغمبر! جو ابھی آپ کی نوبتیاں نکاح میں ہیں ان کے بعد دسویں سے آپ نکاح نہیں کر

سکتے کیونکہ انہوں نے قربانی دی ہے اور آپ یہ بھی نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی کو طلاق دے دیں اور اس کی جگہ کسی اور سے نکاح کر لیں کہ نو کا عدد پورا ہو جائے، اور اسی طرح ازواج مطہرات کو بھی پابند کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تم بھی کسی سے نکاح نہیں کر سکتی، تو یہ دونوں کے لیے اعزاز ہے۔

اور بعض حضرات نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ جو رشتے ہم نے آپ کو بتائے ہیں ان کے علاوہ کسی اور جگہ آپ نکاح نہیں کر سکتے۔ کیا مطلب کہ اگر آپ اپنی کسی رشتہ دار عورت سے نکاح کرنا چاہیں تو اس کے لیے مہاجرہ ہونا شرط ہے، اگر رشتہ دار عورتوں کے علاوہ کسی اور عورت سے نکاح کرنا چاہیں تو اس کے لیے مؤمنہ ہونا شرط ہے، رشتہ دار ہو اور غیر مہاجرہ ہو تو آپ نکاح نہیں کر سکتے، عام عورت ہو اور مؤمنہ نہ ہو تو آپ اس سے بھی نکاح نہیں کر سکتے، یہ پابندی تھی۔ اب اس کا مطلب یہ ہے کہ جو پہلے آپ کے لیے نکاح کا مسئلہ بیان فرمایا گیا ہے یہ حکم اس کے لیے مزید توضیح اور تاکید ہے، یہ نہیں کہ کسی اور نکاح پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ تو بعضوں نے اس کو ترجیح دی ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے۔

### کھانے کی دعوت کے آداب:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَى طَعَامٍ غَيْرَ نَظِيرٍ لَهُ ۖ وَ لَكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ بِحَدِيثِ﴾

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔ آپ نے ولیمہ کیا اور لوگوں کو بلایا تو بعض احباب کھانا تیار ہونے سے پہلے آ گئے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر تو چھوٹا سا تھا، بٹھانے کی جگہ نہیں تھی تو

حضرت زینب دیوار کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئیں۔ کھانا کھا لیا گیا لیکن بعض لوگ نہیں اٹھے اور وہیں پر باتیں کرنے کے لیے جم کر بیٹھ گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ناگوار گزرا تو آپ اٹھ کر باہر تشریف لے گئے۔ آپ جب واپس آئے تو دیکھا کہ لوگ پھر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سے آپ کو ناگوار ہوئی تو ان لوگوں کو احساس ہوا اور وہ اٹھ کر چلے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر بعد گھر سے باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ﴾

ہمیشہ کے لیے یہ باتیں یاد رکھیں:

- 1: جن کو کھانے پر بلایا جائے کھانے پر صرف وہ آئیں۔
  - 2: کھانے سے پہلے جا کر نہ بیٹھیں، اس سے میزبان کو مشغول ہونا پڑتا ہے۔
  - 3: کھانا کھا کر چلے جایا کریں، وہاں بیٹھے نہ رہیں۔
- ان تین آداب کا خیال رکھیں لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب آپس میں بے تکلفی نہ ہو، بیٹھنے کی اور جگہ نہ ہو اور عرف یہ ہو کہ کھانا کھانے کے بعد چلا جانا چاہیے لیکن جس طرح آج کل ہمارے ہاں شادی ہالوں میں ٹینٹ لگے ہوتے ہیں، شادی ہال بک ہوتے ہیں، گیارہ بجے تک بکنگ ہوتی ہے اب آپ بیٹھے رہیں نہ ٹینٹ لگانے والوں کو ٹینشن ہے نہ آپ کو ٹینشن ہے۔ تو یہ معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ بس اس کا خیال کیا کریں۔

﴿إِنَّ ذِكْرَكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَعْجِلُ مِنْكُمْ﴾

اس سے حضور کو تکلیف ہوتی ہے لیکن اللہ کے نبی حیا محسوس فرماتے ہیں تمہیں زبان سے کہتے نہیں، اس لیے تم خود خیال کیا کرو!

## حضور علیہ السلام کو تکلیف دینا جائز نہیں:

﴿وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تُنْكِحُوا زَوَاجَهُ

مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا﴾

تمہارے لیے یہ بات جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف دو اور نہ یہ جائز ہے کہ پیغمبر کے جانے کے بعد ان کی بیوی سے کبھی بھی نکاح کرو۔

میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ ﴿وَأَزْوَاجَهُ أَمْهَتُهُمْ﴾ سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں امت کی مائیں ہیں لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ان سے نکاح کرنا حرام ہے۔ اس کی وجہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی اگر امت کی ماں ہے تو حضور امت کے باپ ہیں، اگر اس بنیاد پر نکاح حرام ہوتا تو امتیوں کا باپ ہونے کی بنیاد پر خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حرام ہوتا امت کی لڑکیوں سے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح جائز ہے۔ تو بنیاد وہ نہیں ہے بلکہ بنیاد یہ آیت ہے کہ پیغمبر کی بیوی سے نکاح نہ کرو اور نکاح نہ کرنے کی علت یہ ہے؟ ﴿وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ﴾ یہ طبعی اور فطری بات ہے کہ جو غیور آدمی ہے وہ اپنی منکوحہ کو خواہ طلاق دے دے کسی اور کو اس کا شوہر بننا اسے طبعاً ناگوار گزرتا ہے، تو عام بندے کی طبعی ناگواری کا خیال نہیں رکھا گیا لیکن پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طبعی تقاضے کا اللہ تعالیٰ نے خیال فرمایا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعزاز دیا ہے، فرمایا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی سے کبھی نکاح نہ کرنا کہ اس سے نبی کو طبعاً ناگوار محسوس ہوگی۔

پردے کا حکم:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ



عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ۖ ذَٰلِكَ آدَنِي أَنْ يُعْرِفَنَ فَلَا يُؤْذِينَ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا  
رَحِيمًا ﴿٥٩﴾

یہاں پردے کی بات فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: اپنی بیویوں سے فرماؤ، اپنی بیٹیوں سے فرماؤ اور ایمان والی عورتوں سے فرماؤ! اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی بھی ایک نہیں بلکہ ایک سے زائد ہیں کیونکہ ”أَزْوَاجُكَ“ فرمایا اور آپ کی بیٹیاں بھی ایک نہیں بلکہ ایک سے زائد ہیں کیونکہ ”بَنَاتِكَ“ فرمایا۔ اب یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ”بَنَاتِكَ“ سے مراد پیغمبر کی حقیقی بیٹیاں نہیں بلکہ پیغمبر کی کلمہ گو بیٹیاں یعنی امتی عورتیں ہیں، تو یہ بات ٹھیک نہیں ہے اس لیے کہ آگے ان کے لیے ﴿وَنِسَاءَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ مستقل الفاظ موجود ہیں، اگر ﴿وَنِسَاءَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ نہ ہوتا تو پھر تو ان لوگوں کو کچھ اعتراض کی گنجائش تھی، جب ﴿وَنِسَاءَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ کا لفظ آگیا تو اب اعتراض کی گنجائش موجود نہیں۔

### آیت مبالغہ کا صحیح مفہوم:

یہاں لفظ ”نِسَاءً“ ہے۔ مجھے اس پر ایک واقعہ یاد آیا۔ اس گزشتہ جمعرات کو جو ہمارے ہاں طلبہ آئے تھے تو ان میں سے ایک طالب علم نے مجھ سے ایک سوال کیا کہ قرآن کریم سورۃ آل عمران میں ہے:

﴿فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا

وَأَنْفُسَكُمْ﴾<sup>143</sup>

کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ ہم اپنے بیٹوں کو لائیں اور تم اپنے بیٹوں کو لاؤ! ہم اپنی بیویوں کو لائیں اور تم اپنی بیویوں کو لاؤ اور ہم خود آئیں اور تم خود بھی آؤ! پھر اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بیوی ساتھ نہیں لائے کیونکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تو پہلے فوت ہو گئی تھیں، اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت خدیجہ کے علاوہ کوئی آپ کی بیوی تھی ہی نہیں! پھر اس میں حضرت علی، حضرت حسن، حضرت حسین اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہم کو لائے، کسی اور بیٹی کو بھی نہیں لائے، اگر آپ کی کوئی اور بیٹی ہوتی تو اسے بھی لاتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی کوئی اور بیٹی تھی ہی نہیں!

میں نے کہا کہ قرآن کریم کی آیت پڑھو ذرا! آیت ہے: ﴿فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَابْنَاتَنَا﴾ کہ ہم اپنے بیٹے لائیں اور تم اپنے بیٹے لاؤ! تو بتاؤ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بیٹا لائے تھے؟ کہا جی نہیں! میں نے کہا: حضور نے بیٹے مانگے یا بیٹیاں؟ تقاضا بیٹوں کا تھا یا بیٹیوں کا؟ کہا: جی بیٹوں کا تھا۔ تو میں نے کہا کہ آپ تو کہتے ہیں کہ ”اگر آپ کی کوئی اور بیٹی ہوتی تو اسے بھی لاتے“ مباہلے میں تو بیٹیوں کا تقاضا ہی نہیں کیا تو لاتے کیوں؟

اہلِ رفض کا استدلال تو یہی ہے نا! وہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیٹی ہے، کیونکہ جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بیٹی کو لائے تھے اور بیٹیاں ہوتیں تو ان کو بھی لاتے۔ میں نے کہا کہ اور بیٹیاں تب لاتے جب بیٹیوں کا تقاضا ہوتا، یہاں تو ”ابناء“ کا لفظ ہے کہ بیٹے لاؤ! بیٹیوں کا تو مطالبہ ہی نہیں ہے تو پھر کیوں لاتے؟ تو پھر ایک کیوں آئی؟ اس لیے کہ موقع پر ایک موجود تھی تو اسے لے آئے، کیونکہ تقاضا تو تھا ہی نہیں۔

﴿وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ﴾ اب یہ سوال کہ ”اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی حضرت خدیجہ کے علاوہ اور بیویاں ہوتیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لاتے “یہ سوال تب تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مباہلہ کے لیے آئے ہوں، نہ مباہلہ کا چیلنج ان عیسائیوں نے قبول کیا نہ دونوں طرف سے خود کو، بیٹوں کو اور بیویوں کو آنا پڑا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تھوڑا کہا تھا کہ میں بھی لے آیا ہوں تم بھی لے آؤ! بلکہ یہ کہا تھا کہ اگر تم مباہلہ کرتے ہو تو تم بھی لاؤ میں بھی لاؤں گا، وہ تو اتفاقاً اس موقع پر حضرت علی، حضرات حسنین کریمین اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے تو انہی کے نورانی چہروں کو دیکھ کر وہ لوگ دوڑ گئے۔

﴿وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ﴾ میں نے کہا کہ یہاں ﴿وَأَنفُسَنَا﴾ ہے ”نَفْسَنَا“ تو نہیں ہے، پھر بتاؤ حضور کتنے نفوس لے کر گئے تھے؟ کہتا ہے: جی چار لے کر گئے تھے۔ تو میں نے کہا: پھر ﴿أَبْنَاءَنَا﴾ میں کون ہے؟ ﴿نِسَاءَنَا﴾ میں کون ہے؟ پھر تو ﴿أَنفُسَنَا﴾ کہنا کافی تھا، باقی کی ضرورت کیا تھی؟!

### ستر عورت اور حجابِ نساء میں فرق:

یہاں حجاب کے متعلق سمجھیں! ایک ہوتا ہے ستر عورت اور ایک ہوتا ہے حجابِ نساء۔ ستر عورت الگ ہے اور حجابِ نساء الگ ہے۔ ستر عورت کا معنی ہوتا ہے اپنے جسم کے پوشیدہ حصوں کو چھپانا، یہ مرد کے لیے بھی ہے اور عورت کے لیے بھی ہے۔ ناف سے لے کر گھٹنے تک یہ مرد کا ستر ہے اس کو چھپانا ضروری ہے اور یہ جلوت میں بھی ہے اور خلوت میں بھی ہے، جس طرح لوگوں کے سامنے جائز نہیں ہے اسی طرح بغیر ضرورت آدمی تنہا ہو تب بھی کھولنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح عورت کا ستر ہے۔ ایک ہے عورت کا ستر عورتوں سے اور ایک ہے عورتوں کا پردہ نامحرموں سے، یہ دو چیزیں بالکل الگ الگ ہیں۔ اب کتنا حصہ عورت کو چھپانا ضروری ہے؟ تو عورت کا

عورت سے وہی ستر ہے جو مرد کا مرد سے ہے اور اگر محرم ہو تو پھر عورت کا ستر الگ ہے، پھر فرق پڑ جاتا ہے۔ میں یہ اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ ستر عورت الگ چیز ہے اور حجاب نساء الگ چیز ہے۔

اور عورت کا حجاب تین قسم کا ہے؛

(۱): ایک ہوتا ہے حجاب بالبیوت کہ عورت گھر میں رہے، پردہ کرے اور بالکل باہر نہ نکلے، ﴿وَقَوْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ یہ حکم ہے۔

(۲): اور ایک ہوتا ہے عورت کا حجاب بالبرقعہ یعنی عورت ایک لمبی چادر لے جس سے اس کا پورا جسم چھپ جائے۔

(۳): اور ایک ہوتا ہے عورت کا حجاب شرعی کہ عورت کا پردہ کیا ہے؟!

یہ تو طے شدہ ہے کہ عورت کو پورے جسم کا پردہ کرنا چاہیے۔ چہرے اور ہتھیلیوں کو بھی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ ستر کا حصہ مانتے ہیں، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ﴿إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾<sup>144</sup> میں شامل کر کے فرماتے ہیں کہ فتنے کا اندیشہ نہ ہو تو چہرہ، ہتھیلیاں اور پاؤں کا اوپر والا حصہ کھول سکتی ہے، فتنے کا اندیشہ ہو تو پھر کھولنا جائز نہیں ہے، اور آج کے دور سے زیادہ فتنہ کس دور میں ہو گا؟ اس لیے عورت کا پورا جسم ستر ہے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

**مقتدا کی شرائط؛ عقل اور ہدایت**

﴿وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلًا﴾

کفار اور مشرکین یہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں

اور اپنے بڑوں کی بات مانی اور انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے بھٹکا دیا۔

اس آیت کا تعلق کفار اور مشرکین کے ساتھ ہے اور غیر مقلدین اسے فٹ کرتے ہیں اکابرین پر۔ یاد رکھنا! جہاں قرآن کریم نے آباء و اجداد کی بات ماننے سے منع کیا ہے ساتھ ایک جملہ ہے:

﴿أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ﴾<sup>145</sup>

کہ اگر آباء و اجداد میں عقل بھی نہ ہو اور وہ ہدایت پر بھی نہ ہوں تو پھر بھی ان کی بات مانو گے؟

اس سے معلوم ہوا کہ اگر عقل اور ہدایت موجود ہو تو پھر ان کی بات مان لینا چاہیے۔ یہ دو شرطیں ذہن میں رکھیں اور جن کی ہم بات مانتے ہیں ان میں عقل بھی ہے اور ان میں ہدایت بھی ہے۔

**بنی اسرائیل کا الزام اور موسیٰ علیہ السلام کی براءت:**

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا كَالَّذِينَ أَخَذَ مُوسَىٰ فَبَرَأَهُ اللَّهُ مِمَّا

قَالُوا ۚ وَكَانَ عِنْدَ اللَّهِ وَجِيهًا ۝﴾

صحیح البخاری میں روایت موجود ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی عادت یہ تھی کہ ان کے مرد سب کے سامنے ننگے ہو کر نہاتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی بھی ہیں، معصوم بھی ہیں، حیا بھی ہے تو آپ اس طرح نہیں کرتے تھے۔ بنی اسرائیل نے ان پر تہمت لگائی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں کوئی جنسی بیماری ہے۔ بعض نے کہا کہ ان کے خصیتین بہت بڑھے ہوئے ہیں، کسی نے کہا کہ ان کا جو عضو ہے اس میں کوئی بیماری ہے، یہ الزام لگاتے اور مذاق

بھی اڑاتے تھے۔ ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہانے کے لیے کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیے۔ معجزاً وہ پتھر وہاں سے چل پڑا۔

موسیٰ علیہ السلام غسل کے بعد پتھر کے پیچھے پیچھے چلتے گئے اور یہ کہہ رہے تھے کہ ”ثَوْبِيْ جَدْر، ثَوْبِيْ جَدْر“ اے پتھر! میرے کپڑے دے دو، اے پتھر! میرے کپڑے دے دو! جہاں بنی اسرائیل کے لوگوں کا ایک بڑا مجمع تھا یہ پتھر وہاں آ کر رک گیا۔ تو اس وقت لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے مبارک جسم کو دیکھا تو ان پر کوئی عیب موجود نہیں تھا۔ موسیٰ علیہ السلام جلالی نبی تھے۔ آپ نے کپڑے پہنے اور آپ کے ہاتھ میں جولا ٹھی تھی پتھر کو تین چار مار دیں تو پتھر پر نشان پڑ گئے جیسے بندے کو مارنے پر پڑتے ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام کا وہاں پر بے عیب ہونا واضح ہو گیا۔

فرمایا ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ“ کہ اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ بننا جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف دی تھی، میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی تکلیف نہ دینا۔<sup>146</sup>

### قولِ سدید اور قولِ صواب میں فرق:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۖ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَطِيعُ الذُّلَّ فَآزَ فَوْزًا عَظِيمًا﴾

ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور درست بات کرو۔ تقویٰ اور درست بات کی وجہ سے اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح فرمادیں گے کہ اعمال میں جو کمی رہ جائے گی اللہ اپنے کرم سے معاف فرمادیں گے۔

ایک ہوتا ہے قول سدید اور ایک ہوتا ہے قول صواب، دونوں میں فرق ہے۔ قول سدید اس قول کو کہتے ہیں جس میں کذب نہ ہو اور قول صواب اس قول کو کہتے ہیں جس میں خطا نہ ہو۔ اس لیے اجتہاد میں صواب اور خطا ایک دوسرے کے مقابلے میں آتے ہیں، صواب اور کذب مقابلے میں نہیں آتے۔

### انسان؛ بارِ امانت کا حامل

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾<sup>(٥٦)</sup>

”امانت“ سے مراد شریعت ہے۔ اللہ رب العزت نے امانت یعنی عقائد اور اعمال دونوں پیش فرمائے آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر اور ساتھ اختیار دیا کہ تم چاہو تو لے لو اور تم چاہو تو نہ لو۔ اگر لو گے اور ان پر عمل کرو گے تو ہم تمہیں ثواب دیں گے اور اگر تم ان کو لے لو لیکن پھر اپنا نہ سکو تو تمہیں عذاب ہو گا۔ ﴿فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا﴾ تو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے اس بار کو اٹھانے سے انکار کر دیا، ﴿وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا﴾ اور ڈر گئے، ﴿وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ﴾ اور نوع انسانی نے اس کو اٹھا لیا، فرد بشر نے نہیں بلکہ نوع انسانی نے اس کو اٹھا لیا، ﴿إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ اس میں دو کوتاہیاں بیان کی ہیں: ایک علمی اور ایک عملی۔ عملی کوتاہی یہ ہے کہ یہ ظلوم ہے اور علمی کوتاہی یہ ہے کہ یہ جہول ہے۔ دونوں کوتاہیاں ہیں۔ عمل میں کمی کرتا ہے یعنی زیادتی کرتا ہے تو ظالم ہے اور علم کمزور ہے یعنی اعتقادات ٹھیک نہیں ہوتے تو جاہل ہے، اور یہ ہر انسان کے بارے میں نہیں ہے بلکہ یہ اکثر نوع بشر کے حوالے سے ہے کہ عموماً ان میں سے اکثر ظالم اور جاہل ہی نکلتے ہیں، سب نے اس امانت کو اٹھایا نہیں ہے۔

یہاں بات سمجھیں! اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آسمان اور زمین اور پہاڑ انہوں نے انکار کیا ہے۔ انکار کرنا عیب نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا تھا جس طرح حضرت لقمان کے بارے میں میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اختیار دیا تھا کہ نبوت چاہیے یا حکمت؟ عرض کیا کہ حکمت۔ نبوت کیوں نہیں؟ کہا: خود اللہ تعالیٰ دیتے تو میں لے لیتا، اب مجھے اختیار دیا ہے، جب میرے اختیار سے ملے گی تو ہو سکتا ہے کہ میں نباہ نہ سکوں۔ تو ان کو بھی اختیار دیا تھا اور انہوں نے انکار کر دیا۔ جبکہ قرآن کریم کے چوبیسویں پارے میں ہے:

﴿فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ﴾<sup>147</sup>

اللہ نے آسمان اور زمین سے فرمایا تھا کہ جبراً ہو یا خوشی سے تم نے ہماری بات ماننی ہے تو آسمان اور زمین نے کہا کہ ہم خوشی سے ماننے ہیں۔

تو سورۃ الحم السجدۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان اور زمین نے بات لی ہے اور یہاں سورۃ الاحزاب سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بات نہیں لی۔ بظاہر دونوں میں تعارض ہے۔ جواب یہ ہے کہ تعارض نہیں ہے کیونکہ یہ جو سورۃ الحم السجدۃ میں ہے اس سے امور تشریعی نہیں بلکہ امور تکوینی مراد ہیں کہ جو تمہارے ذمہ کام ہے تم نے کرنا ہے۔ خوشی سے کرو یا مجبور ہو کر کرو، تم نے کرنے ہیں۔ تو ان دونوں نے کہا کہ ہم خوشی سے کریں گے، اور یہاں جو فرمایا کہ ہم نے امانت پیش کی اور انہوں نے انکار کر دیا تو یہ امور تکوینیہ نہیں بلکہ امور تشریعیہ ہیں، کہا کہ امور تشریعیہ ہمارے بس میں نہیں ہیں، ہم اس پر معذرت کرتے ہیں، ہم کمزور ہیں، ہاں تکوینی امور ہم کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اب ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔



## ایمان اور کفر کا انجام:

﴿يُعَذِّبُ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَ

يَتُوبُ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا﴾

نوع انسانی نے جو امانت کا بار اٹھایا تھا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ انسانوں کے دو گروہ بن جائیں گے، ایک اس امانت کا پاس رکھنے والے اور دوسرے اس امانت کو ضائع کرنے والے۔ امانت کا پاس رکھنے والے اور اس کے تقاضے پر عمل کرنے والے مومنین ہیں اور اس کو ضائع کرنے والے منافقین اور مشرکین ہیں۔ تو فرمایا کہ اس امانت کو ضائع کرنے والے منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو اللہ عذاب دے گا اور مومن مردوں اور مومن عورتوں پر اللہ متوجہ ہو گا، ان کی توبہ کو قبول کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ توبہ کو کیوں قبول کرتے ہیں؟ فرمایا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے، ”غفوراً“ صفت اول ہے اور ”رحماً“ صفت ثانی ہے۔

عام طور پر قرآن کریم میں جب اللہ تعالیٰ دو صفتیں اس طرح جمع فرمائیں تو اس میں صفت اول دعویٰ ہوتی ہے اور صفت ثانی دلیل ہوتی ہے۔ تو ”غفوراً“ دعویٰ ہے اور ”رحماً“ اس کی دلیل ہے۔ یہ کیوں فرمایا؟ تاکہ کوئی بندہ یہ نہ سمجھے کہ چونکہ میں نے توبہ کی ہے تو اللہ کے ذمہ ہے میری توبہ کو قبول کرنا، فرمایا کہ جب تم توبہ کرتے ہو تو ہم قبول کر لیتے ہیں لیکن قبول کرنا ہمارے ذمے نہیں ہے بلکہ قبول اس لیے کرتے ہیں کہ ہم رحیم ہیں اور ہماری رحمت کا تقاضا ہے کہ تمہاری توبہ کو قبول کر لیں۔

اللہ سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

## سورة سبا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي  
الْآخِرَةِ ۖ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ﴾ ۝ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ  
مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۖ وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ ۝ ﴿﴾

تسبیح داؤدی میں پرندوں اور پہاڑوں کی شرکت:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِمَّا فُضِّلَ عَلَيْهِ جِبَالُ آوِيٍّ مَعَهُ وَالطَّيْرُ وَالتَّنَالُ

الْمُحْدِيْدَ﴾ ۝ ﴿﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی طرف سے  
خاص فضیلت عطا کی تھی۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ ہم نے پہاڑوں کو حکم دیا تھا کہ  
اے پہاڑو! تم ان کے ساتھ تسبیح کرو اور پرندوں کو بھی یہی حکم دیا تھا۔

”آوِیِّ“ یہ ”اَوْب، یَاوْب، تَاوِیِّا“ سے مشتق ہے، اس کا معنی ہے دہرانا،  
لوٹانا۔ حضرت داؤد علیہ السلام تسبیح پڑھتے تو ان کے ساتھ پہاڑ اور پرندے بھی تسبیح  
کرنے لگتے تھے اور اس کو دہراتے تھے۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام  
جب تسبیح پڑھتے تو پہاڑوں میں گونج کی آواز پیدا ہوتی کیونکہ تاویب کا معنی گونج نہیں

بلکہ مستقل دوسری آواز ہے۔ اسی طرح یہ جو پہاڑ تسبیح پڑھتے تھے یہ ایسی تسبیح تھی جس کے پڑھنے کو لوگ سنتے اور محسوس بھی کرتے تھے۔ اگر مطلق تسبیح پڑھنا مقصود ہو تو پھر یہ حضرت داؤد علیہ السلام کا اعزاز نہیں ہے کیونکہ تسبیح تو ساری چیزیں پڑھتی ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾<sup>148</sup>

کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو لیکن تم اس کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔

تو سارے پہاڑ اور پرندے تسبیح تو کرتے ہیں لیکن لوگ اس تسبیح کو سمجھتے نہیں ہیں کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ جو تسبیح کرتے تھے اس سے مراد ایسی تسبیح ہے کہ جس کو لوگ سنتے اور سمجھتے تھے کہ یہ کیا کہتے ہیں۔

**اپنے بارے میں لوگوں کی آراء معلوم کرنا:**

﴿وَالنَّارُ الْمَحْدِثَةِ﴾

حضرت داؤد علیہ السلام اپنے بارے میں لوگوں کی آراء معلوم کرتے تھے کہ لوگ مجھے کیسا سمجھتے ہیں؟ اس کا معنی یہ نہیں کہ لوگ میری تعریف کرتے ہیں بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر میرے اندر کوئی ایسی بات ہے جو پسند نہیں ہے تو میں اسے بدلوں گا۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی طریقہ تھا۔ آپ اپنے بارے میں معلومات لیتے تھے کہ لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ تو حضرت داؤد علیہ السلام بسا اوقات بازار میں جاتے باہر سے جو لوگ شہر میں آتے جو ان کو شکل سے نہیں جانتے تھے تو حضرت داؤد علیہ السلام ان سے پوچھتے داؤد کیسا آدمی ہے؟ تو ہر بندہ ان کی

تعریف کرتا۔

اللہ رب العزت نے ان کی تربیت کے لیے ایک فرشتہ بھیجا۔ اس سے پوچھا کہ داؤد کیسا آدمی ہے؟ فرشتے نے کہا کہ اپنی ذات کے لیے اور لوگوں کے لیے تو بہت اچھا ہے بس اس میں ایک تھوڑی سی کمی ہے کہ بیت المال سے وظیفہ لیتا ہے، اگر بیت المال سے نہ لے اور اپنا کما کر کھائے تو بہت اچھا آدمی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام آئے، اللہ کے سامنے روئے اور گڑ گڑائے اور کہا کہ اے اللہ! بات تو ٹھیک ہے، مجھے ایسے اسباب عطا فرمادیں کہ میں اپنا کماؤں اور اپنا کھاؤں اور دین کا کام کروں، پہلے بیت المال سے وظیفہ لیتے تھے پھر جب داؤد علیہ السلام نے دعائگی تو اللہ تعالیٰ نے بطورِ معجزہ لوہے کو آپ کے ہاتھ پر نرم کر دیا جس طرح آدمی رسی کو موڑے تو آسانی سے مڑ جاتی ہے تو حضرت داؤد علیہ السلام بھی لوہا اپنے ہاتھ سے جدھر موڑتے وہ مڑ جاتا تھا، اس سے داؤد علیہ السلام محنت کرتے کمائی کرتے اور باقی وقت تبلیغ میں لگا دیتے۔

اس لیے علماء کو چاہیے کہ وہ دین کا کام کریں اور کوشش کریں کہ معاش ان کا اپنا ہو لیکن اپنا معاش ایسا نہ ہو کہ جس سے دین کا کام ختم ہو جائے۔ دونوں میں فرق سمجھیں۔ بعض لوگ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنا مال کماتے ہیں کہ ہم لوگوں کا نہیں کھائیں گے، اپنا کما کر کھائیں گے اور دین کا کام کریں گے لیکن تجارت میں اتنا منہمک ہو جاتے ہیں کہ دین کا کام نہیں کرتے تو اس سے بہتر ہے کہ تنخواہ لے کر دین کا کام کرتے رہیں۔

باقی جو ہم علماء دین کا کام کرتے ہیں اور اس پر تنخواہ لیتے ہیں تو یہ جائز ہے لیکن جائز اس نیت سے ہے کہ آدمی اس نیت سے تنخواہ لے کہ اللہ تو مجھے اسباب عطا فرما تو میں تنخواہ لینا چھوڑ دوں گا اور بغیر تنخواہ کے دین کا کام کروں گا اور جب اسباب ملیں تو پھر تنخواہ چھوڑ دیں۔ یہ ہے عبادت! یہ نہیں کہ جب تک پیسے نہیں تھے تنخواہ

کے لیے کام کرتے رہے اور جب اللہ نے اسباب دے دیے تو پڑھانا چھوڑ دیا کہ مجھے اب ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ پیسوں کے لیے ہی پڑھاتے تھے۔ یہ گناہ ہے، یہ جائز نہیں ہے۔

### حضرت داؤد علیہ السلام کی کارگیری:

﴿إِنِ اعْمَلْ سَبْغَتٍ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوا صَاحِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ

بَصِيرٌ﴾

فرمایا کہ آپ اس سے زر ہیں بنائیں۔ سر پر پہننے والی لوہے کی ٹوپی بنائیں جس سے تلوار سے بچا جاتا ہے، جسے خود بھی کہتے ہیں۔ اور اس کی کڑیاں ٹھیک تو ازن اور تناسب سے جوڑیں۔

﴿وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ﴾... ”سَرْد“ کا معنی ہوتا ہے بُننا اور ”قَدِّر“ یہ تقدیر سے مشتق ہے جس کا ایک معنی ہے کہ زرہ کی کڑیاں بنانے میں روزانہ کا ایک وقت متعین کریں کہ میں نے اتنے وقت میں بنانی ہیں، سارا وقت اس پر صرف نہ کریں تاکہ عبادت اور دیگر امور میں خلل نہ آئے۔ تو اس سے نظم ثابت ہوتا ہے کہ کام کرنے والے عالم کو نظم و ضبط کا خیال رکھنا چاہیے۔ کچھ وقت معاش کے لیے اور باقی وقت دین کے لیے... اور ”قَدِّر“ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ آپ کڑیاں خاص انداز اور تناسب سے بنائیں تاکہ ٹیڑھی میڑھی نہ ہوں سیدھی ہوں، چھوٹی بڑی نہ ہوں بلکہ ساری برابر ہوں۔ تو اس سے آرائش ثابت ہوتی ہے کہ جب آپ کوئی مکان بنائیں تو خوبصورتی کا خیال رکھیں، آپ کپڑا بنائیں تو اچھا ہو، جوتا ہو تو اچھا ہو، چیز بنائیں تو درست ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایسی خوب صورتی شریعت میں مطلوب ہے۔ آپ مکان بناتے ہیں تو اس میں کوئی ایسی چیز بنالیں کہ خوب صورت لگے، رنگ آپ نے لگانا

ہے تو ایسا لگائیں جو آپ کے علاقے سے میچ کرتا ہو تو اس میں حرج کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارے علاقے میں پہاڑیاں نہیں ہیں، یہاں پر سبزہ کم ہوتا ہے اس لیے یہاں گہرے رنگ نہیں چلتے بلکہ ہلکے چلتے ہیں۔ جب آپ کشمیر، مری اور ان علاقوں میں جائیں جہاں سبزہ بہت ہے تو وہاں ڈارک کالر چلتے ہیں، کالر میں اٹھان نہ ہو تو کالر خوب صورت نہیں لگتا، درخت گھنے ہوتے ہیں، سفیدی سیاہی کی طرح ہوتی ہے، اب سرخی خوب نہ نکلے تو مکان کھل کر سامنے نہیں آتا۔ اس لیے وہاں گہرے کالر چلتے ہیں۔

﴿وَأَعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ آپ نیک کام کرتے

رہیں، میں آپ کے کاموں کو دیکھتا ہوں۔

### حضرت سلیمان علیہ السلام کے اعزازات:

﴿وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غَدُوًّا شَهَرَ وَرَوْاحَهَا شَهْرًا وَأَسْلَمْنَا لَهُ عَيْنَ

الْقَطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَن يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ

أَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ﴾

حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس گھوڑے بہت تھے۔ ایک دن سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے، آپ دیکھ بھال میں اتنے منہمک ہوئے کہ آپ کی عصر کی نماز قضا ہو گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو بہت دکھ ہوا تو آپ نے سارے گھوڑے ذبح کر کے صدقہ فرمادیے۔ سلیمان علیہ السلام پر کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ ان کی شریعت میں جیسے بھینس اور بکری کو کھانا جائز تھا ایسے ہی گھوڑے کا کھانا بھی جائز تھا تو جائز کام کیا۔ پھر ان کا اپنا مال تھا کسی اور کا نہیں تھا۔ اس لیے ذبح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اللہ رب العزت نے سلیمان علیہ السلام کی اس قربانی کو دیکھ کر گھوڑے کے

بدلے میں ہوا ان کے لیے مسخر فرمادی۔ پہلے سفر گھوڑوں پر ہوتا تھا، اب اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں کے بدلے میں ہوا دے دی اور ہوا ایسی تیز رفتار ہوتی تھی کہ ایک گھوڑا ایک مہینہ مسلسل چلتا رہے تو جتنا سفر وہ ایک مہینے میں طے کرتا تھا اتنا سفر ہوا تخت کو لے کر صبح کے وقت طے کر لیتی تھی۔ اس لیے سلیمان علیہ السلام ایک دن میں اتنا لمبا سفر طے کرتے جتنا تیز رفتار گھوڑا مسلسل دو ماہ چلنے سے طے کرتا تھا۔ اب سلیمان علیہ السلام تخت سجادیت، گھر والے بھی اس پر ہیں، وزرائے سلطنت بھی اس پر ہیں، اپنی جماعت کے علماء بھی ساتھ ہیں اور صبح سلیمان علیہ السلام ملک شام میں ہوتے اور دوپہر کو اصرخ - جگہ کا نام ہے - وہاں پہنچ جاتے، ادھر قیلولہ کیا کھانا کھایا اور وہاں سے تخت اڑا تو رات کابل میں گزارتے تھے۔

### شہانہ زندگی تقویٰ کے خلاف نہیں!

اللہ نے کیسی شہانہ زندگی عطا کی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی عالم کی شہانہ زندگی شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ میں اس لیے اکثر یہ بات کہا کرتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں بات چلتی ہے کہ ہمارے شیخ صاحب بہت نیک آدمی ہیں کیونکہ پچیس سال سے صحیح بخاری پڑھانے کے لیے سائیکل پر آرہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ کہو کہ ہمارے شیخ صاحب بہت غریب آدمی ہیں پچیس سال سے سائیکل پر صحیح بخاری پڑھانے کے لیے آرہے ہیں۔ اگر سائیکل پر آنا تقویٰ کی علامت ہوتی تو صبح جو مزدور منڈی جاتے ہیں وہ بہت متقی ہیں، کیونکہ سب سائیکل پر جاتے ہیں۔ تو سواری کا نہ ہونا یہ تقویٰ کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ غربت کی نشانی ہے۔ اس لیے یہ جو حضرات تقویٰ کا یہ معنی بیان کرتے ہیں یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔

اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آپ کو یہ تو ملے گا کہ آپ کے گھر میں دو ماہ تک چولہا نہیں جلا لیکن آپ کو یہ نہیں ملے گا کہ آپ کی سواری کسی

اور صحابی سے کم تر ہو! اللہ کے نبی کی سواری مدینہ میں سب سے اچھی سواری ہوا کرتی تھی۔ مدینہ میں تھوڑا سا خطرہ ہوتا تو آپ گھوڑے کی پشت پر بیٹھتے اور پورے مدینے کا چکر ہوا کی طرح لگا لیتے، اچھی سواری کا ہونا یہ ہمارے پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اور براق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ سواری ہے کہ جس سے تیز رفتار سواری دنیا میں نہ آج تک پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی قیامت کی صبح تک پیدا ہوگی۔ تو تیز رفتار سواری کا ہونا تو سنت ہے۔ تو جو علماء میں خوبیاں ہوتی ہیں ہم وہی چیزیں علماء میں عیب سمجھتے ہیں۔ اس لیے کسی عالم کے پاس اچھی گاڑی دیکھو تو اس کے لیے مزید دعا کرو کہ اللہ اس کو اور اچھی گاڑی دے، عالم کے لیے اچھی گاڑی کا ہونا، اچھی سواری کا ہونا، اچھی بود و باش کا ہونا یہ سنت کے خلاف نہیں ہے۔

### سفید لباس کا اہتمام:

میں آپ کو مجبور نہیں کرتا کہ آپ پگڑی باندھیں لیکن میں بہت خوش ہوتا ہوں جب آپ کی پگڑی دیکھتا ہوں اور جب آپ کا سفید کپڑا دیکھتا ہوں۔ آپ طلبہ ہیں سفید کپڑا رکھنا بہت مشکل ہے، سفید کپڑا ہو پھر اسے کلف لگائیں پھر اس کو سنبھالیں یہ بہت مشکل ہے، اس لیے آپ کی مجبوری ہے لیکن پسند سفید کپڑے کریں اور جب اللہ توفیق دیں تو سفید لباس اختیار کریں۔ اچھی پگڑی پہننا یہ عالم کی شان کے لائق ہے۔ اس کا بہت خیال کیا کریں۔

### تانے کا چشمہ:

﴿وَأَسْلَمْنَا لَهُ عَيْنَ الْقَطْرِ﴾

اور ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لیے تانے کا چشمہ نکال دیا تھا۔  
حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم کر دیا اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے تانے کا چشمہ نکال دیا اور یہ چشمہ بہتا تھا اور ٹھنڈا ہوتا تھا



تاکہ اس سے برتن اور دیگر ضرورت کی اشیاء بنانے میں دقت پیش نہ آئے اور یہ چشمہ میلوں لمبا تھا۔

﴿وَمِنَ الْجَنِّ مَنْ يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ﴾

اور بعض جنات ایسے تھے رب تعالیٰ کے حکم سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے کام کرتے تھے۔ مثلاً سفر پر جاتے تو ہد ہد کے ذمہ تھا کہ پانی دیکھے۔ اللہ نے ہد ہد کو یہ صلاحیت دی تھی کہ وہ زمین پر کھڑا ہو تا تو اس کو پتا چل جاتا کہ پانی کتنا نیچے ہے۔ اس پانی کو جنات فوراً نکال لیتے اور تالاب بناتے اور یہ لشکر وہیں رات گزارتا تھا۔ اب بتاؤ! اتنی تیز رفتار دنیا میں کس کی سروس ہوگی جو اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔

### تسخیر جن کا مسئلہ:

تسخیر جن کا مسئلہ ذہن میں رکھیں۔ جنات کو مسخر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس پر علامہ بدرالدین ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ شبلی دمشقی حنفی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مستقل کتاب ”احکام المرجان فی احکام الجنان“ ہے، اس میں بڑی تفصیل سے یہ مسئلہ لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر جنات انسان کے کسی عمل دخل کے بغیر مسخر ہو جائیں تو یہ اللہ کا فضل ہے اور ان سے کام لینا جائز ہے جیسے جنات من جانب اللہ سلیمان علیہ السلام کے تابع تھے تو یہ ان کا معجزہ ہے۔ اسی طرح بعض صحابہ کرام مثلاً حضرت ابو ہریرہ، حضرت زید، حضرت ابی ابن کعب، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں بھی منقول ہے کہ جنات ان کے تابع تھے اور وہ ان سے کام لیتے تھے۔ جنات کا صحابہ کرام کے تابع ہونا بطور کرامت تھا۔

جنات کو تابع کرنے کے لیے اگر کفریہ کلمات یا کفریہ افعال کیے جائیں تو یہ عمل کفر ہے اور اس طرح تابع کرنا بھی ناجائز اور حرام ہے کیونکہ نافرمان یعنی کافر

جنوں کو تابع کرنے اور ان سے کام لینے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے کفریہ کلمات کہے جائیں کہ جن سے شیاطین جنات خوش ہو جائیں اور خوش ہو کر اس بندے کا کام کریں تو یہ حرام ناجائز ہے۔ جیسے کسی جن کو تابع کرنے کے لیے معاذ اللہ قرآن جلانا یا العیاذ باللہ قرآن پر کھڑے ہو کر غسل کرنا یہ جائز نہیں ہے، حرام ہے۔ اسی طرح کسی فاسق جن کو تابع کرنے کے لیے گناہ کا ارتکاب کرنا یہ بھی جائز نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص جنات کو تابع کرتا ہے، کلمات کفریہ کا ارتکاب بھی نہیں کرتا اسی طرح اعمال فسق کو بھی اختیار نہیں کرتا بلکہ شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے قرآنی آیات، اللہ تعالیٰ کے مبارک ناموں یا ایسے کلمات کے ذریعے تابع کرتا ہو جن کا معنی صحیح ہے تو اس طرح جنات کو تابع کرنا جائز ہے لیکن جنات کو تابع کرنا دفع مضرت کے لیے ہو جب منفعت کے لیے نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے آزاد کو غلام بنانا لازم آتا ہے۔ آپ نے اعمال کی وجہ سے جو جن تابع کیا ہے تو اسے غلام بنایا ہے اس سے کام لینے کے لیے، یہ تو جائز ہی نہیں ہے۔ ہاں کسی نقصان سے بچنے کے لیے آپ اس کو تابع رکھیں تو یہ جائز ہے۔

تو سلیمان علیہ السلام جنات سے کام لیتے تھے۔

### سرکش جنات کی سزا:

﴿وَمَنْ يَدْرُغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِ نَأْذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ﴾ (١٦)

اللہ فرماتے ہیں کہ جس جن نے ہماری بات نہ مانی اور ہمارے حکم سے ہٹ

کر ٹیڑھا راستہ اختیار کیا تو ہم اس کو آگ کا سخت عذاب دیں گے۔

آخرت کا عذاب تو ہو گا ہی لیکن ایک روایت میں ہے کہ دنیا میں بھی ان

جنات پر ایک فرشتہ متعین تھا جس کے پاس آگ کا کوڑا ہوتا تھا، جو جن سلیمان علیہ

السلام کی اطاعت میں کو تاہی کرتا تو وہ فرشتہ اس کو آگ کے اس کوڑے سے مارتا تھا۔

اب اس پر اگر کسی کے ذہن میں سوال ہے کہ جنات تو خود آگ سے بنے تھے تو انہیں آگ کا کوڑا مارنے سے تکلیف کیسے ہو گی؟ اس کا جواب بہت آسان ہے کہ جیسے انسان مٹی سے بنا ہے لیکن مٹی کا ڈھیلا اسے مارو تو درد ہوتا ہے اسی طرح جن اگرچہ آگ سے بنے ہیں لیکن آگ کا کوڑا لگے تو انہیں بھی تکلیف ہوتی ہے۔

### جنات کی ڈیوٹیاں:

﴿يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِبَ وَ تَمَاثِيلَ وَ جِفَانٍ كَأُجْوَابِ وَ قُدُورٍ رُسِيَّتٍ ۖ اَعْمَلُوا اِنَّ دَاوُدَ شَكَرْنَا وَ قَلِيلٍ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّاكِرِينَ﴾

جنات سلیمان علیہ السلام کے لیے وہ چیزیں بناتے جو سلیمان علیہ السلام چاہتے تھے جیسے اونچی اونچی عمارتیں، تصویریں، حوض کی طرح کے پانی بھرنے کے بڑے بڑے برتن اور ایسی بڑی بڑی دیگیں جو ایک ہی جگہ پڑی رہتی تھیں۔ اے داؤد کے خاندان والو! شکر بجالاؤ، میرے بندوں میں سے بہت کم ہیں جو شکر ادا کرتے ہیں۔

### محراب کسے کہتے ہیں؟

مَحَارِبَ؛ محراب کی جمع ہے، محراب کسی مکان کے اعلیٰ اور عمدہ حصے کو کہتے ہیں، محراب اس مخصوص کمرے کو بھی کہتے ہیں جو بادشاہ اور بڑے لوگ خاص اپنے لیے بناتے ہیں جس میں حکومتی امور سرانجام دیتے ہیں۔ محراب یہ حرب سے مشتق ہے جس کا معنی جنگ ہے، بادشاہ لوگ جب اپنا خاص کمرہ بناتے ہیں تو اس تک عام بندے کی رسائی نہیں ہوتی اور جب کوئی شخص اس کمرہ خاص تک پہنچنے کی کوشش کرے تو اس سے جنگ بھی کرتے ہیں اس لیے اس کمرے کو محراب کہتے ہیں، اور محراب مسجد کے اگلے حصے کو بھی کہتے ہیں جس میں امام کھڑا ہوتا ہے۔ تو محراب کا معنی عام کمرہ بھی ہے اور محراب کا معنی اچھی عمارت بھی ہے۔

## حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں تصویر سازی:

﴿وَتَمَازِين﴾

تماثل؛ تماثل کی یا تماثل کی جمع ہے، اس کا معنی ہے تصویریں۔ ایک تصویر ہوتی ہے ذی روح کی اور ایک تصویر ہوتی ہے جو ذی روح کی نہ ہو اور جو ذی روح کی نہ ہو تو اس کی دو قسمیں ہیں: ایک اس چیز کی تصویر جو جامد ہو جیسے پتھر ہے اور ایک اس چیز کی تصویر جو بڑھے جیسے درخت ہے۔ یہ تین قسم کی تصاویر ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں ذی روح کی اور غیر ذی روح کی دونوں قسموں کی تصاویر جائز تھیں اور وہ بنواتے بھی تھے۔ اس پر تو کوئی کلام نہیں ہے۔

## موجود دور میں تصویر کا حکم:

ہمارے دور میں جو غیر ذی روح کی تصویر ہے جیسے درخت، پتھر اور مکانات وغیرہ اس کے جواز میں بھی کوئی اشکال نہیں ہے۔ ہاں البتہ جاندار کی تصویر ہو تو احادیث میں اس پر بہت زیادہ وعیدیں آئی ہیں۔ ایک حدیث پاک میں ہے:

"أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْمُصَوِّرُونَ".<sup>149</sup>

کہ سخت ترین عذاب قیامت کے دن ان کو ہو گا جو تصویریں بناتے ہیں۔

اور ایک حدیث پاک میں ہے:

"كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ".<sup>150</sup>

کہ یہ تصویریں بنانے والے سارے جہنم میں ہوں گے۔ تو مختلف قسم کی وعیدیں احادیث میں آئی ہیں۔

149- صحیح البخاری، رقم: 5954

150- صحیح مسلم، رقم: 2110

اب آج کے دور میں تصویر جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ تصویر جائز ہے کیونکہ پہلے لوگ تصاویر بناتے پھر ان کا احترام کرتے، عظمت دل میں آتی اور ان کی پوجا شروع ہو جاتی تھی اس وجہ سے حرام تھی اور آج کے دور میں چونکہ یہ وجہ نہیں ہے لہذا تصویر جائز ہے۔

تصویر کے جواز اور عدم جواز کا مسئلہ الگ ہے لیکن یہ دلیل ٹھیک نہیں ہے۔

### حرمتِ تصویر کی وجوہات:

تصاویر کے حرام ہونے کی چار وجوہات ہیں:

1: ایک وجہ بت پرستی ہے کہ لوگ تصویر، مورتی بنا کر اس کی پوجا کرتے تھے اس لیے حرام ہے۔

2: دوسری وجہ کہ تصویر ایسی چیز ہے جو زینت ہے لیکن زینت زائد از ضرورت ہے۔ بعض لوگ اپنے گھر میں جانداروں کی تصاویر لٹکاتے ہیں اس لیے یہ جائز نہیں ہے۔

3: تصویر پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نفرت کا اظہار فرمایا ہے۔ فرمایا: ”لَا تَدْخُلُ الْمَلَايِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا تَصَاوِيرُ“<sup>151</sup> ایسے گھر میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے جہاں کتا ہو یا تصویر ہو۔ تو تصویر کو کتے کے ساتھ شمار کیا ہے، جس طرح کتا قابل نفرت ہے اسی طرح تصویر بھی قابل نفرت ہے۔ اب کتے کی قباحت کی کیا وجہ ہے؟ جس طرح اس کی وجہ نہیں بتائی اسی طرح تصویر کے قابل نفرت ہونے کی وجہ بھی نہیں بتائی۔

4: ”مصور“ اللہ رب العزت کی خاص صفت ہے، ﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي

اَلْاَزْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ<sup>152</sup> وہی اللہ ہے جو ماؤں کے پیٹ میں تمہاری تصویریں بناتا ہے۔ جو بندہ تصویریں بناتا ہے گویا وہ اللہ کی صفتِ مصوری میں خود کو شریک کرتا ہے اور قیامت کے دن اللہ فرمائیں گے کہ تم تصاویر بناتے تھے مگر روح نہیں ڈال سکتے تھے، میں تصاویر بناتا تھا اور روح بھی ڈالتا تھا۔ اگر تم تصویر میں روح ڈال سکتے ہو تو ڈال لو! یہ نہیں ڈال سکے گا تو سخت عذاب کا مستحق ہو گا۔ اس لیے جائز نہیں ہے۔

### تصویر کے بارے میں رائے:

مجھ سے کوئی بندہ بھی پوچھے تو میں کہتا ہوں کہ بھائی تصاویر حرام اور ناجائز ہیں، ہم تصویر کو جائز قرار دینے والوں میں شامل نہیں ہیں خواہ تصویر متحرک ہو خواہ تصویر جامد ہو۔ تصویر تصویر ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر ضرورت ہو تو آپ بنا لیں لیکن ضرورت بقدر ضرورت ہو اس سے زائد نہ ہو۔ اتنی بات میں ضرور کہتا ہوں کہ جو لوگ تصاویر بناتے ہیں اور حرام سمجھ کر بناتے ہیں اور بقدر ضرورت بناتے ہیں تو ان کی ضرورت پر ہم اعتراض نہ کریں کہ جی اس کی کیا ضرورت تھی؟ کیوں بنائی ہے! بھائی! یہ ہمارا مسئلہ ہے یا بنانے والے کا مسئلہ ہے؟ (بنانے والے کا۔ سامعین) تو ہم خواہ مخواہ اعتراض کیوں کریں! میں اس لیے کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو مستقل ٹینشن میں مبتلا نہ کرو، خواہ مخواہ کسی کی نفرت اپنے دماغ میں مت بٹھاؤ!

### مسئلہ عمومی بیان کریں لیکن فتویٰ نہ لگائیں:

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی صاحب دامت برکاتہم جب ہندوستان کے دورے پر تشریف لے گئے، میں ان کہ ہاں معہد الفقیر جھنگ گیا تو مجھے مولانا حبیب اللہ صاحب نے کہا: ہمیں دو باتوں پر بہت تعجب ہوا؛

ایک یہ کہ ہم مظاہر العلوم یا دیوبند جہاں بھی گئے ہیں مشائخ پوچھتے کہ مولانا الیاس گھمن صاحب کا کیا حال ہے؟ ہمارے ہاں آپ کی حیثیت ایک خطیب کی ہے اور بس! لیکن وہاں جا کر ہمیں احساس ہوا کہ آپ کی علمی حیثیت کیا ہے؟! دوسرا ایک جگہ ہم گاڑی پر جا رہے تھے تو مشائخ میں تصویر کی بات چلی تو سب نے کہا کہ ناجائز ہے، ان کا کہنا یہ تھا کہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے متحرک ڈیجیٹل تصویر پر دلائل پیش کیے تو ہم نے اس کا جواب انہیں بھیجو دیا ہے، مولانا حبیب اللہ صاحب کہتے ہیں کہ میں نے خود کہا کہ مولانا گھمن صاحب تو بناتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کی بات نہ کریں ان کو چھوڑیں۔

تو مشائخ کا ذہن ہے کہ عمومی مسئلہ بیان کریں، فرد پر فتویٰ نہ لگائیں۔

**جنوں کی کارگیری بڑی بڑی دیگیں:**

﴿وَجَفَّانٍ كَأَبْوَابٍ وَقُذُورٍ رَّسِيَّتٍ ۖ﴾

اور جنات پانی کے لیے بڑے بڑے برتن بناتے جیسے بڑے بڑے حوض ہوتے ہیں تالاب کی طرح کے اور دیگیں بناتے جو ایک جگہ پر جمی ہوتیں۔ اتنی بڑی دیگ ہوتی کہ اس کو اٹھانا مشکل ہوتا۔ ظاہر ہے کہ جنات اس کو بناتے تھے، جنات اس کو پکاتے تھے، عام بندہ اس کو کیسے اٹھا سکتا تھا۔ تو یہ بڑی بڑی دیگیں ہوتی تھیں جس میں کھانے پکاتے تھے۔

**حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات:**

﴿فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَى مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ

تَأْكُلُ مِنْسَأَتَهُ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَنْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا

لَبِئْسُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ۖ﴾

حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر کا کام شروع کیا اور بیت المقدس کا جو بنیادی کام ہے وہ مکمل ہو گیا تھا۔ بنیادی کام کے مکمل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر ہونے کے بعد اللہ سے دعائیں مانگیں:

### حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعائیں:

❖ یا اللہ! جو گناہ گار مسجد اقصیٰ میں آکر توبہ کرے تو آپ اس کی توبہ کو قبول فرمائیں۔

❖ اگر کوئی بے امن شخص خوف اور خطرہ سے بچنے کے لیے اس مسجد میں آئے تو اس کو امن عطا فرمادیں۔

❖ جو مریض اس مسجد میں داخل ہو تو اس کو شفا عطا فرمادیں۔

❖ اگر کوئی فقیر اس مسجد میں آئے تو اس کو غنی فرمادیں۔

❖ جو اس مسجد میں داخل ہو جب تک وہ اس میں رہے آپ اس پر نظر کرم اور نظر رحمت فرمادیں سوائے اس شخص کے جو کسی بے دینی کے کام میں مشغول ہو یا کسی ظلم و ستم کا کام کر رہا ہو۔

یہ پانچ دعائیں سلیمان علیہ السلام نے مانگیں ہر اس بندے کے لیے جو بیت المقدس میں داخل ہو۔ تو تعمیر مکمل ہوئی تب ہی تو دعائیں مانگی ہیں۔

جیسے ہمارے مرکز اہل السنۃ والجماعۃ سرگودھا کی مسجد کے ہال کی تعمیر مکمل ہے، اب ہم چاہتے ہیں کہ پیسے ہوں تو اس کی سیلنگ کروائیں، پیسے ہوں تو اس کو رنگ کروائیں، پیسے ہوں تو اے سی لگوائیں۔ اب دیکھیں اصل کام تو مکمل ہو چکا ہے لیکن تھوڑا بہت کام جو اصل کام سے زائد ہے وہ باقی ہے۔ اسی طریقے سے بیت المقدس کا بنیادی کام تو مکمل تھا البتہ کچھ کام باقی تھا، اس پر تقریباً ایک سال لگنا تھا۔ اب سلیمان علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے وحی آئی کہ آپ کا دنیا سے جانے کا وقت آگیا ہے اور ان



جنات سے کام بھی لینا ہے۔ تو بحکم خداوندی سلیمان علیہ السلام نے شیشے کا ایک کرہ بنایا۔ باہر سے بندہ اندر دیکھے اور اندر سے باہر دیکھے تو سب چیزیں نظر آتی تھیں۔ وہاں بیٹھ کر آپ علیہ السلام نگرانی کرتے رہے اور جنات بھی دیکھ رہے تھے کہ سلیمان علیہ السلام نگرانی فرما رہے ہیں۔

سلیمان علیہ السلام نے ایک دن مصلیٰ بچھایا اور اپنے ساتھ ایک عصا لے کر کھڑے ہو گئے۔ جنات دیکھ رہے تھے کہ آپ اب بھی ہماری نگرانی کر رہے ہیں اور اسی دوران ملک الموت نے باذن اللہ آپ کی روح قبض کر لی، آپ فوت ہو گئے لیکن دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ سلیمان علیہ السلام زندہ ہیں اور نگرانی کر رہے ہیں۔ ایک سال تک جنات اپنے کام میں لگے رہے۔ جب تعمیر کا کام مکمل ہوا اللہ نے دیمک کے کیڑے کو بھیجا، اس نے سلیمان علیہ السلام کے عصا کو کھایا، عصا گرا تو سلیمان علیہ السلام زمین پر گر گئے۔ پھر جنات کو پتا چلا کہ سلیمان علیہ السلام کو فوت ہوئے ایک سال گزر گیا ہے اور ہم کام میں لگے ہیں۔ ایسا کیوں کیا تھا؟ اس سے دو باتیں مقصود تھیں:

نمبر 1: بیت المقدس کا باقی ماندہ کام مکمل ہو جائے۔

نمبر 2: لوگوں کو اس بات کا پتا چل جائے کہ جنات عالم الغیب نہیں ہیں، یہ بے خبر اور بے بس ہیں، یہ اس لیے تاکہ میرے جانے کے بعد یہ لوگوں سے اپنی پوجا شروع نہ کروادیں کہ ہم بڑے طاقت ور ہیں۔

**منکرین حیات الانبیاء کے ایک شبہ کا جواب:**

بعض لوگ اس سے استدلال کرتے ہیں کہ پیغمبر وفات کے بعد زندہ نہیں ہوتے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب لاٹھی گری تو سلیمان علیہ السلام فوراً گر گئے، اگر زندہ ہوتے تو نہ گرتے۔

ہم کہتے ہیں کہ لاٹھی کے گر جانے سے سلیمان علیہ السلام کا گر جانا اگر یہ دلیل ہو موت کی تو جب بندہ ٹیک لگا کر سو جائے اور ٹیک کو ہٹائیں تو بندہ گر جاتا ہے، یہ مردہ ہے یا زندہ ہے؟ (زندہ۔ سامعین) تو ٹیک کے گرنے سے بندے کا گرنا اگر اس کی موت کی دلیل ہو تو سونے والے سارے مردے ہوتے کوئی بھی زندہ نہ ہوتا! اسی طرح ایک بندہ کمزور ہے جو لاٹھی کے سہارے پر چلتا ہے آپ اس کی لاٹھی کھینچیں تو وہ گر جاتا ہے، اب بتاؤ وہ زندہ ہے یا مردہ ہے؟ (زندہ ہے۔ سامعین) اس کو تو کوئی مردہ نہیں کہتا! ایک سلیمان علیہ السلام ملے ہیں جن کو تم نے مردہ کہنا ہے العیاذ باللہ۔

میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ ان لوگوں کی دلیل میں ضعف کتنا زیادہ ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ ماشاء اللہ یہ بہت قرآن بیان کرتے ہیں، ایسا اشکال پیش کیا کہ مزا آ گیا! میں نے کہا کہ گھر میں بیٹھ کر اشکال پیش کرنا کیا مشکل ہے! ان کے اپنے شاگرد ہیں، اپنے تبعین ہیں، واہ واہ لگی ہوئی ہے اور ان کو کیا چاہیے؟

﴿فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنَّ أَنْ لَوْ كَانَُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي

الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿٧٠﴾﴾

جب سلیمان علیہ السلام گرے تو اس وقت جنوں کو معلوم ہوا کہ اگر ان کو غیب کا علم معلوم ہوتا تو وہ اس مشقت میں مبتلا نہ رہتے۔

﴿الْمُهِينِ﴾ کا معنی مشقت ہے، اس میں بہت سارے جنات ایسے تھے جو شوق سے کام نہیں کرتے تھے تبھی تو عذاب مھین فرمایا، اگر سارے شوق سے کام کرتے ہوتے تو ان کے لیے عذاب مھین نہ کہا جاتا۔ بہت سارے لوگ ہوتے ہیں جو دل سے کام کرنا نہیں چاہتے، مجبور ہوتے ہیں کہ بس اب پھنسے ہوئے ہیں تو کام کرنا ہی ہے۔

## قوم سبا کا قصہ:

﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكِهُمْ آيَةٌ جَنَّتِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ﴾

”سبا“ کسے کہتے ہیں؟ ایک حدیث پاک میں ہے کہ یمن میں ایک آدمی تھا جس کا نام سبا تھا، اس کے دس بیٹے تھے، چھ یمن میں رہے اور چار شام میں چلے گئے، ان کے آگے پھر ان کے بیٹوں کے ناموں ہی سے قبیلے چلے اور آگے نسل چلی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ سبا؛ یمن کے بادشاہ اور اس ملک کے باشندوں کا لقب تھا۔

قوم سبا کے رہنے کی جگہ میں اللہ تعالیٰ نے برکت عطا فرمائی تھی۔ ملک یمن کے دار الحکومت کا نام ہے ”صنعاء“ اس سے تین منزل کے فاصلے پر ایک شہر تھا ”مارب“ اس میں یہ قوم آباد تھی۔ یہ ایک بہت خوبصورت جگہ تھی۔ ان کی سڑکوں کے دونوں طرف پھل دار باغات کے سلسلے تھے جو دور دراز تک چلے گئے تھے۔ پہاڑوں کے درمیان ایک وادی میں یہ شہر آباد تھا۔ یہاں کے بادشاہوں نے پہاڑوں کے درمیان میں ایک مضبوط ڈیم بنادیا تھا جس میں پانی کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ پہاڑوں سے آنے والا پانی اور بارشوں کا پانی اس میں ذخیرہ ہوتا تھا۔ اس بند میں تین دروازے رکھے گئے تھے۔ ایک دروازہ اوپر تھا پھر نیچے، پہلے اوپر کا دروازہ کھولتے تو پانی آتا جس سے وہ لوگ اپنے استعمال کا پانی لے لیتے، کھیتوں کے لیے، اپنے استعمال کے لیے، جب اوپر کا پانی ختم ہو جاتا تو نیچے والا دروازہ کھولتے اور پانی استعمال کرتے اور اگر وہ بھی ختم ہو جاتا تو پھر نیچے والا دروازہ کھولتے تھے۔ اس ڈیم کے نیچے ایک تالاب بنا کر اس کے بارہ راستے بنا کر نہریں بنائی گئی تھی جن کے ذریعے شہر میں مختلف جگہوں پر پانی فراہم کیا جاتا تھا۔ ملکہ بلقیس جن کا واقعہ سورۃ النمل میں گزر چکا ہے تو وہ ملکہ بلقیس بھی اسی قوم میں سے تھیں۔

خیر میں خلاصہ عرض کر رہا ہوں کہ شہر کے دائیں بائیں جو دو پہاڑ تھے ان کے کناروں کی سڑکوں پر جو باغات لگائے گئے تھے ان میں پھل اتنی کثرت سے تھے کہ عورت خالی ٹوکری لے کر باغ میں داخل ہوتی تو پھل درختوں سے ٹوٹ کر خود بخود ٹوکری میں گرتے اور ٹوکری بھر جاتی۔ جب انہوں نے اللہ کی اس عظیم نعمت کی ناقدری کی تو اللہ نے ان کے بند کو توڑا، ان کو برباد کر دیا اور بند توڑنے کے لیے اس میں چوہے بھیجے، ان چوہوں نے بنیادوں کو کاٹا اور اس طرح ان کا وہ بند ٹوٹ گیا اور تباہی و بربادی ہو گئی۔ ان باغات کے بدلے میں اللہ نے ان کو اور باغات دیے، ان میں کیکر اور بیری کے درخت تھے۔ بعض بیری کے درخت اچھے ہوتے ہیں جن پر اچھا پھل لگتا ہے اور بعض کانٹے دار درخت ہوتے ہیں جن کا پھل بھی اچھا نہیں ہوتا۔

یمن سے لے کر شام تک ان کی بستیاں ملی ہوئی تھیں۔ جب یہ سفر کرتے تو ہر جگہ ان کو اچھا اسٹاپ ملتا لیکن بربادی کے بعد تو ایسے لگتا تھا کہ یہاں پر کوئی آبادی ہی نہیں تھی۔ اللہ ہمیں اپنی نعمتوں کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

### رزق کی فراوانی قدرت کا انعام ہے:

﴿قُلْ إِنَّ رَبِّيَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ

النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾

آپ فرمائیں کہ میرا رب رزق کو پھیلاتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور کم کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اسی سورت کی آیت نمبر 39 میں ہے:

﴿قُلْ إِنَّ رَبِّيَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ﴾

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تکرار ہے، وہی آیت پہلے ہے اور وہی آیت بعد میں ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ تکرار نہیں ہے۔ یہ جو پہلی آیت ہے اس کا تعلق کفار کے ساتھ ہے، کیونکہ اس سے پہلے ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۝۳۹﴾ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا ۖ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۝۴۰﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس بستی میں ہم نے اپنا کوئی پیغمبر بھیجا تو اس بستی والوں میں سے خوشحال اور مال والے لوگوں نے کہا: ہم اس پیغام کا انکار کرتے ہیں جو تم لائے ہو! اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارا مال بھی تم سے زیادہ ہے اور ہماری اولاد بھی تم سے زیادہ ہے اور ہمیں عذاب بھی نہیں ہوگا!

کیونکہ اگر ہم اللہ کے پسندیدہ بندے نہ ہوتے تو اللہ دنیا میں ہمیں دولت نہ دیتا، جب دنیا میں دی ہے تو موت کے بعد ہمیں عذاب کیوں دے گا؟! تو اللہ فرماتے ہیں کہ ان کو سمجھاؤ کہ رزق اللہ جس کو چاہتے ہیں زیادہ دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں کم دیتے ہیں۔ تو مال اور اولاد کا زیادہ ہونا اللہ کے محبوب ہونے کی نشانی نہیں ہے۔ اس آیت کا تعلق کفار کے ساتھ ہے۔

اگلی آیت نمبر 39 کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ حکم اللہ نے اپنے خاص بندوں یعنی مؤمنین سے فرمایا ہے کہ دیکھو! تم ایمان والے ہو، تقویٰ والے ہو، تمہارا خدا پر اعتقاد ہے، اس لیے اگر مال مل جائے تو مال کی محبت کی وجہ سے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم صدقہ کرنا کم کر دو، مال زیادہ ملے تو خرچ کرنا کم کر دو بلکہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو کیونکہ میں جس کو چاہتا ہوں رزق زیادہ دیتا ہوں، جس کو چاہتا ہوں کم دیتا ہوں، ﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝۴۱﴾ اگر تم نے مال راہِ خدا میں

دے دیا تو مال کم نہیں ہو گا میں اس کے بدلے میں تمہیں اور مال دوں گا۔

تو پہلی آیت کا تعلق کفار کے ساتھ ہے اور دوسری کا تعلق مؤمنین کے ساتھ۔

اس کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ پہلی آیت کا تعلق مختلف لوگوں کے ساتھ ہے کہ ہم نے بعض لوگوں کو رزق میں فراخی عطا فرمائی ہے اور بعض لوگوں کو رزق کی کمی دی ہے اور اس دوسری آیت کا تعلق ایک ہی بندے کے ساتھ ہے لیکن احوال کا فرق ہے۔ ایک بندہ ہے کبھی اس پر مال کی وسعت ہوتی ہے اور وہی بندہ ہے کہ کبھی اس پر مال کی تنگی ہوتی ہے۔ تو سمجھایا کہ اگر مال کی وسعت ہو تو وہ بھی ہماری طرف سے ہے اور کبھی مال کی تنگی ہو تو وہ بھی ہماری طرف سے ہے۔ اب کوئی تکرار نہیں۔

### مال خرچ کرنے کی عادت ڈالیں!

﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ﴾

تم جو چیز بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تو اللہ اس کا بدل تمہیں عطا فرماتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ ہر روز صبح کے وقت دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں، ایک فرشتہ کہتا ہے: ”اللَّهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلْفًا“ کہ اے اللہ! جس نے مال خرچ کیا ہے اس کو اس کے بدلے میں اور مال عطا فرما، اور دوسرا فرشتہ کہتا ہے: ”اللَّهُمَّ أَعْطِ مُبْسِغًا تَلْفًا“ کہ اے اللہ! جو شخص مال خرچ نہیں کرتا اور بخل کرتا ہے اس کے مال کو ہلاک کر دے۔<sup>153</sup>

تو مال خرچ کرنے سے مال بڑھتا ہے، مال خرچ کرنے سے مال کبھی کم نہیں ہوتا۔ میں نے پرسوں بھی عرض کیا تھا آج پھر عرض کرتا ہوں کہ طلبہ بھی مال خرچ کرنے کی عادت ڈالیں، اللہ وسعت دیں گے اور آپ کا مال کم نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

وَاخْرُجُوا دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة فاطر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَكِةِ رُسُلًا أُولَئِكَ أَجْنَحَةٌ مِّثْنَى وَثُلُثٌ وَرُبْعٌ يُزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾

ملائکہ اللہ کے قاصد ہیں:

ملائکہ کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ رب العزت نے ملائکہ کو اپنا قاصد بنا کر بھیجا ہے۔ قاصد کا معنی کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے درمیان فرشتے واسطہ ہوتے ہیں۔ یہ فرشتے کیسے ہیں؟ فرمایا: کسی کے دو پر ہیں، کسی کے تین پر ہیں، کسی کے چار پر ہیں، یہ دو تین چار میں حصر نہیں ہے کہ اس سے زائد پر نہیں ہیں کیونکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے بارے میں روایت میں ہے کہ ان کے چھ سو پر ہیں۔<sup>154</sup>

یہاں بتانا مقصود ہے کہ یہ پروں والے ہیں، دودو، تین تین، چار چار اور اس سے بھی زائد پروں والے۔

حضرت عمر کے قبول اسلام کی دعا:

﴿أَمِنَ زَيْنَ لَهٗ سَوْءَ عَمَلِهِ فَرَاةً حَسَنًا ۖ فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَ

يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَتٍ ﴿١٥٥﴾

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ رب العزت سے دعا مانگی:

"اَللّٰهُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَوْ بِاَبِي جَهْلٍ بِنِ هِشَامٍ"۔<sup>155</sup>

یا اللہ! عمر بن خطاب یا عمرو بن ہشام جسے ابو جہل کہتے ہیں ان دونوں میں سے کسی ایک کی وجہ سے دین کو عزت دے دے۔

دونوں جرنیل ہیں، مضبوط ہیں، بہادر ہیں، ان میں سے کوئی ایک شخص کلمہ پڑھے گا تو اسلام کو ان کی شجاعت کی وجہ سے تقویت بہت ملے گی۔ اللہ رب العزت نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مقدر میں لکھا تھا تو انہوں نے کلمہ پڑھا۔ ان کے آنے سے اسلام بہت بلند ہوا۔ تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ کہ اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت عطا فرما دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں گمراہ فرما دیتے ہیں۔

اس پر بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ جب گمراہ اللہ کرتے ہیں تو گمراہی میں بندے کے اختیار کو تو دخل نہ ہوا پھر بندے کو عذاب کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ رب العزت جو گمراہ کرتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اسباب ضلالت بندہ خود اختیار کرتا ہے، جیسے اسباب بندہ اختیار کرتا ہے اللہ ویسا نتیجہ عطا فرما دیتے ہیں۔

**عزتوں کا مالک اللہ ہے:**

﴿مَنْ كَانَ يَرْيِدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا﴾



دنیا میں کوئی شخص عزت حاصل کرنا چاہتا ہے مال کی وجہ سے، کوئی عزت حاصل کرنا چاہتا ہے اولاد کی وجہ سے، کوئی عزت حاصل کرنا چاہتا ہے لیڈر بن کر تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عزت دینے والا تو میں ہوں، میری طرف سے جو عزت ملتی ہے وہ خالص عزت ہوتی ہے، باقی عزتوں میں ذلت ہوتی ہے وہ صرف دھوکہ ہوتا ہے۔

### کلمات طیبات کا مصداق اور ان کی اہمیت:

﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ﴾

اللہ رب العزت کی طرف پاک کلمات جاتے ہیں۔ پاک کلمات سے مراد کلمہ توحید اور اللہ کی ذات اور صفات کا علم ہے۔ اور نیک اعمال ان کو اوپر اٹھاتے ہیں۔ یہ ترجمہ اس صورت میں ہے کہ جب ﴿يَرْفَعُهُ﴾ میں هُوَ ضمیر ﴿الْعَمَلِ الصَّالِحِ﴾ کی طرف ہو اور ”کا“ ضمیر یہ ﴿الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ کی طرف ہو، معنی ہو گا کہ کلمات طیبات اللہ کی طرف جاتے ہیں اور اعمال صالحہ ان کلمات طیبات کو اوپر اٹھاتے ہیں یعنی اعمال صالحہ کی وجہ سے کلمات طیبات قبول ہوتے ہیں۔ اعمال صالحہ کے بغیر کلمات طیبات خواہ کلمہ توحید ہو یا کوئی اور ذکر و اذکار ہوں اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوں گے۔

اب اس کو ذرا سمجھیں! یہاں پر بہت سارے حضرات نے لکھا ہے کہ عمل صالح کو تھوڑا سا وسیع کیا جائے تو اس میں تصدیق قلبی بھی آجاتی ہے اور دیگر اعمال مثلاً نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ بھی آجاتے ہیں۔ اب یہ جو کہا کہ اعمال صالحہ کے بغیر کلمات طیبات قبول نہیں تو عمل صالح سے مراد اگر تصدیق قلبی ہو یعنی دل سے انسان اللہ کی ذات پر اللہ کی صفات پر ایمان لائے تو یہ بات ٹھیک ہے کیونکہ اگر کوئی شخص زبان سے تَوَلَّاهُ إِلَّا اللَّهُ کہہ رہا ہے لیکن دل سے تصدیق نہیں کرتا بلکہ دل سے انکار کرتا ہے تو

اس کا یہ کلمہ قبول نہیں ہو گا۔

اور اگر اعمالِ صالحہ سے مراد نماز روزہ حج زکوٰۃ ہو تو اب مطلب یہ ہو گا کہ اعمالِ صالحہ کے بغیر کلماتِ طہیات قبول تو ہیں لیکن قبولیتِ تامہ کے لیے اعمالِ شرط ہیں۔ علماء کی زبان میں اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کلمات کی نفسِ قبولیت کے لیے تو اعمالِ شرط نہیں لیکن قبولیتِ تامہ کے لیے اعمالِ شرط ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک بندہ کلمہ بھی پڑھتا ہے، دل سے مانتا اور تصدیق بھی کرتا ہے لیکن اعمالِ نہیں کرتا۔ اب قیامت کے دن اس کا ایمان لانا قابلِ قبول تو ہو گا کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب سے نجات ملے گی لیکن چونکہ عمل میں کوتاہی کر چکا ہے اس لیے اپنے گناہوں کی بقدر سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائے گا۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ ﴿يَزْفَعُ﴾ میں هُوَ ضمیر ﴿اَلْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ کی طرف ہو اور ”ک“ ضمیر یہ ﴿اَلنَّعْمُ الصَّالِحُ﴾ کی طرف ہو۔ اب معنی بالکل برعکس بنے گا کہ کلماتِ طہیات اللہ کی طرف جاتے ہیں اور اعمالِ صالحہ کو یہ کلماتِ طہیات اٹھاتے ہیں یعنی کلماتِ طہیات کی وجہ سے اعمالِ صالحہ قبول ہوتے ہیں۔ مفسرین اس صورت میں معنی یہ کرتے ہیں کہ بندہ عملِ صالح کرے لیکن ساتھ ساتھ ذکر اللہ کا بھی کثرت سے اہتمام کرے تو اس سے اس کے اعمالِ صالحہ مزین ہو جاتے ہیں اور اللہ کے ہاں جلد شرفِ قبولیت پالیتے ہیں۔

**ہر شخص کی عمر متعین ہے:**

﴿وَمَا يُعْتَرُ مِنْ مُعْتَرٍ وَلَا يَنْقُصُ مِنْ عُمرٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ﴾

کسی آدمی کو جو بھی عمر دی جاتی ہے یا اس کی عمر میں جو کمی ہوتی ہے تو وہ سب ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔

عمر کم ہونے کا معنی یہ نہیں کسی کی عمر دس سال ہے تو گھٹا کر نو سال کر دیں بلکہ کم ہونے کا معنی یہ ہے کہ جب عمر کا کچھ حصہ گزر جاتا ہے تو بندے کی کل عمر میں سے اتنی عمر کم ہو جاتی ہے مثلاً ایک بندے کی ٹوٹل عمر انیس سال ہے، نو سال اس نے گزار لیے اور دس سال باقی ہیں۔ تو گویا اس کی کل عمر میں سے جو نو سال کم ہو گئے ہیں یہ بھی اللہ کے علم میں ہیں اور جو دس سال باقی ہیں یہ بھی اللہ کے علم میں ہیں۔

### عمر متعین ہے تو صلہ رحمی سے بڑھے گی کیسے؟

باقی جو حدیث پاک میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبَسِّطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ وَيُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ“ کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کے رزق کو بڑھا دیا جائے اور اس کی زندگی لمبی کر دی جائے تو ”فَلْيَصِلْ رَحْمَتَهُ“ وہ رشتہ داروں کا خیال کرے، ان کے ساتھ نیک سلوک کرے۔<sup>156</sup>

تو بظاہر اس حدیث میں اور دیگر آیات میں تعارض ہے جن میں ہے کہ بندے کی عمر متعین ہے۔ سورۃ النحل میں ہے:

﴿فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾<sup>157</sup>

جب ان کی موت کا وقت آ پہنچے گا تو وہ ایک گھڑی بھی نہ اس وقت سے آگے ہو سکیں گے نہ پیچھے۔

تو عمر تو بندے کی متعین ہے، پھر اگر آدمی صلہ رحمی کرے گا تو عمر بڑھے گی کیسے؟ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: بندے کی عمر تو متعین

156۔ صحیح البخاری، رقم: 5986

157۔ النحل 61:16

ہوتی ہے، جب مدت پوری ہوتی ہے تو اسے ایک گھڑی بھی مہلت نہیں دی جاتی لیکن عمر بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اس بندے کو اولاد دیں گے جو اس کے لیے دعائیں کرے گی تو انسان اپنی عمر میں جو نیک اعمال کرنا چاہتا تھا اس کی عمر تو نہیں بڑھی لیکن اس کی اولاد کی دعاؤں کا فائدہ اس کو پہنچے گا۔ گویا جس طرح زندہ رہنے سے انسان کو فائدہ ہوتا ہے اسی طرح اس کو موت کے بعد بھی فائدہ ملتا رہے گا۔ یہی مطلب ہے کہ اس کی عمر بڑھ گئی ہے۔

### میٹھا اور کڑوا پانی:

﴿وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَيْنِ ۚ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۚ وَمِنْ كُلِّ تَاكُلُونَ تَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاجِرَ تَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾

آگے بات سمجھائی ہے کہ دیکھو! دو دریا ہیں، دونوں برابر نہیں ہیں؛ ایک میٹھا ہے اس سے پیاس بجھتی ہے اور دوسرا کڑوا نمکین ہے۔ میٹھا حلق سے جلدی اترتا ہے اور کڑوا حلق سے جلدی نہیں اترتا۔

حدیث پاک میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب پانی پیتے تو پانی پینے کے بعد یہ دعا فرماتے تھے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي سَقَانَا عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِهِ وَلَمْ يَجْعَلْهُ مِلْحًا اُجَاجًا يَذْنُوْبَنَا." 158

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں اپنی رحمت سے میٹھا پانی پلایا جس سے ہماری پیاس بجھ گئی اور ہماری بد اعمالیوں کی وجہ سے اس پانی کو کڑوا نہیں بنایا۔

## منکرین حیات کی جہالت:

﴿وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۖ وَلَا الظُّلُمُتُ وَلَا النُّورُ ۚ وَلَا الظُّلُمُتُ وَلَا الظُّلُمُتُ ۚ وَلَا الْحَيَاءُ وَلَا الْمَوَاتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ ۚ إِنَّ أَنتَ إِلَّا نَذِيرٌ ۚ﴾

اللہ نے یہاں کفر اور اسلام، شرک اور توحید اور مؤمن اور مشرک میں فرق بیان فرمایا ہے۔ فرمایا: اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں، ظلمات یعنی اندھیرے اور روشنی برابر نہیں، زندہ اور مردہ برابر نہیں۔ اللہ جس کو چاہتے ہیں سنا دیتے ہیں اور آپ نہیں سنا سکتے ان کو جو قبروں میں ہیں۔ آپ کا کام ڈرانا ہے۔

اب دیکھو! ان آیات سے یہ ثابت کرنا کہ انبیاء علیہم السلام نہیں سنتے یہ سراسر جہالت ہے، اس لیے کہ اس آیت میں قطعاً یہ نہیں ہے کہ میت سنتی نہیں ہے، اس میں تو یہ ہے کہ آپ سنا نہیں سکتے۔ ایک ہے کہ مردہ سنا نہیں اور ایک ہے کہ آپ قبر والوں کو سنا نہیں سکتے۔ تو یہاں اسماع کی نفی ہے سماع کی نفی نہیں ہے، سنانے کی نفی ہے سننے کی نفی نہیں ہے۔ اس لیے اس آیت کا سماع موتی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض لوگ خواہ مخواہ کی بحث یہاں چھیڑ دیتے ہیں۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا وہاں سورت النمل کے درس میں کہ آگے سورت فاطر میں ایک آیت آئے گی اور اس کی وہ حضرات عموماً غلط تشریح کرتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے سماع کے قائل نہیں ہیں۔

چونکہ میری خود ان کے ایک مناظر سے - جو ابھی بھی زندہ ہیں - ملاقات اور بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آپ کا جو عقیدہ ہے کہ قبور میں انبیاء علیہم السلام سنتے ہیں یہ اکابر کا عقیدہ نہیں ہے، کیونکہ اکابر کی عبارات سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ قبر والا

مردہ نہیں سنتا۔ دلیل یہ آیت ہے: ﴿وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُورِ﴾ کہ اس آیت کے نیچے شاہ صاحب لکھتے ہیں:- یہ تفسیر عثمانی ہے موضح القرآن کا حوالہ دیا ہے؛ ”تو نہیں سنانے والا قبر میں پڑے ہوؤں کو، حدیث میں آیا کہ مردوں سے سلام علیک کرو اور بہت جگہ مردوں کو خطاب کیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ مردے کی روح سنتی ہے اور قبر میں پڑا ہے دھڑ، وہ نہیں سنتا“۔<sup>159</sup>

اب دیکھیں بظاہر یہ عبارت ہمارے خلاف ہے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ قبر میں جو دھڑ ہے وہ سنتا ہے اور شاہ صاحب کہتے ہیں کہ وہ نہیں سنتا۔

ہمارا ارادہ ہے ان شاء اللہ کہ دورہ تربیۃ العلماء میں اس قسم کی عبارات بھی پیش کریں اور اس قسم کی عبارات سمجھائیں جن سے دھوکہ دیا جاتا ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ اس کا جو مطلب آپ سمجھتے ہیں وہ آپ بیان کریں، اس پر میں سوال کرتا ہوں اور جو میں سمجھا ہوں اس کو میں بیان کرتا ہوں اور اس پر آپ سوال کریں۔ اس نے کہا ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ قبر والے نہیں سنتے، روح سنتی ہے اور وہ علیین میں ہے۔ میں نے کہا اس پر میرا سوال یہ ہے کہ مثال کے طور پر ہم یہاں پر ہیں، میرے والد صاحب کی قبر یہاں سے ایک ایکڑ کے فاصلے پر ہے، اس میں پڑا ہے دھڑ جس میں روح نہیں ہے روح علیین میں ہے، اب دیکھیں! علیین کا فاصلہ یہاں سے اور والد صاحب کی قبر سے برابر ہے، کوئی فرق نہیں ہے۔ علیین کدھر ہے؟ اوپر۔ اب والد صاحب کی قبر یہاں سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر بھی ہو تو فاصلہ علیین تک تو برابر ہے نا، فاصلے میں تو فرق نہیں ہے۔

تو میں نے کہا کہ ہم ہیں اپنے گاؤں میں اور والد صاحب کی قبر ہے قبرستان

میں اور علیین اوپر ہے۔ اب آپ کا موقف یہ ہے کہ قبر میں پڑا ہے دھڑ وہ نہیں سنتا روح سنتی ہے۔ بتاؤ روح کہاں پر ہے؟ کہا جی علیین میں۔ میں نے کہا: آپ جو قبرستان میں قبر پر جا کر کہتے ہیں ”السلام علیکم یا اهل القبور“ وہ تو نہیں سنتا کیونکہ سننا تو روح نے ہے۔ تو آپ قبرستان جانے کے بجائے یہیں سے اوپر منہ کر کے کہا کریں ”السلام علیکم یا اهل القبور“ لوگ پوچھیں گے کہ یہ کیوں؟ تو آپ کہو کہ روح سنتی ہے اور وہ علیین میں ہے، قبرستان میں دھڑ پڑا ہے جو نہیں سنتا تو قبرستان میں جا کر مجھے سلام کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ اس لیے میں یہیں سے سلام کر رہا ہوں۔

میں نے کہا کہ ہمیں یہ بات سمجھائیں کہ روح اوپر ہے اور روح کا دنیا میں ہر جگہ سے فاصلہ مساوی ہے تو پھر اس کا معنی یہ ہوا کہ روح خاص جگہ سے سننے کے بجائے ہر جگہ سے سنے گی۔ تو میں نے کہا: آپ کا یہی عقیدہ ہے کہ روح ہر جگہ سے سنتی ہے؟ ادھر اگر اہل بدعت کہہ دیں کہ یہاں سے ہم صلوٰۃ پڑھیں تو حضور مدینہ میں سنتے ہیں تو آپ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شرک ہے، حضور اتنی دور سے کیسے سن لیتے ہیں! اور یہاں سے مدینہ کا سفر کم ہے اور علیین کا سفر زیادہ ہے اور آپ کہتے ہیں دور سے مخلوق نہیں سنتی خالق کی صفت ہے دور سے سننا تو روح بھی تو مخلوق ہے یہ دور سے کیسے سنتی ہے؟! تو آپ جو معنی کرتے ہیں کہ روح سنتی ہے تو دنیا میں آپ کس کو سناتے ہیں؟ علیین کو سناتے ہیں؟ اگر علیین میں موجود روح کو سنائیں گے تو قبر پر کیوں جاتے ہیں؟ پھر گھر پر بیٹھ کر سلام کریں! کیونکہ سننا جو علیین کو ہے۔

اور اگر آپ کہیں کہ ہم جو سلام کرتے ہیں اس کا معنی دعا ہے تو سوال یہ ہے کہ دعا کے لیے آپ قبرستان کیوں جاتے ہیں؟ وہاں تو وہ جسم ہے جسے آپ کے عقیدے کے مطابق نہ ثواب ہوتا ہے نہ اس کو عذاب ہوتا ہے اور آپ کے عقیدے کے مطابق نہ وہ سنتا ہے تو وہاں جا کر سلام کس کو کرتے ہیں؟ وہ دھڑ تو سنتے بھی نہیں

ہیں تو ان کو دعا دینے کا بھی فائدہ نہیں ہے۔ ہم اہل السنۃ والجماعۃ کے عقیدے کے مطابق تو جسم کو ثواب اور عذاب ہوتا ہے لیکن آپ کے عقیدے میں تو جسم کو ثواب اور عذاب نہیں ہوتا تو اس کو جا کر کیا دعا دیتے ہیں؟ دعا روح کو دینی چاہیے تو وہ گھر سے بیٹھ کر دے لیں، قبرستان جانے کی ضرورت کیا ہے؟

میں نے کہا کہ حضرت شاہ صاحب کی عبارت کا معنی اب میں کرتا ہوں، اس پر آپ سوال کریں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں احوال اصالۃ اور اصلاً جسم پر آتے ہیں اور تبعاً اور ضمناً روح پر آتے ہیں۔ دنیا میں کان سنتا ہے جو کہ جسم ہے اور کان کے واسطے سے روح سنتی ہے، اسی طریقے سے دنیا میں زبان چکھتی ہے جو کہ جسم ہے اور زبان کے واسطے سے روح مزے لیتی ہے، اور موت کے بعد احوال آتے ہیں اصالۃ اور اصلاً روح پر اور تبعاً اور ضمناً آتے ہیں جسم پر۔

اب اس کا معنی یہ ہے کہ جب آدمی دنیا میں زندہ ہوتا ہے تو جسم سنتا ہے اور جسم کے واسطے سے روح سنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کے کان کاٹ دو تو روح نہیں سنتی، آنکھیں نکال دو تو روح نہیں دیکھتی تو اس کا معنی ہے کہ دنیا میں اصل جسم نے سنا ہے اور جسم کے واسطے سے روح نے سنا ہے، اور موت کے بعد احوال براہ راست روح پر آتے ہیں اور روح کے واسطے سے جسم پر آتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ جو شاہ صاحب کا جملہ ہے کہ ”حقیقت یہ ہے کہ مردے کی روح سنتی ہے“ تو روح تو زمین پر نہیں ہے بلکہ وہ علیین میں ہے، اب یہ روح سنے گی کیسے؟ روح اس وقت سنے گی جب اس چیز کو سناؤ گے جس کا روح سے تعلق ہے اور وہ جسم ہے، ”اور قبر میں پڑا ہے دھڑ، وہ نہیں سنا“ کیا معنی کہ اصالۃ جسم نہیں سنتا بلکہ اصالۃ روح سنتی ہے اور تبعاً جسم سنتا ہے۔

اس لیے ہم گھر سے ”اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَهْلَ الْقُبُورِ“ نہیں کہتے بلکہ قبر کے پاس جا کر کہتے ہیں، کیونکہ سنا تو روح نے ہے اور روح علیین میں ہے، اتنی دور سے



ہماری آواز سن نہیں سکتی تو ہم قبر پر جا کر مردے کو سلام کہیں گے جس کے ساتھ روح کا تعلق ہے تو روح اصلاً سنے گی اور مردہ تبعاً سنے گا۔

میں نے کہا: اس پر آپ اعتراض کریں اور اکابرین کی عبارات کو ہماری کسی بات کے خلاف ثابت کریں، اب اکابر کی عبارت ہمارے خلاف نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اکابر کی عبارات کی توضیح کی جائے تاکہ مطلب سمجھ میں آئے۔

### نعت باری تعالیٰ کا بیان:

﴿الَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُتَّخِلِفًا أَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَحُمْرٌ مُتَّخِلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٍ ۚ وَمِنَ النَّاسِ وَالْدَّوَآبِّ وَالْأَنْعَامِ مُتَّخِلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ ۚ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ۝﴾

فرمایا کہ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے مختلف رنگوں کے پھل اگائے اور پہاڑوں کے بھی مختلف رنگ ہیں سفید بھی ہیں، سرخ بھی ہیں، سخت سیاہ بھی ہیں اور اسی طرح انسانوں، جانوروں اور مویشیوں میں بھی ایسے ہیں جن کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ اللہ سے اس کے نیک بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں، علماء ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہے اور مغفرت کرنے والا ہے۔

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ اس جگہ ”كَذَلِكَ“ کا تعلق یا ”إِنَّمَا“ کے ساتھ ہے کہ جس طرح پھلوں کے، پہاڑوں کے، انسانوں کے اور جانوروں کے رنگ مختلف ہیں اسی طرح علماء بھی اللہ سے ڈرنے میں مختلف ہیں، بعض کم ڈرتے ہیں بعض زیادہ ڈرتے ہیں۔ یا ”كَذَلِكَ“ کا تعلق ﴿وَمِنَ النَّاسِ وَالْدَّوَآبِّ وَ

الْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ ﴿۱﴾ کے ساتھ ہے یعنی جس طرح پھلوں کے رنگ مختلف ہیں، پہاڑوں کے رنگ مختلف ہیں اسی طرح انسانوں، جانوروں اور موسیٰیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔

خشیت کی بنیاد علم پر ہے، جتنا بڑا عالم ہو گا اتنی زیادہ اس کے دل میں خشیت الہیہ ہو گی۔ ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ یہ مستقل بات ہے۔ پیچھے اللہ تعالیٰ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا تھا: ﴿إِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ﴾ کہ آپ کے ڈرانے کا نفع ان لوگوں کو ہوتا ہے جو اللہ سے بن دیکھے ڈرتے ہیں، اب اسی مناسبت سے فرمایا کہ بن دیکھے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں، جن کا علم صحیح ہو وہ ڈرتے ہیں، باقی بندے ڈرنے والے نہیں ہیں۔

### خشیت الہیہ عالم کی خصوصیت:

یہ جو ﴿إِنَّمَا﴾ کلمہ حصر فرمایا تو بظاہر اس سے شبہ یہ ہوتا ہے کہ صرف علماء اللہ سے ڈرتے ہیں اور غیر علماء اللہ سے نہیں ڈرتے! حالانکہ علماء بھی ڈرتے ہیں اور غیر علماء بھی ڈرتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿إِنَّمَا﴾ ہمیشہ حصر کے لیے نہیں آتا، بسا اوقات خصوصیت کے لیے بھی آتا ہے۔ تو یہاں یہ حصر کے لیے نہیں ہے بلکہ خصوصیت کے لیے ہے کہ اہل علم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اللہ سے ضرور ڈرتے ہیں، اب غیر علماء ڈریں تو ڈریں، نہ ڈریں تو نہ ڈریں لیکن عالم ضرور ڈرتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ عالم ہو اور نہ ڈرے۔ اس کو ذہن میں رکھیں!

پھر خشیت دو قسم کی ہے؛ ایک ہے خشیت اعتقادی اور ایک ہے خشیت

حالی۔ خشیتِ اعتقادی کا معنی کہ بندے کا اعتقاد ہے کہ نہ مانیں تو اللہ سزا دیتے ہیں اور مانیں تو اللہ اچھی جزا دیتے ہیں، جو اعتقادی خشیت ہوتی ہے اس کے ساتھ عبادات تکلفاً ہوتی ہیں، جبراً ہوتی ہیں، شوق سے نہیں ہوتیں، رغبت سے نہیں ہوتیں اور جب خشیت صرف اعتقادی نہ ہو بلکہ خشیتِ حالی بھی ہو یعنی یہ خشیتِ آدمی کے دل میں یوں پختہ اور غالب آ جائے کہ انسان کی حالت اور کیفیت بن جائے، اس وقت آدمی جو عبادات کرتا ہے تو وہ صرف تکلفاً نہیں ہوتیں بلکہ تقاضائے طبیعت بن جاتی ہیں۔

میں اس کی چھوٹی سی مثال دیتا ہوں کہ جیسے کوئی انسان دوا کھائے اور اس کا ذہن ہو کہ اس دوا کھانے سے بندے کو صحت ملتی ہے تو دوا پسند نہیں ہوتی کھاتا پھر بھی ہے اور اگر ایسی دوا ہو کہ بندے کا ذہن بھی ہو کہ اس سے شفا ملتی ہے اور وہ دوا بندے کو مرغوب بھی ہو تو پھر جب بندہ کھائے گا تو کھانے کا انداز اور ہو گا، اب مجبوراً نہیں کھائے گا بلکہ شوق اور رغبت سے کھائے گا۔ تو اللہ سے ڈرنا اگر صرف اعتقاداً ہو تو عبادت پھر تکلفاً ہوتی ہے اور اگر آدمی اللہ سے ڈرے اور صرف اعتقاداً نہیں بلکہ حالاً بھی ڈرے تو پھر عبادت اس کا تقاضہ بشریت بن جاتی ہے۔

### امت کے تین قسم کے افراد:

﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ إِذِنَ اللَّهُ بِذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿٢٣﴾﴾

اللہ نے اس امت کی خصوصیت بیان فرمائی ہے۔ فرمایا کہ ہم نے اس کتاب قرآن مجید کا وارث ان لوگوں کو بنایا ہے جن کو ہم نے چن لیا تھا لیکن اس امت کی پھر قسمیں ہیں؛ بعض ان میں ظالم ہیں، بعض ان میں معتدل ہیں اور بعض نیکوں میں بہت

آگے بڑھے ہوئے ہیں اور یہ بہت بڑا فضل ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہ بات ثابت ہے کہ ظالم، معتدل اور سابق بالخیرات یہ تینوں امت محمدیہ کے منتخب افراد ہیں، اللہ نے اس کتاب کے لیے امت محمدیہ کو چنا ہے۔ جن کو چنا ہے ان میں ظالم بھی ہیں، ان میں معتدل بھی ہیں اور ان میں بہت اچھے بھی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس امت کا جو سابق بالخیرات ہے یعنی ہر وقت نیک اعمال میں آگے بڑھنے والا ہے ”يَدْخُلُ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ“ وہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو گا، اور ان میں جو مقصد یعنی معتدل ہے ”يَدْخُلُ الْجَنَّةَ بِرَحْمَةِ اللَّهِ“ وہ اللہ کی رحمت سے جنت میں داخل ہو گا اور اس امت کے ظالم اور اصحاب اعراف ”يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ بِشَفَاعَةِ مُحَمَّدٍ“ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی وجہ سے جنت میں جائیں گے۔<sup>160</sup>

### ظالم، معتدل اور سابق بالخیرات کی تعریف:

- ظالم، معتدل اور سابق بالخیرات کی تفصیل یہ لکھی ہے کہ...
- ظالم وہ ہے جو نیکیاں کرے اور گناہوں سے نہ بچے، حلال کام بھی کرتا ہے اور حرام بھی کرتا ہے۔
- اور معتدل وہ ہے جو حلال کام کرتا ہے اور حرام سے بچتا ہے لیکن مکروہات سے نہیں بچتا اور مستحبات کو نہیں کرتا۔
- اور سابق بالخیرات وہ ہے جو حلال کام کرتا ہے اور حرام سے بچتا ہے، مستحبات اپناتا ہے اور مکروہات سے بچتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض مباح

چیزیں جن کے کرنے کی اجازت ہے وہ عبادت میں حد درجہ انہماک یا شبہات کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے۔

### جنتی مردوں کا کنگن پہننا:

﴿جَنَّتْ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا يُجَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَ

لُؤْلُؤًا وَبَسَائِمُ فِيهَا حَرِيرٌ﴾

یہ جو ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں ان میں مذکورہ لوگ داخل ہوں گے اور وہاں ان کو سونے کے کنگن اور موتیوں سے مزین کیا جائے گا اور ان باغات میں ان کا لباس ریشم ہو گا۔

بعض روایات میں ہے کہ دائیں ہاتھ میں سونے کے کنگن ہوں گے اور بائیں ہاتھ میں موتیوں اور جواہرات کے کنگن ہوں گے۔ یہ کبھی ذہن میں نہ لانا کہ زیورات پہننا تو عورتوں کا کام ہے تو جنت میں مرد زیور کیوں پہنیں گے؟ اس لیے کہ موت کے بعد جنت کے احوال الگ ہیں اور دنیا کے احوال الگ ہیں، اس لیے جنت والے معاملات کو دنیا پر قیاس کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ آدمی دنیا میں شراب پیتا ہے تو بالکل حرام ہے اور جب جنت میں شراب پیے گا تو بالکل حلال اور پاکیزہ ہے۔

### کافر کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی:

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۖ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا

يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِنْ عَذَابِهَا ۚ كَذٰلِكَ نَجْزِي كُلَّ كٰفُوٍ﴾

جو لوگ کافر ہیں ان کا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے اور جہنم میں ایسا نہیں ہو گا کہ ان کا فیصلہ ہی کر دیا جائے کہ وہ مرجائیں یعنی ان پر موت نہیں آئے گی اور نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا۔ ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ہر کافر کو۔

اس پر اعتراض یہ ہے کہ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ ابو طالب جہنم میں جائیں گے اور ان کے عذاب میں تخفیف ہوگی کہ صرف ان کو آگ کے جوتے پہنا دیے جائیں گے جن کی وجہ سے ان کا دماغ ہنڈیا کی طرح ابلے گا۔ قرآن کریم کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب میں کمی نہیں ہوگی اور بخاری کی حدیث سے پتا چلتا ہے کہ عذاب میں تخفیف ہوگی۔ تو بظاہر یہ حدیث قرآن کریم کے خلاف ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جو فرمایا: ﴿وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِنْ عَذَابِهَا﴾ کہ ان کفار کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر عذاب کے وہ مستحق ہوں گے اس میں تخفیف نہیں ہوگی۔ ابو طالب نے چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت ساتھ دیا ہے اس لیے ان کے لیے اتنا عذاب ہے کہ ان کے پاؤں میں آگ کے جوتے ڈال دیے جائیں گے، وہ اسی کے مستحق ہیں۔ ان کا عذاب اس سے کم نہیں ہوگا۔ اس میں پھر تخفیف کا لفظ کیوں استعمال ہوا ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا عذاب چونکہ عام کافروں کی نسبت کم ہے تو اس کمی پر صورت تخفیف کی تھی اس لیے وہاں تخفیف کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اب اشکال ختم ہو جائے گا۔

### کافر اور مؤمن کی سزا میں فرق:

﴿كَذَلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَافِرٍ﴾

ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ہر کافر کو۔

اس سے پچھلی سورۃ سبائیں تھا:

﴿وَهَلْ نُجْزِي إِلَّا الْكَافِرَ﴾<sup>161</sup>

کہ ہم صرف کافر ہی کو بدلہ دیتے ہیں۔

اب ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف کافر کو کفر کی سزا دیں گے باقی کسی اور کو سزا نہیں دیں گے حالانکہ مؤمن بھی اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے جہنم میں جائے گا۔ تو مؤمنوں کو بھی تو سزا ہوگی صرف کافروں کو تو نہیں ہوگی!

اس کا جواب اچھی طرح سمجھیں! ایک جواب تو یہ ہے کہ اللہ مؤمن کو ایسا عذاب نہیں دیتے جیسے قوم سبا کافر کو دیا ہے کہ ان کو تباہ و برباد کر کے صفحہ ہستی سے مٹا دیا تھا، تو اس طرح کا عذاب اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو نہیں دیتے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ کافر کو تو عذاب دیتے ہیں لیکن مؤمن کو جو سزا دیتے ہیں اس کو ”عذاب“ نہیں کہا جاتا کیونکہ عذاب کہتے ہیں ”إِلَّا لَمْ أَحْيِ عَلَى سَبِيلِ الْهَوَانِ“ کہ زندہ آدمی کو تکلیف دینا ذلیل کرنے کے لیے۔ کافر کو اللہ جہنم میں بھیج کر تکلیف دیں گے ذلیل کرنے کے لیے اور مؤمن کو اللہ جہنم میں بھیجیں گے تو وہ ذلیل کرنے کے لیے نہیں بلکہ پاک کرنے کے لیے بھیجیں گے کیونکہ اس نے جنت میں جانا ہے اور جنت میں ناپاک آدمی نہیں جاتا۔

اس بات کو ﴿وَاللَّكَفِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾<sup>162</sup> کے تحت حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر عثمانی میں لکھا ہے۔<sup>163</sup> ﴿وَيَخْلُدُ فِيهِ مُهَانًا﴾<sup>164</sup> کے تحت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں لکھا ہے<sup>165</sup> اور سورۃ سبا کی اس آیت ﴿وَهَلْ نُجْزِي إِلَّا الْكَفُورَ﴾ کے

162۔ البقرة: 290

163۔ تفسیر عثمانی: ج 3 ص 95

164۔ الفرقان: 25: 69

165۔ بیان القرآن: ج 3 ص 23

تحت مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں لکھا ہے۔<sup>166</sup>

یہ جو بات میں کہہ رہا ہوں کہ کافر کو جہنم میں سزا ہوگی ذلیل کرنے کے لیے اور اہانت کے لیے اور اگر مسلمان کو جہنم میں بھیجا بھی گیا تو پاک کرنے کے لیے بھیجا جائے گا اگر اس کے خلاف اکابر کا کوئی حوالہ آپ کو ملے تو اس میں آپ کو تاویل کرنی پڑے گی۔ مثلاً سورۃ آل عمران میں ہے:

﴿رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ﴾<sup>167</sup>

یہاں اس آیت کے تحت تفسیر عثمانی میں علامہ عثمانی بھی لکھتے ہیں کہ ”جو شخص جتنی دیر دوزخ میں رہے گا اسی قدر رسوائی سمجھو۔ اس قاعدہ سے دائمی رسوائی صرف کفار کے لیے ہے۔ جن آیات میں عامۂ مومنین سے خزی (رسوائی) کی نفی کی گئی ہے وہاں یہ ہی معنی سمجھنے چاہئیں۔“<sup>168</sup>

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حقیقتاً رسوا کرنے کے لیے نہیں ہوگا بلکہ صورتاً رسوائی ہوگی، اس لیے صورتاً رسوائی کی وجہ سے اس پر لفظ ”خزی“ کا اطلاق کر دیا گیا۔

**بری تدبیر کا نتیجہ خود پر لوٹتا ہے:**

﴿وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ﴾

جو شخص کسی دوسرے کے بارے میں بری تدبیر کرتا ہے تو بری تدبیر کا نتیجہ خود اسی کو بھگتنا پڑتا ہے، دوسرے کا نقصان نہیں ہوتا۔ اس لیے کسی اپنے کے خلاف کبھی بھی کوئی بری تدبیر اختیار نہ کریں۔

166۔ معارف القرآن ج: 7 ص 284

167۔ آل عمران 3: 192

168۔ تفسیر عثمانی ج: 1 ص 359



اس پر سوال ہوتا ہے کہ بسا اوقات کوئی انسان کسی کے خلاف بری تدبیر کرتا ہے اور جس کے خلاف بری تدبیر کرتا ہے اس کو نقصان بھی ہوتا ہے، تو اس کا کیا معنی کہ نقصان اسی کا ہوتا ہے جو کسی دوسرے کا نقصان سوچتا ہے حالانکہ جس کے خلاف تدبیر کی ہے نقصان تو اس کا بھی ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس شخص کے خلاف تدبیر کی ہے اس کا نقصان یقینی نہیں ہوتا، کبھی دنیا کا نقصان ہو گا کبھی نہیں ہو گا اور جس نے نقصان کیا اور دوسرے کے خلاف تدبیر کی اس کا اخروی نقصان یقینی ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ جس نے تدبیر کی ہے اس کا بہت بڑا نقصان ہو گا جہنم میں اور جس کے خلاف تدبیر کی اگر اس کا کچھ نقصان ہو بھی گیا تو اس کے جہنم کے نقصان کے مقابلے میں اس کا دنیوی نقصان اتنا چھوٹا ہو گا کہ اس کو نقصان کہنا ہی نہیں چاہیے۔

اور تیسرا جواب یہ ہے کہ جس کے خلاف تدبیر کی ہے اور اس کا کچھ نقصان بھی ہو گیا تو اس کا یہ نقصان بہت کم ہے، اس ظاہری نقصان کے بدلے میں اس کو جنت میں جو نعمتیں ملیں گی، جو اس کو راحت ملے گی تو اس کو نقصان نہیں کہنا چاہیے۔ جیسے دنیا میں کسی شخص پر بیماری آجائے اور اس کے بدلے میں جنت کی نعمتیں ملیں تو یہ بیماری راحت اور رحمت بن جاتی ہے۔ اسی طرح اس شخص کا بظاہر نقصان ہے لیکن جب اس کا انعام ملے گا تو یہ نقصان بھی اس کو رحمت نظر آئے گا۔

**کافر کے عذاب کے ساتھ جانوروں کی ہلاکت کیوں؟**

﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ﴾

یہاں ﴿النَّاسَ﴾ سے مراد کافر ہے اور ﴿بِمَا كَسَبُوا﴾ سے مراد کفر

ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اعمالِ کفریہ کی وجہ سے سزا دیں تو اس زمین پر کسی ذی روح کو نہ

چھوڑیں، چاہے وہ جانور ہو یا انسان ہو۔

اس پر سوال یہ ہے کہ کافر کو اعمالِ کفر کی وجہ سے اگر سزا دی جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن اس کو سزا دیں اور کسی ذی روح کو بھی زندہ نہ چھوڑیں تو ذی روح کا کیا قصور ہے؟ اگر ذی روح مؤمن ہے تو اس کو تو سزا نہیں دینی چاہیے اور اگر جانور ہے تو وہ احکام کا مکلف ہی نہیں تو پھر اس کو سزا کیوں؟

اس کا جواب سمجھیں! جب اہل کفر بڑھ جائیں گے اور ایمان والے کم ہو جائیں گے تو پھر یوں سمجھو کہ دنیا کی بقاء کا مقصد ختم ہو گیا۔ دنیا کے پیدا کرنے کا مقصد تو یہ تھا کہ بندوں کا امتحان ہو، اللہ نے خیر کو بھی پیدا فرمایا اور شر کو بھی پیدا فرمایا، اب کوئی شر کو اختیار کرے گا اور کوئی خیر کو اختیار کرے گا تو یہ ان کا امتحان ہو گا۔ جب شر بہت غالب ہو گا اور خیر بالکل مغلوب ہو کر رہ جائے گی اب دنیا کو ختم کر دینا چاہیے کہ دنیا کا مقصد ہی ختم ہو گیا۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ جو مؤمن کو ختم کریں گے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ کافر کو کفر کی وجہ سے جو عذاب ہوا ہے مؤمن بھی اسی عذاب کی وجہ سے ختم ہو گا بلکہ بات یہ ہے کہ ختم مؤمن بھی ہو گا لیکن اس کے ختم ہونے کا سبب کوئی اور ہو گا کافر کو ملنے والا عذاب اس کا سبب نہیں ہو گا، اور یہ جو جانور زندہ نہیں رہیں گے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جانور انسانوں کے لیے ہیں، جب انسانوں کو نہیں رکھنا تو جانور کو رکھنے کا کچھ بھی فائدہ نہیں۔

وَاجِزْ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

# دروس القرآن

٣

والإمام محمد الباقس كهن



مركز أهل السنة والجماعة



نام کتاب ..... دُرُوسُ الْقُرْآنِ جلد چہارم

تالیف: ..... محمد الیاس عظیمی

تاریخ اشاعت ..... مارچ 2020ء

بار اشاعت ..... اوّل

تعداد اشاعت ..... 1100

ناشر ..... مکتبہ اہل السنۃ و الجماعۃ

ملنے کا پتہ

مکتبہ اہل السنۃ و الجماعۃ، 87 جنوبی لاهور ڈسٹرکٹ

0321-6353540

0335-7500510

www.ahnafmedia.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## فہرست

### 26 ----- سورۃ لیس

26 ----- فضائل و اسمائے سورت:

27 ----- ﴿لَیْسَ﴾ کا معنی:

27 ----- یاسین نام رکھنے کا حکم:

28 ----- جزیرۃ العرب میں حضور علیہ السلام سے پہلے کوئی نبی آیا یا نہیں؟

29 ----- حضور علیہ السلام کے مخالفین کی حالت:

30 ----- انذار کا فائدہ حضور علیہ السلام کو تو ہو گا:

30 ----- اعمال اور ان کے اثرات:

31 ----- عمل کے نتائج بھی لکھے جاتے ہیں:

32 ----- بستی والوں کا قصہ:

34 ----- حبیب ابن اسماعیل نجار کا ذکر:

35 ----- حبیب نجار کو من جانب اللہ تسلی:

36 ----- بستی والوں کی تباہی:

37 ----- وہ بستی تھی یا شہر: تحقیقی قول:

- 38 ----- بستی اور رسولوں کے نام:
- 38 ----- توحید باری تعالیٰ کی نشانیاں:
- 40 ----- مخلوقات کے جوڑے جوڑے:
- 41 ----- رات؛ قدرتِ حق کی نشانی:
- 41 ----- سورج کا مستقر کیا ہے؟
- 43 ----- سورج کے سجدہ کرنے کا معنی:
- 44 ----- چاند؛ قدرتِ حق کی ایک عظیم نشانی:
- 44 ----- سورج اور چاند کا مرتب نظام:
- 46 ----- کشتیاں؛ اللہ کی نشانیاں
- 46 ----- سمندری نظام:
- 47 ----- کفار کو انفاق کا حکم؟
- 49 ----- نفخ صور اور قبروں سے نکلنا:
- 50 ----- نیند اور موت میں مناسبت:
- 54 ----- قبر کے سوالات امتی سے ہوں گے، نبی سے نہیں:
- 55 ----- دو موتوں اور دو حیاتوں کا صحیح مفہوم:
- 56 ----- ”دلہن کی طرح سو جا!“ یہ عجیب نکتہ:
- 57 ----- پہلی رات دلہن سوتی بھی ہے؟
- 57 ----- جنت کی نعمتوں کا حال:
- 59 ----- اللہ کی طرف سے سلام:
- 59 ----- مجرمو! الگ ہو جاؤ!
- 59 ----- قیامت کے دن زبان پر مہر لگنے کا مطلب:

60 ----- حضور علیہ السلام کو شعر کی تعلیم نہیں دی گئی:

62 ----- عاص بن وائل کی حماقت:

64 ----- جنت چھوٹی خدائی کا نام ہے:

## 66 ----- سورة الصَّفّت

66 ----- فرشتوں کی قسمیں:

66 ----- قسمیں کھانے کی وجہ:

67 ----- نظم و ضبط کی اہمیت:

68 ----- اللہ کی بادشاہت کا بیان:

69 ----- ستارے، زینت اور حفاظت کا ذریعہ:

69 ----- جنتیوں کا رزق یقینی اور دائمی ہے:

71 ----- حورانِ بہشت کا تذکرہ:

71 ----- جنتی اور اس کے کافر ساتھی کا مکالمہ:

73 ----- زقوم، جہنمیوں کی خوراک

74 ----- تذکرہ ہائے انبیاء علیہم السلام:

74 ----- حضرت نوح علیہ السلام:

75 ----- حضرت ابراہیم علیہ السلام:

77 ----- ﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾ کا پہلا معنی:

77 ----- ایک شکار کا جواب:

78 ----- ﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾ کا دوسرا معنی:

79 ----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت:

- 80 ----- خواب میں بیٹے کو ذبح کرنا:
- 82 ----- ایک لفظ کا اضافہ پورے معنی کی تبدیلی:
- 82 ----- انبیاء کو بشر نہ ماننے والوں کے شبہ کا جواب:
- 83 ----- توضیح بالمثال:
- 84 ----- اہل بدعت سے سوالات:
- 84 ----- ذبح کون؟ حضرت اسماعیل یا حضرت اسحاق؟
- 86 ----- حضرت الیاس علیہ السلام:
- 87 ----- حضرت لوط علیہ السلام:
- 87 ----- حضرت یونس علیہ السلام:
- 89 ----- فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہنے والوں سے سوال:
- 89 ----- دلیل کی تین اقسام:
- 90 ----- دلیل الزامی کا ثبوت:
- 92 ----- متکلم اسلام اور مقصد میں انہماک:
- 93 ----- جہد مسلسل کا نتیجہ:
- 94 ----- ”حق غالب رہے گا“ کا معنی:
- 96 ----- تنزیہ باری تعالیٰ:

## 98 ----- سورۃ ص

- 98 ----- ابتدائی آیات کا شانِ نزول:
- 99 ----- تین طلاق کے متعلق حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ (صحیح مسلم):
- 100 ----- حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کا پہلا جواب:



- 101 ----- کتے کے جوٹھے کو کتنی مرتبہ دھوئیں؟
- 101 ----- حدیث ابن عباس کا دوسرا جواب:
- 102 ----- حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کا تیسرا جواب:
- 103 ----- دو احتمالات میں سے ایک کا تعین مجتہد ہی کر سکتا ہے:
- 104 ----- حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کا چوتھا جواب:
- 107 ----- بڑوں کا حوالہ دینے کی وجہ:
- 107 ----- حضرت داؤد علیہ السلام کا اعزاز:
- 108 ----- فصل الخطاب کا معنی:
- 108 ----- حضرت داؤد علیہ السلام کا امتحان:
- 109 ----- واقعہ کی پہلی توجیہ:
- 110 ----- واقعہ کی دوسری توجیہ:
- 110 ----- واقعہ کی تیسری توجیہ:
- 111 ----- حضرت داؤد علیہ السلام کا رجوع الی اللہ:
- 111 ----- رکوع سے سجدہ تلاوت کی ادائیگی کی شرائط:
- 113 ----- قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ رکھنا:
- 114 ----- حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر:
- 115 ----- دینی مشغولیت کی وجہ سے نماز قضا ہونا:
- 116 ----- گھوڑوں کی پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرنے کی توجیہات:
- 117 ----- خود پر سزا مقرر کرنا:
- 117 ----- حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش:
- 118 ----- امارت طلب کرنا کب جائز کب ناجائز؟

- 119 ----- حضرت ایوب علیہ السلام:
- 121 ----- حضرت ایوب علیہ السلام کو حیلہ کی تعلیم:
- 122 ----- جائز اور ناجائز حیلوں کی تفصیل:
- 123 ----- قیامت بہت بڑی خبر ہے:
- 123 ----- تخلیق آدم اور فرشتوں کو سجدہ کا حکم:
- 124 ----- کائنات کا سب سے پہلا اجماع:
- 127 ----- دینی امور پر اجرت کا جواز:
- 127 ----- تکلفات کے بجائے سادگی کو رواج دیجیے:

## 129 ----- سورة الزمر

- 129 ----- لفظ دین کے معانی:
- 129 ----- عبادت خالص مطلوب ہے:
- 131 ----- موبیشیوں کے آٹھ جوڑے اتارنے کا معنی:
- 132 ----- تین اندھیروں میں انسانی تخلیق:
- 133 ----- اللہ کی شان بے نیازی:
- 134 ----- بندہ کسی دوسرے کا بوجھ اٹھائے گا یا نہیں؟ (حل تعارض)
- 135 ----- اسلام کے لیے شرح صدر:
- 136 ----- احسن الحدیث؛ کتاب اللہ
- 136 ----- کتاب اللہ کی صفات:
- 137 ----- خشیت اور خوف میں فرق:
- 137 ----- توحید و شرک کی مثال سے وضاحت:

- 138 ----- ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَّيِّتُونَ﴾ کی تشریح:
- 139 ----- خروجِ روح اور حبسِ روح:
- 140 ----- نبی و امتی کی نیند اور موت میں فرق:
- 142 ----- منکرینِ حیات سے گفتگو کا طریقہ:
- 144 ----- موت اور نیند میں روح کا قبض ہونا:
- 145 ----- ﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا﴾ سے استدلال کا جواب:
- 147 ----- روح اور جسم کے تین تعلقات:
- 148 ----- ان تین تعلقات کے دائرہ ہائے کار:
- 151 ----- شرک کی قباحت:
- 151 ----- باری تعالیٰ کی قدرت و طاقت کا بیان:
- 153 ----- نفخِ صور کا ہولناک منظر:
- 153 ----- جنت مہمان خانہ اور جہنم قید خانہ:
- 154 ----- مہمان کا اکرام کیجیے!
- 155 ----- حضرت مدنی رحمہ اللہ کی مہمان نوازی:

## 156 ----- سورة المؤمن

- 156 ----- فضائلِ سورت:
- 157 ----- اللہ کی صفات کا بیان:
- 158 ----- دو موتیں اور دو زندگیاں:
- 161 ----- حضرت یحییٰ علیہ السلام کے جملہ سے بعض الناس کے استدلال کا جواب:
- 162 ----- فرعون کے مظالم:

- 163 ----- احمد سعید ملتانی کے اعتراض کا جواب:
- 165 ----- رجل مؤمن کی تقریر:
- 166 ----- منکرین رسالت کی شرارت:
- 167 ----- لغات کی تبدیلی سے معافی کی تبدیلی:
- 168 ----- ”أَصْغَرُ عَصَا“ کا معنی:
- 169 ----- عذابِ قبر کا ثبوت:
- 170 ----- آلِ فرعون کی روحمیں کہاں ہیں؟
- 173 ----- انبیاء و مؤمنین کی مدد:
- 175 ----- نبی کی طرف ”ذنب“ کی نسبت کا معنی:
- 176 ----- مغفرت سے فتح کا تعلق؟
- 178 ----- اخلاق کب دیکھے جاتے ہیں؟
- 180 ----- رات اور سکون:
- 180 ----- اترانے اور اُکڑنے میں فرق:
- 182 ----- پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار پر عذاب کا انتظار:
- 183 ----- وحی کے مقابلے میں کفار کا اپنے فن پر اترانا:
- 184 ----- نزاع کی حالت میں ایمان لانا معتبر نہیں!

## 186 ----- سورة الحم السجدة

- 186 ----- ابو الولید عتبہ بن ربیعہ کے قرآن سننے کا واقعہ:
- 188 ----- رحمن اور رحیم کے معنی میں فرق:
- 188 ----- مخلوق کو رحمن کہنا جائز نہیں!

- 190 ----- قرآن کریم کو عربی میں نازل کرنے کی حکمت:
- 191 ----- کفار کی ہٹ دھرمی:
- 191 ----- کفار احکام کے مکلف ہیں یا نہیں؟
- 193 ----- ایمان اور عمل صالح کا لامتناہی اجر:
- 194 ----- زمین پہلے بنی یا آسمان؟ ایک تعارض کا حل:
- 196 ----- کس دن کس چیز کی تخلیق ہوئی؟
- 197 ----- اعضائے جسمانی کی گواہی:
- 199 ----- اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگا کریں!
- 199 ----- مجھے سورت ہو دے بڑھا کر دیا:
- 200 ----- بھائی میرے لیے عافیت ہی مانگو!
- 201 ----- جنت عیش کی جگہ ہے:
- 202 ----- بازارِ جنت:
- 203 ----- ہم عمر بیویاں:
- 204 ----- اللہ کی میزبانی کے کیا کہنے!
- 205 ----- سب سے اچھی کس کی بات ہے؟
- 205 ----- الحاد کا انجام:
- 207 ----- قرآن مجید فصیح ہے:
- 207 ----- مزاج انسانی:

## 210 ----- سورة الشوریٰ

- 211 ----- ترک قرأت خلف الامام پر ایک دلچسپ واقعہ:

- 212 ----- ترک قرأت خلف الامام کی عوامی تقریر:
- 213 ----- الفاظ کے ساتھ لہجہ کا اثر:
- 213 ----- گناہ چھڑوانے کے لیے گناہ کا ارتکاب کبھی نہ کریں!
- 215 ----- چھوٹوں کی خوشی چاول کھانا:
- 217 ----- اللہ تعالیٰ کی مثال نہیں تو مثال کیوں دی؟
- 219 ----- امام ابو حنیفہ نے مناظرے سے روکا، اس کا مطلب:
- 220 ----- دین کے کام میں اخلاص شرط ہے:
- 221 ----- اخلاص پر کھنے کا معیار:
- 222 ----- فراغت کے بعد اساتذہ سے رابطہ ضرور رکھیں!
- 223 ----- احتباء اور انابت میں فرق:
- 224 ----- متکلم اسلام کی تحدیث بالنعمة:
- 224 ----- چپاٹا میں تدریس کا واقعہ:
- 226 ----- دین کی خدمت کا موقع ملے تو فوراً قبول کریں!
- 228 ----- رشتہ داری کا خیال کرو!
- 229 ----- دینی امور پر اجرت کا جواز:
- 229 ----- مصیبت کا اکثری سبب گناہ ہیں:
- 230 ----- دنیا کی زندگی کی حقیقت:
- 231 ----- آخرت کے اجر کے مستحقین کی صفات:
- 234 ----- اولاد دینے والی ذات اللہ ہی کی ہے:
- 235 ----- بیٹی خدا کی رحمت ہے:
- 237 ----- ”پیغمبر بشر نہیں“ پر استدلال کا جواب:

## سورة الزخرف ----- 239

- 240 ----- ثواب و عذاب قبر پر ایک دلچسپ واقعہ:
- 243 ----- نصیحت کرتے رہنا چاہیے:
- 244 ----- سواری پر بیٹھنے اور سفر کی دعا:
- 245 ----- بیٹی کی پیدائش پر مشرک کے تاثرات:
- 245 ----- زیورات میں رہنا عورت کی فطرت ہے:
- 246 ----- غلط عقائد و اعمال سے براءت ضروری ہے:
- 248 ----- اللہ کے ہاں دنیا کی زینت کی کوئی قیمت نہیں:
- 249 ----- دنیا کی قیمت مجھ کے پر کے برابر بھی نہیں:
- 250 ----- برے دوست سے اجتناب:
- 251 ----- وفات کے بعد اچھا تذکرہ:
- 251 ----- اللہ! لوگوں کی نظروں میں مجھے بڑا بنادے
- 252 ----- نوافل مسجد میں پڑھنے کی نصیحت:
- 254 ----- امام مالک رحمہ اللہ کا ابتلاء:
- 255 ----- اکابر کا ابتلاء اور ثبات قدمی:
- 255 ----- مامعذورم کہ مارانگ است!
- 256 ----- مسئلہ ٹھیک بیان کرو!
- 256 ----- نبی کی وحی اپنی قوم کی زبان میں ہوتی ہے:
- 258 ----- قوم فرعون کی سرکشی:
- 260 ----- عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اور قوم کا شور شرابا:
- 262 ----- سلام متارکت کا معنی:

## سورۃ الدخان 264

- 264 ----- نزولِ قرآن دو مرتبہ ہوا ہے:
- 265 ----- قرآن ہی محفوظ کتاب ہے:
- 266 ----- کثرت اور برکت میں فرق:
- 267 ----- استقبالِ رمضان (حدیث سلیمان فارسی)
- 270 ----- حدیث استقبالِ رمضان؛ بیس رکعات تراویح کی دلیل:
- 273 ----- لیلہ مبارکہ سے مراد کیا ہے؟
- 273 ----- ”دخان“ سے کیا مراد ہے؟
- 274 ----- فرعون کی پکڑ:
- 275 ----- نہ آسمان رویانہ زمین روئی کا مطلب:
- 277 ----- تبع اور اس کی قوم کا تذکرہ:
- 278 ----- شاہِ حبشہ؛ حضرت نجاشی
- 278 ----- تبع بادشاہ کی مدینہ منورہ میں آمد:
- 279 ----- تبع کا حضور علیہ السلام کی خدمت میں ہدیہ:
- 280 ----- تبع کے اشعار:
- 281 ----- جہنمیوں کا کھانا؛ زقوم
- 282 ----- متقین کو ملنے والے انعامات:
- 283 ----- انسانی ضروریاتِ زندگی:
- 284 ----- نعمتوں کا استحضار کیجیے!
- 284 ----- قرآن آسان ہے نصیحت کے لیے:



## سورة الباقية ----- 287

- 287 ----- دلائل توحيد:
- 288 ----- قرآن كريم سے فائدہ كب ہوگا؟
- 289 ----- ايام اللہ كا معنی:
- 290 ----- آيت كا شان نزول:
- 291 ----- نزول مكرر كا معنی:
- 292 ----- شريعت، عقائد اور مسائل كا نام
- 293 ----- سبب بندہ اختيار كرتا ہے:
- 295 ----- زمانے كو گالي مت دو!
- 296 ----- جاثية سے کیا مراد ہے؟
- 297 ----- قيمت كے دن اللہ بھلا دیں گے كا معنی:

## سورة الاحقاف ----- 299

- 299 ----- دلائل توحيد كا بيان:
- 300 ----- حضرت عبد اللہ بن سلام كا اسلام:
- 301 ----- يہودیوں كا دو ہر امعیار:
- 302 ----- سلام كو رواج دو!
- 303 ----- حضرت عبد اللہ بن سلام كے تین سوالات:
- 304 ----- اللہ سے عافیت مانگیے!:
- 306 ----- ہدف كے انتخاب میں دو چیزوں كا خیال كريں!
- 308 ----- حقوق اللہ اور حقوق العباد:

- 309 ----- شانِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ:
- 310 ----- وجوہِ فضیلت صدیق اکبر:
- 311 ----- صدیق اکبر کی پسند تین چیزیں:
- 312 ----- نکاح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا:
- 315 ----- صحابہ میں آنیڈیل شخصیت:
- 316 ----- پہلا مسئلہ: حمل کی کم از کم مدت
- 317 ----- دوسرا مسئلہ: مدتِ رضاعت
- 320 ----- گُرُھا اور کُرُھا میں فرق:
- 321 ----- جنات کا مسلمان ہونا:
- 322 ----- جنات کی دعوت:
- 323 ----- اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کی طرح صبر کیجیے!

## 324 ----- سورۃ محمد

- 324 ----- کفار اور مؤمنین کا انجام:
- 325 ----- جنگی قیدیوں کا حکم (ایک تعارض کا حل):
- 327 ----- مشروعتِ جہاد کی حکمت:
- 327 ----- شہداء کے انعامات:
- 328 ----- اللہ ایمان والوں کا دوست ہے:
- 329 ----- عالم کو ”مولانا“ کہنا درست ہے:
- 331 ----- جنت کی نہریں:
- 332 ----- علاماتِ قیامت کا بیان:

- 335 ----- بد بختی کی انتہا:
- 336 ----- سلسلہ چشتیہ کے ذکر پر اشکالات کے جوابات:
- 338 ----- عصمت انبیاء پر اشکال کا جواب:
- 339 ----- نبی اور امتی کے اجتہاد میں فرق:
- 340 ----- علم باری تعالیٰ:
- 341 ----- کفار کے لیے وعید:
- 341 ----- جائز اور ناجائز صلح جائز کی تفصیل:
- 342 ----- انفاق فی سبیل اللہ:
- 342 ----- تذکرہ امام اعظم ابو حنیفہ:

## 344 ----- سورة الفتح

- 344 ----- شان نزول:
- 345 ----- عمرہ کا قصد اور مشرکین مکہ کی مزاحمت:
- 346 ----- حضور علیہ السلام کا معجزہ:
- 346 ----- اہل مکہ کو سمجھانے کی کوششیں:
- 347 ----- حضرت عثمان؛ نمائندہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم:
- 349 ----- قتل عثمان کا بدلہ لینے پر بیعت:
- 349 ----- مشرکین مکہ سے مذاکرات:
- 350 ----- معاہدہ کی شقوں پر فریقین کی گفتگو:
- 352 ----- حضرت عمر کی دربار نبوت میں حاضری:
- 353 ----- ”لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ“ کا معنی:

- 354 ----- مثال کے ذریعے وضاحت:
- 356 ----- فتحِ مبین؛ اتمامِ نعمت کا ذریعہ
- 358 ----- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تین صفات:
- 359 ----- ”ید“ صفتِ متشابہ ہے:
- 360 ----- حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں کی عذر خواہی:
- 361 ----- منافقین کے خیبر جانے پر اصرار کی وجہ:
- 362 ----- حدیثِ حجت ہے:
- 363 ----- پیچھے رہ جانے والوں کو خطاب:
- 364 ----- پیچھے رہ جانے والے مخلصین کا حکم:
- 365 ----- بیعتِ رضوان:
- 370 ----- عمرہ کا خواب سچا ہے:
- 371 ----- غلبہ برہانی اور غلبہ عملی:
- 372 ----- صحابہ کرام کی صفات:

## 375 ----- سورۃ الحجرات

- 375 ----- قرآن کا مخاطب خود کو سمجھیے!
- 375 ----- شانِ نزول:
- 376 ----- علماء کا احترام کرنا بھی ضروری ہے:
- 377 ----- نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کرو!
- 378 ----- روضہ مبارک کے پاس آواز بلند کرنا ممنوع ہے:
- 378 ----- اعمال ختم ہونے کا معنی:

- 380 ----- حضور علیہ السلام گھر میں ہوں تو پکار نہ بلایا جائے:
- 382 ----- احترام پیغمبر اور وارث پیغمبر:
- 382 ----- ابن عباس رضی اللہ عنہما اور علماء کا احترام:
- 383 ----- متکلم اسلام کا معمول:
- 383 ----- خبر کی تحقیق کرنے کا حکم:
- 386 ----- عدالت صحابہ کے متعلق ایک اشکال کا جواب:
- 387 ----- صحابہ سارے عادل ہیں:
- 388 ----- اطاعت رسول کا حکم:
- 389 ----- حکیم الامت کی تعبیر:
- 390 ----- مسلمانوں میں صلح کرانے کا حکم:
- 391 ----- چند اہم ہدایات:
- 393 ----- ایمان والوں کو ہدایات:
- 395 ----- تجسس اور تحسس میں کیا فرق ہے؟:
- 395 ----- غیبت کا وبال:
- 396 ----- اعراب کے دعویٰ ایمان کی حقیقت:
- 398 ----- ایمان اور اسلام میں فرق:

## 402 ----- سورت ق

- 402 ----- سورۃ ق کی اہمیت:
- 403 ----- کفار کے دو تعجبات:
- 405 ----- قدرت باری تعالیٰ:

- 405 ----- علوی ماحول بابرکت ہے:
- 407 ----- رزق خداوندی:
- 407 ----- منکرین انبیاء کا کچھ تذکرہ:
- 408 ----- کنویں والے کون ہیں؟
- 409 ----- اللہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے:
- 410 ----- معیت ذاتیہ کا بیان:
- 413 ----- جہنم سے سوال اور اس کا جواب:
- 413 ----- متقین کا انعام:
- 414 ----- عبرت کون حاصل کرتا ہے؟
- 415 ----- مخالفت کا حل؛ صبر اور تسبیح خداوندی:

## 418 ----- سورة الذاریات

- 418 ----- تین قسم کی مخلوق کی قسم:
- 419 ----- آسمان کی خوبصورتی:
- 419 ----- تردید منکرین:
- 420 ----- متقین کا انعام:
- 421 ----- رات کے قیام کی فضیلت:
- 422 ----- محتاج کی امداد کا حکم:
- 423 ----- انسان میں قدرت کی نشانیاں:
- 424 ----- قیامت کا وقوع یقینی ہے:
- 424 ----- ابراہیم علیہ السلام کا قصہ:

- 424 ----- مہمان کا اکرام کیسے کیا جائے؟
- 426 ----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی:
- 427 ----- ابراہیم علیہ السلام کا خوف اور فرشتوں کی بشارت:
- 428 ----- قوم لوط کی طرف سفر:
- 430 ----- طاقت اور قبیلہ نعمتِ عظمیٰ:
- 430 ----- حضرت موسیٰ دربارِ فرعون میں:
- 431 ----- عاد و ثمود کا انجام:
- 432 ----- تخلیق باری تعالیٰ کے نمونے:
- 433 ----- تسلی پیغمبر:
- 433 ----- عالم اور مشکلات کا سامنا:
- 435 ----- تخلیق جن و انس کا مقصد:
- 435 ----- ارادہٴ تکوینی اور ارادہٴ تشریعی:
- 437 ----- وجہ تخلیق کائنات:
- 438 ----- تصحیح حدیثِ عمر دربارہٴ توسلِ آدم:
- 439 ----- تنبیہ کفار:

## 441 ----- سورة الطور

- 441 ----- بیت معمور کیا ہے؟
- 442 ----- اللہ کا عذاب آکر رہتا ہے:
- 443 ----- قرآن پر عمل ہی اصل مقصد ہے:
- 443 ----- قیامت کی ہولناکی اور مجرمین کا انجام:

- 444 ----- متقین کا انعام:
- 445 ----- والدین کی وجہ سے اولاد کے مقام کی بلندی:
- 446 ----- توسل بالذات کی دلیل:
- 447 ----- پھل اور گوشت جنت کی خوراک:
- 448 ----- جنت میں دوستانہ چھینا جھپٹی:
- 449 ----- شعر کا معنی؛ لغوی اور اصطلاحی
- 451 ----- ”قرآن گھڑا ہوا کلام ہے“ کا تحقیقی اور الزامی جواب
- 452 ----- نبوت وہی ہے:
- 452 ----- اپنے لیے بیٹے اور خدا کے لیے بیٹیاں!
- 454 ----- اجرت علی تعلیم الدین جائز ہے... دلیل:
- 456 ----- غیب کی تعریف:
- 456 ----- سرکشوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں!
- 457 ----- مصیبتوں پر صبر کیجیے!
- 457 ----- مجلس سے اٹھنے کی دعا:

## 459 ----- سورة النجم

- 459 ----- سورت کی خصوصیت اور شانِ نزول:
- 460 ----- حضور علیہ السلام کا جبرئیل امین کو دوبار دیکھنا:
- 461 ----- حضور علیہ السلام کو تسلی:
- 461 ----- ضلال اور غویٰ میں فرق ہے:
- 461 ----- حضور علیہ السلام اپنی طرف سے کوئی بات نہیں فرمائے!



- 462 ----- جبرئیل اور حضور کا قرب:
- 463 ----- دوسری روایت سے کون مراد ہے؟
- 466 ----- زاغ اور طغیٰ میں فرق:
- 467 ----- جو کام ذمہ ہو وہیں کریں!
- 467 ----- نفع اپنے شیخ ہی سے ہوتا ہے... مثال:
- 468 ----- اللہ کی بڑی بڑی نشانیوں کا دیدار:
- 470 ----- مشکرین کے بت؛ لات، منات اور عزیٰ:
- 470 ----- ان بتوں کی حقیقت!
- 472 ----- غیروں کے بجائے اپنوں کی فکر کیجیے:
- 474 ----- ”جوڑ“ کیجیے لیکن کس سے:
- 474 ----- گناہ گاروں اور نیکو کاروں کا بدلہ:
- 475 ----- گناہگار کو امید اور نیکوکار کو تنبیہ:
- 475 ----- گناہ صغیرہ اور کبیرہ میں فرق:
- 477 ----- اتنی نہ بڑھاپا کی داماں کی حکایت...:
- 478 ----- انفاق کی عادت ڈالیے:
- 479 ----- کیا اس کو علم غیب ہے کہ ایسی باتیں کرتا ہے؟
- 481 ----- ”آدمی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا“ کا مطلب:
- 481 ----- ایصال ثواب پر اشکال کا جواب:
- 482 ----- وعظ و نصیحت:

## 485 ----- سورۃ القمر

485 ----- واقعہ شق قمر:

487 ----- قوم نوح پر طوفان:

488 ----- قرآن کے آسان ہونے کا معنی:

489 ----- قوم عاد کی تباہی:

490 ----- قوم ثمود کا انجام:

492 ----- قوم لوط کی پکڑ:

493 ----- آل فرعون کی سرکشی اور اس کا انجام:

493 ----- پانچ بڑی اقوام عالم:

## 496 ----- سورة الرحمن

496 ----- لفظ الرحمن سے سوت کے آغاز کی وجہ:

496 ----- قرآن سب کو سیکھنا چاہیے:

497 ----- اللہ کی نعمتیں:

500 ----- سمندر، خدائی قدرت کا کرشمہ

501 ----- متکلم اسلام کا سمندری سفر:

503 ----- اللہ کی دو اہم صفات؛ ذوالجلال والا کرام

503 ----- عظیم لوگوں کو صاحب احسان ہونا چاہیے:

504 ----- چھوٹوں پر شفقت کریں!

505 ----- متکلم اسلام کی شفقت کے چند واقعات:

509 ----- آسمان سرخ ہو جائے گا:

510 ----- مجرمین کا دواصل جہنم ہونا:

511 ----- مقررین کے انعامات:

512 ----- اصحاب الیمین کے انعامات:

513 ----- خواص اور عوام کے باغات میں فرق:

## 515 ----- سورة الواقعة

515 ----- فضائل سورت:

516 ----- قیامت کی ہولناکی کا بیان:

517 ----- لوگوں کی تین اقسام:

518 ----- پہلی قسم؛ مقررین

519 ----- فرقہ جماعت المسلمین کا دعویٰ:

519 ----- مقررین کے انعامات:

521 ----- دوسری قسم؛ اصحاب یمین

521 ----- اصحاب یمین کے انعامات:

523 ----- دیہاتی اور شہری مزاج کی رعایت:

525 ----- تیسری قسم: اصحاب الشمال

526 ----- اللہ کی چار عظیم نعمتیں:

529 ----- بلا طہارت قرآن چھونا جائز نہیں:

531 ----- حائضہ قرآن نہیں پڑھ سکتی... دلیل:

533 ----- تین گروہوں کا اجمالی بیان:

## سورۃ یس

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿يَس ۝۱ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ ۝۲ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝۳﴾

### فضائل و اسمائے سورت:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"إِنَّ لِكُلِّ شَيْءٍ قَلْبًا وَقَلْبَ الْقُرْآنِ يَس" <sup>1</sup>

ہر چیز کا دل ہوتا ہے اور قرآن پاک کا دل سورۃ یسین ہے۔

اس کی وجہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اصل مقصود آخرت ہے، قبر ہے، حشر ہے، اللہ کی رضا ہے اور اس سورت مبارکہ میں قیامت اور آخرت کے مضامین کو بڑی اہمیت سے بیان کیا گیا ہے اور جب انسان کے دل میں آخرت بیٹھ جاتی ہے تو نیک اعمال کرنا اور گناہ چھوڑنا آسان ہو جاتا ہے۔ خوفِ آخرت گویا دل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح جسم میں دل ہے، وہ ٹھیک ہو تو بندہ ٹھیک ہے، وہ خراب ہو تو پورا جسم خراب ہوتا ہے۔ اسی طرح خوفِ آخرت شریعت میں دل کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ اس سورت میں معاد اور قیامت کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان

کیا ہے اس لیے اس سورت کو قرآن کریم کا دل کہا جاتا ہے۔

اس کا ایک نام سورت عظیمہ بھی ہے کہ یہ بہت عظمت والی ہے۔ اس کا ایک نام مُذَافِعہ بھی ہے کہ جو اس کو پڑھتا ہے اس سے عذاب کو روک دیتی ہے۔ اس کا ایک نام مُعِمَّہ بھی ہے مُعِمَّہ کا معنی کہ انسان کے دنیا اور آخرت کے احوال کو سنبھالتی ہے اور آسان کرتی ہے۔ اس کا ایک نام قاضیہ بھی ہے کہ بندے کی حاجات اور ضرورتیں پوری کرتی ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

"وَأَقْرَبُوهَا عَلَى مَوْتَاكُمْ" <sup>2</sup>

کہ سورت یٰسین کو اپنے مردوں پر پڑھا کرو۔

جب موت کا وقت قریب ہو تو سورت یٰسین پڑھنے سے روح آسانی سے نکل

جاتی ہے۔

### ﴿یٰس﴾ کا معنی:

یہ مقطعات اور متشابہات میں سے ہے جس کا معنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اگرچہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ ”یٰس“ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نام ہے۔

### یاسین نام رکھنے کا حکم:

یہاں ایک مسئلہ یاد رکھ لیں کہ کسی شخص کا نام یاسین رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ”یٰس“ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اس لیے یہ نام نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ یہ معلوم نہیں کہ یہ نام اللہ کے ساتھ خاص ہے جیسے رازق،

خالق، رحمن وغیرہ یا مخلوق کے لیے اس کی گنجائش ہے جس طرح آپ اسمائے باری تعالیٰ کی بحث القواعد فی العقائد کے سبق میں پڑھ چکے ہیں۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ یاسین نام رکھ سکتے ہیں اور صحیح بات بھی یہی ہے کہ یاسین نام رکھنا جائز ہے لیکن جب یاسین کسی شخص کا نام رکھیں تو یوں نہ لکھیں جس طرح قرآن میں لکھا ہے [یس] بلکہ اس طرح لکھیں یا.. الف.. سین.. یا.. نون.. کے ساتھ یعنی یاسین کیونکہ قرآن کریم میں ہے: ﴿سَلِّمْ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ﴾<sup>3</sup> یہ معروف قرأت ہے اور ایک قرأت میں ہے ”سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ“ تو ایک قرأت میں چونکہ مستقل یاسین مخلوق کے لیے استعمال ہوا ہے، اس لیے یاسین نام رکھنا جائز ہے۔

### جزیرۃ العرب میں حضور علیہ السلام سے پہلے کوئی نبی آیا یا نہیں؟

﴿وَالْقُرْآنَ الْحَكِيمَ﴾<sup>۱</sup> إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۲﴾ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۳﴾ تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ﴿۴﴾ لِيُنذِرَ قَوْمًا مَّا أُنْذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ ﴿۵﴾

قسم ہے قرآن کی جو حکمت والا ہے بے شک آپ رسولوں میں سے ہیں، آپ سیدھے راستے پر ہیں، یہ قرآن اس ذات کی طرف سے نازل ہوا ہے جو غالب اور رحم کرنے والی ہے، آپ کو رسول اس لیے بنایا گیا ہے تاکہ آپ ایسی قوم کو ڈرائیں جن کے آباء واجداد کو نہیں ڈرایا گیا اسی وجہ سے یہ لوگ غفلت میں ہیں۔

یہاں فرمایا: ﴿لِيُنذِرَ قَوْمًا مَّا أُنْذِرَ آبَاؤُهُمْ﴾ کہ آپ ایسی قوم کو

ڈرائیں کہ جن کے آباء واجداد کو نہیں ڈرایا گیا... حالانکہ سورۃ فاطر میں ہے: ﴿وَإِنْ

مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ﴿٢٢﴾ کہ اللہ ہر امت میں ایک بندہ ڈرانے والا بھیجتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام انہی کے آباء واجداد میں آئے تھے، پھر یہ کیسے کہا گیا کہ ان کے آباء واجداد کو نہیں ڈرایا گیا؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے بعد بہت لمبا وقت گزرا ہے کہ اس میں ان میں کوئی پیغمبر نذیر نہیں آیا، ہر جگہ پر ”نذیر“ کا معنی یہ نہیں کہ ہر جگہ نبی ہی جائے گا بلکہ کسی جگہ پر نبی جائے گا اور کسی جگہ پر نبی کا نائب جائے گا۔ خصوصاً آپ آخری امت دیکھ لیں۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نذیر بن کر آئے ہیں لیکن جزیرہ عرب سے باہر آپ کے اسفار نہیں ہیں۔ تو ﴿وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ﴿٢٣﴾﴾ کا معنی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت محمدیہ کے نبی ہیں، ایک جگہ پر تو خود نذیر بن کر آئے ہیں، ہر جگہ اور ہر شہر میں آپ نہیں گئے لیکن آپ کے نائب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور امت کے علماء ہر جگہ پر موجود ہیں۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ جو اثر براہ راست نبی سے ہوتا ہے وہ نبی کے نائب سے نہیں ہوتا۔ اس لیے فرمایا کہ ان میں کوئی ڈرانے والا نہیں آیا یعنی بطور نبی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے بعد۔

### حضور علیہ السلام کے مخالفین کی حالت:

﴿إِنَّا جَعَلْنَا فِيْ أَعْنَاقِهِمْ أَغْلًا فَبِهِىْ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُونَ ﴿١﴾ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ﴿٢﴾﴾ یہاں دو مثالیں ان لوگوں کی دی ہیں جو پیغمبر کی بات کو نہیں مانتے۔ پہلی

مثال جیسے کسی شخص کی گردن میں طوق ڈال دیں تو وہ نیچے دیکھنا بھی چاہے تو نہیں دیکھ سکتا، جب نیچے نہیں دیکھ سکتا تو چلے گا کیسے؟ نہیں چل سکتا نا۔

اور دوسری مثال کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے چاروں طرف دیوار ہوتی ہے اور وہ دیوار سے نکلیں گے نہیں تو چلیں گے کیسے۔

اور ایسے آدمی بھی دو قسم کے ہوتے ہیں؛ بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جو نیچے نہیں دیکھ سکتے اور بعض ایسے ہیں کہ جو چاروں طرف نہیں دیکھ سکتے، ہر اعتبار سے اندھے ہیں، ان پر کلام اثر ہی نہیں کرتا۔ تو ان دو قسم کے لوگوں کے لیے دو قسم کی مثالیں بیان کی ہیں۔

**انذار کا فائدہ حضور علیہ السلام کو تو ہو گا:**

﴿وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾

ان کے لیے برابر ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان کو کچھ فائدہ نہیں ہو گا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اس پر سوال یہ ہے کہ جب ڈرانے کا فائدہ نہیں ہے تو پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کیوں ڈراتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ نے ﴿وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ فرمایا ہے، ”سَوَاءٌ عَلَيْكَ“ نہیں فرمایا یعنی ان کو ڈرانے کا آپ کو ثواب تو ملے گا لیکن ان کو فائدہ پھر بھی نہیں ہو گا، یہ لوگ ڈھیٹ اور ضدی ہیں، لہذا ڈراتے رہنا چاہیے۔

**اعمال اور ان کے اثرات:**

﴿إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ﴾

بے شک ہم ہی مردوں کو زندہ کریں گے اور ہم لکھتے ہیں جو انہوں نے اعمال



آگے بھیجے ہیں اور جو ان کے اعمال کے اثرات ہیں ان کو بھی لکھتے ہیں۔

آگے بھیجنے کا معنی یہ ہے کہ آدمی نیک یا برا عمل کرے تو وہ اللہ کے ہاں محفوظ ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ﴾<sup>5</sup>

جو تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا۔

### عمل کے نتائج بھی لکھے جاتے ہیں:

﴿وَأَنفَأْرَهُمْ﴾... اس کا ایک معنی یہ ہے کہ تمہارے اعمال کے جو ثمرات اور نتائج نکلتے ہیں ہم ان کو بھی لکھ لیتے ہیں۔ ایک عمل ہوتا ہے اور ایک اس عمل کا متعدی نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک بندے نے کوئی علمی کام کیا مثلاً وعظ کیا، کوئی کتاب لکھی تو یہ اس کا عمل ہے اور اس کے بعد لوگوں نے اس سے نفع حاصل کیا، لوگ راہِ راست پر آگئے تو یہ اس کا اثر ہے۔ ایک انسان قرآن کریم پڑھتا ہے آگے اس کے شاگرد ہوتے ہیں، یہ قرآن کریم پڑھانا اس کا عمل ہے، آگے شاگرد یہ اس کا نتیجہ ہے۔ ایک بندے نے کوئی برا کام کیا سینما بنا دیا تو جو لوگ اس سینما میں فلمیں دیکھیں گے تو یہ اس بندے کے عمل کا اثر ہے۔ جیسے حدیث پاک میں آیا ہے:

"مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا  
بَعْدَهُ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُنْتَفَضَ مِنْ أَجُورِهِمْ شَيْءٌ وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً  
كَانَ عَلَيْهِ وَزْرُهَا وَوَزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا".<sup>6</sup>

کہ جو شخص اسلام میں کوئی نیک کام ایسا شروع کرتا ہے کہ جس پر لوگ عمل

5- النحل 16: 96

6- صحیح مسلم، رقم: 1017

کرتے ہیں تو اس نیک عمل کا اجر اس کو ملے گا اور جو لوگ نیک عمل کریں گے ان سب کا اجر بھی اس بندے کو ملے گا اور اگر کوئی شخص گناہ کا ایسا کام کرتا ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ گناہ کرتے ہیں تو اس کے گناہ کا وبال اس پر ہو گا اور لوگ جو گناہ کرتے ہیں ان سب کے گناہوں کا وبال بھی اس پر ہو گا۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم بندوں کے اعمال بھی لکھتے ہیں اور ان کے اثرات اور نتائج کو بھی لکھتے ہیں۔

آثار کا ایک معنی نشان بھی آتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث پاک میں آیا ہے کہ انسان جب نماز کے لیے جاتا ہے تو ایک قدم پر اسے ایک نیکی ملتی ہے۔ یہ آثار ہیں۔ جس طرح نماز پڑھنے کا ثواب ہے ان آثار قدموں کے نشانات کا بھی ثواب ہے۔ اللہ اس کو بھی لکھ لیتے ہیں۔

### بستی والوں کا قصہ:

﴿وَأَضْرَبَ لَهُمْ مَثَلًا أَصْحَبَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿١٦﴾ إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا إِنَّا إِلَهُكُم مُّرْسَلُونَ ﴿١٧﴾ قَالُوا مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَمَا أَنْزَلَ الرَّحْمَنُ مِنْ شَيْءٍ ۖ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ﴿١٨﴾﴾

اوپر جن منکرین نبوت و رسالت کفار کا ذکر آیا ہے ان کو متنبہ کرنے کے لیے قرآن کریم بطور مثال کے پہلے زمانے کا ایک قصہ بیان کرتا ہے جو ایک بستی میں پیش آیا تھا۔ فرمایا: ان کے سامنے ایک بستی والوں کی مثال بیان کرو۔ جب ان کے پاس ہمارے رسول آئے۔ جب ہم نے شروع میں۔ ان کے پاس دو پیغمبر بھیجے تو اس بستی والوں نے ان کو جھٹلا دیا۔ ہم نے ایک اور پیغمبر ان کی تصدیق اور تائید کے لیے بھیجا۔ اب ان تینوں نے کہا کہ یقیناً ہم تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ انہوں نے

پھر ان کو بھی جھٹلایا، کہا کہ تم تو ہم جیسے آدمی ہی ہو اور رحمن نے کوئی چیز نازل نہیں کی، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ معاذ اللہ۔

ان رسولوں نے کہا کہ ہمارے رب کو خوب معلوم ہے کہ ہمیں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، ہمارا کام صرف یہی تھا کہ ہم واضح طور پر تمہارے پاس رب کا پیغام پہنچا دیں۔ بعض روایات میں ہے کہ ان پیغمبروں کی دعوت نہ ماننے کی وجہ سے ان بستی والوں پر قحط کا عذاب آیا تو۔ ان بستی والوں نے کہا کہ ہمیں تو تمہارے اندر نحوست محسوس ہو رہی ہے، اگر تم اس کام سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے اور تمہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔ پیغمبروں نے جواب دیا کہ تمہاری نحوست تمہارے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ تم یہ باتیں اس لیے کر رہے ہو کہ تمہیں ایک واضح پیغام پہنچایا گیا ہے؟ تم لوگ تو حد سے تجاوز کرنے والے ہو!

بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے ان پیغمبروں کو شہید کر دیا۔

اب یہاں ایک بات سمجھیں۔ ﴿قَالُوا إِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ﴾ وہ لوگ کہتے تھے کہ ہمیں تو تمہارے اندر نحوست محسوس ہو رہی ہے، کیا مطلب کہ تمہاری وجہ سے ہم پر عذاب آیا ہے۔ جب تم نہیں تھے تو ہمارے اوپر کبھی عذاب نہیں آیا اور جب تم آئے ہو تو ہمارے اوپر دو عذاب آئے ہیں؛ ایک تو ہماری قوم ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے، آپس کے اختلافات کا شکار ہو گئی ہے جس سے ہماری طاقت ختم ہو گئی ہے۔ قوم کا ٹوٹ جانا یہ بہت بڑا عذاب ہوتا ہے اور دوسرا ہم پر قحط کا عذاب آیا ہے، اور جن کو تم گناہ کہہ رہے ہو کفر... شرک... بڑے بڑے جرم... یہ سارے گناہ ہم پہلے بھی کرتے تھے مگر ہمارے اوپر کبھی عذاب نہیں آیا۔ اب عذاب کا آنا یہ تمہاری وجہ سے ہے۔

اب دیکھیں! بظاہر ان کی بات وزنی معلوم ہوتی ہے۔

اس کا جواب سمجھیں کہ جب پہلے کفر اور زنا کرتے تھے تو عذاب اس لیے نہیں آیا کہ ان کے پاس کوئی سمجھانے والا داعی نہیں پہنچا تھا، ان پر حجت تام نہیں ہوئی تھی اور جب انہیں سمجھایا گیا کہ کفر سے باز آ جاؤ، شرک سے باز آ جاؤ، جرم کو چھوڑ دو! جب یہ باز نہ آئے تو حجت تام ہو گئی اس لیے اب عذاب آیا۔ تو عذاب کا آنا یہ تمہارے گناہوں کی نحوست کی وجہ سے ہے۔

اور دوسرا جو تم آپس میں ٹکڑے ہوئے ہو تو یہ تمہاری وجہ سے ہے، پہلے تم ایک دین؛ کفر پر تھے، ہم نے سمجھایا کہ یہ کفر ہے اس کو چھوڑ دو، کچھ نے چھوڑا اور کچھ نے نہیں چھوڑا تو ٹکڑے ہو گئے۔ اگر سارے کفر چھوڑتے اور ایمان قبول کرتے تو ٹکڑے نہ ہوتے۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام نے کہا: ﴿طَايِبُكُمْ مَعَكُمْ﴾ یہ تمہاری نحوست تمہارے ہی ساتھ ہے۔

### حبیب ابن اسماعیل نجار کا ذکر:

﴿وَجَاءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَى قَالَ يَفْقَوْمِ اتَّبِعُوا  
النُّرْسِلِينَ﴾ اتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْئَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُهْتَدُونَ ﴿٦٦﴾  
شہر کے دوسرے کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا، کہنے لگا کہ اے میری قوم! ان رسولوں کی بات مان لو، ان کی بات مان لو جو تم سے اجرت نہیں مانگتے اور صحیح راستے پر ہیں۔

یہ ”رجل“ کون تھا؟ کہتے ہیں حبیب ابن اسماعیل نجار تھا۔ اس کے بارے میں ایک روایت میں ہے کہ یہ جذام کا مریض تھا۔ یہ اپنے بنائے ہوئے معبودوں سے دعا کرتا تھا کہ میری بیماری ٹھیک کر دیں لیکن کچھ افاقہ نہیں ہوتا تھا۔ ستر سال سے یہ بیماری اس پر تھی اور اس کا مکان شہر کے کنارے پر سب سے آخری دروازے پر تھا، یہ

وہاں پڑا رہتا تھا۔ رسول جب اس شہر میں داخل ہوئے تو اسی دروازے سے داخل ہوئے جہاں اس کا مکان تھا۔ تو ان کی پہلی ملاقات اسی شخص سے ہوئی۔ رسولوں نے اس کو دین کی دعوت دی، اللہ کی توحید کی بات کی تو اس نے کہا کہ تمہارے پاس اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل یا علامت ہے؟ انہوں نے کہا بالکل ہے۔ اس نے کہا: میں بیمار ہوں کیا میری بیماری ٹھیک ہو سکتی ہے؟ رسولوں نے کہا کہ ہم اللہ سے دعا کریں گے تو اللہ تمہیں ٹھیک کر دیں گے۔ اس نے کہا کہ میں اپنے معبودوں سے ستر سال سے صحت مانگ رہا ہوں یہ ٹھیک نہیں کر سکے تو تمہارا خدا فوراً کیسے ٹھیک کر دے گا؟ انبیاء علیہم السلام نے دعا مانگی تو یہ ٹھیک ہو گیا اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

جب اس نے شہر والوں کا یہ حال سنا کہ وہ رسولوں کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں تو وہ دوڑ کر شہر میں آیا اور آکر قوم کو بڑے احسن انداز میں سمجھایا۔ اس نے کہا: ﴿يَقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ﴾ کہ ان رسولوں کی بات مان لو۔

### حبیب نجار کو من جانب اللہ تسلی:

یہ نبی کون ہیں؟ ﴿مَنْ لَا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا﴾ جو تم سے کچھ مانگتے نہیں، ﴿وَهُمْ مُهْتَدُونَ﴾ خود بھی ہدایت پر ہیں اور خیر کی باتیں کرتے ہیں لہذا تمہیں خیال کرنا چاہیے اور اسلوب کیسا پیارا اختیار کیا، کہا: ﴿وَمَا لِي لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ کہ جس اللہ نے مجھے پیدا کیا میں اس کی عبادت کیوں نہ کروں! اب یہ ان کو نہیں کہہ رہے بلکہ اپنے آپ کو خطاب کر رہے ہیں کہ مجھے اس رب کی عبادت کرنی چاہیے، میں اللہ کو چھوڑ کر اور خدا کیسے بنالوں؟ مجھے خود خیال کرنا چاہیے لیکن قوم نے بجائے بات ماننے کے اس کو شہید کر دیا۔

اللہ رب العزت نے بذریعہ فرشتہ ان کو بتا دیا کہ تم گھبراؤ مت! اب تمہارا

ٹھکانا ان شاء اللہ جنت ہو گا۔ یہ جو فرمایا: ﴿قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ﴾ کہ اسے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا اہل باطل اس سے استدلال کرتے ہیں کہ موت کے بعد عذاب اور ثواب کا جسم سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اللہ فرما رہے ہیں: ﴿ادْخُلِ الْجَنَّةَ﴾ کہ جنت میں داخل ہو جا! جنت میں تو آدمی جائے گا حشر کے بعد اور اس کو حشر سے پہلے دخولِ جنت کی بات کہی جا رہی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ جسم نہیں بلکہ روح کو دخولِ جنت کا حکم ہو رہا ہے، معلوم ہوا کہ سارے معاملات روح کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ اس کا معنی ہر گز یہ نہیں ہے جو تم نے بیان کیا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ روح تو علیین میں ہے، ابدی جنت جہاں رہنا ہے وہاں تو روح نہیں ہے، شہداء کے بارے میں تو نص ہے ہم اس بات کو تو مانتے ہیں۔ یہاں ان کو یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ تم نے قربانی دی ہے تو اس کا نتیجہ جنت ہو گا اور تم اس قربانی کی وجہ سے جنت میں داخل ہو گے، اور قبر میں دخولِ جنت نہیں ہو تا بلکہ اس میں عرضِ جنت ہوتی ہے جس کو کبھی دخولِ جنت سے تعبیر کر دیتے ہیں، قبر میں جنت دکھائی جاتی ہے، جنت کی خوشبو سونگھائی جاتی ہے، جنت کی فضا دکھاتے ہیں اور قبر میں جنت اور بندے کے درمیان جو دروازہ ہے اس کو کھول دیتے ہیں تو جنت کا منظر بن جاتا ہے۔ جب جنت کا یہ منظر ان کو ملا تو انہوں نے کہا: ﴿يَلَيْتُ قَوْمِي يَعْلَمُونَ﴾ ﴿٢٦﴾ اے کاش! میری قوم کو پتا چل جاتا کہ اللہ نے مجھے معاف کیا ہے اور خدا نے مجھے کتنی عزت دی ہے۔ کاش ان کو پتا چل جاتا۔

**بستی والوں کی تباہی:**

﴿وَمَا أَنْزَلْنَاهُ عَلَىٰ قَوْمِهِ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا

مُنْزِلِينَ﴾ ﴿٢٧﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خُمُودُونَ ﴿٢٨﴾

جب انہوں نے اس بندے کو قتل کیا، ایک روایت میں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی انہوں نے شہید کیا تھا تو اللہ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس قوم کے لیے آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارنے پڑے بلکہ ایک چیخ سے ان کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔

﴿يَحْسِرَةُ عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ

يَسْتَهْزِءُونَ﴾

افسوس ان بندوں پر کہ ان کے پاس جب بھی رسول آتے ہیں تو یہ بات سننے کے بجائے الٹا ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کئی قوموں کو ہلاک کر دیا کہ وہ ان کے پاس لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

ایک روایت میں ہے کہ ان پر عذاب کے لیے حضرت جبرائیل امین آئے، شہر کے دروازے کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور ایک سخت آواز لگائی، اسی آواز کی وجہ سے سارے مر گئے۔

**وہ بستی تھی یا شہر: تحقیقی قول:**

یہاں فرمایا: ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ﴾ قریہ کی بات کی ہے اور آگے فرمایا: ﴿وَجَاءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ﴾ یہاں شہر کی بات کی ہے۔ تو بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ پہلے قریہ یعنی بستی کا لفظ ہے، پھر مدینہ یعنی شہر کا لفظ ہے۔ یہ دو الگ الگ جگہوں کے واقعات تو نہیں ہیں؟

جواب یہ ہے کہ واقعہ ایک ہی جگہ کا ہے، دراصل عربی زبان میں مدینہ؛ شہر کو کہتے ہیں اور قریہ؛ چھوٹی بستی کو بھی کہتے ہیں اور شہر کو بھی کہتے ہیں، دیہات کو بھی کہتے ہیں اور شہر کو بھی کہتے ہیں دونوں کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ طائف والوں نے کہا تھا:

﴿لَوْلَا نَزَلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْفَرِيقَتَيْنِ عَظِيمٍ﴾<sup>7</sup>

یہ قرآن ان دو قریوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترتا؟  
ان دو قریوں سے مراد مکہ اور طائف کے شہر ہیں۔ تو قریہ کا اطلاق شہر پر  
ہونا یہ قرآن کریم سے ثابت ہے، اس لیے ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

### بستی اور رسولوں کے نام:

اس پر مفسرین نے کلام کیا ہے کہ بستی کون سی تھی؟ تاریخی روایات میں  
ہے کہ یہ بستی انطاکیہ تھی۔ انطاکیہ شام میں واقع ہے، اور ان رسولوں کے نام کیا تھے؟  
بعض کہتے ہیں کہ ایک رسول کا نام صادق تھا، ایک کا صدوق تھا، ایک کا شلوم تھا اور  
بعض کہتے ہیں کہ تیسرے کا نام شلوم نہیں بلکہ شمعون تھا۔

میں نے آپ سے پہلے عرض کیا تھا کہ ہر بندے کا اپنا ایک ذوق ہوتا ہے،  
میرا اس معاملے میں ذوق یہ ہے کہ جس معاملے کو قرآن کھولتا ہے اس کو کھولو اور جس  
کو قرآن چھوڑ دیتا ہے اس کو چھوڑ دو! بستی کا تعین نہ بھی ہو تو اس سے واقعہ پر کیا فرق  
پڑتا ہے؟ نبی اس بستی میں آئے تھے، بستی والوں نے جھٹلایا تھا تو ان پر عذاب  
آیا۔ اس سے بندے کو عبرت حاصل ہوتی ہے، نصیحت حاصل ہوتی ہے۔ اگر ناموں کا  
پتا نہیں چلے گا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس لیے ان مباحث میں اسرائیلی روایات  
اور ضعیف روایات کو لے کر قرآن کریم کی تفسیر کرنے کے بجائے جو چیزیں مطلوب  
ہیں بس ان پر غور کریں۔

### توحید باری تعالیٰ کی نشانیاں:

﴿وَآيَةٌ لَهُمُ الْأَرْضُ الْمَيِّتَةُ أَحْيَيْنَاهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا



فِيهِ يَأْكُلُونَ ﴿٣٤﴾ وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِّنْ نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجْرْنَا فِيهَا  
مِنَ الْعُيُونِ ﴿٣٥﴾ لِيَأْكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ ۚ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ ۖ أَفَلَا  
يَشْكُرُونَ ﴿٣٦﴾

اللہ رب العزت نے اب اپنی توحید پر نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔ پہلی نشانی کیا ہے؟ فرمایا کہ اس زمین کو دیکھو یہ بنجر ہوتی ہے، ہم اس کو سرسبز و شاداب کر دیتے ہیں اور ہم اس سے غلے نکالتے ہیں جن کو تم کھاتے ہو۔ ہم نے اس زمین میں کھجوروں کے اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور پانی کے چشمے جاری کیے تاکہ لوگ اس سے پیدا شدہ چیزیں کھائیں۔ پھل، سبزیاں، میوے کھائیں۔ ﴿وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ﴾ اور جو اپنے ہاتھوں سے یہ کماتے ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ پھل کو پیدا تو اللہ فرماتے ہیں آگے انسان کے ہاتھ کا کام شروع ہوتا ہے مثلاً کیلا ہے تو اس کا چھلکا اتار کر کھالیا، پھلوں سے فروٹ چاٹ بنائی، جو سبنا لیا وغیرہ، یہ ﴿وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ﴾ ہے، پھل کی ابتدائی تخلیق اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور کھانے سے پہلے تغیرات یہ بندہ اپنی طرف سے کرتا ہے۔

پھر انسان کے علاوہ جتنے حیوانات ہیں ان کی خوراک مفرد ہے اور انسان کی خوراک مرکب ہے۔ جو جانور گھاس کھاتے ہیں وہ گھاس ہی کھاتے ہیں، وہ گوشت نہیں کھاتے اور جو گوشت کھاتے ہیں وہ گوشت ہی کھاتے ہیں، وہ گھاس نہیں کھاتے، اور انسان گوشت بھی کھاتا ہے اور سبزیاں بھی کھاتا ہے، کبھی گوشت الگ کھاتا ہے اور سبزی الگ کھاتا ہے اور کبھی دونوں کو مکس کر کے کھاتا ہے۔ جو جانور گھاس اور سبزیاں کھاتے ہیں وہ ان میں تغیرات نہیں کرتے جیسے اگتی ہیں ویسے کھا لیتے ہیں اور انسان ایک ایک سبزی کو بیس بیس سٹائل سے کھاتا ہے، جو جانور گوشت کھاتا ہے تو جیسے

گوشت ہے ویسے کھالیتا ہے اور انسان گوشت کی مختلف ڈشیں بنا بنا کر کھاتا ہے۔ اللہ رب العزت نے انسان کو یہ خصوصیات عطا فرمائی ہیں۔

تو انسان جب دونوں قسم کی غذائیں کھاتا ہے، الگ الگ بھی اور اپنی کاریگری سے کس کر کے بھی، تو اللہ نے دونوں کا ذکر فرمایا؛ کھجور اور انگور الگ الگ غذاؤں کا ذکر بھی کیا اور ﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ اَيِّدِيهِمْ﴾ میں اس کی اپنی کاریگری کا ذکر بھی کیا۔ اللہ نے انسان کا ظاہر کتنا اچھا بنایا! خوراک کتنی اچھی بنائی! سب کچھ اللہ نے اس انسان کے لیے پیدا فرمایا ہے۔

### مخلوقات کے جوڑے جوڑے:

﴿سُبْحَنَ الَّذِي خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ﴾

پاک ہے وہ ذات جس نے سب چیزوں کے جوڑے بنائے ہیں، زمین سے اگنے والی چیزوں کے جوڑے، خود انسانوں کے جوڑے؛ مرد اور عورت اور ان چیزوں کے بھی جوڑے جن کو یہ نہیں جانتے!

اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر جمادات میں جوڑے ہوں تو کیا بعید ہے؟ کیونکہ اللہ خود فرماتے ہیں: ﴿وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ﴾ کہ ان چیزوں میں بھی جوڑے ہیں جن کو انسان نہیں جانتے! تو ہو سکتا ہے کہ جمادات میں بھی جوڑے ہوں؛ نر اور مادہ لیکن ہمیں اس کا علم نہ ہو۔

اور ازواج کا ایک معنی ہوتا ہے جوڑا، مرد؛ عورت کے لیے زوج اور عورت مرد کے لیے زوج، دونوں پر زوج کا اطلاق ہوتا ہے، ﴿اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ یہ زوج کی جمع ہے۔ تو زوج دونوں جگہ پر بولا جاتا ہے اور کبھی زوج کا معنی نوع بھی ہوتا ہے۔

تو ﴿حَلَقَ الْاَنۡوَاۡجَ﴾ کا معنی ہو گا کہ ہم نے ہر چیز کی کئی قسمیں پیدا کی ہیں جیسے انگور ایک ہے اور اس کی قسمیں کئی ہیں، کیلا ایک ہے قسمیں کئی ہیں، سبزی ایک ہے قسمیں کئی ہیں، گوشت ایک ہے اس کی کئی اقسام ہیں، تو ہم نے کتنی انواع پیدا کی ہیں تمہارے لیے۔

اسی طرح خود انسانوں میں کیسی انواع ہیں، مرد کو دیکھو تو رنگ الگ ہے، عورت کو دیکھو تو رنگ الگ ہے، نام الگ ہے، علاقے الگ ہیں۔ یہ اللہ رب العزت نے زمین کی نشانی بیان فرمائی ہے۔

### رات؛ قدرتِ حق کی نشانی:

﴿وَاٰیۡةٌ لَّہُمُ النَّیۡلُ ۚ نَسۡخُ مِنْہُ النَّہَارَ فَاِذَا ہُمۡ مُظۡلِمُوۡنَ ﴿۷﴾﴾

ان کے لیے ایک نشانی رات ہے، ہم اس سے دن کو کھینچ لیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

زمین میں اصل ظلمت ہے اور کو اکب، نجوم، شمس اور قمر کی وجہ سے اس میں روشنی عارضی ہوتی ہے اور جب وہ غروب ہو جاتے ہیں تو پھر زمین میں اندھیرا ہو جاتا ہے۔ ”سُخ“ کا معنی ہوتا ہے کھال اتارنا۔ تو اللہ رب العزت رات سے دن نکال لیتے ہیں اور دن سے پھر رات نکال لیتے ہیں۔ جس طرح زمین میں اصل میت؛ بنجر پن ہے، پانی سے سرسبز ہو جاتی ہے، جب پانی نہیں ہوتا تو پھر بنجر ہو جاتی ہے۔ آگے پھر نشانی بیان فرمائی:

### سورج کا مستقر کیا ہے؟

﴿وَالشَّمْسُ تَحۡرِیۡ مُسۡتَقَرِّ لَہَا ۚ ذٰلِکَ تَقَدِّیۡرُ الْعَزِیۡزِ الْعَلِیۡمِ ﴿۸﴾﴾

آپ تھوڑا سا اور اوپر جائیں اور دیکھیں سورج اپنے مستقر پر چلتا ہے، مستقر

یہ ظرف زمان بھی ہو سکتا ہے اور ظرف مکان بھی۔ ظرف زمان کا معنی کہ سورج چلتا رہتا ہے اپنے استقرار کی جگہ تک کے لیے یعنی چلتے... چلتے... چلتے... ایک وقت آئے گا کہ جہاں پر اس نے ٹھہرنا ہے، وہاں پہنچ کر ٹھہر جائے گا اور اس سے مراد قیامت ہے۔ تو مستقر سے مراد اس کے رکنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ مستقر سے مراد رکنے کا زمانہ ہے۔ سورۃ الزمر میں ہے:

﴿خَلَقَ السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ بِأَحْقِّ يُكَودُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَودُ  
النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى﴾<sup>8</sup>

کہ ہر سیارہ یا سیارچہ ایک وقت مقرر کی حد تک اپنے مدار میں چلتا ہے۔  
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقر سے مراد استقرار زمانی ہے کہ سورج چلتا  
رہے گا اپنے رکنے کے زمانے تک۔

یامستقر سے مراد مکان ہے کہ سورج چلتا ہے اور رکنے کی جگہ پر ٹھہرتا ہے  
اور پھر چل پڑتا ہے۔ اب اس سے مراد کیا ہے؟ حدیث پاک میں ہے کہ سورج روزانہ  
تحت العرش سجدہ کرتا ہے، پھر اللہ سے اجازت مانگتا ہے، اجازت ملتی ہے تو پھر چلتا ہے  
اور قیامت تک یوں ہی ہو گا۔ جس دن قیامت قائم ہوگی سورج غروب کے بعد سجدہ  
کرے گا پھر اجازت مانگے گا تو اس کو آگے چلنے کی اجازت نہیں ملے گی اور اس کو حکم ہو  
گا کہ مغرب کی طرف واپس چلے جاؤ اور پھر وہاں سے طلوع ہو! جب وہاں سے طلوع ہو  
جائے گا تو اب قیامت شروع ہو جائے گی، توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے۔

یہاں اگر مستقر سے مراد زمان ہو تو اس پر کوئی اشکال نہیں اور اگر مستقر سے  
مراد مکان ہو تحت العرش تو اس پر اشکالات ہیں فن فلکیات کی وجہ سے بھی اور

مشاہدات کی وجہ سے بھی۔ ایک اشکال تو یہ ہے کہ سورج ایک ملک میں غروب ہوتا ہے اور دوسرے ملک میں طلوع ہوتا ہے، اس کا طلوع اور غروب مسلسل چل رہا ہے اس میں ٹھہراؤ تو نہیں ہے اور جب مستقر کا معنی ہے کہ سورج غروب کے بعد عرش کے نیچے رکتا ہے پھر سجدہ کرتا ہے پھر اجازت لیتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ عرش کے نیچے ٹھہرتا ہے جبکہ فلکیات اور مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مسلسل حرکت ہے، اس میں ٹھہراؤ نہیں ہے۔

### سورج کے سجدہ کرنے کا معنی:

دوسرا سوال یہ ہے اللہ تعالیٰ کے عرش کی جو کیفیت قرآن و سنت سے سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام زمینوں اور آسمانوں کے اوپر محیط ہے، یہ زمین، تمام آسمان، نجوم و کواکب جو بھی ہیں عرش نے ان سب چیزوں کو اپنے اندر لیا ہوا ہے، اس لحاظ سے سورج تو ہمیشہ ہر حال اور ہر وقت عرش کے نیچے ہے تو پھر غروب کے بعد تحت العرش جانے کا کیا مطلب ہوگا؟

جوابات کئی لوگوں نے دیے ہیں۔ بہترین جواب وہ ہے جو حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے دیا ہے۔<sup>9</sup> حضرت کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم سجدہ کا معنی وہ سمجھے ہیں جو سجدہ ہم کرتے ہیں کہ آدمی رک جائے، سکون اختیار کرے اور پیشانی زمین پر رکھ دے، یہاں جو حدیث پاک میں ہے کہ سورج عرش کے نیچے آ کر سجدہ کرتا ہے تو اس سے مراد عرفی سجدہ نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ سورج کا طلوع و غروب ہونا یہ اللہ کے حکم کا پابند ہے، اس کی حرکت اللہ کے فرمان اور حکم کی پابند ہے اسی کو سجدہ قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ہر چیز کا سجدہ اس کی شان کے موافق ہوتا

ہے۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿كُلُّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ﴾<sup>10</sup> دنیا میں ہر چیز کو اللہ نے حکم دیا ہے نماز اور تسبیح کا اور ہر چیز کی تسبیح اور صلوٰۃ اس کی شان کے موافق ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کو سمجھتا ہے۔

سورج کے سجدے کا معنی یہ ہے کہ سورج ہر وقت اللہ کے حکم کے تابع ہے، ہر غروب کے بعد طلوع اپنی مرضی سے نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے حکم سے ہے اور جیسے اللہ کا حکم ہے ویسے وہ چل رہا ہے۔ تو سجدے کا معنی یہ ہے کہ جس طرح سجدہ کر کے بندہ اپنے آپ کو اللہ رب العزت کے حوالے کرتا ہے بالکل اسی طرح سورج نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے تحت العرش کیا ہوا ہے اور خدا کے حکم کے مطابق چل رہا ہے۔

### چاند؛ قدرتِ حق کی ایک عظیم نشانی:

﴿وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ﴾

اور چاند کو دیکھو اللہ کی نشانی ہے، ہم نے چاند کی بھی منزلیں متعین کی ہیں، یہاں تک کہ کم ہوتے ہوتے ایک وقت آتا ہے کہ ایسا ہو جاتا ہے جس طرح کھجور کی پرانی ٹہنی ہوتی ہے۔ تو چاند ایسا باریک سا ہوتا ہے۔ چاند ایک مہینے میں اپنا چکر پورا کرتا ہے۔ یہ روزانہ غروب ہوتا ہے، جہاں غروب ہوتا ہے وہ اس کی منزلیں ہیں، تیس یا انتیس ہیں ایک مہینے میں، پھر ایک رات ایسی بھی آتی ہے کہ اس میں چاند نظر نہیں آتا، اس لیے بعض حضرات چاند کی اٹھائیس منزلیں کہہ دیتے ہیں۔

### سورج اور چاند کا مرتب نظام:

﴿لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَ

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿٦٠﴾

سورج چاند سے آگے نہیں نکل سکتا اور رات دن سے آگے نہیں نکل سکتی۔  
رات نے اپنے وقت پر آنا ہے، دن نے اپنے وقت پر آنا ہے، سورج نے اپنے وقت پر  
آنا ہے اور چاند نے اپنے وقت پر آنا ہے۔

اللہ رب العزت انبیاء علیہم السلام کو انسانوں کی طرف مبعوث فرماتے ہیں،  
انسانوں میں تھوڑی عقل والے بھی ہوتے ہیں اور زیادہ عقل والے بھی ہوتے ہیں اور  
پیغمبر کی مبارک عادت ہوتی ہے کہ وہ ایسی علمی موشگافیاں اور فنی باتیں نہیں کرتے جو  
عوام کی سمجھ سے بالاتر ہوں، پیغمبر ایسی باتیں کرتا ہے جو عوام کے لیے سمجھنا بہت  
آسان ہو۔ جیسے قرآن کریم میں ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْآِهَةِ﴾<sup>1</sup> کہ انہوں نے پوچھا کہ چاند کیا ہے؟ اللہ

نے جواب دیا: ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ میرے پیغمبر! ان کو جواب  
دیجیے کہ اس سے حج کا پتا چلتا ہے، حج کے علاوہ اور احکامات کا پتا چلتا ہے۔ اب دیکھو اللہ  
نے ہمارے احکامات حج، روزہ، عیدین، زکوٰۃ، عورتوں کی عدت کے مسائل ان سب کو  
چاند سے جوڑ دیا اور یہ کتنا آسان سا حساب ہے!

پھر چاند نکل آیا ہے تو اب اس کی علامت کیا ہے؟ فرمایا کہ دو گواہ ہوں یا تم  
خود دیکھ لو، یہ بہت آسان ہے۔ اس کے لیے کسی سائنس اور علم کی ضرورت نہیں  
ہے۔ تو احکام شریعت کو چاند سے جوڑ دیا اور چاند کے دیکھنے کو شہادت سے جوڑ دیا۔ اب  
اس کے لیے کون سا فن چاہیے؟! اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے کیسا سادہ  
سا نظام دیتے ہیں جو ہر بندے کی سمجھ میں آ جاتا ہے۔

## کشتیاں: اللہ کی نشانیاں

﴿وَآيَةٌ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلِّ الْمَشْحُونِ﴾

اللہ نے ایک اور نشانی کا ذکر فرمایا۔ فرمایا: ان کے لیے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو کشتیوں پر سوار کیا۔ یہاں ”اَنَّا حَمَلْنَاهُمْ“ نہیں فرمایا بلکہ ﴿اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ فرمایا حالانکہ یہ خود بھی تو سوار ہوتے ہیں تو اللہ نے صرف ان کی اولاد کی بات کیوں کی ہے؟ یہ بات سمجھانے کے لیے کہ بسا اوقات اولاد تو ہوتی ہے لیکن بندہ ایک جگہ پر رہتا ہے اور دوسری جگہ سے استفادہ کرنا چاہتا ہے تو خود نہیں جانا چاہتا بلکہ اس کی اولاد جانا چاہتی ہے۔ تو فرمایا کہ ہم نے اس کی اولاد کے لیے کشتیاں بنا دی ہیں کہ کشتیوں پر بیٹھیں، اپنی ضرورت پوری کریں اور واپس آجائیں۔ تو بندے کی جگہ بھی نہیں بدلتی اور ضرورتیں بھی پوری ہو جاتی ہیں۔

﴿وَحَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ﴾

اور صرف کشتیاں ہی نہیں بلکہ ہم نے کشتی کے مثل اور بھی بہت سی چیزیں بنائی ہیں جس پر یہ سوار ہوتے ہیں۔ اس سے مراد اونٹ ہے۔ ایک ہے سفینۃ البر خشکی کا جہاز مراد اونٹ ہے اور ایک ہے سفینۃ البحر پانی کا جہاز مراد کشتی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ہم نے ان جیسی چیزیں ان کو اور بھی دی ہیں جس پر یہ سواریاں کرتے ہیں۔ اللہ سب کو ان سواریوں کی نعمت عطا فرمائے۔ آمین

## سمندری نظام:

جب تک آپ کشتی یا بحری جہازوں پر سفر نہ کریں تو یقین کریں کہ اس وقت تک ان جیسی آیات کا مفہوم کھلتا نہیں ہے اور بندے کو سمجھ نہیں آتا کہ اللہ پاک کا یہ کیسا نظام ہے؟ اتنے بڑے بڑے جہاز کہ آپ کے تصور سے بھی ماوراء ہیں! ایک جہاز



جاتا ہے اس پر بیس ہزار کنٹینر ہوتے ہیں اور ایک کنٹینر میں کئی ٹن وزن ہوتا ہے، یہ جو ہمارا گاؤں ہے یہ چھوٹا ہے، اس گاؤں سے بھی بڑے جہاز ہوتے ہیں اور پانی پر تیر رہے ہوتے ہیں۔ بحری بیڑوں پر جنگی ہوائی جہازوں کے اڈے بنائے ہوئے ہوتے ہیں، اسی سے اڑتے ہیں اور اسی پر اترتے ہیں۔ اندازہ کریں وہ بحری بیڑا کتنا بڑا ہو گا؟ ایک جہاز جاتا ہے جس پر پانچ پانچ ہزار بندے سوار ہوتے ہیں، دو دو مہینے کا سفر ہوتا ہے، اس میں ان کی خوراک کی جگہ بھی ہے۔ ان کے غسل کی جگہ بھی ہے، ان کے پانی پینے کا انتظام بھی ہے اور اس کے علاوہ فٹ بال کھیلنے کے لیے گراؤنڈ بھی بنایا ہوتا ہے، یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، نہانے کے لیے جہاز پر سوئمنگ پول ہوتے ہیں۔ کیسا عجیب خدا کا نظام ہے؟ مجھے تو ان کے نام نہیں آتے۔ سفر تو میں کرتا ہوں۔ میں کئی بار ساتھیوں سے کہتا ہوں کہ تمہیں نام آتے ہیں لیکن تمہارے پاس یہ نعمتیں نہیں ہیں اور ہمیں نام نہیں آتے لیکن وہ نعمتیں مل جاتی ہیں۔

یہاں موٹر سائیکل پر چڑھتے ہیں اور سڑک پر دوڑاتے ہیں، اب سمندر پر چلنے کے لیے موٹر سائیکل بنے ہوئے ہیں، ایسے ترتیب سے بنے ہیں کہ بس بیٹھیں اور چلا دیں، بہت رفتار سے دوڑتے ہیں اور میں نے خود دوڑائے ہیں، ان کے سیکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی، بس چابی لگاؤریس دو اور چل پڑو! پھر اس کا نظام ایسا بنایا ہے کہ آپ جتنا بھی تیزی سے موٹریں وہ گرتا نہیں، پانی میں ڈوبنے کا خطرہ نہیں ہوتا کیونکہ لائف جیکٹ پہنا دیتے ہیں اور مزید پیچھے امداد والے پہنچ جاتے ہیں جو بندے کو ڈوبنے نہیں دیتے۔ یہ اللہ کا عجیب نظام ہے۔

**کفار کو انفاق کا حکم؟**

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالُوا الْيَدَيْنِ مَغْرُورًا ۖ وَاللَّذِينَ

أَسْنَوْا أَنْطَعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ ۖ﴾

جب ان کفار سے کہا جاتا ہے کہ جو خدا نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرو تو کافر لوگ ایمان والوں سے کہتے ہیں: اللہ چاہتے تو ان کو کھلا دیتے، ہمیں کیوں کہتے ہو کہ خرچ کرو۔ اس پر بظاہر اعتراض ہوتا ہے کہ کفار تو انفاق فی سبیل اللہ کے مکلف ہی نہیں ہیں تو انہیں مال خرچ کرنے کا حکم کیوں دیا جا رہا ہے؟ انفاق کا حکم تو ان کو ہونا چاہیے جو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے پابند ہوں!

اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کو جو انفاق کا حکم دیا جا رہا ہے یہ شریعت کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ مروت اور انسانی غیرت کی وجہ سے ہے۔ اگر کوئی مر رہا ہو تو ہم اس کو بچائیں گے کیونکہ ہم پابند ہیں، اگر نہیں بچائیں گے تو گناہ ہو گا۔ یہ ہم مسلمانوں کو اللہ کا حکم ہے اور کافر یہ تو نہیں سمجھتا کہ یہ اللہ کا حکم ہے لیکن مرنے والے کو بچانا انسانی ہمدردی ہے۔ تو انسانی ہمدردی میں کہا جاتا ہے کہ تمہیں خدا نے مال دیا ہے تو خرچ کیا کرو!

کافر یہ کہتے ہیں کہ اللہ چاہتا تو ان مساکین کو کھلاتا، ہم کیوں کھلائیں؟ تو اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ اللہ چاہتا تو تمہیں نہ دیتا، تمہیں بھی تو خدا نے دیا ہے تم نے کون سا اپنے پاس سے دینا ہے؟ اللہ کے دیے ہوئے میں سے تو دینا ہے، اور اللہ کا نظام جانور اور انسان کے لیے الگ ہے۔ جانور کو اللہ رزق بلا واسطہ دیتے ہیں اور انسان کو بالواسطہ دیتے ہیں۔ اگر انسان کو بلا واسطہ رزق ملتا تو انسانیت میں تمدن کا نظام ختم ہو جاتا۔ اس لیے بلا واسطہ نہیں بلکہ بالواسطہ ملتا ہے تو انسان میں تمدن کا نظام قائم رہتا ہے۔

میں ایک مثال دیتا ہوں سمجھانے کے لیے۔ یہاں طلبہ پڑھ رہے ہیں، ہر طالب علم کو براہ راست اللہ کھانا دیتا تو یہ مہتمم کو جوتے پر بھی نہ رکھتے، کہتے کہ ہم خود کھاتے ہیں، تمہارا ہمارے اوپر کیا احسان ہے؟ لیکن چونکہ اللہ رب العزت کھانا

مدرسے والوں کے واسطے سے دیتے ہیں تو مدرسے والے قانون بناتے ہیں کہ تم ایک ہفتہ لیٹ آؤ گے تو ہم بطور سزا تمہارا کھانا بند کر دیں گے تو اب یہ طالب علم وقت پر آئے گا کیونکہ کھانا بند ہو گا اور اگر کھانا براہ راست وقت پر ملتا تو یہ مدرسے کی انتظامیہ کی کیسے مانتا؟ کہتا کہ لیٹ جائیں گے پھر بھی کھانا ملنا ہے تو پابندی کی ضرورت کیا ہے؟! اس لیے بالواسطہ ملتا ہے تاکہ نظم اور تمدن قائم رہے۔

اگر اللہ تعالیٰ ہر بندے کو براہ راست رزق دیتے تو غریب اور امیر ختم ہو جاتا اور دنیا کا نظام ہی باقی نہ رہتا۔ اب امیر کے پاس پیسہ ہے اور غریب کے پاس ہنر ہے۔ وہ ہنر لگاتا ہے یہ پیسہ لگاتا ہے تو بلڈنگ تیار ہو جاتی ہے، وہ ہنر لگاتے ہیں امیر پیسہ لگاتا ہے تو کھانے پک جاتے ہیں، کپڑے تیار ہو جاتے ہیں، اللہ نے نظام ایسے بنایا ہے۔

### نسخ صور اور قبروں سے نکلنا:

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ﴾ ﴿٢١﴾

اور جب صور میں پھونک دیا جائے گا۔ ”الْأَجْدَاثِ“ یہ جڈٹ کی جمع ہے جس کا معنی قبر ہے۔ تو یہ قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف تیزی سے دوڑیں گے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ قبروں سے نکل کر تیزی سے دوڑیں گے۔ ایک اور آیت میں بھی اسی طرح ہے:

﴿يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَّاعًا﴾<sup>12</sup>

کہ یہ قبر سے نکل کر دوڑیں گے  
جبکہ ایک آیت میں ہے:

﴿فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ﴾<sup>13</sup>

یہ لوگ ہکے ہکے کھڑے ہو کر دیکھتے رہیں گے۔

بظاہر ان آیتوں میں تعارض ہے لیکن حقیقت میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ جب قبروں سے اٹھیں گے تو مٹی جھاڑتے ہوئے ہکے ہکے ہو کر کھڑے ہو جائیں گے کہ اب ہمارا کیا بنے گا؟ ہم کدھر جائیں؟ اور جب چیخ آئے گی اور ملائکہ دھکیلیں گے تو یہ محشر کی طرف دوڑیں گے۔ تو ﴿فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ﴾ پہلی حالت ہے اور ﴿يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا﴾ یہ آخری حالت ہے۔

﴿قَالُوا يَوْمَئِذٍ لَّنَا مِنْ بَعْثِنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا هَذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَنُ وَ

صَدَقَ الْمُرْسَلُونَ﴾

کہیں گے کہ ہمیں اس سونے کی جگہ سے کس نے اٹھا دیا ہے؟ ان سے کہا جائے گا کہ یہ اللہ وہ کا وعدہ ہے جو تمہارے ساتھ تھا اور جو پیغمبروں نے سچی بات کی تھی یہ وہ ہے۔

### نیند اور موت میں مناسبت:

قبر کو یہاں پر ”مرقد“ فرمایا سونے کی جگہ۔ اگر یہ آیت سمجھ میں آجائے تو پھر بندے کو موت بڑی آسانی سے سمجھ آ جاتی ہے۔ حدیث پاک میں جس طرح نیند پر موت کا اطلاق ہوا ہے اس طرح موت پر نیند کا اطلاق بھی ہوا ہے۔ جب آدمی سونے لگتا ہے تو دعا پڑھتا ہے ”اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ اَمُوتُ وَاُحْيٰی“<sup>14</sup> کہ اے اللہ! تیرے نام کے

ساتھ میں مرتا ہوں اور تیرے نام کے ساتھ زندہ ہوتا ہوں حالانکہ یہ سو رہا ہے تو اس کو تو یہ دعا پڑھنی چاہیے ”اللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ اَنَا اَمُوتُ وَ اَسْتَيْقِظُ“ کہ اللہ! تیرے نام کے ساتھ میں سوتا ہوں اور تیرے نام کے ساتھ اٹھتا ہوں... صبح جب اٹھتا ہے تو ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَاَنَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاٰلِيْهِ النُّشُوْرُ“<sup>15</sup> پڑھتا ہے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں موت کے بعد زندگی دی ہے حالانکہ اسے کہنا چاہیے ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَيَّقَطَنَا بَعْدَ مَا اَنَاَمَنَا“ کہ رات کو سلا یا تھا اور اب اٹھا دیا۔ تو ان احادیث میں نیند پر موت کا لفظ آیا ہے۔

اور حدیث پاک میں ہے کہ جب انسان کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں۔ ایک کا نام منکر اور دوسرے کا نام نکیر ہے۔ وہ اس میت سے سوال کرتے ہیں۔ ایک سوال یہ کرتے ہیں: ”مَا كُنْتَ تَقُولُ فِيْ هَذَا الرَّجْلِ؟“ تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تمہارا کیا نظریہ ہے؟ تو بندہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور رسول تھے۔ یہ ٹھیک جواب دے دیتا ہے تو قبر اس کے لیے وسیع کر دی جاتی ہے اور نور سے بھر دی جاتی ہے۔ پھر فرشتے اسے کہتے ہیں: ”نَمَّ كَنُومَةُ الْعَرُوسِ“ سو جا جس طرح پہلی رات کی دلہن سوتی ہے۔<sup>16</sup>

اب دیکھیں! موت ہے لیکن لفظ سونے کا لائے ہیں۔ تو جس طرح نیند پر موت کا لفظ آیا ہے اسی طرح حدیث میں موت پر نیند کا لفظ بھی آیا ہے۔ اس کا معنی یہ ہوا کہ موت سمجھ آتی ہے جب آدمی نیند سمجھ لے اور جب نیند سمجھ لے تو موت کا

15- صحیح البخاری، رقم: 6314

16- سنن الترمذی، رقم: 1071

سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

دیکھیں! آدمی سوتا ہے اور صبح اٹھ کر غسل خانے میں کھڑا ہوتا ہے۔ بھائی کیا ہوا؟ کہتا ہے کہ مجھ پر غسل واجب ہو گیا ہے، کیوں ہوا؟ اب یہ کہتا ہے کہ یار! مجھے بتاتے ہوئے شرم آتی ہے... فلاں لڑکی خواب میں آگئی تھی تو غسل واجب ہو گیا۔ اب کوئی بھی اس خواب دیکھنے والے کو جھوٹا نہیں کہتا کیونکہ یہ جو خواب میں عمل ہوا ہے یہ جسم کا نہیں بلکہ روح کا عمل ہے اور اس کے جو آثار ہیں وہ روح پر نہیں، روحانی عمل کے آثار جسم پر ہو رہے ہیں، کپڑے جسم نے پہنے ہیں روح نے نہیں، اب کپڑے ناپاک ہو گئے، بدن ناپاک ہو گیا، پھر یہ اپنے بدن اور کپڑوں کو دھو رہا ہے روح کو نہیں دھو رہا۔ اس کا معنی کہ نیند میں احوال براہ راست روح پر آتے ہیں اور اس کا اثر جسم پر ہوتا ہے۔ تو جب موت کو نیند فرمایا تو اس کا معنی یہ ہے کہ موت میں احوال براہ راست روح پر آتے ہیں اور اس کا اثر جسم پر ہوتا ہے۔

چونکہ ہم اس دنیا میں ہیں اور سونے والا اس دنیا میں ہے تو روح کے احوال کی وجہ سے جو جسم پر آثار آئے ہم اس کو دیکھ رہے ہیں اور مان بھی رہے ہیں لیکن موت کے بعد احوال روح پر ہیں اور اس کے آثار جسم پر ہیں وہ ہمیں نظر نہیں آرہے لیکن مان پھر بھی رہے ہیں۔ وہ نظر کیوں نہیں آرہے؟ کیونکہ ان کے احوال اور آثار برزخ یعنی پردے میں ہیں، تو پردے کے نیچے والی چیز نظر نہیں آتی لیکن مانتے پھر بھی ہیں۔

آپ ڈاکٹر کے پاس جائیں اور امی ساتھ ہوں اور امی نے پورا برقعہ پہنا ہو تو آپ ڈاکٹر صاحب سے کہتے ہیں: ڈاکٹر صاحب! یہ میری امی ہے، اسے چیک کریں۔ اب ڈاکٹر صاحب کو برقع تو نظر آرہا ہے لیکن اس میں امی نظر نہیں آرہی لیکن مان پھر بھی رہا ہے کہ آپ کی امی ہے یعنی جو پردے میں ہے وہ نظر نہیں آتا لیکن ہوتا ضرور

ہے، اسی طرح برزخ کا معاملہ ہے، اس میں جو احوال ہوتے ہیں وہ نظر نہیں آتے لیکن ہوتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر کیوں مانتا ہے کہ پردے میں امی ہے اس لیے کہ وہ جب نبض چیک کرتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ امی ہے، جب وہ بخار چیک کرنے کے لیے منہ میں تھرمامیٹر رکھتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ امی ہے، دھڑکن چیک کرنے کے لیے آلہ لگاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ امی ہے اور برزخ میں جو احوال ہیں ہم دیکھنا چاہیں تب بھی نہیں دیکھ سکتے لیکن مانتے پھر بھی ہیں کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

نیند سمجھ آئے تو پھر موت سمجھ آتی ہے۔ آپ سوئے ہوئے ہیں آپ کے ساتھ ایک بندہ سویا ہے، وہ ڈر کے اٹھ جاتا ہے، آپ نے پوچھا کیا ہوا؟ کہتا ہے کہ مجھے سانپ نے ڈسا ہے یا مجھے کتے نے کاٹا ہے، اب اسے کوئی بھی نہیں کہتا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں! حالانکہ وہاں اس کے پاس کوئی سانپ نہیں ہوتا کوئی کتا نہیں ہوتا، آپ اس کو جھوٹا کیوں نہیں کہہ رہے کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ یہ جو سانپ اور کتا ہے یہ جسم کے ساتھ نہیں ہے بلکہ روح کے ساتھ ہے اور اس کے آثار جسم پر ظاہر ہو رہے ہیں، جسم گھبرا جاتا ہے، جسم ڈر جاتا ہے، بندے کا پسینہ چھوٹ جاتا ہے، پیاس لگ جاتی ہے۔ اب بالکل اسی طرح قبر والے بندے کو سانپ ڈس رہا ہوتا ہے، فرشتے گزر مار رہے ہوتے ہیں اور ہمیں پتا نہیں چلتا، کیوں پتا نہیں چلتا؟ اس لیے کہ وہ برزخ میں ہے۔

سونے والا دنیا میں ہے اس کی روح کے احوال کا بھی پتا نہیں چلتا اور مرنے والا برزخ میں ہے اس کے احوال کا بھی پتا نہیں چلتا لیکن یہ سونے والے کے احوال آپ کیوں مان رہے ہیں اس لیے کہ آپ ان احوال سے خود گزر رہے ہوتے ہیں اور برزخ والے کے احوال ہیں لیکن ہم ان سے گزرے نہیں ہیں مگر مانتے پھر بھی ہیں کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اب احوال کے جو آثار اور نتائج ہیں دنیا میں وہ نظر آتے ہیں جسم پر اور موت کے بعد روح کے احوال اور اس کے جو

آثار ہیں وہ نظر نہیں آتے، مانتے پھر بھی ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

اب دیکھو! ﴿يُؤَيِّلْنَا مَنْ بَعَثْنَا مِنْ مَرْقَدِنَا﴾ ہمیں اس سونے کی جگہ سے کس نے اٹھایا؟ اور سورۃ الکہف میں ہے ﴿وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ﴾<sup>17</sup> اصحاب کہف کو تم سمجھ رہے ہو کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔ رَقَدَ، يَزِقُّدُ، رُقُودًا کا معنی سونا ہوتا ہے۔ آپ کوئی قبر دیکھ لو، منکرین حیات کے جو بانی ہیں ان کی قبر پر جا کر دیکھ لیں وہاں بھی مرقد لکھا ہوا ہے۔ سب مرقد مبارک لکھتے ہیں۔ ہر بندہ سمجھتا ہے کہ یہ مرقد یعنی سونے کی جگہ ہے۔ تو بتاؤ! سونے والا زندہ ہوتا ہے یا مردہ؟ زندہ، تو پھر وہ زندہ ہوئے یا مردہ؟ زندہ!

### قبر کے سوالات امتی سے ہوں گے، نبی سے نہیں:

میں اگلی بات کہنے لگا ہوں۔ روح نکل جاتی ہے پھر لوٹتی ہے پھر تین سوال ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا تعلق امتی سے ہے ان کا نبی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نبی سے قبر میں سوالات نہیں ہوتے بلکہ یہ صرف امتی سے ہوتے ہیں۔ امتی جب جواب دیتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے: ”نعم“ سو جا! نبی سے نہ سوال ہے نہ جواب اور نہ ہی سونے کا حکم ہے۔ تو امتی ایسے ہے جیسے سویا ہوا ہے اور نبی ایسے ہے جیسے جاگ رہا ہے۔ سونے والے کے سماع میں اختلاف ہوتا ہے کہ سنتا ہے یا نہیں لیکن جاگنے والے کے سماع میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ اس لیے عام اموات کے سماع میں اختلاف ہے صحابہ کا کہ سنتے ہیں یا نہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کا اختلاف نہیں، پوری امت کا اتفاق ہے کہ وہ سنتے ہیں کیونکہ سونے اور جاگنے والے میں فرق ہوتا ہے۔



ہمارے یہ حضرات بہت زور لگاتے ہیں کہ ”سویا مویا ہکو جیا“ [سونے اور مرنے والا ایک جیسا ہوتا ہے] میں نے کہا: اگر ”ہکو جیا“ ہے یعنی ایک جیسا ہے تو ہم پھر بھی ماننے کے لیے تیار ہیں کہ سونے والا اور مرنے والا ایک جیسا ہے لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ جب آدمی سوئے اور چار بجے کا الارم لگا دے، پھر الارم بجے اور بندہ اٹھ جائے تو سوال یہ ہے کہ اس نے سنا ہے پھر اٹھا ہے یا اٹھا ہے پھر سنا ہے؟ سنا ہے پھر اٹھا ہے نا، اس کا معنی یہ ہوا کہ سونے والا سنتا ہے۔

میں نے کہا: تمہارے مدارس میں جب طلبہ سوتے ہیں، تم ان کو نماز کے لیے اٹھاتے ہو تو وہ تمہاری آواز سن کر اٹھتے ہیں یا اٹھ کر آواز سنتے ہیں؟ کہا جی سن کر اٹھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر اس کا معنی ہے کہ تم بھی ماننے ہو کہ سونے والا سنتا ہے اور ہم بھی ماننے ہیں کہ سونے والا سنتا ہے۔

### دو موتوں اور دو حیاتوں کا صحیح مفہوم:

کہتے ہیں: جی قرآن میں ہے: ﴿اٰمَتْنٰ اٰثْنَتَيْنِ وَاٰحْيَيْنٰ اٰثْنَتَيْنِ﴾<sup>18</sup> کہ دو موتیں اور دو حیاتیں ہیں، تو یہ قبر والی حیات کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ ﴿يُوَلِّدْنَا مَنْ بَعَثْنَا مِنْ مَرْقَدِنَا﴾ یہ بھی تو نص ہے، یہ قرآن تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ قیامت کو اٹھ کر کہے گا کہ ہمیں سونے کی جگہ سے کس نے اٹھایا ہے! قبر کی جگہ کو قرآن سونے کی جگہ کہتا ہے، یہ بھی تو آیت ہے نا! پھر آیات کے، معانی ایسے بیان کرو کہ آیات میں تعارض اور ٹکراؤ ختم ہو جائے۔

دو موتیں اور دو حیاتیں... اس میں بھی کوئی اشکال نہیں ہے۔ جب یہ آیت آئے گی تو پھر اس پر بات کریں گے۔ مختصراً سمجھ لیں کہ ایک ہوتی ہے کھلی حیات اور

ایک ہوتی ہے چھپی حیات، اسی طرح ایک ہوتی ہے کھلی موت اور ایک ہوتی ہے چھپی موت۔ ماں کے پیٹ میں موت ہے روح جو نہیں ہے، پھر روح آئی تو حیات آگئی ہے اور آدمی زندہ ہو گیا۔ پھر دنیا میں آنے کے بعد بندے پر موت آئی، یہ بندے پر دوسری موت ہے، ایک موت آپچی اور اب یہ دوسری موت ہے، اور ایک حیات قیامت کے دن ملے گی جو کھلی حیات ہوگی۔ اب قبر میں پھر حیات ملی ہے، یہ حیات کھلی ہے یا چھپی ہے؟ یہ چھپی حیات ہے۔ تو یہ جو کہتے ہیں کہ دو موتیں اور دوزندگیاں تو یہ دو موتیں اور دوزندگیاں وہ ہیں جو ہر بندہ دیکھتا ہے اور قبر کی حیات ہے لیکن چھپی ہے، اس لیے یہ نظر نہیں آتی۔ اس لیے اس پر اشکال نہیں کرنا چاہیے۔

**”دلہن کی طرح سو جا!“ یہ عجیب نکتہ:**

﴿يُؤَيِّلِنَا مِنْ بَعَثِنَا مِنْ مَرْقَدِنَا﴾

اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرشتہ کہتا ہے ”نَحْمُ“ سو جا! اور آگے اضافہ فرمایا: ”كَتَوَمَةِ الْعُرْوِيسَ“ کہ پہلی رات کی دلہن کی طرح سو جا! الفاظِ نبوت پہ غور کرنا! صرف یہ نہیں فرمایا کہ سو جا بلکہ دلہن کی طرح سو جا، یہ دلہن کا لفظ کیوں لائے؟ یہ بات سمجھانے کے لیے کہ کوئی لڑکی کسی لڑکے کو چاہتی ہے لیکن میسج نہیں کر سکتی خاندان کا مسئلہ ہے، قبیلہ ہے، بغاوت نہیں کر سکتی، اللہ سے بھی ڈرتی ہے، یہ گناہ ہے خوف کھاتی ہے لیکن یہی لڑکی کلمہ نکاح کے ساتھ دلہن بن کر کمرے میں آ جائے تو جس خاندان کا ڈر تھا وہ باہر کھڑے ہیں، اب اس کو ڈر نہیں ہے، پہلے میسج فون کا ڈر تھا، اب بغل میں بغل ڈال کر سوئی ہے کوئی ڈر نہیں ہے، کیونکہ کلمہ نکاح کے ساتھ آئی ہے۔ بالکل اسی طرح قبر ظلمت کا گھر ہے، کیڑوں کا گھر ہے، وحشت کا گھر ہے، عذاب کا گھر ہے اور جب بندہ کلمہ ایمان کے ساتھ آ جائے تو اب کوئی ڈر نہیں ہے اور یہ بات دلہن کے لفظ کے بغیر سمجھ نہیں آ سکتی تھی۔

میں اس لیے طلبہ سے کہتا ہوں کہ اس کو پہلے خود سمجھو پھر آگے سمجھاؤ! جب تم سمجھو گے نہیں تو عوام میں بیان کیسے کرو گے؟ تم نے پھر جھجکنا ہے، ڈرنا ہے، گھبرانا ہے کہ میں اس کا جواب کیا دوں گا! اس لیے اس کو خوب سمجھو!

### پہلی رات دلہن سوتی بھی ہے؟

میں نے بتایا تھا کہ مجھے ایک جگہ سبق کے بعد طلبہ نے چٹ دی کہ استاد جی! پہلی رات دلہن سوتی بھی ہے؟ میں نے کہا کہ سوال تو آپ کا ٹھیک ہے۔ اس کا جواب ذہن میں رکھ لیں کہ جب اس قبر والے سے سوال ہوتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے، تیرا نبی کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ یہ جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، میرا نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے، میرا دین اسلام ہے، تو اس کے ذمے جو کام تھا وہ پورا ہو گیا تو فرمایا کہ اب سو جا! اور دلہن کے ذمہ جو کام ہوتا ہے جب وہ پورا ہو جائے تو وہ بھی سو جاتی ہے اور ایسے سکون سے سوتی ہے کہ بس وہ دلہا جانتا ہے یا دلہن جانتی ہے!

### جنت کی نعمتوں کا حال:

﴿إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغْلٍ فَاكِهُونَ﴾ (35) هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلِّ عَلَى الْأَرْبَابِ مُتَكِنُونَ ﴿36﴾ لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُمْ مَّا يَدَّعُونَ ﴿37﴾

جنت میں نہ نماز ہوگی، نہ روزہ ہوگا، نہ نیند ہوگی۔ پھر اللہ ان کی مشغولیت پھل بنادیں گے، پھل شوق سے کھاؤ، بیوی کو دیکھیں گے اور بیوی کے ساتھ معافہ کریں گے، ستر سال گزر جائیں گے سینہ سے سینہ لگا کر کھڑے ہیں، ہبستری شروع کریں گے تو پانچ سو سال گزر جائیں گے۔ یہاں پانچ سو سال بڑی مدت ہے لیکن وہاں پانچ سو سال کوئی مدت نہیں ہوگی کیونکہ ابدی زندگی ہے۔ یہ خوشیاں تمہاری منتظر ہیں، اس دنیا کی غلاظت پر لعنت بھیج دو پھر دیکھو حلال خوشیوں میں مزا کتنا آتا ہے۔ اللہ

رب العزت نے ان نعمتوں کا تذکرہ کیوں کیا ہے؟ اس لیے کیا ہے کہ لوگوں کو سمجھاؤ، رغبت دلاؤ۔ ہم اس کو بیان کرتے ہوئے شرماتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے! اللہ نے قرآن میں بیان کیا ہے کہ ان کو سمجھاؤ، ان گندگیوں سے ان کی جان چھڑاؤ، پاکدامن عورتوں کی بات کرو۔ بیٹا! اس لعنت سے بچو اس حسن کو دیکھو، یہ سونا چھوڑ دو ہاں کے کنگن پہنو، یہ بات سمجھاؤ جو انوں کو، تم ایک سو کو سمجھاؤ گے تو دس تمہارے ساتھ چل پڑیں گے اور عفت اور پاکدامنی کی زندگی گزاریں گے! لیکن یہ ضروری ہے کہ سمجھانے والے پر حال طاری ہو صرف قال نہ ہو!

﴿إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغْلٍ فَاكِهُونَ ۖ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي

ظِلِّ عَلَى الْأَرْآئِكِ مُتَكِنُونَ ۖ﴾

سبحان اللہ! شوہر ہے اور ساتھ بیویاں ہیں، تکیے لگے ہوئے ہیں، سایہ بنا ہوا ہے اور گپ شپ کر رہے ہیں، اس گپ شپ پر اللہ بھی کتنے خوش ہو رہے ہوں گے! اللہ کی قسم! میں تمہیں جنس کی دعوت نہیں دیتا، میں کہتا ہوں کہ جنت کی نعمتوں کو سوچو! ﴿لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُمْ مَّا يَدَّعُونَ﴾ وہاں ان کے لیے میوے ہوں گے اور ہر وہ چیز ملے گی جو وہ منگوائیں گے۔ یہاں ”وَلَهُمْ مَّا يَسْتَلُونَ“ نہیں فرمایا کہ جس چیز کا سوال کریں گے وہ انہیں ملے گی بلکہ ﴿لَهُمْ مَّا يَدَّعُونَ﴾ فرمایا، يدعون کا لفظ دعوت سے ہے، سوال سے جو چیز ملتی ہے اس کو دعوت نہیں کہتے بلکہ جو بغیر سوال کے ملے اس کو دعوت کہتے ہیں۔ اللہ لفظ ”يَسْتَلُونَ“ کے بجائے ”يَدَّعُونَ“ لائے ہیں۔ یہ جو پھل ہوں گے یہ جو بیویاں ہوں گی یہ جو تخت ہوں گے یہ خدا کی طرف سے تمہاری لیے دعوت ہوگی۔ ﴿لَهُمْ مَّا يَدَّعُونَ﴾ کا معنی بعض نے کیا ہے کہ ”جو وہ مانگیں گے“ لیکن ہم اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ ”جو وہ چاہیں گے“۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:  
اللہ! ہم جنت اس وجہ سے نہیں مانگتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں، اس وجہ سے مانگتے ہیں  
کہ ہم جہنم کو برداشت نہیں کر سکتے، بس اللہ! ہمیں جنت عطا فرمادے۔

**اللہ کی طرف سے سلام:**

﴿سَلِّمْ قَوْلًا مِّن رَّبِّ رَحِيمٍ﴾ (۵۸)

رب رحیم کی طرف سے سلام کہا جائے گا۔

دنیا میں اگر ہمیں کوئی کہے کہ آپ کو فلاں بزرگ کی طرف سے سلام آیا ہے، آپ کو فلاں صاحب نے سلام کہا ہے تو بندے کو خوشی ہوتی ہے، لیکن جنت میں جب اللہ سلام کریں گے تو بندے پر کیا کیفیت طاری ہوگی کہ اللہ نے مجھے سلام کیا ہے، کتنا مزہ آئے گا؟ ہماری درس گاہ میں کوئی بزرگ آئیں اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہیں، ہمیں سلام کریں تو دل خوش ہو جاتا ہے اور جنت میں اللہ سلام کریں گے تو جنت کا کیسا پیارا منظر ہوگا؟

**مجرمو! الگ ہو جاؤ!**

﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ﴾ (۵۹)

ساتھ یہ بھی اعلان ہو گا کہ جو مجرم ہیں وہ الگ ہو جائیں۔ حشر میں مجرم الگ ہو جائیں، غیر مجرم الگ ہو جائیں۔ اللہ ہمیں ان مجرموں میں سے نہ بنائیں۔ آمین

**قیامت کے دن زبان پر مہر لگنے کا مطلب:**

﴿الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ

بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (۶۰)

آج کے دن ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے، ان کے ہاتھ بولیں گے اور ان

کے پاؤں گواہی دیں گے کہ وہ کیا کرتے تھے؟! اللہ ہمیں اس منظر سے بچائے، اللہ میری اور آپ سب کی حفاظت فرمائے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منہ پر مہر لگائی جائی گی اور ہاتھ پاؤں بولیں گے حالانکہ قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ پر ہے:

﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾<sup>19</sup>

ان کے خلاف قیامت کے دن ان کی زبان بھی بولے گی، ہاتھ بھی بولیں گے اور پاؤں بھی گواہی دیں گے کہ وہ کیا عمل کرتے تھے۔

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان پر مہر لگے گی اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان بولے گی۔ تو بظاہر دونوں آیات میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ مہر لگانے کا معنی یہ نہیں ہے کہ منہ کو بند کر دیا جائے گا اور زبان بول نہیں سکے گی بلکہ مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ منہ کو پابند کیا جائے گا کہ وہ اپنی مرضی سے نہیں بولے گا بلکہ وہ بولے گا جو خدا چاہے گا۔ اب زبان بولے گی کہ میں نے گناہ کیا تھا۔ یہ معنی ہے مہر لگانے کا۔

**حضور علیہ السلام کو شعر کی تعلیم نہیں دی گئی:**

﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُبِينٌ﴾<sup>20</sup> لِيُنذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٢٠﴾

ہم نے پیغمبر کو شعر کا علم نہیں دیا اور نہ ہی شاعری پیغمبر کی شان کے لائق

ہے، یہ تو نصیحت کی بات ہے اور نہایت واضح قرآن ہے تاکہ آپ ڈرائیں اس کو جو زندہ ہے، - ”حَیًّا“ سے مراد جس کا دل زندہ ہے ورنہ زندہ تو سارے ہی ہوتے ہیں۔ اور کافروں پر یہ بات ثابت ہو جائے کہ پیغمبر نے سنایا تھا!

میں پہلے بھی یہ بات سمجھا چکا ہوں کہ یہاں اشکال یہ ہے کہ کفار پیغمبر پر اعتراض کرتے تھے کہ یہ شاعر ہے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کو شعر سکھایا ہی نہیں تو سوال یہ ہے کہ کفار نے کیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہا اور کیسے اس قرآن کو شعر کہتے تھے کہ یہ شاعر کی باتیں ہیں؟! بلکہ حدیث پاک میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابنِ طرفہ کا شعر پڑھا۔ شعر یہ ہے:

سَتُبْدِي لَكَ الْآيَاتُ مَا كُنْتَ جَاهِلًا  
وَيَأْتِيكَ بِالْأَخْبَارِ مَنْ لَمْ تَزِدْ

یعنی جن باتوں کا تم کو علم نہیں ہے وقت آنے پر تمہیں سمجھ آ جائے گی اور تمہارے پاس وہ بندہ خبر لائے گا جس کو تم نے خبر لانے کے لیے مقرر نہیں کیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر پڑھا تو آپ نے یوں پڑھا:

سَتُبْدِي لَكَ الْآيَاتُ مَا كُنْتَ جَاهِلًا  
وَيَأْتِيكَ مَنْ لَمْ تَزِدْ بِالْأَخْبَارِ

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: حضور! یہ شعر ایسے نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں شاعر نہیں ہوں اور شاعری میرے مناسب بھی نہیں ہے۔

تو سوال یہ ہے کہ پھر کفار کیسے کہتے رہے کہ یہ شاعر ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں شبہ اس لیے ہوا کہ کفار جو کہتے تھے کہ یہ شاعر ہیں اور یہ قرآن شاعر کی باتیں ہیں اس سے ہم یہ سمجھے کہ شاعر کہتے ہیں مسجع اور مقفی کلام کہنے والے کو حالانکہ

وہاں شاعر کا معنی صرف یہ نہیں ہے، لغت عرب میں شعر کا ایک معنی ہوتا ہے ایسی بات جو فرضی ہو، خیالی ہو اور غیر تحقیقی ہو اور شاعر کہتے تھے جو خیالی اور فرضی باتیں کرے۔ تو عرب کے اس ماحول میں شاعر کا معنی یہ ہے کہ یہ خیالی باتیں کرتا ہے، فرضی باتیں کرتا ہے۔ العیاذ باللہ۔ من گھڑت باتیں کرتا ہے جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ﴾ کا ترجمہ یہ کیا ہے ”ہم نے آپ کو شاعری یعنی خیالی مضامین مرتب کرنے کا علم نہیں دیا۔“<sup>20</sup> دیکھیں! بیان القرآن سے سب اشکال ختم ہو گئے اور میں پھر آپ سے کہتا ہوں یہ مسئلہ درس گاہ میں آپ نے سمجھا ہو گا تو بیان القرآن سمجھ میں آئے گا ورنہ آپ کو بیان القرآن پر بھی اشکال ہو جانا ہے کہ حضرت تھانوی نے ترجمہ ٹھیک نہیں کیا!

### عاص بن وائل کی حماقت:

﴿أَوَلَمْ يَرِ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ﴾

سورۃ یس کی یہ آخری پانچ آیات ایک واقعہ میں نازل ہوئیں۔ مکہ مکرمہ میں عاص بن وائل ایک مشرک تھا۔ اس نے ایک بوسیدہ ہڈی لی، اس کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ پھر اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: کیا قیامت کے دن اللہ اس کو زندہ کرے گا جس کا یہ حال ہو رہا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، اللہ تمہیں موت دے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا اور پھر جہنم رسید کرے گا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں ﴿أَوَلَمْ يَرِ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ

مُبِينٌ﴾



کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے ایک نطفے سے بنایا ہے، پھر وہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے لگتا ہے، ﴿وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا﴾ اور یہ ہمارے بارے میں مثالیں بیان کرنے لگا۔ ہڈیاں اٹھا اٹھا کر مثالیں دیتا پھرتا ہے۔ ﴿وَنَسِيَ خَلْقَهُ﴾ اور اپنی پیدائش کو بھول گیا ہے، ﴿قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ﴾ اور پھر کہتا ہے کہ ان ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ جب یہ بوسیدہ ہوں گی، آپ فرمائیں ﴿يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ جس خدا نے پہلے پیدا کیا ہے وہی دوبارہ پیدا کرے گا، ﴿وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ﴾ اور اس کو پتا ہے کہ میں نے کس کو کیسے پیدا کرنا ہے! ﴿الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِنْهُ تُوقَدُونَ﴾ وہی ہے جس نے سبز درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کر دی ہے جس سے تم آگ جلا لیتے ہو۔

عرب میں دو درخت تھے، ایک کا نام تھا مرخ" اور ایک کا نام تھا عفار، دونوں کی سبز ٹہنیاں ہوتیں، ٹہنی پر ٹہنی مارتے تو آگ جلتی۔ اللہ فرماتے ہیں تم دیکھتے ہو کہ سبز درخت ہے اور اس سے آگ جلتی ہے، تم اس کو سلگاتے ہو ماچس کی طرح اور تم بعثت کا انکار کرتے ہو، بتاؤ سبز درخت اور آگ میں کیا جوڑ ہے؟ وہ اللہ جو سبز درختوں سے آگ کو پیدا کرتا ہے اس کے لیے بوسیدہ ہڈی سے دوبارہ پیدا کام کرنا کیا مشکل ہے؟ ﴿أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَدِيرٍ عَلَى أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ﴾ کیا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں کہ ان جیسا دوبارہ پیدا کر دے؟ کیوں نہیں! وہ بڑا پیدا کرنے والا اور خوب جاننے والا ہے، ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ اس کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو فرماتا ہے کہ

ہو جا، وہ چیز ہو جاتی ہے۔

## جنت چھوٹی خدائی کا نام ہے:

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جنت چھوٹی خدائی کا نام ہے کیونکہ ﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهَى أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ﴾<sup>21</sup> جنت میں جو چاہو گے وہ ملے گا، جو بولو گے وہ ملے گا، اور خدائی کیا ہے؟ ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ جنت کو چھوٹی خدائی کیوں فرمایا؟ اس لیے کہ اس میں یہ سارے اختیارات اللہ کی طرف سے ہیں، اللہ چاہیں تو دے دیں چاہیں تو چھین لیں، یہ بڑی خدائی تو نہیں ہے، تو فرمایا کہ چھوٹی خدائی اللہ دے گا۔ اور یہ حکمت سمجھنا! دنیا میں بندہ وہ کرے جو اللہ چاہتا ہے تو جنت میں وہ ہو گا جو بندہ چاہے گا!

## ”كُنْ فَيَكُونُ“ کا معنی:

﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾<sup>(۱۷)</sup>

اس کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو فرماتا ہے کہ ہو جا، وہ چیز ہو جاتی ہے۔ اس پر ایک اعتراض ہوتا ہے کہ اگر اللہ کے ”كُنْ“ فرمانے سے چیز ہو جاتی ہے تو پھر بچہ نوماد بعد کیوں پیدا ہوتا ہے، فوراً کیوں نہیں پیدا ہوتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ یہ جو فرماتے ہیں ”كُنْ“ کہ ہو جا، تو کتنے وقت میں ہو جا؟ یہ مقدر ہوتا ہے، یہ ہمارے علم میں نہیں بلکہ اللہ کے علم میں ہے، پھر ”فَيَكُونُ“ میں وہ وقت مخفی ہوتا ہے جو اللہ نے ”كُنْ“ کے اندر مقدر رکھا ہے۔ مثلاً

میں کہتا ہوں کہ پانی لاؤ! اب اس کا کیا معنی ہے کہ ایک سیکنڈ میں لاؤ؟ مجھے پتا ہے کہ ”پانی لاؤ!“ کا معنی ہے کہ اتنی دیر میں لاؤ! تو پانی لاؤ! میں وہ وقت مخفی ہوتا ہے کہ یہ اتنی ہی دیر میں لائے گا۔ ہم کہتے ہیں: بھائی دکان سے مٹھائی لاؤ! اب اس کا معنی یہ نہیں کہ فوراً حاضر کرو بلکہ اس کا معنی ہے کہ جاؤ اور لاؤ! اور کتنا وقت لگتا ہے؟ یہ لفظ ”لاؤ“ میں موجود ہے۔ تو اللہ جب بچے کی پیدائش کا حکم دیتے ہیں تو ”کن“ فرماتے ہیں کہ ہو جا تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ نوماء میں ہو جا، یہ نوماء میں ہو جا کا حکم مخفی ہے فیکون کہیں تو نوماء خود بخود آ جاتے ہیں۔

﴿فَسُبْحَنَّ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾

پاک ہے وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں ہر چیز کی بادشاہت ہے اور تم سب نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الصّٰفّٰت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا ۝۱﴾ فَالزّٰجِرِ زَجْرًا ۝۲﴾ فَالْثَلٰثِیۡتِ ذُكْرًا ۝۳﴾ اِنَّ

اِلٰهَکُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا وَ رَبُّ الْمَشَارِقِ ۝۵﴾

### فرشتوں کی قسمیں:

اللہ رب العزت نے ابتداءً تین قسمیں کھائی ہیں۔ قسم ہے ان فرشتوں کی جو صفیں باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں۔ یعنی شیاطین جب عالم بالا کی طرف جانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ فرشتے ان کو روکتے ہیں۔ اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو تلاوت کرتے ہیں ذکر کی۔

### قسمیں کھانے کی وجہ:

یہاں ایک سوال ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے ملائکہ اور فرشتوں کی قسمیں کھائی ہیں کہ ”وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا“... ملائکہ مخلوق ہیں، خالق نہیں ہیں، مخلوق کی قسم کھانا جائز نہیں ہے تو پھر اللہ رب العزت نے ان کی قسم کیوں اٹھائی ہے؟

اس کا آسان جواب یہ ہے: ﴿لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ﴾<sup>22</sup> احکام کے مکلف بندے ہیں اللہ نہیں ہے، کس کی قسم کھانی ہے اور کس کی نہیں کھانی ان احکامات کے بندے پابند ہیں اللہ نہیں، اللہ تعالیٰ جو چاہیں انہیں کوئی نہیں پوچھ سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ مخلوقات میں سے جس مخلوق کی قسم کھاتے ہیں اس کی خاص وجہ ہوتی ہے، بسا اوقات اس مخلوق کی عظمت بتانا مقصود ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿لَعَنَّاكَ اِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾<sup>23</sup>

یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک کی قسم کھائی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بتانے کے لیے۔ اسی طرح بسا اوقات کسی چیز کی قسم کھائی جاتی ہے اس کے فوائد بتانے کے لیے جیسے ﴿وَالَّتَيْنِ وَ الرَّيْتُونَ﴾<sup>24</sup> و طُورِ سِينِينَ ﴿﴾ تو کسی بھی جگہ قسم کھانے کی خاص وجہ ہوتی ہے۔

یہاں ملائکہ کی قسم کیوں کھائی ہے؟ اس لیے کہ مشرکین مکہ میں سے ایک خاص طبقہ تھا جو ملائکہ کی عبادت کرتا تھا۔ تو اللہ نے ملائکہ کی قسم کھائی ہے کہ جس کی تم عبادت کرتے ہو یہ تو خود عابدین ہیں، عبادت کرتے ہیں تو عابد کو معبود بنانے کا کیا معنی ہے؟! اس لیے یہاں ملائکہ کی قسمیں کھائی ہیں۔

**نظم وضبط کی اہمیت:**

آپ کو یاد ہو گا میں حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ ذکر کر چکا ہوں ﴿اِنْ

22۔ الانبیاء 21:23

23۔ الحجر 15:72

24۔ التین 95:1،2

اعْمَلْ سَبْعًا وَقَدِّرْ فِي السَّرِّ ﴿٢٥﴾ کے تحت کہ حضرت داؤد علیہ السلام ایک خاص انداز سے خود کی کڑیاں بناتے تھے، چھوٹی بڑی نہیں بلکہ ترتیب سے... اس سے ثابت ہوا کہ شریعت میں نظم پسندیدہ ہے۔ اب یہاں فرمایا: ﴿وَالصَّغْتِ صَفًّا﴾ صف بندی کے ساتھ عبادت کرنا یہ نظم ہے۔ تو اللہ رب العزت کو نظم پسند ہے، اس لیے بے نظمی کبھی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ اور یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا، یہ مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے بھی لکھی ہے۔ اگر ملائکہ عبادت اس طرح کریں کہ دو کہیں ہوں، چار کہیں ہوں، پانچ کہیں ہوں، دس کہیں ہوں عبادت ہو تو سکتی ہے لیکن نظم وضبط کے بغیر ہوگی، اس لیے ملائکہ سے بھی صف بندی کے اہتمام کے ساتھ عبادت مطلوب ہے۔<sup>26</sup>

اور ایک حدیث مبارک میں بھی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ملائکہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو صف باندھ کر کرتے ہیں، صف میں قریب قریب کھڑے ہوتے ہیں۔<sup>27</sup>

تو ہمیں بھی حکم ہے کہ نماز میں صف سیدھی رکھیں، قریب قریب کھڑے ہوں، اس کا بہت زیادہ خیال کریں۔ جب عبادات میں نظم مطلوب ہے تو بتائیں باقی معاملات میں کیسے نہیں ہوگا؟ اس لیے نظم کا مزاج بنائیں۔

**اللہ کی بادشاہت کا بیان:**

﴿إِنَّ إِلَهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۖ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَ

25- سہا: 11:34

26- معارف القرآن ج 7 ص 417

27- صحیح مسلم، رقم: 430

## رَبُّ الْمَشَارِقِ ﴿٦٩﴾

تسمیں کھانے کے بعد فرمایا: تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے جو آسمانوں کا بھی رب ہے اور زمین کا بھی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کا بھی رب ہے اور مشرقوں کا بھی رب ہے۔ سورج ہر روز ایک نئی جگہ سے نکلتا ہے، طلوع ہونے کی جگہ کو مشرق کہتے ہیں، چونکہ سورج سال بھر میں ہر دن ایک نئی جگہ سے طلوع ہوتا ہے اس لیے فرمایا کہ ﴿رَبُّ الْمَشَارِقِ﴾ اللہ مشرق کے رب ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے کہ اللہ مشرقین اور مغربین کے بھی رب ہیں۔

**ستارے؛ زینت اور حفاظت کا ذریعہ:**

﴿إِنَّا زَيْنَا السَّمَاءِ الدُّنْيَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ ﴿٧٠﴾ وَحِفْظًا مِّنْ

كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ﴿٧١﴾﴾

ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کے ساتھ مزین کیا اور ہر سرکش شیطان سے اس کی حفاظت کی۔

یہاں ملائکہ کے تذکرے کے بعد شیاطین کی بات کی ہے اور بطور خاص کواکب کی بات کی ہے کہ جنات کو جب یہ کواکب لگتے ہیں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ پہلے شیاطین اوپر جا کر عالم بالا کی خبریں سنتے تھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد ان کو آسمان پر جانے سے روک دیا گیا۔ اگر یہ کوشش بھی کرتے ہیں تو شہابِ ثاقب کے لگنے سے دوڑ جاتے ہیں اور اوپر تک نہیں جاسکتے، اگر وہ باتیں سننا بھی چاہیں تب بھی نہیں سن سکتے۔

**جنتیوں کا رزق یقینی اور دائمی ہے:**

﴿أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ﴿٧٢﴾ فَوَاقِهِ ؕ وَهُمْ مُّكْرَمُونَ ﴿٧٣﴾﴾

## جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿۳۳﴾ عَلَى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿۳۴﴾

یہی وہ لوگ ہیں جن کا رزق مقرر کر دیا گیا ہے، میوؤں کے ذریعے ان کا اکرام کیا جائے گا، نعمتوں والے باغات میں، تخت لگا کر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

جنتیوں کو رزق معلوم ملے گا جو یقینی اور دائمی ہے، ﴿رِزْقٌ مَّعْلُومٌ﴾ اس لیے فرمایا کہ جنت کے رزق میں ہلکا سا بھی شبہ نہیں کہ شاید ملے یا نہ ملے بلکہ یقیناً اور دائمی ملے گا۔ دنیا کی طرح نہیں کہ کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا کہ کل مجھے کیا

اور کتنا رزق ملنے والا ہے؟ اور فرمایا کہ اس میں ”فَوَاصِدٌ“ ہوں گے۔ فواکہ یہ فاکہہ

کی جمع ہے، یہ پھل لذت کے لیے ہوں گے خوراک کے لیے نہیں، جنت میں جتنی غذائیں دی جائیں گی وہ سب لذت کے لیے ہوں گی بھوک ختم کرنے کے لیے نہیں ہوں گی کیونکہ انسان کو جنت میں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ نہیں ہو گا کہ کھانا نہیں کھائیں گے تو بھوک لگے گی، کھانا نہیں کھائیں گے تو کمزور ہو جائیں گے، کھانا کھائیں گے تو طاقت آجائے گی، نہیں بلکہ وہاں صرف لذت اور مزے کے لیے کھائیں گے، اپنے شوق کے لیے جو چیز کھانا چاہیں گے وہ کھائیں گے۔

﴿عَلَى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ﴾ ... جنتی تختوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے اور

گپ شپ لگائیں گے۔ اس کا ایک معنی تو بعضوں نے یہ کیا ہے کہ جن تختوں پر جنتی ہوں گے وہ تخت گھومیں گے، جس سے بات کرنی ہوگی اسی کی طرف گھوم کر اس کے سامنے آتے رہیں گے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے سامنے اس طرح ہوں گے جس طرح مجلس والے حلقہ بنا کے بیٹھے ہیں کسی کو دوسرے کی طرف پشت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، کوئی دور بھی بیٹھا ہو گا تو نگاہ اتنی تیز ہوگی کہ دور بیٹھنے والا بھی بہت قریب محسوس ہو گا، ایسا نہیں ہو گا کہ ایک شخص بہت دور بیٹھا ہو تو نظر نہ



## حورانِ بہشت کا تذکرہ:

﴿وَعِنْدَهُمْ قَصِيرَاتُ الطَّرْفِ عَيْنٌ ۝ كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ ۝﴾

اللہ جنت میں جو حوریں دیں گے ان کی ایک صفت یہ بیان کی کہ ان کی نگاہ نیچی ہوگی، اپنے شوہر کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھیں گی اور ان کو اپنا شوہر اتنا خوب صورت لگے گا کہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی کی طرف نگاہ اٹھانے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ﴿قَصِيرَاتُ الطَّرْفِ﴾ کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی نگاہوں کو جھکا دیں گی یعنی ان کے شوہر ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھیں گے، اتنا پاک ماحول ہوگا۔

## جنتی اور اس کے کافر ساتھی کا مکالمہ:

﴿فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي

كَانَ لِي قَرِينٌ ۝ يَقُولُ أَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِينَ ۝﴾

یہاں ایک جنتی کا ذکر کیا جا رہا ہے جس کا دنیا میں ایک ساتھی تھا جو کافر تھا اور آخرت کا منکر تھا۔ جب یہ جنتی جنت کی محفل میں بیٹھا ہو گا تو اپنے کافر ساتھی کو یاد کرے گا کہ فلاں بندہ کدھر ہے جو مجھے طعنے دیتا تھا کہ واقعی تم آخرت کی زندگی کو سچ مانتے ہو؟ وہ مجھے کہا کرتا تھا کہ ہم جب مٹی ہو جائیں گے ہڈیوں میں تبدیل ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہمیں اپنے اعمال کا بدلہ ملے گا؟! اللہ تعالیٰ اس جنتی بندے سے فرمائیں گے کہ تم دیکھنا چاہو تو دیکھ لو! یہ پھر جنت سے جہنم کی طرف دیکھے گا تو وہاں اسے وہ شخص نظر آجائے گا، یہ جنتی اس کافر سے کہے گا خدا کی قسم! تو مجھے بھی گمراہ کر دیتا لیکن اللہ کا کرم تھا کہ اللہ نے مجھے محفوظ رکھا اور میں بچ گیا۔ تو وہاں پر ایسے سلسلے چلیں گے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

قرآن کریم میں صرف ان دو بندوں کا ذکر ہے لیکن یہ تعین نہیں کہ یہ کون تھے اور ان کے نام کیا تھے؟ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ دو بندے تھے، ان میں سے مؤمن کا نام یہود تھا اور کافر کا نام مطروس تھا۔

اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ دو بندے اور تھے جو دوست تھے، مل کر کاروبار کیا، آٹھ ہزار دینار کا منافع ہوا، چار ہزار ایک نے لیے اور چار دوسرے نے، ان میں سے ایک آدمی نے ایک ہزار دینار سے زمین خریدی اور دوسرے نے ایک ہزار صدقہ کیا اور اللہ سے دعا کی کہ یا اللہ! اس ایک ہزار دینار کے بدلے میں جنت میں زمین خریدتا ہوں۔ ایک نے ایک ہزار دینار سے اس زمین پر مکان بنایا اور دوسرے نے ایک ہزار پھر صدقہ کیا اور دعا کی کہ یا اللہ! اس ہزار دینار کے بدلے میں جنت میں ایک گھر خریدتا ہوں، ایک نے پھر ایک ہزار دینار سے شادی کی اور دوسرے نے ایک ہزار پھر صدقہ کر دیا اور دعا کی کہ یا اللہ! میں ایک ہزار کے بدلے میں جنت کی کسی عورت کو پیغام دیتا ہوں۔ پہلے نے ایک ہزار دینار پھر لگایا اور اس سے اپنا سامان خرید اور ایک غلام خرید اور دوسرے نے پھر ایک ہزار دینار اور صدقہ کر دیا، دعا کی کہ یا اللہ! اس کے بدلے میں جنت میں ایک غلام اور جنت کا سامان خریدتا ہوں۔

اتفاقاً ایسا ہو گیا کہ جس نے چار ہزار دینار صدقہ کیا تھا اس کو ضرورت پڑ گئی تو وہ اپنے اس دوست کے پاس کچھ پیسے مانگنے کے لیے گیا۔ اس نے کہا کہ تیرے پیسے کدھر ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے تو خرچ کر دیے اللہ قیامت کو صلہ دیں گے۔ اس نے کہا کہ کیا تم اس بات کو سچا سمجھتے ہو کہ ہم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوں گے اور ہمیں ایک اور زندگی ملے گی اور اس میں اعمال کا بدلہ بھی ملے گا؟ کہا کہ بالکل۔ اس نے کہا: اچھا! پھر جائیں تجھے پیسے نہیں دیتا۔ جب ان دونوں پر موت آئی۔ تو جس نے

پیسے اللہ کی راہ میں خرچ کیے اس کو تو جنت ملے گی اور دوسرا جہنم میں ہو گا۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے اور ہم سب کو آخرت کی فکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

## ز قوم؛ جہنمیوں کی خوراک

﴿أَذِلَّكَ حَيْدٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الرَّقُومِ ۚ إِنَّا جَعَلْنَهَا فِتْنَةً لِّلظَّالِمِينَ ۚ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ۚ طَلْعُهَا كَأَنَّهُ دُؤُوسُ الشَّيْطَانِ ۚ﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ہمیشہ رہنے والے جنت کے انعامات بہتر ہیں یا ز قوم کا درخت؟ ز قوم کا درخت نہایت بدبودار، کڑوا اور کریہہ المنظر ہے۔ تعین میں بہت سارے علماء نے اختلاف کیا ہے کہ ز قوم کسے کہتے ہیں؟ کسی نے کہا کہ ”تھوہر“ کے درخت کو کہتے ہیں، کسی نے کہا کہ ”ناگن پھل“ ایک درخت ہے اس کو کہتے ہیں۔ اس سے غرض نہیں کہ کون سا درخت ہے، بس اتنا کافی ہے کہ جہنم میں ز قوم کا درخت ہو گا۔ ابو جہل اس کا مذاق اڑاتا تھا کیونکہ اس وقت عربوں میں تو نہیں البتہ اور علاقوں میں ز قوم کا اطلاق کھجور اور مکھن پر ہوتا تھا، ابو جہل کہتا کہ یہ ہے ز قوم؛ کھجور اور مکھن، آؤ اس کو کھا لو!۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کو آزمائش بنایا ہے ظالمین کے لیے۔ آزمائش اس طرح کہ کون ہے جو اس کا ذکر سن کر ڈر جائے اور کون ہے جو اس کا ذکر سننے اور پھر سرکشی میں مزید جرات کرے! مکہ والے کافر کہتے تھے کہ ز قوم درخت ہو گا اور آگ میں ہو گا۔ بھلا آگ میں کوئی درخت رہ سکتا ہے؟! فرمایا کہ یہ درخت جہنم کے بالکل نچلے حصے سے پیدا ہو گا۔ یہ اشکال اس درخت پر ہوتا ہے جو باہر پیدا ہو کہ یہ آگ میں کیسے رہے گا؟ جس درخت کی پیدائش ہی آگ میں ہو اس پر یہ اشکال نہیں ہوتا۔ اس کے لیے آگ میں رہنا کیا مشکل ہے!؟

﴿طَلَعَهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيْطَانِ﴾... اس کے خوشے ایسے ہوں گے

جیسے شیطان کا سر ہے۔ شیطان؛ سانپ کو بھی کہتے ہیں تو سانپ کے پھن کی طرح اس کے خوشے ہوں گے کریہہ المنظر۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ تشبیہ تخیلی ہے، تخیلی کا معنی کہ بعض چیزیں دیکھی نہیں ہوتیں لیکن عرف میں مشہور ہوتی ہیں اور اس سے مشابہت ہوتی ہے۔ اب دیکھو! کسی بندے نے دیو نہیں دیکھا لیکن کہتے ہیں کہ فلاں شخص دیو کی طرح بد صورت ہے۔ کسی نے پری نہیں دیکھی لیکن کہتے ہیں کہ فلاں پری کی طرح خوب صورت ہے۔ تو یہ تشبیہ تخیلی ہوتی ہے، بعض چیزیں عرف میں چل رہی ہوتی ہیں لیکن فی الواقع نہیں ہوتیں، اسی تخیل سے اس کو تشبیہ دیتے ہیں، اسی طرح اسے اس تخیل سے تشبیہ دی ہے کہ وہ پھل ایسا ہو گا جیسے شیطان کا سر ہوتا ہے، کوئی آدمی بھی شیطان کو خوب صورت نہیں کہتا، ہمیشہ شیطان کو بد صورت ہی سمجھا جاتا ہے۔

**تذکرہ ہائے انبیاء علیہم السلام:**

﴿وَلَقَدْ نَادَيْنَا نُوْحًا فَلَنِعْمَ الْمُجِيبُوْنَ﴾

اللہ رب العزت نے یہاں سے چھ انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ کیا ہے۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام۔

**حضرت نوح علیہ السلام:**

یہاں نوح علیہ السلام کا تذکرہ کیا ہے۔ فرمایا کہ نوح علیہ السلام نے ہم سے دعا مانگی اور ہم سے کوئی دعا مانگے تو ہم اس کی دعا کو قبول کرنے والے ہیں۔ ہم نے نوح علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کو دردناک عذاب سے بچا لیا تھا، ان کی اولاد باقی رہ گئی

باقی سب ختم ہو گئے اور نوح علیہ السلام کے جانے کے بعد ہم نے بعد والے عام لوگوں کی زبان پر یہ کلمات جاری کیے ﴿سَلَّمَ عَلَىٰ نُوحٍ فِي الْعَلَمِينَ﴾ جب بھی نام لیں گے تو کہیں گے نوح علیہ السلام... نوح علیہ السلام... نوح علیہ السلام کا اچھا تذکرہ جاری کر دیا۔ نوح علیہ السلام کی قوم جو رہ گئی تھی وہ بھی فوت ہو گئی۔ طوفان کے بعد زمین پر جو نسل چلی ہے وہ نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سے چلی ہے؛ ایک کا نام سام تھا، ایک کا نام حام تھا، ایک کا نام یافث تھا۔

اور ترمذی کی حدیث ہے کہ سام کی اولاد اہل عرب ہیں اور حام کی اولاد اہل حبشہ ہیں اور یافث کی اولاد اہل روم ہیں۔<sup>28</sup>

تو ان کے تین بیٹوں سے دنیا میں اولاد چلی، اور اقوال بھی ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میرا تفسیر میں ذوق یہ ہے کہ میں بہت اقوال ذکر نہیں کرتا، بس ایک بات کرو جو زیادہ مناسب ہو، جو دل کو لگتی ہو اور اس کو پھر آگے عوام کو سمجھانا شروع کر دو اور آپ بھی جب عوام میں درس دیں تو اقوال زیادہ نہ بیان کریں کہ جی بعض یہ کہتے ہیں... بعض یہ کہتے ہیں... اس سے سامعین الجھن کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لیے سیدھی سیدھی ایک بات کہہ دیں جو بندوں کے دماغ میں اتر جائے۔

**حضرت ابراہیم علیہ السلام:**

﴿وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام؛ حضرت نوح علیہ السلام کے گروہ کے آدمی تھے، یعنی عقائد ایک تھے۔ ﴿إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ﴾ یہ واقعہ کئی جگہ پر آیا ہے، میں نے صرف موٹی موٹی باتیں کہنی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

قوم سالانہ میلے میں جانے لگی۔ ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ آپ بھی چلیں! ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کو دیکھا اور فرمایا: ﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾ ﴿۱۹﴾ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں نہیں جاسکتا۔ نہیں گئے۔ ان کے جانے کے بعد ابراہیم علیہ السلام بت خانے میں گئے اور آپ نے بتوں سے کہا کہ تم بولتے کیوں نہیں ہو؟ یہ کھانا پڑا ہے تم کھاتے کیوں نہیں ہو؟ پھر ابراہیم علیہ السلام نے دایاں ہاتھ چلایا اور آپ نے ان بتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ جو بڑا بت تھا اس کو چھوڑ دیا۔ واپسی پر قوم نے بتوں کا یہ حال دیکھا تو انہوں نے پوچھا کہ یہ کس نے کیا ہے؟ ﴿قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ إِبْرَاهِيمُ﴾ ﴿۲۰﴾<sup>29</sup> کہا کہ ایک نوجوان ہمارے بتوں کا تذکرہ کرتا تھا، اسے ابراہیم کہتے ہیں، اسی نے کیا ہو گا۔ اس کو پکڑ کر لاؤ۔ ابراہیم علیہ السلام کو لایا گیا، پوچھا: یہ تو نے کیا ہے؟ فرمایا: ﴿بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا فَسَأَلُوهُمْ إِنْ كَانُوا يَنْظُرُونَ﴾ ﴿۲۱﴾<sup>30</sup>

نہیں، یہ حرکت ان کے اس بڑے سردار نے کی ہے، انہی بتوں سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہیں تو! بڑے سے پوچھو جو کندھے پر کلہاڑا لے کر کھڑا ہوا ہے۔ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ تمہیں پتا نہیں ہے کہ یہ بات نہیں کر سکتے۔ فرمایا:

﴿أَفَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ﴾ ﴿۲۲﴾

﴿أَفِ لَكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ ﴿۲۳﴾<sup>31</sup>

کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کر رہے ہو جو تمہیں نہ نفع پہنچاتی ہیں اور نہ نقصان۔ تف ہے تم پر بھی اور تمہارے ان خداؤں پر بھی جن کی تم اللہ کو

29۔ الانبیاء 21:60

30۔ الانبیاء 21:63

31۔ الانبیاء 21:67، 68

چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، کیا تم میں اتنی بھی سمجھ نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام حجت تام کرنا چاہتے تھے، اس لیے آپ نے ایسا طریقہ اختیار فرمایا تھا۔

﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾ کا پہلا معنی:

﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ ۖ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ﴾

ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو قوم تھی وہ ستاروں کی پوجا کرتی تھی اور ستاروں کو موثر بھی سمجھتی تھی کہ ستارے یہ کام کرتے ہیں۔ آپ علیہ السلام نے ایسے اوپر دیکھا تو انہوں نے سمجھا کہ ابراہیم علیہ السلام بھی ہمارا ہم عقیدہ ہے، ستاروں کو دیکھ کر کہتا ہے کہ میں بیمار ہوں۔ کیونکہ یہ لوگ بھی پیشین گوئیاں کرتے تھے، ستارہ دیکھ کر کہتے تھے کہ بارش ہوگی، ستارہ دیکھ کر کہتے کہ فلاں بیمار ہوگا، فلاں کو اولاد ہوگی جبکہ ابراہیم علیہ السلام کا مقصد قطعاً یہ نہیں تھا، مطلب یہ تھا ﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾ کہ میں بیمار ہوں میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بسا اوقات طبیعت ٹھیک نہ ہونے کا مطلب مریض اور بیمار ہونا نہیں ہوتا بلکہ بعض حوادث سے بندے کو تکلیف ہوتی ہے تو کہتا ہے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

کوئی آدمی اپنے مخاطب کی حالت دیکھتا ہے تو اسے دکھ اتنا ہوتا ہے کہ بندے کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے، کہہ اٹھتا ہے کہ اوئے یار! دفع ہو جا تو میرے سامنے نہ آ، تجھے دیکھ کر میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔

ایک شکار کا جواب:

ابراہیم علیہ السلام نے جو ستاروں کو دیکھا تو اس پر کسی کو اشکال نہیں ہونا چاہیے کہ ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ تو یہ نہیں تھا لیکن ابراہیم علیہ السلام نے ان کے

دیکھنے کی طرح دیکھا اور وہ یہ سمجھے کہ ابراہیم علیہ السلام بھی ہماری طرح ستاروں کو موثر سمجھتے ہیں اس سے تو ان کے عقیدے کی تائید ہوتی ہے اور غلط عقیدے والے کی تائید کرنا تو ٹھیک نہیں ہے۔

یہ بات یاد رکھنا کہ تائید تب ہوتی جب ابراہیم علیہ السلام اس کے بعد خاموش رہتے اور ان کے نظریے کی تردید نہ کرتے، آپ نے تو کھل کر تردید کی ہے۔  
قرآن میں ہے:

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا ۖ قَالَ هَٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ

لَا أُحِبُّ الْإِفْلَاقَ ۚ﴾<sup>32</sup>

جب ابراہیم علیہ السلام پر رات چھا گئی اور انہوں نے ایک ستارہ دیکھا تو فرمایا: یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ ڈوب گیا تو فرمایا کہ میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا! تو تائید کیسے ہو سکتی ہے؟! یہ تردید ہے... تائید ہر گز نہیں ہے۔

﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾ کا دوسرا معنی:

﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾... اس کا ایک معنی تو وہ ہے جو میں نے عرض کیا کہ ”میں تم سے بیزار ہوں، تمہاری حرکتوں سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے“ سقیم کا ایک معنی اور بھی ہے جیسے قرآن کریم میں ہے: ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَّيِّتُونَ﴾<sup>33</sup>، یہاں ”إِنَّكَ مَيِّتٌ“ کا معنی ہے کہ آپ پر موت آئی ہے، اسی طرح ﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾ کا معنی یہ نہیں کہ میں بیمار ہوں بلکہ اس کا معنی ہے کہ میں نے بیمار ہونا ہے اور یہ طے شدہ ہے کہ ہر



بندے نے موت سے پہلے بیمار ہونا ہے۔ اگر کسی کو ظاہری بیماری نہ ہو تب بھی موت سے پہلے انسان کے مزاج میں خلل کا آنا لازمی بات ہے، ایسا نہیں ہو سکتا کہ بندے کو خلاف مزاج کبھی کوئی چیز پیش نہ آئے۔

### حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت:

﴿وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ دَبِّي سَيِّدِي﴾ ﴿٩٩﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں۔ پہلے تو آپ علیہ السلام عراق کے کچھ مقامات اور شہروں میں گئے، پھر وہاں سے ہوتے ہوئے شام کے علاقے میں گئے۔ وہاں سے مصر پھر مکہ مکرمہ پہنچے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ کا نام سارہ تھا اور آپ کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ ابراہیم علیہ السلام جب مصر سے گزرے تو اس دوران ایک واقعہ ہوا۔

فرعون مصر۔ فرعون کوئی خاص بندہ نہیں ہے، مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون کہتے ہیں جس طرح ہمارے سربراہ مملکت کو صدر کہتے ہیں تو وہاں ہر بادشاہ کو فرعون کہتے تھے۔ اس ظالم کی عادت تھی کہ کسی بھی خوبصورت خاتون کو دیکھ کر اس کی عزت پر حملہ کرتا تھا۔ اگر اس کے ساتھ اس کا شوہر ہوتا تو اسے قتل کر دیتا تھا اور شوہر کے علاوہ کوئی اور عزیز ہمراہ ہوتا تو اسے کچھ نہیں کہتا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام مصر سے گزرے تو انہوں نے اپنی اہلیہ سے کہا: تم کہنا کہ میں ان کی بہن ہوں۔ حقیقت میں تو بہن نہیں تھی بلکہ بیوی تھی، ابراہیم علیہ السلام نے ظاہری طور پر کہا ہے کیونکہ دنیا بھر کے سارے مسلمان اسلامی بہن بھائی ہیں۔ خیر اس ظالم نے جب ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو اس کا ہاتھ شل ہو گیا۔ پھر اس نے حضرت سارہ سے کہا کہ اپنے خدا سے دعا کرو کہ میرا ہاتھ ٹھیک ہو جائے اب میں کچھ نہیں کہوں گا۔ حضرت سارہ نے دعا کی تو وہ ٹھیک ہو گیا لیکن اس نے پھر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو پھر ہاتھ شل ہو گیا۔ اس نے کہا کہ دعا

کرو کہ میں ٹھیک ہو جاؤں اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ دعا سے ٹھیک ہو تو پھر تیسری بار اس نے یہ حرکت کی تو اب بھی ہاتھ شل ہو گیا۔ اب بھی کہا کہ تم دعا کرو تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔ دعا مانگی تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ اب اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جن ہے یہ انسان نہیں ہے، اس کو مجھ سے دور لے جاؤ! اس نے حضرت سارہ کی خدمت کے لیے ایک لڑکی بھی ساتھ دے دی جس کا نام ہاجرہ تھا اور یہ فرعون کی اپنی بیٹی تھی۔ حضرت سارہ نے یہ سمجھ کر کہ میرے ہاں تو اولاد نہیں ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ آپ اس سے بھی نکاح کریں، شاید اللہ اس سے اولاد دیں۔ حضرت ہاجرہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام حضرت اسماعیل علیہ السلام تھا۔

حضرت سارہ کو دیکھو! اپنا بچہ نہیں تھا، فرمایا آپ ہاجرہ سے نکاح کر لیں اللہ اس سے اولاد دے گا، اللہ نے پھر ان سے اسماعیل بیٹا پیدا فرمایا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جب جوان ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اپنے بیٹے سے فرمایا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے۔ بیٹے نے کہا:

**خواب میں بیٹے کو ذبح کرنا:**

﴿قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ١٢٢﴾

اے ابو جان! جو آپ کو حکم ہوا ہے آپ اس پر عمل کیجیے، ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ”إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا“ نہیں کہا کہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے، بلکہ ﴿إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ﴾ کہا کہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ یہ بتانے کے لیے کہ تنہا میں ہی نہیں ہوں صبر کرنے والا اور بھی ہیں۔ کتنی تواضع ہے کہ اللہ کرم فرمائیں گے آپ بسم اللہ پڑھیں۔ پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے خود فرمایا: ابوجی! مجھے باندھ دیں، ہو سکتا ہے کہ میں درد

برداشت نہ کر سکوں! روایت میں ہے کہ جب چھری چلائی تو اللہ نے چھری اور گردن کے درمیان پیتل حائل کر دیا جس کی وجہ سے گلا نہیں کٹا تو کچھ دیر بعد اسماعیل علیہ السلام نے خود فرمایا: اباجی! مجھے الٹا لٹا دیں۔ ایک تو چھری دیکھنے سے مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے اور دوسرا چھری چل نہیں رہی، شاید آپ محبتِ پدری کی وجہ سے صحیح چلا نہیں رہے لہذا الٹا لٹا دیں۔ پھر چھری چلائی لیکن پھر بھی نہیں چلی تو اللہ نے مقدر میں ذبح لکھا ہی نہیں تھا وہ تو صرف امتحان تھا جو خدا نے ابراہیم علیہ السلام سے لینا تھا۔

یہ بات یاد رکھنا! جب اللہ امتحان لیتے ہیں تو اس کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ اللہ کو معلوم نہیں ہوتا بلکہ امتحان اس وجہ سے ہوتا ہے کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ بلا وجہ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے خلیل بنالیا۔ تو خلیل بنانے کی یہ وجوہات ہیں۔ دیکھو! ہر امتحان میں کیسے کامیاب ہوئے؟

﴿فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّہُ لِلْجَبِّیْنِ﴾ .... دونوں نے خود کو خدا کے حوالے کر دیا۔ اپنے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا، اس کا ایک مطلب تو میں نے بیان کر دیا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے سامنے والا حصہ اس کو کہتے ہیں ”وَجْہَۃٌ“ اور ایک ہے پیشانی کے دونوں کونے، اس کو ”جبین“ کہتے ہیں۔ تو ان کو کروٹ کے بل لٹایا، پیشانی کا ایک کونہ نیچے زمین سے لگ گیا پھر یوں گردن کو ذبح کیا۔ اب کوئی اشکال ہی باقی نہیں رہتا۔

﴿وَنَادٰیہُ اَنْ یَّآ اِبْرٰہِیْمُ﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا ﴿... اللہ فرماتے ہیں: ہم نے کہا ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا،

﴿اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ﴾ یقیناً ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح صلہ دیتے ہیں۔ یہ تو امتحان تھا۔ اس کے بدلے میں ابراہیم علیہ السلام کو جنت کا دنبہ دیا۔ اسماعیل علیہ السلام بچ گئے۔ دنبہ ذبح ہو گیا۔ ابراہیم علیہ السلام کامیاب ہو

## ایک لفظ کا اضافہ پورے معنی کی تبدیلی:

﴿وَقَدْ يَنْدُبُ بِيْنُجٍ عَظِيْمٍ﴾<sup>34</sup>

ہم نے ایک عظیم قربانی فدیے میں دی اور اس بچے کو بچا لیا۔  
میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اللہ رب العزت نے یہاں صرف ”بِیْنُجٍ“  
نہیں فرمایا بلکہ ”بِیْنُجٍ عَظِيْمٍ“ فرمایا۔ اگر دنیا والا دنبہ ہوتا تو ”بِیْنُجٍ“ کافی تھا، چونکہ  
دنبہ جنت سے آیا تھا تو اس وجہ سے ”بِیْنُجٍ عَظِيْمٍ“ فرمایا۔ اب ایک لفظ کا اضافہ ہوتا  
ہے تو اس سے پورا معنی بدل جاتا ہے۔

## انبیاء کو بشر نہ ماننے والوں کے شبہ کا جواب:

میں اس کو سمجھانے کے لیے کئی مثالیں دیا کرتا ہوں۔ جس طرح حضرت  
یوسف علیہ السلام پر فریفتہ ہونے والی زلیخا کو دیگر عورتوں نے طعن و تشنیع کی کہ تو غلام  
پر عاشق ہو گئی ہے۔ تو زلیخا نے کہا: تم نے غلام دیکھا نہیں ہے، چلو تمہیں دکھا دیتی  
ہوں۔ یوسف علیہ السلام سے کہا کہ باہر آئیں۔ دسترخوان پر پھل اور چھریاں رکھ  
دیں۔ عورتوں نے جب اچانک یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو انہوں نے کہا:

﴿مَا هَذَا بَشَرًا ۖ اِنْ هَذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾<sup>34</sup>

یہ تو بشر نہیں ہے، یہ تو فرشتہ ہے۔

زلیخا نے کہا کہ یہی ہے وہ غلام جس پر تم مجھے طعن دیتیں تھیں۔  
اب دیکھو! ہم نبی کو بشر سمجھتے ہیں، جو بشریت نبی کے قائل نہیں وہ کہتے ہیں

کہ نبی بشر نہیں ہوتا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ عورتوں نے کہا: ﴿مَا هَذَا بَشَرًا﴾ کہ یہ بشر نہیں، اور قرآن نے تردید بھی نہیں کی۔ جب قرآن تردید نہ کرے تو مسئلہ وہی ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی بشر نہیں ہے۔

میں نے کہا: اللہ نے سورۃ الشمس میں سات قسمیں کھا کر ارشاد فرمایا ہے:

﴿فَالْهَمَّهَا هُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۖ﴾<sup>35</sup> کہ ہم نے انسان کے مزاج میں بہیمیت اور ملکیت رکھی ہے۔ ملکیت کا معنی، مان کے چلنا اور بہیمیت کا معنی، من مانی کرنا۔... ملکیت کا معنی، فرشتہ پن اور بہیمیت کا معنی، ڈنکر پن۔ جب آدمی من مانی کرتا ہے تو اللہ فرماتے ہیں ﴿أُولَٰئِكَ كَانُوا لَنَا عَامِرًا﴾ کہ یہ جانور کی طرح ہے، وہ بھی من مانی کرتا ہے اور یہ بھی من مانی کرتا ہے لیکن جانور کے مزاج میں مان کر چلنے کی صلاحیت نہیں ہے جبکہ انسان کے مزاج میں ماننے کی صلاحیت ہے پھر بھی من مانی کرتا ہے تو فرمایا ﴿بَلَىٰ هُمْ أَضَلُّ﴾<sup>36</sup> بلکہ جانور سے بھی بدتر ہے۔

### توضیح بالمثل:

اس کی مثال سمجھیں! آپ نے یہاں سے اسلام آباد جانا ہے۔ ایک گاڑی اے سی ہے، ایک نان اے سی ہے، آپ اے سی والی کا ٹکٹ نان اے سی سے زیادہ ادا کر کے لیتے ہیں، راستے میں اے سی خراب ہو جائے تو یہ نہیں کہتے کہ ”یہ گاڑی نان اے سی کی طرح ہے“ بلکہ کہتے ہیں کہ ”یہ تو نان اے سی سے بھی بدتر ہے“ کیونکہ اُس میں تو اے سی تھا ہی نہیں، اس میں اے سی تو تھا مگر کام نہیں کرتا۔ تو جانور کے مزاج

میں من مانی کرنا ہے، انسان کے مزاج میں مان کر چلنا ہے پھر بھی من مانی کرتا ہے تو ”بَلْ هُمْ أَضَلُّ“ ہے۔

﴿مَّا هَذَا بَشَرًا﴾ اس میں بشریت کی نفی نہیں بلکہ بشریت کے ضمن میں من مانی کرنے کی نفی ہے، انہوں نے کہا تھا کہ یہ وہ بشر نہیں ہے جو من مانی کرے، ﴿إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾ یہ تو وہ بشر ہے جو مان کر چلتا ہے اور جو مان کر چلے وہ فرشتہ ہوتا ہے۔ چونکہ فرشتہ مان کر چلتا ہے تو اس کو ”مَلَكٌ“ کہتے ہیں، فرشتے کے مزاج میں مان کر چلنا ہے اور انسان کے مزاج میں من مانی بھی ہے پھر بھی مان کر چلے تو اس کو صرف ”مَلَكٌ“ نہیں کہتے بلکہ ﴿مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾ کہتے ہیں۔

### اہل بدعت سے سوالات:

اب ہم نے تو آیت کا معنی کھول دیا لیکن آپ کہتے ہیں کہ نبی بشر نہیں ہے! دلیل کہ ان عورتوں نے کہا تھا: ﴿إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾ ہم آپ سے پوچھتے ہیں: اگر نبی بشر نہیں ہوتا تو کیا نبی فرشتہ ہوتا ہے؟ کہتے ہیں: نہیں! تو ہم نے کہا کہ وہ عورتیں تو دو باتیں کہتی تھیں:

1: ﴿مَّا هَذَا بَشَرًا﴾ یہ بشر نہیں ہے۔

2: ﴿إِنْ هَذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾ یہ فرشتہ ہے۔

یہ تمہاری دلیل تب بنے گی جب تم نبی کو بشر نہ مانو بلکہ فرشتہ مانو۔ ہم نے تمہارے اعتراض کا جواب دے دیا ہے اب تم ہمارے سوال کا جواب دو۔

### ذبیح کون؟ حضرت اسماعیل یا حضرت اسحاق؟

﴿سَلِّمْ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ﴾ ﴿كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾ ﴿۱۱۱﴾ إِنَّهُ مِن

عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٣٧﴾ وَبَشِّرْهُمْ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿١٣٨﴾

ذبیح؛ اسماعیل علیہ السلام تھے یا اسحاق علیہ السلام تھے؟ بعض کی رائے یہ ہے کہ اسحاق علیہ السلام تھے، بعض کی رائے یہ ہے کہ اسماعیل علیہ السلام تھے اور ترجیح اس کو ہے کہ ذبیح اللہ؛ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔ اس کی چند دلیلیں ہیں:

نمبر 1: اللہ نے پورا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

﴿وَبَشِّرْهُمْ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ﴾

ہم نے انہیں اسحاق کی بشارت دی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسحاق علیہ السلام اس کے بعد پیدا ہوئے۔

نمبر 2: ﴿وَبَشِّرْهُمْ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا﴾

خوشخبری دی کہ اسحاق علیہ السلام پیدا ہوں گے جو نبی ہوں گے۔ اگر یہ بتا دیا جائے کہ بعد میں نبی ہوں گے تو پھر امتحان کیسے ہوا؟ کیونکہ نبی تو تب ہوں گے جب زندہ بھی رہیں گے۔

نمبر 3: اسی طرح قرآن میں ہے:

﴿فَبَشِّرْهُمْ بِإِسْحَاقَ ۚ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ إِسْحَاقُ يَعْقُوبَ ۚ﴾<sup>37</sup>

ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو خوشخبری دی کہ تمہیں اسحاق دیں گے اور اسحاق کا بیٹا یعقوب بھی دیں گے!

تو پہلے خوشخبری مل جائے کہ ان کی اولاد بھی ہوگی تو پھر ذبح کرنا کیسے امتحان بنے گا؟

نمبر 4: پھر اہم بات یہ ہے کہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ ایسے بیٹے کو ذبح کیا جو

پہلا تھا اور پہلے اسماعیل علیہ السلام تھے۔ جب اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیالیس سال تھی اور جب اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو عمر سو سال تھی۔

نمبر 5: ذبح کا یہ واقعہ منیٰ کے قریب عرب میں پیش آیا ہے اور عرب میں حضرت اسحاق نہیں تھے عرب میں حضرت اسماعیل تھے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ ذبح اللہ حضرت اسماعیل ہیں، حضرت اسحاق نہیں۔

﴿وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ﴾

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا واقعہ تفصیل سے پہلے گزر چکا ہے۔

### حضرت الیاس علیہ السلام:

﴿وَإِنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ﴾

حضرت الیاس علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔ الیاس اور ایل یاسین بھی انہی کا نام ہے۔ حضرت حزقیل علیہ السلام کے بعد اور حضرت الیسع علیہ السلام سے پہلے بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے۔ اسرائیل کے بادشاہ کی بیوی ایک بت کی پوجا کرتی تھی جس کا نام ”بعل“ تھا اور ان لوگوں کا کہنا تھا کہ ہمارے اس بت کے آگے ساڑھے چار سو نبی ہیں۔ حضرت الیاس علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور جن کو تم نے نبی مانا ہوا ہے تم ان کو بلاؤ، ادھر میں بھی آتا ہوں، وہ اپنے خدا ”بعل“ کے نام پر قربانی کریں اور میں اپنے اللہ کے نام پر قربانی کرتا ہوں، ان کی قربانی کو آسمانی آگ نے کھا لیا تو ان کا دین سچا اور میری قربانی کو آگ کھالے تو میرا دین سچا۔ بعل بت کے ان جھوٹے چار سو نبیوں نے قربانیاں کیں لیکن کسی ایک کے لیے بھی آگ نہیں آئی کیونکہ وہ جھوٹے تھے، حضرت الیاس علیہ السلام نے جب جانور ذبح کیا تو آسمان سے



آگ آئی اور کھا کر چلی گئی لیکن پھر بھی ان لوگوں نے نہ مانا، ضدی تھے بالآخر اس قوم کو خدا نے تباہ و برباد کر دیا۔

پہلے قربانی کی قبولیت کا یہ ضابطہ تھا کہ آسمان سے آگ آتی اور قربانی کو کھا لیتی تھی تو یہ علامت تھی کہ قربانی قبول ہو گئی ہے۔

### حضرت لوط علیہ السلام:

﴿وَإِنَّ لُوطًا لِّمَنِ الْمُرْسَلِينَ ۖ﴾

حضرت لوط علیہ السلام؛ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھانجے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام کی قوم میں سے سوائے لوط علیہ السلام کے کوئی ایمان نہیں لایا۔ یہ ان کے کلمہ گو تھے۔ پھر اللہ نے ان کو بستی سدوم میں نبی بنا کر بھیجا۔ ان کی قوم نے گندے افعال کیے تو اللہ نے ان کو سخت عذاب دیا اور تباہ و برباد کر دیا۔

### حضرت یونس علیہ السلام:

﴿وَإِنَّ يُونُسَ لِمَنِ الْمُرْسَلِينَ ۖ﴾

یونس علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔ ایک قوم کی طرف بھیجے گئے۔ آپ کی قوم نافرمان تھی۔ آپ کے بار بار سمجھانے کے باوجود راہِ راست پر نہیں آئی تو آپ نے انہیں کہا کہ تم پر خدا کا عذاب تین دن میں آجائے گا۔ اس کے بعد آپ علیہ السلام بستی چھوڑ کر چلے گئے۔ ابھی عذاب کے آثار آئے تو قوم کو حضرت یونس علیہ السلام کی پیشگوئی کی سچائی معلوم ہوئی تو وہ گڑگڑا کر اللہ کے حضور روئی تو خدا نے ان سے عذاب کو ٹال دیا۔ ابھی عذاب کی کیفیت وہ نہیں تھی کہ جس میں توبہ قبول نہ ہو۔ حضرت یونس سمجھے کہ وہ کیفیت آگئی ہے۔ اجتہادی غلطی ہو گئی۔ آپ بستی سے چلے گئے۔ جب آگے کشتی میں جا کر بیٹھے تو کشتی تھوڑا سا آگے چلی تو ڈوبنے لگی۔ کشتی کے ملاح نے کہا کہ

ہماری کشتی میں کوئی دوڑا ہوا غلام ہے، جب تک وہ باہر نہیں پھینکو گے کشتی نہیں چلے گی، اس کو پانی میں پھینکنا پڑے گا۔ جب قرعہ نکالا تو حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکلا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ میں ہی ہوں۔

آپ نے وہاں چھلانگ لگا دی۔ اس کو خود کشتی نہ سمجھنا! کیوں کہ وہ بظاہر ابھی کنارے کے اتنے قریب تھے کہ ان کے ذہن میں تھا کہ میں تیر کر وہاں پر پہنچ جاؤں گا، اس لیے یہ خود کشتی نہیں ہے۔ جو نہی پانی میں گرے تو آگے مچھلی منہ کھولے بیٹھی ہوئی تھی، اس نے نکل لیا۔ حضرت یونس علیہ السلام پھر دعا فرمانے لگے:

﴿لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ ۖ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾<sup>38</sup>

اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دعائے مانگتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے یعنی مچھلی کھا جاتی مچھلی کا پیٹ ان کی قبر بن جاتا۔

اللہ نے چالیس دن کے بعد مچھلی کو حکم دیا۔ اس نے باہر نکالا۔ چالیس دن چونکہ مچھلی کے پیٹ میں رہے تھے تو مسلسل مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے ان کے بدن کے سارے بال ختم ہو گئے۔ اللہ نے فوراً گدو کی بیل وہاں پر لگا دی:

﴿وَأَنْبَغْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِينٍ﴾

”یقطين“ عربی زبان میں اس درخت کو کہتے ہیں کہ جس کا تنانہ ہو جسے ہم اردو میں بیل کہتے ہیں۔ اصل میں ”شجرۃ“ کہتے ہیں تنادار درخت کو اور یہ بیل تھی جس کا تنانہ نہیں ہوتا لیکن پھر قرآن نے اسے شجرۃ کہا ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ معجزہ تھا کہ اللہ نے اس بیل کو تنابند دیا تاکہ حضرت یونس علیہ السلام اس کے نیچے آرام کریں یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں درخت تھا

تو ساتھ اس کے بیل لگ گئی جو درخت پر چڑھ گئی تاکہ اس کے نیچے آرام فرما سکیں۔  
 اور ایک ہرنی کو حکم دیا گیا کہ جا کر ان کو دودھ پلایا کرے۔ آپ وہ دودھ پیتے  
 رہے۔ جب تروتازہ ہو گئے تو اللہ نے حکم فرمایا کہ اپنی قوم کی طرف پھر واپس جاؤ! پھر  
 یہ اپنی قوم کی طرف گئے۔

### فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہنے والوں سے سوال:

﴿فَاسْتَفْتِهِمُ الرِّبَّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ﴾

مشرکین مکہ میں سے بعض وہ تھے کہ جن کا دعویٰ یہ تھا کہ فرشتے اللہ کی  
 بیٹیاں ہیں اور بعض ان کی پوجا بھی کرتے تھے۔ اب ان کو سمجھایا جا رہا ہے۔ فرمایا: اے  
 پیغمبر! آپ ان سے پوچھیں کہ کیا تمہارے رب کے حصے میں بیٹیاں آئی ہیں اور خود  
 تمہارے حصے میں بیٹے آئے ہیں؟! یعنی تم اپنے ماحول میں بیٹیوں کو اپنے لیے باعث عار  
 سمجھتے ہو تو خدا کے لیے کیسے ثابت کرتے ہو؟ یہ تو تمہارے ماحول کے اعتبار سے بھی  
 غلط ہے۔

### دلیل کی تین اقسام:

کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے تین قسموں میں سے کسی ایک قسم کی دلیل  
 دی جاسکتی ہے؛ ایک ہوتی ہے دلیل مشاہدہ جسے عرف کہتے ہیں، ایک ہوتی ہے دلیل  
 عقلی اور ایک ہوتی ہے دلیل نقلی۔ اب تمہارے دعوے پر ان تین دلیلوں میں سے  
 کون سی دلیل ہے؟ یہ جو تم نے کہا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں تو کیا تمہارا مشاہدہ ہے؟  
 ﴿أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ﴾ کیا خدا نے جب فرشتوں کو  
 بیٹیاں بنایا تھا تو تم موجود تھے؟ نہیں تم موجود نہیں تھے تو پھر یہ تمہارا جھوٹ ہوا۔  
 پھر ہوتی ہے دلیل نقلی کہ کسی ایسے بندے کی بات نقل کریں جو بندہ سچا ہو

اور جو بندہ جھوٹا ہو اس کی بات دلیل نقلی کیسی بنے گی؟ تم لوگ جو اس عقیدے کے قائل ہو تم جھوٹے ہو تو تمہاری بات دلیل کیسے بنے گی؟ فرمایا: ﴿أَلَا إِنَّهُمْ مِّنْ أَفْكِهَمَ يَقُولُونَ﴾ ﴿١٥١﴾ وَلَدَّ اللَّهُ ۖ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿١٥٢﴾ یہ لوگ بہتان تراشی کی بنا پر کہتے ہیں کہ اللہ کی اولاد ہے، یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس لیے یہ بھی دلیل نہیں بن سکتی۔

یاد رکھنا کہ تمہارے پاس دلیل عقلی ہونی چاہیے دلیل عقلی بھی نہیں ہے کیونکہ تم خود لڑکیوں کو کم تر سمجھتے ہو اور لڑکوں کو افضل سمجھتے ہو، بیٹیوں کو تم عار سمجھتے ہو اور ان کو قتل کر دیتے ہو تو جو خود تمہاری عقل میں بھی کم تر ہے تو کیا اللہ اس کم تر کو اپنے لیے منتخب کرے گا اور اعلیٰ تمہیں دے گا؟ فرمایا: ﴿أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ﴾ ﴿١٥٣﴾ مَا لَكُمْ تَكْتِفُ تَحْكُمُونَ ﴿١٥٤﴾ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیوں کو ترجیح دی ہے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے کس طرح کے فیصلے کرتے ہو؟ تو عقلی دلیل بھی ان کا ساتھ نہیں دیتی۔

تو تمہاری بات بھی نہ مانیں، مشاہدہ بھی نہیں ہے، عقل کے بھی خلاف ہے، ایک صورت بچتی ہے کہ چلو کسی آسمانی کتاب میں ہو تو وہ لے آؤ ﴿فَأْتُوا بِكِتَابِكُمْ﴾ کوئی کتاب ہے تو وہ لے آؤ! تمہارے پاس تو اس دعویٰ پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ فرشتے عورتیں اور اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔

### دلیل الزامی کا ثبوت:

یہاں ایک بات یاد رکھنا! جب ہم مناظرہ میں گفتگو کرتے ہیں تو ایک ہے جواب تحقیقی اور ایک ہے جواب الزامی۔ یہ الزامی جواب دینا خود قرآن کا طرز اور قرآن کریم سے ثابت ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ ۖ﴾ مَا نَكُم مِّنْ كَيْفَ  
تَحْكُمُونَ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۚ﴾ أَمْرُ نَكُم سُلْطَنٌ مُّبِينٌ ۚ﴾ فَأَتُوا  
بِكِتَابِكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۚ﴾

بیٹی تمہارے ہاں کمتر ہے تو کیا اللہ کمتر کو اپنی بیٹی بنائے گا؟ اگر بنانا ہو تا تو  
افضل کو اپنے پاس رکھتے اور غیر افضل تمہیں دیتے! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو کمتر ہو اللہ  
اس کو اپنے لیے منتخب فرمائیں؟ یہ الزامی جواب ہے کہ جس کو تم عار سمجھتے ہو، جس کو تم  
ذلت سمجھتے ہو تو خدا اس کو بیٹی بنائے گا؟ اگر تمہارے ہاں بیٹی فضیلت کی علامت ہوتی  
تو تم کہتے کہ خدا کی بیٹیاں ہیں! جس کو اپنی غیرت کے خلاف سمجھتے ہو اللہ کے لیے کیسے  
ثابت کرتے ہو؟ یہ دلیل الزامی ہے۔

اور یہ بات یاد رکھنا! الزامی جواب کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ مخالف کی بات کو ہم  
صحیح سمجھتے ہیں، اس کا معنی یہ ہے کہ مخالف جس بات کو صحیح سمجھتا ہے اس کی بات کو اس  
پر پھینکا جائے۔

میں ایک مثال دیتا ہوں تاکہ آپ سمجھ جائیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ابھی المہند  
علی المہند کے سبق میں میں نے ایک مسئلہ بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر  
مبارک کی وہ مٹی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر سے لگی ہوئی ہے کعبہ سے بھی  
اعلیٰ ہے۔ غیر مقلدین اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارے ہاں جب قبر کے ذرے  
جو وجود اطہر سے ملے ہیں کعبہ سے اعلیٰ ہیں تو جب نماز پڑھتے ہو تو منہ کعبہ کی طرف  
کیوں کرتے ہو؟ اُس طرف کیوں نہیں کرتے؟

اب ہم نے الزامی جواب دیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جو افضل ہو منہ ادھر  
کرنا چاہیے تو تم منہ کعبہ کی طرف کرتے ہو عرش کی طرف کیوں نہیں کرتے؟ اب ہم  
نے اس اصول کو مانا نہیں ہے کہ نماز میں منہ افضل کی طرف ہو، ہم نے کہا کہ تمہارے

اس اعتراض کی بنیاد یہ ہے کہ نماز میں منہ افضل کی طرف ہونا چاہیے یہ جو تمہاری بنیاد ہے کہ افضل کی طرف ہونا چاہیے تو تم منہ کعبہ کے بجائے عرش کی طرف کرو۔ ہم نے بنیاد کو تسلیم نہیں کیا بلکہ وہ جس کو بنیاد بناتے ہیں ہم اس کو بنیاد بنا کر ان پر الزام لگاتے ہیں، اسے الزامی جواب کہتے ہیں اور یہ قرآن سے ثابت ہے۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ مخالف کو الزامی جواب سے خاموش کرنا یہ قرآنی طرز ہے اور یہ بات مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں لکھی ہے۔ میں اکثر احباب سے کہتا ہوں کہ پہلے ہم سے سمجھیں پھر معارف القرآن پڑھیں، آپ کو معارف القرآن پڑھنے کا مزا آئے گا۔ ہم سے پوچھتے بغیر معارف القرآن پڑھیں گے تو آپ پڑھتے بھی رہیں گے اور الزامی جواب اور مناظرہ کا رد بھی کرتے رہیں گے۔ ہم سے سمجھ لیں پھر پڑھیں۔ آپ اعتراض نہیں کریں گے بلکہ آپ کو بات کرنے کا لطف آئے گا۔

### متکلم اسلام اور مقصد میں انہماک:

کل ہم راینونڈ میں تھے، مولانا طارق جمیل صاحب سے ملا تو ہماری بات شروع ہو گئی، یہ جو اعتراضات ہیں اکابرین علمائے دیوبند کی عبارات پر اس پر بات ہوئی، میرا خیال یہ ہے کہ پانچ منٹ نہیں گزرے ہوں گے کہ میں نے ایک عبارت پڑھی، دوسری پڑھی، تیسری پڑھی، چوتھی پڑھی۔ اتنے میں عرب کے کچھ مہمان آ گئے تو میں مصافحہ کر کے واپس آ گیا۔ اسلام آباد کے ایک ڈاکٹر ہیں ڈاکٹر خالد رانجھا صاحب یہ میڈیکل کے کسی شعبہ کے ڈائریکٹر ہیں۔ میں واپس گھر سرگودھا آ رہا تھا تو مجھے ان کارات کو میسج آیا کہ آپ مولانا طارق جمیل صاحب کے پاس بیٹھے تھے تو مناظرانہ گفتگو اور عبارات کی تنقیح پر مزا آ رہا تھا، بس اچانک عرب مہمان آ گئے گفتگو رک گئی، آپ نے ہمیں نہیں دیکھا، فوراً چلے گئے، میں مصافحہ سے محروم رہ گیا۔ اگلا جملہ

سنو! کہا: اپنے موضوع میں اتنا انہماک اور دائیں بائیں نہ دیکھنا آپ کا یہ طرز مجھے بہت اچھا لگا۔ کیونکہ میں سیدھا گیا مولانا کے کمرے میں، کرسی پر بیٹھ گیا بات شروع ہو گئی، جب مہمان آگئے تو میں فوراً نکل گیا، میں نے نہیں دیکھا کہ کمرے میں اور کون ہے۔ میں واپس آیا، گاڑی میں بیٹھا اور نکل گیا۔ انہوں نے کہا کہ اپنے مقصد میں یہ انہماک مجھے بہت اچھا لگا۔ دوبارہ پھر مسیح کیا کہ ”نہ دائیں دیکھنا نہ بائیں نظر کا اٹھنا سبحان اللہ!“ یہ کون ہیں؟ پرانے تبلیغ کے ساتھی ہیں اور بہت بڑے منصب پر بیٹھے ہیں۔

### جہدِ مسلسل کا نتیجہ:

آپ یقین فرمائیں! میں جب مرکز رائیونڈ گیا تو ساتھی دوڑ دوڑ کر ملتے تھے، میں امریکہ سے آیا ہوں آپ کے بیانات سے بہت فائدہ ہوا، میں کینیڈا سے ہوں بہت فائدہ ہو رہا ہے، میں افریقہ کا ساتھی ہوں ماشاء اللہ بہت فائدہ ہو رہا ہے، ہم انگلینڈ میں رہتے ہیں بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ وہاں مرکز کے ایک بزرگ ہیں، مجھے فرمانے لگے: مولانا! آپ کے کلپ سنتے ہیں ماشاء اللہ آپ نے نوجوانوں کو سنبھالا ہے اور جو آپ جواب دیتے ہیں مزا آ جاتا ہے۔ یہ مسلسل محنت کا نتیجہ ہے کہ اب ایک ایک بندہ آ رہا ہے۔

میں گاڑی پر تھا تو سندھ کے ایک مہمان آ رہے تھے، میں نے تھوڑا سا شیشہ نیچے کیا کہ چلو ان سے بھی مصافحہ کر لیں۔ ڈاڑھی منڈا آدمی تھا پتا نہیں ملازم تھا یا مزدور تھا، مجھے انہوں نے جو جملہ فرمایا سن کر بہت مزا آیا، مجھے کہتا ہے: او گھسن صاحب! ڈٹ جاؤ، گھسن صاحب! ڈٹ کے رہنا... مجھے لطف آ رہا تھا ان کی بات سے کہ ایک عام بندہ بھی اتنا متاثر ہے اور اتنا خوش ہو رہا ہے۔

اور میں آپ سے کہتا ہوں کہ بس کام سے کام رکھیں، اللہ نے آپ سے کام لینا ہے، ایک وقت آئے گا اللہ آپ کے کام کو دنیا میں منو ادے گا، اگر منوانے کی فکر

سے کام کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ اللہ ہم سب سے کام لیں۔ میں اس لیے کہتا ہوں اس مرکز اہل السنۃ والجماعۃ کا فیض دنیا میں کتنا ہے آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے، کس قدر لوگ اس سے مستفید ہو رہے ہیں اور الحمد للہ مناسب، مہذب، اعتدال اور دلیل کے ساتھ بات ہو رہی ہے۔

وہاں رانیونڈ ہم بیٹھے تھے، مولانا شاہد صاحب حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ کے نواسے ہیں وہ تشریف لائے، پھر مولانا عزیز صاحب آئے، مجھے نہیں یاد کہ کسی کو میرے آنے کا پتا چلا ہو اور وہ نہ آیا ہو۔ ہاں اگر کسی کو پتا نہ چلا ہو تو وہ الگ بات ہے، ہر کسی کا جی چاہتا تھا ملنے کو، کہ ہمارے دسترخوان پر کھائے، ہمارے ساتھ ناشتہ کرے، ہمارے پاس چائے پی لے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں تو کھانا اپنے گھر سے پکوا کر ساتھ لے جاتا ہوں جب رانیونڈ جاتا ہوں۔ میں یہ بات کیوں سمجھا رہا ہوں اس لیے کہ جب ہمارے پاس آئیں تو ہمارے مرکز کی بھی رعایت کریں، جب ہم آپ کے پاس جاتے ہیں تو ہم آپ کی رعایت کرتے ہیں، آپ کے اصولوں کا خیال کرتے ہیں، اپنا کھانا میں ساتھ لے کر جاتا ہوں، روٹیاں ساتھ پکوا کر لے جاتا ہوں تاکہ وہاں کسی قسم کی الجھن نہ ہو۔

**”حق غالب رہے گا“ کا معنی:**

﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۚ إِنَّهُمْ لَهُمُ

الْمَنْصُورُونَ ۚ وَإِنَّ جُنَدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ﴾ ﴿۱۳۳﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہمارا فیصلہ ہے ہمارے بندوں کے بارے میں کہ ہمیشہ ان کی مدد ہوگی، ہمارا لشکر غالب ہو کر رہے گا۔

یہاں بظاہر اشکال ہوتا ہے، اللہ کا وعدہ ہے کہ ہمارے پیغمبر غالب ہوں گے لیکن کتنے پیغمبر ہیں جو بظاہر غالب نہیں ہوئے، قتل کر دیے گئے، قید کر دیے گئے، شہید



کر دیے گئے، جلاوطن کر دیے گئے تو پھر اس آیت کا معنی کیا ہوا؟

اس کا سب سے جو آسان مفہوم ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

فرماتے ہیں:

إِنَّ لِّلْغَلَبِ يُنْصَرُّ وَافِي الدُّنْيَا يُنْصَرُّ وَافِي الْآخِرَةِ<sup>39</sup>.

کہ اگر دنیا میں بظاہر ناکام ہوئے بھی تو آخرت میں پھر کامیاب ہوں گے۔

دنیا میں مغلوب ہوئے بھی نا تو آخرت میں غالب ہی ہوں گے۔

اور حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کی مثال ایسی

ہے جیسے حاکم جا رہا ہو اور راستے میں گاڑی رکے اور ڈاکو اس کو لوٹیں تو بظاہر حاکم مغلوب ہے اور ڈاکو غالب ہیں لیکن حاکم نے دیکھ لیا کہ ڈاکو کون ہیں؟ تو جب کچھ دن بعد اسی حاکم کی عدالت میں آئیں گے۔ اب یہ ڈاکو غالب ہو کر بھی مغلوب ہیں اور حاکم مغلوب ہو کر بھی غالب ہے۔

اسی طرح اللہ کے نمائندے پکڑے جاتے ہیں، ماریں کھاتے ہیں، جیل میں

جاتے ہیں، بظاہر بہت مغلوب ہوتے ہیں لیکن مغلوب ہو کر بھی وہ غالب ہیں کیوں؟

فرمایا: ﴿وَأَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ﴾ ﴿١٦٥﴾ کچھ دیر ٹھہرو، ان کو حسرت ہوگی کہ

اے کاش! ہم ان کو نہ پکڑتے۔ ظلم کرنے والے کو حسرت ہوگی کہ کاش! ہم ظلم نہ

کرتے لیکن ہمیں حسرت نہیں ہوگی کہ اے کاش یہ ہمیں نہ پکڑتے۔

میں بڑے درد سے یہ بات سمجھاتا ہوں کہ ان بک بک کرنے والوں کو،

الزامات لگانے والوں کو، رکاوٹیں ڈالنے والوں کو حسرت ہوگی کہ اے کاش! ہم

الزامات نہ لگاتے۔ اس لیے عزم کرو کہ ہم نے الزام لگانا نہیں ہے الزام سہنا ہے، گالی

دینی نہیں ہے گالی سہنی ہے، ظلم کرنا نہیں ہے ظلم سہنا ہے، کسی کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنی نہیں ہیں رکاوٹیں برداشت کرنی ہیں، جب یہ عزم کر لیں گے تو پھر اللہ کی مدد آپ کے ساتھ ہوگی۔ ہم اللہ کے لیے کام کرتے ہیں، بندوں کے لیے تھوڑا ہی کرتے ہیں!

﴿فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ﴾

یہ جو فرمایا کہ جب ان کے صحن میں عذاب اترتا ہے تو پھر دیکھو کس قدر برا انجام ہوتا ہے ڈرائے جانے والے کفار کی صبح کا۔

یہ عرب کا ایک محاورہ ہے۔ محاورات عرب میں ایسے لفظ استعمال کیے جاتے تھے اور عرب کا معمول تھا کہ جب بھی حملہ کرنا ہوتا تو رات کو انتظار کرتے اور اچانک صبح حملہ کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی معمول تھا کہ اگر کسی دشمن کے خطے میں رات کے وقت پہنچتے تو حملہ کے لیے صبح تک کا انتظار فرماتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خیبر پر حملہ کیا تو فرمایا:

اللَّهُ أَكْبَرُ خَرَبْتُ خَيْبَرَ إِنَّا إِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ ﴿فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ﴾<sup>40</sup>

یہ جملے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مبارک زبان سے خود پڑھ رہے تھے۔

تذریہ باری تعالیٰ:

﴿سُبْحَنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ﴾ ﴿وَسَلَّمَ عَلَى الْمُرْسَلِينَ﴾

﴿وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾

تمہارا رب جو عزت والا ہے ان باتوں سے پاک ہے جو مشرکین بیان کرتے

تھے، اور سلامتی ہو تمام رسولوں پر اور تمام تعریفیں رب العالمین کے لیے ہیں۔  
 مشرکین نے الزامات لگائے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں تو فرمایا:  
 ﴿سُبْحَنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ﴾ اللہ پاک ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا  
 کہ لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کو نہیں مانا تو فرمایا: ﴿وَسَلَّمَ عَلَى الْمُرْسَلِينَ﴾ سلامتی  
 ہے انبیاء علیہم السلام پر۔ مشرک لوگ شرک کا ارتکاب کرتے تھے، فرمایا: ﴿وَالْحَمْدُ  
 لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اللہ شرک کو پسند نہیں فرماتا اللہ  
 توحید کو پسند فرماتا ہے۔

اور علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر قرطبی میں صحابی رسول حضرت ابو  
 سعید خدری رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے نبی پاک صلی  
 اللہ علیہ وسلم سے کئی بار سنا کہ آپ نماز ختم ہونے کے بعد یہ آیات تلاوت فرماتے  
 تھے:

﴿سُبْحَنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ﴾ ﴿وَسَلَّمَ عَلَى الْمُرْسَلِينَ﴾

﴿وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾

حضور صلی اللہ علیہ وسلم آہستہ فرماتے یا اونچی آواز سے؟! سننا تب ہی ہو گا  
 جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات مذکورہ کی تلاوت جہر اُفرمائی ہو گی۔ اس لیے  
 جہر کا رد نہ کرو، آپ کا ذوق نہیں تو آپ جہر اُدعائیں نہ کریں لیکن دوسروں کا رد نہ کریں  
 اور میں یہ بات اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ اپنے ذوق کو شریعت بنا کر مسلط نہ کریں!  
 اپنے مزاج کو شریعت بنا کر دوسروں کی تردید نہ کریں، تھوڑی سی ہمت اور حوصلے  
 سے کام لے لیا کریں۔ اللہ ہم سب کو قبول فرمائے۔ آمین  
 وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة ص

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ ۚ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ ۚ﴾

ابتدائی آیات کا شان نزول:

﴿أَجْعَلِ الْاِلٰهَةَ الْهَآ وَاحِدًا ۚ اِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ مُّجَابَّ ۚ﴾

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ مکرمہ میں مشرکین کو دین کی دعوت دی تو ایک بار وہ تنگ ہو کر ابوطالب کے پاس آئے مرض الوفات میں، انہوں نے مشورہ کیا کہ اگر ابوطالب کے بعد محمد - صلی اللہ علیہ وسلم - پر ہاتھ اٹھائیں گے تو لوگ کہیں گے کہ جب ابوطالب زندہ تھے اس وقت تک ہمت نہیں ہوئی اور ان کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے کے ساتھ یہ سلوک کیا، لہذا ابوطالب کی زندگی میں جا کر فیصلہ کریں۔ انہوں نے ابوطالب سے کہا کہ اپنے بھتیجے کو سمجھاؤ کہ یہ اپنی عبادت کریں اور ہمارے معبودوں کو کچھ نہ کہا کریں۔

ابوطالب نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مجلس میں بلا کر کہا کہ بھتیجے! یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ تم ان کے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہو، ان کو برا بھلا نہ کہا کرو بلکہ تم اپنی عبادت کرو اور یہ اپنے معبودوں کی عبادت کریں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چچا! میں ان کو ایسا کلمہ سکھا رہا ہوں کہ اگر یہ کلمہ پڑھ لیں تو عرب پر ان

کی حکومت ہو اور عجم ان کی غلامی کریں۔ انہوں نے کہا بتاؤ وہ کیا کلمہ ہے؟: فرمایا: ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ تو انہوں نے کہا کہ تعجب ہے کہ ہم سارے خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کریں، یہ ہم سے نہیں ہو سکتا۔ اس پر وہ سارے لوگ چلے گئے۔ اس موقع پر سورۃ ص کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔

﴿أَجْعَلِ الْاِلٰهَةَ الْاِلٰهًا وَّاحِدًا﴾... انہوں نے کہا تعجب ہے یہ کہتا ہے کہ کئی خداؤں کے بجائے ایک خدا کی عبادت کرو۔

### تین طلاق کے متعلق حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ (صحیح مسلم):

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہاں لکھتے ہیں کہ ”اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا۔“<sup>41</sup> یہ ترجمہ میں اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ صحیح مسلم میں ایک حدیث موجود ہے، غیر مقلدین اسے اپنے مسلک پر سب سے مضبوط دلیل سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاق اکٹھی دے تو غیر مقلدین کہتے ہیں کہ ایک ہوتی ہے۔ ان کی دلیل حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ہے:

كَانَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَآيُ بَكْرٍ وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً.<sup>42</sup>

جو ترجمہ یہ لوگ کرتے ہیں پہلے میں وہ ترجمہ کر رہا ہوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق ایک شمار ہوتی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جب دور آیا تو انہوں نے فرمایا: لوگوں کے لیے اللہ نے گنجائش دی تھی لیکن لوگوں نے گنجائش کو ختم

41۔ بیان القرآن: ج 3 ص 267

42۔ صحیح مسلم، رقم: 1472

کر دیا ہے، لہذا جب انہوں نے خود ختم کر دیا تو ہم بھی ختم کر دیتے ہیں، آئندہ کوئی تین طلاق دے گا تو وہ تین ہوں گی۔

اب وہ کہتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق ایک ہوتی تھیں۔ حضرت عمر نے تین کے تین ہونے کا فیصلہ کیا تو ہم نے کلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھا ہے، حضرت عمر کا تو نہیں پڑھا، اور اگر خلیفہ کا فیصلہ ماننا ہے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فیصلہ تو تین کو ایک کہنے کا تھا، حضرت عمر بھی دو سال تک تین کو ایک کہتے رہے، یہ تو بعد میں آپ نے فیصلہ کیا۔

اب بظاہر ان کی دلیل کتنی مضبوط ہے؟ اور ہمارے اپنے لوگ بھی بہت پریشان ہوتے ہیں اس دلیل کو سن کر۔

### حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کا پہلا جواب:

اس حدیث مبارک کے کئی ایک جوابات ہیں، میں وہ سارے جوابات پیش نہیں کرتا، مثلاً ایک جواب یہ ہے کہ اس روایت کے راوی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں اور اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ جب صحابی روایت پیش کرے اور فتویٰ اپنی روایت کے خلاف دے تو پھر روایت کا اعتبار نہیں ہوتا صحابی کے فتویٰ کا اعتبار ہوتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے تقریباً ستائیس مرتبہ کے فتاویٰ موجود ہیں کہ تین طلاق دیں تو تین ہوتی ہیں اور اور تمہارے بقول وہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ تین طلاق ایک ہے، اور فتویٰ تین طلاق کے تین ہونے کا ہے۔ جب صحابی کا فتویٰ اپنی روایت کے خلاف ہو جائے تو اعتبار فتویٰ کا ہوتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ روایتیں دو ہیں، ایک روایت یہی جو صحابی نے نقل کی ہے، ایک روایت اور بھی ہے جو ہمارے علم میں نہیں ہے لیکن صحابی کے علم میں تو ہے، اس لیے

اس نے فتویٰ اس پہلی کے خلاف دیا ہے ورنہ وہ اس کے خلاف فتویٰ کیسے دے سکتے تھے؟

### کتے کے جوٹھے کو کتنی مرتبہ دھوئیں؟

کچھ دن پہلے مجھے ایک شخص نے فون کیا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حدیث بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کتا برتن میں منہ ڈال دے تو سات مرتبہ دھونا چاہیے، اور فقہ حنفی میں ہے کہ تین مرتبہ دھونا چاہیے تو تمہارا فتویٰ حدیث کے خلاف ہے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ کتا اگر برتن میں منہ ڈال دے تو برتن سات مرتبہ دھو لو، یہ تو حدیث ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنا فتویٰ کیا ہے؟ مجھے کہتا ہے کہ جی تین مرتبہ۔ تو میں نے کہا کہ پھر اعتراض فقہ حنفی پر کیوں کرتے ہو، اعتراض حضرت ابو ہریرہ پر کرو کہ حدیث بیان کرتے ہیں سات مرتبہ دھونے کی اور فتویٰ دیتے ہیں تین مرتبہ دھونے کا! اعتراض امام اعظم ابو حنیفہ پر ہو گا یا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر؟ اس پر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سات مرتبہ دھونے والی حدیث نقل کرتے ہیں، فتویٰ تین کا دیتے ہیں کیوں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ تین مرتبہ دھونا فرض ہے اور سات مرتبہ دھونا مستحب ہے۔ اب دیکھو حدیث اور فتویٰ میں تعارض ختم ہو گیا تو فقہائے احناف جو کہتے ہیں کہ تین مرتبہ دھونا چاہیے وہ فرض کے درجے میں اور سات مرتبہ دھونا چاہیے مستحب کے درجے میں ہے۔

### حدیث ابن عباس کا دوسرا جواب:

دوسرا جواب یہ ہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے آگے ایک

شاگرد ہے طاؤس اور یہ شیعہ ہے۔<sup>43</sup>

اور ہمارا اصول یہ ہے کہ بدعتی راوی اگر کوئی روایت نقل کرے اور وہ روایت اہل بدعت کے مسئلے کے موافق ہو تو وہ ہمارے ہاں حجت نہیں ہوتی۔<sup>44</sup>

تین طلاق کو ایک کہنا یہ شیعہ کا مذہب ہے اور راوی کون ہے؟ شیعہ۔ جب شیعہ راوی ہے وہ روایت اپنے مسلک کے مطابق لائے گا تو وہ روایت ہمارے ہاں حجت نہیں ہوگی۔

### حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کا تیسرا جواب:

اور بھی جوابات ہیں۔ ایک جواب یہ ہے کہ ایک ہوتی ہے تاکید اور ایک ہے استیناف تاکید کا مطلب کہ لفظ کو بار بار ذکر کریں اور معنی ایک ہو، اور استیناف کا مطلب کہ لفظ کو تو بار بار ذکر کریں اور ہر بار معنی الگ ہو۔ خاوند کہے: تجھے طلاق.. تجھے طلاق.. تجھے طلاق... اگر تاکید ہو تو معنی ہو گا کہ طلاق ایک ہے اور اگر استیناف ہو تو معنی ہو گا کہ طلاق تین ہیں۔ تو جب انت طالق.. انت طالق.. انت طالق.. کہے تو اس سے مراد استیناف ہو گا یا تاکید؟

اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے امام ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ پہلے کوئی شخص اپنی بیوی کو انت طالق، انت طالق، انت طالق کہہ کر طلاق دیتا تو چونکہ دوسری اور تیسری طلاق سے عام طور پر لوگ نئی طلاق کا ارادہ نہیں کرتے تھے اس لیے لوگوں کی غالب اور عام عادت کو دیکھتے ہوئے ان الفاظ سے محض تاکید مراد لی جاتی تھی اور اس بندے کی نیت

43۔ سیر اعلام النبلاء ج 5 ص 27، 26، المعارف لابن قتیبہ ص 268، 267

44۔ شرح نخبہ الفکر: ص 117، مقدمہ فی اصول الحدیث لعبدالحق الدہلوی: ص 67



کا اعتبار کر لیا جاتا تھا کہ اس نے دوسری اور تیسری طلاق سے محض تاکید مراد لی ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور لوگوں نے تین طلاقیں پے در پے دینا شروع کر دیں اور ان لوگوں کی نیت بھی عموماً طلاق کے دوسرے اور تیسرے لفظ سے استیناف یعنی نئی طلاق دینے ہی کی ہوتی تھی اس لیے جب کوئی شخص تین طلاقیں والا جملہ بولتا تو اس دور کے عرف کی بناء پر تین طلاقیں کا حکم لگایا جاتا تھا۔<sup>45</sup>

یہ بات اس وقت ہے جب ”أَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا“ نہ کہے بلکہ انت طالق.. انت طالق.. انت طالق.. کہے تو اب دو احتمال تھے؛ تاکید یا استیناف لیکن جب ”أَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا“ کہے تو اس سے تین ہی واقع ہوتی تھیں۔

### دو احتمالات میں سے ایک کا تعین مجتہد ہی کر سکتا ہے:

اب دوسری بات سمجھو! جب لفظ ایک ہو اور اس میں دو احتمال ہوں تو ان میں سے ایک احتمال کا تعین مجتہد ہی کر سکتا ہے۔ جیسے انت طالق.. انت طالق.. انت طالق.. میں دو احتمال ہیں ایک تاکید کا اور ایک استیناف کا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زمانے کے تغیر اور فساد کو دیکھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آئندہ اس سے مراد تاکید نہیں ہوگی بلکہ استیناف ہی ہوگا۔

اور محتملۃ المعانی الفاظ میں اگر فقیہ ایک معنی کا احتمال متعین کریں تو مقلد کے ذمہ اس کی تقلید ہوتی ہے۔ جیسے ﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ﴾<sup>46</sup> یہاں قروء؛ قرء کی جمع ہے، قرء کا معنی حیض بھی ہے اور طہر بھی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرء کا معنی حیض ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

45۔ شرح مسلم للنووی: ج 1 ص 478 کتاب الطلاق باب طلاق الثلاث

قرء کا معنی طہر ہے۔ تو جس طرح قرء کے دو معنی ہیں امام نے ایک معنی متعین کیا ہے ایسے ہی انت طالق.. انت طالق.. انت طالق.. کے بھی دو معنی تھے اور ایک معنی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے متعین کر دیا۔ لیکن یہ کب ہے؟ جب یہ انت طالق.. انت طالق.. انت طالق.. کہے، انت طالق ثلاثاً نہ کہے، اور غیر مقلدین کے ہاں ”تجھے طلاق.. تجھے طلاق.. تجھے طلاق..“ کہے تب بھی ایک ہے اور ”تجھے تین طلاق ہیں“ کہے تب بھی ایک ہے، ان کی دلیل تو پھر بھی نہیں بنتی۔

### حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کا چوتھا جواب:

میں جو سب سے بہترین جواب ہے وہ دینے لگا ہوں، وہ سمجھیں۔ یہ جواب ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ:

كَانَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَيُّ بَكْرٍ وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً.

اس کا معنی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں لوگ تین کے بجائے ایک طلاق دیتے تھے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں تین کے بجائے ایک دیتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دور میں تین کے بجائے ایک دیتے، بعد میں لوگوں نے تین کے بجائے ایک نہیں بلکہ تین ہی دینا شروع کر دیں۔

جب ایک دیں گے تو ایک ہوگی اور جب تین دیں گے تو تین ہوں گی۔  
حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

إِنَّ النَّاسَ قَدْ اسْتَعْجَلُوا فِي أَمْرِ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أُنَاةٌ فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ.

لوگوں نے اس معاملے میں جلد بازی شروع کر دی جس میں ان کے لیے

گنجائش موجود تھی۔ کہ ایک دے دیتے، جب انہوں نے تین دے کر گنجائش ختم کر دی تو میں عمر کیا کر سکتا ہوں؟! لہذا یہ تین ہی ہوں گی۔

اب دیکھیں ”كَانَ الطَّلَاقُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَيُّ بَكْرٍ وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً“

اس کا ترجمہ اگر یہ کریں کہ ”حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق ایک ہوتی“... تو اب اس کے جوابات دینے پڑیں گے لیکن اگر ترجمہ یوں کریں کہ ”حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین کے بجائے ایک طلاق دی جاتی تھی“ تو بتاؤ کتنی ہوئی؟ ایک ہی ہوگی... اب جواب کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

اس معنی پر استشہاد یہ آیت دیکھو:

﴿أَجَعَلَ الْإِلَهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا﴾

مشرکین یہ نہیں کہتے تھے کہ محمد - صلی اللہ علیہ وسلم - نے کئی خداؤں کو ایک خدا بنا لیا ہے بلکہ وہ کہتے تھے: کئی خداؤں کی جگہ پر ایک خدا رکھا ہے۔ میں نے اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ نقل کیا ہے، حضرت تھانوی فرماتے ہیں: ”اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا“

﴿أَجَعَلَ الْإِلَهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا﴾ کا ترجمہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے کئی

خداؤں کو ایک خدا بنا لیا، ایسا تو تھا ہی نہیں بلکہ وہ کہتے تھے کہ انہوں نے کئی خداؤں کی جگہ پر ایک ہی خدا رکھا ہوا ہے۔ اسی طرح یہ جو حدیث ہے ”طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً“ اس کا معنی بھی یہی ہے کہ تین کی جگہ پہ ایک ہوتی، تو جب ایک ہوتی تو طلاقیں نافذ کتنی ہونی تھیں؟ ایک!

اسی طرح حدیث پاک میں ہے:

مَنْ جَعَلَ الْهُمُومَ هَمًّا وَاحِدًا هَمَّهُ آخِرَتُهُ كَفَّاهُ اللَّهُ هَمَّهُ دُنْيَاكَ.<sup>47</sup>

جو شخص اپنے تمام غموں کو ایک غم یعنی آخرت کا غم بنالے تو اللہ تعالیٰ اس کی دنیاوی پریشانیوں اور فکروں سے اس کی کفایت فرماتے ہیں۔

اب اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ جس آدمی نے کئی غموں کو ایک غم بنالیا، کئی غم تو ایک غم ہو ہی نہیں سکتے، اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے کئی غموں کے بجائے ایک غم کو اختیار کر لیا اور وہ غم آخرت ہے۔ رزق کا غم ہے، بیماری کا غم ہے، کبھی گناہ کو جی چاہتا ہے، بندہ کٹرول کرتا ہے تو کئی غم ہیں لیکن اس بندے نے سارے غموں کے بجائے ایک غم کو اختیار کیا تو اللہ اس کے دنیا کے غموں کے معاملے میں اس کو کافی ہو جائے گا یعنی ان غموں میں اس کی مدد کرے گا۔

اب ان دونوں کو دیکھو: ﴿أَجْعَلِ الْاِلَهَةَ الْهَآ وَاحِدًا﴾ کہ کیا اس محمد - صلی اللہ علیہ وسلم - نے کئی معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رکھ لیا، اور ”مَنْ جَعَلَ الْهُمُومَ هَمًّا وَاحِدًا“ کہ جس شخص نے کئی غموں کے بجائے ایک ہی غم کو اختیار کر لیا۔ ان دونوں معانی کو دیکھو تو بالکل اسی طرح معنی ہے اس حدیث کا ”طَّلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً“ کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق کے بجائے ایک دی جاتی تھی، جب دیتے ایک تھے تو شمار بھی ایک ہی ہوتی تھی۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ معنی ایسا بیان کرو جس سے شکوک و شبہات ختم ہو جائیں۔

## بڑوں کا حوالہ دینے کی وجہ:

سندھ میں ”دوڑ“ ایک جگہ ہے وہاں مدرسہ ہے رائے ونڈ کی شاخ، وہاں صرف اساتذہ بیٹھے تھے توجہ میں نے وہاں صحیح مسلم کی اس حدیث کا یہ معنی بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تو صحیح مسلم پڑھاتے ہوئے عرصہ گزر گیا ہے، یہ عجیب توجیہ ہے۔ میں نے کہا: یہ توجیہ ہماری نہیں یہ علامہ انور شاہ کشمیری کی ہے۔ جب میں نے علامہ صاحب کا نام لیا تو اب مطمئن ہو گئے۔

میں اپنی توجیہ بیان کرتا ہوں تو لوگوں کو الجھن ہوتی ہے، اس لیے پہلے میں توجیہ بیان کرتا ہوں حوالہ نہیں دیتا، وہ توجیہ ان کے دل کو لگتی ہے لیکن قبول نہیں کرتے کیونکہ ان کے ہاں میری حیثیت نہیں ہے، میں پھر کسی بڑے کا حوالہ دیتا ہوں تو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ اس لیے میں آپ کو یہ بات سمجھاتا رہتا ہوں کہ بھائی! ہماری باتیں آج نہیں لیکن آئندہ نسلوں میں حجت ہوں گی، لوگ حوالہ پوچھیں گے کہ کس نے کہا؟ جواب ہو گا مولانا گھمن صاحب نے کہا، اب حوالہ آجائے گا، اس وقت ان کے لیے جواب دینا بہت آسان ہو جائے گا، الجھن نہیں ہوگی۔

## حضرت داؤد علیہ السلام کا اعزاز:

﴿إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعُشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ ۖ وَالطَّيْرُ

مَحْشُورَةٌ كُلٌّ لَهُ آدَابٌ﴾

ہم نے پہاڑ ان کے ساتھ مسخر کر دیے تھے، وہ صبح وشام ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ ”عُشِيِّ“ کہتے ہیں ظہر سے لے کر آئندہ دن کے طلوع صبح تک کو اور ”إِشْرَاقِ“ کہتے ہیں جب سورج نکل کر روشنی پھیل جائے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ”وَالْإِشْرَاقِ“ سے صلوٰۃ الضحیٰ؛

چاشت کے نوافل پر استدلال کیا ہے۔ اشراق کے نوافل الگ ہیں، چاشت کے نوافل الگ ہیں۔ سورج نکلنے کے پندرہ منٹ بعد یہ دو نوافل اشراق کے ہوتے ہیں اور تقریباً دو گھنٹے بعد یہ صلوٰۃ الضحیٰ یعنی چاشت کے نوافل ہوتے ہیں، یہ دو سے لے کر بارہ تک ہیں لیکن سب سے مناسب یہ ہے کہ آدمی چار رکعات پڑھے۔

میں ایک بات عرض کرتا ہوں کہ جب کوئی حدیث یا کوئی مسئلہ پڑھ لیں تو زندگی بھر عمل کی نیت کریں اور ایک دفعہ ضرور پڑھ لیا کریں۔ سبق سے فارغ ہوں تو ایک بار چار رکعات صلوٰۃ الضحیٰ کی نیت سے پڑھ لیں اور اللہ سے دعا مانگیں کہ اے اللہ! مجھے مستقل معمول بنانے کی توفیق عطا فرما۔ یہ احادیث صرف بیان کے لیے نہیں ہوتیں، عمل کے لیے ہوتی ہیں۔

### فصل الخطاب کا معنی:

﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَأَتَيْنَهُ الْحِكْمَةَ وَفَصَّلَ الْخُطَابَ﴾

ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کی حکومت کو مضبوط کر دیا تھا، انہیں حکمت بھی دی تھی اور ”فصل الخطاب“ بھی دیا تھا۔

﴿فَصَّلَ الْخُطَابَ﴾ یعنی الخطاب الفاصل۔ یہ اضافۃ الصفۃ الی الموصوف کی قبیل سے ہے۔ خطاب فاصل ایسا خطاب جو حق اور باطل میں فرق کرتا ہے۔ اللہ نے یہ بھی حضرت داؤد علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا۔ یہ جو ہم تقریر میں خطبہ پڑھنے کے بعد کہتے ہیں: ”أَمَّا بَعْدُ!“ اس کی ابتدا حضرت داؤد علیہ السلام نے کی تھی۔

### حضرت داؤد علیہ السلام کا امتحان:

﴿وَهَلْ أَتَاكَ نَبُوءُ الْخُصَمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ﴾

حضرت داؤد علیہ السلام عبادت میں مشغول تھے۔ دو آدمی اچانک دیوار

پھلانگ کر آئے اور کہا کہ ہمیں ایک مسئلہ بتائیں اور ساتھ ہی یہ کہا کہ زیادتی نہ کرنا، مسئلہ ٹھیک بتانا! اب دیکھو! یہ ان کا کتنی بے ادبی کا طرز ہے۔ مسئلہ کیا ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ میرے بھائی کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہے، یہ کہتا ہے کہ یہ ایک بھی مجھے دے دو۔ تو جس کی ننانوے ہیں وہ مدعی ہے اور جس کے پاس ایک ہے وہ مدعی علیہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا کہ اس نے بہت بڑی زیارتی کی ہے جو تیرے پاس ایک دنبی ہے وہ بھی مانگی ہے، اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے حق کو چھینتے رہتے ہیں۔ اتنی بات کی تو حضرت داؤد علیہ السلام کو اچانک خیال آیا کہ میرا تو امتحان ہو گیا، اللہ سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گئے۔ یہ ہے پورا واقعہ۔

### واقعہ کی پہلی توجیہ:

اب یہ جو دو بندے آئے تھے یہ کون تھے؟ یہ انسان تھے یا فرشتے تھے جو انسانی شکل میں آئے تھے؟ اگر تو یہ انسان تھے تو اب اس کا مطلب ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے گھر کا ماحول ایسا بنایا ہوا تھا کہ اوقات تقسیم کیے ہوئے تھے، چوبیس گھنٹے گھر میں کوئی نہ کوئی عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اللہ رب العزت سے عرض کیا: یا اللہ! چوبیس گھنٹے ہمارے گھر میں آپ کی عبادت ہوتی ہے۔ داؤد علیہ السلام کا یہ جملہ ٹھیک تھا لیکن اس کا طرز مناسب نہیں تھا یعنی بظاہر طرز سے یوں لگتا تھا کہ جیسے بندہ جتلا رہا ہو کہ ہم آپ کی بہت عبادت کر رہے ہیں۔ اللہ رب العزت نے فرمایا: یہ ہماری توفیق سے ہے، ایک دن ہم آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ دیں گے تو پھر دیکھیں گے کہ چوبیس گھنٹے عبادت ہوتی کیسے ہے۔

اب ایک دن داؤد علیہ السلام کی عبادت کا وقت تھا کہ اچانک دو بندے آئے۔ آپ سے مسئلہ پوچھا اور مسئلہ پوچھ کر چلے گئے تو حضرت داؤد علیہ السلام سوچنے

لگے اوہو! یہ جو میں نے کہا تھا کہ ہر وقت آپ کی عبادت ہوتی ہے، اب اس وقت تو عبادت ختم ہو گئی، یہ میں کس جھگڑے میں پڑ گیا ہوں۔ پھر فوراً داؤد علیہ السلام سجدے میں گر گئے کہ اللہ! تو مجھے معاف فرما دے، آپ کی توفیق کے بغیر کوئی عبادت نہیں کر سکتا۔

### واقعہ کی دوسری توجیہ:

کوئی سائل کسی بڑے آدمی سے مسئلہ پوچھے تو اب اس بندے کا امتحان ہوتا ہے کہ یہ تحمل سے جواب دیتا ہے یا غصہ ہوتا ہے؟ جب ان دو سائلوں نے ایسا بے جا طرز اختیار کیا تو حضرت داؤد علیہ السلام نے تحمل سے جواب دیا غصہ نہیں ہوئے۔ گویا اس امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن اگلا مسئلہ یہ تھا کہ داؤد علیہ السلام نے فرمایا:

﴿لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعَجْتِكَ إِلَىٰ نَعَايِهِ﴾

کہ اس شخص نے تیری دہی کو اپنی دہیوں کے ساتھ ملانے کا مطالبہ کر کے تجھ پر ظلم کیا ہے! دیکھیں مظلوم کو خطاب کیا اس بندے نے تیرے اوپر ظلم کیا ہے جو تیری ایک دہی تھی وہ بھی لے رہا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خطاب مظلوم کو نہیں بلکہ ظالم کو کرنا چاہیے تھا کہ تو نے غلط کیا جو اس کی ایک دہی بھی لے لی۔ اس طرز کو داؤد علیہ السلام سمجھے کہ یہ تو مجھ سے لغزش ہو گئی ہے، فوراً سجدے میں گر گئے کہ یا اللہ! مجھے معاف فرما!

### واقعہ کی تیسری توجیہ:

بعض مفسرین نے اس واقعہ کا ایک مطلب یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے دور میں کسی شخص نے ایک جگہ پیغام نکاح بھجوایا اور داؤد علیہ السلام نے بھی وہاں پیغام نکاح بھجوادیا تو اس کو بڑی تکلیف ہوئی کہ پیغام نکاح پر پیغام نکاح کیوں



بھجوا؟ حالانکہ یہ جائز تھا، ناجائز نہیں تھا لیکن بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو بڑوں کی شان کے لائق نہیں ہوتیں۔ تو اس پر پھر دو فرشتے آئے فرضی قضیہ لے کر بندوں کی شکل میں کہ یہ بتاؤ کہ اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہے، یہ کہتا ہے کہ یہ بھی مجھے دے دو! حضرت داؤد علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ تو مجھے سمجھانا مقصود ہے۔ یا اللہ! تو مجھے معاف فرما دے یعنی میرے پاس تو بیویاں پہلے سے ہیں، اس کے پاس نہیں ہے اور جہاں یہ کرنا چاہتا ہے وہاں میں نے پیغام نکاح بھجوایا! تو سجدے میں گر گئے، حالانکہ یہ کوئی ناجائز کام تو نہیں تھا بالکل جائز تھا۔

### حضرت داؤد علیہ السلام کا رجوع الی اللہ:

﴿وَلَمَّا دَاوُدُ فَتَنَهُ فَاِسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَاَنَابَ ۚ﴾

حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ اس واقعے سے ہم نے ان کو آزما دیا ہے تو انہوں نے اپنے رب سے مغفرت مانگی اور سجدے میں گر گئے اور اللہ کی طرف رجوع کیا۔

یہاں یہ بات سمجھیں۔ ﴿وَخَرَّ رَاكِعًا﴾ حضرت داؤد علیہ السلام سجدے میں گر گئے۔ یہاں اللہ لفظ ”رَاكِعًا“ لائے ہیں حالانکہ ”سَاجِدًا“ ہونا چاہیے تھا تو یہاں سجدے پر رکوع کا اطلاق ہوا ہے۔ اس سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلے کا استنباط فرمایا ہے کہ اگر آدمی دورانِ نماز آیت سجدہ پڑھ لے اور اس کے بعد رکوع میں چلا جائے اور رکوع میں سجدے کی نیت کرے تو سجدہ ادا ہو جائے گا، کیونکہ اللہ نے سجدے پر رکوع کا لفظ استعمال کیا ہے۔

### رکوع سے سجدہ تلاوت کی ادائیگی کی شرائط:

یہ مسئلہ ذہن میں رکھ لیں۔ اگر کوئی شخص دورانِ نماز آیت سجدہ تلاوت

کرے تو اس کو سجدے میں جانا چاہیے، نماز کے دوران سجدہ کرے، پھر کھڑا ہو کر اگلی تلاوت کرے، مستحب تو یہی ہے لیکن اگر آیت سجدہ پڑھنے کے بعد سجدہ میں نہ گیا بلکہ رکوع میں چلا گیا تو سجدہ تلاوت رکوع میں ادا ہو جائے گا لیکن اس کے لیے کچھ شرطیں ہیں:

**پہلی شرط...** یہ ہے کہ آیت سجدہ کے فوراً بعد یا تین آیات کی تلاوت کرنے سے پہلے رکوع کرے۔ اگر تین آیات کے بعد رکوع کیا اور اس میں سجدے کی نیت کی تو سجدہ ادا نہیں ہو گا۔

**دوسری شرط...** اگر آیت سجدہ تلاوت کی اور سجدہ میں چلا گیا تو سجدہ ادا ہو جائے گا اگرچہ سجدے کی نیت نہ کی ہو لیکن اگر رکوع میں چلا گیا تو رکوع میں سجدہ تب ادا ہو گا جب رکوع میں اس نے سجدے کی نیت کی ہو کیونکہ سجدے میں نیت کرے نہ کرے سجدہ ہو گیا ہے لیکن رکوع میں تب ہو گا جب نیت کی ہو۔

اب اس پر میں بطور استشہاد کے ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ اسے کہتے ہیں ”النظار“ جیسے ”الاشباہ والنظائر“ مستقل ایک کتاب ہے۔ جس طرح آدمی وضو کرے اور طہارت کی نیت نہ کرے تو وضو تب بھی ہو جاتا ہے لیکن اگر مٹی سے تیمم کرے اور طہارت کی نیت نہ کرے تو طہارت حاصل نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ کہ مٹی پاکیزگی کے لیے نہیں ہے اور پانی ہے ہی طہارت کے لیے۔ تو یہاں بھی سجدہ ہے ہی سجدے کے لیے، نیت نہ کرے تب بھی ہو جائے گا لیکن رکوع؛ رکوع ہوتا ہے سجدہ نہیں ہوتا، نیت کرے گا تو ہو گا نیت نہیں کرے گا تو نہیں ہو گا۔

اس کو بطور نظیر کے کسی نے پیش کیا یا نہیں کیا لیکن ہم نے پیش کر دیا ہے اور میں آپ کے سامنے اس کی اس لیے وضاحت کرتا ہوں تاکہ آپ اس پر دل چھوٹانے کیا کریں کہ اس سے کسی اور نے تو استدلال نہیں کیا تو آپ کیوں کہتے ہیں؟ اگر کسی اور نے

نہیں کیا تو بھائی ہم نے تو استدلال کر لیا ہے۔ اب بعد والے اس کو پڑھیں گے تو وہ تو کہیں گے کہ مولانا نے استدلال کیا ہے!

میں اس لیے سمجھاتا ہوں کہ مسئلہ کبھی تبدیل نہ کرنا! مسئلہ وہی بتانا جو ہمارے مشائخ نے لکھا ہو۔ اس مسئلہ پر اگر مشائخ نے دس دلائل دیے ہیں اور ہم نے بارہ دے دیے ہیں تو اس میں الجھن کی کون سی بات ہے؟! مزید دلیل کا پیش کرنا تو کوئی الجھن کی بات نہیں ہے، ہاں البتہ مسئلے کو تبدیل کرنا یہ غلط بات ہے۔

### قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ رکھنا:

﴿وَخَزَرًا كَعَا وَآنَابٍ﴾... اس آیت کو میں بطور استنبہاد کے ایک اور مسئلہ پر پیش کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں مسئلہ اس طرح ہے کہ اگر کوئی شخص قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ ڈالنا چاہے تو یہ جائز ہے، اس پر ہمارا استدلال یہ ہے کہ ایک روایت ہے عقیقہ کے بارے میں اور ایک روایت ہے قربانی کے بارے میں۔ جو روایت قربانی کے بارے میں ہے اس میں ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ صَلَّى صَلَاتَنَا وَنَسَكَ نُسُكَنَا فَقَدْ أَصَابَ النُّسُكَ.

کہ جس نے نماز پڑھی اور پھر جانور ذبح کیا تو اس نے قربانی کی ہے۔  
وَمَنْ نَسَكَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَيَنَلِكْ شَاةُ لَحْمٍ.

اور جس نے قربانی نماز سے پہلے کر دی تو اس نے گوشت تو کھا لیا لیکن اس کی قربانی نہیں ہوئی۔<sup>48</sup>

تو یہاں قربانی پر لفظ ”نسک“ استعمال ہوا ہے۔ عقیقہ کے بارے میں فرمایا:  
”مَنْ وَلِدَ لَهُ وَلَدٌ“ جس کے ہاں بچہ پیدا ہو، ”فَأَحْبَبَ أَنْ يَنْسُكَ عَنْهُ“ اور

وہ اس کا عقیقہ کرنا چاہے، ”فَلْيُنْشِكْ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافَأَتَيْنِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاتًا“ تو اگر لڑکا ہو تو دو بکریاں کر لے اور اگر لڑکی ہو تو ایک بکری کر لے۔<sup>49</sup>

اب دیکھو! یہاں عقیقے کے بارے میں لفظ ”نسک“ آیا ہے جس طرح قربانی کے لیے لفظ ”نسک“ ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر عقیقہ کا حصہ قربانی کے جانور میں ڈالنا چاہیں تو ڈال سکتے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ جو لفظ قربانی کے لیے ہے وہی لفظ عقیقہ کے لیے ہے۔ یہ تو ہمارے فقہاء نے دلائل دیے ہیں جو ہمارے متخصصین قربانی کے مسائل والی فائل میں پڑھ چکے ہیں۔

میں اس آیت کو بطور استنبہاد کے اس مسئلہ پر پیش کر رہا ہوں کہ قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ ڈالنا جائز ہے، کیونکہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ اگر نماز میں آدمی آیت سجدہ تلاوت کرے اور رکوع میں نیت سجدے کی کرے تو سجدہ ادا ہو جائے گا۔ دلیل ”رَاكِعًا“ ہے کہ سجدہ پر لفظ رکوع کا استعمال ہوا ہے۔ اب اس آیت کو بطور استنبہاد اس مسئلے پر کسی نے پیش کیا ہے یا نہیں یہ میرے علم میں نہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ اس آیت کو بطور مثال کے اس مسئلے پر پیش کر سکتے ہیں۔

### حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر:

﴿وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾

حضرت داؤد علیہ السلام کو ہم نے سلیمان بیٹا دیا، وہ بہت اچھے آدمی تھے، اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام جہاد فرماتے تھے۔ آپ نے گھوڑے منگوائے دیکھنے کے لیے، بہت خوش ہوئے، فرمایا: ﴿رُدُّوْهَا عَلَيَّ﴾ دوبارہ پھر لاؤ! پھر لائے گئے

تو ان گھوڑوں کو چیک کرتے کرتے سورج غروب ہو گیا اور عصر کی نماز فوت ہو گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بہت روئے، اللہ سے دعا مانگی کہ اے اللہ! مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ اب یہ گناہ نہیں ہے کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا گھوڑوں کو چیک کرنا بھی عبادت تھی، مشغول اتنے ہوئے کہ خیال نہیں رہا کہ میں نے نماز پڑھنی ہے۔

﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عِزًّا﴾<sup>50</sup> حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے وہ بھی گناہ نہیں ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام بھول گئے تو بھی گناہ نہیں ہے لیکن پیغمبر کی شان ایسی ہے کہ نبی اس پر بھی استغفار کر لیتا ہے۔

### دینی مشغولیت کی وجہ سے نماز قضا ہونا:

اب غزوہ خندق کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عصر کی نماز چلی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں قضا کی اور پھر آپ نے کفار کے لیے بد دعا کی۔ فرمایا:

"مَلَأَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ بُيُوتَهُمْ وَقُبُورَهُمْ نَارًا كَمَا شَغَلُونَا عَنْ صَلَاةِ الْوُسْطَى." <sup>51</sup>

یہاں دیکھیں! نماز قضا ہوئی نہیں قضا کروائی ہے تاکہ امت کو مسئلہ سمجھ آئے کہ بسا اوقات دین کی مشغولیت میں نماز قضا ہو سکتی ہے جیسے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے قضا ہوئی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سوتے ہیں تو آپ کا دل جاگتا ہے لیکن اس کے باوجود لیلۃ التعریس میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اور سارے صحابہ کی نماز چلی گئی۔ رات کا آخری پہر تھا، سب سونے لگے۔ کچھ وقت کے بعد صبح صادق ہونی تھی اور پھر

آگے سورج نکلنا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمیں نماز کے لیے کون اٹھائے گا؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں! سارے سو گئے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جدھر سے سورج نکلنا تھا اس طرف منہ کیا اور کجاوے کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھے، ان پر بھی نیند غالب آگئی اور آپ سو گئے۔ جب سورج نکلا سب بیدار ہوئے تو حضور نے پوچھا: بلال! کیا ہوا؟ کہا کہ جس اللہ نے آپ کو سلا یا اس نے مجھے بھی سلا دیا۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی نماز کیوں قضا ہوئی تو یہ تکویناً ہوا ہے تاکہ آئندہ کبھی دینی مشغولیت کی وجہ سے استاد شاگردوں سمیت ایسا واقعہ ہو جائے تو اس پر طنز نہیں کرنا! ہاں تمہاری سستی کو دخل نہ ہو لیکن اگر پھر بھی ایسا ہو جائے تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایسے ہو گیا تھا تاکہ کل ایسا معاملہ پیش آئے تو امت کو مسئلہ سمجھ آجائے۔ ایک ہے کہ زبان سے فرماتے کہ یوں قضا کرو اور ایک ہے کہ عمل سے بتایا کہ یوں اذان دو، یوں تکبیر پڑھو! تو مسئلہ سمجھ آگیا۔

**گھوڑوں کی پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرنے کی توجیہات:**

﴿فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ﴾

جب نماز قضا ہو گئی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ گھوڑوں کو دوبارہ لاؤ! دوبارہ لائے تو آپ علیہ السلام نے گھوڑے ذبح کر دیے کہ ان کی وجہ سے میری نماز قضا ہو گئی ہے۔ اب اس پر اشکال یہ ہے کہ نماز تو قضا ہو گئی ہے اس میں گھوڑوں کا کیا قصور تھا، ان کو کیوں ذبح کیا؟

ہم کہتے ہیں کہ اس میں اشکال کی بات ہی نہیں ہے کیونکہ گھوڑے ان کی ملکیت تھے، اپنے گھوڑے ذبح کرنا کون سی حرج کی بات ہے؟ پھر اس دور میں جیسے گائے اور بھینس کا کھانا جائز تھا گھوڑے کا کھانا بھی جائز تھا۔ اور بعض حضرات نے اس کا معنی بہت اچھا کیا ہے کہ ﴿رُدُّوْهَا عَلٰی﴾ سلیمان بہت خوش ہوئے، فرمایا: ان کو واپس

لاؤ، واپس؛ لایا گیا ﴿فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ﴾ آپ نے ان کی گردنیں نہیں کاٹی تھیں بلکہ محبت کی وجہ سے خوش ہو کر ان کی گردن اور پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرتے رہے اور یہ خوشی اس وجہ سے نہیں تھی کہ میرے پاس مال ہے بلکہ اس وجہ سے تھی کہ میں ان سے جہاد کروں گا، یہ دین کے کام آئیں گے۔ تو دینی امور کی وجہ سے بندے کا خوش ہونا یہ پیغمبر کی شان ہے۔

### خود پر سزا مقرر کرنا:

اب یہ مستقل مسئلہ ہے کہ اگر کسی آدمی سے کسی معاملہ میں سستی یا کوتاہی ہو اور وہ اپنے نفس کے لیے سزا متعین کر لے تو جائز ہے یا نہیں؟ صوفیاء کے نزدیک جائز ہے اور ان کی اصطلاح میں اس کو ”غیرت“ کہتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک صحابی حضرت ابو جہم رضی اللہ عنہ نے ایک شامی چادر پیش کی جس پر کچھ پھول بنے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی۔ بعد میں کہا کہ عائشہ! چادر ابو جہم کو واپس دے دو، نماز کے دوران پھولوں پر میری نظر پڑی تو مجھے کھکا لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے میری نماز میں غفلت آنا شروع ہو جائے۔

صحابی رسول ہیں حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ، اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے ہیں اور باغ میں پرندے کو دیکھا تو اسی کی طرف دیکھنے لگ گئے۔ نماز کے بعد کہا کہ میرا باغ صدقہ ہے، اس کی وجہ سے نماز کی طرف میرا دھیان نہ رہا! تو اپنے نفس کو ایسی سزائیں دینا جائز ہے گناہ نہیں ہے۔

### حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش:

﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَأَلْقَيْنَا عَلَى كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ﴾

اس آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک اور آزمائش کا ذکر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ سوچا کہ میں آج رات اپنی تمام بیویوں کے پاس جاؤں گا، ان سے بیٹے پیدا ہوں گے جو اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے۔ اس وقت آپ ان شاء اللہ کہنا بھول گئے۔ اللہ رب العزت کو اپنے نبی کی یہ بات پسند نہ آئی۔ تمام ازواج میں سے صرف ایک بیوی سے بچہ پیدا ہوا اور وہ بھی مردہ اور آدھا دھڑ نہیں تھا۔ تو کسی خادمہ نے لا کر حضرت کے سامنے کرسی پر ڈال دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس پر تنبہ ہوا کہ میں نے ان شاء اللہ نہیں کہا یہ اس کا نتیجہ ہے۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ کی طرف رجوع فرمایا اور استغفار کیا۔

### امارت طلب کرنا کب جائز کب ناجائز؟

سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مآگی:

﴿قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي إِنَّكَ

أَنْتَ الْوَهَّابُ﴾

اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی حکومت دے کہ میرے بعد کسی کو ایسی حکومت نہ ملے۔ اور واقعاً سلیمان علیہ السلام کے بعد کسی کو ایسی حکومت نہیں ملی کہ جس کی حکومت جنات پر بھی ہو، پرندوں پر بھی ہو، چرندوں پر بھی ہو، ہوائیں بھی اس کے تابع ہوں، ایسی حکومت اللہ نے ان کو دی۔

اس پر بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ سے حکومت مانگی ہے جبکہ حدیث مبارک میں ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ”لَا تَسْأَلِ إِلَّا مَارَةً فَإِنَّكَ إِن أُعْطِيََتْهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وَكَلَّتْ إِلَيْهَا“ کہ کوئی امارت طلب نہ کرنا، کیونکہ اگر مانگنے سے تمہیں کوئی عہدہ کوئی امارت ملی تو تم جانو اور امارت جانے، اللہ کی طرف سے کوئی مدد نہیں



آئے گی، ”وَإِنْ أُعْطِيَتْهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِدَّتْ عَلَيْهَا“ اور اگر مانگے بغیر کوئی امارت ملی تو اللہ کی طرف سے تمہیں مدد ضرور ملے گی۔<sup>52</sup>

اس سے پتا چلا عہدہ اور امارت طلب نہیں کرنی چاہیے۔

اس کا جواب سمجھ لیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ آدمی کو صرف عہدہ کا طالب نہیں ہونا چاہیے، باقی سلیمان علیہ السلام کا مانگنا اس لیے تھا تا کہ اس کے ذریعے دین کا نفاذ ہو، تو اگر مقصد دین کا نفاذ ہو تو پھر اللہ سے حکومت مانگنا جائز ہے اور جب مقصد دین کا نفاذ نہ ہو پھر حکومت مانگنا جائز نہیں ہے۔

### حضرت ایوب علیہ السلام:

﴿وَإِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ﴾

عَذَابٍ ﴿١٦﴾

حضرت ایوب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ستر سال صحت کی زندگی دی۔ پھر امتحاناً اللہ تعالیٰ نے سات سال بیماری دی۔ بیماری اتنی سخت تھی کہ سارے خاندان والے چھوڑ گئے۔ سات بیٹے تھے اور سات بیٹیاں تھیں وہ بھی انتقال کر گئے، تنہا بیوی رہ گئی، وہ مزدوری کر کے حضرت ایوب علیہ السلام کو کھلایا کرتی تھیں، ان کی بیوی کا نام لیلا تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کی پوتی یا بیٹی تھیں۔ ایوب علیہ السلام کی بیوی نے ان کی بہت خدمت کی، اور عجیب بات یہ ہے کہ سات سال کی بیماری میں حضرت ایوب علیہ السلام نے کبھی صحت کی دعا نہیں مانگی، صبر کی انتہا ہے، کبھی بیوی کہتیں کہ آپ اللہ سے دعا مانگیں اللہ آپ کو صحت دے دیں۔ فرماتے: ستر سال اس نے صحت دی ہے، سات سال بیماری دی تو کیا فرق پڑتا ہے؟ مجھے اللہ سے دعا مانگتے بھی حیا آتی ہے

حالانکہ دعا مانگنی چاہیے غلط نہیں ہے۔

ایک دن شیطان انسانی شکل میں طبیب کے روپ میں ان کی بیوی سے ملا۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی نے کہا کہ میرے شوہر کے لیے کوئی دوائی دو، ان کو صحت مل جائے۔ اس نے کہا کہ میں علاج کرتا ہوں، یہ ٹھیک ہو جائیں گے لیکن میری ایک شرط ہے، اگر یہ ٹھیک ہو جائیں تو تُو نے کہنا ہے کہ تو نے ان کو شفا دی ہے، میں اس کے علاوہ کوئی اجرت نہیں لوں گا۔ انہوں نے جا کر ایوب علیہ السلام کو بتایا کہ مجھے ایک بندہ ملا اور اس نے یوں کہا۔ ایوب علیہ السلام نے کہا: بھلی مانس! وہ تو شیطان تھا تو اس کی باتوں میں آگئی ہے۔ اس پر آپ کو بہت دکھ ہوا کہ دیکھو میری بیماری کی وجہ سے شیطان اتنا جری ہو گیا ہے کہ اب وہ میری بیوی سے یہ کفریہ کلمات کہلوانا چاہتا ہے۔ تو حضرت ایوب علیہ السلام نے قسم کھا کر فرمایا کہ اگر اللہ نے مجھے شفا عطا فرمائی تو میں تجھے سو چھڑیاں ماروں گا۔

آپ بہت پریشان ہوئے اور پریشانی میں اللہ سے دعا کی کہ اللہ مجھے صحت دے دیں، اب خدشہ ہے کہ ہمارے گھر میں کہیں ایسی چیزیں نہ آجائیں جن سے دین کا نقصان ہو۔

اللہ پاک کی طرف سے وحی آگئی کہ زمین پر ایڑی ماریں، پانی کا ایک چشمہ نکلے گا، اس پانی سے غسل بھی کریں اور اس کو پیئیں بھی! آپ نے غسل بھی کیا اور پانی کو پیا بھی تو ٹھیک ہو گئے۔ اللہ نے جنت سے ایک لباس عطا فرمایا۔ آپ وہ پہن کر اسی جگہ کے قریب بیٹھ گئے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی اہلیہ آئیں تو حضرت ایوب علیہ السلام جنتی لباس پہن کر حالت صحت میں بیٹھے تھے، انہوں نے آکر پوچھا: یہاں میرے بیمار شوہر بیٹھے تھے، اب وہ کدھر گئے؟ وہ بہت پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو میں ہی

ہوں۔ کہا کہ کیوں مذاق کرتے ہو؟ کہا کہ ذرا پہچانو مجھے! انہوں نے پھر کچھ باتیں کیں تو پہچان گئیں۔

اب اللہ رب العزت نے قسم پوری کرنے کا طریقہ بتا دیا کہ ان کو سو چھڑیوں کا ایک گٹھنا کر ماریں۔ بعض مفسرین نے اس کا ترجمہ قمچیاں کیا ہے اور بعض نے سینکیاں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ تو فرمایا کہ گٹھنا کر اس کو مار دو تو تمہاری قسم بھی پوری ہو جائے گی اور اس کو زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ﴾<sup>53</sup>

ہم نے ان کی دعا کو قبول کیا، ان کی بیماری کو بھی دور کر دیا، ان کو ان کے گھر والے بھی دے دیے اور اتنے لوگ اور بھی دیے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ سات بیٹے اور سات بیٹیاں اللہ نے اور بھی دیں اور جو فوت شدہ تھے خدا نے ان کو بھی زندہ کر دیا۔ اللہ نے کچھ عرصہ امتحان لیا پھر اللہ نے کامیابیاں عطا کیں۔ اس لیے مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ بہتر تفسیر یہی ہے کہ جو بچے ان کے فوت ہو چکے تھے وہ بھی زندہ ہو گئے اور اللہ نے مزید بھی دیے۔

**حضرت ایوب علیہ السلام کو حیلہ کی تعلیم:**

﴿وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِهِ وَلَا تَحْنُتْ﴾

آج بھی مسئلہ یہی ہے کہ اگر کوئی شخص سو چھڑیاں مارنے کی قسم کھائے تو سو باریک شاخیں اکٹھی کرے اور گٹھنا کر مار دے، لیکن دو شرطیں ہیں:

❖ پہلی کہ وہ سو کی سو طولاً یا عرضاً اس شخص کے بدن کو لگیں۔

❖ دوسری کہ اس سے بندے کو کچھ نہ کچھ تکلیف بھی ہو۔

تو جو حکم اس وقت تھا وہ حکم آج بھی ہے، یوں اس کی قسم پوری ہو جائے گی۔ یہاں ایک اور بات بھی سمجھیں۔ وہ یہ کہ انہوں نے فرمایا تھا کہ میں سو چھڑیاں ماروں گا اللہ رب العزت نے ایک حیلہ بتا دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں حیلہ کا جواز ہے، لہذا حیلے کا انکار نہ کرو لیکن ایک بات یاد رکھو کہ اگر حیلہ سے مقصود نرمی ہو... آسانی ہو... شریعت پر عمل ہو... تو پھر جائز ہے اور اگر حیلہ سے مقصود حکم شرعی کا ابطال ہو پھر جائز نہیں ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں قسم کا اصلی تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی زوجہ مطہرہ کو پوری سو قمچیاں ماریں لیکن چونکہ ان کی زوجہ مطہرہ بے گناہ تھیں اور انہوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کی بے مثال خدمت کی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود حضرت ایوب علیہ السلام کو ایک حیلہ کی تلقین فرمائی اور یہ تصریح کر دی کہ اس طرح ان کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ اس لیے یہ واقعہ حیلہ کے جواز کی دلیل ہے۔

جیسا کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا قصہ مشہور ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ السلام کی خدمت میں گوشت پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ گوشت ہے جو حضرت بریرہ کو صدقہ میں دیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ان کے لیے صدقہ ہے اور ہمارے لیے ہدیہ ہے۔ اب ٹھیک ہے کوئی حرج نہیں ہے۔<sup>54</sup>

### جائز اور ناجائز حیلوں کی تفصیل:

اور ایسا حیلہ جس سے حکم شرعی کو باطل کرنا مقصود ہو تو وہ جائز نہیں ہے۔

مثلاً ایک آدمی کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں، اس پر زکوٰۃ فرض ہے، یہ پیسے اس کو کیم شوال کو ملے تھے۔ وہ آئندہ بیس رمضان کو وہ پانچ لاکھ روپے بیوی کو ہدیہ دے دے اور دس شوال کو بیوی اس کو ہدیہ دے دے تو زکوٰۃ تو فرض نہیں ہوگی کیونکہ مال پر ایک سال گزرنا فرض ہے، ایک سال تو گزرا نہیں ہے تو زکوٰۃ کیسے فرض ہوگی؟ لیکن یہ جو حیلہ کیا گیا ہے حکم شرعی کو باطل یعنی زکوٰۃ کو ختم کرنے کے لیے کیا گیا ہے اس لیے یہ حیلہ جائز نہیں ہے۔

### قیامت بہت بڑی خبر ہے:

﴿قُلْ هُوَ نَبَوُّا عَظِيمٌ ۝۱۷﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ ﴿۱۸﴾ مَا كَانَ لِي مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَأِ  
الْأَعْلَىٰ اِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿۱۹﴾ اِنْ يُؤَخِّرِ اِلَیَّ اِلَّا اَنْتُمْ اَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۲۰﴾

آپ فرمادیتے ہیں کہ یہ قیامت تو بہت بڑی خبر ہے جس سے تم منہ پھیر رہے ہو۔ اس کو ماننے سے انکار کر رہے ہو۔ مجھے تو عالم بالا کی کچھ خبر نہیں جس وقت وہاں گفتگو کر رہے تھے۔ اللہ رب العزت نے سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: ﴿اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ کیا آپ ایسے بندے کو خلیفہ بنائیں گے کہ جو خون ریزی کرے گا اور فساد مچائے گا۔ یہ ہے ﴿اِذْ یَخْتَصِمُونَ﴾ کہ ملائکہ کا اختصام اور گفتگو ہو رہی تھی اس کے متعلق حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ آپ فرمائیں کہ میں تو وہاں موجود ہی نہیں تھا اس کے باوجود میں تمہیں بتا رہا ہوں، اس سے ثابت ہوا کہ یہ وحی ہے۔

### تخلیق آدم اور فرشتوں کو سجدہ کا حکم:

﴿اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝۱﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهُ

وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ﴿٤٢﴾

جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا: میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ نبی بشر ہوتا ہے اور یہ سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام کی بات ہو رہی ہے۔ جب آدم علیہ السلام کا بدن ٹھیک کر لوں اور اس میں اپنی روح ڈال دوں تو تم اس کے آگے سجدہ میں گر جانا! اس سے معلوم ہوا کہ نبی وہ جسم ہے جس میں روح ہو، وحی آنا تو شرط ہے وہ تو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

چونکہ آج نبی بحث چل پڑی ہے کہ نبی جسم کو کہتے ہیں یا روح کو؟ ہم کہتے ہیں کہ نبی اس جسم کو کہتے ہیں جس میں روح ہو۔

وفات کے بعد نبی؛ نبی ہوتا ہے کیونکہ نبی اس جسم کو کہتے ہیں جس میں روح ہو! اب دیکھیں کتنا مسئلہ حل ہو گیا۔ نبی وفات کے بعد بھی نبی ہوتا ہے اس کا معنی کہ وفات کے بعد بھی نبی کی روح کا جسم کے ساتھ تعلق ہوتا ہے تبھی تو نبی ہو گا! اگر روح اور جسم کا تعلق بالکل ختم ہو جائے تو نبی آپ کسے کہیں گے؟ کیونکہ تنہا جسم بھی نبی نہیں تنہا روح بھی نبی نہیں ان دونوں کا مجموعہ نبی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر تک روح اور جسم کا تعلق برقرار رہے گا، یہ ختم نہیں ہو سکتا۔

**کائنات کا سب سے پہلا اجماع:**

﴿فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ﴾ (۴۳) إِلَّا إِبْلِيسَ ۖ اسْتَكْبَرَ وَكَانَ

مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿۴۴﴾

تمام فرشتوں نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا، اس نے تکبر کیا وہ کافروں میں سے ہو گیا۔

اس کائنات میں سب سے پہلا اجماع ملا نکہ کا ہے اور اجماع کا سب سے پہلا

منکر ابلیس ہے۔ اب جو اجماع کے قائل ہیں وہ ملائکہ کے راستے پر ہیں اور جو اجماع کے منکر ہیں وہ ابلیس کے راستے پر ہیں۔

اور یہ بات اچھی طرح ذہن میں رکھنا! اجماع امت معصوم ہوتا ہے، اجماع امت میں خطا نہیں ہوتی۔ تو جس طرح فرشتہ معصوم ہوتا ہے اور جس طرح نبی معصوم ہوتا ہے اسی طرح امت کا اجماع بھی معصوم ہے اور معصوم کی جگہ جنت ہوتی ہے جہنم نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ بھی جنتی اور اس کے راستے پر چلنے والے بھی جنتی اور اجماع کا جو مخالف ہے اس کے مخالف ہونے کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا: ﴿اَسْتَكْبِرُ﴾ اس کی وجہ تکبر ہے۔

﴿وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ ... تکبر کیا اور کافر ہو گیا۔ کَانَ کے معنی میں ہے یا مطلب یہ ہے کہ ”كَانَ فِيْ عِلْمِ اللّٰهِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ“ اللہ کو پہلے سے علم تھا کہ یہ کافر ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابلیس اتنا بڑا عابد تھا کہ فرشتہ نہ ہو کر بھی فرشتوں میں شمار ہوتا تھا، اور اتنا بڑا عالم تھا کہ اللہ سے بھی دلیل سے بات کرتا، اللہ نے پوچھا: ﴿مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیْدَیْ﴾ تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ ابلیس نے جواب دیا: ﴿اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ﴾ کہ میں آدم - علیہ السلام - سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے بنایا۔ یہ اللہ سے مناظرہ کر رہا ہے اگرچہ دلیل اس کی غلط تھی، آگے یہ بات آئے گی، اور عارف اتنا تھا کہ اللہ نے فرمایا: ﴿فَاَخْرِجْ مِنْهَا فَانَّا كَرِہِمُ﴾ کہ دفع ہو جا تو مردود ہے۔ ابلیس نے کہا: ﴿فَاَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمٍ یُّبْعَثُوْنَ﴾ مجھے مہلت دے دیں اٹھنے کے دن تک۔ اللہ نے فرمایا: ﴿فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ﴾ جاتجھے مہلت

ہے۔ خدا کے مزاج کو اتنا سمجھتا تھا کہ اللہ حالت غضب میں ہیں اور یہ اس حالت میں اللہ سے مہلت مانگ رہا ہے لیکن اس میں ایک کمی یہ تھی کہ یہ عاشق نہیں تھا، یہ یہاں بھنس گیا تھا۔ جو عاشق ہوتا ہے وہ دلائل نہیں مانگتا، وہ بغیر دلائل کے بات مانتا ہے۔

اس لیے آدمی کو عالم بھی ہونا چاہیے، عارف بھی ہونا چاہیے، عابد بھی ہونا چاہیے اور عاشق بھی ہونا چاہیے۔ عاشق وہ نہیں جسے آپ لوگ عاشق کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾<sup>55</sup> جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ پورے قرآن میں اللہ نے لفظ عشق کو استعمال نہیں کیا کیونکہ عرف میں عشق کا استعمال غلط ہوتا ہے بلکہ اللہ نے اس کو ”اشد حب“ سے تعبیر کیا ہے، بس یہی عشق ہے۔

اللہ نے جب اس سے پوچھا: ﴿أَسْتَكْبَرْتَ﴾ کیا تو نے تکبر کیا ہے؟ ﴿أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ﴾ یا تو ہے ہی بڑا؟ یعنی تو چھوٹا ہو کر خود کو بڑا سمجھتا ہے یا واقعاً تو بڑا ہے؟ اس نے کہا: ﴿أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ﴾ کہ میں ہوں ہی بڑا، ﴿خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ﴾ کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔

اب ایک بات سمجھیں! اس نے کہا کہ میں بڑا ہوں اور دلیل پیش کی کہ میں آگ سے بنا ہوں۔ حافظ ابن قیم نے بدائع الفوائد میں پندرہ دلائل اس پر پیش کیے ہیں کہ مٹی آگ سے بہتر ہے۔ اللہ کو پتا ہے کہ مٹی افضل ہے لیکن خدا نے دلیل کا جواب نہیں دیا، فرمایا: ﴿فَاخْرُجْ﴾ دفع ہو جا! اس سے معلوم ہوا کہ ہر جگہ پر دلیل نہیں ہوتی کبھی بغیر دلیل کے بھی نکال دیتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں: اس کی ذہن سازی کرو، اس کی



تشفیٰ کراؤ، اس کو بات سمجھاؤ۔ میں نے کہا: بعض کوڑھ مفر ہوتے ہیں، ان کو دلیل نہیں دیتے بس ان کو فارغ کر دیتے ہیں۔

### دینی امور پر اجرت کا جواز:

﴿قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ﴾

اللہ فرماتے ہیں: اے پیغمبر! ان سے کہو کہ میں تم سے کوئی پیسہ نہیں مانگتا۔ جو لوگ تعلیم دین پر اجرت کے مخالف ہیں وہ اس آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دین بیان کرتے ہیں لیکن پیسے نہیں لیتے اور کہتے ہیں: ﴿مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ﴾

اس آیت کو بطور دلیل پیش کرنا غلط ہے، کیونکہ ہم علماء تنخواہ اپنے مخالف سے نہیں بلکہ اپنے موافق سے لیتے ہیں اور پیغمبر؛ یہ خطاب اپنے موافق کو نہیں بلکہ اپنے مخالف کو کرتا ہے۔ یہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ﴿مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ﴾ کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، یہ کفار سے کہتے تھے یا صحابہ سے کہتے تھے؟ کفار سے کہتے تھے اور ہم تنخواہ کن سے لیتے ہیں؟ مسلمانوں سے۔ یہ تو دلیل بنتی ہی نہیں، اس کا جواب تو بعد کا مسئلہ ہے۔

میں اس لیے آپ سے کہتا ہوں کہ پہلے مسئلہ کی تنقیح کرو، اس کے بعد دیکھو کہ جواب کی حاجت بھی ہے یا نہیں؟ اللہ کے نبی یہ بات صحابہ سے فرماتے تو اب جواب کی ضرورت پڑتی، یہ بات تو آپ نے اپنے مخالفین سے فرمائی ہے۔ لہذا یہ ان لوگوں کی دلیل ہے ہی نہیں، جب دلیل نہیں تو اس کا جواب دینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔

### تکلفات کے بجائے سادگی کو رواج دیجیے:

﴿وَمَا آتَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ﴾

فرمایا آپ یہ بھی فرمادیں کہ میں تکلف نہیں کرتا، یہ میرا مزاج نہیں ہے، میں سیدھی سیدھی بات کہتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ صحابہ کے اوصاف کے بارے میں بہت پیارا جملہ فرماتے ہیں، میں کئی بار سنایا کرتا ہوں۔

كَانُوا أَفْضَلَ هَذِهِ الْأُمَّةِ أَبَوَّهَا قُلُوبًا، وَأَعَمَّقَهَا عِلْمًا، وَأَقْلَبَهَا تَكَلُّفًا.<sup>56</sup>

تین صفتیں عجیب بیان کی ہیں: ”أَبَوَّهَا قُلُوبًا“ صحابہ دل کے صاف ہوتے تھے، دل میں میل نہیں تھا۔ ”وَأَعَمَّقَهَا عِلْمًا“ علم بہت گہرا ہوتا تھا۔ ”وَأَقْلَبَهَا تَكَلُّفًا“ مزاج میں بے تکلفی ہوتی تھی۔

آج ہمارے دل میں بغض ہے، علم سے کورے ہیں اور مزاج میں تکلفات ہیں، بس اچھے کپڑے پہن کر ہم پیر بننے کی کوشش کرتے ہیں، تقریریں کر کے خطیب بننے کی کوشش کرتے ہیں اور اصلاح کے نام پر غیبت کرتے ہیں۔ اللہ ہم سب کی اصلاح فرمادیں۔ کل ہماری شوریٰ کا اجلاس تھا عشا کے بعد، میں اپنے اراکین شوریٰ سے کہہ رہا تھا کہ ایک بات یاد رکھو! کسی بندے کے بارے میں دل سے بغض ختم کرنا ہو تو اس کے لیے دعا کرو بغض ختم ہو جائے گا۔

ہمارے مخالف سے مخالف لوگ دنیا میں ہیں اور میں قسم کھاؤں تو حانث نہیں ہوں گا کہ میرے دل میں کسی کا بغض نہیں ہے، اس کی وجہ کہ جو میری مخالفت کرتا ہے خدا شاہد ہے میں اس کا نام لے کر دعائیں شروع کر دیتا ہوں اس طرح بغض ختم ہو جاتا ہے، دل میں نفرت نہیں رہتی۔ یہ کام تھوڑا سا مشکل ہوتا ہے لیکن جب آپ شروع کر دیں گے تو ان شاء اللہ طبیعت بن جائے گی۔

وَاجْزُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الزمر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ

الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۝﴾

لفظ دین کے معانی:

﴿الدِّينَ﴾ ... یہاں دین کا معنی عبادت ہے۔ بسا اوقات دین کا معنی

قیامت بھی ہوتا ہے ﴿مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ اللہ قیامت کے دن کا مالک ہے، اور کبھی

دین کا معنی شریعت ہوتا ہے۔ شریعت سے مراد منصوصات؛ وہ عقائد اور اعمال ہیں جو

نص میں صراحت سے آئے ہیں، اسے بھی دین کہتے ہیں لیکن یہ تب ہے جب دین کا

تقابل مذہب کے ساتھ ہو۔ جب دین کا مقابل دنیا کے ساتھ ہو تو دین سے مراد قیامت

ہے، اور جب دین کا مقابل مذہب کے ساتھ ہو تو پھر دین کہتے ہیں منصوصات کو اور

مذہب کہتے ہیں اجتہادیات کو۔ یہاں الدین سے مراد عبادت ہے۔

عبادت خالص مطلوب ہے:

﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّينُ الْخَالِصُ ۚ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ اَوْلِيَاءَ مَا

نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ ذُلْفٰی﴾

اللہ کے لیے خالص عبادت ہے۔ ملاوٹ والی عبادت اللہ قبول نہیں فرماتے۔ وہ مشرکین جو ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اور پھر ان کی عبادت کرتے، پھر فرشتے کی اپنے خیال کے مطابق ایک تصویر بنا لیتے تھے، اس کا بت بناتے پھر اس بت کی پوجا کرتے اور وہ کہتے کہ جس فرشتے کی تصویر کی ہم بت بنا کر پوجا کرتے ہیں اس سے وہ خوش ہوتا ہے، جب خوش ہو گا تو اللہ کے ہاں ہماری سفارش کرے گا۔ تو فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ﴾ جن لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے معبود بنائے ہوئے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت کرتے ہیں، کیوں؟ ﴿يَقْرَبُونَآ إِلَى اللَّهِ ذُنُفًى﴾ تاکہ یہ ہم کو اللہ کے قریب کریں، اللہ کے ہاں سفارش کریں حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اللہ رب العزت ان کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿لَوْ أَرَادَ اللَّهُ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفَىٰ مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ سُبْحَنَهُ﴾ اللہ اگر اولاد بنانا چاہتے تو جو اللہ کو مخلوقات میں سے پسند ہوتا وہ بنا دیتے، اللہ رب العزت تو اولاد سے پاک ہیں۔ یہ جو دعوائے شفاعت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ان بتوں کی شفاعت ہوگی تو یہ بات سمجھ لیں کہ شفاعت کے لیے دو شرطیں ہیں:

1: شفاعت کرنے والا اللہ کے ہاں مقبول ہو۔

2: جس کی شفاعت ہونی ہے وہ قابل مغفرت ہو۔

اگر تو یہ عبادت کرتے جناتِ شیطین کی تو وہاں شفاعت کی ایک شرط ختم ہے کہ وہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہیں اور اگر یہ عبادت کریں ملائکہ کی تو ملائکہ اللہ کے ہاں مقبول تو ہیں لیکن یہ لوگ قابل مغفرت نہیں کیونکہ یہ مشرک ہیں۔ تو شفاعت میں دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے؛ جو سفارش کرے وہ مقبول ہو اور جس کی سفارش کی جا رہی ہو وہ قابل مغفرت ہو۔ مشرک قابل مغفرت نہیں ہوتا۔

## موشیوں کے آٹھ جوڑے اتارنے کا معنی:

﴿حَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلْ مِنْهَا زَوْجَهَا وَانْزَلَ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ ثَمَنِيَّةً أَزْوَاجًا ط﴾

اللہ نے تمہیں ایک جان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا، انہی سے ان کی بیوی کو پیدا کیا اور اللہ نے موشیوں میں سے آٹھ قسم کے جوڑے اتارے ہیں۔ یہاں بظاہر یہ بات تو ٹھیک ہے کہ اللہ نے تم کو ایک جان حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا، ان سے ان کی اہلیہ حضرت حواء علیہا السلام کو پیدا کیا۔ آگے جو یہ فرمایا کہ ہم نے یہ آٹھ قسم کے جوڑے اتارے ہیں، حالانکہ اتارے تو نہیں ہیں۔ تو یہاں کہنا چاہیے تھا: ”حَلَقَ“ کہ پیدا فرمائے ہیں۔ ”اَنْزَلَ.. يُنْزِلُ.. اِنْزَالًا“ تب استعمال ہوتا ہے جب چیز اوپر سے نیچے آئے، جانور تو اوپر سے نیچے نہیں آئے تو ”اَنْزَلَ“ کیسے کہہ دیا ہے؟

◆ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پیدائش کا تعلق پانی سے ہے اور پانی آسمان سے برستا ہے اس لیے اللہ ”اَنْزَلَ“ فرما رہے ہیں...

◆ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ لفظ ”اَنْزَلَ.. يُنْزِلُ.. اِنْزَالًا“ لا کر اپنی کوئی خاص حکمت بیان کرتے ہیں۔ جیسے ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَ

الْمِيزَانَ ط﴾<sup>57</sup>

کہ ہم نے پیغمبروں کو واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتابیں نازل

فرمائیں اور میزانِ عدل نازل کیا... اور جب لوہے کی باری آئی تو فرمایا:

﴿وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾

کہ ہم نے لوہے کو نازل کیا جس میں بہت سخت قوت ہے اور منافع بھی ہیں۔ حالانکہ یہاں کہنا چاہیے تھا ”أَنْشَأْنَا الْحَدِيدَ“ کہ ہم نے لوہے کو پیدا کیا ہے، ”أَنْشَأْنَا“ کے بجائے ”أَنْزَلْنَا“ لفظ کیوں استعمال کیا، اسلوب بدلا ہے یہ بات سمجھانے کے لیے کہ جس طرح تم کتاب کو آسمانی کتاب کا درجہ دیتے ہو تو لوہے کو جہاد میں آسمانی لوہے کا درجہ دینا! پھر اس کی اہمیت تمہارے ذہنوں میں آئے گی اور تم اس کا صحیح استعمال کرو گے۔

اور یہاں ﴿وَأَنْزَلْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ﴾ فرما کر اللہ نے اپنی خاص قدرت بیان فرمائی۔ عام طور پر زمین سے پیدا ہونے والی چیز کی نسبت بسا اوقات انسان اپنی طرف کرتا ہے... یہ باغات میرے ہیں، یہ گندم میری ہے، یہ کام میں نے کیا ہے لیکن جب آسمان سے پانی برستا ہے تو کوئی نہیں کہتا کہ یہ میرا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اللہ نے برسایا ہے۔ تو اپنی خاص قدرت بتانے کے لیے ﴿وَأَنْزَلْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ﴾ فرمایا، گویا یہ ایسے ہے کہ ہم نے اتارا ہے، ان جانوروں کی پیدائش میں تمہیں رتی برابر دخل نہیں ہے۔

### تین اندھیروں میں انسانی تخلیق:

﴿يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾

اللہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تین قسم کے اندھیروں میں ایک سے دوسرے مرحلے میں سے گزارتا ہے۔

تین قسم کے اندھیروں میں پیدا کرتے ہیں یعنی ایک ماں کا پیٹ ہے، ایک

ماں کا رحم ہے اور ایک پھر مخصوص جھلی ہے جس میں بچہ لپٹا ہوتا ہے۔ تخلیق کے مرحلوں سے کیا مراد ہے؟ کہ پہلے پہل پانی کا ایک قطرہ ہوتا ہے، پھر اس سے خون بنتا ہے، اس کے بعد ایک جما ہوا لوتھڑا اور پھر گوشت ہوتا ہے، اس کے بعد پھر ہڈیاں ہوتی ہیں۔ یوں ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت سے بچہ گزرتا ہے۔

### اللہ کی شان بے نیازی:

﴿إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾

اگر تم کفر اختیار کرو تو بے شک اللہ تم سے بے نیاز ہے۔ اللہ اپنے بندوں سے کفر کو پسند نہیں کرتے۔

یہاں دو باتیں سمجھ لیں: ایک ہوتا ہے ارادہ، ایک ہوتی ہے رضا۔ ارادہ اور چیز ہوتی ہے اور رضا اور چیز ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ شر کی پیدائش کا ارادہ فرماتے ہیں تو شر پیدا ہوتا ہے، خیر کی پیدائش کا ارادہ فرماتے ہیں تو خیر پیدا ہوتی ہے۔ اللہ کے ارادے کے بغیر دنیا میں کسی چیز کو وجود نہیں ملتا لیکن اللہ تعالیٰ ہر چیز سے خوش نہیں ہوتے۔ ایمان بھی اللہ کے ارادے سے پیدا ہوا ہے، کفر بھی اللہ کے ارادے سے پیدا ہوا ہے بندے کے امتحان کے لیے کہ بندہ کفر اختیار کرتا ہے یا ایمان اختیار کرتا ہے لیکن اللہ ایمان کو پسند فرماتے ہیں، کفر کو پسند نہیں فرماتے۔

ارادے اور پسندیدگی میں فرق ہے۔ بسا اوقات لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اللہ پیدا نہ کرتے تو ہم کافر کیوں ہوتے؟ اللہ پیدا نہ کرتے تو ایسا کیوں ہوتا؟ تو کسی چیز کا ارادہ کرنا اور ہے اور کسی چیز کو پسند کرنا اور ہے۔ دونوں چیزوں میں فرق ہوتا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی گفتگو ہوتی ہے، میں اس کے دوران درجہ کتب کے طلبہ کو اس لیے تخصص کے اسباق میں بٹھاتا ہوں کہ اگرچہ بعض باتیں آپ کو ابھی سمجھ میں نہیں آئیں گی لیکن ذہن میں بٹھائیں، بعد میں فائدہ ہو گا۔

## بندہ کسی دوسرے کا بوجھ اٹھائے گا یا نہیں؟ (حل تعارض)

﴿وَأَنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾

اگر تم اللہ کا شکر کرو گے تو وہ تمہارے لیے اس کو پسند کرتا ہے، کوئی شخص قیامت کے دن کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

اس پر میں پہلے بات کر چکا ہوں کہ یہ جو حدیث پاک میں آتا ہے:  
 "مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ"۔<sup>58</sup>

کہ اگر کوئی شخص کسی گناہ کے کام کا رواج ڈال دیتا ہے تو اس کا گناہ بھی اس شخص کو ملے گا اور اس بعد جو اس پر عمل کرے گا اس کا گناہ بھی اس شخص کو ملے گا۔  
 اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بوجھ اٹھائیں گے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نہیں اٹھائیں گے۔

اس کا جواب سمجھیں! دو چیزیں ہیں؛ ایک یہ ہے کہ انسان خود کفر کرتا ہے، یہ اس کا اپنا فعل ہے اور ایک بندہ کسی کے کہنے پر کفر کرتا ہے۔ تو گناہ دو قسم کے ہیں ایک ہے کفر کیا اور ایک ہے کسی کے کہنے پر کیا۔ تو جو کفر خود کیا اس کا بوجھ خود اٹھائے گا اور جس کے کہنے پر کیا ہے اس کو اس کہنے کا بوجھ بھی اٹھانا پڑے گا۔ ایک بندہ کسی کو اپنے ساتھ چوری پر تیار کرتا ہے۔ اب اس کی چوری کا بوجھ تو خود اٹھائے گا اور جس نے تیار کیا ہے وہ اس کی چوری کا بوجھ نہیں اٹھائے گا لیکن اس نے تیار کر کے گناہ تو کیا ہے تو اب یہ گناہ اس پر ضرور آئے گا۔ تو بعض گناہ ایسے جن جس کا بوجھ اٹھائیں گے اور بعض گناہ ایسے ہیں جن کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے۔



## اسلام کے لیے شرح صدر:

﴿أَفَنَنْشُرَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِّنْ رَبِّهِ﴾

اللہ جب کسی شخص کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں تو وہ شخص اللہ کی طرف سے خاص نور اور روشنی پر ہوتا ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! شرح صدر کا معنی کیا ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اس بندے کے قلب کو وسیع فرما دیتے ہیں۔ اس کا معنی ہے کہ احکام شریعت کو سمجھنا اور پھر ان پر عمل کرنا اس بندے کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ حضور! شرح صدر کی نشانی کیا ہے؟ فرمایا:

أَلَا تَأْتِي إِلَى دَارِ الْخُلُودِ... جنت کی طرف انسان کا رجوع ہوتا ہے۔

وَالْتَّجَانِي عَنِ دَارِ الْعُرُورِ... اور دنیا کے دھوکے سے بندہ بچتا ہے۔

وَالْتَّهْبُ لِمَوْتٍ قَبْلَ نُزُولِهِ... اور موت کے آنے سے پہلے انسان

موت کی تیاری کرتا ہے۔<sup>59</sup>

یہ اس کی علامت ہے۔ اللہ ہم سب کو عطا فرمائے۔ آمین

﴿فَوَيْلٌ لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ﴾

اور جس کا شرح صدر نہیں ہو تا وہ کون ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے دل اللہ کے ذکر سے سخت ہو جاتے ہیں۔

اب میں اور آپ خود غور کریں کہ اللہ کا ذکر کرنے سے ہمارا دل خوش ہوتا

ہے یا تنگ ہوتا ہے؟ اگر تنگ ہو تو استغفار کرنا چاہیے کہ کہیں ہم ﴿فَوَيْلٌ لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ میں شامل تو نہیں؟ اس پر غور کریں۔

### احسن الحدیث؛ کتاب اللہ

﴿اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيًّا ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۖ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ﴾  
اللہ نے بہترین کلام کو اتارا ہے جو ایسی کتاب ہے جس کے مضامین ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ اس کتاب سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

### کتاب اللہ کی صفات:

اللہ نے جو کتاب نازل کی ہے اس کی صفتیں ہیں:  
پہلی صفت: "مُتَشَابِهًا" ... اس کا ایک مضمون دوسرے سے ملتا ہے۔  
دوسری صفت: "مَّثَانِيًّا" ... ایک مضمون کو بار بار لاتے ہیں تاکہ بات دل میں اترے۔

تیسری صفت: "تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ" ... جو اللہ سے ڈرتے ہیں تو ان کے بدن کانپتے ہیں، خوف محسوس کرتے ہیں، ﴿ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ ... اور پھر ان کے جسم نرم ہو جاتے ہیں، ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

بار بار اللہ کے ذکر کا تذکرہ آتا ہے اور ہم علماء اور طلبہ کو اس پر بہت غور کرنا

چاہیے۔ قرآن ذکر کی کتنی بات کرتا ہے اور ہم کتنا ذکر کرتے ہیں؟

### خشیت اور خوف میں فرق:

ایک لفظ یاد رکھ لیں۔ یہاں ہے: ﴿يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ﴾، خشیت اور خوف میں کیا فرق ہے؟ موزی کی تکلیف کے ڈر کو خوف کہتے ہیں اور عظمت والے کی عظمت کے ڈر کو خشیت کہتے ہیں۔ آدمی سانپ سے بھی ڈرتا ہے اس ڈر کا نام خوف ہے، آدمی کتے سے بھی ڈرتا ہے اس ڈر کا نام خوف ہے اور خشیت کا معنی ہے کسی کی عظمت کی وجہ سے اس سے ڈرنا۔

اب دیکھیں! خشیتِ الہیہ کہ ہم اللہ سے ڈرتے ہیں، کیوں؟ اللہ کی عظمت کی وجہ سے۔ درندے سے ڈرتے ہیں، کیوں؟ اس کی ایذا کی وجہ سے اور اللہ والوں کا رعب یہ عظمت کا ہوتا ہے۔ خشیت اور خوف کے اصل معنی تو یہی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی اس کے خلاف بھی استعمال ہوتا ہے۔

### توحید و شرک کی مثال سے وضاحت:

﴿صَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَكِّسُونَ وَ رَجُلًا سَلَمًا

لِرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِينَ مَثَلًا طُحْمَدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٢١﴾﴾

یہاں سے اللہ نے مشرک اور موحد کی مثال دی ہے۔ ایک غلام ہے جس میں کئی شریک ہیں اور سارے ضدی ہیں، یہ غلام سوچتا ہے کہ میں کس کی بات کو مانوں، کس کی نہ مانوں؟ اور جو موحد ہے اس کا مالک ایک ہی ہے، اس کو الجھن نہیں ہے۔ تو مشرک ٹینشن میں ہوتا ہے کہ یہ خدا ناراض نہ ہو جائے، وہ خدا ناراض نہ ہو جائے اور موحد کے سامنے ایک ہی خدا ہے، بس وہ راضی ہو جائے تو سب ٹھیک ہے۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں لیکن اکثر لوگوں کو اس کا

علم نہیں ہے۔

## ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾ کی تشریح:

﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾

یہاں یہ بات یاد رکھ لیں ”مَیِّتٌ“ اسے نہیں کہتے جس پر موت آچکی ہو، ”مَیِّتٌ“ اسے کہتے ہیں جس پر موت آنی ہو۔ اصل معنی ”مَیِّتٌ“ کا یہی ہے۔ تو یہاں بتایا یہ ہے اے پیغمبر! آپ پر بھی موت آنی ہے اور ان پر بھی موت آنی ہے۔ اب اس آیت کا تعلق پیغمبر کی وفات کے بعد والی حیات سے بالکل نہیں ہے۔ اس لیے بہت سارے مفسرین اس آیت کے تحت اس مسئلے کو چھیڑتے ہی نہیں ہیں لیکن ہمیں کیوں چھیڑنا پڑتا ہے؟ اس لیے کہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو منکر ہے وہ اس آیت سے استدلال کرتا ہے تو پھر ہمیں بھی اس آیت پر بات کرنی پڑتی ہے۔

یہ وضاحت میں کیوں کر رہا ہوں؟ کیونکہ ممکن ہے کہ ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾ کے تحت آپ وفات کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا مسئلہ چھیڑیں اور کوئی آپ پر اعتراض کرے کہ کسی مفسر نے اس آیت کے تحت اس مسئلے کو نہیں چھیڑا تو تم کیوں چھیڑتے ہو؟ تو آپ کے پاس جواب ہونا چاہیے کہ پہلے ہمارے مخالف نے اس سے حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار پر استدلال کیا ہے تو ہمیں جواب دینے کے لیے اس کو چھیڑنا پڑتا ہے۔ یہ الجھن کیوں پیش آرہی ہے؟ اس لیے کہ ہمارے بعض حضرات اعتدال کے نام پر ہم سے ناراض ہوتے ہیں کہ آپ نے کس آیت کے تحت اس مسئلے کو چھیڑ دیا؟ بھائی! یہ ہم لے کر نہیں بیٹھے بلکہ فریق مخالف نے پہل کی ہے۔

جب ایک آدمی اہل السنۃ والجماعۃ کے عقیدے کے خلاف اس آیت کو پیش

کرے گا تو پھر ہم جواب نہیں دیں گے؟! ہاں گزشتہ مفسرین کے دور میں کوئی شخص اس آیت کو اسی مسئلے کے بارے میں پیش کرتا اور وہ جواب نہ دیتے تو پھر آپ کا اعتراض بجا تھا۔ جس دور میں آیت سے غلط استدلال ہو گا تو اسی دور میں جواب دیا جائے گا!

اللہ رب العزت اپنے پیغمبر کے لیے ”مَیِّتٌ“ کا لفظ الگ لائے ہیں اور امت کے لیے ”مَیِّتُونَ“ کا لفظ الگ لائے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کی موت الگ ہے اور امت کی موت الگ ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔ اس لیے لفظ الگ الگ لائے ہیں۔

### خروجِ روح اور جسِ روح:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ یہی بات فرماتے ہیں کہ امت کی موت بصورتِ خروجِ روح ہے اور نبی کی موت بصورتِ جسِ روح ہے۔ ہمارا ایک مخالف مناظر تقریر کے دوران میرا نام لے کر گالیاں بھی دے رہا تھا اور ساتھ کہہ بھی رہا تھا کہ اس کو یہ بھی پتا نہیں کہ ”جس“ کیا ہوتا ہے! یہ ”جس“ گرمی والی سمجھتا ہے۔ میں نے کہا کہ یار تم کبھی ہمارا بیان ہی سن لیتے، کبھی مثالیں ہی سن لیتے۔ ”خروجِ روح“ کا معنی ہے کہ روح جسم سے نکل جائے اور ”جسِ روح“ کا معنی ہے کہ روح جسم میں قلبِ اطہر میں سمٹ جائے اور ”بسط“ کا معنی ہے کہ پھر روح دوبارہ پھیل جائے۔

فرمایا چونکہ نبی کی موت الگ ہے، امت کی موت الگ ہے اس لیے اللہ نبی کے لیے ”مَیِّتٌ“ کا لفظ الگ لائے ہیں اور امت کے لیے ”مَیِّتُونَ“ الگ لائے ہیں، اور اس پر پھر قرآن ہیں کہ ان دونوں کی موت میں فرق ہے۔ موت کو نیند اور نیند کو موت کی بہن کہتے ہیں۔ اس لیے قرآن کریم میں موت پر نیند کا لفظ استعمال ہوا ہے

جیسے ﴿يُؤَيِّنَا مِنْ بَعَثْنَا مِنْ مُرْقَدِنَا﴾<sup>60</sup>، اسی طرح نیند پر موت کا لفظ استعمال ہوا ہے ”اللَّهُمَّ بِاسْمِكَ أَمُوتُ وَأَحْيِي“ تو موت اور نیند آپس میں بہنیں ہیں۔

### نبی وامتی کی نیند اور موت میں فرق:

جب نبی وامتی کی نیند میں فرق ہے تو نبی اور امتی کی موت میں بھی فرق ہو گا۔ نبی کی نیند یہ ہے کہ ظاہر پر آتی ہے اور قلبِ اطہر بیدار ہوتا ہے۔ نبی کی موت بھی یہ ہے کہ ظاہر پر موت آتی ہے اور قلبِ اطہر میں حیات ہوتی ہے۔ تو دونوں میں فرق ہے۔

نبی اور امتی کی موت میں فرق ہے۔ نبی کی موت کے بعد اس کا مالِ رشتہ داروں میں بطورِ وراثت تقسیم نہیں ہوتا اور امتی کی موت کے بعد مالِ وراثت میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ مالِ وراثت میں تقسیم ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ مالِ مورث کی ملک سے نکلے اور ملک سے تب نکلے گا جب روح اور جسم کا تعلق ختم ہو گا۔ امتی کا تعلق ختم ہو جاتا ہے اس لیے مالِ ملک سے نکل جاتا ہے اور نبی کا تعلق ختم نہیں ہوتا تو مالِ ملک سے نہیں نکلتا۔ اس لیے امتی کی موت الگ ہے اور نبی کی موت الگ ہے۔

امتی کی وفات کے بعد بیوی کا تعلق شوہر سے ختم ہو جاتا ہے۔ چونکہ بیوی کا تعلق تب ہوتا ہے جب روح اور جسم کا تعلق ہو اور جب روح اور جسم کا تعلق ختم ہو گا تو زوجیت کا تعلق بھی ختم ہو گا اور پیغمبر کی بیوی کا تعلق وفات کے بعد بھی باقی رہتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ ان کی روح اور جسم کا تعلق باقی ہے۔ تو نبی کی موت الگ ہے اور امتی کی موت الگ ہے۔

میں اس کو سمجھانے کے لیے مثال دیتا ہوں کہ جس طرح جلسے کا میزبان جلسے

کے بعد اعلان کرے کہ تمام حضرات تشریف رکھیں، آپ کے لیے کھانے کا انتظام ہے۔ اب جو جلسے میں آنے والا خطیب ہے وہ بھی وہیں کھانے کے لیے بیٹھ جائے تو جلسے والے کہیں گے: مولانا صاحب! آپ کا کھانا یہاں نہیں، وہاں لگا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کھانوں میں فرق ہے، سامعین کا کھانا الگ ہے اور خطیب کا کھانا الگ ہے، تبھی تو کہا کہ ان کا کھانا دھر ہے اور آپ کا کھانا دھر ہے۔

﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾ میں نبی کے لیے میت کا لفظ الگ لائے اور امت کے لیے الگ لائے۔ اس کا معنی کہ دونوں میں فرق ہے۔

ایک لفظ دو بار بولیں اور معنی ایک ہو تو اس کو ”تاکید“ کہتے ہیں اور ایک لفظ دو بار بولیں اور معنی الگ ہو تو اس کو ”استیناف“ کہتے ہیں اور بلاغت کا ضابطہ ہے کہ استیناف؛ تاکید سے اولیٰ ہوتا ہے۔ اگر جو معنی ”مَيِّتٌ“ کا ہے وہی معنی ”مَيِّتُونَ“ کا ہو تو یہ تاکید ہے۔ اگر دونوں کا معنی الگ ہو تو یہ استیناف ہے۔ تو بلاغت کا بھی تقاضا ہے کہ نبی کی موت الگ ہو اور امت کی موت الگ ہو، الگ الگ ہونی چاہیے۔

یہاں ایک بات اچھی طرح سے سمجھ لیں! بسا اوقات انسان اپنا عقیدہ سمجھ لیتا ہے لیکن دوسرے کو مطمئن نہیں کر پاتا، اپنا عقیدہ دلائل سے شرح صدر کے ساتھ سمجھ آ جاتا ہے لیکن دوسرے کو جواب نہیں دے پاتا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم اپنا عقیدہ سمجھ جائیں، صحیح عقیدہ اختیار کر لیں تو نجات اس پر ہے۔ دوسرے کو جواب نہ دے سکیں تو نجات پھر بھی ہو جائے گی۔ بس نجات کے لیے ضروری ہے کہ اپنا عقیدہ ٹھیک ہو، اس لیے اپنا عقیدہ دلائل سے سمجھ لیں۔ کسی کو آپ جواب دے سکیں تو بہت اچھی بات ہے، اگر نہ دے سکیں تو کم از کم آپ کو یہ تو شرح صدر ہو گا کہ ہمارے عقیدے پر دلائل بہت ہیں، الجھن نہیں ہے، قرآن ہمارا ساتھ دیتا ہے، قرآن ہمارا مخالف نہیں ہے۔

## منکرین حیات سے گفتگو کا طریقہ:

اور یہ بات بڑی اچھی طرح ذہن میں رکھ لیں! بسا اوقات آپ کا مخالف آپ سے کہے گا کہ آپ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی آیت پیش کریں۔ تو آپ ان سے کہیں کہ پہلے موت ہے اور پھر حیات ہے، آپ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت مانتے ہیں؟ کہے گا: مانتا ہوں۔ آپ کہیں: موت پر آیت پیش کریں۔ وہ کہے گا: ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾ آپ پوچھیں کہ جب یہ آیت اتری تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت وفات پا چکے تھے؟ کہے گا: نہیں۔ تو یہ آیت وفات پر دلیل کیسے ہو گی؟ اس سے تو ثابت نہیں ہوتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آچکی ہے، اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ آپ پر موت آئی ہے۔ ایک ہے وقوعِ موت اور ایک ہے خبرِ موت۔ ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ﴾ میں موت کی خبر ہے، موت کا وقوع نہیں ہے۔

کبھی وہ آیت پڑھتے ہیں: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾<sup>61</sup> میں نے کہا: میں بھی نفس ہوں میں تو نہیں مرا، ﴿كُلُّ نَفْسٍ﴾ میں ہر نفس کی موت کا وقوع بیان نہیں کیا جارہا بلکہ ہر نفس کی موت کی خبر دی جا رہی ہے۔ ہمارا سوال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے، اس پر آیت پڑھو!

کبھی پڑھتے ہیں: ﴿لَهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا﴾<sup>62</sup> میں نے کہا: ہم تو سوتے ہیں ہمارے اوپر تو موت نہیں آتی، تو اس میں

61۔ العنکبوت 57:29

62۔ الزمر 42:39



بھی خبر ہے اس میں وقوع نہیں ہے کہ ہر شخص کا وقوع موت بتایا جا رہا ہو۔  
 کبھی کہتے ہیں کہ اگر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر موت نہیں آئی تو صحابہ  
 نے دفن کیوں کیا؟ میں نے کہا کہ یہ آیت پڑھی ہے آپ نے؟ آیت پڑھو آیت! یہ جو  
 تم کہتے پھرتے ہو کہ ہمارے پاس 70 آیتیں اور 1800 حدیثیں ہیں، ہم آپ کو  
 69 آیتیں معاف کرتے ہیں آپ صرف ایک آیت بتائیں اور 1799 حدیثیں معاف  
 ہیں صرف ایک حدیث پڑھ دیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آئی ہے۔ کیوں  
 جھوٹ بولتے ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت پر قرآن کریم سے 70 آیات  
 ہیں!

اب دیکھو! منکرین حیات اگر آپ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی  
 حیات فی القبر پر آیت پوچھیں تو آپ نے ان سے موت فی الدنیا پر آیت مانگنی ہے کہ  
 آپ لوگ کیسے ثابت کرتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آئی ہے؟  
 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت پر صرف ایک دلیل ہے؛ اجماع  
 امت۔ ہم کہتے ہیں کہ جس دلیل سے موت ثابت ہے اسی دلیل سے حیات ثابت ہو  
 گی۔ جب موت؛ اجماع سے ثابت ہے تو حیات بھی اجماع سے ثابت ہوگی۔ آپ لوگ  
 حیات پر اجماع نہیں مانتے بلکہ آپ کہتے ہیں کہ پہلے قرآن پیش کرو تو ہم بھی کہتے ہیں  
 کہ موت پر پہلے قرآن پیش کریں، جب موت پر آپ کے پاس قرآن نہیں ہے تو آپ  
 حیات پر قرآن کیسے مانگتے ہیں؟

یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ تحمل سے بات کرو، جلد بازی نہ کیا کرو، ہمارے  
 پاس تو قرآن ہے پھر کیوں ڈرتے پھرتے ہو؟ تو پیغمبر کی موت کس دلیل سے ثابت  
 ہے؟ (اجماع سے۔ سامعین) تو حیات بھی اجماع سے ثابت ہوگی، تو جس طرح حضور  
 صلی اللہ علیہ وسلم کی موت پر اجماع ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پر

بھی اجماع ہے۔ بات تو ختم ہو گئی۔ اب اگر ہم قرآنی دلیل دیتے ہیں تو ہمارا احسان ہے، یہ اضافی بات ہے ہمارے ذمہ نہیں ہے۔

میں اس لیے گزارش کرتا ہوں کہ اپنے عقائد کو اچھی طرح سمجھیں تو پھر آپ کو کبھی الجھنیں اور پریشانیاں نہیں ہوں گی۔ آپ کیوں پریشان ہیں کہ مطالعہ کرنا پڑے گا، بات کیسے کریں گے؟ کیا اتنی سی بات بھی آپ نہیں کر سکتے؟ یہ بات کرنی کیا مشکل ہے؟ اس لیے آپ گھبرا یا بالکل نہ کریں اور کھل کر بات کیا کریں۔

**موت اور نیند میں روح کا قبض ہونا:**

﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾

اللہ رب العزت روح کو قبض فرما لیتے ہیں جب موت کا وقت آتا ہے اور روح کو قبض فرما لیتے ہیں جب انسان پر نیند آتی ہے، ﴿فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ﴾ پھر جس پر موت کا فیصلہ ہو وہ اپنے پاس رکھ لیتے ہیں، ﴿وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ اور دوسری کو چھوڑ دیتے ہیں ایک وقت تک۔ وقت آنے پر اس پر بھی موت آ جاتی ہے۔ ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾ روح کو قبض کرنا پھر روح کو چھوڑنا؛ اس میں کس قدر دلائل ہیں اس قوم کے لیے جو سمجھتی ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب انسان پر نیند آتی ہے تو انسان کی روح نکلتی ہے لیکن روح کی ایک شعاع انسان کے بدن میں رہتی ہے، اس رابطہ شعاعی کی وجہ سے بندہ زندہ رہتا ہے اور جب موت آتی ہے تو رابطہ شعاعی بھی ختم ہو جاتا ہے، اس لیے انسان پر موت آ جاتی ہے۔ دیکھو! سورج اوپر ہے اور زمین نیچے ہے۔

تو یہاں روشنی کیوں ہے؟ کیونکہ سورج کی شعاعیں یہاں زمین پر ہیں۔ یوں روح کی شعاع ہے اس سے جسم میں حیات رہتی ہے۔ اب جب انسان کی روح عالم مثال کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور خواب آتا ہے تو یہ خواب سچا ہوتا ہے اور جب یہ روح عالم دنیا کی طرف متوجہ ہوتی ہے پھر خواب آتا ہے تو یہ خواب جھوٹا ہوتا ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں۔

اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ روح اور جسم کا تعلق ظاہراً بھی ہوتا ہے اور باطناً بھی ہوتا ہے۔ جب انسان پر نیند آتی ہے تو اس وقت باطنی تعلق تو رہتا ہے جس سے بندہ سانس لے رہا ہوتا ہے، تدبیر ہو رہی ہوتی ہے اور ظاہری تعلق ختم ہو جاتا ہے جس کو حرکت ارادیہ کہتے ہیں وہ ختم ہو جاتی ہے کہ بندہ اپنے ارادے سے چلے دوڑے پھرے، اور جب موت آتی ہے تو پھر یہ ظاہری تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے باطنی تعلق بھی ختم ہوتا ہے تو پھر عام انسان پر موت آ جاتی ہے۔

﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا﴾ سے استدلال کا جواب:

اب اس سے مماتی حضرات استدلال کرتے ہیں:

﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا﴾

میں نے کہا کہ ذرا ترجمہ کرو جو تم کرتے ہو! اب وہ ترجمہ کرتے ہیں کہ ”اللہ قبض کرتا ہے انفس کو یعنی روح کو جب اس پر موت آتی ہے“، تو میں نے کہا کہ کیا روح پر موت آتی ہے؟ کہتے ہیں: جی نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر آپ کیسے ترجمہ کرتے ہیں؟! آپ تو انفس کو مفعول بہ بناتے ہیں اور ﴿مَوْتِهَا﴾ میں ”ہا“ ضمیر کا مرجع انفس ہے۔ یہ میں مماتیت کی بات کر رہا ہوں۔ پھر یہ لوگ ﴿وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا﴾ کا معنی کرتے ہیں ”اور اللہ قبض کرتے ہیں اس کو جو نہیں مرتی اپنی نیند میں“... تو میں

نے کہا کہ نیند جسم پر آتی ہے یا روح پر آتی ہے؟ روح تو نہیں مرتی تو آپ اس کا ترجمہ کیسے کرتے ہیں کہ اللہ روح کو قبض کر لیتے ہیں؟

وہ لوگ تقریر یوں کرتے ہیں: ﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ﴾ انفس جمع ہے "نَفْسٌ" کی اور ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾<sup>63</sup>، ہم نے کہا کہ آپ کہتے ہیں: انفس جمع ہے نفس کی اور ہر نفس نے موت کا مزہ اچکھنا ہے تو ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا روح موت کا مزہ اچکھتی ہے؟ کیا روح مرتی ہے؟ مرتا تو جسم ہے تو پھر ﴿كُلُّ نَفْسٍ﴾ سے مراد جسم ہو گا نا! نفس وہی ہو گا جس نے موت کا مزہ اچکھنا ہے اور موت آتی ہے جسم پر تو نفس سے مراد کیا ہو گا؟ (جسم ہو گا۔ سامعین) اور یہ انفس اُس نفس کی جمع ہے تو پھر اس انفس سے مراد کیا ہو گا؟ (جسم ہو گا۔ سامعین) تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ روح نکل جاتی ہے؟

مماتی مجھے کہنے لگا کہ جی پھر آپ اس آیت کا مطلب سمجھا دیں! میں نے کہا کہ تم نے جو سبق پڑھا ہے پہلے وہ تو سناؤ، اپنی تفسیر ہمیں سمجھاؤ، ہم تو بعد میں بات کریں گے اور ہمارا مطلب سمجھنا تو بڑا آسان ہوتا ہے۔

یہ جو میں نے بات کی ہے یہ ان کے موقف پر اعتراض کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ﴿اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ﴾ اللہ روح کو قبض کر لیتے ہیں ﴿حِينَ مَوْتِهَا﴾ جب موت آتی ہے، ﴿وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا﴾ اور اس کی روح قبض کر لیتے ہیں جس کی موت نہیں آئی ہوتی بلکہ اس کی نیند ہوتی ہے، ﴿فَيُمْسِكُ اللَّهُ قَضِيَّهَا﴾ انْمُوت ﴿اور جس پر موت کا فیصلہ ہو چکا ہو تو اس کی روح کو روک لیتے ہیں۔

میں نے کہا کہ جو تقریر تم نے کی ہے تمہاری اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک آدمی پر نیند آتی ہے اللہ اس کی روح کو قبض کر لیتے ہیں، اگر اس کی زندگی کے دن باقی ہوں تو روح کو واپس بھیج دیتے ہیں اور اگر زندگی کے دن باقی نہ ہوں تو روح کو روک لیتے ہیں۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا؟ میں نے کہا کہ مجھے سمجھاؤ! اگر یہی معنی ہے تو جب نیند میں روح نکل جاتی ہے اگر اس کے لیے فیصلہ زندگی کا ہے تو روح واپس آتی ہے اور اگر فیصلہ موت کا ہے تو روح کو روک لیتے ہیں۔ تو جو روح نکالی تھی اسی کو روکا ہے نا! جب رکی ہے تو بندہ تو سانس لے رہا ہے تو پھر روکنے روکنے میں فرق کیا ہوا؟ جب روح نکل گئی تو بندہ سانس بھی لے رہا ہے، آوازیں بھی نکال رہا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ موت کے ساتھ روح رک گئی ہے تو یہ روح اتنی رکی ہے جتنی نکالی تھی تو پھر یہ فرق کیوں پڑا؟

### روح اور جسم کے تین تعلقات:

فرق کیا ہے اچھی طرح سمجھو! ایک کیفیت انسان کی موت کی ہے اور ایک کیفیت انسان کی نیند کی ہے۔ نیند اور موت دونوں میں اللہ تعالیٰ بندے کی روح الگ کر لیتے ہیں۔ اس روح کا جسم کے ساتھ کئی قسم کا تعلق ہوتا ہے۔ ایک تعلق نیند میں ختم ہوتا ہے یہ ”تَوْنِی“ الگ ہے اور ایک تعلق موت میں ختم ہوتا ہے یہ ”تَوْنِی“ الگ ہے۔

◆ روح کا جسم سے ایک تعلق ہے اس کو کہتے ہیں ”تعلق حیات“

◆ ایک تعلق ہے اسے کہتے ہیں ”تعلق تصرف“

◆ ایک ہوتا ہے ”تعلق تدبیر“

یہ تین تعلقات ہو گئے۔ ایک تعلق سے جسم کو صرف حیات ملتی ہے، نہ ہی تدبیر نہ ہی تصرف، یہ تعلق حیات ہے، اور ایک تعلق ایسا ہے کہ جس سے آدمی کے جسم میں تدبیر ہوتی ہے، تدبیر کا معنی کہ آدمی کا کھانا خود بخود ہضم ہو رہا ہے، خون چل

رہا ہے، سانس لے رہا ہے یہ تعلق تدبیر ہے، اور ایک تعلق تصرف ہے کہ آدمی کھا رہا ہے، پی رہا ہے، دوڑ رہا ہے۔ تو تعلق کی یہ تین قسمیں ہو گئیں۔

### ان تین تعلقات کے دائرہ ہائے کار:

جب آدمی جاگ رہا ہوتا ہے اور زندہ ہوتا ہے تو روح اور جسم کا تعلق حیات بھی ہوتا ہے، تعلق تصرف بھی ہوتا ہے اور تعلق تدبیر بھی ہوتا ہے۔ تعلق تصرف بھی ہے کہ کھانا پیتا ہے، دوڑتا ہے۔ تعلق تدبیر بھی ہے کہ سانس آ رہا ہے، جا رہا ہے، ہمیں سانس کے لیے کوئی زور نہیں لگانا پڑتا؟ خود بخود آ رہا ہے اور دل خود بخود دھڑک رہا ہے، خون خود بخود گردش کر رہا ہے، جگر کام کر رہا ہے، معدہ کام کر رہا ہے یہ تعلق تدبیر ہے اور ہم زندہ بھی ہیں یہ تعلق حیات ہے۔

اور جب انسان پر نیند آتی ہے تو تعلق حیات بھی رہتا ہے، تعلق تدبیر بھی رہتا ہے البتہ تصرف ختم ہو جاتا ہے۔ جب آدمی سوتا ہے تو آدمی کے سونے سے کھانا ہضم ہوتا رہتا ہے، سانس آتی جاتی ہے اور دل خون کو لیتا ہے باہر نکالتا ہے، نبض چل رہی ہوتی ہے۔ یہ تعلق تدبیر ہے۔ اور جب انسان پر موت آتی ہے تو تینوں تعلقات ختم ہو جاتے ہیں۔

تو ”توفیٰ“ دونوں کی الگ الگ ہے۔ بوقتِ نیند اللہ جو روح کو قبض کر لیتے ہیں تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ روح اور جسم کا ایسا تعلق نہیں رہتا کہ جس سے تعلق تصرف ہو۔ اس کو بعض مفسرین یوں بیان کرتے ہیں کہ اللہ روح کو معطل فرما دیتے ہیں۔ معطل کا معنی ہے کہ یہ جو تعلق تصرف تھا یہ اللہ ختم فرما دیتے ہیں۔ یہ نیند ہو گئی اور جب تعلق تدبیر بھی ختم ہو جائے تو پھر یہ موت ہو گئی۔ موت کے بعد پھر جب اللہ نے اعادہ روح فرمانا ہے حساب کتاب کے لیے اب وہ نیند ہوتی ہے، تصرف ختم ہو جاتا ہے لیکن وہ نیند دنیا کی نہیں ہے وہ نیند موت کے بعد کی نیند ہے، وہاں تعلق تدبیر بھی ختم

ہو جاتا ہے، ایک ایسا تعلق رہتا ہے کہ جس سے بندے میں حیات ہوتی ہے لیکن وہ حیات شعور سے محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ حیات نبی کے فرمانے سے محسوس ہوتی ہے، اسے کہتے ہیں: ﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ ۖ وَ لَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ <sup>64</sup> بات سمجھ میں آگئی؟

جب آدمی جاگ رہا ہے تو تعلق حیات بھی ہے، تعلق تصرف بھی ہے اور تعلق تدبیر بھی ہے اور جب سو جائے تو اب تعلق حیات بھی ہے، تعلق تدبیر بھی ہے البتہ تعلق تصرف ختم ہو جاتا ہے اور جب موت آتی ہے تو تعلق حیات بھی ختم، تعلق تدبیر بھی ختم اور تعلق تصرف بھی ختم اور جب اعادہ روح ہوتا ہے سوال و جواب کے لیے تو اب تعلق تصرف بھی نہیں ہے، تعلق تدبیر بھی نہیں ہے بلکہ صرف تعلق حیات ہے۔ نہ مردہ دوڑتا ہے۔ نہ مردہ کھیلتا ہے۔ نہ مردہ کھاتا ہے۔ نہ اس کا خون چل رہا ہوتا ہے۔ نہ اس کی رگیں حرکت کر رہی ہوتی ہیں لیکن اس تعلق سے اس کو جو حیات ملتی ہے اب وہ حیات ایسی ہے کہ آنکھوں سے محسوس نہیں ہوتی، اس لیے فرمایا: ﴿وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾، ”وَلَكِنْ لَا تَعْلَمُونَ“ نہیں فرمایا۔ ادراک بالحواس کا نام شعور ہے اور ادراک بالوحی کا نام علم ہے۔ تو یہاں ”وَلَكِنْ لَا تَعْلَمُونَ“ نہیں فرمایا کہ اس کی حیات ایسی ہے کہ جو وحی سے بھی پتا نہیں چلے گی، حیات ہے لیکن شعور سے پتا نہیں چلے گا اس لیے ﴿وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ فرمایا۔ یہ بات سمجھ آرہی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین) قرآن مجید میں ہے:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ ۖ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ

مُضِلُّوْنَ ﴿۱۱﴾ اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ ﴿۶۵﴾

یہاں ﴿وَلٰكِنْ لَا يَشْعُرُوْنَ﴾ فرمایا کیونکہ فساد تو آنکھ سے نظر آتا ہے، لیکن یہ کفار اتنے بے شعور اور ضدی ہیں کہ انہیں اپنا فتنہ و فساد بھی نظر نہیں آ رہا تو یہاں ان کفار کے شعور کی نفی کی ہے، اور آگے فرمایا:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَا اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْا اَنُؤْمِنُ كَمَا اٰمَنَ

السُّفَهَاءُ اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلٰكِنْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾﴾ ﴿۶۶﴾

یہاں علم کی نفی ہو رہی ہے کیونکہ ایمان نظر نہیں آتا، ایمان کے آثار تو نظر آتے ہیں ایمان نظر نہیں آتا کیونکہ وہ تو قلبی چیز ہے نظر کیسے آئے گی؟ تو ادراک بالحواس کو شعور کہتے ہیں اور ادراک بالوحی کو علم کہتے ہیں۔

یہ جو قبر کی حیات ہوتی ہے یہ تعلق اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اس میں تدبیر بھی نہیں، تصرف بھی نہیں، ہاں اتنا تعلق ہے کہ جس سے حیات ہو اور اتنا تعلق ہے کہ جس سے آدمی تلذذ اور تکلیف کو محسوس کرے۔ آپ عقائد کی کتب میں پڑھیں گے:

اِتَّفَقَ اَهْلُ الْحَقِّ عَلَى اَنَّ اللّٰهَ يُعَيِّدُ اِلَى الْمَيِّتِ فِي الْقَبْرِ نَوْعَ حَيَاةٍ قَدَرَمَا يَتَّالَمُّ وَيَتَلَذَّذُ. ﴿۶۷﴾

یعنی روح کا اتنا تعلق ہو گا کہ جس سے جسم تکلیف اور راحت محسوس کرے۔ وہ تدبیر اور تصرف والا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔

بات سمجھ میں آگئی؟

65۔ البقرة: 11، 12

66۔ البقرة: 13

67۔ شرح المقاصد فی علم الکلام: ج 2 ص 222



## شرک کی قباحت:

﴿وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكَ لَئِن أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ

عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿١٦﴾﴾

آپ کی طرف وحی آئی ہے اور پہلے انبیاء کی طرف بھی وحی آئی ہے کہ اگر تم شرک کرو گے تو تمہارے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تم نقصان اٹھانے والوں میں شمار ہو گے!

یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ شرک کرو گے تو اعمال ضائع ہو جائیں گے، یہ پیغمبر کو خطاب کر کے امت کو سمجھانا مقصود ہے۔ جس طرح فاطمہ مخزومیہ نے مدینہ میں چوری کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دو! سفارش آئی کہ یہ بڑے خاندان کی عورت ہے اس کو کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا.<sup>68</sup>

اگر یہ چوری کرنے والی فاطمہ بنت محمد ہوتی تو میں تب بھی اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ تو یہ امت کو سمجھانا مقصود ہے۔ اسی طرح ﴿لَئِن أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾ یہ امت کو سمجھانا مقصود ہے۔

## باری تعالیٰ کی قدرت و طاقت کا بیان:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ۚ وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ

الْقِيَمَةِ وَالسَّمُوتِ مَطْوِيَّتٌ بِيَمِينِهِ ط سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٦٤﴾

یہ جو کہا کہ قیامت کے دن زمین بھی اللہ کے قبضے میں ہوگی اور سارے آسمان اللہ کے یمین میں لپٹے ہوں گے، یہ میں پہلے سمجھا چکا ہوں کہ ﴿بِیَمِينِهِ﴾ متشابہات میں سے ہے، اس کا معنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بعض متأخرین اس کا معنی کرتے ہیں کہ قیامت کے دن سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہوگا اور اختیار کو ﴿بِیَمِينِهِ﴾ سے تعبیر کرتے ہیں۔

سورة البقرة میں ہے:

﴿وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾<sup>69</sup>

اگر تم عورت کو طلاق دے دو اس سے ملاقات سے پہلے لیکن مہر تم نے مقرر کیا ہو تو اس صورت میں تمہیں نصف مہر دینا ہوگا، ہاں اگر عورت اپنا حق معاف کر دے تو اس کی مرضی ہے، ﴿أَوْ يَعْفُوا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کا اختیار ہے وہ درگزر سے کام لے لے یعنی شوہر آدھا مہر دینے کے بجائے پورا حق مہر دے دے۔

یہاں ”بِیَدِهِ“ کا لفظ استعمال کیا ہے، نکاح حقیقتاً تو ہاتھ میں نہیں ہوتا، پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کے اختیار میں نکاح ہے کہ وہ چاہے تو بیوی کو نکاح میں رکھے اور چاہے تو اس کو طلاق دے دے۔ تو یہاں ”ید“ سے مراد اختیار ہے۔ تو ﴿بِیَمِينِهِ﴾ سے مراد اختیار ہوتا ہے، متأخرین نے یہ معنی لیا ہے لیکن بہتر یہی ہے

کہ اس کو متشابہات میں مانا جائے کہ اس کا معنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

### نسخ صور کا ہولناک منظر:

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ

شَاءَ اللّٰهُ﴾

جب صور پھونکا جائے گا تو تمام آسمان والے اور زمین والے بے ہوش ہو جائیں گے، غش کھا کر گر جائیں گے سوائے اس کے جس کو اللہ چاہے۔

یعنی صور پھونکنے جانے کی وجہ سے سب بے ہوش ہو جائیں گے پھر سب مر جائیں گے اور جو پہلے مر چکے ہیں ان کی روحیں بے ہوش ہو جائیں گی۔

﴿اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ﴾... سوائے اس کے جس کو اللہ چاہے۔ آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا: صور پھونکنے کے اثر سے جو موت واقع ہوگی اس سے جبرائیل، اسرافیل، میکائیل اور ملک الموت محفوظ رہیں گے۔ یعنی اس نسخے سے تو ان کو موت نہیں آئے گی لیکن بعد میں ان کو بھی موت آجائے گی اور سوائے اللہ تبارک و تعالیٰ کے کوئی زندہ نہیں رہے گا۔

### جنت مہمان خانہ اور جہنم قید خانہ:

﴿وَسَيَقُ الّٰذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتّٰى اِذَا جَآءُوْهَا فَتَحَتْ اَبْوَابُهَا﴾

یہاں ایک بنیادی بات سمجھیں۔ اللہ رب العزت نے یہاں جہنم کا تذکرہ فرمایا کہ کفار کو جہنم کی طرف کھینچا جائے گا، جب جہنم کے پاس آئیں گے تو دروازے کھل جائیں گے۔ آگے جنت کی باری ہے، تو وہاں فرمایا:

﴿وَسَيَقُ الّٰذِيْنَ اٰتَقَوْا رَبَّهُمْ اِلٰى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتّٰى اِذَا جَآءُوْهَا وَ

فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾

﴿وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا﴾ میں یہ واؤ حالیہ ہے۔ جب اہل جنت آئیں گے تو ان کے آنے سے پہلے جنت کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے۔ قید خانے اور مہمان خانے میں فرق ہوتا ہے، جب قیدی کو جیل میں لے کے جاتے ہیں تو دروازہ بند ہوتا ہے، قیدی جاتا ہے تو دروازہ کھلتا ہے اور پھر دروازہ بند کر دیتے ہیں، اور مہمان خانے کا طرز یہ نہیں ہوتا، مہمان خانہ مہمان کی آمد سے پہلے کھلا رکھتے ہیں۔

اس لیے آپ نے کئی بار دیکھا کہ میں یہاں بیٹھا ہوں، مہمان قریب آجائیں تو میں کہتا ہوں کہ بھائی گیٹ کھول دو! جب مہمان آئیں گے تو دروازہ کھلا ہو گا اور گاڑی سیدھی اندر آجائے، یہ مہمان خانے کا طرز ہے۔

البتہ آپ کی سیکورٹی ہے، آپ نے گیٹ بند کیا ہوا ہے، مہمان اچانک آگیا وہ گھنٹی بجائے گا تو دروازہ کھل جائے گا لیکن جب آپ کو مہمان اطلاع دے کر آئے تو اب استقبال کا طریقہ یہ ہے کہ گیٹ پہلے سے کھلا ہوا ہو، دسترخوان لگا ہوا ہو، اس سے مہمان کو راحت پہنچے گی۔ ان آداب کا بہت زیادہ خیال رکھا کریں۔

### مہمان کا اکرام کیجیے!

آنے والا مہمان مسلمان ہے، کافر ہے، فاسق ہے، نیک ہے، اہل سنت ہے، اہل بدعت ہے، غریب ہے، امیر ہے جیسا بھی ہے مہمان مہمان ہی ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے:

"مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ." <sup>70</sup>

بس مہمان کا خیال رکھو۔ یہ نہ دیکھو کہ آنے والا کون ہے؟ حیثیت کا مسئلہ بعد کا ہے، اپنی حیثیت کے مطابق مہمان کا ہمیں اکرام ضرور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم

سب کو اس بات کی توفیق عطا فرمائے۔

### حضرت مدنی رحمہ اللہ کی مہمان نوازی:

حضرت مولانا عبد الماجد دریا آبادی رحمہ اللہ حضرت مدنی رحمہ اللہ سے بیعت تھے اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے صرف اصلاحی تعلق تھا۔ جو بات میں سنا نا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ مولانا عبد الماجد دریا آبادی دیوبند جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر اترتے، حضرت مدنی کو اطلاع ہوتی تو حضرت مدنی آتے اور ان کا سامان اٹھا لیتے۔ حضرت مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے حضرت تھانوی کو خط لکھا کہ حضرت مدنی آتے ہیں اور میرا سامان اٹھاتے ہیں تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے، آپ حضرت مدنی سے فرمائیں کہ میرا سامان نہ اٹھایا کریں۔ اب حضرت تھانوی کا جواب سنیں، فرمایا مشائخ کی طبیعت میں فرق ہوتا ہے، حضرت مدنی کا شوق ایسا ہے کہ مہمان کی خدمت سے ان کو خوشی ہوتی ہے اور خدمت نہ ہو تو ان کو تکلیف ہوتی ہے، اس لیے حضرت کو میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ ان کا سامان نہ اٹھایا کریں کیونکہ اس سے ان کو تکلیف ہوگی۔

یہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج تھا، مہمان کے آنے پر یوں خدمت کرتے تھے۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ کے ہاں بسا اوقات مہمان آتے تو آپ ان کے ہاتھ خود دھلواتے پھر فرماتے کہ آپ میرے مہمان ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”فَلْيَكْرِمْ ضَيْفَهُ“ تو میزبان کو میزبانی کے فرائض ادا کرنے چاہئیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی حضرت مدنی رحمہ اللہ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاجْزُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة المؤمن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿حَمْدٌ تَذْنِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ غَافِرِ الذَّنْبِ وَ

قَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ۝ ذِی الطَّوْلِ ۝ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۝ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ۝﴾

### فضائل سورت:

سورة المؤمن، حم السجدة، الشوری، الزخرف، الدخان، الجاثیة اور الاحقاف یہ سات سورتیں قرآن کریم کی وہ ہیں جو حم سے شروع ہو رہی ہیں، انہیں حوامیم اور آل حم بھی کہتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ سات سورتیں قرآن کریم کی زینت ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنا مکان بنانا چاہے اور پھر باہر جگہ تلاش کرے کہ میں مکان بناؤں، اس کو ایسا میدان ملے جو سرسبز ہو تو اس کا جی چاہتا ہے کہ میں یہاں مکان بنا لوں۔ پھر وہ تھوڑا سا مزید آگے جائے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس سے بھی بہترین جگہ موجود ہے جنہیں روضات کہا جائے۔ تو وہ سوچتا ہے کہ وہ جو میدان تھا میں تو اس کے سبزے اور ہریالی کو دیکھ کر تعجب کر رہا تھا اور یہ میدان تو اس سے بھی زیادہ حسین اور سرسبز ہے۔ تو وہ اس جگہ کا انتخاب کرتا ہے جو پہلی سے بھی بہتر تھی۔ تو فرمایا کہ پورا قرآن کریم ایسے ہے

جیسے پہلے والا سرسبز میدان ہو اور حوامیم جو سات سورتیں ہیں یہ ایسے ہیں جیسے اس میدان سے آگے والا میدان ہو جنہیں روضات کہتے ہیں۔

اس سورت کی پہلی تین آیات مصیبت سے بچنے کے لیے پڑھنا ثابت ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شروع دن میں آیۃ الکرسی اور سورۃ مؤمن کی پہلی تین آیات پڑھ لے۔ لحم سے لے کر ﴿إِلَيْهِ الْمَصِيرُ﴾ تک۔ تو وہ دن بھر کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہے گا۔

مشکل وقت اور بطور خاص جب مخالف دشمن حملہ کرے، آپ پر چھاپے مارے تو اس وقت ”لحم لَا يَنْصُرُونَ“ پڑھیں۔ اللہ رب العزت مدد فرماتے ہیں۔

### اللہ کی صفات کا بیان:

اس آیت میں اللہ رب العزت کی صفات بیان فرمائی ہیں: ”الْعَزِيزُ“ عزیز ہیں، غالب ہیں، ”الْعَلِيمُ“ صاحب علم ہیں، ”غَافِرُ الذَّنْبِ“ گناہوں کو معاف فرمانے والے ہیں، ”قَابِلُ التَّوْبِ“ توبہ قبول فرمانے والے ہیں، ”شَدِيدُ الْعِقَابِ“ سخت سزا دینے والے ہیں، ”ذِي الطَّوْلِ“ طاقت والے ہیں۔

لفظ غافریہ غُفْران سے ہے، غفران کا اصل معنی ہے ڈھانپ لینا چونکہ جب انسان کے گناہ معاف ہو جائیں تو اس کا گناہ چھپ جاتا ہے، اس لیے گناہ کی معافی کو غفران سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اصل لغوی معنی ذہن میں ہو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات پر ایک اعتراض ہے وہ اس سے ختم ہو جائے گا۔ آگے ایک جگہ آئے گا تو میں وہاں پہنچ کر بات کروں گا ان شاء اللہ۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللَّهِ أَكْبَرُ مِنْ مَقْعِكُمْ

أَنفُسَكُمْ اذْثَنَّا عَوْنَ إِلَى الْإِيمَانِ فَتَكْفُرُونَ ﴿١٠﴾

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہیں پکار کر کہا جائے گا کہ آج تم جس قدر اپنے آپ سے بیزار ہو رہے ہو اللہ اس سے بھی کہیں زیادہ بیزار ہوتا تھا جب تمہیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم انکار کر دیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ بیزار ہونے کی صفت سے پاک ہے، اللہ میں صفتِ انفعال نہیں ہے لیکن یہ تعبیر صرف سمجھانے کے لیے ہے کہ جس طرح بندہ تکلیف محسوس کرتا ہے تو یوں سمجھو کہ اللہ کو بھی یوں تکلیف محسوس ہوتی ہے جب بندہ کفر اختیار کرتا ہے۔

**دو موتیں اور دوزندگیاں:**

﴿قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا اِثْنَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اِثْنَيْنِ فَاَعْتَرَفْنَا

بِذُنُوبِنَا فَهَلْ اِلَىٰ خُرُوجٍ مِّنْ سَبِيلٍ ﴿١١﴾﴾

قیامت کے دن کفار کہیں گے: اے ہمارے رب! دو مرتبہ آپ نے ہمیں موت دی تھی اور دو مرتبہ آپ نے ہمیں زندگی دی تھی، ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، کیا اب واپس جانے کی کوئی صورت ہے؟ اللہ فرمائیں گے کہ واپسی کے دروازے بند ہیں، اب تم واپس نہیں جاسکتے۔

یہاں یہ بات سمجھیں کہ ماں کے پیٹ میں آنے سے پہلے انسان بے جان مادہ تھا اسے پہلی موت کہتے ہیں۔ روح پھونکی جاتی ہے تو بندے کو حیات مل جاتی ہے، پھر بندہ دنیا میں آتا ہے۔ پھر دنیا میں اس کو موت مل جاتی ہے۔ پھر یہ قبر کے پیٹ میں چلا جاتا ہے، پھر اسے حیات مل جاتی ہے اور پھر اس پر موت آتی ہے اور پھر حشر کے دن زندہ ہو جاتا ہے۔ اب یوں دیکھیں تو تین موتیں اور تین حیاتیں بن جاتی ہیں:



- 1: ماں کے پیٹ والی موت، پھر ماں کے پیٹ والی حیات۔
- 2: پھر دنیا والی موت اور برزخ والی حیات۔
- 3: پھر حشر والی موت اور اس کے بعد پھر حشر کی حیات۔

اور قرآن کریم سے بظاہر معلوم ہو رہا ہے کہ موت بھی دو ہیں اور حیات بھی دو ہیں اور یہی آیت بطور استدلال کے ہمارے خلاف پیش کی جاتی ہے کہ قبر کی حیات، حیات نہیں ہے۔ اگر قبر کی حیات کو حیات مانو گے تو پھر حیاتیں تین ماننی پڑیں گی، کیوں؟ کہ اس کے بعد پھر حشر کی موت بھی ماننی پڑے گی تو تین ہو جائیں گی۔ تو قرآن کہتا ہے کہ دو موتیں ہیں اور تم کہتے ہو کہ تین موتیں ہیں، قرآن کہتا ہے کہ دو حیاتیں ہیں اور تم کہتے ہو کہ تین حیاتیں ہیں۔

اس کا جواب سمجھ لیں! ایک ہے ظاہری موت اور ایک ہے ظاہری حیات، اور ایک وہ حیات ہے جو ظاہری نہیں ہے بلکہ چھپی ہوئی ہے، یہ جو موت کے بعد سے لے کر حشر تک کی حیات ہے یہ حیات برزخ کی حیات ہے جو نظر نہیں آتی، یہ مخفی حیات ہے، اس لیے اس حیات کو یہاں ذکر نہیں کیا۔ یہاں ظاہری حیات کا ذکر ہے، ظاہری حیاتیں دو ہیں؛ ایک دنیا میں اور ایک حشر میں، یہ جو درمیان میں برزخ کی حیات ہے یہ پردے میں ہے، اس لیے یہ ظاہری حیات نہیں ہے ورنہ حیات اب بھی موجود ہے۔ اس حیات کا انکار اس لیے نہیں کر سکتے کہ اس پر نصوص موجود ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي

الْآخِرَةِ﴾<sup>71</sup>

یہاں ﴿وَفِي الْأَحْزَابِ﴾ سے مراد قبر ہے کہ اللہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھتے ہیں قبر میں۔<sup>72</sup>

اگر قبر میں حیات ہے ہی نہیں تو ثابت قدم رکھنے کا کیا معنی؟ تو اس آیت کریمہ اور بہت سی احادیث سے ثابت ہے کہ قبر میں حیات ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک حیات ظاہری ہے اور ایک حیات مخفی ہے۔ اس آیت میں حیات سے مراد وہ حیات ہے جو بالکل ظاہری ہے، جو ہر کسی کو نظر بھی آتی ہے۔ اب دنیا میں کافر کی بھی حیات ہے، مؤمن کی بھی حیات ہے اور دونوں کی حیات نظر بھی آرہی ہے، جب انسان مرتا ہے تو اس کی موت بھی نظر آرہی ہے۔ سورۃ الزمر کی اس آیت:

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ﴾<sup>73</sup>

کی تشریح میں یہ بات کی جا چکی ہے کہ قیامت کے دن جو لوگ زندہ ہوں گے ان پر موت طاری ہوگی اور باقی پر غشی طاری ہوگی۔ اب ایک بندہ قبر کی حیات کے ساتھ زندہ تھا، اب وہ دوبارہ کیسے زندہ ہو گا اس کو تو پہلے سے حیات ملی ہوئی ہے! اصل میں قبر کی یہ حیات مخفی ہے، اب اس کو حیات ظاہری ملنی ہے تو قبر کی اس مخفی حیات پر بے ہوشی طاری ہو جائے گی اور بعد میں اس کی بے ہوشی ختم ہو گا اور وہ کھڑا ہو جائے گا۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سے پہلا وہ بندہ جو بے ہوشی سے نکلے گا وہ میں ہوں گا۔<sup>74</sup>

72- صحیح مسلم، رقم: 2871

73- الزمر 68:40

74- صحیح البخاری، رقم: 4813

اب اس کا معنی یہ ہے کہ وہاں صرف بے ہوشی کی کیفیت ہوگی، یہ نہیں ہو گا کہ حیات کے بعد موت ہوگی۔

**حضرت یحییٰ علیہ السلام کے جملہ سے بعض الناس کے استدلال کا جواب:**

بعض لوگ قرآن کریم کی آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ جس میں حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَسَلَّمَ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا﴾<sup>75</sup>

یہ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے موت ہے اور پھر حیات ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین فرمائیں کہ یہاں پر ایک ہے ”حال“ اور ایک ہے ”ذو الحال“۔ ذو الحال اور حال کا زمانہ ایک ہوتا ہے، ان دونوں کے زمانوں میں فرق نہیں ہوتا، الجھن یہاں سے ہوتی ہے کہ جب ہم ان دونوں کے زمانوں میں فرق کر لیتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَسَلَّمَ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا﴾

حضرت یحییٰ علیہ السلام پر سلام ہے جس دن وہ پیدا ہوئے، جس دن انہیں موت آئے گی اور جس دن زندہ ہوں گے۔

تو لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو! یہاں پہلے موت ہے اور پھر جب بعثت ہوگی تو حیات ہوگی... حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا﴾ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھیں گے اور پھر زندگی ملے گی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حال میں انھیں گے کہ زندہ ہوں گے۔ ﴿يُبْعَثُ﴾ میں ”هُوَ“ ضمیر ذو الحال ہے اور

﴿حَيًّا﴾ اس سے حال ہے، ذوالحال اور حال کا زمانہ ایک ہوتا ہے۔ مثلاً آپ کہتے ہیں ”جَاءَنِي زَيْدٌ رَاكِبًا“ کہ زید میرے پاس سوار ہو کر آیا۔ تو اس کا کیا مطلب کہ وہ سوار ہونے کی حالت میں مدرسہ میں داخل ہوا یا پہلے پیدل تھا اور جب مدرسے میں داخل ہوا تو سوار ہوا؟ پہلے سے سوار تھا۔ اسی طرح ﴿يُبْعَثُ حَيًّا﴾ ہے کہ قیامت کے دن انہیں زندہ حالت میں اٹھایا جائے گا۔ یعنی پہلے سے زندہ ہیں اور اسی حالت میں اٹھیں گے۔ اس لیے یہاں تو صاف ان کی حیات سمجھ آرہی ہے اور حیات بھی کون سی ہے؟ قبر والی ہے۔

﴿وَسَلَّمَ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ﴾... جب پیدا ہوئے۔ یہ ماضی ہے۔ تب بھی سلامتی

﴿وَيَوْمَ يَمُوتُ﴾... جب موت آئے گی تب بھی سلامتی

﴿وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا﴾... جب انہیں زندہ حالت میں اٹھایا جائے گا تب بھی سلامتی

یہاں ”وَيَوْمَ يُحْيِي“ نہیں ہے بلکہ ﴿وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا﴾۔ اگر یہ فرمایا جاتا کہ ”وَسَلَّمَ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَ يَوْمَ يَمُوتُ وَ يَوْمَ يُحْيِي“ تو اب اس کا معنی ہوتا کہ ان پر

سلامتی ہے جب یہ پیدا ہوئے، ان پر سلامتی ہے جب ان کو موت آئے گی اور ان پر

سلامتی ہے جب یہ زندہ ہوں گے لیکن یہاں ﴿وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا﴾ ہے اور ”يُبْعَثُ“ کی

قید ”حَيًّا“ بنادی، اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ بعثت اور حیات اکٹھی ہوں گی۔

تو قرآن کریم کی آیت سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ قبر کی حیات

ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ حیات ایسی ہے جو عام بندے کو نظر نہیں آرہی۔ اس

لیے میں نے کہا کہ یہاں ظاہری دو موتیں اور ظاہری دو حیاتیں ہیں۔

**فرعون کے مظالم:**

﴿فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيَاتِنَا مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوا أَبْنَاءَ الَّذِينَ

اٰمَنُوْا مَعَهُ وَاَسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ ۚ وَمَا كَيْدُ الْكَافِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍۭ ﴿٢٥﴾

جب فرعون کو اس بات کا اندیشہ ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو میری حکومت ختم کرے گا تو اس نے اپنے اراکین سے مشورہ کیا، اس کے اصحاب شوریٰ نے کہا کہ جو بچہ بنی اسرائیل میں پیدا ہو آپ اس کو قتل کر دیں۔ بچے قتل ہوتے رہے۔ جب کچھ عرصہ ایسے گزرا تو پھر انہوں نے مشورہ کیا کہ اگر سارے بنی اسرائیلی مرد قتل ہو گئے تو مشکل ہو جائے گی، ہماری خدمت کون کرے گا؟ مشورہ یہ ہوا کہ بچوں کو ایک سال قتل کریں اور ایک سال زندہ رکھیں۔ تو جس سال بچوں کو زندہ رکھنا تھا اس سال حضرت ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے اور جس سال بچوں کو قتل کرنا تھا اس سال حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اللہ نے ان دونوں کو نبوت عطا فرمائی۔

جب انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بچے قتل کرو تو ساتھ یہ بھی تھا کہ بچیاں زندہ رکھو۔ اب یہاں جو فرمایا: ﴿اَفْتُلُوْا اَبْنَاءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُ وَاَسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ﴾ تو اس میں نساء یہ ابناء کے مقابلے میں ہے۔ اگر ابناء سے مراد بڑے لوگ ہیں جو بالغ ہیں تو نساء سے مراد بالغ عورتیں ہوں گی اور اگر ابناء سے مراد چھوٹے بچے ہیں تو نساء سے مراد بچیاں ہوں گی۔ اب فرعونی جو قتل کر رہے تھے تو وہ پیدا ہوتے ہی قتل کر رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نساء سے مراد وہی بچیاں ہیں جو نابالغ ہوتی تھیں، ان کو چھوڑ دیا جاتا اور ابناء کو قتل کر دیا جاتا۔ تو قرآن کریم کی اس آیت سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح نساء بالغ عورت کو کہتے ہیں اسی طرح نساء نابالغ بچی کو بھی کہتے ہیں۔

**احمد سعید ملتانی کے اعتراض کا جواب:**

یہ بات میں نے کیوں کہی ہے؟ آپ کے علم میں ہے کہ احمد سعید چتر وڑی

نے کتاب لکھی ہے ”قرآن مقدس اور بخاری محدث“ اس کتاب میں اس نے صحیح بخاری کی 53 احادیث پیش کی ہیں اور کہا ہے کہ یہ احادیث العیاذ باللہ قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ ان میں ایک حدیث یہ ہے کہ ام المؤمنین امی عائشہ صدیقہ کا جب نکاح ہوا تو آپ رضی اللہ عنہا کی عمر چھ یا سات سال تھی، جب رخصتی ہوئی تو عمر نو سال تھی۔ تو اس نے کہا کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنً وَثُلَّةً وَدُبْعًا﴾<sup>76</sup>

کہ شادی نساء سے کرو اور نساء کہتے ہیں بالغہ کو اور حضرت عائشہ نکاح اور رخصتی کے وقت نابالغ ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ بخاری کی روایت ٹھیک نہیں ہے، قرآن کے خلاف ہے۔

میں نے کہا: بخاری کی روایت قرآن کے خلاف تب ثابت ہوگی جب نساء کا معنی بالغ عورت ہو اور اگر قرآن بالغ کو بھی نساء کہہ دے اور نابالغ کو بھی نساء کہہ دے تو پھر بخاری کی یہ حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہے۔ قرآن کریم میں نساء بالغ کو بھی کہا گیا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ

عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ﴾<sup>77</sup>

اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور ایمان والی عورتوں سے فرمائیں کہ پردہ کریں۔

تو قرآن بالغ عورت کو بھی نساء کہتا ہے اور یہاں اس سورت میں ہے:

﴿قَالُوا اقْتُلُوا أَبْنَاءَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ﴾

تو قرآن نابالغ کو بھی نساء کہتا ہے۔ جب قرآن کریم نابالغ کو نساء کہہ رہا ہے تو پھر بخاری شریف قرآن کے خلاف کیسے ہوئی؟ میں اس لیے کہتا ہوں کہ پورے قرآن پر نظر نہیں ہوتی تو لوگ بعض احادیث کو قرآن کے خلاف پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

### رجل مؤمن کی تقریر:

﴿وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَن يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ وَإِنَّ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ ۖ وَإِنَّ يَكُ صَادِقًا يُصِيبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ﴾

فرعون؛ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو العیاذ باللہ قتل کرنا چاہتا تھا تو فرعون ہی کے خاندان کا ایک بندہ مؤمن اٹھا جس نے اپنا ایمان چھپایا ہوا تھا، اس نے فرعون اور آل فرعون کو سمجھایا۔ یہ شخص کون تھا؟ بہت سارے مفسرین فرماتے ہیں کہ ان کا نام شمعان تھا اور بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ان کا نام حزقیل تھا اور یہ فرعون کے چچا کا بیٹا تھا۔

اس رجل مؤمن نے کہا: کیا تم ایسے بندے کو قتل کرنا چاہتے ہو جو فرما رہے ہیں کہ میرا رب اللہ ہے! اور وہ اپنے رب کی طرف سے واضح دلائل لے کر بھی آئے ہیں۔ اگر یہ جھوٹ بولتے ہیں تو جھوٹ کا وبال خود انہی کو پہنچے گا اور اگر یہ سچ بولتے ہیں تو جس چیز سے یہ تمہیں ڈرا رہے ہیں اس کا وبال تمہیں ضرور پہنچے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم موسیٰ علیہ السلام کو قتل نہ کرو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدیقین دنیا میں بہت کم ہوئے

ہیں، ایک ان میں یہ تھا ﴿رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ﴾ اور ایک ﴿وَجَاءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَّسْعَى﴾<sup>78</sup> حبیب نجار تھا اور ایک حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدیق اکبر ان سب سے افضل ہیں۔ اس سے آپ کو شبہ ہو گا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صدیق بہت کم ہیں جبکہ قرآن کریم میں ہے: ﴿أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ﴾<sup>79</sup> کہ صدیق تو بہت ہیں، اور خود امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ ستر صدیقین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ پانی پینے سے نیند بہت آتی ہے۔ تو امام غزالی رحمہ اللہ تو ستر صدیقین کہہ رہے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کی مراد یہ ہے کہ صدیق کا وہ مقام جہاں تک کوئی کوئی پہنچتا ہے یہ صدیق بہت کم ہوتے ہیں جو عکس نبوت کی طرح ہوتے ہیں، اور ایسے صدیق کہ جن کا قول؛ فعل کے مطابق ہو تو یہ امت میں بہت ہوتے ہیں۔

### منکرین رسالت کی شرارت:

﴿وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَاءَكُمْ بِهِ ۚ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنَ يَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا﴾<sup>80</sup>  
اس سے پہلے یوسف علیہ السلام تمہارے پاس واضح دلائل لے کر آئے لیکن تم ان کی لائی ہوئی تعلیمات میں شک کرتے رہے، جب یوسف علیہ السلام فوت ہو گئے تو تم نے کہا کہ ان کے بعد اللہ کسی نبی کو نہیں بھیجے گا!



یہ ان لوگوں نے بطور شرارت کہا تھا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یوسف اللہ کے نبی نہیں تھے اور اگر بالفرض وہ نبی بھی تھے تو اللہ کو ان کے بعد نبی بھیجنے کی ضرورت کیا ہے؟! کیونکہ جب ان کی نہیں مانی تو کسی اور کی بھی نہیں مانیں گے اس لیے اللہ ان کے بعد کوئی اور نبی کیوں بھیجیں گے!

### لغات کی تبدیلی سے معانی کی تبدیلی:

یہاں اس لفظ ﴿حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ﴾ کو سمجھیں۔ یوسف علیہ السلام فوت ہوئے، آپ کی وفات ہوئی لیکن قرآن کہتا ہے ”هَلَكَ“ کہ ہلاک ہوئے۔ یہاں بات صرف یہ سمجھنی ہے کہ ہر زبان کے اپنے الفاظ اور اپنے معانی ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ایک لفظ کا جو معنی ہمارے ہاں ہے وہی لفظ عربی میں ہو تو اس کا وہی معنی ہو گا بلکہ وہی لفظ اگر اہل عرب استعمال کریں گے تو اس کا معنی الگ ہو گا اور وہی لفظ ہم استعمال کریں گے تو اس کا معنی الگ ہو گا۔ ہمارے ہاں ”ہلاک“ کا لفظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ ”فلاں شخص ہلاک ہو گیا“ کہیں تو یہ اچھا لفظ شمار نہیں ہوتا اور عربی میں ہلاک دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں ہلاک کا معنی ہے ختم ہونا خواہ صحیح طریقے سے ہو خواہ غلط طریقے سے ہو، عزت کے ساتھ ہو یا ذلت کے ساتھ ہو، اور اردو میں ہلاک کا معنی عزت کے ساتھ نہیں بلکہ ذلت کے ساتھ ہوتا ہے، کہتے ہیں ناکہ فلاں ہلاک ہو گیا۔ تو اب یوسف علیہ السلام کے لیے قرآن کریم ﴿حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ﴾ لفظ استعمال کر رہا ہے لیکن ان کا دنیا سے جانا عزت کے ساتھ تھا۔ معلوم ہوا کہ ہلاک عربی میں ہو تو معنی اور ہوتا ہے اردو میں ہو تو معنی اور ہوتا ہے۔ اب دیکھیں! قرآن مجید میں ہے:

﴿وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ﴾<sup>80</sup>

اردو میں ضال کا معنی ٹھیک نہیں ہوتا، گمراہ کو اردو میں ضال کہتے ہیں اور عربی میں ضال کا معنی ہمیشہ گمراہ نہیں ہوتا۔ ایک چیز کسی کے سامنے نہ ہو اسے کہتے ہیں ضال اور اس کو چیز مل جائے تو اسے کہتے ہیں مہدی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اعلان نبوت سے قبل غارِ حراء میں جاتے اور متفکر ہوتے کہ میں اس امت کو شرک سے کیسے بچاؤں؟ اس امت کو زنا سے کیسے بچاؤں؟ اس امت کو ناحق قتل سے کیسے بچاؤں؟ میں انسان کو انسانیت پر کیسے لاؤں؟ اس پر آپ بہت پریشان ہوتے لیکن راستہ نظر نہیں آتا تھا کہ میں کیسے کام کروں کہ یہ راہِ راست پر آجائیں۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَجَدَكَ ضَالًّا﴾ کہ آپ کے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا ﴿فَهَدَىٰ﴾ تو ہم نے آپ کو راہ دکھادی۔

میں اس لیے بار بار زور دیتا ہوں قرآن فہمی پر کہ جب یہ بات سمجھ میں آ جائے کہ اللہ یہاں کیا فرمانا چاہتے ہیں تو پھر آگے بات سمجھانی آسان ہو جاتی ہے۔ جب یہ مفہوم ذہن میں ہو گا تو ضالاً کا ترجمہ کرنا بہت آسان ہے اور جب یہ مفہوم ذہن میں نہیں ہو گا تو پھر ضالاً کا ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے۔ لفظوں کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ عربی میں اس لفظ کا مطلب کیا ہے اور ہمارے ہاں اس لفظ کا مطلب کیا ہے؟

**”أَصْغَرَ عِضْوًا“ کا معنی:**

شاید آپ کے سامنے عبارات پر بات آچکی ہے، میں کئی بار عبارات سمجھاتا رہتا ہوں اور اس میں فقہ کی عبارتیں بھی پیش کیا کرتا ہوں کہ کس طرح غیر مقلد ان عبارات کا غلط مطلب بیان کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ فقہ حنفی میں لکھا ہوا ہے کہ امام

اس کو بناؤ ”أَصْغَرُ عُضْوًا“ کہ جس کا عضو چھوٹا ہو۔ غیر مقلدین کہتے ہیں کہ امام بنائیں گے یا اس کو چیک کریں گے؟ پتا کیسے چلے گا کہ اس کا عضو چھوٹا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ ان کو یہ غلط فہمی کہاں سے ہوئی؟ اصل میں ”أَصْغَرُ عُضْوًا“ یہ عربی محاورہ ہے جس کا اپنا ایک معنی ہے، اس کا معنی ہوتا ہے پاک دامن۔ تو ہم پاک دامن کہہ دیتے ہیں اور وہ ”أَصْغَرُ عُضْوًا“ کہہ دیتے ہیں۔ اب جو معنی عرب لیتے ہیں وہی معنی ہم بھی لیں گے تو مطلب ٹھیک نکلے گا۔ اب غیر مقلدین نے لفظ تو عربی کا لیا لیکن معنی اردو کے محاورے کا فٹ کیا تو مطلب غلط ہو گیا۔ اس لیے اگر جملہ عربی زبان کا ہو اور ترجمہ بھی عربی زبان کے محاورے کے مطابق ہو تو کبھی بھی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔

### عذابِ قبر کا ثبوت:

﴿فَوَقَّعَهُ اللَّهُ سَيِّئَاتٍ مَّا مَكْرُوهًا وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ﴿١﴾ النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿٢﴾﴾

اللہ نے اس مرد مؤمن کو ان فرعونوں کی بری چالوں سے بچا لیا اور فرعونوں کو برے عذاب نے گھیر لیا۔ آگ ہے جس کے سامنے فرعونوں کو صبح و شام پیش کیا جاتا ہے اور جب قیامت قائم ہوگی تو اس دن حکم ہو گا کہ فرعونوں کو سخت عذاب میں داخل کر دو۔

یہاں فرعونوں کے لیے اللہ نے تین قسم کے عذاب کا ذکر کیا؛ ایک عذاب دنیا کا، ایک عذاب قبر کا اور ایک عذاب آخرت کا، اور لفظ تینوں کے لیے الگ الگ لائے ہیں۔

[1]: ﴿وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ﴾

آلِ فرعون کو دردناک عذاب نے گھیر لیا۔

[2]: ﴿النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا﴾

صبح و شام ان پر آگ پیش کی جاتی ہے، برزخ اور قبر میں۔

[3]: ﴿وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ﴾

قیامت کا دن ہو گا تو حکم ہو گا کہ فرعونوں کو سخت عذاب یعنی جہنم میں داخل کر دو۔

تین عذاب تھے تو لفظ تینوں کے لیے الگ الگ لائے۔ دنیا کے لیے الگ، برزخ کے لیے الگ اور آخرت کے لیے الگ۔ چونکہ تینوں عذابوں کی نوعیت الگ الگ ہے اس لیے لفظ الگ الگ لائے ہیں۔

دنیا کا عذاب کیا تھا؟ ﴿وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ﴾ کہ کبھی عذاب جوں کا ہے، کبھی عذاب مینڈکوں کا ہے، کبھی عذاب خون کا ہے، کبھی عذاب ٹڈیوں کا ہے اور آخری عذاب یہ تھا کہ جب فرعون سمندر کے قریب گئے، بنی اسرائیل تو گزر گئے لیکن یہ راستے میں پھنس گئے اور پانی نے ان کو ختم کر دیا۔ یہ دنیا کا عذاب تھا، سب کو عذاب نے اپنے اندر لے لیا، کوئی اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکا۔

اور جب برزخ کے عذاب کی باری آئی فرمایا: ﴿النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا

غُدُوًّا وَعَشِيًّا﴾

**آلِ فرعون کی روحیں کہاں ہیں؟**

یہاں آپ دو روایتیں سمجھیں! ایک روایت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہے جو تفسیر عبد الرزاق میں بھی ہے اور تفسیر مظہری میں بھی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

آلِ فرعون کی جو روحیں ہیں یہ کالے رنگ کے پرندوں کے پیٹوں میں لاکر

صبح و شام جہنم پر پیش کی جاتی ہیں، ان کو جہنم پر لے آتے ہیں پھر ان کو دکھاتے ہیں یہ تمہارا ٹھکانا ہے۔<sup>81</sup>

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موت کے بعد انسان کو صبح و شام وہ مقام دکھایا جاتا ہے جہاں اس نے قیامت کے حساب کتاب کے بعد پہنچنا ہے۔ جو شخص مؤمن ہے تو اس کو اس کا ٹھکانا جنت دکھایا جاتا ہے کہ حساب کے بعد تم نے یہاں جانا ہے اور اگر وہ شخص کافر ہو تو اسے اس کا ٹھکانا جہنم دکھایا جاتا ہے کہ حساب کے بعد تمہیں یہاں بھیجنا ہے۔<sup>82</sup>

اب بعض لوگ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ والی روایت لیتے ہیں اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما والی روایت کو چھوڑ دیتے ہیں، کہتے ہیں عذاب روح کو ہوتا ہے کیونکہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عالم برزخ میں فرعونوں کی روحیں جو کالے رنگ کے پرندوں کے پیٹ میں ہوتی ہیں ان کو جہنم دکھائی جاتی ہے۔

میں نے کہا کہ صرف ایک روایت کو نہ دیکھو بلکہ صحیح بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بھی دیکھو کہ مؤمنین کو ان کا ٹھکانا جنت اور کفار کو ان کا ٹھکانا جہنم دکھایا جاتا ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عالم برزخ میں روح کو عذاب دکھایا جاتا ہے اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جسم کو دکھایا جاتا ہے کہ یہ

81- تفسیر عبدالرزاق: ج 3 ص 147، التفسیر المظہری: ج 8 ص 261

82- صحیح البخاری، رقم: 3240

تمہارا ٹھکانا ہے۔

ہمارا اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف یہ ہے کہ موت کے بعد اصلاً ثواب اور عذاب روح کو ہوتا ہے اور روح کے واسطے سے جسم کو ہوتا ہے۔ اب یہ دونوں روایتیں جمع ہو جائیں گی کہ نہ ثواب و عذاب صرف روح کو ہے اور نہ صرف جسم کو ہے بلکہ روح اور جسم دونوں کو ہے۔ مؤمنین کی ارواح علیین میں چلی جاتی ہیں تو روح کا تعلق جسم کے ساتھ رہتا ہے، کفار کی ارواح سجن میں چلی جاتی ہیں تو بھی روح کا تعلق جسم کے ساتھ رہتا ہے۔ جسم قبر میں رہ کر جو اپنا ٹھکانا دیکھتا ہے یہ روح کے تعلق سے دیکھتا ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ ثواب و عذاب روح اور جسم دونوں کو ہوتا ہے۔ اس کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ حدیث پاک میں ہے کہ اگر قبر میں مؤمن ہو تو ایک فرشتہ آسمان سے اعلان کرتا ہے کہ اللہ فرما رہے ہیں ”أَنْ قَدْ صَدَّقَ عَبْدِي“ کہ میرے بندے نے سوالوں کا صحیح جواب دیا ہے، ”فَأَفْرِشُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ“ اس کو جنت کا بچھونا دو! ”وَالْبِسُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ“ اس کو جنت کا لباس دے دو! ”وَأَفْتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى الْجَنَّةِ“ جنت کی طرف سے دروازہ کھول دو! ”فَيَأْتِيهِ مِنْ رَوْحِهَا وَطِيبِهَا“ جنت اپنی جگہ پر رہتی ہے اور میت اپنی جگہ پر۔ جنت سے خوشبو اور ہوا آتی ہے۔

مؤمن جنت میں داخل نہیں ہو رہا بلکہ اپنی قبر میں ہے، اس پر جنت کھلتی ہے۔ اسے کہتے ہیں؛ عرض جنت۔

قبر میں اگر کافر ہے تو اعلان ہوتا ہے ”أَنْ كَذَّبَ فَأَفْرِشُوهُ مِنَ النَّارِ وَالْبِسُوهُ مِنَ النَّارِ“ کہ اس بندے نے جھوٹ بولا ہے، اس کو جہنم کا بچھونا دو، جہنم کا لباس دو، ”وَأَفْتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى النَّارِ“ جہنم کی طرف والا دروازہ کھول دو، ”فَيَأْتِيهِ مِنَ النَّارِ“

حَرِّهَا وَسُمُومِهَا“ پھر جہنم کی گرمی اور لو اس کی قبر میں آتی ہے۔<sup>83</sup>

تو کافر جہنم میں داخل نہیں ہو رہا بلکہ اپنی قبر میں ہے اور اس پر جہنم کھلتی ہے۔ اسے کہتے ہیں؛ عرضِ نار، اور ﴿النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا﴾ میں یہی عرضِ نار مراد ہے۔

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ ثواب و عذابِ قبر بھی ہے اور اس کی نوعیت عرضِ جنت اور عرضِ نار کی ہے اور ثوابِ جنت اور عذابِ جہنم بھی ہے اور اس کی نوعیت دخولِ جنت اور دخولِ جہنم کی ہے۔ بس یہ ہے اصل معاملہ، اس کو سمجھنا ضروری ہے۔

### انبیاء و مؤمنین کی مدد:

﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ

الْأَشْهَادُ﴾

ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی اور قیامت کے دن بھی۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فاتح مکہ بنے، موسیٰ علیہ السلام بچ گئے اور فرعون ہلاک ہو گیا لیکن کتنے انبیاء ایسے ہیں کہ جو شہید ہو گئے تو سوال یہ ہے کہ ان کی مدد کیسے ہے؟ کتنے مؤمن ایسے ہیں جو زندگی جیل میں گزارتے ہیں اور ان کا جنازہ وہیں سے اٹھتا ہے۔ ان کی مدد پھر کیسے ہوئی؟

اس کا ایک جواب علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے دیا ہے کہ یہاں ”نصر“ کا معنی انتصار اور انتقام ہے یعنی اللہ فرماتے ہیں کہ ہم ایمان والوں کا اور نبیوں کا بدلہ لیتے ہیں۔ جب کوئی ظالم؛ کسی مؤمن یا کسی نبی پہ ظلم کرتا ہے تو اللہ اس ظلم کا بدلہ ان ظالموں کو

دنیا میں دیتے ہیں۔ مثلاً آپ کسی قبیلہ کے حلیف ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ جب مشکل وقت آن پڑا تو ہم آپ کی مدد کریں گے اور وہ قبیلہ بھی کہتا ہے کہ ہم بھی مشکل وقت میں آپ کی مدد کریں گے۔ دونوں کا معاہدہ ہو گیا۔ دشمن نے اچانک آپ کے حلیف قبیلے پر حملہ کر دیا اور ان کے کچھ بندے قتل کر دیے اور کچھ بندے قید کر لیے۔ اب آپ کے مدد کرنے کا مطلب کیا ہے کہ جو مر چکے تھے ان کو زندہ کریں گے؟ اب مدد کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارا بدلہ لیں گے۔

اسی طرح اگر کوئی بندہ قتل ہو جائے اور اس کا بیٹا رو رہا ہو کہ میرا باپ قتل ہو گیا ہے، بیٹی رو رہی ہے کہ میرا باپ قتل ہو گیا، بیوی رو رہی ہے کہ میرا شوہر قتل ہو گیا، ماں رو رہی ہے کہ میرا بیٹا قتل ہو گیا۔ اس مقتول کے ورثاء کی مدد یہ ہے کہ قاتل کو سزا دو۔ اب یہ ورثاء کہیں گے کہ اس نے بدلہ دلو اگر ہماری مدد کی ہے۔

مدد کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ جب آپ کے بیٹے پر کوئی بندہ حملہ کرے تو کوئی آپ کے بیٹے کو بچالے، یہ بھی مدد ہے اور بیٹا قتل ہو جائے اور بیٹے کا بدلہ لے دیں تو یہ بھی مدد ہے۔ اللہ رب العزت کبھی ایمان والوں اور نبیوں کی مدد یوں کرتے ہیں کہ ان کے دشمن کو ختم کر دیتے ہیں اور نبی اور ایمان والے کو بچا لیتے ہیں اور کبھی مدد یوں کرتے ہیں کہ نبی اور ایمان والا شہید ہو جاتا ہے اور اللہ ان کا بدلہ خود لیتے ہیں۔ جب یہ بات ذہن میں ہوگی تو پھر الجھنیں نہیں رہتیں۔

اور اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں ﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ہم ان کی مدد کرتے ہیں دلیل کے ساتھ یعنی مؤمن اور نبی کا جو مخالف ہے وہ طاقت میں غالب آ بھی جائے تو دنیا دار الامتحان ہے، دارالابتلاء ہے لیکن دلیل کے درجے میں نبی اور مؤمن پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا۔ تو ہم قوتِ دلیل سے ان کی مدد فرماتے ہیں، یہ تھوڑے ہو کر بھی زیادہ نظر آتے ہیں، یہ کم ہو کر بھی غالب نظر آتے ہیں لیکن غالب



بالدلیل ہوتے ہیں۔

## نبی کی طرف ”ذنب“ کی نسبت کا معنی:

﴿فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ

بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ۖ﴾

آپ صبر کریں، بے شک اللہ کا وعدہ حق اور سچ ہے اور آپ اللہ سے معافی مانگیں اپنے ان معاملات کی جو آپ کی شان کے لائق نہیں تھے اور صبح و شام اللہ کی تسبیح اور تحمید کریں۔

اب اس آیت سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس میں ذنب کی نسبت نبی کی طرف ہے۔ اور ذنب عام طور پر گناہ کو کہتے ہیں۔

اس کے کئی جوابات ہیں:

ذنب ایک لفظ ہے، اگر اس کی نسبت نبی کی طرف ہو جائے تو اس کا معنی اور ہوتا ہے اور جب اس کی اضافت امتی کی طرف ہو جائے تو اس کا معنی اور ہوتا ہے، معنی کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ جس طرح محبت ایک لفظ ہے، اس کی نسبت ماں کی طرف ہو جائے تو معنی اور ہے، بیوی کی طرف ہو جائے تو معنی اور ہے، بیٹی کی طرف ہو جائے تو معنی اور ہے، بہن کی طرف ہو جائے تو معنی اور ہے۔ اب لفظ ایک ہے نسبت کے بدلنے سے معنی تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ذنب ایک لفظ ہے، اس کی نسبت امت کی طرف ہو تو معنی اور ہوتا ہے اور نبی کی طرف ہو تو معنی اور ہوتا ہے۔ یہاں ﴿وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ﴾ کا معنی یہ نہیں کہ جیسے امتی گناہ کرتا ہے ایسے ہی نبی کا گناہ ہوتا ہے! یہ معنی بدلتا کیسے ہے ذرا اس کو سمجھیں۔

پہلے میں مثال دیتا ہوں پھر میں بات سمجھاتا ہوں۔ آپ کے ہاں ایک مہمان

آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے دودھ پینا ہے اور شیشے کے گلاس میں چاہیے۔ آپ بچے کو گھر بھیجتے ہیں دودھ لینے کے لیے، اسے ٹھوکر لگی، گلاس گرتا ہے اور ٹوٹ جاتا ہے اور دودھ گر جاتا ہے۔ بچہ کہتا ہے: استاد جی! مجھے معاف کر دیں، مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ آپ کہتے ہیں: تم نے جان بوجھ کر توڑا ہے؟ کہتا ہے: نہیں۔ آپ کہتے ہیں پھر غلطی کس بات کی؟ جاؤ جا کر بیٹھو اور سبق پڑھو۔ استاد جی! معاف کر دیں۔ بیٹا! چلے جاؤ کلاس میں بیٹھو۔ وہ پھر کہتا ہے: استاد جی! مجھے معاف کر دیں، مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ اب مہمان آپ سے کہتا ہے کہ استاذ جی! اس کی غلطی تو نہیں ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ بڑا احساس قسم کا لڑکا ہے، آپ اسے کہہ دیں کہ میں نے معاف کیا۔ آپ کہتے ہیں کہ بیٹا! تیری غلطی تو نہیں ہے لیکن جسے تو غلطی کہتا ہے چلو میں نے معاف کیا۔ اب وہ لڑکا خوش ہوتا ہے کہ استاد جی نے معاف کر دیا۔

اسی طرح ایک کام پیغمبر کرتا ہے اور وہ گناہ نہیں ہوتا موسیٰ علیہ السلام نے قبلی کو مکا مارا وہ مر گیا گناہ تو نہیں تھا جان بوجھ کر تھوڑا مارا لیکن موسیٰ علیہ السلام اللہ سے کہہ رہے ہیں کہ یا اللہ میں نے مکا مارا، جان سے مارنے کی نیت نہیں تھی لیکن پھر بھی میرے مکے سے مرا ہے آپ مجھے معاف کر دیں۔

اب اللہ نبی کے اس لفظ کو نقل کرتے ہیں ﴿وَأَسْتَغْفِرُ لَذُنُوبِكَ﴾ یہ گناہ نہیں ہے لیکن جس کو آپ گناہ کہہ رہے ہیں ہم نے وہ بھی معاف کیا۔ تو ذنب ایک ہی لفظ ہے، اس کی نسبت نبی کی طرف ہو تو معنی یہ ہے کہ وہ گناہ ہوتا نہیں ہے لیکن نبی اس کو گناہ فرما رہے ہوتے ہیں اور جس ذنب کی نسبت امت کی طرف ہو تو وہ گناہ ہوتا ہے۔ اس لیے دونوں میں فرق ہے۔

**مغفرت سے فتح کا تعلق؟**

جیسے سورۃ الفتح میں ہے: ﴿يَغْفِرُ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا

تَنَاحَرُ ﴿۱﴾۔ اب یہاں ذنب کا معنی ”گناہ“ کریں تو آیت میں جوڑ ہی نہیں ہو گا۔ اگر معنی یہ کریں کہ ”ہم نے آپ کو فتح دی تاکہ آپ کے گناہ معاف کر دیں“ تو سوال یہ ہے کہ فتح سے گناہ کی معافی کا کیا تعلق ہے؟ ہاں یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہم نے آپ کو فتح دی تاکہ آپ بدلہ لیں! ہم نے آپ کو فتح دی تاکہ آپ ریاست قائم کریں! ہم نے آپ کو فتح دی تاکہ آپ کو عزت ملے! ہم نے آپ کو فتح دی تاکہ اسلام غالب آجائے... یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن آپ کو فتح دی تاکہ گناہ معاف ہوں تو فتح اور گناہوں کی معافی کا کیا جوڑ ہے؟!

مثلاً آپ کے علاقے میں الیکشن ہوتا ہے، ایک کافر امیدوار ہے اور ایک مسلمان ہے، دونوں مقابلہ کرتے ہیں، مسلمان امیدوار ایم این اے بن جاتا ہے۔ آپ اس کے پاس پانچ کلو مٹھائی لے کر جائیں اور کہیں: مبارک ہو! آپ کے گناہ معاف ہو گئے! کیونکہ آپ جیت گئے ہیں۔ تو سارے کہیں گے کہ یار تو عجیب آدمی ہے، وہ ایم این اے بن گئے اور تو کہتا ہے کہ گناہ معاف ہو گئے۔

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ یہاں ذنب کا معنی گناہ ہے ہی نہیں۔ یہاں ہے ﴿يَتَغَفَّرُ﴾ اور یہ غفران سے ہے جس کا معنی ہے ڈھانپ لینا۔ یہاں ذنب سے مراد ہے الزام اور الزام آدمی کسی کے سامنے نہیں لگاتا، ہمیشہ پشت کے پیچھے لگاتا ہے۔ ذنب عربی میں دم کو بھی کہتے ہیں اور دم جانور کے پیچھے ہوتی ہے، اور الزام بھی چونکہ کسی کی پیٹھ پیچھے لگایا جاتا ہے اس لیے اس کو ذنب کہتے ہیں۔ اب اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے پیغمبر! یہ جو الزامات آپ پر لگتے تھے تو ہم نے سارے الزامات آپ کو فتح دے کر ڈھانپ دیے۔ ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ﴾ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ﴿۲﴾ یہ لوگ آپ کے مخالف تھے اس لیے الزام لگاتے تھے لیکن اب آپ کے غلام بن جائیں گے، اب الزام نہیں لگائیں گے، ہم نے فتح کے بعد

سارے الزام ڈھانپ دیے۔

جیسے آپ سال کے لیے جماعت میں جائیں تو لوگ باتیں کریں گے کہ بیوی کا حق نہیں ہے؟ بچوں کا حق نہیں ہے؟ کتنا ظالم ہے، اسے دنیا کی فکر ہے لیکن اپنی اولاد کی نہیں اور جب آپ سال کے بعد گاؤں واپس آئے اور ساتھ یہ بھی پتا چل جائے کہ یہ گیا تو سال کے لیے تھا لیکن ساتھ انگلینڈ میں ملازمت بھی مل گئی ہے، یہ گیا تو سال کے لیے تھا لیکن اس کو وہاں سے اچھے خاصے ہدیے مل گئے ہیں، گیا تو سال کے لیے تھا لیکن وہاں ایک بندہ مل گیا تھا جس نے کہا کہ میں آپ کا سارا مدرسہ بنادوں گا اور اس کے آنے سے پہلے مدرسہ بنا شروع بھی ہو جائے۔ تو اب کوئی بھی الزام نہیں لگائے گا کہ اسے بیوی بچوں کی فکر نہیں بلکہ ہر کوئی کہے گا کہ ماشاء اللہ آپ کا سال تو زبردست ہوا یا، مزا آگیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے لوگ آپ کے مخالف تھے لیکن اب وہ سمجھیں گے کہ آپ کے قریب آنے سے ان کا فائدہ ہے، ان کی عزت ہے۔ جب خاندان میں آپ کا قد بڑھتا جائے گا تو خاندان آپ کے قریب آتا جائے گا۔ لیکن اگر آپ کا قدم ہو تا جائے تو لوگ دین کے نام پر آپ کو بدنام کرتے جائیں گے۔

### اخلاق کب دیکھے جاتے ہیں؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اخلاق مدینہ منورہ میں تھے وہی اخلاق مکہ میں تھے، یہ نہیں کہ آپ کے مکہ میں اخلاق کم تھے اور مدینہ میں زیادہ تھے۔ جب آپ مکہ میں تھے تو اس وقت کانٹے بچھائے جا رہے تھے، مکہ میں تھے تو او جھڑیاں اوپر پھینکی جا رہی تھیں، مکہ میں تھے تو قتل کے منصوبے بنائے جا رہے تھے اور جب آپ فاتح بن کر آئے تو اب لوگوں نے کہا کہ محمد بہت اخلاق والے ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ مجھے آپ بتائیں! جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے تو کئی زندگی میں لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم کرتے تھے تو حضور نے بدلہ لیا یا معاف کیا؟ (معاف

کیا۔ سامعین) اور جب فاتح بن کر آئے تو مخالفین کو معاف کیا یا بدلہ لیا؟ (معاف کیا۔ سامعین) میرے علم میں کوئی ایک کتاب حدیث یا تاریخ کی نہیں ہے، میرے علم میں کسی بڑے سے بڑے کافر اسکا لر کا جملہ بھی نہیں ہے جس نے لکھا ہو کہ حضور بہت اخلاق والے تھے کیونکہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ والے ظلم کرتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ میں نے معاف کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کب بتانے تھے؟ جب آپ فاتح بن کر گئے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ میں نے معاف کیا۔ اس کی وجہ کہ جب بدلہ لینے کا وقت ہو اور بدلہ لینے پر قادر ہوں اور پھر کہیں کہ میں نے معاف کیا تو اس وقت لوگ کہتے ہیں کہ بڑے اخلاق والے ہیں اور جب طاقت نہ ہو اور بدلہ لینے پر قادر بھی نہ ہوں اور پھر کہیں کہ میں نے معاف کیا تو لوگ اس کو اخلاق نہیں کہتے، لوگ اس بندے کا مذاق اڑاتے ہیں۔

میں اس لیے گزارش کیا کرتا ہوں کہ اخلاق حاکم کے دیکھے جاتے ہیں، اخلاق محکوم کے نہیں دیکھے جاتے۔ ہم محکوم بن کر خوش اخلاق بننا چاہتے ہیں! محکومیت کی حالت میں کوئی آپ کے اخلاق نہیں دیکھے گا۔

ہمارا کوئی تبلیغی ساتھی امریکہ جائے، انگلینڈ جائے یا دنیا کے کسی اور ملک میں جائے تو کھڑا کر کے تلاشی لیں گے حالانکہ اس کے چہرے پر ڈاڑھی ہے، سر پر پگڑی ہے، بہت نیک ہے پھر بھی تلاشی لیں گے اور آپ اسی ڈاڑھی اور پگڑی کے ساتھ وزیر اعظم بن کر جائیں تو اب تلاشی کوئی نہیں لے گا۔ پہلے بھی یہ ڈاڑھی اور پگڑی تو تھی لیکن وہ ایک عام بندہ تھا تو نوعیت الگ تھی۔ اب چونکہ حیثیت بدل گئی ہے تو تمام لوگوں کا مزاج آپ کے بارے میں بدل جائے گا۔

میں اس لیے گزارش کرتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اخلاق بہت بڑی چیز ہیں لیکن کب؟ جب آپ غالب ہوں، آپ طاقتور ہوں، آپ بڑے

عہدے پر ہوں تو پھر آپ کے اخلاق سے لوگ متاثر ہوں گے۔ آپ محکوم ہوں گے تو آپ کے اخلاق سے لوگ متاثر نہیں ہوں گے، کوئی بندہ آپ کے اخلاق دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔

### رات اور سکون:

﴿اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا<sup>ط</sup>

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٦٦﴾﴾

اللہ نے تمہارے لیے رات کو بنایا تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو بنایا تاکہ تم اس میں دیکھو، دن میں کام کیا کرو۔ یعنی اللہ نے دن اور رات کا نظام ایسا بنایا ہے کہ رات کو چونکہ نیند کے لیے بنایا تو اس میں روشنی ختم ہو جاتی ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے اور نظام ایسے بنتا ہے کہ آدمی سوئے تو مزہ آتا ہے۔ اگر کام کرنا چاہے تو اس کو لائٹ جلانا پڑتی ہے اور دن کو جلی جلائی لائٹ ہے، بس یہاں کام کے لیے لائٹ نہیں جلائی پڑتی۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت اور فطرت یہی ہے کہ بندہ دن کو کام کرے اور رات کو آرام کرے۔ ہاں اگر کوئی تقاضا اور ضرورت ہو اور اس کی وجہ سے رات کو کام کرنا پڑے تو کام کرنا چاہیے، یہ نہیں کہ کام کرنا گناہ ہے۔

### اترانے اور اکڑنے میں فرق:

﴿ذِكْرُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفَرُّحُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ

تَمْرَحُونَ ﴿٦٧﴾﴾

کفار سے فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں عذاب اس لیے ہوا کہ تم ناحق زمین میں اتراتے تھے اور اس لیے کہ تم اکڑ دکھاتے تھے۔

ان کفار کو جو عذاب دیا گیا تو اس کی دو وجہیں بیان فرمائی ہیں:

## ◆ ”تَفَرُّحُونَ“ ◆ ”تَغْيِرُ الْحَقِّ“

”تَفَرُّحُونَ“ کے ساتھ ”تَغْيِرُ الْحَقِّ“ کی قید ہے اور ”تَفَرُّحُونَ“ کے ساتھ کوئی قید نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہے فرح اور ایک ہے مرح۔ فرح کا معنی ہوتا ہے خوشی، یہ شریعت میں مطلوب ہے اور جب ناحق ہو تو یہ غلط ہے۔ اور مرح کا معنی ہوتا ہے اکڑنا، یہ شریعت میں مطلوب نہیں ہے، اکڑنا؛ یہ حق ہوتا ہی نہیں بلکہ ہمیشہ ناحق ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کو اللہ پاک گاڑی اچھی دیتا ہے، پیسے دیتا ہے، کپڑے دیتا ہے، مکان دیتا ہے، منصب دیتا ہے۔ یہ بندہ کہتا ہے: یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ یہ بندہ خوش ہو رہا ہے۔ ایک آدمی یوں خوش ہو رہا ہے کہ میرے پاس تو گاڑی ہے اور اُس کے پاس صرف سائیکل ہے۔ اب یہ خوشی ناحق ہے۔ اب گناہ ہو گا۔ اس لیے قرآن کریم میں فرمایا: ﴿فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا﴾<sup>84</sup> کہ اللہ کی نعمتوں پر خوش ہونا چاہیے۔

یہاں فرمایا کہ ان کو عذاب دیا فرحت کی وجہ سے، اس لیے کہ ﴿تَفَرُّحُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ کہ خوشی ناحق تھی اور یہ عذاب کا سبب ہے اور خوشی حق ہو تو یہ شریعت میں مطلوب ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾<sup>85</sup>

کہ آپ اپنے رب کی نعمتوں کا اظہار فرمائیں۔ تو یہ چیزیں اللہ پسند فرماتے ہیں لیکن ناحق پر اللہ گرفت بھی فرماتے ہیں۔

## پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار پر عذاب کا انتظار:

﴿فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ فَمَا نَزَرْنَا بِكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ  
تَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ﴾

اللہ اپنے نبی سے فرما رہے ہیں کہ اے میرے پیغمبر! آپ کچھ انتظار کریں،  
اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ ہم نے ان کافروں کے ساتھ جس عذاب کا وعدہ کیا ہے یا تو آپ کی  
زندگی میں اس عذاب کا کچھ حصہ ان کو دے دیں گے یا آپ کی وفات کے بعد دیں گے  
لیکن دیں گے ضرور۔

اب دیکھو! کفار پر عذاب کا اللہ کے نبی انتظار فرما رہے ہیں نا، تبھی تو اللہ فرما  
رہے ہیں کہ ”فَاصْبِرْ“۔ میں بارہا کہتا ہوں کہ شریعت کو سمجھو! ہمیشہ ایک دماغ بنانا اور  
ہمیشہ ایک ہی بات کہنا کہ اللہ کے نبی نبی الرحمتہ تھے اس لیے حضور چاہتے تھے کہ  
کافروں پر عذاب نہ آئے... یہ بات درست نہیں! اللہ تو فرما رہے ہیں ”فَاصْبِرْ“ کہ  
آپ انتظار کریں، اللہ کا وعدہ برحق ہے، ہم ان کو عذاب دیں گے، آپ کی زندگی میں  
دیں یا آپ کی وفات کے بعد دیں لیکن دیں گے ضرور! اور یہ ”فَاصْبِرْ“ کب کہتے ہیں  
کہ جب بندے کو انتظار ہو یا نہ ہو؟ (انتظار ہو۔ سامعین) تو ان کفار پر عذاب کا حضور  
بھی انتظار فرماتے تھے کہ ان پر عذاب کب آئے گا!

باقی یہ بات کہ عذاب کا انتظار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت کے  
خلاف ہے؟ تو ہر گز نہیں، شانِ رحمت کے خلاف نہیں ہے کیونکہ کفار کو عذاب دینے  
کا مقصد یہ تھا کہ:

نمبر 1: جن مسلمانوں پر ظلم ہوا ہے وہ اس سے خوش ہوں گے کہ ظالم کو سزا ملی ہے  
اور مسلمان کو خوش کرنا یہ رحمت کا تقاضا ہے۔



نمبر 2: اگر یہ کافر زندہ رہے تو مزید کفر کا سبب بنیں گے۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی دعا مانگی تھی: ﴿إِنَّكَ إِن تَذَرَهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ﴾<sup>86</sup> اے اللہ! اگر آپ ان کو چھوڑ دیں گے تو یہ آپ کے بندوں کو گمراہ کریں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی تھی: ﴿رَبَّنَا أَطْمِسْ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّى يَذُوقُوا الْعَذَابَ الْآلِيمَ﴾<sup>87</sup> اے اللہ! ان کے مال کو تباہ و برباد کر دیں اور ان کے دلوں کو اتنا سخت کر دیں کہ یہ اس وقت تک ایمان نہ لاسکیں جب تک اپنی آنکھوں سے عذاب نہ دیکھیں لیں۔

اس لیے پیغمبر کو بھی انتظار تھا کہ ان کو اب ختم ہونا چاہیے۔ آپ نے تیس سال محنت کی ہے، دعوت دی ہے، ان کافروں نے مسلمانوں پر بار بار ظلم کیا ہے تو اب ظالم کو باقی نہیں رہنا چاہیے۔ فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ﴾ میرے پیغمبر! آپ انتظار فرمائیں، ہم آپ کا بدلہ ان سے ضرور لیں گے۔

### وحی کے مقابلے میں کفار کا اپنے فن پر اترانا:

﴿فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ﴾<sup>88</sup>

جب کفار کے پاس انبیاء علیہم السلام دلائل لے کر آتے تو کفار اپنے علم پر بڑے خوش ہوتے اور اتراتے تھے۔ اور جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی نے ان کو گھیر لیا۔

وحی کے مقابلے میں جو فن ہوتا ہے اس کو علم نہیں کہتے، قرآن اسے علم کہہ رہا ہے، اس کی وجہ ﴿يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ﴾<sup>88</sup> کہ وہ لوگ دنیا کی زندگی کے صرف ظاہری پہلو کو ہی جانتے تھے، آخرت کے معاملے میں بالکل غافل تھے۔ جب پیغمبر ان کے پاس دلائل لے کر آتے اور آخرت کی بات کرتے تو یہ لوگ اپنے ظاہری علم کی بنا پر اترتے، چونکہ ان کو دنیا کا یہ فن معلوم تھا کہ بلڈنگ کیسے بنتی ہے، کشتی کیسے بنتی ہے، جنگ کیسے کی جاتی ہے، مال کیسے اکٹھا کیا جاتا ہے؟ تو یہ لوگ اس پر اترتے تھے، اس پر اکڑتے تھے۔ اس لیے یہاں فرمایا: ﴿ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ کہ ان کے پاس حقیقی علم نہیں تھا بلکہ بس ظاہری سا علم تھا۔ اب اس آیت کو ملائیں گے تو ﴿فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ﴾ کو سمجھنا آسان ہو گا کہ ان کے پاس علم نہیں تھا بلکہ دنیاوی زندگی کا ظاہری علم و فن اور ظاہر ہنر تھا۔ یہ لوگ اپنے ظاہری علم پر اکڑتے تھے کہ ہمارے پاس طاقت اور قوت ہے، ہم کیوں کلمہ قبول کریں!

**نزع کی حالت میں ایمان لانا معتبر نہیں!**

﴿فَلَمَّا رَاَوْا بَاسَنَا قَالُوا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحَدّٰهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ

مُشْرِكِيْنَ﴾<sup>89</sup>

اور جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو کہنے لگے کہ ہم ایک اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور ہم ان کا انکار کرتے ہیں جن کو ہم اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے۔

﴿فَلَمْ يَكْ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاسَنَا ۚ سُنَّتِ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ

خَلَدْتُ فِي عِبَادِهِ ۖ وَخَيْرَ هُنَا لَكَ الْكَفْرُونَ ﴿٨٩﴾

جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تب ایمان لانا ان کے لیے کچھ فائدہ مند نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی عادت اور معمول یہی ہے جو اس کے بندوں میں جاری رہی ہے۔ کہ عذاب کے بعد ایمان لانا نفع مند نہیں۔ اور اس موقع پر کافر لوگ نقصان میں پڑ گئے۔ حدیث پاک میں ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُعْزِزْ.<sup>89</sup>

کہ جب غرہ کی حالت آجائے، نزع کی حالت آجائے تو اللہ توبہ قبول نہیں فرماتے۔

اللہ ہم سب کو بات ماننے والا بنائے، اللہ ہم سب کو ضدی لوگوں سے دور رکھے، اللہ ہم سب کو شریعت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة لحم السجدة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿حَمْدٌ تَنْزِيلٌ مِنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ كُتِبَ فَصَلْتُ أَيْتُهُ قُرْآنًا

عَرَبِيًّا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝﴾

میں نے کہا تھا کہ سات سورتیں ایسی ہیں کہ جن کے شروع میں لحم آیا ہے۔ انہیں حوامیم بھی کہتے ہیں اور آل لحم بھی کہتے ہیں اور پھر ہر ایک کو الگ کرنے کے لیے ساتھ کوئی لفظ بڑھا دیتے ہیں جیسے حم المؤمن، حم السجدة وغیرہ۔

ابو الولید عتبہ بن ربیعہ کے قرآن سننے کا واقعہ:

﴿تَنْزِيلٌ مِنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝﴾

قرآن مجید اس ذات کی طرف سے نازل ہوا ہے جو رحمن اور رحیم ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حرم کعبہ کے ایک کونے میں الگ بیٹھے تھے اور عتبہ بن ربیعہ - ابو الولید جس کی کنیت تھی - وہ حرم کعبہ کے دوسرے کونے میں قریشیوں کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے قریش سے کہا کہ اگر تم کہو تو میں جا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کروں، صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کو کچھ پیش کروں کہ آپ تبلیغ چھوڑ دیں اور ہمارے مذہب کو برانہ کہیں۔

ان لوگوں نے کہا کہ آپ چلے جائیں۔ تو عتبہ بن ربیعہ اٹھا اور آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے جا کر کہا کہ محمد! آپ ہم میں بڑے قابل احترام ہیں، آپ ایسی دعوت لے کر آئے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے خاندان میں پھوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ اس لیے میں چند چیزیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں، آپ جس کو پسند فرمائیں ہم ماننے کے لیے تیار ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ نے جو بات کہنی ہیں وہ کہہ دیں، میں آپ کی ساری بات سنتا ہوں۔ اس نے کہا کہ بھتیجے! آپ نے جو دعوت اور تبلیغ شروع کی ہے اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا حاکم مان لیتے ہیں، بادشاہ بنا لیتے ہیں، اگر آپ کو دولت چاہیے تو ہم اکٹھی کر کے دے دیتے ہیں، یوں قریش میں سب سے بڑے مالدار آپ ہوں گے اور اگر آپ پر کوئی جن ہے، کوئی اثر ہے جس کی وجہ سے آپ ایسی باتیں کرتے ہیں تو ہم آپ کا علاج کر لیتے ہیں۔

جب اس نے ساری بات کہہ لی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورت **لُحْمِ السَّجْدَةِ** کی تلاوت شروع فرمائی، جب آپ یہاں پر پہنچے ﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ ضِعْفَةً مِّثْلَ ضِعْفَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ۖ﴾ تو ابو الولید پر خوف طاری ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ مبارک پر رکھا اور کہا کہ میں خاندان اور قربت کا واسطہ دیتا ہوں کہ رک جائیں اور آگے نہ پڑھیں! ابو الولید ڈر گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم پر عذاب آئے۔ ایک روایت میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت شروع کی تو ابو الولید غور سے سننے لگا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم آیت سجدہ پر پہنچے تو آپ نے سجدہ کیا اور پھر فرمایا کہ ابو الولید! آپ نے میرا پیغام سن لیا ہے، اب آپ کو پورا اختیار ہے کہ جو چاہو کرو!

ابو الولید واپس آیا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ قریش نے سمجھا کہ اس پر محمد کے کلام کا اثر ہو گیا ہے، صلی اللہ علیہ وسلم، اس نے آکر کہا کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے میں

اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بہتر یہی ہے کہ تم لوگ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر قریش کے علاوہ باقی عرب ان پر غالب آگئے تو وہ ختم کر دیں گے اور ہمارا کام بغیر لڑائی کے ہو جائے گا اور اگر یہ باقی عرب پر غالب آگئے تو ان کی حکومت ہماری حکومت ہے، ان کی عزت ہماری عزت ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم ان کو چھوڑ دو! تو اس موقع پر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات تلاوت فرمائی تھیں۔

### رحمن اور رحیم کے معنی میں فرق:

﴿تَنْزِيلٌ مِنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

یہاں پر ایک لفظ الرحمن ہے اور ایک لفظ الرحیم ہے۔ رحمن اور رحیم کے معنی میں فرق ہے۔ رحمن کہتے ہیں عام الرحمتہ کو اور رحیم کہتے ہیں تام الرحمتہ کو۔

رحمن کہ جس کی رحمت عام ہو اور رحیم کہ جس کی رحمت خاص اور مکمل ہو۔ کسی شخص کے پاس جتنی شفقت ہو وہ ساری ایک کو دے دے تو یہ ہو سکتا ہے اور ایک شخص اپنی شفقت ہر کسی کو دے دے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص کے پاس جتنی بھی دولت ہے ساری ایک شخص کو دے دے یہ تو ہو سکتا ہے لیکن ایک شخص کے پاس اتنی دولت ہو کہ دنیا میں ہر بندے کو دے دے تو یہ نہیں ہو سکتا۔

تو ایک ہے عام الرحمتہ اور ایک ہے تام الرحمتہ۔ اللہ رب العزت کی رحمت عام بھی ہے اور تام بھی ہے۔ دنیا میں اللہ اپنی رحمت ہر کسی کو دیتے ہیں اور قیامت کے دن اللہ اپنی رحمت ہر کسی کو نہیں دیں گے بلکہ صرف ایمان والوں کو دیں گے۔ تو عام الرحمتہ والی صفت کا ظہور اس دنیا میں ہوتا ہے اور تام الرحمتہ والی صفت کا ظہور قیامت والے دن ہو گا۔

### مخلوق کو رحمن کہنا جائز نہیں!

کسی بشر کے لیے رحیم کا لفظ استعمال کرنا جائز ہے اور رحمن کا لفظ استعمال کرنا

جائز نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ

عَلَيْكُمْ بِأَنفُسِكُمْ مِّنْ رَّوْفٍ رَّحِيمٍ﴾<sup>90</sup>

کہ تمہارے پاس ایک رسول آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہاری تکلیف اس کو بہت گراں گزرتی ہے، اس کو تو بس تمہاری ہی فکر لگی ہوئی ہے۔ اور پیغمبر ایمان والوں کے لیے شفیق اور رحیم ہیں۔

تو یہاں ”رحیم“ کا لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن رحمٰن کا لفظ اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

آپ تفسیر اٹھائیں گے تو وہاں بسم اللہ الرحمن الرحیم کا ترجمہ لکھا ہو گا کہ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ ”نہایت رحم والا“ یہ رحیم ہے، کہ جتنا اس کے پاس ہے وہ سارا دے دے، یہ ہے رحیم۔

اور بندے کے پاس جو کچھ ہو وہ سب کسی کو دے دے تو یہ بندے کے اختیار میں ہے لیکن ہر کسی کو دے دے تو یہ بندے کے بس میں نہیں ہے، اس لیے کسی شخص کو رحمٰن کہنا ٹھیک نہیں ہے۔ عبد الرحمن کو رحمٰن بھائی کہیں تو یہ ٹھیک نہیں ہے، عبد الرحیم کو رحیم بھائی کہیں تو یہ ٹھیک ہے۔ رحیم کا اطلاق مخلوق پر ہوا ہے لیکن رحمٰن کا اطلاق مخلوق پر نہیں ہوا۔ تو دونوں میں فرق ہے۔

اس لیے اللہ کے بارے میں کہتے ہیں: الرحیم فی الدنیا والرحمن فی الآخرة۔ دنیا میں اللہ کی رحمت ہر کسی کو ملتی ہے، کافر کو بھی اور مسلمان کو بھی لیکن آخرت میں اللہ صرف ایمان والوں کو دیں گے، وہاں کافر کو رتی برابر بھی رحمت نہیں دیں گے یعنی

ایسی رحمت جس سے بندے کا کام ہوتا ہو ورنہ قیامت کے دن کسی نہ کسی درجے کی رحمت تو کافر کو بھی ملے گی۔ مثلاً حساب کتاب شروع نہ ہو تو بہت پریشانی ہے، حساب کتاب کا شروع ہو جانا یہ رحمت ہے، کافر کو جتنا عذاب ہوتا ہے اللہ اس سے زیادہ دینے پر قادر ہیں لیکن نہیں دیتے تو یہ بھی رحمت ہے۔ تو کافر کو کسی درجے میں رحمت ملے گی لیکن ایسی رحمت کہ جس کو نعمتوں سے تعبیر کریں، جس سے آسانیاں نظر آئیں یہ رحمت اللہ صرف مؤمن کو دیں گے، کفار کو نہیں دیں گے۔

### قرآن کریم کو عربی میں نازل کرنے کی حکمت:

﴿كِتَبُ فَصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾

یہ ایسی کتاب ہے کہ جس کے مضامین کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ قرآن عربی زبان میں ہے ایسے لوگوں کے لیے جو دانشمند ہیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے اس قرآن سے وہی لوگ نفع حاصل کرتے ہیں جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

”فُصِّلَتْ“ یہ ”فَصَّلَ“ سے ہے۔ مضمون الگ الگ بیان کریں تو بھی فَصَّلَ ہوتا ہے اور مضمون ایک ہو اور کھل کر بیان کریں تب بھی فَصَّلَ ہے۔

﴿بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ فَاعْرِضْ أَعْتَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ﴾

یہ قرآن خوشخبری بھی دیتا ہے اور ڈراتا بھی ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگوں نے قرآن سے منہ موڑ لیا ہے اور اس کو سنتے ہی نہیں!

بشیر اور نذیر جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفیتیں ہیں ایسے ہی قرآن کریم کی بھی صفیتیں ہیں۔ ”نذیر“ ہیں کہ پہلے نافرمانوں اور نہ ماننے والوں کو ڈراتے ہیں اور ”بشیر“ ہیں کہ جب بندہ فرمانبردار بن جاتا ہے تو اسے خوشخبریاں دیتے ہیں۔ ”بشیر“ ہیں کہ مؤمنین کو خوشخبریاں دیتے ہیں اور ”نذیر“ ہیں کہ کفار کو ڈراتے



ہیں۔ تو یہ بشیر اور نذیر دونوں جگہ پر چلتا ہے، ہر ادارے میں چلتا ہے، ہر تحریک میں چلتا ہے اور یہی اسلوب اللہ پاک نے قرآن کریم میں بھی اختیار فرمایا ہے۔

### کفار کی ہٹ دھرمی:

﴿وَقَالُوا اقْلُوبُنَا فِيْ اَكْثٰتِهٖ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنْ

بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاَعْمَلْ اِنَّا عَمِلُوْنَ ﴿٣١﴾

کافر کہتے ہیں کہ جس چیز کی طرف آپ ہمیں بلا رہے ہیں اس کے لیے ہمارے دل پر دے میں ہیں اور ہمارے کانوں میں بوجھ پڑے ہوئے ہیں، ہمارے اور آپ کے درمیان حجاب ہے۔ اس لیے ہم آپ کی بات نہیں سن سکتے۔ آپ اپنا کام کریں اور ہم اپنا کام کریں۔

اب دیکھو! جتنی باتیں وہ لوگ کر رہے تھے اس کا معنی یہ نہیں تھا کہ کوئی درمیان میں کوئی پردہ تھا، پردہ نہیں تھا کیونکہ ہوتا تو نظر آ جاتا۔ یہ محض کفار کی ہٹ دھرمی تھی کہ ہم تمہاری بات نہیں سن رہے۔ اب پیغمبر کو حکم ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحٰى اِلَآىَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

فَاَسْتَفْهِمُوْا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۚ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ﴿٣٢﴾

آپ فرمائیں کہ میں بھی تم جیسا انسان ہوں البتہ مجھ پر یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، بس اسی کی طرف متوجہ رہو اور اسی سے مغفرت مانگو، اور مشرکین کے لیے تباہی ہے۔ جو بات نہیں مانتا وہ دنیا میں بھی تباہ ہو گا اور آخرت میں بھی تباہ ہو گا۔

### کفار احکام کے مکلف ہیں یا نہیں؟

﴿الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿٣٣﴾﴾

وہ مشرک تباہ ہوں گے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور آخرت کا بھی انکار کرتے

ہیں۔

سوال یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنا مسلمان کے ذمہ ہے احکام کا مکلف مسلمان ہوتا ہے کافر نہیں جب کافر احکام کے مکلف ہی نہیں ہیں تو ان کی برائی میں یہ بات کیوں کی جاتی ہے کہ زکوٰۃ نہیں دیتے؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ علماء میں اختلافی ہے بعض کہتے ہیں کہ جیسے مسلمان احکام کے مکلف ہیں ایسے کافر بھی احکام کے مکلف ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں مسلمان مکلف ہیں کافر مکلف نہیں ہیں۔

جو کہتے ہیں کہ کفار بھی احکام کے مکلف ہیں ان کے ہاں تو اعتراض ہی نہیں ہے۔ جن کے ہاں کافر احکام کے مکلف نہیں ہیں ان کے ہاں مطلب کیا ہے؟

ان کا مطلب یہ ہے کہ اصل میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ زکوٰۃ دینا مسلمان پر فرض ہے اگر تم مسلمان ہوتے تو تم بھی زکوٰۃ دیتے لیکن تم مسلمان نہیں ہو اس لیے تم زکوٰۃ بھی نہیں دیتے۔

﴿لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ﴾ کی اصل بنیاد ہے ایمان تباہی ہو مشرکین کے لیے کہ جو زکوٰۃ نہیں دیتے مسلمان ہوتے تو زکوٰۃ بھی دیتے چونکہ یہ مسلمان نہیں ہیں اس لیے زکوٰۃ بھی نہیں دیتے لہذا ان کے لیے تباہی ہے۔

اور یہ بات ان کو کیوں سمجھائی جا رہی ہے حالانکہ مسلمان تو نماز بھی پڑھتا ہے، زکوٰۃ بھی دیتا ہے لیکن یہاں نماز کی بات نہیں کی زکوٰۃ کی بات کی ہے یہ بتانے کے لیے کہ عرب لوگ مالدار تھے اور یہ لوگ صدقہ بھی کرتے تھے، خرچہ بھی کرتے تھے، غریبوں پر مال خرچ کرتے تھے اور مہمانوں پر بھی مال خرچ کرتے تھے لیکن جو کلمہ پڑھتا اس پر خرچ کرنا بند کر دیتے تھے تو یہ طعنہ دیا جا رہا ہے کہ جب تمہارا خرچ

کرنے کا مزاج ہے تو ایک مسلمان پر تمہارا ہاتھ کیوں تنگ ہوتا ہے؟

تو یہاں "لَا يَصْلُوْنَ" کی بات نہیں کی ﴿لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ﴾ کی بات کی ہے کہ تمہارے پاس مال ہے تم خرچ بھی کرتے ہو لیکن جو نبی مسلمان آتا ہے تو تم زکوٰۃ بھی نہیں دیتے خرچ بھی نہیں کرتے۔ تو موافق اور مخالف میں خرچ کے حوالے سے آدمی کا دل تھوڑا سا کھلا ہونا چاہیے، تمہارا یہ مزاج ٹھیک نہیں ہے۔

یہاں ﴿لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ﴾ فرمایا تو دوسرا سوال یہ ہے کہ زکوٰۃ تو مکہ مکرمہ میں فرض ہی نہیں تھی مدینہ منورہ میں فرض ہوئی تھی تو یہاں زکوٰۃ کی بات کیسے کی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے اجمالی طور پر نماز اور زکوٰۃ مکہ مکرمہ میں ہی فرض تھی جس طرح سورت مزمل سے پتہ چل رہا ہے۔ سورت مزمل کی سورت ہے وہاں زکوٰۃ کا ذکر بھی ہے اور نماز کا ذکر بھی ہے تو نماز اور زکوٰۃ مکہ مکرمہ میں فرض تھی لیکن اجمالاً۔ نصاب اور تفصیلات مدینہ منورہ میں آئی تھیں۔ مکہ میں نماز فرض تھی چھپ کر دار ارقم میں پڑھتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے تو نماز کھل کے پڑھی ہے تو نماز تھی تبھی تو پڑھ رہے تھے لیکن باقاعدہ پانچ اذانیں ہوں پانچ نمازیں ہوں پھر جماعت ہو پھر اتنی رکعات ہوں یہ اہتمام مکہ میں نہیں بلکہ مدینہ میں ہوا ہے۔

اس طرح زکوٰۃ خرچ کرنا یہ مکہ میں بھی تھا لیکن کتنا خرچ کرنا ہے، اس کی شرائط کیا ہیں، کس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے؟ یہ تفصیلات مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں۔

**ایمان اور عمل صالح کا لامتناہی اجر:**

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۱﴾

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے تو ان کے لیے ایسا اجر ہو گا جو کبھی ختم نہیں ہو گا۔

ختم نہ ہونے کے دو معنی ہیں؛ ایک معنی یہ ہے کہ اجر دائمی ہو گا جو جنت کی صورت میں ملے گا اور کبھی ختم نہیں ہو گا۔ دوسرا اس کا معنی یہ ہے کہ یہ اجر ایسا ہو گا کہ آدمی اعمال کرے صحت کی حالت میں اور پھر کسی بیماری کی وجہ سے عمل نہ کر سکے تو اللہ بیماری کی حالت میں بھی اس اجر کو باقی رکھتے ہیں جو حالتِ صحت میں ہوتا تھا۔

**زمین پہلے بنی یا آسمان؟ ایک تعارض کا حل:**

﴿قُلْ أَپَيْسَكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أُنْدَادًا ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ ۖ سَوَاءً لِّلْسَاءِ لِيلِينَ ۝ ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا ۖ قَالَتَا أَتَيْنَا طَآئِعِينَ ۝ فَقَضَهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا ۝﴾

آپ فرمادیں کہ کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا ہے اور تم اس ذات کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہو حالانکہ وہ ذات ایسی ہے جو تمام جہانوں کو پالنے والی ہے اور اسی نے زمین پر پہاڑ رکھ دیے اور اس میں برکت دی اور مخلوقات کی غذا ایں اس زمین میں پیدا کیں تو یہ چار دن ہو گئے۔ اللہ نے یہ جو غذا ایں پیدا فرمائی ہیں تو اس سے ضرورت مند یکساں طور پر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ نے آسمان کا ارادہ فرمایا جو دھوئیں کی شکل میں تھا، آسمان اور زمین کو حکم فرمایا: جبراً ہو یا خوشی سے تم نے ہماری بات ماننی ہے تو آسمان اور زمین نے کہا کہ ہم خوشی سے مانتے ہیں۔ تو اللہ نے دو دنوں میں سات آسمان مکمل کر دیے۔ یوں چھ دن

مکمل ہوئے۔ پھر ہر آسمان میں اس کے مناسب جو حکم تھا وہ بھیجا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے زمین کو پہلے پیدا فرمایا اور سورۃ البقرۃ کی آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین پہلے بنائی گئی ہے اور آسمان بعد میں، اللہ نے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ ۚ﴾<sup>91</sup>

کہ اللہ نے پہلے زمین بنائی اور پھر آسمان کا ارادہ فرمایا اور سات آسمان تخلیق فرمائے۔

لیکن آخری پارے کی سورۃ الزلزلۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب اس سے الگ ہے کہ پہلے آسمان کو پیدا کیا گیا اور پھر زمین کو۔ سورۃ الزلزلۃ میں ہے:

﴿عَٰنَتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ ۖ بَنَاهَا ۖ رَفَعَ سَمَكُمَهَا فَسَوَّاهَا ۖ وَ أَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا ۖ وَالْأَرْضُ ۖ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحَاهَا ۖ﴾<sup>92</sup>

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پہلے بنایا اور زمین بعد میں۔ تو ان میں کیا تطبیق ہے؟

اس کا جواب جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے دیا ہے، وہ یہ کہ اللہ نے پہلے زمین کا مادہ بنایا اور پھر آسمان کا مادہ دُخانِیہ بنایا۔ اس کے بعد آسمان کے مادہ دُخانِیہ سے مکمل آسمان بنایا پھر زمین کے بنے ہوئے مادہ سے زمین کو مکمل

91۔ البقرۃ: 29

92۔ الزلزلۃ: 79 تا 30

کیا۔ اب آیات کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہو گا۔<sup>93</sup>

تو یہاں جو ہے ”خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ“ کہ اللہ نے دو دنوں میں زمین کو بنایا تو اس سے مراد زمین کا مادہ ہے اور ”ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ“ سے مراد یہ ہے کہ زمین کا مادہ بنانے کے بعد پھر آسمان کا مادہ دخانیہ بنایا، اور سورۃ الزمرت سے جو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آسمان کو بنایا اور پھر زمین کو بنایا تو وہ اس طرح کہ آسمان کا جب مادہ دخانیہ بنایا تھا تو اس کو پہلے مکمل آسمان بنایا، پھر جو زمین کا مادہ تیار کیا تھا اس سے زمین کو مکمل بنا دیا۔ اب دونوں باتیں ٹھیک ہیں۔

### کس دن کس چیز کی تخلیق ہوئی؟

یہ دن کون کون سے تھے؟ تو اکثر روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ اتوار، پیر، منگل اور بدھ کے دن تھے۔ اتوار اور پیر کے دن زمین بنائی، منگل کے دن پہاڑ بنائے اور پہاڑوں سے متعلقہ جو چیزیں ہیں زمین کو مضبوط کرنے کے لیے وہ بنائیں، بدھ کو غذائیں، پانی اور چشمے بنائے۔ یہ چار دن ہو گئے۔ پھر جمعرات کے دن کو آسمان بنایا، آگے جو جمعہ کا دن تھا تو جمعہ کی تین ساعات میں سے کچھ وقت میں آسمان کو تیار کیا اور باقی جو ساعات رہ گئی تھیں تو اس میں مصائب و آلام، مشقتوں اور تکالیف کو پیدا کیا۔ پھر اس کے بعد آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، جنت میں رکھا، پھر فرشتوں اور ابلیس کو سجدے کا حکم دیا، ملائکہ نے سجدہ کر لیا لیکن ابلیس نے انکار کیا۔ یوں جمعہ کے دن سارے کام مکمل ہو گئے صرف چھ دن میں۔

اس پر اتنا سوال ذہن میں آتا ہے کہ اس وقت دن تو تھے ہی نہیں، دن تو بنے ہیں سورج بنانے کے بعد، تو پھر ان دنوں کا مطلب کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہاں

دن سے مراد حقیقی دن نہیں ہے بلکہ دن سے مراد دنوں کی مقدار ہے۔ جیسے چوبیس گھنٹے کا ایک دن ہوتا ہے تو یہاں چوبیس گھنٹے... چوبیس گھنٹے... چوبیس گھنٹے... یوں دنوں کی مقدار بیان فرمائی ہے۔

### اعضائے جسمانی کی گواہی:

﴿وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿١٦﴾ حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾ وَقَالُوا لِمَ جُودِدْ لَنَا لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقْنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿١٨﴾﴾

اس دن کو یاد کرو جب اللہ کے دشمنوں کو آگ کی طرف ٹولیوں کی شکل میں لے جایا جائے گا۔ جب یہ آگ کے قریب جا پہنچیں گے تو ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے اعمال کی گواہی دیں گی۔ یہ لوگ اپنی کھال اور دیگر اعضا سے کہیں گے کہ ہمارے خلاف تم کیوں گواہی دیتے ہو؟ وہ کہیں گے: جس طرح اللہ نے اوروں کو بولنے کی توفیق دی ہے ایسے ہی اللہ نے ہمیں بھی قوت گویائی عطا کی ہے، اس لیے ہم تمہارے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جا رہا ہے۔

﴿وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَعْتِرُونَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾﴾

اور تم اس بات سے تو چھپ ہی نہیں سکتے تھے کہ تمہارے کان، تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں تمہارے خلاف گواہی دیں بلکہ تمہارا خیال تو یہ تھا کہ اللہ کو تمہارے کئی اعمال کا پتا ہی نہیں! حالانکہ یہ تمہاری غلط فہمی ہے، یہ تمہارے اعضا بھی

دیکھتے ہیں اور اللہ بھی تمہیں دیکھتا ہے۔

﴿وَذِكْرُكُمْ ظَنُّكُمُ اللَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرَدْتُمْ فَأَصْبَحْتُمْ مِّنَ

الْخُسِرِينَ ﴿٢٣﴾﴾

اللہ کی ذات کے بارے میں تمہارا یہی گمان تمہیں لے ڈوبا اور تم تباہ و برباد ہو

گئے۔

حدیث پاک میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بیٹھے بیٹھے مسکرا دیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم سمجھے کہ میں کیوں ہنسا ہوں؟ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! نہیں، فرمایا کہ میں ہنسا اس بات پر ہوں کہ قیامت کے دن ایک بندہ اللہ سے کہے گا کہ یا اللہ! کیا آپ نے ہمیشہ مجھے ظلم سے بچا کر نہیں رکھا ہے؟ اللہ فرمائیں گے: بے شک بچا کر رکھا ہے۔ اس پر بندہ کہے گا کہ یا اللہ! اگر یہی بات ہے تو پھر میں اپنے بارے میں کسی اور کی گواہی پر مطمئن نہیں ہوں، ہاں اگر میرے اپنے اعضاء گواہی دیں تو میں مطمئن ہو جاؤں گا۔ اس وقت اللہ فرمائیں گے کہ اچھا تو پھر تم اپنا حساب خود لے لو۔ اس وقت اس کی زبان کو بند کر دیا جائے گا تو اس کے ہاتھ بولنا شروع ہو جائیں گے، اس کے پاؤں بولیں گے، اس کا جسم بولے گا۔ یہ شخص سوچ رہا تھا کہ میرے خلاف کوئی گواہی دینے والا ہے ہی نہیں تو جن اعضاء سے اس نے گناہ کیے تھے وہی اعضاء اس کے خلاف بولنے لگ جائیں گے۔ پھر اس شخص کی زبان کھول دی جائے گی تو وہ اپنے اعضاء سے کہے گا کہ یہ سارا کچھ تو میں تمہارے مزے کے لیے کرتا تھا، تمہیں آرام پہنچانے کے لیے کرتا تھا اور آج تم ہی میرے خلاف گواہی دیتے

ہو۔ 94



اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں، اللہ ہم سب کو محفوظ رکھیں۔

**اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگا کریں!**

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ

أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ﴾

جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر ڈٹ گئے۔ ڈٹنے کا معنی ہے کہ اس بات پر قائم رہے اور اس موقف پر مضبوط رہے۔ تو ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں، جب موت کا وقت آتا ہے۔ ملائکہ کہتے ہیں کہ آئندہ کی زندگی کے بارے میں تمہیں خوف نہیں ہونا چاہیے اور جو پیچھے ہو چکا ہے اس پر تمہیں غم نہیں کرنا چاہیے کہ فلاں چیز چھوٹ گئی، فلاں چیز چھوٹ گئی، کچھلی پر غم نہ کرو اور آئندہ کا خوف نہ کرو، اور اس جنت پر خوش ہو جاؤ جس کا تمہارے ساتھ وعدہ ہے۔

﴿فَنَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾

ہم تمہارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔

**مجھے سورت ہود نے بوڑھا کر دیا:**

یہاں ”استقامت“ کا لفظ استعمال کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم استقامت کے معاملے سے بہت خوف زدہ ہوتے تھے۔ آپ نے پڑھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک باسٹھ سال ہو رہی ہے اور بیس کے قریب بال آپ کی ڈاڑھی مبارک اور سر مبارک میں سفید تھے، باقی سارے بال سیاہ تھے یعنی آپ کا بڑھاپا ہے کہ صرف چند ایک بال سفید ہوئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ کو کس چیز نے بوڑھا کر دیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ”شَيْبَتَيْنِ هُوْدُوْا أَخَوَانِهَا“ کہ مجھے سورت ہود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔ عرض کیا

گیا کہ یا رسول اللہ! سورت ہود کی کس آیت نے؟ فرمایا: اس آیت نے ﴿فَاسْتَقِمْ﴾  
کَمَا أَمَرْتُ ﴿﴾ کہ تم ڈٹ جاؤ؟ اس آیت کے غم نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔<sup>95</sup>

اس لیے اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا کرنی چاہیے۔ استقامت بڑوں کا کام ہے،  
ہم بہت چھوٹے ہیں۔ ہمیں عافیت کی دعا کرنی چاہیے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے پوچھا:  
یا رسول اللہ! اگر لیلۃ القدر مجھے مل جائے تو میں کون سی دعا مانگوں؟ فرمایا: یہ دعا مانگو!  
"اللَّهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي." <sup>96</sup>

اے اللہ! آپ بہت زیادہ معاف فرمانے والے ہیں اور معاف فرمانے کو پسند  
بھی فرماتے ہیں، مولائے کریم مجھے معاف فرمادیں!

**بھائی میرے لیے عافیت ہی مانگو!**

اور میں کئی بار یہ عرض کر چکا ہوں کہ جب کوئی مجھے استقامت کی دعا دیتا  
ہے تو میں کہتا ہوں کہ استقامت کی دعا نہ دو بلکہ عافیت کی دعا دو۔ کئی بار ایسے ہوا ہے کہ  
میں جلسے سے فارغ ہوا ہوں اور کوئی دھڑلے دار بیان ہوا ہو تو لوگ فوراً کہتے ہیں کہ  
ماشاء اللہ! اللہ آپ کو استقامت دے۔ میں انہیں کہتا ہوں کہ استقامت کا معنی کہ اب  
اس تقریر پر پرچہ ہو، میں تھانے جاؤں، پھر جوتے کھاؤں، پھر جیل جاؤں، پھر رہا ہوں  
اور پھر اسی طرح تقریر کروں... یہ ہے استقامت، اس لیے یہ دعا کرو کہ اللہ آپ کو  
عافیت دیں۔ عافیت کا معنی کہ مولانا صاحب بیان کریں، دیسی گھی میں دیسی مرغا کھائیں،  
بہترین سی مچھلی کھائیں، اچھی سی فیس ملے، آرام سے گھر واپس جائیں، پھر دوسرے دن

واپس آکر اسی طرح کا بیان کریں... یہ ہے عافیت۔ تو عافیت ٹھیک ہے یا استقامت ٹھیک ہے؟ (عافیت ٹھیک ہے۔ سامعین) اس لیے اللہ سے عافیت مانگا کریں۔ پھر میں ان سے کہتا ہوں کہ اپنے لیے استقامت مانگنی ہے تو شوق سے مانگو لیکن ہمارے لیے اللہ سے عافیت مانگو، ہم اللہ سے عافیت مانگتے ہیں۔

### جنت عیش کی جگہ ہے:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُیْ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ﴾ (۳۶)

تمہیں جنت میں وہ کچھ ملے گا جو تم چاہو گے اور تمہیں جنت میں وہ کچھ ملے گا جو تم مانگو گے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ جنت کی تعریف میں فرماتے تھے کہ جنت چھوٹی خدائی کا نام ہے۔ بڑی خدائی تو یہ ہے: ﴿اِنَّمَا اَمْرُكَ اِذَا ارَادَ شَيْئًا اَنْ یَّقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ (۸۶) کہ جو چاہو وہ ہو جائے، جس کا ارادہ کرو وہ ہو جائے۔ حضرت نانوتوی فرماتے ہیں کہ جنت میں انسان جو چاہے گا وہی ملے گا تو یہ چھوٹی خدائی ہے کیونکہ یہ اپنے اختیار میں نہیں ہے، یہ اختیار اللہ نے دیا ہے جب چاہیں واپس لے لیں۔

حدیث میں ہے کہ جنت میں ایک شخص اڑتے ہوئے پرندے کو دیکھے گا اور اس کا جی چاہے گا کہ میں اس کا گوشت کھاؤں تو بغیر آگ کے بغیر دھوئیں کے وہ بھنا ہوا پرندہ اس کے سامنے پلیٹ میں آجائے گا اور یہ اسی وقت کھالے گا۔ حتیٰ کہ بعض روایات میں ہے کہ آدمی جنت میں چاہے گا کہ میرے ہاں اولاد پیدا ہو تو آنا فنا حمل ہو گا اور اسی وقت بچہ پیدا ہو جائے گا۔

جنت عجیب نعمت ہے اور آپ یقین فرمائیں بس عیش کرنے کی اصل جگہ جنت ہے اور یہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ فَاغْفِرْ لِلْاَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةِ".<sup>98</sup>

اے اللہ! اصل عیش تو جنت کی عیش ہے، میرے انصار اور مہاجر صحابہ کی مغفرت فرما! اور یہ بات میں کئی بار عرض کرتا ہوں کہ اللہ نے انسان کی فطرت میں بعض چیزوں کی خواہش رکھی ہے لیکن اس کی تکمیل کی جگہ دنیا نہیں ہے بلکہ اس کی تکمیل کی جگہ جنت ہے۔ مثلاً ہر انسان کی خواہش ہے من مانی زندگی۔ اگر من مانی زندگی انسان کی خواہش نہ ہوتی تو مان کے چلنا عبادت نہ ہوتا۔ مان کر چلنا عبادت اس لیے ہے کہ طبیعت میں من مانی کرنا ہے۔ اگر طبیعت میں بھی مان کے چلنا ہوتا اور پھر مان ہی کے چلتا تو یہ کون سی عبادت ہے؟ اصل عبادت تو بنتی ہی تب ہے کہ جی نہ چاہے اور انسان پھر بھی کام کرے، طبیعت نہ چاہے پھر بھی اعمال کرے لیکن من مانی کی خواہش جو طبیعت میں ہے اس کے پورا کرنے کی جگہ یہ دنیا نہیں ہے، اس خواہش کے مکمل ہونے کی جگہ آخرت ہے۔

ہمارے حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ نفس اتنا شرارتی ہے کہ دنیا جہان کے حسین اس کو دکھا دو، یہ ساری خوبصورت عورتیں دیکھ لے اور اس کے کان میں کہو کہ ایک باقی ہے تو یہ اس کو بھی دیکھے گا۔ یہ نفس کا مزاج ہے۔

**بازارِ جنت:**

دنیا میں ایسے زندگی گزارو جس طرح اللہ چاہتے ہیں، جنت میں ویسی زندگی

گزارو گے جس طرح تم چاہو گے، دنیا میں اپنی شکل و صورت ایسی بناؤ جیسے اللہ کا حکم ہے اور جنت میں ایک بازار ہو گا ”سُوقُ الصُّور“ جو تصویروں کا بازار ہو گا، وہاں جاؤ، گھومو پھرو جیسی تصویر پسند آئے ویسی اپنی شکل بنالو۔ یہاں حمام میں نائی کے پاس جاؤ تو جو فوٹو لگے ہوئے ہوتے ہیں ان کے ڈیزائن کے مطابق اپنی کٹنگ نہیں کرانی اور جنت میں فوٹو لگے ہوئے ہوں گے تو یہ جو کٹنگ والی خواہش ہے یہ جنت میں پوری ہو جائے گی۔ بس دنیا میں تھوڑا سا ضبط کر لو، پھر آخرت میں بس مزے ہی مزے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو جنت کی طلب عطا فرمائیں۔ جنت کی یہ صفیتیں اس لیے اللہ نے بیان فرمائی ہیں کہ بندوں کو آخرت کی فکر ہو اور رغبت ہو۔

### ہم عمر بیویاں:

جنتی بیویوں کی ایک صفت ”اَثَرًا بَا“ ہے یعنی ہم عمر۔ مفسرین نے کہا ہے کہ ہم عمر کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ ان کی اور ان کے شوہروں کی عمر ایک جیسی ہوگی، اس سے مناسبت ہوتی ہے، اور ایک عجیب معنی یہ بھی لکھا ہے کہ شوہر کی ہم عمر نہیں بلکہ یہ آپس میں ہم عمر ہوں گی۔ کیونکہ اگر آپس میں ہم عمر نہیں ہوں گی تو سوکن کی رقابت ہوگی اور ایک جیسی ہوں گی تو کھیلاتی رہیں گی۔ سوکنوں کا مزاج پیدا نہیں ہو گا۔ اللہ پاک نے کیسی عجیب نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کو عطا فرمائیں۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

”عَلَيْكُمْ بِالْأَكْبَارِ فَإِنَّهُمْ أَغْذَبُ أَفْوَاحًا وَأَنْتَقُ أَرْحَامًا وَأَرْضَى بِالْيَسِيرِ“<sup>99</sup>

کہ جب شادی کرو تو اس عورت سے کرو جو کنواری ہو کیونکہ ان کا منہ میٹھا ہوتا ہے، ان کا رحم سترہا ہوتا ہے اور یہ تھوڑے پر خوش ہو جاتی ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اوصاف بیان فرمائے، دیکھو! اللہ کے نبی کیسے انسانیت کا مزاج سمجھتے تھے!

**اللہ کی میزبانی کے کیا کہنے!**

﴿نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ﴾

یہ مہمانی ہوگی اس ذات کی طرف سے جو غفور بھی ہے اور رحیم بھی ہے، معاف کرنے والا بھی ہے اور رحم کرنے والا بھی ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ جنت میں ایسی نعمتیں ملیں گی جن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں ہوگا، لَا عَيْنٌ رَأَتْ اور کسی کان نے سنا نہیں ہوگا، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ اور کسی بشر کے دل میں ان کا خیال بھی نہیں آیا ہوگا وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبٍ بَشَرٍ<sup>100</sup>۔

اس کو سمجھنا بہت آسان ہے۔ مثلاً مہمان کسی کے ہاں جاتا ہے تو میزبان بعض ایسی چیزیں پیش کرتا ہے کہ جس کا مہمان کو تصور بھی نہیں ہوتا کہ یہ بھی دنیا میں ہے اور وہ تو جنت ہوگی۔ دنیا میں میزبان انسان ہوتا ہے تو مہمان کے لیے دسترخوان پر ایسی ڈشیں آتی ہیں کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ مجھے یہ ڈش بھی ملے گی اور جب میزبان اللہ ہوگا تو وہاں ایسی نعمتیں ملیں گی کہ جو کسی نے سوچی بھی نہ ہوں گی۔

بہت سے واقعات پیش آتے ہیں جب میں سفر میں جاتا ہوں۔ صوبہ سندھ میں ایک جگہ ہے کپرو، وہاں ایک بندے نے کوئی چیز دی، میں نے کہا: یہ کیا ہے؟ کہا: جی یہ مچھلی کا حلوا ہے اور میں کراچی سے آیا ہوں صرف آپ کو یہ کھلانے کے لیے۔ میں حیران ہوا کہ مچھلی کا حلوا بھی ہوتا ہے! اور واقعی بہت لذیذ تھا۔ اتنا کہ ہم انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔

## سب سے اچھی کس کی بات ہے؟

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ (۳۳) وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿۳۴﴾

اس سے بہتر کس آدمی کی بات ہو سکتی ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل بھی کرے اور پھر یہ کہے کہ میں اللہ کی بات مانتا ہوں۔ نیکی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی، برائی کے مقابلے میں ایسے طریقے سے جواب دو جو بہتر ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایسا بندہ کہ تمہارے اور اس کے درمیان سخت دشمنی ہو تو وہ بھی دوست بن جائے گا۔

یہاں یہ بات سمجھیں ﴿ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ کہ اگر کوئی تمہارے خلاف برپا کرنا چاہتا ہے تو تم اس کا جواب اچھا دو، اس طرزِ عمل کی وجہ سے جو تمہارے اور اس کے درمیان عداوت تھی وہ محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔ برائی کے جواب میں طرزِ عمل اچھا ہونا چاہیے۔ ہمارے خلاف غلط عقائد اور غلط دلائل پھیلانے جارہے ہیں تو ہمیں جواب میں صحیح عقیدہ تو دینا چاہیے لیکن طرزِ سلجھا ہوا ہو۔ مطلب یہ کہ غلط عقیدہ کا جواب ہونا تو چاہیے، لوگ کہتے ہیں کہ ہونا ہی نہیں چاہیے، اب قرآن کہتا ہے ”ادْفَعْ“ کہ مدافعت تو کرو لیکن اچھے طریقے سے کرو، یہ نہیں کہ مدافعت ہی نہیں کرنی! اللہ تعالیٰ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

## الحاد کا انجام:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخَفُونَ عَلَيْنَا ۚ أَمْ نَظُنُّ فِي النَّارِ خَيْرًا مِّنْ يَّاتِيهِمْ أَمِنَّا يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۚ اْعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ

بَصِيرٌ ﴿٦٠﴾

وہ لوگ جو ہماری آیات میں الحاد کرتے ہیں ہم سے مخفی نہیں ہیں۔ یہ دیکھو کہ جو شخص جہنم میں ڈالا جائے وہ بہتر ہے یا وہ بہتر ہے جو قیامت کے دن امن اور امان کے ساتھ آئے؟ بے شک اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ﴿٦١﴾﴾

یہ ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ وہی ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ﴾ ہیں، یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ فرمایا بے شک یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اس ذکر یعنی قرآن مجید کا انکار کیا جب قرآن ان کے پاس آیا، حالانکہ یہ قرآن تو ایک زبردست کتاب ہے۔

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ

حَمِيدٍ ﴿٦٢﴾﴾

کتاب میں الحاد کرتے ہو اور آیات کا انکار کرتے ہو لیکن یہ ذہن میں رکھ لو ہماری یہ کتاب ایسی ہے کہ باطل اس کتاب میں نہ سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ ایسی ذات کی طرف سے نازل کردہ ہے جو حکمت والی اور خوبیوں والی ذات ہے۔

”الحاد“ کا معنی ہوتا ہے کہ آدمی آیت ٹھیک پڑھے اور معنی اس کا غلط کرے۔ مثلاً کہے خاتم النبیین لیکن معنی غلط کرے جیسے مرزا قادیانی کرتا تھا تو یہ الحاد ہے۔ جو لوگ الحاد کرتے ہیں، تفسیر غلط بیان کرتے ہیں وہ سنیں کہ ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ﴾ کہ اگر کوئی چاہے کہ میں قرآن کے الفاظ بدل لوں تو وہ نہیں بدل سکتا اور اگر چاہے کہ لفظ نہ بدلوں بلکہ معنی بدل لوں تو ﴿وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾ وہ معنی بھی نہیں بدل سکتا۔ قرآن کا ظاہر بھی محفوظ ہے اور قرآن کا باطن بھی محفوظ ہے۔



﴿مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ﴾ سے مراد ظاہر ہے اور ﴿مِنْ خَلْفِهِ﴾ سے مراد باطن ہے۔ جو سامنے ہے وہ نظر آتا ہے اور جو پیچھے ہے وہ نظر نہیں آتا۔ تو جو نظر آتے ہیں الفاظ ان کو قرآن نے ﴿مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ﴾ فرمایا اور جو نظر نہیں آتا معنی اس کو ﴿مِنْ خَلْفِهِ﴾ فرمایا۔ یعنی قرآن کا ظاہر بھی محفوظ رہے گا اور قرآن کا باطن بھی محفوظ رہے گا۔ نہ کوئی قرآن کا لفظ بدل سکتا ہے نہ ہی معنی بدل سکتا ہے۔ کوشش تو کریں گے لیکن رسوا ہوں گے، بالآخر حق ہی غالب رہے گا۔ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی کتاب ہے ”اکفار الملحدین“ اس مسئلے پر، بہترین کتاب ہے، اس کا ہر بندے کو مطالعہ کرنا چاہیے۔

### قرآن مجید فصیح ہے:

﴿وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَجَبِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ۖ أَءِجْعَبُكُمْ وَءَعَرِبَكُمْ﴾

اگر ہم قرآن کو ایسا بنا دیتے کہ یہ فصیح نہ ہوتا تو لوگ کہتے کہ اس کی آیات وضاحت کے ساتھ کیوں بیان نہیں کی گئیں؟! لوگ کہتے کہ جس پر قرآن اترا ہے وہ تو فصیح ہے اور خود قرآن غیر فصیح ہے!؟

ایک لفظ ہے اعجم اور ایک ہے عجم۔ عجم کہتے ہیں غیر عرب کو اور اعجم کہتے ہیں غیر فصیح کو اگرچہ عربی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے اعجمی کا معنی غیر عربی نہ کرنا بلکہ اس کا معنی غیر فصیح کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم قرآن کو ایسے بناتے جو فصیح نہ ہوتا تو لوگ کہتے کہ قرآن کے مضامین کھلے ہوئے کیوں نہیں ہیں۔ قرآن غیر فصیح ہوتا اور عرب جو اس کے اولین مخاطب ہیں وہ فصیح تھے تو جوڑ کیسے ہوتا؟

### مزان انسانی:

﴿لَا يَسْمُرُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ ۖ وَإِنْ مَسَّهُ الشَّرُّ فَيَسْتَوْسُ

## قَنُوطٌ ﴿٢٦﴾

یہاں سے اللہ رب العزت نے انسان کا مزاج بتایا ہے کہ جب بھلائی مانگتا ہے تو تھکتا نہیں ہے اور جب اسے کوئی تکلیف ملتی ہے تو مایوس ہو جاتا ہے اور امیدیں چھوڑ بیٹھتا ہے۔

﴿وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِنَّا مِنْ بَعْدِ ضَرَاءٍ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ هَذَا لِي وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً ۚ وَلَئِنْ رُجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِنْدَهُ لَلْخُسْفَىٰ ۖ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا ۖ وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ۝﴾

جب انسان کو تکلیف پہنچنے کے بعد ہم اسے اپنی رحمت سے نوازتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ بھلائی تو میرا حق تھا، کہتا ہے کہ میرا نہیں خیال کہ قیامت قائم ہو لیکن بالفرض اگر قیامت قائم ہوئی بھی اور میں اپنے رب کی پاس گیا تو وہاں بھی مجھے خوشحالی ملے گی۔ کافروں کو ان کے اعمال کے بارے میں ہم ضرور بتائیں گے اور انہیں سخت عذاب کا مزاح ضرور چکھائیں گے۔

﴿وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأِجِنَابِهِ ۖ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ ۝﴾

جب ہم انسان کو نعمتوں سے نوازتے ہیں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے اور اکر جاتا ہے اور جب اسے کوئی تکلیف پہنچے تو لمبی چوڑی دعائیں کرتا ہے۔

یہاں ”عَرِيضٍ“ فرمایا ”طَوِيلٍ“ نہیں فرمایا کیونکہ جس کا عرض بڑا ہو تو اس کا طول تو بڑا ہوتا ہی ہے۔ جنت کے بارے میں فرمایا: ﴿سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّنَ

رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ﴿١٠١﴾ کہ اپنے رب کی مغفرت کی طرف دوڑو اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہے۔ تو یہاں جنت کا عرض بتا رہے ہیں، اس کا طول نہیں بتا رہے۔ جب عرض بڑا ہو گا تو طول تو اور بھی بڑا ہو گا۔

تو انسان کو راحت بھی اللہ کی طرف سے ملتی ہے اور تکلیف بھی اللہ کی طرف سے ملتی ہے۔ راحت آئے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اگر تکلیف آئے تو بندے کو چاہیے کہ برداشت اور صبر کرے۔ اللہ ہم سب کو یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔  
وَاجِرُ دَعَا أَنَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الشورى

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿حَمْدٌ ۝ عَسَقَ ۝ كَذٰلِكَ يُوْحٰى اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۝ اللَّهُ

الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾

سات سورتیں جن کے شروع میں لُحْم ہے جنہیں حوامیم کہتے ہیں یہ ان میں سے تیسری سورت ہے۔ ﴿حَمْدٌ ۝﴾... یہ مقطعات میں سے ہے، ﴿عَسَقَ ۝﴾ یہ بھی مقطعات میں سے ہے۔

﴿كَذٰلِكَ يُوْحٰى اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۝ اللَّهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾

یعنی جس طرح اس سورت کے ذریعے آپ کو دینی احکام بتائے جا رہے ہیں اسی طرح آپ کی طرف بھی اور گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی طرف بھی اللہ جو غالب حکمت والا ہے، وحی بھیجتا رہا ہے۔

﴿تَكَادُ السَّنُوٓتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ

رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ ۝﴾

ایسے لگتا ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑیں گے۔ مطلب کہ آسمان میں اللہ کی معرفت رکھنے والے اور اللہ کی عبادت کرنے والے فرشتے اس کثرت سے ہیں کہ

یوں لگتا ہے کہ آسمان پھٹ پڑے گا۔ اور فرشتے اللہ کی تسبیح اور تحمید بھی کرتے ہیں اور زمین والوں کے لیے استغفار بھی کرتے ہیں۔

اب بظاہر یہ ہے کہ یہاں لفظ ”مَنْ“ عام ہے کہ فرشتے ہر کسی کے لیے استغفار کرتے ہیں، خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر ہو حالانکہ استغفار صرف ان کے لیے ہوتا ہے جو مسلمان ہوں۔ اس لیے یہاں یہ کہنا پڑے گا کہ یہاں ”مَنْ“ عام نہیں ہے بلکہ ”مَنْ“ خاص ہے۔

### ترک قرأت خلف الامام پر ایک دلچسپ واقعہ:

ایک بار کچھ ساتھی چکوال سے ایک شخص کو یہاں پر لائے۔ اس نے کہا میں نے ترک قرأت خلف الامام پر بات کرنی ہے۔ وہ عالم نہیں تھے بلکہ عام آدمی تھے اور عام آدمی نے دو چار حدیثیں رٹی ہوتی ہیں جن پر ان کا اصرار ہوتا ہے۔ تو میں نے کہا کہ اچھا امام کے پیچھے آپ قرأت کرتے ہیں تو اس کی دلیل کیا ہے؟ اس نے کہا کہ بخاری شریف، حالانکہ بخاری شریف میں ایسی کوئی حدیث موجود نہیں، آپ کبھی دل چھوٹا نہ کیا کریں! اس نے کہا بخاری میں ہے:

لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ.<sup>102</sup>

کہ جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی، اور یہ جو ”مَنْ“ ہے یہ عام ہے خواہ امام ہو، خواہ مقتدی ہو، خواہ اکیلا ہو سب کو یہ شامل ہے۔

میں نے کہا کہ ”مَنْ“ عام ہوتا ہے؟ کہا کہ جی ہاں۔ میں نے کہا کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَيَسْتَغْفِرُ مَنْ يَمُنْ فِي الْأَرْضِ﴾ کہ ملائکہ استغفار کرتے ہیں اس شخص کے لیے جو زمین میں ہے خواہ مسلمان ہو خواہ کافر ہو، کیا یہی معنی ہے؟ کہا کہ

نہیں جی، صرف مؤمنین کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ تو کہتے ہیں کہ ”مَنْ“ عام ہے تو یہ ”مَنْ“ تو خاص ہو گیا تو اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کی یہ بات غلط ہو گئی کہ ”مَنْ“ عام ہوتا ہے۔ وہ اس میں پھنس گیا اور اس کا جواب نہیں دے سکا۔

تو اگر اس سے مراد مؤمن ہوں تو ”مَنْ“ خاص ہو گا اور اگر اس سے مراد کفار اور مؤمنین دونوں ہوں تو پھر استغفار خاص ہو گا، استغفار عام نہیں ہو گا یعنی کفار کے لیے استغفار یہ نہیں ہے کہ ان کے گناہ معاف ہو جائیں بلکہ ان کے لیے استغفار یہ ہو گا کہ یا اللہ! ان کے کفر کے باوجود آپ ان کو عذاب نہ دیں، ان کو مہلت دیں شاید یہ ایمان قبول کریں۔ اب یہ استغفار خاص ہو جائے گا۔ یہ بات سمجھ میں آگئی؟ (جی ہاں۔ سامعین)

### ترک قرأت خلف الامام کی عوامی تقریر:

میں آپ سے کئی مرتبہ عرض کرتا ہوں کہ ایک زبان ہوتی ہے درگاہ کی اور ایک زبان ہوتی ہے عوامی جلسوں کی۔ یہ بات تو میں نے آپ کو عالمانہ طرز اور طالب علمانہ طور پر بتادی ہے لیکن جب عوام کو سمجھائیں تو اس کا طرز بالکل الگ ہوتا ہے۔ عوام کو میں یہ بات سمجھاتا ہوں کہ یہ جو لوگ ترجمہ کرتے ہیں اس حدیث کا کہ:

لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ.

اس شخص کی نماز ہی نہیں ہوتی جو [لفظ ”جو“ کو کھینچ کر ادا کیا] فاتحہ نہ پڑھے۔ یہ ”جو“ کو لمبا نہ کریں، یہ ”جو“ چھوٹا ہے، اور یہ جو آپ لوگ تشریح کرتے ہیں کہ خواہ امام ہو، خواہ مقتدی ہو، خواہ منفرد ہو... میں نے کہا یہ خواہ، خواہ نہ کریں ورنہ ﴿وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ﴾ کا ترجمہ ہو گا کہ فرشتے استغفار کرتے ہیں ہر اس شخص کے لیے جو [لفظ ”جو“ کو کھینچ کر ادا کیا] زمین میں ہے خواہ آپ ہوں، خواہ ابو جہل ہو... تو خواہ، خواہ، خواہ آپ کر لیں گے؟ کہتا ہے کہ جی نہیں۔ تو میں نے کہا کہ جس

طرح یہاں ”من“ چھوٹا ہے تو وہاں بھی ”من“ چھوٹا سا ہے، لمبا نہیں ہے۔ بات سمجھ آئی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین)

### الفاظ کے ساتھ لہجہ کا اثر:

پھر میں آگے بات سمجھاتا ہوں کہ بسا اوقات جب تک لفظ لمبا کھینچ کر ادا نہ کریں تب تک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ جس طرح غیر مقلد کہتے ہیں کہ کوئی شخص اگر بڑی عمر میں عورت کا دودھ پینا چاہے تو پی سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

وَيَجُوزُ اَرْضَاعُ الْكَبِيرِ وَلَوْ كَانَ ذَا الْحَيَةِ لَتَجَوَّزَ النَّظَرُ.<sup>103</sup>

بڑی عمر کا بندہ دودھ پی سکتا ہے اگرچہ ڈاڑھی والا ہو۔

ویجوز اور جائز ہے دودھ پینا "ذالحیة" (ذا کو کھینچ کر) اگرچہ وہ لمبی ڈاڑھی

والا ہو اگرچہ وہ ڈاڑھی والا ہو...

میں نے کہا کہ ”وَلَوْ كَانَ ذَا الْحَيَةِ“ [لفظ ذا کو کھینچ کر ادا کیے بغیر] کہو گے تو حنفی نکل آئے گا کیونکہ حنفی کی ڈاڑھی ایک مشتمل ہوتی ہے، اگر اس کو کھینچ کر کہو گے کہ ”ذَا الْحَيَةِ“ [لفظ ذا کو کھینچ کر ادا کرتے ہوئے] تو اب غیر مقلد ہو گا، عورت کا دودھ پینا جائز ہے اگرچہ ”ذَا الْحَيَةِ“ [ذا کو کھینچ کر ادا کرتے ہوئے] ہو، میں نے کہا کہ یہ مسئلہ تمہارا ہے اس لیے ”ذا“ کو لمبا رکھو اور اسی لحاظ سے تم اس کی طرز لگاؤ، ہماری طرح نہ لگاؤ۔ عوامی طرز میں ان باتوں کو سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

گناہ چھڑوانے کے لیے گناہ کا ارتکاب کبھی نہ کریں!

﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي

رَحْمَتِهِ ۖ وَالظَّالِمُونَ مَا لَهُمْ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿٨﴾

اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک امت بنا دیتا لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے لیکن ظالم لوگوں کے لیے نہ کوئی دوست ہو گا نہ کوئی مددگار۔

اگر اللہ چاہتا تو سب کو مسلمان بنا دیتا، دنیا میں کوئی کافر بھی نہ رہتا لیکن اللہ کا نظام یہ نہیں ہے۔ جب اللہ کا یہ نظام ہی نہیں ہے تو پھر کافر کو مسلمان بنانے کے لیے ناجائز اعمال کا ارتکاب کرنے سے بچنا چاہیے۔ اللہ چاہتا تو سب کو نمازی بنا دیتا تو جب سب نے نمازی نہیں بننا تو بے نمازی کو نمازی بنانے کے لیے اپنی نمازیں خراب کرنے کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے؟! ہمارے ہاں چونکہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی قباحت بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن ہم اس فقیح چیز سے بچنے کے لیے خود قباحت کا ارتکاب نہیں کرتے اور بعض چیزوں کی ہمارے ہاں اہمیت نہیں ہوتی اس لیے ان کا ارتکاب کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص بدعتی آدمی کو نیک کام پر لگانے کے لیے بدعات کر لے گا، اس کا ذہن یہ ہے کہ اگر ہم بدعات میں شریک نہیں ہوں گے تو یہ ہمارے قریب نہیں آئیں گے، اگر قریب نہ آئے تو ان کو بات کیسے کہیں گے، ان کو قریب لانے کے لیے بدعات کا ارتکاب ہماری مجبوری ہے..... اور زانیہ عورت کا زنا چھڑانے کے لیے نہ بندہ اس کے ساتھ زنا کرنے کے لیے تیار ہے، نہ اس سے بوس و کنار کرنے کے لیے تیار ہے، اس کے لیے کوئی بندہ تیار نہیں کہ زنا کر لوں یا تھوڑا سا پیار کر لوں تاکہ یہ مجھ سے مانوس ہو جائے، اس کے دل میں میرا پیار آجائے تو پھر یہ میری بات بھی مانے گی، تو کوئی بندہ اس کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ زنا کی نفرت دل میں ہے تو زانیہ کا زنا چھڑانے کے لیے کوئی شخص زانیہ سے زنا کے لیے تیار نہیں ہو گا، اس کے ساتھ بوس و کنار کے لیے تیار نہیں ہو گا حتیٰ کہ اس زانیہ کو دیکھنے کے لیے بھی تیار نہیں ہو گا لیکن بدعتی کو بدعت سے



نکالنے کے لیے بدعات کا ارتکاب کر لے گا کیونکہ ہمارے دل میں بدعت کی نفرت نہیں ہے اور زنا کی نفرت ہے۔ شرابی کو شراب چھڑانے کے لیے کوئی شخص شراب پینے کے لیے تیار نہیں ہے، کسی فلم دیکھنے والے کو فلم سے بچانے کے لیے کوئی بندہ فلم دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ آج میں اس کے ساتھ فلم دیکھ لوں کیونکہ میں نے اس سے فلموں کو چھڑانا ہے کوئی بندہ تیار نہیں ہوتا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بدعات کے معاملے میں اتنے نرم، اتنے نرم ہیں کہ الامان والحفیظ... اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آپ وعیدیں سنیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سنیں، جو الفاظ بدعات کے رد کے لیے ارشاد فرمائے ہیں وہ شاید دوسرے گناہوں کے لیے نہیں ہوں گے۔ میں اپنے طلبہ سے کہتا ہوں کہ پہلے آپ خود سمجھیں گے تو دوسروں کو بات سمجھائیں گے، جب خود نہیں سمجھیں گے تو کسی اور کو آپ کیسے سمجھائیں گے؟

### چھوٹوں کی خوشی چاول کھانا:

میں نے پرسوں لاہور میں بیان میں کہا اور میں آپ کو بھی سمجھاتا ہوں، میں نے کہا دیکھو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾<sup>104</sup>

ہم جو بھی پیغمبر بھیجتے ہیں تو اس لیے بھیجتے ہیں تاکہ اس کی بات مانی جائے۔ کسی گھر میں کوئی بڑا عالم آئے تو گھر کے بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہماری سعادت ہے کہ کسی کام کے لیے انہوں نے ہم سے رابطہ کیا اور ہماری سعادت ہے کہ ہم بڑوں کے کام آئے اور ان کا جو مقصد ہے وہ ہم پورا کریں... اور اس گھر کے چھوٹے خوش ہیں کیونکہ ان بڑوں کے آنے پر ہمارے گھر میں چاول، چکن یہ چیزیں

ہمیں لگی۔ تو اب بڑوں کے آنے پر بڑوں کا خوش ہونا اس وجہ سے ہے کہ ان کا مقصد ہمارے ذریعے پورا ہو رہا ہے اور بڑوں کے آنے پر چھوٹوں کا خوش ہونا اس وجہ سے ہے کہ بڑوں کے آنے پر ہمیں پلاؤ ملنا ہے۔ میں نے کہا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر ایک خوشی وہ ہے جو بڑوں والی ہے اور ایک خوشی وہ ہے جو چھوٹوں والی ہے۔ وہ لوگ جو چھوٹوں والی خوشی کریں وہ چھوٹے ہیں اور جو بڑوں والی خوشی کریں وہ بڑے ہیں۔

میں نے کہا کہ میں اپنے ساتھیوں سے گزارش کیا کرتا ہوں کہ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کو بھائی مت کہو، میں کہتا ہوں کہ بھائی کہو لیکن بڑا مت کہو، ان کو چھوٹا کہو! میں نے یہ کہا کہ ان کے پاس کیوں گئے ہو؟ میں نے کہا تم نے ان کو بھائی کیوں کہا ہے؟ میں نے کہا کہ ان کو بڑا نہ کہو بلکہ چھوٹا کہو، ان کو بڑے بھائی نہ کہو بلکہ ان کو چھوٹے بھائی کہو! تو چھوٹے کو بڑا نہیں کہنا چاہیے۔ اس سے نقصان یہ ہو گا کہ جب انہیں بڑا مانیں گے تو ان کی عظمت کریں گے، اور حدیث میں ہے:

مَنْ وَقَرَّ صَاحِبٌ بِدَعَاةٍ فَقَدْ أَغَانَ عَلَى هَدْمِ الْإِسْلَامِ۔<sup>105</sup>

جو شخص بدعتی کی توقیر کرتا ہے وہ اسلام کے مٹانے میں مدد کرتا ہے۔

جب آپ انہیں چھوٹا سمجھیں گے تو ”مَنْ لَمْ يَزَحْمْ صَغِيرًا“<sup>106</sup> آپ اس پر شفقت کریں گے اور یہ چھوٹے بھی ہیں، مریض بھی ہیں، مریض آدمی احترام کا مستحق نہیں ہوتا بلکہ مریض آدمی شفقت کا مستحق ہوتا ہے۔

جب مریض کو آپ ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں تو ڈاکٹر اس کو احترام کی نگاہ

105۔ شعب الایمان للبیہقی: ج 7 ص 61 رقم الحدیث 9464

106۔ سنن ابی داؤد، رقم: 4943

سے نہیں دیکھتا بلکہ شفقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ڈاکٹر کی اس شفقت کو مریض سمجھتا ہے کہ میرا احترام کیا ہے حالانکہ وہ احترام نہیں کر رہا ہوتا، وہ شفقت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا ہوتا ہے کہ بھائی! ان کو ذرا یہاں بٹھاؤ، ذرا منہ اوپر کرو، تھوڑا سا پانی اس کے لیے لاؤ... اب یہ شفقت ہو رہی ہے یا احترام ہو رہا ہے؟ (شفقت ہو رہی ہے۔ سامعین) لیکن وہ مریض سمجھ رہا ہے کہ مجھے عزت دے رہا ہے، میرا احترام کر رہا ہے حالانکہ وہ شفقت ہو رہی ہے۔

ان کو بڑا بنا کر تو قیامت کرو بلکہ ان کو چھوٹا سمجھ کر ان پر شفقت کرو اور رحم کا معاملہ کرو۔ ہم مزاج شریعت آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اب جس نے ہماری پوری بات نہیں سنی تو وہ سمجھے گا کہ مولانا گھسن صاحب بہت سخت آدمی ہیں، دیکھو اہل بدعت کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا، میں نے تو یہ کہا کہ شفقت کرو، محبت کرو، ترس کھاؤ ان پر، ان کو چھوٹا سمجھو، ہم منع تھوڑا کرتے ہیں ان کے پاس جانے سے۔

### اللہ تعالیٰ کی مثال نہیں تو مثال کیوں دی؟

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾

اللہ کی مثال کوئی نہیں ہے اور اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے۔

یہاں ایک بات سمجھ لیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہیں، پھر

مثال دے کر سمجھاتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کہتا ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾

کہ اللہ تعالیٰ جیسا کوئی نہیں، قرآن کہتا ہے: ﴿فَلَا تَقْرَبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ﴾<sup>107</sup> کہ اللہ

تعالیٰ کے لیے مثالیں پیش نہ کیا کرو اور تم لوگ مثالیں دیتے ہو۔

میں نے کہا: اللہ نے خود مثال دی ہے، فرمایا:

﴿اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مِثْلُ نُورِهِ كَمِثْلِهَا فِيهَا

مِصْبَاحٌ﴾<sup>108</sup>

کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اللہ کے نور کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق ہو جس میں چراغ رکھا ہوا ہو۔

اللہ تو مثالیں دے رہے ہیں۔ ہاں اب یہ سمجھنا چاہیے کہ مثال دے بھی رہے اور ہمیں حکم بھی فرما رہے ہیں کہ مثال نہ دو۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اچھی اچھی مثالیں تو دو لیکن بری بری مثالیں نہ دو۔ جیسے مشرک کہتے تھے ہم تو اللہ کی عبادت کرتے ہیں، باقی ان بتوں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى﴾<sup>109</sup> اس سے اللہ راضی ہوتا ہے، یہ اللہ کے قریب بھی ہیں، یہ خوش ہو جائیں گے تو ہمیں جلدی اللہ سے ملا دیں گے، ہم اس لیے ان کی عبادت کرتے ہیں۔ جیسے آج کے دور میں بھی لوگ کہتے ہیں کہ ایک بڑا ہوتا ہے، اس بڑے تک پہنچنے کے لیے درمیان میں کوئی واسطہ ہوتا ہے، جب تک واسطہ نہ ہو تو بڑے تک کیسے جائیں گے؟ فرمایا ایسی مثالیں نہ دو، کیونکہ تمہارے اور بڑے کے درمیان فاصلہ ہے جو واسطے کے بغیر طے نہیں ہوتا، اور ﴿وَ نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾<sup>110</sup> اللہ تو تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، یہاں تو فاصلہ ہی نہیں ہے تو واسطوں کی ضرورت کیا ہے؟

108-النور 24:35

109-الزمر 39:3

110-ق 50:16

اس کا خلاصہ یہ نکلا کہ اچھی اچھی مثالیں دو اور بری بری مثالیں مت دو۔ تو دو باتوں میں فرق سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اگر آدمی نہ سمجھے تو پھر الجھنیں بہت ہوتی ہیں۔

### امام ابو حنیفہ نے مناظرے سے روکا، اس کا مطلب:

دو باتوں میں فرق پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک مولانا صاحب نے مجھے کہا: امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے بیٹے امام حماد کو وصیت فرمائی تھی کہ مناظرہ نہ کیا کرو اور آپ لوگ تو مناظرہ کرتے ہیں، آپ کیسے حنفی ہیں؟ میں نے کہا کہ امام صاحب نے وصیت فرمائی تھی کہ مناظرے نہ کیا کرو، تو خود امام صاحب مناظرے کرتے تھے یا نہیں؟ کہنے لگے جی کرتے تھے۔ تو میں نے کہا کہ امام صاحب خود کرتے ہیں اور بیٹے کو منع کرتے ہیں تو میرا سوال ہے کہ اگر مناظرہ اچھا کام تھا تو بیٹے کو منع کیوں کیا اور اگر اچھا کام نہیں تھا تو خود کیوں کیا؟

وہ مولانا صاحب کہنے لگے کہ بیٹے سے کہا تھا کہ ہم اللہ کے لیے کرتے تھے اور تم ذات کے لیے کرو گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہمارے بارے میں آپ کا کیا گمان ہے کہ ہم اللہ کے لیے کرتے ہیں یا اپنی ذات کے لیے کرتے ہیں؟ مجھے کہنے لگے: آپ کے بارے میں تو اچھا گمان ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر وصیت ہمیں کیوں سناتے ہو؟ ہمارے بارے میں کہو کہ مولانا صاحب اس لیے کرتے ہیں کہ امام صاحب کے مقلد ہیں، ان کا امام بھی کرتا تھا اور یہ بھی کرتے ہیں۔ تو ہمارے بارے میں یہ بات کرو! اصل میں جب آدمی حاسد ہوتا ہے تو پھر وہ اچھی تعبیر پیش نہیں کرتا، اچھی بات کو غلط انداز میں پیش کرتا ہے۔

میں نے کہا کہ علامہ علاء الدین حصکفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أَلَمْ نَظَرَ فِي الْعِلْمِ لِنُصَرِّحَ الْحَقَّ عِبَادَةً.<sup>111</sup>

کہ حق کی مدد کرنے کے لیے مناظرہ کرنا عبادت ہے اور آپ کہتے ہیں کہ مناظرہ سے امام صاحب نے منع کیا ہے۔ پھر میں نے ان سے پوچھا کہ مناظرہ کرنا ذات کے لیے گناہ ہے تو بتائیں کہ نماز دکھلاوے کے لیے پڑھنا جائز ہے؟ کہا جی نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر اس سے بھی منع کر دیں۔ قیامت کے دن اللہ شہید کو جہنم میں بھیج دے گا، کیونکہ وہ اللہ کے لیے نہیں بلکہ اپنی ذات کے لیے لڑا تھا، جہاد بھی چھوڑ دیں! قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مولوی صاحب کو جہنم میں بھیج دیں گے کیونکہ وہ اللہ کے لیے نہیں بلکہ دکھاوے کے لیے پڑھتا تھا تو قرآن بھی چھوڑ دیں! اللہ سخی کو جہنم میں بھیج دیں گے کہ یہ سخاوت دکھلاوے کے لیے کرتا تھا تو سخاوت بھی چھوڑ دیں!

میں نے کہا کہ ایک مناظرے کا کیا قصور ہے؟ دین کا کوئی بھی شعبہ ہو اور اس میں لوگ ریا کرتے ہوں تو اس کو ختم کر دو! اصل مسئلہ یہ ہے کہ آج لوگوں کی طبیعت یہ بن گئی ہے کہ دین کے ایک شعبہ میں کام کرتے ہیں اور باقی شعبوں میں کام کرنے والوں کو منع کرتے ہیں تو منع کرنے کے لیے جھوٹے اور غلط جواز پیش کرتے ہیں!

### دین کے کام میں اخلاص شرط ہے:

لیکن ہمارا مزاج یہ نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ مزاج وہ رکھو جو شریعت کا ہے۔ جو بندہ دین کا کام کرتا ہے، کام بہت بڑا ہو لیکن نیت ٹھیک نہ ہو تو وہ کام بہت چھوٹا ہو جاتا ہے، کام بہت چھوٹا ہو لیکن نیت ٹھیک ہو تو کام بہت بڑا ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”إِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِ الثَّمَرَةِ“<sup>112</sup>

کہ جہنم کی آگ سے بچو اگرچہ تمہیں کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ دینا پڑے۔ اب اگر اخلاص کے ساتھ ہو گا تو یہ ٹکڑا بھی بہت بڑا ہو جائے گا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَسْبُوا أَصْحَابِي فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ أَنَّفَقَ أَحَدُكُمْ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدًّا أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ.<sup>113</sup>

میرے صحابہ کو برا بھلا نہ کہنا، کیونکہ اگر تم احد پہاڑ کے برابر سونا بھی خرچ کر لو تو ان کے تقریباً کلو، آدھا کلو جو کے برابر بھی نہیں۔

اس کی وجہ سمجھنا! وجہ یہ ہے کہ ان کے کلو، آدھا کلو میں جو اخلاص تھا وہ بہت بڑا تھا اس لیے ان کا کلو بھی بہت بڑا تھا اور ہمارا احد پہاڑ کا سونا بہت چھوٹا ہے چونکہ ہمارا اخلاص ان کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

کبھی لوگ کہیں گے کہ ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا دفاع کرتے ہیں اور تم تو فروعی مسائل کا دفاع کرتے ہو۔ میں نے کہا: فروعی مسائل کی نسبت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی طرف ہے، اللہ کے نبی کی ذات نہ ہوتی تو فروعی مسائل کہاں سے نکلتے؟! اور فروعی مسائل کوئی معمولی چیز ہوتی ہے کیا؟ اس لیے میں نے کہا کہ اس بات کو سمجھا کرو اچھی طرح!

### اخلاص پر کھنے کا معیار:

آج امت کا عجیب مزج ہے۔ مثلاً ایک عنوان پر ہم کام کرتے ہیں اور اسی

112۔ سنن النسائی، رقم: 2552

113۔ سنن ابی داؤد، رقم: 4658

عنوان پر کوئی دوسرا فرد کرے تو ہم برداشت نہیں کرتے۔ اسی عنوان پر دوسری جماعت کام کرے تو ہم برداشت نہیں کرتے۔ یہ کتنی بڑی زیادتی ہے!

میں کسی فرد یا جماعت کا نام نہیں لیتا، میں اپنی بات کہتا ہوں کہ میں کام کرتا ہوں فرقِ باطلہ کے رد میں۔ اگر کوئی اور فرقِ باطلہ کے رد میں کام کرتا ہو اور میں اس پر خوش ہوتا ہوں تو آپ کو سمجھنا چاہیے کہ استاد جی ٹھیک ہیں، اگر میں اس پر ناراض ہوتا ہوں تو پھر آپ کو یقین کر لینا چاہیے کہ استاد جی ٹھیک آدمی نہیں ہیں۔ میں ٹھیک ہوتا تو مجھے خوش ہونا چاہیے تھا۔ اب دیکھو! دنیا بھر کے تمام فرقِ کارڈ میں اکیلا کر سکتا ہوں؟ (نہیں۔ سامعین) تو جو دوسرے کر رہے ہیں وہ میرے معاون ہیں، مجھے تو خوش ہونا چاہیے، خواہ وہ میرے شہر میں ہوں، خواہ وہ میرے ملک میں ہوں، خواہ وہ کسی اور ملک میں ہوں۔

یہ معیار ہے کسی بندے کو پرکھنے کا لیکن آپ نے اس معیار پر دوسروں کو نہیں پرکھا، اس معیار پر خود کو پرکھا ہے۔ یہ معیار میں اس لیے نہیں بتا رہا کہ آپ اس کسوٹی پر دوسرے کو پرکھیں اور دوسروں پر فتوے دیں، آپ دوسروں کو پرکھنا شروع کر دیں گے تو ہم سمجھیں گے کہ آپ ہمارا مزاج نہیں سمجھ سکے، آپ ہمارے متخصص نہیں ہیں... ہاں اگر اس معیار پر خود کو پرکھو گے تو میں سمجھوں گا کہ آپ ہمارے متخصص ہیں، ہمارے شاگرد ہیں، آپ نے ہمارا مزاج سمجھا ہے۔

**فراغت کے بعد اساتذہ سے رابطہ ضرور رکھیں!**

آپ یہاں سے فارغ ہو کر جاتے ہیں لیکن آپ حفظ کے شعبے میں کام کرتے ہیں تو معمول کا رابطہ تمام اساتذہ سے رکھیں، عزت تمام اساتذہ کی کریں لیکن اصل رابطہ حفظ کے استاذ سے رکھیں، اپنے کام کی کارگزاری ان کو جا کے سنائیں، ان سے پھر مزید رہنمائی لیں، اس سے آپ کے حفظ کے کام میں برکت آجائے گی۔ آپ درجہ



کتب میں کام کر رہے ہیں تو درجہ کتب کے اساتذہ سے رابطہ رکھیں، ان کو کارگزاری سنائیں، ان سے رہنمائی لیں، اس سے آپ کا شعبہ کتب مضبوط ہو جائے گا، اور اگر فراغت کے بعد فرق باطلہ کے رد پہ کام کرنا ہے تو پھر رابطہ ہم سے رکھیں، پھر مشورہ ہم سے لیں، اس سے آپ کا کام بہت بڑھ جائے گا۔ اس اعتماد کو کبھی نہیں چھوڑنا! اور یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ یہ مزاج آپ بنائیں، آج آپ اُدھر بیٹھے ہیں [اشارہ طلبہ کی نشستوں کی طرف] اور کل آپ نے اُدھر بیٹھنا ہے [اشارہ مسند تدریس کی طرف]... یہاں وہ مزاج ہو جو اُدھر والوں کا ہو تو بس پھر آپ کو لطف آئے گا، پھر آپ بہت خوش ہوں گے۔

بعض طلبہ یہ زیادتی کرتے ہیں کہ کتب کے استاذ کی وجہ سے حفظ کے استاذ کو چھوڑ دیتے ہیں اور بعض تخصص کے استاذ کی وجہ سے کتب کے استاذ کو چھوڑ دیتے ہیں، ایسا کبھی نہ کریں۔ ہاں یہ بات ضروری ہے کہ آپ حفظ سے لے کر تخصص تک آئے ہیں، اب اللہ جس شعبہ میں آپ سے کام لیتا ہے تو عزت سب اساتذہ کی کریں لیکن رابطہ اس شعبہ کے اساتذہ سے زیادہ رکھیں، رہنمائی ان سے زیادہ لیں۔

بس جب یہ مزاج بنالیں گے تو کسی کے خلاف دل میں حسد نہیں ہوگا، آپ یہ سمجھیں گے کہ دنیا میں جو بھی دین کا کام کرتا ہے وہ ہمارا معاون ہے۔ اگر اس کے بارے میں کچھ خدشہ بھی ہو تو اس سے بات کریں، جب تک اس سے بات نہیں ہوتی تب تک اپنی زبان بند رکھیں، عوام میں ان کے بارے میں باتیں نہ کریں، اس کا نقصان بہت ہوتا ہے۔ اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

**احتباء اور انابت میں فرق:**

﴿اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ﴾

اللہ جس کو چاہتے ہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور جو اللہ کی طرف رجوع

کرتا ہے اللہ اس کو اپنی طرف پہنچا دیتے ہیں، اپنی طرف اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک ہے عام قانون اور عام ضابطہ اور ایک قانون اور ضابطہ نہیں ہے بلکہ وہ خواص کے لیے خاص ترتیب ہے۔ ترتیب عمومی یہ ہے ”وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاءُ“ اور ”اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاءُ“ یہ عمومی ترتیب نہیں ہے بلکہ یہ خواص کی ترتیب ہے۔ اصل ترتیب تو یہ ہے کہ جو طالب ہو گا ہدایت اسے ملے گی اور جو طالب نہیں ہو گا اللہ اسے بھی کھینچ لیں تو یہ عام ترتیب نہیں ہے بلکہ یہ خواص کے لیے ہے اور یہ کبھی کبھی ہوتا ہے۔

عام قانون کسی ہے، عام قانون وہی نہیں ہے۔ مثلاً کوئی چاہے گا تو قرآن کا حافظ بن سکے گا، نہیں چاہے گا تو نہیں بن سکے گا لیکن امت میں ایسے بندے مل جائیں گے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ ماں کا دودھ پینے سے فارغ ہوئے ہوں اور دو سال میں قرآن کے حافظ بن جائیں لیکن یہ عام ضابطہ نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ہم محنت چھوڑ دیں!

**متکلم اسلام کی تحدیث بالنعمة:**

میں بہت ساری باتیں عرض کیا کرتا ہوں۔ میں نے مناظرے کا فن کسی سے نہیں پڑھا اور میں پڑھاتا ہوں، میں نے خطابت کسی سے نہیں سیکھی اور میں سکھاتا ہوں، میں نے گاڑی کی ڈرائیونگ کسی سے نہیں سیکھی اور میں ڈرائیونگ کرتا ہوں، کوئی خاص چیز کسی سے پوچھ لی کہ بھائی یہ کیا ہے... یہ کیا ہے... یہ الگ چیز ہے لیکن میں بغیر سیکھے گاڑی پر بیٹھا ہوں اور ہم نے ڈرائیونگ کی تو چل پڑی ہے گاڑی۔

**چپاٹا میں تدریس کا واقعہ:**

سب سے پہلے میں نے کینیا، زیمبیا میں گاڑی چلائی تھی۔ وہاں ایک جگہ ہے چپاٹا، وہاں مولانا محمد عبد الرحیم متالار رحمہ اللہ تھے حضرت جی حضرت شیخ الحدیث مولانا

محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ کے خلفاء میں سے تھے، میں وہاں ان کے پاس گیا۔ یہ 1992 یا 1993 کی بات ہے۔ میں نے وہاں درس دیا اور میرا درس ان کو پسند آیا۔ میں چونکہ اس وقت ایک جماعت میں کام کرتا تھا تو انہوں نے اس قیادت سے کہا کہ مولانا کو ہمیں دے دو۔ یوں انہوں نے مجھے وہاں اپنے مدرسے میں مدرس رکھ لیا۔

پھر انہوں نے صبح مجھے ایک فارم دیا، جو انگلش میں لکھا ہوا تھا، کہ آپ یہ فارم پُر کریں! میں نے نیچے دستخط کر دیے۔ انہوں نے کہا کہ اس کو پُر کر کے دیں۔ میں نے کہا کہ میں نے دستخط کر دیے ہیں بس میری طرف سے پُر ہے، اوپر آپ نے جو لکھنا ہے لکھ لیں، ہماری کوئی شرط نہیں ہے، ہم نے بس سبق پڑھانا ہے۔ تو یوں دو ماہ تک میں نے وہاں سبق پڑھایا۔ حضرت کے بیٹے تھے عبدالرشید اور عبدالحلیم وہ میرے پاس پڑھتے تھے اور ایک چھوٹا بیٹا تھا عبدالرؤف وہ حفظ میں تھا۔ میں عشاء کے بعد سو جاتا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلا کر پوچھا آپ مطالعہ کرتے ہیں؟ میں نے کہا کرتا ہوں۔ کہا کہ آپ تو عشاء کے فوراً بعد سو جاتے ہیں، آپ کے سبق جلا لیں تک ہیں، ہر درجے کا سبق ہے۔ تو میں نے کہا جب میں سبق پڑھا رہا ہوں تو آپ اچانک میرے سبق میں تشریف لائیں اور سنیں کہ میں سبق کیسے پڑھا رہا ہوں۔ میں نے طالب علمی میں محنت اتنی کی ہے کہ اب مجھے مطالعہ کی الجھن نہیں ہے، بس سرسری سادیکھتا ہوں کہ سبق کون سا پڑھانا ہے؟

خیر دو ماہ تک میں نے وہاں پڑھایا۔ پھر میں واپس آگیا، میری مجبوری تھی۔ جب زمبیا سے واپس آیا تو چپاٹا میں لو سا کا دارا لکھو مت ہے تو وہ لوگ وہاں مجھے ملنے کے لیے آئے کہ وہاں سے روانہ کریں گے۔ تو انہوں نے مجھے کچھ ڈالر دیے، کتنے تھے مجھے اب بھی نہیں پتا، میں نے نہ دیکھے نہ گنے کہ کتنے دیے۔ میں نے کہا کہ جی میں نہیں لوں گا۔ کہنے لگے: وجہ؟ میں نے کہا کہ میں نے تنخواہ کے لیے نہیں پڑھایا، میری تشکیل تھی

تو میں نے سبق پڑھایا بس، اب میں واپس جا رہا ہوں۔ اگر آپ نے دینا ہی ہے تو ان کو دیں جنہوں نے میری تشکیل کی ہے، میں نہیں لوں گا، اور واقعتاً میں نے نہیں لیے۔ یہ بات میں 1992 / 1993 کی کر رہا ہوں جب میں کنوارہ تھا اور بالکل جوانی تھی، اس دور میں کون پیسے چھوڑتا ہے۔ اس کی برکت ہے کہ اللہ آج دیتا ہے۔

### دین کی خدمت کا موقع ملے تو فوراً قبول کریں!

میں اس لیے کہتا ہوں کہ پیسہ چھوڑو... امامت ملے تو فوراً قبول کرو، یہ طے نہ کرو کہ کتنی تنخواہ ہوگی، آپ مجھے کیا دیں گے، یہ باتیں چھوڑو! بس بسم اللہ پڑھ کر کام شروع کرو، کام اچھا ہو تو لوگوں کا رجوع اتنا ہو گا کہ پیسے سنبھالے نہیں جائیں گے۔ اگر کام اچھا نہ ہو تو بہت جلد امامت ختم ہو جائے گی۔ پھر تم لڑو گے اور وہ رکھیں گے نہیں، جبراً وہاں رہو گے تو ایسے رہنے کا مزا نہیں آتا۔ اس لیے اگر تدریس کی جگہ ملے تنخواہ کی بات چھوڑو، بس پڑھانا شروع کرو۔ آپ اچھے مدرس ہیں اور آپ جانا چاہتے ہیں تو مہتمم صاحب کہیں گے کہ کیوں جا رہے ہیں؟ جی میری معاشی مجبوری ہے تو وہ مہتمم خود پیسے دے گا کہ ہم آپ کا مسئلہ حل کرتے ہیں، آپ مت جائیں اور اگر پہلے ہی دن آپ تنخواہ کا مطالبہ شروع کریں گے تو آپ کی وقعت ان کے دل سے نکل جائے گی اور وہ کہہ دے گا کہ جاؤ کسی اور مدرسے میں مدرس بنو۔

میں بطور خاص اپنے طلبہ سے عرض کرتا ہوں کہ دن کو سبق پڑھاؤ، رات کو تہجد پڑھو، صبح اٹھ کر اللہ اللہ کی ضربیں لگاؤ، اعمال کی پابندی کرو تو ان شاء اللہ اتنی محبوبیت خدا عطا فرمائے گا کہ آپ مہتمم کی مجبوری بن جائیں گے، وہ کہے گا کہ اس مدرس کو مت نکالو، وہ تمہیں سونے سے تول لے گا لیکن جانے نہیں دے گا اور جب تنخواہوں پر لڑو گے، تنخواہ اتنی ہوئی تو میں رہوں گا ورنہ نہیں... اس سے میرا گزارا نہیں ہوتا... میرا گھر دور ہے... میرے بچے ہیں، اس تنخواہ سے گزارا نہیں ہوتا...

اگر یہ باتیں کرو گے تو پھر کچھ نہیں ہو گا۔

میں نے جس دن سے مسلک کا کام شروع کیا ہے اس دن سے صرف ایک یا دو مرتبہ شاید میں نے بس کا سفر کیا ہو اور وہ بھی کسی مجبوری کی وجہ سے۔ پیسوں کی وجہ سے نہیں، کوئی اور وجہ تھی۔ مثلاً میں کراچی سے آ رہا ہوں کبیر والا جلسہ تھا تو دھند میں فلائٹ کینسل تھی تو میں وہاں سے کوچ پر بیٹھا اور آگیا، جلسہ میں نے نہیں چھوڑا، واپسی پر میں نے کراچی جانا تھا تو بس میں ٹکٹ نہیں تھا۔ میں ٹرین پر بیٹھا اور سکھر پہنچ گیا۔۔۔ لیکن میں نے جلسہ نہیں چھوڑا۔ باقی جس دن سے میں نے کام شروع کیا ہے میں بس پر نہیں بیٹھا بلکہ ریٹ کی گاڑی پر بیٹھا ہوں۔ میں نے کہا: اللہ! مجھے ذلیل نہ کرنا، ہماری جنگ مخالف سے ہے، بسوں کے دھکے بہت مشکل ہیں، مخالف بھی خوش ہوتا ہے، اللہ! اپنا کرم فرمادیں۔ میں یہاں سے پشاور گیا ہوں تو مجھے انہوں نے پندرہ سو دیے، میں یہاں سے ڈیرہ غازیخان گیا ہوں ریٹ کی گاڑی پہ تو مجھے انہوں نے تین ہزار دیے، میں یہاں سے حیدر آباد گیا ہوں تو مجھے کسی نے ایک روپیہ نہیں دیا لیکن میں نے کام نہیں چھوڑا۔ آج گاڑی بھی دیکھ لو کہ اللہ نے کیسی قیمتی دی ہے۔

ہمارے ایک بہت بڑے عالم ہیں پنجاب کے، میں ایک بار ملتان گیا، آگے لودھراں جانا تھا تو میں نے ان سے فون پر پوچھا: مولانا! کدھر ہیں؟ کہا کہ میں وفاق کے دفتر میں ہوں۔ میں نے کہا کہ میں آ رہا ہوں اور آپ سے ملتا ہوں۔ مجھے انہوں نے کہا کہ کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا کہ میں نے لودھراں ایک جلسے میں جانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے بھی اسی جلسے میں جانا ہے۔ میں نے کہا کہ چلیں پھر میری گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ ہم گاڑی میں بیٹھے اور گپ شپ لگا رہے تھے۔ ان کے سیکورٹی گارڈ دوسری گاڑی میں تھے۔ تو میں نے ان سے کہا کہ مولانا! میں نے زندگی بھر جلسے والوں سے پیسے نہیں مانگے، وہ خود دے دیں تو واپس نہیں کرتا اور نہ دیں تو مانگتا نہیں ہوں اور

میں آج بھی قسم کھالوں تو حانث نہیں ہوں گا کہ میں اس دن کے انتظار میں ہوں کہ اللہ مجھے اتنے اسباب دے دیں کہ جلسے والے کرایہ دیں اور میں واپس کر دوں کہ میرے پاس ہیں۔ بس یہ میری مجبوری ہے کہ میں لے لیتا ہوں، ابھی اتنا ہے کہ جو دیتا ہے تو میں لے لیتا ہوں اور نہیں دیتا تو مانگتا نہیں ہوں، جتنے وہ دیں تو بس قبول کر لیتا ہوں۔

﴿اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ وَمَا يُدْرِيكُ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ﴾

اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا ہے اور میزان کو بھی اتارا ہے اور آپ کو کیا معلوم شاید کہ قیامت قریب ہو۔

”اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ“ یہ حقوق اللہ ہیں اور ”وَالْمِيزَانَ“ یہ حقوق العباد ہیں۔ ”میزان“ سے مراد ترازو ہے۔ اس کا معنی ہے کہ ترازو میں چیزیں تولی جاتی ہیں بندوں کے حقوق کے لیے۔ تو اللہ نے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں سمجھائے ہیں۔ لہذا ہمیں دونوں قسم کے حقوق کو ادا کرنا چاہیے۔

**رشتہ داری کا خیال کرو!**

﴿قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ﴾

اے میرے پیغمبر آپ ان سے کہیں کہ میں تمہیں جو دعوت دیتا ہوں اس پر پیسے نہیں مانگتا، بس یہ کہتا ہوں کہ رشتہ داری کا خیال کرو۔

اس کو سمجھنا! یہ جو ﴿إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ﴾ ہے یہ ”أَجْرًا“ سے مستثنیٰ متصل نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ ”میں آپ سے مزدوری نہیں مانگتا ہاں اتنا اجر مانگتا ہوں کہ رشتہ داری کا خیال کرو“... یہ مطلب نہیں ہے۔ یہ استثناء مفرغ

ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تم سے کچھ بھی نہیں مانگتا، ہاں البتہ اتنی بات کہتا ہوں کہ میں تمہارا رشتہ دار ہوں، تم لوگ رشتہ داری کا خیال کرو، میری بات کو توجہ سے سنو! میں تمہارا آدمی ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرما رہے ہیں۔ اور بسا اوقات مبالغے کے طور پر لوگ ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ میری مزدوری یہی ہے کہ تم میری قربت کا خیال کرو۔ جیسے کسی عالم کو آپ بلائیں اور وہ کہے: بس! میرے پیسے یہی ہیں کہ تم مسئلہ سمجھ جاؤ، میں سمجھوں گا کہ مجھے تم نے بہت کچھ دے دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ اس کی مزدوری تو نہیں ہے، یہ تو مبالغے کے انداز میں بات سمجھائی جا رہی ہے۔

تو اللہ کے نبی بھی یہ فرما رہے ہیں کہ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا! بس میری قربت کا خیال کرو، تمہارا رشتہ دار ہوں، تمہارا آدمی ہوں۔

### دینی امور پر اجرت کا جواز:

اس پر میں بات کر چکا ہوں ﴿قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ﴾<sup>114</sup> کے تحت کہ جماعۃ المسلمین والے ایسی آیات کو پیش کر کے یہ بات کہتے ہیں کہ اجرت علی تعلیم الدین جائز نہیں ہے۔ بنیادی جواب ذہن میں رکھ لیں کہ یہ خطاب کفار کو ہے اور ہم اجرت کفار سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے لیتے ہیں، یہ اغیار سے ہے اور ہم غیروں سے نہیں بلکہ اپنے معتقد سے لیتے ہیں، غیر سے لیں تو بات اور ہوتی ہے اور اپنے معتقد سے لیں تو بات اور ہوتی ہے۔

### مصیبت کا اکثری سبب گناہ ہیں:

﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ

کَثِيرٌ ﴿٦٠﴾

تمہیں جو مصیبت پہنچتی ہے تو یہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے ہے اور بہت سارے گناہ تو اللہ ویسے ہی معاف کر دیتے ہیں، ان کے بدلے میں تمہیں تکلیف دیتے ہی نہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بات سمجھائی، فرمایا کہ بندے کو چھوٹی سے چھوٹی تکلیف بھی ہو تو یہ انسان کے گناہوں کی وجہ سے ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ اس آیت کا معنی یہ نہیں ہے کہ دنیا میں ہر بندے کو جو تکلیف آتی ہے تو وہ اس کے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو انبیاء علیہم السلام اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں، اسی طرح نابالغ بچے اس سے مستثنیٰ ہیں، مجنون اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کی تکالیف گناہ کی وجہ سے نہیں ہیں کیونکہ ان کا تو گناہ ہوتا ہی نہیں تو گناہ پر تکلیف کیسے آئے گی! ان کی تکالیف ہوتی ہیں ابتلاء اور آزمائش کی وجہ سے۔ حدیث مبارک میں ہے:

"أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً: الْأَنْبِيَاءُ" <sup>115</sup>

یہاں بلاء، ابتلاء ہے کہ سب سے زیادہ تکلیف نبی کو ہوتی ہے ابتلاء کے لیے۔ تو انبیاء علیہم السلام پہ ابتلاء اور آزمائش آتی ہے اور جن کے گناہ نہیں ان پہ بھی ابتلاء آتی ہے، اور بسا اوقات مصیبت آنے کی وجہ رفع درجات ہوتی ہے، اس کی وجہ گناہ نہیں ہوتے بلکہ مقصود درجات کو بڑھانا ہوتا ہے۔

**دنیا کی زندگی کی حقیقت:**

﴿فَمَا أَوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَّاعٌ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾



جو کچھ تمہیں ملا ہے تو یہ دنیا کا سامان ہے جو بہت جلد ختم ہو جائے گا، یہ دنیا کے استعمال کی چیزیں ہیں، ان کی اللہ کے ہاں کوئی قیمت نہیں ہے۔

اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بات سمجھائی ہے، فرمایا:

أَنَّ الدُّنْيَا كُلُّهَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ.<sup>116</sup>

دنیا میں جو چیزیں خدا نے پیدا فرمائی ہیں یہ تمہارے استعمال کی ہیں اور ان میں بہترین چیز نیک عورت ہے۔

اللہ آپ سب کو عطا فرمائیں۔ اللہ آپ کو خوب صورت بھی دیں اور خوب سیرت بھی دیں، اللہ ایسی بیوی دیں کہ دیکھ کر آپ کا دل خوش ہو جائے۔ (آمین۔ سامعین) اور بہترین عورت کون سی ہوتی ہے! اس کے بارے میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”خَيْرُ النِّسَاءِ امْرَأَةً إِذَا نَظَرْتَ إِلَيْهَا سَرَّكَ“ کہ بہترین عورت وہ ہے کہ جب تو اس کو دیکھے تو تجھے مزا آجائے، ”وَإِذَا أَمَرَتْهَا أَطَاعَتْكَ“ جب تو اس کو بات کہے تو فوراً وہ تیری بات مانے، ”وَإِذَا غَبَّتْ عَنْهَا حَفِظْتَكَ فِي مَالِهَا وَنَفْسِهَا“ اور جب تو کہیں چلا جائے تو وہ تیرے مال اور تیری عزت کی حفاظت کرے۔<sup>117</sup>

**آخرت کے اجر کے مستحقین کی صفات:**

﴿وَمَنْ عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَى لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾

جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی ہے۔ کن کے لیے؟

[1]: ﴿آمَنُوا﴾ ان کے لیے جن کے عقیدے ٹھیک ہیں۔

116۔ السنن الکبریٰ للبیہقی: ج 7 ص 80 رقم الحدیث 13580

117۔ جامع الاحادیث للسیوطی: جزء 12 ص 365 رقم الحدیث 12105

[2]: ﴿وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾ ان کے لیے جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے

ہیں، اور وہ کون لوگ ہیں؟ تو ان کی چند صفات بیان فرمائی ہیں:

﴿وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْأَثْمِ وَالْفَوَاحِشَ﴾

[3]: یہ وہ لوگ ہیں جو بڑے بڑے گناہوں سے بچتے ہیں۔

یہاں ”کَبِيرَ الْأَثْمِ“ یعنی بڑے بڑے گناہ کا ذکر اس لیے فرمایا کیونکہ صغائر

تو اللہ رب العزت ویسے ہی معاف فرمادیتے ہیں، اور ”الْفَوَاحِشَ“ بھی کبار ہی ہوتے

ہیں۔ بے حیائی کے کام کو الگ بیان فرمایا اس لیے کہ عام گناہ اور فحاشی میں فرق ہے، یہ

فتیح زیادہ ہوتے ہیں، عیب دار زیادہ ہوتے ہیں۔ دیکھو! پیغمبر کی بیوی کافرہ ہو سکتی ہے

لیکن زانیہ نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے شرعی عیب اور ایک ہوتا

ہے انسانی سوسائٹی کا عیب۔ کفر بہت بڑا عیب ہے لیکن شرعی، انسانی سوسائٹی میں کفر

عیب نہیں سمجھا جاتا۔ اور زنا ایسا عیب ہے جو انسانی سوسائٹی میں بڑا عیب سمجھا جاتا

ہے۔ اللہ اس عیب سے اپنے نبی کی بیوی کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اس لیے یہاں فواحش کا

الگ مستقل ذکر فرمایا۔

﴿وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ﴾

[4]: جب کبھی غصہ ہوتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں۔

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ وہ غصہ ہوتے ہی نہیں بلکہ فرمایا کہ غصہ ہوتے ہیں

لیکن معاف کر دیتے ہیں۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے تھے: جو شخص غصے کی

بات پر غصہ نہ ہو تو وہ گدھا ہے اور کوئی معافی مانگے اور وہ پھر بھی معاف نہ کرے تو وہ

شیطان ہے۔

غصے کی بات پر غصہ آنار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ بسا اوقات

خلافِ شرع بات دیکھتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتنے غصے ہو جاتے کہ ایسا لگتا کہ جیسے آپ کے چہرہ انور پر انار نچوڑ دیا گیا ہو، ایسے چہرہ سرخ ہو جاتا تھا غصے کی وجہ سے۔

﴿وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾

[7، 6، 5]: اور یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی بات مانتے ہیں بطورِ خاص نماز کی پابندی کرتے ہیں اور اپنے معاملات مشورے سے طے کرتے ہیں اور جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ ناکچھ خرچ بھی کرتے ہیں۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ ہر مہینے کچھ مرکز میں جمع کروایا کرو! یہ ہے ”مَجْمَع“ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ گھر سے لاتے ہو وہ سارا جمع کروادو، نہیں بلکہ اپنی چائے کے لیے بھی رکھو، اپنے کھانے پینے کے لیے بھی رکھو لیکن کچھ ناکچھ ہر مہینے مرکز میں بھی جمع کراؤ، یہ اپنا مزاج بناؤ۔

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ﴾

[8]: اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر ظلم ہو تو بدلہ لیتے ہیں۔

یہ مؤمن کی شان ہے۔ پیچھے فرمایا تھا ”وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ“ کہ جب غصے میں ہوں تو معاف کر دیتے ہیں اور یہاں فرمایا کہ بدلہ لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام ان کا مزاج یہ ہے کہ وہ معاف کرتے ہیں لیکن جہاں سمجھیں کہ ظالم کو معاف کرنے سے وہ ظلم میں اور بڑھ جائے گا اور فاسق کو معاف کرنے سے وہ فسق میں اور ترقی کرے گا تو پھر اس سے بدلہ بھی لے لیتے ہیں۔

﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾

اور تکلیف کا بدلہ تکلیف ہے اس جیسی۔ یہاں ”سَيِّئَةٌ“ سے مراد ہے

تکلیف۔ تکلیف دینا برا کام ہے، یہ کوئی اچھا کام تو نہیں ہے، یہ معنی ہے کہ برے کام کا بدلہ اسی جیسا برا ہے۔ نقصان دہ چیز کا بدلہ اسی جیسا نقصان دہ ہے، یہ نہیں کہ کوئی تمہارے ساتھ گناہ کرے تو تم اس کے ساتھ گناہ کرو! یہ معنی نہیں... اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

﴿فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾

جو معاف کر دیں اور صلح کر لیں تو اس کا اجر اللہ دیں گے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں فرماتے۔

مطلب یہ کہ دنیا میں بدلہ لو گے تو تم نے خود بدلہ لیا ہے اور اگر تم چھوڑ دو گے تو آخرت میں اللہ دے گا اور اللہ کا بدلہ دنیا کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔

**اولاد دینے والی ذات اللہ ہی کی ہے:**

﴿يَلَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يُخْلُقُ مَا يَشَاءُ يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنَاقًا وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذُّكُورَ ۖ أَوْ يَزْوِجُهُمْ ذُكْرَانًا وَإِنَاقًا وَيَجْعَلُ مَنْ يَشَاءُ عَقِيمًا إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ﴾

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت کا مالک اللہ ہی ہے، اللہ جو چاہتے ہیں پیدا کرتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں بیٹیاں دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں بیٹے دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں بیٹیاں دونوں دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں نہ بیٹا دیتے ہیں اور نہ بیٹی دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتے بھی ہیں کہ کس کو کیا دینا ہے، اور اللہ کو قدرت بھی ہے کہ اس کو کیا دینا ہے۔

آپ دعا کریں ہماری تو بڑی نیت ہے کہ اللہ اسباب عطا فرمادیں کہ قرآن کریم اس طرح مکمل ہو جائے کہ الحمد سے لے کر والناس تک ایک ایک آیت کی تفسیر

کروں، یہ میں نے نیت پکی کی ہے کہ ویڈیو ریکارڈنگ کرائیں، ایک ایک آیت کی تفسیر کریں، پہلے خلاصہ بیان کریں، پھر ایک ایک آیت پر بولتے جائیں، جب آپ قرآن کریم کی کسی آیت کی تفسیر دیکھنا چاہیں تو بس ایک کلک کریں اور انٹرنیٹ آپ کو اس آیت کی تفسیر دے دے اور ترجمہ با محاورہ ہو جس کو عام بندہ بھی سمجھ سکے۔

### بیٹی خدا کی رحمت ہے:

یہاں یہ بات سمجھیں کہ ہر بندہ شادی کے بعد مانگتا ہے کہ اے اللہ! مجھے بیٹا عطا فرما! اور قرآنی ترتیب کیا ہے؟ ”يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ اِنَاثًا“ اللہ پہلے بیٹی کی بات کرتے ہیں۔ میں اس پر اللہ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں کہ میری پہلی بیوی سے بڑی بیٹی ہے، اس کے بعد دوسری بیوی سے پہلی بیٹی ہے، اس کے بعد تیسری بیوی سے پھر پہلی بیٹی ہے۔ تینوں بیویوں سے ہماری پہلی بیٹیاں ہی پیدا ہوئی ہیں۔

میں یہ باتیں سمجھانے کے لیے کہا کرتا ہوں کہ دل بڑا رکھو! میں کچھ دن پہلے ایک جگہ بیان سے فارغ ہوا تو ایک بندہ مجھے کہنے لگا: مولانا صاحب! پانچ بیٹیاں ہیں، دعا کرو کہ اللہ بیٹا بھی دے۔ میں نے کہا کہ دیکھو! وہ بیٹا جو آپ کی بیوی سے ہو گا وہ کالا ہے یا گورا ہے آپ نے برداشت کرنا ہے، ضدی ہے یا اچھا ہے آپ نے برداشت کرنا ہے، جاہل ہے یا عالم ہے آپ نے برداشت کرنا ہے، وہ لنگڑا ہے یا ٹھیک ہے آپ نے برداشت کرنا ہے، وہ پاگل ہے یا سمجھدار ہے آپ نے برداشت کرنا ہے اور اللہ نے جو آپ کو بیٹی دی ہے اس بیٹی کی وجہ سے جو آپ کو بیٹا ملنا ہے ناداماد... وہ آپ ہزاروں میں سے جس کو چاہو منتخب کرو، میں نے کہا: کیسے تم سادے آدمی ہو یار! داماد بھی تو بیٹا ہوتا ہے لیکن داماد آپ لاکھوں میں سے اپنی پسند کا چنیں... کالا نہ چنیں آپ سفید کو دے دیں، جاہل نہ چنیں آپ عالم کو دے دیں، لنگڑا نہ چنیں آپ صحیح چن لیں اور جو بیٹا آپ کا پیدا ہوا وہ جیسا بھی ہو آپ نے برداشت کرنا ہے۔ تو بیٹی اللہ کی ایسی نعمت

ہے... ایسی رحمت ہے... کہ بیٹی کی وساطت سے جو بیٹے ملتے ہیں وہ اپنی پسند کے ہوتے ہیں اور جو براہ راست ہوتے ہیں وہ اپنی پسند کے نہیں ہوتے۔ میں نے کہا کہ کس الجھن میں پڑے ہو تم۔

حضرت مریم کی والدہ نے دعا مانگی تھی:

﴿رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا﴾<sup>118</sup>

کہ اے اللہ! جو میرے پیٹ میں ہے بس یہ بیٹا ہو جائے، ”مُحَرَّرًا“ کہ بیٹا پیدا ہو تو میں اس کو طالب علم بناؤں گی، مدرسے میں داخل کراؤں گی اور جب بیٹا نہیں بلکہ بیٹی پیدا ہوئی تو انہوں نے کہا: ﴿رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی﴾ اے اللہ یہ تو بیٹی پیدا ہو گئی ہے۔ جواب ملا ﴿وَلَیْسَ الذَّکُوْۤرَ کَانَثٰی﴾ کہ جو بیٹا تو نے مانگا تھا۔ ”الذَّکُوْر“ پر الف لام عہد کا ہے۔ وہ اس بیٹی کی طرح نہیں ہے جو ہم نے دی ہے۔ تو نے بیٹا مانگا تھا اپنی حیثیت کے مطابق اور ہم نے بیٹی دی ہے اپنی شان کے مطابق۔

اس بیٹی کا اپنا لطف ہوتا ہے۔ اس لیے دل چھوٹا نہ کیا کریں۔ بیٹیاں ہیں تو ہماری بیویاں ہیں، بیٹیاں ہیں تو آج ہم پیدا ہوئے ہیں، بیٹیاں نہ ہوتیں تو ہماری زندگیاں کتنی اجیرن ہو جاتیں، اس لیے گھبرا کر نہ کرو۔ بیٹا ہے تب بھی ٹھیک ہے اور بیٹی ہے تب بھی ٹھیک ہے۔

﴿وَمَا كَانَ لِیَبْشِرَ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحِیًا اَوْ مِنْ وَرَآئِ حِجَابٍ اَوْ

یُؤَسِّلَ رَسُوْلًا فِیَوْحٰیۤ بِاٰذِنِهٖ مَا یَشَآءُ ۚ اِنَّهٗ عَلٰی حٰکِمٍۭۭۭۭ﴾

بشر کے ساتھ اللہ کلام کرے گا یا تو الہام کے ذریعہ یا اس سے کلام کرے گا

- پردے کے پیچھے سے یا کلام کرے گا فرشتہ بھیج کر فرشتہ کے واسطے سے
- 1: ”الہام“ کہ اللہ دل میں کوئی بات ڈال دیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں: ”أَلْفِي فِي رُؤُوسِي“ کہ میرے دل میں اللہ نے یہ خیال ڈالا ہے۔
- 2: پردے کے پیچھے سے جیسے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بات ہوئی۔
- 3: جبرائیل امین علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ بھیج دیتے ہیں۔

### ”پیغمبر بشر نہیں“ پر استدلال کا جواب:

اہل بدعت کہتے ہیں کہ پیغمبر کے بشر نہ ہونے پر دلیل یہ آیت ہے کہ بشر وہ ہوتا ہے جس سے اللہ بات کریں گے الہام کے ذریعے یا پردے کے پیچھے یا بذریعہ فرشتہ... اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے عرش پر براہ راست خطاب کیا ہے... نہ الہام ہے، نہ پردہ ہے اور نہ ہی درمیان میں جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر نہیں ہیں، چونکہ بشر کے لیے طریقے تین ہیں اور یہ چوتھا طریقہ بشر کے ساتھ نہیں ہوتا۔

اس کا جواب ہمیں دینے کی ضرورت نہیں، تبیان القرآن یہاں لائبریری میں موجود ہے اس کے مصنف مولانا غلام رسول سعیدی بریلوی صاحب ہیں کراچی کے، فوت ہو گئے ہیں اب، انہوں نے خود اس کے دو جواب دیے ہیں:

◆ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جب براہ راست بالمشافہ ملاقات تھی بغیر حجاب کے تو اس میں گفتگو نہیں تھی، گفتگو کے یہی تین طریقے ہیں۔

◆ یہ عمومی ضابطہ بیان کیا ہے اور اس ضابطہ سے ہٹ کر حضور سے گفتگو یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے، جس سے بشریت پر فرق نہیں پڑتا۔

﴿وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا

انْكُتُبُ وَلَا الْإِيمَانُ﴾

اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے، ایک وقت تھا کہ آپ کو علم نہیں تھا کہ کتاب کیا ہے اور آپ کو ایمان کے اس درجہ کا علم نہیں تھا جس پر اب ہیں! پیغمبر کو جب نبوت ملتی ہے تو نبوت ملنے سے پیغمبر صاحبِ ایمان ہوتا ہے، کیونکہ ایمان کا تعلق تو عقل سے ہے وحی سے نہیں ہے۔ اگر عقل نہ ہو اور وحی ہو تو ایمان کا بندہ مکلف نہیں ہوتا اور عقل ہو اور زمانہ فترت وحی کا ہو تب بھی آدمی پابند ہے ایمان لانے کا، یہ تو عام بندے کے لیے ہے تو نبی کے پاس ایمان کیسے نہیں ہو گا؟! اس لیے نبی اعلانِ نبوت سے پہلے صاحبِ ایمان ہوتا ہے لیکن ایمان کی تفصیلات اور ایمان کا وہ مقام جو اعلانِ نبوت کے بعد ہوتا ہے یہ پیغمبر کو معلوم نہیں ہوتا۔

﴿وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُوْرًا نَّهْدِي بِهِ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ

لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾

لیکن ہم نے اس قرآن کو نور بنایا ہے جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت عطا فرماتے ہیں اور آپ بھی سیدھے راستے کی طرف راہنمائی فرماتے ہیں۔ وہ راستہ کون سا ہے؟

﴿صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ اِلَّا اِلَى اللّٰهِ

تَصِيْرًا لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾

یہ راستہ اللہ کا ہے جس کی ملکیت میں آسمان اور زمین ہیں اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاجِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.



## سورة الزخرف

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿حَمْدٌ ۝ وَ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ۝ إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا

تَعَلَّمَكُمْ تَتَعَلَّمُونَ ۝﴾

لُحْم، قسم ہے اس کتاب کی جو بڑی واضح ہے۔ ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں اتارا ہے تاکہ تم سمجھو!

یہاں پر واضح ہونے سے مراد ہے کہ بطور وعظ و نصیحت قرآن کریم بڑی واضح کتاب ہے۔ اس کا معنی یہ کرنا کہ قرآن کریم میں احکام بہت واضح ہیں، یہ معنی غلط ہے۔ اگر احکام بہت واضح ہوتے تو استنباط اور اجتہاد کی ضرورت نہ ہوتی لیکن احکام کے لیے استنباط اور اجتہاد کرنا پڑتا ہے۔

﴿وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلَىٰ حَكِيمٌ ۝﴾

اور یہ قرآن ہمارے پاس لوح محفوظ میں ہے اور یہ قرآن عظیم اور حکمت والی کتاب ہے۔

یہاں دیکھیں اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ اُمُّ الْكِتَابِ میں ہے۔ میں صرف یہ بات سمجھانا چاہتا ہوں کہ اُم کا معنی ہمیشہ ماں نہیں ہوتا، اس کا معنی اصل بھی ہوتا ہے، بنیاد بھی ہوتا ہے، ماں بھی ہوتا ہے اور ٹھکانا بھی ہوتا ہے۔ مختلف اس کے

معانی ہوتے ہیں۔ قرآن میں ﴿فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ﴾<sup>119</sup> کا معنی ٹھکانا ہے، ﴿هَنَّ أُمُّ انْكَبَتْ﴾<sup>120</sup> کا معنی اصل ہے اور ﴿وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ﴾<sup>121</sup> میں اُم سے مراد ماں ہے۔ تو لفظ اُم کے کئی معنی آتے ہیں، ہمیشہ ایک معنی کبھی نہ کریں۔

### ثواب و عذاب قبر پر ایک دلچسپ واقعہ:

میرا ایک مرتبہ ملتان میں جمعہ تھا۔ تلمبہ مدرسہ جو رانیونڈ کی شاخ ہے وہاں کے صدر مدرس مولانا ریاض صاحب کا مجھے فون آیا کہ آپ ذرا جلدی آجائیں، یہاں قادر پور میں کسی بندے سے بات کرنی ہے۔ ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ کون سے علاقے میں کون سا فتنہ ہے اور وہاں کون سی بات ہوگی۔ تو میں نے صحاح ستہ جو ایک جلد میں اکٹھی چھپی ہے وہ ساتھ رکھ لی اور رات کو ہی تلمبہ چلا گیا۔ رات وہیں سویا۔ طلبہ سوالات کرتے رہے، ہمارے جوابات چلتے رہے۔ صبح اس بندے کے پاس گئے جس سے ملاقات کرنی تھی۔ عمر اُس کی کافی تھی اور وہ تھا جماعۃ المسلمین کا کارکن جو عذاب قبر کا منکر تھا۔

مولانا نے مجھے بتایا کہ مولانا طارق جمیل صاحب سے اس کی بات ہوئی ہے لیکن مولانا کا چونکہ مناظرانہ مزاج نہیں ہے تو یہ بندہ قابو نہیں آیا۔ مولانا نے ان کو سمجھایا بھی کہ سارے مسائل قرآن میں نہیں ہوتے، تفصیلات احادیث میں ہوتی ہیں، نماز کا ذکر قرآن میں ہے لیکن اس کی تفصیلات احادیث میں ہیں، حج کا ذکر قرآن میں ہے لیکن تفصیلات احادیث میں ہیں اور مولانا کی یہ بات بڑی معقول تھی لیکن اس

119۔ القارعة: 102:9

120۔ آل عمران: 7:3

121۔ المائدة: 75:5

بندے نے کہا کہ نہیں جی! جو قرآن میں ہے ہم وہ مانیں گے اور جو نہیں ہے ہم نہیں مانیں گے۔

خیر ہم وہاں چلے گئے۔ اس نے کہا کہ یہ جو عذابِ قبر ہے اس کو ہم نہیں مانتے کیونکہ قرآن کریم میں نہیں ہے۔ میں پہلے سمجھتا ہوں کہ اس بندے کی اصل بیماری کیا ہے تاکہ اس کو وہاں سے پکڑوں۔ میں نے قرآن کریم کی آیت پڑھی:

﴿يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي  
الْآخِرَةِ﴾<sup>122</sup>

کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ثابت قدم رکھتے ہیں دنیا میں اور قبر میں۔  
میں نے کہا کہ دیکھو! یہاں قبر کی بات آگئی ہے۔ اس نے کہا کہ یہاں تو ”الْآخِرَةِ“ ہے، قبر تو نہیں ہے آپ نے ”الْآخِرَةِ“ کا معنی قبر کیسے کر دیا؟ چونکہ میں چاہتا تھا کہ وہ یہ سوال کرے، کیونکہ یہ سوال کرے گا تو آگے چلیں گے۔ تو میں نے کہا کہ پھر ”الْآخِرَةِ“ کا کیا معنی کریں؟ اس نے کہا کہ آخرت کا معنی آخرت کریں۔ میں نے کہا کہ آخرت کسے کہتے ہیں؟ یہ دنیا ہے، اس کے بعد آخرت ہے۔ آخرت تو موت کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے تو یہاں آخرت سے کون سا معنی مراد ہو گا؟ کیونکہ موت کے فوراً بعد سے حشر تک یہ بھی آخرت ہے... حشر سے لے کر دخولِ جنت اور دخولِ جہنم تک یہ بھی آخرت ہے... دخولِ جنت اور دخولِ جہنم کے بعد کی زندگی یہ بھی آخرت ہے... تو یہاں ہم آخرت کا کون سا معنی مراد لیں گے؟ میں نے کہا کہ دیکھو! جیسے قرآن کریم میں ہے: ﴿هُنَّ أُمَّ الْكَتِبِ﴾

اب اُم کا معنی ایک تو نہیں ہے کہ جہاں بھی اُم آئے گا تو اس کا معنی ماں ہی

کریں گے۔ ﴿وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ﴾ یہاں معنی ماں ہے، ﴿هُنَّ أُمَّانُكُنَّ﴾ یہاں اُم کا معنی اصل ہے، ﴿فَأُمُّهُ هَاوِيَّةٌ﴾ یہاں اُم کا معنی ٹھکانا ہے۔ تو لفظ تو ایک ہی ہے لیکن معانی کئی ہیں۔ اسی طرح ”الْآخِرَةُ“ لفظ تو ایک ہے لیکن اس کا ایک مصداق ہے قبر سے حشر تک، ایک مصداق ہے حشر سے جنت تک اور ایک مصداق ہے جنت کے بعد... تو یہاں کون سا مصداق ہو گا؟

میں نے کہا کہ اس کا مصداق نہ آپ متعین کر سکتے ہیں، نہ میں متعین کر سکتا ہوں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا مصداق کیا متعین فرمایا ہے؟ اس پر میں نے پھر روایت پڑھ دی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب بندے کو قبر میں اتارا جاتا ہے، ملائکہ آتے ہیں، اسے بٹھاتے ہیں، پھر تین سوال کرتے ہیں: ”مَنْ رَبُّكَ؟ وَمَا دِينُكَ؟ وَمَنْ نَبِيُّكَ؟“ بندہ ان تین سوالوں کا جواب دے دیتا ہے تو ایک فرشتہ آسمان سے اعلان کرتا ہے کہ اللہ فرما رہے ہیں: ”أَنْ قَدْ صَدَّقَ عَبْدِي“ کہ میرے بندے نے سوالوں کا صحیح جواب دیا ہے، ”فَأَقْرِشُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ“ اس کو جنت کا پچھونا دو! ”وَالْبِسُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ“ اس کو جنت کا لباس دے دو! ”وافتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى الْجَنَّةِ“ جنت کی طرف سے دروازہ کھول دو! ”فَيَأْتِيهِ مِنْ رَوْحِهَا وَطِيْبِهَا“ جنت کی ہوائیں اور جنت کی خوشبو اس قبر میں پہنچ جاتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

”فَذَلِكَ قَوْلُ اللَّهِ تَعَالَى ﴿يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾ کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ”يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ

اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ“ کا یہی مطلب ہے۔<sup>123</sup>

میں نے کہا: دیکھو! قبر کی پوری زندگی بیان کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ “آخرۃ” کا معنی یہ ہے۔ آپ اللہ کے نبی سے ثابت کرو کہ آخرۃ کا معنی یہ نہیں ہے بلکہ یہاں آخرت سے مراد حشر ہے یا جنت اور جہنم ہے۔

اب دیکھو! میں نے اس پوری گفتگو میں حدیث کا نام نہیں لیا، کیونکہ وہ حدیث کے نام سے بدکتا تھا تو ہم نے حدیث کا نام نہیں لیا تو وہ یہ نہیں کہہ سکا کہ حدیث ہم نہیں مانتے، قرآن پیش کرو۔ بات میں نے حدیث سے کی لیکن حدیث کا نام نہیں لیا۔ اب اس کا اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ چونکہ ضد ہے اور ماننا نہیں ہوتا تو اس نے ایک دو باتیں اور کیں، پھر میں نے بات کی۔

اس دوران ایک سنجیدہ سمجھدار آدمی کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ دیکھیں مولانا صاحب! آپ آئے ہیں تیاری کر کے اور ہم نے تیاری نہیں کی، آپ کے پاس کتابیں ہیں اور ہم تو ویسے بیٹھے ہیں، پھر کبھی کتابیں لے کر بیٹھیں گے تو بات حل ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ یہ بات اُس نے کیوں کی؟ دراصل وہ بندہ ہمارا ہم نوا تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ فساد نہ ہو اور بات سمجھ میں آجائے، وہ باباجی بڑی عمر کے ہیں اور ضدی ہیں وہ تو مانیں گے نہیں لیکن آئندہ کوئی بندہ اس کے پاس بات کے لیے اس کے ڈیرے پر نہیں آئے گا، بس لوگوں کے سامنے بات کھل گئی جو ہمارا مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ تو میں بتا رہا تھا کہ اُم کا معنی ہمیشہ ماں نہیں ہوتا۔

**نصیحت کرتے رہنا چاہیے:**

﴿اَفَنْصَرِبُ عَنْكُمْ الَّذِيْ كَرَّ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۝۱۰﴾

کیا تمہاری ضد اور حد سے تجاوز کی وجہ سے ہم تم سے اس نصیحت اور ذکر کو پھیر لیں گے؟! تمہیں نصیحت نہیں کریں گے؟! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس حد تک ممکن ہو فاسق کو، کافر کو، ہر کسی کو نصیحت کرتے رہنا چاہیے۔

### سواری پر بیٹھنے اور سفر کی دعا:

﴿سُبْحَنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ﴾ (۱۲۴) ﴿وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ﴾ (۱۲۵)

پاک ہے وہ ذات جس نے یہ سواری ہمارے تابع کر دی، اور ہم اس سواری کو اپنے قابو میں نہیں لاسکتے تھے، اور ہمیں اپنے رب کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔ جب سواری پر پاؤں رکھیں تو پڑھیں: بسم اللہ، اور جب اس پر بیٹھ جائیں تو کہیں: الحمد للہ، پھر یہ دعا پڑھیں: ”سُبْحَنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ“ (۱۲۴) ﴿وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ﴾ (۱۲۵)

اور بھی دعائیں احادیث میں موجود ہیں۔ یہ بات یاد رکھیں کہ دو دعائیں الگ ہیں: ایک ہے دعا سواری کی اور ایک ہے دعا سفر کی، یہ دعا سفر کی نہیں ہے یہ دعا سواری کی ہے، سفر کی دعا الگ ہے، سفر کی دعا یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ فِیْ سَفَرِنَا هَذَا الْبَرَّ وَالتَّقْوٰی وَمِنْ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰی۔<sup>124</sup>

یہ الگ دعا ثابت ہے اور ”اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَیْنَا سَفَرَنَا“<sup>125</sup>

یہ دعا الگ ہے۔

124۔ سنن ابی داؤد، رقم: 2599

125۔ سنن ابی داؤد، رقم: 2599

دونوں میں فرق کیا ہے؟ جب آپ گھر سے نکلیں اور سفر پہ چلے جائیں تو دعائے سفر ایک مرتبہ پڑھنا کافی ہے اور سواری کی دعابج بھی سوار ہوں گے پڑھتے رہیں گے، سفر کی دعابار بار پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

### بیٹی کی پیدائش پر مشرک کے تاثرات:

﴿أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بِنْتٍ وَأَصْفَكُمْ بَالِبْنَيْنِ ۖ وَإِذَا بَشَّرَ أَحَدُهُمْ

بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝﴾

اللہ نے مشرکین کی غلط فہمی دور کی ہے۔ مشرکین کہتے تھے کہ اللہ نے فرشتوں کو اپنی بیٹیاں بنایا ہے۔ اللہ رب العزت نے بات سمجھائی ہے کہ تمہاری اپنی حالت یہ ہے کہ اگر تمہارے ہاں بیٹی پیدا ہو تو تمہارے چہرے سیاہ ہو جاتے ہیں تو جس چیز کو تم اپنے لیے ناپسند کرتے ہو وہ تم اللہ کے لیے کیسے ثابت کرتے ہو؟ ہاں اگر تمہارے ہاں بیٹی بہت فخر کی علامت ہوتی اور تم یہ کہتے کہ اللہ نے فرشتوں کو بیٹیاں بنایا ہے پھر بھی کوئی بات تھی! جو چیز تمہارے ہاں پسندیدہ نہیں ہے اس کو تم اللہ کے لیے کیسے ثابت کرتے ہو؟

### زیورات میں رہنا عورت کی فطرت ہے:

﴿أَوْ مَنْ يُنْشِئُ فِي الْحُلِيِّهِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ۝﴾

پھر آگے فرمایا کہ عورت کی تو فطرت اور طبیعت یہ ہے کہ وہ زیور میں کھلیتی ہے اور بات کھل کر سمجھا نہیں سکتی۔

یہاں زیور میں رہنا یہ عورت کی طبیعت بیان کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیور کا استعمال عورت کے لیے ہے، مرد کے لیے نہیں ہے، اور اگر عورت زیور کا مطالبہ کرے تو دینا چاہیے، مطالبہ نہ بھی کرے تب بھی بغیر مطالبہ کے دینا چاہیے، یہ

اس کی فطرت ہے، یہ عورت کی طبیعت ہے۔ لیکن یہ یاد رکھ لیں کہ عورت کے لیے سونے اور چاندی کی انگوٹھی اور سونے اور چاندی کے دیگر زیورات جائز ہیں لیکن انگوٹھی سونے اور چاندی کے علاوہ دیگر دھاتوں کی جائز نہیں ہے۔ آج کل ہمارے ہاں نقلی زیور چلتے ہیں، اس کی چوڑیاں تو جائز ہیں لیکن انگوٹھی جائز نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ ذہن میں رکھیں اور اپنے گھروں میں بتائیں کہ گھروں میں عورتیں دھاتی انگوٹھیاں پہنتی ہیں جو سونے یا چاندی کی نہیں ہوتیں، یہ جائز نہیں ہے۔

﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ﴾... یہ جس عورت کی بات کی ہے ورنہ بہت سی عورتیں فصاحت میں ایسی ہوتی ہیں کہ مرد بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

**غلط عقائد و اعمال سے براءت ضروری ہے:**

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ وَإِلَىٰ آلِهِ وَمَنِ اعْتَدَىٰ بَنَاءً مِّمَّا تَعْبُدُونَ﴾

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور قوم سے فرمایا کہ جن کی تم عبادت کرتے ہو میں ان سے بری الذمہ ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب ماحول غلط قسم کا ہو تو آدمی ماحول کی وجہ سے ان غلط قسم کی رسومات میں شرکت نہ کرے اور صرف شرکت نہ کرنا کافی نہیں ہے بلکہ براءت کا اعلان کرنا بھی ضروری ہے کہ میرا کام یہ نہیں ہے جو تم کرتے ہو... اگر آدمی بدعتی ماحول میں رہتا ہو اگرچہ وہ بدعات کا ارتکاب نہ کرے لیکن چونکہ ایسے ماحول میں رہتا ہے تو لوگ بدعتی سمجھیں گے اس لیے اس کے لیے ضروری ہے کہ بدعات کا ارتکاب بھی نہ کرے اور بدعات کا رد نہیں کر سکتا تو کم از کم بدعات سے براءت کا اعلان ضرور کر دے کہ میں یہ کام نہیں کرتا جو تم کرتے ہو۔

﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ﴾



مشرکین کہتے کہ اگر یہ قرآن اللہ نے اتارنا تھا تو یہ مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر اتارا جاتا جس کے پاس مال اور دولت خوب ہوتا، قرآن کو اتارا ہے تو ایک غریب آدمی پر جس کے پاس مال و دولت نہیں ہے، جس کے پاس طاقت نہیں ہے۔

اب ان کی خواہش یہ تھی کہ اللہ کی رحمتِ خاصہ جو نبوت ہے یہ غریب آدمی کو نہیں بلکہ امیر آدمی کو ملنی چاہیے تھی۔ اللہ ان کے جواب میں فرماتے ہیں:

﴿أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾

کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں؟! یہ رحمتِ عامہ جو دنیا کی روزی ہے یہ بھی ہم خود تقسیم کرتے ہیں تو رحمتِ خاصہ جو نبوت ہے کیا وہ تم تقسیم کرو گے کہ اس کو دے دو اور اس کو نہ دو؟

﴿وَدَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا

سُخْرِيًّا﴾

ہم نے معیشت میں تقسیم اس لیے کی ہے تاکہ ایک آدمی کا دوسرے سے کام لینا آسان ہو جائے، آسانی سے کام لے سکے۔ اگر سارے ہی مالدار ہوتے تو مزدوری کون کرتا؟ سارے ہی مزدور ہوتے تو پیسے کون دیتا؟ تو اللہ نے کچھ غریب بنائے اور کچھ امیر بنائے۔

﴿وَرَحِمَتْ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ﴾

اور اللہ کی رحمتِ خاصہ جو نبوت ہے یہ ان چیزوں سے بہتر ہے جس کو تم جمع کرتے پھرتے ہو!

مطلب یہ کہ تم نبوت کو تقسیم کرتے ہو کہ نبوت اس کو ملنی چاہیے اس کو نہیں ملنی چاہیے۔ نبوت رحمتِ خاصہ ہے۔ دنیا کی روزی رحمتِ عامہ ہے جس کی اللہ کے ہاں کوئی وقعت ہی نہیں ہے اللہ نے اس کی تقسیم کا اختیار تمہیں نہیں دیا تو نبوت کی تقسیم کا اختیار تمہیں کیسے دیں گے!؟

**اللہ کے ہاں دنیا کی زینت کی کوئی قیمت نہیں:**

﴿وَلَوْ لَا أَنْ يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً جَاجِلًا يَكْفُرُ بِالرَّحْمَنِ لَبُيُوتِهِمْ سُقُفًا مِنْ فِصَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ ﴿٣١﴾ وَلَبُيُوتِهِمْ أَبْوَابًا وَسُرُدًا عَلَيْهَا يَتَكَبَّرُونَ ﴿٣٢﴾ وَذُخْرُفًا ﴿٣٣﴾﴾

اللہ کا تکنیکی نظام ہے کہ دنیا میں کچھ کافر اور کچھ مسلمان رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر اس بات کا اندیشہ نہ ہو کہ سارے لوگ ہی کافر ہو جائیں گے تو ہم کافروں کو اتنا دیتے کہ ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی ہوتیں، سیڑھیاں چاندی کی ہوتیں، دروازے چاندی کے ہوتے، تکیے چاندی کے ہوتے، ”وَذُخْرُفًا“ اور سونے کے۔

اس کا معنی یہ نہیں کہ سارے چاندی یا سارے سونے کے، مطلب کہ کچھ سونے کے کچھ چاندی کے۔ جیسے ہمارے عرف میں کہتے ہیں سونے اور چاندی کے برتن... تو اس کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ سارے سونے کے ہیں یا صرف پلٹیں سونے کی ہیں۔

تو اللہ فرما رہے ہیں کہ ہمارا نظام ایسا ہے کہ کچھ مسلمان ہوں گے اور کچھ کافر۔ اگر یہ نظام نہ ہونا ہوتا تو ہم کافروں کو اتنا مال دیتے کہ دنیا میں سارے لوگ کافر ہو جاتے لیکن مال کی کثرت ہم ہر کافر کو نہیں دیتے کہ جو بھی کافر ہو گا تو اس کو مال

خوب دیں گے ورنہ اس طرح تو ہر بندہ کافر ہو جائے گا۔ اس لیے ایسا نہیں ہوتا۔

﴿وَإِنْ كُلُّ ذِيكَ لَنَا مَتَاعٌ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ

لِلْمُتَّقِينَ﴾

یہ سب دنیا کے فائدے کی چیزیں ہیں اور اصل آخرت ہے جو اللہ متقین کو عطا فرمائیں گے۔

**دنیا کی قیمت مجھڑ کے پر کے برابر بھی نہیں:**

حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللَّهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ“ کہ اگر اللہ کے ہاں دنیا

کی قیمت ایک مجھڑ کے پر کے برابر بھی ہوتی تو ”مَا سَفَى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ“ اللہ کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیتا۔<sup>126</sup>

چونکہ خدا کے ہاں دنیا کی قیمت نہیں ہے اس لیے کفار کو دے دیتے ہیں۔ لیکن جو کافر ہو اس کو خوب مال دیں یہ بھی نہیں ورنہ تو سارے لوگ کافر ہو جاتے۔

﴿وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقِيْضْ لَهُ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهُ قَرِيْنٌ﴾

وَأَنَّهُمْ لَيَصْدُوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾

جو ضد کی وجہ سے اللہ کے ذکر کو چھوڑ دیتا ہے، اللہ کی بات کو نہیں مانتا تو اللہ اس پر شیطان مسلط فرما دیتے ہیں۔ وہ شیطان اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور شیطان اس کو سیدھے راستے سے ہٹاتا ہے اور یہ بندہ سمجھتا ہے کہ وہ ہدایت پر ہے حالانکہ ہدایت پر نہیں ہوتا۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَنَا قَالَ يَلَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِينُ﴾ (۲۸) وَلَنْ يَنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ إِذْ ظَلَمْتُمْ أَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿۲۹﴾﴾

جب قیامت کا دن ہو گا تو یہ اپنے اس شیطان ساتھی سے کہے گا کہ کاش! میرے اور تمہارے درمیان مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہوتا کیونکہ تو بہت برا ساتھی ہے... لیکن تم لوگ اپنے آپ پر ظلم و ستم کر چکے ہو آج تمہاری اس حسرت سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، آج تم اس عذاب میں اکٹھے شریک ہو گے۔

﴿فَأَنذَرْتُكَ نَجْمَ الْوَعْدِ أَتَهْدِي الْعُمْيَ وَمَنْ كَانَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (۳۰)﴾

اے نبی! کیا آپ بہروں کو سنائیں گے؟ کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھائیں گے؟ کیا آپ ان لوگوں کو راہِ راست پر لائیں گے جو کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں؟

### برے دوست سے اجتناب:

دوستی بری چیز نہیں ہے لیکن دوست ایسا بناؤ جو اچھا ہو اور کسی بندے کو پرکھنا ہو کہ بندہ کیسا ہے، اس کا معیار کیسا ہے تو آپ اس کے دوستوں کو دیکھ لو۔ کسی شاعر کا شعر ہے:

عَنِ الْمَرْءِ لَا تَسْأَلْ وَأَبْصُرْ قَرِينَهُ وَ كُلُّ قَرِينٍ بِالْمُقَارِنِ مُهْتَدِيٌّ

اگر دیکھنا ہو کہ بندہ کیسا ہے تو اس کے دوست دیکھو، اس لیے کہ بندہ اپنے دوستوں کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔

ایسا ممکن نہیں ہے کہ بندہ خود اچھا ہو اور دوست اس کے برے ہوں، اس کے دوست اچھے ہی ہوں گے اور جو دوستی کے لیے برے کو پسند کرتا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ یہ نام کا اچھا ہے، اس کی فطرت میں اچھائی نہیں ہے، ورنہ اپنے دوست ہمیشہ

اچھے رکھتا۔

## وفات کے بعد اچھا تذکرہ:

﴿وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۖ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ﴾

میرے پیغمبر! یہ جو قرآن کریم ہے یہ آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے نیک نامی کا ذریعہ ہے، ایک شرف کی چیز ہے۔ یعنی لوگ قرآن پڑھتے رہیں گے تو آپ کا تذکرہ ہوتا رہے گا، یہ آپ کے لیے شرف کا باعث ہے اور آپ کی قوم کے لیے شرف کا باعث ہے۔

اس آیت سے بعض مفسرین نے استدلال فرمایا ہے کہ کسی بندے کی اچھی شہرت ہونا اور اس کی موت کے بعد اچھے لفظوں سے اس کا تذکرہ ہونا یہ بری بات نہیں ہے، یہ اچھی بات ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی تھی:

﴿وَاجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ﴾

کہ اے اللہ! میں وفات پا جاؤں تو اس کے بعد لوگ مجھے اچھے لفظوں میں یاد کریں۔

## اللہ! لوگوں کی نظروں میں مجھے بڑا بنادے

یہ بات یاد رکھنا! نیک عمل کرنا تاکہ لوگ مجھے اچھا سمجھیں یہ تو ریا ہے لیکن نیک عمل کرنا تاکہ اللہ راضی ہو جائے اور یہ خواہش ہو کہ لوگ مجھے اچھا سمجھیں یہ ریا نہیں ہے، یہ پسندیدہ امر ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام کیا ہے، اسباب جمع کیے ہیں کہ میری دعوت لوگ قبول کریں، اسباب میں سے ایک سبب دعا ہے اور ایک دعا یہ ہے:

وَأَجْعَلْنِي فِي عَيْنِي صَغِيرًا وَفِي أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيرًا.<sup>127</sup>

اے اللہ! مجھے اپنی نگاہ میں چھوٹا بنادے اور لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنادے۔  
لوگ بڑا سمجھیں گے تو بات قبول کریں گے، اگر بڑا نہیں سمجھیں گے تو بات قبول کیسے کریں گے؟! لیکن ”فِي أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيرًا“ کے لیے ضروری ہے کہ ”فِي عَيْنِي صَغِيرًا“ ہو۔ جو ”فِي عَيْنِي صَغِيرًا“ ہوتا ہے وہ ”فِي أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيرًا“ ہوتا ہے، جو بندہ اپنی نگاہ میں چھوٹا ہوتا ہے اللہ اس کو دوسروں کی نگاہ میں بڑا کر دیتے ہیں اور جو اپنی نگاہ میں خود کو بڑا سمجھے اللہ اس کو دوسروں کی نگاہ میں چھوٹا اور ذلیل کر دیتے ہیں۔

### نوافل مسجد میں پڑھنے کی نصیحت:

حضرت امام صاحب نے اپنے ایک شاگرد کو وصیت فرمائی کہ واپس جاؤ تو نوافل مسجد میں پڑھنا، تو لوگ نوافل کی وجہ سے تمہیں نیک سمجھیں گے اور پھر تجھ سے مسائل پوچھیں گے۔ اب دیکھیں اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مجھے نیک سمجھ کر مجھے ہدیے دیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ مجھے اچھا سمجھیں گے تو مجھ سے مسائل پوچھیں گے۔ شریعت میں یہ مطلوب ہے۔

حضرت مولانا ابراہار الحق ہر دوئی رحمہ اللہ کے ایک مرید نے کہا کہ حضرت! میں دکان پر بیٹھا ہوتا ہوں، جب گاہک نہیں ہوتے تو بسا اوقات وقت لغویات اور فضولیات میں گزر جاتا ہے، حضرت میں کیا کروں؟! فرمایا: تسبیح ہاتھ میں رکھ لو، جب گاہک نہ ہوں تو تسبیح پڑھ لیا کرو۔ اس نے پھر خط لکھا کہ حضرت! میں تسبیح تو پڑھتا ہوں لیکن میرے دل میں وسوسہ آتا ہے کہ لوگ مجھے بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ تو اس پر حضرت

نے فرمایا کہ پھر تم کیا چاہتے ہو کہ لوگ تمہیں برا سمجھیں؟! بھائی اس پر تو تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ تم تسبیح اللہ کے لیے کرتے ہو لوگوں کے لیے نہیں کرتے لیکن اس کا اللہ نے دنیا میں نفع تمہیں یہ دیا کہ لوگ اچھا سمجھنے لگے، تو اس میں حرج کی بات کیا ہے؟

ہم علم پڑھتے ہیں اور پڑھاتے ہیں کہ اللہ راضی ہو جائیں، ہماری آخرت ٹھیک ہو جائے، شریعت پر عمل کی توفیق مل جائے اور اس کا دنیا میں فائدہ یہ ہے کہ لوگ بھی اچھا سمجھتے ہیں تو اس میں حرج کی بات کیا ہے؟ ایک ہوتا ہے پڑھنا پڑھانا تاکہ لوگ اچھا سمجھیں، ایک ہوتا ہے پڑھنا پڑھانا تاکہ اللہ راضی ہو اور اللہ اس کا نتیجہ دیتے ہیں کہ لوگ بھی اچھا سمجھتے ہیں۔ اللہ قرآن میں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا ۝۶۱﴾<sup>128</sup>

جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اللہ ان کے لیے محبت کی فضا بنا دیتے ہیں۔

اللہ اعلان فرماتے ہیں کہ اے ملائکہ! میں فلاں بندے سے پیار کرتا ہوں تم بھی کرو، پھر ملائکہ دیگر مخلوق میں اعلان کرتے ہیں کہ اس سے خدا پیار کرتے ہیں تم بھی کرو، وہ آواز اتنی پھیلتی ہے کہ لوگ اس کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں۔

دونوں میں فرق اچھی طرح سمجھ لو! اس وجہ سے عمل کرنا کہ لوگ اچھا سمجھ لیں یہ تو ریا ہے لیکن عمل کرنا اللہ کے لیے اور لوگ بھی اچھا سمجھ لیں تو یہ محمود ہے... یہ مذموم نہیں ہے۔ اور حدیث پاک میں بھی ہے:

لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يُذِلَّ نَفْسَهُ.<sup>129</sup>

کہ مؤمن کے لیے اپنے نفس کو ذلیل کرنا جائز نہیں ہے۔

### امام مالک رحمہ اللہ کا ابتلاء:

ایک یہ ہے کہ آپ دین کا کام کرتے ہیں اور اس کام میں ذلت آتی ہے تو پھر پیچھے نہ ہٹیں، اس کو پھر برداشت کریں۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ طلاق مکروہ یعنی جبراً طلاق واقع نہیں ہوتی۔ احناف کے ہاں جبری طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فتویٰ دیا: ”طَلَاُقُ الْمُكْرَهَةِ لَيْسَ بِشَيْءٍ“ ”حاکم مدینہ نے کہا کہ تمہارا فتویٰ غلط ہے۔ حضرت نے کہا کہ جو فتویٰ دیا ہے میں اس پر قائم ہوں۔ ایک وقت تھا کہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ روزانہ نیا سوٹ پہنتے تھے اور جو جوڑا ایک بار پہنتے وہ زندگی میں دوبارہ نہیں پہنتے تھے۔ اپنے شاگردوں کے جھر مٹ میں باہر نکلتے عجیب شاہانہ انداز میں آکر مسندِ حدیث پر بیٹھتے اور درس دیتے اور ہزاروں لوگ ان کا درس سننے کے لیے آتے۔ لیکن ایک وقت یہ بھی آیا حضرت امام مالک رحمہ اللہ کو سزا کے طور پر اونٹ پر بٹھا کر مدینہ کی گلیوں میں پھرایا گیا امام مالک رحمہ اللہ گرج برس کر بولنے لگے: ”أَلَا مَنْ عَرَفَنِي فَقَدْ عَرَفَنِي“ جو مجھے جانتا ہے وہ تو مجھے جانتا ہے ”وَمَنْ لَمْ يَعْرِفَنِي فَأَنَا مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ“ اور جو نہیں جانتے وہ سن لیں کہ میں مالک ابن انس ہوں، ”وَأَنَا أَقُولُ طَلَاُقُ الْمُكْرَهَةِ لَيْسَ بِشَيْءٍ“ میں کہتا ہوں کہ طلاق مکروہ واقعی نہیں ہوتی۔<sup>130</sup>

یہ ہوتا ہے امام ربانی۔ بظاہر تھوڑی سی ذلت آئی اور دین کو چھوڑ دیا تو یہ کون سا عالم ہے؟ تھوڑی سی گرفتاری آئی تو دین کو بدل دیا یہ کون سا عالم ہے؟ یہ لعنت کا مستحق ہے یہ مولوی تھوڑا ہو سکتا ہے! ہمیشہ اللہ کی نعمتیں کھاتے ہو، کبھی تھوڑی سی



مصیبت آئے تو برداشت کرو، بچپن سے لے کر ڈاڑھی سفید ہو گئی اللہ کے نام پر صدقات کھاتے ہیں، بکرے چھترے کیا کچھ ہم نے نہیں کھایا... اس لیے خدا کے نام پر تھوڑی سی جیل آجائے تو پیچھے مت ہٹو! ذلت آئے تو برداشت کرو! ڈٹ جاؤ دین پر!

### اکابر کا ابتلاء اور ثابت قدمی:

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ - جن کے ہم مقلد ہیں - چار سال آخری عمر کے آپ نے جیل کاٹی ہے اور جیل سے ہی جنازہ اٹھا ہے لیکن ہمارے امام موقف سے پیچھے نہیں ہٹے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کوڑے کھائے لیکن اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹے۔ میں اس لیے کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرنا جائز نہیں ہے لیکن جب اللہ کے دین کے لیے ذلت اٹھانی پڑے تو اسی ذلت میں ہمارے لیے عزت ہے، یہ موت کے بعد فیصلے ہوں گے، دنیا میں فیصلے نہیں ہوا کرتے، دنیا امتحان کی جگہ ہے۔

### مामعذورم کہ مارا ننگ است!

علامہ سعد الدین تفتازانی علم الکلام، معانی، بیان، بدیع، صرف، نحو، منطق کے ایک جید عالم تھے۔ ان کو تیمور لنگ بادشاہ نے بلایا ملاقات کے لیے۔ تیمور لنگ بادشاہ کی ٹانگ میں عذر تھا، زخم آیا تو ٹانگ ایسی ہو گئی کہ فولڈ نہیں ہوتی تھی بلکہ سیدھی رہتی تھی۔ لنگ کا معنی کہ تھوڑے سے لنگڑے تھے۔ بادشاہ تخت پر بیٹھے اور ٹانگ سیدھی کر کے بیٹھے۔ جب علامہ تفتازانی آئے تو بادشاہ کی طرف سیدھی ٹانگ کر کے بیٹھے۔ تیمور لنگ نے کہا: مامعذورم کہ مارا ننگ است، میرا تو عذر ہے کہ میں لنگڑا ہوں۔ علامہ فرمانے لگے: مامعذورم کہ مارا ننگ است، میری مجبوری ہے کہ غیرت مند ہوں۔ یہ ہوتے تھے علماء... جب تک علماء ایسے تھے دین تباہ نہیں ہوا اور جب ہم جیسے ہوئے تو دین تباہ ہو گیا۔ اس لیے اللہ کے لیے اٹھ جاؤ! اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ! کچھ نہیں ہوتا، ذلت اور عزت اللہ کے ہاتھ میں ہے، رزق کے دروازے اللہ کے ہاتھ میں ہیں،

سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

### مسئلہ ٹھیک بیان کرو!

مسئلہ ٹھیک بیان کرو اور میں آپ کی خدمت میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ مسئلہ غلط کبھی بیان نہ کرنا! اگر ایمان اتنا کمزور ہے کہ طاقت اور مخالفت برداشت نہیں کر سکتے تو خاموش ہو جاؤ لیکن غلط مسئلہ بیان نہیں کرنا۔ دیکھو! ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت بعد کے لوگ ہیں، ہمارے تھوڑے سے ڈٹ جانے پر بہت مدد آئی ہے۔ انبیاء علیہم السلام میں سے کئی نبی ایسے گزرے ہیں کہ جن کا کلمہ گو ایک بندہ بھی نہیں ملتا اور آج علماء میں سے ایسے نہیں ہیں کہ جن کا ماننے والا کوئی نہ ہو، اس کے ماننے والے پیدا ہو جاتے ہیں۔

آخر وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ نبی کا ایمان اس مقام پر ہوتا ہے کہ ایک بھی اس کا ماننے والا نہ ہو تو اس کے ایمان میں تزلزل نہیں آتا اور امتی کا ایمان کمزور ہوتا ہے، اس کی محنت پر لوگ نہ جڑیں تو بیچارہ پریشان ہو جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اس کی تھوڑی سی محنت پر ظاہری نتیجہ بہت عطا فرما دیتے ہیں اور نبی بسا اوقات بہت محنت کرتا ہے لیکن ظاہری نتیجہ نہیں نکلتا چونکہ پیغمبر کے ایمان میں تزلزل نہیں آتا، پاؤں نہیں ڈگمگاتے اور ہماری محنت پر نتیجہ نہ ہو تو پھر پریشانی ہو جاتی ہے تو اللہ اس پریشانی سے بچانے کے لیے تھوڑی محنت پر نتیجہ بہت عطا فرما دیتے ہیں۔ پھر بے وقوف وہ ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ میری محنت ہے میں نے ایسا کیا ہے، اس نے ایسا نہیں کیا ہوتا بلکہ اللہ کا خاص کرم متوجہ ہوتا ہے کہ اللہ پاک اس سے کام لے لیتے ہیں۔ تو کام بھی کریں اور دعائیں بھی مانگیں، اللہ تعالیٰ بہت عطا فرمائیں گے۔

نبی کی وحی اپنی قوم کی زبان میں ہوتی ہے:

﴿وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ﴾... فرمایا اے میرے پیغمبر! یہ قرآن کریم

آپ کے ذکر کا ذریعہ ہے اور آپ کی قوم کے ذکر کا ذریعہ بھی ہے۔ یہاں ”وَلِقَوْمِكَ“ سے مراد بعض کہتے ہیں کہ آپ کی قوم قریش ہے، بعض کہتے ہیں کہ مراد پوری امت ہے، صحیح بات یہی ہے کہ مراد قریش ہی ہونے چاہئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں لفظ ”قوم“ آیا ہے اور پیغمبر اپنی قوم کی زبان میں بات کرتا ہے، تو اگر مراد پوری امت ہوتی تو کئی زبانوں میں بات کرتے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گفتگو ہمیشہ عربی میں فرمائی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ﴾<sup>131</sup>

نبی کی وہی زبان ہوتی ہے جو نبی کی قوم کی زبان ہے، نبی پر وحی اسی زبان میں آتی ہے جو نبی کی قوم کی زبان ہوتی ہے۔

ایک مرزا قادیانی بد بخت ایسا ہے کہ جس کی وحی کی زبانیں کم از کم سات ہیں۔ اس کا معنی کہ اس کی پھر قومیں بھی سات ہوں گی اور جس بندے کی قوم ایک نہیں بلکہ سات ہوں وہ حلال زادہ نہیں بلکہ حرام زادہ ہوتا ہے۔ اگر قوم ایک ہو تو وحی کی زبان بھی ایک ہوتی ہے اور وحی کی زبانیں کئی ہوں تو پھر قومیں بھی کئی ہوتی ہیں اور حرام زادہ کبھی نبی نہیں ہو سکتا۔

**حضور علیہ السلام کا پہلے انبیاء سے سوال:**

﴿وَسَأَلَ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ

الرَّحْمَنِ إِلَهَةً يُعْبَدُونَ﴾

اے پیغمبر! آپ پہلے انبیاء علیہم السلام سے پوچھیں کہ ہم نے اپنے علاوہ کسی

اور کو خدا بنایا ہے کہ جس کی عبادت کی جائے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے انبیاء علیہم السلام سے کیسے پوچھیں؟ لیلیۃ المعراج میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء علیہم السلام کے امام بنے ہیں اس وقت آپ نے پوچھا، یا انبیاء علیہم السلام سے پوچھنے سے مراد یہ ہے انبیاء علیہم السلام کے جو صحیفے اور کتابیں ہیں اس میں آپ دیکھیں کہ کسی غیر خدا کو کبھی خدا بنایا ہے؟

### قوم فرعون کی سرکشی:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٢٦﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيَاتِنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُونَ ﴿٢٧﴾ وَمَا نُرِيهِمْ مِنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا ۚ وَآخَذْنَاهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٢٨﴾﴾

ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف اپنی نشانیاں دے کر بھیجا۔ موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو دعوت دی کہا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ جب موسیٰ علیہ السلام یہ دلائل لے کر آئے تو ان لوگوں نے مذاق اڑایا، ہم ان کو اپنی جو بھی نشانی دکھاتے تو وہ پہلی نشانی سے بڑھ کر ہوتی تھی، پھر ہم نے ان کو عذاب دیا تاکہ یہ باز آجائیں... پھر بھی باز نہیں آئے۔

﴿وَقَالُوا يَا أَيُّهُ الشُّجْرَاذِمُ نَارَ رَبِّكَ بِمَا عٰهَدَ عِنْدَكَ ﴿٢٩﴾ إِنَّا لَنُفٰتِدُونَ ﴿٣٠﴾﴾ وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے: اے جادوگر! جو آپ کے خدا نے آپ کے ساتھ وعدہ کیا ہے وہ اللہ سے مانگیں! وہ وعدہ یہ ہے کہ اگر ہم باز آجائیں تو عذاب ٹل جائے گا۔ ﴿إِنَّا لَنُفٰتِدُونَ﴾ اگر آپ نے دعا کی اور عذاب دور ہو گیا تو ہم سیدھی راہ پر آجائیں گے۔

یہ جوان لوگوں نے ﴿يَا أَيُّهَا الشَّجَرُ﴾ کہا تھا اس کے بارے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بظاہر لگتا ہے کہ انہوں نے قصد انہیں کہا تھا، بس ان کو عادت پڑی ہوئی تھی اس عادت کی وجہ سے اس کے منہ سے نکلا کیونکہ بندہ ایسے موقع پر ایسا جملہ نہیں کہتا، وہ تو عذاب ٹلنے کی دعا کرا رہے تھے ﴿ادْمُ لَنَارَ بَكَ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْكَ﴾ کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ جو اللہ کا آپ کے ساتھ وعدہ ہے کہ ہم باز آجائیں گے تو عذاب ٹل جائے گا، ہم باز آتے ہیں آپ اللہ سے عذاب ٹلوا دیں۔ تو ایسے موقع پر تو بندہ ایسا لفظ استعمال نہیں کرتا لیکن بسا اوقات بعض لفظ زبان پر چل رہے ہوتے ہیں تو وہ خود بخود نکل جاتے ہیں، مقصد انہیں ادا کرنا نہیں ہوتا۔

﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمْ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنْكُشُونَ﴾

جب ہم ان سے عذاب کو دور کر دیتے تو وہ اپنا کیا ہوا وعدہ توڑ ڈالتے۔  
فرعون نے اپنی قوم سے کہا کہ دیکھو! میں بادشاہ ہوں، میرے محل کے نیچے سے نہریں نکلتی ہیں، تم دیکھتے نہیں ہو! میں بہتر ہوں یا یہ بندہ بہتر ہے جس کی معاشرے میں کوئی عزت بھی نہیں ہے، ﴿وَلَا يَكَاذِبِينَ﴾ اور قوت بیان اس میں نہیں ہے۔  
حضرت موسیٰ علیہ السلام فصیح اللسان تھے تو پھر اس نے یہ کیوں کہا؟... یا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جو پرانی بچپن کی باتیں تھیں فرعون نے انہی کو دہرایا... یا اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں ہے کہ مجھے متاثر کر سکے۔ یہ بات فرعون نے ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے کہی تھی۔

﴿فَلَوْ لَا اَلْقَىٰ عَلَيْهِ اَسْوَدَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ

فرعون کہتا ہے کہ جب بادشاہ کسی سے خوش ہوتا ہے تو اس کو کنگن پہناتا ہے، اگر اس کا خدا اس سے خوش ہے تو اس کو تو کوئی کنگن نہیں پہنائے! خدا اس سے کیسے راضی ہے؟ اور اگر یہ خدا کا نمائندہ ہے تو بادشاہ کے نمائندے کے ساتھ فوج ہوتی ہے، یہ کیسا نمائندہ ہے کہ اس کے ساتھ ملائکہ کی فوج ہمیں نظر نہیں آتی! فرعون یہ ساری باتیں اپنی قوم کو دھوکہ دینے کے لیے کہہ رہا تھا۔

﴿فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَاطَاعُوهُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِيقِينَ ۝۲۰﴾

فرعون نے اپنی قوم کو بے وقوف بنایا اور قوم نے اس کی بات کو مان لیا۔

﴿فَلَمَّا أَسْفُونَا اُنْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ۝۲۱﴾

﴿فَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا وَمَثَلًا لِّلْآخِرِينَ ۝۲۲﴾

﴿فَلَمَّا أَسْفُونَا﴾ ”جب انہوں نے ہمیں مایوس کر دیا“ اللہ رب العزت

مایوس نہیں ہوتے کیونکہ اللہ صفتِ انفعال سے پاک ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ماحول ایسا ہو گیا کہ چھوٹا ایسی حرکتیں کرے کہ جس سے بڑا مایوس ہو جائے، جب ایسا ماحول پیدا ہو گیا، تو پھر ہم نے ان سے انتقام لیا اور ہم نے تمام کو ختم کر دیا۔ اب یہ پہلے اور بعد والوں کے لیے عبرت کا نشان بن گئے۔

**عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اور قوم کا شور شرابا:**

﴿وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ۝۲۳﴾

جب حضرت عیسیٰ بن مریم کی مثال دی گئی تو آپ کی قوم کے لوگ شور کرنے لگے۔

حدیث مبارک میں ہے کہ ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ لَا خَيْرَ مَعَ أَحَدٍ يُعْبُدُ مِنْ دُونِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ.<sup>132</sup>

کہ اللہ کے علاوہ جس کی پوجا ہوتی ہے اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔

اس پر مشرکین نے کہا کہ عیسائی تو عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا کرتے ہیں تو کیا عیسیٰ علیہ السلام میں بھی خیر نہیں ہے حالانکہ مسلمان خود مانتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبی اور نیک بندے تھے۔ تو ان کے اس اعتراض پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جب قرآن کریم کی آیت اتری

﴿إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾<sup>133</sup>

کہ تم لوگ اور جس کی پوجا تم کرتے ہو، سب جہنم کا ایندھن بنو گے۔

تو ایک شخص تھا عبد اللہ بن الزبیری جو اس وقت کافر تھا، اس نے کہا کہ میرے پاس اس آیت کا جواب ہے، وہ یہ کہ عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا کرتے ہیں، یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کی پوجا کرتے ہیں تو کیا وہ بھی جہنم میں جائیں گے؟ اس پر مشرکین بہت خوش ہوئے۔ اس وقت قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ﴾<sup>134</sup> کہ جن کے لیے ہماری طرف سے پہلے ہی بھلائی لکھی جا چکی ہے وہ اس جہنم سے دور ہوں گے، اور سورۃ الزخرف کی یہ آیت بھی نازل ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ...

نمبر 1: وہ پتھر جن کی تم پوجا کرتے ہو یہ جہنم کا ایندھن ہیں، وہ بے جان مورتیاں جن کی تم عبادت کرتے ہو یہ جہنم کا ایندھن ہیں، ان میں کوئی خیر نہیں ہے۔

132- شرح مشکل الآثار: ج 3 ص 17 رقم الحدیث 987

133- الانبیاء: 21: 98

134- الانبیاء: 21: 101

نمبر 2: وہ لوگ جو اپنی عبادت خود کروائیں ان میں بھی خیر نہیں ہے۔ عیسیٰ السلام نے اپنی عبادت کا کبھی نہیں فرمایا، عزیر علیہ السلام نے کبھی نہیں فرمایا، بلکہ وہ تو کہتے تھے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے خدا نے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔

تو ”لَا خَيْرَ مَعَ أَحَدٍ يُعْبُدُ مِنْ دُونِ اللَّهِ“ سے مراد وہ پتھر ہیں جن کی پوجا کی جائے یا وہ لوگ جو اپنی عبادت خود کروائیں جیسے فرعون کرواتا تھا، اس لیے اس کا حضرت عیسیٰ اور حضرت عزیر علیہما السلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

﴿وَقَالُوا آءِ يَهْتَنَّا خَيْرًا مَّا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ ﴿٥١﴾ إِنَّ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَءِيلَ ﴿٥٢﴾ وَلَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ﴿٥٣﴾﴾

وہ کہنے لگے کہ ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ ایک خدا بہتر ہے؟ یہ لوگ سب مثالیں جھگڑے کی ہی دے رہے ہیں کیونکہ یہ ہیں ہی مزاج کے جھگڑالو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو ایک بندہ تھا، جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اس کو بہترین نمونہ بنا دیا۔ تم عیسیٰ علیہ السلام کی بات کرتے ہو کہ بغیر باپ کے کیسے پیدا ہوئے؟ ہم اگر چاہیں تو تم سے فرشتوں کو پیدا کر دیں۔ جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین بن کر رہیں گے۔ لیکن یہ ہم کرتے نہیں ہیں اور نہ ہی ہماری یہ ترتیب ہے۔

**سلام متارکت کا معنی:**

﴿وَقِيلَ لَهُ إِنَّ هَؤُلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٨٩﴾﴾

﴿وَقِيلَ لَهُ﴾ کی کئی تفسیریں ہیں۔ ایک تفسیر کے مطابق اس میں واو عاطفہ ہے اور اس کا عطف ہے ﴿السَّاعَةِ﴾ پر۔ معنی یہ ہو گا ﴿وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾



کہ قیامت کا علم بھی اللہ کے پاس ہے اور اپنے پیغمبر کی اس بات کا علم بھی اللہ کے پاس ہے کہ جب پیغمبر نے کہا: ﴿يَرْبِّ إِنَّ هَؤُلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ کہ میرے رب! یہ قوم ایسی ہے مجھ پر ایمان نہیں لاتی۔ اللہ نے فرمایا: ﴿فَاَصْفَحْ عَنْهُمْ﴾ ان سے درگزر کریں، ﴿وَقُلْ سَلَامٌ﴾ اور ان لوگوں سے کہیں کہ تمہارا راستہ اپنا ہے میرا راستہ اپنا ہے۔

جب آپ کا مد مقابل ضدی ہو اور آپ کی بات نہ مانے تو اس کو ”سلام“ کہہ دیں۔ اس سلام کا معنی یہ نہیں ہے کہ کافر کو السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہیں، اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا۔ سورۃ الفرقان میں ہے:

﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾

یہ جو سلام اور سلاما فرمایا یہ ایک محاورہ ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں ”اوبابا! معاف کر“ اب اس کا معنی کیا ہوتا ہے کہ آپ اس سے معافیاں مانگ رہے ہیں؟ نہیں بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم تجھ سے بات نہیں کر سکتے۔ یہ کلام عرب کا محاورہ ہے کہ جب کسی سے بات نہ کرنی ہو کہا سلام، سلام، سلام... بس جان چھوڑو ہماری!

یہ سلام محاورہ ہے۔ اگر کوئی بندہ اس سے استدلال کرتا ہے کہ کافر کو سلام کرنا جائز ہے تو ایسا بندہ عربی زبان تو سمجھتا ہے لیکن عربی زبان کے محاورے نہیں سمجھتا۔ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے عربی زبان اور عربی زبان کے محاوروں کا سمجھنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کریم سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاجِرُ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الدخان

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿حَمْدٌ ۝ وَ انْكِسَبَ الْمُبِينُ ۝﴾ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبْرَكَةٍ اِنَّا

كُنَّا مُنْذِرِينَ ﴿٢﴾

یہ تو آپ کے علم میں ہے کہ اکثر سورتوں کے جو نام ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس سورت میں کوئی خاص واقعہ ہوتا ہے اور اس واقعہ کی وجہ سے اس سورت کا نام ہوتا ہے۔ اسے کہتے ہیں ”تَنْسِیۡۃُ الْکُلِّ بِاَسْمِ الْجُزْءِ“ اس سورت میں بھی چونکہ ”دخان“ یعنی دھوئیں کا ذکر ہے اس لیے اسے سورت دخان کہتے ہیں۔

لحم پر پہلے بات ہو چکی ہے کہ یہ سات سورتیں وہ ہیں جو لحم سے شروع ہوتی ہیں، جنہیں حوامیم کہتے ہیں۔ فرمایا: قسم ہے اس کتاب کی جو بڑی واضح ہے، قرآن کریم کو ہم نے برکت والی رات میں نازل فرمایا ہے کیونکہ ہم لوگوں کو ڈرانے والے ہیں۔

## نزول قرآن دومرتبہ ہوا ہے:

یہ بات سمجھیں کہ یہاں نازل ہونے سے مراد کیا ہے؟ کیونکہ قرآن کریم کا

نزول دومرتبہ ہوا ہے:

◆ ایک مرتبہ لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر ہوا ہے۔

◆ اور ایک مرتبہ آسمان دنیا سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب

مبارک پر ہوا ہے ﴿فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ﴾<sup>135</sup>۔

لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر جو قرآن کریم نازل ہوا ہے وہ صرف لیلۃ القدر کی ایک رات میں ہوا ہے جس کا ذکر ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾<sup>136</sup> میں ہے۔ پھر آسمان دنیا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر تھوڑا تھوڑا کر کے تیس سال کے عرصے میں نازل ہوا ہے۔

اس لیے عام طور پر جب لفظ ”أَنْزَلْنَا“ ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اور جب لفظ ”نَزَّلْنَا“ ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے کہ آسمان دنیا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر کیونکہ أَنْزَلَ يُنْزِلُ إِنزَالًا باب افعال کا استعمال وہاں ہوتا ہے جہاں نزول دفعۃً واحدة ہو یعنی ایک ہی دفعہ ہو اور نَزَّلَ يُنْزِلُ تَنْزِيلًا باب تفعیل کا استعمال وہاں ہوتا ہے جہاں نزول تدریجاً ہو یعنی تھوڑا تھوڑا ہو۔ تو لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نزول ایک دفعہ ہے اس لیے لفظ ”أَنْزَلْنَا“ ہے اور آسمان دنیا سے قلب اطہر پر چونکہ تیس سال میں نازل ہوا ہے اس لیے وہاں ”نَزَّلْنَا“ ہے۔

باقی جو کتب سماویہ ہیں تورات، زبور، انجیل اور صحیفہ ان کے لیے عموماً لفظ ”أَنْزَلْنَا“ استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتابیں ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہیں۔

**قرآن ہی محفوظ کتاب ہے:**

سورۃ الحجر میں ہے ”إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ“<sup>①</sup> ہم کہتے

ہیں کہ اللہ رب العزت نے قرآن کریم کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہے۔ اس کی دلیل یہی آیت ہے۔

اس پر اعتراض ہے کہ یہاں پر ”الْقُرْآنَ“ نہیں ہے بلکہ ”الذِّكْرَ“ ہے اور جس طرح ”الذِّكْرَ“ قرآن کو کہتے ہیں اسی طرح تورات، زبور، انجیل کو بھی کہتے ہیں۔ اس کا جواب ہم یہی دیتے ہیں کہ تورات، زبور اور انجیل کو ایک دفعہ اکٹھا نازل کیا گیا اور قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا ہو وہاں ”نَزَّلْنَاهُ“ آتا ہے اور جس کو ایک ہی بار نازل کیا ہو وہاں ”أَنزَلْنَاهُ“ آتا ہے اور یہاں پر ”إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ“ میں ”نَزَّلْنَاهُ“ ہے۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الذکر سے مراد عام ذکر نہیں ہے بلکہ خاص ذکر ہے جو کہ قرآن کریم ہے۔

اس پر پھر یہ سوال ہے کہ ”إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ“ میں تو قرآن کریم کے نزول کے لیے لفظ ”أَنزَلْنَاهُ“ آیا ہے، ”نَزَّلْنَاهُ“ تو نہیں آیا۔

اس کا ہم جواب یہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم کا نزول دو مرتبہ ہے۔ ایک مرتبہ لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نزول ہوا جس کا ذکر ”إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ“ میں ہے اور ایک ہے آسمان دنیا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر ”فَأَنزَلْنَاهُ عَلَى قَلْبِكَ“ اور یہاں پر لفظ ”نَزَّلْنَاهُ“ ہے۔ تو چونکہ نزول دو مرتبہ ہے اس لیے لفظ بھی دو قسم کا آیا ہے۔

### کثرت اور برکت میں فرق:

یہاں فرمایا لیلۃ مبارکہ کہ یہ رات برکت والی ہے۔

میں کئی بار یہ بات سمجھا چکا ہوں کہ ایک ہے لفظ کثرت، ایک ہے لفظ

برکت، چیز تھوڑی ہو اور فائدہ زیادہ ہو یہ برکت ہے اور چیز زیادہ ہو لیکن فائدہ کم ہو تو یہ کثرت ہے۔ یہاں قرآن کریم میں لیلۃ مبارکہ فرمایا کہ یہ رات ایسی ہے جو کمیت اور مقدار میں عام راتوں کی طرح ہے لیکن کیفیت اور معیار میں عام راتوں سے بڑھ کر ہے کہ یہ رات برکت والی ہے۔

### استقبالِ رمضان (حدیث سلیمان فارسی)

اس پر میں ایک حدیث مبارک آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں فضائل رمضان سے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

خَطَبَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آخِرَ يَوْمٍ مِنْ شَعْبَانَ فَقَالَ:  
أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ أَظْلَلَكُمْ شَهْرٌ عَظِيمٌ شَهْرٌ مُبَارَكٌ...

یہ جو لمبی حدیث ہے امام ابن خزیمہ نے اپنی کتاب صحیح ابن خزیمہ<sup>137</sup> میں اس کو نقل کیا ہے اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ نے ”فضائل اعمال“ میں جو ان کا رسالہ ہے فضائل رمضان اس کے شروع میں پہلی حدیث یہی لائے ہیں۔ عام طور پر اس حدیث کی جو شرح بیان کی جاتی ہے وہ آپ نے پڑھی ہے یا سنی ہے لیکن اس حدیث مبارک کی شرح جو میں کرتا ہوں ذرا وہ سنیں! میں کہتا ہوں کہ اس حدیث مبارک میں دو چیزیں ہیں؛ ایک ہے اجمال اور ایک ہے تفصیل۔ ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ أَظْلَلَكُمْ شَهْرٌ عَظِيمٌ شَهْرٌ مُبَارَكٌ“ یہ گویا اجمال اور متن ہے اور آگے اس کی تفصیل اور شرح ہے۔ اس کو آپ اچھی طرح سمجھ لیں۔ یہاں لفظ ”أَظْلَلُ“ فرمایا، لفظ ”أَتَى“ یا ”جَاءَ“ نہیں فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ ”أَتَى“ اور ”جَاءَ“ کا معنی ہے آنا اور ”أَظْلَلُ“ کا معنی ہے چھا جانا۔ جیسے بعض آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور بعض

آتے ہیں اور چھاجاتے ہیں۔

تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ فرمایا ”قَدْ أَظْلَكُكُمْ“ دیکھو! لفظ کتنا پیارا استعمال کیا، رمضان آتا ہے اور چھاجاتا ہے اور پوری دنیا میں رمضان آتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ رمضان آیا ہے، اس کے علاوہ کوئی ایسا مہینا نہیں ہے کہ جو اس طرح چھا جائے جیسے رمضان چھاجاتا ہے۔۔

آپ کے ذہن میں آئے گا ربیع الاول، ربیع الاول آتا ہے لیکن اس کے چند دن ہوتے ہیں، پورا مہینا ربیع الاول میں بہاریں نظر نہیں آتیں، رمضان میں پورا مہینا بلکہ جب رمضان ختم ہو رہا ہوتا ہے تو بہاریں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔

آپ کہیں گے محرم، محرم بھی دیکھ لیں تو محرم میں بازار سجتے ہیں لیکن مساجد کی آبادی محرم میں نہیں بڑھتی، ربیع الاول میں مساجد کی آبادی نہیں بڑھتی، رمضان ایسا ہے کہ جس میں مساجد کی آبادی بڑھ جاتی ہے اور شروع سے لے کر آخر تک، آخر میں اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

اس لیے فرمایا کہ رمضان مبارک صرف آگیا نہیں بلکہ چھا گیا ہے۔ اب دیکھو ”أَظْلَ“ رمضان آیا نہیں ہے ابھی آنا ہے تو پھر یوں فرمانا چاہیے ”تَا يُظْلُ“ پھر ”أَظْلَ“ کیوں فرمایا؟ اصل میں لفظ ماضی تحقق کے لیے ہوتا ہے یعنی جس چیز نے مستقبل میں یقیناً ہونا ہو اس کو لفظ ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ جس طرح قرآن کریم سورۃ شمس میں ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ ذَكَرَهَا﴾

اب یہاں ”قَدْ يُفْلِحُ“ ہونا چاہیے تھا لیکن فرمایا ”قَدْ أَفْلَحَ“ اس لیے کہ تزکیہ کے بعد فلاح اتنی یقینی ہے کہ اس کو ماضی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

”شَهْرٌ عَظِيمٌ“ صرف عظمت نہیں بتائی بلکہ فرمایا: ”شَهْرٌ مُّبَارَكٌ“ کہ یہ

برکت والا بھی ہے۔ برکت کا معنی ہوتا ہے کہ چیز تھوڑی ہو اور فائدہ زیادہ ہو۔ یہ متن ہے۔ آگے ساری حدیث اس کی شرح ہے:

”فِيهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ“ اس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ باقی مہینوں میں ایسی رات نہیں ہے، یہ صرف رمضان ہی میں ہے۔

”جَعَلَ اللَّهُ صِيَامَهُ فَرِيضَةً وَقِيَامَهُ لَيْلَةً تَطَوُّعًا“ یہ مہینا ایسا ہے کہ جس میں اللہ نے روزے کو فرض فرمایا اور اس کی رات کو نفل۔ باقی پورے سال میں کوئی ایسا مہینا نہیں ہے کہ جس میں پورے دن روزہ فرض ہو اور رات تراویح کی طرح نماز ضروری ہو، ایسا کوئی مہینا نہیں ہے۔

”مَنْ تَقَرَّبَ فِيهِ بِمُحْصَلَةٍ مِنَ الْحَبْرِ كَانَ كَمَنْ أَذَى فَرِيضَةً قِيَامًا سَوَاءً وَمَنْ أَذَى فِيهِ فَرِيضَةً كَانَ كَمَنْ أَذَى سَبْعِينَ فَرِيضَةً قِيَامًا سَوَاءً“ اگر کوئی شخص اس مہینے میں نیک عمل کر کے اللہ کا تقرب حاصل کرے تو وہ ایسا ہے جیسے اس نے غیر رمضان میں فرض کو ادا کیا ہو اور جس نے اس میں ایک فرض ادا کیا ہو تو ایسے ہے جس طرح اس نے ستر فرضوں کو غیر رمضان میں ادا کیا ہو۔

نفل کا فرض کے برابر ہونا اور فرض کا ستر فرائض کے برابر ہونا... اب فرض کا ستر فرائض کے برابر ہونا یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ برکت ہے اور نفل کا فرض کے برابر ہونا یہ سمجھ نہیں آتا، یہ سمجھ تب آئے گا کہ پہلے یہ پتا چلے کہ فرض اور نفل میں فرق کیا ہے؟

اگر کوئی شخص ایک فرض ادا نہ کرے اور اس کے بدلے میں پوری زندگی نوافل پڑھتا رہے تو اس فرض کا تدارک نہیں ہو سکتا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ایک فرض ہزاروں نوافل سے افضل ہے اور اس مہینا کا نفل فرض کے برابر ہو گا، تو اب سمجھ آئے

گی کہ اس میں برکت کتنی ہے!

”وَشَهَرٌ يُزَادُ فِيهِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ“ اس مہینے میں مؤمن کا رزق بڑھا دیا جاتا

ہے۔

تو میں آپ کو لفظ برکت سمجھا رہا تھا، کبھی آپ رمضان کے آغاز پر تقریر کریں اور حدیث یہی پڑھیں لیکن سمجھائیں ایسے جیسے میں آپ کو سمجھا رہا ہوں تو پھر بیان کرنے کا بھی لطف آتا ہے اور سننے کا بھی۔

### حدیث استقبال رمضان؛ بیس رکعات تراویح کی دلیل:

میں اسی حدیث کو بیس تراویح پر بطور دلیل کے پیش کرتا ہوں۔ پتا نہیں آپ نے کبھی سنا ہے یا نہیں، اور بیس رکعات تراویح پر یہ ایسی دلیل ہے جو میں نے کہیں نہیں پڑھی لیکن آپ عوام کو سمجھائیں تو یہ فوراً دماغ میں اترتی ہے۔ آپ یہ سمجھیں کہ بیس رکعات تراویح پر یہ دلیل کیسے بنتی ہے؟

◆ پہلی بات یہ سمجھیں کہ حدیث پاک میں ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے فرائض کا حساب ہوگا، اگر فرائض میں کمی رہ جائے تو نوافل دیکھیں گے اور نفلوں سے فرضوں کی کمی کو پورا فرمادیں گے۔ یہ حدیث ذہن میں آگئی؟ (جی ہاں۔ سامعین)

◆ دوسری بات یہ سمجھیں کہ ہم جو روزانہ فرض پڑھتے ہیں ان کی تعداد بیس بنتی ہے؛ فجر کے دو فرض، ظہر کے چار فرض، عصر کے چھ فرض، مغرب کے تین فرض، عشاء کے چار فرض اور تین رکعت وتر۔ یہ کل بیس رکعات ہو گئیں۔ اس پر پہلے لوگوں کو سمجھائیں کہ بھائی جو ہم روزانہ فرائض پڑھتے ہیں ان کی تعداد بیس ہے۔ پھر اس پر خود سوال اٹھائیں کہ آپ کے ذہن میں آئے گا کہ وتر تو واجب ہیں، فرض نہیں ہیں تو پھر فرض میں کیسے بنے؟ پھر اس کا جواب سمجھائیں کہ اگر ایک شخص کی ایک دن کی پانچ نمازیں قضا ہو جائیں تو جب دوسرے دن قضا پڑھے گا تو وتر پڑھے گا یا نہیں؟



پڑھے گا، اس کا معنی ہے کہ وتر؛ فرض کی طرح ہیں۔ آدمی سفر میں جائے تو سنتیں معاف ہو جاتی ہیں لیکن فرائض معاف نہیں ہوتے۔ کیا وتر بھی معاف ہوتے ہیں؟ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ وتر فرض کی طرح ہیں۔ اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کی نمازیں رہ جائیں، آپ اس کا فدیہ ادا کریں تو روزانہ کے حساب سے جو فدیہ ادا کریں گے وہ پانچ نمازوں کا کریں گے یا چھ کا؟ چھ کا، تو وتر کا مستقل فدیہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ فرض کی طرح ہے۔

اب پھر سوال اٹھائیں کہ دیکھو! ان دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ وتر فرض ہیں جبکہ علماء تو لکھتے ہیں کہ وتر واجب ہیں۔ پھر آپ بات سمجھائیں کہ جو ہم کہتے ہیں وہ بھی ٹھیک ہے اور جو علماء کہتے ہیں وہ بھی ٹھیک ہے، کیونکہ وتر کی دو حیثیتیں ہیں: ایک ہے اعتقادی اور ایک ہے عملی۔ اعتقاداً وتر واجب ہیں اور عملاً فرض ہیں۔ ہم جو کہتے ہیں کہ وتر فرض ہیں تو وہ اعتقاداً نہیں بلکہ عملاً فرض ہیں۔ واجب وہ ہوتا ہے کہ جس کا انکار کفر نہیں ہوتا لیکن اس کا ترک فسق ہوتا ہے فرض کی طرح۔

♦ تیسری بات اس حدیث کو دیکھیں کہ رمضان میں جو شخص ایک نفل پڑھے تو وہ فرض کے برابر ہے۔

تو اب ان تین باتوں کو آپ جمع کر لیں:

نمبر 1... روزانہ جو ہم فرائض پڑھتے ہیں ان کی تعداد بیس ہے۔

نمبر 2... قیامت کے دن فرائض کی کمی پوری ہوگی نوافل سے۔

نمبر 3... رمضان کا نفل ثواب میں فرض کے برابر ہے۔

تو روزانہ جو ہم فرائض پڑھتے ہیں ان کی رکعات بیس ہیں۔ اب نوافل سے فرائض کی کمی پوری ہوگی اور ایسا نفل جس سے فرائض کی کمی جلدی پوری ہو وہ نفل ایسا ہونا چاہیے جو فرض کے برابر ہو۔ اب ایسا نفل جو فرض کے برابر ہو وہ رمضان میں

ہوتا ہے غیر رمضان میں نہیں ہوتا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ روزانہ کے فرائض میں ہونے والی کمی نوافل سے پوری ہوگی اور بطور خاص رمضان کے نوافل سے جو فرض کے برابر ہیں۔ تو جو لوگ روزانہ آٹھ فرائض پڑھتے ہیں تو وہ رمضان میں اضافی نوافل بھی آٹھ پڑھیں اور ہم چونکہ روزانہ بیس رکعات فرائض پڑھتے ہیں تو رمضان میں اضافی نوافل بھی بیس پڑھتے ہیں۔

اب دیکھو! عوام کو بات سمجھ آرہی ہے کہ نہیں؟ (آرہی ہے۔ سامعین) اس لیے میں پھر کہتا ہوں کہ ہماری بیس رکعات عقل کے بھی موافق ہیں اور نقل کے بھی موافق ہیں۔ نقل یعنی حدیث کے موافق۔ نصوص کا تقاضا بھی ہے کہ بیس ہونی چاہئیں اور عقل کا تقاضا بھی ہے کہ بیس ہونی چاہئیں۔ تو جو آٹھ کے قائل ہیں وہ نقل کے بھی دشمن ہیں اور عقل کے بھی دشمن ہیں۔

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ آپ پوری دنیا میں دیکھ لیں... وہ ہیں ہی ایسے کہ ان میں عقل نہیں ہے، پھر عقل نہ ہونے پر عوام کو دو چار لطیفے سنا دیں تو خود ہی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

مجھ سے ایک بندہ پوچھتا ہے کہ غیر مقلد اپنے سر پر ٹوپی کیوں نہیں رکھتا؟ میں نے کہا کہ ٹوپی یا پگڑی سر پر وہی رکھتا ہے کہ جس کے پاس عقل ہو اور وہ ٹوپی پہن کر اس کی حفاظت کرتا ہے، جب عقل ہی نہ ہو تو پھر ٹوپی کی کیا ضرورت ہے؟ جب آدمی کے پاس پیسے ہوں تو جیب میں بٹوا بھی رکھے گا، جب پیسے نہ ہوں تو وہ بٹوے کو کیا کرے گا؟! عقل اور دماغ نہ ہو تو ٹوپی اور پگڑی کو کیا کرنا ہے؟ جب عقل ہے ہی نہیں تو اس کو سنبھالنا کیا ہے؟ اس لیے ان کو ٹوپی اور پگڑی کے بغیر رہنا چاہیے، یہ ٹوپی اور پگڑی پہنیں گے تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ یہاں پر آپ ایک ادھ لطیفہ سنا دیں تو لوگ ہنستے ہنستے آپ کے دلائل سنیں گے۔

میں نے تو بہت مختصر وقت میں بیان کیا ہے۔ آپ اس کو تھوڑا سا کھولیں گے تو آدھا پونا گھنٹا لگے گا اور بیس رکعات تراویح پر بہترین دلائل آپ کے سامنے آجائیں گے۔

### لیلہ مبارکہ سے مراد کیا ہے؟

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبْرَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ﴾

قرآن کریم کو ہم نے برکت والی رات میں نازل فرمایا ہے کیونکہ ہم لوگوں کو ڈرانے والے ہیں۔

لیلہ مبارکہ؛ برکت والی رات سے مراد لیلۃ القدر ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ صراحت کے ساتھ قرآن کا لیلۃ القدر میں نازل ہونا منقول ہے: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ تو اس سے لیلہ مبارکہ کی تعین ہو رہی ہے۔

### ”دخان“ سے کیا مراد ہے؟

﴿فَإِذَا تَوَفَّىٰ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ﴾

اے پیغمبر! اس دن کا انتظار کریں جس دن آسمان سے ایک کھلا دھواں آئے گا۔

دخان مبین سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں پہلا قول یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے۔ آپ نے قریش کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعا کی تو مکہ پر سخت قحط پڑا اور قحط اتنا شدید تھا کہ لوگ ہڈیاں اور مردار کھانے پر مجبور ہو گئے۔ لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تو بھوک کی وجہ سے انہیں دھواں نظر آتا تھا۔ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ اگر

آپ دعا کریں اور قحط ختم ہو جائے تو ہم آپ پر ایمان لائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تو قحط ختم ہو گیا لیکن وہ ایمان پھر بھی نہیں لائے۔

اب اس قحط کو ”دخان“ یعنی دھوئیں سے تعبیر کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی کو سخت بھوک اور پیاس لگی ہو تو آنکھیں دھندلا جاتی ہیں، اسے ہر طرف دھواں نظر آتا ہے۔ اس لیے اس کو دخان سے تعبیر کیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ایک خاص نشانی ہے کہ قربِ قیامت میں دھواں نمودار ہو گا جو لوگوں کو ڈھانپ لے گا۔

دخان مبین کے دونوں معنی ٹھیک ہیں، ان میں کوئی منافات نہیں۔ مکہ مکرمہ میں جو قحط آیا تھا وہ مراد لیں تو بھی ٹھیک ہے اور جو قربِ قیامت میں دھواں نمودار ہو گا وہ بھی ٹھیک ہے۔

﴿يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ﴾ (١٦)

اور جس دن جب ہم ان کو سخت گرفت میں لیں گے تو ان سے انتقام لیں گے۔

اس سے مراد بدر کے دن کا عذاب ہے جب بدر میں کفار گرفت میں آئے تھے۔ اس کا ایک معنی یہ بھی ہے اور ایک معنی یہ ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔

**فرعون کی پکڑ:**

﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ﴾ (١٧)

أَدُّوا إِلَيَّ عِبَادَ اللَّهِ إِنِّي نَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ﴾ (١٨) وَأَنْ لَا تَعْلُوا عَلَى اللَّهِ إِنِّي

أَتِيكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ﴾ (١٩)

اور ہم نے اس سے پہلے فرعون کی قوم کو آزمایا تھا، ان کے پاس ہمارے ایک معزز رسول آئے تھے، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام، انہوں نے فرعون سے کہا کہ بنی اسرائیل کو میرے حوالے کر دو، میں امانت دار نبی ہوں۔ یعنی میں خیانت کی بات نہیں کروں گا۔ یہ حکم تو دیا اور ایک حکم یہ بھی دیا کہ اللہ کے سامنے سرکشی مت دکھاؤ، میں تمہارے پاس واضح دلیل لے کر آیا ہوں۔

اللہ رب العزت نے یہاں فرعونوں کے بارے میں بتایا کہ دیکھو! یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آئے ہیں تو تباہ و برباد ہو گئے۔ اللہ نے انہیں کتنی نعمتیں دی تھیں!

﴿كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۖ وَزُدُّوا مَقَامِ كَرِيمٍ ۝۲۱﴾

نَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ ۝۲۲ كَذٰلِكَ ۖ وَاَوْزَنُنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝۲۳﴾

ان لوگوں نے کتنے باغات اور چشمے چھوڑے، کئی کھیت چھوڑے اور کئی رہنے کی اچھی جگہیں چھوڑیں، عیش و عشرت کی جس زندگی میں وہ جی رہے تھے انہوں نے وہ بھی چھوڑی۔ ان سب چیزوں کا وارث ہم نے ایک اور قوم کو بنادیا۔

**نہ آسمان رویانہ زمین روئی کا مطلب:**

﴿مَنْ بَايَعْتُمْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا كَانُوا مُنْظَرِيْنَ ۝۲۴﴾

قرآن کریم اکثر محاورات استعمال کرتا ہے۔ یہ ایک محاورہ ہے کہ ان پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین روئی اور نہ ان کو کوئی مہلت دی گئی۔

اس کا معنی یہ تھا کہ ان کے جانے سے کچھ فرق نہیں پڑا۔ یہ محاورہ ہے کہ فلاں کے جانے پر آسمان بھی رو رہا تھا یعنی اس کے جانے سے فرق پڑا ہے، لیکن یہ فرعون تو خس و خاشاک کی طرح تھے، ان کے جانے سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ واقعاً ایسا

ہے کہ مسلمان کا نیک عمل اوپر جاتا ہے، تو جب نیک عمل اوپر جانا بند ہو تو آسمان روتا ہے، جس جگہ انسان نیک عمل کرتا ہے تو جب وہاں عبادت بند ہو جائے تو پھر زمین روتی ہے۔ ان فرعونیوں کے جانے پر نہ آسمان رو یا نہ زمین روئی، کیونکہ ان کے نہ نیک اعمال زمین پر تھے کہ ان کے مرنے پر زمین روتی، نہ ان کے نیک اعمال آسمان پر جاتے تھے کہ ان کے مرنے پر آسمان روتا۔ اللہ ہم سب کو ایسی زندگی عطا فرمائیں کہ آدمی کے جانے پر آسمان بھی روئے اور زمین بھی روئے۔

جب انسان دنیا میں آتا ہے تو روتا ہے اور دوسرے اس کی آمد پر ہنس رہے ہوتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں اور جب انسان دنیا سے جائے تو یہ ہنسے اور دوسرے روئیں۔ یہ ہے زندگی! اگر خدا نخواستہ ایسا ہو کہ جب آیا تب بھی رو رہا تھا اور جب گیا تب بھی رو رہا تھا تو یہ بڑی ناکامی کی زندگی ہے۔ آنے پر یہ روئے اور جانے پر ہنسے تو یہ کامیابی کی زندگی ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ کسی کو جاتے ہوئے روتا ہوا دیکھ لیں تو کہیں کہ یہ تو غلط تھا! ایسا نہیں ہے بلکہ یہ جو رو رہا ہے تو یہ اللہ کے خوف کی وجہ سے رو رہا ہے کہ پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہو گا؟! لیکن مومن کے لیے موت تحفہ ہے، مومن جیسا کیسا بھی ہو گا بہر حال وہ موت سے کسی درجے میں محبت ضرور کرے گا، وہ سمجھتا ہے کہ میں نے مرنا ہے تو مجھے نعمتیں ملنی ہیں، جتنا بھی کمزور مومن ہو گا اس کو بہر حال موت سے ایک گونہ محبت ضرور ہوتی ہے، اس کو موت سے بالکل نفرت ہو ایسا نہیں ہوتا۔

﴿وَآتَيْنَهُمْ مِنَ الْآيَاتِ مَا فِيهِ بَلَاءٌ مُّبِينٌ ۝۲۳﴾ إِنَّ هَؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ۝۲۴ إِنَّ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِينَ ۝۲۵ فَأَنذَرْنَا بَابًا بَيِّنًا ۝۲۶ إِنَّ كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝۲۷﴾

اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ ہم نے فرعونوں کو ایسی نشانیاں دیں جن

میں ان کے لیے واضح انعام تھا، یہ پھر بھی بات نہیں مانتے تھے، کہتے تھے کہ بس ہم نے ایک ہی بار مرنا ہے، اس کے بعد دوبارہ ہم تھوڑا ہی اٹھیں گے۔ یہ لوگ پیغمبر سے کہتے: اگر تم سچے ہو کہ دوبارہ اٹھنا ہے تو ہمارے باپ دادا جو مر گئے ہیں ان کو اٹھاؤ!

### تبع اور اس کی قوم کا تذکرہ:

﴿أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۚ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ أَهْلَكْنَاهُمْ

لأنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ﴾

اللہ فرماتے ہیں ان سے پوچھو کہ کیا اسباب اور طاقت میں تم بڑھ کر ہو یا قوم تبع تم سے بڑھ کر تھی؟!

”تبع“ شاہِ یمن کو کہتے ہیں۔ جس طرح شاہِ مصر کو فرعون کہتے ہیں، شاہِ روم کو قیصر کہتے ہیں، شاہِ ایران کو کسریٰ کہتے ہیں، شاہِ حبشہ کو نجاشی کہتے ہیں اسی طرح شاہِ یمن کو تبع کہتے ہیں۔ تبع ان کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ تو ان بادشاہوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ تمہارے پاس طاقت اور قوت زیادہ ہے یا تبع کے پاس زیادہ تھی؟

### تُبَّع کا واقعہ:

یہاں ”تبع“ سے مراد خاص تبع بادشاہ ہے یا مطلق شاہِ یمن مراد ہے؟ جس طرح فرعون؛ شاہِ مصر کو کہتے ہیں لیکن جب ہم فرعون کہتے ہیں تو اس سے خاص فرعون مراد ہوتا ہے عام نہیں، اس طرح ہم کسریٰ کہتے ہیں تو عام کسریٰ مراد نہیں ہوتا بلکہ وہ مراد ہوتا ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خط لکھا تھا اور اس بد بخت نے خط پھاڑ دیا تھا العیاذ باللہ، جب ہم نجاشی کہتے ہیں تو ہماری مراد وہ خاص نجاشی ہے جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت؛ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا احترام کیا تھا۔

## شاہِ حبشہ؛ حضرت نجاشی

یقین کریں بندہ جب ایسے خوش بخت لوگوں کو دیکھتا ہے تو برداشت نہیں کر سکتا، بس خوشی سے رونا آجاتا ہے۔ دیکھیں! کتنی بڑی سعادت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت ان کے پاس گئی ہے تو انہوں نے ان کا اکرام کیا ہے، اس اکرام کا صلہ اللہ نے ایمان کی دولت کی صورت میں دیا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا قریش کی خاتون ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہجرت کی دوسرے ملک حبشہ میں اور شوہر نے ساتھ چھوڑ دیا، اب یہ کتنا بڑا دکھ ہے تو اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام نکاح بھیج دیا، اب بتاؤ ان کی خوشی کا کیا عالم ہو گا کہ جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا شوہر مل جائے اور نجاشی نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح پڑھایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حق مہر خود ادا کیا، پھر ساتھ ہدیہ دے کر روانہ کیا ہے۔

یہ تب ہے جب عظمت ذہن میں ہو، یہ باتیں پھر سمجھ میں آتی ہیں کہ کتنی بڑی سعادت ہے! اور پھر جب نجاشی فوت ہوا تو جنازہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں تھے تو نکاح نجاشی نے پڑھا اور جب نجاشی کی باری آئی تو جنازہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا۔ ادلا بدلا ہو گیا۔ اس نے خوشی دی ہے تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بدلے میں خوشی عطا فرمائی ہے۔

## تَبَعَ بادشاہ کی مدینہ منورہ میں آمد:

﴿أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تَبَعٍ﴾... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قباء میں قیام فرمایا۔ پھر قباء سے روانہ ہوئے تو مدینہ شہر میں گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں انصارِ مدینہ میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ اللہ کے نبی ہمارے مہمان



نہیں، ہر ایک کا جی چاہتا کہ آپ کی اونٹنی کی مہار کو پکڑ لیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”دَعُوْهَا فَإِنَّهَا مَأْمُوْرَةٌ“ میری اونٹنی کو چھوڑ دو یہ اللہ کے حکم سے چلی ہے، اللہ کے حکم سے رکے گی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے سسرال بنی نجار کا قبیلہ مدینہ میں تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی خواہش یہ تھی کہ میں اپنے دادا کے سسرال کے ہاں ٹھہروں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیوں نہیں فرمایا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ انصارِ مدینہ میں سے ہر ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیار کرتا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات نہیں بتائی تاکہ کسی کا دل نہ ٹوٹ جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں چھوڑ کر وہاں کیوں گئے؟ تو اللہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کو کس طرح معجزے کے انداز میں پورا کیا کہ آپ کا معجزہ بھی ظاہر ہو گیا اور اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مزید خوشی پیدا ہو گئی، یوں ایک کے پاس جانے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو طبعاً تکلیف نہیں ہوئی۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے سامنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی رکی۔ اللہ آپ سب کو مدینہ منورہ لے جائے (آمین۔ سامعین) مسجد نبوی میں آپ جب داخل ہوں اور صلوٰۃ و سلام پڑھ کر باہر نکلیں تو مسجد نبوی کے موجودہ نقشہ میں جو دایاں کونہ ہے تقریباً یہی جگہ ہے جہاں پر حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مکان تھا، اونٹنی وہاں رک گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مکان میں ٹھہر گئے۔ دو منزلہ مکان تھا۔ مدینہ کے مکانات عام طور پر ایک منزلہ تھے اور یہ دو منزلہ تھا۔

### تُسَبِّحْ کا حضور علیہ السلام کی خدمت میں ہدیہ:

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مکان بھی پیش کیا اور آپ کی خدمت میں ایک خط بھی پیش کیا۔ یہ خط اور

یہ مکان کون سا تھا؟ اصل میں تبع یمن کا بادشاہ یہاں سے گزرا، اس کے ساتھ چار سو علماء تورات کے ماہر تھے۔ جب وہ واپس جانے لگا تو ان علماء نے کہا کہ آپ ہمیں اسی جگہ پر چھوڑ دیں۔ تبع نے پوچھا: کیوں؟ انہوں نے بتایا کہ ہماری کتاب میں لکھا ہے کہ آخری نبی جو آئے گا یہ زمین اس کی دارالہجرت ہوگی۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کریں۔ یہ تبع بہت علم دوست آدمی تھا۔ تو اس نے چار سو علماء کے لیے مکانات بنائے، ان سب کے وہاں نکاح کروائے، ان کو رہنے کے لیے سامان دیا اور ایک مکان دو منزلہ بنایا۔ اس نے کہا کہ جب وہ آخری نبی آئیں تو یہ مکان میری طرف سے ان کے لیے ہدیہ ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ اسی مکان میں رہتے تھے۔ یہ جو دو منزلہ مکان تھا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بنا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان میں آگئے۔ پھر اس تبع بادشاہ نے کہا تھا کہ ایک خط میری طرف سے ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کر دینا۔ نسل در نسل حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس وہ خط چلا آ رہا تھا۔ انہوں نے وہ خط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیا۔ اس خط میں تبع بادشاہ نے کہا تھا:

### تبع کے اشعار:

شَهِدْتُ عَلَى أَحْمَدَ أَنَّهُ رَسُولٌ مِنَ اللَّهِ بَارِي النَّسَمِ

میں گواہی دیتا ہوں کہ احمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے برحق رسول ہیں۔

فَلَوْ مُدَّ عُمَرُ إِلَى عُمَرَةَ لَكُنْتُ وَزِيرًا لَهُ وَابْنُ عَمِّ

اگر مجھے خدا نے موقع دیا اور میری عمر لمبی ہوئی اور میں نے ان کا زمانہ پالیا تو میں ان کا سپاہی بنوں گا اور ان کے چچا کا بیٹا بنوں گا۔ ”ابن عم“ اس وقت چچا کے بیٹے کو کہتے تھے کہ جو معاون بنے۔ تو یہ کہہ رہے تھے کہ میں ان کا معاون بنوں گا اور ان کا وزیر بن جاؤں گا۔

وَجَاهَدْتُ بِالْسَيْفِ أَعْدَاءَهُ وَفَرَجْتُ عَنْ صَدْرِهِ كُلَّ غَمٍّ

اور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے تلوار سے ایسا ٹکراؤں گا کہ آپ کے دل کو ٹھنڈا کر دوں گا۔

تو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے یہ مکان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور یہ والا خط بھی دیا۔

میں یہ باتیں اس لیے بارہا کہتا ہوں کہ آپ لوگ اپنا ایک ذہن بنائیں، اب قیمت تک کوئی نیابی تو آنا نہیں، نبی تو پیدا ہونا نہیں، آپ نبی کے وارث ہیں اور کسی جگہ پر بندے کو صحیح وارث مل جائے تو اپنی زندگی کھپا دو، اپنا سب کچھ لٹا دو، پھر آپ اس کی بہاریں دیکھنا! یہ جو ہمارا ذہن ہوتا ہے ناکہ میں کروں، اس سے بہتر ہوتا ہے کہ انسان کرنے والے پر فدا ہو جائے، پھر ایک وقت آئے گا کہ آپ بھی کریں گے!

یہ جلد بازی انسان کو بہت خراب کرتی ہے۔ میں اکثر ساتھیوں سے کہتا ہوں کہ آپ آئے اور چلے گئے، اس طرح کام نہیں ہوتا، آپ متخصصین ہیں، آپ میں سے ایسے بندے تیار ہو جائیں جو دس سال یہاں پڑے رہیں، اور میں کہتا ہوں کہ دس سال لگاؤ، اور کچھ بھی نہ کرو، صرف مطالعہ کرو اور ذکر کرو... مطالعہ کرو اور ذکر کرو... یہ جو دھیمہ دھیمہ کام ہوتا ہے تقویٰ کے ساتھ اس کی مدت بہت لمبی ہوتی ہے اور جو کام بغیر تقویٰ کے تیز رفتاری سے ہوتا ہے وہ جلدی ختم ہو جاتا ہے۔

جہنمیوں کا کھانا: زقوم

﴿إِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّومِ ۖ طَعَامُ الْأَثَمِ ۖ كَأَنَّهُمْ فِي

الْبُطُونِ ۖ كَغَلِيِّ الْحَمِيمِ ۖ﴾

یہاں پہلے اللہ تعالیٰ نے اہل جہنم کا تذکرہ کیا۔ فرمایا: زقوم کا درخت نافرمانوں

کا کھانا ہو گا، اس کی شکل ہو گی تلچھٹ جیسی، جیسے تیل ہوتا ہے جو گاڑیوں میں استعمال ہو کر پھر پرانا ہو جاتا ہے، استعمال شدہ تیل۔ اس کو کھائیں گے تو آدمی کے پیٹ میں ہنڈیا کی طرح ابال شروع ہو جائے گا، یہ درخت شکل سے بھی بے کار ہو گا اور ذائقہ کے اعتبار سے بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔

﴿خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ۖ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِّنْ عَذَابِ الْجَحِيمِ ۖ طَبَقُ ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ۝۳۹﴾ إِنَّ هَذَا مَا كُنتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ ۝۴۰﴾

اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کو پکڑ کے جہنم کے درمیان میں لے جاؤ، پھر ان کے سروں پر کھولتے ہوئے پانی کا عذاب ڈال دو، اس سے کہا جائے گا کہ چکھو اس کو! تم خود کو بڑا معزز سمجھتے تھے۔ اسی چیز میں تم شک کیا کرتے تھے۔

**متقین کو ملنے والے انعامات:**

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ ۖ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۖ يَلْبَسُونَ مِنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَقَابِلِينَ ۖ كَذَٰلِكَ ۖ وَزَوْجُهُمْ فِي حُورٍ عِينٍ ۖ﴾

یہاں سے متقین کا ذکر فرما رہے ہیں۔ فرمایا: متقین ایسی جگہ پر ہوں گے جو امن والی ہو گی، باغات میں ہوں گے اور چشموں میں ہوں گے۔ باریک ریشم بھی پہنیں گے اور موٹی ریشم بھی پہنیں گے، آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ خوب صورت آنکھوں والی حوروں سے ہم ان کی شادیاں کرائیں گے۔

﴿يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ آمِنِينَ ۖ لَا يَذُقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۖ وَوَقَّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ۖ﴾

ہر قسم کے پھل منگوا کر کھائیں گے اور امن کے ساتھ رہیں گے۔ بس جو موت دنیا میں آئی تھی وہ آگئی اب یہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہوں گے، اللہ انہیں جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھیں گے۔

﴿فَضْلًا مِّن رَّبِّكَ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

یہ اللہ کا خاص کرم ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔  
واقعی یہ اللہ کا فضل ہے ورنہ ہمارے اعمال اس قابل نہیں ہیں کہ اس پر یہ نعتیں ملیں، یہ خدائی کا احسان ہے۔

### انسانی ضروریاتِ زندگی:

اب دیکھو درمیان میں جتنی باتیں ہیں یہ ساری آدمی کی ضرورتیں ہوتی ہیں:  
[1]: مکان بندے کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ﴾ کہ ہم ان کو گھر بھی دیں گے۔

[2]: آدمی کی ضرورت ہے لباس، فرمایا: ﴿يَلْبَسُونَ مِنْ سُندُسٍ وَاسْتَبْرَقٍ﴾ کہ لباس ہم ریشم کا دیں گے۔

[3]: آدمی کی ضرورت ہوتی ہے نکاح، فرمایا: ﴿وَوَجَّهْنَهُمْ بِحُودٍ عَيْنٍ﴾ ہم وہ بھی ان کو دیں گے۔

[4]: آدمی کی ضرورت ہوتی خوراک، فرمایا: ﴿يَكْنِي فَاكِهَةً﴾ کہ ہم یہ بھی دیں گے۔

رہائش، لباس، خوراک اور نکاح یہ بنیادی ضرورتیں ہیں اللہ یہ بھی دیں گے اور ان کے ساتھ مزید دو چیزیں اہم ہوتی ہیں:

[5]: کہ چیزیں ملیں اور امن کے ساتھ ملیں، فرمایا: ﴿أَمِينِينَ﴾ کہ امن کے

ساتھ ملیں گی۔

[6]: چیزیں ملیں اور پھر آدمی سے ناچھوٹیں، فرمایا: ﴿لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَى﴾ کہ ہم یہ بھی دیں گے۔

### نعمتوں کا استحضار کیجیے!

اب دیکھیں! مکان بھی دیں گے، بیوی بھی دیں گے، لباس بھی دیں گے، کھانا پینا بھی دیں گے، امن بھی دیں گے اور ہمیشہ کے لیے دیں گے، کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔ اللہ ہمیں اس کا استحضار عطا فرمادیں۔ بس تھوڑی سی مدت ہے اور یہ تھوڑی سی مدت عمل کی ہے۔ آپ یقین کریں کہ میں آپ کو اپنے دل کی بات نہیں سمجھا سکتا۔ میں تو اپنی بات کہتا ہوں۔ آپ تو بڑے ہیں آپ کی بات نہیں کرتا۔ سچی بات ہے میں تو کبھی رو پڑتا ہوں جب خلوت میں بات آتی ہے کہ اگر اللہ ہمیں کسی کافر کے گھر پیدا کرتے تو کیا ہوتا! بتاؤ ایمان میں ہمارا کیا دخل ہے؟ کس قدر خدا نے کرم کیا ہے کہ ایمان کی دولت دی... کسی جاہل کے گھر پیدا کرتے اور جاہل بنا دیتے تو کیا ہوتا! خدا کا کتنا بڑا کرم ہے کہ اللہ نے علم کے لیے منتخب کیا ہے۔ ہم لوگ جیسے کیسے بھی ہیں علم ہی پڑھتے ہیں، قرآن و حدیث ہی پڑھتے ہیں، علوم نبوت ہی پڑھتے ہیں، کہیں دائیں بائیں تو ہم نہیں جاتے... یہ خدا کا کتنا بڑا احسان ہے۔ اللہ ہمیں ان چیزوں کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمادے۔

### قرآن آسان ہے نصیحت کے لیے:

﴿فَإِنَّمَا يَسْتَرْزِقُكَ بِلسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ﴾

ہم نے قرآن کریم کو آپ کی زبان پر آسان کر دیا ہے تاکہ لوگ نصیحت

حاصل کریں۔

اس آیت اور اس جیسی دیگر آیات کی وجہ سے بعض لوگ دھوکہ دیتے ہیں۔ دھوکہ کیا دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ﴾<sup>138</sup> کہ ہم نے قرآن کو آسان بنا دیا ہے، ﴿فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ﴾ ہم نے قرآن کو آپ کی زبان پر آسان بنایا ہے... تو قرآن آسان ہے اور مولوی لوگ کہتے ہیں کہ قرآن بہت مشکل ہے، خود نہ پڑھنا، خود مطالعہ نہ کرنا بلکہ کسی عالم سے پڑھنا، دیکھو! قرآن کہتا ہے کہ بہت آسان ہے اور مولوی صاحب کہتے ہیں کہ بہت مشکل ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ سمجھیں کہ قرآن کریم جو کہتا ہے وہ بھی ٹھیک ہے اور جو ہم کہتے ہیں وہ بھی ٹھیک ہے۔ یہاں دو چیزیں ہیں؛ ایک یہ کہ قرآن کریم ہے تو بہت آسان لیکن اس آدمی کے لیے جس نے سیکھا ہو، اگر نہ سیکھا ہو تو پھر بہت مشکل ہے۔ آدمی چلانا جانتا ہو تو جہاز چلانا بھی بہت آسان ہے اور نہ جانتا ہو تو سائیکل چلانا بھی بہت مشکل ہے، اب کوئی بندہ کہے کہ جہاز چلانا بہت آسان ہے، دوسرا کہتا ہے کہ بہت مشکل ہے تو دونوں ٹھیک کہہ رہے ہیں کیونکہ جو کہہ رہا ہے کہ آسان ہے تو اس کے لیے آسان ہے جس نے سیکھا ہو اور جو کہہ رہا ہے کہ مشکل ہے تو اس کے لیے جس نے نہ سیکھا ہو۔ تو قرآن کریم بہت آسان ہے اس کا معنی ہے کہ جس نے سیکھا ہو اور بہت مشکل ہے اس کے لیے جس نے نہ سیکھا ہو۔

اور دوسرا اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہے قرآن کریم کا بطور وعظ و نصیحت ہونا اور ایک ہے قرآن کریم کا علمی مضامین کا حامل ہونا۔ پورے قرآن میں یہ نہیں ہے کہ قرآن پاک کے مضامین بہت آسان ہیں، جہاں بھی ﴿يَسَّرْنَا﴾ کا لفظ آیا ہے تو وہاں لفظ ہے ﴿يَسِّرْكَ﴾ یعنی بطور وعظ و نصیحت کے قرآن بہت آسان ہے یعنی اتنا

آسان ہے کہ اگر سامع توجہ اور ادب کے ساتھ قرآن کریم سنے اور اس کا معنی بھی سمجھ نہ آئے تب بھی قرآن اثر شروع کر دیتا ہے لیکن یہ ہے وعظ و نصیحت، اور ایک ہیں قرآن کے علمی مضامین تو بطور علمی مضامین کے قرآن کریم آسان نہیں اور بطور وعظ و نصیحت کے بہت آسان ہے۔

اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاجِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.



## سورة الجاثية

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿حَمْدٌ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿٢﴾ إِنَّ فِي

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٣﴾﴾

دلائل توحید:

یہاں شروع میں اللہ تعالیٰ نے دلائل توحید بیان فرمائے ہیں اور طرز میں تنوع رکھا ہے، الگ الگ طرز اختیار ہے۔ فرمایا: لُحْم، یہ کتاب اس اللہ کی جانب سے نازل کردہ ہے جو غالب حکمت والا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے دلائل ہیں۔

﴿وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿٤﴾﴾

اور تمہیں پیدا کرنے میں اور جانوروں کے پیدا کرنے میں دلائل ہیں ان کے لیے جو یقین رکھتے ہیں۔

﴿وَ اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ

فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفِ الرِّيْحِ آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٥﴾﴾

دن اور رات کے آنے جانے میں اور جو رزق خدا نے آسمان سے اتارا اور

اس کے ذریعے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا، اور ہواؤں کے چلنے میں دلائل ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔

یہاں یہ سمجھیں کہ تین لفظ الگ الگ لائے ہیں:

﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مَبِينٌ ... آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ... آيَاتٌ لِّقَوْمٍ

يَعْقِلُونَ﴾ اس کی وجہ یہ ہے کہ طبقات تین ہیں:

پہلا طبقہ: بعض وہ لوگ ہیں جو ایمان لاچکے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان میں سب سے زیادہ دلائل تو ان کے لیے ہیں جو ایمان لاچکے ہیں، یعنی اصل فائدہ ان کو ہے۔

دوسرا طبقہ: جو ایمان تو نہیں لایا لیکن اس کو یقین ہے کہ یہ دلائل توحید ہیں، اس کو بھی نفع ہو گا کہ وہ ایمان لے آئے گا۔

تیسرا طبقہ: وہ ایمان بھی نہیں لایا اور یہ دلائل توحید ہیں اس پر یقین بھی نہیں رکھتا لیکن اس کے پاس عقل سلیم موجود ہے، ایک وقت آئے گا کہ وہ یقین بھی کرے گا اور ایمان بھی لائے گا۔

اور وہ بندہ جو ایمان بھی نہیں لایا، جس کو یقین بھی نہیں ہے اور جس کے پاس عقل سلیم بھی نہیں ہے تو یہ شخص گمراہ ہے۔ آگے اس کا ذکر فرمایا:

﴿فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾

کہ اس کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو۔

**قرآن کریم سے فائدہ کب ہو گا؟**

تو اس قرآن کریم سے فائدہ کب ہے؟ جب اس پر ایمان لائے یا ایمان تو نہیں لایا لیکن اس کو یقین ہے کہ دلائل توحید ہیں، یہ یقین اس کو ایمان پر لے آئے گا، اور اگر ایمان بھی نہیں اور یقین بھی نہیں ہے لیکن عقل سلیم ہے، وہ سمجھتا ہے اور غور

کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا کہ وہ یقین بھی کرے گا اور ایمان بھی لائے گا۔

## ایام اللہ کا معنی:

﴿قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللَّهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا

بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾

فرمایا: ان ایمان والوں سے کہہ دو کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو ایام اللہ کی امید نہیں رکھتے یعنی قیامت کے دن کو نہیں مانتے۔

یہاں لفظ ہے ”اَيَّامَ اللّٰهِ“... ایام کا معنی ہمیشہ دن نہیں ہوتا بلکہ محاورات میں ایام، معاملات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور یہاں اس سے وہ معاملات مراد ہیں جو قیامت کے دن اللہ اپنے بندوں سے فرمائیں گے۔ مؤمنین کے ساتھ ایک معاملہ اور کفار کے ساتھ دوسرا معاملہ، مؤمنین کے ساتھ رحمت والا معاملہ اور کفار کے ساتھ عذاب والا معاملہ۔

یہاں یہ بات بھی فرمائی جاسکتی تھی کہ ایمان والے ان لوگوں سے درگزر کریں جو ایمان نہیں لائے، لیکن اس طرز کے بجائے یہ طرز اختیار کیا کہ ایمان والے ان لوگوں سے درگزر کریں جو آخرت کی امید نہیں رکھتے، جو قیامت کے دن کو نہیں مانتے... اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص امید نہ رکھتا ہو اور اچانک اس پر تکلیف آئے تو تکلیف بہت سخت ہوتی ہے اور اگر کسی تکلیف کے لیے بندہ پہلے سے ذہنی طور پر تیار ہو تو وہ اتنی سخت نہیں ہوتی۔ تو یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کے لیے عذاب بہت سخت ہو گا جس کی ان کو توقع بھی نہیں ہے، ان کو امید بھی نہیں ہے، جب اچانک پکڑے جائیں گے تو پھر یہ کہیں گے کہ ہمارے ساتھ یہ کیا ہوا؟

کسی بندے سے آپ کو توقع ہو کہ میں اس کے پاس جاؤں گا اور وہ مجھے برا

بھلا کہے گا تو آپ ذہنی طور پر تیار ہو کر جائیں گے۔ اب اگر وہ برا بھلا بھی کہے گا تو آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن کم ہوگی کیونکہ آپ پہلے سے ذہنی طور پر تیار کئے ہیں اور اگر یہ ذہن میں ہو کہ میں جاؤں گا تو جاتے ہی وہ کھانا کھلائے گا لیکن آپ گئے تو اس نے گالی دے کر آپ کو باہر پھینک دیا تو بتائیں کتنی تکلیف ہوگی کہ یار ہم نے کیا سوچا تھا اور یہ کیا ہوا؟ اس لیے یہاں فرمایا: ”لَا يَزُجُونَ“

### آیت کا شانِ نزول:

یہ آیت ﴿قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَزُجُونَ﴾ کب نازل ہوئی؟ اس بارے میں بعض کہتے ہیں کہ مکہ میں نازل ہوئی اور بعض کہتے ہیں کہ مدینہ میں نازل ہوئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مکہ میں کسی نے بہت سخت باتیں کیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جی چاہا کہ میں اس سے انتقام لوں تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ تم انتقام نہ لو بلکہ تم درگزر کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اس واقعے کے مطابق یہ آیت مکی ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ آیت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے۔ غزوہ بنی مصطلق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے ایک کنویں کے قریب پڑاؤ ڈالا جس کا نام مریسبع تھا۔ عبد اللہ بن ابی بن سلول منافق بھی اس لشکر کے ساتھ تھا۔ اس نے اپنے غلام کو بھیجا کنویں پر پانی لینے کے لیے، وہ دیر سے آیا تو اس نے پوچھا کہ دیر سے کیوں آیا ہے؟ اس نے کہا کہ وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غلام موجود تھا اور اس نے کسی کو بھی پانی بھرنے نہیں دیا جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مشکیزے نہیں بھرے گئے۔ مجھے اس وجہ سے دیر ہو گئی۔

اس پر عبد اللہ بن ابی ابن سلول بد بخت نے بہت سخت جملہ کہا تھا، اس نے کہا کہ ہم پر اور ان پر یہ مثال سچی آتی ہے ”سَمِعْنَا كَلْبَكَ يَا كَلْبُكَ“ العیاذ باللہ، العیاذ باللہ، ہمیں تو اس کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے، اس نے کہا کہ اپنے کتے کو خوب موٹا کرو کیونکہ یہ کل تجھے ہی کھائے گا۔ اس نے کتنا غلط یہ محاورہ استعمال کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتا چلا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں اس کی گردن اڑاتا ہوں۔ جبرائیل امین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئے یہ آیت لے کر ﴿قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ﴾

بعض کہتے ہیں کہ یہ آیت دومرتبہ نازل ہوئی ہے؛ ایک بار مکہ میں اور ایک بار مدینہ میں۔

### نزول مکرر کا معنی:

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھیں؛ اسے کہتے ہیں نزول مکرر کہ آیت مکہ میں بھی نازل ہوئی اور مدینہ میں بھی نازل ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ آیت تو ایک بار نازل ہو گئی، دوبار نازل ہونے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دومرتبہ نزول کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آیت نازل ہوتی ہے ایک مرتبہ، دوسری مرتبہ نازل نہیں ہوتی البتہ دوسری مرتبہ ایک موقع ایسا آتا ہے کہ جو اس آیت کے عمل کا ہوتا ہے تو جبرائیل امین علیہ السلام اس نازل شدہ آیت کو لے کر آتے ہیں کہ اس آیت پر عمل کرنے کا یہ موقع ہے اور مفسرین اسی کو نزول مکرر سے تعبیر فرمادیتے ہیں کہ یہ آیت دومرتبہ نازل ہوئی ہے۔

یہ اصول ذہن میں رکھیں گے تو بہت سارے مقامات پر الجھن ختم ہو جائے گی۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا تھا کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں تو جبرائیل امین آگئے یہ آیت لے کر۔ اب یہ آیت نازل تو مکہ میں ہوئی تھی لیکن

حضرت جبرائیل علیہ السلام مدینہ میں اس وقت لے کر آگئے کہ حضور! حضرت عمر کو بتائیں کہ اس آیت پر عمل کا یہی موقع ہے... اور مفسرین اس کو تعبیر کرتے ہیں نزول مکرر سے کہ آیت دوسری مرتبہ نازل ہوئی ہے۔

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ

لَا يَعْلَمُونَ﴾ (۱۷)

یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات سمجھائی ہے کہ بنی اسرائیل تھے ہم نے ان کو کتاب بھی دی، احکام کا علم بھی دیا، ان میں نبی بھی بھیجے، ان کو نفیس قسم کے رزق بھی دیے خاص رزق من اور سلویٰ جو بنی اسرائیل کو ملا ہے وہ کسی اور کو نہیں ملا، یہ آسانی دسترخوان ان کی خصوصیت ہے، اور بعض معاملات میں ہم نے ان کو جہاں والوں پر فضیلت دی ہے، پھر دلائل بھی دیے ہیں لیکن اس سب کے باوجود انہوں نے پھر بھی اختلاف کیا ہے ضد کی وجہ سے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ فرمائیں گے۔ تو یہ بنی اسرائیل کا معاملہ تھا۔

اب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: ﴿ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ اے پیغمبر! ہم نے آپ کو خاص شریعت دی ہے، آپ اسی کی اتباع کریں اور جو جاہل ہیں ان کی باتوں کی پروا نہ کریں۔

اس سے اب صاف پتا چلتا ہے کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی شرائع اور تھیں اور ہمارے پیغمبر کی شریعت اور ہے۔

**شریعت؛ عقائد اور مسائل کا نام**

شریعت میں دو چیزیں ہوتی ہیں: ایک ہیں عقائد اور ایک ہیں مسائل۔

عقائد میں گزشتہ انبیاء علیہم السلام اور ہمارے نبی کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہاں البتہ مسائل شریعت ان کے الگ تھے اور ہمارے الگ ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کی شریعت کا جو مسئلہ ہوتا ہے وہی مسئلہ ہماری شریعت کا بھی ہوتا ہے۔ تو اس کے لیے تو ضابطہ موجود ہے؛ ”شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا شَرِيعَتُنَا مَا لَمْ تُنْسخْ“ کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی شریعت ہماری بھی شریعت ہے، ان کے مسائل ہمارے بھی مسائل ہیں، ہاں اگر ان کو منسوخ کر دیا جائے تو پھر ان کے مسائل ہمارے مسائل نہیں رہتے، اور نسخ مسائل میں ہوتا ہے، نسخ عقائد میں نہیں ہوتا۔ کل عقیدہ اور ہو اور آج عقیدہ اور ہو ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے عقائد میں اختلاف نہیں ہے، صرف مسائل میں ہے۔

### سبب بندہ اختیار کرتا ہے:

﴿أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَغَشَّىٰ قَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ﴾

کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو خدا بنالیا اور خدا نے اس کو گمراہ کیا اور اللہ کے علم میں ہے کہ اس شخص نے اپنی خواہشات کو خدا بنالیا تھا۔

اب یہاں دیکھو! ﴿أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ﴾ پہلے ہے اور ﴿وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ﴾ بعد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کے لیے گمراہی کا فیصلہ اس وقت کرتے ہیں جب بندہ گمراہی کا راستہ پسند کرتا ہے۔ اس سے تقدیر کا اہم مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ اللہ رب العزت بندے کو اختیار دیتے ہیں کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا

ہے، وہ جس راستہ کا انتخاب کرتا ہے اللہ اس میں اس کو اسباب دے دیتے ہیں۔ تو لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا نے اس کو گمراہ کیا ہے، حالانکہ خدا نے گمراہ نہیں کیا ہو تا بلکہ خدا نے بندے کے کسب کے مطابق فیصلہ کیا ہوتا ہے۔

میں اس کی مثال دوں گا تو بات جلدی سمجھ آئے گی۔ ہم کہتے ہیں: بھائی! آپ کا جو تخصص ہے یہ شعبان تک ہے، یہ ہماری طرف سے فیصلہ ہے۔ ایک بندہ رجب میں آکر ہمیں کہتا ہے کہ میں نے گھر جانا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ چلے جاؤ۔ اس کے گھر والے پوچھیں کہ تو واپس کیوں آیا ہے؟ وہ کہے کہ مجھے استاد جی نے خود بھیجا ہے۔ بھائی ہم نے تو کہا تھا کہ آپ کا تخصص شعبان تک ہے لیکن ہم نے بیڑیاں نہیں لگائیں، زنجیر نہیں لگائی، تالا نہیں لگایا کہ آپ جانا چاہیں تو جا ہی نہیں سکتے، نکلنا چاہیں تو نکل ہی نہیں سکتے بلکہ آپ جانا چاہیں تو جاسکتے ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ خیر اور شر کے دو راستے دکھاتے ہیں اور بندے کو اختیار دیتے ہیں کہ یہ راستہ لو یا یہ راستہ لو! چاہو تو خیر کا راستہ لو اور چاہو تو شر کا راستہ لو، خیر کا لو گے تو جنت ملی گی اور شر کا لو گے تو جہنم ملے گی۔ اب پسند بندہ اپنی مرضی سے کرتا ہے شر کا راستہ تو اللہ اس کو شر کے راستے کی طاقت دے دیتے ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ نہ چاہیں تو بندہ شر کے راستے کی طرف نہیں جاسکتا! نہ چاہیں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ طاقت نہ دیں تو نہیں جاسکتا لیکن اللہ طاقت ہی نہ دیں تو امتحان کیسے ہو گا؟ اب اس راستے کو چاہتا بندہ ہے اور طاقت خدا دے دیتے ہیں۔

﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾<sup>139</sup>

تو مشیتِ عبد پر مشیتِ معبود غالب ہوتی ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ



آدمی گناہ اللہ کی رضا سے کر رہا ہے، اللہ کی مشیت کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اللہ ارادہ فرما دیتے ہیں لیکن اللہ اس پہ راضی نہیں ہوتے۔ تو خدا کا ارادہ اور بات ہے اور رضا اور بات ہے۔

﴿وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا

إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُم بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٣٤﴾﴾

کفار یہ کہتے تھے کہ ہماری زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے، یہی مرنا اور جینا ہے، اور یہ جو ہم پر موت آتی ہے تو اللہ نہیں مارتے بلکہ ہمیں زمانہ مارتا ہے۔ زمانے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے جو طبعی اعضاء ہیں ان اعضاء میں قوت ہے وہ آہستہ آہستہ کمزور ہوتے رہتے ہیں اور جب بالکل کمزور ہو جاتے ہیں تو بندہ مر جاتا ہے۔

دنیا میں کوئی بھی چیز ہے مثلاً اب یہ سپیکر ہے تو یہ چلتے چلتے گھس جائے گا اور ختم ہو جائے گا، تو وہ بھی یہی کہتے کہ اسی طرح ہمارے جسم کے اعضاء ہیں، اس میں بچپن ہے، جوانی ہے، بڑھاپا ہے، مدت پوری ہوتی ہے تو ختم ہو جاتے ہیں، یہ تھوڑا ہے کہ اللہ مارتا ہے۔

**زمانے کو گالی مت دو!**

﴿قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ لَا

رَيْبَ فِيهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٥﴾﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ بالکل جھوٹ بولتے ہیں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ فرمایا: آپ فرمادیں کہ اللہ ہی پیدا کرتا ہے اور اللہ ہی مارتا ہے۔ اصل میں دہر کہتے ہیں ازل تا ابد کے زمانے کو۔ پورے وقت کا نام دہر ہے لیکن مجازاً دہر کا اطلاق مخصوص وقت پر بھی ہوتا ہے۔ تھوڑے وقت کو بھی دہر کہہ دیتے ہیں۔

اور حدیث پاک میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَسْبُوا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الدَّهْرُ.<sup>140</sup>

دہر یعنی زمانے کو گالی مت دو اس لیے کہ اللہ ہی دہر ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں فرمایا؟ دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سمجھائی ہے کہ یہ جاہل لوگ جس کام کو دہر کا کام کہتے ہیں تو وہ حقیقت میں اللہ ہی کی قدرت اور طاقت کا نام ہے۔ اصل طاقت تو اللہ کی ہے کہ مارتے بھی اللہ ہیں، زندہ بھی اللہ کرتے ہیں۔ جو لوگ دہر کو برا کہتے ہیں تو اس کا نتیجہ تو اللہ تعالیٰ تک جا پہنچتا ہے۔ اس لیے سمجھایا کہ زمانے کو گالی کبھی نہ دینا۔

**جاشیہ سے کیا مراد ہے؟**

﴿وَتَزَىٰ كُلُّ أُمَّةٍ جَاشِيَةً كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَىٰ إِلَىٰ كِتَابِهَا آلِیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ ﴿٢٨﴾ هَذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِأَحْقِّ إِنَّا كُنَّا نَسْتَنسِخُ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٢٩﴾

قیامت کے دن آپ ہر جماعت کو دیکھیں گے کہ وہ گھٹنوں کے بل پڑے ہوں گے اور ہر جماعت کو ان کے نامہ اعمال کی طرف بلایا جائے گا اور یہ کہا جائے گا: آج تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ یہ ہماری لکھوائی ہوئی کتاب ہے جو تمہارے بارے میں حق سچ بولے گی۔ ہم دنیا میں لکھواتے تھے جو کام تم کرتے تھے۔

”جَاشِيَةً“ جُثُو سے ہے جس کا معنی ہوتا ہے گھٹنے ٹیکنے یعنی اس طرح بیٹھنا کہ آدمی کے گھٹنے اور پاؤں کے پنجے زمین پر لگیں۔ قیامت کے دن ہر بندہ اس طرح ہو

اس پر اشکال یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور بہت سارے صلحاء رحمہم اللہ ایسے ہیں جن کو قیامت کے دن خوف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، اللہ ان کو محفوظ رکھیں گے۔ پھر اس کا مطلب کیا ہوا؟ جواب یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ معاملہ سب کے ساتھ ہو گا لیکن ان کے ساتھ یہ معاملہ اتنی کم مدت کے لیے ہو گا کہ اس کو اگر شمار کریں تو گویا ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوا ہی نہیں ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ جاثیہ سے مراد گھٹنے کے بل نہیں ہے بلکہ جاثیہ کا معنی کہ جیسے نماز میں بیٹھتے ہیں یوں سب بیٹھے ہوں گے اور یہ بیٹھنا خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ عظمت کی وجہ سے ہو گا۔ اب اس پر کوئی اشکال ہی نہیں۔

### قیامت کے دن اللہ بھلا دیں گے کا معنی:

﴿وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنْسِفُكُمْ كَمَا نَسِيفُكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا وَمَا وَكُمُ

النَّارُ وَمَا تَكُمُ مِنَ النَّاصِرِينَ﴾

قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا کہ آج ہم تمہیں اپنی رحمت سے دور کر دیں گے، کیونکہ دنیا میں تم نے اس سے ملاقات کو بھلا دیا تھا، تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔

تو یہاں ”نَنْسِفُكُمْ“ کا معنی یہ نہیں ہے کہ اللہ ان کو بھول جائیں گے بلکہ معنی یہ ہے کہ ان کو نظر انداز کر دیں گے یعنی ان کی طرف دھیان نہیں فرمائیں گے۔ جیسے دنیا میں کوئی بندہ کسی کو سزا دیتا ہے اور بھول جاتا ہے اور بعد میں یاد ہی نہیں رہتا کہ اس کو چھوڑنا بھی تھا۔ تو اللہ تعالیٰ ایسا کریں گے تو نہیں لیکن معاملہ ایسا ہو گا جیسا اللہ کسی کو سزا دے کر بھول جائیں۔

﴿ذِكْرُكُمْ بَلَّغْتُكُمْ اتَّخَذْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا وَغَرَّتْكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا

فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿٢٥﴾ ﴿٢٥﴾

اس وجہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق بناتے تھے، دنیا کی زندگی نے تمہیں دھوکہ دیا ہوا تھا۔ آج قیامت کے بعد نہ تو ان کو جہنم سے نکالا جائے گا اور نہ ہی ان کو کوئی موقع دیا جائے گا۔ تدارک کی ان کے پاس کوئی صورت نہیں ہوگی۔

اللہ رب العزت ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین  
وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الاحقاف

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿حَمْدٌ ۖ تَنزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ مَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بَأْحَقٍّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَمَّا أُنذِرُوا مُعْرِضُونَ ۝﴾

**دلائل توحید کا بیان:**

یہاں اللہ رب العزت نے توحید پر دلائل بیان فرمائے ہیں اور دلائل کی جتنی قسمیں ہیں ساری بیان فرمائی ہیں۔ دلائل کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

1: دلیل عقلی 2: دلیل نقلی

اور دلیل نقلی میں پھر دو قسم کی دلیلیں ہوتی ہیں؛ ایک دلیل وہ جو آسمانی کتاب میں ہو اور ایک دلیل وہ جو پیغمبر کی زبان سے ہو۔ تو یہاں تینوں قسم کے دلائل بیان فرمائے ہیں۔

﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَوَاتِ ۚ﴾

اے پیغمبر! آپ ان سے فرمائیں کہ یہ جو تم اللہ کے علاوہ اوروں کی عبادت

کرتے ہو تو یہ بتاؤ کہ جن کو تم خدا بناتے ہو کیا انہوں نے زمین کی کوئی چیز پیدا کی ہے؟ یا آسمانوں کی تخلیق میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ یہ عقلی دلیل ہے۔

﴿إِنَّمَا نُبَيِّنُ مِنْ قَبْلِ هَذَا﴾

تمہارے اس دعوے پر اگر اس سے پہلے کسی کتاب، تورات، انجیل، زبور یا کسی آسمانی صحیفے میں کوئی بات درج ہے تو میرے پاس لاؤ! یہ دلیل نقلی ہے۔

﴿أَوْ آثَرَةٍ مِّنْ عَلَمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾

یا کسی پیغمبر کی زبان سے کوئی بات نکلی ہو، کوئی علمی بات ہو تو بتاؤ اگر تم سچے ہو تو یہ بھی دلیل نقلی ہے۔ ”آثَرَةٍ“ یہ مصدر ہے سخاوت کے وزن پر۔  
تو اللہ نے تینوں قسم کے دلائل یہاں بیان فرمائے ہیں۔

**حضرت عبد اللہ بن سلام کا اسلام:**

﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنَ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَآءِيلَ

عَلَىٰ مِثْلِهِ فَأَمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠﴾﴾

یہاں یہ بات بنی اسرائیل کو سمجھائی ہے۔ فرمایا: یہ بتاؤ کہ اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہو۔ قرآن تو ہے ہی اللہ کی طرف سے، چونکہ وہ اس کا انکار کرتے تھے اس لیے ان کو سمجھانے کے لیے یہ بات کہی ہے۔ تو اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہو اور تم لوگوں نے اس کا انکار کر دیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک صاحب علم اس کے حق میں گواہی دے اور اس پر ایمان لے آئے اور تم تکبر میں پڑے رہو تو پھر تمہاری بات مانی جائے یا ان کی مانی جائے؟ اس پیغمبر پر ایمان تو بنی اسرائیل کے بڑے بڑے لوگ بھی لائے ہیں۔

اب ﴿شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَآءِيلَ﴾ یہ عام ہے، رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی آمد سے پہلے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے تھے تو وہ بھی شامل ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے وقت کے جو لوگ ہیں جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وہ بھی شامل ہیں کیونکہ انہوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے لوگ بھی شامل ہیں جو آپ کی تصدیق کریں گے، آپ پر ایمان لائیں گے۔ تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے، حضور کی موجودگی میں اور حضور کے بعد کے لوگ سب شامل ہیں۔

بہت سارے مفسرین نے ”شاہد“ سے مراد حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو لیا ہے حالانکہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اسلام لائے ہیں اس آیت کے نازل ہونے کے بعد لیکن جب شاہد کو عام مان لیا جائے تو اگر آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی اسلام لے آئیں تو پھر بھی اشکال نہیں ہے۔

### یہودیوں کا دوہرا معیار:

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ یہودی ان کو اپنا بڑا عالم سمجھتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن سلام نے جب اسلام قبول کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ لوگ مجھے اچھا سمجھتے ہیں کیونکہ انہیں ابھی یہ نہیں پتا کہ میں نے کلمہ پڑھ لیا ہے۔ آپ ان سے میرے بارے میں رائے معلوم کریں تو پتا چل جائے گا کہ میرے بارے میں یہ کیا کہتے ہیں؟ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار چند یہود کو بلا کر پوچھا کہ عبد اللہ بن سلام تم میں کیسے آدمی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ جی بڑے آدمی ہیں، بڑے باپ کے بیٹے ہیں، اچھے آدمی ہیں، اچھے باپ کے بیٹے ہیں۔ فرمایا کہ اگر وہ کلمہ پڑھ لیں تو....؟ یہودیوں نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا! عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اس وقت

پر دے میں چھپے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عبد اللہ بن سلام ذرا سامنے آؤ! تو انہوں نے آکر سب کے سامنے کلمہ پڑھا تو یہودیوں نے کہا کہ یہ بہت گندا آدمی ہے، گندے باپ کا بیٹا ہے۔ فوراً تبدیل ہو گئے۔ اسے کہتے ہیں ضد۔

### سلام کو رواج دو!

اور عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سب سے پہلے میں نے جو حدیث سنی تھی وہ یہ تھی:

أَيُّهَا النَّاسُ، أَفْشُوا السَّلَامَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصَلُّوا الْأَرْحَامَ، وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ.<sup>141</sup>

اے لوگو! السلام علیکم کو پھیلاؤ، لوگوں کو کھانا کھلاؤ، رشتہ داری کا خیال کرو اور رات کو نماز پڑھو جب لوگ سوئے پڑے ہوں، تم امن کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اب دیکھو! اس کھانے میں غریب امیر کا تذکرہ نہیں کہ مالدار کو کھلاؤ یا غریب کو کھلاؤ بلکہ فرمایا کہ کھانا کھلاؤ، امیر غریب سب اس میں شامل ہیں۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں چار باتیں ارشاد فرمائی ہیں؛ ایک دوسرے کو سلام کہنا۔ ہمیں اس چیز کا خیال کرنا چاہیے، اللہ آپ کو مقام عطا فرمائے، اللہ آپ کو عزت دے، اچھی مسند عطا فرمائے، آپ کسی جگہ پر جائیں اور بچے آپ کے استقبال میں کھڑے ہوں تو سلام آپ کو کرنا چاہیے، ایسا کبھی نہ کریں کہ جائیں اور بچے کہیں السلام علیکم، یہ خلاف سنت ہے، جو جاتا ہے اس کا حق ہے کہ وہ سلام کرے اور بچے ”وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“ جواب دیں۔



## حضرت عبداللہ بن سلام کے تین سوالات:

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سوال کیے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں آپ سے ایسے تین سوال کرتا ہوں جن کے جوابات اللہ کے نبی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، آپ ان کے جوابات دیں تو میں اسلام قبول کروں گا!

1: پہلا سوال یہ تھا: ”مَا أَوَّلُ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ“ کہ علاماتِ قیامت میں سب سے پہلی علامت کون سی ہے؟ اس سے مراد اس وقت کی علامت ہے جب قیامت بالکل قریب ہوگی۔

2: دوسرا سوال یہ تھا: ”وَمَا أَوَّلُ طَعَامٍ يَأْكُلُهُ أَهْلُ الْجَنَّةِ“ جنت میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے اہل جنت کون سا کھانا کھائیں؟

3: تیسرا سوال یہ تھا: ”وَمِنْ أَيِّ شَيْءٍ يَنْزِعُ الْوَلَدُ إِلَى أَبِيهِ وَمِنْ أَيِّ شَيْءٍ يَنْزِعُ إِلَى أَخَوَاتِهِ“ کہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو کبھی وہ باپ کے مشابہ ہوتا ہے اور کبھی اس کی شکل اپنے ماموں کی طرح ہوتی ہے یعنی کبھی وہ اپنی ماں کے مشابہ ہوتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں سوالوں کا جواب دیا:

◆ علاماتِ قیامت میں سب سے پہلی علامت کون سی ہے؟ فرمایا: ”أَمَّا أَوَّلُ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ فَنَارٌ تَخْشُرُ النَّاسَ مِنَ الْمَشْرِقِ إِلَى الْمَغْرِبِ“ پہلی علامت ایک آگ ہوگی جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی طرف جمع کرے گی۔

◆ اہل جنت کا پہلا کھانا کون سا ہوگا؟ فرمایا: ”وَأَمَّا أَوَّلُ طَعَامٍ يَأْكُلُهُ أَهْلُ الْجَنَّةِ فَرِيَاذَةُ كَبِدِ حُوتٍ“ کہ اہل جنت کو جنت میں سب سے پہلے مچھلی کے جگر پیش

کیے جائیں گے۔ دعا کریں اللہ ہم سب کو یہ نعمت عطا فرمائیں۔ آمین

♦ بچہ کبھی باپ کے مشابہ کبھی ماں کے مشابہ تو اس کی وجہ؟ فرمایا: ”وَأَمَّا الشَّبَهُ فِي الْوَلَدِ فَإِنَّ الرَّجُلَ إِذَا عَشِيَ الْمَرْأَةَ فَسَبَقَهَا مَاءُوهَا كَانَ الشَّبَهُ لَهُ وَإِذَا سَبَقَ مَاءُوهَا كَانَ الشَّبَهُ لَهَا“ کہ کبھی ماں کا پانی سبقت لے جاتا ہے تو ماں کی طرح ہوتا ہے اور کبھی باپ کا پانی سبقت لے جاتا ہے تو باپ کی طرح ہوتا ہے۔<sup>142</sup>

**اللہ سے عافیت مانگیے!:**

﴿إِنَّ الدِّينَ قَالُوا رَبَّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

يَحْزَنُونَ ﴿١٣﴾﴾

جو لوگ کہتے ہیں ”رَبَّنَا اللَّهُ“ کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر ڈٹ جاتے ہیں تو نہ ان پر خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

ڈٹ جانے کا معنی ہوتا ہے کہ ایک تو ایمان پر قائم رہتے ہیں اور دوسرا ایمان کے مقتضیات پر عمل کرتے ہیں، یہ استقامت ہے۔ استقامت، شریعت کا اعلیٰ درجہ ہے جسے عزیمت کہتے ہیں، رخصت، ادنیٰ درجہ ہے۔ آدمی کو استقامت مانگنی نہیں چاہیے لیکن اگر آجائے تو اختیار کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگیں اور رخصت پر عمل کرنے کا مزاج بنائیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ جب بھی آپ کو دو چیزوں کے بارے میں اختیار دیا جاتا تو آپ جو چیز آسان ہوتی اس کو اختیار فرماتے، اس کی وجہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود تو صاحب استقامت اور صاحب

عزیمت تھے لیکن امت کے لیے ایسا کیا تاکہ امت کے لیے آسانی پیدا ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام جیل میں تھے اور جیل میں قیدی نے خواب دیکھا، آپ علیہ السلام نے تعبیر بتائی تو قیدی بری ہو گیا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ بادشاہ سے میرا تذکرہ کرنا یعنی بادشاہ سے ذکر کرنا کہ جیل میں ایک ایسا شریف بندہ بھی ہے۔ وہ تذکرہ کرنا بھول گیا۔ کچھ عرصے بعد بادشاہ کو خواب آیا، اس نے تعبیر پوچھی تو تعبیر دینے والوں نے معذرت کی کہ یہ خیالات ہیں، ان کی تعبیر نہیں ہوتی۔ وہ بندہ جو یوسف علیہ السلام کے ساتھ قیدی رہ چکا تھا اس نے کہا کہ جی جیل میں ایک آدمی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے پوچھوں۔ یہ وہاں گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے یوسف علیہ السلام سے پوچھا کہ میرے دوست! اس خواب کی تعبیر بتاؤ۔ آپ علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بتائی۔ جب بادشاہ نے خواب کی تعبیر سنی تو اس نے کہا کہ ان کو بلا کر لاؤ! جب بلانے کے لیے گئے تو انہوں نے فرمایا:

﴿فَسَلِّطْ مَا بَالَ النِّسْوَةِ الَّتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ﴾<sup>143</sup>

کہ میں بعد میں آؤں گا پہلے اس واقعے کی تحقیق تو کرو کہ جب ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، ان سے پوچھو کہ انہوں نے ہاتھ کیوں کاٹے تھے! تاکہ صفائی ہو تو پھر باہر جاؤں، میں الزام لے کر باہر نہیں جانا چاہتا۔

یوسف علیہ السلام نے جب یہ فرمایا تو بادشاہ نے عورتوں کو بلا کر پوچھا:

﴿قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُنَّ يُوسُفَ عَنْ نَفْسِهِ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ

مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْءٍ﴾<sup>144</sup>

کہ تمہارا کیا معاملہ تھا جب تم نے یوسف کو ورغلانے کی کوشش کی تھی؟ تو انہوں نے اعتراف کیا کہ ہمارا قصور ہے، یہ ہم نے کیا تھا، یوسف بالکل بری ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یوسف علیہ السلام کی جگہ میں ہوتا تو میں فوراً باہر آجاتا۔<sup>145</sup>

اللہ کے نبی نے امت کو یہ تعلیم دی ہے۔ چونکہ پہلے صفائی ہو اور پھر باہر آئیں تو یہ عزیمت کا راستہ ہے اور جب بادشاہ نے رہائی دی ہے تو اس کو قبول کرو یہ رخصت کا راستہ ہے۔ تو یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کا مزاج بنایا ہے۔ اس لیے صاحب عزیمت دنیا میں بہت کم لوگ ہوا کرتے ہیں، یہ ہر آدمی کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس لیے رخصت پہ گزارا کرو کہ اس میں آسانی بہت ہے۔ عزیمت اگر اختیار کرنی ہے تو سوچ سمجھ کر اختیار کرنی ہے، بس پھر واپس نہیں آنا چاہیے، آدمی جب عزیمت کے راستے سے واپس آتا ہے تو پھر ہزاروں لوگوں کا ایمان تباہ ہو جاتا ہے۔ میں بطور خاص طلبہ سے کہتا ہوں کہ فراغت کے بعد آپ نے راستہ اختیار کرنا ہے تو سوچ سمجھ کر کرنا!

### ہدف کے انتخاب میں دو چیزوں کا خیال کریں!

بس خلاصہ ذہن میں رکھیں! آپ نے کام کیا کرنا ہے اسے ہدف کہتے ہیں۔ جب آپ ہدف کا تعین کر لیں تو پھر اس ہدف تک پہنچنے کے لیے بندے کا انتخاب کریں اور بندے کا انتخاب کرنے کے لیے دو چیزیں ہیں:

[1]: استشارہ

ایک تو اپنے ساتھ محبت کرنے والے سمجھدار آدمی سے مشورہ کریں کہ میں

فلاں سے تعلق رکھوں یا نہیں؟ مشورہ جس سے کرنا ہے اس میں دو صفتیں ہونی چاہئیں:

ایک یہ کہ وہ آپ کا خیر خواہ ہو اور دوسرا یہ کہ وہ عقلمند ہو، سمجھدار ہو۔

جبکہ ہماری حالت یہ ہوتی ہے کہ ہم اس سے مشورہ کرتے ہیں جو کبھی

سمجھدار نہیں ہوتا اور جو سمجھدار ہوتا ہے تو کبھی وہ خیر خواہ نہیں ہوتا۔

[2]: استخارہ... استخارہ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ سے خیر کو طلب کرنا۔

استشارہ لوگوں سے ہوتا ہے اور استخارہ اللہ سے ہوتا ہے۔ استشارہ؛ استخارہ

سے زیادہ مفید ہوتا ہے، کیونکہ جب ہم کسی سے مشورہ لیتے ہیں تو وہ جو بھی مشورہ دیتا

ہے وہ ہمیں سمجھ آجاتا ہے، اور ایک بندے نے استخارہ کیا، اللہ سے خیر طلب کی، اب

اللہ نے کیا فیصلہ کیا ہے یہ ہمیں پتا نہیں چلتا، تو اصل استشارہ ہوتا ہے اور استخارہ کرنا ہے

تو وہ کرے جس کا اپنا کام ہوتا ہے، لوگوں کی عجیب حالت ہوتی ہے کہ کام اپنا ہوتا ہے او

استخارہ دوسروں سے کراتے ہیں۔

میرا ایک مرید ہے، میں اس کے گھر رات ٹھہرا تو مجھے وہ صبح کہنے لگا: مولانا

صاحب! استخارہ کرتے ہیں؟ میں نے کہا کہ کرتا ہوں۔ اب مجھے پتا تھا کہ اس کے بعد

اس نے کیا کہنا ہے؟ کہتا ہے کہ میں نے شادی کے لیے استخارہ کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ

میں استخارہ تو کرتا ہوں لیکن اپنے کام کے لیے، شادی تو نے کرنی ہے اور استخارہ میں

کروں؟! اگر میں نے استخارہ کیا اور میرے خواب میں وہ آگئی اور مجھے پسند آگئی تو پھر

اب میں تیرے لیے اللہ سے مانگوں گا یا اپنے لیے اللہ سے مانگوں گا؟ (مسکراہٹ از

سامعین) اس لیے اپنا استخارہ خود کرتے ہیں۔

تو یہ باتیں طے کرو! نمبر 1 کہ ہدف کا تعین اور نمبر 2 کہ ہدف تک پہنچنے کے

لیے فرد کا تعین... اور فرد کے تعین میں جلدی نہ کرو، استشارہ کرو... استخارہ کرو! جب

فرد کا تعین ہو جائے تو پھر سب کچھ اس پہ لٹا دو۔ کبھی ہدف متعین نہیں کرتے اور کبھی

فرد کے تعین میں جلد بازی کرتے ہیں، اس لیے پھر زندگی بھر الجھن رہتی ہے، کبھی ادھر تو کبھی اُدھر، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر پھسل جاتے ہیں۔

### حقوق اللہ اور حقوق العباد:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا طَحَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَ  
وَضَعَتْهُ كُرْهًا ط وَحَمَلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ط﴾<sup>146</sup>

یہاں اللہ رب العزت نے بطور خاص حقوق العباد کا ذکر کیا ہے۔ بنیادی حقوق دو ہیں؛ ایک حق اللہ اور دوسرا حق العبد۔ پہلے حقوق اللہ کا ذکر کیا ہے کہ توحید کا خیال کرو اور شرک سے بچو، اپنے اعمال کا خیال کرو اب اس کے بعد حق العبد آرہا ہے اور حقوق العباد میں سب سے اہم حق والدین کا ہے، اس لیے اس کا تذکرہ فرمایا اور والدین میں سب سے اہم حق ماں کا ہے، اس لیے اس کا ذکر فرمایا۔

ایک شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے یہ بتائیں کہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہاری ماں، پھر فرمایا: تمہاری ماں، پھر فرمایا: تمہاری ماں،<sup>147</sup>

تو ماں کا ذکر تین بار فرمایا اور پھر والد کا ذکر فرمایا۔ اس لیے ماں کا حق سب سے زیادہ ہے۔

تو اللہ نے فرمایا: ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے، اس کی ماں اسے مشقت برداشت کرتے ہوئے اپنے پیٹ میں اٹھائے

146۔ الاحقاف 15:46

147۔ صحیح البخاری، رقم: 5971

رکھتی ہے، اور مشقت برداشت کر کے اس بچے کو جنتی ہے، پھر بچے کو گود میں رکھتی ہے، دودھ پلاتی ہے اور پھر اس کا دودھ چھڑاتی ہے اور اس میں تیس ماہ لگا دیتی ہے۔

﴿حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ اَشُدَّهُ وَبَلَغَ اَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى الْوَالِدَيْنِ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ ثُبْتُ لِاٰتِيْكَ وَاِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ (١٦)

یہاں تک کہ جب یہ اپنی بھرپور جوانی کو پہنچا ہے اور بعد میں مزید بڑھتا ہوا چالیس سال کی عمر میں پہنچتا ہے تو اللہ سے دعائیں مانگتا ہے کہ اے اللہ! مجھے توفیق دیں کہ میں آپ کی ان نعمتوں کا جو آپ نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائی ہیں میں ان پر آپ کا شکر ادا کروں، میں ایسے نیک اعمال کروں جن سے آپ راضی ہو جائیں اور آپ میری اولاد کو بھی نیک بنادیں۔ اے اللہ! میں آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔

### شانِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ:

بہت سارے مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کے اول مصداق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عمر اٹھارہ سال تھی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بیس سال تھی۔ تو یہ اکٹھے تجارت کے لیے گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے مال کا مضارب بن کر تجارت کی۔ مال اُن کا تھا اور محنت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی اور پرافٹ آدھا آدھا تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس سفر میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت متاثر ہوئے۔ بس پھر آپ کی یاری لگ گئی اور آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معقد بن گئے اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال ہوئی تو

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عمر اڑتیس سال تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت فرمایا، صدیق اکبر نے کلمہ پڑھ لیا۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ”حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ“ کہ جب خوب جوانی کو پہنچے اٹھارہ سال کے ہو کر تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت قریب ہو گئے اور ”وَبَلَغَ أَزْبَعَيْنَ سَنَةٍ“ کہ جب چالیس سال کے ہو گئے تو صدیق اکبر نے یہ دعا مانگی تھی۔ یہ جو فرمایا: ”وَأَنْ أَعْمَلَ صَاحِبًا تَرْضَاهُ“ کہ مجھے توفیق دے کہ میں نیک عمل کروں جس سے اللہ تو راضی ہو جائے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بارہ غلام آزاد فرمائے۔ اور فرمایا: ”وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي“ کہ میری اولاد کو بھی نیک کر۔ تو صدیق اکبر وہ واحد صحابی ہیں کہ جن کے والدین اور اولاد سب کو صحابیت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی چار پشتیں صحابی ہیں، صدیق اکبر کے والد ابو قحافہ اور والدہ ام رومان، خود صدیق اکبر، پھر آپ کی بیٹیاں اور بیٹے اور آگے آپ کے نواسے۔ رضی اللہ عنہم

### وجہ فضیلت صدیق اکبر:

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ انبیاء علیہم السلام کے بعد امت میں سب سے افضل شخص ہیں۔ افضلیت کی وجہ صحابیت ہے، اعمال نہیں۔

[1]: اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ وہ واحد شخص ہیں جن کو قرآن نے صحابی کہا

ہے ﴿إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾<sup>148</sup>، اس لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ سے افضل ہیں۔



[2]: صدیق اکبر رضی اللہ عنہ صحابی ہیں اور صحابی کی وجہ فضیلت صحابیت ہے، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں جن کی چار پشتیں صحابی ہیں، اس لیے آپ تمام صحابہ سے افضل ہیں۔

[3]: صحابی کی وجہ فضیلت صحابیت ہے اور صحابیت صحبت سے ہے، اس کا مطلب جس کو صحبت جتنی زیادہ ملی ہے اتنا افضل ہے اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سب سے زیادہ ملی ہے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو اتنی صحبت نہیں ملی جتنی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ملی ہے۔ کیونکہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا تو دس سال کے بعد انتقال فرما گئی تھیں، باقی ازواج مطہرات جو آئی ہیں سب ان کے بعد کی ہیں اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تو پہلے دن کے ساتھی ہیں، تیس سالہ صحبت اور پھر سفر اور حضر کے ساتھی ہیں۔

[4]: میں چوتھی وجہ فضیلت پیش کرنے لگا ہوں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں کہ جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی خلوت کی صحبت ملی ہے جو کسی اور کو میسر نہیں۔ غارِ ثور میں تین دن اور تین راتیں یہ واحد ابو بکر صدیق تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور اس کا ذکر قرآن نے کیا ہے ﴿ثَانِيِ اثْنَيْنِ اِذْهُمَا فِي الْغَارِ﴾<sup>149</sup> ایسا شخص دنیا میں کوئی نہیں جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی صحبت ملی ہو۔

### صدیق اکبر کی پسند تین چیزیں:

اور بندہ حیران ہوتا ہے کہ اللہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کیسی صحبت

عطا کی تھی۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

حُبِّبَ إِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا ثَلَاثٌ.

کہ میری محبوب ترین چیزیں تین ہیں۔

[۱]: ان میں پہلی چیز ”الْتَّظَرُ إِلَى وَجْهِ رَسُولِ اللَّهِ“ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو دیکھنا۔ اللہ نے صدیق کی یہ خواہش کیسے پوری کی کہ تین دن غار میں ہیں اور سوائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے اور کام بھی کوئی نہیں ہے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار میں صدیق اکبر ایسے مگن تھے کہ سانپ نے ڈس لیا، شدت سے تکلیف ہوئی، آنکھ سے آنسو نکلا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور پر گرا۔ اس کا معنی یہ تھا کہ صدیق اکبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت میں اس قدر محو تھے کہ آپ کو احساس ہی نہیں ہوا کہ میری آنکھ کا آنسو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر گر رہا ہے۔ احساس ہوتا تو صدیق اکبر کبھی نہیں گرنے دیتے۔ جو شخص سانپ کا زہر برداشت کر رہا ہے اور ران کو حرکت نہیں دے رہا تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر آنسو کیسے گرائے گا؟! کیسی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی۔

[۲]: اور فرمایا: ”أَنْفَقُ مَالِي عَلَى أَمْرِ رَسُولِ اللَّهِ“ کہ حضور کی خواہش ہو اور مال میرا ہو۔ آپ نے خرچ کیا اور مثال قائم کر دی۔

[۳]: ”أَنْ تَكُونَ بِبَيْتِي تَحْتَ رَسُولِ اللَّهِ“ کیسے الفاظ ہیں! فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ میری بیٹی ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ بنے۔

**نکاح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا:**

پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی نو سال کی بیٹی حضرت امی عائشہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح میں دی ہے۔

میں کئی باریہ باتیں عرض کرتا ہوں کہ ہم چونکہ شادی کو شہوت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے کوئی شاگرد اپنے استاد کو کبھی اپنی بہن نکاح میں نہیں دے گا، کوئی مرید اپنے پیر کو کبھی اپنی بیٹی کا نکاح نہیں دے گا۔ اس کی وجہ کہ دماغ میں شہوت ہے، اور اگر یہ بات ہو کہ اللہ نے قرآن میں بیوی کو سکون کا ذریعہ فرمایا ہے:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا

150﴾ إِلَيْهَا

کہ اللہ نے تمہی میں سے یعنی تمہاری جنس انسان میں سے تمہاری بیویوں کو پیدا ہے تاکہ تم کو ان سے سکون ملے۔

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا

151﴾ لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا

کہ اللہ نے تمہیں ایک جان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا فرمایا اور اسی سے اس کی بیوی کو بنایا تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے!

اب آپ دیکھ لیں کہ اللہ نے جب بیوی کا ذکر کیا تو فرمایا کہ میں نے عورت کو پیدا فرمایا تاکہ مرد کو سکون ملے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اگر مرید کے دل میں ہو کہ اس سے میرے شیخ کو سکون ملے گا، شاگرد کے دل میں ہو کہ میرے استاد کو سکون ملے گا تو پھر مزاج الگ ہوتا ہے۔ یہ چونکہ ہمارے ذہن میں تصور ہی نہیں ہے اس لیے یہ مزاج پھر نہیں بن پاتا۔ میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ ہم دوسری شادی اور تعدد نکاح کے بارے میں اس لیے صحیح رخ پر نہیں آرہے کہ ہمارے ہاں نکاح کا معنی سمجھ میں

نہیں آ رہا۔ ہم نکاح کو شہوت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں جبکہ شریعت نکاح کو سکون کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خواہش کیا تھی کہ بیٹی میری ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو راحت ملے اور بیوی سے بڑھ کر کوئی کسی کو راحت نہیں دے سکتا اگر بیوی اچھی مل جائے تو... اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ راحت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ اپنی نو سال کی بیٹی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں دی اور اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر باون سال تھی۔

مجھے ایک سفر میں ایک ساتھی نے کہا کہ مولانا صاحب! باقی تو ٹھیک ہے لیکن اتنی چھوٹی عمر اور اتنا بڑا شوہر... بات دل کو نہیں لگ رہی۔ میں نے کہا کہ آپ کے دل کو نہیں لگ رہی کیونکہ آپ صرف پڑھتے ہیں اور میرے دل کو لگتی ہے کیونکہ میں نے اس عمر میں چھوٹی لڑکی سے شادی کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح نکاح کامیاب ہوتا ہے اور یہ نکاح کتنا اچھا ہوتا ہے! آپ لوگوں کی محض تھیوریاں ہوتی ہیں اور ہمارا پریکٹیکل ہے۔ اس لیے صوفیاء ذوقی لوگ ہوتے ہیں، وہ اپنے ذوق اور وجدان سے چیزوں کو محسوس کرتے ہیں، اس لیے دلائل ان پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

حضرت رائے پوری رحمہ اللہ اپنے خلیفہ سے فرمانے لگے کہ ذکر کبھی نہ چھوڑنا، مولوی فتویٰ دیں پھر بھی نہ چھوڑنا۔ اب جس بندے نے ذکر کی حلاوت کو چکھا ہی نہیں ہے، ذکر کے فوائد کو دیکھا ہی نہیں ہے، ذکر کی حقیقت سے واقف ہی نہیں ہے وہ تو پریشان ہو گا کہ لوگ کیا کہیں گے! اس لیے حضرت اوکاڑوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ کامیاب مناظر وہ ہوتا ہے کہ جو دلائل کے ساتھ ساتھ طریقت کو بھی جانتا ہو، جو طریقت کو نہیں سمجھتا وہ کامیاب مناظر نہیں ہو سکتا۔

اس لیے کہ وجدان طریقت سے آتا ہے اور یہ آتا ہے صحبت سے۔ تو جب

ایک شخص کا ذوق صحیح نہیں ہے، وجدان کی کیفیت اس کے پاس نہیں ہے، کیفیات اس پر نہیں آتیں تو وہ کیا سمجھے گا کہ شیخ کی توجہ کا مرید کی توجہ میں کیا دخل ہوتا ہے اور شیخ کے خیال کو مرید کے خیال میں کیا دخل ہوتا ہے۔ جو ان مراحل سے گزرا نہیں ہے وہ تو اس کو شرک کہہ کر ٹال دے گا، کبھی اس کو ہندوانہ چیزیں کہہ دے گا۔ وہ شخص جو کسی خانقاہ میں رہا ہو، کسی شیخ کے پاس بیٹھا ہو، شیخ کی مجلس سے مستفید ہوا ہو، شیخ کا عکس اس کے قلب پر آیا ہو تو اس کو یہ بات سمجھ آئے گی۔

اس لیے کہتے ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عکس رسول ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں اور عجیب بات ہے کہ جتنی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اتنی عمر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ہے۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سال چھوٹے تھے اور دو سال بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جا ملے۔

### صحابہ میں آئیڈیل شخصیت:

سارے صحابہ رضی اللہ عنہم ہمارے لیے آئیڈیل ہیں۔ مجھ سے کوئی پوچھے تو حضرات صحابہ میں سے میرے آئیڈیل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔ صدیق اکبر سے زیادہ جری اور شجاع کوئی نہیں ہے اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔ ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے پوچھا:

أَخْبِرُونِي مَنْ أَشْبَحُ النَّاسِ؟

بتاؤ! لوگوں میں سب سے زیادہ دلیر شخص کون ہیں؟ لوگوں نے کہا: امیر

المؤمنین آپ ہیں۔ فرمایا: نہیں بلکہ دلیر آدمی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں۔<sup>152</sup>

## پہلا مسئلہ: حمل کی کم از کم مدت

یہاں ایک بات سمجھیں۔ یہاں فرمایا:

﴿وَحَمْلُهُ وَفِضْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾

ایک مسئلہ چلتا ہے کہ حمل کی کم از کم مدت کیا ہے؟ تو حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسی آیت سے استدلال فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اللہ نے یہاں فرمایا: ﴿وَحَمْلُهُ وَفِضْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾ کہ حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَالْوَالِدَتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾<sup>153</sup>

کہ دودھ پلانے کی مدت تو دو سال ہے۔

اور یہاں کل مدت بتائی ہے اڑھائی سال۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مدت رضاعت تو ہوتی ہے دو سال، باقی بچیں گے چھ ماہ، تو حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوا چھ ماہ کے بعد۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس پر حد جاری کرو! کیونکہ عام عادت یہ ہوتی ہے کہ بچہ نو ماہ کے بعد پیدا ہوتا ہے اور کم از کم سات ماہ بعد پیدا ہوتا ہے، عام عادت یہی ہوتی ہے۔ تو یہ چھ ماہ بعد کیسے پیدا ہوا؟ اس پر حد جاری کرو! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں، اس پر حد جاری نہ کرو، اس لیے کہ قرآن مجید میں حمل اور رضاعت کی مدت ملا کر تیس ماہ بتائے گئے ہیں اور دوسری آیت میں رضاعت کی مدت چوبیس ماہ ہے۔ تیس سے چوبیس نکالیں تو باقی چھ ماہ بچتے ہیں۔ اس لیے اقل

مدت حمل چھ ماہ ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔<sup>154</sup>  
تو حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے اور زیادہ سے زیادہ مدت کتنی ہو سکتی ہے؟ تو  
بعض کے ہاں یہ دو سال ہے، بعض کے ہاں چار سال ہے۔ حنفیہ کے ہاں حمل کی زیادہ  
سے زیادہ مدت دو سال ہے۔

### دوسرا مسئلہ: مدت رضاعت

دوسرا مسئلہ ہے مدت رضاعت کہ ماں بچے کو کتنے سال تک دودھ پلا سکتی  
ہے؟ تو قرآن کریم میں ہے کہ مدت رضاعت دو سال ہے۔

باقی حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر یہ ایک الزام ہے کہ آپ  
اکثر مدت رضاعت اڑھائی سال مانتے ہیں اور یہ قرآن کریم کی آیت ﴿وَالْوَالِدَتُ  
يُرْضَعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ کے خلاف ہے۔

اس کا جواب اچھی طرح سمجھیں۔ حضرت امام صاحب کا موقف یہ ہے کہ یہ  
جو آیت کریمہ ہے ﴿وَالْوَالِدَتُ يَرْضَعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ جس سے  
آپ استدلال کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اکثر مدت رضاعت دو سال ہے اگر اس  
آیت میں غور کیا جائے تو اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ مدت رضاعت اس کے بعد بھی  
ہے، کیونکہ اللہ رب العزت نے آگے اسی آیت میں فرمایا ہے:

﴿فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ  
عَلَيْهِمَا﴾

کہ مدت رضاعت دو سال ہے۔ پھر یہ ”فا“ تعقیب مع الوصل کے لیے ہے۔

اب یہاں ”فا“ کا معنی ”پس“ نہیں کرنا۔ ہر جگہ اس کا معنی ”پس“ نہیں کرتے۔ کبھی ”فا“ تعلیلیہ ہوتا ہے تو وہاں معنی ہوتا ہے ”اس لیے“... اور کبھی ”فا“ تعقیب مع الوصل کے لیے ہوتا ہے تو وہاں اس کا معنی ہوتا ہے ”بعد میں“... اب یہاں چونکہ ”فا“ ہے اس لیے اس آیت کا معنی ہو گا کہ ”اس کے بعد اگر وہ دودھ چھڑانا چاہیں آپس کی رضامندی اور باہمی مشاورت سے تو کوئی حرج نہیں ہے۔“

تو اگر مدتِ رضاعت ہے ہی دو سال تو اب دو سال کے بعد مشورے کی کیا ضرورت ہے؟ مشورہ تب ہی ہو گا کہ جب اس کے بعد دودھ پلانے کی گنجائش ہوگی۔ تو اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ مدتِ رضاعت دو سال سے زائد بھی ہو سکتی ہے۔

اس کی مثال دوں گا تو بات زیادہ سمجھ آئے گی۔ مثلاً ہمارے ہاں نمازِ ظہر ہوتی ہے پونے دو بجے اور عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے ساڑھے تین بجے۔ اب ہم پونے دو بجے نماز نہیں پڑھتے کیونکہ سبق ہو رہا ہے یا بیان ہو رہا ہے اور کہتے ہیں کہ مؤخر کرو! ہم کہتے ہیں کہ ہماری نماز تو ہے پونے دو بجے لیکن اگر مشورے کے ساتھ اڑھائی بجے پڑھ لو تو بھی ٹھیک ہے۔ لیکن یہ کب ہو گا کہ جب پونے دو بجے کے بعد نماز کا وقت باقی ہو گا۔ اگر نماز کا وقت ہے تو پونے دو بجے لیکن مشورے کے ساتھ اڑھائی بجے بھی کرنا چاہیں تو صحیح تب ہی ہو گا جب پونے دو بجے کے بعد نماز کی گنجائش ہوگی، گنجائش نہ تو پھر کیسے کہیں گے کہ مشورے سے اڑھائی بجے کر دو؟! اب ہمارے ہاں ساڑھے تین بجے نماز کا وقت ختم ہو رہا ہے تو اگر ساڑھے تین کے بعد مشورے کے ساتھ پونے چار بجے ظہر کی نماز پڑھیں تو کیا ٹھیک ہے؟ نہیں، کیونکہ اب وقت ختم ہو گیا ہے۔ تو اس آیت میں ”فا“ بتا رہا ہے کہ دو سال کے بعد بھی گنجائش ہے۔

اور دوسری یہی آیت ہے:

﴿حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمَلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾



”حَمَلَتْهُ“ سے مراد ہے بچے کا ماں کے پیٹ میں ہونا۔ ”وَضَعَتْهُ“ سے مراد ہے بچے کو جننا۔ آگے ”حَمَلَهُ“ ہے۔ اب اس حمل سے کیا مراد ہے؟ یا تو حمل کا معنی ہے کہ بچے کا ماں کے پیٹ میں ہونا۔ ماں کے پیٹ میں بچہ ہو تو اسے بھی حمل کہتے ہیں اور اگر ماں کی گود میں بچہ ہو تو اسے بھی حمل کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْبَةَ ثُمَّ لَمْ يُحْمِلُوا كَمَثَلِ الْجِبَارِ

يَحْمِلُونَ أَثْقَالًا﴾<sup>155</sup>

اب ان بنی اسرائیل کے پیٹ میں تو کتا ہیں نہیں بلکہ باہر ہیں تو اس کو بھی حمل کہتے ہیں۔

اب حمل کے دو معنی ہو گئے۔ یہاں حمل کا معنی کون سا ہو گا؟ تو اگر یہاں حمل کا معنی یہ ہو کہ ماں کا بچے کو پیٹ میں رکھنا۔ تو اب اس کا معنی ہو گا کہ بچے کا پیٹ میں رکھنا، پھر جننا اور پھر گود میں رکھنا ان سب کی مدت ہے اڑھائی سال۔ اب یہاں مدت رضاعت دو سال ہی ہوگی، کیونکہ اقل مدت حمل چھ ماہ ہے تو اکثر مدت رضاعت دو سال ہوگی... اور اگر حمل سے مراد ہو ماں کا بچے کو گود میں اٹھانا تو اب اس کا معنی ہو گا کہ ماں نے بچے کو پیٹ میں رکھا، پھر ماں نے بچے کو جننا، پھر اپنی گود میں اٹھایا اور دودھ پلاتی رہی تیس ماہ۔ اب اکثر مدت رضاعت اڑھائی سال ہوگی۔

اب یہاں معنی کون سالیں۔ تو امام صاحب کا موقف یہ ہے کہ قرینہ یہاں اس بات پر ہے کہ یہاں حمل سے مراد گود اٹھانا ہو کیونکہ یہاں پر ماں کی تین مشقتیں بیان کی جا رہی ہیں۔ اگر حمل سے مراد ہو ماں کا بچے کو پیٹ میں رکھنا وہ تو پہلے آچکا ہے ”حَمَلَتْهُ أُمُّهُ“ میں تو اب یہاں حمل سے مراد بچے کا پیٹ میں ہونا نہیں ہے بلکہ گود

میں ہونا ہے۔

اب اس آیت کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مدتِ رضاعت اڑھائی سال ہے لیکن وہ جو آیت ہے: ﴿وَالْوَالِدَتُ يُرَضِّعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُنْعِمَ الرِّضَاعَةَ﴾ اس میں ”کَامِلَيْنِ“ اور ”أَنْ يُنْعِمَ“ یہ دو لفظ ایسے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مدتِ رضاعت صرف دو سال ہے۔ اب اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال ہے۔ اس لیے امام صاحب کا موقف یہ ہے کہ اکثر مدتِ رضاعت تو ہے دو سال لیکن اگر کوئی بچہ دو سال کے بعد اور اڑھائی سال میں دودھ پی لے تو ہم رضاعت کی مدت تو اسے نہیں کہتے لیکن چونکہ اس کی طرف اشارہ نکلتا ہے اس لیے جب مسئلہ حرمتِ رضاعت کا آجائے گا تو وہاں مدتِ اڑھائی سال بتائی جائے یعنی اگر کوئی پوچھے کہ فلاں لڑکی ہے اس نے فلاں عورت کا دودھ پیا ہے اور میں نے بھی اس عورت کا دودھ پیا ہے تو حرمتِ رضاعت کب تک ہوگی؟ تو اس سے پوچھا جائے کہ اس وقت تمہاری عمر کتنی تھی؟ کہا کہ جی! سوا دو سال، تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ مدتِ رضاعت تو گزر گئی ہے لہذا نکاح حلال ہونا چاہیے تھا لیکن چونکہ اڑھائی سال کی ایک شق بھی نکلتی ہے اس لیے احتیاط یہی ہے کہ وہاں مدتِ رضاعت اڑھائی سال مان لو تا کہ حرمتِ رضاعت میں احتیاط ہو جائے۔ تو امام صاحب اکثر مدتِ رضاعت دو سال ہی مانتے ہیں اور اڑھائی سال یہ مدتِ رضاعت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ حرمتِ رضاعت کے مسئلہ میں اڑھائی سال کو احتیاطاً استعمال فرماتے ہیں۔

### گُرْہَا اور گُرْہَا میں فرق:

یہاں لفظ ہے ”گُرْہَا“، جو شخص از خود مشقت برداشت کرے اسے گُرْہَا کہتے ہیں۔ ماں جو مشقت برداشت کرتی ہے وہ کسی کے مجبور کرنے سے نہیں بلکہ بذاتِ خود برداشت کرتی ہے، اور جو شخص کسی کے مجبور کرنے کی وجہ سے مشقت برداشت

کرے تو اسے کُڑھا کہتے ہیں۔ جیسے ”لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ“<sup>156</sup> یہ کُڑھا سے ہے۔

### جنات کا مسلمان ہونا:

﴿وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ

قَالُوا اَنْصِتُوا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِينَ ﴿٢٦﴾﴾

اور جب ہم نے جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف متوجہ کیا تھا تاکہ وہ آپ سے قرآن سنیں۔ جب جنات آپ کے پاس آئے تھے تو آپس میں کہنے لگے کہ خاموش رہو۔ جب تلاوت مکمل ہو چکی تو یہ جنات اپنی قوم کے پاس چلے گئے انہیں ڈراتے ہوئے۔

نزولِ قرآن سے پہلے جنات اوپر جاتے تھے اور کچھ خبریں سنتے تھے۔ پھر اس میں جھوٹ ملا کر کاهنوں کو بتاتے تھے۔ نزولِ قرآن کے بعد جب وہ اوپر جاتے تو ان کو شہاب ثاقب لگے اور خبریں آنا بند ہو گئیں۔ انہوں نے بیٹھ کر مشورہ کیا کہ وجہ کیا بنی ہے؟ تو مشرق، مغرب، شمال، جنوب تمام اطراف میں جنات دوڑے کہ پتا تو چلے اس کا سبب کیا ہے؟! اسی تلاش میں تھے کہ ان کی ایک جماعت بطنِ نخلہ میں تلاش کرتے کرتے آپہنچی۔ اس دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چند صحابہ کو بطنِ نخلہ میں فجر کی نماز پڑھائی۔ بطنِ نخلہ سے آگے مقامِ عکاظ میں ایک میلہ لگتا تھا جس میں دکانیں بھی تھیں اور لوگ دور دراز سے اس بازار میں آتے اور خرید و فروخت کرتے تھے۔ غالباً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا کے اس بازار میں دعوت دینے کے لیے جانا چاہتے ہوں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے تو جنات کی جو جماعت شہاب

ثاقب لگنے کی وجہ تلاش کر رہی تھی اس نے قرآن سن لیا۔ اس وقت ان کو سمجھ آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو قرآن اتر رہا ہے، جو وحی آرہی ہے اسی وجہ سے ہمیں اوپر جانے سے روک دیا گیا ہے۔ یہ جنات قرآن سننے کے بعد واپس چلے گئے۔ جا کر اطلاع دی اور یہ مسلمان ہو گئے۔ ابھی تک اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں نہیں تھا۔ جب سورۃ الجن نازل ہوئی تو پھر پتا چلا کہ میرے قرآن سننے کی وجہ سے بہت سارے جنات مسلمان ہو چکے ہیں۔

### جنات کی دعوت:

ان جنات نے واپس جا کر اپنے لوگوں کو دعوت دی، کہا:

﴿يَقَوْمَنَا آجِبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ

وَيُخْرِكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٦٦﴾﴾

اے ہماری قوم! اللہ کی طرف بلانے والے کی بات کو مان لو، اس پر ایمان لے آؤ، اللہ تمہارے گناہوں کو معاف فرمادے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔

یہاں ”يَغْفِرَ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ“ نہیں فرمایا بلکہ ”يَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ

ذُنُوبِكُمْ“ فرمایا ہے۔ یہ ”مِنْ“ تبغیضیہ ہے، یہ بتانے کے لیے کہ سارے گناہ ایمان لانے سے معاف نہیں ہوتے، حقوق العباد باقی رہ جاتے ہیں، حقوق اللہ معاف ہو جاتے ہیں لیکن حقوق العباد ایمان لانے سے بھی معاف نہیں ہوتے بلکہ ان کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ ہاں صرف شہید کے بارے میں ایک حدیث میں ہے کہ اگر بندہ شہید ہو جائے اور اس پر کوئی حق ہو تو اللہ اپنے خزانے سے وہ حق ادا فرمائیں گے اور شہید کی خلاصی ہو جائے گی۔ یہ ایک روایت میں موجود ہے۔

## اولو العزم انبیاء علیہم السلام کی طرح صبر کیجیے!

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ ۚ كَانَتْهُمْ يَوْمَ يَزُورُونَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۚ بَلَّغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ﴾

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ پاک نے فرمایا: آپ ان کی تکلیفوں پر صبر کریں اور ایسے صبر کریں جیسے اولو العزم انبیاء علیہم السلام نے صبر کیا تھا۔

یہاں ”مِنَ الرُّسُلِ“ میں مَن تعینہ نہیں بلکہ بیانیہ ہے کیونکہ جتنے انبیاء علیہم السلام ہیں سارے اولو العزم ہیں، کوئی نبی ایسا نہیں جو صاحب عزیمت نہ ہو۔ ہاں عزیمت کے درجات ہیں، اس لیے انبیاء کے بھی درجات ہیں۔ عام طور پر جب فن تفسیر میں اولو العزم انبیاء علیہم السلام کہا جائے تو ان سے مراد وہ پانچ نبی ہوتے ہیں جس کا تذکرہ اس آیت میں ہے:

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾<sup>157</sup>

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام۔ تو یہاں بھی اس کا معنی یہی ہے کہ جیسے یہ انبیاء علیہم السلام صاحب عزیمت تھے تو آپ بھی اسی طرح رہیں۔ اللہ رب العزت ہمیں قرآن سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورۃ محمد

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ۝۱﴾ وَالَّذِينَ  
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ كَفَّرَ  
عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝۲﴾

سورت محمد کا ایک نام سورت قتال بھی ہے کیونکہ اس میں جہاد کا تذکرہ بہت زیادہ ہے۔

### کفار اور مؤمنین کا انجام:

فرمایا: جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستے سے دوسروں کو روکا تو اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے ہیں۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ نازل ہوا اس پر ایمان لائے، ﴿وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ﴾ اور جو کچھ رب کی طرف سے نازل ہوتا ہے وہ برحق ہے۔ تو ان ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والوں کے اللہ گناہ معاف فرما دیتا ہے اور ان کے احوال کو بھی ٹھیک کر دیتا ہے۔

﴿وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ﴾ .... محاورات عرب میں بال حالت کو بھی کہتے ہیں اور

دل کو بھی کہتے ہیں۔ اگر بال سے مراد دل ہو تو معنی یہ ہو گا کہ اللہ ان کے دلوں کی اصلاح فرماتے ہیں اور اگر بال سے مراد احوال ہوں تو پھر معنی ہو گا کہ اللہ ان کے حالات کو درست فرمادیتے ہیں۔

### جنگی قیدیوں کا حکم (ایک تعارض کا حل:)

﴿فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنْتُمُوهُمْ

فَشُدُّوا الرُّبُوعَ ۖ فَمَا مَنَّا بَعْدُ ۖ وَمَا فِدَاءٌ حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ۖ﴾

یہاں اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ جب جنگ ختم ہو جائے اور لوگ قید ہو جائیں تو پھر ان کے بارے میں دو اختیار ہیں؛ چاہیں تو ان قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کر دیں اور اگر چاہیں تو بغیر فدیہ لیے آزاد کر دیں۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے لیکن سورۃ الانفال کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آزادی نہیں بلکہ ان کو قتل کرنا ہے۔

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْغِنَ فِي الْأَدْرِ ۖ تَرِيدُونَ

عَرَضَ الدُّنْيَا ۗ وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۖ﴾

جب بدر کے قیدی گرفتار ہوئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا کہ ان کا کیا کریں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے رشتہ دار میرے حوالے کریں، صدیق کے رشتہ دار ان کے حوالے کریں، عثمان کے رشتہ دار ان کے حوالے کریں کہ اپنے اپنے رشتہ دار کو لیں اور ان کی گردنیں کاٹ دیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ان کو آزاد کر دینا چاہیے شاید یہ کلمہ پڑھ لیں اور ان کی نسلیں آگے اسلام قبول کر لیں۔ باقی جو شہید ہو گئے ہیں تو وہ جنت میں جائیں گے، یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مزاج تھا۔ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر کی رائے کے مطابق فیصلہ فرمایا۔ اس پر قرآن کریم کی یہ

آیات اتریں ﴿مَا كَانَ لِنَبِيِّ أَنْ يَكُونَ لَهُ امْرَأَةٌ حَتَّى يُلَاقِيَ فِي الْأَرْضِ ۖ وَاللَّهُ يُرِيدُ الْأُخْرَةَ ۖ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ ﴿٢٤﴾ لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٢٥﴾ اور تنبیہ کی گئی کہ پیغمبر کو یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ کا عذاب آجاتا تو حضرت عمر بن خطاب اور حضرت سعد بن معاذ کے علاوہ کوئی نہ بچتا۔ اللہ نے کرم کیا کہ خدا کا عذاب نازل نہیں ہوا۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ قیدی کو آزاد کرنا جائز نہیں بلکہ اسے قتل کیا جائے۔ تو بظاہر ان دونوں آیت میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ حاکم وقت کو چار اختیار ہیں:

- 1: جب لوگ قیدی ہو جائیں چاہے تو ان کو قتل کر دے۔
- 2: ان کو غلام بنادے۔
- 3: فدیہ لے کر ان کو آزاد کر دے، اور فدیہ میں پیسے بھی ہیں اور قیدیوں کا تبادلہ بھی ہے یا فدیہ میں کوئی بھی چیز رکھ لیں۔
- 4: فدیہ کے بغیر آزاد کریں اور کچھ بھی نہ لیں۔

حاکم کو یہ چار اختیار ہیں۔ جنگ بدر کے موقع پر یہ بات سخت اس لیے تھی کہ ابھی مسلمان کمزور تھے، طاقت میں نہیں تھے اور طاقت ور کفر گرفتار ہوا تھا۔ منشا یہ تھی کہ ان کو قتل کریں تاکہ کفر کی طاقت ٹوٹ جائے اور جب اسلام طاقت میں ہو تو پھر اہل اسلام کو پورا اختیار ہے کہ جو بھی صورت اختیار کریں جائز ہے۔ تو حاکم وقت کو چاروں اختیار ہیں۔ دو وہاں سے ثابت ہیں اور دو یہاں سے ثابت ہیں۔



## مشروعیتِ جہاد کی حکمت:

﴿وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَكِنْ لَيَبْلُوَنَّكُمْ بِبَعْضِ﴾

یہاں اللہ رب العزت نے جہاد کی ایک حکمت بیان فرمائی ہے۔ پہلی قوموں پر عذاب آجاتا تو وہ قومیں تباہ ہو جاتیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم آج بھی چاہیں تو عذاب دے کر تباہ کر سکتے ہیں لیکن ان کو عذاب دے کر تباہ کرنے کے بجائے ہم نے جہاد کا حکم دے دیا ہے ﴿قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ بِأَيِّدِيكُمْ﴾ یہ بھی عذاب کی ایک شکل ہے لیکن اس میں حکمت کیا ہے؟ اس میں حکمت یہ ہے ﴿وَلَكِنْ لَيَبْلُوَنَّكُمْ بِبَعْضِ﴾ کہ اللہ امتحان لیتا ہے مسلمانوں کا کہ یہ اپنا مال اور جان اللہ کے راستہ میں پیش کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر مجرمین پر خدا کا عذاب آسمان سے آتا اور وہ تباہ ہو جاتے تو مسلمانوں کا یہ امتحان نہ ہوتا۔ ایک مقصد تو مسلمانوں کا امتحان ہے۔

دوسرا فائدہ کہ اس میں کافر کا امتحان ہے کہ کافر میدانِ جنگ میں فتوحات کو دیکھ رہا ہے، اللہ کی مدد مسلمانوں کے ساتھ دیکھ رہا ہے، اب اس مدد کو دیکھ کر وہ کلمہ پڑھتا ہے یا نہیں؟ تو اس میں ہم نے دونوں کا امتحان رکھنا تھا۔

## شہداء کے انعامات:

﴿وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَنْ يُضِلَّ أَعْمَالُهُمْ﴾

پھر وہ مسلمان جو میدانِ جنگ میں قتل ہو جائیں تو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ نے یہاں پر ان کے انعامات کا ذکر کیا ہے:

[1]: ﴿فَلَنْ يُضِلَّ أَعْمَالُهُمْ﴾ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ فاتح بننا اور قاتل بننا اصل

ہے اور مقتول ہو جائے تو بندہ ختم ہو گیا۔ فرمایا: اس نے جہاد کیا ہے اور مقتول ہوا ہے تو ہم اس کا اجر اس کو دیں گے اور ان کے اعمال کو ضائع نہیں کریں گے۔

[2]: ﴿سَيَهْدِيهِمْ﴾ اور ان کی رہنمائی جنت کی طرف کریں گے کہ یہ بندہ جنت میں جائے گا۔

[3]: ﴿وَيُضِلُّهُمْ بِالْهَمِّ﴾ کہ ان کے دل یا ان کے احوال کی اصلاح کر دیں گے۔

[4]: ﴿وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَفَهَا لَهُمْ﴾ کہ اللہ انہیں جنت میں داخل فرمائیں گے۔

پہلے جو گزرا ﴿سَيَهْدِيهِمْ﴾ تو اس کا معنی بھی جنت کا راستہ ہے اور یہاں ﴿وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَفَهَا لَهُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جنت میں داخل کرنے کے بعد مزید انعام بھی عطا فرمائیں گے۔ اور فرمایا: ﴿عَرَفَهَا لَهُمْ﴾ کہ جنت میں جانے والا ہر چیز کو ایسے پہچانے گا جیسے دنیا میں رہ کر اپنے گھر کو پہچانتا ہے۔

اب دیکھو! ایک آدمی کی سوحوریں ہیں اور اچانک اسے دی جائیں تو اس کو تو نام ہی نہیں آتے لیکن اللہ ماحول ایسا بنا دیں گے کہ وہ سمجھے گا کہ یہ میرا مکان ہے، یہ میرا گھر ہے جس طرح آدمی دنیا میں رہتے ہوئے اپنی بیوی کو پہچانتا ہے، اپنے گھر کو پہچانتا ہے، اپنا مقام سمجھتا ہے، اسی طرح جب جنت میں جائے گا تو اپنا گھر، اپنا مکان اور اپنی بیوی ہر چیز کو پہچانتا ہو گا۔ ﴿وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَفَهَا لَهُمْ﴾ کا معنی یہی ہے۔

**اللہ ایمان والوں کا دوست ہے:**

﴿أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ دَمَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۚ وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَالُهَا ۚ﴾ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَى لَهُمْ ﴿١٠٦﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ زمین میں نہیں چلے پھرے کہ یہ دیکھ لیتے کہ

ان سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کا انجام کیسا ہوا؟! اللہ نے ان کو تباہ کر دیا اور ان کافروں کے لیے بھی اسی طرح کا عذاب ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت ایمان والوں کے مولیٰ ہیں اور کفار کا کوئی مولیٰ نہیں ہے۔

یہاں یہ فرمایا کہ اللہ ایمان والوں کا مولیٰ ہے، کفار کا مولیٰ نہیں ہے حالانکہ دنیا میں کفار کے بھی مولیٰ ہوتے ہیں۔ دراصل یہاں مولیٰ حقیقی مراد ہے کہ حقیقی مالک اور مولیٰ مسلمان کو ملا ہے اور حقیقی مالک اور مولیٰ کفار نے چھوڑ دیا ہے، اس لیے اللہ کو چھوڑ کر ان کفار کے پاس کوئی مولیٰ نہیں ہے۔

### عالم کو ”مولانا“ کہنا درست ہے:

یہاں جو بات سمجھنی ہے وہ صرف یہ کہ ابھی ایک نیا فتنہ رونما ہوا ہے، بات چل رہی ہے کہ کسی عالم کو ”مولانا“ کہنا ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ ”مولا“ تو کہتے ہیں اللہ کو جیسے یہاں فرمایا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ تو عالم کیسے ”مولانا“ ہو گیا؟ اس لیے عالم کو مولانا نہیں کہنا چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ”مولا“ کا معنی ایک نہیں ہے، مولا کے چھبیس کے لگ بھگ معانی ہیں اور خود قرآن کریم نے مولا کے لفظ کو کئی معنوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ جس قرآن کی آیت آپ پیش کرتے ہیں کہ اس میں ”مولا“ اللہ کو فرمایا گیا ہے اسی قرآن کریم میں ”مولا“ کا لفظ اللہ کے علاوہ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔

◆ آپ دیکھیں کہ سورۃ التحریم میں ہے: ﴿وَ اِنْ تَظْهَرَا عَلٰیہِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰہُ وَ جَبْرِیْنِ وَ صٰلِحِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَ الْمَلِٰکَۃُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظٰہِرٌ﴾<sup>158</sup> کہ

پیغمبر کا مولا اللہ ہے، ”وَجِبْرِیلُ“ اور جبرائیل بھی نبی کا مولا ہے، ”وَصَالِحُ الْمَوْمِنِینَ“ اور نیک صالح مومنین بھی نبی کے مولا ہیں، ”وَالْمَلَائِکَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِیرٌ“ اور اس کے علاوہ باقی ملائکہ بھی نبی کی مدد کے لیے موجود ہیں۔

تو اس آیت میں تو ”مولا“ جبرائیل علیہ السلام کو بھی کہا گیا ہے، ایمان والوں کو بھی فرمایا گیا ہے اور ”مولا“ بھی نبی کا فرمایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولا کا معنی صرف آقا نہیں ہوتا بلکہ مولا اور معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

♦ جس طرح اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

”مَنْ كُنْتُ مَوْلَا فَعَلَيْ مَوْلَاہُ“<sup>159</sup>

اب دیکھو! یہاں ”مولا“ کا لفظ دوستی کے معنی میں ہے لیکن بعض لوگوں نے یہاں ”مولا“ کا معنی خلیفہ لے لیا ہے حالانکہ یہاں ”مولا“ کا معنی دوستی ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھانا چاہتے ہیں کہ جو مجھ سے محبت کرنا چاہتے ہیں وہ میرے علی سے محبت کریں، جو مجھ سے دوستی رکھتا ہے تو وہ علی سے بھی دوستی رکھے، علی میرا محبوب ہے۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں یہ بات سمجھائی۔

خلاصہ یہ ہے کہ ”مولا“ کا ایک معنی نہیں ہے، مولا کے کئی معانی ہیں۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ ”مولا“ اضداد میں سے ہے یعنی ”مولا“ ایسا لفظ ہے کہ جس کے متضاد معانی ہیں۔ مولا کا معنی آقا بھی ہے اور مولا کا معنی غلام بھی ہے۔ یہ جو ایک لفظ ”موالی“ ہے یہ مولا کی جمع ہے اور مولا مالک کو بھی کہتے ہیں اور غلام کو بھی کہتے ہیں۔

تو ہمارے ہاں جو اہل علم کے لیے ”مولانا“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اصل لفظ

ہے ”مولوی“ یہ نسبت مولا حقیقی کی طرف ہے کہ یہ اللہ والا ہے اور جب ہم کسی کو کہیں ”مولانا“ تو یہاں مولانا کا معنی یہ نہیں ہے کہ یہ اللہ ہے، بلکہ ہمارے ہاں مولانا کا لفظ عزت کا لفظ سمجھا جاتا ہے اور علماء کرام کے لیے یہ لفظ ہمارے معاشرے کی ایک اصطلاح بن چکا ہے۔ آپ دیکھیں کہ ایک بندہ ہمارا مخالف ہوتا ہے اور ہم اسے بھی مولانا کہہ رہے ہوتے ہیں، اس کو عزت ہم اس معنی میں تھوڑا دیتے ہیں کہ ہمارا سردار ہے، ایسا نہیں ہوتا لیکن چونکہ عرف میں یہ ایک محاورہ بن گیا کہ مولوی کے لیے مولانا کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اہل حق ہو تو اسے بھی مولانا کہہ دیتے ہیں اور اہل باطل ہو تو اسے بھی مولانا کہہ دیتے ہیں جس سے مقصود کوئی خاص معنی نہیں ہوتا، صرف اتنا مقصد ہوتا ہے کہ یہ لفظ ”مولانا“ عالم کے لیے استعمال ہوتا ہے اور عرف میں یہ بات آگئی ہے۔

### جنت کی نہریں:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعدَ الْمُتَّقُونَ ۖ فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ ۖ وَأَنْهَارٌ مِنْ لَبَنٍ لَمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ ۖ وَأَنْهَارٌ مِنْ خَمْرٍ لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ ۖ وَأَنْهَارٌ مِنْ عَسَلٍ مُصَفًّى ۖ﴾

یہاں اللہ رب العزت نے جنت کی چار نہروں کا ذکر فرمایا ہے:

- [1]: پانی کی نہر جو بالکل صاف ہوگی۔
- [2]: دودھ کی نہر جس کا ذائقہ تبدیل نہیں ہوگا۔
- [3]: شراب کی نہر جو لذت والی ہوگی، کڑوی نہیں ہوگی، بدبودار نہیں ہوگی۔
- [4]: شہد کی نہر جو بالکل صاف ستھری ہوگی۔

یہ نہریں جنت میں جاری فرمائیں گے۔ وہ جنت کا ماحول ہوگا، دنیا میں تھوڑی

دیر دودھ پڑا رہے تو پھٹ جاتا ہے، فرمایا وہاں ایسا نہیں ہوگا، اور یہاں دنیا میں شہد نکالتے ہیں تو کبھی شہد میں کوئی چھتلا ہوتا ہے، کبھی کوئی اور چیز ملی ہوتی ہے لیکن جنت کے شہد کے بارے میں فرمایا کہ وہاں کا شہد بالکل خالص ہوگا، ایسا شہد نہیں ہوگا جیسا ہم دنیا میں استعمال کرتے ہیں۔ یہاں دنیا میں شراب ہوتی ہے تو شراب میں بو بھی ہوتی ہے اور کڑواہٹ بھی ہوتی ہے، لوگ پھر بھی پیتے ہیں لیکن وہاں کی شراب کڑوی نہیں ہوگی، اس میں بدبو نہیں ہوگی، وہاں صرف لذت ہی لذت ہوگی۔ دنیا میں جو پانی ہے کبھی اس کا رنگ بدل جاتا ہے، کبھی ذائقہ بدلتا ہے لیکن وہاں کا پانی ایسا ہوگا کہ جس میں یہ تبدیلیاں نہیں ہوں گی، بالکل صاف اور شفاف پانی ہوگا۔ اللہ ہم سب کو عطا فرمائے۔ آمین

### علاماتِ قیامت کا بیان:

﴿فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا فَأَنَّى لَهُمْ إِذَا جَاءَتْهُمْ ذِكْرُهُمْ﴾

اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ قیامت کے منتظر ہیں کہ قیامت آئے گی تو پھر بات مانیں گے؟! اگر یہی بات ہے تو سن لیں کہ قیامت ضرور آئے گی لیکن علاماتِ قیامت تو آچکی ہیں اور جب خود قیامت آئے گی تو ان کو نصیحت حاصل کرنے کا موقع کہاں ملے گا؟ اس وقت تو انہیں نصیحت سے کوئی نفع نہیں ملے گا۔

علاماتِ قیامت میں سب سے بڑی علامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں تشریف لانا ہے۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخری نبی ہیں، ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، بس قیامت تک کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نبی ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آجانا علامت ہے کہ اب قیامت آئے گی۔ اس لیے قیامت کا انتظار نہ کرو بلکہ قیامت کی علامات دیکھ کر راہِ راست پر آ جاؤ اور آخرت کی

تیاری کر لو۔

سورة القمر میں ہے: ﴿اَفْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾<sup>160</sup> کہ قیامت قریب آگئی ہے اور اس کی نشانی یہ ہے کہ چاند کے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ ایک نشانی تو قرآن میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ قیامت کی اور بھی علامات ایسی ہیں جو قرآن کریم میں ہیں اور بہت ساری علامات ایسی ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔

صحیح البخاری کتاب النکاح میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يُزْفَعَ الْعِلْمُ کہ علامات قیامت میں سے ہے کہ علم اٹھ جائے گا، ”وَيَكْثُرُ الْجَهْلُ“ اور جہل بہت زیادہ ہو جائے گا، حقیقی علم ختم ہو جائے گا اور جہالت عام ہو جائے گی، ”وَيَكْثُرُ الزِّنَا“ زنا بہت ہو گا، ”وَيَكْثُرُ شُرْبُ الْخَمْرِ“ اور لوگ شراب بہت زیادہ پیئیں گے، ”وَيَقْلُ الرِّجَالُ“ مرد بہت قلیل ہوں گے، ”وَيَكْثُرُ النِّسَاءُ“ عورتیں بہت زیادہ ہوں گی، ”حَتَّى يَكُونَ لِلْحَمْسِينَ امْرَأَةً الْقَيْمُ الْوَاحِدُ“ پچاس عورتوں کا قلیل ایک مرد ہو گا۔<sup>161</sup>

یعنی ایک آدمی کی کفالت میں پچاس عورتیں ہوں گی؛ بیٹیاں ہیں، نواسیاں ہیں، بھانجیاں ہیں اس طرح کر کے پچاس پچاس عورتوں کا قلیل ایک مرد ہو گا۔ یہ علامات قیامت میں سے ہیں۔

سنن الترمذی ابواب الفتن میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت

160- القمر 54:1

161- صحیح البخاری، رقم: 5231

ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

”إِذَا اتَّخَذَ الْفَقِيرُ دُولًا“ جب غنیمت کے مال کو اپنا ذاتی مال سمجھ لیا جائے،  
 ”وَالْأَمَانَةُ مَغْنَمًا“ اور امانت کو غنیمت سمجھ کر اس کو اپنے لیے حلال سمجھنا شروع کر دیا  
 جائے، ”وَالزُّكُوتُ مَعْرَمًا“ اور زکوٰۃ کو ٹیکس کی طرح بوجھ سمجھنا شروع کر دیا جائے،  
 ”وَتُعَلِّمُ لِغَيْرِ الدِّينِ“ دین پڑھا جائے دنیا کے لیے، مال کمانے کے لیے، عزت  
 حاصل کرنے کے لیے، ”وَأَطَاعَ الرَّجُلُ أَمْرًا تَهُ وَعَقَى أَفْه“ آدمی بیوی کی باتیں مانے  
 اور ماں کی نافرمانی کرے، ”وَأَذْنَى صَدِيقُهُ وَأَقْصَى أَبَاةُ“ بندہ اپنے والد کو دور کرے  
 اور دوستوں کو قریب کرے، ”وَوَظَّهَرَتِ الْأَصْوَاتُ فِي الْمَسَاجِدِ“ اور مساجد میں  
 اونچی آواز سے باتیں شروع ہو جائیں، ”وَسَادَ الْقَبِيلَةَ فَاسِقُهُمْ“ اور قوم کا سردار  
 ان میں بدترین فاسق آدمی ہو، ”وَكَانَ زَعِيمُ الْقَوْمِ أَرْذَلَهُمْ“ قوم پر کمینہ آدمی  
 مسلط ہو جائے، ”وَأُكْرِهَ الرَّجُلُ مَخَافَةَ شَرِّهِ“ کسی آدمی کی عزت اس وجہ سے کی  
 جائے کہ عزت نہ کریں تو یہ ہمیں نقصان دے گا، اس کے شر سے بچنے کے لیے اس کی  
 عزت کی جائے، ”وَوَظَّهَرَتِ الْقَيِّنَاتُ وَالْمَعَارِزُ“ گانے والی عورتیں بہت ہو جائیں  
 اور گانے کے آلات؛ ڈھول، سرنگی وغیرہ عام ہو جائیں، ”وَشَرِبَتِ الْخُمُورُ“ اور  
 شراب بہت زیادہ پی جانے لگے، ”وَلَعَنَ آخِرُ هَذِهِ الْأُمَّةِ أَوْلَهَا“ بعد کے لوگ پہلے  
 والے لوگوں پر لعنتیں بھیجیں، ”فَلْيَبْتَغُوا عِنْدَ ذَلِكَ رِجْحًا حَمَرَاءُ“ اگر ایسے حالات  
 پیدا ہو جائیں تو فرمایا کہ پھر تم انتظار کرو سرخ آندھیوں کا، ”وَزَلْزَلَتْ وَخَسَفًا وَمَسْخًا  
 وَقَدْفًا“ زلزلے کا، زمین میں دھنس جانے کا، شکل بدلنے کا، آسمان سے پتھر برسنے کا،  
 ”وَآيَاتٍ تَتَابَعُ كِنِظَامٍ بِأَلٍ قُطِعَ سِلْكُهُ فَتَتَابَعَ“ اور اس طرح کی نشانیوں کا جو اس  
 ہار کی لڑی کی طرح مسلسل ظاہر ہوں گی جس کا دھاگہ ٹوٹ جائے اور اس کے دانے



مسلسل کرنے لگیں، یعنی ان حالات کے بعد علامت پہ علامت یوں ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گی۔<sup>162</sup>

اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

### بد بختی کی انتہا:

بعض لوگ دنیا میں اتنے بد بخت ہیں کہ ان کی بد بختی کی بھی انتہا ہے یعنی بندے کو ان کی باتیں سن کر افسوس ہوتا ہے۔ لوگ غلط کام کرتے ہیں جب پوچھا جائے کہ یہ کام کیوں کرتے ہیں؟ تو جواب پتا ہے کیا دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم یہ کام اس لیے کرتے ہیں تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سچی ہو جائے کیونکہ اللہ کے نبی نے فرمایا کہ قیامت کے قریب ایسے ایسے کام ہوں گے۔ العیاذ باللہ، ان لوگوں کی جرأت کی بھی انتہا ہے۔

میں نے کہا: پیغمبر کے ارشادات ہیں کہ جو ایسے کام کریں گے وہ جہنم میں جائیں گے تو کیا آپ جہنم والے کام بھی کریں گے کہ جن سے بندہ جہنم میں جائے گا تاکہ پیغمبر کی حدیث سچی ہو جائے؟! عجیب باتیں کرتے ہیں بھائی! اگر علامات قیامت میں سے یہ علامت ہے کہ لوگ زنا کریں گے تو یہ بھی تو ہے نا ”لَنْ تَزَالَ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ يَقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ عَلَى مَنْ كَاوَأَهُمْ“<sup>163</sup>

کہ قیامت تک مسلمانوں کا ایک طبقہ حق پر قائم ہو کر باطل سے لڑتا رہے گا۔ تو آپ برے کام کرنے کے بجائے نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاؤ! شامل ہونا ہے تو ہم اس میں شامل ہو جائیں تاکہ ہم اچھی علامت والوں میں شامل ہوں، بری

162۔ جامع الترمذی، رقم: 2211

163۔ مسند احمد: ج 15 ص 69 رقم الحدیث: 19781

علامات میں ضرور شامل ہونا ہے؟!

آپ بد بختی کی انتہا دیکھیں اور اس پر شیطان نے کیسے ان کو مطمئن کر رکھا ہے کہ ہم اس لیے یہ کام کرتے ہیں کہ ہمارے نبی نے فرمایا۔

**سلسلہ چشتیہ کے ذکر پر اشکالات کے جوابات:**

﴿فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوَكُمْ﴾

اے پیغمبر! آپ کو اس بات کا علم ہونا چاہیے!۔ نبی کو خطاب کر کے ہمیں بتایا کہ یہ بات تمہارے بھی علم میں ہونی چاہیے۔ کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔

یہاں یہ بات سمجھیں! ہمارے ہاں جو سلسلہ چشتیہ میں ذکر ہوتا ہے وہ بارہ تسبیحات پر مشتمل ہے:

◆ دو تسبیحات ذکر نفی و اثبات یعنی ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“

◆ چار تسبیحات ذکر اثبات یعنی ”إِلَّا اللَّهُ“

◆ چھ تسبیحات ذکر اسم ذات و ضربی یعنی ”اللہ اللہ“

◆ اور پھر ایک تسبیح اسم ذات یک ضربی ”اللہ“

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیں کہ بظاہر یہ تیرہ تسبیحات بنتی ہیں لیکن کہتے بارہ ہیں، یہ بالکل ایسے ہے جیسے کوئی حافظ تراویح میں قرآن مجید ختم کرتا ہے،

قرآن مجید ”وَالنَّاسِ“ پہ ختم ہوتا ہے تو وہ پھر شروع کرتا ہے اور ﴿الْمَلَأَ﴾ سے

﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ تک پڑھتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ماشاء اللہ حافظ صاحب

نے قرآن کریم ختم کیا ہے، کبھی کوئی کہتا ہے کہ حافظ صاحب نے قرآن مجید بھی ختم

کیا ہے اور سورة البقرة کا پہلا رکوع بھی ختم کیا ہے؟ (نہیں۔ سامعین) کوئی بھی نہیں

کہتا۔ تو وہاں کہتے یہی ہیں کہ قرآن ختم کیا ہے حالانکہ ایک رکوع مزید بھی پڑھا ہوتا ہے۔ یہ جو ایک رکوع مزید پڑھتے ہیں یہ تقاضاً ہوتا ہے کہ میں نے دوبارہ پھر پڑھنا ہے۔ تو سلسلہ چشتیہ میں بارہ تسبیحات کے بعد جو ایک سو مرتبہ پھر اللہ اللہ کہتے ہیں تو یہ بھی تقاضاً ہوتا ہے کہ میں نے اللہ اللہ کو بڑھانا ہے۔ اللہ توفیق عطا فرمائے تو اس تسبیح کو جتنا بڑھانا چاہیں ایک ہزار دو ہزار جتنا بڑھا سکیں اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اس پر ایک اعتراض یہ ہے کہ تم نے کلمہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“ کو کاٹ دیا ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ یہ آج ایک معروف اعتراض چل رہا ہے۔ میں اس بار جب ملائیشیا کے دورہ پر تھا تو باضابطہ انہوں نے مجھ سے ریکارڈنگ کروائی کہ اس اعتراض کا جواب دیں دلائل کی روشنی میں۔ میں نے کہا کہ اس کی تقطیع ہم نے نہیں کی یہ تو خود قرآن کریم سے ثابت ہے۔ اب دیکھو کلمہ ہے: ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“ یہاں سورۃ محمد کی اس آیت میں ہے: ﴿فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ اور سورۃ الفتح میں ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ﴾ تو کلمہ کے دو شق تو قرآن میں موجود ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم میں ہے: ﴿قُلِ اللَّهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ﴾<sup>164</sup> یہاں صرف لفظ ”اللہ“ ہے، اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہے۔

اور حدیث پاک میں ہے:

لَا تَقُومُوا السَّاعَةَ حَتَّى لَا يُقَالَ فِي الْأَرْضِ: اللَّهُ اللَّهُ.<sup>165</sup>

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک زمین میں اللہ اللہ کہا جائے

گا!

یہاں دیکھو! اللہ اللہ ہے۔ تو مختلف انداز سے تقطیع تو قرآن کریم اور احادیث میں موجود ہے، یہ ہم نے نہیں کی اور دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح قاری صاحب بچے کو قرآن کریم پڑھانے کے لیے ایک لفظ بار بار یاد کراتے ہیں مثلاً ”ذَلِكْ اَنْكِتُبْ.... ذَلِكْ اَنْكِتُبْ... ذَلِكْ اَنْكِتُبْ“ تو کوئی بھی نہیں کہتا کہ اس نے تقطیع کی ہے وہ سمجھتا ہے کہ بچے کو ہم نے ایک ایک حرف یاد کرانا ہے تو پوری آیت آسان ہو جائے گی۔ اسی طرح مکمل کلمہ کا نقشہ ذہن میں بٹھانے کے لیے بسا اوقات سالک کو تقطیع کلمہ کر کے کچھ اجزاء بتا دیتے ہیں، پھر دوسرا جزء، پھر تیسرا جزء... تاکہ اچھی طرح ایک ایک جزء اس کے دل میں پیوست ہو جائے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پوری صحیح البخاری میں تقطیع حدیث کرتے ہیں، کوئی بھی ان پر اعتراض نہیں کرتا۔ اعتراض صرف اس پر ہے کہ تم نے کلمہ کے کئی حصے کیوں کیے؟ اللہ تعالیٰ سمجھ عطا فرمائے۔

### عصمت انبیاء پر اشکال کا جواب:

﴿وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾

اے پیغمبر! آپ اللہ سے معافی مانگیں اپنے ان معاملات کی جو آپ کی شان کے لائق نہیں تھے اور ایمان والے مردوں کے لیے اور ایمان والی عورتوں کے لیے۔ اس پر میں نے تفصیل سے بات کی ہے کہ جب ذنب کا لفظ نبی کے لیے استعمال ہو تو معنی اور ہوتا ہے اور ذنب کا لفظ جب امتی کے لیے استعمال ہو تو معنی اور ہوتا ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ نبی معصوم ہے۔ اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم گناہ کرتے ہیں تب ہی تو اللہ فرما رہے ہیں: ﴿وَاسْتَغْفِرْ

لَا تَذْنِبْكَ کہ اپنے گناہ کی معافی مانگیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح لفظ محبت کی نسبت اور اضافت سے معنی بدل جاتا ہے کہ محبت ماں سے ہو تو معنی اور ہے، محبت بہن سے ہو تو معنی اور ہے، محبت بیٹی سے ہو تو معنی اور ہے، محبت بیوی سے ہو تو معنی اور ہے، اور اگر محبت نامحرم عورت سے ہو تو معنی اور ہے اسی طرح ذنب کی نسبت جب امت کی طرف ہو تو معنی اور ہوتا ہے اور جب پیغمبر کی طرف ہو تو معنی اور ہوتا ہے۔

پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ذنب کی نسب ہو تو اس کا ایک معنی یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اجتہادات کہ جن پر بعد میں وحی آ جاتی ہے کہ یہ اجتہاد ٹھیک نہیں تھا تو اس اجتہادی خطا کو بسا اوقات ذنب کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ بھی سمجھ لیں کہ کبھی صواب کے مقابلہ میں خطا آتا ہے اور کبھی صواب کے مقابلہ میں باطل آتا ہے۔ جب صواب بمقابلہ باطل ہو تو صواب پر اجر ہے اور باطل پر اجر نہیں اور اگر صواب بمقابلہ خطا ہو تو اب صواب کا معنی ہے ڈبل جنت اور خطا کا معنی ہے سنگل جنت۔ صواب کا معنی بڑی جنت اور خطا کا معنی چھوٹی جنت۔ تو نبی سے جب اجتہادی خطا ہو جائے تو اس اجتہادی خطا کو بسا اوقات ذنب سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

### نبی اور امتی کے اجتہاد میں فرق:

اب ایک خطا وہ ہے جو مجتہد امتی کی ہے اور ایک خطا وہ ہے جو مجتہد نبی کی ہے۔ پیغمبر کی اجتہادی خطا اور مجتہد امتی کی اجتہادی خطا میں فرق ہے کہ مجتہد امتی سے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو وہ خطا پر باقی رہتا ہے اور پیغمبر سے اجتہاد میں خطا ہو بھی جائے تو پیغمبر کو اللہ خطا پر باقی نہیں رہنے دیتے، وحی کے ذریعہ اس خطا کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت ایسی ہو جاتی ہے کہ جیسے ایک آیت پہلے اور ایک بعد میں ہو، پہلی منسوخ اور دوسری ناسخ۔ ایک حدیث پہلے کی منسوخ اور ایک بعد کی ناسخ۔ تو پیغمبر کی اجتہادی

خطابہ حدیث منسوخ کی طرح ہے اور بعد کی جو احادیث آتی ہیں وہ اس کے لیے ناسخ بن جاتی ہیں۔

خیر میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ذنب کا معنی گناہ نہیں ہے بلکہ ذنب کی نسبت نبی کی طرف ہو تو اس کا ایک معنی ایسا اجتہاد ہے کہ جس میں خطا واقع ہوئی ہو تو آپ اس پر بھی اللہ سے معافی مانگیں۔

**علم باری تعالیٰ:**

﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوِكُمْ﴾

اس میں بندے کے سارے احوال اور سارے افعال اور سارے مقام آ گئے۔ اللہ جانتے ہیں تمہاری ان جگہوں کو جو عارضی ہیں اور ان جگہوں کو جو مستقل ہیں، اللہ جانتے ہیں ان حالات کو جو عارضی ہیں اور جانتے ہیں ان حالات کو جو مستقل ہیں۔ تو ساری چیزیں؛ احوال و اعمال اور مقامات سب اس میں آ گئے ہیں۔

﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْ لَا نَزَّلَتْ سُورَةٌ فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ﴾

اور جو لوگ اہل ایمان ہیں وہ کہتے رہتے ہیں کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں ہوتی تاکہ ہمارا ایمان تازہ ہو اور نئے احکام آئیں تو ان کا ثواب بھی حاصل کریں لیکن جب کوئی ایسی سورت نازل ہوتی ہے جس کے معنی واضح ہوں اور اس میں جہاد کا بھی ذکر ہو تو اے پیغمبر! اس سورت کے نازل ہونے پر منافقین آپ کی طرف اس طرح تکتے ہیں جیسے وہ شخص تکتا ہے جس پر موت کی بیہوشی طاری ہو رہی ہو۔ بڑی خرابی ہے ان منافقین کے لیے۔

## کفار کے لیے وعید:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُّوا الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَسَيُحِطُّ أَعْمَالُهُمْ﴾<sup>(٣٦)</sup>  
 جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستے سے روکا اور ہدایت کا راستہ واضح ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کی تو ایسے لوگ اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ایسے لوگوں کے اعمال تباہ ہو جائیں گے۔

اس وعید کا مصداق ہر وہ کافر ہے جو شریعت کے راستے سے روکتا ہے لیکن بطور خاص اس سے مراد بنو قریظہ اور یہود ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے جنگ بدر کے موقع پر مشرکین مکہ کی بہت مدد کی، ان میں بارہ لوگ ایسے کھڑے ہو گئے کہ جنہوں نے کہا کہ ہر روز تمام کفار کا کھانا ہم پکائیں گے، ایک آدمی نے پورے دن کا کھانا اپنے ذمے لیا۔

## جائز اور ناجائز صلح جائز کی تفصیل:

﴿فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلَامِ ۚ وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ ۚ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَبْتَزَّكُمْ أَعْمَانُكُمْ﴾<sup>(٣٧)</sup>  
 یہاں مسلمانوں سے خطاب کیا کہ تم کمزوری نہ دکھاؤ، صلح کی طرف مت بلاؤ، تم ہی غالب ہو گے۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے، وہ تمہارے اعمال ضائع نہیں فرمائے گا۔  
 سوال یہ ہے کہ یہاں منع کیا جا رہا ہے کہ تم صلح نہ کرو اور دوسری آیت میں ہے: ﴿وَإِنْ جَاحَظُوا السَّلَامَ فَاْجْنَحْ لَهَا﴾<sup>166</sup>

کہ اگر وہ صلح کریں تو تم بھی صلح کرو۔ اس آیت میں اجازت دی جا رہی ہے۔ تو بظاہر دونوں آیات میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک صلح وہ ہے جو دین کے فائدے کے لیے ہو وہ تو جائز ہے اور ایک صلح وہ ہے جو بزدلی کی وجہ سے ہو، یہ جائز نہیں ہے۔

### انفاق فی سبیل اللہ:

﴿وَإِنْ تَوَلَّوْاْ تَغْفِرْ لَكُمْ أُوْلُوْكُمْ وَأَجُورُكُمْ وَلَا يَسْأَلُكُمْ أَمْوَالُكُمْ﴾

اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تمہیں اجر دے گا اور اللہ تم سے تمہارے مال نہیں مانگے گا۔ اس پر بھی سوال یہ ہے کہ قرآن کریم میں کتنی آیات ہیں جن میں حکم دیا جا رہا ہے کہ مال خرچ کرو اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ اللہ تم سے مال کا مطالبہ نہیں کر رہا! اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جہاں حکم ہے کہ مال خرچ کرو تو اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے نفع کے لیے خرچ کرو کیونکہ جب انسان اپنا مال اللہ کے دین کے لیے خرچ کرے گا تو اس کا نفع قیامت کے دن خود اسی کو ہوگا، اللہ اپنی ذات کے لیے تم سے مال نہیں مانگتے۔ تو پہلا مطلب تو یہ ہے۔

اور بعض نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس آیت ﴿وَلَا يَسْأَلُكُمْ أَمْوَالُكُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ میں تم سے سارا مال نہیں مانگتا، اس پر دلیل ﴿إِنْ يَسْأَلُكُمْ مَوْهَا فَيُخْفِئْكُمْ تَبْخُلُوا﴾ ہے کہ اللہ سارا مال تم سے نہیں مانگتا کیونکہ اگر تم سے سارا مال مانگ لیا تو تم بخل کرو گے۔ فرمایا: ﴿وَمِمَّا زَكَّيْنَهُمْ يُنْفِقُونَ﴾ کہ کچھ مال اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔

### تذکرہ امام اعظم ابو حنیفہ:

﴿وَإِنْ تَتَوَلَّوْاْ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُواْ أَمْثَالَكُمْ﴾



اللہ رب العزت اپنی شانِ بے نیازی کو بیان فرما رہے ہیں کہ ہمیں تمہارے اموال کی ضرورت نہیں بلکہ تم خود بھی اگر تبدیل ہو گئے تو تمہاری جگہ ہم اور لوگوں کو لائیں گے جو تمہاری طرح نہیں ہوں گے بلکہ وہ ہماری مکمل اطاعت کریں گے اور ہمارے حکموں کو مکمل مانیں گے۔

اس مقام پر تفسیر مظہری میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا کہ ان کی اولاد؛ ابنائے فارس میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے۔<sup>167</sup>

ایک حدیث ہے جس کے ایک طریق میں علم<sup>168</sup>، ایک میں دین<sup>169</sup> اور ایک میں ایمان<sup>170</sup> کے الفاظ ہیں کہ اگر یہ ثریا ستارے تک بھی پہنچ گیا تو فارس والے لوگ وہاں سے بھی اس کو لے کر آجائیں گے۔

امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے ”تبیض الصحفۃ“ میں لکھا ہے کہ ”لَوْ كَانَ الْعِلْمُ بِالْثُرَيَّا لَتَنَاوَلَهُ رِجَالٌ مِنْ أَهْلِ فَارِسَ“ والی حدیث کا مصداق امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔<sup>171</sup>

اللہ ہم سب کو یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاجْزُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

167- التفسیر المظہری: ج 8 ص 447

168- حلیۃ الاولیاء لابی نعیم الاصبہانی: ج 6 ص 64، 65

169- صحیح مسلم، رقم: 2546

170- صحیح البخاری، رقم: 4897

171- تبیض الصحفۃ ص 59، 60

## سورة الفتح

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا ۚ لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ

وَمَا تَأَخَّرَ وَيَتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝ وَيَنْصُرَكَ اللَّهُ

نَصْرًا عَظِيمًا ۝﴾

### شان نزول:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں ایک خواب دیکھا کہ آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہوئے اور عمرہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے اس کا تذکرہ فرمایا۔ ہر ایک کا شوق بڑھا کہ ہمیں عمرے کے لیے جانا چاہیے۔ فطری شوق تو تھا کیونکہ مہاجرین صحابہ کو مکہ مکرمہ سے نکالا گیا تھا تو ان کا شوق زیادہ تھا۔ انصارِ مدینہ کا بھی شوق تھا کہ ہمیں بھی جانا چاہیے۔ تو سب پر شوق غالب آیا۔ آخر کار فیصلہ ہوا سن 6 ہجری کو مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کے سفر کا۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے باہر جو دیہات تھے وہاں بھی آواز لگوائی کہ سب سے کہو کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ اس کی وجہ ان کے ذہن میں تھی کہ ہم عمرہ کرنے کے لیے جائیں گے تو مشرکین مکہ رکاوٹ پیدا کریں گے اور ممکن ہے کہ جنگ تک نوبت پہنچ جائے، اس لیے ہمیں اپنی طاقت کے ساتھ جانا

چاہیے، مکمل تو نہیں لیکن تلواریں وغیرہ ساتھ لے لیں اور چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بغرض عمرہ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوا۔

ادھر جب مشرکین مکہ کو اطلاع ملی تو ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ان کو عمرہ کرنے دینا چاہیے یا نہیں؟ بالآخر انہوں نے یہ مشورہ کیا کہ ان کو عمرہ نہیں کرنے دینا چاہیے اور ان کو روکنا چاہیے، اگر ویسے نہیں رکتے تو ان کو طاقت کے ساتھ روکیں گے۔ خالد بن ولید ابھی صحابی نہیں بنے تھے یہ کام ان کے ذمے لگا کہ قریش کا ایک گروہ لے کر باہر نکلیں۔ جب یہ نکلے تو اور دیگر لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ مکہ مکرمہ سے باہر بلدخ ایک جگہ کا نام تھا وہاں پر حضرت خالد بن ولید اور ان ساتھ جو لشکر تھا ان لوگوں نے وہاں پڑاؤ ڈالا اور آپس میں عہد کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

### عمرہ کا قصد اور مشرکین مکہ کی مزاحمت:

ادھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اطلاع ملی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قافلہ بھی گیا۔ تو ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے کہ ان کا اور خالد بن ولید کے قافلہ کا آمنا سامنا ہو گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بندے کو بھیجا اور ان سے بات چیت ہوئی کہ ہم صرف بغرض عمرہ آئے ہیں، ہمیں عمرہ کرنے دو، ہم واپس چلے جائیں گے لیکن انہوں نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بات سمجھائی کہ دیکھو! جنگیں کر کر کے تم تھک گئے ہو، مجھے چھوڑ دو، میں عمرہ کروں گا اور واپس جاؤں گا۔ باقی عرب قبائل سے مجھے نمٹنے دو، اگر وہ مجھ پر غالب آگئے اور میں قتل ہو گیا تو تمہارا مدعا پورا ہو جائے گا اور اگر میں زندہ رہا تو تمہیں مزید موقع مل جائے گا تیاری کرنے کا، تم اپنی بھڑاس نکال لینا، فی الحال ہمیں کچھ نہ کہو لیکن وہ پھر بھی آمادہ

نہ ہوئے۔

### حضور علیہ السلام کا معجزہ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو لیا اور خالد بن ولید کے لشکر کے دوسری جانب آپ نے پڑاؤ ڈال دیا۔ قریش کے لشکر نے پانی کی جو جگہ تھی اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جگہ وہ آئی جہاں پانی نہیں تھا، بس وہاں پانی کا ایک کنواں تھا وہ بھی تقریباً خشک ہو چکا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب مبارک اس میں ڈالا اور ایک تیر بھی دیا کہ اس کو اس کنویں میں گاڑ دو۔ تیر کا گاڑنا تھا کہ کنویں کے اوپر کے کنارے تک پانی اٹھ آیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے پاس پانی جمع ہو گیا۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واضح معجزہ دیکھا۔

### اہل مکہ کو سمجھانے کی کوششیں:

خیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کو کوشش کی سمجھانے کی لیکن وہ نہیں مانے۔ اہل مکہ میں سے ایک شخص تھے بدیل بن ورقاء جو بعد میں مسلمان بھی ہو گئے تھے، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ آپ واپس چلے جائیں، عمر نہ کریں! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی بات سمجھائی کہ ہم عمرے کے لیے آئے ہیں، ہماری کوئی اور غرض نہیں ہے، ہم لڑائی کے لیے نہیں آئے، جنگ ہمارا مقصد نہیں ہے۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پوری سمجھائی جو بات حضرت خالد بن ولید کو سمجھائی تھی وہ بات پوری دوہرا دی۔

بدیل بن ورقاء نے بات سمجھی اور واپس جا کر قریش کو بات سمجھائی لیکن قریش نے کہا کہ ہم تو لڑیں گے۔ پھر عروہ بن مسعود ثقفی یہ اپنے طور پر آئے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور بات کی۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی سمجھائی تو ان کو بھی سمجھ آ گئی۔ انہوں نے واپس جا کر اہل مکہ کو سمجھایا لیکن وہ اپنی

ضد پر اڑے رہے اور کہا کہ ہم تو لڑیں گے، ہم تو قتل کریں گے۔ جب قریش نے عروہ بن مسعود کی بات نہ مانی تو وہ اپنی جماعت کو لے کر ان سے الگ ہو گئے۔

پھر حبلیس بن علقمہ جو اعراب کے سردار تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اپنے کچھ آدمی لے کر، انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی پوری بات سمجھائی جو بدیل بن ورقاء اور عروہ بن مسعود کو سمجھائی تھی، ان کو بھی سمجھ آ گئی۔ انہوں نے بھی واپس جا کر قریش مکہ سے بات کی لیکن وہ تو ضد پر اڑے ہی رہے اور کہا کہ ہم تو لڑیں گے۔ جب حبلیس بن علقمہ کی بات بھی انہوں نے نہ مانی تو وہ بھی اپنی جماعت لے کر قریش سے الگ ہو گئے۔ ایک شخص اور بھی آیا، اس نے بھی بات کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی یہی بات سمجھائی۔ اس کو بھی بات سمجھ آ گئی۔ اس نے بھی جا کر قریش کو سمجھایا لیکن وہ ضد پر اڑے رہے۔ یہ بھی اپنی جماعت لے کر ان سے الگ ہو گیا۔

مکہ کے جو قریشی تھے ان کے ذہن میں یہ تھا کہ اگر یہ لوگ آئے، عمرہ کیا اور عمرہ کر کے واپس چلے گئے تو ہمیں باقی عرب کہے گا کہ مسلمان تم پر غالب آ گئے ہیں۔ طاقت کے بل بوتے پر آئے ہیں اور عمرہ کر کے واپس چلے گئے ہیں، اس سے تو ہماری عزت خاک میں مل جائے گی، اس لیے ہم انہیں کسی بھی صورت میں عمرہ نہیں کرنے دیں گے۔

### حضرت عثمان؛ نمائندہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم خود مکہ میں جاؤ اور ان کو سمجھاؤ! حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور! میری خود ان سے جنگ ہے، میرے مزاج کی شدت کو بھی وہ لوگ سمجھتے ہیں، میرا وہاں پر کوئی حامی بھی نہیں کہ بات ان کو سمجھائے، اس لیے بہتر ہے کہ آپ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجیں، ان کا وہاں قبیلہ بھی ہے اور وہاں ان کی خاص عزت بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا، وہ چلے گئے۔ جب مکہ مکرمہ پہنچے تو ابان بن سعید سے ملے، ابان بن سعید بعد میں مسلمان بھی ہو گئے تھے، انہوں نے حضرت عثمان کو پناہ دی اور پھر ان کو لے کر تین دن تک قریش کے جتنے بڑے بڑے سردار تھے سب سے ملاقاتیں کیں، حضرت عثمان نے قریشی سرداروں کو بہت سمجھایا کہ ہم عمرے کے لیے آئے ہیں، لڑائی ہمارا مقصد نہیں ہے لیکن انہوں نے کہا کہ کچھ بھی ہو جائے ہم ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ تین دن تک آپ وہاں ٹھہرے رہے۔ ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر آپ طواف کرنا چاہیں تو کر لیں، فرمایا کہ میں تو حضور کے بغیر طواف نہیں کر سکتا۔ بعض صحابہ نے کہا کہ عثمان کے تو مزے ہیں، وہ تو طواف کر رہے ہوں گے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عثمان میرے بغیر طواف نہیں کرے گا۔ اب دیکھو! اعتماد کی فضا کتنی ہے!

ادھر مشرکین مکہ نے اپنے پچاس آدمی بھیجے کہ جاؤ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو محافظ ہیں ان سے بچ کے ان کا کام تمام کرو۔ جب یہ لوگ آئے تو محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہرے پر مامور تھے انہوں نے ہمت کی، کچھ اور صحابہ ساتھ لیے اور مشرکین کے ان پچاس افراد کو گرفتار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو ان کو قتل بھی کر سکتے تھے لیکن آپ نے ان کو قتل نہیں کیا۔ جب مسلمانوں نے ان کے پچاس بندے قید کر لیے تو انہوں نے حضرت عثمان کو وہاں روک لیا اور کہا کہ تم ان کو مارو گے تو ہم ان کو بھی قتل کر دیں گے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پچاس کو چھوڑ دیا تاکہ وہاں پر قتل نہ ہو۔ انہوں نے بھی حضرت عثمان کو چھوڑ دیا لیکن ادھر خبر

پہنچی کہ حضرت عثمان کو شہید کر دیا گیا ہے۔

### قتل عثمان کا بدلہ لینے پر بیعت:

اس پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم حضرت عثمان کا بدلہ لیں گے اور واپس نہیں جائیں گے۔ دیکھو ہم نے ان کے پچاس بندے چھوڑ دیے اور انہوں نے قتل کر دیا۔ تو یہ ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، اس لیے ہم بدلہ لیں گے۔ اس پر چودہ سو کے لگ بھگ جو صحابہ تھے ان سب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر بیعت کی بدلہ لینے کے لیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیچے اپنا دایاں ہاتھ رکھا اور اس پر اپنا بایاں ہاتھ رکھا اور فرمایا کہ اگر عثمان یہاں پر ہوتے تو وہ بھی موت کی بیعت کرتے۔ یہ میرا ہاتھ عثمان کا ہاتھ سمجھو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے بھی بیعت کر لی۔

### مشرکین مکہ سے مذاکرات:

جب یہ خبر وہاں مکہ مکرمہ میں مشرکین مکہ کے پاس پہنچی تو ان کے ذہن کی فضا تو بالکل بدل گئی۔ وہی مشرکین مکہ جو بات ماننے کی لیے تیار نہیں تھے اللہ رب العزت نے ایسا رعب ان کے دلوں میں ڈالا کہ وہاں سے تین آدمیوں کا قافلہ سہیل بن عمرو کی قیادت میں آیا کہ ہم آپ سے مذاکرات کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بتاؤ! تم کیا چاہتے ہو؟ سہیل بن عمرو پہلے بھی مذاکرات کے لیے آئے تھے اس وقت صرف اتنی بات تھی کہ پچاس بندے رہا کروا کر لے گئے تھے اور اب جب دوبارہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھتے ہی فرمایا کہ مجھے لگتا ہے کہ مکہ والے مذاکرات کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں۔ سہیل کے آنے سے محسوس کیا۔ جب وہ آیا تو پھر مذاکرات شروع ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ جی! آپ اس سال واپس چلے جائیں اور آئندہ سال آپ عمرے کے لیے آئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک

ہے، ہمیں یہ شرط منظور ہے، ہم اس سال واپس جاتے ہیں اور ہم آئندہ سال پھر آئیں گے عمرہ کے لیے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص مسلمان ہو اور آپ کے پاس چلا جائے تو آپ لوگ اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے اور اگر آپ کا کوئی شخص ہمارے مذہب کی طرف واپس آجائے۔ جس کو ہم مرتد کہتے ہیں۔ تو ہم اسے واپس نہیں کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمیں منظور ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی شرائط تھیں جو آپ نے پڑھی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ اس پر بہت رنج ہوا کہ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمیں منظور ہے اور ایک روایت میں ہے کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے اصرار کیا کہ حضور! آپ کس بات پر معاہدہ فرما رہے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو ہمیں چھوڑ کر ان کے پاس چلا جائے گا تو اس کی ہمیں ضرورت ہی نہیں ہے، اس کو کیا کرنا ہے واپس لا کر، بس اسے جانے دو اس کو! صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات سمجھ میں آگئی۔

### معاہدہ کی شقوں پر فریقین کی گفتگو:

اسی طرح سہیل بن عمرو نے یہ بات بھی رکھی کہ ہمارا دس سال کا آپس میں معاہدہ ہے، ہم آپ سے جنگ نہیں کریں گے اور آپ بھی ہم سے جنگ نہیں کریں گے، جو قبیلہ آپ کے ساتھ ملنا چاہے اسے اختیار ہے کہ آپ کے ساتھ ملے اور جو ہمارے ساتھ ملنا چاہے وہ ہمارے ساتھ ملے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمیں منظور ہے۔ ان شرائط پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معاہدہ فرمایا۔

جب معاہدہ لکھا جانے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا کہ لکھو! ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“

یہ سہیل بن عمرو اور محمد کے درمیان ہے تو آپ نے حضرت علی سے فرمایا کہ



لکھو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لکھا

اس پر سہیل نے کہا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم نہ لکھیں، کیونکہ الرحمن اور الرحیم ہمارے ہاں نہیں لکھا جاتا، جو پہلے آپ لکھتے تھے ”بِسْمِکَ اللّٰهُ“ اب بھی وہی لکھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علی! یہی لکھو۔ یہ لکھ دیا گیا۔ پھر فرمایا: لکھو کہ یہ وہ معاہدہ ہے جس کا فیصلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ اس پر بھی سہیل بن عمرو نے کہا کہ اگر ہم آپ کو رسول اللہ مان لیں تو جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا، یہی بات تو ہم نہیں مانتے اور معاہدے میں ایسی باتیں نہیں لکھتے جو فریقین میں اختلافی ہوں بلکہ وہ لکھتے ہیں جو اتفاقی ہوں، ”رسول اللہ“ یہ اختلافی نکتہ ہے اس لیے محمد بن عبد اللہ لکھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علی! یہ ”رسول اللہ“ کا لفظ کاٹ دو اور ”محمد بن عبد اللہ“ کا لفظ لکھو! انہوں نے عرض کیا: حضور! اسے کاٹنا میرے بس میں نہیں ہے۔ انہوں نے نہیں کاٹا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کاغذ مجھے دو! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ خود لے کر معاہدہ اپنے ہاتھ سے لکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو امی تھے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ امی ہونے کے باوجود یہ تحریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لکھی ہے:

”هَذَا مَا قَاضَى مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ وَسَهِيلُ بْنُ عَمْرٍو وَأَصْلَحًا عَلَى وَضْعِ الْحَرْبِ عَنِ الثَّانِي عَشَرَ سِنِينَ يَأْمَنُ فِيهِ النَّاسُ وَيَكْفُفُ بَعْضُهُمْ عَنْ بَعْضٍ“<sup>172</sup>

کہ یہ معاہدہ محمد بن عبد اللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان ہے، دونوں فریقوں نے اس بات پر صلح کی ہے کہ دس سال تک ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے، اس دوران سب لوگ امن کے ساتھ رہیں گے اور ایک دوسرے پر چڑھائی

کرنے سے رکے رہیں گے!

معادہ کی شرائط طے ہوئی ہی تھیں کہ ابو جندل؛ سہیل بن عمرو کے بیٹے کسی طریقے سے اپنی بیڑیاں کھلو کر یہیں حدیبیہ ہی میں پہنچ گئے۔ ابو جندل مسلمان ہو چکے تھے تو ان کے والد سہیل بن عمرو نے ان کو بیڑیاں لگا دیں تھیں۔ تو وہ کسی طرح وہاں سے نکل کر یہاں آ گئے۔ سہیل نے کہا کہ یہ تو ہمارا معادہ ہے کہ اگر ہمارا بندہ ہمارے دین کو چھوڑ کر آپ کے پاس آ جائے تو آپ واپس کرنے کے پابند ہیں، اس لیے ابو جندل کو واپس کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو جندل! واپس چلے جاؤ۔ انہوں نے کہا کہ حضور! یہ بہت ظلم کرتے ہیں۔ فرمایا کہ بہت جلد اللہ اسباب عطا فرما دیں گے، تم واپس چلے جاؤ۔ یوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس کر دیا۔  
تو یہ تھا صلح حدیبیہ کا پس منظر جس پر معادہ ہوا تھا۔

### حضرت عمر کی دربارِ نبوت میں حاضری:

جب وہاں سے واپس آنے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے رہانہ گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: حضور! کیا آپ اللہ کے سچے نبی نہیں ہیں؟ فرمایا کہ سچا نبی ہوں۔ کہا کہ ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں؟ فرمایا: ہم حق پر اور وہ باطل پر ہیں۔ کہا کہ کیا ہمارے مقتول جنت میں اور ان کے مقتول جہنم میں نہیں؟ فرمایا: کیوں نہیں! کہا: یا رسول اللہ! پھر آپ اتنا دب کے کیوں معادہ کرتے ہیں؟! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کا بندہ اور اللہ کا رسول ہوں، میں اللہ کے حکم کے خلاف نہیں کروں گا، اللہ میری مدد ضرور کرے گا۔ عمر! اسی میں خیر ہے۔ حضرت عمر عرض کرنے لگے کہ یا رسول اللہ! آپ نے ہمیں تو فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ میں جائیں گے، طواف کریں گے، عمرہ کریں گے! فرمایا کہ میں نے کہا تھا لیکن کیا یہ بھی کہا تھا کہ اسی سال کریں گے؟ عرض کیا جی نہیں۔ فرمایا کہ میں

نے جس طرح کہا تھا ان شاء اللہ ایسے ہی ہوگا، ہم بیت اللہ کا طواف ضرور کریں گے۔  
حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت خاموش تو ہو گئے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے کہ کیا حضور سچے نبی نہیں ہیں؟ حق پر نہیں ہیں؟ انہوں نے فرمایا: بالکل سچے ہیں، حق پر ہیں۔ کیا مشرکین باطل پر نہیں ہیں؟ فرمایا: باطل پر ہیں۔ تو پھر یہ معاہدہ ہم کیوں کرتے ہیں؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وہی جواب دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں، اللہ کے حکم کے خلاف کبھی نہیں کریں گے اور اللہ ان کی مدد فرمائے گا۔  
حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں برابر صدقہ کرتا رہا، غلام آزاد کرتا رہا، توبہ واستغفار کرتا رہا کہ یا اللہ! یہ میں نے کیا کیا؟ میں کیوں جذبات میں آکر یہ بات کہتا تھا۔

اصل یہ تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ میں صحابہ کے ساتھ بیت اللہ گیا ہوں اور ہم نے عمرہ کیا ہے لیکن اس میں وقت کا تعین نہیں تھا کہ اب کریں گے یا آئندہ سال کریں؟ شوق غالب تھا تو اسی سال روانہ ہو گئے۔ مقرر میں آئندہ سال لکھا تھا۔ جب وہاں سے واپس لوٹے تو پھر یہ سورت نازل ہوئی۔ ایک روایت میں ہے کہ مکمل سورت نازل ہوئی اور ایک روایت میں ہے کہ سورت کا کچھ حصہ ابھی نازل ہوا اور کچھ حصہ بعد میں نازل ہوا۔

**”لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ“ کا معنی:**

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا ۖ لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ

وَمَا تَأَخَّرَ﴾

ہم نے آپ کو کھلی فتح عطا کی ہے۔

کھلی فتح کیوں عطا کی ہے؟ اس کی ایک حکمت جو عام مفسرین نے تحریر فرمائی

ہے وہ یہ ہے کہ کھلی فتح اس لیے عطا کی ہے تاکہ آپ کی جو اجتہادی خطائیں ہیں، خلافِ اولیٰ کام ہیں ہم ان کو معاف کر دیں، ”مَا تَقَدَّمَ“ یعنی اعلانِ نبوت سے پہلے والی اور ”وَمَا تَأَخَّرَ“ یعنی اعلانِ نبوت کے بعد والی۔ اب اس کا تعلق فتح کے ساتھ کیا ہو گا؟ تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اس کا فتح سے تعلق یہ ہے کہ جب ہم آپ کو فتح دیں گے، آپ کی فتح کو دیکھ کر لوگ مسلمان ہوں گے اور لوگوں کے اسلام میں آنے کی وجہ سے آپ کو ثواب ملے گا، ثواب اتنا زیادہ ملے گا کہ اس سے اجتہادی خطاؤں کا تدارک ہو جائے گا۔ ”لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ“ کا معنی یہ ہے۔

اور میں کئی بار کہہ چکا ہوں۔ شاید آپ کے علم میں ہو۔ کہ یہاں ذنب کا معنی اگر ”گناہ“ کریں گے تو آیت میں جوڑ ہی نہیں رہے گا کیونکہ اب معنی یہ ہو گا: ”ہم نے آپ کو فتح دی تاکہ آپ کے گناہ معاف کر دیں“ تو سوال یہ ہو گا کہ فتح سے گناہ کی معافی کا کیا تعلق ہے؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم آپ کو فتح دیں گے تاکہ آپ ریاست قائم کریں، فتح دیں گے تاکہ آپ ظلم کا بدلہ لیں، فتح دیں گے تاکہ آپ احکام نافذ کریں، فتح دیں گے تاکہ اسلام کی عظمت نظر آئے... یہ بات تو سمجھ آتی ہے لیکن فتح دیں گے تاکہ آپ کے گناہ معاف کر دیں تو فتوحات کا گناہوں کی معافی سے کیا تعلق ہے؟

### مثال کے ذریعے وضاحت:

جیسے آپ کے علاقے میں کوئی بندہ الیکشن لڑے اور ایم این اے بنے تو آپ کہیں مبارک ہو! وہ کہے کیوں؟ اس لیے کہ اللہ نے آپ کے گناہ معاف کر دیے؟ وہ پوچھے: کیوں گناہ معاف کر دیے؟ آپ فاتح نہیں ہوئے، آپ غالب نہیں آگئے؟ تو غلبہ کے ساتھ گناہوں کی معافی کا اعلان تو نہیں ہوتا۔

ہاں اگر یہ ہوتا کہ ہم نے آپ کو توبہ کی توفیق دی تاکہ آپ کے گناہ معاف ہو جائیں تو یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے! لیکن ہم نے آپ کو فتح دی تاکہ آپ کے گناہ معاف ہو جائیں، بظاہر اس میں کوئی ربط محسوس نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ یہاں تین باتیں سمجھنا ضروری ہے:

1: ”غَفَرَ... يَغْفِرُ... غَفَرْنَا وَ مَغْفِرَةً“ کا معنی

2: ”مَا تَقَدَّمَ“ اور ”وَمَا تَأَخَّرَ“ کا معنی۔

3: ذنب کا معنی۔

◆ غفران کا معنی ہوتا ہے ڈھانپ لینا۔ اس لیے میدان جنگ میں جو لوہے کی ٹوپی سر پر پہنی جاتی ہے جسے اردو میں خُود کہتے ہیں، اسے عربی میں ”مِغْفَر“ کہتے ہیں یعنی ڈھانپ لینے والی چیز، ڈھانپ لینے والا آلہ۔ تو مغفرت کا معنی ہو اڈھانپ لینا۔

◆ ”مَا تَقَدَّمَ“ سے مراد ہے مکی زندگی اور ”وَمَا تَأَخَّرَ“ سے مراد ہے مدنی زندگی۔

◆ اور ذنب کا معنی صرف گناہ نہیں ہوتا بلکہ ذنب کا معنی الزام بھی ہوتا ہے۔ عربی میں ذنب کہتے ہیں دم کو، جس طرح دم جانور کے پیچھے ہوتی ہے اسی طرح الزام لگانے والے بھی عموماً الزام بندے کے پیچھے لگاتے ہیں۔ تو ذنب محاوراتِ عرب میں الزام کو بھی کہتے ہیں۔

اب اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکی زندگی اور مدنی زندگی میں لوگ الزام لگاتے تھے۔ مکی زندگی میں الزام یہ تھے کہ آپ شاعر ہیں، مجنون ہیں، ساحر ہیں.... اور مدنی زندگی میں الزام کیا تھے کہ آپ کو اقتدار کا شوق ہے، حکومت کا شوق ہے، لیڈر بننے کا شوق ہے... اور الزام کون لگاتا ہے جو مخالف ہو، وہ نہیں لگاتا جو عقیدت مند ہو۔ تو اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ہم نے اتنی کھلی اور شاندار فتح

آپ کو دی ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ﴾ ۱؎ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا﴾ ۲؎ اب اس فتح کے نتیجے میں آپ کے جو مخالف تھے وہ موافق اور معتقد بنے ہیں، جو گالیاں دیتے تھے... الزام لگاتے تھے مخالفت کی وجہ سے وہ جب آپ کے غلام بن کر عقیدت مند ہو گئے تو اب یہ الزام نہیں لگائیں گے بلکہ آپ کی مدح کریں گے، آپ کی تعریف کریں گے۔ تو ہم نے فتح عطا فرما کر مکی اور مدنی زندگی میں جو لگنے والے الزامات تھے وہ سارے ہم نے صاف کر دیے ہیں، اب آپ پر الزام نہیں لگیں گے بلکہ اب آپ کی مدح ہوگی۔

اب اس تقریر کے بعد بات ایسی واضح ہو جاتی ہے کہ اب کوئی اشکال رہتا ہی نہیں ہے اور نہ ذنب کا معنی گناہ کرنا پڑتا ہے بلکہ بلا تاویل بات بالکل کھل کر سامنے آتی ہے، اس لیے بہتر ہے کہ تقریر یہاں پر یہ کر لی جائے۔

### فتح مبین، اتمام نعمت کا ذریعہ

﴿وَيَمِّمُ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا﴾ ۳؎

اللہ نے آپ کو نبوت بھی دی ہے، قرآن بھی دیا ہے اور ہم مزید لوگ حلقہ اسلام میں داخل کر کے آپ پر اپنی نعمت کو مزید مکمل کریں گے اور آپ پہلے بھی صراط مستقیم پر ہیں لیکن راستے میں رکاوٹیں ہیں، اب بغیر رکاوٹوں کے ہم آپ کو دین کے راستے پر چلا دیں گے۔ اب ہم نے کفر کی رکاوٹیں ختم کر دی ہیں، اب سہولت کے ساتھ ہم آپ کو اس راستے پر چلائیں گے۔

﴿هُوَ الَّذِي آتَى السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ ۴؎

یہاں ”السَّكِينَةَ“ سے مراد تحمل ہے۔ فرمایا: اللہ کی ذات وہ ہے جس نے مؤمنین کے دلوں میں تحمل پیدا فرمادیا۔ اگر اللہ کی طرف سے تحمل نہ ہوتا تو اس بات

کو برداشت کرنا کتنا مشکل تھا! ان شرائط کے ساتھ معاہدہ کرنا کتنا مشکل تھا! اللہ نے تحمل کی طاقت دی ہے۔

﴿يَذَرُ الذُّوَّاءَ اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ﴾ پہلے ایمان سے مراد ہے اصل ایمان

اور مزید ایمان سے مراد ہے نور ایمان کہ ہم اس ایمان کے ساتھ مزید ایمان بڑھاتے ہیں، یوں وہ نور ایمان آپ پر آتا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ جُنُودُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾

آسمان اور زمین کے سارے لشکر اللہ ہی کے ہیں، اللہ جانتا بھی ہے اور حکمت والا بھی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فتح کس کو دینی ہے اور حکمت والا بھی ہے کہ یہ فتح کس وقت دینی ہے!

﴿يُدْخِلُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنَّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكْفِّرُ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ ط وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾

یہ ہم نے جو آپ کو فتح عطا فرمائی اور ایمان والوں کو تحمل دیا یہ اس لیے دیا تاکہ یہ آپ کی بات کو مانیں تو اللہ اس کے بدلے میں ان ایمان والے مردوں اور عورتوں کو جنت میں داخل کریں جن میں نہریں جاری ہیں، ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان کے گناہوں کو معاف کر دیں گے۔ اللہ کے ہاں یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

﴿وَيُعَذِّبُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ

الظَّٰلِمِيْنَ بِاللّٰهِ طِنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ دَآبِرَةُ السَّوْءِ ط وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ

لَعَنَهُمْ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ط وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾

اور اللہ نے یہ فتح اس لیے دی ہے تاکہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو

اللہ عذاب دیں، مشرک مردوں اور مشرک عورتیں کو بھی عذاب دیں، ان منافقوں اور مشرکوں کا بد عقیدہ ہونے کی وجہ سے اللہ کے بارے میں گمان اچھا نہیں تھا۔ انہی پر عذاب ہو گا، انہی پر اللہ کا غضب ہو گا، اللہ کی لعنت ہو گی اور پھر آخرت میں اللہ نے ان کے لیے جہنم کا عذاب بھی تیار کیا ہوا ہے اور جہنم واقعی بہت برا ٹھکانہ ہے۔

### رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تین صفات:

﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾

یہاں اللہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تین صفتیں بیان فرمائی ہیں:

[1]: آپ شاہد ہیں۔ شاہد کا معنی کہ آپ قیامت کے دن گواہی دیں گے۔ اللہ کے دربار میں گزشتہ انبیاء علیہم السلام کہیں گے یا اللہ! ہم نے اپنی امتوں کو آپ کی بات پہنچائی ہے لیکن ان کی امتیں کہیں گی کہ انہوں نے ہم تک دین کی بات نہیں پہنچائی۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خلاف گواہی دیں گے کہ یا اللہ! انبیاء علیہم السلام نے دین کی بات پہنچائی تھی اور ان امتوں نے مانا نہیں تھا۔ تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ میرے پاس دلیل قرآن کریم ہے۔

یا اپنی امت پر گواہی دینا مراد ہے چونکہ ہر پیر اور جمعرات کو امت کے اعمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش ہوتے ہیں۔ تو قیامت کو اللہ کے نبی گواہی دیں گے۔

[2]: ”وَمُبَشِّرًا“ مومنین کو خوشخبری دیتے ہیں جنت کی۔

[3]: ”وَنَذِيرًا“ کفار کو ڈراتے ہیں جہنم سے۔

﴿يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعْزِزُوهُ وَتُقِرُّوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا﴾

﴿يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعْزِزُوهُ وَتُقِرُّوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا﴾



ہم نے تم لوگوں کو فتح اس لیے دی تاکہ تم اللہ کی ذات پر ایمان لاؤ، اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اللہ اور رسول پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا یقین اور بڑھ جائے اللہ کے رسول پر۔ ”وَتَعَزِّدُوهُ“ اور تم ان کی مدد کرو، ”وَتَوْقِرُوهُ“ اور تم ان کی عظمت کے قائل ہو جاؤ یعنی ان کی مزید عظمت کرو، عزت کرو۔

یہاں دیکھو! ”وَتَعَزِّدُوهُ“ کا لفظ یہ تعزیر سے ہے۔ اس کا معنی ہے مدد کرنا اور جو مجرم کو سزا دیتے ہیں اس کو بھی تعزیر کہتے ہیں۔ جس جرم کی شریعت میں سزا متعین ہے اسے حد کہتے ہیں اور جس جرم کی سزا متعین نہیں ہے بلکہ حاکم یا قاضی کی صوابدید پر ہو اسے تعزیر کہتے ہیں۔ تو تعزیر میں مدد کیسے ہوتی ہے؟ اس کی وجہ لغات وغیرہ میں یہ لکھی ہے کہ اس سزا کو تعزیر اس لیے کہتے ہیں کہ یہ مجرم کے ساتھ مدد ہے کہ آئندہ وہ یہ جرم نہیں کرے گا۔ یہ مجرم کی مدد کی جارہی ہے تاکہ وہ نیکیوں پر آئے اور گناہوں سے بچے۔ اس لیے اس سزا کو تعزیر کہتے ہیں۔

**”ید“ صفت متشابہ ہے:**

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾

جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں تو یہ دراصل اللہ کی بیعت کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ”ید“ ہے۔

”ید“ اللہ کی صفت ہے جس کا معنی ہم نہیں جانتے اور ”ید“ متشابہات میں سے ہے۔ اصل معنی یہی ہے لیکن متاخرین حضرات فرماتے ہیں کہ ”ید“ کا معنی یہاں قدرت ہے لیکن درجہ گمان میں ہے، درجہ یقین میں نہیں ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ ”ید“ کا معنی قدرت ہے اور درجہ یقین میں ہے۔ اس لیے معتزلہ کا مذہب الگ ہے اور متاخرین کا مذہب الگ ہے۔

متقدمین اور متاخرین کے مذہب میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، یہ نزاع لفظی ہے نزاع حقیقی نہیں ہے۔ متقدمین کہتے ہیں کہ ”ید“ کا معنی حقیقی اللہ کو معلوم ہے اور متاخرین کہتے ہیں کہ ”ید“ کا معنی ہمیں معلوم ہے لیکن حقیقی نہیں بلکہ درجہ گمان میں۔ تو یہ نزاع لفظی ہوا، نزاع حقیقی نہ ہوا۔

﴿فَمَنْ نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنُكْثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهِ

اللَّهُ فَمَیْؤُتٍ بِهِ أَجْرًا عَظِيمًا﴾

جو شخص اس عہد کو توڑے گا تو اس عہد کے توڑنے کا نقصان اسی پر ہی ہو گا اور جو شخص اس عہد کو پورا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ اس کو اجر عظیم دے گا۔

**حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں کی عذر خواہی:**

﴿سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلْفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا

فَاَسْتَغْفِرُ لَنَا يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ﴾

فرمایا کہ جب آپ واپس جائیں گے تو وہ دیہاتی لوگ جو تمہارے ساتھ نہیں گئے تھے وہ اب اپنے عذر پیش کریں گے کہ ہمارے مال اور گھر کی کچھ مصروفیت تھی کہ ہم ساتھ نہیں جاسکے، اس لیے اے پیغمبر! آپ ہمارے لیے اللہ سے معافی مانگیں۔ یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہہ رہے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہیں۔

ان کے دل میں یہ تھا کہ اگر ہم عمرہ کے لیے مکہ گئے تو قتل ہو جائیں گے، واپس نہیں آسکتے اور زبان سے یہ کہتے ہیں کہ ہماری مجبوری تھی، کچھ مصروفیت تھی اس لیے ہم نہیں جاسکے۔ تو ان کی زبان پر کچھ ہے اور دل میں کچھ اور ہے۔

﴿قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ

بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١١﴾ ﴿١١﴾

اے پیغمبر! آپ فرمادیجیے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا تمہیں کوئی نفع دینا چاہے تو وہ کون ہے جو اللہ کے سامنے تمہارے لیے کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو؟ بلکہ اللہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔

یہ اعراب جو سوچ رہے تھے کہ ہم اگر اپنے گھروں میں رہیں گے تو نفع میں ہوں گے اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جائیں گے تو نقصان میں ہوں گے تو ان کی یہ بات غلط ہے۔ نفع نقصان کا مالک اللہ ہے۔ جب اللہ تمہیں نفع یا نقصان دینے کا ارادہ کر لے تو کون بچا سکتا ہے؟! اس لیے تمہارے یہ عذر فضول ہیں۔

﴿بَلْ ظَنَنْتُمْ أَنْ لَنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا

وَزُيِّنَ ذَٰلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنًّا سَوِيًّا ۖ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا ﴿١٢﴾ ﴿١٢﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ تمہارے عذر فضول ہیں، اصل بات یہ ہے کہ تمہارا خیال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کبھی بھی مکہ سے واپس نہیں لوٹیں گے اور یہ بات تمہارے دل کو اچھی بھی لگتی تھی اور تم نے برے گمان قائم کیے تھے اور تم ہو ہی ایسی قوم جو تباہ اور برباد ہو جائے گی۔

**منافقین کے خیر جانے پر اصرار کی وجہ:**

﴿سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَائِمٍ لِّتَأْخُذُوا هَا ذَرُونَا

تَتَّبِعْكُمُ ۖ

جب تم مالِ غنیمت کی طرف جاؤ گے تو وہ لوگ جو پیچھے رہ گئے تھے وہ کہیں گے کہ ہم بھی تمہارے ساتھ چلنا چاہتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا۔ جیسا کہ آگے آرہا ہے

”كَذَّبِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ“۔ کہ اللہ عنقریب تمہیں ایک فتح دیں گے اور اس فتح سے مراد فتح خیبر تھی تو اللہ تعالیٰ نے پہلے بتا دیا کہ جب تم واپس جاؤ گے تو یہ منافقین کہیں گے کہ ہم نے خیبر میں تمہارے ساتھ جانا ہے۔

منافق یہ بات کیوں کہہ رہے ہیں؟ حالانکہ وہ تو جہاد سے ڈرتے ہیں اسی وجہ سے تو مکہ نہیں جا رہے تھے تو پھر یہ لوگ خیبر جانے کی بات کیوں کرتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مکہ سے مسلمانوں کو صحیح سلامت واپس ہوتے ہوئے دیکھا تو ان کو اندازہ تھا کہ خیبر بھی ایسے ہوگا، مسلمانوں کو فتوحات ملنے والی ہیں، لہذا وہاں سے غنیمت ملے گی۔ اس لیے ہم کہیں گے کہ جی ہم بھی خیبر میں ساتھ جائیں گے۔

﴿قُلْ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ إِلَّا قَلِيلًا ۖ فَمَا تَقُولُونَ﴾

تَحْسُدُونََنَا بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٦﴾

فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ تم ہمارے ساتھ نہیں جاسکتے کیونکہ اللہ کا فیصلہ یہی ہے کہ جو لوگ بیعت رضوان میں شریک تھے غزوہ خیبر میں وہی شرکت کریں گے اور جو شریک نہیں تھے تو وہ یہاں بھی شرکت نہیں کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ یہ اللہ کا فیصلہ نہیں ہے بلکہ تم تو ہم سے جلتے ہو کہ کہیں ان کو مال غنیمت نہ مل جائے، حسد کی وجہ سے ایسی باتیں کرتے ہو۔ فرمایا کہ حسد نہیں ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ تم بات کو سمجھتے نہیں ہو۔

**حدیث حجت ہے:**

اب سورة الفتح جو آپ نے دیکھی ہے اس میں تو یہ بات نہیں ہے کہ خیبر فتح ہوگا اور مال غنیمت ہوگا اور جو حدیبیہ والے ہیں صرف وہی اس میں جائیں گے۔ تو یہ

بات کیسے فرمادی کہ ﴿كَذَّبِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ﴾

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہے وحی متلو اور ایک ہے وحی غیر متلو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو بات اللہ نے فرمائی تھی یہ قرآن کریم میں تو نہیں فرمائی بلکہ اللہ نے بات اپنے نبی کو بذریعہ وحی غیر متلو بتادی یعنی یہ بات حدیث پاک میں تھی۔ تو اس سے حدیث پاک کا حجت ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہی بات جو صرف قرآن کریم میں ہو اور حدیث حجت نہ ہو تو پھر جب قرآن کریم کے اندر یہ بات موجود ہی نہیں ہے کہ جو حدیبیہ والے ہیں صرف وہی جائیں گے تو کیسے کہہ دیا کہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ حدیبیہ والے جائیں گے اور کوئی نہیں جائے گا، یہ قرآن میں تو نہیں ہے۔

تو اس سے ثابت ہوا کہ حدیث پاک حجت ہے۔ جس طرح قرآن کریم کو ماننا ضروری ہے اسی طرح حدیث پاک کو ماننا بھی ضروری ہے۔

### پیچھے رہ جانے والوں کو خطاب:

﴿قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَى قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا﴾

حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں کو یہ بات فرمائی کہ دیکھو! یہ طے شدہ بات ہے کہ تم غزوہ خیبر میں تو شرکت نہیں کر سکتے۔ اس سے یہ ہوا کہ منافقین کو تو افسوس صرف یہ تھا کہ ہمیں مالِ غنیمت نہیں ملا اور جو منافقین نہیں بلکہ مخلص صحابہ تھے اور ان کی باتوں میں آکر وہ حدیبیہ میں شرکت نہیں کر سکے اب ان کو بہت دکھ ہو رہا تھا کہ ہم حدیبیہ میں بھی نہیں جاسکے اور اس کے بعد ہم غزوہ خیبر میں بھی شرکت نہیں کر سکے، ہمارا کیا بنے گا؟ تو ان صحابہ سے فرمایا کہ ایک اور وقت آنے والا ہے اللہ تمہیں اس میں شرکت کی اجازت دیتے ہیں، تم وہاں پر اپنے جو ہر دکھا لینا۔

اور اگر اس سے منافقین مراد ہوں تو پھر ان کو یہ کہا جا رہا ہے کہ تم خیر کے لیے پریشان کیوں ہو، یہ تو خدا کا فیصلہ ہے کہ جو حدیبیہ میں شریک تھے خیر میں وہی جائیں گے، اس کے بعد آنے والی جنگیں ہیں تم ان میں شرکت کر لینا، وہاں پتا چل جائے گا کہ تم جاتے ہو یا نہیں جاتے!

﴿قُلْ لِّلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ﴾ ان پیچھے رہ جانے والے دیہاتیوں سے کہہ دو کہ عنقریب تمہارا واسطہ ایسی قوم سے پڑے گا جو سخت جنگجو ہے، تم ان سے لڑو گے حتیٰ کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔ جب تک کلمہ نہیں پڑھیں گے تمہاری لڑائی ان سے جاری رہے گی۔ اگر تم اللہ کی بات مانو گے تو اللہ بہترین اجر دیں گے اور اگر نہیں مانو گے جیسے تم نے پہلے نہیں مانی تو خدا دردناک عذاب دیں گے۔

﴿سَتُذْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ﴾... اس کا مصداق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے بعد کی جنگیں ہیں؛ خواہ وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور کا جہاد ہو جو مسلمہ کذاب کے خلاف تھا خواہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور کا جہاد ہو جو ایرانیوں کے خلاف تھا۔ بہر حال یہ جنگیں بعد کی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس کے بعد کوئی ایسی جنگ پیش نہیں آئی کہ جس میں طاقت ور قوم سے واسطہ پڑا ہو اور جنگ میں بڑی مشکل ہوئی ہو۔

**پیچھے رہ جانے والے مخلصین کا حکم:**

﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرْجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرْجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرْجٌ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَنْ يَتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِيمًا﴾

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو مخلص تھے اور معذور تھے ان کو اور دکھ ہوا

کہ ہمارا کیا بنے گا؟ ہم حدیبیہ میں بھی نہیں جاسکے، خیبر جانے پر بھی پابندی لگا دی گئی، آئندہ جب جنگیں ہوں گی تو ہم تو لڑ نہیں سکتے، ہمارا عذر ہے، اب ہمارا کیا بنے گا؟ فرمایا کہ اگر کوئی شخص ناپیدنا ہو، لنگڑا ہو یا بیمار ہو اور وہ سفر جہاد کے لیے نہ جاسکے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ جو اللہ کی اطاعت کرے اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرے تو اللہ اسے ان باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے منہ موڑے گا تو اللہ اسے دردناک عذاب دے گا۔

### بیعت رضوان:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ

مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا﴾ (٨٨)

جن لوگوں نے اس درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے رضا کا اعلان ہو گیا۔

اللہ ان ایمان والوں سے راضی ہے جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔ اللہ ان کے دل کے اخلاص کو جانتے ہیں۔ اللہ نے ان پر اطمینان نازل فرمادیا یعنی وہ مطمئن ہو کر بیعت کر رہے تھے۔ اور اس کے بعد اللہ بہت جلد انہیں فتح عطا کرنے والے ہیں۔

اس فتح کا مصداق غزوہ خیبر ہے۔ یہاں ایک اشکال اور اس کا جواب سمجھیں۔ ہم نے ابھی کہا تھا کہ غزوہ خیبر میں وہی جائیں گے جو حدیبیہ میں شریک تھے، جو حدیبیہ میں نہیں تھے وہ اس میں نہیں جائیں گے یہ بات قرآن کریم میں نہیں ہے بلکہ حدیث میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث حجت ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ ﴿وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا﴾ کے بارے میں تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ فتح قریب سے

مراد فتح خیبر ہے۔ تو اس کا تذکرہ تو قرآن میں آگیا۔ تو یہ کیسے کہا کہ اس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے؟

اس کے دو جواب سمجھیں:

[1]: اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ تو بتایا کہ اس کے بعد عنقریب ایک جہاد ہو گا جس میں اللہ تمہیں فتح نصیب فرمائے گا لیکن یہ تو نہیں بتایا کہ اس میں شریک کون ہوں گے اور کون نہیں ہوں گے؟ اس میں یہ تو ہے کہ اس جہاد میں حدیبیہ والے شریک ہوں گے لیکن جو حدیبیہ والے نہیں تھے وہ اس میں شریک نہیں ہوں گے، یہ بات تو اس میں نہیں ہے۔

[2]: دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں یہ تو فرمایا کہ فتح قریب ہوگی لیکن فتح قریب سے مراد خیبر کی فتح ہونا یہ تو قرآن کریم میں نہیں ہے، یہ تو احادیث سے پتا چل رہا ہے کہ فتح قریب سے مراد فتح خیبر ہے۔ تو اس سے پھر حدیث کا حجت ہونا ثابت ہو جائے گا۔

﴿وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَذِهِ وَكَفَّ  
أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَتَعْمُونَ آيَةً لِلْمُؤْمِنِينَ وَ يَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا  
مُسْتَقِيمًا﴾

اور اس فتح خیبر کے بعد اور بھی جہاد ہوں گے۔ اب فتوحات کا دور شروع ہو گیا ہے۔ فرمایا: اللہ نے تم سے اور بھی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جو تم حاصل کرو گے اور اللہ نے فوری طور پر یہ فتح تمہیں دی ہے اور اللہ نے دشمن کے ہاتھ کو تم سے روک دیا ہے تاکہ یہ بات مومنوں کے لیے تسلی کا سامان بن جائے اور اللہ تمہاری مزید رہنمائی فرمائیں گے اور مزید ہدایت کا اعلیٰ مقام عطا فرمائیں گے۔

یہ خیبر کا موقع ہے کہ یہودی طاقت میں بھی تھے، ان کے پاس وسائل بھی



تھے، اسباب بھی تھے لیکن ان کے باوجود مرحب کا قتل ہونا تھا کہ خدا نے ان کے دلوں میں مسلمانوں کا اتنا رعب ڈال دیا کہ مسلمانوں کو زیادہ ہاتھ نہیں چلانے پڑے، بغیر لڑے خیبر مسلمانوں کے ہاتھ میں آگیا۔

﴿وَأُخْرِى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا﴾

شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿٢٦﴾

ابھی کتنی ہی جنگیں باقی ہیں جن کو کنٹرول کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے لیکن اللہ نے ان کا احاطہ کیا ہوا ہے یعنی اللہ تعالیٰ آنے والی جنگوں میں تمہیں مزید فتوحات عطا فرمائیں گے۔ اللہ رب العزت ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں۔

﴿وَلَوْ قُتِلَكُمْ الدِّينُ كَفَرُوا وَتَوَلَّوْا إِلَّا دَبَارَ ثَمَّةٍ لَا يَجِدُونَ وِثْيًا وَلَا نَصِيرًا﴾

سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ بُدْلًا ﴿٢٧﴾

اور اگر کفار تم سے جنگ کرتے تو کافر ہی پیٹھ پھیر کر دوڑ جاتے، پھر ان کا کوئی ولی اور مددگار نہ ہوتا۔ یہی خدا کا طریقہ ہے جو پہلے تھا اور اللہ کا یہی طریقہ آئندہ بھی ہے جس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

اب یہاں ایک بات سمجھیں۔ حدیبیہ کے موقع پر صلح ہوئی، جنگ نہیں ہوئی اور قرآن کہہ رہا ہے کہ اگر جنگ ہو جاتی تو شکست کفار کو ہوتی اور مسلمان جیت جاتے تو سوال یہ ہے کہ پھر جنگ کیوں نہیں ہوئی؟ پھر صلح کی کیا ضرورت تھی؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر جنگ ہوتی تو فتوحات تو مسلمانوں کو ہی ہوتیں لیکن فتوحات کے ساتھ ساتھ نقصانات بھی ہوتے کہ مکہ میں بعض مسلمان ایسے تھے جو کفار سے الگ نہیں تھے اور ایسے موقع پر الگ ہونا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اگر مسلمان مکہ پر چڑھائی کرتے تو کفر کی کمر تو ٹوٹتی لیکن بہت سارے مسلمان بھی ساتھ شہید ہو جاتے اور بعد میں مسلمانوں کو دکھ ہونا تھا کہ یہ ہمارے ہاتھوں کیا ہو گیا ہے؟

اسی طرح اگر اس موقع پر جنگ ہوتی تو جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہو بھی جاتی لیکن مسلمانوں کا بھی نقصان ہوتا، ان کے بھی بہت سارے افراد شہید ہو جاتے۔ لیکن اس صلح کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان سارے محفوظ ہوئے اور دعوت کے دروازے کھل گئے، باقی قبائل تک جانا آسان ہو گیا اور آئندہ پھر فاتح ہو کر مکہ میں داخل ہوئے ہیں۔ تو مسلمانوں کی طاقت بھی کمزور نہیں ہوئی اور اللہ نے مزید فتوحات کا دروازہ بھی کھول دیا۔ جنگ ہو کر اگرچہ فتح ہوتی لیکن جنگ نہ ہونے پر جو فتوحات ہیں وہ جنگ کی فتوحات سے بھی زیادہ ہیں۔

﴿وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ أَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا﴾ (۲۲)

یہ جو میں نے پہلے کہا تھا کہ پچاس مشرک آئے تھے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کریں، آپ کو معاذ اللہ قتل کریں تو صحابی رسول محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ان کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ یہ آیت ان کے بارے میں ہے کہ اللہ نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیے کہ وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل نہیں کر سکے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے کہ تم نے ان کو قتل نہیں کیا۔

﴿بِبَطْنِ مَكَّةَ﴾.... اب بطن مکہ کا معنی یہ ہے کہ مکہ میں کا واقعہ ہے حالانکہ یہ مکہ میں کا واقعہ تو نہیں ہے، حدودِ حرم سے باہر کا واقعہ ہے لیکن حدودِ حرم کے قریب ہونے کی وجہ سے بطن مکہ کہہ دیا۔

احناف کی رائے یہ ہے کہ حدیبیہ کا کچھ حصہ حدودِ حرم میں شامل ہے اور اس آیت سے احناف کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

﴿هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ صَدُّوا كُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ الْهَدْيِ

یہی لوگ کافر ہیں جنہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا اور اس ہدیٰ کو بھی روکا جس نے اپنے ذبح ہونے کی جگہ پر جانا تھا۔ اگر ایسے ایمان والے مرد اور ایسی ایمان والی عورتیں نہ ہوتیں جن کو تم نہیں جانتے، اور تمہیں یہ خطرہ بھی نہ ہوتا کہ تم ان پر چڑھائی کر دو گے تو تمہارے اور مشرکین کے درمیان جنگ بپا ہو جاتی اور تمہاری فتح ہو جاتی لیکن بعد میں تمہیں افسوس ہونا تھا اس لیے اللہ نے جنگ کی نوبت آنے ہی نہیں دی۔ ایسا کیوں ہوا تاکہ یہ لوگ قتل نہ ہوں بلکہ زندہ رہیں اور اللہ کی رحمت میں داخل ہوں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل فرماتا ہے۔

ہاں اگر مکہ میں رہنے والے مسلمان کفار سے بالکل الگ تھلگ ہوتے تو ہم کفار کو دردناک عذاب دیتے لیکن چونکہ مسلمان کفار کے ساتھ مکس تھے تو درمیان میں شہید ہو جاتے۔

جب کفار نے اپنے دلوں میں جاہلیت والی حمیت کو جگہ دی تو اللہ نے کرم یہ کیا کہ اطمینان اور سکون اپنے رسول اور ایمان والوں کے دل میں ڈال دیا۔ مشرکین کتنی ضدی باتیں کر رہے ہیں کہ ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ نہیں لکھنا! ”رسول اللہ“

نہیں لکھنا! اس سال واپس چلے جاؤ آئندہ سال آنا! اللہ فرماتے ہیں کہ وہ جاہلیت کی باتیں کرتے ہیں اور خدا نے مسلمانوں کو تحمل عطا فرمایا کہ تم نے برداشت کرنا ہے۔ ﴿وَالزَّمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى﴾ اور مسلمانوں کو خدا نے کلمہ تقویٰ یعنی کلمہ توحید عطا کیا اور دنیا میں مستحق بھی اس کے مسلمان ہی تھے، اور اس کے بدلے میں اللہ جو اجر دے گا یہ مسلمان اہل بھی اس کے ہیں۔

### عمرہ کا خواب سچا ہے:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ﴾

اللہ نے اپنے پیغمبر کے خواب کو سچا کر دکھایا۔  
میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ماضی تحقق کے لیے آتا ہے۔ یعنی جس بات کا آئندہ زمانے میں وقوع یقینی ہو تو اس بات کو ماضی کے صیغہ سے تعبیر کرنا یہ بلاغت اور کلام عرب کا تقاضا ہے۔ تو چونکہ خواب نے سچا ہونا تھا تو فرمایا: ﴿لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ﴾ کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کے خواب کو سچ کر دکھایا یعنی ضرور سچا ہو گا۔

﴿لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ أَمِينٌ﴾  
﴿رُءُوسُكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ﴾

تم مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے امن کے ساتھ، اپنے سروں کا حلق کر اؤ گے یا سروں کا قصر کر اؤ گے۔ اور تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔

اس موقع پر یعنی سن 7 ہجری عمرہ القضاء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق نہیں کروایا تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصر کروایا تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے آپ کے بال مبارک قینچی سے کاٹے تھے۔

﴿فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَلِكَ فَتَحًا قَرِيبًا﴾

جو کچھ تم نہیں جانتے وہ اللہ جانتے ہیں اس لیے اللہ نے خواب پورا ہونے سے پہلے ہی ایک قریب کی فتح تمہیں عطا فرمادی ہے۔

**غلبہ برہانی اور غلبہ عملی:**

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ

كُلِّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا﴾ (آل عمران: ۱۸)

وہی ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے اور اس کی گواہی کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔

غلبہ کی دو قسمیں ہیں: ایک ہے غلبہ برہانی اور ایک ہے غلبہ عملی۔ غلبہ برہانی یعنی تمام ادیان پر دین محمد کا غالب ہونا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہو چکا ہے اور غلبہ عملی یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں ہو چکا ہے اور پورے کرہ ارض پر غلبہ عملی یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں ہو گا ان شاء اللہ العزیز۔

اگر ہمارے دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں تو یہ دعا کریں کہ اللہ ہمیں ان کا ساتھی بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین) فتنوں کا دور ہے اور ایمان ہمارا بہت ضعیف ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ آجائیں اور ہم ڈگمگائیں۔ یہ جو عموماً ہمارے ہاں روزانہ بحث ہوتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آنے والے ہیں، امام مہدی کے ظہور کی ساری نشانیاں پوری ہو گئی ہیں، آج آئے اور کل آئے۔ میں بیانات پر جاتا ہوں تو بعض لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کا کیا خیال ہے؟ میں کہتا ہوں کہ آدمی اپنی اوقات کے مطابق خیال ظاہر کرے، میں اوقات سے بڑھ کر خیال کو ظاہر نہیں کرتا! بس میں کہتا ہوں کہ آپ اس بات کو چھوڑیں! جو ہمارے ذمہ کام ہے ہم وہ کریں۔ بسا اوقات انسان اپنے کاموں سے ہاتھ کھینچ کر بیٹھ جاتا ہے، اپنے ذمہ جو کام ہے وہ بھی چھوڑ دیتا ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنے والے ہیں، بس آج نہیں تو اگلے

سال یا اس سے اگلے سال، بس دو چار سال ہیں جب وہ آئیں گے تو پھر کام کریں گے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ نہ آئے تو پھر کیا ہو گا؟! بھائی! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے بھی تو ہماری ذمہ داریاں ہیں، تو ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی ذمہ داریاں نبھاتے رہیں، وہ آجائیں گے تو ہم ان کے سپاہی ہیں اور اگر ہماری زندگی میں نہ آئے تو ہماری نیت تو ہے کہ ہم ان کے سپاہی ہیں، اس لیے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھیں، بس اپنے ذمہ جو کام ہے اسے جاری رکھیں۔

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ﴾ حضرت محمد اللہ کے رسول ہیں۔ یہاں دیکھیں کہ اللہ نے محمد کے ساتھ ”رسول اللہ“ کی وضاحت کی ہے۔ اس لیے کہ سہیل بن عمرو نے کہا تھا کہ محمد بن عبد اللہ لکھو، محمد رسول اللہ نہ لکھو! اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کاٹ دو۔ حضور نے اس پر تحمل کیا، ضبط کیا اور اس معاہدے کی وجہ سے ”رسول اللہ“ کا لفظ کاٹا ہے تو اللہ نے ہمیشہ کے لیے قرآن کا حصہ بنا کر نازل فرمادیا کہ اب قیامت تک محمد کے ساتھ ”رسول اللہ“ پڑھا جائے گا، لکھا جائے گا۔ انہوں نے وقتی طور پر کٹوایا تھا لیکن اللہ نے مستقل حصہ بنا دیا۔

### صحابہ کرام کی صفات:

﴿وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا﴾ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ہیں وہ کفار کے مقابلے میں سخت ہیں، آپس میں نرم ہیں، تم دیکھو گے کہ وہ رکوع کرتے ہیں، سجدے کرتے ہیں، اللہ کا فضل اور اللہ کی خوشنودی تلاش کرتے ہیں۔

﴿سَيَمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ﴾

کثرتِ سجد کی وجہ سے ان کے چہرے پر نشانِ نظر آتے ہیں۔

اس نشانی سے مراد وہ ظاہری نشان نہیں ہے جو سجدہ کی وجہ سے پیشانی پر پڑ جاتا ہے بلکہ اس سے مراد نورِ تقویٰ ہے جو تہجد والے شخص کے چہرے پر نظر آتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے چہرے پر یہ نور نظر آتا ہے۔ اگر کسی تہجد گزار کے چہرے پر نور نظر نہ آئے تو اپنی آنکھ کا قصور سمجھا کریں، ایسے نہیں کہ کوئی شخص تہجد بھی پڑھے اور آپ کہیں کہ یار! اس کے چہرے پر نور تو نظر نہیں آ رہا بلکہ یوں سمجھنا کہ نور تو ہے لیکن مجھے نظر نہیں آ رہا۔ آدمی کو بخار ہو تو میٹھا انگور بھی آدمی کو موافق نہیں آتا۔ اب یہ نہ کہو کہ انگور کھٹا ہے، یہ کہو کہ انگور تو ٹھیک ہے لیکن میری زبان کا ذائقہ ٹھیک نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح پانی بالکل صاف ہوتا ہے لیکن جس بوتل میں ہوتا ہے اس کا رنگ کالا ہو تو صاف پانی بھی کالا نظر آتا ہے۔ تو تمہاری آنکھوں کے شیشے چونکہ کالے ہیں اس لیے ہر چیز کالی نظر آتی ہے۔

﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيلِ﴾

اللہ نے فرمایا کہ صحابہ کے اوصاف تورات میں بھی بیان کیے گئے ہیں اور انجیل میں بھی بیان کیے گئے ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ فرمایا:

﴿كَزَّرَعٍ اَخْرَجَ شَطَطُهُ فَاَزْرَعَهُ فَاَسْتَغْلَظَ فَاَسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهِ يُعْجَبُ

النَّزَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾

ان کی مثال ایسے ہے جیسے کھیتی ہو، جس نے پہلے تو اپنی کونیل نکالی ہو، پھر اس کو مضبوط کیا ہو، پھر تھوڑی سی موٹی ہوئی ہو، پھر اپنے تنے کے سہارے کھڑی ہوئی ہو کہ کسان اس کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ یہ اللہ کیوں کرتے ہیں تاکہ اس سے کافروں کا دل جلے۔

اللہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی مثال کیوں دی ہے؟ اس لیے کہ ایک وقت

وہ تھا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تھے۔ پھر آپ کے ساتھ حضرت خدیجہ، حضرت علی، حضرت زید بن حارثہ، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہم؛ یہ تھوڑے سے افراد تھے، پھر چند ایک غلام ملے، یوں آہستہ آہستہ ایک وقت آیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ دنیا میں اس قدر قوت والے ہوئے کہ ان کو دیکھ کر جلنے والا کافر ہی ہو سکتا ہے، مسلمان نہیں ہو سکتا۔

البتہ اس آیت کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالنا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی قوت کو دیکھ کر جلنے سے بندہ کافر ہو جاتا ہے یہ نتیجہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طاقت کو دیکھ کر جلنے والا یہ کافروں والا کام کرتا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھ کر جلنا مسلمانوں کا کام نہیں ہے یہ کافروں کا کام ہے۔ تو کافر ہونا اور ہے اور کافروں کا طرز اختیار کرنا اور ہے۔ جیسے حدیث میں ہے:

مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَبِّدًا فَقَدْ كَفَرَ.<sup>173</sup>

اب دیکھو! یہاں بالکل صریح ہے کہ جو جان بوجھ کر نماز چھوڑتا ہے تو اس نے کافروں والا کام کیا۔ جو شخص صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتا بلکہ پریشان ہوتا ہے وہ کافروں والا کام کرتا ہے۔ لہذا اس بنیاد پر کفر کا فتویٰ نہیں دیتے۔

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ ﴿۱﴾ اللہ نے ایمان والوں اور نیک اعمال کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ ان کی مغفرت کرے گا اور ان کو اجر عظیم دے گا۔

اللہ پاک ہمیں قرآن سمجھنے کی اور سمجھانے کی توفیق عطا فرمائے آمین  
وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



## سورة الحجرات

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْدِمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا

اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾

**قرآن کا مخاطب خود کو سمجھے!**

میں نے آپ سے کہا تھا کہ قرآن کریم کی تفسیر یا احادیث کا درس دیں یا کہیں وعظ و نصیحت کریں تو یہ ذہن سے نکال دیں کہ یہ درس عوام کے لیے ہے بلکہ یہ ذہن بنا لیں کہ یہ درس ہمارے لیے ہے۔ میں سورة الحجرات کے شروع میں یہ بات بطور خاص اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہم میں سے ہر بندہ یہ ذہن بنالے کہ اس سورت کا مخاطب میں ہوں، اگر ایسا ذہن بنائیں گے تو پھر عمل کی توفیق مل جاتی ہے۔ اگر آدمی آیات کا مخاطب خود کو نہ سمجھے تو پھر عمل کی توفیق نہیں ملتی بلکہ بندہ یہ کمزوریاں اور عیوب دوسروں میں تلاش کرتا ہے کہ یہ عیب فلاں کے اندر ہے، یہ فلاں کے اندر ہے، یہ فلاں کے اندر ہے اور جب اس کا مخاطب خود کو سمجھیں گے تو پھر یہ عیب کسی اور میں ہو یا نہ ہو بندہ اپنے اندر تلاش کرتا رہتا ہے۔

**شان نزول:**

قبیلہ بنو تمیم کے کچھ لوگ آئے۔ مقصد یہ تھا کہ ہم اپنے قبیلہ کا حاکم کس کو

بنائیں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ باتیں چل پڑیں تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ قنقاع ابن معبد کو بنائیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ اقرع بن حابس کو بنائیں۔ اس پر بات تھوڑی سی چل پڑی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود تھے۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ کے نبی موجود ہیں تو کوئی رائے نہ دیتا جب تک آپ رائے نہ لیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رائے پوچھی نہیں اور انہوں نے رائے دے دی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْدِمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا

اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾

کہ اے ایمان والو! تم پیغمبر سے آگے مت بڑھو، اللہ سے ڈرو! اللہ تعالیٰ تمہاری باتیں سنتا ہے اور تمہارے دلوں کے احوال کو جانتا ہے۔

میں نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ آیات کے ترجمے میں محاورات کو سامنے رکھیں ورنہ آیت کا ترجمہ صحیح نہیں ہو پاتا۔ قرآن کریم ایک محاورے کے مطابق بات کر رہا ہوتا ہے تو ہمیں اسی محاورے کے طرز پر ترجمہ کرنا چاہیے۔

**علماء کا احترام کرنا بھی ضروری ہے:**

یہاں یہ بات سمجھیں کہ پیغمبر کا وارث عالم ہوتا ہے، جو احکام پیغمبر اور امتی کے ہوتے ہیں تقریباً اس سے ملتے جلتے احکام عالم اور غیر عالم کے ہوتے ہیں۔ اب مسجد کا امام ہے، یہ نبی تو نہیں ہے لیکن یوں سمجھیں کہ امت میں نبی کی طرح ہے۔ امت کو مسائل سمجھانے میں یہ نبی کا وارث ہے، اس لیے امت کو اس عالم کے ساتھ ادب اور احترام کا وہی معاملہ کرنا چاہیے جو ایک امت اپنے نبی کے ساتھ کرتی ہے۔ مقتدی اپنے امام کے ساتھ... مرید اپنے پیر کے ساتھ... شاگرد اپنے استاد کے ساتھ... تنظیم میں ہیں تو کارکن اپنے امیر کے ساتھ بس یہی ادب والا رویہ اختیار کرے۔ حضرات فقہاء

نے یہ لکھا ہے، اس لیے اس کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب رائے لیں تو رائے دینی چاہیے اور جب رائے نہ لیں اور رائے لینے کی خواہش بھی نہ ہو تو رائے نہیں دینی چاہیے۔ اسی طرح استاد یا اپنے سے بڑا شخص اگر رائے لے تو رائے دیں اور جب تک اس کے رائے لینے کا منشا سامنے نہ آئے تو تب تک رائے نہیں دینی چاہیے اور اگر یہ خدشہ ہو کہ ہماری رائے ان کو ناگوار گزرے گی پھر تو بالکل رائے نہ دیں، بس خاموشی اختیار کریں۔ جب رائے مانگیں تو پھر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کریں۔

### نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کرو!

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ

بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾

اے ایمان والو! اپنی آواز پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو اور نبی کے ساتھ ایسی بات نہ کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہو ورنہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تمہیں احساس بھی نہ ہو گا کہ تمہارے اعمال ضائع ہو گئے ہیں۔

یہاں پر ”جہر“ کا معنی صرف یہ نہیں کہ اونچی آواز سے بات نہ کرو بلکہ معنی یہ ہے پیغمبر کے ساتھ تم اس طرح بات نہ کیا کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہو۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اتنی پست آواز سے بولتے تھے کہ بسا اوقات پوچھنا پڑتا کہ آپ نے کیا کہا ہے؟

حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی آواز طبعاً بہت اونچی تھی تو وہ بہت پریشان ہوئے کہ میری تو آواز اونچی ہے، نہ چاہتے ہوئے آواز اونچی ہو جاتی ہے تو انہوں نے اپنی آواز کو پست کیا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تو قسم اٹھالی کہ

میں اب زندگی بھربات ایسے کروں گا جیسے بندہ سرگوشی کرتا ہے۔

﴿كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ﴾... آپس میں بات کرنے کے دو مطلب

ہوتے ہیں؛ ایک یہ کہ جس طرح تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو اس طرح نبی کو نہ پکارا کرو! جس طرح بعض لوگ کہتے ہیں: اوائے بات سنو! تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے نہیں کہنا، ایک تو یہ خیال کرو۔ دوسرا یہ کہ جس طرح تم آپس میں بیٹھے ہو اور اونچی باتیں کرتے ہو اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوں تو اسی طرح اونچی باتیں نہ کرو، تمہاری آواز پیغمبر کی آواز سے اونچی نہیں ہونی چاہیے۔

**روضہ مبارک کے پاس آواز بلند کرنا ممنوع ہے:**

اور جس طرح یہ حکم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا والی زندگی میں تھا اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برزخ والی زندگی میں بھی یہی حکم ہے کہ آج بھی مدینہ منورہ میں روضہ رسول پر نہ اونچی آواز سے بات کرنی چاہیے اور نہ ہی وہاں شور و غل کرنا چاہیے۔ اللہ آپ سب کو حرمین کی زیارت کی توفیق دے۔ (آمین۔ سامعین) بیت اللہ کا جمعہ اور نمازیں آپ سنیں گے تو امام بہت بلند آواز سے بولتا ہے لیکن مسجد نبوی کا خطبہ جمعہ سن لیں یا مسجد نبوی کی نمازیں اور تراویح دیکھ لیں تو امام کی آواز اونچی نہیں ہوتی، بہت پست آواز ہوتی ہے۔ آپ کو دونوں میں نمایاں فرق نظر آئے گا۔ وہاں کے خطبات اور نمازوں سے اندازہ ہو گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بھی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ یہاں مسجد نبوی میں کیسے چلنا ہے؟

**اعمال ختم ہونے کا معنی:**

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں؛

(1): پہلا سوال تو یہ ہے کہ اللہ نے یہاں فرمایا: ﴿أَنْ تَخْبَطَ أَعْمَانُكُمْ﴾ کہ

تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ یہ بات اتفاقی ہے کہ نیک اعمال صرف اور صرف کفر کی وجہ سے ضائع ہوتے ہیں، اگر بندہ کافر ہو جائے تو اعمال ضائع ہو جاتے ہیں لیکن اگر معصیت کا کوئی کام کر لے تو اس کی وجہ سے نیک اعمال ضائع نہیں ہوتے۔ اب یہاں جو فعل ہے یعنی ”اونچی آواز سے بات کرنا“ تو یہ فعل کفر نہیں ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ کہ اے ایمان والو! اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ خطاب مومنوں کو ہے، ان میں ایمان موجود ہے۔ جب ایمان موجود ہے تو پھر ان کے اعمال کیوں ختم ہو گئے؟ ایک تو یہ سوال ہے۔

(2): اور دوسرا سوال یہ ہے کہ جس طرح ایمان لانا امر اختیاری ہے اسی طرح کفر بھی امر اختیاری ہے۔ ایک بندہ جب تک اپنے ارادہ اور اختیار سے ایمان نہیں لاتا تو اسے مومن نہیں کہیں گے، اسی طرح اگر کوئی مسلمان اپنے ارادے سے کفر اختیار نہ کرے تو اسے کافر نہیں کہیں گے لیکن یہاں فرمایا: ﴿أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ اعمال ضائع ہوتے ہیں کفر کی وجہ سے تو گویا بندہ کافر ہو جائے گا اور اسے پتا بھی نہیں چلے گا کہ میں کافر ہو گیا ہوں حالانکہ کفر امر اختیاری ہے۔

تو یہ دو سوال یہاں پیدا ہوتے ہیں۔

ان کا جواب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ نے دیا۔ حضرت کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے ایمان والو! تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنے اور جہر کرنے سے بچو! کیوں؟ کہ ایسا کرنے میں خطرہ ہے کہ تمہارے اعمال ختم ہو جائیں گے! خطرہ کیوں ہے؟ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنا یہ ایسے اعمال ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی اور بے

ادبی کا احتمال ہے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو گی۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست اور واضح ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کا وہم اور گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ معاذ اللہ جان بوجھ کر ایسا کام کریں جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو۔ البتہ بعض کام ایسے ہوتے ہیں مثلاً آواز بلند کرنا یا آگے بڑھنا جنہیں کرنے والا شخص ایذا اور تکلیف دینے کے ارادے سے نہ بھی کرے لیکن پھر بھی ایذا کا احتمال تو ہے۔ اس لیے اس کو مطلقاً ممنوع قرار دیا گیا اور اسے معصیت کہہ دی گیا۔ پھر بعض معصیت کے کام ایسے ہوتے ہیں جس کا ارتکاب کرنے والے سے اللہ رب العزت توبہ اور نیک کام کی توفیق سلب کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسا شخص گناہوں میں پڑ کر ایک نہ ایک دن کفر تک جا پہنچتا ہے اور ظاہری بات ہے کہ کفر کی وجہ سے تمام اعمال ختم ہو جاتے ہیں اور ایسا کرنے والے نے چونکہ قصد اور ارادہ نہیں کیا اس لیے اسے پتا بھی نہیں چلے گا کہ اس کے اعمال ختم ہو گئے ہیں۔

یہ خلاصہ ہے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے جواب کا۔ اب اس میں دونوں سوالات کا جواب ہو جاتا ہے۔

**حضور علیہ السلام گھر میں ہوں تو پکار نہ بلایا جائے:**

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ فَلَتَتَقْوَىٰ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ﴾

فرمایا کہ جو لوگ پیغمبر کے سامنے اپنی آواز کو آہستہ کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے منتخب کر لیا ہے اور ان کے لیے مغفرت بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ﴾

یہی بنو تمیم کے لوگ آئے تو ان میں اکثر لوگ چونکہ اعراب لوگ تھے تو انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے کے باہر کھڑے ہو کر آوازیں لگائیں، وہ لفظ یہ تھے: ”اُخْرِجْ عَلَيْنَا يَا مُحَمَّدُ!“ باہر آؤ ہماری بات سنو!

اب بلانے کا یہ طرز ایسا تھا جو مناسب نہیں تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہیں یوں نہیں کرنا چاہیے بلکہ تم نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا انتظار کرو، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو پھر ان کے سامنے بات رکھو۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر چلے جائیں تو ان کو بلایا نہ کرو۔

وہ لوگ جو آپ کو بلاتے ہیں حجروں کے باہر سے ان میں اکثر ایسے ہیں کہ جو بات سمجھتے نہیں ہیں۔ یہاں ﴿اَكْثَرُهُمْ﴾ کیوں فرمایا؟ یا تو واقعتاً اکثر لوگ ایسے تھے جنہوں نے ایسے پکارا تھا اور بعض ایسے تھے کہ جنہوں نے ایسے نہیں پکارا تھا۔

اور یا ﴿اَكْثَرُهُمْ﴾ کہہ کر ان کا خیال فرمایا ہے تاکہ پریشان نہ ہو جائیں یہ بات سمجھائی کہ ان میں اکثر نا سمجھ ہیں۔ اس سے ہر بندہ سمجھے گا کہ میرے بارے میں نہیں دوسرے کے بارے میں ہے تو بات بھی ہو جائے گی اور کسی بندے کی تذلیل بھی نہیں ہوگی۔

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾

اگر یہ لوگ رک جاتے، آواز نہ دیتے یہاں تک کہ آپ باہر تشریف لاتے تو ان کے لیے زیادہ بہتر ہوتا۔

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

انہوں نے جرم اگر کر بھی لیا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف فرماتے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ مہربان ہیں۔

## احترام پیغمبر اور وارث پیغمبر:

اب یہاں جو فرمایا ﴿حَتَّى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ﴾ یہاں ایک نکتہ سمجھیں:

- 1: جب پیغمبر گھر چلے جائیں تو ان کو نہ بلاؤ بلکہ ان کے آنے کا انتظار کرو۔
- 2: اور اگر وہ باہر آئیں تمہاری وجہ سے نہیں بلکہ اپنے کسی کام کی وجہ سے تو پھر بھی ان سے مت پوچھو ﴿حَتَّى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ﴾۔ ہاں جب تمہارے لیے آئیں گے تو پھر ان سے بات پوچھنا!

اور یہاں پر یہی مسئلہ علماء کے لیے ہیں کہ جب گھر چلے جائیں تو ان کو اپنے کام کے لیے مت بلاؤ، انتظار کرو اور جب وہ تمہارے لیے آئیں تو پھر پوچھو۔ یہ بات بہت سمجھنے کی ہے۔ اگر ہم کسی بڑے کو بلاتے ہیں تو مقصد تو شریعت ہوتی ہے۔ جب خود شریعت کہتی ہے کہ یا نہ بلاؤ تو ہمیں نہیں بلانا چاہیے۔

میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں تاکہ آدمی یہ سمجھے کہ شریعت کا مطالبہ کیا ہے؟ شریعت کا منشا کیا ہے؟ شریعت چاہتی کیا ہے؟ جب ہمارا ذہن بن جائے گا کہ ہم سارے کام اللہ کے لیے کرتے ہیں تو پھر ان معاملات میں کسی قسم کی کوئی ٹینشن نہیں ہوتی۔

## ابن عباس رضی اللہ عنہما اور علماء کا احترام:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں معروف ہے کہ آپ اگر کسی عالم صحابی کے پاس حدیث پاک معلوم کرنے کے لیے جاتے تو گھر کے باہر بیٹھ جاتے اور دروازے پر دستک نہیں دیتے تھے۔ جب وہ صاحب باہر تشریف لاتے تو آپ سے کہتے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے ہیں اور آپ نے ایسا کیا! آپ ہمیں بلا لیتے، آپ باہر کیوں بیٹھے ہیں؟ تو آپ فرماتے کہ عالم اپنی قوم میں نبی



کی طرح ہوتا ہے اور نبی کے بارے میں امت کو ہدایت ہے کہ ان کے آنے کا انتظار کیا جائے۔

یہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرما رہے ہیں! اس لیے اس بات کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔

### متکلم اسلام کا معمول:

میں خود اپنی بات عرض کرتا ہوں۔ میں اگر کسی کے پاس جاؤں اور پہلے سے اطلاع دے کر جاؤں تو پھر جا کر اندر اطلاع دیتا ہوں کہ میں آگیا اور اگر میں اپنے سے بڑے کے پاس جاؤں اور اطلاع دے کر نہ جاؤں تو میرا یہ معمول نہیں ہے۔ بس میں کہتا ہوں کہ ان کو آرام کرنے دو! ہم بھی سوتے ہیں، جب ظہر کو اٹھیں گے تو ملاقات ہو جائے گی۔ اگر ان ملاقات کا ارادہ ہو تو مل لیں گے، نہ ہو تو انتظار کر لیں گے۔ اس لیے ہم ناراض بھی نہیں ہوتے۔

### خبر کی تحقیق کرنے کا حکم:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن

تَصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ﴾ ﴿١٠١﴾

حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا جو امہات المؤمنین میں شامل ہیں ان کے والد حارث بن ضرار بن ابی ضرار اپنے قبیلہ بنو المصطلق کے رئیس اور سردار تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اسلام کی دعوت دی اور زکوٰۃ ادا کرنے کا فرمایا۔ چنانچہ میں نے اسلام قبول کر لیا اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اقرار بھی کر لیا۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضور! میں جب اپنی قوم میں جاؤں گا تو انہیں

بھی اسلام کی دعوت دوں گا اور زکوٰۃ ادا کرنے کا کہوں گا، وہ میری بات مانیں گے، اسلام بھی قبول کریں گے اور زکوٰۃ بھی دیں گے، میں ان کی زکوٰۃ کو جمع کر لوں گا، آپ فلاں مہینہ اور فلاں وقت میں اپنا کوئی قاصد میرے پاس بھیج دیں تاکہ جو زکوٰۃ کی رقم میرے پاس جمع ہو جائے گی میں وہ اس کو دے دوں گا۔ چنانچہ حضرت حارث بن ضرار رضی اللہ عنہ چلے گئے۔ انہوں نے اپنی قوم سے زکوٰۃ کی رقم وصول کر لی۔

قاصد بھیجنے کی جو تاریخ مقرر کی تھی جب وہ تاریخ گزر گئی تو ان کو شک ہوا شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے کسی بات پر ناراض ہیں ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا نمائندہ ضرور بھیجتے دے۔ حارث رضی اللہ عنہ نے اپنے سرداروں سے بھی اس بات کا ذکر کی۔ سب نے ارادہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جائیں اور دیکھیں کہ حقیقت حال کیا ہے؟

ادھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا، فرمایا کہ جاؤ اور ان سے زکوٰۃ وصول کر کے لاؤ۔ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ چلے گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ تشریف لے گئے اور لوگوں کو پتا چلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نمائندہ آ رہا ہے تو کچھ لوگ ان کے استقبال کے لیے بستی سے باہر نکلے تو حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو خیال آیا کہ ان کے ساتھ میری پرانی دشمنی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں۔ اس لیے وہ واپس لوٹے اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ یا رسول اللہ! میں تو زکوٰۃ لینے کے لیے گیا تھا لیکن وہ لوگ تو مجھے مارنے کے لیے باہر آئے ہوئے تھے اور زکوٰۃ بھی نہیں دی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک دستہ دیا اور فرمایا کہ جاؤ! پہلے خوب تحقیق کرنا کہ اصل معاملہ کیا ہے اور اس کے

بعد ہی کوئی اقدام کرنا!

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یہاں سے روانہ ہوئے اور ادھر سے وہ لوگ وفد کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ پتا چلے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ تو مدینہ کے قریب دونوں کا آمناسا منا ہو گیا۔ انہوں نے پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو تو حضرت خالد بن ولید نے بتایا کہ ہم تو تمہاری طرف آ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا: کیوں؟ تو حضرت خالد بن ولید نے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن مغیرہ رضی اللہ عنہ کو تمہارے پاس بھیجا تھا زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے لیکن تم نے انکار کر دیا اور انہیں قتل بھی کرنے لگے تھے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تمہارے پاس بھیجا ہے۔ یہ بات سن کر حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو برحق رسول بنا کر بھیجا ہے میں نے ولید بن عقبہ کو دیکھا ہی نہیں اور نہ ہی وہ میرے پاس آئے ہیں۔ ہم تو خود پریشان تھے کہ زکوٰۃ لینے والا کیوں نہیں آیا، اس لیے ہم خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا رہے ہیں کہ کہیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے ناراض تو نہیں ہو گئے، بندہ کیوں نہیں بھیجا؟ یہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور سارا ماجرا پیش کیا تو معاملہ سارا بالکل حل ہو گیا، نہ لڑائی کی نوبت آئی اور نہ قتل و قتال ہوا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا﴾

اگر کوئی فاسق آدمی کوئی خبر لے کر آئے تو تم تحقیق کیا کرو، تحقیق نہیں کرو گے تو ﴿أَنْ تَصِيبُوا قَوْمًا بَٰغَةً فَتُضَاعَفُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَذِيرًا﴾ ﴿١﴾ نتیجہ نکلے گا کہ تم کسی قوم کو نقصان پہنچاؤ گے لاعلمی کی وجہ سے اور بعد میں پھر تمہیں ندامت اٹھانی پڑے گی۔ یہ تو ہوا مسئلہ۔

## عدالتِ صحابہ کے متعلق ایک اشکال کا جواب:

اب اس سے جو قابلِ اشکال بات ہے وہ یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں قاعدہ ہے: ”الْصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُولٌ“ صحابہ سارے عادل ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحابی فاسق تھے۔ تو اگر ضابطہ عدول کا ہے تو پھر یہ فاسق کیسے؟ اور اگر فاسق ہے تو ضابطہ کیسے؟

اس لیے یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھیں:

اس آیت میں فاسق سے مراد وہ خاص صحابی نہیں ہے۔ شانِ نزول اگرچہ یہی واقعہ ہے لیکن مراد وہ صحابی نہیں ہیں بلکہ اس آیت میں ایک ضابطہ اور قاعدہ بیان کیا ہے کہ جب بھی کوئی فاسق آدمی آئے تو اس کی خبر کی وجہ سے تم فوراً کوئی عملدرآمد شروع نہ کر دینا بلکہ پہلے اس کی تحقیق کرنی ہے کہ اس کی بات ٹھیک ہے یا اس کی بات غلط ہے؟ اور یہ اس وقت ہے جب اس فاسق بندے کی خبر سے کوئی نقصان کا اندیشہ ہو، اور اگر فاسق آدمی کی خبر سے نقصان کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو پھر فاسق آدمی کی خبر کی تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، پھر فاسق نہیں کافر آدمی کی خبر کی تحقیق کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً: آپ کے پاس آپ کے علاقے کا کوئی آدمی آتا ہے جو فاسق ہے، ڈاڑھی اس نے منڈوائی ہے، نمازیں وہ نہیں پڑھتا، شراب وہ پیتا ہے اور وہ سرگودھاکسی کاروباری سلسلے سے آیا اور آپ کو آکر ملتا ہے اور کہتا ہے کہ سردی کا موسم تھا میں آنے لگا آپ کے اباجی ملے تو انہوں نے آپ کے لیے دیسی گھی بھیجا ہے اب کوئی آپ تحقیق کریں گے؟ (نہیں۔ سامعین) تو آپ کو پتا ہے کہ ہمارے محلے کا آدمی ہے، ہمارے اباجی سے تعلق ہے تو ابو نے گھی دیا ہو گا اور سردی کا موسم ہے، تو اس کی کوئی تحقیق کرے گا؟ (نہیں۔ سامعین)

یہ فاسق نہیں بلکہ اگر آپ کے محلے کا کوئی عیسائی بھی لے آئے تو آپ لے

لیں گے۔ اس میں تحقیق کی کیا ضرورت ہے؟ تو فاسق کی خبر کی تحقیق اس وقت ہوتی ہے جب اس کی خبر پر یقین کرنے سے نقصان ہوتا ہو اور اگر اس کی خبر سے کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو پھر فاسق کی خبر کی بھی تحقیق کی ضرورت نہیں، بس اس بات کو مان لو۔ تو یہاں ایک ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔

### صحابہ سارے عادل ہیں:

باقی جہاں تک صحابہ رضی اللہ عنہم کا معاملہ ہے تو یہ قاعدہ ہے ”الصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُولٌ“ اس لیے صحابہ کو فاسق نہیں کہتے۔ وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے گناہ ہوئے ہیں لیکن گناہ پر وہ برقرار نہیں رہے بلکہ گناہ کے بعد ان لوگوں نے توبہ کر لی اور جب انسان گناہ کرے اور گناہ کے بعد توبہ کرے تو ایسے آدمی کو فاسق نہیں کہتے۔

صحابہ کرام کے بارے میں جب قرآن کریم میں صاف فرمایا ہے کہ:

1: ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الرُّشِدُونَ﴾

2: ﴿وَكَلَّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ﴾

3: ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ﴾

تو اللہ اس سے تھوڑا راضی ہوتا ہے جو نافرمان ہو، اللہ راضی اس سے ہوتا ہے جو فرمانبردار ہوتا ہے۔ اس لیے صحابہ کرام کے بارے میں عدول کا ضابطہ اپنی جگہ پر بجا ہے۔

اب دیکھو! اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صحابی کی بات کو رد بھی نہیں فرمایا اور ان کی بات پر مکمل اعتماد بھی نہیں فرمایا بلکہ فرمایا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ذرا تحقیق کر لینا! اس سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص

کوئی ایسی خبر لائے تو اس خبر کی بنا پر جلدی کوئی اقدام نہ کریں بلکہ تحقیق کر لیا کریں۔

### اطاعت رسول کا حکم:

﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَوَّزَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ﴾

جب حضرت ولید بن عقبہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتایا کہ بنو مصطلق والے مجھے زکوٰۃ دینے سے انکار کرتے ہیں اور قتل کرنا چاہتے ہیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے غیرت دینی کی بنا پر یہ رائے دی کہ ان لوگوں سے جہاد کرنے کے لیے مجاہدین کو بھیجا جائے اور انہیں قتل کیا جائے لیکن حضور علیہ السلام نے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کی خبر پر فوراً عمل کرنے کا حکم نہیں دیا کہ جا کر اس قبیلہ والوں کو قتل کر دو بلکہ حضرت خالد بن ولید کو حکم دیا کہ جا کر پہلے تحقیق کریں، اصل حقیقت معلوم کریں پھر اس کے مطابق اقدام کریں۔

تو پہلی آیت ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا﴾ میں ایک قاعدہ بیان کیا گیا تھا اور اس آیت ﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُمْ﴾ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک ہدایت کی گئی ہے کہ جب بنو مصطلق کی خبر تم نے سنی تو تمہاری غیرت دینی کو جوش آنا اپنی جگہ پر درست تھا کہ ان کے خلاف مجاہدین کو بھیجا جائے اور قتال کیا جائے لیکن رائے وہی بہتر تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کی تھی کہ پہلے تحقیق کر لی جائے، پھر اقدام کیا جائے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے مشورہ لیں تو مشورہ دو لیکن یہ کوشش نہ کیا کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مشورہ

کے مطابق عمل بھی کرے، یہ بات درست نہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو فہم و فراست اور دانشمندی عطا فرمائی ہے وہ تمہیں حاصل نہیں ہے، اس لیے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری رائے کے مطابق چلیں تو بہت سے معاملات میں تم نقصان میں پڑ جاؤ گے۔ اس لیے رسول اللہ سلم کی بات ماننے میں ہی خیر ہے۔

تو فرمایا: ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُمْ﴾ دیکھو! تمہارے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں، اگر وہ اکثر معاملات میں تمہاری بات مانیں گے تو تمہیں مشقت ہوگی۔

﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ﴾

”لَكِنَّ“ استدراک کے لیے آتا ہے۔ استدراک کسے کہتے ہیں کہ جو ”لَكِنَّ“ سے پہلے والے کلام میں جو شبہ پیدا ہوتا ہے ”لَكِنَّ“ کے بعد والا کلام اس ماقبل والے شبہ کو دور کرتا ہے۔ اب اتنی بات تھی ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ﴾ کہ اس بات کو سمجھو کہ اگر اکثر معاملات دنیاوی میں رسول اللہ تمہاری بات مانیں تو تمہیں مشقت اٹھانی پڑے گی، شبہ یہ پڑتا تھا کہ صحابہ یہ چاہتے تھے کہ حضور ہماری بات مانیں، فرمایا ”لَكِنَّ“ ایسے نہیں ہے جو تمہیں شک پڑ رہا ہے وہ ایسے لوگ نہیں تھے۔ ﴿حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ﴾ اللہ نے کامل ایمان صحابہ کو محبوب بنالیا تھا اور اس ایمان کو حاصل کرنا اللہ نے صحابہ کے دل میں مزین کر لیا تھا۔

**حکیم الامت کی تعبیر:**

یہاں پر حکیم الامت اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں

بہترین ترجمہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میرا کئی مرتبہ جی چاہتا ہے کہ میں بیان القرآن لا کر سامنے رکھ کر بعض آیات کا ترجمہ سناؤں کہ حضرت تھانوی کیسا ترجمہ کرتے ہیں!

﴿وَلَكُمْ مِنَ اللَّهِ حَبَبٌ إِلَيْنِكُمْ الْإِيمَانُ﴾ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

”لیکن اللہ تعالیٰ نے (تم کو مصیبت سے بچا لیا اس طرح سے کہ) تم کو ایمان (کامل) کی محبت دی اور اس (کی تحصیل) کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا۔“

حضرت تھانوی رحمہ اللہ ایسا اضافہ کرتے ہیں کہ اگر اس کو کاٹ لیں تب بھی ترجمہ ہے اور اس کو باقی رکھ لیں تب بھی ترجمہ ہے۔ عجیب ترجمہ ہے بیان القرآن! قرآن کریم کا ترجمہ سمجھنے کے لیے اردو میں جتنی کتابیں آئیں بیان القرآن سب سے بہتر ہے اور شاید ہی دوبارہ کوئی آئے!

حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے تھے میں اردو کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتا صرف عربی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں، اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ علوم اردو زبان میں نہیں ہیں لیکن بیان القرآن کا جب میں نے مکمل مطالعہ کر لیا تو میرا ذہن بدل گیا ہے، اب میں سمجھتا ہوں کہ علوم اردو زبان میں بھی ہیں۔<sup>174</sup>

### مسلمانوں میں صلح کرانے کا حکم:

﴿وَإِنْ طَائِفَتٌ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا﴾

یہ ایک عام مسئلہ بیان کیا ہے کہ جب مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو تمہیں چاہیے کہ تم ان کی اصلاح کرو۔ اور اگر اس کے باوجود بھی صلح نہ کریں تو پھر جو چڑھائی کرتا ہے تو اس کے خلاف دوسرے کا ساتھ دو تا کہ ظلم کا راستہ روک دیا جائے۔



﴿فَإِنْ بَعَثَ إِحْدَهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا النَّبِيَّ تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ﴾

پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو تم ان کو مارو جو زیادتی کرتی ہے یہاں تک کہ اللہ کی بات کو مانیں اور انصاف کی طرف آجائیں۔

﴿فَإِنْ فَاءَتْ فَاصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ

الْمُقْسِطِينَ﴾

اگر وہ باز آجائیں تو صلح کرادو اور انصاف کے ساتھ رہو اور انصاف کا ساتھ دو۔ بے شک اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں انصاف کرنے والوں کو۔

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾

اور مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں، ان کے درمیان صلح کرادیا کرو!

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُزْحَمُونَ﴾

اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

**چند اہم ہدایات:**

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا

خَيْرًا مِّنْهُمْ﴾

اب یہاں ہدایات کی ہیں کہ ایمان والو کو چاہیے:

کوئی مرد کسی دوسرے مرد سے مذاق نہ اڑائے ہو سکتا ہے جس کا مذاق اڑاتا ہے وہ اس سے بہتر ہو۔

﴿وَلَا يَسَاءُ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ﴾

اور ایک عورت دوسری عورت کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے جس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہ اس سے بہتر ہو جو مذاق اڑا رہی ہے۔

﴿وَلَا تَلْبِزُوا أَنْفُسَكُمْ﴾

اور تم عیب نہ نکالا کرو، الزام نہ لگایا کرو ایک دوسرے پر۔

﴿وَلَا تَنَابَزُوا بِاللِّقَابِ﴾

اور برے القاب سے نہ پکارا کرو۔

﴿يُنْسِ الْإِسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ﴾

ایمان لانے کے بعد برانام رکھنا بہت بڑا گناہ ہے۔

﴿وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ (۱۱)

اور جو توبہ نہیں کریں گے تو وہی ظالم ہوں گے۔

یہاں تین مسئلے بیان فرمائے:

[1]: پہلا مسئلہ بیان فرمایا کہ ایک قوم کو دوسری قوم کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔

اس قوم کے لفظ میں عورتیں شامل نہیں، کیوں کہ ﴿وَلَا يَسْأَلُ﴾ مستقل آگے آرہا ہے۔ عموماً قرآن کریم میں جہاں لفظ قوم آتا ہے وہ مرد اور عورت سب کو شامل ہوتا ہے اور یہاں مردوں کو الگ ذکر کیا عورتوں کو الگ ذکر کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو مسئلے کی اہمیت بتانا مقصود ہے کہ مذاق اڑانا جرم کتنا بڑا ہے؟ تو مردوں کو الگ سمجھایا اور عورتوں کو الگ سمجھایا۔

اور الگ اس لیے بھی کیا کہ شریعت کا مزاج بتانا مقصود ہے کہ مخلوط معاشرہ کا تصور شریعت میں ہے ہی نہیں۔ عورت مرد کا مذاق اڑائے اور مرد عورت کا مذاق اڑائے ایسا ہی نہیں، اس لیے مرد کا مذاق اڑاتا ہے اور عورت عورت کا مذاق اڑاتی ہے۔ تو اس لیے ﴿وَلَا يَسْأَلُ﴾ کو الگ ذکر کیا اور ﴿قَوْمٌ﴾ مردوں کو الگ ذکر فرمایا۔ یہاں پر شریعت نے اپنا مزاج بتایا ہے کہ مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔

[2]: اسی طرح کسی پر الزام نہ لگاؤ، عیب نہ نکالو، اور برے القاب نہ دو! اب یہاں ان الفاظ کو سمجھانے کے لیے بڑے اختصار سے کام لے رہا ہوں اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کا ذکر زبان سے ہو، جس کا ذکر قلم سے ہو، جس کا ذکر اشارے سے ہو، تحریر ہو، تقریر ہو، اشارہ ہو، کسی کی نقل اتاریں وہ بھی اس میں شامل ہے، کوئی بر القاب ہو وہ بھی اس کے اندر شامل ہے، کسی کا عیب نکالیں وہ بھی اس کے اندر شامل ہے الزام لگاؤ تو اس میں شامل ہے۔ غرض مقصد یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو دوسرے مسلمان کی تذلیل کا باعث بنے، دوسرے مسلمان کی توہین کا باعث بنے، دوسرے مسلمان کی ایذاء رسانی کا باعث بنے تو اس سے بچنا چاہیے۔

ہاں البتہ بعض القاب ایسے ہوتے ہیں کہ جو کسی کی توہین کے لیے نہیں ہوتے اور وہ بندہ اسی لقب کے ساتھ معروف ہوتا ہے تو اس کے ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ ”امام اعمش نے فرمایا۔“ اب ”اعمش“ کہتے ہیں چندھیائی آنکھوں والے کو، یہ عیب ہے لیکن معروف ہے۔ ”محدث اعرج نے فرمایا۔“ اب یہاں ”اعرج“ کا معنی لنگڑا ہے لیکن معروف اسی سے ہے تو پھر حرج کی کوئی بات نہیں۔ لیکن ویسے اس سے بہت زیادہ بچنا چاہیے۔

[3]: اور یہ جو فرمایا کہ ﴿بِئْسَ الْإِسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص مؤمن ہو اور مؤمن ہونے کے بعد پھر وہ الزام لگائے اور اس کی طرف نسبت ہو گناہ کی تو یہ بہت بری بات ہے کہ ایمان کے بعد ایک شخص کی طرف گناہ کی نسبت ہو۔ تم کسی پر الزام لگاؤ کہ فلاں مسلمان گناہ بھی کرتا ہے یہ بہت بری بات ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔

**ایمان والوں کو ہدایات:**

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ

الظَّنَّ اِنَّهُمْ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ  
اَخِيهِ مَيْتًا فَكْرِهْتُمْ اُولَٰئِكَ

یہاں تین احکام اور بیان فرمائے:

1: ﴿اَجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ﴾ گمان سے بچو کیوں کہ بعض گمان گناہ  
ہوتے ہیں۔

2: ﴿وَلَا تَجَسَّسُوا﴾ تجسس سے بچو، کسی کی خفیہ باتیں کھولنے سے بچو۔

3: ﴿وَلَا يَغْتَبَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ اور آپس میں ایک دوسرے کی غیبت سے  
بچو! کیا تم میں سے کوئی شخص چاہتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے تم اس کو  
ناپسند کرتے ہو تو غیبت کو پسند کیوں کرتے ہو؟ اللہ سے ڈرو اللہ توبہ قبول کرتے ہیں  
اللہ، رحم والے ہیں۔

یہ جو فرمایا کہ گمان سے بچو تو سمجھ لیں کہ گمان کی چار قسمیں ہیں:

- 1: ایک ظن اور گمان ایسا ہے جو حرام ہے۔
- 2: اور ایک ظن اور گمان ایسا ہے جو واجب ہے۔
- 3: اور ایک ظن اور گمان ایسا ہے جو مستحب ہے۔
- 4: اور ایک ظن اور گمان ایسا ہے جو مباح ہے۔

◆ حرام گمان یہ ہے کہ مثلاً اللہ کی ذات کے بارے میں کہ اس طرح یہ گمان  
کرنا اللہ تعالیٰ مجھے ہمیشہ تکلیف میں رکھیں گے، مصیبت میں رکھیں گے۔ یہ بدگمانی اللہ  
کی ذات کے بارے میں حرام ہے، جائز نہیں ہے۔ اسی طرح کسی اچھے مسلمان کے  
بارے میں بلاوجہ اور بغیر کسی قوی دلیل کے بدگمان ہونا یہ بھی حرام اور ناجائز ہے۔

◆ واجب گمان یہ ہے کہ جیسے بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کسی ایک

جانب پر عمل کرنا شرعاً ضروری ہوتا ہے لیکن اس کے متعلق قرآن و سنت میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہوتی۔ تو ایسے موقع پر ظن غالب پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے۔ جیسے لڑائی جھگڑوں کے مقدمات میں قابل اعتماد گواہوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ کرنا یہ حاکم اور قاضی پر واجب ہے۔

♦ ظن مستحب... ہر وہ مسلمان جس کا ظاہر اچھا ہو اور اس میں فسق کی کوئی علامت نہ پائی جائے تو اس کے بارے میں نیک گمان رکھنا مستحب ہے، اللہ رب العزت اس پر ثواب دیتے ہیں۔

♦ ظن مباح ایسا ہے جیسے نماز کی رکعتوں میں کسی بندے کو شک پڑ جائے کہ میں نے تین پڑھی ہیں یا چار پڑھی ہے تو اپنے ظن غالب پر عمل کرنا مباح اور جائز ہے۔

### تجسس اور تحسس میں کیا فرق ہے؟

﴿وَلَا تَجَسَّسُوا﴾

یہاں لفظ ”تجسس“ آیا ہے۔ ایک لفظ ہوتا ہے ”تحسس“ دونوں میں فرق سمجھ لیں:

- تجسس کہتے ہیں کہ ایسی چیز کو تلاش کرنا کہ جس کو چھپایا جا رہا ہو۔
- اور تحسس کہتے ہیں کہ اس چیز کو تلاش کرنا کہ جس کو چھپایا نہ جا رہا ہو معنی دونوں کا تلاش ہی ہے تو یہاں ﴿وَلَا تَجَسَّسُوا﴾ فرمایا یہ بتانے کے لیے کہ ایسی باتیں جو پوشیدہ رکھنی چاہیے تم ان کو کھرید کھرید کر تلاش نہ کیا کرو بلکہ چھوڑ دو۔

### غیبت کا وبال:

﴿وَلَا يَغْتَابَ بَعْضُكُم بَعْضًا﴾

یہاں صرف غیبت کے ساتھ ﴿أَيُّبُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ﴾ فرمایا یہ بتانے کے لیے کہ پچھلے بھی دونوں جرم ہیں لیکن غیبت ان سے بڑا جرم ہے، کیوں؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ایک شخص کسی کے بارے میں بدگمانی رکھتا ہے یا کسی کی خفیہ باتیں معلوم کرتا ہے۔ جرم تو یہ بھی ہیں لیکن چھوٹے ہیں اور غیبت کا جرم بڑا ہے کیوں؟ بدگمانی میں کسی دوسرے کے سامنے برائی کا اظہار نہیں ہوتا اور بدگمان کا ذاتی مسئلہ ہوتا ہے لیکن غیبت کا جرم متعدی ہے، غیبت کرنے والے کا ذاتی مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسروں کو بتا رہا ہوتا ہے۔ ایک گناہ جو لازمی ہو وہ چھوٹا ہوتا ہے اور ایک گناہ جو متعدی ہو وہ بڑا ہوتا ہے اس لیے غیبت بہت بڑا جرم ہے۔

اور حدیث پاک میں ہے: "الْغَيْبَةُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنَا" <sup>175</sup>

غیبت؛ زنا سے بڑا جرم ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ زنا کی منشا باہ ہے اور غیبت کی منشا جاہ ہے، جاہ؛ باہ سے بڑا جرم ہے اس لیے غیبت زنا سے بڑا جرم ہے۔ جو باہ والا مسئلہ ہے یہ بہت جلدی ختم ہو جاتا ہے، ایک کانٹا چبھے ختم، دو تھپڑ لگیں ختم اور جاہ والا مرض ختم نہیں ہوتا۔ یہ حب جاہ کا مرض اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔

**اعراب کے دعویٰ ایمان کی حقیقت:**

﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَ

لَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ ۖ وَإِنْ تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٣٧﴾

بنو اسد ایک قبیلہ تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ انہوں نے دل سے ایمان قبول نہیں کیا بلکہ یہ لوگ مدینہ کے مال میں سے کچھ مال لینا چاہتے تھے اس لیے آکر کہا کہ حضور! ہم تو مؤمن ہیں ہمیں بھی مال چاہیے اور ساتھ یہ بھی کہا کہ ہمارا احسان دیکھو! باقی لوگ تم سے لڑے ہیں اور پھر کلمہ پڑھا ہے اور ہم نے بغیر لڑے کلمہ پڑھا ہے، اس لیے ہمارا حق زیادہ بنتا ہے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ ان آیات میں ان کے جھوٹے دعوے کی تردید کی گئی ہے۔

فرمایا: یہ دیہاتی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اے پیغمبر! آپ ان سے فرمادیجیے کہ تم ایمان تو نہیں لائے، البتہ یہ کہو ﴿أَسْلَمْنَا﴾ کہ ہم نے ظاہری طور پر خود کو تمہارے سپرد کر دیا ہے اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اور اگر تم دل سے اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو گے تو ﴿لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا﴾ اللہ تمہارے اعمال کے اجر میں کچھ بھی کمی نہیں کرے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ ﴿٣٨﴾

ایمان والے تو وہ ہیں جو اللہ اور اللہ کے رسول کو دل سے مانتے ہیں پھر اس میں شک بھی نہیں کرتے اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے مال اور جانوں سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا ہے۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

﴿قُلْ أَتَعْلَمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي

الْأَرْضِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٦﴾ ﴿١٧﴾

اے پیغمبر! آپ ان سے فرمادیجیے کہ کیا تم اللہ کو اپنے دین کی خبر دیتے ہو کہ ہم ایمان والے ہیں، دیندار ہیں، حالانکہ اللہ ان چیزوں کو جانتا ہے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔

﴿يَمْنُونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُلْ لَا تَمْنُوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللَّهُ

يَمْنُ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٨﴾ ﴿١٩﴾

یہ لوگ ایسے ہیں کہ آپ پر احسان جتلاتے ہیں کہ یہ اسلام لے آئے ہیں۔ آپ ان سے فرمادیں کہ تم اپنا احسان مجھ پر مت جتلاؤ بلکہ اگر تم واقعی اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی۔

### ایمان اور اسلام میں فرق:

یہاں صرف اتنی بات سمجھیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور اسلام میں مبادا کے اعتبار سے فرق ہے اور منتہی کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے یعنی دل سے ماننا اور اسلام نام ہے اپنے ظاہر کو اللہ اور اللہ کے رسول کے تابع کرنے کا۔

اب ایمان معتبر اس وقت ہو گا کہ جب آدمی دل سے تصدیق بھی کرے اور اس کا اظہار انسان کے ظاہر پر ہو۔ جس کا سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنی زبان سے کہے "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ایک مرتبہ اپنی زبان سے پورا کلمہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہنا فرض ہے۔ اگر کوئی شخص یہ نہیں کہتا اور صرف دل سے مانتا ہے تو ایسا شخص مؤمن نہیں کہلا سکتا۔

ایک تو یہ آیت آپ کے سامنے آگئی اور دوسری حدیث جبرائیل ہے کہ



جب جبرائیل امین علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:  
 ”أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ“ حضور! فرمائیے کہ اسلام کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ  
 علیہ وسلم نے فرمایا:

الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَتُقِيمَ  
 الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنْ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا  
 کہ اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے  
 لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کیا کر،  
 رمضان کا روزہ رکھا کر اور اگر طاقت ہو تو بیت اللہ کا حج ادا کر۔

تو یہاں پانچ چیزیں ارشاد فرمائیں۔ پھر پوچھا:  
 ”فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ“ کہ ایمان کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ  
 چیزیں فرمائی ہیں:

أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ  
 بِالْقَدْرِ خَيْرٌ وَشَرٌّ.

کہ اللہ کو ماننا، اللہ کے فرشتوں کو ماننا، خدا کی آسمانی کتابوں کو ماننا، اللہ کے  
 رسولوں کو ماننا، آخرت کے دن کو ماننا اور اچھی یا بری تقدیر کو ماننا۔ یہ ایمان ہے۔<sup>176</sup>  
 تو یہاں چھ چیزیں بیان فرمائیں اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور  
 ایمان میں فرق ہے۔

اور جب ہم میت پر جنازہ پڑھتے ہیں تو دعا پڑھتے ہیں:  
 ”اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا

وَذَكِّرْنَا أَنْثَانَا. اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهُ مَيِّتًا فَاَحْيِيْهِ عَلٰى الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مَيِّتًا فَتَوَفَّهُ عَلٰى الْاِيْمَانِ. " <sup>177</sup>

یہاں بظاہر معلوم ہوتا ہے اسلام اور ایمان میں فرق ہے۔ تو یہ فرق لغوی معنی اور مبدا کے اعتبار سے ہے لیکن منتہی اور انجام کے اعتبار سے دونوں میں فرق نہیں ہے۔ ایمان وہی معتبر ہو گا جس میں اسلام بھی ہو اور اسلام وہی معتبر ہو گا جس میں ایمان بھی ہو۔ اس لیے بعض موقع پر صرف اسلام کا ذکر آتا ہے اور بعض موقع پر صرف ایمان کا ذکر آتا ہے۔

ہم جنازے میں دعا مانگتے ہیں کہ اللہ زندہ رکھے اسلام پر اور موت دے ایمان پر۔ کیوں کہ ایمان نام ہے دل سے ماننے کا اور اسلام نام ہے ظاہر پر عمل کرنے کا۔ بوقت موت انسان عمل نہیں کر سکتا صرف دل سے مان سکتا ہے۔ اب ایک بندے کے ذمہ دس سال کی نمازیں ہیں، اب اس کو توبہ کی توفیق ہو گئی۔ اس نے نمازیں قضا پڑھنی شروع کر دیں۔ پانچ دن بعد موت کا وقت آ گیا۔ اب وہ دس سال کی نمازیں پڑھ تو نہیں سکتا لیکن مان تو سکتا ہے۔

ایک بندے نے بیس سال زکوٰۃ نہیں دی۔ اس نے توبہ کر لی۔ اس نے نیت کی کہ میں اپنی ساری زکوٰۃ ادا کروں گا۔ اب زکوٰۃ دے تو نہیں سکتا لیکن مان تو سکتا ہے۔ ایک شخص پر حج فرض تھا۔ اس نے ادا نہیں کیا۔ اب اس نے نیت کی کہ میں ان شاء اللہ اس سال ضرور حج کروں گا کہ اس سے پہلے موت کا وقت آ گیا۔ اب حج کر تو نہیں سکتا لیکن مان تو سکتا ہے۔

اس لیے دعا مانگی جاتی ہے کہ اے اللہ! زندگی اسلام والی دے اور موت

ایمان والی دے! آپ نے کبھی بھی کسی بزرگ کو دعا مانگتے ہوئے یہ نہیں سنا ہو گا: اے اللہ! ہم سب کا خاتمہ بالاسلام فرمادے۔ یہ دعا ہوتی ہے کہ اے اللہ! خاتمہ بالا ایمان فرمادے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ موت کے وقت آدمی مان سکتا ہے اور عمل کرنا اس کے بس میں نہیں ہے تو پھر آدمی دعا ایمان کی کرتا ہے۔

اللہ ہم سب کو اسلام والی زندگی دے اور ایمان والی موت عطا فرمادے۔

آمین

وَاجِرُ دَعَا أَنَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورت ق

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿ق وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ ۚ بَلْ عَجَبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ

فَقَالَ الْكَافِرُونَ هَذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ﴾

### سورت ق کی اہمیت:

حضرت ام ہشام بنت حارثہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمارا گھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے ساتھ تھا، دو سال تک ہمارا تنور بھی ایک رہا جس تنور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روٹیاں پکتیں تھیں اسی میں ہماری روٹیاں بھی پکتی تھیں۔ مجھے سورت ق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن سن کر یاد ہو گئی کیونکہ جمعے کے دن خطبہ جمعہ میں سورت ق پڑھنا آپ کا معمول تھا۔<sup>178</sup>

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز میں کبھی سورت ق اور اقتربت الساعة کی تلاوت فرماتے تھے۔ بعض روایات میں ہے کہ نماز فجر میں بکثرت سورت ق کی تلاوت فرماتے تھے لیکن یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اعجاز تھا کہ لمبی سورتوں کے باوجود آپ کی نماز بہت ہلکی محسوس ہوتی تھی۔

## کفار کے دو تعجبات:

﴿قَدْ تَوَلَّى الْفِئْتَانِ الْمَجِيدِ ۖ بَلْ يَحِبُّونَ أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِّنْهُمْ

فَقَالِ الْكُفِرُونَ هَذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ ۖ﴾

﴿ق﴾ یہ حروفِ تشابہات میں ہے جس کا معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں۔ قرآن

مجید کی قسم! مضمونِ قسم مخدوف ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے، آپ لوگوں کو قیامت سے ڈراتے ہیں۔ ﴿بَلْ يَحِبُّونَ﴾ چاہیے تو یہ تھا کہ یہ لوگ بات قبول کرتے لیکن ان لوگوں نے تعجب کیا کہ ان کے پاس انہی میں سے ایک انسان کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا گیا ہے۔ کافر لوگ یہ کہنے لگے کہ ہم مر جائیں گے، مٹی ہو جائیں گے تو کیا پھر دوبارہ اٹھیں گے؟ یہ بہت مشکل اور عجیب بات ہے۔

گویا یہ کافر دو باتوں پر تعجب کرتے ہیں:

1: نبی کے بشر ہونے پر۔

2: اس بات پر کہ دوبارہ پھر اٹھائے جائیں گے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے مشرک اور آج کے مشرک دونوں کی فکر ایک ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ نبی بشر نہیں ہو سکتا اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ نبی بشر نہیں ہو سکتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کا مشاہدہ تھا اور ان کا مشاہدہ نہیں ہے، اس لیے مشاہدے کی بنیاد پر انہوں نے بشر مانا لیکن نبی نہیں مانا اور یہ نبی تو مانتے ہیں لیکن بشر نہیں مانتے اور ہم اہل السنۃ والجماعۃ بشر بھی مانتے ہیں اور نبی بھی مانتے ہیں۔

﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ ۖ وَعِندَنَا كِتَابٌ حَفِيفٌ ۖ﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ تم اٹھنے کی بات کرتے ہو جب تم مر جاؤ گے اور مٹی

تمہارے جسم کو کھائے گی اور تمہارے جسم کو کم کر دے گی تو ہم یہ بھی جانتے ہیں۔ ہم

جانتے ہیں ان اعضاء کو جن کو مٹی کم کر دے گی۔ ہمارے پاس لوح محفوظ میں سب لکھا ہوا محفوظ ہے۔

جسم کے بعض اعضاء وہ ہیں جن کو مٹی نہیں کھاتی مثلاً ریڑھ کی ہڈی کا جزو اصلی جس سے انسان بنتا ہے اس کو مٹی نہیں کھاتی۔ کبھی قبر اکھڑے تو اس میں ہڈیاں پڑی ہوئیں نظر آتی ہیں، ان کو مٹی نہیں کھاتی اور بعض اعضاء کو مٹی کھاتی رہتی ہے اور جسم کم ہوتا رہتا ہے، ہم تو اس کو بھی جانتے ہیں۔

﴿بَلْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِآيَاتِنَا﴾

اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس جب سچ آیا تھا تو ان لوگوں نے اسے اسی وقت ہی جھٹلادیا تھا اور اب عجیب تضاد کا شکار ہوئے پڑے ہیں۔

یعنی صرف یہ نہیں کہ ان کو تعجب ہے بلکہ یہ تکذیب بھی کرتے ہیں۔ بسا اوقات انسان کو بعض چیزوں پر تعجب ہوتا ہے لیکن تکذیب نہیں کرتا۔ جس طرح ہم کہتے ہیں کہ اس بات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اتنا بڑا درخت ہے اور ایسا عمدہ پھل ہے! لیکن ہم تکذیب تو نہیں کرتے۔ تو یہ لوگ تعجب بھی کرتے تھے اور تعجب سے بڑھ کر تکذیب بھی کرتے تھے۔

اب دیکھیں! وہ لوگ جو تعجب کرتے تھے بلکہ انکار کرتے تھے کہ اللہ ہمارے وجود کو دوبارہ کیسے پیدا فرمائیں گے تو اس انکار کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں: یا تو یہ کہ انسان کے جسم میں موجود ہونے کی صلاحیت نہیں، یا یہ کہ اللہ ان کے موجود کرنے پر قادر نہیں ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے کہ وجود میں صلاحیت نہ ہو تو یہ بات تو غلط ہے۔ انسان کا جسم تو موجود ہے، نہیں تھا تو موجود ہوا۔ تو صلاحیت کا انکار تو ہو نہیں سکتا۔ پھر انکار اس بات کا ہو گا کہ اللہ قادر نہیں ہے۔ تو اس کی تردید کرتے ہوئے اللہ

نے فرمایا:

## قدرتِ باری تعالیٰ:

﴿أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا

مِنْ فُزُوجٍ ۖ﴾

ہماری قدرت دیکھنی ہے تو آسمان کو دیکھو! کہ ہم نے ان کے اوپر آسمان کیسے بنایا! اور اس کو خوبصورت بنایا، اس آسمان میں کسی قسم کا رخنہ نہیں پڑا!

﴿وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ

ذَوْجٍ بِهَيْجٍ ۖ﴾

اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ گاڑ دیے اور اس میں ہر قسم کی خوشنما چیزیں اگادی ہیں۔ جب اللہ یہ کر سکتا ہے تو کیا تمہارے وجود کو پیدا نہیں کر سکتا؟

﴿تَبَصَّرْهُ وَذِكْرَىٰ يُكَلِّمُ عَبْدًا مُنِيبٍ ۖ﴾

ہم نے زمین میں جو کچھ پیدا کیا یہ سب اس لیے پیدا کیا تاکہ ایک تودانائی حاصل ہو اور پھر بینائی حاصل ہو! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں دو لفظ استعمال فرمائے؛ دانائی اور بینائی ہر اس شخص کے لیے کہ جو رجوع کرتا ہے۔

## علوی ماحولِ بابرکت ہے:

﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبْرَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ

الْمُحْصِي ۖ﴾

ہم آسمان سے برکت والا پانی اتارتے ہیں۔ پھر اس کے ذریعے باغات اگاتے ہیں اور غلے کے دانے اگاتے ہیں جنہیں کاٹا جاتا ہے۔

اب دیکھیں! جو پانی اوپر سے نیچے آیا اس کو بابرکت فرمایا، اس لیے کہ وہاں ماحول ایسا ہے۔ ایک ہمارا ماحول ہے سفلی یعنی نیچے والا، ایک ماحول ہے علوی اوپر والا، اوپر والے ماحول میں گناہ نہیں ہیں اس لیے وہاں پر برکات زیادہ ہیں، نیچے والے ماحول میں گناہوں کی وجہ سے برکات کم ہو جاتی ہے۔

بعض ایسی چیزیں ہیں کہ جن کے وجود میں برکت ہے۔ مثلاً مسجد، قرآن وغیرہ ان کے وجود میں برکت ہے۔ تو یہاں جتنے گناہ آتے رہیں گے ان کے وجود کی برکت ختم نہیں ہوگی، خارجی برکات کم ہو جائیں گی اور جو اوپر کا ماحول ہے وہاں وجود میں بھی برکت ہے اور ماحول بھی ایسا ہے کہ وہاں برکتیں ہوتی ہیں۔

یہ بات ذہن میں آئے تو ایک اشکال ختم ہو جاتا ہے۔ ایک ایسے ہمارے عالم جو صوفی مزاج تھے تو انہوں نے کہا کہ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اوپر ہے۔ قرائن کیا ہیں؟ کہ انسان کی توجہ جب بھی نیک کام کی طرف ہو تو اوپر جاتی ہے۔ آدمی جب دعائیں مانگتا ہے تو رجوع اوپر ہو جاتا ہے، جب نیک اعمال ہوتے ہیں تو وہ بھی اوپر جاتے ہیں۔ تو اس سے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اوپر ہے۔

میں نے انہیں کہا کہ وجہ یہ نہیں ہے، دیکھو! ایک معاملہ ہے انسان کی روح کا اور ایک معاملہ ہے نفس کا۔ انسان جو نفس ہے وہ ہے مرغوبات طبعیہ کا نام جو ٹھیک نہیں ہے اور روح ایک مستقل الگ چیز ہے، روح اوپر سے آتی ہے، ہمیشہ اب یہاں کے نفسانی آمیزش میں ملوث ہو کر روح میں بھی نحوستیں آتی ہیں، روح بھی ملوث ہوتی ہے اور پھر ناپاکی کی طرف جاتی ہے نفسانی خواہشات میں ملوث ہونے کی وجہ سے۔ فرق کیا ہے کہ روح چونکہ اوپر سے آئی ہے تو روح کی ترقیات کے لیے اوپر کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور روحانی ترقیات کا نام ہے کہ انسان پاکیزگی اختیار کرے اور ناپاکیوں سے بچے۔ زمین کا ماحول ناپاکیوں کا ہے اور آسمانی ماحول پاکیزگی کا ہے۔ تو جب روح کو



ترقیات چاہئیں ہوں گی تو وہ اس محل کی طرف رجوع کرے گی جہاں ماحول پاک ہوگا، وہ اوپر والا ماحول ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ اللہ اوپر ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اوپر کا ماحول پاک ہے اور اوپر کے ماحول کے پاک ہونے کی وجہ سے روح کی توجہ اس طرف ہوتی ہے۔ نیچے والا ماحول چونکہ گناہوں کی وجہ سے ناپاک ہے اور اوپر کا ماحول بالکل پاک ہے، نورانی ماحول ہے، ملائکہ کا ماحول ہے، گناہوں کا تصور نہیں ہے اس لیے جب بھی تقویٰ مطلوب ہو تو روح اوپر کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اللہ اوپر ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر ماحول پاکیزہ ہے۔

### رزق خداوندی:

﴿وَالنَّخْلُ بَسِطَتْ لَهَا طَلْعُ نَضِيدٍ﴾

اور کھجوروں کے اونچے اونچے درخت ہیں، ﴿لَهَا طَلْعُ نَضِيدٍ﴾ جس کے خوشے تہہ بہ تہہ ہوتے ہیں۔

﴿رَزَقْنَا لِعِبَادٍ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذَلِكَ الْخُرُوجُ﴾

یہ چیزیں ہم نے اپنے بندوں کو رزق دینے کے لیے پیدا کی ہیں۔ برکت والے پانی سے ہم بنجر زمین کو آباد کر دیتے ہیں۔ ﴿كَذَلِكَ الْخُرُوجُ﴾ جس طرح پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرتے ہیں اسی طرح تم بھی نکل کر ہمارے سامنے آ جاؤ گے! یہ کیا مشکل ہے ہمارے لیے؟

### منکرین انبیاء کا کچھ تذکرہ:

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَأَصْحَابُ الرَّسِّ وَثَمُودُ﴾ وَ عَادُ وَ

فِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطٍ﴾

اب اللہ نے اپنے پیغمبر کو تسلی دی ہے کہ یہ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو اس سے

پہلے بھی نوح علیہ السلام کو جھٹلایا ہے اور کنویں والی قوم نے اپنے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلادیا تھا اور قوم ثمود نے بھی حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا۔ اور قوم عاد نے بھی جھٹلایا اور قوم فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور قوم لوط نے بھی جھٹلایا۔

## کنویں والے کون ہیں؟

﴿أَصْحَابُ الرَّسِّ وَثَمُودُ﴾

حضرت صالح علیہ السلام قوم ثمود کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ آپ پر تقریباً چار ہزار افراد ایمان لائے اور بقیہ ایمان نہیں لائے۔ ان منکرین کی شرارتیں بڑھ گئیں تو ان کو تباہ کر دیا گیا۔ حضرت صالح علیہ السلام پر جو چار ہزار لوگ ایمان لائے تھے آپ ان کو لے کر چلے گئے اور ایک جگہ پر آباد ہوئے۔ جہاں آباد ہوئے وہاں ایک کنواں بھی تھا۔ عربی زبان میں کنویں کو ”الرس“ بھی کہتے ہیں۔ اس کنویں کے ساتھ جو آباد تھے اس لیے ان کو کہتے ہیں ”اصحاب الرس“۔ حضرت صالح علیہ السلام کی وفات اسی جگہ پر ہوئی اور جب موت آئی تو کہا: ”حَضَرَ مَوْتُ“ کہ صالح علیہ السلام پر موت حاضر ہو گئی ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی وفات ہو گئی، اس کے بعد سے لے کر اب تک اس جگہ کا نام پڑ گیا ”حضر موت“۔ یہ قوم ایک عرصہ وہاں رہی اور بت پرستی میں مبتلا ہو گئی۔ اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے ایک اور نبی بھیجا۔ اس قوم نے اس پیغمبر کی نافرمانی کی اور اسے قتل کر دیا تو خدا نے اس قوم کو بھی ہلاک کر دیا۔

﴿وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۚ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيدِ ۚ﴾

”ایکے“ کہتے ہیں گھنے جنگل کو۔ حضرت شعیب علیہ السلام جس قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے وہاں گھنے جنگلات تھے۔ ”تبع“ یمن کے بادشاہ کا لقب ہے۔ تو فرمایا کہ: اصحاب الایکہ نے بھی اپنے نبی کو جھٹلایا اور قوم تبع نے بھی جھٹلایا۔ ان میں

سے ہر ایک نے پیغمبر کو جھٹلایا تو ہمارا عذاب ان پر آگیا۔

﴿أَفَعَيَيْنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ۝﴾

اور کسی کو بنانا سننے کی تیسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی بناتے بناتے تھک جائے۔ اللہ نے اس وجہ کی بھی تردید فرمائی اور فرمایا: کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے پر تھک گئے ہیں؟ ہر گز نہیں! بلکہ یہ لوگ دوبارہ پیدا کرنے کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

**اللہ تعالیٰ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے:**

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسُّوْسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ

إِلَيْهِ مِّنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۝﴾

تم پیدائش کی بات کرتے ہو! ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم اس کے دل کے خیالات کو بھی جانتے ہیں اور ہم تو انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

رگیں دو قسم کی ہیں؛ ایک وہ جو جگر سے نکلتی ہیں اور جسم میں خون پہنچاتی ہیں۔ انہیں ”ورید“ کہتے ہیں۔ اور دوسری ان سے باریک رگیں ہیں جو دل سے نکلتی ہیں اور خون کی لطیف بھاپ۔ جسے ہم روح کہتے ہیں۔ اس کو پورے جسم میں پہنچاتی ہیں، انہیں ”شریان“ کہتے ہیں۔ تو ”شریان“ اور ”ورید“ یہ اطباء کے ہاں الگ الگ ہوتی ہیں۔ لیکن عربی لغت کے اعتبار سے ”ورید“ رگ کو کہتے ہیں خواہ وہ جگر سے نکلے، خواہ وہ دل سے نکلے۔ یہاں ﴿الْوَرِيدِ﴾ سے کون سی رگ مراد ہے؟ تو مفسرین فرماتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ یہاں ورید سے مراد شریان یعنی قلب سے نکلنے والی باریک رگیں مراد ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قلب کی حرکت کے بند ہونے کی وجہ سے انسان پر موت آتی ہے۔ جو رگیں جگر سے نکلتی ہیں اور خون پہنچاتی ہیں ان سے

موت کا تعلق نہیں ہے، خون سے باریک جو غبار ہے جسے ہم روح کہتے ہیں موت کا تعلق اس سے ہے۔ تو جب شریان والی رگ کٹتی ہے تو بندے پر بہت جلد موت طاری ہو جاتی ہے۔ کئی بندوں کے جگر نکل جاتے ہیں لیکن بندہ نہیں مرتا لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ دل نکال کر پھینک دیں اور پھر بھی بندہ زندہ رہ جائے، ایسا نہیں ہوتا بلکہ بندہ مر جاتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ یہاں ”ورید“ سے مراد یہی رگیں لی جائیں۔

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾.... اس آیت کے تحت تفسیر

منظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اصحاب الطواہر جو علماء ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہاں ”قرب“ سے مراد قربِ علمی ہے اور جو اصحاب باطن اور صوفیا ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد قربِ ذاتی ہے۔

### معیت ذاتیہ کا بیان:

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اللہ کی ذات اور اللہ کی صفات میں تلازم ہے، جہاں صفت ہوگی وہاں اللہ کی ذات ہوگی، ایسا نہیں ہو سکتا کہ صفت ہو اور وہاں اللہ کی ذات نہ ہو۔ تو اگر قربِ علمی مان بھی لیں تو قربِ علمی کو قربِ ذاتی لازم ہے۔ قربِ ذاتی پھر بھی وہاں پر موجود ہوگا۔<sup>179</sup>

اس لیے اس سے اس وسوسے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ قربِ علمی ہے، قربِ ذاتی نہیں ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ یہاں قرب سے مراد اتصالِ علمی اور احاطہ علمی ہے اور صوفیاء کی رائے یہ ہے کہ یہاں قرب سے مراد صرف قربِ علمی اور احاطہ علمی ہی نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا اتصال ہے جس

کی کیفیت اور حقیقت کسی کو معلوم نہیں لیکن یہ قرب و اتصال بلا کیف موجود ہے۔  
حضرت فرماتے ہیں کہ اس پر دلائل بھی موجود ہیں مثلاً ﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝۱۹﴾،  
﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۝﴾، ﴿إِنَّ مَعَ رَبِّكَ﴾ وغیرہ ایسے دلائل موجود ہیں جن سے یہ خاص  
قسم کی معیت ثابت ہوتی ہے۔

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾.... اس پر ایک چھوٹی سی بات  
مجھے یاد آگئی۔ اب یہ سمجھانا کہ اللہ کیسے بندے کے ساتھ ہیں یہ کتنا مشکل ہے! مولانا  
رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اتصالے بے مثال و بے قیاس      ہست رب الناس را با جانِ ناس  
اللہ کا اتصال بندوں کی ذات سے ایسے ہے کہ جو بے مثال و بے قیاس ہے،  
اس کو سمجھنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔

﴿إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝۱۷﴾  
جب بندہ کوئی کام کرتا ہے تو دائیں بائیں جانب بیٹھنے والے دو فرشتے لکھ لیتے  
ہیں۔

﴿مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝۱۸﴾  
جب بھی کوئی بات بندے کی زبان سے نکلتی ہے تو وہاں ایک نگران متعین  
ہے۔

﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ ۝۱۹﴾  
اور موت کی بے ہوشی کا وقت یقیناً آ پہنچا اور یہی وہ چیز ہے جس سے اے  
انسان تو بھاگا کرتا تھا۔

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيدِ ۝۲۰﴾ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا

سَاقِیْ وَ شَهِیْدٌ ﴿٢١﴾ لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ  
فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ ﴿٢٢﴾

قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا، یہی وعید کا دن ہے۔ ہر شخص آئے گا تو اس کے ساتھ ایک ہنکانے والا ہو گا اور ایک اس کے اعمال پر گواہ ہو گا۔ پھر کہا جائے گا کہ اسی دن کے بارے میں تو غافل تھا آج ہم نے تیرے سارے پردے ہٹا دیے ہیں۔ اب دیکھو! تمہاری نگاہ کتنی تیز ہو گئی ہے!

﴿وَقَالَ قَرِیْبُهُ هَذَا مَا لَدَیَّ عَتِیْدٌ ﴿٢٣﴾﴾

اس کا ہمنشین ایک فرشتہ کہے گا: یہ دیکھو! یہ اعمال نامہ میرے پاس محفوظ ہے۔

﴿الْفِیَا فِي جَهَنَّمَ كُلُّ كَفَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿٢٤﴾ مِّنْأَعْلَیْهِ لُخْمٌ مُّعْتَدٍ مُّرِیْبٌ ﴿٢٥﴾﴾

پھر دو فرشتوں کو حکم ہو گا کہ تم ہر کافر کو اور ہر سرکش کو جہنم میں ڈال دو جو نیکی سے روکنے والا تھا، حد سے تجاوز کرنے والا تھا اور شک ڈالنے والا تھا۔

﴿الَّذِی جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ فَالْقِیَہُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ ﴿٢٦﴾﴾

جس نے اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود بنا رکھا تھا، اس لیے تم اس شخص کو سخت عذاب میں ڈال دو!

﴿قَالَ قَرِیْبُهُ رَبَّنَا مَا أَطْغِیْتُهُ وَلَکِن كَانَ فِي ضَلٰلٍ بَعِیْدٍ ﴿٢٧﴾﴾

قَالَ لَا تَخْتَصِمُوا لَدَیَّ وَ قَدْ قَدَّمْتُ إِلَیْكُمْ بِالْعِیْدِ ﴿٢٨﴾ مَا یُبَدِّلُ الْقَوْلُ

لَدَیَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴿٢٩﴾﴾

اور شیطان کہے گا کہ اللہ! میں نے اس کو گمراہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ خود گمراہ ہوا ہے۔ اللہ فرمائیں گے: میرے پاس اب جھگڑانہ کرو، ہم تو پہلے ہی تمہیں تمہارے برے انجام کی وعید سنا چکے ہیں اور جو بات ہمارے ہاں طے شدہ ہو تو وہ تبدیل نہیں ہوتی اور

ہم بندوں پر ظلم بھی نہیں کرتے۔

**جہنم سے سوال اور اس کا جواب:**

﴿يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأَتْ وَتَقُولُ هَلْ مِنْ مَزِيدٍ﴾

اس وقت کو بھی یاد رکھو جب ہم جہنم سے کہیں گے کہ کیا تمہارا پیٹ بھر گیا ہے؟ تو وہ کہے گی: کیا کچھ اور بھی ہے؟  
قرآن کریم میں ہے:

﴿لَا مَلَكَنَ جَهَنَّمَ مِنَ الْإِنْسَانِ أَجْمَعِينَ﴾<sup>180</sup>

کہ اللہ جہنم کو بھر دیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ جب جہنم کو بھر دیں گے تو پھر کیوں پوچھیں گے کہ کیا تمہارا پیٹ بھر گیا ہے؟ اور وہ کہے گی کہ اور چاہیے! بظاہر دونوں میں تعارض ہے۔

جواب یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ جہنم کو تو لوگوں سے بھر دیا جائے گا اور پھر پوچھیں گے کہ کیا تم بھر چکی ہو اور جہنم کہے گی کہ مجھے اور چاہیے تو اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ جہنم میں مزید جگہ ہوگی، بلکہ یہ صرف تحدید اور زجر کے لیے ہو گا کہ اور لاؤ... اور لاؤ... جو لوگ پہلے سے جہنم میں ہوں گے تو اس سے ان پر خوف طاری ہو جائے گا۔

**متقین کا انعام:**

﴿وَأَزَلِفَتْ الْإِنْجَنَةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ﴾<sup>(۳۱)</sup> هَذَا مَا تُوْعَدُونَ يَكُلُّ

أَوَابٍ حَفِيفٍ ﴿۳۲﴾

جنت کو متقین کے بالکل قریب کر دیا جائے گا اور یہ قطعاً دور نہیں ہوگی۔  
یہی ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ یہ چیز ہر اس بندے کے لیے ہے جو اللہ کی  
طرف رجوع کرنے والا ہو اور اپنی حفاظت کرنے والا ہو۔

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ الْغَيْبَ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُنِيبٍ ۖ﴾

جو اللہ سے بن دیکھے ڈرتا ہو اور رجوع کرنے والا دل لے کر آتا ہو۔

﴿ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ۚ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا

وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ۚ﴾

حکم ہو گا: امن و سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے۔  
جنتیوں کو ہر وہ چیز ملے گی جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس تو بہت کچھ اور بھی ہے۔

﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي

الْبِلَادِ ۚ هَلْ مِنْ مَّخِصٍ ۚ﴾

ان لوگوں سے پہلے کتنے لوگوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جو طاقت میں ان سے  
بڑھ کرتھے، وہ لوگ مزید قوت حاصل کرنے کے لیے شہروں میں پھرتے تھے، کیا ان  
کے بھاگنے کی کوئی جگہ ہے؟

**عبرت کون حاصل کرتا ہے؟**

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرٍ لِّمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ۚ﴾

اس میں اس شخص کے لیے عبرت کا سامان ہے جو دل رکھتا ہو یا دل سے  
متوجہ ہو کر کان لگاتا ہو۔

یہاں پر دو قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا کہ عبرت وہ شخص حاصل کرتا ہے  
جس کے پاس قلب ہو، قلب سے مراد عقل سلیم ہو اور جس کے پاس عقل تو کم ہو



لیکن توجہ سے سنتا ہو۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ یہاں دو قسم کے بندوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک ﴿يَمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ﴾ وہ لوگ جو مشائخ ہیں اور دوسرا ﴿أَوْ أَلْقَى السِّنْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾ کہ جو سالکین ہیں۔ ایک ہوتا ہے بڑے مقام پر فائز ہونا اور ایک ہوتا ہے اس کے پیچھے چلنے والا۔ بڑے مقام والے کو تو شرح صدر ہوتا ہے اور دوسرے کو شرح صدر نہیں ہوتا لیکن بات توجہ سے سنتا ہے اور اعتماد کر لیتا ہے۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ۖ وَ

مَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ ۖ﴾

ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب کو چھ دنوں کی مقدار میں پیدا فرمایا۔ ہمیں اس بنانے میں تھکاوٹ کا احساس تک بھی نہیں ہوا۔

**مخالفت کا حل؛ صبر اور تسبیح خداوندی:**

﴿فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَ

قَبْلِ الْغُرُوبِ ۚ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ ۚ﴾

میرے پیغمبر! آپ ان کی باتوں پر صبر کریں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہیں سورج نکلنے سے پہلے اور سورج غروب ہونے کے بعد۔ رات کے حصوں میں بھی اللہ کی تسبیح کرو اور سجدوں کے بعد بھی تسبیح کرو!

یہ بات کیوں سمجھائی؟ اس لیے کہ جب کوئی بندہ مخالفت کرتا ہے اور مخالفت سن کر تکلیف ہو تو تکلیف سے بچنے کا طریقہ خود کو کسی دوسرے کام میں مشغول کرنا ہے۔ بس اس سے تکلیف کم ہو جائے گی۔ پھر مشغولیت اچھی ہو تو سبحان اللہ کیا

کہنے! تو اللہ نے فرمایا کہ میرے پیغمبر! ان کی باتوں پر صبر کیجیے! باقی جو تکلیف ہوتی ہے اس سے بچنا کیسے ہے؟ تو فرمایا: ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾ کہ عبادات میں خود کو مشغول کر لو، صبح شام ذکر و اذکار میں لگ جاؤ! اب یہ پریشانی کم ہو جائے گی۔ دیکھو! قرآن نے جو نسخہ بتایا ہے اس نسخے کو پلے باندھ لو۔

جب بھی آپ دین کا کام کریں گے تو مخالفت ہوگی۔ اس کا پہلا حل تو ہے کہ اس مخالفت پر صبر کریں اور دوسرا یہ کہ خود کو کسی اور کام میں مشغول کریں۔ وہ دوسرا کام تسبیحات اور عبادات کا ہے۔ اس سے آدمی کو صبر کی توفیق ملتی ہے اور آدمی تسلی اور دل جمعی کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔

ہمارا یہ بہت بڑا المیہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص مخالفت کرے تو ہم اس کی مخالفت کا رونا روتے ہیں، ہر وقت مخالفت کا ذکر کرتے ہیں، پھر جواب میں مخالفت شروع کرتے ہیں، اس سے نقصان ہوتا ہے اور نفع نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بندہ آپ کی بات نہ سمجھے یا آپ کی مخالفت کرے تو آپ اس کی مخالفت نہ کریں، اس کی مخالفت کا ہر وقت ذکر نہ کریں، اس سے غیبت کی بیماری شروع ہو جاتی ہے اور آپس میں نفاق آتا ہے، افتراق آتا ہے، لڑائیاں اور جھگڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے مواقع پر بس خاموش ہو جاؤ! اب جب خاموش ہوں گے تو تکلیف ہوگی، اس تکلیف سے بچنے کے لیے اپنی توجہ ہٹا دو! جب بندے کی توجہ ہٹ جاتی ہے تو تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ ہم اپنی توجہ نہیں ہٹاتے بلکہ پھر اسی بات پر، پھر اسی بات پر دھیان دیتے ہیں اور اس کا خیال لاتے رہتے ہیں تو پھر اس سے بہت نقصان ہوتا ہے۔

﴿وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادُ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ﴾

سنو! جب ایک منادی بہت قریب سے آواز دے گا۔

﴿يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ﴾

اس دن ہر بندہ یقیناً اس چیخ کو سنے گا اور یہی وہ دن ہو گا جب اٹھ کر سامنے آئیں گے۔

﴿إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ ۚ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاجًا ۚ ذَٰلِكَ حَشَرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ ۝﴾

ہم ہی ہیں جو زندہ بھی کرتے ہیں اور مارتے بھی ہیں اور ہماری طرف ہی تمہارا لوٹنا ہو گا۔ اس دن زمین پھٹ کر ان کو اس طرح باہر کرے گی کہ وہ لوگ تیزی سے چل پڑیں گے۔ یہ جمع کرنا ہمارے لیے بہت آسان ہے۔

﴿نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۚ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ ۝﴾

جو کچھ یہ کہتے ہیں ہم خوب جانتے ہیں، آپ ان پر زبردستی کرنے والے نہیں ہیں۔ آپ قرآن کریم سے ذریعے نصیحت ہر اس بندے کو کریں جو وعید سے ڈرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ڈرے گا تب اس پر اس وعید کا اثر ہو گا اور جو ڈرتا نہیں ہے اس پر کیا اثر ہو گا! اللہ ہم سب کو دین کی خدمت کے لیے قبول فرمائے۔ (آمین)

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الذريات

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَالذَّرِيَّتِ ذَرَوًا ۝ فَالْحُمِلَتِ وَقْرًا ۝ فَالْجُرِيَّتِ يُسْرًا ۝﴾

﴿فَالْمُقَسَّسَتِ أَمْرًا ۝﴾

**تین قسم کی مخلوق کی قسم:**

اللہ رب العزت نے اس سورت کے شروع میں تین قسم کی مخلوقات کی قسمیں کھائی ہیں: ایک مخلوق ہے ارضی، ایک مخلوق ہے فضائی اور ایک مخلوق ہے سماوی۔ فرمایا:

﴿وَالذَّرِيَّتِ ذَرَوًا ۝ فَالْحُمِلَتِ وَقْرًا ۝ فَالْجُرِيَّتِ يُسْرًا ۝﴾

﴿فَالْمُقَسَّسَتِ أَمْرًا ۝﴾

قسم ہے ان ہواؤں کی جو گرد و غبار کو اڑاتی ہیں، اور پھر ان بادلوں کی جو بوجھ اٹھاتے ہیں اور پھر ان کشتیوں کی جو آسانی سے چلتی ہیں اور فرشتوں کی جو اللہ کے حکم سے چیزیں تقسیم کرتے ہیں۔

فرشتے یہ سماوی مخلوق ہیں۔ ہوائیں اور کشتیاں یہ ارضی مخلوق ہیں اور درمیان میں بادل یہ فضائی مخلوق ہیں۔ تو اللہ نے ان تینوں کی قسم کھائی ہے۔ پھر فرمایا:

﴿إِنَّمَا تُوْعَدُونَ لَصَادِقٌ ۖ وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ ۝﴾

اور جو وعدہ تمہارے ساتھ ہے وہ سچا ہے، اور جزا اور سزا کا دن یہ واقع ہو کر رہنا ہے۔

### آسمان کی خوبصورتی:

﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُوبِ ۝﴾

پھر آسمان کی قسم کھائی۔ یہاں ”حُبُوبِ“ یہ جمع ہے ”حبیبہ“ کی۔ حبیبہ ان دھاریوں کو کہتے ہیں جو کپڑے میں بن جاتی ہیں، راستے بھی چونکہ دھاریوں کی طرح سیدھے ہوتے ہیں اس لیے راستوں کو بھی ”حُبُوبِ“ کہہ دیتے ہیں۔ اس لیے بعض نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ قسم ہے آسمان کی جو راستوں والا ہے۔ راستوں سے وہ راستے مراد ہو سکتے ہیں جن میں ملائکہ چلتے ہیں۔

اور ایک کپڑے میں کئی دھاریاں ہوں تو اس سے کپڑا خوبصورت بن جاتا ہے۔ اس لیے بعض نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ قسم ہے آسمان کی جو خوبصورت اور حسن و زینت والا ہے، کیونکہ اس میں جب راستے ہوں گے تو خوب صورت بنے گا۔

### تردید منکرین:

﴿إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝﴾

یہ مضمونِ قسم ہے کہ تم لوگ مختلف اور متضاد باتوں میں پڑ گئے ہو!

﴿يُؤْفِكُ عَنْهُ مَنْ أَفَكَ ۝﴾

اس قیامت سے یا اس قرآن سے وہی شخص محروم ہوتا ہے جس کے مقدر میں محروم ہونا لکھا ہے۔ دلائل موجود ہیں تو آدمی کو مان لینا چاہیے لیکن جس کی قسمت میں محرومی ہو وہ محروم ہو کر رہے گا۔

﴿قَتِيلَ الْخُزُوصُونَ﴾

تباہ ہو جائیں وہ لوگ جو اٹکل کی باتیں کرتے ہیں، ظن اور گمان سے چلتے ہیں۔

﴿الَّذِينَ هُمْ فِي غَمْرَةٍ سَاهُونَ﴾ يَسْأَلُونَ أَيَّانَ يَوْمِ الدِّينِ ﴿١٧﴾

جو ایسی غفلت اور بے خبری میں پڑے ہوئے ہیں کہ سب بھول گئے ہیں۔

ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کا دن کب ہو گا؟

﴿يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُقْتَنُونَ﴾

فرمایا کہ ان کو بتاؤ کہ جب تمہیں آگ پر تپایا جائے گا تو وہ دن قیامت کا ہو گا۔

تو دن متعین نہیں کیا بلکہ ان کی تہدید اور عذاب ان کو سنا دیا گیا۔ جیسے کوئی شخص سزائے موت کا قیدی ہو اور اس کو پتا تو ہے کہ سزا ہونی ہے۔ وہ مذاق میں کہتا ہے کہ کب ہے ہماری تاریخ؟ کب پھانسی چڑھیں گے؟ تو اس کو بتایا جائے کہ جب تم سولی پہ چڑھو گے تو وہی تمہارا دن ہے سزا کا۔ تو تعین نہیں بتائی جا رہی دن کی بلکہ سزا بتائی جا رہی ہے۔

﴿ذُوقُوا فِتْنَتَكُمْ ۚ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ﴾

قیامت کے دن کہا جائے گا کہ اپنے کرتوتوں کے مزے اب چکھو، یہی وہ عذاب ہے جس کو تم جلدی مانگتے تھے۔

**متقین کا انعام:**

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ﴾

متقین کے بارے میں فرمایا کہ بے شک متقین باغات میں ہوں گے اور چشموں میں ہوں گے۔

﴿أُخْذِينَ مَا أَرْتُهُمْ رَبُّهُمْ ۚ لَنْهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُحْسِنِينَ﴾

جو نعمتیں ان کا پروردگار ان کو دے گا وہ اس کو لے رہے ہوں گے، یہ متقین اس سے پہلے دنیا میں نیکیاں کرتے تھے۔

### رات کے قیام کی فضیلت:

﴿كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الَّذِينَ مَا يَهْجَعُونَ﴾ ۱۷۰ وَ بِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿۱۷۱﴾

وہ رات کو بہت کم سوتے تھے اور سحری کے وقت اٹھ کر پھر اللہ سے استغفار بھی کرتے تھے کہ شاید ہم آپ کی عبادت نہیں کر سکے۔

یہ جو ﴿كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الَّذِينَ مَا يَهْجَعُونَ﴾ ہے اس میں لفظ ”يَهْجَعُونَ“ یہ ہجوع سے بنا ہے جس کا معنی ہے رات کو سونا۔ اس سے پہلے جو ”مَا“ ہے اس میں دو احتمال ہیں:

[1]: اگر ”مَا“ کو موصولہ بنائیں تو معنی یہ ہو گا کہ ”وہ رات کو بہت کم سوتے تھے۔“ یعنی جاگتے زیادہ تھے۔

[2]: اور اگر ”مَا“ کو نافیہ بنائیں تو معنی ہو گا کہ ”وہ بہت کم بیدار ہوتے تھے۔“ یعنی رات کا زیادہ حصہ سوتے تھے اور بہت کم حصہ جاگ کر گزارتے تھے۔ اب ترجمے دونوں ٹھیک ہیں۔ ”مَا“ موصولہ بنائیں یا نافیہ بنائیں۔

حضرت حسن بصری، حافظ ابن جریر طبری اور بہت سے مفسرین نے اپنے ذوق پر ”مَا“ کو موصولہ قرار دیا ہے کہ یہ لوگ ایسے تھے جو کم سوتے تھے یعنی جاگتے زیادہ تھے۔ راتوں کو عبادت کرتے تھے، نماز میں مشغول رہتے تھے۔

حضرت ابن عباس، امام قتادہ، امام مجاہد وغیرہ نے ”مَا“ کو نافیہ قرار دیا ہے

کہ یہ لوگ ایسے تھے جو سوتے زیادہ تھے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے اس صفت میں وہ تمام لوگ شامل ہو جاتے ہیں جو رات کے کسی حصہ میں اٹھ کر عبادت کر لیتے ہیں، چاہے شروع رات میں چاہے آخر رات میں، یہ فضیلت سب کو حاصل ہو جاتی ہے۔ جب یہ تفسیر کریں گے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو رات کا کچھ حصہ جاگتے ہیں تو بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مغرب اور عشاء کے درمیان نماز پڑھتے ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو لوگ عشاء کی نماز سے پہلے نہیں سوتے وہ بھی اس فضیلت میں شامل ہیں۔

### محتاج کی امداد کا حکم:

﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾ (۱۶)

اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے مال میں سوال کرنے والوں اور محروم لوگوں کا حق ہوتا ہے۔

دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں؛ بعض وہ جو محتاج ہوتے ہیں اور مانگتے ہیں، بعض ایسے ہوتے ہیں جو محتاج تو ہوتے ہیں لیکن مانگتے نہیں ہے۔ تو مؤمنین متقین کی صفت یہ ہے کہ اگر محتاج مانگے تو اس کو بھی دیتے ہیں اور جو محتاج ہو اور نہ مانگے تو اس کو بھی دیتے ہیں۔ یہاں لفظ ”محروم“ فرمایا کیونکہ بندہ محتاج ہو اور نہ مانگے تو محروم رہ جاتا ہے۔ تو فرمایا کہ متقین وہ لوگ ہیں کہ جو شخص نہ مانگنے کی وجہ سے عام طور پر محروم رہ جاتا ہے یہ اسے بھی دیتے ہیں، تو یہ لوگ صرف مانگنے والے کو نہیں دیکھتے بلکہ تلاش کرتے ہیں کہ مستحق کون ہے؟ تو یہ کسی کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتے۔

اور لفظ کیسا استعمال کیا ﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ﴾ یہ لوگ صدقات اس طرح دیتے ہیں کہ جیسا ان کے مال میں حق ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس حق کو ادا کرتے ہیں۔ مطلب کہ یہ لوگ انتظار نہیں کرتے کہ جب کوئی مانگے گا تو پھر دیں گے بلکہ کوئی



نہ مانگے اور محتاج ہو تو یہ تب بھی دیتے ہیں۔

﴿وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ﴾

اور جو اللہ کی ذات پر یقین رکھتے ہیں ان کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں۔  
اب دیکھو! کبھی پانی ہے، کبھی سبزیاں ہیں، کبھی نہریں ہیں.... کتنی چیزیں  
خدا نے زمین میں پیدا کیں۔ بندہ ایک چیز پر غور کرے تو پتا چلتا ہے کہ اس کو پیدا کرنا  
ہمارے اختیار میں نہیں تھا، اس کو نکالنا ہمارے اختیار میں نہیں تھا لیکن اللہ کی ذات  
ایسی ہے جو ان چیزوں کو نکالتی ہے۔ یوں ایک قسم کی زمین سے مختلف قسم کی نباتات  
نکلتی ہیں۔ میں دلائل میں تفصیل بیان نہیں کرتا، میں صرف اشارہ کر رہا ہوں۔

**انسان میں قدرت کی نشانیاں:**

﴿وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ﴾

اور خود تمہاری ذات میں بھی اللہ کی نشانیاں موجود ہیں۔ تم غور و فکر کیوں  
نہیں کرتے؟

﴿وَفِي أَنفُسِكُمْ﴾ کا تعلق پیچھے ﴿وَفِي الْأَرْضِ﴾ کے ساتھ ہے کہ جس

طرح زمین میں دلائل موجود ہیں اسی طرح کتنے دلائل ہیں جو خود تمہاری ذات میں  
موجود ہیں۔ آدمی اپنی ذات کو دیکھ لے کہ آنکھ کتنی چھوٹی سی ہے اور دیکھتی کتنا زیادہ  
ہے۔ یہ اللہ کریم کے علاوہ کون ہے جو اس کو سنبھالتا ہے؟ ایک چھوٹی سی نعمت کو لے لو  
تو بندے کو خدا کی ذات پر یقین ہوتا ہے۔ دنیا میں چھوٹی سی چیز انسان بناتا ہے تو وہ  
تھوڑی دیر بعد خراب ہو جاتی ہے لیکن اللہ کی پیدا کردہ چیز کے فوائد بہت زیادہ ہوتے  
ہیں اور اتنا استعمال ہوتی ہے لیکن مٹھکتی نہیں ہے، استعمال ہو کر گھسکتی نہیں ہے، اس کو  
مزید کسی خوراک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ اللہ نے عجیب نظام بنایا ہے۔

﴿وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ﴾

آسمان کے اندر تمہارا رزق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان میں لوح محفوظ ہے جہاں تمہارا مقدر لکھ دیا گیا ہے۔ ﴿وَمَا تُوعَدُونَ﴾... اور جو تمہارے ساتھ وعدہ کیا جاتا ہے کہ آئندہ جنت بھی ملے گی، یہ سب آسمان میں لکھا ہوا ہے۔

### قیامت کا وقوع یقینی ہے:

﴿فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقُّ مِثْلِ مَا أَنْتُمْ تَنْطِقُونَ﴾

قسم ہے آسمان اور زمین کی کہ قیامت ایسے ہی برحق اور سچی ہے جیسے تم آپس میں باتیں کرتے ہو! یعنی جس طرح تمہیں اپنی گفتگو پر یقین ہے کہ تم بول رہے ہو اسی طرح یہ بات یقینی ہے کہ قیامت نے آکر رہنا ہے۔

### ابراہیم علیہ السلام کا قصہ:

﴿هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ﴾

کیا آپ کے پاس ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا قصہ نہیں پہنچا جو بہت عزت والے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتے آئے۔ ﴿الْمُكْرَمِينَ﴾ سے مراد فرشتے ہیں اور فرشتے ہوتے ہی معزز ہیں یا یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کا اکرام کیا تھا اس لیے انہیں معزز کہا گیا ہے۔

### مہمان کا اکرام کیسے کیا جائے؟

یہاں مہمان کے حوالے سے چند ایک باتیں ذہن نشین فرمائیں۔ مہمان مہمان ہوتا ہے بڑا ہو یا چھوٹا ہو، مسلمان ہو یا کافر ہو، اہل السنۃ ہو یا اہل بدعت ہو، مہمان کا اکرام مہمان سمجھ کر کرنا چاہیے۔ حدیث مبارک میں ہے:

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ صَیْفَهُ. <sup>181</sup>

جو شخص اللہ اور آخر کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ اپنی مہمان کا اکرام کرے۔

تو مہمان میں تخصیص نہیں ہوتی۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ آنے والا آپ کا رشتہ دار ہے تو اس کی نوعیت الگ ہوگی، آنے والا صاحبِ علم ہے تو نوعیت الگ ہوگی لیکن مہمان بحیثیتِ مہمان اس کی حیثیت الگ ہوتی ہے، اس کا تعلق مفادات سے نہیں ہے۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس بات کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اگر ہم شریعت کا حکم سمجھتے ہوئے اپنے مہمان کا اکرام کریں گے تو اللہ راضی ہوگا، اجر ملے گا اور اگر ہم اپنی ذاتی غرض کے لیے اس کی عزت و اکرام کریں گے تو اللہ ناراض ہوگا اور عذاب بھی ہوگا۔ اس لیے نیت ٹھیک کرنا بہت ضروری ہے۔

- 1: ایک تو معمول بنالیں کہ مہمان کا اکرام کرنا ہے چاہے وہ چھوٹا ہے یا بڑا۔
- 2: دوسرا کوشش یہ کریں کہ مہمان کا اکرام گھر سے کریں، گھر والوں کا مزاج بنائیں، گھر والوں کو شریک کریں، گھر والوں کو ساتھ چلائیں اور ان کو یہ بات سمجھائیں کہ مہمان کے آنے پر اللہ کتنے خوش ہوتے ہیں!
- 3: تیسرا یہ کوشش کریں کہ مہمان کی پسند کا کھانا ہو۔ اس سے پوچھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مہمان بسا اوقات نہیں بتاتا تو جو میسر ہے وہ لے کر آجائیں۔
- 4: چوتھا یہ کہ اگر آپ کھانا لے آئے اور مہمان نہ کھانا چاہے تو مہمان پر کھانے کو مسلط نہ کریں، مہمان کو کھانے کے لیے مجبور نہ کریں اور اس طرح مہمان جب کھانا چاہے اس وقت کھلائیں۔

بہر حال میں گزارش کرتا ہوں کہ مہمان کا اکرام کرنا سیکھیں! بطور خاص جس بندے نے دین کا کام کرنا ہے اس کے دسترخوان کو وسیع ہونا بہت ضروری ہے۔ دسترخوان میں وسعت نہ ہو تو کام میں وسعت کبھی نہیں ہو سکتی۔ کام کی وسعت کے لیے دسترخوان کی وسعت بہت ضروری ہے، جتنے اسباب ہیں اتنا انتظام کریں، جس حد تک ممکن ہے اتنا کریں لیکن اپنے دسترخوان کو وسیع رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس کے بہت زیادہ فوائد ہیں؛ دنیاوی فوائد بھی ہیں اور اخروی فوائد بھی ہیں۔

### حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی:

یہاں پر بعض مفسرین نے ابراہیم علیہ السلام سے مہمانی کے آداب لکھے ہیں۔ ایک ادب یہ تھا: ﴿فَرَاغَ إِلَىٰ أَهْلِهِ فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَمِينٍ﴾ ”راغ“ ایسے موقع پر استعمال کرتے ہیں کہ جب کوئی بندہ جائے اور کسی کو محسوس نہ ہونے دے کہ چلا گیا ہے۔ اسے ”راغ“ کہتے ہیں۔ ایک ہے ویسے چلا جانا اور ایک ہے چپکے سے چلا جانا۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے ان کو بتایا نہیں کہ میں تمہارے لیے کچھ لینے جا رہا ہوں بلکہ مہمان سمجھ کر بغیر بتائے لینے کے لیے چلے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ جب مہمان آئے ہیں تو کوئی چیز کھائیں گے نا۔

دوسرا ادب یہ تھا ﴿فَقَرَّبَتْ إِلَيْهِمْ﴾ کہ جب کھانا تیار ہوا تو مہمانوں کو کھانے پر نہیں بلایا گیا بلکہ کھانا مہمانوں کے پاس لے کر گئے، مہمانوں کو تکلیف نہیں دی۔

تیسرا ﴿قَالَ لَا تَأْكُلُون﴾ کہ ان کو یہ نہیں کہا کہ آپ کھاؤ بلکہ یہ پوچھا کہ آپ کھاتے کیوں نہیں ہو؟ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ مہمان کے لیے جو کچھ موجود ہو مہیا کر دو اور مہمان کو کھانے پر مجبور نہ کرو کہ ضرور کھائے۔ اس لیے ابراہیم علیہ

السلام نے پہلے پوچھا کہ تم کھاتے کیوں نہیں ہو؟ تو یہ مہمانی کے آداب بیان کیے ہیں۔

﴿إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ قَوْمٌ مُنْكَرُونَ﴾

ملائکہ ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے، سلام کیا، آپ علیہ السلام نے جواب دیا اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ یہ اجنبی لوگ ہیں۔

یہ بات آپ نے دل میں کہی یا یہ بھی احتمال ہے کہ ان سے پوچھنے کے لیے زبان سے کہی کہ تم کون لوگ ہو؟ میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔

﴿فَرَاغَ إِلَىٰ أَهْلِهِ فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَمِينٍ﴾

﴿فَتَأْكُلُونَ﴾

اتنی بات کی اور ابراہیم علیہ السلام گھر چلے گئے اور بھنا ہوا مچھڑا ان کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ چونکہ فرشتے تھے اس لیے انہوں نے کھانا نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے انہیں کہا کہ آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ لیکن انہوں نے نہ کھایا۔

### ابراہیم علیہ السلام کا خوف اور فرشتوں کی بشارت:

﴿فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً قَالُوا لَا تَخَفْ وَبَشِّرُوهُ بَعْلِمٍ عَلِيمٍ﴾

ابراہیم علیہ السلام نے خوف محسوس کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم تو ملائکہ ہیں، فرشتے ہیں، آپ نہ ڈریں! انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کو بشارت دی کہ اللہ آپ کو بیٹا عطا فرمائے گا جو علم والا ہو گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خوف کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت شرفاء کا معمول یہ ہوتا تھا کہ وہ جب کسی کے ہاں مہمان بننے تو میزبان سے کچھ نہ کچھ کھا لیا کرتے تھے جو اس بات کی علامت ہوتی کہ اس مہمان سے کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر کوئی مہمان نہ کھاتا تو خطرہ ہوتا کہ یہ کہیں کوئی دشمن نہ ہو جو نقصان نہ پہنچا دے۔ اس لیے

ابراہیم علیہ السلام نے خوف محسوس کیا۔

﴿فَاقْبَلَتْ أُمُّ آدَمَ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ ٢٦﴾

قَالُوا كَذَلِكَ قَالَ رَبُّكَ إِنَّهُ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ٢٧﴾

ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ پر دے کے پیچھے تھیں یا قریب تھیں، بات سن رہی تھیں تو ان کو بہت تعجب ہوا انہوں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور کہا کہ میں بانجھ بھی ہوں اور بوڑھی بھی ہوں تو مجھے اولاد کیسے ہوگی؟ انہوں نے کہا کہ اللہ کا فیصلہ ہے اس لیے اولاد آپ کی ہو کر رہے گی، اللہ حکمت والا بھی ہے، اللہ علم والا بھی ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ کس کو دینا ہے اور حکمت والے ہیں کہ کب دینا ہے؟ اس لیے اللہ کی جیسے حکمت ہوتی ہے ویسے ہی فرماتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کی عمر جو مفسرین نے لکھی ہے اس وقت سو سال تھی اور حضرت سارہ کی عمر ننانوے سال تھی۔ تو فرشتوں نے کہا کہ ہم تو آپ کو خوشخبری دیتے ہیں۔

### قوم لوط کی طرف سفر:

﴿قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ٢٨﴾ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ

مُجْرِمِينَ ٢٩ لَنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ جَارَءًا مِّنْ طِينٍ ٣٠ مَسْوَمَةً عِنْدَ رَبِّكَ

لِلْمُسْرِفِينَ ٣١﴾

پھر ابراہیم علیہ السلام نے ان سے پوچھا کہ تم کہا جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہمیں مجرم لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے یعنی ہم لوط علیہ السلام کی بستی کی طرف جا رہے ہیں، تاکہ ان پر ایسے پتھر برسائیں جو پکی مٹی کے بنے ہوتے ہیں جن پر نشان لگے ہوئے ہیں آپ کے رب کے پاس سے۔

اور روایات میں آتا ہے کہ جب پتھر پھینکتے تھے اور بندہ دوڑتا تھا تو پتھر اس کے پیچھے جا کر اس کو لگتا اور تباہ کر دیتا، پھر بعد میں اس کو الٹا کر کے پھینکا گیا تھا۔ تو دو قسم کا عذاب ان پر آیا تھا۔

اب یہاں دیکھیں! آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے ایک ضابطہ بیان کیا تھا کہ ”عِنْدَ رَبِّكَ“ یہ قرآنی اصطلاح ہے۔ تمام چیزوں پر حقیقی اور ظاہری حق اللہ تعالیٰ کا ہے لیکن بعض چیزوں پر ظاہری اختیار بھی اللہ اپنے پاس رکھتے ہیں اور بسا اوقات ظاہری اختیار بندے کو دے دیتے ہیں۔ جہاں ظاہری اختیار بھی اللہ کے پاس ہوں وہاں نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے اور جہاں ظاہری اختیار بندے کے پاس ہو تو وہاں نسبت بندے کی طرف ہوتی ہے۔ یہاں ﴿مُسَوَّمَةٌ عِنْدَ رَبِّكَ﴾ ہے۔ اب ان پتھروں پر جو نشان لگے پڑے ہیں وہ تو ہر کسی کو پتا چل رہا ہے لیکن ﴿عِنْدَ رَبِّكَ﴾ کیوں فرمایا؟ اس لیے کہ ان پتھروں پر نشانات کا پڑنا اس کے ساتھ بندوں کا کوئی تعلق نہیں ہے، یہ خالص اللہ کا اختیار ہے۔ اس لیے نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے۔

﴿فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ ﴿٢٥﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا

غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٢٦﴾

اس بستی میں جو بھی ایمان والا تھا ہم نے اس کو وہاں نے نکال لیا۔ ہم نے اس بستی میں ایک گھر کے علاوہ کسی گھر کو مؤمن نہ پایا۔

لوط علیہ السلام کا عجیب معاملہ تھا۔ مسافر نبی ہیں اور کوئی ایک شخص بھی ساتھ کلمہ گو نہیں ہے۔ صرف اپنا ایک گھر تھا۔ بتاؤ! اس پیغمبر کی کتنی حسرت ہو گی! گھر میں بیوی ہے وہ بھی ایمان نہیں لائی۔ جب بستی سے نکلے تو بیوی بھی عذاب میں مبتلا ہو گئی، وہ بھی ساتھ نہیں تھی، کتنی عجیب کیفیت ہو گی حضرت لوط علیہ السلام کی۔ اور

جب قوم نے حملہ کرنا چاہا تو لوط علیہ السلام نے فرمایا تھا:

**طاقت اور قبیلہ نعمتِ عظمیٰ:**

﴿لَوَ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةٌ أَوْ إِيَّايَ إِلَىٰ دُكُنٍ شَدِيدٍ﴾<sup>182</sup>

اے کاش! میرے پاس تمہارے مقابلے میں طاقت ہوتی، اے کاش! میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لے لیتا! یعنی میرا قبیلہ ہوتا تو آج تم مجھے رسوا نہ کرتے۔  
اس سے معلوم ہوا کہ کسی عالم کو طاقت کامل جانا، اچھے قبیلے کامل جانا، اچھے خاندان کامل جانا یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ بسا اوقات طاقت بہت سارے مصائب سے روک دیتی ہے اور بسا اوقات اچھے خاندان میں پیدا ہونا یہ آدمی کو بہت سارے مسائل سے بچا لیتا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام چونکہ مسافر تھے۔ وہاں ان کا قبیلہ تھا ہی نہیں اس لیے یہ فرما دیا۔

﴿وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ﴾<sup>(ط)</sup>

ہم نے ان میں ایک نشانی چھوڑی ہے ان لوگوں کے لیے جو سخت عذاب سے ڈرتے ہیں۔

**حضرت موسیٰ دربارِ فرعون میں:**

﴿وَفِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطَنٍ مُّبِينٍ﴾<sup>(ط)</sup>

اور دیکھو! موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں بھی ہم نے ایک ایسی ہی نشانی چھوڑی تھی جب ان کو کھلی دلیل دے کر فرعون کی طرف بھیجا۔

﴿فَتَوَلَّىٰ بِرْكَيْبِهِ وَقَالَ سِحْرٌ أَوْ مَجْنُونٌ﴾<sup>(ط)</sup>



تو فرعون نے اپنے پورے اراکین سمیت انکار کیا اور کہا کہ یہ ساحر ہے بلکہ یہ جادوگر ہے۔

﴿فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ ٢٥﴾

ہم نے فرعون کو اور اس کے لشکر کو پکڑا اور ان سب کو سمندر میں پھینک دیا اور فرعون تو تھا ہی ملامت کے قابل!

**عاد و ثمود کا انجام:**

﴿وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ ٢٦﴾

اور قوم عاد میں بھی ہم نے نشانیاں چھوڑی ہیں جب ہم نے ان پر ایسی ہوا بھیجی جو بانجھ تھی۔ کیا مطلب کہ عام طور پر جب ہوا چلتی ہے تو اس میں خیر و برکت ہوتی ہے۔ بادل کھینچ لاتی ہے، بارش کا سبب بنتی ہے لیکن یہ ہوا ان تمام خیروں سے خالی تھی کیونکہ یہ عذاب کی آندھی تھی۔

﴿مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلْنَاهُ كَالرَّمِيمِ ٢٧﴾

یہ ہوا جہاں سے بھی گزرتی اس جگہ کی ساری چیزوں کو ریزہ ریزہ کر ڈالی۔

﴿وَفِي ثَمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ ٢٨﴾

اور قوم ثمود میں بھی ایسی نشانی ہم نے چھوڑی تھی جب ان سے کہا گیا تھا کہ تم چند روز کے مزے اٹھا لو، چند دن من چاہی زندگی گزار لو۔ بندہ عیش و عشرت میں زندگی گزار دے اور اللہ کی فرمانبرداری نہ کرے تو عذاب تو پھر آنا ہی ہے۔

﴿فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ٢٩﴾

اس سمجھانے کے باوجود انہوں نے اپن پروردگار کے حکم کی نافرمانی کی تو انہیں ایک کڑک نے آ پکڑا اور یہ لوگ دیکھتے ہی دیکھتے رہ گئے۔

﴿فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ وَمَا كَانُوا مُنْتَصِرِينَ﴾ (۵۱)

ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ نہ تو کھڑے ہو سکتے تھے اور ہی اس عذاب سے بچ سکتے تھے۔

﴿وَقَوْمَ نُوحٍ مِنْ قَبْلُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِيقِينَ﴾ (۵۲)

اس سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم میں بھی ہم نے نشانیاں چھوڑی ہیں۔ یہ قوم بڑی نافرمان تھی۔ تو یہ مختلف قوموں کا تذکرہ کیا ہے عبرت کے لیے۔

**تخلیق باری تعالیٰ کے نمونے:**

﴿وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ﴾ (۵۳)

فَنِعْمَ الْمِهْدُونَ﴾ (۵۴)

ہم نے آسمان کو طاقت سے پیدا کیا ہے اور ہم تو وسعت دینے والے ہیں۔  
ہم نے زمین کو پھیلا دیا ہے اور ہم کیا ہی بہترین پھیلانے والے ہیں!

﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (۵۵)

اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے ہیں تاکہ تم کچھ نصیحت حاصل کرو!  
یعنی ہر چیز کی دو دو قسمیں پیدا کی ہیں۔ کالا پیدا کیا تو سفید بھی پیدا کیا، میٹھا پیدا کیا تو کڑوا بھی بنایا، مرد کو بنایا تو عورت کو بھی بنایا، مسلمان کو پیدا کیا تو کافر کو بھی پیدا کیا۔ ہر جگہ پر اللہ نے دو دو قسمیں پیدا کی ہیں۔

﴿فَقِرْ إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ﴾ (۵۶)

اس لیے تم اللہ کی طرف دوڑو! بے شک میں تمہیں صاف طور پر ڈرانے والا ہوں۔  
یہاں یہ بات ارشاد فرمائی کہ دلائل کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم شرک کو چھوڑ کر  
توحید اختیار کرتے، مزید یہ کہ ﴿إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ﴾ مجھ جیسا بندہ تم کو

ڈرانے والا بھی ہے، میں نہ ہوتا تو دلائل کا تقاضا تھا کہ تم اللہ کی طرف متوجہ ہوتے اور اب تو میں خود ڈرانے والا تم میں موجود ہوں اس لیے اب تو تمہیں حق کی راہ اختیار کر لینی چاہیے۔

﴿وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ ۚ إِنَّي نَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ﴾

اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بناؤ، کیونکہ میں اللہ کی طرف سے تمہیں واضح ڈرانے والا ہوں۔

**تسلی پیغمبر:**

﴿كَذَلِكَ مَا آتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مُجْنُونٌ﴾

میرے پیغمبر! یہ کام صرف ان لوگوں کا نہیں ہے بلکہ جس طرح آپ سے یہ لوگ آپ سے کہتے ہیں اسی طرح یہ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے کہ جب بھی کوئی نبی آتا تو لوگ یا تو اسے ساحر کہتے یا مجنون کہتے۔

﴿اتَّوَاصُوا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ﴾

کیا یہ لوگ ایک دوسرے کو یہ وصیت کرتے چلے آئے ہیں یعنی یہ تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے مرتے وقت ایک دوسرے سے کہتے چلے آئے ہوں کہ جب بھی کوئی رسول آئے تو ایسے کہنا! فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ یہ لوگ سرکش ہیں اور جو بھی سرکش ہو اس کی یہ عادت ہوتی ہے۔

**عالم اور مشکلات کا سامنا:**

یہاں سے ایک مسئلہ اچھی طرح سمجھیں! کہ ایک معاملہ پیغمبر کے ساتھ تھا اور ایک معاملہ پیغمبر کے وارث کے ساتھ ہے۔ پیغمبر کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا تھا کہ انہیں مخالفین معاذ اللہ ساحر اور مجنون کہتے تھے اور جب عالم کام کرے گا تو اس کا

مقابلہ دو قسم کے لوگوں سے ہوگا:

- 1: بعض وہ لوگ ہوں گے جو فکری طور پر عالم کے مخالف ہوں گے۔
- 2: اور بعض وہ ہیں جو فکری طور پر مخالف نہیں ہیں بلکہ حسد کی بیماری کے شکار ہیں اور جو حاسد ہوتا ہے وہ محسوس پر الزام لگاتا ہے۔ تو جس عالم نے جب بھی کام کیا ہے اس پر الزام لگے ہیں، آئندہ جب بھی کوئی عالم کام کرے گا اس پر الزام لگیں گے۔ وہ پہلے الزام لگانے والے بعد والوں کو وصیت نہیں کرتے کہ تمہارے اندر عالم ہے تم بھی یہ الزام لگانا۔ کیونکہ جو مرض حسد ان میں تھا وہی مرض حسد ان میں بھی ہے۔ وہ ان کا کچھ اور کر نہیں سکتے تھے سوائے الزام لگا کر بدنام کرنے کے اور یہ بھی کچھ اور تو کر نہیں سکتے لیکن الزام لگا کر بدنام کرتے ہیں۔

تو جس طرح پیغمبر کو حکم دیا جا رہا ہے کہ یہ پرانی بات ہے لوگ آپ کو ایسا ایسا کہیں گے تو اس سے علماء کو بھی سمجھنا چاہیے کہ یہ پرانی باتیں ہے جو ایسے الزامات لگاتے ہیں۔ جو بندہ یہ سہہ سکتا ہے تو وہ دین کا کام کرے، جو یہ نہیں سہہ سکتا وہ عقائد یا کسی عنوان پر تحریکات کو شروع ہی نہ کرے اور جب شروع کرنا ہو پھر اللہ کے لیے لگے رہو! لگے رہو اللہ کے لیے! ایک وقت آئے گا ان شاء اللہ کہ اللہ بہت زیادہ قبولیت عطا فرمائے گا۔

﴿فَتَوَلَّ عَنْهُمْ مَتَىٰ أَنتَ بِمَلُومٍ﴾ (٣٤)

اے پیغمبر! آپ ان سے رخ پھیر لیں، آپ پر کوئی الزام نہیں ہوگا۔

﴿وَذِكْرُ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (٣٥)

آپ نصیحت کرتے رہیں کیونکہ نصیحت ایمان والوں کو فائدہ دے گی۔

آپ کے حاسدین کو نہیں تو اپنوں کو تو فائدہ دے گی، اس لیے آپ اپنا کام

جاری رکھیں۔

## تخلیق جن وانس کا مقصد:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (۱۷)

ہم نے جن وانس کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔

اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیا میں بعض لوگ کام کرتے ہیں تو اس میں اپنے فوائد مقصود ہوتے ہیں اور اللہ نے جو بندوں کو پیدا فرمایا ہے تو اس میں اللہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اپنا کوئی مقصد نہیں ہے، کسی اپنے فائدے کے لیے بندے کو پیدا نہیں فرمایا۔

یہاں دو تین باتیں سمجھیں:

[۱]: ایک بات یہ سمجھیں کہ جب جن وانس کو اللہ نے پیدا ہی عبادت کے لیے کیا ہے تو پھر کتنے جن وانس ہیں جو عبادت نہیں کرتے۔ تو ایک کام کے لیے اللہ پیدا فرمائے، پھر وہ بندہ کام نہ کرے تو کیا یہ ہو سکتا ہے؟ اللہ تو فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ (۲۱) <sup>183</sup>

اللہ کسی چیز کا ارادہ فرمائیں اور وہ نہ ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جب اللہ نے انسان اور جنات کو پیدا ہی عبادت کے لیے کیا ہے تو پھر یہ عبادت کیوں نہیں کرتے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ارادہ خدا سے تخلف ہو جائے؟

## ارادہ تکوینی اور ارادہ تشریعی:

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایک ہے اللہ کا ارادہ تکوینیہ اور ایک ہے ارادہ تشریعیہ۔ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ میں ارادہ تشریعی ہے،

ارادۂ تکوینیہ نہیں ہے۔ ارادۂ تکوینیہ میں جس کا ارادہ فرماتے ہیں تو وہ مجبور ہوتا ہے اور اس نے کرنا ہی کرنا ہوتا ہے اور اس میں ابتلاء نہیں ہوتا ہے کہ کرے گا تو ثواب اور نہیں کرے گا تو گناہ، اس میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا اور اس میں بندے کا اختیار بھی نہیں ہوتا۔ تو ارادۂ تکوینیہ میں نہ اختیار ہوتا ہے نہ ابتلاء ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ نے ہواؤں کو حکم دیا کہ تم نے چلنا ہے، وہ چلیں گی، اب ہوا کا اختیار نہیں ہے کہ اس کا جی چاہے تو چلے، جی چاہے تو نہ چلے، اور یہ بھی نہیں کہ چلیں گی تو جنت میں جائیں گی اور نہیں چلیں گی تو جہنم میں جائیں گی۔ جو نہی قیامت آئے گی ہر ہوانے ختم ہو جانا ہے۔ یہ سب ارادۂ تکوینیہ ہے۔ سورج نے مشرق سے نکلنا ہے، اسے خدا کا حکم ہے کہ نکلو! اب ایسا نہیں ہے کہ اس کا جی چاہے تو نکلے، جی چاہے تو نہ نکلے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور سورج نکلے گا تو جنت میں جائے گا اور نہیں نکلے گا تو جہنم میں جائے گا ایسا بھی نہیں ہے۔ تو ارادۂ تکوینیہ میں ابتلاء اور اختیار نہیں ہوتا۔

اور ارادۂ تشریعیہ میں ابتلاء بھی ہوتا ہے اور اختیار بھی ہوتا ہے۔ کیا مطلب کہ اللہ رب العزت بندے کو ایک حکم دیتے ہیں اور ساتھ اختیار بھی دے دیتے ہیں کہ چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ یہ ہے ارادۂ تشریعیہ۔ اختیار بھی دیتے ہیں اور ساتھ ابتلاء بھی ہوتا ہے، اچھا کام کرے گا تو نجات پائے گا اور نہیں کرے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ تو ارادۂ تشریعیہ میں نقصان بھی ہوتا ہے اور ابتلاء بھی ہوتا ہے۔

تو یہاں ارادہ سے مراد ارادۂ تشریعیہ ہے، ارادۂ تکوینیہ نہیں ہے۔

دوسرا جواب قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے ”تفسیر مظہری“ میں دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اصل میں اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے جن و انس کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ ان میں استعداد اور صلاحیت رکھی ہے کہ اگر عبادت کرنا چاہیں تو کر سکیں اور نہ کرنا چاہیں تو نہ کریں۔ تو فرمایا کہ ہم نے ان کی تخلیق اس طرز پر کی ہے

کہ ان میں عبادت کی استعداد رکھی ہے۔ اب چاہیں تو استعداد کا صحیح استعمال کریں اور چاہیں تو استعداد کا غلط استعمال کریں، ہم نے ان کو اختیار دے دیا ہے۔

### وجہ تخلیق کائنات:

[۲]: دوسری بات یہاں یہ سمجھیں کہ جب ہم یہ حدیث پاک پیش کرتے ہیں مستدرک علی الصحیحین کی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کائنات کی تخلیق کے سبب ہیں:

وَلَوْلَا مُحَمَّدٌ مَا خَلَقْتُكَ<sup>184</sup>

کہ اے آدم! اگر میں نے محمد کو پیدا نہ کرنا ہوتا تو میں تجھے بھی پیدا نہ کرتا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام پیدا نہ ہوتے تو ہم بھی پیدا نہ ہوتے۔ تو اس سے معلوم ہوا ہے کہ ہماری پیدائش کا سبب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اب اس حدیث کے خلاف بعض لوگ ایک تو قرآن کی آیت کو پیش کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ اور حدیث پاک میں ہے: ”وَلَوْلَا مُحَمَّدٌ مَا خَلَقْتُكَ“ چونکہ حدیث آیت کے خلاف ہے لہذا حدیث قابل قبول نہیں ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے ”پیدائش کا مقصد“ اور ایک ہوتا ہے ”پیدائش کا سبب“۔ پیدائش کا مقصد ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ ہے اور پیدائش کا سبب ”وَلَوْلَا مُحَمَّدٌ مَا خَلَقْتُكَ“ ہے۔ مقصد اور ہوتا ہے اور سبب اور ہوتا ہے۔

میں ایک مثال دیتا ہوں بات سمجھانے کے لیے کہ آپ سے پوچھا جائے کہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ تو آپ کہیں گے تخصص کرنے، عقائد سیکھنے، مسائل سیکھنے، شریعت کو سیکھنے۔ تو یہ آپ کا مقصد ہے۔ اب پوچھا جائے کہ یہاں کیوں آئے؟ تو ایک متخصص کہتا ہے کہ استاد جی! میرے ساتھ ایک طالب علم پڑھتا تھا، اس نے یہاں مرکز میں دورہ تحقیق المسائل کیا تھا، اس نے مجھے دعوت دی اس لیے میں یہاں پر آیا ہوں۔ تو یہ آپ نے آنے کا سبب بتایا ہے۔ تو تخصص کا مقصد عقائد کو سیکھنا ہے اور سبب وہ طالب علم ساتھی ہے۔ تو مقصد الگ ہے اور سبب الگ ہے۔

### صحیح حدیث عمر دربارہٴ توسل آدم:

دوسرا پھر اس حدیث پر سوال آتا ہے کہ اس کو محدثین نے موضوع اور من گھڑت کہا ہے، لہذا موضوع حدیث قبول نہیں کرنی چاہیے۔ میں آپ کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ بات کرنے والے کو بات ادھوری نہیں بلکہ پوری کرنی چاہیے۔ اگر اس حدیث کو بعض محدثین موضوع کہتے ہیں تو بعض صحیح بھی تو کہتے ہیں۔ خود امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک علی الصحیحین کی کتاب التاریخ میں اس روایت کو نقل کیا ہے اور فرمایا ہے:

"هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ إِسْنَادًا."<sup>185</sup>

کہ اس حدیث کی اسناد صحیح ہے۔

علامہ تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے ”شفاء السقام“ میں لکھا ہے:

قَدْ اعْتَمَدْنَا فِي تَصْحِيحِهِ عَلَى الْحَاكِمِ.<sup>186</sup>

185۔ المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ج 3 ص 517 تحت الحدیث 4286

186۔ شفاء السقام فی زیارة خیر الانام للسبکی: ص 361



کہ ہم حاکم کی تصحیح پر اعتماد کرتے ہیں۔

علامہ تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ اس پر اعتماد فرما رہے ہیں۔ خود حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے جو ”امداد الفتاویٰ“ لکھا ہے علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

حدیثِ توسلِ آدم علیہ السلام بسیدنا النبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم صحیح سند سے ثابت ہے جو مرفوع ہے۔<sup>187</sup>

تو اس لیے یہ کہنا کہ یہ حدیث موضوع ہے درست نہیں۔ کسی حدیث کو موضوع کہنا اجتہادی چیز ہے۔ تو باقی جو اس کو صحیح فرما رہے ہیں وہ بھی اجتہادی چیز ہے۔ اس لیے فوراً رد کر دینا کہ فلاں نے اس کے بارے میں یہ کہہ دیا ہے، یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔

تو یہ حدیث قرآن کریم کی اس آیت کے خلاف نہیں ہے۔

﴿مَا أَرِيدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعَمُونَ﴾

میں ان سے رزق کا مطالبہ نہیں کرتا اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾

بے شک اللہ رزاق بھی ہے، قوت والا بھی ہے۔

**تنبیہ کفار:**

﴿فَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُنُوبًا مِّثْلَ ذُنُوبِ أَصْحَابِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُونَ﴾

اصل میں ”ذُنُوب“ کہتے ہیں بڑے ڈول کو جس کی مدد سے پانی نکالا جاتا ہے۔ عام طور پر دیہاتی علاقے جہاں یہ کنویں موجود ہوں وہاں پانی بھرنے والے جب

ڈول سے پانی بھرتے ہیں تو باری باری بھرتے ہیں۔ اس لیے ”ذُنُوب“ کا معنی باری اور حصہ بھی آتا ہے۔

فرمایا: جن لوگوں نے ظلم کیا ان کی بھی باری ایسے آئے جس طرح ان جیسا کام کرنے والوں کی باری آئی تھی۔ اس لیے یہ لوگ جلدی عذاب کا مطالبہ نہ کریں۔

﴿فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ﴾

جس دن کا ان لوگوں سے وعدہ کیا جا رہا ہے ان دن ان کافروں کے لیے تباہی یقینی ہوگی۔

اللہ ہمیں نیک عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادیں۔ (آمین)

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الطور

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَالطُّورِ ۝۱ وَكَيْتٍ مَّسْطُورٍ ۝۲ فِي رَقٍّ مَّنْشُورٍ ۝۳﴾

”طور“ اصل میں اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر سبزہ اگا ہو اور یہاں اس سے مراد ”طور سینا“ ہے۔ اللہ نے قسمیں کھائی ہیں۔ فرمایا:

”وَالطُّورِ ۝۱“ قسم ہے طور کی۔

”وَكَيْتٍ مَّسْطُورٍ ۝۲ فِي رَقٍّ مَّنْشُورٍ ۝۳“ رَقَّ کہتے ہیں اس باریک چیز کو جو کاغذ کی طرح ہو اور عموماً اس کو کاغذ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ فرمایا: اور قسم ہے کتاب کی جو کھلے ہوئے کاغذ میں لکھی ہوئی ہے۔ مراد اس سے یا تو لوح محفوظ ہے یا اعمال نامہ ہے یا قرآن کریم ہے۔

**بیت معمور کیا ہے؟**

﴿وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ ۝۴﴾

اور قسم ہے بیت معمور کی۔

کعبہ کے بالکل محاذات میں ساتویں آسمان پر ملائکہ کا قبلہ ہے، وہ اس کا وہاں طواف کرتے ہیں۔ ہر روز ستر ہزار فرشتے طواف کرتے ہیں۔ جو ایک بار آئے وہ

دوبارہ نہیں آتا۔ معراج کی رات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ابراہیم علیہ السلام اسی بیت معمور سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ صلہ کیوں دیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کعبہ شروع میں بنا پھر ختم ہو گیا، ابھی جو کعبہ کی بناء ہے اس کے بانی ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ تو اللہ نے اس کے بدلے میں بیت معمور سے تکیہ لگانے کی نعمت ان کو عطا کی ہے۔

﴿وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوعِ ۖ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ﴾

اور قسم ہے بلند چھت کی۔ مراد اس سے آسمان ہے۔ اور قسم ہے اس دریا کی جو پانی سے بھرا ہوا ہے یا معنی یہ ہے کہ قسم ہے اس دریا کی جو بھڑکتا ہے۔ یہ جو سمندر اور دریا ہیں یہ آگ بن جائے گی اور امت کو حشر تک دھکیل کر لے جائیں گے اور یہ ساری آگ پھر جہنم کا ایندھن ہوگی۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔

**اللہ کا عذاب آکر رہتا ہے:**

﴿إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۚ مَّا لَهُ مِنْ دَافِعٍ﴾

قسم کھا کر بتایا کہ اللہ کے عذاب نے آکر رہنا ہے، اس عذاب کو کوئی روک نہیں سکتا۔

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسلمان ہونے سے پہلے میں ایک مرتبہ مدینہ منورہ پہنچا تا کہ جنگ بدر کے جو قیدی تھے ان کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کروں۔ میں جب پہنچا تو اس وقت فجر کی نماز میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کی تلاوت فرما رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز اتنی بلند تھی کہ مسجد نبوی کے صحن میں بھی جا رہی تھی۔ میں نے اس

سورت کی یہ آیت سنی ﴿إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ﴾ مَائَتُہ مِّنْ دَافِعٍ ﴿۱﴾ تو میں بالکل گھبرا گیا۔ مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ میں قیدیوں کی بات کرنے کے لیے آیا تھا اور کلمہ پڑھ کر خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیدی بن گیا یعنی مسلمان ہو گیا۔

### قرآن پر عمل ہی اصل مقصد ہے:

یہاں یہ بات بہت اچھی طرح یاد رکھیں کہ قرآن کریم کی تفاسیر بیان کرتے ہوئے ہم تفسیری نکات پر بہت توجہ دیتے ہیں اور عمل پر توجہ نہیں دیتے۔ نکات پر نکات، نکات پر نکات بیان ہوں گے تو اس سے کیا ہو گا؟ اصل تو یہ ہے کہ آدمی قرآن پڑھے، قرآن پڑھائے، قرآن سمجھے اور سمجھائے اور اس کو عمل کی توفیق ملے، تفسیری نکات کو بیان کرنا کمال نہیں ہے بلکہ قرآن کریم کو پڑھ کر عمل پر آجانیہ کمال ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی بطور خاص آپ زندگیاں پڑھ لیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قرآن کریم کے نکات کتنے ملتے ہیں، بہت کم ملیں گے لیکن ان کی عملی زندگی آپ پڑھ لیں کہ وہ کیسے قرآن کریم پر عمل کرتے تھے۔

میں اس لیے گزارش کرتا ہوں کہ آپ دیکھ لیں کہ پچھلی سورت میں قیامت کا ذکر تھا، اس سورت میں بھی قیامت کا ذکر ہے، ہر سورت میں قیامت کا ذکر بار بار آ رہا ہے۔ یہ قیامت کا ذکر اس لیے نہیں کہ بندہ نکات بیان کرے بلکہ یہ اس لیے ہے کہ بندہ قیامت کا ذکر سنے اور ڈر جائے، اللہ کے خوف سے کانپ جائے، گناہوں سے توبہ کر لے، اپنی آخرت کی تیاری کر لے۔ قیامت کا ذکر اس لیے ہے۔ اللہ ہمیں آخرت کی تیاری کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### قیامت کی ہولناکی اور مجرمین کا انجام:

﴿يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا ۚ وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۚ﴾

جب آسمان کا پنا شروع ہو جائے گا اور پہاڑ چل پڑیں گے یعنی اپنی جگہ سے ٹل جائیں گے۔

﴿اَصْلَوْهَا فَاَصْبِرُوا اَوْ لَا تَصْبِرُوا سَوَاءٌ عَلَيَكُمْ اِنَّا نَجْزُوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (۱۷)

دنیا میں آدمی کو تکلیف آتی ہے تو گرگڑا پڑتا ہے تو تکلیف دینے والے کو ترس آجاتا ہے تو کبھی چھوڑ دیتا ہے لیکن آخرت کا معاملہ یوں نہیں ہے، فرمایا: اس جہنم میں داخل ہو جاؤ، اب تم برداشت کرو یا تم برداشت نہ کرو تمہارے لیے برابر ہے، اب تمہارے اعمال کا بدلہ مل کے رہے گا۔ نہ تمہارے رونے سے ہم تمہیں چھوڑیں گے اور نہ تمہارے چپ رہنے سے تمہیں چھوڑیں گے۔ اب چپ رہو یا روتے رہو، اب تم نے رہنا نہیں پر ہے۔ بتاؤ! کتنی خطرناک بات ہے؟! اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

### متقین کا انعام:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنَّتٍ وَ نَعِيْمٍ﴾ (۱۸) ﴿فَكَهَيِّنٍ بِمَا اَنْهَمُ رَبُّهُمْ ؕ وَ وَهْنُهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابِ الْجَحِيْمِ﴾ (۱۹)

اس کے مقابلے میں نیک لوگوں کا ذکر کیا ہے کہ متقین باغات میں ہوں گے، اللہ کی نعمتوں میں ہوں گے، خوش ہوں گے ان انعامات میں جو خدا نے انہیں دیے ہوں گے۔ ان کا رب ان کو جہنم کے عذاب سے بچالے گا۔

﴿كُلُوْا وَ اَشْرَبُوْا هٰنِئِثًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (۲۰)

حکم ہو گا کہ مزے سے اب کھاؤ اور پیو، یہ تمہارے اعمال کے بدلے میں تمہیں دیا جا رہا ہے۔

﴿مُتَكِيْبِيْنَ عَلٰی سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ؕ وَ زَوْجُهُمْ يَحُوْرُ عِيْنٍ﴾ (۲۱)

جنتی لوگ نشستوں پر ٹیک لگا کر بیٹھے ہوں گے اور یہ نشستیں ترتیب سے بچھی ہوں گی۔ بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں سے ہم ان کا نکاح فرمائیں گے۔ دعا کریں اللہ ہم سب کو عطا فرمائے۔ (آمین)۔

یہ جو ﴿ذَوَّجْنَهُمْ﴾ ہے اس کے بارے میں مفسرین کی دونوں رائے ہیں؛ بعض کہتے ہیں کہ اہل جنت کا جنت میں حوروں سے نکاح ہو گا اور یہ نکاح ہونا محض ان کا اعزاز ہو گا، اعزاز کے طور پر یہ اس کی بیوی ہو گی۔

اور بعض کہتے ہیں کہ نکاح نہیں ہو گا بغیر نکاح کے اللہ ان کو دیں گے لیکن ﴿ذَوَّجْنَهُمْ﴾ سے مراد ہے جوڑا، یعنی ہم حور دے کر اس کا جوڑا بنادیں گے۔  
دونوں تفسیریں ٹھیک ہیں۔

### والدین کی وجہ سے اولاد کے مقام کی بلندی:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلْتَنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ﴾

والدین جنت میں ہوں گے اور اولاد ان کی ایمان والی ہو گی لیکن اولاد کے اعمال میں کوتاہی ہو گی۔ تو جنت میں والدین کہیں گے کہ اللہ! ہماری اولاد تو نچلے درجے میں ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد کو بھی ہمارے والا رتبہ ملے! ان کے اعمال تو والدین کے اعمال کی طرح نہیں تھے لیکن ان کی خواہش کو دیکھ کر اللہ ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کو بھی وہی مرتبہ عطا فرمائیں گے لیکن ایمان شرط ہے۔

اسی طرح حدیث پاک میں ہے کہ بسا اوقات اولاد اوپر والے مقامات پر ہو گی اور اولاد کہے گی کہ یا اللہ! میرے ابو جان! میری امی جان! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ

ان میں ایمان تو تھا لیکن تمہاری طرح اعمال نہیں تھے، لیکن اولاد کی خوشی کے لیے اللہ ان کے والدین کو وہاں پہنچا دیں گے۔

### توسل بالذات کی دلیل:

اب یہاں ایک بات سمجھیں؛ یہ جو ہے ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ وہ لوگ جو مؤمن ہیں تو اس سے مراد ذات ہے، کیونکہ ”الَّذِينَ“ ذات ہوتی ہے، آگے ﴿وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ﴾ اور ان کی اولاد نے ان کی اتباع کی ہے ایمان میں یعنی اولاد بھی مؤمن تھے، آگے ﴿أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ ہم ان والدین کے ساتھ ان کی اولاد کو بھی ملا دیں گے، ﴿وَمَا أَلْتَنَّهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ﴾ اور والدین کے عمل میں کوئی کمی نہیں کریں گے یعنی یہ نہیں کہ ان کو نیچے لے آئیں بلکہ ان کو اسی مقام پر رکھیں گے جس پر وہ تھے اور اولاد کو بھی ان کے مقام پر لے جائیں گے۔

اب دیکھیں! یہ جو اولاد نیک اعمال میں والدین سے کم ہے تو والدین کے ساتھ پہنچ جائیں گے والدین کی وجہ سے، والدین کی برکت سے، والدین کے توسل سے تو یہ ذات کا توسل نہیں ہے تو اور کیا ہے؟! یہ جو اولاد کے اعمال کم ہیں اور اپنے والدین کے پاس پہنچ جائیں گے تو یہ کس وجہ سے پہنچیں گے؟ اپنے اعمال کی وجہ سے یا والدین کی ذات کی وجہ سے؟ (والدین کی ذات کی وجہ سے۔ سامعین) اسی کو تو ذات کا وسیلہ کہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں ذات کا وسیلہ نہیں ہے۔

اب اگر کوئی بندہ کہے کہ یہ ذات نہیں بلکہ والدین کے نیک اعمال تھے تو ان اعمال کی وجہ سے اولاد ان کے مقام پر پہنچی ہے۔ ہم کہتے ہیں: بھائی! ہم جو توسل کرتے ہیں اسی کا کرتے ہیں جو نیک ہو، اس کا تو نہیں کرتے جو بد ہو، بحث تو ذات کی ہے لیکن کون سی ذات؟ نیک ذات! نیک ذات کی وجہ سے ہم توسل کرتے ہیں، بد ذات کی وجہ



سے تھوڑی کرتے ہیں! میں اس لیے کہتا ہوں کہ یہ آیت توسل بالذوات پر مستقل دلیل ہے۔ اس کو نوٹ فرمائیں۔

پھر میں ساتھ ساتھ اس غلجان کو بھی دور کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص کہے کہ توسل بالذات پر یہ آپ نے دلیل دی ہے، آپ سے پہلے بھی کسی نے یہ دلیل دی ہے؟ میں کہا کرتا ہوں کہ بھائی! اگر کسی نے نہ دی ہو اور دلیل موجود ہو تو اس میں حرج کی بات کیا ہے؟ ایک مسئلہ پر ہم سے پہلے والے حضرات پانچ دلائل پیش کریں اور ہم چھ پیش کر دیں تو ہم نے کوئی مسئلہ تبدیل کیا ہے کیا؟ وہی مسئلہ ہے البتہ دلیل کا اضافہ کیا ہے تو اس میں حرج کیا ہے؟

### پھل اور گوشت جنت کی خوراک:

﴿وَأَمَدَدْنَاهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَحَمِیمٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ﴾

ہم انہیں پھل بھی دیں گے اور گوشت بھی دیں گے، جو بھی ان کا دل چاہے ا ہم انہیں عطا کریں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پھل اور گوشت جنت کی خوراک ہے۔ میں ایک جگہ دسترخوان پر تھا تو تین چار نوجوان لڑکے ساتھ تھے اور ایک بزرگ بھی تھے۔ اب وہ لڑکے ایسے تھے جو پھل نہیں کھا رہے تھے۔ بزرگ پھل شوق سے کھا رہے تھے۔ اب عام طور پر ہمارے آج کے جو بچے ہیں یہ پھل شوق سے نہیں کھاتے، چس کھائیں گے، سلائی کھائیں گے، برگر کھائیں گے، سمو سے کھائیں گے، پیزے کھائیں گے، شوارمے کھائیں گے لیکن پھل کی طرف ان کی رغبت نہیں ہے، ان کا یہ مزاج بن گیا ہے۔ تو وہ بزرگ ان لڑکوں سے کہنے لگے کہ بیٹا! تم پھل نہیں کھاتے تو جنت میں کیا کرو گے؟ اب یہ بزرگ ان کو دلیل دے رہے تھے کہ جنت میں بھی پھل ہوں گے، لہذا پھل کھانے چاہئیں تاکہ پھل کھانے کا مزاج بنے۔

یہ بات یاد رکھنا کہ جنت میں جانے پر اہل جنت کا مزاج خود بخود جنت والا ہو جائے گا۔

ملائیشیا میں دیکھ لیں۔ طلبہ صبح بھی چاول کھاتے ہیں، دوپہر میں بھی چاول کھاتے ہیں اور رات میں بھی چاول کھاتے ہیں اور چاول بھی سفید رنگ کے جو پھیکے ہوتے ہیں اور ساتھ اس کے عموماً مچھلی ہوتی ہے۔ آپ لوگ نہیں کھا سکتے لیکن وہ کھاتے ہیں۔ تو اس دفعہ جو میرا ملائیشاء کا سفر تھا۔ تو وہاں یہ بات چل پڑی کہ بھائی ہمارے ہاں کھانا یہ ہوتا ہے اور ملائیشاء میں کھانا یہ ہوتا ہے۔ وہاں ہمارے شاگرد ہیں مولانا طاہر صاحب، یہاں مرکز میں انہوں نے تخصص کیا ہے وہاں میرے میزبان وہی ہوتے ہیں؛ انہوں نے مجھے کہا کہ استاد جی! اصل بات یہ ہے کہ جیسی زمین ہوتی ہے، جیسا موسم ہوتا ہے وہاں کے لوگوں کا اللہ تعالیٰ اسی طرح کا پیٹ بناتے ہیں، اس لیے پاکستان کا جیسا موسم ہے وہاں اسی طرح کی خوراک ہوتی ہے اور ہمارا جیسا موسم ہے اسی طرح کا ہمارا پیٹ ہے اور ایسی ہی ہماری خوراک ہے۔

تو وہاں کی جو خوراک ہے اگر وہی خوراک یہاں پنجاب پاکستان والے کھائیں تو ان کے پیٹ برداشت نہیں کریں گے۔ ادھر کا موسم ہی ایسا ہے تو موسم کے مطابق اللہ خوراک دیتے ہیں۔ جب آدمی جنت میں جائے گا تو اللہ پاک اس کا مزاج بھی یوں بنا دے گا۔ اللہ ہم سب کو عطا فرمادیں۔ (آمین)

**جنت میں دوستانہ چھینا چھٹی:**

﴿يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَا نَغْوُ فِيهَا وَلَا تَأْتِيهِمْ ۖ﴾

اہل جنت جنت میں شراب پر ایک دوسرے سے چھینا چھٹی بھی کریں گے، یہ محبت کی باتیں ہوتی ہیں کہ ایک دوسرے سے جام کھینچیں گے۔ لیکن وہاں نہ تو یہودگی ہوگی اور نہ ہی کوئی گناہ ہوگا۔ یعنی ایک ہوتا ہے کہ آدمی فضول بک بک کرے

وہاں یہ نہیں ہو گا اور سچ مچ گناہ کی باتیں کرے وہاں یہ بھی نہیں ہو گا۔

﴿وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غُلَمَانٌ لَهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ﴾ ﴿٢٦﴾

اللہ رب العزت جنت میں حوریں بھی عطا فرمائیں گے اور جنت میں خدمت کے لیے بچے بھی عطا فرمائیں گے اور وہ بچے ایسے ہوں گے جیسے چھپے ہوئے موتی ہوتے ہیں یا تو اپنی اولاد ہو گی یا جنتی ہو گی جیسے حوریں ہوں گی اللہ ایسے ہی وہاں کی ایک مخلوق پیدا فرمادیں گے۔

﴿وَاقْبَلْ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ﴾ ﴿٢٧﴾ قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْ

أَهْلِيْنَا مُشْفِقِينَ ﴿٢٨﴾ فَنَزَّلَ اللَّهُ عَلَيْنَا وَقَسَمْنَا عَذَابَ السَّعِيرِ ﴿٢٩﴾

وہاں جنتی ایک دوسرے سے باتیں کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ جب ہم دنیا میں تھے تو بہت ڈر لگتا تھا کہ پتا نہیں ہمارے ساتھ کیا ہو گا؟! اللہ نے ہم پر کتنا احسان کیا ہے اور ہمیں مجلسانے والی آگ سے بچا لیا ہے۔ اب سمجھ آ گئی ہے۔

﴿فَذَكِّرْ مَا أَنْتَ بِنِعْمَتٍ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ﴾ ﴿٣٠﴾

میرے پیغمبر! آپ ان کو نصیحت کریں، اللہ کا کرم ہے کہ آپ کا ہن بھی نہیں ہیں اور مجنون بھی نہیں ہیں۔

کاہن ایسے ہوتے ہیں جس طرح ہمارے ہاں نجومی ہوتے ہیں جوتاروں کو دیکھ کر بتاتے ہیں، آپ اللہ کے فضل و کرم سے ایسے نہیں ہیں۔

**شعر کا معنی؛ لغوی اور اصطلاحی**

﴿أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمُنُونِ﴾ ﴿٣١﴾

یہ کہتے ہیں کہ شاعر ہیں اور ہم ان پر موت کے حادثے کا انتظار کر رہے ہیں کہ یہ کب ختم ہوتے ہیں۔

یہ بات میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ایک ہوتا ہے شعر لغوی اور ایک ہوتا ہے شعر اصطلاحی اور عرفی۔ لغت عرب میں شعر کا معنی یہ نہیں ہے کہ مقفیٰ اور مسجع کلام ہو۔ شعر کا معنی مقفیٰ اور مسجع کلام کرنا یہ عرفی معنی ہے، یہ لغوی نہیں ہے۔ یہ جو لوگ کہتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شاعر ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو شعر نہیں پڑھتے تھے تو پھر وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کیسے کہتے تھے؟ پھر شاعر ہونے کا الزام کیسے لگاتے تھے؟

اصل بات یہ ہے کہ شعر کا معنی ہوتا ہے خیالی باتیں کرنا، جس کا خارج میں وجود نہ ہو، جس طرح منطق میں فرضی قضایا کو کہتے ہیں کہ یہ دلائل شعر یہ ہیں۔ تو شعر کہتے ہیں خیالی بات کو جس کا خارج میں وجود نہ ہو۔ تو وہ لوگ یہ کہتے تھے کہ یہ فرضی باتیں کرتے ہیں کہ مر جائیں گے، پھر اٹھیں گے، پھر حساب کتاب ہوگا، پھر جنت ہوگی یا جہنم ہوگی... یہ سب خیالی باتیں ہیں، یہ شاعر ہیں۔ تو وہ لوگ حضور علیہ السلام کو شاعر لغوی معنی کے اعتبار سے کہتے تھے ورنہ جو عرفی شعر ہوتا ہے وہ تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے بھی نہیں تھے، اس کا انہوں نے کیا الزام لگانا ہے؟ اس کے بارے میں تو قرآن نے صاف فرما دیا ہے: ﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ﴾<sup>188</sup> کہ ہم نے حضور علیہ السلام کو شعر کی تعلیم نہیں دی مطلب کہ ہم نے آپ کو عرفی شعر کا فن نہیں دیا اور یہ آپ کی شان کے مناسب بھی نہیں ہے۔

﴿قُلْ تَرَبُّصُوا فَإِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ﴾<sup>(ن)</sup>

آپ فرمائیں کہ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ دیکھیں گے کہ انجام کس کا کیا ہوتا ہے؟

## ”قرآن گھڑا ہوا کلام ہے“ کا تحقیقی اور الزامی جواب

﴿أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُمْ بِهَذَا أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ﴾ (۳۱)

تَقْوَاهُ ۚ بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۲﴾ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ ﴿۳۳﴾

یہ اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھتے ہیں تو اللہ نے فرمایا: کیا ان کی عقلمندی ان کو یہی بات کہتی ہے کہ یہ لوگ ایسا کام کریں؟ یا یہ لوگ سچ مچ ہیں ہی سرکش کہ بلا وجہ ایسی باتیں جکتے ہیں۔ یا یہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ کلام خود گھڑ لیا ہے؟! بلکہ یہ لوگ تصدیق نہیں کرتے۔ اگر یہ لوگ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں تو اس قرآن جیسا کوئی کلام تو بنا کر لائیں!

اللہ نے ان کی بات کے دو جواب دیے ہیں؛ ایک جواب تحقیقی ہے اور دوسرا جواب الزامی ہے۔ تحقیقی اور الزامی جواب دینا یہ قرآن کریم کا طرز ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں لکھا ہے کہ یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کو خود گھڑ لیا ہے تو اس کا تحقیقی جواب تو یہ ہے کہ ایسی بات نہیں بلکہ یہ لوگ یہ بات صرف اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ”لَا يُؤْمِنُونَ“ کہ یہ لوگ عناد کی وجہ سے قرآن کی تصدیق نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ آدمی جس چیز کی تصدیق نہ کرتا ہوں وہ چیز ہزار حق اور صحیح ہو لیکن عنادی بندہ ہمیشہ اس کی نفی ہی کرے گا۔ تو تحقیقی جواب تو یہ ہے۔

اور الزامی جواب یہ ہے کہ اچھا! اگر آپ کہتے ہیں کہ یہ قرآن انہوں نے خود گھڑ لیا ہے تو ﴿فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ﴾ اسی طرح کا کلام تم بھی بنا کر لے آؤ! تم نہیں بنا سکتے تو اس پر کیوں الزام لگاتے ہو کہ اس نے بنا لیا ہے۔

﴿أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ﴾ (۳۴) أَمْ خَلَقُوا

السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ ۚ بَلَّ لَا يُؤْقِنُونَ ﴿٣١﴾

کیا یہ لوگ خود بخود پیدا ہو گئے؟ یا انہوں نے اپنے آپ کو خود پیدا کر لیا ہے؟ یا آسمان اور زمین کو انہوں نے پیدا کیا ہے؟ اور کچھ بھی نہیں ہے اصل بات یہی ہے کہ بس یہ لوگ اللہ کو مانتے نہیں ہیں۔

**نبوت وہی ہے:**

﴿أَمَ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمُصَيِّطُونَ﴾ ﴿٣٢﴾

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ طائف والے کہتے تھے کہ اللہ نے نبی بنانا تھا تو ہم میں سے کسی عزت والے بڑے آدمی کو بناتے! یہ کیسے نبی بن گیا؟ اللہ فرماتے ہیں کہ کیا اللہ کی رحمت کے خزانے ان کے پاس ہیں کہ جس کو چاہیں نبی بنائیں اور جس کو چاہیں نبی نہ بنائیں؟! یا یہ لوگ حاکم بنے ہوئے ہیں کہ ان کے قبضہ میں تو خزانے نہ ہوں لیکن جس کے قبضہ میں خزانے ہیں ان سے کہہ کر یہ لوگ کسی کو نبوت دلواتے ہوں۔ تو اللہ نے دونوں احتمالات کی نفی فرمادی۔

﴿أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ ۚ فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ

مُبِينٍ﴾ ﴿٣٣﴾

کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے کہ اوپر چڑھتے ہیں اور جا کر آسمان کی خبریں سن لیتے ہیں؟ اگر کوئی ایسی سیڑھی ہے تو ان میں سے کوئی جائے اور اوپر کی باتیں سن کر آئے اور کوئی واضح دلیل لے کر آئے!

**اپنے لیے بیٹے اور خدا کے لیے بیٹیاں!**

﴿أَمْ لَهُ الْبَنَاتُ وَلَكُمْ الْبَنُونَ﴾ ﴿٣٤﴾

اور یہ لوگ بھی کتنے عجیب ہیں! کہتے ہیں کہ ہمیں تو بیٹے پسند ہیں اور اللہ کے

لیے فرشتے بیٹیاں ہیں۔ جو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ تم اللہ کے لیے کیوں پسند کرتے ہو؟

اور عجیب بات یہ ہے کہ جب اللہ رب العزت نے یہ بات فرمائی ہے ان کے بارے میں کہ یہ لوگ اپنے لیے بیٹیاں پسند نہیں کرتے اور اللہ کے لیے بیٹیاں پسند کرتے ہیں تو وہاں پر بیٹیوں کی صفت بیان کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے کتنی عجیب بات فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَيَعْلَمُونَ إِلَهُهُ الْبَنَاتِ سُبْحَنَهُ ۚ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُونَ﴾ ﴿٥٦﴾ ان لوگوں نے خدا کے لیے بیٹیاں بنا رکھی ہیں، سبحان اللہ! اور اپنے لیے بیٹے جو ان کو پسند ہیں! ﴿وَإِذَا بَشَّرَ أَحَدَهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ﴾ ﴿٥٧﴾ اور جب ان سے کہا جائے کہ تمہارے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے تو ان کے چہرے سیاہ ہو جاتے ہیں اور وہ گھٹ گھٹ کر مرنے لگتے ہیں، ﴿يَتَوَادَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَبِهِ﴾ ﴿٥٨﴾ (سورۃ النحل) اور یہ آدمی جس کو بیٹی کی خوشخبری دی گئی وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اسے بری خبر ملی ہے۔

آگے ایک بات اور فرمائی وہ اس سے بھی عجیب ہے۔ بیٹیوں کی جو صفیں بیان فرمائی ہیں ان میں یہ ہے کہ ﴿أَوْ مَنْ يُنشِؤُا فِي الْحُلِيِّةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ﴾ ﴿٥٩﴾ یہ عورتوں کی صفت ہے کہ وہ بات کھل کر سمجھا نہیں سکتیں اور زیوروں میں پیدا ہوتی ہیں، اس کا معنی کہ زیور عورت کی فطرت میں شامل ہے۔

تو جس چیز کو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ خدا کے لیے کیسے تجویز کر لیتے ہو؟! کیسی تمہاری تقسیم ہے!

## اجرت علی تعلیم الدین جائز ہے... دلیل:

﴿أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّعْرَمٍ مُّثْقَلُونَ﴾

اے پیغمبر! آپ ان سے پیسے تو نہیں مانگتے کہ آپ ان پر بوجھ ہو! بعض لوگ ایسی آیات پیش کرتے ہیں کہ اجرت علی تعلیم الدین درست نہیں ہے کیونکہ اللہ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا کہ تم ان سے پیسے تھوڑی لیتے ہو! اس پر تفصیل سے بات ہو چکی ہے۔ خلاصہ ہر جگہ پر میں عرض کرتا ہوں کہ ایک ہوتا ہے مخالف اور ایک ہوتا ہے موافق۔ یہ کفار؛ نبوت کے مخالف تھے اور مخالف کو دین سمجھائیں تو پیسے نہیں لیتے، ﴿أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا﴾ کا تعلق مخالف سے ہے اور موافق کو دین بیان کریں اور اس سے پیسے لے لیں تو یہ اس آیت کے خلاف نہیں ہے۔ مخالف اور ہوتا ہے اور موافق اور ہوتا ہے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی لیتے تھے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ہدایا دیتے تھے۔ اور اس پر میں جو ایک دلیل پیش کرتا ہوں آپ اس کو سمجھیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تجارت شروع کی، پچیس سال میں آپ کا نکاح ہوا، جب چالیس سال کی عمر ہو گئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت چھوڑ دی۔ اب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بیوی ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شوہر ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا خرچہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا برداشت کرتی ہیں اعلانِ نبوت کے بعد۔ حالانکہ خرچ برداشت کرنا تو شوہر کے ذمے ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَ



شوہر کی بیوی پر فضیلت کی ایک وجہ یہ ہے کہ نفقہ شوہر کے ذمے ہے۔ تو قرآن سے ثابت ہے اور اعلانِ نبوت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خرچہ آپ کی بیوی برداشت کر رہی ہے۔ اب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر مال خرچ کرتی ہیں تو وہ بیوی ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ حضور کی امتی ہونے کی حیثیت سے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بیوی بھی ہیں اور امتی بھی ہیں۔ جب تک بیوی تھیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خرچ کرتے تھے اور جب نسبت بدل گئی کہ بیوی بھی ہیں اور امتی بھی ہیں تو اب خرچ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا فرما رہی ہیں۔ اب دیکھو! یہ جو مال خرچ ہو رہا تھا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امتی ہونے کی حیثیت سے خرچ ہو رہا تھا کہ حضور! آپ دین کا کام کریں، جو میرا مال ہے وہ آپ کے لیے حاضر ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو تجارت نہیں فرما رہے تو حضور پر خرچ آپ کے صحابہ فرما رہے ہیں، آپ کی صحابیات فرما رہی ہیں۔ اس لیے جب بھی کوئی عالم؛ دین کا کام کرے گا اور ساتھ تجارت بھی شروع کر دے تو دین کا کام نہیں کر سکے گا اور جب خود کو دین کے کام کے لیے فارغ کرے گا تو خرچ اس پر کون کریں گے؟ اس کے معتقدین، اس کے متبعین، اس کے موافقین، اس کے تلامذہ، اس کے مریدین، اس کے مقتدی۔

تو یہ لوگ دلیل کیا پیش کر رہے ہیں کہ پیغمبر کافروں سے مال نہیں لیتے تھے۔ کافروں سے تو ہم بھی نہیں لیتے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ جو دین کے منکر ہیں کیا

کبھی ہم نے ان سے مانگا ہے جو تم ہمارے خلاف یہ آیتیں پیش کر رہے ہو! جب ہم ان سے مانگیں تو پھر تم ہمارے خلاف یہ آیتیں پیش کرنا۔ اللہ رب العزت سمجھ عطا فرمائے۔ (آمین)

### غیب کی تعریف:

﴿أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ﴾<sup>۱۹۱</sup>

یا ان کے پاس غیب کا علم ہے کہ جس کو یہ لکھ لیتے ہیں، پھر محفوظ کرتے ہیں، پھر باتیں کرتے ہیں۔ کوئی غیب ان کے پاس موجود نہیں اس لیے ایسی باتیں مت کریں۔

مطلق غیب کہتے ہیں: ”إِنَّ الْغَيْبَ الْمَطْلَقَ فِي الْإِطْلَاقَاتِ الشَّرْعِيَّةِ مَا لَمْ يَقُمْ عَلَيْهِ دَلِيلٌ وَلَا إِلَى ذِكْرِهِ وَسِيلَةٌ وَسَبِيلٌ“<sup>191</sup>  
یہ تعریف المہند علی المفند میں ہے۔ یعنی اصطلاح شریعت میں مطلق غیب وہی ہوتا ہے جس پہ کوئی دلیل نہ ہو اور وہ بغیر کسی واسطہ و وسیلہ کے حاصل ہو۔

### سرکشوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں!

﴿أَمْ يَرِيدُونَ كَيْدًا ۖ فَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمْ الْمَكِيدُونَ﴾<sup>۱۹۲</sup>

کیا یہ تمہارے خلاف تدبیریں اختیار کرتے ہیں؟ جو لوگ کافر ہیں اور تدبیریں کر رہے ہیں تو یہ اپنے جال میں خود آئیں گے۔

﴿فَذَرِهِمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ﴾<sup>۱۹۳</sup>

اے پیغمبر! آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں حتیٰ کہ وہ دن آجائے کہ

جس دن لوگ بے ہوشی کے عالم میں پڑے ہوں گے۔

﴿يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ﴾

وہ دن ایسا ہو گا کہ جس دن کوئی تدبیر ان کے کام نہ آئے گی اور ان کی مدد بھی کوئی نہیں کرے گا۔

﴿وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَلِكَ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾

ان کے لیے ایک عذاب تو قیامت کے دن ہو گا، ایک عذاب اس سے بھی پہلے ہے لیکن اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے۔

**مصیبتوں پر صبر کیجیے!**

﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ﴾

اب اپنے پیغمبر سے فرمایا کہ آپ صبر کریں، آپ ہماری حفاظت میں ہیں، یہ آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ اور یہ جو آپ کو پریشانی ہے کہ یہ لوگ بات نہیں مانتے تو آپ خود کو مشغول کر لیں اللہ کی تسبیح میں ”حِينَ تَقُومُ“ جب آپ مجلس سے اٹھیں یا جب آپ سو کر اٹھیں تو آپ اس کا خیال کیا کریں۔ اور رات کو بھی تسبیح کیا کریں اور جب ستارے نکل آئیں تب بھی آپ اللہ کی تسبیح کیا کریں۔

**مجلس سے اٹھنے کی دعا:**

اس آیت کے تحت بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جب بھی کوئی مجلس ہو، مجلس کے برخاست ہونے پر آدمی یہ دعا پڑھ لے:

سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ

[یا اللہ! تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے، میں تیری تعریف کرتا ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور تیرے حضور توبہ کرتا ہوں] تو اس مجلس میں ہونے والے تمام گناہوں کو اللہ پاک اپنے فضل سے معاف فرما دیتے ہیں۔ اللہ ہمیں نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرما دے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

## سورة النجم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۝ وَمَا يَنْطِقُ

عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنَّ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝﴾

**سورت کی خصوصیت اور شان نزول:**

سورة النجم پہلی وہ سورت ہے جس میں آیت سجدہ نازل ہوئی۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: عجیب بات یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں جب سورت نجم نازل ہوئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھرے بازار میں جہاں مؤمن اور کافر سب جمع تھے اس سورت کی تلاوت فرمائی اور آیت سجدہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں چلے گئے۔ صحابہ کرام بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں سجدے میں چلے گئے اور جو تمام کفار تھے ان پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سجدے میں گر گئے۔ ایک کافر ایسا تھا جو سجدے میں نہیں گیا، اس نے مٹی زمین سے اٹھالی اور اپنے ماتھے پر لگائی اور کہا کہ میرا سجدہ یہی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس شخص کو حالت کفر پر قتل ہوتے ہوئے میں نے خود دیکھا ہے۔ اس نے کبر اختیار کیا تو اس کا نتیجہ یہی ہوا کہ وہ کفر ہی پہ مرا ہے۔

## حضور علیہ السلام کا جبرائیل امین کو دوبار دیکھنا:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرائیل امین کا دو مرتبہ دیدار ہوا ہے۔ ایک مرتبہ معراج سے پہلے اور ایک مرتبہ معراج کے موقع پر۔ معراج سے پہلے دیدار اس زمانے میں ہوا جو فترت وحی کا زمانہ تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی کے بعد چھ ماہ یا تین سال تک جو وحی نہیں آئی تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل امین کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا کہ جبرائیل امین مشرق کی جانب جہاں سورج طلوع ہوتا ہے، وہاں پہ کھڑے ہیں اور آپ کے جسم پر چھ سو پر ہیں اور پورے مشرق اور مغرب کو ایسے ڈھانپ رکھا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے ہوش ہو گئے جبرائیل امین کو دیکھ کر۔

اور دوسری مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے موقع پر دیکھا ہے سدرۃ المنتہی کے پاس۔ یہ سدرۃ المنتہی ایک بیری کا درخت ہے اور یہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے۔ بیری کو عربی میں ”سدرۃ“ کہتے ہیں اور ”منتہی“ کا معنی ہوتا ہے ”انتہائی جگہ“۔ نیچے سے جو نیک اعمال جاتے ہیں وہ سدرۃ پر پہنچتے ہیں اور وہاں سے ملائکہ اوپر لے جاتے ہیں اور اوپر سے جو احکام آتے ہیں وہ ملائکہ سدرۃ تک چھوڑتے ہیں پھر اگلے فرشتے وہاں سے ان احکامات کو نیچے لاتے ہیں۔ تو یہ درمیان میں ایک جگہ ہے جیسے جنگشن ہوتا ہے، یہ اللہ نے جگہ بنائی ہے اور اسی کے پاس پھر جنت ہے۔ تو جنت سات آسمانوں کے اوپر ہے، اوپر پھر اللہ کی عرش کی چھت ہے، اس کے نیچے جنت ہے۔ تو یوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل امین کو دوبار دیکھا ہے۔

اگلی جو آیات آرہی ہے ان آیات میں یہی مراد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ حضرت جبرائیل کو دیکھا ہے۔ البتہ بعض مفسرین اور صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم کی رائے یہ بھی ہے کہ ان آیات میں جو دوسری بار دیکھنا مراد ہے وہ اللہ رب العزت کی ذات کا دیدار ہے۔ دونوں رائے ہیں۔ دونوں طرح کے اقوال ملتے ہیں۔

### حضور علیہ السلام کو تسلی:

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۖ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۚ﴾

قسم ہے ستارے کی جب وہ اوپر سے نیچے آئے، تمہارے ساتھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہی راستہ بھولے ہیں اور نہ ہی غلط راستے پر چلے ہیں۔ ”صَاحِبُكُمْ“ کہہ کر یہ تسلی دی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے ایک بشر ہیں، کوئی الگ نہیں ہیں تو اس سے بندے کو اُنس پیدا ہوتا ہے۔

### ضلال اور غویٰ میں فرق ہے:

ضلال... کہتے ہیں کہ کوئی شخص راستہ بھول جائے اور اسے راستہ نہ ملے اور غویٰ... کہ کوئی شخص غلط راستے پر چل پڑے۔ تو فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو ضلال ہیں اور نہ ہی غویٰ ہیں یعنی نہ ایسا ہے کہ آپ کو راستہ نظر نہیں آتا اور نہ ایسا ہے کہ آپ غلط راستے پر چل پڑے ہیں۔

### حضور علیہ السلام اپنی طرف سے کوئی بات نہیں فرمائے!

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۚ﴾

اور آپ اپنی خواہش سے بات نہیں فرماتے ہیں بلکہ آپ کی بات وحی ہوتی ہے جو آپ کو بھیجی جاتی ہے۔ اور وحی بھی کون لاتا ہے؟ فرمایا:

﴿عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۖ ذُو مِرَّةٍ ۖ فَاسْتَوَىٰ ۖ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ۚ﴾

وحی لانے والا طاقتور ہے، ﴿ذُو مِرَّةٍ﴾ جو فطر تا طاقت ور ہے کسی کی وجہ سے

طاقت ور نہیں بنا۔ مراد حضرت جبرائیل امین ہیں۔ ”فَاسْتَوَىٰ“ وہ جبرائیل امین اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے اور وہ افق کے اوپر والے کنارے کی طرف تھے تاکہ نظر آئیں۔

### جبرائیل اور حضور کا قرب:

﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ ۖ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ ۖ أَوْ أَدْنَىٰ ۚ﴾

پھر حضرت جبرائیل امین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہو گئے، ﴿فَتَدَلَّىٰ﴾ پھر مزید قریب ہوئے اور کتنا قریب ہوئے فرمایا ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ﴾ قوسان کے فاصلے کے برابر، ﴿أَوْ أَدْنَىٰ﴾ بلکہ اس سے بھی قریب ہوئے۔

اصل میں ایسے تھا کہ اگر عربوں کے دو قبیلوں میں مخالفت ہوتی، پھر وہ دونوں مخالفت ختم کر کے آپس میں صلح کر لیتے تو اس کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ہاتھ پر ہاتھ مارتے تھے اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ہاتھ پہ ہاتھ نہیں مارتے بلکہ وہ دونوں کمان لیتے اور کمان کا ایک پچھلا حصہ ہوتا ہے اور ایک اگلا حصہ ہوتا ہے جہاں دھاگہ لگا ہوتا ہے اور دوسری کمان کی مڑی ہوئی لکڑی کی جگہ ہوتی ہے، تو وہ لوگ لکڑی کی جگہ اپنی طرف رکھتے اور دھاگے کی جگہ دوسری طرف رکھتے اور دھاگے سے دھاگا ملاتے۔

”قاب“ کسے کہتے ہیں، ذرا اسے سمجھیں! مثلاً یہ کمان بنی ہوئی ہے، ایک طرف یہ لکڑی ہے اور دوسری طرف یہ دھاگہ ہے۔ اس لکڑی اور اس کے بالمقابل جو دھاگہ ہے اس کے درمیانی فاصلہ کو قاب کہتے ہیں۔ یہ فاصلہ تقریباً ایک ہاتھ کے برابر ہوتا ہے۔ تو جب عرب لوگ دوستی کرتے تو کمانوں کو یوں پکڑتے اور لکڑی والا حصہ اپنی طرف رکھتے اور رسی والا حصہ دوسرے کی طرف کرتے۔ یوں یہ رسیاں آپس میں مل جاتیں اور ان دونوں آدمیوں کے درمیان فاصلہ دو قاب کا ہوتا تھا۔



تو اب مطلب یہ ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اتنے قریب ہو گئے جتنا دو قاب کا فاصلہ ہوتا ہے تقریباً ایک ذراع کے برابر، ”أَوْ أَدْنَى“ بلکہ اس سے بھی قریب ہو گئے۔ دونوں کمائیں تو آپس میں ملیں گی لیکن دونوں کے درمیان پھر بھی فاصلہ رہے گا لیکن جبرائیل امین جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوئے یہ فاصلہ بھی ختم ہو گیا اور قریب ہو گئے۔

یہ بتانا مقصود ہے کہ جب دوشمنوں کی صلح ہوتی ہے، ان کا جب قرب ہو تو قرب جسمانی ہوتا ہے اور جبرائیل امین کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو قرب ہوا ہے یہ صرف قرب جسمانی نہیں ہے بلکہ یہ قرب روحانی بھی ہے، ان کے نظریات بھی ایک ہیں۔ دو لڑنے والے صلح کرتے ہیں، کبھی نظریہ ایک نہیں ہوتا، بس عارضی طور پر ایک دوسرے کے قریب ہو کر جنگ ختم کرتے ہیں اور جبرائیل امین اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم جو آپس میں قریب ہیں وہ نظریاتی طور پر بھی قریب ہیں اور جسمانی طور پر بھی قریب ہے۔

### دوسری روایت سے کون مراد ہے؟

﴿فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ﴾

اور اللہ رب العزت نے اپنے بندے کی طرف جو وحی فرمانا چاہی وہی وحی فرمائی ہے۔

اب جو حضرات فرماتے ہیں کہ ”ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى“ سے مراد اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ وہ دونوں آپس میں قریب ہوئے ہیں تو اس میں تاویل کرنی پڑتی ہے کہ قریب ہونا اور مزید قریب ہونا ذات کے اعتبار سے یہ تو اس میں ہوتا ہے کہ جس کا جسم ہوا اور وہ جبرائیل امین ہیں۔ اللہ تو جسم سے پاک ہے۔ اب ان کے قرب

سے مراد قربِ تجلی لیں گے تو تاویل کرنی پڑے گی۔ بلا تاویل اگر قرب مراد لیں گے تو وہ جبرائیل امین کا ہو گا اور اگر اللہ کا قرب مراد لیں گے تو وہ تاویل کے ساتھ ہو گا۔ تو جو بلا تاویل ہو اور صاف صاف بلا تکلف نظر آتا ہے وہ قرب حضرت جبرائیل امین کا ہے۔

تو جو حضرات کہتے ہیں کہ اللہ کا قرب ہے تو ان کی دلیل ﴿فَاَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ﴾ ہے کہ یہ جملہ درمیان میں آ رہا ہے کہ پھر اس نے وحی بھی کی، تو وحی تو اللہ کرتے ہیں اس لیے قرب سے مراد اللہ کا قرب ہے۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ سمجھنا یہ مقصود ہے کہ قرب جبرائیل امین کا ہے لیکن اس وقت جبرائیل امین اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں قریب ہوئے ہیں لیکن قرب بلا وحی نہیں تھا بلکہ بواسطہ جبرائیل امین وحی اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔ تو جبرائیل امین کو قریب بھی کیا ہے اور ایسے موقع پر وحی بھی نازل کی ہے۔

بسا اوقات یہ ہو سکتا ہے کہ آپ جبرائیل امین کو دیکھیں اور وحی نہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیکھیں بھی اور وحی بھی ہو۔ تو اس سے اُنس اور بڑھ جاتا ہے یعنی آپ پر وحی آتی اور جبرائیل امین کو دیکھے بغیر آتی، محض ان کی آواز ہوتی تھی اور جسم نہیں ہوتا تھا۔ اب اگر جسم ہو اور آواز نہ ہو تو آواز کی شناخت نہیں ہو گی اور اگر جسم اور آواز دونوں ہوں تو آئندہ بغیر دیکھے جب وحی آئے گی تو شناخت اور آسان ہو جائے گی۔

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ویسے بھی یقین ہوتا ہے لیکن وہ مشاہدے والا یقین بھی ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔

﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ﴾

جو کچھ آپ نے آنکھ سے دیکھا ہے دل نے اسی کی تصدیق کی ہے، ایسا نہیں

ہوتا کہ آدمی آنکھ سے دیکھتا ہے لیکن دل اس کی تصدیق نہیں کرتا۔

مثلاً آدمی دور دیکھتا ہے کہ وہ دھواں ہے، دل کہتا ہے کہ نہیں، دھواں نہیں ہے دھول ہے۔ اب دیکھو! آنکھ دیکھ رہی ہے لیکن دل اس کی تصدیق نہیں کر رہا۔ اب آپ گرمیوں میں سڑک پر دیکھتے ہوں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے پانی ہے حالانکہ پانی نہیں ہوتا، دل کہتا ہے کہ یہ سراب ہے، تو اب آنکھ تو دیکھ رہی ہے لیکن دل تکذیب کر رہا ہے۔

فرمایا: یہاں ایسا نہیں تھا بلکہ جو آنکھ دیکھ رہی تھی دل اس کی تصدیق بھی کر رہا تھا۔

﴿اَفْتَسِرُوْنَ عَلٰی مَا يَزِيْ ۙ﴾

اور جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کیا تم اس میں شک کرتے ہو؟ حالانکہ یہ شک والی بات نہیں ہے۔

﴿اَفْتَسِرُوْنَ عَلٰی مَا يَزِيْ ۙ﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اٰخِرٰی ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ

الْمُنْتَهٰی ﴿۱۴﴾

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار اس کو دیکھا۔ کہاں؟ ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی﴾ سدرۃ المنتہی کے پاس۔ اب دیکھو! یہاں ﴿اَفْتَسِرُوْنَ عَلٰی مَا يَزِيْ﴾ فرمایا، یہ نہیں فرمایا کہ ”اَفْتَسِرُوْنَ عَلٰی مَا قَدَّرَاۤی“۔ اگر ”عَلٰی مَا قَدَّرَاۤی“ ہو تو اس سے مراد ہو گا کہ جو پہلے دیکھ چکے ہیں۔ لیکن یہاں ”عَلٰی مَا يَزِيْ“ ہے کہ جو کچھ اب آپ نے دیکھا ہے وہ بھی ٹھیک ہے اور جو آئندہ دیکھیں گے وہ بھی ٹھیک ہے، دونوں پہ شک نہیں کرنا۔

اب یہاں ”عَلٰی مَا يَزِيْ“ آیا ہے اور آگے صیغہ ”رَاٰ“ پھر ماضی کا آگیا

ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آئندہ دیکھنا بھی ایسے یقینی ہے جیسے پہلے دیکھنا یقینی تھا اور جب ہونے والے کام پر یقین ہو تو پھر وہاں پر صیغہ ماضی لاتے ہیں کہ یہ ایسے ہے جیسا کہ ہو چکا ہے، اتنا یقین ہونا چاہیے۔

﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى﴾ بیری کے پاس جو کہ بالکل آخر میں ہے،  
﴿عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَى﴾ سدرة المنتہی کے پاس جنت ہے۔ ماویٰ کہتے ہیں رہنے کی جگہ کو، رہنے کی جگہ جنت ہے جہاں ابدی رہیں گے۔

﴿إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَى﴾

جب بیری کو اس چیز نے ڈھانپ لیا جس نے ڈھانپ لیا۔  
کس نے ڈھانپا؟ کہتے ہیں کہ سونے کے پروانے تھے یا ملائکہ تھے جنہوں نے ڈھانپا ہوا تھا۔

﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى﴾

نہ تو آنکھ ادھر ادھر ہٹی ہے اور نہ ہی حد سے بڑھی ہے۔

### زاغ اور طغی میں فرق:

زاغ یہ ہے کہ ایک آدمی کسی چیز کو دیکھنا چاہتا ہے لیکن پھر دیکھنا چھوڑ دیتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ نے ایسا نہیں کیا بلکہ جس کو دیکھنا تھا اسی کو دیکھتی رہی۔ اور طغی کا معنی یہ ہے کہ جس کو دیکھنا تھا اس کے ساتھ اور چیزوں کو بھی دیکھنا شروع کر دے، یہاں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ نے ایسا نہیں کیا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو دیکھنا تھا صرف اسی کو دیکھا۔ تو نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ دیکھنے میں چوک گئی ہے اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ نے کئی چیزوں کو دیکھنا شروع کیا۔

## جو کام ذمہ ہو وہیں کریں!

اس میں ایک بات یہ سمجھ لیں کہ پیغمبر کی شان یہ ہے کہ نبی وہی کام کرتا ہے جس کا حکم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ وہ کام نہیں کرتا جس کا حکم نہ ہو۔ اس سے یہ اصول سمجھ میں آتا ہے کہ ادب کا طریقہ یہ ہے کہ جو کام ذمے نہ ہو اس کو چھوڑ دیں اور جو ذمے لگے اسی کو کریں۔ اس سے آدمی کی ترقی بہت جلد ہوتی ہے اور بطور خاص طلبہ اور مریدین کو ان چیزوں کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔ مثلاً آپ سبق پڑھ رہے ہیں؛ دورانِ سبق بڑی سے بڑی شخصیت آجائے تو طالب علم کو چاہیے کہ نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھے، صرف اپنے سبق کو دیکھتا رہے۔ ہاں اگر استاد ہی کہہ دیں کہ سبق بند کر دو اور دروازہ کھول دو تو اور بات ہے، جب تک استاد نہ کہیں تب تک طالب علم کو نگاہ نہیں اٹھانی چاہیے۔ اسی طرح جب مرید اپنے شیخ کی مجلس میں ہو تو پھر اس کے شیخ سے بڑا شیخ بھی آجائے تو پھر مرید کو دائیں بائیں نہیں دیکھنا چاہیے، اس کے بغیر فائدہ مکمل نہیں ہوتا۔

## نفع اپنے شیخ ہی سے ہوتا ہے... مثال:

حضرت مولانا رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ نکاح سے پہلے بیوی کو سوچ لینا چاہیے کہ جس کے ساتھ میرا نکاح ہونا ہے وہ بد صورت ہے یا خوب صورت ہے لیکن جب نکاح ہو جائے تو اب اس کو چھوڑ کر خوب صورت کو دیکھے تو یہ ٹھیک نہیں ہے، اسی طرح جب بیعت کرنی ہے تو دیکھ لو کہ میرا پیر کیسا ہے؟ لیکن جب بیعت ہو جائیں تو اب دائیں بائیں نہ دیکھو، جس طرح عورت کا شوہر کالا بھی ہو تو عورت کو فیض یعنی اولاد اسی شوہر سے ملنی ہے اسی طرح پیر اگر ناقص بھی ہو جب بیعت کریں تو مرید کا ذہن یہ ہونا چاہیے کہ مجھے اب فیض اسی مرشد سے ملنا ہے۔ پھر اس کو فیض ملتا ہے وگرنہ نہیں ملتا۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔

ہاں جب عورت یہ سمجھے کہ میرا شوہر ایسے ایسے ہے، میرا اس سے نبھا نہیں ہو سکتا تو پھر احسن طریقے سے اس سے علیحدگی کرے، خلع ہو سکتا ہے حق مہر دے کر کر الگ ہو سکتی ہے۔ اسی طرح مرید اگر یہ سمجھے کہ مجھے شیخ سے فائدہ نہیں ہو رہا تو پھر احسن طریقے سے شیخ کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرے لیکن جب تک اس کے ساتھ تعلق رکھیں تو مکمل تعلق رکھیں، پھر اس کو دھوکہ نہ دیں۔

### اللہ کی بڑی بڑی نشانیوں کا دیدار:

﴿لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ﴾ ﴿۱۱﴾

آپ نے وہاں اللہ کی بڑی بڑی نشانیاں بھی دیکھی ہیں۔  
یہاں ایک دو باتیں سمجھ لیں؛

[۱]: پہلی بات تو یہ سمجھ لیں کہ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ﴾ ﴿۱۱﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُُّوحَىٰ ﴿۱۲﴾ پیغمبر جب بھی کوئی بات فرماتے ہیں تو وحی سے فرماتے ہیں۔ اگر مراد معانی اور الفاظ دونوں ہوں تو اس کا نام قرآن ہے اور اگر مراد یہ ہو کہ معنی بتا دیا جائے اور الفاظ نہ بتائے جائیں تو اس کا نام حدیث ہے اور اس کو سنت بھی کہہ دیتے ہیں۔ اور یہ جو لفظ بتایا جا رہا ہے یا معنی بتایا جا رہا ہے کبھی حکم خاص یعنی جزئی کی وحی آتی ہے تو پیغمبر وہ بتاتے ہیں اور کبھی خاص جزئی کی نہیں بلکہ قاعدہ کلیہ کی وحی آتی ہے تو نبی وہ بتاتے ہیں۔

اب اس قاعدہ کلیہ سے پیغمبر اجتہاد کر کے جزئی خود نکالتے ہیں جو نبی کا اجتہاد ہوتا ہے، اگر وہ اجتہاد صواب ہو تو اللہ اس کو برقرار رکھتے ہیں اور اگر اس اجتہاد میں خطا ہو تو اللہ بعد میں جزئی کی وحی نازل کر کے اس اجتہاد کو ختم فرمادیتے ہیں۔

اس لیے پیغمبر کی ہر بات کے وحی ہونے کا معنی سمجھ لیں ورنہ لوگ اعتراض

کریں گے کہ جب پیغمبر کی ہر بات وحی ہے تو پیغمبر کے اجتہاد پر بسا اوقات عتاب کیوں آتا ہے؟ اور بسا اوقات نبی کے اجتہاد کو اللہ ختم کیوں فرماتے ہیں؟

[۲]: یہ مسئلہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ کبھی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک مسئلہ جزئی کی صورت میں بطور وحی آتا ہے اور کبھی ایک قاعدہ کلیہ قانون کی صورت میں بطور وحی آتا ہے، پھر پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم اس قاعدہ کلیہ کے ذریعہ مسئلہ کا استنباط فرماتے ہیں، اس میں اگر خطا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ وحی نازل فرما کر نبی کی خطا کو ختم فرما دیتے ہیں اور پھر دوسرا مسئلہ آتا ہے۔

اب اس پر کسی کوشہ ہو کہ جب تک اس اجتہاد کے مقابلے میں وحی نہیں آئی تب تک تو پیغمبر عمل اس اجتہاد پر کریں گے، جب اس کے مقابلے میں وحی آئی اور اس نے اس اجتہاد کو ختم کر دیا تو اب اس اجتہاد کی حیثیت کیا ہوئی جو ختم ہوا؟ ہم کہتے ہیں کہ اس کی حیثیت وہی ہے کہ جیسے کوئی آیت نازل ہو جائے اور جب تک اس کی نسخ آیت نازل نہ ہو تو اسی آیت پر عمل کیا جاتا ہے اور جب اس کی نسخ آیت آتی ہے تو پہلی آیت پر عمل ختم ہو جاتا ہے لیکن جس دوران عمل کیا ہے اس دوران اس آیت کو غلط نہیں کہتے بلکہ اس پر عمل کا اجر پورا ملتا ہے۔

﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيمَانَكُمْ﴾<sup>193</sup>

بیت المقدس کی طرف منہ کیا تھا اور بعد میں وحی آگئی کہ منہ بیت اللہ کی طرف کرو تو جتنے ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے وہ نمازیں ضائع نہیں ہیں، وہ مقبول ہیں۔

[۳]: اسی طرح پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم ایک کلیہ سے اجتہاد فرماتے ہیں، اس

پر عمل کرتے ہیں، جب اس اجتہاد کے مقابلے میں نص آجاتی ہے تو جتنے دن اجتہاد پر عمل ہوا وہ اسی طرح قبول ہے جس طرح نص پر عمل کرنا مقبول ہوتا ہے۔ وجہ ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ ﴿٢١﴾ اس کو اچھی طرح ذہن نشین فرمائیں۔

### مشکرین کے بت؛ لات، منات اور عزیٰ:

﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ ۚ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ﴾ ﴿٢٢﴾

”لات“ یہ قبیلہ ثقیف کا بت تھا، ”عزیٰ“ یہ قریش کا بت تھا، ”منات“ بنو ہلال کا بت تھا۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے خدا بنائے رکھے تھے اور ساتھ مکان بنائے تھے کعبہ کی طرح۔ تو اللہ نے فرمایا کہ یہ جو لات، منات اور عزیٰ تم نے خدا بنا رکھے ہیں کیا ان میں کبھی تم نے غور کیا ہے؟ مطلب کہ یہ پتھروں سے تم بناتے ہو اور پھر ان کو پوجتے ہو! پھر فرمایا:

﴿الْكُفْرَ الذِّكْرَ وَلَهُ الْأُنْثَىٰ ۚ تِلْكَ إِذَا قَسَمْتَٰ صِغْرَىٰ﴾ ﴿٢٣﴾

اور پھر اپنے لیے تم نے بیٹے پسند کر رکھے ہیں اور خدا کے لیے بیٹیاں طے کر رکھی ہیں! کوئی عقل کی بات کرو۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ اللہ کے لیے بیٹیاں تو ٹھیک ہے بلکہ یہ عرف کی بنیاد پر کہا کہ تم بیٹیاں خود پسند نہیں کرتے تو اللہ کے لیے کیوں مانتے ہو؟ یہ کیسی ظالمانہ تقسیم ہے۔

### ان بتوں کی حقیقت!

﴿إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ

سُلْطٰنٍ ۖ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمْ

الْهُدَىٰ﴾ ﴿٢٤﴾



ان کی حقیقت یہی ہے کہ یہ چند نام ہیں جو تم اور تمہارے آباء و اجداد نے خود رکھے ہیں، اللہ نے ان پر کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی۔ یہ کافر لوگ اپنے خیالات کی پیروی کرتے ہیں اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔

ایک ظن وہ ہوتا ہے جو بے دلیل ہو اور ایک ظن وہ ہوتا ہے جو بادلیل ہو لیکن دلیل قطعی نہ ہو۔ وہ ظن جو بے دلیل ہو تو اس کا تو کوئی اعتبار ہی نہیں اور وہ ظن اور گمان جو بادلیل ہو لیکن دلیل قطعی نہ ہو بلکہ دلیل ایسی ہو جس میں دوسری چیز کا احتمال بھی ہو جسے دلیل ظنی کہتے ہیں، تو اس سے جو حکم ثابت ہوتا ہے وہ بھی ظنی ہوتا ہے۔ جیسے اخبارِ آحاد سے کوئی حکم ثابت ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ احکام قطعیات میں سے ہیں جو کہ فرض ہیں اور یہ ظنیات میں سے ہیں جو کہ واجب ہیں یا سنت ہیں۔ تو گمان ہر جگہ برا نہیں ہوتا۔ وہ ظن جو بادلیل ہو وہ برا ہوتا ہے اور وہ ظن جو بادلیل ہو لیکن دلیل قطعی نہ ہو تو وہ گمان قبول بھی ہے اور اس پر عمل کرنا واجب بھی ہے۔

﴿أَمْ لِلْإِنْسَانِ مَا تَمَنَّى ﴿٢٢﴾ فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَى ﴿٢٣﴾﴾

تو تم کیا سمجھتے ہو کہ انسان جو خواہش کرے گا وہ پوری ہو جائے گی، ایسا کبھی نہیں ہوتا! دنیا اور آخرت کی سب نعمتیں اللہ کے پاس ہیں، اللہ جس کو چاہیں دیتے ہیں۔ ﴿وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمَوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ

أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضَى ﴿٢٤﴾﴾

فرشتے بھی قیامت کے دن سفارش نہیں کر سکتے سوائے اللہ کی چاہت اور اللہ کے مرضی کے، اللہ چاہیں گے تو وہ سفارش کر سکیں گے اور کسی نے کیا شفاعت کرنی ہے؟

﴿إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيَسْتَوْفُونَ الْمَلَائِكَةَ تَسْفِيَةً  
الْأُنْثَى ۖ وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنَّ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي  
مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾ ﴿٢٤﴾

یہ کافر لوگ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بتاتے ہیں جس کی ان کے پاس کوئی  
دلیل نہیں ہے، صرف بے دلیل گمان ہے اور جو بے دلیل گمان ہوتا ہے وہ حق کے  
مقابلے میں کسی کام نہیں آتا۔

**غیروں کے بجائے اپنوں کی فکر کیجیے:**

﴿فَاعْرِضْ عَنْ مَن تَوَلَّى ۖ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا  
ۚ ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ وَهُوَ  
أَعْلَمُ بِمَن اهْتَدَى﴾ ﴿٢٥﴾

میرے پیغمبر! آپ ان کی فکر چھوڑیں جو ہمارے ذکر اور ہماری شریعت سے  
منہ موڑ چکے ہیں، یہ صرف دنیا کی زندگی چاہتے ہیں۔ اور ان کا مبلغ علم یہ دنیا کی زندگی  
ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ کون گمراہ ہے اور اللہ جانتا ہے کون ہدایت یافتہ ہے۔

اب یہاں دیکھو! اللہ اپنے پیغمبر پاک سے فرما رہے ہیں کہ ان سے اعراض  
کرو، ان کو بار بار سینے سے لگانے کی ضرورت نہیں ہے، چھوڑ دو ان کو، یہ جو اپنے ہیں بس  
ان کی فکر کرو۔ ہماری شریعت کا مزاج یہ ہے کہ جو اپنے ہیں ان کو جوڑو اور جو غیر ہیں  
ان کی فکر نہ کرو اور جب ہمارا مزاج یہ بنے گا کہ ہم غیر کو جوڑیں گے اور اپنوں کو توڑیں  
گے تو یہ شریعت کے خلاف ہو گا۔ اللہ کو یہ جوڑ نہیں چاہیے۔ بس اپنوں کو جوڑو! اپنوں  
کو ایسا جوڑنا کہ جس میں اپنوں کو چھوڑ کر غیروں کو ساتھ ملانا پڑے تو یہ جوڑ اللہ کے ہاں  
پسندیدہ نہیں ہے، یہ توڑ ہے، ایسے جوڑ کو ہم نے کیا کرنا ہے؟!

میں یہ بات اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ ممکن ہے کل آپ کسی ادارہ کے سربراہ بنو، کل آپ کسی جماعت کے سربراہ بنو تو اس کا بہت خیال رکھنا! ایسا کبھی نہ کرنا کہ جماعت کے سربراہ ہونے پر اپنے محنت کرنے والے کارکنوں کو نظر انداز کر دو اور غیروں کو خوش کرنے کی کوشش کرو! یہ بات مطلوب نہیں ہے۔

دیکھو! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تونیت بھی ٹھیک تھی جب آپ کے پاس حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا صحابی آئے۔ اس وقت بڑے بڑے کافر آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کی تونیت بھی ٹھیک تھی کہ موقع ملا ہے میں ان کو بات سمجھاؤں، اپنے صحابی کو تھوڑا سا نظر انداز کیا ٹھیک نیت کے ساتھ لیکن اللہ نے پوری سورت نازل فرمادی ﴿عَبَسَ وَ تَوَلَّى ۚ اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی ۝۲﴾ وَمَا يُدْرِیْكَ لَعَلَّہٗ یَزِدُّکِی ۝۳﴾<sup>194</sup> کہ میرے پیغمبر! آپ کیا کر رہے ہیں! کتنی سخت تنبیہ آ گئی ہے۔

اس لیے اپنوں کی فکر کرو جو درد لے کر آیا ہے، جو تڑپ لے کر آیا ہے، اس کی فکر کرو، ان کو سنبھالو، باقی سنبھالتے ہیں تو ٹھیک ہے، نہیں سنبھالتے تو جائیں۔ اگر یوں نہ سمجھ آئے تو پھر اس طرح سمجھ لو کہ ایک عورت تمہارے نکاح میں ہے۔ پہلے کھانا اس کو کھلاؤ۔ محلے میں ایک غریب عورت ہے، مستحق وہ بھی ہے لیکن پہلے اپنی بیوی کو کھانا کھلاؤ، یہ زیادہ اہم ہے۔ اپنے بچے بھوکے ہیں، اوروں کے بھی بھوکے ہوں گے، اُن کی فکر بھی کرنی چاہیے لیکن پہلے اپنے بچوں کی فکر کرو، اپنے بچوں کو چھوڑ کر دوسروں کو کھانا کھلانا اور اپنے بھیک مانگتے پھر یہ شریعت نہیں ہے۔ اسی طرح دینی معاملات میں اپنوں کو جوڑو، اپنوں کو!

## ”جوڑ“ کیجیے لیکن کس سے:

اور جوڑ کے حوالے سے ایک بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ ایک ہیں ہماری موجودہ امت کے افراد اور ایک ہیں امت کے گزرے ہوئے اکابر افراد۔ جوڑ کا ایک مطلب یہ ہے کہ امت کے بعد کے افراد کو اہل حق کے پہلے اکابر سے جوڑو تاکہ یہ ان سے نہ ہٹیں، اور ایک معنی یہ ہے کہ بعد والے اکابر سے کٹتے ہیں تو کٹ جائیں، ابھی جو حق اور باطل ہے ان کو جوڑو۔

تو میں حضرات سے کہتا ہوں کہ جوڑ کی بات تو ہم بھی کہتے ہیں لیکن ہمارے ہاں جوڑ کی بات یہ نہیں ہے کہ آج کے حق اور باطل کو جوڑو۔ ہمارے ہاں جوڑ کا پہلا معنی ہے اس امت کے اصغر کو اس امت کے گزرے ہوئے اکابر سے جوڑو تاکہ یہ دائیں بائیں نہ ہٹیں، اُن کے نظریات پہ چلیں۔ ہم اگر ایک نیا نظریہ دیں گے اور نیا نظریہ دے کر حق اور باطل کو جوڑیں گے تو یہ غلط ہے۔ پرانا نظریہ جو اکابر کا تھا وہ پیش کرو تاکہ اس امت کے اصغر اس امت کے اکابر سے جڑے رہیں۔ اپنے اکابر پر لعنت بھیج کر الگ نہ ہو، اور میں گزارش کرتا ہوں کہ اللہ کے لیے محقق نہ بنو، ناقل بنو۔ ہم گزشتہ مسائل پر تحقیق کریں گے تو اکابر سے اصغر کو کاٹ دیں گے اور اگر صحیح ناقل بنیں گے تو آنے والے اصغر کو جانے والے اکابر سے جوڑ دیں گے۔ عافیت امت کو گزشتہ کے ساتھ جوڑ دینے میں ہے، گزشتہ سے توڑنے میں نہیں ہے۔

## گناہ گاروں اور نیکو کاروں کا بدلہ:

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَءَوْا بِمَا

عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰی ﴿٦٦﴾

آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے۔ اللہ جو کلمہ مالک ہیں اس لیے

برے کو اس کے برے عمل کا بدلہ دیں گے اور نیک کو اس کی نیکی کا بدلہ دیں گے۔

﴿الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الذُّلْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَإِذْ أَنْتُمْ أَجْنَتٌ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى ۖ﴾

جو لوگ بڑے بڑے گناہوں سے بچتے ہیں اور بطور خاص بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، ﴿إِلَّا اللَّمَمَ﴾ ہاں چھوٹے چھوٹے گناہ ان سے ہو جاتے ہیں تو الگ بات ہے، اللہ بہت وسیع مغفرت والے ہیں، چھوٹے گناہ معاف فرما دے گا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں خوب جانتے ہیں جب اللہ نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور جب تم ماں کے پیٹ میں تھے اللہ اس وقت بھی جانتے ہیں۔ اس لیے اپنے آپ کے پاکدامن ہونے کے دعوے نہ کیا کرو۔

### گناہگار کو امید اور نیکوکار کو تنبیہ:

یہاں دونوں کو بات سمجھائی ہے: ایک مُسِیء اور دوسرا مُحْسِن۔ جو مُسِیء یعنی گناہ کرنے والا ہے وہ ذہن میں رکھے کہ اللہ کی رحمت بہت بڑی ہے، مایوس نہ ہونا کہ ہم تو گناہگار ہیں ہماری معافی کیسے ہوگی؟ اور جو نیک تھے ان کو بھی سمجھایا کہ نیکی پر اکرنا مت، جو مجرمین ہیں وہ امیدیں رکھیں اور جو نیک ہیں وہ اکڑیں مت۔ مجرم امید رکھیں اور ہم سے معافی مانگیں اور جو نیک ہیں وہ نیک عمل بھی کریں اور پھر بھی ہم سے معافی مانگیں کہ کہیں نیک عمل کی توفیق سلب نہ ہو جائے۔ اللہ پاک نے کیسے دونوں فریقوں کو بات سمجھائی ہے۔

### گناہ صغیرہ اور کبیرہ میں فرق:

یہاں فرمایا: ﴿كَبِيرَ الذُّلْمِ﴾۔ ایک ہے گناہ کبیرہ اور ایک ہے گناہ صغیرہ۔

کبیرہ اور صغیرہ میں فرق یہ ہے کہ وہ گناہ جس پر نص میں جہنم کی وعید آئی ہو یا وہ گناہ جس پر نص میں لعنت کے الفاظ آئے ہوں، یا وہ گناہ جس پر نص میں کوئی حد مقرر کی گئی ہو تو وہ کبیرہ ہے، اور وہ گناہ جس پر کوئی وعید نہ آئی ہو، لعنت نہ آئی ہو اور اس پر کوئی شرعی حد بھی مقرر نہ ہو تو وہ صغیرہ ہے لیکن اگر صغیرہ پر اصرار کیا جاتا ہو وہ بھی کبیرہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایک گناہ صغیرہ ہے لیکن اس کے مفاسد اور نتائج کبیرہ گناہ کی طرح ہوں تو وہ بھی کبیرہ میں شامل ہے۔

اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ وہ ناپسندیدہ ہوتی ہیں، مکروہ ہوتی ہیں، نامناسب ہوتی ہیں، گناہ صغیرہ ہوتی ہیں لیکن اسی میں اگر نیت بدل جائے تو گناہ کبیرہ ہی نہیں بلکہ کفر تک پہنچ جاتی ہیں۔ میں مثال دیتا ہوں کہ مسجد کا صحن ایسا ہو کہ وہاں اینٹیں نہیں لگی ہوئیں، وہاں صرف مٹی ہے، صفیں بھی نہیں ہیں، دریاں بھی نہیں ہیں، قالین بھی نہیں ہے، صرف مٹی ہے، اب وہ جگہ پاک ہے اور آدمی کا تھوک بھی پاک ہے۔ اب اگر کوئی شخص کو تاہی کرے، غفلت کرے اور وہاں تھوک دے تو یہ ناپسندیدہ ہے، مکروہ ہے، اگرچہ تھوک پاک ہے لیکن اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا، انتہائی برا کام ہے لیکن لیکن اگر کوئی شخص اسی تھوک کو کسی پاک جگہ پر پھینک دے نفرت کی وجہ سے تو یہ کفر ہے۔ اب دیکھو! جرم تو ایک ہی ہے، تھوڑی سی نیت کے بدلنے سے وہ صرف کبیرہ گناہ ہی نہیں بلکہ کفر ہو گیا ہے۔ تو بسا اوقات ایک ہی گناہ ہوتا ہے، اس کی ایک جہت کو دیکھیں تو صغیرہ ہوتا ہے اور دوسری جہت کو دیکھیں تو گناہ کبیرہ نہیں بلکہ کفر ہو جاتا ہے۔

میں اس لیے ہر بات کو سمجھاتا ہوں کہ ہر بات کی بنیاد پر غور ضرور کیا کریں کہ یہ کام ہم کیوں کرتے ہیں؟ پھر خود کو بدلنے کی کوشش کریں وگرنہ نقصان بہت ہوتا ہے۔

## اتنی نہ بڑھاپا کی داماں کی حکایت...

﴿فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ﴾

فرمایا کہ پاک دامنی کا دعویٰ نہ کرو۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ کبھی فعل بول کر نفس فعل کا معنی مراد ہوتا ہے۔ یعنی فعل بول کر اسی فعل کا جو معنی نظر آ رہا ہوتا ہے وہی معنی مراد لیا جاتا ہے، اسے کہتے ہیں کہ ”نفس فعل“ مراد ہے اور کبھی فعل بول کر نفس فعل نہیں بلکہ ارادہ فعل مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ﴾<sup>195</sup>

اب یہاں معنی یہ نہیں ہے کہ جب تم نماز کے لیے بالکل کھڑے ہو جاؤ تو اب وضو شروع کرو، بلکہ یہاں معنی یہ ہے کہ جب تم ارادہ کرو قیام الی الصلوٰۃ کا تو اب تم وضو کرو۔ تو یہاں فعل بول کر ارادہ فعل مراد ہے۔

اور بسا اوقات فعل بول کر دعویٰ فعل مراد ہوتا ہے جس طرح یہاں ہے ”فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ“، اس میں یہ دعویٰ فعل مراد ہے کہ تم نے پاک تو ہونا ہے کیونکہ ”قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا“ کامیاب وہ شخص ہے جس نے اپنا تزکیہ کیا۔ تو تزکیہ تو کرنا ہے لیکن یہاں فرمایا کہ ”فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ“ اب یہاں اس کا ترجمہ یہ نہیں کریں گے کہ اپنا تزکیہ نہ کرو بلکہ یہاں معنی ہے کہ تم تزکیہ کا دعویٰ نہ کرو۔ تو یہاں دعویٰ فعل مراد ہے۔ اسی طرح قرآن میں ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِي﴾<sup>196</sup>

کہ اے نبی! ان سے فرماؤ کہ اگر تم اللہ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو میری بات مانو۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری بات مانو کیونکہ جو اللہ سے محبت کرتا ہے وہ تو اتباع کرے گا۔ لیکن یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر تمہارا اللہ سے محبت کا دعویٰ ہے تو پھر حضور کی اتباع کرو! تو یہاں دعویٰ فعل مراد ہے۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اشخاص کے نام بدل دیے صرف اس وجہ سے کہ اس میں دعویٰ تزکیہ کی بو آرہی ہے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا صحابیہ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ کیا نام ہے؟ انہوں نے کہا: ”برہ“۔ فرمایا: بدل دو۔ ”برہ“ کا معنی ہوتا ہے خود کو نیک سمجھنے والی۔ اس کا نام رکھو ”زینب“ ایسے لفظ بدل دیے ہیں کہ جن سے دعویٰ تزکیہ کی بو آتی ہے۔

### انفاق کی عادت ڈالیے:

﴿أَفَرَأَيْتَ الَّذِي تَوَلَّى ۖ وَاعْطَىٰ قَلِيلًا وَّأَكْثَىٰ﴾

اے پیغمبر! آپ نے بھلا اس شخص کو بھی دیکھا ہے جو روگردانی کرتا ہے، جو تھوڑا سا دیتا ہے اور پھر رک جاتا ہے۔ کدیۃ اس پتھر کو کہتے ہیں کہ جب پانی کے لیے کھودیں تو نیچے سے وہ پتھر نکل آئے اور رکاوٹ بنے۔ کوئی بندہ پیسہ خرچ کرتا ہے اسے مفاد نظر نہیں آتا تو روک لیتا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی بندہ نیک عمل شروع کرتا ہے اور کچھ عرصے بعد نیک عمل ختم کر دیتا ہے تو یہ بھی اس میں شامل ہے۔ نیک عمل کریں اور ہمیشہ کریں۔ حدیث پاک میں ہے:

"وَمَا زَالَ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّىٰ أَحَبَبْتُهُ." <sup>197</sup>



بندے کے عمل میں تسلسل ہو تو اللہ اسے اپنا محبوب بنا لیتے ہیں۔

**کیا اس کو علم غیب ہے کہ ایسی باتیں کرتا ہے؟**

﴿أَعِنْدَكَ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهَوْ يَزِي ۖ أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ

مُوسَى ۖ وَابْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى ۖ﴾

کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے جس کو وہ دیکھ رہا ہے؟ کیا اس کو ان باتوں کا کوئی علم نہیں ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کے صحیفوں میں لکھا ہوا ہے؟ کون ابراہیم؟ فرمایا: ”الَّذِي وَفَّى“ کہ ابراہیم وہ تھے جو امتحانات میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان صحیفوں میں باتیں کیا ہیں؟ آگے اٹھارہ آیات میں تقریباً وہی باتیں ہیں جو صحفِ موسیٰ اور صحفِ ابراہیم میں تھیں۔

ان آیات کا پس منظر یہ ہے ایک شخص نے قرآن مجید کی آیات سنیں اور اس کا دل ایمان کی طرف مائل ہو گیا تو اس کو اس کے دوست نے کہا کہ تو اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر نیا دین کیوں اختیار کر رہا ہے؟ یوں اس کو کچھ عار دلائی۔ اس نے کہا کہ میں تو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہوں کہ کہیں آخرت میں میری پکڑ نہ ہو جائے! دوست نے کہا کہ اگر تم مجھے کچھ پیسے دے دو تو میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ آخرت کی پکڑ سے تجھے بچا لوں گا اور تمہارا عذاب اپنے سر لے لوں گا، یوں آخرت کے عذاب سے تم بچ جاؤ گے۔ اس شخص نے اس دوست کو پیسے دیے۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اور پیسے مانگے تو اس شخص نے اور پیسے بھی دے دیے لیکن بعد میں دینا بند کر دیے۔ تو ان آیات میں ان دونوں کی حماقت کو بیان کیا جا رہا ہے کہ جو شخص کہہ رہا تھا کہ میں تمہیں آخرت کے عذاب سے بچا لوں گا تو کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ اس بات پر قادر ہے کہ اسے جہنم کے عذاب سے بچالے؟ اور دوسرا اللہ نے ایک قاعدہ بیان کر دیا کہ

﴿أَلَا تَذَرُوْا زِدْرَةً وَّذُرْ اُخْرٰی﴾ کہ کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اس لیے اس نے جو پیسے دیے تھے کہ وہ آخرت کے عذاب سے مجھے بچالے تو یہ صرف اس کی حماقت کی بات ہے۔

اس آیت کا ایک عمومی معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص مال خرچ کرتا تھا اور پھر اس کو خیال آیا کہ اگر میں نے خرچ کیا تو مال کم ہو جائے گا اور اب اس نے مال خرچ کرنا چھوڑ دیا تو اسے فرمایا جا رہا ہے کہ ﴿اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهَوْ يٰزٰی﴾ کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ اس کا پیسہ خرچ کرنے سے ختم ہو جائے گا؟ حالانکہ اللہ کا تو وعدہ ہے:

﴿وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ﴾<sup>198</sup>

کہ تم جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو تو اللہ اس کے بدلے میں اور دیتا ہے، اور یہ شخص کہتا ہے کہ میرا مال ختم ہو جائے گا، فرمایا: اس کے پاس غیب کا علم تھوڑا ہے کہ یہ کہے کہ میرا مال ختم ہو جائے گا، اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرماتے تھے:

"اَنْفِقْ يٰاِبْلَالُ! وَلَا تَخْشَ مِنْ ذٰی الْعَرْشِ اِقْلًا لَا".<sup>199</sup>

کہ اے بلال! مال کو خرچ کرو اور کمی کا خوف نہ کرو!

اور یہ عجیب بات ہے جس طرح انسان کا جسم ہے، اس کی عمر ستر سال کی ہو جائے تو جسم گھٹتا نہیں ہے، جس قدر جسم سے چیزیں نکلتی جاتی ہیں مثلاً پانی ہے جو پسینے کی صورت میں نکل رہا ہے تو اتنی چیزیں اللہ خوراک کے ذریعے اور پیدا کرتے رہتے

ہیں، بالکل اسی طرح جب مال خرچ ہو تا رہتا ہے تو اللہ اور مال دیتے رہتے ہیں۔

**”آدمی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا“ کا مطلب:**

﴿لَا تَزِدْ وَارِدَةً ذَرْأًا خُرَى﴾

کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی گناہ کیا ہے تو اس کا بوجھ وہی اٹھائے گا جس نے گناہ کیا ہے، کوئی دوسرا اس کے گناہ کے بوجھ کو نہیں اٹھائے گا۔ اسی طرح اگر ایک شخص کسی کو گناہ پر لگائے اور دوسرا شخص گناہ کرے تو گناہ کرنے والے کے گناہ کا بوجھ گناہ کرنے والا ہی اٹھائے گا اور جس نے گناہ پر لگایا ہے اس کو گناہ پر لگانے کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔

**ایصالِ ثواب پر اشکال کا جواب:**

﴿وَأَنْ تَلَيْسَ لِلنَّاسِ إِلَّا مَا سَعَى﴾

اور یہ کہ آدمی کو وہی چیز ملے گی جو آدمی نے خود کیا ہو گا، آدمی کو اپنی کمائی ملے گی۔

بعض لوگوں نے اس آیت سے ایصالِ ثواب کا انکار کیا ہے کہ یہ آیت ایصالِ ثواب کے خلاف ہے حالانکہ اس کا ایصالِ ثواب سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اس آیت میں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مثلاً کوئی شخص فرض نماز نہ پڑھے، کیونکہ کوئی دوسرا پڑھ کر مجھے دے گا تو مجھے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ فرمایا: ایسا نہیں ہو گا بلکہ جس نے فرض ادا کرنے میں اس کے فرض کا اجر اسی کو ملے گا۔ تو سمجھنا یہ مقصود ہے کہ تمہیں تمہاری اپنی کمائی ملے گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی نفلی عبادت کرے اور اس کا اجر تمہارے نامہ اعمال میں ڈالے گا تو تمہیں نہیں ملے گا، یہ معنی اس آیت کا نہیں ہے۔

ایک شخص مسلمان ہے اور دوسرا کافر ہے۔ اب مسلمان اگر صدقہ کرے اور کافر کو ایصالِ ثواب کرے تو بالکل نہیں ہوگا اور اگر مسلمان ایصالِ ثواب مسلمان کو کرے تو پھر ہو جائے گا۔ یہ جو دوسرے کے صدقے کا اجر اس کو ملا ہے تو اس میں بھی اس کی محنت کو دخل ہے کہ یہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا ہے ورنہ اسے ثواب کیسے ملتا؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اچھا! فرائض میں بھی تو ایسے ہوتا ہے مثلاً ایک آدمی پر حج فرض ہے، وہ نہیں کر سکا، وہ کسی دوسرے کو حج بدل کر ادیتا ہے اور کہتا ہے کہ جی اجر مل جائے گا۔ اب یہاں تو دوسرے کے فرض کا اجر مل رہا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حج بدل کر آیا ہے تو خرچہ تو اسی نے دیا ہے، اگر یہ خرچہ نہ دیتا تو حج کیسے ادا ہوتا؟ تو حج بدل بھی اسی کے خرچے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس لیے یہ سعی میں شامل ہے۔

### وعظ و نصیحت:

﴿وَأَنْ سَعِيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ۖ ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءُ الْأَوْفَىٰ ۚ وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ﴾

قیامت کے دن ان کی محنت ان کو دکھادی جائے گی، پھر انہیں پورا بدلہ دے دیا جائے گا اور اللہ ہی کی طرف سب نے پہنچنا ہے۔

﴿وَأَنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَىٰ﴾

اللہ ہی ہنساتے ہیں اور اللہ ہی رلاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہنسنے کے اسباب اللہ دیتے ہیں تو بندہ ہنس پڑتا ہے اور رونے کے اسباب دیتے ہیں بندہ رو پڑتا ہے۔

﴿وَأَنَّهُ هُوَ أَمَاتَ وَأَحْيَا ۖ ۚ وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَ

الْأُنثَىٰ ۚ ۚ مِنْ نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ﴾

اللہ ہی موت دیتے ہیں، اللہ ہی زندہ کرتے ہیں، ہر چیز میں نر اور مادہ اللہ ہی پیدا فرماتے ہیں اور وہ بھی ایک قطرے سے پیدا فرماتے ہیں جب اسے ٹپکایا جاتا ہے۔

﴿وَأَنَّ عَلَيْهِ النَّشْأَةَ الْأُخْرَىٰ ۚ وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَىٰ وَأَقْنَىٰ ۖ وَأَنَّهُ هُوَ رَبُّ الشَّعْرَىٰ ۚ﴾

اور اللہ نے یہ اپنے ذمے لیا ہے کہ دوبارہ پیدا فرمائیں گے، غنی بھی اللہ کرتے ہیں اور مال محفوظ بھی اللہ کرتے ہیں۔ شعریٰ کا رب اللہ ہی ہے۔

”شعریٰ“ ایک ستارے کا نام ہے جسے مکہ والے پوجتے تھے۔ تو ان سے کہا جا رہا ہے کہ شعریٰ کا رب بھی تو اللہ ہے تو تم پھر اس کو کس لیے پوجتے ہو؟!

﴿وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ ۖ وَثَمُودًا فَمَا أَبْقَىٰ ۚ﴾

اللہ نے عادِ اولیٰ کو ہلاک کیا، قوم ثمود کو بھی ہلاک کیا ہے۔ قوم عاد کے نبی حضرت ہود علیہ السلام تھے اور قوم ثمود کے نبی حضرت صالح علیہ السلام تھے۔ اللہ نے ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑا، اور اس سے پہلے قوم نوح کو بھی ہلاک کیا۔ قوم نوح کے بعد سب سے پہلے جن پر عذاب آیا تھا وہ عادِ اولیٰ تھی، یہ لوگ ظالم اور سرکش تھے۔

﴿وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَىٰ ۖ فَغَشَّاهَا مَا غَشَّىٰ ۚ﴾

اور جو بستیاں الٹی ہوئی تھیں تو ان کو بھی اللہ نے ہی الٹا کر رکھ دیا تھا، پھر ان بستیوں پر اور جو عذاب آئے وہ تمہیں تو پتا نہیں وہ اللہ ہی جانتے ہیں کہ کتنے عذابوں نے ان کو ڈھانپ لیا! اے لوگو! تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں پر شک کرتے ہو! جھگڑتے ہو! اختلاف کرتے ہو!

﴿هَذَا نَذِيرٌ مِنَ النَّذْرِ الْأُولَى﴾ ﴿٥٦﴾ أَرَفَتِ الْأَرِفَةَ ﴿٥٧﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ ﴿٥٨﴾ أَفَإِنْ هَذَا الْحَدِيثُ تَعْجَبُونَ ﴿٥٩﴾ وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ ﴿٦٠﴾ وَأَنْتُمْ سَاهُونَ ﴿٦١﴾ فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا ﴿٦٢﴾

یہ قرآن بھی ایسی ڈرانے والی کتاب ہے جیسے پہلے ڈرانے والے صحیفے تھے۔ یا ”نَذِيرٌ“ سے مراد پیغمبر بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ پیغمبر ایسے ڈرانے والے ہیں جیسے پہلے پیغمبر ڈرانے والے تھے۔ قیامت آرہی ہے، اللہ کے علاوہ کوئی اس کو ہٹا نہیں سکتا۔ اور اللہ تو ہٹائیں گے نہیں۔ تم ان باتوں پر تعجب کرتے ہو؟ پھر ہنستے ہو؟ تمہیں رونا نہیں آتا؟ اور تم کھیل کود میں پڑے ہو! اللہ کو سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کیا کرو۔

﴿فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا﴾ ﴿٦٢﴾

اس آیت سجدہ پر سجدہ کرنا چاہیے۔

اللہ ہمیں نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة القمر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿اِقْلَبْ يَتِ السَّاعَةِ وَاَنْشَقَّ الْقَمَرُ ۝۱۰ وَانْ يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا

سِحْرٌ مُّسْتَسِرٌّ ۝۱۱﴾

### واقعہ شق قمر:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں تھے اور رات کا وقت تھا۔ مشرکین مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی نبوت پر معجزہ طلب کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر معجزہ اور نشانی دکھا دوں تو تم کلمہ پڑھ لو گے؟ کہا پڑھ لیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا، اللہ کے حکم سے چاند دو ٹکڑے ہوا۔ ایک ٹکڑا مشرق اور ایک مغرب میں اور درمیان میں غار حراء والی پہاڑی حائل ہو گئی۔ اس پر مشرکین کہنے لگے کہ ابھی تو ہم اس پر یقین نہیں کرتے، ہو سکتا ہے کہ جادو سے آپ نے دو ٹکڑے کیے ہوں، اس لیے کل دن کا انتظار کرتے ہیں، باہر سے جو لوگ کل مکہ مکرمہ آئیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ کیا انہوں نے بھی ایسا دیکھا ہے؟ اگر دیکھا ہو تو پھر ہم مان لیں گے۔ دوسرے دن جب لوگ باہر سے آئے، ان سے پوچھا تو وہ بھی کہتے تھے کہ ہم نے بھی دو ٹکڑے دیکھے لیکن ان لوگوں نے پھر جادو کہہ کر اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ تو اللہ رب العزت نے بات سمجھائی۔

﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَالنَّشَقُ الْقَصِرُ ۚ ۝۱۰۱﴾ وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعَرِّضُوا وَيَقُولُوا

سِحْرٌ مُّسْتَسِيرٌ ﴿۱۰۱﴾

قیامت قریب آگئی ہے، اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔ یہ لوگ کوئی بھی نشانی دیکھتے ہیں تو اعراض کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے جو تھوڑے وقت کے بعد ختم ہو جائے گا۔

”مُسْتَسِيرٌ“ کا معنی کبھی دائمی ہوتا ہے اور کبھی اس کا معنی عارضی ہوتا ہے۔ ”مَرَّ“ یہ مُرور سے ہے بمعنی گزرنے والا۔ تو جب کوئی چیز گزرتی ہے تو ختم ہو جاتی ہے۔ تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ یہ جادو ہے جو بہت جلد ختم ہو جائے گا کیونکہ یہ عارضی چیز ہے۔

﴿وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ وَكُلُّ أَمْرٍ مُّسْتَقَرٌّ ۝۱۰۲﴾

انہوں نے جھٹلایا اور اپنی خواہشات کے پیچھے پڑے، ہر کام نے آخر کار ایک انجام کو پہنچنا ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے دنیا میں ہر کام کا کوئی نہ کوئی انجام ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کا درس دے رہے ہیں اور اپنی رسالت پر معجزات بھی پیش فرما رہے ہیں جیسے یہ معجزہ شق قمر ہے۔ ادھر کافر لوگ اس کو جھٹلا رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا کام کر رہے ہیں اور منکرین اپنا کام کر رہے ہیں۔ ﴿كُلُّ أَمْرٍ مُّسْتَقَرٌّ﴾ ہر کام نے انجام کو پہنچنا ہے۔ یعنی تمہیں جلد ہی انجام معلوم ہو جائے گا کہ پیغمبر سچ فرما رہے ہیں اور تم انکار کر کے غلط انجام کو پہنچ رہے ہو۔

یہ جو فرمایا: ﴿وَكَذَّبُوا﴾ کہ ان لوگوں نے جھٹلایا، جہاں تک چاند کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا تعلق ہے اس کو تو نہیں جھٹلایا اور جھٹلا بھی کیسے سکتے تھے کیونکہ یہ



تو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، تو پھر جھٹلایا کس کو تھا؟ اس نشانی کا جو مقتضی تھا یعنی توحید اور نبوت... ان لوگوں نے اس کو جھٹلایا تھا۔

﴿وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ ۖ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ ۖ فَمَا تُغْنِ التُّذْرُ ۖ﴾

ان کے پاس بہت ساری نشانیاں آئیں جن میں ان کے لیے خبردار کرنے کا سامان تھا، کامل حکمت اور دانائی کی باتیں تھیں مگر ان کو ڈرانے سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

﴿فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَىٰ شَيْءٍ نُكْرٍ ۖ خَشَعُوا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنتَشِرٌ ۖ مُّهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ ۖ يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَذَا يَوْمٌ عَسِيرٌ ۖ﴾

آپ ان کو چھوڑ دیں، ایک وقت آئے گا کہ پکارنے والا ایک ناگوار چیز کی طرف پکارے گا۔ ”الدَّاعِ“ سے مراد ہے فرشتہ اور ”نُكْرٍ“ ایسی چیز کو کہتے ہیں جو مزاج کے موافق نہ ہو، یعنی جب قیامت آئے گی تو ان کو پھر سمجھ آئے گی۔ آنکھیں ان کی جھکی ہوئی ہوں گی، قبروں سے ایسے نکلیں گے جیسے مڈیاں منتشر ہوتی ہیں۔ پھر یہ سر جھکا کر چلیں گے اس فرشتے کی طرف اور کہیں گے کہ آج کا دن بہت مشکل ہے۔

### قوم نوح پر طوفان:

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَ قَالُوا مَجْنُونٌ وَ اِذْ جَرٰٓ ۙ فَدَعٰ رَبَّهُ اَنِّىۡ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۙ﴾

صرف انہوں نے نہیں جھٹلایا بلکہ ان سے پہلے قوم نوح نے بھی ہمارے بندے حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا، ہمارے بندے کو کہتے تھے کہ یہ مجنون ہے، پھر انہیں دھمکیاں دیں۔ تو نوح علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا کہ اللہ! میں بہت

بے بس ہو چکا ہوں، میری مدد فرما۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے کہ ان کی قوم والے بسا اوقات ان کے گلے کو دباتے، نوح علیہ السلام بے ہوش ہو جاتے لیکن پھر بھی اللہ سے دعا مانگتے کہ اللہ! ان کو ہدایت دے دیں، ان کو پتا نہیں کہ میں ان کا کتنا خیر خواہ ہوں۔ ساڑھے نو سو سال اس تکلیف میں گزارے اور بالآخر اللہ سے مدد مانگی کہ اے اللہ! میری مدد فرما۔

﴿فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَرٍ ۖ وَخَجَرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَى أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۚ﴾

تو ہم نے آسمان سے زور دار پانی برسایا اور زمین سے چشمے نکالے۔ یوں آسمان اور زمین کا سارا پانی آپس میں ملا اور بالآخر جو فیصلہ ہو چکا تھا اس کے نتیجے میں یہ لوگ تباہ و برباد ہو گئے۔

﴿وَحَمَلْنَاهُ عَلَى ذَاتِ الْأَوَاحِ وَدُسِّرَ ۖ تَجَرَّى بِأَعْيُنِنَا جَزَاءَ لِمَنِ كَانَ كُفْرًا ۚ﴾ وَلَقَدْ تَرَكْنَاهَا آيَةً فَهَلْ مِنْ مُدْكِرٍ ﴿١٥﴾

ہم نے ان کو تختوں اور میٹھوں سے بنی ایک کشتی پر سوار کیا جو ہماری نگرانی میں چلتی رہی، یہ عذاب دراصل سزا تھی ان لوگوں کی جو کافر تھے۔ ہم نے اس کو عبرت کے آثار کے طور پر باقی رکھا، کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟

﴿فَكَثِيفٌ كَانَ عَذَابِي وَنُذِرٌ ۚ﴾

دیکھو! پھر ہمارا عذاب اور ہمارا ڈر سنانا کیسا تھا؟

**قرآن کے آسان ہونے کا معنی:**

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدْكِرٍ ۚ﴾

ہم نے قرآن کو بہت آسان کر دیا ہے نصیحت حاصل کرنے کے لیے، تو کوئی ہے اس سے نصیحت حاصل کرنے والا۔

یہاں ”یَلِدُكَ“ سے مراد یا تو نصیحت حاصل کرنے والا ہے یا اس سے مراد ہے ”حفظ کرنا“ کہ ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے حفظ کرنے کے لیے، تو ہے کوئی اس کو حفظ کرنے والا، اس کو یاد کرنے والا۔

میں اس کو پہلے بھی کئی بار بیان کر چکا ہوں کہ قرآن کریم کی ایک حیثیت ہے واعظ اور ناصح ہونے کی اور قرآن کریم کی ایک حیثیت ہے شارع ہونے کی۔ یہ جو قرآن کی حیثیت ہے کہ یہ وعظ و نصیحت ہے تو اس اعتبار سے یہ بہت آسان ہے اور جو قرآن کریم کی حیثیت ہے احکامات اور عقائد کی اس اعتبار سے قرآن آسان نہیں ہے، اس اعتبار سے محنت کرنی پڑتی ہے، پوری زندگیاں کھپانی پڑتی ہیں اور پھر بھی آدمی سمجھتا ہے کہ شاید مجھ سے کہیں غلطی نہ ہو گئی ہو۔

آیات قیامت کو سن کر ڈر جانا یہ تو آسان ہے، آیات جنت کو سن کر خوش ہو جانا بھی آسان ہے، گزشتہ قوموں کے حالات کو سننا اور عبرت حاصل کرنا بھی آسان ہے لیکن اس سے عقائد و مسائل کا استنباط کرنا بہت مشکل کام ہے۔

### قوم عاد کی تباہی:

﴿كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِي ۚ﴾ (١٧) ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي

يَوْمٍ نَحْسٍ مُّسْتَبِيرٍ ۚ﴾ (١٨) ﴿تَذَرُهُمُ النَّاسُ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ۚ﴾ (١٩)

قوم عاد نے بھی تکذیب کی تو دیکھو! ہمارا عذاب اور ہمارا ڈر سنانا کیسا تھا؟ ان پر عذاب یہ تھا کہ ہم نے ان پر سخت ہوا بھیجی مسلسل نحوست والے دن میں جو ان لوگوں کو اکھاڑ کے پھینک رہی تھی اور پھر وہ ایسے پڑے ہوئے تھے جیسے اکھڑی ہوئی

کھجور کے تنے ہوں۔

﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذْرِي﴾

دیکھو! کیسے ان پر عذاب آیا، ہم ان کو ڈراتے رہے لیکن یہ باز نہیں آتے۔

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ﴾

ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے، تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا۔

**قوم شمود کا انجام:**

﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ﴾

﴿إِذْ أَلْفَىٰ ضَلَالٍ وَسُعُرٍ﴾

قوم شمود نے نبیوں کو جھٹلا دیا۔ ایک نبی کی تکذیب چونکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی تکذیب ہوتی ہے اس لیے یہاں ”نُذْر“ جمع لائے ہیں، اور وہ کہتے تھے کہ کیا ہم ایک بشر کی پیروی کریں؟ اگر ہم اس کی پیروی کریں گے تو ہم گمراہی میں ہوں گے اور جنون میں ہوں گے۔

”ضَلَالٍ“ سے مراد ہے گمراہی اور ”سُعُرٍ“ سے مراد ہے جنون اور آگے جو

”إِنَّ الْمَجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ“ آ رہا ہے تو اس ”سُعُرٍ“ سے مراد جہنم ہے۔

مطلب ان کا یہ تھا کہ دیکھو! جب بھی کسی شخص کی اتباع کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اگر ہم اتباع ان کی کریں کہ ان سے دنیا ملے گی تو وہ تو تب ہو گا کہ جس کی اتباع کریں وہ صاحب ثروت ہو، دولت والا ہو، یہ تو صاحب ثروت آدمی نہیں ہیں تو دنیا کے امور میں ان کی اتباع کیوں کریں؟ اور اگر اتباع کرتے ہیں شریعت میں اور امور دین میں تو وہ فرشتہ ہونا چاہیے تھا کہ اس کی بات مانیں، یہ تو ہماری طرح کا بشر

ہے۔ تو خلاصہ ان کی بات کا یہ تھا کہ یہ نہ تو فرشتہ ہے کہ ہم اس کی اتباع دینی امور میں کریں اور نہ ہی یہ صاحب طاقت ہے کہ ہم دنیاوی امور میں اس کی اتباع کریں۔

﴿أَلْقَى الذِّكْرَ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌّ ۝۲۵﴾

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ کیا اسی پر وحی آئی تھی، یہ تو کذاب ہے، جھوٹ بولتا ہے اور شیخی مارتا ہے العیاذ باللہ۔

﴿سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُّ ۝۲۶﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ ان کو عنقریب پتا چل جائے گا کہ جھوٹا کون ہے اور شیخی کون مارتا ہے؟

﴿إِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝۲۷﴾ وَنَبِّئُهُمْ

أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُحْتَضَرٌ ۝۲۸﴾

ہم ان لوگوں کی آزمائش کے لیے اونٹنی بھیج رہے ہیں اس لیے اے پیغمبر! آپ صبر کریں اور بیٹھ کر انہیں دیکھیں اور یہ بات ان کو بتائیں کہ پانی ان لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر کسی کو اپنی باری پر حاضر ہونا چاہیے۔ یہ واقعہ تو آپ کے ذہن میں ہے، اس لیے تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں

ہے۔

﴿فَنَادَا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ ۝۲۹﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذْرِي ۝۳۰﴾

تو ان لوگوں نے اپنے ایک آدمی کو بلایا۔ اس کا نام ”قدار“ تھا۔ اس نے اونٹنی پر حملہ کر دیا اور اس کے پاؤں کاٹ دیے جس سے وہ بچاری مر گئی۔ دیکھو! ہمارا عذاب اور ہمارا ڈر سنا کیسا تھا؟! ان پر عذاب کیا تھا؟ فرمایا:

﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمٍ الْمُحْتَظِرِ ۝۳۱﴾

ہم نے ان پر سخت قسم کی چٹخ بھیجی جس کی وجہ سے یہ باڑ کے چورے کی طرح ہو گئے۔

کھیتوں کے باہر کانٹوں کی باڑ لگاتے ہیں جو سال چھ مہینے کے بعد بالکل چوراسا بن جاتا ہے۔ تو اس چٹخ کی وجہ سے ان پر ایسا عذاب آیا کہ وہ بھی اس چورے کی طرح بن کر رہ گئے، ایسے کہ ہاتھ لگاؤ تو ختم ہو جاتے تھے۔

### قوم لوط کی پکڑ:

﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ ۖ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّا آلَ

لُوطٍ نَّجَّيْنَاهُمْ بِسَحَرٍ ۚ نِعْمَةٌ مِّنْ عِندِنَا كَذَلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ ۝۲۵﴾

قوم لوط نے نبیوں کو جھٹلایا۔ ہم نے ان پر پتھروں کی بارش برسائی، ہاں جو حضرت لوط علیہ السلام کو ماننے والے تھے صرف ان کو نجات ملی۔ ہم نے ان کو سحری کے وقت اس عذاب سے بچا لیا تھا۔ یہ ان کے لیے ہماری طرف سے ایک نعمت تھی۔ یہ صرف ان کے ساتھ نہیں ہے بلکہ جو بھی پیغمبر کی بات مانتا ہے ہم اس کو عذاب سے بچا لیتے ہیں۔

﴿وَلَقَدْ أَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ۝۲۶﴾

حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو ہماری پکڑ سے ڈرایا لیکن وہ پھر بھی ہماری تنبیہات اور ڈرانے میں شک کرتے رہے۔

﴿وَلَقَدْ رَاوَدُوهُ عَنْ ضَيْفِهِ فَطَمَسْنَا أَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ ۝۲۷﴾

انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو ان کے مہمانوں کے بارے میں پھسلانا چاہا۔ وہ فرشتے تھے جو بے ریش لڑکوں کی صورت میں مہمان بن کر آئے لیکن یہ ظالم وہاں پہنچے۔ لوط علیہ السلام نے دروازے بند کیے تو وہ چھتوں کے اوپر سے آئے۔ ان

مہمانوں نے کہا کہ ہم تو بے ریش لڑکے نہیں ہیں، ہم تو اللہ کے فرشتے ہیں اور ان کو عذاب دینے کے لیے آئے ہیں۔ پھر لوط علیہ السلام کی گھبراہٹ ختم ہو گئی۔

### آل فرعون کی سرکشی اور اس کا انجام:

﴿وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۖ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا فَأَخَذْنَاهُمْ أَخْذَ عَزِيزٍ مُّقْتَدِرٍ ۝﴾

اور فرعونوں کے پاس ڈر سنانے والی کچھ چیزیں آئی تھیں لیکن ان لوگوں نے ہماری ساری نشانیاں کو جھٹلادیا تھا تو ہم نے ان کو ایسے عذاب دیا جیسے طاقت والا اور قدرت والا عذاب دیتا ہے۔

”النُّذُرُ“ سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پیش کی تھیں۔

### پانچ بڑی اقوام عالم:

پورے قرآن کریم میں بار بار ان پانچ قوموں کا بہت ذکر کیا گیا ہے: قوم لوط، قوم عاد، قوم ثمود، قوم نوح اور قوم فرعون۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ بہت طاقت والے لوگ تھے، پوری دنیا میں ان کی طاقت کی مثال نہیں تھی۔ تو ان اقوام کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ جب ان طاقت وروں کو ہم نے نہیں چھوڑا تو کمزوروں کو مارنا ہمارے لیے کیا مشکل ہے؟!

﴿اَكْفَارُكُمْ خَيْرٌ مِنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ نَكُمُ بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ ۝ اَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُنْتَصِرُونَ ۝﴾

آپ ان سے پوچھیں کہ کیا تمہارے کافران گزشتہ لوگوں سے بہتر ہیں؟ یا تمہارے بارے میں کسی آسمانی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ تمہیں عذاب نہیں ہوگا؟ یا

ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ہم طاقت والے ہیں، ہم اپنا بچاؤ کر لیں گے؟!  
تو کیا تمہارے اندر کوئی خاص فضیلت کی چیز ہے کہ ان قوموں کو تو ہلاک کیا  
لیکن تمہیں ہلاک نہیں کریں گے!؟

﴿سَيَهْرَمُ الْجَمْعُ وَيُولُونَ الدُّبُرَ ۝۲۵﴾

ایک وقت آئے گا کہ ان کی پوری جماعت کو شکست ہوگی، اور یہ غزوہ بدر  
اور احزاب میں ہوا تھا، اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

﴿بَلِ السَّاعَةِ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَذْهَىٰ وَأَمْرٌ ۝۲۶﴾

صرف یہی نہیں ہوا کہ ان کو دنیا میں شکست کا سامنا کرنا پڑے گا بلکہ ان کے  
وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور قیامت بہت زیادہ خوفناک بھی ہے اور بہت کڑوی  
بھی ہے۔

﴿يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُقُوا مَسَّ سَقَرٍ ۝۲۸﴾

جس دن ان کو منہ کے بل آگ میں گھسیٹا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ  
اب جہنم کا عذاب چکھو!

﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ۝۲۹﴾ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ۝۳۰﴾

ہم نے ہر چیز کو ناپ تول کر پیدا کیا ہے اور ہم جب فیصلہ کرتے ہیں تو ہمارا  
حکم ایسے ہوتا ہے کہ پلک جھپکنے میں عمل میں آجاتا ہے۔

”قَدَرٌ“ سے مراد تقدیر ہے۔ تقدیر علم الہی اور امر الہی دونوں کے مجموعے کا  
نام ہے۔

﴿وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا أَشْيَاءَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدْكِرٍ ۝۳۱﴾

ہم نے تم جیسے کئی لوگ پہلے ہلاک کر دیے تھے۔ کیا اس سے عبرت حاصل



والا کوئی ہے؟

﴿وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ۝۲۷ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُسْتَطَرٌّ ۝۲۸﴾

اور ان کافروں نے جو جو کام کیے ہیں یہ سب کام اعمال نامے میں لکھے ہوئے ہیں، ہر چھوٹی بڑی بات سب لکھی ہوئی ہے۔

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ ۝۲۹ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ

مُقْتَدِرٍ ۝۳۰﴾

اور متقین باغات اور نہروں میں ہوں گے، طاقت والے بادشاہ کے ہاں اچھے مقامات پر ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی انہیں میں شامل فرمالے۔ آمین

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الرحمن

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝﴾

سورة القمر میں کفار کے لیے جہنم کے عذاب کا ذکر تھا، اب اس سورة میں ایمان والوں کے لیے نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

لفظ رحمن سے سوت کے آغاز کی وجہ:

﴿الرَّحْمٰنُ ۝﴾

مشرکین مکہ میں رحمن کا نام زیادہ معروف نہیں تھا۔ اس لیے اللہ نے رحمن کے نام سے پوری سورت نازل فرمائی اور اس کا آغاز بھی لفظ رحمن سے کیا ہے۔ مشرکین خود کہا کرتے تھے: ”مَا الرَّحْمٰنُ؟“ کہ رحمن کیا ہے؟ تو اللہ نے پوری سورت اسی نام سے نازل فرمائی۔

قرآن سب کو سکھنا چاہیے:

﴿عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۝﴾

رحمن نے قرآن سکھایا ہے۔ ”عَلَّمَ“ باب تفعیل سے ہے جس کے دو مفعول ہوتے ہیں۔ ایک مفعول کا ذکر کیا اور دوسرے کا نہیں۔ مطلب کہ جو سکھایا ہے

اس کا ذکر تو ہے اور جس کو سکھایا ہے اس کا ذکر نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہر کسی کو پتا ہے کہ قرآن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے۔ تو متعلم اول حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہیں... یا اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ قرآن کریم کی تعلیم ہر کسی کو دینی ہے اس لیے اس کا مفعول بہ ذکر نہیں فرمایا، یہ بتانے کے لیے کہ قرآن کریم ہر کسی کو سیکھنا چاہیے۔

**اللہ کی نعمتیں:**

﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۖ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۖ﴾

اللہ نے انسان کو پیدا فرمایا، پھر اس کو بولنا سکھایا۔

یہاں پہلے تخلیق کا ذکر ہے اور اس کے بعد تعلیم کا ذکر ہے لیکن جب ذکر فرمایا تو تعلیم پہلے اور تخلیق بعد میں ذکر کی، یہ بتانے کے لیے کہ تخلیق سے مقصود یہ ہے کہ بندہ دین سیکھے اور اس پر عمل کرے۔

﴿الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يُحْسَبَانِ ۖ﴾

سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ متعین ہیں۔ صدیوں سے چل رہے ہیں، نہ تھکتے ہیں اور نہ ہی جگہ بدلتے ہیں، یہ ایک انداز سے چل رہے ہیں۔

﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۖ﴾

نجم بھی درخت کو کہتے ہیں اور شجر بھی درخت کو کہتے ہیں لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ شجر سے مراد ہے ایسا درخت جس کا تنا ہو اور نجم سے مراد ایسا درخت ہے جس کا تنا نہ ہو۔ جس طرح انگور وغیرہ کی بلیں ہوتی ہیں جن کا تنا نہیں ہوتا۔ تو بغیر تنے اور تنے والے درخت اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہاں سجدے سے مراد حقیقی سجدہ نہیں ہے جیسے انسان کرتا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ تکویناً اطاعتِ خداوندی پر

مامور ہیں۔ اسی کو سجدے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ﴾

آسمان کو اللہ نے بلند کیا۔ پھر اللہ نے میزان رکھا ہے۔

میزان سے مراد ظاہری ترازو نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہر وہ آلہ ہے کہ جس سے کسی چیز کو تولاجائے یا ناپاجائے، جس کی ایک صورت ترازو بھی ہوتی ہے۔

﴿أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ﴾

اللہ نے میزان بنایا تاکہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو۔

﴿وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ﴾

اور انصاف کا خیال کرو ناپ تول میں اور کبھی کمی نہ کرنا۔

یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اصل ہے عدل۔ عدل سے کبھی نہ ہٹنا اور تمام چیزوں میں عدل بنیاد ہوتا ہے۔ عدل سے ہٹ جائیں تو پھر ظلم ہوتا ہے۔

﴿وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ﴾

﴿الْأَكْمَامِ﴾

اور خدا نے زمین پھیلائی ہے لوگوں کے لیے، اس میں میوے ہیں اور ایسے کھجور کے درخت ہیں جن کا پھل غلاف میں ہوتا ہے۔

﴿وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ﴾

اور کئی طرح کے غلے ہیں جن میں بھوسہ بھی ہوتا ہے اور کھانے کے لیے دانے بھی ہوتے ہیں جیسے گندم، مکئی، چاول وغیرہ۔ اللہ نے کیسا نظام بنایا۔ گندم کا دانہ دیکھ لیں کہ کیسے محفوظ ہوتا ہے؟! چاول دیکھ لیں تو کیسے محفوظ ہے؟! مکئی دیکھ لیں کیسے محفوظ ہے?! اسے محفوظ بنا کر اللہ پھر بندے کے حوالے کر دیتے ہیں۔

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾ (۱۳)

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ (۱۴)

صلصال کہتے ہیں اس مٹی کو جو پانی میں ہو اور پھر خشک ہو جائے اور فخر کہتے ہیں کہ مٹی پانی میں ہو اور پھر وہ آگ پر تپا دی جائے۔ تو اللہ پاک نے انسان کو پیدا فرمایا صلصال یعنی ایسی مٹی سے جو پانی میں ملی تھی اور اس کے بعد وہ مٹی ایسی سخت ہوئی جیسے آگ پر پکائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے نرم ہوتی تھی بعد میں سخت ہو گئی۔

﴿وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارٍ مِنْ نَارٍ﴾ (۱۵)

اور جنات کو پیدا کیا خالص آگ سے یعنی ایسی آگ سے جس میں دھوئیں کی آمیزش نہ ہو، اس آگ سے جنات کو پیدا کیا۔

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾ (۱۶)

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟! اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے کہ خدا نے مٹی سے کتنا خوبصورت انسان بنایا۔

﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ (۱۷)

سورج گرمی میں الگ جگہ سے طلوع ہوتا ہے اور سردی میں الگ جگہ سے طلوع ہوتا ہے۔ تھوڑا تھوڑا جگہوں کا فرق ہے، اس لیے مشرقین اور مغربین فرمایا۔

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾ (۱۸)

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ یہ بھی اللہ کی کتنی بڑی نعمت

ہے؟!

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ﴿١٩﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ﴾ (۱۹)

اللہ دوسمندر چلاتے ہیں جو آپس میں ملے ہوتے ہیں اور ان کے درمیان ایک پردہ ہوتا ہے اور پردہ اس طرح ہوتا ہے کہ ایک سمندر دوسرے میں داخل نہ ہو۔

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟! یہ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے، آدمی پڑھ تو سکتا ہے لیکن جب تک خود نہ دیکھے صحیح مزا نہیں آتا۔ سمندری سفر نہ کرے، سمندروں میں نہ جائے تو مزا نہیں آتا۔

﴿يَخْزِبُهُمْنَهَا اللَّوْؤُ وَالْعَرَبَانُ﴾

ان دونوں سمندروں سے موتی اور مونگا نکلتا ہے۔  
موتی اور مونگا دونوں قیمتی ہیں جو اس سے نکلتے ہیں۔

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟!

﴿وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنشَئَاتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ﴾

اور اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں وہ بڑے بڑے جہاز ہیں جو سمندروں میں ایسے کھڑے ہوتے ہیں جیسے پہاڑ ہوں۔

﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟!

**سمندر؛ خدائی قدرت کا کرشمہ**

اللہ کی کتنی بڑی قدرت ہے! اور آپ یقین فرمائیں کہ جب تک بندہ سمندری سفر نہ کرے ان چیزوں کو مانتا تو ہے لیکن دلی یقین نہیں آتا۔ عجیب نعمت ہے۔ پانی کے

اوپر انسان تیر رہا ہے، پانی کے اوپر بندہ کھیل رہا ہے اور اتنے بڑے بڑے جہاز ہیں کہ ہمارے گاؤں جیسے دس گاؤں ہوں تو ایک جہاز میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ ایک بحری بیڑا بناتے ہیں جس پر سو سو جنگی جہاز ہوتے ہیں، اترتے ہیں، جاتے ہیں، اترتے ہیں، جاتے ہیں، ایک ایک جہاز میں چھ چھ ہزار بندہ بیٹھا ہوتا ہے اور دو دو ماہ اس نے پانی میں چلنا ہوتا ہے اور پھر چھ ہزار بندوں کی خوراک ساتھ ہے۔ پھر جہازوں میں پورے گراؤنڈ بنے ہوئے ہوتے ہیں، فٹبال اس پر کھیل رہے ہوتے ہیں اور ایک ایک بندے کا الگ الگ کمرہ ہوتا ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ اب یہاں یہ بات سمجھ نہیں آتی جب تک بندہ سفر نہ کرے۔ دنیا میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو سمندر میں سیر کے لیے جاتے ہیں، موبائل بند کیا بیوی بچے ساتھ لیے اور سمندر میں چلے گئے، ہفتہ ہفتہ سمندر میں رہتے ہیں اور سیر کرتے رہتے ہیں۔ اللہ پاک آپ کو بھی دین کی وجہ سے ایسے اسفار عطا فرمائیں۔ پھر یہ نعمتیں دیکھیں۔ دین کی برکت سے جب یہ چیزیں بندہ دیکھتا ہے تو عجیب سرور محسوس کرتا ہے۔

### منتقلہ اسلام کا سمندری سفر:

ابھی ہم ملائیشیا میں تھے۔ میں جب بھی بیرون ملک جاتا ہوں اور اپنے معمولات سے جب فارغ ہوتا ہوں تو پھر خواہش ہوتی ہے کہ سیر کریں۔ اس دفعہ ہم گئے تو ایک سمندر تھا، وہاں ہم گئے، اس کے ساحل کا نام Monkey Beach تھا۔ بندر کو کہتے ہیں Monkey اور ساحل کو کہتے ہیں Beach۔ وہاں بندر بہت تھے۔ ہم ایک جگہ سے گزرے، آگے جانا تھا تو ہم نے کشتی بک کرائی۔ جب ہم بیٹھے تو ہمارے ساتھ ایک فیملی بھی بیٹھ گئی، وہ غالباً ہندو تھے۔ جب ہم بیٹھے تو ایک عورت تھی اس نے کہا کہ ہم ان کے ساتھ نہیں بیٹھیں گے۔ ہمارے ساتھی سادہ تھے، جلدی سے اتر گئے حالانکہ جو چلانے والا تھا اس نے اس فیملی سے کہا کہ اگر تم ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتے

تو تم اتر جاؤ کیونکہ یہ لوگ تو پہلے کھڑے تھے لیکن ہمارے ساتھیوں نے جلدی کی۔ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں عجیب حکمت ہوتی ہے۔ جس جہاز میں ہم پہلے جانے لگے تھے وہ جہاز چھوٹا تھا اور اس کی سیٹیں بھی سوزوکی کی سیٹوں کی طرح تھیں، باہر سے پانی آتا تو گندگی وغیرہ اندر آتی۔ خیر ہم اس سے اتر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ایک اور جہاز آیا تو وہ بڑا تھا اور اس کی سیٹیں بھی کرسیوں کی طرح تھیں اور صاف بھی تھا، بڑا مزا آیا۔ ساتھی مجھے کہنے لگے کہ استاد جی! آپ کے ساتھ اللہ کا عجیب نظام چلتا ہے، چھوٹے جہاز سے اتارا اور بڑے اور اچھے جہاز میں بٹھایا۔ پھر وہاں سے ہم سیر کے لیے گئے۔ یہ میں اس لیے بتاتا ہوں کہ اگر اللہ بندے کو مواقع دے تو بندے کو جانا چاہیے۔

ایک مرتبہ میں کوالا الپور سے کلنٹن گیا تو گھر والے میرے ساتھ تھے۔ میں نے میزبانوں سے کہا بھائی! کیا پروگرام بنایا ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ تھوڑی دیر آرام کریں، کھانا کھالیں تو عصر سے پہلے اٹھیں گے، عصر کی نماز کے بعد جائیں گے ساحل پر سیر کرنے کے لیے۔ میں نے کہا کہ عصر کے بعد کیوں جانا ہے؟ صبح چلیں گے! تو انہوں نے کہا کہ عصر کے بعد گید رنگ ہوتی ہے، بہت مزا آتا ہے۔ گید رنگ رش کو کہتے ہیں۔

وہ تو کہنے لگے رش میں بہت مزا آتا ہے۔ میں نے کہا کہ بھائی! گید رنگ میں تو وہ جائے جس نے دوسرے کی بیوی دیکھنی ہو، مجھے تو گید رنگ میں نہیں جانا کیونکہ میری بیوی میرے ساتھ ہوگی، میں نے تو اپنی بیوی کو دیکھنا ہے۔ وہ لوگ اس پر بہت ہنسے اور ایک دوسرے کو یہ سناتے رہے۔

میں نے کہا: ہم صبح فجر کی نماز کے بعد جائیں گے، فجر کی نماز کے بعد ساحل سمندر پر کوئی شخص نہیں ہوتا، ساحل خالی ہوتا ہے اور ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں، عصر کے بعد لوگ آتے ہیں سیر کرنے کے لیے تو گناہوں کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے اور فجر



کے بعد یہ لوگ سو رہے ہوتے ہیں اور سمندر بالکل صاف ہوتا ہے، فضا میں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی یہ نعمتیں دکھائے۔ آمین

### اللہ کی دو اہم صفات؛ ذوالجلال والا کرام

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٦٦﴾ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ﴿٦٧﴾﴾

ہر چیز جو زمین پر ہے وہ ختم ہو جائے گی اور صرف اللہ کی ذات رہ جائے گی۔

”وَجْهُ رَبِّكَ“ سے مراد اللہ کی ذات ہے۔ زمین و آسمان سب ختم ہو جائیں

گے لیکن چونکہ پہلے تذکرہ زمین کا تھا اس لیے فرمایا کہ زمین کی ہر چیز فنا ہو جائے گی۔

”ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ“... یہ ذوالجلال اللہ کی ذاتی صفت ہے اور ذو

الاکرام اللہ کی اضافت والی صفت ہے۔ ذوالجلال سے مراد ہے عزت والے اور ذو

الاکرام سے مراد ہے احسان والے۔ احسان تو دوسروں پر ہوتا ہے اس لیے یہ اضافی

صفت ہے۔ اللہ عظمت والے بھی ہیں اور احسان بھی کرتے ہیں... اور یہ دو صفیں اللہ

کی اکٹھی کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر جو لوگ عظمت والے ہوتے ہیں وہ

احسان کا خیال نہیں کرتے تو یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کی ذات وہ ہے جو عظمت والی

بھی ہے اور احسان والی بھی ہے۔

### عظیم لوگوں کو صاحب احسان ہونا چاہیے:

میں نے جب اس آیت کی تفسیر پڑھی تو یقین کریں مجھے بہت مزا آیا۔ ایک

بات میں معاشرے میں دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ جو شخصیات ہوتی ہیں، جن کا

معاشرے میں قد کاٹھ ہوتا ہے وہ دائیں بائیں کسی کا خیال نہیں کرتے۔ ان کا مزاج ہوتا

ہے کہ کسی کو ضرورت ہو تو ہمارے پاس آجائے اور ضرورت نہ ہو تو نہ آئے کیونکہ یہ

بہت بڑے آدمی ہیں۔ میں جو بات کہنا چاہتا ہوں اللہ کرے وہ بات آپ کی سمجھ میں آ

جائے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عام طور پر جو عظمت والے لوگ ہیں وہ احسان نہیں کرتے، اللہ کی ذات ایسی ہے کہ جو عظمت والی بھی ہے اور احسان والی بھی ہے۔

### چھوٹوں پر شفقت کریں!

آپ کسی علاقے میں جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ جو وہاں بڑے لوگ ہوتے ہیں دین کے اعتبار سے یا دنیا کے اعتبار سے خواہ کسی اور اعتبار سے... مثلاً بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں خاندانی وجاہت ہوتی ہے، پر دادا پیر تھا، پھر دادا پیر تھا، پھر باپ پیر تھا، پھر اب بیٹا پیر ہے، یوں ایک نسل آرہی ہے تو وہ اس علاقے کی روحانی گدی شمار ہوتی ہے، روحانی شخصیت شمار ہوتی ہے، قوم میں ان کا بہت بڑا احترام ہوتا ہے، ان کی عظمت بہت ہوتی ہے... لیکن وہ دوسروں کا خیال نہیں کرتے کہ کوئی اس علاقے میں غریب ہے تو اس کی مدد کر دیں، کوئی بے دین ہے تو اس کو دین پر لائیں، کوئی مصیبت میں ہے تو اس کی مصیبت دور کر دیں! نہیں بس وہ اسی میں مست ہوتے ہیں کہ ہم بہت بڑے لوگ ہیں۔

تو اللہ تو عظمت والے بھی ہیں اور اکرام والے بھی ہیں۔ اگر اللہ پاک دنیا میں کسی کو ظاہری عظمت عطا فرمادیں تو عظمت کے ساتھ پھر احسان والی صفت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ ہمیں تو بہت ڈر لگتا ہے کہ جو عظمت والے ہیں ان کا کھانا الگ ہوتا ہے، رہنا الگ ہوتا ہے، پینا الگ ہوتا ہے حتیٰ کہ ان کے ساتھ جو چلنے والے ہیں وہ بھی ان نعمتوں کو نہیں کھا سکتے۔ ڈرائیو ساتھ ہو گا، خادم ساتھ ہو گا اور لوگ ساتھ ہوں گے لیکن ہر پل محسوس ہو گا کہ یہ بڑے ہیں اور یہ چھوٹا ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے، اللہ ہم سب کو محفوظ رکھے۔

## متکلم اسلام کی شفقت کے چند واقعات:

[۱]: ہمارے ساتھ یہ چلتے ہیں بھائی نعیم اللہ ڈرائیور وغیرہ تو ضرورت ہو تو بتانا پڑتا ہے کہ یہ ڈرائیور ہے لیکن ویسے معمول کے مطابق اتریں تو کئی پوچھتے ہیں کہ یہ آپ کا بیٹا ہے؟ آپ دیکھیں اس کا کپڑا میرے کپڑے سے قیمتی ہوتا ہے، اس کا جو تا میرے جوتے سے قیمتی ہوتا ہے، میں چائے بہت کم پیتا ہوں... مجھے چائے کا شوق نہیں ہے، ہاں اگر مجلس کے لوگ ہیں اور چائے آگئی تو پی لی، بوتل آگئی تو پی لی، باقی میرا ذوق چائے کا نہیں ہے... لیکن صرف اپنے ڈرائیور کی وجہ سے میں چار چار مرتبہ چائے بنواتا ہوں اور فون پہ کہتا ہوں کہ بھائی! خالص دودھ ہو، اس میں پتی ڈالو، چینی اور پانی الگ رکھنا ہے... وہ ہم خود ڈالیں گے۔ اس کی وجہ کہ یہ ایسی چائے پیتا ہے جس میں دودھ ہو، پتی ہو لیکن چینی نہ ہو، اس کی وجہ سے میں آرڈر دیتا ہوں تو اس کو مزے کی چائے ملتی ہے۔ یہ میں اس لیے نہیں بتا رہا کہ میں بہت اچھا کام کر رہا ہوں بلکہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

[۲]: ابھی پرسوں ہم ڈیرہ اسماعیل خان سے واپس آرہے تھے۔ میں نے سلا نوالی جانا تھا۔ میانوالی سے گزر رہے تھے تو راستے میں ہمارے ایک ساتھی تھے خوشاب کے امیر مولانا فیصل صاحب... ان کو میں نے فون کیا۔ میں نے کہا کہ وقت بہت کم ہے، مدرسے میں نہیں آسکتے۔ انہوں نے کہا کہ قریب آکر رابطہ کریں تو میں سڑک پر آکر مصافحہ کر لوں گا۔ پھر میں نے بھائی نعیم اللہ سے پوچھا چائے پینی ہے؟ کہا کہ جی! پینی ہے۔ میں نے کہا کہ وقت بہت تھوڑا ہے، کوئی طریقہ ایسے بنائیں کہ چلتے چلتے پی لیں گے! کہا کہ چلیں استاد جی پھر رہنے دیں! میں سمجھ گیا کہ پینی ہے۔ بس پھر میں رہنے نہیں دیتا۔ میں نے پھر مولانا فیصل صاحب کو فون کیا کہ ہم نے چائے پینی ہے خالص دودھ میں پتی ڈالنی ہے، چینی نہیں ڈالنی، اس کی کوئی ایسی ترتیب بنائیں کہ وقت بھی بچ

جائے اور چائے بھی پی لیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔

روڈ کے اوپر ان کا مدرسہ ہے، ایک گیٹ روڈ پر ہے اور ایک اندر ہے۔ کہنے لگے کہ سڑک والا گیٹ عموماً نہیں کھلتا، ہم سڑک والا گیٹ کھول دیں گے، گیٹ کھلتے ہی ساتھ کمرہ ہو گا وہاں بیٹھ کر چائے پی لیں گے۔ میں نے کہا کہ جب میں آؤں تو دستر خوان لگا ہو۔ اب دودھ پتی چائے پڑی ہے... چینی ساتھ پڑی ہے... سمو سے پڑے ہیں... گجر پلا پڑا ہے۔ یہ میں نے اپنے لیے مانگا کیونکہ اگر میں اپنے لیے نہ مانگتا اور کہتا کہ ڈرائیور نے چائے پینی ہے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ ایک کپ چائے ہوتا۔ تو بسا اوقات صرف ان کو چائے پلانے کے لیے اپنے لیے چائے کا آرڈر دیتا ہوں اور پھر اتنی اچھی ہوتی ہے کہ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں بھی پی لوں۔

تو میں نے اس لیے کہا کہ بندہ عظمت والا تو ہوتا ہے لیکن اکرام والا نہیں ہوتا۔ حدیث پاک میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَلْظُؤُاِیْبَاذَا الْجَلَالِ وَالْإِکْرَامِ۔<sup>200</sup>

کہ اس لفظ کو لازم پکڑو یعنی جب دعائیں مانگو تو یہ کہا کرو ”یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِکْرَامِ“ اس سے اللہ رب العزت دعائیں قبول فرما لیتے ہیں۔

بس اپنے کام میں برکت چاہتے ہو تو اپنے سے چھوٹوں سے معاملہ ٹھیک رکھو پھر یہ محبتیں دیکھنے والی ہوتی ہیں، بڑا کوئی تمہیں پیار نہیں دے گا، چھوٹے تمہیں پیار دیں گے۔

[۳]: پرسوں جب ہم پہاڑ پور بیان کے لیے گئے تو میرے ساتھ مولانا مصطفیٰ خلیل صاحب تھے۔ وہ کہنے لگے استاذ جی! یہاں لوگ کھڑے ہیں، یہ آپ سے وقت لینا

چاہتے ہیں۔ میں نے کہا: گاڑی روکو لیکن وقت نہیں دیں گے کیونکہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ گاڑی روکی تو وہ دوڑ کر آئے، ملے، حال حوال کیا۔ انہوں نے کہا کہ استاد جی! یہاں قریب مسجد ہے تو ہم چاہتے ہیں کہ آپ سنگ بنیاد رکھیں۔ میں نے کہا کہ وقت بہت کم ہے، میں نے آگے جانا ہے، میرا سفر بہت لمبا ہے، آپ ناراض نہ ہوں، ان شاء اللہ اس سے اگلے سفر میں ملیں گے۔

خیر ہم آگے چلے گئے۔ بیان سے فارغ ہوئے تو مجھے مفتی عبدالواحد قریشی صاحب نے کہا استاد جی! یہاں ایک بہت بڑے عالم تھے فوت ہو گئے ہیں، اب ان کے بچے ہیں وہ مسجد کا سنگ بنیاد آپ سے رکھوانا چاہتے ہیں۔ پہلے مجھے اس بات کا پتا نہیں تھا۔ میں نے کہا چلو! وہاں گئے، والد صاحب ان کے فوت ہو گئے تھے، ان کا بیٹا کوئٹہ میں درجہ سادسہ میں پڑھ رہا تھا، اس سال نہیں گیا کیونکہ مدرسہ سنبھالنا ہے۔ ہم گئے، دعا کی اور پتھر رکھا۔ مفتی صاحب نے انہیں پہلے سے کہا تھا کہ استاد جی رکیں گے نہیں، صرف پتھر رکھیں گے اور فوراً نکلیں گے۔

وہ لڑکا میرے ساتھ چل رہا تھا، بڑی منت کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ دو منٹ دو منٹ تشریف رکھیں! کیونکہ اس علاقے میں اہل بدعت بہت ہیں، آپ کے یہاں بیٹھنے سے سے میری عزت بڑھے گی۔ مفتی صاحب سے میں نے کہا کہ چلو پانچ منٹ سے کیا ہوتا ہے۔ ہم بیٹھے، تھوڑا سا بیان کیا اور دعا کی۔ انہوں نے دسترخوان پھر بچھا دیا۔ میں نے کہا کہ اب بیٹھ جاؤ یہ خوش ہو جائیں گے۔ جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو مجھے مفتی صاحب نے دو ہزار روپے دیے، مجھے یقین ہو گیا کہ ان غریبوں نے دیا ہو گا کہ ان کو ہدیہ دے دو۔

اب یہ چھوٹے تھے تو دیکھو محبت بھی دی ہے، پھل بھی کھلایا ہے، دو ہزار روپے بھی دیے ہیں اور وہ کتنے خوش ہوں گے کہ ہمارے پاس رکے۔ اس لیے اپنے

سے چھوٹوں سے محبت کرو، پھر اللہ کی عنایات دیکھو کیسے آتی ہیں؟!

﴿يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَاْنٍۙ﴾

اللہ سے آسمان والے اور زمین والے اپنی ضرورتیں مانگتے ہیں، سب اسی کے مسائل ہیں ہر دن اللہ کی ایک نئی شان ہے۔

یوم سے مراد وقت ہے کہ اللہ ہر روز اور ہر وقت ایک نئی شان میں ہوتے ہیں، کسی کو کچھ دے رہے ہیں کسی کو کچھ دے رہے ہیں۔

﴿سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيَّهٖ الثَّقَلَيْنِۙ﴾

ایک وقت آئے گا اے جنو اور انسانو! کہ جیسے ہم تمہارے لیے فارغ ہو گئے ہیں... کیا مطلب؟ کہ قیامت کا دن آئے گا، حساب کتاب کا دن آئے گا۔

اللہ رب العزت کو ایک کام کرنے کے لیے دوسرے کام سے فارغ ہونے کی ضرورت نہیں ہے لیکن بندہ جب سارے کام چھوڑ کر ایک کی طرف توجہ کرے تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ یہ کام بہت اہم ہے۔ تو یہ بات مخاطب کی عقل کی رعایت رکھتے ہوئے اس انداز میں اس لیے فرمائی ہے کہ تاکہ مخاطب کو بات سمجھ آ جائے کہ ایک وقت آنے والا ہے جس میں حساب کتاب ہو گا اور کوئی کام نہیں ہو گا۔

﴿فَبِاَيِّ آلَاٰءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِۙ﴾

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟!

یہاں سوال یہ ہے کہ حساب کتاب کی خبر دینا یہ نعمت کیسے ہے؟ جواب یہ ہے کہ نعمت ہی تو ہے کہ اللہ نے آنے والے احوال کی تمہیں خبر دے دی ہے۔ اگر دشمن ہمارے اوپر حملہ کرنے والا ہو اور کوئی بندہ اتنا بتا دے کہ تمہارے اوپر حملہ ہونا ہے تو ہم اس کے کتنے احسان مند ہوتے ہیں کہ یار اس نے ہمیں بتا دیا۔ تو یہاں اللہ بتا رہے ہیں کہ ایسا ہونا ہے کہ تمہارا حساب کتاب ہو گا۔ میں پہلے بتا رہا ہوں تاکہ تم اس کی

تیار کر۔ تو یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

﴿يَمْعَشَرُ الْحَجْنَ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَنِ ۖ﴾

اے جن اور انس! اگر تم آسمان اور زمین کی حدود سے نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ، لیکن یہ نکلنا بغیر طاقت کے نہیں ہے اور طاقت تمہارے پاس ہے نہیں تو تم کیسے نکلو گے؟

﴿يُزْسَلُ عَلَيْكُمْ شَوَاطِئُ مِّنْ نَّارٍ ۖ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرُونَ ۖ﴾

تم پر آگ کا شعلہ بھی چھوڑا جائے گا اور دھواں بھی چھوڑا جائے گا، پھر تم مقابلہ بھی نہیں کر سکو گے!

شواظ کہتے ہیں آگ کے شعلہ کو اور نحاس کہتے ہیں دھوئیں کو۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ شواظ آگ کا وہ شعلہ ہے جس میں دھواں نہ ہو اور نحاس وہ دھواں ہے جس میں آگ کا شعلہ نہ ہو۔ یہ دونوں قسم کے عذاب ہوں گے، کبھی شعلہ بھی ہو گا اور دھواں بھی ہو گا، کبھی صرف آگ ہو گی اور دھواں نہیں ہو گا اور کبھی صرف دھواں ہو گا اور آگ نہیں ہو گی۔ یعنی ہر قسم کے عذاب ہوں گے۔

**آسمان سرخ ہو جائے گا:**

﴿فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۖ﴾

جب آسمان پھٹ جائے گا تو یہ ایسے سرخ ہو جائے گا جیسے سرخ رنگا ہوا چمڑا ہوتا ہے۔ اس لیے اس وقت سے ڈرو۔ یہ ایسا سرخ ہو گا جس طرح لوہا تپ کر سرخ ہو جاتا ہے۔

﴿فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ ۖ﴾

اللہ کو سب چیزیں معلوم ہیں، اللہ تحقیقِ حال کے لیے بندوں سے نہیں پوچھیں گے۔ جو پوچھیں گے وہ صرف دھمکانے کے لیے تاکہ اپنے اوپر خود گواہی دیں۔ یہ جو معنی کہ اللہ بندوں اور جنات سے ان کے گناہوں کے بارے میں پوچھیں گے ہی نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی، بغیر پوچھے تمہیں عذاب دے سکتے ہیں لیکن جو پوچھیں گے تو وہ صرف تہدید اور ڈرانے کے لیے اور حجت تام کرنے کے لیے۔

### مجرمین کا واصل جہنم ہونا:

﴿يَعْرِفُ الْمَجْرِمُونَ بِسَيِّئِهِمْ فَيُؤْخَذُ بِالْأَوَاصِي وَالْأَقْدَامِ﴾

وہاں تو پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی، جتنے مجرم ہوں گے ان کی نشانیوں سے پتا چلے گا، پھر ان مجرموں کو سر کے بالوں اور پاؤں سے پکڑا جائے گا۔ فرشتے پیشانی اور قدموں سے گھسیٹ گھسیٹ کر جہنم میں پھینکیں گے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

﴿هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمَجْرِمُونَ﴾

﴿يَتُوفُونَ فِيهَا﴾

اور کہا جائے گا کہ یہی وہ جہنم ہے جس کا مجرم انکار کرتے تھے۔ یہ جہنم اور گرم پانی کے درمیان چکر لگاتے ہوں گے۔

﴿وَلَمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ﴾

جنتی دو قسم کے ہیں؛ ایک ہیں مقررین اور ایک ہیں اصحاب الیمین۔ اصحاب الیمین سے مراد عام جنتی ہیں اور مقررین سے مراد خاص جنتی ہیں۔ خواص و عوام اللہ نے دونوں کے لیے جنت اور باغات کا ذکر کیا ہے۔ پہلے خواص کے باغات کی بات کی



ہے پھر عوام کے باغات کی۔ دونوں میں فرق کیا ہے؟ وہ بھی ساتھ ساتھ سمجھیں:

### مقربین کے انعامات:

﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٌ﴾ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتے ہیں ان کے لیے دو باغات ہوں گے۔ کون سے؟ ﴿ذَوَاتَا أَفْنَانٍ﴾ جو بہت شانوں والے ہوں گے۔ اس کا معنی ہے کہ بہت گھنے ہوں گے۔ ﴿فِيهِمَا عَيْنَاتٌ تَجْرِيْنَ﴾ ان میں جاری چشمے ہوں گے۔ ﴿فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٌ﴾ ان باغوں میں ہر قسم کے پھل ہوں گے اور دو دو قسم کے ہوں گے، ﴿مُتَّكِئِينَ عَلَى فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ﴾ اور وہ ایسے پھونوں پر بیٹھے ہوں گے جو اندر سے ریشم کے ہوں گے۔ اندازہ کریں کہ جب اندر والی طرف ریشم کی ہے تو اوپر والی طرف کیسی ہوگی۔

جب بھی کوئی بندہ فرش پر کوئی چیز بچھاتا ہے تو بیٹھنے کے لیے تو نیچے موٹا کپڑا ہوتا ہے اور اوپر پتلا اور خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کی جو اندرونی تہ ہوگی وہ ریشم کی ہوگی تو اوپر کتنا خوبصورت ہوگا اس کا اندازہ تم خود کرو، ﴿وَجَنَّاتُ الْجَنَّةِ دَانٍ﴾ اور ان باغات کے پھل بہت قریب جھکے ہوئے ہوں گے، ﴿فِيهِنَّ قُصْرٌ لِّلِطَّرَفِ لَّمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ﴾ ان باغات میں حوریں ہوں گی جو آنکھیں جھکائے ہوئے ہوں گی، یہ ایسی ہوں گی کہ کوئی انسان اور جن ان کے قریب بھی نہیں گیا ہوگا، ﴿كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ﴾ یا قوت اور مرجان کی طرح سرخ ہوں گی، خوب صورت ہوں گی، ﴿هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ﴾ ہمارا ضابطہ ہے کہ اچھی چیز کا بدلہ بھی ہم اچھا دیتے ہیں۔

## اصحاب الیمین کے انعامات:

﴿وَمِنْ دُونِهِمَا جَنَّتَيْنِ﴾

اور دو باغات ان سے کم درجے کے ہوں گے۔ دون سے مراد یہ ہے کہ وہ مقررین کے باغات تھے اور یہ اب عام جنت والوں کے باغات ہیں۔

﴿مُدَّهَامَّتَيْنِ﴾

یہ باغات گہرے سبز ہوں گے۔

﴿مُدَّهَامَّتَيْنِ﴾ کو میں عموماً پیش کرتا ہوں اپنے اوپر ایک اعتراض کے جواب میں۔ ابھی میں ڈی آئی خان میں تھا تو مجھے ایک چٹ آئی کہ پہلے آپ کی ڈاڑھی سفید ہوتی تھی اور اب آپ کی ڈاڑھی سیاہ ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ میں نے کہا کہ سیاہ نہیں ہے تمہیں دیکھنے میں دھوکہ لگ رہا ہے، یہ ڈارک براؤن ہے، ایک ہوتا ہے براؤن جو گہرا نہ ہو اور ایک ہوتا ہے ڈارک براؤن جو گہرا ہو۔

یہ رنگ اتنا گہرا براؤن ہے کہ دیکھنے میں سیاہ لگ رہا ہے۔ جس طرح قرآن کریم میں ہے: ﴿مُدَّهَامَّتَيْنِ﴾ جنت کے یہ دو باغ اتنے سبز ہوں گے کہ دیکھنے میں سیاہ لگیں گے۔ تو جس طرح سبز اتنے ہوں گے کہ دیکھنے میں سیاہ لگیں گے تو یہ بھی براؤن اتنی ہے کہ دیکھنے میں سیاہ لگتی ہے لیکن ہے نہیں۔ اس لیے آپ کی آنکھ کا قصور ہے، ہماری ڈاڑھی کا قصور نہیں ہے۔

﴿فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتَيْنِ﴾ ان دو باغات میں دو چشمے ہوں گے جو ابلتے

ہوں گے، ﴿فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَدُمَّانٌ﴾ اور ان میں پھل ہوگا، کھجوریں ہوں گی اور انار ہوں گے، ﴿فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ﴾ ان باغات میں ایسی عورتیں ہوں گی جو سیرت کے اعتبار سے بھی اچھی ہوں گی اور صورت کے اعتبار سے بھی اچھی

ہوں گی، ﴿حُودٌ مَّقْصُودَةٌ فِي الْخِيَامِ﴾ حوریں خیموں میں چھپی ہوں گی، ﴿لَمْ يَطْبُئْهُمْ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ﴾ یہ حوریں ایسی ہوں گی کہ کوئی انسان اور کوئی جن ان کے قریب بھی نہیں آیا ہوگا۔

﴿مُتَّكِئِينَ عَلَى رَفُوفٍ خُضِرَ وَعَبَقَرِيٍّ حِسَانٍ﴾ جنتی لوگ سبز رنگ کے رُفُوف پر اور خوبصورت فرش پر تکیہ لگا کر بیٹھے ہوں گے۔ رُفُوف کا معنی بھی سبز رنگ کا بچھونا ہوتا ہے اور خُضِرَ مزید اس کی تاکید کے لیے ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ رُفُوف کہتے ہیں کہ وہ چیز جس پر نقش و نگار ہو مثلاً ایسے بستر پر بیٹھے ہوں گے کہ جو سبز رنگ والے بھی ہوں گے اور نقش و نگار والے بھی ہوں گے۔ ﴿عَبَقَرِيٍّ حِسَانٍ﴾ کا معنی کہ نہایت خوب صورت قسم کے کپڑے ہوں گے جن پر یہ جنتی لوگ بیٹھیں گے۔ عبقری خوب صورت ہی کو کہتے ہیں اور حسان اس کی مزید تاکید ہے۔

### خواص اور عوام کے باغات میں فرق:

[1]: اب دیکھیں جو خواص کے باغات ہیں ان کے ذکر میں فرمایا: ﴿ذَوَاتَا أَفْنَانٍ﴾ کہ یہ باغات بہت شانوں والے ہوں گے اور جو اصحاب الیمین یعنی عوام کے باغات ہیں ان کے بارے میں ﴿ذَوَاتَا أَفْنَانٍ﴾ کا ذکر نہیں ہے۔

[2]: خواص کے باغات کے بارے میں فرمایا: ﴿فِيهِمَا عَيْنَانِ تَجَرَيْنِ﴾ اور عوام کے باغات کے بارے میں فرمایا: ﴿فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتَيْنِ﴾ ابلتا تو ہر چشمہ ہے، جو بھی چشمہ ہو گا پانی نکلتا ہے تب ہی تو وہ چشمہ ہوتا ہے لیکن خواص کے چشموں کے بارے میں ﴿تَجَرَيْنِ﴾ فرمایا اور اصحاب الیمین جو عام ہیں اس میں ﴿تَجَرَيْنِ﴾ کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی ان کے چشمے صرف ابلتے ہوں گے اور ان کے چشمے ابلیں گے بھی

اور ان کا فیض بھی بہت دور تک جائے گا۔

[3]: خواص کے لیے فرمایا: ﴿فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٍ﴾ کہ ان کے باغات میں ہر پھل دو دو قسم کا ہو گا اور عوام کے لیے فرمایا: ﴿فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ﴾ کہ ان کے باغات میں میوے ہوں گے، انار ہوں گے، کھجور ہوں گی۔ تو خواص کے لیے ہر قسم کے میوے فرمادیے اور عوام کے لیے چند ایک میووں کے نام لیے ہیں۔ پھر خواص کے لیے ﴿زَوْجٍ﴾ جوڑا جوڑا فرمایا اور عوام کے لیے یہ لفظ نہیں فرمایا۔

[4]: خواص کے متعلق ﴿قَصِيرَتُ الطَّرْفِ﴾ فرمایا کہ وہ عورت ایسی ہوگی جو اپنی نگاہ جھکا کر رکھے گی، اور عوام کے بارے میں فرمایا: ﴿مَقْصُودَةٌ فِي الْخِيَامِ﴾ کہ وہ خیموں میں بند ہوگی۔ دونوں میں فرق کیا ہے کہ جو عام ماحول میں آنکھیں نیچی رکھتی ہو تو وہ خود کو بچانے کے لیے بند کمروں میں کیوں نہیں ٹھہرے گی؟ تو ”قَصِيرَتُ“ میں جو مبالغہ ہے وہ ”مَقْصُودَةٌ“ میں نہیں ہے۔ ایک عورت اپنا خود خیال کرتی ہے اور ایک عورت کا خیال اس کا شوہر کرتا ہے۔ تو دونوں میں کتنا فرق ہے!

ان وجوہات سے معلوم ہو رہا ہے کہ خواص؛ عوام سے بہتر ہیں۔ اللہ ہمیں بھی ان خواص میں شامل فرمائے۔ اللہ ہم سب کو دنیا اور جنت کی نعمتیں عطا فرمائے۔ آمین

وَاجِزٌ دَعَا أَنَا الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الواقعة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۚ لَيْسَ لَوْفَعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۖ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝﴾

فضائل سورت:

امام بیہقی رحمہ اللہ کی کتاب شعب الایمان میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جب مرض الوفا میں تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا: مَا تَشْتَكِي؟ آپ کس چیز کا درد محسوس کرتے ہیں؟ فرمایا: دُنُوِيْجَ۔ کہ میں گناہوں کا درد محسوس کرتا ہوں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس امت کے متواضع ترین شخص ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنات کو دعوت دینے کے لیے تشریف لے گئے تو فرمایا اپنے ساتھ اس شخص کو لے کر جاؤں گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر نہیں ہے۔ ہر صحابی کی نظر تھی کہ کس کو بلائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبد اللہ بن مسعود کو بلاؤ، اور اس امت کا متکبر ترین شخص ابو جہل ہے۔ اللہ رب العزت نے متکبر ترین شخص کو متواضع ترین شخص سے جہنم واصل کروایا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: مَا تَشْتَكِي؟ آپ کس چیز کا درد

محسوس کرتے ہیں؟ فرمایا: دُنُوْیَ۔ گناہوں کا درد محسوس کرتا ہوں۔ فرمایا: کوئی چیز چاہیے آپ کو؟ جیسے بندہ بیمار سے پوچھتا ہے، تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”رَحْمَةُ رَبِّیْ“ مجھے اپنے رب کی رحمت چاہیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”أَلَا نَدْعُوْكَ الطَّبِیْبَ“ کہ ہم کسی طبیب کو بلائیں؟ فرمایا: ”الطَّبِیْبُ أَمْرٌ صَنِیُّ“ مجھے تو میرے طبیب نے ہی بیمار کیا ہے۔ حضرت عثمان نے کہا ”أَلَا أَمْرٌ لَّكَ بِعَطَائِكَ؟“ میں بیت المال سے کچھ رقم بھجوادوں؟ فرمایا: ”فَلَا حَاجَةَ لِّیْ فِیْهِ“ کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عثمان نے کہا کہ آپ کی بچیاں ہیں، آپ کے بعد آپ کی اولاد کے کام آئے گا۔ فرمایا کہ مجھے اولاد کے لیے بھی سیسے نہیں چاہئیں، اس لیے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قَرَأَ الْوَاقِعَةَ كُلَّ لَيْلَةٍ لَمْ يَفْتَقِرْ.<sup>201</sup>

کہ جو شخص رات کو سورت الواقعہ پڑھتا ہے اس پر فاقہ کبھی نہیں آتا۔ اور یہ میں نے اپنی بچیوں کو سکھا دیا ہے، اس لیے مجھے ان کے فاقہ کے بارے میں کوئی خوف اور ڈر نہیں ہے۔

تو سورۃ الواقعہ کے بہت سے فضائل ہیں۔ اس لیے اہتمام کے ساتھ سورت الواقعہ پڑھا کریں۔

**قیامت کی ہولناکی کا بیان:**

﴿إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۚ لَيْسَ لَهَا دَافِعَةٌ ۚ﴾ خَافِضَةٌ

رَافِعَةً ﴿٢﴾ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًا ﴿٣﴾ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴿٤﴾ فَكَانَتْ هَبَاءً مُنْبَثًّا ﴿٥﴾ ﴿٦﴾

جب قیامت آئے گی اور قیامت کے واقع ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، یہ سچی بات ہے۔ متکبرین کو، کفار کو جھکا کے رکھ دے گی اور ایمان والوں کو بلند کر دے گی۔ جب زمین میں زلزلہ آجائے گا اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور پر اگندہ غبار کی طرح اڑنا شروع ہو جائیں گے۔

### لوگوں کی تین اقسام:

﴿وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً﴾ ﴿٧﴾

یہ سب انسانوں کو خطاب ہے جو گزر چکے ہیں، جو موجود ہیں یا جو آئندہ آنے والے ہیں کہ تمہاری تین قسمیں ہیں:

- 1: ایک قسم ہے ”مقربین“ کی جو خواص ہیں۔
- 2: ایک قسم ہے ”اصحاب الیمین“ کی جو عام مؤمنین ہیں۔
- 3: ایک قسم کفار کی ہے۔

یہ تین قسم کے طبقات ہیں اور تینوں کا ذکر آگے فرمایا ہے کہ مقربین کو یہ ملے گا... اصحاب الیمین کو یہ ملے گا... اور کفار کو یہ ملے گا۔

دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ مقربین کو بھی ملے گا اور عام مؤمنین کو بھی ملے گا لیکن اصطلاح میں ”مقربین“ ان کو کہتے ہیں جو اللہ کے مزید خاص ہوں اور ”اصحاب الیمین“ سے مراد وہ ہیں جن کو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا لیکن یہ بڑے درجے کے لوگ نہیں ہوں گے بلکہ عام ایمان والے ہوں گے۔

﴿فَأَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ مَا أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ﴿٨﴾ وَأَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ مَا

أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ ﴿٩﴾ وَالسَّيْقُونَ السَّيْقُونَ ﴿١٠﴾ أُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ﴿١١﴾ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿١٢﴾ ﴿١٣﴾

دائیں ہاتھ والے! سبحان اللہ وہ تو کیا ہی اچھے ہیں، اور بائیں ہاتھ والے کیا ہی بدتر ہیں، اور جو اعلیٰ درجے کے ہیں وہ تو اعلیٰ درجے کے ہیں! یہی لوگ اللہ کے خواص ہیں۔ وہ تو نعمتوں کے باغات میں ہوں گے۔

پہلی قسم، مقربین

﴿ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ ﴿١٣﴾ وَقَلِيلٌ مِنَ الْآخِرِينَ ﴿١٤﴾﴾

پہلے مقربین کی بات کی ہے کہ مقربین پہلے کے لوگوں میں بہت زیادہ ہیں اور بعد کے لوگوں میں کم ہوں گے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ زمانہ اولین کا ہے۔ مقربین ان میں زیادہ تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر قیامت تک اس امت کے مقربین کم ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سارے انبیاء اور ان کی امتیں... اور تنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت... تو ان میں مقربین زیادہ ہیں اور ان میں کم ہیں۔

اُن میں زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مقربین میں انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اولیاء اللہ اور شہداء سب شامل ہیں جو بڑے درجے کے ہیں۔ اب ان میں سو الاکھ تو صرف انبیاء علیہم السلام ہی ہیں، بعد والوں میں سو الاکھ انبیاء تو نہیں ہیں، اب ہر نبی کے ساتھ ایک صحابی بھی ہو تو پھر بھی وہ اڑھائی لاکھ بن جاتے ہیں، اس لیے مقربین پہلوں میں زیادہ ہیں اور عام جنتی اس امت میں زیادہ ہیں۔

حدیث پاک میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:



أَهْلُ الْجَنَّةِ مِائَةً وَعِشْرُونَ صَفًّا... کہ اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی۔ ان میں فرمایا کہ هَذِهِ الْأُمَّةُ مِنْهَا ثَمَانُونَ صَفًّا... کہ اسی صفیں تو اس امت کی ہیں اور ”وَالنَّاسُ سَائِرُ ذَلِكَ“ اور چالیس صفیں ساری امتوں کی ہیں۔<sup>202</sup>

### فرقہ جماعت المسلمین کا دعویٰ:

میں نے آپ کو سنایا تھا کہ فرقہ جماعت المسلمین کا ایک آدمی جن کا دعویٰ یہ ہے کہ صرف ہم مسلمان ہیں، باقی سارے کافر ہیں۔ تو ان سے ایک آدمی نے کہا کہ اگر باقی سارے کافر ہیں تو قیامت کے دن ایک سو بیس صفیں اہل جنت کی ہوں گی، ان میں اسی صفیں صرف اسی امت محمدیہ کی ہوں گی اور چالیس صفیں باقی ساری امتوں کو ملا کر ہوں گی۔ اگر صرف تم مسلمان ہو اور باقی سارے کافر ہیں تو تم تو صرف ایک صف بھی پوری نہیں کر سکتے، باقی صفیں تمہارے باپ نے پوری کرنی ہیں؟! اب دیکھیں بعض لوگ کتنے حاضر جواب ہوتے ہیں کہ مخالف بندہ خاموش ہو جاتا ہے۔

تو مقررین تو پہلوں میں زیادہ ہیں اور اصحاب الیمین اس امت میں زیادہ ہیں۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں اور اس پر بعض روایات بھی ہیں کہ دونوں اسی امت کے افراد ہیں، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے مقررین پہلے طبقے میں زیادہ ہیں یعنی قرون اولیٰ میں اور اصحاب الیمین بعد کے زیادہ ہیں۔

### مقررین کے انعامات:

﴿عَلَى سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ ۖ مُتَّكِئِينَ عَلَيْهَا مُتَقَدِّمِينَ ۖ﴾ (۱۶) يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ﴿۱۷﴾ بِأَكْوَابٍ وَأَبَارِيقَ ۖ وَكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ﴿۱۸﴾ ﴿۱۹﴾

سونے کی تاروں سے بنے ہوئے تختوں پر آنے سامنے بیٹھے ہوئے ہوں گے، اور چھوٹے بچے جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے ان کی خدمت کے لیے متعین ہوں گے۔ وہ بچے گلاس، جگ اور صاف شفاف شراب کے جام لے کر پھر رہے ہوں گے۔

جس طرح حوریں ہیں اسی طرح ﴿وَلَذَانِ مُخَلَّدُونَ﴾ ہیں۔ یہ وہ مخلوق ہے جو اللہ جنت سے پیدا فرمائیں گے۔ اس سے مراد دنیا کے بچے نہیں ہیں جو بلوغ سے پہلے فوت ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ تو اپنے والدین کے پاس ہی ہوں گے بلکہ ان سے مراد وہ چھوٹے بچے ہیں جو جنت میں خدمت کے لیے ملیں گے، یہ جنت ہی کی مٹی سے پیدا ہوں گے۔ اللہ پاک خدمت کے لیے جنتیوں کو دیں گے۔

﴿لَا يَصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنْفُونَ﴾

اس شراب کے جام پینے سے نہ ان کے سر میں درد ہوگا، نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا۔

نزف اس کنویں کو کہتے ہیں کہ جس کا پانی نکال دیا جائے۔ تو یہاں مراد یہ ہے کہ وہ شراب ایسی نہیں ہوگی جس سے آدمی کی عقل ختم ہو جائے۔

﴿وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ﴾ وَحَمِيمٍ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ﴿۱۶﴾

اور ان کے لیے پسندیدہ پھل ہوں گے اور پرندوں کا گوشت ہوگا جو ان کو پسند ہوگا۔

جس طرح کا گوشت کھانے کی دل میں خواہش پیدا ہوگی اسی طرح کا گوشت پرندے کا کھانے کو تیار ہوگا۔ یہ چاہیں گے تو تکے بن کر آئیں گے، چاہیں گے تو کباب بن کر آئیں گے، یہ چاہیں گے کہ کڑا ہی ہو تو کڑا ہی بن کر آئے گی۔ خدا نے کیا نعمتیں رکھی ہیں! بس تھوڑی سی زندگی ہے، اس کو حرام سے بچالو، آخرت کی نعمتیں ہماری منتظر ہیں ان شاء اللہ۔

﴿وَحُودٌ عَيْنٌ ۝۲۱﴾ كَاْمَنَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ ۝۲۲﴾

حوریں ہوں گی سفید رنگ کی اور بڑی بڑی آنکھوں والی جس طرح کوئی موتی چھپا کے رکھتے ہیں تو اس طرح وہ صاف شفاف ہوں گی۔

﴿جَزَاءٌ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۲۳﴾ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَ لَا

تَأْتِيهِمَ ۝۲۴﴾ إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا ۝۲۵﴾

یہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے۔ جنت میں وہ کوئی لغو بات نہیں سنیں گے اور نہ وہاں کوئی گناہ کی بات ہوگی بلکہ سلامتی ہی سلامتی کی باتیں ہوں گی۔

**دوسری قسم؛ اصحابِ یمین**

﴿وَاصْطَبُ الْيَمِينِ ۝۲۶﴾ مَا آصْطَبُ الْيَمِينِ ۝۲۷﴾

اور دائیں ہاتھ والے کیا ہی اچھے ہیں دائیں ہاتھ والے!

**اصحابِ یمین کے انعامات:**

﴿فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ۝۲۸﴾ وَ طَلْحٍ مَّنْضُودٍ ۝۲۹﴾ وَ ظِلِّ مُمْدُودٍ ۝۳۰﴾ وَ مَاءٍ

مَسْكُوبٍ ۝۳۱﴾

یہ دائیں ہاتھ والے کون ہیں؟ فرمایا: وہ ایسی بیویوں میں عیش کر رہے ہوں ہوں گے جن پر کاٹنا نہیں ہوگا، اور کیلے ہوں گے تہہ بہ تہہ، لمبے سائے ہوں گے، پانی چلتا ہوگا۔ کھڑا پانی بھی ٹھیک ہے لیکن چلتا پانی ذرا زیادہ اچھا لگتا ہے۔

﴿وَ فَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ۝۳۲﴾ لَا مَقْطُوعَةٍ وَ لَا مَمْنُوعَةٍ ۝۳۳﴾ وَ فُرْشٍ

مَرْفُوعَةٍ ۝۳۴﴾

اس کے علاوہ بہت سارے پھل ہوں گے، نہ تو ختم ہوں گے اور نہ ہی کوئی رکاوٹ ہوگی اور ان کے لیے اونچی نشیمنیں ہوں گی۔

ظاہر ہے کہ جب جنت بلند ہوگی تو اس میں جو کچھونا ہے وہ بھی بلند ہوگا اور بعض کہتے ہیں کہ بلند ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ چونکہ موٹا ہو گا جیسے ہمارے ہاں گدے ہوتے ہیں اس لیے اس کو ”فُزْنٍ مَّرْفُوعَةٍ“ کہتے ہیں، اور ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ ”فُزْنٍ مَّرْفُوعَةٍ“ سے مراد عورتیں ہیں۔ چونکہ عورت کو فراش کہتے ہیں تو وہاں عورتیں ہوں گی اور مرفوعہ سے مراد ظاہری مرفوعہ مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ بلند درجے والی ہوں گی۔

﴿إِنَّا أَنْشَأْنَاهُنَّ إِنِشَاءً ۖ فَجَعَلْنَهُنَّ أَبْكَارًا ۖ﴾

ہم ان عورتوں کو ایک انداز سے بنائیں گے اور ان کو باکرہ رکھیں گے۔ باکرہ بنائیں گے نہیں بلکہ باکرہ رکھیں گے۔ جنت میں جانے کے بعد عورت کی خاصیت ہوگی کہ آدمی اگر اس سے مباشرت کرے گا تو اس کے بعد پھر باکرہ، پھر جائے گا تو پھر باکرہ، ہر بار ایسا ہو گا جیسے پہلی بار اس کے پاس جا رہا ہو۔

یا تو اس سے جنت کی حوریں مراد ہیں یا مراد دنیا کی عورتیں ہیں جنہیں جنت میں ان کے خاوندوں کے لیے خوبصورت بنا دیا جائے گا۔

﴿عُرُبًا أَتْرَابًا ۖ لِأَصْحَابِ الْيَمِينِ ۖ﴾

”عُرُبًا“ کہتے ہیں محبوبہ کو یعنی یہ ایسی عورتیں ہوں گی جو محبوبہ کی طرح ہوں گی، پیار ان سے بہت زیادہ ہوگا۔ ”أَتْرَابًا“ کہ یہ ہم عمر ہوں گی۔ ہم عمر ہونے کا معنی یا تو شوہر اور بیوی کی عمریں برابر ہوں گی جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ جنتی مرد اور عورتیں دونوں کی عمریں 33 سال کی ہوں گی۔ اب اس میں مرد اور عورت کی عمر برابر ہو تو آپس میں اُنس بہت زیادہ ہوتا ہے۔

اور دوسرا معنی یہ ہے کہ عورتیں آپس میں ہم عمر ہوں گی۔ اگر عورتیں

آپس میں ہم عمر ہوں اور ان کا مزاج ملتا تو تو سو کن پن بہت کم ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ دوستوں کی طرح چلتی ہیں۔ میں نے چونکہ دونوں منظر دیکھے ہیں اس لیے اچھی طرح احساس ہے۔ اللہ یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بیوی اور شوہر کی عمر کا قریب قریب ہونا اچھا ہوتا ہے۔ اس میں فائدہ بہت ہوتا ہے لیکن اگر شوہر کی عمر زیادہ ہو اور بیوی کی عمر کم ہو تو پھر شوہر کو اس طرح رہنا چاہیے کہ اس کو محسوس نہ ہو کہ یہ بوڑھا ہے، پھر اس کو بڑھاپے کا احساس ختم کرنا چاہیے۔ میں اس لیے بات سمجھاتا ہوں کہ عام بندے کے بڑھاپے کا احساس کا معنی صرف جنس اور شہوت ہوتی ہے... یہ معنی قطعاً نہیں ہے بلکہ شوہر کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، بات کرنے کا طرز ایسا ہو جیسے جوانوں کا ہوتا ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

﴿لَا صَاحِبَ الْيَمِينِ ۖ ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ ۖ وَثَلَاثَةٌ مِنَ الْآخِرِينَ ۖ﴾

یہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ اصحاب الیمین کو دیں گے۔ اصحاب الیمین کون ہیں؟ فرمایا کہ یہ پہلوں میں بھی بہت ہیں اور بعد والوں میں بھی بہت ہیں۔ مقررین پہلوں میں زیادہ ہیں اور بعد والوں میں کم ہیں اور اصحاب الیمین یہ پہلوں میں بھی بہت ہیں اور بعد والوں میں بھی بہت ہیں۔ اس سے مراد عام جنت والے لوگ ہیں۔

### دیہاتی اور شہری مزاج کی رعایت:

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ بیان القرآن میں لکھتے ہیں کہ اللہ نے مقررین کے لیے جو نعمتیں بیان فرمائی ہیں یہ تمام نعمتیں وہ ہیں جو اصحاب شہر کی پسندیدہ ہوتی ہیں اور اصحاب الیمین کے لیے جو نعمتیں بیان فرمائی ہیں یہ تمام نعمتیں وہ ہیں جو اہل دیہات کی پسندیدہ ہوتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقررین کا مزاج کیا ہو گا اور

اصحاب الیمین کا مزاج کیا ہوگا؟ اب ذرا دیکھیں کہ مقررین کی نعمتیں کیا ہیں؟

- [1]: ”عَلَى سُرِّ مَوْضُوءَةٍ“ سونے کی تاروں کے تختوں پر بیٹھنا
- [2]: ”وَلَذَانِ مُخَلَّدُونَ“ چھوٹے چھوٹے بچے خدمت پر الگ رکھے ہوئے ہیں
- [3]: ”بِأَكْوَابٍ وَ آبَارِيقٍ ؕ وَ كَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ“ گلاس، جگ اور جام شراب کا دور چل رہا ہے

- [4]: ”وَنَحْمِ طَيْرٍ مَّأْيُشْتَهُونَ“ پرندوں کا گوشت اور تکیے چل رہے ہیں
- [5]: ”وَحُورٌ عِينٌ“ حوریں خدمت کر رہی ہیں

تو یہ شہریوں کا مزاج ہوتا ہے اور جب دیہاتیوں کی باری آئی تو فرمایا:

- [1]: ”فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ“ بیریاں ہوں گی، یہ بیر کھائیں گے
- [2]: ”اور“ وَطَلْحٍ مَّنْضُودٍ“ تہ بہ تہ کیلے کھائیں گے
- [3]: ”وَزَيْلٍ مَّمْدُودٍ“ لمبے سایہ دار درخت ہوں گے
- [4]: ”وَمَاءٍ مَّسْكُوبٍ“ اور جاری پانی ہوگا۔ چشمے شہروں میں ہوتے ہیں یا دیہاتوں میں ہوتے ہیں؟ (دیہاتوں میں۔ سامعین) یہ دیہاتی مزاج ہے۔

- [5]: ”وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ۖ لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ ۚ“ اور پھل ہوں گے جو ختم نہیں ہوں گے اور نہ کوئی روک ٹوک ہوگی۔ پھلوں کا ماحول دیہاتوں میں ہوتا ہے۔ دیہاتیوں کو خوف ہوتا ہے کہ فلاں پھل کا سیزن ختم ہو گیا، تو فرمایا کہ جنت میں نہ سیزن ختم ہوگا اور نہ پھل پر پابندی ہوگی۔ شہروں میں تو پھل کا سیزن ختم بھی ہو جائے تب بھی کولڈ اسٹور سے مل جاتا ہے لیکن دیہاتوں میں نہیں ملتا۔ اس لیے یہ جملے شہریوں سے زیادہ دیہاتیوں کے مناسب ہوتے ہیں۔

## تیسری قسم: اصحاب الشمال

﴿وَأَصْحَابُ الشِّمَالِ ۖ مَا أَصْحَابُ الشِّمَالِ ۖ فِي سَمُومٍ وَحَمِيمٍ ۖ وَ

ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُومٍ ۖ لَا بَارِدٍ وَلَا كَرِيمٍ ۖ﴾

اور بائیں ہاتھ والے کتنے بدتر ہوں گے بائیں ہاتھ والے! یہ لوگ آگ اور کھولتے ہوئے پانی کے عذاب میں گرفتار ہوں گے، سیاہ دھویں کے سائے میں پڑے ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہو گا اور نہ ہی عزت و خوشحالی کا ذریعہ ہو گا۔

﴿إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِينَ ۖ وَكَانُوا يُصِرُّونَ عَلَى الْحِنثِ الْعَظِيمِ ۖ﴾

یہ لوگ دنیا میں بہت خوشحال تھے اور بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے۔ خوشحال ہونا برا کام نہیں ہے، یہ اللہ کی نعمت ہے لیکن ان کی خوش حالی کا اثر یہ تھا کہ یہ لوگ بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے۔ یہ غلط بات ہے۔

یہاں دیکھو: ﴿يُصِرُّونَ﴾ فرمایا کہ یہ لوگ گناہوں پر اصرار کرتے ہیں،

کیونکہ متقین کے اوصاف میں سے ہے: ﴿وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلَى مَا فَعَلُوْا﴾<sup>203</sup> کہ وہ اصرار نہیں کرتے۔ متقی وہ نہیں ہوتا جس سے گناہ کبیرہ نہ ہو، اس سے گناہ کبیرہ بھی ہوتا ہے لیکن فوراً توبہ کرتا ہے۔ بس تقاضائے بشریت غالب آیا اور اس نے گناہ کر لیا، پھر فوراً توبہ کرتا ہے۔

﴿وَكَانُوا يَقُولُونَ اٰیْذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ۖ

لَمَبْعُوثُونَ ۖ اَوَاٰبَاۡؤُنَا الْاَوَّلُونَ ۖ﴾

یہ لوگ کہتے تھے کہ جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے پھر ہڈیاں ہو

جائیں گے تو کیا ہمیں پھر اٹھایا جائے گا؟ اور کیا ہمارے آباء و اجداد بھی اٹھائے جائیں گے؟

﴿قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ﴿١٩﴾ لَمَجْمُوعُونَ إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ

مَعْلُومٍ ﴿٢٠﴾﴾

اللہ نے فرمایا کہ اے پیغمبر! آپ ان سے فرمائیں کہ پہلے والے بھی اور بعد والے بھی سب لوگ وقت مقرر پر اٹھائے جائیں گے۔

﴿ثُمَّ إِنَّكُمْ أَنتُمُ الصَّاكُونَ الْمَكْذِبُونَ ﴿٢١﴾ لَا كَلُومَٰنَ مِن شَجَرٍ مِّنْ

زَقْوَمٍ ﴿٢٢﴾ فَمَائِيُونَ مِّنْهَا الْبُطُونَ ﴿٢٣﴾ فَشَرِبُونَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيمِ ﴿٢٤﴾

فَشَرِبُونَ شُرْبَ الْهَيْمِ ﴿٢٥﴾ هَذَا نُزْلُهُمْ يَوْمَ الدِّينِ ﴿٢٦﴾﴾

پھر اے گمراہ جھوٹے لوگو! تم زقوم کے درخت کو کھاؤ گے، اسی سے پیٹ بھرو گے، پھر اس کے اوپر گرم پانی پیو گے جیسے پیسا اونٹ پیتا ہے۔ قیامت کے دن تمہاری یہی مہمانی ہے۔

اللہ کی چار عظیم نعمتیں:

[1]: تخلیق انسانی

اللہ آگے چار چیزیں بیان فرماتے ہیں:

﴿أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ ﴿٢٧﴾ ءَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ ﴿٢٨﴾﴾

یہ بتاؤ! کہ تم جو نطفہ پکاتے ہو کیا تم پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرتے ہیں؟! تم تو نطفہ رکھ کے چھوڑ دیتے ہو، باقی اس سے انسان کو پیدا کرنا یہ تم نہیں کرتے، یہ ہم بناتے ہیں۔

﴿نَحْنُ قَدَرْنَا بَيْنَكُمْ الْأَمْوَاتَ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿٢٩﴾ عَلَىٰ أَنْ



نُبَدِّلَ أَمْثَانَكُمْ وَنُنْشِئْكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١١﴾ ﴿١١﴾

پھر ہم نے ہی تمہارے درمیان موت رکھی ہے، اور کوئی طاقت ایسی نہیں جو ہمیں عاجز کر دے! ہم عاجز نہیں ہیں کہ تم جیسے اور بندے پیدا نہ کر سکیں اور تمہیں ایسی مخلوق بنادیں جس کو تم جانتے نہ ہو! یعنی تمہاری خلقت تبدیل کر دیں۔

﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ﴾ ﴿١٢﴾ ﴿١٢﴾

اور تمہیں خوب معلوم ہے کہ پہلے بھی ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، تو اس بات سے تم نصیحت کیوں نہیں لیتے؟!

[2]: بھیتی اگانا

﴿أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ﴾ ﴿١٣﴾ ﴿١٣﴾ ءَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ﴿١٤﴾ ﴿١٤﴾

نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ﴿١٥﴾ ﴿١٥﴾ إِنَّا لَمُعْرِضُونَ ﴿١٦﴾ ﴿١٦﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ﴿١٧﴾ ﴿١٧﴾

یہ بتاؤ! کہ جو کھیتی تم بوتے ہو کیا اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟! اگر ہم چاہیں تو پورا پودا ختم کر دیں اور تم حیرت سے باتیں ہی بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو تاوان پڑ گیا ہے، ہم تو محروم ہو گئے ہیں۔

[3]: پانی کی فراہمی

﴿أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ﴾ ﴿١٨﴾ ﴿١٨﴾ ءَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ

نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ ﴿١٩﴾ ﴿١٩﴾ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ﴿٢٠﴾ ﴿٢٠﴾

یہ بتاؤ! جو پانی تم پیتے ہو کیا تم اس کو بادلوں سے اتارتے ہو یا ہم اتارتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو کڑوا بنادیں، تو پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے؟!

حدیث پاک میں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب پانی پیتے تو پانی

پینے کے بعد یہ دعا فرماتے تھے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ سَقَانَا عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِہٖ وَلَمْ یَجْعَلْہٗ مِلْحًا اُجَاجًا

یَذْنُوْبَنَا." 204

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں اپنی رحمت سے میٹھا پانی پلایا جس سے ہماری پیاس بجھ گئی اور ہماری بد اعمالیوں کی وجہ سے اس پانی کو کڑوا نہیں بنایا۔ جس کو یہ دعا یاد ہے تو وہ اس کو پڑھا کرے، نہیں یاد تو اس کو یاد کرے۔

#### [4]: آگ کی نعمت

﴿اَفَرَأَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُورُوْنَ ۝۱۶۱ ؕ اَنْتُمْ اَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ۝۱۶۲ نَحْنُ جَعَلْنَهَا تَذْکِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ ۝۱۶۳ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ ۝۱۶۴﴾

اچھا یہ بتاؤ! یہ جو آگ تم جلاتے ہو اس کا درخت تم اگاتے ہو یا ہم اگا رہے ہیں؟ ہم نے اس کو سامانِ نصیحت بنایا ہے اور جو لوگ صحرا کا سفر کرتے ہیں ہم نے اس درخت کو ان لوگوں کے لیے نفع مند چیز بنایا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ اپنے رب کے نام کی تسبیح کیجیے!

﴿فَلَا اُقْسِمُ بِمَوْقِعِ الْجُؤْمِ ۝۱۶۵﴾

یہ جو قسم کے شروع میں ”لا“ آتا ہے تو بعض کہتے ہیں کہ یہ ”لا“ زائدہ ہوتا ہے۔ یہ عرب کا دستور و مزاج ہے کہ ”لا“ زائدہ کے بعد ”اُقْسِمُ“ کا لفظ لاتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ لا زائدہ نہیں ہوتا بلکہ یہ محاورات میں استعمال ہوتا ہے

جیسے ہمارے ہاں بندہ عام بات کہتا ہے کہ ”نہیں! بات تو آپ نے ٹھیک کی ہے“ حالانکہ لفظ نہیں کا کلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح عرب کی بھی عادت تھی، ان کے یہ محاورات تھے جیسے ہمارے ہاں ایسے محاورات میں استعمال ہوتا ہے۔

یا ”لا“ کے ذریعے مخاطب کے گمان کی نفی کرتے ہیں پھر قسم کھاتے ہیں۔  
 ”لا... وہ بات نہیں جو تم کہتے ہو، اُقْسِمُ... قسم ہے میں یہ بات کہتا ہوں۔“

اور یہاں قسم ہے ستارے کے ڈوبنے کی جگہ کی اور بتانا یہ مقصود ہے کہ جو چڑھتا ہے اس نے ڈوب جانا ہے، ڈوبتے ستارے کو دیکھ کر بندے کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

### بلا طہارت قرآن چھونا جائز نہیں:

﴿وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّتَوْتَعِلْمُونَ عَظِيمٌ﴾ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ﴿۱﴾ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ﴿۲﴾ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ﴿۳﴾

یہ قسم ہے اگر تم سمجھو تو بہت بڑی قسم ہے کہ یہ قرآن عظمت والا ہے، ایک محفوظ کتاب میں ہے جس کو وہی چھو سکتے ہیں جو پاک کیے گئے ہیں۔

﴿لَا يَمَسُّهُ﴾ میں ”ہ“ ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اگر کتاب ہے تو اس سے مراد لوح محفوظ ہے اور ﴿الْمُطَهَّرُونَ﴾ سے مراد ملائکہ ہیں، دوسری کوئی تفسیر ہو ہی نہیں سکتی۔ قرآن کریم لوح محفوظ میں ہے تو لوح محفوظ کو کون چھوتا ہے؟ انسان یا فرشتے؟ (فرشتے۔ سامعین) تو انسان تو چھو ہی نہیں سکتا۔

یا ”ہ“ ضمیر کا مرجع قرآن ہے، ﴿لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ﴾۔ اب یہاں قرآن کریم سے خاص قرآن نہیں ہے بلکہ قرآن کریم سے مراد وہ تمام صحیفے ہیں ﴿فِي صُحُفٍ﴾

مُكَرَّمَةٍ ﴿٧٧﴾ مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿٧٨﴾ ﴿٧٩﴾ تو قرآن سے مراد مصحف ہے، وہ تمام کتابیں جو صحیفوں میں ہیں۔ اس کا معنی کہ کسی بھی آسمانی کتاب کو آسمان سے زمین پر لانے والے ملائکہ ہوتے ہیں، ملائکہ کے بغیر کوئی اس کو چھو نہیں سکتا، تو پاکیزہ ہاتھ ہی اس کو لگتے ہیں۔

اور بعض کہتے کہ ”ہ“ ضمیر کا مرجع تو قرآن ہے لیکن اس سے مراد صحف نہیں ہیں بلکہ خاص قرآن کریم ہے اور ”الْمُطَهَّرُونَ“ سے مراد ہے انسان۔ مطلب یہ ہو گا کہ انسان پاک ہو تو قرآن کو چھوئے اور ناپاک ہو تو قرآن کو چھو نہیں سکتا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ قرآن کریم کو چھونا جنبی اور مُحَرِّث (بے وضو) کے لیے جائز نہیں ہے اس کی بنیاد یہ نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد المعجم الکبیر میں حدیث ہے:

لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ. <sup>206</sup>

قرآن کریم کو پاک بندہ چھوئے، ناپاک بندہ قرآن کو ہاتھ نہ لگائے۔ اب یہاں یہ بات سمجھنا کہ اختلاف اس میں نہیں ہے کہ قرآن کریم کو چھونے کے لیے پاک ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اس پر تو ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا اتفاق ہے کہ ناپاک آدمی قرآن کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، خواہ محدث ہو یا جنبی ہو، اس میں حائضہ وغیرہ سب شامل ہیں۔ اس میں تو اتفاق ہے۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ یہ آیت دلیل بن سکتی ہے یا نہیں؟ تو بعض کہتے ہیں کہ اس آیت کو بطور دلیل پیش کرنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ”الْمُطَهَّرُونَ“ سے مراد ملائکہ ہیں۔ باقی ناپاک آدمی قرآن کو ہاتھ

نہیں لگا سکتا، اس کی دلیل حدیث ہے ”لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ“، یہ آیت دلیل نہیں ہے۔

تو اختلاف مسئلے میں نہیں ہے، اختلاف اس بات میں ہے کہ یہ آیت اس مسئلے کے لیے دلیل ہے یا نہیں ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ اس کو بطور دلیل پیش کر سکتے ہیں اور بطور دلیل پیش کیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا نے جب حضرت عمر آئے تھے تو بہن کی پٹائی کے بعد کہا کہ فاطمہ! لاؤ کیا پڑھ رہی تھیں؟ اس وقت انہوں نے کہا تھا کہ نہیں! اس قرآن کو ناپاک بندہ ہاتھ نہیں لگا سکتا، ”إِنَّكَ رَجُسَ وَلَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ“ غسل کر کے آؤ، پھر تمہیں دکھاتی ہوں، وہ غسل کر کے آئے تو پھر وہ اوراق ان کو دیے جن پر قرآن کریم لکھا ہوا تھا۔<sup>207</sup>

ورق اس دور کا جو بھی ہوتا ہو گا۔ تو انہوں نے بطور دلیل اس آیت کو پیش کیا ہے۔

تو بسا اوقات مسئلہ میں اختلاف نہیں ہوتا، اختلاف اس میں ہوتا ہے کہ یہ دلیل بن سکتی ہے یا نہیں؟ اس لیے جب بھی آپ دلیل پیش کریں کہ ناپاک مرد یا ناپاک عورت قرآن کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تو اس آیت کے بجائے دلیل میں حدیث پیش کریں ”لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ“ اور اگر اس آیت کو بطور دلیل پیش کرنا ہو تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن والا حوالہ بھی پیش کریں کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غسل کروایا اور بنیادیہ آیت تھی۔

**حائضہ قرآن نہیں پڑھ سکتی... دلیل:**

ایک تو مسئلہ ہے مرد کا۔ اب مسئلہ ہے عورت کا کہ عورت اگر حائضہ ہو تو

اس حالت میں قرآن کو چھو نہیں سکتی یہ تو نص آگئی ”لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ“ اب قرآن پڑھ سکتی ہے یا نہیں؟ تو ہم کہتے ہیں کہ قرآن نہیں پڑھ سکتی اور آج غیر مقلدین نے مسئلہ چھیڑا ہوا ہے کہ حائضہ عورت قرآن پڑھ سکتی ہے، نفاس والی عورت قرآن پڑھ سکتی ہے کیونکہ اس کے قرآن پڑھنے کی ممانعت پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

حائضہ اور نفاس والی عورت اور حالت جنابت میں قرآن کریم کو نہ پڑھ سکنے پر احادیث مبارکہ موجود ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَقْرَأُ الْحَائِضُ وَلَا الْجُنُبُ شَيْئًا مِنَ الْقُرْآنِ<sup>208</sup>

حائضہ عورت اور حالت جنابت والا مرد یا عورت قرآن کریم نہیں پڑھ سکتا۔

﴿تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ﴾ أَفِيْهِذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُدْهِنُونَ ﴿٨٧﴾

یہ کتاب اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے، کیا تم اس کتاب کو سرسری اور معمولی سی بات سمجھتے ہو؟!

لفظ مُدْهِنُونَ یہ دُھن سے ہے، دُھن کہتے ہیں تیل کو، اِدْهَان کا معنی ہوتا ہے تیل نکالنا۔ جب کسی چیز پر تیل لگائیں تو وہ بہت نرم ہو جاتی ہے۔ فرمایا تم قرآن کریم کو معمولی چیز سمجھتے ہو کہ جیسے چاہا موڑ لیا، چاہا تو مان لیا، چاہا تو نہیں مانا! ایسی بات نہیں ہے۔

﴿وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنْكُمْ تُكَذِّبُونَ﴾ ﴿٨٨﴾

اور تم نے قرآن کو جھٹلانا اپنی خوراک بنا رکھا ہے کہ بس تم نے ضرور ہی جھوٹ بولنا ہے۔ جیسے ہمارے محاورات میں کہتے ہیں نا کہ جب تک فلاں شخص جھوٹ

نہ بولے اس وقت تک اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا! یہ ہمارے محاورات ہیں۔ تو یہاں عرب کے محاورات پر بات کی جا رہی ہے کہ جب تک تم جھوٹ نہ بولو تو تمہارا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

﴿فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلُقُومَ ﴿٨٧﴾ وَأَنْتُمْ حِينِيذٍ تَنْظُرُونَ ﴿٨٨﴾ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلَكِنْ لَا تُبْصِرُونَ ﴿٨٩﴾﴾

یہ ان کو دھمکایا جا رہا ہے جو کہتے ہیں کہ ہم کیسے پیدا ہوں گے؟ ہم نہیں اٹھیں گے! تو فرمایا کہ تم اٹھنے کو روک سکتے ہو؟ تمہارے بس میں ہوتا تو تم تو بندے کو مرنے بھی نہ دیتے۔ تم نکلتی روح کو نہیں روک سکتے تو جب روح دوبارہ ڈالی جائے گی تو تم کیا کر سکتے ہو؟ جب حلقوم تک روح نکل آتی ہے تم دیکھ بھی رہے ہوتے ہو اور ہم تم سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں لیکن تمہیں پتا نہیں چلتا۔

﴿فَلَوْلَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ﴿٩١﴾ تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٩٢﴾﴾

اگر دوبارہ تم نے نہیں اٹھنا تو اس روح کو تم لوٹالو اگر تم سچے ہو!

### تین گروہوں کا اجمالی بیان:

﴿فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٩٣﴾ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ ۖ وَجَنَّتٌ نَّعِيمٌ ﴿٩٤﴾﴾

اب پھر مقربین کی بات فرمائی ہے کہ جو مقربین خواص ہیں ان کو راحت ہو گی اور ان کے لیے خوشبوئیں ہوں گی اور نعمتوں والے باغات ہوں گے!

﴿وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ﴿٩٥﴾ فَسَلَمٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ﴿٩٦﴾﴾

اور جو اصحاب الیمین؛ دائیں ہاتھ والے ہیں ان کے لیے فرمایا: اگر کوئی شخص اصحاب الیمین میں سے ہو گا تو ان سے کہا جائے گا کہ تمہارے لیے سلامتی ہی سلامتی ہے! یہاں اصحاب الیمین کے ساتھ ان نعمتوں کا تذکرہ نہیں کیا جو مقربین کے ساتھ کیا تھا، اس

لیے کہ یہ خواص نہیں ہیں، یہ عوام ہیں۔ خواص کی بات الگ ہوتی ہے اور عوام کی بات الگ ہوتی ہے۔

اصحاب الیمین میں صرف وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو نیک اعمال کریں اور گناہ کبھی نہ کریں بلکہ جو نیک اعمال کریں وہ بھی اصحاب الیمین میں شامل ہیں اور جو گناہ کریں اور توبہ کر لیں تو وہ بھی اصحاب الیمین میں شامل ہیں اور جو لوگ اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے جہنم میں چلے جائیں گے پھر جہنم سے نکل کر جنت میں جائیں تو وہ بھی اصحاب الیمین میں شامل ہیں، اور یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مسلمان اگر اپنے اعمال بد کی وجہ سے جہنم میں جائے گا تو یہ عذاب نہیں ہو گا یہ تزکیہ ہو گا البتہ صورت عذاب کی ہوتی ہے۔ اس لیے بسا اوقات لفظ عذاب کا اس پر اطلاق ہو جاتا ہے ورنہ حقیقتاً وہاں تزکیہ ہوتا ہے گناہوں سے پاک کرنے کے لیے۔ اس مقام پر قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ ان کو پاک کر کے جنت میں داخل کیا جائے گا۔<sup>209</sup>

میں ایک بات کہتا ہوں کہ بسا اوقات شیطان یہاں پر انسان کو دھوکہ دیتا ہے کہ یار مقررین نہ سہی... بڑی جنت نہ سہی... چھوٹی ہی سہی، اس لیے زیادہ اعمال نہ کریں تو کیا ہوا! یہ آج کہہ رہا ہے لیکن وہاں جا کر بندہ کہے گا کہ بڑی جنت ہی ملے... یہ الگ بات ہے کہ جنت میں حسد، بغض اور کینہ نہیں ہو گا، اللہ دل کو صاف فرمادیں گے اور چھوٹی جنت پر انسان راضی ہو جائے گا لیکن دل تو یہی چاہے گا کہ مجھے بڑی جنت ہی ملے۔

﴿وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الضَّالِّينَ ۖ فَنُزِّلْ مِنْ حَمِيمٍ ۖ وَتَصْلِيَةٌ



جَحِيمٍ ﴿٩٣﴾ إِنَّ هَذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ﴿٩٤﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٩٥﴾ ﴿٩٦﴾

اور اگر بندہ ان لوگوں میں سے ہو جو جھٹلانے والے ہیں، گمراہ ہیں تو گرم پانی سے اس کی مہمانی ہوگی، جہنم میں داخل ہوگا اور یہ بات حق ہے، یقینی ہے اور ہو کر رہے گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ جو تمہارا رب ہے اس کی تسبیح بیان کیا کرو۔

اللہ ہم سب کو مقربین میں شامل فرمائیں۔ اللہ ہم سب کی خطاؤں سے درگزر فرمادیں، دعاؤں کا سلسلہ مسلسل بندے کو جاری رکھنا چاہیے اور گناہوں سے بچنے کا پورا اہتمام کرنا چاہیے۔ اگر کبھی گناہ ہو جائے تو فوراً اللہ سے توبہ کرنی چاہیے۔

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

# دروس القرآن

٥

والإمام محمد الباقس كرم الله وجهه

مركز أهل السنة والجماعة



نام کتاب ..... دُرُوسُ الْقُرْآنِ جلد پنجم

تالیف: ..... محمد الیاس رحمانی

تاریخ اشاعت ..... مارچ 2020ء

بار اشاعت ..... اوّل

تعداد اشاعت ..... 1100

ناشر ..... مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ

ملنے کا پتہ

مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ، 87 جنوبی لاهور ڈسٹرکٹ

0321-6353540

0335-7500510

www.ahnafmedia.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## فہرست

### 29 ----- سورة الحديد

29-----پانچ مسبحات:

29-----تسبیح حالاً اور تسبیح قائلاً:

30-----وساوس کے بچنے کا وظیفہ:

30-----فنائے امکانی اور فنائے عملی:

31-----معبیت باری تعالیٰ:

32-----ایمان لانے کا فطری جذبہ ہر ایک میں موجود ہے:

34-----کفار کو ”إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ“ کہنے کا مطلب:

35-----انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب:

36-----اولین ساتھ دینے والے افضل ہوتے ہیں:

36-----ایک اشکال کا جواب (حضرت سعد بن معاذ اور قبر کی تنگی)

39-----خلفائے راشدین چار ہیں:

40-----عشرہ مبشرہ ایک اصطلاح ہے:

41-----مؤمنین کے نور سے کیا مراد ہے؟

- 42----- منافقین کی اس نور سے محرومی:
- 43----- مؤمنین اور منافقین کا مکالمہ:
- 44----- ایمان والوں کا تذکرہ:
- 45----- سارے صحابہ؛ صدیق بھی ہیں شہید بھی ہیں:
- 47----- ایک معروف اشکال کا جواب:
- 49----- اکابر کے علوم سے توافق:
- 50----- دنیا کی زندگی کے پانچ مراحل:
- 52----- مغفرت کی طرف دوڑو!
- 52----- مصیبت کی دو قسمیں:
- 53----- مختال اور فخور میں فرق:
- 54----- بخل کی مذمت:
- 54----- لوہا اتارنے کا مطلب:
- 56----- حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ:
- 57----- رہبانیت کی ابتدا:
- 57----- رہبانیت کا حکم:
- 59----- اہل کتاب کے ایمان لانے پر دواجر کی وجہ:
- 59----- اہل کتاب کو ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ سے خطاب کی وجہ:

## 61 ----- سورة المجادلة

- 61----- ابتدائی آیات کا شان نزول:
- 62----- ظہار کی تعریف اور حکم:

ایمان والوں کو ایمان کا حکم؟ 63-----

عذاب مہین کا معنی: 63-----

معت ذاتیہ: 64-----

یہود احکام کے مکلف نہیں تو انہیں حکم کیوں؟ 65-----

یہود کی گستاخی (السَّامُ عَلَیْكُمْ کہنا) 66-----

مجلس میں کشادگی کرنے کا حکم: 67-----

بعض لوگوں کو مجلس سے اٹھانے کی وجہ: 67-----

مجلس کے آداب: 68-----

حضور علیہ السلام سے ملاقات سے پہلے صدقہ کا حکم: 68-----

اس حکم کی منسوخی: 69-----

ملاقات کے لیے نظم بنایا جاسکتا ہے: 70-----

منافقین کی کذب بیانی: 71-----

حزب الشیطان کی محرومی: 72-----

حزب اللہ کی کامیابی: 73-----

## 75 ----- سورة الحشر

ابتدائی آیات کا شان نزول: 75-----

بیر معونہ کا واقعہ: 75-----

بنو نضیر کی عہد شکنی اور جلا وطنی: 76-----

یہود کی دو مرتبہ جلا وطنی: 77-----

یہود کا گمان باطل: 78-----

- 79----- دنیا میں جلاوطنی اور آخرت میں عذاب کی وجہ:-----
- 80----- صحابہ کرام کا اجتہادی اختلاف:-----
- 80----- اجتہادی اختلاف میں مددِ خدا شامل حال ہوتی ہے:-----
- 81----- اکابرین کے اختلاف کی توجیہ:-----
- 81----- اختلاف محفوظ میں ہو تو دلیل معصوم، عام مجتہدین میں ہو تو دلیل محفوظ:-----
- 82----- مالِ غنیمت اور مالِ فئی کا حکم:-----
- 84----- مالِ فئی اور مالِ غنیمت میں اللہ کا حصہ ذکر کرنے کی حکمت:-----
- 86----- مالِ فئی کے مصارف بیان کرنے کی حکمت:-----
- 86----- دین کا خلاصہ؛ اوامر اور نواہی:-----
- 87----- مالِ فئی کے حق دار:-----
- 88----- انصار صحابہ کا ایثار:-----
- 89----- خود پر دوسروں کو ترجیح:-----
- 90----- مالِ فئی میں آئندہ کس کا حصہ ہو گا؟-----
- 91----- منافقین کی وعدہ خلافی:-----
- 92----- منافقین کی بزدلی کا عالم:-----
- 93----- شیطان کا دھوکہ:-----
- 94----- فکرِ آخرت کیجیے!-----
- 95----- قرآن پہاڑ پر نازل کرتے تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتا:-----
- 96----- اسمائے حسنی:-----
- 98----- دعائے مستجاب کا مجرب طریقہ:-----

- 100 ----- شانِ نزول:
- 101 ----- حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کی اجتہادی خطا:
- 102 ----- اسے چھوڑ دو! یہ بدری ہے:
- 103 ----- دشمنِ خدا سے دوستی جائز نہیں:
- 105 ----- حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ:
- 106 ----- ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے لیے استغفار کرنے کا مطلب:
- 107 ----- اہل ایمان کی دعائیں:
- 108 ----- رشتہ دار کفار ہوں تو تعلقات کا حکم:
- 110 ----- صلح حدیبیہ کی بعض شرائط:
- 112 ----- مسلمان عورتوں کے کافر خاوندوں کو مہر واپس کرو:
- 114 ----- ایمان والی عورتوں کی بیعت:
- 115 ----- عالم سے بیعت کی دلیل (ایک دلچسپ واقعہ):
- 117 ----- بیعت کی اقسام:
- 118 ----- بیعت کی ضرورت و اہمیت:
- 119 ----- مغضوب علیہم سے دوستی کی ممانعت:

## 120 ----- سورة الصف

- 120 ----- شانِ نزول:
- 121 ----- کرۂ ارض پر بڑا عالم کون ہے؟
- 122 ----- دعویٰ نہ کرے دعوت دیتا ہے:
- 123 ----- مجاہدین اسلام خدا کو محبوب ہیں:



- 124 ----- سبب اختیار کرنا بندے کا فعل اور نتیجہ مرتب کرنا اللہ کا فعل:
- 125 ----- بشارتِ عیسیٰ علیہ السلام:
- 126 ----- حضور علیہ السلام نبی اسماعیل میں سے ہیں:
- 128 ----- ظالم کون ہے؟
- 128 ----- پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا:
- 128 ----- غلبہ عملی اور غلبہ برہانی:
- 130 ----- نفع بخش تجارت جہاد فی سبیل اللہ:
- 131 ----- جہاد کا معنی قتال ہے:
- 132 ----- آیات جہاد میں تحریف کا حکم:
- 133 ----- مثال کے ذریعے وضاحت:
- 134 ----- دین کے مددگار بنو!
- 134 ----- حوای کی تعریف:

## 136 ----- سورة الجمعة

- 136 ----- پیغمبر کی چار صفات:
- 137 ----- پیغمبر پاک کی بعثت عامہ:
- 138 ----- امام ابو حنیفہ کی بشارت:
- 139 ----- ﴿وَأَخْرَجْنَا مِنْهُمْ﴾ کا مصداق امام ابو حنیفہ:
- 140 ----- جہاں پر بڑا کام چھوڑے وہاں سے چھوٹا شروع کرے:
- 141 ----- باادب اور بے ادب:
- 142 ----- ہم عاشقِ مدینہ ہیں:

- 143 ----- گدھے کی مثال:
- 144 ----- گدھے پر بوجھ ہو تو ٹانگیں چوڑی ہو جاتی ہیں:
- 145 ----- شیطان کے لیے محفوظ گزر گاہ:
- 146 ----- سچے ہو تو موت کی تمنا کرو!
- 147 ----- جمعۃ المبارک:
- 147 ----- جمعہ کی دوسری اذان سنت ہے:
- 148 ----- اذانِ اول کے بعد خرید و فروخت ممنوع ہے:
- 149 ----- سعی الی الجمعہ کا اہتمام کیجیے!
- 149 ----- دیہات اور جمعہ کی ادائیگی:
- 150 ----- صحابہ کرام کے خطبہ چھوڑ کر جانے کی وجہ:

## 152 ----- سورة المنافقون

- 152 ----- سورت کا شانِ نزول (مفصل واقعہ):
- 153 ----- عبد اللہ ابن ابی کی ہرزہ سرائی:
- 157 ----- منافقین کی دروغ گوئی:
- 158 ----- عبد اللہ ابن ابی کا متکبرانہ رویہ:

## 161 ----- سورة التغابن

- 161 ----- پانچ مسبحات:
- 161 ----- تخلیقاتِ باری تعالیٰ:
- 162 ----- منکرین کا انجام:
- 164 ----- مؤمنین کا انجام:

164 ----- تکالیف آنے کی وجوہات:

166 ----- ”بیوی اور اولاد دشمن ہیں“ کا مفہوم

## 168 ----- سورة الطلاق

168 ----- ”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ“ اور ”يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ“ کہنے میں فرق:

168 ----- طلاق کے متعلق چند احکام:

169 ----- عورت عدت کہاں گزارے؟

171 ----- ان صورتوں میں خاوند کے گھر سے نکل سکتی ہے:

172 ----- تقویٰ پر ملنے والے انعامات:

174 ----- جن کو حیض نہیں آتا ان کی عدت:

174 ----- حاملہ کی عدت:

175 ----- بچے کو دودھ پلانے کا مسئلہ:

177 ----- حقیقی عقلمند کون؟

177 ----- سات آسمان اور سات زمینیں:

179 ----- اثر ابن عباس کی توجیہ (از حضرت نانوتوی)

181 ----- ناقل بنو محقق نہیں:

183 ----- معیت ذاتیہ:

## 185 ----- سورة التحريم

185 ----- سورت کا شان نزول:

187 ----- الیاس! تم نے خون کیوں دیا؟

- 188 ----- حلال کو حرام سمجھنے کے تین درجے:
- 189 ----- محبت رسول مطلوب ہے:
- 191 ----- اپنی اور گھر والوں کی فکر کیجیے!
- 192 ----- توبہ نصوحا کیا ہے؟
- 193 ----- پیغمبر کو جہاد اور سختی کا حکم:
- 193 ----- دو مومن اور دو کافر عورتوں کی مثال:

## 195 ----- سورة الملك

- 195 ----- سورت الملك کی فضیلت:
- 195 ----- صفات متشابہات کے متعلق ہمارا موقف:
- 197 ----- احسن عملاً اور اکثر عملاً میں فرق:
- 198 ----- سبب تخلیق کائنات:
- 199 ----- تقلید واجب ہے:
- 199 ----- درجہ حفظ کے بچوں کو منظرہ سکھانا:
- 201 ----- تقلید نہ کرنے کے نقصانات:
- 203 ----- اللہ کو صرف عرش پر ماننے والوں کا علمی جائزہ:

## 205 ----- سورة القلم

- 205 ----- قلم سے کیا مراد ہے؟
- 206 ----- خلق عظیم کی حامل شخصیت:
- 206 ----- تلوار؛ اخلاق سے خارج نہیں:
- 208 ----- طاقت کی اہمیت کا انکار کبھی نہ کرنا:

- 209 ----- مداہنت سے احتراز کرو!
- 209 ----- مداہنت فی الدین حرام ہے:
- 210 ----- اکابر کے کلام سے توافق پر خوشی:
- 210 ----- موقع پر باطل کی وضاحت ضروری ہے:
- 211 ----- باغ والوں کا انجام:
- 212 ----- تجلی ساق کا ظہور:
- 213 ----- حضرت یونس علیہ السلام کا اجتہاد:
- 215 ----- حضور علیہ السلام کی حفاظت:
- 215 ----- نظر بد کا علاج:

## 216 ----- سورة الحاقة

- 216 ----- ”الحاقة“ قیامت کا ایک نام ہے:
- 217 ----- دو نفخوں کا بیان:
- 218 ----- دائیں ہاتھ والے، بائیں ہاتھ والے:
- 219 ----- جہنمیوں کا انجام:
- 220 ----- قرآن شعر نہیں:
- 221 ----- پیغمبر اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرتا:

## 223 ----- سورة المعارج

- 223 ----- نصر بن حارث کی بے جا جرأت:
- 224 ----- قیامت کے دن کی مقدار؛ تعارض کا حل
- 225 ----- حضرت عزیر کے قصہ سے منکرین کا استدلال اور اس کا جواب:

227 ----- قیامت کی ہولناکی:

227 ----- انسان کی بے صبری:

228 ----- خشوع خضوع کے ساتھ نماز کی پابندی:

## 230 ----- سورة النوح

230 ----- حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ:

232 ----- تقدیر پر اشکال کا جواب:

234 ----- استغفار کرنے پر پانچ انعامات:

236 ----- قوم نوح کے دور میں پانچ بت:

237 ----- حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا کی وجہ:

## 239 ----- سورة الجن

239 ----- شان نزول:

241 ----- جنات کا قرآن سننا:

242 ----- مشرکین کا جنات کو شریک ٹھہرانا:

243 ----- رافع بن عمیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

244 ----- ”مساجد اللہ کی ہیں“ کا معنی:

244 ----- علم غیب کی تعریف:

245 ----- اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب ہے:

245 ----- حفظ الایمان کی عبارت کی وضاحت:

## 249 ----- سورة المزمل

- 249 ----- شانِ نزول:
- 250 ----- منزل اور مدثر کا معنی:
- 250 ----- فترت وحی کے بعد نازل ہونے والی پہلی سورت:
- 250 ----- قیام اللیل کا حکم:
- 252 ----- تہجد کی منسوخت کی وجوہات:
- 254 ----- قیام لیل کی حکمت:
- 254 ----- رات کو قیام کی وجہ:
- 255 ----- ذکرِ اسم ذات کا ثبوت:
- 256 ----- سات مقاماتِ سلوک کا تذکرہ:
- 257 ----- امام، مقتدی اور منفرد کے لیے الگ الگ آیات:
- 258 ----- توبہ کا معنی و مفہوم:

## 260 ----- سورة المدثر

- 260 ----- صفتِ انداز:
- 260 ----- عقیدہ توحید پر کار بند رہنے کا حکم:
- 261 ----- بدلے کا سوچ کر احسان نہ کریں!
- 261 ----- ولید بن مغیرہ کی اسلام دشمنی:
- 263 ----- اولاد کا سامنا ہونا نعمت ہے:
- 264 ----- جہنم کے انیس فرشتے کیوں؟ (حضرت تھانوی کی توجیہ):
- 265 ----- انیس فرشتے: امتحانِ کفار اور ایمانِ مومنین
- 267 ----- کفار احکام کے مکلف ہیں یا نہیں؟

268 ----- نفسِ عذاب اور اشتدادِ عذاب:

269 ----- کفارِ گدھوں کی مانند ہیں:

## 271 ----- سورة القيامة

271 ----- قسم کے شروع میں لازماً کافرانہ:

272 ----- نفس کی تین اقسام:

273 ----- بعث بعد الموت کا اثبات:

276 ----- ترک قرأت خلف الامام کی دلیل:

277 ----- ترک قرأت خلف الامام پر گفتگو کا طریقہ:

278 ----- ”فاتحہ قرآن ہے“ پر دلیل:

279 ----- قیامت کے دن دیدارِ باری تعالیٰ:

280 ----- مجرمین کی رسوائی:

## 283 ----- سورة الدھر

283 ----- ”هَلْ“ برائے تحقیق:

283 ----- انسانی تخلیق کا مادہ:

284 ----- نذر کا حکم اور بنیادی شرائط:

285 ----- مسکین کو کھانا کھلانے کا اجر:

286 ----- جنت کے پیالوں کی بناوٹ:

287 ----- جنت کے خادم بچوں کی صفات:

288 ----- قدر اور اجر میں فرق:

290 ----- مشیتِ الہی اور رضائے الہی میں فرق:



## سورة المرسلات 292

- 292 ----- ہو اؤں اور فرشتوں کی قسمیں:
- 293 ----- جھٹلانے والوں کو انجام:
- 294 ----- متقین کی کامیابی:
- 295 ----- لفظ ”حدیث“ سے غیر مقلدین کے استدلال کا جواب:

## سورة النبأ 297

- 297 ----- بڑی خبر کیا ہے؟
- 298 ----- الفاظ کے ساتھ لہجے کی اہمیت:
- 300 ----- انعامات باری تعالیٰ:
- 300 ----- نیند، تھکاوٹ اتارنے کا مؤثر ذریعہ
- 301 ----- آسمانوں کی تخلیق و تزئین:
- 301 ----- وقوعِ قیامت کا بیان:
- 302 ----- ”حَقَب“ کی مقدار:
- 303 ----- جہنم کا ہولناک عذاب:
- 304 ----- متقین کے لیے انعامات:
- 306 ----- کافر کی حسرت؛ کاش میں مٹی بن جاتا

## سورة الزمر 307

- 307 ----- فرشتوں کی پانچ اقسام:
- 308 ----- قیامت کا منظر:

- 309 ----- موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ:
- 310 ----- بعث بعد الموت پر دلیل:
- 311 ----- وقوع قیامت کا بیان:
- 311 ----- خواہش نفس کو روکنے کے تین درجات:
- 312 ----- اپنے علم پر عمل کیجیے!

### 314 ----- سورة عَبَسَ

- 314 ----- سورت کا شان نزول:
- 315 ----- عام فہم ترجمہ کی ضرورت و اہمیت:
- 315 ----- طالب دین کو مقدم رکھیں!
- 316 ----- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد:
- 318 ----- اپنوں کا خیال پہلے رکھیں:
- 320 ----- اپنے کام پر شرح صدر:
- 320 ----- رہِ اعتدال پر گامزن رہیں!
- 322 ----- موت، مؤمن کا تحفہ
- 324 ----- ثواب و عذاب قبر برحق ہے:
- 324 ----- قبر کے متعلق بعض اشکالات کے جوابات:
- 325 ----- برزخ کی تعریف اور اعتراضات کے جوابات:
- 327 ----- کامیابی کا راز: محنت اور تقویٰ

### 329 ----- سورة التَّكْوِيْرِ

- 329 ----- نفعِ اولیٰ کے بعد کے احوال:

- 330 ----- نفخہ ثانیہ کے بعد کے احوال:
- 331 ----- زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے سوال:
- 332 ----- پانچ ستاروں کی قسمیں:
- 333 ----- جبرئیل امین کی صفات:
- 335 ----- قسم اور مقسم بہ میں مناسبت:
- 336 ----- ہدایت کی دو قسمیں:

### 338 ----- سورة الانفطار

- 338 ----- احوال قیامت کا بیان:
- 339 ----- اللہ کی صفت کریمہ:
- 340 ----- اللہ! تیرے کرم نے دھوکے میں ڈالا۔
- 340 ----- ”کریم“ کے پانچ معانی:
- 341 ----- ایصال ثواب کا اثبات:
- 343 ----- نیک اور برے لوگوں کا انجام:

### 345 ----- سورة المطففين

- 345 ----- تطفیف کا معنی:
- 346 ----- فکر آخرت تمام اعمال کی بنیاد:
- 347 ----- ”سجین“ کیا ہے؟
- 347 ----- دلوں کا زنگ:
- 348 ----- دیدار الہی:
- 350 ----- جنت کی شرابِ خالص:

## 352 ----- سورة الانشقاق

352 ----- احوال قیامت کا بیان:

353 ----- انسانی محنت اور اس کا ثمرہ:

355 ----- پیدائش سے جنت و جہنم تک کے مرحلے:

356 ----- آیت سجدہ:

## 357 ----- سورة البروج

357 ----- شانِ نزول:

360 ----- اصحابِ اخدود کا انجام:

361 ----- اہل ایمان کی کامیابی:

361 ----- اہل کفر کی ناکامی:

## 363 ----- سورة الطارق

363 ----- ”طارق“ کسے کہتے ہیں؟

364 ----- صلب اور ترائب کا معنی:

366 ----- امکانِ قیامت اور وقوعِ قیامت:

367 ----- کافروں کو مہلت:

## 368 ----- سورة الاعلىٰ

368 ----- سجدوں کی تسبیح:

369 ----- خالق اور موجد میں فرق:

- 371 ----- نسخ کی چند صورتیں:
- 371 ----- پہلے عادت، پھر عبادت:
- 373 ----- ردِ فرق باطلہ ایک مشکل کام ہے:
- 374 ----- نصیحت مؤمنین کے لیے سودمند:
- 375 ----- تزکیہ نفس کامیابی کا ذریعہ:
- 375 ----- قرآن سے اللہ کا ثبوت:

### 378 ----- سورة الغاشية

- 378 ----- مشقت برداشت کریں لیکن اللہ کے دین کے لیے:
- 379 ----- حضرت عمر اور عیسائی راہب:
- 380 ----- جہنمیوں کی خوراک؛ گرم پانی اور ضریح
- 381 ----- جنت کی نعمتیں:
- 382 ----- میزبانی کے آداب:
- 382 ----- مہمان خانے اور جیل خانے میں فرق:
- 384 ----- اونٹ، آسمان، پہاڑ اور زمین:
- 385 ----- منصب نبوت:

### 386 ----- سورة الفجر

- 386 ----- فجر، دس راتوں، جفت اور طاق سے مراد:
- 387 ----- قوم عاد کا انجام:
- 389 ----- قوم ثمود کی پکڑ:
- 389 ----- میخوں والے فرعون کا حشر:

- 390 ----- اللہ کے گھات میں ہونے کا معنی:
- 390 ----- انسان کی ناشکری کا بیان:
- 391 ----- نیکی کے کام:
- 393 ----- کفر کی وجہ سے جہنم اور اعمالِ بد کی وجہ سے از دیارِ جہنم:
- 394 ----- قیامت کے دن زمین کا بھونچال:
- 395 ----- نفس کی تین اقسام:
- 396 ----- اہل اللہ سے محبت:
- 397 ----- اولیاء اللہ کی توہین سے بچنا:

### 398 ----- سورۃ البلد

- 398 ----- قسم کے شروع میں ”لَا“ لانے کا مقصد:
- 399 ----- مشقت؛ انسانی پیدائش کا جزء لازم
- 401 ----- آنکھ؛ نعمتِ خداوندی
- 403 ----- زبان اور ہونٹ کی نعمت:
- 403 ----- حق و باطل کی پہچان:
- 404 ----- چند امورِ خیر:
- 404 ----- صبر اور صلہ رحمی کی تلقین:
- 405 ----- دائیں ہاتھ والے اور بائیں ہاتھ والے:

### 406 ----- سورۃ الشمس

- 406 ----- گیارہ قسمیں:
- 408 ----- انسان کی فطرت میں تقویٰ اور فجور کی آمیزش:

408 ----- کامیاب انسان:

408 ----- قومِ ثمود کی سرکشی کا انجام:

## 411 ----- سورة الیل

411 ----- انسانی کوشش کا تنوع:

411 ----- نیکی اور بدی کا نتیجہ:

412 ----- شریعت بنے گی طبیعت لیکن کب؟

414 ----- اشتیٰ اور اتقیٰ کے انجام میں فرق:

414 ----- صحابہ کرام محفوظ ہیں:

415 ----- حضرت سعد اور قبر کا جھکا (توجیہات)

## 417 ----- سورة الضحیٰ

417 ----- شانِ نزول:

418 ----- چاشت اور رات کی قسم کھانے کی وجہ:

419 ----- آخرت کے دنیا سے بہتر ہونے کا معنی:

420 ----- عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

422 ----- روح اور جسم کے تین تعلقات:

424 ----- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کب راضی ہوں گے؟

424 ----- پیغمبر پاک پر نعمتِ خداوندی:

425 ----- تین احسانات اور تین اہم احکامات:

## 428 ----- سورة الم نشرح

- 428 ----- شرح صدر کا معنی:
- 429 ----- ”آپ کا بوجھ اتار دیا“ کا معنی:
- 430 ----- ایکسڈنٹ کا واقعہ:
- 431 ----- ہم نے آپ کا نام بلند کر دیا:
- 432 ----- ایک تکلیف اور دورِ احتی:
- 433 ----- رجوع الی اللہ؛ کام بڑھانے کا ذریعہ
- 434 ----- عبادات کی دو قسمیں:
- 435 ----- خود کو تھکا دیں!
- 435 ----- مصیبت کے وقت کی دعا:

### 437 ----- سورة التین

- 437 ----- انجیر، زیتون، طورِ سینین اور مکہ مکرمہ کی قسم:
- 437 ----- انسان اللہ کی قدرت کا حسین شاہکار:
- 438 ----- آیت کے دو مطلب:
- 440 ----- ”تو چاند سے زیادہ خوبصورت نہ ہوئی تو تجھے تین طلاق!“

### 443 ----- سورة العلق

- 443 ----- قرآن کریم کی پہلی نازل ہونے والی آیات:
- 444 ----- شانِ نزول:
- 445 ----- صفتِ رب؛ جامع الصفات
- 445 ----- انسان کی پیدائش:
- 446 ----- قلم؛ تعلیم کا ایک اہم ذریعہ



448 ----- ابو جہل کی دشمنی:

448 ----- ابو جہل کا انجام بد:

## 450 ----- سورة القدر

450 ----- شان نزول:

451 ----- لیلۃ القدر کا پہلا معنی:

451 ----- کیا پہلی امتوں میں بھی امر بالمعروف تھا؟

452 ----- لیلۃ القدر کا دوسرا معنی:

453 ----- قرآن محفوظ ہے:

454 ----- نزول قرآن دوبار ہوا ہے:

## 456 ----- سورة التیّٰتہ

456 ----- اہل کتاب اور مشرکین کی ہٹ دھرمی:

457 ----- کتبِ قیمہ سے مراد:

457 ----- شریعتِ محمدیہ اعتدال کا نام ہے:

458 ----- اہل کتاب کے اختلاف کی وجہ:

459 ----- اہل کتاب اور مشرکین کا انجام:

460 ----- جنت کی نعمتیں:

## 461 ----- سورة الزلزال

461 ----- احوالِ قیامت:

462 ----- نیکی اور برائی کا بدلہ یقینی ہے:

463 ----- دین کا خلاصہ:

### 465 ----- سورة العنکبوت

465 ----- گھوڑوں کی قسمیں:

466 ----- انسانی خصلت مال سے محبت:

467 ----- حیات فی القبر:

468 ----- قسم اور مقسم بہ میں مناسبت:

### 469 ----- سورة القارعة

469 ----- قارعہ کا معنی:

469 ----- انسان؛ بکھرے ہوئے پتنگے

470 ----- پہاڑ؛ دھکی ہوئی روئی

470 ----- آخرت؛ عیش کی جگہ یا عذاب کا مقام

470 ----- وزن اعمال دو مرتبہ ہوگا:

### 472 ----- سورة النکاث

472 ----- مال پر فخر کا انجام:

473 ----- یقین کے تین درجات:

### 475 ----- سورة العصر

475 ----- کامیابی کا راز:

476 ----- تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا معنی:

## 477 ----- سورة الهمزة

477 ----- عیب جوئی اور طعنہ زنی دو بری خصلتیں:

478 ----- مال سے حد درجہ محبت:

478 ----- حُطْمہ کیا ہے:

## 480 ----- سورة الفيل

480 ----- واقعہ اصحابِ فیل:

483 ----- ہاتھی والوں کا انجام:

## 485 ----- سورة القريش

486 ----- عبادت کے لیے دواہم چیزیں:

## 487 ----- سورة الماعون

## 488 ----- سورة الكوثر

488 ----- شانِ نزول:

488 ----- ”الکوثر“ کا معنی:

## 492 ----- سورة الكفرون

492 ----- شانِ نزول:

493 ----- دو جملوں کے تکرار کی وجہ:

495 ----- اہل باطل سے براءت کا اعلان:

495 ----- دین اور مذہب میں فرق:

496 ----- خطاب کرنے اور نقل کرنے میں فرق:

497 ----- تشہد کے صیغہ خطاب سے استدلال کا استدلال کا جواب:

500 ----- سورة النصر

502 ----- سورة الہب

502 ----- سورت کا شان نزول:

503 ----- ابولہب کا انجام:

503 ----- ابولہب کی بیوی کا حشر:

504 ----- انکیشن نہیں سلیکشن!

505 ----- سورة الاخلاص

505 ----- توحید باری تعالیٰ:

505 ----- ”صمد“ کا معنی:

506 ----- اللہ نہ کسی کا باپ نہ کسی کا بیٹا:

508 ----- سورة الفلق

508 ----- سورة الناس

508 ----- معوذتین کا شان نزول:

510 ----- جادو کا ہو جانا برحق ہے:

510 ----- جادو گر کا میاب نہیں ہوتا کا مطلب:

- 512 ----- جادو سے بچنے کا وظیفہ:
- 515 ----- قرآن کریم کے آغاز و اختتام میں ربط:
- 516 ----- پورے قرآن کا خلاصہ:
- 520 ----- لفظ رب، مالک، الہ لانے کا مقصد:

## سورة الحديد

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿سَبِّحْ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (1)

### پانچ مسبجات:

سورت حديد، سورت حشر، سورت صف، سورت جمعه اور سورت تغابن یہ پانچ سورتیں ایسی ہیں جن کا آغاز تسبیح سے ہوتا ہے۔ ان پانچ سورتوں کو مُسَبِّحات کہتے ہیں۔ پہلی تین سورتیں حديد، حشر اور صف یہ لفظ ”سَبِّحْ“ سے شروع ہوتی ہیں اور سورت جمعه اور تغابن یہ لفظ ”يُسَبِّحُ“ سے شروع ہوتی ہیں۔

### تسبیح حالاً اور تسبیح قالاً:

﴿سَبِّحْ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (2)

اللہ ہی کے لیے تسبیح بیان کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمینوں میں

ہیں۔

تسبیح دو قسم کی ہے؛ ایک ہوتی ہے تسبیح حالاً اور ایک ہوتی ہے تسبیح قالاً۔ حالاً کا معنی ہے کہ ایسی تسبیح جو دوسرے کو سنائی نہ دے اور قالاً کا معنی ہوتا ہے کہ ایسی تسبیح جو دوسرے کو محسوس ہو۔ سورج صبح سے لے کر شام تک چلتا ہے، روزانہ ایک وقت مقررہ پر نکلتا ہے اور ایک مقررہ وقت پر ڈوبتا ہے، ترتیب سے دائیں بائیں نہیں ہوتا،

سورج اللہ کے حکم کی پابندی کرتا ہے، یہی اس کی تسبیح ہے۔

جس طرح ہم کہتے ہیں کہ شکر کی دو قسمیں ہیں: ایک ہوتا ہے شکرِ صوری اور ایک ہوتا ہے شکرِ حقیقی۔ شکرِ صوری یہ ہے کہ شکر کی صورت ہو۔ مثلاً یا اللہ! تیرا بڑا شکر ہے، یا اللہ! تیرا بڑا اکرم ہے، یا اللہ! تیرا بڑا احسان ہے... اور شکرِ حقیقی کہ آدمی زبان سے تو کچھ نہیں کہہ رہا لیکن جو اللہ کا حکم ہو اس پر پابندی سے عمل کرتا ہے اور مان لیتا ہے۔ شکرِ حقیقی یہ شکرِ صوری سے بھی زیادہ افضل ہوتا ہے لیکن صوری اور حقیقی ہونے دونوں چاہئیں۔

﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾

اللہ اول حقیقی ہے اور آخر حقیقی ہے۔ اول حقیقی کا معنی کہ جس کی کوئی ابتدا نہیں اور آخر حقیقی کا معنی کہ جس کی کوئی انتہا نہیں، ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہے۔

### وساوس کے بچنے کا وظیفہ:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو وساوس کی تکلیف ہو، وساوس کا مریض ہو تو یہ آیت آہستہ سے پڑھ لیا کرے اللہ اس سے وساوس کو ختم فرمادیتے ہیں۔

### فنائے امکانی اور فنائے عملی:

اللہ تعالیٰ اول بھی ہے اور آخر بھی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ باقی جتنی چیزیں ہیں وہ فنا ہوں گی لیکن اللہ کی ذات کبھی فنا نہیں ہوگی۔

اس پر ایک اشکال ہے کہ یہ جو فرمایا گیا ہے ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ کہ ہر چیز فنا ہوگی لیکن اللہ رب العزت نے جنت کو پیدا فرمایا ہے اور یہ فنا نہیں ہوگی، جہنم کو

پیدا فرمایا ہے یہ بھی فنا نہیں ہوگی... تو پھر یہ بات کیسے ٹھیک ہوگی کہ اللہ رب العزت کی ذات کے علاوہ ہر چیز فنا ہوگی؟!

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہے فنا کا وقوع اور ایک ہے فنا کا امکان۔ فنا کا وقوع تو سب پر نہیں ہوگا، اللہ نے جنت کو پیدا فرمادیا ہے اب جنت فنا نہیں ہوگی، جہنم کو پیدا فرمادیا ہے اب جہنم فنا نہیں ہوگی لیکن فنا کا امکان ان پر بھی ہے یعنی جنت اپنی ذات کے لحاظ سے باقی رہنے والی نہیں ہے، اپنی ذات کے اعتبار سے توفانی ہے لیکن اللہ نے اس کو بقا عطا فرمادی ہے اور اللہ کی ذات وہ ہے جس پر فنا کا وقوع بھی نہیں اور فنا کا امکان بھی نہیں۔

### معیت باری تعالیٰ:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾

اللہ پاک تمہارے ساتھ ہیں تم جہاں کہیں بھی ہو اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہیں۔

میں ایسی آیات بار بار ذکر کرتا ہوں تاکہ آپ اس عقیدے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ ایک اللہ کی معیت ذاتیہ ہے اور ایک اللہ کی معیت وصفیہ ہے۔ جمہور اسی بات پر ہیں کہ اللہ کی معیت؛ معیت ذاتیہ ہے اور ہمارے بہت سارے صوفیا اس بات پر ہیں کہ اللہ کی معیت؛ معیت صفاتیہ ہے۔ مجھے خود اس پر ہمیشہ خلجان رہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی معیت کو معیت ذاتیہ ماننے میں کوئی اشکال نہیں ہے تو پھر معیت ذاتیہ کی نفی کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟

حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا میں نے ایک جواب پڑھا اور وہ جواب وہ تھا جو میں خود دیتا ہوں، جب حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا جواب پڑھا تو شرح صدر ہوتا ہے کہ یہ ہمارا ذاتی جواب بھی ہے اور اکابر کا بھی ہے۔ وہ جواب یہ ہے



کہ جب جمہور معیتِ ذاتیہ کی نفی کرتے ہیں تو وہاں اصل نفی تجسیم کی ہے، چونکہ جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ ہر جگہ پر ہے تو عوام کا ذہن یہ بنتا ہے کہ شاید اللہ کا جسم ہر جگہ پر ہے، اللہ تعالیٰ چونکہ جسم سے پاک ہیں تو تجسیم کی نفی کے لیے معیتِ ذاتیہ کی نفی ہوتی ہے اور اگر تجسیم کا شبہ نہ ہو تو پھر معیتِ ذاتیہ پر کوئی اشکال اور کوئی کلام نہیں ہے۔

میں نے پہلے بھی آپ سے عرض کیا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا۔ کہ بہت سارے معاملات میں میری اپنی تعبیرات ہوتی ہیں، مجھے ایک بات پر شرح صدر ہوتا ہے تو وہ میں اپنی رائے کے طور پر پیش کرتا ہوں اور الجھن یہ رہتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ رائے رائج نہ ہو لیکن جب اس پر اکابر کی رائے ملتی ہے تو پھر آدمی کا دل بہت خوش ہوتا ہے کہ یہ میری ذاتی رائے نہیں ہے۔

**ایمان لانے کا فطری جذبہ ہر ایک میں موجود ہے:**

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالرَّسُولِ يَدْعُوكُمْ لِتُؤْمِنُوا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾<sup>(۱)</sup>

کیا بات ہے کہ تم ایمان نہیں لاتے حالانکہ اللہ کے رسول تمہیں بلاتے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ اور اس سے پہلے تم اللہ سے وعدہ بھی کر چکے ہو۔ عالم ارواح میں جب اللہ رب العزت نے فرمایا تھا کہ ”اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ“ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا تھا ”جی“ کیوں نہیں؟! آپ ہمارے رب ہیں۔ تو تم عالم ارواح میں وعدہ کر چکے ہو تو اب ایمان کیوں نہیں لاتے؟

ایک بات اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں! کیونکہ عالم ارواح میں روح نے ”جی“ کہا تھا اس لیے آج دنیا میں فطری اور طبعی طور پر انسان میں اللہ کی ذات پر ایمان لانے کا جذبہ موجود ہے، بس ماحول اس کو دبا دیتا ہے، جس طرح آگ کی چھوٹی سی

چنگاری راکھ میں موجود ہوتی ہے اور اوپر جو راکھ پڑی ہے وہ آگ کی چنگاری کو بھڑکنے نہیں دیتی، جب آپ راکھ ہٹائیں گے تو اندر سے وہ چنگاری بھڑک جائے گی۔ بالکل اسی طرح انسان کے دل میں ایمان لانے کا جذبہ موجود ہوتا ہے لیکن وہاں کا جو ماحول ہوتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتا۔ آپ جب کسی کافر کو دلائل سے بات سمجھائیں گے اور دلائل سے ماحول کا اثر چھٹے گا تو اللہ کی ذات پر ایمان لانے کا جذبہ بیدار ہو جائے گا۔ جیسے حدیث پاک میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُلُّ مَوْلُودٍ يُوَدُّ لَدَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ وَيُنَصِّرَانِهِ<sup>1</sup>۔

ہر بندہ طبعاً فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، بعد میں اس کے والدین کبھی اس کو یہودی بنادیتے ہیں اور کبھی اس کو عیسائی بنادیتے ہیں۔

اسی طرح اللہ نے انسان کی فطرت میں نیکی کا جذبہ بھی رکھا ہے۔

اللہ گیارہ قسمیں کھا کر فرما رہے ہیں ﴿فَالْتَمَسْهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ (سورۃ الشمس) کہ اللہ نے ہر انسان کی طبیعت میں گناہ کا ذوق بھی رکھا ہے اور گناہ سے بچنے کی طاقت بھی رکھی ہے۔

بعض لوگ خالصتاً بے حیائی کے ماحول میں ہوں گے اور کسی بھی وقت مسجد کی طرف آئیں اور تھوڑی سی بات سنیں تو زندگی ایسے بدل جاتی ہے کہ بندے کو بظاہر یقین نہیں آتا کہ کبھی اس کی زندگی بھی بدلے گی؟ اور بعض لوگ گناہوں میں ڈوبے ہوتے ہیں لیکن آپ تھوڑی سی دین کی بات شروع کر دیں تو تڑپنا شروع ہو جاتے ہیں پھر جب باہر جاتے ہیں تو دوبارہ گناہ شروع ہو جاتے ہیں۔ ہم یہاں نیکیوں کے ماحول میں ہوتے ہیں، پھر اندر سے توبہ کی طبیعت بھی بن جاتی ہے لیکن باہر نکل کر پھر گناہ ہو

جاتا ہے۔ یہ جو برا ماحول ہے یہ انسان کو بہت زیادہ تباہ کر دیتا ہے۔

**کفار کو ”اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ“ کہنے کا مطلب:**

﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُولِ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا  
بِرَبِّكُمْ وَقَدْ آخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

سوال اس پہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار کو یہ فرما رہے ہیں کہ تم اللہ پر ایمان کیوں نہیں لاتے حالانکہ رسول تمہیں اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، پھر کہا کہ اس سے پہلے عالم ارواح میں تم عہد بھی کر چکے ہو ایمان لانے کا، آگے فرمایا: ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ کہ اگر تم مؤمن ہو! سوال یہ ہے کہ وہ تو مؤمن نہیں تھے؛ وہ تو کافر تھے تبھی تو ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم اللہ پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ تو کافروں کو ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ کہنے کا کیا مطلب ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ میں نفس فعل مراد نہیں ہے بلکہ دعویٰ فعل مراد ہے یعنی اگر تم ایمان کا دعویٰ کرتے ہو اور اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر پیغمبر کی بات کیوں نہیں مانتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر خود بھی کہتے تھے کہ ہم مؤمن ہیں، کہتے تھے: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰی﴾ کہ ہم جو بتوں کی پوجا کرتے ہیں تو اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ ہم اللہ کو نہیں مانتے، ہم اللہ کو مانتے ہیں، باقی یہ اللہ کے محبوب بندوں کی تصویریں ہیں، یہ ہمیں اللہ کے اور قریب کر لیتے ہیں۔

وہ دعویٰ ایمان کا رکھتے تھے تو اللہ فرماتے ہیں کہ اگر اپنے دعویٰ ایمان میں

سچے ہو کہ اللہ کو مانتے ہو تو اللہ کے رسول کو کیوں نہیں مانتے؟ صرف اللہ کو ماننے کا نام ایمان نہیں ہے بلکہ اللہ کی ساری باتوں کو ماننے کا نام ایمان ہے۔ تو جب اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر بھیجا ہے اور تمہارا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں تو اللہ کی بات مان کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مان لو! پھر کیوں نہیں مانتے۔

### انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب:

﴿وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ

الْأَرْضِ ط﴾

تم اللہ کے راستہ میں مال خرچ کیوں نہیں کرتے؟ حالانکہ زمین و آسمان کا وارث تو اللہ ہے۔

یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ مال جو تمہیں دیا ہے وہ اللہ کا ہے، آپ کو تھوڑے وقت کے لیے دیا ہے اور اللہ کا مال اللہ کے راستے میں خرچ کرنا اس سے انسان کو رکنا نہیں چاہیے بلکہ بڑھ کر خرچ کرنا چاہیے۔

”میراث“ کا معنی ہوتا ہے کہ ایک مالک کے فوت ہونے کے بعد دوسرے انسان کو مال مل جائے، یہ میراث ہے اور وراثت میں بلک اختیاری نہیں ہوتی بلکہ ملک جبری ہوتی ہے یعنی بیٹا باپ کے مرنے کے بعد باپ کے مال کا مالک نہ بھی بننا چاہیے تو وہ پھر بھی بنے گا، اس میں اس کے اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ جبری چیز ہے۔ تو اللہ تعالیٰ یہاں پر یہ سمجھا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کے مالک ہیں، کیا مطلب کہ حقیقتاً مال ہے ہی اللہ کا، تم چاہو تب بھی اللہ کا ہے اور نہ چاہو تب بھی اللہ کا ہے، وقتی طور پر تمہیں دیا ہے، تم جب جاؤ گے تو مال اپنے حقیقی مالک کے پاس خود بخود چلا جائے گا، یہ تھوڑی دیر کے لیے دیا ہے، اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔

**اولین ساتھ دینے والے افضل ہوتے ہیں:**

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَتْلٍ ۖ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَتَلُوا ۖ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝﴾

خرچ کرنے والے تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے لیکن یہ بات فرمائی کہ فتح مکہ سے پہلے جنہوں نے خرچ کیا اور جہاد کیا وہ افضل ہیں ان سے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد خرچ کیا اور جہاد کیا۔ پہلے والے افضل ہیں۔ افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کوئی تحریک لے کر اٹھے اور پتانہ ہو کہ تحریک چلے گی یا نہیں چلے گی؟ مشکلات ہوں تو اس وقت جو ساتھ دینے والے ہوں وہ افضل ہوتے ہیں۔ تو فتح مکہ سے پہلے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چل رہے تھے تو اس وقت لوگوں کو شک تھا کہ پتا نہیں آگے ان کا کیا ہو گا اور اکثر کفار کو یقین تھا کہ معاذ اللہ یہ کچھ دنوں بعد ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت جو لوگ جان کی پرواہ کیے بغیر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملے ہیں وہ ان سے افضل ہیں جو اس وقت آئے جب اطمینان ہو گیا تھا کہ اب اسلام غالب ہے، اب اس کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ حکمت ہے پہلے لوگوں کے زیادہ اجر کی۔

**ایک اشکال کا جواب (حضرت سعد بن معاذ اور قبر کی تنگی)**

﴿وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۗ﴾

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہر ایک کے ساتھ جنت کا وعدہ کیا ہے۔ یہاں ایک سوال اور اس کا جواب سمجھیں:

سوال یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم

جنتی ہیں، کسی صحابی کو عذاب نہیں ہو گا لیکن بہت ساری روایات سے پتا چلتا ہے کہ بعض صحابہ کو قبر کا عذاب ہوا ہے۔ مثلاً حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو جب قبر میں دفن کیا گیا تو قبر نے ان کو دبوچا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر وہاں ٹھہرے، ان کے لیے دعا کی۔ تو عذاب تو ہوا ہے۔

اس کے کئی ایک جوابات ہیں۔ ان کو اچھی طرح سمجھ لیں:

[۱]: ایک جواب تو اس کا یہ ہے کہ یہ جو وعدہ ہے کہ صحابی کو عذاب نہیں ہو گا، اس سے مراد قبر کا عذاب نہیں ہے بلکہ مراد جہنم کا عذاب ہے۔ حدیث میں جو ہے:

لَا تَمَسُّ النَّارُ مُسْلِمًا رَأَى أَوْ رَأَى مَنْ رَأَى.<sup>3</sup>

اس مسلمان کو آگ نہیں چھو سکتی جس نے مجھے دیکھا یا اس مسلمان کو دیکھا جس نے مجھے دیکھا!

تو اس کا تعلق قبر کے ساتھ نہیں ہے، اس کا تعلق جہنم کے ساتھ ہے اور کسی صحابی کے بارے میں کوئی روایت موجود نہیں ہے کہ حشر کے بعد کوئی صحابی تھوڑی دیر کے لیے بھی جہنم میں جائے... قبر کے واقعات تو ملیں گے لیکن جہنم کا کوئی واقعہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔

[۲]: اور دوسرا اس کا جواب یہ ذہن میں رکھ لیں کہ قبر کی حیثیت کیا ہے؟ قبر دنیا کی زندگی کا تتمہ ہے اور آخرت کی زندگی کا مقدمہ ہے۔ قبر؛ دنیا کی انتہا ہے اور آخرت کی ابتدا ہے۔ جس طرح معروف شاعر علامہ محمد اقبال کا شعر ہے:

موت کو سمجھیں غافل اختتامِ زندگی

ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

ایک جہاں ختم ہو رہا ہے اور دوسرا جہاں شروع ہو رہا ہے۔ تو قبر ایک حیثیت سے دنیا ہے اور ایک حیثیت سے آخرت ہے۔ اب یہ دیکھیں کہ دار العمل نہیں ہے تو اس حساب سے آخرت شروع ہو گئی ہے اور یہ دیکھیں کہ جزا و سزا مکمل نہیں ہے تو پھر آخرت بھی نہیں ہے کیونکہ جزاء و سزاء آخرت میں مکمل ہوگی۔ یہاں جزاء و سزا مکمل نہیں ہے کیونکہ نہ تفصیلی سوال ہے، نہ تفصیلی جواب ہے لیکن چونکہ دار العمل بھی نہیں ہے اس لیے اس کو دنیا بھی نہیں کہہ سکتے۔ تو یہاں پر دنیا ختم ہو رہی ہے اور آخرت شروع ہو رہی ہے اور دنیا میں آدمی نیک سے نیک بھی ہو تو اس کو کچھ تکلیف کا آجانا یہ نیکی کے خلاف نہیں ہوتا۔ تو یہ چونکہ من کل الوجوہ آخرت نہیں ہے اس لیے کسی صحابی کو اس میں تکلیف کا آجانا یہ صحابی کو عذاب نہ ہونے کے مخالف نہیں ہے۔

عام طور پر لوگ یہ کہتے ہیں کہ دم کر دیں تاکہ میں ٹھیک ہو جاؤں اور دم کرنے والا خود بیمار ہو جائے تو لوگوں کو تعجب ہوتا ہے حالانکہ تعجب نہیں ہونا چاہیے، دنیا تو دار الابتلاء ہے۔ تو جس طرح دنیا میں کسی نیک آدمی پر تکلیف کا آجانا اس کے تقویٰ کے خلاف نہیں ہوتا اسی طرح قبر چونکہ من کل الوجوہ آخرت نہیں ہے تو اس میں بھی کسی صحابی پر تکلیف کا آجانا اس کے عذاب نہ ہونے کے خلاف نہیں ہے۔

یہ دونوں جواب ذہن نشین فرمائیں۔ یہ جو پہلا جواب میں نے دیا ہے یہ مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے معارف القرآن میں دیا ہے اور جو دوسرا جواب ہے یہ میں نے کہیں نہیں پڑھا، اگر غلطی ہو تو میری طرف سے اور اگر ٹھیک ہو تو پھر اللہ کی طرف سے... بعض حضرات نے اور جوابات بھی دیے ہیں لیکن بہترین یہی دو جواب ہیں جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیے ہیں۔

خلاصہ ان کا یہ نکلتا ہے کہ یا تو عذاب سے مراد ہے جہنم کا عذاب کہ جہنم میں نہیں جائیں گے... یا جواب یہ ہے کہ قبر من کل الوجوہ آخرت نہیں ہے بلکہ یہ دنیا کا

تمتہ ہے اور آخرت کا مقدمہ ہے، تو جس طرح دنیا میں کسی مسلمان متقی پر تکلیف کا آجانا یہ تقویٰ کے منافی نہیں ہے اسی طرح قبر میں کسی صحابی پر تکلیف کا آجانا ان کے عذاب کے نہ ہونے کے منافی نہیں ہے۔ جہنم کا عذاب ان پر ہر گز نہیں ہوگا۔

### خلفائے راشدین چار ہیں:

﴿وَكَلَّمَ اللَّهُ الْحُسَيْنِ﴾

یہاں پر ایک بات اور بھی سمجھ لیں! جب ہم کہتے ہیں کہ خلفائے راشدین چار ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ خلفائے راشدین چار نہیں بلکہ سات ہیں۔ وہ ان چار کے بعد حضرت امیر معاویہ، حضرت حسن اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کو بھی خلفائے راشدین میں شامل کرتے ہیں۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ چھ ماہ تک خلیفہ رہے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کچھ عرصہ مکہ مکرمہ پر خلیفہ رہے ہیں اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت تو کئی سالوں پر محیط ہے۔ تو ان کا خلیفہ ہونا حقائق سے ثابت ہے جس کا رد نہیں ہو سکتا اور یہ تینوں راشدین بھی ہیں کیونکہ قرآن کریم نے تمام صحابہ کو فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ﴾ تو یہ تینوں خلفاء بھی ہیں اور راشد بھی ہیں، اس لیے خلفائے راشدین چار نہیں بلکہ سات ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ ”خلفائے راشدین“ یہ شرعی اصطلاح ہے۔ خلفائے راشدین سے مراد کیا ہے؟ تو قرآن کریم میں ہے:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ



فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ ۖ ﴿٤﴾

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال بھی کیے تو اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ اللہ انہیں زمین میں خلافت کا جس طرح پہلے لوگوں کو دی تھی اور اپنے پسندیدہ دین کو ضرور اقتدار بخشے گا۔

اس آیت استخلاف میں جن حضرات سے خلافت کا وعدہ ہے وہ چار ہیں، سات نہیں۔ تو خلفائے راشدین سے مراد ہے ”خلافت راشدہ موعودہ فی القرآن“ اس سے مطلق خلافت راشدہ مراد نہیں اور وہ چار خلفاء ہی ہیں، سات نہیں ہیں۔ باقی ان تین صحابہ کی خلافت ہے اور خلافت عادلہ ہے۔ خلافت راشدہ سے مراد وہ خلفاء ہیں جن کے ساتھ خلافت کا قرآن میں وعدہ ہے اور وہ چار ہیں سات نہیں۔ اس کے دلائل آیت استخلاف کی تشریح میں اپنے مقام پر ہیں۔

### عشرہ مبشرہ ایک اصطلاح ہے:

یہ آیت ﴿كُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى﴾ میں بطور جواب کے پیش کرنے لگا ہوں کہ ہم کہتے ہیں عشرہ مبشرہ فی الجنۃ کہ جن صحابہ کو جنت کی بشارت دی ہے وہ دس ہیں؛ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت سعد، حضرت سعید، حضرت زبیر، حضرت ابو عبیدہ، حضرت عبد الرحمن بن عوف اور حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ یہ دس صحابہ کرام ہیں۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ رب العزت تو فرما رہے ہیں: ﴿كُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى﴾ کہ جنت کا سب کے ساتھ

وعدہ ہے اور تم کہتے ہو کہ جنت کی بشارت ان دس کو ملی ہے، لہذا ان میں سے صرف دس کو عشرہ مبشرہ بالجنة کہنا یہ اس آیت کے خلاف ہے، سب صحابہ کو جنت کی بشارت ہے، لہذا عشرہ مبشرہ بالجنة نہ کہا کرو! یہ سوال بالکل اسی طرح ہے جس طرح وہ کہتے ہیں کہ ساتوں خلفاء بھی ہیں اور راشد بھی ہیں، اس لیے خلفائے راشدین سات بنتے ہیں چار نہیں، اس لیے صرف چار کو خلیفہ راشد نہ کہا کرو بلکہ سات کو کہا کرو!

اس کا جواب یہ ہے کہ عشرہ مبشرہ بالجنة ایک خاص اصطلاح ہے اور اس سے مراد ایسے صحابہ کرام ہیں جن کو ایک مجلس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نام لے کر جنتی ہونے کی بشارت دی ہے۔ وہ دس ہیں، وہ سارے نہیں ہیں۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ باقی کو بشارت نہیں ملی بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ صحابہ جن کا نام لے کر ایک مجلس میں جنت کی بشارت دی ہے وہ دس ہیں، اب یہ ﴿كُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى﴾ کے خلاف نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح خلفائے راشدین سے مراد وہ صحابہ ہیں جن کی خلافت کا وعدہ آیت استخلاف وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ میں ہے اور وہ چار ہی ہیں۔ لہذا ان چار کا خلیفہ راشد ہونا باقی کے ”هُمْ الْمُرْشِدُونَ“ ہونے کے خلاف نہیں ہے۔ یہ بات سمجھ میں آگئی؟

یہ باتیں میں اس لیے آپ کو بار بار سمجھاتا ہوں اور سبق میں عرض کرتا رہتا ہوں تاکہ آپ پر بات کھلے۔ جب انسان پر اپنا موقف کھل جاتا ہے تو پھر اس حقیقی مسلک کے خلاف آنے والے دلائل سے بندہ متاثر نہیں ہوتا۔

**مؤمنین کے نور سے کیا مراد ہے؟**

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَ بَآيَمَانِهِمْ بُشْرُكُمُ الْيَوْمَ جَنَّتْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا<sup>ط</sup>

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٧﴾

اس دن جب آپ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے سامنے اور دائیں جانب ہو گا۔ ان سے یہ کہا جائے گا کہ آج کے دن تمہارے لیے خوشخبری ہے ایسے باغات کی جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ تم ہمیشہ ان میں رہو گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔

اس نور سے مراد وہ نور ہے جو قیامت کے دن مؤمن کو ملے گا جب وہ پل صراط کی طرف جائیں گے، نور ان کے سامنے بھی ہو گا اور دائیں جانب بھی ہو گا۔ بعض روایات میں بائیں جانب کے نور کا بھی ذکر ہے، اس لیے یہاں دائیں جانب کا ذکر ہونا یہ بائیں جانب کے خلاف نہیں ہے، کیوں کہ عدم ذکر عدم وجود کو مستلزم نہیں ہوتا کہ اگر یہاں بائیں جانب کا ذکر نہیں کیا تو بائیں جانب ہو گا ہی نہیں! ایسی بات نہیں۔ یہاں اعزاز بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اصحاب الیمین ہیں، ان کے سامنے بھی نور ہو گا اور ان کے دائیں جانب بھی نور ہو گا۔

اور بعض روایات میں ہے کہ ہر بندے کا نور اس کے اعمال کے مطابق ہو گا۔ مختلف روایتیں ہیں در منثور میں اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر مظہری میں بھی ان کو جمع کیا ہے۔ مختلف روایات ہیں مثلاً وضو کریں گے تو اس کا بھی نور ہو گا، صدقہ کریں گے تو اس کا بھی نور ہو گا، تکبیر اولیٰ سے نماز پڑھیں گے تو اس کا بھی نور ہو گا اور سورۃ الکہف کا نور تو اتنا لکھا ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن سورت کہف پڑھتا ہے تو اس کے قدم سے لے کر آسمان تک نور ہو گا۔

**منافقین کی اس نور سے محرومی:**

﴿يَوْمَ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا

نَقْتَسِسْ مِنْ نُورِكُمْ قِيلَ اِرْجِعُوا وَاَعْكُمُ فَالْتَمِسُوا نُورًا فَضَرَبَ بَيْنَهُمْ  
بِسُورَةِ بَابٍ طَبَاطُئُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿٣٢﴾

روایات میں ہے کہ مؤمن کو بھی نور ملے گا اور منافق کو بھی ملے گا۔ مؤمن اور منافق دونوں پل صراط کی طرف آئیں گے تو وہاں منافقین کا نور ختم ہو جائے گا۔ اس وقت یہ لوگ پریشان ہوں گے اور مؤمنین کو پکار کر کہیں گے: ﴿اَنْظُرُوْنَا نَقْتَسِسْ مِنْ نُورِكُمْ﴾ کہ ہمیں دیکھو! ہمیں بھی تھوڑا سا نور دے دو، تو ان سے کہا جائے گا ﴿اِرْجِعُوا وَاَعْكُمُ فَالْتَمِسُوا نُورًا﴾ کہ پیچھے مڑ جاؤ اور نور تلاش کرو! جب وہ پیچھے دیکھیں گے کہ شاید پیچھے سے نور ہمیں ملے گا تو مسلمانوں اور منافقین کے درمیان دیوار آجائے گی۔ اب یہ آگے دیکھیں گے تو کچھ بھی نہیں ہو گا اور دیوار ایسی ہوگی کہ اس میں کی جانب جو مؤمنین کی طرف ہوگی وہاں رحمت ہوگی اور باہر کی جانب جو منافقین کی طرف ہوگی وہاں عذاب ہو گا۔ اب یہ الجھن میں پڑ جائیں گے کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا؟!

**مؤمنین اور منافقین کا مکالمہ:**

﴿يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ قَالُوْا بَلٰى وَكُنْكُمْ فَمَنَّمُ  
اَنْفُسُكُمْ وَتَرَبَّصْتُ وَاذْتَبَعْتُ وَغَرَّتْكُمْ الْاَمَانِي حَتّٰى جَاءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ  
بِاللّٰهِ الْعُرُوْرُ﴾ ﴿٣٣﴾

وہ منافق لوگ ان مؤمنین سے کہیں گے: کیا ہم دنیا میں تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ مسلمان کہیں گے کیوں نہیں! تم ہمارے ساتھ تھے لیکن تم نے خود کو گمراہی میں ڈال دیا تھا اور تم منتظر تھے کہ کب اسلام ختم ہو گا، کب ان مسلمانوں پر کافر غالب آئیں گے؟! اور تم دین کے بارے میں شک میں پڑے رہتے تھے اور تمہاری تمناؤں

اور امیدوں نے تمہیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا کہ مسلمان آج مرے تو کل مرے...  
تم اسی فکر میں پڑے رہتے تھے یہاں تک کہ موت آگئی۔ شیطان نے تمہیں دھوکہ  
دے کر خدا سے کتنا دور کر رکھا تھا۔

﴿فَالْيَوْمَ لَا يُوْخِذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ مَأْوَكُمْ  
النَّارُ هِيَ مَوْلَاكُمْ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾ (١٥)

آج نہ تو تم سے فدیہ لیا جائے گا اور نہ عام کافروں سے۔ تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے  
اور تم وہیں رہو گے اور جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔

### ایمان والوں کا تذکرہ:

اب اللہ ایمان والوں سے فرماتے ہیں:

﴿الْمُؤْمِنُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنْ  
الْحَقِّ ۚ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ  
فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَسِقُونَ﴾ (١٦)

کیا ایمان والوں پر ابھی ایسا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور دین  
حق کی وجہ سے نرم پڑ جائیں اور یہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوں جنہیں کتاب دی گئی اور  
پھر ان پر ایک لمبا زمانہ گزر گیا اور ان کے دل سخت ہو گئے اور بہت سے لوگ ان میں  
نافرمان بھی ہیں۔

﴿اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمْ الْآيَاتِ  
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ (١٧)

آدمی گناہ کرے تو دل مر جاتا ہے، توبہ کرے تو دل زندہ ہو جاتا ہے جیسے  
مردہ زمین کو اللہ زندہ کر دیتے ہیں۔ مردہ زمین اور بنجر زمین کے لیے پانی آباد ہونے کا

سبب بنتا ہے، اسی طرح اللہ کے ذکر سے مردہ قلوب زندہ ہوتے ہیں۔

﴿إِنَّ الْمَصْدِقِينَ وَالْمُصَدِّقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضَعَّفُ

لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ﴾

جو مرد اور عورتیں صدقہ کرتے ہیں اور اللہ کو اچھا قرض دیتے ہیں تو اللہ ان کے صدقات کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے اور ان کے لیے بہترین اجر ہے۔  
آج وقت ہے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا اس لیے خلوص سے اللہ کی راہ میں دیں۔

**سارے صحابہ؛ صدیق بھی ہیں شہید بھی ہیں:**

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۖ وَالشُّهَدَاءُ

عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ

أَصْعَبُ النَّجْمِ﴾

جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں وہ اپنے رب کے ہاں صدیق بھی ہیں اور شہید بھی ہیں۔ ان کے لیے اجر ہو گا اور ان کو نور ملے گا۔ جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ان کو جہنم میں ڈالا جائے گا۔

یہاں اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن سارے کے سارے صدیق بھی ہیں اور شہید بھی ہیں حالانکہ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ سارے مؤمن شہید نہیں ہوتے، کچھ شہید ہوتے ہیں اور کچھ نہیں ہوتے۔

قرآن کریم کی آیت بھی ہے:

﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ

مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ﴿٥﴾

کہ سب شہید بھی نہیں اور سب صدیق بھی نہیں جبکہ سورۃ حدید سے معلوم ہوتا ہے کہ سب صدیق بھی ہیں اور سب شہید بھی ہیں۔

[۱]: اس کا ایک جواب سمجھیں اور یہ بات بعض حضرات نے فرمائی ہے کہ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ خاص ہے کہ صحابہ جتنے بھی تھے وہ سارے صدیق بھی تھے اور سارے شہید بھی تھے۔ خود حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام سے فرمایا: تم سب کے سب صدیق اور شہید ہو اور دلیل کے طور پر یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۖ وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ﴾ کہ صحابہ سارے صدیق بھی ہیں اور سارے شہید بھی ہیں۔

اگر مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہوں تو پھر شہید کا مطلب صرف وہ شخص نہیں جو اللہ کے راستے میں کٹ جائے بلکہ شہید وہ بھی ہے کہ جو اللہ کے راستے میں قتل ہونے کے لیے خود کو پیش کر دے۔ اگر بظاہر اس کو شہادت نہ بھی ملے تب بھی وہ شہید کے مقام پر پہنچتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

مَنْ سَأَلَ اللَّهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَغَهُ اللَّهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَإِنْ مَاتَ عَلَىٰ فِرَاشِهِ. <sup>6</sup>

کہ جو شخص صدق دل سے اللہ سے شہادت مانگے تو اللہ اسے شہداء کی منازل عطا فرمادیتے ہیں اگرچہ وہ بستر پر ہی جان دے دے۔

یعنی جو خود کو پیش کر دے اور وہ شہید نہ بھی ہو تب بھی اس کو شہید ہی شمار

کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہر وقت خود کو پیش کیا تھا اس لیے وہ اگر میدان جہاد میں شہید نہ بھی ہوں تب بھی شہید ہیں۔

تو یہ بات سمجھ آگئی کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ خاص ہے کہ وہ صدیق بھی سارے تھے اور شہید بھی سارے تھے۔

[۲]: اور اس کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ یہ آیت ان کے بارے میں ہے جو کامل ایمان والے ہیں۔ کامل ایمان والے صدیق تو ہوتے ہی ہیں، باقی ایسا نہیں ہو سکتا کہ قتل ہونے کا موقع ہو اور کامل ایمان والا خود کو پیچھے کرے، کامل ایمان والا تبھی ہو گا جب شریعت پر پورا عمل کرنے والا ہو۔ تو اس سے ایمان کامل والے لوگ مراد ہیں۔ اس لیے کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

### ایک معروف اشکال کا جواب:

یہاں ایک معروف سوال اور اس کا جواب سمجھیں۔ سوال یہ ہے کہ حدیث پاک میں ہے کہ دو شخص اکٹھے مسلمان ہوئے، ان میں سے ایک شہید ہو گیا اور دوسرا ایک سال تک زندہ رہا۔ جو ایک سال زندہ رہا وہ بھی فوت ہو گیا۔ ایک صحابی کہتے ہیں میں نے خواب میں دیکھا کہ بعد میں فوت ہونے والا جنت میں پہلے گیا۔ مجھے بہت تعجب ہوا۔ جب صبح ہوئی تو میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ بات عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَلَيْسَ قَدْ صَامَ رَمَضَانَ بَعْدَهُ وَصَلَّى بَعْدَهُ سِتَّةَ أَلْفِ رَكْعَةٍ<sup>7</sup>

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اس نے ایک سال روزے رکھے ہیں اور نمازیں پڑھی ہیں۔



اب اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شہادت سے بندہ جلدی جنت میں نہیں جاتا بلکہ باقی اعمال سے بندہ جلدی جنت میں جاتا ہے۔ بعض لوگ ایسی آیات اور احادیث کو جہاد کے خلاف پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بہتر ہے کہ جہاد نہ کریں اور نماز روزے میں لگے رہیں، اس سے آدمی جنت میں جلدی جاتا ہے۔

اس کا جواب سمجھ لیں کہ شہادت کی دو قسمیں ہیں؛ ایک ہوتی ہے شہادت حقیقیہ اور ایک ہوتی ہے شہادتِ صوریہ۔ شہادتِ حقیقیہ یہ ہے کہ آدمی کٹے، قتل ہو اور شہید ہو جائے اور شہادتِ صوریہ یہ ہے کہ خود کو قتل کے لیے پیش کرے اور اس کے لیے لڑتا بھی رہے، میدانوں میں جاتا بھی رہے اور پھر بھی اتفاقاً ایسا ہو کہ قتل نہ ہو بلکہ طبعی موت مر جائے تو یہ بھی شہید ہے۔ اس کی دلیل حدیث مبارک ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ سَأَلَ اللَّهَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَغَهُ اللَّهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ وَإِنْ مَاتَ عَلَى فِرَاشِهِ.<sup>8</sup>

کہ جو شخص صدق دل سے اللہ سے شہادت مانگے اور مانگنے کا معنی میں نے عرض کر دیا کہ یہ خود کو قتال کے لیے پیش بھی کرے اور اس کے لیے لڑتا بھی رہے، تو اللہ اسے شہداء کی منازل عطا فرمادیتے ہیں اگرچہ وہ بستر پر ہی جان دے دے۔

اب یہ جو دو صحابی تھے، ایک کو شہادتِ صوریہ ملی اور ایک کو شہادتِ صوریہ تو نہیں ملی لیکن شہادتِ حقیقی دونوں کو ملی ہے، ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۖ وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ صحابہ سارے کے سارے شہید ہیں، کیوں کہ صحابہ کرام میں سے کوئی ایسا نہیں کہ جب میدانِ جنگ ہو اور شہادت کی طرف نہ بڑھے، ہاں کبھی

عذر کی وجہ سے ایسا ہو بھی گیا تو توبہ کی اور معافی مانگ لی، وہاں تو ہر بندہ قتل ہونے کے لیے جاتا تھا لیکن کسی کو شہادت مل گئی اور کسی کو نہیں ملی۔ جن کو نہیں ملا ان کے اختیار میں نہیں ہے، انہوں نے تو خود کو پیش کر دیا تھا۔ تو چونکہ حقیقتاً دونوں شہید تھے۔ اس لیے جب دونوں شہید ہوں اور ایک شہید کے اعمال نامہ میں اعمال زیادہ ہوں اور ایک شہید کے نامہ اعمال میں نیک اعمال کم ہوں تو جنت میں پہلے وہ جائے جس کے پاس شہادت بھی ہے اور شہادت کے ساتھ ساتھ نامہ اعمال میں اعمال بھی زیادہ ہیں تو اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔

اصل میں ہمیں جو اشکال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائیں۔ اس وجہ سے ہوا ہے کہ ہم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کو ایسے دیکھا کہ جیسے ہم خود ہیں کہ ہم میں سے کوئی شخص لڑنے کے لیے جاتا ہے اور کوئی نہیں جاتا تو ہم نے سمجھا کہ شاید وہ بھی ایسے تھے کہ کچھ جاتے تھے اور کچھ نہیں جاتے تھے۔ صحابہ ایسے نہیں تھے، وہ سارے لڑنے کے لیے جاتے تھے، ہر بندہ قتل ہونے کے لیے جاتا تھا اور بعض شہید ہو جاتے اور بعض نہ ہوتے۔ ہمیں اپنی زندگی دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی اپنی طرح نظر آئی، اس لیے ہمیں اشکال پیدا ہوا۔

### اکابر کے علوم سے توافق:

یہ جو میں نے حدیث پاک کا جواب دیا ہے کہ شہادتِ صوریہ اور شہادتِ حقیقیہ... مجھے ایک الجھن تھی کہ یہ جو میں جواب دیتا ہوں کیا یہ جواب کسی بزرگ نے بھی دیا ہے کہ نہیں؟ رات مجھے تفسیر معارف القرآن میں یہ لفظ مل گیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ یہ جو میں کہتا ہوں کہ شہادتِ صوریہ اور شہادتِ حقیقیہ اور یہ کہ صحابہ سب کے سب شہادتِ حقیقیہ پر فائز تھے... یہ اکابر کے کلام میں بھی ہے۔ اب اشکال کا جواب صرف ہمارا نہ رہا بلکہ اکابر کے ساتھ مل گیا ورنہ یہ جواب تو میں بارہ سال پہلے سے

دے رہا تھا لیکن اس کی باضابطہ کہیں نقل نہیں مل رہی تھی اس لیے اس پر یہ الجھن تھی۔

## دنیا کی زندگی کے پانچ مراحل:

﴿اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُمْ زِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعٌ الْغُورِ ٢٠﴾

دنیا میں پانچ مراحل بیان فرمائے ہیں: لہو، لعب، زینت، تفاخر اور تکاثر۔

[1]: آدمی ایسا کھیل کھیلے جیسے چھ، سات ماہ کے چھوٹے بچے لیٹ کر اپنے کھیل میں لگن ہوتے ہیں، ان کھیلوں کا کوئی معمولی سا بھی فائدہ نہیں ہوتا، اسے ”لہو“ کہتے ہیں۔

[2]: اور ایک وہ کھیل ہوتا ہے کہ نفع ذہن میں نہیں ہوتا لیکن نفع ہوتا ضرور ہے جیسے چھ سات سال کے بچے دوڑ رہے ہوتے ہیں، بھاگ رہے ہوتے ہیں، وہ اس کا نفع سمجھتے نہیں ہیں لیکن نفع بہر حال ہوتا ہے، جسم کو فائدہ ہوتا ہے، ایکسر سائز ہو رہی ہوتی ہے۔ اسے ”لعب“ کہتے ہیں۔

[3]: جو فطری خوبصورتی ہوتی ہے بندہ اس سے بڑھ کر زیب و آرائش اختیار کرے تو اسے زینت کہتے ہیں۔

[4]: اور آپس میں فخر کرنا کہ میری طاقت... میری دولت... میری جوانی... میری فلاں چیز... اسے تفاخر کہتے ہیں۔

[5]: پھر مال اور اولاد کے اضافے کی فکر میں لگے رہنا، اسے تکاثر کہتے ہیں۔

دنیا بس یہ چند چیزیں ہیں کہ پہلے لہو ہوتی ہے، پھر لعب ہوتا ہے، اس کے بعد زینت ہوتی ہے، پھر تفاخر ہے اور پھر تکاثر ہے۔ ہر اگلی حالت پر پہنچنے کے بعد پچھلی حالت بندے کو عبث اور فضول نظر آرہی ہوتی ہے۔ جب بچہ چھ ماہ یا سال کا ہوتا ہے تو وہ کھیل میں مگن ہوتا ہے، اس کی ساری زندگی وہی ہوتی ہے، آپ اس سے کھلونا لے لیں تو وہ چیختا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میرا سب کچھ یہی ہے لیکن جب یہ چھ سال کا ہوتا ہے اور اس کو وہی کھلونا دو تو وہ لینے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ فضول چیز ہے۔ اب اس کے اور کھلونے ہوتے ہیں، اگر وہ کھلونا اس سے واپس لیں مثلاً چھوٹی سی کار ہے، چھوٹا سا سکوٹر ہے، چھوٹی سی سائیکل ہے تو اس پر وہ مرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میرے لیے پوری کائنات یہی ہے، اور جب یہی بچہ دس بارہ سال کا ہو جائے تو اس کو ان کھلونوں پر تعجب ہوتا ہے، اس کو دیں تو لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

اب اس کو اپنی طاقت پر ناز ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں! بارہ سال سے لے کر اٹھارہ سال کا زمانہ اس میں لڑکے بھی لڑکیوں کے ساتھ شامل ہوتے ہیں، بناؤ سنگھار، زیب و زینت... پتا نہیں کیا کچھ ہوتا ہے اور پھر جب تھوڑی سی عمر بڑی ہو جائے تو پھر بڑی عمر لڑکوں کو کپڑوں کے ٹیپ ٹاپ کا نہیں ہوتا، بس اپنی طاقت کے گھمنڈ میں سب کچھ بھول جاتے ہیں اور جب بڑھاپا ہوتا ہے پھر یہ بھی عجیب لگتا ہے، اب فکر ہوتی ہے کہ اب ان چیزوں پر پیسا لگانا چھوڑ دو، اب پیسہ بچاؤ! اور جوانی میں بچانے کے بجائے لگانے کی کوشش ہوتی ہے۔

ہر اگلی حالت میں پہنچنے پر پچھلی حالت فضول لگتی ہے، اور جب موت آ جائے گی تو پھر پانچوں کی پانچوں حالتیں فضول لگیں گی، پھر ایک ہی چیز نظر آئے گی کہ نیک اعمال کیا تھے؟ نیک اعمال کیا تھے؟ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ دنیا تو ایسی ہے کہ:

﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ آجَبٍ اِنْكَفَارَ نَبَاتِهِ ثُمَّ يَهَيِّجُ فَتَرُدُّهُ مُصْفَرًا ثُمَّ

## يَكُونُ حُطَاةً

جیسے کھیتیاں اگتی ہیں تو کسان کو بہت اچھی لگتی ہیں اور پھر وہ خشک ہو جاتی ہیں، پھر وہ زرد ہو جاتی ہیں، پھر چورا چورا ہو جاتی ہیں۔ یہی حال انسان کی زندگی کا ہے، پہلے ابو... پھر لعب... پھر زینت... پھر تفاخر... پھر نکاثر اور پھر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ صرف نیک اعمال باقی رہ جاتے ہیں۔

## مغفرت کی طرف دوڑو!

﴿سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ  
وَالْأَرْضِ ۖ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن  
يَّشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾

اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اللہ کی جنت کی طرف دوڑو جس کا کم از کم عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ کم از کم اس کی چوڑائی آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے۔ یہ چوڑائی بتائی جا رہی ہے، لمبائی نہیں بتائی۔ یہ جنت ایمان والوں کے لیے تیار ہے اور یہ اللہ کا فضل ہے، اللہ جس کو چاہتا ہے عطا فرما دیتا ہے۔

## مصیبت کی دو قسمیں:

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَنْ نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾

یہاں دو قسم کی مصیبتیں بیان فرمائی ہیں؛ ایک جو انسان کی ذات کو پیش آتی ہے اور دوسری جو انسان کی ذات کو نہیں ہوتی، وہ خارجی دنیا میں نظر آتی ہے۔ مثلاً انسان کو بخار ہو گیا تو یہ اس کی ذاتی مصیبت ہے، بارش ہو گئی اور باہر کیچڑ ہو گیا، باغات

ختم ہو گئے، یہ بھی مصیبت ہے لیکن یہ خارجی مصیبت ہے۔

فرمایا: دونوں قسم کی مصیبتیں آتی ہیں اور آنے سے پہلے اللہ نے لکھ دی تھیں، یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔

﴿يَكَيْلًا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا

يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾

یہ اس لیے تھا تاکہ اگر کوئی چیز تمہیں نہیں ملی تو تمہیں رنج نہ ہو اور اگر اللہ کوئی چیز دے دیتے ہیں تو تم اس پر اکڑو بھی نہیں۔ اس لیے کہ اللہ رب العزت اکڑنے والے کو اور شیخی کرنے والے کو نہیں پسند فرماتے۔

### مختال اور فخور میں فرق:

مختال اور فخور میں فرق ہوتا ہے۔ انسان کے جو داخلی فضائل ہیں اگر ان پر انسان عجب میں مبتلا ہوتا ہے تو مختال ہے اور اگر خارجی چیزیں دیکھ کر انسان کبر میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ فخور ہے۔ ذاتی چیزیں مثلاً میرا جسم بہت اچھا ہے، میری صحت بہت اچھی ہے، میں بولتا بہت اچھا ہوں، میرا دماغ بہت اچھا ہے، میرا حافظہ بڑا اچھا ہے، اس سے بندہ عجب کا شکار ہوتا ہے تو اسے کہتے ہیں مختال... اور خارجی چیزیں مثلاً میرے پاس گاڑی بہت بڑی ہے، ساتھی بڑے اچھے ہیں، پیسہ بہت ہے تو اس کی وجہ سے جو کبر پیدا ہوتا ہے اس کو فخور کہتے ہیں۔ اگر انسان کے داخلی فضائل سے عجب آئے تو ایسے شخص کو مختال کہتے ہیں اور خارجی وسائل کی وجہ سے جو کبر پیدا ہو اسے فخور کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نہ مختال کو پسند کرتے ہیں نہ فخور کو پسند فرماتے ہیں، اور لفظ کیسے فرماتے ہیں ”لَا يُحِبُّ“ کہ محبت نہیں کرتے۔ اس کا معنی کہ انسان کو اللہ کی محبت ہر وقت سامنے رکھنی چاہیے۔

## بخل کی مذمت:

﴿الَّذِينَ يَخْلُونُ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ

هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٢٢﴾﴾

اللہ نے مختال اور فحور کی عادات کو بیان فرمایا کہ مختال اور فحور وہ لوگ ہیں جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی دعوت دیتے ہیں۔ جو شخص اللہ سے منہ موڑے گا تو اللہ بے نیاز اور لائق تعریف ذات ہے۔

## لوہا اتارنے کا مطلب:

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ

لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ

لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٢٢﴾﴾

ہم نے رسولوں کو معجزات دے کر بھیجا، ہم نے ان کے ساتھ کتب بھی نازل فرمائی ہیں اور ترازو بھی نازل کیا تاکہ لوگ عدل و انصاف سے کام لیں اور ہم نے بطور خاص لوہا بھی نازل کیا جس میں جنگی قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے دیگر منافع بھی ہیں۔ اللہ نے یہ چیزیں اس لیے نازل کی ہیں تاکہ اللہ دیکھیں کہ کون شخص اس کے دین کی مدد کرتا ہے، اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قوی اور غالب ہے۔

یہاں ”المیزان“ سے مراد ہیں معجزات، ”الکتاب“ سے مراد ہیں کتابیں اور ”المیزان“ سے مراد وہ خاص احکام ہیں جو عدل سے متعلقہ ہیں۔ ان کو بطور خاص ذکر فرمایا تاکہ حقوق العباد کی بہت زیادہ رعایت ہو۔

فرمایا کہ لوہے کو نازل کیا ہے جس میں جنگی قوت اور منافع ہیں۔ کتابوں کو تو نازل کیا ہے یہ بات تو سمجھ آتی ہے لیکن لوہے کو نازل تو نہیں کیا بلکہ لوہے کو تو پیدا فرمایا

ہے تو پھر ﴿وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ﴾ کیوں فرمایا؟

بعض حضرات اس کا ایک جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ عرب کے محاورات میں استعمال ہوتا ہے کہ ایک چیز اتاری جاتی ہے، دوسری اتاری نہیں جاتی لیکن لفظ دونوں کے لیے ایک طرح بولا جاتا ہے۔ جیسے ہم اپنے مہمان سے کہتے ہیں کہ کھانا وغیرہ کھا لیں! اب ”کھانا“ تو اس نے کھانا ہے اور ”وغیرہ“ میں چائے ہے لیکن دونوں کے لیے لفظ استعمال کیا ہے ”کھانا“۔ اسی طرح ﴿وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ﴾ فرمایا کہ لوہا ہم نے اتارا ہے۔ تو جو لفظ کتابوں کے اتارنے کے لیے فرمایا وہی لفظ لوہے کے لیے استعمال کیا ہے کیونکہ عرب ایسے محاورات استعمال کرتے ہیں۔

اور دوسرا اس کا جواب یہ ہے کہ ”أَنْزَلْنَا“ کا لفظ صرف لوہے کے لیے ہی نہیں فرمایا بلکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے چوپایوں کے لیے بھی یہی لفظ ارشاد فرمایا ہے ﴿وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ ثَلَاثِينَ أَزْوَاجًا﴾<sup>9</sup> اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنی بھی چیزیں ہیں پیدائش سے پہلے اللہ نے لوح محفوظ میں لکھا ہے کہ فلاں چیز پیدا کرنی ہے اور لوح محفوظ اوپر ہے، اب ”أَنْزَلْنَا“ ہم نے اس کو نازل کیا کا معنی یہ ہو گا کہ ہم نے اس کو پیدا کرنے کا حکم نازل کیا۔ تو چونکہ ان کے بارے میں جو حکم تھا وہ پہلے سے لوح محفوظ میں تھا، حکم اوپر سے نیچے آتا ہے اس لیے لفظ ”أَنْزَلْنَا“ استعمال فرمایا ہے۔ اور ایک جواب مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ نے دیا، میں اس مجلس میں موجود تھا اور میں نے اپنے کانوں سے یہ جواب خود سنا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ”أَنْزَلْنَا“ کا ذکر یہ بات سمجھانے کے لیے کیا کہ جس طرح تم کتابوں کو مُنَزَّل من اللہ



سمجھتے ہو لوہے کو بھی اہمیت ایسے دو! یہ اسلوب اس لیے بتایا ہے ورنہ کہنا چاہیے تھا ”أَنْشَأْنَا الْحَدِيدَ مِنَ الْأَرْضِ“ کہ ہم نے کتابیں آسمان سے نازل کی ہیں اور لوہا زمین سے پیدا کیا ہے لیکن ”أَنْزَلْنَاهُ“ کا لفظ یہ بتانے کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ لوہے کو اہمیت ایسے دو دین کی اشاعت اور دین کے نفاذ میں جس طرح آسمانی کتابوں کو اہمیت دیتے ہو!

پھر لوہے کی بنیادی طور پر دو اہمیتیں بیان فرمائی ہیں؛

[۱]: فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ... ایک جنگی استعمال

[۲]: وَمَنْفَعٌ لِلنَّاسِ... اور دوسرا عام استعمال کی چیزیں جیسے گارڈر، مانک، گھڑیاں اور دیگر سامان ہے۔

ان میں پہلا اصل مقصد ہے ”فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ“، مؤمن کی شان یہ ہے کہ لوہے کو استعمال کرے دین کی تنفیذ کے لیے، دین کی طاقت کے لیے، بس اس سے دین بہت مضبوط ہوتا ہے۔

### حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ فَمِنْهُمْ مُهْتَدٍ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾

حضرت نوح علیہ السلام کو ”آدم ثانی“ بھی کہتے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ”قدوة الانبياء“ اور ”قدوة الانسان“ کہتے ہیں جو بعد والوں سب کے مقتدی ہیں۔

فرمایا: ہم نے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کو بھیجا۔ علیہما السلام۔ اور ان دونوں کی اولاد میں ہم نے نبوت کا سلسلہ جاری کیا اور کتاب بھی دی، پھر ان میں سے بعض لوگ ہدایت یافتہ ہو گئے اور اکثر لوگ فاسق نکلے۔ اس کے بعد اور نبی بھیجے۔

حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو بھیجا اور انہیں انجیل دی۔

### رہبانیت کی ابتدا:

﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾

حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا سے تشریف لے گئے۔ ان کے متبعین نے آہستہ آہستہ شریعت کو چھوڑنا شروع کیا اور ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جس نے طاقت سے نافرمانوں کو روکنا چاہا لیکن طاقت ان کے مقابلے میں کم تھی، یہ پیچھے رہ گئے اور بعض ایسے تھے جن کے پاس طاقت نہیں تھی تو انہوں نے زبان سے سمجھا کر روکنا چاہا تو یہ بھی آخر کار ان کے حملوں کی زد میں آکر شہید ہو گئے۔ ایک تیسرا طبقہ تھا کہ جنہوں نے روکنا چاہا لیکن وہ سمجھتے تھے کہ نہیں روک سکتے تو انہوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ ہم اس معاشرے سے الگ تھلگ ہو جائیں تاکہ گناہوں میں مبتلا نہ ہوں۔ اس کا حکم اس شریعت میں نہیں تھا بلکہ انہوں نے خود اس کا اہتمام کیا تھا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں نے رہبانیت کو از خود اختیار کیا تھا، ہم نے ان پر رہبانیت کو فرض قرار نہیں دیا تھا اور ان کی منشا یہ تھی کہ ہم گناہوں سے بچ جائیں اور اللہ ہم سے راضی ہو جائیں، بعد میں وہ اس پر قائم نہیں رہ سکے۔ البتہ ان میں سے جو ایمان لائے تھے تو ہم نے ان کو اجر دیا۔ البتہ ان میں بھی اکثر ایسے تھے جو نافرمان نکلے۔

### رہبانیت کا حکم:

”رہبانیت“ کا اصل معنی ڈرنا ہے، راہب کہتے ہیں اللہ سے ڈرنے والے کو

یعنی اللہ سے ڈر کر حلال چیزوں کو چھوڑ کے الگ تھلگ ہو کر رہنا۔ ہمارے ہاں رہبانیت کا حکم کیا ہے؟ اس کے لیے سمجھیں کہ رہبانیت یعنی حلال چیزوں کو چھوڑ دینے کے تین درجے ہیں:

- (1): اعتقاداً حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کر دیں، یہ جائز نہیں ہے۔
- (2): اعتقاداً تو حلال سمجھیں لیکن عملاً ایسے ہوں جیسے اس کو حرام سمجھیں یعنی اس شدت کے ساتھ چھوڑیں جیسے حرام کو چھوڑا جاتا ہے، جیسے کوئی انسان بیماری میں مبتلا ہوتا ہے اور ایک حلال چیز کھانے سے بیماری بڑھ جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے دس سال ہو گئے کہ میں نے فلاں چیز کو نہیں کھایا اور نہ ہی کھاؤں گا۔ اب یہ عملاً ایسا ہے جیسے حرام سمجھا ہو لیکن یہ جائز ہے کیوں کہ اس کا اعتقاد یہ نہیں ہے کہ یہ چیز حرام ہے بلکہ اعتقاد یہ ہے کہ اس چیز کے کھانے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے لہذا میں نہیں کھاؤں گا۔ اسی طرح ایک آدمی بعض جائز چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے کہ اس سے گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ مثلاً بازار میں جانا جائز تو ہے لیکن میں نہیں جاؤں گا کیوں کہ اگر جاؤں گا تو بد نظری ہوتی ہے۔ تو یہاں حلال چھوڑنے کا منشا حرام سے بچنا ہے، اس لیے یہ بھی جائز ہے۔

- (3): آدمی بعض حلال چیزوں کو چھوڑے اور یہ سمجھے کہ اس کے چھوڑنے پر مجھے ثواب ملتا ہے تو اس اعتقاد کے ساتھ چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ نرم آرام دہ کپڑا پہننا جائز ہے لیکن میں نہیں پہنتا کیوں کہ اس کے نہ پہننے پر مجھے ثواب ملے گا... یہ غلط بات ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ:

- 1: حلال کو چھوڑنا اعتقاداً حرام سمجھتے ہوئے، یہ جائز نہیں ہے۔
- 2: حلال چیز کو چھوڑنا علانیہ جائز ہے۔
- 3: حلال چیز کو چھوڑنا کہ اس کے چھوڑنے پر ثواب ملے گا یہ بھی جائز نہیں۔

## اہل کتاب کے ایمان لانے پر دواجر کی وجہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ  
مِنْ رَحْمَتِهِ وَيَجْعَلْ لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ  
رَحِيمٌ﴾

اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ تاکہ اللہ تمہیں دہرا اجر دے اور تمہیں نور عطا کرے جس کے ذریعے تم چلو اور تمہارے گناہوں کو معاف فرمائے۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔

پہلے ایمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لائے تھے اور اب ایمان حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر لاؤ تو تمہیں دواجر مل جائیں گے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہیں نور عطا فرمائیں گے جس پر تم چلو گے اور جو پہلے تم گناہ کر چکے ہو اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی انسان اسلام قبول نہیں کر رہا اور نیک اعمال کرتا ہے تو اس کے نیک اعمال کی کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن جب یہ بندہ ایمان قبول کر لے گا تو جو حالت کفر میں نیک اعمال کیے تھے اللہ ان نیک اعمال کا بھی اجر عطا فرمادیتے ہیں اور حالت کفر میں جو گناہ کیے تھے اللہ اپنے کرم سے ان گناہوں کو گناہ نہیں لکھیں گے۔

## اہل کتاب کو ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ سے خطاب کی وجہ:

یہاں صرف ایک اشکال رہ جاتا ہے کہ یہود اور نصاریٰ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائیں انہیں اہل کتاب کہتے ہیں اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں تو پھر انہیں اہل کتاب نہیں کہتے بلکہ اہل ایمان کہتے ہیں لیکن یہاں پر نصاریٰ کو خطاب فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ حالانکہ کہنا چاہیے تھا

”يَا أَهْلَ الْكِتَابِ“

اصل میں ان کو یہ بات سمجھانا مقصود ہے کہ دیکھو! اگر اس بات پر غور کرو تو کہ تمہارے ہاں انجیل میں لکھا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننا چاہیے۔ صرف تم نے اس لکھے ہوئے پر عمل ہی کرنا ہے۔ اس حساب سے تو تم تو مؤمنین کی طرح ہو۔ تمہارے پاس بھی لکھی ہوئی کتاب موجود ہے اور مؤمنین کے پاس بھی کتاب قرآن موجود ہے، لکھے ہوئے قرآن پر یہ بھی عمل کرتے ہیں اور لکھی کتاب پر تم بھی عمل کر لو تو تم ایمان والوں کی طرح ہو۔ اس لیے یہاں پر ”يَا أَهْلَ الْكِتَابِ“ کے بجائے ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ فرمایا۔

بعض کہتے ہیں کہ چونکہ انہوں نے بالآخر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہونا تھا اس لیے لفظ ایمان استعمال فرمایا یا بول کے اعتبار سے۔

﴿يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللَّهِ وَ أَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾

یہاں پر ”لا“ زائدہ ہے مطلب یہ ہے کہ وہ اہل کتاب جو ایمان لے آئے ان کو دگنا اجر ملے گا اور جو ایمان نہیں لائے ان کو قیامت کے دن اس بات کا پتا چلے گا کہ اللہ کے فضل میں سے کچھ بھی ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ سارا فضل اللہ نے اپنے اختیار میں رکھا ہے۔ اللہ جس کو چاہتے ہیں اسے عطا فرمادیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں اس کو نہیں عطا فرماتے۔

وَاخْرُجُوا أَنَا أَيْنَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة المجادلة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا وَتَشْتَكِي إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ

يَسْمَعُ تَحَاوَرَكُمَا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ﴾

### ابتدائی آیات کا شان نزول:

حضرت اوس بنت صامت رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ”أَنْتِ عَلَيَّ كَظْهَرِ أُخْتِي“ کہ تم مجھ پر ایسے ہو جیسے میری ماں کی پشت ہے۔ عربوں میں جب کوئی ظہار کر لیتا تو اس کی بیوی ہمیشہ کے لیے اس پر حرام ہو جاتی اور یہ طلاق سے بھی سخت حرام ہوتی، اس کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ حضرت خولہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے شوہر نے یہ بات کہہ دی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے علم میں تمہارے بارے میں کوئی وحی نہیں ہے۔ حضرت خولہ رو پڑیں۔ پھر اللہ سے فریاد کی ”اللَّهُمَّ إِنِّي أَشْكُو إِلَيْكَ“ کہ اللہ میں تیرے دربار میں فریاد لے کر آئی ہوں، میرے بچے ہیں، میں بوڑھی ہوں، اب میں کہاں جاؤں گی؟ اللہ! میری مدد فرما۔ اس وقت اس سورت کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں اور ظہار کا حکم آ گیا۔

امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں وہاں قریب تھی، پوری گفتگو میں بھی نہیں سن سکی لیکن اللہ نے پوری گفتگو سن لی۔

### ظہار کی تعریف اور حکم:

”ظہار“ کہتے ہیں کہ شوہر اپنی بیوی کو محرماتِ ابدیہ کے ایسے حصے کے ساتھ تشبیہ دے کہ جس کو دیکھنا اس کے لیے جائز نہ ہو۔ اس کا کفارہ یہ ہے کہ غلام آزاد کرو۔ اگر غلام آزاد کرنے کی طاقت نہیں ہے تو دو ماہ مسلسل روزے رکھو۔ دو ماہ مسلسل روزے نہیں رکھ سکتے بڑھاپے کی وجہ سے یا کسی بیماری کی وجہ سے یا کسی عذر کی وجہ سے تو پھر ساٹھ مساکین کو کھانا کھلاؤ یا ساٹھ مسکینوں کو صدقۃ الفطر کی مقدار غلہ یا اس کی قیمت دے دو۔

حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کے شوہر غریب تھے تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ! میرے پاس تو کوئی غلام نہیں ہے۔ فرمایا: روزے رکھو! کہا کہ جی میں تو آنکھوں کا مریض ہوں، میں تو دن میں تین بار کھانا نہ کھاؤں تو میری بینائی ختم ہونے کا خطرہ ہے۔ فرمایا کہ پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔ کہا کہ میری تو اس کی بھی استطاعت نہیں ہے، ہاں اگر آپ مدد کر دیں تو کچھ کر سکوں گا۔ تو پھر کچھ غلہ اللہ کے نبی نے دیا، کچھ باقی صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیا۔ یوں جمع کر کے ساٹھ مساکین کا فدیہ ان کو دیا جو انہوں نے مساکین میں تقسیم کیا اور یوں مسئلہ حل ہو گیا۔

اگر کوئی شخص ظہار کر لے اور بیوی سے رجوع کرنا چاہے تو اس کے لیے یہ شرط ہے کہ کفارہ ضرور دے اور یہ قرآن کریم میں بالکل صاف طور پر اللہ نے فرمادیا ہے ﴿ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا﴾ کہ یہ اس شخص کے لیے ہے جس نے یہ گفتگو کی ہے اور اب اس کا تدارک کرنا چاہتا ہے اور اگر طلاق دے کر فارغ کرنا چاہے تو اس کی مرضی ہے۔ یعنی ظہار ہو گیا ہو تو بیوی اس سے جدا نہیں ہوگی، بیوی اس کے نکاح میں

رہے گی لیکن اس کے ساتھ صحبت اور صحبت کے جو اسباب ہیں وہ اختیار نہ کرے۔ ہاں اگر وہ اس کے ساتھ ملنا اور تعلقات رکھنا چاہتا ہے تو پھر یہ کفارہ ہے اور اگر طلاق دینا چاہتا ہے تو پھر اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔

### ایمان والوں کو ایمان کا حکم؟

﴿ذَلِكَ لِيَتَّوْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ﴾

یہ جو حکم دیا گیا ہے کفارے کا یہ اس لیے ہے تاکہ تم اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ۔ سوال یہ ہے کہ ایمان تو پہلے سے تھا، تو یہ دوبارہ ایمان لانے کا حکم کن کو ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ حکم تو ایمان والوں کو ہی ہے لیکن یہاں ایمان لانے سے مراد اعتقاد نہیں ہے، یہاں ایمان سے مراد عمل ہے یعنی اپنا عمل ایسے کرو کہ تمہارا عمل بتائے کہ تم مؤمن ہو۔ تو مراد اس سے عمل ہے، اعتقاد نہیں۔

### عذاب مہین کا معنی:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ كُبِتُوا كَمَا كُبِتَ الَّذِينَ مِنَ

قَبْلِهِمْ﴾

جو لوگ اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس طرح ذلیل ہوں گے جیسے ان سے پہلے لوگ ذلیل ہوئے تھے۔

﴿وَاللَّكَفِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝﴾

اور کفار کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔

یہ پہلے میں بات سمجھا چکا ہوں کہ کافر کو جو عذاب ہوتا ہے وہ اسے رسوا کرنے کے لیے ہوتا ہے اور مؤمن کو جو عذاب ہوتا ہے وہ گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوتا ہے، ہاں صورت اس کی عذاب کی ہوتی ہے۔ اس لیے بسا اوقات اس پر



عذاب کا اطلاق ہو جاتا ہے کیونکہ صورت خزی اور رسوائی کی ہوتی ہے۔

﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا ۗ أَحْصَاهُ اللَّهُ وَ  
نَسُوهُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾

اللہ قیامت کے دن سب کو اٹھائیں گے اور انہیں ان کے اعمال کی خبر دیں  
گے، اللہ نے تو سب کچھ محفوظ کیا ہوا ہے اور یہ لوگ بھول گئے ہیں۔  
”یہ لوگ بھول گئے ہیں“... یا تو سچ مچ بھول گئے ہیں یا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ  
جیسے بندہ جاننے کے باوجود بھول رہا ہوتا ہے۔

### معیت ذاتیہ:

﴿الَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ مَا يَكُونُ مِنْ  
نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَٰبِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا آدْنَىٰ مِنْ ذَلِكَ وَلَا  
أَكْثَرُ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۚ إِنَّ  
اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾

یہودیوں کی عادت تھی کہ جب مسلمانوں کو آتا دیکھتے تو آپس میں سرگوشی  
کرتے تھے۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ مسلمان پریشان ہوں کہ شاید ہمارے خلاف سازش ہو  
رہی ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں منافقین بھی ایسا کرتے تھے۔

تو فرمایا: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین ہے اللہ اس کو  
جاننے میں۔ اگر تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو تو ان کے ساتھ چوتھا اللہ ہوتا ہے،  
پانچ آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہو تو ان کے ساتھ چھٹا اللہ ہوتا ہے۔ اور یہ سرگوشی  
کرنے والے کم یا زیادہ ہوں، وہ جہاں بھی ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ قیامت کے  
دن اللہ ان کو ان کے اعمال کے بارے میں بتائے گا کیونکہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

یہاں میں پھر عرض کرتا ہوں اور میں بار بار یہ بات لاتا ہوں کہ دیکھو یہاں ہے ﴿هُوَ مَعَهُمْ﴾، اب اگر تاویل نہ کرو تو معیت ذاتیہ ہوتی ہے اور تاویل کرو تو معیت وصفیہ ہوتی ہے۔ تو جو لوگ تاویل نہیں کرتے ان کو معیت ذاتیہ کا قائل ہونا چاہیے، اور اگلی بات میں پھر یہاں کہتا ہوں تاکہ آپ کے ذہن میں بات پختہ ہو جائے۔ ہمارے حضرات اکابر میں سے اگر کوئی معیت ذاتیہ کی نفی کرتے ہیں تو مقصود تجسیم کی نفی ہے، اگر تجسیم ذہن میں نہ ہو تو معیت ذاتیہ پر کوئی اشکال نہیں ہے۔

### یہود احکام کے مکلف نہیں تو انہیں حکم کیوں؟

﴿الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَى ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنَجَّوْنَ بِالْأَثَرِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ﴾

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جن لوگوں کو سرگوشیاں کرنے سے منع کیا گیا تھا وہ پھر بھی وہی کام کرتے ہیں اور سرگوشی بھی کیسی کرتے ہیں؛ گناہ کی اور ظلم و زیادتی کی اور رسول کی نافرمانی کرنے کی۔

ایک تو مسلمان کو تکلیف دینا ایک مستقل ظلم ہے اور اگر واقعتاً اس کے خلاف کوئی پلان ہے تو اس کے تو ظلم ہونے پر تو کوئی اشکال ہی نہیں ہے۔

یہاں پر ایک سوال اور جواب ذہن میں رکھیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم ہمیشہ کہتے ہیں کہ احکام کا مکلف مسلمان ہے اور سرگوشیاں کرتے تھے یہودی، یہودی تو احکام کے مکلف ہی نہیں تھے تو ان کو منع کرنے کا فائدہ کیا ہو گا؟ ان کو منع کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہود بھی افعال کے مکلف ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہود من حیث الکافر تو احکام شریعت محمدیہ کے مکلف نہیں ہیں لیکن من حیث المعاهد یہ بھی مکلف ہیں کیوں کہ یہودیوں کا مسلمانوں کے

ساتھ معاہدہ تھا۔ تو جب کوئی بندہ معاہدہ کرتا ہے تو پھر معاہدے میں دونوں فریقوں کو بات ماننا پڑتی ہے۔ معاہدہ تھا کہ ایک دوسرے کو تکلیف نہیں دیں گے اور ان کی سرگوشی سے مسلمانوں کو تکلیف ہوتی تھی، تو فرمایا کہ تم ایسا کام کیوں کرتے ہو کہ جس سے تکلیف ہوتی ہے؟ تو وہ من حیث الکافر تو مکلف نہیں ہیں لیکن من حیث المعاهد پھر بندہ مکلف ہو جاتا ہے۔

### یہودی گستاخی (الْسَّامُ عَلَيْكُمْ کہنا)

﴿وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ ۖ وَيَقُولُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ حَسْبُكُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فِئْسَ الْمَصِيرُ ۝﴾  
یہودی بسا اوقات آتے اور کہتے ”الْسَّامُ عَلَيْكُمْ“ سام کا معنی موت ہے۔

ایک مرتبہ یہودی آیا اور اس نے کہا ”الْسَّامُ عَلَيْكُمْ“ ام المؤمنین امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بہت غصہ آیا تو آپ نے کہا: ”الْسَّامُ عَلَيْكُمْ لَعَنَكُمْ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْكُمْ“ کہ موت تم پر ہو، لعنت ہو اور خدا کا غضب تم پر نازل ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تھی ناں اور ایمان کا تقاضا بھی ہے کہ بندہ ایسے موقع پر خاموش نہ رہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عائشہ! ایسی بات کیوں کہتی ہو؟ کہا: حضور! اس نے ایسی بات کہی جو ہم سے برداشت نہیں ہوتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تو جواب ان کو دے دیا تھا۔ انہوں نے کہا ”الْسَّامُ عَلَيْكُمْ“ تو میں نے کہا ”عَلَيْكُمْ“ ان کی دعا قبول نہیں ہوگی لیکن میری دعا قبول ہوگی تو میں نے جواب دے دیا۔

فرمایا: اے پیغمبر! جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو سلام کرتے ہیں اور ایسا سلام کرتے ہیں جو اللہ نے آپ کو کبھی نہیں کیا، اور یہودی یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم

غلط کہتے ہیں تو ہمارے اوپر اللہ کا عذاب کیوں نہیں آتا؟ اللہ فرماتے ہیں: ﴿حَسْبُہُمْ جَہَنَّمُ﴾ کہ دنیا میں عذاب نہ آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عذاب نہیں ہوگا، عذاب ہوگا اور عذاب بھی جہنم کا ہوگا، تم اس میں داخل ہو گے اور وہ بہت گندا اٹھکانا ہے۔

### مجلس میں کشادگی کرنے کا حکم:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَإِذَا قِيلَ انشُرُوا فَانْشُرُوا يَنْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ (۷)

اے ایمان والو! جب کہا جائے کہ مجلس میں کشادگی پیدا کرو تو تم کشادگی پیدا کر لیا کرو! اللہ تمہیں وسعت عطا فرمائیں گے اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ! تو تم اٹھ جاؤ۔ اللہ ایمان والوں کو بلندیاں عطا فرمائیں گے اور ایمان والوں میں بطور خاص اہل علم کو اللہ مزید درجات عطا فرمائیں گے۔ اللہ تمہارے اعمال سے خوب واقف ہیں۔

### بعض لوگوں کو مجلس سے اٹھانے کی وجہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرماتھے اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی بیٹھے تھے۔ اسی دوران کچھ بزرگ صحابہ بھی آگئے جو بدری تھے، ان کو مجلس میں بیٹھنے کے لیے جگہ نہیں ملی تو وہ کھڑے رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سمٹ سمٹ کر بیٹھو تا کہ آنے والوں کو جگہ ملے، مجلس کے شرکاء سمٹ کر بھی بیٹھے لیکن اس کے باوجود ان آنے والے صحابہ کرام کے لیے بیٹھنے کی جگہ نہ بن سکی۔ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض حضرات سے فرمایا کہ تم اٹھ جاؤ اور ان کو جگہ دے دو!

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بعض حضرات کو اٹھایا تو اس کی وجہ کیا تھی؟ بعض کہتے ہیں کہ وہ پہلے سے بیٹھے تھے تو جگہ تنگ تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ تم اٹھ جاؤ تو یہ ایسے تھا جیسے شاگرد کو استاد کہتا ہے کہ بھائی! تم اٹھ جاؤ، مہمان ہیں ان کو جگہ دو! ایک تو یہ وجہ تھی۔ یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تادیباً اٹھایا کہ دیکھو! وہ آئے ہیں تو تمہیں چاہیے تھا کہ جگہ کشادہ کرتے یا سمٹ کر ان کو بٹھاتے، اس لیے تم خود اٹھ جاؤ! یا تادیباً نہیں اٹھایا بلکہ بس ویسے اٹھادیا کہ اب تم اٹھ جاؤ، ان کو بھی بات سن لینے دو۔

### مجلس کے آداب:

✽ اور جب یہ کہا جائے کہ مجلس میں جگہ کشادہ کرو تو کشادگی پیدا کیا کرو، اللہ تعالیٰ وسعت عطا فرمائے گا ﴿يَفْسَحُ اللَّهُ لَكُمْ﴾ کیا مطلب کہ دنیا میں رزق میں وسعت عطا فرمائے گا اور آخرت میں بھی وسیع جنت عطا فرمائے گا۔

✽ اور جب دو بندے بیٹھے ہوں اور سرگوشی کر رہے ہوں تو تیسرے آدمی کو آ کر نہیں بیٹھنا چاہیے جب تک کہ اجازت نہ ہو۔ یہ ادب کا تقاضا ہے۔ خواہ مخواہ نہ بیٹھیں، اجازت لیں کہ میں آ جاؤں یا بیٹھ سکتا ہوں؟ اگر کہیں کہ نہیں! تو چلے جائیں۔

✽ اور جب کچھ لوگ بیٹھے ہوں تو یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کہ کسی کو اٹھاؤ اور خود بیٹھ جاؤ!

✽ اور جب کچھ لوگ بیٹھے ہوں اور کوئی اور بندہ آ جائے تو کوشش کرو کہ سمٹ کر بیٹھ جاؤ اور جگہ بناؤ تاکہ آنے والا بھی بیٹھ سکے۔

✽ اور جب کوئی بڑا کہہ دے کہ اٹھ جاؤ! تو فوراً اٹھ جایا کرو، جب کہے کہ جگہ وسیع کر دو! پھر فوراً وسیع کرو۔ پھر آدمی کو اس میں بالکل تردد کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

### حضور علیہ السلام سے ملاقات سے پہلے صدقہ کا حکم:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ خُجُومِكُمْ

صَدَقَةٌ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ۖ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٧﴾

جو یہودی تھے وہ بسا اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی میں بات کرتے اور وقت ضائع کرتے اور بعض مالدار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے وہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بڑی دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے۔ اس کا ایک اثر تو یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ بلا وجہ لمبی لمبی بات خلوت میں کریں، ایک ایک کو وقت دیں تو وقت بہت زیادہ چاہیے اور دوسرا یہ اثر ہوتا کہ جو غریب صحابہ تھے ان کو اس کی وجہ سے تکلیف ہوتی تھی کہ ہم غریب ہیں، ہم پیچھے رہتے ہیں، ان مالداروں کو قرب ملا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لمبی لمبی بات کرتے ہیں۔ تو ان غریب صحابہ کی بھی دل جوئی نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے اللہ پاک نے حکم دیا کہ تم ایسا کام نہ کرو! اگر کبھی بات کرنی ہی ہے تو نیکی کی بات کرو اور کبھی خلوت میں سرگوشی کرنے کا تو تصور ہی نہ کرو! اور پیغمبر سے بات کرنی ہو تو پہلے صدقہ دو اور اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرو! یہ حکم دیا گیا۔ اب جو منافق تھے ان کے لیے تو صدقہ دینا مشکل تھا، انہوں نے بات کرنا ہی چھوڑ دی۔ تو حکم شرعی کا یہ فائدہ ہوا۔ تو فرمایا: اے ایمان والو! اگر کبھی تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خلوت میں بات کرنی پڑے تو اس تنہائی کی بات سے پہلے صدقہ کر لیا کرو! یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ کیونکہ تمہیں اس کا اجر ملے گا۔ اور پاکیزہ بھی ہے۔ اس لیے کہ جب اصلاح ہوگی تو فضول باتیں نہیں کرو گے۔ اگر تمہارے پاس صدقہ کے لیے مال نہ ہو تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ یعنی اس کا معنی یہ ہے کہ صدقہ دینا واجب تھا لیکن اگر نہ ہو تو اللہ تمہیں معاف فرمادے گا۔

اس حکم کی منسوخی:

﴿اَسْأَلُكُمْ اَنْ تَقْلُدُوْا بَيْنَ يَدَيَّ نَحْوَكُمْ صَدَقَتْ ۖ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا

تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَ  
اللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٧٧﴾

تنہائی میں بات کرنے کی وجہ سے جو صدقہ دینا ضروری تھا کیا تم اس سے ڈر گئے؟! اب جب تم صدقہ نہیں دے سکتے تو اللہ نے کرم یہ کیا کہ تمہیں معاف کر دیا! بس اب نماز پڑھتے رہو، زکوٰۃ ادا کرتے رہو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو! اللہ تعالیٰ تمہارے عمل سے باخبر ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس حکم کے نازل ہونے کے بعد تنہا میں وہ شخص ہوں جس نے اس پر عمل کیا ہے، نہ مجھ سے پہلے کسی نے کیا اور نہ میرے بعد کوئی کرے گا۔

### ملاقات کے لیے نظم بنایا جاسکتا ہے:

مجھے ایک بات پہ اشکال رہتا تھا لیکن اس آیت کو سمجھنے کے بعد میرا اشکال ختم ہو گیا۔ اشکال یہ رہتا تھا کہ آپ نے دیکھا کہ ہمارے ہاں ماہانہ خانقاہی مجلس میں لوگ آتے ہیں تو میں سب سے کہتا ہوں کہ آپ نے بات بھی سن لی ہے، بیعت بھی کر لی ہے، مصافحہ بھی کر لیا ہے، اب بلا وجہ کمرے میں نہ آیا کریں، ہاں اگر کوئی ضروری کام ہو تو آجائیں، میں اس سے آپ کو منع نہیں کرتا! کیونکہ بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ فارغ ہونے کے بعد آتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں۔ پوچھتا ہوں کہ کوئی کام ہے؟ نہیں جی بس ویسے سلام کرنا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ سلام تو ہم نے باہر کر لیا تھا... لیکن پھر بھی مجھے ایک جھجک اور خوف سار ہتا تھا کہ یار ان کی دل شکنی نہ ہو کہ ہمیں بٹھاتا کیوں نہیں ہے؟ اس آیت کو پڑھنے کے بعد بالکل شرح صدر ہو گیا ہے کہ یہ پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ دیکھیں! نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے صاحب حیثیت لوگ بات کرتے تو اس سے دوسروں کا دل دکھتا اور جب بہت زیادہ دیر تک بات کرتے تو اللہ

کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ ایک ایک کو میں اتنا اتنا وقت کیسے دوں گا؟ تو اللہ پاک نے مستقل حکم شرعی نازل فرما دیا کہ اگر یہ کرنا ہے تو پھر کچھ صدقہ دے کے آیا کرو پھر بات کیا کرو! اس کا معنی ہے کہ کچھ پابندی لگی۔ اب جو صدقہ نہیں دے سکتے تھے تو ان کو معافی دے دی لیکن اس سے شریعت کا مزان جو سمجھ میں آگیا کہ بلا وجہ یوں نہیں کرنا چاہیے۔

### منافقین کی کذب بیانی:

﴿الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مَّا هُمْ مِنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿١٦﴾ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾﴾

کچھ منافق تھے جو قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم تم میں سے ہیں، ہم مسلمان ہیں، اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں ان کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ فرمایا: کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا جنہوں نے ایسے لوگوں سے دوستی کی ہوئی ہے جن پر اللہ کا غضب ہے۔ یہ لوگ نہ تم میں سے ہیں نہ ان میں سے ہیں۔ جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں اور ان کو پتا بھی ہے کہ ہم جھوٹ بولتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کیا ہوا ہے۔

﴿مَّا هُمْ مِنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ﴾... مطلب کہ ظاہراً تمہارے ساتھ ہیں ان کے ساتھ نہیں ہیں اور باطناً ان کے ساتھ ہیں تمہارے ساتھ نہیں ہیں، تو نہ پورے ان کے ساتھ ہیں اور نہ پورے تمہارے ساتھ ہیں۔

﴿اتَّخَذُوا آيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿٢١﴾﴾

یہ لوگ اپنی قسموں کو ڈھال بناتے ہیں تم سے بچنے کے لیے کہ خدا کی قسم ہم



تو مسلمان ہیں، ہم تو مومن ہیں... یہ صرف تم سے بچنے کے لیے کرتے ہیں، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

﴿يَوْمَ يَنْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ وَ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَذِبُونَ﴾ ﴿١٦﴾

جب قیامت کا دن ہو گا تو یہ لوگ اللہ سے اس دن بھی یہی باتیں کریں گے جس طرح تمہارے سامنے کرتے ہیں، کہیں گے کہ اللہ! ہم قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمارا مقصد یہ نہیں تھا، اللہ کی قسم! ہمارا ارادہ یہ نہیں تھا۔ اللہ فرمائیں گے کہ تم جھوٹ بولتے ہو، میں تمہارے ارادے کو جانتا ہوں۔

### حزب الشیطان کی محرومی:

﴿اسْتَخْوَدَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ ۖ أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ ﴿١٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَ رَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَىٰ ۚ ﴿١٨﴾

شیطان نے ان پر غلبہ حاصل کیا ہے اور اللہ کی یاد کو ان سے بھلا دیا ہے، یہ شیطان کا گروہ ہے اور شیطان کا گروہ نقصان اٹھائے گا۔ جو لوگ اللہ اور اللہ کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ ذلیل ترین ہوں گے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

﴿كَتَبَ اللَّهُ لَا غَلِبَنَّا أَنَا وَ دُسُلُنَا ۖ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ ﴿١٩﴾

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ میں اور میرے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے۔ بے شک اللہ طاقتور اور غالب ہے۔

اس پر ایک سوال ہے کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ میرے رسول غالب رہیں گے لیکن دیکھا جائے تو کتنے انبیاء اور رسول ایسے ہیں جو شہید ہو گئے! اس کا جواب میں

نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ غلبہ کی دو قسمیں ہیں؛ ایک ہے غلبہ برہانی اور ایک ہے غلبہ عملی۔

[1]: یہاں غلبہ عملی نہیں بلکہ غلبہ برہانی مراد ہے۔ ظاہر اُغلبہ اگر کفر کو مل بھی جائے تو بھی دلیل سے ہمیشہ رسول ہی غالب رہتا ہے۔

[2]: یا غلبہ سے مراد یہ ہے کہ میں تمہارا بدلہ لوں گا۔ اگر کوئی بندہ کسی نبی کو تکلیف دے تو اللہ اس کا بدلہ خود لیتے ہیں، اگر کوئی شخص رسول کو شہید کرے تو انتقام اللہ خود لیتے ہیں۔ تو فرمایا کہ یہ ہمارا فیصلہ ہے کہ غالب ہم ہیں اور ہمارے رسول ہیں۔ اللہ تو ہے ہی غالب اور رسول کے غالب ہونے کا معنی کہ اگر کوئی رسول کو قتل کر بھی دے تو اس کا بدلہ اللہ خود لیتے ہیں اور بالآخر پیغمبر ہی غالب آتا ہے اور کفر مغلوب ہو کر دنیا سے ختم ہو جاتا ہے۔

### حزب اللہ کی کامیابی:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۗ﴾  
جو لوگ اللہ سے محبت رکھتے ہیں اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ ان لوگوں سے پیار کریں جو اللہ اور اللہ کے رسول کے مخالف ہیں خواہ وہ ان کے والد ہوں، بیٹے ہوں، بھائی ہوں یا خاندان کے لوگ ہوں۔

﴿أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ ۗ﴾  
ان کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو لکھ دیا ہے اور اللہ اپنی روح سے ان کی مدد فرماتے ہیں۔ ”روح“ سے مراد نورِ ایمان ہے کہ اللہ ایمان میں ایسا نور عطا فرمادیتے ہیں کہ جس سے بندے کی مدد ہوتی ہے، اس نور کی وجہ سے بندہ کفر کو بھی پہچانتا ہے،

سازشوں سے بھی بچ جاتا ہے۔ تو روح سے مراد یہاں نورِ ایمان ہے۔

﴿وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ

وَرَضُوا عَنْهُ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٣٣﴾﴾

اللہ ان کو ایسے باغات میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان

باغات میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔ یہی اللہ کا

گروہ ہے اور اللہ کا گروہ ہی کامیاب ہوتا ہے۔

اللہ ہمیں حزب اللہ میں شامل فرمائیں اور حزب الشیطان سے ہم سب کی

حفاظت فرمائیں۔ اللہ منافقت کی زندگی اور منافقت کی موت سے بچائیں۔ اللہ خالص

ایمان عطا فرمائیں۔ آمین

وَاجِرُ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الحشر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿سَبِّحْ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ ﴿١﴾

### ابتدائی آیات کا شان نزول:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لائے تو مدینہ میں وہ اسباب جن سے دین مضبوط ہوتا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے اختیار فرمائے۔ ان میں ایک یہ تھا کہ مدینہ منورہ میں یہود بستے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معاہدے کیے۔ ان معاہدات میں ایک بنیادی شق یہ تھی کہ اگر یہود پر کسی نے حملہ کیا تو ہم تعاون کریں گے اور ہم پر کسی دشمن نے حملہ کر دیا تو یہود ساتھ دیں گے۔ اگر یہود کے بندے سے قتل ہو گیا تو دیت میں ہم ساتھ شریک ہوں گے اور اگر ہمارے بندے سے قتل ہو گیا تو دیت میں یہود شریک ہوں گے۔ یہ معاہدہ تھا۔

### بیر معونہ کا واقعہ:

اس معاہدے کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تھے تو بیر معونہ کا واقعہ پیش آیا کہ ایک قبیلہ کے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ کچھ معلمین بھیجیں جو ہمارے قبائل کو دین سکھائیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر صحابہ کو بھیجا۔ راستے میں انہوں نے عہد شکنی کی اور ان صحابہ کو شہید کر دیا۔ ان ستر

میں سے صرف ایک عمرو بن امیہ ضمری بچ گئے اور بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ واپس آ رہے تھے تو راستے میں ان کا دو کافروں سے واسطہ پڑا۔ انہوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ کافر ہیں، مخالف ہیں، ان پر حملہ کر کے دونوں کو قتل کر دیا۔ جب یہ دونوں کو قتل کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو پتا چلا کہ وہ دونوں قبیلہ بنی عامر کے افراد تھے اور بنی عامر وہ قبیلہ تھا کہ جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ تھا۔ اب معاہدے کے رو سے ان کو مارنا جائز نہیں تھا لیکن ان کو پتا نہیں تھا کہ یہ بنو عامر قبیلہ کے ہیں، انہوں نے غلطی سے مار دیا۔ تو جب غلطی سے مارا تو اب قصاص تو تھا نہیں۔ البتہ دیت آتی تھی۔

### بنو نضیر کی عہد شکنی اور جلا وطنی:

تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنو نضیر کے پاس گئے جو یہودی تھے کہ چونکہ دیت ہے اور ہم سب نے مل کر ادا کرنی ہے، اس لیے کچھ رقم ہم جمع کریں اور کچھ تم جمع کرو۔ بنو نضیر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ یہاں تشریف رکھیں، ہم مال جمع کرتے ہیں، اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ جس مقام کے نیچے آپ تشریف فرما ہیں اوپر سے بڑا پتھر گراؤ تاکہ آپ یہیں قتل ہو جائیں اور معاملہ ختم ہو جائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آگئی، اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا تو آپ وہاں سے اٹھ کر مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع فرمایا اور بنو نضیر کو پیغام بھجوادیا کہ تم نے وعدہ خلافی کر کے معاہدہ کو توڑ دیا ہے، اب ہمارا تمہارا معاہدہ ختم ہو گیا، لہذا اب تمہیں دس دنوں کی مہلت دی جاتی ہے کہ تم اپنا سامان اٹھاؤ اور یہاں سے نکل جاؤ، ہم تمہیں کچھ نہیں کہتے۔ لیکن بنو نضیر اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ جب تیار نہیں ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر گئے اور باقاعدہ جہاد کا اعلان کیا کہ ان کو ختم کر دیتے ہیں۔ یہ سارے لوگ قلعہ بند ہو گئے۔ اب ان کے جو درخت تھے صحابہ کرام نے

جلانے شروع کر دیے تاکہ ان کو تکلیف ہو، بعض صحابہ کرام نے نہیں جلائے کہ بنو نضیر جب چلیں جائیں گے تو یہ درخت ہمارے کام آئیں گے۔ جب انہوں نے سمجھا کہ اب ہماری جان بخشی کی کوئی صورت ممکن نہیں، شاید ہم ختم ہو جائیں تو پھر ان لوگوں نے کہا کہ آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم مدینہ چھوڑ کے چلے جاتے ہیں۔ تو اکثر ان میں سے شام کے علاقے میں چلے گئے اور کچھ ان میں سے خیبر میں چلے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جتنا سامان ایک بندہ ایک اونٹ پر لاد سکتا ہے لے جائے، ان لوگوں نے گھروں کے دروازے، چارپائیاں اور جو کچھ اٹھا سکتے تھے اٹھا کر وہاں سے چلے گئے۔

یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت بڑی وسعتِ ظرفی تھی کہ وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مارنا چاہتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ مدینہ چھوڑ کے جہاں جانا چاہو چلے جاؤ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس حکمتِ عملی میں حکمتیں بہت زیادہ تھیں لیکن آپ نے وسعتِ ظرفی کا مظاہرہ فرمایا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

**یہود کی دوسرے مرتبہ جلا وطنی:**

﴿سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾

هُوَ الَّذِيْ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ﴿١٠﴾

جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے۔ وہی ہے جس نے اہل کتاب کے کافر لوگوں کو ان کے گھروں سے پہلی مرتبہ نکالا تھا۔

”لِاَوَّلِ الْحَشْرِ“ یعنی پہلی مرتبہ کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے

قبل یہود کے ساتھ ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا کہ ان کو اپنے گھروں سے جلا وطن کیا گیا ہو۔ یہ پہلی بار ہوا تھا۔ یہاں ”پہلی بار“ کہنے میں ایک لطیف اشارہ یہ ہے کہ اب بھی نکالا ہے اور ایک وقت بعد میں بھی آئے گا کہ ان کو دوسری مرتبہ بھی ان کے گھروں سے نکالا جائے گا۔ تو مدینہ سے نکل کر ان میں سے جو لوگ شام چلے گئے تھے وہ تو چلے گئے، بعض لوگ خیبر میں رک گئے تھے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں ان کو خیبر سے بھی نکالا۔ تو یہ سارے کے سارے پھر شام میں چلے گئے تھے۔

**یہود کا گمانِ باطل:**

﴿مَا ظَنَنْتُمْ أَنْ يَخْرُجُوا وَظَنُّوا أَنَّهُمْ مَانِعَتُهُمْ حُصُونُهُمْ مِنَ اللَّهِ فَأَتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہاں ان کے قلعے اتنے زیادہ مضبوط تھے کہ تمہارا بھی خیال نہیں تھا کہ وہ باہر نکلیں گے اور خود ان کا بھی خیال یہی تھا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ سے بچالیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے پکڑا کہ ان کو جہاں سے گمان بھی نہیں تھا! اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔

﴿يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي

الْأَبْصَارِ﴾

وہ لوگ اپنے مکانات کو اپنے ہاتھوں سے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے توڑ رہے تھے۔ اے آنکھوں والو! اس واقعے سے عبرت حاصل کرو!

مطلب کہ مومن بھی ان کے مکانات کو توڑ رہے تھے اور یہود خود بھی توڑ رہے تھے۔ ”وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ“ کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے توڑ رہے تھے... یہ ایسے تھا جیسے کوئی رضامند ہوتا ہے حالانکہ اس میں بنو نضیر کی رضامندی نہیں تھی لیکن

چونکہ انہوں نے جانا تھا تو مسلمان بھی ان کے کواڑ توڑ توڑ کر ان کے حوالے کرتے رہے کہ یہ لو اپنا سامان اور نکل جاؤ یہاں سے! اس سے ایک تو ان کا غیظ و غضب بڑھتا اور دوسرا اس سے مسلمانوں کی طاقت کا اظہار ہوتا۔ اس وجہ سے وہ مسلمان بھی ان کے مکانات توڑتے رہے۔

### دنیا میں جلا وطنی اور آخرت میں عذاب کی وجہ:

﴿وَلَوْلَا اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ الْجَلَاءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي

الْآٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ﴿٢٠﴾﴾

اگر اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں یہ جلا وطنی کا فیصلہ نہ فرماتے تو ان پر دنیا میں عذاب آجاتا اور یہ ختم ہو جاتے۔ تو قتل کا عذاب نہیں آیا بلکہ ان کو جلا وطن کر کے روانہ کر دیا گیا اور آخرت میں ان کے لیے پھر ایک عذاب ہو گا جہنم کا۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاقُّوْا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدٌ

الْعِقَابِ ﴿٢١﴾﴾

اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی تھی اور جو اللہ کی مخالفت کرے تو وہ سمجھ لے کہ اللہ سخت پکڑ فرماتے ہیں۔

تو دنیا میں جلا وطنی کا عذاب تھا نقض عہد کی وجہ سے اور آخرت میں ان کو عذاب ہو گا دنیا میں عدم ایمان کی وجہ سے کہ ان میں ایمان نہیں تھا۔ ایمان نہ ہونے کی اصل سزا آخرت میں ہوتی ہے اور نقض عہد کی سزا دنیا میں ہوتی ہے۔ تو جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی اور عہد توڑا تو اس کی سزا دنیا میں مل گئی اور پیغمبر کی مخالفت کی اور ایمان نہیں لائے تو اس کی سزا ان کو پھر آخرت میں دی جائے گی۔



## صحابہ کرام کا اجتہادی اختلاف:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّن لِّيْنَةٍ أَوْ نَزَعْتُمْوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ

وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ﴾

تم نے جو درخت کاٹے یا جنہیں نہ کاٹا تو یہ اللہ کے حکم سے ہی تھا اور یہ اس لیے ہوا تاکہ اللہ فاسق اور گناہگاروں کو رسوا کرے۔

بعض مسلمانوں نے درخت کاٹ دیے اور بعضوں نے نہیں کاٹے۔ جنہوں نے کاٹے ان کا مقصد یہ تھا کہ جب ہم ان کے درخت کاٹیں گے تو یہودیوں کی تکلیف بڑھے گی اور ہماری طاقت کا اظہار ہو گا اور جنہوں نے نہیں کاٹے ان کی منشا یہ تھی کہ یہود چلے جائیں گے تو یہ درخت ہمارے کام آجائیں گے۔ تو رائے دونوں کی اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔ ان میں کسی کی رائے تو غلط نہیں تھی۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ جنہوں نے درخت کاٹے اور جنہوں نے چھوڑ دیے یہ سب اللہ کے حکم سے تھا۔

## اجتہادی اختلاف میں مد و خدا شامل حال ہوتی ہے:

اب دیکھو! یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجتہاد تھا درختوں کو کاٹنا اور نہ کاٹنا اور ان کے اجتہاد کو اللہ نے ”فَبِإِذْنِ اللَّهِ“ فرمایا کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اجتہاد ہوتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے، بندے کی ذات اس میں شامل نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ اگر اجتہاد درست ہو جائے تو دوا اجر ملتے ہیں اور اگر اجتہاد میں خطا ہو جائے تو ایک اجر پھر بھی ملتا ہے، اس لیے ”فَبِإِذْنِ اللَّهِ“ فرمایا۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ ان کا ایسا کرنا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے ساتھ تھا کہ تم چاہو تو درخت چھوڑ دو اور چاہو تو درخت کاٹ دو! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجازت دینا اور پھر اللہ تعالیٰ کا اس کو ”فَبِإِذْنِ اللَّهِ“ سے تعبیر

کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی احادیث پر عمل کرنا ایسا ہی ضروری ہے جس طرح قرآن کریم پر عمل کرنا ضروری ہے۔

### اکابرین کے اختلاف کی توجیہ:

یہاں سے ایک بات جو سمجھ آتی ہے۔ میں نے کہیں پڑھی نہیں ہے لیکن سمجھ آتی ہے۔ کہ جس وقت انگریز برصغیر میں آیا اور ان کو نکالنے کی تحریک چلی تو اس وقت ہمارے اکابرین میں سے حضرت مدنی اور حضرت تھانوی رحمہما اللہ کی رائے میں اختلاف تھا۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ کی رائے یہ تھی کہ انگریز کی فوج میں بھرتی ہونا حرام ہے، کیوں کہ اگر ان کی فوج میں مسلمان شامل ہوں گے تو مسلمان؛ مسلمانوں کو قتل کریں گے تو بہت بڑا گناہ ہو گا۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی رائے یہ تھی کہ نہیں، انگریز کی فوج میں بھرتی ہونا جائز ہے، کیوں کہ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ انگریز نے چلا جانا ہے تو اگر مسلمان فوج میں ہوں گے تو آئندہ فوج مسلمانوں کی ہو گی، اگر مسلمان شامل نہیں ہوں گے تو آئندہ فوج کافروں کی ہو گی، تو پہلے بھی کافر ہیں اور ان کے جانے کے بعد پھر کافر ہوں گے، ہم ایک کافر کو نکالیں گے تو دوسرا سوار ہو گا، اس لیے فوج میں اپنے افراد ہونے چاہئیں۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ نے بھی نفع دیکھا اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بھی نفع دیکھا، دونوں کا اجتہاد الگ تھا۔

اب یہاں بھی دیکھو! بعض نے کہا کہ ان کے درخت کاٹ دو، کاٹیں گے تو ان کو تکلیف ہو گی، ان کی شان و شوکت ٹوٹے گی، اسلام کا غلبہ نظر آئے گا اور بعضوں نے کہا کہ ان درختوں کو چھوڑ دو، کیوں کہ جب انہوں نے چلے جانا ہے تو ان کے درختوں سے فائدہ ہمیں ہی ہونا ہے۔

### اختلاف محفوظ میں ہو تو دلیل معصوم، عام مجتہدین میں ہو تو دلیل محفوظ:

جس طرح ہمارے اکابر میں اختلاف تھا ایسے ہی حضرات صحابہ کرام رضی

اللہ عنہم میں بھی اختلاف تھا اور یہ بات یاد رکھو کہ جب اختلاف دو ماجر میں ہو تو پھر دلیل میں محفوظ کو پیش کیا جاتا ہے اور جب اختلاف دو محفوظ میں ہو تو پھر دلیل میں معصوم کو پیش کیا جاتا ہے۔ عام مجتہدین میں اختلاف ہو تو ان کا اختلاف کیسا تھا اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو پیش کرتے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف تھا تو اس اختلاف کو سمجھانے کے لیے پھر دونوں کو پیش کرتے ہیں جیسے حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام کے درمیان اختلاف تھا، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے درمیان اختلاف تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب تشریف لے گئے تو حضرت ہارون علیہ السلام نے ان بنی اسرائیل کو قتل نہیں کیا جو شرک کرتے تھے، اور قتل نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اگر میں ان کو قتل کرتا تو آپ کہتے کہ میرے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا! اور مجھے آپ فرما کر گئے تھے کہ ان کو اکٹھا کر کے رکھنا، تو میں نے ان کو اکٹھا کر رکھا! تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ نہیں، میری رائے یہ ہے کہ جو شرک کریں ان کو مارو۔ حضرت ابو بکر صدیق میں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم میں بھی اختلاف ہو رہا ہے کہ بدر کے قیدیوں کو قتل کرو اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں کہ نہیں، ان کو قتل نہ کرو، شاید اگلی نسل مسلمان ہو جائے۔

تو اس لیے جب دو ماجر مجتہدین میں اختلاف ہو تو پھر دلیل میں ہم محفوظ صحابہ کو پیش کرتے ہیں اور جب محفوظ صحابہ میں اختلاف ہو جائے تو ان کے اختلاف کو سمجھانے کے لیے انبیاء معصوم کو پیش کیا جائے گا۔

یہ کلیہ یاد رکھو تو بہت ساری مثالوں کو اکٹھا کر سکتے ہو، ان کو بیان کرنے میں بہت فائدہ ہوتا ہے۔

**مالِ غنیمت اور مالِ فنی کا حکم:**

﴿وَمَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا آوَجْفَعَهُمْ عَلَيْهِ مِنْ حَيْلٍ وَلَا

رِكَابٍ وَلَكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ ۖ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠﴾

اور اللہ نے جو مال اپنے نبی کو فئی کے طور پر عطا فرماتا ہے تو یہ ایسا مال ہے جس کے لیے تم نے نہ اپنے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ دوڑائے، لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے غلبہ عطا فرمادیتا ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔  
کافر سے حاصل ہونے والا مال دو قسم کا ہوتا ہے:

ایک مال وہ ہوتا ہے کہ جنگ و جدل اور قتل و قتل کے بعد حاصل ہو اور ایک مال وہ ہے کہ جو بغیر لڑائی کے حاصل ہو۔ تو جو مال لڑائی کے بعد حاصل ہوتا ہے اس کو مالِ غنیمت کہتے ہیں اور جو مال لڑائی کے بغیر حاصل ہو جائے اس کو مالِ فئی کہتے ہیں۔ مالِ غنیمت میں پانچواں حصہ بیت المال کا ہوتا ہے اور چار حصے جنگ لڑنے والے مجاہدین میں تقسیم ہوں گے۔ آدمی پیدل ہو تو اس کو ایک حصہ ملتا ہے اور اگر سواری ہو تو اس کو دو گنا حصہ ملتا ہے، ایک اپنا اور ایک سواری کا، اور اگر مالِ فئی ہو تو اس میں غانمین کو کوئی حصہ نہیں ملتا، وہ سارے کا سارا مال اللہ اور اس کے رسول کا ہوتا ہے۔  
مالِ غنیمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي

الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۚ﴾<sup>10</sup>

کہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ، رسول، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے۔

اگر آپ شمار کریں تو خمس کے ان حصہ داروں کی تعداد چھ بنتی ہے اور مالِ فئی میں سارے کا سارا مال اللہ اور اللہ کے رسول کا ہوتا ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ

وسلم کی مرضی ہے کہ جس کو چاہیں عطا کر دیں۔

### مالِ فنی اور مالِ غنیمت میں اللہ کا حصہ ذکر کرنے کی حکمت:

﴿مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي

الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾

اللہ اپنے رسول کو بستیوں کا جو مال فنی کے طور پر عطا کرتا ہے تو یہ اللہ، رسول، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے۔

یہاں جب مالِ فنی کے حصہ داروں کو بیان فرمایا تو تعداد چھ ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مالِ فنی کو اپنی ذات، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کریں گے اس لیے ان کا ذکر یہاں ہوا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس حصہ داروں کے بیان میں ”فَلِلَّهِ“ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ کہ مالِ فنی اللہ کے لیے بھی ہے۔ اسی طرح جب مالِ غنیمت کے پانچویں حصے کا ذکر فرمایا تو اس میں بھی ﴿فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ﴾ فرمایا کہ پانچویں حصے میں بھی اللہ کا حصہ ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہاں ”فَلِلَّهِ“ اور سورۃ الانفال میں ﴿فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ﴾ کہہ کر یہ بات سمجھانی مقصود ہے کہ ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ یہ مال کافروں کا ہے اور ناپاک ہے، اور ناپاک مال سے بچنا چاہیے۔ تو اس شبہ کو دور کرنے کے لیے اللہ کا نام شروع میں لیا، اس میں اشارہ ہے کہ دنیا کے سارے مال کے حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہیں اور عارضی ملکیت اللہ بندوں کو دے دیتے ہیں لیکن جب بندہ کفر کر کے اللہ سے بغاوت کرتا ہے تو پھر مال بندے کی عارضی ملکیت سے نکل کر حقیقی مالک اللہ کی ملکیت میں واپس آ جاتا ہے۔ اب یہ مال خالص اللہ کی ملکیت ہے، بندوں کا اس میں کوئی دخل

نہیں ہے۔ جن مستحقین کو اب یہ مال دیا جائے گا تو وہ خالص اللہ کی ملکیت سے دیا جائے گا اس لیے ان کے لیے حلال اور پاک ہو گا، اس میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو گا کہ یہ کافروں کی ملکیت تھا۔ بھائی جب یہ اللہ کی ملک سے مل رہا ہے تو پاکیزہ ہی ہو گا۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا:

﴿فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا﴾<sup>11</sup>

کہ یہ مال حلال بھی ہے اور پاک بھی ہے۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے زمین سے اللہ پانی کا چشمہ نکالیں اور بندہ اس سے پانی پی لے تو یہ پانی پاکیزہ بھی ہے اور حلال بھی ہے۔ تو یہ جو کفار کا مال ہے یہ کفار کی ملک سے نکل گیا ہے بغاوت کرنے کی وجہ سے، اس لیے یہ مال اب خالص اللہ تعالیٰ کا ہے۔ خیر یہ بات سمجھانے کے لیے شروع میں اللہ کا نام لیا ہے۔

یہ جو ”وَلِذِي الْقُرْبَىٰ“ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ان کو جو مال دیا جاتا ہے مالِ غنیمت کے پانچویں حصے میں سے یا مالِ فئی میں سے تو اس کی دو وجہیں تھیں؛ ایک وجہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہیں اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دینی معاملات میں مدد کی ہے اس لیے ان کا حق بنتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مستحق ہیں، لہذا ان کو بھی دینا چاہیے جس طرح کہ یتیم مستحق ہے، مسکین مستحق ہے، مسافر مستحق ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار بھی مستحق ہیں، تو ان کو بھی دینا چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اب یہ تو شق ختم ہو گئی کہ انہوں نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی ہے، اللہ کے نبی تو دنیا میں نہیں ہیں اس لیے اب دوسری

شق رہ گئی ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ دار ہو اور مستحق ہو تو اس کو بھی مالِ غنیمت اور مالِ فئی میں سے دیا جاسکتا ہے، پیغمبر کے دور میں اختیار نبی کا تھا اور اس کے بعد دور خلفاء کا ہے اور آج کے دور میں جو امیر ہو گا اس کا اختیار ہو گا، وہ جس کو جتنا چاہے دے دے، یہ اس کی صوابدید پر ہے۔

### مالِ فئی کے مصارف بیان کرنے کی حکمت:

﴿كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ وَالْآيَاتِ﴾

مالِ فئی کے یہ مصارف کیوں بتائے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے آنے سے پہلے رواج یہ تھا کہ جو کمانڈر ہو یا حاکم ہو یا غنیمت یا فئی کا مال سارا اسی کا سمجھا جاتا تھا۔ تو فرمایا کہ ایسا نہیں ہے کہ مال صرف اغنیاء اور بڑوں کے درمیان رہے بلکہ اس میں غرباء اور یتیموں کا حصہ بھی رکھا ہے کہ ان کے پاس بھی مال جائے۔

### دین کا خلاصہ؛ اوامر اور نواہی:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا

اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝﴾

اصل تو یہ ہے کہ مالِ غنیمت میں سے جو خمس ہے اس میں سے اور مالِ فئی میں سے جتنا اللہ کے نبی دیں وہ تم لے لو اور جو نہ دیں تو اس کی وجہ سے تمہارے دلوں میں کدورت نہیں آنی چاہیے، چونکہ پیغمبر کا صوابدید اختیار ہے لیکن یہاں مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق صرف مالِ فئی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ تمام احکام شریعت کے ساتھ ہے۔ یہاں ”اَتَى“ بمعنی ”اَمَرَ“ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آگے آ رہا ہے ”ذَهَبُكُمْ“... نہی کے مقابلے میں امر آتا ہے۔ تو اس کا معنی یہ ہے کہ جس بات کا پیغمبر حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس کام سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔ تو نہی یہ امر

کے مقابلے میں آتی ہے۔

میں آپ سے بارہا کہتا ہوں کہ جب غیر مقلد آپ سے کہتے ہیں کہ تم ایک حدیث پیش کرو کہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع الیدین سے منع کیا ہو... تو ہم کہتے ہیں کہ تم ان غیر مقلدین سے کہو کہ تم ایک حدیث پیش کرو کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع الیدین کا حکم دیا ہو! کیوں کہ منع کے مقابلے میں حکم آتا ہے اور جب وہ کہیں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع الیدین کیا ہے... تو ہم پیش کریں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا ہے! فعل کے مقابلے میں ترک آتا ہے اور حکم کے مقابلے میں منع آتا ہے۔ تو جب تم روایت حکم والی پیش کرو تو پھر ہم سے منع کا مطالبہ کرو اور جب تم صرف فعل والی پیش کرو گے تو ہم سے منع نہیں بلکہ صرف ترک کا مطالبہ کرو!

تو یہاں ”اُتِیَ“ بمعنی اُمر ہے، دلیل ”نَهَمُكُمْ“ ہے۔ اسی طرح میں نے آپ سے کہا تھا کہ قرآن کریم میں ہے ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَيْرِ وَالْأَمْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ یہاں اِثْم سے مراد گناہ نہیں ہے بلکہ اِثْم سے مراد ضرر ہے، اس کی دلیل ﴿وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ ہے کہ یہاں اِثْم کے مقابلے میں نفع آرہا ہے۔ تو جب یہاں نفع ہے تو مقابلے میں کیا ہوگا؟ ضرر! ہاں اگر نفع سے مراد ثواب ہوتا تو پھر اِثْم سے مراد گناہ ہوتا۔ اسی طرح ”اُتِیَ“ بمعنی اُمر ہے اس لیے کہ اس کے مقابلے میں نہیں آرہا ہے۔

**مالِ فنی کے حق دار:**

﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهْجَرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ  
يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ



## الْصَّادِقُونَ ﴿٨﴾

یہ جو فرمایا تھا کہ تم مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو اور مسافروں کو دو! جب مستحقین کی بات کی ہے تو اب بطور خاص فرمایا کہ مستحقین میں ان فقراء کو دو جنہوں نے اپنا گھر چھوڑا اللہ کے لیے، ان کی دنیاوی کوئی غرض نہیں ہے، اللہ کی مدد کرتے ہیں اور اللہ کے رسول کی مدد کرتے ہیں اور بہت سچے لوگ ہیں، اس لیے ان کو دو۔

## انصار صحابہ کا ایشار:

﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا﴾

اور اسی طرح یہ مال ان انصار کو دو جو پہلے سے ہی دار الاسلام میں رہتے ہیں یعنی مدینہ منورہ میں رہائش پذیر ہیں۔ جو کوئی ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے تو یہ اس کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ اور ان کو جو مال فئی میں سے ملتا ہے تو ان کو تکلیف نہیں ہوتی بلکہ انصار خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے مہاجر بھائیوں کو ملا ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ جب بنو نضیر کا مال فئی مسلمانوں کو حاصل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مدینہ کے سردار حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ انصار کو میرے پاس بلاؤ۔ جب سب انصار مدینہ آگئے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا جس میں انصار مدینہ کی مدح فرمائی کہ انہوں نے مہاجرین کے ساتھ حسن سلوک سے کام لیا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو! یہ مہاجر مکہ سے مدینہ آئے ہیں اور ان کے پاس مکانات نہیں تھے، تم نے ان کو مکانات دیے ہیں، یہ تمہارے مکانوں میں رہتے ہیں۔ اب بنو نضیر کا مال

فئی ملا ہے تو اگر یہ ہم مہاجرین کو دے دیں تاکہ یہ لوگ تمہارے مکانوں کے بجائے اپنے مکانوں میں ٹھہریں تو تمہاری کیا رائے ہے؟ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا اختیار تھا لیکن پھر بھی مشورہ کیا۔ یہ بات سن کر انصار کے دو بڑے سردار حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہم کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! ہم یہ چاہتے ہیں کہ مال فئی سارا مہاجرین کو دے دیں اور جو ہمارے مکانوں میں رہتے تھے ان کو ہمارے مکانوں میں بھی رہنے دیا جائے۔ کیا قربانی ہے صحابہ کی رضی اللہ عنہم! جمیع! فتوحات کے دور شروع ہوئے ہیں اور کیا تقریر کر رہے ہیں ان کے سردار کہ حضور! ہماری خواہش ہے کہ جو مال فئی ہے بنو نضیر والا وہ سارا ان کو دے دیں اور جو ہمارے مکان ہیں ہم ان سے واپس نہیں لیتے! دنیا میں کوئی ایسی مثالیں تلاش کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قائم کیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر سارا مال مہاجرین کو دے دیا۔ باقی انصار میں سے سہل بن حنیف اور ابو دجانہ رضی اللہ عنہم یہ دو بہت غریب تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو بھی کچھ عطا فرمادیا۔

### خود پر دوسروں کو ترجیح:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُوقِ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾

اور خود فاقہ اور تنگی میں ہوں تب بھی اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، اور وہ آدمی جس کو بخل سے اللہ بچالیں بس وہی بندہ کامیاب ہے۔

”بخل“ یہ چھوٹا ہوتا ہے اور ”شُح“ یہ بخل کا اعلیٰ درجہ ہوتا ہے۔ اصل میں انسان کی طبیعت میں بخل ہے۔ مال سمیٹنا اور مال سنبھالنا یہ اس کی عام عادت ہے۔ ہاں اگر اللہ کسی کو اس طبیعت کے خلاف کرنے کی توفیق عطا فرمادیں تو بس کیا ہی کہنے! وہ تو

بہت کامیاب ہے۔

## مالِ فنی میں آئندہ کس کا حصہ ہوگا؟

﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا  
الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ  
رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾

اور یہ مالِ فنی ان لوگوں کو بھی ملے گا جو ان صحابہ کے بعد آئیں گے، جو یہ دعا  
کریں گے کہ اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی  
مغفرت فرما جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور ہمارے دلوں میں ان ایمان والوں کے  
لیے کینہ نہ آئے۔ بے شک آپ شفقت کرنے والے مہربان ہیں۔

”وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ“ سے مراد یا تو وہ لوگ ہیں جو صحابہ کرام  
رضی اللہ عنہم کے بعد مدینہ منورہ میں آئیں گے... یا مراد وہ ہیں جو صحابہ کے بعد ایمان  
قبول کریں گے... یا بعد سے مراد کہ دنیا میں ان صحابہ کے بعد آئیں گے۔ مطلب یہ  
ہے کہ مالِ فنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، آپ کے رشتہ داروں کا ہے، یتیموں  
کا ہے، مساکین کا ہے، مسافروں کا ہے اور مہاجرین صحابہ کا ہے، انصار صحابہ کا ہے اور  
ان کے بعد جو اہل ایمان آنے والے ہیں ان کا بھی ہے۔ یہ ہمیشہ کے لیے مالِ فنی کا  
ضابطہ ہے، یہ صرف اس دور کا نہیں تھا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ نے بعد والے  
مؤمنین کو پابند کیا ہے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے استغفار اور دعائیں  
کریں۔

اور یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے بُری

رائے اپنے ذہن میں رکھنا جائز نہیں ہے بلکہ تمام مؤمنین؛ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے دعا کرنے کے پابند ہیں۔

### منافقین کی وعدہ خلائی:

﴿الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ﴾

کیا آپ نے ان منافقین کو نہیں دیکھا جو اپنے اہل کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے اور تمہارے بارے میں ہم کسی کی بات نہیں مانیں گے۔ اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔

یہ عبد اللہ ابن ابی ابن سلول منافق اور اس کے ساتھی تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنوں نے یہود سے معاہدے کر رکھے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، تم فکر نہ کرو! اگر تمہیں مدینہ سے نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے، تمہارے ساتھ جنگ ہوئی تو ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں، جب یہود کو یہاں سے نکالنے کا موقع آئے گا تو یہ منافق نکلیں گے نہیں، جب ان سے قتال کی باری آئے گی تو دوڑ جائیں گے، یہ لوگ ان کا ساتھ پھر بھی نہیں دیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ بنو نضیر کو جب نکالا گیا تو عبد اللہ ابن ابی کا ایک فرد بھی ساتھ نہیں نکلا۔ جب ان کے قلعے کا محاصرہ کیا گیا تو ایک فرد بھی ان کے ساتھ نہیں نکلا۔ بنو قینقاع کے لوگ تھے، غزوہ بدر کے بعد جب ان کا محاصرہ کیا گیا اور پندرہ دن تک محاصرہ جاری رہا، ان کے دل میں اللہ نے رعب ڈال دیا اور ان کی بس ہو گئی تو پھر عبد اللہ ابن ابی نے منیتوں کی کہ حضور! ان

کی جان بخشی کر دیں اور ان کو یہاں سے نکال دیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، یہ مدینہ چھوڑ کر چلے جائیں، ہم ان کو کچھ نہیں کہتے۔ تو ان کی جان بخشی ہوئی اور وہ وہاں سے چلے گئے تھے۔

تو اللہ رب العزت نے فرمایا کہ ان منافقین کو دیکھو کہ کیسے معاہدے کرتے ہیں لیکن جب وقت آئے گا تو یہ دوڑ جائیں گے۔

### منافقین کی بزدلی کا عالم:

﴿لَا يَغَاثِرُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرَىٰ مُّحَصَّنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ ۚ﴾

یہ لوگ اتنے بزدل ہیں کہ سارے مل کر بھی تم سے نہیں لڑ سکتے، ہاں قلعہ بند ہو کے لڑیں تو لڑیں کھلا نہیں لڑ سکتے، یا شہر کی حفاظت کے لیے جو بڑی دیوار ہوتی ہے اس کے پیچھے ہو کر تو لڑ سکتے ہیں سامنے دو بدو لڑ ہی نہیں سکتے، ان میں جرأت نہیں ہے۔ اور آپ یقین فرمائیں کہ آج بھی کسی میں جرأت نہیں ہے، اگر جرأت ہے تو وہ ہماری بزدلی کی وجہ سے ہے، ہمارے اندر غیرت ہو تو کسی کی کیا جرأت ہے کہ ہمیں ہاتھ بھی لگائے!

﴿بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ ۚ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ۚ ذَٰلِكَ

بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ۚ﴾

فرمایا کہ یہ اکٹھے ہو کر بھی تم سے نہیں لڑ سکتے کیوں کہ ان کی آپس کی جنگ ہے۔ یہ اللہ فرما رہے ہیں۔ تمہارا خیال ہے کہ یہ اکٹھے بیٹھے ہیں، یہ اکٹھے نہیں ہیں ان کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہیں، ہر کسی کا اپنا عقیدہ ہے، یہ نافہم قسم کی قوم ہے، دین کو سمجھتی نہیں ہے تو تم ان کے اتحاد سے پریشان نہ ہو۔

﴿كَمَثَلِ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

بنو نضیر کی مثال تو ان لوگوں کی ہے جو کچھ عرصہ پہلے اپنے کیے کا بدلہ چکے ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اس سے مراد بنو قینقاع کے یہودی ہیں۔ انہوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے امن کا معاہدہ کیا تھا لیکن خود ہی اس کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ ان کو بھی جلا وطن کیا گیا تھا۔

**شیطان کا دھوکہ:**

﴿كَمْثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلنَّاسِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنْكُمْ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ﴾ ﴿١٦﴾

ان کی مثال تو ایسے ہے جیسے شیطان ہے کہ وہ انسان سے کہتا ہے کہ کافر ہو جا! بندہ جب کافر ہو جاتا ہے تو پھر شیطان کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری ہوں۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

یہاں منافقین کی مثال بیان کی ہے کہ عبد اللہ ابن ابی اور اس کی جماعت کے کرتوتوں کو سمجھنا ہو تو شیطان کو دیکھو۔ جنگ بدر میں شیطان انسانی شکل میں آیا تھا اور ابو جہل اور اس کے ساتھیوں سے کہا تھا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں لیکن جب اس نے آسمان سے فرشتے اترتے دیکھے تو کہا کہ میں تم سے بری ہوں، تم جانو اور یہ جانیں، میں جارہا ہوں۔ پھر وہاں سے دوڑ گیا۔ تو فرمایا کہ عبد اللہ ابن ابی بھی اسی طرح ہے۔ ابھی یہ ان سے کہتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن جو نہی آسمانی مدد آئے گی تو یہ شیطان کی طرح انہیں چھوڑ کر دوڑ جائے گا۔ اللہ ہم سب کو شیطان سے محفوظ رکھیں۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔ (آمین)

## فکرِ آخرت کیجیے!

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلِتَنْظُرُنَفْسُ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا اعمال آگے بھیجے ہیں؟! اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔  
تم نے کفر کا انجام دیکھا ہے اس لیے اب ذرا اپنا خیال کرو، طاعات کرو، آگے نیک اعمال بھیجو گے تو وہی تمہارے کام آئیں گے۔

پہلے ”اتَّقُوا اللَّهَ“ سے مراد ہے کہ طاعات اختیار کرو اور دوسرے ”اتَّقُوا اللَّهَ“ سے مراد ہے کہ گناہوں سے بچو! اب یہ تکرار نہیں ہو گا، ہر ایک کا معنی الگ الگ ہو جائے گا... یا پہلے ”اتَّقُوا اللَّهَ“ سے مراد ہے کہ نیک اعمال کرو اور دوسرے ”اتَّقُوا اللَّهَ“ سے مراد ہے کہ اخلاص کا بھی خیال رکھو! اب بھی کوئی تکرار نہیں ہے کیونکہ اب دونوں کا معنی الگ الگ ہے۔

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۚ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٢٤﴾

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں ایسا کر دیا کہ وہ خود اپنے آپ کو بھول گئے۔ یہی لوگ فاسق ہیں، گنہگار ہیں اور فاسق لوگ اصحاب النار ہوتے ہیں اور متقی لوگ اصحاب الجنة ہوتے ہیں۔ اس لیے فرمایا: جنتی اور جہنمی کبھی برابر نہیں ہو سکتے، جنتی لوگ ہی کامیاب ہیں۔

﴿فَأَنسَهُمْ أَنفُسَهُمْ﴾... کیا مطلب کہ ان کو پتا ہی نہیں کہ ہمارے نفع کی

کیا چیز ہے اور نقصان کی کیا چیز ہے؟ یہ لوگ گناہوں میں ایسے ڈوبے ہوئے ہیں کہ اپنی جان سے بھی بے پروا ہو گئے۔

### قرآن پہاڑ پر نازل کرتے تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتا:

﴿وَأَنزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لِّرَأْيِهِ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ

خَشْيَةِ اللَّهِ ۖ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٦١﴾﴾

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے قرآن اتارا۔ فرمایا: اگر ہم اس قرآن مجید کو پہاڑ پر اتارتے تو پہاڑ اللہ کے خوف سے دب جاتا اور اس کے ریزے ریزے ہو جاتے۔ ہم یہ مثالیں اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ تم کچھ غور و فکر کیا کرو۔

تو پہاڑ بھی اس کے نازل ہونے کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اور ایک تمہارے دل ہیں کہ قرآن کا تم پر اثر ہی نہیں ہو رہا۔ اس قرآن کو سمجھو۔

میں کئی بار بیانات میں عرض کرتا ہوں کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم نے بہت پیاری بات فرمائی ہے۔ حضرت قاری طیب صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اگر براہ راست قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو پہاڑ پھٹ جاتے۔ سوال یہ ہے کہ آٹھ سال کا بچہ قرآن کو اپنے سینے میں رکھ لیتا ہے تو وہ کیوں نہیں پھٹتا؟ اگر قرآن اتنا بوجھ والا ہے کہ پہاڑ پھٹ جاتا ہے تو پھر چھوٹا بچہ کس طرح قرآن کو سینے میں اٹھا لیتا ہے؟ اور قرآن اگر چھوٹا بچہ بھی اٹھا سکتا ہے تو پھر پہاڑ کیوں نہیں اٹھا سکتا؟ حضرت فرماتے ہیں کہ وجہ یہ ہے کہ جس طرح سورج منیر ہوتا ہے اور چاند مستنیر ہوتا ہے، چاند؛ سورج سے روشنی لیتا ہے، جسم براہ



راست سورج کی تپش کو برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ سورج جلالی ہے اور اس کی تپش بھی جلالی ہے، براہ راست سورج کی روشنی آنکھیں نہیں برداشت کر سکتیں لیکن جب بدر چودھویں کا چاند نکلتا ہے تو سورج کی تپش اس چاند سے گزرتی ہے اور پھر بروقت میں بدلتی ہے تو جسم کو مزا آتا ہے۔ یہ سورج جلالی ہے اور اس کی تپش بھی جلالی ہے لیکن جب چاند سے گزرتی ہے تو چاند جمالی ہے، یہ حرارت، بروقت میں بدل جاتی ہے چاند کے جمال کی وجہ سے اور یہ ضیاء نور میں بدل جاتی ہے چاند کے جمال کی وجہ سے تو پھر جسم کو بھی لطف آتا ہے اور آنکھ کو بھی مزا آتا ہے چاند کی وجہ سے۔ اسی طرح اللہ پاک جلالی ہے اور اس کا کلام بھی جلالی ہے، جلالی کلام اگر براہ راست پہاڑ پر اترتا تو پہاڑ برداشت نہ کرتا، اللہ اپنے جلالی کلام کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالی سینہ پر اتارتے ہیں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالی ہونٹوں سے باہر نکالتے ہیں تو جس قرآن کو پہاڑ نہیں اٹھا سکتا تھا یہ حضور کے جمال کی برکت ہے کہ آٹھ سال کا بچہ بھی اٹھا لیتا ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

یہ ہے قاری طیب صاحب کا علم! میں کہتا ہوں کہ ایسے ایسے لوگ موجود ہیں تمہیں کیا پڑی ہے کسی اور کو دیکھنے کی؟ اپنے اکابر کو پڑھو اور اپنے اکابر کی تعریفیں کرو! اپنے بیانات میں اپنے اکابر کا تذکرہ کرو! اکابر کا نام لو اور اگلی نسلوں میں منتقل کرو! میری گزارش سمجھ آرہی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین)

اسمائے حسنیٰ:

﴿هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ﴾ ۲۲ ﴿هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ أَلَمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾ ۲۳ ﴿

وہی اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ چھپی ہوئی باتوں کو بھی جانتا ہے اور کھلی ہوئی باتوں کو بھی، وہ بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے، وہی اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

آگے اللہ کے صفاتی نام ہیں۔ وہ ملک ہے یعنی بادشاہ ہے، قدوس ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے کہ قدوس؛ اسے کہتے ہیں جو زمانہ ماضی میں عیوب سے پاک ہو۔ سلام؛ جو زمانہ مستقبل میں پاک ہو۔ مؤمن؛ جو آدمی کو امن دینے والا ہو، آدمی پر تکلیف نہ آنے دے۔ مہمین؛ نگرانی کرنے والا کہ اگر تکلیف آجائے تو اس کو رفع کر دے۔ عزیز یعنی غالب ہے۔ جبار اگر جبروت سے ہو تو معنی طاقت ور ہے اور اگر جبر سے ہو تو معنی اصلاح کرنے والا ہے۔ جس طرح جبیرہ وہ لکڑی ہوتی ہے جو بازو ٹوٹنے کے بعد باندھتے ہیں کہ بازو کو ٹھیک کر دے، تو جبار کا معنی ہے اصلاح کرنے والا۔ متکبر... کبر اللہ کی خاص صفت ہے اور یہ صفت اللہ کو زیب بھی دیتی ہے۔

﴿هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ يُسَبِّحُ لَهُ مَا

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٢٢﴾﴾

اللہ تعالیٰ خالق ہیں، باری ہیں یعنی حکمتوں کے ساتھ پیدا کرتے ہیں، مصور ہیں کہ جس کو پیدا کرتے ہیں اسے شکل و صورت دیتے ہیں، اللہ کے نام بھی بہت اچھے ہیں۔ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص صبح کے وقت تین بار ”أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّبِّحِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ پڑھ لے اور اس کے بعد سورۃ الحشر کی آخری تین آیتیں پڑھ لے تو ستر ہزار فرشتے اس کے لیے شام تک مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور اگر یہ شخص

شام سے پہلے فوت ہو جائے تو اللہ اسے شہیدوں میں شامل فرماتے ہیں اور اگر یہ شام کو پڑھ لیں تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور اگر یہ فوت ہو گیا تو اللہ اس کو شہداء میں شامل فرمائیں گے۔<sup>12</sup>

آپ بھی اس کا معمول بنائیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ کم از کم انیس سال ہو گئے ہیں یہ اسی طرح میرے معمول میں شامل ہے۔ بہت ساری ایسی دعائیں ہیں کہ الحمد للہ میں اپنے معمولات میں رکھتا ہوں۔ بعض ایسی بھی ہیں جو میرے درجہ اولیٰ والے سال سے چل رہی ہیں۔

### دعائے مستجاب کا مجرب طریقہ:

ایک تو اس کے پڑھنے کا اہتمام کریں اور دوسرا یہ میرا اپنا مجرب نسخہ ہے، اور میں یہ سنی سنائی بات نہیں کر رہا اپنا تجربہ بتا رہا ہوں کہ کسی عنوان پر کبھی دعا مانگنی ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے درود شریف پڑھیں۔ پھر سورۃ الحشر کے آخری رکوع ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللَّهَ﴾ سے تلاوت شروع کریں اور جب یہاں پہنچیں ﴿لَوْ أَنزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَّرَأَيْنَاهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾ تو یہاں تلاوت روک دیں، پھر یہاں دعا کریں کہ اے اللہ! میری یہ ضرورت، میری مصیبت، میری تکلیف، میرے لیے پہاڑ ہے، آپ کی قدرت و طاقت کے سامنے اس کی کیا حیثیت ہے؟ اللہ! میری اس حاجت کو پورا فرما دیں! اس کے بعد پھر آگے تلاوت شروع کریں۔ پھر جب آپ پہنچیں ﴿لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی﴾ پر تو اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسمائے حسنیٰ کو پڑھ لیں۔

اسمائِ حسنیٰ پڑھتے ہوئے دل میں اپنی مراد کا تصور کریں۔ جب یہ اسماء مکمل ہو جائیں تو پھر تلاوت شروع کر دیں اور رکوع کے اختتام پر گیارہ بار درود شریف پڑھ لیں اور آخر میں جو آپ کی ضرورت ہے وہ مانگیں۔ ان شاء اللہ دعائیں قبول ہوں گی۔

اللہ رب العزت ہماری جائز حاجات کو پورا فرمائے، ہماری دعاؤں کو قبول

فرمائے۔ آمین

وَاجِرُ دَعَا أَنَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الممتحنة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ

إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ﴾

### شان نزول:

یہ غزوہ بدر کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے کا واقعہ ہے۔ مکہ کی ایک عورت تھی جو مُغَنِّیہ تھی گانا گاتی اور پیسے کماتی۔ اس کا نام سارہ تھا۔ یہ مدینہ منورہ آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تم مسلمان ہو کر آئی ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ تو پھر یہاں کیوں آئی ہو؟ اس نے کہا کہ آپ لوگ مکہ کے اعلیٰ خاندان تھے۔ مکہ کے سردار تو بدر میں مارے گئے اور آپ لوگ یہاں آ گئے، اب میرا گزارا نہیں ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ مکہ کے نوجوانوں کا کیا بنا؟ مطلب کہ وہ تو تجھ پہ پیسا لٹاتے تھے، اب ان کا کیا ہوا؟ کہنے لگی کہ جنگ بدر کے بعد انہوں نے مجھے بلانا چھوڑ دیا ہے اس لیے میں سخت تنگی میں ہوں، میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ میری کچھ مدد کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عبدالمطلب سے فرمایا کہ اس کو کچھ مال دے کر اس کی کچھ مدد کر کے اس کو مکہ بھجوادو۔ انہوں نے اس کی کچھ مدد کی۔ اب وہ واپس مکہ جانے کی تیاری کرنے لگی۔

آپ کے علم میں ہے کہ حدیبیہ میں مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ مشرکین مکہ نے اس معاہدہ کی پاسداری نہیں کی اور معاہدہ کو توڑ ڈالا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین پر حملہ کرنے کے لیے خفیہ طور پر تیاری شروع کر دی تھی۔

### حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کی اجتہادی خطا:

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ بدری صحابی تھے۔ ان کو پتا چلا کہ یہ عورت مکہ سے آئی ہے اور اب واپس جا رہی ہے۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ اصلاً یمن کے تھے اور مکہ مکرمہ میں آکر آباد ہوئے تھے۔ مکہ مکرمہ میں ان کا قبیلہ نہیں تھا۔ یہ خود تو ہجرت کر کے مدینہ منورہ آگئے تھے لیکن ان کے اہل و عیال مکہ مکرمہ ہی میں تھے۔ تو ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ جتنے لوگ ہجرت کر کے آئے ہیں تو ان میں سے ہر ایک کا خاندان وہاں پر ہے، اگر بیوی بچے بھی مکہ میں ہیں تو ساتھ دوسرا خاندان بھی ہے، رشتہ دار وہاں پر ہیں اس لیے ان کو تو نقصان کا خدشہ نہیں ہے۔

اب مکہ میں جب جنگ ہو گی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے بچوں کو نقصان پہنچ جائے۔ تو میں مکہ والوں پر احسان کروں اور انہیں پیغام پہنچا دوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے اوپر حملہ کرنے والے ہیں تم تیاری کر لو! اگر میں ان کے ساتھ یہ ہمدردی کروں تو وہ بھی اس کے بدلے میں میرے بچوں کا خیال رکھیں گے اور میرے بچے بچ جائیں گے اور یہ تو مجھے پورا یقین ہے کہ مکہ فتح ہونا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاتح بننا ہے، میں مکہ والوں کو یہ بات بتاؤں تب بھی مکہ فتح ہونا ہے اور نہ بتاؤں تب بھی ہونا ہے! لیکن اس تدبیر سے میرے بچے بچ جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے مکہ والوں کو ایک خط لکھا جس میں اس حملے کی خبر دی۔ یہ خط انہوں نے سارہ کو دیا اور کچھ پیسے بھی دیے۔

یہ سارہ ابھی روضہ خان ایک جگہ تھی وہاں پہنچی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے اس معاملہ کا سارا حال بتا دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت ابو مرثد اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم کو بلایا اور فرمایا کہ فلاں مقام پر یہ عورت پہنچی ہے اور اس کے پاس ایک خط ہے، وہ خط لے کر آؤ! انہوں نے گھوڑے دوڑائے اور وہاں پہنچے۔ وہ عورت پکڑی گئی، ان حضرات نے کہا کہ تمہارے پاس ایک خط ہے وہ ہمیں دے دو۔ اس نے کہا کہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ خط دو ورنہ ہم تمہارے کپڑے اتروادیں گے، خط ہم نے لینا ہے تم سے! اس سے وہ ڈر گئی۔ خط اس کی ازار میں تھا۔ اس نے وہاں سے نکالا اور ان حضرات کو دے دیا۔ خط لے کر یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

### اسے چھوڑ دو! یہ بدری ہے:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس واقعہ کا پتا چلا تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضور! اس کو ذرا میرے حوالے کریں... میں اس کی گردن اڑا دوں، اس کی جرأت کیسے ہوئی کہ ہماری بات کفر تک پہنچا دی ہے!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم نے یہ خط دیا ہے؟ کہا کہ جی میں نے دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم نے ایسے کیوں کیا؟ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! مکہ میں میرے بچے ہیں، میں یمنی ہوں، مکہ کا رہنے والا نہیں ہوں تو میں نے چاہا کہ مکہ والوں پر احسان کر دوں تاکہ میرے بچے بچ جائیں، باقی سب کا خاندان ادھر ہے لیکن میرا کوئی خاندان مکہ میں نہیں ہے، باقی میرے ایمان میں کوئی تزلزل نہیں آیا، مجھے آپ کی فتح پر پورا یقین ہے، یہ میں نے اپنے بچوں کو بچانے کے لیے کیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حاطب سچ کہتا ہے، اس کے بارے میں

خیر ہی کہو، خیر کے علاوہ کوئی بات نہ کہو! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے مخاطب ہو کر فرمایا: عمر! یہ بدری نہیں ہے؟ کہا کہ جی بدری ہے۔ فرمایا کہ ان کے گناہوں کی معافی نہیں ہے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے کہ حضور! آپ نے سچ فرمایا۔ دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ جری تھے دین کے معاملہ میں لیکن جب بات سمجھ آتی تھی تو وہیں ہتھیار ڈال دیتے تھے۔ کہا حضور! آپ نے سچ فرمایا۔ اس پر سورۃ الممتحنہ کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

### دشمن خدا سے دوستی جائز نہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ﴾

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو دوستی کے پیغام بھیجنے لگو! حالانکہ ان لوگوں نے تمہارے دین حق کو جھٹلایا ہے۔ ان لوگوں نے اللہ کے نبی کو اور تمہیں مکہ سے صرف اس وجہ سے نکالا تھا کہ تم اللہ رب العزت پر ایمان لاتے ہو!

یہاں دیکھیں کہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ ”لَا تَتَّخِذُوا الْكَفَّارَ أَوْلِيَاءَ“ کہ کفار کو اپنا دوست نہ بناؤ بلکہ فرمایا: ”لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ“ کہ میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ! یہ اسلوب اختیار کیا یہ بتانے کے لیے کہ ان سے دوستی نہ رکھنے کی وجہ یہی ہے کہ یہ میرے بھی دشمن ہیں اور تمہارے بھی دشمن ہیں۔ کافر جب تک اپنے کفر پر قائم ہے وہ کسی مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا!



﴿إِنْ كُنْتُمْ حَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي﴾

یہاں یہ بتایا کہ اگر تم میرے راستے میں جہاد کے لیے نکلے ہو اور میری رضا مندی کے لیے نکلے ہو تو پھر ان کفار سے دوستی مت کرو! کفار سے دوستی کا مطلب ہے کہ ان کی رضا مندی کا خیال کیا جائے۔ جب تم اللہ کی رضا مندی کے طالب ہو تو پھر کفار کی رضا مندی اور ان کی دوستی کی بالکل پروا نہ کرو!

﴿تُسِرُّونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۖ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ ۖ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ۝۱﴾

پھر تم ان کے پاس محبت کے خفیہ پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو میں سب جانتا ہوں۔ جو بھی ایسا کام کرے گا تو وہ راہِ راست سے بھٹک جائے گا۔

﴿إِنْ يَتَّقِفُواكُمْ يَكُونُوا أَعْدَاءُ ۖ وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ ۖ وَأَنْتُمْ بِالْأَيْدِيهِمْ بِالشُّوْءِ ۚ وَذُو النُّفُوسِ الْكَافِرُونَ ۝۲﴾

ان کا بس چلا تو یہ تمہارے خلاف اپنی دشمنی ظاہر کریں گے، تمہارے ساتھ برائی کرنے کے لیے اپنے ہاتھ بھی چلائیں گے اور اپنی زبانیں بھی دراز کریں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم کافر ہو جاؤ!

اس سے معلوم ہوا کہ کافر جب تک کافر ہے اور مؤمن جب تک مؤمن ہے تو کافر اس مؤمن سے پیار نہیں کر سکتا جب تک کہ یہ ایمان کو نہ چھوڑ دے۔ اور اب تو اگر کوئی مسلمان ایمان چھوڑ دے تو کافر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے ایمان کو چھوڑا ہے مفاد کے لیے تو پھر بھی پیار نہیں کرے گا۔ جب اس کو یقین ہو جائے کہ اس نے ایمان چھوڑا ہے کفر کو پسند کرنے کی وجہ سے تو پھر شاید وہ پیار کر لے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت

فرمائے۔ آمین

﴿لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۖ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾

قیامت کے دن نہ تمہاری رشتے داریاں تمہارے کام آئیں گی اور نہ اولاد تمہارے کام آئے گی۔ اللہ ہی وہاں تمہارے بارے میں فیصلہ کریں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہیں۔

**حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات مبارکہ:**

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءُؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے اسوہ کو دیکھو! انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے بھی بری ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو ان سے بھی بری ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے بھی برأت کا اعلان کیا، بادشاہ سے بھی برأت کا اعلان کیا کہ میں تم سے بیزار ہوں، میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں۔

﴿كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم تمہارے نظریات کو نہیں مانتے اور تمہارے اور ہمارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا ہو گیا ہے جب تک تم اللہ وحدہ پر ایمان نہیں لاؤ گے!

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف یہ نہیں فرمایا ”حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ“ کہ

ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض ہے اور یہ ختم ہو گا جب تم اللہ پر ایمان لاؤ! نہیں بلکہ آپ علیہ السلام نے فرمایا: ”حَتَّى تَوْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحَدَّ“ کہ تم ایک اللہ کو مانو، یہ جو تم نے جھوٹے خدا بنارکھے ہیں ان سب کی نفی کرو اور ایک خدا کو مانو تو پھر ہم تمہارے اور تم ہمارے ہو، جب تک یہ نہیں ہوتا تو ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔

تو اس معاملے میں مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتداء کرنی چاہیے اور کفر سے برأت کا اعلان کرنا چاہیے۔ کافر باپ ہو یا بیٹا؛ علیحدگی اختیار کرو۔ ہاں ایک بات کا خیال رکھو ابراہیم علیہ السلام نے ایک بات ایسی فرمائی تھی اس میں تم نے ان کی اتباع نہیں کرنی۔ وہ بات کیا تھی، فرمایا:

**ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے لیے استغفار کرنے کا مطلب:**

﴿الْقَوْلَ لِزُهَيْمٍ لَا بِيَدِهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ﴾

یہ جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے فرمایا تھا کہ میں آپ کے لیے ضرور استغفار کروں گا، باقی میں آپ کو خدا کے عذاب سے بچاؤ نہیں سکتا!

تو یہاں منع کیا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اتباع تو کرو لیکن اس معاملے میں اتباع نہ کرو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں آئے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے فرمایا تھا: ﴿لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ﴾ کہ میں آپ کے لیے استغفار کروں گا! لہذا میں بھی اپنے کافر رشتہ داروں کے لیے استغفار کروں! تو فرمایا کہ اس معاملے میں ان کی اتباع نہ کرو کیونکہ ہر بندہ اس بات کو نہیں سمجھ نہیں سکتا کہ ابراہیم علیہ السلام کے اس فرمان ﴿لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ﴾ کا کیا مطلب تھا؟!

دراصل آپ علیہ السلام کے اس فرمان کا معنی یہ تھا کہ میں تمہارے لیے دعا کروں گا کہ اللہ تمہیں ایمان دے پھر اللہ تمہارے گناہ معاف فرما دے! یہ مطلب

نہیں تھا کہ کافر ہوتے ہوئے تمہارے گناہ معاف فرمادے۔

یا اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا خیال یہ تھا کہ میرے ابا کے دل میں ایمان اتر آیا ہے تو اللہ کرے اپنی زبان سے اس کا اظہار کریں لیکن ﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ﴾<sup>13</sup> جب آپ کو پورا یقین ہو گیا کہ ان کے دل میں ایمان نہیں اترتا تو آپ نے والد سے برأت کا اعلان کر دیا۔

تو یہاں یہ کہنا مقصود ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد کافر تھے اور آپ نے کافر والد کے لیے استغفار فرمایا تھا تو بظاہر اس سے شبہ ہوتا ہے کہ کافر کے لیے استغفار کرنا جائز ہے۔ تو فرمایا کہ باقی سارے معاملات میں ان کی اقتداء کرو لیکن اس معاملے میں نہیں، کافر کے لیے استغفار نہ کرنا کہ کافر ہوتے ہوئے اللہ ان کو معاف فرما دے... یہ کبھی نہ کرنا۔

### اہل ایمان کی دعائیں:

﴿رَبَّنَا عَلَيْنِكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾

اے ہمارے رب! ہم آپ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں، آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور آپ ہی کی طرف ہم نے آنا ہے۔

﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَاعْفُ رَنَّا رَبَّنَا إِنَّكَ أَنْتَ

الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾

اے ہمارے رب! ہمیں کافروں کی آزمائش سے محفوظ رکھ اور ہماری مغفرت فرما! بے شک تو غالب حکمت والا ہے۔

﴿عَسَى اللَّهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادَيْتُمْ مِنْهُمْ مَوْدَّةً وَ

اللَّهُ قَدِيرٌ ۖ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾

یہ معاملہ بہت مشکل تھا کہ باپ مسلمان تو بیٹا کافر، بیٹا مسلمان تو باپ کافر، شوہر مسلمان تو بیوی کافر، بیوی مسلمان تو شوہر کافر... اور حکم یہ تھا کہ ان سے برأت کا اعلان کر دو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس حکم شرعی پر عمل کیا لیکن مشکل تو بہت تھا۔ مشکل نہ ہوتا تو پھر ان کو شاباش کیوں ملتی! مشکل بہت تھا اس لیے اللہ نے اس پر ان کو تسلی دی ہے۔

فرمایا: وہ وقت دور نہیں کہ جب اللہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جن کے ساتھ تمہاری دشمنی ہے دوستی پیدا فرمادے گا۔ اللہ اس بات پر قادر ہے اور مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

یعنی یہ کچھ وقت کی بات ہے، بہت جلد یہ عداوت محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔ مطلب کہ تم فاتح بنو گے اور وہ مسلمان ہو جائیں گے تو دشمنی ختم ہو جائے گی، پھر دوستی دوبارہ لوٹ آئے گی۔ ساتھ ہی اللہ پاک نے تسلی بھی عطا فرمائی کہ یہ تھوڑے دنوں کی بات ہے، ان شاء اللہ جلدی کام ہو جائے گا۔

**رشتہ دار کفار ہوں تو تعلقات کا حکم:**

﴿لَا يَنْهٰكُمْ اللّٰهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ

مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾

جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی اور انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے بھی نہیں نکالا تو ان سے اچھے تعلقات رکھنے اور انصاف کا سلوک کرنے سے اللہ تمہیں نہیں روکتے!

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ایک بیوی تھی جن کا نام تھا قُنَیْہہ اور آپ نے زمانہ کفر میں ان کو طلاق دی تھی۔ ان سے آپ کی بیٹی پیدا ہوئی تھیں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا۔ آپ کی دوسری بیوی حضرت ام رومان سے بیٹی پیدا ہوئیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ اب ذرا اندازہ کرنا! حضرت اسماء مسلمان ہیں اور ہجرت کر کے مدینہ آگئی ہیں۔ آپ کی والدہ قُنَیْہہ کافرہ ہے، وہ مکہ سے مدینہ آئی ہے اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے اور ساتھ ہدیہ بھی لے کر آئی ہے۔ کیا کیفیت ہوگی ایمان کی! اللہ کی قسم بندہ دنگ رہ جاتا ہے۔ میں توجہ خلوت میں بیٹھتا ہوں تو رو پڑتا ہوں یہ واقعات پڑھ کر، مجھ سے بالکل برداشت نہیں ہوتا! مکہ سے ماں چلی ہے اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے اور ہدیہ ساتھ لے کر آئی ہے۔ حضرت اسماء نے فرمایا: امی اندر نہیں آنا! گھر نہیں آنے دیا اور ہدیہ قبول نہیں کیے۔ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں کہ حضور! میری ماں آئی ہے ملنے کے لیے، اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ صلہ رحمی کا خیال کرو! ان کا خیال رکھو، ان سے تعلق میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس پر یہ آیت اتری ہے۔

حضرت اسماء کا ایمان دیکھو! جب اس سطح پر بندہ کھڑا ہونا پھر اللہ کی طرف سے مدد اترتی ہے، پھر فتوحات اترتی ہیں۔

﴿وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾

اور جو لوگ ان سے دوستی رکھیں گے ایسے لوگ ظالم ہیں۔

میں خدا کی قسم کھا کر بڑے درد سے تمہیں سمجھاتا ہوں کہ کافر سے کبھی محبت نہ کرنا، فاسق سے کبھی محبت نہ کرنا، وہ نافرمان ہے، ظالم ہے، ان سے پیار نہ کرو! پیار صلحاء سے کرو، پیار مؤمنین سے کرو! ہاں مدارات و معاملات مجبوری ہیں، رشتہ دار ہیں، خاندان کے لوگ ہیں لیکن موالات نہ کرنا، دل سے کبھی ان سے پیار نہ کرنا، دل

میں کبھی کسی کافر کو جگہ نہ دینا! دل خالص اللہ کے لیے رکھو۔

### صلح حدیبیہ کی بعض شرائط:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَاِمْتَحِنُوهُنَّ ۚ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ ۚ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۚ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۚ﴾

فرمایا: اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم ان کا امتحان لے لیا کرو۔ جب تمہیں یقین ہو جائے کہ یہ ایمان والی ہیں تو انہیں کافروں کو واپس مت کرو! یہ مسلمان عورتیں ان کافروں کے لیے حلال نہیں اور وہ کافران کے لیے حلال نہیں ہیں۔

حدیبیہ میں معاہدہ ہوا تھا۔ اس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ اگر کوئی مسلمان العیاذ باللہ مرتد ہو کر چلا گیا تو واپس نہیں ہو گا اور اگر کوئی کافر مسلمان ہو گیا اور مسلمانوں کے پاس آ گیا تو اس کو واپس کیا جائے گا۔ ابھی یہ معاہدہ لکھا ہی تھا، کہتے ہیں کہ ابھی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ابو جندل آگئے۔ عرض کرنے لگے: حضور! میرا کچھ کریں۔ ابو جندل کا والد سہیل بن عمرو چونکہ معاہدہ لکھنے والا تھا تو اس نے کہا کہ ہمارا معاہدہ ہو چکا ہے کہ اگر ہمارا بندہ ہمارے دین کو چھوڑ کر آپ کے پاس آ جائے تو آپ واپس کرنے کے پابند ہیں، اس لیے ابو جندل کو واپس کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو جندل! واپس چلے جاؤ۔ کہا کہ حضور! یہ مجھے نہیں چھوڑیں گے، بہت مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہوں۔ فرمایا کہ ہم نے معاہدہ کیا ہے۔ ابو جندل! واپس چلے جاؤ، اللہ کوئی اچھی سمیل پیدا فرمادیں گے۔

اسی موقع پر حضرت سعیدہ بنت حارث رضی اللہ عنہا صحابیہ تھیں وہ بھی آ

گئیں کہ حضور! میں بھی آگئی ہوں۔ یہ اس وقت صیفی بن انصب کے نکاح میں تھیں جو کافر تھا۔ وہ بھی ساتھ آگیا اور اس نے حضور سے عرض کیا کہ میری بیوی مجھے واپس کر دیں کیونکہ آپ کے اور ہمارے درمیان معاہدہ ہوا ہے اور آپ نے شرط قبول کر لی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارا معاہدہ عورتوں کے لیے نہیں ہے، یہ صرف مردوں کے لیے ہے، خواتین کو واپس نہیں کیا جائے گا۔

اصل میں یہ تھا کہ چونکہ معاہدے کے عموم میں بظاہر عورتیں شامل تھیں لیکن وضاحت تو نہیں تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ جو شق ہے یہ مردوں کے لیے ہے، عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ اللہ کی شان ہے کہ اللہ نے کفار کے دل میں بات کو ڈال دیا اور اس کی مخالفت انہوں نے بھی نہیں کی، وہ بھی خاموش ہو گئے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سعیدہ صحابیہ ہے، اس کو ہم واپس نہیں کریں گے۔

یوں سمجھیں کہ وہ جو تعیم تھی نا... وہ اس تخصیص سے منسوخ ہو گئی کہ یہ خاص مردوں کے لیے ہے عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ اس کے بارے میں قرآن کریم کی یہی آیات نازل ہوئیں۔

اور بعض روایات میں ہے کہ ام کلثوم بنت عتبہ بن ابی معیط یہ صحابیہ تھیں، عمرو بن عاص کے نکاح میں تھیں، ام کلثوم رضی اللہ عنہا بھی مدینہ منورہ آگئیں اور ان کے دو بھائی تھے، ایک کا نام ولید تھا اور ایک کا نام عمارہ تھا وہ بھی مسلمان ہو کر مدینہ آ گئے۔ عمرو بن عاص ان کو لینے کے لیے آ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ام کلثوم تو واپس نہیں جائے گی، ہاں اس کے بھائیوں کو لے جاؤ۔ اس نے کہا: کیوں؟ فرمایا کہ اس میں ہمارا کوئی معاہدہ نہیں ہے، عورت ہم واپس نہیں کر سکتے، باقی مردوں کو لے جاؤ، ہم اس سے منع نہیں کرتے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔



حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ان عورتوں سے قسم لی جاتی تھی کہ تم اپنے مرد سے ناراض ہو کر تو نہیں آئیں؟ کہتیں کہ جی نہیں! کسی مرد کی محبت میں تو نہیں آئیں؟ وہ کہتیں کہ جی نہیں! تمہارے آنے کا کوئی اور مقصد تو نہیں ہے؟ کہتیں کہ جی نہیں! پوچھا جاتا کہ صرف اسلام کی وجہ سے آئی ہو؟ جی ہاں۔ بس ٹھیک ہے، یہ مسلمان ہے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کر لو۔ اس بیعت کے کلمات آگے آرہے ہیں۔

### مسلمان عورتوں کے کافر خاوندوں کو مہر واپس کرو:

﴿وَأْتُوهُمْ مَّا أَنْفَقُوا ۖ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أَجُورَهُنَّ ۖ وَلَا تُمْسِكُوا بِعَصَمِ الْكَوَافِرِ ۚ سَأَلُومًا مَّا أَنْفَقْتُمْ وَلَيْسَ لَكُمْ مَّا أَنْفَقُوا ذِكْرٌ حُكْمُ اللَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٠﴾﴾

ان عورتوں کے خاوندوں نے ان پر جو کچھ خرچ کیا یعنی ان کو مہر دیا تو وہ ان کو ادا کر دو! جب تم ان کے مہر ادا کر دو تو ان سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور کافر عورتوں کی عصمتیں اپنے پاس نہ رکھو۔ آگے ان عورتوں کا معاملہ یوں طے کرو کہ جو مہر تم نے ان بیویوں کو دیا ہو جو کافر ہیں تو تم اس کا مطالبہ ان کے نئے شوہروں سے کر سکتے ہو اور جو عورتیں مسلمان ہو کے آئی ہیں ان کے شوہر ان کے مہر کا مطالبہ تم سے کر سکتے ہیں۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ اللہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

﴿وَأْتُوهُمْ مَّا أَنْفَقُوا﴾ کافر نے جو مہر ان کو دیا تھا تو وہ مہر تم ان کو واپس کر دو۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ عورت حق مہر واپس کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس نے استعمال کر لیا ہو اور اب دینے کی طاقت نہ رکھتی ہو۔ تو فرمایا کہ مہر تم مسلمان اس کو

واپس کرو اور اس کو رکھ لو۔

﴿وَلَا تَمْسِكُوا بِعَصَمِ الْكَوَافِرِ﴾... اور کافر عورتوں کی عصمتیں اپنے پاس نہ رکھو۔ ”عصم“ یہ عصمت کی جمع ہے یعنی وہ جو کافرہ عورتیں ہیں اب ان کی عصمت کو تم چھوڑ دو، انہیں آزاد کر دو، ان کو تم اپنے نکاح میں نہ رکھو۔ یعنی مسلمان ہجرت کر کے آگیا اور بیوی اس کی کافرہ ہے تو اس کو چھوڑ دے۔

یہ تقریباً چھ خواتین تھیں۔ ان میں سے پانچ مکہ مکرمہ میں تھیں اور کافرہ تھیں۔ جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو وہ ہجرت کر کے مدینہ نہیں آئیں بلکہ مکہ ہی میں رہیں اور اپنے کفر پر قائم رہیں۔ صرف ایک عورت ام الحکم بنت ابی سفیان یہ حضرت عیاض بن غنم قریشی کے نکاح میں تھی۔ یہ مرتد ہو کر مکہ واپس چلی گئی تھی۔ باقی پانچ ایسی تھیں جو نکاح میں تھیں اور شروع سے ہی کافرہ تھیں، تو انہوں نے ہجرت نہیں کی اور کفر پر باقی رہیں۔ ان کے بارے میں حکم یہ تھا کہ اگر کسی کی بیوی کافرہ ہے اور وہ ہجرت کر کے نہیں آتی تو تمہارا نکاح ختم ہو گیا، اب وہ کافرہ تمہارا حق مہر تمہیں واپس لوٹائیں اور اگر ان کی عورت تمہارے پاس آئی ہے اور تم اس کے کافر شوہر کو اس کا حق مہر لوٹاؤ۔ کفار تو ظاہر ہے کہ شریعت کو نہیں مانتے تھے انہوں نے تو نہیں دیے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیا۔

جن چھ عورتوں کا ذکر ہوا کہ پانچ تو شروع ہی سے کافر رہیں اور ایک اسلام لانے کے بعد مرتد ہو کر مکہ چلی گئی تھی۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ جو مرتد ہوئی تھی ام الحکم بنت ابی سفیان بعد میں وہ اسلام کی طرف لوٹ آئی تھی اور جو باقی پانچ تھیں انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔

﴿وَإِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقِبْتُمْ فَاتُوا الَّذِينَ ذَهَبَتْ أَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَا أَنْفَقُوا ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ

## مُؤْمِنُونَ ﴿١٧﴾

اور اگر تمہاری عورتوں میں سے کوئی عورت تمہارے ہاتھ سے نکل کر کافروں کے پاس چلی جائے اس طرح کہ اس کا حق مہر بھی تمہیں نہ مل سکے تو پھر جب تمہاری باری آئے یعنی کافروں کی عورتوں میں سے کوئی عورت مسلمان ہو کر تمہارے پاس آئے اور تم اس سے نکاح کرو تو اب ضابطے کے تحت تمہیں اس عورت کے خاوند کو اس کا حق مہر ادا کرنا چاہیے تھا لیکن چونکہ تمہیں بھی تمہاری بیوی والا حق مہر نہیں ملا اس لیے تم بھی حق مہر نہ دو بلکہ یہ حق مہر اس شخص کو ادا کر دو جس کی بیوی ان کافروں کے پاس چلی گئی تھی۔ اور اللہ سے ڈرا اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو!

## ایمان والی عورتوں کی بیعت:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَى أَنْ لَا يُنْبِرَنَّ بِاللهِ شَيْعًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيَنَّكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعُهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ ﴿١٧﴾

فرمایا کہ اے نبی! جب آپ کے پاس مومن عورتیں آئیں اور بیعت کرنا چاہیں تو انہیں بیعت کرو۔ آگے پھر وہ بیعت کے الفاظ ہیں کہ تم بیعت ان باتوں پر کرو:

- [1]: شرک نہیں کریں گی۔
- [2]: چوری نہیں کریں گی۔
- [3]: زنا نہیں کریں گی۔
- [4]: ناحق اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔
- [5]: بہتان نہیں باندھیں گی، ﴿بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ﴾ کے

الفاظ ذکر کیے ہیں یہ بتانے کے لیے کہ قیامت کے دن آدمی کی زبان نہیں بولے بلکہ اس کے ہاتھ پاؤں اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ تو یہاں ہاتھ پاؤں کا ذکر اس لیے کیا کہ انسان کو چاہیے کہ کسی پر بہتان باندھنے سے پہلے سوچ لے کہ میں یہ کام دو ہاتھوں اور دو پاؤں کے درمیان کر رہا ہوں اور یہی چار گواہ قیامت میں میرے خلاف گواہی دیں گے۔

[6]: اور ہر نیک بات آپ کی مانیں گی۔

آپ ان کی بیعت بھی کریں اور ان کے لیے اللہ سے دعا بھی کریں۔ اللہ معاف فرمانے والے ہیں۔

### عالم سے بیعت کی دلیل (ایک دلچسپ واقعہ):

میں یہاں پر ایک واقعہ سنایا کرتا ہوں کہ ہم نے جب کام کا آغاز کیا تو یہ ادارہ نہیں تھا اور سب سے پہلے ہم نے بچیوں میں کام شروع کیا ہے۔ تو اس وقت پانچ بچیاں غالباً پانچ سال کی میں نے داخل کیں۔ جو صبح آتیں یہاں گھر پہ... ب... ت... ش... پڑھ کر چلی جاتیں، پھر شام کو آتیں، آدھا گھنٹا پھر میں ان کو سبق پڑھاتا اور چھوٹے بھائی قاری شعیب احمد صاحب کو میں نے کہا کہ آپ بچوں کو پڑھاؤ۔ اب وہ بچیاں بھی چلی گئیں۔ ان میں سے ایک بچی نے ہمارے ہاں مرکز اصلاح النساء میں دو سال کا کورس بھی کر لیا ہے۔ مجھے اب نہیں یاد کہ میں نے مہینا پڑھایا یا ڈیڑھ مہینا... بہر حال اس سے زیادہ نہیں پڑھایا۔

اس سے پہلے میں نے چھ ماہ کا کورس کرایا۔ اس میں ایک غیر مقلد لڑکی ہماری گاؤں کی تھی۔ وہ میرے سبق میں آگئی۔ اس نے مجھ سے سوال کیا کہ استاد جی! کیا کوئی عورت کسی عالم مرد سے بیعت کر سکتی ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں، کر سکتی ہے۔ اس نے کہا کہ دلیل؟ میں نے یہ آیت پڑھی ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ

يُبَايِعُنكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكَنَّ بِاللَّهِ شَيْعًا ﴿١٠﴾ اس نے کہا کہ میرا سوال یہ نہیں کہ کوئی عورت نبی کی بیعت کر سکتی ہے یا نہیں؟ میرا سوال یہ ہے کہ کسی عالم کی بیعت کر سکتی ہے یا نہیں؟ عورت نبی کی بیعت کرے اس کو تو میں مانتی ہوں، اس پر تو مجھے دلیل کی ضرورت نہیں، عورت کسی عالم کی بیعت کرے میں تو اس پر دلیل مانگتی ہوں، اس پر کوئی دلیل پیش کریں۔ آپ اس عورت کی تیاری دیکھیں!

میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جب نماز کھڑی ہوتی تو جماعت کون کراتا تھا؟ کہا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم میں نے کہا کہ جمعہ کے دن خطبہ کون دیتا تھا؟ کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں نے کہا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم مسئلہ پوچھتے تو فتویٰ کون دیتا؟ کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

میں نے کہا کہ جب جہاد ہوتا تو قیادت کون کرتا؟ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے کہا کہ جب کوئی خواب دیکھتا تو تعبیر کون دیتا؟ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد میں نکاح ہوتا تو کون پڑھاتا؟... کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے کہا کہ جب خواتین ہوتیں تو ان کی بیعت کون لیتا؟... کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

میں نے کہا کہ آپ بتائیں کہ

- ◆ اب نماز کون پڑھائے گا؟ کہا کہ مولانا صاحب
- ◆ اب خطبہ جمعہ کون دے گا؟ کہا کہ مولانا صاحب
- ◆ اب خطبہ نکاح کون دے گا؟ کہا کہ مولانا صاحب
- ◆ اب فتویٰ کون دے گا؟ کہا کہ مولانا صاحب
- ◆ اب خواب کی تعبیر کون بتائے گا؟ کہا کہ مولانا صاحب

میں نے کہا کہ جب عورتوں نے بیعت لینی ہو تو اب بیعت کون لے گا؟ تو اس کے لیے نبی کو لائیں؟ اب چپ ہو گئی۔ میں نے کہا کہ بات اچھی طرح سمجھو! عالم نبی کا وارث ہے اور وارث اپنے مورث کی تمام چیزوں کا وارث ہوتا ہے، صرف ایک کا نہیں ہوتا، اگر باقی سارے کام مولانا صاحب نے کرنے ہیں اور نبی نے نہیں کرنے تو تمہیں بیعت بھی مولانا صاحب نے کرنی ہے، کوئی نبی تمہارے لیے نہیں لاسکتے۔ اس نے کہا کہ مجھے بات سمجھ میں آگئی ہے۔

اور یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ اس کا تعلق خاص مہاجرات کے ساتھ نہیں ہے، اس کا تعلق بعد میں صحابیات کے ساتھ بھی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیات مہاجرات کے علاوہ ان سے بھی بیعت لی ہے اور امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: مرد بیعت کرتے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ میں ہاتھ دیتے، خواتین بیعت کرتیں تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نامحرم عورت کے ہاتھ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

### بیعت کی اقسام:

- آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تین قسم کی بیعت لیتے تھے:
- [1]: بیعت علی الایمان... کہ پہلے کافر تھے، اب کلمہ پڑھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور بیعت کی کہ ہم مسلمان ہوتے ہیں۔
  - [2]: بیعت علی الجہاد... میدانِ جہاد میں بیعت کرنی ہے۔ اس کو بیعت علی الموت بھی کہتے ہیں۔ ہم مرجائیں گے لیکن آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے، جب تک زندہ ہیں آپ کے ساتھ رہیں گے۔

[3]: بیعت علی ارکان الاسلام... کہ کلمہ پڑھ لیا ہے، جہاد بھی کرتے ہیں، اب ہم بیعت کرتے ہیں کہ احکام شریعت پر عمل کرتے رہیں گے اور ہم گناہوں سے بچیں

گے۔

یہ تین قسم کی بیعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں آج جو مشائخ بیعت لیتے ہیں یہ نہ تو بیعت علی الایمان ہے، نہ بیعت علی الجہاد ہے بلکہ یہ بیعت علی ارکان الاسلام ہے۔ تو یہ تین قسم کی بیعت مشروع ہے۔

### بیعت کی ضرورت و اہمیت:

اس لیے جو شخص کسی سے بیعت نہ ہو اس کو بیعت کرنی چاہیے۔ حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میں یہ تو نہیں کہتا کہ بیعت ضروری ہے لیکن یہ کہتا ہوں کہ تزکیہ نفس ضروری ہے اور مشاہدہ یہ ہے کہ تزکیہ نفس بغیر بیعت کے ہوتا ہی نہیں ہے، اس لیے بیعت ضروری ہے۔ اللہ ہم سب کو یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اور جب کسی کے ہاتھ پر بیعت ہوں تو پھر فنائے کلی حاصل کریں۔ پھر اپنی خواہشات کو شیخ کی خواہشات کے تابع کریں تو پھر بیعت کرنے کا فائدہ ہوتا ہے وگرنہ بیعت کا فائدہ نہیں ہوتا۔ بیعت کا مقصد اپنی روح کا علاج ہے اور علاج تب ہوتا ہے جب مریض اپنا پورا مرض معالج کے سامنے رکھے اور اگر اپنا مرض معالج کے سامنے نہ رکھے تو پھر علاج نہیں ہوتا۔ اگر مریض یہ سمجھے کہ میں ڈاکٹر کو اپنا مرض بتاؤں گا تو ڈاکٹر کیا محسوس کرے گا تو علاج نہیں ہو گا۔ تو جس طرح مریض جسمانی مرض کے لیے ڈاکٹر کے سامنے اپنا مرض رکھتا ہے اور اس کو ڈاکٹر پر پورا اعتماد ہوتا ہے، مثلاً کہ ڈاکٹر مجھ سے نفرت نہیں کرے گا، علاج اچھی طرح کرے گا، میری یہ کمزوری کسی اور کو نہیں بتائے گا بالکل اسی طرح اپنے طبیب روحانی یعنی اپنے شیخ پر اعتماد ہونا چاہیے کہ میں اپنے گناہ بتاؤں گا تو میرا شیخ مجھ سے نفرت نہیں کرے گا، پوری ہمت اور کوشش سے میرا علاج کرے گا، یہ میرا مرض کسی اور کو نہیں بتائے گا۔ جب یہ اعتماد ہو تو پھر

کھل کر اپنا مرض بتائیں۔

ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ اس پر شبہ ہے کہ جب گناہ کرو تو گناہ کسی کو بتانا نہیں چاہیے چونکہ اللہ نے گناہ پر پردہ ڈالا ہے۔ اس لیے اگر شیخ کو اپنا گناہ بتا دیا تو گویا اپنے گناہ پر اسے گواہ بنالیا! میں نے کہا کہ وہ تب ہے کہ جب بندہ گناہ کرے اور لذت کے لیے دوسروں کو بتائے تو پھر تو جائز نہیں ہے اور اگر گناہ ہو گیا ہو اور معالج کو بتائے اپنی اصلاح کے لیے تو اس سے مقصد نہ تو گناہ کا اظہار ہے نہ لذت لینا ہے بلکہ اپنے گناہ کو ختم کرنا ہے۔ نیت کے بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے۔

**مغضوب علیہم سے دوستی کی ممانعت:**

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَكُونُوا

مِنَ الْأَحْزَةِ كَمَا يَبِيسُ الْكَفَّارُ مِنَ أَصْحَابِ الْقُبُورِ﴾ (١٦)

فرمایا کہ اے ایمان والو! ان لوگوں سے پیار نہ کرو جن پر اللہ کا غضب ہے اور وہ آخرت سے ایسے مایوس ہو چکے ہیں جیسے قبر میں پڑے کافر خدا کی رحمت سے مایوس ہیں۔

جب کافر مر کر قبر میں چلا جاتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ اب مجھے جنت نہیں ملنی۔ فرمایا کہ ان یہودیوں کو بھی پتا ہے کہ مسلمان حق پر ہیں اور ہم کفر پر ہیں اور ان کو پتا ہے کہ موت کے بعد ہمیں جہنم ملنی ہے جس طرح قبر میں پڑے کافر کو یقین ہے اسی طرح ان کو بھی یقین ہے۔ تو ایسے کفار سے پیار نہ کرو، ان سے دوریاں اختیار کرو۔

اللہ رب العزت ہم سب کی حفاظت فرمائیں، اللہ ہم سب کو خالص ایمان کی

نعت عطا فرمائیں۔ آمین

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



## سورة الصف

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿سَبِّحْ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿١﴾

### شان نزول:

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین غزوہ احد میں تھے اور وقتی طور پر ایسی صورتحال پیدا ہوئی کہ جب اعلان ہوا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں تو بعض صحابہ کمزور ہو گئے اور بعض ڈٹ کر لڑے۔ مزید یہ کہ رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی بن سلول اپنے تین سو افراد لے کر ایک طرف ہو گیا اور اس غزوہ میں شریک نہیں ہوا۔ تو مجموعی صورتحال سے بعض صحابہ پر بھی اثر پڑا کہ ہماری کمزوری ہے۔ تو جو کمزوری رہ گئی تھی تو اس کی تلافی کے لیے ان کا جی چاہتا تھا اور یہ باہمی مشاورت کرتے کہ اگر ہمیں پتا چلے کہ اللہ کے ہاں سب سے محبوب عمل کون سا ہے تو ہم اس پر جان و مال سب کچھ لٹا دیں گے۔ اس پر یہ سورة الصف نازل ہوئی۔

﴿سَبِّحْ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴿٢﴾ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴿٣﴾ ﴿٢﴾

جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔ اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں ہو! اللہ کو یہ بات بالکل پسند نہیں کہ ایسی بات کرو جو کرتے نہیں ہو!

یہاں یہ بات بتانی مقصود ہے کہ آدمی کو دعوے نہیں کرنے چاہئیں کہ ہم یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے۔ اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ:

﴿وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَلِكَ غَدًا ۚ﴾ (٣) ﴿١٤﴾ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ ﴿١٤﴾

میرے پیغمبر! آپ بھی کوئی بات فرمائیں تو یہ نہ کہا کریں کہ میں یہ کام کروں گا بلکہ یہ فرمایا کریں کہ ان شاء اللہ کروں گا یعنی اگر اللہ چاہے تو ہو گا نہ چاہے تو نہیں ہو گا۔

تو یہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بات سمجھائی ہے کہ یہ بات نہ کرو کہ ہم جان و مال لٹا دیں گے۔ ہاں یہ کہو کہ اگر حکم شرعی ہے تو ہم ان شاء اللہ پوری کوشش کریں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ ایسا لفظ استعمال نہ کرو کہ جس میں بظاہر تعلیٰ ہو۔

### کرہ ارض پر بڑا عالم کون ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ اس وقت سب سے بڑا عالم کرہ ارض پر کون ہے؟ فرمایا کہ میں ہوں۔ بڑے عالم تو موسیٰ علیہ السلام ہی تھے کیونکہ نبی تھے لیکن یہ لفظ بظاہر ایسا تھا کہ اس کے بجائے اگريوں فرماتے کہ میرے علم کے مطابق تو میں ہوں شاید کوئی اور بھی ہو، یہ کہنا زیادہ مناسب تھا۔ اس پر اللہ کی طرف

سے عتاب آگیا کہ جانیں ہمارا فلاں بندہ ہے، اس سے ملاقات کریں۔ پھر آپ علیہ السلام نے ملاقات کی حضرت خضر علیہ السلام سے۔ جس کا قصہ سورۃ الکہف میں موجود ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام کو تکوینات کا علم تھا تشریعات کا علم نہیں تھا، شریعت میں پھر بھی موسیٰ علیہ السلام بڑھ کر تھے، نبی جتنا بھی بڑا ہو لیکن اللہ سے تو چھوٹا ہے نا! حضرات انبیاء علیہم السلام ہم سے تو بہت بڑے ہیں لیکن اللہ سے تو چھوٹے ہیں، اس لیے اللہ رب العزت اپنے پیغمبر کو تنبیہ بھی فرماتے ہیں اور پیغمبر کا تذکرہ بھی فرماتے ہیں اور پیغمبر سے اگر خلافِ اولیٰ بات ہو تو اس پر اپنے نبی کو ہدایات بھی دیتے ہیں۔

تو فرمایا کہ ایسی باتیں نہ کرو جو تم نہ سکو! اللہ کو ایسی بات پسند نہیں ہے کہ بندہ ایسا دعویٰ کرے جو کر نہ سکے۔

### دعویٰ نہ کرے دعوت دیتا رہے:

یہاں دو باتیں الگ الگ ہیں؛ ایک ہے دعویٰ اور ایک ہے دعوت۔ کسی بڑے عمل کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے یہ اللہ کو پسند نہیں ہے لیکن اگر کوئی نیک عمل نہ کرتا ہو تو اس نیک عمل کی دعوت دینی چاہیے۔ تو یہاں دعوے کی نفی ہو رہی ہے دعوت کی نفی نہیں ہو رہی۔ اس لیے تفسیر بیان القرآن میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ خلاصہ کے طور پر فرما رہے ہیں کہ اس سے وعظ بلا عمل کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک یہ ہے کہ آدمی جو دعوت دیتا ہے خود بھی اس پر عمل کرے، اس کا حکم دوسری جگہ پر موجود ہے:

﴿أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ﴾<sup>15</sup>

کیا تم لوگوں کو حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو!  
تو یہاں پر تنبیہ ہے کہ بے عمل نہیں ہونا چاہیے بلکہ باعمل ہونا چاہیے۔

اور یہاں جو بات فرمائی ہے تو یہاں ترغیب اس بات کی دی ہے کہ صرف زبانی دعوے نہ کرو بلکہ عمل بھی کرو۔ تو اگر کوئی شخص عمل نہیں کرتا اور نیک عمل کی دعوت دیتا ہے تو اس کو ایک اجر پھر بھی ملے گا اور اگر عمل بھی کرتا ہے اور نیک عمل کی دعوت بھی دیتا ہے تو اس کو دو اجر ملیں گے اور اگر کوئی شخص نیک عمل کی دعوت نہیں دیتا صرف نیک عمل کرتا ہے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے۔ ہاں البتہ نیک عمل بھی کرے اور دعوت بھی دے تو وہ زیادہ مناسب ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ

الْمُسْلِمِينَ﴾<sup>16</sup>

اس شخص سے زیادہ کس کی بات اچھی ہوگی جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں بھی مسلمانوں میں سے ایک مسلمان ہوں۔  
تو دعوت بھی دیں اور نیک عمل بھی ہونا چاہیے۔ بہر حال یہاں دعوت بلا عمل کی نفی نہیں ہے بلکہ ترغیب دے رہے ہیں کہ جو کہتے ہو وہ کیا بھی کرو۔

**مجاہدین اسلام خدا کو محبوب ہیں:**

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَانَتْهُمْ بُنْيَانًا

## مَرْصُوصٌ ﴿٢٠﴾

اب اللہ نے محبوب عمل بتا دیا۔ فرمایا کہ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو میدان جہاد میں نکل کے سبسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹ کر لڑتے۔  
حدیث پاک میں ہے:

أَيُّهَا النَّاسُ لَا تَمْنُوا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَسَلُّوا اللَّهَ الْعَافِيَةَ، فَإِذَا لَقِيتُمُوهُمْ فَاصْبِرُوا وَاعْلَمُوا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ الشُّيُوفِ.<sup>17</sup>

اے لوگو! دشمن سے ملاقات یعنی جنگ کی تمنانہ کرو، بلکہ اللہ سے عافیت مانگو لیکن جب جنگ آجائے تو بس پھر ڈٹ جاؤ! پھر دوڑنا نہیں چاہیے۔

**سبب اختیار کرنا بندے کا فعل اور نتیجہ مرتب کرنا اللہ کا فعل:**

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَوْمَ لِمَ تُوذُونَنِي وَقَدْ تَعْلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ ۖ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾ ﴿٢١﴾

اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ اے میری قوم! تم مجھے تکلیفیں کیوں دیتے ہو حالانکہ تمہیں پتا بھی ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، جب ان لوگوں نے ٹیڑھا پن اختیار کیا تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ اللہ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھو کہ ﴿فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ﴾ یا ﴿حَتَّمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ﴾ اس قسم کی جو آیات آتی ہیں تو ان پر کسی کو

یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ جب اللہ نے مہر لگا دی تو بندے کا قصور کیا ہے؟ اللہ نے ہدایت سے دور کر دیا تو بندے کا قصور کیا ہے؟

اس کا جواب سمجھیں کہ اللہ رب العزت نے ہر بندے میں فجور اور تقویٰ دونوں چیزیں رکھی ہیں، گناہ کرنے کی طاقت اور گناہ کو کنٹرول کرنے کی طاقت، جب بندہ گناہ کرنے کی طاقت استعمال کرتا ہے اور کنٹرول کرنے کی طاقت استعمال نہیں کرتا بلکہ قصداً گناہ پہ گناہ کرتا رہتا ہے تو بالآخر اللہ ہدایت کے دروازے بند کر کے گناہ کا دروازہ اس کا کھولتے ہیں، اللہ اس کے دل پر مہر لگاتے ہیں، پھر وہ نیک عمل نہیں کر سکتا۔ تو یہ جو اللہ مہر لگاتا ہے جس کی وجہ سے بندہ نیک عمل نہیں کر سکتا تو اللہ یہ مہر ابتدا سے نہیں لگاتا بلکہ بندے کی ضد اور عناد اور بد کرداری کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ جیسے ایک بندہ فیکٹری میں ملازم ہو اور چھٹیاں کرے۔ اس کے بعد اس کا مالک کہے کہ بھائی! چھٹیاں نہ کرو، وہ پھر بھی چھٹیاں کرے۔ او بھائی! چھٹیاں مت کیا کرو۔ وہ پھر بھی کرے۔ اگر تم چھٹیاں کرو گے تو ہم نکال دیں گے۔ یہ پھر بھی چھٹی کرے۔ پھر مالک اس کو نکال دے۔ اب یہ ملازم اس کے بعد کہتا پھرے کہ میں نے کیا کیا ہے؟ مجھے تو ویسے ہی نکال دیا ہے۔ بھائی! تجھے پہلے تو رکھا ہوا تھا، نکالا اس لیے کہ تو ضد پر تھا، بات نہیں مانتا تھا تو نکال دیا تجھے۔ نکالا اس وجہ سے نہیں کہ مالک چاہتا ہے کہ اس کو نکالوں، نکالا اس وجہ سے ہے کہ اس کی اپنی حرکتیں ایسی تھیں۔ جب اللہ مہر لگاتا ہے تو وہ ابتداءً نہیں لگاتا بلکہ جب بندہ حرکتیں ایسی کرتا ہے تو اس پر مہر لگ جاتی ہے۔

**بشارت عیسیٰ علیہ السلام:**

﴿وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَبْنِيْ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ

مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ يَدَیْ مِنَ التَّوْرَةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلِ یَّآئِیْ مِنْ بَعْدِیْ اٰمَنَۃٌ

أَحْمَدُ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُبِينٌ ﴿١﴾

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں، تورات کی تصدیق کرتا ہوں، بعد میں آنے والے پیغمبر کی بشارت بھی دیتا ہوں جس کا نام احمد ہے۔ پھر جب وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

ایک بات تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی احمد کی۔ یہاں نام ”محمد“ نہیں لیا بلکہ ”احمد“ بتایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب میں محمد نام رکھا جاتا تھا، احمد نام رکھنا متعارف نہیں تھا، اس لیے ایسا نام بتایا کہ ان کے ہاں پہلے متعارف تھا ہی نہیں، فرمایا کہ ایسے نبی کی بشارت دیتا ہوں کہ جس کا نام احمد ہو گا۔

**حضور علیہ السلام نبی اسماعیل میں سے ہیں:**

دوسری بات ﴿فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ﴾ پر سمجھیں! آج ایک نئی بحث چلی ہے ایک گمراہ قسم کا شخص ہے شیخ محمد کے نام سے، اس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو نبی بن کر آئے تھے تو عربوں میں نہیں تھے بلکہ یہ بنی اسرائیل میں تھے اور اس پر دلیل کے طور پر یہ آیت پیش کرتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ﴾ کہ میں تورات کی تصدیق کرتا ہوں، ﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ اور اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دیتا ہوں۔ ﴿فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ﴾ جب وہ احمد بنی اسرائیل کے پاس آیا تو ﴿قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُبِينٌ﴾ انہوں نے کہا کہ یہ تو جادو ہے۔ شیخ محمد کہتا ہے کہ دیکھو! یہاں صاف پتا چل رہا ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل میں آئے تھے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ﴾ میں ”هُوَ“ ضمیر کا مرجع احمد نہیں ہے، ”هُوَ“ ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میں تورات کی تصدیق بھی کرتا ہوں، احمد کی بشارت بھی دیتا ہوں اور جو دلائل اور معجزات حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے ان کے بارے میں بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا: ﴿هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ﴾ یہ تو کھلا جادو ہے۔ تو یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے کہی تھی۔ اس کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ ہر گز نہیں ہے۔ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 110 کو دیکھیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ لِيَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدْتُكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۖ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۚ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَتَدْبِرُ الْأَكْشَمَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۚ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِيَ إِسْرَءِيلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَذَا إِلَّا أَسْحَرٌ مُّبِينٌ ۝﴾

جب عیسیٰ علیہ السلام دلائل لے کر آئے تو بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ یہ تو جادو ہے۔ تو اس کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر ہونے کا طعنہ اہل مکہ نے دیا ہے، اہل مدینہ نے کبھی نہیں دیا۔ اہل مکہ طعنہ دیتے ہیں لیکن مدینہ میں آنے کے بعد یہود نے کبھی نہیں کہا تھا کہ آپ ساحر ہیں۔ معلوم ہوا کہ عربوں کا معاملہ الگ ہے



اور بنی اسرائیل کا معاملہ الگ ہے۔ اس سے قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل میں نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔

### ظالم کون ہے؟

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعَىٰ إِلَى الْإِسْلَامِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾

اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے جبکہ اس کو اسلام کی طرف دعوت دی جا رہی ہوتی ہے۔ اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے!

### پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا:

﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَهِهِمْ ۖ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَتَوْكَرَهُ انْكَفُرُونَ﴾

یہ لوگ اپنے منہ سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں جبکہ اللہ اپنے نور کو مکمل کریں گے اگرچہ کافروں کو یہ بات جتنی بھی برے لگے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے منہ سے اس دین کو ختم کرنا چاہتے ہیں یعنی یہ ان کے زبانی دعوے ہیں کہ ہم دین کو مٹا دیں گے لیکن یہ دین ان کے دعوؤں سے مٹ نہیں سکتا۔ ایک معنی تو یہ ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ واقعتاً جیسے اللہ کے نور کو کوئی بندہ اپنے منہ کے پھونکوں سے بجھانا چاہے تو ایسے ہی ہے کہ جیسے اللہ کے دین کو کوئی بندہ اپنی طاقت سے ختم کرنا چاہے، جس طرح اللہ کے نور کے مقابلے میں انسان کی پھونک کی کوئی حیثیت نہیں ہے اسی طرح اللہ کے دین کے مقابلے میں ان کی پوری طاقت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

### غلبہ عملی اور غلبہ برہانی:

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ

كُلِّهِ وَتَوَكَّرَ الْمَشْرِكُونَ ﴿٦﴾

وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی قرآن کریم دے کر بھیجا اور دین حق یعنی دین اسلام دے کر بھیجا ہے تاکہ اللہ کا دین تمام ادیان پر غالب آجائے، اور مشرک جتنا بھی چاہے بالآخر یہ دین غالب ہو کر رہی رہے گا۔

بظاہر اس پر اشکال یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا تیس سالہ دور نبوت گزار کر چلے گئے لیکن دین تمام ادیان پر غالب نہیں آیا بلکہ جزیرہ عرب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم رہے اور تھوڑا سا باہر نکلے اور یہ غالب تو بعد کے ادوار میں ہوا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں بھی پوری دنیا پر دین غالب نہیں آیا تھا۔ بہت سارے خطے ایسے تھے جہاں دین نہیں پہنچا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور آئے گا تو پھر دین اسلام تمام ادیان پر غالب آئے گا اور ایک شخص بھی ایسا نہیں ہو گا جو کلمہ پڑھ کر مسلمان نہ ہو بلکہ سب کے سب موت سے پہلے پہلے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائیں گے۔ تو اس کا مطلب کیا ہوا کہ اللہ نے اپنے نبی کو بھیجا تاکہ تمام ادیان پر غالب فرمادیں؟

اس کا جواب سمجھ لیں کہ غلبہ کی دو قسمیں ہیں؛ ایک ہے غلبہ عملی اور ایک ہے غلبہ برہانی۔ جو غلبہ برہانی ہے وہ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہو گیا تھا، کوئی بھی ایسا کافر اور کوئی بھی ایسا بے دین نہیں ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ہو گفتگو کے لیے اور دلیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر غالب نہ آئے ہوں، کیونکہ دلیل قرآن کریم ہے اور وہ تمام دلائل پر غالب ہے، اور ایک ہے غلبہ عملی وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں ہوا اور جو ہر شخص کا کلمہ پڑھنا ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں ہو جائے گا اور عیسیٰ علیہ السلام بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی بن کر دین کے نفاذ کی بات فرمائیں گے۔

اب اگر ہم کسی جگہ پر غالب آتے ہیں تو ہمارا یہ غلبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ہے، حضور کا دین ہے، حضور کی لائی ہوئی ہدایت ہے، اسی کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام چلیں گے اور غالب آئیں گے تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر عمل کرنے کی وجہ سے غالب آئیں گے تو غلبہ بظاہر کسی کا بھی ہو درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی ہے۔ تو یہاں غلبہ برہانی مراد ہے۔

### نفع بخش تجارت جہاد فی سبیل اللہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۖ تُوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ۖ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝۱۱﴾

یہاں جہاد کی بات کی ہے کہ ہم تمہیں ایسی تجارت بتائیں کہ جس کے دو نفع ہیں: ایک آخرت کا اور ایک دنیا کا۔ آخرت کا نفع یہ ہے کہ ﴿تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک عذاب سے بچائیں گے، اور دنیا کا نفع کیا ہے: ﴿نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ﴾ کہ اللہ کی مدد ملتی ہے اور فتح بھی عنقریب ملے گی۔

مومن کے ہاں دنیا کا نفع اصل نہیں ہوتا بلکہ آخرت کا نفع اصل ہوتا ہے، اس لیے اللہ نے آخرت کے نفع کو مقدم کیا ہے۔

فرمایا: وہ تجارت جو تمہیں نفع دے وہ یہ ہے کہ تم اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اپنی جان و مال کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو تو۔

﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسْكِنٌ طَيِّبَةٌ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝۱۲﴾

اللہ تمہارے گناہوں کو معاف کریں گے اور تمہیں ایسے باغات میں بھیجیں گے جہاں نہریں جاری ہوں گی اور ہمیشہ رہنے والے باغات اور اچھے اچھے مکانات بھی ہوں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔

﴿وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا ۖ نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ۖ وَبَشِيرٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۖ﴾

اس کے علاوہ اللہ تمہیں ایک اور چیز بھی دے گا اور وہ تمہیں پسند بھی ہے، وہ ہے اللہ کی مدد اور عنقریب ملنے والی فتح۔ اور مؤمنین کو خوشخبری سنادیں۔

اس سے مراد فتح مکہ ہو یا فتح خیبر ہو جو بھی فتوحات ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں اور قیامت تک آنے والی فتوحات بھی اس میں شامل ہیں۔ چونکہ انسان کی فطرت ہے کہ یہ جلدی کو پسند کرتا ہے اس لیے اللہ نے جلدی نفع دنیا والا ان کو دیا اور دینے کا وعدہ فرمایا۔

### جہاد کا معنی قتال ہے:

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ قرآن کریم، احادیث مبارکہ اور شریعت میں جو اصطلاح ہے جہاد، شرعاً جہاد کا معنی متعین ہے یعنی اللہ کے راستے میں قتال کرنا اللہ کے دین کو سر بلند کرنے کے لیے۔

مَنْ قَاتَلَ لِيَتَكُونَ كَلِمَةً لِلَّهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ<sup>18</sup>

جو شخص اس لیے قتال کرے کہ اللہ کا دین بلند ہو تو یہ شخص واقعاً اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا ہے۔

احکام شریعت میں جتنے بھی احکامات ہیں تو ان میں ایک معنی لغوی ہوتا ہے اور ایک معنی اصطلاحی ہوتا ہے۔ تو یہ لغوی معنی معتبر نہیں ہوتا بلکہ اصطلاحی معنی معتبر

ہوتا ہے۔ جس طرح صلوٰۃ حکم شرعی ہے، اس کا لغوی معنی ہے تحریک الالیتین، اپنے سرین کو حرکت دینا لیکن یہاں صلوٰۃ کا معنی شریعت میں سرین کو حرکت دینے والا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ارکان مخصوصہ کا اوقات مخصوصہ میں اذکار مخصوصہ کے ساتھ ہونا یہ نماز ہوتی ہے۔ اذان لغت میں ”هُوَ الْإِعْلَامُ“ ہے کہ اعلان کرنا اور شریعت میں عام اعلان مراد نہیں ہے بلکہ مخصوص اعلان مراد ہے مخصوص کلمات کے ساتھ مخصوص اوقات میں۔ اسی طرح حج کا لغوی معنی ہے ”ارادہ“ لیکن شریعت میں ہر ارادے کو حج نہیں کہتے بلکہ عملاً انسان مخصوص اوقات اور مخصوص جگہ میں مخصوص افعال ادا کرے تو اس کا نام حج ہے۔ اسی طرح صوم کا لغوی معنی ہے ”الإِمْسَاكُ“ یعنی مطلقاً رکنا روزہ ہے لیکن شریعت میں صوم کہتے ہیں صبح سے لے کر شام تک رکنا کھانے، پینے اور جماع سے نیت کے ساتھ۔ بالکل اسی طرح جہاد کا لغوی معنی ہے مشقت اور اصطلاح شریعت میں ہر مشقت والے کام کو جہاد نہیں کہتے بلکہ جہاد کا معنی متعین ہے جس کو کہتے ہیں قتال فی سبیل اللہ۔ آپ تفاسیر اٹھالیں آپ کو یہی معنی ملے گا اور تمام کتب احادیث اٹھالیں جہاں بھی کتاب الجہاد ہو گا اس کے ساتھ صرف اور صرف قتال کا مسئلہ ہو گا، کوئی اور نہیں ہو گا اور جہاں بھی فقہ میں کتاب الجہاد ہو گا تو وہاں صرف جہاد کے مسائل ہوں گے اور کوئی مسئلہ وہاں پر زیر بحث نہیں آئے گا۔

### آیات جہاد میں تحریف کا حکم:

اس لیے میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ جہاد نہیں کر سکتے تو نہ کریں، جہاد نہ کرنا تو گناہ ہے لیکن آیات جہاد میں تحریف کرنا یہ کفر ہے۔ فسق؛ اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل معافی ہے لیکن کفر قابل معافی نہیں ہوتا، اپنی جان چھڑانے کے لیے ہم تحریفات شروع کر دیتے ہیں، یہ قطعاً جائز نہیں ہے۔ اس لیے اپنے ایمان کی ہمیں بہت زیادہ فکر کرنی چاہیے۔

اس لیے میں شرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں کہ جہاد کا معنی قتال فی سبیل اللہ ہے، یہ امت پر فرض عین ہے، اس کا منکر کافر ہے اور اس کا تارک فاسق ہے۔ ایک تو جہاد کا معنی ٹھیک کریں، جہاد کا حکم ٹھیک بتائیں اور اس کے بعد آپ نہیں کر سکتے تو اپنے فسق کو تسلیم کریں کہ بھائی! میں مانتا ہوں کہ میں فاسق ہوں، میں عملاً جہاد نہیں کر رہا لیکن اس کا یہ معنی کہ میں تاویل کروں.... یہ ہمارے بس میں نہیں ہے۔ مسئلہ ہمیشہ ٹھیک بتائیں، کمی بیشی نہ کریں۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔

### مثال کے ذریعے وضاحت:

اب آپ بتائیں! ہم یہاں پر بیٹھے ہیں اور باہر سے کسی مدرسے کے مہتمم صاحب آجائیں یا کسی مدرسے کا مدرس آجائے جو تھوڑی تنخواہ پر زیادہ پڑھاتے ہوں اور مشقت بہت برداشت کرتے ہوں تو آپ کیا کہیں گے کہ استاد جی! آپ کو ملنے کے لیے فلاں مدرسے کے مجاہد صاحب آئے ہیں یا یہ کہیں گے کہ فلاں مدرسے کے مدرس یا مہتمم صاحب آئے ہیں؟ سارے یہی کہیں گے کہ مدرس یا مہتمم آیا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا ہو جس کے دور دراز علاقے میں خانقاہ ہو، پانی نہ ملتا ہو، ضروریات زندگی میسر نہ ہوں، مشقت کے ساتھ اللہ اللہ کرتا ہو اور وہ ملنے کے لیے آئے تو آپ کیا کہیں گے کہ استاد جی! فلاں خانقاہ کے شیخ آئے ہیں یا یہ کہیں گے کہ فلاں خانقاہ کے مجاہد آئے ہیں؟ (فلاں خانقاہ کے شیخ آئے ہیں۔ سامعین) اسی طرح اگر کوئی تبلیغی جماعت آئی ہو اور مشقت کے ساتھ تبلیغ کرتے ہوں، ہمیں ملنے کے لیے آجائیں تو آپ کیا کہیں گے کہ استاد جی! چند تبلیغ والے آئے ہیں یا مجاہدین آئے ہیں؟ (تبلیغ والے آئے ہیں۔ سامعین) اور جب یہ کہیں کہ ایک مجاہد ملنے کے لیے آیا ہے تو اب معنی یہ ہو گا کہ جہاد کرنے والا مجاہد آیا ہے۔ دیکھو! ہمارے عرف میں بھی جہاد کا معنی متعین ہے۔ پھر کیوں ہم جھوٹ بولتے ہیں، کیوں دھوکہ دیتے ہیں اور اپنے ایمان کو کیوں تباہ کرتے ہیں؟

بھائی! پڑھانے پر فضائل موجود ہیں، تزکیہ پر فضائل موجود ہیں، دعوت و تبلیغ پر فضائل موجود ہیں تو جہاد کے فضائل کیوں مروڑتے ہو؟

خدا کے لیے تحریفیں کر کے دین کو مت بگاڑو! دین کو خراب مت کرو! اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

**دین کے مددگار بنو!**

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِحَوَارِيِّنَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ فَأَمَنْتَ طَائِفَةٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَآءِيلَ وَكَفَرْتَ طَائِفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ﴾

فرمایا کہ اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو جیسے عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہے جو اللہ کے واسطے میری مدد کرے؟ حواریوں نے کہا کہ ہم مدد کریں گے۔ پھر یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور ایک نے کفر کیا۔ اللہ نے ایمان والوں کی مدد کی ان کے دشمنوں کے خلاف اور بالآخر ایمان والے غالب آ گئے۔

**حوای کی تعریف:**

حوارین جمع ہے حواری کی۔ حواری کہتے ہیں ایسے مخلص دوست کو جس میں عیب نہ ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا نے ایسے بارہ دوست دیے تھے جن میں عیب نہیں تھے۔ عیب دو قسم کا ہوتا ہے؛ ایک عیب ہوتا ہے لازمی اور ایک عیب ہوتا ہے متعدی۔ کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں کہ جن کا نقصان انسان کی ذات کو ہوتا ہے اور کچھ کمزوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا نقصان انسان کی ذات کو نہیں بلکہ پورے معاشرے کو

ہوتا ہے۔ یہ جو لازمی عیب ہے اس کا کفارہ ہو جاتا ہے اور جو متعدی عیوب ہوتے ہیں ان کی تلافی بڑی مشکل ہوتی ہے۔ اس لیے اپنے مزاج میں یہ چیز شامل کریں کہ متعدی گناہ کبھی نہ کرو۔ لازمی بھی نہیں کرنا چاہیے لیکن متعدی گناہ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نصاریٰ کے تین فرقے تھے؛ ایک فرقہ یہ کہتا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں لہذا اوپر چلے گئے ہیں۔ بعض کہتے کہ خدا کے بیٹے تھے لہذا خدا نے اپنے پاس بلا لیا اور بعض کہتے کہ خدا کے بندے تھے، اللہ نے ان کو محفوظ کرنے کے لیے اوپر بلا لیا۔ تو تین قسم کے فرقے ان میں ہو گئے تھے۔

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



## سورة الجمعة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿١﴾  
هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيٰتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ  
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢﴾﴾

جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہیں وہ اللہ جو بادشاہ ہے، ہر عیب سے پاک ہے، غالب ہے اور حکمت والا ہے۔ وہی ہے جس نے اُمیوں کے لیے انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے کتاب اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، انہیں پاک کرتا ہے، کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس سے پہلے یہ لوگ واضح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

### پنجمبر کی چار صفات:

اللہ رب العزت نے اپنے پنجمبر کی چار صفات بیان فرمائی ہیں:

[1]: ”يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيٰتِهِ“ انہیں قرآن کریم پڑھ کر سناتے ہیں۔

[2]: ”وَيُزَكِّيْهِمْ“ تزکیہ سے ہے یعنی اخلاقِ رذیلہ سے پاک کرتے ہیں۔ عجب،

کبر، حسد، بغض اور گندے عقائد سے پاک کرتے ہیں۔

[3]: ”وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ“ قرآن مجید کا معنی سمجھاتے ہیں۔

[4]: ”وَالْحِكْمَةَ“ اور سنت کی تعلیم دیتے ہیں۔

یہ چار کام ہیں یعنی عملًا بتاتے ہیں کہ قرآن پر عمل کیسے کرنا ہے؟

یہاں ”الْمُؤْمِنِينَ“ سے مراد تو عرب ہیں۔ اُمی کہتے ہیں اُن پڑھ شخص کو۔ اُن پڑھ کا معنی جس نے کسی آدمی سے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا ہو۔ اس معنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُمی ہیں کہ آپ نے کسی آدمی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا۔ اُمی کا یہ معنی کرنا کہ جسے کچھ نہ آتا ہو یہ معنی ٹھیک نہیں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا، براہِ راست اللہ نے اپنے پیغمبر کو تعلیم دی ہے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی آپ کے معلم نہیں ہیں، نبی کا معلم خدا ہوتا ہے اور جبرائیل علیہ السلام درمیان میں واسطہ ہیں۔ میں سمجھانے کے لیے مثال دیتا ہوں کہ جیسے یہ پینسل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ پینسل اُس طالب علم کو دے دو، تو یہ دینے والا درمیان میں واسطہ ہے۔ میں تمہیں ایک پیغام دے رہا ہوں کہ فلاں بندے کو دے دو، یہ واسطہ ہے۔ اسی طرح جبرائیل علیہ السلام اللہ عز و جل اور پیغمبر کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں۔

**پیغمبر پاک کی بعثت عامہ:**

﴿وَأَخْرَجْنَا مِنْهُمْ لَمَنَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾

اللہ تعالیٰ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اُمیوں کی طرف بھی بھیجے گئے اور ان لوگوں کی طرف بھی بھیجے گئے، ﴿لَمَنَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ﴾ جو ابھی ان کے ساتھ نہیں ملے۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

﴿لَمَنَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ﴾ کا معنی ”ابھی تک پیدا نہیں ہوئے“ بھی کر سکتے ہیں

اور ”ابھی تک انہوں نے کلمہ نہیں پڑھا“ بھی کر سکتے ہیں، دونوں معافی ٹھیک ہیں۔

﴿ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾

یہ اللہ کا فضل ہے اللہ جسے چاہتے ہیں عطا فرما دیتے ہیں۔ اللہ بہت بڑے فضل

کا مالک ہے۔

یہاں ایک بات سمجھیں کہ یہ جو ”فِي الْأُمِّيِّينَ“ میں لفظ ”فی“ ہے یہ بمعنی

”لام“ ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ اللہ جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر بھیجا ”فِي

الْأُمِّيِّينَ“ امیوں کے لیے ”وَ الْآخَرِينَ“ اور بعد والوں کے لیے۔ اگر یہ ترجمہ نہیں

کریں گے تو اشکال پیدا ہو گا کہ اُمِّيِّينَ میں نبی بنا کر بھیجا ہے یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے

اور جو موجود نہیں تھے ان میں نبی بن کر کیسے آئے؟ وہ تو موجود ہی نہیں تھے۔ اس

لیے یہاں ”فی“ کا معنی ”لام“ کریں گے۔ اب اشکال ختم ہو جائے گا۔ اور ”فی“ کا معنی

”لام“ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں کیا

ہے۔ میں نے کتنی مرتبہ آپ سے کہا کہ آپ کو کتنے اشکالات متن قرآن پر ہوں تو

بیان القرآن کھولو، آپ دیکھنا کہ قرآن کریم کے متن کے اشکال کیسے حل ہوتے ہیں۔

**امام ابو حنیفہ کی بشارت:**

﴿وَ الْآخَرِينَ مِنْهُمْ﴾

ایک روایت میں ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی ہے کہ صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ”الْآخَرِينَ“ سے مراد

کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا۔ پھر پوچھا گیا کہ ”الْآخَرِينَ“ سے

مراد کون ہیں؟ پھر سکوت فرمایا۔ پھر پوچھا گیا کہ ”الْآخَرِينَ“ سے مراد کون ہیں؟

تیسری بار جب پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ

عنہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا:

لَوْ كَانَ الْإِيمَانُ عِنْدَ الثُّرَيَّا لَعَالَهُ رَجُلٌ أَوْ رَجُلٌ مِنْ هَؤُلَاءِ.<sup>19</sup>

کہ اگر ایمان ثریا ستارے پر بھی پہنچ گیا تو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے قبیلے کے لوگ وہاں سے بھی لائیں گے۔

ایک روایت میں دین کا لفظ ہے<sup>20</sup> اور ایک روایت میں علم کا لفظ ہے۔<sup>21</sup>

امام جلال الدین حضرت سیوطی رحمہ اللہ شافعی ہونے کے باوجود لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا مصداق حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ ہیں۔<sup>22</sup>

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ عجم سے تھے۔ ائمہ اربعہ میں امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ میں سے کوئی بھی عجمی نہیں تھے، تنہا امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ عجمی تھے اور فارسی تھے۔ تو یہ بشارت ان کے بارے میں ہے۔

﴿وَأَخْرَجَ مِنْهُمْ﴾ کا مصداق امام ابو حنیفہ:

اس پر پھر میرے اپنے دلائل ہیں جو میں پیش کرتا ہوں بات سمجھانے کے لیے:  
[1]: دیکھو! ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”أَخْرَجَ كَالنُّجُومِ“<sup>23</sup>

19- صحیح البخاری، رقم: 4897

20- صحیح مسلم، رقم: 2546

21- حلیۃ الاولیاء لابی نعیم الاصبہانی: ج 6 ص 64، 65

22- تبیض الصحیفۃ ص 59، 60

23- مشکوٰۃ المصابیح: ص 554 باب مناقب الصحابة

میرے صحابہ نجوم ہدایت ہیں۔

ثریا ایک ستارہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ”اٰخِرِيْنَ“ حضرت سلمان فارسی کے قبیلے کے لوگ ہوں گے، ثریا تک جب دین ہو گا تو وہ اسے وہاں سے بھی لیں گے۔ اس کا معنی کہ آخرین میں ایسے لوگ ہوں گے جو براہ راست صحابہ سے دین حاصل کریں گے اور وہ امام اعظم ابو حنیفہ ہیں۔ یہ ہمارا استدلال ہے۔ اب دیکھیں! نفس مسئلہ ٹھیک ہو تو دلائل آپ جمع کرتے جائیں۔ تو آخرین کا مصداق امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ہیں۔

[2]: میں ایک اور توجیہ پیش کرتا ہوں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم عرب ہیں اور آپ کا دین عرب و عجم سب کے لیے ہے۔ تو ایک ایسا شخص چاہیے کہ جو عجمی ہو اور عربی جانتا ہو، وہ باقی تینوں ائمہ میں سے کوئی امام نہیں ہے بلکہ یہ صرف امام اعظم ابو حنیفہ ہے جو عجمی اور عربی دونوں جانتے ہیں۔ کیا معنی کہ عربی پڑھیں گے اور عجمیوں کو سکھائیں گے، تو آخرین کا مصداق وہ آدمی ہے۔

[3]: ایک ایسا شخص ہونا چاہیے کہ جو عرب و عجم کے درمیان میں ہو، عرب سے لے اور عجم کو دے، یہ امام اعظم ابو حنیفہ ہے۔ کیوں، اس لیے کہ امام اعظم ابو حنیفہ کوفہ میں تھے اور کوفہ عرب و عجم کے درمیان سنگم ہے، یہ شہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بسایا تھا۔ تو ضرورت ہے کہ ایسا شخص ہو جو سنگم پر بیٹھا ہو، اُدھر سے لے اور اُدھر دے، امام مالک رحمہ اللہ ہیں ہی مدینہ میں، اُدھر سے لیں گے تو اُدھر ہی دیں گے کیونکہ دونوں طرف مدینہ ہے۔ یہ واحد امام اعظم ابو حنیفہ ہیں جو سنگم کوفہ پر بیٹھے ہیں، عرب سے لیتے ہیں اور عجم کو دیتے ہیں۔

**جہاں پر بڑا کام چھوڑے وہاں سے چھوٹا شروع کرے:**

آپ بڑی جرأت سے کہا کریں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ائمہ فقہاء میں پہلے

فقیہ ہیں جنہوں نے علم شریعت کو مدون فرمایا ہے اور ان سے پہلے کسی نے یہ کام نہیں کیا اور پہلا شخص مکہ اور مدینہ کا نہیں بلکہ کوفہ کا ہونا چاہیے تھا.... اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں بڑا کام چھوڑ کر جائے تو چھوٹا وہاں سے شروع کرتا ہے، صدیق چھوٹے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہیں، حضور مدینہ سے گئے.... صدیق رضی اللہ عنہ مدینہ سے چلے، صدیق رضی اللہ عنہ بڑے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ چھوٹے ہیں، صدیق رضی اللہ عنہ مدینہ سے گئے.... عمر رضی اللہ عنہ مدینہ سے چلے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑے ہیں اور عثمان رضی اللہ عنہ چھوٹے ہیں، عمر رضی اللہ عنہ مدینہ سے گئے.... عثمان رضی اللہ عنہ مدینہ سے چلے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑے ہیں اور علی رضی اللہ عنہ چھوٹے ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مدینہ سے گئے.... حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ سے چلے، اب حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑے ہیں اور ان کے بعد چار فقہاء ہیں، حضرت علی ان چاروں سے بڑے ہیں۔

اب توجہ رکھنا! خلفاء میں چار ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم اور فقہاء میں چار امام احمد، امام شافعی، امام مالک اور امام ابو حنیفہ۔ اس کا معنی یہ ہے کہ خلفاء بڑے ہیں اور فقہاء چھوٹے ہیں۔ تو جہاں سب سے آخری خلیفہ گیا ہے تو سب سے پہلا فقیہ وہیں آئے گا، حضرت علی رضی اللہ عنہ مکہ سے جاتے تو پہلا امام مکہ میں آتا، حضرت علی مدینہ سے جاتے تو پہلا امام مدینہ میں آتا۔ چونکہ آخری خلیفہ کوفہ سے ہی گیا ہے لہذا پہلے امام کو کوفہ میں ہی ہونا چاہیے۔ کوفہ آخری خلیفہ کی جائے شہادت ہے اور پہلے امام کی جائے ولادت ہے! (سبحان اللہ۔ سامعین) اب دیکھو! بات کیسے کھلتی ہے! لوگوں کو بات سمجھ آتی ہے۔

### باادب اور بے ادب:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حنفی ڈائریکٹ مدینہ کی بات نہیں کرتے بلکہ کوفہ کی

بات کرتے ہیں کہ کوفہ کے ذریعے مدینہ جاؤ جبکہ ہم کہتے ہیں کہ ڈائریکٹ مدینہ چلو!  
ہم نے کہا کہ یہ ترغیب تو احادیث میں ہے۔ المستدرک علی الصحیحین میں  
روایت موجود ہے:

"أَكَاْمِدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلَىٰ بَابِهَا، فَمَنْ أَرَادَ الْمَدِيْنَةَ فَلْيَأْتُ الْبَابَ." <sup>24</sup>

میں نبی علم کا شہر ہوں اور علی شہر علم کا دروازہ ہے۔ جو شہر علم میں آنا چاہتا  
ہے وہ دروازے سے ہو کر آئے۔

میں سمجھانے کے لیے کہتا ہوں کہ مسجد کا امام اعلان کرتا ہے کہ صفِ اول  
میں نماز پڑھو اس کا اجر بہت ملتا ہے۔ ایک شخص وہ ہے جو دروازے سے گزر کر صفِ  
اول میں جائے، یہ باادب نمازی ہے، ایک شخص وہ ہے جو دروازہ پھلانگ کر صفِ اول  
میں جائے، یہ بے ادب نمازی ہے۔ تو جو شخص کوفہ کر اس کر کے جائے تو یہ بے ادب  
ہے اور جو کوفہ سے ہو کر مدینہ جائے یہ باادب ہے۔

یہ تعلیم تو ہمیں احادیث سے ملی ہے کہ اول کوفہ جانا چاہیے۔ یہ باتیں سمجھاؤ!  
پھر دیکھو کہ عوام کیسے ساتھ ملتی ہے؟!

### ہم عاشقِ مدینہ ہیں:

پھر سوال کرتے ہیں کہ جی امام بخاری رحمہ اللہ کتنے بڑے آدمی ہیں! آپ  
لوگ امام بخاری کی تقلید نہیں کرتے، امام ابو حنیفہ کی تقلید کرتے ہو، امیر المؤمنین فی  
الحديث کو چھوڑ کر آپ نے امام اعظم ابو حنیفہ کی تقلید کی ہے۔

ہم نے کہا کہ ہم عاشقِ مدینہ ہیں اور عاشق کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے  
معشوق کے پاس جلدی پہنچے۔ امام بخاری سے کہیں کہ مدینہ جانا ہے، امام بخاری سٹاپ

بہت کرتے ہیں، مثلاً ”وَبِهِ قَالَ حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ أَشْكَب حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فَضِيلٍ عَنْ عُمَارَةَ بْنِ الْقَعْقَاع عَنْ أَبِي زُرْعَةَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ“ لوجی مدینہ آگیا۔

اور جب امام ابو حنیفہ سے کہیں کہ مدینہ جانا ہے تو وہ کیا کہتے ہیں....

عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ وَائِلَةَ بْنِ الْأَثَّعِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي أَوْفَى قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

دیکھو! فوراً سٹاپ آتا ہے۔ ہم نے کہا کہ امام بخاری کی رفتار بہت تھوڑی ہے،

امام ابو حنیفہ نان سٹاپ چلتے ہیں۔ اس لیے ہم ان کے مقلد بننے ہیں۔

اور یہ بات الگ ہے کہ علم حدیث امام بخاری کے پاس زیادہ تھا یا امام ابو حنیفہ کے پاس زیادہ تھا؟ یہ مستقل بحث ہے۔ حضرت امام صاحب نے اپنے بیٹے حماد کو وصیت کی ہے۔ وصایا میں انیسویں نمبر پر یہ وصیت ہے کہ میرا بیٹا! میرے پاس پانچ لاکھ احادیث ہیں، ان میں سے پانچ حدیثیں تجھے دے رہا ہوں، ان پر عمل کرنا! <sup>25</sup>

پانچ لاکھ احادیث میں سے پانچ دی ہیں اپنے بیٹے کو تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ ان کے پاس تھوڑی احادیث تھیں! اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

**گدھے کی مثال:**

﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا طَبَسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَ اللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾



## الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢﴾

اور فرمایا کہ ان یہود کی مثال ایسی ہے جیسے گدھا ہو اور اس پر کتابیں لاد دی گئی ہوں۔ یہ ان کتابوں سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

یہ ”اسفار“ سفر کی جمع ہے، سفر بڑی کتاب کو کہتے ہیں۔ بڑی بڑی کتابیں گدھے پر لاد تو وہ عمل نہیں کرتا۔ اللہ ہمیں گدھا بننے سے محفوظ فرمائیں۔ جانوروں میں گدھا ایسا جانور ہے کہ جب حماقت میں مثال دینی ہو تو گدھے کی مثال دیتے ہیں۔ اس لیے یہاں ان کی بات فرمائی ہے۔

اب یہاں ذرا حسن ترتیب کو دیکھیں کہ بہت عجیب ہے۔ ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا﴾ میں پہلے رسول کی بات کی ہے، اس کے بعد ﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ﴾ میں صحابہ کی بات کی ہے، ﴿وَأَخْرَجَ مِنْهُمْ لِمَا يَلْحَقُوا بِهِمْ﴾ میں پھر فقہاء مجتہدین کی بات کی ہے اور اس کے بعد ﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِلُوا الثَّوْدَةَ﴾ میں پھر گدھوں کی بات کی ہے۔ کیسی ترتیب اللہ نے قائم فرمائی! پہلے نبی، پھر صحابہ، پھر مجتہد اور بعد میں گدھے جو کتابیں اٹھا کر پھرتے ہیں اور بات سمجھتے نہیں ہیں۔ ان کی آواز بھی گدھے کی طرح ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ سب سے بدترین آواز گدھے کی ہے۔

**گدھے پر بوجھ ہو تو ٹانگیں چوڑی ہو جاتی ہیں:**

اور ہمارا واسطہ گدھوں سے پڑا ہے۔ میں بتایا کرتا ہوں کہ یہ گدھے کی علامت ہے کہ گدھے کی کمر پر پانچ من گندم رکھو تو وہ اٹھالے گا لیکن سر پر ایک چھٹانک کا کپڑا رکھو تو نہیں اٹھائے گا۔ یہ کمر پر بوجھ اٹھالیں گے اور جب سر پر جالی کی ٹوپی بھی رکھو گے تو یہ نہیں اٹھا سکتے! یہ گدھے کا کام ہے۔ عام حالت میں گدھا بالکل

صحیح کھڑا ہو گا اور جب آپ اس پر بوجھ لا دو گے تو اس کی ٹانگیں چوڑی ہو جائیں گی۔ یہ گدھے کی نشانی ہے۔ میں سمجھانے کے لیے کہتا ہوں کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝﴾<sup>26</sup>

کہ وہ مومن کامیاب ہیں جو نماز میں خشوع کرتے ہیں۔

اور خشوع والے کون ہیں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

وَلَا يَزِفُّونَ أَيْدِيَهُمْ فِي الصَّلَاةِ.<sup>27</sup>

کہ ترک رفع یدین والی نماز یہ خشوع والی ہے اور ترک رفع یدین نہ ہو تو پھر خشوع نہیں ہوتا۔ اور قرآن میں ہے:

﴿وَأَنَّهُ أَتَكْبِيْرَةً إِلَّا عَلَى الْخُشْعَيْنِ﴾<sup>28</sup>

تو ترک رفع الیدین خشوع ہے اور جہاں ترک رفع الیدین ختم ہو گیا تو نماز بھاری ہو گئی، بوجھ پڑا تو پھر فوراً ٹانگیں کھل جاتی ہیں۔ یہ گدھے کا کام ہے کہ جب تک کھڑا ہو ٹھیک ٹھاک ہوتا ہے اور جب اس پر بوجھ ڈالو تو اس کی ٹانگیں کھل جاتی ہیں، یہ بھی بالکل ٹھیک ٹھیک کھڑے ہوتے ہیں، جو نہی بوجھ ڈالو فوراً ٹانگیں کھول دیتے ہیں۔

**شیطان کے لیے محفوظ گزر گاہ:**

اور پھر ان کے دماغ دیکھو اور استدلال دیکھو۔ جماعت کے ساتھ نماز ہو رہی ہے، ساتھ ساتھ نمازی ہیں۔ اب کہتے ہیں کہ پاؤں سے پاؤں ملاؤ! ٹانگیں کھلی کرو! میں نے کہا کہ بھائی! پاؤں سے پاؤں کیوں ملاتے ہو؟ کہتے ہیں کہ ہم پاؤں سے پاؤں ملاتے

26۔ المؤمنون 23:1، 2

27۔ تفسیر ابن عباس: ص 212

28۔ البقرة 45:2

ہیں تاکہ شیطان درمیان میں نہ گزرے۔ میں نے کہا کہ پاؤں سے پاؤں چپکا کر نہ رکھو بلکہ درمیان میں جگہ رکھو تاکہ شیطان یہاں سے گزرے، اس کو یہاں سے جانے دو، لیکن یہ لوگ پاؤں سے پاؤں ملاتے ہیں اور ٹانگیں کھول دیتے ہیں تاکہ شیطان وہاں سے نہ آئے یہاں سے آئے، شیطان کو راستہ دینا ہے لیکن خطرناک راستہ دینا ہے۔ تو ہے ناگدھوں والا دماغ؟ حماقت ہے یا نہیں؟

**سچے ہو تو موت کی تمنا کرو!**

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوْا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ١٠١﴾ وَلَا يَتَمَنَّوْنَ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿١٠٢﴾

یہود کہتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اللہ کے دوست ہیں۔ فرمایا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم اللہ کے دوست ہو تو دوست تو دوست سے ملنے کی بہت چاہت کرتا ہے، کیوں کہ ”الْمَوْتُ جَسَدٌ يُوصِلُ الْحَبِيبَ إِلَى الْحَبِيبِ“<sup>29</sup> موت تو ایسا پل ہے کہ دوست کو دوست سے ملاتا ہے۔ تو فرمایا کہ اللہ کے محبوب ہو تو پھر موت مانگو! لیکن یہ موت نہیں مانگتے۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا يَتَمَنَّوْنَ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ﴾ یہ لوگ کبھی موت نہیں مانگیں گے، اس لیے کہ ان کو اپنے کرتوتوں کا پتا ہے کہ مرنے کے بعد ہمارے ساتھ کیا ہونا ہے!

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک موت کی دعا مانگتا تو فوراً مر جاتا۔

## جمعة المبارک:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا

إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذِكُّكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١﴾﴾

اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے بلایا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف جانے کا اہتمام کرو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔

کعب بن لؤی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں سے ہیں انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں آنے سے پانچ سو ساٹھ سال قبل جمعہ شروع کیا تھا، وہ توحید پر تھے، جب جمعہ کا دن آتا تو لوگوں کو جمع کرتے، خطبہ دیتے اور اللہ کی توحید بیان کرتے تھے۔ انصارِ مدینہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے پہلے جمعہ کے دن کا اجتماع شروع کر دیا تھا۔ اللہ کو جمعہ کا اجتماع پسند تھا تو شریعت نے باضابطہ جمعہ کا دن دیا ہے۔

## جمعہ کی دوسری اذان سنت ہے:

جمعہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک اذان ہوتی تھی جو مؤذن خطبہ کے وقت امام کے سامنے کھڑے ہو کر دیتا تھا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی ایسے تھا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی ایسے ہی معاملہ رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے دوسری اذان شروع کروائی۔ ایک اذان تو امام کے سامنے ہوتی ہے یہ تو پہلے سے تھی اور ایک اذان اس سے پہلے والی حضرت عثمان نے شروع کروائی۔ دوسری اذان کا معنی یہ نہیں کہ امام کے منبر کے سامنے جو اذان دی جاتی ہے اس کے بعد والی اذان ہو، ایسا نہیں بلکہ دوسری کا معنی یہ

ہے کہ پہلے ایک اذان تھی اور اب دواذانیں ہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک اذان مقام زوراء پر دی جاتی جس کی آواز پورے مدینے میں پہنچتی تھی اور دوسری اذان سابقہ معمول کے مطابق منبر کے سامنے ہوتی تھی۔ صحیح بخاری میں روایت موجود ہے:

أَنَّ الثَّانِيْنَ الثَّانِي يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَمَرَ بِهِ عُثْمَانُ حِينَ كَثُرَ أَهْلُ الْمَسْجِدِ  
وَكَانَ الثَّانِيْنَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ حِينَ يَجْلِسُ الْإِمَامُ.<sup>30</sup>

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دوسری اذان شروع فرمائی تھی اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہ کا اتفاق تھا کہ ٹھیک ہے۔ میں نے آپ لوگوں کو بتایا تھا کہ اجماع صحابہ نبوت کی طرح معصوم ہوتا ہے۔

پھر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ میں دنیا میں نہیں ہوں گا  
”فَإِنَّهُ مَنْ يَعْشُ مِنْكُمْ بَعْدِي فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ  
الْخُلَفَاءِ الْمُهَدِّدِينَ الرَّاشِدِينَ“<sup>31</sup>

تو پھر خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنا۔

**اذان اول کے بعد خرید و فروخت ممنوع ہے:**

اور اس بات پر بھی امت کا اجماع ہے کہ یہ جو قرآن کریم میں ہے: ﴿إِذَا  
نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ﴾ کہ جب جمعہ کے لیے بلایا جائے تو اس وقت تم  
کاروبار وغیرہ چھوڑ دو، اس سے مراد پہلی اذان ہے۔ پہلی اذان کے بعد یہاں تک لکھا  
ہے کہ عالم کو مطالعہ کرنا بھی چھوڑ دینا چاہیے، اب صرف اور صرف جمعہ کی تیاری ہو۔

30- صحیح البخاری، رقم: 915

31- سنن ابی داؤد، رقم: 4607

## سعی الی الجمعہ کا اہتمام کیجیے!

میں اس لیے گزارش کرتا ہوں کہ اس پر میں اور آپ عمل کی کوشش کریں۔ اللہ کے لیے یوں نہ کریں کہ ہم علماء نے جب جمعہ پڑھانا ہو تو پھر جلدی آئیں اور جب جمعہ پڑھنا ہو تو پھر دیر سے آئیں۔ جمعہ سے متعلقہ چیزیں تو ہو سکتی ہیں مثلاً جمعہ کی تیاری ہے لیکن جو چیزیں جمعہ کی تیاری کے علاوہ ہیں اس سے ہم بچنے کی کوشش کریں۔ مجھے اور آپ کو اپنی کوتاہی پر توبہ کرنی چاہیے اور اس کا بھرپور اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا

إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾

”فَاسْعَوْا“ کا معنی آپ نے دوڑنا نہیں کرنا کہ ”دوڑو!“ بلکہ ”فَاسْعَوْا“ کا معنی ہے کہ ”اہتمام کرو“۔ جب جمعہ کی پہلی اذان ہو تو اللہ کے ذکر کی طرف جانے کا اہتمام کرو!

سعی کا معنی ہمیشہ دوڑنا نہیں ہوتا۔ دیکھو! صفا اور مروہ کے درمیان سعی ہوتی ہے تو اس کا معنی دوڑنا ہے؟ نہیں بلکہ اہتمام سے چلو۔ تھوڑی دوڑ تو مخصوص جگہ پر ہے، باقی کو اہتمام کے ساتھ کرو۔ تو سعی کا معنی ہمیشہ دوڑنا نہیں ہوتا بلکہ اس کا معنی اہتمام کرنا ہے۔

## دیہات اور جمعہ کی ادائیگی:

﴿وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جمعہ شہر میں ہوتا ہے، ”الْبَيْعَ“ اس کی ایک دلیل ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چالیس شخص عاقل بالغ

ایک جگہ پر اکٹھے ہو جائیں تو جمعہ فرض ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ عاقل بالغ تو بے شک دوہی ہوں جنہوں نے جمعہ پڑھنا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ شہر ہو یا قصبہ ہو، بازار ہو، قاضی ہو یہ جمعہ کی شرائط میں سے ہیں۔

اذانِ اول کے بعد کوئی بھی کام کریں تو یہ ممنوع ہے۔ جس طرح اذانِ اول کے بعد تجارت کرنی ٹھیک نہیں ہے اسی طرح کوئی اور کام بھی ٹھیک نہیں ہے لیکن شہروں میں عموماً تجارت ہوتی ہے اس لیے لفظ ”وَذَرُوا الْبَيْعَ“ استعمال فرمایا۔ ایک بات یہ بھی یاد رکھیں کہ یہاں لفظ ”بیع“ میں خریدنا بھی شامل ہے، صرف فروخت اس میں شامل نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ خرید و فروخت کو چھوڑ دو اور جمعہ کی تیاری کرو۔

**صحابہ کرام کے خطبہ چھوڑ کر جانے کی وجہ:**

﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۖ﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن جمعہ کے فرض کے بعد خطبہ دیتے تھے جیسے ہمارے ہاں عیدین کا خطبہ ہوتا ہے۔ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض پڑھالیے اور خطبہ دے رہے تھے کہ ندا آئی کہ قافلہ آگیا ہے۔ یہ قافلہ تھا حبیہ بن خلف کلبی کا۔ یہ قافلہ شام سے آیا تھا۔ ان کا قافلہ جب بھی آتا تو ضروریاتِ زندگی کا سارا سامان اس میں ہوتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی تعداد تجارت کے لیے چلی گئی۔ کچھ رہ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر سارے چلے جاتے تو مدینہ کی وادی آگ کے عذاب سے بھر جاتی۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور سمجھایا گیا کہ جب کوئی تجارت ہو، کوئی مشغولیت کی چیز ہو تو خطبہ کو چھوڑ کر جانا جائز نہیں ہے۔ اللہ کے پاس جو چیز ہے وہ تجارت کی ان چیزوں سے بہتر ہے۔ تو تجارت کی وجہ سے دنیاوی اسباب پر بھروسہ نہ کرو بلکہ اللہ کی جو چیزیں ہیں وہ اس سے بہتر ہیں، ان پر اعتماد کرو۔

اب اس پر شبہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر چلے گئے تو یہ بہت بڑا گناہ تھا حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے، کیوں کہ خطبہ تھا جمعہ کے بعد اور ضروریاتِ زندگی کی ان کو ضرورت تھی۔ اب قافلہ آگیا اور آواز ایسی لگی کہ عورتوں اور مردوں کو جانا پڑا۔ عورتوں پر تو جمعہ فرض نہیں ہے اس لیے وہ چلی گئیں اور بعض ایسے تھے کہ جن کی اہلیہ چلی گئی اور شوہر یہاں پر ہے تو ضروریاتِ زندگی تو دونوں کو معلوم ہوتی ہیں اس لیے وہ بھی چلے گئے اور ایسے موقع پر جب کچھ حضرات یہیں پر موجود ہیں اور کچھ چلے گئے ہیں تو اس طرف ذہن نہیں جاتا کہ ہم کو رہنا چاہیے تھا، بلکہ ذہن میں تھا کہ ہم جائیں گے تو ضرورت کی چیزیں ختم ہو جائیں گی۔

بسا اوقات انسان اپنا ایک اجتہاد کر لیتا ہے کہ میں جاؤں گا تو ضرورت کی چیزیں ختم ہو گئی ہوں گی تو مجھے ذرا دقت پیش آئے گی۔ اس لیے میں جا کر ضروری چیزیں حاصل کر لوں۔ یہ ایسے ہے جس طرح ہمارے ہاں جماعت کھڑی ہو اور بندہ کہے کہ میں تھوڑا سا کام کر لوں پھر جماعت میں پہنچوں گا، اسی دوران ایک رکعت چلی جاتی ہے۔ تو جس طرح اس بندے کا اجتہاد ہوتا ہے نا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا بھی یہ اجتہاد تھا لیکن یہ چونکہ اللہ کو پسند نہیں آیا اس لیے اس پر تنبیہ آگئی ہے کہ ایسا نہ کیا کرو، عبادات کے وقت عبادات پر توجہ دیا کرو اور یہ کام تو بعد میں بھی ہو جائیں گے۔ یوں تنبیہ فرمائی۔

اس واقعے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کا خطبہ نماز سے پہلے دینا شروع فرما دیا اور نہ پہلے فرض نماز پڑھی جاتی تھی اور بعد میں خطبہ ہوتا تھا۔

وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



## سورة المنافقون

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ

إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ كَذِبُونَ﴾

سورت کا شان نزول (مفصل واقعہ):

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا چلا کہ قبیلہ بنو المصطلق کا سردار حارث بن ضرّار کچھ افراد کو لے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگی تیاری کر رہا ہے۔ یہ حارث بن ضرّار حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے والد تھے جو اس غزوہ کے بعد مسلمان ہوئیں اور ازواجِ مطہرات میں شامل ہوئیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم خود پیش قدمی کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر چل دیے۔ ساتھ منافق بھی چلے گئے تاکہ مالی غنیمت میں ہمارا بھی حصہ ہو جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب بنو المصطلق کے مقام پر پہنچے تو وہاں ایک کنواں یا چشمہ تھا، جس کا نام تھا مرسیع، وہاں پر پڑاؤ ڈالا۔ اس لیے اس کو غزوہ بنو المصطلق بھی کہتے ہیں اور غزوہ مرسیع بھی کہتے ہیں۔ خیر وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے۔ حارث بن ضرّار اپنا لشکر لے کر پہنچا۔ فریقین نے صفیں درست کیں اور دونوں نے

تیسوں سے ایک دوسرے پر حملہ کیا۔ اس میں بنوالمصطلق کے کئی افراد مارے گئے اور اللہ نے فتح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی۔

لیکن یہاں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا کہ ابھی مرسیع کے کنویں پر ہی تھے، انصار اور مہاجرین صحابہ موجود تھے۔ ایک انصاری اور مہاجر میں تھوڑی سی بات پر تکرار ہوئی اور نوبت جھگڑے تک پہنچ گئی۔ مہاجر صحابی کا نام تھا جہاہ اور انصاری صحابی کا نام تھا سنان بن وبرہہ بنی رضی اللہ عنہما۔ انصاری نے انصار کو بلایا اور مہاجر نے مہاجرین کو بلایا۔ قریب تھا کہ کوئی بڑا فتنہ کھڑا ہو جاتا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا چلا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فوراً موقع پر پہنچ گئے۔ سب کو جمع کیا اور فرمایا: ”مَا تَابُلُ دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ؟“ کہ یہ کیا جاہلیت کی آوازیں ابھی سے اٹھ رہی ہیں؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بہت سمجھایا کہ مسلمان کو چاہیے کہ ظالم اور مظلوم کی مدد کرے، مظلوم کی مدد اس طرح کہ اس سے ظلم کو روکے اور ظالم کی مدد اس طرح کہ ظالم کا ہاتھ ظلم سے روک دے تاکہ وہ جہنم میں نہ چلا جائے۔ خیر صحابہ رضی اللہ عنہ میں صلح ہو گئی۔

### عبداللہ ابن ابی کی ہرزہ سرائی:

عبداللہ ابن ابی ابن سلول منافق کو جب اس بات کا پتا چلا تو اس نے اس موقع کو اپنے لیے نہایت غنیمت جانا کہ اب مسلمانوں کو لڑانے کا خوب موقع ہے۔ لشکر ابھی مرسیع کے مقام پر ہی تھا تو عبداللہ بن ابی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک جگہ پر بیٹھا تھا۔ اتفاق سے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بھی وہاں پر تھے۔ یہ صحابی تھے اور عمر ان کی تھوڑی تھی، یہ بھی ساتھ بیٹھے تھے تو عبداللہ بن ابی نے فتنے کی آگ کو بھڑکانے کے لیے کہا کہ دیکھو! تم نے مہاجرین کو سر پر چڑھا دیا ہے، پہلے تم نے ان کو کھانے کھلائے ہیں، اب یہ ہمارے سر پر چڑھتے ہیں، ہر بات پر ہمیں ڈانٹتے ہیں، ہمیں

لے کر جنگوں میں نکلتے ہیں، ایک تو ان کا نان و نفقہ ختم کر دویہ خود تنگ ہو کر چھوڑ کر چلے جائیں گے، باقی جب ہم عزت والے واپس جائیں گے تو ان ذلیل لوگوں کو اپنے شہر سے نکال دیں گے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی تو جا کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتادی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھ کر کہ زید بن ارقم ابھی چھوٹے ہیں، ممکن ہے ان کو غلط فہمی ہو گئی ہو ان سے پوچھا: کیا تمہیں غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟ عرض کیا: نہیں حضور، میں نے خود سنا ہے۔ فرمایا: دیکھ لو۔ کہا کہ حضور میں نے سنا ہے اور مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی۔

یہ بات لشکر میں پھیلی کہ زید بن ارقم کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن ابی نے یہ بات کی ہے تو چونکہ عبد اللہ بن ابی قبیلہ خزرج کا معزز آدمی سمجھا جاتا تھا تو اس کے بارے میں لوگوں نے کہا کہ نہیں وہ ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے ایسی بات کی ہے؟ اس نے کہا: حضور! یہ بالکل جھوٹ ہے، میں نے تو ایسی بات نہیں کہی اور قسمیں کھا کر اپنی سچائی کا یقین دلایا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی ابن سلول کی بات سن کر اس کا عذر قبول فرمایا لیا۔ اب لوگ حضرت زید بن ارقم کو ملامت کرنے لگے کہ تم نے ایک سردار کے بارے میں ایسی بات کہی ہے، اس پر تہمت لگائی ہے اور اس کے ساتھ قطع رحمی کا معاملہ کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اس بات کا پتا چلا تو حضرت عمر نے کہا کہ حضور! مجھے اجازت دیں کہ میں عبد اللہ بن ابی کا سر قلم کروں! اس کو جرأت کیسے ہوئی بات کرنے کی؟! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں عمر! ایسا نہ کرو، لوگ کہیں گے کہ محمد اپنے بندوں کو مارتا ہے، پھر ایک نیا پروپیگنڈا شروع ہو جائے گا۔

عبد اللہ بن ابی بن سلول منافق کے بیٹے حضرت عبد اللہ مسلمان تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! مجھے

اجازت دیں میں اپنے باپ کا سر قلم کر کے لاتا ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی اور میرے باپ کا سر قلم کرے گا تو ممکن ہے کہ وہ میرے سامنے آئے گا تو مجھے تکلیف ہو گی اور پھر میں اس کو قتل کر بیٹھوں گا اور جہنم میں جاؤں گا، مجھے اجازت دیجیے، میں اپنے باپ کا سر خود قلم کرتا ہوں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی منع فرما دیا۔

غزوہ سے فارغ ہوئے۔ جب واپس آنے لگے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلاف معمول پورا دن سفر کیا، پوری رات سفر کیا اور اگلے دن پھر سفر کیا۔ جب دوپہر کا وقت ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ آرام کیا۔ اس کا مقصد مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ یہ اپنے قبیلہ کا بڑا آدمی ہے، ایک افواہ پھیل گئی ہے، اگر یہ افواہ سچی ہے تو مسئلہ اور اگر جھوٹی ہے تو بھی مسئلہ کیونکہ ایک انتشار کا خدشہ تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل سفر کر کے لشکر کو تھکانا شروع کیا تاکہ اس بات سے توجہ ہٹ جائے۔

دوران سفر جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر عبد اللہ بن ابی کے بارے میں کوئی آیات نازل نہیں ہوئی تھیں تو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن ابی کو نصیحت کی کہ دیکھو! تم نے بات کی ہے، بہتر ہے کہ غلطی کا اعتراف کر لو ورنہ وحی آئے گی تو تم پریشان ہو جاؤ گے لیکن عبد اللہ بن ابی نے یہ بات سن کر منہ پھیر لیا۔ حضرت عبادہ بن صامت فرمانے لگے کہ مجھے لگتا ہے کہ تو جس طرح تو منہ پھیر رہا ہے تو ضرور تیرے بارے میں قرآن اترے گا۔

جب راستے میں تھے تو حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی خواہش تھی کہ میں سامنے جاؤں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کروں۔ اس لیے وہ قریب ہوتے، پھر پیچھے ہٹتے، قریب ہوتے، پھر پیچھے ہٹتے۔ تھوڑا سفر آگے ہوا تو حضرت زید بن ارقم

رضی اللہ عنہ کا گھوڑا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل ساتھ چل رہا تھا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بہت منتظر تھا کہ کوئی وحی آئے اور میرے بارے میں صفائی ہو ورنہ میں تو بدنام ہو جاؤں گا۔

حضرت زید بن ارقم فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر پسینہ آگیا، سانس پھولنا شروع ہوا اور سواری پر بوجھ پڑنا شروع ہوا تو میں سمجھ گیا کہ وحی آرہی ہے۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو چونکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہی تھا سواری پر تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت میرا کان پکڑا اور فرمایا: اے بچے! جو تم نے بات کی تھی وہ ٹھیک ہے، اللہ نے تمہاری تصدیق کر دی ہے اور سورت المنافقون نازل ہو گئی ہے۔ یوں عبد اللہ بن ابی کے بارے میں بات کھل گئی۔

جب یہ لشکر مدینہ میں داخل ہونے لگا تو عبد اللہ بن ابی منافق کے بیٹے حضرت عبد اللہ صحابی نے اپنے باپ کی سواری کو روک لیا اور پاؤں سواری کے گھٹنے پر رکھ کر بٹھالیا۔ انہوں نے کہا کہ تو مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ تو نے کہا تھا کہ میں مدینہ میں داخل ہوں گا تو عزت والے ذلت والوں کو نکال دیں گے! تو بتا کہ تو نے کس کو ذلت والا کہا اور کس کو عزت والا کہا؟ عزت والا تو ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ ابا! تو مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیں! اس وقت عبد اللہ بن ابی نے کہا کہ میں تو عورتوں اور بچوں سے بھی زیادہ ذلیل ہو گیا ہوں۔ مطلب کہ میرا اپنا بیٹا میرے مقابلے میں اتر آیا ہے۔ پیچھے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری آئی۔ فرمایا: کیا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ یہ مسئلہ ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے باپ کو چھوڑ دو! انہوں نے پھر اسے مدینہ میں داخل ہونے دیا۔ تو یہ سورت اس سفر میں نازل ہوئی۔

## منافقین کی دروغ گوئی:

﴿إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ  
إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ كَذِبُونَ﴾

یہ منافق کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن یہ منافق لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔

جھوٹ بولنے سے مراد کیا ہے؟ کہ منافق کہتے ہیں کہ ہم دل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول مانتے ہیں۔ فرمایا کہ تم دل سے نہیں مانتے بلکہ محض زبان سے کہتے ہو، تمہارے یہ دعوے بالکل جھوٹے ہیں۔

﴿اتَّخِذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا  
كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾

یہ لوگ دو کام کرتے تھے:

1: ایک تو جھوٹی قسمیں کھاتے تھے اپنی جان اور مال کو بچانے کے لیے۔

2: لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے تھے۔

﴿اتَّخِذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ یہ ان کا لازمی جرم تھا اور ﴿فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ یہ ان کا متعدی جرم تھا۔ ایک جرم ان کی ذات کی حد تک تھا کہ جھوٹ بولتے تھے اور دوسرا جرم یہ کہ یہ لوگوں کو دین سے روکتے تھے، یہ ان کا متعدی جرم تھا۔

﴿ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ﴾

تمہارے سامنے کلمہ پڑھتے ہیں اور جب اپنے بندوں کے پاس جاتے ہیں تو

پھر زبان سے کفر بکتے ہیں۔ ان کے بار بار جرم کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگ گئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بات کو سمجھتے نہیں۔

﴿وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۖ وَلَا يَتَّقُونَ اللَّهَ تَسَعٌ يَقُولِهِمْ ۖ كَانَتْهُمْ حُشْبٌ مُسْنَدَةٌ ۖ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْعَةٍ عَلَيْهِمْ ۖ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۖ قَتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّى يُؤْفَكُونَ ۝﴾

منافقین کے ظاہر کو دیکھو تو بڑے بڑے ان کے جسم ہیں لیکن جب ان کی باتیں سنو تو ایسے لگتے ہیں کہ جیسے یہ لکڑیاں ہیں جو سہارے پر کھڑی ہوئی ہیں، یہ ڈرپوک اور بزدل قسم کے لوگ ہیں۔ جسم دیکھو تو بڑے بڑے اور جب باتیں دیکھو تو اتنے بزدل لوگ ہیں۔ ان کو ہر وقت خدشہ رہتا تھا یعنی جب بھی کہیں سے تھوڑی سی بھی آواز آئی گھوڑوں کی تو منافق سمجھتے تھے ہمارے بارے میں وحی آگئی ہے ہمارا پتہ چل گیا ہے اب ہماری خیر نہیں ہے۔ ہر چیخ و پکار کو سمجھتے ہیں کہ ہمارے اوپر کوئی آفت آنے لگی ہے، یہ تمہارے دشمن ہیں، بچو ان سے۔ اللہ ان کو برباد کرے۔ یہ لوگ کہاں پھرے جاتے ہیں!

**عبداللہ ابن ابی کا متکبرانہ رویہ:**

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّارُ عَوْسُهُمْ ۖ وَرَأَيْتَهُمْ يَصْذَوْنَ ۖ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ۝﴾

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن ابی بن سلول سے کہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے جاؤ اور جا کر معافی مانگ لو۔ اس نے کہا تھا کہ تمہارے کہنے پر کلمہ بھی پڑھا ہے، تمہارے کہنے پر زکوٰۃ بھی دیتا ہوں، اب حضور کو سجدہ رہ گیا ہے وہ میں کر لیتا ہوں، آخر تم کیا چاہتے ہو مجھ سے!؟

فرمایا کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ! رسول اللہ تمہارے لیے مغفرت کی دعا کریں تو یہ لوگ اپنے سروں کو جھٹکنے لگتے ہیں، آپ ان کو دیکھیں کہ یہ کیسے تکبر کرتے ہوئے منہ پھیر لیتے ہیں۔

﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۚ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ

لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝۱﴾

اے میرے پیغمبر! آپ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں ان کے لیے برابر ہے، اللہ ان کو معاف نہیں کرے گا! اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے۔

﴿هُمْ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنْفَضُوا ۚ وَبِاللَّهِ

خَوَارِئِ السَّنِوَةِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنَّ الْمُنْفِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ ۝۲﴾

یہی منافق لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے ساتھ ہیں ان پر مال خرچ نہ کرو تا کہ یہ لوگ چلے جائیں۔ فرمایا کہ آسمانوں اور زمینوں کے سارے خزانوں کا مالک اللہ ہے لیکن منافق لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے!

﴿يَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ ۚ

وَبِاللَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنْفِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝۳﴾

یہ منافق کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ میں پہنچیں گے تو عزت والے لوگ ذلت والوں کو باہر نکال دیں گے حالانکہ عزت بالذات اللہ کے لیے ہے، اللہ کے واسطے سے پیغمبر کے لیے ہے، پھر پیغمبر کے دین پر عمل کریں گے تو مؤمنین کے لیے ہے لیکن منافق اس بات کو نہیں سمجھتے نہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ

اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝۴﴾



یہاں مسلمانوں کو ترغیب ہے کہ مال اور اولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کرے، جو ایسا کرے گا نقصان اٹھائے گا۔

﴿وَأَنْفِقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾ ﴿١٠﴾

موت آنے سے پہلے پہلے صدقات واجبہ ادا کرو ورنہ موت آئے گی تو بندہ کہے گا کہ اے کاش! مجھے تھوڑا سا وقت مل جائے کہ میں صدقہ کروں اور نیک ہو جاؤں!

﴿وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ ﴿١١﴾

جب موت کا وقت آئے گا تو مہلت نہیں ملتی۔ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہیں۔

اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔  
وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة التغابن

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝١﴾

﴿هُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝٢﴾

### پانچ مسجحات:

میں نے بتایا تھا کہ پانچ سورتیں ایسی ہیں جن کا آغاز تسبیح سے ہوتا ہے۔ انہیں مسجحات کہتے ہیں۔ ان میں سے چار سورتیں سورت حدید، سورت حشر، سورت صف اور سورت جمعہ تو گزر چکی ہیں، یہ آخری سورت ہے سورت تغابن۔ فرمایا: جو چیزیں آسمانوں اور زمینوں میں ہیں وہ اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہیں۔ اللہ ہی کی بادشاہت ہے اور تمام تعریفیں بھی اللہ کے لیے ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

### تخلیقات باری تعالیٰ:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا

تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝٣﴾

اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ تم سب اللہ کی عبادت کرتے لیکن تم نے کیا کیا؟ بعض کافر ہو گئے اور بعض مومن ہو گئے۔ تو

تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ سب کو چاہیے کہ اللہ کو مانیں۔ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ تمہارے ان اعمال کو بھی جانتا ہے جو ایمان والے ہیں اور ان اعمال کو بھی جانتا ہے جو کفریہ ہیں۔

﴿خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۗ وَ

إِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۝﴾

اللہ رب العزت نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا فرمایا۔ اللہ نے تمہیں صورتیں دی ہیں اور بہت بہترین صورتیں تمہیں عطا کی ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

”بِالْحَقِّ“ حق سے مراد ہے حکمت اور منفعت یعنی حکمت کے ساتھ اور نفع کے ساتھ پیدا فرمایا۔ اللہ کی تخلیق نہ نفع کے بغیر ہے اور نہ حکمت کے بغیر۔

﴿فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ﴾ جتنی بھی صورتیں پیدا کی ہیں سب سے بہترین

صورت انسان کو دی ہے۔ فرمایا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ کہ دنیا میں جتنی شکلیں اللہ نے بنائی ہیں ان میں سب سے زیادہ خوبصورت شکل انسان کو عطا فرمائی ہے۔

﴿يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ

وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝﴾

جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اللہ اسے جانتا ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو یا ظاہر کرتے ہو اللہ اس کو بھی جانتا ہے۔ اللہ دلوں کے رازوں سے بھی واقف ہے۔

**منکرین کا انجام:**

﴿الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهُمْ وَ

لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٣﴾

کیا تمہارے پاس ان کافروں کے حالات نہیں پہنچے جو پہلے گزر چکے ہیں، انہوں نے اپنے کرتوتوں کا وبال چکھا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْا ابَشِّرْ

يَهْدُوْنَنَاۤ اَفْكَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَاسْتَغْنٰی اللّٰهُ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ ﴿٤﴾

ان کے انکار اور اس پر عذاب کی وجہ یہ بنی کہ ان کے پاس جب رسول واضح دلائل لے کر آتے تو یہ ان سے کہتے کہ کیا بشر ہی ہمیں ہدایت کی راہ دکھائیں گے؟ اس لیے انہوں نے کفر اختیار کیا اور منہ موڑا تو اللہ نے بھی شانِ بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ اللہ بے نیاز اور لائق تعریف ذات ہے۔

﴿اَبَشِّرْ يَهْدُوْنَنَاۤ﴾ میں اس پر پہلے کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ ان کی

رائے یہ تھی کہ بشر نبی نہیں ہوتا۔ بد قسمتی سے آج بھی بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ نبی بشر نہیں ہوتا۔ ذہن دونوں کا ایک ہے کہ بشریت نبوت کے منافی ہے۔ انہوں نے دیکھا تو نبی نہیں مانا اور انہوں نے نہیں دیکھا تو نبی مانا مگر بشر نہیں مانا۔ بشر لفظ مفرد ہے لیکن معاً جمع ہے، اس لیے آگے ”يَهْدُوْنَنَا“ یہ جمع ہے معنی کی رعایت کرتے ہوئے۔

﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ لَّنْ يُبْعَثُوْۤا قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ

لَتُنَبِّیْنَ بِمَا عَمِلْتُمْ وَاٰیٰتِ اللّٰهِ یَسْبِرُوْنَ﴾ ﴿٥﴾

کافر یہ گمان کرتے ہیں کہ انہیں قیامت کے دن نہیں اٹھایا جائے گا۔ اے پیغمبر! آپ فرمائیں کہ نہیں، اللہ تمہیں ضرور اٹھائے گا۔ پھر تمہیں تمہارے بارے میں بتائے گا۔ اللہ پر یہ بہت آسان ہے۔

﴿فَاٰمِنُوْۤا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِۦ وَالنُّوْرَ الَّذِیْۤ اَنْزَلْنَا وَاَللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

﴿حَبِيرٌ﴾

اس لیے اللہ پر ایمان لاؤ، اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس نور پر ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل کیا۔ یہاں نور سے مراد قرآن کریم ہے۔

**مؤمنین کا انجام:**

﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ يَوْمَ الْجَمْعِ ذَلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

جس دن اللہ تمہیں جمع کریں گے وہ بڑا خسارے کا دن ہے۔ جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے تو اللہ ان کے گناہ معاف فرمائیں گے اور انہیں جنت میں داخل فرمائیں گے جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جنتی ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا وَبِئْسَ الْمَصِيرُ﴾

اللہ جنتیوں کا تذکرہ فرماتے ہیں تو جہنمیوں کا ذکر بھی فرماتے ہیں۔ فرمایا: جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا تو یہ لوگ جہنم میں جائیں گے۔ جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔

**تکالیف آنے کی وجوہات:**

﴿مَا آصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ﴾

دنیا میں جو بھی تکلیف آتی ہے وہ اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی، اللہ کے حکم سے آتی ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ اللہ چاہتے ہیں کہ بندے کو تکلیف ہو بلکہ اس کا معنی یہ ہے

کہ انسان اسباب تکلیف جمع کر بھی لے لیکن اللہ نہ چاہیں تو تکلیف نہیں آسکتی۔  
 عموماً مصیبت آتی ہے گناہ کی وجہ سے۔ کبھی بندہ گناہ کرتا ہے تو گناہ کی وجہ سے تکلیف آجاتی ہے، کبھی تکلیف آتی ہے بندے کے گناہ کے کفارے کی وجہ سے کہ تکلیف آتی ہے تو بندے کے کسی گناہ کا کفارہ بن جاتی ہے اور کبھی تکلیف بغیر کسی گناہ کے رفع درجات کے لیے آتی ہے۔

دنیا میں انسان کو جو بھی مصیبت آئے تو اگر دیکھنا ہو کہ یہ کفارہ ہے یا یہ عذاب ہے یا رفع درجات کا ذریعہ ہے؟ تو یہ دیکھیں کہ اگر تکلیف کے آنے سے پہلے گناہ سے بچتا تھا اور تکلیف کے بعد بھی بچتا ہے تو یہ تکلیف رفع درجات کے لیے ہے۔ اگر پہلے گناہوں سے نہیں بچتا تھا لیکن تکلیف کے بعد بچنا شروع ہو گیا ہے تو یہ تکلیف کفارہ سینات کے لیے ہے اور اگر پہلے بھی گناہ کرتا تھا اور تکلیف کے بعد بھی گناہ کرتا ہے تو یہ تکلیف اس کے حق میں عذاب ہے، راحت کا ذریعہ نہیں ہے۔

﴿وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ اللّٰهُ قَلْبَهُ ۚ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝۶۱﴾

جو اللہ کو مانتا ہے، اللہ اس کے دل کو صبر اور رضا کی توفیق دیتے ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کو جانتے ہیں۔

﴿وَاطِيعُوا اللّٰهَ وَاطِيعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا

الْبَلٰغُ الْمُبِينُ ۝۶۲﴾

اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو۔ اگر تم نے منہ موڑا تو یاد رکھو ہمارے پیغمبر کی ذمہ داری صرف پہنچانا ہے۔ انکار کا وبال اور اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وََعَلٰی اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۶۳﴾

اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ مومنین کو چاہیے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

## ”بیوی اور اولاد دشمن ہیں“ کا مفہوم

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنِّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ

فَاخْذَرُواهُمْ﴾

اے ایمان والو! تمہاری بعض بیویاں اور تمہاری بعض اولادیں تمہارے دین کی دشمن ہیں، اس لیے تم ان سے احتیاط کرو۔

یہ آیت کریمہ کس موقع پر نازل ہوئی ہے؟ بعض کہتے ہیں فلاں خاص صحابی کے بارے میں ہے کہ وہ جہاد پر جانا چاہتے تو کبھی بیوی رکاوٹ بنتی، کبھی اولاد رکاوٹ بنتی کہ آپ ہمیں چھوڑ کر جائیں گے تو ہمارے پاس کون ہو گا؟ ان کی بات سن کر وہ رک جاتے۔ عوف بن مالک الاشجعی ان کا نام تھا۔ یہ بات ان کے بارے میں ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ یہ آیات ان صحابہ کرام کے بارے میں ہے جو مکہ مکرمہ میں تھے، مسلمان ہو گئے تھے۔ اس وقت جو شخص مکہ میں مسلمان ہوتا تو اس کے لیے ہجرت کرنا فرض تھا۔ اس کے ذمہ تھا کہ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ آئے۔ بعض اپنے گھر والوں کی وجہ سے مکہ نہیں چھوڑ سکے تو فرمایا کہ یہ تمہارے دین کے دشمن ہیں، ان سے بچو۔

﴿وَإِنْ تَعَفُّواْ وَتَصْفَحُواْ وَتَغْفِرُواْ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (۳۷)

اور اگر تم ان کو معاف کر دو۔ مثلاً اگر بیوی سے خطا ہو جائے اور تم سے معافی مانگے تو معاف کر دو، ”وَتَصْفَحُوا“ اور تم درگزر کرو! درگزر کا معنی کہ جب معافی دے دی ہے تو بار بار ملامت نہ کرو، اس کے جرم کو بار بار مت ذکر کرو۔ ”وَتَغْفِرُوا“ اور تم ان کو بخش دو۔ بخش دینے کا معنی کہ اب دل سے بھی نکال دو۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والے ہیں، رحم کرنے والے ہیں۔

﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ (١٥)

تمہارے اموال اور تمہاری اولاد امتحان ہیں اور اللہ کے پاس اجر عظیم ہے۔

﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ﴾

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم تھا کہ تقویٰ اختیار کرو۔ ان کو شبہ ہوتا کہ ہم تقویٰ اختیار کیسے کریں؟! ہم انسان ہیں اس لیے کبھی گناہ ہو جائیں گے، کبھی نیک عمل چھوٹ جائے گا، کبھی اللہ کے حکم پر عمل نہیں ہو گا۔ فرمایا: ”مَا اسْتَطَعْتُمْ“ تم اتنا کرو جتنا تمہارے بس میں ہے، پھر بھی کمی ہو جائے تو اللہ معاف فرمائیں گے۔ بات کو سنو، عمل کرو اور کچھ اللہ کی راہ میں صدقہ دو کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔

﴿وَمَنْ يُؤَقِّ شَحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (١٦)

اور جو بندہ بخل سے بچ گیا تو یہ انسان یقیناً کامیاب ہو جائے گا۔

﴿إِنْ تَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضْعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ﴾ (١٧)

اللہ شُکُورٌ حَلِيمٌ (١٧)

اگر تم اللہ کو قرض دو اخلاص کے ساتھ، یہ صورت قرض کی ہے لیکن درحقیقت صدقہ ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے بڑھا کر تمہیں دے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف بھی کرے گا۔ ”وَاللَّهُ شَكُورٌ“ اللہ قدر کرتے ہیں تو نیک اعمال قبول فرما لیتے ہیں، ”حَلِيمٌ“ اللہ بردبار ہیں کہ اگر بندہ گناہ کرے تو سزا فوراً نہیں دیتے، توبہ کا موقع دیتے ہیں، پھر بھی بندہ توبہ نہ کرے تو اس سزا کو آخرت تک مؤخر کر دیتے ہیں۔

﴿عَلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (١٨)

اللہ ظاہر اور باطن سب کو جانتے ہیں۔ غالب ہیں، حکمت والے ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



## سورة الطلاق

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا

الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ﴾

سورة الطلاق کو بعض روایات میں سورة النساء الصغریٰ بھی کہتے ہیں کیونکہ

اس میں تمام تراکام عورتوں کے متعلق ہیں۔

”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ“ اور ”يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ“ کہنے میں فرق:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ﴾.... قرآن کریم میں اللہ رب العزت کبھی ”يَا أَيُّهَا

النَّبِيُّ“ فرماتے ہیں اور کبھی ”يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ“ فرماتے ہیں۔ جب ”يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ“

فرمائیں تو اس وقت خاص نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرنا ہوتا ہے اور جب

”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ“ فرمائیں تو خطاب نبی کو ہوتا ہے لیکن احکام امت کو سنانے مقصود

ہوتے ہیں۔

طلاق کے متعلق چند احکام:

﴿إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ﴾.... یہاں سوال یہ ہے کہ جب ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ﴾

فرمایا تو بظاہر یہ تھا ”إِذَا طَلَقْت“ یعنی واحد کا صیغہ ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں واحد نہیں

بلکہ جمع کا صیغہ ”طَلَّقْتُمْ“ لائے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا ایک جواب تو میں نے ویسے ہی ذکر کیا کہ چونکہ مقصود امت کو احکام بتانے تھے اس لیے ”إِذَا طَلَّقْتُمْ“ جمع کا صیغہ فرمایا۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہاں لفظ ”قُلْ“ مخدوف ہے، عبارت یوں ہوگی: ”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ (قُلْ) إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ“ کہ آپ ایمان والو کو بتائیں کہ جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو۔

﴿النِّسَاء﴾.... یہاں نساء سے مراد وہ عورت ہے جس کے ساتھ خلوت صحیحہ ہو چکی ہو اور اگر خلوت صحیحہ نہ ہو تو اس کے لیے عدت ہے ہی نہیں۔ عورت کو طلاق ہو جائے اور خلوت صحیحہ نہ ہوئی ہو تو اس عورت کی عدت نہیں ہوتی۔ خاوند جب طلاق دے تو فوراً فارغ ہو جاتی ہے۔ خلوت صحیحہ کا معنی ہوتا ہے کہ ایسی بند جگہ ہو جہاں اگر شوہر اپنی بیوی سے ہمبستری کرنا چاہے تو کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ تو اس خلوت صحیحہ کو مباشرت کے قائم مقام قرار دے دیا جاتا ہے۔

﴿فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ﴾.... ان عورتوں کو ایسے وقت طلاق دو کہ عدت گزارنا ان کے لیے آسان ہو یعنی حالتِ طہر میں طلاق دو۔ جب ان کو طلاق دے دو اور عدت شروع ہو جائے تو عدت کو شمار بھی کیا کرو! عدت کا خیال عورت کو بھی کرنا چاہیے اور مرد کو بھی کرنا چاہیے لیکن خطاب مردوں کو فرمایا ہے کہ مرد اس کا اہتمام کریں۔

**عورت عدت کہاں گزارے؟**

﴿لَا تَخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ﴾

جب عورت کو طلاق ہو جائے تو عورت عدت کے دوران مرد کے گھر رہنے

کی پابند ہے، اس کا سکنیٰ مرد کے ذمے ہے، نفقہ مرد کے ذمے ہے، کھانا پینا اور رہائش بھی مرد کے ذمے ہے۔ یہ حق شوہر نہیں ہے بلکہ یہ حق شرع ہے۔ کیا مطلب؟ کہ ایک تو مرد اس کو گھر سے نکالے مت۔ دوسرا اگر مرد راضی بھی ہو کہ عورت کہے میں جانا چاہتی ہوں پھر بھی جانا جائز نہیں ہے۔ یہ شرع کا حق ہے، مرد کا حق نہیں ہے۔ اس لیے بلاوجہ عورتوں کے لیے ان کے گھروں سے خود بھی نکلنا جائز نہیں ہے اور مردوں کے لیے نکالنا بھی جائز نہیں ہے۔ دونوں حکم آگئے۔

﴿بُيُوتِهِنَّ﴾..... یہاں ”بیوت“ کی نسبت عورت کی طرف کی ہے حالانکہ ”بیوت“ کا مالک مرد ہے عورت نہیں ہے، اس میں عورت کا اعزاز بیان کیا ہے کہ جو تم نے عورت کو رہنے کے لیے گھر دیا ہے اس گھر سے عورت کو مت نکالو اور قرآن کریم میں تمام مقامات میں ”بیت“ کی نسبت عورت کی طرف کی ہے۔ ایک مقام پہ فرمایا:

﴿وَإِذْ كُنَّا مَا يَتْلُو فِي بُيُوتِكُنَّ﴾<sup>32</sup>

یہاں بھی بیت کی نسبت عورت کی طرف ہے۔

ہاں ایک مقام ایسا ہے کہ جہاں عورت گناہ کرتی ہے تو گھر کی نسبت عورت کی طرف نہیں رہتی۔ سورۃ النساء میں ہے:

﴿وَالَّتِي يَأْتِيَنَّ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ

أَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَإِنْ شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ﴾<sup>33</sup>

اب یہاں یہ نہیں فرمایا کہ ”فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي بُيُوتِهِنَّ“ کیونکہ جب

عورت نے گناہ کر لیا اور گناہ پر گواہ مکمل ہو گئے تو اب اس کا گھر ختم ہو گیا۔ اب اس نے سزا کے لیے گھر سے باہر نکلنا ہے۔ اس کا تذکرہ آگے آ رہا ہے:

**ان صورتوں میں خاوند کے گھر سے نکل سکتی ہے:**

﴿وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ﴾

نہ تم ان کو گھروں سے نکالو اور نہ یہ عورتیں خود نکلیں۔ یہ نہیں کہ شوہر راضی ہے تو چلی جائے۔ شوہر اگر جانے کے لیے راضی ہے پھر بھی ان کے لیے جانا جائز نہیں ہے بغیر کسی عذر شرعی کے۔ ہاں البتہ کچھ صورتوں میں عورت گھر سے نکل سکتی ہے، تم اس کو نکال سکتے ہو جب یہ عورت کسی فاحشہ مبینہ کا ارتکاب کرے۔

♦ فاحشہ مبینہ سے مراد کہ زنا کر لے اور گواہی سے ثابت بھی ہو جائے تو اب حد لگانے کے لیے اس کو گھر سے نکالو!

♦ ایک صورت فاحشہ مبینہ کی یہ بھی ہے کہ عورت زبان دراز بہت ہے، اس کے ساتھ رہنا بس میں نہیں ہے تو بھی نکال سکتے ہو۔

♦ اور تیسری صورت فاحشہ مبینہ کی یہ ہے کہ عورت خود گھر سے بھاگ کر نکل جائے۔ اب جانے دو اس کو۔

﴿وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۖ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ﴾

یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا تو شریعت کا نقصان نہیں بلکہ یہ اپنا نقصان کرے گا۔

﴿لَا تَذَرْنِي لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا﴾

جب تم شریعت کا خیال کرو گے، حدود اللہ کا خیال کرو گے تو ہو سکتا ہے کہ اللہ اس کے بعد کوئی بہترین صورت پیدا فرمادیں۔

﴿فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ  
وَأَشْهَدُوا ذَوَىٰ عَدْلٍ مِّنكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ ۚ ذَٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ مَن  
كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ﴾

جب یہ عورتیں عدت کے قریب ہو جائیں اب چاہو تو ان کو چھوڑ دو یعنی رجوع نہ کرو اور چاہو تو روک لو یعنی رجوع کر لو۔ دونوں صورتیں ٹھیک ہیں۔ اس پر تمہیں دو گواہ بنالینے چاہئیں اور شہادت کا بہت زیادہ خیال کرو۔ اللہ اس کے ذریعے نصیحت کرتے ہیں اس آدمی کو جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لاتا ہے۔

گواہ بنانا مستحب ہے، واجب نہیں۔ گواہ کیوں بنانے چاہئیں؟ ہو سکتا ہے کہ شوہر رجوع نہ کرے اور عورت کہہ دے کہ اس نے رجوع کیا تھا، اسی طرح اگر مرد نے رجوع نہ کیا ہو اور عدت پوری ہو جائے، اب عورت اس کے ساتھ دوبارہ نکاح نہیں کرنا چاہتی جبکہ شوہر کہتا ہے کہ نکاح کی تو ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں نے تو رجوع کیا تھا... تو دونوں طرف سے خدشہ ہے، اس لیے یہاں پر گواہ بنالینے چاہئیں۔

### تقویٰ پر ملنے والے انعامات:

﴿وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۖ﴾

اس سورت میں اللہ رب العزت نے تقویٰ پر پانچ انعامات کا ذکر فرمایا ہے:

[1]: "وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا" جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے مصائب سے نکلنے کا راستہ بنادیتے ہیں۔

[2]: "وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" اللہ اس کو بے گمان روزی عطا فرمادیتے ہیں۔

[3]: "وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا" اللہ ان کے لیے تمام امور میں

آسانیاں پیدا فرمادیتے ہیں۔

[4]: ”وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَكْفِرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ“ اور جو تقویٰ اختیار کرے اللہ اس کے گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں۔

[5]: ”وَيُعْظِمُ لَهُ أَجْرًا“ اللہ اس کو اجر عطا فرمادیتے ہیں۔

اور دوسرے مقام پر سورت انفال میں فرمایا:

﴿إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا﴾<sup>34</sup>

جب تم تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ حق اور باطل کے درمیان امتیاز عطا فرما دیتے ہیں کہ حق اور باطل میں فرق کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

یہ عجیب اللہ کی نعمت ہے کہ حق کا حق اور باطل کا باطل ہونا معلوم ہو جائے اور باطل کے وار سمجھ میں آجائیں۔ یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے۔ باطل ایسا وار کرتا ہے کہ بندہ اس کا وار سمجھتا نہیں ہے کہ باطل چاہتا کیا ہے! لیکن تقویٰ ایسی بڑی نعمت ہے کہ اللہ اس کے ذریعے حق اور باطل کے درمیان فرق کرنا سمجھا دیتا ہے اور یہ بات گناہوں کی آلودگی میں سمجھ نہیں آتی۔ اللہ ہم سب کو یہ نعمت عطا فرمائے۔

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ

بِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾<sup>35</sup>

جو اللہ پر توکل کرے تو اللہ اس کے لیے کافی ہے اور اللہ جو کام کرنا چاہتے ہیں وہ کر کے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اپنے علم کے مطابق متعین کر رکھا ہے۔

”توکل“ اور چیز ہے اور ”تعطل“ اور چیز ہے۔ اسباب اختیار کیے بغیر اللہ پر بھروسہ کرنا یہ تعطل ہے اور اسباب اختیار کر کے اللہ پر بھروسہ کرنا یہ توکل ہے۔ ہم

تعطل کے پابند نہیں ہیں بلکہ ہم توکل کے پابند ہیں۔

### جن کو حیض نہیں آتا ان کی عدت:

﴿وَالَّذِي يَدِينُ مِنَ الْمُحِيضِ مِنْ نِسَائِكُمْ إِذَا نَبَتْهُنَّ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ وَالَّذِي لَمْ يَحِضْ﴾

یہاں ان عورتوں کی عدت بتائی ہے کہ جن کو حیض نہیں آتا بڑھاپے کی وجہ سے یا بچپن کی وجہ سے تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اس میں حیض اور طہر کا کوئی دخل نہیں ہے۔

### حاملہ کی عدت:

﴿وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾

اور وہ عورت جو حاملہ ہے اس کی عدت وضع حمل ہے۔ جب بچہ پیدا ہو جائے تو عدت ختم۔ کسی عورت کو خاوند نے طلاق دی اور بچے کی پیدائش میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔ آدھے گھنٹے بعد بچہ پیدا ہوا تو اس عورت کی عدت فوراً ختم ہو جائے گی۔

﴿أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ﴾

اپنی حیثیت کے مطابق سکنی دو! عورت اگر مالدار ہو اور شوہر غریب ہو تو شوہر کے ذمے مالداروں والا سکنی اور رہائش نہیں ہے بلکہ اس کے ذمہ غریبوں والی رہائش ہے اور اگر عورت غریب ہو اور شوہر مالدار ہو تو پھر شوہر کی حیثیت کے مطابق امیروں والا سکنی اور امیروں والا نفقہ دینا ضروری ہے۔ اب شوہر کی حیثیت کا خیال کیا ہے۔

﴿وَلَا تُضَآرُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ﴾

عورتوں کو تنگ نہ کرو تکلیف دینے کے لیے کہ تم ان کو طلاق دو حیض میں

اس وجہ سے ان کی عدت لمبی ہو جائے گی، ایسا نہ کرو! تین طلاق اکٹھی بھی نہ دو! تم نے اس کو طلاق دے دی ہے اور جب آخری حیض آتا ہے تو پھر رجوع کر لیتے ہو، اس کے بعد پھر طلاق دیتے ہو، ایسا نہ کیا کرو!

﴿وَإِنْ كُنْ أُولَاتٍ حَمَلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ﴾

یعنی وہ عورت جس کو طلاق بائنہ ہو، طلاق مغلطہ ہو، طلاق رجعی ہو... کسی قسم کی طلاق ہو، کسی بھی قسم کی عدت ہو، اس کا نفقہ اور سکنی شوہر کے ذمے ہے۔

**بچے کو دودھ پلانے کا مسئلہ:**

﴿فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاتُّوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ﴾

اگر عورت حاملہ ہو اور بچہ پیدا ہو جائے تو عورت کی عدت تو ختم ہو گئی لیکن یاد رکھنا اگر عورت کو طلاق ہو اور عورت عدت میں ہو تو اس صورت میں شوہر کے بچے کو دودھ پلانا اس عورت کے ذمہ ہے، اس دودھ پلانے پر شوہر سے پیسے لینا جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ جب تک عورت عدت میں ہے اس کا نفقہ اور سکنی شوہر کے ذمہ ہے، اب پیسے کس بات کے لے گی؟! لیکن جب عورت کی عدت پوری ہو جائے تو اب دودھ پر پیسے لینا چاہے تو لے سکتی ہے۔ اب شوہر کتنے پیسے دے گا؟ تو جتنے عام معمول کے مطابق چلتے ہیں اتنے دے گا۔ یہ بھی درست نہیں کہ عورت پیسے زیادہ مانگے کیوں کہ مرد کی مجبوری ہے، اس نے دودھ تو مجھ سے پلوانا ہے.... اور شوہر کے لیے بھی یہ درست نہیں کہ وہ پیسے کم دے کیونکہ ماں ہے، اس نے دودھ تو پلانا ہی پلانا ہے۔ تو دونوں یوں نہ کریں بلکہ جتنے اس دور میں پیسے بنتے ہیں اس کا خیال کریں۔ یہ اس ساری بات کا خلاصہ ہے۔

﴿فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاتُّوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَاتَّبِعُوا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوفٍ ۚ﴾



وہ تمہارے لیے بچوں کو دودھ پلائیں تو ان کا خرچہ دو! کیونکہ اب تو عدت پوری ہو گئی ہے۔ اور باہمی مشورہ کرو کہ ماہانہ دودھ پلانے کے کتنے پیسے ہونے چاہئیں۔

﴿وَإِنْ تَعَاَسَرْتَ ثُمَّ فَسَّرْتُ ضِعْفَ لَهْ أُخْرَىٰ ۖ﴾

اگر شوہر اور بیوی میں بحث چل پڑے، تکرار ہو جائے اور کسی نتیجے پر نہ پہنچیں تو پھر کسی اور عورت سے دودھ پلوادو۔

﴿لِيُنْفِقَ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَن قَدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا

أَنشَأَ اللَّهُ ۖ﴾

ہر صاحب وسعت اپنی وسعت کے مطابق نفقہ دے اور جس شخص کا رزق تنگ ہو تو وہ اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے!

﴿لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ۖ﴾

یعنی اگر پیسے کم ہیں تو پھر بھی خرچہ دو، اپنی تنگی کا بہانہ نہ کرو کہ میرے پاس تو ہیں ہی نہیں، جو ہیں وہ بھی خرچ ہو جائیں گے تو اللہ اس کے بعد اور عطا فرمادے گا۔

﴿وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا

شَدِيدًا ۖ وَعَذَّبْنَاهَا عَذَابًا نُكَرًا ۖ﴾

کتنی بستیائیں ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے ان سے سخت حساب لیا اور انہیں سخت عذاب دیا۔ اس سے مراد اگر دنیا ہے تو پھر ”فَحَاسَبْنَاهَا“ ماضی کا صیغہ ہے، اس حساب سے اعمال کا وہ حساب مراد نہیں ہے جو حشر میں ہو گا۔ یہاں حساب سے مراد یہ ہے کہ ہم نے ان کو دنیا میں سزا دی ہے اور اگر اس سے مراد آخرت کا حساب ہے تو پھر ”فَحَاسَبْنَاهَا“ اور ”عَذَّبْنَاهَا“ یہ ماضی کا صیغہ تحقق کے لیے ہے کہ جہاں کسی کام کے کرنے کا یقین ہو وہاں پر ماضی کا صیغہ

استعمال کیا جاتا ہے۔

**حقیقی عقلمند کون؟**

﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ آمَنُوا قَدْ أَنْزَلَ اللَّهُ

إِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۖ﴾

یہاں عقل مند ایمان والوں کو بتایا گیا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو! اللہ نے تمہارے پاس ذکر بھیجا ہے۔ ذکر یعنی نصیحت کا پیغام۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص ایمان والا ہے وہ حقیقی عقل مند ہے اور جو ایمان قبول نہیں کرتا وہ جتنا بھی سمجھدار ہو وہ عقل مند نہیں ہے۔ عمرو بن ہشام کو ابو الحکم کہا جاتا تھا یعنی حکمتوں والا لیکن جب ایمان قبول نہیں کیا تو ابو الحکم کے بجائے ابو جہل کہا جانے لگا کہ اس کے پاس کوئی حکمت کی چیز نہیں۔ سب سے بڑی نعمت اللہ کی طرف سے ایمان ہے۔ ایمان قبول کیا تو عقلمند ہے اور اگر قبول نہ کیا تو بے وقوف ہو گا۔ حدیث مبارک میں ہے:

”الْكَيْسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ“ عقل مند وہ شخص ہے جو موت کی تیاری کرے، ”وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَلَّى عَلَى اللَّهِ“ اور بے وقوف شخص وہ ہے کہ جو نیک عمل نہ کرے بس اسی خواہش پر رہے کہ اللہ بخش دیں گے۔ ایسے ہی بلا وجہ امیدوں پر کھڑا رہے، فرمایا کہ یہ بہت بڑا بے وقوف آدمی ہے۔<sup>35</sup>

**سات آسمان اور سات زمینیں:**

﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۚ

اللہ رب العزت کی ذات وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا فرمائے اور انہی کی طرح سات زمینیں بھی پیدا فرمائیں۔

﴿مِثْلَهُنَّ﴾.... مثل کی دو قسمیں ہوتی ہیں؛ مثل بالکم اور مثل بالکیف۔  
کیا مطلب کہ ایک چیز دوسری کی طرح ہو مقدار میں تو یہ مثل بالکم ہے اور اگر ایک چیز دوسری کی طرح ہو کیفیت میں تو یہ مثل بالکیفیت ہے۔

میں ایک بات کہہ چکا ہوں کہ اشکال ہوتا ہے کہ ﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا﴾<sup>36</sup> میں اللہ نے فرمایا کہ اگر صحابہ جیسا ایمان ہو گا تو تمہیں نجات ملے گی، صحابہ جیسا ایمان نہیں ہو گا تو تمہیں نجات نہیں ملے گی۔ اس پر سوال یہ تھا کہ صحابہ جیسا ایمان تو امت کے بس میں نہیں ہے، جو ایمان صحبتِ نبوت سے ملتا ہے وہ صحبتِ نبوت کے بغیر کیسے مل سکتا ہے؟ صحبتِ نبوت کی وجہ سے آدمی کا ایمان کمال تک پہنچ جاتا ہے، اس کے لیے اعمال کی حاجت بھی نہیں ہوتی! تو اس کا کیا معنی کہ صحابہ جیسا ایمان ہو گا تو تمہیں نجات ملے گی۔ یہ تو بظاہر تکلیف مالا یطاق ہے کہ ایسے کام کا مکلف بنانا ہے کہ جو بندے کے بس میں نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا تھا کہ یہاں مثل فی الکلم مراد ہے، کیفیت مراد نہیں ہے۔

یعنی یہ مراد نہیں کہ تمہارے ایمان کی کیفیت وہ ہو جو صحابہ کے ایمان کی کیفیت تھی، یہ تو ممکن ہی نہیں ہے بلکہ یہاں مراد یہ ہے کہ جن جن چیزوں پر صحابہ رضی اللہ عنہم ایمان لاتے تھے ان ان چیزوں پر تم ایمان لاؤ گے تو کامیاب ہو جاؤ گے، ان میں سے ایک چیز بھی چھوڑ دو گے تو تم ناکام ہو جاؤ گے۔ صحابہ پانچ نمازیں مانتے تھے اب تم نے بھی پانچ ماننی ہیں، تم چار مانو گے تو ناکام ہو جاؤ گے لیکن جس کیفیت سے وہ

پڑھتے تھے ویسے تم پڑھو یہ مطلوب نہیں ہے۔ اشکال اس لیے پیدا ہوا کہ ہمارے ذہن میں کیفیت ہے کہ جو صحابہ کے ایمان کی کیفیت ہے تمہارے ایمان کی بھی وہی کیفیت ہونی چاہیے، یہ مراد نہیں ہے بلکہ یہاں کمیت مراد ہے کہ جتنی چیزوں پر صحابہ ایمان لائے اتنی پر تم بھی ایمان لاؤ۔

اور یہاں ﴿مِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ میں جو مثل ہے تو اس سے مراد مثل فی الکم ہے، کیفیت نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ آسمان بھی سات ہیں تو ان کی مثل زمینیں بھی سات ہیں اور مثل سے مراد کیفیت نہیں ہے، مثل سے مراد کمیت ہے یعنی سات آسمان اور سات زمینیں کیفیت میں ایک جیسی نہیں ہیں۔ زمین و آسمان کے درمیان فاصلہ ہے، اسی طرح ہر دو آسمانوں کے درمیان بہت طویل فاصلہ ہے تو کیا ہر دو زمینوں کے درمیان بھی اتنا طویل فاصلہ ہے؟ یہ ہمارے علم میں نہیں ہے اور نہ یہ ضروری ہے۔ ہر دو آسمانوں کے درمیان ملائکہ کی ایک بہت بڑی تعداد ہے تو کیا ہر دو زمینوں کے درمیان بھی اسی طرح کی مخلوق ہوگی، یہ ضروری نہیں ہے کیونکہ یہاں پر مثل سے مراد کمیت ہے، کیفیت نہیں ہے۔

### اثرا بن عباس کی توجیہ (از حضرت نانوتوی)

اگرچہ بعض روایات میں ساتوں زمینوں پر مخلوقات کا ہونا بھی منقول ہے۔ جس طرح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ کی کتاب ہے ”تخذیر الناس عن انکار اثرا بن عباس“ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک اثر ہے کہ جس طرح سات آسمان ہیں اسی طرح اللہ نے سات زمینیں پیدا فرمائی ہیں اور ہر زمین میں ”نَبِيٌّ كُنْيَتُكُمْ وَاَدَمُ كَاَدَمَ، وَنُوحٌ كَنُوحَ، وَإِبْرَاهِيمُ كِابْرَاهِيمَ، وَعِيسَى

گَعِيسَى“<sup>37</sup> کہ ان میں نبی ہیں جیسے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آدم ہیں آدم جیسے، نوح ہیں نوح جیسے، ابراہیم ہیں ابراہیم جیسے اور عیسیٰ ہیں عیسیٰ جیسے علیہم السلام، اور اسی پر اشکال ہے کہ اگر سات زمینوں میں سے ہر زمین پر محمد ہیں تو خاتم الانبیاء کون سے محمد ہوں گے؟۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا انکار کر دو۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انکار نہ کرو بلکہ صحابی کے قول کا معنی ایسا بیان کرو کہ جس پر کوئی اشکال باقی نہ رہے۔ تو ”تحذیر الناس“ اصل میں اس اعتراض کا جواب ہے اور یہ بڑی بہترین پڑھنے والی مدلل کتاب ہے۔ اللہ ہم سب کو پڑھنے کی اور پھر سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سات زمینیں ہیں اوپر نیچے، توجو دنیا کا ضابطہ ہے کہ سات منزلہ مکان ہو تو ساتویں منزل کو آخری کہتے ہیں، پہلی منزل کو آخری نہیں کہتے۔ اسی طرح ساتویں زمین کو آخری کہتے ہیں، پہلی کو آخری نہیں کہتے۔ توجب ہماری زمین آخری ہے تو ہماری زمین کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی آخری ہوں گے۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چھ زمینیں نہ ماننا اور صرف ایک زمین میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ماننا یہ اتنا باعث کمال نہیں ہے جتنا چھ زمینوں میں محمد مان کر اس ہماری زمین کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے افضل ماننا یہ کمال ہے۔ عجیب توجیہ فرمائی ہے۔ فرمایا کوئی بادشاہ ایک ملک کا بادشاہ ہو اور دوسرا بادشاہ ایک ملک کا نہیں ہے بلکہ چھ ملک اور بھی ہیں، ان چھ ممالک کے چھ بادشاہ ہوں اور یہ ساتویں ملک کا بادشاہ ان چھ ملکوں کے بادشاہوں کا بھی بادشاہ ہو اور اپنے ملک کا

بھی بادشاہ ہو تو اب بتاؤ! زیادہ فضیلت کس میں ہے؟ چھ ملکوں کے بادشاہ مان کر ان کو ان چھ کے اوپر بادشاہ مانا جائے اس میں فضیلت زیادہ ہے یا چھ اور ملکوں کے بادشاہ ہی نہ مانے جائیں؟

ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں فضیلت زیادہ ہے جب چھ ملکوں کے بادشاہ مان کر ان کے اوپر بادشاہ مانا جائے۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ عجیب بات فرماتے ہیں، حضرت نانوتوی فرماتے ہیں کہ یہ توجیہ اگر مجھ سے پہلے کسی کے ذہن میں نہیں آئی تو اس سے میرا بڑا ہونا تھوڑا لازم آتا ہے، ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ چھوٹوں کے ذہن میں ایسی بات آئی جو بڑوں کے ذہن میں نہیں آئی۔ عجیب تواضع ہے حضرت رحمہ اللہ کی۔ میں اس لیے کہتا ہوں کہ توجیہ آپ بدلتے رہیں لیکن موقف نہ تبدیل ہو۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ ایک یہ ہے کہ آپ ایسی توجیہ بیان کریں کہ موقف ہی تبدیل ہو جائے، یہ تو بہت بڑا ظلم ہے۔

**ناقل بنو محقق نہیں:**

ہمارے ہاں ہر ماہ فیصل آباد میں جمعرات کے دن طلبہ اور بطور خاص علماء میں جو پروگرام ہوتا ہے اس میں ایک بات میں نے انہیں بھی عرض کی تھی اور میں آپ سے بھی عرض کرتا ہوں کہ تمام طلبہ یہ ذہن بنا لو کہ ہم نے مسلک اہل السنۃ والجماعۃ احناف دیوبند کا ناقل بننا ہے محقق نہیں بننا! حدیث پاک میں علامات قیامت میں سے ایک علامت یہ ہے کہ ”وَلَعَنَ آخِرُ هَذِهِ الْأُمَّةِ أَوْلَهَا“<sup>38</sup> کہ بعد والے پہلے والوں پر لعنت کریں گے۔ اگر بعد والے ناقل ہوں گے تو پھر لعنت نہیں کریں گے اور جب بعد والوں میں سے ہر بندہ محقق بنے گا تو پھر لعنت کی نوبت آئے گی۔

ایک مسئلے پر چودہ سو سال سے تحقیق ہو چکی ہے، اب میں ان کے مقابلے میں نئی تحقیق پیش کرتا ہوں اور ان کو ٹھیک نہیں کہتا تو میں تو شاید اعتدال کر لوں لیکن میرے ماننے والے ان کو برا کہیں گے، مجھے اچھا کہیں گے اور اب لعنت شروع ہو جائے گی، اور اگر چودہ سو سال کی جو تحقیق ہے میں اسی کو آگے لے کر چلوں، اسی کو سمجھاؤں، اس پر ہونے والے اشکال کا جواب دوں تو اب بعد والے لعنت نہیں کریں گے۔

اس کو میں دوسرے لفظوں میں یوں سمجھاتا ہوں کہ آج ہر بندہ کہتا ہے کہ امت کو جوڑنا چاہیے۔ اب اس کے دو مفہوم ہیں؛ ایک یہ کہ بعد والی امت کو پہلی امت سے جوڑو تا کہ تسلسل باقی رہے اور ایک یہ ہے کہ بعد والوں کو تو پہلوں سے کاٹ دو لیکن موجودہ مختلف طبقات کو جوڑو! تو لوگوں کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ امت کے جو موجودہ طبقات ہیں ان کو جوڑو۔ ہم کہتے ہیں کہ نہیں، ان کو جوڑو نہ جوڑو یہ بعد کا مسئلہ ہے لیکن بعد والوں کو پہلوں سے جوڑو تا کہ امت کا تسلسل برقرار رہے اور اکابرین امت پر اعتماد بحال رہے۔

ایسی تحقیق پیش کرنا جو پہلوں کے خلاف ہو اس سے آدمی کو بچنا چاہیے۔ اگر آپ کی تحقیقات پہلوں کے خلاف ہیں اور آپ دلائل کی بنیاد پر تحقیق کے قائل ہوئے ہیں تو پھر بھی آپ کا ذہن تو ہے نا کہ آپ نبی نہیں ہیں، امتی ہیں، نبی کا اجتہاد ہو تو اس میں بھی بعض مرتبہ خطا ہو جاتی ہے تو ہمارے اجتہاد میں خطا کیسے نہیں ہوگی۔ ایک اجتہاد پہلے والوں کا ہے اور ایک اجتہاد آج کا ہے، ہم اپنے اجتہاد کو قربان کر دیں پہلے والے اجتہاد پر، ایک وقت آئے گا کہ اللہ کریم دلیل بھی عطا فرمادے گا۔

اچھی طرح بات ذہن نشین فرمائیں اور اس کا ذہن بھی بنالیں کہ اگر آپ کی تحقیق اکابرین والی ہوگی اور اسی کو لے کر چلیں گے تو جو مدد اکابرین کے ساتھ تھی وہی

مدد آپ کے ساتھ ہوگی، جو محبوبیت لوگوں میں ان کی تھی وہی آپ کی ہوگی، جو مقبولیت اللہ کے ہاں ان کو حاصل تھی وہی آپ کو ہوگی اور قیامت کے دن جو مقام ان کا ہوگا اللہ اس مقام پر آپ کو بھی لے کر جائے گا۔

﴿يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمْنَ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾

تو بات چل رہی تھی کہ سات آسمان اور سات ہی زمینیں ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ آسمانوں اور زمینوں میں اللہ کے فیصلے اترتے ہیں تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اللہ کے حکم کی دو قسمیں ہیں؛ ایک ہے حکم تشریعی اور دوسرا ہے حکم تکوینی۔ اگر یہاں ”امر“ سے مراد وہ احکام ہوں جو اللہ رب العزت فرشتوں کے ذریعے اپنے نبی کو اور نبی کے واسطے سے انسانوں اور جنات کو دیتے ہیں تو اس کو حکم تشریعی کہتے ہیں کہ یہ کرو گے تو ثواب ملے گا، نہیں کرو گے تو گناہ ہوگا۔ یہ حکم تشریعی ہے۔ اگر اس زمین کے نیچے والی زمینوں پر بھی مخلوق ہو اور ”الْأَمْرُ“ سے مراد حکم تشریعی ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، اور اگر ”الْأَمْرُ“ سے مراد حکم تکوینی ہو تو پھر ساتوں زمینوں پر جن وانس کا ہونا کوئی ضروری نہیں، حکم تکوینی جس طرح انسانوں اور جنات پر لاگو ہوتے ہیں اسی طرح حکم تکوینی دیگر مخلوقات پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔ پھر اشکال ہی کوئی نہیں رہتا۔

**معیت ذاتیہ:**

﴿وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾

اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔

اس سے کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے کہ یہاں ”عِلْمًا“ کی بات کی ہے،



یہاں ”ذَاتًا“ کی بات تو نہیں کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احاطہ علمی تو ہے احاطہ ذاتی نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کریم میں ﴿وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾<sup>39</sup> ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں ﴿وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطًا﴾<sup>39</sup> بھی ہے۔ دونوں آیتیں موجود ہیں، احاطہ علمی بھی ہے اور احاطہ ذاتی بھی ہے اور جب علم الہی؛ ذاتِ الہی سے جدا نہیں ہے تو حضرت گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جہاں علم ہو گا وہاں ذات ہوگی، پھر تو احاطہ علمی سے احاطہ ذاتی خود بخود مراد ہو گا۔<sup>40</sup>

حضرت تھانوی رحمہ اللہ بہت پیاری بات فرماتے ہیں کہ ہمارے جن مشائخ نے معیتِ ذاتیہ کا انکار کیا ہے بظاہر لگتا ہے کہ وہ تجسیم کی نفی کرنا چاہتے ہیں کہ لوگ معیتِ ذاتی کو تجسیم نہ سمجھ لیں، اس لیے یہ حضرات معیتِ ذاتیہ کی نفی کر لیتے ہیں اور معیتِ وصفی کے قائل ہو جاتے ہیں۔

اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة التحريم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ ط

وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾

سورت کا شان نزول:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ عصر کی نماز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے کھڑے تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے پاس تشریف لے جاتے، یہ آپ کا معمول تھا۔ ایک دن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور معمول سے زیادہ ٹھہرے۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہد پیش کیا۔ آپ نے شہد پی لیا۔ اس کے بعد حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کی باری تھی۔ تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے جس کے پاس تشریف لائیں تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہے کہ حضور! آپ نے مغفیر پیا ہے! مغفیر ایک گوند ہوتا ہے اور اس میں خاص قسم کی کچھ بو بھی ہوتی ہے۔

چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے کہا کہ حضور! آج تو آپ کے منہ سے گوند مغفیر کی بو آ رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، میں نے تو شہد پیا ہے۔ انہوں نے

کہا کہ ہو سکتا ہے کہ مکھی نے مغایر گوند چوسا ہو اور اس سے شہد بنا ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں آئندہ شہد نہیں پیوں گا اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ زینب کو یہ بات نہ بتانا، اس کا دل دکھے گا۔ انہوں نے آگے بات بتادی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اور یوں بات آگے نکل گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آگئی، ساری بات علم میں آگئی تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تمہیں ایک بات آگے بتانے سے منع کیا تھا لیکن تم نے پھر آگے بتادی، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دینے کا بھی ارادہ کیا تھا کہ میں نے منع کیا اور پھر بھی تم نے ایسا کیا! جبرائیل امین علیہ السلام حاضر ہوئے، کہا کہ حضرت حفصہ کو طلاق نہ دیں، یہ بہت نیک عورت ہیں، نمازیں بہت پڑھتی ہیں، ان کو کچھ نہ کہیں! تو یہ اس کا خلاصہ ہے۔ اللہ کی طرف سے حکم آگیا کہ آپ نے جو قسم کھائی ہے اس کا کفارہ ادا کریں اور اپنی قسم کو توڑ دیں۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتِ أَزْوَاجِكَ

وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾

اے نبی! آپ ان چیزوں کو کیوں حرام کرتے ہیں جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کی ہیں اور وہ بھی اپنی بیویوں کی خوشنودی کے لیے، ﴿وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ یہ جو آپ نے کیا ہے یہ گناہ نہیں ہے، گناہ ہوتا ہم تب بھی معاف کر دیتے!

یہاں بظاہر اسلوب ایسے ہے کہ جیسے آپ سے جواب طلبی ہو رہی ہے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا! حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ حقیقت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اللہ نے شفقت والا معاملہ کیا ہے کہ ہم نے شہد حلال کیا ہے تو آپ نے اپنے اوپر کیوں حرام کیا ہے؟ اب کفارہ دیں، قسم توڑیں، کیوں آپ حلال کو حرام

کرتے ہیں؟ یہ شفقت کی باتیں ہو رہی ہیں لیکن اسلوب ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے جواب طلبی ہو، اس لیے فرمایا ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ کہ اگر ہو بھی تو ہم رحم کرنے والے ہیں۔

### الیاس! تم نے خون کیوں دیا؟

میں اس پر اپنا ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں، شاید پھر آپ کو جلدی بات سمجھ آ جائے۔ میں جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد میں درجہ خامسہ میں پڑھتا تھا۔ وہاں ایک طالب علم تھے ڈی آئی خان کے مولانا عبید اللہ صاحب، مدرسہ کے ساتھ ایک بڑا گراؤنڈ تھا اس میں فٹبال کھیتے تھے عصر کے بعد۔ مولانا عبید اللہ کھیل کے دوران دوڑتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگے تو بازو ٹوٹ گیا، خون نکلا تو اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ لڑکوں نے خون دینا چاہا لیکن گروپ نہیں ملا، میرا گروپ مل گیا تو میں نے خون دے دیا۔ دوسرے دن ظہر کے بعد میں سبق میں تھا تو استاذ جی شیخ نذیر صاحب رحمہ اللہ کلاس کے باہر تشریف لائے اور مجھے بلایا: الیاس! ادھر آؤ۔ مجھے باہر لے گئے اور فرمایا: تو نے خون کیوں دیا؟ اور کوئی لڑکا نہیں تھا؟ اس طرح مجھے ڈانٹا۔

میں جس مدرسے میں پڑھتا تھا تو ایسے پڑھتا تھا کہ اساتذہ کو بھی مزا آتا تھا۔ پھر مجھے کمرے میں لے گئے، دو سو روپے دیے اور کہا کہ ان سے دودھ پینا! پھر مجھے کھجوریں دیں، پھر کہا کہ میرے کمرے میں پنخیری پڑی ہے، تم کھا لینا۔ اب دیکھنے والا کیا سمجھ رہا ہے کہ استاذ ڈانٹ رہا ہے لیکن یہ ڈانٹنا نہیں تھا، یہ شفقت تھی کہ تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

تو اللہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے شفقت فرما رہے ہیں کہ آپ نے کیوں حرام کیا؟ آپ شہید کیا کریں! اب بتاؤ شفقت ہے کہ نہیں؟ لیکن اس پوری بات کو نہ سمجھیں تو بندہ سمجھتا ہے کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غلطی ہو گئی ہے کہ آپ

نے شہد کو حرام فرمایا ہے۔

## حلال کو حرام سمجھنے کے تین درجے:

کسی حلال چیز کو حرام کرنے کے تین درجے ہیں:

- [1]: حلال کو اعتقاداً حرام سمجھے، یہ کفر ہے۔
- [2]: اعتقاداً تو حرام نہ سمجھے لیکن کسی مصلحت کی وجہ سے قسم کھا کر حرام کر لے، یہ گناہ تو نہیں ہے لیکن مناسب بھی نہیں ہے اور اگر بغیر کسی مصلحت اور فائدے کے حرام کر لے تو یہ گناہ ہے۔

[3]: اعتقاداً بھی حلال سمجھے اور قسم کھا کر حرام بھی نہ کرے البتہ کسی عذر کی وجہ سے اس کے ساتھ معاملہ ایسا کرے کہ جیسے حرام سمجھتا ہے۔ جیسے ایک آدمی شوگر کا مریض ہو، اس سے پوچھا جائے کہ چائے پیو گے؟ وہ کہے کہ میں نے تو چائے اپنے اوپر حرام کی ہوئی ہے، میں نے نہیں پینی! اب اس طرح حلال کو حرام کرنا یہ حرام نہیں ہے یعنی عملاً ایسے ہے کہ گویا حرام ہے۔ ایک بندہ کہتا ہے کہ حرام ہے کہ میں نے دس سال سے یہ بات کی ہو! کسی مصلحت و ضرورت کی وجہ سے ایسا کہنا جائز ہے لیکن بہتر نہیں ہے۔ تو ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی عذر کی وجہ سے حلال چیز کو چھوڑ دیا ہو، کبھی عذر بیماری ہوتی ہے اور کبھی عذر باطنی اصلاح ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی تھی مصلحت کی وجہ سے تو فرمایا کہ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ کیا محبت کا انداز ہے اللہ کا اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ!

﴿قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ

الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾

اللہ نے تمہاری قسموں سے نکلنے کا طریقہ مقرر فرما دیا ہے، اللہ تمہارا مولا

ہے، اللہ جانتا ہے حکمتوں والا ہے۔

یعنی آپ اپنی قسموں کو توڑیں اور اس کا کفار ادا کریں۔

﴿وَإِذْ أَسْرَ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ

اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بَعْضُهُ وَاعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ

أَنْبَأَكَ هَذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ﴾

اس وقت کو یاد کرو کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی بیوی سے کوئی راز کی بات کی تھی اور جب اس بیوی نے آگے بات بتائی تو اللہ نے نبی کو بتادی۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے پوری بات بتادی لیکن اللہ کے نبی نے پھر بھی یہ پوری بات بیوی سے نہیں کی تاکہ ان کو زیادہ شرمندگی نہ ہو، بس اتنا کہا کہ تم نے اچھا نہیں کیا، ہمارا راز افاش کیا، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس بیوی نے عرض کیا کہ حضور! آپ کو کس نے بتایا؟ فرمایا: مجھے اللہ نے بتایا جو علیم اور خبیر ذات ہے۔

**محبت رسول مطلوب ہے:**

﴿إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا﴾

آیت سمجھنا ذرا! اس سے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن پر کبھی شبہ نہیں ہو گا۔ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے ایسا کام کیوں کیا تھا؟ اصل میں وہ چاہتی تھیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت زیادہ سے زیادہ حاصل کریں اور نبی کی محبت زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا یہ شریعت میں مطلوب ہے۔ ایسے طریقے اختیار کرنا کہ جس سے کوئی بندہ پیغمبر کا محبوب بنے یہ مطلوب ہے لیکن اس میں ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا کہ جس سے دوسرے کی حق تلفی کا خدشہ ہو تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تو فرمایا: ﴿إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا﴾ کہ عائشہ اور حفصہ! تم نے یہ سارا کام

کیوں کیا تا کہ حضور کی محبت ہم سے زیادہ ہو، زینب سے کم ہو تو تم توبہ کرو! ”فَقَدْ صَعَتُ“ تمہیں توبہ کرنی چاہیے! یہ ”ف“ تعلیل ہے، مطلب کہ تمہیں توبہ کا حکم اس لیے ہے کہ تمہارے دل مائل ہو گئے تھے اس بات کی طرف کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب بن جائیں اور زینب کی محبت کم ہو جائے۔ اگر زینب کی محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کم ہوئی تو زینب کے حقوق میں کمی کا خدشہ ہے، اس لیے تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو!

﴿إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ﴾ کہ اگر تم نے توبہ کی، یہاں ”إِنْ“ شرطیہ کی جزاء مخدوف ہے یعنی ”اگر تم نے توبہ کی تو بہت اچھا ہے۔“

﴿وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيرٌ﴾

اگر توبہ نہ کرو اور تم چاہو کہ ہم ایسی کوشش کریں کہ نبی پر غالب آجائیں تو یہ نہیں ہو سکتا! کیوں، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست تو اللہ تعالیٰ ہیں اور جبرائیل علیہ السلام ہیں اور نیک ایمان والے ہیں، پھر فرشتے آپ کے مددگار ہیں۔ تو تم ایسی باتوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر غالب نہیں آ سکتیں!

﴿عَسَىٰ رَبُّهُ أَنْ يُلَاقَكُمْ أَنْ تُبَدِّلَهُ آذَانًا حَيْرَانًا مِّنْكُمْ مُّسْلِمًا

مُؤْمِنًا قَنِتًا تَبَيَّنَتْ عِدَّتِ سَبَّحَتْ تَبَيَّنَتْ وَابْكَارًا﴾

اور اگر تمہارے ذہن میں یہ ہو کہ ﴿لَسْنَا كَأَحَدٍ مِّنَ الدِّسَاءِ﴾ ہم کائنات میں سب سے بہترین عورتیں ہیں، ہم سے بہتر کون سی عورت ہو گی جس سے حضور نکاح کریں گے! فرمایا کہ ٹھیک ہے ابھی تو تم بہتر ہو لیکن جب اللہ فیصلہ فرمائیں گے تو تم سے بھی بہتر عورتیں ہو جائیں گی۔

﴿عَسَىٰ رَبُّهُ إِنَّمَا طَلَعَتِ الْغُصْنُ﴾.... یہ اشکال کا جواب ہے کہ نبی کی بیویاں تو سب سے بہتر ہوتی ہیں تو ان سے بہتر کون سی عورت ہو سکتی ہے؟ فرمایا: اگرچہ اس وقت تو تم سب سے بہتر ہو اور تم سے بہتر دنیا میں کوئی عورت موجود نہیں ہے لیکن جب نبی تمہیں طلاق دینے کا فیصلہ کریں گے تو پھر اللہ تم سے بہتر عورتیں بنادیں گے یا کچھ عورتوں کو تم سے بہتر بنادیں گے، وہ نبی کے نکاح میں آجائیں گی تو اللہ تمہارے بدلے میں اپنے نبی کو دیں گے، ایسی بیویاں ”مُسْلِمَاتٌ“ جو اطاعت بھی کریں، ”مُؤْمِنَاتٌ“ ان کے عقیدے بھی ٹھیک ہوں، ”قَنِیَّتٌ“ فرمانبرداری بھی کریں، ”تَّيْبَتٌ“ اللہ کی طرف متوجہ بھی ہوں، ”عَبِيدَتٌ“ عبادت بھی کریں، ”سَّيِّحَتٌ“ روزے بھی رکھیں، ”تَّيْبَتٌ وَابْتَكَارًا“ ان میں سے کچھ باکرہ؛ کنواری ہوں گی اور کچھ ثیبہ؛ پہلے سے شادی شدہ ہوں گی۔

### اپنی اور گھر والوں کی فکر کیجیے!

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے، اس آگ پر ایسے فرشتے مامور ہیں جو تند خو اور سخت مزاج ہیں، اللہ جو حکم انہیں دے اس میں اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! خود کو جہنم کی آگ سے بچائیں یہ تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اہل و عیال کو کیسے بچائیں؟ فرمایا کہ خود گناہوں سے بچو اور ان کو بھی گناہوں سے بچاؤ، خود نیک اعمال کرو اور ان کو بھی نیک اعمال پہ لاؤ تو یہ



بھی آگ سے بچ جائیں گے۔

### توبہ نصوحا کیا ہے؟

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾

اے ایمان والو! خالص توبہ کرو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے خالص توبہ یہ ہے کہ:

- 1: جو گناہ کیا ہے اس پر آدمی کو ندامت ہو جائے۔
- 2: جو فرض چھوڑ دیا تھا اس کی قضا کر لے۔
- 3: کسی کا مال لوٹا تھا تو اس کو واپس کر دے۔
- 4: کسی سے زیادتی کی تھی تو اس سے معافی مانگ لے۔
- 5: آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کر لے۔
- 6: اور جس طرح نفس کو گناہ کرتے دیکھا تھا اسی طرح نفس کو اللہ کی اطاعت کرتے بھی دیکھے! یہ ہے توبہ نصوحا۔

﴿عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾

قرآن کریم میں بار بار یہ بات آئے گی کہ جب تم خالص توبہ کرو گے تو تمہیں امید رکھنی چاہیے کہ اللہ تمہارے گناہوں کو معاف فرما دیں گے۔ تو جب اللہ نے گناہوں کے معاف کرنے کا وعدہ کیا ہے تو پھر امید نہیں یقین ہونا چاہیے، پھر ”عَسَىٰ“ یعنی امید کا لفظ کیوں لاتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان نیک عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نیک عمل پر دنیا میں نعمتیں دیتے ہیں۔ اس نیک عمل کے بدلے میں نعمت تو مل گئی، اب جنت کس بات کی؟! اگرچہ ہم نے وعدہ کیا تھا لیکن جو تم نے عمل کیا تھا اس کا بدلہ تو تمہیں دنیا میں مل گیا تھا، اس لیے اب تمہیں امید ہونی چاہیے۔

## پیغمبر کو جہاد اور سختی کا حکم:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾

یہاں اللہ نے دو حکم دیے ہیں:

1: جہاد کا

2: سخت ہونے کا

جہاد کرنے کا تعلق کفار کے ساتھ ہے اور سخت ہونے کا تعلق منافقین کے ساتھ ہے یعنی کفار سے جہاد کرو اور منافقین پر سختی کرو۔

اب کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو سختی نہیں فرماتے تھے تو یہ بالکل غلط بات ہے۔ جب تک اسلام کا غلبہ نہیں تھا تو اس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نرمی فرمائی ہے۔ پارہ نمبر گیارہ کے پہلے اور دوسرے رکوع میں آپ تفسیر ابن کثیر اٹھا کر دیکھ لیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر بیٹھے اور ایک ایک منافق کا نام لے کر مسجد سے نکالا ”أُخْرِجْ يَا فُلَانُ! أُخْرِجْ يَا فُلَانُ!“ نکل جاؤ مسجد سے! جب تک غلبہ نہیں تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت نرمی فرمائی ہے اور جب غلبہ ہو گیا تو پھر صفوں سے باہر نکال دیا۔ اس لیے یہ غلطی کبھی بھی نہ کرنا کہ مکی دور کی بات لے کر تم مدنی دور پر فٹ کر دو! اللہ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

## دو مومن اور دو کافر عورتوں کی مثال:

﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتٍ زُوحٍ وَّامْرَأَتٍ نُّوَطٍ﴾

حضرت نوح علیہ السلام نبی ہیں اور بیوی کا کافرہ ہے، نام واغلہ ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نبی ہیں اور بیوی کا کافرہ ہے، اس کا نام والہہ ہے۔ دونوں کفر پر تھیں اور

پیغمبر کا ساتھ نہیں دیا تو دونوں جہنم میں گئیں۔

﴿وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَاتٍ فِزَعُونَ﴾

فرعون کی بیوی آسیہ کافر کی بیوی ہیں لیکن نبی کا ساتھ دیا تو جنت میں گئیں۔

﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ

رُوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتِبَ لَهَا مِنَ الْخَيْرَاتِ أَلْفٌ﴾

حضرت مریم علیہ السلام کا خاوند نہیں تھا۔ ان کے والد مسجد اقصیٰ کے امام

تھے۔ بہت بڑے آدمی تھے۔

اللہ نے دو مومن عورتوں اور دو کافرہ عورتوں کی مثالیں دی ہیں۔ اللہ ہم

سب کو نیک بنادیں اور ہماری عورتوں کو بھی نیک بنادیں اور ہم سب کو شریعت پر عمل

کرنے کی توفیق عطا فرمادیں۔ آمین

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الملك

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾

### سورة الملك کی فضیلت:

سورة الملك کا ایک نام ”الْمَانِعَةُ“ ہے اور ”الْمُنْجِيَةُ“ بھی ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

هِيَ الْمَانِعَةُ هِيَ الْمُنْجِيَةُ تُنْجِيهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ.<sup>41</sup>

کہ سورة الملك عذابِ قبر کو روکنے والی اور عذابِ قبر سے نجات دلانے والی ہے۔

### صفات متشابہات کے متعلق ہمارا موقف:

﴿تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾

برکت والا ہے وہ اللہ جس کے قبضہ قدرت میں بادشاہی ہے۔

اس پر کئی بار بات ہو چکی ہے کہ ”ید“ اللہ کی صفت ہے جس کا معنی اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ متقدمین اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک یہ ہے کہ ”ید“ متشابہات میں سے ہے اور اس کا معنی کوئی نہیں جانتا۔ متاخرین اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک یہ ہے کہ

”ید“ سے مراد قدرت ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ الفقہ الاکبر میں فرماتے ہیں:

”وَلَا يُقَالُ إِنَّ يَدَهُ قُدْرَتُهُ أَوْ نِعْمَتُهُ لِأَنَّ فِيهِ إِبْطَالُ الصِّفَةِ وَهُوَ قَوْلُ

أَهْلِ الْقُدْرِ وَالْإِعْزَالِ وَلَكِنْ يَدُهُ صِفَتُهُ بَلَا كَيْفٍ“<sup>42</sup>

”ید“ کا معنی قدرت کرنا یہ معتزلہ کا مذہب ہے، اس لیے ”ید“ کا معنی قدرت نہ کریں بلکہ ”ید“ اللہ کی صفت ہے جس کا معنی اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور معتزلہ کہتے ہیں کہ ”ید“ کا معنی قدرت ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ اگر ”ید“ کا معنی قدرت کرنا معتزلہ کا مسلک ہے تو تقریباً نانوے فیصد اکابر اہل السنۃ والجماعۃ بھی ”ید“ کا معنی قدرت ہی کرتے ہیں۔ جس طرح حدیث میں ہے کہ:

وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوَدِدْتُ أَنْ أَقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَأُقْتَلَ ثُمَّ أَحْيَا فَأُقْتَلَ ثُمَّ أَحْيَا فَأُقْتَلَ ثُمَّ أَحْيَا فَأُقْتَلَ ثُمَّ أَحْيَا<sup>43</sup>

اس کا ترجمہ ہمارے سارے اکابر یہی کرتے ہیں کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ جب ”ید“ کا معنی قدرت کرنا معتزلہ کا مذہب ہے تو پھر اہل السنۃ والجماعۃ ”ید“ کا معنی قدرت کیوں کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ”ید“ سے مراد قدرت یہ صرف معتزلہ کا مذہب نہیں ہے بلکہ متاخرین اہل السنۃ والجماعۃ اکابر کا بھی ہے۔ وہ بھی کہتے ہیں کہ ”ید“ سے مراد قدرت ہے تو پھر واقعی سوال ہو گا کہ متاخرین اہل السنۃ والجماعۃ کے ہاں بھی ”ید“ کا معنی قدرت اور معتزلہ جو گمراہ ہیں ان کے ہاں بھی ”ید“ کا معنی قدرت ہو تو دونوں میں

42- الفقہ الاکبر: ص 2

43- السنن الکبریٰ للبیہقی: ج 9 ص 157 رقم 18957

فرق کیا ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ متاخرین اہل السنۃ والجماعۃ اہل حق کے ہاں ”ید“ کا معنی قدرت ہے درجہ ظن اور درجہ گمان میں جبکہ معتزلہ کے ہاں ”ید“ کا معنی قدرت ہے درجہ یقین میں۔ اس لیے دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

اور ”ید“ کا معنی ہاتھ کرنا متقدمین اور متاخرین اہل السنۃ والجماعۃ میں سے کسی کا مسلک نہیں۔ سن تین سو ہجری سے پہلے کے علماء متقدمین ہیں اور سن تین سو ہجری کے بعد کے علماء کو متاخرین کہا جاتا ہے۔ بسا اوقات ”ید“ کا معنی بعض حضرات ہاتھ کرتے ہیں تو وہ لغت کو دیکھ کر کرتے ہیں، اس کا اصطلاح شرع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

### احسن عملاً اور اکثر عملاً میں فرق:

﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ

الْعَزِيزُ الْغَفُورُ﴾

اللہ وہ ذات ہے جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ آزمائے کہ تم میں سے کس کے اعمال زیادہ اچھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔

یہاں موت کو حیات پر مقدم کیا حالانکہ حیات پہلے ہے اور موت بعد میں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے پیدا کیا ہے تاکہ موت کی تیاری کرے اور تیاری وہی کر سکتا ہے جو موت کو ذہن میں رکھ کر زندگی گزارے۔ یہ موت بمنزلہ شرط کے ہے آخرت کی تیاری کے لیے اور حیات بمنزلہ ظرف کے ہے آخرت کی تیاری کے لیے یعنی حیات وہ جگہ ہے جہاں انسان رہ کر کام کرتا ہے اگر اللہ کسی کو زندگی نہ دے تو تیاری کیسے کرے گا؟ اور موت نہ رکھی ہو تو تیاری کیوں کرے گا؟ تو موت بمنزلہ شرط کے ہے۔

﴿يَتَّبِعُواكُمُ أَتَيْكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ایک ہوتا ہے احسنُ عملاً اور ایک ہوتا ہے اکثرُ عملاً۔ یہاں احسنُ عملاً فرمایا ہے اکثرُ عملاً نہیں فرمایا۔ قیامت کے دن اعمال کا وزن ہو گا اور وزن کی بنیاد کمیت نہیں بلکہ کیفیت ہو گی۔ یہ بات میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ احادیث میں جہاں وزنِ اعمال کی بات ہے وہاں یہ نہیں ہے کہ اعمال کو قیامت کے دن گنا جائے گا بلکہ یہ ہے کہ اعمال کو قیامت کے دن تولد جائے گا۔ قیامت کے دن اعمال کو نہ گنا بلکہ وزن کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وزن کی بنیاد کیفیت ہے کمیت نہیں ہے۔ اس لیے یہ نہیں فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ یہ دیکھے گا کہ تم میں سے کس نے اعمال زیادہ کیے ہیں، بلکہ فرمایا کہ اللہ یہ دیکھے گا کہ اعمال کس نے زیادہ اچھے کیے ہیں؟

### سببِ تخلیق کائنات:

یہاں پر تو نہیں دوسرے ایک مقام پر مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے معارف القرآن میں لکھا ہے کہ ﴿يَتَّبِعُواكُمُ أَتَيْكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات کی تخلیق کا سبب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ کیوں، اس لیے کہ کائنات میں سب سے احسنُ عملاً اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ اکثرُ عملاً تو ہو سکتے ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر احسنُ عملاً کوئی نہیں ہو سکتا۔

اور یہ جو ہے کہ موت اور حیات کو پیدا فرمایا تو حیات کے درجات ہیں۔ حیات کا ایک درجہ ہے کہ جس میں حس ہو کہ محسوس کرے اور ایک درجہ ہے کہ جس میں حرکت ہو کہ چلے پھرے اور ایک درجہ یہ ہے کہ اس میں نمو ہو کہ بڑھے۔ اب دیکھو! انسان میں حس بھی ہے، حرکت بھی ہے اور بڑھنا بھی ہے اور درخت نباتات میں نمو ہوتا ہے لیکن حرکت نہیں ہوتی دائیں بائیں کی۔ تو انسان، حیوان اور نباتات ان

میں حیات کی تینوں قسمیں پائی جاتی ہیں؛ حس، حرکت اور نمو اور یہ جو جمادات ہیں ان میں یہ تینوں قسمیں نہیں پائی جاتیں، ہاں البتہ ایک درجہ کی حیات ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں۔

**تقلید واجب ہے:**

﴿وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ١٠﴾

فَاعْتَرَفُوا بِذَنبِهِمْ فَسُحْقًا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ ١١﴾

وہ لوگ کہیں گے کہ کاش ہم کسی کی بات سن لیتے یا خود ہی عقل سے کام لے لیتے تو آج جہنم میں داخل نہ ہوتے! وہاں اپنے گناہ کا اعتراف کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہو گا کہ دفع ہو جاؤ اہل جہنم!

تقلید کرنا واجب ہے اور تقلید کے بغیر انسان کبھی بھی شریعت پر عمل نہیں کر سکتا۔ عمل کرنا تو دور کی بات ہے تقلید کے بغیر انسان کو عمل مل ہی نہیں سکتا۔

**درجہ حفظ کے بچوں کو مناظرہ سکھانا:**

میراہری پور ایک جگہ بیان تھا۔ میں وہاں سے گزرتے ہوئے ایک مدرسہ میں رکا تو درجہ حفظ کے طلبہ تھے۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ آپ ان میں بیان کر دیں تو میں نے قاری صاحب سے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے طلبہ کو مناظرہ سکھاؤں؟ مجھے وہ کہنے لگے کہ بچے کیسے سیکھیں گے؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے آپ سے یہ سوال تو نہیں کیا کہ آپ کے بچے مناظرہ سیکھیں گے یا نہیں سیکھیں گے؟ میں نے تو آپ سے یہ سوال کیا ہے کہ مناظرہ سکھاؤں یا نہ سکھاؤں؟ آپ کہہ دیں کہ سکھا دیا کہہ دیں کہ نہ سکھاؤ۔ انہوں نے کہا کہ آپ سکھا سکتے ہیں تو سکھا دیں! میں نے بچوں سے کہا کہ آپ مسجد سے باہر نکلیں گے، ایک شخص آپ سے



پوچھے گا: آپ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے ہیں؟ آپ نے کہنا ہے کہ نہیں۔ وہ پوچھے گا: کیوں نہیں پڑھتے؟ آپ نے کہنا ہے کہ ہمیں آتی نہیں ہے۔ تو وہ کہے گا کہ میں سکھا دوں؟ آپ کہیں کہ جی سکھا دیں تو ہم پڑھ لیں گے۔ جب وہ آپ کو فاتحہ سکھانی شروع کرے تو وہ کہے گا: الف لام زبر ”اَل“ تو ایک بچے نے کہنا ہے: الف لام پیش ”اَل“ وہ کہے گا: نہیں، الف لام زبر ”اَل“ آپ نے کہنا ہے: الف لام زیر ”اَل“ تو وہ کہے گا کہ آپ ”اَل“ کیوں نہیں پڑھتے؟ آپ اس سے پوچھو کہ انکل! آپ ”اَل“ کیوں نہیں پڑھتے، ”اَل“ کیوں نہیں پڑھتے؟ وہ کہے گا کہ دیکھو! یہاں زبر لکھا ہوا ہے۔ آپ نے کہنا ہے کہ یہ زبر اللہ نے لکھا ہے؟ اللہ کے رسول نے لکھا ہے؟ کس نے لکھا ہے، اس کا نام بتاؤ؟ اب اس کو نام کا تو پتا نہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکے گا کہ حجاج بن یوسف نے لکھوایا تھا۔ لکھنے والے کا تو اس کو بھی نہیں پتا۔ تو آپ نے کہنا ہے کہ حجاج بن یوسف تو کوفہ کا ظالم آدمی تھا، ہم تو کوفہ کے نیک آدمی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بات بھی نہیں مانتے تو ظالم کی بات کیوں مانیں؟ یہ ان کا سبق انہی کو سنائیں۔

اس لیے کسی نیک آدمی کی بات کرو اور ہمیں بتاؤ کہ ”اَلْحَمْدُ“ کے شروع میں جو زبر ہے یہ زبر کیوں ہے؟ اصل میں تو ہمزہ ہوتا ہے نا، ابتدائے کلام میں مفتوح ہوتا ہے لیکن اس کو تو ہر بندہ نہیں سمجھتا، لوگ اس کو الف ہی کہتے ہیں اس لیے میں اس کو الف کہہ کر بات سمجھا دیتا ہوں۔ اب وہ پھنس جائے گا۔ اب دیکھو! اگر کسی شخص کی تقلید نہ کرو تو قرآن کریم کے شروع میں جو ہمزہ ہے اس پر جو زبر ہے وہ بھی ثابت نہیں ہوتی تقلید کے بغیر۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ تقلید نہیں ہے بلکہ ہمارے پاس تو دلیل ہے۔ تو اس سے پوچھو کہ کیا دلیل ہے؟ وہ کہے گا کہ نحو کا اصول ہے کہ ہمزہ وصلی ابتدائے کلام میں مفتوح ہوتا ہے۔ تو اس سے پوچھو کہ یہ اصول کس نے دیا ہے؟ کسی کا نام تو لو! تو وہ

بندہ ابوالاسود دؤلی کا نام لے یا کسی کا بھی نام لے تو اسے کہیں کہ یہ نہ اللہ ہے اور نہ اللہ کا رسول ہے۔ یہ تو تقلید ہی ہوئی نا۔ تقلید کے بغیر ہمزہ کا زبر ثابت کر کے دو! نہیں کر سکتے تو پورے قرآن کو تقلید کے بغیر کیسے ثابت کرو گے؟ پھر شریعت کے اعمال تو بعد کا مسئلہ ہے، تقلید کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

### تقلید نہ کرنے کے نقصانات:

لیکن جو شخص تقلید نہ کرے اس کا ایک نقصان دنیا میں ہے، ایک قبر میں ہے اور ایک آخرت میں۔ دنیا میں نقصان یہ ہوتا ہے کہ اسے شریعت نہیں ملتی جس کی وجہ سے گمراہ ہی رہتا ہے۔ قبر میں نقصان کیا ہوتا ہے؟ صحیح بخاری میں ہے کہ جب مردے کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں، اسے بٹھاتے ہیں اور اسے کہتے ہیں: مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟

کہ تمہارا اس شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا نظریہ ہے؟ وہ اس کا جواب نہیں دے پاتا تو کہتا ہے ”لَا أَدْرِي كُنْتُ أَقُولُ مَا يَقُولُ النَّاسُ“ مجھے کچھ پتا نہیں ہے، جو لوگ کہتے تھے میں بھی وہی کہتا تھا۔ تو اسے کہا جاتا ہے ”لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ“ پھر اسے لوہے کے ہتھوڑوں سے کنپٹیوں پر مارا جاتا ہے تو وہ چیختا ہے، اس کی چیخ و پکار کو جن وانس کے علاوہ ساری مخلوق سنتی ہے۔<sup>44</sup>

علامہ کرمانی رحمہ اللہ شارح بخاری نے ”لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ“ کا معنی لکھا

ہے:

(قَوْلُهُ لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ) أَيْ لَا عَلِمْتُ بِنَفْسِكَ بِإِلْسَانِي لَا وَلَا

تَكُوتَ الْقُرْآنَ أَوْ الْمَعْلَى لَا اتَّبَعَتِ الْعُلَمَاءُ بِالتَّقْلِيدِ فِيمَا يَقُولُونَ.<sup>45</sup>

کہ تو دلیل کی بنیاد پر بات جانتا بھی نہیں تھا اور علماء کی تقلید کر کے بات مانتا بھی نہیں تھا۔

اور آخرت کے دن ترک تقلید کا نقصان کیا ہوگا؟ تارکین تقلید کہیں گے:

﴿وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾<sup>46</sup>

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ تفسیر عزیزی میں لکھتے ہیں:

”بعض حضرات مفسرین کرام نے ”نَسْمَعُ“ کو تقلید پر اور ”نَعْقِلُ“ کو تحقیق و اجتہاد پر محمول کیا ہے۔ ان دونوں لفظوں سے یہی مراد ہے کہ یہ دونوں نجات کے ذریعے ہیں۔“<sup>46</sup>

”نَعْقِلُ“ کا معنی ہوتا ہے دلیل سے خود بات سمجھنا اور ”نَسْمَعُ“ کا معنی کہ دلیل نہیں سمجھ سکتے تھے تو سمجھانے والے کی بات توجہ سے سن لیتے اور مان لیتے۔ اسی کا نام تقلید اور اجتہاد ہے۔ تو ترک تقلید کا نقصان آخرت میں یہ ہے کہ انسان جہنم میں جائے گا۔

﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَ

كُلُوا مِنْ رِزْقِهِ ۚ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ﴾<sup>47</sup>

ذلول کہتے ہیں ایسے جانور کو جو سواری کے لیے خود کو پیش کرے اور سرکش

نہ کرے، ایسا جانور جو آرام سے سوار کو اپنے اوپر بٹھائے اور آگے ہے ﴿فَامْشُوا فِي

45- حاشیہ صحیح البخاری: ج 1 ص 178 طبع قدیمی کتب خانہ کراچی

46- تفسیر عزیزی اردو: ج 3 ص 23

مَنَّاكِبَہَا ﴿﴾ مناکب کہتے ہیں کندھے کو۔ بیٹھتے تو جانور کی پیٹھ پر ہیں، کندھوں پر نہیں بیٹھتے لیکن یہاں کندھوں کا ذکر ہے۔ دراصل یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ایسا جانور جو اپنے کندھے بھی پیش کر دے تو بتاؤ وہ کتنا مطیع ہو گا؟ تو یہ سمجھایا ہے کہ دیکھو! زمین کو اللہ نے اس جانور کی طرح بنایا ہے کہ جو اپنے کندھے بھی پیش کر دے یعنی اللہ نے کیسے زمین کو تمہارے لیے مطیع کر دیا ہے۔

### اللہ کو صرف عرش پر ماننے والوں کا علمی جائزہ:

﴿ءَاٰمَنْتُمْ مِّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ اِلَآرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُورُۙ﴾

اَمْرًا مِّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّزْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًاۙ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَیْفَ نَذِیْرٍ ﴿۱۷﴾

کیا تم اس اللہ کی اس بات سے بے خوف ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تم کو زمین میں دھنسا دے اور زمین تمہیں نگل جائے، کیا تم اس اللہ کی اس بات سے بے خوف ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہارے اوپر پتھر برسائے۔ تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ میرا ڈرانا کیسا ہے۔

اب یہاں دیکھو! اللہ کی ذات کے بارے میں فرمایا ”مَنْ فِی السَّمَآءِ“ کہ وہ اللہ جو آسمان میں ہے۔ تو وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ عرش پر ہے، یہ دونوں آیتیں ان کے خلاف ہیں کیوں کہ آسمانوں پر کرسی ہے، کرسی پر سمندر ہے، سمندر پر عرش ہے یہ یہاں ”مَنْ فِی السَّمَآءِ“ فرمایا۔ اگر ”عَلَى الْعَرْشِ“ ہو گا تو ”مَنْ فِی السَّمَآءِ“ کیسے ہو گا؟ یہ تو قرآن کا ظاہر بتا رہا ہے کہ اللہ عرش پر نہیں ہے بلکہ آسمان میں ہے! اور جہاں تک معاملہ ہے ﴿الَّذِیْ حُتِّیَ الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ تو اس کو بہت سارے علماء نے متشابہات میں سے لکھا ہے جبکہ یہ آیت ﴿مَنْ فِی السَّمَآءِ﴾ تو متشابہات میں سے

بھی نہیں ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا عرش پر ہونا قرآن کے ظاہر کے مطابق ہے تو اس سے بڑا دنیا میں جھوٹ کیا ہو گا؟ ظاہر کے مطابق کیسے ہے؟ زیادہ سے زیادہ اگر آپ نے کہنا ہی ہے تو یہ کہہ دو کہ قرآن کریم کی بعض آیات کے ظاہر کے مطابق ہے، یہ تو نہ کہو کہ ظاہر کے مطابق ہے۔ میں اس لیے آپ حضرات کو سمجھاتا ہوں کہ بعض لوگ اعتدال کا نام استعمال کرتے ہیں لیکن درحقیقت ہم سے زیادہ متشدد ہوتے ہیں اور نام اعتدال کا ہوتا ہے۔

بس یہ چند آیتیں عقائد کے متعلقہ تھیں جو میں نے عرض کر دی ہیں۔ اللہ ہمیں صحیح عقائد و نظریات پر قائم رکھے۔ آمین

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة القلم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَ الْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۝۱ مَا أَنْتَ بِمُعْجِزٍ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ۝۲﴾

”ن“ کشابہات میں سے ہے، حروف مقطعات میں سے ہے جس کا معنی اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

**قلم سے کیا مراد ہے؟**

”وَ الْقَلَمِ“ قسم ہے قلم۔ اس سے مراد یا تو قلم تقدیر ہے یا مراد قلم خلاق ہے۔ قلم تقدیر سے مراد وہ قلم ہے جسے اللہ نے مخلوقات کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے حکم دیا تھا کہ لکھو، اللہ پاک نے جو کچھ لکھوانا تھا وہ سب کچھ لکھ دیا۔ یا اس سے مراد قلم خلاق ہے یعنی مخلوقات کی قلم جس سے مخلوق لکھتی ہے۔ یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں، قلم تقدیر بھی اور قلم خلاق بھی لیکن سورة العلق میں ﴿اقْرَأْ وَ رَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝۱ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۲﴾ میں قلم سے مراد قلم تقدیر نہیں بلکہ قلم خلاق ہے یعنی مخلوق والی قلم۔ لیکن یہاں سورة القلم میں تو دونوں مراد ہیں۔

﴿مَا أَنْتَ بِمُعْجِزٍ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ﴾ میرے پیغمبر! اللہ کا فضل ہے کہ آپ مجنون نہیں ہیں۔ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں جو آپ کو مجنون کہتے ہیں۔

## خلق عظیم کی حامل شخصیت:

﴿وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ ۝ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝﴾

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صاحب اخلاق تھے۔ ام المؤمنین امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا کہ قرآن کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سے بھرا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں یہ بات جو چلائی جاتی ہے کہ اسلام اخلاق سے پھیلا ہے، جہاد اور تلوار سے نہیں پھیلا یہ بہت بڑا جھوٹ ہے اور شریعت پر بہت بڑا بہتان اور الزام ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ تلوار کو اخلاق سے الگ کیا جا رہا ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے گھر سے تلواریں ہی نکلی تھیں۔ تو نبی کے گھر سے نکلنے والی چیز اخلاق کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے؟ اس لیے تلوار اخلاق کا جز ہے، اخلاق سے خارج نہیں ہے۔

## تلوار: اخلاق سے خارج نہیں:

زبان سے سمجھنا چاہیے لیکن جب سمجھ میں نہ آئے تو پھر دماغ ٹھیک کرنا چاہیے۔ جس طرح کسی آدمی کو سمجھنا اخلاق ہے اسی طرح کسی بد دماغ آدمی کا دماغ ٹھیک کرنا بھی اخلاق ہے۔ تلوار اخلاق میں شامل ہے، اخلاق سے خارج نہیں ہے۔ پھر لوگ بعض مثالیں دیتے ہیں کہ سن کر بھی بندے کو شرم آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جی فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دربار میں ایک شہزادہ گرفتار ہو کر آیا تو اس نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے پانی مانگا۔ جب پانی لے لیا پینے کے لیے تو اس نے کہا کہ جی میں ڈر رہا ہوں کہ پانی پینے لگوں تو مجھے قتل نہ کر دیں۔ فرمایا: نہیں کریں گے! اس نے کہا: جب تک میں پانی نہ پیوں مجھے نہیں ماریں گے؟ فرمایا نہیں ماریں گے۔ اس نے پانی گرا دیا اور اس نے کہا کہ مجھے پتا ہے کہ مسلمان قول کے پکے ہیں، یہ مجھے نہیں ماریں گے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جاؤ تمہیں آزادی ہے، تمہیں نہیں ماریں

گے۔ اس نے اسی وقت کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ تو دیکھو! یہ تلوار سے ڈر کر نہیں ہوا تھا بلکہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اخلاق کو دیکھ کر ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ شخص حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دربار میں ایسے ہی بیٹھا ہوا تھا؟

جب یہ ایران میں تھا تو ایسی بات کیوں نہیں کرتا تھا وہاں اس کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اخلاق کیوں نظر نہیں آتے تھے؟ تلوار کے سائے میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دربار میں آیا، یہاں تک اس کو تلوار لائی ہے، اس کے بعد پھر اخلاق دیکھے ہیں۔ تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ تلوار اخلاق سے خارج ہے؟! عجیب بے وقوفی کی بات ہے یہ۔ سورۃ النصر میں ہے: ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ﴾ ۱؎ وَذَآيَاتِ النَّاسِ يُدْخِلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝۲﴾ جب طاقت استعمال ہوئی نا تو پھر فرد نہیں بلکہ افراد اسلام میں آئے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح فرمایا ہے تو بتاؤ وہ دس آدمی گئے تھے یا دس ہزار گئے تھے؟ (دس ہزار گئے تھے۔ سامعین) خالی ہاتھ گئے تھے یا اسلحہ لے کر گئے تھے (اسلحہ لے کر گئے تھے۔ سامعین) اور جب مکہ میں داخل بھی ہوئے نا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام سے فرمایا تھا کہ ایک دوسرے سے دور دور بیٹھو اور تھوڑے تھوڑے ہو کر بیٹھو، آگ جلاؤ تاکہ پتا چلے کہ ان کی طاقت بہت ہے اور ایک ایک قبیلہ مکہ میں داخل ہو اور تکبیر کے نعرے لگاتے چلے جاؤ! مکہ والوں پر رعب بیٹھ گیا، کسی کی جرأت نہیں تھی دم مارنے کی اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق دیکھو کہ ”مَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِي سُفْيَانَ فَهُوَ آمِنٌ، وَمَنْ أَعْلَقَ بَابَهُ فَهُوَ آمِنٌ، وَمَنْ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَهُوَ آمِنٌ“<sup>47</sup>



یہ کیسی جرأت سے اعلان ہو رہے ہیں؟! کہ آج جو ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے گا تو اسے کچھ نہیں کہیں گے، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا تو اسے بھی کچھ نہیں کہیں گے! اور جو حرم میں داخل ہو جائے گا تو اسے بھی کچھ نہیں کہیں گے!

لوگ کہتے ہیں کہ جی دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف کر دیا۔ ہم نے کہا: ٹھیک ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف فرما دیا ہے لیکن یہ تو دیکھو کہ کب معاف فرمایا؟ معاف فرمایا ہے جب یہ لوگ تلوار کے نیچے تھے تبھی معاف فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں بھی معاف کرتے رہے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت نہیں کی تھی تو اس وقت بھی معاف فرماتے رہے لیکن اس وقت تو کوئی مسلمان نہیں ہو رہا تھا اور اب معاف کیا تو اب گروہ درگروہ مسلمان ہو رہے ہیں۔ کیوں کہ اب طاقت والے ہو کر معاف کر رہے ہیں۔ بات سمجھ میں آئی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے لیے رات کو چھپ کر نکلے تھے جب طاقت نہیں تھی لیکن جب واپس آئے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار کا قافلہ لے کر آئے۔

### طاقت کی اہمیت کا انکار کبھی نہ کرنا:

اس لیے طاقت کا انکار کبھی نہیں کرنا! ہاں یہ اقرار کرو کہ ہمارے پاس طاقت نہیں ہے! اپنے پاس طاقت نہ ہو اور بندہ طاقت کا انکار کر دے تو یہ درست نہیں ہے! اپنے پاس دولت نہیں ہے تو دولت کا انکار کر دے کہ جی دولت سے کیا ہوتا ہے! یہ بات درست نہیں۔ کیونکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس اونٹنیوں کی مالیت کے برابر کپڑے بھی پہنے ہیں۔ مدینہ میں سب سے قیمتی گھوڑا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوتا تھا، قیمتی تلوار اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوتی تھی۔ تمہارے پاس اگر یہ

چیزیں نہیں ہیں تو ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟! میں اس لیے کہتا ہوں کہ شریعت کے مزاج کو سمجھو! بس مزاج شریعت سمجھ میں آجائے تو مزہ آتا ہے۔

**مداہنت سے احتراز کرو!**

﴿فَلَا تُطِيعُوا الْمُكَذِّبِينَ ۝ وَذُوالْوُتْدِ هُنَّ فَيُذْهِنُونَّ ۝﴾

یہ عام کفار کے بارے میں بھی ہے اور بطور خاص ولید بن مغیرہ کے بارے میں ہے۔ نواوصاف اللہ نے اس کے ذکر فرمائے ہیں کہ یہ کتنا گندہ انسان ہے! اگر اس کے پاس دولت ہے تو پھر کیا ہوا؟! اس کی گندگی دیکھو اور ایسے بندے کی بات نہ مانو۔  
فرمایا: آپ جھٹلانے والوں کی بات کبھی نہ مانیں۔ یہ کافر چاہتے ہیں کہ تم مداہنت اختیار کرو، دین میں کمزوری اختیار کرو، ”فَيُذْهِنُونَّ“ وہ بھی مداہنت بن جائیں گے اور تمہاری مخالفت کم کریں گے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ مشرکین اور کفار چاہتے ہیں کہ تم ان کے مقابلے میں توحید بیان کرنا کم کر دو تو وہ تمہاری مخالفت میں کمی کر دیں گے۔

**مداہنت فی الدین حرام ہے:**

اور اس آیت کے تحت تفسیر مظہری اور معارف القرآن میں ہے کہ کفار کی رعایت میں ان کی مخالفت کم کرنا یہ مداہنت فی الدین اور حرام ہے، اضطراب کی صورت اس سے الگ ہے لیکن بغیر کسی اضطرابی کیفیت کے ایسا کرنا جائز نہیں۔<sup>48</sup>

میں کہتا ہوں کہ تم کون سی اضطرابی صورت میں ہو کہ کبھی ان کی رعایت ہے، کبھی منکرین حیات کی رعایت ہے، کبھی اہل بدعت کی رعایت ہے، کبھی فلاں کی

رعایت ہے! تم کون سی اضطرابی کیفیت میں ہو؟ میں نے ایک جگہ عرض کیا، میں نے کہا کہ بین الاقوامی سطح پر تم کفر کو پیغام دینا چاہتے ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ہم اکٹھے ہیں تو ٹھیک ہے تم ان کو بھی ساتھ بٹھاؤ، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن گلی گلی محلہ محلہ ان کو کیوں ساتھ بٹھاتے ہو! ہر جگہ پر اپنا مذہبی اور دینی تشخص خراب کرتے ہو۔ مداخلت فی الدین حرام ہے۔

### اکابر کے کلام سے توافق پر خوشی:

مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تفسیر مظہری میں یہ لکھا ہے۔ اس لیے اس کا بہت زیادہ خیال فرمایا کریں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں یہ باتیں اپنے ذوق سے کہتا ہوں لیکن جب مجھے حوالہ ملتا ہے تو اپنے دل کی خوشی پھر میں ہی جانتا ہوں کہ مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ میں ہمیشہ کہتا تھا کہ وزنِ اعمال کا مدار کیفیت ہے کمیت نہیں لیکن میرے پاس حوالہ نہیں تھا۔ رات دورانِ مطالعہ میرے پاس یہ حوالہ آگیا تو میں بہت خوش ہوا۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ”أَحْسَنُ عَمَلًا“ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اعمال گنے نہیں جائیں گے بلکہ تولے جائیں گے تو اعمال کی بنیاد کمیت نہیں ہے کیفیت ہے۔ ”أَحْسَنُ عَمَلًا“ فرمایا ”أَكْثَرُ عَمَلًا“ نہیں فرمایا۔ میرا دل کتنا خوش ہوا یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں اللہ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں۔ میں نے کئی بار کہا کہ میں اصولِ شریعت سے شریعت کے مسائل بیان کرتا ہوں اور جزئیات میرے پاس نہیں ہوتیں لیکن دورانِ مطالعہ پھر جزئیات آتی ہیں۔ ہاں البتہ میں نظائر پیش کرتا رہتا ہوں۔

### موقع پر باطل کی وضاحت ضروری ہے:

﴿وَلَا تُطْعَمُ كُلُّ خَلْفٍ فِي مَهِينٍ﴾

یہ اس کے اوصاف بیان کیے ہیں کہ یہ شخص جھوٹی قسمیں کھاتا ہے، ”مَہِیْنِ“ یہ شخص ذلیل اور کمینہ ہے، ”هَمَّازٍ“ طعنہ بہت دینے والا ہے، ”مَشَّاءٍ“ چغل خور ہے، ”مَنَّاءٍ لِّخَيْرٍ“ خیر سے روکتا ہے، ”مُعْتَدٍ“ حد سے تجاوز کرتا ہے، ”اَنِيمٍ“ گناہ گار ہے، ”عُتْلٍ“ مزاج کا سخت ہے اور پھر ”بَعْدَ ذَلِكَ زَنِيمٍ“ بدنام بھی ہے، ولد الزنا اور حرام کی اولاد ہے، ”اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِيْنٍ“ وجہ صرف یہ ہے کہ اس کے پاس بہت مال ہے اور اولاد ہے۔

دیکھو! قرآن کتنے سخت الفاظ استعمال کرتا ہے ایک کافر کے بارے میں اور ہم نے کیا ڈرامہ رچا رکھا ہے کہ جی ایسی بات نہیں کہنی چاہیے! ارے بھائی! قرآن کریم تو کھل کھل کر اس بد معاش کے اوصاف بیان کر رہا ہے۔

﴿سَنَسِفُهُ عَلَى الْخُزُومِ﴾

ہم قیامت کے دن اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔ دور سے پتا چلے گا کہ یہ بد بخت آرہا ہے۔

## باغ والوں کا انجام:

﴿اِنَّا بَلَوْنَهُمْ كَمَا بَلَوْنَا اَصْحَابَ الْجَنَّةِ اِذْ اَفْسَسُوا لَيَصْرِمُنَّهَا

مُضْطَبِّحِينَ﴾

یہ اصحاب الجنۃ کون تھے؟ یہ یمن کے شہر صنعاء سے چھ میل باہر ایک آدمی کا باغ تھا اور کھیتی بھی تھی۔ اس کا معمول تھا کہ جو پھل درختوں سے گرتا فقراء کو دیتا تھا اور جب کھیتی کاشت کرتا تو بھوسے کے ساتھ جو دانے اڑتے وہ بھی فقراء کو دیتا۔ اس کے علاوہ بھی دیتا رہتا تھا۔ وہ فوت ہو گیا تو اولاد نے چاہا کہ یہ مال غریبوں کو نہیں ملنا چاہیے، لہذا ہم صبح جلدی جلدی جائیں اور غریبوں کے آنے سے پہلے ہی کھیتی توڑ

لیں۔ جب یہ لوگ گئے تو اللہ نے ان کے کھیت کو جلا کے راکھ کر دیا۔

﴿فَاصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ﴾

صریم کا معنی ہوتا ہے مقطوع، کاٹا ہوا۔ تو یہ باغ بھی ایسے ہو گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی ہوتی ہے کہ زمین بالکل صاف ہو گئی، اور صریم؛ رات کو بھی کہتے ہیں۔ اس صورت میں معنی ہو گا کہ یہ کھیت جل کر ایسے سیاہ ہو گیا جیسے راکھ ہوتی ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم راستہ بھول گئے، ہمارا باغ ادھر تو نہیں تھا۔ پھر کہا کہ نہیں، ادھر ہی تھا۔ جو ہم نے حرکت کی کہ کوئی مسکین ہمارا مال نہ کھائے یہ اس کی سزا ملی ہے۔ اب اللہ سے معافی مانگو! انہوں نے معافی مانگی، توبہ کی۔ بعض روایات میں ہے کہ اللہ نے پھر ان کو یہ باغ عطا فرما دیا تھا۔

**تجلی ساق کا ظہور:**

﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ﴾ ﴿٢٦﴾ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَلِيمُونَ ﴿٢٧﴾

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جب ساق کی تجلی فرمائیں گے اور ان کافروں کو سجدے کی طرف بلایا جائے گا تو کافر سجدہ نہیں کر سکیں گے۔ ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی، ذلت ان پر سوار ہوگی کیوں کہ دنیا میں سجدے کی طرف بلایا جاتا تو یہ لوگ صحیح سالم ہونے کے باوجود سجدہ نہیں کرتے تھے۔ لہذا اب قیامت کے دن بھی ان کو سجدے کی توفیق نہیں ہوگی۔

”ساق“ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص تجلی ہے جس کا اظہار قیامت کے دن ہو گا اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جو لوگ دنیا میں سجدہ کرتے تھے وہ تو از خود سجدے میں گر جائیں

گے اور جو دنیا میں سجدہ نہیں کرتے تھے ان کو قیامت کے دن بھی سجدے کی توفیق نہیں ہوگی۔ بہت سارے مفسرین یہاں ساق کا لغوی معنی پنڈلی کر دیتے ہیں جس سے عام بندے کو شبہ پڑ جاتا ہے کہ شاید اللہ کی پنڈلی ہے حالانکہ اللہ رب العزت جس طرح جسم سے پاک ہے اسی طرح اعضائے جسم سے بھی پاک ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ بیان القرآن میں ساق کا معنی پنڈلی نہیں فرماتے بلکہ ساق کا معنی ساق ہی فرماتے ہیں۔ اس لیے اسلم اور احوط طریقہ یہی ہے کہ ساق کا معنی پنڈلی کے بجائے ساق ہی کیا جائے، ید کا معنی ہاتھ کے بجائے ید ہی کیا جائے تو اس میں عوام کو بات سمجھانی بہت آسان ہو جاتی ہے۔

﴿فَذَرْنِي وَمَنْ يُكْذِبْ بِهَذَا الْحَدِيثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ﴾

یہ جو فَذَرْنِي وَمَنْ يُكْذِبْ ہے یہ محاورہ ہے۔ جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں: تم مجھے اور اسے چھوڑو، میں جانوں اور یہ جانیں! یہ محاورات ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے پیغمبر! جو ہماری باتوں کی تکذیب کرتا اسے مجھ پر چھوڑ دو! میں اس کو ڈھیل دے کے وہاں پہنچا دوں گا جہاں یہ سوچ بھی نہیں سکے گا، جہنم میں جائے گا سیدھا، چھوڑو ان کو، میں جانوں اور یہ جانیں۔ تو اللہ نے یہ محاورہ استعمال کیا ہے۔

**حضرت یونس علیہ السلام کا اجتہاد:**

﴿فَاصْبِرْ بِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ

مَكْظُومٌ ۝۱۸﴾

میرے پیغمبر! آپ صبر کریں، وقت پر ان پر عذاب آئے گا، آپ ہمت سے کام لیں، اپنے کام میں لگے رہیں اور حضرت یونس علیہ السلام کی طرح آپ نہ کریں۔ یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو بہت سمجھایا۔ قوم نے ان کی نہیں مانی۔ تو انہوں نے

قوم سے کہا کہ تین دن میں عذاب آنے والا ہے۔ یہ کہا اور چلے گئے۔ ابھی عذاب کے وہ آثار نہیں تھے کہ جن کے آنے پر انسان کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ چنانچہ قوم جنگل میں نکلی، معافیاں مانگیں تو اللہ نے ان سے عذاب کو ٹال دیا۔ یونس علیہ السلام بستی کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔ یہ ان کا اجتہاد تھا کہ عذاب آرہا ہے، آثارِ عذاب دیکھے لیکن ابھی وہ آثار نہیں تھے جن میں توبہ قبول نہیں ہوتی۔ انہوں نے سمجھا کہ عذاب آرہا ہے۔ تو ان کا اجتہاد تھا اس لیے وہ چلے گئے۔

پھر سوچا کہ واپس جاؤں گا تو قوم مجھے جھٹلا دے گی کہ یہ نبی ہے؟ اس نے کہا تھا کہ عذاب آرہا ہے اور عذاب تو آیا نہیں۔ پھر آپ دریا کی طرف گئے اور کشتی میں بیٹھے اور کسی اور شہر جانے لگے۔ آگے کشتی والا واقعہ آپ کے علم میں ہے کہ کشتی بھنور میں پھنسی اور ملالاح نے کہا کہ کوئی بھاگا ہوا غلام ہے۔ فرمایا: وہ تو میں ہوں۔ قرعہ نکالا تو ان کا نام نکلا۔ انہوں نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ مچھلی نے منہ میں لیا۔ چالیس دن مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ پھر باہر آئے۔ وہاں پر کدو کی بیل لگی ہوئی تھی۔ ایک ہرنی آئی، وہ دودھ پلاتی تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام صحت مند ہوئے اور واپس آ گئے۔

تو فرمایا: ﴿وَلَا تَكُنْ مِثْلَ نَاصِيَةِ الْكُنُوزِ﴾ کہ آپ یونس علیہ السلام کی طرح نہ ہونا! حضرت یونس تھوڑی جلدی کر گئے تھے، آپ جلدی نہ کرنا، آپ صبر کریں، ہم وقت پر ان سے نمٹ لیں گے۔ یا تو دنیا میں انہیں عذاب دیں گے یا موت کے بعد۔

یہ حضرت یونس علیہ السلام کا اجتہاد تھا۔ دیکھو! اجتہاد مجتہد امتی سے بھی ہوتا ہے اور اجتہاد مجتہد نبی سے بھی ہوتا ہے اور خطا کبھی مجتہد امتی کے اجتہاد میں ہوتی ہے اور کبھی مجتہد نبی کے اجتہاد میں ہوتی ہے۔ لیکن دونوں میں فرق ہے۔ چونکہ مجتہد امتی پر وحی نہیں آتی اس لیے ممکن ہے کہ وہ اپنی خطائے اجتہادی پر موت تک قائم رہے اور اسی طرح دنیا سے چلا جائے لیکن اس پر بھی ایک اجر کا وعدہ ہے۔ لہذا اس کو

ثواب ملے گا، اور مجتہد نبی اجتہاد کرے اور خطا ہو جائے تو اس پر وحی آ جاتی ہے اور وحی کے بعد خطائے اجتہادی ختم کر کے نص دے دی جاتی ہے اور پیغمبر کی خطائے اجتہادی کی حیثیت یہی ہوتی ہے جیسے پہلے ایک نص ہو اور اس کو منسوخ کر کے اس کے بدلے میں نئی نص کو لایا جائے۔ اس لیے پیغمبر پر اعتراض بھی نہیں ہوتا۔

### حضور علیہ السلام کی حفاظت:

﴿وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَ

يَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ﴾ (١٤)

اللہ فرماتے ہیں کہ ان کافروں کو جب نصیحت کی جا رہی ہوتی ہے تو یہ نبی کو ایسے گھور کے دیکھتے ہیں جیسے اپنی آنکھوں سے پھسلا دیں گے، راہِ حق سے ہٹا دیں گے۔ یہ بھی محاورہ ہے جیسے ہمارے ہاں محاورات میں ہوتا ہے کہ تو مجھے دیکھتا ایسے ہے جیسے کھا جائے گا۔ تو یہاں بھی محاورہ استعمال کیا گیا ہے کہ کافر لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے دیکھتے ہیں جیسے حق سے پھسلا دیں گے۔ البتہ بعض روایات میں ہے کہ مکہ میں ایک شخص تہاجر نظر لگانے میں معروف تھا۔ مکہ والوں نے اس کو بلایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر بد لگاؤ۔ اس نے بہت تاڑ تاڑ کے دیکھا لیکن اس کی نظر بد سے بھی اللہ نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو محفوظ فرمالیا۔

### نظر بد کا علاج:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے تھے: اگر کسی شخص کو نظر لگ جائے تو

یہ آیات پڑھ کر دم کرے تو اللہ شفا دیتے ہیں۔ یہ آیات ﴿وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا

لَيُزْلِقُونَكَ﴾ سے لے کر آخر سورت تک پڑھنی ہیں۔

وَاخْرُجْ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



## سورة الحاقة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

”الحاقة“ قیامت کا ایک نام ہے:

﴿الْحَاقَّةُ ۝ مَا الْحَاقَّةُ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ ۝﴾

ثابت ہے اور تمہیں کیا خبر کہ وہ ثابت چیز کیا ہے؟

قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ”الْحَاقَّةُ“ بھی ہے اور اس کا معنی ہوتا ہے ثابت ہونے والی یا ثابت کرنے والی۔ قیامت پر دونوں معنی صادق آتے ہیں کہ قیامت برحق ہے اور ثابت ہے، یہ ضرور ہوگی اور یہ ثابت کرنے والی بھی ہے کہ قیامت کے دن مسلمانوں کے لیے جنت کو ثابت کرے گی اور کافروں کے لیے جہنم کو ثابت کرے گی۔

﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنَّكَارِ ۝ إِذْ قَالَ لِقَارِئِهِ ۝ فَاذْكُرْ ۝ فَاهْلِكُ ۝﴾

بِالطَّاعِيَةِ ۝﴾

یہاں قوم ثمود اور عاد کا تذکرہ کیا ہے کہ جب انہوں نے قیامت کو جھٹلایا تھا۔ یہاں قیامت کا دوسرا نام ہے ”النَّكَارَةُ“ ذکر کیا ہے یعنی کھڑکھڑانے والی اور قیامت ہے بھی اسی طرح۔ تو جب انہوں نے جھٹلایا تو پھر ثمود کا انجام تو یہ ہوا کہ وہ

سرکش ہوا کے ذریعہ ہلاک کر دیے گئے۔

﴿وَأَمَّا عَادُ فَاهْلِكُوا بِرِيحِ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۖ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَتَلَمِيذَ أَيَّامٍ حُسُومًا ۖ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَى ۚ كَأَنَّهُمْ أُجِزُوا نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۖ﴾

”صرصر“ کا معنی ہے ٹھنڈی ہوا اور عاتیہ کا معنی ہے سرکش ہوا۔ یعنی قوم عاد پر ہوا ایسے چلی جیسے سرکش ہو، کوئی اس کو کنٹرول کرنے والا نہ ہو۔ اس ہوانے ان کو برباد کر کے رکھ دیا۔ یہ ہوا سات راتیں اور آٹھ دن چلی تھی یعنی بدھ کے دن صبح کو چلی اور آئندہ بدھ شام کو جا کے رکی۔ تو اس طرح راتیں سات بنی ہیں اور دن آٹھ بنے ہیں۔ ”حُسُومًا“ کا معنی ہوتا ہے کاٹنے والی۔ تو اس ہوانے ان کو کاٹ کے رکھ دیا اور قد ان کے لمبے تھے اور یہ لوگ ایسے پڑے ہوئے تھے کہ جیسے کھجور کے تنے کو کاٹ کر رکھ دیں۔

### دو نفخوں کا بیان:

﴿فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ ۖ﴾

قرآن کریم میں دو نفخوں کا ذکر ہے؛

[1]: پہلے نفخہ کا ذکر ﴿وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَبَقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي

الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ﴾<sup>49</sup> میں ہے۔ پہلے نفخہ کو نفخہ صعب کہتے ہیں۔ صور کی شکل

سینگ کی طرح ہوگی۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام اس میں پھونکیں گے۔ شروع میں

اس کی آواز کم ہوگی لیکن آہستہ آہستہ آواز بڑھتی جائے گی، پھر اتنی تیز آواز ہو جائے

گی کہ لوگوں کے کان پھٹ جائیں گے اور سب لوگ بے ہوش ہو جائیں گے۔ یہ پہلا نفع ہو گا۔

[2]: دوسرے نفع کا ذکر ﴿ثُمَّ نُنْفِخُ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ﴾<sup>50</sup>

میں ہے کہ جب دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو سارے اٹھ کر میدان میں آجائیں گے۔ اس نفع کو نفعِ بعث بھی کہا جاتا ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ ان دو کے علاوہ ایک اور نفع بھی ہے، اس کو نفعِ فزع یعنی گھبراہٹ کا نفع کہتے ہیں۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ تینوں ممکن ہیں، اس طرح کہ جو سب سے پہلے صور پھونکا جائے تو اس میں آدمی پر گھبراہٹ طاری ہوگی، پھر دوسرے میں بے ہوشی طاری ہوگی، پھر تیسرے میں سارے اٹھادیے جائیں گے۔ تو یہ تین مرتبہ صور کو پھونکا جائے گا۔

﴿وَالْمَلَائِكَةُ عَلَىٰ أَزْجَائِهَا ۖ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ

ثَلَاثِينَ﴾<sup>51</sup>

اس وقت اللہ کے عرش کو چار فرشتوں نے اٹھایا ہے۔ قیامت کے دن چار اور ہوں گے اور یوں آٹھ فرشتے عرش کو اٹھائیں گے۔ اس کی حکمت کیا ہے؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔

**دائیں ہاتھ والے، بائیں ہاتھ والے:**

﴿فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۖ فَيَقُولُ هَآؤُمُ اقْرَءُوا

كِتَابِي ۖ إِنَّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلْكٌ حَسَابِيَهُ﴾<sup>52</sup>

جن کو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا تو وہ لوگوں کو بلائیں گے کہ دیکھو! میرے اعمال نامے کو پڑھو۔ مجھے دنیا میں یقین تھا کہ میرا حساب ہو گا۔ یہ شخص جنتی ہے۔ اس کو اونچے اونچے باغات ملیں گے جس کے پھل جھکے ہوئے ہوں گے۔

﴿وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ ۖ فَيَقُولُ يَلَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيهِ ۖ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيهِ ۖ يَلَيْتَهَا كَانَتْ اقْضَايَةً ۖ مَا آغْنِي عَنِّي مَالِيهِ ۖ هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيهِ ۖ﴾

اور جس کو نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں ملے گا تو وہ کہے گا کہ کاش! مجھے اعمال نامہ نہ ہی ملتا! اور مجھے پتا ہی نہ چلتا کہ میرا حساب کیا ہے؟ کاش مجھے اس سے پہلے موت ہی آ جاتی! میرا مال بھی میرے کچھ کام نہ آیا اور میری طاقت و سلطنت بھی خاک میں مل گئی۔

### جہنمیوں کا انجام:

﴿خُذُوا فَعْلُوهُ ۖ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ ۖ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ ۖ﴾

حکم ہو گا: اس کو پکڑو اور جہنم میں پھینکو۔ سات ہاتھ لمبی زنجیر ہوگی جس میں ڈال کر جہنم میں پھینکا جائے گا۔ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ زنجیر ایسی ہوگی جسے آدمی کے جسم میں ایک طرف ڈال کر دوسری جانب سے نکالا جائے گا جس طرح تسبیح کے دانے سے دھاگہ گزارا جاتا ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔

﴿إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ۖ وَلَا يَحْضُ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۖ﴾  
یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین نہیں رکھتا تھا اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا تھا۔

بڑا جرم کفر ہے یعنی اللہ رب العزت پر ایمان نہ لانا اور اس کے بعد بڑا جرم مسکین کو کھانا نہ کھانا ہے۔ اس اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ مسکین کو کھانا نہ کھانا اور مستحق کو نہ دینا یہ بہت بڑا جرم ہے۔

﴿فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هُنَا حَبِيمٌ ۖ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ۖ﴾

لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ۖ﴾

آج ان جہنمیوں کا وہاں پہ کوئی دوست نہیں ہو گا اور غسلیں کے علاوہ کوئی کھانا نہیں ہو گا! اسے مجرم لوگوں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔ یہی گناہگار لوگ اسے کھائیں گے۔

”غِسْلِينِ“ اس پانی کو کہتے ہیں جس سے پیپ کو دھویا جائے۔ تو یہ پانی ان جہنمیوں کو پینے کے لیے دیا جائے گا۔

﴿فَلَا أَقْسَمُ بِمَا تُبْصِرُونَ ۖ وَمَا لَا تَبْصِرُونَ ۖ﴾

میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو اور ان چیزوں کی بھی جن کو تم نہیں دیکھتے۔ جسے تم دیکھتے ہو یعنی تمام مخلوقات جسے بندے دیکھتے ہیں مثلاً چاند، سورج، پہاڑ وغیرہ اور جو نظر نہیں آتیں جیسے عالم بالا کی مخلوقات ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ”وَمَا لَا تَبْصِرُونَ“ سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔

**قرآن شعر نہیں:**

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۖ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا

تُؤْمِنُونَ ۖ﴾

یہ رسول کی بات ہے اور شاعر کی بات نہیں ہے۔ اس پر پہلے بات ہو چکی ہے کہ وہ لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہتے تھے تو اللہ نے جواب دیا کہ میرا

رسول شاعر نہیں ہے۔

**پیغمبر اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرتا:**

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿٦٦﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ

بِأَلْسِنِينَ ﴿٦٧﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ﴿٦٨﴾﴾

یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ اپنی طرف سے باتیں کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر یہ پیغمبر کوئی اپنی طرف سے کوئی بات ہماری طرف منسوب کر کے کہتے تو ہم ان کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے، پھر ہم ان کی شہ رگ کو کاٹ کے رکھ دیتے!

اصل میں ”الْوَتِينَ“ کہتے ہیں ایسی رگ کو جو دل سے نکلتی ہے اور اس کے ذریعے روح پورے بدن میں پھیلتی ہے، وہ رگ کٹے تو آدمی فوراً مر جاتا ہے۔ تو فرمایا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بات کرتے تو ہم ختم کر کے رکھ دیتے۔

یہاں اچھی طرح یہ بات سمجھیں کہ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جو بھی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے گا اس کی سزا یہ ہوگی کہ دنیا میں اللہ اس کو ہلاک کر دیں گے۔ یہاں قانون نہیں بیان کیا۔ یہاں صرف حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بات کی ہے کہ تم کہتے ہو کہ یہ اپنی طرف سے بات کہتے ہیں، اگر یہ اپنی طرف سے کوئی بات کرتے تو ہم ایسا کرتے، جب ہم نے ایسا نہیں کیا تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ پیغمبر ہماری بات کرتے ہیں، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں فرماتے۔

﴿وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنْكُمْ مُكَذِّبِينَ ﴿٦٩﴾ وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى

الْكَافِرِينَ ﴿٧٠﴾﴾ وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ﴿٧١﴾﴾

یہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے اور کام کرنے والوں کو

طریقہ بتایا ہے کہ یہ آپ کی تکذیب کرتے ہیں، یہ آپ کو جھٹلاتے ہیں، اس کا حل کیا ہے؟ فرمایا: ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ﴾

آدمی عبادات میں مشغول ہو جائے، آدمی جب اس میں مشغول ہو جائے تو پھر لوگوں کی مخالفت اس پر اثر نہیں کرتی۔ دوسرے مقام پر ہے:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ﴾ ﴿٩٤﴾ ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ﴾ ﴿٩٥﴾<sup>51</sup>

اے پیغمبر! ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتوں کی وجہ سے آپ کا دل گھٹتا ہے، آپ کا دل تنگ ہوتا ہے۔ جب ایسا معاملہ ہو تو آپ سجدہ کریں اور تسبیح کریں۔ یہ جس طرح پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا اسی طرح پیغمبر کے ورثاء علماء کرام کے لیے بھی ہے کہ جب لوگ مخالفت کریں، لوگ تردید کریں، لوگ تکذیب کریں اور مخالف دکھ دینے پر اتر آئے تو اس کا حل یہ نہیں ہے کہ جواب میں گالیاں دو بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ سجدے کرو، تسبیح کرو، عبادات میں مشغول ہو جاؤ! اس سے اللہ رب العزت انسان کے دل کو تسلی عطا فرمادیتے ہیں۔  
وَاجْزُ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة المعارج

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

نضر بن حارث کی بے جا جرأت:

﴿سَأَن سَآءِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ ۚ لِّلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ ۚ مِّنَ

اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ ۚ﴾

نضر بن حارث نے قرآن کو جھٹلانے میں حد درجہ جرأت سے کام لیا، اس نے کہا:

اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ

السَّمَاءِ. <sup>52</sup>

اے اللہ! اگر یہ قرآن سچا ہے اور آپ کی طرف ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسائیں۔  
اللہ فرماتے ہیں کہ ایک بندے نے عذاب مانگا ہے جو کافروں پر آنے والا  
ہے اور اس عذاب کو کوئی ٹالنے والا نہیں ہے، یہ عذاب اللہ کی طرف سے آئے گا جو  
آسمانوں کا مالک ہے۔

یہاں اللہ کی صفت بیان کی ہے ﴿ذِي الْمَعَارِجِ﴾، معارج؛ معراج کی جمع  
ہے بمعنی سیڑھیاں۔ مراد اس سے آسمان ہے۔ چونکہ اوپر جانیں تو پہلا آسمان، پھر



دوسرا آسمان، پھر تیسرا آسمان، ایسے سیڑھیوں کی طرح ہے۔

## قیامت کے دن کی مقدار؛ تعارض کا حل

﴿تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ

سَنَةٍ ۝﴾

فرشتے اور روح ایسے دن میں اللہ کی طرف جاتے ہیں جو پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔

اب یہاں پر یہ ہے کہ وہ دن پچاس ہزار سال کے برابر ہے اور سورۃ السجدہ میں ہے ﴿كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ﴾ کہ یہ دن ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں آیتوں میں تعارض ہے کہ یہاں فرمایا کہ ایک دن پچاس ہزار سال کے برابر ہے اور اکیسویں پارے میں فرمایا کہ ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہو گا۔

اس کا ایک تو معروف جواب ہے کہ یہ ہر آدمی کی کیفیت اور احوال کے اعتبار سے ہے۔ جو زیادہ گناہ گار ہوں گے ان کو ایسا لگے گا کہ یہ دن پچاس ہزار سال کا ہے اور جو کم گناہ گار ہوں گے، کفر میں کم ہوں گے ان کو محسوس ہو گا کہ ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے اور ایمان والوں کے لیے اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”كَفَدَ مَا بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ“<sup>33</sup> کہ ظہر سے عصر کے درمیان کا جو وقت ہے قیامت کا پورا دن ایمان والوں کے لیے ایسا ہو گا۔

تفسیر مظہری میں اس کا جواب اس سے بھی زیادہ مناسب دیا گیا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہے دنیا کا اور ایک دن ہے آخرت کا۔

یہ جو فرمایا کہ ایک دن پچاس ہزار سال کے برابر ہو گا تو یہ آخرت اور حشر کا دن ہے، ﴿فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ یہ آخرت کے لیے ہے، اور یہ جو دوسرے مقام پر فرمایا ﴿كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ﴾ کہ ایک دن ایک ہزار کے برابر ہو گا تو یہ آخرت کا نہیں ہے بلکہ یہ دنیا کا ہے۔ کیونکہ صحیح حدیث میں ہے کہ زمین سے آسمان کے درمیان کی مسافت پانچ سو سال ہے۔ اگر کوئی بندہ اوپر جائے اور حکم لے کر آئے تو اس کو ہزار سال لگے گا، پانچ سو سال جانے میں اور پانچ سو سال واپس آنے میں اور جبرائیل امین علیہ السلام ایک ہی دن میں آتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔ تو تمہارا کام جو ایک ہزار سال کا تھا وہ فرشتہ ایک دن میں کر لیتا ہے۔ تو یہ دنیا والا ایک دن مراد ہے۔ اب دیکھو! اس توجیہ سے تعارض ہی ختم ہو جاتا ہے۔

### حضرت عزیر کے قصہ سے منکرین کا استدلال اور اس کا جواب:

اچھا یہاں وہ نکتہ ذہن میں رکھیں کہ اگر قیامت کا دن ہو پچاس ہزار سال یا ایک ہزار سال کے برابر تو اس سے انبیاء علیہم السلام کی حیات فی القبر پر جو اعتراض ہوتا ہے اس کا جواب بڑے آرام سے دیا جاسکتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام ایک تباہ شدہ بستی سے گزر رہے تھے تو فرمایا: ﴿أَتَىٰ يُعْجِي هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ کہ اللہ اس بستی کو کیسے زندہ کریں گے؟ ﴿فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ﴾ اللہ نے انہیں ایک سو سال موت دی، پھر ان کو زندہ کیا۔

تو یہ لوگ اس سے دلیل بناتے ہیں کہ قبروں میں انبیاء علیہم السلام زندہ نہیں ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ دیکھو! جب ایک سو سال کے بعد اللہ نے ان کو اٹھایا تو پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتُمْ﴾ کہ آپ کتنا عرصہ رہے ہیں؟ تو انہوں نے کہا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ کہ میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہ کر آیا ہوں۔ تو اس سے معلوم ہوا

کہ نبی قبر میں مردہ ہوتے ہیں کیونکہ ان کو پتا نہیں چلا کہ میں کتنا عرصہ رہا ہوں۔ تو یہ دلیل ہے کہ نبی قبر میں زندہ نہیں ہوتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جو پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتُ﴾ کہ آپ کتنا عرصہ ٹھہرے ہو تو انہوں نے کہا کہ دن یا دن کا بعض حصہ، تو دنیا کا ایک ہزار سال آخرت کا ایک دن ہوتا ہے اور جب دنیا کا ایک سو سال ہو گا تو آخرت کا کچھ حصہ ہو گا، مکمل دن نہیں ہو گا۔ تو جب پوچھا کہ ﴿كَمْ لَبِثْتُ﴾ آپ کتنا ٹھہرے ہیں؟ آپ نے کہا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ حضرت عزیر نے اُدھر کا بتایا تھا کہ جہاں رہ کر آئے تھے۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿بَلْ لَبِثْتَ مِائَةً عَامٍ﴾ کہ آپ سو سال ٹھہرے ہیں دنیا کا۔ ہم نے یہاں کا پوچھا ہے وہاں کا نہیں پوچھا! تو انہوں نے وہاں کا بتایا جو بعض دن بتا ہے اور اللہ نے یہاں کا بتایا جو ایک سو سال بتا ہے۔ تو اس سے تو نبی کا علم ثابت ہوتا ہے، لاعلمی ثابت نہیں ہوتی۔

اور اگر مان بھی لیا جائے کہ حضرت عزیر کو پتا نہیں چلا تھا۔ تو پتا نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ نبی قبر میں زندہ نہیں ہوتا۔ دیکھو! اصحاب کھف سوئے ہوئے تھے اور قرآن کریم میں ﴿وَنَحْسَبُهُمْ آيَاقًا وَهُمْ رُقُودٌ﴾ کہ تم سمجھتے ہو کہ اصحاب کھف جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔ تو سونے والے بندے تو مردہ نہیں ہوتے۔ جب یہ اٹھے ہیں تو آپس میں پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْنَا﴾ کہ کتنا عرصہ ٹھہرے ہو؟ کہا: ﴿لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ ہم دن یا دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔ تو یہ تو زندہ تھے، مرے ہوئے نہیں تھے۔ ثابت ہوا کہ عدم علم، عدم حیات پر دلیل نہیں ہے۔ اس لیے اس کو عدم حیات پر دلیل بنانا درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

## قیامت کی ہولناکی:

﴿يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْهَيْلِ ۖ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۚ﴾

قیامت کے دن آسمان کیسے ہوں گے؟ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ ہوں گے۔ مہل کہتے ہیں تلچٹ کو، یہ جو گاڑی کا آئل چینج کرتے ہیں وہ سیاہ رنگ کا ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر ہے: ”كَالْدِّهَانِ“ کہ یہ آسمان سرخ ہو گا تپتی ہوئی آگ کی طرح۔ تو بظاہر تعارض لگتا ہے حالانکہ تعارض نہیں ہے کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ شروع میں سیاہ ہو اور بعد میں سرخ ہو جائے، یا یہ ہو کہ کبھی سیاہ ہو جائے اور کبھی سرخ ہو جائے۔ دونوں چیزیں موجود ہیں، اس لیے ان میں تعارض نہیں ہے۔

﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی ۚ تَدْعُوۡا مِّنۡۢ اَدْبَرَۤ وَاَتَوٰی ۚ﴾

یہ آگ کی صفت بیان کی ہے۔ ”نَزَّاعَةً“ ایک شعلہ ہے، ”لِّلشَّوٰی“ یہ شواہ کی جمع ہے۔ یہ سر کی کھال کو بھی کہتے ہیں اور باقی جسم کی کھال کو بھی۔ تو فرمایا کہ یہ آگ ایسی ہو گی جو انسان کی کھال کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔

## انسان کی بے صبری:

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا ۚۙ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ۚۙ وَّاِذَا

مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوۡعًا ۚۙ﴾

انسان کی فطرت بیان کی ہے کہ انسان بہت بے صبر اور کم ہمت ہے۔ جب اس کو تکلیف پہنچے تو حد سے تجاوز کر کے گڑ گڑاتا ہے اور جب اس کو مال ملے تو پھر حق ادا نہیں کرتا بلکہ بخل کرتا ہے۔

اب اس پر سوال یہ ہے کہ جب انسان کی فطرت میں شامل ہے گڑ گڑانا اور بخل کرنا تو پھر گڑ گڑانے پر اعتراض کیوں ہے؟ اور بخل کرنا جرم کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض چیزیں انسان کی فطرت میں ہوتی ہیں اور اسی پر امتحان ہوتا ہے کہ یہ کام نہیں کرنا! امتحان تو اسی چیز کا نام ہے کہ اللہ نے انسان کی طبیعت میں رکھا ہے کہ جب آدمی کے سامنے پانی آئے تو پینے کو جی چاہے، اب روزہ رکھا ہو گرمی کا تو فطرت ہے کہ پیاس لگتی ہے مگر انسان اس فطرت پر عمل نہیں کرتا۔ اگر اس فطری تقاضے پر عمل کرے گا تو گناہ ہو گا، عمل نہیں کرے گا تو تقویٰ ہو گا۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ بات شامل ہے لیکن اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ انسان اس پر عمل شروع کر دے بلکہ اس پر عمل نہ کر کے اس سے بچنا چاہیے۔

### خشوع خضوع کے ساتھ نماز کی پابندی:

﴿إِلَّا الْمَصَلِّينَ ۚ الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ﴾

یہاں دیکھیں! دو صفتیں بیان کی ہیں: کہ یہ لوگ نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ آگے ہے: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ کہ یہ لوگ اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں تکرار ہے کہ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ بات تو ایک ہوئی۔ جواب یہ ہے کہ یہ تکرار نہیں ہے، یہ جو فرمایا: ﴿عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ﴾ اس کا معنی یہ ہے کہ نماز کے اول سے لے کر نماز کے آخر تک ہمیشہ نماز کے آداب کی رعایت کرتے ہیں اور یہ جو فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ تو اس کا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ نماز میں ہمیشہ خشوع اختیار کرتے ہیں۔ تو پہلے سے مراد ہے اول تا آخر اور اس سے مراد ہے ہمیشہ، لہذا اس میں کوئی تکرار نہیں ہے۔

﴿كَلَّا ۚ إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِمَّا يَعْلَمُونَ﴾

مشرکین کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ بہت اچھے طریقے سے جانتے ہیں کہ ہم نے ان کو کس چیز سے پیدا کیا۔ یہ دلیل اس بات پہ دی ہے کہ مشرکین کا خیال یہ تھا کہ جب ہم مر جائیں گے، ہڈیاں ہو جائیں گے، ریزہ ریزہ بنیں گے تو دوبارہ کیسے اٹھائے جائیں گے؟ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تو تم جانتے ہو کہ ہم نے تمہیں کس چیز سے پیدا کیا ہے؟ پانی کے ایک قطرے سے ہم نے پورا جسم بنایا۔ پانی کے قطرے سے پورا جسم بنانا یہ زیادہ مشکل ہے اور جب انسان پیدا ہو اور مر جائے تو اس انسان کو دوبارہ بنائیں تو یہ آسان ہے۔ تو جو کام مشکل تھا تم اس کو مانتے ہو، تو اس سے آسان کام کرنا کیا یہ ہمارے بس میں نہیں ہے؟

﴿فَلَا أَفْسِمُ رَبِّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ إِنَّا لَنَقْدِرُونَ﴾ (۱) ﴿عَلَىٰ أَنْ تُبَدِّلَ

خَيْرًا مِّنْهُمْ ۚ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ﴾ (۲)

میرے پیغمبر! ہم تو اس بات پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور یہ ہمیں مغلوب نہیں کر سکتے!

﴿فَدَسَّرَهُم بِخَوْضٍ وَآيَلَعَبُوا حَتَّىٰ يُلْقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يَوْمَعُدُونَ﴾ (۳)

يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَّاءَ كَانَتْهُمْ إِلَىٰ نُصْبٍ يُؤْفَضُونَ﴾ (۴)

ان کو چھوڑو، ان کو گیلیں لگانے دو، جھوٹ بولنے دو، ایک وقت آئے گا کہ جب یہ اس دن سے جا ملیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ مراد اس سے قیامت کا دن ہے۔ اس دن یہ لوگ قبروں سے دوڑتے ہوئے نکلیں گے جیسے عبادت کے لیے کسی بت کی طرف دوڑتے ہیں، تو یوں آئیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین  
وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة النوح

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ أَنْ أَنْذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَهُمْ

عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

### حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ:

حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ نے ان کی قوم کی طرف بھیجا کہ جا کر اپنی قوم کو دعوت دیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے چالیس سال کی عمر میں نبوت دی ہے۔ ﴿فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾<sup>54</sup> اور ساڑھے نو سو سال ان کی عمر ہوئی ہے۔ چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی اور کل عمر ساڑھے نو سو سال ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نو سو دس سال یہ مسلسل دعوت دیتے رہے اور اتنی مشکلات میں نوح علیہ السلام نے دعوت دی ہے کہ ان کی مثال انبیاء علیہم السلام میں شاید نظر نہ آئے۔

نوح علیہ السلام کی عمر اتنی زیادہ تھی لیکن آپ کی قوم کی عمر اتنی بڑی نہیں تھی۔ یہ آپ علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ آپ کی عمر اتنی بڑی تھی۔ انہوں نے اپنی قوم کی

کئی نسلیں دیکھی ہیں۔ بسا اوقات یہ دعوت دیتے تو ان کی قوم کے لوگ ان کو کسی کمبل میں لپیٹ کر پھینک دیتے اور اوپر سے مارتے، وہ سمجھتے کہ شاید نوح علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں، وہ چھوڑ کر چلے جاتے۔ کئی گھنٹے اس طرح گزر جاتے، پھر نوح علیہ السلام کو جب ہوش آتا تو آپ علیہ السلام اٹھتے اور اٹھ کر پھر اپنی قوم کو دعوت دیتے اور اللہ سے یہ دعا کرتے:

”رَبِّ اِهْدِ قَوْمِي فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ“<sup>55</sup>

اے اللہ! میری قوم کو ہدایت عطا فرما، یہ مجھے جانتے نہیں ہیں کہ میں ان کا کیسا خیر خواہ ہوں۔

اور بعضوں نے لکھا ہے کہ قوم کے لوگ آپ کا گلہ گھونٹ کر چھوڑ دیتے اور سمجھتے کہ یہ فوت ہو گئے، چھوڑ کر چلے جاتے، جب ان کو ہوش آتا تو پھر ان کو دعوت دیتے۔ ایک نسل ختم ہو گئی تو آئندہ نسل کو دعوت دی کہ شاید یہ ٹھیک ہو جائے، یہ ختم ہو گئی تو اگلی نسل کو دعوت دی کہ شاید یہ ٹھیک ہو جائے۔ یوں نوح علیہ السلام نے نو سو دس سال تک اپنی قوم کو مسلسل دعوت دی اور اپنی قوم کو سمجھایا۔

﴿اِنْ اَعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقَوْهُ وَاَطِيعُوْا﴾

فرمایا: اللہ کی عبادت کرو، اس سے ڈرو اور میری بات مانو۔

﴿يَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُخْرِجْكُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ

اِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ ۚ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

اللہ تمہارے گناہوں کو معاف فرمادے گا اور ایک وقت تک تمہیں مہلت دے گا اور جب اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آجائے تو پھر اس میں مزید تاخیر نہیں ہوتی۔



اے کاش! تم اس بات کو سمجھو۔

یہاں ”يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ“ نہیں فرمایا بلکہ ”يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ“ فرمایا ہے۔ یہاں مِّنْ تبعیضیہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تمہارے بعض گناہوں کو معاف کر دے گا۔ آدمی کے ذمہ کچھ حقوق اللہ ہیں اور کچھ حقوق العباد ہیں، حقوق اللہ میں کوتاہی کی ہو تو ایمان لانے سے وہ معاف ہو جائیں گے، زمانہ کفر کے سارے گناہ معاف ہوتے ہیں لیکن حقوق العباد جو زمانہ کفر میں سلب کیے ہوں، غصب کیے ہوں تو وہ معاف نہیں ہوتے، جن کو واپس کر سکتے ہوں واپس کرنا ضروری ہے اور جس سے معاف کر سکتے ہوں تو معاف کروانا ضروری ہے۔ مال لوٹا ہے تو واپس کرو۔ اگر گالی دی ہے تو اس کو واپس کیسے کراؤ گے؟ بس اس سے معاف کروالو۔

### تقدیر پر اشکال کا جواب:

﴿إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ﴾

جب اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آجائے تو پھر اس میں مزید تاخیر نہیں ہوتی۔ مطلب یہ کہ اگر تم اللہ سے ڈرو گے اور میری بات مانو گے تو اللہ رب العزت ایک وقت تک تمہیں زندہ رکھیں گے، عذاب نہیں دیں گے اور جب وقت آئے گا تو پھر تمہیں مہلت بھی نہیں ملے گی۔

بظاہر دونوں میں بات سمجھ نہیں آرہی کہ اگر تم اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو تو پھر ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ﴾ اللہ تمہیں معاف کریں گے، تمہیں کچھ نہیں کہیں گے اور ﴿يُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسْتَقَرٍّ﴾ اللہ تمہیں ایک متعین وقت تک ڈھیل دیں گے، جب وقت آئے گا تو پھر ﴿لَا يُؤَخَّرُ﴾ تمہیں ڈھیل نہیں ملے گی۔ تو سوال یہ ہے کہ اس میں ایمان اور تقویٰ کو کیا دخل ہوا؟ یہ تو کافر کے ساتھ بھی ایسے ہی ہے کہ

ایک وقت تک اس کو مہلت ہوتی ہے، وقت جب آجائے تو اس کو بھی مہلت نہیں ملتی۔

میں یہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ پہلے تقدیر کا معنی سمجھیں، پھر تقدیر کی قسمیں سمجھیں تو یہ آیت سمجھ میں آئے گی۔ عام بندے سمجھتے ہیں کہ تقدیر صرف امر الہی کا نام ہے حالانکہ تقدیر صرف امر الہی کا نام نہیں ہے بلکہ علم الہی اور امر الہی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اللہ کے علم میں تھا کہ میں بندے کو اختیار دوں گا تو بندہ اپنے اختیار سے فلاں کام کرے گا۔ یہ ”علم الہی“ ہوا، اور اللہ نے اس کو لکھ دیا کہ بندہ فلاں کام کرے گا تو یہ ”امر الہی“ ہوا۔ اب علم الہی؛ امر الہی کے خلاف ہو یا امر الہی؛ علم الہی کے خلاف ہو ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو تقدیر صرف ”علم الہی“ کا نام نہیں بلکہ تقدیر علم الہی اور امر الہی کے مجموعے کا نام ہے۔ اور بندہ مجبور محض ہو ایسا بھی نہیں کیونکہ ہونا بندے کے اختیار کے ساتھ تھا۔ یہ ہے تقدیر کا معنی!

پھر تقدیر کی ایک قسم ہے تقدیر مُبَرَّم اور ایک قسم ہے تقدیر معلق۔ مُبَرَّم کا معنی ہوتا ہے قطعی اور یقینی، ایسی تقدیر کہ جو ٹل نہیں سکتی اور ایک تقدیر معلق ہے جو ایک شرط کے ساتھ ہے، اگر یوں ہو گا تو یوں کر دیں گے۔ اس کو معلق کہتے ہیں۔

تو یہاں یہ فرما رہے ہیں کہ اللہ کے تو علم میں ہے کہ یہ بندہ کفر اختیار کرے گا یا یہ بندہ ایمان اختیار کرے گا۔ اگر یہ کفر اختیار کرے گا تو اس پر عذاب آئے گا اور اگر کفر اختیار نہیں کرے گا تو اس پر عذاب نہیں آئے گا بلکہ اللہ اس کو ایک وقت تک مزید زندگی ایسے دیں گے کہ جس میں عذاب نہیں ہو گا۔ تو فرمایا کہ اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو مزید ایک مدت تک اللہ تمہیں ڈھیل دیں گے، تمہیں موقع دیں گے اور تمہارے اوپر عذاب نہیں آئے گا۔ پھر جب وہ آخری وقت جو تقدیر مُبَرَّم ہے موت کا وہ آئے گا تو پھر تو مہلت نہیں ملے گی، پھر تو موت ہر کسی پر آئی ہے،

مؤمن پر بھی اور کافر پر بھی لیکن یہ کفر کی وجہ سے جو عذاب آنا تھا جب تم ایمان اختیار کرو گے تو عذاب نہیں آئے گا بلکہ مزید ایک مدت تک اللہ تمہیں زندہ رکھیں گے اور عذاب سے محفوظ رکھیں گے۔

جس طرح حدیث پاک میں ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"لَا يَزِيدُ الْقَضَاءُ إِلَّا الدَّعَاءَ، وَلَا يَزِيدُنِي الْعُمْرُ إِلَّا الْبُرَّ." <sup>56</sup>

کہ تقدیر کو دعا ٹال دیتی ہے کہ انسان کے مقدر میں لکھا ہے کہ اگر یہ دعا کرے گا تو یہ تکلیف نہیں ہوگی، یہ دعا نہیں کرے گا تو پھر اس کو تکلیف ہوگی، اور والدین سے حسن سلوک کرنا عمر کو بڑھا دیتا ہے، والدین سے حسن سلوک کرے گا تو عمر بڑھ جائے گی اور نہیں کرے گا تو عمر نہیں بڑھے گی لیکن اللہ کے علم میں یہ دونوں چیزیں ہیں کہ یہ کرے گا یا نہیں کرے گا۔

**استغفار کرنے پر پانچ انعامات:**

﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْهِم مِّدْرَارًا ۝ وَيُمِدُّكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا ۝﴾

نوح علیہ السلام فرماتے ہیں میں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو وہ معاف کرنے والا ہے، وہ آسمان سے تم پر بارش برسا دیں گے، وہ تمہیں مال دیں گے، تمہیں بیٹے دیں گے، تمہیں باغات دیں گے، تمہیں نہریں دیں گے۔

یہ پانچ انعام دیں گے اگر تم استغفار کرو گے۔ سوال یہ ہے کہ دنیا میں کتنے

لوگ ہیں جو استغفار کرتے ہیں لیکن ان کی اولاد بھی نہیں ہوتی، باغات بھی نہیں ہوتے، نہریں بھی نہیں ہوتی تو یہ نعمتیں پھر بھی نہیں ہوتیں۔ اس کا جواب بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ جو بھی استغفار کرے گا تو اس کو یہ پانچ نعمتیں ملیں بلکہ یہ نوح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ خاص تھا کہ اگر تم استغفار کرو گے تو اللہ تعالیٰ بارش بھی دیں گے، مال بھی دیں گے، بیٹے بھی دیں گے، باغات بھی دیں گے اور نہریں بھی دیں گے۔

اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر اس کو قاعدہ کلیہ بھی مان لیا جائے تو اشکال پھر بھی نہیں ہے۔ یہ بڑا عجیب جواب دیا ہے حضرت نے۔ فرمایا کہ اگر کسی بندے سے کوئی وعدہ کیا جائے اور جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ نہ دیں بلکہ اس سے بڑھ کر دیں تو یہ تو نہیں کہتے کہ آپ نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ مثلاً بھائی! آپ اگر دس بجے میرے پاس آؤ گے تو میں تمہیں چنے کے ساتھ ناشتہ کراؤں گا۔ وہ دس بجے آئے تو آپ نے پائے نہاری اور حلیم کھلا دی۔ تو وعدہ تو چنے کا کیا تھا اور کھلایا ہے پائے نہاری اور حلیم تو یہ ایفاء عہد ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ قاعدہ مان بھی لیا جائے کہ استغفار سے یہ تمام چیزیں ملیں گی، اگر کسی کو یہ نہ ملے اور اس سے بڑھ کر ملے تو ایفاء عہد تو پھر بھی ہے کہ اللہ اپنے بندے کو ایمان اور تقویٰ سے قلبی سکون عطا فرماتے ہیں جو ان پانچوں چیزوں سے بڑھ کر ہے۔ اگر کسی کے ہاں بارش بر سے اور نقصان ہو جائے، اولاد ہو اور تکلیف کا ذریعہ بنے، مال ہو اور اس کی ڈکیتی ہو جائے، آدمی کے باغات اور کھیت ہوں لیکن ان کو نقصان ہو جائے۔ اگر اللہ ان پانچ چیزوں کے بجائے آدمی کو سکون قلبی عطا فرمادے تو وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔

اس لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر قاعدہ کلیہ بھی مانا جائے

اشکال تب بھی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ یا تو یہی پانچ چیزیں دیتے ہیں یا اس سے بھی بڑھ کر دیتے ہیں۔ آپ یقین فرمائیں بیان القرآن کی تعبیرات ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی حضرت کے علوم پر عرش پر عرش کر اٹھتا ہے۔

### قوم نوح کے دور میں پانچ بت:

﴿قَالَ نُوحٌ رَبِّ انَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدَهُ إِلَّا خَسَارًا ۖ وَمَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا ۝ وَ قَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا ۖ وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ۝﴾

نوح علیہ السلام کی قوم کے لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کہتے کہ دیکھو! تم نے ان کی بات کو ماننا نہیں ہے۔ نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے عرض کی: اے میرے رب! ان لوگوں نے میری نافرمانی کی ہے اور بات اس کی مانتے ہیں جس کے مال اور اولاد نے ان کو نقصان میں ڈالا ہے۔ مراد اس سے قوم کے بڑے بڑے سردار ہیں۔ اور بہت بڑے بڑے مکر انہوں نے کیے۔ یہ ”کُبَّارًا“ اکبر کا مبالغہ ہے۔ اور آپس میں ایک دوسرے سے یہ کہتے کہ اس نوح کی وجہ سے اپنے خداؤں کو چھوڑنا نہیں ہے خصوصاً ﴿وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا ۖ وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا﴾ ان پانچ ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو کسی صورت میں بھی نہ چھوڑنا!

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد اور حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے یہ پانچ بزرگ تھے۔ لوگ ان کو بڑی عقیدت سے دیکھتے۔ یہ دنیا سے چلے گئے تو لوگ ان کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ شیطان نے ان کے دلوں میں ڈالا کہ یہ نیک آدمی تھے، ان کی تصویریں بنا کر گھر میں رکھ لو، ان کے دیکھنے سے اللہ یاد آئے گا، آخرت یاد آئے گی۔ کچھ عرصہ ایسے ہی رہا۔ اگلی نسل آئی تو شیطان نے انہیں کہا کہ یہ اللہ کے بہت نیک

بندے ہیں تم ان کو سجدے کرو گے تو اس سے اللہ بہت خوش ہو گا کہ یہ میرے نیک بندوں کو پوجتے ہیں۔ لوگ ان کو پوجنا شروع ہو گئے۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ تم نے اپنے ان خداؤں کو نہیں چھوڑنا! اسے کہتے ہیں تخصیص بعد التعمیم کہ پہلے تمام خداؤں کے بارے میں کہا کہ اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑنا، پھر کہا کہ فلاں فلاں خاص خاص کو تو کبھی بھی نہیں چھوڑنا! یہ تخصیص بعد التعمیم ہے۔

### حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا کی وجہ:

﴿وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا﴾

حضرت نوح علیہ السلام اللہ سے دعا مانگتے ہیں: اے اللہ! ان ظالموں کو اور گمراہ کر دے، ان کی گمراہی میں اضافہ کر دے۔

یہاں اعتراض یہ ہے کہ نبی جب بھی دعا مانگتے ہیں تو ہدایت کی مانگتے ہیں اور نوح علیہ السلام تو گمراہی کی دعا مانگ رہے ہیں۔ اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ نوح علیہ السلام پر وحی آگئی تھی کہ ان میں سے مزید آپ پر کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے، جو ایمان لائے ہیں بس یہی ہیں، آئندہ آپ کی قوم میں سے کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ تو جب ایمان نہیں لائیں گے تو ان کو عذاب ہونا چاہیے۔

اسی لیے نوح علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ! جب انہوں نے ایمان لانا نہیں ہے تو جہنمی گمراہی ان کے مقدر میں ہے وہ ساری گمراہی ان کو دے دے تاکہ عذاب آئے اور ان سے زمین پاک ہو جائے۔ تو بظاہر گمراہی کی دعا کی ہے لیکن حقیقت میں استحقاق عذاب کی دعا کی ہے کہ یا اللہ! آپ نے ان کو جتنا گمراہ کرنا ہے آپ کر دیں تاکہ یہ مستحق عذاب ہو جائیں۔

﴿مِمَّا خَطِيئَتِهِمْ أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوا لَهُمْ مِنْ دُونِ

اللَّهُ أَنْصَارًا ﴿٢٥﴾

یہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے پہلے تو پانی میں غرق ہوئے اور موت کے بعد برزخ کی آگ میں چلے گئے۔ ان کو دو قسم کا متضاد عذاب ہوا۔ اب پانی اور آگ میں تضاد ہے۔ پانی اور آگ کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں ہے، ادھر پانی کا عذاب اور پانی کے عذاب سے نکلیں تو پھر آگ کا عذاب ہو گا۔

﴿وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ إِنَّكَ

إِنْ تَذَرْنِي هُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا إِلَّا فَاَجْرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾﴾

حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی: اے میرے رب! ان کافروں میں سے ایک بندہ بھی زمین پر باقی نہ رکھنا! اگر آپ نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ آپ کے بندوں کو اور گمراہ کریں گے اور ان سے جو نسل پیدا ہوگی وہ بھی کافروں کی پیدا ہوگی، اس لیے ان کو تباہ کر دیں اور ساتھ ہی پھر یہ دعا بھی کر دی:

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ

الْمُؤْمِنَاتِ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِيْنَ إِلَّا تَبَارًا ﴿٢٨﴾﴾

اے میرے رب! مجھے بخش دے، میرے والدین کو بخش دے اور ہر اس بندے کو بخش دے جو میرے گھر میں ایمان کی حالت میں داخل ہوا، اسی طرح تمام ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو بخش دے اور ظالموں کو تباہ و برباد فرما۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاجْزُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

## سورة الجن

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿قُلْ أَوْحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا مَّجْبَاً﴾

### شان نزول:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں بہت دعوت دی اور مکہ والوں نے آپ کو بہت تنگ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت میں مدد اور تعاون کے لیے طائف تشریف لے گئے۔ طائف میں آپ نے قبیلہ بنو ثقیف کے عمیر ثقفی کے تین بیٹوں عبدیاللیل، صعود اور حبیب سے ملاقات کی۔ ان کے بارے میں معروف تھا کہ یہ اچھے لوگ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دی، قوم کے مظالم کا ذکر کر کے فرمایا کہ میں تم سے مدد طلب کرنے آیا ہوں۔ انہوں نے آپ کا مذاق اڑایا۔ شریر لڑکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگائے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھر مارے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں مبارک سے خون نکلا۔ یہ وہ لوگ تھے جو سب سے اچھے لوگ شمار ہوتے تھے اور انہوں نے آپ کو یہ صلہ دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے واپس تشریف لائے۔ طائف سے نکلنے کے بعد عتبہ اور شیبہ کے انگوروں کے باغ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ لی۔ عتبہ اور شیبہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت دیکھی تو ان کو ترس آیا۔ انہوں نے اپنے



غلام عدّاس اس کا نام تھا، اس کو بھیجا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جا کر کچھ انگور دو کھانے کے لیے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگور کھانے شروع کیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی۔ وہ عدّاس غلام عیسائی تھا۔ اس نے کہا کہ یہ آپ نے کیا پڑھا؟ فرمایا: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اس نے کہا کہ یہ لفظ تو کھانے سے پہلے کوئی نہیں پڑھتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم کون ہو؟ کہا: میں عدّاس ہوں۔ پوچھا: علاقہ کون سا ہے؟ اس نے بتایا کہ میں نینو کا رہنے والا ہوں۔ فرمایا: اس علاقے میں یونس بن متی ہوتے تھے؟ کہا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ نبی تھے اور میرے بھائی تھے، میں بھی نبی ہوں۔ اس نے کہا: آپ نبی ہیں؟ فرمایا: ہاں میں نبی ہوں۔

اس وقت عدّاس نے آپ کے ہاتھوں کو چوما اور آپ کے سر کو چوما۔ اس عمل کو عتبہ اور شیبہ دونوں نے دیکھا۔ عدّاس واپس آیا تو انہوں نے کہا: یہ تو نے کیا کیا؟ لگتا ہے تو بھی اپنا دین چھوڑ گیا ہے، اس وقت سب سے افضل دین تو تمہارا ہے یعنی نصاریٰ کا۔ اس نے کہا: نہیں، سب سے افضل دین ہمارا نہیں ہے سب سے افضل دین ان کا ہے، جس نبی کے بارے میں ہم نے سنا تھا یہ وہ نبی ہے۔ یہ واقعہ راستے میں پیش آیا۔

پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مقام نخلہ پر رکے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو تہجد کی نماز پڑھی۔ ملکِ یمن کے جنات کا ایک گروہ بھی یہیں پہنچا ہوا تھا۔ چونکہ پہلے ملائکہ کو جب اللہ پاک حکم دیتے تو ملائکہ اپنے پروں کو ہلاتے اور بہت خوش ہوتے اور جو حکم آسمان سے زمین کی طرف آتا تھا ان احکام کو دیکھ کر خوش ہوتے اور آپس میں مذاکرہ کرتے۔ ملائکہ آسمان سے نیچے آتے تھے تو جنات وہاں جا کر ان باتوں کو سن لیتے اور واپس آ کر نجومیوں کو بتاتے کہ بارش ہونے والی ہے، فلاں کام

ہونے والا ہے، نجومی ان میں کچھ جھوٹ ملا کر یہ باتیں قوم کو بتا دیتے تھے، اس سے ان کا کام چلتا رہتا تھا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنا شروع ہوئی تو پھر اللہ رب العزت نے مستقل انگارے شہاب ثاقب کی صورت میں ان کے پیچھے لگا دیے جو جنات کو مارتے تھے اور جنات اوپر نہیں جاسکتے تھے۔ اب جنات بہت پریشان تھے کہ ایسا کیا واقعہ پیش ہوا ہے کہ ہمیں اوپر جانے سے روک دیا گیا ہے۔ اس تلاش میں نکلے ہوئے مقام نخلہ پر پہنچے تو دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں تلاوت فرما رہے تھے۔

ان لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت سنی اور چلے گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ان کے آنے کا پتا چلا، نہ تلاوت سننے کا پتا چلا، نہ ان کے ایمان کا پتا چلا۔ وحی آئی تو بذریعہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا۔

جنات؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چھ مرتبہ حاضر ہوئے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پانچ مواقع پر جنات سے گفتگو کرنا ثابت ہے اور یہ موقع ایسا ہے کہ جس میں جنات کی آمد کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا نہیں چلا تھا، اس ملاقات میں جنات سے براہ راست گفتگو نہیں ہوئی تھی۔

### جنات کا قرآن سننا:

﴿قُلْ أَوْحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا

عَجَبًا ۖ﴾

آپ فرما دیجیے کہ میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ جنات کے ایک گروہ نے قرآن کو بغور سنا اور کہنے لگے کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔

”نَفَرٌ“ کہتے ہیں تین سے لے کر دس تک کو اور یہ آنے والے جنات نو تھے

اور ملکِ یمن کے علاقے نصیبین کے رہنے والے تھے۔

﴿وَأَنَّهُ تَعَلَّى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا ۖ وَأَنَّهُ كَانَ يَفْقُورُ سَفِيهًا عَلَى اللَّهِ شَطَطًا ۖ﴾

یہ چونکہ ایمان لے آئے تھے اس لیے انہوں نے کہا: ہمارے رب کی شان بلند ہے، اللہ کی نہ کوئی بیوی ہے اور نہ کوئی اولاد۔ جو ہم میں بے وقوف لوگ ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں غلط باتیں کرتے ہیں۔

﴿وَأَنَّا ظَنَمْنَا أَن لَّنْ نَّقُولَ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۖ﴾

اور ہمارا پہلے خیال یہ تھا کہ انسان اور جن اللہ پر کبھی جھوٹ نہیں بولتے لیکن آج پتا چلا کہ ہمیں شرک کی باتیں بتانے والے جنات جھوٹ بولتے تھے۔

**مشرکین کا جنات کو شریک ٹھہرانا:**

﴿وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا ۖ﴾

مشرکین مکہ کا ایک معمول تھا کہ جب سفر پر نکلتے اور کسی وادی میں رات کو ان کا پڑاؤ ہوتا تو وہاں یہ لوگ ایک جملہ کہا کرتے تھے:

إِنِّي أَعُوذُ بِعَظِيمِ هَذَا الْوَادِي مِنْ شَرِّ سَفَهَاءِ قَوْمِهِ.<sup>57</sup>

اس وادی کے سردار جن کی قوم کے بے وقوف شریر جنات کے شر سے بچنے کے لیے میں اس سردار کی پناہ میں آتا ہوں۔

یہ ان کا معمول تھا کہ ایسے کہا کرتے تھے۔ یہاں یہ ذکر فرمایا کہ لوگوں میں

کہتے ہی لوگ ایسے ہیں جو جنات کی پناہ میں آتے ہیں ﴿فَزَادُوهُمْ رَهَقًا﴾ اور یہ بات جنات کو مزید گمراہ کرتی ہے، اکڑ میں مبتلا کرتی ہے کہ دیکھو! انسان بھی ہم سے مدد مانگتے ہیں۔

### رافع بن عمیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

رافع بن عمیر رضی اللہ عنہ صحابی ہیں۔ اپنے اسلام لانے کا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں ریگستان کے علاقے میں سفر کر رہا تھا۔ اچانک مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا تو وہیں اونٹنی سے اترا اور سو گیا اور یہی جملہ ”أَعُوذُ بِعَظِيمِهِ هَذَا الْوَادِعِ مِنَ الْحِجْرِ“ میں نے بھی کہہ کر وہاں کے جنات سے پناہ مانگی۔ جب میں سویا تو خواب میں دیکھا کہ ایک شخص آیا اور میری اونٹنی کا گلا کاٹنے لگا۔ میں اٹھا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں پھر سو گیا اور دیکھا کہ اونٹنی کا کوئی گلا کاٹ رہا ہے۔ میں اٹھا تو کوئی بھی نہیں تھا البتہ اونٹنی گھبراہٹ کا شکار تھی، حرکت کر رہی تھی۔ میں پھر سو گیا۔ تیسری بار خواب میں میں نے پھر یہی واقعہ دیکھا۔

پھر میں جب میں نیند سے بیدار ہوا تو دیکھا کہ میری اونٹنی تڑپ رہی ہے اور وہی شخص جس کو میں نے خواب میں اپنی اونٹنی پر حملہ کرتے دیکھا تھا کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک ہتھیار ہے۔ ساتھ ہی ایک بوڑھے کو بھی دیکھا جو اس نوجوان کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے اور اونٹنی پر حملہ کرنے سے اسے روک رہا ہے۔ اسی دوران تین وحشی گائے وہاں سے گزریں تو اس بوڑھے نے اس نوجوان سے کہا کہ اس اونٹنی کو چھوڑ دو اور ان تین میں سے کوئی ایک لے لو۔

اس نوجوان نے ایک وحشی گائے لے لی اور چلا گیا۔ وہ بوڑھا پھر میری طرف متوجہ ہوا اور مجھے اس نے کہا کہ وہ دور گزر گیا جب جنات سے پناہ لی جاتی تھی، اب تم یہ نہ کہا کرو بلکہ اب تم یہ کہو ”أَعُوذُ بِاللَّهِ رَبِّ هُمَمٍّ مِنْ هَوْلِ هَذَا الْوَادِعِ“

میں اس اللہ کی پناہ میں آتا ہوں جو محمد کا رب ہے اس وادی کے خوف اور شرور سے۔ تو میں نے پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ تو اس بوڑھے نے کہا کہ وہ نبی ہیں جو یثرب میں ہیں۔ میں اسی وقت نکلا اور سیدہ مدینہ منورہ آیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملتے ہی جو واقعہ میرے ساتھ پیش آیا تھا مجھے سارا بتا دیا۔ تو میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔<sup>58</sup>

### ”مساجد اللہ کی ہیں“ کا معنی:

﴿وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا﴾

یا تو ”الْمَسَاجِدَ“ حقیقی معنی میں ہے کہ سجدہ کی جگہیں کہ مساجد ساری اللہ کے لیے ہیں، انسان کو چاہیے کہ مساجد میں جا کر اللہ کے علاوہ کسی اور کو مدد کے لیے نہ پکارے۔

یہ ”الْمَسَاجِدَ“ مسجد کی جمع ہے اور مصدر میمی ہے جس کا معنی ہے سجدہ کرنا۔ اب آیت کا معنی یہ ہو گا کہ ہر قسم کے سجدے تعظیمی ہوں یا عبادت کے ہوں سارے اللہ کے لیے ہیں اور اللہ کے ساتھ کسی کو سجدے میں شریک نہیں کرنا چاہیے۔

### علم غیب کی تعریف:

﴿قُلْ إِنْ أَدْرِي أَقْرَبُ مَّا تُوْعَدُونَ أَمْ يَجْعَلُ لَهُ رَبِّي أَمَدًا﴾

﴿الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا﴾

”عالم الغیب“ کا لفظ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور پر استعمال کرنا ہرگز جائز نہیں، کیونکہ غیب اسے کہتے ہیں جس پر کوئی دلیل نہ ہو اور اس تک پہنچنے کا کوئی

راستہ نہ ہو۔ مطلق غیب اسے کہتے ہیں:

”إِنَّ الْغَيْبَ الْمُطْلَقَ فِي الْإِظْلَاقَاتِ الشَّرْعِيَّةِ مَا لَمْ يُقُمْ عَلَيْهِ دَلِيلٌ  
وَلَا إِلَى ذِكْرِهِ وَسِيلَةٌ وَسَيِّئٌ“ کہ جس تک پہنچنے کی کوئی دلیل اور راستہ نہ ہو۔<sup>59</sup>

اور جب اس تک آپ پہنچ گئے تو پھر غیب غیب نہیں رہتا، وہ مشاہد بن جاتا ہے، ظہور ہو جاتا ہے اس کا۔ اللہ رب العزت عالم الغیب ہیں، اللہ کے پاس وہ علوم ہیں جن تک رسائی کسی بندے کے بس میں نہیں ہے۔

**اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب ہے:**

﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا ۖ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ  
يَسْأَلُكَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ۚ﴾

اللہ اپنے غیب پر مطلع کرتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو منتخب فرماتے ہیں۔ یہ جو ”إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ“ کا استثناء ہے یہ استثناء منقطع ہے۔ ”عِلْمُ الْغَيْبِ“ سے مراد کہ اللہ تعالیٰ کا جو علم ہے وہ ہر قسم کا ہے اور ”إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ“ کہ جس غیب پر اللہ کسی کو مطلع فرماتے ہیں یہ وہ غیب ہے جس کا تعلق رسالت کے علوم سے ہے، یہ عام غیب نہیں ہے۔ تو یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔

**حفظ الایمان کی عبارت کی وضاحت:**

اللہ کی ذات کے علاوہ کسی اور کے لیے عالم الغیب کا لفظ استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی کتاب ”حفظ الایمان“ میں جو عبارت ہے اس پر اہل بدعت اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے

ہیں: جتنا غیب اللہ کے نبی کے پاس ہے العیاذ باللہ اتنا غیب تو عام آدمی کے پاس بھی ہے،  
مجنون کے پاس بھی ہے اور حتیٰ کہ جانوروں کے پاس بھی ہے۔ تو حضرت تھانوی رحمہ  
اللہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی ہے۔

حالانکہ بات یہ نہیں ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں  
کہ اللہ کی ذات کے علاوہ کسی اور پر ”عالم الغیب“ کا لفظ استعمال کرنا جائز نہیں۔ کیوں کہ  
جب تم اللہ کے علاوہ اللہ کے رسول کو ”عالم الغیب“ کہتے ہو تو تمہاری مراد کیا ہے؟ اگر  
تم کہتے ہو کہ اس علم غیب سے تمام علوم یعنی ”جميع ما كان وما يكون“ مراد ہے تو  
اس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، اور اگر آپ کہتے ہو کہ اس سے مراد تمام  
نہیں بلکہ بعض ہیں تو بعض ہونا یہ پیغمبر کا کمال نہیں ہے۔ کمال وہ ہوتا ہے جو صاحب  
کمال میں ہو اور دوسرے میں نہ ہو۔

تو بعض ہونا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال نہیں ہے کیوں کہ بعض وہ  
باتیں جو ایک بندے کو معلوم ہوں اور دوسرے کو نہ ہوں تو یہ مجنون کے پاس بھی ہوتا  
ہے۔ ایک مجنون ہے وہ اپنی جیب میں کوئی مٹی کا ڈھیلا ڈال لیتا ہے اور کہتا ہے کہ میری  
جیب میں کیا ہے؟ ہمیں معلوم نہیں کہ اس کی جیب میں کیا ہے لیکن اس کو پتا ہے کہ  
جیب میں مٹی کا ڈھیلا ہے، اور ایسی باتیں تو بعض صبی اور بچوں کو بھی معلوم ہوتی ہیں جو  
بڑے کو معلوم نہیں ہوتیں اور اسی طرح بعض چیزیں جانوروں کو معلوم ہوتی ہیں جو  
انسانوں کو معلوم نہیں ہوتیں۔ مثلاً کسی جگہ گھی پڑا ہوا ہے تو چوہی سو گنگھ لیتی ہے لیکن  
ہمیں نہیں پتا چلتا، اسی طرح پانی نیچے ہوتا ہے اور ہد ہد پرندہ معلوم کر لیتا ہے لیکن ہمیں  
نہیں پتا چلتا۔

تو نبی کے لیے ”عالم الغیب“ لفظ کا کیسے استعمال کریں گے؟ جب آپ نبی کے  
لیے ”عالم الغیب“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اگر آپ کی مراد تمام علوم ہیں تو اس پر

دلیل نہیں ہے اور اگر بعض علوم ہیں تو بعض ایسی باتیں ایک کو معلوم ہوں اور دوسرے کو معلوم نہ ہوں تو یہ عام انسان بھی جانتا ہے، جانور بھی جانتا ہے، صبی بھی جانتا ہے، مجنون بھی جانتا ہے تو یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اختصاص کیسے ہوا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آپ نے کون سا کمال ثابت کیا؟

دوسری بات سمجھیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ لوگ کہتے ہیں کہ ہم جو عالم الغیب کہتے ہیں تو یہ ہماری خاص اصطلاح ہے اور جب ہم کہتے ہیں کہ حضور عالم الغیب ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض باتیں ایسی معلوم ہیں جو دوسروں کو معلوم نہیں ہیں۔ فرمایا کہ اگر تمہاری یہ اصطلاح مان لی جائے کہ عالم الغیب کا لفظ جس طرح اللہ پر بولا جاتا ہے تو نبی پر بھی بولا جائے تو پھر اس تاویل سے تو خالق، مالک، رازق اور معبود کا لفظ بھی اللہ کے علاوہ مخلوق پر استعمال کرنا ہو گا۔ کوئی بندہ کہتا ہے میں اپنے مالک کو رازق کہتا ہوں اور میرے ہاں رازق کا معنی یہ ہے کہ جو تنخواہ دے، یہ میری اصطلاح ہے۔ کوئی بندہ اپنے والد کو خالق کہے کہ میرے ہاں خالق کا معنی ہے کہ جس کی وجہ سے بچہ پیدا ہو۔ تو اگر اس طرح تاویلات کرتے جائیں تو پھر اللہ کی کون سی صفت بچے گی؟

آگے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس سے بھی باریک بات فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں: اگر یوں تاویل کر لی جائے تو اس طرح تو تاویل کر کے اللہ پر عالم الغیب کا لفظ استعمال کرنا جائز نہیں ہو گا کیوں کہ ایک بندہ کہتا ہے کہ میرے ہاں عالم الغیب کا معنی یہ ہے کہ ایسا بندہ جو سب نہ جانتا ہو بلکہ کچھ جانتا ہو اور چونکہ اللہ سب کچھ جانتے ہیں لہذا اللہ کو عالم الغیب نہیں کہہ سکتے۔ بات سمجھ آرہی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین)

اگر آپ عالم الغیب کا لفظ اللہ کے علاوہ نبی پر تاویل کر کے بولتے ہیں تو کوئی بندہ یہی تاویل کرے گا تو اللہ پر یہ لفظ استعمال کرنا جائز نہیں ہو گا۔ کوئی کہے گا کہ اللہ



عالم الغیب نہیں ہے کیوں کہ میرے ہاں عالم الغیب کا معنی یہ ہے کہ جس کو کچھ معلوم ہو اور کچھ معلوم نہ ہو، لہذا یہ لفظ اللہ کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ تو ایسی تاویلات نہ کرو جس سے شریعت کا چہرہ مسخ ہو جائے۔

یہ ہے حفظ الایمان کی پوری عبارت کا خلاصہ۔ اب آپ بتائیں اس میں توہین کا پہلو کون سا بنتا ہے؟ (کوئی نہیں۔ سامعین)

اللہ تعالیٰ ہمیں بات سمجھنے کی اور آگے سمجھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

## سورة المزمل

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿يَا أَيُّهَا الْمَزْمِلُ ۖ قُمِ الْبَيْتَ إِلَّا قَلِيلًا ۖ﴾ ١ ۖ نَصْفَهُ أَوْ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۖ﴾ ٢

### شان نزول:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت گھبراہٹ کا شکار ہوئے اور یہ طبعی خوف تھا۔ ایسے جبرائیل امین کو کبھی دیکھا نہیں تھا۔ پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے۔ سارا واقعہ سنایا۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت تسلی دی۔ تقریباً چھ ماہ تک وحی کا سلسلہ بند رہا اور ان چھ ماہ کے دوران رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبارک خواب آتے رہے۔ اسی وجہ سے خواب کو نبوت کا چھیلیسواں حصہ کہتے ہیں کہ اعلان نبوت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بنتی ہے 23 سال اور اگر 23 سال کی ششماہیاں دیکھیں تو وہ بنتی ہیں چھیلیس۔ تو ان میں سے جو پہلے چھ ماہ تھے ان میں وحی نہیں آئی بلکہ خواب آتے رہے۔ تو کہتے ہیں کہ روئے صادقہ یہ وحی کا چھیلیسواں حصہ ہیں کہ چھ ماہ تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب آتے رہے اور نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ تو جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ وحی نہیں آئی بلکہ خواب کے ذریعہ وحی آتی رہی۔

تو چھ ماہ کے بعد ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہی شخص

آسمان کے کنارے میں کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حراء میں دیکھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک گھبراہٹ کی کیفیت سی طاری ہو گئی اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”زَقِلُّوْیْ! زَقِلُّوْیْ!“ میرے اوپر چادر ڈال دو۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ پر چادر ڈال دی۔

### مزمل اور مدثر کا معنی:

اللہ رب العزت نے ﴿يَا أَيُّهَا الْمَرْمِلُ﴾ اور ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ انہی لفظوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا ہے۔ ان میں کوئی بہت گہرا فرق نہیں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مدثر؛ دثار سے ہے جسے لحاف کہتے ہیں اور مزمل؛ زمیل سے ہے جسے چادر کہتے ہیں، بس چادر اوڑھ لی یا تھوڑا سا بڑا کپڑا اوڑھ لیا تو ﴿يَا أَيُّهَا الْمَرْمِلُ﴾ فرمایا اور ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ فرمایا۔

### فترت وحی کے بعد نازل ہونے والی پہلی سورت:

فترت وحی کے بعد پہلی کون سی سورت نازل ہوئی؟ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ سورت مزمل نازل ہوئی لیکن اس کا ابتدائی حصہ نازل ہوا اور اس کا آخری حصہ ایک سال بعد نازل ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ سورت مدثر نازل ہوئی اور بعض کہتے ہیں کہ دونوں اکٹھی نازل ہوئیں، الگ الگ نہیں۔

### قیام اللیل کا حکم:

﴿يَا أَيُّهَا الْمَرْمِلُ﴾ ۱ قُمْ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۲ ۚ تَصَفَّهٖ أَوْ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۳ ۚ أَوْزِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۴ ﴿

اس میں اللہ پاک نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی محبت کے ساتھ

”يَا أَيُّهَا الْمَرْءُ“ کہہ کر خطاب فرمایا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب پر رات کے چوتھائی حصہ سے کچھ زیادہ رات کا قیام کرنا فرض تھا۔

فرمایا: اے چادر اوڑھنے والے! آپ رات کا کچھ حصہ چھوڑ کر باقی رات قیام کیا کریں۔ یہ قیام آدھی رات کر لیں، یا اس سے تھوڑا کم کر لیں، یا پھر اس سے تھوڑا زیادہ کر لیں۔

اب بندے کے ذہن میں سوال آتا ہے کہ ﴿قُلِ النَّيْلُ إِلَّا قَلِيلًا﴾ میں ”قَلِيلًا“ کی جو تشریح ”نِصْفَةً“ سے کی جا رہی ہے بظاہر یہ ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں کہ نصف تو قلیل نہیں کہلاتا!

اس کا جواب یہ ہے کہ رات تو شروع ہوتی ہے مغرب سے، جب مغرب سے لے کر آپ صبح صادق تک چلیں گے پھر آپ دیکھیں کہ نصف کیا بنتا ہے! مثلاً آج کل ہمارے ہاں مغرب ہو رہی ہے پونے چھ بجے اور صبح صادق ہو رہی ہے پونے چھ بجے تو یہ بارہ گھنٹے بن گئے۔ تو یہ ہے پوری رات۔ اس کا نصف چھ گھنٹے ہے اور جب آپ عشاء کی نماز پڑھیں گے، سنتیں پڑھیں گے اور پھر سوئیں گے تو اس کے بعد آپ دیکھیں کہ اب نصف کیا بنے گا؟ آپ نے عشاء کی نماز پڑھی ساڑھے سات بجے، اب آپ کو سوتے سوتے ساڑھے آٹھ بج گئے۔ اب آپ ساڑھے آٹھ سے شروع کریں اور پونے چھ تک چلیں تو اب کتنے گھنٹے بنیں گے؟ اب اس کا نصف ساڑھے چار بنے گا۔

اب دیکھیں، مغرب سے لے کر صبح صادق تک اس کا نصف کیا بنتا ہے؟ اور ساڑھے آٹھ بجے کے بعد اس کا نصف کیا بنتا ہے؟ اب اگر رات کو دیکھیں تو وہ شروع ہوتی ہے پونے چھ سے لے کر صبح صادق تک لیکن جو تہجد کا معاملہ ہے اس کی رات شروع ہونی ہے سونے کے بعد۔ کہ جب آپ کا سونے کا وقت شروع ہوتا ہے تو آپ کی

رات شروع ہو گئی۔ تو جب آپ اس کا نصف دیکھیں گے تو یہ کچھ کم پوری رات بن جائے گی۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ نے جو رات کو تہجد پڑھنی ہیں تو یہ جو تہجد والی رات ہے یہ سورج کے غروب ہونے سے شروع ہوگی یا عشاء کے بعد شروع ہوگی؟ عشاء کے بعد شروع ہوگی! اور جو پوری رات ہے وہ غروب ہونے سے لے کر صبح صادق تک ہے۔ اس رات کا جو نصف ہے وہ 12 بجے ہے اور جو تہجد آپ نے پوری رات پڑھنی ہیں وہ عشاء کے فرض کے بعد ہیں، کوئی عشاء کے فرض 9 بجے پڑھتا ہے اور ہم جو عشاء پڑھتے ہیں تو وہ ساڑھے سات بجے پڑھتے ہیں ورنہ اگر مستحب وقت کے مطابق عشاء تاخیر سے پڑھیں گے تو کم از کم ساڑھے آٹھ، نو بجے ہوگی۔ اس کے بعد جو نصف ہو گا وہ کچھ کم پوری رات بن جائے گی۔ اب سمجھ میں آئی؟ (جی ہاں۔ سامعین)

### تہجد کی منسوخت کی وجوہات:

پہلے تہجد ایک سال تک فرض رہی۔ اس کے بعد معراج کی رات آپ تشریف لے گئے عرش پہ، اللہ نے پانچ نمازیں دے دیں، وہ پانچ نمازیں فرض ہو گئیں اور تہجد کی فرضیت منسوخ ہو گئی۔ منسوخی کی تین وجوہات اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں بیان فرمائی ہیں:

#### [1]: پہلی وجہ

﴿إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلُثِي الثَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ الثَّيْلَ وَالتَّهَارَ ۖ عَلِمَ أَن لَّنْ نَّحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ﴾

اللہ کے علم میں ہے کہ تم دو تہائی کے قریب یا نصف کے قریب یا ایک تہائی کے قریب رات کو کھڑے ہوتے لیکن اس کو شمار کرنا تمہارے لیے ذرا مشکل ہے۔

جب آدمی تہجد پڑھنا شروع کر دے تو اس کو اندازے کے ساتھ شمار کرنا مشکل ہے کہ اب نصف رات ہو گئی ہے اب دو تہائی رات گزر گئی ہے۔ گھڑیاں تو اس وقت نہیں ہوتی تھیں۔ اس لیے اللہ نے حکم کو منسوخ کر کے آسانی پیدا فرمادی کہ اب تم چاہو تو پڑھ لو، نہ چاہو تو نہ پڑھو، لیکن پڑھ لو تو بہتر ہے۔ ”مُخَصَّصَةٌ“ کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا تمہارے لیے کافی مشکل تھا، یہ عمل احصاء مشکل تھا، گنتی مشکل نہیں تھی، اس لیے اللہ نے آسانی پیدا فرمادی ہے۔

### [2]: دوسری وجہ

﴿عَلِمَ أَنَّ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَرَضٌ ۖ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ ۖ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾

تم میں سے بعض مریض ہیں تو فرض ادا کرنا مشکل ہو گا، بعض دن بھر روزی کمانے میں مصروف رہتے ہیں تو رات کو فرض ادا کرنا مشکل ہو گا، بعض اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں تو فرض ادا کرنا مشکل ہو گا اس لیے اللہ پاک نے اس کی فرضیت کو منسوخ فرمادیا۔

### [3]: تیسری وجہ

پیچھے گزر چکا ہے کہ ﴿إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْعًا طَوِيلًا﴾ کہ آپ کی دن میں مشغولیت بھی بہت زیادہ تھی، ذاتی کام بھی اور دینی کام بھی، پھر رات کو کھڑا ہونا مشکل تھا۔ ان تین عذروں کے پیش نظر اللہ نے فرضیت تہجد کو ختم کر دیا اور یہ فرمایا کہ اب فرض نہیں ہے، اب نفل ہے، پڑھ لو تو بہتر ہے اور نہ پڑھو تو کوئی گناہ نہیں

لیکن تہجد کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اہتمام فرماتے تھے، کسی وجہ سے رات کو رہ جاتے تو سورج نکلنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ لیتے تھے۔ ہمارے اوپر قضا تو نہیں لیکن پڑھنا ضرور چاہیے اور عالم کو تو اس کا بہت اہتمام کرنا چاہیے۔

## قیام لیل کی حکمت:

یہاں جو رات میں اٹھنے کا فرمایا ہے اس کی وجہ ﴿إِنَّا سَنُلْقِيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا﴾ ہے کہ یہ وحی کی ابتدا ہے اور آئندہ پورا قرآن نازل ہونا ہے جو بہت وزنی اور بوجھ والا ہے تو اٹھنا مشکل ہو گا۔ اس لیے اللہ نے حکم دیا کہ تم ابھی سے ترتیل کے ساتھ قرآن پڑھو۔ رات کو اٹھنے کی عادت ڈالو۔ جب مشقت برداشت کرنا شروع کریں گے تو آپ کے لیے مشقت والا کام کرنا آسان ہو جائے گا۔

## رات کو قیام کی وجہ:

اور یہ حکم رات کا کیوں دیا ہے؟ اس کی تین وجہیں بیان فرمائی ہیں:

[1]: ”إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً“ رات کو جب آدمی اٹھتا ہے تو اس سے نفس کی اصلاح بہت زیادہ ہوتی ہے۔ آدمی رات کو سوئے اور پھر اٹھے تو گرمی میں رات چھوٹی ہے اور سردی میں سردی بہت زیادہ ہے۔ تو رات کا اٹھنا یہ نفس کے لیے بہت زیادہ اصلاح کا سبب ہے اور یہ نفس کو روندتا ہے۔

[2]: ”وَأَقْوَمُ قِيْلًا“ اور اس میں آدمی چونکہ اکیلا ہوتا ہے تو اکیلا آدمی بات دل سے کرتا ہے، اقْوَمُ قِيْلًا کا معنی یہ نہیں کہ بات سچی کرتا ہے بلکہ آدمی بات بڑی دل جمعی سے کرتا ہے، قرآن دل جمعی سے پڑھتا ہے، مناجات دل جمعی سے کرتا ہے، خلوت ہوتی ہے، ساتھ بندہ کوئی نہیں ہوتا۔

[3]: ”إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْعًا طَوِيلًا“ رات کو کوئی اور تمہاری مشغولیت نہیں

ہے جبکہ دن کو مشغولیات بہت زیادہ ہوتی ہیں، اس لیے ہم نے کہا کہ رات کو اٹھا کرو! بہتر تو یہی ہے کہ آدمی سوئے اور پھر اٹھے لیکن نہ سوئے اور پھر بھی تہجد پڑھے تو عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”الَّيْلُ كُلُّهَا نَائِثَةٌ“ یہ پوری رات ہی اٹھنا ہے، جب بھی تہجد پڑھے وہ تہجد ہی شمار ہوگی۔<sup>60</sup>

اس کا ہم سب کو بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ اللہ مجھے بھی توفیق عطا فرمائے، اللہ آپ کو بھی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

### ذکر اسم ذات کا ثبوت:

﴿وَادْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبْتَئِلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا﴾

آج کل ایک بات دنیا میں چل رہی ہے کہ اللہ... اللہ... اللہ... یہ جو ذکر اسم ذات اکیلا کرتے ہیں تو بعض لوگ اس پر کہتے ہیں کہ اسم ذات کا اکیلا ذکر کرنا یہ بدعت ہے، کیونکہ یہ کہیں سے ثابت نہیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں کہ اس آیت سے اسم ذات کا اکیلا ذکر کرنا ثابت ہو رہا ہے، کیوں کہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا ”وَادْكُرِ رَبَّكَ“ کہ اپنے رب کو یاد کرو بلکہ یہ فرمایا ”وَادْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ“ کہ اپنے رب کا نام لو، اور رب کا نام کیا ہے؟ اللہ! اس لیے اللہ... اللہ... کہنا یہ قرآن کی اس آیت سے ثابت ہے۔ اس لیے اسے بدعت نہیں کہہ سکتے۔<sup>61</sup>

اور حدیث پاک میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

60- التفسیر المظہری: ج 10 ص 108

61- التفسیر المظہری: ج 10 ص 111



لَا تَقُومُوا السَّاعَةَ حَتَّى لَا يُقَالَ فِي الْأَرْضِ اللَّهُ اللَّهُ.<sup>62</sup>

جب تک اللہ اللہ کہنے والے لوگ ہوں گے تب تک زمین میں قیامت نہیں آئے گی۔  
میں اگلی بات اس سے بڑھ کر کہتا ہوں کہ سلسلہ چشتیہ کے حضرات اسم  
ذات دو ضربی اللہ اللہ [پہلے لفظ اللہ کی ہاپر پیش اور دوسرے لفظ اللہ کی ہاپر سکون کے  
ساتھ] الگ کراتے ہیں اور اسم ذات یک ضربی اللہ الگ کراتے ہیں۔ اسم ذات یک  
ضربی تو قرآن سے ثابت ہو گیا ﴿وَإِذْ كُنِيَ اسْمُ رَبِّكَ﴾ سے کہ اپنے رب کا نام لو اور اسم  
ذات دو ضربی اس حدیث میں آگیا ”لَا تَقُومُوا السَّاعَةَ حَتَّى لَا يُقَالَ فِي الْأَرْضِ اللَّهُ  
اللَّهُ“ اور یہاں لفظ اللہ ایک بار نہیں بلکہ دوبار فرمایا ہے، اس لیے اسم ذات دو ضربی بھی  
ثابت ہے۔ جب یہ بات صاف صاف ہے تو اس کو بدعت کہنے کی ضرورت کیا ہے؟!  
اللہ ہم سب کی اصلاح فرمائے۔ آمین

### سات مقامات سلوک کا تذکرہ:

یہاں سلوک کے سات مقامات کو بیان فرمایا ہے:

[1]: ”قُمِ اللَّيْلُ إِلَّا قَلِيلًا“ رات کو عبادت کرنا۔ اس سے سلوک کس سے طے

ہوتا ہے؟ ملا علی قاری رحمہ اللہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں:

مَنْ لَا يَقُومُ اللَّيْلَ لَيْسَ مِنَ الصَّالِحِينَ الْكَامِلِينَ.<sup>63</sup>

وہ شخص صالح کامل ہو ہی نہیں سکتا جو رات کو قیام نہیں کرتا۔

[2]: ”وَرَتَّبِ الْقُرْآنَ تَرْتِيبًا“ قرآن کریم کو ترتیل کے ساتھ پڑھو! ترتیل کا

معنی ہوتا ہے مخارج بھی صحیح ہوں اور حسن صوت بھی ہو، جس حد تک اللہ نے آواز دی

62۔ جامع الترمذی، رقم: 2207

63۔ مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح: ج 3 ص 275 باب التحریض علی قیام اللیل

ہو اس حد تک اپنی آواز کو خوبصورت بنا کے قرآن کریم کو پڑھے۔

[3]: ”وَادْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ“ اللہ اللہ بھی کرے۔

[4]: ”وَتَبَشِّرْ اِلَيْهِ تَبَعِيًّا“ لوگوں سے الگ تھلگ بھی رہے یعنی کچھ وقت

خلوت میں بھی گزارے۔ مستقل نہیں لیکن کچھ وقت خلوت میں بھی گزارے۔

[5]: ”فَاتَّخِذْهُ وَحْيًا“ کہ اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کرے۔

[6]: ”وَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ“ لوگوں کی باتوں پر صبر کرے۔

[7]: ”وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا“ اور اگر لوگ تنگ کریں، تکلیف دیں اور

آپ کے خلاف باتیں شروع کریں اور ان سے الگ ہونا پڑے تو خوبصورتی کے ساتھ

ان سے الگ ہو جائیں۔ ”هَجْرًا جَمِيلًا“ معنی یہ ہے کہ جب آپ کسی سے علیحدگی

اختیار کریں تو اس کا برے لفظوں میں تذکرہ نہ کیا کریں۔ بس اس کا خیال فرمایا کریں۔

آپ کسی ادارے کے ساتھ چل رہے تھے اور اب نہیں چل سکتے اور الگ ہو گئے تو اب

ان کا برا تذکرہ نہ کریں، غیبت نہ کریں، ان کے عیوب نہ بیان کریں، بس چھوڑ دیا تو

چھوڑ دیا۔ آپ کسی جماعت میں تھے اور الگ ہو گئے تو بس اب ان کے خلاف کچھ نہ

کہیں۔ گھروالی تھی اس کو طلاق دے دی تو اب اس کے غلط تذکرے نہ کریں، اس کے

عیوب نہ بیان نہ کریں۔ ان چیزوں میں انسان کو بہت زیادہ احتیاط کرنی چاہیے، اس کا

بہت زیادہ خیال کرنا چاہیے۔

**امام، مقتدی اور منفرد کے لیے الگ الگ آیات:**

﴿فَاقْرَءْ وَاَمَّا تيسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾

ایک نمازی منفرد ہے، ایک نمازی مقتدی ہے اور ایک نمازی امام ہے۔

تینوں کے لیے الگ الگ آیات اللہ نے قرآن کریم میں نازل فرمائی ہیں۔ یہ جو آیت

ہے ”فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ“ یہ منفرد کے لیے ہے، مقتدی اور امام کے لیے نہیں کیونکہ تہجد کی جماعت نہیں ہوتی بلکہ تہجد انفرادی ہوتی ہے، اس لیے منفرد کو حکم ہے ”فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ“ کہ جہاں سے قرآن آسان لگے تم وہاں سے قرآن کریم کو پڑھو۔

اور امام کے لیے سورۃ بنی اسرائیل میں آیت ہے ﴿وَلَا تَجْهَرُ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتُ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا﴾<sup>64</sup> کہ نہ تو امام اتنا اونچا قرآن پڑھے کہ مقتدی تھوڑے ہیں اور اس کی آواز زیادہ ہو اور نہ اتنی آہستہ پڑھے کہ مقتدی زیادہ ہوں اور آواز کم پڑ جائے، بلکہ درمیانہ راستہ اختیار کرے۔ اور مقتدی کے متعلق سورۃ الاعراف میں ہے: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ کہ جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو پھر سنو اور توجہ دو اور خاموشی اختیار کرو۔

**توبہ کا معنی و مفہوم:**

﴿عَلِمَ أَنْ لَنْ تُحْصَوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾

اس آیت کا معنی یہ نہیں ہے کہ تم نے گناہ کیا اور تم نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ توبہ کا معنی ہوتا ہے ”رجوع کرنا“ یہاں ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے والے حکم سے رجوع کر لیا۔ پہلے حکم یہ تھا کہ تہجد فرض ہے اور اب حکم یہ دیا کہ تہجد فرض نہیں بلکہ نفل ہے۔ تو رجوع ہو گیا۔ جب بندہ گناہ کو چھوڑتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس نے توبہ کی یعنی وہ بھی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف چلا جاتا ہے۔ تو یہاں ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ﴾ کا معنی یہ نہیں ہے

کہ اللہ نے ان کے گناہ کو معاف کر دیا تھا، گناہ تو تھا ہی نہیں تو معاف کیا کیا! اس لیے معنی یہ ہے کہ پہلے والے حکم کو واپس لے لیا۔

﴿وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾

یہ آیت چونکہ مکی ہے تو یہاں زکوٰۃ ادا کرو کا معنی کیا ہے؟ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ پوری سورت مکی ہے لیکن یہ آیت مدنی ہے، اور بعض کی رائے یہ ہے کہ نہیں، جس طرح نماز فرض مکہ میں تھی اور بہت ساری تفصیلات مدینہ منورہ میں آئیں اسی طرح نفس زکوٰۃ تو مکہ مکرمہ میں فرض ہو گئی تھی البتہ اس کی تفصیلات مدینہ منورہ میں آئیں۔

﴿وَمَا تَقْضُوا لَآنَفْسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ وَّ

أَعْظَمَ أَجْرًا﴾

تم جو بھی مال آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں ضرور پاؤ گے۔ اللہ کے پاس پہنچ کر یہ مال پہلے سے کہیں بہتر ہو جائے گا اور اس کا ثواب بھی بہت زیادہ ہو جائے گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ایک بار پوچھا: ایک مال تمہارے پاس ہے اور ایک مال تمہارے ورثاء کے پاس ہے، تمہیں کون سا مال اچھا لگتا ہے؟ جو تمہارے پاس ہے وہ یا جو تمہارے ورثاء کے پاس ہے؟ عرض کیا گیا کہ حضور! ہمیں تو وہ مال پسند ہے جو ہمارے پاس ہے! فرمایا: سوچ کر جواب دو! عرض کیا حضور! یہی جواب ذہن میں آتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا مال وہ ہے جو تم نے اللہ کے راستے میں خرچ کر دیا اور جو مال رہ گیا وہ تمہارا نہیں بلکہ تمہارے وارثوں کا ہے۔

اللہ ہمیں دین کے احکامات پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

## سورة المدثر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

صفتِ انذار:

﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾

لحاف لپٹنے والے! یا بڑی چادر لینے والے! آپ مستعد ہو جائیں! تیار ہو جائیں!  
اور لوگوں کو ڈرائیں! اپنے رب کی تکبیر بیان کریں!  
قرآن کریم میں جہاں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات آئی ہیں انذار  
اور تبشیر دونوں اکٹھی آئی ہیں لیکن یہاں انذار تو ہے، تبشیر کا لفظ نہیں ہے۔ چونکہ یہ  
ابتدائی سورت ہے اور اس وقت مسلمان دوچار ہی تھے، باقی سارے کافر تھے تو کفار کو  
تو تبشیر نہیں بلکہ ان کو انذار ہوتا ہے، ڈرایا جاتا ہے، اس لیے فرمایا کہ تم ان کو ڈراؤ۔

عقیدہ توحید پر کاربند رہنے کا حکم:

﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝﴾

اپنے کپڑوں کو صاف رکھیں! یہاں چونکہ نماز ابھی فرض نہیں تھی اس لیے  
نماز کی بات نہیں کی صرف اتنا فرمایا کہ اپنے کپڑے صاف رکھیں! اور گناہ اور بتوں سے  
دور رہیں۔

اب دیکھو! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں اور نبی ہونے کے باوجود

عقیدہ توحید کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ بتوں سے دور رہیں اور عقیدہ توحید پر مستحکم رہیں۔ تو جو معصوم نہیں ہے اس کو عقیدہ توحید پر کار بند رہنے کے لیے کس قدر تاکید کی ضرورت ہوگی؟! کس قدر اہمیت ہوگی اس کے لیے؟!

**بدلے کا سوچ کر احسان نہ کریں!**

﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ﴾

اور یوں خرچ نہ کرو کہ امید رکھو کہ بعد میں مجھے زیادہ ملے گا۔ میں اس کو ہدیہ دیتا ہوں تو کل یہ بھی ہدیہ دے گا۔ ہمارے ہاں شادی کے موقع پر اس کو ”نیوتا“ کہتے ہیں کہ جب شادی ہوتی ہے تو لوگ پیسے لکھتے ہیں اور پھر جب دوسرے کی باری آتی ہے تو پھر اپنی کاپی کو دیکھتے ہیں کہ اس نے پانچ سو دیا تھا تو ہم کتنے دیں؟! تو شادی کے موقع پر بعض لوگ دوسروں کو پیسے دیتے ہیں تاکہ جب ہمارے بچے کی شادی ہو تو ہمیں پیسے اس سے زیادہ ملیں۔ ایسی حرکتیں نہ کرو، یہ قرآن کریم کے مزاج کے خلاف ہے۔

اسی طرح یہ سوچ کر کہ کسی کو ہدیہ دیں کہ آج وہ ہمارے پاس آئے ہیں تو ہم ان کو ہدیہ دیں اور جب ہم ان کے علاقے میں جائیں گے تو وہ بھی ہمیں ہدیہ دیں گے۔ یہ باتیں ٹھیک نہیں ہیں۔

﴿وَمِرَّتْكَ فَأَصْبِرْ﴾

اللہ کی ذات کے لیے برداشت کرو۔

**ولید بن مغیرہ کی اسلام دشمنی:**

﴿ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۖ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ۖ وَ

## بَيِّنْ شُهُودًا ﴿٣٧﴾

کئی روایات سے ثابت ہے کہ یہ آیات ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئیں۔ یہ مکہ کا سب سے مالدار آدمی تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ اس کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ دینار تھی۔ اس دور میں مکہ سے طائف تک اس کے باغات تھے۔ جب سورت المؤمن کی آیت ﴿حَمْدٌ تَذْكِرُ أَنْصَتَبَ مِنَ اللَّهِ الْغَزِيرِ الْعَلِيمِ﴾ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ إِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿٣٧﴾ نازل ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلاوت کر رہے تھے تو ولید بن مغیرہ نے سنا اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا کہ یہ کلام نہ تو کسی انسان کا ہے اور نہ کسی جن کا، اس کی خاص حلاوت ہے اور اس کی خاص رونق ہے، اس کا اعلیٰ؛ شربار ہے اور اسفل؛ میٹھا پانی ہے، یہ بلند بالا کلام ہے، اس کو کوئی مغلوب نہیں کر سکتا اور یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔

چونکہ یہ بڑا مالدار آدمی تھا تو جب یہ بات مکہ میں پھیلی تو قریب تھا کہ لوگ اسلام کی طرف آئیں۔ ابو جہل نے سوچا کہ میں اس کو میں کیسے سمجھاؤں؟ ابو جہل اس کے پاس گیا اور کہا: ولید بن مغیرہ! اگر تم نے ابو بکر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اچھی بات کہنی ہے کچھ لینے کے لیے تو ہمیں بتاؤ ہم مکہ والے پیسے جمع کر کے تمہیں دے دیتے ہیں۔ یوں اس کو عار دلائی۔ ولید بن مغیرہ نے کہا: کیسی بات کرتے ہو؟ میری دولت کا تمہیں پتا نہیں؟ تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ تم مجھے پیسے جمع کر کے دو گے؟ ابو جہل نے کہا کہ پھر تم ان کی تعریفیں کیوں کرتے ہو؟ اگر پیسا نہیں تو پھر اور کیا مقصد ہے؟ ولید بن مغیرہ نے کہا: تم ان کے بارے میں کہتے ہو کہ وہ مجنون ہیں، سچ بتاؤ کہ تم نے ان کو کوئی مجنونانہ کام کرتے دیکھا ہے؟ ابو جہل نے کہا نہیں۔ اس نے کہا: تم کہتے ہو کہ وہ شاعر ہیں، کیا تم نے ان کو شعر کہتے ہوئے سنا ہے؟ ابو جہل نے کہا

نہیں۔ ولید بن پھر کہا: تم انہیں کذاب کہتے ہو، کیا تم نے کبھی انہیں جھوٹ بولتے سنا ہے؟ کہا نہیں۔ اس نے پھر پوچھا: تم لوگ انہیں کاہن کہتے ہو، کیا تم نے ان کا کلام کبھی کاہنوں والا سنا ہے؟ کبھی ایسی باتیں سنی ہوں جو کاہنوں کی ہوتی ہیں؟ ابو جہل نے کہا کبھی نہیں سنا۔

ابو جہل پریشان ہو گیا۔ پھر ابو جہل نے کہا اچھا! تم بتاؤ کہ ان کو کیا کہیں؟ ولید نے کہا کہ میرا خیال یہ ہے کہ ان کو ”ساحر“ کہو کیونکہ انہوں نے بھائی کو بھائی سے، بیٹے کو باپ سے اور خاوند کو بیوی سے الگ کر دیا ہے، جادو کے بغیر یہ نہیں ہو سکتا۔ بس جادو گر کہہ دو! ولید بن مغیرہ کے کہنے پر سب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ ساحر کہنا شروع کر دیا۔ اس پر ابو جہل بہت خوش ہوا کہ میرا وار چل گیا ہے۔

اللہ فرماتے ہیں:

﴿ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۖ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ۖ وَ

بَيْنَ شُهُودًا ۖ﴾

جس کو میں نے پیدا کیا ہے اس کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو!  
یہ ولید بن مغیرہ خود بھی اکیلا تھا اور اس کا باپ بھی اکلوتا تھا۔ تو یہ کہتا تھا کہ وحید ابن الوحید ہوں اور بیٹے بہت تھے۔ اللہ نے فرمایا: چھوڑو اس کو، اس کا حساب میں لوں گا، ہم نے اس کو مال دیا ہے، بچے اس کے سامنے ہیں۔

**اولاد کا سامنا ہونا نعمت ہے:**

﴿وَبَيْنَ شُهُودًا﴾ اس کی اولاد اس کے سامنے ہے۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اولاد کا سامنا ہونا خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ تعجب ہے ان پر جو پیسہ کمانے کے لیے اولاد کو



دوسرے ملکوں میں بھیجتے ہیں اور کئی کئی سال تک ان کا منہ بھی نہیں دیکھ سکتے۔

﴿ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ۖ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِأَيْتِنَا عَنِيدًا ۖ﴾

سَأْمُرُّهُ قَدْ صَعُودًا ۖ﴾

پھر اس کی خواہش ہے کہ میرا مال اور بڑھے۔ کہتے ہیں کہ جب ابو جہل کا اس ولید بن مغیرہ سے یہ مکالمہ ہوا تو اس کے بعد پھر اس کی دولت کبھی نہیں بڑھی۔ بس اس دولت پہ سٹاپ لگ گیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ یہ سرکش ہے۔ اس کی سزا یہ بتائی کہ ہم اس کو صعود پر چڑھائیں گے۔ ”صعود“ جہنم میں ایک پہاڑ ہے جس پر چڑھتے ہوئے ستر ہزار سال لگ جائیں گے، جب وہاں چڑھے گا تو پھر وہاں سے گرا دیا جائے گا، پھر چڑھے گا، پھر گرا دیا جائے گا۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

**جہنم کے انیس فرشتے کیوں؟ (حضرت تھانوی کی توضیح):**

﴿لَوْ أَحَاطَ لِلْبَشَرِ ۖ عَلَيْهَِا تِسْعَةَ عَشَرَ ۖ﴾

جہنم پر انیس فرشتے متعین ہیں جو جہنم کی نگرانی کرتے ہیں۔

یہ انیس کیوں ہیں؟ مختلف مفسرین کی مختلف رائے ہیں۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو میرے دل کو لگتا ہے وہ یہ کہ عقائد میں بنیادی عقائد نو ہیں۔ اللہ پر ایمان لانا، یہ عقیدہ رکھنا کہ یہ عالم حادث ہے، فرشتوں پر ایمان لانا، آسمانی کتابوں پر ایمان لانا، تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا، تقدیر پر ایمان لانا، قیامت کے دن پر ایمان لانا، جنت کے برحق ہونے پر ایمان لانا، جہنم کے برحق ہونے پر ایمان لانا۔ عقائد میں یہ نو چیزیں ایسی ہیں جو بنیادی ہیں اور پھر ہمارے جو اعمال ہیں ان میں سے جو کرنے والے ہیں اس میں پانچ بنیادی ہیں اور نہ کرنے والے بھی پانچ بنیادی ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ کرنے والے کون سے ہیں؟ کلمہ پڑھنا، نماز

پڑھنا، زکوٰۃ دینا، روزہ رکھنا، اور حج کرنا... اور منہیات کہ جن سے بچنا ضروری ہے؛ چوری سے بچنا، قتل سے خصوصاً قتل اولاد سے بچنا، زنا سے بچنا، بہتان اور عصیان فی المعروف کہ جس میں ظلم، غیبت، اکل مال یتامیٰ وغیرہ سب آجاتا ہے۔ تو حضرت فرماتے ہیں اعتقادی اعتبار سے یہ کل 19 چیزیں بنیادی بنتی ہیں، اس لیے 19 کا عدد ذکر فرمایا۔ اور ان عقائد میں سب سے بڑا عقیدہ توحید کا ہے تو ان 19 میں بڑا ایک فرشتہ متعین ہے جس کا نام مالک ہے واللہ اعلم۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً﴾

یہ جہنم پر جو نگران ہیں وہ فرشتے ہیں۔

ایک کافر بے ایمان نے کہا تھا کہ جہنم کے 19 فرشتے ہیں ان کو تو میں اکیلا کافی ہوں، 10 دائیں ہاتھ میں لوں گا اور 9 بائیں ہاتھ میں پکڑوں گا۔

**انیس فرشتے؛ امتحان کفار اور ایمان مومنین**

﴿وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيَقِنَ الَّذِينَ

أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزِدَّادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا وَلَا يَزْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا  
الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ﴾

تو اللہ فرماتے ہیں: ہم نے یہ تعداد ان کی آزمائش و امتحان کے لیے بنائی ہے کہ یہ کیا کرتے ہیں؟ ورنہ حدیث پاک میں ہے کہ جہنم کو جب دھکیل کر لایا جائے گا تو اس کو لانے کے لیے ستر ہزار لگائیں ہوں گی اور ایک ایک لگام پر ستر ستر ہزار فرشتے ہوں گے۔ یہ 19 تو بڑے فرشتے ہیں۔ باقی ان کے ماتحت کتنے ہوں گے؟ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔

تو یہ عدد ہم نے اس لیے بنایا تھا کہ کفار کا امتحان ہو اور تاکہ اہل کتاب کا یقین

بڑھ جائے۔ چونکہ ان کی کتابوں میں یہ بات درج تھی تو ان کو یقین آجائے کہ جو ہماری کتابوں میں تھا وہی بات قرآن کریم میں ہے، اور ایمان والوں کا ایمان بڑھ جائے۔

یہ جو فرمایا: ﴿لَيَسْتَيَقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ﴾ کہ اہل کتاب کو یقین ہو۔ یہ یقین شرعی نہیں بلکہ یقین لغوی ہے۔ یقین شرعی ہو تو پھر مسلمان ہو جائیں، مراد یقین لغوی ہے کہ ان کو یقین آجائے کہ جیسے وہاں پر تھا ایسے ہی یہاں پر ہے۔

﴿وَيَزِدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا﴾ اور اس سے ایمان والوں کا ایمان بڑھتا ہے۔ ایمان والوں کا ایمان کما بھی بڑھتا ہے اور کیفاً بھی بڑھتا ہے۔ ایمان کی کیفیت بڑھتی ہے اور کمیت بھی۔ کمیت کیوں بڑھتی ہے؟ ایک اور چیز ایسی آئی جس پر ایمان لانا ضروری ہے تو ایمان کی مقدار بڑھ گئی ہے اور کیفیت کیوں بڑھتی ہے؟ کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے قرآن کی یہ بات ایسی ہے کہ جس کو یہودی بھی مانتے ہیں، اس سے بندے کی ایمانی کیفیت بڑھ جاتی ہے۔ تو کماً اور کیفاً دونوں طرح ان کا ایمان بڑھتا ہے۔

﴿وَلَا يَزِيدُ الْوَيْسَاءُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ﴾

یہ تاکید ہے کہ اہل کتاب اور مؤمن اس میں ذرہ بھی شک نہ کریں۔ اسی وجہ سے دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ ”أُوتُوا الْكِتَابَ“ الگ لائے اور مؤمنین کے لیے ”وَالْمُؤْمِنُونَ“ کا لفظ الگ لائے۔ کیوں کہ مؤمن کا تو ایمان شرعی ہے، یقین شرعی ہے، اس میں شک نہیں کریں گے اور اہل کتاب کا یقین شرعی نہیں ہے بلکہ یقین لغوی ہے۔

﴿وَلَيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَانْكُفِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ

بِهَذَا مَثَلًا ۖ كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۗ﴾

اور جن کے دلوں میں مرض ہے یعنی منافق لوگ اور کافر لوگ یہ سارے

مل کر کہیں گے کہ اللہ کیا چاہتے ہیں ایسی مثالیں بیان کر کے؟ ایسی مثالیں کیوں دیتے ہیں؟ تو فرمایا: اس لیے مثالیں بیان کرتے ہیں تاکہ تم اس کے ذریعہ گمراہ ہو جاؤ اور ایمان والوں کو اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب فرمائے۔

یہ جواب ان کو تہدیداً ہے، یہ ڈانٹنے والا جواب ہے۔ یہ ڈانٹ کر ان کو سمجھایا جا رہا ہے۔

﴿إِنَّهَا لِأَحَدَىٰ انْكُبَرِ﴾

یہ جو فرمایا ہے کہ جہنم اتنی سخت ہو گی تو یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ کُبَرِ یہ کبریٰ کی جمع ہے۔

**کفار احکام کے مکلف ہیں یا نہیں؟**

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ﴾ ۲۲ ﴿قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمَصْلِيِّينَ﴾ ۲۳ ﴿وَلَمْ نَكُ نَطْعُمُ الْمَسْكِينِ﴾ ۲۴ ﴿وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَاطِبِينَ﴾ ۲۵ ﴿وَكُنَّا نَكْذِبُ بِيَوْمِ الدِّينِ﴾ ۲۶

اصحاب الیمین جب جہنمیوں سے پوچھیں گے کہ تم جہنم میں کیوں آئے ہو؟ وہ اپنے جرم یہ بتائیں گے:

[1]: ”لَمْ نَكُ مِنَ الْمَصْلِيِّينَ“ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔

[2]: ”وَلَمْ نَكُ نَطْعُمُ الْمَسْكِينِ“ ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، یعنی یہ جو حق واجب تھا ہم ادا نہیں کرتے تھے۔

[3]: ”وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَاطِبِينَ“ اسلام کے خلاف ہم گپیں ہانکتے تھے۔

[4]: ”وَكُنَّا نَكْذِبُ بِيَوْمِ الدِّينِ“ اور ہم قیامت کا انکار کرتے تھے۔

یہ چار جرم بیان کیے۔ پھر ﴿حَتَّىٰ آتَيْنَا الْيَقِيْنَ﴾ ۲۷ ﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ

شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ﴿٣٨﴾ موت آگئی اب کسی سفارش کرنے والے کی سفارش ان کفار کے حق میں معتبر نہیں ہوگی۔ اب دیکھیں یہاں جرم بتائے؛ نماز نہ پڑھنا، مسکین کو کھانا نہ کھلانا، اسلام کا مذاق اڑانا اور قیامت کو جھٹلانا۔

سوال یہ ہے کہ قیامت کے دن جہنم میں کافر کو جو عذاب ہو گا وہ تو احکام کا مکلف ہی نہیں ہے، نماز کا مکلف نہیں ہے، صدقات کا مکلف نہیں ہے۔ جب ان چیزوں کا مکلف ہی نہیں ہے تو یہ چیزیں وجہ عذاب کیسے ہو سکتی ہیں؟ جس چیز کا بندہ مکلف ہو اگر اس پر عمل نہ کرے تو پھر عذاب ہو گا جیسے ایمان کے مکلف ہیں، ایمان نہ لائے تو پھر عذاب ہو گا لیکن نماز کے مکلف نہیں ہیں، مسکین کو کھانا کھلانے کے مکلف نہیں ہیں تو ان دو کاموں کے نہ کرنے پر عذاب کیوں ہو رہا ہے؟

### نفس عذاب اور اشتدادِ عذاب:

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس کا بہت پیارا جواب دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک ہوتا ہے نفس عذاب اور ایک ہوتا ہے اشتدادِ عذاب۔ نفس عذاب کی بنیاد تو کفر ہے اور اشتدادِ عذاب کی بنیاد نماز نہ پڑھنا اور صدقہ نہ دینا ہے۔ تو کفر کی وجہ سے عذاب ہو گا اور نماز نہ پڑھنے اور صدقہ نہ دینے کی وجہ سے عذاب میں اضافہ ہو گا۔

پھر بھی بندے کے ذہن میں کسی درجے میں سوال رہ جاتا ہے کہ جب نماز کا مکلف نہیں تو نماز نہ پڑھنے پر عذاب کا اضافہ کیوں ہو گا؟ حضرت رحمہ اللہ اس کی توجیہ فرماتے ہیں کہ جب آدمی ایمان لائے گا تو نماز بھی پڑھے گا، ایمان لائے گا تو روزہ بھی رکھے گا۔ تو جس طرح ایمان کے بعد نماز ہے، ایمان کے بعد روزہ ہے۔ تو اگر ایمان نہیں لایا تو عذاب ہو گا اور اگر ایمان لاتا تو جنت ملتی اور ایمان کے بعد نماز بھی تھی تو جس طرح ایمان کی فرع نماز ہے اسی طرح عذاب کی فرع اشتدادِ عذاب ہے۔ تو نفس عذاب؛ نفس کفر یعنی ایمان نہ لانے پر ہے اور اشتدادِ عذاب جو عذاب کی فرع ہے یہ

فرع نماز نہ پڑھنے پر ہے۔

یہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی بہت پیاری توجیہ ہے جو انہوں نے بیان القرآن میں ذکر فرمائی ہے۔ میں اس لیے گزارش کرتا ہوں کہ بیان القرآن پڑھنے کا اہتمام کیا کریں۔

**کفار گدھوں کی مانند ہیں:**

﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ﴾ ۛ كَانَتْهُمْ حُرٌّ مُّسْتَنْفِرَةً ۛ﴾

فَرَّتْ مِنْ قَسْوَدَةٍ ۛ﴾

ان کو کیا ہوا کہ نصیحت سے اعراض کرتے ہیں! یہ ایسے ہیں جیسے گدھے ہوں اور گدھے بھی جنگلی جو شیر کو دیکھ کر دوڑتے ہیں۔

پہلی بات تو فرمائی کہ یہ گدھے ہیں۔ یہ تشبیہ اس لیے دی کہ جس طرح گدھا بیوقوف ہے یہ بھی بیوقوف لوگ ہیں کہ اپنی آخرت اور دین کو سمجھتے نہیں ہیں اور جنگلی گدھا کیوں کہا؟ اس لیے کہ جو گدھا گھر میں پالتو ہوتا ہے وہ ہر چیز سے نہیں دوڑتا، کسی چیز سے دوڑتا ہے اور جنگلی گدھا؛ جن سے نہیں دوڑنا چاہیے ان سے بھی دوڑتا ہے۔ فرمایا: یہ گدھے جنگلی ہیں اور شیر کو دیکھ کر تو سپید لگا دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ کفار بھی ایمان اور توحید کا نام سن کر ایسے دوڑتے ہیں جیسے جنگلی گدھا شیر سے دوڑتا ہے۔

﴿بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِنْهُمْ أَنْ يُؤْتَى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً﴾ ۛ كَلَّا بَلْ لَا

يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ۛ كَلَّا إِنَّهُ تَذَكُّرَةٌ ۛ فَمَنْ شَاءَ ذَكِّرْهُ ۛ﴾

اور پھر یہ کافر کہتے ہیں کہ اگر تم برحق ہو تو پھر تم جو قرآن لاتے ہو تو ہمارے نام پر صحیفے ہمارے ہاتھ پر لاؤ! اللہ فرماتے ہیں: ہرگز ایسی باتیں نہیں ہیں، بس ان کو آخرت کا خوف نہیں ہے۔ یہ قرآن ہم نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے، اس

سے جو چاہے نصیحت حاصل کرے۔

﴿وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۖ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ﴾

لیکن اصل تو وہی نصیحت حاصل کرے گا جس کے بارے میں اللہ چاہے۔

اللہ ہی سے ڈرنا چاہیے اور اللہ ہی معاف فرمانے والے ہیں۔

اللہ ہم سب کو تقویٰ کی نعمت عطا فرمائے۔ آمین

وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة القيامة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَمَةِ ۖ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۖ﴾

**قسم کے شروع میں لازائدہ کا فائدہ:**

”لَا أُقْسِمُ“ کے شروع میں لازائدہ ہے۔ لازائدہ کا معنی یہ ہے کہ یہ عملاً اُقْسِمُ فعل پر رفع، نصب اور جزم نہیں دیتا۔ اسے اُقْسِمُ فعل کے شروع میں اس لیے لاتے ہیں کہ پہلے مخاطب اور مخالف کے عقیدے کی نفی کرتے ہیں کہ تم جو کہتے ہو کہ قیامت کو نہیں اٹھیں گے تو یہ بات نہیں ہے۔

﴿لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَمَةِ﴾

میں قیامت کے دن کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم ضرور اٹھو گے۔

تو اُقْسِمُ کے شروع میں جو لالاتے ہیں اس سے مخاطب اور مخالف کے نظریہ کی نفی کرتے ہیں۔ اب لانہ لائیں تو یہ نفی کیسے سمجھ میں آئے گی؟! اس لیے لالایا جاتا ہے اور جب ہم زائدہ کہیں گے تو پھر اشکال ہوتا ہے کہ جب لازائدہ ہے تو لانے کا فائدہ کیا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ زائدہ کا معنی محض یہ ہے کہ مابعد فعل میں یہ عمل نہیں کرتا، باقی فائدہ ہے کہ مخاطب کے غلط نظریے کی اس سے تردید ہوتی ہے۔ تو اللہ رب



العزت نے قسم کھائی ہے قیامت کے دن کی اور قسم کھائی ہے ایسے نفس کی جو ملامت کرنے والا ہے اور جو اب قسم مخدوف ہے یعنی ”لَتُبْعَنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ کہ تم قیامت کے دن ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

### نفس کی تین اقسام:

نفس سے مراد ہوتی ہے روح یا جان۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

1: نفس امارۃ 2: نفس لوامۃ 3: نفس مطمئنۃ

سورۃ یوسف میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿وَمَا أَزِيئُ نَفْسِي ۚ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمْتُ﴾<sup>65</sup>

اے اللہ! جو میں بچا ہوں اس گناہ سے تو اس پر میں اپنی کوئی تعریف نہیں کرتا کہ میری خوبی ہے۔ نفس کا تو کام ہی ہے گناہ کی دعوت دینا لیکن جب اللہ بچانا چاہے تو اللہ بچا لیتے ہیں۔

تو فطرتاً ہر نفس ”امارہ“ ہوتا ہے۔ انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے گناہ کا تقاضا رکھا ہے۔ گیارہ قسمیں کھا کر اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھائی ہے: ﴿فَالْتَهُمَهَا جُؤَرَهَا وَتَقْوَمَهَا﴾<sup>66</sup> کہ ہر انسان کی فطرت میں گناہ کا تقاضا ہے۔ لہذا نفس فطرتاً انسان کو گناہ کی دعوت دیتا ہے۔ اس کو کہتے ہیں ”نفس امارہ“

اور جب انسان گناہ نہیں کرتا اور اپنے نفس کو کنٹرول کرتا ہے تو اس کے بعد نفس ”لوامۃ“ بنتا ہے یعنی ملامت کرتا ہے کہ تجھے گناہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے توبہ کی تو نفس لوامہ بن جاتا ہے۔ تو ابتداءً اور طبعاً ہر نفس امارہ ہے اور جب گناہ کر کے توبہ

65- یوسف 12:53

66- الشمس 91:8

کرتا ہے تو نفسِ لوامہ بنتا ہے اور جب گناہ چھوڑ کر نیکی اس کی طبیعت بن جاتی ہے تو پھر نفس ”مطمئنہ“ بن جاتا ہے۔ یہاں نفسِ لوامہ کی قسم کھائی ہے۔

### بعث بعد الموت کا اثبات:

﴿يَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ﴾ ۞ بَلَىٰ قَدَرِينَا عَلَىٰ أَنْ نَسْوِيَّ

بَنَانَهُ ۞

انسان کا خیال ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے۔  
اصل تو مقصود ہے کہ پورے انسان کو اٹھائیں گے لیکن پورے انسان کے بجائے ہڈیوں کا ذکر کیوں کیا ہے؟ اس لیے کہ اس جسم میں مدار ہڈیوں پر ہوتا ہے۔ جسم سے ہڈی نکال دو تو گوشت کیا کر سکتا ہے لیکن کسی کی پنڈلی پر گوشت نہ ہو صرف ہڈی ہو انسان پھر بھی چل سکتا ہے۔ زندہ پھر بھی رہتا ہے لیکن اگر ہڈیوں کو نکال دو تو صرف گوشت سے کام نہیں ہوتا۔ چونکہ بنیاد ہڈی ہے اس لیے ہڈیوں کا ذکر کیا ہے۔ فرمایا: تم پورے انسان کی بات کرتے ہو ہم تو اس کی انگلیوں کے پور تک ٹھیک ٹھیک بنا سکتے ہیں۔

یہاں پوروں کا ذکر کیوں کیا ہے؟ اصل میں یہ محاورہ ہے۔ محاورات میں پورے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جب آدمی نے پورے جسم کی راحت یا تکلیف بتانی ہو تو محاورات میں پورے بتاتے ہیں کہ میرے انگ انگ میں درد ہے، میرا پورا پورا دکھتا ہے، لیکن مراد پورا جسم ہوتا ہے۔ تو یہاں محاورہ استعمال کیا ہے۔

اور یہاں ”بَنَانُ“ کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ ایک ہیں انسان کے بڑے اعضاء اور ایک ہیں چھوٹے چھوٹے اعضاء۔ عام طور پر بڑے اعضاء کو بنانا آسان ہوتا ہے اور چھوٹے چھوٹے اعضاء کو بنانا مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً آپ بس لے لیں، گاڑی لے لیں، عمارت لے لیں تو بڑی بڑی چیزیں بنانا تو آسان ہوتا ہے لیکن چھوٹی چھوٹی چیزیں

بنانا مشکل ہوتا ہے۔ تو اللہ فرماتے ہیں کہ جو تمہارے چھوٹے چھوٹے پورے ہیں ہم ان کو بھی بنا سکتے ہیں تو باقی بڑا جسم ہمارے لیے بنانا کیا مشکل ہے؟ یا اس لیے پورے کا ذکر بطور خاص کیا ہے کہ انسان کے پورے میں خطوط ہیں، لائنیں ہیں، یہ دنیا میں کسی انسان کی انگلی کے نشان دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں۔ اللہ رب العزت نے فرمایا کہ تم پورے جسم کی بات کرتے ہو ہم تو تمہارے پورے بھی بنائیں گے۔ پوروں کی جو لائنیں ہیں جیسی اب ہیں ایسی ہو تب بھی گی، ان میں بھی فرق نہیں ہو گا اور تم پورے جسم کی بات کرتے ہو کہ کیسے بنائیں گے؟

﴿بَلْ يُرِيدُ الْإِنْسَانُ لِيَفْجَرُ أَمَامَهُ ۚ يَقْسَعُ أَيْكَانَ يَوْمَ

الْقِيَمَةِ ۚ﴾

انسان چاہتا ہے کہ بس آئندہ بھی گناہ کرتا رہے، گناہ پر گناہ کرتا رہے اور پھر پوچھتا ہے کہ قیامت کب آئے گی؟

﴿فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۚ وَخَسَفَ الْقُرْ ۚ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۚ﴾

فرمایا: جب ایسا وقت آئے گا تو آنکھیں حیرت زدہ رہ جائیں گی، دیکھیں گی لیکن کچھ نظر نہیں آئے گا، سورج اور چاند دونوں بے نور ہو جائیں گے، دونوں ایک حالت پر ہوں گے۔ بعض روایات میں ہے کہ جب قیامت آجائے گی تو سورج اور چاند دونوں ایک طرف سے طلوع ہوں گے۔

﴿يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفْرُ ۚ كَلَّا لَا وَزَرَ ۚ إِلَىٰ رَبِّكَ

يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۚ﴾

اس وقت انسان کہے گا کہ میں دوڑ کر کہاں جاؤں؟ اب کہیں بھی نہیں جا سکے گا۔ اب تو اللہ تک ہی پہنچے گا۔

﴿بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۚ﴾

قیامت کے دن انسان کے خلاف گواہ ملائکہ بھی ہوں گے، اعمال والے رجسٹر بھی ہوں گے، زمین بھی ہوگی لیکن خود انسان اپنی ذات کے خلاف گواہ بنے گا یعنی جب انسان جھوٹ بولنا چاہے گا تو اس کے اپنے اعضاء اس کے خلاف بولیں گے۔ باہر سے گواہ لانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

﴿وَلَوْ أَنفَىٰ مَعَاذِيرُهُ ۖ﴾

مَعَاذِيرُ.... مِعْذَار کی جمع ہے جو معذرت سے ہے۔ تو انسان قیامت کے دن عذر بنائے گا لیکن اس کا عذر کام نہیں دے گا۔ کہے گا کہ ہم تو مشرک نہیں تھے لیکن اس کا یہ جھوٹ چل نہیں سکے گا۔ اعضاء خود بول پڑیں گے کہ یہ جھوٹ بولتا ہے، وہ کہیں گے کہ ہم تو شرک کرتے تھے۔

﴿لَا تَحْزَنْكَ بِهِ لِسَانُكَ لِتَتَعَجَّلَ بِهِ ۖ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۚ﴾

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک تویہ کوشش فرماتے کہ جبرائیل علیہ السلام جب پڑھیں تو ساتھ ساتھ آپ بھی پڑھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ساتھ ساتھ یاد کرتے تاکہ آئندہ مشکل نہ ہو۔ اللہ رب العزت نے فرمایا کہ آپ جبرائیل کے ساتھ جلدی جلدی نہ پڑھیں، آپ کے دل میں قرآن مجید کو جمع کرنا ہماری ذمہ داری ہے، ”وَقُرْآنَهُ“ اور آپ کی زبان سے پڑھانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

﴿فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۖ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۚ﴾

اور جب ہماری طرف سے فرشتہ پڑھے تو آپ اس کی اتباع فرمائیں، سنتے رہیں، پھر ہم آپ کی زبان پر اس کا بیان بھی جاری کر دیں گے۔

تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ اتنی مشقت برداشت نہ کریں، بس آپ خاموشی سے سنیں، ہم یاد بھی کرا دیں گے اور آپ کی زبان پر جاری بھی کرا دیں گے۔

### ترک قرأت خلف الامام کی دلیل:

﴿فَإِذَا قَرَأَهُ فَأَتْبَعُ قُرْآنَهُ﴾

یہ دلیل ہے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیے اور امام کے پیچھے قرأت میں فاتحہ بھی شامل ہے کہ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ دلیل ذرا سمجھیں کہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿فَإِذَا قَرَأَهُ فَأَتْبَعُ قُرْآنَهُ﴾ کہ جب فرشتہ قرآن پڑھے تو آپ فرشتے کی اتباع کریں اور اتباع کا معنی یہ نہیں ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے پڑھیں، بس اتباع کا معنی یہ ہے کہ آپ خاموش رہیں۔ تو قرأت قرآن کی اتباع کو اللہ تعالیٰ نے خاموش ہونے سے تعبیر فرمایا ہے اور سنن ابن ماجہ وغیرہ میں روایت موجود ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ، فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا، وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا وَإِذَا قَالِ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ فَقُولُوا آمِينَ.<sup>67</sup>

کہ امام اس لیے بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی اتباع کی جائے۔ پھر اس کی تفصیل بتائی کہ ”فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا“ کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، ”وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا“ جب وہ پڑھے تو تم خاموش ہو جاؤ، ”وَإِذَا قَالِ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ فَقُولُوا آمِينَ“ اور جب امام ”غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ“ پڑھے تو تم آمین کہو!

اب دیکھو! یہاں ”وَإِذَا قَرَأْتَ فَأَنْصِتُوا“ ہے کہ جب امام پڑھے تو تم خاموش رہو اور قرآن کریم میں بھی ہے کہ ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾ کہ جب فرشتہ قرآن پڑھے تو آپ اس کی اتباع کریں، اتباع کا معنی کہ خاموش رہیں اور اس کی دلیل ﴿لَا تُحَرِّدْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ﴾ ہے۔ آیت میں اتباع قرآن کو خاموشی فرمایا اور حدیث پاک میں اتباع امام کو خاموشی فرمایا۔ جب قرآن اور حدیث دونوں فرما رہے ہیں کہ اتباع امام کا معنی خاموشی ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب امام پڑھے تو مقتدی کو خاموش رہنا چاہیے۔

یہ امام صاحب کی قوی اور مضبوط دلیل ہے قرآن سے ترک قرأت خلف الامام پر۔

### ترک قرأت خلف الامام پر گفتگو کا طریقہ:

یہاں یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اگر کسی شخص سے اس موضوع پر گفتگو کرنا پڑے تو اس کا طریقہ سمجھ لیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی چاہیے! تو آپ دلائل اس پر نہ دیں کہ امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے بلکہ پہلی بات یہ طے کر لیں کہ فاتحہ پڑھنا قرأت کہلاتا ہے یا نہیں؟ فاتحہ کا پڑھنا: اس کو قرآن کا پڑھنا کہتے ہیں یا نہیں؟ پہلے یہ طے کر لیں۔ اگر قرأت فاتحہ کو قرأت قرآن آپ ثابت کر لیں گے تو اگلی بات بہت آسان ہے۔ کیونکہ ہمارا موقف یہ نہیں ہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے بلکہ ہمارا موقف ہے کہ امام کے پیچھے قرآن کی کوئی سورت بھی نہیں پڑھنی چاہیے جبکہ غیر مقلدین کے ہاں فرق ہے کہ امام کے پیچھے 113 سورتیں نہ پڑھے، بلکہ ایک سورت فاتحہ پڑھے اور ہمارا موقف ہے کہ 114 سورتوں میں سے کوئی ایک بھی نہ پڑھے۔

اب سوال یہ ہے کہ 113 سورتوں کو تم قرأت قرآن کہتے ہو تو کیا فاتحہ کو

بھی قرأتِ قرآن کہتے ہو یا نہیں؟ آپ یہ ثابت کریں اور یہ ثابت کرنا بہت آسان ہے کہ فاتحہ کا پڑھنا بھی قرآن کا پڑھنا ہے۔ اس پر دلیل خود صحیح بخاری میں ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبَا بَكْرٍ وَعُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا كَانُوا يَفْتَتِحُونَ الصَّلَاةَ بِالْحَمْدِ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.<sup>68</sup>

کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نماز کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔ اس کا معنی ہے کہ قرأت الحمد للہ رب العالمین سے شروع ہوتی ہے اور الحمد للہ رب العالمین سورت الفاتحہ ہے۔

**”فاتحہ قرآن ہے“ پر دلیل:**

فاتحہ قرآن ہے اس پر ایک اور دلیل سمجھ لیں۔ کسی غیر مقلد سے پوچھو کہ جب تم نماز شروع کرتے ہو تو کہتے ہو: ”اللَّهُ أَكْبَرُ“.... پھر ”سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالَى جَدُّكَ وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ“.... آگے ”أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“.... آگے ”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۝ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝“ آمین.... آگے ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ ذَلِكِ أَنْكِتُ لَا رَيْبَ فِيهِ“ اب بات سمجھنا کہ اگر قرآن مجید ۱۱۱ سے شروع ہو رہا ہے تو اعوذ باللہ یہ ۱۱۱ الحمد للہ رب العالمین کے

شروع میں نہ ہوتا بلکہ اَلَمَّ کے شروع میں ہوتا۔ اور اللہ کا فرمان ہے: ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾<sup>69</sup> کہ جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو اعوذ باللہ پڑھ لیا کریں! تو اس تعوذ کا الحمد للہ رب العالمین سے پہلے ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ الحمد للہ رب العالمین قرآن ہے۔

یہ ہمارے دلائل ہیں۔ تو پہلے یہ بات طے کر لو کہ فاتحہ کا پڑھنا قرآن کا پڑھنا ہے یا نہیں؟ مناظرہ ہوتا ہے تو ہو؛ نہیں ہوتا تو نہ ہو لیکن جب تک بنیاد نہ ہو گفتگو نہ کریں۔ دس گھنٹے لگ جائیں یا تین گھنٹے لگ جائیں یا تین دن گزر جائیں، گفتگو نہیں ہوتی تو نہ ہو لیکن بنیاد ضرور بنائیں۔ میدان اپنی پسند کا سجائیں، پھر میدان میں اتریں۔ مخالف کی پسند کے میدان میں کبھی نہ اتریں۔

### قیامت کے دن دیدار باری تعالیٰ:

﴿وَجُودٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۖ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ﴾

قیامت کے دن بعض چہرے تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کو دیکھنے والے ہوں گے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ کا دیدار بندے کو ہو گا۔

اور اہل السنۃ والجماعۃ کے تمام مذاہب اور افراد قیامت کے دن رؤیت باری تعالیٰ کے قائل ہیں سوائے معتزلہ اور خوارج کے، یہ دو فرقے قیامت کے دن بھی رؤیت باری تعالیٰ کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے پاس نقلی دلیل تو کوئی نہیں ہے البتہ ان کے پاس صرف عقلی دلائل ہیں کہ رؤیت تب ہوتی ہے کہ جب رائی اور مرئی کے درمیان فاصلہ ہو اور اللہ اور بندے کے درمیان تو فاصلہ نہیں ہے تو رؤیت کیسے ہوگی؟ مثلاً آپ آنکھ سے اس چیز کو دیکھیں گے کہ آنکھ اور اس چیز کے درمیان فاصلہ ہو۔ تو



رؤیت تب ہوگی جب رائی اور مرئی کے درمیان فاصلہ ہو۔ اگر فاصلہ نہیں تو اللہ کو دیکھیں گے کیسے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہیں دیکھ سکتے۔ یہ صرف عقلی دلیل ہے ان کے پاس۔

ہم نے کہا کہ جب اللہ کی رؤیت پر نص قطعی آجائے تو پھر رؤیت کما یلیق بِشأنہ (جیسی اللہ کی شان ہے، اسی کے مطابق) ہوگی، اس پر عقلی دلائل پھر ختم ہو جاتے ہیں۔

### مجرمین کی رسوائی:

﴿وَجُودُهُ يُومِئِدُ بِأَسِرَةٍ ۖ تَنْظُنُّ أَنْ يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۖ كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ النَّزَاقِي ۖ وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ ۖ﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بعض چہرے قیامت کے دن بے رونق ہوں گے، ان کو خدشہ ہوگا کہ ابھی مرے اور جب ان کی روح گلے تک آئے گی تو اس وقت کہا جائے گا کہ بلاؤ کسی علاج کرنے والے کو۔ رَاقٍ سے مراد صرف دم کرنے والا نہیں ہے، اس وقت عرب میں چونکہ رواج اس بات کا تھا کہ لوگ جھاڑ پھونک اور دم کرتے تھے، اس لیے یہاں رَاقٍ فرمایا ورنہ مراد دوا دارو ہے کہ جب انسان کی روح نکلنے لگتی ہے تو پھر کہتے ہیں کہ کسی ڈاکٹر کو بلاؤ!

﴿وَالْتَفَتَتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۖ إِلَى رَتَبِكَ يُومِئِدُ ۖ الْمَسَاقُ ۖ﴾

پنڈلی پنڈلی پر چڑھ جاتی ہے۔ اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ آدمی بے چینی اور اضطراب کی وجہ سے ٹانگ کو ٹانگ پر رکھ دیتا ہے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ انسان کمزور اتنا ہوتا ہے کہ پنڈلی دوسری پنڈلی پر چڑھ جائے تو اس کو اتارنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی، اتنا لاغر اور بے بس ہو جاتا ہے۔

﴿فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّى﴾ ۛ وَلَكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّى ۛ ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ

أَهْلِهِ يَتَمَطَّى ۛ﴾

نہ اس نے توحید کی تصدیق کی ہے اور نہ نماز پڑھی ہے بلکہ اس نے توحید کی تکذیب کی ہے اور پھر واپس چلا گیا ہے اور واپس بھی کیسے جاتا ہے ”یَتَمَطَّى“ فخر کرتے ہوئے کہ میں نے بہت بڑا کام کیا کہ میں نے اہل حق کو نہیں مانا۔

﴿أَوَّلَىٰ لَكَ فَأَوَّلَىٰ ۛ ثُمَّ أَوَّلَىٰ لَكَ فَأَوَّلَىٰ ۛ﴾

یہ جو لفظ ہے ”أَوَّلَىٰ“ یہ اصل میں وِیْل کا مقلوب ہے۔ لفظ ”أَوَّلَىٰ“ یہاں چار مرتبہ فرمایا۔ تباہی ہے تباہی ہے تباہی ہے تباہی ہے۔ یہ چار مرتبہ کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک بربادی ہے جب اس پر موت آئے، پھر بربادی ہے جب یہ قبر میں ہوگا، پھر بربادی ہے جب یہ حشر میں اٹھے گا، پھر بربادی ہے جب یہ جہنم میں ہوگا۔ تو چونکہ بربادی کے مقامات چار تھے اس لیے چار مرتبہ یہ لفظ فرمایا۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ چار بار تکرار ہوا، تکرار نہیں ہوا بلکہ ہر مقام کی تباہی الگ بتائی ہے۔

﴿أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى ۛ أَلَمْ يَكُنْ نُطْفَةً مِنْ مَنِيٍّ

يُمْنِي ۛ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ۛ﴾

کیا آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اسے یونہی فضول چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا یہ نطفہ نہیں تھا جسے رحم مادر میں ٹپکایا جاتا ہے، پھر بعد میں وہ گوشت کا لو تھرا بنتا ہے، اللہ اسے پیدا کرتے ہیں، پھر اس کو برابر کرتے ہیں۔

﴿فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۛ أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَدْرِ عَلَىٰ أَنْ

يُعْجَىٰ الْمَوْتَىٰ ۛ﴾

پھر اس سے کسی کو مرد بناتے ہیں اور کسی کو عورت بناتے ہیں۔ کیا اللہ اس

بات پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کرے؟!

حدیث پاک میں ہے کہ جب یہ آیت پڑھیں ”أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَدِيرٍ عَلَىٰ أَنْ

يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ“ تو یہاں یہ پڑھا کریں: ”بَلَىٰ وَأَنَا عَلَىٰ ذَلِكَ مِنَ الشَّاهِدِينَ“<sup>70</sup>

لیکن یہ شرط ہے کہ فرض نماز نہ ہو، نفل نماز ہو تب بھی گنجائش ہے اور نماز

کے علاوہ ہو تب بھی ہے۔

وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الدھر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْعًا مَّذْكُورًا ۝١﴾

انسان پر ایک ایسا وقت گزرا ہے کہ یہ بے نام و نشان تھا۔

”هَلْ“ برائے تحقیق:

یہاں یہ بات سمجھنا کہ ”هَلْ“ اصل میں تو استفہام کے لیے آتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسی چیز جو بالکل واضح اور کھلی ہو تو اس کو بھی ”هَلْ“ سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ مقصد تاکید ہوتا ہے، مقصد استفہام نہیں ہوتا۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ دیکھ سورج نکلا ہوا نہیں ہے؟ اس کا معنی کہ ضرور نکلا ہوا ہے۔ میں نے کل تجھے یہ بات نہیں کہی تھی؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ضرور کہی تھی۔ اس لیے بعض مفسرین نے اس مقام پر فرمایا ہے کہ یہاں ”هَلْ“ بمعنی قد کے ہے یعنی تحقیق انسان پر ایسا وقت گزرا ہے کہ وہ بے نام و نشان تھا۔

انسانی تخلیق کا مادہ:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا

بَصِيرًا ۝٢﴾ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝٣﴾

ہم نے انسان کو ایسے نطفے سے پیدا کیا ہے جو ملا جلا ہوتا ہے۔ پھر ہم اس کو آزماتے ہیں، اسے آنکھیں دیتے ہیں، کان دیتے ہیں، پھر ہم اس کو دوراستے دکھاتے ہیں کہ یہ شکر کرتا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔

”آمَشَاجٍ“ کا معنی ہے مخلوط۔ یا تو اس سے مراد ہیں اخلاط اربعہ جن سے نطفہ پیدا ہوتا ہے۔ اخلاط اربعہ یعنی خون، بلغم، سودا اور صفراء۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کا نطفہ ملتا ہے تو اس سے انسان پیدا ہوتا ہے۔

﴿إِنَّا آخَذْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلَاسِلًا وَأَغْلَلْنَا سَعِيرًا ۖ إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۖ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا ۖ﴾

اور کفار کے لیے ہم نے زنجیریں بنائی ہیں، طوق بنائے ہیں اور آگ بنائی ہے۔ جو نیک لوگ ہیں وہ ایسی شراب پیئیں گے جس میں کافور ملی ہوئی ہوگی اور ایسے چشمے سے پیئیں گے جس سے نیک لوگ پیتے ہیں اور جہاں چاہیں گے اس کو جاری کر کے لے جا سکیں گے۔

حدیث پاک میں ہے کہ اہل جنت کے ہاتھ میں سونے کی چھڑی ہوگی، چشمے کو جہاں حکم دیں گے وہاں سے ابلے گا اور نہر کو جدھر کا حکم کریں گے اُدھر کو جاری ہو جائے گی۔ ایک جنتی کہے گا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی جگہ پر بیٹھ کر پیوں تو اپنی جگہ ہی سے اشارہ کرے گا تو نہر بالکل قریب آجائے گی۔

**نذر کا حکم اور بنیادی شرائط:**

﴿يُؤْفُونَ بِالْأَنْذَرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۖ﴾

اور یہ واجبات کو ادا کرتے ہیں یعنی جو چیزیں ان کے ذمہ لازم ہیں ان کو ادا

کرتے ہیں اور ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس کی برائی ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔  
لازم کو ”النَّذْر“ سے کیوں ذکر کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نذر کا پورا کرنا

ضروری ہوتا ہے لیکن نذر کی شرائط میں سے دو شرطیں بنیادی ہیں:

1: آدمی نذر اور منت گناہ کی نہ مانے۔

2: نذر ایسی چیز کی نہ مانے جو اس کے ذمہ پہلے سے فرض ہو، مثلاً یہ کہے کہ یا اللہ! اگر میرے پرچے میں 100 نمبر آجائیں تو میں ظہر کی نماز پڑھوں گا۔ ایسی نذر نہ مانے، اس لیے کہ اگر وہ قیل ہو جائے؛ ظہر تو پڑھنی پھر بھی ہے۔

حضرت امام صاحب رحمہ اللہ کا موقف ہے کہ اس میں تیسری شرط یہ بھی ہے کہ اس کی جنس میں سے کوئی چیز فرض ہو۔ مثلاً نماز کی منت مانے تو نماز فرض ہے، اس لیے نفل کی منت مان سکتا ہے۔ نفلی روزے کی منت مانے تو بھی درست ہے کیوں کہ روزے کی جنس رمضان کے روزے اس پر فرض ہیں لیکن جس عبادت کی جنس میں سے کوئی فرض نہ ہو وہ منت مانے گا تو فرض نہیں ہوگی۔ مثلاً میں نماز جنازہ پڑھوں گا تو جنازے کی کوئی ایسی جنس نہیں جو بندے پر فرض ہو اس لیے یہ منت اس پر لازم نہیں ہوگی۔ میں صدقہ کروں گا تو صدقے کی جنس زکوٰۃ بندے پر لازم ہے اس لیے ایسی منت ماننا اس کے لیے ٹھیک ہے۔

**مسکین کو کھانا کھلانے کا اجر:**

﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا﴾

یہ ”عَلَى حُبِّهِ“ میں عَلَى بمعنی مَعَ کے ہے اور ”مِسْكِينًا“ ضمیر کا مرجع کھانا ہے۔ معنی یہ ہو گا کہ کھانے سے خود بھی پیار کرتا ہے لیکن پھر بھی غریب، قیدی اور مسکین کو دیتا ہے۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ ”مِسْكِينًا“ ضمیر کا مرجع اللہ ہے کہ اللہ کی محبت میں

خرچ کرتا ہے۔

قیدی اگر مظلوم ہو تو اس کو دینا صدقہ ہے اور اگر ظالم ہو اور قید میں ہو پھر بھی اس پر خرچ کرنا صدقہ ہے۔ قیدی مسلمان ہو تب بھی اس پر خرچ کرنا چاہیے اور قیدی کافر ہو تب بھ اس پر خرچ کرنا اجر کا کام ہے۔

﴿إِنَّا نَخَافُ مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَتَطِيرًا ۝۱۱﴾ فَوْقَهُمْ اللَّهُ شَرُّ ذَٰلِكَ  
الْيَوْمِ وَلَقَّهْم نَضْرَّةً وَسُرُودًا ۝۱۲﴾

”عبوس“ کہتے ہیں جو چروں کو بے رونق اور اداس کر دے اور ”قَطِير“ کہتے ہیں سخت کو۔ فرمایا: یہ لوگ کہیں گے کہ ہمیں تو اس دن کا خوف ہے جو چروں کو اداس کر دے گا اور بہت سخت ہو گا۔ اللہ پاک ان کو اس دن سے کے شر سے بچائیں گے اور ان کو اللہ تازگیاں دیں گے اور خوشیاں دیں گے۔

﴿وَجَزَّيْنَهُمَا صَبْرًا وَجَنَّةً وَحَرِيرًا ۝۱۳﴾ مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى  
الْأَرَآئِكِ لَا يَزُونَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا ۝۱۴﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ ہم ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت دیں گے اور ریشم کا لباس دیں گے اور وہاں پر آدمی مسہریوں پر بیٹھے ہوں گے اور جنت میں نہ تو سخت دھوپ ہوگی اور نہ سخت ٹھنڈ ہوگی۔

﴿وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلُّهَا وَذُلَّتْ قُطُوفُهَا تَذَلِيلًا ۝۱۵﴾

اور درختوں کے سائے بالکل قریب ہوں گے اور ان کے جو پھل ہیں وہ انسان کے اختیار میں ہوں گے کہ جب چاہے کھالے، جب چاہے نہ کھائے۔

**جنت کے پیالوں کی بناوٹ:**

﴿وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِأَنْيَةِ مِّنْ فِضَّةٍ وَآكُوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرًا ۝۱۶﴾

﴿قَوَارِيرًا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا﴾ (١٦)

اور ان کے برتن چاندی کے ہوں گے اور پیالے ہوں گے شیشے کے اور شیشہ ہو گا چاندی کا اور بڑے مناسب انداز میں اس کو بھر بھر کر استعمال کرے گا۔ یہ جو فرمایا کہ شیشہ ہو گا چاندی کا، تو یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ برتن سفیدی میں چاندی کی طرح ہو گا اور صفائی میں شیشے کی طرح ہو گا۔ شیشہ بہت صاف ہوتا ہے لیکن چاندی کی طرح سفید نہیں ہوتا اور چاندی بہت سفید ہوتی ہے لیکن ایسی صاف نہیں ہوتی کہ اس میں سے کوئی چیز نظر آجائے لیکن وہاں کا برتن ایسا ہو گا کہ دیکھنے میں یوں لگے گا جیسے چاندی ہے اور جب اس کی ستھرائی کو دیکھیں گے تو یوں لگے گا جیسے شیشہ ہے؛ دونوں خوبیاں اس برتن میں ہوں گی۔

**جنت کے خادم بچوں کی صفات:**

﴿وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُخَلَّدُونَ﴾

اور وہاں ان کو پلانے کے لیے ایسے بچے ہوں گے جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے۔ آپ کسی بھی گھر میں جائیں اور کوئی چیز بڑا آدمی لائے تو خوشی ہوتی ہے لیکن چھوٹا سا بچہ لے کر آئے تو کتنا پیارا لگتا ہے۔ اللہ رب العزت وہاں خدمت کے لیے ایسے چھوٹے بچے دیں گے جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے۔

﴿إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَنْشُورًا﴾ (١٧) وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَرًا رَأَيْتَ

نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا﴾ (١٨)

اور جب تم بچوں کو دیکھو گے تو ایسے دیکھو گے جیسے کے موتی ہوتے ہیں بکھرے ہوئے۔ اور تم دیکھو گے نعمت اور بہت بڑی بادشاہت۔

﴿عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ سُنْدُسٌ خُضْرٌ وَاسْتَبْرَقٌ وَحُلُوعَا آسَاوَرٍ مِنْ



فَضِيَّةً وَ سَفْهَةً رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ﴿٢٦﴾ ﴿٢٦﴾

”سندس“ کہتے ہیں باریک کو اور ”استبرق“ کہتے ہیں موٹی کو۔ وہاں ریشم ایسی ہوگی جو موٹی بھی ہوگی اور باریک بھی ہوگی۔ انسان کبھی باریک کپڑا پہنتا ہے تو بہت مزہ آتا ہے، کبھی موٹا کپڑا پہنے تو اس کی لذت اپنی ہوتی ہے۔ دونوں قسم کی ریشم اللہ عطا فرمائیں گے۔

### قدر اور اجر میں فرق:

﴿إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُورًا﴾ ﴿٢٦﴾ ﴿٢٦﴾

یہاں دونوں قسم کی ریشم عطا فرمادی ہے۔ یہ تمہارے اعمال کا بدلہ بھی ہے اور تمہاری محنت کی قدر بھی ہے۔ قدر اور اجر میں فرق ہوتا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم اعمال کا اجر بھی دیں گے اور قدر بھی کریں گے، یعنی پُرٹوکول بھی دیں گے۔

تنخواہ کو اجر کہتے ہیں اور اس پر پُرٹوکول کو قدر کہتے ہیں۔ وزیر اعلیٰ کی تنخواہ دو تین لاکھ ہوگی لیکن وزیر اعلیٰ کا پُرٹوکول کیا ہے کہ وہ لاہور سے چلے تو سرگودھا تک روڈ بلاک ہوتے ہیں کہ وزیر اعلیٰ صاحب آرہے ہیں۔ جس آدمی کی تنخواہ دس لاکھ کیا دس کروڑ بھی ہو، تو وزیر اعلیٰ کی طرح اس کے آنے پر کوئی روڈ بلاک نہیں ہوگا۔ تو اجر اور قدر میں فرق ہوتا ہے۔

امام کی تنخواہ مقتدیوں کی بنسبت بہت کم ہوتی ہے۔ مقتدی ایسا جس کی تنخواہ دس لاکھ ہے اور امام جس کی تنخواہ دس ہزار ہے۔ تو اجر دیکھیں تو امام کا کم ہے اور مقتدی کا زیادہ ہے لیکن قدر امام کی زیادہ ہے اور مقتدی کی کم ہے۔ تو اجر اور قدر میں فرق ہوتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِي عِنْدَ فُسَادِ أُمَّتِي فَلَهُ أَجْرُ مِائَةِ شَهِيدٍ.<sup>71</sup>

جو شخص میری ایک سنت کو زندہ کرے گا جس کو لوگ چھوڑ دیں گے تو اللہ اس کو سو شہید کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ سو شہید کی قدر دیں گے، اس لیے کہ اللہ کے راستے میں نکل کر کٹنے سے جو شہادت ملتی ہے اس پر اللہ جو مقام دیتے ہیں وہ قدر ہے اور سنت کے زندہ کرنے پر اللہ جو نعمتیں دیتے ہیں وہ اجر ہے۔ تو سنت کے زندہ کرنے پر اجر تو مل سکتا ہے لیکن ایک شہید کی قدر نہیں مل سکتی۔ قیامت کے دن جب جنت میں جائیں گے تو واحد شہید ہو گا جس کا اپنے پروٹوکول کو دیکھ کر یہ تقاضا ہو گا کہ مجھے دنیا میں بھیجا جائے، میں پھر جاؤں لیکن سنت کو زندہ کرنے والا کبھی یہ نہیں کہے گا کہ مجھے دنیا میں بھیج دو تاکہ میں پھر سنت کو زندہ کر کے آتا ہوں۔ چونکہ اس کا وہ پروٹوکول نہیں ہے جو شہید کا ہے۔ تو قدر الگ ہے اور اجر الگ ہے۔

اس حدیث کی وجہ سے بعض لوگ جہاد سے دور ہو جاتے ہیں کہ جب ایک سنت کے زندہ کرنے پر سو شہید کا اجر ملتا ہے تو پھر اللہ کے راستے میں جا کر کٹنے اور شہادت حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میدانِ جہاد میں کٹنے سے اللہ رب العزت انسان کو پروٹوکول دیتے ہیں جو قدر ہے کہ قیامت کے دن شہید ستر آدمیوں کی شفاعت کرے گا جن پر جہنم کا فیصلہ ہو چکا ہو گا۔ یہ اجر نہیں ہے بلکہ یہ قدر ہے، یہ پروٹوکول ہے۔

﴿نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۖ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَلَهُمْ

تَبْدِيلًا﴾

ہم نے ہی ان کو پیدا کیا اور ان کے جوڑ مضبوط بنائے۔ جوڑ مضبوط بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جوڑ بظاہر بہت کمزور ہوتے ہیں لیکن اللہ نے ان کو ایسے عمدہ طریقے سے بنایا ہے کہ سو سال بھی استعمال ہوتے ہیں تو گھستے نہیں ہیں، پرانے نہیں ہوتے، اپنا کام جاری رکھتے ہیں۔

### مشیتِ الہی اور رضائے الہی میں فرق:

﴿إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۖ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝﴾

یہ بات بڑی توجہ سے سمجھنا! فرمایا: یہ نصیحت ہے، بس جو چاہے اللہ کی طرف چلے، صحیح راستہ اختیار کرے اور اگر تم چاہو کہ ہم اللہ کی طرف چلیں تو تم نہیں جاسکتے جب تک اللہ نہ چاہے۔

تو اس پر شبہ ہوتا ہے کہ بندے کی مشیت اللہ کی مشیت کے تابع ہوتی ہے، جب اللہ چاہے گا تو بندہ نیک اعمال کرے گا، بندہ چاہے بھی تو نیک اعمال نہیں کر سکتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ بندہ تو مجبور محض ہو گیا۔ تو پھر ہمارے عمل کرنے پر ثواب اور نہ کرنے پر عذاب کیوں ہے؟

یہ بات اچھی طرح سمجھنا! ﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کوشش تم کرو گے، محنت تم کرو گے، مانگو گے تم، ارادہ تمہارا ہو گا لیکن کر تم تب ہی سکتے ہو جب اللہ چاہے، اللہ کے چاہنے کے بغیر تو تم کر ہی نہیں سکتے لیکن محنت تو تم نے کی ہے، پھر اللہ نے بھی چاہا ہے۔ تم نے گناہ کا ارادہ کیا ہے، گناہ کی کوشش کی ہے، گناہ کے اسباب جمع کیے۔ اللہ کا نظام ہے کہ اسباب پر مسبب؛ دنیا میں ہوتا ہے۔ کوئی بندہ کسی کو تلوار مارے تو اللہ نے تلوار میں قتل کی تاثیر رکھی ہے لیکن قتل کون کرے

گا؟ بندہ۔ اب قتل بندے نے اپنے اختیار سے کیا ہے، اپنے ارادے سے کیا ہے، از خود مارا ہے لیکن اللہ اس تلوار میں قتل کی تاثیر نہ رکھیں تو قتل نہیں ہو سکتا لیکن تاثیر قتل کی تو اللہ نے رکھی ہے اور یہی تمہارا امتحان تھا کہ میں چاہوں گا، تلوار کاٹے گی، نہیں چاہوں گا تو تلوار نہیں کاٹے گی لیکن ہم نے تلوار میں کاٹنے کی صلاحیت رکھی ہے۔ لہذا تم کسی کو ناحق مت مارو۔

ایک بندہ کہتا ہے کہ میں نے خود کشی کی ہے، اللہ نے چاہا تو میں مرا ہوں، اگر اللہ نہ چاہتا تو میں نہ مرتا۔ ہم نے کہا کہ اس کا معنی ہے کہ زہر میں اللہ نے قتل کی صلاحیت رکھی ہے اور تمہیں بتایا ہے کہ زہر نہ کھانا! اگر کھاؤ گے تو مر جاؤ گے، ناحق مرو گے، خود کشی ہو گی اور ہم نے زہر میں مارنے کی صلاحیت رکھی ہے۔ یہ معنی ہے کہ اللہ چاہتا ہے تو بندہ زہر سے مرتا ہے اور نہ چاہے تو نہیں مرتا، اللہ نے چاہا ہے تو زہر میں تاثیر رکھی ہے، تم نے زہر کو استعمال کیا ہے، لہذا تم مجرم ہو۔ تو یہ معنی نہیں ہے کہ بندہ مجبور محض ہے اور اس کو اعمال میں کوئی دخل نہیں ہے۔

اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاجْزِ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة المرسلات

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا ۝۱﴾ فَالْعَصْفِ عَصْفًا ۝۲ وَالنَّشِيرَاتِ تَشِيرًا ۝۳﴾

یہاں اللہ رب العزت نے پانچ قسمیں کھائی ہیں، پہلے تین قسمیں ہواؤں کی کھائی ہیں اور پھر دو قسمیں فرشتوں کی کھائی ہیں۔

**ہواؤں اور فرشتوں کی قسمیں:**

فرمایا: قسم ہے ان ہواؤں کی جو مسلسل چلائی جاتی ہیں، قسم ہے ان ہواؤں کی جو آندھیوں کی طرح چلتی ہیں، قسم ہے ان ہواؤں کی جو بادلوں کو اڑا کر منتشر کر دیتی ہیں اور بعد میں بادل ختم ہو جاتے ہیں۔

﴿فَالْمُفْرِقَاتِ فَرَقًا ۝۴﴾ فَالْمُلْقِيَاتِ ذِكْرًا ۝۵ عُنْدًا أَوْ نَذْرًا ۝۶﴾

قسم ہے ان فرشتوں کی جو وحی لا کر حق اور باطل کو الگ کر دیتے ہیں، قسم ہے ان فرشتوں کی جو وحی کے ذریعے ذکر لاتے ہیں۔ یا تو اس وجہ سے کہ بندہ معذرت کرے اور توبہ کر لے اور یا اس وجہ سے کہ نہیں کرتا تو اس کو ڈرائیں کہ تم جہنم میں جاؤ گے۔

﴿إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ ۝۷﴾ فَإِذَا الْنُجُومُ طُمِسَتْ ۝۸ وَإِذَا السَّمَاءُ

فَرَجَتْ ﴿٩﴾ وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ﴿١٠﴾ وَإِذَا الرُّسُلُ اقْتَتَتْ ﴿١١﴾

جو تمہارے ساتھ وعدہ ہے قیامت کا وہ ہو کر رہے گا، اور یہ وعدہ کب پورا ہو گا؟ جب ستارے بے نور ہو جائیں گے، آسمانوں میں دراڑیں آجائیں گی، جب پہاڑوں کو اڑا دیا جائے گا، جب انبیاء علیہم السلام کو جمع کیا جائے گا۔

﴿لَا يَوْمَ أُجِلَّتْ ﴿١٢﴾ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ﴿١٣﴾ وَمَا أَذْرِكَ مَا يَوْمَ

الْفَصْلِ ﴿١٤﴾﴾

اگر کوئی کہے کہ اس معاملے میں پھر تاخیر کس دن کی ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ فیصلہ کے دن کی اور تمہیں اندازہ ہے کہ فیصلے کا دن کون سا ہے؟

**جھٹلانے والوں کو انجام:**

﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿١٥﴾ أَلَمْ نُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ نُنْبِئُهُمُ

الْآخِرِينَ ﴿١٧﴾ كَذَلِكَ نَفْعِلُ الْبَاطِلِ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٨﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿١٩﴾﴾

کیا ہم نے پہلی قوموں کو ہلاک نہیں کیا اور ان کے پیچھے دوسرے لوگوں کو بھی ہلاک کر دیا۔ ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتے ہیں۔ جھٹلانے والوں کے لیے سخت ہلاکت ہے۔ ویل؛ جہنم کی ایک وادی ہے جس میں جہنمیوں کی پیپ جمع ہوتی ہے۔

﴿انْطَلِقُوا إِلَىٰ ظِلٍّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ ﴿٢٠﴾ لَا ظِلِيلٍ وَلَا يُغْنِي مِنَ الْهَبِ ﴿٢١﴾﴾

قیامت کے دن اعلان ہو گا کہ تم آؤ اس بادل کی طرف اور سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے۔ اس سے مراد وہ دھواں ہے جو قیامت کے دن جہنم سے اٹھے گا، جو دیکھنے میں سائبان کی طرح ہو گا لیکن چونکہ دھواں ہو گا اس لیے نہ اس کا سایہ ہو گا اور نہ وہ گرمی سے بچائے گا۔

﴿إِنَّهَا تَزْمِي بَشِيرٍ كَالْقَصْرِ ۝ كَأَنَّهُ جِمْلَتٌ صُفْرٌ ۝﴾

پھر اس دھویں سے شعلے نکلیں گے۔ انگارے نکلیں گے جو بڑے بڑے محل کی طرح ہوں گے۔ پھر جب محل ٹوٹے گا تو اس سے چھوٹے چھوٹے انگارے نکلیں گے جو زرد اونٹوں کی طرح ہوں گے۔

**متقین کی کامیابی:**

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلِّ وَعُيُونٍ ۝ وَفَوَاحٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ۝﴾

كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝﴾

قیمت کے دن نیک لوگ درختوں کے سائے میں ہوں گے اور پانی کے چشموں میں ہوں گے اور انہیں ایسے پھل ملیں گے جیسے یہ چاہیں گے۔ حکم ہو گا کہ رغبت کے ساتھ جو چاہو کھاؤ۔ یہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے اور ہم اسی طرح احسان کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

﴿وَيَلِيَّوْا يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝ كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُمْ جُعِلْمْوْنَ

۝ وَيَلِيَّوْا يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اذْكَعُوا لَا يَزْكَعُونَ ۝ وَيَلِيَّوْا يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝﴾

﴿وَيَلِيَّوْا يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝﴾

ہلاکت اور تباہی ہے جھٹلانے والوں کے لیے۔ کافروں کو حکم ہے کہ تم چند روز کھاپی لو اور عیش کی زندگی گزار لو۔ حقیقت میں تم ہی مجرم ہو! ہلاکت اور تباہی ہے جھٹلانے والوں کے لیے۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے آگے جھکو تو جھکتے نہیں ہیں۔ ہلاکت اور تباہی ہے جھٹلانے والوں کے لیے۔

یہاں رکوع سے مراد یا تو اس کا لغوی معنی ہے جھکنا۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ

اللہ کے احکام کے سامنے سر جھکا دو اور انہیں تسلیم کر لو لیکن وہ ایسا نہیں کرتے۔ یا اس سے مراد نماز والا رکوع ہے۔ تو رکوع بول کر پوری نماز مراد ہے کہ جب ان کو نماز کے لیے بلایا جاتا ہے تو نماز کے لیے نہیں آتے۔

**لفظ ”حدیث“ سے غیر مقلدین کے استدلال کا جواب:**

﴿فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ﴾

قرآن کے بعد کس بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟ اس کے بعد کوئی اور چیز بھی ہے جس کو یہ مانیں گے؟

حدیث پاک میں ہے کہ جب تلاوت کرتے ہوئے یہاں پر پہنچیں ﴿فَبِأَيِّ

حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ﴾ تو یہ پڑھا کریں: ”اٰمَنَّا بِاللّٰهِ“ کہ ہم اللہ پر ایمان لائے۔

یہاں پر بعض غیر مقلد کہتے ہیں کہ دیکھو! ہم اہل حدیث ہیں، قرآن میں

ہے ﴿فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ﴾۔ میں نے کہا کہ یہ بات کتنی بے ہودہ ہے، یہ

تولغوی بات ہے اور ”کا“ ضمیر کا مرجع قرآن ہے کہ قرآن کریم کے بعد وہ کون سی بات

ہے کہ جس کو یہ مانیں گے؟ تو یہاں تو جو چیز قرآن کے خلاف ہے اس کو حدیث کہا جا

رہا ہے۔ اگر اس استدلال سے تم اہل حدیث بنو گے تو اس حدیث سے مراد قرآن کے

خلاف باتیں ہیں۔

اور کبھی کہتے ہیں کہ جی دیکھو! قرآن کریم کو اللہ نے ”حدیث“ کہا ہے

﴿اِنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيثِ﴾<sup>72</sup> تو اللہ نے احسن حدیث قرآن کو کہا ہے۔

میں نے کہا: قرآن کریم میں جس طرح اللہ نے اپنی باتوں کو ”حدیث“ فرمایا



ہے اسی طرح اللہ نے غیر کی باتوں کو بھی ”حدیث“ فرمایا ہے۔ فرمایا: ﴿فَيَأْتِي حَدِيثٌ  
بَعْدَ أَيُّ مَنُونٍ﴾ تو یہ لغوی بات ہے۔ جب یہ چیزیں ذہن میں رکھو گے تو الجھن کبھی  
نہیں ہوتی۔

میں نے کہا: لغت میں تو ہر بات کو ”حدیث“ کہتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ  
صحیح البخاری حدیث کی کتاب ہے، صحیح مسلم حدیث کی کتاب ہے تو یہاں حدیث سے  
مراد اصطلاحی معنی ہے۔ تو لغتاً اس کا معنی الگ ہوتا ہے اور اصطلاحاً اس کا معنی الگ  
ہوتا ہے۔ ہم لغات کے پابند نہیں ہیں بلکہ ہم اصطلاح کے پابند ہیں۔

اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاجِرُ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة النبأ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ﴿١﴾ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيمِ ﴿٢﴾ الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ ﴿٣﴾﴾

بڑی خبر کیا ہے؟

عَمَّ یہ ”عَنْ“ کے آگے ”مَا“ استفہامیہ ہے اور اس کا الف گرا ہوا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب توحید کے بعد قیامت کا ذکر فرمایا تو مشرکین از روئے استہزاء اور مذاق یہ بات کہتے کہ قیامت کب آئے گی؟ تو یہاں اللہ رب العزت نے کتنے پیارے انداز میں بات کی ہے کہ یہ کس چیز کے بارے میں پوچھتے ہیں؟ یہ پوچھتے ہیں اس خبر کے بارے میں اور وہ بھی بہت بڑی خبر کے بارے میں اور اس میں اہل حق سے اختلاف کرتے ہیں! یہ بالکل ایسے ہے جیسے کوئی کہے کس کے بارے میں پوچھتے ہو؟ استاد جی کے بارے میں؟ جن کو ساری دنیا جانتی ہے! اب دیکھو سوال ہو رہا ہے۔

تو اسی طرح یہاں ”عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ“ ہے کہ یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھتے ہیں؟ اس خبر کے بارے میں جس میں اختلاف بھی کرتے ہیں۔

﴿كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ﴿٤﴾ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ﴿٥﴾﴾

ان کا جو خیال ہے کہ قیامت نہیں آئے گی، تو فرمایا: ہر گز ایسا نہیں! قیامت آئے گی اور یہ لوگ دیکھ بھی لیں گے۔ ”ثُمَّ كَلَّا“ پھر سنو! یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت نہیں آئے گی، ہر گز ایسا نہیں! قیامت آئے گی اور یہ لوگ دیکھ بھی لیں گے۔ ان کا خیال غلط ہے کہ قیامت نہیں آئے گی۔

یہ میں صرف اس لیے کہتا ہوں کہ ﴿كَلَّا سَيَعْلَمُونَ﴾ ۱؎ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ﴿۱﴾ کے ترجمے کو سمجھو! یہ اللہ نے کیوں فرمایا ﴿عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ﴾ کہ ایک بڑی خبر کے بارے میں پوچھتے ہیں اور ان کے خیال میں ہے وہ نہیں آئے گی، فرمایا: ہر گز ایسی بات نہیں! وہ ضرور آئے گی اور یہ لوگ دیکھ لیں گے اور پھر سنو! ایسا نہیں ہو سکتا جیسے یہ کہتے ہیں، قیامت آئے گی، ﴿سَيَعْلَمُونَ﴾ اور تمہیں پتا چل جائے گا جب وہ آئے گی۔

### الفاظ کے ساتھ لہجے کی اہمیت:

میں اس لیے کہتا ہوں کہ استفہام کو استفہام کے لہجے میں کہو تو پھر بات سمجھ آتی ہے۔ ہم استفہام کو استفہام کے انداز میں نہیں کہتے تو پھر سمجھ نہیں آتی کہ قرآن مجید کیا کہہ رہا ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دین کو سب سے زیادہ سمجھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بھی دیکھتے ہیں اور ادائیں بھی دیکھی ہیں، ہم تک الفاظ پہنچتے ہیں اور ادائیں نہیں پہنچتیں، اس لیے سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اور جب ہم قرآن کریم کا ترجمہ کرتے ہیں پھر یونہی گزر جاتے ہیں اور ترجمہ کرتے ہیں کہ ”کس چیز کے بارے میں پوچھتے ہیں؟ پوچھتے ہیں ایک خبر کے بارے میں!“ تو طالب علم نہیں سمجھ پاتا کہ قرآن کیسے سمجھایا جا رہا ہے۔ اس لیے میں بار بار عرض کر رہا ہوں کہ اس کا طرز سمجھو! جیسے دو طالب علم ہوں اور تبصرہ کر رہے

ہوں کسی امتحان کے بارے میں تو استاد جی سن لیں اور پوچھیں: ”کس چیز کے بارے میں تبصرہ کر رہے ہو؟ امتحان کے بارے میں؟ وہ تو ضرور ہوگا، کچھ فائدہ نہیں تبصرہ کرنے کا۔“ اور اگر لہجہ سمجھائے بغیر ویسے ذکر کرو کہ ”طالب علم کس چیز کے بارے میں تبصرہ کرتے ہیں؟ تبصرہ کرتے ہیں امتحان کے بارے میں“ تو وہ کیسے سمجھ آئے گا؟

میں اس لیے کہتا ہوں کہ قرآن کریم سمجھیں اور پھر جب درس قرآن دیں تو پھر لوگوں کو سمجھائیں، جھجک سے کام نہ لیں! قرآن کریم محاورات پر بات کرتا ہے اور محاورات؛ کو محاورات کے انداز میں کہہ کر بات کی جاتی ہے اور قرآن جس لہجے میں بات کرتا ہے اس لہجے میں سمجھاؤ تو پھر مخاطب کو بات سمجھ آتی ہے وگرنہ سمجھ میں نہیں آتی۔

یہ کس چیز کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟ بنا کہتے ہیں بڑی خبر کو، عظیم کہہ کر مزید اس کی عظمت بیان کی، یہ کس چیز کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟ بڑی خبر کے بارے میں جس میں اہل حق سے اختلاف کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ قیامت نہیں آئے گی، کَلَّا... ہر گز نہیں! وہ آئے گی، ”سَيَعْلَمُونَ“ ان کو پتا چل جائے گا، ”ثُمَّ“ پھر سنو! تم کہتے ہو کہ قیامت نہیں آئے گی، فرمایا: آئے گی اور ان کو پتا چل جائے گا جب آئے گی۔ اب اگر یوں بیان کریں تو ”ثُمَّ“ کا معنی سمجھ میں آتا ہے وگرنہ ”ثُمَّ“ کا معنی سمجھ میں نہیں آتا۔ مثلاً میں کہتا ہوں: دیکھو! کل تم نے دس بجے پہنچنا ہے، پھر سنو! میں کہہ رہا ہوں کہ دس بجے پہنچنا ہے! اب دیکھو! ”ثُمَّ“ کا معنی سمجھ آ رہا ہے یا نہیں؟ (آ رہا ہے۔ سامعین) اگر اس طرز سے نہ سمجھائیں تو قرآن کی فصاحت و بلاغت سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ صرف کتابوں کے مطالعہ سے نہیں سمجھ آتے، یہ درس گاہوں میں سمجھ آتے ہیں۔

## انعامات باری تعالیٰ:

﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهْدًا ۝۱۱۱ وَ الْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝۱۱۲ وَ خَلَقْنٰكُمْ

اَزْوَاجًا ۝۱۱۳﴾

یہ لوگ توحید اور قیامت میں شک کرتے ہیں، یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے زمین کو کیسے نرم بچھونا بنادیا اور زمین میں پہاڑوں کو میخوں کے طور پر ایسے لگا دیا ہے کہ زمین ہل نہیں سکتی اور ہم نے تم سب کو جوڑا جوڑا پیدا کیا؛ مرد اور عورت۔

## نیند؛ تھکاؤ اتارنے کا موثر ذریعہ

﴿وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝۱۱۴﴾

”سُبَاتًا“ یہ سبت سے ہے، سبت کا معنی ہوتا ہے کاٹ کے رکھ دینا۔ نیند بھی بے آرامی کو ختم کر دیتی ہے۔ تو فرمایا: ہم نے نیند بنائی ہے تمہارے لیے راحت کی چیز، جس قدر راحت نیند سے آتی ہے کسی اور چیز سے نہیں آتی۔ میں مشاہدات نہیں بتاتا میں تجربات بتا رہا ہوں۔ آدمی بہت تھکا ہو اور لوگ دبانا شروع کر دیں تو تھکاؤ نہیں اترتی، سو جائیں تو تھکاؤ اتر جاتی ہے۔ تیل لگواؤ تھکاؤ نہیں اترے گی، سو جاؤ گے تھکاؤ اتر جائے گی۔ تو نیند سب سے زیادہ راحت کی چیز ہے تھکاؤ کو ختم کرنے میں، اور اس کا آپ معمول بنائیں خصوصاً قیلولہ کا، قیلولہ دس منٹ کا ملے پھر بھی سنت سمجھ کر کریں، اس لیے کہ اس کے فوائد بہت زیادہ ہیں۔ میرا بھی کراچی کا سفر تھا تو چونکہ پورا دن سفر رہا، عشاء کے بعد پھر میرا بیان تھا تو میں وہاں پہنچا ہوں تقریباً 7:40 پر، 8:00 بجے اذان تھی، میں پونے آٹھ سو گیا اور 8:10 پر اٹھا، نیند پوری ہو گئی، یہ اتنی سی نیند نہ ہوتی تو بہت تھکاؤ ہوتی۔

﴿وَجَعَلْنَا النَّيْلَ لِبَاسًا ۝۱۱۵﴾

اور نیند کے لیے بہترین ہوتا ہے کہ روشنی کم ہو، شور نہ ہو، آرام دہ ماحول ہو اور اس کے لیے اللہ نے رات کو بنایا ہے، خود بخود روشنی ختم ہو جاتی ہے، خود بخود لوگوں پر ایسے آثار آنا شروع ہو جاتے ہیں کہ ہر بندہ سونے کے لیے متوجہ ہو جاتا ہے، اس لیے رات کا انتخاب کیا۔

﴿وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۷﴾

اور کام کرنے کے لیے روشنی چاہیے تو اس کے لیے انسان کے نکالے بغیر خود بخود سورج نکلتا ہے، اس لیے فرمایا کہ دن کو ہم نے بنایا ہے کام کرنے کے لیے، اندھیرے میں آدمی سوتا ہے اور روشنی میں کام کرتا ہے۔ تو رات میں اندھیرا کر دیا کہ سو جاؤ اور دن کو روشنی کر دی کہ اب اپنا کام کر لو۔

**آسمانوں کی تخلیق و تزئین:**

﴿وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝۱۸ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ۝۱۹ وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرِ مَاءً ثَجَّاجًا ۝۲۰ لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۝۲۱ وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ۝۲۲﴾

اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے اور سورج کو روشن چراغ بنایا اور پانی سے بھرے ہوئے بادلوں سے ہم مسلسل پانی اتارتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے غلہ، سبزیاں اور باغات اگائیں۔ باغات بھی کیسے؟ فرمایا ”أَلْفَافًا“ ایک دوسرے سے ملے ہوئے جنہیں گھنے باغات کہتے ہیں۔

**وقوع قیامت کا بیان:**

﴿إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝۲۳ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ ۝۲۴﴾

﴿أَفْوَاجًا ۝۲۵﴾

قیامت کا دن مقرر ہے جس دن صور میں پھونک دیا جائے گا تو تم فوج در فوج

آؤ گے۔ بعض روایات میں ہے کہ کچھ لوگ سوار ہو کر آئیں گے اور کچھ لوگ پیدل آئیں گے اور کچھ کو بیڑیوں میں جکڑ کر لایا جائے گا۔ جیسے جیسے لوگوں کے اعمال ہوں گے ان کے مطابق ان سے معاملہ ہوگا، اور یہ بھی ہے کہ کافر الگ ہوں گے اور مؤمن الگ ہوں گے، پھر مؤمنین میں بھی فساق الگ ہوں گے، صالحین الگ ہوں گے تو قیامت کا بہت ہولناک منظر ہوگا۔ اللہ اس ہولناکی سے بچائیں۔

جو انسان دنیا میں دین کے لیے مشقت برداشت کرتا ہے اللہ آخرت کی ہولناکی سے اس کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اللہ کریم ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ بندہ دنیا میں بھی دین کے لیے مصیبتیں اٹھائے اور قیامت کو پھر مصیبت زدہ ہو ایسا نہیں ہوتا! یہ اللہ کی شان کریمی کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ عافیت مانگیں لیکن کبھی دنیا کی تکلیف آجائے تو برداشت کرنی ہے اور آخرت کی مشقت سے بچنا ہے۔

﴿وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۖ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۖ﴾

اور آسمان کھول دیا جائے گا تو اس کے دروازے ہی دروازے بن جائیں گے، اور پہاڑوں کو چلایا جائے گا تو وہ سراب بن جائیں گے۔ جنگل میں جو ریت ہوتا ہے وہ دور سے پانی نظر آتا ہے لیکن قریب جائیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا سوائے ریت کے، اس کو بھی سراب کہتے ہیں۔ تو قیامت کے دن یہ پہاڑ بھی اسی ریت کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر نظر آئیں گے۔

**”حَقَب“ کی مقدار:**

﴿لَاِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۚ لِلطَّاغِيْنَ مَابًا ۚ لِّبَثِّيْنَ فِيْهَا ۚ

اَحْقَابًا ۚ﴾

جہنم گھات میں ہے جیسے کوئی چھپ کر بیٹھا ہوتا ہے کہ اچانک حملہ کرے گا

اسی طرح جہنم گھات میں لگی ہوئی ہے، یہ جائیں گے تو فرشتے پکڑ کے جہنم میں ڈال دیں گے۔ ”لِلطَّاغِيْنَ مَأْبَا“.. یہ جہنم سرکش لوگوں کے لیے ٹھکانا ہے۔ طاغین سے مراد کافر ہیں یا طاغین سے مراد وہ مسلمان ہیں جو فاسق اور گناہگار ہیں۔ ”تَبِثِيْنَ فِيْهَاۤ اَحْقَابًا“.. اور اس جہنم میں وہ زمانہ دراز.. در زمانہ در زمانہ رہیں گے۔ احقاب یہ حَقَب کی جمع ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے مطابق ایک حقب اسی سال کا ہوتا ہے۔ ایک سال بارہ مہینے کا، ایک مہینا تیس دن کا اور ایک دن ایک ہزار سال کا تو اس اعتبار سے حقب بنتا ہے دو کروڑ اٹھاسی لاکھ سال کا۔

اس پر سوال یہ ہے کہ کفار کے بارے میں اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور یہاں فرمایا کہ احقاب یعنی کئی زمانوں تک رہیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار وہ جہنم سے نکل جائیں گے، تو یہ دوام تو نہ ہوا؟ اس کے دو جواب ہیں: ایک یہ کہ یہ عذاب کفار کے لیے نہیں ہے، یہ فساق مسلمانوں کے لیے ہے اور طاغین سے مراد فساق ہیں، یہ ایک مدت دراز تک جہنم میں رہیں گے اور پھر نکل جائیں گے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں نکلنے کا ذکر نہیں ہے، یہ نہیں فرمایا کہ چند حقب رہیں گے پھر نکل جائیں بلکہ فرمایا کہ کئی احقاب جہنم میں پڑے رہیں گے یعنی ایک حقب ختم ہو گا تو دوسرا شروع، وہ ختم ہو گا تو تیسرا شروع، وہ ختم ہو گا تو چوتھا شروع، تو احقاب ختم نہیں ہوں گے، ایک ختم ہو گا تو دوسرا شروع ہو جائے گا۔

**جہنم کا ہولناک عذاب:**

﴿لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ۚ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاۗقًا ۚ جَزَاءُ



نہ اس میں کوئی ٹھنڈی چیز ان کو ملے گی اور نہ ہی کوئی اچھی چیز پینے کی ملے گی، ملے گا تو کیا؟ ﴿حَمِيمًا وَغَسَّاقًا﴾ گرم پانی اور پیپ، اور یہ پورا پورا بدمذہب ہے۔

اس پر بھی سوال ہے کہ یہاں ہے ﴿لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا﴾ کہ ان کو ٹھنڈ نہیں ملے گی اور بعض روایات میں ہے کہ جہنم میں زمہریر یعنی ٹھنڈک کا عذاب بھی ہو گا۔ جواب یہ ہے کہ اس زمہریر سے مراد ہے ایسی ٹھنڈ جو بندے کو جما کر رکھ دے اور ”بَرْدًا“ کہتے ہیں ایسی ٹھنڈ کو جو معتدل ہو۔

﴿إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَزْجُونَ حِسَابًا﴾ ﴿٢٢﴾ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَابًا ﴿٢٣﴾ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا﴾ ﴿٢٤﴾ فَذُوقُوا فَلَنْ نَزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا﴾ ﴿٢٥﴾

یہ لوگ قیامت کے حساب کی امید نہیں رکھتے تھے اور ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے۔ ہم نے ہر چیز کو لکھ کر رکھا ہوا ہے اور قیامت کے دن ارشاد ہو گا کہ چکھو! آج ہم تمہیں صرف عذاب ہی چکھائیں گے۔

### متقین کے لیے انعامات:

﴿إِنَّ لِمُتَّقِينَ مَفَازًا﴾ ﴿٢٦﴾ حَدَآئِقَ وَأَعْنَابًا﴾ ﴿٢٧﴾ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا﴾ ﴿٢٨﴾

یہاں سے متقین کا ذکر ہے۔ فرمایا: متقین کے لیے کامیابی ہے، ان کو باغات ملیں گے اور بطور خاص انگور کے باغات ملیں گے۔ یہ تخصیص بعد تعیم ہے۔ اور ان کو ایسی عورتیں ملیں گی جن کی ابھرتی جوانی ہو گی۔ ”أَتْرَابًا“ ہم عمر، ”كَوَاعِبَ“ یہ کاعبہ کی جمع ہے اور کاعبہ کہتے ہیں کہ جس کا کچھ حصہ ابھرا ہو، اس لیے ٹخنے کو کعب کہتے ہیں کیونکہ ٹخنہ ابھرا ہوتا ہے باقی جسم سے۔ ابھرتی جوانی کا معنی ہوتا ہے کہ ان کے پستان اٹھے ہوتے ہیں، یہ عورت میں حسن ہے جس کے بغیر انسان کو لطف نہیں آتا اور اللہ نے جنت کی حوروں کی اٹھارہ صفتیں بیان فرمائیں اور یہ اس لیے بیان کیں کہ ان کو

بیان کیا کرو، انہیں سنا کرو کیونکہ اس سے بندے کی رغبت بڑھتی ہے۔ تاکہ ناپاک حسن سے جان چھوٹے اور پاک حسن کی طرف رغبت ہو۔ اللہ ہم سب کو حوریں عطا فرمائے۔ (آمین)

﴿وَكَاذِبًا هَاقًا ۖ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذْبًا ۗ جَزَاءٌ مِّن رَّبِّكَ عَطَاءٌ حِسَابًا﴾

اور صاف بھرے ہوئے پیالے ہوں گے، جنت میں نہ بے ہودگی ہوگی نہ جھوٹ ہوگا۔ یہ بدلہ ہے تمہارے رب کی طرف سے اور عطا ہے بغیر حساب کے۔ اس پر سوال یہ ہے کہ جزا کہتے ہیں کہ جو اعمال کے بدلے میں ہو اور عطا کہتے ہیں جو بغیر بدلے کے ہو۔ تو جزا اور عطا دو چیزیں اکٹھی کیسے ہوں گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل تو انسان نے نیک اعمال کیے ہیں اور ان نیک اعمال کی وجہ سے جنت میں بھیجا جا رہا ہے لیکن بتانا یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے نیک اعمال اس قابل نہیں ہیں کہ ان کے بدلے میں جنت ہو، یہ اللہ کی طرف سے عطیہ ہے جو تمہیں عطا کر رہے ہیں۔

﴿رَبِّ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمَنِ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا ۖ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا ۖ﴾

قیامت کے دن کوئی پوچھ نہیں سکے گا کہ اس کو چھوٹی جنت دی ہے اس کو بڑی کیوں؟ اس کو سزا کیوں دی؟ اس کو معاف کیوں کیا؟ جبرائیل امین بھی ہوں گے اور دوسرے فرشتے بھی ہوں گے، سارے اب صف در صف کھڑے ہوں گے۔

﴿لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَابًا ۖ﴾

اللہ کی اجازت کے بغیر قیامت کے دن کوئی بات بھی نہیں کر سکے گا اور جو

کوئی بات کریں گے تو وہ درست بات ہی کریں گے۔ یہ حق ہے، سچا دن ہے، جو اپنے رب کے پاس ٹھکانا بنانا چاہتے ہیں تو بنالیں۔

**کافر کی حسرت؛ کاش میں مٹی بن جاتا**

﴿وَيَقُولُ اِنْ كُنْتُ لَيْتَنِى كُنْتُ تُرْبًا﴾

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن پہاڑ وغیرہ ختم کر کے پوری زمین کو برابر کیا جائے گا تا کہ درمیان میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کی وجہ سے ایک کو دوسرا نظر نہ آ سکے۔ پھر قیامت کے دن اللہ ایسی بکریاں کھڑی کریں گے کہ ایک بکری نے دنیا میں اس بکری کو مارا تھا جس کے سینگ نہیں تھے، اللہ سینگ والی بکری کے سینگ ختم کر دیں گے اور جس کے دنیا میں سینگ نہیں تھے اس کو دیں گے اور فرمائیں گے کہ اس کو ٹکڑا کر بدلہ لو! وہ بدلہ لے گی۔ پھر حکم ہو گا کہ دونوں مٹی بن جاؤ! اس وقت کافر کہے گا: ”لَیْتَیْنِیْ کُنْتُ تُرْبًا“ اے کاش! آج میں بھی مٹی بن جاتا... لیکن نہیں بن سکے گا۔

یہاں ایک نکتہ سمجھیں کہ جنت اوپر ہے اور جہنم نیچے ہے۔ نیچے مٹی ہے اور جہنمی آدمی نیچے کیوں جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گیارہ قسمیں کھا کر ارشاد فرمایا کہ ہم نے انسان کی جبلت میں فجور اور تقویٰ دونوں رکھے ہیں۔ فجور کا معنی ہے من مانی کرنا اور تقویٰ کا معنی ہے مان کے چلنا۔ مان کے چلنے والی مخلوق ہے ملائکہ جو اوپر ہیں اور من مانی کرنے والی مخلوق جانور ہے جو زمین سے بنتی ہے اور نیچے رہتی ہے۔ تو جو انسان من مانی کرتا ہے اللہ اس کو وہ ٹھکانا دیتا ہے جو جانوروں کا ہے جو نیچے ہے اور جو مان کے چلتا ہے اس کو وہ ٹھکانا دیتا ہے جو ملائکہ کا ہے اور وہ اوپر ہے، اس لیے جنت کو اوپر بنایا اور جہنم کو نیچے بنایا۔

وَاجِرْ دَعْوَاَنَا اِنَّ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

## سورة النزعۃ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَالنَّزِعَتِ غَرْقًا ۚ وَالنَّشِطَتِ نَشْطًا ۚ وَالسَّبِغَتِ سَبْغًا ۚ﴾

فَالسَّبِغَتِ سَبْغًا ۚ فَالْمَدْبِرَتِ أَمْرًا ۚ﴾

### فرشتوں کی پانچ اقسام:

[1]: ”وَالنَّزِعَتِ غَرْقًا“.. قسم ہے ان فرشتوں کی جو کافروں کی روح کو کھینچ کر نکالتے ہیں۔

[2]: ”وَالنَّشِطَتِ نَشْطًا“.. اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو مسلمانوں کی روح اتنی آسانی سے نکالتے ہیں کہ جیسے گرہ کھول دی گئی ہو، چمڑے کی مشک میں پانی ہے اس کو کھول دو، غبارے میں ہوا ہے اس کا منہ کھول دو۔ جس طرح ہوا نکلتی ہے اسی طرح تیزی سے مسلمان کی روح نکل جاتی ہے۔

یہاں ایک بات سمجھ لیں۔ کافر کی روح مشکل سے نکلتی ہے، بظاہر اگر نظر آئے بھی کہ کافر جلدی مر گیا تو بظاہر کا حکم اور ہوتا ہے، اندر کی تکلیف اور ہوتی ہے۔ مسلمان کو بظاہر تکلیف محسوس ہو بھی تو پھر بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ اللہ کافر کے لیے موت کے بعد برزخ کا عذاب مستحضر کرتے ہیں اس کو دیکھ کر کافر کی روح کا جسم سے

نکلنے کو دل ہی نہیں کرتا، فرشتے کھینچ کر نکالتے ہیں پھر اس کو تکلیف ہوتی ہے، اور مومن کے لیے اللہ برزخ کے انعامات سامنے کر دیتے ہیں تو روح دوڑ کر وہاں جاتی ہے۔ اس لیے جو شہید ہے اس کی روح عام انسان کی بنسبت بہت آسانی سے نکلتی ہے، اللہ ہم سب کو شہادت کی موت عطا فرمائے۔ (آمین)

[3]: ”وَالسَّيِّئَاتِ سَبْحًا“.. اور قسم ہے ان ملائکہ کی جو تیرتے ہیں۔ تیرنے کا

معنی کہ جس طرح زمین ہے اس میں درخت ہیں پہاڑ ہیں رکاوٹیں ہیں اور پانی میں رکاوٹیں نہیں ہیں، کشتیاں بغیر رکاوٹ کے بھاگتی رہتی ہیں، اس لیے فرمایا کہ ملائکہ اللہ کے حکموں کو لے کر تیرتے ہیں یعنی ان کو بھی درمیان میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔

[4]: ”فَالسَّيِّئَاتِ سَبْقًا“.. جو حکم ملتا ہے اس کو لے کر دوڑتے ہیں۔

[5]: ”فَالْمُذَبِّحَاتِ أَمْرًا“.. پھر جو حکم خدا ان کو دیتے ہیں ان کے لیے تدبیر

اختیار کرتے ہیں۔

### قیامت کا منظر:

﴿يَوْمَ تَزْجَفُ الرَّاجِفَةُ ۖ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۖ قُلُوبٌ يُّوْمِئِذٍ وَاجِفَةٌ ۖ أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ﴾

جس دن ہلانے والی ہلا کر رکھ دے گی۔ اس سے مراد پہلا صور ہے۔ اس کے پیچھے دوسری آئے گی۔ اس سے مراد دوسرا صور ہے۔ اس دن آدمیوں کے دل لرزتے ہوں گے اور ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی۔

﴿يَقُولُونَ عَرَانَا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ ۖ إِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّحْرَةً ۖ قَالُوا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۖ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ ۖ فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ﴾

کہتے ہیں کہ کیا ہم دوبارہ پہلی حالت پر لوٹا دیے جائیں گے؟ جب ہم بوسیدہ ہڈیاں بن جائیں پھر بھی؟ مزید یہ کہتے ہیں کہ اگر تمہاری بات سچی ہے پھر تو ہمارا بہت نقصان ہو گا! ہم نے تو قیامت کے لیے کوئی عمل کیا ہی نہیں ہے۔

اللہ فرماتے ہیں: ﴿فَاتَّصَاهُ زُجْرَةٌ وَاحِدَةٌ﴾ وہاں تو ایک کڑک ہو گی اور سارے لوگ نکل کر میدان میں آکھڑے ہوں گے، پھر ان کو سمجھ آئے گی۔

### موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ:

﴿هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ﴿١٥﴾ إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿١٦﴾﴾

جس طرح آج یہ لوگ باتیں کر رہے ہیں کہ کیا ہو گا؟ اگر حشر پاپا تو بہت نقصان ہو گا وغیرہ وغیرہ... تو موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آپ نے سنا؟ انہیں فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا اور فرعون بھی سرکشی کرتا تھا، وہ بھی جھٹلاتا تھا! وہ بھی ایسی باتیں کرتا تھا، بالآخر فرعون کا کیا حشر ہوا؟ یہ لوگ بھی آج بک بک کرتے ہیں ان کا حشر بھی ان سے بدتر ہو گا۔

وادی مقدس جس کا نام طوی تھا وہاں اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کی۔

﴿إِذْ هَبَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ﴿١٧﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ إِلَىٰ أَنْ تَزْكَىٰ ﴿١٨﴾﴾

﴿أَهْدِيكَ إِلَىٰ رَبِّكَ فَتَخْشَىٰ ﴿١٩﴾﴾

کہ فرعون کے پاس جاؤ! اس نے سرکشی کی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جا کر فرعون سے کہا کہ کیا تو چاہتا ہے کہ تو ٹھیک ہو جائے؟ تو اپنی اصلاح چاہتا ہے؟ میں تیرے رب کے راستے کی رہنمائی کروں تاکہ تجھ میں خوفِ خدا پیدا ہو جائے!

﴿فَارَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ ﴿٢٠﴾ فَكَذَّبَ وَعَصَىٰ ﴿٢١﴾ ثُمَّ أَذْبَرَ يَسْعَىٰ ﴿٢٢﴾﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو معجزات دکھائے، اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی، پھر وہ پیڑھے پھیر کر دوڑا یعنی تخت کی طرف گیا، وہاں سب کو جمع کیا اور پکار کر کہنے لگا: ”أَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْلَى“ میں ہی تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔

﴿فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْأَخِرَةِ وَالْأُولَىٰ ۖ﴾

اللہ نے اسے دنیا اور آخرت کا ایسا عذاب دیا کہ بعد والوں کے لیے عبرت بن گیا۔ ”نکال“ ایسے عذاب کو کہتے ہیں کہ جو دوسروں کے لیے عبرت کا باعث بنے۔

### بعث بعد الموت پر دلیل:

﴿عَاثُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ ۚ بَنَاهَا ۖ رَفَعَ سَمَكُهَا فَسَوَّاهَا ۖ﴾

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں کیسے اٹھائیں گے؟ اللہ فرماتے ہیں کہ تمہیں اٹھانا کیا مشکل ہے؟ پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟ ہم نے آسمان کو پیدا کیا ہے تو تمہیں پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان کو؟ آسمان کی چھت کو اونچا کیا اور پھر اسے برابر کر دیا ہے۔

﴿وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا ۖ﴾

فرمایا: اور اللہ نے اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کی دھوپ نکالی۔ اصل میں چونکہ سورج جاتا ہے تو رات آتی ہے، سورج آتا ہے تو روشنی آتی ہے اور سورج کا تعلق آسمان سے ہے اس لیے ان سب چیزوں کی نسبت آسمان کی طرف ہو رہی ہے۔

﴿وَالْأَرْضُ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا ۖ أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَ

مَرْعَاهَا ۖ وَالْجِبَالِ أَرْسَاهَا ۖ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۖ﴾

فرمایا: پھر ہم نے زمین کو پھیلایا ہے، اس سے اس کا پانی نکالا، اس کا گھاس اور نباتات نکالیں اور پہاڑ اس میں قائم کیے تاکہ تم اور تمہارے جانور نفع اٹھائیں۔

## وَقَوْعِ قِيَامَتِ كَابِيَانِ:

﴿فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ۖ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا

سَعَىٰ﴾

جب اچانک بہت بڑا ہنگامہ برپا ہو جائے گا تو اس وقت انسان کو اپنے سارے  
کرتوت یاد آجائیں گے۔

﴿وَبُورَّتِ الْجَحِيمُ لِمَنْ يَّزَىٰ﴾

اس دن دوزخ ہر دیکھنے والے کے سامنے لائی جائے گی۔

﴿فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ ۖ وَ أَثَرَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ

النَّارُ ۖ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ فَإِنَّ

الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ﴾

جس شخص نے نافرمانی کی اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دی تو جہنم اس کا ٹھکانا ہو گا  
اور جو شخص اللہ کے حضور پیش ہونے سے ڈر گیا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو  
جنت اس کا ٹھکانا ہو گا۔

## خواہش نفس کو روکنے کے تین درجات:

پہلا درجہ: یہ ہے کہ آدمی اچھے عقائد اختیار کرے اور برے عقائد سے  
بچے، نیک اعمال کرے اور کبھی کبھی گناہ ہو جائے۔

دوسرا درجہ: یہ ہے کہ عقائد بھی اچھے ہوں، اعمال بھی اچھے ہوں، گناہوں  
سے بچے اور ساتھ مشتبہات سے بھی بچے۔ مشتبہات کا معنی کہ ایسی چیز جس میں شک  
ہو کہ شاید یہ گناہ ہے یا شاید نیکی ہے تو اس کو چھوڑ دے۔

تیسرا درجہ: کہ آدمی کے عقائد بھی ٹھیک ہوں، اعمال بھی ٹھیک ہوں،



گناہوں سے بھی بچے، ذکر اللہ بھی کرے، مراقبہ بھی کرے اور اس کثرت کے ساتھ نفس کی اصلاح کرے کہ نفس گناہوں کا نام بھی نہ لے۔

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا آتَتْ مِنَ الذِّكْرِ ۖ إِنَّمَا تُغْنِي عَنْكَ الْسَّاعَةُ ۚ﴾

﴿إِنَّمَا آتَتْ مُنْذِرًا مِّنَ الْغَدِ ۖ إِنَّمَا تُغْنِي عَنْكَ الْسَّاعَةُ ۚ﴾

یہ پوچھتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی؟ میرے پیغمبر! قیامت کا حتمی علم تو اللہ کو ہے نا! تو اس کو بیان کرنے سے آپ کو کیا فائدہ؟ اس کا حقیقی علم تو ہم نے نہ آپ کو دیا ہے نہ کسی اور کو دیا تو اس کے تذکرے کا کیا فائدہ؟! اس کا حقیقی علم اللہ کو ہے؟ آپ صرف اس کو ڈرائیں جو ڈرنا چاہتا ہے۔

﴿كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحًى ۚ﴾

جب یہ قیامت کے دن اٹھیں گے تو ان کو محسوس ہو گا کہ ایک شام یا ایک صبح ہم دنیا میں رہے تھے، اور اس کو دنیا میں رہ کر سمجھنا بہت آسان ہے۔ جیسے آج دیکھو! کسی آدمی کی عمر پینتیس سال ہے، کسی کی چالیس سال ہے، پچاس سال ہے، آپ میں سے ہر بندہ اپنی عمر دیکھ لے تو یوں لگتا ہے کہ کل آئے تھے۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی اتنی عمر گزار کریں گے کہ جیسے کل آئے تھے، اتنی تھوڑی سی زندگی ہے۔

**اپنے علم پر عمل کیجیے!**

اس لیے ہمیں بھرپور خیال کر کے اپنی آخرت کی فکر اور تیاری کرنی چاہیے۔ یہ بات میں بارہا کہتا ہوں کہ قرآن کریم اس لیے نہیں ہوتا کہ ہم پڑھ رہے ہیں، سیکھ کر ہم درس دیں گے بلکہ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہم پڑھ رہے ہیں اور اس پر عمل کریں گے، درس کا موقع ملے نہ ملے.. پڑھانے کا موقع ملے نہ ملے.. اصل تو قرآن کریم پڑھا جاتا ہے عمل کرنے کے لیے۔

ہم سب اپنی کوتاہیاں دیکھ لیں۔ اگر کوتاہی ہے تو اصلاح کریں، اچھی حالت ہے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔ جتنا پڑھیں اس پر عمل کریں اور انسان کو قرآن کا فائدہ تب ہوتا ہے جب انسان قرآن کریم کا مخاطب خود کو سمجھے۔ اگر میں درس دے رہا ہوں کیوں کہ میں نے آپ کو سمجھانا ہے، آپ مطالعہ کریں گے کیوں کہ آپ نے آگے پڑھانا ہے، اپنی اصلاح کے لیے نہ میں مطالعہ کروں نہ آپ مطالعہ کریں تو ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟

بس جو پڑھو اس پر عمل کرو! ہم نے پڑھا کہ مسکین اور یتیم پر خرچ کرو، خدا کی راہ میں خرچ کرو تو کسی کو ایک کپ چائے پلا دو، دو روپے گلہ میں ڈال دو تو یہ عمل ہو گیا، اگر ہم نے نہیں کیا تو سوچو ہم نے کیوں نہیں کیا؟ اب دیکھنا! اس محاسبے سے آئندہ عمل کی توفیق کیسے ہوتی ہے۔

اگر ہم تہجد نہیں پڑھتے قرآن کی آیت پڑھی ہے تو اب تہجد شروع کرو کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ اللہ کا ذکر نہیں کرتے قرآن کی آیت پڑھی ہے تو اب ذکر اللہ شروع کر دو! دیکھنا آئندہ رغبت کتنی ہوتی ہے۔ بس میں کہتا ہوں کہ قرآن کریم پڑھتے جاؤ اور عمل کرتے جاؤ! پڑھتے جاؤ اور عمل کرتے جاؤ! پڑھتے جاؤ اور عمل کرتے جاؤ! پھر دیکھنا اس کا کتنا فائدہ ہوتا ہے؟! قرآن کریم عمل کی کتاب ہے یہ صرف مطالعہ کی کتاب نہیں ہے۔

اللہ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورۃ عَبَسَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿عَبَسَ وَتَوَلَّى ۖ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى ۚ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّى ۖ﴾

### سورت کا شان نزول:

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ مشرکین کے بڑے بڑے رؤساء کو دعوت دے کر توحید کا عقیدہ سمجھا رہے تھے جن میں ابو جہل، عتبہ بن ربیعہ، ابی بن خلف، امیہ بن خلف، شیبہ یہ بڑے بڑے لوگ تھے اور بعض روایات میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بھی نام ہے جنہوں نے ابھی تک کلمہ پڑھ کر اسلام قبول نہیں کیا تھا۔

گفتگو کے دوران حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اور انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کی کوئی آیت سمجھنا چاہی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ نہ دی۔ تو انہوں نے اصرار کیا، بار بار کہا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا یوں بار بار کہنا ناگوار گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے توجہ ہٹالی اور مشرکین مکہ کی طرف متوجہ رہے۔ جب مجلس سے اٹھ کر آپ تشریف لے گئے تو اٹھتے ہی آثارِ وحی نمودار ہوئے اور یہ سورت مبارکہ آپ پر نازل ہوئی۔

﴿عَبَسَ وَ تَوَلَّى ۖ اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی﴾... ناگوار گزرا ان کو اور انہوں نے توجہ نہ دی اس لیے کہ آنے والا ان کے پاس ایک نابینا شخص تھا۔ ﴿وَمَا يُدْرِیْكَ لَعَلَّہٗ یَزْكٰی﴾... اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ اچھی طرح مکمل سنور جاتا یا کسی خاص معاملے میں نصیحت حاصل کرتا ﴿اَوْ یَذْكُرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّکْرٰی﴾... یا یہ نصیحت اس کو نفع دیتی۔

تو یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بات سمجھائی ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ آپ کو عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔

### عام فہم ترجمہ کی ضرورت و اہمیت:

ایک تو ان الفاظ کے معانی اچھی طرح سمجھ لیں۔ ہمارے ہاں عموماً تفاسیر میں اس کا ترجمہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ ”جسین بجیں ہوا“ اب یہ ترجمہ آج کی اردو کے موافق نہیں ہے، اس لیے ہم معنی اچھی طرح سمجھ نہیں پاتے تو آگے سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ تو ”عَبَسَ“ کا معنی یہ کریں کہ آپ کو ناگوار گزرا۔

﴿وَتَوَلَّى﴾... اور آپ نے توجہ نہ دی۔ ایک تعبیر یہ ہے کہ ”اعراض کیا“ اور ایک ہے ”توجہ نہ دی“ دونوں میں فرق ہے۔ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایسے الفاظ استعمال کریں جو آپ کی شان کے موافق ہوں اور محاورہ اس مفہوم کا ساتھ دیتا ہو۔

### طالب دین کو مقدم رکھیں!

﴿اَمَّا مِّنْ اِسْتَعٰی ۖ فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدِّیْ ۖ وَمَا عَلَیْكَ اِلَّا یَزْكٰی﴾ وہ شخص جو دین کے معاملے میں لا پرواہی سے کام لیتا ہے آپ اس کی بہت فکر کرتے ہیں حالانکہ آپ کے ذمہ نہیں ہے کہ آپ اس کو سنوایں۔

﴿وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعَىٰ ۖ وَهُوَ يَخْشَىٰ ۖ فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ ۖ﴾

ہاں البتہ جو شخص آپ کے پاس طالب بن کر آتا ہے اور وہ اللہ سے ڈرتا بھی ہے آپ اس پر مکمل توجہ نہیں دیتے۔

اب ”یَسْعَىٰ“ کا معنی ہمیشہ ”دوڑنا“ نہیں ہوتا کہ آپ یہ ترجمہ کریں کہ ”آپ کے پاس آتا ہے دوڑتا ہوا“ عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ تو دوڑتے ہوئے نہیں آئے تھے۔ اصل میں یہاں یہ بات بتانی مقصود ہے کہ جو بہت توجہ دیتا ہے، طالب بن کر آتا ہے اور ڈرتا بھی ہے تو آپ اس کی فکر کم کرتے ہیں۔

﴿كَلَّا ۖ أَسْنَدَهُ أَيْسَهُ نَكَبِي ۖ﴾ ﴿إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۖ﴾ ﴿مَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ۖ﴾ ﴿يَهْدِي ۖ﴾

قرآن کریم نصیحت ہے لیکن اس شخص کے لیے جو اس سے نصیحت حاصل کرنا چاہے۔ اب دیکھیں! ترجمہ سے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کتنا فصیح و بلیغ ہے۔ اس لیے میں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ قرآن کریم کا ترجمہ کرتے ہوئے محاورات کا بہت خیال رکھا کریں۔

### آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد:

یہاں یہ بات سمجھیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اجتہاد فرمایا تھا۔ آپ کا اجتہاد یہ تھا کہ کفر ایک بہت بڑا جرم اور بیماری ہے اور اگر صحابی نے کوئی مسئلہ دریافت کرنا تھا تو یہ بعد میں بھی ہو سکتا تھا۔ پہلے بڑے جرم کا علاج کرنا چاہیے، کفر سے بندے کو بچانا چاہیے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر کی شدت کا خیال کرتے ہوئے کفار پر توجہ دی ہے اور صحابی پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد تھا اور اس اجتہاد میں خطا کیا ہوئی؟ یہ قرآن کریم کے لفظ بتا رہے ہیں:

﴿وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَكِّي﴾ ﴿١﴾ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرَى﴾ ﴿٢﴾

آنے والا شخص ایسا تھا کہ یا تو تزکیہ کر کے کامل سنور جاتا یا آنے والا شخص ایسا تھا کہ کسی خاص معاملے میں نصیحت حاصل کر لیتا، تو ﴿أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَى﴾ ﴿٣﴾ فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّى﴾ ﴿٤﴾ جو بے پرواہی کرتے ہوں ان کی آپ کو فکر ہے تو صحابی کا طالب بن کر مسئلہ پوچھنا اس بات کی دلیل تھی کہ اس کو یقیناً فائدہ ہوتا اور جو بات سنا نہیں چاہتے تھے آپ ان کو سناتے ہیں، تو وہاں یقین نہیں تھا، ہو سکتا ہے کہ فائدہ ہو، درجہ ظن ہے، موہوم چیز ہے۔ تو خطا کیا ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امر متیقن کو چھوڑ دیا امر موہوم کی وجہ سے، یہ خطا ہوئی۔ اللہ رب العزت نے اس اجتہاد پر تنبیہ فرمادی کہ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو لوگ اعتراض کرتے ہیں، اجتہاد تو پیغمبر کا ہو اس میں بھی خطا ہو جاتی ہے، فرق یہ ہے کہ غیر نبی کے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو وہ بسا اوقات اس پر قائم رہتا ہے چونکہ اس پر وحی نہیں آتی اور نبی کے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو نبی اس پر قائم نہیں رہتے چونکہ بعد میں وحی آ جاتی ہے۔ تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد تھا اور اجتہاد میں خطا تھی۔ اللہ رب العزت کی طرف سے وحی آ گئی کہ آپ کا یہ اجتہاد ٹھیک نہیں تھا، لہذا آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

”یُزَكِّي“ اور ”يَذَّكَّرُ“ دونوں میں فرق یہ ہے کہ تزکیہ یہ کامل اور آخری درجہ ہے یعنی نفع اکمل اور ”يَذَّكَّرُ“ یہ ابتدائی درجہ ہے کہ جب آدمی شروع میں آتا ہے تو قرآن کریم پڑھتا ہے، ذکر کرتا ہے، نصیحت حاصل کرتا ہے، گناہوں کو چھوڑتا ہے اور ”يُزَكِّي“ یہ کامل درجہ ہوتا ہے۔ تو دونوں درجے قرآن کریم نے بیان کیے ہیں بڑے اہتمام کے ساتھ۔

## اپنوں کا خیال پہلے رکھیں:

یہاں جو بات میں سنانا چاہتا ہوں تو اس کے لیے میں معارف القرآن مفتی محمد شفیع صاحب کی ساتھ لایا ہوں تاکہ حضرت کے لفظ نقل کروں اور اس سے آپ کو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ جو کام ہم نے دنیا میں شروع کیا ہے یہ کس حد تک ٹھیک ہے؟ میں نے آپ سے کئی بار کہا کہ میں کئی باتوں کو اصولِ شریعت کی روشنی میں لے کر چلتا ہوں اور میرے سامنے اس کی کوئی تحریر نہیں ہوتی اور جب ہمارے اس طرز اور اسلوب پر اکابر کی کوئی تحریر ملتی ہے تو پھر دل بہت خوش ہوتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے اس آیت کے تحت یہ لکھا ہے، میں لفظ پڑھ کے سنا تا ہوں:

اس موقع میں یہ تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو کام بیک وقت آگئے؛ ایک مسلمان کو تعلیم اور اس کی تکمیل اور دلجوئی، دوسرے غیر مسلموں کی ہدایت کے لیے ان کی طرف توجہ۔ قرآن کریم کے اس ارشاد نے یہ واضح کر دیا کہ پہلا کام دوسرے کام پر مقدم ہے، دوسرے کام کی وجہ سے پہلے کام میں تاخیر کرنا یا کوئی خلل ڈالنا درست نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اصلاح کی فکر غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کی فکر سے اہم اور مقدم ہے۔<sup>73</sup>

ہم پوری دنیا میں یہی کام کر رہے ہیں اور ہمارے اوپر یہی الزام ہوتا ہے کہ تمہیں کفر کی فکر نہیں ہے، تمہیں مسلمانوں کی فکر پڑی ہوئی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ ہم کہتے ہیں کہ بات کرو ختم نبوت پر کہ قادیانی کافر ہیں، اس پر کہ فلاں کافر ہے اور آپ لوگ کام کرتے ہو فقہ پر، حنفیت پر، اکابر پر، علماء پر... داخلی مسائل کو آپ نے اپنے

کام کی محنت کا میدان بنایا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ بھائی! ہم کسی پر بھی تنقید نہیں کرتے ان موضوعات پر جو کام کرتے ہیں وہ ہم سے بڑے ہیں، ہم ان کو اپنے آپ سے بڑا سمجھتے ہیں لیکن جو کام ہم کرتے ہیں، اکابر کی تحریرات پڑھو وہ کیا کہتے ہیں کہ مقدم کون لوگ ہیں؟ تبلیغی جماعت پوری دنیا میں کام کرتی ہے اور تبلیغ کے اصولوں میں سے ہے کہ کسی کافر کو اسلام کی دعوت نہیں دینی، آپ کو دیکھ کر کلمہ پڑھے اور مسلمان ہو جائے تو الگ بات ہے، دعوت آپ نے اپنوں کو دینی ہے، اپنے ٹھیک ہو جائیں گے تو پھر کافر بھی مسلمان ہو جائیں گے، فرق کیا ہے کہ تبلیغ کی دعوت کا اصول تھوڑا سا مختلف ہے اور ہمارا تھوڑا سا مختلف ہے اور کوئی وجہ نہیں! اور اس پر لوگوں کو اشکالات پیدا ہوتے ہیں لیکن جب آپ غور کریں گے تو یہ دونوں کام مختلف بھی نہیں ہیں، وہ فضائل کے ذریعے اعمال پھیلاتے ہیں اور ہم دلائل کے ذریعے اعمال کو پختہ کرتے ہیں، اب اس میں اشکال والی کون سی بات ہے؟

اس سے اگلی بات سمجھیں، حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں:

”اس میں ان علماء کے لیے ایک اہم ہدایت ہے جو غیر مسلموں کے شبہات کے ازالے اور ان کو اسلام سے مانوس کرنے کی خاطر بعض ایسے کام کر بیٹھتے ہیں جس سے عام مسلمانوں کے دلوں میں شکوک شبہات یا شکایات پیدا ہو جاتی ہیں، ان کو اس قرآنی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کی حفاظت اور اصلاحِ حال کو مقدم رکھنا چاہیے، اکبر مرحوم نے خوب فرمایا:

بے وفا سمجھیں تمہیں اہل حرم اس سے بچو

ذیٰر والے کج ادا کہہ دیں، یہ بدنامی بھلی<sup>74</sup>



غیر کہہ دیں کہ یہ بندہ ٹھیک نہیں یہ بدنامی لے لو، اس کی پروانہ کرو اور ہم اس سے پریشان ہوتے ہیں کہ غیر ہمیں اچھا نہیں سمجھتا، غیر ہمیں کیا کہے گا! چھوڑو غیر کو اپنوں کی فکر کرو!

اب مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ... مفتی دارالعلوم دیوبند... حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے دستِ راست کتنی کھل کے بات فرما رہے ہیں کہ ”اس میں ان علماء کے لیے ایک اہم ہدایت ہے...“ اور یہی رونا میں روتا ہوں آپ کفار کو دین کی طرف لاتے ہوئے ایسے کام نہ کرو کہ مسلمانوں کے لیے آئندہ مصیبت پیدا ہو جائے، مسلمان پھر یہ کہیں گے کہ یہ کام ٹھیک تھا، اگر ٹھیک نہ ہوتا تو فلاں حضرت کیوں کرتے! اس لیے یہ مسائل پیدا نہ کرو!

### اپنے کام پر شرح صدر:

یہ میں نے اس لیے دود لیلیں پڑھی ہیں تاکہ آپ کو اپنے کام پر شرح صدر ہو جائے۔ مجھے تو الحمد للہ شرح صدر ہے لیکن بسا اوقات عام بندے کا مزاج ہوتا ہے کہ یہ کس نے لکھا ہے؟ میں نے کہا: جو ہم کام کرتے ہیں آئندہ یہ الجھن نہیں ہوگی کہ یہ کس نے لکھا ہے؟! لوگ خود بتائیں گے کہ جی فلاں نے لکھا ہے! اس کی ہر گز پروانہ کریں کہ آپ کے ساتھ دو ہیں یادس ہیں، مسلسل کام کریں، اعتدال کے ساتھ کام کریں، اللہ رب العزت آئندہ نسلوں میں اس آواز کو عام فرمادیں گے۔

### رہِ اعتدال پر گامزن رہیں!

میں بارہا کہہ رہا ہوں کہ دیکھو! ہم توڑ نہیں رہے اور اس موقع پر پھر اعتدال کا پہلو ذہن میں رکھیں! ہمارے ہاں الجھنیں یہ ہیں کہ بعض فتنے ہیں چھوٹے یا بڑے، ہمارے اکابر ان فتنوں کو کسی کام کے لیے ساتھ ملا لیتے ہیں تو دوسرے لوگ جو چھوٹے ہیں ان میں دو طبقہ بن جاتے ہیں: ایک طبقہ کہتا ہے کہ یہ فتنے ٹھیک ہیں، کیوں کہ اگر یہ

غلط ہوتے تو ہمارے اکابر ان کو ساتھ کیوں ملاتے؟! دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ اکابر غلط ہیں کیوں کہ انہوں نے فتنوں کو ساتھ ملا کر مضبوط کیا ہے۔

کوئی فتنوں کو ٹھیک کہہ دیتا ہے اور کوئی اکابر کو غلط کہہ دیتا ہے اور آپ دیکھیں کہ ہم کتنے راہ اعتدال پر ہیں کہ فتنوں کو فتنہ سمجھتے ہیں اور بڑوں کو بڑا سمجھتے ہیں، اپنوں کو اپنا سمجھتے ہیں اور غیر کو غیر سمجھتے ہیں۔ پھر لوگ ہمیں کہتے ہیں کہ آپ پھر ان کو ساتھ کیوں نہیں ملاتے؟ میں نے کہا کہ بھائی! ہم چھوٹے ہیں، ان فتنوں سے کام نہیں لے سکتے، ہمارے بڑے وہ بڑے ہیں ان فتنوں سے کام لے سکتے ہیں۔

اس کی مثال ایسے سمجھو کہ جیسے مدرسہ کے مہتمم صاحب کسی طالب علم کو بھیجیں کہ فلاں بھنگی عیسائی کو بلا کر لاؤ، میں ذرا سبق پڑھا رہا ہوں، اس کو دفتر میں بٹھا کر چائے پلاؤ! اب باقی طلبہ کو الجھن ہوتی ہے کہ استاذ جی عیسائی کی کتنی قدر کرتے ہیں، ہمیں آج تک چائے کا کپ نہیں پلایا لیکن بھنگی کو دفتر میں بٹھا کر چائے پلا رہے ہیں! جب تھوڑی دیر میں استاد سبق سے فارغ ہوتے ہیں تو بھنگی سے کہتے ہیں کہ یہاں طلبہ بہت ہیں، ہمارا نکاسی کا نظام ذرا کمزور ہے، ذرا گٹر صاف کر دو! پھر طالب علموں کو بات سمجھ آتی ہے کہ اس کو چائے کیوں پلائی ہے۔

مہتمم صاحب آپ کو چائے پلاتے اور کہتے کہ گٹر کو صاف کر دو! تو آپ نے کہنا تھا کہ کسی بھنگی کو بلا لیں۔ اب بھنگی کو بلا لیں اور پہلے چائے پلائیں ابھی گٹر صاف کرنے کا کہا نہیں تو آپ کو اشکالات شروع ہو گئے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم بھنگی کو بھنگی سمجھتے ہیں اور مہتمم صاحب کو مہتمم صاحب سمجھتے ہیں، اس بھنگی کو چائے پلانے کی وجہ سے مہتمم صاحب کو بھنگی کے ساتھ نہیں ملاتے اور چائے پینے کی وجہ سے ہم بھنگی کو مہتمم صاحب کے ساتھ نہیں ملاتے۔ بھنگی؛ بھنگی رہے گا اور مہتمم صاحب؛ مہتمم صاحب رہیں گے۔

اسی طرح ہمارے بڑے حضرات اگر کسی بڑے کام کے لیے کسی فتنے کو ساتھ ملائیں گے تو نہ ہم فتنوں کو صحیح کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی ہم اکابر کو فتنہ کہہ سکتے ہیں، میں تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ تم بتاؤ اس سے زیادہ اعتدال کا کوئی راستہ ہو سکتا ہے اور پھر بھی بدنام ہم ہوتے ہیں کہ مولانا گھسن صاحب بہت سخت ہیں! عجیب بات ہے۔

بتاؤ اس سے زیادہ اعتدال کیا ہو سکتا ہے! میں اس لیے کہتا ہوں کہ جو ہمارے قریب نہیں بلکہ دور ہیں ان کو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ جب ہمارے ساتھ رہتے ہیں تو یہ شبہات ختم ہو جاتے ہیں۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

### موت؛ مؤمن کا تحفہ

﴿ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ﴾

پھر انسان کو موت دی اور اسے قبر میں پہنچا دیا۔

یہاں پر اللہ رب العزت نے موت کو مقامِ نعمت میں بیان کیا ہے کہ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ حدیث پاک میں ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ؛ الْمَوْتُ.<sup>75</sup>

کہ مؤمن کا تحفہ موت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ ایک جنازہ گزرا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مُسْتَوِيحٌ أَوْ مُسْتَرَاخٌ مِنْهُ“ یہ مستراح ہے یا مستراح منہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! مستراح یا مستراح منہ کا

کیا معنی ہے؟ فرمایا کہ یہ مرنے والا یا تو لوگوں کے شر سے بچ گیا ہے یا لوگ اس کے شر سے بچ گئے ہیں۔<sup>76</sup>

موت مؤمن کے لیے تحفہ ہے۔ مؤمن جیسا بھی ہو وقتی طور پر طبعی تقاضے کی وجہ سے موت سے گھبراتا ہے لیکن درحقیقت ہر مؤمن موت سے پیار کرتا ہے کیوں کہ دنیا میں محبوب ترین چیز مؤمن کی اللہ ہے اور اللہ ملے گا موت کے بعد، دنیا میں ملتا ہے لیکن پتا نہیں چلتا اور وہاں ملے گا ایسے کہ محسوس بھی ہو گا۔ اس لیے حیان بن اسود کہتے ہیں:

الْمَوْتُ جَسَدٌ يُوصَلُ الْحَبِيبَ إِلَى الْحَبِيبِ.<sup>77</sup>

موت وہ پل ہے جو یار کو یار سے ملاتا ہے۔

کون شخص ہے جو موت سے پیار نہ کرتا ہو، موت سے ہر مؤمن پیار کرتا ہے۔ موت سے ڈریں بھی مت اور مانگیں بھی مت، موت کی تیاری کریں۔ بس اللہ برکت والی عمر عطا فرمائے، تھوڑی عمر میں اللہ زیادہ کام لے لے۔ آمین

اللہ نے موت کو مقامِ نعمت میں بیان کیا ہے۔ یہ موت ایسی چیز ہے جو انسان کی تمام مصیبتوں سے جان چھڑا دیتی ہے، انسان راحت کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

﴿فَأَقْبِرَ﴾... قبر کو بھی اللہ نے مقامِ نعمت کے طور پر بیان کیا ہے کہ ہم

تمہیں قبر دیتے ہیں۔

ایک بندہ فوت ہوتا ہے۔ اس کو غسل دو، خوشبو لگاؤ، پھر اس کو سفید رنگ کا کفن دو، پھر اکٹھے ہو کر نمازِ جنازہ کی صورت میں اس کے لیے مغفرت کی دعائیں مانگو،

76۔ شعب الایمان للبیہقی: ج 7 ص 8 رقم الحدیث 9264

77۔ التذکرۃ للقرطبی: ص 13 باب النہی عن تمنی الموت

پھر عزت و احترام کے ساتھ اس کو قبر میں دفن کرو۔ موت کے بعد بھی اللہ نے انسان کو کتنی شرافت اور کتنی عزت دی ہے۔ قبر بھی مقامِ نعمت پر ہے اور موت بھی مقامِ نعمت پر ہے۔

### ثواب و عذاب قبر برحق ہے:

ہم اہل السنۃ والجماعۃ قبر کے ثواب اور عذاب کے قائل ہیں۔ ثواب کا معنی کہ جو نیک اعمال کیے تھے ان کا اچھا بدلہ ملے اور عذاب کا معنی کہ جو برے کام کیے تھے ان کا برا بدلہ ملے، اور ہم قائل ہیں کہ قبر میں ثواب یا عذاب اصالتاً بلا واسطہ براہِ راست روح کو ہوتا ہے، طبعاً و ضمناً بلا واسطہ جسم کو ہوتا ہے، موت کے بعد احوال براہِ راست روح پر آتے ہیں، روح کے واسطہ سے جسم پر آتے ہیں جیسے دنیا میں احوال براہِ راست جسم پر اور جسم کے واسطہ سے روح پر آتے ہیں۔

### قبر کے متعلق بعض اشکالات کے جوابات:

اور یہ جو لوگ اس پر اشکال کرتے ہیں کہ جسم تو ہوتا نہیں ہے تو احوال آتے کیسے ہیں؟ جانور نے جسم کو کھالیا اور پاخانے کے راستہ سے باہر نکال دیا، اب کس کو عذاب و ثواب ہو گا؟ کسی میت کو جلایا اور راکھ کو ہوا میں اڑایا، پانی میں بہایا تو عذاب و ثواب کس کو ہو گا؟ اگر کوئی شخص پانی میں گر گیا اور مر گیا اس کے جسم کے اعضا پانی میں تحلیل ہو گئے تو اب ثواب و عذاب کس کو ہو گا؟

لوگوں نے یہ سارے شبہات پیدا کیے یہ بتانے کے لیے کہ جسم کو قبر میں ثواب اور عذاب نہیں ہوتا اور قبر یہ نہیں ہے جو زمین والی ہے، قبر وہ ہے جو علیین یا سچین ہے کیوں کہ اس کو تو قبر ملی نہیں ہے، دفن ہوا نہیں تو پھر اس کو ثواب و عذاب کیسے ہو گا؟

جواب یہ ہے کہ ہمارا مخالف قبر کا معنی نہیں سمجھتا اس لیے اشکال کرتا ہے

اور ہمیں قبر کا معنی نہیں آتا تو ہم جواب نہیں دے سکتے، وہ بھی سمجھ جاتا اور ہم بھی سمجھ جاتے تو کم از کم دیانت والی لڑائی ختم ہو جاتی اور ضد والی لڑائی کا کوئی علاج نہیں ہے۔ قبر کی تعریف سمجھیں کہ میت اور میت کے اجزاء کے مقرر کا نام قبر ہے، تو دنیا میں کون سا ایسا شخص ہے کہ جس کو قبر نصیب نہیں ہوتی؟

اگر اس کو جانور نے کھایا اور پھر پاخانے کے راستے سے باہر نکال دیا گیا تو اس کے اجزاء کسی جگہ تو ہوں گے، وہی اس کی قبر ہے۔ اگر جلایا اور اس کی راکھ کو ہوا میں بکھیر دیا یا پانی میں بہا دیا تو وہ ذرے پانی کے ساتھ مل کر کہیں تو جائیں گے نا؟ جہاں جائیں گے وہی قبر ہے۔ ایک آدمی پانی میں گر کر مر گیا، اجزاء پانی میں تحلیل ہو گئے تو تحلیل ہو کر کہیں تو گئے ہیں نا؟ جہاں جائیں گے وہی قبر ہے۔

اب میت صحیح سالم ہو اس کے ساتھ روح کا تعلق قائم اللہ نے کرنا ہے اور اگر میت ایک جگہ سالم نہ ہو بلکہ منتشر ہو تو اس کے ساتھ بھی روح کا تعلق قائم اللہ نے کرنا ہے، تو اللہ کی قدرت پر تمہیں کیا اشکال ہے؟ یہ صرف ان لوگوں کی ڈھکوسلہ بازی ہے ورنہ وہ شخص جو قبر میں ہے تین دن کے بعد اس کی لاش پھٹتی ہے اور چند دن کے بعد سارا جسم مٹی میں ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے تو پھر یہ تین سوال کرنے کی ضرورت کیا پڑی ہے؟ پھر تو سب ایک جیسے ہیں، پھر ثواب و عذاب کس کو ہو گا؟

اس لیے ہم نے کہا کہ روح کو ہو گا لیکن روح اور جسم کا تعلق کتنا ہونا چاہیے قَدْ مَا يَتَلَذُّ وَيَتَأَلَّمُ.. اتنا تعلق کافی ہے کہ جس سے جسم ثواب اور عذاب کو محسوس کرے، اتنا تعلق نہیں ہے کہ جیسے دنیا میں ہے کہ دوڑتا پھرے۔

### برزخ کی تعریف اور اعتراضات کے جوابات:

اسی قبر کو برزخ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ برزخ میں ثواب اور عذاب ہوتا ہے۔ تو لوگ کہتے ہیں کہ برزخ تو اور جہان ہے یہ جہان ہی نہیں ہے تو فرعون تو اس دنیا میں

ہے، وہ پھر برزخ میں کیسے ہوا؟ پھر اس کو تو برزخ کا عذاب نہیں ہو رہا۔ میں یہاں پر بھی وہی بات کہتا ہوں کہ معترض کو برزخ کا معنی نہیں آیا تو وہ اعتراض کرتا ہے اور ہمیں برزخ کا معنی نہیں آیا تو جواب نہیں دے سکتے۔

برزخ کسے کہتے ہیں؟ سچین ایک مقام ہے جو سات زمینوں سے نیچے ہے، علیین ایک مکان ہے جو آسمان سے اوپر ہے، سچین سے لے کر علیین تک سارے مکان اور موت سے لے کر حشر تک یہ سارا زمانہ۔۔ جب یہ جمع ہو جاتے ہیں تو اس کو برزخ کہتے ہیں۔ تو برزخ؛ ظرفِ زمان اور ظرفِ مکان دونوں کے مجموعے کا نام ہے، سچین سے علیین تک ظرفِ مکان اور موت سے لے کر حشر تک ظرفِ زمان جب جمع ہوتے ہیں تو پھر برزخ بنتا ہے۔ کبھی اعتراض کرتے ہیں: جی فرعون بھی اسی زمین پر ہے اور ہم بھی اسی زمین پر ہیں، فرعون برزخ میں ہے ہم برزخ میں کیوں نہیں ہیں؟ اسی طرح اگر کسی شخص کو قبر میں دفن نہ کریں بلکہ زمین کے اوپر رکھ دیں تو وہ تو برزخ میں ہو گا اور ہم برزخ میں کیوں نہیں ہیں؟

میں نے کہا ہم زمین پر رہتے ہیں، سچین سے علیین تک ہمیں مکان ملا ہے لیکن صرف مکان کا نام برزخ نہیں ہے بلکہ موت سے لے کر حشر تک جب زمان بھی ملے گا تو پھر برزخ بن جائے گا۔ فرعون کو دونوں چیزیں ملی ہیں، ظرفِ زمان بھی اور ظرفِ مکان بھی اور ہمیں ظرفِ مکان تو ملا ہے لیکن ظرفِ زمان نہیں ملا، اسی وجہ ہم برزخ میں نہیں ہیں، وہ برزخ میں ہے۔

اب دیکھو! برزخ کو سمجھنا کتنا آسان ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بہت مشکل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مشکل ہو گا آپ کے لیے اللہ نے ہم پر آسان کیا ہے، تم نہیں سمجھا سکتے تو پھر ہماری درس گاہ کا رخ کرو اور ہماری اردو بھی اتنی عجیب ہے کہ مجھے دور دور سے لوگوں کے میسج آتے ہیں کہ مولانا صاحب! آپ کی اردو اتنی عجیب ہے کہ

مشکل سے مشکل عقیدہ بھی خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے۔ یہ اللہ کا نظام ہے۔ جب بھی کسی چیز کا فقدان ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ افراد پیدا فرما دیتے ہیں، اس فرد سے کام لیتے ہیں، جب کام پورا ہو جائے تو اس فرد نے دنیا سے جانا ہوتا ہے اور وہ چلا جاتا ہے، حجت تام ہو جاتی ہے۔ اب لوگ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بات ہمیں کسی نے سمجھائی نہیں۔

### کامیابی کا راز: محنت اور تقویٰ

اور اب اگلی بات سمجھنا! یہ برزخ اور مابعد الموت کے مسائل، علوم سے نہیں آتے، یہ اس وقت آتے ہیں جب آدمی صاحبِ حال ہو، صرف صاحبِ قال ہو تو یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جو قول سے سمجھ آتی ہیں اور بعض چیزیں ایسی ہیں جو قول سے نہیں بلکہ ذوق اور وجدان سے سمجھ میں آتی ہیں اور یہ وجدان اور ذوق کی نعمت اللہ دیتے ہیں تقویٰ کی برکت سے اور محنت کی برکت سے۔ صرف تقویٰ ہو تو بھی وجدان ٹھیک نہیں ہوتا اور صرف محنت ہو تب بھی ٹھیک نہیں ہوتا، محنت اور تقویٰ دو چیزیں مل جائیں تو اللہ پاک ذوق عطا فرماتے ہیں، پھر اللہ اس چیز کو بندے کا حال بنا دیتے ہیں اور جب کسی پر حال طاری ہو جائے تو اس کو سمجھانا بہت آسان ہوتا ہے اور ایسا حال ہوتا ہے کہ بسا اوقات بندہ اس حال میں مغلوب ہو جاتا ہے۔ مجھ سے ایک ساتھی نے پوچھا کہ ہم جو مشائخ کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے مغلوب الحال ہو کر بات کی ہے اس لیے ان کی بات کا اعتبار نہیں ہے تو کیا نبی بھی مغلوب الحال ہوتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں کبھی نبی بھی مغلوب الحال ہوتا ہے کبھی ایسا حال ہوتا ہے کہ پیغمبر کی ظاہری بات بظاہر شریعت کے خلاف نظر آرہی ہوتی ہے حالانکہ وہ بات ٹھیک ہوتی ہے۔ دیکھو! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر میں گئے، تین سو تیرہ صحابہ کرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اِنْ تُهْلِكَ هٰذِهِ الْعَصَابَةَ مِنْ اَهْلِ الْاِسْلَامِ لَا تُعْبِدْ فِي الْاَرْضِ



اے اللہ! اگر یہ تین سوتیرہ شہید ہو گئے تو قیامت تک آپ کی عبادت کوئی نہیں کرے گا۔

ایسے ہو سکتا ہے؟ اللہ کی عبادت تین سوتیرہ پر موقوف ہے؟ یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم مغلوب الحال ہو کر فرما رہے ہیں کہ اللہ! میں پوری جمع پونجی لے کر آ گیا ہوں، میں آخری نبی ہوں۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اعتبار سے بات فرما رہے ہیں۔ اس لیے اگر مشائخ سے کوئی بات مغلوب الحال ہو کر نکل جائے تو الجھن کا شکار کبھی نہ ہوا کرو، مشائخ کو چھوڑو مت! ہاں جو بات سمجھ نہیں آتی تو اسے سمجھو، ایک نہیں سمجھا سکتا تو دوسرے سے سمجھو۔

کبھی لوگ فون کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ فون نہیں سفر کرو، جی! بہت دور ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر نہ سمجھو، عبارات کو اتنا سمجھنے کی ضرورت کیا پڑی ہے؟ اور اگر ضرورت ہے تو آ جاؤ! ہم تمہیں سمجھاتے ہیں لیکن تھوڑا سا وقت نکالو۔

اللہ ہم سب کو یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة التکویر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ۝۲ وَإِذَا الْجِبَالُ

سُيِّرَتْ ۝۳﴾

**نسخہ اولیٰ کے بعد کے احوال:**

قیامت میں ایک نسخہ اولیٰ ہو گا اور ایک نسخہ ثانیہ ہو گا۔ نسخہ اولیٰ کا معنی کہ صور پہلی بار پھونکا جائے گا اور نسخہ ثانیہ کہ پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا۔ قیامت کے بعض احوال وہ ہیں کہ جن کا تعلق نسخہ اولیٰ کے ساتھ ہے اور بعض وہ ہیں کہ جن کا تعلق نسخہ ثانیہ کے ساتھ ہے۔ اب یہ جو پہلے چھ احوال ہیں یہ نسخہ اولیٰ کے حوالے سے ہیں۔

﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱﴾

اس کا ایک ترجمہ یہ ہے کہ جب سورج بے نور ہو جائے گا۔ دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ جب سورج کو توڑ دیا جائے گا۔ ”تکویر“ کے دونوں معانی ٹھیک ہیں اور دونوں کی تائید احادیث سے ہوتی ہے۔ دونوں میں تطبیق بھی ممکن ہے کہ پہلے سورج کی روشنی ختم کر دی جائے گی، پھر اس کو سمندر میں گرادیا جائے گا کیونکہ روایات میں ہے کہ شمس و قمر کو سمندر میں پھینک دیا جائے گا، پھر وہاں تیز آندھی چلے گی جس سے پورا

سمندر بھڑک اٹھے گا اور اس سے ایک طوفان برپا ہو گا۔

﴿وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ۖ﴾

اور جب ستارے ٹوٹ کر گر پڑیں گے۔

﴿وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۖ﴾

جب پہاڑوں کو چلا دیا جائے گا۔ پہاڑ اڑیں گے روئی کی طرح۔

﴿وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۖ﴾

اور جب دس ماہ کی گا بھن اونٹنی آزاد پھرے گی، کوئی بھی اس کو پکڑنے والا نہیں ہو گا۔ عربوں کے ہاں دس ماہ کی گا بھن اونٹنی بہت قیمتی شمار ہوتی ہے۔ تو جب نفخہ اولیٰ ہو گا تو یہ آزاد پھرے گی، کوئی بھی اس کا خیال کرنے والا نہیں ہو گا۔

﴿وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ۖ﴾

اور جب جنگلی اور وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے۔ عام طور پر سارے جانور اکٹھے نہیں ہوتے، ہاتھیوں کے ریوڑ الگ ہوتے ہیں، گیدڑ الگ ہوتے ہیں، شیر الگ رہتے ہیں لیکن نفخہ اولیٰ کا منظر ایسے ہو گا کہ سارے کس ہوں گے، اکٹھے پھریں گے۔

﴿وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۖ﴾

اور جب دریاؤں کو بھڑکا دیا جائے گا۔

**نفخہ ثانیہ کے بعد کے احوال:**

﴿وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ۖ﴾

یہاں سے آگے چھ احوال وہ ہیں جن کا تعلق نفخہ ثانیہ کے ساتھ ہو گا۔ فرمایا: جب ہر قسم کے لوگوں کے جوڑے بنا دیے جائیں گے، کافروں کا جوڑا الگ ہو گا مسلمانوں کا الگ ہو گا، گروہ اور ٹولیاں بنیں گی، پھر صلحا الگ ہوں گے، فساق الگ ہوں

گے، پھر فساق میں بھی خاص گناہ کرنے والے الگ ہوں گے، زانی الگ ہوں گے، چور الگ ہوں گے، ڈکیت الگ ہوں گے۔

یعنی جرائم کرنے والے تو ہوں گے لیکن بعض لوگ خاص گناہ کرتے ہیں جیسے ڈکیتی کرتے ہیں، پھر شراب بھی پیتے ہیں، پھر زنا بھی کرتے ہیں اور عیاشی بھی کرتے ہیں۔ اب یہ شراب اور زنا گناہ ہیں لیکن اصل اس کا جرم کون سا ہے؟ ڈکیتیاں کرنا، اور جب ڈکیتی چھوڑ دیں تو زنا شراب بھی ختم ہو جائے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ڈکیت ہے حالانکہ جرم اور بھی ہوتے ہیں، پھر جو اس طرح خاص جرم کرنے والے ہوں گے وہ لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔ اسی طرح صلحاء ہیں، عالم نماز بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، حج بھی کرتے ہیں لیکن یہ کون ہیں؟ علماء۔ اب یہ علماء اکٹھے ہو جائیں گے۔ یہ مطلب ہے اس کا۔

**زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے سوال:**

﴿وَإِذَا الْمَوْءَدَةُ سُئِلَتْ﴾

اور جس بچی کو زندہ درگور کرتے تھے اس سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔

﴿بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾

کہ کس جرم کی وجہ سے اس کو قتل کیا گیا ہے۔ یہ پوچھا کس سے جائے گا؟ خود اس بچی سے پوچھا جائے گا کہ تجھے کیوں قتل کیا تھا؟ یہ اس لیے کہ اس بچی کی طرف سے قیامت کے دن دعویٰ کرنے والا کوئی نہیں ہو گا تو اللہ اسی سے پوچھیں گے کہ تو بتا تجھے کیوں قتل کیا گیا تھا؟ کوئی اور تو اس کا مقدمہ لڑنے والا نہیں ہو گا، تو وہ بتائے گی کہ اللہ! میرا کوئی جرم نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں لڑکی تھی اور یا اس بچی کے بارے میں ان درندوں سے پوچھیں گے جو زندہ درگور کرتے تھے کہ تم نے یہ جرم کیوں کیا

تھا؟

قیامت کے دن ہر جرم کے بارے میں پوچھا جائے گا لیکن بطورِ خاص اس بچی کا ذکر اس لیے کیا کہ اس کی طرف سے قیامت کے دن کوئی دعوے دار نہیں ہو گا تو اللہ اس کے خود دعوے دار بن کر پوچھیں گے۔

﴿وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۖ﴾

عمال نامے پھیلا دیے جائیں گے، ہر آدمی اپنے اعمال نامے کو دیکھے گا۔

﴿وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ۖ﴾

آسمان کھول دیے جائیں گے۔ کھول دینے کا معنی یہ ہے کہ نیچے سے دیکھیں گے تو آسمان کے اوپر کی جو چیزیں ہیں وہ بھی نظر آئیں گی۔

﴿وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِرَتْ ۖ﴾

اور جب جہنم کو مزید بھڑکا دیا جائے گا۔

﴿وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ۖ﴾

اور جنت کو متقین کے قریب کر دیا جائے گا۔

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ ۖ﴾

جس شخص نے جو اعمال کیے ہیں آج اس کے سامنے ہوں گے، وہ اپنے اعمال کو جان لے گا۔ یہاں تک کے چھ احوالِ نَفْثِ ثانیہ کے بعد ہوں گے۔

**پانچ ستاروں کی قسمیں:**

﴿فَلَا أَقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۖ﴾

اللہ رب العزت نفثِ اولیٰ اور نفثِ ثانیہ کو بیان کرنے کے بعد اب قسمیں کھا کر یہ بات سمجھا رہے ہیں کہ قیامت نے بھی آنا ہے اور قرآن بھی سچا ہے، میرا پیغمبر بھی سچا ہے، لہذا تم اس کو مان لو۔ فرمایا: قسم ہے ان ستاروں کی جو چھپ جاتے ہیں۔ میں پہلے

بھی عرض کر چکا ہوں کہ ”اُقْسِمُ“ پر ”لا“ داخل کیا جاتا ہے مخاطب کے نظریے کی تردید کرنے کے لیے کہ جو تمہارا خیال ہے کہ قرآن ٹھیک نہیں ہے، تمہارا جو خیال ہے کہ پیغمبر - معاذ اللہ - مجنون ہے ایسی بات نہیں ہے، ”اُقْسِمُ“ میں قسم کھا کر یہ بات کہہ رہا ہوں: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾

﴿فَلَا أَقْسِمُ بِالْحُكْمِ﴾ ﴿الْجَوَارِ الْكُنَّسِ﴾

ستاروں میں سے پانچ ستارے ایسے ہیں جو پہلے آگے چلتے ہیں، پھر اٹھتے ہوتے ہیں اور پھر وہ عالم ملکوت میں جا کر چھپ جاتے ہیں، ورنہ عام طور پر ستارے آگے جا کر پیچھے نہیں ہوتے یا کھڑے رہتے ہیں یا وہ اپنے مدار میں چلتے رہتے ہیں۔ وہ پانچ ستارے زحل، مشتری، عطارد، مریخ اور زہرا ہیں اور ان پانچوں کو فلسفہ میں ”نجوم متخیرہ“ کہتے ہیں۔ یہ حیران کن قسم کے ستارے ہیں۔ اللہ نے ان کی قسم کھائی ہے کہ قسم ہے ان ستاروں کی جو چھپ جاتے ہیں اور جب آگے ہو کر پیچھے ہوتے ہیں تو پھر چلتے رہتے ہیں۔ ”الْحُكْمِ“ کا معنی پیچھے ہٹ جانے والے، ”الْجَوَارِ“ کا معنی سیدھے چلنے والے اور ”الْكُنَّسِ“ کا معنی چھپ جانے والے۔

﴿وَالْيَلِ إِذَا عَسَّسَ﴾

قسم ہے رات کی جب وہ چلی جاتی ہے۔

﴿وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ﴾

اور قسم ہے صبح کی جب وہ آ جاتی ہے۔

**جبرئیل امین کی صفات:**

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾ ﴿ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ﴾

یہ جواب قسم ہے۔ یعنی یہ جو قرآن کریم ہے یہ اللہ کا کلام ہے، اس کو لانے

والا کریم ہے، عزت والا ہے، طاقت والا ہے۔ طاقت کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ اس کے چھ سو پر ہیں۔ یہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام ہیں۔ اور عرش کے مالک؛ اللہ کے ہاں ان کا بڑا مرتبہ ہے۔

بطور خاص عرش کی بات کیوں کی ہے۔ آپ ”القواعد فی العقائد“ میں ایک سوال جواب پڑھ چکے ہیں، سوال یہ تھا کہ اللہ رب العزت ﴿ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ﴾ کا تذکرہ کیوں کرتے ہیں کہ اللہ اپنے عرش پر مستوی ہوئے۔ وہاں ہم نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہم استواء علی العرش کا معنی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش کے مالک ہیں، اللہ تعالیٰ کی عرش پر حکومت ہے۔ ہم اس کا معنی یہ کرتے ہیں۔ مخلوقات میں سب سے بڑی مخلوق عرش ہے، اس لیے اللہ رب العزت عرش کا بطور خاص ذکر فرماتے ہیں۔ یہاں ﴿ذِي الْعَرْشِ﴾ فرمایا کہ اللہ تو وہ ہے جو عرش کا مالک ہے۔ تو جب عرش کے مالک ہیں تو باقی چیزیں سب کی سب خود بخود ان کی ملک میں آئیں گی۔ اس لیے یہاں پر اللہ تعالیٰ نے بطور خاص عرش کا ذکر فرمایا ہے۔

﴿مُطَاعٍ ثُمَّ آمِينَ﴾

مطاع ہے یعنی اس کی بات فرشتے بھی مانتے ہیں، امانت دار بھی ہے خیانت کبھی نہیں کرتا۔

﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ﴾

اور جس کے پاس قرآن آیا ہے جو تمہارے ساتھی ہیں۔ العیاذ باللہ۔ ان میں جنون نہیں ہے۔

﴿وَلَقَدْ رَاَهُ بِالدُّفُقِ الْمُبِينِ﴾

اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل کو افق؛ اوپر والا جو

واضح کنارہ ہے وہاں ان کو دیکھا ہے۔

﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾

اور خود پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت یہ ہے کہ یہ غیب کی بات بتانے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ کاہن کے پاس غیب کی خبریں نہیں ہوتیں لیکن جو جھوٹی خبریں غیب کی بنا کر وہ بتاتے ہیں وہ بھی مفت میں نہیں بتاتے بلکہ پیسے لے کر بتاتے ہیں، خبریں چھپا کر رکھتے ہیں جبکہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم چھپا کر نہیں رکھتے بلکہ جو خبر آتی ہے بتا دیتے ہیں۔

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ﴾

اور یہ قرآن کریم شیطان مردود کاہنوں والی بات نہیں ہے بلکہ پیغمبر والی بات ہے۔

**قسم اور مقسم بہ میں مناسبت:**

اب یہاں دیکھو! جو قسمیں کھائی ہیں: ﴿فَلَا أَقْسِمُ بِالْخُنَّسِ﴾ الجَوَادِ الْكُنَّسِ ﴿﴾ کہ قسم ہے ستاروں کی جو آگے جاتے ہیں، پھر پیچھے آتے ہیں، پھر چلتے رہتے ہیں پھر عالم ملکوت میں چھپ جاتے ہیں۔ اس کے مناسب آگے کیا ہے؟ فرمایا: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾ ﴿﴾ جبرائیل امین علیہ السلام آتے ہیں، پھر واپس چلے جاتے ہیں کسی کو نظر نہیں آتے۔ تو حضرت جبرائیل امین کی حالت کے موافق یہ قسم کھائی۔

یہ جو قسم کھائی ہے ﴿وَالتَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ﴾ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ﴿﴾ یہ قرآن کریم اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار سے ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے ہیں تو ظلمتیں چھٹ گئی ہیں اور صبح ہو گئی ہے۔ تو ان



دونوں کی مناسبت سے اللہ نے دونوں طرح کی قسمیں کھائی ہیں۔ ایک قسم ایسی ہے کہ جو جبرائیل علیہ السلام کے مناسب ہے اور ایک قسم وہ ہے کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مناسب ہے۔

﴿فَإِنَّ تَذْهَبُونَ ۖ إِنَّ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ﴾ ۚ لِمَنْ شَاءَ

مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ ﴿۲۸﴾

اس قرآن کو چھوڑ کر تم کہاں دوڑتے ہو؟! یہ قرآن کریم نصیحت ہے بالعموم سارے جہان کے لیے اور بالخصوص اس شخص کے لیے جو سیدھے راستے پر چلنا چاہتا ہو۔ یہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بیان القرآن کا ترجمہ ہے۔

### ہدایت کی دو قسمیں:

ہم کہتے ہیں کہ ہدایت کے دو طریقے ہیں:

1: اراءۃ الطريق.. سیدھا راستہ دکھا دینا

2: ایصال الی المطلوب.. سیدھے راستے پر چلا دینا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ذکر بالعموم نصیحت ہے جہان والوں کے لیے اور بالخصوص ان لوگوں کے لیے جو تم میں سے سیدھے راستے پر چلنا چاہتے ہوں۔ بالعموم عوام الناس کے لیے یہ قرآن نصیحت ہے اراءۃ الطريق کے طور پر کہ ان کو راستہ دکھا دیتا ہے اور خواص کے لیے یہ نصیحت ہے کہ ان کو منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی تعبیرات ہیں۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ بیان القرآن پڑھا کرو، لطف لو بیان القرآن پڑھ کر، حضرت نے کمال کر دیا ہے لغات الگ حل کی ہیں، صرف ونحو کو الگ حل کیا ہے، تصوف کو الگ چھیڑا ہے، عقائد کی بات کرتے ہیں، پھر مسائل سلوک لاتے ہیں، پھر بین القوسین میں سارے شبہات کو رد فرمادیتے ہیں۔ حضرت نے یہ عوام کے لیے لکھا

ہے اور آپ یقین فرمائیے کہ جب حضرت یہ فرماتے ہیں کہ میں طالب علمانہ طور پر یہ بات کر رہا ہوں تو میں کسی اور کی بات نہیں کرتا میں اپنی بات کرتا ہوں کہ میری بس ہو جاتی ہے، مجھے سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے جب حضرت خالص علمی رنگ اختیار فرما تے ہیں۔

جب یہ نصیحت ہے بالعموم بھی اور بالخصوص بھی تو پھر بھی لوگ ہدایت پر کیوں نہیں آتے؟ حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں اللہ کی تکوینی حکمتیں ہیں کہ بعضوں کے لیے مشیت ہوتی ہے تو ہدایت مل جاتی ہے اور بعضوں کے لیے حکمت کی وجہ سے مشیت نہیں ہوتی تو ان کو ہدایت نہیں ملتی، اس لیے آپ اس پر زیادہ پریشان نہ ہوں۔

﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾

تم چاہو بھی تو سیدھے راستے پر نہیں چل سکتے۔ ہاں جب اللہ چلانا چاہے تو پھر چل سکتے ہو۔ بس یہ دعا کریں کہ اللہ ہم سب کے لیے صراط مستقیم پر چلانے کا فیصلہ فرما لیں۔ آمین

وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الانفطار

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ﴿١﴾ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴿٢﴾ وَإِذَا

الْبَحَارُ فُجِّرَتْ ﴿٣﴾﴾

### احوال قیامت کا بیان:

جب آسمان ٹوٹ جائے گا، بکھر جائے گا۔ ستارے گر پڑیں گے۔ جب دریاؤں کو مزید چلا دیا جائے گا۔ دریا تو پہلے بھی چل رہے ہیں یہاں چلانے کا مطلب یہ ہے کہ میٹھے اور کھارے پانی کو ملا دیا جائے گا، پھر ان کو اکٹھا کر کے چلایا جائے گا۔

﴿وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ﴿٤﴾﴾

قبروں کو اکھاڑ کر رکھ دیا جائے گا۔ اب دیکھو! قبر اسے کہتے ہیں جہاں میت یا اجزائے میت ہوں، قبر کا معنی علیین یا سحین نہیں ہے۔

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ﴿٥﴾﴾

ہر آدمی جان لے گا کہ اس نے آگے کون سا عمل بھیجا ہے اور پیچھے کون سا عمل چھوڑا ہے۔ اس کا ایک معنی یہ ہے کہ جو نیک اعمال اس نے کیے تھے آگے وہ اس کے لیے ذخیرہ ہوں گے وہ بھی دیکھ لے گا اور جو نیک عمل وہ نہیں کر سکا تھا چھوڑ

دیے تھے وہ بھی اس کے سامنے آجائیں گے، پیچھے والے اور بعد والے بھی۔  
 یا یہ معنی ہے کہ کوئی ایسا شخص کہ جس نے کوئی نیک عمل خود کیا تو اس کا اجر  
 بھی اسے ملے گا اور ایسا نیک عمل پیچھے چھوڑا کہ لوگ اس پر عمل کرتے تھے اس کا اجر  
 بھی اس کو ملے گا جسے صدقہ جاریہ کہتے ہیں۔ مثلاً مسجد بنادی، مدرسہ بنادیا، نیک اولاد  
 چھوڑ کر چلا گیا یا علم چھوڑ کر چلا گیا۔ تو جو نیک اعمال خود کیے اور آگے بھیج دیے یہ اس کا  
 ”قَدَمَتْ“ ہیں اور جو پیچھے چھوڑے کہ لوگ اس پر عمل کرتے تھے یہ اس کا ”اُخَّرَتْ“  
 ہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّبَكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝۱﴾ الَّذِي خَلَقَكَ  
 فَسَوَّبَكَ فَقَدَلَكَ ۝۲ فِي آيٍ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ۝۳﴾

اے انسان! تجھے کس چیز نے دھوکے میں ڈالا اپنے رب کریم کے بارے میں  
 جس اللہ نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہارے جوڑوں کو تناسب سے بنایا، پھر تمہارے مزاج  
 میں اعتدال رکھا۔ اخلاطِ اربعہ میں سے کسی کو بڑھا دیا یا کسی کو کم کر دیا، جسم میں  
 حرارت یا برودت بڑھ جائے یا کم ہو جائے ایسا نہیں کیا بلکہ مزاج میں اعتدال رکھا۔ پھر  
 جیسے چاہا اس طرح تمہیں جوڑ کر تمہاری شکل کو بنادیا۔

### اللہ کی صفت کریمی:

اللہ نے یہاں صفت کریم کیوں بیان فرمائی۔ اللہ بتانا چاہتے ہیں کہ دیکھو!  
 جس کے تم مستحق نہیں ہو اللہ پھر بھی دیتا ہے اور اللہ نے تمہارے اعمال پر فوراً مواخذہ  
 نہیں فرمایا، تم نے رات کی تاریکی میں گناہ کیے تھے لیکن اللہ نے اپنی رحمت سے چھپا  
 لیے تو تم دھوکے میں آگئے ہو کہ ہمارا کچھ نہیں ہوگا! تو فرمایا:

﴿كَلَّا بَلْ تُكْذِبُونَ بِاللَّيْلِ ۝۱﴾ ہر گز نہیں! دھوکے میں مت آؤ، بلکہ

تم مزید دھوکے میں آجاتے ہو اور اتنے دھوکے میں آتے ہو کہ قیامت کے دن کو بھی جھٹلانا شروع کر دیتے ہو، کچھ خیال کرو۔

﴿وَإِنَّ عَلَيْنَكُمْ لَحَفِظِينَ ﴿١٦﴾ كَرَامًا كَاتِبِينَ ﴿١٧﴾ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ﴿١٨﴾﴾

تم پر تو فرشتے متعین ہیں۔ تمہاری حفاظت ہو رہی ہے۔ یہ فرشتے عزت والے ہیں۔ وہ لکھ رہے ہیں جو تم کرتے ہو وہ سب جانتے ہیں۔

**اللہ! تیرے کرم نے دھوکے میں ڈالا**

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کراچی والے میں نے خود ان کے سامنے بیٹھ کر سنا ہے، حضرت فرماتے تھے کہ میں جب یہ آیت پڑھتا ہوں: ﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ﴾ کہ تمہیں تمہارے کریم رب کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈالا تو بے ساختہ میری زبان سے نکلتا ہے کَرْمُكَ.. کَرْمُكَ.. بس اللہ! آپ کریم اتنے ہیں کہ ہم دھوکے میں پڑ گئے ہیں۔ جس طرح ایک بندہ ہے وہ سمجھتا ہے کہ فلاں بزرگ ایسا ہے کہ میں نے اس کی کوئی چیز کھا بھی لی تو وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے، میں نے ان کو کچھ کہ بھی دیا تو بھی وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے، میں دیر سے چلا گیا تو استاذ جی نے پھر بھی کچھ نہیں کہنا! یہ ہے کرم۔ اس کرم کا تقاضا یہ تھا کہ وقت پر آتے، اس کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ آدمی نافرمانیاں شروع کر دیتا۔

اللہ کریم ہے اور کرم کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے کرم کو دیکھ کر بات مانتے، ہم اس کے کرم کو دیکھ کر دھوکے میں آ گئے اور ہم نے کیا کام شروع کر دیا؟!

**”کریم“ کے پانچ معانی:**

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ”کریم“ کے پانچ معانی لکھے ہیں:

1: الَّذِي يُعْطِي بِدُونِ الْإِسْتِحْقَاقِ.

کریم وہ ہے جو اس کو دیتا ہے جو حقدار نہیں ہوتا، غیر مستحق کو دینے والے کو کریم کہتے ہیں۔

2: الَّذِي يُعْطِي بُدُونِ الْمَنِّ وَالْفَضْلِ

کریم وہ ہے جو دیتا ہے پھر جتلاتا نہیں ہے کہ تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں دیا تھا، اس کو کریم کہتے ہیں۔

3: الَّذِي يَتَفَضَّلُ عَلَيْنَا فَوْقَ مَا نَسْتَمْلِي بِهِ

جتنی آدمی کی توقع ہوتی ہے اس سے بڑھ کر دیتا ہے، اس کو کریم کہتے ہیں۔

4: الَّذِي يَتَفَضَّلُ عَلَيْنَا بِدُونِ مَسْئَلَةٍ وَلَا وَسِيلَةٍ

جو بن مانگے بھی دے اور بن وسیلہ بھی دے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وسیلہ نہ کریں تب بھی دیتا ہے اور اگر وسیلہ کریں تو اللہ تعالیٰ جلدی دیتا ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ وسیلہ کر سکتے ہیں۔

5: الَّذِي يَتَفَضَّلُ عَلَيْنَا وَلَا يَخَافُ نِفَادَ مَا عِنْدَهُ

وہ عطا کرے اور اس کو اپنے خزانے میں کمی کا کوئی خدشہ نہ ہو۔ اللہ پاک ہمیں اپنی شان کریمی سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

### ایصالِ ثواب کا اثبات:

میں اس آیت کو بسا اوقات ایصالِ ثواب پر پیش کرتا ہوں بطور دلیل کے۔ دیکھو! اگر کوئی شخص ارادہ گناہ کرے اور گناہ نہ کرے تو اس کو نہیں لکھا جاتا جب تک گناہ نہ کرے، ارادہ نیکی کرے اور نیکی نہ کرے تب بھی لکھ لیا جاتا ہے۔ قانونِ عدل یہ ہے کہ ارادہ گناہ پر گناہ نہ لکھتے تو ارادہ نیکی پر نیکی نہ لکھی جاتی، اگر ارادہ نیکی پر نیکی لکھ دیتے تو ارادہ گناہ پر گناہ بھی لکھ لیتے لیکن اللہ نے قانونِ عدل سے کام نہیں لیا بلکہ قانونِ کرم سے کام لیا۔

آدمی گناہ ایک کرے تو ایک لکھا جاتا ہے اور نیکی ایک کرے تو دس لکھی جاتی ہیں۔ قانونِ عدل یہ تھا کہ ایک گناہ پر ایک نیکی اور ایک نیکی پر ایک نیکی لکھتے، نیکی پر دس ہے تو گناہ پر بھی دس لکھتے لیکن قانونِ عدل سے کام نہیں لیا بلکہ قانونِ کرم سے کام لیا۔ پھر اگر باپ مر جائے اور بیٹا زنا کرے اور کہے کہ یا اللہ! اس کا گناہ میرے ابا کو دے دیں تو اللہ نہیں دیتے اور اگر یہ بندہ نیک عمل کرے اور کہے کہ یا اللہ! اس کا ثواب میرے ابا کو دے دیں تو اللہ دے دیتے ہیں، ایصالِ عذاب نہیں ہوتا بلکہ ایصالِ ثواب ہوتا ہے، قانونِ عدل یہ ہے کہ اگر نیکی دی ہے تو اس کا گناہ بھی دے دیتے اور اگر گناہ نہیں پہنچتا تو نیکی بھی نہ پہنچتی، یہاں بھی قانونِ عدل سے کام نہیں بلکہ قانونِ کرم سے کام لیا ہے۔

پھر اللہ رب العزت نے انسان کو جتنی عمر دی ہے مثلاً ستر سال۔ یہ بالغ ہوا ہے پندرہ سال کے بعد تو پچپن سال کی نیکیاں اور پچپن سال کے گناہ اعمال نامہ میں تول دیے جائیں گے۔ اب اگر جتنی عمر ہے اور اتنے ہی اعمال ہوتے۔ میں اپنی بات کرتا ہوں، آپ کی تو نہیں کرتا۔ شاید ہمارے لیے جنت میں جانے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوتی چونکہ ہماری عمر میں گناہ زیادہ ہیں اور نیک اعمال کم ہیں اور شاید جنت کی صورت نہ نکلتی۔

اگر اللہ قیامت تک انسان کو زندہ رکھتے اور قیامت کے دن اس کو موت دیتے اور پھر اس کو زندہ کرتے اور اس کی نیکیوں اور گناہوں کو تول جاتا تو گناہ بڑھ جاتے اور نیکیاں کم ہو جاتیں، اللہ نے کرم فرمایا کہ زندگی تھوڑی دی ہے اور اس کے بعد والے اگر گناہ کر کے اس کو بخشیں تو نامہ اعمال میں نہیں ڈالتے اور بعد والے نیک اعمال کر کے بخشیں تو اللہ اس کے نامہ اعمال میں ڈال دیتے ہیں۔ زندگی پچپن سال ہے، گناہ بھی پچپن سال کے ہیں اور نیک اعمال پچپن سال کے نہیں، تو بعد والے نیک اعمال کر

کے اس کو بخشیں تو قیامت تک اللہ اس کے نامہ اعمال میں ڈالتے رہیں گے۔ اب جب قیامت کے دن نامہ اعمال تولا جائے گا تو بہت کم بد قسمت ایسے ہوں گے کہ جن کے نامہ اعمال میں نیکیاں کم نکلیں اور گناہ زیادہ نکلیں۔ یہ اللہ کا قانونِ کرم ہے۔

ایصالِ ثواب اللہ کے کریم ہونے کی دلیل ہے اور ایصالِ ثواب کا انکار اللہ کے شانِ کرم کے انکار کی دلیل ہے۔ ہم اللہ کو کریم مانتے ہیں۔ ہاں ہم یہ بات کہتے ہیں کہ جو ایصالِ ثواب کو نہیں مانتے ہم دعا کرتے ہیں کہ ہمارے بعد والے نیک اعمال ہمیں بخش دیں تو وہ ہمیں مل جائیں اور تمہارے بعد والے نیک عمل کریں اور تمہیں بخشیں تو اللہ کرے تمہیں نہ ملیں تو اس پر ان آمین کہنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اللہ پاک ہم سب کو سمجھ عطا فرمائے۔ آمین

**نیک اور برے لوگوں کا انجام:**

﴿إِنَّ الْآبَرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۝ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۝﴾

نیک لوگ جنت کی نعمتوں میں ہوں گے اور کفار لوگ جہنم میں ہوں گے۔ یہاں فجار سے فاسق نہیں بلکہ فجار سے کافر مراد ہیں، اس کی دلیل ﴿وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ﴾ یہ جہنم میں داخل ہوں گے تو پھر کبھی اس سے نکلنے والے نہیں ہوں گے۔ خلود فی النار یہ کفر کے لیے ہوتا ہے فسق کے لیے نہیں ہوتا۔

﴿وَمَا آذْرُكَ مَا يَوْمَ الدِّينِ ۝ ثُمَّ مَا آذْرُكَ مَا يَوْمَ الدِّينِ ۝﴾

آپ کو کیا پتا قیامت کتنی سخت ہے؟ آپ کو پھر بتا رہا ہوں کہ آپ کو کیا پتا قیامت کتنی سخت ہے؟ ”ثُمَّ“ کا معنی سمجھ میں آگیا؟ میں اس لیے رک رک کر ترجمہ کر رہا ہوں تاکہ تمہیں سمجھ میں آجائے۔



﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْعًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ﴾

قیامت وہ ہے جس دن کوئی آدمی کسی دوسرے کے ذرہ برابر کام نہیں آسکے گا اور اس دن معاملات خالص اللہ کے ہاتھ میں ہوں گے، کسی کا اختیار نہیں چلے گا۔ یہاں سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ قیامت کے دن شفاعت نہیں ہوگی۔ شفاعت کا معاملہ الگ ہے۔ ذاتی طور پر انسان کسی دوسرے کے کام نہیں آئے گا۔ جس کو اللہ اجازت دیں گے وہ شفاعت بھی کرے گا اور وہ بولے گا بھی۔ اس سے شفاعت کی نفی نہیں ہوتی۔ اللہ ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورۃ المطففین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۚ الَّذِیْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ ۖ وَاِذَا کَالُوْهُمْ اَوْ ذُنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ ۚ﴾

### تطفیف کا معنی:

”تطفیف“ کہتے ہیں کمی بیشی کو۔ تطفیف کا تعلق صرف ناپ اور تول کے ساتھ نہیں ہے بلکہ تمام معاملات کے ساتھ ہے۔ مثلاً استاذ ہے پڑھانے میں کمی کرتا ہے اور تنخواہ پوری لیتا ہے تو یہ مُطَفِّف ہے۔ طالب علم داخلہ لیتا ہے، کھانا پورا کھاتا ہے لیکن پڑھنے میں کمی کرتا ہے تو یہ بھی مُطَفِّف ہے۔ یہ سب مُطَفِّف کی صورتیں ہیں۔ لیکن یہاں بطور خاص ذکر ہے لین دین کا۔ آدمی جب کسی کو دے تو کم کر کے دے اور جب لے تو مکمل لے۔ مکمل لینا جرم نہیں ہے لیکن مکمل لینا اور کم دینا یہ جرم ہے۔ اگر آدمی دے بھی کم اور لے بھی کم تو پھر جرم کی نوعیت بدل جاتی ہے اور جب لے مکمل لیکن دے کم تو پھر جرم کی نوعیت بڑھ جاتی ہے۔

چونکہ اصل مقصود دینے میں کمی ہے اس لیے کیل اور وزن دونوں کا ذکر کیا اور مکمل حق لینا یہ کوئی عیب نہیں ہے اس لیے یہاں پر صرف کیل ذکر فرمایا ہے اور یہ

جو کیل ہوتا ہے کہ پیمانے کے ساتھ ناپنا اس کا ذکر خالص اس وجہ سے کیا ہے کہ مکہ میں عموماً اور مدینہ منورہ میں خصوصاً تول کارواج کم تھا اور ناپ کا زیادہ تھا، ڈھیریاں لگانے یا گنتی کرنے کا رواج زیادہ تھا۔

## فکرِ آخرت تمام اعمال کی بنیاد:

﴿أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ﴾

یہ جرم اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ان کو اس بات کا اعتقاد نہیں ہے کہ قیامت کے دن ہم اٹھیں گے۔ جس شخص کا یہ اعتقاد ہو کہ قیامت کے دن اٹھیں گے وہ ایسا جرم کبھی نہیں کرتا اور یہ بالکل اپنا ذہن بنالیں کہ تمام اعمال کی بنیاد آخرت ہے، جب انسان کو پورا یقین ہو کہ موت کے بعد ہر چیز کا حساب ہونا ہے پھر آدمی دینے میں کمی نہیں کرتا، جھوٹ نہیں بولتا، کسی کی عزت پہ حملہ نہیں کرتا جب یہ یقین ہو، اور بطورِ خاص ہم جو علماء ہیں ہمیں اس کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے کہ ہمارے قول اور فعل سے نہ کسی کو تکلیف ہو نہ کسی پر الزام ہو، باطل کے ساتھ بھی جنگ ہو تو اتنی ہو جتنی بنتی ہے، ذاتیات پہ بلا وجہ حملہ کرنا مناسب نہیں ہے اور کسی مسلک میں کوئی چیز نہ ہو تو اس کا ذکر کرنا یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا قیامت کے دن ہم سے حساب ہو گا۔ اس کا بہت خیال رکھیں۔

﴿كَلَّا﴾

یہ جو ان کا خیال ہے قیامت کے دن نہیں اٹھائے جائیں گے یہ خیال بالکل غلط ہے، ہر گز ایسی بات نہیں ہے بلکہ یہ اٹھائے جائیں گے۔

یہ میں کا ہر جگہ یہ ترجمہ قصد کرتا ہوں کہ آپ اس کو سمجھیں کہ یہ یہاں کیوں استعمال ہو رہا ہے۔ ﴿كَلَّا﴾ کا یہاں مطلب یہ ہے ان کا خیال یہ ہے کہ ہم

قیامت کو نہیں اٹھائے جائیں گے، فرمایا: ﴿كَلَّا﴾ ان کی یہ بات ٹھیک نہیں ہے، ہر گز ایسی بات نہیں بلکہ یہ اٹھائے جائیں گے۔

”سجین“ کیا ہے؟

﴿كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينَ﴾

تمہارے جتنے نامہ اعمال ہیں وہ محفوظ ہیں، نامہ اعمال کفار کا بھی ہے اور نامہ اعمال ایمان والوں کا بھی ہے۔ ”الْفُجَّارِ“ سے مراد کفار ہیں۔ کفار کا نامہ اعمال سجین میں ہے اور مؤمنین کا نامہ اعمال علیین میں ہے۔ اسی طرح مؤمنین کی ارواح کا مقام اور مستقر علیین میں ہے اور کفار کی ارواح کا مستقر سجین میں ہے۔

سجین؛ سات زمینوں سے نیچے جگہ کا نام ہے اور علیین سات آسمانوں سے اوپر عرش کے نیچے ایک مقام کا نام ہے۔ ﴿كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينَ﴾ کہ کفار کے اعمال سجین میں محفوظ ہیں اس کی صورت یہ ہے کہ کفار کے اعمال نامے سجین میں محفوظ ہوتے ہیں اور یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ وہاں ایک جامع رجسٹر ہو جس میں تمام کفار کے اعمال کو لکھا جاتا ہو اور وہ رجسٹر وہاں پہ محفوظ ہوتا ہے۔ ارواح بھی ان کی وہاں پر ہیں اور اعمال بھی وہاں پر ہیں۔

دلوں کا رنگ:

﴿وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ﴾ الَّذِينَ يُكَذِّبُونَ بَيِّوْمِ الدِّينِ ﴿١١﴾ وَ

مَا يُكَذِّبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ﴿١٢﴾ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ

الْأَوَّلِينَ ﴿١٣﴾ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿١٤﴾

قیامت کے دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی و بربادی ہوگی۔ یہ جھٹلانے والے وہ لوگ ہیں جو قیامت کا انکار کرتے ہیں، قیامت کا انکار وہ لوگ کرتے ہیں جو حد

سے تجاوز کرنے والے ہیں، جو گناہ کرتے ہیں، جب ان کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کی جائے تو کہتے ہیں کہ یہ پہلے لوگوں کی بے سند قسم کی باتیں ہیں۔ العیاذ باللہ۔

فرمایا: ﴿كَلَّا﴾ یہ جو تمہارا خیال ہے کہ قرآن کریم بے سند کہانی ہے یہ خیال ٹھیک نہیں ہے، ایسی بات نہیں ہے اور یہ جو کہتے ہیں کہ قرآن کہانی ہے۔ معاذ اللہ۔ تو اس پر ان لوگوں کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے۔ دل سیاہ ہو گئے ہیں اس لیے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اور یہ زنگ کیوں لگا ہے؟ ﴿مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے۔

جیسے حدیثِ پاک میں ہے کہ مؤمن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر یہ بندہ توبہ کر لیتا ہے اور گناہوں کو چھوڑ کر نیک اعمال شروع کر دیتا ہے تو یہ سیاہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور دل پہلے کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ بندہ توبہ نہیں کرتا بلکہ گناہ پر گناہ کرتا چلا جاتا ہے تو یہ نقطے لگتے لگتے انسان کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔

﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمْ حُجُّوْا﴾<sup>(۱۲)</sup>

ان کا خیال ہے کہ نہ قیامت ہوگی نہ ہم اٹھیں گے، نہ ہمارا حساب کتاب ہوگا نہ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، فرمایا: ﴿كَلَّا﴾ ہر گز نہیں، یہ بات بالکل غلط ہے۔ یہ لوگ جب قیامت کو اٹھیں گے اور اللہ کے سامنے پیشی ہوگی تو ان کا حشر یہ ہوگا کہ یہ اللہ کا دیدار نہیں کر سکیں گے۔

**دیدارِ الہی:**

یہاں ایک بات یوں سمجھیں کہ قیامت کے دن اگر اللہ تعالیٰ کی زیارت ممکن نہ ہوتی یا اہل ایمان کو زیارت نہ ہوتی تو یہ بات نہ کہی جاتی کہ ﴿إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ

يَوْمَئِذٍ لَّمْ يَجُوبُونَ ﴿٦٨﴾ کفار کو اللہ کی زیارت سے روک دینا اور ان کو اللہ کا دیدار نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اہل ایمان کو دیدار ہو گا۔ اگر اہل ایمان کو بھی دیدار نہ ہو اور ان کو بھی دیدار نہ ہو تو دونوں میں فرق کیا ہو گا؟ تو کفار کے بارے میں یہ کہنا کہ قیامت کے دن ان کو اللہ کا دیدار نہیں ہو گا اس بات کی دلیل ہے کہ مومنین کو اللہ کا دیدار ہو گا۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَجُودَ يَوْمَئِذٍ نَّاصِرَةٌ ۖ إِلَىٰ دَيْبِهَا نَاطِرَةٌ ۖ﴾<sup>79</sup>

اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے، اور وہ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

دوسری بات کہ اللہ رب العزت کا دیدار اور اللہ کی زیارت کا شوق اور تقاضا ہر انسان کی فطرت اور طبیعت میں اللہ نے رکھ دیا ہے۔ اللہ کی محبت انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ بسا اوقات ماحول کی وجہ سے اس محبت کا اظہار نہیں ہوتا وگرنہ یہ ہر انسان کی طبیعت میں شامل ہے۔ قیامت کے دن جب رکاوٹیں ساری ختم ہو جائیں گی تو فطری تقاضا ہو گا اللہ کی زیارت کا۔

کفار کو اللہ اپنی زیارت نہیں کروائیں گے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کی محبت انسان کی فطرت میں شامل ہے، جس سے محبت ہوتی ہے اس کو دیکھنے کو دل بھی کرتا ہے، اللہ کو دیکھنے کو دل اس لیے کرے گا کہ اللہ سے پیار ہے، اللہ سے محبت نہ ہو تو دیکھنے کو دل کیوں کرے گا اور ان کو کیوں روک دیا جائے گا کہ یہ اللہ کا دیدار نہیں کر سکتے۔ تو اللہ کی محبت اور اللہ کی زیارت یہ دونوں چیزیں فطرت میں شامل ہیں۔

﴿ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ۖ ثُمَّ يُقَالُ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ

تُكَذِّبُونَ ﴿١٤﴾

پھر وہ جہنم میں داخل ہوں گے اور انہیں کہا جائے گا یہ وہی جہنم ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

﴿كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْبَرِّارِ لَفِي عِلِّيِّينَ ﴿١٥﴾﴾

ان کا خیال یہ تھا کہ ہم دنیا میں ختم ہو جائیں گے، مر جائیں گے، نہیں اٹھائے جائیں گے، جو اعمال ہم کرتے ہیں ان کا حساب نہیں ہو گا، فرمایا: ”کَلَّا“ ہر گز نہیں، حساب ہو گا! نیک لوگوں کا نامہ اعمال ہم نے علین میں رکھا ہے۔

﴿كِتَابٌ مَّرْقُومٌ ﴿١٦﴾ يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ ﴿١٧﴾﴾

وہ رجسٹر ہے جسے اردو میں دفتر کہتے ہیں۔ اس پر مہر لگی پڑی ہے جیسے سرکاری رجسٹر جب بند ہو جائے تو اوپر مہر لگا دیتے ہیں۔ اللہ کے مقرب فرشتے اس کے پاس جاتے ہیں۔

﴿إِنَّ الْبَرَّارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿١٨﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ ﴿١٩﴾﴾

نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے۔ آرام دہ نشستوں پر بیٹھے ہوں گے اور نظارے کر رہے ہوں گے۔

**جنت کی شرابِ خالص:**

﴿يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ ﴿٢٠﴾ خِتْمُهُ مِسْكَ ط وَفِي ذَلِكِ

فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ﴿٢١﴾﴾

ان کو خالص شراب پلائی جائے گی جس پر مہر لگی ہو گی اور مہر بھی مشک کی ہو گی۔ اس میں آگے بڑھنے والوں کو آگے بڑھنا چاہیے۔ بڑھنے کی چیزیں یہ ہیں۔

﴿وَمِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ ﴿٢٢﴾ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ﴿٢٣﴾﴾

اور اس شراب میں کچھ ”تسنیم“ بھی ہو گا۔ تسنیم کیا ہے؟ یہ ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے مقربین پیتے ہیں۔ یعنی ان کو تو خالص تسنیم ملتا ہے اور جو نیچے درجہ کے جنتی ہیں ان کو شراب کی اندر کچھ تسنیم ملا دیا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تسنیم تو شراب سے بھی اعلیٰ قسم کا ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ۚ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ۚ وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ۚ وَإِذَا رَآوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ۚ﴾

یہ مجرم لوگ دنیا میں ایمان والوں پر ہنستے تھے، جب ان کے قریب سے گزرتے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے اور جب گھر جاتے تو مزے لے لے کر ان کے تذکرے کرتے اور جب دنیا میں ان ایمان والوں کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَفِظِينَ ۚ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۚ عَلَىٰ الْأَرَائِكِ ۚ يَنْظُرُونَ ۚ هَلْ تُؤِثُّبُ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۚ﴾

حالانکہ یہ کافران مسلمانوں پر نگہبان تھوڑے ہیں۔ آج تو یہ ہو گا کہ ایمان والے کفار پر ہنسیں گے۔ جنت میں آرام دہ نشستوں پر بیٹھ کر ان کو دیکھ رہے ہوں گے اور پھر یہ کہیں گے کہ کافروں کو اس کام کا بدلہ مل گیا ہے جو وہ کرتے تھے۔

وَاجْزُ دَعُوا أَنَا الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



## سورة الانشقاق

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۖ وَأَذْنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۖ وَإِذَا الْأَرْضُ

مُدَّتْ ۖ وَأَنفَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۖ وَأَذْنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۖ﴾

### احوال قیامت کا بیان:

جب آسمان پھٹ پڑے گا۔ آسمان اللہ کی بات کو سنے گا اور مان لے گا اور وہ اسی لائق ہے کہ سنے اور مان لے۔ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ زمین میں ہے نکال کر باہر کرے گی اور خود خالی ہو جائے گی اور اللہ کے حکم کو سنے گی اور مانے گی اور زمین کو حکم ماننا بھی چاہیے۔

اللہ رب العزت کے حکم دو قسم کے ہیں:

1: حکم تشریعی 2: حکم تکوینی

حکم تشریعی کا معنی کہ جس میں اللہ مکلف کو کرنے نہ کرنے کا کچھ اختیار بھی دیں، کرنے پر اس کو اچھا اجر ملے اور نہ کرنے پر اس کو سزا ملے اور حکم تکوینی کہ جس میں مکلف کا کوئی اختیار نہیں ہوتا، اس کو کرنا ہی کرنا ہوتا ہے اور اس میں یہ شامل نہیں ہوتا کہ اسے کرنے پر اچھا بدلہ ملے گا اور نہ کرنے پر عذاب ملے گا۔ آسمان اور زمین کو جو حکم ملیں گے وہ حکم تکوینی ہوں گے، حکم تشریعی نہیں ہوں گے۔

قیامت کے دن زمین کو پھیلا دیا جائے گا۔ حدیث پاک میں ہے جیسے چمڑے کو کھینچ کر بڑا کرتے ہیں۔ آج کے دور میں ربڑ سمجھیں کہ اسی زمین کو کھینچ کے بڑا کر دیا جائے گا۔ آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک آنے والے سب انسان اس زمین پر جمع ہوں گے اور ہر آدمی کو اتنی جگہ ملے گی جہاں وہ پاؤں رکھ کر کھڑا ہو سکے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

### انسانی محنت اور اس کا ثمرہ:

﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ ۚ﴾

اے انسان! تم نے اپنے رب تک مشقت اٹھا کر پہنچنا ہے اور مشقت اٹھاتے اٹھاتے اللہ تک پہنچ جانا ہے۔ مسلمان ہو یا کافر دنیا میں ہر کسی نے مشقت اٹھانی ہے۔ اگر مشقت نیک کام کی ہوگی تو اچھا بدلہ ملے گا اور برے کام کی ہوگی تو ظاہر ہے کہ انجام برا ہوگا۔

﴿فَأَمَّا مَنْ أَوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا

يَسِيرًا ۖ وَيُنْقَلَبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۖ﴾

جس شخص کو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیں گے تو اس کا حساب آسان ہو جائے گا۔ حساب آسان ہونے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ صرف پیشی فرمائیں، اعمال نامہ دیکھیں اور اس کو چھوڑ دیں اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس کے عذاب کو کم کر دیں۔ دونوں اس میں شامل ہیں۔ جب اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا تو یہ اپنے تعلق والوں کے پاس خوش ہو کر آئے گا کہ میری جان بچ گئی، میں تو چھوٹ گیا۔

﴿وَأَمَّا مَنْ أَوْتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ۖ فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۖ وَ

يَضِلُّ سَعِيرًا ۖ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۖ إِنَّهُ ظَنَّ أَن لَّنْ يَمُورَ ۖ بَلَىٰ ۖ

إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا ﴿١٥﴾

وہ شخص جس نے مشقت اٹھائی ہوگی لیکن گناہوں میں اور اللہ کی نافرمانی میں تو اس کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں دیں گے۔ ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہوں گے اور بائیں ہاتھ میں نامہ اعمال پکڑا دیا جائے گا۔ اس وقت یہ موت کو پکارے گا جس طرح آدمی مصیبت میں موت کو پکارتا ہے لیکن جہنم میں داخل ہوگا، موت نہیں آئے گی۔ یہ وہ شخص تھا کہ دنیا میں بہت خوش تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں دوبارہ نہیں اٹھوں گا، لوٹ کر وہاں نہیں جاؤں گا۔ اللہ فرماتے ہیں: ”بلی“ کیوں نہیں، وہاں تو جانا ہی ہے۔ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

﴿فَلَا أَقْسَمُ بِالشَّفَقِ ﴿١٦﴾ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿١٧﴾ وَالْقَمَرِ إِذَا

اتَّسَقَ ﴿١٨﴾ لَتَرَكُنَّ بَطَافًا عَن طَبَقِ ﴿١٩﴾﴾

پھر اللہ نے چار قسمیں کھائی ہیں، فرمایا: ”فَلَا“ تمہارا خیال ہے کہ نہیں اٹھیں گے تمہاری یہ بات صحیح نہیں ہے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم نے اٹھنا ہے۔ یہ ”لَا“ زائد کا مطلب ہے۔ آگے چار قسمیں کھائی ہیں۔ چونکہ چار قسم کے احوال ہیں کہ پہلے سورج غروب ہوتا ہے اور رات شروع ہوتی ہے اس کو ”الشَّفَقِ“ کہتے ہیں تو اس کی قسم کھائی، پھر اس کے بعد کچھ اندھیرا ہو جائے تو اس کو ”الَّيْلِ“ کہتے ہیں تو اس کی قسم کھائی، پھر جب رات مزید گہری ہو جائے تو لوگ رات میں چھپ جاتے ہیں یعنی آدمی سو گئے ہیں، جانور ہیں، اور بھی چیزیں ہیں رات کا اندھیرا ان کو چھپا لیتا ہے تو اسے فرمایا ”وَمَا وَسَقَ“ کہہ کر اس کی قسم کھائی، پھر جب چاند نکلتا ہے تو چاند بھی اپنے اندر چیزوں کو سمیٹ لیتا ہے، رات آتی ہے تو اپنی تاریکی میں لے لیتی ہے اور چاند آتا ہے تو اپنی روشنی میں لے لیتا ہے تو ”وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ“ کہہ کر اس کی قسم کھائی ہے۔ یہ چار

قسمیں کھا کر فرمایا۔

## پیدائش سے جنت و جہنم تک کے مرحلے:

﴿لَتَذَكَّبْنَ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾

قسم کھا کر فرمایا کہ تم ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے کی طرف چڑھتے جاؤ گے! جب کوئی چیز تہہ بہ تہہ ہو تو اس کی ایک تہہ کو طبقہ کہتے ہیں اور مجموعہ کو ”طبقات“ کہتے ہیں۔ تو فرمایا کہ تم نے بھی تہہ بہ تہہ آگے جانا ہے، اور یہ انسان کی پیدائش سے لے کر جنت تک کے مراحل ہیں۔ ایک وقت ہوتا ہے کہ انسان نطفہ ہوتا ہے، پھر ایک مرتبہ ماں کے رحم میں جاتا ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ آدمی جما ہوا خون بنتا ہے، پھر گوشت بنتا ہے، پھر ہڈیاں ہوتی ہیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھتا ہے، پھر اس میں اعضاء بنتے ہیں، پھر اس میں روح آتی ہے، پھر یہ بطور خوراک ماں کے پیٹ کے حیض کو استعمال کرتا ہے، پھر وقت آتا ہے کہ ماں کے دودھ کو استعمال کرتا ہے، پھر اچھی خوراک کھاتا ہے، پھر اس کی جوانی آتی ہے، پھر بڑھاپا آتا ہے، پھر موت ہے، پھر برزخ ہے، پھر حشر ہے، پھر جنت ہے یا جہنم ہے۔ یہ لمبا سلسلہ ہے۔

﴿فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ ۱۱۱ ﴿وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ﴾ ۱۱۲ ﴿بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُكَذِّبُونَ﴾ ۱۱۳ ﴿وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ﴾ ۱۱۴ ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ ۱۱۵ ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾ ۱۱۶ ﴿

ان کو کیا ہو گیا کہ یہ ایمان نہیں لاتے؟ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے۔ ان کو ایسا کرنا چاہیے تھا بلکہ یہ عجیب لوگ ہیں کہ الٹا تکذیب کرتے ہیں۔ اللہ ان کے اعمال کو محفوظ کرتے ہیں۔ ان کو دردناک عذاب کی خبر دے دو، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے نیک اعمال کیے تو ان کے لیے اجر ہو

گا، ایسا اجر ہو گا جو ختم بھی نہیں ہو گا۔

## آیت سجدہ:

﴿وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ﴾

یہ آیت سجدہ ہے۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اس آیت کو جو پڑھے یا سنے اس پر سجدہ کرنا واجب ہے۔ بعض ائمہ سجدے کے قائل نہیں۔ ہمارے امام صاحب سجدہ کرنے کے قائل ہیں۔ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے میں نے عشاء کی نماز پڑھی تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس مقام پر سجدہ کیا۔ میں نے پوچھا: سجدہ کیوں کیا؟ فرمایا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دوسری روایت میں فرماتے ہیں: ہم نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں اس سورت انشقاق پر بھی سجدہ کرتے دیکھا ہے اور اقرأ باسم ربک پر بھی سجدہ کرتے دیکھا ہے۔ تو امام صاحب یہاں پر سجدے کے قائل ہیں۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا معمول یہ تھا کہ حضرت وجوب سجدہ کے قائل تھے لیکن ایسے لوگوں میں تھے جو سجدہ کے قائل نہیں تھے تو حضرت فرماتے ہیں کہ میں نماز میں اس سورت کی کبھی تلاوت نہیں کرتا چونکہ میرے ہاں سجدہ واجب ہے، میں سجدہ کروں گا اور یہ لوگ سجدہ نہیں کریں گے، اگر میں نہیں کروں گا ان کی رعایت کرتے ہوئے تو مجھے گناہ ہو گا اور اگر اپنے مسئلے کی رعایت پر سجدہ کروں گا تو ان میں اختلاف ہو گا، اس لیے میں اس سورۃ کی تلاوت نماز میں نہیں کرتا تاکہ ہم باہمی اختلاف سے بچ جائیں۔

وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة البروج

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۝۱ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۝۲ وَشَاهِدٍ مَّشْهُودٍ ۝۳﴾

### شان نزول:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ سے 70 سال پہلے ایک بادشاہ تھا۔ یہ معروف واقعہ ہے آپ نے سنا ہو گا۔ یوسف ذونواس اس بادشاہ کا نام تھا اور یہ کافر تھا۔ اس کے پاس ایک جادوگر تھا، جادوگر جب بوڑھا ہوا تو اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے ایک لڑکا دو جس کو میں جادو سکھا دوں تاکہ میرے بعد وہ تمہارے کام آتا رہے۔ اس بادشاہ نے اس کو ایک لڑکا دیا جس کا نام عبد اللہ بن تامر تھا کہ اس کو جادو سکھاؤ۔

یہ بچہ گھر سے جادو سیکھنے کے لیے اس جادوگر کے پاس جاتا تو راستے میں ایک راہب تھا جو عیسائی مذہب پر تھا اور عبادت کرتا تھا، یہ بچہ اس کے پاس رکنا۔ اس کے پاس بیٹھتا، اس کی باتیں سنتا۔ بچہ اس سے بہت متاثر ہوا اور عیسائی مذہب کے مطابق جو اس وقت حق تھا ایمان لے آیا۔ ایک بار یہ بچہ آ رہا تھا تو راستے میں ایک شیر تھا اس نے لوگوں کا راستہ روکا ہوا تھا۔ اس بچے نے پتھر اٹھایا اور شیر کو مارتے ہوئے یہ کہا کہ اے اللہ! اگر راہب کی باتیں جادوگر کی باتوں سے سچی ہیں تو یہ شیر مر جائے۔ یہ کہہ کر اس

نے پتھر مارا تو شیر مر گیا۔ اب لوگوں میں اس بچے کی کرامت مشہور ہو گئی۔

ایک نابینا اس کے پاس آیا کہ میری آنکھیں ٹھیک کر دو! لڑکے نے کہا کہ شفا دینے والی ذات تو اللہ کی ہے، تم وعدہ کرو کہ اگر ٹھیک ہو گئے تو اللہ کی توحید پر ایمان لاؤ گے! نابینا نے شرط مان لی۔ اس نے دعا کی تو وہ ٹھیک ہو گیا اور اللہ کی توحید پر ایمان لے آیا۔ اس کی وجہ سے اس بچے کی شہرت بہت ہو گئی۔ جب یہ بات کاہن تک پہنچی تو اس نے بادشاہ کو بتایا کہ ہمارے دین کا نقصان ہو رہا ہے۔ تو بادشاہ نے راہب کو بھی اور عبد اللہ بن تامر اس بچے کو بھی اور اس نابینا کو جس کی آنکھ ٹھیک کی تھی سے بھی بلایا۔ راہب اور اس نابینے کو فوراً قتل کر دیا اور اس بچے کے بارے میں اس نے اپنے نوکروں کو بھیجا کہ اس کو پہاڑ پر لے جاؤ اور وہاں سے گراؤ۔ جب وہاں لے گئے تو زلزلہ آیا اور جو گرانے کے لیے گئے تھے وہ خود گر کر مر گئے اور یہ بچہ زندہ واپس آ گیا۔

پھر بادشاہ نے کہا کہ اس کو دریا میں غرق کر دو! جب اس کو دریا میں لے گئے تو پانی میں ہلچل ہوئی اور کشتی الٹ گئی، جو غرق کرنے کے لیے گئے تھے وہ خود غرق ہو گئے اور یہ بچہ کرواپس آ گیا۔ اس کو بادشاہ قتل نہیں کر سکا تو اس بچے نے بادشاہ سے کہا کہ ایک صورت تم اختیار کرو تو میں مر جاؤں گا۔ مجھے تیر مارو اور یہ کہہ کے مارو کہ ”بِسْمِ اللّٰهِ رَیّ“ اور لوگوں کے مجمع کے درمیان مارو۔ مجمع موجود ہو تو ظاہر ہے کہ ایسی باتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔ تو جب بادشاہ نے ”بِسْمِ اللّٰهِ رَیّ“ کہہ کر تیر مارا تو تیر اس کی کنپٹی پہ لگا اور بچہ شہید ہو گیا۔ اس وقت یہ بات دیکھتے ہی بادشاہ کی سلطنت کے کئی لوگ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ اصل مذہب یہی سچا ہے جو اللہ کے نام والا ہے۔

بادشاہ نے ان کے لیے آگ کی خندقیں کھدوائیں اور اس میں ان کو ڈال کر مارنا شروع کر دیا۔ 12 ہزار کی تعداد میں بندے اس بے ایمان نے قتل کیے۔ کہتے ہیں کہ اس میں صرف ایک عورت تھی جس کو آگ کی خندق میں گرنے میں ہچکچاہٹ

ہوئی۔ اس کی گود میں چھوٹا بچہ تھا۔ انہوں نے اس بچے کو لے کر پھینکا۔ اس بچے نے خندق سے آواز دی ”اَنَا عَلَى الْحَقِّ“ میں حق پر ہوں تم لوگ صبر کرو۔ پھر ماں نے چھلانگ لگا دی تو ماں بھی شہید ہو گئی۔

یہ واقعہ سنایا مسلمانوں کو تسلی دینے کے لیے کہ جس طرح ظالموں نے ظلم کیا تھا اور انجام بد ہوا تھا اسی طرح کفار تمہارے اوپر ظلم کرتے ہیں تو انجام بد کا سامنا ان کو بھی کرنا پڑے گا۔ جنہوں نے خندق کھودی تو اس خندق کی آگ پھیلی اور شہر میں لگ گئی۔ لوگ سارے جل گئے۔ بادشاہ دوڑ کر دریا میں گیا تو غرق ہو گیا۔ سارے ختم ہو گئے۔ مومنین تو جنت میں چلے گئے اور کفار جو ان کو قتل کرتے رہے اور ظلماً مارتے رہے خود اس آگ میں جل کر جہنم میں چلے گئے۔

حضرت عبداللہ بن تامر کا یہ واقعہ یمن میں ہوا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں کسی وجہ سے اس جگہ کو کھودا گیا تو اتفاق سے وہاں ایک بچہ نکلا جس نے ہاتھ اپنی کپٹی پر رکھا ہوا تھا۔ جب اس کا ہاتھ ہٹایا گیا تو خون بہنا شروع ہو گیا اور۔ جب ہاتھ اسی جگہ رکھا گیا تو بچے کا خون نکلنا بالکل بند ہو گیا۔ یمن کے امیر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاتھ وہیں پر رکھو اور اسی طرح بچے کو دفن کر دو۔

### ﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ﴾

قسم ہے آسمان کی جو برجوں والا ہے۔ ”برج“ کہتے ہیں محل کو۔ اصل معنی ہے کھانا۔ تو کھلی ہوئی چیز کو برج کہتے ہیں۔ یہاں برج سے مراد یا تو آسمان کے سیارے ہیں یا برج سے مراد آسمانوں میں بڑے بڑے محلات ہیں جہاں پر فرشتے رہتے ہیں جو آسمانوں کی حفاظت پر مامور ہیں۔

﴿وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ﴾ وَشَهِيدٌ مَّشْهُودٌ ﴿﴾... اور قسم ہے اس



دن کی جس کا وعدہ ہے یعنی قیامت کے دن کی اور قسم ہے اس دن کی جو آتا ہے یعنی جمعہ کا دن، اور قسم ہے اس دن کی جس میں لوگ جاتے ہیں یعنی عرفہ کا دن، چونکہ عرفہ میں لوگ میدان عرفات میں جاتے ہیں اور جمعہ میں لوگ اپنی جگہ پر ہوتے ہیں اس لیے جمعہ کو شاہد اور عرفہ کو مشہود کہہ دیا۔

### اصحابِ اخذ و کا انجام:

﴿قَتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ ﴿٦٠﴾ النَّارِ ذَاتِ الْوُقُودِ ﴿٦١﴾ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ﴿٦٢﴾ وَهُمْ عَلَى مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ﴿٦٣﴾ وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ﴿٦٤﴾﴾

ملعون ہوئے ہیں خندقوں والے؛ اس آگ والے جو ایندھن سے بھری ہوئی تھی، جب وہ اس آگ کے پاس بیٹھے تھے اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کرتے اس کا تماشا بھی دیکھتے تھے اور یہ ظلم کیوں کرتے تھے صرف اس وجہ سے کہ وہ لوگ اللہ عزیز و حمید پر ایمان لائے تھے۔

﴿الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿٦٥﴾﴾

وہ اللہ جس کے قبضہ قدرت میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ﴿٦٦﴾﴾

وہ لوگ جنہوں نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو تکلیفیں دیں، پھر توبہ نہیں کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور جلانے والی آگ ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ ”ثُمَّ“ درمیان میں لا کر

اللہ نے اپنی شان کریمی بتائی ہے کہ اگر اس کے بعد توبہ کرتے تو یہ عذاب نہ آتا، پھر توبہ بھی نہیں کی۔ یہ ”ثُمَّ“ تراخی کے لیے بھی ہوتا ہے کہ ان کو مہلت ملی کہ توبہ کریں لیکن انہوں نے توبہ بھی نہیں کی۔

### اہل ایمان کی کامیابی:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ﴾

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

جہاں ان مجرمین کا ذکر کیا تو ساتھ ایمان والوں کی نعمتوں کا بھی ذکر کیا۔

﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ﴾ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِي وَيُعِيدُ ﴿۱۳﴾ وَهُوَ الْعَفُوُّ الْوَدُودُ ﴿۱۴﴾

آپ کے رب کی پکڑ بہت سخت ہے، وہی پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ اللہ معاف بھی فرماتے ہیں، محبت بھی فرماتے ہیں۔

﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ﴾ فَعَالٌ لِّمَآ يُرِيدُ ﴿۱۵﴾

اللہ عرش کا مالک ہے اور بزرگی والا ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

### اہل کفر کی ناکامی:

﴿هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ﴾ فِرْعَوْنُ وَثَمُودُ ﴿۱۶﴾ بَلِ الَّذِينَ

كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ﴿۱۷﴾ وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ ﴿۱۸﴾ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ ﴿۱۹﴾ فِي

نُوحٍ مَحْفُوظٍ ﴿۲۰﴾

کیا آپ کے پاس لشکر والوں کی بات پہنچی ہے؟ فرعون اور قوم شمود کی۔ جب یہ خبریں پہنچی ہیں تو اس سے لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیے تھی لیکن کافر لوگ پھر بھی تکذیب میں لگے ہوئے ہیں لیکن اللہ ان سب کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ خدا کی پکڑ سے یہ لوگ کہاں جائیں گے۔ باقی ان لوگوں کے جھٹلانے سے قرآن کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ فرمایا: قرآن مجید ویسی ہی عظمت والی کتاب ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔ یہ اگر جھٹلاتے ہیں تو اس کا خمیازہ خود بھگتیں گے۔

اللہ ہم سب کو ایمان پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاحِزْ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الطارق

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ۝ النَّجْمُ

الثَّاقِبُ ۝﴾

”طارق“ کسے کہتے ہیں؟

قسم ہے آسمان کی اور طارق کی۔ طارق کا معنی ہے جو رات کو آئے۔ فرمایا کہ: آپ کو پتا ہے کہ طارق کیا ہے؟ وہ ستارہ ہے جو بالکل روشن ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ جب قرآن میں ”وَمَا أَدْرَاكَ“ کا لفظ آئے تو اس کا ترجمہ کرنا سیکھو۔ جب ہم اپنے محاورات میں بات کریں تو یوں کہتے ہیں: یہ جو مہمان آئے ہیں پتا ہے کون ہیں؟ یہ فلاں صاحب ہیں۔ اب یہ ہے ”وَمَا أَدْرَاكَ“ جب ہم اس طرز پر بات نہیں کرتے تو ”وَمَا أَدْرَاكَ“ کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن کریم کیا کہہ رہا ہے۔ اس سے قرآن کی فصاحت اور بلاغت کھل کر سامنے نہیں آتی۔ تو ”وَمَا أَدْرَاكَ“ یہ محاورات میں گفتگو ہو رہی ہے کہ تمہیں معلوم ہے طارق کیا ہے؟ وہ ستارہ ہے جو روشن ہے۔

﴿إِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝﴾

ہر انسان پر ایک نگہبان فرشتہ مقرر ہے۔ یہ ”إِنْ“ نافیہ ہے، ”لَمَّا“ بمعنی

”إِلَّا“ ہے اور یہ حصر کے لیے ہے۔

﴿فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ﴾

انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے؟  
تیسویں پارے میں زیادہ تر مضامین کا تعلق قیامت اور معاد کے ساتھ ہے۔  
مشرکین مکہ کو خطاب ہے جو قیامت کے منکر تھے۔ یہاں ان کو یہ بات سمجھائی ہے کہ  
تم قیامت کے منکر ہو کہ انسان دوبارہ کیسے بنے گا؟ ہڈیوں میں جان کیسے آئے گی؟  
گوشت کیسے چڑھے گا؟ تم نے دیکھا ہے کہ پانی کے نطفے سے اللہ اتنا بڑا انسان بناتا ہے تو  
بنے ہوئے انسان کو دوبارہ بنانا کیا مشکل ہے۔

**صلب اور ترائب کا معنی:**

﴿خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ۖ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ﴾

انسان اس پانی سے پیدا ہوا ہے جو ٹپکنے والا ہے جو پشت اور سینے سے نکلتا ہے۔  
یہ پشت اور سینے سے مراد کیا ہے؟ کیا واقعتاً پشت اور سینہ ہے یا پورا جسم پشت  
اور سینے سے کننا ہے؟ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ جب بھی بچہ پیدا ہوتا ہے تو  
ماں اور والد دونوں کا پانی ملتا ہے تو بچہ پیدا ہوتا ہے، والد کا پانی کمر سے آتا ہے اور ماں کا  
پانی سینے سے آتا ہے، اس لیے ”مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ“ فرما دیا۔

لیکن بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ایسا نہیں بلکہ انسان جس نطفے سے پیدا  
ہوتا ہے وہ نطفہ انسان کے پورے جسم سے بنتا ہے تو نطفے کا وہ حصہ جو سر سے نکلا ہے  
اس سے سر بنتا ہے، نطفے کا وہ حصہ جو پاؤں سے نکلا ہے اس سے پاؤں بنتا ہے، نطفے کا وہ  
حصہ جو ہاتھ سے نکلا ہے اس سے ہاتھ بنتا ہے تو جمع اجزائے بدن نطفہ سے بنتے ہیں لیکن  
انسان کے پورے جسم میں اہم ترین حصے دو ہی ہیں؛ یا انسان کے سامنے کا حصہ یا انسان

کے پیچھے کا حصہ، تو سامنے والے حصے کو سینے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور پیچھے والے حصے کو کمر سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ قرآن کریم کا جو ظاہر ہے وہ یہ نہیں بتا رہا کہ مرد کی پشت اور عورت کا سینہ ہوتا ہے، اس لیے بہتر ہے کہ اس سے مرد کی پشت اور عورت کا سینہ مراد نہ لیا جائے بلکہ یہ کہا جائے کہ پورے جسم سے نطفہ پیدا ہوتا ہے۔

﴿إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۖ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ۚ﴾

وہ اللہ جو اس طرح انسان کو پیدا کر سکتا ہے وہ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ دوبارہ وہ دن کون سا ہو گا؟ فرمایا: جس دن تمام مخفی چیزوں کو کھول دیا جائے گا۔ عقائد کا تعلق انسان کے دل کے ساتھ ہے، آدمی زبان سے کلمہ پڑھے لیکن دل میں کفر ہو تو قیامت کے دن یہ کفر کھول دیا جائے گا۔ آدمی کسی سے بہت اچھا تعلق رکھے لیکن اندر سے جڑیں کاٹا ہو تو قیامت کے دن یہ راز کھل جائے گا۔ آدمی کسی کے ساتھ فساد کرتا ہو اور صورت اصلاح کی ہو تو قیامت کے دن یہ راز کھلے گا۔ تو وہ چیزیں جو دنیا میں انسان چھپا رہا ہے اور پردے ڈال رہا ہے قیامت کو ساری کھول دی جائیں گی۔ اس لیے اللہ ہم کی حفاظت فرمائے۔

کبھی بھی کسی انسان سے منافقانہ تعلق نہیں ہونا چاہیے اور دھوکے سے بچنا چاہیے۔ انسان دنیا میں دھوکہ دے سکتا ہے قیامت میں دھوکہ کیسے دے گا؟ اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔

﴿فَمَالَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ﴾

اور قیامت کا دن ایسا ہو گا کہ نہ انسان کے پاس طاقت ہو گی کہ اللہ کے عذاب سے بچ سکے اور نہ اس کو کوئی بچانے والا کوئی دوسرا مددگار ہو گا۔ آدمی جب بھی مصیبت سے بچتا ہے تو اس کے بچنے کی وہی صورتیں ہیں؛ یا اپنے پاس طاقت موجود ہو یا اس کے پاس معاون ہو۔ قیامت کے دن دونوں صورتیں نہیں ہوں گی۔

## امکانِ قیامت اور وقوعِ قیامت:

﴿وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۚ وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۚ﴾

قسم ہے آسمان کی جس سے مسلسل بارش برستی ہے اور قسم ہے زمین کی کہ جب بچ زمین سے نکلتا ہے تو زمین پھٹ جاتی ہے۔

یہاں یہ بات سمجھیں کہ ایک ہے قیامت کا وقوع اور ایک ہے قیامت کا امکان۔ جہاں تک تعلق ہے امکانِ قیامت کا تو اس کا ردِ منکرین کے پاس کچھ بھی نہیں کہ قیامت واقع ہونا ممکن نہیں ہے، کیوں کہ ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ ان آیات میں اللہ نے امکانِ قیامت پر دلیل دی ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ آسمان سے بارش برسا سکتا ہے اور بچ کو زمین پھاڑ کر نکال سکتا ہے؛ جب یہ ساری باتیں ہو سکتی ہیں تو اللہ دوبارہ انسان کو پیدا کر کے قیامت کیوں نہیں برپا کر سکتا؟! امکانِ قیامت پر بہت سارے دلائل ہیں، یہ امکانِ قیامت کی ایسی عقلی دلیل ہے کہ کوئی عقل مند اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ ہاں البتہ ضد کا کوئی علاج نہیں۔

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ فَصْلٍ ۚ وَمَا هُوَ إِلَّا هَزْلٌ ۚ﴾

یہ جو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے یہ ایسا کلام ہے جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرتا ہے، یہ فضول کتاب نہیں ہے۔

یہ وقوعِ قیامت کی دلیل ہے۔ کیوں کہ وقوعِ قیامت کی بات کرنے والا خود قرآن کریم ہے اور قرآن کریم قولِ فاضل ہے حق اور باطل کے درمیان اور اس کے خلاف تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ تو قرآن کریم کا قولِ فصل ہونا وقوعِ قیامت کی دلیل ہے کہ قیامت ضرور واقع ہوگی۔

## کافروں کو مہلت:

﴿إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۖ وَأَكِيدُ كَيْدًا ۖ﴾

یہ کافر پھر بھی آپ کے خلاف تدابیر اختیار کرتے ہیں تو ہم بھی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ ”کَيْدًا“ سے مراد ہمیشہ بری تدبیر نہیں ہوتی بلکہ مطلق تدبیر کو بھی ”کَيْدًا“ کہتے ہیں۔ تو وہ بھی تدبیریں کرتے ہیں اور ہم بھی تدبیریں کرتے ہیں۔

﴿فَهَلْ انْكفِرِينَ أَمْ لَهُمْ دُوْدًا ۖ﴾

آپ کچھ وقت کے لیے ان کو مہلت دیں۔  
لیکن وہ مہلت کا معنی یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ان کو عذاب نہیں ہوگا، یہ تو ہماری طرف سے ڈھیل ہے جس کو یہ لوگ ہمارا کرم سمجھیں اور جب گرفت کا وقت آئے گا تو ان کو کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



## سورة الاعلىٰ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ ۝۱ الَّذِي خَلَقَ فَسُوَّىٰ ۝۲ وَالَّذِي قَدَّرَ

فَهْدَىٰ ۝۳﴾

سجدوں کی تسبیح:

جب یہ سورت مبارک نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اجْعَلُوهَا فِي سُجُودِكُمْ.<sup>80</sup>

”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَىٰ“ کو اپنے سجدے میں پڑھا کرو، اور احادیث سے یہ بات

ثابت ہے کہ جب سورۃ الاعلیٰ پڑھیں اور حالت نماز میں نہ ہوں تو پھر یہ کہنا چاہیے  
”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَىٰ“۔ سارے ایک بار پڑھ لیں۔ اگر نماز میں ہوں تو پھر نہ پڑھیں۔

﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ ۝۱﴾

تم تسبیح بیان کرو اپنے رب کی جو بہت اعلیٰ ہے۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا

ہوں کہ جیسے ہم کہتے ہیں اسم ذات یک ضربی اللہ.. اللہ.. یہ آیت اس پر مستقل دلیل

ہے۔ کیونکہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا ”سَبِّحْ رَبَّكَ الْأَعْلَىٰ“ کہ تسبیح بیان کرو اپنے رب کی

جو بہت اعلیٰ ہے، بلکہ یہ فرمایا کہ تسبیح بیان کرو اپنے رب کے نام کی جو بہت اعلیٰ ہے اور

نام کیا ہے؟ ”اللہ“... تو قرآن کریم کی آیت سے اللہ کا نام جو اسم ذات ہے اس کا ذکر

کرنا ثابت ہے۔

”سَبِّحْ“ کا معنی کیا ہوتا ہے؟ سَبِّحْ، يُسَبِّحْ، تَسْبِيحًا تسبیح پڑھنا اور اسم

ذات کیا ہے؟ اللہ... اس لیے فرمایا کہ تم تسبیح بیان کرو اپنے رب کے نام کی۔ اللہ اللہ کرنا قرآن کریم کی نص سے ثابت ہے۔

﴿الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى ۖ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى ۖ﴾

جس رب نے پیدا کیا یعنی تمہیں عدم سے وجود میں لایا، پھر مناسب انداز سے بنایا جس کو جیسے بنانا چاہیے اسے ویسے بنایا، پھر ہر چیز کے مناسب کچھ چیزیں تجویز فرمائیں، پھر ان چیزوں کی طرف اس کی رہنمائی بھی فرمائی۔

یہاں اللہ نے چار صفتیں بیان فرمائی ہیں؛ خَلَقَ، فَسَوَّى، قَدَّرَ، فَهَدَى۔ کیسی پیاری ترتیب قائم فرمائی ہے!

### خالق اور موجد میں فرق:

فرمایا: اللہ نے تم کو پیدا کیا۔ خلق کا معنی ہوتا ہے عدم سے وجود میں لانا اور موجود کو نیا ڈیزائن دینے کو ایجاد کہتے ہیں۔ دنیا میں تمام چیزوں کا خالق اللہ ہے اور موجد انسان ہے۔ یہ ہمارے سامنے گھڑی ہے، یہ لوہے سے بنی ہے، تو لوہے کا خالق اللہ ہے لیکن یہ جو گھڑی کی موجودہ صورت ہے اس کا موجد کون ہے؟ انسان۔ تو خالق ہر چیز کا اللہ ہے اور موجد انسان ہوتا ہے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ موجد کچھ وقت کے لیے مالک ہوتا ہے، جب اس چیز کو فروخت کر دے تو اس کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور خالق ہمیشہ ہر چیز کا مالک ہوتا ہے۔ چونکہ ہمارا خالق اللہ ہے تو موت تک ہمارے وجود کا مالک بھی اللہ ہے، انسان کا موجد تو دنیا میں کوئی نہیں ہے، انسان کے علاوہ باقی چیزوں کا خالق اللہ ہے اور موجد انسان ہے۔ وہ جب چیز کو فروخت کرتا ہے تو اس کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے لیکن اللہ کا حق ملکیت ختم نہیں ہوتا، اللہ اپنی مخلوق میں جو فیصلے چاہیں صادر فرمائیں۔

یہ دلیل اچھی طرح سمجھنا! خود کشی کرنا حرام ہے۔ خود کشی اس لیے حرام

ہے کہ جسم کا مالک انسان خود نہیں ہے اس کو ضائع نہیں کر سکتا۔ یہ اللہ کی ملک میں دخل دے رہا ہے جو اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ دلیل اس کی اللہ کا خالق ہونا ہے۔

﴿فَسَوِّى﴾.. پھر اللہ رب العزت نے مناسب انداز میں پیدا فرمایا۔ مثلاً

جیسے اونٹ بنانا چاہیے اس کو ویسے بنایا، جیسا انسان بنانا چاہیے اس کو ویسا بنایا، جس طرح دوسرے جانوروں کو بنانا چاہیے ان کو بنایا۔ تو جس چیز کی جیسے بنانی چاہیے اللہ پاک نے ویسی شکل بنائی۔

﴿قَدَّرَ﴾.. پھر اللہ نے ہر جاندار کے مناسب چیزوں کو تجویز فرمایا۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ انسان کے لیے مناسب ہے کہ گندم کھائے، جانور کے لیے مناسب ہے کہ گھاس کھائے تو جس کے لیے جو چیز مناسب تھی اللہ نے اس کے لیے وہ تجویز فرمائی۔

﴿فَهَدَى﴾.. پھر اس کی طرف رہنمائی بھی فرمائی۔ مثلاً انسان کی طبیعت

ہی ایسی بنائی کہ خود اس کی طرف چلتا ہے۔ بچے کے لیے دودھ مناسب ہے تو اللہ پاک نے دودھ پیدا فرمایا اور دودھ کے لیے کچھ کہنا نہیں پڑتا بچہ از خود دودھ کا مطالبہ کرتا ہے۔ انسان کے لیے مناسب ہے پانی تو پانی کے لیے اس کو کہنا نہیں پڑتا خود بخود اس کی طلب ہوتی ہے۔ اگر سردی ہو تو سردی میں انسان کے مناسب کیا ہے؛ چادر، جرسی کوئی اور چیز اب یہ کہنا نہیں پڑتا بلکہ انسان کی طبیعت میں ہے کہ یہ خود بخود ان چیزوں کو تلاش کرتا ہے۔ یہ معنی ہے ”فَهَدَى“ کا۔

﴿وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۚ فَجَعَلَهُ خُشَبًاۢۙ اٰخُوٰی ۝﴾

اور جس نے زمین سے گھاس اگایا ہے، پھر اس کو سیاہ رنگ کا کوڑا بنا دیا۔

گھاس شروع میں چھوٹا ہوتا ہے پھر بڑا ہوتا ہے، پھر کٹ جاتا ہے، پھر ریزہ ریزہ ہو جاتا

ہے۔ یہ قیامت کے احوال بتائے ہیں کہ جس طرح انسان پیدا ہوتا ہے، پھر اسے چیزیں ملتی ہیں، پھر کھاتا پیتا ہے، پھر عمر گزار کر ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے گھاس ہے کہ پہلے پیدا ہوتا ہے پھر بڑا ہو کر سرسبز ہوتا ہے پھر زرد ہو جاتا ہے، پھر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ حالت تمہاری ہے کہ انسان نطفے سے لے کر بڑھاپے تک کے کئی مراحل سے گزرتا ہے، پھر اس کا دنیا میں وجود ہی نظر نہیں آتا۔

### نسخ کی چند صورتیں:

﴿سَنُقَرِّكَ فَلَا تَنْسَى ۖ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا

يَخْفَى ۚ﴾

ہم آپ کو پڑھائیں گے آپ بھولیں گے نہیں، ہاں جو اللہ چاہے کہ بھول جائیں وہ تو بھول جائیں گے۔ نسخ کی ایک صورت ہے بھول جانا۔ فرمایا:

﴿مَا نُنْسخُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسخُهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا﴾<sup>81</sup>

ہم جس آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا اس کو بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر آیت لاتے ہیں یا اس جیسی لاتے ہیں۔ نسخ کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اللہ بھلا دیتے ہیں اور بسا اوقات ایک آیت کے بدلے میں دوسری آیت لے آتے ہیں۔

پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کو جانتے ہیں جو ظاہر ہیں اور جو مخفی ہیں۔

### پہلے عادت، پھر عبادت:

﴿وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرَى ۚ﴾

یہ آیت بہت سمجھنے والی ہے۔ یہاں ”الْيُسْرَى“ سے مراد ہے آسان

شریعت۔ بظاہریوں ہونا چاہیے تھا ”نَبِيٌّ لَّكَ الْيُسْرَى“ کہ ہم آپ کے لیے شریعت کو بہت آسان کر دیں گے جس پر آپ آرام سے چل سکیں گے لیکن فرمایا کیا؟ ﴿وَوَيْسِرُكَ لِلْيُسْرَى﴾ کہ ہم آپ کو آسان کر دیں گے شریعت کے لیے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم آپ کی طبیعت میں شریعت پر چلنا بنادیں گے، شریعت پر چلنے میں آپ کو دقت محسوس نہیں ہوگی، آپ کے مزاج کو شریعت بنادیں گے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کئی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ جب انسان اعمال کرتا ہے تو شروع میں ریا ہوتی ہے، اس کے بعد عادت بنتی ہے، اس کے بعد عبادت بنتی ہے۔ جب یہ جملہ میں نے سنا تو مجھے بھی سمجھ نہیں آتا تھا لیکن ایک وقت آیا کہ پھر سمجھ میں آیا۔ اس لیے میں بسا اوقات سبق میں چھوٹے طلبہ کو بھی بٹھادیتا ہوں کہ بعض باتیں سمجھ نہیں آئیں گی لیکن یاد ہو جائیں گی اور ایک وقت آئے گا سمجھ بھی آئیں گی۔

حضرت کے اس جملے کا معنی سمجھو! اب ایک طالب علم چھوٹا ہوتا ہے، حفظ کا پھر متوسط کا پھر اولیٰ کا، اب تہجد پڑھنے کو اس کا دل نہیں کرتا لیکن پھر بھی پڑھ لیتا ہے اللہ کے لیے یا استاد جی کے لیے؟ استاد جی کے لیے پڑھتا ہے تو یہ ریا ہے۔ ہمارے ہاں ریا کا مفہوم خاص ہے کہ آدمی دکھاوے کے لیے پڑھے یا شہرت کے لیے پڑھے حالانکہ ریا کے مفہوم میں وسعت ہے۔ دکھاوے کا ایک معنی شہرت ہے اور دکھاوے کا ایک معنی شہرت تو نہیں لیکن خوف ہے کہ لوگوں کو پتا چل جائے کہ نماز پڑھی ہے۔ بسا اوقات چھوٹے بچوں کا وضو بھی نہیں ہوتا لیکن پھر بھی پڑھتے ہیں۔

یہ اعمال شروع میں کیا ہیں؟ ریا ہے۔ اس کے بعد عادت، عادت کا معنی کہ انسان بہت سارا وقت نماز میں ایسا گزارتا ہے کہ اس کے ذہن میں قیامت کا استحضار بھی نہیں ہوتا، جنت اور جہنم کا استحضار بھی بوقت عبادت نہیں ہوتا، بس وہ روٹین سے چل رہا ہوتا ہے کہ نماز بھی پڑھنی ہے، تہجد بھی پڑھنی ہے، تلاوت بھی کرنی ہے۔ اب

دیکھیں! جو آپ اسباق پڑھتے ہیں ان کا پڑھنا باعثِ اجر ہے، باعثِ ثواب ہے، اس پر اللہ راضی ہوتے ہیں، قیامت کے بعد جنت ملتی ہے لیکن کوئی طالب علم صرف پڑھ رہا ہو، کوئی نحو پڑھ رہا ہو تو اس کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں ہوتا کہ میں صرف و نحو پڑھ رہا ہوں اور اس سے قرآن سمجھ میں آئے گا اور ثواب ملے گا لیکن بس وہ پڑھ رہا ہوتا ہے، یہ اس کی عادت بنی ہوئی ہوتی ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ ردِ فرقِ باطلہ پر کوئی کتاب پڑھنے کو بھی عبادت سمجھتا ہے کہ اس سے مقصود دشمن کا رد ہے۔

### ردِ فرقِ باطلہ ایک مشکل کام ہے:

حضرت مولانا حیات رحمہ اللہ فاتحِ قادیان یہاں چوکیہ میں بھی رہے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ مرزائیت پر سب سے بڑے مناظر رہے ہیں۔ حضرت نے ایک مرتبہ بنیانِ پہنی ہوئی ہے اور نیچے لنگی باندھی ہوئی ہے، سخت گرمی میں پسینہ بہہ رہا ہے اور چاروں طرف مرزے کی کتابیں پڑی ہوئی ہیں۔ امیر شریعت رحمہ اللہ یا کوئی اور تشریف لائے تو انہوں نے فرمایا کہ کیا پڑھ رہے ہو؟ اس پر حضرت مولانا حیات رحمہ اللہ نے کہا کہ حضرت! کیا پڑھنا ہے، لوگ قرآن پڑھتے ہیں، تلاوت کرتے ہیں اور میں ہر وقت مرزے کی گالیاں پڑھتا ہوں، ہر وقت اس کے گند کو کھولے بیٹھا ہوں، مجھے تو اپنی زندگی بھی عجیب لگتی ہے۔ فرمایا کہ اس پر اللہ تعالیٰ آپ کو قرآن پڑھنے سے بھی زیادہ اجر دے گا! یہ کتنا مشکل ہے امت کے ایمان کو بچانے کے لیے ایسی باتیں پڑھنا جن کو پڑھنے کے لیے دل بھی تیار نہیں ہو رہا۔ یہ اتنا مشکل کام ہے! اس پر اللہ کی طرف سے بہت مقبولیت ملتی ہے۔

تو خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اعمال پہلے ریا... پھر عادت... پھر عبادت... بڑی دیر کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ اللہ انسان کی طبیعت کو ایسا بناتا ہے کہ شریعت پر عمل کرنے میں اس کو راحت محسوس ہوتی ہے۔ ظہر کا وقت

ہے اور گرمی بہت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال سے فرماتے ہیں: ”یَا بِلَالُ اِرْحَنَّا“ ہمیں اذان سے راحت پہنچاؤ۔<sup>82</sup>

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے راحت ملتی ہے۔

دیکھیں! آج ایک وقت ہے، جوانی کی مستی ہوتی ہے، آدمی دوپہر کو سوتا ہے استاد بھی اٹھائیں تو اٹھنے کو دل نہیں کرتا لیکن آپ اس کو برداشت کریں! ایک وقت آئے گا کہ آپ ظہر پڑھ کر عصر کا انتظار کریں گے کہ اذان کب ہو اور میں عصر کی نماز پڑھوں، کب تہجد کا وقت ہو کہ میں اٹھ جاؤں! اللہ سب کو یہ چیزیں عطا فرمائے۔

**نصیحت مؤمنین کے لیے سودمند:**

﴿فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى﴾

اگر نصیحت کا فائدہ ہے تو آپ نصیحت کرتے رہیں۔

یہاں ”اِنْ“ شرط کے لیے نہیں ہے کہ اگر نصیحت کا فائدہ ہو تو نصیحت کریں اور نہ ہو تو نہ کریں، ایسا نہیں ہے، یہ محاورات ہیں۔ جس طرح ہم کہتے ہیں: بھائی! اگر تم طالب علم ہو تو تمہیں یہ کام کرنا چاہیے، اگر تم انسان ہو تو بات سمجھو! اب اس میں کوئی شک ہے کہ مخاطب انسان نہیں ہے؟ یہ صرف یاد دہانی ہوتی ہے، اس میں شرط مقصود نہیں ہوتی۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ نصیحت تو ہوتی ہی نفع کے لیے ہے یعنی اے پیغمبر! اگر نصیحت کا فائدہ ہے تو آپ کرتے رہیں یعنی آپ نصیحت کرتے رہیں نصیحت کا فائدہ ہوتا ہے۔

﴿سَيَذَكِّرْ مَنْ يَخْشٰى﴾ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقٰى ﴿۱۱﴾ الَّذِیْ یَصْلٰی النَّارَ

اَنْكُبْزٰی ﴿٧٧﴾ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰی ﴿٧٨﴾

لیکن نصیحت سے فائدہ وہی حاصل کرتا ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ بد بخت آدمی نصیحت سے دوڑتا ہے۔ بد بخت وہ شخص ہے جو جہنم میں داخل ہو گا جو بہت بڑی آگ ہے۔ ”النَّارُ الْكُبْرٰی“ دنیا کی آگ چھوٹی ہے اور جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے بڑی ہے۔ یہ بندہ نہ اس میں مرے گا نہ اس میں زندہ رہے گا۔ ”مرے گا نہیں“ یہ بات تو سمجھ آتی ہے لیکن ”زندہ نہیں رہے گا“ اس کا مطلب کیا ہے؟ ”لَا یَحْيٰی“ کا معنی یہ ہے کہ راحت کے ساتھ زندہ نہیں رہے گا، موت تو آئے گی نہیں اور زندہ بھی نہیں رہے گا، مطلب یہ ہے کہ وہ زندگی راحت والی نہیں ہوگی، وہ موت سے بدتر زندگی ہوگی۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

**تزکیہ نفس کا میابی کا ذریعہ:**

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكٰی ﴿٧٩﴾ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلٰی ﴿٨٠﴾﴾

وہ شخص کامیاب ہے جس نے اپنی اصلاح کر لی اور اپنے رب کے نام کو یاد کیا۔

اب دیکھو! یہاں یہ نہیں آیا کہ جس نے اپنے رب کو یاد کیا بلکہ آرہا ہے ”وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلٰی“ کہ اپنے رب کے نام کو یاد کیا۔ اس سے اللہ اللہ کا ذکر سمجھ آتا ہے۔ کتنی قرآنی آیات ہیں جن سے اللہ کے نام کا ذکر ثابت ہے۔ بعض لوگ پھر بھی کہتے ہیں کہ اللہ اللہ کرنا بدعت ہے۔

**قرآن سے اللہ اللہ کا ثبوت:**

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھیں۔ میں کئی بار کہتا ہوں کہ میرے بہت سارے تعجبات ہوتے ہیں۔ مجھے اس پر بہت تعجب ہوتا ہے کہ جب ہم کہیں گے کہ



بھائی ذکر کرو! تو فوراً سوال ہوتا ہے کہ اللہ اللہ کہاں سے ثابت ہے؟ ہم نے کہا: ہمارے مشائخ مکتے ہیں، ہمارے بزرگ کرتے ہیں۔ بزرگ کیا ہوتے ہیں؟ قرآن پیش کرو! ہم نے قرآن پیش کیا: ﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى﴾ کہ وہ شخص کامیاب ہے جس نے اپنے رب کا نام لیا۔ کہتا ہے: اس کے تحت کس نے لکھا ہے کہ اس سے مراد اللہ کا ذکر ہے؟ ہم نے کہا: پھر بزرگ آگئے! جب ہم یہ کہتے ہیں کہ بزرگ ذکر کرتے ہیں تو تم نے کہا کہ آیت پیش کرو! جب ہم نے آیت پیش کی ہے تو اب کہتے ہو کہ اس کا معنی کس بزرگ نے کیا ہے؟ تعجب والی بات ہے! میں اسی لیے کہتا ہوں کہ جب گفتگو ہوتی ہے تو ایک بنیاد بناؤ۔

جب یہ لوگ دلیل میں امام حرین پیش کرتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ طے کرو کہ دلیل میں امام حرین ہو گا بس! پھر جب ہم امام حرم کے مسئلے ان کے خلاف پیش کرتے ہیں تو پھر کہتے ہیں کہ ہم ان کے مقلد ہیں؟ ہم نے کوئی ان کا کلمہ پڑھا ہے؟ اس لیے کہتا ہوں کہ ایک بات طے کرو؛ یاد لائل طے کرو یا شخصیات طے کرو۔

﴿بَلْ تُوْتِرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۖ وَالْآٰخِرَةَ خَيْرٌ ۚ وَآبَتُنِي ۖ﴾

لیکن تم لوگ ایسے ہو کہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی بھی رہے گی۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ﴾<sup>83</sup>

جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ کان تمہارے پاس ہے اس نے ختم ہو جانا ہے اور اس سے جو تم نے نیک بات سنی ہے وہ اللہ کے پاس چلی گئی اُس نے باقی رہنا

ہے۔ آنکھ تمہارے پاس ہے اس نے ختم ہو جانا ہے اور اس سے جو تم نے صحیح دیکھا ہے وہ اللہ کے پاس ہے اُس نے باقی رہنا ہے۔ زبان تمہارے پاس ہے اس نے ختم ہو جانا ہے اور تم نے اس سے جو نیک بات کی ہے، قرآن پڑھا ہے، درود شریف پڑھا ہے؛ وہ باقی رہے گا۔

﴿إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ (۱۸) صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ (۱۹)﴾

یہ مضمون صرف قرآن میں نہیں ہے بلکہ پہلے صحیفوں میں بھی ہے، وہ پہلے صحیفے یعنی ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے صحیفے عطا فرمائے تھے اور موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے پہلے دس صحیفے عطا فرمائے اور بعد میں تورات عطا فرمائی۔

وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الغاشية

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ ۝١﴾

کیا آپ کے پاس اس واقعے کی خبر آئی ہے جو سب کو ڈھانپ لے گا۔ اس واقعے سے مراد قیامت ہے۔

مشقت برداشت کریں لیکن اللہ کے دین کے لیے:

﴿وُجُوهٌ يُّؤْمِنُ خَاشِعَةً ۝٢ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝٣ تَصَلَّى نَادًا

حَامِيَةً ۝٤﴾

جس دن بعض چہرے ذلیل اور رسوا ہوں گے۔ محنت کر کر کے تھکے ہوں گے اور گرم آگ میں داخل ہوں گے۔

”محنت کر کر کے تھکے ہوں گے“ اس کا کیا معنی ہے؟ اللہ فرماتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدًا فَلَئِنَّ لَكَ<sup>84</sup>

اے انسان! تو نے مشقت اٹھاتے اٹھاتے اپنے رب تک پہنچ جانا ہے۔

تو ہر آدمی نے مشقت برداشت کرتے کرتے اللہ کے پاس جانا ہے۔ اگر

بندے نے مشقت میں نیک کام کیے ہوں گے تو بدلہ اچھا ملے گا:

﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۖ فَسَوْفَ يُحَاسِبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۖ﴾<sup>85</sup>

اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا اور حساب آسان ہوگا، اور اگر مشقت اٹھائی ہوگی لیکن گناہوں میں اور اللہ کی نافرمانی میں تو بدلہ برا ہوگا:

﴿وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ۖ فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۖ﴾<sup>86</sup>

نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں ملے گا، ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہوں گے۔ اس وقت بندہ موت کو پکارے گا۔

اللہ نے یہاں ”عَامِلَةً تَأْصِبَةً“ میں یہ بات سمجھائی کہ مشقت تو ہر بندہ برداشت کرتا ہے مثلاً ایک شخص نکاح کرتا ہے تو پیسے خرچ کرتا ہے، اب مشقت اس نے بھی کی ہے اور ایک بندہ زنا کرتا ہے اور پیسے خرچ کرتا ہے تو مشقت اس نے بھی کی ہے لیکن جنہوں نے خدا کی نافرمانی میں مشقت اٹھائی تو یہی وہ لوگ ہیں جن کے چہروں پر ذلت اور رسوائی چھائی ہوگی۔ یہ لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ محنت بھی کی لیکن خدا کی رضا کو نہ پاسکے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

### حضرت عمر اور عیسائی راہب:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ملک شام میں گئے۔ آپ سے ملنے کے لیے ایک عیسائی راہب آیا۔ اپنے مذہب کی عبادات، ریاضت اور محنت و مشقت کی وجہ سے اس کا چہرہ سوکھا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو رو پڑے۔ کسی نے کہا کہ امیر المؤمنین! آپ کیوں روتے ہیں؟ فرمایا کہ اس کا چہرہ دیکھتا ہوں کہ اس نے کتنی

85۔ الانشقاق 84:7، 8

86۔ الانشقاق 84:10، 11

محنت و مشقت کی لیکن اللہ کو پھر بھی راضی نہ کر سکا! کیوں کہ اس کا عقیدہ ٹھیک نہیں ہے، عیسائی ہے، عقائد کو بنیادی دخل ہے اعمال کے قبول ہونے میں۔ اس لیے پوری دنیا میں ہماری تحریک کی بنیاد عقائد ہیں، عقائد میں خلل آگیا تو اعمال قبول ہوں گے ہی نہیں اور عقائد ٹھیک ہو گئے تو پھر اللہ سے بہت امید ہوتی ہے بخشش کی۔

نیک اعمال کا بدلہ اچھا ہے اور برے اعمال کا بدلہ برا ہے۔ جیسا انسان عمل کرتا ہے اسی کے مطابق انسان کو جزا اور سزا ملتی ہے۔ جو شخص دنیا میں اللہ کے لیے مشقت برداشت کرتا ہے اللہ قیامت کے دن اس کو عزت دے گا اور جو دنیا میں اللہ کے لیے مشقت برداشت نہیں کرتا تو اللہ قیامت کے دن اس کو ذلیل کر دیں گے۔ اس لیے آدمی اللہ کے لیے مشقت برداشت کرے، اللہ کے لیے باتیں سنے، اللہ کے لیے مار کھائے، اللہ کے لیے تکلیف برداشت کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کی رسوائی سے محفوظ فرمائیں گے۔

﴿نَادًا حَامِيَةً﴾... اس آگ کی صفت ”حَامِيَةً“ بیان کی ہے جس کا معنی ہے؛ گرم۔ آگ تو ویسے بھی گرم ہوتی ہے پھر اس کو ”حَامِيَةً“ کیوں فرمایا؟ دراصل اس میں اس آگ کی گرمی کے تسلسل کو بیان کیا ہے کہ یہ آگ ایسی ہوگی جو مسلسل گرم رہے گی، اس کی گرمی میں کمی نہیں آئے گی۔

**جہنمیوں کی خوراک؛ گرم پانی اور ضریح**

﴿تُسْقَىٰ مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۖ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْحٍ ۝۱﴾

کھولتے اور ابلتے ہوئے چشموں سے ان کو پانی پلایا جائے گا۔ قیامت کے دن جو ان کو کھانے کے طور پر ملے گا وہ کانٹے دار جھاٹیاں ہوں گی۔

یہاں سوال یہ ہے کہ قرآن کریم میں اہل جہنم کے لیے اور کھانے بھی ہیں، کسی جگہ پر ہے کہ ان کو زقوم دیا جائے گا، کسی جگہ ہے کہ ان کو غسلین دیا جائے گا لیکن

یہاں حصر کے ساتھ فرمایا کہ ان کا کھانا صرف ضریح ہوگا، کانٹے دار جھاڑیاں ہی ملیں گی۔ تو باقی مقامات پر تو اور کھانے بھی ثابت ہیں تو یہاں حصر کے ساتھ کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں پر یہ مقصود نہیں ہے کہ ضریح کے علاوہ ان کو کوئی اور کھانا نہیں ملے گا بلکہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ لذت والا اور فائدہ بخش کھانا ان کو کوئی نہیں ملے گا، جو ملے گا وہ نقصان دہ ہی ہوگا جس طرح کہ ضریح ہے۔ تو یہ بطور مثال بیان فرمایا۔

اور بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ جہنم کے مختلف درجات ہیں، بعض درجات میں ضریح ملے گا اور بعض میں زقوم ملے گا اور بعض میں غسلین ملے گا۔ دوسرا اس پر سوال یہ ہے کہ جہنم تو آگ کا نام ہے اور آگ تو ہر چیز کو جلا کر رکھ دیتی ہے تو وہاں یہ کانٹوں والے درخت کیسے پیدا ہوں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو اللہ کی قدرت ہے، ہو سکتا ہے کہ اس درخت کی خوراک اللہ آگ ہی بنا دے کہ یہ آگ ہی کی وجہ سے زندہ رہے، یہ تو اللہ کا نظام ہے کہ وہ کسی چیز کی خوراک کیا بناتے ہیں۔

﴿لَا يُسْنِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ﴾

نہ اس کھانے سے موٹے تازے ہوں گے اور نہ ہی اس کھانے کی وجہ سے ان کی بھوک ختم ہوگی۔

**جنت کی نعمتیں:**

﴿وَجُودٌ يَوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ﴾ ۱۸ ﴿لِسَعِيهَا رَاضِيَةٌ﴾ ۱۹ ﴿فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ

﴿لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً﴾ ۲۰ ﴿

اب یہاں سے جنتیوں کی صفیں بیان ہو رہی ہیں۔ فرمایا: قیامت کے دن کئی

چہرے تروتازہ ہوں گے۔ اپنی محنت پر خوش ہوں گے۔ وہ بلند جنت میں ہوں گے۔ وہاں کوئی لغو اور بے ہودہ بات نہیں سنیں گے۔

مفسرین نے لکھا ہے جنت کی خوبی ہے کہ وہاں شور نہیں ہوگا کیونکہ شور ہونے سے بندے کو تکلیف ہوتی ہے۔

﴿فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۖ فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ۖ وَ أَكْوَافٌ  
مَّوْضُوعَةٌ ۖ وَ تَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ۖ وَ زَوَاجٌ مُبْتَلَوْنَ ۖ﴾

اس میں چشمے بہتے ہوں گے اور وہاں اونچے اونچے تخت ہوں گے اور پیالے ترتیب سے رکھے ہوں گے اور گاؤتکیے بچھے ہوں گے اور قالین بچھائے ہوں گے۔

### میزبانی کے آداب:

یہ جو ساری باتیں بتائی ہیں میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اللہ رب العزت نے آداب بتائے ہیں کہ جنت میں پینے کے لیے پیالے ترتیب سے رکھے ہوں گے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں پانی پینے کے لیے جگہ ہو وہاں گلاس بھی ہوں، اور استعمال کی وہ چیزیں جو انسان کی ضرورت ہیں ان کو ترتیب کے ساتھ رکھنا یہ آداب معاشرت ہے، اور یہ جنت کی صفات میں سے اللہ نے ایک صفت بیان کی ہے کیونکہ جنت؛ اللہ کی طرف سے اہل جنت کے لیے مہمان خانہ ہے: ﴿نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ﴾<sup>87</sup>

### مہمان خانے اور جیل خانے میں فرق:

قرآن کریم نے جو جنت اور جہنم کا ذکر کیا ہے تو یوں فرمایا:

﴿وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فَتَحَتْ

أَبْوَابُهَا﴾<sup>88</sup>

کفار کو جہنم کی طرف کھینچا جائے گا، جب کفار جہنم کے قریب آئیں گے تو اس کے دروازے کھل جائیں گے۔

اور جنت کے بارے میں یوں فرمایا:

﴿وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَىٰ الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَ

فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا﴾<sup>89</sup>

﴿وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا﴾ میں واو حالیہ ہے یعنی جب اہل جنت آئیں گے تو دروازے کھلے ہوئے ہوں گے۔

اس لیے کہ مہمان کے آنے سے پہلے مہمان خانے کا دروازہ کھلا ہونا یہ قرآن کریم نے ادب بتایا ہے۔ مہمان کھڑا ہو اور تم چابی تلاش کر رہے ہو، دروازہ اسی وقت کھل رہا ہو تو بتاؤ یہ مہمان خانہ ہے یا جیل خانہ ہے؟ جیل کا ماحول یہ ہے کہ جب قیدی آتا ہے اس وقت دروازہ بند ہوتا ہے، چابی لائی جاتی ہے اور دروازہ کھلتا ہے، قیدی کو اندر کرتے ہیں اور پھر دروازہ بند کیا جاتا ہے۔ تو مہمان خانوں کو مہمان خانہ بناؤ، مہمان خانہ کو جیل خانہ نہ بناؤ! مہمان خانہ مہمان کے آنے سے پہلے کھلا ہو، مہمان کی ضرورت مہمان کے آنے سے پہلے موجود ہو، مہمان کو کہنا پڑے کہ بھائی! چائے لاؤ... پانی لاؤ... بھائی! ٹشو مل جائے گا... تو یہ کون سی مہمان نوازی ہے؟ اس لیے مہمان کے آنے سے پہلے اس کی ضروریات کا انتظام کر لینا چاہیے۔



## اونٹ، آسمان، پہاڑ اور زمین:

﴿أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۖ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۖ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۖ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۖ﴾<sup>۱۸</sup>  
یہ لوگ چونکہ قیامت کے منکر تھے تو ان کو ان کے ماحول کی چیزیں ذکر کر کے یہ بات سمجھائی کہ اللہ کے لیے قیامت کو برپا کرنا کیا مشکل ہے؟! فرمایا: کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اللہ نے اسے کیسے بنایا ہے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ اللہ نے اسے کس طرح بلند فرمایا ہے؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح اسے زمین میں گاڑ دیا ہے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ ہم نے کس طرح اس کو بچھا دیا ہے۔

یہ چار چیزیں اللہ نے اس لیے ذکر فرمائی ہیں کہ عرب کے ہاں جنگلات یا پہاڑ یا پھر اونٹ ہوتے تھے، سامنے دیکھیں تو اونٹ ہے، اوپر دیکھیں تو آسمان ہے، نیچے دیکھیں تو زمین ہے، دائیں بائیں دیکھیں تو پہاڑ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اپنے ارد گرد کا ماحول دیکھو! جب یہ سب کچھ اللہ بنا سکتا ہے تو پھر قیامت برپا کرنا اس کے لیے کیا مشکل ہے؟

اور بطور خاص اللہ نے اونٹ کا ذکر کیا، عجیب اللہ پاک کا کرم ہے۔ عرب کے علاقے میں ہاتھی ہوتے تو ان کے لیے پالنا مشکل ہوتا اور اونٹ کو پالنا بہت آسان ہوتا ہے، ایک تو اونٹ اپنی خوراک خود دیتا ہے، درخت ہو تو تمہیں کاٹنا نہیں پڑے گا اونٹ خود اس کے پتے کھائے گا، پتے نہیں ہوں گے تو ٹہنیاں کھائے گا، یہ اونٹ کی صفت ہے۔ عرب میں ریگستان ہیں پانی بہت کم ہوتا ہے، کہیں ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا، اونٹ کے بدن میں اللہ نے اضافی ٹینکی رکھی ہے، اونٹ اتنا پانی پیتا ہے کہ ایک ہفتے سے بھی زیادہ اس پانی سے گزارہ کر سکتا ہے۔

پھر وہاں سفر کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، گرمی بہت سخت ہوتی ہے اور خدا نے

اونٹ کی یہ خوبی رکھی ہے کہ وہ شام سے لے کر صبح تک پوری رات سفر کر سکتا ہے، علاقہ ریگستان کا ہے جس پر چلنا مشکل ہے، اللہ نے عرب کو اونٹ دیے ہیں جن کے پاؤں کے نیچے ایسی چیز ہے جس سے ان کے لیے ریت پر چلنا بہت آسان ہے۔ پھر اونٹ اتنا بڑا جانور ہے کہ اس پر سوار ہونا بہت مشکل تھا، عام جانور اور انسان کو دیکھیں تو ان میں ایک گھٹنا ہوتا ہے لیکن اونٹ کی ٹانگ میں دو گھٹنے ہوتے ہیں، ایک آگے ہوتا ہے اور ایک پیچھے نکلا ہوا ہوتا ہے، اس پیچھے والے گھٹنے پر پاؤں رکھو اور اونٹ پر چڑھ جاؤ! سیڑھی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

پھر چلنے میں گرنے کا خطرہ ہوتا ہے تو اس کے لیے اللہ نے کوہان بنادی ہے کہ اس کو پکڑ لو۔ اللہ تعالیٰ نے کتنی آسانیاں پیدا فرمائی ہیں، اور اس کے مزاج میں اللہ تعالیٰ نے ایسی اطاعت رکھی ہے کہ بچہ نہیں بلکہ پانچ سال کی بچی کو نکیل دے دو تو سو اونٹ اس کے پیچھے چلتے جائیں گے۔

### منصب نبوت:

﴿فَذَكِّرْ ۚ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۚ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ﴾ (٢٢) ﴿إِلَّا مَنْ تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ﴾ (٢٣) ﴿فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ﴾ (٢٤) ﴿إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ﴾ (٢٥) ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ (٢٦) ﴿﴾

میرے پیغمبر! آپ نصیحت فرمائیں آپ کا کام نصیحت فرمانا ہے، آپ ان پر کوئی نگران تو مسلط نہیں ہیں کہ ان کی زیادہ فکر کریں۔ ہاں جو روگردانی کرتا ہے اور کفر اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ ان سب نے ہمارے پاس ہی آنا ہے اور ہم نے ہی ان سب کا حساب لینا ہے۔

اللہ ہم سب کو آخرت کی فکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

## سورة الفجر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝ وَالْيَلِّ إِذَا يُسِيرُ ۝﴾

فجر، دس راتوں، جفت اور طاق سے مراد:

﴿وَالْفَجْرِ﴾ .... قسم ہے فجر کی۔ اس فجر سے مراد ہر روز کی فجر ہے۔

جب ہر روز صبح صادق ہوتی ہے تو اللہ کی نئی شان کا ظہور ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ”الفجر“ سے مراد خاص یوم النحر کی فجر ہے یعنی دس ذوالحجہ کی فجر۔ اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ہر دن کی رات ہوتی ہے صرف یوم النحر ایک ایسا دن ہے جس کی کوئی رات نہیں ہے، یوم النحر ہوتا ہے دس ذوالحجہ کو اور یوم عرفہ ہے نو ذوالحجہ کو کہ جب عرفات کے میدان میں حاجی وقوف کرتا ہے، اسی کا نام اصل حج ہے، حج کارکن اعظم یہی ہے۔ تو یوم عرفہ نو ذوالحجہ کا دن ہے۔ اس سے پہلے کی رات یوم عرفہ کی رات ہے اور اس کے بعد کی رات یہ بھی یوم عرفہ کی رات ہے یعنی یوم عرفہ کی دو راتیں ہیں۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اگر انسان یوم عرفہ کے دن کا کوئی وقت میدان عرفات میں گزارے تب بھی حج ہو گا اور اگر یوم عرفہ کا دن گزار کر اگلی جو رات ہے صبح صادق سے پہلے پہلے وہاں کچھ قیام کرے تب بھی حج ہو جائے گا۔ تو یوم عرفہ سے پہلے کی رات بھی یوم عرفہ کی رات ہے اور اس کے بعد کی رات بھی یوم عرفہ کی رات ہے۔ یوم النحر

ایک ایسا دن ہے جس کی کوئی رات نہیں ہے، اس لیے اس کی بطورِ خاص قسم کھائی ہے کہ ”وَالْفَجْرِ“ قسم ہے فجر کی۔

﴿وَيَسَّالِ عَشِيرَ﴾ ... اور قسم ہے دس راتوں کی۔ عموماً مفسرین ان دس راتوں سے ذوالحجہ کی پہلی دس راتیں مراد لیتے ہیں۔ حدیث میں ان کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ بعض روایات میں ان کی ہر رات کی عبادت کا اجر لیلیۃ القدر کے برابر بتایا گیا ہے اور ہر دن کا اجر سال کے روزوں کے برابر بتایا گیا ہے، اس سے اللہ بچھلی خطاؤں کو معاف فرماتے ہیں۔

﴿وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ﴾ ... قسم ہے جفت اور طاق کی۔ جفت کہتے ہیں جوڑے کو اور طاق کہتے ہیں تنہا کو۔ اب یوم عرفہ؛ نو ذوالحجہ کو دیکھیں تو یہ طاق ہے اور یوم النحر؛ دس ذوالحجہ کو دیکھیں تو یہ جفت ہے، اس لیے بعض حضرات کہتے ہیں کہ نو ذوالحجہ اور دس ذوالحجہ کی قسمیں کھائی ہیں۔

﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَسِرَ﴾ ... اور قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے۔

﴿هَلْ فِي ذَلِكَ قَسَمٌ لِذِي حِجْرٍ﴾

اللہ فرماتے ہیں: کیا عقل والوں کے لیے یہ قسمیں کافی نہیں ہیں؟ کہ کتنی بڑی قسمیں ہم نے کھائی ہیں۔

”حِجْر“ کا معنی ہوتا ہے ”المنع“ یعنی روکنا۔ چونکہ عقل انسان کو گناہوں سے اور گندی باتوں سے روکتی ہے اس لیے بسا اوقات عقل کو بھی حجر سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

**قوم عاد کا انجام:**

﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۖ إِرْمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۖ﴾

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے عاد کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ یعنی قوم ارم کے ساتھ جو اونچے اونچے ستونوں والی قوم تھی۔

یہ عاد؛ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ نوح علیہ السلام کے بیٹے سام تھے اور ان کے بیٹے ارم تھے اور ان کے بیٹے عاص تھے اور عاص کے بیٹے عاد تھے۔ تو عاد کا سلسلہ نسب یوں ہے: عاد بن عاص بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام۔ ارم کے دو بیٹے تھے؛ ایک تو عاص تھے اور دوسرے بیٹے عابر تھے اور عابر کے بیٹے تھے ثمود یعنی ثمود بن عابر بن ارم۔ عاد اور ثمود دونوں ارم پر جا کر مل جاتے ہیں۔ عاد یہ عاص کے واسطے سے ارم میں جا کر مل جاتے ہیں اور ثمود، عابر کے واسطے سے ارم میں مل جاتے ہیں۔

﴿الْمَ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۖ اِذْ مَرَّ ذَاتِ الْعِمَادِ ۖ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۖ﴾... آپ کے رب نے عاد کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ یعنی قوم ارم کے ساتھ۔

قوم عاد دو ہیں: عادِ اولیٰ اور عادِ آخریٰ۔ عادِ اولیٰ کون تھے؟ اور عادِ آخریٰ کون تھے؟ نوح علیہ السلام کے ایک بیٹے ہیں سام اور ان کے بیٹے ہیں ارم۔ پھر ان ارم کے بیٹے ہیں عاص اور ان کے بیٹے ہیں عاد۔ اسی طرح ارم کے دوسرے بیٹے تھے عابر اور عابر کے بیٹے تھے ثمود۔ ارم پر عاد اور ثمود دونوں ملتے ہیں۔ اگر عاد کے سلسلہ کو دیکھیں اور اوپر جائیں تو اوپر ارم ہے اور نیچے آئیں تو عاد ہے۔ تو بسا اوقات قوم ارم کو ”عادِ اولیٰ“ کہتے ہیں اور قوم عاد کو ”عادِ آخریٰ“ کہتے ہیں۔ عذاب ان دونوں پر آیا تھا لیکن یہاں تصریح کر دی گئی کہ یہاں عاد سے مراد عادِ اولیٰ ہے جو کہ قوم ارم ہے۔ یہ لوگ ایسے تھے کہ ان کے جسم ستونوں کی طرح تھے، بہت قد کاٹھ تھا، ان جیسے جسموں والے بندے اللہ نے دنیا میں پیدا نہیں کیے۔

## قوم ثمود کی پکڑ:

﴿وَتَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِیِّ﴾

اور آپ کے رب سے قوم ثمود کے ساتھ کیا کیا جنہوں نے وادی قریٰ میں چٹانیں تراشی تھیں۔

یہ لوگ وادی القریٰ میں رہتے تھے۔ ”الْوَادِی“ یہ مخفف ہے وادی القریٰ کا۔ یہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر ان میں اپنے مکان بناتے تھے۔ میں نے ان مکانات کو دیکھا ہے۔ بندے کو بہت تعجب ہوتا ہے اور یقین نہیں آتا بغیر مشینوں اور جدید آلات کے ایسا کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ غاریں ہیں اور ان میں مکان بنے پڑے ہیں۔ اندر جائیں تو عجیب طرح کا نظام ہے۔ ان کے سونے کے لیے جو بستر ہوتے تھے وہ ایسے تھے جیسے ہمارے ہاں قبریں ہوتی ہیں۔ غار کھودی ہے، غار میں نیچے جگہ بنی ہوئی ہے سونے کے لیے۔ ہماری چارپائی تو اوپر ہوتی ہے لیکن ان کی جگہ نیچے قبر کی طرح کھودی ہے، تقریباً ایک فٹ نیچے جگہ ہوتی تھی، وہاں لیٹنے کی جگہ بناتے تھے۔ یہ نظام تھا اس قوم ثمود کا۔ یہ کتنی پرانی بات ہے لیکن ابھی تک وہاں نشانات موجود ہیں۔

## میںخوں والے فرعون کا حشر:

﴿وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ﴾

اور آپ کے رب سے فرعون کے ساتھ کیا کیا جو میںخوں والا تھا۔ فرعون بد بخت کی عادت یہ تھی کہ جب کسی کو سزا دیتا تو اس کے دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں میں میخیں گاڑ دیتا تھا اور سانپ اور بچھو اوپر چھوڑ دیتا تھا سزا کے لیے۔

﴿الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ﴾ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفُسَادَ ﴿۱۳﴾ فَصَبَّ

عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿۱۴﴾

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے شہروں میں سرکشی کی اور بہت فساد برپا کیا پھر خدا نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔

عذاب کے ساتھ کوڑے کا لفظ اس لیے ذکر کرتے ہیں کہ عام طور پر جب کوڑا مارتے ہیں تو ایک جگہ نہیں مارتے بلکہ جسم کے مختلف حصوں پر مارتے ہیں۔ تو بتایا یہ جارہا ہے کہ ان پر مختلف قسموں کا عذاب آیا تھا۔

**اللہ کے گھات میں ہونے کا معنی:**

﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبَاسٌ صَادٍ﴾

بے شک تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے۔

یہ صرف تعبیر ہے سمجھانے کے لیے ورنہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کیسے گھات لگائے ہوئے ہیں۔ آپ نے ”القواعد فی العقائد“ میں یہ بات پڑھی ہے کہ انسانی عقول پر چونکہ محسوسات اتنے غالب ہیں کہ محسوس والی تعبیر کیے بغیر معقول سمجھ ہی نہیں آتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو سمجھانے کے لیے ایسے ذکر کیا جاتا ہے کہ جیسے محسوسات ہوتی ہیں کیونکہ ان کے بغیر بندہ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ دنیا میں بندے کو سمجھ آتا ہے کہ جب کسی کو پکڑنا ہو تو بندہ گھات لگا کر بیٹھ جاتا ہے تو دشمن کو پکڑ لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی گرفت میں لیتے ہیں جس طرح ان کے شایان شان ہے۔ یہ انسان کے علم میں نہیں لیکن سمجھانے کے لیے بتایا ہے کہ جس طرح انسان گھات میں بیٹھا ہو تو فوراً پکڑتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ انسان کو نظر نہیں آتے لیکن جب گرفت کا ارادہ فرماتے ہیں تو فوراً پکڑ فرما لیتے ہیں۔

**انسان کی ناشکری کا بیان:**

﴿فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَغَىٰ رُبَّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ ۖ فَيَقُولُ

رَبِّیْ اَكْرَمَنِ ﴿١٥﴾ وَاَمَّا اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهُ ۚ فَيَقُوْلُ رَبِّیْ اِهَانَنِ ﴿١٦﴾

اللہ تعالیٰ نے یہاں انسان کی دو حالتیں بیان فرمائی ہیں کہ جب اللہ اس کو آزمائش میں مبتلا کریں؛ عزت دے دیں، نعمتیں دے دیں تو انسان کہتا ہے ”رَبِّیْ اَكْرَمَنِ“ کہ میرے رب نے مجھے عزت دی ہے، اور جب اللہ اس کی آزمائش کریں کہ اس کا رزق تنگ کر دیں تو انسان کہہ اٹھتا ہے کہ اللہ نے مجھے رسوا کر دیا۔

پھر انسان اس وقت روتا ہے کہ خدا نے مجھے ذلیل کر دیا، میرا پیسہ ختم کر دیا۔ اگر اللہ کسی کو دولت دیں تو یہ سمجھتا ہے کہ میں دولت کا مستحق تھا، میں عزت کا مستحق تھا اس لیے خدا نے مجھے عزت دی ہے اور اگر دولت نہ دیں تو یہ سمجھتا ہے کہ میں دولت کا مستحق تھا لیکن خدا نے مجھے دولت نہ دے کر رسوا کیا ہے۔ انسان اس آزمائش سے جو سمجھتا تھا اس کا نتیجہ دو باتیں ہیں:

نمبر ایک... کہ عزت اور ذلت کا مدار مال پر ہے، مال مقصود بالذات ہے کہ جس کو مال ملا تو اسے عزت مل گئی اور جس کو مال نہیں ملا تو اسے ذلت مل گئی۔

نمبر دو... ان کا خیال تھا کہ ہم اس بات کے مستحق ہیں کہ ہمیں مال ملنا چاہیے۔ اس لیے اگر ملے تو خوش ہوتے ہیں کہ ہم مستحق تھے تو ہمیں مل گیا اور اگر نہ ملے تو اس پر کہتے ہیں کہ ہم مستحق تھے تو ہمیں کیوں نہیں دیا، ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔

تو یہ دو بنیادی باتیں ہیں جو انسان کہتا ہے۔

نیکی کے کام:

﴿كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿١٧﴾ وَلَا تَحْضُوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿١٨﴾ وَتَأْكُلُوْنَ الثَّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَتُحِبُّوْنَ اَلْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾﴾



اللہ فرماتے ہیں: ”کَلَّا“ یہ بات ہر گز نہیں، تمہاری یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ مال مقصود بالذات نہیں اور تم اس کے مستحق بھی نہیں ہو۔ یہ تو تمہارے دو جرم تھے ہی کہ جو مقصود بالذات نہیں تھا تم نے اس کو مقصود سمجھ لیا اور یہ کہ تم مستحق نہیں تھے اور تم نے اپنا استحقاق سمجھ لیا۔ ان دو جرموں کے علاوہ تمہارے جرم کچھ اور بھی ہیں۔ وہ کون سے ہیں؟ فرمایا: تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور مسکین کے کھانے کی ترغیب نہیں دیتے اور میراث کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے محبت بھی بہت زیادہ کرتے ہو!

یہاں یہ بات سمجھیں کہ یتیم کو صرف کھانا کھانا کافی نہیں بلکہ یتیم کو کھانا کھانا اور عزت کے ساتھ کھانا ضروری ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿بَنَ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ﴾ بلکہ تم تو یتیم کی عزت بھی نہیں کرتے۔ اگر کوئی شخص کھانا کھلا بھی دے اور عزت نہ کرے تو اس نے قرآن کریم کے حکم پر عمل نہیں کیا، کھانا بھی کھلائیں اور عزت کے ساتھ کھلائیں۔

﴿وَلَا تَخْضَوْنَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمَسْكِينِ﴾ مسکین کو خود بھی کھانا کھلائیں اور کھانا کھلانے کی ترغیب بھی دیں۔ قرآن کریم میں یتیم اور مسکین اور فقیر کو کھلانے کی بہت ترغیب آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے تو بندے کو اس کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿وَتَأْكُلُونَ الثَّرَاثَ أَكْلًا لَّئْسَ﴾... ”لَمْ“ کا معنی ہے ”بیم“، یعنی تم وراثت کے سارے مال کو خود ہڑپ کر جاتے ہو کہ جن کا استحقاق ہے ان کو نہیں دیتے۔ یہ بھی تمہارا جرم ہے۔

﴿وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَنًّا﴾... ”جَنًّا“ سے مراد ہے ”بہت زیادہ“

یعنی تم مال سے بہت زیادہ پیار کرتے ہو، اتنا بھی نہیں کرنا چاہیے کہ حقوق کی رعایت نہ کر سکو۔

### کفر کی وجہ سے جہنم اور اعمالِ بد کی وجہ سے ازدیادِ جہنم:

اصل میں یہاں بات چل رہی تھی کفار اور مشرکین کی اور آگے ذکر فرمایا ہے ان کے اعمال کو، کیونکہ ان کا اصل جرم؛ کفر اور شرک ہے، یہ جو جرم بیان فرمائے ہیں ﴿كَلَّا بَلْ لَّا تُشْكِرُ مَوْنَٰنِیَّتِیْمَ ۝۱۴ وَلَا تَخْضَوْنَ عَلَی طَعَامِ الْمِسْكِیْنَ ۝۱۵﴾ تَاْكُلُوْنَ التَّرَاثَ اَخْلَاۤءُنَا ۝۱۶﴾ وَتُحِبُّوْنَ اَلْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝۱۷﴾ یہ اس کفر اور شرک کے جرم پر اضافی ہیں۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا۔ کہ جب کفار سے پوچھا جائے گا کہ ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِی سَفَرٍ ۝۱۸﴾ کہ تمہیں جہنم میں کس چیز نے ڈالا؟ تو وہ جواب دیں گے: ﴿لَمْ نَكُ مِنَ الْمَصْلِیْنَ ۝۱۹﴾ وَ لَمْ نَكُ نَطْعُمُ الْمِسْكِیْنَ ۝۲۰﴾ کہ ہم نماز بھی نہیں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا بھی نہیں کھلاتے تھے۔ تو کفار نے اپنے اعمال بیان کیے۔

سوال یہ ہے کہ کافر کو جہنم اور جہنم کی سزا کفر کی وجہ سے ملے گی اعمال چھوڑنے کی وجہ سے نہیں ملے گی تو پھر جواب میں انہوں نے اعمال کا ذکر کیوں کیا کہ ہمیں اس لیے سزا مل رہی ہے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، ان پر تو نماز فرض ہی نہیں ہے، نماز اور صدقات فرض اس پر ہیں جو کلمہ پڑھ چکا ہو، جس نے کلمہ ہی نہیں پڑھا تو اس پر نماز اور زکوٰۃ فرض نہیں، وہ احکام کا مکلف نہیں ہے تو پھر احکام پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے اس کو سزا کیوں ملتی ہے؟

وہاں بھی میں نے بات کی تھی اور یہاں پھر سمجھ لیں! ایک ہے عذاب اور ایک ہے امتدادِ عذاب، ایک ہے عذاب اور ایک ہے ازدیادِ عذاب، ایک ہے نفس

عذاب اور ایک ہے زیادتی عذاب... کافر اور مشرک کو جہنم میں عذاب ہو گا کفر کی وجہ سے اور اس عذاب میں اضافہ ہو گا بد عملی کی وجہ سے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان مؤمن ہو تو جنت ملتی ہے ایمان کی وجہ سے اور جنت بڑھ جاتی ہے انسان کے اعمال کی وجہ سے، نفس ایمان پر تو جنت کا وعدہ ہے اور جب ایمان کے ساتھ اعمال بھی بڑھ جائیں تو جنت بھی بڑھتی جائے گی۔ اسی طرح نفس کفر پر جہنم کی وعید ہے اور جب کفر کے بعد اعمال بد بڑھ جائیں گے تو جہنم کی سزا بھی بڑھتی جائے گی۔ تو نفس جنت ایمان کی بنیاد پر ہے اور جنت بڑی ہونا اور مزید نعمتیں ہونا یہ اعمال کی وجہ سے ہے، اسی طرح نفس جہنم یہ کفر کی وجہ سے ہے اور اس میں مزید سزاؤں کا بڑھنا بد اعمالیوں کی وجہ سے ہے۔

### قیامت کے دن زمین کا بھونچال:

﴿كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا﴾

فرمایا: ”کلَّا“ ہر گز ایسا نہیں! یہاں ”کلَّا“ کا معنی یہ ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ یتیم کی عزت کریں گے تو کیا ہو گا آخرت میں تو کچھ ملنا نہیں! مسکین کو کھلائیں گے تو آخرت میں تو کچھ ملنا نہیں! جتنا مال جمع کر سکتے ہیں کر لیں یا کسی کے مال کو ہڑپ کر لیں گے تو کون سا ہماری پکڑ ہو گی کیوں کہ ہم نے تو دوبارہ اٹھنا نہیں، فرمایا: ”کلَّا“ تمہاری یہ بات ہر گز درست نہیں!

”دکَّا“ کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو ٹکڑا کر ٹوڑنا۔ فرمایا: جب زمین توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔

﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۚ وَجِئَآ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۚ﴾

يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى ﴿١٦﴾

قیامت کے دن تمہارا پرودگار اور قطاروں میں فرشتے آئیں گے۔ اللہ آئیں گے یہ متشابہات میں سے ہے۔ متشابہات کا معنی اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اللہ کیسے آئیں گے یہ اللہ ہی جانتے ہیں۔ اور جہنم کو گھسیٹ کر لایا جائے گا۔ پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ جہنم کی 70 سے زائد لگائیں ہیں اور ہر لگام پر 70 ہزار سے زائد فرشتے ہوں گے جو اس کو کھینچ کر لائیں گے۔ جہنم کو گھسیٹ کر میدانِ محشر کے قریب لایا جائے گا۔ اس دن کافر انسان کو سمجھ آجائے گی کہ مجھے دنیا میں کیا کرنا چاہیے تھا اور میں نے کیا کیا! لیکن اس وقت یہ سمجھ آنا بے سود ہو گا، اس کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہو گا۔

﴿يَقُولُ يَلَيْتَنِي قَدَّمْتُ حَيَاتِي ۖ فَيَوْمَئِذٍ لَا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ۖ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ ۖ﴾

اس دن وہ کہے گا: اے کاش! میں آج کی زندگی کے لیے کچھ کمالیتا۔ اس دن کا عذاب ایسا اللہ دیں گے کہ اس جیسا عذاب کوئی نہیں دے سکتا اور اللہ ایسی گرفت فرمائیں گے کہ اس دن اس طرح کی گرفت کوئی نہیں کر سکتا۔

### نفس کی تین اقسام:

﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۖ﴾

حساب کتاب کے بعد یہ اعلان ہو گا: اے نفسِ مطمئنہ! - اے وہ انسان جو اطمینان والا ہے اور اللہ کے احکام پر راضی ہے! - اپنے اللہ کی طرف اس طرح لوٹو کہ تم اللہ سے راضی ہو اور اللہ تم سے راضی ہو!

”ارْجِعِي“ یعنی واپس لوٹو... کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ نفسِ مطمئنہ آیا بھی وہاں سے ہے اور جائے گا بھی وہاں پہ۔ تو روح جہاں سے آئی ہے وہیں واپس جائے

پہلے گزر چکا ہے کہ نفس کی تین قسمیں ہیں:  
نفس امارہ... نفس لوامہ... نفس مطمئنہ

فطر تہر نفس؛ نفس امارہ ہے، ہر ایک کی طبیعت میں خدا نے گناہ کا تقاضا رکھا ہوا ہے۔ جب آدمی مشقت برداشت کرتا ہے اور گناہوں کو چھوڑتا ہے، توبہ کرتا ہے تو اس کا نفس؛ نفس لوامہ بنتا ہے اور مسلسل نیکیاں کر کے طبیعت پر جبر کر کے گناہوں سے بچتے بچتے ایک وقت آتا ہے کہ نفس؛ مطمئنہ بن جاتا ہے۔

**اہل اللہ سے محبت:**

﴿فَادْخُلِي فِي عِبَادِي﴾ ﴿وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ ﴿٢٦﴾

میرے بندوں میں داخل ہو جاؤ اور میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔

﴿فَادْخُلِي فِي عِبَادِي﴾ کو ﴿وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ پر مقدم کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ دخول جنت کا راستہ دخول فی عباد اللہ ہے۔ اگر کوئی شخص جنت میں جانا چاہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں میں۔ جو جنتی ہیں۔ شامل ہو جائے۔ بس یہ سب سے آسان ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ یَّقْدِرُ عَلَیْهِ

حُبِّكَ۔<sup>90</sup>

یا اللہ! میں آپ سے آپ کی محبت مانگتا ہوں اور جو آپ سے محبت کریں ان کی محبت مانگتا ہوں اور ان اعمال کی محبت مانگتا ہوں جو آپ کی محبت کے قریب کر دیں۔ اصل تو اللہ کا قرب ہے اور اللہ کے قرب کا ذریعہ نیک اعمال ہیں اور اللہ کی

محبت اور نیک اعمال کے درمیان ولایت کی محبت کا ذکر کیا ”وَحُبُّ مَنْ يُحِبُّكَ“، اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب تقویٰ کی محبت یہ انسان کو تقویٰ عطا کر دیتی ہے، ولی کی محبت سے انسان بہت جلد اعمالِ صالحہ پر آجاتا ہے۔

### اولیاء اللہ کی توہین سے بچنا:

اور آپ نے خود بھی دیکھا ہو گا۔ اللہ ہمیں ان مواقع سے کبھی نہ گزارے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ عام طور پر اہل اللہ کو بکنے والا شخص اعمال سے محروم رہتا ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بات کا اہتمام کیا ہے کہ کبھی اہل اللہ کے خلاف میں نے زبان اور قلم استعمال نہیں کیا۔ اگر مجھے ان کی تحقیق خلافِ شرع بھی محسوس ہوئی تو میں نے اس پر بھی درگزر کیا ہے کہ ان کے پاس بھی کوئی دلیل ہوگی، کسی بنیاد پر یہ بات کرتے ہوں گے، میں نے ایسا طرز اختیار نہیں کیا جس سے ان کی توہین کا پہلو نکلتا ہو۔ اس لیے اس بات کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

جنت میں جانے کا سب سے آسان راستہ کون سا ہے؟ اللہ کے بندوں میں شامل ہو جاؤ! ایک آدمی کہیں جاتا ہے، وہ بڑا آدمی ہے اور اس کے ساتھ اس کا ڈرائیور بھی ہے، اس کا سیکرٹری بھی ہے، اس کا گارڈ بھی ہے تو لوگ ڈرائیور، سیکرٹری اور گارڈ کو بھی عزت دیتے ہیں جس طرح آنے والے مہمان کو دیتے ہیں، اس کو بھی وہی کھانا ملتا ہے جو آنے والے مہمان کو ملتا ہے۔ اللہ رب العزت کی غیرت کے خلاف ہے کہ دنیا میں جس سے تعلق ہو اس کے ساتھ آنے والوں کا دنیا والے حیا کریں اور اللہ اولیاء اللہ سے محبت کرنے والوں کو محروم کر دے ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ اللہ ہم سب کو اہل تقویٰ کی محبت عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

## سورة البلد

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ ۚ وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ ۚ وَالْوَدَّ مَأْوَدًا ۚ﴾

قسم کے شروع میں ”لا“ لانے کا مقصد:

﴿لَا أُقْسِمُ﴾ کے شروع میں جو ”لا“ ہے یہ کلام عرب میں معروف ہے کہ جب بھی ان کے ہاں قسم کھائی جاتی ہے تو قسم کے شروع میں ”لا“ لگاتے ہیں۔ شروع میں ”لا“ لانے کا مقصد مخاطب کے خیال کی تردید کرنا ہے کہ تمہارے ذہن میں جو بات ہے یہ غلط ہے اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری بات ٹھیک ہے۔

﴿لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ ۚ﴾

اللہ تعالیٰ مشرکین کے ذہن کی نفی فرما رہے ہیں۔ مشرکین کا ذہن یہ تھا کہ ہم جو چاہیں کریں... ہمیں کسی نے پوچھنا نہیں... کسی نے پکڑنا نہیں... قیامت کا دن نہیں ہو گا... فرمایا: ”لا“ یہ بات نہیں ہے.. ”اُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ“ میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔ اس سے مراد شہر مکہ ہے۔ اللہ نے مکہ کی قسم کھائی ہے۔

﴿وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ ۚ﴾

یہ ”هَذَا الْبَلَدِ“ کی مزید تعظیم بیان کی ہے کہ میں قسم کھاتا ہوں اس شہر

کی، اب یہ شہر ایسا ہے کہ اے پیغمبر! آپ بھی اس شہر میں رہتے ہیں۔ تو اس سے اس مکہ کی عظمت دو گنی ہے۔ ایک مکان اچھا ہے اور دوسرا اس کا مکین اچھا ہے اور عموماً مکان کی قیمت مکین کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے۔ مکہ کی عظمت کو بڑھایا ہے کہ اس میں آپ بھی رہتے ہیں، اور یہ تب ہے جب ”حِلُّ“ کا لفظ حلول سے ہوا اور اگر یہ لفظ حلال سے ہو تو پھر معنی الگ ہو گا۔ پھر معنی یہ ہو گا کہ آپ کی ذات ایسی ہے کہ مکہ مکرمہ میں کافر آپ کے خون کو حلال سمجھتے ہیں... یا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وہ ہے کہ حرم مکہ میں کسی کو قتل کرنا جائز نہیں ہے لیکن کچھ وقت کے لیے ہم نے حرمت کا یہ حکم اٹھا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہاں قتل کو حلال کر دینا ہے اور یہ فتح مکہ کے موقع پر ہوا بھی تھا کہ احکام حرم اٹھا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کفار کا قتل جائز کر دیا گیا تھا۔

﴿وَالِدٌ وَمَا وَلَدَ﴾

قسم ہے والد یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی اور ان کی اولاد کی۔

**مشقت؛ انسانی پیدائش کا جزء لازم**

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا فرمایا ہے۔ یہ عنوان

قرآن کریم میں بار بار آیا ہے۔ سورۃ الانشقاق میں گزرا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدًّا فَلَقِيَهُ﴾<sup>91</sup>

کہ اے انسان! تم نے اپنے رب تک مشقت اٹھاتے اٹھاتے پہنچ جانا ہے۔



اور یہاں فرمایا: ”لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ“ کہ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ اس سے یہ بات بڑی کھل کر سمجھ آتی ہے کہ دنیا میں کوئی آدمی مشقت کے بغیر ہو تو اس پر تعجب ہونا چاہیے اور دنیا میں کوئی مشقت میں ہو تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ عین فطرت ہے۔ دنیا میں کسی شخص پر کوئی تکلیف کوئی مشقت نہ آئے تو اس پر تعجب ہونا چاہیے اور اگر تکلیف اور مصیبت آئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ دنیا تو نام ہی مشقت کا ہے۔ اس لیے اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو مشقت میں بنایا ہے۔ یہاں ”کَبَدٍ“ کو اللہ نے ظرف بنایا اور انسان کو مظروف بنایا ہے کہ انسان ہے ہی مشقت میں، اس لیے اسے مشقت اٹھانی ہے۔

﴿اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۚ﴾

کیا کافر یہ سمجھتا ہے کہ اس پر کسی کو بھی قدرت نہیں۔

﴿يَقُولُ اَهْلَكْتُ مَا لَا لُبَّ دَا ۙ﴾

اور یہ کافر بد بخت اتنے ہیں کہ اسلام کی مخالفت میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں مال خرچ کرتے ہیں اور فخر سے کہتے ہیں کہ میں نے بہت زیادہ مال خرچ کیا ہے۔ ”لُبَّ دَا“ کا معنی ہے وافر مقدار، کہ میں نے بہت مال خرچ کر دیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے مال تھوڑا خرچ کیا ہے اور اس تھوڑے کو زیادہ کہہ رہے ہیں اور پھر یہ کون سا کارنامہ کیا ہے انہوں نے پیغمبر کی مخالفت میں مال خرچ کر کے؟!

﴿اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهُ اَحَدٌ ۙ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ وَ لِسَانًا وَّ

شَفَتَيْنِ ۙ وَ هَدَيْنٰهُ النُّجْدَيْنِ ۙ﴾

کیا یہ سمجھتا ہے کہ اس کو کوئی نہیں دیکھ رہا؟! یہ کیسے ہو سکتا ہے تم اللہ سے

مخفی رہو؟ اللہ فرماتے ہیں: کیا ہم نے اسے آنکھیں نہیں دیں؟ اسے زبان نہیں دی؟ اسے دو ہونٹ نہیں دیے؟ اور اس کو ہم نے دو راستے دکھائے۔

### آنکھ؛ نعمتِ خداوندی

﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ﴾... اللہ نے پورا جسم انسان کو دیا لیکن بطور خاص اللہ نے اس میں آنکھوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اس لیے کہ انسان آنکھوں سے اچھی اور بری جگہیں دیکھتا ہے، سیدھا اور برا راستہ دیکھتا ہے اس لیے بطور خاص ان کا ذکر فرمایا اور یہ آنکھیں انسان کے جسم میں اللہ کی نعمتیں ہیں۔ دیکھو! یہ ایک سینکڑ میں لاکھوں کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہیں۔ آنکھوں کی حفاظت کا نظام اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ آنکھ میں یہ پانی ہے تھوڑا سا، یہ خشک ہو جائے تو دنیا کی ساری طاقتیں مل کر وہ پانی نہیں دے سکتیں اور یہ جو آنکھ کی پتلی ہے یہ جسم کا ایک ایسا حصہ ہے جو ہر انسان کی برابر ہے چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا اور عجیب بات یہ کہ آنکھ کی پتلی کبھی کسی کی بھی نہیں بڑھتی، انسان کے بدن کے تمام اعضاء آہستہ آہستہ بڑھتے رہتے ہیں لیکن آنکھ کی یہ جو کالی سی گول پتلی ہے یہ بڑھتی نہیں ہے، جب بچہ پیدا ہوتا ہے تب بھی اتنی ہوتی ہے اور جب بندہ مرتا ہے تب بھی اتنی ہوتی ہے۔ شروع سے لے کر آخر عمر تک اس کا سائز ایک ہی رہتا ہے، یہ بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔ آپ کوئی بچہ دیکھیں تو اس کی پتلی اتنی بڑی ہوگی جتنی بڑوں کی ہوتی ہے، وہ چھوٹی نہیں ہوگی۔ یہ اللہ کا عجیب نظام ہے۔ آنکھ آہستہ آہستہ بڑھتی ہے لیکن اندر کی جو کالی سی گولی ہے وہ اتنی ہی رہے گی۔

آنکھ میں لاتعداد بلب ہیں جن کی وجہ سے روشنی ہوتی ہے اور بندہ دنیا کو دیکھتا ہے اور پھر آنکھ کی یہ خوبی ہے کہ اگر کوئی نقصان دہ چیز آنکھ کی طرف آئے تو بندہ نہیں کرنا پڑتی بلکہ خود بخود بند ہو جاتی ہے یعنی آپ آنکھ میں انگلی ڈالو تو آنکھ خود بخود بند

ہو جائے گی۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی نور اللہ مرقدہ بڑی عجیب بات فرماتے تھے، حضرت فرماتے کہ دنیا میں انسان کے جسم کو جو چیز تکلیف دیتی ہو اس کے آنے پر آنکھ خود بخود بند ہو جاتی ہے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ جو چیز آخرت کو تباہ کرتی ہو وہ آپ کے سامنے آئے اور آنکھ خود بخود بند نہ ہو! اصل میں ہم نے آنکھ سے گناہ کرنے کا مزاج ایسا بنالیا ہے کہ گناہ کی چیز سامنے آئے تو آنکھ بند نہیں ہوتی۔ اگر یہ مزاج نہ بنایا ہوتا تو نامحرم کے سامنے آتے ہی آنکھ خود بخود بند ہو جاتی۔ اس کے بند نہ ہونے کی وجہ ہماری اپنی عادات ہیں کہ ہم نے اس کو گندہ بنایا ہے۔

یہ بات مزید سمجھنی ہو تو دیکھیں کہ قبر کا ثواب و عذاب برحق ہے اور جب ہم یہ بات پیش کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چند قبروں کے پاس سے گزرے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری بدک گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو احساس ہوا کہ یہاں عذاب ہو رہا ہے۔<sup>92</sup>

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمینی قبر کو ”قبر“ کہتے ہیں۔ جو لوگ اس کے قبر ہونے کے منکر ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہی قبر ہوتی تو کتنے قبرستان ہیں جن میں سے جانور گزرتے ہیں لیکن وہ نہیں بدکتے تو پھر یہ کیوں نہیں بدکتے، ان کو بھی بدکنا چاہیے، اس سے معلوم ہوتا ہے یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا باقی اس قبر میں عذاب و ثواب نہیں ہوتا۔ سوال سمجھ میں آگیا ان لوگوں کا؟ (جی ہاں۔ سامعین) تو اس کا جواب یہ ہے کہ معجزہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نہیں تھا کہ جانور بدک گیا، معجزہ یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا چل گیا کہ اس قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔

رہی یہ بات کہ اُس وقت جانور بد کا تھا تو اب کیوں نہیں بد کتے! تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً ایک جانور ہے جس نے کبھی ٹرین کو نہیں دیکھا اور آپ اس جانور کو لے جا رہے ہوں کہ اچانک ٹرین آجائے تو وہ جانور آپ کو بھی گرا کر دوڑ جائے گا، لیکن وہ جانور جو ٹرین کی پٹری کے پاس رہتے ہیں، روزانہ انجن وہاں سے بولتے ہوئے گزرتا رہتا ہے لیکن ان جانوروں کو احساس بھی نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح آج جب ہر قبرستان میں عذاب ہی عذاب ہے، جانور وہاں سے گزر کر عادی بنے ہوئے ہیں تو پھر اچانک بد کیں گے کیسے؟ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

### زبان اور ہونٹ کی نعمت:

﴿وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ﴾ کیا ہم نے اسے زبان نہیں دی؟ اسے دو ہونٹ نہیں دیے؟ زبان انسان کی تلوار ہے، یہ اچھے کام بھی کرتی ہے اور برے کام بھی کرتی ہے۔ تلوار کی حفاظت کے لیے نیام ہوتی ہے اللہ نے اس زبان کی حفاظت کے لیے دو ہونٹ دیے ہیں۔ آپ اگر زبان کو غلط استعمال پر روکنا چاہیں تو ہونٹ بند کر دیں زبان بولنا بند کر دے گی۔ زبان نے تب بولنا ہے جب ہونٹوں نے کھلنا ہے، ہونٹ نہیں کھلیں گے تو زبان کام نہیں کرے گی۔ تو زبان کو غلط استعمال سے روکنے کے لیے اللہ نے ہمیں ہونٹ عطا فرمائے تاکہ اس کا غلط استعمال کبھی بھی نہ ہو۔ اللہ نے کیسے حفاظت کا انتظام فرمایا! انسان کے دماغ میں ایک سوچ آتی ہے، دماغ اس کو لفظ دیتا ہے اور زبان اس کو ادا کر دیتی ہے، ایک سیکنڈ کا بھی پتا نہیں کوئی کروڑواں حصہ ہو گا! اتنی رفتار سے کام چل رہا ہوتا ہے۔

### حق و باطل کی پہچان:

﴿وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ﴾ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾﴾

ہم نے انسان کو دو راستے دے دیے ہیں؛ جنت والا بھی اور جہنم والا بھی لیکن انسان پھر بھی دین کی گھاٹی سے نہیں گزر سکا۔

﴿الْعَقَبَةُ﴾... اصل میں کہتے ہیں پہاڑ کے اوپر والی چٹان کو جس پر چڑھ کر انسان دشمن سے بچتا ہے، اگر کوئی مخالف ہو تو چٹان کی چوٹ میں چلے جائیں تو مخالف سے بچ سکتے ہیں اور بسا اوقات دو پہاڑوں کے درمیان جو راستہ ہوتا ہے جسے گھاٹی کہتے ہیں اس کو بھی عقبہ کہتے ہیں۔ اگر دشمن کا خطرہ ہو تو آدمی گھاٹی سے گزر کر سائیڈ پر نکل جاتا ہے اور دشمن سے بچ جاتا ہے۔ یہاں اللہ نے دین اسلام کو ”عقبہ“ فرمایا ہے کہ جس طرح چٹان یا گھاٹی دشمن سے بچاتی ہے، دین اسلام بھی انسان کو جہنم سے بچاتا ہے۔

### چند امورِ خیر:

﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۚ فَكُ رَقَبَةٍ ۚ﴾ ﴿١٢﴾ أَوْ اطْعَمٌ فِي يَوْمٍ ذِي

مَسْغَبَةٍ ۚ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۚ﴾ ﴿١٣﴾ أَوْ مَسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۚ﴾ ﴿١٤﴾

اور تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ عقبہ کیا ہے جس کی بات ہم نے کی ہے؟ غلام آزاد کرنا، فاقے کے دن کسی بھوکے کو کھانا کھلانا، ایسا یتیم جو رشتہ دار بھی ہو اس کی خدمت کرنا یا کسی خاک آلود مسکین کے ساتھ تعاون کرنا۔

”يَتِيمًا“ کے ساتھ ”ذَا مَقْرَبَةٍ“ کی بات اس لیے فرمائی کہ یتیم بھی ہو اور رشتہ دار بھی ہو تو اس کو دینے پر اللہ دوہرا اجر دیتے ہیں؛ ایک یتیم کا پیٹ بھرنے کا اور دوسرا صلہ رحمی کا۔

### صبر اور صلہ رحمی کی تلقین:

﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالرَّحْمَةِ ۚ﴾ ﴿١٥﴾

صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ انسان یہ کام کر لے کہ غلام آزاد کر دے، مسکین کو کھانا کھلا دے، یتیم کا اکرام کر لے بلکہ ان کاموں کے باوجود اس کو اہل ایمان کے زمرے میں داخل ہونا ضروری ہے، کیونکہ ایمان کے بغیر یہ اعمال قبول نہیں ہوتے۔ اس لیے فرمایا اس شخص کو چاہیے کہ ایمان والوں میں شامل ہو جائے اور یہ ایمان والے ایک دوسرے کو تلقین کرتے ہیں کہ جب تکلیف آجائے تو برداشت کیا کرو، ایک دوسرے کو تلقین کرتے ہیں کہ محبت اور شفقت سے رہا کرو!

**دائیں ہاتھ والے اور بائیں ہاتھ والے:**

﴿أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ﴾

فرمایا: یہی وہ لوگ ہیں جو دائیں ہاتھ والے ہیں یعنی ان کو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا۔

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الْمَشْأَمَةِ﴾

﴿مُؤَصَّدَةٌ﴾

اور جو لوگ ہماری آیات کا انکار کرنے والے ہیں وہ بائیں ہاتھ والے ہیں یعنی ان کو اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں ملے گا۔ ان کے اوپر آگ ہوگی جس کو بند کر دیا جائے گا یعنی کافروں کو جہنم میں ڈالیں گے اور جہنم کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اب یہ کبھی بھی جہنم سے نہیں نکل سکتے، ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الشمس

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا ۝۱ وَالْقَمَرُ إِذَا تَلَّهَا ۝۲ وَالنَّهَارُ إِذَا جَلَّهَا ۝۳﴾

گیارہ قسمیں:

یہاں اللہ رب العزت نے گیارہ قسمیں کھا کر یہ مضمون سمجھایا ہے اور قرآن کریم میں اس سے زیادہ کسی اور مضمون کو سمجھانے کے لیے اتنی قسمیں نہیں اٹھائی گئیں۔

﴿وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا ۝۱﴾

قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی۔ یہ جو واؤ عاطفہ ہے اس کے بعد ”ضُحَاهَا“ اس شمس کا وصف ہے تو یہ وصف بصورت عطف بیان ہو رہا ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ یار اس بندے کو دیکھو اور اس کا قلم دیکھو اور اس کی زبان دیکھو! اب یہ اس کا وصف بصورت عطف بیان ہو رہا ہوتا ہے۔

فرمایا: سورج کو دیکھو اور سورج کی روشنی کو دیکھو! ترجمہ کرتے ہوئے یہ لہجہ میں اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ بسا اوقات بندے کو الجھن ہوتی ہے کہ جب سورج کی قسم کھالی تو اب روشنی کی قسم کیوں کھائی ہے؟ تو میں بارہا یہ بات سمجھاتا ہوں کہ آپ محاورات میں بات کیا کریں پھر دیکھیں قرآن کیسے سمجھ میں آتا ہے؟! محاورات کو ذہن

سے ہٹا دو تو پھر قرآن سمجھ میں نہیں آتا۔ ”وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا“ قسم ہے سورج کی اور سورج کی روشنی کی! یعنی سورج کو دیکھو.. سورج کا چڑھنا دیکھو.. سورج کی روشنیاں دیکھو۔

﴿وَالْقَمَرُ إِذَا تَلَّهَا﴾

اور قسم ہے چاند کی جب وہ سورج کے بعد آئے۔ عام طور پر چاند سورج کے غروب ہونے کے کافی دیر بعد نظر آتا ہے لیکن بطورِ خاص جو چودھویں کا چاند ہوتا ہے وہ سورج کے غروب ہونے کے فوراً بعد نکلتا شروع ہو جاتا ہے۔ تو اس جملہ سے مقصود یہ ہے کہ جب چاند درجہ کمال پر ہو۔

﴿وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّهَا﴾

اور قسم ہے دن کی جب وہ زمین کو روشن کر کے رکھ دے۔ یہاں ”ہا“ ضمیر سے مراد زمین ہے جس کا پہلے ذکر نہیں ہوا لیکن عرب کے محاورات میں بھی ہے اور ہمارے محاورات میں بھی ہے کہ بعض چیزوں کا ذکر زبان سے نہیں ہوتا لیکن ذہنوں میں ہوتا ہے جس کو معبودِ ذہنی کہتے ہیں۔

﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا﴾

اور قسم ہے رات کی جب وہ سورج کی روشنی پر چھا جائے اور اسے چھپالے۔

﴿وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا﴾

اور قسم ہے آسمان کی اور اس ذات کی جس نے آسمان کو بنایا۔

﴿وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا﴾

اور قسم ہے زمین کی اور اس ذات کی جس نے زمین کو بنایا۔

﴿وَالنَّفْسِ وَمَا سَوَّاهَا﴾



اور قسم ہے انسان کی اور اس ذات کی جس نے انسان کو صحیح طرح بنادیا۔  
یہ کل گیارہ قسمیں بنتی ہیں۔ عام مفسرین کے ہاں یہ قسمیں سات ہیں اور  
حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ گیارہ قسمیں ہیں۔ عام مفسرین  
ان جملوں ”مَا بَدَّلَهَا“ اور ”وَمَا ظَلَمَهَا“ میں ”مَا“ کو مصدر یہ کہتے ہیں تو سات  
قسمیں بنا لیتے ہیں اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ ”مَا“ بمعنی ”مَنْ“ لے کر ذات کی قسم  
مراد لیتے ہیں تو اس صورت میں گیارہ قسمیں بن جاتی ہیں۔ اگر ”مَا“ بمعنی ”مَنْ“ ہو  
اور ذات ہو تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایک  
استدلال ہے کیونکہ مصنوع سے استدلال ہوتا ہے صانع کے وجود پر۔ تو پہلے مخلوق کا ذکر  
کیا ہے جس سے خدا کی ذات پر استدلال ہو سکتا ہے۔

### انسان کی فطرت میں تقویٰ اور فجور کی آمیزش:

تو اللہ نے گیارہ قسمیں کھا کر فرمایا:

﴿فَالْهَمَّهَا جُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۖ﴾

کہ اللہ نے انسان کی ذات میں گناہ کا تقاضا بھی رکھا ہے اور گناہ کو کنٹرول  
کرنے کی طاقت بھی اس کے مزاج میں رکھی ہے۔

### کامیاب انسان:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّهَا ۖ﴾ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا ﴿۱۰﴾

وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اپنے نفس کی اصلاح کر دی اور وہ شخص برباد  
ہو گیا جس نے اپنے نفس کو تباہ کر دیا یعنی اس کی اصلاح نہ کر سکا۔

### قوم شمود کی سرکشی کا انجام:

﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ۖ إِذِ انْبَعَثَ أَشْقَاهَا ۖ﴾ فَقَالَ لَهُمُ

رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَ سُقِيَهَا ﴿١٣﴾ فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا ۖ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذُنُوبِهِمْ فَسَوَّيْنَاهَا ﴿١٤﴾ وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ﴿١٥﴾

آگے مثال دی ہے کہ ایسا شخص گزرا تھا جس نے اپنے نفس کو تباہ کیا تھا۔ فرمایا: قوم ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے نبی کو جھٹلایا، جب ان میں ایک بد بخت اونٹنی کو مارنے کے لیے کھڑا ہوا۔ اللہ کے رسول نے کہا کہ یہ اونٹنی اللہ کی ہے، اس کا اور اس کے پانی پینے کا پورا پورا خیال رکھنا! ﴿فَكَذَّبُوهُ﴾ پھر بھی انہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا اور اس اونٹنی کو کاٹ کے رکھ دیا۔ اس کے پاؤں کاٹے۔ ﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذُنُوبِهِمْ فَسَوَّيْنَاهَا﴾ ان کے رب نے ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے مسلسل عذاب برسا یا، ﴿فَسَوَّيْنَاهَا﴾ اور سب کو برابر کر کے رکھ دیا۔ یہ عذاب ایسا تھا جو مردوں، بچوں، بوڑھوں، عورتوں سب پر آیا۔

﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا﴾

اور اللہ انجام سے نہیں ڈرتے۔ دنیا کے بادشاہ کسی کو عذاب دیں تو ڈرتے ہیں کہ ہمارے خلاف بغاوت نہ ہو اور اللہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ اس لیے کہ اللہ کو بغاوت کا خطرہ نہیں۔ خدا کا عذاب بہت سخت ہوتا ہے۔ اس پر کئی بار میں تقریر کر چکا ہوں اور آپ سن بھی چکے ہیں۔

یہاں ایک اہم باتیں سمجھ لیں:

﴿فَالْهَمَّهَا جُؤَرَهَا وَتَقَوَّيْنَاهَا﴾

اللہ نے بندے میں گناہ کا تقاضا بھی رکھا ہے اور گناہ سے بچنے کی صلاحیت بھی رکھی ہے۔

اللہ نے یہاں ”جُؤَر“ کو ”تَقَوَّى“ پر مقدم کیا یعنی گناہ کو نیکی پر مقدم کیا

ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقویٰ ہوتا ہی تب ہے جب گناہ کا تقاضا ہو اور اگر انسان میں گناہ کا تقاضا ہی نہ ہو تو پھر کنٹرول کی طاقت کی ضرورت ہی نہیں۔ پہلے گناہ کا تقاضا ہو گا تو پھر کنٹرول کی طاقت بھی ہوگی اس لیے فوراً کو مقدم کیا لیکن مقصود گناہ کرنا نہیں بلکہ گناہ سے بچنا ہے۔ جب مقصود کی بات آئی تو ﴿مَنْ ذَكَّهَهَا﴾ کو مقدم کیا اور ﴿مَنْ دَسَّهَهَا﴾ کو مؤخر کیا کہ وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کی اصلاح کی اور وہ تباہ ہوا جس نے اپنے نفس کو مٹی میں ملا دیا، نفس کی اصلاح نہ کر سکا۔ جب مقصد کی بات آئی تو پھر ﴿مَنْ ذَكَّهَهَا﴾ کو مقدم کیا اور ﴿مَنْ دَسَّهَهَا﴾ کو مؤخر کیا۔

اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاجِرُ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الليل

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ۚ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ۚ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۚ﴾

قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے اور دن کی جب وہ روشن ہو جائے اور قسم ہے اس اللہ کی جس نے مرد کو پیدا کیا اور عورت کو پیدا کیا۔

انسانی کوشش کا تنوع:

﴿إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ۖ فَاَمَّا مَنْ اَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۖ وَصَدَّقَ

بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۖ﴾

تمہاری کوشش مختلف ہے یعنی تمہارے اعمال مختلف ہیں؛ کسی کے اعمال نیک ہیں، کسی کے اعمال بد ہیں۔ جو شخص اللہ کے رستے میں مال دے اور اللہ سے ڈرے اور سب سے اچھی بات کی تصدیق کرے۔ سب سے اچھی بات سے مراد دین اسلام ہے جس کو ماننے اور عمل کرنے پر جنت کا وعدہ ہے۔

نیکی اور بدی کا نتیجہ:

﴿فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۖ﴾

تو ہم اس بندے کو سامان دے دیتے ہیں راحت کی چیز کے لیے۔

﴿وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۖ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنُيَسِّرُهُ

لِلْيُسْرَىٰ﴾

اور جو شخص بخل کرے اور بے پرواہی اختیار کرے اور اسلام کی تکذیب کرے، اسلام کو جھٹلائے تو ہم اس کو سامان دے دیتے ہیں مشکل اور تکلیف دہ چیز کے لیے۔

”يُسِّرُ“ کا معنی ہوتا ہے اسباب دینا۔ ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صدقات دے، تقویٰ اختیار کرے اور دین اسلام کی تصدیق کرے، یہ تین کام کرے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسے اسباب عطا فرما دیتے ہیں کہ اس کے لیے دین کا کام کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے... اور جو شخص بخل کرے، یتیموں اور غریبوں کی پرواہ نہ کرے اور دین اسلام کی تکذیب کرے تو اللہ اسے ایسے اسباب دیتے ہیں جن کی وجہ سے اس کے لیے کفر اور فسق پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

انسان جیسی محنت کرتا ہے اسی کے مطابق اللہ اس کو اسباب عطا فرماتے ہیں۔ جو انسان مسلسل نیکی کے راستے کی تلاش کرے تو اللہ ایسے اسباب دے گا کہ نیکی کرنا آسان ہو جائے گا اور جو چوبیس گھنٹے گناہ سوچے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسے اسباب دے گا کہ گناہ کرنا اس کے لیے آسان ہو جائے گا۔ یہ انسان کی محنت کی وجہ سے ہے۔ جیسی محنت کرتا ہے اللہ اس کو دنیا میں اس کا رزلٹ دے دیتے ہیں۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے یہ دنیا دار الجزاء نہیں ہے۔

**شریعت بنے گی طبیعت لیکن کب؟**

﴿فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ﴾ پر یہاں ایک بات سمجھیں۔ اب قواعد کا

تقاضا یہ تھا کہ یہاں ”فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ“ نہ کہا جاتا بلکہ اللہ فرماتے ”فَسَنُيَسِّرُهُ لَہُ

الْبُسْرَى“ کہ جو شخص صدقات دیتا ہے، تقویٰ اختیار کرتا ہے اور دین اسلام کی تصدیق کرتا ہے تو ہم اس کے لیے شریعت پر چلنا آسان کر دیتے ہیں۔ انسان؛ ذات ہے اور آسانی یا مشکل؛ صفت ہے۔ آسان ہونا اور مشکل ہونا کسی ذات کی صفت نہیں ہے کہ یہ بندہ مشکل ہے اور یہ بندہ آسان ہے، آسان ہونا یا مشکل ہونا یہ بندہ کی صفت تو نہیں ہو سکتی نا! آسان ہونا یا مشکل ہونا یہ عمل کی صفت ہوتی ہے کہ یہ عمل مشکل ہے یا یہ عمل آسان ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتے کہ ہم اس بندے کے لیے عمل کو آسان کر دیتے ہیں تو یہ بات ٹھیک ہوتی، ہم اس بندے کے لیے شریعت پر عمل کرنا مشکل بنا دیتے ہیں تو یہ بات ٹھیک ہوتی... لیکن اللہ نے یہاں یہ فرمایا: ہم اس بندے کو آسان کر دیتے ہیں شریعت پر عمل کے لیے اور ہم اس بندے کو مشکل بنا دیتے ہیں شریعت پر عمل کے لیے۔ حالانکہ آسان یا مشکل ہونا یہ عمل کی صفت ہے یہ بندے کی ذات کی صفت نہیں۔ تو یہاں یہی بتانا مقصود ہے کہ جب بندہ اب تین چیزوں کا قصد کرتا ہے اور ان پر محنت کرتا ہے تو اللہ اس کی طبیعت ایسی بنا دیتے ہیں کہ شریعت پر عمل کرنا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے اور اگر وہ ان تین برائیوں کے لیے محنت کرتا ہے تو اللہ اس کی طبیعت ایسی بنا دیتے ہیں کہ اس کے لیے شریعت پر عمل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

”الْبُسْرَى“ سے مراد جنت ہے کیونکہ جنت نیک اعمال سے ملتی ہے اور ”الْعُسْرَى“ سے مراد جہنم ہے اور جہنم اعمال بد سے ملتی ہے۔ اللہ پاک ہمارا مزاج بھی ایسا فرمادے کہ ہمارے لیے شریعت پر چلنا آسان ہو جائے۔ آمین

﴿وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّى﴾

آج جس شخص کے پاس مال ہے اور وہ بخل کرتا ہے تو جب یہ جہنم میں داخل ہو گا تو یہ مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

﴿إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ﴾

ہمارے ذمہ سمجھانا ہے۔ اس لیے سمجھاتے ہیں۔

﴿وَأَنَّ لَنَا لَآخِرَةً وَالْأُولَىٰ﴾

اور دنیا اور آخرت ہمارے قبضے میں ہیں۔ جو انسان نیک اعمال کرتا ہے اس کو جنت دے دیں گے اور جو برے اعمال کرتا ہے اس کو جہنم دے دیں گے۔

**اشقیٰ اور اتقیٰ کے انجام میں فرق:**

﴿فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ﴾ لَا يَصْلُهَا إِلَّا الْاَشَقَىٰ ﴿١٥﴾ الَّذِي كَذَّبَ

وَتَوَلَّىٰ ﴿١٦﴾

میں نے تمہیں بھڑکنے والی آگ سے خبردار کر دیا ہے جس میں بد بخت ہی داخل ہوگا، جس نے دین حق کو جھٹلایا تھا اور اس سے اعراض کیا تھا۔  
یہاں ایک بات سمجھیں!

﴿وَسَيَجْزِيهَا الْاَتَقَىٰ﴾ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ﴿١٧﴾

اور وہ شخص جو متقی ہے وہ اس آگ میں داخل ہونے سے بچا لیا جائے گا۔ یہ وہ شخص ہے جو اپنا مال خدا کی راہ میں دیتا ہے تاکہ اس کا مال پاکیزہ ہو جائے۔

**صحابہ کرام محفوظ ہیں:**

اس آیت سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین محفوظ ہیں۔ محفوظ کا معنی کہ وہ گناہ نہیں کرتے اگر گناہ کر لیتے ہیں تو اللہ ان کے نامہ اعمال میں رہنے نہیں دیتا، اس لیے وہ جہنم میں بھی داخل نہیں ہوں گے۔ صحابی کبھی بھی جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔ میں آپ کو یہ بات سمجھا چکا ہوں اعتراضات اور جوابات کے ساتھ۔ شاید آپ کو یاد ہوگا۔ کہ نبی معصوم ہوتا ہے اور صحابی محفوظ ہوتا

ہے، نبی سے اللہ گناہ ہونے نہیں دیتے اور صحابی سے ہو جاتا ہے لیکن اللہ نامہ اعمال میں رہنے نہیں دیتے۔ صحابہ عذاب سے بھی محفوظ ہیں اور بد عملی سے بھی محفوظ ہیں۔

### حضرت سعد اور قبر کا جھٹکا (توجیہات)

اس پر اشکالات تھے کہ صحابہ کرام کے کتنے واقعات ہیں کہ جن کو قبر کی تکلیف ہوئی ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ قبر میں گئے تو قبر نے ان کو دبایا، پھر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قبر میں اترے اور ان کے لیے دعائیں مانگیں تو ان کی قبر کھل گئی۔ تکلیف تو ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم یہ کیسے مان لیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو عذاب نہیں ہوتا۔ اس سوال کے جوابات آپ کے ذہن میں ہوں گے۔ میں نے ایک جواب یہ عرض کیا تھا کہ عذاب کہتے ہیں: ”إِلَّا لَهُ الْحَيِّ عَلَى سَبِيلِ الْهُوََانِ“ کو کہ زندہ کو تکلیف دینا ذلت کے لیے، اور جب ذلیل کرنا مقصود نہ ہو تو اس کو عذاب کہتے ہی نہیں۔ باقی جو صورتِ عذاب ہے تو یہ کیوں ہوئی؟ اس کا میں نے جواب یہ دیا تھا کہ یہ جو صحابہ کرام کے بارے میں ہے کہ ان کو عذاب نہیں ہو گا تو اس سے مراد برزخ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد جہنم ہے اور کوئی صحابی جہنم میں داخل ہو گا اس کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔

اور قبر کے جھٹکے اس کے خلاف نہیں ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں صحابہ کو عذاب نہیں ہو گا تو اس سے مراد جہنم کا عذاب ہے اور یہ جو قبر ہے یہ جہنم نہیں ہے، اس میں عرضِ نار ہوتا ہے دخولِ نار نہیں ہوتا۔

ایک جواب شاید آپ کو یاد ہو گا یہ تھا کہ یہ جو موت سے لے کر حشر تک کی زندگی ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ یہ دنیا کا تتمہ ہے اور آخرت کا مقدمہ ہے۔ یہ نہ تو پوری آخرت ہے اور نہ ہی پوری دنیا ہے، من وجہ یہ دنیا ہے اور من وجہ یہ آخرت ہے اور مؤمن کو دنیا میں تکلیف کا آجانا یہ ایمان کے خلاف نہیں ہے تو چونکہ من وجہ یہ دنیا



ہے اس لیے اس میں تکلیف کا آجانا ایمان کے خلاف نہیں ہے۔

﴿الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۖ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ ۖ﴾

﴿إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ﴾

متقی وہ شخص ہے جو اپنا مال خدا کی راہ میں دیتا ہے تاکہ اس کا مال پاکیزہ ہو جائے۔ اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں کہ جس کا وہ بدلہ اتار رہا ہو بلکہ یہ شخص صرف اپنے رب کی رضا کے لیے مال خرچ کرتا ہے جس کی اونچی شان ہے۔

﴿وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ﴾

عنقریب یہ شخص راضی ہو جائے گا۔ اللہ اس کو راضی کر دیں گے۔ روایات میں آتا ہے کہ اس سے مراد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ آیات ان کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔ مکہ مکرمہ میں سات ایسے غلام صحابہ کرام جن کو کفار تکلیفیں دیتے تھے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مال خرچ کر کے ان کو آزاد کروا دیا تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے والد کہتے ہیں: تم کمزور آدمی کو آزاد کرتے ہو کسی طاقت ور کو خرید کر آزاد کرو جو تمہارے مشکل وقت میں کام آئے گا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں اپنی ذات کے لیے آزاد نہیں کرتا صرف اللہ کی رضا کے لیے آزاد کرتا ہوں۔ اللہ ہم سب کو اپنی آخرت اور رضا کے لیے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔  
وَإِخْرُجُوا أَنَا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الضحیٰ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَالضُّحَىٰ ۝۱ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۝۲ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَاقَلِ ۝۳﴾

### شان نزول:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے ایک دورا تیں تہجد کے لیے نہیں اٹھ سکے تو ابو لہب کی بیوی ام جمیل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جملے کسے کہ ان کے خدا نے ان کو چھوڑ دیا ہے تو اس پر یہ سورت نازل ہوئی اور بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ دنوں کے لیے وحی نہیں آئی تو ابو لہب کی اس بیوی نے کہا کہ ان کو ان کے ساتھی نے چھوڑ دیا ہے تو اس وقت یہ سورت نازل ہوئی۔

تاخیر وحی کے واقعات کئی بار پیش آئے ہیں۔ ایک بار جب مشرکین مکہ نے یابہود نے تین سوال کیے تھے کہ روح کیا چیز ہے؟ وہ کون نوجوان تھے جو غار میں چلے گئے تھے؟ اور وہ کون شخص ہے جس نے مشرق اور مغرب پر حکومت کی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ان کا جواب کل بتاؤں گا۔ چونکہ ان شاء اللہ نہیں کہا تھا اس لیے سترہ دن تک وحی نہیں آئی۔ اس پر بھی مشرکین نے شور مچایا تھا کہ دیکھو! ان کے خدا نے ان کو چھوڑ دیا ہے۔ اسی طرح ابتدا میں بھی ایک واقعہ پیش آیا تھا کہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تین سال تک وحی بند رہی جسے فترت وحی کا زمانہ کہتے ہیں۔ تو خلاصہ سب کا ایک ہی ہے کہ کچھ دنوں کے لیے وحی نہیں آئی تو اس پر ان لوگوں نے شور مچایا تھا۔

### چاشت اور رات کی قسم کھانے کی وجہ:

﴿وَالصُّحُفِ ۝۱۱۱ إِذَا سَجَىٰ ۝۱۱۲ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ۝۱۱۳﴾

قسم ہے سورج کی دھوپ چڑھنے کی اور قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے۔  
نہ ہی آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا ہے اور نہ ہی آپ کا رب آپ سے بیزار ہوا ہے۔

﴿وَلَا خَيْرَۃَ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُولٰٓئِی ۝۱۱۴﴾

آپ کی بعد والی حالت پہلی والی حالت سے بہتر ہے۔

اللہ رب العزت آپ کی ہر بعد والی حالت کو پہلے والی حالت سے بہتر بناتے ہیں، جب اللہ چھوڑ دیں گے تو بعد والی حالت پہلے والی حالت سے بدتر ہوگی لیکن اللہ نے نبوت کے لیے آپ کا انتخاب فرمایا تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ آپ کو چھوڑ دیں؟! تو اللہ رب العزت نے قسمیں کھا کر یہ بات سمجھائی ہے۔

یہاں ایک بات تو یہ سمجھیں کہ یہاں قسم سورج کے نکلنے کی روشنی کی ہے اور قسم رات کے چھا جانے کی ہے، سورج نکلتا ہے تو شروع میں روشنی کم ہوتی ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے، رات آہستہ آہستہ پھیلتی ہے اور پھر چھا جاتی ہے۔ اللہ نے یہ قسمیں کھا کر فرمایا:

﴿وَلَا خَيْرَۃَ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُولٰٓئِی ۝۱۱۵﴾

آپ کی ہر بعد والی حالت پہلے والی حالت سے مزید بہتر ہوتی ہے۔ جس طرح سورج کی روشنی شروع میں کم ہوتی ہے پھر زیادہ ہوتی جاتی ہے، رات کی تاریکی شروع

میں کم ہوتی ہے پھر زیادہ ہو جاتی ہے۔ تو سورج کا کمال دن کو خوب روشن ہونا ہے اور رات کا کمال خوب اندھیرا ہونا ہے، اس طرح آپ کی بعد والی حالت پہلے والی حالت سے مزید بہتر ہوتی ہے، کم نہیں ہوتی۔ تو یوں قسمیں کھا کر اللہ رب العزت نے بات سمجھائی ہے۔

### آخرت کے دنیا سے بہتر ہونے کا معنی:

﴿وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ﴾

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی سے بہتر ہے۔ دنیا میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز ہے اور آخرت میں اعزاز اس سے زیادہ ہو گا۔

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بعد والی حالت پہلے والی حالت سے بڑھ کر ہے۔ اگر اس کو ذہن میں رکھ لیا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن ہے.. ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جوانی ہے تو جوانی؛ بچپن سے بڑھ کر ہے۔ جوانی کے بعد بڑھاپا ہے تو یہ بڑھاپا؛ جوانی سے بڑھ کر ہے۔ اعلان نبوت نہیں ہوا تھا پھر اعلان نبوت ہوا۔ تو اعلان نبوت ہونے کی زندگی اعلان نبوت نہ ہونے سے زیادہ بڑھ کر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی زندگی میں تھے تو فتوحات کم تھیں اور جب مدینہ میں گئے تو فتوحات بڑھ گئیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی؛ مکی زندگی سے بڑھ کر ہے۔ اسی طرح دنیا میں عبادت بھی ہے اور مشقت بھی ہے اور موت کے بعد مشقت نہیں صرف انعامات ہیں تو آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی سے بڑھ کر ہے۔

جب ان سب چیزوں کا موازنہ کریں گے تو پھر یہاں سے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حیات وہ ہے جو دنیا میں ہے اور ایک

حیات وہ ہے جو برزخ میں ہے، جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیاوی حیات عالم ارواح کی حیات سے اعلیٰ ہے تو عالم برزخ کی حیات؛ عالم دنیا کی حیات سے اعلیٰ ہے اور عالم آخرت کی حیات؛ عالم برزخ کی حیات سے مزید اعلیٰ ہے۔ یہ بات سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ عالم ارواح کی جو حیات ہے تو اس کے ساتھ دنیا والا جسد نہیں اور دنیا کی جو حیات ہے اس میں روح مبارک بھی ہے اور جسد مبارک بھی ہے تو حیات بڑھ گئی ہے، اسی طرح جو برزخ کی حیات ہے وہ دنیا کی حیات سے مزید بڑھ جاتی ہے کیونکہ دنیا کی حیات میں مشقتیں ہیں اور برزخ کی حیات میں کوئی مشقت نہیں ہے، اور برزخ میں جسم کی حیات بھی ہے اور روح کی حیات بھی ہے اور حشر کے بعد کی جو حیات ہے وہ عالم برزخ کی حیات سے بھی بڑھ کر ہے۔ عالم برزخ کی حیات حشر پر ختم ہو جائے گی اور حشر کے بعد والی جو زندگی ہے وہ نہ ختم ہونے والی ہے۔ تو عالم برزخ کی حیات کی جو مدت ہے اس نے عالم حشر پر ختم ہو جانا ہے پھر ایک اگلی زندگی شروع ہونی ہے جو ابدی ہے۔ تو ابدی زندگی یہ غیر ابدی زندگی سے اعلیٰ ہوتی ہے، اس لیے وہ حیات اس حیات سے بھی اعلیٰ ہوتی ہے۔ اس کو ذہن نشین فرمائیں۔

### عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبر مبارک میں ہیں۔ کوئی شخص وہاں روضہ مبارک پر سلام بھیجے اور آہستہ آواز سے کہے تو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سن لیتے ہیں اور دنیا کی حیات میں یوں نہیں ہے۔ دنیا کی حیات میں کوئی شخص آہستہ سے آواز دے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں سنتے، تھوڑا سا اونچی بات کرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سن لیتے ہیں اور برزخ میں کوئی آہستہ بھی کہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سن لیتے ہیں۔ اس کا معنی ہو گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو سماع برزخ کا ہے وہ دنیا کے سماع سے اعلیٰ ہے اور اس کو بڑے آرام سے عقلی انداز میں سمجھایا جاسکتا ہے۔

جو لوگ سماع فی القبر کا انکار کرتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابی کے گھر تشریف لے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا تو صحابی نے جواب دیا لیکن آہستہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر سلام کیا انہوں نے پھر جواب دیا لیکن آہستہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا نہیں، آپ نے تیسری بار جب سلام فرمایا تو انہوں نے جواب دیا لیکن آہستہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس آنے لگے کہ شاید وہ گھر میں نہیں ہیں تو وہ صحابی باہر نکل کر آ گئے۔ انہوں نے کہا ”یا رسول اللہ! آپ نے سلام فرمایا تھا، میں نے سنا تھا اور میں نے جواب آہستہ دیا تھا اس لیے کہ آپ کا سلام ہمارے لیے بہت بڑی دعا ہے، تو میں چاہتا تھا کہ یہ دعا آپ کی بار بار ہو اس لیے میں آہستہ سے جواب دے رہا تھا کہ آپ جواب نہ سنیں اور پھر سلام کریں۔“<sup>93</sup>

اس روایت سے وہ لوگ دلیل پکڑتے ہیں کہ دیکھو! درمیان میں دیوار حائل تھی اور صحابی نے آہستہ جواب دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں سنا اور موت کے بعد ایک دیوار باہر کی ہے، ایک دیوار اندر قبر کی ہے اور ایک دیوار برزخ کی ہے۔ تو تین دیواریں حائل ہیں تو پھر کیسے سنیں گے؟

ہم نے کہا کہ یہ جو آپ دلیل پیش کرتے ہیں یہ خود دلیل سماع ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے ہیں۔ دیکھو درمیان میں دیوار حائل تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام فرمایا تو صحابی نے سن لیا نا؟! (جی ہاں۔ سامعین) تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں سماع تو ہے نا! اور صحابی نے آہستہ کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں سنا، اس کا مطلب کہ سماع ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ آہستہ ہو تو نہیں سنتے اور اونچا ہو تو سنتے

ہیں۔ اس سے سماع کا انکار تو نہیں ہو رہا۔

آگے رہا یہ مسئلہ کہ یہاں آہستہ جواب دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں سنا اور قبر پر آہستہ کہیں تو پھر بھی سن لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اصالتہ اور براہ راست سماع ہوتا ہے جسم کا اور جسم کے واسطے سے سماع ہوتا ہے روح کا، اور قبر میں براہ راست سماع ہوتا ہے روح کا اور روح کے واسطے سے ہوتا ہے جسم کا۔ اب ظاہر ہے کہ جسم کا سماع کمزور ہے اور روح کا سماع زیادہ ہے، اور پھر قبر میں جو روح کی پرواز ہے وہ اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ بہت آہستہ کہو تو بھی سن لیتی ہے کیونکہ پرواز بڑھ جاتی ہے۔ اور پرواز کیسے بڑھتی ہے؟ اس کو ذرا سمجھ لیں۔

### روح اور جسم کے تین تعلقات:

دنیا میں روح اور جسم کا تعلق تین طرح کا ہے:

1: تعلق تصرف

2: تعلق تدبیر

3: تعلق حیات

تعلق تصرف کا معنی روح کا جسم کے ساتھ وہ تعلق جس کی وجہ سے جسم از خود اپنا کام اپنے اختیار سے کرتا ہے جیسے اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، جاگنا... یہ کام ہوتے ہیں۔

اور تعلق تدبیر؛ جس تعلق سے جسم کے کام غیر اختیاری طریقے سے خود بخود ہوتے ہیں جس طرح روح اور جسم کے تعلق سے ہم چاہیں نہ چاہیں کھانا ہضم ہو رہا ہے، ہم چاہیں نہ چاہیں خون کی گردش ہو رہی ہے، ہم چاہیں نہ چاہیں نبض چل رہی ہے تو یہ تدبیر کا تعلق ہے۔ پورے جسم کا جو نظام ہے خود بخود چل رہا ہے، ہمارے اختیار کے بغیر چل رہا ہے۔

اور روح اور جسم ایک کا تعلق وہ ہے کہ جس سے جسم کو حیات ملتی ہے۔ جب آدمی جاگ رہا ہوتا ہے تو روح اور جسم کے تینوں تعلق باقی رہتے ہیں؛ تعلق تصرف، تعلق تدبیر اور تعلق حیات۔ روح کی رفتار بہت کم ہوتی ہے، روح دور جاتی ہی نہیں اور جب آدمی سو جاتا ہے تو روح کا تعلق تصرف ختم ہو جاتا ہے تو دو تعلق رہتے ہیں۔ اب روح کی پرواز بڑھ جاتی ہے۔ اب جب آدمی سوتا ہے تو کسی کی روح مکہ چلی جاتی ہے۔ کسی کی مدینہ چلی جاتی ہے۔ کسی کی کہاں۔۔ کسی کی کہاں۔۔ جیسی روح ہوتی ہے ویسی جگہ پر چلی جاتی ہے۔

لیکن جب انسان جاگ رہا ہو اور جاگتے ہوئے کہے کہ یار میں نے ابھی مکہ مکرمہ دیکھا ہے تو لوگ اسے کہیں گے کہ تو جھوٹ بول رہا ہے! یہاں بیٹھ کر تو مکہ نظر نہیں آتا۔ اور اگر سونے والا کہے کہ میں دورانِ سبق سو گیا تھا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کعبہ کی زیارت کر رہا ہوں، کعبہ کا طواف کر رہا ہوں تو کوئی بھی نہیں کہتا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔ کعبہ کا طواف جسم نہیں کر رہا بلکہ روح کر رہی ہے۔ صرف ایک تعلق تصرف کم ہوا ہے تو روح کی پرواز کتنی بڑھ گئی ہے!

اور جب آدمی پر موت آتی ہے اور قبر میں چلا جاتا ہے تو تعلق تدبیر بھی ختم ہو جاتا ہے، تعلق حیات بھی ختم ہو جاتا ہے موت جو آگئی ہے! اب روح الگ ہے اور جسم الگ ہے لیکن جب دوبارہ روح کا اعادہ ہوتا ہے تو تعلق حیات ہو جاتا ہے، تعلق تدبیر ختم ہو جاتا ہے۔ اب قبر مبارک میں جو روح اور جسم کا تعلق ہے تو تعلق تصرف اور تعلق تدبیر کے بغیر ہے۔ تو جب تعلق تصرف ختم ہو جائے تو روح کی پرواز اتنی بڑھتی ہے اور جب روح کا تعلق تدبیر بھی ختم ہو جائے اب بتاؤ روح کی پرواز کتنی ہو گی؟

اب مدینہ منورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر ہو اور ہم یہاں سے



سلام کریں اور روح مدینہ منورہ میں سن لے یہ عقل کے خلاف نہیں ہے، عقل اس کی نفی نہیں کرتی لیکن چونکہ شرع کی اس پر دلیل نہیں ہے اس لیے ہم اس کے قائل نہیں ہوتے، ہم قائل اس بات کے ہیں کہ روضہ مبارک پر پڑھیں تو خود سنتے ہیں اور دور سے پڑھیں تو فرشتے پہنچاتے ہیں حالانکہ دور سے سماع پر عقل مخالف نہیں ہے۔ جتنا شریعت سے ثابت ہے ہم اتنا مانتے ہیں اور جو ثابت نہیں وہ نہیں مانتے! اسی کا نام اعتدال ہوتا ہے۔

### حضور صلی اللہ علیہ وسلم کب راضی ہوں گے؟

﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾

آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِذَا لَأَرَضَىٰ وَوَاحِدٌ مِّنْ أُمَّتِي فِي النَّارِ۔<sup>94</sup>

میرا ایک امتی بھی جہنم میں ہو تو میں راضی نہیں ہوں گا۔

حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت

کے بارے میں اللہ میری شفاعت کو قبول فرمائیں گے۔ اللہ فرمائیں گے ”رَضِيتَ يَا

مُحَمَّدٌ؟“ کیا آپ راضی ہو گئے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے: ”يَا رَبِّ

رَضِيتُ“ ہاں اللہ میں راضی ہو گیا ہوں، میں خوش ہو گیا ہوں۔<sup>95</sup>

### پیغمبر پاک پر نعمتِ خداوندی:

﴿أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ﴾

94۔ التفسیر الکبیر للرازی: ج 31 ص 192

95۔ الجامع لاحکام القرآن القرطبی: ج 2 ص 3335

اللہ رب العزت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے کہ میں آپ کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ ہم نے تو ہمیشہ آپ کی مدد کی ہے، یہ جو لوگ باتیں کر رہے ہیں یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ فرمایا: کیا آپ کو اللہ نے یتیم نہیں پایا پھر اللہ نے آپ کو ٹھکانا دیا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت آپ علیہ السلام کے دادا نے کی، وہ فوت ہوئے تو چچا ابو طالب نے کی۔ اب دیکھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ایمان سے محروم ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اللہ نے اس قدر ان کے دل میں ڈال دی کہ سائے کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور بہت خیال رکھا۔

﴿وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ﴾

آپ شریعت سے ناواقف تھے، بے خبر تھے، اللہ نے آپ کو شریعت کا راستہ دکھا دیا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے، جب تک اعلان نبوت نہیں ہوا شریعت آپ کے علم میں نہیں تھی، اللہ نے بعد میں دی ہے۔

﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ﴾

آپ نادار تھے، آپ کے پاس مال نہیں تھا تو اللہ نے غنی فرما دیا۔

﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۖ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۖ وَأَمَّا

بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾

اب آپ یتیم پر سختی نہ کریں، سائل کو نہ ڈانٹیں! اور اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ کیا کریں۔

**تین احسانات اور تین اہم احکامات:**

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے یہاں تین حکم فرمائے ہیں اور اس

سے پہلے اللہ نے تین احسانات یاد کرائے ہیں:

◆ پہلا حکم دیا... ”فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ“ کہ آپ نے یتیم پر سختی نہیں کرنی! اس لیے اللہ نے ماضی یاد دلایا، فرمایا: ”أَلَمْ يَجِدَكَ يَتِيمًا فَآوَى“ جب سامنے کوئی یتیم آئے تو اپنی یتیمی کو اپنے ذہن میں رکھیں! پھر یتیم پر سختی نہ کرنا بہت آسان ہو گا۔

◆ دوسرا حکم دیا... ”وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ“ کہ جب کوئی مانگنے والا آئے تو اسے جھڑکنا مت!

اس حکم کا تعلق ”وَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَى“ اور ”وَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَى“ دونوں کے ساتھ ہے کہ دیکھیں آپ کے پاس شریعت کا علم نہیں تھا اور اللہ نے دیا ہے، آپ کے پاس مال نہیں تھا خدا نے دیا ہے۔ اب ”وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ“ اگر کوئی سائل آپ کے پاس شریعت کا مسئلہ پوچھنے کے لیے آئے تو ڈانٹیں مت بلکہ اسے مسئلہ سمجھائیں، پہلے آپ کو بھی مسائل نہیں آتے تھے ہم نے بتا دیے ہیں۔ ایسے ہی اگر کوئی شخص مانگنے کے لیے آئے، مال کا سوال کرے تو ”فَلَا تَنْهَرْ“ اسے بھی مت ڈانٹیں، اس کو مال دیں، کیونکہ آپ کے پاس بھی مال نہیں تھا ہم نے آپ کو مال دیا ہے۔ تو ”وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ“ کا تعلق دونوں کے ساتھ ہے۔

◆ تیسرا حکم دیا... ”وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ“ ... آپ اپنے رب کی نعمتوں کا اظہار فرمائیں، جو اللہ نے نعمتیں آپ کو دی ہیں ان کا آپ زبان سے تذکرہ بھی کریں۔

اس حکم کا تعلق پوری سورت کے ساتھ ہے کہ جتنی نعمتیں ہم نے آپ کو دی ہیں، ان سب نعمتوں کا اظہار آپ اپنی زبان سے کریں اور بیان کریں۔ جب اللہ کسی کو

دولت عطا فرمائیں تو اس پر دولت کے آثار نظر آنا اللہ کو پسند ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ بندہ میری نعمت کا اظہار کرے۔

اس سورۃ الضحیٰ سے لے کر سورۃ الناس تک ہر سورت کے ساتھ تکبیر کہنا سنت ہے۔ تکبیر کے الفاظ ہیں: ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ“ اس تکبیر کو سورت شروع میں پڑھ لیں یا سورت کے آخر میں پڑھ لیں دونوں طرح سے ثابت ہے۔ آپ سب ایک مرتبہ پڑھ لیں۔ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ“  
وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الم نشرح

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْمُتَشَرِّحُ لَكَ صَدْرَكَ ۖ وَوَضَعْنَا عَنكَ وَدْرَكَ ۚ﴾

اس سورت مبارکہ میں اللہ رب العزت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی نعمتوں کا اظہار فرما رہے ہیں۔ سورۃ الضحیٰ سے لے کر آخر تک جو سورتیں ہیں۔ تقریباً بائیس ہیں۔ ان تمام سورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا ذکر ہے، درمیان میں کچھ قیامت کا ذکر بھی ہے لیکن اصل ذکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا ہے۔ جب قرآن مجید شروع ہوا تو:

﴿الْم ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۚ﴾

وہاں قرآن کی عظمت بیان کی اور جہاں قرآن ختم ہوا ہے تو وہاں صاحب قرآن کا ذکر کیا ہے۔ قرآن کا آغاز ہوا تو وہاں قرآن کی عظمت کا بیان تھا اور جہاں قرآن ختم ہو رہا ہے تو وہاں صاحب قرآن کی عظمت کا بیان ہے۔ فرمایا:

شرح صدر کا معنی:

﴿الْمُتَشَرِّحُ لَكَ صَدْرَكَ ۚ﴾

کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کھول نہیں دیا؟!  
اس کے دو معنی ہیں:

نمبر 1: جو شوق صدر ہوا تھا؛ باضابطہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک چاک کیا گیا، قلب مبارک کو باہر نکالا گیا اور زمزم کے پانی سے دھو کر علوم و معرفت سے اس کو بھر دیا گیا۔

نمبر 2: ہم نے آپ کو علوم کی وسعت عطا کی ہے اور مخالفین کی مخالفت کو برداشت کرنے کا تحمل دیا ہے۔ ہم نے آپ کا سینہ بڑا کر دیا ہے۔

**”آپ کا بوجھ اتار دیا“ کا معنی:**

﴿وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝﴾

ہم نے آپ سے آپ کا بوجھ اتار دیا ہے وہ بوجھ جس نے آپ کی پشت کو جھکا کے رکھ دیا تھا۔

اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت بڑے تھے اور بسا اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسا کام فرما لیتے کہ آپ سمجھتے کہ مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا تو اس پر آپ کو بہت زیادہ افسوس ہوتا، اتنا افسوس ہوتا کہ گویا مجھ سے خطا ہو گئی ہے۔ اللہ رب العزت نے تسلی دی ہے کہ نہ ان باتوں کا آپ سے مواخذہ ہے اور نہ ان پر آپ کی پکڑ ہے۔ آپ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ آپ میں جب حساسیت پیدا ہوگی یہ آیت پھر سمجھ آئے گی کہ اس کا مطلب کیا ہوتا ہے! بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ بندہ کہتا ہے کہ مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا، یا میں نے کر لیا! حالانکہ آدمی اپنے ذوق سے اس کو ٹھیک سمجھ رہا ہوتا ہے اور پھر اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

دوسرا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ چونکہ پورے عالم کے نبی تھے اور یہ ایسا بڑا بوجھ تھا کہ جب آپ سوچتے تو کانپ جاتے حتیٰ کہ جوانی میں بڑھاپے کے آثار نظر آتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ کو کس چیز نے بوڑھا کیا؟ فرمایا کہ

سورت ہود نے۔ سورت ہود کی کون سی آیت؟ فرمایا: ”فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ“<sup>96</sup>

اب اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوچتے کہ میں پوری دنیا کا نبی ہوں، پوری دنیا کو سنبھالنا ہے، پوری دنیا کو دعوت دینی ہے اور تنہا مکہ میں ہوں، ساتھ گھر کے بندے بھی نہیں ہیں، خاندان کے بھی نہیں ہیں، جان کے دشمن ہیں تو پوری دنیا میں کیسے پہنچوں گا، فرمایا:

﴿وَوَضَعْنَا عَنكَ وَزْرَكَ ۖ الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۖ﴾

ہم نے آپ کو اتنا بڑا دل دیا ہے کہ آپ کے لیے تحمل آسان ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا کہ جس بوجھ نے آپ کی کمر کو توڑ دینا تھا ہم نے اس بوجھ سے بھی آپ کو بچا لیا۔ آپ کا دل اتنا بڑا ہو گیا کہ مشکل آپ کو مشکل محسوس نہیں ہوتی۔

### ایکسیڈنٹ کا واقعہ:

جب دل بہت بڑا ہوتا ہے تو پھر مشکلیں مشکل محسوس نہیں ہوتیں، بندہ مشکلات میں بھی ہنس رہا ہوتا ہے، کھیل رہا ہوتا ہے جیسے آپ کہتے ہیں کہ انجوائے کر رہا ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ایک تو ایکسیڈنٹ؛ حادثے بہت ہوئے ہیں، آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ ایک بار یہ ہماری سڑک بن رہی تھی اور میں خود گاڑی چلا رہا تھا۔ مولانا ٹمبس الرحمن صاحب ہمارے کراچی کے امیر ہیں، ان کا نکاح تھا لاہور میں، مجھے کہا کہ استاد جی میری بڑی خواہش ہے کہ نکاح آپ پڑھائیں! میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

میں خود سرف گاڑی لے گیا، ساتھ لڑکا بیٹھا ہوا تھا، مجھے بخار بھی تھا اور گاڑی بھی چلا رہا تھا۔ واپسی پر مغرب کے بعد سخت بارش ہوئی اور اندھیرا بھی تھا۔ گاڑی کی لائٹوں میں بھی دیکھنا مشکل تھا۔ تو پیچھے ایک پُل ہے ”پُل مانگنی“ وہاں سے میں آیا تو

جیسے ہی میں نے کراس کیا تو میں نے پوچھا کہ کون سی جگہ ہے؟ لڑکا کہتا ہے کہ استاد جی! یہ 84 چک ہے۔ یہ ہمارے 87 کے ساتھ والا۔ ہم قریب آگئے ہیں۔ تو میں نے سمجھا کہ دسواں میل [چک 87 کے بالکل قریب ایک پل کا نام] ہو گا، اسی طرح کا پل تھا۔ آگے روڈ ٹوٹا ہوا تھا، جب میں نے اس طرف گاڑی موڑی اور سیدھی لانے لگا تو تقریباً دو فٹ کی گہرائی کھودی ہوئی تھی، اسی سپیڈ سے گاڑی سیدھی اندر گئی، گاڑی بڑی تھی پھر ایسے اوپر اٹھی پھر نیچے گری، گاڑی الٹی ہو گئی، اب ظاہر ہے کہ پٹرول گرنا بھی شروع ہو گیا اور بارش بھی ہو رہی تھی، شیشہ ٹوٹا تو میں وہاں سے باہر نکلا، لوگ دوڑے کہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہو گا۔ باہر نکلا تو میں ہنس رہا تھا۔

اب ان لوگوں کو دیکھ کر تعجب ہو رہا تھا کہ یار ہم آئے کہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہو گا اور یہ ہنس رہا ہے! میں نے کہا کہ بس گاڑی بند کرو، بارش ہو رہی تھی اس لیے بارش سے آگ نہیں لگی۔ اس کے بعد میں نے فون کیا اور رینٹ کی گاڑی منگوائی۔ میں نے کہا کہ میں مرکز جاتا ہوں، گاڑی صبح لے آنا۔ مرکز گاڑی لے آئے۔ میں نے پٹیاں لگائیں، کپڑے سیٹ کیے اور ٹھیک تھا۔ میں طلبہ میں آگیا، میں نے کہا جب اللہ نے بچا لیا تو اب کیاروناد ہونا!

**ہم نے آپ کا نام بلند کر دیا:**

﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾

اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا نام بلند کر دیا ہے۔

جہاں اللہ کا نام ہو گا وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی ہو گا۔ حدیث پاک

میں ہے کہ اللہ رب العزت نے فرمایا:



إِذَا ذُكِّرْتُ ذُكِّرْتَ مَعِيَ.<sup>97</sup>

میرے ساتھ آپ کا بھی تذکرہ کیا جائے گا، ہمیشہ آپ کا نام لیا جائے گا۔

### ایک تکلیف اور دورا حتمی:

﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۖ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۖ﴾

میرے پیغمبر! اگر آپ پر مشکلات ہیں تو مشکلات کے بعد آسانیاں بھی ہیں، ہم مشکل دیں گے تو مشکل کے بعد آسانی بھی دیں گے۔

یہ آپ نے پڑھا ہو گا ”العُسْر“ پر الف لام تعریف کا ہے جس سے عسر کا لفظ معرفہ بنا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ معرف باللام کا اگر تکرار ہو تو اس دوسرے لفظ سے مراد ایک چیز یعنی وہی پہلے والی چیز ہوتی ہے اور اگر نکرہ کا تکرار ہو تو اس سے مراد دو چیزیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ یہاں ﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۖ﴾ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿۱﴾ میں ”العُسْر“ معرفہ ہے اور تکرار کے ساتھ ہے اور ”يُسْرًا“ نکرہ ہے اور یہ بھی تکرار کے ساتھ آیا ہے، اس کا معنی کہ ایک ”عُسْر“ پر اللہ دو ”يُسْر“ دیں گے، ایک تنگی پر اللہ دو آسانیاں دیں گے۔ آپ نے نور الانوار میں یہ شعر پڑھا ہو گا:

إِذَا اشْتَدَّتْ بِكَ الْبَلَوُ فَقَهَّكُزْ فِي الْكَمْ نَشْرُحْ

فَعُسْرٌ بَيْنَ يُسْرَيْنِ إِذَا فَكَّرْتَهُ فَافْرَحْ<sup>98</sup>

کہ جب پریشانیاں اور مصیبتیں تمہیں گھیر لیں تو سورۃ الم نشرح میں غور کیا کرو! اس میں دو یسر کے درمیان ایک عسر ہے، کیا مطلب کہ ایک مصیبت پر اللہ دو خوشیاں دیتے ہیں، جب اس کو پڑھو گے، اس میں غور کرو گے تو خوش ہو جاؤ گے!

97- صحیح ابن حبان: ص 944 کتاب الزکاة باب فی ذکر نعم المنعم رقم الحدیث 3382

98- نور الانوار: ص 90

لیکن یہ بات سمجھ لیں کہ یہاں ”العُسْرِ“ سے مراد عام عسر نہیں ہے بلکہ اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عسر ہے کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف ہے اللہ ہر تکلیف پر کم از کم دو آسانیاں دیں گے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی ہے کہ مشکلات ختم ہو جائیں گی اور آسانیاں شروع ہو جائیں گی۔ اگر کسی بندے کو مشکلات کے بعد راحت نہ ملے، مشکلات ہی ملیں تو وہ یہ نہ سمجھے کہ اس آیت کے خلاف ہے کیونکہ یہ ہر فرد کے لیے نہیں ہے بلکہ خالصتاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ اللہ اپنے کرم سے ایسا ہی کرتے ہیں کہ جب کوئی تکلیف آئے اور بندہ ڈٹ جائے اور برداشت کرے تو اللہ اس کے بعد آسانیاں پیدا فرمادیتے ہیں لیکن اصلاً یہ وعدہ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے۔

### رجوع الی اللہ؛ کام بڑھانے کا ذریعہ

﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ۖ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ﴾ (۸)

جب آپ عبادات سے فارغ ہو جائیں۔ ایسی عبادات جسے تبلیغ کہتے ہیں۔ پھر آپ ذاتی عبادات میں مشغول ہو جائیں، اور اپنے اللہ کی طرف متوجہ رہیں۔ عبادات دو قسم کی ہیں؛ بعض وہ ہیں کہ جن سے اجر تو ملتا ہے لیکن مقصود اس سے دوسروں کو نفع پہنچانا ہوتا ہے اور بعض عبادات وہ ہیں کہ جن سے مقصود اپنے آپ کو نفع پہنچانا ہوتا ہے۔ مثلاً میں ابھی آپ کو سبق پڑھا رہا ہوں، آپ کا مقصد بھی اجر ہے اور میرا مقصد بھی اجر ہے تو سب کا مقصود ثواب ہی ہے لیکن سبق پڑھانے سے آپ کو سمجھانا مقصود ہے خود سمجھنا مقصود نہیں ہے۔ ایک شخص مصلیٰ پر امام بنتا ہے اس کا مقصد اپنی نماز نہیں بلکہ دوسروں کو جماعت کرانا ہوتا ہے، قاری صاحب درس گاہ میں بیٹھتے ہیں تو ان کا مقصد قرآن کو خود پڑھنا نہیں بلکہ بچوں کو پڑھانا ہوتا ہے۔

تو بعض عبادات وہ ہیں کہ جن سے مقصود دوسروں کو نفع ہوتا ہے اور فرض سے پہلے جو ہم سنتیں پڑھتے ہیں تو ان سے مقصود اپنی ذات ہوتی ہے، جب رات کو اٹھ کر تہجد پڑھتے ہیں تو اس کا نفع اپنی ذات کو دینا مقصود ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت اپنے پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہے ہیں کہ جب آپ ان عبادات سے فارغ ہو جائیں جن کا مقصد امت کو نفع دینا ہے تو اب ان عبادات میں مشغول ہو جائیں جن کا مقصد اپنی ذات کو نفع دینا ہے، جب دعوت اور تبلیغ سے آپ فارغ ہو جائیں تو پھر ذکر کریں، پھر نوافل پڑھیں، پھر تلاوت کریں، پھر غور و فکر کریں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح یہ حکم پیغمبر کو ہوتا ہے یہی حکم پیغمبر کے وارث کو بھی ہے۔ علماء کو چاہیے کہ کچھ وقت ایسا نکالیں کہ جو خالص اپنی ذات کے لیے ہو، اس میں ذکر کا اہتمام کریں، تلاوت کا اہتمام کریں، تہجد کا اہتمام کریں خالص اپنی ذات کے لیے۔ میں اسی لیے روتا ہوں کہ علماء کو ذکر دوسروں سے زیادہ کرنا ضروری ہے، علماء کے لیے تہجد دوسروں سے زیادہ ضروری ہے۔

### عبادات کی دو قسمیں:

قرآن کریم میں اللہ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ عبادات جن سے دوسروں کو نفع پہنچانا مقصود ہوتا ہے ان کے ساتھ ہے ”فَرَعْتَ“ کہ جب آپ ان سے فارغ ہو جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ عبادات جن کا مقصد اپنی ذات کو نفع پہنچانا ہے ان سے بندہ کبھی فارغ نہیں ہوتا اور جن سے مقصد دوسروں کو نفع پہنچانا ہوتا ہے ان سے بندہ فارغ ہو جاتا ہے۔ سبق پڑھانے کا تو خاص وقت ہوگا، تقریر کا خاص وقت ہوگا اور تصنیف کا خاص وقت ہوگا لیکن اپنی ذات کے لیے اللہ اللہ کرنے کے لیے کوئی خاص وقت نہیں ہوگا! اس لیے کوشش کر کے ہمیں اس میں مشغول رہنا چاہیے۔

## خود کو تھکا دیں!

اور پھر لفظ ”فَانْصَبْ“ یہ نصب سے ہے، ”فَانْصَبْ“ کا معنی ہے ایسے مشغول ہوں کہ آپ تھکاوٹ محسوس کریں۔ اتنا ذکر نہیں جس پر طبیعت خوش ہو بلکہ اتنا ذکر کریں کہ تھکاوٹ محسوس ہو، اتنے نوافل نہیں جن سے ہشاش بشاش ہوں بلکہ اتنے نوافل پڑھیں جن سے جسم کو تھکاوٹ محسوس ہو۔

اب ہم خود اندازہ کریں کہ ہم کتنا ذکر کرتے ہیں؟ ہم تلاوت کتنی کرتے ہیں؟ ہم تہجد کتنی پڑھتے ہیں؟ اس لیے ہم تمام یہ نیت کریں کہ موت تک تہجد نہیں چھوڑیں گے... ادائیں، اشراق نہیں چھوڑیں گے، تلاوت کریں گے؛ یہ مزاج بنالیں۔ ہمارے جتنے مشائخ ہیں ہم سب کی قدر کرتے ہیں اور بہت عزت کی نگاہ سے ان کے فرمودات کو دیکھتے اور سنتے ہیں لیکن ہر کسی کا اپنا ذوق ہوتا ہے۔ میرا اپنا ذوق یہ ہے کہ مسنون اعمال کا اہتمام کروں، بس مسنون اعمال پر زور دوں۔

## مصیبت کے وقت کی دعا:

مجھ سے اکثر ساتھی پوچھتے ہیں کہ ہم مصیبت میں کیا پڑھیں؟ میں کہتا ہوں کہ ”يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ“ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی پڑھتے تھے اس لیے آپ بھی پڑھیں۔ اسی طرح اگر کوئی تکلیف ہو گئی ہو تو یہ پڑھیں:

بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِي لَا يَصْرُ مَعَ اسْمِهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔<sup>99</sup>

حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ پڑھتے تھے۔ آپ بھی یہ پڑھیں۔ جو مسنون چیزیں ہیں ان کا اہتمام کریں۔ مجھے لوگ کہتے ہیں جی! ہمارے لیے دعا کرو۔ میں کہتا

ہوں کہ فرض نماز کے بعد آپ خود اپنے لیے دعا کیا کرو، جب فرض نماز کے بعد دعا کی قبولیت کا وقت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے تو بس اسی کا اہتمام کرو، اس کا بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ جی! میرا مسئلہ ہے اس کے لیے آپ استخارہ کریں۔ میں کہتا ہوں کہ بھائی! کام آپ کا ہے اور استخارہ ہم کریں، آپ خود استخارہ کر لیں۔ اور استخارے والے لوگ بھی عجیب تماشے ہیں، اُس لڑکی کی تصویر بھی دیں گے کہ اس کو ذرا دیکھ لو اس سے میں نے شادی کرنی ہے! اللہ حفاظت فرمائے۔ بس ان خرافات سے بچو! یقین کرو کہ اس سے کچھ بھی نہیں ہوتا، وقتی خواہشات پوری ہوتی ہیں۔ وقتی شہوتیں پوری ہوتی ہیں۔ وقتی طور پر دو چار روپے مل جاتے ہیں اور انجام اس کا ذلت ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة التین

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَالْتَيْنِ وَالزَّيْتُونَ ۚ وَطُورِ سَيْنِينَ ۚ وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۚ﴾

انجیر، زیتون، طور سینین اور مکہ مکرمہ کی قسم:

اللہ رب العزت نے یہاں چار قسمیں کھائی ہیں:

[1] انجیر کے درخت کی قسم، [2] زیتون کے درخت کی قسم، [3] طور سینین کی قسم، [4] مکہ مکرمہ کی قسم۔

ان قسموں سے یا تو خاص انہی درختوں کی قسمیں مراد ہیں یا ان شہروں کی قسمیں مراد ہیں جہاں یہ درخت اگتے ہیں اور وہ علاقہ شام ہے جہاں پر زیتون بھی ہوتا ہے اور انجیر بھی ہوتا ہے۔ ”طور“ تو پہاڑ کا نام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ سے ہمکلام ہوئے تھے اور سینین یا سیناء اس جگہ کا نام ہے جہاں یہ طور پہاڑ ہے۔ ﴿هَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ﴾ سے مراد شہر مکہ مکرمہ ہے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور اپنی ابتدائی زندگی یہاں گزاری ہے۔ یہ قسمیں کھا کر مضمون بیان فرمایا۔

انسان اللہ کی قدرت کا حسین شاہکار:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۚ﴾

ہم نے انسان کو دنیا کی سب سے اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۖ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝﴾

اس کے بعد ہم انسان کو دنیا کی بدترین حالت کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔ ہاں وہ لوگ جو ایمان لائے، نیک اعمال کیے تو ان کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ پہلے تو اللہ نے چار قسمیں کھا کر انسان کے حسن صورت کو بیان کیا ہے کہ ہم نے اس کو شکل کتنی اچھی عطا کی ہے! ایک حدیث پاک میں ہے:

"خَلَقَ اللَّهُ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ" <sup>100</sup>

اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔ یہ متشابہات میں سے ہے۔ بعض حضرات اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنی صفات کا کچھ حصہ انسان کو عطا فرمایا ہے۔

### آیت کے دو مطلب:

اس آیت کے دو مطلب ہیں:

[1]: "الانسان" سے مراد کافر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو کافر ہے ہم اس کی بعد کی زندگی کو بدترین بنا دیتے ہیں، ہم نے اس کی شکل و صورت بہت اچھی بنائی ہے لیکن جب وہ ایمان اور عمل صالح کو اختیار نہیں کرتا تو اس کی ظاہری شکل تو بڑھاپے میں ویسے ہی بدتر ہو جاتی ہے اور اس کی موت کے بعد کی زندگی اس سے بھی بدتر بنا دیتے ہیں، ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ ہاں جو ایمان والے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں تو ان کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔

ظاہری شکل تو ان کی بھی تبدیل ہو جاتی ہے، بڑھاپے میں شکل و صورت جوانی والی

نہیں رہتی لیکن اس کا اثر صرف دنیا پر ہوگا، انجام بہر حال ان کا اچھا ہے ﴿فَلَهُمْ أَجْرٌ  
غَيْرُ مَعْنُونٍ﴾ کیونکہ ایمان اور نیک اعمال ان کے موجود ہیں، ظاہری شکل اچھی نہیں  
بھی رہی تو پھر بھی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس صورت نے تو ختم ہونا ہی ہے، کافر کی بھی  
اور مؤمن کی بھی لیکن کافر کا آخرت کا انجام بہت برا ہوگا اور مؤمن کو آخرت میں  
ایسی شکل و صورت ملے گی کہ جس کا دنیا میں کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا۔

جس طرح حدیث پاک میں ہے کہ جنت میں ایک بازار ہے جس کا نام ہے؛ صُوقُ الشُّوَرِ  
تصویروں والا بازار، اس میں صرف تصویریں لٹکی ہوئی ہیں، جنتی اس بازار میں جائیں  
گے سیر کے لیے تو جی چاہے گا کہ بال ایسے ہوں تو بال ویسے ہی بن جائیں گے، شکل ایسی  
ہو تو ویسی بن جائے گی، ڈیزائن ایسے ہو تو ویسے ہی بن جائے گا۔ جیسے جاموں کی دکانوں  
پر آپ نے دیکھا ہو گا کہ بالوں کی کٹنگ کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ اور مزے کی بات یہ  
ہے کہ جنتی جو شکل چاہیں گے ویسی بن جائے گی اور جب گھر جائیں گے تو بیگم پہچان بھی  
لے گی کہ یہ وہی ہے، ایسا نہیں ہو گا کہ بیگم کو پتا ہی نہ چلے کہ یہ میرے گھر میں کون آ  
گیا! وہاں سب پہچان لیں گے کہ یہ وہی ہے اللہ ایسی صورت پیدا فرما دیں گے۔ ایک  
معنی تو یہ ہے۔

[2]: اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کو بہت خوب صورت  
شکل میں پیدا فرماتے ہیں لیکن جوانی کے بعد شکل بگڑتی ہے، بڑھاپے کی طرف آتے  
ہیں تو جوانی والی شکل و صورت باقی نہیں بنتی، اعضاء میں وہ طاقت نہیں رہتی، کمزور ہو  
جاتے ہیں، جسم میں ضعف آجاتا ہے، بدترین سی حالت انسان کی ہو جاتی ہے، انسان  
دوسروں کے سہاروں پر ہوتا ہے، چلنے کا محتاج ہوتا ہے، پیشاب پاخانہ کرنے میں  
دوسروں کا محتاج ہوتا ہے، بسا اوقات ناک اور آنکھوں کو خود صاف نہیں کر سکتا، بسا  
اوقات اپنے منہ پر لگے پانی کو صاف نہیں کر سکتا ایسی حالت ہو جاتی ہے لیکن اگر ایمان



اور اعمالِ صالحہ ہوں تو اللہ اس کے ایمان اور نیک اعمال کی وجہ سے ایسے افراد اس کو عطا فرمادیتے ہیں جو اس کی خدمت کرنے کو سعادت سمجھتے ہیں اور یہ بندہ بدتر حالت سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

ہمارے حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب رحمہ اللہ نے اپنی آخری عمر کے چودہ سال بستر پر گزارے ہیں فالج کی وجہ سے لیکن اللہ نے خدام کی ایسی فوج عطا فرمائی تھی کہ جو ہر وقت حضرت کی خدمت میں لگے رہتے تھے اور ہر بندہ خدمت کو اپنے لیے سعادت سمجھتا تھا، کبھی ناک کے ساتھ ٹشو کو لگاتے تو اس کو اٹھانے والے کئی لوگ ہوتے تھے۔ بندہ جب اپنی جوانی کو اللہ پر لٹاتا ہے تو پھر اللہ بڑھاپے میں ایسے افراد عطا فرمادیتے ہیں۔ حضرت فرماتے تھے کہ میرے ساتھ پھرنے والے یہ جوان خوب صورت لڑکے آپ دیکھتے ہو لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ اختر نے اپنی اٹھارہ سالہ جوانی اپنے ستر سالہ بوڑھے شیخ پر فدا کی ہے، اس کا صلہ یہ ہے کہ خدا نے مجھے بڑھاپے میں یہ نوجوان دے دیے ہیں۔ ہم آدمی کی جوانی کی قربانیاں نہیں دیکھتے اس لیے اس کے بڑھاپے کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔

**”تو چاند سے زیادہ خوبصورت نہ ہوئی تو تجھے تین طلاق!“**

آپ نے یہ واقعہ سنا ہو گا جو اس مقام پر مفسرین لکھتے ہیں کہ عیسیٰ بن موسیٰ ہاشمی جو ابو جعفر منصور کا وزیر تھا، اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا تھا۔ بعض لوگ بیوی سے پیار ضرورت سے زیادہ کرتے ہیں، بیوی سے پیار تو ہونا چاہیے لیکن ضرورت سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ بہت پیار کرتا تھا تو ایک بار چاندنی رات میں یہ بیوی کے ساتھ بیٹھا تھا، اس نے پیار کی مستی میں اپنی بیوی سے کہہ دیا:

أَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا إِنْ لَمْ تَكُونِي أَحْسَنُ مِنَ الْقَمَرِ

کہ اگر تو چاند سے زیادہ خوبصورت نہیں تو تجھے تین طلاق۔

یہ کہا تو بیوی فوراً اٹھ کر پردے میں چلی گئی کہ تو نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ اس نے تو مذاق میں کہا تھا لیکن طلاق مذاق میں بھی ہو جاتی ہے۔ رات اس نے بڑی مشکل اور بے چینی سے تڑپ تڑپ کر گزاری۔ صبح خلیفہ ابو جعفر منصور سے کہا کہ میں تو رات یہ کام کر بیٹھا ہوں۔ خلیفہ نے فقہائے شہر کو بلایا اور یہ مسئلہ پوچھا۔ تمام نے فتویٰ دیا کہ تمہاری بیوی کو تین طلاق ہو گئی ہیں۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد وہاں موجود تھے جو بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ تو خلیفہ نے پوچھا کہ آپ کیوں نہیں بولتے؟ تو انہوں نے یہ آیت تلاوت کی: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ اللہ کا فیصلہ ہے کہ انسان کو دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت بنایا ہے۔ تو ان کی بیوی چاند سے زیادہ خوب صورت ہے اس لیے میری رائے پر طلاق نہیں ہوئی۔ باقی فقہاء نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ ابو جعفر منصور نے کہا کہ جاؤ! طلاق نہیں ہوئی، تمہاری بیوی تمہارے لیے حلال ہے۔<sup>101</sup>

بیوی سے پیار کرنا جائز ہے لیکن اتنا نہ کریں کہ اس میں نمازیں چلی جائیں، تلاوت چلی جائے اور سب اعمال ختم ہو جائیں۔ بس حدود میں رہ کر پیار کرنا چاہیے۔

﴿فَمَا يَكْذِبُكَ بَعْدَ بِالذِّينِ﴾

اس کے بعد کون سی چیز ہے جو تمہیں قیامت کی تکذیب پر مجبور کرتی ہے؟

﴿أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَكَمِينَ﴾

کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ اس کی بات تم نہیں مانتے! حدیث پاک میں کہ جب تم یہ سورت پڑھو اور ﴿أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ

الْحَكِيمِينَ ﴿۱۰۲﴾ پر پہنچو تو ”بلیٰ وَأَنَا عَلَىٰ ذَٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِينَ“ کہا کرو! <sup>102</sup>

یعنی اللہ پوچھ رہے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ تو اس کا جواب یہ دینا چاہیے کہ ”کیوں نہیں! اللہ احکم الحاکمین ہے اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ اللہ احکم الحاکمین ہے۔“ آپ بھی پڑھ لیں!

انسان کے اعمال میں کوئی چھوٹی موٹی کوتاہی ہو بھی جائے تب بھی اپنی زبان پر حق کو جاری رکھو، حق کی تائید کرتے رہو تو اللہ اس پر بھی نواز دیتے ہیں۔  
وَاجْزُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة العلق

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ﴿١﴾ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴿٢﴾ اقْرَأْ وَ  
رَبُّكَ الْأَكْرَمُ ﴿٣﴾ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿٤﴾ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿٥﴾

قرآن کریم کی پہلی نازل ہونے والی آیات:

سورة العلق کی یہ پہلی پانچ آیتیں سب سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔

یہاں ایک بات سمجھ لیں کہ قرآن کریم کی سورة النمل میں جو بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے یہ بالاتفاق قرآن کا حصہ ہے:

﴿إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾<sup>103</sup>

اس کے علاوہ جو ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ ہے تو اس کے بارے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ قرآن مجید کا حصہ ہے اور دو سورتوں کے درمیان فرق کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے، یہ لا علی التبعین قرآن کا حصہ ہے یہ ہر سورت کا حصہ نہیں ہے۔ جب تراویح میں قرآن مجید پڑھیں تو ہمارے بعض مشائخ کی رائے یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم اس سورت العلق کے شروع میں جہراً پڑھ لیں، کیوں کہ قرآن

کریم کے پورے ختم کے لیے کسی سورت کے شروع میں بسم اللہ کا جہراً پڑھنا ضروری ہے۔ اگر کسی ایک رکعت میں بسم اللہ الرحمن الرحیم جہراً نہیں پڑھیں گے تو مقتدی قرآن کریم تو سنیں گے لیکن بسم اللہ الرحمن الرحیم کا سماع نہیں ہوگا۔ کسی رکعت میں یہ پڑھ لیں تاکہ پورے قرآن کا سماع ہو جائے۔ اب کس سورت کے شروع میں پڑھیں تو میں نے عرض کیا کہ بعض مشائخ کا معمول یہ تھا کہ وہ سورۃ العلق کے شروع میں پڑھتے تھے۔

### شان نزول:

نبوت کے اعلان سے قبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کئی کئی راتیں غار میں رہتے تھے، خلوت آپ کو محبوب ہو گئی تھی، ہر وقت آپ اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ دنیا سے کٹ کر خالص اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا اور اسی میں غور و فکر کرتے رہنا یہ آپ کی عبادت تھی۔ ایک دن اچانک جبرائیل امین علیہ السلام آئے اور کہا ”اقْرَأْ“ کہ آپ پڑھیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مَا أَنَا بِقَارِئٍ“ میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں فرمایا تھا؟ اس لیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سمجھے کہ کوئی لکھی ہوئی چیز ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ پڑھو! تو لکھی ہوئی چیز تو میں نہیں پڑھ سکتا۔ اس لیے فرمایا: ”مَا أَنَا بِقَارِئٍ“ میں کیسے پڑھوں، میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ تو جبرائیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سینے کے ساتھ ملا کر دیا، اتنا دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت محسوس کی۔ پھر کہا: ”اقْرَأْ“ کہ آپ پڑھیں! ارشاد فرمایا: ”مَا أَنَا بِقَارِئٍ“ میں کیسے پڑھوں، میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر کہا: ”اقْرَأْ“ کہ پڑھیں! تین بار دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: ”مَا أَنَا بِقَارِئٍ“ کہ پڑھا ہوا نہیں ہوں تو پھر جبرائیل امین نے یہ پانچوں آیتیں پڑھیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پانچوں آیات کا

تلفظ فرمایا۔

## صفتِ رب؛ جامع الصفات

﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾

پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے آپ کو پیدا کیا۔  
دیکھیں! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ صفتِ رب؛ اللہ تعالیٰ کی ایسی صفت ہے کہ جو تمام صفات کو جامع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلی وحی میں صفتِ رب بیان فرمائی ہے۔ قرآن کریم کی سب سے پہلی آیت ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ ہے اور قرآن کریم کی سب سے آخری سورت ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ ہے۔ عالم ارواح کا سوال ”اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ“ تھا اور عالم برزخ کا سوال ”مَنْ رَبُّكَ“ ہو گا! تو ان تمام مقامات میں صفتِ رب کو ذکر کیا ہے کیونکہ یہ صفتِ رب تمام صفات کو جامع ہے۔ اس لیے بعض مقامات میں صفتِ رب پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

## انسان کی پیدائش:

﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾

پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ انسان کو جنم ہوئے خون سے پیدا کیا۔

اللہ کی صفات میں سب سے بڑی صفت؛ صفتِ خلق ہے کہ اللہ نے تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ چونکہ اللہ نے اپنے احکامات کا پابند انسان کو بنانا ہے اس لیے پیدائش میں انسان کا ذکر کیا کہ اللہ نے انسان کو جنم ہوئے خون سے پیدا فرمایا ہے۔ یہاں ”خلق“ کا ذکر کیوں کیا؟ اس لیے کہ انسان کی پیدائش کے مختلف مراحل ہیں۔ سب سے پہلے خوراک ہے، پھر خوراک سے نطفہ بنتا ہے اور نطفے کے بعد

پھر علق ہے، علق کے بعد پھر مضغ؛ جما ہوا گوشت ہے، پھر اس کے اوپر ہڈی چڑھتی ہے، پھر روح آتی ہے، پھر انسان بنتا ہے۔ تو پیدائش کے مراحل میں ”علق“ ایک درمیانی حالت ہے تو اس کا یہاں ذکر اس لیے کر دیا تاکہ اس سے ابتدا اور انتہا کی حالتوں کی طرف اشارہ ہو جائے۔

﴿اِقْرَآ وَرَبُّكَ الْكَرِيمُ﴾

پھر دوبارہ فرمایا اور تاکید سے فرمایا کہ پڑھیں! آپ کا رب بڑا ہی کریم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو فرما رہے تھے کہ میں پڑھا ہوا انسان نہیں ہوں تو فرمایا کہ آپ کا رب کریم ہے، آپ نہیں پڑھے ہوئے تو پھر کیا ہوا؟! آپ کا رب کریم ہے اور کریم ہوتا ہی وہ ہے ”الَّذِي يُعْطِي بَدُونَ الْاِسْتِحْقَاقِ“ جو بغیر استحقاق کے دیتا ہے۔

**قلم؛ تعلیم کا ایک اہم ذریعہ**

﴿الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾

جس نے انسان کو قلم کے ذریعے سکھایا۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جس کو انسان جانتا بھی نہیں تھا۔

اللہ نے پہلے ﴿الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ فرمایا، پھر ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ فرمایا، حالانکہ ﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ کے بعد ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ﴾ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ انسان وہی چیز سیکھتا ہے جو پہلے سے نہ جانتا ہو تو دوبارہ ”عَلَّمَ“ کیوں فرمایا؟ یہ بتانے کے لیے کہ سیکھنے کا ذریعہ صرف قلم ہی نہیں ہے بلکہ بعضوں کو اللہ تعالیٰ علم دیتے ہیں بذریعہ قلم کہ وہ لکھی ہوئی چیز کو دیکھ کر پڑھ لیتے ہیں اور بعضوں کو علم دیتے ہیں بدون القلم کہ وہ لکھے ہوئے سے نہیں سیکھتے بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو صوری علوم عطا فرما دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو کسی اور ذریعے سے علوم عطا فرما

دیتے ہیں۔

حضرت مولانا رومی رحمہ اللہ اس بات کو یوں سمجھاتے ہیں کہ اہل تقویٰ کا علم کبھی ختم نہیں ہوتا، فرمایا کہ جس طرح گھڑے کا پیندا توڑ کر اس گھڑے کو سمندر کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو گھڑے میں پانی کبھی ختم نہیں ہوتا بالکل اسی طرح اہل تقویٰ کا دل چونکہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے اس لیے وہاں سے علوم نکلتے رہتے ہیں اور کبھی ختم نہیں ہوتے۔

﴿كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَّاظٍ ۚ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ ۗ﴾

فرمایا کہ سچ بات تو یہ ہے کہ انسان بہت سرکش ہے، حد آدمیت سے نکل جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے بارے میں یہ سمجھ رہا ہے کہ مجھے کسی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے تمہیں دنیا میں کسی فرد کی ضرورت نہیں ہے لیکن تم نے اللہ کی طرف تو لوٹ کر جانا ہے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھنا! ایک تو یہ ہے کہ انسان کے پاس ایسے اسباب ہوں کہ انسان؛ انسان کا محتاج نہ ہو، یہ تو ٹھیک ہے لیکن انسان؛ خدا کا محتاج نہ ہو، یہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ انسان حد آدمیت سے نکل جاتا ہے، کیوں کہ وہ خود کو مستغنی سمجھتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ مجھے کسی کی کیا ضرورت ہے!

دو باتیں سمجھنا! ایک یہ کہ اپنی ذات کی حد تک تھوڑا بہت کام کرنے میں ایک بندے کو دوسرے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اپنی ذات سے بڑھ کر جب آپ تحریک اور کاز کی بات کریں گے تو پھر آپ کو ایک کی نہیں پھر ہر کسی کی ضرورت پڑتی ہے، پھر روابط... پھر تعلق... پھر جوڑ... یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے، جنہوں نے کام نہیں کرنا ان کو تو کوئی ضرورت نہیں ہے اور جنہوں نے کام کرنا ہے ان کو تو ضرورت ہے، ان کو تو حکمت عملی اختیار کرنی پڑتی ہے۔



## ابو جہل کی دشمنی:

﴿أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَى ۙ عَبْدًا إِذَا صَلَّى ۖ﴾

کیا آپ نے ایسے شخص کو بھی دیکھا ہے جو بندے کو منع کرتا ہے جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ ابو جہل نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کیا کہ میرے سامنے نمازیں نہ پڑھو! میرے سامنے سجدے نہ کیا کرو! اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہاں چھوڑ سکتے تھے! ایک بار ابو جہل آیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سجدہ فرما رہے تھے، ابو جہل کی خواہش تھی کہ میں نماز کے دوران کوئی ایسی حرکت کروں کہ آپ نماز چھوڑ دیں۔ جب یہ حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا تو فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ کسی نے پوچھا: کیا ہوا؟ اس نے کہا کہ مجھے آگے خندق نظر آرہی ہے آگ کی اور اس میں کوئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جہنم کی آگ تھی اور وہ صورتیں ملائکہ تھے، اگر یہ آگے آتا تو فرشتے اس کی بوٹی بوٹی کر کے رکھ دیتے۔

## ابو جہل کا انجام بد:

﴿أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَى الْهُدَىٰ ۙ أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰ ۖ﴾

﴿كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۖ﴾

آپ یہ بتائیں کہ اگر وہ نماز پڑھنے والا شخص ہدایت پر ہو، صرف ہدایت پر ہی نہ ہو بلکہ وہ دوسروں کو تقویٰ کا حکم بھی دیتا ہو۔ یہاں ”اَوْ“ بمعنی ”بَلْ“ ہے۔ یعنی تقویٰ کی بات بھی کرتا ہو تو کیا پھر بھی تم اس کو روکو گے؟ اور پھر یہ دیکھو کہ روکنے والا شخص کون ہے؟ یہ روکنے والا شخص جھٹلاتا بھی ہے اور خود روگردانی بھی کرتا ہے۔

﴿الَّذِي يَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ يَرْىٰ ۖ﴾

﴿بِالنَّاصِيَةِ ۖ النَّاصِيَةِ كَاذِبَةٌ خَاطِئَةٌ ۖ﴾

کیا اسے یہ معلوم نہیں کہ اللہ اس کو دیکھ رہے ہیں؟! ﴿كَلَّا﴾ اس کو ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے، ﴿لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ﴾ اور اگر یہ باز نہ آیا اور ایسا کام کر لیا تو ہم اس کی پیشانی سے گھیٹ کر لے آئیں گے۔ اور پیشانی بھی کیسی ہے؟۔ ایک جھوٹے آدمی کی پیشانی ہے جو کہ گنہگار ہے۔

﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ﴾ ﴿سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ﴾ ﴿كَلَّا لَا تُطَعُّهُ وَاسْجُدْ وَ

﴿اِقْتَرِبْ﴾

اس بندے کو چاہیے کہ اپنی مجلس والوں کو بلاؤ، ہم اپنی پیادہ فوج ملائکہ کو بلائیں گے۔ اے پیغمبر! ﴿كَلَّا﴾ آپ ان کی بات کو ہرگز نہ مانیں، بس آپ سجدہ کریں اور میرا قرب حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بات سمجھائی ہے کہ اہل باطل جتنا بھی زور لگائیں ان کی پروانہ کریں، بس آپ خدا کی عبادت میں لگے رہیں۔ یہ پہلے کئی بار آچکا ہے کہ جب اللہ یہ ذکر فرماتے ہیں کہ یہ لوگ آپ کو تنگ کرتے ہیں، یہ آپ کو ستاتے ہیں تو آخر میں یہ بات ارشاد فرماتے ہیں: ”فَسَبِّحْ“ کہ آپ تسبیح کریں اور یہاں فرمایا: ”وَاسْجُدْ“ کہ سجدہ کریں۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھا دے۔

میں آپ سے بار بار کہتا ہوں کہ مخالفین جتنی بھی کوشش کریں اس کا حل جواب دینا نہیں ہے، اس کا حل رجوع الی اللہ ہے، اس کا حل عبادت میں مشغولیت ہے، اس سے انسان بالکل بدل جاتا ہے، ماحول بالکل سازگار ہو جاتا ہے، انسان کے قلب کو بڑی تسلی ہوتی ہے جب انسان جوابات دینے کے بجائے اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، رجوع الی اللہ کرتا ہے اور زبان محفوظ کرتا ہے۔ جب یہ آیت پڑھیں تو اس موقع پر سجدہ کرنا چاہیے، پڑھنے والے کو بھی اور سننے والے کو بھی۔

وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة القدر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۚ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۚ

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۚ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۚ﴾

### شان نزول:

حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے ایک عابد کا ذکر کیا جو ساری رات عبادت میں مشغول رہتا اور دن کو جہاد کرتا تھا۔ اس نے مسلسل ایک ہزار مہینے اسی طرح گزار دیے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم اس کے مقام کو کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ اس پر یہ سورت مبارکہ نازل ہوئی کہ اس امت کا شرف یہ ہے کہ اس امت کو اللہ نے ایک رات ایسی عطا فرمائی ہے جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔<sup>104</sup>

فرمایا: ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل کیا اور آپ کو کیا معلوم کہ لیلۃ القدر کیا ہے؟! لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

”قدر“ کا معنی ہوتا ہے شرف اور عزت یا ”قدر“ کا معنی ہوتا ہے تقدیر۔

## لیلۃ القدر کا پہلا معنی:

اگر پہلا معنی ہو تو لیلۃ القدر سے مراد ہے شرف، عزت اور عظمت والی رات۔ چونکہ یہ ایک رات ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے اس لیے یہ عزت اور عظمت والی رات ہے۔ یہ رات رمضان المبارک کی آخری دس راتوں میں سے کوئی ایک رات ہے اور ان میں بھی زیادہ ترجیح اس بات کو ہے کہ طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہے؛ اکیس، تیس، پچیس، ستائیس اور انیس۔

## کیا پہلی امتوں میں بھی امر بالمعروف تھا؟

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم آج تک یہ سنتے آرہے ہیں کہ یہ امت پہلی امتوں کی بہ نسبت افضل ہے ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ کہ یہ امت بہترین امت ہے، خیر امت ہے اور اس امت کے خیر امت ہونے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ﴿تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾<sup>105</sup> کہ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو پہلی امتوں میں بھی تھا۔ حدیث پاک میں ہے کہ اللہ رب العزت نے ایک فرشتے کو۔ غالباً جبرائیل علیہ السلام تھے۔ ان کو بھیجا کہ جا کر فلاں بستی کو تباہ کر دو! جبرائیل امین آئے، دیکھا کہ ایک شخص عبادت کر رہا تھا، جبرائیل امین نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا:

إِنَّ فِيهِ عَبْدَكَ فَلَا تَأْلَمْ يَعْصِكَ ظَرْفَةٌ عَيْنٍ

اس میں ایک ایسا بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے کے برابر آپ کی نافرمانی نہیں کی تو کیا اس کے ہوتے ہوئے تباہ کر دوں؟

قَالَ: اِقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ فَإِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ لِي سَاعَةً قَطُّ.

فرمایا کہ پہلے اس کو تباہ کرو اور پھر اس بستی کو تباہ کرو، اس لیے کہ یہ ہماری نافرمانی کو ہوتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن اس کے چہرے پر بل تک نہیں آتا۔<sup>106</sup>

اگر امر بالمعروف نہیں تھا تو اس کو تباہ کیوں کیا ہے؟

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ ﴿کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ کے تحت لکھتے ہیں کہ اس امت کی وجہ فضیلت یہ ہے کہ اس میں ایسا امر بالمعروف ہے کہ جس کو رد کرنے کی کوئی صورت موجود نہیں ہے۔ اگر کوئی اس امت کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو رد کر دے تو پھر اس کی پشت پر جہاد کی طاقت موجود ہے اور پہلی امتوں میں عام طور پر یہ نہیں تھا، بس خاص خاص امتوں میں تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی امت میں جہاد تھا، عام نبیوں کی امتوں میں جہاد نہیں تھا، اس امت کی دعوت چونکہ مقرون بالجهاد ہے اس لیے یہ امت تمام امتوں سے افضل ہے۔

﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۚ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ﴾ ... لیلۃ القدر ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔ اس پر بھی اعتراض ہے کہ ہزار مہینوں کے تراسی سال بنتے ہیں۔ تو تراسی سالوں میں سے ہر سال میں لیلۃ القدر بھی آئی ہوگی، تو پھر یہ ایک رات ان تراسی سالوں سے کیسے بڑھ جائے گی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تراسی سال وہ مراد ہیں کہ جن میں لیلۃ القدر نہ ہو، یہ لیلۃ القدر ان ایک ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔

### لیلۃ القدر کا دوسرا معنی:

”لیلۃ القدر“ کو لیلۃ القدر کہنے کی ایک وجہ تو یہ تھی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ”لیلۃ القدر“ تقدیر سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پورے سال میں جو جو احکام اور

اعمال کسی کی تقدیر میں ہوتے ہیں اللہ رب العزت اس رات میں ان احکامات کو لوح محفوظ سے نقل کروا کے ملائکہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔

اس پر بھی اعتراض ہوتا ہے کہ یہاں دو روایتوں میں تعارض ہے کہ عام طور پر ہم سنتے ہیں کہ لیلة البراءة جسے ہم شبِ براءت کہتے ہیں یعنی پندرہویں شعبان کی رات، اس رات میں آئندہ سال ہونے والے تمام احوال اللہ رب العزت فرشتوں کے حوالے کر دیتے ہیں؛ کون اچھا ہے، کون برا ہے، کس نے مرنا ہے، کس نے جینا ہے، کس کو کتنا رزق ملنا ہے!

اس کا جواب یہ ہے کہ لیلة البراءة؛ پندرہویں شعبان کو اللہ تعالیٰ اجمالی فیصلہ فرماتے ہیں کہ پورے سال میں کیا ہونا ہے اور لیلة القدر میں لوح محفوظ سے نقل کروا کر جس جس فرشتے کے ذمہ جو جو کام ہوتے ہیں ان کے حوالے کیا جاتا ہے۔ تو اجمالی فیصلے شبِ براءت میں ہوتے ہیں اور تفصیلی طور پر لکھ کر فرشتوں کے حوالے لیلة القدر میں کیے جاتے ہیں۔

### قرآن محفوظ ہے:

ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم محفوظ ہے۔ تورات، زبور اور انجیل محفوظ نہیں ہیں، ان میں تحریف ہو گئی ہے۔ ہمارے پاس اس کی دلیل ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾<sup>107</sup> ہے۔ یہاں ”الذِّكْر“ سے مراد قرآن کریم ہے کہ قرآن کریم نازل بھی اللہ نے فرمایا ہے اور اس کی حفاظت کا وعدہ بھی اللہ نے کیا ہے۔ اس پر سوال یہ ہے کہ ”الذِّكْر“ سے مراد قرآن کریم نہیں ہے کیونکہ جس طرح الذکر قرآن کریم کو کہتے ہیں اسی طرح تورات، زبور اور انجیل کو بھی کہتے ہیں، تو

اس پر کیا دلیل ہے کہ الذکر سے مراد قرآن کریم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہے باب تفعیل؛ نَزَّلَ يُنَزِّلُ تَنْزِيلًا اور ایک ہے باب افعال؛ اَنْزَلَ يُنَزِّلُ اِنْزَالًا۔ باب تفعیل میں تدریج ہے، جب تھوڑا تھوڑا کوئی کام کریں تو باب تفعیل ہوتا ہے، جب ”نَزَّلْنَا“ ہو تو اس کا معنی ہے کہ ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا اور جب ”اَنْزَلْنَا“ ہو تو اس کا معنی ہے کہ ایک ہی مرتبہ سب کو نازل کیا ہے۔ تو اللہ نے ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ الذکر سے مراد قرآن کریم ہے، چونکہ باقی کتابیں تھوڑی تھوڑی نہیں بلکہ یکبارگی نازل ہوئی ہیں اس لیے وہ مراد نہیں ہیں۔

### نزولِ قرآن دوبار ہوا ہے:

اس پر پھر سوال ہوتا ہے کہ اس سورت میں ہے ﴿اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾۔ جس طرح تورات، انجیل اور زبور کے لیے ”اَنْزَلْنَا“ آیا ہے اسی طرح قرآن کریم کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے۔ ایک مرتبہ لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اور دوسری مرتبہ آسمان دنیا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر۔ ﴿اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ میں یہ نزولِ اولیٰ مراد ہے یعنی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اور ﴿فَاَنزَلْنَاهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ﴾ میں نزولِ ثانوی ہے یعنی آسمان دنیا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر۔

﴿تَنْزِيلُ الْمَلَكَةِ وَالرُّوحِ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ۖ سَلَّمَ

هِيَ حَتَّىٰ مَطَلَعِ الْفَجْرِ ۖ﴾

”مِنْ كُلِّ أَمْرٍ“ کا تعلق ”سَلَّمَ“ کے ساتھ ہے یا ”تَنْزِيلُ“ کے ساتھ ہے۔

دونوں صورتوں میں معنی الگ الگ ہو گا۔ اگر ”مِنْ كُلِّ أَمْرٍ“ کا تعلق ”تَنْزِيلُ“ کے ساتھ ہو تو ”مِنْ“ بمعنی با ہو گا۔ معنی یہ ہو گا کہ فرشتے اور روح القدس اس رات میں اللہ کے حکم کے ساتھ اترتے ہیں۔ ”كُلِّ أَمْرٍ“ سے مراد خیر کے کام ہیں یعنی تمام امورِ خیر کو لے کر آسمان سے اترتے ہیں۔ چنانچہ جن بندوں کو عبادات میں مشغول دیکھتے ہیں تو ان کے لیے سلامتی کی دعائیں کرتے ہیں۔

اگر ”مِنْ كُلِّ أَمْرٍ“ کا تعلق ”سَلَامٌ“ کے ساتھ ہو تو پھر ”امر“ سے مراد امرِ شر ہو گا کہ یہ رات امورِ شر سے محفوظ ہے صبح صادق کے طلوع ہونے تک۔  
وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



## سورة البينة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ

حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۚ رَسُولٌ مِنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُطَهَّرَةً﴾ ﴿١﴾

اہل کتاب اور مشرکین کی ہٹ دھرمی:

دورِ جاہلیت کے کفار خواہ وہ اہل کتاب، یہود و نصاریٰ ہوں یا مشرکین؛ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے کفر میں اتنے سخت ہیں کہ بہت بڑی دلیل آنے تک یہ اپنے کفر سے باز آنے کے لیے تیار نہیں تھے اور عجیب بات یہ کہ بہت بڑی دلیل پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات آئی ہے اس کے باوجود بعض لوگ کلمہ حق قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ان یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا کفر اتنا سخت تھا کہ عام اور چھوٹے دلائل سے یہ کلمہ نہ پڑھتے بلکہ بہت بڑی دلیل آتی تب یہ کلمہ پڑھتے لیکن بعض بد بخت ایسے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے بڑی دلیل آنے کے باوجود بھی کلمہ نہیں پڑھ رہے۔

فرمایا: اہل کتاب اور مشرکین میں سے بعض ایسے تھے جو اپنے کفر سے باز آنے والے نہیں تھے یہاں تک کہ ان کے پاس بہت بڑی واضح دلیل نہ آتی۔ وہ دلیل اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتے ہیں۔

## کتابِ قیمہ سے مراد:

﴿فِيهَا كُتِبَ قِيمَةٌ﴾

ان صحیفوں میں ایسے احکام درج ہیں جو مضبوط اور معتدل ہیں۔  
 ”کُتِبَ“... کتاب کی جمع ہے اور یہاں کتاب سے مراد لکھی ہوئی کتاب نہیں ہے بلکہ اس سے مراد احکام ہیں۔ کیوں کہ اگر کتاب سے مراد معروف لکھی ہوئی کتاب ہو تو ”فِيهَا“ میں ہا سے مراد صحف ہیں جو کہ صحیفہ کی جمع ہے اور صحیفہ بھی لکھی ہوئی کتاب کو کہتے ہیں۔ پھر ”فِيهَا“ کہنے کا کوئی معنی نہ ہوتا! اس لیے کتب سے مراد احکام ہیں۔ یہ ایسے ہے جس طرح قرآن کریم میں ہے: ﴿لَوْ لَا كُتِبَ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾<sup>108</sup> کہ اگر اللہ کا حکم طے شدہ نہ ہوتا تو تم پر عذاب آجاتا۔ یہاں بھی کتاب سے مراد حکم ہے۔

## شریعت محمدیہ اعتدال کا نام ہے:

﴿قِيَمَةٌ﴾... سے مراد ہے معتدل اور مستحکم۔ معنی ہو گا کہ ان صحیفوں میں ایسے احکام درج ہیں جن میں اعتدال بھی ہے اور استحکام بھی۔ مطلب یہ کہ ان احکام میں افراط و تفریط بھی نہیں ہے اور ان احکام میں کمزوری بھی نہیں ہے۔ احکام مضبوط بھی ہیں اور معتدل بھی۔ کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہماری شریعت؛ شریعتِ معتدلہ ہے۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ❁

اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے پر چلا

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾<sup>109</sup> ☼

ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے۔

﴿إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ﴾<sup>110</sup> ☼

یہ قرآن ایسا راستہ دکھاتا ہے جو مستقیم ہے۔

### اہل کتاب کے اختلاف کی وجہ:

﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَةُ﴾

اور اہل کتاب نے اس وقت آپس میں اختلاف کیا جب ان کے پاس روشن دلیل آپہنچی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے یہود و نصاریٰ اس بات پر متفق تھے کہ آخر زمانے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے۔ اس بارے میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا۔ تورات اور انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور آمد کا ذکر موجود تھا اور یہ لوگ ایسی بشارتیں سناتے بھی تھے۔ مزید یہ کہ جب ان کا مقابلہ مشرکین سے ہوتا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دے کر دعائیں مانگتے تھے کہ اے اللہ! جو آخری نبی آنے والے ہیں ان کی برکت سے ہمیں مخالفین پر فتح عطا فرما! لیکن جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ان لوگوں نے اختلافات شروع کر دیے۔ کچھ لوگوں نے تو مانا لیکن اکثر لوگوں نے نہ مانا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے لگے۔

﴿وَمَا أَمْرًا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ حُنَفَاءَ وَ

يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ ﴿٥﴾

حالانکہ ان کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں اور ہر باطل سے الگ رہتے ہوئے عبادت کو خالص اللہ کے لیے رکھیں، نماز کی پابندی کریں، زکوٰۃ ادا کریں اور یہی مستقیم اور معتدل امت کا طریقہ ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہود اور نصاریٰ کے بارے میں تو بات سمجھ آتی ہے کہ ان کو حکم تھا کہ نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں اور عبادت خالص اللہ کے لیے کریں کیونکہ ان کے پاس تورات اور انجیل کتابیں موجود تھیں اور ان میں یہ احکامات درج تھے لیکن مشرکین کے لیے یہ حکم کہاں تھا کہ نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں اور عبادت خالص اللہ کے لیے کریں؟! اس کا جواب یہ ہے کہ مشرکین مکہ ملتِ ابراہیمی پر ہونے کے دعویدار تھے اور ابراہیم علیہ السلام تو یہ سارے کام کرتے تھے۔ جب وہ خود کو ملتِ ابراہیمی پر عمل پیرا کہتے تھے تو گویا انہیں بھی حکم ہے کہ وہی کام کریں جو ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا۔

**اہل کتاب اور مشرکین کا انجام:**

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾ ﴿٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ  
أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ﴿٧﴾

یہاں ایمان والوں کا اور کافروں کا تقابل بیان کیا ہے۔ فرمایا: اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کا ارتکاب کیا وہ جہنم میں داخل ہوں گے اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، یہ بدترین مخلوق ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے تو یہ بہترین مخلوق ہیں۔

## جنت کی نعمتیں:

﴿جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتٌ عَدْنٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ﴾

ان ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کا بدلہ اللہ کے ہاں وہ باغات ہیں جو ہمیشہ رہنے والے ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، یہ لوگ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہو گا اور یہ اللہ سے راضی ہوں گے۔ یہ سب انعامات اس شخص کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتا ہو۔

حدیث پاک میں ہے اللہ رب العزت اہل جنت سے فرمائیں گے: ”یَا أَهْلَ الْجَنَّةِ“ وہ جنتی جواب دیں گے: ”لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهُ فِي يَدَيْكَ“ اے ہمارے رب ہم حاضر ہیں! آپ کی فرمانبرداری کے لیے حاضر ہیں اور تمام بھلائیاں آپ ہی کے اختیار میں ہیں۔ اللہ رب العزت فرمائیں گے: ”هَلْ رَضِيتُمْ؟“ کہ جو میں نے تمہیں نعمتیں دی ہیں کیا تم راضی ہو؟ جنتی کہیں گے: ”رَضِينَا“ یا اللہ! ہم خوش ہیں، آپ نے ہمیں سب کچھ دیا ہے تو پھر راضی کیوں نہ ہوں؟ تو اللہ فرمائیں گے کہ میں تمہیں اس سے بڑی چیز دیتا ہوں۔ عرض کریں گے: اے اللہ! اس سے بڑی چیز کیا ہے؟ اس وقت اللہ فرمائیں گے کہ میں تم سب سے راضی ہوں اب تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ اللہ رب العزت یہ نعمت ہم سب کو عطا فرمائیں۔ (آمین) اور یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو دنیا میں دی ہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گئے اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الزلزال

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۖ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۖ وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ يَوْمَئِذٍ تُخَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۚ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۚ﴾

### احوال قیامت:

زلزلہ زمین میں دو مرتبہ ہوگا؛ ایک نفعِ اولیٰ کے وقت اور ایک نفعِ ثانیہ کے وقت۔ نفخ کا معنی ہوتا ہے پھونک مارنا۔ ایک مرتبہ جب اسرائیل علیہ السلام صور میں پھونک ماریں گے تو زمین میں بھونچال آجائے گا، زلزلہ ہوگا، پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے، آسمان کے ستارے گر جائیں گے اور دنیا میں سب مر جائیں گے۔ پھر دوبارہ صور میں پھونکیں گے تو پھر زلزلہ آئے گا، پھر مردے اٹھ جائیں گے، زمین کے دفینے باہر نکل آئیں گے۔ یہ دوسرا زلزلہ ہوگا اور یہاں ﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا﴾ میں یہی دوسرا زلزلہ مراد ہے۔

فرمایا: جب زمین میں زلزلہ آئے گا اور زمین اپنے اندر کے خزانے باہر نکال دے گی۔ اس وقت انسان کہے گا کہ زمین کو کیا ہو گیا ہے؟ اس دن زمین اپنے اندر کی

ساری باتیں بتائے گی۔ اس لیے کہ اللہ نے اسے یہی حکم فرمایا ہو گا۔

زمین یہ بتائے گی کہ مجھ پر فلاں نے فلاں گناہ کیا، فلاں نے فلاں نیک کام کیا۔ زمین دُفینے بھی باہر نکالے گی اور اپنے اوپر ہونے والے نیک اور برے کام بتائے گی۔ اس لیے حدیث پاک میں ہے:

”إِذَا تَابَ الْعَبْدُ أَنْتَسَى اللَّهُ الْحَفَظَةَ دُنُوْبَهُ وَأَنْتَسَى ذَلِكَ جَوَارِحَهُ وَمَعَالِمَهُ مِنَ الْأَرْضِ“ کہ جب بندہ گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ وہ گناہ فرشتوں کو بھلا دیتے ہیں اور اس کے اعضاء کو بھلا دیتے ہیں اور اس زمین پر جس پر اس نے گناہ کیا تھا اس زمین کو بھی بھلا دیں گے، ”حَتَّى يَلْقَى اللَّهَ وَلَيْسَ عَلَيْهِ شَاهِدٌ مِنَ اللَّهِ بِذَنْبٍ“ یہ بندہ اللہ کے ساتھ قیامت کے دن ایسی حالت میں ملے گا کہ اس کے خلاف کوئی گواہی دینے والا نہیں ہو گا۔<sup>111</sup>

اللہ رب العزت ہم سب کو ایسا ہی بنا دے۔ آمین

﴿يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ﴾

اس دن لوگ کئی گروہوں میں بٹ جائیں گے تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں۔

کچھ گروہ ایمان والوں کے ہوں گے اور کچھ کافروں کے ہوں گے۔ کافر اپنے اعمال کا نتیجہ جہنم دیکھیں گے اور مومن اپنے اعمال کا نتیجہ جنت دیکھیں گے۔

**نیکی اور برائی کا بدلہ یقینی ہے:**

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا

يَرَهُ ﴿١٥٤﴾

جس شخص نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا یعنی اس کا بدلہ اسے ملے گا اور ذرہ برابر بھی گناہ کیا ہو گا وہ بھی اسے بھی دیکھے گا۔

یہاں مفسرین نے لکھا ہے کہ خیر سے وہ مراد ہے جو خیر مقبول بھی ہو یعنی اس سے مراد ایسی نیکی ہے جو صحیح عقیدہ کے ساتھ ہو، باطل عقیدے کے ساتھ کی گئی نیکی کو اللہ ہرگز قبول نہیں کرتے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی لکھا ہے۔ پھر صحیح عقیدے کے ساتھ ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ وہ خیر ایسی ہو کہ جسے آدمی وہاں تک لے کر بھی پہنچے، ایسا نہ ہو کہ کفر کر بیٹھے اور ساری خیر کو ضائع کر دے۔ اسی طرح اگر دنیا میں شر یعنی کوئی گناہ کیا ہے اور بعد میں توبہ کر لی تو یہ شر قیامت کے دن نہیں دیکھے گا کیونکہ یہ شر قیامت تک پہنچا ہی نہیں بلکہ پہلے معاف ہو گیا ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورت زلزال کو نصف قرآن فرمایا کہ یہ آدھا قرآن ہے اور سورت اخلاص کو تہائی قرآن فرمایا، سورت کافرون کو ربع قرآن فرمایا۔<sup>112</sup>

### دین کا خلاصہ:

﴿مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا

يَرَهُ ﴿٢٠﴾

یہاں ایک بات سمجھیں۔ میں بارہا آپ کو سمجھاتا ہوں کہ دین خلاصہ دو ہی

چیزیں ہیں:

نمبر 1... ﴿وَمَا أَتَاكُمْ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں جو کچھ دیں وہ لے لو۔



نمبر 2... ﴿وَمَا نَهَكُمُ عَنْهُ فَأَنْتَهُوْا﴾ اور جس چیز سے منع فرمادیں اس سے رک جاؤ۔

پیغمبر جو چیز دیں اس کا نام ”خیر“ ہے اور جس چیز سے منع کر دیں اس کا نام ”شر“ ہے۔ پیغمبر کی صفات کا خلاصہ بھی دو صفتیں ہیں؛ بشیر اور نذیر۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشیر الی الخیر ہیں اور نذیر من الشر ہیں۔ یہ دو ہی صفتیں کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے بعد دائمی ٹھکانے دو ہی ہیں؛ ایک جنت اور دوسرا جہنم۔ خیر والے جنت میں جائیں گے اور شر والے جہنم میں جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی جہنم سے حفاظت فرمائیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

## سورة العديت

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَالْعَدِيتِ ضَبْحًا ۝۱﴾ فَالْمُورِيَتِ قَدْحًا ۝۲﴾ فَالْمُغِيَرَتِ ضَبْحًا ۝۳﴾

گھوڑوں کی قسمیں:

اس سورت میں اللہ پاک نے قسمیں کھائی ہیں گھوڑوں کی اور ان سے مراد لڑائی والے گھوڑے ہیں جو جہاد اور غیر جہاد میں استعمال ہوتے ہیں، خاص جہاد میں استعمال ہونے والے گھوڑے مراد نہیں ہیں بلکہ مراد مطلق لڑائی میں استعمال ہونے والے گھوڑے مراد ہیں۔ عرب چونکہ لڑائی اور جنگ وجدل کے عادی تھے اس لیے اس مناسبت سے انہیں سمجھانے کے لیے قسمیں کھائی ہیں۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَالْعَدِيتِ ضَبْحًا ۝۱﴾ قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے

ہیں۔ ﴿فَالْمُورِيَتِ قَدْحًا ۝۲﴾ قدح کہتے ہیں ٹاپ کو، گھوڑے اپنے ٹاپ کو جب سخت زمین پر ماریں تو اس سے آگ کی چنگاریاں نکلتی ہیں خصوصاً جب اس کے نیچے لوہے کی کڑیاں لگائی گئی ہوں تو اور آگ نکلتی ہے۔ فرمایا: قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ٹاپ مار کر آگ نکالتے ہیں۔

﴿فَالْمُغِيَرَتِ ضَبْحًا ۝۳﴾ اور ان گھوڑوں کی قسم جو صبح کے وقت تباہ

وہر باد کر دیتے ہیں، تاراج کرتے ہیں۔ عرب کے ہاں عادت تھی کہ رات کے وقت حملہ نہیں کرتے تھے، جب صبح ہوتی تو پھر حملہ کرتے، رات کی تاریکی میں حملے کو بزدلی سمجھتے تھے اور صبح کے حملے کو شجاعت اور دلیری سمجھتے تھے۔

﴿فَآتَيْنَ بِهِ نَقْعًا ۖ فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا﴾ ﴿۱﴾ قسم ہے ان گھوڑوں کی جو غبار اڑاتے ہیں اور دشمن کی جماعتوں میں گھس جاتے ہیں۔ ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ﴾ ﴿۲﴾ گھوڑوں کی قسمیں کھا کر اب فرمایا کہ انسان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکر ہے۔

”کَنُودٌ“ کا معنی ہے کہ نعمتیں ملیں تو بھول جائے اور مصیبتیں ہمیشہ یاد رکھے، خوشی کا تذکرہ نہ کرے اور شر کا تذکرہ کرے۔ انسان بڑا ہی ناشکر ہے۔

### انسانی خصلت مال سے محبت:

اس پر بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ ”انسان“ کا لفظ تو نیک اور برے سب کو شامل ہے، کفار کو بھی شامل ہے، مسلمانوں کو بھی شامل ہے، انبیاء علیہم السلام کو بھی شامل ہے تو کیا اس حکم میں العیاذ باللہ انبیاء علیہم السلام اور نیک لوگ بھی شامل ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ”إِنَّ الْإِنْسَانَ“ سے مراد کافر شخص ہے کہ کافر کی خصلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ناشکر ہوتا ہے، مال سے ضرورت سے زیادہ پیار کرتا ہے، حضرات انبیاء علیہم السلام اور نیک صالح مومنین اس سے ہرگز مراد نہیں!

عام مسلمانوں کو چاہیے کہ کافروں کی اس خصلت سے بچیں۔ اگر کوئی مسلمان ہو اور یہ کافرانہ خصلتیں اس میں ہوں تو اسے ان سے بچنے کا خوب اہتمام کرنا چاہیے۔ ﴿وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ﴾ ﴿۱﴾ اور ناشکر ہونے پر خود گواہ ہے۔ اس کا عمل بتاتا ہے کہ یہ ایسا کرتا ہے۔

## حیات فی القبر:

﴿وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۝٨١ أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ ۝٨٢﴾

انسان مال کی محبت میں بہت سخت ہے۔ کیا یہ نہیں جانتا کہ جس دن قبروں میں پڑے مردوں کو زندہ کیا جائے گا۔

اس پر یہ شبہ نہ کریں کہ یہ آیت حیات فی القبر کے خلاف ہے! اس لیے کہ ایک ہوتی ہے حیات ظاہری اور ایک ہوتی ہے حیات مخفی۔ قبر میں میت کو جو حیات ملتی ہے وہ حیات مخفی ہوتی ہے۔ حیات مخفی کا معنی یہ ہے کہ روح اور جسم کے تعلق سے اتنی حیات ہوتی ہے ”قَدَرٌ مَّا يَتَلَذَّذُ وَيَتَأَلَّمُ“ جس سے قبر والا جسم لذت بھی محسوس کرے اور تکلیف بھی محسوس کرے، بس اتنی سی حیات کے ہم قائل ہیں، اس سے زیادہ حیات کے ہم قائل نہیں ہیں اور وہ حیات بہت مخفی ہوتی ہے۔

جیسے دیکھو! بال میں حیات موجود ہے اور یہ اتنی کمزور حیات ہے کہ بال کو کاٹ لیں تب بھی درد نہیں ہوتا لیکن اتنی حیات ہے جس سے بال بڑھتا رہتا ہے۔ اب بال میں حیات ہے لیکن کمزور ہے۔ اس کے اوپر آدمی کا رخسار ہے، اس میں بھی حیات ہے لیکن حیات اتنی ہے کہ کاٹیں تو درد ہوتا ہے لیکن اگر اس پر کوئی مٹی وغیرہ لگ جائے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پھر اس کے اوپر آنکھ کی پتلی کی حیات ہے، اس میں مٹی پڑے تو بھی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ حیات مزید حساس ہے لیکن ہوا آنکھ کو لگ جائے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس کے اوپر دماغ ہے، دماغ کی حیات اتنی حساس ہے کہ ہلکی سی ہوا لگے تو بھی موت کا خطرہ ہوتا ہے۔

حیات کی قسمیں ہیں نا! اسی طرح کافر کی حیات ہے، پھر اس کے اوپر مومن کی حیات ہے، پھر شہید کی حیات ہے، پھر نبی کی حیات ہے۔ یہ حیات کے درجات ہیں، اس کا معنی یہ نہیں کہ حیات کا انکار کیا جائے! قیامت کے دن جو حیات ملے گی وہ ظاہری

اور کھلی ہوئی حیات ہوگی اور قبر میں جو حیات ملتی ہے وہ مخفی اور چھپی ہوئی ہوتی ہے۔  
قیامت کے دن ظاہری حیات ملنے سے قبر والی چھپی ہوئی حیات کی نفی نہیں ہوتی۔

﴿وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ﴾ إِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ خَبِيرٌ ﴿۱۱۳﴾

اور جو کچھ سینوں میں ہے اسے ظاہر کیا جائے گا۔ بیشک ان کا رب ان باتوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔

یہ جو اللہ قسم کھاتے ہیں کسی چیز کی تو اللہ اس بات کے پابند نہیں ہیں کہ اس چیز کی قسم کھائیں اور اس کی نہ کھائیں بلکہ اللہ مخلوق کی قسم کھانا چاہے یں تو کھا سکتے ہیں، ہاں البتہ انسان مخلوق کی قسم نہیں کھا سکتا، ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ﴾<sup>113</sup> اس لیے کہ اللہ سے نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے ہیں البتہ مخلوق سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا ہے۔

### قسم اور مقسم بہ میں مناسبت:

ہاں البتہ جب کسی چیز کی قسم کھاتے ہیں تو قسم کو مقام قسم سے مناسبت بہت ہوتی ہے۔ یہاں گھوڑوں کی قسم کیوں کھائی ہے؟ یہ بتانے کے لیے کہ گھوڑوں کو تھوڑا سا نانج، تھوڑا سا کھانا، تھوڑا سا پانی انسان دیتا ہے اور گھوڑا جان کی بازی لگا دیتا ہے اپنے مالک کے لیے اور انسان کو اللہ رب العزت سب کچھ دیتے ہیں لیکن انسان خواہشات تک کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ تو اللہ رب العزت نے یہاں پر گھوڑوں کی قسمیں اس لیے اٹھائی ہیں کہ اے انسان! تم ان گھوڑوں کو دیکھتے تو تمہیں کچھ عبرت حاصل ہو جاتی۔

وَاجْزُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة القارعة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَا أَذْرُكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳﴾

قارعہ کا معنی:

قیامت ایسی ہوگی جو ہلا کے رکھ دے گی اور تمہیں پتا ہے کہ ہلا کے رکھ دینے والی وہ کون سی چیز ہے؟ تمہیں اس کا تھوڑا سا احساس بھی ہے کہ وہ کیا چیز ہوگی؟  
انسان؛ بکھرے ہوئے پتنگے

﴿يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ۝۴﴾

اس دن انسان ایسے پھر رہے ہوں گے جیسے پروانے ہوتے ہیں۔  
پروانے کو ایک تو سمجھ نہیں آتی کہ میں نے جانا کہاں ہے! کبھی ادھر کبھی ادھر ٹکریں مارتا ہے اور بہت پریشان ہوتا ہے۔ جب بارش ہوتی ہے اس کے بعد یہ پروانے نکلتے ہیں اور عموماً جہاں پر روشنی ہو وہاں جمع ہو جاتے ہیں، پریشان بھی ہوتے ہیں اور کمزور بھی ہوتے ہیں۔

اسی طرح قیامت کے دن انسان پریشان بھی ہوگا اور کمزور بھی ہوگا۔ اللہ کریم رحم فرمائیں۔

## پہاڑ: دھنکی ہوئی روئی

﴿وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ﴾

اور پہاڑ ایسے ہوں گے جیسے دھنکی ہوئی رنگین روئی ہوتی ہے۔  
عِھن کہتے ہیں رنگین روئی کو اور منفوش کا معنی ہوتا ہے دھنکی ہوئی۔  
پہاڑوں کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اور وہ قیامت کے دن اڑتے پھریں گے۔ ان کو  
رنگین دھنکی ہوئی اون سے تشبیہ دی کیونکہ اسے دھنکا جائے تو وہ اڑنے لگتی ہے۔

## آخرت: عیش کی جگہ یا عذاب کا مقام

﴿فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۖ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاٰصِيَةٍ ۖ وَأَمَّا  
مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۖ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۖ وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهٗ ۚ نَارٌ  
حَامِيَةٌ﴾

جس آدمی کا میزان وزنی ہو گا تو وہ عیش والی زندگی میں ہو گا اور جس کا میزان  
ہلکا ہو گا تو اس کا ٹھکانا ہادیہ ہو گا۔ تمہیں کیا پتا کہ ہادیہ کیا ہے؟ وہ تو جلا کر رکھ دینے والی  
سخت قسم کی آگ ہے۔

## وزن اعمال دو مرتبہ ہو گا:

وزن اعمال قیامت کے دن دو مرتبہ ہو گا۔

[۱]: ایک ہو گا وزن اعمال کافر کا اور مؤمن کا۔ مؤمن کا وزن اعمال ایسا ہو گا کہ  
میزان بھاری ہو گا اور کافر کا وزن اعمال ایسا ہو گا کہ میزان ہلکا ہو گا۔ اس وزن اعمال کی  
وجہ سے کافر الگ ہو جائیں گے اور مؤمن الگ ہو جائیں گے۔

[۲]: اس کے بعد مؤمنین کا وزن اعمال دوبارہ ہو گا۔ اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ  
ان کی نیکیاں کتنی ہیں اور گناہ کتنے ہیں۔

اور یہ ذہن میں رکھ لیں کہ قیامت کے دن جو وزن ہو گا اس کا مطلب یہ ہے کہ اعمال کو تولایا جائے گا، گننے کی روایات نہیں ہیں۔ وہاں اعمال گنے نہیں جائیں گے کہ کتنے کیے ہیں بلکہ اعمال کو دیکھا جائے گا کہ کیسے کیے ہیں؟ اگر ایک آدمی نے دو رکعات پڑھی ہیں اور اخلاص بہت زیادہ ہے تو ان دو کا وزن دو سو رکعات سے بھی زیادہ ہو گا، یہ میں مثال دے رہا ہوں ورنہ کتنا زیادہ ہو گا یہ تو اللہ ہی بہتر جانتے ہیں، اور جن میں اخلاص بہت کم ہو تو ان کا وزن کم ہو گا۔ اس پر تفصیلی بات میں سورۃ الملک کی آیت ﴿يَبْلُوكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ میں کرچکا ہوں آپ کو یاد ہو گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



## سورة التكاثر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿الْهَلْكُمْ التَّكَاثُرُ ۝ حَتَّىٰ ذُرُّتُمُ الْمَقَابِرَ ۝﴾

مال پر فخر کا انجام:

کافر اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہمارے پاس مال بہت ہے، ہمارے پاس دولت بہت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: تم کو فخر کرنے نے غافل کر کے رکھ دیا ہے یہاں تک کہ تم قبروں میں پہنچ جاتے ہو!

یہاں ”التَّكَاثُرُ“ سے مراد کثرت نہیں ہے بلکہ کثرت پر فخر کرنا ہے۔

﴿كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝﴾

یہ جو تم مال کو قابلِ فخر سمجھتے ہو اور آخرت کو قابلِ غفلت سمجھتے ہو تو فرمایا: ﴿كَلَّا﴾ ایسا ہرگز نہیں ہے یعنی مال قابلِ فخر چیز نہیں ہے، ﴿سَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾ جب تم مرو گے تو عنقریب تمہیں سمجھ آئے گی کہ دولت قابلِ فخر نہیں ہے، ﴿ثُمَّ كَلَّا﴾ پھر سنو! یہ جو تمہاری سوچ ہے کہ دولت قابلِ فخر چیز ہے تمہاری یہ بات ٹھیک نہیں ہے، ﴿سَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾ جب تم موت کے بعد دوبارہ اٹھو گے پھر تمہیں سمجھ آ جائے گی کہ یہ مال قابلِ فخر چیز نہیں ہے۔ تو پہلے ﴿سَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾ سے مراد مرتے وقت

پتا چلنا ہے اور دوسرے ﴿سَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾ سے مراد مر کر دوبارہ اٹھتے وقت پتا چلنا ہے۔ اب تکرار نہیں ہو گا کلام میں۔

﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ﴾

اگر تمہارا خیال ہے کہ تم جو مال جمع کرتے ہو، کماتے ہو؛ اس کا کوئی حساب نہیں ہو گا تو تمہاری یہ رائے بالکل غلط ہے۔ اگر تم دیکھ لو اور تمہیں یقینی علم آجائے تو تم ایسی باتیں کبھی نہ کرو، پھر تمہیں یہ چیزیں غفلت میں نہیں ڈالیں گی۔

﴿لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ﴾ ثَمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ﴿٢﴾

تم یقیناً جہنم کو دیکھو گے، پھر یقیناً تم اسے اپنی یقین کی آنکھ سے دیکھو گے۔

﴿ثُمَّ لَتَسْتَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ﴾

پھر قیامت کے دن تم سے نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔  
سورۃ النکاثر کی فضیلت یہ ہے کہ اس کی تلاوت کرنے پر ایک ہزار آیتیں پڑھنے کا ثواب ملتا ہے۔

### یقین کے تین درجات:

یقین کے تین درجے ہوتے ہیں؛ ایک ہوتا ہے علم یقین، ایک ہوتا ہے عین یقین اور ایک ہوتا ہے حق یقین۔

(1): علم یقین کا معنی ہے کہ کوئی بتائے اور ہم مان لیں۔

(2): عین یقین کا معنی ہے کہ دیکھیں اور مان لیں۔

(3): حق یقین کا معنی ہے کہ تجربہ کریں اور مان لیں۔

سب سے اوپر کا مقام حق یقین ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے دو کا تو تذکرہ کیا لیکن حق یقین کا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن کو عین یقین ہو گا تو ان کو حق

الیقین بھی ہو گا۔ تو یہاں جو فرمایا ﴿تَتَرَوْنَهَا عَيْنَ الْيَقِينِ﴾ کہ تم نے جہنم کو دیکھنا ہے تو اس سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے جہنم میں داخل ہونا ہے، کیونکہ جہنم کو مؤمن بھی دیکھے گا اور کافر بھی دیکھے گا لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داخل صرف کافر ہو گا۔ جب وہاں جائے گا تو اسے حق الیقین بھی حاصل ہو جائے گا۔ اس لیے یہاں پر حق الیقین کا ذکر نہیں ہے، ورنہ یقین کے تین درجے ہوتے ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة العصر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَالْعَصْرِ ۝١ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝٢ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣﴾

کامیابی کا راز:

یہاں پر اللہ رب العزت نے قسم کھائی ہے زمانے کی کیونکہ اسی زمانے میں انسان خسارے اور نقصان میں رہتا ہے۔ زمانے کی قسم کھا کر فرمایا: کامیاب انسان وہی ہو گا جس کا عقیدہ ٹھیک ہو، اعمال سنت کے مطابق ہوں، حق کی تلقین کرتا ہو اور صبر کی تلقین کرتا ہو۔

اب دیکھیں! اللہ نے ”زمانہ“ مخلوق کی قسم کھائی ہے۔ اس کی مناسبت مضمونِ قسم کے ساتھ یہ ہے کہ انسان کی تباہی اور انسان کی آبادی اسی زمانہ کے ساتھ متعلق ہے۔ اس مدت میں چاہیں تو نیک اعمال کریں اور خود کو آباد کریں اور اللہ کو خوش کریں اور آخرت کی تیاری کر لیں اور چاہیں تو اسی زمانے میں گناہ کریں اور اپنے آپ کو برباد کریں۔

اب دو چیزیں ایسی ہیں جن کا تعلق انسان کی اپنی جان سے ہے اور دو چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے نہیں ہے۔ ﴿آمَنُوا وَعَمِلُوا

الصَّلَاحِ کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے کہ اپنا عقیدہ ٹھیک ہو اور اپنے اعمال سنت کے مطابق ہوں۔ ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ﴾ و ﴿تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ کا تعلق اپنی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ دوسروں کے ساتھ ہے کہ دوسروں کو حق کی تلقین کریں اور دوسروں کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ تو کچھ کام ہر بندے کے ذمے ہیں اور کچھ کام بقدر طاقت بندے کے ذمہ ہیں۔

### تواصي بالحق اور تواصي بالصبر کا معنی:

﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ﴾ و ﴿تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ اس کے کئی معانی ہیں۔

[۱]: یہاں حق سے مراد ہے ایمان اور اعمالِ صالحہ اور صبر سے مراد ہے گناہوں سے بچنا۔ اب حکم یہ ہو گا کہ وہ امر بالمعروف بھی کرتے ہیں اور نہی عن المنکر بھی کرتے ہیں۔

[۲]: دوسرا معنی اس کا یہ ہے کہ عقائد میں فساد آتا ہے شبہات کی وجہ سے اور اعمال میں فساد آتا ہے خواہشات کی وجہ سے۔ ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ﴾ کا معنی ہے کہ یہ لوگ شبہات کو دور کرتے ہیں اور ﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ کا معنی کہ خواہشات کی اصلاح کرتے ہیں۔ شبہات کے ازالے کا تعلق علم سے ہے اور خواہشات کی اصلاح کا تعلق عمل سے ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ یہ علمی اصلاح بھی کرتے ہیں اور عملی اصلاح بھی کرتے ہیں، اور علمی و عملی اصلاح یہ عوام کا کام نہیں ہے... یہ علماء کا کام ہے، اس لیے علماء کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ شبہات کا رد کیسے کرنا ہے اور خواہشات کی اصلاح کیسے کرنی ہے۔ اس کا علماء کو بطور خاص خیال رکھنا چاہیے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

## سورة الصمزة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿وَيْلٌ لِّكُم مِّنْ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۚ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۚ﴾

عیب جوئی اور طعنہ زنی دو بری خصلتیں:

ہمز کا معنی ہوتا ہے پیٹھ پیچھے کسی کے عیب بیان کرنا اور لمز کا معنی ہوتا ہے آمنے سامنے کسی کو طعنہ دینا۔ یہاں تین جرم بیان فرمائے ہیں۔  
فرمایا: تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو دوسروں میں عیب نکالتے ہیں اور طعنہ دیتے ہیں۔

بعض اعتبار سے کسی کے عیب بیان کرنا، کسی کی غیبت کرنا بڑا جرم ہے اور بعض اعتبار سے طعنہ دینا بڑا جرم ہے۔ غیبت کرنا اس لیے بڑا جرم ہے کہ غیبت تو غیر موجودگی میں ہوتی ہے۔ جب آدمی کسی کی غیبت کرتا ہے تو اس کو روکنے والا کوئی نہیں ہوتا اس لیے بندہ اس میں لگا رہتا ہے اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے؛ اس حساب سے یہ بڑا گناہ ہے۔ اور جب کسی کو کوئی طعنہ دیں تو طعنہ دینے والا شخص چونکہ سامنے ہوتا ہے اس لیے وہ اپنا دفاع بھی کرتا ہے اس لیے یہ گناہ زیادہ بڑھتا نہیں ہے، بس ایک حد تک آ کے ختم ہو ہی جاتا ہے۔

اور بعض مرتبہ کسی کو طعنہ دینا بڑا جرم ہوتا ہے کیوں کہ جس کو طعنہ دیا

جائے تو یہ اس کی توہین ہوتی ہے اور کسی کی توہین کرنا بہت بڑا جرم ہے۔

### مال سے حد درجہ محبت:

﴿الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ﴾

یہ وہ شخص ہے جو مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا رہتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا!

اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ مدرسے کے پیسے آئے تو ان پر یہ بات فٹ کریں، آدمی دکان پر بیٹھا ہو اور شام کو پیسے گنے تو اس پر فٹ کریں، کہیں سے کوئی ہدیہ یا صدقہ ملے اور اس کو گنیں تو اس پر فٹ کریں... یہ معنی نہیں ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ یہ ایسا شخص ہے کہ جو اپنے مال پر فخر کرتا ہے اور گن گن کر اپنے آپ کو خوش کرتا ہے کہ میرے پاس اتنے لاکھ ہو گئے، اتنے کروڑ ہو گئے، گن گن کر بتاتا ہے اور یہ شخص مال کی محبت میں اتنا منہمک ہے کہ سمجھتا ہے کہ میری ہر مشکل مال و دولت سے حل ہو گی، موت سے غافل ہو کر زندگی کے منصوبے یوں بنا رہا ہے کہ گویا اس کا مال بھی ہمیشہ رہے گا اور یہ خود بھی ہمیشہ رہے گا، اس پر کبھی موت آئے گی ہی نہیں۔ فرمایا:

### حُطْمہ کیا ہے:

﴿كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۚ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۚ نَارُ اللَّهِ

الْمُوقَدَةِ ۚ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْآفِئَةِ ۚ﴾

یہ بات اس کی بالکل غلط ہے کہ اس نے اور اس کے مال نے ہمیشہ رہنا ہے بلکہ اس کو ایسی آگ میں پھینکیں گے کہ جو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی۔ توڑ پھوڑنے کرنے والی آگ کون سی ہے؟ یہ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے اور یہ سیدھی دل پر پہنچتی

﴿إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّدَةٌ ﴿٨﴾ فِي عَمْدٍ مُّدَدَةٍ ﴿٩﴾﴾

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.



## سورة الفیل

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحَابِ الْفِيلِ ﴿١﴾﴾

### واقعہ اصحاب فیل:

اصحاب فیل کا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت والے سال کا پیش آیا تھا۔ سورۃ البروج میں پہلے بات گزر چکی ہے کہ یمن کا آخری بادشاہ یوسف ذونواس تھا جو قوم حمیر کا تھا۔ اس نے اس وقت کے جو اہل حق تھے یعنی نصاریٰ ان پر بہت ظلم و ستم کیا تھا۔ خندقیں کھدوا کر ان میں آگ بھری اور ان لوگوں کو اس آگ میں جھونک دیا۔ بارہ ہزار یا اس سے بھی زائد بندے اس نے جلائے تھے۔ ان کا اپنا انجام یہ ہوا کہ خندقوں کی آگ خندقوں سے باہر نکل کر پھیلی اور اس نے خندق پر موجود سپاہیوں کو جلا کر راکھ کر ڈالا۔ ملک یمن پر رابط اور ابرہہ نے قبضہ کیا، ذونواس کو شکست دی، وہ بھاگ کر دریایا کی طرف گیا اور دریا میں غرق ہو کر مرا۔ یہ واقعہ آپ کے علم میں ہے۔

ان مظلوم عیسائیوں میں سے دو آدمی ذونواس کی گرفت سے بچ کر ملک شام نکل گئے قیصر کے پاس اور اسے جا کر کہا کہ حمیر کے بادشاہ ذونواس نے نصاریٰ پر ظلم کیا ہے، آپ اس سے انتقام لیں۔ قیصر نے حبشہ کے بادشاہ کو پیغام بھیجا کہ ذونواس بادشاہ

سے انتقام لو! ملکِ یمن حبشہ سے قریب پڑتا تھا۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے ابرہہ اور رابطہ - یہ اس کے دو جرنیل تھے - ان کو بھیجا یمن پر حملے کے لیے تو انہوں نے جاکر پورے یمن کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ پھر ان کی آپس میں بھی لڑائی ہوئی، رابطہ مارا گیا اور ابرہہ بچ گیا۔ اس ابرہہ کو نجاشی بادشاہ نے یمن کا حاکم بنا دیا۔

اب چونکہ یہ تھانصرانی اور اس کا مکہ سے تو تعلق تھا نہیں تو اس کے ذہن میں یہ تھا کہ جب مجھے اپنی سلطنت ملی ہے، اپنی حکومت ملی ہے، اپنی طاقت ملی ہے تو میں یہاں پر ایک ایسا کنیسہ بناؤں گا کہ لوگ مکہ میں بیت اللہ کے بجائے یہاں اس کنیسہ میں عبادت کریں۔ اس نے پھر ایک بہت بڑا عبادت خانہ بنایا جو اتنا اونچا تھا کہ نیچے کھڑے ہو کر اس عبادت خانے کی بلندی پر نظر ڈالنا ممکن نہیں تھا۔ ہیرے جواہرات سب کچھ اس پہ لگا دیا۔

یمن میں جو لوگ رہتے تھے وہ اس سے نفرت کرتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ لوگ مکہ میں جائیں اور بیت اللہ کی زیارت کریں۔ بعض روایات میں ہے کہ کسی مسافر قبیلہ نے کنیسہ کے قریب آگ جلائی اور آگ کنیسہ کو لگ گئی اور اسے کافی نقصان پہنچا۔ بعض روایات میں ہے اس سے نفرت کرتے ہوئے کسی نے اس کنیسہ میں پاخانہ کر دیا۔ جب ابرہہ کو پتا چلا تو اس نے کہا کہ میں مکہ جاؤں گا اور بیت اللہ کو گرا کے رکھ دوں گا۔ اب ابرہہ بیت اللہ کو گرانے کے لیے نکلا تو جو عرب تھے راستے میں ڈونفر انہوں نے مقابلہ کیا۔ یمن میں تھے، انہوں نے اپنے عرب قبائل کو اکٹھا کیا، مقابلہ کیا لیکن وہ بیچ میں ہی ختم ہو گئے۔

پھر یہ آگے نکلا تو راستے میں ایک قبیلہ تھا قبیلہ خثعم، اس کا سردار تھا نفیل بن حبیب۔ انہوں نے مقابلہ کیا، وہ بھی گرفتار ہو گئے۔ پھر یہ طائف گئے انہوں نے ان سے معاہدہ کر لیا کہ تم ہمارے بتوں کو کچھ نہ کہو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ بالآخر یہ

مکہ پہنچے اور انہوں نے سب سے پہلے جو ان کے اونٹ تھے ان پر قبضہ کر لیا۔ جناب عبدالمطلب کے بھی دو سواونٹ تھے۔ اس ابرہہ کا ایک سفیر اندر گیا حناطہ حیثیری تو اس نے مکہ والوں سے بات کی۔ مکہ والوں نے کہا کہ ہمارے بڑے سردار ہیں عبدالمطلب آپ ان سے بات کریں۔ عبدالمطلب سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ ہمارے اونٹ دے دو، باقی تم جانو اور کعبے کا خدا جانے۔

حناطہ حیثیری نے کہا کہ چلو تم بات کرو ابرہہ سے۔ بات کرنے کے لیے گئے۔ کہتے ہیں کہ عبدالمطلب بہت وجیہ آدمی تھے، قد آور آدمی تھے۔ ان کو ابرہہ نے دیکھا تو اپنے شاہی تخت سے نیچے اتر آیا، ان کے ساتھ بیٹھا، پوچھا: کیسے آئے؟ ابرہہ نے کہا کہ ہمارے آنے کا مقصد تو کعبہ گرانا ہے۔ عبدالمطلب نے کہا کہ میں کعبہ کے لیے بات کرنے نہیں آیا ہوں، میں تو اونٹ مانگنے کے لیے آیا ہوں۔ تو ابرہہ نے کہا کہ میرے دل میں جو تمہاری عزت تھی وہ اس بات سے ختم ہو گئی، میرا خیال یہ تھا کہ تم اپنے عبادت خانے کی بات کرو گے، تم عبادت خانے کے بجائے اونٹوں کی بات کرتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ بہر حال وہ تو کعبہ جانے اور اس کا رب جانے، وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ ہمارے اونٹ واپس کر دو! ابرہہ نے اونٹ واپس دے دیے۔ عبدالمطلب واپس چلے گئے۔

واپس جا کر انہوں نے کعبہ کو پکڑ کر دعائیں مانگیں اور ان کو یقین تھا کہ یہ لوگ تباہ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد دعائیں مانگیں اور قریش کے جتنے لوگ تھے وہ پہاڑوں پر چڑھ گئے منظر دیکھنے کے لیے۔ ابرہہ کے ہاتھی کا نام تھا محمود جو بڑا ہاتھی تھا، سات آٹھ ہاتھی اور بھی اس کے ساتھ تھے۔ جب یہ مکہ میں داخل ہونے لگے تو ہاتھی نے اٹھنے سے انکار کر دیا اور بعض کہتے ہیں کہ نفیل بن حبیب نے اس ہاتھی کے کان میں کہا تھا کہ دیکھو! یہ اللہ کا گھر ہے ادھر نہ جانا ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔

اب ہاتھی کو واپس لاتے تو وہ چلتا، سیدھا چلاتے تو نہیں چلتا تھا، اٹھنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہو رہا تھا، بہت کچھ کیا جیسے ہاتھی کو مارتے ہیں، کڑے ڈالتے ہیں لیکن وہ تیار نہیں ہوا۔ پھر مجبور کیا اس کے ناک میں کڑا ڈال کر تیار کیا، کھینچا پھر بھی آگے نہیں گیا۔

خیر وہ تو نہیں اٹھا، باقی ہاتھی اٹھے اور ان لوگوں نے کعبہ کا جو نہی رخ کیا تو اللہ رب العزت نے چھوٹے چھوٹے پرندوں سے جو بہت چھوٹے تھے اور سرخ رنگ کے ان کے پنجے تھے، ہر ایک کے پاس تین کنکریاں ہوتیں اور وہ کنکریاں ایسی تھیں جو ترمٹی کو آگ پر پکانے سے تیار ہوتی ہیں، ایک چونچ میں ایک دائیں پنجے میں اور ایک بائیں پنجے میں۔ جس کے سر پر لگتی اس کے اوپر سے داخل ہو کر نیچے سے نکل جاتی اور پورا جسم بھوسے کی طرح ہو جاتا تھا۔ ابرہہ کو اللہ تعالیٰ نے زندہ رکھا۔ اس کا جسم گلنا شروع ہو گیا تو اس کے جسم کا ایک ایک حصہ گل گل کر سڑ کر گرتا رہا اور بالآخر یہ مر گیا۔

یمن کا دارالحکومت ہے صنعاء اور وہاں پر یہ کلیسا ہے۔ اس کو میں نے خود دیکھا ہے۔ اس طرح عجیب تباہ شدہ جگہ ہے کہ آدمی کو دیکھ عبرت ہوتی ہے۔ تھوڑی سی جگہ ہے، کنویں کی طرح ہے اور کوئی مخلوق وہاں آباد نہیں۔ ایک اجڑا ہوا ساحل ہے اور وہاں اس کے آثار و نشان پڑے ہیں۔ اس کے باہر ایک جنگلا لگا ہوا ہے، اس کو بند کیا ہوا ہے، بس یہ جگہ تھی۔

**ہاتھی والوں کا انجام:**

﴿الَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ﴾

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو نہیں دیکھا لیکن اگر واقعہ ایسا

یقینی ہو کہ لوگوں نے اس کو دیکھا ہو اور اس کا مشاہدہ بھی کیا ہو تو اس کے علم یقینی کو کبھی لفظِ رویت سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح مستقبل میں ہونے والے واقعات جن کا وقوع یقینی ہو تو انہیں بھی ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے دو آدمیوں کو مکہ مکرمہ میں خود دیکھا، وہ آنکھوں سے نابینا اور پاؤں سے لنگڑے تھے اور اللہ کے عذاب کو بھگت رہے تھے۔ یہ اصحاب الفیل میں سے تھے۔

﴿الَّذِينَ يَجْعَلُونَ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۖ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۖ﴾

کیا اللہ نے ان کی ساری تدبیروں کو خاک میں نہیں ملا دیا تھا؟! اور ان پر مختلف قسم کے پرندے بھیجے تھے۔

”ابابیل“ کسی خاص پرندے کا نام نہیں ہے۔ پرندوں کے جھنڈ کو ابابیل کہا گیا ہے۔ یہ پرندوں کی کوئی قسم تھی جو اللہ نے ان پر بھیجی تھی۔ ایک خاص قسم کا پرندہ جسے ہم اپنی زبان میں ابابیل کہتے ہیں یہ وہ نہیں تھے۔

﴿تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ۖ﴾

یہ پرندے ان پر پتھر کے کنکر پھینک رہے تھے۔ ”سِجِّيل“ کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ مُعَرَّب ہے سنگِ گل سے۔

﴿فَجَعَلَهُمْ كَعَصِفٍ مَّا كُوِيَ ۖ﴾

اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا کر دیا جیسے کھایا ہوا بھوسہ ہوتا ہے۔

عام بھوسہ نہیں بلکہ وہ بھوسہ جو کھایا ہوا ہوتا ہے، اس کی کیا حیثیت رہ جاتی

ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة القریش

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿لَا يَلْفُ قُرَيْشٍ ۚ الْفِهُمُ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۚ﴾

قریش کی عظمت اس واقعہ فیل کے بعد پوری دنیا میں مشہور ہو گئی کہ یہ بہت نیک ہیں، عظمت والے ہیں، عزت والے ہیں، ہر کوئی ان کا احترام کرتا تھا۔ یہ لوگ سردیوں میں اور گرمیوں میں سفر کرتے تھے تجارت کے لیے۔ ان کی عادت یہ تھی کہ یمن گرم علاقہ ہے اور شام ٹھنڈا ہے تو یہ سردیوں میں یمن جاتے اور گرمیوں میں شام جاتے اور کعبے کی عظمت کی وجہ سے لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ قافلوں پہ ڈاکے پڑتے لیکن انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔ تو اللہ پاک نے ان نعمتوں کا ذکر فرمایا کہ تم ان نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

﴿لَا يَلْفُ قُرَيْشٍ ۚ الْفِهُمُ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۚ﴾

قریش کے مانوس ہو جانے کی وجہ سے یعنی گرمی اور سردی کے سفر سے مانوس ہو جانے کی وجہ سے۔

اس کا محذوف کیا ہے؟ ”أَهْلَكُنَا أَصْحَابُ الْفِيلِ“ ہم نے ان ہاتھی والوں کو تباہ کیا تھا قریشیوں کی وجہ سے، جب وہ تباہ ہوئے تو قریش کو مزید عزت ملی۔

﴿فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ ۚ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّنْ جُوعٍ ۚ وَ

أَمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۖ ﴿٢٠﴾

اس لیے ان کو چاہیے کہ اس گھر، بیت اللہ کے رب کی عبادت کریں جس رب نے ان کو بھوک میں کھلایا اور جس نے خوف سے ان کو امن دیا۔

### عبادت کے لیے دواہم چیزیں:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کے لیے دو چیزیں بہت ضروری ہیں:

1: فقر و فاقہ نہ ہو۔

2: بد امنی نہ ہو۔

امن ہو اور پیٹ میں خوراک ہو تو عبادت کرنے کا آدمی کو لطف آتا ہے۔

دو نعمتیں بہت اہم ہیں اور خصوصاً اپنے ملک پاکستان کے لیے دعا کیا کریں اللہ

تعالیٰ ہمیں دونوں چیزیں عطا فرمائیں! اللہ معیشت میں کسی کا محتاج نہ بنائیں اور اللہ امن

میں غیر کا محتاج نہ بنائیں۔ اللہ ہمارے ملک پاکستان کو امن کا گہوارہ بنائے۔ آمین

وَاجِرُ دَعَا أَنَا أَنَّ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الماعون

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْإِيمَانِ ﴿١﴾ فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيمَ ﴿٢﴾ وَلَا  
يَحْضُ عَلَى طَعَامِ الْمَسْكِينِ ﴿٣﴾ فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ ﴿٤﴾ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ  
سَاهُونَ ﴿٥﴾ الَّذِينَ هُمْ يُرَآءُونَ ﴿٦﴾ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ﴿٧﴾﴾

یہ سورت بھی کفار کے رد میں ہے اور اس میں ان کے جرائم کو بیان کیا گیا ہے فرمایا: کیا آپ نے ایسے شخص کو دیکھا ہے جو قیامت کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ تباہی ہے ایسے نمازیوں کے لیے جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ یعنی جو نماز پڑھتے ہی نہیں، اگر کبھی پڑھتے ہیں تو۔ دکھاوا کرتے ہیں، اور زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔

”ماعون“ کہتے ہیں بہت چھوٹی سی چیز کو جو عام طور پر دوسری ایک دوسرے سے عاریہ لیتے رہتے ہیں اور زکوٰۃ کو ماعون اس لیے کہتے ہیں کہ یہ مال کا چالیسواں حصہ یعنی سو روپے کے مقابلے میں اڑھائی روپے ہوتے ہیں جو بالکل تھوڑے ہوتے ہیں، اس لیے زکوٰۃ کو ماعون کہتے ہیں۔ تو یہ صفتیں کفار کی ہیں۔ مسلمان کو یہ صفتیں اختیار نہیں کرنی چاہئیں اور ان سے بچنا چاہیے۔

وَاجِزْ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.



## سورة الكوثر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿إِنَّا آتَيْنَاكَ الْكُوثُرَ ۝ فَصَلَ لِرَبِّكَ وَانْحَزَ ۝ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝﴾

### شان نزول:

عاص بن وائل ایک کافر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے جناب قاسم جب فوت ہوئے تو عاص بن وائل نے طعنہ دیا، کہا کہ محمد کی نرینہ اولاد فوت ہو گئی، اب ان کا مشن چلانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ بس جو نبی یہ فوت ہوں گے ان کا کام ختم ہو جائے گا۔ اس پر سورة الكوثر نازل ہوئی۔  
فرمایا: اے پیغمبر! ہم نے آپ کو کوثر؛ خیر کثیر دی ہے۔

### ”الکوثر“ کا معنی:

”الکوثر“ کے چھپیس معانی ہیں اور سارے معانی اس ”خیر کثیر“ پر صادق آتے ہیں۔ اکثر مفسرین اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ ”ہم نے آپ کو حوضِ کوثر عطا کیا۔“ حوضِ کوثر میدانِ حشر میں ایک حوض ہو گا۔ کوثر؛ جنت کی ایک نہر ہے، وہاں سے دو پر نالے اس حوض میں گرتے ہیں۔ اس سے ایمان والوں کو پانی پلایا جائے گا۔ اس کی لمبائی ایک مہینے کی مسافت کے برابر ہے۔ پانی اس حوض کا دودھ سے زیادہ سفید ہو گا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہو گا۔ پانی پینے کے لیے برتنوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گی کہ

ستاروں کی تعداد سے بھی زیادہ اور جو شخص اس سے پانی پی لے گا تو جنت میں داخل ہونے تک اس کو پھر پیاس نہیں لگے گی۔ اللہ ہم سب کو یہ عطا فرمادیں۔ آمین

اور بعض روایات میں ہے کہ کچھ لوگ اس حوض پر آئیں گے تو فرشتے ان کو ہٹا کر پیچھے کر دیں گے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ یہ تو میرے ساتھی ہیں، ان کو آنے دو، ”فَيَقَالُ لِي: إِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا أَخَذْتُوْا بَعْدَكَ“<sup>114</sup>

فرشتے کہیں گے: آپ کو نہیں پتا کہ آپ کے بعد ان لوگوں نے کون سی خرافات کی تھیں! یہ آپ کے ساتھی نہیں ہیں۔

اس کے بارے میں بعض لوگ اشکال کرتے ہیں کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بہت سخت و عید ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان اور اعمال کی نفی کرتی ہے... حالانکہ اس سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا معنی یہ نہیں کہ ”یہ میرے صحابہ ہیں“ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ یہ میری امت کے لوگ ہیں، یہ تو میرے ساتھی ہیں۔ فرشتے کہیں گے کہ نہیں! آپ کو نہیں پتا، یہ بدعتی لوگ ہیں۔ رہی یہ بات کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیسے فرمائیں گے کہ یہ میرے ساتھی ہیں؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث پاک میں ہے کہ وضو کرنے والے کے اعضائے وضو روشن ہوتے ہیں۔ تو اعضائے وضو کے روشن ہونے سے معلوم ہو گا کہ یہ آپ کے امتی اور آپ کے ساتھی ہیں لیکن بدعات کی وجہ سے ان کو پیچھے ہٹا دیا جائے گا۔ لہذا اس سے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین پر رد نہیں ہوتا۔

اور صحیح بخاری کی جو روایت ہے:

مُرْتَدِّينَ عَلَى أَعْقَابِهِمْ<sup>115</sup>

کہ یہ لوگ وہ تھے جو مرتد ہو گئے تھے۔

اب یہاں صلہ ”علی“ ہے، ”عن“ نہیں ہے۔ اگر ”عن“ ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ ایمان لائے تھے پھر ایمان سے پھر گئے تھے۔ لیکن یہاں ”علی“ ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ ایمان میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو بظاہر ایمان والوں میں شامل تھے، حقیقت میں نہیں۔ تو جیسے آئے تھے ویسے ہی پلٹ گئے تھے۔ اگر ان الفاظ پر غور کریں تو پھر کوئی بھی اشکال نہیں رہتا۔

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾

آپ اس نعمت کے شکر میں اللہ کی نماز پڑھیں اور قربانی دیں۔  
عموماً ”نحر“ کا تعلق ہوتا ہے اونٹ کی قربانی پر۔ عرب چونکہ اونٹ کی قربانی زیادہ کرتے تھے اس لیے ”وَانْحَرْ“ کا لفظ استعمال کیا ورنہ نحر کا لفظ اونٹ کی قربانی پر بھی استعمال ہوتا ہے اور دوسرے جانوروں کی قربانی پر بھی ہو جاتا ہے۔  
”وَانْحَرْ“ کا ایک معنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے یہ کیا ہے کہ آدمی نماز میں ہاتھ ناف کے نیچے باندھے۔<sup>116</sup>

﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ﴾

”شَانِئَكَ“ کا معنی ہوتا ہے عیب لگانے والا، بغض رکھنے والا۔ فرمایا: یہ جو آپ سے بغض رکھتے ہیں نا تو مقطوع النسل یہی ہوں گے۔  
اس کا مطلب یہ ہے اگرچہ آپ کے مخالفین کی جسمانی اولاد بھی ہو لیکن ان

115۔ صحیح البخاری، رقم: 3349

116۔ سنن الاثرم بحوالہ التہذیب لابن عبد البر ج 8 ص 164

کانام نہیں ہوگا، ان کا تذکرہ نہیں ہوگا، ان کا کام نہیں چلے گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نرینہ اولاد تو فوت ہو گئی لیکن روحانی اولاد تو ہے، قیامت تک جو شخص کلمہ پڑھے گا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی بیٹا ہے اور آپ کی مذکر جسمانی اولاد نہ بھی ہو تو بیٹی سے تو آپ کی اولاد چلی ہے نا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی رہے گا اور اولاد سے جو مقصود ہوتا ہے وہ مشن بھی آپ کا ان شاء اللہ چلتا رہے گا۔

وَاجِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سُورَةُ الْكَافِرُونَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۝ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝﴾

شان نزول:

عاص بن وائل، اسود بن عبد المطلب، ولید بن مغیرہ اور امیہ بن خلف یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک وفد لے کر آئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم معاہدہ کر لیتے ہیں کہ آپ ایک سال تک ہمارے خداؤں کی عبادت کریں اور ایک سال تک ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں۔ اس سے باہمی لڑائی اور جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۝ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝ وَلَا أَنْتُمْ

عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ ۝ وَلَا أَنْتُمْ عِبِدُونَ مَا

أَعْبُدُ ۝﴾

کہہ دیجیے! اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو، اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور میں آئندہ بھی ان کی عبادت نہیں کرنے والا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم ان کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

## دو جملوں کے تکرار کی وجہ:

﴿لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ﴾ وَلَا أَنْتُمْ عِبِدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴿ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ ﴾ وَلَا أَنْتُمْ عِبِدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴿﴾

یہاں یہ جملے تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ اس لیے مفسرین حضرات نے اس کی مختلف تفسیریں بیان کی ہے:

[۱]: ایک تو اس کی تفسیر یہ ہے کہ پہلے جملے ﴿لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ﴾ وَلَا أَنَا عِبِدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴿﴾ کا معنی یہ ہے کہ میں فی الحال ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو اور تم بھی فی الحال اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی عبادت میں کرتا ہوں... اور دوسرے جملے ﴿وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ﴾ وَلَا أَنْتُمْ عِبِدُونَ مَا أَعْبُدُ ﴿﴾ کا معنی یہ ہے میں آئندہ بھی ان کی عبادت نہیں کروں گا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ ہی آئندہ تم اس کی عبادت کرو گے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اس تفسیر کے مطابق ایک جملے کا تعلق حال سے ہے اور دوسرے کا تعلق مستقبل سے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ موحد ہوتے ہوئے بندہ مشرک نہیں ہو سکتا اور مشرک ہوتے ہوئے موحد نہیں ہو سکتا۔ یہ میں اس لیے وضاحت کر رہا ہوں کہ شاید کسی کے ذہن میں آئے کہ یہ جو فرمایا کہ ”میں نے عبادت کی ہے نہ کروں گا تمہارے معبودوں کی“ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے اور یہ جو فرمایا کہ ”تم نہ میرے رب کی عبادت کرتے ہو نہ کرو گے“ تو یہ کیسے فرمایا؟ کیونکہ ان میں سے کتنے مشرک تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے! اس کا جواب یہ ہے کہ تم جب تک مشرک ہو اور مشرک ہو کر میرے رب کی عبادت کرو تو اس عبادت کا کوئی فائدہ نہیں ہے، موحد؛ موحد ہوتے ہوئے مشرک

نہیں ہو سکتا اور مشرک؛ مشرک ہوتے ہوئے موحد نہیں ہو سکتا۔

[۲]: اور اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”مَا“ کبھی موصولہ ہوتا ہے جو بمعنی ”الَّذِي“ کے ہوتا ہے اور کبھی ”مَا“ مصدریہ ہوتا ہے کہ جس فعل پر داخل ہو اسے مصدر کے معنی میں کر دیتا ہے۔ یہاں جو پہلا جملہ ہے ﴿لَا أَحْبَدُ مَا تَعْبُدُونَ﴾ و لَا أَنْتُمْ عِبِدُونَ مَا أَحْبَدُ ﴿﴾ اس میں ”مَا“ موصولہ ہے، اس صورت میں معنی یہ بنتا ہے کہ میں نہیں عبادت کرتا ان کی جن کی تم عبادت کرتے ہو اور تم نہیں عبادت کرتے اس خدا کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں، اور دوسرے جملے ﴿وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ﴾ و لَا أَنْتُمْ عِبِدُونَ مَا أَحْبَدُ ﴿﴾ میں ”مَا“ مصدریہ ہے۔

معنی ہو گا کہ میری عبادت کا طریقہ وہ نہیں ہے جو تمہاری عبادت کا طریقہ ہے اور تمہاری عبادت کا طریقہ وہ نہیں ہے جو میری عبادت کا طریقہ ہے۔ تو پہلے سے مراد معبودوں کا اختلاف ہے کہ میرا معبود الگ ہے اور تمہارا معبود الگ ہے... اور دوسرے سے مراد طریقہ عبادت کا اختلاف ہے کہ تمہارا طریقہ عبادت الگ ہے اور میرا طریقہ عبادت الگ ہے، اور کلمہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“ اس کی عملی تفسیر بنتا ہے۔ عبادت کے لیے بھی دو چیزیں ہوتی ہیں؛ ایک حکم خدا اور دوسرا طریقہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ معبود اور طریقہ عبادت دونوں الگ الگ ہیں۔

[۳]: اور تیسری تفسیر یہ ہے کہ اس میں تاکید مقصود ہے۔ مطلب یہ ہو گا کہ میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں... میں پھر کہتا ہوں کہ میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

تو یہاں تکرار، تاکید کے لیے ہے۔

### اہل باطل سے برائت کا اعلان:

﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾

تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔ یہاں دین سے مراد یا تو ”جزا“ ہے کہ تمہارے عقیدے اور عمل کی جزا تمہیں ملے گی اور میرے عقائد اور اعمال کی جزا مجھے ملے گی... یا دین کا معنی عقیدہ اور نظریہ ہے کہ تم اپنے دین پر ہو اور میں اپنے دین پر ہوں، میری وجہ سے اگر تم اپنا دین نہیں بدلتے تو تمہاری وجہ سے میں اپنا دین بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

### دین اور مذہب میں فرق:

یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ اصل میں دین اور مذہب میں فرق ہوتا ہے۔ دین کہتے ہیں منصوصات کو اور مذہب کہتے ہیں اجتہادات کو۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں؛ مذاہب اربعہ، مذہب ابی حنیفہ... ادیان اربعہ نہیں کہتے اور دین ابی حنیفہ بھی نہیں کہتے۔ جب یہ بات سمجھ آئے گی تو یہ اشکال ختم ہو جائے گا کہ جی انہوں نے دین کے چار ٹکڑے کر دیے ہیں؛ ایک دین ابو حنیفہ کا ہے، ایک دین شافعی کا ہے، ایک دین مالک کا ہے اور ایک دین امام احمد بن حنبل کا ہے۔ رحمہم اللہ۔ جبکہ قرآن کہتا ہے: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾<sup>117</sup> کہ دین ایک ہی ہے اور انہوں نے دین کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہم نے کہا کہ دین چار نہیں ہیں، دین ایک ہی ہے البتہ مذاہب چار ہیں۔ دین کہتے ہیں منزل کو مذہب کہتے ہیں راستے کو۔ منزل ایک ہوتی ہے اور منزل تک پہنچنے کے لیے راستے کئی ہو سکتے ہیں۔ تو دین؛ منصوصات کا نام ہے اور



مذہب؛ اجتہادیات کا نام ہے۔

یہ بات میں نے اس لیے کی ہے کیونکہ بعض مفسرین یہاں کہتے ہیں کہ دین سے مراد دین اسلام ہے۔ تو جہاں یہ لکھا ہو کہ یہاں دین سے مراد مذہب ہے تو وہاں مذہب کا لفظ دین کے لیے استعمال ہوا ہوتا ہے ورنہ معنی دونوں کا بالکل الگ الگ ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے ایمان کا معنی الگ ہے اور اسلام کا معنی الگ ہے لیکن ایمان کا لفظ اسلام پر بولا جاتا ہے کیوں کہ ایمان سے مقصود اسلام ہے اور اسلام بغیر ایمان کے معتبر نہیں ہے۔ اس لیے ایسا اطلاق کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔

سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص فجر اور مغرب کی سنتوں میں پڑھنا مستحب اور محبوب ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کا اہتمام فرماتے تھے اور آپ اس کا تذکرہ بھی فرمایا کرتے تھے۔

### خطاب کرنے اور نقل کرنے میں فرق:

لفظ ”قل“ پر بات اچھی طرح سمجھو۔ میں کئی بیانات میں بات عرض کیا کرتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ تکلم فرماتے ہیں تو معنی الگ ہوتا ہے اور جب ہم تکلم کرتے ہیں تو معنی الگ ہوتا ہے۔ ہم اهل السنۃ والجماعۃ ہیں۔ ہم اذان سے پہلے ”اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰہِ“ نہیں پڑھتے۔ کوئی بندہ پوچھے کہ تم کیوں نہیں پڑھتے؟ تو ہم کہتے ہیں کہ ہم اس لیے نہیں پڑھتے کہ ہم عاشق پیغمبر ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر پیغمبر کے عاشق ہوتے پھر تو پڑھتے، صلوٰۃ نہ پڑھنا یہ کون سا عاشق پیغمبر ہے؟ ہم نے کہا: بھائی دیکھو! ہم یہاں زندہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں زندہ، اور یہاں سے مدینہ منورہ کا فاصلہ ہزاروں کلومیٹر کا ہے اور جس کو بڑا سمجھیں اس کو دور سے پکارنا ادب کے خلاف ہوتا ہے، اس لیے ہم دور سے یا

رسول اللہ نہیں کہتے کہ یہ ادب کے خلاف ہے۔

میں سمجھانے کے لیے پھر مثالیں دیتا ہوں اور طلبہ سے بھی کہتا ہوں کہ اپنے بیان میں مثال ضرور دیا کرو اس سے بات کھلتی ہے۔ ایک آدمی سکول میں جاتا ہے اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے پوچھتا ہے کہ میں نے ماسٹر غلام رسول صاحب سے ملنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ماسٹر صاحب تو ابھی چلے گئے۔ ایک بچے کو ہیڈ ماسٹر صاحب دوڑاتے ہیں کہ جاؤ اور ماسٹر صاحب کو بلا کر لاؤ۔ وہ بچہ ان کے پیچھے دوڑ رہا ہوتا ہے۔ کوئی دور سے اس بچے کو آتا ہوا دیکھتا ہے تو ماسٹر صاحب سے کہتا ہے کہ استاذ جی لگتا ہے کہ وہ بچہ آپ کو بلانے کے لیے دوڑا آرہا ہے۔ ماسٹر صاحب پیچھے دیکھتے ہیں تو رک جاتے ہیں۔ بچہ قریب آتا ہے تو پوچھتے ہیں کہ تم مجھے بلانے آئے ہو؟ وہ کہتا ہے: جی ہاں، آپ کو ہیڈ ماسٹر صاحب بلارہے ہیں۔ بیٹا! آپ مجھے آواز دے دیتے! تو وہ بچہ کہتا ہے کہ سر! میں آپ کو آواز کیسے دیتا؟

اب دیکھو یہ ماسٹر غلام رسول ہے تو ہم اتنا ادب کرتے ہیں کہ غلام رسول ہو اور استاذ ہو تو اس کو بھی دور سے نہیں پکارتے۔ تو خود رسول کو دور سے کیسے پکاریں گے؟!۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اب دیکھو! کس طرح عوام کے ذہن میں مثال بیٹھتی ہے۔

### تشہد کے صیغہ خطاب سے استدلال کا استدلال کا جواب:

اب اس پر وہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب آپ نماز پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں ”اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ“ اب تو آپ نے بھی دور سے پکار لیا۔ تو اب آپ بھی بے ادب بن گئے۔ ہم نے کہا کہ نہیں! اذان سے پہلے ”اَلصَّلٰوۃُ وَ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ“ اور تشہد میں ”اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ“ کہنے میں فرق ہے۔ جواب بہت اچھی طرح سمجھنا! یہ مسئلہ بار بار آپ کو پیش آئے گا۔

اب فرق کیا ہے! جب اللہ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الْمَرْمِلُ ۖ قُمْ إِلَيْنَا إِلَّا قَلِيلًا ۖ﴾ ♦

اے نبی! اٹھیں اور تہجد پڑھیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۖ قُمْ فَأَنْذِرْ ۖ﴾ ♦

اے نبی! اٹھیں اور تبلیغ کریں۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ

عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ﴾ ♦

اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور ایمان والی عورتوں سے فرمائیں کہ پردہ

کریں۔

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۖ﴾ ♦

آپ فرمائیں کہ اے کافرو!

ان آیات میں اللہ رب العزت اپنے نبی کو حکم دیتے ہیں! اور جب ہم قرآن

پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں ﴿يَا أَيُّهَا الْمَرْمِلُ﴾ تو ہم نبی کو حکم نہیں دیتے، جب ہم پڑھتے

ہیں ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ تو ہم حضور کو حکم نہیں دیتے، جب ہم پڑھتے ہیں ﴿يَا أَيُّهَا

النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ﴾ تو ہم حکم نہیں دیتے۔ فرق یہ ہے کہ جب اللہ ”یا“ فرمادیں تو

پیغمبر کو حکم دیتے ہیں اور جب ہم ”یا“ کہیں تو حکم نہیں دیتے بلکہ اللہ کے خطاب کو نقل

کرتے ہیں۔

جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر تشریف لے گئے ہیں معراج کے

موقع پر، تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: ”الْسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ“ اللہ نے حضور صلی

اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا تھا اور جب ہم نماز میں کہتے ہیں: ”الْسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا

النَّبِيُّ“ تو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب نہیں کرتے بلکہ ہم اللہ کے خطاب کو

نقل کرتے ہیں۔ خطاب کرنا اور ہوتا ہے اور خطاب کو نقل کرنا اور ہوتا ہے۔ ہم خطاب نہیں کرتے بلکہ خطاب کو نقل کرتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب عرش سے فرش پر واپس تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد میں پڑھا: ”الْسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کسی نبی کو خطاب نہیں کیا بلکہ اللہ کے عرش والے خطاب کو نقل فرمایا۔ اسی طرح جب ہم پڑھتے ہیں تو ہم بھی پیغمبر کو خطاب نہیں کرتے بلکہ اللہ کے خطاب کو نقل کرتے ہیں۔

وَاخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة النصر

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ﴿١﴾ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ﴿٢﴾﴾

جب یہ سورت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صحابہ کرام کے مجمع میں تلاوت فرمایا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس کو سن کر رونے لگے۔ رونے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ اس میں جہاں فتح مکہ کی بشارت ہے وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے جانے کے اشارے بھی ہیں۔

فرمایا: جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح ہو جائے تو آپ لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ اسلام میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔

﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۖ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ﴿٣﴾﴾

تو آپ اپنے رب کی حمد کی تسبیح پڑھیں اور استغفار کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کو قبول فرمانے والے ہیں۔

ام المؤمنین امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد یہ دعائیں مرتبہ

پڑھتے تھے: ”سُبْحَانَكَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي“<sup>118</sup>

ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ علیہ وسلم کا معمول بن گیا تھا آپ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر وقت یہ دعا پڑھتے تھے: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوبُ اِلَيْهِ۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ﴾ حجة الوداع کے موقع پر نازل ہوئی اور اس کے بعد ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾<sup>119</sup> نازل ہوئی۔ ان دونوں کے نازل ہونے کے بعد 80 دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقریباً 50 دن پہلے آیت کلامہ نازل ہوئی ﴿قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ﴾<sup>120</sup>۔ پھر وفات سے 35 دن قبل ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾<sup>121</sup> نازل ہوئی اور وفات سے اکیس دن یا سات دن پہلے ﴿وَ اتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾<sup>122</sup> یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت جو مکمل نازل ہوئی ہے وہ سورۃ الفاتحہ ہے اور قرآن کریم کی آخری سورت جو مکمل نازل ہوئی وہ یہی سورۃ النصر ہے۔  
وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

118- صحیح البخاری، رقم: 4967

119- المائدہ 5:3

120- النساء 4:176

121- التوبہ 9:128

122- البقرہ 2:281

## سورة اللہب

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ۝﴾

### سورت کا شان نزول:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾<sup>123</sup> کہ آپ اپنے رشتہ داروں کو ڈرائیں؛ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوہ صفا پر چڑھے اور فرمایا: يَا صَبَا حَاہ! یہ اعلان ہوتا تھا لوگوں کو بلانے کے لیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو آواز دی اور بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا بنی فہر اور یا بنی عدی کہہ کر انہیں پکارا۔ لوگ اکٹھے ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں تمہیں کہوں کہ اس صفا پہاڑی کے پیچھے دشمن ہے جو تم پر حملہ کرے گا تو کیا تم مان لو گے؟ انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں مانیں گے ”مَا جَزَّ بَنَا عَلَيْكَ إِلَّا صِدْقًا“ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچ بولنے والا پایا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”فَإِنِّي نَذِيرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ“ تمہیں آنے والے عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ ابو لہب نے کہا۔ اس کا نام

عبدالعزیٰ تھا۔ اس بد بخت نے کہا: ”تَبَّ لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ، أَلَيْهَذَا جَمَعْتَنَا؟“ اے محمد!- العیاذ باللہ- تو تباہ ہو جائے، تو نے اس لیے بلایا تھا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہیں، قرآن اتر رہا ہے ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ﴾ ابو لہب تباہ و برباد ہو جائے۔ یہ سورت نازل ہوئی۔<sup>124</sup>

یہاں ”ید“ سے مراد ابو لہب کے صرف ہاتھ نہیں ہیں بلکہ ید سے مراد پورا جسم ہے۔ ”تَبَّ“ یہ ماضی کا صیغہ ہے۔ سمجھو کہ وہ تباہ ہو گیا ہے۔

### ابو لہب کا انجام:

﴿مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ۖ﴾

اس کا مال اور اس نے جو کچھ کمایا اس کے کسی کام نہیں آئے گا۔

ابو لہب کے بیٹے بھی خوب تھے اور پیسے بھی خوب تھے۔ کہتا تھا کہ جو محمد کہتا ہے وہ سب غلط کہتا ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اگر اس کی بات ٹھیک ہوئی بھی تو میں اپنے بیٹوں اور مال کو استعمال کر کے عذاب سے بچ جاؤں گا۔

﴿سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۖ﴾

وہ داخل ہو گا ایسی آگ میں جو شعلے والی ہوگی۔

### ابو لہب کی بیوی کا حشر:

﴿وَأُمُّهُ هِيَ أَتَتْهُ حَمَاتُهُ الْمَحْطَبِ ۖ﴾

اور اس کی بیوی بھی اس آگ میں داخل ہوگی جو لکڑیاں اٹھاتی تھی۔ اس کا نام ام جمیل تھا اور یہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بہن تھی۔



”لکڑیاں اٹھاتی تھی“ کا یا تو حقیقی معنی مراد ہے کہ کانٹے دار لکڑیاں اٹھاتی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں بچھاتی تھی یا اس کا معنی یہ ہے کہ جہنم میں زقوم کا درخت اٹھائے گی اور ابو لہب پر پھینکے گی اور اس کی آگ مزید بھڑکائے گی۔

﴿فِي حَبْلٍ مِّنْ مَّسَدٍ﴾

اور اس کی گردن میں بڑی مضبوط رسی ہوگی۔

جہنم کے طوق اور زنجیروں کو یہاں مضبوط رسی سے تعبیر فرمایا کہ یہ جہنم میں چلے گی اور وہاں اس کی گردن میں جہنم کے طوق اور زنجیریں ہوں گی، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ کنجوس مزاج کی عورت تھی، اتنے بڑے سرداروں کی بہن اور بیوی ہونے کے باوجود اپنی کمر پر لکڑیاں اٹھا کر لاتی اور اس کی رسی کو اپنے گلے میں لپیٹ لیتی تھی۔ اس کی یہی رسی اس کے گلے میں پھنسی، جب اٹھنے لگی تو اس کا گلہ دب گیا اور دم گھٹنے سے مر گئی۔

**الیکشن نہیں سلیکشن!**

﴿تَبَّتْ يَدَا آدَمَ لَهَبٍ وَتَبَّ﴾... بعض حضرات اس آیت کے تحت یہ

فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر جب ابو لہب نے جملہ کسا تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہیں دیا بلکہ جواب اللہ نے خود دیا ہے۔ یہی بات میں سمجھایا کرتا ہوں کہ نبی مبعوث من اللہ ہوتا ہے، کیونکہ نبی الیکشن سے نہیں ہوتا۔۔۔ نبی سلیکشن سے ہوتا ہے۔ اس لیے جب نبی پر اعتراض ہو تو نبی خاموش ہوتا ہے، جو نبی کی سلیکشن کرتا ہے وہ خدا جواب دیتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہیں اور اللہ نے جواب دیا ہے۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

## سورة الاخلاص

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝﴾

توحید باری تعالیٰ:

جب مشرکین مکہ نے کہا تھا: اللہ کیا ہے؟ اللہ کا نسب نامہ کیا ہے؟ تو اللہ نے سورت الاخلاص اتاری۔ فرمایا: آپ فرمائیں کہ اللہ ایک ہے، اللہ صمد ہے۔ بے نیاز ہے۔

”صمد“ کا معنی:

”صمد“ کسے کہتے ہیں؟ ”الَّذِي لَا يَحْتَاجُ إِلَى شَيْءٍ وَيَحْتَاجُ إِلَيْهِ كُلُّ شَيْءٍ“ صمد اسے کہتے ہیں کہ جس کا ہر کوئی محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں، اور یہ جو ﴿اللَّهُ الصَّمَدُ﴾ کا ہم ترجمہ کرتے ہیں کہ اللہ بے نیاز ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کو کسی کی ضرورت نہیں ہے، اسے کسی کی حاجت نہیں ہے۔ ایک بات یہ ذہن میں رکھیں کہ بے نیاز کا ایک معنی ہمارے معاشرے میں یہ ہوتا ہے کہ کوئی غلط کرے یا ٹھیک کرے اسے کوئی پوچھنے والا نہ ہو! یہاں قرآن مجید میں صمد اور بے نیاز کا معنی یہ نہیں ہے۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھیں! اللہ تعالیٰ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا

فرمائے۔ آمین

**اللہ نہ کسی کا باپ نہ کسی کا بیٹا:**

﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ﴾

نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ اس کا کوئی والد ہے۔

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾

اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

اب دیکھو! انہوں نے سوال کیا تھا کہ اللہ کیا ہے؟ اور ان کو جواب دیا کہ اللہ کون ہے! معلوم ہوا کہ ہمیشہ سائل کے سوال کے مطابق جواب نہیں دیتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ سائل کی مشا کیا ہے اور سائل کو جواب کیا دینا چاہیے! انہوں نے پوچھا تھا کہ اللہ کیا ہے؟ اگر یہ بتایا جاتا کہ اللہ کیا ہے تو یہ سمجھنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر چیز کی تعریف ہوتی ہے وجود سے، اللہ کی تعریف ہوتی ہے سلب سے۔ کیا مطلب کہ دنیا میں کسی چیز کی تعریف کریں گے تو کہیں گے کہ یہ چیز ایسی ہے اور اللہ کی تعریف کریں گے تو کہیں گے کہ اللہ ایسے نہیں ہیں۔ آپ نے پڑھا ہے القواعد فی العقائد میں کہ جب اللہ کے بارے میں پوچھا جائے کہ اللہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیتے ہیں:

اللَّهُ لَيْسَ بِجَسَمٍ وَلَا جَوْهَرٍ وَلَا عَرِضٍ وَلَا طَوِيلٍ وَلَا عَرِيزٍ وَلَا يَشْغُلُ الْأَمْكِنَةُ وَلَا يَحْوِيهِ مَكَانٌ وَلَا جِهَةٌ مِنَ الْجِهَاتِ السَّتَّةِ<sup>125</sup>

اب دیکھو! اللہ جسم بھی نہیں، جوہر بھی نہیں، طویل بھی نہیں، عریض بھی نہیں، مکانات میں اتر کر ان کو بھرتے نہیں، کوئی مکان اللہ کا احاطہ بھی نہیں کر سکتا،

جہات ستہ میں سے کوئی جہت اللہ کے لیے ثابت بھی نہیں۔

تو وہاں تعریف ساری سلبی ہے۔ اس لیے اگر ان کے سوال کے جواب میں یہ بتایا جاتا کہ ”اللَّهُ كَيْسٌ بِحَسْبِهِ وَلَا جَوْهَرٌ...“ تو ان لوگوں کو کیا سمجھ آتا کہ جوہر کیا ہے! اور اس کا سلب کیا ہے! اس لیے انہوں نے جب پوچھا کہ اللہ کیا ہے؟ تو جواب دیا گیا کہ اللہ کون ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْآهْلِةِ﴾<sup>126</sup>

انہوں نے پوچھا کہ چاند کیا ہے؟ تو ان کو جواب دیا کہ چاند کیوں ہے؟! فرمایا: ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾<sup>127</sup> انہیں بتاؤ؛ چاند اس لیے ہے کہ اس سے تم اپنے معاملات اور حج کے اوقات متعین کرو۔

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ﴾<sup>127</sup>

انہوں نے پوچھا کہ کیا خرچ کریں؟ ان کو جواب دیا کہ تم یہ پوچھو کہ کہاں خرچ کریں! ﴿قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ﴾ کہ جو خرچ کرنا ہے اپنے والدین اور عزیز و اقارب وغیرہ پر خرچ کرو!

تو ہمیشہ ایسا نہیں کرتے کہ جو سوال کیا ہے اسی کا جواب دیں بلکہ جو مناسب ہو وہ جواب دینا چاہیے۔ اللہ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَأَخِرُ دَعْوَانَا أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

## سورة الفلق

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝۲ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا

وَقَبَ ۝۳ وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ۝۴ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝۵﴾

## سورة الناس

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱ مَلِكِ النَّاسِ ۝۲ إِلَهِ النَّاسِ ۝۳ مِنْ شَرِّ

الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝۴ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝۵ مِنَ الْغِيَّةِ وَ

النَّاسِ ۝۶﴾

معوذتین کا شان نزول:

یہ دونوں سورتیں اکٹھی نازل ہوئی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مدینہ کے یہودی لبید بن اعصم نے اپنی بیٹیوں کے ذریعے جادو کروایا۔ جادو کا اثر یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات ایک کام فرمالیتے اور آپ کے ذہن میں ہوتا کہ میں نے یہ کام نہیں کیا۔ بس اتنا سا اس جادو کا اثر ہوا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے تھے تو خواب میں دو فرشتے

آئے۔ ایک فرشتہ آپ کے سر کی جانب اور ایک فرشتہ آپ کے پاؤں کی جانب بیٹھ گیا۔ سر ہانے والے فرشتے نے دوسرے فرشتے سے پوچھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو ہوا ہے۔ پوچھا: کس نے کرایا ہے؟ کہا: لبید بن اعصم یہودی نے۔ کس چیز پر کرایا ہے؟ اس نے تفصیل بتائی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس کنگھی مبارک سے بال سنوارتے تھے اس کنگھی کے کچھ دندانے لیے ہیں اور ایک رسی لی ہے، اس رسی میں گیارہ گرہیں لگائی ہیں اور ہر گرہ میں ایک سوئی لگائی ہے، پھر اس کو کھجور کے پھل کے غلاف میں رکھ کر ایک کنواں - جسے بُرُذوان کہتے ہیں - اس میں ایک پتھر کے نیچے اس کو رکھ دیا گیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خواب سے بیدار ہوئے تو آپ سیدھا اس کنویں پر تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پتھر کو ہٹوایا تو نیچے یہ سب کچھ رکھا ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ دونوں سورتیں نازل ہوئیں۔ آپ ایک آیت پڑھتے اور ایک گرہ کھولتے، آپ کو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے میرے جسم سے بوجھ اتر رہا ہے، گیارہ آیتیں پڑھ لیں تو گیارہ گرہیں کھل گئیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کا نام نہیں بتایا کہ کہیں اس کو قتل نہ کر دیا جائے، فرمایا کہ اللہ نے مجھے تو صحت دے دی ہے، اب میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ میری وجہ سے کسی کو تکلیف ہو، اور بعض روایات میں ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پتا چلا تو انہوں نے اجازت چاہی اس کو قتل کر دیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اپنی ذات کے لیے انتقام کو پسند نہیں کرتا۔ آپ نے منع فرما دیا۔

ہمیں بھی صبح و شام ان دونوں سورتوں کے پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود ان سورتوں کو پڑھتے تھے، اپنے مبارک ہاتھوں پر

پھونک مارتے پھر ان کو پورے جسم پر مل لیتے تھے۔ آخری عمر میں حضرت ام المؤمنین امی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یہ دونوں سورتیں پڑھتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں پر پھونک دیتیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ جسم پر مل لیا کرتے تھے۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اپنے ہاتھوں پر دم کر کے اپنے ہاتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس لیے نہیں پھیرتی تھی کہ جو برکت آپ کے ہاتھوں میں ہے وہ میرے ہاتھوں میں کہاں ہو سکتی ہے؟!

### جادو کا ہو جانابر حق ہے:

یہ بات ذہن نشین فرمائیں کہ جادو کا ہو جانابر حق ہے۔ برحق ہونے کا معنی یہ نہیں کہ جادو ٹھیک ہے بلکہ برحق ہونے کا معنی یہ ہے کہ جادو ثابت ہے، جادو کیا جائے تو ہو جاتا ہے اور یہ کوئی قابلِ اشکال چیز نہیں ہے۔ جس طرح زہر کھانے کی وجہ سے بندہ مر جاتا ہے تو زہر کا ایک اثر ہے، نمک کھائیں تو نمک کا اثر ہے، مرچ کھائیں تو مرچ کا اپنا اثر ہے، پانی کا اپنا اثر ہے، ہر چیز کا اپنا ایک اثر ہے۔ اسی طرح کلمات میں اللہ نے تاثیر رکھی ہے اور وہ کلمہ اپنی تاثیر دکھاتا ہے، نبی پر بھی اثر ہوتا ہے اور غیر نبی پر بھی ہوتا ہے۔

### جادو گر کا میاب نہیں ہوتا کا مطلب:

جو لوگ نبی پر جادو ہونے کے قائل نہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلَا يَفْلِحُ السَّحَرُونَ﴾<sup>128</sup>

کہ جادو گر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر یہ مان لیں کہ نبی پر جادو ہوا ہے تو اس کا معنی ہے کہ جادو گر تو کامیاب ہو گئے۔

ہم کہتے ہیں کہ آیت نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ ذہن بنا ہے۔ اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھیں کہ ایک ہوتا ہے جادو گر کا جادو چل جانا اور ایک ہوتا ہے جادو گر کا اپنے مقصد میں کامیاب ہو جانا۔ جادو چلنا اور ہے اور مقصد میں کامیاب ہونا اور ہے۔ مثلاً کچھ لوگ کسی شخص پر قاتلانہ حملہ کرتے ہیں تاکہ اس کو مار دیں اور حملہ ہو بھی جاتا ہے لیکن بندہ بچ جاتا ہے۔ اب یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ حملہ ہوا ہی نہیں، ہاں حملہ ہوا ہے لیکن قاتل اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کرنے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ آپ نبوت کے کام کو چھوڑ دیں، دعوت نہ دیں، تبلیغ نہ کریں لیکن اس جادو کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم دین کی دعوت دیتے رہے۔ تو جادو گر کا جو مقصد تھا اس میں وہ کامیاب نہیں ہوا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو ہوا ہی نہیں۔

دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مد مقابل ستر ہزار جادو گر آئے تھے، انہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں تو وہ سانپ بنتی ہوئی نظر بھی آئیں اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ﴿فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُوسَى﴾<sup>129</sup> موسیٰ علیہ السلام نے خوف محسوس کیا۔ جادو تو ہوا اور اس کا اثر بھی ہوا۔ اب ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم موسیٰ علیہ السلام پر غالب آجائیں لیکن وہ غالب نہیں آ سکے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان جادو گروں نے جادو کیا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے۔ تو جادو کرنا اور ہے اور جادو میں کامیاب ہو جانا اور ہے۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس لیے



جس طرح عام آدمی پر جادو ہو جاتا ہے تو نبی پر بھی ہو جاتا ہے۔

### جادو سے بچنے کا وظیفہ:

جادو سے بچنے کے لیے سورت یونس کی آیت نمبر 80 اور آیت نمبر 81 صبح و شام پڑھ لیا کریں:

﴿فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ اَلْقُوا مَا اَنْتُمْ مُّلقُونَ ﴿٨٠﴾  
فَلَمَّا اَلْقَوْا قَالَ مُّوسَىٰ مَا جِئْتُمْ بِهٖ السَّحَرُ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَا  
يُضِلُّ عَمَلِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٨١﴾﴾

اسی طرح یہ دعا ”بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِي لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي  
السَّمَاءِ وَهُوَ السَّيِّغُ الْعَلِيْمُ“<sup>130</sup> بھی صبح و شام تین تین بار پڑھ لیا کریں اور  
معوذتین بھی صبح و شام پڑھ لیا کریں۔ یہ مسنون اعمال ہیں۔ ان کی برکت سے انسان  
جادو سے محفوظ رہتا ہے۔

ان دونوں سورتوں میں اللہ رب العزت نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے  
واسطے سے ہمیں تعلیم دی ہے کہ شر دو قسم کے ہیں جن سے تمہیں بچنا چاہیے۔ ایک شر  
وہ ہے جس کا اثر دنیا میں ہے اور ایک شر وہ ہے جس کا اثر آخرت میں ہے۔

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿١﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿٢﴾﴾

میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی مخلوقات کے شر سے۔

اس شر کا نقصان انسان کی دنیا پر ہوتا ہے۔

﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴿٣﴾﴾

اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ چھا جائے۔

اب رات کے اندھیرے میں اگر کسی پر حملہ ہو جائے اور بندہ قتل ہو جائے تو یہ دنیا کا نقصان ہو گا، کوئی حملہ کرے اور بندہ زخمی ہو جائے تو دنیا کا نقصان ہو گا۔

﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ﴿﴾

اور گرہوں پر پھونک مارنے والیوں کے شر سے اور حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے۔

دشمن اگر جادو کرے اور کامیاب بھی ہو جائے تو دنیا کا نقصان ہو گا، حاسد اگر کسی سے حسد کرے تو بھی دنیا کا نقصان ہو گا۔ تو پہلی سورت سورۃ الفلق میں اس شر کا ذکر ہے جس کا تعلق دنیاوی نقصان سے ہے اور سورۃ الناس میں اس شر کا ذکر ہے جس کا تعلق اخروی نقصان سے ہے۔ چونکہ دنیا کا نقصان پہلے ہے اس لیے اس کا ذکر پہلے فرمایا اور اخروی نقصان بعد میں ہے اس لیے اس کا ذکر بعد میں فرمایا ہے۔

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿﴾

یہاں ”مَا خَلَقَ“ یعنی تمام مخلوقات کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد رات کے شر سے، گرہوں پر پھونکنے والی جادوگریوں کے شر سے اور حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا۔ تو اصل تو مخلوقات کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم ہے باقی مزید تین چیزوں کے شر کا ذکر کیوں فرمایا؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً ایک آدمی اپنے بیٹے کو سرگودھا سے کراچی کے لیے ٹرین پر بٹھائے اور کہے کہ بیٹا! راستے میں اپنا بہت خیال رکھنا، خاص طور پر اپنے موبائل سے کسی کو فون نہ کرنے دینا، خاص طور پر کسی کا کھانا نہ کھانا، خاص طور پر کسی آدمی کا سامان اپنے پاس نہ رکھنا۔ تو اصل تھا کہ اپنا خیال رکھنا، اس کے بعد بعض وہ خاص خاص چیزیں جن کا خیال کرنا چاہیے ان کی نشاندہی بھی کر دی۔

بالکل اسی طرح اصل تو تمام مخلوقات کے شر سے اللہ کی پناہ میں آنا ہے، ہاں خاص طور پر اس شر سے جو رات میں ہوتا ہے کیونکہ دن والے شر تو نظر آتے ہیں جبکہ رات والے نظر نہیں آتے، اور خاص طور پر اس شر سے جو جادو کا ہوتا ہے کیونکہ کوئی آدمی گولی مارے تو نظر آتی ہے اور جادو کرے تو کلمات نظر نہیں آتے، اسی طرح خاص طور پر حاسد کے شر سے اللہ کی پناہ مانگو کیونکہ حاسد کا شر مخفی ہوتا ہے، حاسد ساتھ بھی رہتا ہے، اوپر اوپر سے محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے لیکن اندر اندر سے جل رہا ہوتا ہے۔ تو اسے تخصیص بعد التعمیم کہتے ہیں کہ پہلے عام بات کہہ دی جائے اور بعد میں بعض خاص باتیں کہی جائیں۔

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾

یہاں دیکھیں! اللہ کی صفت بیان فرمائی ہے ”رَبِّ الْفَلَقِ“ کہ جو صبح کا رب ہے اور آگے جس سے پناہ مانگی ہے اس کا چار بار تذکرہ کیا، اور اگلی سورت میں آیا ہے:

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱ مَلِكِ النَّاسِ ۝۲ إِلَهِ النَّاسِ ۝۳﴾

یہاں اللہ کی تین صفتیں بیان فرمائی ہیں: رب، ملک اور الہ، اور جس سے پناہ مانگی ہے اس کا ایک بار ذکر کیا یعنی ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شر بہت خطرناک ہے۔ دنیا کا شر مضرت میں کم ہوتا ہے اور آخرت کا شر مضرت میں بڑا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ کی تین صفتیں بیان کر کے اس ایک شر سے پناہ مانگی ہے۔

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾

وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو وسوسہ ڈال کر چھپ جاتا ہے۔

یہاں فرمایا: ”الْخَنَّاسِ“... یہ خنس سے ہے جس کا معنی ہے چھپنا۔ جب

انسان اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان جو اپنا منہ انسان کے دل پر رکھ کر بیٹھا ہوتا ہے وہ ذکر اللہ کی وجہ سے پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب ذکر ختم کرتا ہے تو پھر وہاں پر بیٹھ جاتا ہے، جب پھر ذکر شروع کرے تو پھر پیچھے ہٹ جاتا ہے، جب ذکر ختم کرے تو پھر واپس آ جاتا ہے۔ اس لیے شیطان کو خناس کہتے ہیں۔

﴿الَّذِي يُوسُّوسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۖ مِنَ الْغِيَةِ وَالنَّاسِ ۖ﴾

جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ جنات میں سے بھی ہے اور انسانوں میں سے بھی۔

وسوسہ ڈال کر تباہ کرنے والے دونوں قسم کے لوگ ہیں یعنی شیطاں بھی ہیں اور انسان بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں کے شرور سے ہم سب کو محفوظ فرمائیں۔ آمین

### قرآن کریم کے آغاز و اختتام میں ربط:

قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت؛ سورۃ الفاتحہ ہے اور قرآن کریم کی سب سے آخری دو سورتیں؛ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس ہیں۔ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے۔ عام آدمی جو اچھی گفتگو کرنے والا ہو اس کے کلام کے شروع اور کلام کے آخر میں ربط ہوتا ہے، مناسبت ہوتی ہے، ایسا شخص بے ربط کلام کبھی نہیں کرتا۔ اللہ رب العزت سے بہتر کلام کس کا ہو سکتا ہے؟! اس لیے اللہ کے کلام کی ابتدا اور انتہا میں ربط بہت عجیب ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی صفتیں بیان فرمائی ہیں:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۝﴾

اس کے بعد بندے نے اللہ سے اپنا تعلق بیان کیا ہے:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾

کہ اے اللہ! ہمارا آپ سے تعلق ہے کہ ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں۔

اس کے بعد بندے نے پھر دو چیزیں مانگی ہیں:

1: ﴿إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾

2: ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾

یہ دو چیزیں مانگی ہیں۔ دنیا میں جب بھی کسی سے کوئی چیز مانگی جائے تو پہلے اس کی تعریف کرتے ہیں، پھر اس کا اور اپنا تعلق بتاتے ہیں اور اس کے بعد مانگنا شروع کرتے ہیں۔ سورۃ الفاتحہ میں ہم پہلے اللہ کی تعریف کرتے ہیں، پھر اللہ سے اپنا تعلق بتاتے ہیں، پھر مانگنا شروع کر دیتے ہیں، اور مانگی دو چیزیں ہیں:

1: ﴿إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾

اے اللہ! ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

2: ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾

اے اللہ! ہم آپ سے صراطِ مستقیم مانگتے ہیں۔

الفاتحہ میں دو چیزیں اللہ سے مانگی ہیں اور قرآن کریم کے آخر میں سورۃ الفلق اور سورۃ الناس میں بھی دو چیزوں سے پناہ مانگی ہے۔

1: ﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ﴾

2: ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾

سورۃ الفاتحہ میں دو چیزیں مانگی ہیں کہ یہ دو ہمیں چاہئیں اور سورۃ الفلق اور سورۃ الناس میں دو چیزوں سے پناہ مانگی ہے کہ یہ دو چیزیں ہمیں نہیں چاہئیں!

**پورے قرآن کا خلاصہ:**

پورے قرآن کریم اور پورے دین کا خلاصہ دو چیزیں ہیں:

نمبر 1... ﴿وَمَا أَتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں جو

کچھ دیں وہ لے لو!

نمبر 2... ﴿وَمَا نَفْهَمُ عَنْهُ فَاَتَتْهُوَا﴾ اور جس چیز سے منع فرمادیں اس سے رک جاؤ۔

پنجم جو چیز دیں اس کا نام ”خیر“ ہے اور جس چیز سے منع کر دیں اس کا نام ”شر“ ہے۔

اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۖ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا

يَرَهُ ۚ﴾

جس شخص نے ذرہ برابر بھی خیر اور نیکی کی ہوگی تو اسے اس کا بدلہ ملے گا اور جس نے ذرہ برابر شر یعنی گناہ کیا ہو گا تو اسے اس کا بدلہ ملے گا۔

تو خیر یعنی چاہیے اور شر سے بچنا چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا خلاصہ دو صفتیں ہیں؛ بشیر اور نذیر۔ صفتِ بشیر کہ جنت کی طرف دعوت دے کر بلانے والا اور صفتِ نذیر کہ وعیدیں سنا کر ڈرانے والا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے بعد انسان کے ابدی ٹھکانے دو ہی ہیں؛ جنت یا جہنم۔ اس سے پہلے عالمِ ارواح ٹھکانہ تھا لیکن وہ ابدی نہیں تھا، اس کے بعد عالمِ دنیا ہے لیکن یہ بھی ابدی نہیں ہے، اس کے بعد عالمِ برزخ ہے اور یہ بھی ابدی نہیں ہے، عالمِ برزخ کے بعد حشر ہے یہ بھی ابدی نہیں اور حشر کے بعد جو ٹھکانے ہیں جنت یا جہنم وہ ابدی ہیں لیکن وہ دونوں ازلی نہیں ہیں کہ ہمیشہ سے ہوں، ہاں ابدی ہیں کہ ہمیشہ رہیں گے، جنت بھی ہمیشہ رہے گی اور جہنم بھی ہمیشہ رہے گی، نہ جنت ختم ہوگی اور نہ جہنم ختم ہوگی۔

جنت اہل خیر کی جگہ ہے اور جہنم اہل شر کی جگہ ہے۔ جو صاحبِ خیر ہیں وہ

جنت میں رہیں گے اور جو صاحبِ شر ہیں وہ جہنم میں رہیں گے۔ ہاں اگر کسی آدمی کا شر چھوٹا ہے یعنی اس کے پاس ایمان تو ہے لیکن ایمان کے ساتھ ساتھ اعمالِ سیئہ بھی ہیں تو وہ کچھ وقت جہنم میں رہے گا اور بالآخر جہنم سے نکال کر جنت میں بھیج دیا جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ اپنے کرم سے اسے جہنم میں نہ بھیجیں بلکہ براہِ راست خیر یعنی ایمان کی وجہ سے جنت میں بھیج دیں۔

موت کے بعد خیر والے جنت میں جائیں گے اور شر والے جہنم میں جائیں گے، اور ہمیں حکم ہے کہ ہم اللہ سے جنت کو مانگیں اور جہنم سے پناہ مانگیں: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ... ”خیر“ جنت میں جانے کا ذریعہ ہے اور ”شر“ جہنم میں جانے کا ذریعہ ہے۔

تو اللہ رب العزت نے قرآن کریم کی پہلی سورت سورۃ الفاتحہ میں دو خیریں بتائی ہیں اور آخری دو سورتوں میں دو شر بتائے ہیں۔

سورۃ الفاتحہ میں دو خیریں بتائیں؛

1: ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾

2: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾

اور آخری دو سورتوں میں دو شر بتائے؛

1: ﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ﴾

2: ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾

یہ دو خیر اور دو شر کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی نے دنیا میں رہنا ہے تو دنیا میں انسان کو عافیت چاہیے، عزت چاہیے، سہولت چاہیے، امن چاہیے، راحت چاہیے۔ اس لیے فرمایا کہ دنیا میں تم ہم سے ہماری مدد مانگو! اگر اللہ کی مدد انسان کو مل

جائے تو اس سے انسان کو عزت ملتی ہے، راحت ملتی ہے، سکون ملتا ہے، سہولت ملتی ہے۔ آدمی اگر شر سے بچ جائے تو دنیا میں راحت سے رہتا ہے، اسی لیے فرمایا: ﴿مِنْ ثَمَرِ مَا خَلَقَ﴾ کہ مخلوق کے شر سے پناہ مانگو! جس آدمی کو دنیا میں اللہ کی مدد مل گئی تو یہ غالب ہو گا، مخلوق کے شر سے پناہ مل گئی یہ انسان پر امن ہو گا اور عافیت و امن کے ساتھ دین کے کام میں لگا ہو گا اور آخرت کی طرف اس کا سفر جاری رہے گا۔ ہم اللہ پاک سے دعا کرتے ہیں:

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً

ہمیں دنیا بھی اچھی عطا فرما اور آخرت بھی اچھی عطا فرما!

دنیا اچھی ملتی ہے جب اللہ کی مدد مل جائے، دنیا اچھی ہوتی ہے جب انسان مخلوقات کے شر سے بچ جائے اور آخرت اچھی ہوتی ہے جب ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ انسان کو صراطِ مستقیم مل جائے، جب ﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ شیطان کے وساوس سے بچ جائے پھر انسان کی آخرت بھی اچھی ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم کی ابتدا اور انتہا میں کتنی بہترین مناسبت ہے!

بطورِ خاص یہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ امت کی خیر کی طرف رہنمائی کریں اور امت کو شر سے بچائیں۔ جو عالم امت کو خیر بتاتا ہے اور امت کو شر سے نہیں بچاتا وہ آدھا کام کرتا ہے اور جو خیر بھی بتاتا ہے اور شر سے بھی بچاتا ہے وہ پورا کام کرتا ہے۔ پیغمبر کی پوری وراثت ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ ہے۔ نبوت کی پوری وراثت صرف خیر بتانا نہیں بلکہ نبوت کی پوری وراثت خیر بتانے کے ساتھ ساتھ شر سے بچانا بھی ہے۔ اس لیے رسول اکرم صلی اللہ



علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا مزاج تھا:

كَانَ النَّاسُ يَسْأَلُونَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخَيْرِ  
وَكُنْتُ أَسْأَلُهُ عَنِ الشَّرِّ خَفَافَةً أَنْ يُدِيرَ كَيْفِي<sup>131</sup>

کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کی باتیں پوچھتے تھے اور میں آپ سے شر کی باتیں پوچھتا تھا اس ڈر سے کہ کہیں میں اس شر میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ امت کو خیر کی طرف بلانا ہے اور امت کو شر سے بچانا ہے۔ سورۃ الفاتحہ اور معوذتین کا خلاصہ بھی یہی ہے۔

خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ قرآن کی ابتدا اور انتہا میں مناسبت بہت پیاری ہے اور ہمیں ان چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے اور ہم اس پر اللہ کا جس قدر شکر ادا کریں کم ہے کہ بحمد اللہ تعالیٰ مرکز اہل السنۃ والجماعۃ اسی راستے پر چل رہا ہے، ہم دونوں کاموں کا اہتمام کرتے ہیں، دونوں چیزیں بتانے کی بھرپور فکر کرتے ہیں اور یہ فکر کرنی بھی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی توفیق عطا فرمائیں اور اللہ پاک آپ کو بھی توفیق عطا فرمائیں۔ یہ ہمارے دروس القرآن کا آخری سبق تھا جس میں آپ نے شرکت فرمائی ہے۔ دعا کریں کہ آئندہ سال کوئی ایسی ترتیب بن جائے کہ پورے قرآن کریم کا آیت وار ترجمہ کیا جائے۔ اس کا بہت زیادہ فائدہ ہو گا ان شاء اللہ۔

**لفظ رب، مالک، اللہ لانے کا مقصد:**

یہاں بس صرف ایک بات سمجھ لیں!

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿١﴾ مَلِكِ النَّاسِ ﴿٢﴾ إِلَهِ النَّاسِ ﴿٣﴾﴾

یہاں بظاہر عربی ترکیب کا تقاضا یہ تھا کہ آگے ”مَلِكُهُمْ“ اور ”إِلَهُهُمْ“ ضمیریں ہوتیں جو ”النَّاسِ“ کی طرف لوٹتیں۔ تو النَّاسِ... النَّاسِ... النَّاسِ... کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے ایسا اسلوب اختیار فرمایا ہے یہ بتانے کے لیے کہ یہاں ہر مرتبہ ”النَّاسِ“ کی مراد الگ ہے، انسانوں کی مختلف حالتوں کے اعتبار سے ”النَّاسِ“ کا بار بار تذکرہ آیا ہے۔

جب پہلے فرمایا: ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ تو یہاں ”الناس“ سے مراد انسان کی بچپن کی حالت ہے۔ اس پر دلیل لفظ رب ہے۔ جوانی میں بھی انسان تربیت محتاج ہوتا ہے لیکن بچپن میں بچہ تربیت کا زیادہ محتاج ہوتا ہے، نہ اٹھ سکتا ہے، نہ چل سکتا ہے تو اس کے ظاہری اختیارات بالکل ختم ہوتے ہیں۔

﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ میں ”الناس“ سے انسان کی جوانی کی حالت بیان فرمائی ہے۔ دلیل اس پر لفظ ملک ہے۔ کیونکہ اس حالت میں انسان کو جوانی کا نشہ ہوتا ہے تو اس کے لیے ملک اور حکمران ضروری ہوتا ہے جو ان کی اس حالت میں ان کو کنٹرول کرے اور قوت اور طاقت کے ساتھ راہِ راست پر رکھے۔

﴿إِلَهِ النَّاسِ﴾ یہاں پر انسان کی بڑھاپے کی حالت مراد ہے۔ دلیل اس پر لفظ الہ ہے۔ چونکہ عبادت کی طرف بندہ بچپن اور جوانی میں بھی مائل ہوتا ہے لیکن بڑھاپے میں سوائے عبادت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

﴿مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ﴾ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ﴿١﴾

یہاں ”النَّاسِ“ سے مراد وہ انسان ہے جس کی حالت اچھی ہو، خیر والی ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً شیطان وسوسے وہیں ڈالتا ہے جہاں پر آدمی اچھا ہو، برے آدمی کو مزید وسوسا میں مبتلا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

## ﴿مِنَ الْجَنَّةِ وَالنَّاسِ﴾

یہاں ”النَّاسِ“ سے مراد وہ انسان ہے جو شر والا ہو، اس لیے کہ وسوسے ڈالنے والا اچھا آدمی نہیں ہوتا، وسوسے ڈالنے والا آدمی برا ہوتا ہے۔ تو چونکہ انسان کی پانچ حالتوں کا ذکر تھا اس لیے پانچوں مرتبہ ضمیر کے بجائے مستقل اسم ظاہر الناس کا ذکر فرما دیا ہے۔

قرآن کریم کے اختتام پر یہ ذہن نشین فرمالیں کہ اصل علم قرآن کریم اور حدیث مبارک کا علم ہے، یہ بنیادی علوم ہیں، آگے علم الفقہ یہ قرآن کریم اور حدیث پاک کا خلاصہ، نچوڑ اور مغز ہے۔ سب سے زیادہ محنت قرآن کریم اور حدیث پاک پر کرنی چاہیے۔ قرآن کریم کو پڑھنا چاہیے، قرآن کریم کو سمجھنا چاہیے، قرآن کریم پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خوش قسمت ہے وہ انسان جس کا قرآن کریم سے رابطہ اور تعلق بہت مضبوط ہو۔ اس لیے جس قدر تعلق مضبوط کر سکیں تو کریں اور قرآن کریم کو سب سے زیادہ تہجد میں پڑھنا چاہیے۔ تہجد کا وقت بہت بہترین وقت ہوتا ہے قرآن کریم پڑھنے کے لیے۔ فجر کی نماز میں تلاوت عام نمازوں کی بنسبت زیادہ ہوتی ہے تو یہ بطور خاص قرآن کریم کی تلاوت کا وقت ہے۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین  
وَاجْرُدْ دَعْوَانَا إِنَّ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.